2ND EDITION

ہماری ویب ڈیجیٹل بک

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی

DR RAIS AHMED SAMDANI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Dr Rais Ahmed Samdani"
at Hamariweb.com

لمس ۔ عابد خورشید

میں نے عابد خورشید کو ۱۱ مئی ۲۰۱۰ء کو اس وقت دیکھا جب میں شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز، جامعہ سرگودھا میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر منسلک ہوا، شعبہ سے منسلک ہوتے وقت جس کاغذی کاروائی کی ضرورت ہوتی ہے عابد خورشید نے اس میں نا صرف میری مدد کی بلکہ بہت ہی خوش اسلوبی سے تمام کاروائی کو تکمیل تک پہنچایا۔ ایک اجنبی کے ساتھ جب کہ اس کے ساتھ صرف سلام دعا ہی ہوئی تھی مثالی کارکردگی کا اظہار قابل تعریف تھا۔ اس کا یہ عمل ظاہر کر رہا تھا کہ عابد خورشید ایک نیک، سچا، ہمدرد اور دوسروں کی مدد کرنے والا انسان ہے۔ عابد میرے شعبہ میں میرا رفیق کار تھا۔ مجھے یہ پہلی ہی نظر میں بھلا معلوم ہوا، تفصیلی تعارف نہیں ہوا تھا لیکن میرا گمان تھا جو بعد میں یقین میں بدل گیا کہ کسی بھلے خاندان کا ایک ایسا ثبوت ہے جس کی پرورش اس کی ماں نے بہت ہی احتیاط سے کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک ایسا انسان موجود ہے جس میں دکھ بھی ہے سکھ بھی، خوشی بھی ہے غمی بھی، آنسو بھی ہیں تبسم بھی، یہ ہنستا ہے تو اس کے دکھ کا سایہ بھی جھلک دکھا رہا
ہوتا ہے، جب یہ افسردہ ہوتا ہے تو اس کے چہرہ پر ہلکی سی اداسی نمایاں ہوتی

ہے۔

حالیؔ نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں لکھا کہ 'یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے۔ بعض طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے' مجھے یہ کہنے میں کوئی تعمل نہیں شعری مجموعہ 'لمس' کا خالق عابد خورشید ایک اکتسابی شاعر نہیں بلکہ شاعری کی استعداد' عطیہ خداوندی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ شاعر نے اللہ کی اس نعمت کو اپنے اندر محسوس کیا اور اس عطیہ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں بھی لا رہا ہے۔

شاعری کی ایک علامت موزونیٔ طبع بھی ہے۔ بے شمار شاعر بہت اچھا کہتے ہیں لیکن اشعار کی ادائیگی موزوں نہیں ہوتی۔ الفاظ کی ادائیگی، اتار چڑھاؤ، زیر ، زبر اور پیش کا ادراک کیے بغیر اشعار پڑھتے ہیں۔ عابد خورشید ایک اچھا شاعر تو ہے ہی، ساتھ ہی موزونیٔ طبع کا مکمل ادراک رکھتا ہے۔ مشاعرے میں اشعار پڑھنے کا انداز بہت موزوں ساتھ ہی پر کشش بھی ہے۔

عابد خورشید کا مجموعہ کلام 'لمس' اپنے تجربات و مشاہدات کی رعنائی کے اعتبار سے شاعر کے احساسات کا خوبصورت عکس ہے ہی نہیں بلکہ اس میں آپ بیتی

کا حسن بھی جھلک رہا ہے۔ یہ رومانیت اور حقیقت پسندی کی خوبصورت کاوش ہے۔ عابد خورشید کا تعلق شاہینوں کے شہر سرگودھا سے اور یہ نوجوان شاعر سرگودھا کے شعراء کے اس قبیل سے ہے جو مداحینِ ڈاکٹر وزیر آغا ہی نہیں بلکہ سرگودھا اسکول جس کے بانی بھی ڈاکٹر وزیر آغا ہی تھے کے سرگرم کارکن ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ اردو زبان کی ایک قدآور شخصیت کا نام ہے۔ آپ ان دانشوروں میں سے تھے جو بیک وقت ہفت پہلو یعنی شاعری، تحقیق، تنقید، فلسفہ سائنس، تاریخ، اساطیر اور اردو انشاپردازی کے شہسوار تصور کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اردو انشائیہ کو عام کرنے میں جو کام کیا وہ نا قبل فراموش ہے۔ وہ یقیناً ہمارے عہد کی ایک اہم اور معتبر ادبی شخصیت تھے۔ عابد خورشید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے مجموعہ کلا 'لمس' کا فلیپ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں ''عابد خورشید کی غزل میں ایک ایسی کیفیت کا لمس اُبھر ہے جس میں آنسو اور تبسم باہم آمیز ہوگئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اُس کے اَندر کا دُکھ اور کرب گنجان ہو کر ایک ایک لفظ سے پھوٹتا نظر آنے لگا ہے''۔ مزید لکھتے ہیں کہ'' عابد خورشید کے ہاں ایک آشنہ ضبط ہے۔ وہ نہ صرف اِس دل دوز اور کربناک صورتِ حال کا سامنا کرنے میں کامیاب ہے بلکی اُس نے اپنے اور اِس کے درمیان جمالیاتی فاصلہ بھی قائم کر رکھا ہے' جب وہ کہتا ہے ۔

رت جگے کا کرب ہے یا اروشنی کا خوف

ایک ہنگامہ سا ہے شام و سحر کے آس پاس

تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری صورتِ حال کا ایک بلند مقام سے دیکھ رہا ہے۔ یعنی وہ اُسے خود میں پوری طرح جذب کرنے کے باوجود اُس پر ایک ترچھی نظر ڈالنے پر قادر ہے۔ دُکھ کی معیت میں زندہ رہنے کی یہ سعادت بہت کم تخلیق کاروں کے حصے میں آئی ہے''۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے سند دے دینے کے بعد اب اس بات کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ مجھ جیسا شخص کچھ کہے۔

فلیپ دوم سرگودھا کی ایک اور بہت ہی محترم و معزز شخصیت نے تحریر کیا ہے وہ ہیں پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول صاحب۔ سرگودھا میں رہتے ہوئے میں نے ان کی انگریزی تصنیف ''سرگودھا کی تاریخ'' سے استفادہ کیا۔ اپنے موضوع پر انتہائی عمدہ تحقیق ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے لمس کے شاعر کو ''پختہ فکر اور انوکھے اظہار کا شاعر قرار دیا ہے''۔

جناب ریاض احمد شادؔ عابد خورشید کے مجموعہ کلام پر اپنے اظہاریے بعنوان 'لمس کی مہک' میں عابد خورشید کی شاعری کا تجزیہ مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ آپ کے خیال میں عابد خورشیدؔ ہمارے سماج کی اُس اکثریت کا شاعر ہے' جن کے لیے صبح کرنا شام کا ہی جوئے شیر لانا نہیں ہے بلکہ شام کرنا

صبح کا بھی اُتنا ہی مُحال ہے۔ اس سفر کی دشواریوں کو پوری گہرائی سے محسوس کرنے اور پھر تمام تر شعری رچاؤ کے ساتھ بیان کرنے کے ضمن میں عابد خورشیدؔ کا جو کمال ہے اُس کا سب سے بہتر ادراک اُس کے شعروں سے ہی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسے شعروں کی تشریح و توضیح کبھی خود شعروں سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ المختصر شادؔ صاحب نے عابد خورشیدؔ کو شاعرِ حزن و ملال یا شاعرِ غم اندو کے لقب سے نوازا ہے''۔

شاعری میں دکھ و تکلیف، غم و اندوہ، دکھ اور کرب کے احساسات کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا شاعر کا فن قرار پاتا ہے۔ زندگی میں عابد خورشیدؔ پر جو گزری یا معاشرے میں جو کچھ اس نے دیکھا، محسوس کیا اسے اشعار کی صورت میں پیش کر دیا۔ ایک جگہ اپنے کرب کا اظہار اس طرح کیا۔

ایک لمحے کو بھی اپنا سَر ہلا سکتا نہیں
اِتنی تلواریں ہیں عابدؔ اپنے سَر کے آس پاس

عابد ایک عام آدمی ہے، اس کی زندگی آسائشوں سے عبارت نہیں بلکہ یہ ایک سیلف میڈ انسان ہے جس نے اپنی زندگی میں دکھ زیادہ دیکھے، معاشرہ نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اسے اس کی صلاحیتوں کے مقابلے میں وہ کچھ نہیں ملا جس کا یہ حق دار تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بیان میں دکھ کا اظہار نمایاں ہے۔ غموں

کے بیان کرنے پر اپنے آپ کو بے اختیاری محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

ہر سمندر شمار میں کب ہے
غم مِرے اختیار میں کب ہے

عابد خورشید اپنے مستقبل سے مایوس نہیں، پر امید ہے۔ میں بہت ہی پر امید ہوں کہ عابد خورشید یکھنے، محسوس کرنے اور علم کی جس منزل پر سبک رفتاری، ثابت قدمی سے رواں دواں ہے ، ایک وقت آئے گا کہ اس کی زندگی ماضی سے بالکل مختلف ہوگی ، ہوسکتا ہے اس نئی زندگی میں اس کی شاعری کا انداز بھی بدل جائے، احساسات کی رت میں تبدیلی آجائے۔ عابد خورشید کے ہاں رومانیت بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کے دکھ کا سایہ اس کی رومانیت پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ ماں اور باپ جیسی عظیم ہستیوں کی موجودگی ہمارے لیے ایک عظیم نعمت ہوتی ہے لیکن ان کی جدائی اور جدائی کے بعد کی صورت حال کو عابد نے اس طرح بیان کیا ۔

باپ جو مر گیا مِرا، اینٹیں سَرکنے لگ گئیں
سارے مکین بٹ گئے، سارا مکان بٹ گیا

عابد خورشید کے چند خوبصورت شعر ۔

کسی کی آنکھ کے بھیگے ہوئے منظر میں رہتے ہیں

ہمارا گھر نہیں ہے ہم کسی کے گھر میں رہتے ہیں
ہمارے دل میں آ کر آپ سے دو دن نہیں نکلے
ہم اِک مدت سے اِس ٹوٹے ہوئے مندر میں رہتے ہیں
تمہارا واقعہ یہ ہے کہ ہوا گلی قطاروں میں
ہماری داستان یہ ہے کہ ہم آخر میں رہتے
مئی ۲۰۱۱ء ۲ :

عبدالوہاب خان سلیم۔ایک کتاب دوست

کتاب ایک مسلمہ حقیقت ہے اسے ہر دور، ہر زمانے میں فضیلت حاصل رہی ہے۔ بہ قول حکیم محمد سعید شہید ''کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو، جس درسگاہ میں کتابیں نہ ہوں وہ ایسی درس گاہ کی مانند ہے جس میں طلباء نہ ہوں۔ جس شہر میں کتب خانے نہ ہوں وہ ایک شہر ویراں ہے اور جس کتب خانے میں لوگوں کو کتابوں سے عشق و محبت نہ ہو وہ کتب خانہ علم کی بس ایک نمائش گاہ ہے، یہ نمائش گاہ لگی بھی رہ سکتی ہے اور یہ نمائش زمانے کے ہاتھوں تباہ بھی ہو سکتی ہے''۔ درحقیقت، کتاب ایک ایسی روشنی ہے کہ جس نے گزرے زمانے کی شمع کو کسی لمحے مدھم ہونے نہیں دیا۔ زمانے کی ترقی اسی مینارہ نور کی مرہون منت ہے۔ یہ ایک ایسا انمٹ لازوال سرمایہ ہے کہ جس نے انسانی ترقی کے تمام ادوار یعنی ماضی، حال اور مستقبل کو مربوط رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا خوش گوار فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ سقراط کا کہنا تھا کہ '' جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ گھر حقیقتاً گھر کہلانے کا مستحق نہیں ہے وہ تو زندہ مردوں کا قبرستان ہے''۔ فلسفی ایمرسن کا کہنا ہے کہ ''اچھی کتاب بے مثال دوست ہے جو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنے کی صلاح دیتا

ہے'' کارلائل کے خیال میں ''اچھی کتابوں کا مجموعہ دورِ جدید کی سچی یونیورسٹی ہے'' ۔ ملٹن کا کہنا تھا کہ ''ایک اچھی کتاب عظیم روح کے قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے۔ اس کو محفوظ کرنے کا مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو اس عظیم روح سے روشناس کرانا ہے'' ۔کتاب سے اچھا کوئی دوست نہیں۔ کتاب سے دوستی اور عقیدت انسان کی زندگی پر خوشگوار اثرات ڈالتی ہے۔ کتاب سے عشق کرنے والوں کی زندگی خوشگوار اور مطمئن ہوتی ہے۔ یہ کہانی ہے کتاب سے عشق کرنے والے کی، ایک ایسے عاشق کی جس نے اپنی زندگی میں کتاب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس سے محبت کی، اس کی خوشبو سے اپنی روح کو منور رکھا اور دوسروں تک اسے پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کی

زندگی اطمینان اور سکون سے عبارت نظر آتی ہے۔ بقول صہبا اختر۔

کتابیں اُجالوں کی دِم ساز ہیں
کتابیں ستاروں کی آواز ہیں
کتابوں کا مقصد ہے روحانیت
کتابوں کا مذہب ہے انسانیت
کتابوں کی طاقت ہیں فکر و خیال
ہے کتابوں کو ممکن نہیں زوال
کتابوں کو حاصل ہے وہ اقتدار

جسے چھین سکتے نہیں تاجدار
خموشی کبھی ان پہ چھاتی نہیں
کتابوں کی گویائی جاتی نہیں

میں شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، یونیورسٹی آف سرگودھا میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر منسلک ہوں، قیام' جامعہ کے ٹیچرز ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۵ میں ہے، شعبہ اردو کے چیر مین پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی اسی ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۲ کے مقیم ہیں۔ڈاکٹر تونسوی اردو کے معروف ادیب، شاعر، نقاد اور دانش ور ہیں،ان کی علمی خدمات کو حکومت پاکستان نے سراہتے ہوئے دو سال قبل تمغہ امتیاز سے نوازا، ان کے چاہنے والوں نے ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے خاکے اور سوانحی مضامین لکھے،آپ کی تخلیقات کا اشاریہ رابعہ سرفراز نے مرتب کیا۔ان کی علمی کاوشوں پر مصر اور بھارت میں ڈاکٹریٹ ہو چکی ہے، پاکستان کی تقریباً تمام ہی جامعات میں آپ کی شخصیت اور علمی کاوشوں پر ایم فل اور ماسٹر تھیس لکھے جا چکے ہیں۔ماہ نامہ 'وجدان' لاہور نے ان پر خصوصی شمارہ شائع کیا۔ سرگودھا میں ڈاکٹر صاحب میرے دوست ہی نہیں بلکہ میرے ہاسٹل کی تنہائی کے ساتھی بھی ہیں، آج کل ہماری سرد شامیں ایک ساتھ میرے کمرے میں گزرتی ہیں اس سے قبل سرگودھا کی گرم شامیں باہر کھلی فضاء میں گزرا کرتی تھیں۔ یہ تفصیل میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ایک کتاب دوست عبدالوہاب

خان سلیم پر لکھنے کا سبب میرے یہی محترم دوست بنے۔ایک دن میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو معلوم ہے کہ شخصیات میرا موضوع ہیں اوران پر لکھنا میرا پسندیدہ شوق بھی ہے، میں (معذرت کے ساتھ) آپ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس جملے سے وہ محظوظ ہوئے، اگلے ہی دن مجھے ایک کتاب لا کر دی ، کہا کہ میرا ایک خاکہ میرے استاد ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے لکھا ہے وہ اس میں شامل ہے اسے آپ پڑھ لیں مدد ملے گی، کتاب کا عنوان تھا ''درشن جھروکہ''۔ یہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے لکھے ہوئے خاکوں کا مجوعہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اردو کے معروف ادیب و دانش ور ،اسی (۸۰) سے زیادہ کتابوں کے مصنف ،آپ وہی سلیم اختر ہیں جنھوں ۱۹۵۷ء میں جامعہ پنجاب ، لاہور سے لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا تھا، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں خدمات انجام دیں اور کتب خانوں کے موضوعات پر بھی کافی کچھ لکھا۔

درشن جھروکہ ''میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک خاکہ تحریر کیا ہے جس کا عنوان ہے '''' دوستی کا گُلِ سرسبز'' ، یہ سرسبز اور باغ و بہار شخصیت ہے '' عبد الوہاب خان سلیم'' کی۔ یہ خاکہ پڑھ کر طبیعت تو خوش ہوئی، ساتھ ہی وہ ارادہ تقویت پا گیا جو کئی ماہ قبل جب میں کراچی میں تھا تو استاد مکرم ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب کی خواہش تھی کہ میں عبدالوہاب خان سلیم کا انٹرویو کروں تاکہ ایک علم دوست ،کتابوں کے عاشق، لکھاریوں کے بہی خواہ، جو عرصہ

دراز سے انگریز بہادر کی سرزمین امریکہ میں رہتے ہوئے کتابوں اور اُن سے تعلق رکھنے والوں پر اپنی دلی محبت نچھاور کر رہا ہے کی شخصیت کے بارے میں احباب کو معلوم ہوسکے۔ میں اس منصوبے پر عمل کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا اور ایک سوال نامہ بذریعہ برقی ڈاک بہ توسط ڈاکٹر غنی الاکرم سبز واری اور براہِ راست عبد الوہاب خان سلیم کی صاحب زادی کو امریکہ بھیج چکا تھا۔ سال گزر گیا، متعدد بار یاد دہانی بھی کرائی، ایک دن عبد الوہاب خان سلیم نے فون پر بات بھی کی اور انٹرویو دینے کا وعدہ بھی کیا، لیکن وقت گزرتا گیا یہ ممکن نہ ہوسکا۔ عبد الوہاب خان سلیم پر ڈاکٹر سلیم اختر کا خاکہ میری اس تحریر کی بنیاد بنا، بہت ممکن ہے کہ خان صاحب اس تحریر کے بعد اپنے اور میرے استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبز واری صاحب سے کیے وعدے کے مطابق ٹیلی فون پر وقت دے دیں، تاکہ ایک علم دوست، کتاب اور کتاب کاروں سے محبت کرنے والا، جس کے توسط سے بے شمار پاکستانی مصنفین کی تصانیف آج امریکہ، لندن اور بھارت کے کتب خانوں کی زینت بن چکی ہیں طالبان علم ان سے استفادہ کر رہے ہیں کے بارے میں لوگوں کو زیادہ تفصیل سے معلوم ہوسکے۔

۱۹۷۲ء کی بات ہے میں ایم اے (لائبریری سائنس) سال اول، جامعہ کراچی کا طالب علم تھا، اپنے سینئرز (ایم اے سال فائنل) میں سے ایک صاحب کو جو دیگر طالبِ علموں کے مقابلے میں زیادہ عمر کے دکھائی دیتے تھے کو اکثر ڈاکٹر

غنی الاکرم سبزواری صاحب کے کمرے میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا، گفتگو کا انداز انتہائی مؤدبانہ، عاجزی، انکساری کا پیکر۔ اس وقت ان کے پاس جو بھی کتابیں یا فائل ہوا کرتیں وہ انہیں اپنی بغل میں دبائے رکھتے تھے، اپنی اس ادا کے باعث یہ شعبے میں پہچانے بھی جاتے تھے۔ وہاب صاحب نے ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے سے قبل ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیوسٹی سے لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا، جہاں پر وہ ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک سال پیچھے تھے اور جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں موصوف مجھ سے ایک سال آگے تھے، یعنی میرے بیچ میٹ تھے۔ ان کے کلاس فیلوز میں آبان رستم جی، لیناڈی سوزا، اودیش کچھمن، صابرہ سلطانہ، رئیسہ خاتون، سکینہ محمد، رخسانہ جمیل، سیدہ آمنہ قادری، ظہیر الدین اور بدر الدین خورشیداور احمد خان شامل تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور عبد الوہاب خان سلیم کورس کرنے کے بعد جامعہ پنجاب کے کتب خانے سے بھی منسلک رہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ ''میں پہلی نگاہ کے عشق کا تو قائل نہیں لیکن نگاہ میں دوستی کا قائل ہوں اور یہی وہاب کے معاملہ میں ہوا۔ امتحان پاس کر لینے کے بعد وہاب بھی یونیورسٹی لائبریری میں آگیا یوں مزید قربت کے مواقع ملے۔ بس یوں سمجھیں کہ میری سرپرستی'' میں آگیا۔ ہم دونوں کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا میں اس سے چند'' برس بڑا تھا لیکن بہت کچھ دیکھ چکا.

تھا اور وہاب کے مقابلے میں خاصا تجربہ کار بلکہ جہاں دیدہ تھا۔ سو میں نے اپنے تجربات کی روشنی میں وہاب کو مشوروں سے نوازنا شروع کر دیا..... کیسے مشورے؟ چنچل نار کو کیسے لطیفے سنا کر راغب کیا جا سکتا ہے؟ کس طرح لڑکی سے چائے کی پیالی کا رومانس کرو اور کس لڑکی کو تواضع تک محدود رکھنا ہر گز دل نہ دینا اور کس سے پناہ مانگنا وغیرہ وغیرہ''۔ جامعہ کراچی میں دوران طالب علمی عبد الوہاب خان سلیم نے اپنے دوست ڈاکٹر سلیم اختر کے ان مشوروں پر خوب خوب عمل کیا اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ کراچی کی رنگینیوں کا لطف اٹھا کر، علم کی دولت سے مالا مال ہو کر تن تنہا ہی پنجاب واپس لوٹ گئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر سلیم اختر کو عبد الوہاب خان سلیم کی شادی میں بالواسطہ کردار ادا کرنے کا موقع کیسے ملتا اور چھ فٹ کا شہ بالا بننے کا موقع بھی نہ ملتا اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''وہاب کو خورشید بھابی کی صورت میں ایسی نیک بخت اور سلیقہ شعار بیوی کیسے ملتیں''۔ کہتے ہیں اولاد مرد کی قسمت سے اور خوشحالی یعنی دولت عورت کی قسمت سے ملتی ہے۔ الحمد اللہ وہاب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی چیزوں سے نوازا ہے، اولاد بھی

اور دولت بھی۔ اولاد سعادت مند اور دولت جس کا وہ دل کھول کر جائز استعمال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر اردو میں ایم اے بھی تھے چناں چہ وہ اردو کے لیکچرر ہو گئے

بعد ازاں پروفیسر کے مرتبہ پر فائز ہوئے جب کہ وہاب صاحب کراچی سے پنجاب اور پھر امریکہ چلے گئے اور پھر امریکہ کے ہی ہو رہے لیکن انہوں نے اپنی روح سے رشتہ نہیں توڑا جیسا کہ اکثر ہمارے نوجوانوں نے کیا کہ وہ گوروں کے درمیان جا کر اپنے جسم کے ہو رہے اپنی روح، اپنی سرزمین، اپنے لوگوں کو بھول گئے۔ وہاب صاحب نے امریکہ جانے سے قبل ڈاکٹر سلیم اختر سے کہا تھا کہ ''بھائی سلیم! اگرچہ میں پیسہ کمانے جا رہا ہوں اور اس کے لیے سب کچھ کر گزروں گا مگر پیسے کے علاوہ اور بھی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں''۔ وہاب صاحب کا کہا سچ ثابت ہوا واقعی انہوں نے پیسوں کے علاوہ بھی بہت کچھ حاصل کیا، یوں تو ان کی امریکہ میں گزری پوری زندگی ہی ان کے کہے کی منہ بولتی تصویر ہے لیکن انہوں نے اولاد کی صورت میں سعادت مند اولاد، (چار بیٹیاں، ایک بیٹا) اور دیارِ غیر میں رہتے ہوئے وطن عزیز کے لوگوں کو بھلایا نہیں، کتاب، کتب خانوں، کتابداروں اور اہلِ قلم سے روابط قائم رکھے، ادیبوں، شاعروں، مصنفین و مولفین کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، پاکستانی مصنفین و مولفین کا تخلیق کردہ علمی سرمایہ بڑی تعداد میں آج امریکہ، برطانیہ اور بھارت کے کتب خانوں میں محفوظ ہے اور تشنگانِ علم ان سے اپنی علمی پیاس بجھا رہے ہیں۔ بے شمار مصنفین کی کاوشیں وہاب صاحب کے توسط سے منظرِ عام پر آسکیں۔

میری عادت رہی ہے کہ میں اپنے نام موصول ہونے والے خطوط حتیٰ کے چھوٹی چھوٹی تحریریں بھی ردی کی ٹوکری کی نظر نہیں کرتا بلکہ انھیں محفوظ رکھتا ہوں۔ خطوط کی تعداد سینکڑوں میں ہوگی، خطوط کی ان فائلوں کو کبھی کبھار کھول کر بیٹھ جاتا ہوں تو یادوں کے دریچے واہ ہوجاتے ہیں۔ بعض ایسے احباب کے خطوط بھی ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ان کی تحریریں جو میرے نام تھیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ عبد لوہاب خاں سلیم پر اپنی تحریر مکمل کرچکا تھااوراپنی ایک اور ہم پیشہ محترمہ فرخندہ لودھی مرحومہ پر لکھنے کی منصوبہ بندی کررہا تھا، خطوط کی فائلوں میں اچانک اپنے نام موصول ہونے والے عبد لوہاب خاں سلیم کے خط پر نظرپڑی، اقبال حسین صاحب سے اسی وقت درخواست کی کہ اگر رسالے کی کاپیاں نہ جڑی ہوں تو ایک پیراگراف کا اضافہ کردیں، ان کی عنایت سے وہاب صاحب کا یہ خط بھی شاملِ خاکہ ہوا۔ یہ خط وہاب صاحب نے فروری ۱۹۸۳ء کو امریکہ کے شہر نیویارک سے تحریر کیا تھا۔ آپ کا خط مختصر ضرور ۸ ہے لیکن ایک تعلق کا خوبصورت اظہار، ہزاروں میل دور بیٹھ کر یاد رکھنا بڑی بات ہے۔ :

فروری ۱۹۸۳ء ۸

برادرم صمدانی صاحب !

سلام شوق، مزاج گرامی !

عزیزم، مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں میں آپ کو جانتا ہوں، ممکن ہے

!آپ نے بھی مجھے پہچان لیا ہو
گزشتہ دنوں ایک خط غنی الاکرم سبزواری صاحب کا بھی کٹے سے آیا تھا۔ یہ خط موصول کرکے مجھے اپنے صحیح پتے سے آگاہ فرمائیں تاکہ میں آپ کو تفصیلی خط تحریر کرسکوں۔
.براہِ کرم آپ مایوس نہ فرمایئے گا چند سطور مجھے تحریر کردیجیے گا تاکہ میں آپ سے گفتگو کرسکوں۔ شکریہ

عبدالوہاب خان سلیم

یقینا میں نے وہاب صاحب کو جواب ضرور دیا ہوگا، لیکن اس کے بعد ہمارے مابین خط کتابت کا کوئی ریکارڈ میرے پاس نہیں نہ ہی مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہاب صاحب کا کوئی پتر آیا تھا۔ البتہ ہم دونوں کے استاد محترم غنی الاکرم سبزواری صاحب ہمارے مابین تعلق کا ذریعہ تھے، مجھے اکثر وہاب صاحب کے بارے میں کچھ کچھ معلوم ہوتا رہا ہے اور اسی طرح وہاب صاحب تک میرا نام بھی پہنچتا رہا۔ یہ تحریر اسی تعلق اور محبت کا ثمر ہے۔
کتاب سے محبت ہی عبدالوہاب خان سلیم کو شعبہ لائبریری سائنس میں کھینچ لائی۔ کتب بینی اوراس سے عقیدت انہیں عشق کی حد تک ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب نہ صرف خود پڑھتے ہیں بلکہ کتاب تحفہ کے طور پر اپنے احباب کو دیتے بھی ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر نے عبدالواہاب خان سلیم کے خاکے میں لکھا کہ

وہاب ''ہندوستان ' پاکستان بلکہ یورپین ممالک سے کتابیں اور جرائد خریدتا اور پڑھتا رہتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اردو دنیا کے تمام اہل قلم سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھتا ہے۔ آپ پاک و ہند کے کسی بھی بڑے ادیب اور دانشور کا نام لیں، وہ وہاب کا دوست نکلے گا اور اس سے بھی بڑی بات.... جس کے لیے حوصلہ ' ظرف اور زر کی ضرورت ہے... یہ ہے کہ جو کتاب اسے پسند آجائے اسے خرید کر احباب اور معزز اہل قلم کو بطور تحفہ پیش کرتا ہے اور سنیے ... ابھی اور بھی بتانے کو بہت کچھ ہے۔ گرما کے آغاز میں نیویارک میں بیٹھے وہاب کی جانب سے روح افزا کی نصف درجن بوتلیں حاضر اور جولائی میں آم۔ خود شوگر کا مریض مگر دور بیٹھا احباب کی تواضع کا اہتمام کر رہا ہے''۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے جن خوبیوں کا ذکر کیا، یہ تمام کی تمام وہاب صاحب میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کا رابطہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں سے ہی نہیں بلکہ لائبریری سائنس کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ہم پیشہ احباب سے ایسا ہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ عبدالوہاب خان سلیم اپنے استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب سے گزشتہ چالیس برس سے مسلسل رابطے میں ہیں، کیونکہ سبزواری صاحب از خود امریکی شہری ہیں ۲۷ برس مکہ المکرمہ میں رہے، اب امریکہ میں زیادہ پاکستان میں کم رہتے ہیں۔ وہاب صاحب اور سبزواری صاحب میں استاد و شاگرد کے رشتے کے علاوہ عقیدت اور محبت کامثالی

تعلق بھی ہے۔

عبدالوہاب خان سلیم کے بارے میں ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری نے اپنی سوانح عمری بہ عنوان 'کیابیت گئی؟ قطرہ پہ گُہر ہونے تک: تلخ وشیریں حادثات اور واقعات پر مبنی آپ بیتی' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں وہاب صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہاب صاحب نے ایک بار بتایا کہ ان کے پاس اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تقریباًدس ہزارکتابیں جمع ہو گئی ہیں۔ ان میں کثیر تعداد حج اور عمرے کے سفر ناموں کی ہے۔ ان میں بعض تو بہت ہی نایاب اور کمیاب نسخے ہیں جو انھوں نے ہندوستان 'پاکستان اور امریکہ کے کتب خانوں سے فوٹو کاپی کراکے محفوظ کیے ہیں۔ایسے ہی ادبی رسائل اور سوانحی کتابوں کی بھی بڑی تعداد ہے۔ مجلات ہندوستان اور پاکستان سے کافی منگوائے ہیں۔ان کا حافظہ ماشاء اللہ بڑے غضب کا ہے۔ میرا خیال ہے ان کو ساری کتابوں کے مندرجات ازبر ہیں۔جب بھی گفتگو ہوتی ہے مصنفین کے حالات' واقعات' سرگزشت اس طرح سناتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔میں نے ان سے کئی بار کہا کہ آپ اپنے ذخیرہ کتب کی کتابیات مرتب کریں چھپوا میں دوں گا۔ لیکن یہ کام ابھی تک نہیں ہو سکا''۔ایک اور جگہ سبزواری صاحب نے لکھا' عبدالوہاب صاحب کو حج کے سفر نامے جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ایک مرتبہ جب کہ خان صاحب عمرے کے لیے گئے ہوئے تھے اور سبزواری صاحب کے مہمان تھے، وہاب صاحب نے سبزواری صاحب سے کہا

کہ ''مدینہ منورہ پرانے راستے سے چلیں کیونکہ پرانے سفر نامے میں رابغ، مستورہ، بدر اور دیگر مقامات کا بہت تذکرہ کیا گیا ہے''۔ سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ '' میں انہیں پرانے راستے سے مدینہ منورہ لے گیا۔ راستے میں ہم رابغ میں رکے وہاں ہم نے مچھلی اور چاول کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ اکثر سفر ناموں میں حجاج کرام نے رابغ میں مچھلی کھانے کا لکھا تھا''۔ سبزواری صاحب نے یہ انکشاف کرکے یہ بات بھی عام کردی کہ خان صاحب کا ذاتی ذخیرہ ہزاروں نایاب کتب پر مشتمل ہے۔ نیز آپ کی اس رائے میں وزن ہے کہ خان صاحب کو اپنے ذخیرہ کی کتابیات مرتب کرنی چاہیے۔ یہ مفید اور تحقیق کرنے والوں کے لیے مفید تر ہوگا۔

عبدالوہاب خان سلیم بزرگوں خصوصاً اور اپنے اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ استادوں کی تعظیم کرنا، ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر جھکے رہنا، نظر نہ اٹھانا جیسے مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھے جب وہاب صاحب جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں طالب علم تھے میں ان سے جونیئر تھا لیکن وہاب صاحب کو مودبانہ انداز میں اساتذہ کے سامنے متعدد بار دیکھا۔ استاد سے حد درجہ عقیدت اور محبت کی مثال جس کا ذکر ڈاکٹر سبزواری نے اپنی سوانح عمری میں کیا اپنی نوعیت کی منفرد مثال ہے۔

سبز واری صاحب جب جامعہ کراچی میں استاد تھے تو وہاب صاحب ایم اے کر رہے تھے،
سبز واری صاحب جامعہ کراچی کے کیمپس میں اور وہاب صاحب ہاسٹل میں رہا کرتے
تھے، وہاب صاحب اکثر اپنے استاد کے گھر جایا کرتے تھے، وہاب صاحب ایم کرنے کے
بعد امریکہ چلے گئے اور سبز واری صاحب مکہ المکرمہ چلے گئے۔ سبز واری صاحب لکھتے ہیں
کہ ''ایک دفعہ وہاب صاحب امریکہ سے پاکستان گئے، جامعہ کراچی کیمپس جاکر سبز واری
صاحب کے سابقہ مکان سی ۴۰ بھی گئے، اس مکان میں اُس وقت جامعہ کے ایک
دوسرے استاد رہائش پذیر تھے، وہاب صاحب نے ان سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ
اس مکان میں میرے استاد رہا کرتے تھے میں اُن کے پاس آیا کرتا تھا، مجھے اُن سے '
بہت عقیدت تھی اور اب بھی ہے۔آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس مکان کے
دروازے کو بوسہ دینا چاہتا ہوں'۔ ان استاد صاحب نے کہا ضرور۔ وہاب صاحب نے
دروازے کو بوسہ دیا اور جانے لگے تو وہ استاد صاحب وہاب صاحب کو عزت سے گھر
میں لے گئے کچھ خاطر مدارت کی اور فرمایا' 'میں حیران ہوں کہ آپ اپنے استاد سے
اِس قدر محبت کرتے ہیں۔ ہم تو ایسے شاگردوں کو ترستے ہیں[illegible] کچھ اسی قسم کا
وہاب صاحب نے سبز واری صاحب کے مکہ المکرمہ سے واپس آجانے کے بعد سبز واری
صاحب کے مکہ الکرمہ والے گھر بھی تشریف لے گئے اور مالک مکان جو کہ عربی تھا سے
اجازت لے کر دروازہ کو بوسہ دیا۔ یہ ہے اپنے بزرگوں خصوصاً اساتذہ سے انتہائی محبت
اور عقیدت ، جس کا عملی مظاہرہ عبدالوہاب خان سلیم نے کیا۔

عبدالوہاب خان سلیم ۶ فروری ۱۹۳۹ کو دریا باد، ضلع بارہ بنکی (یو پی) ہندوستان میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم ضلع مراد آباد، سنبھل، حسن پور میں حاصل کی۔ میٹرک سیالکوٹ سے کیا، ایف اے، بی اے، مرے کالج، سیالکوٹ ہی سے کیا۔ ڈپلوما لائبریری سائنس ۱۹۶۰ میں پنجاب یونیورسٹی سے اور ایم اے لائبریری سائنس ۱۹۷۱ میں کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ۱۹۵۹ سے ۱۹۷۳ تک اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثت سے خدمت انجام دی۔ ۱۹۷۳ میں امریکہ چلے گئے۔ آپ کی ماشا اللہ چار بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ لڑکا اور لڑکیاں ڈاکٹر اور انجینئیر ہیں، ایک بیٹی فاریسٹ ہے۔ بہ فضل تعالی امریکہ میں خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔

عبدالوہاب خان سلیم کو اللہ نے فراغ دل اور مدد کرنے والا جذبہ عطا کیا ہے۔ وہ اپنے شناسا احباب کی معاونت کرکے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لکھاریوں کی دل سے مدد کرتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان لائبریرین شپ کی معروف شخصیت پروفیسر ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی سوانح بہ عنوان 'پروفیسر ڈاکٹر نسیم فاطمہ: شخصیت اور کام' شائع ہوئی جسے ہما منان بٹ نے مرتب کیا۔ یہ سوانح وہاب صاحب کی تحریک پر مرتب ہوئی اور اس کی اشاعت میں عبدالوہاب خان سلیم کی حوصلہ افزائی بھی شامل ہے جس کا اعتراف مولفہ نے کتاب کے تعارف میں اس طرح کیا ''میں

عبدالوہاب خان سلیم کی اس عنایت کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مالی معاونت بھی کی اور ہمت افزائی مسلسل کرتے رہے''۔ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا وہاب صاحب کی سرشت میں شامل ہے۔ کتاب میں مختلف احباب کے خطوط بھی شامل ہیں ان میں سے وہاب صاحب کے تین خطور صفحہ نمبر ۲۳۳۔۲۳۶ پر ہیں، یہ خطوط وہاب صاحب کی اپنی تحریر میں ہیں۔ اپنے ایک مکتوب بنام ڈاکٹر نسیم فاطمہ تحریر شدہ یکم اگست ۲۰۰۵ء میں وہاب صاحب نے لکھا'' مجھے خوشی ہوئی ہے آپ نے اپنی خود نوشت لکھنا شروع کردی ہے۔ اس خود نوشت کی اشاعت پر جو بھی خرچہ ہوگا سب ادا کروں گا، گزشتہ روپیہ آپ کے پاس ہے جو کمی ہوگی میں اور دے دوں گا اور خوشی سے دوں گا، بس آپ محنت کرکے خود نوشت مکمل کرلیں''۔اس طرح کی بے شمار مثالیں اور بھی پائی جاتی ہیں کہ وہاب صاحب نے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی جس کے باعث ان کی تخلیقات منظر عام پر آسکیں۔ صہبا اختر نے کیا خوب نظم ''کتابیں'' ، مصنفین کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ۔

مبارک ہیں وہ ہاتھ اور قلم
جو کرتے ہیں زندہ کتابیں رقم
کتابوں میں جس نے اضافہ کیا
سرِ طاقِ فن اِک دیا رکھ دیا

عبدالوہاب خان سلیم اللہ کی وحدانیت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ خوف خدا کے جذبے

سے سرشار مذہبی ذہن کے مالک ہیں۔ متعدد عمرے اور حج کر چکے ہیں، سنا ہے ہر سال ہی زیارت بیت اللہ کو جاتے ہیں۔بقول ڈاکٹر سبزواری '' عبدالوہاب صاحب ربِ کعبہ نے اِس قدر دینی جذبہ اُجاگر کر دیا کہ انہوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ماشاء اللہ مسلسل آٹھ حج کیے''۔ سبزواری صاحب لکھتے ہیں کہ ' 'عبدالوہاب خان سلیم پہلی بار اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمد ارشد خان صاحب کے ساتھ عمرے پر تشریف لائے میں ان کو جدہ ایئر پورٹ پر لینے گیا۔ قیام ہمارے ہاں ہی رہا۔ ان کو عمرہ کرانے حرم شریف لے گیا جوں ہی ہم باب عبدالعزیز سے حرم شریف میں داخل ہوئے۔اُن کی نظر بیت اللہ شریف پر پڑی بس وہیں سجدے میں گر گئے اور زار وقطار رونا شروع کر دیا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے اور توبہ استغفار کرتے رہے۔ میں نے ان کو اٹھایا اور مطاف میں لے گیا۔ عمرہ کرایا۔ عمرے کے دوران روتے رہے ااور توبہ استغفار کرتے رہے''۔

معراج جامی ،وہاب صاحب کے خصوصی نمائندے اور دوست ہیں، کراچی میں رہتے ہیں،شاعر ہیں ،ناشر ہیں،کتابیں اور رسائل شائع کرتے ہیں۔ ماہ نامہ 'پرواز'لندن ماہ نامہ 'سفیر اردو' لیوٹن اور سہ ماہی 'ارتباط' استنبول کے مدیر بھی ہیں۔جامی، صاحب نے وہاب صاحب کے بارے میں بتایا کہ '' میرا تعلق وہاب صاحب سے بہت قدیم ہے لیکن میری آج تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی بس فون پر گفتگو ہوتی ہے۔

عبدالوہاب خان سلیم کتابوں کے دیوانے ہیں، اچھی کتاب یا ان کے خصوصی موضوعات پر کوئی کتاب ان کے علم میں آجائے تو وہ کسی نہ کسی طرح اُسے حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان اور ہندوستان میں متعدد ایسے دوست بنائے ہوئے ہیں جو ان کی اس خواہش کی تکمیل کو ممکن بناتے ہیں۔ میں بھی اسی قسم کا فریضہ ان کے لیے انجام دیتا ہوں۔ جامی صاحب نے بتایا کہ کتاب سے ان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ذاتی ذخیرے میں ہزاروں کتابیں ہیں، انہوں نے اپنے گھر کے علاوہ اپنی بڑی بیٹی کے گھر کا تہہ خانہ بھی اسی غرض سے لے لیا ہے اور وہ بھی کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ نے بتایا کہ وہاب صاحب کے خاص یا پسندیدہ موضوعات خود نوشت، سوانح، خاکے اور سفر نامے ہیں۔ ان کے پاس ان موضوعات پر بے شمار نایاب اور قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہاب صاحب دوستوں کے دوست، خیال کرنے والے اور یاد رکھنے والوں میں سے ہیں۔ وضع دار انسان ہیں۔ دنیا دار ہی نہیں دین دار بھی ہیں تقریباً ہر سال عمرہ کرتے ہیں"۔

عبدالوہاب خان سلیم پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے "پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل" جس کے سبزواری صاحب مدیر اعلیٰ اور رئیس ایسو ی

ایٹ چیف ایڈیٹر ہوں کے امریکہ کے لیے نمائندہ خصوصی کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ 'لائبریری پروموشن بیورو' جو اس رسالے کی اشاعت کا اہتمام بھی کرتا ہے نے پچاس سے زائد کتب بھی شائع کی ہیں۔ عبدالوہاب خان سلیم نے ازراہ عنایت اس ادارے کی تمام کتابیں خرید کر ہندوستان میں علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ کرادیں ہیں۔ کراچی میں موجود وہاب صاحب کے دوست معراج جامی صاحب نے یہ فریضہ انجام دیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے وہاب صاحب کے خاکے میں جامی صاحب کو ایک تجویز دی تھی کہ جامی صاحب اپنے رسالے سفیر اردو کا ایک شمارہ وہاب صاحب کے لیے مخصوص کردیں۔ معقول تجویز تھی، جامی صاحب کو پسند بھی آئی لیکن اس تجویز پر عمل نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی تجویز اور ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب کی تجویز کہ عبدالوہاب خان سلیم اپنے ذاتی ذخیرے کی فہرست مرتب کریں جس کی اشاعت کو ممکن بنایا جائے تاکہ علم کے شیدائیوں کو وہاب صاحب کے ذخیرہ کتب کا علم ہوسکے اور وہ اس سے فیض حاصل کرسکیں۔ دونوں تجاویز مناسب ہیں۔

وہاب صاحب کے لیے تیسری تجویز میری بھی ہے کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے آنے والی نسل کو بہرا مند فرمائیں اور اپنی سوانح حیات قلم بند کریں۔ خود

نوشت اور سوانح حیات تو وہاب صاحب کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ وہاب صاحب احباب کی سوانح میں دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں سوانح لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں تو ان کی سوانح میں دیگر لوگوں کی دلچسپی کا خیال کرتے ہوئے خان صاحب کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے بے شمار خود نوشت اور سوانح حیات کا مطالعہ بھی کیا ہے، ان کے لیے یقینا یہ کام مشکل نہیں ہو گا۔ سوانح حیات قلم بند کرنا ایک علمی، ادبی اور تاریخی فریضہ ہوتا ہے۔ ایسے احباب جن کی زندگی نشیب و فراز سے دوچار رہی ہو، جو سیلف میڈ رہے ہوں، ان کی جد وجہد دوسروں کے لیے نمونہ ہو، سب سے بڑھ کر اللہ تبارک تعالیٰ نے انہیں صلاحیت اور وسائل سے نوازا ہو، انہیں ہر صورت اس فریضہ کی انجام دہی میں سوچ و بچار کے بجائے عمل پیہم پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر وہاب صاحب اس تجویز پر عمل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو راقم اس فرض کی ادائیگی میں ان کی معاونت کرکے خوشی محسوس کرے گا اور معراج جامی اس کی اشاعت ذوق و شوق سے کریں گے۔

عبدالستار ایدھی۔ خدمت و عظمت کا نشان

شخصی خاکہ

عبد لستار ایدھی نام ہے ایک ایسی شخصیت کا جس کی زندگی انسانیت کی خدمت سے عبارت نظر آتی ہے۔ ایدھی نے پاکستان میں انسانی خدمت کی ایسی لازوال روایت قائم کی کہ آج پاکستان میں بے شمار لوگ انفرادی اور اجتمائی طور پر لوگوں کی خدمت میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ عبدالستار ایدھی میرا ذاتی دوست نہیں ، میرا رشتہ دار نہیں، اور نہ ہی اُس سے میرے ذاتی مراسم ہیں البتہ مَیں نے عبدالستار ایدھی کو اس وقت بہت قریب سے دیکھا جب وہ جوان تھا،اس کی پوری زندگی خدمت انسانیت سے وابستہ نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی فلاحی خدمات کا آغاز کراچی کے علاقے میٹھا در سے کیا تھا، میٹھا در اور میری رہائش کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا، عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج جس میں مَیں نے ۲۴ سال خدمات انجام دیں میٹھادر اور کھارادر سے کچھ ہی مسافت پر ہے۔

عروس البلاد کراچی کی ایک قدیم لبتی ''لیاری'' میرے اور عبدالستا ایدھی کے مابین قدرِ مشترک ہے۔ ایدھی بنیادی طور پر کراچی کی ایک غریب اور کچی لبتی لیاری کا باسی ہے اور میرا بچپن اور جوانی بھی اِسی لبتی میں گزری۔ میری

فلاحی اور نیم سیاسی سرگرمیوں کا محور بھی لیاری ہی رہا۔ لیاری نام ہے کراچی کی ایک ایسی بستی کا جس میں ایک طرف تو انتہائی غریب لوگ آباد ہیں تو دوسری جانب متوسط لوگوں کے علاوہ میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی جو کاروباری ہیں کھارادر، میٹھادر، وزیر مینشن، صرافا بازار، میمن سوسائیٹی جیسی آبادیوں میں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہتے ہیں لیکن وہ مالی طور مستحکم ہیں۔ عبدالستار ایدھی نے انسانیت کی خدمات کا آغازا میٹھادر سے کیا۔ تقسیم سے قبل یہاں ہندوں کی اکثریت تھی اب ان قدیم بلڈنگوں میں رہنے والے مکینوں کی اکثریت میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی، سندھی، ترک اور کچھ سے تعلق رکھنے والوں کی ہے۔ یہ علاقہ انتہائی تنگ اور گنجان آباد ہے، میٹھادر اور کھارادر کے ارد گرد واقع علاقوں میں قائداعظم محمد علی جناح کی پیدائش گاہ وزیر مینشن ، موسیٰ لائن، میمن سوسائیٹی (نوآباد)، کھڈا مارکیٹ، مجھی میانی مارکیٹ شامل ہیں۔ میٹھادر کے مشرق میں جوڑیا بازار، لی مارکیٹ ،پرانا حاجی کیمپ،گارڈن، لسبیلا ، لیاقت آباد، فیڈرل بی ایریا، گلشن اور جامعہ کراچی ہے، مغرب میں کراچی پورٹ، کیماڑی ، منوڑہ، جنوب میں صرافہ بازار اور ککری گراؤنڈ ، موسیٰ لین، کلری، بغدادی، بہار کالونی، آگرہ تاج کالونی اور شیر شاہ قبرستان اور شمال میں نیو میمن مسجد ،بولٹن مارکیٹ ، سٹی اسٹیشن، کلفٹن اور ڈیفنس ہے، میرا خاندان قیام پاکستان کے وقت ہجرت کرکے کراچی آنے والوں میں سے تھا،ابتدا میں کراچی کی قدیم آبادی ''کھڈا مارکیٹ'' میں رہائش اختیار

کی، کچھ عرصہ کے بعد بہار کالونی منتقل ہو گئے اور پھر "آگرہ تاج کالونی" میں اپنا گھر بنا لیا۔ میرا بچپن، جوانی انہی علاقوں میں گزرا۔

عبد الستار ایدھی کے پرکھوں کا تعلق ہندوستان کے علاقے گجرات سے تھا، ایدھی گجرات کے علاقے 'بانٹوا' میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا، تقسیم ہندوستان کے وقت اس خاندان نے کراچی ہجرت کی لیاری کا علاقہ میٹھا در ان کا مستقر ٹھہرا، اسوقت ایدھی کی عمر ۱۹ برس تھی۔ دکھی انسانیت کا خدمت کا جذبہ ایدھی میں اپنی ماں کی خدمت سے پیدا ہوا، ایدھی ابھی گیارہ برس کا تھا کہ اس کی ماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ paralyzedمعزور ہو گئی، یہی نہیں ہوا بلکہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنا ذہنی توزن بھی کھو بیٹھی ، ایسی صورت میں اُسے کل وقتی خدمات گزار کی ضرورت تھی ، ایدھی نے اس کام لیے اپنے سے بہتر کسی کو نہ پایااوراس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ماں پر مرکوز کردی اور اس کی خدمات میں لگ گیا، ایدھی اپنے ماں کے تمام تر کام از خود کیا کرتا تھا، کھانا کھلانا، کپڑے بدلوانا، صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا، نہلانا دھلا ، ایدھی کی زندگی میں یہی وہ لمحات تھے کہ اس کے اندر انسانیت کی خدمات کا جذبہ بیدار ہوا۔ ایدھی کی ماں آٹھ سال بعد انتقال کر گئیں اور اپنے بیٹے کے اندر خدمات کا ایسا جذبہ اجاگر کر گئی جس نے ایدھی کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدمت کا نشان بنا

دیا۔ایدھی کی ماں نے ایدھی کو بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ مہربان رہنے اور غریبوں کی مدد کرنے کی تلقین کی تھی۔ایدھی نے اپنی ماں کی اس نصیحت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔

عبدالستار ایدھی کو دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ اپنی ماں کی خدمت کے نتیجے میں ملا، اگر ایدھی اپنی ماں کی خدمت نہ کرتا تو شاید آج وہ اس مقام و مرتبہ پر نہ ہوتا، یہ مرتبہ ، یہ اعزاز، یہ مقام ماں کی خدمت کے عوض نصیب ہوااور اس اعزاز و مرتبے کو پروان چڑھانے میں بھی ایک عورت کا عمل دخل رہااور وہ نیک صفت، وفا شعار عورت ہے بلقیس ایدھی ، عبدالستار ایدھی سے شادی سے قبل بلقیس ایدھی نرس کے پیشے سے تعلق رکھتی تھی اور عبدالستار ایدھی کی ڈسپنسری میں خدمات انجام دیا کرتی تھی، ایدھی نے ۱۹۶۵ء میں بلقیس ایدھی سے شادی کی، شادی کے بعد سے آج تک بلقیس ایدھی نے اپنے شوہر کا ایسا ساتھ نبھایا کہ جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔یہ قدم قدم پر ایدھی کے ساتھ رہی ، ایدھی کو اس مقام، مرتبہ اور منزل پر پہنچانے میں اس کا کردار قابل رشک ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ایدھی نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق کاروبار شروع کیا لیکن اس میں اس کا دل نہیں لگا کیونکہ اس کے دل میں توانسانیت کی خدمات

کا جذبہ جنم لے چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں اس نے میٹھادر میں ایک دکان خریدی اور اس میں غریب لوگوں کے لیے ڈسپنسری قائم کی۔ جو ڈاکٹر اس کی ڈسپنسری میں مریضوں کو دیکھا کرتا تھا اس نے ایدھی کو طبی امداد کے تمام امور کی تربیت بھی دی۔ یہ ایدھی کی فلاحی خدمات کا نقطہ آغاز تھا۔ ایدھی اپنے آپ کو اس ڈسپنسری تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے پہلی بار عوام سے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے مدد کی اپیل کی۔ لوگوں نے اس کی بات کو توجہ سے سنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بات میں اثر پیدا کردیا تھا۔ لوگوں نے اس پر بھروسی کیا، اعتماد کیا۔ ابتدائی طور پر ایدھی کو دو لاکھ روپے کی رقم وصول ہوئی۔اسی رقم سے ایدھی نے اپنی خدمات کے دائرہ کو وسیع کیا۔ایک کمرہ پر مشتمل ڈسپنسری ایک چھوٹے سے اسپتال میں تبدیل ہو گئی۔ ایک ایمبولینس بھی خرید لی گئی۔ ان آنکھوں نے نوجوان ایدھی کو ملیشا کے کپڑے کا لباس زیب تن کیے اسی چھوٹے سے اسپتال کے سامنے چارپائی پر بیٹھے بارہا دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی فون نایاب چیز ہوا کرتا تھا۔ اکثر لوگ ایدھی کو از خود آکر کسی بھی قسم کے حادثہ کی اطلاع کیا کرتے تھے۔ ایدھی نے اپنی سماجی ادارے ایدھی ٹرسٹ کا آغاز مبلغ پانچ ہزار روپے سے کیا تھا جو ترقی کر کے کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔

اگست ۲۰۱۱ء کی بات ہے لیاری کے علاقے موسیٰ لائن میں ایک بلڈنگ کے زمین بوس

ہو جانے کا واقع پیش آیا جس میں کئی خاندان ملبے تلے دب کر اپنی جان کھو بیٹھے۔ اِن دنوں مَیں سعودی عرب میں تھا، عمرے بھی کیے اور مدینہ میں حاضری بھی دی، زیادہ وقت اپنے بڑے بیٹے عدیل کے پاس جدہ میں اور اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نبیل کے پاس پہاڑی علاقہ فیفاء (جذان) میں گزرا، فیفاء سعودی عرب کا وہ علاقہ ہے جو یمن کی سرحد پر ہے، پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، یہاں آکر مری، ایوبیہ، نتھیا گلی اور بارہ گلی کی یاد تازہ ہو گئی، سرد موسم، تقریباً روز ہی بارش کا ہونا، یہاں میرا کام کچھ نہیں تھا ماسوائے عبادت، کھانا پینا اور آرام کے البتہ یہاں مَیں نے خاکے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی احباب کے خاکے لکھے، کچھ خاکے جو سرگودھا میں رہتے ہوئے شروع کیے تھے، یہاں انہیں مکمل کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ یہاں سکون تھا، امن تھا، لکھنے والے کو اچھا ماحول میسر آجائے تو وہ اسے غنیمت جانتا ہے۔ اِسی دوران کراچی میں موسیٰ لائن میں بلڈنگ گرنے کی افسوس ناک خبر آئی، رمضان کا مہینہ تھا، ایک دن ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اے آر وائی پر اپنے پروگرام 'شہر رمضان' میں اس بلڈنگ تلے دب جانے والی ایک فیمیلی کو بلایا شاید دو بچے ہی زندہ بچ گئے تھے ان کے والدین اور دیگر بہن بھائی ملبے تلے دب جانے سے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، وہ پروگرام دیکھ کر دکھ اور کرب تو قدرتی تھا، موسیٰ لائن کی مخدوش عمارتیں، تنگ و تاریک گلیاں نظروں میں گھوم گئیں۔ مَیں برسوں اپنے گھر سے کالج موٹر سائیکل پر اسی موسیٰ

لائن کے سامنے سے جایا کرتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ عبدالستار ایدھی کا خاکہ لکھنے کی وجہ یہی موسیٰ لائن کی گرنے والی عمارت ہے۔آج سے ۳۹ سال قبل ۱۹۷۳ء میں اِسی موسیٰ لائن میں زمین بوس ہونے والی ایک بلڈنگ کا منظر اور اس کی تباہ کاریاں، حلاکتیں اور وہاں عبدالستار ایدھی کے ہمراہ لاشیں نکالنے، امداد فراہم کرنے کا منظر سامنے آگیا۔ عبدالستا ایدھی نے اُس وقت اس بلڈنگ کے گرنے پر دن رات ازخود ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے نکالا تھا،ایدھی اس وقت جوان تھا، اس کے رضاکار بھی تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی اس کی ایمبولینسیز نے جوکام کیا تھا وہ بھی قابل تعریف تھا،ایدھی کی سماجی خدمات کو شہرت اُسی واقع سے ملی تھی ،اس وقت کا ایدھی آج کے ایدھی سے جسمانی طور پر مختلف ہے،مَیں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے گری ہوئی عمارت کے ملبے تلے دبی ہوئی عورتوں، بچوں اور مردوں کی لاشوں کو نکالتے دیکھا تھا۔ مسخ شدہ اور ایسی لاشیں جن کے نذدیک جاتے ہوئے لوگ ڈرا کرتے تھے عبد الستار ایدھی ہر طرح کے ڈر و خوف سے آزاد ہو کر اس بدبو دار اور تعافن زدہ لاش کو ٹھکانے لگا دیا کرتا تھا۔ کیا جذبہ تھا، ایدھی کی خدمات کا شہرہ ۱۹۷۳ء میں موسیٰ لائن میں زمین بوس ہونے والی عمارت اور عبدالستار ایدھی کی فراہم کردہ خدمت سے عوام الناس کا اعتماد ایدھی پر بڑھتا گیا اور ایدھی کی خدمات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ آج ایدھی فاؤنڈیشن کو دنیا میں سب سے بڑے خدمتی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔

آج کے عبد الستار ایدھی کو گزشتہ سال ائر پورٹ پر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، مَیں کراچی سے لاہور جا رہا تھا، جہاں سے مجھے سرگودھا یونیورسٹی جانا تھا، ائر پورٹ پر عبد الستار ایدھی بھی موجود تھا، اس کا سفر بھی کراچی سے لاہور کے لیے تھا، لاہور ائر پورٹ پر دو نوجوان ایک دائیں اور ایک بائیں ایدھی کا ہاتھ پکڑے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نہ سیکیوریٹی تھی، نہ پولس نہ پولس کی موبائلیں، نہ لوگوں کو روکا گیا، نہ ٹریفک ہی جام ہوا، اگر غلطی سے کوئی کوئی وزیر یا سفیر ہوتا تو اس وقت ائر پورٹ پر قیامت کا سما ہوتا، چھوٹا قد، وہی کالے رنگ کے ملیشیا کا شلوار قمیض ، سر پر مخصوص کالی ٹوپی ، سانولا رنگ جس میں کسی قدر سیاہی کی آمیزش، پیروں میں چپل، سفید کالی داڑھی لمبائی میں بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، پیشانی سے عظمت و بزرگی آشکارہ ، چہرہ پر متانت و سنجیدگی، دھیرے دھیرے ، چھوٹے چھوٹے قدموں سے ائر پورٹ سے باہر آئے، نہ وہ دبدبا تھا نہ وہ جوش، چہرہ پر اطمیان اور بردباری نمایاں تھی، وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مَیں نے ایدھی کو جوانی میں بھی دیکھا تھا۔آج کا ایدھی جسمانی اعتبار سے مختلف ہے۔ انسانیت کی خدمت کے طویل سفر نے ایدھی کی شخصیت میں نیکی، بھلائی اور دوسروں کی مدد و اعانت کی سفیدی کو اجاگر کر دیا ہے، ایدھی کا چہرہ ایک مہربان اور شفیق انسان کا چہرہ محسوس ہو رہا تھا، سنجیدہ اور متین انسان کا چہرہ، سلام اس عظیم ہستی

پر۔
ایدھی فاؤنڈیشن کے تحت خدمات کی مختلف جہتیں ہیں، ایمبولینس سروس کے حوالے سے یہ دنیا کی سب سے بڑی خدمتی تنظیم ہے، ایدھی ایمبولینسیز میں ائر ایمبولینس بھی شامل ہے، ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر مریضوں کی تیز تر منتقلی میں کام آتے ہیں، صرف کراچی میں ۸ اسپتال مفت طبّی امداد فراہم کررہے ہیں، موبائل ڈسپنسری اور بلڈ بنک اس کے علاوہ ہے، ایدھی کے تحت ۱۵ ''اپنا گھر'' ہیں جس میں بے سہارا، لاوارث، ذہنی معزوروں کو پناہ ملی ہوئی ہے۔ایدھی کے تحت ''جھولا''ایک ایسی منفرد خدمت ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی، پاکستان میں جس کا کوئی نہیں اللہ کے بعد ایدھی اس کا سہارا اور مددگار ہوتا ہے۔انسان خواہ امیر ہو یا غریب، وارثین موجود ہوں یا وہ لاوارث ہو مرنے کے بعد اس کے جسد خاکی کو جلد سے جلد خاک کی نظر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے فوری تدفین عمل میں نہ لائی جاسکے ، یا لاش لاوارث ہو تو عبدالستا ایدھی کے ''مردہ خانے'' ہی ان مردوں کی وقتی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ کراچی میں سہراب گوٹھ پر قائم ایدھی مردہ خانہ لاوارث لاشوں اور وقتی طور پر محفوظ کرائی گئی لاشوں کا مرکز ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس مردہ خانے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا،لاشیں کفن پہنیں شیلفوں پر اوپر نیچے ترتیب سے رکھی ہوتی ہیں، دیکھ کر ایدھی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہاں مردوں کو غسل دینے

اور کفنانے کا انتظام بھی ہے۔ عورتوں کے لیے غسل و کفن کا مرکز میٹھادر میں قائم ایدھی مرکز میں ہے۔

عبد الستار ایدھی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جارہا ہے اور لکھا جائے گا۔ایدھی پر مرتب کی جانے والی سوانح حیات انگریزی میں ہے جسے ایک معروف مصنفہ نے بڑی محنت اور مہارت سے مرتب کیا ہے۔ My Feudal Lord کی خالق تہمینہ درانی، تعارف کی محتاج نہیں، انہیں اپنی اِسی کتاب سے شہرت حاصل ہوئی، یہ غلام مصطفٰی کھر کی سابق ا وروزیر اعلٰی پنجاب شہباز شریف کی موجودشریک حیات ہیں، معروف سیاست داں سر سکندر حیات کی پوتی اور شوکت اللہ درانی کی بیٹی ہیں۔انہوں نے عبدالستار ایدھی کی سوانح حیات A Mirror to the Blind کے نام سے مرتب کی ہے، یہ سوانح ۱۹۹۶ء میں نیشنل بیوروآف پبلی کیشن نے شائع کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایدھی کی زندگی کی کہانی انہوں نے ٹیپ کی اور یہ ٹیپ چالیس گھنٹوں پر محیط ہے۔اس سوانح حیات میں عبد الستار ایدھی کی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔

تہمینہ درانی کی کتاب My feudal Loardکا ۳۶زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی اس کتاب کاترجمہ اردوزبان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ہوجائے تاکہ عام لوگ ایدھی کی زندگی کے بارے

میں تفصیل سے جان سکیں۔
۱۹۸۹ء میں حکومت پاکستان نے ایدھی کو "نشان امتیاز" دیا، بے شمار مقامی تنظیموں اور اداروں نے بھی ایدھی کو اعزازات سے نوازا۔ عالمی سطح پر بھی ایدھی کو اعزاز سے نوازا گیا، ۱۹۸۸ء میں آرمینیا میں زلزلہ سے متاثرہ افراد کی خدمت کے اعتراف میں اس وقت کی روس کی حکومت نے ایدھی کو ''لینن امن انعام'' سے نوازا، فلپائن حکومت نے ۱۹۸٦ء میں عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کو ''میگسیسیا ایوارڈ (Magsayay award)'' دیا، ۲۰۱۰ء میں یونیورسٹی آف بیڈفورڈشائر نے ایدھی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اسی طرح عبدالستا ایدھی کو مختلف اداروں نے اعزازات وانعامات سے نوازا لیکن ایدھی کے لیے اصل اعزاز وانعام تو پاکستان کے لوگوں کا اعتماد اور بھروسہ ہے، وہ والہانہ محبت، عقیدت اور احترام ہے جو لوگ ایدھی پر نچاور کرتے ہیں۔اللہ ایدھی کو سلامت رکھے۔
۸ ستمبر ۲۰۱۱ء، ۱۰ شوال ۱۴۳۲ھ، جدہ، سعودی عربیہ

فیض احمد فیضؔ۔ میرا پرنسپل

فیض احمد فیضؔ سے کون واقف نہیں، ادب کی دنیا کا ایک عظیم نام۔ معروف شاعر تابشؔ دہلوی نے بہت سچ کہا کہ ’ عظیم شخصیتوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے ‘۔ الحمد اللہ مجھے یہ عظمت حاصل ہے کہ میں نے اردو ادب کی اس عظیم شخصیت کو نہ صرف دیکھا بلکہ بہت قریب سے دیکھا۔ فیضؔ صاحب بلاشبہ پاکستان کے اُن چند گنے چنے شاعروں اور ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے دنیائے ادب میں پاکستان کو بلند مقام دیا۔ ۲۰۱۱ء فیض احمد فیضؔ کی سوویں سالگرہ کا سال تھا، فیض صاحب سو سال قبل ۱۲ فروری ۱۹۱۱ء میں پاکستان کے شہر سیال کوٹ کے نزدیک کالا قادر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ حکومت پاکستان نے موجودہ سال کو فیضؔ کی صدی کے سال کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔ اس سال ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھرپور انداز سے کیا جائے گا، مقتدرہ قومی زبان نے اس کا آغاز پروفیسر منیر یوسف حسن اور ڈاکٹر روش ندیم کی مرتب کردہ کتاب ’فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین) ‘ سے کیا، اس حوالہ سے ایک کتاب ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بہ عنوان ’’فیض کی تخلیقی شخصیت : تنقیدی مطالعہ‘‘ بھی مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔

فیض کو خراج تحسین پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ فیض جنوبی ایشیا کی سب

سے بڑی جدید ادبی تحریک، ترقی پسند ادبی تحریک کے بانی ارکان میں سے تھے۔ فیض پاکستان کا بہت بڑا شاعر اور ہر دل عزیز شاعر بھی ہے۔ فیض کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا مگر میں شاعری سے قطع نظر فیض کے بحیثیت کالج کے پرنسپل کے تذکرہ کروں گا۔ عام طور پر لوگ فیض کو ایک بڑا شاعر ہی سمجھتے ہیں اور وہ ہے بھی لیکن بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ فیض ایک ماہر تعلیم، پروفیسر، منتظم اور کالج پرنسپل بھی رہے اور اس حیثیت سے انہوں نے آٹھ سال (۱۹۶۴ء۔۱۹۷۲ء) خدمات انجام دیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ فیض صاحب جب حاجی عبد اللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل تھے تو میں اس کالج کا طالب علم تھا، دو سال (۱۹۶۸ء۔۱۹۷۰ء) میں اس کالج کا طالب علم رہا اور گریجویشن اسی کالج سے کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں میرا تبادلہ اسی کالج میں ہوگیا، اس کالج میں میری خدمات ۲۷ سالوں (۱۹۷۴ء۔۱۹۹۷ء) پر محیط ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت نے تمام تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تو فیض صاحب نے سرکاری ملازمت اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن وہ جب بھی کراچی میں ہوتے کالج ضرور آیا کرتے۔ اس طرح مجھے فیض صاحب کو ہر دو حیثیتوں سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ فیض صاحب نے ملازمت اختیار کی تھی، آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز ہی استاد کی حیثیت سے ایم اے او کالج امرتسر سے ۱۹۳۵ء میں کیا تھا، آپ برطانوی ہند میں فوج میں اعلیٰ عہدہ

پر بھی رہ چکے تھے، اس وقت جب آپ نے محسوس کیا کہ انگریز اندرونِ خانہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کر رہا ہے تو آپ نے فوج کی ملازمت کو خیر باد کیا اور روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کی ادارت سنبھال لی۔ گویا فیض صاحب شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ فوجی بھی تھے، صحافی بھی، استاد بھی تھے، اعلیٰ منتظم اور ماہر تعلیم بھی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان تھے۔

مَیں یہ تحریر سعودی عرب کے صوبہ جذان کی حسین وادی، پہاڑوں کی ملکہ فیفاء جسے 'جبال فیفاء' بھی کہا جاتا ہے کے ایک گھر میں بیٹھ کر لکھا رہا ہوں، میرا چھوٹا بیٹا نبیل فیفاء جنرل اسپتال ''میں ڈاکٹر ہے اور اسپتال کے سامنے ہی رہائش پذیر بھی'' ہے۔ ابھی کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے، مَیں جامعہ سرگودھا کو الوداع کہہ کر واپس کراچی پہنچا، اچانک دل نے پریشان کیا، ۱۲ اپریل کو میری انجو گرافی اور فوری طور پر انجو ڈالا گیا، دنیا میں میری(stent)) پلاسٹی بھی ہوئی اور دل کی ایک شریان میں اسٹینٹ زندگی کی دعائیں ہو رہی تھیں، اُدھر اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر حاضر ہونے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ کام مقدس سرزمین پر مجھ سے لینا تھے ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ میں فیض احمد فیضؔ پر اپنے بہت پرانے منصوبے کی تکمیل کروں۔ فیض احمد فیضؔ آٹھ برس (۱۹۶۴ء۔۱۹۷۲ء) کراچی کے ایک ڈگری کالج ''حاجی عبداللہ

ہارون کالج'' کے پرنسپل رہے، آپ اس کالج کے بانی پرنسپل تھے۔ کالج کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ سر حاجی عبداللہ ہارون بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، قائداعظم کو آپ پر مکمل اعتماد تھا یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ہارون ہر مرحلے پر قائداعظم کے ہمراہ دکھائی دیتے ہیں جس کا ثبوت پیر علی محمد راشدی کے اس بیان سے ملتا ہے کہ '' قائداعظم محمد علی جناح ۱۹۳۸ء میں اوراس کے بعد عبد اللہ ہارون مرحوم کے انتقال تک جب بھی کراچی تشریف لاتے ان کا قیام ہمیشہ سیفیلڈ'' یعنی سر حاجی عبداللہ ہارون کی رہائش واقع کلفٹن میں ہوتا۔ برصغیر کے'' معروف تاجر اور سب سے بڑھ کر انسان دوست۔ آپ کی سیاسی، سماجی، طبّی، تعلیمی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بے لوث خدمات سے کسی کو انکار نہیں۔ حاجی عبداللہ ہارون سندھ کے ان مسلمان سیاست دانوں اور تاجروں میں سے تھے جن کے دل میں مسلمانوں کے لیے ہمدردی، اخوت اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آپ نے مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی بہتری اور فلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، آپ نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور انہیں متحد کرنے میں بے پناہ محنت کی، آپ نے خواتین کی تعلیم اور ان کے حقوق کے لیے بھی جدوجہد کی، آپ نے مسلمانوں کی آواز کو دنیا میں پہنچانے اور عام کرنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں ایک اخبار الوحید'' جاری کیا جس نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی، انگریز اور ہندو'' بوکھلا اٹھے، آخر کار مقصد میں کامیابی ہوئی لیکن افسوس

کہ قیام پاکستان تک عبد اللہ ہارون کی عمر نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ان کا گھر 'سیفیلڈ' ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھا، اس گھر میں برصغیر کا شاید ہی کوئی مسلمان رہ نما ایسا ہو جس کا گزر نہ ہوا ہو جن میں قائداعظم محمد علی جناح، سر آغا خان، مونا محمد و علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، آزاد سبحانی، فضل حسین، فضل الحق، سر سکندر حیات، مسعود اللہ، اکرام خان، سلطان احمد، صاحبزادہ عبد القیوم، ڈاکٹر انصاری، عبد الرحمٰن صدیقی، بہادر یار جنگ وغیرہ شامل مل ہیں۔ مجھے بھی اس گھر میں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ یہ گھر عبد اللہ ہارون کے بعد ان کے بیٹوں یوسف ہارون، محمود ہارون، سعید ہارون اور پوتے حسین ہارون کے سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا، زمانہ طالب علمی اور ابتدائی دنوں میں مَیں لیاری میں رہائش پذیر تھا اور ایک سماجی تنظیم 'تاج ویلفیر سینٹر' کا سرگرم کارکن بھی تھا، محمود ہارون اس ادارے کے سرپرستِ اعلیٰ ہوا کرتے تھے، اسی حوالے سے مجھے سیفیلڈ جانے اور اس گھر کو دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔

کراچی کی قدیم بستی ''مچھروں کی بستی'' ہے جو 'کھڈا مارکیٹ' کہلاتی ہے، اب اسے نوآباد اور میمن سوسائیٹی' کہا جاتا ہے، یہی مچھیروں کی بستی کراچی کا نقطہ آغاز تھا۔' حاجی عبد اللہ ہارون نے اسی بستی میں ۱۹۲۳ء میں غریب لوگوں کے لیے ایک یتیم خانہ قائم کیا تھا، جو آج بھی قائم ہے، خود حاجی عبد اللہ

ہارون اسی یتیم خانے کے احاطہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ حاجی عبد اللہ ہارون کالج اور دیگر تعلیمی ادارے اسی احاطے میں قائم ہیں۔ حاجی عبد اللہ ہارون کے انتقال کے بعد ان کے مشن کو جاری و ساری رکھنے کے لیے" حاجی عبد اللہ ہارون ایسو سی ایشن" کا قیام عمل میں آیا، جس کی پر ستی حاجی عبد اللہ ہارون کے بیٹوں نے کی، حاجی عبد اللہ ہارون مسلم لیگی تھے، ان کے تینوں بیٹے تادم مرگ مسلم لیگی رہے۔اس ایسو سی ایشن نے حاجی عبد اللہ ہارون کے قائم کردہ یتیم خانے کو فعال بنایا، اسکول، کالج، ٹیکنکل کالج، اسپتال اسی احاطے میں قائم کیے۔ غریب بستی میں قائم یہ تمام ادارے آج بھی قائم ہیں اور خدمات

فراہم کر رہے ہیں۔فیض احمد فیضؔ کا ایک خوبصورت شعر ؎

پھر نظر میں پُھول مہکے ، دل میں پھِر شمعیں جلیں

پھِر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

فیض صاحب نے جب اس کالج کی پرنسپل شپ اختیار کی وہ اس وقت بھی ایک بڑے اور معروف شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، ان کا بڑا نام تھا، کراچی کی غریب بستی میں نئے کالج کا سربراہ بننا، کیا مصلحت تھی، کیا راز تھا، اس بات کا جواب فیض صاحب کی اپنی زبان سے سنیے، فیضؔ صاحب نے ڈاکٹر غلام حسین اظہر کو ایک انٹرویو میں دیا، یہ انٹرویو ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب "فیض کی تخلیقی شخصیت: تنقیدی مطالعہ" میں شامل ہے۔ سوال کیا گیا کہ آپ نے

اس ادارے کی سربراہی کیوں قبول کی تھی'؟فیض صاحب کا کہنا تھا''جس علاقے میں حاجی عبداللہ ہارون کالج قائم کیا تھا اس میں ہائی سکول کے علاوہ تعلیم کی اور سہولتیں نہ تھیں، اس علاقہ میں اکثریت غریب عوام کی ہے، ماہی گیر، گاڑی چلانے والے اور مزدور پیشہ لوگ جو بچوں کو کالج نہیں بھجوا سکتے تھے، یہ علاقہ بُرے لوگوں کا مرکز تھا یہاں ہر قسم کا غیر مستحسن کاروبار کیا جاتا تھا، اکثر غلط راہ پر بچپن ہی سے پڑ جاتے تھے، یہاں عبداللہ ہارون نے یتیم خانہ بنوایا تھا جو ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گیا تھا، باقی کچھ نہیں تھا،ان کے (حاجی عبداللہ ہارون) جانشینوں کی مصروفیات کچھ اور تھیں، صرف لیڈی نصرت ہارون کو اس ادارے سے دلچسپی تھی۔لندن سے واپسی پر انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم یہ کام سنبھال لیں۔ ہم نے جاکر علاقہ دیکھا، بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا، یہاں انٹرمیڈیٹ کالج بنایا، پھر ڈگری کالج پھر ٹیکنکل اسکول اور پھر آڈیٹوریم کچھ رقم ہارون انڈسٹری سے خرچ کی گئی، کچھ ہم نے فراہم کی،ماہی گیروں کی سب سے بڑی کوآپریٹو سوسائیٹی بنی، انھوں نے ہمیں ڈائیریکٹر بنالیا، ہم نے طے کیا کہ سوسائیٹی کے اخراجات سے بچوں کو مفت تعلیم دی جائے اور بچوں کے سب اخراجات یہی ادارہ برداشت کرے، اس کالج میں طلبہ کی اکثریت کو مفت تعلیم دی جاتی تھی''۔
فیض حاحب کی ان باتوں کا میں بھی چشم دید گواہ ہوں، جیسا میں نے پہلے بھی

کہا کہ ۱۹۷۲ء کے بعد فیض صاحب جب کبھی کراچی میں ہوتے وہ بغیر بتائے کالج آجایا کرتے۔ ایک مرتبہ جب کہ ہمارے کالج کے پرنسپل پروفیسر سید احمد حسین زیدی مرحوم تھے ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ فیض صاحب کراچی آئے ہوئے ہیں، ہم چند ساتھیوں نے جن میں شبنم صدیقی، اقبال احمد مرحوم، عبدالرشید راجہ اور مَیں پیش پیش تھے، فیض صاحب کو کالج آنے کی دعوت دی جسے آپ نے فوراً قبول کر لیا، یہ کوئی بڑی تقریب نہیں تھی، طے پایا تھا کہ ہم اساتذہ فیض صاحب سے خوب خوب باتیں کریں گے اور ان کی باتیں سنیں گے۔ یہ تقریب کالج کی لائبریری میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر بشارت کریم کیفی مرحوم جن کا سلیکشن فیض صاحب نے ہی کیا تھا، استقبالیہ کمیٹی کے چیر مین تھے، اساتذہ اور طلبہ نے فیض صاحب کا استقبال کیا، پہلے تو فیض صاحب نے پورے کالج کا ایک چکر لگایا، ان میں آفس، لیبارٹریز، اسکول، یتیم خانہ، اسپتال وغیرہ، بعد میں آپ لائبریری تشریف لائے، لائبریری دیکھ کر آپ نے خوشی کا اظہار کیا، یہ لائبریری فیض صاحب کے زیر نگرانی ہی پروان چڑھی تھی۔ پرنسپل صاحب نے استقبالیہ کلمات کہے، اساتذہ کی جانب سے شبنم صدیقی صاحب جو اردو کے پروفیسر اور ادیب و شاعر ہیں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فیض صاحب خوش پوش انسان تھے، زیادہ تر سوٹ پہنا کرتے، سگریٹ پینا ان کا محبوب مشغلہ تھا، آپ نے اپنے منفرد انداز میں اساتذہ اور طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کالج سے اپنی وابستگی پر روشنی ڈالی، آپ نے کہا 'اس کالج سے میرا جو تعلق رہا ہے اس وجہ

سے میں اپنے آپ کو یہاں اجنبی یا مہمان تصور نہیں کرتا، آپ نے اس کالج سے اپنی وابستگی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ''لیڈی نصرت ہارون مرحوم نے ہم سے کہا کہ لیاری میں جو کالج قائم ہوا ہے اس کی سرپرستی آپ حاصل کرلیں چناں چہ ہم لیاری میں آئے اور اس کالج کے علاوہ یہاں کے مکینوں کا جائزہ لیا مجھے یہاں عجیب سی مخلوق نظر آئی ہم نے فوراً حامی بھر لی، اس طرح ہمارا اس ادارے سے تعلق قائم ہوگیا۔ پھر اساتذہ اور ساتھیوں کی ایک اچھی جماعت مل گئی اس طرح یہ کالج بہت جلد ڈگری کالج بن گیا۔ اس کی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ آپ نے کہا کہ لیاری جیسی بستی میں علم کو عام کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے لیے ہم نے کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب ہوئے''۔ اس سوال کے جواب میں کہ فیض صاحب آپ عبداللہ ہاران کالج سے الگ کیوں ہوئے''؟ آپ کا جواب تھا کہ یہ'' ادارہ قومی تحویل میں لیا جانے والا تھا اور مجھے گھر بھی واپس آنا تھا، کراچی میں کالج بن گیا، اسپتال بن گیا، اتنا کچھ بن گیا اب آگے دوسرے لوگ چلائیں''۔ آپ سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ فیض حاحب کہ '' ان امور کے علاوہ اس ادارے کو ایک مثالی ادارہ بنانے کے لیے آپ نے کن امور پر توجہ دی''؟ فیض صاحب کا جواب تھا ''کراچی میں خاص طور پر بدامنی، بے چینی، ہڑتالوں وغیرہ کے قصے ہوتے رہتے تھے، طلباء اور اساتذہ میں بھی رابطہ نہیں تھا، ہم نے کوشش کی کہ اس امر کی اصلاح کی جائے، طلباء اور اساتذہ مل کر کام کریں چناں چہ ہمارے کالج

میں ایک مرتبہ بھی ہڑتال نہیں ہوئی، گورنمنٹ ادارے بند ہو جاتے تھے مگر ہمارا کالج کھلا رہتا تھا اور طالب علم پڑھائی کے لیے آتے تھے۔ اس کالج کا نقشہ دوسرے کالجوں سے بالکل مختلف تھا، درسی کتابیں پڑھانے کے علاوہ اساتذہ اور طلباء کی بصیرت میں اضافہ کے لیے لائبریری کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی، اہل ثروت سے مدد لی گئی، اساتذہ سے اپنے اپنے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھوائے گئے، میرے خیال میں محدود ذرائع کے باوجود یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا"۔

فیض صاحب کالج کی نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں بھرپور دلچسپی لیا کرتے تھے، اس زمانے میں طلبہ یونین باقاعدگی سے تشکیل پاتی تھیں، ان کے انتخابات ایک عام سے بات تھی، اس زمانے میں بھی انتخابات ہوئے ہم نے بھرپور حصہ لیا، اسلامی جمعیت طلبہ، NSF، نیشنل اسٹوڈنٹ فیڈریشن اس دور کی BSO بلوچ اسٹوڈنٹ آرگنائیزیشن خاص طلبہ تنظیمیں تھیں، فیض صاحب تمام تنظیموں سے تعلق رکھنے والے کالج کے طلبہ کو یکساں اہمیت دیا کرتے تھے۔ تقریری مقابلے، بیت بازی کے مقابلے، حمد و نعت، مضمون نویسی اور طلبہ کے ساتھ پکنک منانا، مجھے یاد ہے کہ تعلیمی سال کے اختتام پر کالج کی طرف سے ٹھٹھہ میں کلری جھیل پر پکنک کا پراگرام تشکیل دیا گیا، تمام طلبہ دو بسوں میں تھے، فیض صاحب اپنی فوکس ویگن میں بعض اساتذہ کے ساتھ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، وہ کچھ دیر ہمارے

ساتھ رہے ، فیض صاحب کے پاس اس وقت فوکس ویگن تھی، ان کا ڈرائیور ایک دبلا پتلا نوجوان تھا، اُسے ہم نے ہمیشہ صاف ستھرا، خوش پوش دیکھا، اس مانے میں تنگ پتلون ، نوک دار جوتوں کا رواج تھا جسے عرف عام میں ’ ٹیڈی فیشن‘ کہا جاتا تھا، یہ ڈرائیور ٹیڈی لباس اور جوتوں میں ہوا کرتا تھا، زلفیں بڑی بڑی، سامنے سے وحید مراد بنا رہتا تھا۔ اس کی خوش پوشی اور اسمارٹ رہنا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ فیض صاحب کو اپنے ڈرائیور کا یہ انداز دلبرانہ بھی پسند تھا، وہ خوش پوش تھے اور خوش پوشی کو پسند کیا کرتے تھے ۔

کالج میں اساتذہ کا انتخاب فیض صاحب نے از خود کیا تھا، کچھ اساتذہ اسکول سے لے لیے گئے تھے، فیض صاحب ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور مارکسی فلسفہ حیات کے علم بردار تھے لیکن اساتذہ کے انتخاب میں آپ نے غیر جانبداری اور میرٹ کو بنیاد بنایا تھا، اسا تذہ کا انتخاب ان کی تعلیمی قابلیت و اہلیت کو بنیاد بنا کر کیا گیا تھا، تمام اساتذہ اپنے اپنے مضمون میں یکتا تھے، پروفیسر ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان واضح طور پر مارکسی فلسفہ کے پیروکار نظر آتے تھے تو دوسری جانب پروفیسر شفیق الرحمان صاحب پکے جماعت اسلامی کے حامی تھے، دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر فہیم الدین ، پروفیسر جمیل واسطی سید، معروف شاعر دلاور فگار، سندھی کے ادیب رشید احمد لاشاری، پروفیسر یونس صدیقی، پروفیسر انیس الرحمٰن قریشی، بشارت کریم، عبد الرحیم میمن، پروفیسر ریاض الحسن

قدوائی، پروفیسر عبد الرشید راجہ، پروفیسر اقبال احمد، پروفیسر اطہر صدیقی، نجم الدین انصاری، اطہر آفریدی، پروفیسر شمشاد احمد خان، راشد حیٔ، غلام اصغر، نظام سحرائی، عزیز انصاری اور ذکی حسن شامل تھے۔ ان اساتذہ میں متعدد ڈایریکٹر کالجز، چیرٔمین تعلیمی بورڈ اور پرنسپل بھی ہوئے۔ اساتذہ کے ساتھ فیض صاحب کا رویہ ہمدردانہ ا،اور شفقت آمیز ہوا کرتا تھا۔ پروفیسر عبد الرشید راجہ جو اسلامیات کے استاد تھے میرے بڑے مہربان، محبت کرنے والے ، انہوں نے فیض صاحب کا اساتذہ سے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ 'ایک سال کالج کا نتیجہ صرف دس فیصد رہا، ہم سب کو اس پر بہت تشویش تھی، ڈر و خوف بھی تھا، کیونکہ یہ ایک پرائیویٹ کالج تھا، تمام اختیارات پرنسپل اور وائس پرنسپل کے پاس ہوا کرتے تھے، فیض صاحب پرنسپل اور پروفیسر ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان وائس پرنسپل تھے، فیض صاحب نے اسٹاف کی ایک میٹنگ طلب کی ، تمام ساتھی بے انتہا پریشان اور تشویش میں مبتلا تھے، نہیں معلوم کیا ہونا ہے، بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ ہم فیض صاحب سے کہیں گے کہ وہ ہماری تنخواہ سے انکریمنٹ واپس لے لیں، فیض صاحب اپنے مخصوص انداز سے تشریف لائے اور میٹنگ شروع کی،آپ نے میٹنگ میں کسی کو بات کرنے کا موقع نہیں دیا، ار خود ان وجوہات پر روشنی ڈالی جن کے باعث نتیجہ بہت خراب آیا، ساتھ ہی اساتذہ کو مخاطب کرکے یہ بھی کہا کہ اب تمام ساتھی محنت سے پڑھائیں اور طلبہ پر خصوصی توجہ دیں، جس ٹیچر کا نتیجہ آئندہ اچھا ہوگا اسے اضافی انکریمنٹ دیئے

جائیں گے۔ بعد میں فیض صاحب نے اپنی اس تجویز پر عمل بھی کیا، ریاضی کے پروفیسر جو بعد میں کالج کے پرنسپل بھی ہوئے ان کا نتیجہ اچھا آیا جس کے نتیجے میں انہیں اضافی انکریمنٹ بھی دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں مَیں جب اس کالج میں ٹرانسفر ہو کر آیا تو یہ کالج سرکاری تحویل میں آچکا تھا اور یہ حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج بن چکا تھا، اس کالج میں سائنس، آرٹس اور کامرس فیکلٹیز تھیں، پروفیسر جمیل واسطی سید اس کالج کے پرنسپل تھے۔ بعض اساتذہ جو اسی کالج میں میرے استاد رہے تھے اب میرے ساتھی تھے ان میں پروفیسر شفیق رحمانی، ریاض الحسن قدوائی، محمد یونس صدیقی، عبدالرشید راجہ، بشارت کریم شامل تھے۔

فیض صاحب کو ۱۹۶۳ء میں لینن انعام سے نوازا گیا، یہ عالمی ایوارڈ وصول کرنے کی تقریب میں فیض نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا'' امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں' اس لیے امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ' ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں''۔

فیض صاحب ترقی پسند بھی تھے، مارکسی فلسفہ حیات کے علم بردار بھی تھے۔ دانشوروں کا دائیں اور بائیں سے تعلق عام سی بات تھی۔ فیض صاحب نے اپنے

خیالات زبردستی کسی پر تھوپنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ایک زمانے میں آپ نے جلا وطنی کی زندگی بھی گزاری۔ایک دور ایسا بھی تھا کہ لوگ فیضؔ کے اشعار برملا پڑھتے ہوئے ڈرا کرتے تھے اور پھر یہ دور بھی آیا کہ مشاعروں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر فیض ہی فیض ہوا کرتے تھے۔ متعدد گلوکاروں کو فیض کا کلام گانے سے ہی شہرت ملی۔

فیض ایک سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ افتخار عارف نے ایک انٹرویو میں فیض صاحب سے پوچھا آپ جب پیچھے مڑکر اپنی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں تو کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوتا؟'' فیض صاحب نے بغیر کسی تامل کے یہ بات کہی کہ زندگی میں دو پچھتاوے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں قرآن حفظ کرنا چاہتا تھا مگر چار پانچ پاروں کے حفظ کے بعد میں نے یہ سلسلہ منقطع کردیا۔ مجھے ساری عمر اس کا ملال رہا۔ دوسرا یہ کہ میں کرکٹر بننا چاہتا تھا اور نہیں بن سکا''۔ یہ بات تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ فیض صاحب عربی جانتے تھے اور انھوں نے عربی میں بھی ایم اے کیا ہوا تھا لیکن یہ بات کہ وہ قرآن مجید حفظ کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ چند پارے حفظ بھی کرچکے تھے بہت کم لوگ اس سے آگاہ ہوں گے۔آپ کی اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اندر کا فیض کیسا تھا۔ یہ بات آغا ناصر نے اپنے مضمون 'فیض کی چند باتیں' جو اخبار اردو کی جلد ۲۸ شمارہ ۲، ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں نقل کی ہے۔ عبداللہ ہارون کالج کے ایک استاد پروفیسر عبدالرشید

راجہ جو ۳۰ سال اس کالج سے منسلک رہے ،اسلامیات کے پروفیسر تھے، آپ نے بتایا
کہ جب تک فیض صاحب کالج کے پرنسپل رہے ہم نے فیض صاحب کو رمضان میں
سگریٹ پیتے نہیں دیکھا، جب کے ڈاکٹر م ۔ ر۔ حسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوا
کرتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ میں فیض کے بحیثیت شاعر بات نہیں کروں گا، اپنی
بات کو صرف فیض کے بحیثیت کالج کے پرنسپل کے محدود رکھوں گا۔ کیونکہ مَیں نے فیض
کو بحیثیت پرنسپل کے دیکھا۔ میرا ایک مضمون ۲۰۰۲ء میں عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج
کے میگزین ''نوید سحر'' میں بعنوان ''فیض احمد فیض سے پروفیسر فضل الٰہی تک'' شائع
ہو چکا ہے۔ جس میں مَیں نے فیض صاحب سے ۲۰۰۲ء تک اس کالج کے جو پرنسپل
ہوئے ان کی شخصیت کا اختصار سے احاطہ کیا ہے۔ اس مضمون کے بعد ہی میں نے ارادہ کیا
تھا کہ فیض صاحب پر کچھ لکھوں گا، میرے اس ارادے کو اس وقت زیادہ تقویت ملی
جب میں ۲۰۰۹ء میں جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس سے منسلک
ہوا اور ہاسٹل لائف شروع ہوئی ، میری خوش نصیبی کے میرے ہاسٹل میں میرے
برابر والے کمرہ میں پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی تھے، ہم ایک دوسرے کے دوست بن
گئے، اپنے اپنے شعبوں سے واپس آ کر ہمارا وقت ایک ساتھ گزرتا
شعر و شاعری اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی۔ تونسوی صاحب فیض کے چاہنے

والے ہیں ،اردو کے طلبہ کو فیض پڑھایا بھی کرتے تھے، فیض پر تحقیق بھی کرا چکے تھے۔ فیض صدی کے حوالے سے فیض پر ایک کتاب بھی مرتب کر رہے تھے، ہم اکثر فیض کی غزلیں لیب ٹاپ پر سنا کرتے ، اقبال بانو کی آواز میں فیض کی غزل 'ہم بھی دیکھیں گے ، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' ہم دونوں بڑے شوق سے سنا کرتے ۔ایک دن تونسوی صاحب نے فیض پر اپنی مرتب کردہ کتاب فیض کی تخلیقی شخصیت : تنقیدی مطالعہ کا ایک نسخہ دیا، یہ کتاب پڑھ کر فیضؔ پر لکھنے کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا جس کی تکمیل اب رمضان کے مہینے میں اور سعودی عرب کی سرزمین پر ہوئی۔

فیض صاحب نے شہر کراچی میں رہتے ہوئے کئی ادبی، ثقافتی ، تعلیمی اور سماجی تنظیموں کی سرپرستی بھی کی۔ کراچی میں ادارہ یادگار غالب فیض احمد فیضؔ نے مرزا ظفر الحسن سے قائم کروایا تھا۔ فیض صاحب تو اس ادارے کی سرپرستی کیا کرتے تھے، مرزا ظفر الحسن کی زندگی کا مقصدِ حیات یہ ادارہ تھا۔ ادارہ یادگار غالب کے قیام کی روداد مرزا ظفر الحسن نے اپنے ایک مضمون ''فیضؔ ایلس اور میں'' میں اس طرح بیان کی کہ ''جنوری ۱۹۶۸ء کے پہلے ہفتے میں سبط حسن نے ٹیلی فون پر کہا فیضؔ نے تمھیں بلایا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا میرا اندازہ ہے کہ تم نے غالب کے پرزے اڑانے کی جو کوشش کی تھی اس کی کوئی سزا دینا چاہتے ہیں۔اس جملے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے دن سبط

کے گھر پہنچا جو سڑک پار فیضؔ کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم دونوں فیضؔ کے گھر گئے جہاں انھوں نے کہا فروری ۱۹۶۸ء میں پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں غالبؔ کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے۔ ہمارا بھی ارادہ ہے کہ کراچی میں کچھ کام کریں۔ آپ ایک انجمن بنائیں اور شروع کردیں ''اس کے بعد کہا'' البتہ ایک بات یاد رکھیے ویسے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے مگر از خود کوئی کام نہیں کریں گے۔ آپ جو کام ہمارے سپرد کریں، کریں گے''۔اس کے بعد اضافہ کیا ''دوسروں کے متعلق سمجھ لیجیے کہ وعدے سب کریں گے پورا کوئی نہیں کرے گا''۔ اس پر سبط حسن نے کہا ''ہم تو وعدہ بھی نہیں کرتے۔ سارا کام تم ہی کو کرنا ہوگا''۔ فیضؔ نے آخری جملہ کہا ''بالکل تنہا''۔ یہ میرے لیے کوئی چیلنج نہیں اعزاز تھا۔ کیوں کہ فیضؔ جیسی شخصیت کو مجھ پر اعتماد کہ میں انجمن بنا سکتا ہوں، صد سالہ برسی کا انتظام کرسکتا ہوں اور سب کچھ اکیلے۔ اس وقت نام طے کیا ''بزم غالب''اور پانچ سات منٹ ٹھہر کر آگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات سے پہلے یا اس کے بعد سبط اور فیضؔ میں میری بابت کیا گفتگو ہوئی۔ نہ میں نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔بزم غالب کے قیام اور نام کا اعلان اخباروں میں چھپوادیا دو چار دن بعد بزم کے پیڈ بنوانے انجمن پریس گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ اس نام کی ایک انجمن دس پندرہ برس سے قائم ہے۔ اس خیال سے کہ نام پر کیوں کسی سے جھگڑا مول لیں اور وہ بھی ابتدائی دنوں میں اپنے طور پر طے کیا کہ بزم غالبؔ کی بجائے ''ادارۂ یادگارِ غالبؔ ''نام

رکھوں۔ فیضؔ سے پوچھا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب نام کی تبدیلی کا اعلان اخباروں میں شائع کر دیا۔ جیب میں دھیلہ نہ دمڑی ادارہ یادگارِ غالبؔ قائم ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد فیضؔ کے بتائے ہوئے چند لوگوں کو ٹیلی فون کیا کہ فلاں اتوار کو صبح فیضؔ کے گھر جمع ہوں ادارے کی بابت کچھ گفتگو ہو گی۔ وہ سب آئے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ فیضؔ ادارے کے صدر ہوں۔ سبط نے یا شاید فیضؔ نے میرا نام لے کر کہا یہ اس کے معتمدہ عمومی ہوں۔ اس کے بعد مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جتنے مدعوئین اتنے ہی عہدے دار اور اراکین بلکہ بعض جو نہیں آئے تھے انھیں بھی رکن عاملہ بنا لیا گیا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ جاتے وقت سبط حسن نے پھر کہا تم نے ہمیں رکن تو بنایا ہے کام ہم دمڑی کا نہیں کریں گے۔ سید اپنے قول کا سچا نکلا''۔ مرزا ظفر الحسن نے ادارے کی لائبریری کی عمارت کی تعمیر کے حوالے سے لکھا کہ ''عمارت کس طرح بنی، کس طرح ہاتھ سے نکل گئی ایک طویل کہانی ہے۔ یہاں اتنا
اشارہ کر دوں کہ عمارت کو منہدم ہونے سے فیضؔ نے بچایا۔ اگر ان کا نام اور شخصیت درمیان میں نہ ہوتی تو آج غالب لائبریری کی جگہ اس عمارت کا ملبہ ہوتا''۔
غالب لائبریری اپنی مثال آپ ہے۔ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں گورنمنٹ کالج برائے طلباء کے احاطے میں اس ادارے کی عمارت ہے۔ ۱۹۹۷ء میں میرا

تبادلہ حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج سے گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد میں ہوگیا اور پھر مَیں اپنے ریٹائرمنٹ ۲۰۰۹ء تک اسی کالج میں خدمات انجام دیتا رہا۔ یہاں مجھے فیض صاحب کے قائم کردہ ادارے ادارہ یادگار غالب اور غالب لائبریری کی قربت بھی میسر رہی کیونکہ یہ ادارہ میرے کالج کے احاطے میں ہی تھا۔آخر میں فیض صاحب کے اس شعر

پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

(شائع شدہ ماہ نامہ ''نگار پاکستان'' کراچی، فروری ۲۰۱۲ء)

فیفاء، جیذان، سعودی عرب، ۳ اگست ۲۰۱۱ء، مطابق ۳۔رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

دنیائے لائبریرین شپ کی ایک عہد ساز شخصیت پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم

ڈاکٹر عبدالمعید سے میرا استاد اور شاگرد کا رشتہ ہے۔ آپ میرے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کی شخصیت، علمیت اور قابلیت نے میری پیشہ ورانہ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے، میں نے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ معید صاحب کو پہلی بار دیکھ کر میرا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک عام انسان نہیں بلکہ علمیت اور قابلیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ان چند انسانوں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی بات ہے گریجویشن کے بعد میں جامعہ کراچی میں داخلہ لینے کی خواہش لیے ڈرا اور سہا ہوا جامعہ کراچی کی لائبریری جو اب ڈاکٹر محمود حسین لائبریری ہے کی پانچویں منزل پر قائم شعبہ لائبریری سائنس پہنچا جہاں ایک کمرے کے باہر دروازے پر غنی الاکرم سبزواری کے نام کی تختی لگی تھی، دیکھ کر اطمینان ہوا کیوں کہ مجھے ان ہی سے ملاقات کرنا تھی۔ اکرم صاحب اس وقت شعبہ کے ایک سینئر استاد اور انتظامی امور سے وابستہ تھے۔ مدعا بیان کیا کہ میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لینے کی خواہش رکھتا ہوں تا کہ اکنامکس میں ایم اے کرسکوں، ارادہ بینکر بننے کا ہے۔ اکرم صاحب نے لائبریری سائنس کی ایسی پر کشش تصویر پیش کی کہ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ میں شعبہ لائبریری سائنس ہی میں داخلہ لوں گا، میرا داخلہ معاشیات

کے بجائے شعبہ لائبریری سائنس میں ہوگیا۔ شعبہ میں میرا پہلا دن تھا تمام کمروں کے چاروں اطراف کھلی ہوئی فضا نے کلاس روم کو ضرورت سے زیادہ روشن کردیا تھا بلکہ چبھتی ہوئی روشنی کا احساس نمایاں تھا۔ کلاس روم طلبہ اور طالبات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ ایم اے سال اول (لائبریری سائنس) کی کلاس تھی۔ تمام طلبہ نے جامعہ کے شوق میں کالے رنگ کے گاؤن زیب تن کیے ہوئے تھے (اُس زمانے میں جامعہ کے ہر طالب علم کے لیے کالا گاؤن پہننا لازمی تھا)۔ کلاس روم میں مکمل خاموشی، پہلے دن کے خوف نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی خاموش بنا دیا تھا۔ پہلی کلاس تعارفی کلاس تھی شعبہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید، غنی الاکرم سبزواری (مشیر امور طلبہ)، سید جلال الدین حیدر اور اظہار الحق ضیاء کلاس میں موجود تھے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے تمہیدی کلمات کہے، شعبہ کا تعارف کرایا، اساتذہ کے بارے میں بتایا، ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی عالم فاضل شخص گفتگو کر رہا ہے۔ گندمی رنگ، چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، روشن آنکھیں، ہنستا ہوا چہرہ، سیاہ بال، کلین شیو، کالے رنگ کے چشمہ نے ان کی شخصیت کو حسین بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالمعید ہندوستان کے ایک معزز اور مسلمان گھرانے میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو بازید پور (Bazidpur)، ضلع مظفرپور، صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ

کے والد اور دادا سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے سرگرم کارکن رہ چکے تھے جنہوں نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ معید صاحب نے خاندانی روایات کے برخلاف تعلیم کے حصول کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہائی اسکول کا امتحان اور انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں گریجویشن کیا، آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز لائبریرین کی حیثیت سے کیا، پروفیشن کا انتخاب بھی آپ نے از خود کیا، جو آپ کا علم اور کتاب سے محبت اور عقیدت کی غمازی کرتا ہے۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں اینگلو عربک کالج میں لائبریرین کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، اس دوران آپ لائبریرین شپ کی عملی تربیت کی جانب مائل ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں کلکتہ تشریف لے گئے جہاں پر آپ بنگال لائبریری ایسوسی ایشن کے تحت منعقد ہونے والے لائبریری سائنس کے سرٹیفکیٹ کورس میں شریک ہوئے جو کلکتہ یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر نہار رنجن رائے کی سرپرستی میں منعقد ہو رہا تھا۔ کلکتہ کے قیام کے دوران معید صاحب لائبریرین شپ کے زیادہ نزدیک آگئے آپ نے برطانوی ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری ''اپمیریل لائبریری آف انڈیا'' کا مطالعہ انتہائی باریک بینی سے کیا اس کے علاوہ شمالی ہندوستان کے کئی بڑے کتب خانوں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس دوران آپ کو برطانوی ہندوستان کے نامور لائبریریز سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا، خاص طور پر امپیریل لائبریری کے لائبریرین خان بہادر اسد اللہ خان کی صحبت حاصل ہوئی،

معید صاحب خان بہادر سے بہت زیادہ متاثر تھے عام گفتگو کے علاوہ کلاس میں بھی خان بہادر صاحب کا تذکرہ بہت احترام سے کیا کرتے تھے۔ خان بہادر صاحب امپیریل لائبریری کے لائبریرین ہونے کے علاوہ لائبریری ٹریننگ کلاس کے بانی بھی تھے اور آپ کو انڈین لائبریری ایسو سی ایشن کے بانی سیکریٹری جنرل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

کلکتہ سے واپس دہلی آکر آپ نے عرابک کالج، نئی دہلی کے لائبریرین کی حیثیت سے خدمات شروع کیں۔ اب آپ پہلے سے زیادہ پروفیشنل ہوچکے تھے۔ آپ نے تین سال (۱۹۴۲ء۔ ۱۹۴۵ء) لائبریری کی ترقی اور ترتیب کے امور انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اس کے بعد آپ کو دہلی یونیورسٹی لائبریری میں لائبریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا آپ نے دو سال (۱۹۴۶ء۔ ۱۹۴۷ء) یہاں خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے فوری بعد آپ نے دیگر مسلمانوں کی طرح ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی اور لاہور کو اپنا اولین مسکن بنایا۔ پنجاب پبلک لائبریری کے خواجہ نو رالٰہی جو اس وقت لائبریرین تھے کے ماتحت آپ نے چیف کیٹلاگر کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ خواجہ صاحب آپ کو دہلی کے زمانے سے جانتے تھے۔ لاہور میں لائبریری سرگرمیوں کا آغاز ہوا قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے وقت پنجاب لائبریری اسکول بند ہو گیا تھا، ایسو سی ایشن کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں اور ماڈرن لائبریرین بھی بند ہوگیا تھا، لائبریری

پروفیشن کے تقریباً تمام ہی سر گرم کارکن ہندو تھے جنھوں نے بھارت چلے جانے کا فیصلہ کیا جس کے باعث لائبریری پروفیشن میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اب تمام تر دارومدار لائبریرین شپ کے پیشے سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات پر تھا جنھوں نے پاکستان ہجرت کی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے ابتدائی ایام میں فضل الٰہی مرحوم، عبدالمعید اور خواجہ نورالٰہی کی کوششوں سے پہلی انجمن ''پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن'' ۶ جون ۱۹۴۸ء کو پنجاب پبلک لائبریری میں کام کرنے والے عملے کے تعاون سے معرضِ وجود میں آئی ۔ جس کے صدر خلیفہ شجاع الدین اور ناصر احمد سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی ایسو سی ایشن نے ایک ڈپلومہ کورس بھی شروع کیا جس کے ڈائریکٹر فضل الٰہی مقرر ہوئے۔ سہ ماہی رسالہ 'ماڈرن لائبریرین' فضل الٰہی اور عبدالمعید کی ادارت میں جاری کیا۔ جس کے صرف تین شمارے شائع ہو سکے۔

کراچی میں سندھ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا، ڈاکٹر عبدالمعید نے لاہور سے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا، آپ سندھ یونیورسٹی کے اولین لائبریرین مقرر ہوئے اور چار سال (۱۹۴۸ء ۔ ۱۹۵۲ء) تک لائبریری کے قیام اور ترقی کے اقدامات کیے، کراچی یونیورسٹی کے قیام اور سندھ یونیورسٹی کے حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد آپ کراچی یونیورسٹی کے (۱۹۵۲ء) اولین اسسٹنٹ لائبریرین (انچارج) مقرر ہوئے۔ اب معید صاحب کی بھرپور لائبریری سرگرمیوں

کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر صاحب مشیگن یونیورسٹی، امریکہ سے لائبریری سائنس میں ایم ایل ایس کرنے تشریف لے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں واپس تشریف لائے اور جامعہ میں شعبہ لائبریری سائنس کے قیام میں کامیابی حاصل کی۔ آپ یہ محسوس کر رہے تھے کہ لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم (پی ایچ ڈی) بھی پروفیشن کے لیے ضروری ہے چنانچہ ۱۹۶۱ء میں آپ یونیورسٹی آف الینائے، امریکہ سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے تشریف لے گئے، ۱۹۶۴ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں آپ لائبریری سائنس کی تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں نائیجیریا تشریف لے گئے۔ بعد ازاں آپ نے ۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی سے استعفیٰ دیدیا، ۱۹۸۲ء میں آپ مستقل وطن تشریف لے آئے لیکن آپ کی صحت کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ آپ ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء کو کراچی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ آپ جامعہ کراچی کے قبرستان میں مدفون ہیں، راقم کو تجہیز و تدفین میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو کئی انجمنوں کی سرپرستی اور سربراہی کا اعزاز حاصل ہے، متعدد انجمنوں کے آپ بانی رکن یا عہدیدار ہیں ان میں پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن (۱۹۴۷ء)، پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن (۶۰۔۱۹۵۷ء) پہلے جنرل سیکریٹری، پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ (۶۰۔۱۹۴۹ء) پہلے نائب صدر، کراچی لائبریری ایسو سی ایشن (۶۰۔۱۹۴۹ء) پہلے نائب در، کراچی یونیورسٹی

لائبریری ایسوسی ایشن سائنس المنائی ایسوسی ایشن (۸۴۔ ۱۹۵۶ء) سرپرست، لائبریری پروموشن بیورو (۸۴ء۔ ۱۹۶۶ء)، ، ایسین فیڈریشن آف لائبریری ایسوسی ایشن (۱۹۵۷ء) نائب صدر، انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات (۱۹۶۰ء) شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمعید نے ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی کی بنیاد ڈالی اور اسے بلندی پر پہنچایا ساتھ ہی شعبہ لائبریری سائنس کے قیام کو بھی ممکن بنایا آپ کی کوششوں سے یہ شعبہ ۱۰ اگست ۱۹۵۶ء کو معرض وجود میں آیااور آپ اس کے اولین صدر شعبہ مقرر ہوئے جس کی تقلید ملک کی دیگر جامعات نے کی۔ شعبہ لائبریری سائنس ڈاکٹر عبد المعید کے زندہ جاوید کارناموں میں سے ایک ہے یہاں پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر تعلیم کا آغاز ہوا بعد ازاں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغاز بھی ڈاکٹر صاحب ہی کے دور میں ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں شعبہ لائبریری سائنس سے جناب عبدالحلیم چشتی نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ان کے نگراں ڈاکٹر عبدالمعید ہی تھے۔۱۹۵۶ء سے آج تک سینکڑوں افراد نے لائبریری سائنس میں تعلیم حاصل کی اور وہ اندرون و بیرون ملک لائبریری خدمات انجام دے رہے ہیں یہ معید صاحب ہی کا لگایا ہوا درخت ہے جس کی شاخیں اب ملک سے نکل کر بیرون ملک تمام دنیا میں پھیل چکی ہیں۔آپ نے ماہرین علم کتب خانہ کی ایک بہت بڑی تعداد شاگردوں کی صورت میں تیار کی ہے شخصیت گری کا یہ اعجاز بھی آپ ہی کا مرہون منت ہے۔

۱۹۸۱ء میں شعبہ کی سلور جوبلی کا انعقاد ہوا جس میں ڈکٹر صاحب نے بنفس نفیس شرکت کی۔اس موقع پر لائبریری پروموشن بیورو نے ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک کتاب بعنوان ''پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستان لائبریرین شپ'' شائع کی ۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور کتب خانوی خدمات کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے۔اس مجموعہ مضامین کو مرتب کرنے کا اعزاز مشترک مولف کی حیثیت سے راقم الحروف کو حاصل ہے کتاب کی تعارفی تقریب ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء کو لیاقت میموریل لائبریری آڈیٹوریم میں میں منعقد ہوئی ، صوبائی وزیر تعلیم جسٹس سید غوث علی شاہ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے اپنے خطاب میں کہا کہ آپ حضرات نے میری جس قدر قدرانی کی ہے معلوم نہیں میں اس کا مستحق ہوں یا نہیں۔ مقررین نے جو کچھ میرے متعلق کہا میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔کتاب کے بارے میں کئی مقررین نے اظہار خیال کیا۔

آج پاکستان میں کتب خانوں اور لائبریری سائنس کی تعلیم کو جو مقام حاصل ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی جدوجہد اور کاوشوں کا رہین منت ہے۔ ۲۰۰۶ء میں پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کی تحریک کو پچاس سال مکمل ہوگئے۔ شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی نے پچاس سال مکمل ہونے پر گولڈن جوبلی کا انعقاد۱۸۔۱۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کو کیا، افتتاح جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر قاسم پیرزادہ

صدیقی نے کیا۔ تقریبات دو دن جاری رہیں۔اس دوران متعدد اجلاس مختلف موضوعات پر منعقد ہوئے جس میں کراچی کے علاوہ ملک کے دیگر شہروں سے بھی ماہرین لائبریری سائنس نے شرکت کی۔ راقم الحروف کو ان تقریبات کے ایک اجلاس کی صدارت کا اعزاز حاصل ہوا جس کا موضوع ’’پاکستان میں لائبریرینز اور پاکستان لائبریرین شپ‘‘ تھا، اس کے علاوہ ایک اور اجلاس جس کا موضوع ’’پاکستان میں لائبریری ایسوسی ایشنز کا کردار‘‘ تھا راقم نے ایک مقرر کی حیثیت سے متعلقہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ یہ دونوں اجلاس ۱۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کو ہوئے۔ تقریبات میں دیگر ماہرین نے بھی اظہار خیال کیا۔ گولڈن جوبلی تقریب میں شعبہ کے بانی ڈاکٹر عبد المعید کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جب تک لائبریری سائنس کی تعلیم جاری ہے ڈاکٹر عبد المعید کو اسی طرح خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہے گا۔ المختصر ڈاکٹر عبد المعید کو پاکستان میں لائبریری تعلیم کی تحریک میں جو اولیت حاصل ہے وہ ہمیشہ رہے گی اور ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ واصل عثمانی کے بقول۔

جو بجھ گیا تو ہوا اور بھی درخشندہ
چراغ ایسے لہو کے جلا گیا اک شخص

(مصنف کی کتاب یادوں کی مالا میں شامل)

فرخندہ لودھی۔ ایک ادیب ایک کتاب دار

میں اپنے آپ کو خاکہ نگار نہیں سمجھتا، البتہ شخصیات میرا موضوع گزشتہ پینتیس برس سے ہیں۔ شخصیات پر لکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے، انہیں خراج عقیدت پیش کرکے میری روح کو تسکین ہوتی ہے، یہی میرا بنیادی مطمع نظر ہوتا ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل اور اخبارات میں چھپتے رہے، ۲۰۰۹ء میں چند خاکوں اور سوانحی مضامین پر مشتمل کتاب ''یادوں کی مالا'' کے نام سے لاہور سے 'الفیصل' نے شائع کی۔ فرخندہ لودھی کے بارے میں میری یہ تحریر فرخندہ لودھی کا خاکہ نہیں، نہ ہی میرا یہ مقام ہے کہ میں فرخندہ لودھی جیسی قلم کار کا خاکہ لکھوں جس کی علمی وادبی اور پیشہ ورانہ خدمات کا دائرہ انتہائی وسیع ہے جس کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے اسے صدارتی تمغہ حسن
کارکردگی سے بھی نوازا۔ یہ تحریر تو محض خراج تحسین ہے اپنی ہم پیشہ کے لیے۔

ایسے ہم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غم زدگاں
مرگِ مجنوں پہ کڑھو، ماتمِ فرہاد کرو

اگر کسی کو فرخندہ لودھی کا خاکہ پڑھنا ہی ہے تو وہ فرخندہ کے شوہر پروفیسر

صابر لودھی کے لکھے ہوئے خاکے بہ عنوان 'فرخندہ لودھی اور میں (صباحکایتِ زلف تو در میاں انداخت) ، یہ جی سی یونیورسٹی لاہور کے مجلّہ ''راوی ۲۰۱۰ء'' میں شائع ہوا، یہی خاکہ بقول صابر لودھی مکمل حالت میں لاہور کے رسالے 'الحمرا' کی جنوری ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ مجلّہ 'راوی' نے اس خاکے کو کاٹ چھانٹ دیا تھا، دوسرا خاکہ ''فرخندہ لودھی۔میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' پروفیسر صاحب کی خاکوں کی کتاب ''بھلایا نہ جائے گا''میں موجود ہے۔ یہ خاکے فرخندہ کی نجی
اور ادبی زندگی کی مکمل اور خوب صورت تصویر پیش کرتے ہیں۔

صابر لودھی اردو کے پروفیسر ہیں،ایچی سن کالج لاہور سے ۱۹۵۸ء میں لیکچرر کی حیثیت سے خدمات کا آغاز کیا، مختلف کالجوں میں خدمات انجام دیں، پروفیسر اردو کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ کیا خوب خاکے لکھتے ہیں بلکہ فرمائشی خاکہ نگار ہیں۔ان کی خاکوں کی کتاب کے فلیپ پر فرخندہ لودھی کی اس رائے سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔فرخندہ کے خیال میں ''دوستوں کے اصرار پر ان کا خاکہ لکھ دیتے ہیں، خاکہ اڑانے سے احتراز کرتے ہیں ، قلم کو ایسا کنٹرول میں رکھ کر چلاتے ہیں کہ خاکہ لکھوانے والا باغ باغ ہو جاتا ہے اور اپنے حلقہ احباب میں دکھاتا، سناتا پھرتا ہے۔ اب ان کی خاکہ نگاری کی دھوم کچھ اس انداز سے مچی ہے کہ دور دور سے خاکہ لکھوانے کی

فرمائشیں اور سفارشیں آنے لگیں ہیں''۔فرخندہ لودھی کے خاکوں میں انھوں نے جس سچائی اور بے باکی سے کام لیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکوں کے ذریعہ فرخندہ لودھی کی شخصیت کے تمام تر پہلوایک ایک کرکے اس طرح سامنے آجاتے ہیں کہ

جیسے فرخندہ لودھی کی بارات اپنے روائیتی انداز سے چھم چھم کرتی چلی آ رہی ہو۔

پاکستان لائبریرین شپ اور اردو و پنجابی ادب کی معروف و محترم شخصیت ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی۔ مَیں نے اسی ماہ کی ۱۱تاریخ کو سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز میں ایسو سی ایٹ پروفسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔خیال یہی تھا کہ اپنی اولین فرصت میں فرخندہ لودھی کا خاکہ لکھوں گا لیکن شعبے میں پڑھانے کی مصروفیات، ہاسٹل لائف وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد کی عمر میں، میرے لیے بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا،شہر نیا، لوگوں کے درمیان اجنبی،الغرض بے شمار قسم کی وجوہات آڑے آتی گئیں۔ انہی دنوں ایک سینئر لائبریرین، جو عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں، کتاب دوست ہیں، 'عبد الوہاب خان سلیم' کا خاکہ لکھا جو'پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل میں شائع ہوا دوسرا خاکہ اپنے عزیز دوست جامعہ سرگودھاکے شعبہ اردوکے چیرٔ مین ڈاکٹر طاہر، تونسوی

کا لکھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اب جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے شعبہ اردو کے چیئرمین ہیں۔وقت تیزی سے رواں دواں تھا، اب میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اب کوئی اور کام نہیں کروں گا، چناں چہ میں نے اپنی سوچ کے دھارے کو اس جانب مرکوز کردیا، جامعہ سرگودھا کی لائبریری سے چند کتابیں فرخندہ لودھی کی تحریر کردہ ملیں، لیکن وہ تو افسانے اور کہانیاں تھیں۔ عابد خورشید سے ذکر کیا، انہوں نے فرخندہ کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

ایک دن اپنے ایک دوست ڈاکٹر خالد ندیم جو شعبہ اردو، جامعہ سرگودھا میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، ڈاکٹر طاہر تونسوی کے قریبی دوست اور ساتھی، انھی کے توسط سے یہ میرے بھی دوست ہوئے، میں نے انہیں فون کیا کہ میں اپنی ایک ہم پیشہ خاتون فرخندہ لودھی) جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، وہ اردو و پنجابی ادب کی معروف) لکھاری بھی ہیں پر لکھنا چاہتا ہوں، ان پر مواد کی تلاش میں ہوں، کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر خالد ندیم نے لمحے بھر کو سوچا اور گویا ہوئے، کچھ کچھ ذہن میں آرہا ہے، میں آپ کو ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں۔ مشکل سے پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے میرے موبائل پر گھنٹی بجی، ڈاکٹر خالد ندیم گویا ہوئے آپ کا مطلوبہ مواد مجھے مل گیا ہے، میں کچھ ہی دیر میں آپ کے ہاسٹل آتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کا انتظار کررہا،

ہوں۔ فروری کا مہینہ سردی اپنی بہاریں دکھا رہی تھی، سورج غروب ہونے کے بعد تو سردی زیادہ ہی شدید ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سردی کی پروانہ کرتے ہوئے میرے کمرے میں آ موجود ہوئے۔ کہنے لگے لیجیے آپ کی مشکل انشاء اللہ آسان ہو جائے گی، یہ کہہ کر انہوں نے بڑے سائز کا ایک ضخیم مجلّہ میرے ہاتھ میں تھمایا، یہ تھا ''مجلّہ راوی ۲۰۱۰ء'' جی سی یونیورسٹی لاہور کا خصوصی مجلّہ۔ اس مجلّہ میں گوشہ میر تقی میرؔ، گوشہ ن۔م۔راشدؔ، گوشہ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، گوشہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ ''گوشہ فرخندہ لودھی'' بھی تھا۔ اس لمحے میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میری ایک ہم پیشہ کے بارے میں یہ گوشہ مرحومہ کی علمی و ادبی خدمات کا کھلا اعتراف ہے۔

اس سے قبل ۲۰۰۶ء میں حکومت کی طرف سے فرخندہ لودھی کو 'صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی'' بھی دیا جا چکا تھا۔ مَیں نے فرخندہ کے گوشے کو اُسی وقت پڑھنا شروع کر دیا، ڈاکٹر خالد ندیم گویا ہوئے، ڈاکٹر صاحب آپ اِسے اپنے پاس رکھیں، استفادہ کرلیں تو واپس کر دیجیے گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری مشکل آسان کر دی، اب میں یقیناً فرخندہ لودھی پر آسانی سے کچھ لکھ سکوں گا۔ 'گوشہ فرخندہ لودھی' میں ایک خاکہ فرخندہ لودھی کے شوہر پروفیسر صابر لودھی کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان ہے ''فرخندہ لودھی اور میں (صبا حکایتِ زلف تو درمیاں انداخت)''، ایک تحریر ڈاکٹر انور سدید کی ہے

انہوں نے ''فرخندہ لودھی کی ذاتی ڈائری سے'' کے عنوان سے فرخندہ لودھی کی ڈائری جو ۱۹۸۳ء کے مختلف ایام میں لکھی گئی سے اقتباسات نقل کیے۔ بقول انور سدید 'یہ ڈائری اشاعت کی غرض سے نہیں لکھی گئی لیکن یہ ایک ایسی خود کلامی ہے جس میں مصنفہ کا سماجی تاثر، بے لوث اور بے تکلف ذاتی رائے سما گئی ہے اور ہمیں ان کے داخلی جزیروں تک رسائی کا موقعہ فراہم کرتی ہے''۔ ایک اور اچھا مضمون جی سی یونیورسٹی کے موجودہ مہتمم اعلیٰ عبد الوحید نے تحریر کیا ہے جس کا عنوان ہے 'محترمہ فرخندہ لودھی: مُوقر لائبریرین اور ادبی شخصیت'، سعشہ خان سابق مدیر مجلّہ راوی کے مضمون کا عنوان ہے ''فرخندہ لودھی: ماں۔۔ بس یادیں ہیں باقی''۔ ان مضامین کے علاوہ خواتین کی افسانہ نگاری کے عنوان سے منعقد ہونے والے مذاکرہ کی روداد جس میں فرخندہ لودھی بھی شریک گفتگو تھیں

شامل ہے۔فرخندہ لودھی کا معروف افسانہ ''اور۔۔۔جب بجا کٹورا'' گوشے کا حصہ ہے۔ ہم اپنی زندگی میں جو بھی منصوبے بنا لیں لیکن ہوتا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ میں نے فرخندہ لودھی پر لکھنا شروع کیا لیکن اپنے نجی معاملات کے باعث مجھے جامعہ سرگودھا کو الوداع کہنا پڑا، ۲۸ فروری ۲۰۱۱ء جامعہ سرگودھا میں میرا آخری دن تھا، یکم مارچ کو میں

کراچی واپس پہنچ گیا، اب مجھے سعودی عرب جانا تھا، ویزا آچکا تھا، چنانچہ تیاریاں شروع کردیں۔ مالکِ تقدیر نے قسمت میں ابھی کچھ اور امتحان لکھا تھا، اپریل کے پہلے ہفتے میں اچانک میرے الٹے ہاتھ میں درد ہوا، جس نے شدت اختیار کرلی، نوبت عام ڈاکٹر اور فوری (Angiography) سے کارڈک سینٹر تک پہنچ گئی۔ ۱۲اپریل کو انجو گرافی میں Artery| بھی ہوئی اور دل کی ایک شریان (Angioplasty) طور پر انجو پلاسٹی ڈالا گیا، اس طرح مَیں عام انسان سے کارڈک پیشنٹ بن گیا۔stent)) سٹینٹ

سعودی عرب کے لیے میری سیٹ ۲۹ مئی کی بک ہوچکی تھی، مَیں تیزی سے بہتری محسوس کر رہا تھا، ڈاکٹر نے مجھے سفر کی اجازت کے ساتھ عمرہ کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ انھی دنوں مَیں پروفیسر صابر لودھی کے خاکوں کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا جو میں نے لاہور کے 'کتاب سرائے' سے خریدی تھی، کتاب کا تعارف پڑھا اختتام پر لودھی صاحب کے گھر کا پتا اور فون نمبر درج تھا، میں نے انھیں فون کیا، انھوں نے ہی اٹھایا، اپنا تعارف کرایا، کہنے لگے میں آپ سے بخوبی واقف ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے آپ کی کتابوں کو جو فرخندہ کی کتابوں کی الماری میں رکھی تھیں جھاڑ پونچھ کر دوبارہ وہیں رکھا ہے۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں خاکے بھی لکھ لیتا ہوں، فرخندہ کا خاکہ لکھ رہا ہوں، کتاب میں آپ کا نمبر دیکھا تو سوچا کہ آپ سے بات کروں کچھ معلومات

حاصل ہو جائیں گی۔ خوش ہوئے، میرا ایڈریس نوٹ کیا، کہا کہ فرخندہ پر لکھا ہوا میرا خاکہ جو حال ہی میں چھپا ہے آپ کو بھیج دونگا، اس سے کافی مدد مل جائے گی۔ ایسا ہی ہوا، چند روز میں مجھے وہ خاکہ مل گیا میری مشکل اور آسان ہو گئی۔
اب میں نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے ہی فرخندہ کے خاکے کو مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا، جو کام کیا تھا وہ ساتھ رکھ لیا۔ عمرے کی ادائی گی اور مدینہ منورہ میں حاضری کے بعد مَیں اس جانب متوجہ ہوا، اللہ نے مقدس سرزمین پر اس کام کو مکمل کرانا تھا، پہلے کس طرح ہو سکتا تھا۔ فرخندہ لودھی نے ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ کیا تھا، یہ وہی ڈپلومہ تھا جس کا آغاز ۱۹۱۵ء میں آسا ڈان ڈکنسن نے کیا تھا، قیام پاکستان کے بعد یہ کورس دوبارہ شروع ہوا، اس ڈپلومے کو حاصل کرنے والوں میں دیگر کے علاوہ اردو کے نامور محقق ڈاکٹر سلیم اختر، سینئر لائبریرین عبد الوہاب خان سلیم بھی شامل تھے۔ ملازمت کا آغاز ۱۹۵۸ء میں کوئنز میری کالج لاہور سے کیا، اس اعتبار سے فرخندہ مجھ سے سینئر تھی، میں نے ۱۹۷۲ء میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ میرا اولین رابطہ فرخندہ سے اس وقت ہوا جب فرخندہ اپنے کالج میں لائبریری سائنس بہ طور اختیاری مضمون شروع کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ کراچی کے کالجوں میں یہ مضمون ۱۹۷۶ء میں شروع ہو چکا تھا۔ میری نصابی

کتاب ''ابتدائی لائبریری سائنس'' انٹر میڈیٹ سال اول کے لیے ۱۹۸۰ء میں اور سال دوم کے لیے ''مبادیاتِ لائبریری سائنس'' ۱۹۸۵ء میں آچکی تھیں۔ پنجاب میں مضمون تو شروع ہوگیا تھا لیکن کوئی کتاب نصاب کے مطابق نہیں تھی۔ فرخندہ کی بڑائی تھی کہ انھوں نے نصاب میں میری کتب کو شامل کرایا۔ انھیں کتب کی حصولیابی کے لیے فرخندہ نے مجھ سے رابطہ کیا۔ بعد میں یہ تعلق پیشہ ورانہ مسائل کے حوالے سے قائم رہا۔ ۱۹۸۵ء کی بات ہے فرخندہ لودھی نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا :

صمدانی صاحب !

السلام علیکم !

''آپ نے جس جذبے سے اس میدان میں کام کی پہل کی ہے میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھارہی ہوں ۔ سوچیے اگر آپ کی کتاب نہ ہوتی تو طالبات کیا پڑھتیں۔ اس وقت میری کلاس میں ۱۷ طالبات ہیں۔ کلاس شروع ہوئی تو پتہ کروانے پر معلوم ہوا کہ ابتدائی اور مبادیات لائبریری سائنس کراچی میں بھی دست یاب نہیں۔ بڑی پریشانی ہوئی کریکلم ونگ لاہور کے رسرچ آفیسر (لائبریری سائنس) چوہدری نذیر احمد نے اس سلسلے میں بے حد مدد کی اور کہیں سے آپ کی کتاب حاصل کرکے فوٹو کاپیاں تیار کرکے طالبات کو دیں۔ نیا مضمون ہونے کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھیں''۔

فرخندہ لودھی

اس وقت فرخندہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین وحدت کالونی، لاہور میں تھیں۔ اسی حوالے سے جی سی یونیورسٹی کے چیف لائبریرین عبدالوحید نے اپنے مضمون ''''محترمہ فرخندہ لودھی: مؤقر لائبریرین اور ادبی شخصیت'' میں لکھا'' ۱۹۹۰ء میں وہ انٹر کی سطح پر لائبریری سائنس کا مضمون متعارف کروانے میں کامیاب ہوگئیں اور اپنے کالج گورنمنٹ کالج برائے خواتین وحدت کالونی لاہور) پنجاب میں پہلی بار لائبریری) سائنس کے مضمون کا اجراء کیا۔ بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں جب وہ اپنی پوسٹ اور اسی تنخواہ پر گورنمنٹ کالج لاہور میں آئیں تو یہاں بھی یہ مضمون پڑھایا جانے لگا''۔ فرخندہ لودھی کے اس عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مضمون سے انسیت، دلچسپی اور محبت رکھتی تھیں اس کی ترقی اور اس کے وقار کی سربلندی کے لیے ہر دم کوشاں رہیں۔

فرخندہ لودھی سے میرا ایک تعلق یہ بھی رہا کہ وہ بھی کالج لائبریرین تھی اور میری سرکاری ملازمت جو ۳۵ برس پر محیط ہے مختلف کالجوں میں رہی۔ وہ مستند لکھاری اور میں قلم کاروں کی دنیا میں کچھ کوشش کر لیتا ہوں۔ اس حوالے سے ہمارے پیشہ ورانہ دکھ درد ایک ہی تھے۔ پروموشن، سروس اسٹرکچر، پرنسپل صاحبان کا نامناسب سلوک جیسے مسائل ہمارے پیشہ ورانہ مسائل میں سرفہرست تھے جن سے لڑتے لڑتے بے شمار ساتھی ریٹائر ہوگئے کچھ فرخندہ کی طرح اللہ کو

پیارے ہوئے۔ فرخندہ صرف اسی محاذ پر برسرپیکار نہیں رہی بلکہ اس کی زندگی میں کئی محاذ تھے جن پر وہ چومکھی لڑ رہی تھی۔ اس کی نجی زندگی بھی ایک محاذ تھی، وہ پنجابی اور اردو کی لکھاری تھی وہاں بھی اُسے اپنے آپ کو منوانے کی جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔ اس نے ادیبوں کے کسی گروہ یا گروپ سے اپنے آپ کو منسلک نہیں کیا تھا پھر بھی اس پر مخصوص ادیبوں سے وابستگی کا لیبل لگتا رہا، ہر محاظ پر ہمت اور بہادری کا مقابلہ کیا، کالج کی سطح پر اپنے سبجیکٹ کو متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا تو اسے پائے تکمیل تک پہنچا کر دم لیا، لائبریریز کے پروموشن کی تحریک میں شامل ہوئی تو اسے مکمل کرکے دم لیا، کالج لائبریرینز کے سروس اسٹرکچر کی جنگ اس خوبصورتی سے لڑی کہ وزارت تعلیم کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے، ادیبوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسی لکھاری ہے کہ جس کی تحریر میں جان ہے، وہ با مقصد لکھتی ہے ،اپنی پذیرائی کے لیے ہر گز نہیں لکھتی بل کہ اپنی تحریر سے پڑھنے والوں کو ایک خاص پیغام دیتی ہے، وہ ادیبوں میں گروہ بندی کی بھی قائل نہیں ، اس کا کہنا ہے کہ ادیب صرف اور صرف ادیب ہوتا ہے۔اس نے احمد ندیم قاسمی کو بھی وہی عزت و احترام دیا جو ڈاکٹر وزیر آغا کو دیا۔

فرخندہ لودھی کا تعلق مشرقی پنجاب کے ککے زئی خاندان سے تھاجہاں یہ ہوشیار پور کے محلّہ 'وکیلاں' میں رہا کرتے تھے۔ فرخندہ اپنے آبائی شہر میں ۱۲

مارچ ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد اس خاندان نے پاکستان ہجرت کی اور پنجاب کے شہر منٹگمری (ساہی وال) کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کے والد اور تین بڑے بھائی محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ تین بہنوں اور تین بھائیوں میں فرخندہ کا آخری نمبر تھا۔ فرخندہ نے پولیس والوں کے ماحول میں آنکھ کھولی، پلی بڑھی لیکن اس نے اپنے آپ کو ان خصوصیات سے محفوظ رکھا جو عام طور پر پولیس والوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ تعلیم حاصل کرکے اپنے گھر کے ماحول کو بدلنا چاہتی تھی۔ وہ تو کتاب سے محبت کا سچا جذبہ لیے پیدا ہوئی تھی۔ وہ قلم کی طاقت پر ایمان رکھتی تھی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے عملی جدوجہد کی۔ تعلیم حاصل کی، ملازمت کی، قلم اٹھایا، پوری زندگی کتابوں کے درمیان رہی اور کامیاب بھی ہوئی۔ فرخندہ کا کہنا تھا کہ ''مجھے تعلیم حاصل کرکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جنون ہوگیا تاکہ خاندانی دباؤ سے نجات مل سکے''۔ فرخندہ نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ساہی وال سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ کیا۔ ۱۹۶۲ء میں لائبریری سائنس ہی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۸ء میں اردو میں ایم اے میں بھی کیا۔ وہ چاہتی تو بہت آسانی سے اردو کی لیکچرر بن جاتی۔ اس میں صلاحیت بھی تھی، ڈگری بھی اور لکھاری ہونے کے ناتے ادبی حلقوں میں اس کا نام تھا لیکن اُسے تو کتابوں سے عشق تھا۔ کتابیں اس کی دوست تھیں، ساتھی تھیں وہ کتابوں کے درمیان رہنا چاہتی تھی اور رہی۔ اس نے لائبریرین ہونے کو ترجیح

دی، کبھی

مَیں نے کہا تھا۔

حصول علم ہے ہر ایک کام سے بہتر

دوست نہیں ہے کوئی کتاب سے بہتر

فرخندہ کی شادی پروفیسر صابر لودھی سے ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو ہوئی۔ بقول صابر لودھی انھوں نے جس خانوادے میں آنکھ کھولی وہاں صباحت کا راج تھا۔ ملاحت کو دیکھنے کے'' لیے آنکھیں ترستی تھیں''۔ پختون خواہ کی سرزمین جہاں کے لوگ اپنے ظاہری پن میں سرخ سفید، صحت مند اور خوبرو شخص کو 'سانولی سلونی، اداس، سیاہ، متجسس آنکھیں' کیسے بھا گئیں۔ صابر لودھی کو فرخندہ کی متجسس آنکھیں ایسی اچھی لگیں کہ انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں اپنا لیا۔ اس طرح پروفیسر صابر لودھی کو فرخندہ کے روپ میں وہ ملاحت مل گئ جس کو دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں۔ ایک ادیب لائبریرین اور ایک ادیب پروفیسر کا ملاپ یقینا حسین ملاپ سے کم نہیں، اگر گاڑی کے دونوں پہیوں سے ادب کی کرنیں پھوٹتیں ہوں، ترسیل علم دوطرفہ ہو تو یہ سونے پہ سہاگہ ہی ہے۔ دونوں کی زندگی کا سفر ادب کی ترویج وترسیل سے عبارت رہا۔ فرخندہ ترسیل علم کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج میں بھی کردار ادا کرتی رہی اور صابر صاحب بھی اسی منزل کے شہ سوار رہے۔ یہ دوسری بات بقول صابر لودھی۔ ''اصل میں فرخندہ روایتی

ہے، یونانی مفکر زینو کی شاگرد اور صابر لودھی یونانی فلسفی اپی غورس کا پیرو ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی سوچ ہے، اپنے اپنے دائرے ہیں، تاہم فرخندہ پر سکون زندگی گزار رہی ہے، اضطراب 'محرومی' شکست کے باوجود پر سکون....اس اطمینان میں اُس کے اپنے فلسفے کا دخل ہے۔میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں 'ساتھ ساتھ چلو' دُور دُور رہو'' سو دونوں دُور دُور رہ کر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں'' ۔ایک اور جگہ پروفیسر صابر لودھی نے لکھا''جب کوئی المیہ ،ماضی کا کوئی دکھ، محرومی کا کوئی احساس ، نارسائی کا کوئی لمحہ اُسے بے کل کر دیتا تو وہ کتھارسس کے لیے لکھنے بیٹھ جاتی اور جب کوئی افسانہ یا ناول کا ایک ٹکڑا مکمل ہو جاتا تو اطمینان کا سانس لیتی، تھک کر لیٹ جاتی یا کسی معصوم بچے سے باتیں کرنے لگتی۔ مجھ سے وہ اجنبی رہتی اور یہ اجنبیت زندگی بھر ہمارے درمیان قائم رہی۔ دونوں ایک ساتھ، ایک گھر میں ....اپنے اپنے خیالات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہوئے (وہ کم، میں زیادہ) ایک دوسرے سے خوف زدہ یہی ہماری کامیاب زندگی اور پچاس سالہ رفاقت کا راز تھا''۔ یہ تھی فرخندہ لودھی کی ازداوجی زندگی اس کے اپنے مجازی خدا کے الفاظ میں ۔بہ قول شاعر۔

ساتھ رہ کے بھی دور ہی رہے ہم تم
دھوپ چھاؤں کی دوستی عجب گزری

فرخندہ لودھی کی پیشہ ورانہ خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، اُس کے ہم پیشہ

اُسے عزت و احترام سے دیکھا کرتے تھے۔ اردو اور پنجابی ادب کے دانش ور بھی اس کا اتنا ہی احترام کیا کرتے اور ''باجی'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لائبریرین شپ کے پیشے میں بھی فرخندہ لودھی کا بہت ادب و احترام تھا، فرخندہ کی پیشہ ورانہ خدمات کے معترف ہی نہیں بلکہ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فرخندہ نے ۱۹۵۸ء میں کوئین میری کالج لاہور سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ بقول عبدالوحید ''اس زمانے میں سانولا رنگ، دل کش قامت، دل میں اتر جانے والی اداس آنکھیں اور غیر معمولی لمبے گھنے بال ان کی پہچان ہوا کرتے تھے۔ زمانے کی گرد نے انھیں دھندلا دیا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ان کے سادہ لباس کی تقلید کی جاتی تھی۔ ساڑھی، پورے بازوں کا بلاؤزر اور بند اونچے گلے کی قمیض کا پہناوا، انھوں نے کالج میں نہ صرف پسندیدہ بلکہ عام کیا تھا''۔ لائبریرین کا عہدہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں بہت ہی منفرد ہوا کرتا ہے، کام سب سے زیادہ، تنخواہ سب سے کم، تعلیمی استطاعت اساتذہ کے مساوی بسا اوقات ان سے بھی زیادہ لیکن عزت و احترام میں ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک عام سی بات تھی۔ فرخندہ نے اس ماحول اور رویے کا مقابلہ کرنے اور اس میں بہتری کی عملی جدوجہد کا بیڑا اٹھایا۔ وہ ایک حساس طبیعت کی مالک تھی، اپنے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند

کرنے کھڑی ہوئی تو منزل کو پا کر ہی دم لیا۔ یہ وہ دور تھا جب فرخندہ کوئین میری کالج میں ملازمت کیا کرتی تھیں۔ بقول عبد الوحید '' بطور لائبریرین کوئین میری کالج کا ملازمتی دور انہیں کسی ترقی کی منزل تک تو نہ پہنچا سکا کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب گریجویٹ لائبریرین کو بہ مشکل چودھواں اسکیل کے مساوی تنخواہ ملتی تھی۔ یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر لائبریرین کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ اور تنخواہ سب سے کم تھی۔ پیشہ ورانہ ایسوسی ایشن کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی''۔ اسی زمانہ میں فرخندہ لودھی نے پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کے تحت لائبریرینز کے حقوق کی جنگ لڑنے کا بیڑا اٹھایا، بعد ازآں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے بھی جدوجہد کی اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر مقصد کے حصول میں کامیاب و کامران ہوئیں۔ لائبریری انجمنوں سے فرخندہ کی وابستگی کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس طویل جدوجہد میں فرخندہ اپنے ساتھیوں کے کٹھن سے کٹھن مرحلہ پر ہمیشہ اگلی صف میں نظر آئیں۔ انتظامیہ کے افسران فرخندہ کی ادبی حیثیت سے بھی بخوبی واقف تھے، اس کا ادبی قد کاٹھ بھی افسران پر بھاری پڑا اور انھوں نے مسائل کو حل کرنے پر سنجیدگی سے توجہ دی۔

فرخندہ محض لائبریرین ہی نہ تھیں بلکہ ان کا شمار اردو اور پنجابی کی معروف لکھاریوں میں ہوتا تھا۔ اردو میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے جوہر

دکھانے کے بعد انھوں نے پنجابی میں بھی افسانے، کہانیاں اور ناول تحریر کیے جو بہت مقبول ہوئے۔انھوں نے خاکہ نگاری بھی کی، ان کا تحریر کردہ خاکہ ''انور سدید بھائی صاحب'' میں مصنفہ نے ڈاکٹر انور سدید کی نجی زندگی کی جھلکیاں خوبصورت انداز سے قلم بند کی ہیں۔خاکہ کے اختتام پر فرخندہ لکھتی ہیں ''بھائی صاحب کا خاکہ لکھنے کے لیے میں خود کو کئی برس سے آمادہ پا رہی ہوں لیکن وہی طبیعت کی کسل مندی اور بد عہدی، لفظوں کی تنگی اور بے آہنگی، مجھ جیسے لوگ قلم کاروں کی دنیا میں کبھی کبھی ٹامک ٹوئیاں مارلیتے ہیں۔ میدان مارنے والے شہسوار بھائی انور سدید جیسے ہی لوگ ہیں، قلم جن کی زیر ہیں اتنے رواں کہ مہمیز کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی لوگ آج ادب کی آبرو ہیں''۔ فرخندہ لودھی کا یہ خاکہ سجاد نقوی کی کتاب ''انور سدید۔ گرم دم جستجو''میں شامل ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے مجلہ راوی ۲۰۱۰ء میں 'فرخندہ لودھی کی ذاتی ڈائری سے' کچھ اقتباسات نقل کیے ہیں ۔بقول ڈاکٹر انور سدید فرخندہ نے باقاعدگی سے اپنی ڈائری نہیں لکھی۔ اس کی صرف ایک ڈائری دستیاب ہوئی جو ۱۹۸۳ء کے مختلف ایام میں لکھی گئی۔ انور سدید کے مطابق یہ ایک ایسی خود کلامی ہے جس میں مصنفہ کا سماجی تاثر، بے لوث اور بے تکلف ذاتی رائے سما گئی ہے اور ہمیں ان کے داخلی جزیروں تک رسائی کا موقعہ فراہم کرتی ہے''۔

فرخندہ نے ۱۹۸۳ء میں جو ڈائری لکھی اس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ

اپنے پیشے سے دل برداشتہ تھیں۔ اگر انھوں نے لائبریرین شپ کے بجائے اپنے شوہر کی طرح ٹیچنگ کا شعبہ اختیار کرلیا ہوتا تو وہ بھی پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوتیں۔ پھر بھی انھوں نے مسائل و مشکلات کا مقابلہ کیا، ہمت نہ ہاری، لڑتی رہیں، اپنی ڈائری میں ایک جگہ فرخندہ نے لکھا"لگتا ہے میں لائبریرین ہوں اور اس حیثیت سے کسی نہایت غیر اہم کالج سے اٹھائی جاؤں گی۔ میرے مقدر میں تمام محنت اور کوشش کے باوجود ترقی کا زینہ نہیں"۔یہی بات پروفیسر صابر لودھی نے بھی کہی کہ "فرخندہ لودھی کو لائبریرین کا پیشہ تضحیک آمیز لگا، وہ کامل اختیار کی طلب گار تھی"۔ فرخندہ لودھی نے زندگی کی بازی ہاری نہیں ،بلکہ وہ کامیاب و کامران رہی۔ فرخندہ فالج کی بیماری میں ۱۲ سال مبتلا رہی ، اس مرض کے کئی حملے ہوئے ،زندگی میں چلتے پھرتے حالات و مسائل کا مقابلہ کرتی رہی اور زندگی کے ۱۲ سال ویل چیئر پر موذی مرض سے مقابلہ کرتے کرتے زندگی کی بازی ہار گئی۔ ۵ مئی ۲۰۱۰ء ،شام ۵ بجے شام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں واپڈا ٹاؤن لاہور کا قبرستان ان کا آخری مستقر ٹھہرا۔ اللہ تعالی مرحومہ کی مغفرت فرمائے ،آمین۔علامہ اقبال نے کیا خوب شعر کہا ہے ۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

شائع شدہ: ماہ نامہ "الحمراء" لاہور، ۱۲: ۳، مارچ ۲۰۱۲ء) تحریر)

(شدہ ۱۲ جولائی ۲۰۱۱ء جدہ، سعودی عربیہ

مَولِدُ النبیؐ (پیدائش گاہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مکہ المکرمہ حرم شریف کی حدود میں موجود پیدائش گاہ (مَولِدُ النبی) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب ایک عوامی لائبریری ہے جو مکتبہ مکۃُ المکرمہ (مکہ لائبریری) کہلاتی ہے۔ یہ گھر پیدائش گاہ (مَولِدُ النبی) کے نام سے ہی معروف ہے۔ اس جگہ اور اس گھر کو اس وجہ سے ہی اہمیت، فوقیت اور بلند مرتبہ حاصل ہے کہ اس جگہ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔

مولد النبی ﷺ اصل حالت میں نہیں یہ تعمیر کے کئی مراحل سے گزرا ہے لیکن خطہ زمین اور جگہ وہی ہے۔ ''تاریخ مکۃُ المکرمۃ'' اور ''تاریخ مدینۃُ المُنوّرۃ'' کے مصنف محمد عبد المعبود نے الشیخ پاشا و امرائے مصر کے حوالے سے خلافت عثمانیہ میں مکہ کے محلوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس وقت مکہ میں محلّہ جرول، مسفلہ، جیاد، قشاشیہ، الغزہ، اشامیہ، القرافہ، السلیمانیہ کے علاوہ محلّہ 'شعب بنی عامر بھی تھا۔ مولد النبی ﷺ اسی محلّہ شعب بنی عامر میں تھا۔ یہ محلّہ غزہ کے شمال میں ہے اس میں مولد النبی ﷺ مولد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور بنی ہاشم کے مکانات تھے۔ اس کے شرقی حصہ میں زمانۂ جاہلیت میں بنی عبدالمطلب آباد تھے۔ لیکن آج کل یہاں اشرافِ مکہ مقیم ہیں۔ ریش کے

مکانات زیادہ تر حرم کے شمال کی طرف تھے۔

مَولِدُ النبی یا یہ مقدس گھر اس اعتبار سے اہم اور متبرک ہے کہ اس جگہ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت بروز پیر، ۱۲ ربیع الاول عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء شعب بنی ہاشم میں ہوئی۔ بعض جگہ ۱۷ ربیع الاول بھی درج ہے۔ یہ گھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم عبداللہ ابن عبد المطلب کی ملکیت تھا۔ جب عبد المطلب نابینا ہوگئے تو انہوں نے اپنی جائیداد اپنی زندگی ہی میں اپنے بچوں میں تقسیم کردی۔ اس عمل کے نتیجے میں یہ گھر اور اس کے گرد جو کچھ بھی تھا شہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ ابن عبد المطلب کے حصے میں آیا اور ان کے بعد یہ جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوگئی۔ جب آپ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ جانے لگے تو آپ ﷺ نے اپنی یہ ملکیت اپنے چچازاد بھائی عقیل بن ابی طالب کو ہبہ کردی۔ آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت کے وقت فرمایا تھا "کیا عقیل ہمارے لیے چھت یا گھر رہنے دیں گے" عقیل بن ابی طالب سے یہ گھر محمد بن یوسف ثقفی جو حجاج بن یوسف کا بھائی تھا' نے خرید کر اپنے مکان میں شامل کرلیا تھا اور اسی کے نام "بیت ابن یوسف" سے مشہور ہوا حتیٰ کہ ۱۷۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ "خیزران" جب حج بیت اللہ کو گئیں تو انہوں نے اس مکان کو خرید کر وہاں مسجد تعمیر کرادی۔

تاریخ مکہ" کے مصنف محمد عبدالمعبود نے الشیخ رفعت پاشاؒ کے حوالہ لکھا ہے لکھا ہے کہ ' نبی ﷺ کا مکانِ ولادت سڑک سے تقریباً ڈیڑھ میٹر نشیب میں واقع تھا۔ جس میں " داخل ہونے کے لیے پتھر کی بنی ہوئی چند سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا تھا۔ شمالی دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی ۱۲ میٹر لمبا اور ٦ میٹر چوڑا صحن تھا۔ اس کے دائیں جانب ایک دروازہ چھوٹے سے کمرہ کی طرف کھلتا' جس کے اندر لکڑی کا ایک چبوترا بنا ہوا تھا' جس میں سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے جو درمیان سے کھود کر گہرا کیا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہی نبی ﷺ کی ولادت گاہ ہے"۔ اس جگہ کا کل رقبہ تقریباً ۸۰ مربع میٹر تھا۔ اب اس گھر اور اس عمارت کی یہ صورت نہیں ۔ یہ گھر اور یہ جگہ وقت، حالات اور زمانہ کے ہاتھوں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا موجودہ صورت تک کئی صدیوں میں پہنچا ہے۔ البتہ یہ بات انتہائی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس جگہ پر قائم ہونے والی عمارت مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی لیکن یہ جگہ وہی مقام ہے جہاں نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت ہوئی۔ اب یہ گھر نشیب میں نہیں بلکہ حرم شریف کی حدود میں صفا و مروا کے درمیان باب السلام کے بالمقابل پہاڑ کے دامن میں وسیع و عریض کھلے اور صاف ستھرے میدان میں نمایاں طور پر دو منزلہ عمارت کی صورت میں موجود ہے۔ نہ وہ چھوٹے کمرے ہیں نہ ہی کسی جگہ کوئی چبوترا موجود ہے۔ حرف شریف کی جانب اس کا بنیادی

دروازہ ہے۔ جوں ہی عمارت میں داخل ہوں ایک وسیع اور دیدہ ذیب حال جس کے چاروں جانب لکڑی کی شیشے والی خوبصورت الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی دلکش نظارہ پیش کرتی ہیں۔ بالکل سامنے کی جانب منتظمین لائبریری کی میزیں ہیں اندر کی جانب بھی کمرے ہیں جن میں لائبریری کے فنی امور کی انجام دہی کی جاتی ہے۔انتہائی بائیں جانب لائبریری کے مہتمم اعلیٰ کا دفتر ہے۔لائبریری کمپیوٹرائزڈ کرنے کا کام جاری ہے۔ گویا لائبریری کا کمپیوٹرائی کیٹلاگ تیزی سے تیاری کے مراحل میں ہے۔ مہتمم اعلیٰ کے دفتر کے چاروں جانب الماریوں میں مجلد کتابیں رکھی ہیں۔بتایا گیا کہ یہ نایاب اور قدیم کتابوں اور قلمی نسخے ہیں جنہیں جلد کرا کے محفوظ کیا گیا ہے۔

مولد النبی ﷺ کی تعمیر کئی بار ہوئی۔ لیکن یہ مقدس گھر اپنی اصل جگہ پر قائم ہے یہ گھر مسجد بنا اور پھر اس مسجد سے دوبارہ گھر میں تبدیل ہونے کے بعد اس کی تعمیر و مرمت مختلف سلاطین اپنے اپنے دور میں کرتے رہے۔ مصنف محمد عبدالمعبود نے 'مراۃ الحرمین جلد ۲ ص ۱۸۸) کے حوالہ سے لکھا ہے ۵۷۶ھ میں خلیفہ الناصر عباسی، ۶۶۶ھ میں) ملک مظفر صاحب یمن، ۷۴۰ھ میں حفیدہ المجاہد، ۷۵۸ھ میں مصر کے ایک رئیس، ۷۶۶ھ '۸۰۱ھ میں ملک اشرف شعبان، ۹۳۵ھ میں سلطان سلیمان خان نے یہ خدمت انجام دی۔ ۹۶۳ء میں سلطان سلیمان خان نے تین بیش بہا قندیلیں بھیجیں جن میں سے دو کعبہ شریف کے لیے اور ایک مولد

النبی ﷺ میں آویزاں کرنے کے لیے۔ ۱۰۰۹ھ میں سلطان مراد خان نے اس کی از سر نو تعمیر کرائی اور اس پر ایک عظیم الشان گنبد اور مینار بنوایا۔ بعد ازیں دولت عثمانیہ میں اس جگہ دینی درسگاہ قائم

کردی گئی۔ محمد عبد المعبود نے تاریخ القویم (جلد ا، ص ۲۷۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علامہ طاہر کردی دامت ابرکاتہم تحریر کرتے ہیں کہ ۱۳۴۳ھ میں یہ عمارت منہدم ہوگئی تھی جسے الشیخ عباس بن یوسف القطان المتوفی ۱۳۷۰ھ نے اپنے ذاتی اخراجات سے تعمیر کرنا شروع کیا تھا لیکن دو ہی ماہ بعد ان کا وصال ہوگیا۔ چنانچہ اس کے خلف الرشید الشیخ امین نے کام مکمل کرایا۔ مرحوم نے وصیت کی تھی کہ یہاں ایک عالی شان لائبریری بنائی جائے جس سے علماء اور طلباء استفادہ کریں۔ بہر حاصل اس وقت وہاں افادۂ عوام کے لیے عالی شان لائبریری بنی ہوئی ہے اور دروازہ پر ''مکتبہ مکۃ المکرمہ'' کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر سامی محسن انگاوی جو اسلامک آرکیٹیکچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہیں نے اخبار ''البلاد السعودیہ'' میں شائع ہوئے والے مضمون بعنوان "A School and a Library at the Historical Sites" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سعودی فرماں رواں شاہ عبدالعزیز نے شیخ عباس قطان کو یہ متبرک جگہ جو خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا کا گھر تھا اس مقصد کے لیے دیا کہ اس گھر کی چھت پر قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کریں اور مولد النبی ﷺ میں ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام عمل میں لائیں۔

راقم الحروف کو ۷ ستمبر ۲۰۱۱ء مطابق ۹ شوال ۱۴۳۲ھ پیدائش گاہ (مَولِدُ النبی) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ لائبریری کے مطالعہ کے دوران مہتمم اعلیٰ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَّار سے ملاقات ہوئی۔ یہ گھر قشاشیہ اسٹریٹ پر قائم ہے جو سوق الیل (نائٹ مارکیٹ) کے نام سے معروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب اس گھر کے اردگرد ہفتہ میں ایک دن پرانے سامان کی خرید وفروخت کا بازار لگتا ہے۔ کردی خاندان' کے 'ماجد کرد' سے ''مجیدیہ لائبریری'' جو ان کی ذاتی لائبریری تھی خریدی گئی، یہ لائبریری نایاب اور قیمتی کتب پر مشتمل ہے۔ کتابیں سلیقے سے دیدہ زیب الماریوں میں ترتیب وار رکھی ہیں۔ کتب خانہ کے مدیر کا کمرہ (آفس) وہی جگہ ہے جہاں پر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں آمد ہوئی، یہ بات مجھے مدیر مکتبہ (لائبریرین) یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَّار نے ہی بتائی، الحمد اللہ مجھے اس کمرہ میں بیٹھنے اور کچھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، یسلم صاحب سے جب مَیں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مجھے خصوصی توجہ دی، اپنے آفس میں لے گئے، قہوا پلایا، کتب خانے میں موجود قدیم اور نادر کتب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَّار اہل بیت میں سے ہیں، جامع مسجد امام البخاری کے امام وخطیب بھی ہیں۔

ڈاکٹر عبد الطیف عبد اللہ بن دھیش نے اپنی کتاب ''پرائیویٹ لائبریریز ان مکہ'' (انگریزی) میں لکھا ہے کہ ''مجیدیا لائبریری کا قیام ۱۳۲۸ھ میں عمل میں آیا۔ یہ لائبریری محمد ماجد بن صالح بن فیض اللہ بن حسن کی ذاتی لائبریری تھی۔ ماجد کرد ایک علمی و ادبی شخصیت تھے انہوں نے ہمیشہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ماجد کرد کو کتابوں سے محبت تھی ، وہ بنیادی طور پر تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے ۔ شیخ ماجد کرد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے بھی اس لائبریری کو ترقی دی۔ ۱۳۷۰ ھ میں شاہ عبد العزیز نے حکم دیا کہ پیدائش مَولِدُ النبی یعنی اس گھر میں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی عوامی لائبریری قائم کر دی جائے جو شعیب علی میں واقع تھی۔اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے انتہائی مقدس و محترم جگہ کو ایسی جگہ بنا دیا جائے جہاں پر دنیائے اسلام سے اہم علم ، محققین و مصنفین اور علم و حکمت سے وابستہ لوگ آزادی سے آسکیں اور علم کی پیاس بجھا سکیں۔ (شائع شدہ روزنامہ جنگ، سنڈے میگزین ۲۰۔۲۶

(جنوری ۲۰۱۳ء ، ص۔ ۲

شفیع عقیل (شین عین) بہترین مبصر؛ لوک داستانوں کے امین

شفیع عقیل (شین۔عین) بھی رخصت ہوئے۔۲۰۱۳ء میں ہمارے کئی ادیب و شاعر ہم سے جدا ہوگئے، ابھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو دنیا سے رخصت ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ آج ۷ ستمبر کو یہ خبر بھی پڑھی کے ش۔ع بھی چلے گئے۔ شفیع عقیل بلا شبہ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کے ادیب اور لوک داستانوں کو قلم کی زبان دینے کے ماہر تھے۔ عرصہ دراز سے روزنامہ جنگ میں کتابوں پر تبصرے کر رہے تھے۔اس فن میں مہارت حاصل ہوگئی تھی اور اس حوالے سے بلند مقام پر فائز تھے ۔ان کا خاندانی نام محمد شفیع اور ادبی نام شفیع عقیل لیکن عرصہ ہوا انہوں نے شین عین کو ہی اپنی پہچان بنا لیا تھا۔۱۹۳۰ء میں لاہور چھاونی کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں "تھینہ" میں پیدا ہوئے۔کہنے والے کہتے ہیں کہ اب یہ گاؤں موجود نہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا ابتدائی دور لاہور کے علاقے دھرم پورا جس کا نیا نام مصطفیٰ آباد ہے میں گزارا۔۱۹۵۰ء میں لاہور سے کراچی تشریف لے آئے۔ان کی تعلیم روایتی تھی ادیب عالم اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۹ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ہوا تھا۔ کراچی میں رہتے ہوئے ان کے پاس یقیناً موقع تھے کہ وہ اپنی تعلیم کو آگے بڑھاتے لیکن نہیں معلوم کیا مجبوریاں اور رکاوٹیں تھیں۔ان کی تحریر کی پختگی اور رچاؤ ایک منجھے ہوئے مصنف کا پتا دیتی ہیں۔

شفیع عقیل مستقل مزاج انسان تھے کراچی آئے تو کراچی کے ہی ہو رہے، صحافت کا پیشہ اختیار کیا تو صحافی کے حیثیت سے ہی دنیا سے رخصت ہوئے ، روزنامہ جنگ سے ۱۹۵۰ء میں وابستہ ہوئے تو اپنی زندگی کے ۶۴ سال اسی ادارے میں گزار دئے اور اسی ادارے سے منسلک رہتے ہوئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ادارہ جنگ کے تحت ہی اخبارِ جہاں کے لیے بھی کام کیا۔ جنگ کے میگزین کی ادارت بھی کی۔ بھائی جان کے لقب سے معروف ہوئے۔ رسالہ 'بھائی جان' ، ہفت روزہ ''ماحول'' کے مدیر بھی رہے۔ مجید لاہوری مرحوم کے ساتھ پندرہ روزہ ''نمکدان'' کے نائب مدیر بھی رہے۔ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز مجید لاہوری اور شوکت تھانوی کے ساتھ ہی کیا تھا۔ مجید لاہور پر دو کتابیں 'مجید لاہوری فن اور شخصیت' اور مجید 'لاہوری کی حرف و حکایت، ۱۹۷۱ء' میں مرتب کی، شوکت تھانوی پر ان کا ایک مضمون ''ظرافت نگاری کی شان: شوکت تھانوی'' شائع ہوا۔ وہ آرٹ کے نقاد کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

شفیع عقیل کو ان کی ادبی و تصنیفی خدمات پر اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ سے نوازا گیا، ۱۹۷۶ء میں حبیب ادبی ایوارڈ، ۱۹۷۸ء مین بک کونسل ادبی ایوارڈ، ۱۹۹۰ء میں خوش حال خان خٹک ایوارڈ اور سر عبدالقادر ایوارڈ ملا، ۱۹۹۵ء میں خدمت صحافت ایوارڈ، ۲۰۰۴ء

میں حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا، ۲۰۰۵ء میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوراڈ اور لائف فیلو ورلڈ پنجاب کانفرنس، ۲۰۰۹ء میں کراچی پریس کلب کا نشان سپاس دیا گیا اسی سال لائف فیلو' اکادمی ادبیات پاکستان] اور کتاب 'پنجاب رنگ' پر داؤد ادبی انعام سے بھی انہیں نوازا گیا۔

شفیع عقیل مرحوم لوک کہانیوں، لوک داستانوں اور پنجاب کی لوک کہانیوں کے حوالے سے بلند مقام رکھتے تھے۔انہوں نے مختلف زبانوں کے ادب خاص طور پر پنجابی ادب کو اردو میں ترجمہ کرکے اردو پڑھنے والوں کو پنجابی ادب سے خوب خوب متعارف کرایا، ان کی یہ ادبی خدمت تادیر یاد رکھی جائے گی۔ اس حوالے سے انہوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں۔ ان میں پنجابی لوک کہانیاں (۱۹۶۳ء)، پنجاب لوک داستانیں (۱۹۷۵ء)، پنجاب رنگ (۱۹۶۸ء)، جاپان لوک کہانیاں، ایرانی لوک کہانیاں، چینی لوک کہانیاں ۱۹۷۵ء، جرمن لوک کہانیاں، جرمن لوک داستانیں، جاپانی لوک حکائتیں، دوستی کا پھل (لوک کہانی)، سوچاں دی زنجیر (۱۹۷۵ء)، سسی پنوں (۲۰۰۲ء) شامل ہیں۔

شفیع عقیل کی تصانیف کی کل تعداد ۳۷ ہے۔ ان کی اولین کتاب ۱۹۵۲ء میں 'بھوکے افسانے)کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ گویا انہوں نے تصانیف کی ابتدا افسانوں سے) کی۔ اس اس کے بعد اردو اور پنجابی میں تصانیف و تالیفات کا

سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کی تصانیف میں 'ایک آنسو ایک تبسم' (طنز و مزاح) ۱۹۵۳ء، ڈھل گئی رات (ناول) ۱۹۵۷ء، '، 'مجید لاہوری فن اور شخصیت' ۱۹۵۸ء، تیغ ستم' طنز و مزاح) ۱۹۶۳ء، ہماری منزل غازی یا شہید (رپوتاژ) ۱۹۶۸ء، 'پنجاب رنگ) ۱۹۶۸ء'، 'غالب جنھوں ہر کوئی چنگا آکھے (پنجابی ترجمہ) ۱۹۶۹ء، ' 'پنجاب کے پانچ قدیم شاعر ۱۹۷۰ء، '' مجید لاہوری کی حرف و حکایت ۱۹۷۳ء، سیر و سفر ۱۹۸۰ء، 'زہر پیالہ' (۱۹۸۰ء)، سیف الملوک ۱۹۹۰ء، ' تنقید و آگہی ' (۱۹۹۵ء)، قائد اعظم محمد علی جناح تقریریں تے بیان ۱۹۹۷ء 'نامور ادیبوں اور شاعروں کا بچپن' (۱۹۹۸ء)، نامور ادیبوں کی نایاب کہانیاں اور ڈرامے ۱۹۹۸ء، 'نامور شاعروں کی نایاب منظومات' (۱۹۹۹ء)، نا'مور ادیبوں اور شاعروں کے نایاب مضامین' (۲۰۰۲ء) ادیب اور ادبی مکالمے ۲۰۰۲ء، دو مصور بشیر مرزا اور آزر زوبی ۲۰۰۳ء، مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں ۲۰۰۴ء، پیرس تو پھر پیرس ہے ۲۰۰۴ء، سلطان بانوں' (۲۰۰۴ء)، سلطان باہو: حیات و فن ۲۰۰۴ء، زندگی پھر کہاں چھ ممالک کا سفر نامہ ۲۰۰۹ء، سرخ سفید سیاہ' (۲۰۰۹ء)، سفر نامہ مغربی جرمنی' چار جدید مصور، تصویر اور مصور، مصور اور مصور شامل ہیں۔ شفیع عقیل کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ ان کی کتاب ''پنجابی لوک کہانیاں'' یونسکو کی جانب سے سات زبانوں میں شائع ہوئی۔ ان میں سے تین جرمن زباں میں ترجمہ ہوئیں۔ پاکستان رائیٹر گلڈ کی جانب سے ان کی کتاب ''پنجاب رنگ پر انہیں داؤد ادبی انعام سے روازاگیا۔ ''

تبصرہ نگاری ادب کی ایک معروف صنف ہے۔ عرصہ دراز سے پڑھنے والے شفیع عقیل کو کتابوں پر تبصرے کے حوالے سے ہی جانتے تھے۔ روزنامہ جنگ میں 'ش ع' کے نام سے ہر ہفتہ کئی کتابوں پر تبصرے شائع ہونا بنیادی وجہ تھی۔ تبصرہ اپنے معنی وسعت کے اعتبار سے اہمیت لیے ہوئے ہے۔ تبصرہ پڑھ کر کتاب کے بارے میں بڑی حد تک اندازہ کرلینا کہ اس میں کیا کچھ ہے آسان ہوتا ہے۔ ایک مغربی مفکر نے تبصرے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ ''تبصرہ دستاویز یا کتاب کے متن کو مختصر اور صحیح طور پر اس انداز سے بیان کرنا کہ وہ اصل دستاویز معلوم ہو''۔ گویا تبصرہ اصل دستاویز کا نچوڑ یا حاصل ہوتا ہے۔ شفیع عقیل مرحوم کتاب پر تبصرے کے فن سے خوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے اس فن میں انفرادیت قائم کرلی تھی۔ ان کے لکھے ہوئے تبصرے پڑھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوتے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میری سوانحی خاکوں پر مشتمل کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی' جو ۲۰۱۲ء مین شائع ہوئی تھی پر شفیع عقیل مرحوم نے تبصرہ تحریر کیا۔ یہ تبصرہ روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت مورخہ ۶ جنوری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے لکھا کہ ''اصنافِ ادب میں خاکہ کسے کہتے ہیں؟ خاکہ نگاری کے اصول یا حدود و قیود کیا ہیں؟ کیا شخصیات کے بارے میں تعریفی توصیفی مضامین کو خاکہ کہا جائے گا؟ یا پھر عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' خاکے کی تعریف میں آتا ہے؟ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے جس پر بہت کچھ کہا جاسکتا

ہے۔ بہر صورت اردو ادب میں اکابرین نے بھی خاکے تحریر کیے ہیں اور موجودہ دور میں بھی بہت سے ادیب لکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے بھی بہت پہلے اردو کے قدیم تذکروں میں کسی نہ کسی صورت میں ملتا ہے۔ اس طرح اگر خاکہ نویسوں کی فہرست ترتیب دی جائے تو طویل ہو جائے گی۔ در اصل ہمارے ہاں خاکہ نویسی کا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا، چنانچہ یاد نگاری بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ سوانح نگاری بھی در آئی ہے، آراء نویسی بھی اس کا حصہ بن گئی ہے اور مصنف کے گزشتہ حالات و واقعات بھی اسی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ بہر صورت خاکوں پر مشتمل کئی کتابیں اردو کا سرمایہ بن گئی ہیں اور حوالے کے طور پر ان کا تذکرہ آتا ہے۔ ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' میں بھی شخصی خاکے شامل ہیں۔ مصنف پاکستان کی مختلف جامعات میں رہے ہیں، اس لیے ان کا مختلف علمی و ادبی شخصیات سے تعلق رہا ہے، جن میں سے بعض کے انہوں نے خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان خاکوں میں سوانحی پہلو بھی ہیں اور خود مصنف کی اپنی یادداشتیں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے ان شخصیات کو جیسے دیکھا، ان کے مشاہدے میں کیا کیا باتیں آئیں؟ ان باتوں کا اظہار اس کتاب میں ہے''۔ تبصرہ نگار کی خوبی اور مہارت دیکھئے کہ اس نے کتاب، صاحبِ کتاب اور اس موضوع پر مختصر اظہار خیال خوبصورت انداز سے کیا ہے۔ یہی ایک اچھے تبصرے کی خوبی بھی ہوتی ہے۔ تبصرہ کتاب کی تعریف و توصیف بیان کرنے کا نام نہیں ساتھ ہی غیر ضروری تنقید بھی تبصرہ نہیں کہلاتی اس میں میانہ روی اور غیر جانب داری کی

چاشنی کا پایا جانا تبصرے کی اصل روح ہے۔

شفیع عقیل نے علمی ، ادبی خدمت کے جو چراغ اپنے خون پسینے سے روشن کیے ہیں وہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔پانچ دریاؤں کی سرزمین پر طلوع ہونے والا یہ ستارہ ۸۳ برس اپنی آب وتاب دکھا کر کراچی شہر کی مٹی میں ۷ ستمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگیا۔اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے آمین۔

(شائع شدہ روزنامہ جنگ ، سنڈے میگزین ۲۲ ستمبر ۲۰۱۳ء)

حکیم محمد سعید شہید۔ تحقیق کے آئینے میں

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالہ بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور
کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے ماخوذ)

حکیم محمد سعید دنیائے اسلام کی ایک نامور، قابل احترام اور کثیر الجہات شخصیت تھے جن کی خدمات کا دائرہ بے شمار شعبہ ہائے زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔ خاص طور پر معاشرہ کی بہبود اور عالم اسلام کی فلاح، علم و حکمت، طب و سائنس، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تربیت، صحافت، رسائل و جرائد اور اشاعت کتب، عربی زبان کی ترویج و ترقی، کردار و اخلاق کی تعمیر، نونہالوں کی تعلیم و تربیت، تعمیر و استحکام وطن کے علاوہ پاکستان میں لائبریری تحریک اور کتب خانوں کی ترقی و فروغ میں آپ کی خدمات نمایاں، فقید المثال اور دور رس اثرات کی حامل ہیں۔ ''آپ کا شمار ان عظیم المرتبت افراد میں ہوتا ہے جن کی زندگی کا بنیادی مقصد خدمت اور تعمیر و ترقی وطن رہا، آپ نے اپنی زندگی میں قومی سطح پر خلوص و شفقت، علم و فضل اور ایثار و قربانی کے انمٹ نقوش چھوڑے'' (۲)۔ چیف جسٹس (ر) انوار الحق کے بقول ''حکیم محمد سعید ایک ایسے انسان تھے جن

کے کمالات کے دائرے کا احاطہ کرنے بیٹھیں تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ کوئی اکیلا آدمی اتنے مفید کام بھی کر سکتا ہے، اس وسیع پیانہ پر" (۳)۔

کتاب اور کتب خانہ حکیم محمد سعید کی شناخت ہے جو تاابد آپ کو زندہ وجاوید رکھے گی، اپنی اس شناخت سے آپ کو بے حد عقیدت اور لگاؤ تھا جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب آپ نے شہر علم مدینتہ الحکمہ کے بارے میں اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ تیار کیا تو اس قطعہ اراضی پر کہ جس پر شہر علم بسایا گیا ہے سب سے پہلے پائے تکمیل کو پہنچنے والی عالی شان عمارت لائبریری کی تھی جو بیت الحکمہ کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ اس لائبریری کو بجا طور پر دنیا کی ایک منفرد، مثالی اور ایشیاء کی بڑی لائبریری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ نے اس کتب خانے کا نام بیت الحکمہ رکھا تو آپ کے ذہن میں اسلامی دور کا وہ تاریخی ادارہ بیت الحکمت کا تصور جاگزیں تھا جسے عباسی خلیفہ جعفر المنصور (المتوفی ۱۳۵ھ۔۱۵۸ھ) نے بغداد میں قائم کیا تھا بعد میں خلیفہ ہارون الرشید (المتوفی ۱۷۰ھ۔ ۱۹۳ھ) نے اسے ترقی دی۔ گویا آپ کسی بھی تعلیمی ادارے کی اصل روح کا ادراک رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شہر علم (مدینتہ الحکمہ) کی اصل روح بیت الحکمہ) کی تخلیق کو اولیت دی گئی اور بیت الحکمہ کی تعمیر کے بعد دیگر)

تعلیمی اداروں جن میں اسکول، کالج، یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹس شامل تھے کا

قیام عمل میں لایا گیا۔

حکیم محمد سعید ان صاحب فضل و کمال شخصیات میں سے تھے کہ جن کی ضیاء علم و دانش نے بیسویں صدی کو منور اور تابناک بنا دیا۔ آپ کا نقطہ نظر واضح، رائے دو ٹوک اور مصلحت سے پاک تھی، آپ انسان دوست، درد مند معالج، محقق اور دانش ور، تاریخ دان، فروغ تعلیم کے داعی، مدیر مولف و مصنف، اعلیٰ منتظم، اسلامی علوم پر ماہرانہ نظر رکھنے والے، ملکی سیاست کے نباض، حقیقت پر مبنی سوچ و فکر کے حامل اور ایک وضع دار انسان تھے۔ بقول ایس ایم ظفر ''حکیم محمد سعید خون کے آخری قطرہ تک محب وطن تھے۔'' (۴) در حقیقت آپ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ ''عام طور پر لوگ سانسوں کی گنتی اور شب و روز کے شمار کو زندگی سمجھتے ہیں جب کہ حکیم محمد سعید کے نزدیک زندگی سعی پیہم اور جہد مسلسل کا نام ہے۔'' (۵)۔

حکیم محمد سعید کے آباؤ اجداد کا تعلق چین کے شہر سنکیانگ سے تھا جہاں سے یہ خاندان سترھویں صدی کے آغاز میں ہجرت کر کے پشاور منتقل ہوا، تقریباً ۸۰ سال بعد اس خاندان نے پشاور سے ملتان ہجرت کی اور ۱۳۵ برس پنجاب کی سرزمین کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے عشرہ میں آپ کے خاندان کے افراد نے پنجاب کی سرزمین کو الوداع کہتے ہوئے دہلی ہجرت کی اور حوض قاضی

کو اپنا مسکن بنایا۔ ۱۸۵۶ء میں حکیم محمد سعید کے پردادا دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے آپ کے دادا حافظ شیخ رحیم بخش ۱۸۶۴ء اور نانا کریم بخش ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مزاجاً مہم جو واقع ہوئے تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد پیلی بھیت منتقل ہو گئے، وہیں پر حافظ شیخ رحیم بخش کی شادی ہوئی، ۱۸۸۳ء میں حکیم محمد سعید کے والد حافظ حکیم عبدالمجید کی پیدائش ہوئی، ۱۸۸۶ء میں آپ کے چچا حافظ عبدالرشید پیدا ہوئے۔ آٹھ برس پیلی بھیت میں رہنے کے بعد آپ کے دادا دوبارہ دہلی چلے گئے اور حوض قاضی کو از سر نو آباد کیا۔

حکیم محمد سعید ۹ جنوری ۱۹۲۰ء (۱۶ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ) کو صبح چار بج کر سترہ منٹ پر ہندوستان کے شہر دہلی کے کوچہ کاشغری، بازار سیتارام میں پیدا ہوئے۔ برصغیر کے معروف عالم دین حضرت مولانا احمد سعید نے آپ کا نام ''محمد سعید'' رکھا۔ سعید کے معنی ہیں ' سعادت، مبارک، بابرکت، نیک، خوبیوں والا، خیر و عافیت والا '۔ آپ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ابھی آپ صرف ڈھائی برس کے تھے کہ آپ اپنے والد حکیم عبدالمجید (ولادت ۲۲ جون ۱۸۸۳ء، بمقام پیلی بھیت، وفات ۲۲ جون ۱۹۲۲ء) کے سایہ سے محروم ہوگئے آپ کے والد حافظ قرآن تھے اور ان کا روحانی تعلق حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ سے تھا۔

۱۹۰۰ء میں حکیم حافظ حاجی عبدالمجید بانی دواخانہ ہمدرد کا نکاح رابعہ بیگم سے ہوا۔ آپ انتہائی نیک، اطاعت اور خدمت گزار، نماز و روزہ کی پابند، پردہ کی پابند، محنتی، وفاشعاراور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ خواجہ حسن نظامیؒ نے آپ کو مادر ہمدرد کا خطاب دیا تھا۔ محترمہ رابعہ بیگم کے انتقال کے بعد خواجہ حسن نظامیؒ نے ان کے احترام میں ایک کتاب بعنوان ''مادر ہمدرد'' لکھی اپنی والدہ کے بارے میں حکیم محمد سعید نے لکھا'' میری والدہ نہایت نرم مزاج خاتون تھیں، مگر ساتھ ہی گرم مزاج بھی تھیں۔ ساری زندگی اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ ان کی تربیت کا سارا زور اخلاق پر تھا۔ بداخلاقی پر سخت سزا دیتی تھیں'' (۶)۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''اگر ان میں یہ عظمتیں نہ ہوتیں تو ابا جان کے انتقال کے
بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا'' (۷)۔

حکیم محمد سعید کے والد حکیم عبدالمجید ایک مستقل مزاج شخص تھے۔ آپ کو ادویات کے خواص میں خاص دلچسپی تھی۔ شوق اور مہارت کے باعث انھوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ ہندوستانی دواخانے میں ملازمت کرلی۔ اس عرصے میں طب کا مطالعہ بڑی گہرائی اور طب کی متعدد کتابوں کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا۔ آپ کو جڑی بوٹیوں سے گہرا شغف تھا اور ان کی پہچان کا

ملکہ حاصل تھا آخر کار انھوں نے نباتات کے میدان میں اترنے کا نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ بیماریوں کی شفاء کے لیے ہندوستان بھر سے جڑی بوٹیاں حاصل کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ بقول حکیم محمد سعید ''آپ ایک بلند پایہ نبض شناس تھے۔ یعنی جڑی بوٹیوں کے ماہر'' (۸ ۔ حکیم عبدالمجید بڑی محنت سے حکیم اجمل خان کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ انھیں احساس ہوا کہ حکیم اجمل صاحب ان کی دیانت پر شک کرنے لگے ہیں۔ غیرت فطرت نے یہ شبہ برداشت نہ کیا اور اس عظیم انسان نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ ۱۹۰۶ء میں اپنے سسر رحیم بخش صاحب سے کچھ پیسے لے کر ہمدرد کی بنیاد ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ جڑی بوٹیوں کی تجارت بھی شروع کی۔ ہمدرد دکان کو چلانے کے لیے حکیم عبدالمجید نے نباتات سے دوائیں بنانا شروع

کیں اور ان کی اہلیہ رابعہ بیگم نے ہر مرحلے پر اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔

ہمدرد دواخانے کی پہلی دوائی ''حب مقوی معدہ'' تھی۔ رابعہ بیگم اور ان کی بہن فاطمہ بیگم دونوں عبدالمجید صاحب کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور سل بٹے سے نباتات پیس کر ہاتھ سے گولیاں بناتی تھیں۔ حوض قاضی سے ہمدرد کی منتقلی لال کنویں کی ایک دکان میں ہوئی اور جب اس کاروبار میں وسعت پیدا ہوئی تو اس کو لال کنویں سے اس کی ابتدائی جگہ منتقل کرنا پڑا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو اس جگہ سے ہمدرد کے نئے دور کا آغاز ہوا حکیم عبدالمجید کی انتھک محنت اور مستقل

مزاجی نے ہمدرد کو ناقابل تسخیر بنا دیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو ہمدرد کا نیا دور شروع ہوا، لیکن افسوس اس نئے دور کی افتتاحی تقریب کے دوران حکیم عبدالمجید علیل تھے اور اس عظیم الشان تقریب میں شرکت نہ کر سکے۔ ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو ۳۹ سال کی عمر میں آپ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہونے کے لیے ہمدرد کا ایک باب کھلا چھوڑ گئے (۹)۔ اس وقت حکیم محمد سعید کی عمر ڈھائی برس تھی، آپ کی پرورش آپ کی والدہ رابعہ بیگم اور آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے کی۔ شہید حکیم محمد سعید کی رسم بسم اللہ ۱۹۲۲ء میں تین برس کی عمر میں ادا ہوئی۔
ہندوستان کے معروف عالم مولانا احمد سعید نے قرآن مجید کی سورۃ خلق کی پہلی آیت پڑھائی۔ اس موقع پر بچوں کی نماز باجماعت کا بھی اہتمام ہوا۔ تقریب کے دولھا نے امامت کے فرائض سرانجام دیے اس طرح آپ بچوں کی جماعت کے امام ہوئے اور نماز عصر پڑھائی۔ تین برس کے حکیم محمد سعید نے جگت چچی کے گھر قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور صرف پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ ''رسم آمین'' کی تقریب کا اہتمام بھی بڑے پروقار طریقے سے ہوا۔ ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جانے کے بعد آپ کی والدہ نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا بیٹا اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے آپ کو حوض قاضی، اجمیری

دروازہ، دہلی کی اونچی مسجد ' مسجد گاڑی بان' میں قائم مدرسہ تعلیم القرآن میں داخل کرا دیا گیا۔ مسجد کے پیش امام حافظ عمر دراز علی نے آپ کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ اس وقت حکیم محمد سعید کی عمر نو برس تھی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے اپنی والدہ کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سے قبل آپ چھ برس کی عمر میں پہلا روزہ بھی رکھ چکے تھے۔

حکیم محمد سعید حصول علم سے کبھی غافل نہ ہوئے، دینی تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد آپ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے ماسٹر ممتاز حسین اور ماسٹر اقبال حسین سے حاصل کی جب کہ عربی و فارسی کے استاد قاضی سجاد حسین تھے (۱۰)۔ قاضی سجاد حسین کا شمار اس وقت ہندوستان کے عربی اور فارسی کے نامور علماء اور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی ہدایت پر آپ نے طب کا خاندانی پیشہ اختیار کرنے اور طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، ۱۹۳۶ء میں جب کہ آپ کی عمر ۱۴ برس تھی آپ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج دہلی میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے یہاں پر آپ کے اساتذہ حکیم عبدالحفیظ، میجر ظفریاب حسین اور ڈاکٹر اے جی قریشی تھے۔ پاکستان ہجرت کے بعد جب آپ طبیب کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ہمدرد کے فروغ و ترقی کے

لیے کوشاں تھے آپ نے محسوس کیا کہ آپ کو انگریزی زبان میں گفتگو کے دوران مشکلات پیش آرہی ہیں تو آپ نے بلا جھجک انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ انگریزی کے ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ آپ نے لکھا کہ 'انگریزی زبان میں گٹ پٹ کرنے کی مشق کراچی میں کی۔ میری استاد شفیقہ ائرمارشل میکڈانلڈ، کمانڈر انچیف پاکستان ائر فورس کی اہلیہ تھیں' (۱۱) ۔اس عمل سے آپ نے ثابت کیا کہ حصول علم میں وقت اور عمر کی قید نہیں۔ انسان عمر کے کسی بھی حصہ میں باقاعدہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ حکیم محمد سعید کی شادی ان کی خالہ زاد محترمہ نعمت بیگم سے ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ نعمت بیگم ایک مثالی وفادار صابر و شاکر اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے انھیں ایک ایثار پیشہ خاتون قرار دیا۔ حکیم محمد سعید نے اپنی زندگی کی کہانی میں اپنی شریک حیات کے بارے میں تحریر فرمایا کہ ''اگر ایسی معصوم شریک حیات مجھے نہ ملتیں تو شاید میں وہ سارے کام نہ کرسکتا کہ جو میں نے کر لیے ہیں۔ انھوں نے ہر تکلیف برداشت کرکے میری راحت کو ہر راحت پر مقدم رکھا۔ جب غربت کا دور دورہ تھا تو بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ ہم دونوں نے خاموشی سے فاقے بھی کر لیے۔ پھر جب کراچی میں ہمدرد کے قیام کا وقت آیا تو اس عظیم خاتون کے پاس جو زیور تھا وہ سب مجھے دے دیا اور ہمدرد کے قیام میں اس عظمت نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا'' (۱۲)۔

حکیم محمد سعید اور محترمہ نعمت بیگم کی رفاقت ۳۸ برس پر محیط ہے۔ آپ کی شریک حیات نے ایسا حق رفاقت ادا کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ۱۸ اگست ۱۹۸۱ء دن کے دو بجے اللہ کو پیاری ہوئیں۔ حکیم صاحب کی اولاد میں ایک بیٹی سعدیہ راشد ہیں جو محترم حکیم صاحب کے بعد ہمدرد کے جملہ امور کی نگراں و سرپرست ہیں۔ حکیم محمد سعید اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید سے بہت متاثر تھے۔ حکیم عبدالحمید کو بھی آپ سے بے انتہا محبت تھی، بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ در حقیقت حکیم محمد سعید کی تعلیم و تربیت، سیرت اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں آپ کی والدہ رابعہ بیگم اور آپ کے بڑے بھائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ دونوں کی تربیت نے آپ کو ایک مثالی انسان بنا دیا۔ حکیم صاحب نے اپنی کہانی میں تحریر فرمایا کہ ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی جان نے میری تربیت اور محبت کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے میرے سامنے ایک نمونہ بن کر رہے ہیں اور مجھے انھوں نے انسان بنا دیا۔'' ایک اور جگہ آپ نے اعتراف کیا کہ ''میرا رواں رواں ان کا زیر احسان ہے۔'' اپنے بڑے بھائی سے تمام عمر ہدایت و رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ درحقیقت حکیم محمد سعید کی زندگی اپنے بڑے بھائی کا پرتو ہے۔ وہی ان کے آئیڈیل تھے۔ خود ان کے بقول ''زندگی کی ہر دوڑ میں اور سعی و جہد کی ہر منزل میں تتبع حمید سے غافل نہیں رہا۔'' ایک اور

جگہ آپ نے لکھا ”میں نے
پوری زندگی اپنے بھائی جان محترم کے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کو آج تک ناں نہیں
کہا ہے۔“
حکیم عبدالحمید بھی اپنے چھوٹے بھائی سے بے پناہ محبت کیا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ حکیم
سعید سے اس حد تک مطمئن تھے کہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ” اگر سرسیدؒ مرحو
م مسدس حالی اللہ کے سامنے پیش کریں گے تو میں حکیم سعید کو پیش کر دوں گا“۔ اگر
مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی کہ آج پاکستان میں حکیم محمد سعید صاحب کا جو
کارنامہ مدینتہ الحکمہ کی شکل میں نظر آتا ہے وہ بھی حکیم عبدالحمید صاحب کی تعلیم و
تربیت اور مشوروں کا حاصل ہے“ (۱۳) ۔ محترمہ سعدیہ راشد کا کہنا ہے کہ ” ابا جان
اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، بہت احترام کرتے تھے۔ نہ جانے وہ انھیں
چھوڑ کر کیسے چلے آئے۔ کہیں انھوں نے ضرور لکھا ہوگا۔ یہ پاکستان کا جذبہ تھا اور مسلم
لیگ سے ان کی وابستگی جس نے انھیں پاکستان چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ انھیں اپنے
بھائی سے بہت محبت تھی اور انھیں چھوڑ کر آنا ان کے لیے یقیناً ایک کٹھن کام تھا۔ میں
سمجھتی ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی۔ اللہ کو ان سے اچھے کام کرانے تھے۔ انھوں نے
دل و جان سے پاکستان کی خدمت کی، لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کیا“ (۱۴)۔

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالصتاً مذہبی تھا۔ نماز، روزہ، تلاوت قرآن مجید، بڑوں کا حد درجہ ادب چھوٹوں کا لحاظ اور شفقت کے ساتھ پیش آنا خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس ماحول کا نقشہ حکیم صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ '' صبح اٹھے تو محترمہ والدہ صاحبہ کو ہمیشہ ہی جاء نماز پر دیکھا اور سوتے وقت ان کو تلاش کیا تو ان کو جاء نماز پر پایا۔ گھر کا ماحول یہ تھا کہ ہر انسان نمازی تھا۔ ہر شخص حافظ قرآن تھا۔ احترام کا یہ عالم کہ کیا مجال کہ سب سے بڑی بہن کے سامنے زبان کھل جائے۔ والدہ محترمہ اور بھائی کے سامنے ٹوپی کے بغیر جانا مشکل تھا۔ بات کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ آواز نیچی رہے۔ ہماری والدہ محترمہ خاندان کی چوہدری تھیں۔ وہ ہر فرد خاندان، بلکہ ہر فرد معاشرہ سے محبت واحترام سے ملتی تھیں۔ خاطر تواضع کا اہتمام خوب تھا۔ گھر کا ماحول یہ تھا کہ نماز روزے کا بڑا احترام تھا اور تلاوت قرآن حکیم معمولات زندگی۔ اسی بات سے دیانت و صداقت کا درس ملتا رہتا تھا۔ میرے دور میں ماحول یہ تھا کہ محلے کا کوئی بزرگ قریب سے گزر جاتا تو بچے ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ السلامُ علیکم سے استقبال کرتے تھے۔ جواب میں وعلیکم السلام کے ساتھ دست شفقت سے نہال ہو جاتے تھے۔ بچوں کا حال یہ تھا کہ کوئی بزرگ سامان اٹھائے چل رہا ہے تو بچے فوراً سامان ہاتھوں میں لے لیتے تھے اور بزرگ کو ان کے گھر تک چھوڑ

آتے تھے (۱۵)۔ آپ نے اعتراف کیا کہ ''آج میں جو کچھ بھی ہوں، وہ بھائی جان محترم کے نقش قدم پر چلنے کا ثمر ہے۔ بزرگوں کا احترام کرکے میں سعید بنا ہوں'' (۱۶)۔

اپنے والد کے انتقال (۲۲ جون ۱۹۲۲ء) کے بعد ہمدرد مطب کی نگرانی اپنی والدہ کی سرپرستی میں حکیم عبدالحمید نے سنبھال لی تھی اس وقت آپ کی عمر ۱۳ برس تھی جب کہ حکیم محمد سعید صرف ڈھائی برس کے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اور طبّی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکیم محمد سعید اپنے بھائی حکیم عبدالحمید کے ہمراہ ہمدرد کو مزید فعال بنانے میں مصروف ہوگئے اور پاکستان ہجرت کرنے سے قبل (۱۹۴۰ء۔ ۱۹۴۷ء) تک بھرپور طریقہ سے ہمدرد کے فروغ کی جدوجہد کرتے رہے۔ دونوں بھائیوں کی زندگی کا مقصد اب طب یونانی کی نہ صرف ترویج و ترقی تھا بلکہ ہمدرد کو ایک دواخانہ سے بڑھا کر خدمت خلق کا ایک عظیم الشان ادارہ بنانا تھا۔ بس یہی ایک دھن ان دونوں کو تھی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، ان کے خلوص اور لگن کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور انھیں قابل رشک کامیابی سے نوازا (۱۷)۔ اور ہمدرد ایشیا کا سب سے بڑا دوا ساز ادارہ بن گیا۔ حکیم محمد سعید نے عطاروں کی مددگاری، نسخہ بندی، عطاری، دوا سازی، پیکٹ و پارسل تیار کرنا بہی کھاتا، روزنامچہ نویسی، خطوط کے جوابات دینے کے علاوہ ہمدرد کے انتظامی امور میں مہارت حاصل کر چکنے کے

بعد باقاعدہ مطب شروع کیا۔ ۱۹۴۰ء میں آپ کو ہمدرد کے جملہ امورِ انتظامی بھی سونپ دیے گئے۔ اب حکیم محمد سعید ہمدرد کے سب کچھ تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے مقام پر ہونے والے تاریخی جلسہ عام جس میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی اس میں حکیم محمد سعید شریک تھے۔ قرار داد پاکستان پیش کیا جانے والا روح پرور منظر سعید ملت کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر نے آپ کے ذہن کو جلا بخشی۔ وہ بنیادی طور پر تحریر و تحقیق کے آدمی تھے۔ شہر دہلی سیاست کا گڑھ تھا۔ قائداعظم دہلی میں اکثر قیام کرتے تھے اس طرح سعید ملت اکثر و بیشتر ان کی زیارت سے فیض یاب ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حکیم صاحب کے مختلف سیاست دانوں سے تعلقات استوار ہو چکے تھے اور وہ ان کے خیالات سے بہرہ مند ہوتے پھر حکیم صاحب کا منطقی ذہن سیاسی حالات کا تجزیہ کرتا جو اکثر درست ثابت ہوتا اور پرانی گرہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد تحریک پاکستان میں حیران کن برق رفتاری آ گئی۔ ادھر سعید ملت خانقاہی مزاج رکھنے والے تنہائی پسند نہیں تھے ان کی ملاقات زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے انسانوں سے ہوتی۔ ہمدرد کی وجہ سے بڑی شخصیات کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوتا۔ اپنے ذاتی مراسم، مشاہدے اور غور و فکر کا عادی ہونے کی وجہ سے وہ چشم بینا کے مالک بن چکے تھے۔ ان کی بصیرت پکار پکار کر ان کو منزل کے تعین پر مجبور کر

رہی تھی۔ ہندوؤں کا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ گاندھی کی منافقت کھل کر سامنے آچکی تھی۔ قائد اعظم اپنی اصول پرستی اور خلوص بے کراں کی بنا پر برصغیر کے سیاسی افق پر چھا رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانان برصغیر کی واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھر چکی تھی۔ فرنگیوں کی ناانصافیوں اور بدعہدیوں کانگریس کی کہہ مکرنیوں، وعدہ خلافیوں اور ہٹ دھرمیوں، اپنوں بیگانوں کی جفاؤں کے باوجود قیام پاکستان کی راہ ہموار ہو چکی تھی بلکہ اب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا اور کمند بفضل خدا بڑی مضبوط تھی۔

حکیم محمد سعید نے غور فکر کے بعد بہت بڑا فیصلہ کیا اور وہ یہ تھا کہ "بھارت میں جس انداز کی حکومت قائم ہوگی میں اس کا وفادار نہیں رہ سکتا، لہٰذا مجھے پاکستان جانا ہوگا"۔ یہ اتنا بڑا فیصلہ تھا جسے دیوانگی قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہ تاج شاہی چھوڑ کر کاسۂ گدائی تھامنے والی بات تھی۔ جھونپڑی سے محل میں جانا آسان ہو سکتا ہے، لیکن محل سے جھونپڑی میں آنے کے لیے جرات رندانہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پاکستان آنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی کا آغاز از سر نو کیا جائے اور وہ بھی بے سرو سامانی کے نقطہ آغاز سے، کیوں کہ بھارت میں ہمدرد کے جملہ اثاثے وقف ہو چکے تھے۔ اس سے بڑی بات، عاشق زار بھائی کی مخالفت کا سوہان روح خیال تھا۔ وہ بھائی جس کے ہر فیصلہ کو شہید پاکستان حرفِ آخر قرار دیتے تھے، لیکن یہ حب اختیاری کا معاملہ

تھا،اب خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، مصائب و آلام اس کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ یہ خاردار راستے پر ننگے پاؤں چلنے والا معاملہ ہوتا ہے اسے دو دھاری تلوار پر گامزن ہونا بھی کہتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو سے سعید ملت کے خوش گوار تعلقات تھے اس سلسلے میں آپ نے ایک بار دو ٹوک الفاظ میں کہا ''میں پنڈت جواہر لال نہرو کا قریبی دوست ہو سکتا ہوں، لیکن اس کی حکومت کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ منافقت کی مجھ میں صلاحیت ہی نہیں۔'' یہ الفاظ ادا کرکے سعید ملت نے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ وہ اسلام جو سعید ملت کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پھر چودہ اگست ۱۹۴۷ء والا سورج طلوع ہوا۔ برصغیر تقسیم ہوگیااور مملکت خداداِ پاکستان، معرض وجود میں آ گئی، لیکن اس کے بعد (یا پہلے) جو کچھ ہوااس نے حکیم محمد سعید کا سینہ چھلنی کر دیا۔ ظلم و بربریت کا فیل مست بے زنجیر ہوگیا اور انسانیت کو پس دیوار منہ چھپا کر آنسو بہانا پڑے۔ مسلمان کش فسادات حکیم محمد سعید نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ دہلی میں ان کے کئی چاہنے اور چاہے جانے والے شہید ہوگئے۔ سرزمین دہلی میں جن کی جڑیں صدیوں سے جمی ہوئی تھیں وہ خشک اور بے حقیر تنکوں کی طرح دوش ہوا پر اڑنے لگے۔ ہمدم، دوست، سب کچھ لٹا کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ رشتے دار اور مضبوط تعلقات تارِ عنکبوت سے زیادہ ناپائیدار ثابت ہوئے۔ علم و ادب کے خزانے جلا دیے گئے۔

عزتیں لوٹی گئیں، مہر و محبت کے شبستان نذر آتش کر دیے گئے۔ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت شروع ہو گئی۔ ہندوؤں، سکھوں کا کردار اس قدر گھناؤنا، اس قدر نفرت انگیز تھا کہ حکیم محمد سعید نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کر دیا۔ ہندستان میں آپ نے اپنے پیاروں کے ساتھ مل کر بہت بڑا مشن پورا کر دیا۔ ادارہ ہمدرد عوام الناس کی خدمات کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ نوزائدہ مملکت پاکستان کے عوام کی خدمت بھی کی جائے (۱۸)۔ حکیم محمد سعید نے عزیز رشتہ داروں، دوستوں اور بے شمار چاہنے والوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنانے کے بارے میں حکیم محمد سعید نے اپنی کہانی میں تحریر فرمایا کہ ''میں کراچی کیوں آیا؟ ایک دل چسپ داستان ہے۔ ایک تو بات یہی ہے کہ جناب حکیم احسن صاحب دہلی میں طبیہ کالج میں میرے ساتھ طب پڑھا کرتے تھے پھر سندھ اسمبلی کے اسپیکر آنریبل سید میاں محمد شاہ صاحب سے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے ہاں تعلق قائم ہوا۔ پھر ان سے دوستی ہو گئی۔ سید میران محمد شاہ اس زمانے ۱۹۳۷ء میں وائسرائے کی کونسل میں بیٹھنے کے لیے خاص لباس ٹیل کوٹ، کالی نکٹائی وغیرہ کے ساتھ آیا کرتے۔ اب دوستی پھیلی تو سندھ کے وزیر اعلیٰ خاں بہادر محمد ایوب کھوڑو جب دہلی آتے تو میں ان کا میزبان بنا۔ سندھ کے وزیر تعلیم جناب پیر الٰہی بخش صاحب سے دوستی تھی۔ وہ میرے گھر ٹھہرا کرتے تھے۔ میر غلام علی تالپور کا بھی میں ہی میزبان ہوتا تھا۔ وہ وزیر داخلہ سندھ تھے۔

یہ دوستیاں مجھے راولپنڈی کے بجائے کراچی لے آئیں، ورنہ فکر و فہم کے
لحاظ سے راولپنڈی میں صنعت لگانی چاہیے تھی۔ میری دوربین نگاہیں راولپنڈی کا مستقبل
۱۹۴۷ء میں
دیکھ سکتی تھیں'' (۱۹)۔

پاکستان ہجرت کی تین وجوہات بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا کہ '' میں ۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لیے کراچی آگیا، اپنی والدہ محترمہ رابعہ بیگم کو روتا چھوڑ کر آیا، اپنے عظیم محسن اور بھائی کو اداس چھوڑ آیا، اپنی ہر جائیداد چھوڑ آیا، اپنا پیارا شہر دہلی چھوڑ آیا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ میں فکری اعتبار سے اورمزاجی لحاظ سے بھارت کا وفاراد نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں بھارت کا وفادار نہیں ہو سکتا تھا تو مجھے اصولاً وہاں رہنا نہیں چاہیے تھا۔ بھارت چھوڑنے پر میرا ہر دوست مخالف تھا۔ میرے عزیز واقارب کو میرا بھارت چھوڑنا گوارا نہ تھا، حتیٰ کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تک نے بھی پاکستان نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میرے بزرگ بلکہ دوست حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی رائے بھی یہی تھی کہ مسلمانوں کو بھارت میں رہنا چاہیے، مگر میں نے اصول کی خاطر ہر چیز قربان کر دی اور خالی ہاتھ پاکستان چلا آیا'' (۲۰)۔

ہجرت کی دوسری وجہ آپ نے یہ بیان کی کہ '' وقت گزرتا گیا بھائی جان محترم کے

بیٹے عبدالمعید اور حماد احمد بڑے ہوتے رہے ان نہایت اچھے بھتیجوں کے دل میں ضرور یہ خیال آیا کہ یہ چچا جان کون بزرگ ہیں جو سارے کاروبار پر حاوی و قابض ہیں ان کی جائیداد تو ابا جان سے بھی زیادہ ہے جس دن میں نے اپنے بھتیجوں کے دلوں میں اس کانٹے کو محسوس کیا میں نے ایک تاریخی فیصلہ کر لیا۔ میں نے ۱۹۴۴ء میں کراچی کو اپنا مرکز بنانے کا ارادہ کر لیا، مگر بات ٹلتی رہی۔ ۱۹۴۴ء میں، میں کراچی آ کر رہا تھا۔ پھر مارچ ۱۹۴۷ء میں کراچی آیا۔ یہاں سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ میں زمین خریدی۔ ایک مکان کا فیصلہ کیا۔ اب میں نے ہجرت کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ میں خاندان میں کوئی افتراق پیدا نہیں کر سکتا تھا اور میں اپنے عظیم بڑے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ ساتھ دل کا ساتھ تھا یہ ساتھ محبت کا ساتھ تھا۔ یہ ساتھ احترام کا ساتھ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا ہمدرد خاندان میں چچا بھتیجوں کی لڑائی کا کوئی بھی امکان ہو۔ عزتِ خاندان نے مجھے راہ ہجرت دکھائی۔ میں نے اسے سنت کے طور پر قبول کر لیا۔ ۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو میں نے صبح ۱۰ بجے ہندستان چھوڑ دیا" (۲۱)۔ ہجرت کی تیسری وجہ آپ نے یہ بیان کی کہ "ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو قتل عام ہوا اس نے ۱۸۵۷ء کی یادیں تازہ کر دیں اس میں جوانمردی اور جرات سے ہم نے ہمدرد کو محفوظ کیا، مگر یہ بھی فیصلہ کیا کہ پاکستان جا کر قسمت آزمائیں" (۲۲)۔

جنوری ۱۹۴۸ء دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر حکیم محمد سعید کو رخصت کرنے دیگر لوگوں ۹ کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید، آپ کے استاد مولانا قاضی سجاد حسین موجود تھے۔ قاضی سجاد حسین نے حکیم صاحب کو عربی اور فارسی پڑھائی تھی۔ آپ اسی روز ہندوستان سے اپنی شریک حیات اور بیٹی سعدیہ کے ہمراہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے۔ کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ سندھ کالونی، جمشید کوارٹرز کے مکان 185/1 میں رہائش اختیار کی جو حافظ محمد الیاس کی نگہبانی میں تھا۔ شہر کراچی آپ کے لیے نیا نہیں تھا۔ آپ ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۷ء میں بھی یہاں آ چکے تھے، لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی۔ آپ نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندستان کو مستقل طور پر خیرباد کہا اور پاکستان کو دل و جان سے اپنا وطن بنایا۔ آپ اپنا سب کچھ ہندستان چھوڑ آئے تھے۔ آپ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابتدائی چند ماہ مشکل میں گزرے۔ ہر وقت مصروف رہنے والے کے پاس کوئی مصروفیت نہ تھی۔

دہلی میں بے شمار جائیداد کا مالک، پیکارڈ کار میں سفر کرنے والا کراچی میں میلوں پیدل سفر کر رہا تھا۔

آپ اس کوشش میں تھے کہ مطب کے لیے کوئی جگہ مل جائے۔ بالآخر آپ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ایک پارسی ایڈلجی ڈنشا کے ذریعہ کراچی کے علاقے آرام باغ

میں شاہراہ لیاقت (فیریئر روڈ) پر اعوان لاج میں جگہ مل گئی اور ہمدرد مطب کا آغاز ہوا۔ افتتاح ۱۹ جون ۱۹۴۸ء کو وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش نے کیا۔ مطب کا آغاز ہوا۔ اللہ نے برکت دی۔ مریض آنے لگے۔ اب دوا سازی کے لیے جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی، اس موقع پر آپ کی دوستی کام آئی، آپ کے دوست اسپیکر سندھ اسمبلی کے توسط سے آرام باغ میں اعوان لاج کے سامنے قائم دھرم شالہ کا نیچے کا حصہ حاصل ہوگیا۔ یہاں سے ہمدرد پاکستان کے تحت دوا سازی کے کام کا آغاز ہوا۔ دواؤں کی تیاری کے بعد ان کی فروخت بھی ضروری تھی اب ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں سے لوگوں کو آسانی سے ہمدرد کی دوا مل سکے۔ اس وقت صورت حال بہتر ہو چکی تھی۔ مطب شروع ہو چکا تھا، دوائیں تیار ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ نونہال گرائپ واٹر کی وہ بوتلیں جو ہندوستان سے چلتے ہوئے آپ کے بڑے بھائی نے آپ کے ہمراہ کر دی تھیں کہ وقت ضرورت کام آئیں گی وہ تمام فروخت ہو چکی تھیں۔ ان بوتلوں کی فروخت کے لیے آپ نے بڑی محنت اور مشقت کی تھی، کیوں کہ یہ کام آپ نے از خود انجام دیا تھا۔ کراچی کی معروف شاہراہ فریئر روڈ پر ایک دکان ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدی گئی (۲۳) پاکستان میں یہ ہمدرد کا نقطہ آغاز تھا۔ آپ نے اپنا مطب اور اپنی خدمات کو زندگی کے اختتام تک اسی جگہ پر قائم رکھا۔ اس مقام تک پہنچنے سے قبل آپ کو مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے ملازمت کی بھی کوشش کی۔ حاجی سر عبداللہ ہارون یتیم خانہ جو کراچی کے قدیم علاقے کھڈا

مارکیٹ میں قائم ہے۔ اب اس علاقے کا نام نیا آباد میمن سوسائٹی ہے۔ یتیم خانہ کے ساتھ ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا یہ اب حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ اسکول کے نام سے موجود ہے۔ حکیم محمد سعید اس اسکول میں پہنچے اور کہا کہ ' حافظ قرآن ہوں استاد کی حیثیت سے ملازمت چاہتا ہوں '، آپ کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اس طرح سول اسپتال کے نزدیک ایک اسکول میں بھی آپ کو ملازمت نہ مل سکی۔ لیکن آپ نے حوصلہ نہ ہارا، جدوجہد کرتے رہے، حتیٰ کہ کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔ آپ نے ایک اسکول میں

چھ ماہ استاد کی حیثیت سے بچوں کو تعلیم بھی دی اور اسی دوران یہ فیصلہ بھی کیا کہ مستقبل میں اسکول ضرور قائم کریں گے۔

مطب اور دوا سازی کے کام میں استحکام پیدا ہوا تو آپ نے اپنی طبّی خدمات کے دائرے کو کراچی کے علاوہ دیگر شہروں تک وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں ہمدرد کی بنیاد رکھی۔ ایک سال بعد ۱۹۵۱ء میں لاہور میں انارکلی میں مطب قائم ہوا جس کا افتتاح وزیرِاعلیٰ پنجاب میاں محمد ممتاز دولتانہ نے کیا۔ بعد ازاں آپ پشاور، راولپنڈی، ملتان اور سکھر میں بھی مطب کرنے لگے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ مطب والے دن بطور خاص روزہ رکھا کرتے اور بغیر کسی وقفہ کے مریضوں کو دیکھا کرتے۔ آپ نے لندن میں بھی مطب کیا۔ مریض غریب ہوتا یا امیر آپ نے کبھی کسی مریض سے فیس

نہیں لی طب کے فروغ کے لیے طبیہ کالج قائم کیا جس کا افتتاح ۱۴ اگست ۱۹۵۸ء کو مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے کراچی میں کیا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کا قیام دہلی میں ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا۔ کراچی میں ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی بنیاد ۱۹۵۶ء میں پڑی۔ اس سے قبل آپ ۱۹۵۳ء میں ہمدرد کو وقف کر چکے تھے۔ اور اس کی راہ متعین کر دی تھی۔ ارشاد احمد حقانی کے بقول حکیم صاحب پاکستان کے ان مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے جو قوم کی عظمت اور رفعت کے لیے انتھک محنت کرتے ہیں۔ دولت تو بہت سے لوگوں نے کمائی، لیکن حکیم صاحب نے یہ دولت ایک درجن سے زائد میدانوں میں قومی زندگی کو شان دار اور مال دار بنانے کے لیے وقف کر دی۔ خود درویش کی زندگی گزاری (۲۴)۔ ایس ایم ظفر کے خیال میں ''مجھے تو وہ اس دور کے ابوذر غفاری دکھائی دیتے ہیں جو اپنی ضرورت سے زیادہ دولت وقف کرتے جاتے ہیں اور دولت جمع کرنے والوں اور ارتکاز زر کے ملزموں کو اپنے عمل اور بیانات سے بے نقاب کر رہے ہیں'' (۲۵)۔ خدمت انسانی کا یہ اعزاز شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوا ہو کہ آپ نے اپنی زندگی میں معاشرے کے ہر طبقے کے تین ملین مریضوں کا علاج کیا۔ ان میں امیر بھی تھے غریب بھی، جوان بھی تھے بوڑھے بھی۔ سربراہانِ مملکت سے لے کر نچلی سطح تک کے لوگ شامل تھے۔ کسی ایک سے بھی تشخیص و تجویز کا معاوضہ (Consultation Fee) نہیں لیا (۲۶)۔

حکیم محمد سعید کا کہنا تھا کہ وہ صحافی بننا چاہتے تھے۔ علم و ادب سے شغف تھا اور تحریر و تصنیف کی جانب ابتدا ہی سے مائل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ہمدرد صحت کا اجرا دہلی سے ہوا، اس کے اولین مدیر خواجہ نیاز احمد تھے۔ ۱۹۳۳ء سے حکیم عبدالحمید اس کے مدیر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں یہ ذمہ داریاں حکیم محمد سعید کو سونپ دی گئیں، لیکن عملی طور پر آپ نے ۱۹۴۱ء میں ادارت کے فرائض سنبھالے۔ یہ تحریر و تصنیف کی ابتدا تھی۔ طبی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے اس رسالہ کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی اور اس کی ۱۹ جلدیں قیام پاکستان تک شائع ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے اس رسالہ کی اشاعت کراچی سے شروع کی، لیکن اس کا تسلسل ہندستان سے جاری کی گئیں جلدوں سے ہی برقرار رکھتے ہوئے اس کی جلد ۲۰ کا اولین شمارہ جو جنوری ۱۹۵۱ء میں حکیم محمد سعید کی ادارت میں جاری ہوا تھا کراچی سے جاری ہونے والا پہلا شمارہ تھا۔ ہمدرد کے علاوہ آپ کی ادارت میں کئی رسائل جاری ہوئے ان میں ہمدرد نونہال (۱۹۵۳ء)، اخبار الاطب (یکم جنوری ۱۹۹۵) SPEM، (۱۹۵۵ء)، پیامی (۱۹۷۷ء۔ ۱۹۹۹ء)، ہمدرد میڈیکس (اپریل ۱۹۵۷ء ۱۹۸۷ء)، Endeavour (ء)، میڈیکل ٹائم (۱۹۷۸ء)، ہمدرد اسلامیکس (۱۹۷۸ء جریدہ (۱۹۸۳ء)، خبرنامہ ہمدرد (۱۹۶۰ء) شامل ہیں۔ حکیم محمد سعید شہید کا تحریری سرمایہ نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ علم و ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو کہ جس پر آپ نے نہ لکھا ہو۔ آپ کی انگریزی اور اردو تصانیف ۲۵۰ سے زیادہ ہیں جن کا تفصیلی جائزہ آئندہ باب میں لیا جائے گا۔

طب کے میدان میں کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد آپ نے معاشرہ کے دیگر مسائل اور کمزوریوں کی جانب توجہ دی۔ اس سلسلہ میں آپ نے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، سماجی کارکنوں، سیاست دانوں، ماہرین تعلیم اور مذہبی دانشوروں کو دعوت دی کہ وہ آگے آئیں اور عام
لوگوں کی مشکلات و مسائل کے حل میں شریک ہوں (۲۷)۔

حکیم محمد سعید نے خدمت خلق، وطن سے محبت اور اصلاح معاشرہ کے لیے مختلف طریقے اور پروگرام ترتیب دیے ان میں جاگو جگاؤ، پاکستان سے محبت کرو پاکستان کی تعمیر کرو، پاکستان کا یوم آزادی ۱۴ اگست کے بجائے ۲۷ رمضان المبارک کو منانے کی تحریک، کتب خانوں کے قیام اور فروغ کی تحریک، آواز اخلاق، ڈاکٹروں، حکیموں اور سائنس دانوں میں سہ فریقی اتحاد، علما اور علم کا احترام، صحت مند قوم، خودی، دن میں دو وقت کھانا، اردو زبان کی ترویج و ترقی، اسلامی تعلیمات کا فروغ، جہاں دوست، جوانان امروز کے علاوہ شام ہمدرد جو بعد میں ہمدرد مجلس شوریٰ کہلائی کے علاوہ بزم ہمدرد نونہال شامل ہے۔ شام ہمدرد کا آغاز ۱۹۶۱ء میں کیا گیا۔ اس کے ذریعے پاکستانی دانشوروں، ادیبوں، شعراء، حکماء اور سائنس دانوں، سیاست دانوں، ماہرین تعلیم، صحافیوں غرض ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو ایک ایسا فقید المثال پلیٹ فارم مہیا کیا گیا

جس کے ذریعے وہ اپنا نقطہ نظر عوام الناس تک پہنچا سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا غیر سیاسی ادارہ ہے جسے بام عروج پر پہنچانے کے لیے آپ نے مسلسل محنت اور جدوجہد کی۔ حتیٰ کہ اسے عالمی شہرت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۹۵ء میں حکیم محمد سعید نے فقید المثال تحریک شام ہمدرد کو ''ہمدرد مجلس شوریٰ'' کا مرتبہ ومقام دینا طے کیا۔ شورائیہ ہمدرد کے بنیادی مقاصد کی وضاحت آپ نے ان الفاظ میں کی ''شورائیہ ہمدرد پاکستان میں ارباب اقتدار کی فکر و عدل کو صراط مستقیم دینے کا فریضہ انجام دے گی۔ اس ملی جدوجہد کا منتہائے مقصود صاحبان اقتدار کو بہ خلوص صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کے اقدامات پر تبصرہ کرنا اور غلط پر گرفت قائم کرنا۔'' بقول عطاء الحق قاسمی ''اس طرح گویا انھوں نے چاروں صوبوں کے عوام اور دانشوروں کو محبت کی لڑی میں پرو دیا'' (۲۸) ۔

شام ہمدرد کے مقررین اور صدور کی تعداد تقریباً ایک ہزار کے قریب رہی۔ چونکہ شوریٰ ہمدرد کا مزاج سیاسی نہیں ہے بلکہ اس کا اعلیٰ ترین مقصد حکومت وقت کو نہ صرف مشورہ دینا بلکہ عوام الناس کو رہنمائی بھی فراہم کرنا تھا اس لیے شوریٰ کے اراکین کی تعداد کو محدود رکھا گیا یہ تعداد مجموعی طور پر ۱۷۳ سے آگے نہ بڑھ سکی اور یہ معزز اراکین اپنا کام احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ شوریٰ ہمدرد حکیم محمد سعید شہید کی علمی، طبّی سماجی، ثقافتی اور

تعلیمی خدمات کا ایک عظیم الشان مرکز ہے، ایک ایسا مرکز ہے جو کہ علم کا چراغ جلائے ہوئے ہے اور فکر و عمل کی راہیں نہ صرف کھولتا ہے بلکہ ان راہوں کو کشادہ ہی کرتا جارہا ہے۔ شوریٰ ہمدرد غیر سیاسی فورم لیکن اہل سیاست کی رہنمائی کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ شوریٰ ہمدرد کے ذریعے حکیم صاحب نے علم وادب میں ایک شان دار اور منفرد روایت قائم کی آپ نے شوریٰ ہمدرد کے ذریعہ خود کو ہمیشہ کے لیے اس فانی دنیا میں فنا ہو کر بھی لافانی کر لیا ہے اور ان کی یہ عظیم الشان خدمت تاریخ ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے گی (۲۹)

آپ بچوں سے بے انتہا محبت کرنے لگے تھے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''جب میں نے اپنی محبت کو اس قدر بڑھا لیا کہ مجھے پاکستان کا ہر بچہ اور دنیا کا ہر بچہ اپنا لگا تو پھر مجھے بزم ہمدرد نونہال شروع کرنے کا خیال آیا میں جس طرح اپنی اولاد کی بھلائی کی سوچتا ہوں اسی طرح میں ہر بچے کی بھلائی کی سوچتا ہوں۔ یہ اس سوچ کے نتیجہ میں بڑوں کی شام ہمدرد کی طرز پر بچوں کی شام ہمدرد کا تصور سامنے آیا۔ آپ نے اپنے رفقاء کے مشورے سے ''بزم ہمدرد نونہال'' (نونہال اسمبلی) کی ابتدا کی۔ کراچی کے بعد پشاور، راولپنڈی اور لاہور میں بزم کے اجلاس منعقد ہونے لگے۔ آپ بچوں کے پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے۔ بچوں سے محبت اس قدر بڑھی کہ آپ نے بچوں کے لیے باقاعدہ

اور مسلسل لکھنا شروع کر دیا اور اس قدر لکھا کہ نو نہال ادب کے تمام مصنفین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ۱۹۹۲ء میں لکھی گئیں بارہ ''سچی کہانیاں'' بچوں کے ادب میں ایک انمول اضافہ ہے (۳۰) ۔ بچوں کے لیے جتنی تعداد میں سفر نامے لکھے شاید ہی کسی اور نے بچوں کو اتنی اہمیت دی ہو۔ اس کے علاوہ بچوں کی صحت، غذاؤں، ، حفظان صحت اور اخلاق پر بے شمار مضامین اور کتب تحریر کیں۔ ''تعلیم و تعلم کی اہمیت کو حکیم سعید نے اس حد تک سمجھا اور اشاعت تعلیم کے لیے اس قدر کام کیا کہ بچوں کے سر سید کہے جانے لگے (۳۱) بقول الطاف حسین قریشی ''وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے تھے کہ پاکستان کی بہترین خدمت یہ ہے کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا معیاری انتظام کیا جائے اور لوگوں بالخصوص حکمرانوں کے اخلاق سنوارنے پر بھرپور توجہ دی جائے'' (۳۲)۔

حصول علم، تخلیق علم، فروغ علم اور تحفظِ علم کے حوالے سے حکیم محمد سعید کی خدمات ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ پاکستان کی ۵۸ سالہ تاریخ میں ہمیں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملی کہ کسی فرد واحد نے علم کے حوالے سے اس قدر عظیم خدمات سر انجام دی ہوں۔ تصانیت کے حوالے سے آپ کی تخلیقات تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔

تعلیم کے بارے میں آپ کی رائے یہ ہے کہ '' تعلیم کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا اور تربیت کے بغیر انسانیت میں نکھار پیدا نہیں ہوتا۔

تعلیم و تربیت کے بغیر آدمی ایسا
ہے کہ جیسے بے روح، ایک جسد بے حیات۔ تعلیم کے بغیر ایک ملت زندگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی اور تربیت کے بغیر ایک ملک عظمت حاصل نہیں کر سکتا" (۳۳)۔

ہم فخر ملت حکیم محمد سعید کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انھوں نے باری تعالیٰ کے احکامات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے آپ کو پہلے فنا فی العلم کے درجہ پر پہنچایا اور پھر فروغ علم کو اپنا سچا اور کھرا نصب العین قرار دیا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی اسی کی خاطر قربان کر دی" (۳۴)۔مدینتہ الحکمہ میں قائم بیت الحکمہ اور دیگر تعلیمی اداروں میں قائم کتب خانے اور ان میں جمع اور محفوظ لاکھوں کتابیں اور ان سے استفادے کا مربوط نظام علم کو جمع، محفوظ، ترتیب و تنظیم و ترسیل علم کی واضح مثال ہے۔ بقول ڈاکٹر انیس خورشید "حکیم صاحب خود بھی کتاب کے رسیا ہیں اور عوام تک ان کو پہنچانے کے لیے کتب خانوں کے قیام ان کو قابل استعمال بنانے اور فروغ دینے کے لیے ایک ملک گیر مربوط نظام کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کی شادی پر آپ نے کتابوں کی ایک قابل استعمال لائبریری بھی جہیز میں دی تھی۔ کتب خانوں کی تحریک کے حوالے سے ملک بھر میں آپ نے جو کام کیا ہے وہ

بھی ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے' (۳۵)۔فروغ علم کے حوالے سے آپ کا سب سے بڑا خواب شہر علم و ثقافت بسانا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں مکہ مکرمہ میں پہلی عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی حکیم محمد سعید شہید اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جارہے تھے کہ راستے میں شہر علم بسانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ آپ کا کہنا ہے کہ وجدانی کیفیت میں جو نام ذہن میں آیا وہ مدینتہ الحکمت تھا۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''قیام مکہ کے دوران میں نے طواف کعبہ کے بعد، مقام ابراہیم پر بیٹھ کر قرآن حکیم سے راہنمائی طلب کی تو وجدانی کیفیت کی تصدیق ہو گئی۔'' ۱۸ اگست ۱۹۸۳ء کو حب ڈیم سے ۲۳ کلو میٹر پہلے اور ناظم آباد سے ۲۶ کلومیٹر دور ۱۲۶۰ ایکڑ زمین اس مقصد کے لیے خریدی گئی۔ اس شہر علم کا سنگ بنیاد ۱۵ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ملک کے ۱۵۰ دانشوروں، عالموں، صحافیوں، ممتاز سیاست دانوں، ماہر تعلیم کے علاوہ مختلف ممالک کے سفارتکاروں اور مذاکرہ ملی تعلیمات نبویؐ کے مندوبین کی موجودگی میں رکھا گیا۔ ہر ایک مندوب نے اپنے اپنے نام کی ایک ایک اینٹ نصب کی۔

مدینتہ الحکمہ میں سب سے پہلے پائے تکمیل کو پہنچنے والی عمارت ''بیت الحکمہ'' (لائبریری) کی تھی۔ جس کا افتتاح ۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا۔ اس شہر علم میں قائم ہونے والے دیگر اداروں میں ہمدرد یونی ورسٹی سنگ بنیاد ۱۷ جون ۱۹۸۵ء بہ دست صدر پاکستان جنرل)

محمد ضیاء الحق) ہمدرد اسکول (سنگ بنیاد ۱۶ جون ۱۹۸۷ء بہ دست صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق)، ہمدرد کالج، ہمدرد ویلج اسکول ہاؤس، ہمدرد کالج آف اسکالرز ایسٹرن میڈیسنز طب مشرق) ہمدرد کالج آف میڈیسنز (ایم بی بی ایس)، ہمدرد کالج آف مینجمنٹ) سائنسز، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹیڈیز اینڈ ریسرچ، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف فارماکولوجی اینڈ ہربل ریسرچ، بائیو ٹیکنالوجی سینٹر برائے ہربل میڈیسن، ہمدرد کالج آف کامرس، ہمدرد انڈسٹریل سٹی، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، الفرقان ہوسٹل، بین الاقوامی کانفرنس سینٹر، ہمدرد سینٹر آفا ایکسی لینس فار ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ، سائنس مرکز، اسپورٹس کمپلیکس، اسٹاف کالونی، باغ اور عظیم الشان مسجد قائم ہے۔

حکیم محمد سعید کی زندگی کا ہر لمحہ علم و حکمت کے میدانوں میں پیش رفت سے عبارت تھا ۔ شام ہمدرد کے ذریعہ آپ نے پاکستان میں ایک فکری انقلاب برپا کیا۔ ہمدرد رسائل و جرائد کے ذریعہ سے انھوں نے نہ صرف پاکستان میں حسن فکر و عمل کی دعوت مسلسل دی بلکہ عالمی سطح پر دنیا نے آپ کی خدمات جلیلہ کا برملا اعتراف کیا۔ جریدہ ہمدرد نونہال نے تعمیر اذہان کا بے مثل کارنامہ انجام دیا، ہمدرد صحت نے پیام صحت دیا، ہمدرد میڈیکس (انگریزی) نے دنیا میں طب عربی کا آوازہ بلند کیا اور ہمدرد اسلامیکس انگریزی) نے عالمی سطح پر)

اسلام کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فروغ علم اور اسے عام کرنے کے باب میں آپ کا ایک عظیم الشان کارنامہ سندھ کے گورنر (۱۹ جولائی ۱۹۹۳ء۔ ۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء) کی حیثیت سے انتہائی مختصر عرصہ میں شدید جدوجہد کرکے چار یونیورسٹیاں قائم کر ادیں۔ آپ نے گورنر ہاؤس میں ۸ اکتوبر ۱۹۹۳ء ' ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۱۴ ہجری ' جمعتہ المبارک کو عید مسلمین بنا دیا پاکستان کی چار یونیورسٹیوں (سرسید یونیورسٹی برائے سائنس و ٹیکنالوجی، بقائی یونیورسٹی اوف ہیلتھ سائنسز، جامعہ قائد اعظم (سندھ مدرستہ الاسلام) اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین) کے قیام کے لیے دستاویزات (چارٹرز) عطا فرمائے۔ اس موقع پر گورنر ہاؤس میں منعقدہ تقریب میں سندھ کی تمام جامعات کے وائس چانسلر صاحبان سے خطاب کرتے ہوئے شہید حکیم محمد سعید نے کہا کہ ''میں اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس گورنر ہاؤس میں کہ جہاں قائد اعظم نے زمام اقتدار سنبھال کر تعمیر پاکستان کے ذیل میں کل پاکستان اول تعلیمی کانفرنس کی داغ بیل ڈالی تھی آج میں سندھ میں چار جامعات کے قیام کی اجازت دینے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ درس گاہیں تعلیم و تربیت اور تدریس کی خدمت جلیلہ میں نہایت لگن ' ذمہ داری اور اخلاص کے ساتھ مصروف ہیں۔ ان کا مرتبہ اور معیار بلند کرنا ایک سعادت ہے۔ ایک فرض ادا کرنے کے مترادف ہے جامعات کا درجہ ملنے سے ان کا مراکز علم و حکمت کو اپنے نیک عزائم اور بلند تر

مقاصد کی تکمیل میں سہولت ہوگی (۳۶)۔

حکیم محمد سعید سیاسی آدمی نہ تھے، لیکن سیاست کے لیل و نہار سے اچھی طرح واقف تھے۔ بلکہ سیاست کے نباض تھے۔ بے شمار سیاست دانوں، سربراہان مملکت، وزیروں، سفیروں، بادشاہوں، شہزادوں غرض بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں سے آپ کے بہت اچھے اور گہرے تعلقات رہے، لیکن آپ نے کسی بھی دور میں کسی ایک سے بھی ذاتی فائدہ حاصل نہ کیا۔ پاکستان میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور جرنل محمد ضیاء الحق سے آپ کے بہت اچھے اور قریبی تعلقات تھے۔ جرنل محمد ضیاء الحق کے دور میں آپ مشیر طب (۱۹۷۸ء۔۱۹۸۲ء) بھی رہے۔آپ کا درجہ مرکزی وزیر کے برابر تھا۔ جب تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے اپنی اصل حیثیت کو برقرار رکھا یعنی مطب برقرار رکھا اور اپنی دیگر تمام تر مصروفیات اور خدمات کا سلسلہ ویسے ہی جاری رہا۔ اس دور میں تمام تر اخراجات خود کیے سرکاری مراعات حاصل نہ کیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں مولانا کوثر نیازی کی وجہ سے جو آپ کے دوست تھے کراچی سے قومی اسمبلی کا الیکشن اپنی مرضی کے بغیر لڑا جس میں کامیابی نہ ہونا تھی نہ ہوئی، کیوں کہ آپ اپنے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر اعوان ''ان کے اجلے نام کو پاکستان

کے مقتدر حکمرانوں نے اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا، مگر اس

میں ناکام رہے'' (۳۷) ۔

شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی ساری زندگی راہ عمل و تعمیر کی ایک روشن مثال ہے۔''
انھوں نے تادم مرگ علم و آگہی، خدمت خلق اور تدبر و تدبیر کی شمع جلائے رکھی'' (
۔ وہ مٹھاس ہی مٹھاس۔ ایسی مٹھاس جس سے روح میں تازگی آ جاتی ہے۔ وہ ایک (۳۸
ماہر طبیب، ایک صاحب اسلوب ادیب، ایک سرگرم سیاح اور ایک مستعد چانسلر تھے (
۔ نذیر ناجی نے درست کہا''وہ مکمل طور پر تہذیب و تمدن میں ڈھلی ہوئی شخصیت (۳۹
تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ طرز گفتگو، لباس، طور اطوار اور شائستگی، کسی چیز میں بناوٹ
نہیں تھی ان کا سب کچھ سچ تھا وہ ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت کے مالک تھے (
۔ مفتی تقی عثمانی نے حکیم محمد سعید کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں تحریر فر(۴۰
مایا'' حکیم صاحب ایک وضع دار شخصیت تھے، انہوں نے پاکستان کے ابتدائی دور میں
فقر و افلاس کا بھی خاصا وقت گذارا، ہمدرد دواخانہ کے قیام کے لیے انہوں نے بڑی
قربانیاں دیں اُس دور کی مشکلات کو انہوں نے جس خندہ پیشانی سے جھیلا، اس کی
داستان کبھی کبھی وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب
مولانا مفتی محمد شفیع) سے انہیں ابتدا ہی سے عقیدت اور محبت تھی چنانچہ حضرت والد)
صاحب کے پاس ان کا کثرت سے آنا جانا رہتا تھا اور اسی تعلق کے نتیجے میں دارالعلوم
کے قیام کے وقت وہ اس کے بانی ارکان میں شامل ہوئے۔ مشاغل کے

تنوع اور ہجوم کے باوجود وہ ہمیشہ پرسکون رہتے تھے، انہیں کبھی بھی گھبراہٹ سے مغلوب نہیں دیکھا، ان کا نظام الاوقات اتنا مستحکم اور معمولات اتنے مضبوط تھے کہ وہ ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتے اور مطمئن رہتے تھے'' (۴۱)۔ حکیم محمد سعید ایک بااصول انسان تھے اپنے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہو کر ہی آپ نے زندگی میں کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں آپ نے کرن خلیل کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ''میں اپنے خاص اصول رکھتا ہوں اور ان اصولوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے زندگی میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ میں کسی سے نفرت کرنا نہیں جانتا۔ میں محبت کرتا ہوں، احترام کرتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ جو برا کہتے ہیں ان کو اچھا کہتا ہوں۔ جو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کی راحتوں کا سامان کرتا ہوں۔ محنت کرتا ہوں۔ وقت ضائع نہیں کرتا، وقت کا احترام کرتا ہوں (۴۲)۔

وقت کے اس قدر پابند کہ لوگ آپ کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کر لیا کرتے درحقیقت آپ اپنے اس قول ''وقت اللہ کی امانت ہے اس کا صحیح استعمال عبادت ہے'' کی عملی تفسیر تھے۔ شہید پاکستان کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ نے راقم الحروف کو زیر نظر تحقیق کے لیے بطور خاص انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ '' انہیں حکیم صاحب کی وقت کی قدر کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا'' (۴۳)۔ روزنامہ پاکستان لاہور کے ڈاکٹر اجمل

نیازی کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے اپنی آرزو کے بارے میں کہا ”میری آرزو، آرزو پاکستان۔ میری تمنا، پاکستان میں صد فی صد تعلیم۔ میری خواہش صحت سے سرشار ملت پاکستان۔ میرا مقصود پاکستان علم و حکمت کا گھوارہ، میرا مطمع نظر پاکستان میں امن و چین۔ شرافت و صداقت، امانت و دیانت۔ میری جستجو پاکستان میں قناعت“ ۔اپنے فلسفہ زندگی کے بارے میں پاکستان ٹیلی وژن پر نعیم بخاری کو انٹرویو دیتے ہوئے واضح کیا کہ ” میرا فلسفہ زندگی خدمت اور کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے“ (۴۴)۔اپنی شہادت سے چند روز قبل (۹ ستمبر ۱۹۹۸ء) کو اپنے بڑے بھائی کے نام اپنے آخری خط میں مطب سے ریٹائر ہونے کے بارے میں لکھ چکے تھے۔آپ نے تحریر فرمایا”میں ۹ جنوری ۲۰۰۰ء کو مطب سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔ ۹ جنوری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں مطب کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ خدمت خلق کا حق اس طرح بھی ادا کر دیا ہے میں نے“ (۴۵)۔

آپ کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۶ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا، ۱۹۸۱ء میں استنبول یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی جانب سے سرٹیفکیٹ آف میرٹ دیا گیا، ۱۹۸۲ء میں فاؤنڈیشن برائے ترویج سائنس، کویت نے اسلامک میڈیسن پرائز سے نوازا۔ ۱۹۸۴ء میں آپ کی نمایاں سائنس خدمات کے اعتراف میں آپ کو اسٹاک ہوم سویڈن میں

منعقد ہونے والے ایکو پنکچر اور متبادل ادویہ کے سیمپوزیم کے خصوصی اجلاس میں ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگری'' عطا کی گئی۔ ایک خصوصی کانوکیشن میں جو ۳'' جون ۱۹۸۴ء کو منعقد ہوا ڈاکٹر نوبیل نے یہ اعزازی ڈگری آپ کو پیش کی (۴۶)۔ کمشنر بہاول پور نے بہاولپور کے عوام کی جانب سے صادق دوست ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۹۳ء میں ہیومن رائٹس سوسائٹی پاکستان نے آپ کی ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں کی جانب سے (WHO) انسانی حقوق ایوارڈ'' سے نوازا، ۱۹۹۵ء میں عالمی ادارہ'' ورلڈ نوٹوبیکو ڈے میڈل ایوارڈ'' ، ۱۹۹۶ء ایوارڈ کانفرنس (پاکستان لیگ امریکہ)'' برائے صحت تعلیم اور سماجی خدمات اور ۱۹۹۶ء میں روٹری کلب، اسلام آباد کی جانب سے آوٹ اسٹینڈنگ پاکستانی ایوارڈ، سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں بو علی سینا انٹر نیشنل پرائز، ۱۹۹۹ء میں آپ کو ''جناح ایوارڈ'' اور انٹر نیشنل ایسو سی ایشن اوف لائنز کلبز کی جانب سے ''لائنز نیشنل پرائڈ ایوارڈ ۱۹۹۹ء'' سے نوازا گیا۔ حکومت پاکستان نے شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی میڈیسن کے شعبے میں قابل قدر خدمات کے اعتراف میں ۱۴ اگست ۲۰۰۰ء کو انہیں پاکستان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ''نشان امتیاز'' (بعد از وفات) دینے کا اعلان کیا، ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء کو ایوان صدر میں ایک شاندار اور پر وقار تقریب میں صدر پاکستان جنابِ محمد رفیق تارڑ نے یہ اعزاز حکیم محمد سعید کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ کو عطا فرمایا (۴۷) شہید حکیم محمد سعید کو مختلف القابات سے بھی ''نوازا گیا جن میں

بچوں کے سرسید"، "سرسید ثانی"، "عہد جدید کے ابن سینا"، "مجدد طب" وغیرہ شامل ہیں۔ شہادت کے بعد آپ کو "شہید پاکستان"، "شہید وطن"، "فخر ملت" کے القابات سے نوازا گیا۔ حکیم محمد سعید ایک مکمل انسان تھے۔ انسانیت کی خدمت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنایا، اسی کے لیے جیے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ ہر سانس کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کیا اور اسی مقصد عظیم کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کر دی۔ جیے جس کے لیے جان اس پہ دے دی یہی بس داستان زندگی ہے (۴۸)۔ بقول حکیم نعیم الدین زبیری "حکیم صاحب جو آج بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اٹھ گئے تو سہارا بھی ایسا لگتا ہے اٹھ گیا" (۴۹)۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء بروز ہفتہ (۲۵ جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ)، روزہ کی حالت میں نماز فجر کی ادائیگی کے بعد کراچی میں مریضوں کی خدمت کے لیے اپنے مطب پہنچتے ہی شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ وطن عزیز پر جان نثار کرنے والا، پاکستان کو امن کا گہوارہ بنا دیکھنے والا، وہ جس نے اپنا تن من دھن سب کچھ قوم اور ملک پر نچھاور کر دیا حتیٰ کہ اپنی جان بھی اس پر نثار کر دی۔ اس عظیم انسان کی قربانیوں کی کوئی حد، کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ وہ مملکت پاکستان کا ہی نہیں امت مسلمہ کا سرمایہ تھا۔ وہ زندہ ہے او زندہ رہے گا۔ حکیم محمد سعید کی شخصیت، خدمات اور کارناموں پر بہت لکھا گیا، لکھا جا رہا

ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کے ہر ہر پہلو پر
تحقیق کی جا سکتی ہے اسی
طرح خدمات اور کارناموں پر الگ الگ تحقیق ہو سکتی ہے۔

حواشی و حوالے

ا۔ صمدانی، رئیس احمد۔ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی
میں حکیم محمد سعید شہید کا کردار۔ (پی ایچ ڈی
۶۳۹ص۔ xxi، مقالہ) ہمدرد یونیورسٹی کراچی، ۲۰۰۶ء

۲۔ لودھی، محمد اسلم۔ قومی ہیروز (لاہور: وفا پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۴۷

۳۔ ستار طاہر۔ حیات سعید: شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی واحد و مستند سوانح حیات۔
اشاعت
دوم (لاہور: برٹ بکس، ۲۰۰۰ء)، ص۔ ۱۶۳

4- Zafar, S. M.'Hakim Mohammed Said Remembered'
Newsletter:
Hamdard University, 4th Death Anniversary, 2002, issue
no
5: November 2002, p.5

۵۔ شاہین، رحیم بخش۔ ''مٹھی میں بند لمحے''۔ در، کتاب سعید مولف ظہور احمد
اعوان۔ (پشاور:

ادارہ علم وفن پاکستان،۱۹۹۸ء) ص۔ ۴۵
۶۔ حکیم محمد سعید۔ بچوں کے حکیم محمد سعید: شہید پاکستان کی زندگی کی کہانی، خود ان کی زبانی مرتبہ
سعدیہ راشد، مسعود احمد برکاتی اور رفیع الزماں زبیری۔ (کراچی: نہال ادب، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ۲۰۰۲ء) ، ص۔ ۱۵
۷۔ ستار طاہر، حوالہ ۲، ص ۔ ۳۷
۸۔ شہید حکیم محمد سعید ''نجی زندگی'' انٹرویو از کرن خلیل (مارچ ۱۹۹۸ء) در، روبرو: شہید حکیم محمد
سعید کے انٹرویوز۔ مرتبہ' رفیع الزماں
زبیری (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ۲۰۰۰ء) ، ص ۲۴۰
۹۔ نسرین نثار۔ شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی تعلیمی خدمات ۔ (کراچی: یونیورسل پبلشر، ۱۹۹۹ء
ص ص۔ ۵ ۔ ۱۳،)

10. Samdani, R. A. 'Hakim Mohammed Said : At a Glance'. Pakistan Library Bulletin, Hakim Mohammed Said Number 31(1-2): March-June, 2000:19-20

۱۱۔ ستار طاہر، حوالہ ۲، ص ۷۹

۱۲۔ بچوں کے حکیم محمد سعید۔ حوالہ ۶، ص ۷۰
درکتاب سعید، حوالہ ۴، ص۔ (Love) ۱۳۔ قدوائی' ارشد علی۔ فرام انڈیا وولو
۱۳۲
۱۴۔ سعدیہ راشد۔ ابا جان۔ در اقوال سعید مرتبہ رفیع لزماں زبیری.۔ (کراچی، فضلی
، سنز
۱۹۹۹ء) ، ص۔ ۱۱۰
۱۵۔ زبیری' رفیع الزماں ۔ حوالہ ۸، ص ص۔ ۶ ۔ ۷
۱۶۔ برکاتی' مسعود احمد ۔ وہ بھی کیا دن تھے: حکیم محمد سعید کے بچپن کی یادیں مرتبہ
مسعود
احمد برکاتی. ۔ (کراچی: نونہال ادب، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ص۔ ۶۴
۱۷۔ زبیری' رفیع الزماں (مرتب) اقولِ سعید۔ (کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۹ء) ، ص
ص۔ ۹ ۔ ۱۰
۱۸۔ شیخ 'اختر حسین۔ راہ حیات پر پون صدی کا سفر ہر لمحہ تابناک، ہر لمحہ یادگار۔ قومی
ڈائجسٹ
لاہور۔ ماہنامہ ''شہید پاکستان نمبر''۔ ۲۰ نمبر ۸ (جنوری ۱۹۹۹ء) : ۴۴۔۴۵
۔ لودھی 'محمد اسلم ۔ حوالہ ا، ص۔ ۱۸۸ ۱۹
۲۰۔ ایضاً۔ ص ۱۸۹
۲۱۔ حکیم محمد سعید۔ حکیم عبدالحمید نونہالان وطن کے لیے ایک عظیم انسان کی

کہانی ۔۔ (کراچی
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ۱۹۹۵ء) ، ص ص ۔۳۲۔ ۳۳
۲۲۔ طارق، صادق حسین ۔ پاکستانی ادب کے معمار: حکیم محمد سعید (فن اور شخصیت)
۔تدوین ناصر
زیدی۔ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۱۹۹۹ء) ، ۱٦۷۔ص
۲۳۔ شیخ، اختر حسین۔ حوالہ ۲۰، ص ۴۹
۲۴۔ حقانی ،ارشاد احمد۔ ’’ محسن قوم تھے، معمار قوم تھے، معلم قوم تھے‘‘، قومی ڈائجسٹ
قومی،
ڈائجسٹ۔ لاہور۔ ماہنامہ ’’شہید پاکستان نمبر‘‘مدیر مسؤل مجیب الرحمٰن شامی۔۲۰ نمبر
جنوری ۱۹۹۹ء) : ۱۲۲۔ ۱۲۳) ۸
۲۵۔ ظفر، ایس ایم ۔ بنام کرپشن عوام کی عدالت میں (کراچی : بیت الحکمہ، ۱۹۹۷ء)
ص ۔٦،

26. D`Silva, Lily Anne and Masood Ahmed Barkati
ed.Hakim
Mohammed Said: Profile of a Humanitarian. (Karachi:
Adarts,
n. d.), p.10
27. Sabzwari, G. A. 'Hakim Said: Great Man in History '.
Pakistan
Library Bulletin. Hakim Mohammed Said Number , 31 (1-2)
1.March - June 2000

۲۸۔ قاسمی، عطاء الحق۔ ''ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر سب سے زیادہ پیار آتا
ہے'' قومی
ڈائجسٹ۔ لاہور۔ ماہنامہ ''شہید پاکستان نمبر''۔۲۰ نمبر ۸ (جنوری ۱۹۹۹ء) :۱۲۶
۲۹۔ سواتی، محمد جاوید۔ ''نصاب تعلیم کے بارے میں حکیم محمد سعید کے افکار'' (ایم
. فل مقالہ
ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، ہمدرد یونیورسٹی کراچی ،۲۰۰۱ء۔
۲۰۰۲ء)
ص ۔۱۸۔ ۱۹
۳۰۔ حکیم محمد سعید۔ سچی کہانی: میری ڈائری کی زبانی۔ جنوری دسمبر ۱۹۹۲ء ۔
کراچی: ہمدرد)
. (فاؤنڈیشن پریس ۱۹۹۲ء
۳۱۔ ندوی، حکیم مقبول احمد۔ شہید ملت، محسن یونانی حکیم محمد سعید۔ الشفا نئید ہلی، شہید
حکیم حافظ محمد
سعید نمبر ۶ (۴) اپریل ۱۹۹۹ء۔
۳۲۔ قریشی، الطاف حسین ۔ ''زمین پر سونے اور کفایت شعاری سے رہنے میں انھیں
لذت ملتی
تھی''۔ قومی ڈائجسٹ ، قومی ، لاہور۔ ماہنامہ ''شہید پاکستان نمبر''۔ ۲۰ نمبر

جنوری) ۸
۱۹۹۹ء)
۳۳۔ قومی ڈائجسٹ۔ لاہور۔ ماہنامہ ''شہید پاکستان نمبر''۔۲۰ نمبر ۸ (جنوری ۱۹۹۹
ء) : ۱۱۰
۳۴۔ کوثر، انعام الحق۔ علم کے سچے شیدائی۔ در، زبیری، رفیع الزماں۔ شہید حکیم محمد
سعید: یادیں اور
باتیں۔ (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ۱۹۹۹ء) ، ص۔۱۳۹
۳۵۔ انیس خورشید۔ صاف شفاف شخصیت۔ در کتاب سعید ترتیب ڈاکٹر ظہور احمد اعوان
۔ (پشاور: ادارہ علم وفن پاکستان،۱۹۹۸ء) ص ص۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱.
۳۶۔ خبر نامہ ہمدرد۔ ۳۳ (۱۱) : ۲۵، مئی ۱۹۹۳ء۔
۳۷۔ اعوان، ظہور احمد (مولف)۔کتاب سعید۔ (پشاور: ادارہ علم وفن پاکستان،۱۹۹۸
ء) ص ۲۹۵
۳۸۔ بشریٰ رحمان۔ ''اقوال سعید کی سعادت'' در، جواہر سعید: حکیم محمد سعید شہید
کے فکرانگیز اور
حیات بخش اقوال۔ مرتبہ قمر احسان۔ (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ۱۹۹۹ء)
ص۔ ۸،
۳۹۔ محسن احسان۔ ' چراغ فکر و آگہی'۔ ہمدردِ صحت۔ کراچی ،ماہنامہ،' اشاعت خاص

: (سعید شہید'' ، ٦٧ نمبر١٠(اکتوبر١٩٩٩ء

٤٠۔ نذیر ناجی۔ 'اس کھاتے میں ضرورت مند داور سفید پوش لوگوں کے نام اور پتے درج تھے'۔

قومی ڈائجسٹ۔ لاہور۔ ماہنامہ ''شہید پاکستان نمبر''۔٢٠ نمبر ٨ (جنوری ١٩٩٩ء) :، ١٣٥

٤١۔ عثمانی' محمد تقی۔ .ہر دلعزیز شخصیت : حکیم محمد سعیدؒ۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ١٧ اکتوبر ٢٠٠٣ء۔

٤٢۔برکاتی' مسعود احمد۔ مرد درویش: حکیم عبدالحمید کی فکر وعمل کے چند گوشے کراچی: ہمدرد)

فاؤنڈیشن پاکستان،١٩٩٩ء)ص ١٠٨

٤٣۔ سعدیہ راشد۔ صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ،انٹرویو از محق،١٩ دسمبر ٢٠٠٤ء ، کراچی

٤٤۔ زبیری' رفیع الزمان۔ رو.برو۔ حوالہ ٨

٤٥۔ ہمدرد دہلی۔پندرہ روزہ۔''شہید حکیم محمد سعید نمبر''مدیر،حماد احمد ، ١٠٥ (تفصیل (درج نہیں

٤٦۔ خبر نامہ ہمدرد۔ ٢٣ (٧۔٨) : ٤، جولائی ۔ اگست ١٩٨٤ء۔

٤٧۔ خبر نامہ ہمدرد۔ ٤١ (٥) : ٥۔٦، مئی ٢٠٠١ء۔

۴۸۔ مشکور احمد۔ 'ہمدرد ملت، حکیم محمد سعید' ۔ الشفائی ۔ دہلی، شہید حکیم حافظ محمد
سعید نمبر ٦ (۴) :
اپریل ۱۹۹۹ء۔
۴۹۔ زبیری' حکیم نعیم الدین، حکیم صاحب' در، شہید حکیم محمد سعید: یادیں اور باتیں۔
مولف رفیع
الزماں زبیری (کراچی: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ۱۹۹۹ء) ، ص ۱۵۸
(شمائع شدہ ماہنامہ' نگار پاکستان' کراچیجلد۹۱، شمارہ ۱۱ (نومبر ۲۰۲۱ء)

فاطمہ ثریا بجیا پر شائع ہونے والی کتاب بجیا

برصغیر کی عظیم ڈرامہ نویس ...فاطمہ ثریا بجیا کی کہانی کی تعارفی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

فاطمہ ثریا بجیا کے نام سے کون واقف نہیں۔ ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور سماجی خدمات کے حوالے سے بجیا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں لوگ تعزیم و تکریم اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بجیا ایک ہمدرد دل ، نیکی کرنے کی عملی خواہش رکھنے والی ایسی خاتون ہیں جن میں ہمت ، عظمت اور استقامت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بجیا کے تخلیق کردہ معرکتہ اآرا ڈراموں کے سلسلے شمع، آگہی، بابر، عروسہ، آساوری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ سب پر عیاں ہے۔ بجیا ان تخلیق کاروں میں سے بھی ہیں جنھوں نے جاپانی کہانیوں کو اسٹیج پر روشناس کرایا۔ بجیا صرف ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ وہ ایک انجمن ، ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ شہر کراچی میں ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔ شہر کی کوئی بھی سماجی، ثقافتی یا ادبی تقریب بجیا کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت اور ڈرامہ نویسی کے حوالے سے کتاب کا منظر عام پر آنا یقینا ایک قبل ستائش اقدام ہے۔

بجیا: بر صغیر کی عظیم ڈرامہ نویس ... فاطمہ ثریا بجیا کی کہانی'' کے عنوان سے سیدہ عفت حسن رضوی نے بجیا کے حالات زندگی پر مشتمل کتاب تحریر کی۔ ۲۱ مئی ۲۰۱۲ء پیر کی شام آرٹس کونسل کے خوب صورت آڈیٹوریم میں تعارفی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔

مَیں نے یہ خبر روزنامہ جنگ میں دو روز قبل ہی پڑھی اور ارادہ کرلیا کہ کتاب کی تعارفی تقریب میں شرکت کی جائے۔ چناں چہ ہم اپنی بیگم شہناز کے ہمراہ وقت مقررہ پر تقریب گاہ پہنچ گئے۔ مہمان کتاب سے زیادہ بجیا سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ تقریب کو ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر تقریبات اپنے وقت مقررہ سے کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ ضرور شروع ہوتی ہیں۔ لیکن اس تقریب کی ایک خوبی یہ تھی کہ یہ اپنے وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی شروع کردی گئی۔ اسٹیج پر بجیا کے علاوہ بجیا کے ایک بھائی انور مقصود، ایک بہن معروف شاعرہ زہرہ نگاہ، کتاب کی مصنفہ سیدہ عفت حسن رضوی، صدر جلسہ آغا ناصر موجود تھے۔ ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقریب کی دوسری خوبی یہ تھی کہ تقریب ختم ہوئی لیکن لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ جب ہم آرٹس کونسل سے باہر نکلے تو ایک فیملی گاڑی سے اتری ہمیں واپس جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تقریب ختم ہوگئی۔ ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بچارے وہیں سے واپس ہوگئے۔

انور مقصود نے اپنے منفرد اور ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ تقریب کے میزبان کے فرائض انجام دیے۔ انور مقصود کی بَذلَہ سَنجی، خوش طبعائی، حاضر جوابی نے تقریب کو اور بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ وہ دوران تقریب جب بھی کسی مہمان کو اظہار خیال کی دعوت دیتے یا کسی مقرر کی تقریر کے اختتام پر ضرور کوئی نہ کوئی چٹکلا چھوڑ کر سامعین کو مَحظُوظ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کے اس طرز عمل کے باعث سامعین کی بھرپور توجہ اور دل چسپی مسلسل قائم رہی اور وہ بھرپور انداز سے مقررین اور بجیا کو وقفے وقفے سے خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

بجیا کی سوانح سیدہ عفت حسین رضوی نے چھ سال کی تحقیق کے بعد قلم بند کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس دوران بجیا کے ساتھ رہیں اور وقت گزارا، انھوں نے بجیا سے بہت ہی ذاتی قسم کے سوالات بھی کیے لیکن بجیا نے کسی سوال پر اپنی بُھویں نہیں چڑھائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فاطمہ ثریا بجیا کی زندگی کی کہانی لکھنا میرے لیے اعزاز ہے۔ میں جیسے جیسے بجیا سے ملتی رہی بجیا کی زندگی کے اوراق میرے سامنے کھلتے گئے اور حیرت انگیز شخصیت، درویش صفت اور وقت کی ولی بجیا کی کہانی مرتب ہو گئی۔

تقریب کے میزبان انور مقصود نے مقررین کو اظہار خیال کی دعوت دیتے ہوئے

مقررین سے گزارش کی کہ وہ اپنی تقاریر کو بجیا کی طرح مختصر رکھیں۔ کیوں کہ وقت کم ہے مقررین زیادہ ہیں، ہمیں یہ حال کسی دوسری تقریب کے لیے خالی کرنا ہوگا۔ ایک موقع پر انور مقصود نے اپنے خاندان کے مابین محبت کی وجہ بتاتے ہوئے وضاحت کی اور بتایا کہ ہم دس بہن بھائیوں میں بہت محبت کی وجہ شاید یہ بھی رہی کہ ہمارے والدین ہمارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے۔ اگر وہ جائیداد وغیرہ چھوڑ جاتے تو شاید ہم ایک دوسرے سے اتنی محبت نہ کرتے انہوں نے بتایا کہ ان کا چھوڑا ہوا سرمایا دس ہزار کتابیں ہیں۔

اپنی بہن زبیدہ طارق کا تعارف انور مقصود نے کچھ اس طرح کرایا ''آپ چھ بیچے تہذیب کے لیجیے، آٹھ تمدن کے، اور نو ماضی کے۔ پھر سب کو ملا کر منہ کے ایک کونے میں رکھ لیجیے آیندہ کبھی بدتمیزی نہیں کریں گے''۔ زبیدہ طارق نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی ماں اور بجیا کو مختلف نہیں پایا۔ بجیا نے جس کام میں ہاتھ ڈال دیا وہ نکھر گیا۔

معروف اداکار قاضی واجد کو اظہار خیال کی دعوت دیتے ہوئے انور مقصود نے کہا کہ قاضی واجد وہ واحد فن کار ہیں جو بجیا کے ڈرامے لکھنے سے بھی پہلے سے تھیٹر کر رہے ہیں۔ قاضی واجد اپنے مخصوص انداز سے ہنستے مسکراتے اسٹیج پر تشریف لائے اور فرمایا میرے پاس جو شہرت ہے اس میں بجیا کا بہت دخل ہے۔ ان

کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے اور یہ جملہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ اس سے مختصر تقریر ہو
نہیں سکتی۔
قدسیہ اکبر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ بجیا ہمارے ساتھ موجود ہیں ، ہمارے درمیان ہیں ، ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی تمام تر شفقتوں ، محبتوں کو سمیٹ لیں۔ بجیا نے ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ انہوں نے جاپان لوک ورثہ کو بھی متعارف کریا، جاپان کے شہنشاہ نے انہیں سب سے بڑا سول اعزاز عطا کیا۔ بجیا ایک پر عظم اور باہمت خاتون ہیں ہم نے انہیں کبھی حوصلہ ہارتے نہیں دیکھا وہ ہمیشہ پر امید دکھائی دیتی ہیں ، ہم نے کبھی ان کے لبوں پر شکایت یا تکلیف کا اظہار کرتے نہیں دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بجیا ہمارے لیے گھنے سایہ دار شخصیت کی مانند ہیں۔ اللہ ان کا سایہ سلامت رکھے۔ مصنفہ نے بجیا کی کہانی لکھ کر یقیناً ایک بڑی خدمت کی ہے۔
اقبال لطیف نے کہا کہ دنیا کی سارے ممتا، دنیا کی ساری بہنوں کی محبت ، دیناکے تمام لوگوں کی محبت کو جمع کر دیا جائے تو بنتا ہے ’بجیا‘۔ وہ بے لوث محبت کرنے والوں میں سے ہیں۔ پی ٹی وی کے ڈراموں کے دوران بجیا کا کردار ایک استاد، ماں، بڑی بہن کی طرح کا ہوا کرتا تھا۔ ہم نے دوران کام ان

سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

بجیا کی معروف شاعرہ بہن زہرہ نگاہ نے بہت ہی فصیح و بلیغ تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم دس بہن بھائی ہیں اور ہمارے درمیان ''تو اور میں'' کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں، اس وجہ سے اگر وہ اپنی بہن کی ستائش میں کچھ کہیں گی گویا وہ اپنے بارے میں ہی کچھ ہوگا، اس وجہ سے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ بجیا ہماری ہی بڑی بہن نہیں یہ تمام پاکستانیوں کی بڑی بہن ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بجیا کا گھر ایک سماجی مساوات کی ایک مثال ہے ان کے ہاں نا امیدی نہیں وہ تو ابدی امید پرست ہیں۔ حالات اس قدر خراب ہیں لیکن بجیا اس کے باوجود معاشرہ کی بہتری کے لیے بہت پر امید رہتی ہیں۔

معروف شاعر پروفیسر سحر انصاری نے خطاب کرتے ہوئے بجیا کے کردار اور خدمات پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا کہ بجیا کی شخصیت میں انسان سے محبت اور اس کی فلاح کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ بجیا ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں ان کے نانا نواب نثار یار جنگ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے بجیا کی ایک عادت کا بطور خاص ذکر کیا کہ وہ ہر ایک کو خواہ وہ ان سے بڑا ہو یا چھوٹا 'بیٹا' کہتی ہیں جب وہ خود چالیس (۴۰) سال کی تھیں تو اسی (۸۰) سال کے شخص کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں۔ بجیا کی پاکستان جاپان فورم، غالب

لائبریری اور آرٹس کونسل کے لیے بجیا کی خدمات پر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ایک موقع پر انور مقصود نے بتایا کہ بجیا سے ملنے کے لیے کسی کو بھی پیشگی وقت لینے کی ضرورت نہیں ۔ بجیا کا گھر چوبیس گھنٹے ہر ایک کے لیے کھلا رہتا ہے۔ان کا کوئی مہمان کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جاتا۔ بجیا کسی کو بھی ''نہیں'' نہیں کہہ سکتیں، وہ ہمہ وقت ہر ایک لیے حاضر رہتی ہیں۔

پاکستان ٹیلی وژن کے سابق ڈائریکٹر و براڈ کاسٹر آغا ناصر نے اپنی طویل تقریر میں بجیا کے حوالے سے مختلف واقعات بیان کیے۔انہوں نے بتایا کہ بجیا پاکستان ٹیلی وژن سے کیسے منسلک ہوئیں۔انہوں نے انکشاف کیا کہ بجیا نے پاکستان ٹیلی وژن سے اپنے سفر کا آغاز ایک ڈرامے میں ساس کا کردار ادا کرکے کیا تھا جس کے پروڈیوسر وہ خود

تھے۔انہوں نے کہا کہ جب ضیاء الحق کے دور میں ٹیلی وژن پر خواتین کے لیے دوپٹہ پالیسی پر سختی سے عمل کرنے کے احکامات جاری ہوئے تو بجیا نے بغداد ار غرناطہ کے حوالے سے منفرد کردار تخلیق کیے۔انہوں نے بتایا کہ بجیا کو جاپان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ اور حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی سے نواز جاچکا ہے لیکن بجیا جیسی شخصیت کے لیے یہ اعزاز انتہائی ناکافی ہیں انہیں اس سے بڑے اعزاز سے نوازا جانا چاہیے۔آغا ناصر نے کتاب کے حوالے سے کہا کہ بجیا پر

بہت پہلے کتاب آجانی چاہیے تھی لیکن دیر آید درست آید، مصنفہ قابل مبارک باد ہیں لیکن یہ ایک کتاب بجیا جیسی عظیم ہستی پر کافی نہیں ان پر مختلف زاویوں سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ اگر حکومتی ادارے یہ کام کریں تو بہتر ہے۔آغا ناصر کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ بجیا کو بڑے اعزاز سے نوازا جائے، انور مقصود نے ازراہ مزاق جملہ کسا کہ 'بجیا ان اعزازات سے بہت بہتر ہیں کیوں کہ یہ اعزازات بابر اعوان، رحمان ملک اور سلمان فاروقی جیسے لوگوں کو دیے گئے ہیں۔ تقریب سے احمد شاہ نے بھی خطاب کیا۔آخر میں مہمانوں کی تواضع کا اہتمام تھا۔ اس سے قبل مختلف احباب نے بجیا کو پھول پیش کیے اور تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

کتاب کی مصنفہ سیدہ عفت حسن رضوی نے اپنی اس کتاب میں فاطمہ ثریا بجیا کی زندگی کے حالات و واقعات کو احسن طریقے سے اور سلیقے کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ بجیا کے خاندان، والد، والدہ، بہن بھائیوں اور دیگر عزیز رشتہ داروں کے بارے میں معلومات کے علاوہ بجیا کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں سیر حاصل مواد جمع کر دیا ہے۔ بجیا کی سماجی سرگرمیوں ، سیاسی اور نیم سیاسی حالات کا تذکرہ بھی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ بے بہا خصوصیات کی حامل خصوصیات پر یہ پہلی لیکن اچھی کوشش ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قدر خوبیوں کی مالک شخصیت پر مذید کام کیا جائے۔ بجیا کے خاندان خصوصاً بھائی اور بہن اس مقام و

مرتبہ پر ہیں کہ وہ بجیا پر تصنیف و تالیف کے کام کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت ۲۰ مئی ۲۰۱۲ء میں کتاب پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ تبصرہ نگار کے مطابق بجیا ادبی میدان میں پانچ دہائیوں سے زائد عرصے سے فعال ہیں۔ پیش نظر کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بجیا کے بارے میں ہے۔ سعدہ رفعت حسن رضوی نے اپنی کتاب میں آپ کی زندگی کے حالات و واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ تبصرہ نگار نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بجیا نے کچھ عرصہ جنگ کراچی میں بھی کام کیا تھا، میں (یعنی تبصرہ نگار) میگزین ایڈیٹر اور وہ (یعنی بجیا) خواتین کے صفحات کرتی تھیں، مجھے کتاب میں اس کا حوالہ نظر نہیں آیا، ہو سکتا ہے مجھ سے مطالعے میں چوک ہو گئی ہو اور کہیں ذکر ہو اور مجھے نظر نہ آیا ہو۔

کتاب کے ابتدائی میں بجیا نے ''محفوظ ہیں سب یادیں، اور یاد ہیں سب باتیں'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔پروفیسر سحر انصاری نے کتاب کے بارے میں رائے دی ہے۔ مصنفہ کا تعارف جناب عارف الحق عارف، ڈایریکٹر شعبہ مذہبی امور، سینئر بورڈ، جیو ٹی وی نے کرایا ہے۔ قاسم جلالی کی تحریر بہ عنوان ''ایک چراغ تین رخ'' کے عنوان سے ہے۔مصنفہ نے ''حرف

آغاز" کے عنوان سے کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔کتاب کا سرورق خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ طباعت بھی عمدہ، کاغذ اچھا استعمال کیا گیا۔ قیمت ۳۹۵ روپے ہیں۔

اردو کے ادیب و نقاد سید محمد اصغر کاظمی کی تصانیف و تالیفات کا جائزہ

کتاب انسانی تہذیب و تمدن کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا طاقت ور آلہ ہے جو دنیا میں تغیر و تبدیلی لانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ معروف مصنف و مولف رابرٹ بی ڈاؤنز نے کتابوں کو دنیا کو تبدیل کرنے والی قوت کہا ہے۔ ڈاؤنز نے ایک کتاب بعنوان ''عظیم کتابیں جنھوں نے دُنیا بدل ڈالی'' بھی مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ ''کتابیں بے کار، بے حیثیت اور بے اثر نہیں بلکہ یہ متحرک اور زندہ قوتیں ثابت ہوئی ہیں جنھوں نے حالات اور واقعات کا دھارا بدل ڈالا ہے۔ کتاب ایک مسلمہ حقیقت ہے اسے ہر دور ہر زمانے میں فضیلت حاصل رہی ہے۔ حکیم محمد سعید شہید کے مطابق ''کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو، درحقیقت کتاب ایک ایسی روشنی ہے کہ جس نے گزرے زمانے کی شمع کو کسی لمحہ مدھم ہونے نہیں دیا''۔ سقراط کا کہنا تھا کہ '' جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ گھر حقیقتاً گھر کہلانے کا مستحق نہیں ہے وہ تو زندہ مردوں کا قبرستان ہے''۔ فلسفی ایمرسن کے مطابق ''اچھی کتاب بے مثال دوست ہے جو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنے کی صلاح دیتا ہے'' کارلائل کے خیال میں ''اچھی کتابوں کا مجموعہ دور جدید کی سچی یونیورسٹی ہے'' ۔ ملٹن کا کہنا تھا کہ

ایک اچھی کتاب عظیم روح کے قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے۔اس کو محفوظ کرنے کا" مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو اس عظیم روح سے روشناس کرانا ہے" ۔بے شک کتاب سے اچھا کوئی دوست نہیں۔کتاب سے دوستی اور عقیدت انسان کی زندگی پر خوش گوار اثرات ڈالتی ہے۔کتاب سے عشق کرنے والوں کی زندگی خوشگوار اور مطمئن ہوتی ہے ۔ معروف شاعر صہبا اختر نے کتاب کو شاعرانہ نقطہ نظر سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتاب اُجالوں کی دم ساز ، ستاروں کی آواز ہے، صحیفہ ہے، اوستا وگیتا ہے، گرونانک کا وجدان ہے، گوتم کا نروان ہے، دبستان علوم ہے، شبستانِ ماہ و نجوم ہے، تہذیب وآداب کا صحیفہ ہے، کمال چرغِ ہدیٰ ہے ، تمنائے قربِ خدا ہے ، اذنِ زمیں وفا ہے، آوازِ کوہِ صفا ہے، افکار کا خزینہ ہے ، اجالوں کی پیغامبر ہے ، ستاروں کی نورِ نظرہے، رخ زیست کا آب و رنگ ہے، دانش کا دل ہے، ہنر کا دماغ ہے، تمدن کی روح رواں ہے اور یہ بھی کہ کتابیں ازل ہیں کتابیں ابد۔

ایک خاتون لائبریرین شاعرہ امتہ لودود روحؔی کا کہنا ہے ؎

ہنر مندی و تحقیق سکھاتی ہے کتاب آدمی کو انسان بناتی ہے کتاب
جو کرتے ہیں محبت کتابوں سے روحؔی
ہر لمحہ نیا فہم سکھاتی ہے کتاب

کبھی مَیں نے کہا تھا ؎

حصول علم ہے ہر اِک فعل سے بہتر

دوست نہیں ہے کوئی کتاب سے بہتر

کتاب لکھنا کس قدر دشوار گزار کام ہے اس کا اندازہ اہل قلم ہی کر سکتے ہیں۔کتاب کی اہمیت ہی قلم کار کو اس قدر محنت اور ذہنی اور جسمانی مشقت پر آمادہ کرتی ہے۔کتاب مصنف کی سوچ، تفکر، تحقیق و جستجو کا حاصل ہوتی ہے۔ نثر نگار یا شاعر اپنا مافی الضمیر الفاظ میں بیان کرکے جس قدر اطمینان اور سکون محسوس کرتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے، بقول شاعر۔

لکھنے والا ہی جان سکتا ہے

حرف لکھنے میں جو قیامت ہے

سید محمد اصغر کاظمی ادب کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی لکھنے کی عمر کم ضرور ہے لیکن اس کم عمری میں انہوں نے جس قدر لکھا جو چھپ کر ہمارے سامنے آیا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصغر کاظمی کی لکھنے کی عمر جب پچاس ساٹھ کی ہوگی تو ان کی تصنیفات و تالیفات کا کیا عالم ہوگا۔ مَیں نے اپنے کالج (گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد) میں شاید اکتوبر ۲۰۰۷ء میں ایک دھان پان سے انسان کو دیکھا، شکل صورت سے معصوم سا لگ رہا تھا، سادہ لباس، چشمہ لگا ہوا، گندمی رنگ، سیاہ بال اپنے کام سے کام رکھا کرتا، کلاس لی خاموشی سے اسٹاف روم میں آیا، کلاس کا وقت ہوا پھر کلاس

لینے چلا گیا، ایک دن اس سے قربت حاصل ہو ہی گئی معلوم ہوا کہ یہ نوجوان اردو کے استاد ہیں، تفصیلی تعارف بھی ہوا، اطمینان ہوا کہ یہ صرف ایک استاد ہی نہیں بلکہ لکھنا پڑھنا بھی کیا کرتے ہیں، شام کے اوقات میں حسرت موہانی میموریل لائبریری، نارتھ ناظم آباد سے وابستہ بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ ایک معروف ادبی جریدے ''نگارِ پاکستان'' سے بھی بطور مدیر منسلک ہیں۔ جس کے سرپرست اور مدیر اعلیٰ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور یہ اس کے مدیر ہیں۔ کیونکہ مَیں بھی لکھنے کے مرض میں مبتلا ہوں اس حوالے سے اصغر کاظمی سے ملاقاتیں رہنے لگیں۔ لیکن میں جلد ہی اپنی ملازمت کی مدت پوری ہونے پر ریٹائر ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ شروع میں جامعہ سرگودھا چلا گیا ایک سال بعد چند ماہ کے لیے سعودی عرب میں قیام رہا۔ اس طرح اصغر صاحب سے ملاقات میں طویل وقفہ آگیا۔ واپسی ہوئی اور کالج کبھی کبھار جانا شروع کیا تو اصغر صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ ان ہی کی توسط سے میری کچھ تحریریں نگار پاکستان میں شائع ہوئیں۔ ایک دن حسرت موہانی میموریل لائبریری جانا ہوا، باتوں باتوں میں اصغر کاظمی نے خیال ظاہر کیا کہ مَیں ان کی کتابوں پر ایک مضمون لکھوں۔ کتاب ہی تو میرا موضوع ہے مَیں نے آمادگی ظاہر کر دی، اس بندہ خدا نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسی وقت اپنی ڈھیر ساری کتابیں میری گاڑی میں رکھ دیں۔ اب مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں ان کی تصانیف و تالیفات کا پوسٹ مارٹم کروں اور ایک تحقیقی مضمون لکھوں۔ کتاب لکھنے والوں

کے لیے معروف شاعر صہبا اختر نے کیا خوب کہا ہے۔

مصنف کتابوں کے ویراں سہی
حقیر و غریب، و پریشان سہی
مگر ان کو حاصل ہے وہ سلطنت
کہ پرچم کشا ہے جہاں تمکنت

صہبا اختر نے پھر یہ بھی کہا جو حقیقت پر مبنی ہے۔

کتابوں کا افسوں نہیں ٹوٹتا
کبھی ان کا سورج نہیں ڈوبتا

ادب میں اصغر کاظمی کا میدانِ عمل تنقید و تحقیق ہے، میری طرح شخصیات بھی اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اسی حوالہ سے اصغر کاظمی نے بے شمار ادبی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا۔ انہوں نے مضامین بھی بے شمار لکھے لیکن جو کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہکاظمی صاحبنے کتابوں کے حوالے سے تدوین کا کام زیادہ کیا ہے۔ میرے خیال میں لکھنے سے زیادہ لوگوں سے لکھوانا یا مطلوبہ موضوعات پر شائع شدہ تخلیقات کی تلاش، جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ فاضل مولف اپنے اس مقصد میں کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری ’’ محمد اصغر کاظمی ایک باخبر نوجوان ادیب ہیں۔ متعدد کتابوں کے مرتب و مصنف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور

تحقیق و تنقید کے حوالے سے وہ تا دیر ادب کی خدمت کرتے رہیں''۔ میری دعائیں بھی اس نوجوان تخلیق کار کے لیے ۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ فاضل مولف کے موضوعات میں پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مولانا حسرت موہانی، بیگم حسرت موہانی اور اشتیاق اظہر شامل ہیں ۔ان کے علاوہ تنقید، خطوط اور اداریوں کے حوالے سے بھی تالیفات مرتب کی ہیں۔ذیل میں اصغر کاظمی کی ان تمام تصانیف وتالیفات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ کسی بھی لکھاری کی کل کائنات اس کی وہ تحریر ہوا کرتی ہے جو طبع شدہ صورت میں عوام الناس کے سامنے آجائے۔ چناں چہ فاضل مصنف جو گزشتہ کئی برسوں سے تصانیف وتالیفات کے میدان میں مصروف عمل ہیں کی کل مطبوعات کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اصغر کاظمی کی شخصیت میں چھپے تخلیقی راز افشاں ہو سکیں۔سید محمد اصغر کاظمی کے لکھنے اور چھپنے کی عمر تو زیادہ ہو گی لیکن تصنیف وتالیف کی اشاعت ایک مختصر سی کتاب سے ہوئی جو ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب تنقید کی ایک مختصر سی کتاب تھی جو داستان سب رس اور رانی کیتکی سے متعلق ہے۔

سب رس اور رانی کیتکی کی کہانی کا تنقیدی جائزہ'، سید محمد اصغر کاظمی امروہوی اور ایم اے راقم کھوکھر۔ کراچی: کھوکھر پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ۹۶ص۔

اردو میں داستان گوئی کو منفرد مقام حاصل ہے، اس فن کے خالق اسد اللہ تھے جو

ملا وجہی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ ملا وجہی کی تحریر کردہ شہرہ آفاق داستان ''سب رس'' ہے جو ۱۶۳۵ء میں تخلیق ہوئی اور مولوی عبد الحق بابائے اردو نے اس داستان کو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع کیا۔ یہ داستان دکن کے قطب شاہی خاندان کے عبد اللہ قطب شاہ کے کہنے پر لکھی گئی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ اردو کی یہ داستان نیشا پور کی فارسی مثنوی ''دستور عشاق'' اور اس کے نثری خلاصہ 'شبستان خیال' اور ''حسن و دل سے 'ماخوذ ہے۔ تصنیف داستان ''سب رس'' اور سید انشاء اللہ خان انشاء کی تخلیق رانی کیتکی'' کی تلخیص ان کے سوانحی خاکے اور کہانی پر تنقیدی تبصرہ پر مشتمل ہے۔ یہ'' مختصر کتاب اردو کے طلبہ کی نصابی ضروریات کی تکمیل کے لیے تحریر کی گئی تھی، خوشی کی بات یہ ہے کہ مصنفین اپنے اس مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ پروفیسر علی حیدر ملک جنہوں نے کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا کے خیال میں یہ کتاب طلبہ اور اساتذہ کے لیے یقینا کارآمد اور مفید کام ہے۔ اس کی نوعیت گویا درسی ہے۔ درسی نوعیت کی کتابوں کا شمار اعلیٰ تنقیدی اور تحقیقی کتابوں میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کی کتابیں نہ صرف یہ کہ نصابی ضروریات کو پورا کرتی ہیں بلکہ تحقیق و تنقید کے لیے بنیاد بھی فراہم کرتی ہیں'۔

خطوط احباب ''جہان حمد'' اور ارمغانِ حمد میں شائع شدہ خطوط پر مبنی انتخاب از سید محمد اصغر کاظمی اور حافظ محمد نعمان طاہر۔۔ کراچی: جہانِ

حمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ۳۳۶ص۔

تاریخ انسانی شاید ہے کہ خط، مراسلت یا مکتوب رسانی حضرت انسان کے مابین باہمی تعلق کا ذریعہ رہا ہے۔فاصلوں پر رہتے ہوئے خط ہی وہ واحد سہارا تھا جو دو دلوں کے درمیان دوری کو کم کرنے کا ذریعہ تھا۔ وقت اور ترقی کے ساتھ خط نے بھی اپنی ہیئت یعنی شکل صورت بدلی، جب تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وقت یہی خط یا مکتوب اپنی اولین صورت ' تصویری خط ' دور رہنے والوں کے درمیان ایک دوسرے کی بات کو پہچانے کا ذریعہ تھا۔ تصویر کشی فن تحریر یا خطاطی کا سنگِ بنیاد اور خطاطی و مصوری کا سرچشمہ تصور کی جاتی ہے۔تاریخ میں ایک ترکستانی دوشیزہ کا محبت نامہ گویا خط مشہور ہے، یہ خط اس وقت کا ہے جب گفتگو کے لیے کوئی زبان وجود میں نہیں آئی تھی ۔ اس دوشیزہ نے ایک تھیلے میں چند چیزیں رکھ کر اپنے سے دور رہنے والے اپنے محبوب کو بھیج دیں۔ یہ اس دوشیزہ کا اس زمانہ کا خط تھا،اپنے محبوب کے نام۔ اس تھیلے میں رکھی ہوئی ہر چیز ایک خاص مفہوم ظاہر کرتی تھی مثلاً بھوسے کا تنکا: تمہاری محبت میں میرا رنگ زرد ہو گیا ہے، سرخ گلاب: جب میں تمہارا تصور کرتی ہوں تو میرا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، سوکھی ہوئی خوبانی یا کوئی اور سوکھا ہوا پھل: میں اس پھل کی طرح سوکھ گئی ہوں،جلا ہوا کوئلہ: میرا دل تمہاری محبت میں سلگ رہا ہے،ایک خوشنما پھول: تم حسین ہو، شکر یا میٹھی کوئی چیز: تم شیریں ہو، پتھر

کیا تمہارا دل پتھر کا ہو گیا ہے، باز یا کبوتر کا پر: اگر میرے پر ہوتے تو میں تمہارے : پاس اُڑ کر پہنچ جاتی، اخروٹ کی گری: میں اپنے کو تمہیں سونپتی ہوں۔زبان اور تحریر کی ایجاد کے بعد خط نے اپنے ہئیت بدلی اور یہ صورت آج تک رائج ہے لیکن اب اس نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے وہ ہے انٹرنیٹ پر ای میل، موبائل پر ایس ایم ایس۔ لیکن اس کی اہمیت اور افادیت میں آج تک کمی نہیں آئی۔

مکتوبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطوط، حجاج بن یوسف کا خط، حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے خطوط، شیخ شرف الحق احمد یحییٰ مینری رحمت اللہ علیہ کے مکتوبات اور اسی طرح دیگر علمائے دین کے خطوط تاریخ میں زندہ و جاوید ہیں۔ ادب میں بھی خطوط کا اعلیٰ مقام ہے۔ عبد الرحمٰن چغتائی نے غالب کی مکتوب نگاری کو غالب کی شاعری سے کہیں اعلیٰ درجہ کی تخلیق قرار دیا

ہے۔بقول غالب ؎

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کوئی پیغامِ زبانی اور ہے

خطوط نگاری میں مولانا آزاد کا مقام بھی بلند ہے۔ ”غبارِ خاطر“ ان کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبال کے خطوط کا اپنا ایک مقام ہے، ڈپٹی نذیر

احمد کے خطوط ادبی تاریخ میں اہم ہیں۔ زمانے نے کروٹ لی ، نئی ایجادات یعنی کمپوٹر، انٹرنیٹ، موبائل اور ابلاغ عامہ نے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا، خطوط لکھنے اور بھیجنے کا رواج دم توڑتا جارہا ہے۔ شاعروں ، دانشوروں کے مابین مکتوبات کا جو تبادلہ ہوا کرتا تھا

ان میں بڑی حد تک کمی آگئی ہے۔ادیبوں ، شاعروں ، دانشوروں کے خطوط ہماری ادبی تاریخ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ راغبؔ مرادبادی کے بقول ؎

دل دادہ کتابوں کے ہیں جو صاحبِ ذوق
پڑھتے ہیں خطوط' اہل دانش کے بشوق

جناب طاہر حسین طاہر سلطانی ادبی جریدے ماہنامہ ''ارمغانِ حمد'' اور سہ ماہی ''جہان حمد'' کو مدیر کی حیثیت سے شائع کر رہے ہیں یہ جریدے حمد و نعتیہ ادب کے حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ جناب محمد اصغر کاظمی اور حافظ محمد نعمان طاہر کی مرتب کردہ یہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف مشاہیر نے جناب طاہر حسین سلطانی کو تحریر کیے۔ یہ خطوط سلطانی صاحب کے علمی ادبی تحقیقی اور تنقیدی دائروں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط سے ان کی ادبی کاوشوں کا ادراک بخوبی ہوتا ہے۔

جناب طاہر حسین سلطانی کے ہی حوالے سے کاظمی صاحب نے عمدہ کام کیا ہے۔ طاہر سلطانی صاحب نے ارمغانِ حمد کے مدیر اعلیٰ کیحیثیت سے اداریے تحریر کیے ان کو کتابی صورت میں یک جا کر دیا۔ ادریوں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ تشکیل پا گیا جو اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

طاہر باتیں: ماہنامہ ارمغارنِ حمد کے فکری و اصلاحی اداریے مرتبہ اصغر کاظمی اور حافظ محمد نعمان طاہر۔ کراچی: جہان حمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ۲۸۰ص

ارمغانِ حمد" کراچی سے شائع ہونے والا جریدہ ہے جس کے مدیر اعلیٰ طاہر حسین" سلطانی صاحب ہیں۔ مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے نہوں نے آٹھ سالوں (۲۰۰۴ء تا ۲۰۱۱ ے) میں جو اداریے تحریر کیے پیش نظر کتاب اُن اداریوں کا مجموعہ ہے۔ کسی بھی اخبار یا رسالے میں اداریے کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے۔ مولفینِ کتاب نے اداریے کے لغوی معنی "مدیر کی تحریر" یا مدیر کے انداز میں اظہار خیال کے لکھے ہیں۔ انھوں نے مغربی مفکر سر جیمز بیری اور میکس لرنر کی تعریفیں بھی بیان کی ہیں۔ جیمز بیری کے مطابق اداریہ رائے کو متاثر یا قاری کو محظوظ کرنے کے لیے تحقیق اور نقطہ نظر کو مختصر، " منطقی اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے"۔ جب کہ میکس لرنر کا کہنا ہے کہ اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روز مرہ کے واقعات کی تہہ میں کارفرما" ہوتے

ہیں''۔ ان تعریفوں کی روشنی میں اداریے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

اداریہ کسی بھی اخبار یا جریدہ کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ یہ مدیر کا نقطہ نظر، خیالات یا پالیسی بیان بھی ہوتا ہے۔ بعض مدیران اداریے میں صرف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ پیش نظر شمارہ میں کیا کچھ ہے گویا جریدہ میں شامل مندرجات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ بعض اداریہ نویس جدید مسائل کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں، ایسے اداریے اپنے طور پر ایک مضمون ہی ہوتے ہیں۔' ارمغانِ حمد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کراچی سے شائع ہونے والا ایک ایسا جریدہ ہے جو صرف حمد باری تعالیٰ کے لیے وقف ہے۔ اس میں حمد باری تعالیٰ سے متعلق مضامین ہی شائع ہوتے ہیں۔ کسی بھی ایک موضوع پر رسالے کی اشاعت ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ ایسے جریدے تو کئی ہیں جو صرف حمد اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف ہیں لیکن حمد باری تعالیٰ کے لیے وقف شاید یہ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہے۔ طاہر سلطانی صاحب جو حمد و نعت کے شاعر ہیں کا بڑا اعزاز ہے کہ انہوں نے رسالہ 'ارمغان حمد' کو فروری، ۲۰۰۴ء سے جاری رکھا ہوا ہے گویا یہ مجلّہ اپنی اشاعت کے آٹھویں سال میں ہے۔ مولفین کتاب نے ارمغان حمد' کے اداریوں کی اہمیت کے پیش نظر ان تمام اداریوں کو جو ۲۰۰۴ء سے ' ۲۰۱۱ کے درمیان تحریر کیے گئے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں منظر عارفی کا ایک مضمون بہ عنوان ''ارمغان حمد'' شامل ہے جس میں کتاب کا

عنوان 'فکر طاہر' لکھا ہوا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مولفین نے ابتدا میں کتاب کا عنوان یہ رکھا ہوگا بعد میں اسے تبدیل کر دیا گیا وہ بھی اجلت میں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے سرورق پر جو عنوان شائع ہوا ہے وہ فکر طاہر سے زیادہ اچھا نہیں۔ کتاب کا عنوان دراصل کسی بھی شخصیت کے چہرے کی مانند ہوتا ہے اسے صاف ستھرا، نکھرا نکھرا، جاذب نظر ہونا چاہیے چہرہ ہی شخصیت کا اولین اظہار ہوتا ہے۔ یہی صورت کتاب کی بھی ہوتی ہے۔ عنوان سے ہی کتاب کے بارے میں اولین رائے قائم کی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر کتاب اپنے موضوع پر عمدہ اضافہ ہے۔

ادب کی دنیا کا ایک معروف و معتبر نام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بلا شبہ اردو کے استاد الاساتذہ میں سے ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری کے مشن کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی خدمات تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جائیں گی۔ آپ نے ''نگارِ پاکستان'' کو بھی قائم و دائم رکھا ہوا ہے۔ اردو ادب کے اس جریدے کی اشاعت کو ۹۱واں سال چل رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس جریدے کی اشاعت کا بار ڈاکٹر صاحب کے کاندھوں پر ہے۔ آپ نے اسے خوش اسلوبی سے اٹھایا ہوا ہے۔ اب اصغر کاظمی بھی ان کے شریک سفر ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصانیف و تالیفات معیار و مقدار کے اعتبار سے بلندی کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ کاظمی صاحب نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کی تصانیف وتالیفات کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ پیش لفظ، دیباچوں کو کتابی شکل دی، ڈاکٹر صاحب کی تصانیف وتالیفات پر جو تبصرے شائع ہوئے انہیں کتابی صورت میں شائع کیا، ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ادیبوں اور دانشوروں کی آرا کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا۔ ذیل میں اصغر کاظمی کی ان کتب کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حوالے سے وقفہ وقفہ سے منظر عام پر آئیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری : ایک ہمہ جہت صاحبِ قلم مرتبہ از سید محمد اصغر کاظمی .۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ۶۷۲ص، ،۔۱۳۵۸ روپے۔

سید محمد اصغر کاظمی اردو ادب کی ان شخصیات میں سے ہیں کہ جنہوں نے اپنے قلم کی روانی کو مسلسل رواں دواں رکھا ہوا ہے۔ مضامین کے علاوہ تصانیف کا ایک سلسلہ ہے جس کا آغاز ۱۹۹۷ء میں ایک مختصر سی کتاب ''سب رس اور رانی کیتکی کی کہانی کا تنقیدی جائزہ'' سے ہوا، تنقید کے علاوہ شخصیات ان کا خاص موضوع ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے علاوہ اشتیاق اظہر مرحوم اور پھر ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کا خاص موضوع رہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک ہمہ جہت صاحبِ قلم'' ایک ایسی تالیف ہے جس میں ''

اردو کے قابل ذکر ۸۵ لکھنے والوں کے وہ مضامین شامل ہیں جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں تحریر کیے۔ ان نامور لکھنے والوں کا تعلق پاکستان ہی سے نہیں بلکہ متعدد کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی سیرت و شخصیت کے حوالے سے اس کتاب میں ۱۶ مضامین ہیں، لکھنے والوں میں مرزا ادیب، رشید حسن خان (بھارت)، مالک رام بھارت)، نورالحسن جعفری، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر،) ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر شباہت علی خان (جرمنی)، ڈاکٹر مظفر حنفی (بھارت)، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی (بھارت)، ابوالجیش سحر (بھارت)، ڈاکٹر رحیم رضا (اٹلی)، اشفاق حسین کنیڈا)، پروفسر سحر انصاری، احمد حسین صدیقی شامل ہیں۔ وجدان و عرفان کے حوالے) سے ۷ مضامین ہیں لکھنے والوں میں پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھارت)، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فاروق احمد، ڈاکٹر انوار احمد (جاپان)، ڈاکٹر) رضا کاظمی اور ڈاکٹر سید جاوید اقبال شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید و تحقیق سے متعلق مضامین ہیں لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر خلیق انجم (بھارت)، پروفیسر نظر ۷ احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر انور سدید، حکیم نثار احمد علوی اور ڈاکٹر آغا سہیل شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی زبان و مسائل زبان کے تحت ۴ مضامین ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر عرش صدیقی ڈاکٹر نعمت الحق، عبد

الرحمٰن ناصر اور پروفیسر عقیل دانش (لندن) شامل ہیں۔لغت نویسی و فرہنگ شناسی پرڈاکٹر مسعود حسین خان (بھارت) اور مرزا نسیم بیگ کا مضمون ہے۔ اصناف و اسالیب کے تحت ۸ مضامین ہیں، لکھنے والوں میں ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر اے بی اشرف (ترکی)، ایم حبیب خان (بھارت)، پروفیسر ریاض صدیقی، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر انصاراللہ نظر (بھارت) اور پروفیسر آفاق احمد صدیقی شامل ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور شخصیت شناسی کے تحت ۱۱ قلم کاروں کے لکھے ہوئے مضامین ہیں جن میں پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، سیدہ اقصح وحید، ضیاء ندیم، ڈاکٹر صابر کلوروی، محمد سہیل، ڈاکٹر عقیلہ شاہین، ڈاکٹر محمد امین، محمد حبیب صدیقی، ڈاکٹر سید معراج نیر اور ڈاکٹر ہلال نقوی شامل ہیں۔ ماہنامہ 'نگار' کے عنوان سے ۴ مضامین ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (بھارت)، پروفیسر عتیق احمد، ظفر اقبال ظفر بھارت)، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری شامل ہیں۔ڈاکٹر صاحب پر شعراء کے منظوم تاثرات) بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تالیفی و تصنیفی سرمایہ کی فہرست، ڈاکٹر صاحب کا سوانحی خاکہ اور کچھ تصاویر کتاب کا حصہ ہیں۔اس طرح کل ۸۵ لکھنے والوں کے مضامین کتاب کا حصہ ہیں۔

اصغر کاظمی نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ان کے فن کے حوالے سے مضامین کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کردیا ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن اپنی طرح داری

کے ساتھ خوبصورت انداز میں سامنے آ گئی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مفید ماخذ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تنقیدی زاویے مختصر مختصر مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی.۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ۱۵۹ص،۔۴۲۵ روپے تصانیف و تالیفات پر اپنے سے زیادہ مستند لکھنے والے، معروف قلم کار، سینئر ادیب یا صاحب کمال استاد سے کتاب کا پیش لفظ یا دیباچہ لکھوالنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ مصنف کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی تحریر عام طور پر تقریظ، مقدمہ، پیش لفظ، پیش نامہ، دیباچہ، تعارف کے عنوان سے ہوتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد پڑھنے والوں کو کتاب اور کتاب کے مصنف کے بارے میں ایک مستند اور ماہر لکھنے والے یا استاد کے تاثرات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ تعارف یا دیباچہ لکھنے والا جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس پر مختصر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور مختصر الفاظ میں کتاب کے خالق یعنی مصنف کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کردیتا ہے۔ یہ تعارف یا دیباچے عموماً تعریفی و توصیفی ہی ہوا کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی تعارف یا دیباچہ ایسا لکھا گیا ہو جس میں دیباچہ نگار نے کتاب یا صاحبِ کتاب کے بارے میں اپنی منفی رائے کا اظہار کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچہ یا تعارف کتاب پر لکھے گئے تبصروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ دیباچہ یا تعارف دوسروں سے لکھوانے میں ایک مصلحت یہ بھی کار

فرما ہوتی ہے کہ مصنف اپنی اور اپنی کتاب کی تعریف از خود لکھے، یہ کسی بھی طور اچھا نہیں لگتا، یہ خود ستائی کے زمرہ میں آجاتا ہے، چناچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے سے سینئر لکھنے والوں، اساتذہ، دانشوروں، عالم فاضل احباب سے اپنے اور اپنی کتاب کے بارے میں تعریفی و توصیفی کلمات لکھوانے کے لیے دیباچہ سازی نے مقبولیت حاصل کی ۔دیباچہ بنیادی طور پر جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس موضوع کے ماہر قلم کار، عالم فاضل ہی سے لکھوانے کی روایت تھی لیکن وقت کے ساتھ دیباچہ نگاروں میں ملک کی معروف شخصیات جیسے صدر مملکت، وزیر اعظم، وزراء اکرم، معروف سیاست دانوں، معروف تاجروں کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا،یقیناً اس کا مقصد کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرنا ہی ہے۔

لکھنے والا جیسے جیسے مقبولیت اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے اس کا شمار دیباچہ نگاروں کی فہرست میں آجاتا ہے۔ اردو کے ممتاز دیباچہ نگاروں میں مولوی عبد الحق کا مقام بلند نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابائے اردو کے لکھے ہوئے مقدمات محض تعریفی و توسیفی ہی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ان کے مقدمات میں متعلقہ موضوع پر تحقیق ہوا کرتی تھی۔عہد حاضر کے تمام ہی سینئر لکھنے والے، اساتذہ اور استاد لااساتذہ دیباچہ نگاروں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان میں اردو کے معروف لکھاری، استاد الااساتذہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کا مقام و مرتبہ بلند نظر آتا ہے۔آپ بلا شبہ موجودہ عہد کی ممتاز اور قد آور علمی و ادبی شخصیات میں سے ہیں۔اپنی نگارشات کے بارے میں مصنفین ڈاکٹر صاحب کے چند جملے لکھوانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے بے شمار تصانیف وتالیفات کے

بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور

یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نزدیک دیباچہ نگاری ایک مستقل فن ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ دیباچے ، تقریظ، تعارف ، پیش لفظ، مقدمہ ، دیباچہ اور فلیپ نہ صرف مصنف اور کتاب کا تعارف کراتے ہیں بلکہ موضوع پر بھرپور روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں نئے لکھنے والوں کی اصلاح، رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کتاب میں کمزوری محسوس کرتے ہیں تو اس طرح اصلاح کرتے ہیں کہ مصنف کا دل بھی رکھ لیتے ہیں اور کمزوری کی نشان دہی بھی کر جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو موضوع پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔ڈاکٹر صاحب کی دیباچہ نگاری کا انداز بھی منفرد ہے۔آپ نے حد درجہ سادہ، رواں اور عام فہم زبان میں دیباچے تحریر کیے ہیں تاکہ قاری کو کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔

پیش نظر کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لکھے گئے ۳۱ فلیپ اور تبصرے

شامل ہیں۔ یہ کسی بھی طور مکمل نہیں ہیں ، ان کی تعداد یقینا بے شمار ہو گی۔اس سے قبل کاظمی صاحب ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے دیباچوں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں ''تنقید نما'' جلد اول اور جلد دوم کے عنوان سے مرتب کر چکے ہیں۔کاظمی صاحب کا کہنا ہے کہ اس موضوع پر تلاش کا سلسلہ جاری ہے اور وہ آئندہ بھی یہ کام جاری رکھنے کا عظم رکھتے ہیں۔ایک خیال کے مطابق ڈاکٹر صاحب اب تک سو سے زیادہ تخلیق کاروں کی نگارشات پر فلیپ اور دیباچے تحریر چکے ہیں۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ سال نو یعنی ۲۰۱۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پہلا فلیپ میری خاکوں کی کتب ''جھولی میں ہیرے اور موتی' کا تحریر فرمایا، حالانکہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں تھی۔ڈاکٹر صاحب کی محبت ہے کہ آپ نے میری کتاب اور میرے بارے میں تحریر فرمایا ''ڈاکٹر رئیس صمدانی کے لکھے ہوئے خاکے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی یادداشتیں بہت مضبوط ہیں، ان کی نگاہ حقائق اور واقعات پر بڑی گہری رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی ایک باشعور صاحب قلم ہیں، مقبولیت و عدم مقبولیت یا کسی رسالے میں چھپنے نہ چھپنے پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے بلکہ ادب کی خدمت نہایت سلیقے اور لطیف پیرائے میں انجام دے رہے ہیں۔ان کی تحریروں کی سادہ بیانی و حق گوئی میں ایسا جادو ہے کہ وہ اپنے قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری کتاب ختم کیے بغیر اس کے

سحر سے نہیں نکل سکتا''۔ڈاکٹر صاحب کی عنایت کے انھوں نے اپنی خرابی صحت کے باوجود میری کتاب ''یادوں کی مالا'' پر بھی اپنی رائے کا اظہار فرمایا تھا۔آپ لکھا''کتاب بلحاظ زبان و بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی۔کتاب نہایت صاف ستھرے انداز میں شائع ہوئی ہے اور قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ مضامین کی فہرست میں کچھ تو مختصر خاکے ہیں کچھ تنقیدی جائزے ہیں اور کچھ مختصر تذکرے، مگر اختصار میں بھی وہ سب کچھ آگیا ہے جو موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری تھا''۔

تنقید نما (دوسروں کی مطبوعات پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دیباچے)،مرتبہ ﷺ محمد اصغر کاظمی۔۔ کراچی: فرید پبلشرر، ۲۰۰۱ء،۳۱۷ص۔

اصغر کاظمی کی مرتب کردہ یہ کتاب 'تنقید نما' بھی پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے تحریر کردہ دیباچے ، تقریظ، تعارف ،پیش لفظ، مقدمہ ، دیباچہ اور فلیپ پر مشتمل ہے۔کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نثری کتب کی تعداد ۱۷ ہے جب کہ شعری کتب کی تعداد ۲۹ ہے جن پر ڈاکٹر صاحب محترم کے لکھے

گئے دیباچے شامل ہیں۔ مولف 'حرفِ آغاز' میں رقم طراز ہیں کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دیباچہ نگاری کو بھی ایک مستقل فن کی حیثیت دی ہے اسی لیے وہ دیباچہ نگاری کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی علمی و ادبی تحقیقی مقالات کو۔ انہوں نے دیباچہ نگاری کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اسی لیے ان کے تحریر کردہ دیباچے نہ صرف مصنف اور کتاب کا تعارف کراتے ہیں بلکہ موضوع پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی لیے یہ دیباچے بڑے جاندار اور معلومات افزا ہیں'۔

مولف نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ دیباچوں کو یکجا کرکے کئی مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ یہ دیباچے مستقبل کے دیباچہ نگاروں کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ انہیں اس فن سے آگاہی بھی فراہم کریں گے۔ مصنفین، مولفین اور ان کی تخلیقات پر ڈاکٹر صاحب کے گراں قدر خیالات کو اس تالیف میں یکجا کردیا گیا ہے جو مستقبل کے محقق کے تحقیقی سفر میں مفید ثابت ہوں گے۔

تنقید نما: ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے منتخب دیباچے (جلد دوم)، مرتبہ [illegible] اصغر کاظمی۔۔ کراچی: حرا فاؤنڈیشن پاکستان، ۲۰۰۶ء، ۲۲۴ص

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ تقریظ، تعارف، پیش لفظ، مقدمہ، دیباچہ

کے سلسلے کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اسے مؤلف نے جلد دوم کہا ہے۔ اس میں کل ۵۳ دیباچے شامل ہیں، ۱۵ نثری کتب جب کہ ۳۸ شعری کتب ہیں۔ جب کہ پہلی جلد جو تنقید نما" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس میں ۴۶ کتابوں کے دیباچے شامل تھے،" ان کتب کی فہرست بھی جلد دوم کے اختتام پر دی گئی ہے۔ اس طرح ان دونوں جلدوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ ۹۹ کتابوں جن میں ۳۲ نثری کتب اور ۶۷ شعری کتب شامل ہیں۔ موئلف کا کہنا ہے کہ اب بھی ایسی کتابوں کی تلاش جاری ہے جن پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ دیباچے شامل ہیں، گویا مستقبل قریب میں اس موضوع پر تیسری جلد بھی منظر عام پر آ سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ موئلف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ فلیپ بھی جمع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اب تک سو سے زیادہ کتب کے فلیپ تحریر کر چکے ہیں۔

بلا شبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، وہ اپنے عہد کی ایک قد آور شخصیت ہیں ان کے علمی ورثہ کو خواہ کسی بھی صورت میں ہو یک جا کرنا گویا اردو ادب کی تاریخ کے قیمتی سرمائے کو محفوظ کرنے کے مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نقاد و تذکرہ نگار ہیں، سفر نامہ، مرثیہ نگاری، فن تاریخ گوئی، فن رباعی، شخصیت نگاری، نعت شناسی، مقالہ نگاری اور تبصرہ نگاری میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان تمام کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بابائے اردو

مولوی عبدالحق کی روایت کو جاری و ساری رکھتے ہوئے دیباچہ نگاری میں بھی اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے۔ موجودہ عہد کے اہل قلم اپنی نثری یا شعری کتب پر ڈاکٹر صاحب سے دیباچہ یا فلیپ لکھوا کر انتہائی مسرت محسوس کرتے ہیں اور اسے اپنے لیے قابل احترام گردانتے ہیں۔کتاب پر اپنے سے زیادہ علمیت کے حامل شخص، معروف اہل دانش یا اہل قلم سے کتاب کا تعارف دیباچہ لکھوانے کا بنیادی مقصد صاحبِ کتاب سے زیادہ کتاب کا تعارف ہوتا ہے۔ دیباچہ نگار کتاب کی بعض خصوصیات کو اچھے انداز سے بیان کردیتا ہے جو مصنف سے نظرانداز ہوجاتی ہیں یا خود ستائی یا انکساری کے باعث انہیں بیان نہیں کرتا، دوسری الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لکھنے والا از خود اپنی تعریف نہیں کرسکتا اس کے لیے بھی وہ دیباچہ نگار کا سہارا لیتا ہے اور دیباچہ نگار مصنف کی اس خواہش کو خوش اسلوبی سے دیباچے میں بیان کردیتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تحریر کردہ دیباچے نہ صرف مصنف اور کتاب کا خوبصورت انداز سے تعارف کراتے ہیں بلکہ موضوع پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس عمل سے نہ صرف دیباچہ نگاری کے فن کو دوام بخشا بلکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، رہنمائی اور اصلاح کی بھرپور کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔ بقول مؤلف ''جہاں وہ کتاب میں کمزوری محسوس کرتے ہیں تو اس طرح اصلاح کرتے ہیں کہ مصنف کا دل بھی رکھ لیتے ہیں اور کمزوری کی نشان دہی بھی کرجاتے ہیں''۔

علم و ادب کی جو خدمت فاضل مولف کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ تدوین کا فن کوئی سہل نہیں بلکہ یہ زیادہ مشکل . محنت طلب اور تھکا دینے والا عمل ہے۔ کاظمی صاحب مستقل مزاجی سے اس مشکل عمل کے صراط مستقیم پر عمل پیرا ہیں۔ امید ہے وہ جلد اس میدان کے اگلی صف کے سہواروں میں اپنا مقام بنالیں گے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری : تصنیفات و تالیفات کے آئینے میں مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی.۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ۲۴۴ص

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا علمی سرمایا تعداد اور معیار کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر صاحب بر صغیر پاک و ہند میں اردو ادب کے اہل قلم میں بہ طور ماہر لسانیات ، نقادو محقق،تذکرہ نگار، سفرنامہ نگار ، مرثیہ نگاری، فن تاریخ گوئی، فنِ رباعی، شخصیت نگاری، نعت شناسی، مقالہ نگاری اور تبصرہ نگاری میں اپنی مستند علمیت اور منفرد نقطہ ہائے نظر کی بدولت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے لیے ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات خصوصاً آپ کی تخلیقات کئی اعتبار سے آپ کو دیگر لکھنے والوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ۷۰ سے زیادہ ہے اور بیشتر کتب کے کئی کئی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پیش نظر تصنیف میں ڈاکٹر صاحب کی ۶۷ تصانیف پر تبصرے شامل ہیں ۔ یہ تبصرے اہل قلم نے تحریر کیے اور مختلف اخبارات اور ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹرحب کی یہ تصانیف ۱۹۶۲ء سے ۲۰۱۰ء کے درمیان شائع ہوئی ہیں۔ تبصرہ نگاروں میں معروف ادبی شخصیات شامل ہیں ان میں علامہ نیاز فتح پوری، مولانا حامد حسن قادری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر نجیب، عابد علی عابد،ڈاکٹر سلیم اختر، کرنل غلام سرور، ڈاکٹر وفا راشدی، ڈاکٹر انور سدید، مرزاادیب، سید ذاکر اعجاز، ابو سلمان شہجہان پوری،ڈاکٹر روبینہ ترین،ڈاکٹر ممتاز احمد خان،پروفیسر احمد سعید، محمود الرحمٰن، شفیع عقیل، ادیب سہیل،ارم اجمل ملک، رئیس الزماں خان، رحیم بخش شاہین، ثناء الحق صدیقی، شفیق الدین شارق، امراؤطارق،ڈاکٹر مشرف احمد، نصیر احمد، محمد احمد سبزواری، ثروت رضوی قابل ذکر ہیں۔یہ تبصرے جن اخبارات اور ادبی رسائل میں شائع ہوئے ان میں روزنامہ جنگ، نوائے وقت، ایکسپریس ، ڈان کراچی اورادبی رسائل میں ماہنامہ قومی زبان، ادبی دنیا لاہور، اسلامی جمہوریہ، ہفت روزہ تنویر، ممبئی، ترجمان القرآن بہ طورِ خاص قابل ذکر ہیں۔فاضل موئف نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصانیف وتالیفات پر شائع شدہ تبصروں کو ایک ساتھ شائع کرکے اردو

ادب کے لکھنے والوں اور ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا کردی ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تبصرہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ تبصرہ کتاب یا مضمون میں شامل حقائق اور موضوع کے بارے میں نقطہ نظر کو اختصار کے ساتھ، منطقی انداز میں اور خوب صورت انداز سے پیش کرنے کا نام ہے۔ تبصرہ کسی بھی محقق اور مصنف یا پڑھنے والے کو مختصر الفاظ میں یہ بتا دیتا ہے کہ مکمل تحریر یا کتاب میں اس کے مطلب کی کوئی چیز موجود ہے یا نہیں۔ بسا اوقات پڑھنے والا صرف تبصرہ ہی پڑھ کر یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے اس کتاب کی ضرورت ہے یا نہیں۔ تبصرہ کتاب کے تعارف یا دیباچے سے کم اہم نہیں ہوتا۔ تبصرہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں ابتدائی اور بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں تبصرہ نگار کتاب کی خامیوں اور مصنف کی کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کردیتا ہے۔ تبصرہ نگار طویل جملوں کے بجائے مختصر جملوں میں تحریر کی تہہ میں چھپے حقائق کو خوبصور انداز میں بیان کردیتا ہے۔کتابوں پر تبصروں کی اہمیت کے پیش نظر اخبارات اور رسائل وجرائد میں مستقل بنیادوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ صرف تبصروں پر مشتمل تخلیقات بھی شائع ہوتی ہیں، بھارت سے ''اردو بک ریویو'' کے عنوان سے ایک ماہانہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ کراچی کے ڈان اخبار ہر ہفتہ بک ریویو کے عنوان سے خصوصی ایڈیشن شائع کرتا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے

تبصروں پر مشتمل خوبصورت کتابچے بھی شائع کیے ہیں۔

سید اشتیاق اظہر شریف النفس انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قلم کار اور ایک سیاست داں بھی تھے۔ صحافت کے پیشہ سے بھی وابستہ رہے، وہ تحریک پاکستان کے ایک ایسے سپاہی تھے جنھوں نے مولانا حسرت موہانی کی قیادت میں جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مجھے اشتیاق اظہر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت وہ روزنامہ نوائے وقت سے منسلک تھے اور مَیں عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھا۔ حاجی عبداللہ ہارون کی برسی کے موقع پر میں نے ایک طویل مضمون تحریر کیا۔ خیال تھا کے اس مضمون کو جنگ اخبار میں برسی کے موقع پر جگہ مل جائے گی لیکن ایسا نہ ہوسکا، وقت سے قبل ہی مجھے اندازہ ہوا کہ جنگ اخبار میرا یہ مضمون شائع نہیں کرے گا۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ آپ روزنامہ نوائے وقت کے دفتر جائیں اور جناب اشتیاق اظہر صاحب سے ملاقات کریں اور انہیں بتائیں کہ عبداللہ ہارون مرحوم کی برسی کے موقع پر یہ مضمون شائع ہوجائے تو اچھا ہوگا۔ مَیں قائداعظم کے مزار کے نزدیک واقع نوائے وقت کے دفتر چلا گیا۔ اتفاق سے اشتیاق اظہر صاحب اپنے آفس میں موجود تھے۔ میرے تعارف کرانے پر شفقت سے پیش آئے اور میری بات توجہ سے سنی۔ مجھ سے مضمون بھی لیا اور کہا کہ میری کوشش ہوگی کہ آپ کا یہ مضمون اسی تاریخ کو جس دن سر عبداللہ ہارون کی برسی ہوتی ہے نوائے وقت میں چھپ جائے۔ میں مطمئن ہو کر

واپس آگیا۔ مجھے خوشی ہوئی جب میرا مضمون ''حاجی سر عبد اللہ ہارون: شخصیت'' ۲۹ اپریل ۱۹۸۲ء کو روزنامہ نوائے وقت کے صفحہ آٹھ پر شائع ہوا۔ مجھے بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مضمون کو شامل اشاعت کرانے میں اشتیاق اظہر صاحب نے ذاتی دلچسپی لی۔ اس مضمون کی اشاعت کی وجہ ہی تھی کہ روزنامہ جنگ میں ایک ماہ بعد ہی میرا ایک مضمون ''کراچی کے کتب خانوں کا سرسری جائزہ'' ۱۴ جون ۱۹۸۲ء کو شائع ہو سکا۔ اشتیاق اظہر صاحب خود تو لکھاری تھے ہی دوسروں کو خصوصاً نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔

سید اشتیاق اظہر کے حوالے سے اصغر صاحب کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں پہلے ۱۹۹۸ء میں ''اشتیاق اظہر کی صحافتی اور شعری خدمات: مشاہیر کی نظر میں'' اور دوسری اگلے ہی سال یعنی ۱۹۹۹ء میں ''سید اشتیاق اظہر فن اور شخصیت'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

ان دونوں کتب میں سید اشتیاق اظہر کی شخصیت اور خدمات نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

اشتیاق اظہر کی صحافتی اور شعری خدمات: مشاہیر کی نظر میں مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی. ۔ کراچی: سمیع پبلیکیشنز، ۱۹۹۸ء، ۱۲۳ص۔

سید اشتیاق اظہر شاعر اور صحافی ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک ادیب، محقق، مقرر، دانشور، تاریخ داں، سرکاری افسر، سماجی کارکن اور ایک سیاسی شخصیت بھی تھے۔ پیش نظر کتاب میں مولف نے سید اشتیاق اظہر کے حوالے سے ان مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو سید اشتیاق اظہر کی صحافتی اور شعری خدمات کے اعتراف میں ملک کے دانشوروں اور اہل علم حضرات نے تحریر کیے اور وہ مختلف اخبارات، رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حکیم محمد سعید، پروفیسر سحر انصاری، حکیم محمد احسن، محمد اسماعیل ذبیح، پروفیسر حسنین کاظمی، پروفیسر ظفر عمر زبیری، سید محمد تقی، ہارون سعد، ریئر ایڈمرل ایم آئی ارشد، جبریل صدیقی، خواجہ رضی حیدر، شہاب دہلوی، ڈاکٹر وفا راشدی، عبد الحق کاسنگجوی، ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی، ڈاکٹر فاضل زیدی، آفاق صدیقی، پروفیسر مظہر جعفری، جمیل جبلپوری، اکرام زیبائی، صدیق طاہر، ماجد قریشی، امجد قریشی، منور علی، محمود خاور، اعتبار ساجد، خالد ایس حسن، سرشار صدیقی، رعنا اقبال شامل ہیں۔ سید اشتیاق اظہر نے اپنی زندگی ہی میں ایک کتاب ''میری صحافتی اور شعری زندگی'' کے عنوان سے تحریر کی تھی۔ بیشتر اہل قلم نے سید اشتیاق اظہر کی اس کتاب کو اپنا موضوع بنایا اور اظہر صاحب کی صحافتی خدمات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مولف نے ان مضامین کو ایک جگہ جمع کر کے مرحوم سید اشتیاق اظہر پر مستقبل کے محقق کے لیے اہم

اور معلوماتی مواد فراہم کر دیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اشتیاق اظہر کی شخصیت بھرپور انداز سے سامنے آ گئی ہے۔

سید اشتیاق اظہر: فن اور شخصیت مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی .۔ کراچی: ۱۹۹۹ء، ۳۱۸ (ص۔ (ناشر کانام درج نہیں

اصغر کاظمی نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن متعدد اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بقول پروفیسر ظفر عمر زبیری جنھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ ''آئینہ خانہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے ''کتاب کیا ہے آئینہ خانہ ہے کہ اشتیاق صاحب کی شخصیت کے ۳۰ تیس پینتیس ۳۵ پہلو جگمگاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور لکھنے والوں میں حکیم محمد سعید، مولانا اسمٰعیل ذبیح، حکیم محمد احسن، پروفیسر حسنین کاظمی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے لے کر راقم تک شامل ہیں کہ ہر لکھنے والے نے بڑی اپنائیت اور محبت سے اپنے خیالات اور محسوسات کا اظہار کیا ہے''۔

کتاب میں مضامین کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ ابتدا میں اشتیاق اظہر کی شخصیت پر پروفیسر حسنین کاظمی، پروفیسر ظفر عمر زبیری، ڈاکٹر فرید الدین بقائی، خواجہ رضی حیدر، صدیق طاہر، امجد قریشی اور مسعود حسن شہاب دہلوی کے مضامین

ہیں۔ جن سے اشتیاق اظہر کی شخصیت کے تقریباً تمام ہی پہلو خوبصورتی کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔ شخصیت اور شاعری کے عنوان سے ۱۴ مضامین ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وفا راشدی، ڈاکٹر عبدالحق حسرت، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر ارشادالحق قدوس، ڈاکٹر فاضل زیدی، پروفیسر مظہر علی جعفری، شہاب دہلوی، پروفیسر آفاق صدیقی، سرشار صدیقی، اکرم زیبائی، ماجد قریشی، شبانہ علی اور محمود اختر کاظمی شامل ہیں۔ شخصیت اور صحافت کے عنوان سے جن لکھنے والوں کے مضامین شامل مجموعہ ہیں ان میں محمد اسماعیل ذبیح، حکیم محمد سعید، سید محمد تقی، ہارون سعد، حکیم محمد احسن، ایم آئی ارشد، جبریل صدیقی، جمیل جبلپوری، منور علی، محمود خاور، خالد ایس حسن، رعنا اقبال، سید محمد اصغر کاظمی، تاثیر نقوی، خان ظفر افغانی، اعتبار ساجد اور فیروز احمد سمیع شامل ہیں۔

اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اشتیاق اظہر صاحب کی تحریر کردہ تصانیف وتالیفات پر مختلف اہل قلم کے تحریر کردہ تبصرے بھی شامل ہیں۔ بعض ۲۳ شعرا کا منظوم خراج عقیدت، اشتیاق اظہر صاحب کو مختلف تقاریب میں جو نثری اور شعری سپاس نامے پیش کیے گئے، انٹرویو، یادگار تصاویر اور اعزازات کی تفصیل بھی کتاب کا حصہ ہے۔

مولانا سید فضل الحسن، حسرت موہانی کے نام سے معروف ہیں اردو ادب میں اعلیٰ مقام اور بلند منصب و مرتبہ پر فائز ہیں۔ وہ 'سید الاحرار' اور 'رئیس المتغزلین' کہے جاتے ہیں۔ وہ ایک نڈر صحافی ہی نہیں بلکہ اردو صحافت کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ اردو غزل کے ممتاز شاعر، شارح ،تذکرہ نگار، نقاد، سیاسی رہنماء اور تحریک آزادی کے صفِ اول کے رہنماؤں میں سے تھے ۔ صاف گو اور حق پرست ہی نہیں خدا رسیدہ صوفی اور درویش منش انسان تھے۔اپنے نام اور تخلص کے حوالہ سے ان کا یہ شعر بہت مقبول ہے ۔

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اپنے ایک مضمون ''مولانا حسرت موہائی'' جو ماہنامہ تہذیب' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کے بارے میں لکھا تھا کہ ''اگر' کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پر جو اکثر ترکی ہوتی تھی۔آدھ آدھ انگل چیکٹ جمع ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اجلا، جوتے نے کبھی برش کی صورت نہ دیکھی تھی۔آواز جھینگر سے ملتی جلتی۔ لیکن اس بے ڈال قالب میں بے پایاں روحانی وقت، اخلاقی جرات اور خلوص

وصداقت تھی"۔

حسرت کے بارے میں بابائے اردو کی اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت علامہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر تھے ۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

حسرت نے سادہ زندگی گزاتے ہوئے دنیا میں جو نام پیدا کیا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکا ہے۔ان کی اسی خصوصیت نے انہیں سید الاحرار اور تحریک آزادی کے عظیم رہنما ہونے کا اعزاز بخشا۔ معروف دانش ور سرشار صدیقی نے انہیں "فوق البشر" کہا۔ مشکل وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، جیل میں رہے تو وقت ضائع نہیں کیا بلکہ ادب اور غزل میں ایسا مقام پیدا کیا کہ "رئیس المتغزلین" کہلائے۔ جیل میں کہا ہوا ایک شعر جو بے انتہا مشہور ہے ۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اردو ادب کا کون سا ایسا بڑا ادیب اور دانشور ہے جس نے حسرت پر قلم نہیں

اٹھایا۔ حسرت کی شخصیت سے لے کر سیاسی جدوجہد، ادب کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ مضامین اور کتابیں لکھی گئیں اور حسرت پر مختلف زاویوں سے تحقیق کا عمل جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ حسرت کے حوالہ سے یوں تو کئی نام لیے جا سکتے ہیں لیکن محمد اصغر کاظمی صاحب کو بلاشبہ حسرت شناسی اور حسرت پر تحقیق و جستجو میں یقینا ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انہوں نے حسرت موہانی کی شخصیت، تذکرہ نگاری، حمد و نعت اور منقبت گوئی کے علاوہ مولانا حسرت موہانی دانشوروں کی نظر میں جیسی تالیفات مرتب کرکے حسرت شناسی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حسرت پر کئی احباب نے کام کیا۔ سرشار صدیقی کے مطابق حسرت موہانی کے سوانحی تعارف کے طور پر سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ''حالات حسرت'' کے عنوان سے جناب عارف ہسوی نے پہلی بار تفصیلی جائزہ کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں جناب عبدالشکور نے ''حسرت موہانی'' کے نام سے کتاب دی، جناب محمد اسلم ہندی نے ۱۹۵۵ء میں ''رازدانِ حیات'' تصنیف کی، اسی زمانے میں جناب عبدالقوی دسنوی نے ''حسرت کی سیاسی زندگی'' کے نام سے کتاب چھاپی، پھر ساٹھ کی دیہائی میں حسرت کی شاعری'' اور ''مولانا حسرت موہانی'' کے عنوان سے علی الترتیب جناب '' ڈاکٹر یوسف حسین خان اور جناب حکیم محمد سعید کی کتابیں شائع ہوئیں۔ حسرت موہانی کے حوالہ سے سید اشتیاق اظہر کی مطبوعات میں سید الا

حرار، مولانا حسرت موہانی حصہ اول ذاتی زندگی (اشتیاق اظہر اور نصرت موہانی)، حسرت کی زندگی، مقالات حسرت، مولانا حسرت موہانی کا سلسلہ سخن، نشاط النساء بیگم حسرت موہانی سیرت وخطوط کی روشنی میں، حسرت موہانی کی منتخب نظمیں (انگریزی ترجمہ) حسرت شناسی اور حسرت فہمی کی تحریک کو ایک نئی سمت دی۔

جناب شفقت رضوی نے حسرت پر کئی کتابیں مرتب کیں ان میں 'گلدستہء حسرت'، انتخاب دیوانِ حسرت'،' مولانا حسرت مجاہد آزادی کامل'،' مطالعہ حسرت موہانی' اور' مولانا حسرت موہانی کتابیات' شامل ہیں۔ان مطبوعات کے بعد کراچی میں' حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ نے حسرت پر مطبوعات کا سلسلہ دوبارہ جاری کیا۔ ابتداء میں سید اشتیاق اظہر نے حسرت کے حوالہ سے کئی تالیفات مرتب کیں ان کے اس عظیم مقصد کے لیے 'حسرت موہانی لائبریری وٹرسٹ' کو سید محمد اصغر کاظمی کے روپ میں ایک محنتی، جفاکش، تحقیقی ذہن رکھنے والا، کھوج لگانے اور جستجو کرنے کی فکر میں رہنے والا نوجوان میسر آگیا جس نے حسرت فہمی اور حسرت شناسی کی تحریک کو زندہ رکھتے ہوئے حسرت سے محبت کرنے والوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کر نے میں نمایاں کردار ادا کیا۔بقول رئیسہ موہانی ''اصغر کاظمی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور مولانا حسرت موہانی کے بارے میں ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے مہینوں کی

شب و روز محنت کے بعد مولانا کے بارے میں شائع ہونے والی ایسی نادر و نایاب تحریریں تلاش کر لیں ہیں جو علم وادب کی دنیا کے روشن ستاروں نے مولانا کے فن اور شخصیت کے بارے میں قلم بند کی تھیں"۔ ذیل میں کاظمی صاحب کی ان تالیفات کا تذکرہ الگ کیا جاتا ہے۔

سید الاحرار ... رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی: دانشوروں کی نظر میں ترتیب وتدوین سید محمد اصغر کاظمی .۔ کراچی: حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ)، ۲۰۰۲ء، ۲۹۶ص۔)

حسرت موہانی کے حوالہ سے اصغر کاظمی کی اولین تالیف ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی یہ حسرت موہانی دانشوروں کی نظر میں" تھی اور اس کتاب کو حسرت موہانی میموریل" لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ) نے شائع کیا۔کتاب کا انتساب رئیسہ موہانی اور سید انعام الحسن موہانی کے نام ہے۔ کتاب کا ابتدئیہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تحریر کردہ ہے اور پیش لفظ پروفیسر قیصر نجفی سابق صدر شعبہ اردو، عائشہ باوانی گورنمنٹ کالج نے تحریر کیا ہے۔ کتاب میں پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے اردو ادب کے ۵۵ دانشوروں کی آراء شامل ہیں۔ان میں بابائے اردو مولوی عبد الحق ، مولانا جمال میاں فرنگی محلّی، اسماعیل ذبیح، سید حسن مثنیٰ ندوی، سید ہاشم رضا، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر عبادت

بریلوی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سید ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر محمود الرحمان، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، رئیسہ بیگم موہانی، سید اشتیاق اظہر، ڈاکٹر خلیق انجم اور دیگر معروف دانشور شامل ہیں۔ بلا شبہ یہ تالیف مولانا حسرت موہانی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ہی نہیں سیاسیات، صحافت کے علاوہ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی حمد و نعت اور منقبت گوئی مرتب سید محمد اصغر کاظمی ۔- کراچی: حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)، ۲۰۰۳ء، ۱۷۷ص۔

حسرت موہانی کے حوالہ سے سید محمد اصغر کاظمی کی دوسری تالیف اگلے ہی سال یعنی ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ حسرت کی حمد و نعت اور منقبت گوئی سے متعلق ہے۔ حسرت غزل ہی میں رئیس المتغزلین نہ تھے وہ حمد، نعت اور منقبت اور ادب کی دیگر اصناف میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''حسرت موہانی کا مطالعہ شعر و ادب میں چونکہ اپنے سارے معاصرین سے وسیع، توانا تھا اس لیے اس توانائی و وسعت کے آثار اُن کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ !

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

تو غلط نہیں کہا البتہ اِس فیض رسائی کے باوجود کسی اُستاد کے مقلد نظر نہیں آتے۔ انھوں نے دوسروں کے فیض و اثر کو قبول تو کیا ہے لیکن اپنے انفرادی رنگ کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے''۔ حسرت بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتیہ کلام میں غزل کی جھلک نظر آتی ہے انھوں نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدہ نہ مثنوی کی ہوس

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تحریر کیا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''حسرت موہانی کی حمد و نعت کا ذخیرہ اُن کے مجموعہ کلام میں اس طرح بکھرا ہوا ہے کہ آسانی سے نظر نہیں آتا پھر بھی جوئیدہ پابندہ کے مصداق جناب اصغر کاظمی نے حسرت کی حمد و نعت اور منقبتوں کے بارے میں ایسی اطلاعات فراہم کردی ہیں جو مولانا حسرت موہانی سے اصغر کاظمی کے لگاؤ کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں اور اُن کی تحقیق و تنقیدی نظر کو معتبر بھی بناتی ہیں''۔

مولانا حسرت موہانی: ایک ہمہ جہت شخصیت تحقیق و ترتیب سید محمد اصغر کاظمی ۔۔ کراچی: حسرت ماہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)، ۲۰۰۴ء، ۳۹۲ص۔

حقیقت یہ ہے کہ حسرت شناسی اور حسرت فہمی کے حوالہ سے فاضل مولف نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ مولانا حسرت موہانی کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک اہم اور قابل قدر حوالہ ہیں۔پیش نظر کتاب میں حسرت کی شخصیت کے حوالہ سے ۴۴ اہل دانش کے مضامین شامل ہیں۔ سرشار صدیقی نے اپنے دیباچہ بعنوان 'تفہیم حسرت اور جدید نسل' میں لکھا کہ ''یہ کتاب جہاں مولانا حسرت موہانی کے بارے میں ایک خوشگوار اضافہ ہے وہیں دوسرے حسرت پسند نوجوانوں کے لیے ایک بھرپور ترغیب بھی ہے''۔پروفیسر عزیز انصاری نے اس کتاب کو حسرت فہمی پر ایک بڑا کام قرار دیا۔المختصر یہ کتاب تاریخ و سیاسیات ، صحافت اور ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ اور اہل تحقیق کے لیے حسرت پر ایک بیش بہا حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

رئیسہ موہانی نے اپنے ''ابتدائیہ' میں لکھا ہے کہ میری نظر سے مختلف ادیبوں کی تحریروں کا ایسا گلدستہ ابھی تک نہیں گزرا جس میں مولانا کی شخصیت کے اتنے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہو، اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا کی سیاست ، صحافت، مکتوب نگاری، غزل گوئی،تذکرہ نویسی، نظم گوئی، عشقیہ شاعری، نفسیاتی واقفیت نگاری، حمد و نعت گوئی، منقبت نویسی، شارح، تنقیدی اور تحقیقی شعور، ماہرِ نکاتِ سخن، درویشی، آئین فہمی، عزم و

استقلال، دین داری، قلندرانہ مزاج، مذہبی رجحان، انقلابی شاعری، مناجات گوئی، اور اداریہ نویسی کے ساتھ ساتھ کھیل کود سے دلچسپی ان کی شاعری کے حسی تلازمے اور ان کی تصانیف جیسے اہم موضوعات کے بارے میں ادیبوں کی تحریریں شامل ہیں۔ جن کی بدولت یہ کتاب ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کرلے گی اور یہ کتاب مستقبل کے محققین کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔

مولانا حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی .۔ کراچی: حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)، ۲۰۰۸ء، ۱۷۳ص۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق 'حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری کا انداز سب سے مختلف ہے۔ ایک انفرادیت ان کے تذکروں کی یہ ہے کہ انھوں نے ہر بڑے شاعر کے ذکر کے ساتھ اس کے تلامذہ کا سلسلے وار ذکر کیا ہے'۔ اصغر کاظمی کی کتاب ''مولانا حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری''، حسرت فہمی اور حسرت شناسی کے حوالہ سے قابل تعریف کام ہے۔ مولف نے محنت اور سلیقہ کے ساتھ معروف اہل دانش اور معتبر اہل قلم کی نگارشات شامل کی ہیں۔ کسی بھی موضوع پر از خود لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا کسی اور سے کسی بھی موضوع پر لکھوانا ہوتا ہے۔ اسی طرح مضامین کے انتخاب کا مرحلہ بھی انتہائی کٹھن اور مشکل ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے کہ کس مضمون کو شامل کیا جائے اور کس کو

نہیں۔ مولف اس منزل میں سرخ رو نظر آتے ہیں انھوں نے تمام مقالات کا انتخاب انتہائی ذہانت اور تدبر سے کیا ہے۔ پروفیسر ہارون
الرشید نے اس مجموعہ کو حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری پر ایک گراں قدر کتاب قرار دیا ہے۔

کتاب میں چھ مقالات شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر احمر لاری کے مقالہ کا عنوان ہے حسرت موہانی کا نظریۂ تذکرہ نگاری"، پروفیسر سید شفقت رضوی کے مقالہ کا عنوان" ہے "تذکرہ نگاری اور حسرت موہانی"، پروفیسر اشتیاق طالب نے "حسرت موہانی اور تذکرہ نگاری" کے تحت مقالہ تحریر کیا ہے۔ ان کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر سید افضال احمد بخاری، پروفیسر شفیق الرحمٰن، ایم حبیب خان اور سید محمد اصغر کاظمی نے بھی حسرت کی تذکرہ نگاری پر مقالات تحریر کیے ہیں۔
کتاب کے بارے میں ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، لکھتی ہیں کہ "ان مضامین کو یک جا کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ حسرت موہانی کی تذکرہ نویسی کے حوالے سے تذکرۃ الشعرء اُردوئے معلی کی ادبی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے"۔
مولانا حسرت موہانی کی صحافتی خدمات (اردوئے معلی، تذکرۃ الشعراء، مستقل

اور استقلال کے آئینے میں مرتبہ سید محمد اصغر کاظمی۔۔کراچی: حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)، ۲۰۱۲ء،۱۷۶ص

پیش نظر تصنیف کے موئف سید محمد اصغر کاظمی نے کتاب کے ابتدائیہ میں درست کہا کہ مولانا حسرت موہانی ایک بلند پایہ شاعر اور تذکرہ نگار و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ " اردو صحافت کے ایک ایسے علمبردار تھے جن کا ہمسر نہ اُن کے عصروں میں نظر آتا ہے اور نہ اُن کے بعد آنے والوں میں"۔ صحافت کے حوالے سے مولانا کی خدمات تاریخ کا ایک انمٹ باب ہیں۔ انھوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مختلف ادوار میں رسائل نکالے جن میں وہ اپنے ادبی، سماجی اور سیاسی خیالات بھی پیش کرتے رہے ساتھ ہی ساتھ ادب کی خدمات بھی۔ ان کے جاری کردہ رسائل اردوئے معلیٰ، تذکرۃ الشعراء، مستقل اور استقلال کو اردو ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان چاروں رسائل میں اردوئے معلیٰ کو مولانا کی صحافتی زندگی میں ایک شناخت کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ صرف مولانا حسرت موہانی کی شناخت ہی نہیں بلکہ اردو صحافت کو اس رسالہ نے ایک شناخت دی۔ یہ ایک نیم ادبی اور نیم سیاسی رسالہ تھا۔ اس رسالہ میں شائع ہونے والی تحریروں میں مولانا کی بے لاگ شخصیت کا عکس نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اردوئے معلیٰ "۱۹۰۳ء میں شائع ہوا اور ۱۹۴۲ء تک شائع ہوتا رہا، یہ کئی بار"

بند بھی ہوا پھر جاری ہوتا رہا۔ اردوئے معلّٰی کے بند ہو جانے کے بعد ۱۹۴۱ے میں " تذکرۃ الشعراء " جاری کیا اس کے صرف سات شمارے ہی شائع ہو سکے۔ ۱۹۲۸ء میں " مستقل " کے نام سے ایک رسالہ کانپور سے جاری کیا۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے " استقلال " کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ ان رسائل میں مولانا حسرت موہانی اپنے ادبی ، سیاسی و مذہبی خیالات و افکار کا اظہار انتہائی بے باکی سے کرتے رہے۔ ان چاروں میں جو مقام و مرتبہ اردوئے معلّٰی کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا اس کی وجہ اردوئے معلّٰی کا طویل عرصہ تک جاری رہنا تھا۔ یہ رسالہ انتالیس سال (جولائی ۱۹۰۳ے سے مارچ ۱۹۴۲ء) تک جاری رہا۔ اس کی طویل زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے ، کبھی بند بھی ہوا پھر جاری ہوا۔ یہ دراصل مولانا حسرت کی مکمل زندگی کا آئینہ دار تھا۔ اس رسالے نے ہی اردو صحافت میں بے باکی اور بے خوفی کی روایت کو پروان چڑھایا، لوگوں میں سیاسی شعور کو بیدار کیا ، یہی رسالہ مولانا کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کا باعث بھی ہوا۔

پیش نظر تالیف میں مولانا حسرت موہانی کی صحافتی زندگی اور اردوئے معلّٰی کے حوالے سے گیارا مضامین شامل ہیں ۔ ان میں پروفیسر آلِ احمد سرور کا مضمون " اردوئے معلّٰی کی گراں قدر خدمات " ، ڈاکٹر احمر لاری کا مضمون " مولانا حسرت موہانی ایک ممتاز صحافی " ، ڈاکٹر خلیق انجم کا مضمون "حسرت اور

صحافت''، ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون ''حسرت موہانی کی صحافت''، ڈاکٹر عفیرہ حامد کا مضمون ''حسرت موہانی کی صحافتی خدمات''، ڈاکٹر طاہر مسعود کا مضمون ''حسرت موہانی کی صحافت''، گربچن چندن کا مضمون ''حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ''، پروفیسر سید شفقت رضوی کا مضمون ''حسرت موہانی اور رسالہ اردوئے معلیٰ''، ڈاکٹر افضال احمد بخاری کا مضمون ''اردوئے معلیٰ حسرت کی صحافت کی
ضیاء پاشی، سلیم احمد کا مضمون ''حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ''، کے علاوہ سید محمد اصغر کاظمی کا مضمون ''مولانا حسرت موہانی کا صحافیانہ کردار'' شامل ہے۔
اصغر کاظمی اس سے قبل بھی حسرت موہانی کے حوالے سے متعدد کتب تالیف کر چکے ہیں۔ ان سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''اصغر کاظمی مولانا حسرت موہانی کے عاشقوں میں ہیں''۔ وہ حسرت موہانی میموریل لائبریری سے بھی منسلک ہیں۔ دن میں کم از کم چار گھنٹے اس لائبریری میں گزارتے ہیں۔ اردو کے استاد ہیں، لکھاری ہیں۔ایسی صورت حال میں حسرت سے عشق ایک
فطری عمل ہے۔ کاظمی صاحب کی یہ کاوش علمی و ادبی حلقوں خصوصاً حسرت کے چاہنے والوں میں طویل عرصہ تک مقبول و محبوب رہے گی۔

بیگم حسرت موہانی کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے بہت درست لکھا کہ " اگر ہندوستان کی عظیم خواتین پر کتاب لکھی جائے تو بیگم حسرت موہانی کے ذکر کے بغیر وہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی۔ دراصل حسرت کی چھتنار شخصیت کے سائے میں بیگم حسرت دَب کر رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ پہلی مسلمان مجاہدہ خاتون تھیں ، جنھوں نے جنگِ آزادی کا علم بلند کیا۔ مولانا محمد علی کی والدہ محمدی بیگم ، بیگم حسرت موہانی کے بعد ہی جنگِ آزادی میں شامل ہوئیں"۔ خواجہ حسن نظامی نے حسرت کی شریکِ حیات سیدہ نشاط النساء بیگم کو مشاہیر ہند میں شمار کرتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا "حسرت کی بیوی مسلمانان ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے ایام بلا میں ایسی وفا شعاری اس عورت سے ظاہر ہوئی جیسے سیتا جی نے رام چندر جی کے ساتھ کی تھی"۔ شاعر تنویر پھول نے ذکر نشاط کے عنوان سے بیگم حسرت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے

کہا ۔

موہان فخر کرتا ہے حسرت کے نام پر
تاریخ ناز کرتی ہے بیگم کے کام پر

بیگم حسرت موہانی کے حوالے سے اصغر کاظمی نے ایک کتاب مرتب کی جسے حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ) نے شائع کیا۔

نشاط النساء بیگم حسرت موہانی : افکار و کردار تحقیق و ترتیب سید محمد اصغر کاظمی۔۔ کراچی :
حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال (ٹرسٹ)، ۲۰۰۵ء، ۲۱۶ص
پیش نظر کتاب نشاط النساء بیگم حسرت موہانی : افکار و کردار میں بیگم حسرت موہانی کی شخصیت، کردار، کام، اور ان کی عظیم الشان جدوجہد اور اپنے عظیم شوہر حسرت موہانی کی فرماںبرداری اور حوصلہ افزائی کی داستان پر مشتمل مستند اہل قلم کی نگارشات شامل ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون خود مولانا حسرت موہانی کا تحریر کردہ ہے جس میں شجرہ نسب، خاندان کی تفصیل، بیگم سے قرابت، سلسلہ علالت اور انتقال سے ایک روز قبل خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تفصیل، صفات وغیرہ کی تفصیل ہے۔ آخر میں حسرت لکھتے ہیں کہ مجھ کو برابر پاداش کا خطرہ لگا رہتا تھا جس کا اظہار میں نے اپنی آخری غزل میں بایں الفاظ میں کیا۔ اس غزل کا ایک شعر ۔

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر ذراہِ انتقام
مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لیے

نشاط النساء بیگم حسرت موہانی کی صاحبزادی نعیمہ بیگم کا مضمون ''والدہ

مرحومہ'' کے عنوان سے ہے جس میں وہ لکھتی ہیں کہ ''مولانا جیل میں رہتے تھے اوروالدہ نہ صرف یہ کہ گھر کا خرچ چلاتی تھیں بلکہ مولانا کے دیوان شائع کرتی تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ ان کے مقدموں کی پیروی فرماتی تھیں۔ ان مصائب اور شدائد نے ان کی فطرت کو اور بھی نکھار دیا تھا''۔ بیگم حسرت موہانی نے ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ حسرت نے اپنے جذبات کا اظہار اپنی ایک غزل میں اس طرح کیا۔

عاشقی کو حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی بیکار ہے تیرے بغیر
کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دِل پہ ذوق شاعری اِک بار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اِک آزار ہے تیرے بغیر

کتاب میں بیگم حسرت موہانی کے بارے میں م
شاہیر وقت کے خراج تحسین شامل ہیں جن میں عارف ہسوی، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، شورش کاشمیری، کے مختصر خیالات ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ سردار علی صابری کا مضمون ''بیگم حسرت موہانی کی حریت پسندی'' کتاب کا حصہ ہے جو جنگ مڈویک میں شائع ہوا تھا۔ ضیاء الدین احمد برنی کا مضمون، جو عظمت رفتہ میں شائع ہوا، جلیل قدوائی کا مضمون ''فدائے حریت (حسرت

موہانی) کی شریک حیات'' ماہنامہ 'حسرت' بمبئی میں شائع ہوا، غلام احمد فرقت کاکوروی کا مضمون، حبیب الرحمٰن حبیب کا مضمون کشن پرشاد کول کا مضمون ''حسرت کی دمساز اور ساتھی''، پرنسپل عبد الشکور کا مضمون 'حسرت کی رفیق حیات'، ڈاکٹر اشرف کا مضمون 'نشاط النساء بیگم'، رابعہ بیگم کا مضمون 'نشاط النساء بیگم کتاب کا حصہ ہیں۔

ادبی جریدہ 'نگارِ پاکستان 'میں شائع ہونے والے مضامین میں رابعہ بیگم کا مضمون ' با حوصلہ اور جری خاتون' اور تحسین سروری کا مضمون بھی کتاب کا حصہ ہے۔ الحاج ڈاکٹر سید نجم الحسن موہانی کا مضمون 'بیگم حسرت موہانی' جو العلم کراچی میں شائع ہوا، رئیسہ موہانی کا مضمون 'سچائی و ایثار کا پیکر نشاط النساء بیگم''، سید اشتیاق اظہر کا تفصیلی مضمون نشاط النساء بیگم' جس میں آپ نے لکھا کہ ''بیگم صاحبہ کے انتقال کی خبر کانپور میں عام' ہوئی تو سارے شہر میں لوگوں نے سوگ میں دوکانیں بند کردیں اور اسی روز انہیں بساطیوں کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا'۔

حکم محمد سعید کے مضمون بعنوان 'سید الاحرار مولانا حسرت موہانی ''حیات و کردار کا ایک دل آویز مرقع' سے ماخوذ بیگم حسرت پر مضمون 'بیگم حسرت موہانی' بھی شامل کتاب ہے۔ خدا بخش لائبریری جنرل (پٹنہ) میں شائع ہونے والا مضمون

بیگم حسرت موہانی'نشاط النساء بیگم) جسے ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے تحریر کیا تھا شامل ' کتاب ہے جس میں مصنفہ نے بیگم حسرت کے خطوط بیگم صاحبہ کی وفات پر مختلف اہم قلم کے مضامین سے اقتباسات شامل ہیں۔ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون 'حسرت کی ہمدم و دمساز' ہے۔ مصنف نے بیگم حسرت اور مولانا حسرت کی شادی کے بارے میں لکھا ہے کہ 'اندازہ ہوتا ہے کہ مخالفتوں کے باوجود یہ شادی حسرت اور نشاط النساء کی باہمی مرضی سے ہوئی تھی۔ شادی کے بعد حسرت نے ایک غزل میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے ۔

ہے غرض ہر سمت اک ہنگامۂ شادی بپا
کچھ نہیں چلتی ملامت گر کی ، در بابِ نشاط

احمد سلیم کا مضمون 'بیگم حسرت۔ ایک وفا شعار بیوی'، کے علاوہ ہندوستان کے معروف اہل قلم ڈاکٹر خلیق انجم کا مضمون "نشاط النساء بیگم' ، بیگم حسرت پر تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے۔یہ مضمون کتاب 'حسرت موہانی' سے لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر احمر لاری کا مضمون بیگم حسرت موہانی حق پسند اور راست گو خاتون'' ، محمودہ بیگم کا مضمون "نشاط النساء' بیگم کے تذکرے کے بغیر حسرت موہانی کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا' ، یہ مضمون ماہنامہ الانسان' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اپنے عنوان ہی سے بامعنی ہے اور حقیقت' کو عیاں کرتا ہے۔ رومیصا موہانی کا مضمون ' نشاط النساء بیگم۔ تحریک آزادی کی سرگرم کارکن

خاتون' ، طالب ہاشمی کا مضمون ' سیدہ نشاط النساء بیگم '، ایم حبیب خان کا مضمون 'بہادر اور حوصلہ مند خاتون' اور سیف اللہ موہانی کا مضمون ' تحریک پاکستان کی مجاہدہ بیگم حسرت موہانی' جو روزنامہ 'انصاف' کرچی میں شائع ہوا سید محمد اصغر کاظمی کی تحقیق کا حصہ ہیں۔

کتاب کی اہمیت فلیپ پر ذکرِ نشاط کے عنوان سے تنویر پھول کی نظم اور غالب عرفان کی رائے سے بھی واضح ہے۔ تنویر پھول کے خیال میں ۔

اصغر نے کارنامہ ادب میں نیا کیا
مبسوط تذکرہ ہے یہ حسرت کی زوج کا
اے پھول ! دیکھ اس میں ہے تحقیق تہہ بہ تہہ
تاریخ اس کی ''گلشنِ ذکرِ نشاط'' کہہ

غالب عرفان نے کتاب کو ایک تحقیقی دستاویز قرار دیتے ہوئے کتاب کے بارے میں لکھا ''بیگم حسرت موہانی (نشاط النساء بیگم) کے افکار و کردار پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہوئی یہ کتاب جسے ہمارے عہد کے جواں سال محقق اصغر کاظمی نے بہت محنت مشقت اور نہایت عرق ریزی کے بعد مرتب کیا ہے دراصل ایک دستاویز ہی نہیں بلکہ مستقبل کے مورخوں اور تحقیق کے طلباء کے لیے حوالے کی گراں قدر خدمات انجام دینے کا مرتبہ بھی رکھتی ہے''۔

سید محمد اصغر کاظمی کے لکھنے کی عمر ۱۵ سال ہے، مضامین کی تعداد تو سینکڑوں میں ہوگی، وہ اخبارات کے علاوہ متعدد ادبی رسائل میں لکھتے ہیں ان میں نگار پاکستان، نفاذ اردو، ارمغان حمد، الانسان، سربکف، دانش، جہان حمد، تجدید نو، تذکرہ، ادبِ لطیف، عبارت، الملتگایہ اور محافظِ حق شامل ہیں۔ ان کی اولین کتاب ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی جو کہ 'سب رس اور رانی کیتکی کا تنقیدی جائزہ تھا۔ اس بتداء کے بعد مولف تدوین کی جانب مائل نظر آتے ہیں۔ اشتیاق اظہر اور مولانا حسرت موہانی کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی جانب مائل ہوئے اور اشتیاق اظہر، مولانا حسرت موہانی اور پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حوالے سے تالیفات منظر عام پر آئیں۔ دیگر موضوعات میں نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، خطوط، اداریے کے حوالے سے ایک ایک کتاب سامنے آئی۔

کاظمی صاحب اس وقت گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں اردو کے استاد ہیں، کالج کی ادبی سرگرمیوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ مَیں بھی اس کالج سے کوئی ۱۲ سال منسلک رہا، میرے ریٹائرمنٹ کے بعد کالج کے مجلے ''روایت'' کی ادارت انھوں نے ہی سنبھالی اور مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۲ء کے

مجلے شائع ہوئے۔ ان سے قبل مجلّہ روایت ۲۰۰۴ء اور مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء گولڈن جوبلی نمبر میری ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ میرے اور کاظمی صاحب سے قبل اردو کی معروف و محترم شخصیات کالج میگزین کی ادارت کے فرائض انجام دے چکی تھیں ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی ادارت میں کالج کا اولین مجلّہ شائع ہوا، طلبہ کی جانب سے پروفیسر سحر انصاری میگزین سیکریٹری تھے، بعد میں ڈاکٹر عبد السلام، پروفیسر مسیح الدین صدیقی، شاہد عشقی، پروفیسر ایس ایم لطیف اللہ، پروفیسر سراج الدین قاضی اور ڈاکٹر حسن محمد خان صاحب نے ادارت کے فرائض انجام دیے۔

آخر میں اپنی بات صہبا اختر کے ان اشعار پر ختم کرونگا۔

مبارک ہیں وہ ہاتھ اور قلم
جو کرتے ہیں زندہ کتابیں رقم
کتابوں میں جس نے اضافہ کیا
سرطاقِ فن اِک دیا رکھ دیا
لکھے حرف جو مجھے احترام
قلم کے قبیلے کو میرا سلام

کراچی ، ۲۳ اگست ۲۰۱۲ء

ڈاکٹر طاہر تونسوی - اردو ادب کا روشن ستارہ

شخصی خاکہ

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر یا ان سے ملاقات کرنے کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کے شعور کا حصہ بن جائیں۔پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی سے میری ملاقات کو ابھی مختصر وقت ہی ہوا تھا، ان کی شخصیت میں مجھے ایسی جادوئی کشش محسوس ہوئی کہ وہ میرے شعور کا حصہ بن گئے۔ڈاکٹر صاحب میرے پرانے واقف کار نہیں' ان کا شعبہ الگ 'میرا شعبہ الگ۔ ان سے دوستی کو سال بھی نہیں ہوا، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم برسوں پرانے وقف کار ہیں۔ہمارے مابین ملتان کی مقدس سر زمین قدر مشترک ہے۔ ان کی جنم بھومی' تونسہ شریف، 'میری جنم بھومی' میلسی ،'جن میں دو تین سو کلو میٹر کا ہی فاصلہ ہوگا۔ میں دنیا میں ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو آیا' وہ یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو وارد ہوئے،اس طرح وہ مجھ سے ڈھائی ماہ آگے ہیں۔ انہوں نے کراچی کے ماری پور کے ماڈل اسکول سے اپنی عملی زندگی کا آغاز بہ حیثیت استاد کے کیا، میرا تعلق بھی مسرور بیس سے رہا، مَیں نے سیکنڈری اسکول تک تعلیم اسی جگہ سے حاصل کی۔ وہ مکمل ادیب 'مَیں ادیبوں کا چاہنے والا، وہ شاعر' میں شاعروں کے خاندان سے متعلق۔ وہ محقق، سوانح نگار اور خاکہ نگار' میں نے بھی اس موضوع پر

تھوڑا بہت لکھا اور شخصیات کو اپنا موضوع بنایا، سوانحی مضامین اور خاکے لکھے ۔اور سب سے اہم بات جو قربت سے سامنے آئی کہ ہمارے مزاج میں بڑی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔اسی مطابقت نے ہی ہمیں مختصر وقت میں قریب کر دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض لوگوں میں اتنی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں کہ اگر مجھ جیسا شخص ان پر قلم اٹھانا چاہیے تو شخصیت کو قلم کی گرفت میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ساتھ بھی ہے، وہ اس قدر خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں کہ میرے لیے ان کی ان خوبیوں کو اور صلاحیتوں کو سمیٹنا مشکل ہو گیا۔مجھے یقین ہے کہ میں ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں گا۔ میرے موضوع کا نام حفیظ الرحمٰن ، طاہر تخلص، تونسہ شریف سے نسبت نے انہیں طاہر تونسوی بنا دیا۔تونسہ ڈیرہ غازی خان کی ایک مشہور تحصیل ہے۔ڈیرہ غازی خان سے پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے، کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔یہاں معروف صوفی بزرگ خواجہ محمد سلیمان تونسوی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جن کی تعظیم سے تونسہ 'تونسہ شریف' کہلاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب تونسہ میں یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو کاشانہ محمود میں پیدا ہوئے ۔ تونسہ کو اپنی شناخت بنا لیا، اب لوگ ان کے اصل نام سے بھی واقف نہیں۔آپ اردو کے محقق، نقاد، شاعر، سوانح وخاکہ نگار، سرائیکی ادب کا منفرد حوالہ، استاد اور مقرر کی حیثیت سے معروف ہیں۔اپنے نام کے ساتھ تونسوی کے لاحقہ کا اضافہ کرنے کی وجہ آپ نے یہ بیان کی کہ' تونسہ میں تصوف کی روایت کے ساتھ ساتھ ادب کی

روایت بھی ہے۔ تونسہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات فکر تونسوی، سرور تونسوی اور فدائے ادب تونسوی اپنے زمانے کے معروف ادیب و دانش ور تھے۔ فکر تونسوی کی کتاب 'چھٹا دریا' بہت ہی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ اپنی اس تصنیف میں فکر تونسوی کا کہنا ہے کہ پانچ دریاؤں کی مقدس سرزمین میں چھٹے دریا کا اضافہ ہوا وہ خون کا دریا تھا' یعنی تقسیم ہند کے وقت انسانی جانوں کا جو خون بہایا گیا' اُسے انہوں نے خون کے چھٹے دریا سے تشبیہ دی۔

سرور تونسوی بنیادی طور پر صحافی تھے' ساتھ ہی مشاعروں کی روداد لکھنے کے ماہر بھی تھے، فدائے ادب تونسوی طنز و مزاح لکھتے تھے۔

۱۱ مئی ۲۰۱۰ء کو مَیں نے سرگودھا یونیورسٹی میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر جوائن کیا۔ رہائش یونیورسٹی کے ٹیچرز ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۵ میں تھی' جہاں مَیں بائیولوجی کے ڈاکٹر ظفر اقبال کا روم پاٹنر تھا۔ شہر نیا، لوگ نئے، ماحول اجنبی' البتہ خالصتاً علمی۔ زندگی کا پہلا تجربہ تھا گھر سے باہر رہنے کا' وہ بھی ہاسٹل لائف۔ اکثر احباب سے سنا کرتا تھا کہ ہاسٹل لائف عام زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ مَیں شعبہ سے واپس ہاسٹل آتا اور عصر کی نماز کے لیے مسجد چلا جاتا اور پھر کیمپس کے پر فضا ماحول میں کھو جایا کرتا۔ جامعہ سرگودھا کا عین وسطی حصہ خوبصورت منظر پیش کرتا ہے' اس میں وسیع و عریض سرسبز کھیل کے میدان، جن کے گرد لہلہاتے درخت حسین نظارہ پیش کرتے

اور شام کے اوقات میں ان میدانوں میں طلباء ہر قسم کے کھیلوں میں مصروف نظر آتے۔ ان میدانوں کے چہار اطراف صاف ستھری سڑکیں صبح و شام جاگنگ ٹریک جہاں ہر عمر کے لوگ صبح و شام دوڑتے اور چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ مَیں بھی اس حسین منظر نامے کا حصہ بن گیا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر واپس ہاسٹل کا رخ کرتا تو باہر کھلی فضا میں کرسیاں رکھی ہوا کرتیں اور ایک کرسی پر عام طور پر ایک صاحب کو مستقل بیٹھا ہوا دیکھا کرتا، میرے ہی ہم عمر تھے۔ مَیں انہیں دور ہی سے سلام کر دیا' کرتا وہ مجھے اسی طرح جواب دے دیا کرتے۔ اکثر احباب ان کے پاس آکر بیٹھتے اور چلے جاتے' لیکن یہ مستقل مزاجی سے اپنی نشست پر براجمان رہتے۔ ایک دن ڈائینگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے ہوئے تفصیلی تعارف ہوا۔ جب مَیں نے انھیں یہ بتایا کہ میرا تعلق کراچی سے ہے اور مَیں ڈاکٹر محمد فاضل کے شعبہ میں استاد کی حیثیت سے آیا ہوں، عمر تو کراچی میں گزری' لیکن پنجاب کا شہر میلسی میری جنم بھومی ہے۔ انہوں نے بھی اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام طاہر تونسوی ہے شعبہ اردو کا چیر مین ہوں۔ اب ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ دور دور کے سلام قربتوں کے سلاموں میں بدل گے' ساتھ ہی مَیں باقاعدگی سے ان کی شام کی محفل کا مستقل حصہ بن گیا اور گرمیوں کی شامیں ایک ساتھ گزرنے لگیں' حتیٰ کہ گرم شامیں سرد شاموں میں تبدیل ہو گئیں اور یہ بھی فرق ہوا کہ یہ محفل کھلی فضا کے بجائے میرے کمرے میں سجنے لگی۔ اس محفل میں ہمارے شریک ڈاکٹر ظفر اقبال اور ڈاکٹر عبدالرشید رحمت بھی ہوتے،

ڈاکٹر ظفر بائیالوجی میں اور ڈاکٹر عبدالرشید رحمت ، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، ڈاکٹر صاحب کے رفیق کار ڈاکٹر خالد ندیم بھی اس محفل کے شریک ہوتے ۔ ڈاکٹر خالد ڈاکٹر صاحب کے قریبی ساتھی ہیں۔ کبھی کبھار ڈاکٹر شاہد راجپوت جو ہمارے ہاسٹل کے میس سیکریٹری تھے' شریک محفل ہو جایا کرتے۔'

کہتے ہیں کہ کسی بھی شخصیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس شخصیت سے قربت ہی درست پس منظر مہیا کرتی ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کی پہچان اس کے ساتھ سفر کرنے یا ایک ساتھ وقت گزارنے سے ہوتی ہے ۔ماضی میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کسی بھی بڑی شخصیت کی سوانح قلم بند کرنے کے لیے قلم کار کو اپنے موضوع کے ساتھ کچھ وقت گزارنا پڑا اس قربت کے نتیجے میں ہی قلم کار اپنے موضوع کو جان سکا اور اس کی زندگی کے بارے میں لکھ سکا۔ہیکٹر بولیتھو نے قائداعظم کی سوانح تحریر کرنے کی منصوبہ بندی کی تو اُسے قائد کی قربت حاصل کرنا پڑی اور اس مقصد کے لیے وہ پاکستان آیا اور قائد کے روز و شب کا ساتھی بنا۔ ستار طاہر نے شہید حکیم محمد سعید کی سوانح قلم بند کی تو انہیں بھی حکیم صاحب کے ساتھ کچھ دن گزارنے پڑے۔ میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ زیادہ قربت بھی اس تناظر سے محروم کر دیتی ہیں'جو شخصیت کو سمجھنے کے لیے مُحدب شیشے کا کام کرتا ہے'۔مجھے کچھ

عرصہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی قربت کا شرف حاصل ہوا، یہ قربت جامعہ سرگودھا کے ٹیچرز ہاسٹل نے فراہم کی، جہاں پر وہ کمرہ نمبر ۲ مَیں اور میں کمرہ نمبر ۵ کا مقیم تھا۔ یہ تحریر اسی قرابت داری کا پیش خیمہ ہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں مجھے اپنے موضوع کو سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہوئی، مَیں نے اُنہیں قریب سے دیکھا، مختلف موضوعات پر کھل کر سیر حاصل گفتگو کی، سادہ طبیعت کے مالک ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مَیں اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں ڈاکٹر طاہر تونسوی پر آسانی سے کچھ لکھ لوں گا، جیسے جیسے میں ان کی شخصیت کو ٹٹولتا گیا' میری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب مَیں نے ان کے کام کا مطالعہ کیا اور ان مضامین، خاکوں، ان پر لکھی گئی کتابوں اور رسائل کے خاص نمبروں کا مطالعہ کیا تو ایک مرحلے پر مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اپنا قلم بس یہیں روک لوں۔ ڈاکٹر صاحب سے اپنے اس ارادے کا ذکر کرچکا تھا کہ سوانحی مضامین یا خاکہ نویسی میرا مشغلہ ہے اور مَیں آپ پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس وجہ سے حوصلہ نہیں ہوا یہ کہنے کا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کام میرے بس کا نہیں۔ آپ پر تو بے شمار قلم کار طبع آزمائی کرچکے۔ بعض تو اردو ادب کا بڑا نام ہیں، مَیں کہاں؟ میرا مقام کہاں؟ لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحبت نے مجھے حوصلہ دیے رکھا اور میں اپنی منزل کی جانب بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی حساس اور درد مند انسان ہیں، دوستوں کے دوست، خیال کرنے والے اور کام آنے والوں میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے، ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد ملک خدا بخش محمود محکمہ انہار میں ملازم تھے، ڈپٹی کلکٹر ریٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم تونسہ میں حاصل کی، ایم اے اور پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ طاہر تونسوی کی تربیت میں ان کی والدہ عائشہ بی بی کا زیادہ حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تین بھائی (خلیل الرحمٰن، جمیل الرحمٰن) ہیں، بہن کوئی نہیں۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ والد صاحب کی توجہ سے محروم ہوگئے، جس کی وجہ والد صاحب کا دوسری شادی کر لینا تھا۔ آپ کی والدہ اور چچا ملک قادر بخش' جو بعد میں آپ کے سسر بھی ہوئے' نے پرورش میں اہم کردار ادا کیا۔ چوں کہ آپ اپنے بھائیوں میں بڑے تھے' اس وجہ سے ذمہ داریاں اور مشکلات بھی زیادہ اٹھانا پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی والدہ مرحومہ سے بے انتہا محبت و عقیدت رکھتے ہیں، ایک دن گفتگو میں والدہ کا ذکر کرکے آب دیدہ ہوگئے۔ آپ کا کہنا ہے کہ والدہ کے انتقال کے بعد گھر سے برکت ہی اٹھ گئی۔ جنوری ۲۰۱۱ء میں والدہ کی برسی کے موقع پر آپ ملتان تو نہ جاسکے' لیکن برسی کے سلسلے میں آپ کئی دن مسلسل متفکر رہے اور اپنے بیٹوں اور بہوؤں کو برسی کے سلسلے میں مسلسل ہدایت دیتے رہے، ان دنوں وہ خاصے رنجیدہ بھی رہے۔ اپنے بیٹوں (عامر حفیظ، ناصر حفیظ)، بہوؤں (گل رخ عامر، صبا ناصر)، پوتے محمد عبداللہ، پوتیوں دل نشیں (عنیزہ

علیہا، طیبہ، فاطمہ اور سدرہ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو سعادت مند، بہوویں ملیں، دونوں کا معمول ہے کہ ہر روز شام سات بجے کے بعد الگ الگ فون کرتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی خیریت دریافت کرتی ہیں، ڈاکٹر صاحب اپنی پوتیوں اور پوتے محمد عبد اللہ سے بات ضرور کرتے ہیں۔ اپنی پوتیوں اور پوتے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر دیدنی خوشی ہوتی ہے۔ شام ہوتے ہی آپ کو فون کا انتظار رہتا ہے' اگر کسی وجہ سے فون نہ آئیں تو یہ از خود فون کرکے پہلا سوال یہ کرتے ہیں کہ ' ہاں بھئی کیا وجہ، خیریت تو ہے' فون کیوں نہیں کیا'۔ ان کا پوتا ابھی چھوٹا ہے اور ابھی بولنا شروع کر رہا ہے، یہ اُسے بھی فون پر بلاتے ہیں اور صرف یہ کہتے ہیں کہ محمد عبد اللہ جانی! اپنے بوڑھے بابا کو ڈراؤ تو سہی۔ جواب میں یقینا وہ صرف ہنستا ہوگا یا کسی بھی قسم کی آواز نکالتا ہوگا۔ اس کی اس ادا پر فریفتہ اور قربان ہوئے جاتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی پوتی فون پر نہ آئے اور ان کی بہو یہ بتائے کہ وہ سو گئی ہے تو یہ قدرِ متفکرانہ انداز سے دریافت کرتے ہیں 'کیوں بھئی! کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے'۔ آپ کا انداز ایک مشفق باپ کا ہوتا ہے۔ خاندان کے سربراہ کو جن خوبیوں کا مالک ہونا چاہیے' وہ تمام کی تمام خوبیاں آپ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر تونسوی کی علمی خدمات کو حکومت پاکستان نے سراہتے ہوئے ۲۰۰۹ء میں تمغہ امتیاز سے نوازا، مختلف ادبی اور سماجی تنظیموں کی جانب سے بھی آپ کو اعزازات سے نوازا گیا، اسی سال ۲۰۱۱ء میں ادارہ نیاز و نگار کی جانب سے آپ کو "نشان نیاز' (نیاز فتح پوری ایوارڈ) سے نوازا گیا۔ ان کے چاہنے والوں نے ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے خاکے اور سوانحی مضامین لکھے۔ آپ کی تخلیقات کا اشاریہ رابعہ سرفراز نے مرتب کیا، ڈاکٹر عامر سہیل نے ڈاکٹر طاہر تونسوی پر کتابیات مرتب کی۔ شہزاد بیگ نے ' ڈاکٹر طاہر تونسوی: ایک مطالعہ' کے عنوان سے کتاب مرتب کی، ڈاکٹر اسد فیض نے اعتبار حرف کے عنوان سے مجموعہ مرتب کیا، ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تنقیدی مضامین کا انتخاب فن نعت کی نئی جہت' کے عنوان سے محمد حیات چغتائی نے مرتب کیا۔'

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی علمی کاوشوں پر جامعہ الازہر (قاہرہ) مصر میں ایمن عبد الحلیم مصطفیٰ احمد نے ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم کی نگرانی میں بہ عنوان ' ڈاکٹر طاہر تونسوی بہ حیثیت تنقید نگار' پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا، بھارت کی ونوبھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ (جھارکھنڈ) میں محمد عاشق خان نے ڈاکٹر جلیل اشرف کی نگرانی میں بہ عنوان 'ہم عصر اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی خدمات' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، پاکستان کی تقریباً تمام ہی جامعات میں آپ کی شخصیت اور علمی کاوشوں پر ایم فل

اورایم اے کی سطح پر مقالات لکھے جاچکے ہیں۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں فاروق فیصل نے ڈاکٹرشفیق احمد کی نگرانی میں ' ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تحقیق و تنقید کا تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، سمیہ ناز نے ڈاکٹر عقیلہ شاہین کی نگرانی میں ایم اے اردو کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی ، بہاولپور میں ' ڈاکٹر طاہر تونسوی بحثیت محقق و نقاد' مقالہ تحریر کیا، صدف ناز نے پروفیسر فہمیدہ شیخ کی نگرانی میں ایم اے اردو کے لیے جامعہ سندھ جامشورو میں 'ادبیات اردو کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کردار' کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا، صائمہ تبسم منصوری نے ڈاکٹر ہلال نقوی کی نگرانی میں ایم اے اردو کے لیے جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر میں 'ڈاکٹر طاہر تونسوی کی قلمی خدمات 'کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا ،یونیورسٹی کالج آف ایجو کیشن ملتان میں طاہرہ بی بی نے ڈاکٹر شوکت مغل کی نگرانی میں ایم اے اردو کے لیے 'ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تعلیمی خدمات ' کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔نسرین بتول نے ڈاکٹر عقیلہ جاوید کی نگرانی میں ایم اے اردو کے لیے جامعہ بہاء الدین ملتان میں مقالہ تحریر کیا۔مختلف رسائل وجرائد نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے حوالہ سے خصوصی نمبر بھی شائع کیے :ان میں ماہ نامہ 'وجدان 'لاہور،' ہم عصر'ملتان ، 'اہل قلم' ملتان، ماہ نامہ ' شام و سحر' اور روزنامہ ' آفتاب' ملتان شامل ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شخصیت ایک کھلی کتاب کی سی ہے، انھوں نے دوسروں پر اور دوسروں نے ان پر بہت کچھ لکھا، جو کتابوں اور رسائل میں محفوظ ہے۔ پھر بھی انسان کی شخصیت کے بعض پہلو وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے اب ڈاکٹر سلیم اختر والا وہ طاہر تونسوی نظر نہیں آیا' جو ملتان میں بیٹھ کر لاہور کو سر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، نہ ہی چومکھی لڑتا ہوا ڈاکٹر طاہر تونسوی کہیں دکھائی دیا۔ یہ تو صلح جو ہے، امن پسند ہے، ہر ایک سے خوش ہو کر ملتا ہے، البتہ صاف گو، نڈر، غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا اس کے مزاج کا حصہ ہمیشہ سے رہا ہے اور اب بھی ہے۔ یہ بے چین بگولہ ضرور ہوگا' کیونکہ اپنی عمر کے اس حصہ میں جب کہ اکثر لوگ گھر بیٹھ جایا کرتے ہیں اور اللہ اللہ کرتے نظر آتے ہیں، ڈاکٹر طاہر تونسوی ہے کہ اللہ اللہ کے ساتھ بہت کچھ کر گزرنے کے بعد بھی بہت کچھ کرنے کی لگن اپنے دل میں لیے ہوئے ہے بلکہ عملی طور پر میدان عمل میں دکھائی دیتا ہے، ہشاش بشاش گھر سے دور ہاسٹل لائف گزار رہا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر فرمان فتح پوری ' وہ طبعاً فعال شخصیت ہیں اور جس کام کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کو ہر زاویے سے قابل توجہ بنا دیتے ہیں'۔ عطاء الحق قاسمی نے روزنامہ جنگ میں اپنے کالم 'روزنِ دیوار سے' میں تونسوی صاحب کے بارے میں لکھا کہ ' 'یونیورسٹی کے شعبہ اردو (سرگودھا یونیورسٹی) کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر طاہر تونسوی جیسا ایک فعال سربراہ میسر ہوا۔ شوگر کا مرض انسان کو بے بس بنا کر رکھ دیتا ہے لیکن طاہر تونسوی نے شوگر

کو بے بس بنا کر رکھا ہوا

ہے''۔

برصغیر میں کسی بھی جگہ اردو کے حوالہ سے منعقد ہونے والا کوئی سیمینار یا کانفرنس ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔ سرگودھا جیسے شہر میں عالمی اردو کانفرنس کروا ڈالی' جس میں پاکستان ہی نہیں' ہندستان، بنگلہ دیش، مصر، امریکہ سے دانش وروں نے بھرپور شرکت کی۔ سرگودھا کہنے کو تو شاہینوں کا شہر ہے 'لیکن عوام الناس کے لیے ائرپورٹ کی سہولت سے محروم ہے، یہاں پہنچنے کے لیے اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد سے تین گھنٹے کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ اس مشکل کے باوجود عالمی اردو کانفرنس میں مندوبین نے بھرپور شرکت کی، کانفرنس کی کامیابی کا سہرا ڈاکٹر طاہر تونسوی ہی کو جاتا ہے۔ ۲۰۱۱ء میں منعقد ہونے والا نیاز، نگار و فرمان سیمینار کراچی میں منعقد ہوا، مجھے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ساتھ اس سیمینا میں شرکت کا موقع ملا۔ خوشی اس بات کی رہی کہ اس موقع پر طاہر تونسوی کراچی میں میرے مہمان تھے۔ تین دن مختلف شخصیات سے ملاقات بھی رہی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے گھر ان سے ملاقات کی، انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب سے بھی ملے، معراج جامی صاحب کے دفتر بھی گئے اور انہوں نے اپنے گھر چائے پر بھی بلایا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ انہی دنوں ایکسپو سینٹر میں

کتابوں کی عالمی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اکیڈمی ادبیات کراچی کے ڈائریکٹر نور محمد پٹھان کی دعوت پر افتتاحی تقریب میں بھی شرکت کی ۔ڈاکٹر ظفر اقبال، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، جامعہ کراچی ڈاکٹر طاہر تونسوی کے دیرینہ دوست ہیں، انہوں نے ازراہ عنایت اپنے گھر واقع یونیورسٹی کیمپس دعوت پر بلایا، اس موقع پر ان کے ساتھ طویل نشست رہی۔انہوں نے ازراہ عنایت اپنی ذاتی لائبریری کا ایک حصہ بھی دکھایا' جو ان کے کیمپس کے مکان کے گیراج میں قائم ہے۔کتابیں خوبصورت الماریوں میں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی ذاتی لائبریری مختلف جگہ بکھری ہوئی ہے ۔ان کی لائبریری دیکھ کر محسوس ہوا کہ یہ گھر واقعی کسی پروفیسر کا گھر ہے۔

ایک وقت تھا جب ڈاکٹر طاہر تونسوی ادبی معرکہ آرائیاں کرتے نظر آتے تھے،یہی وجہ ہے کہ اس دور کے لکھنے والوں نے جب بھی ڈاکٹر طاہر تونسوی پر قلم اٹھایا تو ان معرکوں کو بنیاد بنایا، حالانکہ انہوں نے ہمیشہ اصولوں پر اختلاف کیا۔ اس موقع پر وہ کبھی اپنے استادوں کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں' کبھی دوستوں کے لیے مخالفین کو جواب دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے اُن معرکوں کے بارے میں اب ان کا کہنا ہے کہ ' مجھے ان سے نقصان ہی ہوا، فائدہ نہیں'۔ طاہر تونسوی دوستوں کے دوست ہیں۔آپ کا کہنا ہے کہ ' ' مَیں دوستوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا شخص ہوں' اپنے دوستوں کا دفاع کرنے سے مَیں نے

کبھی گریز نہیں کیا‘‘۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی طبعاً شاعر اور تخلیقی فن کار ہیں، شعر کہنا ان کی جبلت اور فطرت میں شامل ہے۔ان کے ادبی سفر کا آغاز شاعری ہی سے ہوا، ابتدا میں استاد فیض تونسوی سے اصلاح لی۔۔پہلا شعر ۱۳ سال کی عمر میں کہا'جب وہ میٹرک میں تھے۔ یہ نظم بچوں کے لیے تھی، اس نظم کا ایک مصرع' جو تونسوی صاحب کو یاد ہے کچھ ایسے ہے ۔

میں ڈاکٹر بنوں گا جب مَیں جوان ہوں گا
ابا سے پیسے لے کر دوائی مَیں مفت دوں گا

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے شاعر کی حیثیت سے ہی ادبی سفر کا آغاز کیا۔ دورانِ تعلیم ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی اور خواجہ محمد زکریا جیسے اردو کے اعلیٰ پائے کے اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہوئی اور عرش صدیقی جیسے پائے کی شخصیت نے ان کا حوصلہ بلند کیا۔ تحقیق و تنقید کی جانب مائل ہونے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر تونسوی نے بتایا کہ ان کے محترم استاد ڈاکٹر سلیم اختر کے کہنے پر کہ مَیں دو کشتیوں میں پاؤں نہ رکھوں اور شاعری کے بجائے تحقیق و تنقید کو بنیاد بناؤں مَیں نے شاعری کو ثانوی حیثیت دینا شروع کردی' لیکن ختم نہیں کی اور اپنی تمام تر صلاحیتیں تحقیق و تنقید پر صرف

گیں۔اور ایک تنقید نگار کے طور پر مقبول ہوئے۔طاہر تونسوی نے اپنے اندر کے شاعر کو بھی جگائے رکھا، شعر کہتے رہے اور بہت خوب کہا۔ محسن نقوی نے طاہر تونسوی کی شعری صلاحیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا کہ ''طاہر تونسوی کم کم شعر کہتا ہے' مگر سوچ سمجھ کر کہتا ہے''۔ شعر اور شاعر سے عقیدت طاہر تونسوی کے مزاج کا حصہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں جب پہلی مرتبہ ایم اے میں مقالہ لکھنے کا موقع ملا تو انہوں نے ملتان کے شعرا کو اپنا موضوع بنایا۔کہا جاتا ہے کہ وہ جناب احسان دانش پر کام کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے وہ احسان دانش کے ہمراہ اپنے استاد ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس گئے' لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے احسان دانش کو جواب دیا کہ آپ پر کام کرنے والے تو بہت ہیں' ملتان کے شعرا پر کام طاہر تونسوی سے بہتر کوئی نہ کرسکے گا۔ احسان دانش نے بھی اس بات سے اتفاق کیا اور تونسوی صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر نگرانی ملتان کے شعرا'' پر مقالہ قلم بند کیا۔یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو اسے بہت'' پذیرائی حاصل ہوئی۔ اپنے موضوع پر پہلا اور منفرد کام تھا، اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا 'حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو کو جہاں چھوڑا تھا' طاہر تونسوی نے اس کو بہت آگے بڑھایا ہے'۔اے بی اشرف نے اس کتاب کو 'ملتان کی شعری تاریخ' قرار دیا، تاج سعید کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی محنت کرنا جانتا ہے' اپنی اس تالیف سے ملتان کو زندہ جاوید تذکرہ بنا دیا ہے'۔ ان کا شعری مجموعہ تو طے'

ہوا نا' ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے پسندیدہ شعرا میں میرؔ، اقبالؔ، غالبؔ، فیضؔ، ندیمؔ اور فرازؔ ہیں۔ میر کو پسند کرنے کی وجہ میرؔ کا سوز و گداز، اقبالؔ کی قومی شاعری، غالبؔ کا رنگ سخن، فیضؔ کی انقلابی شاعری، ندیمؔ کا تہذیبی شعور اور فرازؔ کا رومان اور انقلاب سے بھرپور لب و لہجہ پسند ہے تاہم ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کہنا ہے کہ فرازؔ زمانہ طالب علمی سے پسندیدہ شاعر ہے، مَیں جب انٹرویوز دیا کرتا تھا تو کسی نہ کسی طریقہ سے احمد فرازؔ کی شاعری پر گفتگو کیا کرتا تھا۔اب جب کہ اللہ کے فضل و کرم سے انٹرویوز لینے کا موقع ملتا ہے تو میں احمد فرازؔ کی شاعری کے بارے میں سوال ضرور پوچھتا ہوں اور اس کے یہ دو شعر مجھے پسند ہیں:۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے
فاصلہ کچھ نہیں ترے در تک
زندگی راستے میں پڑتی ہے

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ادیبوں اور دانش وروں پر بھی قلم اٹھایا، آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالہ سے بھارت کے معروف دانش ور خلیق انجم نے کہا کہ

ڈاکٹر طاہر تونسوی اعلا درجے کے لکھنے والوں میں ہیں۔ ادب میں ان کا صاف ستھر مذاق ہے'۔ بھارت ہی ایک اور دانش ور، محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو 'ایک نعل در آتش اور کار آگاہ محقق' قرار دیا۔ آپ کی تخلیقات میں 'ہم سفر بگولوں کا'، 'مسعود حسن رضوی ادیب حیات اور کارنامے'، 'فیضؔ کی تخلیقی شخصیت'، 'غالبؔ تب اوراب'، 'ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت و تخلیقی شخصیت'، 'وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر'، 'ڈاکٹر فرمان فتح پوری احوال و آثار'، 'دنیائے ادب کا عرش'، 'سر سید شناسی'، 'جہت ساز قلم کار ڈاکٹر سلیم اختر'، 'جہت ساز دانش ور ڈاکٹر عرش صدیقی'، جہت ساز تخلیقی شخصیت ع س مسلم'، 'شجر سایہ دار سحرا کا' (کشفی ملتانی) شامل ہیں۔' اقبالؔ سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کو خاص عقیدت ہے، اقبالؔ کے حوالہ سے آپ کی متعدد کتب شائع ہوئیں ان میں 'حیات اقبال' ، ' اقبال اور پاکستانی ادب'، 'اقبال اور مشاہیر'، 'اقبال اور سید سلیمان ندوی'، ' اقبال اور عظیم شخصیات'، 'اقبال شناسی اور نخلستان'، 'اقبال شناسی اور التخیل'، ' اقبال شناسی اور نیرنگ خیال'، 'اقبال شناسی اور نیاز و نگار' شامل ہیں۔ فیض احمد فیضؔ سے ڈاکٹر صاحب کو خاص عقیدت ہے۔ 'فیض کی تخلیقی شخصیت'، ' فیض احمد فیض : تنقیدی مطالعہ'، ' شاعر خوش نوا۔ فیض' (بسلسلہ فیض صدی) اور' مطالعہ فیض کے ماخذات' (اشاریہ) آپ کی تصانیف ہیں۔ غالبؔ کے حوالہ سے آپ کی کتاب 'غالب

تب اور اب' (مسعود حسن رضوی کے مضامین) منظر عام پر آچکی ہے جسے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی اردو تنقید میں معتبر حوالہ ہیں، ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے انہیں 'سماجیاتی دبستان کا نقا' د قرار دیا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ 'تحقیق و تنقید اور اقبالیات میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے لیے جو نام اور مقام بنایا ہے' وہ اس کی محنت کا ثمر ہے'، عرش صدیقی نے ڈاکٹر تونسوی کی تنقید کے حوالے سے رائے دی کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تنقیدی اسلوب امتزاجی ہے'۔ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے کہ' ڈاکٹر طاہر تونسوی اپنی تاریخی اہمیت کی بدولت مستقبل کے محققوں اور نقادوں کے لیے دلیل راہ ثابت ہوگا'۔بھارت کے انیس اشفاق کا کہنا ہے کہ' ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تنقیدی تجزیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مضامین میں لفظیات واصطلاحات کی تکرار نظر نہیں آتی'۔بھارت ہی کے رام لعل کا کہنا ہے کہ' ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقید تجزیے اور تبصرے کی حدود کو پار کرتی ہوئی ایک نئے انداز کے ادبی مطالعوں کا سا لطف پیدا کردیتی ہے'۔ تحقیق و تنقید پر آپ کی تصانیف میں 'تجزیے'، 'رجحانات'، 'ہم سخن فہم ہیں'، ' لمحہ موجود۔ ادب اور ادیب'، 'افکار و تجزیات'، ' تحقیق و تنقید منظر و نامہ'، ' طنز و مزاح۔تاریخ تنقید انتخاب' اور ' تذکرہ کتابوں' کا شامل ہیں۔

فریدیات، تصوف اور صوفیائے کرام سے محبت اور عقیدت ڈاکٹر تونسوی کا خاندانی ورثہ ہے، آپ نے صوفیائے کرم کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور تصانیف تحریر کیں ان میں 'لطیف شناسی'، ' آئینہ خانہ شاہ لطیف'، ' خواجہ غلام فرید: شخصیت و فن'، ' فرمودات فرید'، 'مطالعہ فرید کے دس سال'، 'عکس فرید'، ' خواجہ محمد ابراہیم یکپاسی اور ان کا خاندان' شامل ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی سرائیکی کے بھی ادیب ہیں، سرائیکی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ سرائیکی ادب کی تخلیق کے حوالہ سے پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا کہ 'ڈاکٹر طاہر تونسوی کے ادبی کمالات کا ایک رخ سرائیکی دنیا کی ادبی اور تہذیبی شخصیت کی دلکش و دلنواز پیشکش بھی ہے۔ پاکستان کی تہذیبی زندگی کو ان کی یہ ایسی عطا ہے' جسے اردو دنیا کبھی فراموش نہ کر سکے گی'۔ سرائیکی ادب میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تصانیف میں 'چراغ اعوان دی ہیر'، ' سرائیکی ادب: ریت تے روایت'، 'سرائیکی وچ مزاحمتی شاعری'، 'خوش دل۔حیات تے کلام'، ' خیر شاہ'، 'سرائیکی دے چونڑویں افسانے'، 'علامہ اقبال تے سرائیکی زبان و ادب' اور 'سرائیکی کتابیات 'شامل ہیں۔ دیگر کتب میں 'اردو اور بہاالدین زکریہ یونیورسٹی'، 'صنف نازک کی شاعری'، ' صنف نازک کی کہانیاں'، 'نصاب تعلیم اور اکیسویں صدی'، 'مسعود حسن رضوی' (کتابیات)، 'عرش صدیقی کے سات مسترد

افسانے' قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر طاہر تونسوی کو اللہ تعالیٰ نے خداداد صلاحیتوں سے نوازا' وہ اپنے مضامین اور تصانیف کے عنوانات ایسے رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا ششدر رہ جاتاہے اور فوری اس جانب متوجہ ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر انداز سرسری نہیں' بلکہ وہ اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔اپنے موضوع کے بارے میں تحقیق کی غرض سے انھوں نے دور دراز کے سفر بھی کیے' تاکہ ذاتی طور پر حقائق جان سکیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ملازمت کا آغاز کراچی کے ایک اسکول سے استاد کی حیثیت سے کیا۔ اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں کالج لیکچرر ہوگئے۔ ابتدائی تعیناتی گورنمنٹ کالج ، ڈیرہ غازی خان میں ہوئی، بعد ازاں ملتان، لاہور، کہروڑ پکا، کبیر والا،اور میانوالی کے مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے، ترقی پا کر اسسٹنٹ پروفیسر اور پروفیسر ہوئے، ۱۹۸۷ء میں پرنسپل ہوگئے اور مختلف کالجوں میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۳ء میں ڈائریکٹر کالجز، ملتان ہوگئے، بعد ازآں ملتان انٹر میڈیٹ بورڈ کے چیرمین ہوئے ، فیصل آباد انٹر میڈیٹ و سیکنڈری بورڈ کے چیرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مختلف علمی و تہذیبی اداروں سے وابستہ رہے ،اسی دوران بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے پرنسپل کی حیثیت سے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۷ء کو ریٹائر ہوئے اور ۲۲

جنوری ۲۰۰۸ء کو سرگودھا یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات کا آغاز کیا، شعبہ کی ترقی میں آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے' وہ جامعہ سرگودھا کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے۔ شعبہ میں ایم فل کلاسز کا آغاز آپ ہی کی کوششوں سے ہوا۔ تین سال جامعہ سرگودھا میں خدمات انجام دینے کے بعد آپ نے فیصل آباد یونیورسٹی میں خدمات کا آغاز کیا، جہاں پر آپ صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ذاتی کتب خانوں کو منتخب ، نایاب اور قلمی نسخوں کے حوالہ سے ہمیشہ سے انفرادیت حاصل رہی ہے۔ ماضی میں بے شمار علمی شخصیتیں ایسی رہی ہیں کہ جن کے ذاتی ذخیرے قیمتی اورنایاب علمی ذخیرے سے مالا مال تھے۔ آج بھی علم سے محبت کرنے والوں کے ذاتی علمی ذخیرے منتخب و نایاب کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں' ان علم کے قدر دانوں میں ایک نام ڈاکٹر طاہر تونسوی کا بھی ہے۔ان کی ذاتی لائبریری ہزاروں کتب و رسائل سے آراستہ ہے۔ آپ نے اپنے گھر واقع ملتان کی بالائی منزل پر لائبریری بنوائی 'جس میں بے شمار علمی سرمایہ محفوظ ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذخیرے سے 2/3 حصہ ملتان کے نزدیک واقع جھنڈیر لائبریری کو دے دیا ہے، جس میں کتب و رسائل کے علاوہ کافی تعداد میں خطوط بھی شامل ہیں۔ جھنڈیر لائبریری میں ایک ہال ڈاکٹر طاہر تونسوی کے نام سے معنون ہے، اس میں گوشہ عرشؔ صدیقی بھی ہے۔ غالبؔ سے ڈاکٹر صاحب کو خاص عقیدت

ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے ذاتی ذخیرے میں غالب پر خصوصی مواد محفوظ کیا، گویا آپ کی لائبریری کی خصوصیت اس میں قائم 'گوشہ غالب' ہے۔ آپ نے غالب پر اشاریہ بھی بنایا ہوا ہے، جس سے تحقیق کرنے والوں کو بھی سہولت ہوتی ہے۔ فرح ذبیح نے ڈاکٹر صاحب کی لائبریری میں قائم گوشہ غالب کی توضیحی و تشریحی فہرست مرتب کی 'جو ۳۰۱ اندراجات پر مشتمل ہے۔ فرح ذبیح کا یہ مضمون سہ ماہی 'ہم عصر' میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی از خود اشاریہ کی افادیت سے بخوبی آگاہ ہیں، آپ تحقیق و تنقید کے آدمی ہیں، ادب کی یہ صنف تلاش و جستجو کا تقاضا کرتی ہے اور یہ تلاش و جستجو اشاریہ اور کتابیات کے ذریعہ ہی پوری ہوتی ہے، چناں چہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اشاریہ اور کتابیات کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ ان کی تصانیف وتالیفات میں اشاریہ اور کتابیات بھی ملتی ہیں۔ کتابیات میں 'مسعود حسن رضوی' (کتابیات) مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی، 'سرائیکی کتابیات'، اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کی، اشاریہ کے حوالہ سے آپ کا مرتب کردہ اشاریہ 'مطالعہ فیضؔ کے ماخذات' کے عنوان سے مقتدرہ قومی زبان شائع کر رہی ہے، اس کے علاوہ آپ نے غالبؔ، خواجہ فرید، شاہ لطیف اور فراز پر اشاریہ مرتب کیے' جو مضامین کی صورت میں آپ کی تصانیف اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی از خود ہی محقق نہیں' بل کہ محقق گر بھی ہیں اور تحقیق کرنے

والوں کو تحقیق و جستجو میں دامے درمے سخنے کتابے معاونت بھی کرتے ہیں۔اس معاونت کا سلسلہ باقاعدہ کسی بھی تحقیق کرنے والے کے سپروائیزر کی صورت میں ہی نہیں بلکہ وہ مضامین لکھنے والوں، کتاب لکھنے والوں کو بھی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔اس رہنمائی کا کوئی وقت مقرر نہیں، ہر وقت اور ہر جگہ لوگ ان سے رابطہ کرتے ہیں اور وہ طالب کی دادرسی خوشی سے کرتے ہیں۔مجھے تو وہ چلتا پھرتا رہنمائی کرنے والا بگولہ دکھائی دیتے ہیں۔اکثر لوگ موبائل پر بھی ان سے رہنمائی لیتے ہیں، میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے کسی سے یہ کہا ہو کہ آپ کون ہیں، میرے پاس وقت نہیں یا اس مقصد کے لیے از خود حاضر ہوں۔

بلا تفریق، ہر کس و ناکس کی رہنمائی کرنا ڈاکٹر صاحب کا معمول ہے، جس نے جس وقت جو معلومات مانگی 'انہوں نے اسی وقت اسے فارغ کر دیا۔اپنے شعبہ میں بلند مقام پر پہنچنے کے بعد بھی سادگی کا یہ انداز ان کے بلند مرتبہ اور حقیقی استاد ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔دوسری جانب وہ تحقیق کرنے والوں کے باقاعدہ سپروائیزر بھی ہیں، ان کی نگرانی میں ڈاکٹر مختار ظفر نے 'ملتان کے نمائندہ شعرا' کے موضوع پر زکریا یونیورسٹی ملتان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ،ملتان کے معروف شاعر ڈاکٹر اسلم انصاری نے 'اردو شاعری میں المیہ تصورات: میر سے فانی تک' کے موضوع پر زکریا یونیورسٹی ملتان سے پی ایچ ڈی کی

ڈگری حاصل کی۔ رعنا محمد صفدر نے 'اردو آپ بیتی کی تاریخ: ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، پروفیسر محمد خان نے 'لکھنوی غزل میں مبالغہ' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، سجاد احمد پرویز نے 'اردو اور سرائیکی کے باہمی تراجم' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، چودھری بشیر احمد نے 'اقبال بحیثیت وکیل' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، فرح ذبیح نے 'لطیف الزماں کے کتب خانہ میں ذخیرہ غالبیات کی توضیحی و تشریحی فہرست' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی تسنیم آصف نے 'الطاف فاطمہ کی ناول نگاری کا فکری و فنی جائزہ' کے موضوع پر علامہ، اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، حمید الفت ملغانی نے 'سرائیکی کنایات' کے موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی، سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں نو طلباء و طالبات آپ کی نگرانی میں ایم فل کر رہے ہیں۔

گندمی رنگ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، درمیانہ قد، چوڑا سینہ، مضبوط جسم، چہرے پر مسکراہٹ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، کلین شیو، سنا ہے جوانی میں ،نواب آف کالا باغ کی طرز کی مونچھیں ہوا کرتی تھیں

سر پر مختصر بال جن میں چاندی نمایاں، سنجیدہ طرز گفتگو، معلومات کا خزانہ، ہر موضوع پر تفصیلی اور حوالائی گفتگو، گفتگو میں بر محل خوبصورت اشعار کا استعمال، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔

اللہ تعالٰی تونسہ شریف کے اس روشن ستارہ کو شاد آباد رکھے، علم و ادب کے فروغ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی علمی خدمات ہمیشہ قائم دائم رہیں گی اور انہیں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ اگر مجھ سے کوئی یہ پوچھے گا کہ میں نے جامعہ سرگودھا میں رہتے ہوئے کیا حاصل کیا تو مَیں بڑے فخر سے یہ کہوں گا کہ مَیں نے داکٹر طاہر تونسوی کی دوستی حاصل کی' جو میری باقی ماندہ زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوگی۔ چند اشعار ڈاکٹر طاہر تونسوی کے شعری مجموعے 'تو طے ہوا نا' سے:

تو طے ہوا نا کہ جب بھی لکھنا رتوں کے عذاب لکھنا
یہ دور اہل قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
اجاڑ موسم میں تپتے صحرا کو آب لکھنا حباب لکھنا
جو ہو سکے تو مرے حق میں فیصلے لکھنا
گناہ کو بھی ثواب کہنا ببول کو بھی گلاب لکھنا

شکستگی کے معانی مری لغت میں نہیں

میں ٹوٹ جاؤں تو اس کو بھی زاویے لکھنا

شائع شدہ: زرنگار، فیصل آباد، شمارہ ۷۔۸، جنوری۔ جون ۲۰۱۱ء۔ مصنف کے خاکوں

کے مجموعے ''جھولی میں ہیرے اور موتی''میں شامل)

اردو کے نامور استاد، ادیب و محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر آخر

اتوار ۴ اگست ۲۰۱۳ء کی صبح جنگ اخبار معمول کے مطابق پڑھنا شروع کیا صفحہ اول پر
جوں ہی نظر نیچے گئی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کی خبر پڑھ
کر دل بیٹھ سا گیا۔ فوری طور پر احساس ہوا کے ہم اردو ادب کی ایک اور اہم شخصیت
ممتاز ادیب، محقق، نقاد، ماہرِ تعلیم اور استاد الااساتذہ سے محروم ہوگئے۔ آپ نے
بروزہفتہ ۲۵ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ مطابق ۳ اگست کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس
روز کراچی میں شدید بارش تھی جس کے باعث تدفین نہ کی جاسکی۔ بارش کے باعث
اس روز اخبار بھی نہ آسکا اگر کسی بھی طرح تدفین کر دی جاتی تو یقیناً مجھ سمیت بے
شمار لوگ ڈاکٹر صاحب کے سفر آخری میں شرکت سے محروم رہ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب
کوئی تیس برس جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے منسلک رہے۔ آپ کی تحریر معیار اور
تعداد کے اعتبار سے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ پچاس کے قریب
تصانیف اور بے شمار مضامین شائع ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے مراسم ادب اور کتاب کے حوالے سے قدیم تھے۔ وہ مجھ
پر ہمیشہ مہربان رہے۔ ان کی محبت اور شفقت کو کبھی بھلایا نہیں

جا سکتا۔ جولائی ۲۰۱۳ء میں مَیں اپنی ایک کتاب ''شیخ محمد ابراہیم آزاد۔ شخصیت اور شاعری'' مکمل کر چکا تھا۔ خواہش تھی کہ اس کتاب پر بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا دیباچہ ہو۔ اپنی اس بات کا اظہار اصغر کاظمی صاحب جو رسالہ 'نگارِ پاکستان' کے مدیر ہیں سے کیا۔ وہ رسالے کے سلسلے میں ہر اتوار کی صبح ڈاکٹر صاحب کے پاس جایا کرتے تھے۔ مجھے اس بات کا علم بھی تھا کچھ عرصہ قبل مَیں ان ہی کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے بھی جا چکا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے جو صاحب فراش تھے ،ان کے لیے اٹھنا اور بولنا بھی مشکل تھا سے اس بات کا اظہار کیا کہ صمدانی صاحب اپنی ایک کتاب پر ان کے دیباچے کے خواہش مند ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ بھی سکیں۔ پھر بھی انہوں نے میری خواہش کو رد نہیں کیا اور کہا کہ جوں ہی انہوں نے اپنی طبیعت بہتر محسوس کی وہ یہ کام کر دیں گے۔ یہ بات جولائی کے ابتدائی ایام کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بستر پر لیٹے لیٹے کاظمی صاحب کو دیباچے کے نکات ڈکٹیٹ کرائے اور کاظمی صاحب نے دیباچہ مکمل کر کے ڈاکٹر صاحب کو پڑھ کا سنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیباچے سے بعض جملے نکالنے اور بعض میں ردو بدل کرنے کی ہدایت کی۔ڈاکٹر صاحب کا تصحیح شدہ دیباچہ کاظمی صاحب نے مجھے ۱۷ جولائی کو لا کر دیا اس دیباچے پر ۱۱ جولائی کی تاریخ درج ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کاظمی صاحب کو یہ بھی ہدایت کی کہ دیباچے کے آخر میں درج تاریخ نہ لکھی جائے۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو گی

کہ ڈاکٹر صاحب دیگر احباب کو اس طرح کے کاموں کے لیے معزرت کر چکے ہوں گے اور اس پر تاریخ درج ہو جانے سے دیگر مصنفین ان سے دیباچہ یا تقریظ کے لیے رجوع کر سکتے تھے۔ اس طرح مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دمِ رخصت آخر میری کتاب کا دیباچہ تحریر فرمایا۔ مَیں اس اعزاز پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھ پر ڈاکٹر صاحب کی یہ پہلی عنایت نہیں تھی۔اس سے قبل آپ نے میری دو کتابوں کی تقریبِ رونمائی میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ میری کتاب 'یادوں کی مالا' پر تبصرہ تحریر فرمایا اور میری شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب' جھولی میں ہیرے اور موتی' جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی کا فلیپ بھی ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ڈاکٹر صاحب اس قدر جلد چلے جائیں گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میری تفصیلی ملاقات' حلقۂ نیاز و نگار' کے سالانہ جلسے منعقدہ دسمبر ۲۰۱۰ء بمقام ڈاکٹر قدیر خان آڈیٹوریم ،وفاقی اردو یونیورسٹی کے موقع پر ہوئی تھی۔ مَیں ان دنوں سرگودھا یونیورسٹی سے منسلک تھا اور دسمبر کی تعطیلات میں کراچی آیا ہوا تھا۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد شعبہ اردو کے چیرَمین ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب جو اس وقت سرگودھا یونیورسٹی سے

ہی منسلک تھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے کراچی تشریف لائے تھے۔ ان کا قیام میرے گھر ہی تھا، تونسوی صاحب سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ تونسوی صاحب اور مَیں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے جہاں کچھ وقت ان کے ساتھ گزرا، نیاز و نگار کی اس ادبی کانفرنس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مخصوص احباب کے لیے جامعہ کراچی کے کیمپس میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اس ڈنر میں بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کافی وقت گزرا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب جو اب شیخ الجامعہ اردو ہیں اُس وقت جامعہ کراچی کے ڈین آف آرٹس تھے نے اپنی قیام گاہ پر تکلف دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا جس میں تونسوی صاحب کے ساتھ میں بھی شریک دعوت تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر میری رہائش سے نذدیک ہی ہے۔ میں گلشن اقبال کے بلاک ۶ میں اور ڈاکٹر صاحب کا گھر بلاک '۱۳ڈی ون' میں ہے۔ نماز جنازہ ظہر کی نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کے گھر کے نذدیک واقع 'مسجد خلفائے راشدین' میں ہونا تھی۔ میں وقت مقررہ پر ان کے گھر پہنچ گیا۔ بے شمار علمی ادبی، سیاسی، سماجی شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے احباب خصوصاً بیٹے (انجینئر سید اسرار علی) موجود تھے۔ میرے ساتھ پہنچنے والوں میں جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، جامعہ اردو کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر اقبال شامل تھے۔ دیگر معروف احباب میں قومی اسمبلی کے رکن متحدہ قومی

موومنٹ کے رہنما ڈاکٹر فاروق ستار، رؤف صدیقی، مزمل قریشی، واسع جلیل، پروفیسر سحر انصاری، جامعہ سرسید کے چانسلر انجینئر عادل عثمان، جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد قیصر، جسٹس ریٹائرڈ قاضی خالد علی، پروفیسر رئیس علوی، ڈاکٹر بلال علوی، احمد حسین صدیقی، رضوان احمد، یحییٰ ولی اللہ، ڈاکٹر یونس حسنی، روزنامہ جنگ کے اختر سعیدی، نوائے وقت کے راشد نور، ناصر عارف حسین لائبریری کے ناظم اعلیٰ ندیم ہاشمی، ادارہ ادبیاتِ پاکستان کے ریجنل ڈائریکٹر نور محمد پٹھان، رسالہ نگارِ پاکستان کے مدیر سید محمد اصغر کاظمی اور دیگر علمی ادبی شخصیات شامل تھیں۔

ظہر کی نماز کے بعد نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور ڈاکٹر صاحب اپنے عزیز رشتہ داروں، خاندان کے احباب، علمی و ادبی شخصیات کے قافلے کے ہمراہ سفرِ آخر پر روانہ ہوئے۔ ان کی آخری منزل جامعہ کراچی کا قبرستان تھی۔ دو بسوں اور بے شمار کاروں کا یہ قافلہ صدانی اسپتال کے سامنے سے گلشن چورنگی، ڈسکو بیکری کے سامنے سے ہوتا ہوا ابوالحسن اصفہانی روڈ پر واقع جامعہ کے آئی بی اے گیٹ سے جامعہ کی حدود میں داخل ہوا اور جامعہ کی خاموش فضاؤں میں منزل مقصود پر پہنچا جہاں پر جامعہ کراچی کے قبرستان میں لحدِ فرمان اپنے ساکن کے انتظار میں اپنا دامن واہ کیے ہوئے تھی۔

اتوار کی وجہ سے جامعہ بند تھی، سڑکیں ویران فضاء غمگین، نَم اور سوگوار تھی۔ سڑکوں کے دونوں جانب کھڑے گُم سُم اور ششدر درختوں نے ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید تو کہا مگر حزیں اور دل گرفتگی کے ساتھ، ٹہنیاں جُھک جُھک گئیں، غنچے سہم کر پتوں کی اوٹ میں چھپ گئے، جامعہ کی عمارتیں بھی ملول تھیں ان پر سیاہ بادلوں نے اداسی کی چادر بچھائی ہوئی تھی۔ شعبہ اردو نے اپنے محبوب سربراہ کو قافلے کے ہمراہ دور سے آخری منزل کی جانب رواں دواں دیکھا تو وہ بھی اپنے باغ باں کا سامنا نہ کرسکا رنج والم میں ڈوب گیا۔کچھ ہی دیر میں قافلہ قبرستان پہنچ گیا۔ یہ ایک ایسا دارالمقابر ہے جہاں ایک خاص نظم و ضبط ہے، کوئی مکین اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتا یعنی انکروچمنٹ نہیں ہوتی، یہ تو ہم انسانوں کی بستیاں ہیں جہاں کا ہر رہائشی اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کا بس چلے تو اپنے گھر کے سامنے کی گلی یا سڑک کو بھی اپنے گھر میں شامل کرلے۔کاش ہم شہر خاموشاں کے مکینوں سے ہی کچھ سبق سیکھیں۔ اب وقتِ آخر تھا۔

سب لوگ سر جھکائے لحدِ فرمان کے گرد جمع تھے۔ نم آنکھوں،افسردہ اور بوجھل دل کے ساتھ اپنے ہر دلعزیز استاد، ادب کے قیمتی سرمایے اور ایک شفیق و مہربان بزرگ کے جسد خاکی کو اپنے ہاتھوں آغوش لحد کے سپرد کیا،ڈاکٹر صاحب کی

لحد کے بائیں جانب شعبہ سیاسیات کے استاد پروفیسر ڈاکٹر رضوان احمد آرام فرما ہیں ، تھوڑے ہی فاصلے پر آپ نیچے کی طرف آپ کے ساتھی اور دوست پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی آرام فرما ہیں۔ غم و حزن کی اس کیفیت میں سوچ کا مہور وہ قدآور علمی وادبی شخصیات تھیں جو اس قبرستان میں ابدی نیند سو رہی ہیں ۔ ایک ایک کرکے سب نظروں کے سامنے تھے۔ بارش کے باعث قبرستان میں چلنا مشکل ہو رہا تھا لیکن ہمت کرکے میں بعض شخصیات کی لحد تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا ان میں پروفیسر ڈاکٹرابوالخیر کشفی، طاہرہ کشفی، پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید ،ڈاکٹر سید شاہد علی رضوی، پروفیسر ڈاکٹر افضال حسین قادری، پروفیسر ڈاکٹر نسیمہ ترمذی، پروفیسر مولانا منتخب الحق قادری، پروفیسر ڈاکٹر سید حامد محمود، پروفیسر ڈاکٹر ریاض السلام شامل تھے۔ ان سب کے لیے دعائے مغفرت کی ۔ جامعہ کراچی میں زمین کا یہ چھوٹا سا قطعہ زمین کس قدر مردم خیز ہے کہ جس میں بے شمار اہل دانش ، علماء، شعراء، ادبا، صوفیہ، حکماء آسودۂ خاک ہیں۔ مجھے تو اس زمین کے اس مختصر سے ٹکڑے پر رشک آ رہا تھا کہ اس زمین نے کیسی کیسی علمی وادبی شخصیتیں پیدا کیں ۔ کلام مجید کی سورۃ 'طٰہٰ' کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ''اسی زمیں میں سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی زمین میں پھر واپس لوٹائیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ تمہیں نکال کھڑا کریں گے''۔ اسی حوالے سے کہاوت مشہور ہے کہ 'پہنچی وہی پے خاک جہاں کا خمیر تھا'۔ بیشک ہمیں واپس

لوٹ کر جانا ہے۔ یہ شعر اس وقت کی صورت حال کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے ۔

ہجوم سلسلۂ رفتگاں دکھائی دیا
زمین پر ہی مجھے آسماں دکھائی دیا

میں دوسری بار اس قبرستان میں آیا تھا اس سے قبل اپنے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید صاحب کی تدفین کے موقع پر جن کا انتقال ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء کو ہوا تھا۔ آج ان کی یاد بھی اود کر آئی، ان کی قبر پر بھی دعا کی۔ قبرستان میں اپنے بچپن کے دوستوں سید جمال احمد اور سید سبطین رضوی سے بھی ملاقات ہو گئی ۔ معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں میں سے ہیں۔ جتنی دیر ڈاکٹر صاحب کی تدفین ہوئی جمال صاحب اور سبطین سے گفتگو ہوتی رہی۔ قبر کی تاریکی، خوف اور دیگر باتیں اپنی جگہ لیکن اس وقت ڈاکٹر صاحب کی لحد ان کے مزاج کے عین مطابق صاف ستھری، کشادہ، روشن اور سادہ سی لگی لیکن کچھ دیر بعد جب اس لحد کے اندرونی منظر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا جائے گا اور دنیاوی روشنی سے تعلق نہ رہے گا یقیناً خدا کی رحمت کی روشنی اُسے منور رکھے گی۔ کچھ ہی دیر میں لحد کو اوپر سے ڈھانپ دیا گیا، احباب نے لحد پر مٹی ڈال کر اہل قبر سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر صاحب کا جسد خاکی منوں مٹی تلے چلا گیا۔ یوں ہندوستان کے شہر ''فتح پور'' سے ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء میں شروع ہونے والی زندگی کا اختتام پاکستان کے

ایک بڑے صنعتی شہر کراچی میں ۴ اگست ۲۰۱۳ء میں
سال کی عمر میں ہوا۔ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو کے سابق استاد ڈاکٹر اسلم فرخی کا ۸۷
یہ شعر حسب حال ہے ۔
آج اپنے ہی ہاتھوں تجھے مٹی میں دبا آئے
کل تک تیرے جینے کی دعا مانگ رہے تھے
ادارہ ادبیاتِ پاکستان کے ریجنل ڈائریکٹر نور محمد پٹھان نے پاکستان کے ادیبوں کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کی لحد پر پھولوں کی چادر چڑھائی ، قبر کے گرد کھڑے احباب نے فاتحہ پڑھی اور ڈاکٹر صاحب کے لیے مغفرت کی دعا کی ، واپسی شروع ہوئی ، مَیں اپنی کار میں بیٹھا تو ڈاکٹر صاحب کی قبر نظر آ رہی تھی دل ہی دل میں اُن کے لیے ایک بار پھر دعا کی اور خدا حافظ کہا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ استاد
قمر جلالوی کے اس شعر کے ذریعہ کہہ رہے ہوں ۔
شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم
کہتے ہیں کہ موت العالِم موت العالَم کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس دنیا سے چلے جانا، دنیا سے ایک عالِم کا چلے جانا ہے ۔ عالِم مشکل سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یہ یقیناً نقصانِ عظیم ہے۔ علامہ اقبال کیا خوب بات کہی ہے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

موت.بر حق ہے ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے رخصت ضرور ہو گئے لیکن وہ ہمیشہ ہماری یادوں میں رہیں گئے۔ ان کے علمی وادبی کارنامے اس دنیا میں رہتی دنیا تک لوگوں کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔اللہ تعالی ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین۔ثمہ آمین۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

بابائے اردو مولوی عبدالحق

انھوں نے اردو کی ترویج کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں
ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق ''اگر بابائے اردو مولوی عبدالحق نہ ہوتے اور اردو سے انھیں یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ لگاؤ نہ ہوتا تو کیا واقعی موجودہ دور میں اردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو آج بہت سی زبانوں کے لیے باعث رشک ہے انھوں نے اردو کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا زندگی کی راہوں پر دوڑایا اس کے بازوؤں میں حریفوں سے مقابلہ کی سکت پیدا کی اردو کی تاریخ،
مخالفت کی تاریخ کشمکش کی تاریخ ہے ہنگاموں کی تاریخ ہے بابائے اردو کی ذات نہ ہوتی تو اردو کے لیے ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ ہوتا ممکن تھا کہ وہ ان معرکوں میں کام آجاتی اور آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔ بابائے اردو کے طفیل ہی وہ زندہ اور سرخ رو ہے دنیا میں شاید ہی کوئی مثال، زبان سے اس قدر بے پناہ محبت کی کہیں اور ملتی ہو وہ سپردگی اور انہماک اور استغراق اور وہ دھن جو جنون کی سرحد سے ٹکراتی ہے دینا کے عظیم ترین دماغوں ہی کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو کی اردو

سے یہ لگن تحریک پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی بنی''۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اردو کو جو بھی مقام و مرتبہ حاصل ہو سکا ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی انتھک کوششوں کا ہی ثمر ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ وہ قیام پاکستان کے چودہ سال بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے لیکن جس عمارت کی بنیاد سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے ساتھ رکھی جاتی ہے وہ عمارت اتنی ہی دیرپا اور مضبوط و مستحکم بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو کے جن حریفوں کا ذکر کیا ہے اگر بابائے اردو نے اس کی بنیادوں میں اردو سے محبت اور عقیدت کا جذبہ نہ بھر دیا ہوتا تو وہ حریف کب کے اسے مٹی تلے دفن کر چکے ہوتے۔ بابائے اردو نے اردو کی نہ ختم ہونے والی زندگی کا جو پتھر قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں رکھ دیا تھا وہ اس قدر بھاری بھرکم اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند تھا کہ اسے گرانے ، پاش پاش کرنے کی تمام تر تدبیریں ناکام ہوئیں اور آج اردو بابائے اردو کے طفیل ہی زندہ اور سرخ رو ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ۱۸۹۴ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کر رہے تھے تو وہاں انہیں جن اکابرین کی قربت اور صحبت میسر آئی ان کے اثرات نے مولوی عبدالحق کو اردو کا متوالا ، دیوانہ اور عاشق زار بنا دیا ان عظیم اہل علم و دانش میں علامہ شبلی نعمانی، سرسید احمد خان، سید راس مسعود، محسن الملک، سید محمود، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اور بابو مکھرجی

شامل تھے۔ بابائے اردو کو سب سے زیادہ محبت و عقیدت سر سید احمد خان سے تھی وہ ان کی علمی، سیاسی اور معاشرتی بصیرت کے قائل اور گھائل ہو گئے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب بابائے اردو نے یہ فیصلہ کیا کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی کے لیے وہ کچھ کرنا ہے جو اردو کو تاحیات زندہ سلامت رکھے۔ اردو سے عشق اسی دوران شروع ہو چکا تھااور اردو بابائے اردو کی محبوبہ بن چکی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال دی گئی تھی بابائے اردو ۱۹۱۲ء میں انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے اس سے قبل ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۱ء علامہ شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی اور مولوی عزیز مرزا اس کے سیکریٹری رہے۔ پروفیسر آرنلڈ انجمن کے اولین صدر تھے۔ بابائے اردو نے ایک کام یہ کیا کہ وہ انجمن کو علی گڑھ سے حیدرآباد دکن لے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن اورنگ آباد سے دہلی منتقل کر دی گئی۔ مولوی عبد الحق اردو کے تحفظ اور بقا کی جنگ لڑتے رہے۔ ہندوستان کے ہندو قومی زبان ہندی رکھنے کے لیے سر گرم تھے ،گاندھی جی بھی ان کے ہمنوا اور اس کے حق میں تھے۔

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد.برطانوی دور حکومت میں بابائے اردو نے انڈین سول سروس اختیار کی اور چیف ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے دہلی میں حکومت کے محکمہ داخلہ میں کام کا آغاز کیا۔ مولانا اورنگ آباد میں صوبائی انسپیکٹر آف اسکول بھی رہے۔ اس دوران سر سید احمد خاں کی بنائی

ہوئی آل انڈین محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس جس کا نام بعد میں 'آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرنس' ہوا۔اس کا مقصد مسلم معاشرہ میں تعلیم اور دانشوری کا فروغ تھا۔ عبدالحق اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔اس کے بعد بابائے اردو حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ وہ ابتداء میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ بعد میں وہ شعبہ فیکلٹی آف اردو کے چیرمین مقرر ہوئے۔ اس سے قبل وہ ۱۹۳۰ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بابائے اردو نے 'انگلش اردو' ڈکشنری مرتب کی۔

قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مولوی عبدالحق نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا وہ خالی ہاتھ پاکستان آئے۔ انجمن کا تمام تر ریکارڈ، مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ جو دہلی منتقل ہوا تھا ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ ساز و سامان کے اعتبار سے تو خالی ہاتھ تھے لیکن ان کے باطن میں ان کی محبوبہ 'اردو' اور 'انجمن ترقی اردو' چھپی ہوئی تھی جو ان کے ہمراہ پاکستان آئی۔ یہاں آکر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انجمن کی تشکیل نو کی اور پھر اس کے زیر سائے کاموں کا آغاز کیا۔ کراچی میں انجمن کا دفتر قائم ہوا مولوی صاحب انجمن کے بدستور سیکریٹری رہے۔ شیخ عبدالقادر اس کے صدر،
مقرر ہوئے۔ انجمن کے دفتر کے لیے مولوی صاحب کراچی کی قدیم بستی لیاری میں

قطعہ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابتدائی طور پر انجمن کا دفتر اسی جگہ قائم ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں مولوی عبدالحق نے انجمن کی اس عمارت میں 'اردو کالج' قائم کیا۔ اب مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے تحت ملک میں اردو کے فروغ و ترقی کی جدوجہد کو اپنا نصب العین بنایا دوسری جانب کراچی کے غریب عوام کی بستی لیاری میں اردو کالج قائم کرکے یہ ثابت کیا کہ وہ غریبوں اور نچلے درجہ کے طبقے میں احساس محرومی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کے غریب اور متوسط طبقے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اردو کالج کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس نے کراچی کے غریب عوام کو تعلیم کے حصول میں ہر ممکن رہنمائی اور سرپرستی کی۔ اردو کالج سے فارغ التحصیل طلباء نے بعد میں دیگر اداروں کے تحت بابائے اردو کے مشن کو آگے بڑھایا۔

بابائے اردو جب تک حیات رہے انجمن کے ساتھ ساتھ ملک میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سرگرداں رہے۔ انجمن کے تحت قائم ہونے والے تعلیمی ادارے 'اردو کالج' میں مختلف علوم کی تعلیم اور کالج کی عمارت میں توسیع کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیفات اور ترجمے کا کام بھی جاری و ساری رہا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق جب پاکستان آئے ان کی عمر ۷۷ برس تھی۔ پاکستان میں ان کی سرگرمیوں کا دورانیہ ۱۴ سال ہے اس دوران ان کی عمر عزیز ۷۷ برس سے ۹۱ برس رہی۔ انہوں نے ۹۱ برس کی عمر میں ۱۹۶۱ء میں داعی اجل کو

لبیک کہا۔ یہ عمر تو آرام اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ہوتی ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی ہمت کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ضعیف العمری میں کس قدر تھکا دینے والے کام کیے یہ سب اردو زبان کے لیے جذبہ ہی تو تھا جس نے ان سے یہ عظیم کام کروائے انجمن ترقی اردو پاکستان اور اس کے تحت بے شمار کتب کی تصنیف ، تالیف و ترجمہ اور اشاعت، ماہنامہ قومی زبان کی مسلسل اشاعت، اردو کالج جو اب وفاقی اردو یونیورسٹی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بابائے اردو کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ انجمن کا دفتر گلشن اقبال بلاک ۷ میں قائم ہو چکا ہے جہاں بابائے اردو کے قائم کردہ کتب خانے بھی ہیں۔ وفاقی اردو یونیورسٹی اس وقت تین کیمپسیز پر مشتمل ہے۔لیاری میں عبد الحق کیمپس، گلشن اقبال ، یونیورسٹی روڈ پر گلشن کیمپس اور اسلام آباد میں بھی اسلام آباد کیمپس کام کر رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں اس وقت کی حکومت نے ملک کے تمام تر تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا چنانچہ اردو کالج کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء میں ایک صدارتی حکم

کے تحت اردو کالج کو جامعہ کا درجہ دے دیا تھا۔ گلشن کیمپس میں قائم کتب خانے کا نام ''بابائے اردو مولوی عبد الحق یادگاری کتب خانہ'' ہے۔ یہ قومی ادارے قومی ملکیت میں ضرور ہیں لیکن بابائے اردو کی یادگار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق محقق، نقاد، خاکہ نگار اور خطبہ ،مقدمہ یا دیباچہ نگار کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔"چند ہم عصر" بابائے اردو کے خاکوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے ہمعصروں کے خاکے دلچسپ اور منفرد انداز میں لکھے ہیں۔ خاکہ نگاری میں ان کی یہ کتاب بے حد مقبول ہے۔بابائے اردو کی نثر نگاری میں سادگی کا عنصر نمایاہے۔ عام فہم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہاں بھی مولوی صاحب سر سید کی نثر نگاری سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سرسید کی نثر کے حسن کو اپنے خیالات و نظریات میں جذب کرکے نئی نسل کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خطبات اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات کو اردو کے لیے بانگ درا کہا گیا ہے۔ دکنی مخطوطات کو تلاش کرکے ان پر تحقیق کرنا اور ان کتب پر 'مقدمہ' حاشیے اور صحتِ ،متن کے اعلیٰ نمونے پیش کیے۔ معراج العاشقین، سب رس

قطب مشتری، گلشنِ عشق اور علی نامہ بابائے اردو کی تخلیقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کی کتاب 'اردو کی نشو نما میں علمائے اکرم کا حصہ' معرکتہ الآ را کتاب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق کا وطن ہندوستان کا شہر ہاپوڑ تھاجہاں وہ۱۶ نومبر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ۷۷برس متحدہ ہندوستان میں گزارے جب کے بڑھاپے کی زندگی کے ۱۴برس پاکستان میں بسر کیے اور وہ کارنامے انجام

دے جو رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے کراچی میں ۹۱ برس کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو وفات پائی، اپنے ہی قائم کیے ہوئے انجمن ترقی اردو کے مرکز اور اردو کالج (اب وفاقی اردو یونیورسٹی عبدالحق کیمپس) جو لیاری میں بابائے اردو روڈ پر واقع ہے کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بابائے اردو نے اپنے ایک خاکے کا اختتام اس مصرعے پر کیا ہے، میں نے بھی ان کے لیے اسی مصرعے کا انتخاب کیا واقعی ایسا ہے ۔

پنچھی اڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے

(شائع شدہ روزنامہ جنگ کے میڈویک میگزین، بدھ، ۱۴ اگست ۲۰۱۳ء)

پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم

خطوط، یادداشتیں اور تاثرات

پاکستان لائبریرین شپ میں پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید کا نام معروف ہی نہیں معتبر بھی ہے۔ لائبریری سائنس کے شعبے میں صدارتی تمغہ حسن کارکردگی حاصل کرنے والے آپ اولین شخص ہیں۔ راقم الحروف کو جامعہ کراچی میں آپ کا شاگرد (۱۹۷۱ء۔ ۱۹۷۲ء) ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس تعلق کو میں بہت اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ استاد و شاگرد کا مقدس رشتہ ایسا نہیں جو ایک بار قائم ہونے کے بعد توڑا جاسکے۔ اسلامی تہذیب میں پروان چڑھے ہوئے لوگ اس رشتے کو ایک مقدس رشتہ تصور کرتے ہیں جو تمام دوسرے تعلقات پر حاوی ہے۔میں نے بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے اس رشتہ کو باوجود بعض اختلافات کے ہمیشہ مقدس سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا دوسرا تعلق یہ ہے کہ میں نے جس موضوع (لائبریری سائنس)پر لکھنا شروع کیا تو میرے پیش نظر دیگر مصنفین کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تحریریں تھیں جن سے میں متاثر ہوا اور ان سے استفادہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے متاثر ہونے اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی تیسری اہم وجہ یہ ہے میں نے ڈاکٹر صاحب کو تمام زندگی باوجود جسمانی کمزوری کے شدید محنت کرتے ہوئے پایا۔ ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۷۱ء میں پہلی بار شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی

میں دیکھا، شعبہ لائبریری کی پانچویں منزل پر تھا، تمام کلاسیں اوپر ہی ہوا کرتی تھیں صرف ڈاکٹر انیس خورشید صاحب کی کلاس زمینی منزل پر ہوا کرتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب سیڑھیوں پر چڑھ نہیں سکتے تھے کیوں کہ وہ پیروں میں فالج یا پولیو کے مرض میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز بھی دھیمی اور قدرِ سست روی کا شکار تھی۔ اس کے برعکس اللہ تعالی نے آپ کو قلم کی طاقت سے نوازا، میں نے ڈاکٹر صاحب کو مسلسل لکھتے دیکھا، لائبریرین شپ کے موضوع پر آپ کی تخلیقات معیار و مقدار ہر اعتبار سے پاکستان لائبریرین شپ کی پوری تاریخ میں لاثانی ہیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس عمل نے متاثر کیا کہ انہوں نے اپنی بیماری، کمزوریِ صحت کے باوجود قلم کی روانی کو کم نہ ہونے دیا، لکھتے رہے اور چھپتے رہے۔ آپ کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جسمانی کمزوری انسان کے بلند مقاصد کے آڑے نہیں آسکتی۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نگاہ جن کی بلند ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

ڈاکٹر انیس خورشید صاحب صاحب جامعہ کراچی کے سابقوالاولون میں سے ہیں۔ آپ نے جس محنت، جفاکشی اور لگن سے جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس کی آبیاری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے جامعہ کراچی کو اپنی عمر کا بہترین حصہ عطا کیا اور اپنی صلاحیتوں کا نچوڑ دیا، ایک کہنہ مشق لائبریرین، تجربہ

کار اور قابل استاد ہونے کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کے موضوع پر آپ کی متعدد تصانیف وتالیفات اور بے شمار مضامین قیمتی اثاثہ ہیں۔پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی ، لائبریری سائنس کی تعلیم کی تحریک ، پیشہ ورانہ مطبوعات اور کتب خانوں کی انجمنوں کی کارکردگی کی تاریخ ڈاکٹر صاحب کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہے گی۔بقول الحاج محمد زبیر' ڈاکٹر صاحب جیسے مجموعہ محاسن اشخاص کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں''۔

پاکستان میں لائبریرین شپ کے شعبہ میں ایک نقصان دہ عمل یہ ہوا کہ جس شخص نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی یا وہ کسی بھی جامعہ یا معیاری ادارے سے وابستہ ہوا اس نے اپنے آپ کو بیرون ملک روزگار سے وابستہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کا یہ شعبہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ھنر مندوں اور تجربہ کار افراد سے محروم ہوتا چلا گیا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس شعبہ میں پی ایچ ڈی حاصل کر لینے والے اکثر پاکستانیوں نے ملک میں خدمات فراہم کرنے کو ثانوی حیثیت دی، ڈالر اور ریال کی چکا چوند روشنی نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا اور وہ اس عارضی چمک کے سمندر میں بہہ گئے۔اعلیٰ تعلیم کے حامل ایسے لوگوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے کہ جنھوں نے اپنے وطن میں رہتے ہوئے خدمت کو اپنا نصب العین بنایا اور تمام عمر اپنے ہی ملک میں گزار دی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر انیس خورشید صاحب بھی ہیں کہ جن کے لیے باوجود خراب صحت

کے بیرون ملک ملازمت کا حصول مشکل نہیں تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور وطنِ عزیز میں رہتے ہوئے خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ اپنے ریٹائرمنٹ تک جامعہ کراچی سے منسلک رہے آپ کا یہ عمل آپ کو ممتاز اور محترم بناتا ہے۔

ڈاکٹر انیس خورشید صاحب نے کراچی لائبریری ایسوسی ایشن کے سرٹیفکیٹ کورس (۱۹۵۲ء) سے پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز کیا، ۱۹۵۷ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور امریکہ کی (Rutgers-State University of N J) سے ۱۹۵۹ میں ایم ایل آئی ایس کیا۔ امریکہ کی (University of Pittsburgh) سے ۱۹۶۹ء میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

آپ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز جامعہ کراچی کے کتب خانے سے (۱۹۵۴ء) بطور کلاسیفائر کے کیا، ستمبر ۱۹۵۹ء میں شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی میں آپ کا تقرر بطور جزو وقتی لیکچرر کے ہوا بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں کل وقتی لیکچرر ہوئے اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں پروفیسر ہوئے اس دوران آپ کئی بار صدر شعبہ کے فرائض انجام دیتے رہے اور اسی حیثیت سے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان لائبریرین شپ کے ایک مستند اور معتبر محقق، مصنف اور

مولف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ کا تحریری سرمایہ پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کے فروغ میں بھی آپ کی خدمات قابل قدر ہیں ۔ جامعہ کراچی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید کا مرہون منت ہے جب کہ اسی شعبہ میں ایم ایل ایس (ایم اے لائبریری سائنس) کا آغاز ڈاکٹر انیس خورشید کی کوششوں کے باعث ۱۹۶۲ء میں ممکن ہو سکا۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن سے آپ طویل عرصہ تک وابستہ رہے اور مختلف حیثیتوں سے بے بہا خدمات انجام دیں، متعدد کانفرنسوں کی روئیدادیں مرتب کیں، (KULSAA) کلسا کے اولین چیرمین رہے، پاکستان لائبریری ریویو کے مدیر اعلیٰ بھی رہے، قائد اعظم محمد علی جناح پر کتابیات کی تدوین، ٹیکنکل ورکنگ گروپ کی رپورٹ، پاکستانی ناموں کی کیٹلاگ سازی، لائبریری قانون کا مسودہ، پائیلٹ پبلک لائبریری اسکیم آپ کے اہم کارنامے ہیں جنھیں پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب پر متعدد مضامین تحریر کیے گئے اور آئندہ بھی تحریر کیے جائیں گے، پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر نے ڈاکٹر صاحب کے ریٹائرمنٹ پر آپ کی شخصیت اور علمی و علمی خدمات پر ایک کتاب بعنوان Making of Librarianship in Pakistan: Presentation volume to honour Prof. Dr. Anis Khurshid on his retirement بھی مرتب کی۔ یہ کتاب ڈاکٹر انیس خورشید کی شخصیت اور لائبریری خدمات کا سیر حاصل احاطہ کرتی ہے۔ اس مجموعہ میں پاکستان

اور بیرون ملک سے تعلق رکھنے والی ۱۵ شخصیات کے مضامین شامل ہیں۔ڈاکٹر صاحب پاکستان لائبریرین شپ کی وہ واحد شخصیت ہیں جنہیں
حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ''صدارتی تمغہ حسن کارکردگی'' سے نوازاجو پاکستان لائبریرین شپ کے لیے بھی ایک اعزاز ہے۔
ڈاکٹر انیس خورشید صاحب سے میرا خط وکتابت کا رشتہ قائم رہا گو کہ ہم ایک ہی شہر کے باسی ہیں۔آپ کی ایک خوبی یہ بھی میں نے دیکھی کہ آپ نے ہمیشہ میرے خط یا جب کبھی میں نے اپنی کوئی بھی تصنیف آپ کو بھیجی تو آپ نے بذریعہ ڈاک اس کی رسید سے ضرور نوازا، گو وہ تحریر مختصر ہی ہوا کرتی تھی لیکن جواب ضرور دیا کرتے۔ ۱۹۹۸ء میں راقم نے آپ کو اپنی ایک کتاب کا 'پیش لفظ' تحریر کرنے کی درخواست کی۔آپ کا خط تحریر شدہ ۱۲ جنوری ۱۹۹۸ء موصول ہوا جس میں آپ نے معزرت چاہتے ہوئے انڈکس بننے کی خبر PLR تحریر فرمایا ''تمہارا خط مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۹۸ء موصول ہوا پاکر خوشی ہوئی لیکن میں تواب خرابی صحت کی وجہ سے لکھنے کا کام ختم کرچکاہوں ، گو لڈن جوبلی کے سلسلے میں بہت ہی اصرار پر ایک مضمون لکھا تھا اس کے بعد طبیعت جو خراب ہوئی تو ڈاکٹر کے کہنے پر اس کام کو بالکل بند کرنا پڑ رہا ہے۔ معزرت خواہ ہوں، نیک تمناؤں کے ساتھ، انیس خورشید''۔بعد میں اس کتاب کا پیش لفظ جناب معین الدین خاں صاحب نے تحریر فرمایا۔ وقتی طور پر تو مجھے احساس ہوا کیوں کہ اس اشاریہ

پر ڈاکٹر صاحب سے بہتر لکھنے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ آپ ' کلسا ' (کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس المنائی ایسوسی ایشن) کے اولین چیرٔ مین اور رسالے پاکستان لائبریری ریویو"کے اولین ایڈیٹر بھی رہے تھے۔''

لائبریری سائنس کے مختلف موضوعات کے علاوہ سوانح نویسی یا سوانحی کتابیات کی تدوین کی جانب میری توجہ شروع ہی سے رہی ہے۔ کئی شخصیات پر میرے مضامین شائع ہوئے ۔ ڈاکٹر عبد المعید پر اولین سوانح شریک مولف کی حیثیت سے مرتب کی جو۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ۔ ۱۹۹۸ء میں اختر ایچ صدیقی پر میری کتاب (Akhtar H. Siddiqui: A Bio-bibliographical Study) شائع ہوئی ، یہ کتاب اختر صدیقی صاحب ہی نے ڈاکٹر انیس خورشید کی خدمت میں پیش کی۔ڈاکٹر صاحب نے میری اس

کتاب کے بارے میں اپنے ایک خط (۱۸ مئی ۱۹۹۷ء) جو اختر صدیقی صاحب کے نام تھا اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

ڈیر اختر صدیقی ' السلام علیکم !

تم آئے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، بے سروسامانی کے اس دور میں جذبہ کی کمی نہ تھی، ہر کوئی کچھ نہ کچھ اچھا اکام کرنا چہتا تھا کہ پیشہ کتاب داری کو وقعت حاصل ہو۔ لڑائی جھگڑے بھی تھے لیکن کام کرنے والے کام کرتے

رہتے تھے۔ آج اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ ہمارا پیشہ معتبر گردانا جانے لگا ہے۔
مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے بارے میں شائع ہونے والی Bio-Bibliographical
کی ایک کاپی مجھے عنایت فرمائی ورنہ میں ایک اچھی کتاب سے شاید محروم Study
رہتا۔ میں نے سرسری طور پر ہی اسے دیکھا ہے مجھے کتاب اچھی لگی۔ presentation
کو پیش کیا گیا ہے۔ کتاب data بہت ہی اچھے طور پر کی گئی ہے اور نہایت عمدگی سے
سے آپ کی بھرپور شخصیت اپنی طرحداری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ تدوین اور ترتیب
بھی اچھی ہوئی ہے یوں کہنا چاہئے کہ اختر ایچ صدیقی کی متنوع اور سدا بہار شخصیت اپنی
پوری کتابیاتی سرگرمیوں کے ساتھ اس کتاب کے ذریعہ بھرپور طور پر نمایاں ہو جاتی
ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی عطا
فرمائے، آمین۔ سید ارشاد علی بھی آج آئے تھے اُن کو بھی میں نے کتاب دکھائی تھی،
اُن کو بے حد پسند آئی۔ بھابی کو آداب کہیے' دعاؤں کے ساتھ، مخلص'' انیس
خورشید۔

قومی کتابیات پاکستان (۱۹۴۷ء۔۱۹۶۱ء) جلد سوم راقم نے بطور چیف ایڈیٹر مرتب
کی۔ حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے شعبہ لائبریریز نے ۱۹۹۹ء میں اسے شائع کیا
اس کتاب کے موصول ہونے کے بعد ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط ۲۰

PNB- فروری ۲۰۰۰ء میں تحریر فرمایا: ''تمہارے خط مورخہ ۱۳ فروری کے ساتھ
ملا' بے حد شکریہ۔ غالباً اس ببلوگرافی کے ساتھ باقی حصہ (500-900) 61-47
جو چھپنے سے رہ گیا تھا وہ بھی شامل ہو گیا ہے' یہ کام قابل تعریف ہے۔ مبارکباد قبول
کریں''۔ مخلص، انیس خورشید۔
۱۹۹۷ء میں میں نے ڈاکٹر خالد محمود کے اشتراک سے پاکستان سے شائع ہونے والے
لائبریری وانفارمیشن سائنس کے رسائل وجرائد کا پچاس سال کا اشاریہ مرتب کیا
۔ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط مورخہ ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء میں تحریر فرمایا: ''تمہاری
ملی' بے حد شکریہ۔ یہ Periodical Literature in LIS اور خالد محمود کی کتاب
کوشش قابل مبارک باد ہے۔ اس کام کو جاری رکھنے کی
ضرورت ہے لیکن اسے رسائل تک محدود رکھنا وہ بھی مقامی رسائل تک سود مند
ہوگا۔ میری دعائیں تم لوگوں کے ساتھ ہیں'۔ دعاؤں کے ساتھ، انیس خورشید۔ ۹
فروری ۲۰۰۱ء کو آپ کا خط راقم کے نام موصول ہوا آپ نے تحریر فرمایا:
ڈیر صمدانی ! تسلیمات!
ملا بے حد شکریہ، نیلا رنگ جو رسالہ کے سرورق کے لیے PLB تمہارا بھیجا ہوا رسالہ
اس مرتبہ استعمال ہوا ہے وہ اتنا دلفریب اور دل آویز ہے کہ میں تعریف کیے بغیر نہ رہ
سکا اس لیے یہ خط عجلت میں لکھ رہا ہوں۔ لگتا ہے رسالہ پر بہار آ گئی ہے، خدا کرے کہ
ہمارا لٹریچر بھی اسی طرح خوش رنگ اور اثر

پذشابت ہو۔ میری طرف سے مبارکباد قبول ہو۔ بخاری مرحوم پر مضمون کا بھی شکریہ،
کی کانفرنس ۱۹۵۸ءPLA ہمارے پرانے ساتھی تھے جن سے پہلی ملاقات کراچی میں
میں ہوئی تھی، اللہ تعالی مرحوم کے درجات بلند کرے آمین ! ظہیرالدین خورشید کو
کو From MARC to MARC-2 ابو ظہبی کی عرب کلف کانفرنس میں انکے پیپر
کے یونیورسٹی کے خبرنامہ کاKFUPM کانفرنس کا بہترین مقالہ کا ایوارڈ ملا ہے۔ اس خبر کا
تراشہ منسلک ہے۔ میں نے محترم معین الدین خان صاحب کو بھی تراشہ چھپنے کے لیے
بھیجا تھا اگر انہوں نے آپ کو دیدیا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ بلیٹن یا پی ایل اے
نیوز لیٹر میں چھاپ دیں تو میں ممنون ہونگا''۔ ہم نے یہ خبر اپنے رسالے
میں شائع کی جس کا بعد میں ڈاکٹر صاحب نے (Pakistan Library Bulletin)
شکریہ بھی ادا کیا۔ ستمبر ۲۰۰۱ء کی بات ہے ڈاکٹر صاحب نے جریدہ نیادور، افکار اور فنون
تلاش کرنے کے بارے میں کہا، مجھے نہیں معلوم کہ میں یہ citation کے بارے میں
کام کرسکا یا نہیں آپ نے اپنے خط مورخہ ۱۵ جولائی ۲۰۰۱ء میں تحریر فرمایا، ''کل تم
نے گھر رسالہ پہنچا دیا بے حد خوشی ہوئی، شکریہ۔ بدرالدین کو خط بھجوادیا ہے۔ قمر
مرزا بھی رسالہ پا کر بے حد خوش ہونگے وہ تو ریگور رسالہ کے ریڈر رہے ہیں۔ ڈاکٹر
citation مہیا کردیا ہے اب آپ افکار اور فنون کے citation جالبی نے نیادور کا
ہی تلاش کریں عنایت ہوگی۔ دعاؤں کے ساتھ۔ ''انیس خورشید''۔

لاہور کے الطاف شوکت صاحب مرحوم سے میرے باوجود عمر کے فرق کے پیشہ ورانہ اوردوستانہ مراسم تھے۔ میرے پاس اپنے نام آئے ہوئے ان کے بھی بے شمار خطوط محفوظ ہیں۔ان کے انتقال کے بعد میں نے ان پر ایک مضمون لکھااور اس رسالے کی کاپی جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیا ساتھ ہی یہ بھی لکھاکہ میں جناب جمیل نقوی پر ایک مضمون تحریر کرنے کاارادہ رکھتا ہوں۔ مضمون میں جمیل نقوی صاحب کے بارے میں آپ کی رائے بھی شامل ہوجائے تو مضمون میں چار چاند لگ جائیں گے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی رائے مجھے ٹیلی فون پر تحریر کرادیں۔ڈاکٹر صاحب اس پر تیار ہوگئے ،آپ نے اپنے خط مورخہ ۲۸ اگست

۲۰۰۱ء کو تحریر فرمایا:

ڈیر صمدانی ۔ السلام علیکم!

تمہارا خط ملا اور رسالہ بھی، ظہیر کی خبر چھاپنے کا شکریہ۔ مجھے دکھ ہوا کہ ہمارے پرانے ساتھی اور ہمارے عظیم دوست میاں الطاف شوکت بھی ہم سے جدا ہوگئے ۔ انا اللہ وانا علیہ راجیعون،اللہ تعالیٰ ان کو قدم قدم پر جنت نصیب کرے ۔میں اکثر محمد تاج اور ان کے ساتھیوں سے ان کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا مگر کسی نے ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دی میری خط وکتابت تو کئی سال پہلے بند ہو گئی تھی ورنہ مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور ان کا خط آتا

تھا۔ مضمون میں نے سر سری طور پر پڑھا ہے۔ میری طبیعت بہت خراب ہے بیٹھ کر کچھ کام نہیں کر سکتا۔ نقوی صاحب پر ضرور میں اپنے تاثرات بیان کروں گا لیکن میں لیٹے لیٹے ٹیلی فون پر آپ کو لکھواؤنگا۔ یہ خط بڑی مشکل سے لکھ رہا ہوں۔ آپ مجھے اپنے گھر کا نمبر لکھ کر بھیج دیں اور بتا دیں کہ آپ سے بات کرنے کا کون سا اچھا وقت ہوگا۔ میں ضرور آپ کو فون کرونگا۔ اب آپ میرے مطلوبہ مضامین کے لیے پریشانی نہ اٹھائیں"۔ میرے پاس ان کی نظمیں تو ہیں اور یہ بھی علم ہے

کہ وہ ان کے انتقال کے بعد چھپی نہیں ہیں وہی حوالہ دیدونگا، آپ کی تلاش کے لیے شکر گزار ہوں، اچھا اب اجازت دیجئے"۔

انیس خورشید

ڈاکٹر صاحب سے فون پر بھی اکثر کسی نہ کسی حوالہ سے بات ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح ۱۹۹۶ء میں میرا ایک مضمون پروفیسر اختر حنیف مرحوم پر شائع ہوا تھا اس مضمون میں بھی میں نے ڈاکٹر انیس خورشید صاحب کی اختر حنیف صاحب کے بارے میں رائے نقل کی ہے جو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ۱۹ اپریل ۱۹۹۶ء کو ٹیلی فون پر ہی حاصل کی تھی۔ یہ مضمون پاکستان لائبریری بلیٹن کی جلد ۲۷ شمارہ ۱۔۲ ، مارچ جون ۱۹۹۶ء میں شامل ہے۔ اسی حوالہ سے آپ نے میرے ۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کے خط کے جواب میں ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء کو تفصیلی خط تحریر

فرمایا آپ لکھتے ہیں :

ڈیر صمدانی ۔ السلام علیکم !

تمہارا ۱۹ ستمبر کے خط کا بہت شکریہ غالباً صمد انصاری صاحب نے mix-up کر لیا ہوگا میں تمہاری شکایت کیسے کرتا میں نے تو جو تم سے درخواست کی تم نے فوراً بہم پہنچائی۔ صمد انصاری صاحب سے گفتگو تو ڈاکٹر محمود حسین کے حوالے سے ہو رہی تھی انہوں نے نگار کی بات ضرور آتی PLA کے نمبر کے بارے میں پوچھا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب کا ذکر ہو تو ہے سو میں نے بھی ان سے پوچھا کہ بھئی سائیں ملک اور عطا اللہ کی طرف سے کوئی خبر ملتی ہے میں نے تب یہ بھی کہا کہ میں نے تو دونوں کو کئی خط لکھے لیکن جواب نہ ملنے سے خاموش ہو رہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ انسائیکلو پیڈیا لندن کے لیے مجھے اپنا ۳ سال کے کمپیوٹر سنٹر کراچی اور حیدر آباد PLA کرنا ہے تو میں نے update پہلے کا مضمون کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے پیسہ نہ ہونے کیوجہ ، مشینوں کی درستگی کا کام رکنے کی خبر دی۔ تب میں نے تمہارا ذکر کیا کہ آج کل صمدانی صاحب سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے ان کا خط آیا تھا تو میں نے جواب فوراً دیا تھا مگر شاید وہ مصروف ہیں۔ ان کی طرف سے جواب نہیں ملا (خط میں تو میں نے تمہارے مضمون 'کے ایم سی کی لائبریریز' کی تعریف کی تھی اور اسے اپنے مضمون میں حوالہ دینے کی بات بھی کی تھی اور جو بات میں نے پوچھی تھی وہ تمہارے گھر کے نمبر کے بارے میں تھا کہ میرے پاس پرانا نمبر تھا، اس کے بعد میں نے دو مرتبہ

ملتا رہا کل رات بھی engage تمہارے گھر بشیر سے نمبر لے کر بات کی تھی پہلے دن تو یہی کیفیت رہی کل بھی میں نے ۲ گھنٹے وقفہ وقفہ سے کوشش کی تھی غالباً خراب ہوگیا ہوگا۔ البتہ درمیان میں ایک دن میں نے ۸ بجے کے لگ بھگ ٹیلی فون کیا تھا تو اتفاق سے ٹیلی فون مل گیا اور تمہارے بیٹے سے بات بھی ہوئی تھی اس وقت تم گھر نہیں ہے تو میں نے لکھا دیا تھا۔ غالباً وہ message آئے تھے اس نے پوچھا کہ کوئی بھی تم کو نہیں ملا ورنہ تم ضرور بات کرتے) میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ message میں نے کمپیوٹر کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا تھا وہ تو صمد سے بات کرتے ہوئے یاد آگیا تھا تو میں نے معلومات معلوم کر لی تھی اور تم سے صرف رابطہ اس وقت نہ ہونے کی بات کی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ محترم نقوی صاحب کے بارے میں میں ضرور تم سے بات کرونگا اس وقت میں بیمار تھا اور بیٹھ کر خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا لیکن میں نے تم کو خط لکھا تھا اور یہ بھی پوچھا تھا کہ تمہارے پاس میرا مضمون اُن کے بارے میں موجود ہے تو وہ کون سا مضمون ہے؟ بہر حال ایسی کوئی بات نہیں میں نے کرسکو۔ غالباً تم کو میرا خط بھی نہیں contact بس یو ہی ذکر کر دیا تھا تا کہ تم مجھ سے ملا ہے ورنہ تم جواب ضرور دیتے۔ بہر حال آپ کی شکایت نہیں کی تھی اور نہ معلومات نہ دینے کے بارے میں بات کی تھی وہ تو ہیڈ کواٹرس سے خبر نہ آنے کی وجہ سے غالباً صمد صاحب نے سمجھا ہوگا کہ میں نے کمپیوٹر والی بات ہی کے حوالے سے پوچھا ہوگا۔

،امید ہے کہ غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ مخلص

انیس خورشید"۔ کتوبر ۲۰۰۱ء میں میں نے اپنی بیٹی کی شادی کی اطلاع دی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کا خط تحریر شدہ ۱۱۰کتوبر ۲۰۰۱ء موصول ہوا جس میں آپ نے تحریر فرمایا :

ڈیر صمدانی' اسلام علیکم!

کمپیوٹر سینٹر کی PLA تمہارا خط ملا اور ٹیلی فون پر بات ہوئی بے حد خوشی ہوئی۔ معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔ بیٹی کی شادی کی اچھی خبر بھی سنائی بے حد خوشی ہوئی، پیشگی مبارک باد قبول۔ دونوں بچے (میرے بیٹے عدیل اور نبیل) بھی ماشاء اللہ بہتر پیشہ ورانہ تعلیم کی جانب رجوع ہیں انشاء اللہ تمہاری طرح لگن سے کام کرکے ان پیشوں میں نام پیدا کریں گے۔اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کامرانی سے سرفراز فرمائے آمین۔ دعا گو، انیس خورشید"۔اس سلسلے میں دوسرا خط ڈاکٹر صاحب کا ۲۶ دسمبر ۲۰۰۱ء کو موصول ہوا، آپ میری بیٹی کی شادی میں تو کمزوریِ صحت کے باعث شریک نہ ہوسکے لیکن شادی کے دوسرے روز ہی آپ نے مبارکباد اور معذرت کا خط تحریر کیا آپ نے لکھا:

ڈیر صمدانی' السلام علیکم !

تمہاری بیٹی کا کارڈ ملا۔ بدرالدین کو میں نے اسی روز پہنچا دیا تھا میں خود آنہیں سکتا بالکل چلنا پھرنا دشوار ہوگیا ہے، سردی کی وجہ سے دشواری رہتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ۲۵ دسمبر کو آپ کو مبارکباد کا پیغام مل جائے لیکن افسوس ہے کہ میں یہ بھی نہ کرسکا آج موقع ملا ہے تو خط بھیج رہا

ہوں۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ الحمداللہ اپنی بیٹی کی اس بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے۔خدا کرے یہ رشتہ کامیاب اور خوشیوں سے بھرپور ثابت ہو۔ آمین۔ دعاؤں کے ساتھ، مخلص۔انیس خورشید'' ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر میں جو شفقت، محبت اور اپنائیت تھی اس نے مجھے حوصلہ دیا۔

پاکستان لائبریرین شپ کے حوالے سے جناب محمد عادل عثمانی کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ پاکستان میں لائبریرین شپ کے بانی جناب ڈاکٹر عبدالمعید کے دو جانشینوں میں ڈاکٹر انیس خورشید اور محمد عادل عثمانی شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمعید جو جامعہ کراچی کے لائبریرین بھی تھے اور شعبہ لائبریری سائنس کے سربراہ بھی۔آپ نے ان دونوں اہم عہدوں کے لیے اپنے بعد جن شخصیات کا انتخاب کیا ان میں ڈاکٹر انیس خورشید صاحب شعبہ کے سربراہ ہوئے جب کہ عادل عثمانی صاحب جامعہ کراچی کی مرکزی لائبریری ڈاکٹر محمود حسین لائبریری) کے سربراہ ہوئے۔عادل عثمانی صاحب کی لائبریری) خدمات اور لائبریری مواد کی فراہمی میں آپ کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا، آپ کی تصانیف وتالیفات پاکستان لائبریرین شپ کا اہم سرمایہ ہیں۔راقم الحروف نے محمد عادل عثمانی کی تصانیف وتالیفات اوران کی پیشہ ورانہ خدمات پر مبنی سوانحی کتابیات مرتب Muhammad Adil Usmani: A Bib-bibliographical Study) کی جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط

مورخہ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں تحریر فرمایا :

ڈیر صمدانی ! السلام علیکم !

تمہارا گیارہ اکتوبر کا خط ملا، محمد عادل عثمانی (سرکار) کی سوانحی کتابیات کی خوبصورت جلد ملی اور مجلہ ''روایت'' بھی، خوشی ہوئی، پڑھ تو نہ سکا ہوں لیکن خوشی ہوئی تم سے دھن کے پکے لائبریرین نے مرتب کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ضعف عمری کا شکار ہوں، یادداشت کمزور ہو گئی ہے، گھر میں بند رہتا ہوں، ذہنی دباؤ تکلیف کا باعث رہتا ہے۔ اس لئے خط وکتابت بند کر دی ہے، ڈرائنگ روم تک بھی جانا اور دیر تک بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ میں نے اب لکھنے پڑھنے کا کام تقریباً ختم کر دیا البتہ یہ ضرور ہے کہ حکیم صاحب کے بارے میں جو کچھ واقفیت تھی وہ میں نے شائع کروادیا ہے جو ہمدرد صحت جون ۲۰۰۳ء میں بعنوان '' ہے حرف حرف اس کا زمانے میں معتبر'' یہ مضمون غالباً تم نے حاصل کر لیا ہوگا۔ ایک مضمون تقی عثمانی صاحب کا بھی جنگ میں غالباً اسی سال چھپا تھا، ایسا جامع مضمون حکیم صاحب پر میں نے پہلے نہیں پڑھا تھا۔ یہ خط بھی ایک ہفتہ کی کوشش سے لکھ پایا ہوں۔ میں نے انگریزی میں بھی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے مجھ سے اب کچھ حاصل نہیں ہو گا، معافی چاہتا ہوں''۔ دعا گو۔ انیس خورشید '۔

میں شہید حکیم محمد سعید پر اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے

خیالات سے استفادہ چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے آپ سے متعدد بار تحریری درخواست کی۔ میرے استفسار پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تحریر کے ذریعہ رہنمائی فرمائی جس سے میرا کام آسان ہو گیا۔ ڈاکٹر انیس خورشید صاحب پاکستان لائبریرین شپ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے۔ آمین۔

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

بہادر شاہ ظفؔر - ایک شاعر ایک مطالعہ

تاریخی نام ' ابو ظفر ' پورا نام ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ۔اردو زبان میں تخلص ' ظفر '، بھاشا اور دوسری زبانوں کی شاعری میں 'شوق رنگ' تخلص تھا۔ معین الدین اکبر ثانی کی ہندو نژاد بیوی لال بائی جو ایک راجپوت خاندان سے تھی کے بطن سے ۲۴ ،اکتوبر ۱۷۷۵ء کو پیدا ہوئے۔اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے ۔ شہنشاہوں کے گھر پیدا ہونے والے بچے کی تعلیم و تربیت شہزادوں کی طرح ہونا ایک لازمی امر تھا۔ حافظ محمد خلیل نے کلام مجید پڑھایا، اتالیق کے فرائض حافظ ابراھیم نے انجام دئے جنھوں نے شہزادے کو فارسی انشا پردازی اور عربی کی تعلیم سے سرفراز کیا۔ بہادر شاہ ظفؔر کے دادا شاہ عالم ثانی کا انتقال ۱۸ نومبر ۱۸۰۶ء کو ہوا تو بہادر شاہ کے والد معین الدین اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے اس وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ بادشاہت کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ انتظامی امور انگریز بہادر کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندے چلایا کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء تک ہندوستان پر کمپنی کی گرفت انتہائی مضبوط ہو چکی تھی، شاہ ثانی نام کے حکمراں رہ گئے تھے۔ جنوری ۱۸۱۰ء میں بہادر شاہ ظفؔر کو ولی عہدی کے مرتبے پر فائز کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی ماں ایک راجپوت تھی شاید یہی تعلق

راجپوتوں سے محبت اور قربت کا تھا جس کے باعث بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۲۵ء میں نواب احمد قلی خان راجپوت جو بھٹنیر (موجودہ نام بیکانیر) کے ایک جاگیر دار تھے کی بیٹی سے شادی کی اس وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر پچاس سال تھی۔ بہادر شاہ ظفر ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو جب کہ ان کی عمر ۶۳ سال تھی تخت شاہی پر براجمان ہوئے۔ بادشاہت کمزور سے کمزور تر اور انگریز طاقت ور ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ انگریز دہلی پر قابض ہو گیا۔ سقوط دہلی ایک دردناک داستان ہے۔ جون ۱۸۵۸ء لال قلعہ میں بہادر شاہ پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور موت کی سزا سنادی گی جس کو بعد میں جلاوطنی میں تبدیل کر دیا گیا۔ بادشاہ کو تمام اہل و عیال جو بھی تھے کے ہمراہ دلی سے الہ آباد، مرزا پور، بکسر، دیناپور، رامپور بلیا، کھلنا، اور پھر جنگی جہاز ماگارے کے ذریعہ ۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون پہنچا دیا گیا۔ بہادر شاہ نے اپنے سفر کا کچھ اس طرح اشعار میں بیان کیا۔

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغ باں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

رنگون کے قید خانے میں قلعے والوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا گیا لیکن اس

کے باوجود بہادر شاہ ظفر کی صحت خراب سے خراب تر ہوتی گئی اس کی وجہ ایک تو ضعیفی تھی اور یہ بھی کہ کہاں بادشاہ وقت کہاں ایک قیدی۔ صحت پر تو لازمی اثر پڑنا ہی تھا۔ حلق پر فالج کا حملہ ہوا، کھانا پینا جاتا رہا۔ اس کے باوجود اسی کیفیت میں چار سال گزار کرے نومبر ۱۸۶۲ء بروز جمعہ بہادر شاہ ظفراللہ کو پیارے ہوئے جہاں قید تھے اسی جگہ ان کی قبر بھی بنادی گئی۔ 'تاریخِ ادبِ اُردُو' کے مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ 'بہادر شاہ ظفر عظمتِ رفتہ کی آخری نشانی تھے۔ مزاجاً رحم دل، بامروت، غریب پرور، وسیع المشرب اور خلیق تھے۔ نخوت و غرور نام کا نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے ظفر کو 'دہلی کا آخری سانس' قرار دیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے وطن میں دفن نہ ہونے کا اظہار کرب اور

افسوس کے ساتھ اپنی ایک غزل میں خوبصورت انداز میں کیا۔

ہے کتنا بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

حسرت سے بہادر شاہ ظفر نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ ان کی خواہش تو تھی کہ ان کا گھر مدینہ میں بنے۔

یہی حسرت تھی کہ گھر میرا مدینہ میں بنے
بنا رنگون میں ارماں مرے سینے میں رہے

بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے ایک شاعر نے اسی مضمون کو کچھ اس طرح بیان کیا ۔

نہ دبایا زمیں نے اُنھیں نہ دیا کسی نے کفن اُنھیں

نہ ہوا نصیب وطن اُنھیں نہ کہیں نشان مزار ہے

بہادر شاہ ظفر کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے دادا شاہ عالم ثانی کی زیر سرپرستی ہوئی ۔
شاعری اور فن خطاطی کا شوق بھی دادا کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی بھی شاعر تھے اور شعاعؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ جب کہ ان کے دادا شاہ عالم ثانی بھی شاعر تھے اور آفتابؔ تخلص کیا کرتے تھے ۔ گویا بہادر شاہ ظفرؔ کو شعر و سخن کی نعمت اپنے اجداد سے وراثت میں ملی تھی

انھوں نے شاہی ماحول میں آنکھ کھولی جس کا اظہار اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ۔

جو ہیں ظفرؔ پیدائش ان کی بے فکری میں گزرے ہے

آٹھ پہر اندیشہ ہی میں دانشور کے جاتے ہیں

بہادر شاہ ظفرؔ کے جسم میں شہنشاہوں کے ساتھ ساتھ شعراء اور ادباء کا خون

بھی رواں تھا جس نے بہادر شاہ کو سخن فہمی کی جانب مائل کیا۔ انہیں شاہی ماحول میں موجود بلند پایہ شاعروں و دانشوروں کی صحبت بھی میسر تھی ۔ یہ دور اکبر شاہ ثانی کا تھا۔ میر عزت اللہ عشقؔ، شاہ نصیر، محمد ابراہیم ذوقؔ، میر کاظم حسین اور اسد اللہ خان غالبؔ جیسے بلند پایہ شعراء دربار سے وابستہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے ان شعراء کے درمیان نہ صرف آنکھ کھولی بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان شعراء کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ بہادر شاہ کم عمری سے شعر کہنے لگے۔ پروفیسر ڈاکٹر سردار احمد خان نے اپنی تصنیف بہادر شاہ ظفر شخصیت، فکر و فن' میں لکھا ہے کہ ' ظفرؔ نے دس سال کی عمر سے شعر' گوئی کی تو انھوں نے میر عزت اللہ عشقؔ اور شاہ نصیر سے تقریباً بیس سال مشورہ سخن کیا ہوگا'۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں شاہ نصیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے ان کے بعض اشعار سے یہ واضح ہے ۔ؔ

سنگ لاخ ایسی غزل تو نے یہ لکھی ہے ظفرؔ
سن کے ہو جائیں جیسے طبع کے گھوڑے پتھر

بہادر شاہ ظفرؔ کا تعلق استاد ذوقؔ سے بھی گہرا رہا۔ ظفرؔ کے کلام میں استاد ذوقؔ کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ ظفرؔ، ذوقؔ کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔

ترے سخن میں ہے استاد ذوقؔ کا وہ فیض

غزل نہ لکھی کسی نے ظفرؔ برابر کی

بعض نقادوں نے ظفرؔ کے کلام کو استاد ذوقؔ سے منسوب کیا اور کہا کہ ظفرؔ کیونکہ دینے والے منصب پر تھے اور استاد ذوق لینے والے منصب پر تھے اس لیے ذوق، ظفر کو شعر لکھ کر دیا کرتے تھے۔ڈاکٹر جالبی کے مطابق ظفرؔ (پیدائش ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء) ذوقؔ پیدائش ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء) کے ہوش سنبھالنے سے پہلے صاحب دیوان بن چکے تھے اور) ظفرؔ، ذوقؔ سے عمر میں چودہ سال بڑے تھے۔ دیوانِ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اپنا دیوان ۱۲۱۴ھ ۱۸۰۰ء میں مکمل کر چکے تھے'۔ جالبی صاحب نے حافظ محمود شیرانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے بھی اس بات کی تردید کی ہے کہ ظفرؔ کا کلام استاد ذوقؔ کا کہا ہوا ہے اس بات کی نفی کرتے ہوئے اسے بے بنیاد اور لغو قرار دیا ہے۔ اسی طرح مورخین نے مولانا محمد حسین آزادؔ اور انگریز مورخ اسپر نگر کی تنقید کو بھی بے سروپا قرار دیا ہے۔ منشی امیر احمد علوی نے اپنی کتاب 'تاجدارِ دہلی محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر'مطبع ۱۹۲۵ء لکھنؤ میں لکھا ہے کہ 'کلیات ظفرؔ کا بیشتر حصہ ذوقؔ کا اصلاحی ہے اس میں کلام نہیں ظفرؔ کی شاعری کو ذوقؔ کی تربیت سے فروغ ہوا'۔ امیر احمد علوی کے مطابق ' مؤلف تذکرۂ گل رعنا' کا کہنا ہے کہ 'ذوقؔ، ذوقؔ ہیں، ظفرؔ کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں۔ ظفرؔ کے یہاں جو

سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا۔ محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف والفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور جگر دو کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے اب انہیں ظفرؔ کا سمجھو یا ذوقؔ کا'۔

استاد ذوقؔ ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲۷۱ھ میں انتقال کر گئے۔ اب بہادر شاہ ظفرؔ کو اپنے کلام پر اصلاح لینے کے لیے کسی اور استاد شاعر کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مرزا غالبؔ سے بہتر کوئی اور استاد کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ذوقؔ کے بعد قلعہ میں غالبؔ کی خوب قدر افزائی ہوئی اور غالبؔ نے بہادر شاہ کے کلام پر اصلاح بھی دی۔ لیکن بقول الطاف حسین حالیؔ، ' مرزا غالبؔ اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے'۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غالبؔ کا اصلاح شدہ کلام غدر میں تلف ہوگیا۔ قلعہ میں مرزا غالبؔ کی قدر دانی عروج پر تھی، غالبؔ اپنی شوخی سے بھلا کیسے باز آ سکتے تھے۔ ایک روز شہنشاہ کے حضور یہ شعر کہا۔

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب

نظام الدین خسرو، سراج الدین کو غالبؔ

بہادر شاہ ظفرؔ ان شعراء میں سے ہیں کہ جنھوں نے اپنے ہمعصر شعرا کا

باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ مرزا مظہر جاں جاناں، میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ، کا دور گزر چکا تھا، میر تقی میرؔ موجود تو تھے لیکن وہ ضعیف ہو چکے تھے۔ ظفرؔ کی متعدد غزلیں معروف شعراء کی زمین میں ہیں لیکن ظفرؔ کا انداز سخن اپنی جگہ انفرادیت لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ان کا شعری قد بلند پایہ شعراء سے کسی بھی طور پیچھے نظر نہیں آتا کسی کسی جگہ تو وہ ان سے آگے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سردار احمد خان 'غالبؔ کا انداز سخن اگرچہ دوسرے شعراء سے علیحدہ ہے لیکن ظفرؔ نے غالبؔ کی طرح جو غزلیں کہیں ان میں وہ غالبؔ کے دوش بدوش نظر آتے ہیں'۔ اس حوالے سے ظفرؔ کے بعض شعر ملاحظہ کیجئے۔

حیدر علی آتشؔ کا یہ شعر۔

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے ہونے نہ دیا

اسی زمین میں ظفرؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

رات بھر مجھ کو غمِ یار نے سونے نہ دیا
صبح کو خوفِ شبِ تار نے سونے نہ دیا

غالبؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اب ظفرؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

مینھ خوب برستا ہے جو ہوتی ہے ہوا بند
بہتے ہیں ظفرؔ اشک دمِ ضبطِ فغاں اور

بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری، شاعری کے جملہ رموز و اوقاف کی پابند نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے اندر ایک مقصد لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی شاعری سے اخلاقیات کا پیغام دیتے ہیں، شاعری کو لفظوں کی کتھا نہیں سمجھتے بلکہ وہ شاعری کو ادب کا اہم فن تصور کرتے ہیں اور اسے علماء و فضلاء کی ذمہ داری بھی۔ وہ شاعری میں نئے نئے مضامین اور خیالات کو سامنے لانے کے قائل ہیں

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جسے تلاش ہے مضمون کی جانتا ہے وہ
کہ ہے تلاش سے سب کی جدا ظفرؔ کی تلاش

بہادر شاہ کی شاعری سادہ اور عام فہم ہے۔ ہر خاص و عام اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ ساتھ ہی ظفرؔ خوش فکر کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں ؎

تجھ سا تو خوش فکر و خوش گفتار دیکھا ہی نہیں
جو غزل تیری سنی ہم نے ظفرؔ اچھی سنی

'بہادر شاہ ظفرؔ نیک، پابند صوم و صلوۃ تھے۔ غالبؔ نے انہیں 'شاہِ دیں دار

کہا۔ مذہبی طور پر پیر مریدی کی جانب مائل
اور مولانا فخر الدین سے بیعت تھے۔ اپنے پیر و مرشد کے لیے یہ شعر کہا۔
اے ظفرؔ دل سے ہوں خاکِ درِ فخر الدین
معتقد میں نہ گداؤں کا ہوں نہ شاہوں کا

منشی امیر احمد علوی نے لکھا ہے کہ 'بہادر شاہ ظفر پر درویش کا رنگ چھڑا ہوا تھا۔ اسرار و نکاتِ تصوف بیان فرمانے اور پیری و مریدی فروغ پر تھا۔ اپنے مریدین کو پانچ سو روپے ماہوار بطور مددِ معاش کے خزانہ عام سے ملتا تھا۔ دوسری جانب بہادر شاہ کو رقص و موسیقی سے بھی جذباتی لگاؤ تھا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی 'تقویٰ اور رقص و موسیقی کا یہ تضاد اس لیے تھا کہ عظمتِ رفتہ کی روایت کا حصہ تھا۔ ایسا ہی ہوتا آیا تھا، اس لیے ایسا ہی ہونا چاہیے اور اسی لیے ایسا ہی ہوتا رہا'۔

ظفرؔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں یکساں عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کی وجہ ان ان کے مزاج میں پایا جانے والا وہ جذبہ تھا جس کے باعث وہ ملت سے محبت، مذہب سے عشق کے علمدار تھے۔ تعصب جیسی کوئی چیز بہادر شاہ ظفرؔ میں موجود نہیں تھی۔ خطاطی میں خطِ نسخ کے ماہر تھے۔ اپنے خوش نویس ہونے پر فخر تھا۔ کہتے ہیں۔

خوش نویس ایسا ہے تو دیکھ کے ہوتے ہیں خجل
تیرے خامے کی ظفرؔ صاحبِ فرہنگ تراش

بہادر شاہ ظفرؔ غزل میں جدت پسندی اور نئے نئے موضوعات، انوکھے پن کے قائل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غزل میں کوئی انوکھی چیز نہ ہو تو اس غزل کے بیان کرنے میں انہیں لطف نہیں آتا ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔

دل اپنا فکر غزل میں نہیں لگتا
زمیں غزل کی نہ ہووے اگر انوکھی سی

باندھے نئے مضامین چن کر ظفرؔ سب اس میں
تجویز جس غزل کی ہم نے زمیں نئی کی

ظفر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اسی طرح اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حمدِ باری تعالیٰ کے حوالے سے ظفرؔ کہتے ہیں۔

کہاں ایسا ہمارا منہ کہ ہو جاوے ادا ہم سے
ظفرؔ حمدِ الٰہی وہ جو شایانِ الٰہی ہے

نعتِ رسول مقبول ﷺ کے بیان کرنے پر ظفرؔ نے کہا۔

منہ کیا مرا ظفرؔ جو کہوں نعت مصطفٰے
ان کی ثنا خدا نے ہے قرآن میں لکھی

خلفۂ راشدین سے محبت و عقیدت ان کے ایمان کا حصہ تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا۔

ابوبکر و عمر، عثمان و حیدر کا ہے کیا کہنا
ظفر ہم خاکِ پا ان چار یار مصطفٰی کے ہیں

وہ مسلماں ہیں ظفر صاحبِ ایماں کہ جنھیں
نہ صحابہ سے ہو بغض اور نہ شبیر سے لاگ

بہادر شاہ ظفرؔ نے ادب کی تمام تر اصناف میں شعر کہے ان میں حمد، نعت رسول مقبول ﷺ ، رباعی، مثلث، مخمس، پنکھا، قطعات، سہرے، سلام مرثیہ، دوہے، ٹھمریاں، مسدس، تضمین شامل ہیں۔ ظفر کے کلام میں موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گانے والوں نے ان کے کلام کو خوبصورتی سے گایا ہے۔ ظفرؔ کی مشہور غزل کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں، نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں

جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں ' جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

ظفرؔ کی ایک اور خوبصورت غزل کے چند اشعار ۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے دل کون ترا صبر و قرار
بے قراری مجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری میں یاسیت ہے، نرماہٹ ہے، غم انگیزی ہے، میٹھاس ہے اثر انگیزی ہے ، قید کی تنہائی کا دکھ ہے، کرب ہے، ویرانگی ہے، ٹوٹ پھوٹ ہے، عرش سے فرش پر آنے کی کسک ہے۔ ظفرؔ کی شاعری دل پر اثر کرتی ہے۔

خوب گزری گرچہ اوروں کی نشاط و عیش میں
اپنی بھی رنج والم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

اے ظفرؔ یہ ترے اشعار ہیں یا لہ زار
کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

بہادر شاہ ظفرؔ تاجدارِ دہلی کے علاوہ ایک شاعر کی حیثیت سے عوام الناس میں زیادہ جانے جاتے ہیں ۔ انہیں مقبول شاعروں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔

ان کی بعض بعض غزلیں عوام میں بے انتہا مقبول ہیں۔ مختلف موضوعات پر ظفر کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چند موضوعات اور شعر ملاحظہ کیجئے۔

بھلائی کرنا واجب

ہے یہ نسخہ خوب ظفر کام آئے گا اس کو یاد رکھو
کوئی برائی لاکھ کرے پر تم پر بھلائی واجب ہے

خاکساری

اے ظفر خاک سے انسان کا بنا ہے پتلا
خاکساری ہی سے دنیا میں ہے انساں کی نمود

خدمت میں عظمت ہے

وہ سچ کہتے ہیں خدمت ہی میں عظمت ہے
کہ جو ہوتا ہے خادم پھر وہی مخدوم ہوتا ہے

حرص

خدا محفوظ رکھے آدمی کو حرص دنیا سے
کہ جو رہتا ہے اس میں ذلت و خواری میں رہتا ہے

دوستی

دوست اچھے ہو تو پوری دوستی کے ہو رہو
یا کسی کو کر رکھو تم یا کسی کے ہو رہو

نادان کی دوستی

نہیں ناداں کی دوستی بہتر بلکہ دانا کی دشمنی اچھی

وضع داری

ہم اس کی بات کے قائل ہیں اے ظفر جس نے

بھلا کہا جسے منہ سے اسے برا نہ کہا

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ظفر کی شاعری کو ان کی آپ بیتی قرار دیا اور کہا کہ ’ اس کے مطالعہ سے ان کی زندگی اور رویوں کا کھوج لگایا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کی تصویر اتاری جا سکتی ہے‘۔ ظفر کی مشہور زمانہ غزل کے چند شعر۔

لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیا میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
ہے کتنا بد نصیب ظفر دفن کے لیے

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

منشی امیر احمد علوی کے مطابق بادشاہ کے پانچ دیوان تھے لیکن دفتر پنجم آشوب غدر میں ضائع ہو گیا۔ دیوان اول، دوم، سوم اور چہارم راقم کو انجمن ترقی اردو کے 'کتب خانہ خاص' میں ملے اور راقم نے ان کا مطالعہ کیا۔ یہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع شدہ ہیں۔ دیوان اول پر تاریخ اشاعت درج نہیں، یہ جلد ۳۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جلد دوم کے ۱۹۸ صفحات ہیں، جلد سوم ۱۹۶ اور جلد چہارم ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ یہ سب مطبع سلطانی سے چھپے ہوئے دوادین کی نقل ہیں جنہیں مطبع نول کشور نے ۱۸۶۹ء میں 'کلیات ظفر' کے نام سے شائع کیا۔ بنیادی طور پر یہ دیوان ۱۸۴۵ء (دیوان اول)، ۱۸۵۰ء (دیوان دوم) اور پھر چارو دیوان میرٹھ سے ۱۲۷۸ھ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئے تھے۔ کلیات ظفر کے علاوہ ظفر کی نثری تصانیف میں ظفر نے ۱۲۲۶ھ میں ' لغت اور اصطلاح دکن' تین جلدوں میں مرتب کی تھی اس تصنیف کا نام 'تالیفات ابو ظفری' ہے اس تصنیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کہاں گئی کچھ نہیں معلوم۔ دوسری نثری تصنیف 'خیابانِ تصوف' ہے، شرح گلستان یہ ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی سے طبع ہوئی۔

استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی

جانشین فصیح الملک داغ دہلوی

۱۸۶۳ء تا ۱۹۵۵ء

بیخودؔ دہلوی اردو زبان کے شعرائے متوسطین میں سے ہیں۔اردو شاعری کا یہ دور اُنیسویں صدی کے آغاز سے کوئی ۱۸۷۰ء تک شمار کیا جاتا ہے۔اس دور نے دہلی (دلی) اور لکھنؤ میں اردو کے مایہ ناز اور بلند درجے پر فائز شعرا کو جنم دیا۔ولیؔ کے بعد میرؔ، غالبؔ، سوداؔ کا شعری زمانہ اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچانے کا دور تھا۔ہر استاد نے اردو شاعری کی بنادوں کو دوام بخشا۔دورِ متوسطین کے شعرا دورِ مقتدمین کے نقش قدم پر ہی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔بیخودؔ کے ہمعصر شعرا میں داغ دہلوی (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء)، الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)،اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء۔۱۹۱۷ء)، شادؔ عظیم آباد(۱۸۴۶ء۔۱۹۲۷ء) ، نظم طباطبائی (۱۸۵۲ء)،احمد رضا بریلوی(۱۸۵۶ء ۔۱۹۲۱ء)، شیخ محمد ابراہیم آزادؔ(۱۸۶۸ء۔۱۹۴۷ء)، سائلؔ دہلوی (۱۸۶۸ء۔۱۰ ستمبر ۱۹۴۵ء)، مولانا ظفرؔ علی خان (۱۸۷۰ء) ، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)، مولانا محمد علی جوہرؔ(۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء)، حسرتؔ موہانی (۱۸۷۸ء ۱۹۵۱ء)، فانی بدایونی(۱۸۷۹ء)،اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء) شامل

ہیں۔ڈاکٹر اے وحید نے اس دور کے شعرا کی جو فہرست مرتب کی ہے ان میں رنگین، جان صاحب، سلیمان، قائم، منت، ممنون، قدرت، بیدار، ہدایت، ضیا، بقا، فراق، حزیں، بیان، راسخ، نظیر، ناسخ، آتش، اسیر، برق، مہر، منیر، قلق، بحر، سحر، ذکی، درخشاں، شفیق، بیخود، ھنر، ھلال، وزیر، رشک، مہر، منیر، سعادت، واجد علی شاہ اختر، انیس، دبیر، رشید، اوج، ذوق، شیفتہ، تسکی، ظہیر، انور، مجروح، سالک، آرزو شامل ہیں۔بقول ڈاکٹر وحید غیر معروف شعرا تو ان گنت

ہیں۔

بیخودؔ دہلوی اتوار ۲۲ فروری ۱۸۶۳ء میں ہندوستان کی ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے۔احمد حسین صدیقی نے شعرا کا جو تصویریں البم ''چند تصویرِ رفتگاں'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے اس میں بیخودؔ کی تاریخ پیدائش ۲۱ مارچ ۱۸۶۰ء لکھی ہے۔وہاب اشرفی نے 'تاریخِ ادبِ اردو: ابتداء سے ۲۰۰۰ء تک' جلد اول میں بیخود کی تاریخِ پیدائش کا سال ۱۸۵۸ء لکھا ہے جب کہ لالہ سری رام اس بات پر خاموش ہیں۔ڈاکٹر وحید نے ۳ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ (۱۹۶۲ء) تحریر کیا ہے۔اسلامی تاریخ کے حساب سے ان کی تاریخ پیدائش اتوار ۲۲ فروری ۱۸۶۳ئ ہوئی جو زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔بھرت پور ہندوستان کے صوبے راجستھان کے مشرقی حصے میں ہے اسے مہاراجہ سورج مل' نے ۱۷۳۳ء میں آباد کیا تھا۔اس کا قدیم نام 'میوات' تھا لیکن جب' ہندوستان بھارت کہلایا تو 'میوات' بھرت

پور بن گیا۔اس اعتبار سے بیخودؔ پیدائشی راجپوت ہیں لیکن ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ تذکرہ ہزارداستان معروف بہ خمخانۂ جاید'' کے مصنف لالہ سری رام نے اپنے'' تذکرے میں لکھا ہے کہ'' بیخودؔ کی عمر کا ابتدائی زمانہ اپنے والد شمس الدین احمد کے ساتھ ریاست بھرت پور میں گزرااور وہیں فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم پائی پھر دہلی آکر اپنے شوق سے اچھی علمی استعداد پیدا کی اور وجاہت خاندانی و میلان طبع سے اچھے بزرگوں کی صحبت اٹھائی۔بیخودشاعروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد شاعر تھے اور سالمؔ تخلص کیا کرتے تھے۔ یہ خاندان شاعر ہی نہ تھا بلکہ ان کے پردادا عالمگیر ثانی کے دورِ حکمرانی میں وزیر کے عہدہ پر فائز تھے۔ چنانچہ خاندانی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی بیخودؔ کا خاندان اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ شاعری بیخودؔ کا فطری ذوق اور آبائی میراث تھی۔ بیخودؔ نے شاعری شروع کی تو ان کی عمر ۱۲سال تھی۔خاندانی روایات کے مطابق بیخودؔ کو بچپن میں ہی فن سپہ گری، شکاریات، پہلوانی اور دیگر فنون لطیفہ کی جانب مائل کرنے کی تدابیر کی گئیں لیکن وہ توایک شاعر کی سوچ اورشاعر کی روح لے کرپیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کے سفر کو طے کرتے ہوئے شاعری کے بلند مرتبے کو جالگے۔ تمام فنون پیچھے رہ گئے اور شاعری ان

کی زندگی کی میراث ٹھہری۔

بیخودؔ دہلوی کا نام سید وحید الدین احمد تھا۔ ابتدا میں 'نادر' تخلص کیا لیکن جلد بیخودؔ تخلص کرنے لگے اسی سے معروف ہوئے۔ دہلی آبائی وطن تھا اس لیے دہلوی کہلائے۔ اردو اور فارسی کی تعلیم مولانا الطاف حسین حالیؔ سے حاصل کی۔ حالیؔ کی صحبت میں ہی بیخودؔ کو شعر و سخن سے رغبت پیدا ہوئی۔ حالیؔ نے بیخود میں شعری ذوق دیکھتے ہوئے انہیں اس یگانہ روزگار شاعر داغؔ دہلوی جن کا شاعری میں اس وقت طوطی بول رہا تھا کی باقاعدہ شاگردگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ بیخودؔ دہلوی نے حالیؔ کے مشورے کو مُختَبر جانا اور داغؔ کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ یہ واقع ۱۸۹۱ء کا ہے۔ اس وقت داغؔ حیدر آباد دکن میں تھے۔ بیخودؔ حیدر آباد دکن چلے گئے اور کوئی چھ ماہ استاد سے مشق سخن حاصل کرتے رہے۔ بیخودؔ اپنے استاد کے سامنے دل و جان سے فدا تھے۔ استاد نے بھی اپنے شاگرد کو سخن فہمی کے تمام نکات اس طرح سمجھائے کہ شاگرد کی شاعری میں نکھار آگیا۔ شاگرد نے اپنے استاد کے شاعرانہ روپ و رنگ کو ایسا اپنایا کہ ان کا شمار داغؔ کے خاص تلامذہ میں ہوا۔ جانشین داغؔ اور وحید العصر کہلائے۔ یہی نہیں بلکہ داغؔ نے بیخودؔ کو بھی استادی کے مرتبے پر فائز کر دیا۔ بیخودؔ دہلوی اپنے استاد کی استادی کے قدر دان تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے اس شعر میں کیا۔

زباں استاد کی بیخودؔ ترے حصے میں آئی ہے
پھر اتنا بھی نہیں کوئی خدا رکھے ترے دم کو

بیخودؔ، داغؔ کے علاوہ مومنؔ اور غالبؔ کی شعری صلاحیتوں کے دل سے مُعتَرف تھے۔ ان کا احترام اور ان جیسی صلاحیتوں کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ بیخودؔ دہلوی کا یہ شعر استاد کے ساتھ ساتھ مومنؔ اور غالبؔ کی صفات کی تمنا لیے ہوئے ہے۔ ؎

زباں استاد کی بیخودؔ تو ہو مضمون مومنؔ کا
بیاں غالبؔ کا ہو اشعار کی یہ شان پیدا کر

استاد داغؔ بھی اپنے ہونہار شاگرد کی صلاحیتوں کے قدر داں تھے۔ لالہ سری رام نے بیخودؔ کے بارے میں داغؔ کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''داغؔ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی شاعری اور زبان دانی میرے قابلِ اطمینان ہے، اصناف کلام پر بہ فضل تعالیٰ قدرت رکھتے ہیں داغ کی زبان ان کی زبان ہے یہ مجھے اُستاد کہہ کر ناز کرتے ہیں میں ان کو اپنا بچہ سعید جان کر دعائے عمر دراز'' ۔شاہد احمد دہلوی بیخودؔ کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ 'حکیم واصل خان نے استاد داغؔ سے پوچھا ''آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی
باقی رہے گا''؟ استاد نے فرمایا ''بیخودؔ۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری

زبان گھر کے گھر میں رہی''۔

بیخودؔ مطالعے کے بے حد شوقین تھے۔شاعری کے ساتھ ساتھ ماہر نثر نگار بھی تھے۔ ناول سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا۔ بہت ناول پڑھا کرتے تھے۔ ناول کے اسی شوق نے ان سے ایک ناول ''ننگ و ناموس'' لکھا۔ یہ ناول عورتوں کے پردے کے بارے میں مولانا عبدالحلیم شررؔ کی تحریک پر لکھا گیا تھا جس میں پردے کی اچھائیاں اور خامیوں کا ذکر تھا۔انہوں نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی تھی۔ بیخودؔ شاعری میں ہی استاد نہ تھے بلکہ وہ معلم کی حیثیت سے ان لوگوں کو جنہیں اردو زبان نہیں آتی تھی خاص طور پر انگریزوں اور عیسائیوں کو اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے، یہی ان کا ذریعہ معاش بھی تھا۔ یہ عمل ۳۲ سالوں پر محیط رہا۔ گویا ان کا پیشہ معلّمی تھا۔

بیخودؔ نے طویل عمر پائی تھی ،شاہد احمد دہلوی نے بیخود دہلوی کا خاکہ تحریر کیا جو ان کی کتاب ''گنجینۂ گوہر'' میں شامل ہے۔ شاہد دہلوی نے بیخود کو ان کی آخری عمر میں دیکھا ۔ طویل عمر کی صورت میں زندگی کے آخری شب و روز بہت مختلف ہوا کرتے ہیں۔ صحت کا کمزور ہوجانا، چلنے میں مشکلات پیش آنا، ہاتھوں میں رعشہ کا آجانا، دانت مصنوعی ہونے کے باعث گفتگو کا انداز بدل جانا، سب سے بڑھ کر مزاج میں تبدیلی عام سے بات ہے۔ بیخودؔ کے ظاہری حلیہ کا ذکر شاہد

احمد دہلوی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔ ''بیخوؔد صاحب اس وقت اسّی سے اوپر ہو چکے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا۔ رنگ گھٹا ہوا گندمی، سفید براق سر سیدی داڑھی، لبیں ترشی ہوئیں۔ اتنی عمر ہونے پر خاصے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے۔ بتیسی پوری نقلی چڑھی ہوئی تھی۔ جس کا تالوا اکثر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جبڑا نیچے آ رہتا۔ پھر اسے چبا کر ٹھیک کرتے تو بات کرتے۔ لہجہ خالص دلی والوں کا تھا۔ تکلف سے بری، اور آواز اونچی اور کراری تھی''۔ آخری عمر میں ان کے مزاج میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ خاص طور پر حج کرنے کے بعد ان کے مزاج اور ان کے کلام بھی وہ نہیں رہ تھا ۔لالہ سری رام نے بیخوؔد کو بڑا خلیق ملنسار، زندہ دل، پابند وضع شخص لکھا ہے۔

بیخوؔد اپنی شاعری پر بہت نازاں تھے۔ شاعری میں ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ میرے پر دادا شیخ محمد ابراہیم آزاؔد کا کلام ''دیوان آزاد'' کے نام سے ۱۹۳۲ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ جناب آزاؔد، بیخوؔد کے تلامذہ میں سے تھے۔ آزاؔد صاحب ۱۹۱۳ء میں

باقاعد سلسلہ شاگردی استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخوؔد دہلوی جانشیں فصیح الملک داغ دہلوی داخل ہوئے۔ بیخوؔد دہلوی نے آزاؔد کے بارے میں لکھا کہ '' خمخانۂ بیخوؔد کے جرعہ کشوں میں ایک حاجی شیخ محمد ابراہیم آزاؔد کا نام بھی درج رجسٹر شاگرداں ہے خدا اُن کو زندہ رکھے صوفی منش انسان ہیں حمد و نعت کہتے ہیں عاشقانہ شعر

نہیں کہتے تعجب خیز امر یہ ہے کہ باوجود شغل وکالت شعر کہتے ہیں ان کا کلام بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چندہ محتاج نہیں ۔ کئی سال ہوئے میں نے ان کو نعت گوئی میں اپنا خلیفہ بنالیا تھا''۔ بیخودؔ نے نظم

میں آزادؔ صاحب کی شخصیت اور کلام کا نقشہ اس طرح کھینچا ۔

نام آزادؔ وضع کے پابند میرے شاگرد میرے عاشق زار

ہیں یہ مداح سرورِ عالم نعت گوئی ہے خاص ان کا شعار

ان کے اشعار سب ہیں تاریخی

کرتے ہیں واقعات کا اظہار

یہ محدث نہ یہ مُورخ ہیں یہ تو عشق نبی کے ہیں بیمار

ہیں یہ مداح سیرت نبوی اور مداح اِن کا بیخودؔ زار

بیخودؔ کے ایک اور شاگرد شیخ محمد عبداللہ بیدلؔ بیکانیری، راجستھان کے معروف شاعر اور استاد بیخودؔ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔مالک رام نے 'تذکرہ معاصرین' میں لکھا ہے کہ بیخودؔ نے اپنے شاگرد بیدلؔ بیکانیری کے بارے میں کہا جو بیدلؔ کے دیوان ''باغ فردوس'' کے آخر میں موجود ہے کہ ''بیدلؔ نے میری زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے میرے پاس مالِ دنیا سے اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان رکھتا تھا، وہ حضرت بیدلؔ کی نذر ہوئی، ان کے بہت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں''۔ بیدلؔ بیکانیری بھی دل و جان

سے اپنے استاد کے قدر داں تھے۔ بیدلؔ اپنے استاد کی شان میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

شاعر نہیں ہے حضرت بیخود سا ہند میں
شہرہ ہے آج جن کا جہاں میں بجائے داغ

ایک اور جگہ بیدلؔ بیکانیری نے کہا ۔

حضرت بیخود کا ہر شاگرد ہے ساغر بکف
بیخودی طاری ہو بیدل کا دیوان دیکھ کر

بیخودؔ دہلوی اسلوب بیان میں اپنے استاد داغؔ دہلوی کے شانا بہ شانہ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ داغؔ کی شعری تربیت کا نتیجہ ہے۔ معمولی معمولی موضوعات کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنے کا سلیقہ بیخودؔ کو خوب آتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ۔

مل جائے وہ تو اس کی بلائیں ضرور لوں
میں ڈھونڈنے چلا ہوں دعا کو اثر کے بعد

نکلی یہ جان یا کوئی کانٹا نکل گیا
راحت ملی ہے آج مجھے عمر بھر کے بعد

بیخودؔ مومن خان مومنؔ اور سائلؔ دہلوی کی طرح مقطع میں اپنا تخلص عمدگی کے

ساتھ استعمال کرتے ہیں جس سے مقطع و تخلص دونوں میں نکھار آ جاتا ہے۔ اپنے تخلص کے حوالے سے بیخودؔ نے خوبصورت شعر کہا ہے ۔

ہمیں معنی تو سمجھا دے ذرا بیخود کے اے بیخودؔ
یہ تو نے نام کیا رکھا ہے اپنا پارسا ہو کر

بیخودؔ دہلوی کے کلام میں سادگی، روانی، تسلسل اور بڑی حد تک ہمواری اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ وہ منظر نگاری، واقعہ نگاری، سیرت نگاری، اخلاق، ہمدردی، فلسفہ، وسعت نظر، حقیقت پسندی کی روح جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ دہلی جسے دلی بھی کہا گیا کے اجڑنے کو کئی شعرا نے اپنے شاعری کا موضوع بنایا اور خوبصورت شعر کہے۔ دہلی کے حالات اور واقعات سے بیخودؔ کا کلام خالی نہیں ، بیخودؔ نے

دلی کے اجڑنے کے درد کو اپنے اس شعر میں کس کرب کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

نہ لینا نام دلی کا ہمارے سامنے بیخودؔ
اُسی اُجڑے ہوئے گلشن کے ہم بھی رہنے والے ہیں

بیخودؔ کے اکثر اشعار میں فطری انداز کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

رقیبوں کے حوالے سے بیخودؔ کا یہ اچھا شعر ملاحظہ کیجئے ۔

رقیبوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہو گیا پیدا
خدا آباد رکھے میں تو کہتا ہوں جہنم کو

تحقیر اور توقیر کا امتزاج کیا خوب اس شعر میں کیا گیا ہے ۔

دل کا سودا نہیں کرنا مجھے تحقیر کے ساتھ
جان حاضر ہے اگر لیجئے توقیر کے ساتھ

بیخوؔد کے اشعار میں اس حوالے سے افسوس ناک باتیں، دکھ اور درد پایا جاتا ہے۔زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ سوز و گداز ان کی شاعری کا حصہ ہے ، سادگی اور بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔وہ شیریں ، مترنم اور منتخب الفاظ استعمال کر کے اپنے اشعار کو پر تاثیر بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو عام فہم الفاظ کے ذریعہ نظم کر دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیان کچھ کچھ حالیؔ اور استاد داغؔ سے ملتا جلتا ہے۔ بیخوؔد بنیادی طور پر سیدھے سادھے سچے ، خلیق، ملنسار، زندہ دل اور پابند وضع انسان تھے ان کے مجموعوں میں ' شہسوارِ بیخود' ، 'گفتارِ بیخود' اور 'دیوانِ بیخوؔد کے علاوہ شرح دیوان غالب اور ایک ناول ''ننگ و ناموس'' شامل ہے۔

بیخودؔ پاکستان آ گئے تھے شاید ان کا دل پاکستان میں نہیں لگا۔ انہیں اپنی دلی (دہلی) زیادہ عزیز تھی۔ شاید ان کی مٹی وہیں کی تھی، طویل عمر پائی، والد کی طرح سینچری تو نہ کر سکے ۹۳ سال کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ دہلی میں درگاہ خواجہ

باقی باللہ میں دفن ہوئے۔

مر گیا بیخودؔ تو اِس کا کیا ملال

موت تو آخر سب ہی کے ساتھ ہے

اسی موضوع کو ایک انداز سے اس طرح بیان کیا۔

مدفن میں اپنی خاک سے آئی صدا مجھے

میں نقش پائے یار ہوں لیکن مٹا ہوا

انتخاب کلام :

بگڑنا اس کا غصہ میں بھی شوخی سے نہیں خالی

مزے کی بات کہہ جاتا ہے ظالم بے مزا ہو کر

نام بیخود ہے تو مے خوار بھی ہوگا وہ ضرور

پارسا ہم تو سمجھتے نہیں کہتا ہے وہی

بات سُننے میں کیا قیامت ہے

ہر سخن مدعا نہیں ہوتا

کھٹکتی ہے مرے سینے میں یارب آرزو اُس کی

نکل جائے یہ دل کی پھانس وہ سامان پیدا کر
آپ کہتے ہیں کہ رہتا ہے ترا اکثر خیال
آپ کے دل میں تو گنجائش کہیں اتنی نہیں
لڑائی سے یوں جب ہی تو روکتے رہتے ہیں ہم تم کو
کہ دل کا بھید کہہ دیتی ہے لڑنے میں نظر دیکھو
خدا جانے کہ کیا گزری خدا جانے کہ کیا بیتی
جنابِ شیخ کعبے سے نہایت شرمسار آئے
محفل وہی مکان وہی آدمی وہی
یا ہم نئے ہیں یا تیری عادت بدل گئی
دل کو پہلو میں اضطراب رہا
زندگی بھر یہی عذاب رہا
رہے گی دھن میں زباں اپنے جب تک
زباں پر رہے گا فسانہ کسی کا
یہ دل کبھی نہ محبت میں کامیاب ہوا
مجھے خراب کیا آپ بھی خراب ہوا
نہ دیکھے ہوں گے رند لاأبالی تم نے بیخودؔ سے
کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہا ہوتے جاتے ہیں
انجمن ترقی اردو پاکستان کے ادبی رسالے ''قومی زبان'' کے شمارے دسمبر)

۲۰۱۳ء میں شائع ہوا)

پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر

پاکستان لائبریرین شپ کے معروف استاد و محقق

۱۹۷۱ء کے ابتدائی دنوں میں سے کوئی دن، شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی کے کتب خانے (یہ اب ڈاکٹر محمود حسین لائبریری ہے) کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ تمام کمروں کے چاروں اطراف کھلی ہوئی جگہ نے کلاس روم کو ضرورت سے زیادہ روشن کردیا تھا بلکہ چبھتی ہوئی روشنی کا احساس نمایاں تھا۔ کلاس روم میں کل ۷۷ طلبہ جن میں ۴۴ طلبہ اور ۳۳ طالبات تھیں۔ یہ ایم اے سال اول (لائبریری سائنس) کی کلاس تھی۔ تمام طلبہ نے جامعہ کے شوق میں کالے رنگ کے گاؤن زیب تن کیے ہوئے تھے (اُس زمانے میں جامعہ کے ہر طالب علم کے لیے کالا گاؤن پہننا لازمی تھا)۔ کلاس روم میں مکمل خاموشی، پہلے دن کے خوف نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی خاموش بنا دیا تھا سونے پر سہاگہ یہ کہ پروفیسر صاحب کے خشک اور دو ٹوک لہجے نے طلبہ کو دم بہ خود کر دیا تھا۔ پروفیسر صاحب کلاس میں تشریف لائے تمہیدی گفتگو کے بعد بتایا کہ وہ کیٹلاگ سازی پڑھائیں گے۔ لفظ کیٹلاگ آج پہلی بار سنا تھا اُس وقت تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی جنگلی جانور کا نام ہے جو وادیِ کیلاش سے تعلق رکھتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ عُقدہ کھلا

کہ یہ تو لائبریری سائنس کا ایک بنیادی مضمون ہے۔ پروفیسر صاحب کا نصیحت آمیز لیکچر ختم ہوا ان کے کلاس روم سے جاتے ہی ایک جانب سے آواز آئی "اف توبہ بڑا ہی مشکل مضمون ہے' خدا خیر کرے" اس پر ایک اور قہقہ لگا، یہ آواز کلاس کے ایک زیادہ عمر کے طالب علم منظور الکریم کی تھی جو اپنے مزاج میں بھرپور مزاح لیے ہوئے تھے ان کے ساتھ ان کے ایک اور دوست جبار نے ٹھیکہ لگایا 'بچ کے رہنا بھائیوں اور بہنو' ۔ لیکن چند ہی دنوں میں پروفیسر صاحب کی سختی نرمی اور پیار و محبت میں بدل گئی ۔ یہ تھے (سید جلال الدین حیدر (جو اب پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر ہیں

سید اعجاز حسین مرحوم کے بیٹے، آپ کے علاوہ آپ کی تین بہنیں ہیں جن میں آپ کا نمبر چوتھا ہے۔ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء کو ہندوستان کے شہر جون پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جون پور ہی میں حاصل کی، الہ آباد بورڈ سے جنرڈ شیعہ انٹر کالج، جون پور سے ۱۹۵۳ء میں میٹرک اور ۱۹۵۵ء میں انٹرپاس کیا، ۱۹۵۶ء میں والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور ناظم آباد نمبر ا میں سکونت اختیار کی بعد ازاں نارتھ ناظم آباد میں سکونت اختیار کی اور آج بھی وہیں مقیم ہیں۔ اردو کالج سے ۱۹۵۹ء میں بی اے، جامعہ کراچی سے ۱۹۶۱ء میں لائبریری سائنس میں ڈپلومہ، ۱۹۶۴ء میں مریکہ سے ایم ایل آئی ایس کرکے وطن واپس آئے ایک سال بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو سیدہ ریاض زہرہ سے رشتہ ازدواج میں

منسلک ہوئے آپ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ ایک انسان کو زندگی میں سب کچھ مل جائے۔ آپ کا ثابت قدم رہنا اللہ کی ذات پر پختہ ایمان کا مظہر ہے۔ ۱۹۶۰ میں جامعہ کراچی کے کتب خانے سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، صدر شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

لانبا قد، بھاری جسم (جواب نہیں رہا)، کتابی چہرہ، گندمی رنگت، گھنے سیاہ بال (جن میں اب سفیدی نمایاں ہے)، داڑھی مونچھیں صاف یعنی کلین شیو، ستواں ناک، آنکھیں چھوٹی اور کسی قدر اندر کی جانب، مضبوط ہاتھ پیر، زیادہ تر پینٹ شرٹ اور کوٹ پتلون لیکن کبھی کبھی شیروانی اور علی گڑھ کاٹ کے پیجامے میں بھی ہوا کرتے تھے اب تو اکثر تقاریب میں اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ جوانی میں وضع دار تھے تمام زندگی اسی وضع داری میں گزار دی، وقت اور اصولوں کے سخت پابند۔ کلاس میں کبھی دیر سے نہیں پہنچے کلاس میں آئے راسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر مخصوص انداز سے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر کلائی کی جانب وقت دیکھا ساتھ ہی کلاس پر ایک معنی خیز نظر دوڑائی انداز بتا رہا ہوتا کہ دیکھو میں بالکل وقت پر کلاس میں آگیا ہوں۔ جو کچھ پڑھاتے حد درجہ عالمانہ اور فنی انداز سے پڑھاتے البتہ لہجہ میں قدرِ کرختگی ضرور تھی۔

اس زمانے میں جامعہ کراچی میں سیمسٹر نظام رائج نہیں ہوا تھا اور ہر مضمون میں انٹر کے طور پر ۲۵ مارکس ہوا کرتے تھے جس (Internal Evaluation) نل ایویولیشن کی تفویض کا کل اختیار متعلقہ استاد کے پاس ہوتا تھا جلال صاحب دوران لیکچر ان ۲۵ نمبروں کا خوف بہت زیادہ دلایا کرتے تھے آپ کی یہ بات طلبہ میں اس قدر عام ہوئی کہ اکثر طلبہ آپ کو 'سر ۲۵ نمبر' کہنے لگے تھے۔ایک بار شعبہ سال اول و دوم کے تمام طلبہ پکنک منانے کسی ساحلی مقام پر گئے شعبہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر عبدالمعید، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزوری (اس وقت ڈاکٹر نہیں تھے)،ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر (اس وقت ڈاکٹر نہیں تھے)، اختر حنیف، اظہار الحق ضیاء اور ممتاز بیگم بھی تھیں۔چند طلبہ جن میں افتخار خواجہ (اب ڈاکٹر افتخار الدین خواجہ ہیں) بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے بانی صدر شعبہ ہوئے بعد ازاں شعبہ تعلیم سے ریٹائر ہوئے، رموز احمد خان (اس وقت شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، اسلامیہ یونیورسٹی ، بہاولپور کے صدر شعبہ ہیں)، عبدالجبار اور منظور الکریم (مرحوم) اس تماشے کے بنیادی کردار تھے۔ رموز احمد خان کو سر سے پیر تک سفید چادر ڈال کر زمیں پر لٹا دیا گیااور افتخار خواجہ نے ان سے سوالات دریافت کرنا شروع کیے۔ان کے چاروں جانب طلبہ اور اساتذہ کھڑے تھے۔ پہلے ڈاکٹر عبدالمعید کی جانب اشارہ کیااور پوچھا یہ کون ہیں ؟ ، جواب دیا گیا کہ ڈاکٹر عبدالمعید

پوچھا کہ یہ اِس وقتٖماں ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں جواب دیا گیا کہ یہ اس وقت آشور بنی پال کے کتب خانے میں ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ میں اس کتب خانے کی کتابیں جو مٹی کی تختیاں ہیں کس طرح اپنے ساتھ لے جاؤں۔ (زور دار قہقہ اور تالیاں)، پھر سبز واری صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں؟ جواب دیا کہ یہ سر اکرم ہیں اور اس وقت سوچ رہے ہیں کہ پکنک پر آئے ہوئے جن طلبہ نے چندہ نہیں دیا ان سے کیسے وصول کیا جائے (واضح رہے کہ سبز واری صاحب اس وقت مشیر طلبہ تھے اور تمام تر طلبہ سرگرمیاں ان ہی کی مرحون منت تھیں)، اس کے بعد تماشہ گر نے جلال صاحب کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں؟ جواب دیا یہ سر جلال ہیں اور اس وقت سوچ رہے ہیں کہ ۲۵ نمبر میں سے کس کس کو زیرو نمبر دوں اس جواب پر تمام لوگوں نے زور دار قہقہ لگایا۔

۱۹۷۲ء میں جلال صاحب ایران چلے گئے اور تبریز یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۷۵ء میں واپس آکر دوبارہ شعبہ سے منسلک ہوئے ڈاکٹر حیدر سے راقم کا تعلق استاد و شاگرد کے علاوہ ہم پیشہ و ہم مشرف کا بھی تھا چنانچہ اکثر شعبہ میں ان سے ملاقاتیں رہتیں لیکن کم کم اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم باقاعدہ طور پر اپنے استاد غنی الاکرم سبز واری صاحب کے قائم کردہ ادارے لائبریری پروموشن

بیورو اور اس کے تحت جاری رسالے 'پاکستان لائبریری بلیٹن' (نیا نام پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل) سے منسلک ہو چکے تھے اور' عثمانی و سبزواری' کے حلقے میں داخل تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا جلال صاحب اور ہم قریب آتے گئے اور تعلق استاد شاگرد سے بڑھ کر دوستانہ ہو گیا اب ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر ادب و لحاظ کے دائرہ میں رہتے ہوئے گفتگو ہونے لگی۔ راقم پہلی مرتبہ ۱۹۹۵ء میں اس وقت جب کہ جلال صاحب شعبہ کے سربراہ تھے بورڈ آف اسٹڈیز برائے لائبریری و انفارمیشن سائنس جامعہ کراچی کا رکن مقرر ہوااور مسلسل ۹ سال یہ فرائض انجام دیتا رہا ۔جلال صاحب کے بعد ڈاکٹر نعیم قریشی اور ڈاکٹر نسیم فاطمہ نے بھی میرے انتخاب کو بر قرار رکھا۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ اعزاز جلال صاحب ہی کی وجہ سے ملا تھا۔ راقم ۱۹۹۵ء ، ۱۹۹۷ء میں جزوقتی استاد بھی رہا۔

ڈاکٹر حیدر پاکستان میں لائبریرین شپ کے استاد الااساتذہ میں سے ہیں ۔آپ نے پاکستان لائبریرین شپ کو بہت کچھ دیا۔ آپ کے شاگرد جو ہزاروں میں ہیں پاکستان کے کونے کونے میں خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ بیرونی دنیا میں میں بھی آپ کے شاگروں کی بڑی تعداد ہے۔ آپ ایک علمی انسان اور بزرگ اسکالرہیں۔آپ کی علمی خدمات بہت وقیع اور محترم سمجھی جاتی ہیں۔ لائبریرین شپ کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جو آپ کے قلم کی گرفت میں نہ آسکا ہو۔ آپ کی تحریر کا

زیادہ حصہ انگریزی زبان میں ہے جو پاکستان اور بیرون ملک کے پیشہ ورانہ جرائد میں شائع ہوا، آپ نے اردو زبان میں بھی لکھا۔ ڈاکٹر خالد محمود کے ایک سروے کے مطابق بیرونی دنیا کے رسائل وجرائد میں ڈاکٹر حیدر کے تحریر کردہ مضامین تعداد کے اعتبار سے پاکستان میں لائبریرین شپ کے کسی بھی لکھنے والے کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہیں ۔وہ مسلسل لکھ رہے ہیں جو کام کیا بہت ہی محنت، لگن، جذبے اور انہماک سے کیا ان کی تحریر لائبریرین شپ میں معتبر اور محترم سمجھی جاتی ہے۔ ان کے شاگرد اور رفقا محبت اور احترام سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ڈاکٹر حیدر کی زیر نگرانی حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کے اساتذہ خالد محمود اور کنول امین نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت بھی آپ کے زیر نگرانی چند طالب علم لائبریری سائنس میں تحقیق میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر حیدر نے اپنے ریٹائرمنٹ (جولائی ۱۹۹۸ء) کے بعد اِستغنا کو اپنا شعار بنایا، آپ نوکری بعد از نوکری کے قائل نہیں جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آپ کو ریٹائر ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں آپ نے کوئی نوکری نہیں کی، البتہ آپ تین سیمسٹر کے لیے جز وقتی استاد ضرور رہے جسے آپ اپنی زندگی کی ایک غلطی تصور کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے آپ کو کل وقتی تصنیف وتالیف سے منسلک کیا ہوا ہے۔ قناعت پسند ہیں۔ تھوڑے کو بہت سمجھتے ہیں۔ آپ نے اپنے عمل سے یہ بھی

ثابت کیا کہ حصول علم کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں اور ہنر زندگی کے کسی بھی حصہ میں سیکھا جاسکتا ہے۔آپ نے ۵۶ سال کی عمر میں ۱۹۹۴ء میں لفبرو یونیورسٹی، برطانیہ (Loughborough University, UK) سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد کمپیوٹر میں دسترس حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیااور اپنے آپ کو اس قابل کیا کہ انٹرنیٹ کے استعمال کے ساتھ ساتھ اپنے مضامین از خود کمپوز کر سکیں اور وہ اب ایسا ہی کرتے ہیں ساتھ ہی انٹرنیٹ کی دنیا سے بھی مسلسل رابطہ میں رہتے ہیں۔جلال صاحب کے قریبی دوستوں کا حلقہ محدود نظر آتا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید کو پاکستان لائبریرین شپ کا واحد بانی تصور کرتے ہیں ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں اور ان کا ذکر اکثر کیا کرتے ہیں اور ان کی علم فہمی کے بڑے قائل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمعید پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کرچکے ہیں۔ اختر حنیف مرحوم آپ کے قریبی دوست تھے۔آپ کے جامعہ کراچی کے بعض پروفیسر حضرات سے بھی دوستانہ مراسم اور قربت ہے ان میں ڈاکٹر محمد صابر جو آپ کے پڑوسی بھی ہیں قریبی دوستی ہے۔ اکثر محبت سے ان کا ذکر کیا کرتے ہیں۔راقم کو بھی ڈاکٹر صابر کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی میں ایم ایل ایس کے دوران ترکی زبان کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا ڈاکٹر صاحب ہی استاد تھے۔

انسان کی پہچان اس کے ساتھ سفر کرنے سے بھی ہوتی ہے مجھے جلال صاحب کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد اور واپسی کا ہوائی سفر کرنے اور ہوٹل میں ایک ساتھ قیام کا اتفاق ہوا۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی سولھویں (۱۶) کانفرنس منعقدہ ۲۵۔۲۶ جون ۱۹۹۷ء بمقام نیشنل لائبریری آف پاکستان میں شرکت کا پروگرام ہم نے ساتھ بنایا۔اس وقت میرا گھر جلال صاحب کے گھر اور ائرپورٹ کے درمیان میں تھا چنانچہ آپ نے مجھے میرے گھر سے لے لیا میں نے ائرپورٹ پر کرایہ دینے کی کوشش کی مگر جلال صاحب کہاں یہ برداشت کرنے والے ، سفر اچھا گزرا راستہ میں مختلف پیشہ ورانہ اور دیگر موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ فلائٹ رات کی تھی اس وجہ سے شاید صبح تین بجے اسلام آباد پہنچے ،۔برسات نے سردی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا کراچی والوں کے لیے تو یہ اچھی خاصی سردی تھی ظفر جاوید نقوی ائرپورٹ پر موجود تھے انہوں نے ہوٹل پہنچایا ، ہم دونوں نے کچھ دیر آرام کیا صبح ہوتے ہی نیشنل لائبریری پہنچا دیے گئے۔ جلال صاحب نے ایک سیشن کی صدارت بھی کی مجھے بھی ایک پیپر پڑھنا تھا۔ رات میں جلال صاحب کے شاگرد آجاتے اور رات گئے محفل جمی رہتی۔ جلال صاحب ہر ایک کی توجہ کا مرکز ہوا کرتے تھے۔ دوسرے روز ہم جلدی فارغ ہوگئے فلائٹ رات کی تھی ہم دونوں ہوٹل کے آس پاس گھومنے نکل گئے مرغن کھانے کھا کر دونوں کی طبعیت بوجھل ہو گئی تھی چنانچہ ایسی جگہ کی تلاش شروع کی جہاں پر بہت ہی ہلکی چیز کھانے کو مل جائے آخر کار ہم اس میں کامیاب ہوگئے۔ واپسی

نائٹ کوچ سے تھی ائرپورٹ پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ جہاز ابھی کراچی ہی سے نہیں آیا ہمیں انتظار کرنا ہوگا اس طرح ہم نے رات کے کئی پہر لاؤنج میں گزارے، اس دوران مختلف موضوعات کے علاوہ کبھی ڈاکٹر عبدالمعید، کبھی ڈاکٹر انیس خورشید، کبھی اختر حنیف اور کبھی شعبہ کے حالات زیر بحث آتے رہے۔ جلال صاحب اور اکرم صاحب کا امریکہ جانا، اکرم صاحب سے دوستی اور کلسا کے حوالے سے اختلافات غرض قسم قسم کے موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ شاید رات دو بجے فلائٹ چلی اور ہم چار بجے کراچی ائرپورٹ پہنچے۔ جلال صاحب بہت ہی محتاط واقع ہوئے ہیں کہنے لگے کہ ہمیں صبح کا انتظار کرنا چاہیے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان دنوں کراچی کے حالات اچھے نہیں تھے اس وجہ سے ان کی رائے مناسب تھی میں نے کوئی جواب نہ دیا رات بھر کی نیند اور بے آرامی کے باعث حال بہت ہی برا ہو رہا تھا ایسی کیفیت میں تو فوراً گھر پہنچنے کو جی چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے یہ رائے دی کہ وہ میرے گھر چلیں وہاں پر صبح کی سفیدی ہوتے ہی اپنے گھر چلے جائیں شاید جلال صاحب میری کیفیت کا اندازہ کر چکے تھے وہ اس پر تیار ہو گئے۔ ہم نے ٹیکسی کی اور چل دیے میں ان دنوں دستگیر سوسائٹی میں رہتا تھا جب ٹیکسی یاسین آباد کے پل پر پہنچی تو جھٹکے لیتی ہوئی رک گئی اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جلال صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ دیکھا میں اسی لیے کہہ رہا تھا کہ صبح کا انتظار کر لیا جائے۔ ایک لمحہ کو یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ ڈرائیور کی چال تو نہیں، میرے ذہن میں یہ خیال

کوندا کہ جلال صاحب درست کہہ رہے تھے واقعی ہمیں ائر پورٹ پر صبح کا انتظار کرلینا چا ہیے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں ہی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگے۔ عام طور پر سڑکوں پر تین بجے سے صبح ہونے تک کا وقت بہت ہی خوف ناک ہوتا ہے ٹریفک نہ ہونے کے برابر، رات کا اندھیرا، آدم نا آدم ذات، دور سے اگر کسی گاڑی کی لائٹ نظر آئے تو خوف کی کیفیت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں نے تو دل ہی دل میں جس قدر قرآنی آیات یاد تھیں پڑھ ڈالیں شاید جلال صاحب نے بھی یہی کچھ کیا ہوگا۔ میں اس وجہ سے اور بھی خوف زدہ تھا کہ اگر خدا نخواستہ کچھ ہوگیا تو تمام تر قصور میرا ہی ہو گا کیوں کہ جلال صاحب تو ائر پورٹ پر وقت گزارنا چاہتے تھے میرے کہنے پر وہ تیار ہوگئے۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ ٹیکسی والا قصداً یہ حرکت نہیں کر رہا اور واقعی ٹیکسی خراب ہو گئی ہے ہم نے ٹیکسی کو فارغ کیا میرا گھر کچھ ہی دور تھا، ہم دونوں کے پاس جو بھی سامان تھا اسے اٹھا کر پیدل چلنا مشکل تھا ساتھ ہی سامان کے ساتھ سڑک پر زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے باہر نہیں تھا چنانچہ ہم دونوں نے جیسے تیسے سامان اٹھایا اور گھر کی جانب چل دیے، گھر پہنچ کر خدا کا شکرادا کیا۔ صبح ہوتے ہی جلال صاحب کو ان کے گھر کے لیے رخصت کیا۔ جلال صاحب کے ساتھ یہ سفر یادگار رہا وہ ہم سفر کو بور ہونے نہیں دیتے وقت، حالات اور ہم سفر کی مناسبت سے بات سے بات نکالتے ہیں اس میں سنجیدگی بھی ہوتی ہے، ہنسی مذاق بھی، کچھ آپ بیتی ہوتی ہے اور کچھ جگ بیتی لیکن

تمام تر گفتگو ادب آداب اور شائستگی کے دائرے میں کرتے ہیں۔

مارچ (۲۶۔۲۸) ۲۰۰۷ء میں پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی ستھرویں کانفرنس پاکستان کی قومی لائبریری اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ اس بار بھی ہم نے ایک ساتھ سفر کیا لیکن اس بار ہمارے ہمراہ جہاز میں عبدالصمد انصاری، مختار اشرف، آمنہ خاتون، فرحت حسین اور رفعت پروین بھی تھیں۔ آمنہ خاتون کے صاحبزادے سلمان غزالی جو ایروایشیاء میں ملازم ہیں نے ہمیں نہ صرف رعایت سے ہوائی ٹکٹ دلوائے بلکہ فلائٹ پر آکر اپنی والدہ کے ہمراہ مجھے، جلال صاحب، صمد صاحب اور مختار اشرف کو بزنس کلاس میں بٹھا دیا، ہم پیچھے سیٹ پر بیٹھ کر اکثر پردے کے آگے بزنس کلاس میں بیٹھے مسافروں کو دیکھا کرتے تھے لیکن کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، عزیزم سلمان نے آج یہ راز بھی فاش کرادیا کہ بزنس کلاس کیسی ہوتی ہے۔ سفر خوش گوار گزرا۔ اللہ تعالیٰ اُسے جزادے۔ اسلام آباد کے ہوٹل ''چیک ان'' میں ہم نے ساتھ ہی قیام کیا، میرے کمرے میں مختار اور جلال صاحب کے ہمراہ صمد صاحب تھے، مختار کی طبیعت کچھ نرم گرم ہوگئی وہ اپنے کمرے میں آرام کیا کرتا اور میں، صمد اور جلال صاحب رات گئے مختلف موضوعات پر باتیں کیا کرتے، تین دن اسی طرح گزرگئے، دن بھر کانفرنس میں مصروف رہتے رات میں ہم دن بھر کی مصروفیات کا تجزیہ کرتے اور دیگر موضوعات جن میں ہر طرح کی باتیں شامل تھیں کیا کرتے۔ جلال صاحب کے سو

جانے کے بعد میں اور صبا اپنے اپنے کمرے سے باہر آکر ہوٹل کے کامن روم میں بیٹھ جاتے جہاں پر مدھم روشنی ہوا کرتی تھی، ایک ایک سگریٹ کا کش لگاتے اور کراچی کے جھمیلوں سے آزاد رات گئے تک باتیں کرتے رہتے۔ (سگریٹ نوشی میری عادت نہیں اکثر اس قسم کے ماحول میں بدپرہیزی ہوجاتی ہے) ۔ اس بار بھی جلال صاحب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ وہ مجلسی آدمی ہے، محفل کو اپنی باتوں سے پر رونق رکھتے ہیں۔ پی ایل اے کی کانفرنس میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا، اپنے مضمون کے علاوہ دیگر معاملات پر بھی حصہ لیتے رہے۔

آدمی کی پرکھ معاملات سے بھی ہوتی ہے جلال صاحب معاملات کے بہت کھرے ہیں۔خالد محمود (اب ڈاکٹر خالد محمود ہیں) کراچی آئے اور میرے گھر قیام کیا، ان دنوں وہ جلال صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ چنانچہ ان سے ملاقات مقدم تھی ہم دونوں جلال صاحب کے گھر پہنچے بہت ہی اچھی طرح ملے اور گفتگو ہونے لگی تھوڑی دیر بعد جلال صاحب اندر گئے اور کچھ پیسے غالباً تین سو روپے تھے لاکر خالد کی طرف بڑھائے خالد نے پوچھا کہ سر یہ کیا ہے میں بھی قدرے حیران تھا کہنے لگے کہ تم نے فلاں کتاب مجھے فوٹو اسٹیٹ کراکے بھیجی تھی یہ اس کے پیسے ہیں اب خالد نے بہت چاہا کہ وہ ان سے یہ رقم نہ لے لیکن جلال صاحب کہاں ماننے والے، جب خالد نے زیادہ زور دیکر کہا کہ سر شاگرد ہونے کے ناتے اگر میں نے ایسا کر ہی دیا تو یہ میرا فرض بنتا ہے

لیکن جلال صاحب نے ایک نہ سنی جلال میں آ گئے اور وہ رقم اسے دیکر ہی دم لیا۔
ہے (Rich) ڈاکٹر حیدر کا ذاتی ذخیرہ لائبریرین شپ کے حوالے سے نایاب اور قیمتی ۔مجھے جب کسی کتاب ، مقالے یا مضمون کی ضرورت ہوتی ہے جلال صاحب کی عنایت سے مجھے مل جاتی ہے لیکن واپسی کے وعدے کے ساتھ۔ایک مرتبہ ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ جو بکھرے ہوئے اوراق پر مشتمل تھا مجھے اس کی ضرورت ہوئی میں نے اپنے لیے فوٹو کاپی کرائی ساتھ ہی اصل کاپی کی جلد بھی بنوادی اس خیال سے کہ یہ مزید خراب نہ ہو، میں نے جب یہ کتاب انہیں واپس کی تو خوش تو ہوئے لیکن اس کی جلد بندی کے پیسے

جو صرف بیس روپے تھے مجھے جبراً ادا کرکے سکون میں آئے۔
ڈاکٹر حیدر تہذیب کے ایک یادگار نمائندے ہیں ایسے پر وقار نمائندے اب معدوم ہو تے جارہے ہیں۔آپ کی گفتگو میں شائستگی، دھیما پن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔در حقیقت وہ 'میاں آدمی ہیں'۔ سادہ طبعیت پائی ہے، رہن سہن سادہ ہے، دکھاوے اور بناوٹ کے قائل نہیں ،آپ نے کئی ۱۹۸۵ء میں جو کار (سوزوکی ایف ایکس) خریدی تھی آج بھی اسی پر اکتفا کیے ہوئے ہیں۔ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں جو صوفہ سیٹ آج سے ۲۰ سال قبل تھا آج بھی وہی ہے لیکن صاف

ستھرا دیکھنے میں ایک پروفیسر کا ڈرائنگ روم لگتا ہے۔ اگر کسی چیز کا اضافہ ہوا تو وہ کتابیں اور اب کمپیوٹر ہے۔ صفائی پسند ہیں۔ لباس ہمیشہ صاف ستھرا زیب تن کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ گھر بھی صاف ستھراہ رکھتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ، گھر آنے والے کی خاطر تواضع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ بڑے مہمان نواز ہیں باوجود اس کے کہ تمام کام آپ کو از خود کرنا ہوتے ہیں میں نے بارہا کہا کہ سر میرے آنے پر تکلفات نہ کیا کریں میرے لیے وہ لمحات بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں جب وہ از خود چائے کی پیالیاں یا کولڈ ڈرنک لے کر آتے ہیں لیکن جلال صاحب اپنی روایات سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بقول غالب:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

آپ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی حق پسندی اور محتاط انداز فکر ہے۔ جلال صاحب سچ کہتے اور سچ سننا پسند کرتے ہیں۔ زندگی کے معاملات میں زیادہ محتاط ہیں آپ کا کہنا ہے کہ اگر کسی کو فائدہ پہنچانے میں میرا نقصان نہیں ہو رہا تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔ محتاط انداز فکر آپ کی شخصیت کا ایک لازمی حصہ نظر آتا ہے۔ کئی سال قبل آپ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور چند روز کارڈیو ویسکلر میں بھی داخل رہے۔ بعد ازاں ڈاکٹروں نے آپ کی رپورٹس کی

روشنی میں اس بات کی نفی کی کہ آپ کو دل کا عارضہ ہے لیکن آپ نے احتیاط کے پیش نظر زندگی کے معمولات پر نظر ثانی کی، خوراک اور پرہیز کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنا لیا اس پر آج تک سختی سے کاربند ہیں۔ عیش برنی کے بقول :

قدم قدم پہ یہاں احتیاط لازم ہے
کہ منتظر ہے یہ دنیا کسی بہانے کی

آج سے کوئی دس سال قبل میں نے جلال صاحب پر لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس مقصد سے ان سے با قاعدہ انٹرویو (۷ جولائی ۱۹۹۶ء) کو کیا، وقت کس تیزی سے گزرا معلوم ہی نہ ہو سکا دیکھتے ہی دیکھتے ۱۰ سال گزر گئے اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری بار با قاعدہ ملاقات آٹھ سال بعد ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء کو کی، یہ ملاقات اپنی تحقیق کے حوالے سے تھی۔ اب دس سال بعد میں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو سکا کہتے ہیں دیر آید درست آید۔ ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان دس سالوں میں انہیں زیادہ نزدیک سے دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا ساتھ ہی استاد و شاگرد کا تعلق بڑھ کر دوستانہ ہو گیا اس کام کو اِس وقت ہی مکمل ہونا تھا۔ میں اس مضمون میں ڈاکٹر حیدر کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکا بس جو بھی صلاحیت ہے اس کے مطابق کوشش کی کہ آپ کی شخصیت کے مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کر سکوں استاد جو کچھ اپنے شاگرد

کو دیتا ہے اس کا حق تو ایک شاگرد کبھی بھی ادا نہیں کر سکتا یہ تو ایک معمولی سا نذرانہ ہے شاگرد کا اپنے استاد کے لیے۔

(مصنف کی کتاب یادوں کی مالا میں شامل)

احسانؔ دانش - شاعرِ مزدور۔ میرے ہم وطن

مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ مَیں شاعر مزدوراحسانؔ دانش کا ہم وطن ہوں۔

ہندوستان کا صوبہ یوپی (اترپردیس) کا ضلع مظفر نگرایک معروف ضلع ہے جو شمالی مغربی اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ احسانؔ دانش اسی ضلع کے شہر کاندھلہ میں ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے اور ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ احسانؔ دانش کے خاندان کا تعلق تو ضلع میرٹھ کے شہر باغپت سے تھا لیکن ان کے والد قاضی دانش علی نے باغپت کو خیر باد کہہ کر ضلع مظفر نگر کے شہر کاندھلہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، احسان دانش اسی شہر میں پیدا ہوئے۔احسان دانش نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ ’’میں قصبہ کاندھلہ مظفر نگر (یوپی) میں ایک مزدور کے گھر پیدا ہوا۔ کاندھلہ کی سرزمین علم نوازی‘ اور ادب پروری کے لحاظ سے تاریخی اور مشہور جگہ ہے۔چناں چہ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولانا روم کے ساتویں دفتر کا شاعر اسی خاک پاک سے اٹھا تھا۔ اور آج تک برابر یہاں سے علمی چشمے پھوٹتے رہے ہیں‘‘۔

ہندوستان کا ضلع مظفر نگر نہایت مردم خیز خطے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس سرزمین نے علماء دین، صوفیائے اکرم اور فقہائے اسلام اور اہل دانش کی ایک

بڑی جماعت پیدا کی، پائے کے سیاست داں پیدا کیے ہیں، اعلیٰ منتظمین، معلّمین، منصفین و مصنفین کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ہے۔ ان اعلیٰ شخصیات کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی خدمات کو عالمی سطح پر معتبر حیثیت حاصل ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ (پیدائش ۱۹ اگست ۱۸۶۳ء، وفات ۴ جولائی ۱۹۴۳ء) قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے، مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ (پیدائش ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۶ء وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء) اور پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان کا تعلق بھی مظفر نگر سے تھا وہ یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے۔ حاجی ولی اللہ صاحب قدس سرہ، محمد احمد صاحب سراوے والے، جناب زاہد حسین اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر (۱۰ جولائی ۱۹۴۸ء تا ۱۹ جولائی ۱۹۵۳ء)، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستان میں پاکستان کے اولین ہائی کمشنر، منصوبہ بندی کمیشن کے اولین چیرمین، پاکستان کے پہلے پانچ سالہ منصوبے کے خالق)، زاہد حسین کے صاحبزادے جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، جناب محمد ابصار حسین قرنی، مفتی و محدث مولانا عبدلمالک، مولانا عبد الخالق کاندھلہ والے، معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد پیدائش ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء وفات ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء)، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ)، شیخ محمد ابراہیم آزاد سابق چیف جسٹس بیکانیر چیف کورٹ اور صاحب دیوان شاعر، جناب مبشر احمد واحدی، ڈاکٹر غنی الکرم سبزواری، ملتان سے تعلق رکھنے والے معروف نعت گو شاعر تابش صمدانی جن کے

نعتیہ مجموعے 'برگ ثنا'، 'مرحبہ سیدی' شائع ہو چکے ہیں ضلع مظفر نگر سے تعلق رکھتے ہیں۔ معروف ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی کا وطن بھی تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ہی ہے۔ مَیں نے کبھی اپنے اور احسان دانش کے وطن کے لیے کہا تھا۔

مظفر نگر تری عظمت کو سلام
کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تو نے

احسان دانش کو شاعر مزدور کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ احسان دانش کا عملی طور پر محنت مزدوری کرنا تھا۔ انہوں نے ایک محنت کش گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کے والد بھی پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالا کرتے تھے۔ اپنے والد اور نانا کے معاشی حالت کا ذکر احسان دانش نے اپنی آپ سرگزشت میں اس طرح کیا ہے کہ ''میرے والد قاضی دانش علی قصبہ باغپت ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے اور میرے نانا ابو علی کاندھلہ میں ایک غریب سپاہی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میرے والد کاندھلہ چلے آئے۔ باغپت میں وہ کسی بلند منصب پر فائز نہ تھے اور ان کی کم علمی نے انہیں سپاہیانہ حدود سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ترک وطن کے بعد بھی عرصہ تک وہ سپاہی رہے لیکن جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ نہروں کی کھدائی کرانے والے ٹھیکیداروں میں میٹ کا فریضہ انجام دیتے تھے اور جب یہ

جمعداری نہ ملتی تو خود مزدوری کرتے"۔

اپنے والد کے علمی ذوق کے بارے میں احسان دانش نے لکھا ہے کہ "میرے والد بہت پڑھے لکھے نہ تھے مگر ذہین اور خوش مذاق انسان ضرور تھے اُنہیں فارسی کی سینکڑوں غزلیں اور آزار کی بعض مشہور ضخیم کتابیں از بر تھیں"۔ خود تو پڑھ لکھ نہ سکے لیکن اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی خواہش ان کے دل میں ضرور موجود تھی۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل تنگ دستی کے باعث نہ کر سکے اور یہ خواہش دل میں لیے ہی اللہ کو پیارے ہوئے۔ غربت نے گویا احسان دانش کے گھر ڈیرا ڈال رکھا تھا، ابھی پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ پیٹ بھرنے کے لیے عملی جدوجہد شروع کرنا پڑی۔ وہ ابھی چوتھی جماعت ہی میں تھے کہ روزگار کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

اس دوران چند اردو اور فارسی کی کتابیں اپنے استاد سے ضرور پڑھ لی تھیں۔پڑھنے کا شوق انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ شروع میں اپنے آبائی شہر کاندھلہ میں روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہے، خاطر خواہ کامیابی نہ ملی، مجبوراً میونسپلٹی میں نائب قاصد ہو گئے، اس دوران اپنے استاد قاضی محمد ذکی کاندھلوی سے فیض حاصل کرتے رہے اور مطالعہ جاری رکھا۔ لکھتے ہیں کہ "میرا مطالعہ اور جذبہ مجھے قصبہ کاندھلہ میں بلند نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ میں کھیتوں کھلیانوں، سڑکوں اور

دفتروں کے راستے ناپتا ناپتا تھک گیا''۔ بہتر روزگار کی تلاش میں دہلی کا رخ کیا۔ وہاں ایک پرنٹنگ پریس میں سیاہی مین کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا لیکن غیر مطمئن رہے اور واپس قصبہ کاندھلہ آ گئے لیکن معاشی حالات تھے کہ بہتر ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مجبور ہو کر لاہور کا رخ کیا اور چند روز اپنے ہمراہیوں کی خدمت باورچی کی حیثیت سے کرتے رہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لاہور نے احسان دانش کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے لیکن لاہور کے ابتدائی ایام ان کے لیے سخت محنت و مشقت لیے ہوئے تھے یہ محنت اس قدر دل برداشتہ کر دینے والی تھی کہ احسان دانش دن بھر محنت مزدوری کر کے رات کو جب بستر پر لیٹتے تو انہیں یہ احساس جاں گزیں ہوتا کہ ان کے جسم میں اتنی سی زندگی باقی ہے کہ صبح تک چل سکے لیکن والدین کا خیال ان کا شانہ پکڑ کر اگلے روز پھر محنت مزدوری پر لے جاتا۔ احسان دانش لکھتے ہیں کہ ''جب لاہور کی فضا سے مانوس اور راستوں سے ذرا واقف ہوگیا تو اپنی محبوب جگہ لائبریری کا رخ کرتا دوپہر کو مزدور آرام کرتے تو میں لائبریری کو بھاگتا اور جب کام بند ہو جاتا تو ساری ساری رات کتابیں پڑھتا''۔ مزدور سے معمار ہوئے اور جب معماری نے ناتہ توڑ لیا تو چوکیدار ہو گئے جہاں انہیں کتب بینی کا زیادہ وقت ملنے لگا انہوں نے خوب خوب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ چوکیدار سے باغبانی پھر قالین بافی کے ہنر سے بھی

بہر مند ہوئے۔بقول مولوی سعید ''احسان دانش رات میں مشاعروں کی محفلوں میں دیکھے جاتے جب کہ صبح کے وقت وہ کسی بھی نئی تعمیر شدہ عمارت میں ایک ہاتھ میں برش اور دوسرے ہاتھ میں رنگ کی بالٹی کے لیے ساتھ مصروف عمل دکھائی دیتے اور کبھی باغبانی کرتے نظر آتے''۔

جدید شعرائے اردو کے مؤلف عبدالحمید نے سچ لکھا ہے کہ ''لاہور میں ''مکتبہ دانش'' کے قیام سے پہلے احسان کو غم روزگار نے جن جن دشوار منزلوں سے گزارا ہے اُن کی تفصیل میں جاتے ہوئے سچ مچ قلم تھرایا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔احسان نے اپنی ادبی زندگی سے پہلے شہر لاہور میں مزدوری، معماری، باغبانی، چوکیداری، قلعی گری اور نہ جانے کیا کچھ نہیں کیا، لیکن شاباش ہے اس پختہ عزم انسان کی جدوجہد پر جس نے اپنے حوصلوں کو بلند رکھا، محنت مزدوری کو اپنی کمزوری نہ بننے دیا، کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے جس سے ان کا علمی ذوق پروان چڑھتا رہا اور وہ ایک علمی شخصیت کے طور پر جانے جانے لگے، ان کی نثر اور نظم لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگے۔ ریلوے میں نائب قاصد بھی رہے اور پھر ایک مطبع کے کتب خانے میں ملازمت کرلی اور بیس روپے ماہانہ کی اجرت پر کئی برس مصروف عمل رہے۔یہیں رہتے ہوئے ان کی پہلی کتاب ''حدیثِ ادب'' شائع ہوئی اور پھر احسان دانش نے اپنا مکتبہ بنالیا اور کتابیں لکھنے اور شائع ہونے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

احسان دانش کے لیے محنت و مشقت کرکے روزی کمانہ فخر کی بات تھی۔ حالات نے ا
نہیں مشقت کا عادی بنا دیا لیکن اس زندہ دل اور حوصلہ مند انسان نے نہ سخت سے سخت
حالات کا مقابلہ بلند حوصلہ سے اور جواں مردگی سے اس طرح کیا کہ مایوسی ، حوصلہ
شکنی، کم ہمتی کو شکست ہوئی اور عزم و استقلال کو فتح نصیب ہوئی اور احسان دانش کو
دنیائے ادب میں وہ مقام حاصل ہوا جو کم لوگوں کو ملتا ہے۔انہیں اس دنیا سے رخصت
ہوئے ۳۱برس ہوچکے ہیں لیکن وہ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کی زندگی
سبق آموز ہے اور نئی نسل کو اس بات کا سبق دیتی ہے کہ محنت و مشقت میں کوئی
بارئی نہیں، مشکل سے مشکل حالات مقابلہ حوصلے اور بلند ہمتی سے خلوص اور اللہ پر
مکمل بھروسے کے ساتھ کیا
جائے تو کامیابی انسان کے قدم چومتی ہے۔

احسان دانش نے اسکول میں صرف چار جماعتیں پڑھی تھیں ، بعض اساتذہ نے انہیں
کتاب پڑھنے کی جانب مائل ضرور کیا تھا لیکن شاعری ان کا باقاعدہ استاد کوئی نہیں تھا،
کتاب زندگی بھر احسان دانش کی ساتھی رہی، ہم نوا رہی، رہنما و رہبر رہی۔کتاب کی
رفاقت سے وہ کبھی بیزار نہیں ہوئے بلکہ دن میں محنت مزدوری اور رات رات بھر
کتاب کا مطالعہ ان کا معمول رہا،کتاب نے انہیں کبھی زچ نہیں کیا بلکہ یہ کتاب ہی تھی کہ
جس نے احسان کی علمی دولت میں

اضافہ کیا، ذخیرہ الفاظ میں بڑھاوا دیا، قوت گفتار میں کمال پیدا کیا، ذہنی صلاحیت کو وسعت بخشی، احسان نے جو سیکھا، جو حاصل کیا وہ مطالعہ سے اور کتاب سے سیکھا۔ البتہ شعر و شاعری کا ذوق قاضی محمد ذکی کی صحبت میں ہوا۔ احسان حصول علم کے لیے حکماء و فضلاء کے قدموں میں زانوئے ادب نہیں ہوئے بلکہ کتاب ہی نے احسان کو وہ سب کچھ دیا جو انہیں حکماء وفضلا اور اساتذہ کے قدموں میں زانوئے ادب ہونے سے مل سکتا تھا۔ کتاب اور مطالعہ نے ہی انہیں علم و حکمت کے زیور سے آرستہ کیا۔ احسان دانش نے عملی طور پر یہ سچ کر دکھایا کہ جو کتاب سے رغبت رکھتا ہے، محبت کرتا ہے اور ان کا قرب حاصل کرتا ہے وہ تمام دینوی و دنیاوی رحمتوں اور نعمتوں سے فیضیاب ہوتا ہے۔ احسان دانش کی شاعری میں محنت کش کی آواز ہے۔ ابتدا میں ان کی شاعری روایتی قسم کی ہی تھی، یعنی نظم و غزل، اور اس میں حسن و عشق کا غالب تھا اس میں رومانیت تھی۔ لیکن بہت جلد ان کی شاعری میں ان کی عملی زندگی کے رنگ و روپ ابھرنے لگے، سماجی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا اظہار ان کے اشعار میں ہونے لگا۔ ایک تو احسان کی عملی زندگی محنت مشقت سے عبارت تھی دوسرے، یہ وہ دور تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد حالات بدل رہے تھے، ترقی پسند رجحانات عام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ احسان دانش نے بھی مزدور اور محنت کشی کو اپنی شاعری کا محور و منبع بنایا اور وہ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی کلیدی

شخصیت کے طور پر نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ ان کی شاعری میں درد تھا، کرب تھا اور مزدور کی پکار تھی۔ ان کے اسی اظہار کے باعث انہیں عوام نے ''شاعر مزدورز'' کے لقب سے نوازا۔ ان کی مشہور نظمیں ''باغی کا خواب'' اور'' سادھو کی چتا'' بے انتہا مقبول ہوئیں۔احسان دانش کی آواز میں بھی سوز تھا، درد تھا، ابتدا میں وہ نعت گوئی بھی کیا کرتے تھے۔

احسان دانش علم عروض میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے ہر ہر مصرعہ کی بندش لاجواب اور ہر شعر لازوال ہے۔انہوں نے غزل کو ایک نیا شعور دیا ہے۔ان کے ہاں الفاظ کا وسیع ذخیرہ پایا جاتا ہے، زبان فصیح، شستہ اور پاکیزہ ہے۔ واقعہ نگاری اور واردات کے بیان کو خوبصورتی سے نظم کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔پروفیسر محمد واصل عثمانی جو احسان دانش کے بڑے مدح ہیں نے انہیں غزل کا امام کہا ہے۔ادریس صدیقی نے اپنے مضمون 'اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ' میں احسان دانش کو جوش کا ہم پلہ قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ احسان دانش کی شاعری عام آدمی کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے'۔ان کے کلام میں معرفت و آگہی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

احسان دانش جتنے خوبصورت شاعر تھے اتنی ہی جاذبیت ان کی نثر میں بھی تھے۔ ان کی آپ بیتی ''جہانِ دانش'' مثالی آپ بیتی شمار ہوتی ہے۔احسان دانش نے اپنا

مکتبہ ”مکتبہ دانش“ قائم کر لیا تھا اور کتب کی اشاعت اسی ادارے تحت کیا کرتے تھے ان کی تصانیف کی تعداد ۸۰ سے زیادہ ہے، مضامین کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ ان کی تصانیف میں حدیث ادب، حدیثِ دانش، جہانِ دگر، چراغاں، نوائے کارگر، ابلاغِ دانش، آتش خاموش، تشریحِ غالب، جاذنو، زخم و مرحم، شیرازہ، مقامات، گورستان، آواز سے الفاظ تک، فصلِ سلاسل، زنجیرِ بہاراں، میراث مومن، اردو مترادفات، دردِ زندگی، لغت الااصلاح اور دیگر شامل ہیں۔ احسان دانش کی ادبی خدمات کے حوالے سے حکومت پاکستان نے ۱۹۷۸ء میں انہیں تمغہ امتیاز سے نوازا۔ معروف شاعر و ادیب پروفیسر محمد واصل عثمانی نے احسان دانش کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا ان کی اس نظم کے چند اشعار ؎

دلّی کی ہے زباں تو فانیؔ کا رنگ ہے اسلوب تیرا دیکھ کے دشمن بھی دنگ ہے

فکرِ رسا پہ تیری زمانہ نثار ہے

اس عہد میں تو گوہر یکتا شمار ہے

اقلیم نظم و شعر کا تو تاجدار ہے

تیری غزل سے لہجہ ترا آشکار ہے

احسان دانش کے کلام سے منتخب اشعار ؎

چوکھٹیں قبر کی خالی ہیں، انہیں مت بھولو

جانے کب کون سی تصویر سجادی جائے

اگرچہ خُلدِ بریں کا جواب ہے دنیا مگر خدا کی قسم ایک خواب ہے دنیا
رہِ خلوص میں احسانؔ اس سے بچ کر چل
کہ ایک خضرِ ضلالت مآب ہے دنیا
آج پھر یاد بہت آئے وہ آج پھر اُس کو دُعا دی ہم نے
کوئی تو بات اُس میں بھی ہے احسانؔ
ہر خوشی جس پہ لٹا دی ہم نے
نظر فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا
حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نہ رہنماؤں کی مجلس میں لے چلو مجھے
میں بے آداب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہوگا
کبھی مجھ کو ساتھ لے کر، کبھی میرے ساتھ چل کر
وہ بدل گیا اچانک میری زندگی بدل کر
لوگ یوں دیکھ کر ہنس دیتے ہیں
تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

شاعرِ عوام، حبیب جالبؔ کی مزاحمتی شاعری

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو، میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا انھوں نے ہر آمر وقت کے سامنے کلمہ حق بلند کیا، جس کی پاداش میں زندگی بھر آزمائشوں سے گزرے مجھ میں اور حبیب جالب میں ایک قدر مشترک ہے وہ یہ کہ جالب ۲۴ مارچ ۱۹۲۸ء کو دینا میں آئے اور ۱۹۹۳ء میں اسی ماہ کی ۱۳ کو اس دینائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ میں بھی مارچ کی ۲۵ کو لیکن ۱۹۴۸ء کو اس دنیا میں آیا سرِدست واپسی کی تاریخ نہیں معلوم کیا ہوگی، شاید مارچ ہی ہو۔ جالب کو جن لوگوں نے دیکھا اور سنا ان لوگوں میں مَیں بھی شامل ہوں۔ اس قدر بے باک مزاحمتی لہجہ اور خوبصورت انداز ، لہن میں سوز اور درد، میں نے اپنی زندگی میں کوئی اور ایسا دیکھا نہ سنا۔ جالب نے ہندوستان کی سرزمین مشرقی پنجاب کے علاقے میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور میں دیہاتی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی جب کے سیکنڈری تعلیم دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں حاصل کی۔ جالب کو پیدائشی شاعر کہا جوئے تو غلط نہ ہوگا۔ پہلا شعر ہفتم جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے کہا وہ یہ تھا۔ اسی طرح دوسرے شعر کی وجہ نمازیوں کو نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگتے دیکھ کر جو کیفیت جالب کے ذہن میں

آئی جالب نے اسے شعر میں اس طرح بیان کیا ۔

مدتیں ہو گئیں خطا کرتے شرم آتی ہے اب دعا کرتے

حبیب جالب کی شاعری میں میٹھا میٹھا سوز و گداز اور دل میں اتر جانے والی ایسی ٹھنڈ نک ہے جس کی حساسیت اور چاشنی کو وہی لوگ بہتر طور پر محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اس ٹھنڈک کا مزا حبیب جالب کو بھرے مجمع میں ترنم اور لے سے شعر پڑھتے ہوئے سنا ہو۔ حبیب جالب کے اشعار ہی میں گہرائی و گیرائی نہیں ہے اس کی آواز میں بھی شیرینی تھی، میٹھاس تھا، سحر تھا، مقناطیسیت تھی۔ بقول فراق گورکھپوری ''میرا بائی کا سوز اور سورداس کا نغمہ جب یکجا ہو جائیں تو اسے حبیب جالب کہتے ہیں''۔ لیکن جالب اپنا تعارف اپنے ایک شعر میں

بہت ہی خوبصورت انداز سے کراتے ہوئے کہتے ہیں ۔

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا

اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں

حبیب جالب ایک عوامی شاعر تھا، اس نے عوام الناس کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی انتہائی خوبصورت انداز سے کی۔ دل میں اتر جانے والے اشعار لوگ اٹھتے بیٹھتے گن گنایا کرتے تھے۔ عوام نے ہی اپنے محبوب شاعر کو ''شاعرِ

عوام'' کا خطاب دیا تھا۔ جالب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ہندوستان میں ہی محنت مزدوری سے کر دیا تھا۔ پاکستان ہجرت کی تو یہاں بھی انہیں مزدوری ہی کرنا پڑی۔ شاعری اور مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا۔ نام حبیب احمد تھا مستؔ تخلص کیا کرتے تھے اس طرح وہ شروع میں حبیب احمد مستؔ میانوی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت کراچی ہجرت کی اور گورنمنٹ سیکنڈری اسکول جیکب لائن میں درجہ دہم میں داخلہ لیا۔ اورینٹل کالج لاہور میں بھی پڑھا۔ عملی زندگی میں بطور پروف ریڈر کے کام کیا، ۱۹۵۲ء میں ھاری تحریک میں شمولیت اختیار کی اور اسی تحریک کے رکن کی حیثیت سے پہلی بار گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۹۵۶ء میں نیشنل عوامی پارٹی جو اب اے این پی ہے میں شمولیت اختیار کی اور آخر تک اسی جماعت میں رہے۔

حبیب جالب پر تحقیق و توصیفی کام کرنے والوں میں یوں تو کئی نام لیے جا سکتے ہیں لیکن ان میں مجاہد بریلوی ایک ایسا نام ہے جس نے جالب سے حق تعلق و دوستی کو خوب خوب نبھایا۔ ان کی کتاب ''جالب جالب'' جالب کا تعارف نامہ کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ 'کوئی تو پرچم لے کر نکلے'، ' بیادِ جالب'، 'حبیب جالب فن اور شخصیت' مجاہد بریلوی کی تصانیف ہیں۔ جالب ایک بہت بڑا شاعر، نفیس انسان، حوصلے اور ہمت کا مالک تھا۔ اس پر تحقیق و تصنیف کا عمل اس کی زندگی سے جاری ہے اور یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہے گا۔ جالب پر سعید

پرویز نے بہت کام کیا کئی کتب مرتب کیں، ان کے علاوہ طاہر اصغر، ضیا ساجد، ظہور احمد خان اور عبد الرحمان اور دیگر کے کام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حبیب جالب کے جو مجموعے منظر عام پر آئے ان میں برگ آوارہ، سر مقتل، عہد ستم، ذکر بہتے خون کا، گوشے میں قفس کے، عہد سزا، حرف حق، اس شہر خرابی میں، جالب نامہ، حرف سردار، کلیات حبیب جالب اور فلمی گیتوں کا مجموعہ رقص زنجیر شامل ہے۔

مجھے حبیب جالب کو نذدیک سے دیکھنے، مشاعروں میں سننے اور جنرل محمد ایوب خان، جنرل محمد یحییٰ خان، جنرل محمد ضیاء الحق اور ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومتوں میں جلسے جلوسوں اور بڑے بڑے اجتماعات میں حکومت کے خلاف ان کی نظمیں سننے کا بارہا اتفاق ہوا۔ ”دستور“ حبیب جالب کی ایسی نظم تھی کہ جس نے عوام الناس کو حبیب جالب کے عشق میں گرفتار کر دیا۔ اس نظم سے ہی جالب کی انقلابی شاعر کے دور کا آغاز ہوا۔ اس نظم نے حکومت وقت کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ اگر یوں کہا جائے کہ اس نظم نے حبیب جالب کو زندہ جاوید کر دیا تو غلط نہ ہوگا۔ ایوب خان نے جو دستور قوم کو دیا تھا یہ نظم اس کے خلاف اعلان بغاوت تھا حبیب جالب نے اپنی یہ نظم سب سے پہلے مری کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی، پھر کیا تھا، گلی گلی کوچہ کوچہ ہر ایک زبان پر یہی شعر ہوا کرتا، حبیب جالب جس مشاعرہ میں جاتے، اجتماعات میں ہوتے یہی فرمائش ہوا کرتی کہ

آپ اپنی وہی نظم 'دستور'' سنائیں اور حبیب جالب اپنے مخصوص انداز، آواز اور لب ولہجے کے ساتھ اپنی یہ نظم سنایا کرتے۔ لاکھوں کے مجمعے میں حبیب جالب کی آواز لوگوں کے دلوں میں اتر جایا کرتی ۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

حبیب جالب کو اس نظم کی پاداش میں جیل جانا پڑا، جھوٹا مقدمہ بنایا گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ حبیب جالب آزاد نہ رہیں لیکن حکومت وقت کو پسپہ ہونا پڑا، اب حبیب جالب ان کی نظمیں اور جیل لازم و ملزوم ہوگئے تھے۔ نظریاتی طوپر حبیب جالب سرخے تھے یعنی سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے، سخت گیر نظریاتی انسان تھے۔ انہوں نے ولی خان کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کرلی تھی اور آخر وقت تک اسی جماعت سے وابستہ بھی رہے۔ ایوبی دور حکومت میں حبیب جالب کے مجموعہ کلام ''سر مقتل'' پر پابندی لگا دی گئی۔ جالب کب
چپ رہ سکتے تھے پکار اُٹھے ۔

مرے ہاتھ میں قلم ہے، مرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا دبا سکے گا، کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امنِ عالم، تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں، تُو غروب ہونے والا

اس سے قبل جالب ایک ایسا شعر کہہ چکے تھے کہ جو جالبؔ کی پہچان بن گیا تھا۔ کسی بھی مشاعرہ میں یا اجتماع میں جہاں جالب کو شرکت کرنا ہوتی، تو یہ شعر ضرور تحریر ہوا کرتا۔

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

حبیب جالب ایک جانب عوام کی ترجمانی کر رہے تھے تو دوسری جانب سنجیدہ شاعری کی جانب بھی ان کی بھرپور توجہ تھی۔ فلمی شاعری بھی کی ان کے بعض بعض فلمی گانے بے انتہا مقبول ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں انہیں گریجویٹ ایوارڈ دیا گیا ان کا لکھا ہوا گانا احمد رشدی نے گایا اور موسیقار مصلح الدین تھے اور فلم تھی ''جوکر''۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

نگار ایوارڈ سے بھی انہیں نوازا جاتا رہا، ۱۹۶۹ء، فلم ''زرقا'' گلوکار مہدی حسن، موسیقی کار رشید عطرے تھے۔ اس گیت کو عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی، یہ جالب کی معروف نظم تھی جس کا عنوان تھا ''نیلو''۔

تو کہ ناواقفِ آدابِ غلامی ہے ابھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار د رکی جرات ہوئی تو کیونکر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے

بعد کے سالوں میں بھی نگار ایوارڈ جالب صاحب کو ملتے رہے، ان کے علاوہ انجمن تحفظ حقوق نسواں ایوارڈ، گریجویٹ ایوارڈ، حسرت موہانی ایوارڈ، جمہوریت ایوارڈ، سوھن سنگھ جوش ایوارڈ، قومی فلم ایوارڈ، نگار ایوارڈ اور، نشان امتیاز ۱۹۹۴ء میں بعد از مرگ حکومت پاکستان نے عطا کیا۔ ایوب خان نے اقتدار اپنے ہم منصب جنرل محمد یحییٰ خان کے سپرد کردیا۔ ایوب خان کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا اس کے باوجود حبیب جالب کی نظم دستور کی مقبولیت میں کمی نہ آئی تھی کہ انھوں نے دوسرے آمر کو اُسی لب ولہجہ میں مخاطب کیا، ان کی یہ نظم بھی اسی رح مقبول ہوئی۔

تم سے پہلے وہ جواِک شخص یہاں تخت نشین تھا

اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقین تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا
مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بننا، بھلا جالب کیسے.برداشت کر سکتے تھے، وہ پکار اٹھے ۔
محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو
مغربی پاکستان اب صرف پاکستان تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی.برسر اقتدار آئی، بھٹو صاحب کی خواہش تھی کہ حبیب جالب نیشنل عوامی پارٹی چھوڑ کر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلیں لیکن جالب تو اصولوں کے بنے ہوئے تھے۔ نظریاتی انسان تھے، اپنے اصولوں اور نظریات پر قائم رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو صاحب اور حبیب جالب کے راستے بھی جدا ہوگئے۔حبیب جالب نے لاہور سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن اپنی جماعت عوامی نیشنل پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا، بھٹو کا طلسم گلی گلی کوچے کوچے عام تھا، اس

سیلاب نے تو بڑوں بڑوں کی ہوا نکال دی تھی۔ بھلا حبیب جالب اس طوفان سے کیسے مقابلہ کر سکتے تھے۔ ہار تو یقینی تھی لیکن جالب کے لیے ایک اور کٹھن وقت شروع ہوگیا۔ جالب تو ظلم و ستم برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت رکھتا تھا، وہ تو یقین و ایمان کی منزل پر تھا، جہد مسلسل اور ہر کٹھن سے کٹھن مرحلہ کو اپنی جان پر جھیلنے کا حوصلہ اس میں موجود تھا۔ اپنی اس قوت کے بارے میں ہی اس نے کہا تھا۔

غم اٹھانے میں ہے کمال ہمیں

کر گیا فن یہ لازوال ہمیں

جالب کو ۱۹۷۶ء میں حیدرآباد سازش کیس میں جیل جانا پڑا۔ مجاہد بریلوی نے لکھا کہ گرفتاری کے بعد ڈی ایس پی نے حبیب جالب سے کہا ''آپ کے دیگر کامریڈوں سے بات ہو گئی ہے انہیں ہم نے چھوڑ دیا ہے اگر آپ بھی ولی خان کے خلاف بیان لکھ دیں تو ہم آپ کو ابھی چھوڑ دیں گے ورنہ عمر بھر حیدرآباد جیل میں سڑتے رہیں گے۔ یہ ایسا کیس ہے جس میں آپ شاید ہی زندہ بچیں''۔ جالب صاحب نے ڈی ایس پی سے کہا جیل میں تو شاید چند سال جی بھی لوں مگر معافی نامہ لکھ کر میں چند دن بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا بہتر ہے کہ آپ اپنی کاروائی کریں''، ڈی ایس پی نے بڑے غصے سے حوالدار سے کہا ''اس کو ہتھکڑی ڈالو۔۔'' اور یہ کہہ کر حیدرآباد روانہ کردیا''۔ یہ تھا ، ایک نظریاتی

بااصول اور نڈر انسان کا کردار۔اس دور میں حبیب جالب کی ایک نظم "ممتاز" لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو ہر خاص و عام کی زباں پر عرصہ دراز تک عام رہی بلکہ آج بھی لوگ اسے نہیں بھولے۔ حبیب جالب کی اس نظم نے بہت مقبولیت حاصل کی ۔

قصر شاہی سے ، یہ حکم صادر ہوا ، لاڑکانے چلو

ورنہ تھانے چلو

اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو، گیت گانے چلو

ورنہ تھانے چلو

حبیب جالب کے کردار اور اصولوں کی شفافیت ، اعلیٰ ظرفی اور جرت اظہار کا اندازہ اس واقع سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جس شخص نے انہیں جھوٹے مقدمہ میں جیل بھجوایا، جب تک وہ بر سر اقتدار رہا، جالب صاحب اس کے غلط اعمالوں اور برائیوں کی نشان دھی اپنی نظموں میں کرتے رہے اور بانگ دھل کرتے رہے۔ بھٹو صاحب کے اقتدار کا سورج بالآخر تمام ہوا۔ حبیب جالب ایک مشاعرہ میں پہنچے ، لوگوں نے "لاڑکانے چلو ، لاڑکانے چلو "کی صدائیں بلند کرنا شروع کیں، حبیب جالب کو اپنے سامعین کی یہ فرمائش بالکل پسند نہیں آئی ۔آپ نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو "میں حکمرانوں کے خلاف اس وقت شعر پڑھتا ہوں جب وہ اقتدار میں ہوں"۔ بھٹو صاحب اس وقت جیل میں ہیں ان پر

مشکل وقت ہے۔ اعلیٰ ظرفی اور معاف کر دینے کی یہ اعلیٰ مثال جس کا عملی مظاہرہ جالب نے کیا۔ ہماری سیاست میں کم کم پائی جاتی ہے۔ اب ملک پر ایک اور آمر مسلط ہو چکا تھا۔ بھٹو صاحب جیل جا چکے تھے۔ ان پر قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا حبیب جالب نے نئے آنے والے آمر جنرل ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار پھر انہیں یاد دلایا۔

ظلمت کو ضیاء صر صر کو صباء، بندہ کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہُما کیا لکھنا

اور پھر یہ بھی کہا۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
کہاں تک دوستوں کی بے رخی کا ہم کریں ماتم
چلو اس بار بھی ہم ہی سر مقتل نکلتے ہیں

ضیاء الحق کے دور میں سیاسی لوگوں کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بھی پابند سلاسل کیا گیا۔ مافی ناموں پر لوگوں کو رہائی کے احکامات صادر کئے گئے۔ حبیب جالب کوٹ لکھپت جیل میں تھے، انہوں نے وہاں سے مافی نہ مانگنے کا مشورہ دیا۔ ان کی یہ نظم جیل سے باہر چلی گئی اور مقبول ہو گئی۔ حکام بالا کے علم میں یہ بات آئی تو جیل میں آپ کی سرزنشت ہی نہیں ہوئی

بلکہ آپ کو میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا۔ جالب صاحب نے کا کہنا تھا کہ میانوالی جیل میں ہم اس کمرہ میں رہے، جہاں جواہر لعل نہرو، مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو رہے تھے۔

جالب کی اس نظم کے چند اشعار یہ تھے ۔

دوستو جگ ہنسائی نہ مانگو

موت مانگو رہائی نہ مانگو

عمر بھر سر جھکائے پھروگے

سب سے نظریں بچائے پھروگے

اپنے حق میں برائی نہ مانگو

موت مانگو، رہائی نہ مانگو

ضیاء الحق کے بعد بے نظیر اور پھر میاں نواز شریف کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ حبیب جالب کی عمر بڑھتی جارہی تھی، وہ بیمار رہنے لگے تھے لیکن انہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے مسائل اور مشکلات کی نشادھی، ظلم وزیاتی کے خلاف شعر کہنا ترک نہیں کیا۔ بے نظیر نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں جالب صاحب کو ان کی کتاب ''حرف سردار'' کے لیے انعام واکرام سے نوازا۔ آپ نے حکومت سے دیگر مراعات لینے سے انکار کردیا۔ بے نظیر کی حکومت کے دوران ان کی ایک نظم بہت مقبول ہوئی جس میں انہوں نے غریبوں کے حالات تبدیل نہ ہونے کا گلا

کیا۔ ؎

وہی حالات ہیں فقیروں کے

دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

ہر بلاول ہے دیس کا مقروض

پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

بے نظیر کی پہلی حکومت تو چلی گئی ، پر حالات تبدیل نہ ہوئے۔ نواز شریف کا دور حکومت شروع ہوا، جالب صاحب میں وہ تن تناؤ نہیں رہ گیا تھا۔ بیماریوں اور پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا تھا، پر اندر کا شاعر توانا تھا۔ نواز شریف نے بلند بانگ دعوے کیے، عوام کی فلاح کے لیے بہت کچھ کرنے کی باتیں کیں، ایک موقع پر انھوں نے عوام کی خاطر اپنی جان دینے کی بات بھی کی، جب کے عمل اس کے برعکس دکھائی دیا ۔ جالب سے نہ رہاگیا اور انھوں نے ایک نظم کہی جو بہت مقبول ہوئی ؎

نہ جان دے دو، نہ دل دے دو

بس اپنی ایک مل دے دو

زیاں جو کرچکے ہو قوم کا

تم اس کا بل دے دو

جالب کو دکھوں اور بیماریوں نے گھیر لیا تھا، ان کی صحت دن بدن گرتی ہی

جا رہی تھی، کبھی ایک اسپتال میں کبھی دوسرے اسپتال میں، حتیٰ کہ انہیں علاج کے لیے ملک سے باہر بھی لے جایا گیا، یکے بعد دیگرے بیماریاں ان پر حملہ آور ہوتی گئیں۔ ایک نڈر، بے باک، بہادری کا پیکر جس نے بڑے بڑے فوجی آمروں اور حکمرانوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اپنی بیماری کے ہاتھوں بے بس ہوگیا تھا۔ اپنی اسی بے بسی کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں بھی کیا۔

بہت تذلیل تو کرلی ہماری زندگانی کی

اجازت موت کی اب ہم کو بن کے رحم دل دے دو

عوام کے دلوں کی ترجمانی کرنے والا یہ نڈر، بے باک، باہمت، حوصلہ مند، شاعر ۱۳ ارچ ۱۹۹۳ء کو ۶۵ برس اس دنیا میں گزارنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ جالب کا ہی شعر ہے

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے

سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

امجد اسلام امجد نے جالب کی رخصتی پر جو نظم کہی اس کے چار مصرے درج ہیں۔ اللہ جالب کی مغفرت کرے۔ آمین۔

جس آوارہ دیوانے کو جالب کہتے تھے

ہستی کی اس راہ گزر سے اب وہ جاتا ہے

اے مٹی، اے ارضِ وطن، لے اپنی باہیں کھول

تیری جانب لوٹ کے تیرا شاعر آتا ہے

(شائع شدہ روزنامہ جنگ مڈویک میگزین (قلم و قرطاس)، ۲۷ مارچ ۲۰۱۳ء)

مولانا حسرت موہانی

’’اردوئے معلّیٰ ‘‘پہلا اُردو جریدہ تھا جس نے ہندوستانی سیاست کو وسعتِ ذہن اور بلند نگاہی عطا کی

ادب اور سیاست کے شہسوار

مولانا سید فضل الحسن، حسرت موہانی کے نام سے معروف ہیں اردو ادب میں اعلیٰ مقام اور بلند منصب و مرتبہ پر فائز ہیں۔ وہ ’سید الاحرار‘ اور ’رئیس المتغزلین‘ کہے جاتے ہیں۔ وہ ایک نڈر صحافی ہی نہیں بلکہ اردو صحافت کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ اردو غزل کے ممتاز شاعر، شارح ،تذکرہ نگار، نقاد، سیاسی رہنماء اور تحریکِ آزادی کے صفِ اول کے رہنماؤں میں سے تھے ، صاف گو اور حق پرست ہی نہیں خدا رسیدہ صوفی اور درویش منش انسان تھے۔اپنے نام اور تخلص کے حوالہ سے ان کا یہ شعر بہت مقبول ہے ۔

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اپنے ایک مضمون ’’مولانا حسرت موہائی‘‘ جو ماہنامہ ’تہذیب‘ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کے بارے میں لکھا کہ ’’اگر کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی

مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پر جو اکثر ترکی ہوتی تھی۔ آدھ آدھ انگل چیکٹ جمع ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اجلا، جوتے نے کبھی برش کی صورت
نہ دیکھی تھی۔ آواز جھینگر سے ملتی جلتی۔ لیکن اس بے ڈال قالب میں بے پایاں روحانی وقت، اخلاقی جرات اور خلوص و صداقت تھی''۔

حسرت نے سادہ زندگی گزاتے ہوئے دنیا میں جو نام پیدا کیا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکا ہے۔ان کی اسی خصوصیت نے انہیں سید الاحرار اور تحریک آزادی کے عظیم رہنما ء ہونے کا اعزاز بخشا۔ معروف دانش ور سرشار صدیقی نے انہیں ''فوق البشر'' کہا۔ مشکل وقت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، جیل میں رہے تو وقت ضائع نہیں ''کیا بلکہ ادب اور غزل میں ایسا مقام پیدا کیا کہ ''رئیس المتغزلین کہلائے۔ جیل میں کہا ہوا ایک شعر جو بے انتہا مشہور ہے ۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

حسرت نے برطانوی سامراج کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا، انہیں کئی بار جیل جانا پڑا، انہیں پہلی بار ۱۹۰۸ء میں گرفتار کیا گیا اور دو سال کی سزا اور

بصورت عدم ادائیگی جرمانہ چھ ماہ کی مزید سزا تجویز کی گئی۔ چونکہ آپ جرمانہ ادا کرنے سے معذور تھے اس وجہ سے ان کا نہایت نادر کتب خانہ جس میں سیکڑوں نایاب قلمی کتابیں اور کمیاب تصانیف، دیوان اور تذکرے تھے جنھیں حسرت نے انتہائی تلاش و جستجو اور صرف سے اکٹھا کیا تھا کاٹ کباڑ کی طرح نیلام کر دیا گیا۔ بیگم حسرت کے مطابق ''یہ کتب خانہ ساڑھے چار ہزار کی مالیت کا تھا اور حکومت نے اسے صرف ساٹھ روپے میں فروخت کردیا''۔ حسرت کے ساتھ جیل میں عام قیدی کی مانند سلوک کیا گیا، مولانا کی قید میں اور اخلاقی مجرموں کی قید میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان سے دس ماہ تک چکی پسوائی گئی۔ اس دوران رمضان شریف کا مقدس مہینہ بھی آیا۔ آپ نے اس موقع پر یہ شعر کہا

جو بہت مشہور ہوا۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

۱۹۱۶ء میں حسرت کی دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور مقدمہ چلا کر دو سال قید با مشقت کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں محنت مشقت، سختی، مصائب و آلام اور مظالم نے مولانا کی طبیعت میں درویشانہ شان پیدا کردی تھی۔ ان کی طبیعت میں سادگی کے ساتھ ساتھ نڈر اور دلیر انسان نے جنم لے لیا تھا۔ آپ کے ساتھ یہ مظالم 'اردو ئے معلیٰ' کی اشاعت اور ان میں شائع ہونے والے مضامین

کی پاداش میں رواں رکھے گئے۔ اردوئے معلی کے بند ہوجانے کے بعد مولانا نے سُدیشی تحریک علی گڑھ میں چلائی ، ان کے اس اقدام پر مولانا شبلی نعمانی نے انہیں لکھا ”تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے ، پھر پالی ٹیشن بنے اوراب بنیے ہوگئے“۔ ۱۹۲۲ء میں حسرت کو آخری بار گرفتار کیا گیا تو آپ ای سدیشی اسٹور کے لیے فکر مند تھے۔اس بار مولانا ڈھائی سال قید میں رہے۔ مولانا ایک طریق علم کے بھی موجد بھی ہیں اسے انہوں نے مزاحمت دفاعی یعنی (Passive Resistence) کانام دیا تھا۔ یہ نظریہ بعد میں ”ستیہ گرد“ کہلایا۔ اسے گاندھی نے اختیار کیا اور عدم تعاون اور ستیہ گرد قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ گاندھی کا فلسفہ مولانا حسرت موہانی کے مزاحمت دفاعی سے اخذ کیا گیا ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۰۷ء میں اپنے ایک مضمون میں پیش کیا تھا۔

مولانا حسرت موہانی ایک بلند پایہ شاعر اورتذکرہ نگار و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بے باک اور نڈر صحافی بھی تھے ۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ”حسرت موہانی کا مطالعہ شعر وادب میں چونکہ اپنے سارے معاصرین سے وسیع ، توانا تھا اس لیے اس توانائی و وسعت کے آثار اُن کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔ حسرت بنیادی طو رپر غزل کے شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتیہ کلام میں غزل کی جھلک نظر آتی ہے انہوں نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ۔

عشق حسرت کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدہ نہ مثنوی کی ہوس

حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری کا انداز سب سے مختلف ہے۔ ان کے تذکروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر بڑے شاعر کے ذکر کے ساتھ اس کے تلامذہ کا سلسلے وار ذکر کیا ہے۔ اصغر کاظمی کی کتاب ''مولانا حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری''، حسرت فہمی اور حسرت شناسی کے حوالہ سے اچھا کام ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' ۱۹۰۳ء میں شائع کیا، یہ ۱۹۴۲ء تک شائع ہوتا رہا، کئی بار بند بھی ہوا پھر جاری ہوتا رہا۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ کے مطابق ''اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد ''درستیٔ مذاق'' قرار دیا گیا تھا۔ یہ صرف ادبی رسالہ ہی نہ تھا بلکہ اس میں ملکی اور غیر ملکی سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں اردوئے معلیٰ کے بند ہو جانے کے بعد ۱۹۴۱ء میں ''تذکرۃ الشعراء'' جاری کیا اس کے صرف سات شمارے ہی شائع ہوسکے۔ ۱۹۲۸ء میں '' مستقل '' کے نام سے ایک رسالہ کانپور سے جاری کیا۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے '' استقلال'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ ان رسائل میں مولانا حسرت موہانی اپنے ادبی، سیاسی و مذہبی خیالات و افکار کا اظہار انتہائی بے باکی سے کرتے رہے۔ ان چاروں میں جو مقام و مرتبہ

اردوئے معلیٰ کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا اس کی وجہ اردوئے معلیٰ کا طویل عرصہ تک جاری رہنا تھا۔ یہ رسالہ انتالیس سال (جولائی ۱۹۰۳ء سے مارچ ۱۹۴۲ء) تک جاری رہا۔ اس کی طویل زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے، کبھی بند بھی ہوا پھر جاری ہوا۔ یہ دراصل مولانا حسرت کی مکمل زندگی کا آئینہ دار تھا۔ اس رسالے نے ہی اردو صحافت میں بے باکی اور بے خوفی کی روایت کو پروان چڑھایا، لوگوں میں سیاسی شعور کو بیدار کیا، یہی رسالہ مولانا کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کا باعث بھی ہوا۔

مولانا ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی ذہن کے مالک تھے۔ ادبی جریدوں میں انہوں نے ادب کی ترویج کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی خیالات و نظریات کو دلیری اور بے باکانہ انداز سے شامل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ بھی بلند کیا اور عوام کو اس کے حصول کے لیے برطانوی سامراج کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کی تلقین کی۔ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین اتحاد قائم کرنے کے داعی بھی تھے اور یہ جدوجہد ۱۹۲۲ء تک کرتے رہے اور ناامید ہو کر اس نظریے سے دستبردار ہو گئے۔ دوسری جانب ادبی پرچوں کے ذریعہ مولانا نے اُردو ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ اردو ادب میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل رہے گا۔ دونوں صورتوں ادب اور یا سیاست مولانا نے مقصدی صحافت کی، اصولوں کے پابند، حق گوئی، بے باکی، عزم

واستقلال میں چٹان کی مانند مضبوط انگریز کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے نقطہ نظر پر ڈٹے رہنے والوں میں سے تھے۔برطانوی سامراج کا ظلم و بربریت، جیل سختی اور مظالم حسرت کے مقصد کے سامنے ڈھیر نظر آتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے اپنے ایک مضمون میں اپنے شجرہ نسب، خاندان کی تفصیل، بیگم سے قرابت، سلسلہ علالت اور انتقال سے ایک روز قبل خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تفصیل بیان کی ہے۔آخر میں حسرت نے لکھا کہ مجھ کو برابر پاداش کا خطرہ لگا رہتا تھا جس کا اظہار میں نے اپنی آخری غزل میں بایں الفاظ میں کیا۔اس غزل کا ایک شعر ؎

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر ذراہِ انتقام

مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لیے

بیگم حسرت موہانی نے ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔حسرت نے اپنے جذبات کا اظہار اپنی ایک غزل میں اس طرح کیا ؎

عاشقی کو حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر

آرزو کی زندگی بیکار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں

دِل پہ ذوق شاعری اِک بار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اِک آزار ہے تیرے بغیر

اردو ادب کا کون سا ایسا بڑا ادیب اور دانشور ہے جس نے حسرت پر قلم نہیں اٹھایا۔ حسرت کی شخصیت سے لے کر سیاسی جدوجہد، ادب کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ مضامین اور کتابیں لکھی گئیں اور حسرت پر مختلف زاویوں سے تحقیق کا عمل جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ حسرت پر کئی احباب نے کام کیا۔ حسرت موہانی کے سوانحی تعارف کے طور پر سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ''حالات حسرت'' کے عنوان سے عارف ہسوی کی کتاب شائع ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں عبدالشکور نے ''حسرت موہانی'' کے نام سے کتاب لکھی، محمد اسلم ہندی نے ۱۹۵۵ء میں ''رازدانِ حیات'' تصنیف کی، اسی زمانے میں جناب عبدالقوی دسنوی نے ''حسرت کی سیاسی زندگی'' کے نام سے کتاب چھاپی، پھر ساٹھ کی دیہائی میں ''حسرت کی شاعری'' اور ''مولانا حسرت موہانی'' کے عنوان سے علی الترتیب جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان اور جناب حکیم محمد سعید کی کتابیں شائع ہوئیں۔ حسرت موہانی کے حوالہ سے سید اشتیاق اظہر کی مطبوعات میں سید الاحرار، مولانا حسرت موہانی حصہ اول ذاتی زندگی (اشتیاق اظہر اور نصرت موہانی)، حسرت کی زندگی، مقالات حسرت، مولانا حسرت موہانی کا سلسلہ سخن، نشاط النساء بیگم حسرت موہانی سیرت و خطوط کی روشنی میں، حسرت موہانی کی منتخب نظمیں (انگریزی

ترجمہ) حسرت شناسی اور حسرت فہمی کی تحریک کو ایک نئی سمت دی۔ جناب شفقت رضوی نے حسرت پر کئی کتابیں مرتب کیں ان میں 'گلدستہء حسرت'، 'انتخاب دیوانِ حسرت'، ' مولانا حسرت مجاہد آزادی کامل'، ' مطالعہ حسرت موہانی' اور' مولانا حسرت موہانی کتابیات' شامل ہیں۔ان مطبوعات کے بعد کراچی میں حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ نے حسرت پر مطبوعات کا سلسلہ دوبارہ جاری کیا۔ ابتداء میں سید اشتیاق اظہر نے حسرت کے حوالہ سے کئی تالیفات مرتب کیں۔ کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں قائم 'حسرت موہانی لائبریری و ٹرسٹ' جہاں ایک عمدہ لائبریری بھی قائم ہے حسرت فہمی اور حسرت شناسی کی تحریک کو زندہ رکھنے اور حسرت سے محبت کرنے والوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرنے میں نمایاں کردار ادا کررہا ہے۔

حسرت موہانی نے ۱۹۵۰ء میں حج ادا کیا۔ وہ حج سے واپسی پر پاکستان بھی تشریف لائے ۔ شاید انہیں اپنے بلاوے کا احساس ہو چلا تھا، بعض نے لکھا کہ انہیں اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا۔ انہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے میں بے شمار مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور پاکستان تشریف لائے، کراچی میں اپنے احباب سے ملاقات ان کا بنیادی مقصد تھا۔ یہاں آپ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ مستقل طور پر پاکستان میں قیام کرلیں لیکن آپ کا جواب تھا کہ ''میں ہندوستانی مسلمانوں کو اکیلا نہیں چھوڑ

سکتا"۔ کراچی سے لاہور ہوتے ہوئے مولانا کانپور چلے گئے۔ بیماری طول پکڑتی جارہی تھی، کمزوری اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ بہتر علاج کی غرض سے آپ کانپور سے لکھنؤ منتقل ہوگئے اور فرنگی محل میں قیام کیا اسی جگہ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا حسرت موہانی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور مولوی انوار کے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔

شیخ محمد ابراہیم آزادؔ: شخصیت و شاعری

نام محمد ابراہیم ، آزادؔ تخلص ، تاریخی نام غلام باری تھا، ہندوستان کے صوبہ راجستھان
کی تاریخی ریاست بیکانیر آپ کے آباؤ اجداد کی مسکن تھی جس کی مناسبت سے آپ
راجپوت اور بیکانیری ٹھہرے، نقشبندیہ سلسلہ سے تعلق نے آپ کو نقشبندی بنا
دیا۔ آپ ہندوستان کے صوبے یوپی کے ضلع مظفر نگر کے قصبے 'حسین پور' میں بروز
منگل ۲۵ فروری ۱۸۶۸ء مطابق یکم ذیقعد ۱۲۸۴ھ کی شب پیدا ہوئے۔ آپ نے ۷۹
سال عمر پائی ، طویل علالت کے بعد قیام پاکستان سے ڈھائی ماہ قبل ۸ جون ۱۹۴۷ء کی
شب کو اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی ، آپ
بیکانیر میں اپنے آبائی قبرستان میں مدفن ہیں۔
جنابِ آزادؔ صاحبِ دیوان شاعر ہیں اور آپ کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ مداح سرا
شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ نے تمام زندگی نعت کہی اور عشقیہ شاعری سے نہ صرف
بچے رہے بلکہ اہل اسلام کو اسے اختیار کرنے کو منع فرمایا۔ باوجود بلند پایہ وکیل
اور بیکانیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہونے کے آپ کی پوری زندگی سادگی کا نمونہ
تھی۔ آپ ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے ، خاندان کے اکثر احباب علاوہ دیگر
مشاغل کے شعر و سخن سے خاص شغف رکھتے تھے اور حمد

ونعت گوئی کو اپنے لیے اعزاز تصور کیا کرتے۔آپ کے خاندان کے بزرگ دیوان، قاضی، وکیل، جج اور استاد تھے بعض تجارت کے پیشے سے بھی وابستہ تھے۔آپ کی طبیعت میں شعر وسخن کا مذاق ابتدا ہی سے تھا بقول ایک ہمعصر بھائی محمد اسرائیل صاحب آپ کی طبیعت بھی رسا تھی استعداد و قابلیت سے اللہ عز وجل نے کافی حصہ عطا فرمادیا تھا اس لیے آپ نے بجائے عشقیہ شاعری کے حمد و ثنائے باری تعالیٰ عزاسمہ و نعت رسول مقبول خیر الانام واسوۂ حسنہ کو اپنا مطمع نظر اور نصب العین قرار دیا۔بقول تابش صمدانی آزاد صاحب کا گھرانا صدیوں سے گہوارۂ علم وادب رہا ہے۔ جناب آزادؔ کا تعلق خاندان باری بخشؒ سے ہے جو خاندانِ حسین پور کے نام سے بھی معروف ہے۔آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار نبی بخشؒ سے حاصل کی جو مذہبی سوچ رکھتے تھے۔اپنے والد کی زیر نگرانی آزاد صاحب نے چند ہی سالوں میں فارسی زبان پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ فارسی زبان میں خط وکتابت فرمانے لگے۔آپ انتہائی ذہین اور مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ قدرت نے آپ کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازہ تھا، حافظہ اس قدر تیز کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے ہمیشہ یاد رہتی۔آپ ایک شفیق باپ، فرمانبر دار فرزند، خیال کرنے والے شوہر، بہترین استاد، بلند پایہ وکیل، بہترین منصف وجج، خوش اخلاق، خوش طبع، خوش مزاج، خوش گو اور بلند

کردار ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدردانِ قوم بھی تھے۔

آزادؔ صاحب کی شخصیت اور مقام کئی جہت سے ممتاز اور منفرد ہے آپ اسرارِ شریعت سے واقف، کتاب و سنت کے بحرِ ذخار کے سچے عاشق اور صاحبِ فضل و کمال تھے۔ عربی زبان کے الفاظ کا استعمال، قرآنی آیات کا ترجمہ آپ نے اپنے کلام میں بہت ہی خوبی سے نظم فرمایا۔ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کی سوچ یہ تھی کہ ’خدا کی صِفَت تو پھول تو کیا پتے پتے سے ظاہر ہوتی ہے۔ حسن و اخلاق کے بیان کرنے کے لیے ذات مقدس محبوب خدا کی ایسی ہے کہ اگر تمام عمر ایک صفت کے ہی بیان میں خرچ کی جائے تو ایک شمہ بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ اگر نعت کے بیان کرنے میں افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے تو عین موجب خوشنودی خدااور رسول ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے کے لیے قرآن پاک و تفاسیر و کتب پر غور کرنا پڑتا ہے اور جس قدر انہماک اس میں ہوگا اسی قدر حضور کا عشق اس کے دل میں ہوگا جو عین ایمان ہے‘۔

آزادؔ صاحب ملتِ اسلامیہ کی بہبود کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں پر ظلم و زیادتی ہو رہی تھی وہ اس کا درد محسوس کر رہے تھے۔ اپنے اس دکھ کا اظہار انہوں نے اپنی نظموں میں برملا کیا۔ وہ اسلامی مساوات اور اخوت کے علمبردار بھی تھے۔

آپ کی شخصیت متقیانہ صفات کی حامل تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ تصوف کے موضوعات اور جذباتِ حقیقی کو آپ نے جس باریک بینی اور خوبی کے ساتھ نظم میں بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تصوف آپ کا پسندیدہ موضوع تھا آپ کے نثری مضامین یقینا تصوف کے مشکل مسائل کا حل پیش کرتے ہوں گے۔ کیوں کہ جو شخص نظم میں تصوف جیسے دقیق اور مشکل موضوع کو اسقدر مہارت اور خوبی سے بیان کرنے میں کمال رکھتا ہو وہ نثر میں اس موضوع پر زیادہ بہتر انداز سے قلم اٹھا سکتا ہے۔

جناب آزادؔ کی شخصیت کا ایک قابل تقلید پہلو دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا اور اس میں عملی طور پر حصہ لینا تھا۔ خاندان میں منعقد ہونے والی مختلف تقاریب، حتیٰ کے چھوٹی سے چھوٹی تقاریب میں شریک ہونا، بچوں اور بڑوں میں گھل مل جانا آپ کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

آپ ایک حساس اور درد مند دل لیے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور دل جوئی کیا کرتے، اکثر احباب کے انتقال پر آپ نے اپنے جذبات کا اظہار نظم میں کیا اپنے اعزا و اقرِبا کے بچوں کی شادی کے موقع پر سہرے کہے۔ اپنے پیر حاجی فظ جماعت علی شاہ نقشبندی علی پوری، استاد بیخودؔ دہلوی

کی شان میں نظمیں کہیں، اسی طرح دیگر بزرگوں کی شان میں منقبتیں پیش کیں۔
دنیاکے حالات و واقعات پر بھی جنابِ آزادؔ کی نظر تھی آپ نے ان حالات اور سیاست کو قریب سے دیکھا،ان کی نظرپوری دنیا خصوصاً اسلامی ممالک میں ہونے والے مظالم اور زیادتیوں پر رہتی تھی اوران مظالم کو جو مراکش، ایران، اٹلی، کابل اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ہو رہے تھے انکی کسک وہ اپنے اندر محسوس کیا کرتے ان کا اظہار آپ نے برملا کیا۔ایک موقع پر آپ نے کہا۔

علم مولا میں ہے جو حال مراکش اب ہے
کیسا مظلوم ہے ایران رسولِ اکرم
شہ کو معلوم ہیں اٹلی کے مظالم جو ہیں
اب غضب ڈھاتا ہے بلقان رسولِ اکرم

آپ ہندوستان کی سیاست سے بے بہرہ نہیں تھے۔فرماں روائے کابل سلطان محمد حبیب الرحمٰن خان بہادر کی ہندوستان آمدکے موقع پرآپ نے ایک نظم کہی آپ کے بقول یہ نظم برادران صاحبان قوم کی خواہش پر کہی۔ گویاآپ اپنے گرد بسنے والے احباب کی خواہشات کا بھی احترام کیا کرتے تھے۔اس موقع پر آپ نے کہا۔

مرحبا ہند ترے آج جو مہماں آئے
بارک اللہ عجب شان کے سلطاں آئے
میزباں تجھ کو مبارک ترے مہماں آئے

منتظر جس کا زمانہ تھا وہ سلطاں آئے

آپ نام و نمود اور شہرت کو نہ پسند فرماتے اور نہ ہی انھوں اس جانب توجہ کی۔ آپ کا کل علمی سرمایہ ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ آزادؔ صاحب اپنی جگہ جلیل المرتبہ، زود حس، زود فہم، زود گو، ذی علم، کہنہ مشق شاعر تھے لیکن مفادِ اشاعت اور فیضان ابلاغ سے یکسر بے نیاز تھے۔

عاجزی و انکساری آزادؔ صاحب کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ ان کے کلام سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کے ان کے مزاج میں خاکساری، فروتنی اور عاجزی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ بڑوں کا احترام اور عزت، چھوٹوں سے وضع داری برتنا خاندانی روایت تھی۔ آپ صالح، با اصول، ایماندار، انصاف پسند، بات کے سچے اور کھرے واقع ہوئے تھے۔ معاملات کے سچے، نڈر، بے باک اور کھری بات بلا خوف و خطر کہہ ڈالتے۔ یہ شعر آپ کی ان صفات کا عکاس ہے ۔

شاعر نہ میں ہوں اور نہ اہل زباں ہوں میں

جادو نگار میں ہوں نہ سحر البیان ہوں میں

اظہار شہ جو کرتا ہوں آزادؔ میں بیان

ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں معجز بیاں ہوں میں

آزادؔ صاحب صوم و صلوٰۃ کے پابند اور متقیانہ صفات رکھتے تھے۔ نماز کی ادائیگی کے حوالے سے ایک واقعہ بہت مشہور ہے جسے ہمارے خاندان کے احباب اکثر سنایا کرتے ہیں۔ آزادؔ صاحب بیکانیر اسمبلی کے بہ لحاظ عہدہ رکن تھے۔ ایک دن اجلاس جاری تھا۔ بیکانیر کا مہاراجہ گنگا سنگھ از خود اس اجلاس میں موجود تھا۔ دوران اجلاس عصر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ آزادؔ صاحب نے اجلاس وقتی طور پر رکوانے کی درخواست نہیں کی بلکہ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اسمبلی ہال میں ایک جانب جاکر اپنی شیروانی اتار کر جائے نماز کے طور پر نیچے فرش پر بچھا کر نماز ادا فرمائی۔ اسمبلی میں موجود ہندوں اور سکھوں کی غالب اکثریت کے باوجود آزادؔ صاحب کی یہ بے باکی ممکن ہے کہ ہندوں شدت پسندوں کو پسند نہ آئی ہو لیکن آزادؔ صاحب کی اس ادا نے راجپوت مہاراجہ گنگا سنگھ کو متاثر کیا اور اس کے حکم سے آئندہ اسمبلی کے اجلاس کے دوران نماز کے اوقات میں وقفے کا خیال رکھا جانے لگا۔ عدالتوں کے لیے بھی حکم جاری ہوا کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لیے وقفہ رکھا جائے اسی طرح جمعہ کے دن بیکانیر کے اسکولوں میں نماز جمعہ سے قبل چھٹی کی جانے لگی۔ بیکانیر کی مدینہ مسجد کا سنگِ بنیاد جناب آزادؔ کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ یہ مسجد راجستھان میں خوبصورتی کے اعتبار سے منفرد اور دیدہ ذیب مسجد شمار کی جاتی تھی۔ بیکانیر اسٹیٹ کے تحت قائم ہونے والی سیرت کمیٹی کے سرپرستِ اعلیٰ بھی

تھے۔

آزآد صاحب تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اپنے خیالات اور نظریات کا پرچار انھوں نے اپنے نثری مضامین اور شاعری میں بھرپور انداز سے کیا۔ تصوف اور آزادی نسواں کے موضوع پر آزاد صاحب کے نثری مضامین رسالہ ''پیام اتحاد'' اور دیگر رسائل میں شائع ہوئے بقول پروفیسر عبدالحصی 'آزآد صاحب تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اپنے مخصوص نظریات کی تائید میں یکہ و تنہا لڑتے دھائی دیتے ہیں' ۔

افسوس آزاد صاحب کا نثری علمی سرمایا پاکستان منتقل نہ ہوسکا۔ جس قدر بھی شائع ہوا ہندوستان میں ہی رہ گیا۔

آزآد صاحب لوگوں میں رہنے والے، لوگوں کی بات سننے والے، خاموشی سے مستحقین کی مدد کرنے والوں میں سے تھے۔ خاندان اور برادری میں خوش مزاج و خوش گفتار کے طور پر جانے جاتے تھے۔ علمی ، ادبی ، ثقافتی ، سماجی اور بھلائی کے کاموں میں عملی شریک ہوا کرتے۔

جب کبھی مالی مدد کرنے ضرورت ہوتی کبھی بُخل اور تنگ نظری سے کام نہ لیتے

بلکہ فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کرتے۔

۱۸۸۱ء میں ہندوستان کے شہر فرید کوٹ کے مہاراجہ نے آزآد صاحب کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے آپ کو اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی جسے آپ نے قبول کر لیا۔ اس طرح آپ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۷ء تک فرید کوٹ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بعد ازاں آپ فرید کوٹ سے ہندوستان کی ریاست بیکانیر منتقل ہوگئے میرے والد صاحب قبلہ انیس احمد صمدانی مرحوم آزآد صاحب کے فرید کوٹ سے بیکانیر منتقل ہونے کا واقعہ اکثر سنایا کرتے تھے کہ مہاراجہ فرید کوٹ آپ کی بہت عزت کیا کرتا تھا اور ہر طریقے سے آپ کا خیال بھی رکھتا۔ آزآد صاحب بھی نیک نیتی اور محنت سے تمام امور کی انجام دہی فرماتے رہے۔ ایک روز کسی سرکاری تقریب میں مہاراجہ نے آپ کو اپنے کسی کارندے کے ذریعہ شراب کی پیش کش کر دی۔ آپ کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری، آپ اسی وقت اپنے گھر تشریف لے گئے اور بغیر کسی کو بتائے رات کے اندھیرے میں فرید کوٹ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہتے ہوئے بیکانیر تشریف لے گئے اور زندگی میں دوبارہ کبھی فرید کوٹ کا رخ نہیں کیا۔ مہاراجہ کو جب آزآد صاحب کے چلے جانے کا علم ہوا تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوا اور سرکاری احکام جاری کیا کہ شیخ صاحب جب کبھی بھی فرید کوٹ دوبارہ واپس آئیں گے تو انہیں وہی اعزاز اور مقام دیا جائے گا۔ مگر آزاد صاحب نے دوبارہ فرید کوٹ جانے کے بارے میں سو

چا بھی نہیں۔

بیکانیر میں اس وقت مہاراجہ گنگا سنگھ حکومت برطانیہ کی طرف سے حاکم تھا۔ یہ بیکانیر کا اکیسواں مہاراجہ تھا جس نے ۱۸۹۸ء میں تاج برطانیہ کی جانب سے اقتدار سنبھالا اور اپنی موت ۲ فروری ۱۹۴۳ء تک بیکانیر پر حکومت کرتا رہا۔ گنگا سنگھ ایک نیک انسان تھا ۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں ریاست کی بہتری اور ترقی کے بے شمار اقدامات کئے۔ آزاد صاحب کی نیک سیرت اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے مہاراجہ گنگا سنگھ بھی آپ کا قدر داں ہو گیا اور آپ کو ریاست کے وزیر اور قانونی مشیر کا درجہ دیا گیا۔ اکتوبر ۱۸۹۷ء سے آپ نے بیکانیر میں وکالت کی ، ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک چیف کورٹ بیکانیر میں جج و چیف جسٹس کے فرائض انجام دیئے۔ تابش صمدانی نے اپنے مضمون 'آزاؔد بیکانیری اور اُن کا فن' میں لکھا ہے کہ 'مہاراجہ بیکانیر نے آزاؔد صاحب کی سو روپے ماہانہ پنشن مقرر کی جو تاحیات جاری رہی اور بطور خاص یہ حکم صادر کیا گیا کہ خزانے کا کارندہ خود آزاؔد صاحب کے گھر پر جا کر پینشن کی رقم ادا کیا کرے گا۔ ایسے اعزاز کی بیکانیر کی تاریخ میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی ۔ آزاؔد صاحب نے جہاں ایک طرف بیکانیر میں دینی خدمات سرانجام دیں ، وہاں شعر و ادب سے بھی فضائے بیکانیر کو آشنا کیا۔ آپ کو 'بابائے بیکانیر' کہا جاتا تھا''۔ بیکانیر ریاست کی جانب سے آپ کی عزت و توقیر کا یہ عالم تھا کہ گھر

سے عدالت جانے اور عدالت سے واپس گھر لانے کے لیے آپ کے لیے دو گھوڑوں والی بگی آیا کرتی تھی۔

ریاست بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ کی تخت نشینی کو کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔ گنگا سنگھ سے قبل ڈونگر سنگھ ریاست بیکانیر کا حکمراں تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے چھوٹے بھائی گنگا سنگھ کو بیٹا بنالیا تھا۔ چنانچہ اس کے انتقال کے بعد ریاست کی حاکمیت اعلیٰ گنگا سنگھ کو سونپ دی گئی۔ یہ ریاست کا اکیسواں سربراہ تھا۔ اس کے خاندان کے کچھ لوگوں نے کورٹ میں مقدمہ کر دیا۔ آزادؔ صاحب چیف جج کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور ریاست کے ایک نامی گرامی وکیل شمار کیے جاتے تھے۔ گنگا سنگھ نے آزادؔ صاحب کو اپنا وکیل مقرر کیا اور آپ کو ایک سرکاری وکیل کی حیثیت سے تمام مراعات دی گئیں۔ آپ نے اپنی مدد کے لیے ایک جونئیر وکیل بھی مقرر کیا۔ جناب نثار احمد صمدانی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ آزادؔ صاحب نے سرکار بیکانیر کی نمائندگی کرتے ہوئے مہاراجہ گنگا سنگھ کے کیس کی پیروی اس خوبی سے کی کہ کیس کا فیصلہ مہاراجہ گنگا سنگھ کے حق میں ہوگیا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ راجہ اس عظیم کارنامے پر بے انتہا خوش تھا۔ محبوب احمد سبزواری مرحوم جو آزادؔ صاحب کے ہم زلف اور میرے ماموں تھے نے بتایا تھا کہ صرف آزادؔ صاحب کے جونیئر وکیل جناب نثار احمد صاحب کو اس وقت

ہزار روپے کیس کا معاوضہ دیا گیا۔ راجہ نے آزادؔ صاحب کو ریاست بیکانیر کا ایک ۲۰ وسیع علاقہ دینے کی پیش کش کی اور کہا کہ آپ اس پورے گاؤں کے مالک ہوں گے۔ آزاد صاحب نے راجہ کی اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم آپ کو کثیر رقم دی گئی اوراس کے ساتھ ہی آپ کو ریاست کے ایک وزیر کا درجہ دے دیا گیا جو آخر تک قائم رہا۔

آزادؔ صاحب راجستھان کے ایک نامی گرامی وکیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی مقبولیت اور شہرت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوا جب انھوں نے برطانوی عدالت میں بیکانیر کے مہاراجہ گنگا سنگھ کی تخت نشینی کا کیس جیتا۔ اس کامیابی نے آزادؔ صاحب کو بیکانیر کی حکومت میں اعلیٰ مقام عطا کیا۔ ریاست بیکانیر میں آپ کو ایک ذہین، بے باک اور ایماندار وکیل کے طور جانا جانے لگا۔ آپ کے اعزاز و مرتبے میں اضافے کے ساتھ ساتھ مالی طور پر بھی آپ کی حیثیت مستحکم ہوئی۔ مالی طور پر بے حد مستحکم ہونے کے باوجود غرور اور تکبر آپ سے کوسوں دور تھا۔

آزادؔ صاحب حق گو، نڈر اور اصولوں کے سخت پابند تھے۔ بقول پروفیسر عبد الحصی جناب محمد ابراہیم آزادؔ مرحوم نے ایک مرد حق اور حق اندیش کی طرح حق و صداقت ' کے دیئے کو بیکانیر کے ویران صحرا میں روشن رکھا جس کی روشنی نے

بہت سی نیک روحوں کو منور کیا۔ آزآد صاحب کی صلاحیت خدا داد تھی۔ آپ نے اپنے والد ماجد کی آغوش تربیت میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ اردو ، فارسی کے علاوہ عربی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بزرگوں کی صحبت سے اپنے قلب کو منور کیا۔ اساتذہ کی خدمت میں آپ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کے اساتذہ کی تربیت اور صحبت نے انہیں اس طرح نکھار دیا کہ پورے راجستھان میں آپ کی شہرت ایک نیک اور دین دار کی حیثیت سے عام ہو گئی لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔ آپ کے ہمعصر آپ کی علمیت ، اعلیٰ مہارت ، سخن فہمی اور مداح سرائی سے بے انتہا متاثر تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کا نعتیہ دیوان طبع ہونے لگا تو بے شمار اہل علم ، شاعروں، دانشوروں نے اس پر اظہار خیال کرنا یا تقاریظ لکھنے اپنے لیے اعزاز جانا۔ آزآد صاحب نے ان میں سے چند کی آرا کو ہی دیوان میں شامل کیا۔ باقی کو اس وجہ سے شامل اشاعت نہیں کیا کہ انہیں اپنی تعریف و توصیف پسند نہیں تھی۔ ان احباب سے آپ نے معزرت چاہی جو آپ کے دیوان میں شامل ہے۔

جنابِ آزآد بیکانیری کا زمانہ انیسویں صدی عیسویں کے نصف آخر سے بیسویں صدی عیسویں کے تقریباً نصف آخر تک ہے ۔ اس دور کی ممتاز شخصیات میں علامہ اقبال ، حسرتؔ موہانی، مولانا محمد علی جوہرؔ، الطاف حسین حالیؔ، احمد رضاؔ بریلوی، داغؔ دہلوی، سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، محسنؔ

کاکوروی، شاد عظیم آباد، مولانا غلام شہید، آسی غازی پوری، حسن بریلوی، علامہ ضیاء القادری، محمد عبداللہ بیدل، حافظ خلیل الدین حسن، حافظ پیلی بھیتی، محمد یوسف راسخ منشی عبدالشکور خاں برق اجمیری، محمد عبداللہ صوفی شامل ہیں۔مذہبی عقائد کے اعتبار ، سے آپ سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت قبلہ حاجی سید جماعت علی شاہ نقشبندی سجادہ نشیں علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ (فیصل آباد)کے باقاعدہ مرید تھے۔

سخن فہمی آزاد صاحب کے خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے، صاحبِ دیوان اور بقول ابن انشا بے دیوان شاعر بھی ہوئے ہیں۔آزاد صاحب بنیادی طور پر راجپوت تھے راجپوتانہ نے بھی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں، میرابائی، مہدی حسن اور ریشماں کو مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان کے تین طرفہ تحفے قرار دیا ہے جن کے وہ قائل اور گھائل ہیں حالانکہ وہ خود بھی راجپوت ہی ہیں۔ بعد میں ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر (یوپی)کے قصبہ حسین پور کو آباد کیا۔

مَیں نے آزاد صاحب کو نہیں دیکھا اس کی وجہ یہ رہی کہ میں اُن کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے پورے نو ماہ بعد دنیا میں آیا۔ گویا آزاد صاحب نے اس دنیا سے واپسی کا سفر باندھا اور مَیں نے اس دنیا میں آنے کی تیاری شروع کی۔

یہی اللہ کا نظام ہے وہ دنیا میں اپنے بندوں کو بھیجتا اور واپس بلاتا رہتا ہے۔ میرے لیے آزادؔ صاحب کی شخصیت کی ظاہری وَضع قَطع یا حلیہ بہ۔بعینہٖ بیان کرنا مشکل ہوگا لیکن میں نے آزادؔ صاحب کے کئی بیٹوں کو جو میرے دادا ہوئے کو بہت قریب سے دیکھا، ان کے بعض بیٹے ان کا پَرتَو، ظِلّ یا پرچھائیں تھے۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو مَیں نے اپنے والد صاحب اور دیگر احباب سے سنیں آزادؔ صاحب کی شخصیت کا ظاہری حلیہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے۔ دبلے پتلے ،مِیانَہ قد،کتابی چہرہ، سانولا نکھرا نکھرا رنگ ، چہرے پر معصومیت، جسم وجسہ معدوم و موہوم ، متانت اور سنجیدگی ، معمولی مونچھوں کے ساتھ کالی داڑھی، کھڑے نقش، ستواں ناک، کرنجی آنکھیں، کشادہ پیشانی، جھدرے بال ، ہنستا مسکراتا چہرہ ، ہنستے وقت دانت نمایاں ہوا کرتے، مخروطی انگلیاں،نرم گفتار، سبک رفتار، مرنجاں مرنج، خوش لباس گھر میں کرتا پاجامہ عدالت جاتے وقت سر پر راجستھانی امامہ (پگڑی) ،کالی جبہ نما شیروانی اور علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، پیروں میں کبھی سلیم شاہی اور کبھی قائدِ اعظم کے فیتے والے بوٹوں جیسے بوٹ یہ ہے آزادؔ صاحب کی ظاہری شخصیت جو میں بنا سکا۔

شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کی شاعری

شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کی شاعری کی ابتدا عشقیہ شاعری سے ہوئی یہ دور ۱۹۰۳ء

مطابق ۱۳۲۱ھ کا تھا۔ ابتدا میں منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری شاگرد رشید حضرت داغؔ دہلوی سے اصلاح لی۔ لیکن ان کا مزاج اس سے مختلف تھا تعلیم و تربیت اسلامی طرز پر ہوئی تھی ۔ مذہب سے خاص لگاؤ اور صوم و صلاۃ کے پابند تھے ۔ مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ذہن نے عشقیہ شاعری کو قبول نہ کیا اور بہت جلد اس سے راہِ فرار اختیار کی اور عشقیہ شاعری سے توبہ کر لی اور عہد کیا کہ نعت کے سوا کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ نے مولانا مولوی عبدالحیٔ بیخود بدایونی سے بھی اصلاح لی۔ آزادؔ صاحب کا عشقیہ کلام جس قدر بھی تھا منظر عام پر نہ آ سکا اور نہ ہی محفوظ رہا۔ آزادؔ بذات خود اس کے حق میں بھی نہ تھے کہ عشقیہ کلام منظر عام پر آئے۔ آپ بہت جلد غزل گوئی سے تائب ہو کر صرف حضور اکرم ﷺ کی مداح سرائی کی جانب آ گئے اور تادمِ العمر نعت کہتے رہے۔

۱۹۱۳ء (۱۳۳۱ھ) میں آپ باقاعد سلسلہ شاگردی استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی جانشیں فصیح الملک داغؔ دہلوی داخل ہوئے۔ بیخودؔ دہلوی نے آپ کے بارے میں میں لکھا کہ ' خمخانۂ بیخودؔ کے جرعہ کشوں میں ایک حاجی شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کا نام بھی درج رجسٹر شاگرداں ہے خدا اُن کو زندہ رکھے صوفی منش انسان ہیں حمد و نعت کہتے ہیں عاشقانہ شعر نہیں کہتے تعجب خیز امر یہ ہے کہ باوجود شغل وکالت شعر کہتے ہیں ان کا کلام

بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چندہ محتاج نہیں ، کئی سال ہوئے میں نے ان کو نعت گوئی میں اپنا خلیفہ بنالیا تھا'۔ بیخودؔ دہلوی نے آزادؔ صاحب کی شخصیت کا خوبصورت نقشہ اس طرح کھینچا ۔

نام آزادؔ وضع کے پابند میرے شاگرد میرے عاشقِ زار

ہیں یہ مداح سرورِ عالم نعت گوئی ہے خاص ان کا شعار

ان کے اشعار سب ہیں تاریخی

کرتے ہیں واقعات کا اظہار

یہ محدث نہ یہ مُورخ ہیں یہ تو عشق نبی کے ہیں بیمار

ہیں یہ مداح سیرت نبوی اور مداح اِن کا بیخودؔ زار

آزادؔ صاحب ۱۹۰۳ء (۱۳۲۱ھ) میں سلسلہ مریدی پیر و مرشد حافظ حاجی سید جماعت علی شاہ نقشبندی سجادہ نشیں علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ شامل ہوئے ۔ پنی ایک نظم میں آپ نے اپنے استاد اور پیر، دونوں کو ایک ہی شعر میں کس قدر خوبصورتی کے ساتھ نذرانہ عقیدت پیش کیا ۔

استاد نے زبان دی مضمون شیخ نے

دیوان میرا مفت میں تیار ہوگیا

آزادؔ صاحب نے اپنے شاعر ہونے کے بارے میں انتہائی انکساری کے ساتھ یہ کہا

کہ وہ نہ تو شاعر ہیں اور نہ ہی اہل زباں ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں بلا خوف وتردد کے کہہ دیتے ہیں۔ یہ ان کی انکساری ہے ورنہ ان کے قادر الکلام شاعر ہونے میں کسی بھی قسم کا شک و شبہ نہیں پایا جاتا۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ شاعری کے علم و عروض کے سخت پابند نظر آتے ہیں۔ لفظیات میں بھی آزادؔ بے مثال ہیں۔ انھوں نے عام فہم اور سادہ الفاظ استعمال کیے۔ پروفسر سحر انصاری کے الفاظ میں جو انھوں نے نظیر اکبر آبادی کے لیے کہے تھے آزادؔ صاحب پر بھی صادق آتے ہیں کہ انھوں نے عامیانہ۔ سوقیانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کو بھی شاعری بنا دیا ہے۔

آزادؔ صاحب کی شاعری نہ تو مبہم و پیچیدہ علامتوں کی شاعری ہے اور نہ ہی دورِ ارتقا استعارات وکنایاتی کی بلکہ آپ کی شاعری سیدے سادے سچے جذبوں کے ارتعاش کی شاعری ہے، عشقِ نبوی میں ڈوبے ہوئے خیالات کی شاعری ہے۔ آپ کی شاعری وجدانی اور رسمیات سے بالکل پاک اور اس میں جذب و انجذاب کی وہ شدت بھی موجود ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذات و صفات سے والہانہ لگاؤ سے پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کے عام سننے والے کے ذہن و دل میں آ آسانی سے اُتر جاتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کے اس شعر میں کہی ہوئی بات

آزادؔ صاحب کی شاعری پر پوری اترتی ہے۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت

دل میں سُنتے ہی جو اُتر جائیں

: آزآد کی حمد نگاری

شیخ محمد ابراہیم آزآد کا نعتیہ دیوان ''ثنائے محبوب خالق دیوان آزآد' کا آ غاز حمد باری تعالی سے ہوا ہے۔آزآد صاحب بھی اپنی عبدیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پروردگار کی حمداس طرح بیان کرتے ہیں ۔

اللہ تونے خاک کو انسان بنادیا

انسان کیا بنایا مسلماں بنا دیا

انسان کو کائینات کے ایک ایک زرے میں اللہ کی کبریائی اور اس کا جلوہ دیکھائی دیتا ہے۔

آزآد نے اسے کس خوبصورت انداز سے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ۔

جلوے جلوے میں لگا رہتا ہے پردا تیرا

پردے پردے میں نظر آتا ہے جلوا تیرا

آزآد نے بعض موقع پر نعت سے حمد پیدا کی ۔ فرماتے ہیں ۔

جب عالم امکاں ہی میں تو سب سے سوا ہو

تو جس کا ہو بندہ وہ بھلا کیوں نہ خدا ہو

حمد کے ایک شعر میں آپ نے پروردگار کے حوالے سے کیا خوب خیال پیش کیا ہے ۔

کیا بات تیری قدرتِ والا کی اے قدیر
کن کہہ کے جس نے عالمِ امکاں بنا دیا
اپنی ایک حمد میں آزادؔ خالق کائنات کی حمد سرائی میں کہتے ہیں ۔
سب کچھ تیری قدرت میں ہے سب علم میں تیرے
حاضر رکھا ہر شے کو بنا کر نہ بنا کر
حق تعالیٰ کی رحمت کا ذکر آزادؔ نے اس طرح کیا ۔
ظاہر ہے کہ رحمت ہے تیری عدل سے بڑھ کر
نیکی کو لکھا جاتا ہے دس درجے بڑھا کر
باری تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت کے حوالے سے آزادؔ نے کیا خوب کہا ہے ۔
کیا بتائے کوئی اے ذکر فضیلت تیری
جب کہ مذکور ہے مذکور سے محبت تیری
نقش ہے دل پہ ترا سکہ زباں پر تیرا
جسم پر حکم ترا جاں پہ حکومت تیری
تری تعریف ہے قرآن میں کیا کیا مذکور
کیا کیا مذکور حدیثوں میں ہے مدحت تیری
رات دن شام و سحر جاگتے سوتے ہر دم
ہے یہ ارشاد کہ کثرت سے ہو کثرت تیری
پانچ نمازوں اور اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا نقشہ کیا خوب پیش کیا ہے ۔

پنج نوبت ہے تری پانچ یہ رُکنِ اسلام

اللہ اللہ یہ تری شان یہ شوکت تیری

تجھ سے آباد مساجد ہیں کعبہ معمور

عرش پر شان تری کُرسی پہ طلعت تیری

: آزادؔ کی نعت نگاری

آزادؔ اسرارِ شریعت سے واقف، کتاب و سنت کے بحرِ ذخار کے سچے عاشق اور صاحبِ فضل و کمال ہیں۔ ثنا خوانی میں جس باریک بینی، احتیاط اور ادب شناسی کی ضرورت ہو تی ہے آزادؔ اس سفر میں بہت ہی خوبی کے ساتھ گزرے ہیں۔ زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ امتیاز الشعراء بیخودؔ دہلوی نے آپ کے کلام کے بارے میں فرمایا کہ ''ان کا کلام بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چنداں محتاج نہیں ہے'' ۔آپ کا کلام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپ نے کلام اللہ سے مدحت سرائی سیکھی اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے مدحت سرا اور عاشق رسول کو اپنا راہ رو بنا یا۔

لکھتا ہوں کیا ثنا رُخ عالی جناب کی

تفسیر لکھ رہا ہوں خدا کی کتاب کی

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'وصف ' یا 'مدح 'کے ہیں یا ''کسی شخص

میں اچھی اور قابل ذکر صفات و خوبیوں کا پایا جانا اور ان خوبیوں کا بیان کیا جانا'۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں لفظ 'نعت' کا استعمال مجازاً صرف اور صرف سید المرسلین خاتم الا نبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے توصیف ثنا یعنی تعریف کے لیے ہوا ہے۔ اردو اور فارسی میں لفظ نعت سے مراد حضرت محمد ﷺ کی مدح و ثنا مراد ہوتی ہے۔ عربی میں مدح النبی' یا 'المدائح النبویہ' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد رفیع الدین' اشفاق جنھوں نے اردو میں نعتیہ شاعری پر پہلا تحقیقی مقالہ تحریر کیا جس پر انہیں ناگپور یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی کے خیال میں 'اس صفت کا تعلق دینی احساس اور عقیدت مندی سے ہے اور اسے خالص دینی اور اسلامی ادب میں ''شمار کیا جاتا ہے'۔ اسی طرح ڈاکٹر شاکر اعوان کی تصنیف ''عہد رسالت میں نعت اردو ادب میں اپنے موضوع پر قابل تعریف کام ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف اردو کی نعتیہ شاعری'' اپنے موضوع پر معتبر حوالہ ہے۔''

نعت کہنا یا نعت کا پڑھنا مسلمان کی حیثیت سے باعث برکت اور باعث ثواب تصور کیا جاتا ہے۔ بے شمار شعراء جو صرف عشقیہ شاعری کیا کرتے ہیں انہوں نے حصول ثواب کی غرض سے نعت بھی کہی بعض نے تو ثواب کی خاطر اور بعض نے صرف اس لیے نعت کہی تاکہ وہ اپنے آپ کو نعتیہ شعراء کی صف میں بھی کھڑا

کر سکیں۔ جنابِ آزآد کے پورے نعتیہ کلام میں نبی اکرم ﷺ سے والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار نمایاں ہے۔ آپ کے کلام سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کہنے والا عشقِ رسول ﷺ میں مجسم ڈوبا ہوا ہے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔ ان کے اشعار بسا اوقات پڑھنے والے پر اس قدر شدید اثر ڈالتے ہیں کہ وہ اندر سے تڑپکر رہ جات ہے اور محسوس کرتا ہے جیسے وہ

از خود اپنے نبی کی شان بیان کر رہا ہے۔

پڑھتا ہوں میں نبی پہ درود و سلام آج

اللہ سے ہم کلام ہے میرا کلام آج

بخت رسا نکال دے اتنا تو کام آج

دربار مصطفےٰ میں ہو میرا سلام آج

آزآد صاحب کے کلام سے واضح ہے کہ آپ کو اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ عربی پر بھی عبور حاصل تھا، آپ کا فارسی کلام جو خاص آپ کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے باوجوہ شائع نہیں ہو سکا۔ عربی زبان کے الفاظ کا استعمال، قرآنی آیات کا ترجمہ آپ نے اپنے کلام میں بہت ہی خوبی سے نظم فرمایا۔ جنابِ آزآد نے تحریر فرمایا کہ ''حمد و نعت کیا ہے۔ واقعی خدا کا شکریہ ادا کرنا ہے خدا کی صفت تو پھول تو کیا پتے پتے سے ظاہر ہوتی ہے۔ حسن و اخلاق کے بیان کرنے کے لیے ذات مقدس محبوب خدا کی ایسی ہے کہ اگر تمام عمر ایک صفت

کے ہی بیان میں خرچ کی جائے تو ایک شمہ بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ اگر نعت کے بیان کرنے میں افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے تو عین موجب خوشنودی خدااور رسول ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے کے لیے قرآن پاک و تفاسیر وکتب سیر پر غور کرنا پڑتا ہے اور جس قدر انہماک اس میں

ہوگا اسی قدر حضور کا عشق اس کے دل میں ہوگا جو عین ایمان ہے ''۔

الستُ ربّکم ارشاد خالق جب ہوا سب سے

تو سب کا مقتدیٰ ہو کر بڑھا آگے بلے تیرا

کھلے ہیں معنیٔ یٰسین وطٰہٰ جو کوئی سمجھے

ہر اک ان میں لقب ہے اے حبیب کبریا تیرا

حدیثوں میں بیاں تو نے کیا ہے حمدِ خالق کو

خدا قرآن میں مداح ہے خیر الوریٰ تیرا

کیا بات تیری قدرتِ والا کی اے قدیر کن کہہ کے جس نے عالم امکاں بنا دیا

ربِّ ہب لی اُمتی کہتے ہیں آپ

مختصر سا ہے سوالِ مصطفےٰ

جس کی تعریف و توصیف مالکِ کائینات نے بیان کی ہو اس کی شانِ اقدس میں عقیدت کے پھول کسی بھی بندے کی جانب سے پیش کیے جائیں بڑی سعادت کی بات ہے۔

آنحضرت محمد ﷺ کی مدح و ثنا بیان کرنے کا شرف آپ کے چچا جناب ابو طالب کو

حاصل ہے جنہوں نے بنو ھاشم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ محمد ﷺ کو کفار مکہ کی زیادتیوں سے بچائیں۔ دوسرا مدح جاہلیت کا نامور شاعر اعشیٰ بن قیس کو کہا جاتا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ عربی کے اولین نعت نگاروں میں جناب ابو طالب اور اُم مُعبد کے نام آتے ہیں۔ دونوں کی نعتیں، عربی ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور ان کے حوالے، بعد کے اکثر نعت گو شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ اُم معبد کا نام عاتکہ بنتِ خالد ہے اور اس کی نثری نعت کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے ہے کہ اسے متعدد عربی شعرا نے منظوم کیا ہے، اس کے مواد کو بطورِ تلمیح اپنے کلام میں صرف کیا ہے، اور حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس کے حوالے سے ایک پورا نعتیہ قصیدہ کہہ کر اپنے دیوان کو مُزین کیا ہے''۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ عہد رسالت کے مادحین رسولؐ میں سے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت کو عہد نبوی میں ہی منبر عطا کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنی شعری تخلیقات (نعت) پیش کر سکیں۔ حضرت حسان بن ثابت کے علاوہ عہد رسالت میں جن مادحینِ رسولؐ کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت حمزہؓ بن عبد لمطلب، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ ابن رواحہ، حضرت سید ابن ابی ناس اکنانی، حضرت مالک بن المنظ، حضرت عباسؓ، حضرت ابو سفیان بن الحارث، حضرت کعب بن مالکؓ حضرت مالک بن نمطہ شامل ہیں۔ خواتین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہ الزہرہؓ سے بہت سے نعتیہ اشعار منسوب ہیں۔ حضرت صفیہؓ بنت ابی

طالب، حضرت عاتکہؓ

بنت عبد لمطلب شامل ہیں۔ حضرت حسان کا یہ خوبصورت شعر ملاحظہ کیجئے ۔

'وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآءِ

ترجمہ (اے حسن و جمال کے آقا ﷺ آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھوں نے کسی کو نہیں دیکھا اور آپ ﷺ سے بڑھ کر جمیل کسی عورت نے بچہ پیدا نہیں کیا)۔ حضرت حسانؓ کو شاعر اسلام اور شاعر النبیؐ' ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ نعت رسول ﷺ کے بیان کرنے میں آزادؔ صاحب نے اپنے آپ کو حضرت حسان بن ثابت ارضی اللہ عنہ کا مقلد کہا۔ جناب آزادؔ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

نعت میں ہوں اُسی شاعر کا مقلد میں بھی

مل گئی تھی جسے خلعت میں ردائے آقا

شائقو دل سے ہمیں میلاد خوانی چاہیے

قلبِ صدیقی بیان حساں زبانی چاہیے

حضرت کعب بن زبیر عہد رسالت کے مداحین میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ حضرت کعبؓ نے جب اپنا قصیدہ بردہ شریف حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپؐ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ اپنی چادر مبارک اتار کر انعام میں دے دی اسی لیے اس قصیدے کا نام قصیدہ بردہ پڑ گیا۔ عباسی عہد میں مداح سرا ابو لاعتاحیہ کا نام ملتا ہے۔ ان

کے علاوہ ابن الفارض، عبد اللہ الیافعی، صرصری اور امام البوصیری، ابن نباتہ مصری، شہاب الدین محمود الحلبی، ابن جابر الاندلسی، ابن خلدون، عبد اللہ شیرازی، حسین دجانی، عبدالغنی النابلسی قابل ذکر ہیں۔
صحابہ اکرم کے بعد مداح سرائی کا سلسلہ بطور مقدس فن کے جاری رہا۔ صوفیاء اکرام بھی محبت رسول ﷺ میں سرشار نظر آتے ہیں۔امام ابو حنیفہ کے نعتیہ قصائد مشہور ہیں۔ امام زین العابدین، غوث اعظم، خواجہ بختیار کاکی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت شمس تبریزی، مولانا روم، سعدی شیرازی، بو علی شاہ قلندر، خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، مولانا جامی، مولانا احمد رضاء خان بریلوی، فردوسی، بابا طاہر، ابو سعید ابوالخیر، عبداللہ انصاری، حکیم سنائی، فریدالدین عطار، نظامی، خاقانی، فردوسی، سوری، نظامی، عرفی، قدسی، رامی اور علامہ اقبال فارسی اور اردو زبان کے نعتیہ کلام کے سرمائے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔فارسی شعرا میں جامیؔ کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

نسیما جانبِ بطحا گزر کن
زاحوالم محمد ﷺ را خبر کن

جامیؔ کا ہی یہ فارسی شعر کس قدر مشہور ہے اس شعر کو ضرب المثل کی حیثیت

حاصل ہے۔

لَا یُمکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

سعدی شیرازی کی عربی کی یہ نعت زبانِ زد خاص و عام ہے۔

بلغ العلی بکمالہٖ کشف الدّجی بجمالہٖ

حسنَت جمیع خصالہٖ صلو علیہ و آلہٖ

امیر خسرو کی نعت کا یہ شعر دیکھئے۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو

محمد ﷺ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

جان محمد قدسی کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اردو زبان کے قدیم و جدید شعراء میں یوں تو بے شمار نام ملتے ہیں لیکن گیسو دراز، فخر الدین نظامی، قدسی، بیدل، غالب، ملا وجہی، عوارض، ابن نشاطی، نصرتی، ولی، سید محمد اکبر حسینی، سراج، سودا، شیراز، باقر آقاہ، نظیر اکبر

آبادی، شہید، غالب، مومن، لطف، راجہ مکھن لال، منشی شنکر لال، ساقی، ولی دکنی، سودا، جگر، میر، انیس، دبیر، امیر مینائی، محسن کاکوروی، شائق، حالی، شبلی، ظفر علی خان، حالی، حفیظ جالندھری، نظم طباطبائی، طوفان نیرت، جلیل، شاہ نیاز بریلوی، بیدم وارثی بہزاد لکھنوی، مولانا احمد رضا خان، ، ماہر القادری، خلیل صمدانی کے علاوہ شیخ محمد ابرہیم آزاد شامل ہیں۔ دور حاضر کے نعت گو شعراء میں اثر صہبائی، احسان دانش، اختر لکھنوی، ادیب رائے پوری، ارمان اکبر آبادی، اعجاز رحمانی، اقبال صفی پوری، انور جمال، تابش دہلوی، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، خالد بزمی، ذوق، ظفر نگری، ذہین شاہ تاجی، راغب مرادآبادی، ستار وارثی، سرشار صدیقی، سعید وارثی، اقبال عظیم، سیماب اکبرآبادی، صبیح رحمانی، صہبا اختر، عاصی کرنالی، محشر بدایونی، جمیل نقوی، تابش صمدانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امیر مینائی کا نعتیہ کلام متاثر کن ہے ۔

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے کہ یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں
دو قدم بھی نہیں چلنے کی ہے طاقت مجھ میں
شوق کھینچے لیے جاتا ہے میں چلا جاتا ہوں

حسرت موہانی بے شمار صلاحیتوں کے مالک۔ شاعر، ادیب، صحافی، محقق، تذکرہ

نگار اور سیاسی رہنما۔ ان کی نعتیں دل میں اترنے والی ہیں۔اپنے بارے میں کیا خوب شعر کہا۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

علامہ اقبال ایک قومی شاعر ہیں یوں تو ان کا شمار نعت گو شعراء میں نہیں ہوتا لیکن ان کے فارسی اور اردو کلام میں خوبصورت نعتیں موجود ہیں۔اقبال کے یہ خوبصورت شعر۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
کی محمد ﷺ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جمیل نقوی کو ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے 'سرکار کی چاہت والے' کہا ہے۔ ان کی کہی ہوئی حمد و نعت بہت مقبول ہیں۔

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بُھول گیا
یو ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوقِ تماشا بُھول گیا

سید فصیح رحمانی جتنی اچھی نعت پڑھتے ہیں ان کی کہی ہوئی نعت بھی خوب ہوتی ہے ۔

کعبہ کی رونق کعبہ کا منظر ، اللہ اکبر اللہ اکبر
دیکھوں تو دیکھے جاؤں برابر ، اللہ اکبر اللہ اکبر
حیرت سے خود کو کبھی دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کبھی میں حرم کو
لایا کہاں مجھ کو میرا مقدر ، اللہ اکبر اللہ اکبر
تیرے کرم کی کیا بات ہے مولا، تیرے حرم کی کیا بات ہے مولا
تا عمر کر دے آنا مقدر ، اللہ اکبر اللہ اکبر

آزآد صاحب سے پہلے بھی اس خاندان کے احباب میں ادبی و شعری ذوق پایا جاتا تھا
آزاد صاحب کی اولادوں اور خاندان کے بے شمار احباب سخن فہمی کا ذوق رکھتے ہیں۔
صاحبِ دیوان اور بے دیوان شاعر و نثر نگار بھی ہیں۔آزآد صاحب کے بیٹے خلیل صمدانی
خلیلؔ کی کہی ہوئے نعتیں بھی گہرا اثر رکھتی ہیں ۔ ان کا مجموعہ کلام 'گلزار خلیل'
تابشؔ صمدانی مرحوم نے مرتب کیا۔ تابشؔ صمدانی کے بیٹوں رہبر اور سرور میں شعری
ذوق پایا جاتا ہے اور شعر کہتے ہیں ۔ تابشؔ صمدانی بھی نعت گو شاعر تھے۔ ان کی نعتوں
کے کئی مجموعے شائع ہو چکے۔ ان کا ایک شعر
ملاحظہ کیجئے ۔

یہ بھی مرے اجداد کا احسان ہے تابش
ورثہ میں ملا ہے مجھے مدحت کا قرینہ

تابشؔ کے اس شعر کے حوالے سے مَیں نے کبھی تابشؔ صمدانی کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

وراثت میں ملی ہیں جسے آبا کی صفات
کتنا خوش نصیب مدح سرا ہے تابشؔ

آزادؔ صاحب ان خوش نصیبوں میں سے ہیں کہ جن کے بیٹے، پوتے اور اب پڑپوتے ان کے نقشِ قدم پر عمل پیرا ہیں۔ تابشؔ صمدانی کے بیٹوں رہبرؔ صمدانی اور سرورؔ خلیل صمدانی خوب شعر کہتے ہیں۔ سرورؔ صمدانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اجداد کو میرے صدیاں بیتیں مداح سرائی کرتے ہوئے
نعتِ نبیؐ کہنے کا جذبہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

حافظ ضیاؔ احمد مشتاق مرحوم، آزادؔ صاحب کے پوتی داماد ہیں یعنی جناب خلیل احمد صمدانی کے داماد۔ ان کا مجموعہ کلام 'گرداب تمنا' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ حافظ ضیا صاحب مرحوم کے بیٹے فرخ ضیا اور اطہر ضیا سخن فہم ہیں، شعر کہتے ہیں، نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ ضیاؔ صاحب کا ایک خوبصورت شعر۔

ہماری بس یہی روداد ہے اے داورِ محشر
خطائیں ہوتی رہتی ہیں پشیماں ہوتے رہتے ہیں

ضیاؔ صاحب حافظ قرآن بھی تھے اس مناسبت سے انہوں نے کیا خوب شعر کہا۔

پوچھے گا خدا مجھ سے کیا لائے تو کہہ دوں گا
الفت ہے محمدؐ کی سینے میں بھی قرآں ہے

مَیں آزادؔ صاحب کا پڑپوتا ہوں۔ خود کو شاعر تو نہیں کہتا البتہ ضرورت کے مطابق کچھ کہہ لیتا ہوں۔ نثر لکھنے سے فرصت نہیں ملی۔ شعر و ادب کا ذوق وراثت میں ضرور ملا ہے۔ جیساکہ خود میں نے عرض کیا تھا۔

ہو کیوں نہ ناز مجھے سخنوری پہ رئیسؔ
میرے ہی اجداد کا ورثہ ہے جو مجھے ملا ہے

اللہ تبارک و تعالٰی نے مجھے تین بار بالترتیب (۲۰۱۱ء، ۲۰۱۳ء، ۲۰۱۴ء) عمرہ کی سعادت نصیب فرمائی۔ خانہ کعبہ پر حاضری کے موقع پر میں نے کچھ اس طرح عرض کیا۔

رَحمت کا تیری منظر دیکھ رہا ہوں
دعاؤں کا اپنی ثَمر دیکھ رہا ہوں
رَونَق تیرے گھر کی دیکھ رہا ہوں
ناچیز پہ تیرا اَبرِ کرم دیکھ رہا ہوں

روضۂ رسول ﷺ پر حاضری نصیب ہوئی۔ اپنی کیفیت کو اس طرح بیان کیا۔

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پاگیا ہوں
تھی یہ آرزو مدت سے مدینہ دیکھوں
کرم پہ اپنے نبیؐ کے، مراد پاگیا ہوں
تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب
جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پاگیا ہوں
نگاہیں کیسے ہٹتیں روضے کی جالیوں سے رئیسؔ
برسوں کی پیاس کا احساس پاگیا ہوں

کسی بھی مصنف یا شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جناب آزادؔ کے کلام سے ان کی شخصیت کے خدوخال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ آپ ان خوش نصیب شعراء میں سے ہیں کہ جنہیں مدحت سراجی تحفۂ خداوندی کے طور پر ملی۔ نعت گوئی ان کے خمیر کا لازمی حصہ ہے۔ آزادؔ صاحب نے حمد، نعت، قصیدہ، رباعیات، قطعات، سلام اور دیگر اصناف شاعری میں زندگی کے ہر ہر موضوع کو خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ اسلام تلوار سے نہیں بلکہ اچھے اخلاق اور حضور کے پاکیزہ عمل سے پھیلا، اس موضوع کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا۔

یا نبی تیرا مبارک ہو آنا کیسا

تجھ سے پہلے تھا جہالت کا زمانہ کیسا
جُھوٹ کہتے ہیں کہ تلوار سے پھیلا اسلام
کام باتوں سے لیا تیغ چلانا کیسا

شب معراج کے واقعات کا ذکر جناب آزادؔ نے عشق مصطفےٰ میں ڈوب کر کیا۔ اس کیفیت کو آپ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اس کلام کا کہنے والا گذرا ہے۔اللہ نے آپ کو غیر معمولی دسترس، جذبہ صادق اور بصیرت سے نوازا تھا۔ آپ نے اپنی اسی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے کلام کو ان خصوصیات کے ساتھ پیش کیا اور
کامیاب و کامران ہوئے۔

شبِ معراج تیرا بن کے مہماں عرش پر جانا
مقدر تیری اُمت کا تھا پستی سے ابھر جانا

آزادؔ صاحب نے حج وزیارت روضہ القدس کی خواہش و تمنا،زیارت طیبہ کی تڑپ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے مختلف نعتوں میں بیان کیا ہے۔

ارمان ہے مدینے کا کعبہ کی آرزو
لے چل خدا کے واسطے بخت رسا مجھے

روضہ رسول ﷺ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا۔

شکر خدا غلام ہے آقا کے سامنے

پہنچا دیا ہے پیاس نے دریا کے سامنے

جناب آزادؔ کی خوش نصیبی کہ آپ کو خواب میں رسولِ مقبول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے اپنے کلام میں اس سعادت کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے ۔

گُم کیا خواب میں بھی جلوہ دکھا کر مجھ کو

رخ روشن بھی دکھایا تو چُھپا کر مجھ کو

میں قسم کھاکے یہ کہہ دونگا کہ جنت دیکھی

شہ دکھائیں گے اگر روضہ بُلا کر مجھ کو

حضور اکرم ﷺ کی ولادت با سعادت کا ذکر بہت ہی اچھے انداز سے کیا ۔

ہو مبارک باعث کون و مکاں پیدا ہوئے

فخر آدم شاہِ عالم جانِ جاں پیدا ہوئے

چاند کو دو ٹکرے کرنے کا ذکر جناب آزادؔ اس طرح کرتے ہیں ۔

دو ٹکڑے جس نے بدر کو ایمان سے کر دیا

یہ ہے کمال ناخن رشک ہلال کا

آزادؔ نے بعض اہم موضوعات کو بہت ہی خوبصورت اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

کیا رتبہ بیاں ہوسکے اس شاہ ہدیٰ کا

وہ نور ہے اللہُ غنی کس خدا کا

وہ اول مخلوق ہے وہ افضل مخلوق
وہ اشرفِ مخلوق ہے محبوب خدا کا
صورت کا وہ نقشہ ہے کہ وہ نور خدا ہے
سیرت کی وہ صورت کہ ہے محبوب خدا کا
سر کیا نانا کی اُمت پر فدا
پھل یہ لایا ہے نہالِ مصطفےٰ
کیوں کام لے قدموں سے مدینے کے سفر میں
شیدائے نبی سر ہی کے بل جائے تو اچھا

اردو زبان اور اپنے استاد جناب بیخود دہلوی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے جناب آزآد فرماتے ہیں۔

شکر صد شکر اے خلاق زبانِ اردو
فضل سے تیرے نمایاں ہوئی شانَ اردو

نظم ، قصائد، رباعیات، منقبت، سلام اور تصوف

آزآد نے حمد و نعت کے علاوہ نظم ، قصائد، رباعیات، سلام اور منقبت بھی کہیں جو آپ کے بزرگان دین سے دلی عقیدت کا اظہار ہے۔آپ کا نعتیہ و منقبتی کلام پُر اثر اور پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔آپ سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت قبلہ حاجی سید جماعت علی شاہ نقشبندی

سجادہ نشیں علی پور سیدان ضلع سیالکوٹ (فیصل آباد)کے با قاعدہ مرید تھے۔آپ کے پیر و مرشدکے یہاں سالانہ جلسہ انورا لصوفیہ کا ہوتا تھا۔آزاؔد صاحب نے ان جلسوں میں (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۷ء) با قاعدہ شرکت فرمائی اور اپنی نظمیں پیش کیں۔آپ کے دیوان کا حصہ دوم انہیں نظموں پر مشتمل ہے۔ان نظموں میں آپ نے اپنے پیر و مرشد کی عزت ، احترم و توقیر جس انداز سے بیان کی کے اس سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ اپنے شیخ کا کس حدتک احترم کیا کرتے تھے۔آپ کی نعتوں میں بھی اکثر آپ کے شیخ کا ذکر ملتا

ہے۔

آزاؔد صاحب نے تصوف کے موضوعات اور جذباتِ حقیقی کو باریک بینی اور خوبی کے ساتھ نظم میں بیان کیا ہے۔آپ کے نثری مضامین تصوف کے مشکل مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔اس موضوع کے حوالے سے آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہو ں ۔

جب فانی و مجبور یہ انسان بنا ہو
کیا قادر و قیوم کی پھر اس سے ثنا ہو
میں خاک ہوں تو نُور ہے کیا تیری ثنا ہو
ممکن نہیں ممکن ہے اگر تیری عطا ہو
رہ کر عرب میں تیرے اُمی رسول نے
اہل عجم کو صاحب عرفاں بنا دیا

ذی عقل آدمی کو بنایا تو کیا ہوا
دانا بناکے پھر مجھے ناداں بنا دیا
تونے آزادؔ غزل نعت میں لکھی کیا خوب
دیکھنا ہوگا یہ مقبول ترانا کیسا

آپ تصوف کی معراج پر فائز ہیں چنانچہ اپنے اس مقام کا ذکر بھی انہوں نے اپنے کلام میں کیا، اہل تصوف کے اجلاس میں آپ نے بڑی خوبی سے عام انسان کو تصوف کے درجات کے بارے بتاتے ہوئے کہا کہ ۔

سنگلاخ زمیں رکھتی ہیں یہ منزلیں اپنی
خود چل کے نہ گرنا کہیں تم ٹھوکریں کھا کر
اس مرد خدا کی تمہیں ہے سخت ضرورت
جو کھینچ لے اوپر کو ذرا ہاتھ بڑھا کر
آئے نہ نظر گر تمہیں تھک جائیں نگاہیں
تب دیکھنا آزادؔ کی عینک کو لگا کر

جناب آزادؔ نے اپنی شاعری کے پیغام میں طریقت کو شریعت کا پابند بنایا چنانچہ آپ نے تمام مسلمانوں کو اور خاص طور پر اہل طریقت کو کھلے ہوئے الفاظ میں بتا دیا کہ ۔

اے طریقت تو ضیا ہے اور شریعت خورشید

سیرت مہر ہے تو مہر ہے صورت تیری

جناب آزآد نے حضرت غوث الاعظم محی الدین جیلانی، خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اور خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کی شان میں منقبت بھی کہی۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

قتیل رنگِ یزدانی محی الدین جیلانی

شہیدِ نازِ سبحانی محی الدین جیلانی

علیم علمِ عرفانی محی الدین جیلانی

خبیر رازِ پنہانی محی الدین جیلانی

حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اور حضرت سلطان حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہما کی شان میں منقبت کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے آزآد نے کہا ۔

عجب ہیں دونوہی سلطان معین الدین حمید الدین

شہ دیں صاحب ایماں معین الدین حمید الدین

مالماں کیوں نہ شیدا ہوں کہ ہیں اسلام میں دونو

وہ نور قلب یہ ایماں معین الدین حمید الدین

آزآد دنیا میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات سے لا علم نہیں تھے بلکہ

ان کی نظر پوری دنیا خصوصاً اسلامی ممالک میں ہونے والے مظالم اور زیادتیوں پر بھی رہتی تھی اور ان مظالم کو جو مراکش، ایران، اٹلی، کابل اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ہو رہے تھے انکی کسک وہ اپنے اندر محسوس کیا کرتے ان کا اظہار آپ نے بہت ہی خوبصورت انداز سے کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

علم مولا میں ہے جو حال مراکش اب ہے
کیسا مظلوم ہے ایران رسولِ اکرم
شہ کو معلوم ہیں اٹلی کے مظالم جو ہیں
اب غضب ڈھاتا ہے بلقان رسولِ اکرم
سلطنت مُلکِ مراکش کی بھی رکھنا قائم
اور سلامت رہے ایران رسولِ اکرم
اس پہ سایا رہے الطاف و کرم کا تیرے
جو یہ کابل کا ہے سلطان رسولِ اکرم
ہند والے بھی مسلماں ہوں ایسے آقا
جیسے تھے اگلے مسلماں رسولِ اکرم
ختم آزادؔ کی فریاد ہے مولا اس پر
ہو درود آپ پہ ہر آن رسولِ اکرم

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور سلام سوز غم اس طرح پیش کیا۔

سوزِ غمِ امام میں آہ و غاں نہیں
ایسا جلا دیا ہے کہ مطلق دھواں نہیں
آزادؔ کیا کہو گے سلامِ جناب پاک
طرزِ بیاں نہیں تمہیں تابِ بیاں نہیں

فرماں روائے کابل سلطان محمد حبیب الرحمٰن خان بہادر کی ہندوستان آمد کے موقع پر آپ نے ایک نظم کہی آپ کے بقول یہ نظم برادران صاحبان قوم کی خواہش پر کہی۔

مرحبا ہند ترے آج جو مہماں آئے
بارک اللہ عجب شان کے سلطان آئے

آزادؔ صاحب نے بچوں کو انگریزی پڑھانے، کھیتی باڑی کرانے یا مدرسوں میں پڑھا کر مسجد کا مولوی بنانے کے عمل کو اچھوتے انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر بچہ کھیتی باڑی کرے تو اسے کہا جاتا ہے کہ یہ کام تو کم تر لوگوں کا ہے۔ انگریزی پڑھنے کی صورت

میں اسے والدین کے لاڈ پیار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر بچہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرے تو اسے مسجد کا مولوی کہا جاتا ہے۔ یہ صورت حال بچے کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اس خیال کو آپ نے اس قطعہ میں اس طرح بیان کیا۔

کھیتی کریں تو کہتے ہیں کام جاٹ کا
انگلش پڑھیں تو کہتے ہیں بچہ ہے لاٹ کا
مسجد کا مُلاں کہتے ہیں جو علمِ دین پڑھیں
جاہل ہے کُتا دھوبی کا گھر کا نہ گھاٹ کا

جنابِ آزاد نے رباعیات بھی کہیں۔چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

خاک بنتا ہوں تو ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں
آنسو بنتا ہوں تو آنکھوں سے گرا دیتے ہیں
پھونس بنتا ہوں تو ہوں چھاج میں پھٹکا جاتا
دانہ بنتا ہوں تو چکی میں دلا دیتے ہیں

کیسی گھبراتی جوانی بسواری آئی
کہہ گئی جاتی ہوں میں پیری کی باری آئی
آتے ہی بیٹھ گئی ٹیک کے زانو پیری
چونکہ یلغار چلی تھی تھکی ہاری آئی

آزاد صاحب ہندوستان میں بے راہ روی اور اسلام سے دوری کو محسوس کر رہے تھے۔ ان حالات کا انہیں ادراک بھی تھا اور وہ ان کے لیے پریشان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ایک جگہ ان حالات کا ذکر اس طرح کیا۔

کیا کہوں ہند میں اسلام کی حالت کیا ہے

مٹتے جاتے ہیں جہاں دین کے طور و اطوار

آزادؔ صاحب مسلمانوں کی دین سے دوری کی وجہ خود انہیں قرار دیتے ہیں اور اس کے زوال کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں ۔

ہم نے خود پاؤں میں اپنے ہی کلہاڑی ماری

توڑ کر دین کے ارکان رسولِ اکرم

چودھویں صدی میں اسلام سے متعلق حالات تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ زمانے کا نقشہ ہی پلٹ گیا ہے جو کل تک اسلام سے دور تھے وہ اسلام کے دعویدار بن گئے ہیں۔ اس دور کے بارے میں آپ نے اپنی ایک نظم میں کہا ۔

یک بہ یک رنگ زمانے کا یہ پلٹا کیسا

اے صدی چودھویں تیرا ہے یہ نقشہ کیسا

جنابِ آزادؔ نے اپنے تخلص کے حوالے سے ایک جگہ کہا ۔

تخلص پر مرے آزادؔ جو حیراں ہیں ، ناداں ہیں

غلام اس شہؐ کا ہوں جس کے غلام آزاد رہتے ہیں

آزادؔ کو بیکانیر کی اردو شعراء برادری میں غیر معمولی مقبولیت اور عزت و توقیر حاصل تھی چونکہ آپ حضرت بیخودؔ دہلوی سے شرف تلمیذ رکھتے تھے اس لیے اس فن میں درجہ اعتبار حاصل تھا اور راجستھان کے تقریباً تمام شعراء ہی ان کے دامانِ فیض سے وابستہ تھے۔ آزادؔ الفاظ کے مزاج دان ہیں، صداقت ' جذبات

عقیدت اور خلوصِ اظہار ان کی قدرتِ کلام کے ضامن ہیں اور سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز شاعر کا خاص وصف ہے۔ ان کے ہاں ایک خوش گوار قسم کی جدت پسندی اور ندرتِ بیان کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کے کلام میں آپ کا شعری باطن تمام تر طہارت کے ساتھ جلوہ نما ہے بلکہ ایک خوشبو بھی ہمراہ ہے جس میں ان کے اظہار و افکار معطر ہیں۔

آپ نے عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ اور محاورات کا خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر آزاد مکمل طور پر شعر و سخن کی جانب مائل ہوتے ، ان کے کلام کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ طبع کرنے کا اہتمام کیا جاتا اور اس کی مناسب تشہیر بھی کی جاتی تو ادب اور شعر و شاعری کے دنیا میں دیگر معروف شعراء اور ادیبوں کی طرح آزآد صاحب کا مقام محفوظ ہوتا اور شہرت کی بلندی پر ہوتے لیکن عشقِ مصطفےٰ میں مجسم ڈوبے ہوئے اس عاشق رسول ﷺ نے شعر گوئی کو اپنے جذبہ عشق رسول ﷺ کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انہیں نام و نمود کی ہر گز پروا نہیں تھی اور نہ ہی انہوں اس جانب توجہ کی۔ آزآد صاحب کی شاعری بیان و انداز ، جملوں کی ترکیب اور استعمال نیز الفاظ کے خوبصورت چناؤ کے اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے۔ وہ بہت ہی اخلاق، سچائی، صفائی، نیک نیتی ، عجز و انکساری کے ساتھ اپنے اندر کی سچائی اور کیفیت کو شعر کا

جامہ پہنانے میں کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(مصنف کی کتاب شیخ محمد ابراہیم آزاد: شخصیت و شاعری' شائع شدہ ۲۰۱۳ء سے ماخوذ)

(میری ماں (شخصی خاکہ

پیار کہتے ہیں کسے اور مامتا کیا چیز ہے
کوئی ان بچوں سے پوچھے جن کی مر جاتی ہے ماں
موت کی آغوش میں جب تھک کر سو جاتی ہے ماں
تب جا کر تھوڑا سا سکوں پاتی ہے ماں
شکریہ ہو ہی نہیں سکتا کبھی اس کا ادا
مرتے مرتے بھی دعا جینے کی دے جاتی ہے ماں

ماں ''ایک عظیم نام ،قدرت کا بے مثال اور انمول تحفہ ، قربانی، ایثار، مروت، صبر ورضا، پیار و محبت ،خلوص و وفا کی روشن مثال۔ ایک ایسا منفرد اور انمول رشتہ جس کی محبتوں کا، شفقت کا، قربانی کا، ایثار کا، خلوص کا ،وفاؤں کا، تقدس کا اور سب سے بڑھ کر ممتا کا کوئی مول نہیں۔ماں کی عظمت کو لاکھوں سلام، میری ماں تیرے قدموں کو سلام۔

میری ماں کا نام صفیہ سلطانہ اور والد صاحب کا نام انیس احمد صمدانی تھا۔ ماں سبزواری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور والد راجستھانی تھے ، بعد میں ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر کے قصبہ حسین پور کو آباد

کیا۔ والد شہری بابو اور والدہ مشرقی پنجاب کی ایک دیہاتی۔ شہری اور دیہاتی ملاپ سے جنم لینے والے بندھن نے شہر کراچی میں ایک کامیاب زندگی گزاری، دنیاوی زندگی کا دورانیہ ۵۰ سال ۵ ماہ اور ۲۵ دنوں پر محیط رہا۔ اس ملاپ نے سات زندگیوں کو جنم دیا، انھوں نے ان ساتوں زندگیوں کی پرورش کی، انہیں تناور درخت بنایا، یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی تین بہنوں اور دو بھائیوں کی بھی پرورش کی، انہیں پروان چڑھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔

میری امی اور ابا ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء بروز ہفتہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، گویا قیام پاکستان سے صرف چھ ماہ قبل۔ والد صاحب ملازمت کی وجہ سے راجستھان کے شہر گنگا نگر میں بہ سلسلہ ملازمت رہا کرتے تھے، جب کہ دیگر اہل خانہ بیکانیر میں رہتے تھے۔ والدہ اپنے والدین کے ساتھ ہندوستان میں مشرقی پنجاب کے شہر فرید کوٹ میں رہائش پزیر تھیں۔ بارات گنگا نگر سے فرید کوٹ گئی تھی۔ دونوں خاندانوں میں پہلے سے رشتہ داریاں تھیں۔ شادی کے وقت میری والدہ کے والد صاحب (امید حسن سبزواری) یعنی میرے نانا شدید بیمار تھے، ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی ان کی زندگی میں اپنے گھر کی ہوجائے۔ خاندان کے بعض بزرگوں نے یہ رشتہ بہت ہی عجلت میں طے کرایا، کہتے ہیں کہ کوئی پل انسان کی دعا کی قبولیت کا بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول کر لی تھی چنانچہ رشتہ طے ہوگیا، دوسری جانب بیماری شدید صورت اختیار کرتی گئی اسی

دوران شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ بارات آئی آپ بستر علالت پر تھے بیٹی کو اسی حالت میں رخصت کرکے اللہ کا شکر ادا کیا، حالت بگڑتی گئی آپ نے رات بھر اپنی نوبیاہتا بیٹی کی واپسی کا انتظار کیا، آنکھیں دروازے پر لگی تھیں، صبح ہوئی، ٹرین نے دوپہر کو آنا تھا، باغباں کو اپنی اس کلی کا شدت سے انتظار تھا جو عنقریب پھول بننے جارہی تھی لیکن دوسری جانب درخت جھک رہا تھا، پتے مرجھا رہے تھے، ٹہنیاں زرد ہو رہی تھیں، ہواؤں کا رنگ بدل رہا تھا، وقت کا صیاد اپنا تیر چلانے کو تیار بیٹھا تھا، مہلت ختم ہونے کو تھی، یکایک کلی نمودار ہوئی اور منتظر باپ کے سینے سے جالگی، باغباں کے مہربان ہاتھوں نے اپنی کلی کو سینے سے لگایا، منتظر آنکھوں کو ٹھنڈا کیا لیکن وہ ہاتھ وہیں جم کر رہ گئے وہ آنکھیں جو محوِ انتظار تھیں سینے کی ٹھنڈک کو پہچان کر مطمئن سی ہوئیں اور پھر انجان بن گئیں، دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کی اس خواہش کی تکمیل بھی کر دی جس کی آرزو انہوں نے بیماری کی حالت میں کی تھی، کلمہ طیبہ پڑھا اور اسی حالت میں جب کہ آپ کی بیٹی سرخ جوڑے میں ملبوس اپنے منتظر باپ کے سینے سے لگی اپنے سینے کو ٹھنڈا کررہی تھی باغباں نے چپکے سے آنکھ موند لی اور آپ کی روح اس دنیائے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرواز کر گئی۔

میرے والدین کی شادی کو چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ پاکستان کے قیام کا

اعلان ہو گیا۔ ہندوستان سے مسلمان ہجرت کرکے پاکستانی علاقوں میں آنے لگے۔ میرے والد صاحب ہندوستان کے شہر گنگا نگر کی عدالت میں پیشکار تھے انہوں نے وہاں سے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا، ان کے والد اور بہن بھائیوں نے بعد میں ہجرت کی اور کراچی منتقل ہوئے۔ والدہ اپنے میکے میں تھیں انہوں نے اپنے بڑے بھائی شیخ محبوب احمد سبز واری کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی پنجاب کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔ میرے وجود کا خمیر ہندوستان کی سرزمین گنگا نگر یا بیکا نیر (راجستھان) میں معرض وجود میں آچکا تھا، اسے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرے والدین کو پاکستان ہجرت کا قصد کرنا پڑا، 'لے کر رہیں گے پاکستان بٹ کر رہے گا ہندوستان' کی صدائیں میرے کانوں میں براہ راست تو نہیں البتہ اپنی ماں کے کانوں سے ہوتی ہوئی مجھ تک ضرور پہنچیں۔اس کا احساس میں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں، کیوں کہ میں اس وقت شکم مادر میں رہتے ہوئے ہجرت کی بہاروں کا لطف لے رہا تھا۔مجھے ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو یعنی قیام پاکستان کے سات ماہ بعد اس دنیا میں آنا تھا اور آیا۔

امی بتایا کرتی تھیں کہ ہمارا زمانہ شرم و حیا کا تھا،زنِ حاملہ اپنے والد، بھائیوں اور اپنے بزرگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم محسوس کرتی تھیں۔چنانچہ وہ یعنی میری امی ان دنوں اپنے بھائیوں کے سامنے نہیں آتی تھیں ،جب وہ گھر میں ہوتے تو وہ کسی بھی کمرہ میں ہی چھپی رہا کرتیں۔ وقت گزرتا گیا، میرے

دنیا میں آمد کے دن قریب آ رہے تھے ، میرے والد صاحب کراچی میں ملازم ہو چکے تھے ، ایک بڑے کنبے کی کفالت ان کے کاندھوں پر تھی۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت تھی ، قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں والد صاحب نے کراچی میں محنت مزدوری بھی کی، پھر انہیں ملازمت مل گئی۔ وہ میری پیدائش پر والدہ کے پاس بھی نہ جاسکے ، یقینا مالی مشکلات رہی ہوں گی۔ میلسی شہر اس وقت ضلع ملتان کی تحصیل ہوا کرتا تھا ، چھوٹا لیکن صاف ستھرا، اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''میلسی شہر بڑا گلزار جس میں بجلی ہے نہ تار''، یہ وہ دور تھا جب عام طور پر بچوں کی پیدائش گھروں میں ہوا کرتی تھی، بلکہ یہ رواج بہت عرصہ تک قائم رہا، اسپتال نہ ہونے کے برابر تھے، محلوں میں بعض عورتیں بچوں کی پیدائش میں معاون کا کردار ادا کیا کرتیں تھیں، اُنہیں عرف عام میں 'دائی' کہا جاتا تھا۔ 'دائی' کوئی کوالیفائیڈ نرس نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنے تجربے کی بنیاد پر زنِ حاملہ کا سہارا ہوا کرتی تھی۔ میری امی اور میں بھی ایک دائی جس کا نام ' اَنسری' تھا کے رحم کرم پر تھے۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ امی نے بتایا تھا کہ نہیں معلوم کیا وجوہات ہوئیں پیدائش کے وقت دائی نے بتایا کہ نومولاد کو الٹا پیدا ہونا ہے، جس کی وجہ سے پیدائش کے وقت مشکلات پیدا ہو گئیں، امی نے بتایا تھا کہ اس وقت دائی کو یہ کہتے سنا گیا کہ زچہ و بچہ دونوں میں سے کسی ایک کی زندگی کو خطرہ لائق ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل میری نانی کا انتقال بھی بچے کی پیدائش پر ہوا تھا، میری والدہ

کے لیے یہ لمحات اس حوالہ سے بھی پریشان کن رہے ہونگے۔ گویا میری پیدائش کے وقت میری امی کی زندگی خطرہ میں تھی اور میری جان کو بھی خطرہ تھا۔ خوشی کے یہ لمحات وقتی طور پر افسردگی اور پریشانی میں بدل گئے، لوگ پریشان تھے، دو زندگیوں کے لیے دعائیں بھی کر رہے تھے۔ لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ نے دونوں زندگیوں کو سلامت رکھا۔ ہمارے معاشرہ میں لڑکے کی پیدائش کو زیادہ خوش کن سمجھا جاتا ہے، چنانچہ میری آمد پر میلسی اور کراچی میں خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے۔ کراچی میں میرے دادا اپنے پہلے پوتے کی آمد پر پھولے نہ سماتے تھے، میرا نام بھی انہوں نے ہی تجویز کیا تھا، میری پھوپیاں اور میرے چچا اپنے بھتیجے کی آمد پر بے انتہا خوش تھے، میری چھوٹی خالہ جن کی اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی جو بعد میں میری خوش دامن بھی ہوئیں میری آمد پر کچھ زیادہ ہی خوش تھیں، میرے تینوں ماموؤں (محبوب احمد، مطلوب احمد اور محمد احمد) کی
خوشی دیدنی تھی، انہوں نے ڈھیروں لڈو اس موقع پر تقسیم کیے۔ کراچی میں بھی خوب خوب مٹھائی تقسیم کی گئی۔

میری امی نے مشرقی پنجاب کے ایک دیہات میں آنکھ کھولی تھی، وہیں پلی بڑھی تھیں، بچپن اور جوانی دیہات کے ماحول میں گزرا تھا جہاں ان کے والد اور ایک بھائی پٹواری تھے، بعد میں ان کے بھائی (مطلوب احمد) بھی پاکستان میں پٹواری

ہوئے۔ دیہات کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ پٹواریوں کا رہن سہن کس قسم کا ہوتا ہے، گندم ،چاول ، گھی ، شکر سال بھر کا گھر میں جمع، گائیں، بھینس ، بکری اور دیگر جانور، ساتھ ہی کام کرنے والے نوکر چاکر، الغرض صحت مند آب و ہوا کے ساتھ ساتھ خالص غذا، آج کے دیہاتوں میں بھی یہ سب کچھ میسر ہے۔فرق یہ ہوا کہ اِن دیہاتوں نے مختصر شہر کا روپ دھار لیا ہے۔جہاں بجلی، ٹیلی ویژن، فرج اور ائر کنڈیشن کی سہولیات میسر آ گئیں ہیں۔

ہمارے خاندان کے بزرگ فقہ حنفی سے تعلق رکھتے تھے، میرے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزاد پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے، جج و چیف جج بھی رہے، ساتھ ہی شاعری سے بھی شغف تھا۔نذر و نیاز، محفل میلاد اور درود و سلام کے قائل تھے۔ میرے والد صاحب بھی انہی نظریات پر عمل پیرا رہے۔ہم نے انہیں جوانی میں بھی نماز سے غافل نہیں دیکھا، ہمارے گھر کا ماحول مذہبی تھا، گھر میں نعتِ رسول مقبول ﷺ اور میلاد کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ہر اسلامی مہینے میں اس کے تقدس کی مناسبت سے پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا جس میں ہمارے قریبی عزیز رشتہ دار بھرپور شرکت کیا کرتے۔ محرم الحرام میں عاشورہ کے دن گھر میں حلیم کی دیگ پکا کرتی، ہمارے قریبی عزیز شروع شب ہمارے گھر آ جایا کرتے ، رات بھر رَت جگا رہتا، صبح ہوتے ہی حلیم کی تقسیم شروع ہو جاتی، گھر میں کھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ ہماری امی ذوق وشوق سے ہر سال اس کا اہتمام کیا

کرتیں، ماہ ربیع الاول میں گھر کا ماحول زیادہ مذہبی ہوا کرتا تھا، محفل میلاد کا انعقاد ہوا کرتا۔ گیارھویں شریف کو نیاز کی دیگ، ماہِ رجب کی ۲۲ تاریخ کو گھر میں کونڈوں کی ٹکیاں تیار ہوتیں، اس رات بھی ہمارے قریبی عزیز رشتہ دار شروع رات سے ہمارے گھر آجاتے، رات بھر جشن کا سماں ہوا کرتا تھا، دن بھر مہمانوں کی آمد جاری رہتی تھی۔ ماہِ شعبان کی پندرھویں شب خصوصی عبادت کا اہتمام ہوا کرتا، امی اس دن سوجی اور چنے کی دال کا حلوہ پکایا کرتیں اور رات میں ہمیں قبرستان جانے کی تاکید کیا کرتیں، شروع میں ہم شیر شاہ کے قبرستان جایا کرتے تھے جہاں پر میرے دادا اور دیگر احباب مدفن ہیں، جب ہم دستگیر منتقل ہوگئے تو یٰسین آباد کے قبرستان جانا ہمارا معمول بن گیا، اب میرے ابا اور امی اِسی قبرستان میں مدفن ہیں۔ ماہِ رمضان کا پورا مہینہ موسم بہار کی طرح ہوا کرتا تھا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ پاپا کھانے کے شوقین تھے، عام دنوں میں بھی اور ماہ رمضان میں خاص طور پر دستر خوان بے شمار قسم کے کھانوں کی اشیاء سے بھرا ہوا ہوتا۔ ہم نے اپنی امی کو ماہِ رمضان میں دن بھر مصروف دیکھا، کبھی ان کی زبان پر کسی قسم کا شکوہ نہیں آیا۔ گھر میں جو تقریبات ہوا کرتیں تھیں، امی ان تمام کا اہتمام بہت ذوق و شوق سے کیا کرتی تھیں، وقت سے پہلے ہی تمام چیزیں بازار سے خرید کرلاتیں، جو عزیز و رشتہ دار ہمارے گھر کے نزدیک رہا کرتے تھے انہیں متعلقہ شب آنے کی دعوت دیا کرتیں۔ انہیں اپنے گھر دیکھ کر

خوش ہوتیں، ان کی خاطر تواضع کیا کرتیں۔ پاپا کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوا پھر ختم ہی ہو گیا۔

امی مہمان نوازی میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔ روز مرہ آنے والے مہمانوں کی خوش دلی سے خاطر مدارات کیا کرتیں۔ اگر کوئی کھانے کے وقت گھر آ جاتا تو پاپا کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر ہر گز نہ جائے، ہماری امی نے پاپا کی اس خواہش پر ہمیشہ خوش دلی سے عمل کیا۔ ہمارے گھر کا دستر خوان ہمیشہ دراز رہا۔ ہمارے گھر کا دستر خوان ہمیشہ فرشی ہوا کرتا تھا، ہم نے ہمیشہ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ طویل عرصہ رہنے والے مہمان بھی ہمارے گھر میں اکثر رہے۔ دراصل ہمارے ابا جان انتہائی نرم دل، مہمان نواز اور کسی کی دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے، جب بھی کسی رشتہ دار نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو وہ فوراً اپنی خدمات حاضر کر دیا کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ شخص ہمارے ہاں مستقل مہمان ہو جایا کرتا۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں۔ حتیٰ کہ پوری فیمیلی کو ہمارے ابا جان اور امی نے اپنے گھر میں پناہ دی وہ کافی عرصہ تک ہمارے گھر میں رہتے رہے۔ گویا ہمارا گھر مہمان سرائے بھی تھا، ہم میں سے کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے فیصلہ پر اُف بھی کرتے بلکہ وہ وقت بہت ہی ہنسی خوشی گزرتا۔ امی ہما وقت مستقل مہمانوں کے ساتھ خوش دلی سے پیش آیا کرتیں۔

میں نے اپنی امی کی زبانی سنا کہ ابھی وہ چند برس کی ہی تھیں کہ ان کی والدہ انتقال کر گئیں، ان کے والد صاحب کیونکہ پٹواری تھے اس وجہ سے گھر میں کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں تھی ۔بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی، ایک بہن ان سے بھی چھوٹی تھی کوئی دو سال کی ، ان دونوں بہنوں کی پرورش ان کے والد اور بڑے بھائیوں نے کی۔امی کی آنکھیں قدرِ چھوٹی تھیں، یہ بچپن میں یہ بہت خراب رہی تھیں، بیضوی مائل نکھرا نکھرا چہرہ ، قد مناسب، رنگت ڈھلی ہوئی گندم جیسی، ناک ستواں، لمبے ہاتھ ، مخروطی انگلیاں، گال پر دائیں جانب نمایاں تلِ، سر پر ہمیشہ دوپٹہ کا پلو، پر خلوص ملنسار، فراخ دلانہ لب و لہجہ، پاکیزہ خیالات کی مالک دیہات کے ماحول میں پروان چڑھنے والی، جس کی ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ چکا ہو، لکھنا پڑھنا کیسے سیکھ سکتی تھی، یہی ہوا اِمی لکھ پڑھ نہ سکیں۔شادی بھی جلد ہو گئی، لیکن قربان جاؤں اس نیک صفت کے کہ ہمیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ہماری ماں پڑھی لکھی نہیں، الحمداللہ ہم سب نے تعلیم حاصل کی، نماز بھی پڑھا کرتیں، ضرورت مندوں کی خاموشی سے مدد کیا کرتی تھیں۔

ہم نے کبھی اِمی اور ابا کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتے نہیں دیکھا، حتیٰ کہ دونوں کو کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ اس میں ہمارے پاپا کا بھی

کمال تھا۔ وہ انتہائی صلح جو قسم کے انسان تھے۔ امی نے کبھی پاپا کو ان کا نام لے کر مخاطب نہیں کیا، کہا کرتی تھیں کہ ہمارے ہاں شوہر کا نام لینا معیوب ہے۔ وہ اکثر پاپا کو سنئے، سنتے ہیں یا تمہارے پاپا کی یہ بات، تمہارے بھائی صاحب کی وہ بات وغیرہ سے پاپا کے بارے میں بات کیا کرتیں تھیں۔ پان دان ہمارے گھر کی روایت تھی، پاپا اور امی دونوں ہی پان کھایا کرتے، پاپا اپنے ساتھ پان کی ڈبیا اور بٹوا رکھا کرتے تھے۔ امی کی دیگر ذمہ داریوں میں پان بنا کر دینا بھی تھا۔ آخر میں امی نے پان کھانا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پاپا شروع میں سیگریٹ بھی پیا کرتے تھے، جب پان کھانا شروع کیا تو سیگریٹ پینا چھوڑ دی۔ میرے سب ہی بہن بھائیوں نے اپنے امی ابا کی اس روایت کو جاری رکھا ہوا ہے لیکن مَیں ان دونوں ہی چیزوں یعنی پان اور سیگریٹ سے بچا ہوا ہوں۔

اِمی بہت با ہمت اور قوت برداشت کی مالک تھیں، سارا سارا دن گھر کے کاموں میں لگیں رہتیں، زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ کراچی میں رہائش کی ابتدا تو کراچی کی قدیم بستی کھڈا مارکیٹ سے ہوئی، ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والے کئی خاندان ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے، ایک کمرہ میں کوئی چار خاندان مقیم تھے، یہاں بھی امی نے استقامت سے وقت گزارا، حالانکہ وہ مشرقی پنجاب کے ایک دیہات کے کشادہ گھر میں رہنے کی عادی تھیں، اس جگہ قیام مختصر

رہا، مہاجرین کی ایک آبادی ''بہار کالونی'' کا قیام عمل میں آیا تو وہاں ایک پلاٹ لے لیا گیا اور مکان بھی بن گیا، سکون سے زندگی بسر ہونے لگی۔اس وقت ہم دو بہن بھائی تھے ، دو پھوپھیاں اور دو چچا تھے ،اس طرح ہمارا گھرانا آٹھ افراد پر مشتمل تھا، بعد ازآں دونوں پھوپیوں کی شادی ہو گئی، ہم بہن بھائیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا، ہم دو سے بڑھ کر سات ہو گئے۔ چھوٹی بستیوں میں رہنے والے مکینوں میں باہم رواداری، پیار و محبت زیادہ ہوتا ہے۔ میرا بچپن اور جوانی اسی بستی میں گزرا، حتیٰ کہ شادی کے بندھن میں بھی اسی جگہ بندھا، ہماری چھوٹی خالہ حیدرآباد سندھ میں رہا کرتی تھیں، ۱۹۵۱ء میں میری چھوٹی خالہ ذکیہ خاتون کے ہاں پہلی لڑکی کی ولادت ہوئی، نام 'شہناز' رکھا گیا، میرے ابا جان نے فرط مسرت اور جذبات میں آ کر اُسی وقت اعلان کر دیا کہ 'یہ لڑکی میری ہوئی'، کہتے ہیں زبان سے نکلی کوئی خواہش اللہ تعالیٰ سن لیتا ہے، شاید یہ بھی قبولیت کی گھڑی تھی،اللہ نے میرے ابا کی یہ دعا قبول کر لی،فرشتوں نے پکے رجسٹر میں ہمارے نام لکھ کر مہر ثبت کر دی ،مَیں نے بھی بڑے ہو کر اپنے والدین کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کیا،۲۸ سال بعد ۱۹۷۵ء میں مَیں اور شہناز شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ چوتھی دیہائی آدھی گزر چکی ہے بندھن قائم ہے، کب تک قائم رہتا ہے ، یہ خدا کو معلوم، مختلف جہات سے مکمل شریک سفر ہیں ،مزاج شناس، ہم نوا اور ہم قدم بھی، ہم مکہ، مدینہ، جدہ ، فیفا (جیذان) کے پھیرے ساتھ ساتھ کر چکے ہیں۔اللہ نے دو بیٹوں

عدیل اور نبیل ، ایک بیٹی فاطینہ سے نوازا، پوتا صائم عدیل، نواسہ ارحم اور نواسی نہا ہماری کل کائینات ہے۔

جب ہم سب بھائی بڑے ہوگئے ، کسی حد تک مالی طور پر آسودہ حال بھی، باہمی مشورہ سے کراچی کے کسی اچھے علاقے میں منتقل ہونے کی منصوبہ بندی کی گئی،اس منصوبہ پر عمل کی صورت ایک ہی تھی کہ اس مکان کو جس میں ہم گزشتہ کئی دہائیوں سے رہ رہے تھے، جسے پاپا نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے رفتہ رفتہ تعمیر کیا تھا سیل آوٹ کر دیا جائے۔ پاپا کے لیے یہ ایک تکلیف دہ فیصلہ تھا۔ امی بھی پاپا کے ساتھ تھیں، شروع میں وہ تیار نہ ہوئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی اولاد کی یہی خواہش ہے تو وہ اپنی اولاد کی خواہش کے آگے دست بردار ہوگئے۔ انہیں آمادہ کرنے میں ہماری امی نے اہم کردار ادا کیا، مغیث چچا بھی پاپا کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے میں پیش پیش تھے ۔

نومبر ۱۹۸۶ء میں ہم دستگیر سوسائیٹی کی آبادی آصف نگر میں منتقل ہوگئے۔ یہ ۱۲۰ گز پر بنا ہوا مکان تھا، گنجائش کم تھی ، مکین زیادہ تھے ، لیکن اس وقت دلوں میں کشادگی تھی ، رفتہ رفتہ مکان میں بھی بڑھاوا آتا گیا یعنی ۱۲۰ گز کا مکان جو زمینی منزل پر مشتمل تھا گراؤنڈ پلس ٹو ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۹۷ء میں ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے صرف ہماری امی کو ہی نہیں بلکہ ان کی تمام اولاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ہمارے والد صاحب کا صدمہ ارتحال تھا۔ پاپا انجائینا کے بھی

مریض تھے، شوگر بھی تھی لیکن انہیں پیشاب میں تکلیف کے باعث ابن سینا اسپتال، گلشن اقبال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں پر ان کا پراسٹیٹ گلینڈ کا آپریشن ہوا، نہیں معلوم کیا پیچیدگی ہوئی دوسرے دن ہی طبیعت بگڑ گئی، ۵ ستمبر، بروز جمعہ، صبح صادق کے وقت اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ انا اللہ و انا علیہ راجیعون، باغباں نے اپنے گلشن کے ایک ایک پودے کی دل و جان سے آبیاری کی تھی، اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا، دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا، اس کی محنت کا ثمر تھا کہ باغباں کا لگایا ہوا ہر ہر پودہ تناور درخت بن چکا تھا، ہر درخت چھاؤں دینے کے قابل ہو چکا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ باغباں کو اپنے درختوں کی چھاؤں سے راحت میسر آتی، وہ سکون و آرام سے زندگی بسر کرتا، لیکن مالکِ کائنات نے قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ باغباں کا کام پورا ہو چکا تھا، اب اُسے اُس دنیا میں جانا تھا جس کی تیاری بھی اس نے کر لی تھی۔ اس نے خاموشی سے اللہ کے حکم کو لبیک کہا اور اپنے ہرے بھرے گلشن کو الوداع کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا وہاں بسالی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ پرنم آنکھوں، دکھے دل کے ساتھ پاپا کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور دیگر احباب نے انہیں آخری آرام گاہ پہنچایا، ہم بھائیوں نے لرزتے ہاتھوں پاپا کے جسد خاکی کو لحد میں اتارا اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا۔ اس حادثہ نے اِمی کو سب سے زیادہ متاثر کیا، ہم سب بہن بھائیوں کے لیے پاپا کی جدائی سخت تکلیف دہ تھی،اِمی نے اس صدمہ کو مشکل سے

برداشت کیا لیکن انہوں نے اس کمرہ کو جس میں وہ پاپا کے ساتھ سالوں رہی تھیں آخری وقت تک نہیں چھوڑا، حالانکہ وہ پاپا کے چلے جانے کے بعد ۱۲ سال اس دنیا میں رہیں، انہیں بھی اُسی جگہ ان کی بیٹیوں نے غسل دیا جہاں پر پاپا کو ہم سب بھائیوں نے اپنے ہاتھوں غسل دیا تھا۔

امی نے اپنی زندگی میں طویل وقت بیماری میں گزارا، ۱۹۶۹ء کی بات ہے امی کو کھانسی کی تکلیف شروع ہوئی، کافی علاج کرایا لیکن کھانسی میں اضافہ ہی ہوتا رہا، ڈاکٹر عبد لعزیز بلوانی جو ہمارا فیمیلی معالج تھا کا علاج ہوا کرتا تھا، ڈاکٹر بلوانی نے مشورہ دیا کہ کسی کنسلٹنٹ کو دکھایا جائے، کچھ دن بعد ڈاکٹر بلوانی اپنے ہمراہ ڈاکٹر افتخار راٹھور کو ہمارے گھر لے آئے، ڈاکٹر افتخار راٹھور چیسٹ اسپیشلسٹ تھے، انہوں نے چیک کیا اور بتایا کہ امی کے پھیپڑوں میں پانی بھر گیا ہے، اُسے سرنج کے ذریعہ نکالنا ہوگا، دوائیں لکھ کر دے دیں اور وقت دے دیا کلینک پر آنے کا، ڈاکٹر افتخار راٹھور کی کلینک انکل سریا اسپتال میں تھی، ہم مقررہ وقت پر پہنچ گئے، ڈاکٹر صاحب نے امی کو بیڈ پر بٹھایا اور کمر کی جانب سے پسلیوں کے درمیان سے سرنج داخل کی اور خاصا پانی نکالا، اس عمل سے امی کی طبیعت تو بہتر ہو گئی لیکن وہ مستقل طور پر تپ دق کی مریضہ بن گئیں، اس زمانے میں اس مرض کا علاج بہت طویل ہوا کرتا تھا، روزانا انجیکشن لگنا ہوتا تھا، اور یہ انجیکشن پینسلین

کے ہوا کرتے تھے مہینوں لگتا تھے۔ شروع شروع میں تو کمپاؤنڈر سے انجیکشن لگوائے گئے، لیکن مشکلات پیش آنے لگیں، اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ مَیں نے انجیکشن لگانا سیکھا اور مہینوں یہ ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ ان کی طبیعت تو بہتر ہو گئی لیکن سردیوں میں اکثر کھانسی اور سانس کی تکلیف ہوجایا کرتی تھی۔ وہ اس بیماری سے طویل عرصہ نبرد آزماں رہیں، ۱۹۹۰ء میں ان کی آواز اچانک بند ہو گئی، تکلیف کوئی نہیں تھی صرف آواز بند ہو گئی تھی، علاج ہوا، کچھ افاقہ بھی ہوا لیکن آواز پوری طرح بحال نہیں ہوئی، ابتداء میں تو بہت مشکل ہوئی لیکن رفتہ رفتہ آواز کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ گلے کی یہ تکلیف ہی اُس بیماری کا شاخسانہ تھی جو انہیں ۲۰۰۹ء میں ہوئی اور پھر انہیں اپنے ساتھ ہی لے گئی۔

جِنّاَت کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں انسان و جن کو ایک ساتھ مخاطب کیا ہے جِنّاَت اچھے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں کو پریشان کرنے والے بھی، ایسی مثالیں عام ملتی ہیں۔ ہم نے اپنی امی کی زبانی یہ بات کئی بار سنی کہ وہ جب چھوٹی سی تھیں ابھی چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا تو اکثر ایک سانپ ان سے کھیلا کرتا تھا، وہ ان کے گلے میں کبھی ایک جانب کبھی دوسری جانب گھومتا رہتا اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے پکڑتی اور کھیلا کرتی تھیں، جب کوئی ان کے پاس آجاتا تو وہ غائب ہو

جاتا، ان کے والدین نے کسی عامل کے ذریعے اس سانپ کو جو دراصل 'جن' تھا چلتا کیا۔ ہم بہن بھائی اکثر اپنی امی کو اس واقعہ کی یاد دلا کر مذاق کیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کی بات ہے میری امی کو بخار آگیا، معمولی سی بات تھی، علاج ہوا اتر گیا لیکن کھانسی نہ گئی، ایسا بھی اکثر ہوتا ہے، کھانسی کی دوا استعمال کرتی رہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آواز سے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی مرد کھانس رہا ہے، سب کو تشویش ہوئی، ہمارے خاندان میں سید امام صاحب جِنّات کا اتار کیا کرتے تھے جب انہیں امی کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے بتایا کہ امی پر کسی جن کا اثر ہے، انہوں نے اس کا اتار شروع کر دیا، کچھ تعویذ، پڑھا ہوا پانی اور ساتھ ہی ہمیں پڑھنے کے لیے کچھ بتایا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان پر (ہماری امی پر) کسی مرد جن کا اثر ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ کچھ نہیں کرے گا، اسے جانے میں کچھ وقت لگے گا۔ سارے بہن بھائی چھوٹے تھے، خوف زدہ ہو جانا ایک قدرتی عمل تھا، ان کی کھانسی اسی طرح جاری رہی، کھانستے وقت مرد کی آواز نمایاں ہوا کرتی لیکن کوئی اور بات کبھی نہیں ہوئی۔ امام صاحب کا عمل جاری رہا انہوں نے نے بتایا کہ وہ رات میں پڑھائی بھی کرتے ہیں۔ چند روز گزرنے کے بعد ایک دن امی پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا لیکن اس دورے کے باوجود ان میں وہ نقاہت یا کمزوری دیکھنے میں نہیں آئی۔ بیٹھے بیٹھے کھانس رہی تھیں البتہ اس دن انہوں نے مرد کی آواز میں بولنا

شروع کیا چند جملے ہی ذہن میں ہیں، مرد کی آواز میں کہا کہ ''میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا''، '' وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''، ''تم لوگ مت ڈرو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا'' وغیرہ وغیرہ۔ میں اِمی کے پاس ہی تھا، میری کسی بہن سے چائے کے لیے کہا کہ 'میں چائے پیوں گا'، چائے بنادی گئی، تھوڑی سے چائے پی ،آدھا کپ چائے باقی تھی، مجھے مخاطب کیا، کہنے لگیں !تو میرا بیٹا ہے، میں نے کہا کہ ہاں ہوں، گویا ہوئیں! میرا ایک کام کرے گا میں نے کہا کرونگا، پھر کہا کہ یہ کپ میں جو چائے ہے اسے دروازے کے باہر پھینکدے، بظاہر یہ عام سی بات تھی، لیکن اس وقت کچھ عجیب سا ڈراور خوف کی کیفیت طاری تھی، میں نے کہا کہ اسے میز پر رکھ دیں، پھینکنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن مصر ہوئیں کہ میں اسے باہر پھینک دوں، میں ان کے اصرار پر سمجھ گیا کہ بات کچھ اور ہے، میں نے ڈرتے ڈرتے انکار کردیا، کھانسی کے دورے میں بے انتہا اضافہ ہوا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ کھانسی بند ہوگئی اور ان کی اس کیفیت میں بھی تبدیلی آگئی یعنی وہ اپنی آواز میں باتیں کرنے لگیں، امام صاحب کو اس کیفیت سے آگاہ کیا گیا انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ چائے باہر دروازے پر نہیں پھینکی، ایسا کرنے کی صورت میں 'جن' ان کے اوپر سے تو چلا جاتا لیکن باہر دروازے پر اپنا بسیرا جما لیتا۔اس طرح امام صاحب نے ہمیں ایک بڑی مشکل سے نجات دلائی اور امی ٹھیک ہوگئیں۔

مارچ ۲۰۰۹ء میں گلے کی تکلیف کی ابتداء ہوئی، کھانے پینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی، علاج مسلسل ہوتا رہا لیکن تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا گیا، نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ پانی بھی مشکل سے پیا جانے لگا۔ کہا کرتی تھیں کہ مجھے کینسر سے ڈر لگتا ہے، انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں گلے کی نالی کا کینسر (Cancer of Oesophagus) ہو گیا ہے لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ رمضان المبارک قریب آ رہے تھے، ادھر ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ صحت مند جسم آہستہ آہستہ کمزوری کی جانب مائل تھا۔ امی کو اسپتال جانے سے بھی خوف آتا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تو ان کے لیے بھی تکلیف کا باعث ہوگا اور ہم سب بھی پریشان ہوں گے، ان کی تکلیف کا علاج تو اب یہ رہ گیا تھا کہ غذا کے لیے نالی پاس کرا دی جائے، اب انہیں آکسیجن کے بغیر سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ آکسیجن سیلنڈر بدلنے کے دوران ان کی حالت بگڑ جاتی، بلڈ پریشر ایک دم کبھی ہائی اور کبھی ایک دم کم ہو جاتا۔ ارشد ندیم جو کوالیفائیڈ میڈیکل کمپاؤنڈر بھی ہے امی کے انجیکشن اور ڈرپ لگانے کی ذمہ داری لیے ہوئے تھے، میرا چھوٹا بیٹا ڈاکٹر نبیل جو عباسی شہید اسپتال میں تھا اب اسپتال سے اپنی دادی کے پاس ہی آ جاتا، ہم سب زیادہ وقت امی کے پاس ہی گزارا کرتے۔ ان کا کمرہ اسپتال کا کمرہ ہی بن گیا تھا، اسپتال کا ایک بیڈ بھی ایک پڑوسی سے مل گیا تھا، اس سے اور زیادہ آسانی ہو گئی

تھی، رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، امی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی، ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گئی تھیں۔ چہرہ سے نقاہت اور کمزوری صاف عیاں ہونے لگی تھی، ستمبر کا مہینہ شروع ہونے میں کچھ دن باقی تھے، کہا کرتی تھیں کہ جمعرات مجھ پر بھاری ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے پاپا کی اور میری فاتحہ ایک ساتھ ہی کرا دیا کرنا، اس کی وجہ یہ تھی کہ پاپا کا انتقال ۵ ستمبر کو ہوا تھا، جیسے جیسے ۵ ستمبر نزدیک آ رہی تھی ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، جمعرات ۱۲ رمضان المبارک (۳ ستمبر ۲۰۰۹ء) صبح سے ہی حالت بگڑنا شروع ہو گئی تھی، دن میں کئی بار حالت بگڑی، صبح کے وقت ندیم اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر سید جمال احسن کو جو میرے ایک مرحوم دوست پروفیسر سید ریاض احسن کے بھائی ہیں کو گھر پر لائے، انہوں نے بھی ناامیدی کا اظہار کیا، اسی دن ڈاکٹر انور سہیل بھی آئے ان کا خیال تھا کہ کیونکہ خوراک بالکل نہیں جا رہی اس لیے غذا کی نالی پاس کر دی جائے، تاکے امی کچھ وقت اور ہمارے درمیان میں رہ سکیں، لیکن ہم سب نے اب یہ مناسب نہیں سمجھا کہ امی کو مزید اذیت میں مبتلا کیا جائے، ابھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر ہی رہے تھے کہ امی کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی، ایسا محسوس ہوا کہ وہ جا چکی ہیں، ندیم ارشد کا خیال تھا کہ برین ڈیتھ ہو چکی ہے، اس نے امی کے سینے کو کئی بار پمپ بھی کیا، لیکن ایسا نہیں تھا، انہوں نے پھر سے سنبھالا لیا، تھوڑی دیر میں اُٹھ کر بیٹھ گئیں، ہم سب کو مسلسل خاموشی سے دیکھے جا رہی تھیں، بالکل خاموش، شاید اللہ تعالیٰ نے انہیں

ہم سب کو آخری بار دیکھنے کی مہلت دی تھی، اس وقت ہم سب کے اوسان خطا تھے ، ہم نے بھی ان سے کوئی بات نہیں کی، ہم بھی خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے، وہ پھر سے کومہ میں چلی گئیں،مَیں امی کے پیروں کی جانب کھڑا تھا، میرے برابر میری چھوٹی بہن روحی اور شاہین کھڑی تھیں، ایک جانب پرویز، تسلیم، ندیم تھے،امی کی چاروں بہویں شہناز،پروین، روبی اور اسماء بھی ایک جانب کھڑی تھیں، دائیں جانب ارشد ندیم اور بائیں جانب ڈاکٹر نبیل تھے جو امی کی کیفیت کے مطابق ارشد ندیم کو ہدایت دیتے اور ندیم اس پر عمل کر رہے تھے، نبیل نے امی کے ہاتھ پر بلڈ پریشر کا آلہ لگایا ہوا تھا، ایک ہاتھ امی کی نبض پر تھا، نبض ڈوبتی جارہی تھی، بلڈ پریشر انتہائی نیچے کی جانب تھا، مسجد سے عصر کی اذان شروع ہوئی، ہماری نظریں امی کے چہرہ پر تھیں، گھڑی میں چار بجکرپینتالیس منٹ ہوئے تھے ،یک لخت محسوس ہوا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا (جسے سرسراہٹ کہا جاسکتا ہے) امی کے پیروں سے شروع ہوا جب منہ تک پہنچا تو ان کا چہرہ ساکت اور بے جان ہو چکا تھا، اس لمحے میرے منہ سے نکلا ’نبیل امی گئیں‘، اور بس ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ، ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ہمارے بند ہاتھوں سے ہماری انمول متع چھین کر لے گیا ہو اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ہوں،اِمی ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں اور ہم اپنے والد صاحب کے بعد اپنی ماں سے بھی محروم ہو گئے ۔ انااللہ وانا علیہ راجیعون پروردگاِ عالم اِمی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے

اور جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ آمین۔

بیماری اور کمزوری کے باعث چہرہ پر گوشت نام کو نہ تھا،گال پچک گئے تھے، کنپٹیوں میں گڑھے ہو گئے تھے، ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گی تھیں، جب آخری سفر پر لے جانے کا وقت قریب آیا تو رنگت پیلی پڑ گئی تھی، کنپٹیاں بھر گئیں تھیں، پچکے ہوئے گال بھر گئے تھے، چہرہ پر ورم آ جانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ خاموشی اور سکون غالب تھا، محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مسافر طویل مسافت طے کر کے تھک ہار کر سو گیا ہے، موت کی جلا چہرہ پر نمایاں تھی اور رنگت میں کچھ عجیب سی طلسمی پیلاہٹ اپنا حسن دکھا رہی تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حنوط کی ہوئی ممی۔

امی کے تمام بچے بشمول پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کراچی ہی میں تھے سوائے میری بیٹی فاھینہ کے جو کہ لاہور میں رہتی ہے،تدفین کیونکہ صبح ہونا تھی ، اسے بھی وقت مل گیا اور وہ بھی صبح تین بجے کی فلائٹ سے اپنے بچوں کے ساتھ دادی کے سفر آخرت میں شرکت کو پہنچ گئی۔ سفر آخر شروع ہوا، انہیں پاپا کے قریب ہی جگہ ملی، صابرہ، شاکرہ، عالی حوصلہ کی زندگی کا سفر جو ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سرزمین سے شروع ہوا تھا ۳ ستمبر ۲۰۰۹ء کو ۷۹ سال بعد کراچی میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ ماں سے قلبی تعلق اور عقیدت کا رشتہ اس قدر

مستحکم اور اٹوٹ ہے کہ ماں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی یہ رشتہ اور تعلق ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔اس کی یادوں کے دیے ہر دم روشن رہتے ہیں۔شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنی ماں کی یاد میں اپنے دُکھ بھرے جذبات اور احساسات کو جس انداز اور اسلوب میں پیش کیا ''ماں'' کے لیے یہ میرے ہی نہیں بلکہ ہر دکھ بھرے دل کی دردمندانہ اور پر خلوص دعا ہے :

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا !
نُور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا !
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے !

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

عبد الصمد انصاری - دھیمہ سالہجہ - تھوڑی سی شوخی

عبد الصمد انصاری سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۷۲میں یم اے کرنے کے بعد ملازمت مل گئی تھی لیکن حلقہ عثمانی و سبز واری میں داخل ہونے کے باعث اکثر جامعہ کراچی جانا ہوتا جہاں پر شعبہ لائبریری سائنس جو جامعہ کراچی کی لائبریری (ڈاکٹر محمود حسین لائبریری) کی پانچویں منزل پر تھا اکثر احباب سے ملاقاتیں ہوتیں۔ انہیں دنوں معلوم ہوا کہ میرے بعد ایم اے کرنے والے کچھ طلبہ میں سے ایک عبد الصمد انصاری، اقبال الرحمٰن فارقی عرف لڈو میاں، فاروق عظیم ، صمید بیگ اور چند دیگر نوجوان بھی عثمانی و سبز واری کے نیاز مندان میں سے ہیں۔یعنی سبز واری صاحب کے عشق میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس خبر پر اطمینان ہوا کہ چلو میرے پیر بھائیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دیکھنے کا اشتیاق بڑھا ۱۹۷۴کے ایک دن سبز واری صاحب کے کمرہ میں ملاقات ہو گئی۔ نوجوان دیکھنے میں خوبصورت ، مناسب، گورا رنگ، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، مضبوط جسم، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، کالے گھنے بالوں میں اب رنگنے کے باوجود سفیدی نمایاں، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں

اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت
تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔کچھ کچھ شباہت کسی اداکار کی سی ،
تھی، پہلے تو خیال ہوا کے شاہد موصوف اداکار بھی ہوں لیکن یہ راز بعد میں عیاں ہوا
کہ میرا خیال بڑی حد تک درست تھا، یہ خود تو اداکار نہیں البتہ معروف اداکار قاضی
واجد انکے ماموں زاد بھائی ہیں۔ گویا یہ ذوق خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔
میں نے زندگی میں اپنے دوستوں کو ممکن حد تک سنبھال کر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی
جس کسی سے تعلقِ دوستی قائم ہوگیا اس سے ناتا جوڑے رکھا، بے شمار دوستوں کی ،
ناپسند باتوں اور عادتوں کو محض اس وجہ سے درگزر کیا، کیونکہ میں دوست بنانے کا تو
قائل ہوں ، دوست گنوانے یا چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے مخالفین بڑھانے کو اچھا
نہیں سمجھتا، دوستی کے بارے میں میری یہ سوچ ہے کہ ''دوستی قربانی چاہتی ہے''۔
دوستوں کی کڑوی کسیلی ، کسی حد تک ناپسند باتوں کو اس وجہ سے درگزر کیا جائے تا کہ
دوستی قائم رہے، میں اس میں بڑی حد تک دوستی کے اس فلسفے پر کامیاب بھی رہا،
باوجود اس کے کہ میرے بعض مہرباں میرے اس عمل سے اختلاف رکھتے ہوئے مجھ پر
تنقید بھی کرتے ہیں۔ بقول

میر دردؔ ؎

کیا میر سب ہم نے گلزار دنیا

گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

صمد انصاری مزاجاً سست اور دھیمے لہجے کے مالک ہیں۔ ہمارے استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری انہیں پیار سے 'صمد ڈھیلے' کہا کرتے ہیں اور ان کی اس عادت پر اکثر بیشتر ان کی سرزنش بھی کرتے ہیں۔ میرے ساتھ لائبریری اسکول میں پڑھاتے ہوئے انہیں ۳۰ سال ہوگئے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جس دن اُن کی کلاس ہوتی ہے میں لیاقت لائبریری جاتے ہوئے انہیں لینے ان کی لائبریری چلا جاتا۔ میں اکثر پندرہ منٹ قبل ہی پہنچتا۔ انہیں معلوم ہے کہ وقت بہت کم، راستہ بھی پندرہ منٹ کا ہی ہیں اس کے باوجود اٹھتے اٹھتے خاصا وقت لگا دینا ان کا معمول ہوا کرتا ہے۔ جسے بسا اوقات میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہوجاتا لیکن برداشت کیا کرتا ہوں۔ جب وہ گاڑی چلا رہے ہوں اور آپ ان کے ہمراہ برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوں، اتفاق سے آپ خود بھی گاڑی چلانا جانتے ہوں تو ان کی سبک رفتاری کو دیکھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ انہیں فوری سیٹ سے ہٹا کر بندہ خود گاڑی چلانے لگے۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ان کی کیفیت کچھ اس شعر کی سی ہوتی ہے۔

خرامہ خرامہ معتر معتر\
نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں

کراچی کی ہنگامہ خیز سڑک جب آپ کے دائیں اور بائیں گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی دوڑی چلی جارہی ہوں صمد انصاری ہیں کے جیسے مال روڈ پر ٹہل رہے ہیں۔ اکثر گاڑی چلانے والے جب صمد انصاری کے دائیں یا بائیں سے گزرتے ہیں تو انہیں گھور گھور دیکھتے جاتے ہیں، یقینا دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ کراچی کی سڑک ہے صفاری پارک نہیں۔
حلقہ عثمانی و سبزواری کسی نہ کسی موقع پر پیشہ ورانہ تقریبات کا اہتمام کیا کرتے تھے، ایک تقریب عادل عثمانی صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی جس میں اس نوجوان کے جوہر مزید کھلے، محفلوں میں بولنا جانتا ہے بلکہ اچھا بولتا، گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اس نوجوان باصلاحیت کے اندر ایک شاعر بھی موجود ہے، یعنی اس کے شعر پڑھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ حساس دل کا مالک اور شعر کو صحیح پڑھنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ بس اسی دن غیر ارادی طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ دوستی بڑھائی جائے چنانچہ پینگیں بڑھانا شروع کیں، دوسری جانب بھی میرے لئے دوستی کی خواہش نظر آئی، بس اب ہم اکثر و بیشتر ملنے لگے۔ دوستی آگے بڑھنے لگی، دوریاں قربتوں میں بدل گئیں۔ میں ابتدا میں پریمئر کالج میں بعد ازآں عبداللہ کالج میں تھا، ساتھ ہی اسکول آف لائبریرین شپ میں پڑھا بھی رہا تھا جب کہ موصوف انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز کے لائبریرین تھے، میں کبھی کبھار ان کے آفس جایا کرتا، ہمارے موضوعات زیادہ تر اکرم صاحب اور عثمانی صاحب، اس

حوالے سے کبھی لائبریری پروموشن بیورو اور کبھی اس کے جاری کردہ رسالے پاکستان لائبریری بلیٹن ہوا کرتے، ہم اکثر مختلف پروگراموں کی منصوبہ بندی کیا کرتے۔۱۹۷۹ میں جب میں اسکول آف لائبریرن شپ کا انتظامی سربراہ بن گیا تھا، اگر کوئی ٹیچر معزرت کرلے یا چلاجائے تو نئے استاد کی تلاش میری ذمہ داری تھی۔ کسی استادکے معزرت کرنے کے بعد نئے ٹیچر کی شمولیت کا مرحلہ آیا تو میری پہلی نظر عبد الصمد انصاری پر گئی، میں نے اپنا مدعا بیان کیا، تفصیل بتائی کہ تمہیں ہفتہ میں صرف ایک ۴۵ منٹ کی کلاس لینا ہوگی، یہ کیوں کہ شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی میں جذوقتی استاد رہ چکے تھے، پڑھانے سے دلچپی بھی رکھتے تھے، صلاحیت بھی تھی۔انہیں میری بات میں کشش نظرآئی اور یہ میرے پھندے میں آگئے وہ دن سوآج کا دن ہم ایک دوسرے کے اسیر ہوچکے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس شخصیت سے قربت ہی درست پس منظر مہیا کرتی ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کی پہچان اس کے ساتھ سفر کرنے یا ایک ساتھ وقت گزارنے سے ہوتی ہے۔ماضی میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کسی بھی شخصیت کی سوانح قلم بند کرنے کے لیے قلم کار کو اپنے موضوع کے ساتھ کچھ وقت گزارنا پڑااس قربت کے نتیجے میں ہی قلم کار اپنے موضوع کو جان سکا اور اس کی زندگی کے بارے میں لکھ سکا لیکن میرا موضوع تو گزشتہ تیں

سال سے میرا ہمزاد ہے، گھر کی زندگی کے علاوہ شہر بھر میں ہونے والی کوئی تقریب، کوئی محفل، خوشی کی ہو یا غمی کی یہ میرے ساتھ ہوتا ہے، مختلف قسم کے فلاحی، سماجی، تفریحی اور ادبی پروگرام ہم نے ایک ساتھ ترتیب دیئے، شہر سے باہر مختلف شہروں میں ہونے والی کانفرنسوں میں یہ میرا شریک سفر رہا، ہوٹل کے کمروں میں یہی میرا شریک ہوتا ہے۔ اسے مَیں نے جتنے قریب سے دیکھا شاید ہی کسی اور نے دیکھا ہوگا۔ یہ میرے اور مَیں اس کے بہت سے ظاہری اور خفیہ رازوں کا امین بھی ہوں۔ امانت دار کی حیثیت سے میں اپنے دوست کی صرف ظاہری خصوصیات پر ہی قلم اٹھاؤں گا، کیونکہ امانت میں خیانت کسی بھی طرح اچھا فعل نہیں۔

صمد انصاری میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے، اس نے جب بھی لکھا اچھا لکھا، ادبی مزاج خاندانی ہے، لیکن اس نے اپنے اندر کے قلم کار کو پوری طرح باہر آنے ہی نہیں دیا، شعر کہتا ہے اور اچھے شعر کہے، لیکن بد قسمتی یہ کہ اس نے نہ تو جم کر نثر لکھی اور نہ ہی اپنے اندر کے شاعر کو آزادی کے ساتھ باہر آنے دیا، گویا یہ زندگی کے کسی بھی حصہ میں اس جانب سنجیدہ نہیں رہا، باوجود اس کے کہ یہ نثر لکھنے والوں کے درمیاں رہا انھوں نے لاکھ ٹکریں ماریں کہ یہ سنجیدگی سے نثر لکھے، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی جب خود جی چاہا لکھا، اسی طرح شاعروں کی صحبت میں رہا، لیکن شاعری میں بھی اسی، طرح

ڈنڈی مارتا رہا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے دامن میں چند غزلیں، چند نظمیں اور کچھ ، پیروڈیز ہوں گی

اسی طرح چند مضامین بھی۔ہاں یہ دو کتابوں کا شریک مصنف بھی ہیں۔

قریبی دوست ہوتے ہوئے بھی میں صمد انصاری کے نکاح کا گواہ نہیں کیونکہ بارات کراچی سے اسلام آباد گئی تھی البتہ جائز ولیمہ کا گواہ ضرور ہوں۔ قسمت سے اچھی بیوی ملی ، پڑھی لکھی اور سیدھی سادھی، میری شاگرد بھی رہی۔ بچوں کی پرورش اور تربیت بہت اچھے طریقے سے کی۔ اپنی بیوی کی سادگی کا ایک واقع جو صمد انصاری نے سنایا ، دلچپی سے خالی نہیں کہتے ہیں کہ 'میری شادی اسلام آباد میں ہوئی، یعنی سسرال والے اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے۔ بارات گئی ، نکاح ہوا، رخصتی بھی ہوئی اور چند روز وہیں گزارنے کا پروگرام بنا۔ شادی کے بعد انہوں نے بیگم سے کہا کہ میرے ایک دوست نے مری میں رہنے کا انتظام اس طرح کردیا ہے کہ مری میں ان کا اپنا گیسٹ ہاؤس ہے چنانچہ ہم ھنی مون کے لیے مری چلتے ہیں۔ صمد انصاری نے بتایا کہ جب میں نے اپنی نئی نویلی بیگم سے یہ کہا کہ ہنی مون کے لیے مری چلتے ہیں قیام کا انتظام ہو گیا ہے توانہوں نے انتہائی سادگی اور بیگانے انداز میں کہا کہ ہم تو مری بے شمار بار جا چکے ہیں، ہر آنے والے مہمان کو مری سیر کرانے لے جاتے ہیں ، میں مری جا کر کیا کروں گی آپ ندیم کے ساتھ چلے جائیں (ندیم بیگم صمد انصاری کے

بھائی ہیں)، وہ آپ کو اچھی طرح مری کی سیر کرادیں گے۔ ہائے رے تیری سادگی، قربان جایئے اس سادگی پر، آج کل کی لڑکیاں تو رشتہ طے ہونے سے قبل ہی ہنی مون کے منصوبے بنا لیتیں ہیں۔ میرا دوست صمد انصاری اس سادگی پر قربان ہوگیا اپنے نئے نویلے سالے کے ساتھ مری چلے گئے۔ نہیں معلوم یہ ھنی مون تھا یا کچھ اور۔۔۔۔ لگتا ہے صرف مون ہی مون ہوگا کیونکہ ہنی تو اسلام آباد میں ہی رہ گئی تھی۔

اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

صمد انصاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہیں وقت، حالات اور لمحہ موجود کے حوالہ سے اشعار اور واقعات بہت جلد سوجھ جاتے ہیں اور یہ اسی وقت شعر سنا دیتے ہیں یا اس سے مناسبت رکھتا ہوا کوئی قصہ، ایک دن کالج میگزین کے حوالہ سے بات ہورہی تھی، انہوں نے فوری ایک قصہ رسید کردیا،انہوں نے اپنے ایک کزن کا واقعہ سنایا کہ پنجاب کے کسی کالج میں ایک انگریز مہمان آئے ،کالج پرنسپل انگریز موصوف کو" بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اپنے کالج کا میگزین دکھا رہے تھے جس پر شاہین کی خوبصورت رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی، وہ انہیں بتا رہے تھے کہ ہم نے اپنے قومی ہیرو علامہ اقبال کے شاہین کی تصویر چھاپی ہے، علامہ اقبال کا شاہین اور ان کا تصور ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اس

کے علاوہ علامہ اقبال اور ان کے فلسفہ کے بارے میں تفصیل بتا رہے تھے، اسی دوران اسی کالج کے ایک سنئیر پروفیسر پرنسپل کے کمرہ میں داخل ہوئے، انہوں نے یہ خیال کیے بغیر کے کوئی غیر ملکی مہمان بھی کمرہ میں موجود ہے میگزین پر ایک نظر دوڑائی اور اپنے مخصوص انداز میں پنجابی میں گویا ہوئے "اوہی کبوترا" ان کا کہنا تھا میگزین پر سابقہ میگزین کی طرح شاہین کی تصویر ہے جسے انہوں نے کبوتر سے تشبیح دی، پرنسپل صاحب بھی ان کے اس برجستہ جملے کو سن کر رہ گئے ان کا خیال تھا کہ انگریز مہمان موصوف پروفیسر کے اس جملے کو سنا ان سنا کردیں گے لیکن انگریز مہمان نے پرنسپل صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں، پرنسپل صاحب نے انگریز مہمان کو کسی طرح ٹال دیا۔ یقینا بعد میں انہوں نے موصوف پروفیسر کی خبر لی ہوگی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ہم دونوں اپنے حلقہ دوستی میں ہر خوشی اور غمی میں اکثر ساتھ ہی جاتے ہیں، کبھی وہ مجھے لے لیتے ہیں کبھی یہ فریضہ میں ادا کرتا ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید کا انتقال ہوا تو جامعہ کراچی کے قبرستان میں ہم ایک ساتھ تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر اللہ کو پیارے ہوئے تو ہم دونوں نے انہیں بوجھل دل کے ساتھ وادی حسین قبرستان میں دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہا، ڈاکٹر انیس خورشید کے انتقال کے بعد ہم نے مل کر ان کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی، اختر حنیف

صاحب کے انتقال پر ہم ساتھ ساتھ تھے، ہمارے ایک شاگرد سمیع الدین، گورنمنٹ کالج برائے کامرس واکنامکس کے لائبریرین تھے، اچھی خوبیوں کا نوجوان تھا، پہلی شادی ہوئی کامیاب نہ ہوئی، دوسری شادی ہوئی، ہنسی خوشی زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک کسی موزی مرض نے آدبوچا، دیکھتے ہی دیکھتے صحت منداور خوبرو جوان چٹ پٹ ہوگیا، مغرب بعد تدفین ہوئی، لیاقت آباد میں رہا کرتا تھا وہیں سے جنازہ اٹھا، قبرستان میں صمد انصاری اور میں ساتھ ہی تھے۔ رات کی تاریکی میں جبکہ چاند کی روشنی بھی ماند تھی، شاید ایسی جوان موت پر چاند بھی افسوس کررہا تھا۔ ہم نے اپنے اس شاگرد کو لحد میں اتارا، دل انتہائی دکھی اور افسردہ تھا، لیکن اللہ کی مرضی جسے جب چاہے اپنے پاس بلالے، مصلحت خداوندی سمجھ کر سوائے صبر کے انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ واپسی کا سفر شروع ہوا، قبرستان میں اندھیرا تھا، معمولی سی روشنی کے سہارے ہم دونوں قبروں کو بچاتے ہوئے چلے آرہے تھے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا کہ اچانک میری نظر ایک قبر کے کتبہ پر پڑی لکھا تھا ''سیدہ نجمہ سلطانہ تاریخ وفات ۔۔''، میں نے صمد انصاری کو متوجہ کیا اور کہا کہ ذرا یہ کتبہ توپڑھو، یہ یہاں کب آگئیں، صمد انصاری نے کتبہ دیکھا اور ہنس دیے، ابھی تھوڑی دور ہی چلے تھے صمد کہنے لگے ارے بھئی یہ بھی ہیں، میں نے کہا کون، کتبہ دیکھا تو لکھا تھا '' آمنہ خاتون تاریخ وفات۔۔''، یہ حسن اتفاق تھا، ہم دونوں کچھ دیر قبروں کے درمیان کھڑے ہوگئے اور اس اتفاق پر گفتگو کرنے لگے، ہم دونوں نے

کہا کہ چلو آگے چلتے ہیں ہو سکتا ہے، نسیم فاطمہ اور نسرین شگفتہ بھی یہیں کہیں ہوں، اس بات پر ہم دونوں خوب محضوض ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی عمر دراز کرے، اسکول آف لائبریرین شپ اور لائبریری پروموشن بیورو میں یہ ہماری شریک کار ہیں۔

صمد انصاری کا تعلق ہندوستان کی ریاست گوالیار سے ہے،انھوں نے اسی ریاست کے شہر 'لشکر' میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں جنم لیا۔ قاضی خاندان سے تعلق ہے ان کے خاندان کے اکثر احباب اپنے نام کے ساتھ 'قاضی' لگاتے ہیں۔ ان کے جدِ امجد ہندوستان کی معروف شخصیت عبدا لمناف انصاری ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ صمد اپنے والدین کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں، ۱۹۶۳جب یہ کالج کے سیکنڈ ائیر میں تھے والدہ کا انتقال ہو گیا، ان کی بقیہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی والدہ بہنوں اور بھائیوں نے پوری کی، چھوٹے ہونے کے باعث لاڈلے بھی تھے، بھائیوں نے انہیں خوب خوب آزادی دے رکھی تھے، دوران تعلیم موٹر سائیکل اور کار کا استعمال کیا کرتے تھے، جامعہ میں پہنچے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، شکل صورت پر کشش، ہینڈسم ، چاکلیٹی مسکراہٹ اور سونے پر سہاگہ یہ کے چار ویل موجود، دوستوں خصوصاً لڑکیوں کے متوجہ ہونے کے تمام تر لوازمات موجود تھے۔ اسلامیہ کالج سے بی ایس سی کرنے کے بعد لائبریری سائنس میں داخلہ لیا، بہت اچھا وقت جامعہ میں گذارا، شعبہ کی طلبہ سوسائٹی

کے صدر بھی رہے، الیکشن لڑتے اور لڑواتے بھی رہے۔ اپنے زمانے میں ادبی، سماجی و ثقافتی پروگرام منعقد کرنے میں طاق تھے، اب بھی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی پروگرام کرڈالیں، سبزواری صاحب کی پاکستان آمد کے منتظر رہتے ہیں، ان کی آمد سے قبل ہی پروگرام ترتیب دینے کی منصوبہ سازی کرڈالتے ہیں۔

صمد انصاری کی ایک بہن ۱۹۶۲ میں جامعہ کراچی سے MSc کرنے کے بعد لندن چلی گئی اور وہی مستقل سکونت اختیار کر لی، ان کی دوسری بہن 'حبیبہ خاتون' نے بھی لائبریری سائنس میں ایم اے کیا ہوا تھا، صمد کو اس شعبہ میں آنے کی ترغیب انہیں سے ملی، کیونکہ وہ ان سے قبل لائبریری سائنس کی ڈگری لے چکیں تھیں۔ اردو میں بھی ایم اے تھیں، ادبی ذوق بھی رکھتی تھیں، اچھی شاعرہ بھی تھیں، ان کی غزلیں مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ صمد انصاری کے خاندان میں لیٹ شادی کرنے کی روایت رہی ہے، حبیبہ خاتون کی شادی کراچی میں لیکن دیر سے ہوئے، اولاد بھی نہیں تھی، ساتھ ہی زندگی نے بھی وفا نہ کی، دونوں بہن بھائی برابر برابر فلیٹ میں رہا کرتے تھے، ایک دن صمد نے بتایا کہ بہن پر فالج کا حملہ ہوگیاہے، صمد نے بہت خدمت کی، ان کے شوہر بھی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، صمد بہن کی بیماری سے پریشان رہا کرتے تھے، کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور حملہ ہوااور وہ کچھ دن زندگی سے لڑتے لڑتے ہار گئیں اور اللہ کو پیاری

ہوگئیں۔ حبیبہ خاتون کی ایک غزل کے چند
اشعار ؎
راہ دل کی تھی نہ کوئے جسم و جاں کی بات تھی
کاوشِ پیہم کا مقصد جستجوئے ذات تھی
کائناتِ وقت میں محصور تھے مجبور تھے
بن گئے کتنے فسانے مختصر سی بات تھی

صمد کی شادی لیٹ ہوئی، صمد کے سب سے بڑے بھائی اور صمد کی شادی ایک ساتھ ہی ہوئی تھی، لیٹ شادی کے کچھ فوائد ہیں تو نقصانات بھی ہیں جن کا احساس دیر سے ہوا کرتا ہے۔ صمد کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیاں (فائزہ اور مدیحہ) اور ایک بیٹے (سعود) سے نوازا، دونوں بیٹیوں کی بالفضل تعالیٰ شادیاں ہوچکی ہیں، مدیحہ لندن میں اور فائزہ لاہور میں رہتی ہیں، فائزہ نے فزیالوجی میں ایم ایس سی کے ساتھ لائبریری سائنس کا کورس بھی کیا ہوا ہے جس ناتے سے یہ میری شاگرد بھی ہے۔ سعود این ای ڈی یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس کے فائنل ایئر میں ہیں۔

صمد انصاری کے گھر کا ماحول علمی اور شاعرانہ تھا، خاندان کا تقریباً ہر شخص شاعری کے ہنر سے واقف تھا انکے بزرگوں میں ریاض جیوری، معین الدین شیدا

عبدالرحمٰن دریا، پروفیسر یوسف جمال، محفوظ الرؤف اور آصف جمال خاصے معروف، ہیں بڑی بہن اور بھائی شعری ذوق رکھتے تھے۔ صمد انصاری میں شعری ذوق ابتداء ہی سے تھا آٹھویں کلاس میں بچوں کی نظموں سے شاعری کی ابتداء ہوئی، روزنامہ جنگ میں بچوں کے صفحہ میں ان کی نظمیں شائع ہوئیں۔ پاکستان میں اولین رہائش مارٹن کواٹر میں تھی، گلوکار ایم کلیم، احمد رشدی، مسرور انور اور راغب مراد آبادی ان کے ہمسائے تھے۔ گھر کا ماحول شاعرانہ تھا، ان کے گھر ادبی نشستیں بھی ہوا کرتیں تھیں سلیم احمد، اطہر نفیس، خالد علیگ، صادق مدہوش، شیدا گجراتی، اسد محمد خان اور ساقی فاروقی ان شعری نشستوں میں شریک ہوا کرتے۔ صمد انصاری مشاعرے کے شاعر نہیں لیکن انہیں بے شمار موقع محل کی مناسبت سے شعر یاد ہیں، شعر کہتے بھی ہیں۔ پیروڈی کے بھی ماہر ہیں۔

مجلسی آدمی ہیں، دوستوں میں رہنا، ہنسی مزاق، تفریحی ماحول کے شوقین ہیں، دوستوں کے دوست، یاروں کے یار، جس محفل میں ہوں، نمایاں نظر آتے ہیں، برملا شعر سناتے ہیں یا گفتگو کی مناسبت سے کوئی چٹکلا چھوڑنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

وفا شعار ہیں ہم دوستی میں یکتا ہیں\
ملے نہ دادِ وفا اس کا غم نہیں کرتے

بڑوں، بزرگوں، استادوں کا احترام ان کا خاندانی شعار ہے، اپنے استاد ڈاکٹر

غنی الاکرم سبزواری

کے پرستاروں میں صف اول میں سے ہیں۔یوں تو سبزواری صاحب کے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن صمد انصاری اپنے استاد سے جس قدر احترام اور عزت کا عملی ثبوت دیتے ہیں اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔اس عقیدت و محبت میں خلوص و سچائی کی چاشنی پائی جاتی ہے۔بقول منظر بھوپالی ؎

اپنے اسلاف کی عظمت کے پرستار ہیں ہم
سگ دربار نہیں صاحبِ کردار ہیں ہم

لائبریری سائنس میں ماسٹرز کرنے کے بعد صمد انصاری نے عملی زندگی کا آغاز جامعہ کراچی کے کتب خانے سے کیا۔ جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں اپنے روزو شب کی تفصیل ، ملازمت حال اور جناب عادل عثمانی و ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری سے اپنے تعلق کا مختصر احوال صمد انصاری نے اپنے ایک مضمون ''میرے مربی میرے مہربان'' میں اس طرح لکھا ''میں نے جب شعبہ لائبریری سائنس میں داخلہ لیا تو میری خوش قسمتی تھی کہ اسوقت شعبہ کے بانی بابائے لائبریری سائنس ڈاکٹر عبدلمعید شعبہ اور لائبریری دونوں کے سربراہ تھے اور کیا غضب کا معیار اور ڈسپلن تھا۔معید صاحب کے علاوہ میرے استادوں میں ڈاکٹر انیس خورشید صاحب، ڈاکٹر غنی الاکرام سبزواری، اظہارالحق ضیاء صاحب اور اختر حنیف صاحب، مظہر باری خان صاحب شامل تھے ۔ عادل عثمانی صاحب اور

ممتاز بیگم صاحبہ جزوقتی اساتذہ میں شامل تھے میری بڑی خواہش تھی کہ مجھے عثمانی صاحب کا کورس ملے لیکن مجھے سائنس گریجویٹ ہونے کی وجہ سے مس ممتاز کے کورس میں بھیج دیا گیا مجھے بڑا افسوس تھا کہ میں اس عظیم شخصیت کا شاگرد نا بن سکا لیکن یہ افسوس اسوقت ختم ہو گیا جب ۱۹۷۴ میں ایم۔ایل۔آئی۔ایس کے فوراً بعد یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت کا موقع ملا۔ ہوا یوں کہ ابھی ہمارا رزلٹ صرف نوٹس بورڈ پر ہی لگایا گیا تھا کہ یونیورسٹی لائبریری میں کچھ نئے پروفیشنلز کی آسامیاں خالی ہوئیں اور سبز واری صاحب جو اسوقت شعبے کے چیئرمین تھے مجھے اور صمید بیگ کو عثمانی صاحب سے ملنے کو کہا صمید بیگ اور ہم دونوں کا شمار اسوقت کے ٹاپ ٹین طلبہ میں کیا جاتا تھا عثمانی صاحب نے ٹیسٹ لیکر کل سے کام پر آنے کے لئے کہہ دیا اسطرح ہم دونوں کا تقرر کیٹلاگر کے طور پر کر دیا گیا اور یوں ان سے افسر اور ماتحت والا رشتہ قائم ہو گیا اور ہم دونوں نے عثمانی صاحب کے زیر تربیت اپنے پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا ہم نے عثمانی صاحب کو نہایت مہربان، اصول پسند اور مستعد افسر پایا وہ ہمیں اپنے دفتر میں بلا کر اکثر لائبریری کے مختلف شعبوں کے بارے میں تفصیلات بتاتے اور محنت سے کام کرنے کی تلقین کرتے صمید بیگ کچھ ماہ کام کرنے کے بعد سعودی عرب چلے گئے اور انکی جگہ ہمارے ہی شعبے کے ایک ذہین طالبعلم سبطِ اختر نصیری کی تقرری ہو گئی مجھے اور سبطِ اختر صاحب کو ٹیکنکل سیکشن میں درجہ بندی کرنے کے لئے تعینات کر دیا گیا

جہاں ہماری انچارج مسز خان تھیں اور یوں چند سال میں ہم نے ان سے درجہ بندی سیکھی اور بہت کام کیا بعد میں اسی کام کے تجربے کی وجہ سے شعبہ میں جزوقتی استاد منتخب کرلیا گیا عثمانی صاحب بہت خوش ہوئے اور مجھے بلا کر مبارک باد دی وہ خود بھی شعبے میں پہلے سے ہی جزوقتی طور پر ایک کورس پڑھا رہے تھے ۔۱۹۷۵ سے ۱۹۷۸تک مجھے یونیورسٹی لائبریری کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کا موقعہ ملا اس میں بھی عثمانی صاحب کی مہربانیاں شامل تھیں عثمانی صاحب نے ہی مجھے لائبریری سے شائع ہونے والے نیوز لیٹر کے ادارت میں شامل کیا اور اسطرح میرا لکھنے پڑھنے کا شوق جو کچھ بھی ہے یہ عثمانی صاحب کی وجہ سے ہے بعد میں مجھے انکی زیر نگرانی شائع ہونے والے رسالہ ' پاکستان لائبریری بلیٹن 'موجودہ نام ' پاکستان لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس جنرل' میں شامل ہونے کا موقع بھی ملا اس تین سال کے عرصے میں میں نے عثمانی صاحب کو نہایت شفیق اور مہربان افسر اور استاد کے طور پر پا لیا تھا شاید اگر میں انکا ایک سیمسٹر کا شاگرد ہو بھی جاتا تو مجھے اسقدر سیکھنے کا موقعہ نا ملتا جو مجھے ان تین سالوں میں حاصل ہوا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ میرے سب سے عزیز استاد ڈاکٹر غنی الاکرام سبزواری کے سب سے عزیز استاد ہیں اسطرح میں انکو اپنا دادا استاد شمار کرتا ہوں اس طور پر ان سے ایک جذباتی لگاؤ ہونا یقینی تھا جذباتیت سے قطع نظر عثمانی صاحب ایک نہایت مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے انتہائی خوش لباس اور وضع قطع کے لحظ سے نستعلیق شخصیت تھا

جائے تو پچانا ہوگا ایسی شخصیات کے جدا ہونے کا افسوس کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہی شعر بار بار پھر زبان پر آتا ہے ۔

اور وہ جو دلنواز تھا وہ تو چلا گیا

ایک سوگوار درد سے رشتہ ضرور ہے

جامعہ کراچی کے بعد صمد انصاری سعودی عرب چلے گئے لیکن وہاں ان کا قیام مختصر رہا، واپس کراچی آ گئے اور انسٹی ٹیوٹ آف بنکرز کے چیف لائبریرین ہوگئے، میری دوستی انہیں انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز سے کالج کھینچ لائی، انہوں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور اور گورنمنٹ نبی باغ کالج کے لائبریرین ہوگئے، وہیں سے ریٹائر ہوئے، مصروفیت کو جاری رکھتے ہوئے گلشن اقبال میں ورکس کوآپریٹیو

ہاؤسنگ سوسائیٹی کے کمیونیٹی سینٹر میں قائم لائبریری میں بطور لائبریرین منسلک ہوگئے، تاحال یہ مصروفیت جاری ہے۔

ان کے ہر دل عزیز استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری نے اپنی سوانح حیات ' 'کیا بیت گئی؟ قطرہ پہ گُہر ہونے تک'' میں صمد انصاری کے بارے میں لکھا ''یہ بھی میرے ہونہار شاگرد ہیں۔ ذرا نازک مزاج ہیں۔ادبی اور شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں۔ تعلیم کے دوران خاصے سوشل تھے۔ ایم اے لائبریری سائنس ہیں۔ بی

باغ کالج میں لائبریرین رہے وہاں سے فارغ ہونے کے بعد گلشن اقبال میں ورکس کو آپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی کی لائبریری میں لائبریرین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ہمارے ساتھ بیورو (لائبریری پروموشن بیورو) کے کام میں شریک ہیں۔ ہمارے ہیں، مضامین لکھتے رہتے ہیں اور رئیسAssociate Chief Editor مجلّہ میں احمد صمدانی صاحب کے لائبریری اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن میں بھی متحرک ہیں اور پیشہ ورانہ انجمنوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک کتاب جو حال ہی میں شائع ہوئی 'اسکول کے کتب خانے' کے شریک مصنف ہیں"۔

صمد انصاری کی ایک غزل ؂

وہ مجھے یاد نہیں اور اُسے بھولا بھی نہیں
دل ہے تنہا مگر ایسا تنہا بھی نہیں
دشمنِ جاں بھی نہیں اور مجھے پیارا بھی نہیں
وہ جو اپنا بھی نہیں اور پرایا بھی نہیں
کیوں فضا سرد ہے دل کی مجھے احساس کہاں
آتشِ غم سے سجاؤں کوئی شعلہ بھی نہیں
فصلِ گل آئی ہے لیکن کوئی زنجیر نہیں
ہار پھولوں کا نہیں پاؤں میں کانٹا بھی نہیں
دل بھی زخمی نہیں اور آنکھ میں آنسو بھی نہیں

حال اچھا ہے مگر ایسا اچھا بھی نہیں
غم کا احساس گیا اپنی بھی پہچان گئی
جو مجھے ڈھونڈ کے لائے کوئی ایسا بھی نہیں
اب کے کچھ اور بدل ڈالا ہے میں نے خود کو
کوئی جب دل کو دکھاتا ہے تو ہنستا بھی نہیں
صمد انصاری کی ایک تازہ غزل ۔
اداس شام بہت تھی مگر گزر ہی گئی
جو تیری یاد میں گزری تو کچھ سنور ہی گئی
جو آگ تیری محبت نے ہم کو بخشی تھی
وہ آگ راکھ ہوئی اور پھر بکھر ہی گئی
وہ آئے بزم میں لیکن ہمیں نہ دیکھ سکے
نظر اٹھی تو مگر ہم سے بے خبر ہی گئی
ہر ایک کاوش گرما کے بے اثر ٹھہری
وہ موج درد مگر اپنا کام کر ہی گئی
چہار سمت تباہی کا جال پھیلا کر
چڑھی ہوئی وہ ندی آخرش اتر ہی گئی
کراچی، ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء
(مصنف کے خاکوں کے مجوعے ”جھولی میں ہیرے اور موتی“ میں شامل)

تابش صمدانی - شخصی خاکہ

۱۶اپریل ۲۰۰۲ء بروز منگل کالج سے شام پانچ بجے گھر واپسی ہوئی ابھی کچھ وقت ہی ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی چھوٹے بیٹے نبیل نے کہا ابو مغیث دادا کا فون ہے بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئے کہ ملتان میں تابش بھائی کا انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کا پورا جملہ نہیں سنا۔ سنتا کیا۔۔۔طویل تعلق ، ابھی تین ماہ قبل کی ملاقات اور کوئی ایک ہفتہ قبل اپنے نام ان کا تحریر کردہ خط جس کے ہمراہ انہوں نے اپنا تازہ مجموعہ کلام (مرحبا سیدی) بھی بھیجا تھا سب کچھ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ معلوم کرنے پر بتایا کہ انتقال آج ہی سہ پہر چار بجے ہوا ہے کل ظہر کی نماز کے بعد تدفین ہو گی میں نے دوبارہ دریافت کیا کہ کیا واقعی تدفین کل ظہر میں ہو گی کہنے لگے کے ہاں ایسا ہی ہو گا میں کل صبح بذریعہ ہوائی جہاز جارہا ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اگر میں رات کی کسی بھی ٹرین سے سوار ہو جاؤں تو کل صبح بہت آسانی سے ملتان پہنچ جاؤنگا اور تدفین میں شرکت ہو جائے گی چنانچہ اس پروگرام پر عمل کرتے ہوئے میں رات کی ٹرین میں سوار ہونے اسٹیشن پہنچا شہناز، عدیل اور نبیل اسٹیشن چھوڑنے گئے جوں ہی اسٹیشن پہنچا ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی رینگنے لگی ، ٹکٹ بھی نہیں لیا تھا اگر ٹکٹ لینے رک جاتا تو ٹرین چھوٹ ہی جاتی ۔ میں چلتی ٹرین میں جو ڈبہ

سامنے آیا سوار ہو گیا شروع میں تو سیٹ نہیں ملی رات میں کسی وقت پولس والوں کی مہربانی سے بیٹھنے کی جگہ مل گئی ساتھ ہی ٹی ٹی سے ٹکٹ بھی بنوالیا اس طرح اگلے دن ۱۲ بجے کے قریب بڑی ہی مشکل سے گھر ڈھونڈتا ہوا گھر پہنچا۔ قسمت میں تدفین میں شرکت نہیں تھی گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ احباب ابھی ابھی قبرستان سے واپس آکر بیٹھے ہیں پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے تدفین صبح ہی کر دی گئی۔ ملتان کے اخبارات میں جو خبر تابش صمدانی کے انتقال کی شائع ہوئی اس میں بہت واضح طور پر تحریر تھا کہ تدفین بعد نماز ظہر کی جائے گی۔ نا معلوم کیا وجوہات تھیں۔ عام طور پر ہارٹ اٹیک کی صورت میں انتقال ہو جانے یا بہت ہی موٹے جسم والے کے لیے تدفین میں عجلت کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہاں تو دونوں ہی صورتیں نہ تھیں ۔ عام زندگی میں ہی تابش صمدانی انتہائی دبلے پتلے تھے رہی سہی کسر کینسر جیسے مرض نے پوری کر دی تھی ۔اس فیصلے سے نہ صرف میں بلکہ ملتان سے تعلق رکھنے والے وہ احباب جنھوں نے اخبار میں تدفین کی خبر پڑھی تھی تدفین میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ بعض احباب میری موجودگی میں تدفین میں شرکت کرنے ظہر کی نماز میں آئے۔ ان سب کو میری ہی طرح دکھ ہوا ہو گا۔ دل ہی دل میں افسوس کرتا رہا کاش میں نے ٹرین سے پروگرام نہ بنایا ہوتا اور ہوائی جہاز سے آجاتا اب کیا ہو سکتا تھا۔ دل میں تدفین میں عدم شرکت کی کسک لیے اسی رات واپسی کا سفر باندھا اور مشکل سفر کے بعد گھر واپسی ہوئی۔ سفر میں مرحوم کی شخصیت اور ان سے کی ہوئی

گفتگو اور خط و کتابت جس کے مطابق میں نے ان سے کہا تھا کہ ’’ میں آپ کی شخصیت اور نعت گوئی پر لکھوں گا ‘‘ کے بارے میں سوچتا رہا کہ کاش میں ایسا ان کی زندگی ہی میں کر سکتا پھر یکایک خیال آیا کہ اب وہ ہم سے بہت دور جا چکے ہیں لیکن ان کی یادیں اور سب سے بڑھ کر ان کی کتابیں (نعتیہ مجموعہ کلام) تو موجود ہیں جو اب میرے اس ارادے کی تکمیل میں معاون ہو نگی، یہ کتابیں انہیں تا ابد زندہ رکھیں گی۔ معروف شاعر صہبا اختر نے کتاب کی اہمیت کو اپنی نظم ’’کتابیں‘‘ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کتابوں کا افسوں نہیں ٹوٹتا
کبھی ان کا سورج نہیں ڈوبتا
کتابوں کی طاقت ہیں فکر و خیال
کتابوں کو ممکن نہیں ہے زوال
مبارک ہیں وہ ہاتھ اور قلم جو کرتے ہیں زندہ کتابیں رقم

اپنے ارادے اور تابش صمدانی سے کیے ہوئے وعدے کی تکمیل میں پانچ سال لگ گئے۔ تابش صمدانی پر کتاب تو نہ لکھ سکا ارادہ کتاب لکھنے کا ہی تھا یہ سوچ کر کہ انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ ایسا نہ ہو کہ خواہش دل ہی دل میں رہ جائے اور اسی خواہش میں اگر کہیں جنابِ تابش سے آمنہ سامنہ ہو گیا تو میں انہیں کیا منہ دکھاؤنگا بس مضمون پر ہی اکتفا کر لیا۔ قارئین سے یہ وضاحت

ضروری ہے کہ تابش صمدانی میرے والد کے چچازاد بھائی ہیں اس رشتہ سے میرے چچا ہیں لیکن مجھے ان سے اور شاید انہیں مجھ سے خاص انسیت تھی ، وجہ مجھے نہیں معلوم میں تو ان سے اس وجہ سے متاثر ہوں کہ وہ میرے خاندان کے ایک ایسے فرد ہیں جو، علم و ادب اور شعر گوئی کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤاجداد کے علمی اور ادبی ورثہ کو اپنی آئندہ نسل میں منتقل کرنے کے امین تھے ۔وہ بھی مجھ پر مہرباں تھے شاید انھوں نے مجھ میں بھی کچھ ایسی ہی صفات محسوس کی ہوں واللہ عالم بالثواب۔

نام طفیل احمد صمدانی ، تخلص تابش،تابش صمدانی سے معروف ہیں۔ ہندوستان کے صوبے راجستھان کے شہر بیکانیر (جو کبھی ریاست بیکانیر تھی) میں اپنے آبائی مکان آزاد منزل'' میں ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے۔آپ خاندانِ باری بخش جو بعد میں'' خاندانِ حسین پور کہلایا کی ۳۶ ویں نسل سے ہیں۔آپ کے والد ماجد کا نام خلیل صمدانی اور دادا کا نام شیخ محمد ابراھیم آزاؔد ہے۔ناچیز کے خیال میں :

باغِ ابراھیم کا ایک پھول ہیں تابش
جانشین آزاؔد اور جانِ خلیل ہیں تابش
،آزاؔد، خلیل اور تابش ایک ہی تسلسل کے تین نام ہیں ، خاندان، پیشہ

مزاج، عادات واطوار، ذوق علم وآگہی، شعر گوئی وشعر فہمی اور سب سے بڑھ کر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق اور عقیدت اور اس کا اظہار نعت گوئی کے ذریعہ کرنا ایسی قدرِ مشترک ہے کے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ایک ہی خاندان کے دادا، بیٹے اور پوتے میں تسلسل کے ساتھ اسقدر مطابقت اور قدر مشترک کا پایا جانا خدا تعالیٰ کا خاندان باری بخش کے لئے ایک انمول عطیہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی اس عنایت پر جس قدر شکر ادا کریں کم ہے :

ہو نہ کیوں ناز ہمیں آزادؔ، خلیقؔ وتابشؔ پر
کہ ایک ہی چمن کے یہ درخشندہ ستارے ہیں
رہی ہمیشہ جن کے لبوں پر سرکار کی مدحت
جو صدیوں میں ہوں پیدا یہ مہ انجم ہمارے ہیں

تابشؔ صمدانی نے اپنے آبائی شہر بیکانیر کے آبائی گھر ”آزاد منزل“ میں آنکھ کھولی تو آزاد منزل کے درو دیوار شعر و سخن کی فضاء سے منور و معمور تھے۔ آزاد منزل کو علم و ادب ،شعر گوئی اور مدحت رسول ﷺ کی محافل کے انعقاد میں راجستھان میں عام طور پر اور بیکانیر میں خاص طور ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ بقول انصار محشرؔ عباسی امروہوی ” بیکانیر میں اردو ادب کی داغ بیل کا سہرا آزادؔ مرحوم نے ڈالا “۔ ہندوستان کے معروف شعراء آزاد منزل

میں منعقد ہونے والی ادبی مجالس اور مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے اس ادبی ماحول، خاندانی اثرات اور اپنے والد کی سرپرستی نے تابشؔ صمدانی کی شخصیت کو مجسم سخن فہم اور عاشق زار بنادیا :

وراثت میں ملی ہیں جسے آبا کی صفات

کتنا خوش نصیب مدحت سرا ہے تابشؔ

تابشؔ صمدانی کو وکالت کے ساتھ ساتھ شعر و نعت گوئی ورثہ میں ملی ۔ تابشؔ صمدانی کے دادا جناب آزادؔ، والد بزرگوار خلیلؔ صمدانی اور خاندانِ باری بخش کے بے شمار احباب شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ تابشؔ نے از خود اس بات کا اعتراف برملا کیا کہ انہیں مدحت کا قرینہ ورثہ میں ملا۔ آپ کہتے ہیں :

یہ بھی مرے اجداد کا احسان ہے تابش

ورثہ میں ملا ہے مجھے مدحت کا قرینہ

جناب حافظ لدھیانوی نے تابشؔ صمدانی کے مجموعے کلام 'مرحبا سیدی' میں 'فکر تابشؔ' کے عنوان سے اظہار خیال کرتے ہوئے واضح کیا کہ " تین پشتوں سے یہ معزز گھرانہ حضور ﷺ کے مدحت نگاروں کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ تین پشتوں سے گھر کی فضاء میں نعت کے زمزمے گونجتے رہے ہیں میر انیسؔ نے اپنے

خاندنی شرف کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا ’’پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں‘‘ حافظ صاحب نے اس مصرعہ کی مناسبت سے ایک اور مصرعہ کہا اور تابشؔ صمدانی کو مشورہ دیا کہ وہ اس کرم خاص کا ذکر کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ’’ تیسری پشت ہے سرکار کی مداحی میں ‘‘۔ الحمد اللہ خاندان باری بخش میں شروع ہی سے ذوق شاعری بدرجہ اتم موجود ہے اوران کا شمار حضور اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کی مداح سراحوں میں ہوتا ہے۔ جناب آزادؔ کے بعد تیسری ہی نہیں بلکہ چوتھی اور پانچویں پشت میں بھی ذوق نعت گوئی پایا جاتا ہے۔ الحمد اللہ تابشؔ صمدانی کے بیٹے رہبر اور سرور شعری ذوق رکھتے ہیں۔ عجز و انکساری کا پیکر، قناعت اور پاک باطنی ان کی سرشت میں تھی۔ تہذیب و شائستگی ان کے خمیر میں شامل تھی۔ وہ ایک بے باک اور کھرے انسان تھے اور سب سے بڑھ کر سرتاپا عاشق رسول ﷺ اور بزرگوں کا حد درجہ احترام تابشؔ صمدانی کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ علامہ احمد سعید شاہ کاظمیؒ کے صاحبزادے جناب مظہر سعید شاہ کاظمی تابشؔ صمدانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ’جب میں نے تابشؔ صمدانی کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نحیف و نزار اور کمزور و ناتواں شخص عزم صمیم کا پیکر ' اِخلاص و ایثار کا مجسمہ اور جذبوں کا جوالا مکھی ہے عشق رسول ﷺ اس کا مسلک اور بزرگان دین اور اولیاء کرام سے عقیدت و محبت اس کا شرف ہے یہی وجہ ہے کہ نعت رسول ﷺ مقبول ہو یا منقبت

اولیا کرام تابشؔ صمدانی کے کلام میں ادبی خوبیوں اور فنی محاسن کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اور مثرہ پر چمکتے ہوئے آنسو دکھائی دیتے ہیں'۔ در حقیقت تابشؔ صمدانی عجز وانکساری کا پیکر تھے۔بزرگوں کا حد درجہ احترام کیا کرتے اپنوں سے چھوٹوں کے ساتھ بھی انکساری سے پیش آتے۔بزرگوں کا احترام تو ان کی زندگی کا شعار تھا۔ ایک جگہ آپ کہتے ہیں :

مجھ کمتر و بے مایہ پہ الطاف کی بارش
تابشؔ یہ ثمر ہیں۔بزرگوں کی دعا کے

تابشؔ صمدانی نمود و نمائش ، دکھاوے اور شہرت سے بہت دور تھے۔ ان کی گفتگو سادہ، لباس میں حد درجہ سادگی ، رہن سہن میں سادگی اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تابشؔ صمدانی کی ظاہری اور باطنی کیفیت منکسرانہ اور عاجزانہ تھی وہ اپنی گفتگو ، لب و لہجہ چال ڈھال اور برتاؤ میں ایک مثالی انسان تھے البتہ شاعرانہ خصوصیات نمایاں تھی۔ ، انہیں دیکھ کرایک عام آدمی بھی یہ کہ سکتا تھا کہ موصوف شاعر ہیں۔ مولوی محمد سلطان عالم انصاری ایڈووکیٹ سپریم کورٹ ملتان کے مطابق ''انہوں نے کبھی نام و نمود اور شہرت حاصل کرنے کے ذرائع نہیں اپنائے پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ملتان میں نعت گوئی کے فروغ میں جو خدمات سرانجام دی ہیں انہیں کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکے گا''۔ملتان ہی کے جناب حافظ محمد فاروق خان سعیدی کا کہنا

ہے کہ تابشؔ صمدانی ملتان کی نامور اور ہردلعزیز علمی و ادبی شخصیت ہیں آپ زود گو اور مشاق سخنور ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز قانون داں بھی ہیں۔ شاعری کے علاوہ قانون دانی بھی آپ کو ورثہ میں ملی ہے'۔

میں تابش صمدانی کے انتقال سے کوئی چار ماہ قبل (۶ جنوری ۲۰۰۲ء) کو ملتان جانے اور ان کی تیمارداری کا شرف حاصل ہوا۔ برادرم سہیل صمدانی نے مشکل آسان کی اور اپنے ہمراہ مجھے تابشؔ صمدانی کے گھر لے گئے۔ راقم بہت عرصہ سے ان کی شخصیت اور نعت گوئی پر لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا چنانچہ دیگر باتوں کے علاوہ اپنے اس ارادہ کا اعادہ بھی کیا۔ آپ اس وقت اپنی بیماری (کینسر) سے نبرد آزماں تھے، سخت تکلیف اور کرب میں تھے۔ ایسی صورت میں انسان حوصلہ افزائی ہی کر سکتا ہے سو ایسا کیا اپنے مزاج کے مطابق کسر نفسی سے کام لیا بات یہ طے ہوئی کہ میں کراچی جا کر ایک سوالنامہ بھیجوں گا وہ ان سوالات کے جوابات تحریر کرکے بھیج دیں گے۔ چنانچہ راقم نے ایسا ہی کیا دوسری جانب موذی مرض ان پر حاوی آتا جارہا تھا اور وہ اس کے ہاتھوں اندر ہی اندر شکست کھاتے جارہے تھے۔ اپنے انتقال سے ایک ماہ گیارہ دن قبل (۵ مارچ ۲۰۰۲ء) کو آپ نے راقم کو ایک خط تحریر کیا جس کے اوپر تحریر تھا ''بستر علالت سے'' ۔ خط کا مکمل متن حسب ذیل ہے۔

بستر علالت سے - ۷۸۶ - 5/3/2002

عزیز محترم رئیس صمدانی صاحب سلام مسنون

کچھ روز ہوئے والانامہ ملا۔ علالت بڑھتی جارہی ہے۔ پروردگار عالم کی رحمت کی آس ہے۔ انسان کو ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے۔ آج پھر کیمو تھراپی کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ ہو رہا ہوں۔ ایک ہفتہ گھر پر اور دو ہفتے اسپتال میں گزرتے ہیں۔ انشاللہ جلد ہی دوسرا نعتیہ مجموعہ ''مرحبا سیدی'' منظر عام پر آرہا ہے پیش کروں گا۔''آزادؔ'' پر جو مضمون تحریر فرمایا اس کی کاپی عنایت کریں (اپنے جد امجد حضرت شیخ محمد ابراھیم آزادؔ پر راقم کا تحریر کردہ مضمون قصور سے شائع ہونے والے رسالے 'انوار الصوفیہ' میں شائع ہوا تھا)۔ انٹر ویو کے لیے بہتر اور معروف شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ میں کیا اور میری شخصیت کیا۔ اگر زندگی اور علالت نے اجازت دی جس قابل ہوں سوالنامہ کا جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں آپ محنت اور کاوش فرمارہے ہیں۔ یہ اپنی جگہ تعمیری کام ہے۔ کراچی کے بیشتر عزیزان سے قریب قریب رابطہ ختم ہوگیا ہے اور نہ ہی ان حضرات کے ایڈریس معلوم ہیں۔

آپ نے ملاقات کے لیے وقت نکالا اس کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ 'مرحبا سیدی' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خط بھی شامل ہو رہا ہے جو اپنی جگہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔ خدا کرے بات بن جائے اور یہ کلام بارگاہِ رسالت میں

مقبول ہو جائے۔ علالت کے زمانے میں ہی کلام رہبر اور سرور (دونوں آپ کے بیٹے ہیں) سے یکجا کروایا۔ خود ہی اپنے کلام کا جیسا تیسا انتخاب ہو سکا کیا ہے۔انشاء اللہ کتاب آنے پر فوری آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔ دعا فرمائیں خیریت سے یہ شارٹ کامیاب رہے اور گھر خیریت سے واپسی نصیب ہو۔ بھابی صاحبہ (راقم کی والدہ محترمہ) کی خدمات میں خاص طور پر دعا کی استدعا ہے۔ عزیزان کے لیے سلام و دعا۔ گھر کا فون نمبر ۷۷۷۸۷۷ ہے۔ کچھ روز پہلے ہی فون لگا ہے۔ مغیث صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام اور دعا کے لیے عرض کر دیجئے گا۔ اب ہمارا بھی کیا پتہ ہے۔ خدا جانے حالیؔ نے کس کرب سے شعر کہا تھا :

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا

یادگارِ بزم دلی ایک حالیؔ رہ گیا

پروردگار عالم آپ کا حافظ و ناصر رہے اور آپ اسی طرح علمی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہیں۔ فقط والسلام

دعا گو بھی اور محتاج دعا بھی ، تابشؔ

تابشؔ صدانی بیماری کی اس کیفیت میں بھی بلند حوصلہ تھے ان کی بیماری ان کے کمزور اور نحیف جسم پر تو حاوی آتی جارہی تھی لیکن وہ کسی صورت بھی ان

کے حوصلے اور قوت ارادی کو شکست نہ دے سکی۔ وہ تو اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھتے تھے اور حضور اکرم ﷺ کے سچے عاشق اور مداح سراہوں میں سے تھے۔ عشق رسول سے والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ سخت اذیت اور تکلیف میں ہونے کے باوجود خواہش ہی نہیں بلکہ عملی طور پر اس جستجو میں تھے کہ کسی طرح ان کا دوسرا نعتیہ مجموعہ کلام منظر عام پر آ جائے۔ آپ کی یہ خواہش پوری ہوئی آپ کا مجموعہ کلام ''مرحبا سیدی'' آپ کے انتقال سے چند روز قبل منظر عام پر آگیا۔ انتقال سے صرف ۱۲ روز قبل ۴مارچ ۲۰۰۲ء کو آپ نے ایک مختصر خط راقم

الحروف کو تحریر کیا جس کے ہمراہ آپ نے اپنے تازہ مجموعہ کلام کی کاپیاں بھی ارسال کیں۔ خط کا مکمل متن کچھ اس طرح ہے۔

بستر علالت سے۔ ۷۸۶ ۔ مورخہ ۴ اپریل ۲۰۰۲ء

عزیز محترم رئیس صمدانی صاحب سلام مسنون !

گزستہ دنوں آپ کا خط ملا۔ علالت کی یہ نوعیت ہے ایک ماہ میں کم وبیش پندرہ روز اسپتال میں گذرتے ہیں۔ کل پھر کیمو تھراپی کا شارٹ لگنا ہے۔ ایک ہفتہ دس روز ایڈمٹ رہنا ہوتا ہے۔ دوسرا نعتیہ مجموعہ ''مرحبا سیدی'' پیش کر رہا ہوں ۔ ایک کتاب برادر مغیث صمدانی صاحب اور ایک کتاب انعام صدیقی صاحب کے لیے ہے۔ ان حضرات کو بھجوا دیں۔ میرے پاس ان کا ایڈریس نہیں ہے۔ انٹرویو کے لیے مناسب شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔ میں کیا اور میری شخصیت کیا۔

تاہم زندگی رہی اور بیماری نے کچھ مہلت دی تو آپ کے سوال نامے کا جواب عرض کردوں گا۔ آپ البتہ بروشر کے لیے اپنے تاثرات عنایت کریں۔ محترمہ بھابی صاحبہ کی خدمات میں سلام اور دعا کی استدعا ہے۔ جملہ عزیزان کو سلام دعا۔

فقط والسلام۔

دعا گو۔ تابش

میرے نام تابش صمدانی کا یہ آخری خط تھا ان کا پہلا خط جو میرے پاس محفوظ ہے انہوں نے ملتان ہی سے ۲۹ جون ۱۹۸۰ء کو تحریر کیا تھا۔ ان سے میری رفاقت ان کے پاکستان آنے (۱۹۷۰ء) کے بعد سے ہے جب کبھی ملاقات ہوئی دیگر خاندانی موضوعات کے علاوہ علمی اور ادبی موضوعات پر بھی گفتگو ہوا کرتی۔ خط وکتابت کا آغاز ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ میں نے حضرت شیخ محمد ابراھیم آزادؔ جو میرے پر دادا اور تابش صمدانی کے دادا ہوتے ہیں کے نعتیہ کلام کے انتخاب پر مبنی مجموعہ ترتیب دینے کا ارادہ کیا۔ تابش صمدانی نے میرے اس فیصلہ کی نہ صرف تائید کی بلکہ کلام کے انتخاب میں معاونت کا بھی وعدہ کیا۔ میں میں نے اپنی اک کتاب جنابِ تابش کو ارسال کی اس کے جواب میں آپ ۱۹۸۰ نے راقم کو ۲۹ جون ۱۹۸۰ء کو جواب تحریر کیا آپ نے تحریر فرمایا :

کتاب عنایت فرمانے کا شکریہ۔۔بڑی مسرت ہوئی۔پروردگار عالم آپ کو اس سے ”

بھی زیادہ کامیابی اور شہرت عطا فرمائے آپ خاندان حضرت آزآد کا وقار بن کر ابھریں۔ میں نے حضرت آزآد کے کلام کا انتخاب شروع کر دیا ہے یا تو میں تمام انتخاب کی نقل روانہ کردوں یا آپ ملتان کا پروگرام بنالیں۔ میں اس تحریک میں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں''۔ اس مجموعہ کلام کا عنوان ''بر لب قدسیاں'' بھی جناب تابش صمدانی نے ہی تجویز کیا تھا۔

جنابِ آزاد کا نعتیہ کلام جو میں نے اور جناب تابش صمدانی نے منتخب کیا تھا کتابت بھی کرالیا گیا اس کی تصحیح ہو رہی تھی کہ کاتب قمر صدیقی کا اچانک انتقال ہو گیا اور مجھے کتابت شدہ مسودہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا اور یہ مجموعہ منظر عام پر نہیں آ سکا جس کا افسوس آج تک ہے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۸۰ کے تحریر کردہ اپنے خط میں تابش صمدانی نے دیگر خاندانی باتوں کے علاوہ ملتان ریڈیو اسٹیشن سے حضرت علیؓ کے سلسلے میں ۴ اگست کو منقبت پڑھنے کی اطلاع بھی دی۔ ۵ نومبر ۱۹۸۰ء کو تحریر کیے گئے خط میں ۸ نومبر کی شب ریڈیو اسٹیشن ملتان سے سیدنا فاروق اعظم کی منقبت پڑھنے کی اطلاع بھی دی۔

۱۹۸۶ء کی بات ہے تابش صمدانی کراچی تشریف لائے گھر آئے لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی انہیں غالباً اسی روز واپس جانا تھا۔ میرے نام ایک پرچہ اور ایک فائل چھوڑ گئے۔ پرچہ میں تحریر تھا'' ملاقات نہیں ہو سکی۔ فائل چھوڑے

جارہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) سے مفصل تاثرات حاصل فرمائیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی کچھ کلام ابھی باقی ہے۔ جلد ہی کتابت کا کام شروع کرا رہا ہوں امید ہے اس سلسلے میں آپ خاطر خواہ تعاون فرمائیں گے''۔اس پرچہ پر تاریخ درج نہیں اور نہ ہی مجھے اب صحیح تاریخ یاد ہے البتہ اگست ۱۹۸۶ء سے پہلے کی بات ہے (یہ پرچہ اور وہ فائل میرے پاس آج بھی محفوظ ہے) یہ فائل تابش صمدانی کے مجموعہ کلام ''برگ ثنا'' کی تھی جو ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔بعد میں آپ نے اس سلسلے میں کئی خطوط بھی تحریر فرمائے۔اس مجموعہ کلام میں تابش صمدانی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، عرش صدیقی، عاصی کرنالی، اقبال صفی پوری اور حزیں صدیقی کے خیالات شامل ہیں۔ باوجود کوشش کے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے رابطہ نہ ہوسکا۔اس دوران آپ کی ایک مختصر کتاب ''نذر سعید''شائع ہوئی جو حضرت علامہ احمد سعید شاہ کاظمیؒ کے بارے میں ہے راقم نے کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات اور مبارک باد تحریر کی جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا: ''نذر سعید'' کو پسند فرمانے کا شکریہ۔ خدا کے فضل سے ادبی حلقوں میں نذر سعید کو پسند کیا گیا۔ کراچی میں علامہ احمد سعید شاہ کاظمیؒ کے بڑے مرید اور معتقد ہیں لیکن وہاں میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ نعتیہ مجموعہ ''برگ ثنا'' کی کتابت کا مرحلہ قریب قریب مکمل ہے فروری میں مکمل ہو جائے گا۔ محترم اقبال صفی پوری صاحب نے اپنے تاثرات عنایت فرما دئے ہیں۔اب کتاب کی

طباعت کا مرحلہ درپیش ہے اس سلسلے میں آپ کے تجربات اور تجاویز سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ ملتان کی طباعت کا معیار ''نذر سعید'' ہے۔ایسی طباعت تو ملتان میں ہو سکتی ہے۔اگر آپ کو مصروفیات اجازت دیں تو اپنے مشورے سے نوازیں''۔(یہ خط ۴ فروری ۱۹۸۸ء کو تحریر کیا گیا)

تابش صمدانی کے والد جناب خلیل صمدانی اور دیگر اہل خانہ اپنے بڑے بھائی جناب انیق احمد والد بزرگوار جناب رشید احمد صمدانی کی تیمارداری کی غرض سے پاکستان تشریف لائے اور ملتان میں قیام کیا۔اس دوران تابش صمدانی کے والد اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے تدفین ملتان میں ہوئی۔اس حادثہ کے بعد تابش صمدانی نے فیصلہ کیا کہ وہ اب مستقل پاکستان اور ملتان میں قیام کریں گے اپنے والد محترم کی آخری آرام گاہ کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن نہیں جائیں گے۔آپ کو اپنے والد سے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی آپ نے اپنی زندگی کا یہ معمول بنا لیا تھا کہ آپ ہر روز اپنی زندگی کے معمولات کی شروعات سے قبل اپنے والد کے مزار پر فاتحہ پڑھا کرتے بعد ازآں دنیاوی معمولات شروع کیا کرتے۔ اپنے اس طرز عمل پر آپ آخر تک قائم رہے۔

تابش ملتان میں طرحی نعتیہ مشاعروں کے انعقاد کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔آپ نے ایک ادبی انجمن 'بزم نو' قائم کی ۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ملتان شہر کے

شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور طرحی نعتیہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔

مرزا عزیز اکبر بیگ کے مطابق ''بیشتر غزل گو شعراء اس تحریک سے متاثر ہو کر نعت رسول اکرم ﷺ کی طرف مائل ہوئے اور اب ملتان میں ہر طرف نعتیہ مشاعروں کا چرچا ہے''۔تابش صمدانی کی رہائش گاہ جو نیو ملتان میں ہے نعتیہ مشاعروں کا مرکز تصور کی جاتی ہے۔

تابش صمدانی علی گیرین تھے۔آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں اردو میں ایم اے کی سند حاصل کی تھی ۔ ملتان شہر میں قائم 'علی گڑھ اولڈ بوائز ایسو ی ایشن' سے تابش دور کیسے رہ سکتے تھے ۔۱۹۷۰ء میں ملتان میں سکونت اختیار کرتے ہی آپ ایسو ی ایشن سے منسلک ہو گئے اور کئی سال اس کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ایسو ی ایشن کے صدر اور ایڈووکیٹ سپریم کورٹ ملتان مولوی سلطان عالم انصاری کے مطابق تابش صمدانی کی گرانقدر خدمات قابل تحسین ہیں۔ انہیں علی گڑھ سے والہانہ لگاؤ ہے اور اس تحریک کو وہ پاکستان کی اساس سمجھتے ہیں'۔

تابش صمدانی باہمی اخوت اور میل جول پر یقین رکھتے تھے۔ہر ایک کی خوشی اور دکھ درد میں شریک ہوتے ۔ اگر کسی دوسرے شہر میں کسی عزیز رشتہ دار کے دکھ تکلیف کا علم ہو جاتا تو اس سے خط کے ذریعہ اظہار ہمدردی کیا کرتے ۔ مجھے

یاد نہیں کہ میرے گھر کسی بھی قسم کی پریشانی یا غم میں انہوں نے خط لکھ کر اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار نہ کیا ہو۔آپ خاندان کے افراد میں باہمی میل جول، محبت، رواداری اور خوش گوار تعلق پر یقین رکھتے تھے۔ خاندانی ایسو سی ایشن '' ینگ میں حسین پوری ایسو سی ایشن''کی سرگرمیوں میں بھی آپ شریک رہے۔ ۱۹۹۰میں ایسو سی ایشن کے صدر جناب مشکور احمد نے تابش صمدانی ، رشید احمد صمدانی، جناب عبدالخالد، جناب فہیم احمد صدیقی اور ملتان شہر میں رہائش پذیر دیگر اہل خاندان کو ایسو سی ایشن کی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرنے کی دعوت دی۔ مشکور صاحب کی دعوت پر نہ صرف تابش صمدنی نے بلکہ ملتان سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام ہی حسین پوریوں نے لبیک کہا اور ایسو سی ایشن کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ایسو سی ایشن کا اجلاس عام فیصل آباد کے شہر ''بابے والا'' میں منعقد ہوا جس میں صرف ملتان شہر سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۲۰ اراکین نے شرکت کی۔آپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا ''کبھی بچپن میں ایسو سی ایشن کے بارے میں سنا تھا اب مشکور صاحب کے ملتان آنے کے بعد مجھ تک یہ پیغام پہنچا کہ ینگ مین حسین پوری ایسوایشن کا اجلاس ہو رہا ہے تو میرے ذہن میں کچھ سوالات ابھرے ، میرے سامنے ایسو سی ایشن کا منشور نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ ینگ میں حسین پوری ایسو سی ایشن کے لیے میں مدعو کیا جارہا ہوں ، میں تو اب پچاس کے پیٹھے میں ہوں ، میں بڑی الجھن میں رہا کہ مجھے اس میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں ، میرے

برادر گرامی رشید احمد صمدانی اس میں جائیں یا اپنے بچوں کو بھیجیں تو اس کے نام میں ایک ابہام ہے اسے دور ہونا چاہیے"۔آپ نے مزید فرمایا کہ" میں موجودہ انتظامیہ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں ان کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ مجھ جیسے رسوائے زمانہ اور گوشہ عافیت میں رہنے والے شخص کو وہ اسٹیج پر لے آئے تو کیا یہ ان کی ولایت نہیں ہے۔ میں تو مشکور صاحب کو صدر ہی نہیں سمجھتا بلکہ دور حاضر کا ولی سمجھتا ہوں اور جناب مشکور احمد کا کردار یہ کہ رہا ہے :

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

ایسو سی ایشن کا اجلاس عام ۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ء میں ملتان شہر میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس عام ڈاکٹر مصباح الحق صاحب کے ملتان ہومیوپیتھک میڈیکل کالج میں منعقد ہوا جس میں پاکستان بھر سے خاندان حسین پور کے احباب نے شرکت کی۔تابش صمدانی نے اپنی تقریر کا آغاز حسب روایت اس شعر سے کیا امیر آتی ہے مجھ کو شرم اس محفل میں کچھ کہتے ہوئیکہ میں ناقص ہوں اور کامل یہاں ہر فن کے بیٹھے ہیں آپ نے کہا "میں ان تمام بزرگوں کی ارواح مقدسہ کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے یہ ایسو سی ایشن قائم کی اور ہم آج ایک عظیم مقصد کے لیے یہاں یکجا ہوئے ہیں"۔ خاندان میں پائے جانے والے اختلافات اور رنجشوں کے

حوالے سے آپ نے کہا کہ ’’ ہمیں اس بات کا اندازہ لگانا ہو گا کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو ہمیں نفاق کی طرف لے جا رہے ہیں ان عوامل کا پتہ چلانے کے بعد ہمیں اپنا انداز فکر بدلنا ہو گا۔ پرانی قدروں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہو گا کہ آج کا یہ جدید طرز عمل ہی ہمارے درخشاں مستقبل کی ضمانت ہے ‘‘۔

تابش صمدانی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے والد قبلہ خلیل احمد نے اپنی زندگی کا طویل حصہ بیماری میں گزارا۔ آپ نے اس بات کا اظہار اس طرح کیا ’’ میری عمر کا بہترین زمانہ اکثر و بیشتر علالت میں گزرا۔ قریب قریب تیس برس مہلک و جاں فرسا امراض کینسر، ٹیرجیمینل نورلجیا وغیرہ وغیرہ میں مبتلا رہا ‘‘۔ اس وجہ سے بھی تابش صمدانی کی زندگی دباؤ اور بوجھ میں رہی لیکن انھوں نے حالات کا مقابلہ انتہائی حوصلہ اور بہادری سے کیا۔ طالب صمدانی اور حسین صمدانی ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ عقیلہ، طیبہ، طاہرہ، قدسیہ اور سعدیہ ان کی بہنیں ہیں۔ تابش صمدانی کی شادی اپنے خاندان ہی میں جناب مشتاق احمد کی صاحبزادی بہار آرا سے ہوئی۔ تین بیٹے رہبر، سرور، صفدر اور دو بیٹیاں عظمت اور نصرت ہیں۔ بیٹے شعری ذوق رکھتے ہیں، سرور اپنے والد کی طرح شعبہ قانون سے وابستہ ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ امید ہے خاندان کے ساتھ ساتھ اپنے والد کا نام بھی روشن کریں گے۔

تابش صمدانی کی نعتیہ شاعری

تابش صمدانی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں کہ جنہیں مدحت سراجی اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی گویا نعت گوئی تابش صمدانی کے خمیر کا حصہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ تابش کے دادا حضرت شیخ محمد ابراہیم آزآد اور والد بزرگوار جناب خلیل صمدانی اپنے وقت کے معروف اور مستند صاحب دیوان نعتیہ شاعر تھے۔ تابش صمدانی نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنے گھر کی فضاء کو سخن فہمی و سخن گوئی سے مسحور پایا انہوں نے اِسی فضاء میں اپنے دادا حضرتِ آزآد اور والد خلیل صمدانی کی زیر سرپرستی پرورش پائی ۔شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو جانا ایک قدرتی عمل تھا چنانچہ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ آپ کی شاعری ذہن وادراک کو متاثر کرنے والی ہے۔ انہوں نے نہایت نازک حساس اور شاعرانہ طبیعت پائی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے احساسات و جذبات کو خوبصورت اور دلکش الفاظ کا روپ دیا۔ آپ کو ایک فطری شاعر کہا جاسکتا ہے۔

تابش صمدانی کی نعت گوئی میں جو عاجزی وانکساری پائی جاتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حصہ ہے ۔بزرگوں کا حد درجہ احترام ان کی زندگی کا خاصا تھا یہی وجہ ہے کہ تابش کی نعت کی فضاء شاعرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ

مودبانہ ہے۔ معروف دانشور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ ” آپ نے غزل کا مزاج پایا ہے اس کے رموز آشنا ہیں اور ان رموز کو عشق رسول ﷺ سے بطریق احسن منسلک کرنے کا سلیقہ بھی ہے“۔تابش صمدانی اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

مجھ کو یہ اعتراف ہے تابشؔ کہیں کہیں
مضمون غزل کے دیوان میں آ گئے

معروف شاعر احمد ندیم قاسمی کے خیال میں ”تابشؔ صمدانی کی نعتوں کا مجموعہ پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ نعت بطور عبادت بھی کہی جا سکتی ہے ان کی نعتوں میں وہی عبادت کی سی سپردگی اور لگن ہے وہ حضور ﷺ کے حسنِ صورت کا ذکر کریں یا جمالِ سیرت کا بیان صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر حضور ﷺ کی ذات والا صفات کے عشق میں کھویا ہوا ہے اور نعت برائے نعت نہیں کہہ رہا بلکہ اس میں اپنے شعور و وجدان کی تمام رسائیوں اور لطافتوں کو سمو رہا ہے“ ۔ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ تابشؔ صمدانی کی نعت میں عبد و معبود کا ایک حقیقی رشتہ ابھر کر سامنے آگیا ہے“۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ تابشؔ کے نعتیہ کلام میں عشق رسول ﷺ سے پیدا ہونے والی گرمی نے کلام کو پر اثر بنا دیا ہے“۔اقبال عظیم نے کہا کہ ”یہ نعتیں پڑھ کر ہر دیانت دار صاحب فکر و نظر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کلام ایک ایسے پختہ مشق شاعر کا

ہے جسے نہ صرف زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے بلکہ جو آدابِ نعت گوئی اور نکات سخن وری سے پوری طرح آگاہ ہے اور جس نے حیات پاک رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ بھی خاطر خواہ کیا ہے '۔ (مرحبا سیدی)تابش صمدانی کی نعت میں حضور اکرم ﷺ سے دوری ، ان تک پہنچنے کی تڑپ حدرجہ پائی جاتی ہے۔ان کی یہ خواہش کہ وہ دربار نبویؐ میں حاضری دیں ان کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔آپ کہتے ہیں

:

ہر لمحہ آس ہے کہ بلاوا اب آئے گا
اس طرح جی رہا ہوں در مصطفےٰ سے دور

: ایک اور جگہ تابش کہتے ہیں

جاکے واپس نہ آؤنگا تابش
حاصل مدعا مدینہ ہے

ادب، احترام، عاجزی، انکساری اور دھیمہ پن تابش صمدانی کی ذات کا حصہ ہیں جنھیں ان کے کلام میں نمایاں طور پر محسوس کیا

: جاسکتا ہے۔آپ ایک جگہ کہتے ہیں

ہے یہ بھی عطا آپ کی میں نعت سرا ہوں
ورنہ تھا کہاں مجھ میں سلیقہ میرے مولا

پروفیسر ڈاکٹر عرش صدیقی نے کہا کہ تابش صمدانی کا باطن عشق رسول ﷺ سے منور اور ان کا ظاہر یہاں تک کہ ان کی گفتگو کا دھیما پن ان کی چال ڈھال غرض ان کی شخصیت کے ہر پہلو میں عشق رسول منعکس ہے ان کی نعت گوئی کا سب سے نمایاں پہلو (محبت کا وہ دلکش والہانہ پن ہے جو ادب کی حدود کا بھی احترام کرتا ہے۔" (برگ ثنا

تابش صمدانی کا کوئی باقاعدہ استاد نہیں تھا ابتدا میں اپنے والد سے فیض حاصل کیا، تابش نے جس ادبی اور شعری ماحول میں پرورش پائی اس نے تابش میں پختگی پیدا کردی۔

پروفیسر عاصی کرنالی کے بقول تابش صمدانی ایک پختہ فکر شاعر ہیں ۔ جوانی ہی میں وہ دستگاہ کمال کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ مشاقی نے ان میں مہارت اور چابک دستی کا ھنر پیدا کیا"۔ ڈاکٹر بیدل حیدر کہتے ہیں کہ تابش صمدانی علمی بصیرت ہے کہ ان کے کلام میں دور دور تک کسی قسم کا کوئی سقم نظر نہیں آتا"۔ محمد افسر ساجد کا خیال ہے کہ " تابش کی فکر میں پختگی ہے"۔ تجدید نو اسلام آباد کی مدیرہ عذرا اصغر کا کہنا ہے کہ ' تابش صمدانی کی نعت گوئی کی فضاء مکمل طور پر شاعرانہ آھنگ سے ہمکنار ہے۔ مودبانہ بھی ہے اور محبت سے لبریز

بھی اس طرح تابش صمدانی ہمیں ایک پختہ گو اور فکر و آگہی کے شاعر نظر آتے ہیں"۔

یہ بات اظہر من شمس ہے کہ تابش صمدانی نعت گوئی کا قرینہ رکھتے تھے اور اس کے من جملہ رموز سے اچھی طرح آگاہ تھے۔اعزاز احمد آذر کا کہنا ہے کہ '' تابش صمدانی کی نعت گوئی اپنے اسلوب و ابلاغ کے لحاظ سے بھی خوبصورت اور اثر آفرینی کا حسین امتزاج ہے''۔پروفیسر شیخ محمد اقبال نے کہا کہ ''وہ لفظی جادوگری اور ادبی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی بزم کا جادو جگاتے ہیں ان کا بزتو ان کی محبت ہے''۔تابش صمدانی نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا ان کی خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ نعت کہتے رہیں ۔

تابش صمدانی کا پہلا نعتیہ مجموعہ کلام '' برگ ثنا'' ۱۹۸۸ء میں جب کہ دوسرا مجموعہ ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔آپ نے اپنے والد جناب خلیل صمدانی کے کلام پر مشتمل مجموعہ بھی مرتب کیا جا ۱۹۶۸ء میں بیکانیر، راجستھان سے شائع ہوا۔یہ آپ کی پہلی ادبی کاوش تھی۔بزرگان دین سے والہانہ محبت و عقیدت تابش صمدانی کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس جذبہ کا اظہار عملی طور پر ان کی مطبوعات ''نذرِ سعید'' اور منقبت کے پھول'' ہیں ۔اول الذکر اعلیٰ حضرت علامہ احمد سعید کاظمیؒ سے والہانہ '' ارادت و عقیدت اور بے پناہ محبت و مؤدت کی آئینہ دار ہے۔یہ کتاب ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔'منقبت کے پھول' جناب علامہ حامد علی خانؒ کی شان میں تابش کا

نظرانہ عقیدت ہے۔ تابش کے مجموعہ کلام کے بارے میں ان کے بڑے بیٹے رہبر صمدانی نے یہ قطعہ کہا :

شاہدِ کبریا کی خصوصی عطا

فکرِ تابش کو کرتی گئی پُرضیا

تا قیامت رہیں گی یہ جلوہ فشاں

''مرحبا سیدی'' اور ''برگِ ثنا''

تابش صمدانی نعت گوئی کو اپنے اجداد کا ورثہ تصور کرتے ہیں اور اس آرزو کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے اجداد کی طرح زندگی کے اختتام تک سرور کائینات احمد مجتبیٰ ﷺ کے حضور نعت کا نذرانہ پیش کرتے رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا :

زیست اب جتنی ہے باقی عزم ہے تابش یہی

حمد باری اور نعت مصطفےٰ لکھونگا میں

لکھ لکھ کے نعت پڑھتا رہوں آپ کے حضور

یہ عظمتِ قلم یہ نوا چاہیے مجھے

میری تو زندگی یہی میری تو بندگی یہی

آخری سانس تک رہوں مدح سرا مصطفےٰ

اللہ نے تابش صمدانی کی یہ آرزو پوری کی باوجود سخت بیماری اور تکلیف کے انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی بستر علالت سے حضور اکرم ﷺ کے حضور نعت کا نذرانہ پیش کیا۔اللہ تعالی ان کی خواہش کو قبول و منظور فرمائے۔آمین ۔

ہے عیاں عشق محمدؐ ہر ایک شعر سے
رشید الخیال و بلیغ النظر ہے تابش
قبول مدح محبوبؐ ہو تابش کی رئیس
ہے یہ دعا تمھیں جنت ہو نصیب تابش

(مصنف کے سوانحی مجموعہ ''یادوں کی مالا''میں شامل)

اماں حوا کے شہر جدہ کا پاکستان انٹر نیشنل اسکول

حب الوطنی اور پاکستانیت کی اعلیٰ مثال

سعودی عرب میں بڑی تعداد میں غیر ملکی بسلسلہ ملازمت رہائش پذیر ہیں ۔ پاکستانی اپنے مذہبی تعلق و عقیدت کے باعث یہاں ملازمت اور رہائش کو فوقیت دیتے ہیں ۔ سعودی عرب کا شہر جدہ اماں حوا کے شہر کا درجہ بھی رکھتا ہے ۔ یہ شہر مکہ المکرمہ سے صرف ۴۵ منٹ کی ڈرائیو پر ہے جب کہ یہاں سے مدینہ جانا بھی بہت آسان ہے۔ مکہ اور مدینہ جانے والوں کے لیے یہ شہر ایک گزرگاہ یا رابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عمرہ یا حج کی ادائیگی کے لیے لوگ جدہ ائرپورٹ پر ہی آتے ہیں یہاں سے بذریعہ سڑک مکہ یا مدینہ جاتے ہیں۔ جب بحری راستے سے لوگ عمرہ اور حج کرنے آیا کرتے تھے ،اس وقت بھی جدہ کی بندرگاہ پر ہی اترا کرتے پھر مکہ اور مدینہ جاتے تھے۔ اس اعتبار سے جدہ شہر کو ہر اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔ جدہ شہر صنعتی شہر بھی ہے۔ یہاں بے شمار کمپنیوں کے دفاتر موجود ہیں۔ ابتدا سے اعلیٰ تعلیم تک کی سہولتیں موجود ہیں۔ سعودی تعلیمی ادارے بے شمار ہیں لیکن مختلف ممالک نے بھی یہاں اپنے اسکول قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ' پاکستان انٹر نیشنل اسکول جدہ (انگلش سیکشن)

ہے۔ یہ جدہ کے خوبصورت علاقے رحاب میں واقع ہے۔اس کے ایک جانب شاہرہ' فلسطین گزرتی ہے۔ اسکول کے مرکزی گیٹ پر کھڑے ہوں تو انتہائی دائیں جانب مکہ روڈ پر گاڑیاں تیز رفتاری سے مکہ کی جانب جاتی نظر آتی ہیں۔ اس اسکول کا قیام پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں ۱۹۹۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ اِ س کی عمارت وسیع، کشادہ، دلکش اور جاذب نظر ہے۔ اسکول کے چاروں جانب مرکزی گیٹ کے علاوہ آٹھ دروازے ہیں۔

سے الحاق شدہ اور عالمی سطح پر (CIPP) اسکول کیمرج انٹرنیشنل پرائمری پروگرام اور اپنی پہچان رکھتا ہے۔ کونسل آف انٹرنیشنل اسکول برطانیہ کی رکنیت رکھتا ہے۔ یہاں طلبہ کے لیے پلے گروپ سے اے لیول کی سہولتیں موجود ہیں انہیں کیمرج یونیورسٹی کے اور اے لیول کے امتحان کے لیے تیار کرایا جاتا ہے۔ روزنامہ جنگ کےGCSE لیے نمائندے برائے جدہ شاہد نعیم کی رپورٹ جو ہفتہ ۱۴دسمبر ۲۰۱۳ء کو جنگ اخبار کے بلادی صفحہ پر شائع ہوئی کے مطابق پاکستان انٹرنیشنل اسکول جدہ (انگلش سیکشن) کے طالب علموں نے مئی جون ۲۰۱۳ء کے کیمرج کے بیرونی امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کرکے ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ کیمرج یونیورسٹی کے اعلامیے کے مطابق اے میں فہد بن طاہر، محمد عرفان، قاضی جاوید، حیا شکیل، ربیعہ شبیہ،A Level) (لیول حمدان الطاف، عمران ساجد، حفصہ خان، ابرھیم قریشی، محمد فراز خالد، سید اسامہ احمد، حسن اور

کے امتحان میں ایشمIGCSE فاروق ضامن نے امتیازی نمبروں میں کامیابی حاصل کی۔
سرمد نے اول پوزیشن حاصل کی۔
(Y1-11) ہمارا پوتا محمد صائم عدیل بھی اس اسکول میں زیر تعلیم ہے اب وہ اول کلاس میں ہے۔ دسمبر ۲۰۱۳ء میں جدہ میں تھا ۱۹ دسمبر ۲۰۱۳ء کو اسکول میں بچوں کے تھی۔ ہمParents Meeting والدین کاان کے اساتذہ سے ملاقات کا اہتمام تھا یعنی بھی ساتھ ہولیے۔ سوچا کہ اس بہانے اسکول کو اندر سے ہی دیکھ لیں گے۔ باہر سے تو اکثر دیکھا ہی کرتا تھا۔ وقت مقررہ پر اسکول پہنچے ،اسکول کے چاروں طراف گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ یہ ان والدین کی گاڑیاں تھیں جو پاکستانی ہیں ، جدہ میں ملازمت کرتے ہیں اور ان کے بچے پاکستان انٹر نیشنل اسکول جدہ میں زیر تعلیم ہیں۔ آج صرف پرائمری کلاسوں کے طلبہ کے والدین کو ہی بلایا گیا تھا۔ اس سے بڑی جماعت کے طلبہ کے والدین ہفتہ کو آنا تھا۔ مشکل سے پارکنگ ملی۔ اسکول کے چاروں طرف آٹھ گیٹ ہیں۔ ہمیں دروازہ نمبر ۸ سے اندر جانا تھا۔ اسکول کے چاروں طرف بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ پاکستان کا قومی پرچم کی تصوریریں آویزاں ہیں۔ دیکھ کر اچھا لگا اور خوشی ہوئی۔اس وقت مرکزی دروازہ پر اوپر کی جانب ایک بڑی سی تصور آویزاں ہے جس میں پاکستان کے سابق صدر جناب آصف علی زرداری اسکول کی پرنسپل محترمہ سینئر سحر کامران کو تمغہ امتیاز دے رہے ہیں۔ جی ہاں سحر کامران پاکستان

کی سینٹ کی رکن ہیں اور ہمارے محترم صدر نے انہیں اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں تمغہ امتیاز سے نوازا ہے۔ صدر آصف علی زرداری کے بہ حیثیت صدر پاکستان رخصت ہوجانے اور نوز شریف حکومت کے آجانے کے بعد محترمہ سحر کامران پرنسپل نہیں رہیں اور انہیں بھی زرداری صاحب کے ساتھ ہی رخصت ہونا پڑا۔ وجوہات کا علم نہیں۔ عام طور پر سیاسی عہدوں میں اسی طرح کے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ سحر کامران اس سے خوش ہیں یا نہیں یہ تو انہیں ہی معلوم ہوگا لیکن اس عمل سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہوگا کہ وہ اب سینٹ کی رکن کی حیثیت سے سینٹ کے اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوسکیں گی۔ پاکستان سے محبت اور خدمت کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہے کہ خاتون ہوتے ہوئے بیک وقت ملک میں بھی خدمت کریں اور ملک سے باہر بھی کل وقتی خدمات انجام دیں۔ تب ہی تو محترم آصف زرداری صاحب نے انہیں خدمت میں امتیاز کا شرف بخشا۔

جوں ہی ہم اسکول میں داخل ہوئے انتہائی خوشگوار احساس نے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان اور پاکستانیت اپنے عروج پر تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہم پاکستان کے کسی اچھے سے اسکول میں ہی ہیں۔ صاف ستھرا، روشن، ہوادار ماحول۔ انتہائی دائیں جان کچھ کلاسیں تھیں بچے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ مرد اپنے بچوں کی خبر گیری کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ خواتین جتنی بھی تھیں کالے عبایے میں ملبوس خوشی خوشی

اپنے بچوں کی تعلیمی رپورٹ معلوم کرنے کی منتظر تھیں۔ خوشیوں کے لمحات نمایاں تھے عید کا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اوپر کی جانب بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان، بے نظیر بھٹو، چودھری رحمت علی، حفیظ جالندھری، مینار پاکستان، فیصل مسجد، اسلامیہ کالج پشاور، رہائش گاہ قائداعظم زیارت، نیشنل مونومنٹ کی خوبصورت رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ حب الوطنی اور ملک سے محبت کا لازوال اظہار۔ اس بلاک کے برابر ہمارے پوتے صاحب کی کلاس تھی جہاں ان کے والدین کو ان کی ٹیچر کے سامنے پیش ہونا تھا۔ ہرے رنگ کا مصنوعی آسٹروٹف بچھا ہوا تھا جس پر ایک جانب قالین کی خوشنما جانمازیں بچھی تھیں۔ کچھ خواتین و مرد نماز عصر ادا کر رہے تھے۔ اس حصے کے اوپر ان تمام فوجی افسران و جوانوں کی تصویریں آویزاں تھیں جنھوں نے ملک و قوم کے لیے اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کیا اور انہیں سب سے بڑے فوجی اعزاز 'نشانِ حیدر' سے نوازا گیا۔ ان میں کیپٹن محمد سرور شہید، میجر طفیل محمد شہید، میجر عزیز بھٹی شہید، پائیلٹ آفیسر راشد منہاس شہید، جوان سوار محمد حسین شہید، میجر محمد اکرم شہید، لانس نائیک محمد محفوظ شہید، میجر شبیر شریف، کیپٹن کرنل شیر خان شہید، حولدار لالک خان شامل ہیں۔ کلاس روم کے ساتھ ایک کمرہ پر لائبریری لکھا تھا غالباً یہ جونیئر سیکشن کی لائبریری ہوگی۔ اس وقت یہ بند تھی۔

ہمارے بیٹے عدیل نے پورے اسکول کا ایک راؤنڈ بھی کرایا۔اس کا مقصد اسکول کا جائزہ لینا تھا۔ اسکول کا ایڈمن بلاک بھی خوبصورت ہے۔ کشادہ اور حسین ۔ یہاں قائد اعظم محمد علی جناح، صدر مملکت جناب ممنون حسین، وزیر اعظم محمد نواز شریف، علامہ اقبال اور بے نظیر بھٹو کی خوبصورت رنگین تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ اس سے آگے کلاسوں کا سلسلہ ہے ایک جگہ بڑے نوٹس بورڈ پر لکھا ہے ''آیئے پاکستان کی سیر کریں'' اس جگہ اسکول کے بچوں کی تیار کردہ مختلف تصویریں لگیں ہیں جن سے پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پلے گراؤنڈ کے سامنے ایک نیا بلاک ''کنگ عبداللہ بن عبد العزیز ایجوکیشن بلاک بنایا گیا ہے۔اس کے سامنے 'بے نظیر بھٹو آڈیٹوریم' بہت ہی بڑا، کشادہ اور دلکش ہے۔ اس میں بھی قائد اعظم، علامہ اقبال اور بے نظیر بھٹو کی رنگین تصاویر لگیں ہیں۔ اس وقت اس میں بے شمار اساتذہ موجود ہیں جو بچوں کے والدین سے ان کے بچوں کی تعلیمی کارکردگی کے بارے میں گفتگو کررہی ہیں۔ ہر ایک میز پر متعلقہ کلاس کا نام لکھا تھا۔

کلاس روم کشادہ، ائر کنڈیشن، قالین بچھے ہوئے۔ سینئر کلاسیز میں ملٹی میڈیا کی سہولت موجود ہے۔ ویب پر فراہم معلومات کے مطابق دو لائبریریز ہیں ایک جونئر سیکشن میں اور دوسری سینئر سیکشن میں ۔یقیناً ہوں گی اس لیے کہ ہمارے

پوتے صاحب کبھی کبھی لائبریری کی کتاب بھی لاتے ہیں۔اسکول کی کمپیوٹر لیب تمام تر ضروری آلات سے آراستہ ہیں، پہلی جماعت میں کمپیوٹر کا ایک سبجیکٹ پڑھایا جاتا ہے۔ سائنس لیبارٹریز بھی تمام تر ساز وسامان اور آلات سے آراستہ ہیں۔ کینٹین کی سہولت بھی ہے۔ طلبہ کے کھیلنے کے لیے کشادہ پلے گراونڈ اسکول کے اندر ہی بنا ہوا ہے۔ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ہم نصابی سرگرمیاں بھی اسکول کا لازمی حصہ ہیں۔ طلبہ پڑھائی میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں ساتھ ہی دیگر سرگرمیوں میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ جدہ کا یہ اسکول ہر اعتبار سے قابل تعریف اور مثالی ہے۔

برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کتب خانہ

رضا علی عابدی

اپنی تصنیف

''برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کتب خانہ''کی روشنی میں

☆

پاکستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا، ریڈیو ہی عوام الناس کے لیے معلومات اور تفریح و طباع کا ذریعہ تھا۔ ۱۹۷۵ میں بی بی سی لندن کی اردو سروس سے ایک پروگرام بعنوان ''کتب خانہ' شروع ہوا، اس وقت میں شعبہ لائبریری وانفامیشن سائنس سے منسلک ہو چکا تھا نیز اسی سال میری ایک کتاب ''کتب خانے تاریخ کی روشنی میں'' منظر عام پر آچکی تھی۔ اس حوالہ سے میری دلچسپی کتب خانوں، خصوصاً کتب خانوں کی تاریخ کے بارے میں زیادہ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے رضا علی عابدی کی مدھر آواز بی بی سی لندن کی اردو سروس سے بارہا سنی، ان کے اس پروگرام کے متعدد نشریے.بڑی دلچپی سے سنے۔ یہ پروگرام کوئی سال بھر سے زیادہ مسلسل نشر ہوا، بقول رضا علی عابدی 'یہ پروگرام ۱۴۰ ہفتے نشر ہوا اور یہ کہ اس کا بند ہونا بے شمار سننے والوں کی

خفگی کا باعث بنا'۔ اسی قسم کا دوسرا پروگرام ۱۹۸۲ء میں اسی عنوان سے نشر ہوا۔ بات درست ہے یہ پروگرام تھا ہی اس قدر دلچسپ، مفید اور معلوماتی ، ساتھ ہی اس پروگرام کو رضا علی عابدی کی منفرد آواز و انداز نے خوب سے خوب تر بنا دیا تھا۔اس پرگرام کا بنیادی مقصد پرانی اردو کتابوں کو جو مختلف عوامی کتب خانوں اور مختلف علمی و ادبی شخصیات کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ تھیں متعارف کرانا تھا۔اس پروگرام میں کتابوں کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کا ذکر آ جانا یقینی تھا۔اس پروگرام کو ترتیب دینے کی غرض سے رضا علی عابدی نے کوچہ کوچہ ،قریہ قریہ سفر کیا،برطانیہ کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف شہروں میں گئے ، بقول عابدی صاحب 'اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ موقع پر جاکر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی پہاڑیوں سے لے کرمدراس کے ساحل تک اور بنگال کے سبزہ زاروں سے راجستھان کے ریگ زاروں تک قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں ، اور کس حال میں ہیں'۔ عابدی صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ، ان علاقوں میں موجود نایاب و نادر کتابوں کا حال اور ان کی خستہ حالی کی داستان اس خوبصورت انداز سے

ریڈیو پر بیان کی کہ اس وقت کے سننے والے جو کتاب و ادب اور کتب خانوں سے دلچسپی رکھتے تھے عابدی صاحب کو جی بھر کر داد دینے میں پیچھے نہ رہے۔

عابدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس تحقیق کے دوران انہوں نے بہت کونے جھانکے ۔ کسی

میں نور بھرا تھا اور کہیں اندھیروں کا راج تھا۔ کہیں کتابیں بچائی جا رہی تھیں اور کہیں کیڑوں کی غذا بن رہی تھیں'۔ یہ جستجو تو تھی ریڈیو کے لیے انہوں جو بھی پروگرام ترتیب دیے کامیاب رہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ عابدی صاحب کو اپنی اس تحقیق کو کتابی شکل دینے کا خیال آیا اور اس نے عملی جامہ بھی پہن لیا جس کا نام ہے ''برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں: کتب خانہ'' جو ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئی اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس عمل سے کتاب اور کتب خانوں کے بارے میں کی گئی تحقیق جو ریڈیو پر نشر ہوئی ہواؤں میں بکھرنے کے ساتھ ساتھ صفحہ قرطاس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ وہ پروگرام جو آج سے تین دھائی قبل نشر ہوا، جو لوگ پروگرام نہ سن سکے تھے وہ اس کتاب کے ذریعہ سالوں پرانی پھیلنے والی خوشبوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب دیگر کتب سے مختلف ہے، کیونکہ یہ ریڈیو کے ایک دستاویزی پروگرام پر مبنی ہے اس کتاب کی تحریر کا انداز بھی وہی ریڈیائی ہے لیکن دوران مطالعہ خوبصورت انداز دل کو لبھاتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کی ورق گردانی کی جاتی رہے۔کتاب چوبیں ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کسی نہ کسی شہر، گاؤں، دیہات میں موجود نایاب کتب کی تفصیل بیان کرتا ہے۔کتاب کا پیش لفظ برطانیہ میں

اردو کے نامور محقق اور استاد رالف رسل نے تحریر کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ ’’ایک طرح سے یہ کتاب ایک پرزور اپیل کی تمہید ہے اس کتاب نے افراد، انجمنوں اور ارباب حل وعقد، کی توجہ اس طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پبلک اور ذاتی کتب خانوں اور مدرسوں، خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہاکتابوں اور مخطوطات کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول مصنف ’’اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آجائے‘‘۔

کتاب کو شائع ہوئے پچیس برس ہو چکے لیکن اس کے مطالعہ کے دوران یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں آج سے بیس یا تیس برس پرانی ہیں۔جو باب بھی پڑھا جائے دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔انداز بیان شائستہ، ادبی اور دل کو لبھانے والا ہے۔کتاب کی اہمیت کے پیش نظر پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے ’’پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جنرل‘‘جو کراچی سے شائع ہوتا ہے نے اس کتاب کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، اس کی کئی اقساط شائع ہو چکی ہیں جسے قارئین پسند کر رہے ہیں۔المختصر رضا علی عابدی کی یہ تصنیف قدیم کتابوں کے بارے میں معلومات کا منفرد خزانہ ہے۔اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے نایاب کتب کے بارے میں معلومات کی بارات چھم چھم کرتی چلی آرہی ہیں۔

جامعہ سرگودھا میں میرے شب و روز

کچھ یادیں کچھ باتیں

زندہ دلوں کا گہوارہ ہے سرگودھا میرا شہر
سب کی آنکھوں کا تارہ ہے سرگودھا میرا شہر
ناصر کاظمی

شاہینوں کے شہر سرگودھا تو رہے تا ابد آباد
تیرے حسین کھیتوں کی ہوا کھینچ لائی مجھے

میں ۲۵ مارچ ۲۰۰۹ء کو گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کراچی سے ریٹائر ہو چکا تھا، ڈاکٹر محمد فاضل صاحب جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز کے چیئرمین تھے جن سے میرے مراسم کی نوعیت برادرانہ تھی، ان کے توسط سے میرا تقرر بہ حیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ہو گیا، یہ ڈاکٹر فاضل کی عنایت اور مجھ سے محبت تھی، میں نے بھی سرگودھا جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مئی ۲۰۱۰ء کے ابتدائی دنوں میں مجھے سرگودھا یونیورسٹی کی جانب سے تقرر نامہ موصول ہوا، اس کے لیے میں پہلے

سے تیار تھا چناں چہ میں نے کراچی سے رختِ سفر باندھا، ۱۰ مئی کو شاہین ایر لائن سے لاہور کے لیے سیٹ ریزرو کرالی، یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا لیکن ایک بڑے مقصد کے لیے کیا گیا تھا۔ کراچی کے تمام معاملات کو تیزی سے سمیٹا، گھر والوں کو اپنے اس فیصلے پر تیار کیا جس کے لیے مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی البتہ میری شریک سفر شہناز زیادہ فکر مند اور پریشان تھیں، لیکن اس بنا پر کہ مجھے جو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے مجھے اس کو لبیک کہنا چاہیے وہ بھی خوشی سے مجھے خدا حافظ کہنے پر تیار ہوگئیں۔ میری بیٹی جو لاہور میں کئی سالوں سے مقیم ہے اس خبر پر خوش تھی کیونکہ اس فیصلے پر عمل کی صورت میں اس کے والدین مستقبل میں اس کے نزدیک ہو رہے تھے۔ پیر ۱۰ مئی نے دستک دی، تیاری مکمل ہوئی، خوشی خوشی ایر پورٹ پہنچ گیا۔ شہناز، مہوش (میری بڑی بہو)، ڈاکٹر نبیل، ڈاکٹر ثمرہ (میری چھوٹی بہو) میرا ہر دلعزیز پوتا صائم عدیل مجھے ائر پورٹ پر خدا حافظ کہنے میرے ساتھ تھے۔ بعد ازآں میرا بڑا بیٹا عدیل بھی اپنے آفس سے ایر پورٹ آگیا۔ جیسے جیسے اپنوں سے رخصت ہونے کا وقت قریب آرہا تھا، میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔ جذبات کو قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا، میں کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا، محسوس ہوا جیسے میری آواز بند ہو گئی ہے، کوشش کی کہ کچھ بات کر سکوں مگر الفاظ نہ نکل سکے۔ مشکل سے آنسوؤں کو روک سکا پھر بھی انھوں نے میرا ساتھ نہ دیا، بند گلے، بھیگی آنکھوں اور افسردہ چہرے کے ساتھ خاموشی سے اپنوں

کو ایک ایک کرکے گلے لگایا، اپنے پوتے صائم کو ایک سے زیادہ بار پیار کیا، دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے سینے سے جدا نہ کروں، مجھے سب سے زیادہ صائم سے بچھڑنے کا افسوس تھا اور رہے گا۔ سامان کی ٹرالی کو دھکا دیتا ہوا، نیچی نگاہ کیے اپنی آئندہ منزل کی جانب چل دیا۔ بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج کی جانب چلا، دل بیٹھا جارہا تھا، سر بو جھل تھا، پھر بھی بھاری قدموں سے لاؤنج کی طرف بڑھا، ایر پورٹ کے مرکزی دروازے کے ساتھ رنگین شیشے کے پیچھے لائن سے میرے جگر گوشے کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے، میں نے بھی ان کی جانب دیکھا، لیکن نظر نیچے کرکے ہاتھ ہلاتا رہا، مجھ میں انہیں دیکھنے کی تاب نہ تھی، میرا پوتا صائم اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مجھے خدا حافظ کر رہا تھا۔ اس کی اس ادا نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا، میں نے سوچا کہ کہیں میں نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا، میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر سب کو غور سے دیکھاایک ایک کرکے سب کو دعا دی، خدا حافظ کہا اور آگے کی جانب بڑھ گیا۔

جنت نگاہ شہر کراچی کہ جہاں میرا سنہرا بچپن گذرا، رسیلی جوانی کی بہاریں پھلی پھولیں اور بڑھاپے کی دہلیز پر بھی اسی شہر میں قدم رکھا۔ اس کی رونقوں کو، بہاروں اور محفلوں کو، دوستوں کو، عزیزوں کو، پیاروں کو الغرض ہر ایک کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ یوں محسوس ہوا کہ شہر سرگودھا میں کچھ خاص کشش تھی جس نے مجھے اتنے بڑے فیصلے پر آمادہ کرلیا۔

ہے عجب کشش اے سرگودھا تیری شام و سحر میں
کہ میں کراچی کی حسین رنگینیوں کو چھوڑ آیا

جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھا، بیلٹ کسی، موبائل پر ایک بار پھر شہناز کو خدا حافظ کہا، اسی دوران لاہور سے میری بیٹی فاہینہ کا بھی فون آیا اسے بھی اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔ راستے میں فلائٹ ناہموار ہوئی اور جہاز ڈولنے لگا، اس کیفیت کو میں نے الگ سے اپنی ایک تحریر ''مَیں نے موت کو قریب سے دیکھا'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے، ہوائی سفر کے دوران مَیں اپنے ذہن کو دوسری جانب مائل کرنے کے لیے مضامین کی پروف ریڈنگ میں مصروف ہوگیا، میرے اس عمل نے میرے خیالات کو مختلف سمت منتقل کر دیا، بیش تر وقت مضامین کی پروف ریڈنگ میں گزر گیا۔

ذہن میں بار بار تمام لوگوں کے افسردہ چہرے آرہے تھے، آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو خاموشی سے پونچھتا رہا، اپنے آپ کو یہ تسلی دیتا رہا کہ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے اور اپنی خوشی سے کیا ہے۔ یہ فیصلہ میں نے ایک عظیم مقصد کے لیے کیا، اس کے لیے میں اپنے بسے بسائے اور ہر طرح کی سہولتوں سے مزین گھر کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ میرے پیش نظر ملازمت کا حصول یا اس سے ملنے والی رقم ہر گز ہر گز نہیں تھی۔ میں تمام زندگی قناعت پسند رہا ہوں اور

اس اصول پر عمل پیرا بھی کہ انسان کو اتنے ہی پیر پھیلانے چاہیں جتنی بڑی چادر ہو۔ الحمداللہ میری تمام زندگی بہت خوش گوار اور مطمئن رہی۔ میں تو اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی لاج رکھنا چاہتا ہوں جو قدرت نے مجھے انتھک محنت اور کوششوں کے بعد عطا کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی مجھ میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہے کہ میں اپنے علم سے دوسروں کو فیض یاب کرسکوں۔ جامعہ سرگودھا میں میرا بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر تقرر میرے لیے ایک اعزاز تھا، میں اس اعزاز کی ہر صورت میں تکریم چاہتا تھا۔ باوجود اس کے کہ سرگودھا جو شاہینوں کا شہر کہلاتا ہے، عوام الناس کے لیے ایر پورٹ کی سہولت سے بھی محروم ہے۔جب کہ میں اپنی کمر کی تکلیف کے پیش نظر ریل یا بس کے ذریعے طویل سفر نہیں کرسکتا، یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ مجھے لاہور یا فیصل آباد تک ہوائی سفر، اس کے بعد بذریعہ بس (ڈیوو Daewo) تقریباً ڈھائی گھنٹے کا سفر اور بھی کرنا ہوگا۔ ان سب قباحتوں کے باوجود میں نے اس اعزاز کے حصول کو اپنا مقصد بنایا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کبھی افسردہ ہوجاتا اور کبھی اپنے فیصلے پر اطمینان کا اظہار کرتا۔ میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھر جاتیں اور میں رازداری سے انہیں پونچھ لیتا، بار بار آنسوؤں کو سمجھاتا رہا لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ بقول میر دردؔ ؎

کرتا رہا میں دیدۂ گریہ کی احتیاط
پر ہو سکی نہ اشک کے طوفان کی احتیاط

مئی کی خوش گوار صبح سرگودھا میں ہوئی۔ ڈیوو بس اسٹاپ پر سرگودہا یونیورسٹی کے ۱۲
شعبہ لائبریری و انفامیشن سائنسزکے چیرمین پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل اور شعبے کے ایک
سینئر استاد میاں محمد اسلم بھٹی جو میرے ایم اے کے کلاس فیلو بھی تھے مجھے لینے آئے
ہوئے تھے۔ بس اسٹاپ سے جامعہ مشکل سے دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔، فیصلہ ہوا کہ
پہلے شیخ الجامعہ سے ملاقات کی جائے، چنانچہ ہم تینوں شیخ الجامعہ کے دفتر پہنچے، شیخ الجامعہ
پروفیسر ڈاکٹرچودھری محمد اکرم سے ملاقات ہوئی، خوش ہوئے اور خوش اخلاقی سے
ملے۔ فاضل صاحب کو میرے قیام کے بارے میں کچھ ہدایات دیں، پھرہم نے ایڈیشنل
رجسٹرار چودھری اظہارالحق صاحب سے ملاقات کی ، انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ میرا
تعلق

پنجاب کے شہر میلسی سے ہے تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا، اس ملاقات کے بعد ہم اپنے
شعبے میں آ گئےٗ اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔

۲۰۰۲ء میں سرگودھا گورنمنٹ کالج نے جامعہ سرگودھا کا روپ اختیار کیا،ایک سو ایکڑ
سے زیادہ پر مشتمل ہے اس کا وسیع و عریض سرسبز وشاداب رقبہ جامعہ کے حسن کو
دوبالا کرتا ہے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا ایک قدیم تاریخی درس گاہ ہے۔ یہ پاکستان کے
قیام سے قبل عمل میں آیا تھا۔ سرگودھا شہر کی اہمیت اور

وسعت کے پیش نظر حکومت نے اسے جامعہ کا درجہ دیا۔ اس کے اولین وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ریاض الحق طارق تھے۔ ان کے بعد پروفیسر ڈاکٹر چودھری محمد اکرم شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ جامعہ سرگودھا کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے ڈاکٹر اکرم چودھری جیسا علم پرور، ادیب و محقق اور عربی زبان کے عالم کی سربراہی نصیب ہوئی۔ آپ نے جامعہ سرگودھا کو بہت جلد پاکستان کی دیگر نامور جامعات کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ایچ ای سی کی رپورٹ برائے سال ۲۰۱۰ء کے مطابق علم و تحقیق میں جامعہ سرگودھا پاکستان بھر کی تمام جامعات میں آٹھویں نمبر پر تھی۔ ڈاکٹر چودھری محمد اکرم وہ ایک نفیس اور محنت پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ بقول عطاء الحق قاسمی 'وہ صرف اسکالر ہی نہیں بلکہ نہایت خلیق اور منکسر المزاج انسان بھی ہیں۔

شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنسز کا قیام ۲۰۰۸ء میں عمل میں آیا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان شعبہ کے اولین سربراہ تھے، شعبہ جامعہ کی مرکزی لائبریری کی عمارت میں قائم ہوا، چیئرمین کا آفس پہلی منزل پر ہے، اُس وقت کلاس تیسری منزل پر ہوا کرتی تھی، میری واپسی سے چار ماہ قبل میڈیکل کالج کے لائبریری بلڈنگ سے منتقل ہو جانے کے نتیجے میں شعبہ کُلی طور پر لائبریری کی زیریں منزل پر منتقل ہو گیا، اساتذہ کے لیے علیحدہ کمرے، کشادہ کلاس روم، درجہ بندی و کیٹلاگ سازی کی لیب اور آفس پر مشتمل شعبہ ہر اعتبار

سے کشادہ، روشن اور دیدہ زیب ہوگیا۔اس وقت شعبہ میں صرف چار لوگ تھے، فاضل صاحب پروفیسر اور صدر شعبہ بھی تھے، میاں محمد اسلم بھٹی، ڈپٹی لائبریرین اور شعبے میں جزوقتی استاد تھے، نور مصطفیٰ خان اور صفیہ کوکب لیکچرر تھی، میرا تقرر ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔مستقبل قریب میں ایم فل بھی شروع کرنے کا منصوبہ تھا، میرے تقرر کی ایک وجہ بھی یہی تھی۔بدقسمتی سے میری موجودگی میں اس منصوبے پر عمل درآمد شروع نہ ہوسکا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان صاحب کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں، یہ دوستوں کے دوست، یاروں کے یار ہیں۔لائبریرین شپ کے پیشے میں انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتاہے۔مجلسی آدمی ہیں، ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا بول ہی نہیں سکتا، بات سے بات، قصے سے قصہ، کہانی سے کہانی نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے اور خوبصورت انداز سے سنانے کا ملکہ بھی حاصل ہے۔کھانے کے بہت شوقین ہیں، کھانا دل سے کھاتے ہیں،شروع شروع میں مجھے اکثر کھانے پر بلالیا کرتے تھے،دل کے مریض بھی ہیں،ان کے دل کی ایک شریان میں بھی اسٹینٹ ڈلاہوا ہے۔کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ یہ مرض انہیں کراچی میں اس وقت لگا تھاجب یہ جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے گئے تھے، اس راز سے انہوں نے اس وقت پردہ اٹھایاجب میں سرگودھا سے واپس کراچی چلاگیااور دل کی تکلیف میں مبتلا ہوا۔میرے دل کی تکلیف میں گرفتار ہونے کا قصہ کچھ اس

طرح ہے کہ مَیں یکم مارچ ۲۰۱۰ء کو جامعہ سرگودھا سے رخصت ہو کر واپس اپنے گھر کراچی چلا گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے اپنے بیٹوں کے پاس سعودی عرب جانا تھا، میرا ویزا آچکا تھا۔ اپریل ۲۰۱۰ء کے پہلے ہفتے میں اچانک میرے الٹے ہاتھ میں درد ہوا، جس نے شدت اختیار کرلی، نوبت عام ڈاکٹر سے کارڈک سینٹر تک پہنچ گئی۔ ۱۲اپریل کو انجو گرافی (Angiography) ہوئی اور فوری طور پر انجو پلاسٹی (Angioplasty) بھی ڈالا گیا، اس طرح آناً فاناً میں (stent) میں اسٹینٹ Artery اور دل کی ایک شریان مَیں عام انسان سے کارڈک پیشنٹ بن گیا۔ اس بات کی اطلاع جب فاضل صاحب کو ہوئی تو انھوں نے میری مزاج پرسی کے لیے کراچی فون کیا اور تفصیل معلوم کی، اس وقت انھوں نے بتایا کہ وہ بھی اس صورت حال سے دو چار ہو چکے ہیں۔ اب میں بہت اچھی طرح محسوس کرسکتا ہوں کہ وہ کس قدر حوصلہ مند اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان کی قربت میں مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیاوی بیماریوں سے تو محفوظ ہی رکھے لیکن دل کی اِن تین بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رکھے جن کے بارے میں نبی آخری الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ’’اِن تین چیزوں سے بچو پہلی ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو اور ایک دوسرے سے پیٹھ نہ کرو یعنی ایک دوسرے سے منہ موڑ کر اِدھر اُدھر نہ ہوجاؤ۔

یہ راز مجھ پر سرگودھا آکر افشا ہوا کہ فاضل صاحب کے اندر ایک شاعر بھی موجود ہے، جو اب تک دبکا بیٹھا تھا،جب سے وہ سرگودھا آئے ہیں اس نے اٹھکھیلیاں شروع کردی ہیں، مَیں جوں ہی کلاس لے کر انھیں سلام کرنے حاضر ہوتا ، یہ کھٹ سے اپنا تازہ کلام سنانے کی فرمائش کیا کرتے ، مجھ سے پہلے یہ اپنے تازہ کلام پر میاں صاحب سے خوب خوب داد وصول کرچکے ہوتے تھے۔مَیں بھی انہیں لمبی لمبی داد دیا کرتا تھا، ساتھ ہی یہ بھی کہا کرتا تھا کہ فاضل صاحب کسی استاد شاعر کو اپنا کلام دکھایئے، ہوسکے تو مشکل الفاظ کی جگہ سہل اور عام فہم الفاظ استعمال کیجیے۔انھوں نے پہلے پہل عشقیہ شاعری کی، ایک دو غزلیں بھی مجھے سنائیں، لیکن جلد تائب ہوگئے اور حمد، نعت اور مناجات کی جانب مائل ہوئے۔مَیں نے اپنے دوست پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب جو میرے ہاسٹل کے ساتھی بھی تھے اور شعبہ اردو کے چیرَمین بھی ' سے سفارش بھی کی کہ وہ فاضل صاحب کے کلام کو دیکھ لیں، فاضل صاحب نے از خود بھی تونسوی صاحب سے درخواست کی تھی لیکن وہ جامعہ سرگودھا سے جی سی یونیورسٹی فیصل آباد چلے گئے۔فاضل صاحب نے جب سے ہوش سنبھالا پہلے تو تعلیم پھر کسب معاش کے لیے گھر سے دور ضرور رہے لیکن غافل نہیں۔ماشاء اللہ سات بیٹے اور ایک بیٹی ان کی زندگی کا اثاثہ ہیں، کرکٹ کی ٹیم کی خواہش تھی جو پوری نہ ہوسکی، ان کا مستقل ٹھکانہ رحیم یار خان ہے لیکن یہ کراچی، بہاولپور، ملتان، اسلام آباد ہوتے ہوئے دو دریاؤں کے بیچ واقع سرگودھا پہنچ چکے ہیں،

یہاں بھی انھیں قرار نہیں، اضطرابی کیفیت طاری ہے۔ بس بلاوے کے منتظر ہیں، جامعات میں لائبریری و انفارمیشن سائنس شعبے کے قیام کی ہیٹرک کر چکے ہیں، انھیں ماہر 'قیامِ شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مَیں فاضل صاحب سے ایک عرصے سے واقف ہوں اور بغیر تکلف کے کھلے دل سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی علمی گفتگو، ذوق سلیم، غیر معمولی حافظہ، تاریخی شعور قابل تعریف ہے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت بے شمار خوبیوں سے مزین ہے۔ ان کی زندگی لگے بندھے انداز سے نہیں گزری، نہ ہی یہ اکھرے اور سپاٹ لوگوں میں سے ہیں، ان کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں، کچھ حسین خواب پورے ہو چکے، کچھ کے لیے امید سے ہیں، ان کی ہشت پہلو زندگی کسی بھی خاکہ نگار کا موضوع بن سکتی ہے، زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ فاضل صاحب کا خاکہ قلم بند کروں گا۔ احمد فراز کا خوبصورت شعر ؎

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

فاضل صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ جب سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے سربراہ بنے اس وقت سے آج تک وہ مختلف جامعات میں بیک وقت صدر شعبہ اور یونیورسٹی لائبریری کے سربراہ بھی رہے، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان اور

جامعہ سرگودھا میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کے شعبہ جات کھولنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے، بعض وجوہات کے باعث ملتان میں شعبہ بند ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس اور مرکزی لائبریری کی سربراہی کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہو چکا ہے۔ سادگی ان کا شعار ہے، عاجزی و انکساری ان پر ختم ہے،ان کا ایک وصف جو مَیں نے محسوس کیا کہ یہ بڑوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنوں سے چھوٹوں کے ساتھ بھی انکساری، عاجزی، عزت اور محبت سے ملا کرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ زندہ ہی ان کے لیے ہوں، گھمبیر سے گھمبیر اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو خوبصورتی سے نمٹانا انہیں خوب آتا ہے۔ بشری کمزوریاں اور خامیاں کس انسان میں نہیں۔ بہ قول الطاف حسین حالیؔ ۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاک ساری اپنی کام آئی بہت

میاں محمد اسلم بھٹی نام ہے ایک باغ و بہار شخصیت کا، انھوں نے جامعہ کراچی سے ۱۹۷۱ء میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا تھا، امریکہ سے بھی ایک ایم اے کی سند حاصل کر چکے ہیں، ان کی زیادہ ملازمت پاکستان سے باہر کی ہے، یہ لائبریری میں اور شعبہ میں فاضل صاحب کے قریبی معاون ہیں، میاں صاحب کا تعلق سرگودھا سے ہے، یہ یہاں کے مقامی رہائشی ہیں، میاں صاحب کی پہلی شریک

حیات انتقال کر گئی تھیں، آپ نے پشاور سے تعلق رکھنے والے ایک سینئر لائبریرین سر ور خان صاحب کی بیٹی سے عقد ثانی کیا، لگتا ہے سرور خان صاحب کو ان کے سفید بالوں پر ترس آگیا تھا۔ زندہ دل، نیک، سادہ طبیعت، ہمدرد اور اخلاص کا مجموعہ، مناسب قد، بھاری جسم، پُر وجاہت، کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں چمک، لہجے میں معصو میت، گورا رنگ، سر پر بچے کچے بالوں میں سفیدی، داڑھی مونچھوں میں چاندی، گھنی بھنویں، ستواں ناک، آنکھیں چھوٹی، مضبوط ہاتھ پیر، گھر سے باہر شلوار قمیض، گھر میں دھوتی اور کرتا، سر پر ٹوپی، ان کی شخصیت شہر اور دیہات کی ملی جلی فضا لیے ہوئے ہے۔ دوسروں کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مجھ پر ان کی خصوصی عنایت تھی، ان کے دیئے ہوئے بعض مفید مشورے میرے بہت کام آئے۔ ان کی گفتگو میں مزا اور رچاؤ اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ یہ ہر بات کے جواب میں لطف کی آمیزش کر لیتے ہیں، ان کے شاگردوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ میاں صاحب لیکچر کے دوران بھی مزا سے بہت کام لیتے ہیں۔ فاضل صاحب انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے، میاں صاحب انگریزی اچھی لکھتے ہیں۔ فاضل صاحب اس سے خوب خوب استفادہ کیا کرتے ہیں۔ انگریزی فاضل صاحب کی بھی بُری نہیں، میاں صاحب فاضل صاحب کے ساتھ اور فاضل صاحب میاں صاحب کے ساتھ اس قدر رہا کرتے تھے کہ کچھ کچھ یاجوج و ماجوج والی کیفیت تھی ،ایک دن جب کہ وہ تنہا تھے کسی نے فاضل صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ ' کیا یونیورسٹی نے آپ کو گاڑی اور ڈرائیور بھی دیا ہوا ہے؟ یہ بات

فاضل صاحب نے ہی بتائی تھی۔ میاں صاحب اچھے اور نیک آدمی ہیں۔ میرے سرگودھا پہنچنے کے بعد میری پہلی دعوت انھوں نے ہی اپنے گھر پر کی تھی اور میری واپسی پر بھی کھانے کا اہتمام کیا۔ان کی بیگم بہت اچھے کھانے پکاتی ہیں، ہاتھ میں ذائقہ بھی ہے، مجھے تو حیرت ہوئی کہ پختون خواہ سے تعلق رکھنے والی خاتون دہلی اور یوپی والوں کے ذائقے دار کھانے پکالیتی ہیں۔ میاں صاحب خوش نصیب ہیں کہ انہیں دوسری بار بھی ایک سگھڑ اور سلیقہ مند خاتون ملیں۔ میاں صاحب کا گاؤں ''جھاوریاں'' سرگودھا میں ' رانجھے ' کے گاؤں کے آس پاس ہی ہے، جی ہاں ہیر ' والا رانجھا،مَیں نے میاں صاحب سے کئی بار کہا کہ آپ تو رانجھے کے گاؤں ''تخت ہزارہ'' سے اچھی طرح واقف ہیں، اس کے کچھ کچھ اثرات بھی آپ پر نظر آتے ہیں، مجھے بھی اس گاؤں کی زیارت کرادیں تاکہ مَیں کراچی جاکر یہ کہہ سکوں کہ مَیں نے ہیر والے رانجھے کا گاؤں تخت ہزارہ دیکھا ہے، کہتے ہیں ہیر اور رانجھا جھنگ جاتے ہوئے اسِ سڑک ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ہیر جھنگ کے کسی گاؤں سے تعلق رکھتی تھی ، میاں صاحب اپنی صحت اور مصروفیات کے باعث اس پروگرام پر عمل نہ کرسکے اور مَیں رانجھے کا گاؤں 'تخت ہزارہ نہ دیکھ سکا۔

شعبہ میں نور مصطفیٰ خان ایک کہنا مشق استاد تھے، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم کیا سندھ یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ،

سے ایم فل کر رہے ہیں۔ نوجوان ہیں، فاضل صاحب کے ساتھ ہی شعبے سے منسلک ہوگئے تھے، میں نے محسوس کیا کہ شعبے کے زیادہ تر کام نور مصطفیٰ ہی انجام دیتے ہیں، یہ فاضل صاحب کے داماد بھی ہیں، یہ انفرادیت انھیں ممتاز کرتی ہے۔ مَیں تو کہا کرتا تھا کہ شعبے کو نور مصطفیٰ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ پڑھانے کے علاوہ یہ طلباء کی ہم نصابی سرگرمیوں کے انچارج بھی ہیں، داخلے کے مراحل کی نگرانی، امتحانات لینا، رزلٹ ترتیب دینا، ٹائم ٹیبل بنانا، میٹنگ کی روداد قلم بند کرنا، طلباء کے اسٹڈی ٹور ترتیب دینا، کھیلوں کے مقابلوں میں طلباء و طالبات کی شرکت کو یقینی بنانا الغرض شعبے کا ہر کام نور مصطفیٰ ہی کو کرنا ہوتا ہے۔ اس قدر کام کرنے والا ہر ایک کو خوش نہیں رکھ سکتا، یہی حال ان کا بھی ہے، کام بھی کرتے ہیں اور تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے، فاضل صاحب سے رشتہ داری کا طعنہ بھی انہیں سننے کو ملا کرتا ہے۔

مَیں شعبے سے منسلک ہوا تو صفیہ کوکب جز وقتی لیکچرر تھی، صفیہ نے ایک سال قبل ہی پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ایم اے کیا تھا۔ مَیں نے ایک تقدس و پاکیزگی کا ہالہ اس کے گرد محسوس کیا، نقاب کیا کرتی تھی، اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں خوش بختی اور زندگی کا پتا دیتی تھیں۔ صورت میں سیرت کا عکس نمایاں تھا، دیہات کی فضاء میں پروان چڑھی لیکن خود

اعتمادی، مضبوط اعصاب اور مضبوط کردار نمایاں تھا، خوش مزاج، خوش گفتار، پر خلوص ملنسار، شائستہ اور مہذب تھی۔ اس کا رنگ روپ بتاتا تھا کہ یہ افسانے آسانی سے گھڑ سکتی ہے اور اچھی شاعرہ بھی ہو سکتی ہے۔ شعبے میں اس کے لیے کمرہ تو کجا بیٹھنے کو میز کرسی بھی نہیں تھی، میاں صاحب اور نور مصطفیٰ کے کمرے میں مہمانوں والی کرسیوں پر ہی بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اُس وقت میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی، مَیں نے لائبریری کے عملے کے ذریعے اسی کمرے میں اس کے لیے ایک چھوٹی سی میز اور کرسی کا بندوبست کرادیا، بعد میں میاں صاحب الگ کمرے میں چلے گئے اور مجھے میاں صاحب کی میز کرسی مل گئی۔ صفیہ کوکب اچھا پڑھاتی تھی ، طلباء بھی اس سے خوش تھے، اگر وہ شعبے میں اپنی ذمے داریاں جاری رکھتی تو اچھا تھا۔ اس کے چلے جانے سے شعبہ ایک اچھی استاد سے محروم ہوگیا۔ دراصل اس کی شادی ایک سال قبل ہی ہوئی تھی، شوہر' حیدر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے منسلک تھے، اس طرح اس کا میکہ (والدین کا گھر) سرگودھا کی نواحی بستی 'سلاں والی' میں، شوہر اسلام آباد میں اور یہ خود جامعہ سرگودھا کے ہاسٹل میں اور شادی کو صرف ایک سال ہوا تھا، یقینا یہ ایک مشکل وقت تھا۔ دونوں میاں بیوی نے مل کر اس مشکل کو آسان بنادیا اور اس نے شعبہ کو خدا حافظ کہا اور اسلام آباد کو مستقل آباد کرلیا جہاں اس کا شوہر حیدر اس کے انتظار میں فرش راہ کیے ہوئے تھا۔ اب تو اس کے آنگن میں ایک پھول کا اضافہ بھی ہو گیا ہے، خوشی کی بات ہے۔

شعبے میں دو نوجوان بھی تھے ایک عابد اور کامران، عابد خورشید کہنے کو توآفس کلرک تھا لیکن اردو میں ماسٹر اور ایم فل بھی کر رہا تھا، شاعر بھی اچھا تھا، چلتے چلتے اس نے مجھے اپنا شعری مجموعہ ''لمس'' دیا اور تبصرہ لکھنے کی فرمائش بھی کی، مَیں نے کراچی جاکر اس پر تبصرہ لکھا اور اسے بھیج دیا، یہاں اس کے بارے میں وہی باتیں نقل کر رہا ہوں جو مَیں نے تبصرہ میں لکھی تھیں۔' مَیں نے عابد خورشید کو ۱۱ مئی ۲۰۱۰ء کو اس وقت دیکھا جب میں شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز، جامعہ سرگودھا میں بحیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر منسلک ہوا، شعبے سے منسلک ہوتے وقت جس کاغذی کاروائی کی ضرورت ہوتی ہے عابد خورشید نے اس میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ بہت ہی خوش اسلوبی سے تمام کاروائی کو تکمیل تک پہنچایا۔ ایک اجنبی کے ساتھ جب کہ اس کے ساتھ صرف سلام دعا ہی ہوئی تھی مثالی کارکردگی کا اظہار قابل تعریف تھا۔ اس کا یہ عمل ظاہر کر رہا تھا کہ عابد خورشید ایک نیک، سچا، ہمدرد اور دوسروں کی مدد کرنے والا انسان ہے۔ عابد میرے شعبے میں میرا رفیق کار تھا۔ مجھے یہ پہلی ہی نظر میں بھلا معلوم ہوا، تفصیلی تعارف نہیں ہوا تھا لیکن میرا گمان تھا جو بعد میں یقین میں بدل گیا کہ کسی بھلے خاندان کا ایک ایسا ثپوت ہے جس کی پرورش اس کی ماں نے بہت ہی احتیاط سے کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک ایسا انسان موجود ہے جس میں دکھ بھی ہے سکھ بھی، خوشی بھی ہے غمی بھی، آنسو

بھی ہیں تبسم بھی ، یہ ہنستا ہے تو اس کے دکھ کا سایہ بھی جھلک دکھا رہا ہوتا ہے،جب یہ افسردہ ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر ہلکی سی اداسی نمایاں ہوتی ہے۔عابد خورشید کا مجموعہ کلام 'لمس' اپنے تجربات و مشاہدات کی رعنائی کے اعتبار سے شاعر کے احساسات کا خوبصورت عکس ہے ہی نہیں بلکہ اس میں آپ بیتی کا حسن بھی جھلک رہا ہے۔ یہ رومانیت اور حقیقت پسندی کی خوبصورت کاوش ہے۔عابد خورشید کا تعلق شاہینوں کے شہر سرگودھا سے اور یہ نوجوان شاعر سرگودھا کے شعراء کے اس قبیل سے ہے جو مداحینِ ڈاکٹر وزیر آغا ہی نہیں بلکہ سرگودھا اسکول جس کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا ہی تھے کا سرگرم کارکن ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ اردو زبان کی ایک قدآور شخصیت کا نام ہے۔ آپ ان دانشوروں میں سے تھے جو بیک وقت ہفت پہلو یعنی شاعری، تحقیق، تنقید، فلسفہ سائنس، تاریخ ،اساطیر اور اردو انشاپردازی کے شہسوار تصور کیے جاتے تھے۔ انھوں نے اردو انشائیہ کو عام کرنے میں جو کام کیا وہ ناقبل فراموش ہے۔وہ یقینا ہمارے عہد کی ایک اہم اور معتبر ادبی شخصیت تھے۔ عابد خورشید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے مجموعہ کلا 'لمس' کا فلیپ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا۔ یہ تبصرہ پاکستان لائبریری وانفارمیشن

سائنس جرنل کی جلد ۴۲، شمارہ ۳ ستمبر ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ عابد خورشید کے اشعار دیکھیے۔

کسی کی آنکھ کے بھیگے ہوئے منظر میں رہتے ہیں

ہمارا گھر نہیں ہے ہم کسی کے گھر میں رہتے ہیں
ہمارے دل میں آ کر آپ سے دو دن نہیں نکلے
ہم اِک مدت سے اِس ٹوٹے ہوئے مندر میں رہتے ہیں

کامران رعنا بھولا بھالا اور سیدھا سادھا دیہاتی بابو، یہ عابد خورشید کا نائب تھا، ہر ایک کے کام آنا اس کی عادت تھی،مَیں کراچی سے سعودی عرب آگیا پر اس نے مجھ سے ناطہ قائم رکھا، پاکستان سے سعودی عرب فون کرنا ایک مہنگا سودا ہے پر یہ اکثر فون کرتا ہے اور میری خیریت پوچھتا ہے۔ حسنین دفتری تھا لیکن مہذب اور شائستہ ، حافظ قرآن بھی ،مَیں نے اسے بہت ترغیب دی کہ وہ میٹرک ضرور کرلے، مجھے جب کبھی کیمپس سے باہر جانا ہوتا حسنین مجھے اپنی موٹر بائیک پر لے جاتا،اس نے کبھی انکار نہیں کیا، سرگودھا شہر کی مرکزی سڑکوں اور شاپنگ سینٹرز کو مَیں نے اِسی کے ہمراہ دیکھا۔ تابع دار اور نیک فرید ایک ایسا نوجوان تھا جو تھا تو نائب قاصد لیکن بڑوں بڑوں کو اپنے پیچھے لگائے رکھتا تھا، فاضل صاحب کے آفس کے باہر ٹِک کر نہیں بیٹھتا تھا جب دیکھوں لائبریری کے مرکزی کاؤنٹر پر جھرمٹ میں گھِرا نظر آتا تھا۔ خوش پوس و خوش لباس ، فاضل صاحب کا تابیدار، زرا زرا سی بات پر لڑنے کو تیار، میری عزت کیا کرتا تھا، اچھا نوجوان تھا۔

مَیں جب شعبے سے رخصت ہو رہا تھا تو شعبے کے لیے ایک بات بہت اچھی ہوئی وہ یہ کہ ڈاکٹر شمشاد احمد شعبہ سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر منسلک ہوگئے۔ ڈاکٹر شمشاد نے جامعہ کراچی سے لائبریری و انفارمیشن سائنس میں پی ایچ ڈی کیا،ان کا تعلق سرگودھا کے شہر 'فاروقہ' سے ہے اس اعتبار سے ان کا شعبہ میں آ جانا شعبے کے لیے خوش گوار اضافہ تھا۔ نوجوان، مستعد اور پر جوش استاد ہیں۔افسوس وہ بھی مختصر وقت ہی شعبے میں رہ کے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور چلے گئے۔ان سے جو اچھی امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔

مَیں نے شعبے میں رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ شعبے کے جونیئر اساتذہ نور مصطفیٰ خان اور صفیہ کوکب پڑھانے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی جانب بھی توجہ دیں۔ ہم تینوں نے مشترکہ طور پر ایک مضمون انگریزی میں جامعہ سرگودھا کی مرکزی لائبریری پر تحریر کیا، یہ مضمون اپنے موضوع پر اولین کوشش تھی ، اس سے قبل سرگودھا یونیورسٹی لائبریری پر کوئی مضمون نہیں لکھا گیا تھا، ہم نے لائبریری کے بارے میں معلومات جمع کیں، اسٹاف ، طلباء اور عام قارئین سے انٹر ویوز بھی کیے، یہ مضمون پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل کی جلد ۴۱، شمارہ ۳، ستمبر ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔اس کاوش کا بنیادی مقصد سرگودھا یونیورسٹی لائبریری کے بارے میں اعداد و شمار اور حقائق سامنے لانا تھااور اپنے دونوں جونیئر ساتھیوں کو لکھنے کی ترغیب دینا بھی تھا۔ میری خواہش اور

کوشش تھی کہ پروفیشن سے منسلک ساتھیوں کو تصنیف وتالیف اور چھپنے کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ میسر آئیں، میری سوچ یہ ہے کہ پاکستان کے تمام لائبریری اسکول اپنے اپنے طور پر تحقیقی جریدہ شائع کریں، اس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے، پاکستان میں صرف شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، جامعہ پنجاب لاہور واحد لائبریری اسکول ہے جو سالانہ بنیاد پر ایک تحقیقی جریدہ' پاکستان جرنل آف لائبریری و انفارمیشن سائنس' شائع کررہاہے، دوسرا جریدہ کراچی سے لائبریری پروموشن بیورو'پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل' شائع کرتی ہے، یہ سہ ماہی جریدہ ہے جو گزشتہ ۴۲ سال سے مستقل شائع ہورہاہے۔ مجھے اس جریدہ کا چیف ایسو سی ایٹ ایڈیٹر ہونے کا اعزازحاصل ہے، مَیں نے کوشش کی کہ سرگودھا میں قائم لائبریری اسکول سالانہ بنیاد پر ہی سہی ایک جریدہ شائع کرے۔فاضل صاحب کو جب یہ تجویز دی تو فوری تیار ہوگئے، میاں صاحب نے حسب عادت تحفظات کا اظہار کیا پھر وہ بھی تیار گئے، نور مصطفیٰ اور صفیہ کوکب نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ شعبہ کے چیئرمین کے توسط سے یہ تجویز شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری صاحب کو ارسال کی گئی، شیخ الجامعہ نے فاضل صاحب کو اس پر تبادلہ خیال کے بلایا، شاید وہ ان کی زبانی اس تجویز کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے، انہوں نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اوراس کی باقاعدہ منظوری دیدی، اس تجویز کے مطابق سرگودھا لائبریری اسکول سالانہ بنیاد پر ایک تحقیقی جریدہ شائع کرے گا، جریدہ

کانام ''سرگودھا جرنل آف لائبریری وانفارمیشن سائنس'' تجویز کیا گیا تھا، سرپرستِ عالی شیخ الجامعہ اور سرپرست چیئرمین شعبہ اور مجھے اس جریدہ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا، افسوس مجھے بعض مجبوریوں کے باعث شعبہ کو خیر باد کہنا پڑا، یہ تجویز شیخ الجامعہ سے

باقاعدہ منظور شدہ ہے، شعبہ کے ذمہ داران کو اس تجویز پر عمل کرنے کی سعی کرنا چاہیے، میرا اتمام تر تعاون اب بھی ان کے ساتھ ہوگا۔

اس موقع پر سرگودھا جو ایک تاریخی شہر ہے' کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، سرگودھا کی تاریخ پر صاحبزادہ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول صاحب نے ایک عمدہ کتاب بعنوان (History of Sargodha) تحریر کی ہے، مصنف کے مطابق ''سرگودھا کی بنیاد ۲۲ فروری ۱۹۰۳ء کو سر میلکوم ھیلے (Sir Malcolm Hailey) نے رکھی جو بعد میں پنجاب کا گورنر بنا۔ سرگودھا دو دریاؤں چناب اور جہلم کے بیچ میں واقع ہے۔ سرگودھا دو لفظوں 'سر' اور' گودھا' کا مرکب ہے۔ 'سر' کا مطلب ہے ''پول (Pool or Pond) '' اور گودھا ایک ہندو جوگی کا نام تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق جوگی کا اصل نام ''لالو'' تھا، گودھا اس کے قبیلے کا نام تھا۔ یہ جوگی' تالاب کے کنارے پر رہتا تھا۔ جب نیا شہر وجود میں آیا تو اس نے خود بخود سرگودھا کا نام اختیار کر لیا۔ لفظ 'گودھا' سنسکرت زبان کے لفظ ''یودھا (Yoddha)'' سے

(Fighters) ''ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے''لڑنے والے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں سرگودھا میں پاکستان ائر فورس نے دشمن کو جس بہادری اور دلیری سے پسپا کیا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ پاک فضائیہ کی بہادری کے نتیجے میں اس شہر کو ''شاہینوں کا شہر (City of Eagle)'' کا خطاب دیا گیا۔آج یہ شہر اسی نام سے معروف ہے۔ سرگودھا شہر کی ایک خوبی اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہاں کی زرعی زمین سنتروں اور کینوؤں کی پیداوار کے حوالے سے دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ یہاں کے سرسبز کھیتوں میں کینوؤں کے بے انتہا درخت اپنا ثانی نہیں رکھتے، کینوؤں کے موسم میں یہ درخت جب کینوؤں سے لدے ہوئے ہوتے ہیں تو خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ بہترین اقسام کے کینوؤں کی پیداوار کی وجہ سے اس شہر کو کینوؤں کا شہر (Kinoo Capital of the World) یا پاکستان کا کیلی فورنیا (California of Pakistan) بھی کہا جاتا ہے۔ سرگودھا ایک مردم خیز سرزمین ہے جس نے علمائے دین، صوفیائے اکرم ، اہل دانش ، شاعروں، سیاسی مدبروں کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ، جن کے خیالات، خدمات اور تصنیفات سے ہمارے کتب خانے مالا مال ہیں ۔ان کی خدمات کو قومی اور عالمی سطح پر معتبر حیثیت حاصل ہے۔ان میں بعض احباب کے نام فخر سے لیے جاسکتے ہیں۔ فیروز خان نون معروف سیاست دان جو پاکستان کے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ معروف شاعر و دانش ور احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر

انور سدید، اور دیگر سرگودھا شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ عشق، محبت اور قربانی کے لازوال کردار ہیر اور رانجھا کا تعلق بھی اسی سرزمین سے رہا، رانجھا کا گاؤں ''تخت ہزارہ'' سرگودھا شہر سے بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے جب کہ ہیر جھنگ سے تعلق رکھتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا اسکول کے روح رواں تھے، ڈاکٹر انور سدید نے اس گروپ کو اور زیادہ پروان چڑھایا۔ بعض لکھنے والوں نے اسے ''دبستان سرگودھا'' اور بعض نے سرگودھا گروپ بھی کہا ہے۔ شاہد حنائی نے اپنی خاکوں کی کتاب 'چہرہ نما' میں عذرا اصغر کا خاکہ بعنوان ''رنگ، خوشبو، روشنی'' میں لکھا عذرا اصغر ابھی گروپ بندی کے خلاف ہے۔ تاہم تعلق خاطر کی بنا پر سرگودھا گروپ کی سرگرم کارکن ہے۔ جب تک ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی ڈاک نہ پہنچ جائے ''تجدید نو'' کی اشاعت میں تاخیر ممکن ہے۔ دونوں بزرگوں میں سے جو بھی اسلام آباد آئے۔ عذرا اصغر دعوت کا اہتمام ضرور کرے گی۔ خود اپنے افسانے بھی وزیر آغا گروپ کے رسائل کو ہی بھجوائے گی۔ ''تجدید نو'' میں چھپنے والوں کی اکثریت بھی اسی گروپ کی حامی ہے۔ پروفیسر صابر لودھی نے اپنی خاکوں کی کتاب ''بھلایا نہ جائے گا'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کا خاکہ بعنوان ''وزیر آغا۔ نظریہ ساز راوین'' میں لکھا ''وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں، حالانکہ ان کے نکتہ چینوں نے ان کے ادبی جریدے ''اوراق'' میں

لکھنے والوں کو ''دبستان سرگودھا'' کے ارکان کہا ہے اور وزیر آغا کو اس دبستان کا بانی قرار دیا ہے۔ دراصل دانشوروں کا حلقہ ہی ان کا دبستان ہے''۔

جامعہ میں کل وقتی پڑھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا، اس سے قبل میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں جذوقتی پڑھا چکا تھا، اس کے علاوہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے گریجویٹ پروگرام کے علاوہ ایم اے کا ٹیوٹر بھی رہ چکا تھا۔ میرے لیے پوسٹ گریجویٹ کلاس کو پڑھانا کوئی مشکل نہ تھا، مئی میں سیمسٹر اپنے اختتام پر تھا، پھر بھی مَیں نے جونیئر اور سینئر کے دو دو مضامین کے باقی ماندہ کورس کو مکمل کرانے کی ذمہ داری لے لی۔ سینئرز کا آخری سیمسٹر تھا انہیں دو مضامیں Archives Managementاور Human Resource Management اسی طرح جونیئرز کی Applied Cataloguingکے کورسز مکمل کرائے۔ اس سیمسٹر کے اختتام کلاس کو کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور مَیں کراچی آگیا، چھٹیوں کے بعد ایم اے سال اول کی نئی کلاس آئی، سیمسٹر اول اور فائنل کی کلاس کا تیسرا سیمسٹر شروع ہوا، اس سیمسٹرز میں مجھے دو دو مضامین پڑھانا تھے ان میں جونیئر کو Introduction to Classificationاور Bibliography: Theory & Practice جب کے فائنل اورMarketing of Library and Information Services کلاس کو Literature on Social Sciences پڑھایا۔مَیں نے بھی محنت کی اور میرے طلبہ وطالبات نے بھی میرے ساتھ محنت سے پڑھا، یہی

وجہ تھی کہ جب مَیں نے جامعہ سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا تو میرے طلبہ میرے اس فیصلہ پر سب سے زیادہ رنجیدہ اور پریشان تھے، ہر ایک نے فرداً فرداً مجھ سے اپنا فیصلہ واپس لینے کی درخواست کی،مَیں اپنے طلبہ کی اس خواہش پر بار بار فیصلہ بدلنے کا سوچا کرتا تھا لیکن میری مجبوریاں میرے آڑے آجایا کرتیں اور میں اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔ میرے طلبہ اب بھی فون پر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں دوبارہ سرگودھا کب آرہا ہوں۔ طلبہ کی مجھ سے اس قدر محبت اور عقیدت ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن ، فیڈرل برانچ نے اسلام آباد میں کانفرنس منعقد کی، سرگودھا سے فاضل صاحب، میاں اسلم، نور مصطفی اور اس ناچیز نے شرکت کی، کراچی سے ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب جو امریکہ سے آئے ہوئے تھے نے بطور خاص شریک ہوئے، صمد انصاری ان کے ساتھ تھے۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد سبزواری صاحب کو شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنسز، جامعہ سرگودھا آنے کی دعوت دی گئی، طے پایا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی سرگودھا چلیں،اس موقع پر میاں صاحب ہی ہمارے کام آئے،انہوں نے اپنے بھائی کی کار کا انتظام کر لیا، اب ہم سب یعنی سبزواری صاحب، فاضل صاحب ، میاں صاحب، صمدانصاری، نور مصطفی اور مَیں سرگودھا کے لیے اسلام آباد سے روانہ ہوئے،رات گئے سرگودھا پہنچے،

میاں صاحب نے سبزواری صاحب اور صمد انصاری صاحب کو اپنا مہمان بنایا، مَیں بھی ساتھ ہی تھا، گھر پہنچے کمرہ میں تین بستر لگے ہوئے تھے۔ گویا مہمانوں کے لیے پہلے سے اہتمام کیا جا چکا تھا۔ میاں صاحب نے راستے ہی میں بیگم کو ہدایات جاری کردی تھیں، ناشتہ کے بعد شعبہ میں ڈاکٹر سبزواری صاحب کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام تھا۔ طلبہ وطالبات نے مہمانوں کا استقبال کیا، تقریریں ہوئی، فاضل صاحب نے استقبالیہ کلمات کہے، سبزواری صاحب، صمد صاحب اور مَیں نے بھی تقریر کی۔ سبزواری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ''لائبریری اور لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کو دوام حاصل ہے، جدید انفارمیشن کے پھیلاؤ کے باوجود کتاب کی اہمیت مسلمہ ہے اور لائبریری کی اہمیت و ضرورت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے، لائبریری سائنس کے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اپنی صلاحیتوں کو زیادہ مضبوط و مستحکم کریں، کتب خانوں میں کمپیوٹر کا استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے''۔ اس موقع پر ڈاکٹر فاضل خان صاحب نے فرمایا کہ ''مجھے ڈاکٹر سبزواری کی شاگردگی پر فخر حاصل ہے، ڈاکٹر صاحب دنیائے لائبریرین شپ کا ایک ایس رخشندہ ستارہ ہیں کہ جن کی علمی خدمات آج بھی جاری و ساری ہیں، آپ نے ڈاکٹر سبزواری کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں ہماری دعوت قبول کرتے ہوئے سرگودھا تشریف لائے۔ سبزواری صاحب اور صمد انصاری نے ایک رات ہاسٹل میں گزاری، کمرے میں دو ہی بیڈ تھے، مَیں نے ایک گدہ فرش پر ڈال لیا تھا خیال تھا کہ مَیں اس پر سو جاؤں گا، سبزواری صاحب نے جب

یہ دیکھا تو وہ بیڈ سے اٹھ کر نیچے آ گئے۔ کہنے لگے میں نیچے لیٹوں گا۔ ہم دونوں نے بہت منت سماجت کی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی۔ ذرا ئی تو دیکھئے کہ دونوں شاگرد ایک دائیں دوسرا بائیں بیڈ پر اور استاد

درمیان میں زمین پر۔ اس لمحہ شرمندگی تو دامن گیر تھی ہی لیکن استاد کی خواہش زیادہ مقدم تھی۔

طلبہ کی حوصلہ افزائی اور ان میں مقابلہ کا رجحان پیدا کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں طلبہ کو انعامات، اسکالرشپ، میڈل، شیلڈ اور نقد انعامات دئے جانے کی روایت قدیم ہے۔ پاکستان کی مختلف جامعات کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں بھی بہتر تعلیمی کارکردگی کے حامل طلبہ کے لیے میڈل اور اسکالرشپ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم کے لیے 'اسپل گولڈ میڈل (SPIL Gold Madel)' جاری ہوا۔ 'اسپل' انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات (Society for the Promotion & Improvement of Libraries, SPIL) 'پاکستان میں کتب خانوں کے فروغ و ترقی کے لیے ۱۹۶۰ء میں قائم کی گئی۔ کتاب اور کتب خانوں کا درد رکھنے والی معروف شخصیت حکیم محمد سعید شہید اس سوسائیٹی کے بانی صدر تھے جو اپنی شہادت تک اس کے صدر رہے۔ اسپل گولڈ میڈل کے لیے حکیم محمد سعید نے اس وقت مبلغ ایک لاکھ روپے جامعہ کراچی کو فراہم

کیے تھے۔ اسپل گولڈ میڈل کے اجراء کے بعد لائبریری سائنس کے طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دیگر اداروں میں بھی میڈل اور ایوارڈ جاری ہوئے، یہ ایوارڈ لائبریری سائنس کی معروف شخصیات کے ناموں سے منسلک نظر آتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالمعید گولڈ میڈل، پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر گولڈ میڈل اور ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ایوارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسپل گولڈ میڈل کے بعد دوسرا گولڈ میڈل ''ڈاکٹر عبد المعید گولڈ میڈل'' ۱۹۸۱ء میں پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے زیر اہتمام چلنے والے ادارے اسکول آف لائبریرین شپ میں جاری ہوا، جو ہر سال لائبریری سائنس کے ہائر سرٹیفیکیٹ کورس میں اول پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم کا دیا جاتا ہے۔ تیسرا گولڈ میڈل ''پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر گولڈ میڈل'' شعبہ لائبریری و انفارمیشن، جامعہ پنجاب، لاہور میں جاری کیا گیا۔ اس گولڈ میڈل کے لیے مبلغ ایک لاکھ روپے جامعہ پنجاب کو پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر نے ہی فراہم کیے تھے۔ ''ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ایوارڈ (Dr. Ghaniul Akram Sabzwari Award)'' ۲۰۱۰ء میں شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز، جامعہ سرگودھا میں جاری ہوا۔ یہ ایوارڈ پاکستان لائبریرین شپ کی معروف استاد، مصنفہ و محققہ پروفیسر ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی تحریک پر جامعہ سرگودھا میں جاری کیا گیا، اس مقصد کے لیے ڈاکٹر نسیم فاطمہ نے جامعہ سرگودھا کو پچاس ہزار روپے کی رقم فراہم کی۔ یہ ہر سال اس طالب علم کو دیا جاتا ہے جس

نے تحقیق کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز میں ایم ایل آئی ایس کا پہلا سیشن مکمل ہو چکا تھا، آٹھ طلبہ وطالبات نے مقالات تحریر کیے تھے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر محمد فاضل خان صاحب نے فیصلہ کیا کہ ' ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ایوارڈ' شعبہ کے اس طالب علم کو دیا جائے گا جس کا تحقیقی مقالہ سب سے بہترین ہوگا۔ بہترین مقالہ کے انتخاب کی ذمہ داری صدر شعبہ نے مجھے سونپ دی، منصف کی حیثیت سے مجھے ان مقالات میں سے بہترین مقالہ کا انتخاب کرنا تھا، شعبہ کی ایک طالبہ آنسہ صائمہ روحی نے (College Libraries of Sargodha) کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا تھا، میری رائے میں وہ دیگر مقالات میں بہتر تھا، چنانچہ ۲۰۱۰ء میں پہلے 'ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ایوارڈ' کی حقدار صائمہ روحی قرار پائیں۔

شعبہ میں بہت اچھا وقت گزرا، شعبے اور لائبریری کے تمام ساتھی میرا بہت خیال کیا کرتے تھے، انہوں نے مجھے جو عزت دی مَیں اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گا، لائبریری کے تمام ساتھی خاص طور پر ناصر گجر، محمد احمد شاہ، راجہ غلام مصطفیٰ، آسیہ، آفس کے ساتھی عابد خورشید، کامران رانا، محمد حسنین، فرید اور دیگر جن کے نام مجھے اب یاد نہیں سب ہی میری بہت عزت کیا کرتے اور خلوص کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے انہوں نے کبھی میرے کسی کام سے انکار نہیں کیا۔

ناصر گجر سینئر لائبریرین ، یہ ڈاکٹر خالد محمود کے کلاس فیلو بھی ہیں، اچھا اور نیک انسان ہے، میں نے کوشش کی کہ یہ شعبہ میں پڑھانے پر آمادہ ہو جائے لیکن نہیں معلوم کیا مجبوری تھی کہ اس نے میری ایک نہ سنی، محمد احمد شاہ صاحب بھی سینئر لائبریرین ہیں، انٹر کے طلبہ کو لائبریری سائنس پڑھاتے ہیں، میرے بہت ہی مہرباں رہے، انہوں نے مجھے سرگودھا نہ چھوڑنے کی بہت ترغیب دی، مجھے کرایہ کا گھر دلوانے کے لیے بھی بہت تگ و دو کی، اپنے گھر بھی لے گئے، کھانا بھی کھلایا، ان کی بیٹی میری شاگرد بھی رہی۔ ایک بچی آسیہ بھی تھی، ہنستی مسکراتی ہر وقت کام میں مصروف نظر آیا کرتی تھی، یہ اردو ٹائپ بھی جانتی تھی، تھی تو کلرک لیکن علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ایم اے کر چکی تھی،اللہ تعالیٰ اس کا مستقبل اچھا کرے۔

فاضل صاحب کے دو بیٹے سرگودھا میں اُن کے ساتھ تھے ایک حافظ صاحب اور دوسرا عمران ۔ عمران' فاضل صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، شاید میٹرک کر رہا تھا، عمران میرا بہت خیال رکھتا تھا، جب بھی اپنے ہاسٹل سے نیچے اترتا میرے پاس آ کر پوچھا کرتا انکل کوئی کام تو نہیں۔ کبھی مجھے کچھ منگوانا ہوتا تو اس سے منگوالیا کرتا، اکثر میرے کمرہ میں آ جاتا اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتا، ایک موبائل ہاتھ میں اور ایک جیب میں ہوا کرتا تھا۔ اس کا

ہم عمر لڑکا فاروق ہمارے ہاسٹل میں ہمارے کک کا اسسٹنٹ تھا، اسے ہاسٹل سیکریٹری ڈاکٹر شاہد راجپوت صاحب نے نذر حسین کی مدد کے لیے رکھ لیا تھا، یہ ہمارے کام بھی کردیا کرتا تھا۔ اچھا لڑکا تھا، والدین بہت غریب تھے، سرگودھا کے کسی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ فاروق بھی میرا بہت خیال کیا کرتا تھا، ہم سب لوگ اس کی مدد کیا کرتے، میرا کمرہ ڈائننگ روم کے برابر میں تھا، جس سے منسلک کچن تھا، اس وجہ سے بھی میرا تعلق ان سے زیادہ رہا کرتا تھا۔ عمران ویسے تو چھوٹا تھا، ابھی میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا، اسکول میں پڑھا کرتا تھا، بہت شوخ اور شرارتی ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب، شائستہ اور عزت کرنے والوں میں سے تھا۔ موبائل کا تو آجکل بچوں کو کریز ہے، اسے بھی تھا۔ جیسا مَیں نے کہا کہ ایک موبائل جیب میں اور ایک ہاتھ میں، سمیں ان کے علاوہ، موبائل میں اس قسم کا سافٹ ویئر بھی آتا ہے کہ جس کے ذریعہ آواز تبدیل ہوجاتی ہے، مرد کی آواز نسوانی ہی نہیں ہوتی بلکہ عمر کے اعتبار سے تبدیل کی جاسکتی ہے، جیسے ۱۶ سال کی لڑکی کی آواز، ۴۰ سال کی عورت کی آواز، مجھے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا، یہ بات میں نے عمران کی زبانی ہی سنی تھی۔ فاروق عمران کا دوست بھی بن گیا تھا، کیونکہ یہ ہم عمر بھی تھے۔ عمران نے آواز بدلنے والا سافٹ ویئر استعمال کرتے ہوئے فاروق کو لڑکی کی آواز میں فون کیا اور عشق و محبت کی باتیں بھی کیں، فاروق کم عمر ضرور تھا لیکن جوانی کا خمار آنا شروع ہوگیا تھا، پھر ہاسٹل کے سامنے سے دن بھر طالبات کا ادھر سے

ادھر آنا جانا۔ فاروق عمران کے بہکاوے میں آگیا۔ عمران اکثر رات میں آتا مجھ سے کہتا انکل جی دیکھیں ابھی فاروق موبائل کی آواز سنتے ہی ایک طرف کونے میں چلا جائے گا۔ واقعی ایسا ہی ہوا بھی کرتا۔ اس طرح عمران نے فاروق کو بہت پریشان کیا۔ ابھی یہ تماشا چل ہی رہا تھا۔ کہ عمران نے سکیورٹی گارڈ کے ساتھ جھگڑا کر لیااور ایسا جھگڑا کیا کہ اس سیکیورٹی گارڈ کو جو اس سے عمر میں کافی بڑا بھی تھاایک عدد تھپڑ رسید کر دیا۔ بات فاضل صاحب تک پہنچی انہوں نے اسی میں عافیت جانی کے عمران کو واپس اپنے گھر رحیم یار خان بھیج دیا جائے اور عمران کو بہت اجلت میں گھر بھیج دیا گیا۔ وہ مجھے بہت عرصہ تک یاد آتا رہا۔ مَیں نے فاضل صاحب سے اسے واپس بلوانے کو کہا بھی لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ اللہ اس بچے کو ہمیشہ خوش رکھے۔

شعبہ کے طلبہ نے مجھے جو عزت دی وہ میری زندگی کا قیمتی سرمایا ہے۔ مَیں شعبہ سے منسلک ہوا تو فائنل سیمسٹر کے طلبہ کو مشکل سے دو ماہ ہی پڑھایا ہوگااس کے بعد وہ اس شعبہ سے فارغ ہونے گئے اور عملی زندگی میں مصروف عمل بھی، وہ تمام میرے ساتھ جس خلوص ، محبت اور اپنائیت سے پیش آیا کرتے قابل تعریف ہے۔ بعض طلبہ جن میں ذیشان راؤ، عبدالرحیم، صائمہ روحی ، سمیعہ روحی، ثمیرا بانو، سمعیہ جبار، اسما حسن، حافظہ ماریہ شیریں شامل تھے نے میرے اعزاز میں الوداعی دعوت کا اہتمام بھی کیا۔ شعبہ کے اولین سیشن کے بعض

طلبہ وطالبات اب بھی مجھ سے رابطے میں ہیں اور اکثر مجھے فون کر لیتے ہیں ان میں صائمہ روحی، سیمرا حیدر، شاہد، رحیم، عدیلہ وڑائچ اورماریہ شامل ہیں۔ دوسرے سیشن کے طلبہ کو مَیں نے دو سمسٹرپڑھایا، میرا ایک شاگرد ارشد ہجرا جسے مَیں کلاس میں ارشد بھٹی کہا کرتا تھا حالانکہ وہ بھٹی نہیں تھا، اسی کلاس کا ایک طالب علم عرفان گوندل تھا، یہ ارشد کا قریبی دوست تھا، اس نے ایک کارنامہ انجام دیا، پہلے سمسٹر کا امتحان تھا، مجھے چھٹی پر کراچی جانا پڑا، اپنا پرچہ بنا کر نور مصطفیٰ کو دیدیا، جس دن میرے مضمون کا امتحان تھا سنا ہے کہعرفان نے اپنی جگہ کسی دوسرے لڑکے کو امتحان دینے کے لیے بٹھادیااور وہ پکڑا بھی گیا، اس کے بعد سے عرفان گوندل نے کلاس میں آنا ترک کردیا، مَیں جب واپس سرگودھا آیا تو یہ قصہ معلوم ہوا، اب مَیں نے ارشد کو اس کے دوست کی دوستی کی بناپر ارشد بھٹی کہنا شروع کردیا۔ کیونکہ عرفان بھٹی کے نام سے معروف تھا۔ارشد نے مجھے اپنے گاؤں 'جھال چکیاں لے جانے اور وہاں کی مشہور دال ''دال جھال چکیاں دی'' کھلانے کی دعوت دی، اس کا گاؤں سرگودھا شہر سے بارہ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، میں نے قبول کرلی، مقررہ وقت ارشد موٹر بائیک پر مجھے جھال چکیاں لے گیا، راستے میں بارش بھی ہوئی لیکن یہ مجھے موٹر بائیک پر سرپٹ دوڑاتا ہوااس مشہور ہوٹل لے گیا جہاں کی یہ دال سرگودھا ہی میں نہیں بلکہ پورے پنجاب میں مشہور ہے، ایسا ہی ہے کہ جیسے کراچی میں اسٹوڈنٹ بریانی،ملتان کا سوہن حلوہ، خوشاب کا ڈوڈا،

کراچی میں کبھی عبدالخالق کے رس گلے بہت مشہور ہوا کرتے تھے۔ فریسکو کی مٹھائی بہت مشہور تھی، ۔برنس روڈ کی نہاری بہت پسند کی جاتی تھی، ہوٹل بڑا تھا، لوگ جوق درجوق چلے آرہے تھے، صفائی کا فقدان تھا، ہوٹل میں دال روٹی کا ریٹ فکس تھا یعنی ڈیڑ سو روپے میں ایک شخص جس قدر دال اور جس قدر روٹی کھا سکتا ہے کھالے، خوش خوراکوں کے تو وارے نیارے اور ہم جیسوں کے لیے ایک وقت کی دال روٹی ڈیڑھ سو روپے میں، لیکن یہ عام دال نہیں بلکہ سرگودھا کی مشہور و معروف ہے دال ہے، دال گرینڈ کی ہوئی تھی، کچھ کچھ کراچی کے حلیم کا مزاہ تھا لیکن یہ دال ہی تھی۔۔ارشد نے بھی مجھ سے ناتا جوڑا ہوا ہے، اکثر فون کرلیتا ہے۔

میرا ایک شاگرد افتخار احمد سینئر کلاس میں تھا، اس کا چھوٹا بھائی مختار احمد بھی ایک سال قبل میرا شاگرد رہ چکا تھا، یہ سرگودھا شہر سے دور ایک گاؤں ' للیانی' میں رہتے ہیں، کینوؤں کا موسم تھا، سرگودھا تو ہے ہی کینوؤں کا شہر، اس نے اپنے گاؤں لے جانے کی دعوت دی، جس دن اس کے گاؤں جانا تھا مَیں نے اپنی بیٹی جو لاہور میں رہتی ہے کو بھی بلا لیا، وہ بھی اپنی کار میں آگئی، اب ہم افتخار کے بتائے ہوئے راستہ پر چل دئے، عاصم کار ڈرائیو کررہے تھے ، میری نواسی نہا اور نواسہ ارحم بھی ساتھ تھے، کچھ دیر میں ہم افتخار کے گاؤں 'للیانی' پہنچ گئے، چاروں طرف زرعی زمین جس میں

مختلف اشیاء کاشت کی ہوئی تھیں، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کینوؤں کے درخت کینوؤں سے لدے ہوئے تھے، خوبصورتی کا بے مثال منظر، درمیان میں افتخار کا گھر تھا، فاطینہ اور بچے اندر چلے گئے ، باہر ایک جانب گائیں ، بھیسیں، بکریاں بندھی تھیں، چارہ کاٹنے کی مشین لگی ہوئی تھی، ٹریکٹر بھی ایک جانب کھڑا تھا، دو عدد چارپائیاں جن پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں ،افتخار کے والد اور چچا نے ہمارا استقبال کیا، سادگی، خلوص و محبت کا لازوال اظہار، سلام دعا اور تعارف ہوا، تھوڑی دیر ستانے کے بعد افتخار نے ہم سب کو اپنے کینوؤں کے باغ میں چلنے کو کہا، افتخار کا بھائی مختار اور اس کی چھوٹی بہن سمینہ بھی ہمارے ہمراہ تھے، کینوؤں کے درختوں کے درمیاں پہنچ کر دونوں بچوں نے کینوں توڑنا شروع کردیے، ہم نے بھی اپنے ہاتھوں سے کینوں توڑ کر اسی وقت کھائے، کراچی کے رہنے والوں کے لیے دیہات کے قدرتی نظاروں کا میسر آجانا ایک نعمت سے کم نہیں۔ ہم نے خوب خوب کینوں توڑے اور کھائے بھی، کچھ سبزیاں بھی لگی ہوئی تھیں وہ بھی توڑیں ، بڑا لطف آیا، واپس گھر آئے ،شام ہورہی تھی، افتخار کے والد نے گدھا کھولا اور زرعی زمین کی جانب چل دئے، تھوڑی ہی دیر میں گدھے پر جانوروں کا چارا لاد کر واپس آئے، چارا اُتارا اور پھر سے واپس چلے گئے، اس طرح انہوں نے کافی چارہ جمع کر لیا، اب گدھے کو اپنی جگہ باندھا اور چارہ کاٹنے والی مشین چلائی اور جو چارا وہ لائے تھے اسے کاٹنا شروع کیا، کچھ ہی دیر میں سارا چارا کٹ گیا، اب انہوں نے یہ

چارہ جانوروں کے سامنے ڈالنا شروع کیا، تھوڑی دیر میں مختار نے ٹریکٹر اسٹارٹ کیا اور ٹریکٹر لے کر اپنی زمین کی جانب چلا گیا، یقینا یہ شام کے وقت زمین پر حل چلانے گیا ہوگا۔اب ہم گھر میں گئے جہاں پر گرما گرم کھانا ہمارا منتظر تھا، لذیذ ومزیدار کھانا کھا یا، گھر والوں سے اجازت چاہی ،افتخار کی امی اور بہن سے سلام دعا ہوئی اور واپسی کا سفر شروع ہوا، افتخار نے گاڑی کی ڈگی میں ڈھیروں کینوں اور سبزیاں رکھ دیں،اسے ہم نے منع بھی کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ دیہات کی زندگی اب بھی بناوٹ اور دکھاوے سے پاک ہے۔اس میں حسن ہے، سادگی ہے، پیار ہے ، محبت ہے، حالانکہ یہ گاؤں اب شہروں کا روپ دھار چکے ہیں ، یہاں شہر کی تمام سہولتیں اور آسائشیں فراہم ہیں اس کے باوجود یہاں بناوٹ اور ریاکاری کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ افتخار نے بتایا کہ وہ دونوں بھائی اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے ہیں، ساتھ ہی انہوں نے گاؤں میں ایک اسکول بھی کھولا ہوا ہے جہاں پر وہ دونوں بھائی صبح کے وقت مصروف رہتے ہیں۔ افتخار کی بہن میری بیٹی فاھینہ کی دوست بن گئی ہے ، گو عمر میں اس چھوٹی ہے یہ اکثر اسے فون کرکے خیریت معلوم کرلیتی ہے، افتخار بھی رابطہ میں رہتا ہے۔

جونیئر کلاس کے ایک اور طالب علم حماد نے بھی دعوت دی، اس کا شادی ہال تھا، دوپہر کی دعوت تھی، میرا ایک شاگرد ارشد مجھے اپنی موٹر سائیکل پر لے گیا.

گاڑی ایک شادی ہال کے سامنے روکی میَں نے کہا کہ کیا شادی کا کھانا کھلاؤگے۔ اندر گئے تو استقبالیہ پر حماد موجود تھا، پتا چلا کہ یہ شادی ہال اسی کا ہے، اس نے ہماری دعوت اسی شادی کے کھانے میں کی ہے، راجہ مصطفیٰ صاحب کی رہائش شادی ہال کے نزدیک ہی تھی انہیں بھی مدعو کیا تھا وہ بھی آ گئے۔ فاضل صاحب نے، نور مصطفیٰ نے، میاں صاحب نے، ڈاکٹر شمشاد احمد نے الگ الگ الوداعی دعوتوں کا اہتمام کیا۔ شعبہ کی جانب سے الوداعیہ بھی ہوا۔ میری دو شاگرد بہنوں صائیمہ اور سمیۂ نے اپنے گھر دعوت پر بلا یا، اس کی امی اور بھائی بہت خلوص سے ملے۔ واپسی پر صائمہ کے بھائی نے ہاسٹل بھی چھوڑا۔ سب لوگوں کی محبت، خلوص اور عقیدت کو میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔

جامعہ سرگودھا کا ٹیچرز ہاسٹل کا کمرہ نمبر ۵ میرے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میَں بائیالوجی کے استاد ڈاکٹر ظفر اقبال کا روم میٹ تھا، ڈاکٹر ظفر اچھے انسان تھے، تحقیق کے آدمی تھے، لکھنا اور چھپنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ہاسٹل میں ٹیچر کو نیٹ کی سہولتیں میسر تھیں، ظفر صاحب جتنی دیر کمرہ میں ہوتے لیب ٹاپ پر سرچنگ کرتے اور مضامین لکھتے رہتے، میَں اپنے لیب ٹاپ پر مصروف رہا کرتا، دونوں اپنے اپنے بیڈ پر لیب ٹاپ پر مصروف عمل رہا کرتے۔ خاموش طبع تھے، کم سے کم گفتگو کیا کرتے تھے، اتفاق سے میَں بھی ان کا ہم مزاج تھا، ہم دونوں کے درمیان بہت کم جملوں کا تبادلہ ہوا کرتا، لیکن

دونوں کوایک دوسرے سے کبھی شکایت نہیں ہوئی، وہ اردو کم سرائیکی زیادہ بولا کرتے تھے، ان کی فیملی جھنگ میں تھی۔ وہ ہر جمعہ کی دوپہر اپنے گھر چلے جایا کرتے اور پیر کی صبح واپس آیا کرتے تھے، اس دوران مَیں کمرہ میں تنہا ہی ہوا کرتا۔ شہر نیا، لوگ نئے، ماحول اجنبی' البتہ خالصتاً علمی۔ زندگی کا پہلا تجربہ تھا گھر سے باہر رہنے کا وہ بھی ہاسٹل لائف۔ اکثر احباب سے سنا کرتا تھا کہ ہاسٹل لائف عام زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ مَیں شام پانچ بجے تک شعبہ میں رہتا، عصر کے وقت شعبہ سے واپس ہاسٹل آتا اور عصر کی نماز کے لئے مسجد چلا جاتا اور پھر کیمپس کے پر فضا ماحول میں کھو جایا کرتا۔ جامعہ سرگودھا کا عین وسطی حصہ خوبصورت منظر پیش کرتا ہے' اس میں وسیع و عریض سرسبز کھیل کے میدان، جن کے گرد لہلہاتے درخت حسین نظارہ پیش کرتے اور شام کے اوقات میں ان میدانوں میں طلبہ ہر قسم کے کھیلوں میں مصروف نظر آتے۔ ان میدانوں کے چاروں اطراف صاف ستھری سڑکیں صبح و شام جاگنگ ٹریک بنی ہوتی تھیں' جہاں ہر عمر کے لوگ دوڑتے اور چہل قدمی کرتے نظر آتے ۔ مَیں بھی اس حسین منظر نامے کا حصہ بن گیا تھا۔ ٹیچرز ہاسٹل میں زمینی منزل پر ہمارے علاوہ کمرہ نمبر ۲ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب شعبہ اردو کے چیئر مین تھے، اردو کے معروف ادیب، شاعر اور دانشور بھی، کمرہ نمبر ۳ میں ڈاکٹر ارشد جن کا تعلق عارف والا سے تھا' رہا کرتے تھے ۔ پہلی منزل پر ڈاکٹر شاہد راجپوت ، ڈاکٹر دانش اور دیگر احباب تھے، ہمارے برابر

میں ''فارن فیکلٹی ہاسٹل'' تھا جس میں فاضل صاحب اور نور مصطفیٰ، ڈاکٹر عبدالرشید رحمت، ڈاکٹر ڈوگر اور دیگر کی رہائش تھی۔ مَیں مغرب کی نماز پڑھ کر واپس ہاسٹل کا رخ کیا کرتا تو باہر کھلی فضا میں کرسیاں رکھی ہوا کرتیں اور ایک کرسی پر عام طور پر ایک صاحب کو مستقل بیٹھا ہوا دیکھا کرتا، میرے ہی ہم عمر تھے۔ مَیں انہیں دور ہی سے سلام کر دیا کرتا وہ مجھے اسی طرح جواب دے دیا کرتے۔ اکثر احباب ان کے پاس آکر بیٹھتے اور چلے جاتے' لیکن یہ مستقل مزاجی سے اپنی نشست پر براجمان رہتے۔ ایک دن ڈائینگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے ہوئے تفصیلی تعارف ہوا۔ جب مَیں نے انھیں یہ بتایا کہ میرا تعلق کراچی سے ہے اور مَیں ڈاکٹر محمد فاضل کے شعبہ میں استاد کی حیثیت سے آیا ہوں، عمر تو کراچی میں گزری' لیکن پنجاب کا شہر میلسی میری جنم بھومی ہے۔ انھوں نے بھی اپنا تعارف کرایا کہ میرا نام طاہر تونسوی ہے شعبہ اُردو کا چیئر مین ہوں۔ اب ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ دور دور کے سلام قربتوں کے سلاموں میں بدل گئے' ساتھ ہی مَیں باقاعدگی سے ان کی شام کی محفل کا مستقل حصہ بن گیا اور گرمیوں کی شامیں ایک ساتھ گزرنے لگیں' حتیٰ کہ گرم شامیں سرد شاموں میں تبدیل ہو گئیں اور یہ بھی فرق ہوا کہ یہ محفل کھلی فضاء کے بجائے میرے کمرے میں سجنے لگی۔ اس محفل میں ہمارے شریک ڈاکٹر ظفر اقبال اور ڈاکٹر عبدالرشید رحمت بھی ہوتے، ڈاکٹر ظفر بائیالوجی میں اور ڈاکٹر عبدالرشید رحمت، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ تھے، ڈاکٹر صاحب کے

رفیق کار ڈاکٹر خالد ندیم بھی اس محفل کے شریک ہوتے ۔ کبھی کبھار ڈاکٹر شاہد راجپوت جو ہمارے ہاسٹل کے میس سیکریٹری تھے شریک محفل ہو جایا کرتے۔ سردیاں اپنی بہاریں دکھا رہی تھی، سوچتا ہوں کہ اگر کمرہ میں ہیٹر نہ ہوتا تو ہمارا کیا حال ہوتا، مَیں اور تونسوی صاحب مغرب کی نماز کے بعد سے رات گئے تک محفل سجائے رکھتے، ڈاکٹر ظفر عام طور پر رات کا کھانا کھانے کے بعد دوسرے ہاسٹل میں اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے، ڈاکٹر عبدالرشید رحمت نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر ہمارے کمرہ میں آجایا کرتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہتی، آج بھی جب کبھی وہ دن یاد آتے ہیں تو ایک فلم ذہن میں چل جاتی ہے اور ساری باتیں، سارے واقعات اور وہ حسین لوگ ایک ایک کرکے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ترکی کے انقلابی شاعر ناظم حکمت کا شعر فیض احمد فیض نے ترجمہ کیا:

مری جاں تجھ کو بتلاؤں ، بہت نازک یہ نکتہ ہے

بدل جاتا ہے انسان ، جب مکاں اس کا بدلتا ہے

جامعہ کے ٹیچرز ہاسٹل میں میس کا انتظام ہاسٹل کے مکینوں کو از خود کرنا ہوتا تھا، جامعہ کی طرف سے ڈائننگ روم ، کچن اور ایک عدد کُک کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ نذر حسین ہمارا کُک تھا، سابق فوجی تھا، بردبار اور اچھی عمر تھی، کھانا ٹھیک ہی پکایا کرتا تھا۔ خاص طور پر مکس

سبزی، کڑھی، کریلے جن میں کڑواہٹ نام کو بھی نہ ہوتی تھی اور آلو بھرے پراٹھے۔ میس سیکریٹری شعبہ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر شاہد راجپوت تھے۔ ان کا گھر اسلام آباد میں تھا۔ وہ اکثر جمعرات کو اپنے گھر اسلام آباد چلے جاتے۔ اسی طرح وہ احباب جن کی فیمیلیز سرگودھا کے قرب وجوار میں تھیں وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو سدھار جاتے۔ ہاسٹل میں میرے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہوا کرتا۔ شاہد راجپوت صاحب کی غیر موجودگی میں ہمارا کُک یہ سمجھتا کہ اب اس کی بھی چھٹی ہے وہ ان احباب سے پہلے اپنے گھر روانہ ہوجاتا، گویا ہفتہ کے تین دن جمعہ، ہفتہ اور اتوار ہمارے میس میں کھانے کی چھٹی ہونے لگی، ہمارے لیے یہ مشکل تھا کہ کیمپس کے باہر کھانا کھانے جایا کریں وہ بھی سخت سردی میں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر خالد ندیم اور طارق کلیم کی محبت اور خبرگیری کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، سخت سردی میں یہ دونوں صاحبان موٹر سائیکل پر رات گئے کھانا لیے آیا کرتے، ان کے مزیدار کھانے بہت یاد آتے ہیں، خاص طور پر ساگ کا لطف مَیں آج بھی محسوس کرسکتا ہوں۔

ڈاکٹر خالد ندیم شعبہ اردو، جامعہ سرگودھا میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، تخلیقی سوچ رکھتے ہیں، لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، متعدد مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوچکے ہیں، ان کی ایک کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے، لکھاریوں کی مدد کرکے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سرگودھا میں قیام کے دوران خاکہ نویسی پر

میری خاص توجہ رہی، شاید ماحول کا اثر تھا، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور عبد الوحاب خان سلیم پر ہاتھ صاف کیا اور ان کے خاکے قلم بند کیے ، دونوں خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا خاکہ اپنی ہم پیشہ فرخندہ لودھی کا لکھنا شروع کیا، جو اردو و پنجابی ادب کی معروف لکھاری بھی تھیں، مجھے فرخندہ لودھی پر مواد درکار تھا، یونیورسٹی کے مرکزی لائبریری سے مجھے کچھ نہ مل سکا، ایک دن مَیں نے ڈاکٹر خالد ندیم کو فون کیا اور مدعا بیان کیا، لمحے بھر کو سوچا اور گویا ہوئے ، کچھ کچھ ذہن میں آ رہا ہے، میں آپ کو ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں۔ مشکل سے پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے میرے موبائل پر گھنٹی بجی، ڈاکٹر خالد ندیم گویا ہوئے آپ کا مطلوبہ مواد مجھے مل گیا، میں کچھ ہی دیر میں آپ کے ہاسٹل آتا ہوں۔ میں نے کہا میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ فروری کا مہینہ ' سردی اپنی بہاریں دکھا رہی تھی، سورج غروب ہونے کے بعد تو سردی زیادہ ہی شدید ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سردی کی پروانہ کرتے ہوئے میرے کمرہ میں آ موجود ہوئے۔ کہنے لگے لیجئے آپ کی مشکل انشاء اللہ آسان ہو جائے گی، یہ کہہ کر انھوں نے بڑے سائز کا ایک ذخیم مجلّہ میرے ہاتھ میں تھمایا، یہ تھا ''مجلّہ راوی ۲۰۱۰ء''جی سی یونیورسٹی لاہور کا خصوصی مجلّہ ،اس مجلّہ میں گوشہ میر تقی میرؔ، گوشہ ن۔م۔راشدؔ، گوشہ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، گوشہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ ''گوشہ فرخندہ لودھی'' بھی تھا۔اس لمحہ میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میری ایک ہم پیشہ کے بارے میں یہ گوشہ مرحومہ کی علمی و ادبی خدمات

کا کھلا اعتراف تھا، اُسی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ اب مَیں یقیناً فرخندہ کو خراجِ تحسین پیش کر سکونگا اور ایسا ہی ہوا، مَیں نے فرخندہ پر اپنا خاکہ مکمل
کرلیا۔ ڈاکٹر خالد ندیم کی عنایتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔
اس موقع پر طارق کلیم اور اس کی محبتوں اور عنایتوں کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی، یہ ڈاکٹر تونسوی صاحب کے ایم فل کے شاگرد تھے انہوں نے تونسوی صاحب کے ساتھ ساتھ میرا اتنا ہی خیال رکھا جتنا وہ ڈاکٹر تونسوی کا رکھا کرتے تھے، گویا ' تمہیں چاہیں تمہارے چاہنے والوں کو چاہیں والی صورت تھی ' ۔ خوب اچھے اچھے اور لذیز کھانے کھلائے، یہ بھی سخت سردی میں موٹر سائیکل پر رات گئے آیا کرتے تھے، اسکول میں استاد تھے، اکیڈمی میں بھی پڑھاتے تھے، صحافت سے بھی منسلک تھے، شاید اے آر وائی سے وابستہ تھے، مصروفیات کے باوجود اس قدر خیال، طارق کلیم کے ایک اور عمل کو مَیں کبھی بھلا نہیں سکونگا، اپنے استاد ڈاکٹر تونسوی کے فرمابردار تو تھے ہی اپنے استاد کے دوست کے ساتھ بھی ان کی مہربانیاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ان کی تربیت اچھے ہاتھوں میں ہوئی ہے، ہوا یہ کہ سرگودھا میں قیام کے دوران میرے دانت میں تکلیف شروع ہو گئی جو بڑھتی ہی گئی، تونسوی صاحب نے طارق کلیم سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، طارق کلیم نے اگلے ہی دن آنے کے لیے کہا، وہ

طے شدہ وقت پر آ گئے مجھے اپنے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ڈاکٹر صاحب نے دانت دیکھا اور کہا کہ اس کا علاج یہی ہے کہ اسے نکال دیا جائے ورنہ یہ آپ کو مسلسل پریشانی میں مبتلا رکھے گا، تین دن کی دوا لکھ دی، اب مجھے تین دن بعد پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا تھا، طارق کلیم پھر طے شدہ وقت پر میرے شعبہ میں آ موجود ہوئے، وہ مجھے پھر اُن ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے، میرا دانت نکال دیا گیا، ڈاکٹر صاحب نے نہ تو پہلے فیس لی اور نہ ہی دوبارہ حالانکہ مَیں نے طارق کلیم کو اشارہ بھی کیا جسے ڈاکٹر صاحب نے محسوس کر لیا کہنے لگے اشارے نہیں چلیں گے، بس ٹھیک ہے، ڈاکٹر صاحب طارق کلیم کے دوستوں میں سے تھے۔جماعت اسلامی سے تعلق تھا، طارق کلیم نے بتایا کہ انہوں نے گزشتہ انتخابات میں جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر سرگودھا سے الیکشن بھی لڑا تھا اور کم ووٹوں سے ہار گئے تھے۔اچھے ڈاکٹر تو ہیں ہی ساتھ ہی نیک انسان بھی ہیں انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ جامعہ سرگودھا میں استاد ہوں تو زیادہ محبت سے ملے۔۔

گرمیاں تھیں، مَیں اور ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب ہاسٹل کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے، مغرب کے بعد کا وقت رہا ہوگا، فضاء میں زور دار دھماکہ ہوا، ساتھ ہی آسمان پر آگ کا گولا بھی ایک جانب سے دوسری جانب جاتا ہوا دکھائی دیا، ہم دوڑ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے، ان دنوں پورا ملک دھماکوں اور خود کش

حملوں کی لپیٹ میں تھا، سب لوگ پریشان تھے کہ یہ کس قسم کا دھماکہ ہوا ہے، اتنے میں کراچی سے فون آیا کہ ٹیلی ویژن پر پٹی چل رہی ہے کہ سرگودھا میں بم بلاسٹ ہوا ہے، مَیں نے بتایا کہ تاحال یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ دھماکہ کس قسم کا ہے البتہ دھماکہ ضرور ہوا ہے ،ہم خیریت سے ہیں۔ رات میں اطلاع ملی کے دھماکے کی وجہ بم بلاسٹ نہیں تھا بلکہ سرگودھا ایئر بیس سے ایف ۱۶ طیارے نے اپنی رفتار کو آواز سے تیز تر کیا یعنی (Sound barrier) عبور کیا جس کے باعث فضاء میں زور دار دھماکہ ہوا۔ یہ بات میرے علم میں پہلی بار آئی تھی کہ جب جہاز ساؤنڈ بیریئر کراس کرتا ہے تو زور دار دھماکہ ہوتا ہے۔

حیات ہوٹل سرگودھا کے شاعروں اور دانشوروں کا مرکز بھی ہے، غالباً اس کے مالک ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے قدر داں ہیں، یہاں ادبی محفلوں کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر تونسوی صاحب نے کہا کہ آج محفل مسالمہ ہے اس میں جانا ہے، کہنے لگے کہ اگر آپ نے امام حسین کی شان بھی کچھ کہا ہے تو آپ کو بھی موقع مل سکتا ہے، مَیں نے کہا کہ مَیں صرف آپ کو اور دیگر احباب کو سنوں گا، مغرب کی نماز کے بعد ہم حیات ہوٹل پہنچ گئے، ایک چھوٹے سے کمرہ میں محفل مسالمہ کا اہتمام کیا گیا تھا، شاعر حضرات پہنچ گئے تھے، سب نے امام عالی مقام کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا،

ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب ، عابد خورشید نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ دیگر شعراء میں مرتضیٰ حسن، ذوالفقار احسن، طارق حبیب، آصف راز، اخلاق عاطف کے علاوہ صاحبزادہ پروفیسر عبدالرسول صاحب بھی موجود تھے انہیں پہلی بار قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، سرگودھا کی تاریخ پر ان کی تحریر کردہ کتاب سے مَیں استفادہ کرچکا تھا۔
جامعہ سرگودھا سے میری واپسی ایک ماہ قبل ہی طے ہوچکی تھی، کنٹرکٹ کے مطابق مَیں نے ایک ماہ قبل انتظامیہ کو مطلع کردیا کے ۲۸ فروری ۲۰۱۱ء جامعہ میں میرا آخری ورکنگ ڈے ہوگا، ایسا ہی ہوا، یہ بات عام ہوئی کہ مَیں جامعہ چھوڑ کر جارہا ہوں تو میرے کرم فرماؤں نے مجھے روکنے کی کس کس طرح درخواست نہیں کی، میرے دل میں ان سب کے لیے بہت احترام ہے، میرے عزیز طلبہ نے اجتمائی طور پر اور فرداً فرداً مجھ سے کہا کہ مَیں اپنے فیصلہ پر نظرثانی کروں ، مَیں ان سب کو اپنی مجبوریاں بتاتا رہا۔ میرے بعض طلبہ نے پروگرام بنایا کہ وائس چانسلر صاحب کے پاس جاکر احتجاج کیا جائے ، یہ بات میرے علم میں آئی تو مَیں نے ان طلبہ کو بہت سمجھایا اورانہیں ایسا نہ کرنے کی تاکید کی، یہ مجھ سے محبت تھی، جمعہ کی نماز میں وائس چانسلر صاحب کے پی اے جناب مقصود صاحب سے ملاقات ہوئی ، انھوں نے فرمایاکے میرے پاس بعض لوگوں کے فون آئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم صمدانی صاحب کو نہ جانے دیں اور ان کی خواہش

کے مطابق انہیں فیملی رہائش فراہم کریں، یہ میرے چاہنے والوں کی مجھ سے محبت تھی، احمد شاہ صاحب جو لائبریری میں تھے انہوں نے بھی مجھے بارہا فیصلہ پر نظرثانی کرنے کی درخواست کی، جب مَیں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی تو وہ مجھے سرگودھا شہر میں کئی مکان کرائے کے دکھانے کے لیے لے گئے، مَیں ان کی اس محبت کو کبھی نہ بھلا سکونگا، مَیں نے وائس چانسلر صاحب کے پی اے مقصود صاحب سے کہا کہ یہ مجھ سے محبت کرنے والوں کی مجھ سے چاہت ہے، مَیں اس کی قدر کرتا ہوں، میرا نوٹس پیریڈ چل رہا تھا، وائس چانسلر صاحب اچانک لائبریری اور شعبہ میں آگئے، فاضل صاحب چھٹی پر تھے اور مَیں قائم مقام چیئرمین تھا، وائس چانسلر صاحب نے شعبہ کے مختلف حصے اور وہ کمرے دیکھے جو میڈیکل کالج کے لائبریری بلڈنگ سے منتقل ہوجانے کی صورت میں خالی ہوئے تھے، مَیں وائس چانسلر صاحب کو تفصیل بتاتا رہا، وائس چانسلر صاحب کے علم میں یہ بات تھی کہ فاضل صاحب چھٹی پر بہاولپور گئے ہوئے ہیں۔ جب وائس چانسلر صاحب واپس جانے کے لیے لائبریری سے باہر آئے تو میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے، کہنے لگے ۲۸ فروری کو آپ جارہے ہیں، اگر آپ رہائش کی وجہ سے جارہے ہیں تو ہم آپ کو یہ رہائش فراہم کردیتے ہیں، پھر انہوں نے اپنے پی اے کو اشارہ کیا اور کہا کہ صمدانی صاحب کو رہائش فراہم کریں، جب وہ یہ سب کچھ کہہ چکے تو مَیں نے احترام سے عرض کیا کہ سر مجھے بعض مجبوریوں کے باعث جانا ہی ہوگا، آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے موقع فراہم کیا کہ مَیں جامعہ میں

آسکا، آپ کی اس عنایت کا بھی شکریہ۔

جامعہ سرگودھا کے شعبہ اردو نے سرگودھا جیسے شہر میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں پاکستان ہی نہیں' ہندوستان، بنگلہ دیش، مصر، امریکہ سے دانشوروں نے بھر پور شرکت کی۔ کراچی سے سحر انصاری اور جامعہ کراچی کے ڈاکٹر ظفر اقبال نے شرکت کی، ان احباب سے ملاقات بھی ہوئی، سرگودھا کہنے کو تو شاہینوں کا شہر ہے 'لیکن عوام الناس کے لیے ائرپورٹ کی سہولت سے محروم ہے، یہاں پہنچنے کے لیے اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد سے تین گھنٹے کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔اس مشکل کے باوجود عالمی اردو کانفرنس میں مندوبین نے بھرپور شرکت کی، مجھے بھی اس کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا، کئی سیشنز ہوئے جن میں ماہرین نے مقالات پیش کیے، مشاعرہ بھی ہوا، شاعروں نے خوبصورت کلام پیش کرکے داد وصول کی۔پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری کے دو خوبصورت شعر یاد رہ گئے ۔

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھُلایا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

اپنے دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کی فرمائش پر میں نے اس کانفرنس کی تفصیلی روداد قلم کی، یہ روداد کراچی سے شائع ہوئے والے ادبی جریدہ ''نگار پاکستان'' کی اشاعت فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔

مَیں نے جامعہ سرگودھا کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا، میرے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ دو ماہ کی چھٹی لے لی جائے یا پھر استعفیٰ دے دوں ، مجھے وزٹ ویزا پر سعودی عرب جانا تھا، چھ ماہ سے پہلے میری واپسی ممکن نہیں تھی، چھٹیاں لینے کی صورت میں مجھے بار بار اپنی چھٹی بڑھوانا پڑتی، اس صورت میں طلبہ کا بھی نقصان ہوتا اور فاضل صاحب سے تعلقات خراب ہونے کا بھی اندیشہ تھا، فاضل صاحب لاکھ دوست صحیح مگر آفیسر پھر آفیسر ہوتا ہے ، میں ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ فیصلہ کیا کہ استعفیٰ دے دیا جائے، یکم فروری کو میں نے ایک ماہ کا نوٹس دے دیا، مجھے ۲۸ فروری کے بعد میں جامعہ سے رخصت ہونا تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب یکم فروری کو سرگودھا سے جی سی یونیورسٹی فیصل آباد چلے گئے، ایک ماہ ہاسٹل میں گزارنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ اس دوران مَیں الوادعی دعوتیں کھاتا رہا جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ میں یکم مارچ کو واپس کراچی آگیا۔ سرگودھا میں گزرے میرے شب و روز میری زندگی کا قیمتی اور یادگار سرمایہ ہیں۔ انہیں میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ اپنی ان یادوں کو سعودی عرب کی سرزمین میں جمع

کرنے کا موقع ملا، یہ میرے لیے اور بھی اعزاز ہے۔

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

جدہ، سعودی عرب ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۱ء، ۲۲ ذیعقد ۱۴۳۲

ادب میں تَبصِرَہ نگاری کی اہمیت

کسی کتاب یا دستاویز پر تبصرہ کرنا بھی ایک فن ہے

تَبصِرَہ نگاری ادب کی ایک معروف اور اہم صنف ہے۔ اصنافِ ادب 'افسانوی اور غیر افسانوی ادب' پر مشتمل ہوتا ہے۔ تبصرہ نگاری غیر افسانوی ادب کے زمرَہ میں آتی ہے ۔ تبصرہ اپنے معنی اور وسعت کے اعتبار سے اہمیت لیے ہوئے ہے۔ تبصرہ پڑھ کر کتاب کے بارے میں بڑی حد تک اندازہ کرلینا کہ اس میں کیا کچھ ہے آسان ہوتا ہے ۔ تبصرہ کے لغوی معنی 'تفصیل، تصریح، توضیح، تشریح کے ہیں۔ جامع اللغات کے مطابق 'تبصرہ کسی بات کے متعلق رائے ظاہر کرنے کے ہیں'۔ ایک مغربی مفکر نے تبصرے کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ '' تبصرہ، دستاویز یا کتاب کے متن کو مختصر اور صحیح طور پر اس انداز سے بیان کرنا کہ وہ اصل دستاویز معلوم ہو''۔ گویا تبصرہ اصل دستاویز کا نچوڑ یا حاصل ہوتا ہے۔ 'اردو لغت' مرتبہ اردو ڈکشنری بورڈ میں تبصرے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ 'کسی کتاب یا رسالے وغیرہ کو پڑھ کر اس کی خوبی یا خامی کے بارے میں رائے دینا'' یا 'کسی امر یا واقعہ کے بیان میں خوبی اور خامیوں کا ذکر' تبصرہ کہلاتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کے خیال میں '''تبصرہ مصنف کو حوصلہ بخشتا ہے

اور اُسے سوچ کے نئے زاوئے

عطا کرتا ہے اور اسے اپنی تخلیق پر نظر ثانی کا مشورہ بھی دیتا ہے''۔

تبصرہ 'خلاصے' سے مختلف ہوتا ہے۔ خلاصے میں مضمون یا دستاویز میں کیا کچھ ہے انتہائی اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ عطش درانی کے خیال میں 'تلخیص کسی عبارت کو کم از کم الفاظ میں اس طرح لکھنا کہ اس عبارت کا تاثر برقرار رہے اور کوئی بات محل نظر نہ ہو' تلخیص نگاری کہلاتی ہے'۔ اس کے برعکس تبصرے میں کتاب کے مندرجات اور اسلوبِ بیان کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور مواد کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ تبصرہ قاری کو کتاب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اس کی بنیاد پر قاری اس دستاویز یا کتاب کے بارے میں کوئی مقرر نہیں ہوتا (Lenth) رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تبصرہ کے لیے سائز یہ ایک پیراگراف بھی ہو سکتا ہے زیادہ بھی۔ طویل اور کئی صفحات پر مشتمل تبصرہ مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ اس کتاب یا دستاویز کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ بن جاتا ہے۔ بسا اوقات مدیران کی جانب سے قدغن لگا دی جاتی ہے کہ تبصرہ دو سے چار سو الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔ تبصرہ نگار کو اس پابندی پر بھی عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ تبصرہ مختصر ہی ہوتا ہے۔ طویل تبصرے پڑھنے والوں کے لیے مشکل کا باعث بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سفیر اختر کے خیال میں

تبصرہ کو بہت زیادہ بے لاگ بھی نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی بہت فراخ دل۔ جہاں محقق کی غلطیوں کی نشاندھی کی جائے وہیں ساتھ ہی بتادیا جائے کہ غلطی کی نوعیت کیا ہے'۔ تبصرہ نگار کی خوبی اور مہارت یہ ہونی چاہیے کہ کتاب ، صاحبِ کتاب اور اس موضوع پر مختصر اظہار خیال خوبصورت انداز سے بیان ہوجائے۔ یہی ایک اچھے تبصرے کی خوبی بھی ہوتی ہے۔ تبصرہ کتاب کی تعریف و توصیف بیان کرنے کا نام نہیں ساتھ ہی غیر ضروری تنقید بھی تبصرہ نہیں کہلاتی اس میں میانہ روی اور غیر جانب داری کی چاشنی کا پایا جانا تبصرے کی اصل روح ہے۔ مکمل اور معیاری تبصرہ وہ ہے جسے پڑھ کر قاری اس کتاب یا دستاویز کے بارے میں یہ رائے قائم کرلے کہ یہ کتاب اس کی ضروریات کی تکمیل کرتی ہے یا نہیں۔

کتاب کی اشاعت سے قبل اگر مصنف کسی سے کتاب کے بارے میں کچھ لکھواتا ہے تو وہ دیباچہ یا تقریظ کے زمرے میں آتا ہے۔ دیباچہ یا تقریظ عام طور پر تنقیدی نہیں ہوتی اگر کوئی لکھنے والا دیباچے یا تقریظ میں مصنف کی تحریر پر تنقیدی تقریظ یا دیباچہ لکھتا ہے تو مصنف کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس دیباچے کو کتاب میں شامل نہ کرے جیسا کہ سرسید نے اپنے کتاب 'آئین اکبری' جو ۱۸۵۵ء میں مکمل کی اور دیباچہ لکھنے کی درخواست مرزا غالبؔ سے کی ، مرزا

نے تنقیدی مثنوی لکھ کر سر سید کو بھیج دی۔ یہ تقریظ ثنائی نہیں تھی بلکہ تنقیدی تھی۔ اس میں سرسید کو کچھ مشورے دیے گئے تھے۔ سر سید نے تقریظ میں کی گئی تنقید کو قبول نہیں کیا اور غالبؔ کی اس تقریظ کو عَلَی الاعلَان کتاب میں شامل بھی نہیں کیا۔ چھپی ہوئی کتاب پر تنقیدی تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر مصنفین ادبی رسالوں کو اپنی نگارشات تبصرے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ مدیران سے یہ درخواست نہیں کی جاتی کہ تبصرہ صرف تعریفی ہی ہو۔ تبصرہ لکھنے والا آزاد ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا تبصرہ چاہے لکھے اور تبصرہ نگار کتاب کے کسی نہ کسی کمزور پہلو کی نشاندھی تبصرہ میں ضرر کرتا ہے۔ انگریزی زبان میں تبصرہ نگاری کی تاریخ ۱۸۴۰ء سے شروع ہوتی ہے جب ایڈ گرایلن پوئی (Edgar Allan Poe) نے معروف ''گراہم میگزین'' (Graham's Magazine) میں کتابوں پر تبصرہ کا آغاز کیا۔

ادبی رسائل اور اخبارات کتب پر تبصروں کو اہمت دیتے ہیں اور ایک تسلسل اور اہتمام کے ساتھ کتب پر تبصرے شائع کرتے ہیں جب کہ اخبارات کم از کم ہفتہ میں ایک دن کتب پر تبصرے شائع کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مختلف ماخذات اشارے، خلاصہ جات کی طرز پر تبصروں کے ماخذ بھی شائع ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تبصروں پر مشتمل ماخذ کی اشاعت ایک عام سے بات ہے جیسے لندن ریویو آف بکس (London Review of Book, LRB) ۱۹۷۹ء سے برابر شائع ہورہا ہے۔ اس کے ہر

شمارے میں ۱۵ سے ۲۰ کتب پر ماہرین تعلیم، مصنفین اور صحافت سے تعلق رکھنے والوں کے تحریر کردہ تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ نیو آرک امریکہ سے نیو آرک ریویوز آف بکس (The New York Reviews of Books, NYREV or NYRB) ایک پندرہ روزہ جریدہ ہے جس میں ادب، کلچر اور حالاتِ حاضرہ پر مضامین کے علاوہ نئی کتب پر تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کا اخبار 'نیو آرک ٹائم' تسلسل کے ساتھ 'نیو آرک ٹائمس بک ریویو (The New Yor Times Book Review)' شائع کرتا ہے۔ اس اخبار میں ۱۹۹۶ء سے تبصرے شائع کئے جا رہے ہیں۔ اردو زبان میں اس قسم کے ماخذات کی روایت خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ کتب پر تبصروں پر مشتمل ایک ماہنامہ 'اردو بک ریویو' کے نام سے دریا گنج دہلی، بھارت سے شائع ہوتا ہے۔ اس جریدے میں اردو و انگریزی کی کتب پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام نئی کتابوں کے تعارف اور تبصرہ پر مشتمل ششمائی مجلّہ 'نقطۂ نظر' ۱۹۹۶ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر سفیر اختر ہیں۔ موجودہ شمارہ ۳۱ (اکتوبر ۲۰۱۱ء سے مارچ ۲۰۱۲ء) تک کے دور پر مشتمل ہے۔ تقریباً تمام ہی ادبی جرائد کتابوں پر تبصرہ شائع کرتے ہیں۔ انگریزی اخبار 'دی نیوز' اور اخبار 'ڈان' کتابوں پر تبصرے شائع کرتے ہیں روزنامہ جنگ کے سنڈے میگزین میں برس ہا برس سے کتب پر تبصرے شائع ہو رہے ہیں۔ اس حوالے سے شین عین شفیع عقیل مرحوم) کی علمی)

خدمات قابل ذکر ہیں۔ انہیں تبصرے کا فن خوب آتا تھا۔

کتاب یا دستاویز پر تبصرہ کرنا ایک فن ہے۔ اسے ایک عام سے بات تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ تبصرہ نگار جو بات بھی کتاب کے بارے میں لکھتا ہے بسا اوقات اسے اس کا جواب بھی دینا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ تبصرہ تحریر کرتے وقت احتیاط سے کام لینے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ جس کتاب کا پر تبصرہ کیا جانا ہو، بہتر اور مناسب تو یہ ہے کہ وہ کتاب جس موضوع سے بحث کرتی ہو، اس موضوع کا ماہر ہی اس پر تبصرہ تحریر کرے۔ عام طور پر اخبارات و رسائل میں اس بات پر کم کم عمل ہوتا ہے۔

تبصرہ نگاری ابتدا ہی سے مصنفین، مولفین، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کا مشغلہ رہا ہے۔ غالبؔ نے سرسید کی کتاب 'آثار الصنادید' (۱۸۴۷ء) اور آئین اکبری' (۱۸۵۵ء) پر تبصرہ لکھا جسے تقریظ کہا گیا۔ دونوں کتابیں شاعری پر نہیں تھیں۔ غالبؔ نے کتاب کے موضوع سے اختلاف کرتے ہیں تقریظ تحریر کی۔ الطاف حسین حالیؔ کو تبصرہ نگاری میں کمال حاصل تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے لکھے ہوئے تبصرے کتاب کے بارے میں دو ٹوک رائے ہوا کرتے تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے بھی اپنے رسالے 'نگار' میں تبصرے تحریر کیے۔ اس سلسلے کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم نے آگے بڑھایا اور بے شمار کتابوں پر دیباچہ، تقریظ ہی

نہیں لکھیں بلکہ کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ خود میری کتاب ’’یادوں کی مالا‘‘ پر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مختصر تبصرہ تحریر فرمایا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک بلند پایہ تبصرہ نگار تھے۔ ان کے کیے ہوئے تبصرے تاریخِ تبصرہ نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ علامہ ماہر القادری کتاب کے تفصیلی مطالعہ کے بعد تبصرہ تحریر کیا کرتے تھے۔ مشفق خواجہ مرحوم اپنے ادبی کالم میں کتابوں کا تعارف خوبصورت انداز میں کرایا کرتے تھے۔ رئیس امروہوی مرحوم بھی اپنے کالموں میں کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ معروف ادیب، دانش ور اور کالم نگار جمیل الدین عالی اپنے کالموں میں اکثر کتابوں کا تعارف کراتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح عطاء الحق قاسمی بھی کبھی کبھار کسی کتاب کے تعارف کو اپنے کالم میں شامل کر لیتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے مجلے ’قومی زبان‘ میں کئی اہل قلم کتابوں پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ بزرگ صحافی اور قلم کار محمد احمد سبزواری صاحب کے لکھے ہوئے تبصرے قومی زبان میں شائع ہو رہے ہیں۔ ’نقطۂ نظر‘ جو صرف کتابوں کے تبصروں پر مشتمل مجلہ ہے میں ڈاکٹر سفیر اختر تبصرہ نگاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ اس قدر وسیع اور طویل ہے کہ ہر ایک مجلے اور تبصرہ نگار کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض معروف تبصرہ نگاروں اور رسائل و جرائد کے نام یہاں نہ لکھے جا سکے ہوں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

شائع شدہ روزنامہ جنگ میڈویک میگزین ۲۷ نومبر ۲۰۱۳ء، ص ۶

URL: .jang.com.pk/11-27-2013/karachi/mag6.asp

اردو ادب میں دیباچہ نگاری کی روایت

تقریظ صرف ثنائی نہیں ، اصلاحی بھی ہونی چاہیے

دیباچہ نگاری ادب کی ایک اہم اور منفرد صنف ہے جس کے بارے میں یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا آغاز کب اور کس نے کیا۔ لیکن یہ ایک قدیم روایت ہے کہ کتاب لکھنے والا اپنے سے زیادہ مستند لکھنے والے ، معروف قلم کار، شاعر و ادیب ، صاحب کمال شخصیت سے کتاب کے بارے میں مختصر رائے لکھوایا کرتے تھے۔ مصنف کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کی لکھی ہوئی تحریر تقریظ، تمہید، مقدمہ، پیش لفظ، پیش نامہ، سر نامہ، دیباچہ یا تعارف کے عنوان سے کتاب میں شامل ہوتی ہے۔انگریزی میں لفظ Foreword استعمال ہوتا ہے۔اس کا بنیادی مقصد پڑھنے والوں کو کتاب اور مصنف کے بارے میں ایک مستند اور ماہر لکھنے والے یا استاد کے تاثرات سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ تقریظ یا دیباچہ لکھنے والا جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس پر اختصار سے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے ساتھ ہی مصنف کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہ تقریظ یا دیباچے عموماً تعریفی و توصیفی ہی ہوا کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی تقریظ یا دیباچہ ایسا لکھا گیا ہو جس میں دیباچہ نگار نے کتاب یا صاحبِ کتاب کے بارے میں اپنی منفی

رائے کا اظہار کیا ہو۔ بھلا منفی رائے کو مصنف کتاب میں کیوں کر شامل کرے گا۔ غالبؔ نے سر سید کی کتاب کی تقریظ میں منفی باتیں لکھیں سر سید نے اس تقریظ کو کتاب میں شامل کرنے صاف انکار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچہ یا تقریظ کتاب پر لکھے گئے تبصروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ دیباچہ دوسروں سے لکھوانے میں ایک مصلحت یہ بھی کار فرما ہوتی ہے کہ مصنف اپنی اور اپنی کتاب کی تعریف از خود لکھے، یہ کسی بھی طور اچھا نہیں لگتا، یہ خود ستائی کے زمرہ میں آجاتا ہے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے سے زیادہ عالم فاضل شخص سے اپنی کتاب کے بارے میں تعریفی و توصیفی کلمات لکھوانے کے لیے دیباچہ سازی نے مقبولیت حاصل کی ۔ دیباچہ بنیادی طوپر جس موضوع پر کتاب لکھی گئی اس موضوع کے ماہر قلم کار، عالم فاضل ہی سے لکھوانے کی روایت تھی لیکن وقت کے ساتھ دیباچہ نگاروں میں ملک کی معروف شخصیات جیسے صدر مملکت، وزیر اعظم، وزراء اکرم، معروف سیاست دانوں، معروف شخصیات کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا، یقناً اس کا مقصد کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرنا ہی ہے۔

رضا علی عابدی نے اپنی تصنیف 'کتابیں اپنے آباء کی' میں لکھا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں شائع ہونے والی کتاب میر امن کی ''باغ و بہار'' تھی یہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کتاب کا دیباچہ 'جان گلکرسٹ کا تحریر کردہ ہے۔ سر سید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' پہلی بار ۱۸۴۷ء میں 'سید الاجنار' کے تحت

جب کہ دوسری بار 'منشی نول کشور' لکھنؤ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے آخر میں تقریظیں شامل ہیں۔آثار الصنادید پر تقریظیں لکھنے والوں میں محمد مومن خان مومن، مولوی امام بخش صہبائی، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اور محمد صدرالدین خان شامل ہیں۔یہ تقریظیں نظم اور نثر دونوں میں لکھی گئیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ ''دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انہوں

نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی (مولانا امام بخش صہبائی) کی تقریظ چھپی ہے''۔

حالیؔ ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں کہ سر سید احمد خان نے اپنی کتاب 'آئینِ اکبری' ۱۸۵۵ء میں مکمل کی۔انہوں نے محسوس کیا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جو ان کی اس علمی کاوش اور محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ سر سید نے مرزا غالبؔ سے رابطہ کیا کہ وہ اس کتاب کی تقریظ (اس وقت کی روایت کے مطابق ثنائیہ پیش لفظ) تحریر کردیں۔غالبؔ نے سر سید کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ان کی کاوش کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ غالبؔ نے کتاب کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے طور پر ایک اصلاحی نظم لکھی جو فارسی میں تھی۔سر سید نے اس تقریظ کو آئین اکبری میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ نظم سر سید کی کتاب 'آئینِ اکبری' کا پیش لفظ یا تقریظ ضرور ہے

لیکن اس کتاب کا حصہ نہیں۔ یہ دیباچہ یا مثنوی تعریفی نہیں بلکہ اس میں مصنف کی سرزنش بھی کی گئی اور بہت سے مفید مشورے غالبؔ نے سرسید کو دئے۔ دیباچہ نگاری کے سفر میں یہ اہم پیش رفت تھی اور غالبؔ کی جانب سے دیباچہ نگاروں کو یہ پیغام بھی تھا کہ دیباچہ یا تقریظ صرف ثنائی ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اصلاحی یا تنقیدی بھی ہو سکتی ہے۔ دیباچہ نگار تصنیف میں کوئی کمی یا خامی محسوس کرے تو بلا تردد اس کا اظہار بھی کر دے۔ غالبؔ کی یہ نظم ''کلیاتِ غالب'' کے علاوہ سبط حسن کی کتاب 'نویدِ فکر' میں شامل ہے۔ غالبؔ شاعری کی معراج پر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں خطوط نگاری کے دولھا بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مکتوب نگاری کو بھی ایک نیا رنگ اور منفرد اسلوب دیا۔ مرزا غالبؔ کی تقریظ کو سرسید نے قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے ظاہر کیا ہے کہ ابو الفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب 'تاریخ ادبِ اردو' جلد چہارم میں بھی اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ مرزا غالب کے علاوہ مصطفیٰ خاں مرحوم نے بھی آئین اکبری پر تقریظ لکھی جو کتاب میں شامل نہ ہو سکی۔

۱۸۴۷ء ہی میں ایک اور کتاب پیرس سے ''انتخاب تصانیف ہندوستانی'' کے عنوان سے شائع ہوئی جس میں قدیم اردو اور دکھنی نظم و نثر کے نمونے شامل تھے۔ اس کتاب کا دیباچہ جو فرانسیسی میں تھا ''گارساں دتاسی'' نے تحریر کیا

تھا۔دیباچہ نگاری کی جانب یہ بھی ایک مثبت پیش رفت تھی۔سر سید کے بعد تصانیف و تالیفات میں دیباچہ یا تقریظ کی روایت جاری و ساری رہی۔اس کی صورت کچھ اس طرح تبدیل ہوئی کہ ابتداء میں تقریظ یا دیباچے کتاب کے آخر میں دئے جاتے تھے بعد ازاں دیباچے کتاب کے ابتدائی صفحات میں دئے جانے لگے۔یہ سمجھا گیا کہ کتاب کے بارے میں کسی دوسرے شخص کی رائے جو زیادہ علم و فضیلت رکھتا ہے اہم اور فوقیت رکھتی ہے۔

اردو کے ممتاز دیباچہ نگاروں میں بابائے اردو مولوی عبد الحق کا مقام بلند نظر آتا ہے۔ بابائے اردو کے لکھے ہوئے مقدمات محض تعریفی و توصیفی ہی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ان کے مقدمات میں متعلقہ موضوع پر تحقیق ہوا کرتی تھی۔شاہد دہلوی کے مطابق ''مقدمہ بازی (دیباچہ، تقریظ) تو مولوی عبد الحق مرحوم ہی پر پھبتی تھی' اور ان ہی کے ساتھ ختم ہو گئی''۔

عہد حاضر کے تمام ہی تجربہ کار لکھنے والے اور استاد لااساتذہ دیباچہ نگاروں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان میں استاد الااساتذہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم کا مقام و مرتبہ بلند نظر آتا ہے۔آپ بلا شبہ موجودہ عہد کی ممتاز اور قد آور علمی و ادبی شخصیات تھے۔ڈاکٹر صاحب نے بے شمار تصانیف و تالیفات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے

نزدیک' دیباچہ نگاری ایک مستقل فن ہے'۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے تحریر کردہ دیباچے ، تقریظ، تعارف ،پیش لفظ، مقدمہ ، دیباچہ اور فلیپ نہ صرف مصنف اور کتاب کا تعارف کراتے ہیں بلکہ موضوع پر بھرپور روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں نئے لکھنے والوں کی اصلاح، رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کتاب میں کمزوری محسوس کرتے ہیں تو اس طرح اصلاح کرتے ہیں کہ مصنف کا دل بھی رکھ لیتے ہیں اور کمزوری کی نشان دہی بھی کر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو موضوع پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔ڈاکٹر صاحب کی دیباچہ نگاری کا انداز بھی منفرد ہے۔آپ نے حد درجہ سادہ، رواں اور عام فہم زبان میں دیباچے تحریر کیے ہیں تاکہ قاری کو کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔' تنقید نما' اور 'ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تنقیدی زاویے مختصر مختصر' ایسی تصانیف ہیں جن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لکھے ہوئے دیباچے شامل ہیں جن کی تعداد ملا کر ۱۰۰ بنتی ہے ۔یہ کتب سید محمد اصغر کاظمی نے مرتب کی ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دمِ رخصت آخر میری کتاب کا دیباچہ تحریر فرمایا۔ مَیں اس اعزاز پر فخر محسوس کرتا ہوں۔

نامور شخصیات جنہیں دیباچہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور انھوں نے بے شمار کتب کے دیباچے بھی تحریر کیے ان میں حکیم محمد سعید شہید کا نام قابل ذکر ہیں ۔ حکیم صاحب نے بے شمار مضامین کے علاوہ دو سو سے زیادہ تصانیف و

تالیفات تحریر کیں ساتھ ہی بے شمار دیباچے، مقدمے اور تقریظیں لکھیں۔ دیباچہ نگاری اور تقریظ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام بھی معتبر ہے۔ انھوں نے بھی بے شمار مصنفین کی کتب کے دیباچے تحریر کیے۔ ڈاکٹر صاحب پر مرتب ہونے والی کتابیات میں ۷۰ کے قریب کتابوں کی فہرست دی گئی ہیں جن کے دیباچے یا تقریظ ڈاکٹر جالبی نے لکھے۔ شاہد احمد دہلوی جنھوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کا خاکہ تحریر کیا جو ان کی کتاب گنجینۂ گوہر میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دیباچوں اور مقدموں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' اور'' شیخ عبدالقدوس گنگو''ہی اور ان کی تعلیمات پر جمیل صاحب نے عالمانہ مقدمے لکھ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ یہ ادب کا ایک شائستہ طالبِ علم اور اردو کا ایک شریف نقاد تصوف اور صوفیوں میں کہا جا کر پھنس گیا۔ ان مقدموں کو لکھنے کے لیے اس کو اپنا کتنا خون پانی کرنا پڑا ہوگا''۔ یہ بات ۱۹۶۲ء کی ہے اور یہ تصانیف اعجاز الحق قدوسی کی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں قدوسی صاحب کی ایک کتاب 'میری زندگی کے پچھتر سال' کا مقدمہ بھی ڈاکٹر جالبی نے ہی لکھا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی کتاب 'تاریخ ادب انگریزی'، اشتیاق حسین قریشی کی کتاب 'جدوجہد پاکستان'، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب پاکستان کی قدیم اردو شاعری' کا دیباچہ ڈاکٹر جالبی کا ہی '
لکھا ہوا ہے۔ اب تک ان کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ ہوگی جن کے دیباچے

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھ چکے ہیں۔

اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ بے شمار ہیں جنھوں نے قابل ذکر دیباچے یا مقدمے تحریر کیے۔ ان میں احسان دانش ، جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی، تابش دہلوی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، پروفیسر سحر انصاری ، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی ، ڈاکٹر وزیر آغا، امجد اسلام امجد، رئیس امروہوی ، زہرہ نگاہ، کشور ناہید ، فیض احمد فیض، ادا جعفری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مرحوم، عطاء الحق قاسمی، فہمیدہ ریاض اور دیگر بے شمار ادبی شخصیات ایسی ہیں جن سے مصنفین تقریظ لکھوا کر مطمئن و شاد ہوتے ہیں۔ دیباچہ نگاری یا تقریظ نگاری ادب کی اہم اور مقبول صنف ہے۔ شائع ہونے والی ہر کتاب نہیں تو ہر دوسری کتاب میں دیباچہ یا تقریظ کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مدد و معاون ہوتی ہے۔

-شائع شدہ روزنامہ جنگ میڈویک میگزین ۳۰ ستمبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہوا

ادب میں خلاصہ نگاری کی روایت

خلاصہ یا تلخیص ادب کی ایک اہم صنف اور تحقیقی مقالے یا تحقیقی مضمون کی بنیاد ہوتا ہے۔ تحقیقی مضمون شروع میں اگر خلاصہ نہ ہو تو وہ مضمون تحقیقی مضمون کے زمرے میں نہیں آتا، اسی طرح تحقیقی مقالات کے ابتدا میں تحقیق کا خلاصہ دینا تحقیقی ضرورت ہے۔ 'خلاصہ، تبصرے سے مختلف ہوتا ہے۔ خلاصے میں مضمون یا دستاویز کی وسعت اور متن کا لب لباب مختصر یا تفصیلی بیان کیا جاتا ہے کہ قاری خلاصہ پڑھ کر یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ اسے اب اصل دستاویز یا مضمون پڑھنا چاہیے یا نہیں تاہم خلاصہ اصل مضمون یا دستاویز کا نعم البدل ہر گز نہیں ہوتا البتہ فوری اور مختصر وقت میں معلومات فراہم کرنے سبب ضرور ہوتا ہے۔ عطش درانی کے خیال میں 'تلخیص کسی عبارت کو کم از کم الفاظ میں اس طرح لکھنا کہ اس عبارت کا تاثر برقرار رہے اور کوئی بات محل نظر نہ ہو' تلخیص نگاری کہلاتی ہے'۔اس کے برعکس تبصرے میں کتاب کے مندرجات اور اسلوبِ بیان کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور مواد کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اختصار سے بیان کیا جاتا ہے۔ تبصرہ قاری کو کتاب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اس کی بنیاد پر قاری اس دستاویز یا کتاب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

مغربی مصنف جنیفیر ای راؤلی نے اپنی کتاب 'خلاصہ نگاری اور اشاریہ سازی' میں
خلاصہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'خلاصہ دستاویز کے متن کو مختصر اور صحیح
طوپر اس انداز سے بیان کرنا کہ وہ اصل دستویز معلوم ہو'۔ گویا خلاصہ اس مختصر تحریر
کو کہتے ہیں جو اصل مضمون یا مسودہ کا نچوڑ ہو یعنی کسی بھی دستاویز (مضمون یا مقالہ)
کا نچوڑ یا حاصل خلاصہ کہلاتا ہے۔ جامعہ اللغات میں خلاصہ کے معنی 'اختصار، کسی چیز کا
بہترین حصہ، نچوڑ، جوہر، نتیجہ، حاصل کے بیان کیے گئے ہیں۔ خلاصہ کی دو اقسام بیان کی
گئیں ہیں ایک 'معلوماتی (Informative) اور دوسری' بیانی یا وضاحتی
(descriptive)' ۔ معلوماتی خلاصہ قاری کو ماخذ کے بارے میں اساسی اطلاعات
فراہم کرتا ہے جب کہ بیانی یا وضاحتی خلاصہ پڑھ کر قاری اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ
ماخذ اس کے لیے مفید ہے اور مضمون یا کتاب کا مطالعہ اس کے لیے کارآمد ہوگا۔
خلاصہ نگاری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا
۔ خیال ہے کہ کتاب مٹی کی تختیوں، پیپائرس، پارچمنٹ اور پھر کاغذ پر تیار کی گئی قلمی
کتب کے سر ورق پر کتاب کے بارے میں مختصر لکھنے کا رواج تھا یہی خلاصہ نگاری کی ابتدا
تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فن بھی بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ انیسویں
صدی کے آغاز میں علمی مواد برق

رفتاری سے منظر عام پر آنا شروع ہوا تو مواد کے اس اشاعتی سیلاب نے محققین اور لکھنے والوں کے لیے مشکلات پیدا کردیں کہ وہ اپنے مطلوبہ موضوعات پر شائع شدہ مواد کے بارے میں کس طرح آگاہ ہوں۔ اس اشاعتی سیلاب پر قابو پانے کے لیے تحقیق و جستجو اور منصوبہ بندی کی گئی چناچہ کتابیات، اشاریہ جات کے ساتھ ساتھ خلاصہ نگاری کو ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہوئے خلاصہ نگاری کا رواج عام ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں اولین خلاصہ بعنوان (Chemischer Information Sdiensts) شائع ہوا۔ انگریزی زبان میں متعدد خلاصے شائع ہو رہے ہیں بلکہ ہر مضمون کے علیحدہ علیحدہ خلاصے شائع ہوتے ہیں۔

ابن ندیم (محمد بن اسحاق ابن ندیم) جو پیشے کے اعتبار سے وراق تھے نے ''الفہرست'' کے عنوان سے کتابیات مرتب کی جو قدیم عربی کتابوں کی توضیحی کتابیات ہے۔ اس میں چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کے علوم وفنون کی کتب کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس توضیحی کتابیات میں کتاب جس موضوع پر ہے اس کے ساتھ ساتھ مصنفین کے بارے میں بھی معلوت درج کی گئی ہیں۔ کتاب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں موجود خامیوں کی بھی نشاندھی کی ہے۔ اس کتابیات کو قدیم کتب کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ کتابیات کا اردو ترجمہ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے کیا جسے ۱۹۶۳ء میں لاہور سے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔ معروف مصنف رابرٹ بی ڈاؤنز (Robert B. Downs) کی مرتب کردہ کتابیں جنھوں نے

معرکۃ الآراکتب پر تبصرہ و۔Books that changed the world 'دنیا بدل ڈالی تخلیص کامثالی مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ 'عظیم کتابیں: جنھوں نے دنیا بدل ڈالی' کے عنوان سے غلام رسول مہر نے کیا اور فکشن ھاؤس نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔
اردو ادب میں خلاصہ نگاری، تبصرہ اور دیباچہ نگاری کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہے۔ تصانیف پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرنا کہ مصنف اپنی تصنیف کی اشاعت سے قبل از خود کسی ماہر فن سے درخواست کرے تو یہ عمل دیباچہ یا تقریظ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طرح کے اظہاریے میں کتاب پر تنقید نہیں ہوتی البتہ کتاب کو مزید بہتر بنانے کی کوئی تجویز ہو سکتی ہے۔ خلاصہ مصنف از خود تحریر کرتا ہے چنانچہ اس میں اختصار کے ساتھ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہے، تبصرہ کتاب کی اشاعت کے بعد کوئی بھی کرسکتا ہے یہ ثنائی اور تنقیدی ہو سکتے ہیں۔ اردو ادب میں خلاصہ نگاری کا کوئی ماخذ تو نہیں ملتا البتہ بعض مصنفین نے منفرد انداز سے کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے انہیں ہم خلاصہ نگاری کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں توضیحی کتابیات میں کتب پر مختصر تبصرے بھی ہوتے ہیں انہیں بھی خلاصہ نگاری کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔

بی بی سی اردو سروس کے حوالے سے ایک معروف نام رضا علی عابدی کا ہے۔۱۹۷۵ میں بی بی سی لندن کی اردو سروس سے ایک پروگرام بعنوان ''کتب خانہ' شروع ہوا اور کوئی سال بھر سے زیادہ نشر ہوا، اس پرگرام کا بنیادی مقصد پرانی اردو کتابوں کو جو مختلف عوامی کتب خانوں اور مختلف علمی و ادبی شخصیات کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ تھیں متعارف کرانا تھا۔اس پروگرام میں کتابوں کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کا ذکر آ جانا یقینی تھا۔اس پروگرام کو ترتیب دینے کی غرض سے رضا علی عابدی نے کوچہ کوچہ ،قریہ قریہ سفر کیا، برطانیہ کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف شہروں میں گئے ، بقول عابدی صاحب اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ موقع پر جا کر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ ڈیرہ اسماعیل' خان کی پہاڑیوں سے لے کرمدراس کے ساحل تک اور بنگال کے سبزہ زاروں سے راجستھان کے ریگ زاروں تک قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں ، اور کس حال میں ہیں'۔ عابدی صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ، ان علاقوں میں موجود نایاب و نادر کتابوں کا حال اور ان کی خستہ حالی کی داستان اس خوبصورت انداز سے ریڈیو پر بیان کی کہ اس

وقت کے سنے والے جو کتاب و ادب اور کتب خانوں سے دلچپی رکھتے تھے عابدی صاحب کو جی بھر کر داد دینے میں پیچھے نہ رہے۔

عابدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس تحقیق کے دوران انہوں نے بہت کونے جھانکے ۔ کسی

میں نور بھرا تھا اور کہیں اندھیروں کا راج تھا۔ کہیں کتابیں بچائی جا رہی تھیں اور کہیں کیڑوں کی غذا بن رہی تھیں'۔ یہ جستجو تو تھی ریڈیو کے لیے پروگرام ترتیب دینے کی جو کامیاب رہی ، اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ عابدی صاحب کو اپنی اس تحقیق کو کتابی شکل دینے کا خیال آیا اور اس نے عملی جامہ بھی پہن لیا جس کا نام ہے ''برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کتب خانہ'' ہے اور یہ جو ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئیَ۔ اس عمل سے کتاب اور کتب خانوں کے بارے میں کی گئی تحقیق جو ریڈیو پر نشر ہوئی ہواؤں میں بکھرنے کے ساتھ ساتھ صفحہ قرطاس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ وہ پروگرام جو آج سے تین دھائی قبل نشر ہوا، جو لوگ پروگرام نہ سن سکے تھے وہ اس کتاب کے ذریعہ سالوں پرانی پھیلنے والی خوشبوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

رضا علی عابدی کی مرتب کردہ ایک اور اہم کتاب جسے خلاصہ نگاری کی ذیل میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان تصانیف کے بارے میں بقول عابدی ہمارے بزرگوں نے پڑھی تھیں اور جو یورپ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ یہ وہ تصانیف ہیں جنہیں قدیم کتب کہا جاسکتا ہے۔
ان کتابوں کے بارے ہی
میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے کہا ؎
خزانے علم و حکمت کے ، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

رضا علی عابدی کی مرتب کردہ اس کتاب عنوان 'کتابیں اپنے آباء کی: گزرتے وقت' بدلتی تہذیب، زبان کے ارتقاء اور تاریخ کی کروٹوں کی داستان قدیم کتابوں کی زبانی'' ہے۔اس تصنیف میں پہلی کتاب جس کا ذکر کیا گیا ہے ۱۸۰۳ء میں شائع ہونے والی میر بہادر علی حسینی کی ''اخلاقِ ہندی'' ہے جو قدیم داستانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب میر امن دہلوی کی 'قصہ باغ وبہار' ہے جو ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح سر سید احمد خان کی 'آثار الصنادید' اور 'آئین اکبری' وغیرہ کے بارے میں خوبصورت اور منفرد انداز سے کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

آن لائن (Pakistan Sciecne Abstract, PSA) پاکستان سائنس ایبسٹریکٹ ماخذ ہے جو حکومت پاکستان کا ادارہ پاکستان سائنٹفک اینڈ ٹیکنالوجیکل انفارمیشن سینٹر (PASTIC) شائع کرتا ہے۔ اس خلاصے میں سائنسی و فنی رسائل، کانفرنسیز کی روداد اور سائنسی موضوعات پر مضامین کے خلاصے شامل ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں اس قسم کے ماخذات کی روایت خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ کتب پر تبصروں پر مشتمل ایک ماہنامہ 'اردو بک ریویو' کے نام سے دریا گنج

دہلی، بھارت سے شائع ہوتا ہے۔اس جریدے میں اردو وانگریزی کی کتب پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔اسے خلاصے کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام نئی کتابوں کے تعارف اور تبصرہ پر مشتمل ششماہی مجلّہ 'نقطۂ نظر' ۱۹۹۶ء سے شائع ہورہا ہے۔اس کے مدیر ڈاکٹر سفیر اختر ہیں۔ موجودہ شمارہ ۳۱ (اکتوبر ۲۰۱۱ء سے مارچ ۲۰۱۲ء) تک کے دور پر مشتمل ہے۔ تقریباً تمام ہی ادبی جرائد کتابوں پر تبصرہ شائع کرتے ہیں۔انگریزی اخبار 'دی نیوز' اور اخبار' ڈان' کتابوں پر تبصرے شائع کرتے ہیں روزنامہ جنگ کے سنڈے میگزین میں برس ہا برس سے کتب پر تبصرے شائع ہورہے ہیں۔اس حوالے سے شین عین (شفیع عقیل مرحوم) کی علمی خدمات قابل ذکر ہیں۔انہیں تبصرے کا

فن خوب آتا تھا۔خلاصہ کے بارے میں مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ :

خلاصہ قاری کا وقت بچاتا ہے

خلاصہ ماضی میں شائع شدہ مواد کا جائزہ پیش کرتا ہے

خلاصہ پڑھنے والے کی زبان کی مشکل کا حل ہے یعنی اصل دستاویز یا مضمون کسی ایسی زبان میں ہے جس سے پڑھنے والا واقف نہیں

خلاصہ جو عام طور پر انگریزی میں ہوتا ہے اس مشکل کا حل ہوتا ہے۔

خلاصہ یا تلخیص طویل مضمون اور ضخیم تحقیقی مقالے کو اختصار سے بیان کرنے کا ذریعہ ہے۔

اپنی کہانی اپنی زبانی آپ بیتی (حصہ اول

(پیدائش تا ۲۰۱۲ء)

سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں، زندگی کی چونسٹھویں بہار دیکھ رہا ہوں، سچ بات تو یہ ہے کہ اب بہت ہو چکا، بہت کچھ کھا لیا، بہت کچھ دیکھ لیا، بہت کچھ پڑھ لیا، بہت کچھ لکھ بھی لیا اور چھپ بھی گیا۔ لائبریری میں کتابوں کی درجہ بندی کے لیے ایک اسکیم رائج ہے جسے ایک امریکی ماہر لائبریری سائنس میلول ڈیوی نے ۱۸۷۶ء میں مرتب کیا تھا۔اس اسکیم میں کل علم کو دس درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے،علوم کی اوپر سے نیچے تقسیم کا فلسفہ ڈیوی نے یہ بیان کیا ہے کہ پتھر کا انسان جیسے جیسے شعور کی دنیا میں قدم رکھتا چلا گیا، مختلف علوم معرض وجود میں آتے گئے۔اِسی مناسبت سے اس نے علوم کی ترتیب مقرر کی، یہ اس کا اپنا فلسفہ ہے اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش موجود ہے، اس کے خیال میں پتھر کے انسان کا اولین عمل سوچنا تھا چنانچہ اس نے فلسفہ کو سرِ فہرست رکھا، سوچنے کا یہ عمل جب آگے بڑھا تو پتھر کے انسان نے اپنے خالق کے بارے میں سوچا اس کا یہ عمل اُسے مذہب کی جانب لے گیا چنانچہ مذہب کو دوسرے نمبر پر رکھا، اب انسان کو اپنے ہم جنسوں سے تعلقات استوار کرنے کی رغبت ہوئی، اُس کا یہ عمل سماجی علوم کی ابتدا تھی،راہ و رسم قائم کرنے کے لیے زبان کی

ضرورت تھی ، اب زبان معرض وجود میں آئی، پتھر سے آگ اور پہیے سے گاڑی بنائی، اس کا یہ عمل سائنس اور ٹیکنالوجی کے زمرہ میں آیا، مصوری اسے فائن آرٹس کی جا نب لے گی،اب حضرت انسان کو شاعری کی سوجھی تو ادب معرض وجود میں آیا۔
یہاں آکر انسان بوڑھا ہوچکا تھا، چل چلاؤ کا وقت قریب آیا تو اس نے سوچا کہ اپنی زندگی کے حالات قلم بند کرے، زندگی میں جو تجربات و مشاہدات ہوئے انھیں آئندہ آنے والی نسل کی رہنمائی کے لیے قلم بند کرجائے۔ میلول ڈیوی کے فلسفے کے مطابق اب ہم بھی تمام تر مراحل طے کر چکے، للذا اپنی آپ بیتی یا خاکہ، تجربات و مشاہدات جیسے بھی ہیں اچھے یا برے انھیں اپنی آنے والی نسل کے لیے چھوڑ جائیں ، اگر وہ مناسب جانیں تو رہنمائی حاصل کرلیں ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسل نے موبائل ، کمپیوٹر ، انٹرنیٹ اور آزاد میڈیا کے دور میں آنکھ کھولی ہے اسے ہم جیسے سیاہ وسفید ٹیلی ویژن دیکھنے والوں ، بلیک رنگ کا لائن ٹیلی فون استعمال کرنے والوں، بسوں ، منی بسوں، رکشا، سرکلر ریلوے ، گھوڑا گاڑی اور بیل گاڑی میں سفر کرنے والوں کے تجربات و مشاہدات سے کیا لینا دینا، خاموشی سے کمپیوٹر آن کیا ، انٹرنیٹ کے توسط سے جو مرضی چاہا دیکھ لیا، وہ چیز بھی جو ان کے کام کی ہے وہ بھی جو ان کے کام کی نہیں۔ میلول ڈیوی کا فلسفہ بیان کرنے کا مقصد اپنے بارے میں لکھنے کا مدعا بیان کرنا تھا کہ اب ہمارا بھی چل چلاؤ ہے، نہیں معلوم کب ہوا کا تیز جھونکا چلے اور چراغ گل ہوجائے۔ ویسے بھی جب سے ہماری انجوپلاسٹی

ہوئی ہے، ہمارے دل نے ہمیں یہ احساس دلانا شروع کردیا ہے کہ وہ ہمارے جسم میں موجود ہے۔ دھک دھک کر رہا ہے، اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنی دھک دھک بند کر سکتا ہے۔ ویسے اختیار کا مالک تو ہمارا پیدا کرنے والا ہے، اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا خواہ ہمارا دل ہمیں کتنا ہی ڈرائے، دھمکائے ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ غالبؔ نے اپنی آپ بیتی میں اِسی بات کو اس طرح کہا کہ ''جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی''۔ تو جناب ہماری داڑھی میں بھی چاندی نمایاں ہو چکی ہے، گالوں پر چیونٹی کے انڈے بھی نظر آنے لگے ہیں البتہ ابھی دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ ناصر کاظمی کے بقول ؂

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

اپنا خاکہ لکھنا یا آپ بیتی قلم بند کرنا بڑا کٹھن کام ہے حالانکہ خاکہ نگار پہلے ہی اپنے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوتا ہے۔ اپنے خاکے میں ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ بندہ اپنی ذات سے متعلق اچھی باتیں لکھے تو اپنے منہ میاں مٹھو والی مثال صادق آتی ہے، اچھا بھی نہیں لگتا، برائی لکھے، کیڑے نکالے تو کیسے، ہم نے دوسروں کے خاکے لکھے ہیں، ہر صورت میں خاکہ اڑانے سے

احتراز کیا ہے، تو پھر اپنا خاکہ بھی ایمانداری سے لکھیں گے۔ مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے کہ ’ آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے اور از راہ کسر نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے‘۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خاکہ خواہ کسی کا ہو، اپنا ہی کیوں نہ ہو ہر صورت میں خاکہ نگار کو سچائی اور ایمانداری کا دامن تھامے رہنا چاہیے ،اس کا بنیادی مقصد خاکہ اڑانا نہ ہو بلکہ شخصیت کے باطن میں چھپے موتیوں کی تلاش ہونا چاہیے۔ سو ہم نے بھی اپنی تلاش اور اپنے باطن میں چھپے رازوں کو افشا کرنے کا قصد کر لیا۔ نہیں معلوم اس میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے خاکے کو ’ایک ایسی صراطِ مستقیم قرار دیا ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے‘۔ مجھے اپنے باطن میں جھانکنے یا اپنا خاکہ لکھنے کی ترغیب ’’خود ستائیاں‘‘ پڑھ کر ملی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اردو کے نادر و نایاب خود نوشت خاکے جمع کر کے خود نوشت خاکوں کی دنیا میں قابل تعریف کام کیا ہے۔

میرے پرکھوں کی سرزمین راجستھان تھی، اس حوالے سے میں بنیادی طور پر راجستھانی یا راجپوت ہوں ،راجستھان آج کل آبادی کے لحاظ سے بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہے، تقسیم سے قبل اس صوبے کا نام راجپوتانہ تھا اور یہ صوبہ بائیس

راجواڑوں (ریاستوں) کا مجموعہ تھا۔ راجپوتانہ نے بھی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں، میرابائی، مہدی حسن اور ریشماں کو مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان کے تین طرفہ تحفے قرار دیا ہے جن کے وہ قائل اور گھائل ہیں حالانکہ وہ خود بھی راجپوت ہی ہیں۔ بعد میں ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ حسین پور کو آباد کیا۔ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت دیوان باری بخش علیہ الرحمتہ جو ہندوستان کے ایک حکمراں خاندان سے تھے انھوں نے سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں بھٹنیر (بیکانیر) سے دہلی ہجرت کی، اس وقت دھلی میں مہاراجہ پال عرف جیون سنگھ تورمار خاندان کی حکومت تھی، حکومت کی جانب سے ہمارے خاندان کے جدامجد کو کھڈی (شکارپور) جو اس زمانہ میں ایک صوبے کی حیثیت میں تھا دیوان مقرر کیا گیا۔ شہاب الدین شاہجہاں کے عہد میں ہمارا خاندان شکارپور سے منتقل ہو کر قصبہ حسین پور، ضلع مظفر نگر، یوپی میں مقیم ہوا۔ میرے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزادؔ حسین پور سے پہلے فرید کوٹ پھر بیکانیر منتقل ہوئے۔ان کا یہ عمل ایسا ہی تھا کہ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا، پردادا نے اپنے انتقال تک، دادا اور والد صاحب نے تقسیم ہندوستان تک بیکانیر کو ہی آباد کیے رکھا۔ میرے منہ میں خاک اگر پاکستان نہ بنتا اور اگر بنتا بھی تو دنیا کی سب سے بڑی ہجرت نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم راجپوتانہ کی سرزمین بیکانیر میں ہی ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوتے۔

مظفر نگر ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی مردم خیز سرزمین ہے جس نے علمائے دین، صوفیائے کرام اور فقہائے اسلام کو جنم دیا، اہل علم ودانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ،ان شخصیات میں بعض احباب کے نام فخر سے لیے جاسکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد مظفر نگر کا موضع 'پھلت' تھا، اسے قریہ اولیاء بھی کہا جاتا ہے۔ عالم دین مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۲۸۰ھ میں بمقام قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان کا تعلق بھی مظفر نگر سے تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، حاجی ولی اللہ محمد احمد سراوے والے ،زاہد حسین ، اولین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان ، جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، محمد ابصار حسین قرنی عمرپور والے، مفتی و محدث مولانا عبدلمالک ، مولانا عبد الخالق کاندھلہ والے، شیخ محمد ابراہیم آزاد، سابق چیف جسٹس ، بیکانیر چیف کورٹ ،معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ)، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری،، مبشر احمد واحدی، معروف شاعر احسان دانش، تابش صمدانی
اورافسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی کا وطن بھی تھانہ بھون مظفر نگر تھا۔اس اعتبار سے مجھے ایسی متبرک سرزمین سے نسبت حاصل ہے جس کی کوکھ نے عظیم ہستیوں کو جنم دیا۔ میرے خاندان میں اکثر احباب تدریس اور شاعری سے شغف رکھتے
ہیں، صاحب دیوان شاعر بھی ہیں اور بے دیوان شاعر بھی، مَیں شعر گھڑ لیتا ہوں، شاعر ی میرے خمیر میں تو ہے لیکن

تاحال باقاعدہ شاعری نہیں کی، اپنے موضوع پر لکھنے سے فرصت ہی نہیں ملی، البتہ موقعہ محل یا ضرورت کے لیے شعر کہہ لیتا ہوں، جیسے یہ نثری شعر۔

مظفر نگر تری مٹی کی عظمت کو سلام

کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تو نے

میرے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزاد صاحب کا دیوان ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے ''ثنائے محبوب خالق: دیوان آزاد'' کے نام سے شائع ہوا تھا، ۷۵ سال بعد اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں کراچی سے شائع ہوا، آزاد صاحب وکیل تھے، بیکانیر میں جج اور چیف جج بھی رہے، نثر بھی لکھی، تصوف ان کا خاص موضوع تھا، ان کے متعدد مضامین ''پیامِ اتحاد'' میں شائع ہوئے۔ دادا شیخ خلیل صمدانی صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کے بیٹے تابش صمدانی کئی نعتیہ مجموعوں کے خالق ہیں۔ میرے خاندان میں ادب سے تعلق کا یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے کئی پشتوں سے جاری ہے۔ کئی احباب شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ جنابِ آزاد استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔

ادب سے وابستگی میرے خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے، صاحبِ دیوان اور بقول ابن انشا بے دیوان شاعر ہوئے ہیں اس وجہ سے لکھنا ضروری سمجھا اور لکھنا بھی

چاہیے، اپنے بزرگوں کو یاد رکھنے اور انھیں خراج تحسین پیش کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، اگر ہمارے پرکھوں میں صاحب دیوان اور بے دیوان شاعر نہ ہوتے تو لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی، خاموشی سے گزر جاتے یا پھر ہم بھی ابن انشا کی طرح لکھ دیتے کہ ''ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھوں اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سودا گر بتاتا ہے۔ ابن انشا کو بارہا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا ورنہ یا تو اسے اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا''۔ ہمیں سہارے کی بھی ضرورت نہیں، شرمندگی بھی نہیں، ہمیں تو اپنے شاعر اور ادیب پرکھوں پر فخر ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میری مختصر سی سرگذشتِ حیات سنیے اور خود میری ہی زبانی۔

میری زندگی کا سب سے اہم اور منفرد واقعہ خود میری پیدائش ہے۔ جی ہاں یہی سچ ہے، تو سنیئے یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ میرے والدین کی شادی قیام پاکستان سے پانچ ماہ قبل مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، میرے وجود کا خمیر ہندوستان میں معرضِ وجود میں آچکا تھا، اسے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرے والدین کو پاکستان ہجرت کا قصد کرنا پڑا، 'لے کر رہیں گے پاکستان بٹ کر رہے گا ہندوستان''کی صدائیں میرے کانوں میں براہِ راست تو نہیں البتہ اپنی ماں کے کانوں سے ہوتی ہوئی مجھ تک ضرور پہنچیں۔ اس کا احساس میں آج بھی

محسوس کر سکتا ہوں، کیوں کہ میں اُس وقت شکمِ مادر میں رہتے ہوئے ہجرت کی بہاروں کا لطف لے رہا تھا۔ مجھے بروز پیر ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو یعنی قیامِ پاکستان کے سات ماہ بعد اس دنیا میں آنا تھا اور آیا۔ پنجاب کے ایک دیہات نما شہر 'میلسی' میں اپنے ماموں جناب محبوب احمد سبزواری کے گھر پیدا ہوا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو میری والدہ اپنے میکے مشرقی پنجاب کے شہر فرید کوٹ میں تھیں، والد صاحب بیکانیر میں تھے، چنانچہ والدہ نے اپنے بھائیوں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور پنجاب کی سرزمین ان کی مستقر ٹھری جب کہ والد صاحب نے کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔

میلسی ہے ایک شہر، پانچ دریاؤں کی سرزمین پر
میں ہوں رئیسؔ اُسی آسماں کا ایک ستارہ

یہ وہ زمانہ تھا جب عام طور پر بچوں کی پیدائش گھروں میں ہوا کرتی تھی، محلوں میں بعض عورتیں بچوں کی پیدائش میں مددگار کا کردار ادا کیا کرتی تھیں، اُنھیں عرف عام میں 'دائی' کہا جاتا ہے۔ 'دائی' کوئی کوالیفائیڈ نرس نہیں ہوتی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر زنِ حاملہ کا سہارا ہوا کرتی تھی۔ میری امی اور مَیں بھی ایک دائی جس کا نام 'اَنسری' تھا کے رحم و کرم پر تھے۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اپنے دادا کا پہلا پوتا، اپنی پھوپھیوں اور چچاؤں کا پہلا بھتیجا، یہی وجہ تھی کہ میری آمد پر میرے چاہنے والوں نے

کان لگائے ہوئے تھے کہ کیا خبر آتی ہے اب تو سائنس اتنی ترقی کرچکی ہے کہ وقت سے پہلے ہی اطلاع آجاتی ہے کہ دنیا میں آنے والا ابنِ آدم ہوگا یا وہ بنتِ حوا ہو گی۔ اچانک یہ اطلاع ملے کے نومولود بابا آدم کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے تو خوشی دوبالا ہوجاتی ہے۔ دنیا میں میری آمد متوقع ہی تھی کہ 'دائی' نے اعلان کر دیا کہ اس دنیا میں آنے والے رئیسِ اعظم ہیں وہ سر کے بل نہیں بلکہ پیروں کے بل اس دنیا میں آئیں گے۔زچگی کی اصطلاح میں اِسے بچے کا الٹا پیدا ہونا کہا جاتا ہے۔ دائی کی اس دیدہ دلیری نے گھر کے ماحول کو یک سر بدل کے رکھ دیا، خوشی کا ماحول افسردگی میں بدل گیا، موقع واردات پر موجود چہرے کملا گئے، فضاء غمگین ہو گئی،اس خبر نے کراچی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جہاں پر میرے والد صاحب اپنے باپ بننے کی خبر سننے کے لیے بے تاب تھے، میرے دادا کو اپنے دادا بننے کی خبر کا انتظار تھا اور میری پھوپھیاں اور چچا اپنے بھتیجے کا اس دنیا میں آنے کا انتظار بے تابی سے کر رہے تھے، وہ بھی اس خبر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب مجھے ہی نہیں بلکہ میری ماں کی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ گویا مَیں نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی یہ کارنامہ انجام دیا کہ اپنی ماں کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ رہا معاملا الٹے اور سیدھے کا، تو بات یہ تھی کہ مَیں نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ مَیں جوں ہی اس دنیا میں آؤں دائی صاحبہ میری گردن دبوچ لیں، مَیں تو اُس سے اپنی قدم بوسی کرانا چاہتا تھا،ایسا ہی ہوا، مَیں دنیا میں چلتا ہوا ہی

آیا، گویا الٹا پیدا ہوا، اپنا اپنا طریقہ واردات ہے۔ بچے کا الٹا پیدا ہونا بھی کیا چیز ہوتا ہے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں، مَیں جوان ہوگیا تھا، کالج میں پڑھا کرتا تھا، اُس وقت ہم آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے، چھٹی کا دن تھا، صبح ہو چکی تھی لیکن مَیں ابھی سو رہا تھا، ابا جان نے سوتے سے اٹھایا کہنے لگے چلو ایک صاحب پڑوس سے آئے ہیں میرے دوست ہیں ان کی کمر میں چک آ گئی ہے تم اُن کی کمر پر اپنے سیدھے پیر کی لاٹری رکھ دو، پہلے تو مَیں سمجھا ہی نہیں، مَیں نے آنکھیں ملتے ہوئے ساتھ ہی ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا ہوا ہے ؟ پاپا (والد صاحب کو ہم پاپا کہا کرتے تھے)، انھوں نے وہی جملہ پھر دہرایا، مَیں نے انتہائی ادب سے کہا کہ میں کوئی پہلوان، ہڈی جوڑنے والا یا مالشیہ ہوں، کہنے لگے ، نہیں بھئی، بات یہ ہے کہ کیونکہ تم الٹے پیدا ہوئے تھے اس لیے تمہارے پیر کی لاٹری میں یہ تاثیر ہے کہ اگر کسی کی کمر میں چک آ جائے تو تمہارے اس عمل سے اس کی تکلیف دور ہوجائے گی۔ ابا جان کا حکم تھا، مجال نہیں تھی کہ چوں چرا کی جاتی، خاموشی سے آنکھیں ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں گیا وہ صاحب فرش پر اوندھے منہ پڑے تھے، مَیں نے جا کر ویسا ہی کیا جیسا ابا جان نے کہا۔ بعد میں بھی اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہوئے۔ جس طرح دنیا میں بے شمار قسم کی فضولیات اور تواہمات ہیں، یہ بھی انھی میں سے ایک

ہے۔

چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ مَیں اپنے دادا کے ساتھ بہار کالونی کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گیا تھا، ایک دن دادا نماز پڑھنے میں مصروف تھے مَیں مسجد کی چھوٹی سے دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیااور بلند آواز سے اُس زمانے کا ایک مشہور گانا ''اے میرے دل کہیں اور چل اس دنیا سے دل بھر گیا'' گانے لگا، دادا کو میری یہ حرکت بری نہیں لگی بلکہ انھوں نے گھر آ کر خوش ہو ہو کر سب کو میری اس حرکت کے بارے میں بتایا، اس زمانے کا ایک اور واقعہ جو میری نظروں کے سامنے کبھی کبھی آ جاتا ہے وہ میرے دادا کا اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کا انتقال ہوا تو انھیں بہار کالونی والے گھر ہی میں پلنگ کھڑے کرکے ان پر چادریں ڈال کر غسل دینے کی جگہ بنائی گئی تھی ،مَیں بار بار اس جگہ آ جایا کرتا لوگ مجھے وہاں سے بھگا دیا کرتے۔ کچھ بڑا ہوا تو بہار کالونی والے گھر سے آگرہ تاج کالونی والے جھونپڑی نما گھر منتقل ہونا یاد ہے، ایک چھوٹا سا کمرہ جس کی چھت ایس بسٹاس کی شیٹوں کی تھی، صحن کی چار دیواری سرکنڈوں کی، بارش میں چھت درمیان سے ٹپکا کرتی اور ہم اپنے پلنگ کبھی اِدھر کبھی اُدھر کرلیا کرتے ۔ غسل قدیم طرز کا جس کے دروازے پر ٹاٹ کا (Toilet) خانہ علیحدہ ،لازمی اثاث البیت پردہ پڑا ہوا، رفتہ رفتہ گھر پکا ہوتا گیا لیکن تمام

کمروں کی چھت ایس بسٹاس ہی کی تھیں، سردیوں میں سرد، گرمیوں میں گرم اور برسات میں اللہ کی رحمت اندر آیا کرتی لیکن گھر اپنا تھا، یہی خیال ہم سب کو خوش و خرم رکھا کرتا، اسی گھر اور اسی ماحول میں ہم سب بہن بھائی پروان چڑھے اور بڑے ہوئے۔

بچپن میں خاموش طبع تھا، مجال ہے کہ کسی کے سامنے کوئی بات کرلوں، مجھے گونگے شاہ کا خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد جوہر کھلے ، اسٹیج پر بولنا، مجمعے کے سامنے تقریر کرنا، پروگراموں کی کمپیئرنگ کرنا، اس کا چسکا کیسے لگا اس کی تفصیل مَیں نے نیچے بیان کی ہے۔ پڑھائی میں مشکل سے پاس ہونے والا، کھلنڈرا قسم کا تھا، عام طور پر احباب کا خیال یہی تھا کہ یہ مشکل سے میٹرک کرلے تو اسے کسی ٹیکنکل کام میں لگا دیا جائے ، ہوا بھی ایسا ہی ، ابھی انٹر ہی کیا تھا یار لوگوں نے پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں اپرنٹس شپ میں بھرتی کرادیا، اس کا قصہ کچھ اس طرح ہے ،۱۹۶۸ء کی بات ہے میں انٹر کرچکا تھا، میرا تعلیمی ریکارڈ بہت نمایاں نہیں تھا، بس نارمل تھا۔ ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ فیصلہ ہوا کہ میں کوئی ٹیکنکل لائن اختیار کروں، ساتھ ہی اپنی پڑھائی بھی جاری رکھوں۔ چنانچہ میں نے عبداللہ ہارون کالج میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا ۔ ہمارے رشتہ کے ماموں لئیق احمد مرحوم پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں ملازم تھے، انہوں نے مجھے

میں بھرتی کرادیا۔(Apprenticeship) فیکٹری میں شروع ہونے والی اپرنٹس شپ پر فٹ کر (Bench) یہ خالصتاً ٹیکنکل کام تھا۔ شروع کے دو ماہ لوہے کے ٹکڑوں کو بچ نے کے بعد لوہے کی فائل کے ذریعہ مخصوص طریقے سے گھسنا ہوتا تھا۔ دو ماہ کے بعد کا (Lathe Machine)کارکردگی کی بنیاد پر کوئی مشین مین بن جاتا، کوئی خراد مشین کاریگر تو کوئی بچ فٹر ہی رہتا، اس وقت ہم آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے، ہر روز فجر کے وقت گھر سے نکلتا، بس کے ذریعہ سٹی اسٹیشن پہنچتا اور وہاں سے مہران ایکسپریس کے ذریعہ جو ٦ بجے چلا کرتی تھی مشین ٹول فیکٹری پہنچا کرتا۔ مرِہٹ کر میں نے دو ماہ گزار لیے اس کے بعد مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں اسے جاری رکھ سکتا، چنانچہ مَیں تو دوماہ بعد ہی بھاگ کھڑا ہوا، یہ نرم و نازک ہاتھ تو قلم چلانے کے لیے تھے، ان سے لوہا کس طرح گھسا جا سکتا تھا، لئیق ماموں کیوں کہ آفس میں تھے اس وجہ سے میری جاں بخشی ہوگئی ورنہ شاید پولیس کے ذریعہ بلوالیا جاتا۔ یہ میری زندگی کی اولین ملازمت یا ایسی پڑھائی تھی کہ جس کے بعد روزگار کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لئیق ماموں اکثر کہا کرتے تھے کہ تمہارا بیچ ٹول فیکٹری کا اولین بیچ تھا، کافی ترقی ہوتی، لیکن اس قدر سخت محنت کا کام میرے بس کی
بات نہیں تھی۔ مجھے تو قلم چلانا تھا اور تعلیم کے میدان میں رہنا تھا خراد مشین کا ”خرادیہ“ کیسے بن سکتا تھا۔

حساب کتاب سے مجھے شروع ہی سے الجھن تھی، یہی وجہ ہے کہ میٹرک میں حساب کا پرچہ مشکل سے پاس کیا تھا۔ مرزا غالب کا بھی حساب سے جی گھبراتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ 'انہیں جوڑ لگانا نہیں آتا'۔ میٹرک پیلے اسکول سے کیا، وہ دور پیلے اسکولوں ہی کا تھا،اُس وقت تعلیم کو لوگوں نے تجارت نہیں بنایا تھا۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بڑا نام تھا، لوگ فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم نے کوتوال بلڈنگ، جیکب لائن، وسطانیہ، لیاری کواٹر، این جے وی میں پڑھا، ڈیجیرین ہونا بڑا اعزاز تھا، عبدالقدیر خان جیسے نامور لوگ ڈیجیرین ہیں۔ میرا سرکاری اسکول کراچی میں پی اے ایف ماری پور اب اِسے 'جیں مسرور' کہتے ہیں کہ کیمپ نمبر ۲ میں تھا۔ میرے گھر سے خاصا دور تھا، پیدل جانا مشکل ہوا کرتا تھا، لفٹ لے لیا کرتے یا پھر سرکاری بسیں ہمارا مقدر ہوا کرتی تھیں۔ اسکول کا ماحول صاف ستھرا نیم فوجیانہ تھا،اکثر اساتذہ کیمپس ہی میں رہا کرتے تھے، سول ادارے ہوتے ہوئے بھی فوجی ڈسیپلن تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہوئی تو میں نویں جماعت میں تھا، ایوب خان کی تاریخی تقریر ''دشمن نے کس قوم کو للکارا ہے'' ہم نے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے آفس کے ریڈیو پر سنی تھی۔ کیمپس میں کرکٹ گراؤنڈ بہت عمدہ تھے، کرکٹر امتیاز احمد کو اسی جگہ کھیلتے دیکھا تھا، اسکول کے دوست فوجیوں کی اولادیں ہی تھیں، یقیناً ان میں سے اکثریت نے فوجی ملازمت اختیار کی ہوگی۔ بہت کم سے ملاقات

ہو سکی۔ چند نام ہی ذہن میں ہیں ریاض، اختر، افتخار، اظہر، شمیم، ظفراللہ نیازی طالبات بھی کلاس میں تھیں لیکن ان میں سے کسی کا نام ذہن میں نہیں۔

اساتذہ سب ہی محنتی، قابل اور اچھا پڑھانے والے تھے، جی چاہتا ہے کہ ان سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھوں پر طوالت ایسا کرنے سے روک رہی ہے،ان سب کے لیے محبت بھرا اسلام عقیدت جو نام اب ذہن میں ہیں ان میں محمد احمد قریشی صاحب، کلیم صاحب، محمد ظہیر صاحب، امیر الہدیٰ صاحب، محمد احمد صدیقی (علیگ)،افسر صاحب، بھی ہوئے، فیض احمد شاہ صاحب، سلیم صاحب، زرین (DEO)افسر صاحب ڈی ای او صاحب، اکرام صاحب ان کا جوانی میں ہی انتقال ہوگیا تھا،مسیز مرتضیٰ اور مسیز شمیم شامل تھیں۔ ظہیر صاحب اور امیر الہدیٰ صاحب ایجوکیشن سپروائیزر ہو گئے تھے، ۱۹۷۶ ء میں شہناز کا تبادلہ حیدرآباد سے کراچی ہوا تو دونوں احباب نے ہماری بہت مدد کی اور گھر کے نزدیک تر اسکول میں تبادلہ کر دیا۔

ایف ایس سی سندھ مسلم کالج سے کیا، یہاں پروفیسر کوہاٹی پرنسپل ہوا کرتے تھے، لحیم شحیم، صحت مند اور بارُعب انسان تھے، ان کے سامنے کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، جوں ہی ان کی گاڑی کالج گیٹ کے سامنے آکر رکا کرتی نیچے سے اوپر تک سناٹا چھا جایا کرتا، کالج کے اساتذہ میں پروفیسر اویس احمد

ادیب معاشیات کے استاد تھے، قابل اور اپنے موضوع پر مکمل دسترس،اویس صاحب سے متاثر ہو کر ہی میں نے معاشیات میں ایم اے کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پروفیسر اسحاق اور پروفیسر چودھری صاحب اردو کے استاد ہوا کرتے تھے،پروفیسر سید لطف اللہ صاحب تاریخ اسلام پڑھایا کرتے تھے، یہ بعد میں میرے ساتھی اور دوست بھی ہوئے، جماعت اسلامی سے تعلق تھا، فلاحی ادارے جمعیت الفلاح کے سیکریٹری بھی رہے، مجھے جمعیت الفلاح میں سرگرم کرنے کی کئی سال کوشش کرتے رہے، ان کے کہنے پر مَیں نے جمعیت کی لائبریری کواز سر نو ترتیب دینے کا کام بھی کیا۔ سراج الدولہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، اچھے اور نیک انسان تھے۔ بی اے عبد اللہ ہارون کالج سے کیا، یہاں ہمارے پرنسپل فیض احمد فیضؔ صاحب تھے۔ فیض صاحب کو بطور اپنے پرنسپل کے خاکے میں متعارف کرایا ہے۔ یہ خاکہ میری اِسی کتاب میں شامل ہے۔ دھیمے لہجے کے ساتھ ساتھ دھیمہ پن ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ یہاں میرے اساتذہ میں پروفیسر یونس صدیقی ،پروفیسر احمد حسین، پروفیسر بشارت کریم ،پروفیسر ریاض الحسن قدوائی، پروفیسر شفیق رحمانی اور عبد الرشید راجا صاحب تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جب میرا تبادلہ اسی کالج میں ہوا تو یہ تمام اساتذہ میرے ساتھی ہوئے، طویل عرصہ ہم ایک ساتھ رہے۔اساتذہ اور بھی تھے ، یہ داستان طویل ہے کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھی ہے۔

گریجویشن کے بعد اکنامکس میں ماسٹر کرنے جامعہ کراچی کی دہلیز پر قدم رکھا، معلومات حاصل کرنے کے چکر میں ہم پہنچ گئے اپنے چچا کے شعبے میں، انھوں نے سبز باغ دکھایا اپنے سبجیکٹ کا، ہم سیدھے سادھے تو تھے ہی آگئے ان کے چکر میں اور اکنامکس کے بجائے لائبریری سائنس کے شعبے میں داخل کرلیے گئے۔ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی تو دیکھیے وہ دن اور آج کا دن اسی پروفیشن کے ہو کر رہ گئے۔ شادی ہوئی، تین بچے بھی ہوگئے پر ہم نے اپنی پڑھنے کی ڈگر نہ بدلی، شادی کے ۱۰ سال بعد ایک ایم اے علم سیاسیات میں اور کرڈالا، ہمارا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اگر عملی سیاست میں حصہ لینے کی ضرورت ہوئی تو سیاست کے یہ رموز کام آئیں گے لیکن نوبت ہی نہیں آئی، سیاست دانوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر صبح و شام کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں،اب تو سیاست ،نام ہے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا
پیسے بنانے کا، کرپشن کرنے کا اور جان سے مار ڈالنے کا، ٹی وی پر جو روز سیاسی دنگل سجا ہوتاہے وہی کافی ہے عبرت والوں کے لیے۔

پڑھائی کا بھوت بدستور ہمارے سر پر سوار رہا، کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، ہم مسلسل اس چکر میں رہے کہ کسی طرح پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مل جائے، نہ معلوم کیوں جیسے جیسے ہمارے مضامین اور کتابیں منظر عام پر آرہی تھیں پی ایچ ڈی کرنے کی ہوس بڑھتی ہی جارہی تھی، یہاں آکر

دوستوں نے ہری جھنڈی دکھا دی، وہ دوست جو اس پوزیشن میں تھے کہ ہمارا ہاتھ تھام لیتے ، تیرنا تو ہم نے خود ہی تھا، بس ڈوبتے کو تنکے کے سہارے والی بات تھی ، انہوں نے ایسی کنی کاٹی کے خود تو تیر کر ساحل پر جالگے، ہم رہ گئے وہیں پر کھڑے کے کھڑے، پر ہمارے باطن میں جو دیا روشن ہوا تھا اس کی روشنی ماند نہیں پڑی، ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری، ایک جانب عمر کے ماہ و سال ہمیں تیزی سے بڑھاپے کی جانب رواں دواں کیے ہوئے تھے دوسری طرف خواہش تھی کہ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں آرہی تھی بلکہ روزبہ روز جوان ہی ہورہی تھی، بالآخر ۲۰۰۶ء نے دستک دی، میرا ہمدرد یونیورسٹی میں جانا ہواہی کرتا تھا، بیت الحکمہ (ہمدرد لائبریری) کے ڈائریکٹر پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری جو ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے ڈائریکٹر اور جامعہ ہمدرد کے 'لائف پروفیسر' بھی تھے، میری ان سے مراسم کی نوعیت قدیمی تھی، عمر کے فرق کے باوجود دوستانہ مراسم تھے۔ ایک دن ان سے تحقیق پر گفتگو ہوئی ، مَیں نے ایک موضوع کا اظہار کیا کہ اس موضوع پر کام کیا جاسکتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پی ایچ ڈی سے نیچے بات نہیں ہوگی یعنی ایم فل نہیں کروں گا، انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور مجھے اس موضوع پر synopsis تیار کرنے کو کہا، مَیں تو تیار ہی بیٹھا تھا اور ٹاپک بھی اپنی پسند کا، پھر کیا تھا، رات دن لگا کر ایک خاکہ تیار کیا اور ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے معمولی سی کانٹ چھانٹ کی اور پی ایچ ڈی کا پہلا پتھر رکھ دیا گیا، داخلے سے پہلے ہی

کام بھی شروع ہوگیا، جب بھاری بھر کم سپر وائیزر رہنمائی کے لیے تیار ہو تو پھر کیا چاہیے تھا، ہم نے کام شروع کر دیا۔

موضوع کے انتخاب کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ مجھے زندگی میں ایک شخص نے بہت زیادہ متاثر کیا جو خون کے آخری قطرہ تک محب وطن تھا، وہ جب تک جیا زندگی کو سعی پیہم اور جہد مسلسل سمجھ کر جیا، اس مرد آہنگ کو آپ سب جانتے پہچانتے ہیں، وہ ہے شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید۔ مَیں نے انھیں قریب سے دیکھا، کتب خانوں کے فروغ و ترقی کے لیے انہوں نے ۱۹۶۰ء میں ایک انجمن ''انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات (SPIL,Society for the Promotion & Development of Libraries)'' بنائی تھی جس کے وہ تادم شہادت صدر رہے، جب ان کی شہادت ہوئی وہ اس کے صدر اور مَیں اس کا جوائنٹ سیکریٹری تھا۔ تحقیق کے لیے جو موضوع منتخب کیا گیا تھا وہ حکیم محمد سعید کی کتب خانوی خدمات سے متعلق تھا، مقالے کا عنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' تھا۔ تحقیق کا بنیادی مقصد پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید اور انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات، اسپل کے کردار اور کارناموں کا جائزہ لینا تھا۔ پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری میرے تھیسس سپر وائیزر اور ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری معاون سپر وائیزر مقرر ہوئے۔ جون ۲۰۰۶ء میں کام شروع

کر دیا گیا، مَیں نے فیصلہ کیا کہ دو سال میں کام مکمل کر لونگا، یہی ہوا، مَیں رات رات بھر کام میں لگا رہتا، مجھے مواد کے حصول میں مشکل پیش نہیں آئی، میری ذاتی لائبریری میں اس موضوع پر وافر مواد موجود تھا، دوستوں نے بھی بھر پور تعاون کیا، حکیم محمد سعید کے قریبی ساتھیوں، ہمدرد لائبریری میں کام کرنے والوں اور لائبریری سائنس کے ماہرین کے انٹر ویوز میری تحقیق کا اہم حصہ تھا، کراچی کے علاوہ میں کوئٹہ، لاہور، اسلام آباد، حیدرآباد بھی گیا اور احباب کے انٹر ویوز کیے۔ دو سال بعد تھیسس تو مکمل ہوگیا لیکن جاتے جاتے مجھے ایک ایسا تحفہ دے گیا جو میری باقی ماندہ زندگی میں میرے ساتھ رہے گا وہ ہے میرے کمر کے مہروں کی تکلیف، مسلسل اور زیادہ کمپیوٹر پر کام کرنے کے نتیجے میں مَیں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا مریض بن چکا تھا، کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی، پی ایچ ڈی میں دو مراحل ہوتے ہیں ایک تو کام جسے محقق کو ہی کرنا ہوتا ہے دوسرا مرحلہ جو بد قسمتی سے پاکستان کی جامعات میں زیادہ اہم ہے وہ ہے انتظامی مراحل کی پیچیدگیاں اور مشکلات۔ ہمارے ملک کی جامعہ سرکاری ہو یا پرائیویٹ حال سب کا ایک جیسا ہے،اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پرائیویٹ جامعات میں پروفیسران اور دیگر عملہ زیادہ تر سرکاری جامعات سے جان چھڑا کر یہاں آتا ہے۔جامعہ ہمدرد کا بھی یہی حال ہے۔جامعہ ہمدرد کے 'بورڈ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ (Board of Advanced Studies & Research ,BASR) نے مجھے ایم فل سے پی ایچ ڈی میں منتقلی کی حتمی منظوری

دینا تھی، بورڈ کے بعض کرم فرما پروفیسر حضرات زبیری صاحب سے زیادہ ہی محبت کیا کرتے تھے، وہ بورڈ کی میٹنگ میں کوئی نہ کوئی نکتۂ اعتراض کھڑا کر دیا کرتے، جس کے باعث ایم فل سے پی ایچ ڈی میں منتقلی کا معاملہ التوا کا شکار ہوتا رہا، زبیری صاحب مسلسل کوشش کرتے رہے، اپنے سپروائزر کی ہدایت پر مَیں نے تھیسس بھی جمع کرا دیا،

مہربان حضرات اپنی روش پر ڈٹے رہے، اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا، بالآخر فتح حق کی ہوئی، بقول میری ایک کلاس فیلو عذرا قریشی ''محنت رنگ لاتی ہے''، سو میری محنت رنگ لائی، مہربانوں کو اللہ نے ہدایت دی، بورڈ نے ایم فل سے پی ایچ ڈی میں منتقلی کی منظوری دے دی، تھیسس کی کاپیاں انڈیا بھیجی گئیں، رپورٹس مثبت تھیں، وائیوا ہوا، اپریل ۲۰۰۹ء میں نوٹیفیکشن جاری ہوا کہ ہمیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کر دی گئی، مارچ ۲۰۰۹ء میں مَیں ریٹائر ہو گیا، اس طرح مجھے دونوں اعزاز ساتھ ساتھ حاصل ہوئے۔ تجربہ ہوا کہ انسان اگر کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لے بہ شرطِ کہ مقصد نیک ہو، اللہ پر مکمل بھروسا، صدق دل سے محنت کرے تو کامیابی قدم چوما کرتی ہے۔

لباس انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مَیں نے کالج میں ملازمت کے دوران کبھی شلوار قمیض نہیں پہنی، ہمیشہ پینٹ شرٹ، سوٹ یا سفاری سوٹ پہنا کرتا، یہ نہیں کہ شلوار قمیض میں کوئی برائی ہے بس یہ میرا مزاج

تھا، میرے گھر کا لباس کرتا شلوار ہی ہے، پینٹ شرٹ کے نیچے چپل پہنے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ کھانے میں ہر شے کھالیتا ہوں، لیکن چاول اور کالی مسور کی دال جسے کھڑی مسور کی دال بھی کہا جاتا ہے ،ہری مرچ اور پودینے کی چٹنی، اچار اور سلاد کے ساتھ پسندیدہ ڈش ہے، سبزیوں میں بینگن سخت نا پسند ہیں، پھلوں میں کینو پسندیدہ ہیں، مٹھائی میں کچھ بھی پسند نہیں، بس جو سامنے آجائے چکھ لیتا ہوں، کھانے کے دوران چپ چپ کی آواز نکالنے والوں کا گلا کاٹنے کو جی چاہتا ہے، چائے پیتا ہوا وہ شخص بھی اچھا نہیں لگتا جو سڑپ سڑپ کرکے چائے پیے، کھانا کھانے کے دوران اس بات کا خیال نہ رکھنے والے کہ ان کے منہ کے اطراف خصوصاً داڑھی یا مونچھوں پر کچھ لگ گیا ہے،ایسے لوگ سامنے والے کا کھانا بدمزہ کردیتے ہیں۔ بچپن میں ہم نے ایک اصطلاح ایجاد کی تھی وہ یہ کہ جب ہم سب مل کر کھانا کھارہے ہوتے اور کسی کے منہ پر کچھ لگ جاتا تو اس وقت کہا جاتا 'شاخ پے الو'، یہ جملہ سن کر ہر شخص اپنا اپنا منہ صاف کرنے لگ جاتا۔ جس کسی کے منہ پر کچھ لگا ہوتا وہ خود بہ خود صاف ہو جاتا، اس طرح بات بھی بن جاتی کسی کو برا بھی نہیں لگتا تھا۔ مسجد میں باجماعت نماز کے دوران بعض نمازی حضرات قیام ، رکوع و سجود میں دل ہی دل میں پڑھنے کی بجائے اتنی بلند آواز سے پڑھتے ہیں کہ ان کے دائیں اور بائیں موجود نمازی مشکل میں آجاتے ہیں، ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ صاف سمجھ میں بھی نہیں آتے صرف ان کے منہ سے ہوا کے ساتھ پھُس پھُس سنائی دیتا

ہے۔اسلام میں توپڑوسیوں کے بہت حقوق ہیں، ہمارے مولوی صاحبان کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔ ایسے نمازیوں سے صرف یہی کہا جاسکتا ہے 'شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات'۔

کسی کی دل آزاری مجھے منظور نہیں، کوشش ہوتی ہے کہ میرے عمل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔برداشت اور درگزر کا مادہ مجھ میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، میں اپنی زندگی میں اپنوں اور غیروں کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی، کڑوی کسیلی حتیٰ کہ تیر و نشتر اپنے اندر خاموشی سے محفوظ رکھتا رہا ہوں، مجھے اپنی حیثیت و مقام کا ہمیشہ احساس رہا یہی وجہ ہے کہ مَیں ساری زندگی زبان بند کیے رہا، اپنے لبوں کو سیے اور منہ کو تالا لگائے رہا، میرے صبر کو بارہا آزمایا گیا، میری خاموشی کو توڑنے کے لیے ہزار حربے استعمال کیے گئے، پر مَیں نے چپ کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، اس کا نقصان بھی ہوا لیکن فوائد زیادہ حاصل ہوئے، معدہ خراب نہیں ہوا، بد ہضمی نہیں ہوئی، جگر، گردے، پھیپڑے سب کچھ ہی

ٹھیک رہا بس ایک دل نے آخر میں آکر گڑبڑ کردی۔

قدرتی حسن اور نزاکت کا قدردان ہوں، میک اپ زدہ کو دیکھ کر دل خراب ہونے لگتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ موٹاپے سے اللہ بچائے۔ خواتین پردے میں بھلی لگتی

ہیں، سعودی عرب میں خواتین کو عبایا پہننا لازمی ہے ، وہ اس میں اچھی بھی لگتی ہیں۔
زیادہ آزادی خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سی برائیاں اسی وجہ سے
ہیں۔ شہروں میں اپنے کراچی کی کیا بات ہے، کبھی یہ روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا، اب تو
سیاست نے اس شہر کا حلیہ ہی بگاڑ کے رکھ دیا ہے، لاہور بھی کم اچھا نہیں، اب تو مجھے
سرگودھا بھی اچھا لگنے لگا ہے۔ اسلام آباد میں مصنوعیت اور دکھاوا نمایاں ہے۔ پاکستان
سے باہر سعودی عرب کی کیا بات ہے، مکہ دل کا سکون ہے تو مدینہ راحتِ جان ، جی چاہتا
ہے کہ دن مکّہ میں گزرے تو رات مدینے میں وہ بھی روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے یہ سب نصیب کی بات ہے جسے چاہا در پہ بلا لیا ، جسے چاہا اپنا بنا لیا، یہ بڑے
کرم کے ہیں فیصلے ، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

بات سعودی عرب کی چلی تو جناب مَیں ۲۹ مئی ۲۰۱۱ء کو سعودی عرب پہنچا اور پانچ ماہ
جون تا اکتوبر ۲۰۱۱ء) یہاں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، خانہ کعبہ کو پہلی بار اپنی)
آنکھوں سے دیکھا کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، کس قدر حسین
منظر تھا، کیا خوبصورتی تھی، نور ہی نور، مَیں اس کے بعد بے شمار مرتبہ خانہ کعبہ گیا، بہت
بہت دیر سامنے رہا، کئی فرض نمازیں اس طرح ادا کیں کہ میرے اور خانہ کعبہ کے بیچ
کچھ نہیں ہوتا تھا اور فاصلہ مشکل سے دو گز، یعنی اول صف میں، کعبہ شریف کو بالکل
قریب سے دیکھا،

چھوا، چمٹا، لپٹا، التجائیں کیں، حرم کی چوکھٹ کو پکڑ کر روتا رہا، گریہ وزاری کرتا رہا، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا رہا، حرم کی چوکھٹ کے بالکل نیچے کھڑے ہو کر مسلسل آنکھیں ٹھنڈی کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، حجرِ اسود کے کئی بوسے لینے کی سعادت ملی، لیکن پہلی نظر کا منظر بھلائے نہیں بھولتا، جب بھی کعبہ شریف کا خیال آتا ہے وہی پہلی نظر کا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے، رہی بات مانگنے اور دعا کی، تو اپنی اس کیفیت کو اشعار میں

مَیں نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

مانگنے تو بہت کچھ گیا تھا، پر ہوا عجب حال

تھے اشک جاری، اندر تھا ایک تلاطم برپا

سوچتا ہی رہا کروں پیش اپنی سیاہ کاریاں

نہ دل نے دیا ساتھ نہ زباں پہ ہی کچھ آ سکا

میرے محترم بزرگ دوست جمیل نقوی مرحوم کے یہ اشعار بھی میری اس کیفیت کی صحیح تر

جمانی کرتے ہیں، میں نے جمیل نقوی صاحب کا خاکہ بھی لکھا تھا جو میری کتاب 'یادوں کی مالا' میں شامل ہے ۔

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا

یوں ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوق تماشا بھول گیا
پہنچا جو حرم کی چوکھٹ تک اِک ابر کرم نے گھیر لیا
باقی نہ رہا یہ ہوش مجھے، کیا مانگ لیا کیا بھول گیا

یہ بات حقیقت ہے کہ خانہ کعبہ پر جب پہلی نظر پڑتی ہے تو انسان کے ہوش و خرد مفلوج ہوجاتے ہیں، اول تو یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ہم جیسا گناہ گار اور یہ سعادت، صرف اور صرف آنکھوں سے ندامت اور توبہ کے آنسو رواں ہوتے ہیں۔اللہ ہماری توبہ قبول کرنے والا ہے ،

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

مجھ سے گناہ گار پر یہ بارشِ کرم
منہ دیکھتا ہوں ، رحمتِ پروردگار کا

میرے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزاؔد جو الحمداللہ صاحب دیوان شاعر تھے۔آپ کو نعتیہ کلام بہ عنوان شاہ محبوب خالق: دیوان آزاد پہلی بار ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔آپ جب روضہ اقدس پر حاضر ہوئے تو اپنی
دلی کیفیت کو نظم میں بیان کیا اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

شکرِ خدا غلام ہے آقا کے سامنے

پہنچا دیا ہے پیاس نے دریا کے سامنے
کیا دیکھتی ہیں آنکھیں میں قرباں اے خدا
جانم فدا ہے کیا دلِ شیدا کے سامنے
دل سے زباں یہ کہتی ہے تو خود ہی عرض کر
میری مجال کیا ترے مولا کے سامنے

مَیں نے پہلا عمرہ اپنی شریکِ حیات شہناز، بیٹے عدیل اور نبیل، اپنی چھوٹی بہو ثمرا نبیل کے ہمرہ جمعہ ۳ جون ۲۰۱۱ء یکم رجب ۱۴۳۲ھ کو کیا، میری انجیوپلاسٹی کو ابھی ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا، مجھ میں اتنی طاقت اور حوصلہ نہیں تھا کہ طواف کے سات پھیرے اور صفا و مروا کے ساتھ چکر از خود چل کر کر سکتا۔ان دنوں حرم شریف میں رش بھی زیادہ تھا، چنانچہ وہیل چیئر لے لی گئی، خانہ کعبہ کے سات طواف عدیل نے وہیل چیئر چلائی اور صفا و مروا کے درمیان سات پھیروں میں چھوٹے بیٹے نبیل نے مجھے کھینچا، دونوں بیٹوں کو اپنے عمرہ کا ثواب تو ملا ہی، ساتھ ہی میری ویل چیئر چلانے کا ثواب بھی حاصل ہوا ہوگا۔ اس دوران مَیں دیگر دعاؤں کے ساتھ یہ بھی دعا کرتا رہا کہ پروردگار جب تو نے مجھے یہ سعادت عطا کی کہ اپنے گھر بلالیا تو مجھے یہ بھی توفیق عطا فرما کہ آئندہ میں خود چل کر یہ سعادت حاصل کر سکوں، اللہ نے میری یہ دعا قبول فرمائی اور مَیں نے بعد میں کئی عمرے اور متعدد طواف خود چل کر

کیے۔ زیادہ قیام جدہ میں بڑے بیٹے عدیل کے پاس تھا، شروع میں تو عدیل اپنے ساتھ حرم شریف لے جاتا رہا لیکن پھر ہم دونوں نے سوچا کہ ہمیں از خود ہی ہمت کرنی چاہیے اور ایسا ہی ہوا، دونوں میاں بیوی جدہ سے مکہ جانے لگے، کعبہ شریف کے خوب خوب پھیرے لیے، مقام ملتزم، مقامِ ابراہیم، میزابِ رحمت پر دعائیں کیں، حطیم میں نمازیں ادا کیں، صفا و مروہ کے چکر کیے، حجرِ اسود کے خوب خوب بوسے نصیب ہوئے، آبِ زمزم جتنا پی سکتے تھے پیا۔ کعبہ شریف کی قربت کا خوب خوب موقع ملا، حسرت پوری کی، انسان اور اللہ کا معاملہ ایسا ہے کہ دل ہی نہیں بھرتا، ہم طواف کرکے گھر پہنچتے اور آئندہ جانے کی باتیں شروع کر دیا کرتے۔

مدینے میں بھی حاضری ہوئی، مدینے کی ٹھنڈک کا کیا کہنا، سعادت اور نصیب کی بات ہے۔ اپنی اس کیفیت کو مَیں نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

کچھ ایسی تصویر بس گئی ہے دل میں کعبہ شریف کی
آنکھوں میں ہر دم رہتی ہے تصویر کعبہ شریف کی
پیاس بجھی ہے، نہ بجھے گی یہ تو ہے مجھے معلوم
پھر بھی اک چاہت سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی
ایک بار اور جاؤں، پھر جاؤں اور جا کر واپس نہ آؤں
بس یہی اک تدبیر سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی

حرم کے میدان میں باب الفتح کے سامنے، باہر کی جانب، پہاڑ کے دامن میں قائم اپنے پیارے نبی کی پیدائش گاہ (مَولِدُالنبی) صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اس گھر کی تعمیر نو کر کے یہاں اب ایک عوامی کتب خانہ (مکتبہ مکہ المکرمہ) قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ جگہ مولدِ نبی کے نام سے ہی جانی جاتی ہے، ' الکردی خاندان' کے 'ماجد کرد' سے ''مجیدیہ لائبریری'' جو ان کی ذاتی لائبریری تھی خریدی گئی، یہ لائبریری نایاب اور قیمتی کتب پر مشتمل ہے۔ کتابیں سلیقے سے دیدہ زیب الماریوں میں ترتیب وار رکھی ہیں۔ کتب خانے کے مدیر کا کمرہ (آفس) وہی جگہ ہے جہاں پر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں آمد ہوئی، یہ بات مجھے مدیر مکتبہ (لائبریرین) یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَار نے ہی بتائی، الحمد اللہ مجھے اس کمرے میں بیٹھنے اور کچھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، یَسلم صاحب سے جب مَیں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مجھے خصوصی توجہ دی، اپنے آفس میں لے گئے، قہوا پلایا، کتب خانے میں موجود قدیم اور نادر کتب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَار اہل بیت میں سے ہیں، جامع مسجد امام البخاری کے امام وخطیب بھی ہیں ۔ جدہ میں اماں حوا کے مقبرہ پر بھی حاضری کا موقع ملا، قدیم قبرستان کو مقبرہ حوا کا نام دیا گیا ہے اس میں اور بھی بے شمار قبریں ہیں، قبروں پر نمبر بھی ڈلے ہوئے ہیں لیکن اماں

حوا کی قبر کا کوئی مخصوص نشان نہیں، نہ ہی یہاں کے ملازمین کے علم میں ہے کہ اماں حوا کی قبر کون سی ہے۔ سعودی عرب میں قبروں کے نشانات کہیں بھی نہیں، جنت المعلیٰ، جنت البقیع اور دیگر قبرستانوں میں کسی بھی قبر پر کوئی نشان نہیں ملتا۔

میری بیٹی فاہینہ، عاصم مشکور، نواسی نیہا اور نواسے ارحم بھی سعودی عرب آئے انہوں نے بھی ۱۷ جون کو عمرہ کی سعادت حاصل کی، میرا پوتا صائم اور بڑے بہو مہوش عدیل ایک ماہ قبل ہی سعودی عرب سے واپس کراچی آ گئے تھے، انہوں نے بھی عمرہ کی سعادت حاصل کر لی تھی۔ الحمد اللہ مَیں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ میری شریک حیات، بیٹے، بہوئیں، پوتا صائم، نواسی نیہا اور نواسہ ارحم عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، یہ میری خواہش بھی تھی جو الحمد اللہ پوری ہوئی، اپنے پرودگار کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران مجھے شہر اور دیہات دونوں طرح کے ماحول کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مکّے و مدینے کے علاوہ میرا قیام مستقل طور پر جدہ میں رہا، یہاں جدید شہری سہولتیں میسر ہیں۔ ترقی کا سفر جاری و ساری نظر آتا ہے، کشادہ صاف ستھری شاہراہیں، میلوں لمبے پل، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، بڑے بڑے مال شاپنگ سینٹر)، جدیدیت کا منہ بولتا ثبوت۔ لوگوں میں)

فوبیہ بھی (Crease) شہنشاہوں اور نوابوں والی صفات نمایاں ، سعودیوں کو کریز ہے، صاف ستھرا ثُوب (جُبہ) ، عام طور پر سفید وہ بھی بہترین کپڑے کا استری شدہ جس پر کریز نمایاں ، مجال ہے کہ کسی جگہ کوئی نشان نظر آ جائے یا اس میں سلوٹیں پڑی ہوئی ہوں، سر پر بڑا مخصوص صاف ستھرا کریز شدہ رومال (غنترہ شماغ) رومال کے درمیان والی کریز ان کے سر سے ناک کی جانب کھڑی ہوئی ہوتی ہے اور وہ بار بار اس کریز کو اپنی ناک کی سیدھ میں کرتے رہتے ہیں سر پر کالا گول رِنگ' (خاطم)، خوشبو میں بسے ہوئے ، ہاتھ میں تسبیح، منہ میں مسواک، ٹیکسی چلانے والے سے لے کر بادشاہ وقت تک اسی وضع قطع میں رہتے ہیں، خواتین عبایا پہنے نظر آتی ہیں ، منہ بھی ڈھکا ہوا، شادیوں کے شوقین ہیں، نماز کے پابند، ہر گلی محلے میں اذان کے فوری بعد بڑی تعداد میں سعودی مسجد کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ نماز کے اوقات میں کاروبار زندگی خواہ وہ کچھ بھی ہو بند ہو جاتا ہے۔ ان کی مسجدیں صرف اور صرف عبادت گاہیں ہیں، جمعہ کے خطبہ میں سیاست پر کوئی بات نہیں ہوتی، مسجدوں میں قرآن کریم کپڑے کے جزدانوں میں لپٹے ہوئے نہیں ہوتے، بلکہ عام کتابوں کی طرح اوپر اور نیچے شیلفوں میں سلیقے سے رکھے ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے مکے میں حرم شریف اور مدینے میں مسجد نبوی میں رکھے ہوئے ہیں۔ اکثر سعودیوں کو نماز سے پہلے یا بعد میں قرآن کریم پڑھنے کی عادت ہے، چاہے ایک صفحہ ہی کیوں نہ پڑھیں ۔ خلوص سے ملتے ہیں، باہم مصافحہ کرتے ہیں، ارضِ مقدس میں معانقہ اور تقبیل کی

روایت پائی جاتی ہے، اَلسلامُ علیکم کے بعد مصافحہ کرتے ہیں ، بغل گیر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی پیشانی یا سر پر تین بوسے لیتے ہیں۔ اللہ کی خصوصی نظر کرم اس سرزمین پر، یہاں کے مکینوں پر ۔ کبھی یہاں سواری کے لیے اونٹ اور دیگر جانور ہوا کرتے تھے آج دنیا کی قیمتی ترین گاڑیاں سڑکوں پر دندناتی، لشکارے مارتی نظر آتی ہے۔ ہر گھر مکمل ائر کنڈیشن، لوڈ شیڈنگ کیا ہوتی ہے یہاں کے لوگ اس سے لاعلم ہیں، پٹرول سستا البتہ پانی مہنگا ہے۔ملاوٹ، دھوکہ دہی ،چور بازاری،مال کا دو نمبر ہونا ان سب باتوں کا یہاں تصور ہی نہیں، صفائی نصف ایمان ہے اس کا اندازہ یہاں آکر ، ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رشوت نہیں لی جاتی، جدہ شہر میں غیر سعودی ٹیکسی ڈرائیور نظر آتے ہیں، جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ صرف سعودی ٹیکسی ڈرائیور ہی جا سکتا ہے، عام طور پر جمعرات ، جمعہ، رمضان اور حج کے ایام میں یہ سعودی ٹیکسی ڈرائیور مکہ اور مدینہ جانے والے زائیرین سے خوب خوب رقم وصول کرتے ہیں، یہی صورت حال ایئر پورٹ سے شہر میں جانے کی بھی ہے۔ یہاں بھی غیر سعودی ٹیکسی ڈرائیور سواری ایئر پورٹ لے جا سکتا ہے لیکن ایئر پورٹ سے اندرون شہر مسافروں کو صرف سعودی ٹیکسی ڈرائیور ہی لے جا سکتے ہیں اور وہ مسافروں کی خوب کھال اتارتے ہیں۔جدہ میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور خاصی تعداد میں نظر آئے، بقالوں (جنرل اسٹور) ، اسپتالوں میں پیرامیڈیکل اسٹاف بنگلہ دیشی اور ہندوستان کے شہر کیرالا کے لوگ (ملباری) زیادہ تعداد میں دکھائی دیتے ہیں۔پاکستانی

ڈاکٹروں کی بڑی تعداد سعودی اسپتالوں میں کام کررہی ہے۔

پہاڑی آبادی کی صورت حال قدرِ مختلف ہے، مجھے سعودی عرب کے صوبے جذان جسے وادی جذان بھی کہا جاتا ہے کے ایک پہاڑی علاقہ فیفاء میں رہنے کا موقع ملا، اسے جبال فیفاء) پہاڑ) (Jibal Fayfa) بھی کہا جاتا ہے، یمن کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہاں یمنی رسم و رواج کا غلبہ نظر آتا ہے۔ جذان سے صبیاء، العیدابی، عیان، الدائر پھر پہاڑوں کے درمیان اوپر کی جانب سفر کرتے ہوئے فیفاء پہنچتے ہیں۔ راستے سنسان،، دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد، میدان، پہاڑ ہی پہاڑ، لیکن مجال ہے کہ کسی بھی قسم کا بھی ڈر یا خوف محسوس ہوتا ہو۔ جذان میں جزیرہ فراسان (Farasan Island) میں ہے۔ جذان یونیورسٹی حال ہی میں قائم ہوئی ہے (Red Sea) ہے، یہ بحر الاحمر جو ہر اعتبار سے مثالی ہے۔ جذان میڈیکل کالج، جذان میوزیم اور مکتبہ جذان العامہ (Jazan General Library) بھی قائم ہے۔ جذان ائیرپورٹ پر جذان کی ثقافت کی خوبصورتی سے تشہیر کی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر پنجاب کی ثقافت نظروں میں آجاتی ہے۔ فیفاء میں میرا چھوٹا بیٹا نبیل فیفاء جنرل اسپتال میں ڈاکٹر ہے، محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان کے علاقے مری، ایوبیہ، نتھیا گلی، بارہ گلی میں آگئے ہیں، اسپتال بھی پہاڑ کی چوٹی پر، اس کا گھر بھی پہاڑ کی چوٹی پر، ہم گھر

کے (ARY) سے باہر نکلتے یا ٹیکسی سے اتر کر گھر میں جاتے تو ہماری چال اے آر وائی ڈرامے ''بلبلے'' والی 'مومو' کی طرح ہوا کرتی تھی۔ پہاڑی علاقوں کا موسم عام طور پر سرد ہی ہوا کرتا ہے۔ فیفاء کا موسم بھی سرد، خوش گوار اور صحت افزا تھا۔ بارش کا ہونا معمول تھا۔ اکثر بارش کے ساتھ اُولے بھی گرا کرتے۔ یہاں ایئر کنڈیشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے مَیں نے دیہات لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہاں کے مکینوں کی

اکثریت وہ لوگ ہیں جن کا لباس سعودیوں سے مختلف ہے۔ ہمارے دیہاتیوں کی طرح یہ دھوتی (فوطہ) پہنتے ہیں۔ وہ بھی رنگ برنگی۔ آدھی پنڈلیاں کھلی ہوئی۔ اوپر قمیض اس پر کوٹ۔ دونوں بے رنگے اور بے ڈھنگے۔ دھوتی کو کمر پر خوب اڑسا ہوا کہ یہاں موٹی تہہ بن جاتی ہے۔ کمر پر ایک چوڑی بیلٹ بندھی ہوتی ہے۔ عام طور پر عمرہ یا حج کے

دوران جو بیلٹ استعمال ہوتی ہے یہ اُسی طرح کی بیلٹ (عصال) ہوتی ہے۔ اس بیلٹ کے بالکل سامنے ناف پر ایک خنجر یا چاقو (سکین) جس کا دستہ اوپر کی جانب واضح نظر آ رہا ہوتا ہے لگائے رکھتے ہیں۔ سر پر ٹوپی کے بجائے رسی لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں درخت کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں جس میں پتے اور پھول لگے ہوتے ہیں لگائے رکھتے ہیں۔ یہ لباس بوڑھے اور جوان دونوں کا ہوتا ہے۔ 'گات' کھانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ سارے ہی سعودی بڑے شوق اور اہتمام سے کھاتے ہیں۔ گات پودینا یا ہرا دھنیے یا پودینے کی طرح ٹہنی میں لگے پتے ہوتے ہیں۔ گات، کھجور اور گھوہ (ایک طرح کا قہوا) چھوٹی چھوٹی

پیالیوں میں

پینا تمام سعودیوں کی روایت ہے۔ گھروں، دفتروں، دکانوں میں لوبان کی طرح کسی چیز کی دھونی دینا بھی سعودی تہذیب کا حصہ ہے، اس مقصد کے لیے لوبان دان یا بجلی کے لیمپ نما لوبان دان استعمال کیے جاتے ہیں۔ خوشبو کے لیے لوبان کی جگہ کوئی خاص لکڑی یا اس کا برادہ استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس کی خوشبو لوبان کی طرح کی نہیں ہوتی ۔ دیہات کی خواتین زیادہ پردے میں رہتی ہیں۔ سعودی اپنی زبان تک محدود ہیں، انگریزی کے بغیر ان کی تمام ضروریات احسن طریقے سے پوری ہو رہی ہیں۔

دوست بنانے کا قائل ہوں، دوستی بگاڑنے کا قائل نہیں ، مَیں نے زندگی میں اپنے دوستوں کو ممکن حد تک کانچ کے گلاسوں کی طرح سنبھال کر رکھا ہے ، جس کسی سے تعلقِ دوستی قائم ہوگیا اس سے ناتا جوڑے رکھا، بے شمار دوستوں کی ناپسند باتوں اور عادتوں کو محض اس وجہ سے درگزر کیا کہ تعلق دوستی جڑا رہے۔ دوستی کے بارے میں میرا فلسفہ یہ ہے کہ ”دوستی قربانی چاہتی ہے“۔ دوستوں کی کڑوی کسیلی باتیں ، کسی حد تک ناپسندیدہ باتوں کو اس وجہ سے درگزر کیا جائے کہ دوستی کا بندھن قائم رہے۔ کچھ دوست اپنے مزاج میں انتہائی کڑوے، کسیلے، بدمزاج بھی ہیں ان کی بدمزاجی اور تیزابیت کو برداشت کیے رہا، ان سے دوستی قائم ہے۔

بعض دوستوں سے دوستی کی نصف سنچری ہو چکی ہے، خیال ہے دوستی کی گولڈن جوبلی تقریب کا اہتمام کروں، یہ وہ دوست ہیں جن سے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں تعلق دوستی قائم ہوا اور آج تک مراسم دوستانہ ہیں، گویا ان کے ساتھ بچپن گزرا، جوانی ایک ساتھ بسر ہوئی اور اب بڑھاپے کے شب و روز میں بھی ساتھ ہیں۔ چند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں ان میں ظفر احمد صدیقی، احمد حسین، سید اختر حسین شاہ، شکیل احمد صدیقی عرف، پیارے، سید محمد سبطین رضوی، قاضی محمد ارشاد، ابرار حسین، یونس، سعید جعفری شامل ہیں، بعض سینئر دوست بھی تھے جو عمر میں تو ہم سے بڑے تھے لیکن ہم سب دوستی کے بندھن میں ایک ہی تھے۔ سینئر دوستوں میں سید جمال احمد، سید ممتاز علی زیدی، سید حیدر رضا، شیث صمدانی، انیس فاروقی صاحب، مظہر الحق صاحب، چودھری محمد اشرف منظور احمد بٹ، زماں صاحب، مغیث صمدانی، ظفر احمد صدیقی شامل ہیں، بعض ساتھی، اب اس دنیا میں نہیں رہے انھیں یاد کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ان میں محمد وسیم نظامی، جوانی میں موٹر سائیکل کے حادثے میں اللہ کو پیارا ہو گیا، منظور احمد بٹ، فیاض صاحب، اطہر مرزا، محمود احمد صدیقی، عارف احمد صدیقی، جلیس احمد صمدانی، سراج الحق اور محمد ربانی خان، شامل ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ ان میں سے اپنے دوست منظور احمد بٹ کا خاکہ لکھا تھا جو میری کتاب ''یادوں کی مالا'' میں شامل ہے۔ ان سب دوستوں میں شکیل جسے اس کے گھر والے اور ہم بھی 'پیارے' کہتے تھے حا ل آں کہ وہ پیارا تھا نہیں، انتہائی شریر، چلبلا، راہ چلتے

ہوؤں کو بِتکا دینے والوں میں سے تھا، اس نے اپنی شرارتوں سے معمولی جھگڑے ہی نہیں بلکہ تصادم کرائے کہ نوبت تھانے اور کچہری تک پہنچ گئی، یہ بات جب کی ہے جب آتش جوان تھا، اب واقعی یہ پیارا ہوچکا ہے۔ احمد حسین خاموش اور سنجیدہ رہتے ہوئے بات میں مزاح پیدا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب وہ بھی سنجیدہ ہوگیا ہے، کالے رنگ پر سفید داڑھی بھلی لگتی ہے، ظفر سدا بہار ہے، نانا دادا بن گیا پر دیکھنے میں وہی نوجوان چھوٹا سا۔ سید جمال احمد فٹبال کے بہترین کھلاڑی تھے، انھوں نے جوان رہنے کا،
راز کسی کو نہیں بتایا، ممتاز زیدی صاحب پیشے کے اعتبار سے استاد تھے، اب کسی رسالے سے منسلک ہیں، قلم کار، قناعت پسند، سرد بار، سنجیدہ اور متین، زندگی لوگوں کی خدمت کرتے گزار دی، شادی نہیں کی، لوگوں کی خدمت میں ہی مگن رہے جب ٹھان لی کہ شادی کرنا ہے تو ایک نہیں لگاتار دو چھکے لگادیے، سنجیدہ مزاق اچھا کرتے ہیں۔ ان کی باغ و بہار شخصیت بے شمار خوبیوں سے مزین ہے۔ ان کی زندگی لگے بندھے انداز سے نہیں گزری، نہ ہی یہ اکہرے اور سپاٹ لوگوں میں سے ہیں، ان کی زندگی کے بے شمار پہلو ہیں اور خاکہ نگار کا موضوع بن سکتی ہے، زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ زیدی صاحب کا خاکہ قلم بند کرونگا۔ سید اختر حسین شاہ کا تعلق بنیادی طور پر کہروڑپکہ سے تھا، یہ روزگار کی تلاش میں کراچی آنکلے، اس کے دو بھائی بھی اس کے ہمراہ تھے، بے بہا خوبیوں کے مالک، پرائمری اسکول میں ٹیچر رہے، پھر فزیکل ایجوکیشن میں ڈپلومہ کرلیا، اسٹیل مل کے اسکول میں

اسپورٹس ٹیچر ہوگے، انتہائی ہنس مکھ، ہر زبان پر عبور، ہم انھیں شاہ جی کہا کرتے تھے، ان کے والد پیری مریدی سے تعلق رکھتے تھے، ایک بار میں میلسی گیا تو واپسی پر کہروڑ پکہ بھی چلا گیا، اس قدر میٹھی زبان اور پیار کرنے والے لوگ، کچھ عرصہ ہوا انھوں نے کراچی کو خیر باد کہا، اور وہاڑی میں سکونت اختیار کی، ایک ہی بیٹا تھا وہ کسی بنک میں ملازم ہے، شاہ صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے اور کسی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں۔اُن کی اس خصوصیت کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔اسرار لندن میں اور سعید امریکہ میں ہیں۔اسرار سے فیس بک پر رابطہ رہتا ہے، سعید نے اپنی دنیا الگ بسا لی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے گھر کے سامنے 'والی بال' کا میدان تھا، شام کے اوقات میں والی بال کھیلا کرتے تھے، میں دیگر کے مقابلے میں چھوٹا تھا، چنانچہ کسی ایک جانب نیٹ پر کھڑا کر دیا جاتا، تمام دوستوں میں ربانی خان سب سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھے، قد کاٹھ میں بھی ماشاء اللہ لمبے چوڑے تھے، وہ میرے سامنے والی ٹیم میں تھے اور سینٹر میں تھے، ایک بال پر انہوں نے پوری شدت کے ساتھ شارٹ لگائی گیند اوپر جانے کے بجائے نیٹ کے نیچے سے ہوتی ہوئی میرے سینے پر لگی، اس شارٹ میں اس قدر شدت تھی کہ میرا سانس بند ہوگیا، منہ کھلا ہوا تھا، گرنے ہی والا تھا کہ لوگوں نے فوری زمین پر لٹا دیا، ان میں کوئی عقلمند بھی تھا اس نے میرے دونوں پیر سائیکل کے پیڈل کی

طرح چلانا شروع کیے، کسی نے میرے منہ میں اپنا منہ ڈال کر سانس اندر داخل کیا، تب کہیں جاکر میرا سانس شروع ہوا۔ اسی طرح ہاکی کھیلتے ہوئے قاضی ارشاد کی ہاکی میرے منہ پر لگی جس سے ہونٹ پھٹ گیا۔ ٹانکے لگنے کی نوبت آ گئی۔ تمام کھیلوں میں کرکٹ سب سے زیادہ کھیلی، ٹیم کی کپتانی بھی کی۔ ٹیبل ٹینس، بیڈ منٹن، گُلی ڈنڈا، کنچے، چُھپن چھپائی، پٹھو گرم، چَررا، کیرم، لیڈو الغرض کوئی کھیل ایسا نہیں جو نہ کھیلا ہو۔ اسی لیے تو مِیں نے اپنے آپ کو کھلنڈرا کہا۔ تاش کھیلنے کا شوق نہیں تھا پر کھیل لیا کرتے تھے۔
تاج ویلفیئر سینٹر جس کا مَیں نے اوپر ذکر کیا میں بلیک کوئن کا ٹورنامنٹ منعقد ہوا، ہمارے بعض سینئر دوست خصوصاً محمود صاحب، حیدر بھائی، اطہر مرزا، عثمان صاحب، فیاض صاحب، اقبال بھائی، جلیس چچا تاش کھیلنے کے ماہر اور دیوانے تھے، بلیک کوئین کی جو ٹیم بنی اس میں میرے ساتھی ظفر صدیقی تھے، میچ ہوتے رہے، ہم
یکے بعد دیگرے میچ جیت کر فائنل میں پہنچ گئے اور فائنل بھی جیت گئے۔
سینما میں فلم دیکھنے کا شوق کبھی نہیں رہا، شادی کے بعد بیگم کے ساتھ صرف ایک بار سینما میں فلم دیکھنے گیا، کلاسیکل میوزک پسند ہے، غزلیں سننا اچھا لگتا ہے، مہدی حسن، گلشن آرا سید، منی بیگم، تصور خانم، اقبال بانو کی گائی ہوئی غزلیں روح کو تسکین پہچاتی ہیں۔ تاش تو کھیل لیا کرتا ہوں لیکن

برج، پچیسی، شطرنج کھیلنا ہی نہیں آتی اور نہ ہی کبھی کھیلی۔ جب سے ہوش سنبھالا ایک بار رمضان کے روزے نہیں رکھے، وہ بھی اس وجہ سے کہ یکم رمضان کو عین تراویح پڑھتے کے دوران گردے کا درد شروع ہوا جو اس قدر شدید تھا کہ مجھے تراویح میں نیت توڑنا پڑی، بہ مشکل گھر اور پھر اسپتال پہنچایا گیا، جمعہ کی نماز نہیں چھوڑتا، نمازیں پڑھیں لیکن پنج گانہ نمازی نہیں رہا، اب کوشش ہوتی ہے کہ پابندی ہوجائے۔ گھر کے کاموں میں بیوی کی مدد کرکے خوشی محسوس کرتا ہوں، جھاڑو دینا اچھا نہیں لگتا۔ برتن دھولیتا ہوں، صفائی بھی کرلیتا ہوں، اپنی کتابوں کی صفائی ستھرائی از خود کرتا ہوں۔ جب بیٹی گھر پر تھی تو وہ کام کرنے نہیں دیا کرتی تھی اب بہوئیں موجود ہوں تو کام کرنا ممکن نہیں، جب دونوں گھر پر نہ ہوں تو بیوی کا ہاتھ بٹا دیا کرتا ہوں۔ بیوی پر رُعب نہیں جماتا، کوشش کرتا ہوں آواز دھیمی رہے اور بات بنی رہے۔ آہستہ چلتا ہوں، قدم چھوٹے اُٹھاتا ہوں اکثر بیوی کے ساتھ چلتے ہوئے بیوی کو ٹوکنا پڑتا ہے کہ وہ بھی آہستہ چلے۔ ہنستا ہوں، قہقہا نہیں لگاتا، ہنستے ہوئے آواز بلند نہیں ہوتی، وقت کی پابندی کی کوشش کرتا ہوں، کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرسکوں تو کئی دن پریشان رہتا ہوں۔ محبت کس نے نہیں کی، مَیں نے بھی کی، بہت ہی حسین چیز سے جس کا نام ہے لکھنا اور پڑھنا، محبت ہے کتابوں سے، لکھاریوں سے اور کتابوں سے محبت
کرنے والوں سے۔

قلم کار یا لکھاری بھی اداکار ہوتا ہے۔ ہمارے صدرِ مملکت قبلہ آصف علی زرداری صاحب نے سیاسی اداکار کی اصطلاح ایجاد کی۔ لیکن انھوں نے کبھی وضاحت نہیں کی کہ سیاسی اداکاران کی نظر میں دراصل ہیں کون، سیاست داں، ٹیلی وژن کے اینکر پرسن گفتگو کا سیاسی دنگل سجانے والے یا سیاسی موضوعات پر کالم لکھنے والے صحافی، عام طور پر، ٹی وی کے اینکر اور صحافی اپنے آپ کو سیاسی اداکار ہی سمجھنے لگے ہیں۔ قلمی اداکاروں میں شوکت صدیقی، اشفاق احمد، شاعروں میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، فرازؔ، پروین شاکر، سنجیدہ لکھاریوں میں ممتاز مفتی، خاکہ نگاروں میں حالیؔ، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر سلیم اختر، مبین مرزا، انور سدید، پروفیسر صابر لودھی، مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، ڈاکٹر یونس بٹ کالم نگاروں میں زاہدہ حنا، عطاء الحق قاسمی، الطاف حسن قریشی، سیاست دانوں میں، قائد اعظم محمد علی جناح، ذوالفقار علی بھٹو، سائنسدانوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، اداکاروں میں شمیم آرا، دلیپ کمار، گلوکاروں میں مہدی حسن، نور جہاں، گلشن آرا سید، ایسے اداکار ہیں جنھیں پڑھ کر، دیکھ کر یا سن کر طبیعت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں میں عبدالستار ایدھی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر عبدالمعید، ڈاکٹر

طاہر تونسوی، سے متاثر ہوں۔

مَیں پیدائشی لکھاری نہیں، مجھے لکھنے کی جانب راغب کرنے میں میرے استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب کا پورا پورا ہاتھ ہے، اگر وہ مجھے اس جانب مائل نہ کرتے ۔مجھے لکھنے اور چھپنے کا چسکا نہ ڈالتے تو شاید مَیں اس جانب نہ آتا، انھوں نے میرے گرد ایسا گھیرا تنگ کیا کہ مَیں اس بھنور میں پھنستا ہی چلا گیا، حتیٰ کہ اسی کا ہی ہو کر رہ گیا، رہی سہی کسر میرے دوستوں نے پوری کر دی۔ لکھنا اور چھپنا بھی ایک طرح کا نشہ ہوتا ہے، جس طرح سگریٹ، پان، شراب نوشی، افیون، بھنگ، ہیروئن اور گھات کے عادی اپنی جان لاکھ چھڑائیں ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اس سے آزاد ہونا اسی طرح لکھنا اور پھر چھپنا بھی ایسا ہی نشہ ہے جس کو لگ جاتا ہے اس سے آزاد نہیں ہو پاتا۔

مَیں بعض لکھاریوں کی طرح ہر چیز ایک ہی نشست میں لکھنے کا عادی نہیں بلکہ لکھنے کے معاملے میں قدرِے مختلف واقع ہوا ہوں، ایک وقت میں کئی کئی مضامین بشمول کتاب کا لکھنا جاری رکھتا ہوں، جب لکھنے کے لیے قلم کاغذ استعمال ہوتا تھا،اس وقت کئی کئی فا ئلیں کھلی ہوا کرتی تھیں، جب سے کمپیوٹر سیکھ لیا اور انگریزی اور اردو لکھنا شروع کر د ی، تو قلم ہاتھ سے جاتا رہا، اب ایک فولڈر میں کئی کئی موضوعات کی فائلیں بنی ہوتی ہیں۔ گویا اب کمپیوٹر ہی

قلم ہے اور کمپیوٹر ہی کاغذ، کسی بھی ایک موضوع پر مَیں زیادہ دیر تک نہیں لکھ سکتا، طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ بعض لکھاری ایک مضمون شروع کرتے ہیں اور اسے ختم کرکے ہی دم لیتے ہیں، اپنا اپنا طریقہ واردات ہے۔لکھنا کب شروع کیا یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، جامعہ کراچی میں ایم اے (۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء) کرنے کے دوران باقاعدہ لکھنے کی جانب رغبت ہوئی، ۱۹۷۵ء میں میری پہلی کتاب جو ایک کتابیات تھی شائع ہوئی، یہ میرا ایم اے کا مقالہ تھا، ۱۹۷۷ء میں کتب خانوں کی تاریخ پر دوسری کتاب ''کتب خانے تاریخ کی روشنی میں'' شائع ہوئی، پہلا مضمون اسلامی کتب خانوں کے بارے میں تھا جو کراچی کے ایک ماہ نامہ ''ترجمان'' میں جنوری ۱۹۷۸میں شائع ہوا۔ سوانحی مضامین لکھنے کی ابتدا بھی ۱۹۷۸ سے ہوئی، پہلا سوانحی مضمون خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تھا جو ماہ نامہ 'ترجمان' کی اگست ۱۹۷۸ کی اشاعت میں شامل ہوا۔ سوانحی مضامین سے مَیں خاکوں اور رپوتاژ کی جانب آیا۔ پہلی رپوتاژ اپنی بیٹی 'سحر' کے انتقال پر ۱۹۸۰ء میں لکھی جو 'ادب و کتب خانہ' میں شائع ہوئی، یہ میری کتاب 'یادوں کی مالا' میں بھی شامل ہے۔اِسی سال اپنے جد امجد شیخ محمد ابراہیم آزادؔ پر میرا مضمون قصور سے شائع ہونے والے رسالے 'انوارالصوفیہ' میں شائع ہوا،۱۹۷۸ء ہی میں لائبریری سائنس کے موضوع پر پہلا مضمون 'پاکستان لائبریری بلیٹن' میں شائع ہوا، اسی سال مَیں اس رسالے کا ایڈیٹر مقرر ہوا، اس رسالہ سے وابستگی کو آج ۳۳ سال ہوگئے ہیں، میرے سب

سے زیادہ مضامین اسی رسالے میں شائع ہوئے۔ بس اس طرح لکھنے اور چھپنے کی یہ گاڑی چلنا شروع ہوئی جو گزشتہ ۳۵ برس سے رواں دواں ہے۔ میری کتابوں کی تعداد ہو چکی ہے جب کہ ۲۵۰ کے قریب مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے ۳۲ اپنے ایک کالم ''پچاس سالہ قلمی سفر'' میں لکھا تھا کہ ''ایک لکھنے والے کی اصلی عمر وہی ہوتی ہے جو اس کی لکھنے پڑھنے میں گزرتی ہے''۔ میری اولین کاوش ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی تھی، اس طرح میرا قلمی سفر ۳۴ سالوں پر محیط ہے، اب آپ کو میری عمر کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ نکما آدمی قلم کار کیسے بن گیا؟ کسی نے سچ کہا ہے کہ نکما آدمی ہی قلم کار بنتا ہے۔ اچھا، تو ہمارے ملک میں استاد کون بنتا ہے؟ کبھی کسی کے والدین نے یہ خواہش کی کہ ان کا بیٹا یا بیٹی بڑے ہو کر استاد بنے، ہرگز نہیں، ڈاکٹر اور انجینئر سے نیچے کوئی آتا ہی نہیں۔ حال آں کہ معلم کا کام، مرتبہ اور شان ہم سب اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمارا استاد تو حادثاتی استاد ہوتا ہے، اسی طرح قلم کار بھی حادثاتی ہوتے ہیں، مَیں بھی حادثاتی قلم کار ہوں، حادثہ یہ ہوا کہ قلم کاروں کے بیچ پھنس گیا، مجھے لکھنے والوں کی صحبت و دوستی میسر آ گئی اور مَیں نے بھی اس دوستی سے فائدہ اٹھا یا، لکھاریوں کی صف میں اپنے آپ کو بالکل پیچھے کھڑا پاتا ہوں۔ نکما

ہونے کی وجہ سے مَیں نے ڈاکٹر یا انجینئر بننے کا خواب دیکھا ہی نہیں، والدین نے یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا، مَیں نے یہ معاملہ اپنے اللہ پر چھوڑ دیا، بس اللہ نے جو بنانا تھا بنا دیا، اب صبر شکر کرتا ہوں، کہ اس نے لکھنے پڑھنے کی توفیق عطا کی، ایک عدد سلیقہ مند استاد بیوی، بیٹے، بیٹی، گھر گھرستی، سب کچھ عطا کیا میرے مولا کا شکر ہے۔لکھنے کے ساتھ ساتھ بولنا بھی آگیا، مجمعے میں بولنا، تقریر کرنا، اس کے پیچھے بھی میرے دوستوں کا ہاتھ ہے۔ مَیں کراچی کی ایک غریب آبادی لیاری میں آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتا تھا، وہاں کے نوجوانوں نے جو عمر میں مجھ سے بڑے ہی تھے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سماجی ادارہ ''تاج ویلفیئر سینٹر'' قائم کیا تھا، یہ بات ہے ۱۹۶۰ء کی، جہاں اہل محلہ چھوٹے بڑے کھیل کود کے علاوہ فلاحی کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ بہت ہی اچھا ماحول تھا، بڑے اپنے چھوٹوں کا حد درجہ خیال کیا کرتے، چھوٹے اپنے بڑوں کے احترام کے ساتھ ان کے شریک رہا کرتے، گویا چھوٹوں کے لیے یہ ایک تربیت گاہ تھی۔تاج ویلفئر سینٹر ایک ایسا فلاحی ادارہ تھا جس نے اپنے اراکین میں خدمت خلق کا مثالی جذبہ پیدا کر دیا تھا، مختلف سیاسی نظریات کے حامل، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف قومیتوں سے تعلق اور مختلف مذہبی عقائد رکھنے کے باوجود اس ادارے سے منسلک لوگ اپنے آپ کو ایک ہی خاندان کا فرد تصور کیا کرتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ، درد خوشی یا غمی میں عزیز رشتہ داروں سے بڑھ کر شریک رہا کرتے۔خلوص، محبت،

ہمدردی، باہمی شفقت، اخوت، بھائی چارے کے اس ماحول کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ شاید ہم میں سے کسی کو بھی وہ ماحول زندگی میں دوبارہ نہیں مل سکا۔ در حقیقت میں نے اس ماحول سے بہت کچھ سیکھا، محفل میں گفتگو کرنا، مجمعے کے سامنے اسٹیج پر تقریر کرنے کا حوصلہ مجھ میں اسی دور میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن اور جوانی اسی جگہ گزری، میں نے اسی علاقے کے اسکولوں پہلے قومی انجمن پرائمری اسکول بعدہ غازی محمد بن قاسم ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ایس ایم کالج اور عبد اللہ ہارون کالج سے انٹر اور بی اے کیا، اس ماحول سے میں تہذیبی اور تمدنی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف ہوا، یہی وجہ ہے کہ لڑکپن کے یہ تہذیبی نقوش میرے ذہن و دل پر آج بھی مرُتسم ہیں۔

جمعہ ۷ دسمبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے، میری چھوٹی خالہ ذکیہ خاتون کے ہاں شام پانچ بجے کراچی سے سیکڑوں میل دور اندرون سندھ ’ٹھارو شاہ‘ میں پہلی لڑکی کی ولادت ہوئی، نام ’شہناز‘ رکھا گیا، میرے والد صاحب نے پانچ بج کر پانچ منٹ پر ریڈیو پر اعلان کردیا، اس وقت ٹی وی تو تھا نہیں وگرنہ جیو پر اعلان ہوتا کہ ’یہ لڑکی میری ہوئی‘، اس وقت میری عمر پونے تین سال تھی، مَیں حیرت و یاس کی مورت بنا اپنے ابا کی بات کو غور سے سن رہا تھا، میری قسمت کا فیصلہ بغیر مال دیکھے کس بے باکی اور دھڑلے سے کر رہے تھے، کہتے ہیں کبھی زبان سے نکلی کوئی خواہش اللہ تعالیٰ سن لیتا ہے، شاید یہ بھی قبولیت کی گھڑی

تھی،اللہ نے میرے ابا کی یہ خواہش سن لی،فرشتوں نے پکے رجسٹر میں ہمارے نام لکھ کر مہر ثبت کر دی ، مَیں نے بھی بڑے ہو کر اپنے والدین کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کیا اس دوران نظریں اِدھر اُدھر بہکی بھی خاص طور پر جامعہ کراچی کی چکا چوند روشنی نے متاثر بھی کیا لیکن اللہ نے ثابت قدم رکھا،۲۸ سال بعد ۱۹۷۵ء میں مَیں اور شہناز شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ چوتھی دھائی آدھی گزر چکی ہے بندھن قائم ہے، کب تک قائم رہتا ہے ، یہ خدا کو معلوم، مختلف جہات سے مکمل شریک سفر ہیں ،مزاج شناس، ہم نوا اور ہم قدم بھی، ہم مکہ، مدینہ، جدہ، فیفا (جیذان) کے پھیرے ساتھ ساتھ کر چکے ہیں۔اللہ نے دو بیٹوں

عدیل اور نبیل ، ایک بیٹی فاہینہ سے نوازا، پوتا صائم عدیل، نواسہ ارحم اور نواسی نیہا میری کل کائینات ہے۔

بچپن ہی سے مَیں پان اور سگریٹ سے دور رہا، حال آں کہ میری امی اور ابا خوب خوب پان کھایا کرتے تھے،بلکہ پان میں تمباکو بھی نوش کیا کرتے تھے، گھر میں باقاعدہ پان دان تھا، پان کی ڈبیا اور بٹوے کا بول بالا تھا۔ مَیں پان، چھالیہ، تمباکو، کتھا اور چونا خرید کر لایا کرتا تھا لیکن خود اس لَت سے دور ہی رہا، سگریٹ البتہ کبھی دوستوں کے ساتھ وہ بھی پکنک پر ، یا پھر کسی کانفرنس کے موقع پر ہوٹل میں قیام کے دوران کش لگا لیا کرتا

ہوں۔زندگی میں کبھی بقول سعادت حسن منٹو 'کڑوا شربت' (شراب) نہیں پیا، پینا تو دور کی بات چھوا تک نہیں۔ایک مرتبہ ایک دوست عباس کو اپنے دوسرے دوست شاہ جی کے گھر پیتا دیکھ کر طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔کتابوں سے محبت اور انھیں سلیقہ سے رکھنے کی عادت شروع ہی سے ہے، ذاتی لائبریری دو ہزار کتب پر مشتمل ہو گی، یہ کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں، ان میں لائبریری سائنس، اسلام کے علاوہ سوانح حیات، خاکے اور خود نوشت کا بڑا ذخیرہ ہے، خاکوں کی کتاب جب اور جہاں سے ملے خرید لیتا ہوں، جون ۲۰۱۱ء میں مَیں سعودی عرب آیا تو میرے سامان میں کتابوں کا ایک علیحدہ سے کارٹن تھا، اس میں خاکوں کے مجموعے زیادہ تھے، مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ مَیں نے لیپ ٹاپ کے خالی کارٹن میں کتابیں رکھ لی، اس کارٹن کے اوپر لیپ ٹاپ کی رنگین تصویر بنی ہوئی تھی، مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تصویر اس کارٹن کے گم ہو جانے کا سبب بن جائیگی، دیگر سامان کے ساتھ یہ کارٹن بھی لگیج میں جمع کرا دیا گیا، جب ہم جدہ ائر پورٹ پر اترے تو تمام سامان تو آگیا، کتابوں کا یہ کارٹن غائب تھا، بہت انتظار کیا، متعلقہ کارندوں سے خوب خوب بحث و مباحثہ کیا، تو تو میں میں بھی کی، لیکن کچھ حاصل نہ ہوا، آخر کار اس کی رپورٹ ہوئی، کاغذی کاروائی کے بعد متعلقہ حکام نے یقین دلایا کہ آپ فلاں نمبر پر رابطہ کیجیے گا، اگر مل گیا تو آپ کو اطلاع کر دی جائے گی، گھر آکر ایسا لگا کہ جیسے میں خالی ہاتھ ہی آیا ہوں، پروگرام تو یہ تھا کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد کچھ لکھنے

کا کام کروں گا، چند احباب کے خاکے سرگودھا میں رہتے ہوئے شروع کیے تھے انہیں مکمل کرونگا، کتابیں نہ ملنے کے باعث طبیعت لکھنے کی جانب مائل ہی نہیں ہوئی، وقت گزرے نہیں گزر رہا تھا، اپنے بیٹے عدیل کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ایئر پورٹ پر معلومات کرتا رہے شاید کچھ اچھی خبر سننے کو مل جائے، جدہ آئے ہوئے ایک ماہ ہونے کو تھا ہر طرح کی کوشش بے سود رہی، ایک دن ائر پورٹ سے فون آیا کہ کارٹن مل گیا ہے آ کر لے جایئے عدیل ائر پورٹ گیا، تلاش کیا پر نا امید ہو کر واپس آگیا، رابطہ مسلسل جاری رکھا، چند دن بعد پھر اطلاع ملی کہ پیکٹ آ کر لے جائیں، اس بار میرے ایک دوست عبد الطیف جو ان دنوں جدہ کے ایک اسکول میں استاد ہیں مجھے اپنی کار میں ایئر پورٹ لے گئے، وہ اپنے کسی ساتھی کو رخصت کرنے ایئر پورٹ جارہے تھے، ازراہ عنایت مجھے بھی ساتھ لے لیا، کیونکہ مَیں ان سے اس بات کا ذکر کر چکا تھا، ہم دونوں ائیر پورٹ پی آئی اے آفس گئے میری کتابوں کا پیکٹ آفس میں موجود تھا، جان میں جان آئی ، اللہ کا شکر ادا کیا، آفس حکام نے بتایا کہ یہ پیکٹ آپ کے سامان کے ساتھ ہوائی جہاز میں رکھا ہی نہیں گیا، شاید کسی مہربان نے لیپ ٹاپ سمجھتے ہوئے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا، جب یہ راز افشا ہوا کہ اس میں تو کتابیں ہیں تو واپس ائر پورٹ پر چھوڑ دیا۔ پی آئی اے کے حکام نے بتایا کہ یہ چند روز قبل اکیلا ہی کراچی سے آیا ہے۔ کسی نے درست کہا کہ 'اصل چیز معیار ہے۔ ایک چیز جو آپ کی نظر میں بے قیمت ہے وہی دوسرے کے لیے بیش قیمت

ہے'۔ یہ پیکٹ جو چند کتابوں پر مشتمل تھا میرے لیے اس کی بہت اہمیت تھی لیکن دوسروں کے لیے یہ چند کتابیں ہی تھیں۔ پیکٹ ملنے کے بعد مَیں لکھنے کا سلسلہ شروع کر سکا۔ علامہ شبلی نعمانی کے صندوق کی چوری کا واقعہ مَیں نے حکیم ڈاکٹر سید محمود احمد برکاتی کی کتاب ''جادۂ نسیاں۔ بھولتی یادیں'' میں پڑھا، دلچسپ ہے،آپ بھی سنیے اس سے کتاب کی وقعت عیاں ہوتی ہے۔علامہ شبلی نعمانی مولوی عبد الغفور، جو اکبری، مسجد (درگاہ خواجہ صاحب، اجمیر) میں صدر مدرس تھے سے ملاقات کے لیے اجمیر گئے اور درگاہ خواجہ صاحب پہنچ کر وہاں ایک حجرے میں اپنا سامان رکھ دیا جو صرف ایک صندوق پر مشتمل تھا، مولوی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ یہ صندوق رکھ کر مجھے تلاش کرنے نکلے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے گھر قیام کے لیے اصرار کیا اور سامان یہاں منتقل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ اس حجرے تک آیا، یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ صندوق غائب ہے، چوری ہوگیا، پولیس میں رپورٹ لکھوادی، اس زمانے کی پولیس فرض شناس ہوتی تھی، چنانچہ پولیس کا سپاہی بار بار یہ پوچھنے کے لیے آتا کہ اس صندوق میں کیا کیا تھا۔علامہ صاحب ہر بار یہی جواب دیتے کہ چند کپڑوں کے علاوہ فلاں فلاں کم یاب اور نایاب کتابیں تھیں۔آخر وہ سپاہی مجھے الگ لے جا کر کہنے لگا کہ ایک صندوق تو ہم نے دریافت کر لیا ہے مگر اس میں تو نقد رقم بھی ہے اور آپ کے مہمان اس رقم کا تذکرہ ہی نہیں کرتے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ صندوق ان کا نہیں ہے، میں نے مولانا شبلی سے دریافت کیا کہ اس

صندوق میں کیا کیا تھا؟ تو انھوں نے پھر یہی جواب دیا کہ فلاں فلاں کم یاب و نایاب کتابیں تھیں۔ میں نے پوچھا، کوئی رقم بھی تھی؟ تو جواب دیا کہ ، ہاں رقم تھی مگر اصل سرمایہ تو وہ کتابیں ہیں، میں نے پوچھا کہ وہ رقم کتنی ہے تو جواب دیا کہ پانچ ہزار روپے۔ اس پر میں نے جھنجلا کر کہا، کئی روز سے ہم پریشان ہیں اور پولیس بھی اور آپ نے اب تک کتابوں ہی کتابوں کا نام لیا ہے، رقم کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ چنانچہ میں نے غصے میں چیخ کر کہا 'اب تک کیوں نہیں بتایا کہ اس میں پانچ ہزار روپے بھی تھے'، پھر میں نے پولیس کو بتایا کہ اس صندوق میں پانچ ہزار روپے بھی تھے، پولیس نے وہ صندوق مولانا کے حوالے کر دیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے صندوق کھول کر سب سے پہلے اپنی کتابوں کو سنبھالا اور رقم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی'۔ یہ واقعہ آج سے سو سال پہلے کا ہے ، پانچ ہزار کی رقم اس زمانے میں ایک حیثیت رکھتی تھی لیکن اہمیت کی بات ہے، علامہ شبلی نعمانی کے نزدیک بھاری رقم کی اہمیت نہیں تھی بلکہ وہ نایاب و نادر کتابیں اہمیت رکھتی تھی۔

عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ہمارے ایک ساتھی تھے عبدالباری سراج احمد، یہ ایک پرائیویٹ کالج 'بلوچ انٹرمیڈیٹ کالج' کے پرنسپل تھے، جب کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تو انھیں لیکچرر بنا کر اس کالج میں ٹرانسفر کر دیا گیا، سیاسیات ان کا مضمون تھا، سیدھے سادھے بھلے آدمی تھے، حیدر آباد

دکن سے ان کا تعلق تھا۔ انھیں سونے کے بسکٹ جمع کرنے کا شوق تھا، گلشن اقبال میں رہا کرتے تھے بس سے اترتے تو راستے میں صرافا بازار پڑتا یہ وہاں سے اکثر سونے کی اشرفیاں خرید کر لاتے اور اسٹاف روم میں ان کی تشہیر کرنے کے علاوہ چائے میں ان اشرفیوں کو ڈال کر چمچے سے ہلایا کرتے ان کا خیال تھا اس طرح سونا ان کے جسم میں جارہا ہے جو باعث تقویت ہے، ایک دن ہمارے ایک ساتھی غلام اصغر صاحب نے کہا کہ باری صاحب مجھے بھی یہ اشرفیاں دیں میں بھی چائے میں ڈال کر ان کی طاقت حاصل کرلوں انھوں نے وہ دو اشرفیاں اصغر صاحب کو دے دیں انھوں نے بھی انھیں اپنی چائے کی پیالی میں ڈالا، چمچے سے ہلایا اور چائے پینے لگے، چائے پیتے پیتے انھوں نے وہ اشرفیاں چھپالیں اور باری صاحب سے کہا کہ باری صاحب یہ تو میرے پیٹ میں چلی گئیں، باری صاحب نے جب یہ سنا تو ان کی ہوائیاں اڑ گئیں، بیس گرام سونے کا معاملہ تھا، یہ ایک اچھا مذاق تھا، باری صاحب اکثر نئے نوٹوں کی گڈیاں بھی کالج لایا کرتے اور اسٹاف روم میں نکال کر ان کی تشہیر کیا کرتے ، یہ ان کی عادت تھی، ایک دن کپڑے کے تھیلے میں نئے نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں ، ان کے کہنے کے مطابق ایک ایک ہزار کے سو نوٹ تھے، جاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے کہیں جانا ہے پیسوں کا یہ تھیلا آپ لے جائیں کل مجھے لاکر دے دیجیے گا، مَیں کالج سے نزدیک ہی رہا کرتا تھا،اعتماد کی بات تھی، مَیں نے وہ تھیلا لے لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گیا اگلے دن وہ تھیلا لاکر باری صاحب کے حوالہ کردیا ،

انھوں نے گھر جاکر نوٹ گنے تو وہ ایک سو ایک تھے یعنی ایک لاکھ ایک ہزار روپے تھے،جب کہ انھوں نے اپنے طور پر سو نوٹ گن کر اس میں رکھے ہوں گے، اگلے روز کالج آئے مجھ سے کہنے لگے کہ صمدانی صاحب آپ نے نوٹ گنے تھے ، میں نے کہا کہ نہیں مجھے ضرورت نہیں تھی نوٹ گنے کی، اب تو جناب انہوں نے اسٹاف روم میں میری ایمانداری کا خوب خوب پرچار کیا، کئی دن تک وہ اس بات کا ذکر کرتے رہے۔ باری صاحب اور اصغر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہےاللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔مَیں ۲۳ سال چھ ماہ عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں رہا پھر میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں ہوگیا جہاں ۱۲ سال خدمت انجام دیں۔

سرگودھا یونیورسٹی میں گزارے ہوئے میرے روز و شب یادگار اور میری زندگی کا سرمایا ہیں۔ سرکاری عہدہ ملازمت ختم کر چکا تھا، ڈاکٹر محمد فاضل صاحب جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے چیرمین تھے جن سے میرے مراسم کی نوعیت برادرانہ تھی، انھوں نے ازراہ عنایت میرا تقرر بحیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر کے اپنے شعبہ میں کرادیا، یہ ان کی عنایت اور مجھ سے محبت تھی، میں نے بھی سرگودھا جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مئی ۲۰۱۰ء کے ابتدائی دنوں میں مجھے سرگودھا یونیورسٹی کی جانب سے تقرر نامہ موصول ہوا، میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا چنانچہ میں نے کراچی سے رختِ سفر باندھا۔جنت نگاہ

شہر کراچی کو جہاں میرا سنہرا بچپن گزرا، رسیلی جوانی کی بہاریں پھلی پھولیں اور پھر بڑھاپے کی دہلیز پر بھی اسی شہر میں قدم رکھا۔ اس کی رونقوں کو، بہاروں اور محفلوں کو، دوستوں کو، عزیزوں کو، پیاروں کو الغرض ہر ایک کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ محسوس ہوتا ہے شہر سرگودھا میں کچھ خاص کشش تھی جس نے مجھے اتنے بڑے فیصلے پر آمادہ کرلیا۔

ہے عجب کشش اے سرگودھا تیری شام و سحر میں
کہ میں کراچی کی حسین رنگینیوں کو چھوڑ آیا

۱۲ مئی کی خوش گوار صبح سرگودھا میں ہوئی، ڈیوو بس اسٹاپ پر سرگودہ یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز کے چیر مین پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل اور شعبے کے ایک سینئر استاد میاں محمد اسلم بھٹی جو میرے ایم اے کے کلاس فیلو بھی تھے مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ بس اسٹاپ سے جامعہ مشکل سے دس منٹ کے فاصلے پر ہے، فیصلہ ہوا کہ پہلے شیخ الجامعہ سے ملاقات کی جائے، چنانچہ ہم تینوں شیخ الجامعہ کے دفتر پہنچے، شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر چودھری محمد اکرم سے ملاقات ہوئی، خوش ہوئے اور خوش اخلاقی سے ملے، فاضل صاحب کو میرے قیام کے بارے میں کچھ ہدایات دیں، پھر ہم نے ایڈیشنل رجسٹرار چودھری اظہار الحق صاحب سے ملاقات کی۔

جامعہ سرگودھا کا ٹیچرز ہاسٹل کا کمرہ نمبر ۵ میرے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میں بائیولوجی کے استاد ڈاکٹر ظفر اقبال کا روم میٹ تھا، ڈاکٹر ظفر اچھے انسان تھے، تحقیق کے آدمی تھے، لکھنا اور چھپنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ہاسٹل میں ٹیچرس کو انٹرنیٹ کی سہولتیں میسر تھیں، ظفر صاحب جتنی دیر کمرے میں ہوتے لیپ ٹاپ پر سرچنگ کرتے اور مضامین لکھتے رہتے، مَیں اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف رہا کرتا، دونوں اپنے اپنے بیڈ پر لیپ ٹاپ پر مصروف عمل رہا کرتے۔ خاموش طبع تھے، کم سے کم گفتگو کیا کرتے تھے، اتفاق سے مَیں بھی ان کا ہم مزاج تھا، ہم دونوں کے درمیان بہت کم جملوں کا تبادلہ ہوا کرتا، لیکن دونوں کو ایک دوسرے سے کبھی شکایت نہیں ہوئی، وہ اردو کم سرائیکی زیادہ بولا کرتے تھے، ان کی فیملی جھنگ میں تھی، وہ ہر جمعہ کی دوپہر اپنے گھر چلے جایا کرتے اور پیر کی صبح واپس آیا کرتے تھے، اس دوران مَیں کمرے میں تنہا ہی ہوا کرتا۔ شہر نیا، لوگ نئے، ماحول اجنبی' البتہ خالصتاً علمی۔ زندگی کا پہلا تجربہ تھا گھر سے باہر رہنے کا وہ بھی ہاسٹل لائف۔ اکثر احباب سے سنا کرتا تھا کہ ہاسٹل لائف عام زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ مَیں شام پانچ بجے تک شعبہ میں رہتا، عصر کے وقت شعبے سے واپس ہاسٹل آتا اور عصر کی نماز کے لیے مسجد چلا جاتا اور پھر کیمپس کے پر فضا ماحول میں کھو جایا کرتا۔ جامعہ سرگودھا کا عین وسطی حصہ خوبصورت منظر پیش کرتا ہے' اس میں وسیع و عریض سر سبز کھیل کے میدان، جن کے گرد لہلہاتے درخت حسین نظارہ پیش کرتے اور شام

کے اوقات میں ان میدانوں میں طلباء ہر قسم کے کھیلوں میں مصروف نظر آتے۔ ان میدانوں کے چاروں اطراف صاف ستھری سڑکیں صبح و شام جاگنگ ٹریک بنی ہوتی ہیں' جہاں ہر عمر کے لوگ دوڑتے اور چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ مَیں بھی اس حسین منظر نامے کا حصہ بن گیا تھا۔ ٹیچرز ہاسٹل میں زمینی منزل پر ہمارے علاوہ کمرہ نمبر ۲ میں ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب ہوا کرتے تھے، سرگودھا میں رہتے ہوئے تونسوی صاحب میرے قریبی دوست بن گئے۔

جامعہ کے ٹیچرز ہاسٹل میں میس کا انتظام ہاسٹل کے مکینوں کو از خود کرنا ہوتا تھا، جامعہ کی طرف سے ڈائننگ روم، کچن اور ایک عدد کُک کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ نذر حسین ہمارا کُک تھا، سابق فوجی تھا، بردبار اور اچھی عمر تھی، کھانا ٹھیک ہی پکایا کرتا تھا۔ خاص طور پر مکس سبزی، کڑھی، کریلے جن میں کڑواہٹ نام کو بھی نہ ہوتی تھی اور آلو بھرے پراٹھے، میس سیکریٹری شعبہ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر شاہد راجپوت تھے، ان کا گھر اسلام آباد میں تھا وہ اکثر جمعرات کو اپنے گھر اسلام آباد چلے جاتے، اسی طرح وہ احباب جن کی فیمیلیز سرگودھا کے قرب و جوار میں تھیں وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو سدھار جایا کرتے، ہاسٹل میں میرے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کے علاوہ شاید ہی کوئی اور ہوا کرتا، شاہد راجپوت صاحب کی غیر موجودگی میں ہمارا کُک یہ سمجھتا کہ اب اس کی بھی چھٹی ہے وہ ان احباب سے پہلے اپنے

گھر روانہ ہو جاتا، گویا ہفتے کے تین دن جمعہ ، ہفتہ اور اتوار ہمارے میس میں کھانے کی چھٹی ہونے لگی، ہمارے لیے یہ مشکل تھا کہ کیمپس کے باہر کھانا کھانے جایا کریں وہ بھی سخت سردی میں۔اس حوالے سے ڈاکٹر خالد ندیم اور طارق کلیم کی محبت اور خبر گیری کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، سخت سردی میں یہ دونوں صاحبان موٹر سائیکل پر رات گئے کھانا لیے آیا کرتے، ان کے مزے دار کھانے بہت یاد آتے ہیں،خاص طور پر ساگ کا لطف مَیں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر خالد ندیم شعبہ اردو ، جامعہ سرگودھا میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، تخلیقی سوچ رکھتے ہیں، لکھنا پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، متعدد مضامین ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، انہوں نے اپنی ایک کتاب ''مکاتیبِ ابنِ فرید بنام رفیع الدین ہاشمی'' بھی مجھے عنایت فرمائی، لکھاریوں کی مدد کرکے خوشی محسوس کرتے ہیں۔سرگودھا میں قیام کے دوران خاکہ نویسی پر میری خاص توجہ رہی، شاید ماحول کا اثر تھا، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور عبد الوہاب خان سلیم پر ہاتھ صاف کیا اور ان کے خاکے قلم بند کیے ، دونوں خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا خاکہ اپنی ہم پیشہ فرخندہ لودھی کا لکھنا شروع کیا، جو اردو و پنجابی ادب کی معروف لکھاری بھی تھیں، مجھے فرخندہ لودھی پر مواد درکار تھا، یونیورسٹی کے مرکزی لائبریری سے مجھے کچھ نہ مل سکا، ایک دن مَیں نے ڈاکٹر خالد ندیم کو فون کیا اور مدعا بیان کیا، لمحے بھر کو سوچا اور گویا ہوئے ، کچھ کچھ ذہن

میں آ رہا ہے، میں آپ کو ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں۔ مشکل سے پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے میرے موبائل پر گھنٹی بجی، ڈاکٹر خالد ندیم گویا ہوئے آپ کا مطلوبہ مواد مجھے مل گیا، میں کچھ ہی دیر میں آپ کے ہاسٹل آتا ہوں۔ میں نے کہا میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ فروری کا مہینہ سردی اپنی بہاریں دکھا رہی تھی، سورج غروب ہونے کے بعد تو سردی زیادہ ہی شدید ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے میرے کمرے میں آ موجود ہوئے۔ کہنے لگے لیجیے آپ کی مشکل انشاء اللہ آسان ہو جائے گی، یہ کہہ کر انھوں نے بڑے سائز کا ایک ضخیم مجلّہ میرے ہاتھ میں تھمایا، یہ تھا ''مجلّہ راوی ۲۰۱۰ء ''جی سی یونیورسٹی لاہور کا خصوصی مجلّہ۔اس مجلّہ میں گوشہ میر تقی میرؔ، گوشہ ن۔م۔راشدؔ، گوشہ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی، گوشہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ ''گوشہ فرخندہ لودھی'' بھی تھا۔اس لمحے میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میری ایک ہم پیشہ کے بارے میں یہ گوشہ مرحومہ کی علمی و ادبی خدمات کا کھلا اعتراف تھا، اُسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اب مَیں یقیناً فرخندہ کو خراجِ تحسین پیش کر سکوں گا اور ایسا ہی ہوا، مَیں نے فرخندہ پر اپنا خاکہ مکمل کر لیا۔ ڈاکٹر خالد ندیم کی عنایتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

اس موقع پر طارق کلیم کی محبتوں اور عنایتوں کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی، یہ ڈاکٹر تونسوی صاحب کے ایم فل کے شاگرد تھے انھوں نے تونسوی صاحب کے ساتھ

ساتھ میرا اتنا ہی خیال رکھا جتنا وہ ڈاکٹر تونسوی کا رکھا کرتے تھے۔ گویا' تمھیں چاہیں تمھارے چاہنے والوں کو چاہیں والی صورت تھی' ۔ خوب اچھے اچھے اور لذیز کھانے کھلائے، یہ بھی سخت سردی میں موٹر سائیکل پر رات گئے آیا کرتے تھے۔ اسکول میں استاد تھے، اکیڈمی میں بھی پڑھاتے تھے، صحافت سے بھی منسلک تھے، شاید اے آر وائی سے وابستہ تھے، مصروفیات کے باوجود اس قدر خیال ۔ طارق کلیم کے ایک اور عمل کو مَیں کبھی بھلا نہیں سکونگا، اپنے استاد ڈاکٹر تونسوی کے تابع دار تو تھے ہی اپنے استاد کے دوست کے ساتھ بھی ان کی مہربانیاں اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ ان کی تربیت اچھے ہاتھوں میں ہوئی ہے، ہوا یہ کہ سرگودھا میں قیام کے دوران میرے دانت میں تکلیف شروع ہو گئی جو بڑھتی ہی گئی، تونسوی صاحب نے طارق کلیم سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، طارق کلیم نے اگلے ہی دن آنے کے لیے کہا، وہ طے شدہ وقت پر آ گئے مجھے اپنے ہمرہ ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے، انھوں نے دانت دیکھا اور کہا کہ اس کا علاج یہی ہے کہ اسے نکال دیا جائے ورنہ یہ آپ کو مسلسل پریشانی میں مبتلا رکھے گا، تین دن کی دوا لکھ دی، اب مجھے تین دن بعد پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا تھا، طارق کلیم پھر طے شدہ وقت پر میرے شعبے میں آ موجود ہوئے، وہ مجھے پھر ان ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے، میرا دانت نکال دیا گیا، ڈاکٹر صاحب نے نہ تو پہلے فیس لی اور نہ ہی دوبارہ حالانکہ مَیں نے طارق کلیم کو اشارہ بھی کیا جسے ڈاکٹر صاحب نے محسوس کر لیا کہنے لگے اشارے

نہیں چلیں گے۔ بس ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر صاحب طارق کلیم کے دوستوں میں سے تھے۔جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ طارق کلیم نے بتایا کہ انھوں نے گزشتہ انتخابات میں جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر سرگودھا سے الیکشن بھی لڑا تھا اور کم ووٹوں سے ہار گئے تھے۔اچھے ڈاکٹر تو ہیں ہی ساتھ ہی نیک انسان بھی ہیں، انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں جامعہ سرگودھا میں استاد ہوں تو زیادہ محبت سے ملے۔

حیات ہوٹل سرگودھا کے شاعروں اور دانشوروں کا مرکز بھی ہے، غالباً اس کے مالک ادبی ذوق رکھتے ہیں اور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے قدر داں ہیں، یہاں ادبی محفلوں کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر تونسوی صاحب نے کہا کہ آج محفل مسالمہ ہے اس میں جانا ہے، کہنے لگے کہ اگر آپ نے امام حسین کی شان بھی کچھ کہا ہے تو آپ کو بھی موقع مل سکتا ہے، مَیں نے کہا کہ مَیں صرف آپ کو اور دیگر احباب کو سنوں گا، مغرب کی نماز کے بعد ہم حیات ہوٹل پہنچ گئے، ایک چھوٹے سے کمرے میں محفل مسالمہ کا اہتمام کیا گیا تھا، شاعر حضرات پہنچ گئے، سب نے امام عالی مقام کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا، ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب، عابد خورشید نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ دیگر کے علاوہ صاحبزادہ پروفیسر محمد عبدالرشید صاحب بھی موجود تھے انھیں پہلی بار قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، سرگودھا کی تاریخ پر ان کی تحریر کردہ کتاب سے

مَیں استفادہ کرچکا تھا۔

جامعہ سرگودھا سے میری واپسی ایک ماہ قبل ہی طے ہوچکی تھی، کنٹریکٹ کے مطابق مَیں نے ایک ماہ قبل انتظامیہ کو مطلع کردیا کہ ۲۸ فروری ۲۰۱۱ء جامعہ میں میرا آخری ورکنگ ڈے ہوگا، ایسا ہی ہوا، یہ بات عام ہوئی کہ مَیں جامعہ چھوڑ کر جارہا ہوں تو میرے کرم فرماؤں نے مجھے روکنے کی کس کس طرح کوشش نہیں کی، میرے دل میں ان سب کے لیے بہت احترام ہے، میرے عزیز طلباء نے اجتماعی طور پر اور فرداً فرداً مجھ سے کہا کہ مَیں اپنے فیصلے پر نظرثانی کروں ، مَیں ان سب کو اپنی مجبوریاں بتاتا رہا، میرے بعض طلباء نے پروگرام بنایا کہ وائس چانسلر صاحب کے پاس جاکر احتجاج کیا جائے ، یہ بات میرے علم میں آئی تو مَیں نے ان طلباء کو بہت سمجھایا اورانہیں ایسا نہ کرنے کی تاکید کی، یہ مجھ سے محبت تھی، جمعے کی نماز میں وائس چانسلر صاحب کے پی اے مقصود صاحب سے ملاقات ہوئی ، انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس بعض لوگوں کے فون آئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم صمدانی صاحب کو نہ جانے دیں اور ان کی خواہش کے مطابق انھیں فیمیلی رہائش فراہم کریں، یہ میرے چاہنے والوں کی مجھ سے محبت تھی، احمد شاہ صاحب جو لائبریری میں تھے انھوں نے بھی مجھے بارہا فیصلہ پر نظرثانی کرنے کی درخواست کی، جب مَیں نے انھیں اپنی مجبوری بتائی تو وہ مجھے سرگودھا شہر میں کئی مکان کرائے کے دکھانے کے لیے لے گئے، مَیں ان کی

اس محبت کو کبھی نہ بھلا سکوں گا، مَیں نے وائس چانسلر صاحب کے پی اے سے کہا کہ یہ مجھ سے محبت کرنے والوں کی مجھ سے چاہت ہے، مَیں اس کی قدر کرتا ہوں، میرا نوٹس پیریڈ چل رہا تھا، انھی دنوں وائس چانسلر صاحب اچانک لائبریری اور شعبے میں آ گئے، فاضل صاحب چھٹی پر تھے اور مَیں قائم مقام چیئر مین تھا، وائس چانسلر صاحب نے شعبے کے مختلف حصے اور وہ کمرے دیکھے جو میڈیکل کالج کے لائبریری بلڈنگ سے منتقل ہو جانے کی صورت میں خالی ہوئے تھے، مَیں وائس چانسلر صاحب کو تفصیل بتاتا رہا، وائس چانسلر صاحب کے علم میں یہ بات تھی کہ فاضل صاحب چھٹی پر بہاولپور گئے ہوئے ہیں۔ جب وائس چانسلر صاحب واپس جانے کے لیے لائبریری سے باہر آئے تو میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے، کہنے لگے ۲۸ فروری کو آپ جا رہے ہیں، اگر آپ رہائش کی وجہ سے جا رہے ہیں تو ہم آپ کو رہائش فراہم کر دیتے ہیں، پھر انھوں نے اپنے پی اے کو اشارہ کیا اور کہا کہ صمدانی صاحب کو رہائش فراہم کریں، جب وہ یہ سب کچھ کہہ چکے، مَیں نے احترام سے عرض کیا کہ سر مجھے بعض مجبوریوں کے باعث جانا ہی ہوگا، آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے موقع فراہم کیا کہ مَیں جامعہ میں آ سکا، آپ کی اس عنایت کا بھی شکریہ۔

جامعہ سرگودھا کے شعبہ اردو نے سرگودھا جیسے شہر میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں پاکستان ہی نہیں ' ہندوستان، بنگلہ دیش، مصر، امریکہ

سے دانشوروں نے بھرپور شرکت کی۔ کراچی سے سحر انصاری اور جامعہ کراچی کے ڈاکٹر ظفر اقبال نے شرکت کی، ان احباب سے ملاقات بھی ہوئی، سرگودھا کہنے کو تو شاہینوں کا شہر ہے 'لیکن عوام الناس کے لیے ایئرپورٹ کی سہولت سے محروم ہے، یہاں پہنچنے کے لیے اسلام آباد ، لاہور، فیصل آباد سے تین گھنٹے کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔اس مشکل کے باوجود عالمی اردو کانفرنس میں مندوبین نے بھرپور شرکت کی، مجھے بھی اس کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا، کئی سیشنز ہوئے جن میں ماہرین نے مقالات پیش کیے، مشاعرہ بھی ہوا، شاعروں نے خوبصورت کلام پیش کرکے داد وصول کی۔پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری کے دو خوبصورت شعر یاد رہ گئے ۔

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھُلایا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

میں پیدائشی بیماری کی پوٹلی رہا ہوں، پیدا ہونے کا وقت نزدیک آیا تو دائی نے اعلان کیا کہ نو مولود کو الٹا پیدا ہونا ہے ، اس اطلاع نے دو زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا، خوشی افسردگی میں بدل گئی، لوگ خوشی کے ترانے گانے کے بجائے دو زندگیوں کی دعا کرنے لگے۔ گویا دنیا میں آنے سے پہلے ہی مَیں نے یہ

کارنامہ انجام دیا کہ اپنی ماں کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا۔اللہ نے دونوں زندگیوں کو سلامت رکھا اور مَیں اس دنیا میں آگیا۔یہ تھا دنیا میں میری زندگی کا آغاز۔ زندگی کے اس طویل سفر میں مجھے متعدد بار مختلف بڑی بیماریوں نے آدبو چا، نوبت اسپتال میں داخل ہونے اور سرجری کی آگئی ۔اللہ کے فضل و کرم سے مَیں ہر بار صاف بچ نکلا۔گویا مجھ پر اللہ کا خاص کرم بھی رہا اور میری ماں کی

دعائیں بھی میرے شامل حال رہیں۔بقول سورج نرائن ؎

غموں کی دھوپ مجھے راکھ کس طرح کرتی

میں اپنی ماں کی دعاؤں کے سائباں میں تھا

مَیں منتوں اور مرادوں سے تو نہیں ہوا تھا البتہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا، یعنی پہلوٹھی کا تھا۔بتانے والوں نے بتایا کہ ابھی میں نے چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ میرے بدن پر آبلے نمودار ہوگئے۔امی نے بتایا تھا کہ ہمارے ہی خاندان کی کسی مہربان نے جو اولاد سے محروم تھی کچھ کارستانی مجھ پر کرادی تھی، ایک دن میری بنیان خون میں لت پت ملی، کسی بڑی بزرگ کے کہنے پر امی نے اس بنیان پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی، امی نے بتایا کہ جیسے جیسے وہ بنیان جل رہی تھی اور شعلے فضا میں بلند ہورہے تھے، ساتھ ہی میرا بدن آبلوں سے بھرتا جارہا تھا۔اس بیماری نے مجھے اور میرے والدین کو

کافی عرصے مشکل میں مبتلا رکھا، ڈاکٹری علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی ہوا تب جاکر مجھے اس بیماری سے نجات ملی، اس بیماری کی باقیات آج بھی میرے بدن پر موجود ہیں۔ اللہ تعالٰی کسی کو بلاوجہ پریشانی میں مبتلا کرنے والوں کو نیک ہدایت دے۔ عام طور پر بچے ایک سال کی عمر میں کھڑا ہونا یا قدم اٹھانا شروع کردیتے ہیں کہتے ہیں کہ مَیں دو سال کا ہوگیا تھا قدم اٹھ کر ہی نہیں دے رہے تھے، گمان گزرا کہ کہیں پیروں کی کوئی تکلیف تو نہیں، اصلی گھی کی خوب خوب مالش کی گئی تب جاکر میرے قدم اُٹھے۔ کوئی سات آٹھ سال کا ہوا تو کانوں میں تکلیف شروع ہوگئی، بہت علاج ہوا لیکن افاقہ نہیں ہوا، ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا، سول اسپتال میں ایک ڈاکٹر جاننے والا تھا اس کے توسط سے آپریشن ہوا، تب جاکر اس مرض سے نجات ملی۔ بواسیر کا مرض لاحق ہوگیا، اس کا ڈاکٹری علاج کے ساتھ روحانی علاج بھی ہوا، تب اس مرض سے نجات مل پڑا ہوا، گردے میں پتھری ہوگئی پھر مثانے میں پتھری ہوگئی، عباسی شہید اسپتال میں ڈاکٹر انور سہیل کے توسط سے کیتھیڈر پاس کرکے پتھری کو باہر نکالنے کی تدبیر کی گئی لیکن پتھر نے باہر آنے سے صاف انکار کردیا، پھر آپریشن کی تاریخ طے ہوئی، پتھر خوف سے خود بہ خود باہر آگیا۔ اگست ۱۹۸۲ء کی بات ہے مجھے فسچیولا ہوگیا، آپریشن ہوا، کراچی پورٹ ٹرسٹ کے اسپتال میں جو کیماڑی میں ہے (Fistula) آپریشن ہوا، ڈاکٹر رضا نے یہ آپریشن کیا، مَیں کوئی ۱۹ دن اسپتال میں رہا، مجھے یہ سہولت مغیث چچا کی وجہ سے میسر آئی، اس وقت وہ کے

پی ٹی میں ملازم تھے اور وہاں کی یونین میں سرگرم عمل بھی، یہ وہ وقت تھا جب حمیرا چچی حیات تھیں، اسپتال کے نزدیک ہی وہ رہا کرتے تھے ،دونوں نے میرا بے انتہا خیال رکھا، اللہ تعالیٰ حمیرا چچی کی مغفرت فرمائے، بہت نیک اور ہمدرد خاتون تھیں۔

پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے دوران مَیں رات دن کمپیوٹر پر کام کرتا رہا، کام تو ہوگیا،ڈگری بھی مل گئی لیکن یہ ڈگری مجھے تحفے میں کمر کی تکلیف دے گئی، اب میں کمر کے مہروں کی تکلیف میں مبتلا ہوچکا تھا، ہر طرح کا علاج ہوا لیکن یہ تکلیف میری زندگی کی ساتھی بن چکی ہے۔ مَیں ان بیماریوں سے بچتا بچاتا ،زندگی کے نشیب وفراز سے ہوتا ہوا عمر کے ۶۳ ویں سال میں پہنچ گیا، مارچ ۲۰۰۹ء میں کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر ایک سال سرگودھا یونیورسٹی میں پڑھا کر واپس کراچی آگیا، خیال یہ تھا کہ بہت کمالیا، بہت ملازمت کرلی، کام بھی بہت کرلیا، لکھنے لکھانے کا عمل جاری رکھوں گا، اللہ کے گھر خانہ کعبہ' حاضری دونگا، اپنے گناہوں کی معافی طلب کروں گا، سرکار دو عالم سرور' کائینات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر سلام عرض کرنے مدینہ منورہ جاؤں گا، الحمد اللہ یہ سب کچھ ہوا، آج یہ تحریر میں سعودی عرب کی سرزمین پر ہی لکھ رہا ہوں لیکن یہاں حاضری سے قبل مجھ پر کیا گزری ، میرے دل نے میرے ساتھ کیا تماشا کیا، یہ قصہ دلچسپ بھی ہے، سبق آموز

بھی، اس میں مزہ بھی ہے، سنجیدگی بھی، اللہ پر بھروسا اور ایمان کی مثال بھی۔ مَیں درد جگر، دردِ کمر کے ساتھ ساتھ دردِ دل کا مریض بن
چکا ہوں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

ایک دکھ ہو تو کوئی اس کا مداوا بھی کرے
دردِدل، دردِ جگر، دردِ کمر تینوں ہیں

مَیں کالج کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے ایک سال بعد ۱۱ مئی ۲۰۰۹ء کو جامعہ سرگودھا سے منسلک ہوگیا، میرے سرگودھا چلے جانے کے ایک ماہ بعد ہی میرے بڑے بیٹے عدیل نے خوش خبری سنائی کہ اس کا بلاوا سعودی عرب سے آگیا ہے، کچھ دن بعد میری بڑی بہو مہوش اور پوتا بھی سعودی عرب چلے گئے، ابھی چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کے شہناز نے اطلاع دی کہ نبیل کو سعودی عرب سے ملازمت کا پروانہ آگیا ہے اور وہ دونوں یعنی نبیل اور ثمرا نے بھی رخت سفر باندھا، مَیں دونوں کو الودع کہنے کراچی آتا رہا۔ اب میرا گھر میرے بچوں سے خالی ہوچکا تھا، بیٹی کی شادی تو کئی سال قبل ہی ہوچکی تھی۔اب دونوں بیٹوں کی جانب سے تقاضا ہوتا رہا کہ ہم دونوں سعودی عرب آجائیں، ہم نے جانا تو تھا ہی اب ہمارے جانے کی صورت بدل گئی تھی۔ مَیں مارچ ۲۰۱۰ء کو سرگودھا سے مستقل کراچی واپس آگیا۔اب مجھے کسی بھی وقت سعودی عرب جانا تھا، ویزے کا انتظار تھا، تیاریاں شروع ہوچکی تھیں، دوسری جانب میرا دل اندر ہی اندر

تماشا کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا، اپریل ۲۰۱۰ء کے پہلے ہفتے میں اچانک میرے الٹے ہاتھ میں درد ہوا، جس نے شدت اختیار کر لی، نوبت عام ڈاکٹر سے کارڈک سینٹر تک اسپتال میں داخل (KHID) پہنچ گئی۔ ۱۲اپریل کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ ڈیزیز تجویز کی ،اگلے ہی دن (Angiography) ہوا،پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق نے انجو گرافی مَیں آپریشن ٹیبل پر تھا، میرے دائیں جانب ڈاکٹر اور دیگر عملہ اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ ہرے رنگ کے ایپرن اور ٹوپی پہنے مجھ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہے تھے، میرے بائیں جانب اوپر اسکرین لگی تھی، اس کے نیچے ایک کمپیوٹر رکھا تھا پیرامیڈیکل اسٹاف نے میری دائیں ٹانگ کے اوپر کی جانب سے کارستانی شروع کی اور، دیکھتے ہی دیکھتے ان کا پاس کیا ہوا کیتھیڈر میرے دل میں پہنچ گیا، اوپر اسکرین پر میرا دل واضح طور پر لشکارے مار رہا تھا، مشکل سے پندرہ منٹ بعد کام تمام ہوا، مجھے آپریشن بیڈ سے اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا، رپورٹ یہ دی گئی کہ دل کی ایک شریان بند ہے ، فوری (stent) میں اسٹینٹ Artery کرکے شریان (Angioplasty) طور پر انجو پلاسٹی ڈالنے کی ضرورت ہے، میرے تینوں بھائی اور مغیث چچا جو آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے انہوں نے ڈاکٹر کو گرین سگنل دے دیا، کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ آپریشن ٹیبل پر منتقل کر دیا گیا، وہی عمل پھر سے شروع ہوا، اس بار کیتھڈر کے ذریعہ اسٹینٹ بند شریان تک پہچانا تھا،ڈاکٹر کے ہاتھ میری دائیں ران پر حرکت کرتے محسوس ہو رہے تھے جب کہ اس کی نظریں

اُسی اسکرین پر تھیں ، مَیں بھی اپنے دل اور اس کے اندر ہونے والی کیفیت کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ بیچ میں ایک وقت ایسا آیا کہ میرے دل میں شدید درد ہونے لگا، میری شکایت پر ایک نرس نے میری زبان کے نیچے اسپرے کیا، جس سے درد فوری طور پر ختم ہوگیا، اس بار یہ عمل آدھے گھنٹے کا تھا، ڈاکٹر محمد اسحاق نے یہ عمل کیا، اس طرح آناً فاناً میں مَیں عام انسان سے کارڈک پیشنٹ بن گیا۔ ہندوستان کے ایک شاعر اقبال اشعر کا خوبصورت شعر ہے

وہ شخص ایک لمحے میں ٹوٹ پھوٹ گیا
جسے تراش رہا تھا میں ایک زمانے سے

بیماریوں کے حوالے سے اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ میری پوری زندگی بیماریوں سے لڑتے جھگڑتے ہی گزری لیکن یہ بھی نہیں کہ ان بیماریوں نے مجھے کچھ کرنے نہیں دیا، مَیں نے اپنی زندگی بھرپور انداز سے گزاری، بیماریاں آتی رہیں اور علاج
کے بعد مَیں نارمل لائف شروع کردیا کرتا تھا ۔

عمر تو بیماریوں سے کھیلتے ہی گزری اپنی رئیسؔ
ایک دل ہی بچا تھا سو وہ بھی کر لے کسر پوری

دل کی تکلیف کیوں ہوئی؟ مَیں تو عام زندگی میں بہت محتاط رہا تھا، خوش خوراک بھی نہیں ہوں، مرغن کھانے بھی نہیں کھائے، پھر میرے دل کو یہ کیا ہوا، کیوں اس نے اس عمر میں مجھے پریشان کیا، یہ راز اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، بیماری بھی اللہ کی طرف سے آیا کرتی ہیں، لگتا یہی ہے کہ مجھ سے ہی کوتاہی ہوئی اور مَیں ہی اس کی صحیح دیکھ بھال نہ کرسکا، بہ قول سیماب اکبرآبادی ؎

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں

اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دل کی بیماری بھی کیا خوب ہوتی ہے، ہر دم ہر لمحے اسی کے خیال میں گم، انسان ایک ایک قدم احتیاط سے اور پھونک پھونک کر اٹھانے لگتا ہے، اس کی سوچ کا محور وہ از خود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس لمحے دل ذرا بے چین ہوتا ہے دنیا کی ہر شے بیمار محسوس ہونے لگتی ہے۔یہی صورت میری بھی ہے، لیکن یہ دل ہی تو ہے جو مجھے جینے کا حوصلہ دیتا ہے، مجھ سے یہ کہتا ہے کہ انسان کے تمام اعضاء بیمار ہو سکتے ہیں تو دل کیوں نہیں ، تمہارے ساتھ تو یہ ہوچکا ہے، کیا تمہاری آنکھیں آج بھی وہی ہیں ، کیا تمہارے کان خراب نہیں ہوئے، کیا تمہیں پتھری کی تکلیف نہیں ہوئی، کیا تم بواسیر کے مرض میں مبتلا نہیں ہوئے، کیا تمہاری کمر نے تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا، اب اگر میں کمزور پڑ گیا ہوں، تو اس

میں میرا کیا قصور ہے، میں بھی تو آخر تمہارے جسم کا ایک ادنی سا عضو ہوں، میں نے ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا ہے، تمہیں حوصلہ دیا ہے، تمہیں برائی سے، غلط کاموں سے بچائے رکھا ہے، تمہیں بھٹکنے سے بچائے رکھا ہے، اب میں بھی تمہاری طرح چونسٹھ برس کا ہوگیا ہوں، میرے اعصاب بھی کمزور پڑ چکے ہیں، مجھے بھی سہارے کی، حوصلے کی ضرورت ہے، چلو اب ہم مل کر اللہ کا شکرادا کریں، اللہ ہمیں ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے اور ہم اپنی باقی ماندہ زندگی کو حوصلے اور ہمت کے ساتھ گزار دیں۔ رضی اختر شوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ کیا اس دل کو بیماری لگی ہے
لگے ہے شہر سب بیمار ایسا

مَیں فلاحی، سماجی، نیم سیاسی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتا رہا ہوں، سرکاری ملازمت سے قبل سیاست میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا، فلاحی ادارے تاج ویلفیئر سینٹر کے پرچم تلے بے شمار فلاحی کام کیے، کالج میں ملازم ہوجانے کے بعد پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن سندھ کا صدر، سیکریٹری کی حیثیت سے کئی سال مصروف عمل رہا، پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کا ۱۹۷۴ء سے سرگرم کارکن ہوں، اسکول آف لائبریرین شپ کے تحت سرٹیفیکیٹ کورس سے مسلسل منسلک رہا۔ اب اس کا ڈائریکٹر ہوں، لائبریری پروموشن بیورو کے تحت کتابوں کی اشاعت اور

رسالے کی تدوین و اشاعت کا فریضہ بھی ۱۹۷۸ء سے انجام دے رہا ہوں، بزم اکرم، سندھ پروفیسرز اینڈ لکچرر ایسو سی ایشن کا کارکن ہی نہیں رہا بلکہ سندھ کی سطح پر کئی سال الیکشن آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا رہا۔ فلاحی، ادبی، ثقافتی پروگراموں کا انعقاد کرنے میں پیش پیش رہا ہوں۔

خاکے میں عام طور پر خاکہ نگار شخصیت کی شکل وصورت کے بارے میں یہ بھی بتاتا ہے کہ چہرہ کتابی ہے یا گول، نقشہ پتلا ہے یا نقوش تیکھے ہیں، داڑھی ہے تو کیسی ہے، پیشانی کشادہ ہے یا آنکھوں سے لگی ہوئی ہے، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک ہے یا وہ کوری ہیں، ناک ستواں ہے یا پھیلی ہوئی، بال کالے گھنے ہیں یا چٹیل میدان ہے، رنگ کالا ہے یا گورا، قد لمبا ہے یا چھوٹا، جسم فربا ہے یا سیخ سلائی، مقصد شخصیت کے ظاہری نقوش کی تصویر کشی ہوتی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہوسکے کہ زیر مطالعہ شخصیت چہرے مہرے سے کیسی ہے۔ تو جناب اپنی شکل وصورت بس گزارے لائق ہے، غالبؔ کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مَیں اعتدال پسند واقع ہوا ہوں، کبھی اپنی بساط سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں

کی، ہمیشہ چادر کو دیکھ کر پیر پھیلائے ہیں، سادہ زندگی بسر کی ہے، فلیٹ خریدنے کی استعداد تھی سو فلیٹ ہی میں رہا، گاڑی کبھی بہت اچھی نہیں رکھی مہران پر اکتفا کرتا رہا، جب تک صحت اچھی تھی موٹر سائیکل استعمال کرتا رہا،زندگی کا زیادہ سفر موٹر سائیکل پر ہی بسر ہوا، میری شریک سفر بھی قناعت پسند اور میری ہم خیال ہیں،انھوں نے ہمیشہ میری خوشیوں کا خیال رکھا، میری سوچ اور خواہش کو ترجیح دی، میرے بچوں نے بھی مجھ سے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی جو میرے بس میں نہیں تھی ، میرے بیٹے عدیل اور نبیل میری سوچ کے مطابق میرے ہم قدم رہے، تعلیم حاصل کی اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ میری دونوں بہوئیں مہوش اور ڈاکٹر ثمرا سادگی پسند ہیں ، کم کو زیادہ جانتی ہیں، میری بیٹی فاہینہ بھی صابر اور قناعت پسند ہے، تھوڑے کو بہت جانتی ہے، شادی عاصم مشکور سے ہوئی، خوش و خرم ہیں، عاصم ایک خود دار اور محنت کرکے آگے بڑھنے والوں میں سے ہے، میری نواسی نیہا، نواسہ ارحم اسکول جانے لگے ہیں۔ میرا پوتا صائم میری جان ہے، اسے دیکھ کر میری روح خوش ہوتی ہے،اللہ تعالیٰ ان سب کی عمر دراز کرے۔

میرے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نبیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک پھول عطا کیا تھا،مَیں نے اس کے کانوں میں آزان بھی دی اور اس کا نام محمد سبحان تجویز کیا۔ افسوس میرا یہ پوتا صرف چھ دن دنیا میں رہ کر دینا سے رخصت ہوگیا۔ مجھے اس کا بہت

ملال اور دکھ ہے۔ معصوم بچے اپنے والدین کی بخشش کا ذریعہ بنے گے۔
زندگی میں جِنّات کے حوالے سے بھی تجربات ہوئے، جن انسانی روپ میں مجھ سے مخاطب بھی ہوئے، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی لیکن نقصان نہیں پہنچایا۔ جِنّات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں کو پریشان کرنے والے بھی، ہماری امی پر ایک جن صاحب آ گئے تھے، کافی پریشانی ہوئی، اس کی تفصیل مَیں نے امی کے خاکے میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ یہاں ایک اور واقعہ بیان کروں گا ۔ میرے ایک دوست کی بیوی (وہ بھی پروفیسر ہے) اس مشکل سے دو چار ہوئی۔ پروفیسرنی صاحبہ کی بعض حرکات ایسی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ جِنّات کے اثر وغیرہ کا ہے۔ اسے کسی عامل کے بارے میں معلوم ہوا، سردیوں کا زمانہ تھا میرے دوست نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں مجھے کسی نے ایک عامل کے بارے میں بتایا ہے جو ڈیفنس کے پاس کسی کچی بستی میں رہتا ہے اس کے پاس بیگم کو لے جانا ہے اچھا ہے ایک سے دو ہوں گے، نہ معلوم کیا صورت ہو، میں تیار ہو گیا، اس کی طبیعت واقعی خراب تھی، میں اس کے ساتھ ہو لیا، مغرب کے بعد وہ عامل مریضوں کو دیکھا کرتا تھا، ہم بعد نماز مغرب وہاں پہنچ گئے۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے ان کو فارغ کرنے کے بعد اس عامل نے پروفیسرنی صاحبہ کو اپنے دائیں جانب بٹھا دیا، اس کے برابر میرا دوست بیٹھا تھا، عامل نے تفصیل معلوم کی اور عمل شروع کر دیا، خاتون

کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا،بڑی بڑی آنکھیں باہر کی جانب، ہم سب کو گھور گھور کر دیکھنے لگی، عامل نے یہ محسوس کیا کہ جن آسانی سے نہیں جائے گا چنانچہ اس نے اپنے کارندوں کو کوئلے دہکانے کے لیے کہا، کمرے کی لائٹ مدھم کر دیں، عامل بہت زیادہ موٹے دانے والی تسبیح لے کر کھڑا ہوگیا اور تسبیح پڑھنے لگا، اتنے میں کوئلے دھک گئے، عامل نے دھکتے کوئلوں کو ایک مخصوص برتن میں ڈال کر پروفیسرنی صاحبہ کی ناک کے نیچے کیا اور ان پر چھوٹی سرخ مرچیں جن پر اس نے تسبیح پڑھنے کے بعد پھونک ماری تھی کوئلوں پر ڈال دیں، مرچوں کی دھونی سے ہم سب کا برا حال لیکن وہ خاتون جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا، اس عامل نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال پکڑے دوسرے ہاتھ سے مرچوں کی دھونی اس کی ناک میں زبردست طریقے سے دی، کافی دیر کے بعد اس پر کچھ اثر ہوا، عامل اس سے مخاطب ہوا، پوچھا کہ 'بتا تو کون ہے'؟ مردانہ آواز میں جواب دیا کہ ' میں جن ہوں'، تعداد کیا ہے، اکیلا ہوں، اس عورت کو چھوڑ دے، کہنے لگا کہ یہ میری بیوی ہے میں نہیں جاؤں گا وغیرہ وغیرہ، عامل نے یہ عمل دہرایا، مرچوں کی دھونی نے اس کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں کا برا حال کر دیا تھا لیکن وہ عورت اطمینان سے تھی، آخرکار عامل نے 'جن' کو جانے پر مجبور کر دیا، اس نے جانے کا وعدہ تو کرلیا لیکن فوری طور پر نہیں گیا، ہم یہ سمجھے کہ وہ چلا گیا، واپسی کا سفر شروع ہوا، میرا دوست پہلے ہی بیمار تھا اس صورت حال کے بعد اسے سردی اور بخار ہوگیا، ڈیفنس سے گلشن اقبال تک

کا سفر خاصا طویل تھا، میرے دوست کے لیے گاڑی چلانا ممکن نہیں تھا، اس نے مجھ سے گاڑی چلانے کے لیے کہا، یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، وہ جب اگلی سیٹ پر بیٹھنے لگا اور بیوی کو پیچھے سیٹ پر بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اس کی بیوی نے مردانہ آواز میں کہا'' ہٹو میں آگے بیٹھوں گا''، میں گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا، میں نے جب یہ جملہ سنا تو میرے ہوش گم ہو گئے میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ یعنی 'جن' اس عورت میں موجود ہے، اب کیا ہو سکتا تھا، میرا دوست پیچھے بیٹھ گیا، اس کے ساتھ اس کی کوئی ۱۲ سال کی بیٹی بھی پچھلی سیٹ پر تھی، اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہوئے، وہ عورت نظر نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، میں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ راز داری کے ساتھ اس عورت پر نظر رکھے ہوئے تھا، میں بھی یہ چاہتا تھا کہ خاموشی ٹوٹے، اسی لمحے میرے دوست نے اس کی خیریت پوچھی، شاید وہ بھی چاہتا تھا کہ خوف کا ماحول خوش گوار ماحول میں بدل جائے، اس کے بولتے ہی وہ عورت مردانہ آواز میں چلائی ''خاموش بیٹھا رہے''، اس کے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی، کہنے لگی'' تو خاموشی سے گاڑی چلا''، میں نے اپنے دوست سے کچھ کہا، اس کے جواب میں وہ عورت مردانہ آواز میں مجھ پر برس پڑی، بولی، '' خاموش نہیں رہے گا، ابھی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا''، اس کے اس جملے نے میرے ہوش گم کردیے، میں اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ اگر اس نے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیا تو کیا ہوگا، میرے بدن کا ایک ایک رُواں کھڑا تھا، بدن کپکپانے لگا، وہ یہ جملہ کہہ

کر خاموش ہو گئی، میں بدستور گاڑی چلاتا رہا، جس قدر قرآنی آیات یاد تھیں وہ تمام مسلسل پڑھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ کسی بھی طرح منزل آجائے، جب ہم شہید ملت روڈ کے پل پر پہنچے تو وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی، کہنے لگی'' پان کھلا اور سگریٹ پلا''، میں نے جواب دیا کہ میں دونوں چیزیں نہیں استعمال کرتا اپنے میاں سے کہو وہ کھلائے گا.
اب تو جناب وہ زور سے دھاڑی کہنے لگی 'سگریٹ کی دکان پر گاڑی روک، سنا نہیں تونے، میں نے کہا کہ اچھا دکان آجائے تو روکتا ہوں لیکن میں نے گاڑی کی اسپیڈ کم نہیں کی، وہ بھی اس کے بعد خاموش ہو رہی، گھر آگیا، خدا کا شکر ادا کیا، چابی اپنے دوست کے حوالے کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ میرے دوست نے بتایا کہ وہ رات بھر سوتی رہی، صبح اٹھی تو اسے ان تمام باتوں کا علم نہیں تھا کہ اس نے رات میں دو مردوں کو کس قدر خوف میں مبتلا کیا، اس نے بتایا کہ اس عمل کے بعد اس کی بیوی ٹھیک ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا نہ بھولنے والا واقعہ ہے،جب کبھی مجھے اس کا خیال آجاتا ہے 'جن' سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ سے جِنّات پر میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔
خطوط نویسی کو ادبی صنف میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹر نیٹ کے عام ہونے سے قبل تک خطوط ہی ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے اور معلومات کے تبادلے کا اہم ذریعہ تھے،.برقی ڈاک (E-Mail) نے خطوط نویسی کو

تہس نہس کر دیا۔ ماضی میں لکھاریوں نے خطوط کے ذریعہ اپنے ادبی جوہر دکھائے، کتابی شکل میں شائع ہونے والے خطوط ادبی تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔ غالب علامہ اقبال، شبلی نعمانی، ابن انشا کے خطوط ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ مَیں نے جب سے لکھنے کی دنیا میں قدم رکھا، اس بات کی عملی کوشش کی کہ میرے نام لکھی گئی ہر ہر تحریر خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو محفوظ کرلوں اور مَیں نے ایسا ہی کیا، میرے علمی ذخیرہ میں ایک ہزار کے قریب خطوط محفوظ ہیں، یہ خطوط و تحریریں تمام طرح کے احباب کی ہیں جن سے میرا خط کتابت کا تعلق رہا۔ بعض اہم شخصیات جن کے خطوط میرے نام آئے اور وہ میرے پاس محفوظ ہیں ان میں حکیم محمد سعید، ڈاکٹر عبد المعید، ڈاکٹر انیس خورشید، محمد عادل عثمانی، ڈاکٹر غنی الا کرم سبزواری، الحاج محمد زبیر، میاں الطاف شوکت اور دیگر شامل ہیں۔

اپنی تلاش کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی کو اختصار سے خاکے کی صورت میں قلم بند کر سکوں تاہم بعض موضوعات طویل ہوگئے انہیں مختصر کرنے سے بات مکمل طور پر واضح نہ ہو پاتی، بہت سی باتیں ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ اپنی تلاش کی کوشش مَیں نے اپنے سعودی عرب میں قیام کے دوران ہی کی، جس کی بنیادی وجہ وقت اور کراچی کے ہنگاموں اور روز مرہ کے معمولات اور جھمیلوں سے بے فکری

تھی، آخر میں اپنی روداد حیات کو سیماب اکبر آبادی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

مری روداد' رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

جدہ، سعودی عربیہ ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء، مطابق ۲۵ ذیعقد ۱۴۳۲ھ

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

پروفیسر محمد احمد۔ پیکرِ بے مثال

شخصی خاکہ

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مَیں یکم اپریل ۱۹۷۵ء کو گورنمنٹ پریمیئر کالج ناظم آباد سے حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج ٹرانسفر ہو کر آیا۔ اس وقت پروفیسر جمیل واسطی سید کالج کے پرنسپل تھے۔ جمیل واسطی صاحب سندھ یونیورسٹی سے منسلک تھے، جب فیض احمد فیض اس کالج کے پرنسپل تھے تو واسطی صاحب سندھ یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کر عبداللہ ہارون کالج آگئے تھے۔ انگریزی کے استاد تھے، ۱۹۷۲ء میں فیض صاحب نے تعلیمی اداروں کو قومیائے جانے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار نہیں کی اور وہ کالج سے رخصت ہوگئے ان کے بعد پروفیسر م۔ ر۔ حسان کالج کے پرنسپل ہوئے ان کا تبادلہ اردو کالج میں ہوگیا تو پروفیسر جمیل واسطی سید کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ واسطی صاحب انتہائی نفیس انسان تھے۔ خوش پوش و خوش گفتار، ہمیشہ سوٹ وہ بھی ٹائی کے ساتھ زیب تن کیے رہتے۔ گفتگو اور وضع قطع سے نستعلیق تھے، کسی کے دکھ تکلیف کو دل سے محسوس کرتے اور ٹھنڈی آہ بھر کر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے۔ مجھ سے گرم جوشی سے ملے، گھنٹی بجائی چپراسی سے کہا زیدی صاحب کو بلایئے، کچھ ہی وقفے کے بعد زیدی

صاحب آگئے، یہ آفس سپرنٹنڈنٹ تھے، اچھے آدمی تھے، اللہ مغفرت فرمائے۔انھوں نے میری جوائینگ کی کاروائی مکمل کی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب کمرہ میں داخل ہوئے ،کالی شیروانی اور علی گڑھ پیجامہ میں ملبوس، دراز قدہرے رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے، بغل میں حاضری رجسٹر، دونوں ہاتھ چاک میں لت پت، ہنستے مسکراتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے، السلام علیکم کے بعد واسطی صاحب کی طرف استفسارانہ نظروں سے دیکھا، واسطی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا، یہ ہیں صمدانی صاحب ہمارے نئے لائبریرین گورنمنٹ پریمئر کالج سے ٹرانسفر ہوکر آئے ہیں، پھر واسطی صاحب نے ان صاحب کا مجھ سے تعارف کراتے ہوئے کہا آپ ہیں انیس الرحمٰن قریشی ہمارے میتھ کے استاد، جن کا علی گڑھ سے تعلق ہے،انیس الرحمٰن صاحب مجھ سے گرم جوشی سے ملے،اس لمحے ان کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ تھی۔بعد میں انیس صاحب کالج کے پرنسپل بھی ہوئے اور کالج میں میرے سب سے قریبی دوست بھی۔ابھی انیس صاحب سے ملاقات ہوہی رہی تھی کہ ایک اور صاحب کمرے میں داخل ہوئے ، یہ تھے شمشاد احمد خان صاحب، گٹھا ہوا بدن، چوڑا سینا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کلین شیو، سنجیدہ اور متین، ان سے بھی تعارف ہوا، شمشاد صاحب بھی بعد میں پروفیسر ہوئے اور پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ کمرے میں داخل ہونے والے تیسرے ایک نوجوان تھے، کم عمر، خوبصورت، چھوٹا قد، گندمی رنگ، چشمہ لگا ہوا، کلین شیو، پینٹ شرٹ پہنے ہوئے سنجیدہ اور بردباری نمایاں تھی، میرا خیال تھا کہ یہ اس کالج کے بی ایس سی کے طالب، علم

ہوں گے۔ سلام کے بعد وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر واسطی صاحب سے سنجیدگی سے مخاطب ہوئے اور لیب کے بارے میں کوئی مشکل بیان کی ، واسطی صاحب نے ’ٹھیک ہے ٹھیک ہے‘ کہا اور پھر میرا تعارف ان سے کرایا اور ان کے بارے میں مجھ سے کہا کہ یہ ہیں جناب راشد حیؔ صاحب، فزکس کے استاد ہیں، اب راشد صاحب سے مصافحہ ہوا، راشد صاحب کالج کے سب سے کم عمر استاد تھے،کچھ دن بعد میرے ایک عزیز کی شادی میں نظر آئے، میں نے پوچھا آپ یہاں کیسے، انہوں نے بھی یہی جملہ مجھ سے دوہرایا، گفتگو کے بعد یہ راز افشاں ہوا کہ راشد حیؔ اور مَیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریبات میں ملتے رہے ہوں گے لیکن تعارف نہیں ہوا، اب ہم کالج کے ساتھی ہی نہیں تھے بلکہ عزیز بھی۔اب مَیں اسٹاف روم میں گیا جہاں دیگر اساتذہ موجود تھے ، ان میں شعبہ اردو میں یونس صدیقی صاحب اور فضل الٰہی صاحب ، شعبہ سیاسیات میں اقبا ل صاحب اور عبدا لباری سراج صاحب ، شعبہ اسلامیات میں عبد الرشید راجا صاحب ، نظام سحرائی سندھی کے استاد تھے، شعبہ فزکس میں راشد حیؔ اوراشفاق احمد خان ، بوٹنی میں شمشاد احمد خان صاحب ، زولوجی میں انور محمد شاہ، شعبہ کیمسٹری میں ذکی صاحب اور غلام اصغر صاحب۔ میرے وہاں آجانے کے بعد کئی ساتھی آئے سب سے بہت اچھے قریبی دوستی رہی، بہت اچھا وقت گزرا۔ میرا تعلق کیونکہ لائبریری سے تھا اور حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج صبح و شام کی شفٹ میں تھا، صبح میں سائنس ،آرٹس فیکلٹی تھی اور شام میں آرٹس وکامرس فیکلٹی ، لائبریری ایک ہی

تھی، پرنسپل بھی ایک لیکن اساتذہ الگ الگ تھے، میری ذمہ داریوں میں شام کی شفٹ میں لائبریری کی نگرانی بھی قرار پائی۔ اب مجھے صبح ہی نہیں بلکہ شام میں بھی کالج آنا تھا۔ میرا گھر کالج سے نزدیک تھا، نئی نئی نوکری ملی تھی وہ بھی گریڈ ے اکی، جوانی کا خمار تھا، جوش وجذبہ تھا، گھر کی ذمے داریاں نہیں تھیں، مَیں نے شام میں بھی کالج آنا قبول کر لیا۔

حاجی عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج میرے لیے نیا نہیں تھا، میں نے بی اے اِسی کالج سے کیا تھا، اس زمانے میں فیض صاحب کالج کے پرنسپل تھے، کچھ اساتذہ سے سلام دعا تھی، آفس کے کچھ لوگ بھی واقف تھے، علاقہ بھی دیکھا بھالا تھا۔ اس زمانے میں میری رہائش کالج کے نزدیک آگرہ تاج کالونی میں تھی، میں َزمانہ طالب علمی سے ہی لیاری کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم تھا۔ اس وجہ سے مَیں نے اپنے آپ کو اس کالج میں اجنبی محسوس نہیں کیا۔ اگلے ہی دن شام کی شفٹ میں چلا گیا، شام کی شفٹ میں جوائننگ رپورٹ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت شام کی شفٹ کا سربراہ 'انچارج' کہلاتا تھا جو کے پرنسپل کو جوابدہ ہوا کرتا تھا۔ اب شام کی شفٹ کو مکمل کالج کا درجا حاصل ہو چکا ہے، شام کی شفٹ کا انچارج پرنسپل ہوتا ہے۔ مَیں سیدھا انچارج کے کمرے میں داخل ہوا، سلام کیا، انچارچ کی کرسی پر جو صاحب براجمان تھے انہوں نے کرسی سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور مجھے بیٹھنے کو کہا، میں نے اپنی جوائننگ کا بتایا جس پر وہ خوش

ہوئے، جو اساتذہ ان کے سامنے بیٹھے تھے ان سے میرا تعارف کرایا، ان اساتذہ میں پروفیسر ریاض الحسن قدوائی، احمد حسین صاحب، عبدالرحیم میمن، سید نسیم حسین زیدہ افتخار یوسف زئی، میر محمد شوروشامل تھے، بعد میں پروفیسر شفیق رحمانی صاحب سے بھی تعارف ہوا، رحمانی صاحب اسی کالج میں میرے استاد رہے تھے، انہوں نے سیاسیات پڑھائی تھی، ریاض الحسن قدوائی صاحب بھی
میرے استاد تھے، وہ تاریخ اسلام پڑھایا کرتے تھے،اکثر میرے ساتھی اور دوست بن چکے تھے۔
پروفیسر محمد احمد شام کی شفٹ کے انچارج اور پروفیسر جمیل واسطی سید کالج کے پرنسپل تھے۔ مَیں بدستور صبح وشام کالج آیا کرتا تھا، واسطی صاحب بہت نیک انسان تھے البتہ اپنے اصولوں میں سخت گیر، اس زمانے میں تعلیمی اداروں میں بیرونی عناصر، طلباء تنظیموں کا عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، خاص طور پر ستر (۷۰) کی دھائی میں طلباء تنظیموں کے نام سے سیاسی لوگوں نے تعلیمی اداروں میں بے جامداخلت بہت زیادہ شروع کردی تھی، حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج جس علاقے میں قائم تھا وہاں کااس (PSF) پاکستان پیپلز پارٹی کا طوطی بولا کرتا تھا اور پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا بھی تھا، بعض ایسے (BSO) علاقے میں غلبہ تھا، کچھ اثر بلوچ اسٹوڈنٹس فیڈریشن عناصر بھی تھے جو نہ تو پی ایس ایف کے تھے اور نہ ہی بی ایس او کے وہ دونوں ہی تنظیموں سے فائدہ اٹھا

یا کرتے تھے۔ انھوں نے کالج کو اپنے ناجائز کاروبار کا ذریعہ بنایا ہوا تھا، یہ عناصر فیض صاحب کے زمانے سے ہی کالج میں موجود تھے۔ طلباء تو وہ ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر امتحان پاس کرکے، ڈگری لینے کے بعد اپنے اپنے پیشوں میں مصروف عمل ہو جاتے ہیں، یہ لوگ تو برس ہا برس سے اسی کالج میں نظر آرہے تھے، جب مَیں ۱۹۶۸ ء میں اس کالج کا طالب علم تھا تو مَیں نے ایک لڑکے شوکت بلوچ کو دیکھا تھا جو اپنے آپ کو شوکت کامریڈ کہلوایا کرتا تھا، جب ۱۹۷۴ء میں مَیں اس کالج میں تبادلہ ہو کر آیا تب بھی یہ اس کالج میں موجود تھا اور جب مَیں ۲۳ سال اس کالج میں گزارنے کے بعد ۱۹۹۷ء میں گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد جارہا تھا تب بھی یہ شخص اسی کالج کی سیاست سے وابستہ تھا۔ اب یہ لڑکا نہیں رہا تھا بلکہ عمر رسیدہ شخص ہو چکا تھا لیکن اس کے روز و شب اسی کالج سے وابستہ تھے۔ امتحانات کے دنوں میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی منفی سرگرمیاں عروج پر ہوا کرتی تھیں، کبھی کبھی ہمیں اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہوا کرتا تھا، بس صبر کرکے رہ جایا کرتے تھے، جمیل واسطی سید صاحب نیک اور سیدھے سادھے آدمی تھے، غلط کام نہ کرتے اور نہ ہی کرنے دیا کرتے، چنانچہ کالج کے حالات بگڑتے چلے گئے، ایک طرف واسطی صاحب بیرونی عناصر سے نبرد آزما تھے دوسری طرف نہیں معلوم کیا غلط فہمیاں ہوئیں کہ ان کی پروفیسر محمد احمد صاحب سے ٹھن گئی، حالانکہ وہ تو صبح میں ہوا کرتے تھے اور محمد احمد صاحب شام میں، کیونکہ پرنسپل پورے کالج کا ایک ہی

ہوا کرتا تھا، محمد احمد صاحب کو ہر بات کے لیے پرنسپل سے ہی رابطہ کرنا ہوتا تھا،
بھی لکھنا ہوا کرتی تھی . دونوںACR پرنسپل کو شام کے انچارج کی سالانہ خفیہ رپورٹ
انگریزی کے پروفیسر تھے، خوب خوب انگریزی کے جوہر دونوں نے دکھائے ، نوبت
یہاں تک آ گئی کے معاملہ ڈائریکٹریٹ تک پہنچ گیا، واسطی صاحب نے محمد احمد صاحب کی
بھی خراب کردی تھی، محمد احمد صاحب نے بعد میں جب وہ پرنسپل ہوگئے واسطی ACR
صاحب کی وہ رپورٹ پڑھ کر سنائی، مجھے تو واسطی صاحب بہت ہی معصوم لگے، انہوں
نے یہ عمل غصے میں کیا، انھوں نے اس رپورٹ میں یہ کہنے کی کوشش کی کہ یہ شخص
جو اپنے ظاہر میں مذہبی ہے، شیروانی، علی گڑھ پیجامہ اور جناح کیپ پہنتا ہے، اس کا باطن
اس کے ظاہر سے مختلف ہے ،اِسی قسام کے الزامات جن کی بنیاد پر کوئی کاروائی ممکن نہیں
تھی واسطی صاحب نے محمد احمد صاحب پر لگائے ۔ڈائریکٹریٹ کے اعلیٰ حکام نے محسوس کیا
کہ اس جھگڑے کا حل یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کا تبادلہ کردیا جائے، ایسا ہی
ہوا، واسطی صاحب کا تبادلہ ملیر کے کالج میں کردیا گیا، شروع میں انہوں نے اپنا ٹرانسفر
رکوانے کی تگ ودو کی جب کامیابی نہ ہوئی تو خاموشی سے چلے گئے، لکھنے پڑھنے والے
آدمی تھے، ایک دفعہ ہمدرد لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی، پھر ملاقات نہ ہوسکی۔ محمد
احمد صاحب کو پرنسپل بنادیا گیا، اب وہ شام کے بجائے صبح آنے لگے، صبح میں اکثر
اساتذہ ان کے لیے نئے تھے ، مَیں ان سے زیادہ نذدیک تھا، انہوں نے اپنی وہی روش

رکھی، تمام اساتذہ کے ساتھ پیار محبت سے پیش آنا، ان کا خیال رکھنا، اپنی خوبیوں سے انھوں نے سب ہی اساتذہ کے دل جیت لیے تھے، سب ہی ان کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے، تاہم اساتذہ بیرونی عناصر کو اہمیت دینے، ان کے بعض کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی عادت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ محمد احمد صاحب ان بیرونی عناصر کے ساتھ از خود نمٹنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے جب کہ اساتذہ چاہتے تھے کہ ان کے خلاف مشترکہ کاروائی کی جائے، محمد احمد صاحب نے اپنی حکمت عملی سے بیرونی عناصر کو بھی اور اساتذہ کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے رہے اور کامیاب رہے۔

محمد احمد صاحب نے کالج کے آفس اسٹاف کو کھلی چھٹی دی ہوئی تھی، آفس کے تمام کام از خود کیا کرتے تھے، جب بھی کوئی لیٹر لکھنا ہوتا وہ مجھ سے کہتے آؤ میاں ذرا کاغذ قلم تو نکالو، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ڈکٹیشن دینگے اور مجھے لیٹر لکھنا اور ٹائپ کرکے لانا ہوگا، یہ وہ زمانہ تھا جب کمپیوٹر عام نہیں ہوا تھا، ٹائپ رائیٹر پر خط کتابت ہوا کرتی تھی، مجھے اس وقت بھی ٹائپنگ آتی تھی چنانچہ وہ ڈکٹیشن دیا کرتے اور میں لکھتا جاتا، بعد میں ٹائپ شدہ لیٹر انھیں لا دیتا، اگر غلطی ہوتی تو دوبارہ ٹائپ کیا کرتا، وہ اس لیٹر کو از خود لفافے میں ڈالتے ،ڈاک ٹکٹ لگاتے کالج سے واپسی پر ڈاکخانے میں ڈال دیا کرتے، آفس اسٹاف کی نااہلی کے باعث انھیں ایسا کرنا

پڑتا تھا۔ مجھ پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ سال کے اختتام پر اساتذہ کی سالانہ خفیہ رپورٹ لکھنے کا وقت آتا تو یہ کام بھی میرے سپرد تھا۔ایک ایک کرکے ہر ٹیچر کی ACR Pen لکھواتے مَیں پیراگراف ٹائپ کرکے لاتا پھر ہم ٹائپ شدہ پیراگراف متعلقہ Picture ٹیچر کی اے سی آر میں پین پکچر کے خانے میں چسپاں کردیا کرتے۔ ایک اے سی آر کی چار کاپیاں بنائی جاتی تھیں، ہر ایک میں تقریباً دس یا پندرہ خانے ہوتے ان میں سے کرنا ہوتے تھے، محمد احمد صاحب (Innitial) کسی ایک پر پرنسپل کو اپنے چھوٹے دستخط چار میں سے ایک پر اپنے دستخط کرکے مجھے دے دیا کرتے میں متعلقہ خانوں میں نقطے لگا کر دیا کرتا پھر وہ جلدی جلدی اس پر اپنے چھوٹے دستخط کرتے جاتے، ہر سال کی اے سی آر کی فائلوں کو رکھنا بھی میری ذمہ داری تھی، یہ بات تھی اعتماد اور بھروسے کی، ان اے سی آر میں میری اپنی اے سی آر بھی ہوا کرتی تھی۔ پین پکچر پر یاد آیا، دلچسپ واقعہ ہے جو ہمارے دور میں بہت مشہور ہوا، مَیں ان پرنسپل صاحب کا نام نہیں لکھوں گا، لیکن یہ بات درست اور حقیقت ہے کہ میرے ہی کالج کے ایک پروفیسر صاحب پرنسپل ہو کر اندرون سندھ کے کسی ایک کالج میں چلے گئے، سال ختم ہونے پر انھیں اپنے ماتحت عملے کی اے سی آر بھی لکھنا تھی، سوانھوں نے لکھیں، پین پکچر کا مطلب وہ یہ سمجھے کہ یہاں متعلقہ ٹیچر کی تصویر اپنے پین سے بنانا ہے، کسی سے مشورہ کیے بغیر انہوں نے آؤ دیکھا نا تاؤ ہر ٹیچر کی تصویر اپنے پین سے اس خانے میں بناتے چلے گئے، ڈائریکٹر

صاحب نے جب اس کالج کی اے سی آر دیکھیں تو سر پکڑ کر رہ گئے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس بات کو راز ہی رہنے دیتے لیکن انہوں نے محفلوں میں رازداری سے اس کا ذکر بھی کیا، ایسا اس وجہ سے ہوا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے اساتذہ کو سینیارٹی کی بنیاد پر انتظامی امور سونپ دئے جاتے ہیں، ان کے لیے انتظامی امور کی تربیت کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ محمد احمد صاحب یہ قصہ اکثر سنایا کرتے تھے اور ہم سب محظوظ ہوا کرتے۔ عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج کراچی کے دیگر کالجوں سے قدرِ مختلف تھا، اسی طرح جب پروفیسر انیس الرحمٰن قریشی صاحب پرنسپل ہوئے تو وہ بھی کالج کے تمام انتظامی امور از خود انجام دیا کرتے تھے، یہاں تک کے کیش بک بھی وہ از خود ہی لکھنے لگے تھے، اس کی وجہ کیشیئر پر عدم اعتماد تھا۔

محمد احمد صاحب مجلسی آدمی تھے، آپ کے گرد لوگوں کا گھیرا لگا رہتا، آپ کا مطالعہ وسیع نظر گہری، یادداشت غیر معمولی اور نپی تلی تھی دورانِ گفتگو ادیبوں اور شاعروں کے، قصے اور واقعات سنانا آپ کی عادت تھی، اسلامیہ کالج سکھر کا بہت زیادہ ذکر کیا کرتے خاص طور پر اس کالج کے ایک استاد جنہیں وہ 'خدا دوست' کہا کرتے تھے بہت ذکر کیا کرتے، ان کے قصے خوب سنایا کرتے، آپ کو اشعار بھی بہت یاد تھے اور ان کا بر محل استعمال بھی انھیں خوب آتا تھا۔ وقت پر کالج آیا کرتے، ان کے وقت پر کالج آجانے سے کالج کا نظام درست

رہتا تھا، کسی بھی ادارے کا سربراہ وقت کا پابند نہ ہو تو بہت سے مسائل بلا وجہ جنم لینا شروع کردیتے ۔ اسی کالج میں ہمارے ایک پرنسپل صاحب ایسے بھی بنے تھے جو صبح دس بجے سے پہلے کالج نہیں آیا کرتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ وہ صبح سویرے نہیں اٹھ سکتے کیونکہ انھیں صبح کے وقت کالے پیلے چکر آتے ہیں۔ محمد احمد صاحب اپنے ساتھیوں کا بہت خیال رکھنے والے تھے، کسی بھی ٹیچر کے ساتھ کوئی پریشانی ہوجاتی تو اس سے ہمدردی ہی نہیں کرتے بلکہ اس پریشانی کو حل کرنے میں پورا پورا ساتھ دیا کرتے ۔کالج اساتذہ کے لیے الیکشن ڈیوٹی بہت ہی پریشانی کا مرحلہ ہوا کرتا تھا، ہمارے کالج کے تمام ہی ساتھیوں کی الیکشن ڈیوٹی لیاری میں لگا کرتی تھی، یہ علاقہ پیپلز پارٹی کا حلقہ انتخاب تھا اور آج بھی ہے، کم پڑھے لکھے، غریب اور متوسط لوگ یہاں رہتے ہیں لیکن ان میں سیاسی شعور بہت ہے، یہاں کے مرد ہی نہیں بلکہ خواتین کچھ اور کریں یا نہ کریں ہر الیکشن میں جیے بھٹو کے نعرے ضرور لگاتی ہیں اور الیکشن والے دن پولنگ اسٹیشن پر ضرور موجود ہوں گی، ان کا نام ووٹر لسٹ میں ہو یا نہ ہو، ان کی بلا سے انہیں ووٹ ہر صورت میں ڈالنا ہوتا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ رہا ہے، مَیں نے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۷ء تک تمام ہی انتخابات میں پریزائیڈنگ آفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اس دوران لیاری کے مختلف علاقوں میں تعینات رہا، یہاں کے لوگوں میں غربت اورناخواندگی کے باوجود سیاسی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ محمد احمد صاحب کی پوری کوشش ہوا کرتی تھی کہ ان کے

کالج کے ٹیچر کسی بھی طرح الیکشن ڈیوٹی سے بچ جائیں۔ کوئی ٹیچر بیمار ہوجاتا تو اس کی خبر گیری کیا کرتے، زیادہ بیماری کی صورت میں اس کے گھر مزاج پر سی کو بھی جاتے۔ ہو گیا، نوبت آپریشن کی آ گئی، (Fistula) اگست ۱۹۸۲ء کی بات ہے مجھے فسچیو لا کراچی پورٹ ٹرسٹ کے اسپتال میں جو کیماڑی میں ہے آپریشن ہوا، ڈاکٹر رضا نے یہ آپریشن کیا، مَیں کوئی ۱۹ دن اسپتال میں رہا، کالج میں چھٹی کی درخواست بھیج دی تھی۔ محمد احمد صاحب میرے گھر آئے، تسلی دی، حاضری رجسٹر ان کے ساتھ تھا، میرے دستخط کرائے اور مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک آرام کا مشورہ دیا۔ اس طرح کا طرز عمل میرے ساتھ ہی نہ تھا وہ کالج کے تمام اساتذہ

کے ساتھ بھی نیکی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ شیوا بریلوی نے کیا خوب کہا ؎

کوئی آساں نہیں ناصح مشفق بنا

کچھ سلیقہ بھی درکار نصیحت کے لیے

پروفیسر محمد احمد صاحب کا تعلق ہندوستان کے شہر شاہجہاں پور سے تھا۔ بچپن سے ہی ذہین اور پڑھاکو تھے، معاشیات میں ایم اے کیا، گولڈ میڈل حاصل کیا تھا، پھر انگریزی میں بھی ایم اے کیا، نثر اور نظم دونوں میں عبور حاصل تھا، شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ جوانی میں شوقین مزاج تھے، ازدواجی زندگی

کامیاب نہیں ہوئی، شادی ہوئی اور علاحدگی ہو گئی، پھر شادی نہیں کی، زندگی تنہا اپنے بھائی اور ان کی اولاد کے ساتھ ہی گزار دی، اسلامیہ کالج سکھر پروفیسر محمد احمد صاحب کی پہچان تھا جہاں پر آپ نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت گزارا، سکھر میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج کو ایک اہم مقام حاصل تھا، پروفیسر حنیف شاکر جو سکھر میں پروفیسر محمد احمد کے شاگرد رہ چکے تھے اور گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد میں میرے ساتھی بھی رہے کہ مطابق ”نسیم الہدیٰ صاحب نے ۱۹۶۱ء میں اسلامیہ اسکول و کالج کی بنیاد رکھی تھی، محمد احمد صاحب جو اس وقت اسکول میں استاد تھے کو کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا، آپ کا تعلیمی ریکارڈ بہت ہی شاندار تھا، اچھے اور قابل استاد تھے، انتظامی امور کو انجام دینے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ منتظم کی حیثیت سے آپ انتہائی بہ اصول اور سخت گیر تھے، اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ آپ کا رویہ سخت ہوا کرتا تھا“۔ بسا اوقات وقت اور حالات انسان کو بالکل مختلف بنا دیتے ہے لیکن ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آخری سانس تک اپنی اُسی روش پر قائم و دائم رہتے ہیں۔ پروفیسر محمد احمد کو وقت اور حالات نے مختلف بنا دیا تھا، ۱۹۷۳ء میں وہ سکھر سے کراچی آ گئے اور ان کا تبادلہ حاجی عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ہو گیا جہاں پر انہیں شام کی شفٹ کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب وہ ایک مختلف انسان تھے، مزاج میں نرمی، پیار محبت، حد درجہ انکساری، ہمدردی، خیال کرنے والے، حتیٰ کہ انتظامی امور میں بھی انتہائی

نرم اور در گزر کرنے والے۔ وہ اپنے لباس ، وضع قطع اورتراش خراش سے علی گیرین نظر آیا کرتے تھے ، ان کی گفتگو اور طور طریقوں میں بھی علیگیوں کی سی نستعلیقیت واضح تھی۔ شین قاف درست ، چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ دل نشیں گفتگو کیا کرتے، وضع داری ان پر ختم تھی، ان کے آفس میں کوئی چھوٹا یا بڑا داخل ہوتا تو اپنی کرسی سے اُٹھ کراس سے مصافحہ کیا کرتے، خواہ اس وقت کتنا ہی بڑا شخص پہلے سے ان کے پاس کیوں نہ بیٹھا ہوتا یا وہ کتنا ہی ضروری کام ہی کیوں نہ کر رہے
ہوتے۔ بہ قول الطاف حسین حالیؔ ۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا

خاکساری اپنی کام آئی بہت

چھوٹا قد، گندمی رنگ، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، ستواں ناک جس کے نیچے سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، سر پر کالے سفید بال ،، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت ، تحمل ، وضع داری اور بردباری کا خوشگوار اظہار۔ موسم گرم ہو یا سرد، باد و باراں ہو یا خوش گوار، آندھی چل رہی ہو یا سخت حبس محمد احمد صاحب شیروانی اور علی گڑھ کاٹ پیجامے اور سر پر جناح کیپ لگائے، ہاتھ میں تسبیح لیے خرامہ خرامہ بس اسٹاپ سے کالج اور کالج سے بس

اسٹاپ کی طرف رواں دواں رہتے ، یہ ان کا مستقل لباس تھا، جب کبھی وہ شیروانی اتار کر وضوع کیا کرتے تو ان کے سفید کرتے میں کئی پیوند لگے ہوتے جو صاف نظر آیا کرتے، پرانے کپڑے میں پیوند لگنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن نئے کرتے میں پیوند سمجھ سے بالا تھے،ان پیوندوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کسی اناڑی نے لگائے ہیں، مَیں جب بھی یہ دیکھتا ذہن میں یہ خیال ضرور آتا کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے، وہ دستگیر سوسائیٹی، فیڈرل بی ایریا میں رہا کرتے تھے، اتفاق سے میں بھی دستگیر میں ہی منتقل ہوگیا، میرا گھران کے گھر کے پاس ہی تھا، اب میں کبھی کبھار ان کے گھر چلا جاتا، نیچے کی منزل میں ان کے چھوٹے بھائی اپنی فیملی کے ہمراہ رہا کرتے تھے ، گھر کی پہلی منزل پر ایک کمرہ محمد احمد صاحب کا ٹھکانا تھا، کتابوں کی الماری، پڑھنے لکھنے کی میز اور کرسی ، ایک الماری کپڑوں کی، سونے کے لیے فرش پر بستر لگا ہوا، کمرے میں صفائی ستھرائی کا فقدان نظر آتا تھا۔ گھر میں ہوتے تو بنیان اور دھوتی پہنے ملتے، سگریٹ پیا کرتے تھے، ابتدا میں سگریٹ خود بنا کر پیا کرتے ، پھر پائپ میں تمباکو پینے لگے ، میز پر تمباکو بکھرا ہوا ملتا۔ ایک دن میں نے ان سے کرتے میں پیوند والی بات پوچھ ہی لی کہ آپ کے صاف اور نئے کرتے میں بھی پیوند لگے ہوتے ہے؟ کہنے لگے یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔اب مَیں آگے کچھ نہ بول سکا، میری حیرت دور ہو گئی۔ان کی شادی کامیاب نہیں رہی ، علیحدگی ہو گئی تھی، وہ میرے آفیسر تو تھے لیکن ان سے دوستانہ مراسم ہوگئے

تھے۔ ان سے ہر قسم کی بات کرلیا کرتا تھا۔ ایک دن مَیں نے کہا کہ 'آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے اگر آپ تیار ہوں تو کوشش کی جائے'۔ مَیں نے پورا جملہ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ ان کی باتوں سے لگا کہ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے عزیزوں میں ایک خاتون ایسی تھیں جو عمر اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ان کے لیے مناسب لگیں۔ پہلے مَیں نے ان خاتون کے بھائی سے بات کی ان کی رضامندی کے بعد محمد احمد صاحب سے کہا کہ میرے عزیزوں میں ایسی خاتون ہیں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی، عمر کے اعتبار سے آپ کے لیے مناسب ہیں، نمازی پرہیزگار بھی ہیں۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو میرے ہمراہ چلیں، بات کرلیتے ہیں، انھوں نے کہا ٹھیک ہے، وقت لے کر مَیں انھیں لڑکی والوں کے گھر لے گیا، گفتگو ہوئی، دونوں ہی نے ایک دوسرے کو پسند کیا لیکن نہیں معلوم بات آگے نہیں بڑھ سکی، بات آئی گئی ہو گئی، حسن اتفاق دیکھیے کہ کچھ عرصے بعد ان خاتون کی شادی سکھر ہی میں ایک صاحب سے ہو گئی، مَیں ان سے ملا معلوم ہوا کہ وہ محمد احمد صاحب کے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ مَیں نے محمد احمد صاحب سے کہا کہ جہاں مَیں آپ کو رشتے کے سلسلے میں لے گیا تھا، ان خاتون کی شادی سکھر میں آپ کے ایک دوست سے ہو گئی ہے نام بتایا تو وہ بھی پہچان گئے کہنے لگے کہ وہ تو میرے بہت پرانے اور اچھے دوست ہیں۔ یہ محض اتفاق تھا، وہ خاتون اب اس دنیا میں نہیں۔ محمد احمد صاحب میرے کالج سے ریٹائر ہو گئے جس دن ریٹائر ہوئے دوسرے ہی دن سے انھوں نے پاکستان نیوی کے

کسی تعلیمی ادارے کو جوائین کر لیا تھا۔

کافی عرصے وہاں پڑھاتے رہے۔ جب ہمت بالکل جواب دے گئی تو گھر بیٹھ گئے۔

۱۹۸۰ء کی بات ہے میری تیسری کتاب جو کہ انٹر میڈیٹ سال اول کے لیے تھی شائع ہونا تھی۔ مَیں نے پروفیسر محمد احمد صاحب کو کتاب کا مسودہ مقدمہ تحریر کرنے کے لیے دیا، آپ نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا، آپ نے میرے بارے میں لکھا" فاضل مصنف میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور سلیقہ ہے انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور معلومات کو اپنی فطری انہماک و نشاط کے ساتھ قلم بند کیا ہے جو ان کی صلاحیت ، قوت عمل اور فکری ارتقاء کا نمونہ ہے۔ کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں اس کے اندران کا خون جگر بھی شامل ہے معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود'۔ احقر فاضل مصنف سے ایک عرصے سے واقف ہے اور بغیر تکلف کے کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ ان کی علمی گفتگو، ذوق سلیم ، وغیرہ معمولی حافظہ ، تاریخی شعور سے نہ صرف متاثر ہے بلکہ کافی استفادہ کیا ہے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت لائبریری سائنس کی اعلیٰ ترین ڈگری سے مزین ہے۔ انھوں نے لائبریری سائنس کے علوم میں ایک ماہر فن کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ میں پورے وثوق سے کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ اس کتاب سے صرف طالب علم ہی نہیں بلکہ ہر وہ انسان جس کا علم و ادب سے لگاؤ ہے مستفید ہو سکتا ہے۔" مجھ جیسے کم علم کے بارے میں

پروفیسر محمد احمد صاحب کی یہ رائے میرے نزدیک عظمت کی دلیل ہے۔ حقیقت یہ کہ آپ ایک عظیم انسان تھے اور عظیم شخصیتوں کے ساتھ رہنا بھی عظمت ہوتا ہے، مجھے اس بات پر فخر حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی میں کئی سال محمد احمد صاحب کے زیر سایہ رہا۔ ''یہ عنائتیں یہ نوازشیں مری ایک مشت غبار پر''۔ پروفیسر محمد احمد صاحب کی مکمل زندگی تدریس اور علمی خدمت میں گزری۔ آپ سادگی کا نمونہ تھے، انکساری اور عاجزی آپ کا شعار تھا۔ ایک دن اطلاع ملی کہ محمد احمد صاحب کا انتقال ہوگیا، میں ان کی تدفین میں شریک نہ ہوسکا، افسوس ہوا، کہتے ہیں موت العالِم

موت العالَم کے مصداق ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

کتنی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی

کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

فیفاء، جیذان، سعودی عرب، ۱۴اگست

۲۰۱۱ء، مطابق ۴ رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

پروفیسر لطیف اللہ۔ علم وہنر کا پیکر

شخصی خاکہ

ناظم آباد نمبر ۳ گول مارکیٹ سے چند قدم آگے ڈاکٹر ضیاء الدین میموریل اسپتال سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک مثلث نما کشادہ جگہ کے انتہائی بائیں جانب کارنر کا ایک خستہ حال مکان جس کے ایک کمرے کا دروازہ باہر کی جانب کھلا ہوتا ہے ، سامنے پلنگ پر سفید چادر ، دو عدد لکڑی کے صوفے جن میں سے ایک پر کچھ گرد آلود کتابیں اور چند ریک جن میں کتابیں ہی کتابیں رکھی نظر آتی ہے۔پلنگ پر ایک بزرگ لیٹے ہوتے ہیں۔ دھان پان جسم ، چھوٹا قد، گندمی رنگ، چہرے پر' شہاب نامہ' کے مصنف قدرت اللہ شہاب جیسی داڑھی ، کبھی اس قسم کی داڑھی ویت نام کے عظیم رہنما''ہوچی مِنہ' کی مشہور تھی، بنگال کے اکثر لوگ بھی اسی قسم کی داڑھی رکھتے ہیں۔سر پر سفید مٹیالے بالوں کا ٹراسا گچھا جس نے ان کے چہرے کو نمایاں کیا ہوا ہے ۔ یہ ہیں گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد کے ایک ریٹائرڈ استاد'' پروفیسر لطیف اللہ'' جنھوں نے ۲۲ سال (۱۹۶۶ء ۔ ۱۹۸۸ء) کالج میں تدریسی فرائض انجام دئے۔ ایک ایسا فلسفی ، سائنس داں، مصنف و محقق یا شاعر جو صرف اپنی دنیا میں مگن ہو اس کی جیتی جاگتی تصویر پروفیسر لطیف اللہ میں نظر آتی ہے۔ان پر ابن انشاء کا کہا ہوا یہ جملہ صادق آتا ہے

جو انہوں نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے ایک سابق پروفیسر انجم اعظمی کے لیے لکھا تھا کہ ''یہ چہرہ عصر حاضر کے تب وتاب کو سمیٹنے والے شخص کا چہرہ نہیں۔نہ فقط ان کے محبوب کا روئے دل آرا ہے بلکہ ایک عالم کا چہرہ ہے۔ کہیں شاداب' کہیں وقت کی تمازت سے جھلسا ہوا' کہیں روشن' کہیں دھندلا' کہیں پورا کہیں آدھا''۔

پروفیسر لطیف اللہ کا تعلق راجستھان کے علاقے ''الور'' سے ہے جو دہلی کے نزدیک تر واقع ہے۔ گویا لطیف اللہ راجستھان کی علمی و ادبی تہذیب کی نمائندہ شخصیات میں سے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ اردو کے علاوہ فلسفہ اور تصوف ان کے خاص موضوعات ہیں۔ کالج میگزین روایت' کے گولڈن جوبلی نمبر کی اشاعت کا فیصلہ ہوا تو کالج کے سابق اساتذہ کا یاد کیا' جانا ایک لازمی امر تھا چنانچہ دیگر شخصیات کے علاوہ پروفیسر لطیف اللہ کی تلاش شروع ہوئی۔ کئی احباب سے معلوم کیا لیکن کچھ پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ ایک روز اپنے کالج کے کامرس سیکشن میں کسی طرح لطیف اللہ صاحب کا ذکر آ گیا، میں نے ذکر کیا کہ مجھے ان کی تلاش ہے، نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ منصور صاحب نے فرمایا کہ لطیف اللہ صاحب تو ناظم آباد نمبر ۳ میں ہی رہتے ہیں، انھوں نے راستہ سمجھایا کہ اس اس طرح ان کے گھر پہنچا جا سکتا ہے۔ میں اگلے ہی دن

بتائے ہوئے راستے پر نکل کھڑا ہوا، گول مارکیٹ کے ارد گرد چکر لگائے، مگر ناکامی ہوئی۔کچھ عرصہ بعد اپنی ناکامی کا ذکر منصور صاحب سے کیا کہ مجھے آپ کا بتایا ہوا لطیف اللہ کا گھر نہیں ملا۔ انہوں نے ازراہ عنایت مجھے اسی وقت ساتھ چلنے کا کہا، میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنی گاڑی ان کی گاڑی کے پیچھے لگا دی اس طرح ہم لطیف اللہ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا، پلنگ پر ایک بیمار شخص لیٹا نظر آرہا تھا، سفید کرتا پاجامہ اور زلف پریشان، چہرے پر اداسی اور تکلیف نمایاں تھی، ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھے، سلام دعا ہوئی، میں نے مدعا بیان کیا، آپ نے وعدہ بھی کرلیا لیکن جب میں کوئی پندرہ دن بعد ۹ اپریل ۲۰۰۸ء کو دوبارہ یاد دہانی کے لیے پہنچا تو انھوں معذرت کی اور کہا کہ وہ اب خود تو لکھ نہیں سکتے شاید کسی دوسرے کی مدد کے منتظر رہتے ہیں، یہ مدد نھیں اس دوران نہیں مل سکی۔ ان کی کمزوری کی وہی کیفیت میں نے دیکھی تو ان سے گفتگو کا آغاز کر دیا اور ساتھ ہی جو کچھ وہ بول رہے تھے نوٹ بھی کرتا جارہا تھا۔انھوں نے بھی جب مجھے نوٹ لیتے دیکھا تو زیادہ دلچپی سے گفتگو شروع کردی۔اپنی گفتگو کا آغاز ہی اقبال کے فلسفہ خودی، وحدت الوجود، امیر خسرو اور اسی طرح کے فلسفیانہ موضوعات پر بولتے رہے، اپنے بارے میں بتایا:

میں نے ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ڈائریکٹر آف اسکول ایجوکیشن (اس وقت ڈائریکٹر ”

اسکول بورڈ تھا) کے آفس میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور اردو میں ایم اے کر لیا۔ یہاں میری ملازمت کا سلسلہ ۱۹سال یعنی ۲۷اکتوبر ۱۹۶۶ء تک جاری رہا۔ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں جگہ خالی ہوئی وہ اس طرح کہ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے کالج سے جامعہ کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا ان کے چلے جانے سے ایک لیکچرر کی جگہ خالی ہوئی اس سیٹ پر میرا تقرر بہ طور لیکچرر اردو کے ہوا اور میں نے ۲۸اکتوبر ۱۹۶۶ء کو اپنی ملازمت کا آغاز کیا جو میرے ریٹائر منٹ ۱۵جولائی ۱۹۸۸ء تک جاری رہی۔ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد کے شعبہ اردو میں اس وقت ڈاکٹر عبد السلام، شاہد عشقی، انجم اعظمی پہلے سے تھے اب میرا اضافہ ہوا۔ بعد میں ڈاکٹر حسن محمد خان، سراج الدین قاضی صاحب بھی آ گئے۔ کالج میں بہت اچھا ماحول تھا، سب ہی اساتذہ اچھے تھے۔ میں کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں طلباء کی رہنمائی کیا کرتا تھا، کالج کے طلبہ بھی سرگرم رہتے، پروفیسر ظہیر احمد صاحب پرنسپل تھے انہوں نے کالج میگزین کی ذمہ داری مجھے سونپ دی اور میگزین کا نگرانِ اعلیٰ بنا دیا۔ اس سے قبل کالج کے جو میگزین شائع ہوئے وہ ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر عبد السلام کی نگرانی میں شائع ہوئے تھے۔ اب یہ اہم ذمہ داری میرے کاندھوں پر تھی۔ اس کام میں میرے شریک کار پروفیسر سراج الدین قاضی تھے جنھیں شعبہ اردو کا نگراں مقرر کیا گیا اور پروفیسر خواجہ نیاز حامد کو شعبہ انگریزی کا نگراں مقرر کیا گیا۔ ہم سب نے مل کر مجلے کی

ترتیب واشاعت کاکام شروع کیا۔ ہماری یہ کاوش ''روایت ۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء'' کی صورت میں سامنے آئی۔ کالج کے میگزین کے حوالے سے اس بار ایک نئی روایت بھی قائم ہوئی وہ یہ کہ اس سے قبل کالج میگزین ''المنورہ'' کے نام سے شائع ہوتا رہا تھا۔ ہم نے ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج کے میگزین کا نام 'روایت' رکھا۔ اس نام سے روایت شائع بھی ہوا۔ اس میں کیا کچھ ہے وہ آپ کو اس شمارے سے اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔ اس میگزین میں میرا ایک مضمون ''رسول ﷺ کی سیاسی زندگی'' شامل ہے۔ ایک اور بات یہ کہ کالج میگزین کا یہ نام تاحال روایت ہی ہے اور یقینا گولڈن جوبلی کے موقع پر جو خاص شمارہ شائع کیا جارہا ہے۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے حوالے سے ایک طالب علم شہنشاہ حسین کا ذکر ضرور آتا ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ وہ ان استادوں کی بے انتہا عزت و تکریم کیا کرتا تھا جو کسی بھی قسم کی سیاست میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ وہ میرا براہ راست شاگرد نہیں تھا لیکن میرا حد درجے احترام کیا کرتا تھا، البتہ ایک اور طالب علم مسرور احسن گستاخ تھا لیکن اس نے میرے ساتھ کبھی بدتمیزی نہیں کی۔ اگر کبھی وہ سگریٹ پی رہا ہوتا اور میں وہا ں سے گزر بھی جاتا تو وہ اپنا ہاتھ پیچھے کی جانب کر لیا کرتا تھا اس کے برعکس ایسا بھی ہوا کہ اس نے سگریٹ کا دھواں استاد کے منہ پر چھوڑا، اس کی بھی بعض وجوہات تھیں میں ان

میں جانا نہیں چاہتا۔

آپ نے میرے دور کے پرنسپل صاحبان کے بارے میں پوچھا تو جناب سارے ہی پرنسپل اپنے اپنے دور میں کالج کی بہتری کے کام کرتے رہے جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے تو ہر ایک کی عادات واطوار مختلف ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد حسن جعفری صاحب انتہائی سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے، نرم مزاج، شائستہ اور اچھے اخلاق کے مالک تھے۔کاظمی صاحب کے زمانے میں حالات میں تبدیلی آچکی تھی، طلباء سیاست میں سرگرم ہوگئے تھے، محکمہ تعلیم کے تحت جو تعلیمی ادارے تھے وہ اس وقت کی حکومت جو کہ بھٹو صاحب کی تھی کے حمایتی تھے۔ اسی اعتبار سے حالات بھی رہے۔ سموں صاحب کے دور میں کافی گڑبڑ رہی ۔ میں نے اپنے پورے تدریسی دور میں کبھی کسی بھی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لیا، تمام طلباء کو یکساں جانا، ہمیشہ اپنے سبق کے دائرے میں رہا، پڑھانا، کلاس لینا، شعر و شاعری، ادبی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں طلباء کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ جو لوگ سیاست میں کسی بھی طرح شامل ہوئے انھیں اس کے نتائج بھگتنا بھی پڑے۔پروفیسر ظہیر احمد بہت نفیس انسان ہیں۔جب پرنسپل تھے کالج کے تعلیمی اور انتظامی امور کو خوب صورتی سے چلایا۔ میرے بہت اچھے تعلقات رہے بلکہ جب وہ ریٹائر ہوگئے تو ان تعلقات میں زیادہ سرگرمی آ گئی۔ میں انھیں کے دور میں ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوا۔

میں اردو کا استاد تھا پڑھانے کے ساتھ ساتھ لکھنا میرا اوڑھنا بچھونا رہا اور اب بھی ہے۔ جہاں آپ بیٹھے ہیں یہ میری کائنات ہے۔ اس سے آپ کو میرے بارے میں کافی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اردو کے علاوہ تصوف اور فلسفہ میرا موضوع ہے۔ اس پر میں نے لکھا مضامین کی تعداد تو بہت ہوگی البتہ میری پانچ کتابیں ایسی ہیں جو میں نے فارسی سے ، اردو میں ترجمہ کیں، پانچ ذاتی تصانیف ہیں جو تصوف کے موضوعات پر ہیں ، میرا نعتیہ مجموعہ کلام بہ عنوان " مفلس کی سوغات" بھی شائع ہوچکا ہے۔ میرے مضامین پاکستان کے علاوہ ہندوستان سے بھی شائع ہوئے ۔ میرا ایک مضمون ایران کے رسالے دانش" میں شائع ہوچکا ہے۔ میری کتاب " مولانا جلال الدین رومی کا پیام عشق """ ہندوستان سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ ایک اور کتاب " تصوف اور سریت" بھی ہندوستان سے شائع ہوچکی ہے۔

صمدانی صاحب میں جب پاکستان میں فارسی زبان کو ناپید ہوتے دیکھتا ہوں تو دلی دکھ اور افسوس ہوتا ہے ۔ خاص طور پر وزارت تعلیم نے فارسی کی تدریس سے غفلت اختیار کرکے ہند اسلامی تہذیب کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور تخلیقی صاحیت کو ابھرنے اور بالیدہ ہونے کا موقع اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔ اب جو تہذیبی مظاہرے پڑھنے میں آتے ہیں وہ انتہائی شرم ناک اور قابل مذمت ہیں۔

کلاسیکی ادب اور فارسی سے غفلت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک صاحب جو فارسی کے استاد رہے ہمارے کالج میں انہوں نے چھے سے سات سال فارسی کا مصرع پڑھا اور نہ کوئی اور اردو کا ایسا شعر پڑھا جس پر کلاسیکی فارسی کا اثر ہو۔ اگر چہ یہ بات قابل قبول محسوس نہیں ہوتی لیکن واقعہ یہی ہے کہ فارسی کے استاد ہو کر فارسی سے اتنا دور ہو جانا قومی المیہ ہے''۔ (شائع شدہ مجلّہ 'روایت ۲۰۰۸ء، گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد)

پروفیسر لطیف اللہ کے بارے میں یہ میری یہ تحریر ۲۰۰۸ء کی ہے، جب میں گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد کے مجلّہ روایت کا چیف ایڈیٹر تھا اور مجھے روایت کا گولڈن جوبلی نمبر مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، اس وقت پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی کالج کے پرنسپل تھے، میں اسی حیثیت سے مجلّہ روایت کا ایک شمارہ ۲۰۰۴ء میں مرتب کر چکا تھا، گولڈن جوبلی نمبر کے لیے میں نے پروفیسر لطیف اللہ سے ملاقات کی ،اور ان کے بارے میں لکھا، میری یہ تحریر مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکی ہے میں جب کراچی میں تھا تو مجھے پروفیسر لطیف اللہ کے انتقال کا علم ہوا، افسوس اور دکھ کے سوا انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ اب ڈاکٹر اسلم فرخی کی خاکوں کی کتاب ''موسم بہار جیسے لوگ'' میں لطیف اللہ کا خاکہ بہ عنوان ''شیخ باچراغ:

شیخ لطیف اللہ" پڑھ کر مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی، ڈاکٹر اسلم فرخی، لطیف اللہ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے، دونوں کا ساتھ بہت طویل رہا، مجلّہ روایت کے اس گولڈن جوبلی نمبر کے سلسلے میں مَیں نے ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے گھر کے دو چکر لگائے تھے، انہوں نے اپنی تحریر از خود لکھ کر دیدی تھی جو متعلقہ روایت نمبر میں شامل ہے۔ لطیف اللہ صاحب کا خاکہ تفصیلی اور بہت عمدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف اللہ صاحب کو جنت الفردوس

میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

(شائع شدہ مجلّہ "روایت ۲۰۰۸ء، گورنمنٹ کالج برائے طلباء، کراچی

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

پروفیسر ڈاکٹر عبد السّلام۔ متاعِ دیدۂ تر

شخصی خاکہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے ان اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے کالج کے قیام کے ابتدائی دنوں (۱۹۵۶ء) میں تدریسی فرائض کا آغاز کیا۔اس سے قبل وہ اردو کالج میں ۲۵ جون ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک استاد کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج سے ۲۱ اگست ۱۹۸۲ء کو ریٹائر ہوئے ساتھ ہی جامعہ کراچی کے شعبہ اردو اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین میں ۲۰۰۰ء تک تدریس کے فرائض انجام دیے اس طرح آپ کی تدریسی خدمات ۱۹۴۹ء تا ۲۰۰۰ء یعنی ۵۱ برسوں پر محیط ہیں۔

۸۶ سالہ ڈاکٹر سلام ۲۰۰۰ء سے ضعیفی اور صحت کی خرابی کے باعث اپنے گھر تک محدود ہیں۔ گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے میگزین ''روایت'' کے گولڈن جوبلی نمبر ڈاکٹر عبد السلام کے تاثرات کے بغیر ادھورا ہی رہے گا چنانچہ ۷ اپریل ۲۰۰۸ء بروز پیر میں پروفیسر ہمایوں اقبال کے ہمراہ اپنے کالج سے ڈاکٹر عبد السلام کے گھر واقع نارتھ ناظم آباد کے بلاک 'ایچ' پہنچا، دروازے پر ڈاکٹر عبدالسلام' کے نام کی تختی لگی تھی، بیگم عبد السلام نے ہمیں ڈاکٹر صاحب تک

پہنچایا، وہ اپنے گھر کے کامن روم میں ڈائننگ میز کے قریب کرسی پر بیٹھے تھے ساتھ ہی واکر رکھی تھی، انتہائی نحیف، کمزور، چھوٹا قد، چھریرا بدن، سفید کرتا پائے جامہ پہنے، خس خسی مگر زیادہ سفید داڑھی، سر پر کالے سفید چند بال، چہرہ پر دانت نمایاں، لیکن بلند حوصلہ، بہ ہمت، خوش اخلاق، منکسر المزاج طبیعت۔ خوشی سے ملے، ہماری آمد ان کے لیے اچنبھا نہیں تھی بلکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھے کیوں کہ چند روز قبل ہمایوں اقبال صاحب ان کے گھر جا چکے تھے اس وقت وہ قطعاً اس قابل نہیں تھے کہ گفتگو کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کی بیگم جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ بھی اردو میں ایم اے ہیں اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کرانے میں پھرتیلے انداز میں مصروف تھیں۔ جس قدر وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزرا ان کی بیگم جو خود بھی عمر رسیدہ ہیں ڈاکٹر صاحب پر جس طرح توجہ اور ان کا خیال کر رہی تھیں، درحقیقت یہ مشرقی روایات اور اسلامی شعار کا جیتا جاگتا عملی نمونہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا، وہ پہلے سے تیار تھے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اردو کالج سے وابستگی اور خدمات پر بولنا شروع کیا، جب انہیں کافی دیر ہو گئی تو میں نے انہیں گورنمنٹ کالج ناظم میں گزارے ہوئے ماہ و سال کے بارے میں کچھ بتانے کو کہا، انہوں نے گورنمنٹ کالج سے اپنی وبستگی کے بارے میں چند جملے کہے لیکن وہ پھر سے اردو کالج میں گزارے ہوئے اپنے ماضی میں

کھو جاتے، محسوس ہوا کہ ضعیف العمری کے باعث ڈاکٹر صاحب کی یادداشت ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی۔ وہ بار بار اردو کالج پہنچ جاتے اور میں انہیں گورنمنٹ کالج جس میں انہوں نے ۲۶ سال (۱۹۵۶ء ۔ ۱۹۸۲ء) گزارے تھے واپس لاتا رہا۔ڈاکٹر صاحب کی علمیت و قابلیت میں کوئی شبہ نہیں وہ اپنے موضوع پر y authorit سمجھے جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ ایک خود نوشتی مضمون معروف ادبی رسالے ''سیپ'' کے شمارہ ۷۵ (خاص نمبر) ۲۰۰۶ء میں بہ عنوان ''ممنوعہ راستہ'' شائع ہوا۔ اس مضمون کی فوٹو کاپی آپ نے ہمیں فراہم کی ۔ اس رسالے کی تلاش میں وہ اپنی واکر کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے اپنے بیڈ روم تک گئے اور از خود یہ شمارہ ڈھونڈ کر لائے۔ مضمون ڈاکٹر صاحب پر سیر حاصل مواد فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تقسیم ہند کے بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ کا تعلق ہندوستان کے علاقے راجستھان کے شہر ''کوٹہ '' سے ہے۔ جہاں پر آپ ۲۵ جنوری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ڈاکٹر صاحب بچپن میں بہت ہی شوخ اور شرارتی تھے لیکن پڑھنے لکھنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''ان کی پیدائش پر ان کے کان میں اذان کی نحیف آواز کے بعد جو زوردار

آواز پڑی وہ طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے سُر تھے۔شاید اسی لیے مجھے زندگی بھر موسیقی سے دلچسپی رہی"۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی کیا جہاں پر آپ کے اساتذہ میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور عزیز احمد شامل تھے۔آپ کا کہنا ہے کہ "مجھ میں تنقید سے دلچسپی پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے لیکچروں کی وجہ سے ہوئی"۔

ابتدا میں برماشیل، اسٹیٹ بنک میں ملازمت کی پھر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ 'کل پاکستان انجمن ترقی اردو' سے منسلک ہو گئے۔ڈاکٹر سلام کا مزاج کسی دفتر میں کلرکی کا نہیں تھا وہ بنیادی طور پر استاد تھے، ان کا کہنا ہے کہ" وہ بنیادی طور پر ٹیچنگ کے آدمی ہیں" ۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے برماشیل اور اسٹیٹ بنک کی ملازمت سے از خود سبکدوشی اختیار کی۔۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں سینئر لیکچر رہوئے اور ساتھ ہی شعبہ اردو کے سربراہ بھی ہوئے اس وقت کالج میں آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر اسلم فرخی، انجم اعظمی، شاہد عشقی اور عقیلہ شاہین عباسی تھیں۔آپ نے گورنمنٹ کالج میں رہتے ہوئے ۱۹۶۸ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی آپ کے مقالے کا عنوان تھا" اردو ناول بیسویں صدی میں"۔

گورنمنٹ کالج کے اساتذہ میں اسلم فرخی صاحب کو بھی یہ فضیلت حاصل ہے کہ

انہوں نے بھی گورنمنٹ کالج میں رہتے ہوے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ڈاکٹر سلام لسانیات پر ماہر تصور کیے ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لسانیات کے استاد بھی رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کالج میں بھرپور زندگی گزاری، تدریس کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں مسلسل سرپرستی کی، وہ ہاکی کے اچھے کھلاڑی رہ چکے تھے کالج میں بھی کھیلوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔آپ کا کہنا تھا کہ اس زمانے میں شہنشاہ حسین بہت معروف طالب علم تھا لیکن وہ میری انتہائی عزت کیا کرتا تھااس نے کبھی میرے سامنے سگریٹ نہیں پی، اگر کبھی ایسا ہوا کہ میں سامنے آ بھی گیا تو وہ سیگریٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا کرتا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھی اساتذہ اور کالج پرنسپل کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔آپ کا کہنا تھا کہ کالج پرنسپل گیلانی سروس کے آدمی تھے، اپنے ساتھیوں کا بہت خیال رکھا کرتے تھے لیکن ان کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ ہم لوگ ان کی تعریف کریں۔آپ نے کہا کہ گیلانی صاحب کے بعد جعفری صاحب اس منصب پر فائز ہوئے بہت اچھے دوست تھے ، انہوں نے کالج کے امور کو اپنے کنٹرول میں رکھا، شریف اور نیک انسان تھے ان کے برعکس ڈاکٹر سید ایس ایم احمد تیز طرار اور انجمن باز قسم کے انسان تھے ان کا یہ نام اسلم فرخی نے رکھا تھا، رشید صاحب کو طلباء نے بہت پریشان کیا، فاروقی صاحب بہت کم وقت کے

لیے آئے انہوں نے تیز دوڑنا شروع کر دیا تھا، ان کی شہرت ایک اچھے منتظم کی تھی لیکن انہیں چلنے نہیں دیا گیا۔ عبدالرؤف کو بھی طلباء نے تنگ کیا البتہ ظہیر صاحب کے زمانے میں حالات بدل گئے تھے وہ اچھے منتظم اور اچھے انسان تھے۔

اس سوال کا کہ آپ اپنے زمانہ طالب علمی کا موجودہ دور سے کیسے تقابل کریں گے۔
آپ نے کہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات بالکل بدل گئے، دنیا ہی بدل گئی، وہ دنیا الگ تھی یہاں کی دنیا الگ ہے، وہاں استاد کا احترام تھا، عزت کی جاتی تھی، طلباء میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ اور لگن تھی جس کا اب فقدان پایا جاتا ہے۔ آج کا استاد سیاست میں شامل ہو گیا۔ آپ نے کہا کہ حالات بگاڑنے کی ایک وجہ اپنی عزت سے لڑکوں کو کھیلنے کا موقع دینا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں آپ کے بیتے ہوئے بائیس سالوں کا ناقابل فراموش واقعہ کیا ہے آپ نے فرمایا کہ ''مجھے زبردستی پرنسپل بنایا جانا تھا''۔ میں نے مجبوری میں پرنسپل کا چارج لے لیا لیکن انہیں تاکید کرتا رہا کہ جلد ریگولر پرنسپل بھیجیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھ سے پڑھوا لیجیے میں صرف تدریس کا آدمی ہوں۔ ایک اور واقعہ آپ نے یہ بتایا کہ ہمارے ایک انگریزی کے استاد تھے سید محمد احسن، وہ امریکہ چلے

گئے تھے اور وہیں پر مستقل رہائش اختیار کرلی تھی ان کا خط امریکہ سے میرے پاس آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ وہ وہاں old huse میں رہتے ہیں، میں ان کا خط پڑھ کر خون کے آنسو رویا، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں یہ صورت حال نہیں ، احسن صاحب کی دو لڑکیاں بھی ہیں۔ نئی نسل کے نام اپنے پیغام میں ڈاکٹر سلام نے کہا کہ وہ'' پڑھائی کو مقدم رکھیں اگر وقت ملے تو کھیلوں میں بھی دلچپی لیں''۔

ڈاکٹر عبد السلام بنیادی طوپر ایک استاد ہیں انھوں نے ۱۹۴۹ء سے پڑھانا شروع کیا اردو کالج کے بعد گورنمنٹ کالج ناظم میں ۱۲اگست ۱۹۸۲ء تک استاد رہے، اس دوران وہ جامعہ کراچی میں بھی پڑھاتے رہے، ریٹائر ہونے کے بعد جامعہ کراچی اور پھر جناح یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دیے ۲۰۰۰ء میں جب آپ کی صحت اس قابل نہ رہی کہ آپ باہر جاسکیں تو آپ مجبور ہوگئے۔آپ نے متعدد کتابیں تخلیق کیں ان میں تحقیق و تنقید، تسہلیل البلاغت، فن ڈرامہ نگاری منزل بہ منزل، لسانیات کی ٹیکسٹ بک عمومے لسانیات، جدید اردو تنقید کے معمار، فن ناول نگاری، اصول تنقید، میرانیس اور ان کے مرثیے شامل ہیں۔آپ کے بے شمار مضامین مختلف ادبی و تحقیقی رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ (شائع شدہ مجلّہ 'روایت ۲۰۰۸ء، گورنمنٹ کالج برائے طلباء ، ناظم آباد)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام اب اس دنیا میں نہیں، مجھے اس بات کا علم ڈاکٹر اسلم فرخی کی خاکوں کی کتاب ''موسم بہار جیسے لوگ'' میں شامل ڈاکٹر عبد السلام کا خاکہ پڑھ کر ہوا، ڈاکٹر اسلم فرخی سلام صاحب کے ساتھیوں میں سے تھے وہ اور سلام صاحب گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں کئی برس تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسلم فرخی صاحب کا لکھا ہوا خاکہ پڑھ کر سلام صاحب سے کی ہوئی گفتگو اور وہ ان کا معصوم چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ ڈاکٹر صاحب پر اب ایک کتاب بھی منظر عام پر آ گئی ہے۔ اچھے انسان تھے ،اللہ مغفرت کرے۔

گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد کے کئی اساتذہ کو یہ اعزاز حاصل ہو سکا کہ انہوں نے کالج کی ملازمت کے دوران اعلیٰ تعلیم کے سلسلے کو جارکھتے ہوئے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان اساتذہ میں ڈاکٹر اسلم فرخی، عبد القیوم اور ڈاکٹر عبد السلام شامل ہیں ۔ ان اساتذہ کی تقلید کرتے ہوئے مجھے بھی یہ شرف حاصل ہو سکا کہ میں نے بھی جامعہ ہمدرد سے حکیم محمد سعید شہید کی کتاب اور کتب خانے سے تعلق کے حوالے سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ میرے تھیسس کا عنوان تھا''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کا کردار''۔ میرے ایک ساتھی ڈاکٹر سردار احمد صاحب نے کو بھی یہ اعزاز حاصل ہو سکا۔ کالج کے موجودہ پرنسپل پروفیسر نوید ہاشمی ایم فل کر چکے ہیں ۔امید کی جا سکتی ہے کہ انہیں بھی یہ اعزاز حاصل ہو

گا۔ ڈاکٹر عبد السلام نے ''اردو ناول کے ارتقا'' پر تھیس لکھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب محمد حسین آزاد' پر اور عبدالقیوم صاحب نے 'نثر حالی' پر'
تھیس لکھا اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام سے میرا ایک تعلق ہندوستان کی ریاست راجستھان ہے۔ وہ بھی راجستھانی اور میں بھی بنیادی طور پر راجستھانی ہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب راجستھان کی مشہور ریاست کوٹے سے تعلق رکھتے تھے میرے آباؤاجداد کا قیام ریاست بیکانیر میں رہا بعض قریبی عزیز اب بھی بیکانیر کی سرزمین کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ آخر میں اپنی بات ، کو ڈاکٹر عبد السلام کے ظاہری روپ پر ان کے ایک قریبی دوست ڈاکٹر اسلم فرخی کی رائے پر ختم کرتا ہوں ''چھوٹا قد، گورا رنگ، کرنجی آنکھیں، جھدرے بال ، ہنستا، مسکراتا چہرہ، چال ڈھال اور انداز میں کھلاڑیوں کا بانکپن… یہ تھا ڈاکٹر عبد السلام کا ظاہری روپ ۔ اُن کا باطن اس سے بھی زیادہ اُجلا اور شفاف تھا''۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ آمین

(مصنف کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ۲۰۱۲ء میں شامل)

محمد عادل عثمانی

میں نے اپنے زمانہ طالب علمی ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ کراچی کے دوران لائبریری سائنس کی مختلف کتابوں میں عادل عثمانی صاحب کا نام پڑھا۔ اس دوران بعض اساتذہ اپنے لیکچر کے میں اکثر عادل عثمانی صاحب کا تذکرہ احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ عثمانی صاحب اس زمانے میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں تھے، ۱۹۷۳ء میں واپس آئے اس وقت ایم اے کا نتیجہ آچکا تھا۔ وہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کے ڈپٹی لائبریرین تھے ڈاکٹر عبدالمعید صاحب کے نائیجیریا چلے جانے کے بعد ان کے جانشین بھی ہوئے۔ مجھے عثمانی صاحب کے شاگرد نہ ہونے کا افسوس تھا۔

دو سال جامعہ میں کیسے گزر گئے پتہ ہی نہ چلا، ایم اے کر لینے کے بعد ملازمت کا مرحلہ درپیش تھا ابھی نتیجہ آئے ہوئے مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ جناب سبزواری صاحب نے کہا کہ آپ یونیورسٹی لائبریری میں عادل عثمانی صاحب کے پاس چلے جائیں، میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ میں پہلی فرصت میں لائبریری چلا گیا، اب عثمانی صاحب لائبریرین ہو چکے تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا اور اکرم صاحب کا حوالہ دیا۔ بہت ہی شفقت اور محبت سے بیٹھنے کو

کہا۔ عثمانی صاحب کو آج پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انتہائی بردبار، مہذب، بااخلاق، درمیانہ قد، مناسب جسم (اب کمزور ہوگئے ہیں)، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، گھنے سیاہ بال (اب بالکل سفیدی اور وہ بھی کم کم)، کلین شیو (اب بالکل سفید داڑھی)، ستواں ناک، روشن پیشانی، کتابی چہرہ، روشن آنکھیں، وضعدار، وقت اور اصولوں کے سخت پابند۔ گفتگو میں شگفتگی، شائستگی، دھیمہ پن اور عالمانہ انداز گفتگو جیسی صفات آپ میں نمایاں تھیں۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ایک فارم دیا کہ اسے بھر دیجئے اور متعلقہ آفس میں جمع کرادیں کل سے آپ کی نوکری شروع۔ یہ میری زندگی کی اولین ملازمت تھی جو ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ کاغذی کاروائی کے بعد مجھے لائبریری کے ریسرچ ریڈنگ روم میں بھیج دیا گیا یہ دور ذوالفقار علی بھٹو کا تھا انہوں نے تعلیم یافتہ افراد کے لیے ایک اسکیم کا آغاز کیا تھا جو NDVP کہلاتی تھی میرا یہ تقرر بھی اسی پروگرام کے تحت تھا جو صرف چار ماہ قائم رہا کیوں کہ میرا تقرر حکومت سندھ کے محکمہ تعلیم کے ایک کالج میں گریڈ ۱۷ میں ہوگیا۔ اس طرح عثمانی صاحب کے ساتھ میرا آفیسر اور ماتحت کا تعلق قائم ہوگیا۔ وہ ایک ذمہ دار، شفیق اور قابل سربراہ تھے۔ آپ کے انداز سے کبھی یہ تاثر نہیں ملا کہ وہ آفیسر ہیں اور دیگر ان کے ماتحت، ان کا پیار محبت اور شفقت والا رویہ ہر ایک کے ساتھ ہوا کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنے

ماتحتوں کو اعتماد میں لے کر کام کیا کرتے اور یہ احساس اور تاثر پیدا کیا کرتے تھے کہ لائبریری ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور تمام کام کرنے والے خواہ ان کی حیثیت کچھ بھی ہو ایک خاندان کے فرد ہیں۔

عادل عثمانی صاحب سے میرا ایک اور تعلق ۱۹۷۵ء میں اس وقت قائم ہوا جب ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب بہ سلسلہ ملازمت سعودی عرب تشریف لے گئے۔ عادل عثمانی صاحب رسلہ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے میں اس رسالہ میں شمالیت اختیار کرچکا تھا۔ اب بیورو اور رسالے کے معاملات کے لیے عثمانی صاحب سے تعلق قائم ہو گیا۔ یہاں ہم آفیسر اور ماتحت نہیں تھے بلکہ ایک ہی ادارے کے کارکن لیکن ہر اعتبار سے سینئر اور جونیئر کے رشتہ میں رہتے ہوئے پیشہ ورانہ امور انتہائی خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہے۔ عثمانی صاحب کی ایک صفت اپنے سے چھوٹوں کو اس انداز سے تربیت کرنے کی ہے کہ سامنے والے کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کی تربیت کی جارہی ہے۔ آپ کی فراخدلانہ طبیعت و صلاحیت کے باعث آپ کے ساتھ کام کرنے والوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عثمانی صاحب بھی ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب تشریف لے گئے اور میرا اور ان کا یہ براہِ راست تعلق منقطع ہوگیا۔

اس دوران ان سے بہت کچھ سیکھا۔ آپ سے یہ تعلق ختم ضرور ہو گیا لیکن ایک نئے

تعلق نے جنم لیا وہ تھا خط وکتابت کا تعلق۔

سعودی عرب سے راقم کے نام عثمانی صاحب کا پہلا خط ۶ نومبر ۱۹۷۹ء کو موصول ہوا جب کہ میری خطوط کی فائل میں آخری خط ۵ مئی ۱۹۹۸ء کا لکھا ہوا ہے۔اس طرح میرے نام آئے ہوئے آپ کے خطوط کی تعداد جو میں محفوظ رکھ سکا ۶۲ ہے۔ان خطوط میں لائبریری پروموشن بیورو اور رسالے کے علاوہ پروفیشنل معاملات کے بارے میں تفصیل ہوا کرتی تھی۔عثمانی صاحب کی شخصیت اور لائبریرین شپ کے لیے آپ کی خدمات کا تقاضہ تھا کہ آپ کو کتابی صورت میں متعارف کرایا جائے۔میرا ایک شوق شخصیات کو پڑھنا اور ان پر لکھنا رہا ہے۔چنانچہ کئی احباب پر مضامین لکھے۔ڈاکٹر عبدالمعید اور اختر ایچ صدیقی پر تصانیف مرتب کیں جو بالترتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئیں۔۱۹۹۶ء میں جب کہ عثمانی صاحب پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے میں نے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں آپ پر ایک کتاب انگریزی میں مرتب کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ کی اجازت اور تعاون کی ضرورت ہے۔آپ نے کثر نفسی سے کام لیتے ہوئے ٹال مٹول سے کام لیا اور سعودی عرب واپس چلے گئے۔مجھے احساس تھا کہ عثمانی صاحب نام ونمود اور شہرت کو پسند نہیں کرتے وہ تو خود پیچھے رہتے ہوئے اوروں کو آگے بڑھاتے رہے ہیں لیکن میں اپنے دل میں یہ ارادہ کرچکا تھا کہ میں یہ کام کروں گا چنانچہ اس حوالے سے عثمانی صاحب سے رابطہ جاری رکھا اور اپنے خطوط میں

انہیں اس جانب مائل کرتا رہا، میں نے آپ سے کام شروع کرنے اور متعلقہ مواد ارسال کرنے کی درخواستیں کیں۔ بالآخر برف پگھلی اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگیا، عثمانی صاحب اس پر تیار ہوگئے۔کتاب کی تیاری میں آپ میری رہنمائی اپنے خطوط کے ذریعہ کرتے رہے اور میں یہ کام رفتہ رفتہ کرتا گیا حتیٰ کہ نو سال کی طویل محنت رنگ لائی اور عثمانی صاحب پر میری کتاب ۲۰۰۴ء میں بعنوان

''Muhammad Adil Usmani : A Bio-bibliographical Study''شائع

ہوئی۔ اس کتاب پر ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط مؤرخہ ۱۱۹کتوبر ۲۰۰۴ء میں مختصر تبصرہ یہ کیا'' تمہارا گیارہ اکتوبر کا خط ملا، محمد عادل عثمانی (سرکار) کی سوانحی کتابیات کی خوبصورت جلد ملی اور مجلّہ ''روایت'' بھی، خوشی ہوئی، پڑھ تو نہ سکا ہوں لیکن خوشی ہوئی تم سے دھن کے پکے لائبریرین نے مرتب کیا ہے''۔عثمانی صاحب کی شخصیت میں میرے لیے جو احترام، عقیدت اور لگاؤ کا عنصر پایا جاتا ہے اس کے باعث میں نے عثمانی صاحب پر کتاب مرتب کی، اس سے قبل میں عادل عثمانی صاحب پر دو مضامین انگریزی ہی میں لکھ چکا تھا، پہلا پاکستان لائبریری بلیٹن (جلد ۲۴، شمارہ ۴، دسمبر ۱۹۹۳ء) میں دوسرا اسی سال ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی جانب سے شائع ہونے والے سووینیر میں شائع ہوا۔

عادل عثمانی صاحب ایک عظیم اور انمول انسان ہیں ان کی شخصیت میں سادگی کا

رچاؤ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ منکسر المزاجی ان کی طبیعت کا جُز و ہے۔ جامعہ کراچی کے بڑے کتب خانہ کی سربراہی طویل عرصہ کی لیکن ہم نے آج تک کوئی منفی بات آپ کے بارے میں نہیں سنی۔ آپ کے کردار کی بلندی کا یہ حال ہے کہ آپ نے کبھی کسی بک سیلر یا کسی شخص سے کوئی ادنی سی چیز لینا اپنے لیے کسر شان تصور کیا۔ آپ کو تحفہ میں ملنے والی تمام کتب جامعہ کراچی کے ذخیرہ میں شامل ہیں۔ آپ نے اپنا ذاتی کتب خانہ مرتب نہیں کیا جو کتابیں آپ کے پاس تھیں سعودی عرب جاتے ہوئے انہیں ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کو دے گئے۔

حکیم محمد سعید نے جناب عادل عثمانی کے بارے میں اپنی خود نوشت بعنوان '' نو نہالوں کے لئے سچی کہانی میری ڈائری کی زبانی مئی ۱۹۹۲ء'' (صفحہ ۱۳۴) میں تحریر فرمایا'' جناب عادل عثمانی نہایت نفیس انسان ہیں۔ نہایت سمجھ دار کتب دار' (لائبریرین) پہلے جامعہ کراچی میں تھے اب جامعہ ام القریٰ کی شاخ لائبریری طائف میں ہیں۔ ان سے ملنے کو بہت دل چاہتا تھا۔ بس میں نے ان کو آج بلا لیا۔ ایک گھنٹہ ان سے باتیں کیں۔ ان کا مشورہ یہ ہے کہ طب نبویؑ میں سائنسی توجہ کروں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میری کتاب ''طب نبویؑ '' تیار ہے۔ جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب نظر ثانی کر رہے ہیں''۔

عادل عثمانی صاحب نرم دل ، ہمدرد ، سخی ، صلہ رحمی کرنے والے اور ضرورت

مندوں کی خاموشی سے مدد کرنے والوں میں سے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ اس طرح مدد کرنا کہ ضرورت مند کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ اس کی مدد کی جارہی ہے اور کون کر رہا ہے۔ عثمانی صاحب کی اس منفرد اور قابل تقلید عمل کا ذکر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے اپنی کتاب ''آنگن میں ستارے'' میں عادل عثمانی صاحب کے چھوٹے بھائی محمد واصل عثمانی پر لکھے گئے خاکے میں کیا، یہاں اسے بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس واقعہ بیان کرنے سے پہلے وضاحت کی کہ ''یہ محض سنی سنائی بات نہیں۔ ذاتی واردات ہے اور اس قدر مؤثر ہے کہ واصل عثمانی صاحب کے بھائیوں کی خصوصیات اور خاندانی اثرات کی وضاحت میں قلم بند ہونا ضروری ہے''۔ (صفحہ ۲۰۴) ۔ اس واردات کے ڈاکٹر اسلم فرخی ہی عینی شاہد نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کے بعد راقم بھی عادل عثمانی صاحب کے صلۂ رحمی کے اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب لکھتے ہیں ''عادل عثمانی صاحب یونیورسٹی میں ڈپٹی لائبریرین تھے۔ میں جب بھی لائبریری جاتا ایک بڑے بوڑھے صاحب کو دیکھتا، سرپر دوپلی، بر میں شیروانی، خمیدہ کمر، بھویں اور پلکیں دونوں سفید، خاموشی اور انہماک سے کام میں مصروف نظر آتے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے مذاق میں عادل صاحب سے کہا بھی کہ کیا لائبریری میں سبک دوشی کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ عادل صاحب میری بات کو ہنسی میں ٹال گئے۔ اب یہ ہوا کہ عادل صاحب کا تقرر مکہ یونیورسٹی میں ہوگیا اور وہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ایک دن وہ میرے پاس آئے۔ میں ان دنوں شعبہ

تصنیف وتالیف وترجمہ کا ناظم تھا۔ عادل صاحب نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا، ''میں ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں ۔ ایک ذمہ داری آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ انکار نہیں کریں گے''۔ عادل صاحب نے یہ الفاظ اتنے خلوص اور لجاجت سے کہے کہ میں متاثر ہوا۔ کہنے لگے، آپ نے اُن بڑے میاں کو لائبریری میں دیکھا ہے ۔ وہ میرے عزیز ہیں۔ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ دو میاں بیوی ہیں ۔ اولاد کوئی ہے نہیں، گزارے کی کوئی صورت نہیں مگر غیرت مند اتنے ہیں کہ کسی رشتے دار کا احسان لینا گوارا نہیں۔ میں نے ان کے لیے یہ صورت نکالی کہ انھیں فرضی طور پر لائبریری میں رکھ لیا، پان سو روپے (۵۰۰) مہینہ میں انھیں دیتا ہوں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں تنخواہ مل رہی ہے کیونکہ لائبریری کا خزانچی پہلی تاریخ کو رقم انھیں ادا کردیتا ہے ،اب میں جارہا ہوں لہٰذا لائبریری میں یہ کام نہیں ہوسکے گا۔ آپ انھیں اپنے شعبہ میں بلا لیجیے اور پہلی کے پہلی پان سو روپے انھیں ادا کردیجئے گا۔ روپیہ آپ کے پاس پہنچتا رہے گا مگر اس بات کا علم کسی کو نہ ہو اور ان صاحب کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو ورنہ یہ رقم نہیں لیں گے۔ میں نے خوش دلی سے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ وہ بزرگ دوسرے دن آپہنچے۔ میں نے یہ سوچا کہ ان کے لیے روز روز کا دفتر آنا بھی تکلیف دہ ہے لہٰذا ''سیر الاولیا'' کا فارسی نسخہ ان کے حوالے کیا۔ اشاریہ مرتب کرنے کا طریقہ سمجھایا اور کہا، آپ گھر پر یہ کام کریں۔ پہلی کو آئیں ۔ مہینے بھر کا کام ساتھ لائیں اور تنخواہ لے

جائیں۔چنانچہ یہ سلسلہ میری نظامت کے دور میں جاری رہا۔بعد میں شاید عادل صاحب نے کوئی دوسرا انتظام کیا۔ مجھے یہ خوشی ہوئی کہ ایک نیک کام میں میں بھی شریک رہا۔ یہ واقعہ ۸۰ء کا ہے۔اس زمانے میں پان سو روپے جان رکھتے تھے۔ پھر ایک پورے کنبے کی پرورش کرنے والے تنخواہ دار کے لیے ہر مہینے پان سو روپے خاموشی سے ادا کرنا بڑی ہمت اور ایثار کا کام تھا مگر عادل صاحب خاموشی سے یہ کام کرتے رہے''۔

(صفحہ ۲۰۴)

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے جب یہ نیک کام انجام دے لیا اور شعبہ تصنیف و تالیف سے کسی دوسری جگہ چلے گئے تو ان محترم بزرگ کی اسی طریقے سے امداد جاری رکھنے کی ذمہ داری عادل عثمانی صاحب نے ڈاکٹر نسیم فاطمہ کے سپرد کی جو شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں استاد اور لائبریری پروموشن بیورو میں شریک کار تھیں۔اس وقت یہ معاملہ میرے علم میں بھی لایا گیا کہ رازداری کے ساتھ ان صاحب کی امداد کا سلسلہ کیسے جاری رکھا جائے۔چنانچہ ہم نے لائبریری پروموشن بیورو کی تصانیف سے متعلق بعض کام ان بزرگ کے سپرد کیے ، وہ اسی طرح کام گھر پہ لے جاتے اور ہر مہینے پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ بیورو کے خزانچی 'اشرف صاحب' سے لے لیا کرتے تھے جس کی ادائیگی عادل عثمانی صاحب سعودی عرب سے کر دیا کرتے تھے۔اب بھی وہ یہ سمجھتے رہے کہ انھیں بیورو میں ملازم رکھ لیا گیا ہے۔ایک مرتبہ وہ بزرگ کچھ عرصہ کے لیے

غائب ہوگئے، اپنی تنخواہ لینے آئے اور نہ ہی وہ کام واپس کیا جو وہ لے گئے تھے۔جب کافی وقت گزر گیا تو تشویش ہوئی ، مختلف خیالات کا ذہن میں آنا ایک قدرتی عمل تھا، کیوں کہ ان بزرگ کی عمر خاصی تھی، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی تحریر کیا کہ کمر جھکی ہوئی، سر اور داڑھی ہی سفید نہ تھی بلکہ آنکھوں کی پلکوں اور بھوؤں کے بال بھی سفید تھے، بڑی مشکل سے کسی طرح ان کے گھر واقع نیو کراچی کا پتہ معلوم کیا، معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ان کے گھر کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ واقعی عثمانی صاحب ایک حقیقی ضرورت مند کی مدد کر رہے ہیں اور دنیا میں جنت کما رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی طرح ہم بھی کسی حد تک اس نیک کام میں شریک رہے۔

عادل عثمانی صاحب ہندوستان کے معروف ضلع اِلٰہ آباد کے تاریخی مقام 'کڑا' سے تعلق رکھتے ہیں، آپ اسی بستی کے ایک گاؤں 'رشید مئی' میں ۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔اِلٰہ آباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۹۴۸ء میں مجیدیہ اسلامیہ کالج ، اِلٰہ آباد سے میٹرک کیا، الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں گریجویشن کیا۔اسی سال پاکستان ہجرت کی، کراچی میں کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کے تحت لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس ہو رہا تھا آپ نے ۱۹۵۳ء میں اس کورس میں داخلہ لیا، اس کلاس میں انیس خورشید صاحب بھی تھے، لائبریرین شپ کے پیشہ میں یہ آپ کا نقطہ آغاز تھا۔ ۱۹۵۴ء میں جامعہ کراچی کے کتب خانے

میں ریفرنس اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔۱۹۵۶ء میں جامعہ کراچی میں شعبہ لائبریری سائنس کی بنیاد پڑی اور پوسٹ گریجویٹ کورس کا آغاز ہوا، عادل عثمانی صاحب پہلے سیشن ۵۷ء ۔۱۹۵۶ء کے طالب علم تھے۔اس کلاس کے بعض طالب علموں میں انیس خورشید، عبد اللہ خان، صادق علی خان، سید افتخار حسین سبزواری، محمد عبید اللہ سیفی، محمد اظہار الحق ضیاء اور محمد سجاد ساجد شامل تھے۔انیس خورشید صاحب کی پہلی، عادل عثمانی صاحب کی دوسری اور سید مظہر علی زیدی کی تیسری پوزیشن تھی۔

۱۹۵۸ء میں آپ ایشیا فاؤنڈیشن اور فل برائٹ اسکالرشپ پر امریکہ کی رٹگرس یونیورسٹی گئے جہاں سے آپ نے لائبریری سائنس میں ایم کی سند حاصل کی۔وطن واپس آکر آپ جامعہ کراچی کے کتب خانے سے منسلک ہوگئے ساتھ ہی شعبہ لائبریری سائنس میں جزووقتی استاد کے فرائض بھی انجام دیے۔ ۱۹۶۰ء میں اسسٹنٹ اور جون ۱۹۶۱ء میں ڈپٹی لائبریرین اور ساتھ ہی قائم مقام لائبریرین ہوئے کیوں کہ معید صاحب پی ایچ ڈی کرنے امریکہ تشریف لے گئے تھے۔۱۹۷۳ء میں آپ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کے لائبریرین ہوگئے، ۱۹۸۳ء میں آپ نے اس وقت ریٹائرمنٹ لی جب آپ سعودی عرب میں تھے۔سعودی عرب میں آپ نے طویل عرصہ خدمات انجام دیں۔آپ کنگ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ کے لائبریرین ۱۹۷۳ء۔۱۹۶۸ء، لائبریرین امہ القریٰ یونیورسٹی، مکہ ۱۹۷۹ء۔ ۱۹۸۲ء اورڈائریکٹر سینٹرل لائبریری، امہ القریٰ یونیورسٹی، طائف ۱۹۸۲ء ۔ ۱۹۹۹ء رہے۔آپ جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں ۱۹۶۷ء میں شروع ہونے والے

پہلے پی ایچ ڈی پروگرام کے ان طالب علموں میں بھی تھے جنھوں نے اس کورس میں داخلہ لیا لیکن اسے پائے تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔

جامعہ کراچی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری ڈاکٹر عبدالمعید اور محمد عادل عثمانی کی پیشہ ورانہ زندگی کا حاصل ہے۔آپ دونوں نے اس کتب خانے کو قائم کیا اور اسے بلندی پر پہنچانے میں اپنی تمام عمر لگا دی، ڈاکٹر عبد المعید صاحب کے کارناموں میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام بھی شامل ہے۔ عادل عثمانی صاحب لائبریری میں بک بنک کے قیام کے روح رواں ہیں۔آپ ہی کی کوششوں سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے دورِ وائس چانسلری میں جامعہ کراچی میں بک بنک قائم ہوا جو آج بھی خدمات انجام دے رہا ہے۔ عادل عثمانی صاحب کو پاکستان میں لائبریری ریسرچ اور لائبریری مطبوعات کے حوالے سے سبقت حاصل ہے۔آپ کی پیشہ ورانہ زندگی تصنیف وتالیف سے عبارت نظر آتی ہے۔آپ کی مرتب کردہ پاکستان بک ٹریڈ ڈائریکٹری جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی، یہ اپنی نوعیت کی اولین ماخذ ہے،اسی طرح کتابیاتی ضبط کے موضوع پر آپ کی کتاب Status of Bibliography in Pakistan اپنے موضوع پر ابتدائی اور اہم کام ہے یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی، اس کا اردو ترجمہ ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آیا،آپ نے انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات (SPIL) کے مختلف سیمیناروں کی رودادیں بھی مرتب کیں،اسکول لائبریری ورکشاپ کی رپورٹ ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آئی ، ان

کے علاوہ آپ نے انگریزی میں قرآن پر مواد کی کتابیات، اسلام پر پی ایچ ڈی مقالات کی کتابیات، قائد اعظم پر کتب، علامہ اقبال پر کتب کا کیٹلاگ بھی مرتب کیا۔ پاکستان لائبریری بلیٹن جس کا موجودہ نام پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جرنل ہے سے مسلسل وابستہ ہیں۔ آپ کی انگریزی کتابوں کی تعداد ۱۰، اردو مطبوعات کی تعداد ۲، عربی زبان میں ایک، سیمینار اور کانفرنسوں کی روودادیں ۵، کتابچے اردو وانگریزی ۹، اسکیم و پلان ۳ اور مضامین و اداریے انگریزی میں ۱۳، اردو میں ۱۲ ہیں۔

عادل عثمانی صاحب نے لائبریری انجمنوں میں بھی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا، پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن، کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس المنائی ایسوسی ایشن، انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات، پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ، سندھ لائبریری ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ لائبریری ایسوسی ایشن، برطانیہ، امریکن لائبریری ایسوسی ایشن، اسپیشل لائبریری ایسوسی ایشن کانفرنس، امریکہ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ امریکہ، برطانیہ، یورپ، مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے اہم اور بڑے کتب خانوں کا دورہ کرچکے ہیں۔

عادل عثمانی صاحب پانچ بھائی (محمد عاقل عثمانی، محمد فاضل عثمانی، محمد

کامل عثمانی، محمد عادل عثمانی اور محمد واصل عثمانی) اور دو بہنیں انیس فاطمہ اور قریش فاطمہ ہیں۔واصل عثمانی عرف بھولے میاں جو علامہ کے لقب سے معروف ہیں صاحب دیوان شاعر ہیں۔ جناب ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری کے جگری دوست ہونے کے ناطے اکرم صاحب نے اپنی کتاب 'درجہ بندی' میں انھیں اپنا ہمزاد لکھا ہے) علامہ مجھ پر) بھی مہربان ہیں اور اپنی شفقت و محبت جب کبھی پاکستان میں ہوتے ہیں نچھاور کرتے رہتے ہیں۔

باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں ،وہ خصوصیات جو غزل گو شاعر میں پائی جاتی ہیں بدرجہ اتم ان میں بھی موجود ہیں۔ عادل عثمانی صاحب کا بہت احترام اور ادب کرتے ہیں۔ اپنے مجموعہ کلام "سب سخن میرے" ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی اپنے بھائی عادل عثمانی صاحب کی شان میں منظوم نذرانۂ عقیدت

(کچھ اس طرح پیش کیا ہے ۔ (صفحہ ۹۵

تری نگاہ نے بخشی خرد کو تابانی

ترے کرم سے بڑھی زندگی میں جولانی

ترا وجود مرے واسطے حصارِ کرم ہے

تیری ذات سے لطف و کرم کی ارزانی

رہے ہمیشہ مرے سر پہ سایۂ عادل

مرے قریب نہ آئے کوئی پریشانی

اللہ تعالیٰ نے عادل عثمانی صاحب کو فرمانبردار اولاد ذکور اور اولاد اناث سے نوازا، محترمہ نورجہاں دختر نصیرالدین آپ کی شریک حیات تھیں۔ محمد عامر عثمانی، محمد عمر عثمانی، محمد سلمان عثمانی آپ کے بیٹے ہیں جب کہ خدیجۃ الکبریٰ (ریحانہ)، عائشہ سلطانہ، میمونہ (رضوانہ)، آمنہ اور رومانہ عثمانی آپ کی صاحبزادیاں ہیں۔ عادل عثمانی صاحب، جامعہ کراچی اور سعودی عرب کی ملازمتوں سے فارغ ہو جانے کے بعد کراچی میں مقیم ہیں اور اپنی ریٹائرمنٹ لائف انتہائی سکون اور آرام سے گزار رہے ہیں، سعودی عرب میں رہتے ہوئے آپ بعض نا مناسب حالات سے دوچار ہوئے، ان میں آپ کی شریک حیات کی جدائی بھی شامل تھی جن کے باعث آپ ذہنی دباؤ اور بیماری کا شکار ہوگئے، ویسے تو بڑھاپا از خود ایک بیماری ہوتا ہے، آپ نے لکھنے کی مصروفیات کو خیر باد کہہ دیا ہے، اب آپ کا وقت عبادت اور اپنے بچوں میں گزرتا ہے۔ کم کم گفتگو کے پہلے بھی عادی تھے اب اس میں بھی کمی آگئی ہے۔ مخاطب ان سے جو بات کرے جواب دے دیتے ہیں ورنہ چپ ہی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ سلامت رکھے، آمین۔

۲۸ جنوری ۲۰۰۷ء

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

قومی تعلیمی پالیسیاں، ترقیاتی منصوبے اور کتب خانے

مصنف کے پی ایچ ڈی مقالہ سے ماخوذ)

۱۹۵۲ء میں پاکستان میں نظام تعلیم کے حوالہ سے تشکیل پانے والا تعلیمی ترقی کا چھ سالہ قومی ترقیاتی منصوبہ سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہوسکے۔ ۱۹۵۹ء میں اس وقت کے صدر مملکت محمد ایوب خان کے دور حکومت میں ایک تعلیمی کمیشن سیکریٹری تعلیم ایس ایم شریف کی سربراہی میں قائم کیا گیا۔ اس کمیشن کی تجاویز نے ملک میں ہنگامہ آرائی کی فضاء پیدا کر دی۔ اختلافی اور قابل اعتراز محرکات یونیورسٹی آرڈیننس کی منسوخی اور تین سالہ کورس تھا۔ اسی حکومت کے دور میں جسٹس حمودالرحمن کی سر براہی میں ایک کمیشن قائم ہوا۔ جس نے طلبہ کی شکایات کا ازالہ کرنے کے علاوہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے کئی اقدامات تجویز کئے اس طرح اس کمیشن کی رپورٹ تعلیمی پالیسی کی حیثیت اختیار کر گئی (۱)۔

تعلیمی پالیسی (۱۹۷۰ء) (Education Policy 1970)

پاکستان کے صدر جنرل محمد یحیٰ خان نے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر

مارشل نور خان کو وزارت تعلیم کا قلمدان سونپا ور تعلیمی شعبہ میں اصلاحات مرتب کر نے کو کہا۔ چناچہ نور خان نے جنوری ۱۹۷۰ء میں اپنی رپورٹ بعنوان ''تجاویز برائے تعلیمی پالیسی'' مرتب کی یہی ۱۹۷۰ء کی قومی تعلیمی پالیسی تھی جسے نور خان کی تعلیمی پالیسی بھی کہا جاتا ہے (۲)۔ اس پالیسی میں کتب خانوں کے قیام اور فروغ کے لئے بہت ہی مختصر بات کی گئی تھی اور حسب ذیل

تجاویز شامل تھیں:

۱۔ کتب خانے تعلیمی اداروں کے لئے اندر اور باہر کھولے جائیں گے۔

۲۔ کتب خانے مناسب مطالعاتی مواد کے ساتھ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کے لئے ضروری ہیں۔

۳۔ لوکل باڈیز اپنے زرائع سے اپنے علاقے کے عوام کے لئے کتب خانے قائم کریں (۳)۔

پاکستان لائبریری بلیٹن نے اپنے اداریہ میں حکومت کے اس اقدام کو سراہاتے ہوئے کتب خانے کے قیام اور ترقی کی تجاویز پیش کیں (۴)۔

(Education Policy 1972 - 1980) (تعلیمی پالیسی (۱۹۷۲ء۔۱۹۸۰ء) (۵)

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار حکومتی سطح پر کسی بھی قومی اہمیت کے منصوبے

کتب خانوں کے لئے بہترین اوراعلیٰ ترین منصوبہ بندی سامنے آئی۔ اگر اس منصوبہ بندی پر عمل درآمد ہو جاتا تو یہ بات یقینی تھی کہ ملک میں عوامی کتب خانوں کا ایک وسیع جال بچھ جاتااور اس کے مثبت اثرات ملک کی تعلیمی ٬ ثقافتی ٬ سماجی اور معاشی ترقی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے۔اس اعلان سے یہ توقع بندھگئی تھی کہ پاکستان میں علم و ثقافت اور کتب خانوں کو وہی عروج حاصل ہو جائیگا جو ماضی میں مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے مگر افسوس ملک میں پچاس ہزار کتب خانوں کے قیام کا منصوبہ صرف فائلوں تک محدود رہااور قائدِ عوام کا مجوزہ عوامی کتب خانوں کا نظام ملک میں عملی جامہ نہ پہن سکا۔ اس تعلیمی پالیسی کا اعلان اس وقت کے صدر مملکت ذوالفقار علی بھٹو جن کے پاس تعلیم کا قلم دان بھی تھا ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو کیا۔ پالیسی میں کتب خانوں کے حوالے سے حسب ذیل دو پر کشش اور موہ لینے والے اعلانات تھے :

(۱) ملک کے شہروں اور دیہاتوں میں ۵۰ ہزار عوامی کتب خانوں (50 Thousands People's oriented Public Libraries) کا قیام۔

(۲) تعلیمی اداروں اور عوامی کتب خانوں میں لائبریرنز کے لئے باعزت کیڈر (Respectable Cader) اور ٹیچرز اور لیکچررز کے مساوی تنخواہ کے اسکیل کا نفاذ (۲)۔

ملک میں پچاس ہزار کتب خانوں کے قیام، لائبریریز کے لئے کیڈر اور تنخواہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بک بنک کے قیام کو لائبریرین شپ سے وابستہ افراد نے خیر مقدم کیا اور اسے ملک میں کتب خانوں کی ترقی اور لائبریری اور پیشہ کے لئے سنگ میل قرار دیا۔ الحاج محمد زبیر مرحوم نے کہا کہ اس تعلیمی پالیسی سے یہ امید ہو گئی تھی کہ اب پاکستان میں کتب خانوں کی توسیع و ترقی کا ایک سنہرا باب شروع ہو جائیگا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محض امیدیں باندھ لینے سے کوئی امید بر نہیں آتی (۷)۔ قمر مرزا نے کتب خانوں کے کردار جو وہ قوم کی زندگی میں ادا کر سکتے ہیں کو تسلیم کرنے د کریہ ادا کیا (۸)۔ شیخ محمد حنیف نے کہا کہ پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں پہلی بار لائبریریز کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے (۹)۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن نے اپنے آٹھویں سالانہ کانفرنس میں ایک قرارداد میں حکومت کے اس اقدام کو سراہا اور اطمینان کا اظہار کیا کہ حکومت نے ملک میں کتب خانوں کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا (۱۰)۔ پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے 'پاکستان لائبریری بلیٹن' نے اپنے اداریہ میں پالیسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے سابقہ پالیسیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ حکومت کو گزشتہ حکومتوں کی پالیسیوں، ترقیاتی منصوبوں اور اعلانات سے سبق یکھنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار بھی

ملک میں کتب خانوں کی ترقی کا منصوبہ حسب سابق اعلان تک محدود نہ رہ جائے (۱۱)۔ پاکستان لائبریری بلیٹن، پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن اور دیگر ماہرین لائبریری سائنس کے خدشات درست ثابت ہوئے اور اس تعلیمی پالیسی کا بھی سابقہ پالیسیوں والا ہی انجام ہوا۔ یعنی ملک میں پچاس ہزار عوامی کتب خانوں کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ ملک کے کالجوں میں خدمت انجام دینے والے لائبریرینز کو لیکچررز کے مساوی تنخواہ کا اسکیل ضرور مل گیا۔

(Education Policy 1979) (تعلیمی پالیسی (۱۹۷۹ء) (۱۲)

پاکستان میں عام طور پر حکومت کی تبدیلی کے سابقہ حکومت کے منصوبے اور پالیسیاں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ نئی آنے والی حکومت نے تعلیمی پالیسی کے لئے ایک تعلیمی منصوبہ تشکیل دیا جس کا عنوان تھا (Draft Work Plan for Implementation of the National Education Policy) یہ ڈرافت نئی تعلیمی پالیسی کی بنیاد بنا۔ پالیسی کا اعلان ۱۴ فروری ۱۹۷۹ء کو ہوا۔ اس پالیسی میں ملک میں کتب خانوں (۱۳) کے قیام، کتابوں کی فراہمی اور دیگر امور کے بارے حسب ذیل تجاویز شامل تھیں:

۱۔ ملک میں ۵۰۰۰ ہزار مسجد اسکول قائم کئے جائیں گے ہر ایک ادارے کو ۲۰ نصابی کتب اور ایک قرآن مجید فراہم کیا جائے گا۔

۲۔ ملک میں ۵۰۰۰ ہزار محلہ اسکول قائم کئے جائیں گیاور یونسکو ' یونیسف اور یو این ڈی
کے ذریعہ ان اداروں کو کتابیں فراہم کی (UNDP) پی
جائیں گی۔
۳۔ خاتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیجائیگیاور ان کے اداروں کو کتابیں فراہم کی جائیں
گی۔
۴۔ دس ہزار تعلیم بالغان کے مرکز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تعلیمی پروگرام سے
ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ مستفیض ہوں گے۔
۵۔ دینی مدارس کو فقہ ' حدیث اور رتفسیر کی کتب فاہم کی جائیگی۔
۶۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے کتب خانوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دی جائیگی۔
۷۔ ٹیکنکل اور پعشہ ورانہ کالجوں کے کتب خانوں کو سہولت فراہم کی جائیگی۔
۸۔ ملک میں ایک سو بک بنک کھولے جائیگے (۱۴)۔
نقوی کے بقول تعلیمی پالیسی میں کتب خانوں کی ترقی کے بارے میں کوئی الگ سے باب نہیں۔ صرف یونیورسٹی ایجوکیشن کے تحت 'لائبریرےز اور لیبریٹری' کے عنوان سے کتب خانوں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ یونیورسٹیز میں کت ب خانوں کو جدید کتب اور تحقیقی رسائل سے مستحکم بنایا

جائیگا(۱۵)۔

(National Education Policy 1992) (قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۹۲ء

تعلیمی پالیسی ۱۹۹۲ء۔۲۰۰۲ء (۱٦) کا اعلان وزیر اعظم نواز شریف کے دورحکومت میں دسمبر ۱۹۹۲ء ہوا۔ وزیر تعلیم نے واضح کیا کہ یہ پالیسی ملک کے دانشور، ماہرین ۲۰ تعلیم۔ انتظامی امور کے ماہرین اور قومی اسمبلی اور سینٹ کی تعلیمی کمیٹی کے اراکین سے مشورہ کے نتیجہ میں تشکیل پائی ہے۔انہوں نے کہاکہ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کے لئے مالی وسائل پر مبنی منصوبہ بھی منسلک کیا گیا ہے۔ کتب خانوں کے قیام اور ترقی کے لئے مختلف ابواب میں حسب ذیل تجاویز شامل تھیں:

(Quality of Public Instruction) باب٦۔ میں تجویز کیا گیا تھا کہ:

نصابی کتب کے بک بنک کی اسکیم کو تمام تعلیم اداروں تک بڑھا دیا جائے گا۔ ۵.۳.۲.۷

اسکولوں میں کتب خانوں کی بہتری کے لئے خصوصی پرجیکٹ متعارف کئے جائیں ۷.۳.۲.۷ گے۔ عام اور پیشہ ورانہ کالجوں میں،

یونیورسٹیوں

اور عوام کو کتب خانے قائم کرنے کے لئے امداد فراہم کی جائے گی۔

(کتابوں اور رسالہ کے لئے مناسب امداد راہم کی جائے گی۔(۱۷ ٦.۴.۲.۷

(Higher Education and Science) باب۹۔ میں تجویز کیا گیا تھا کہ:

کتابوں اور رسائل کے لئے مناسب امداد فراہم کی جئے گی۔ ۹.۳.۲

۳۔۱۴ قائدِاعظم یونیورسٹی لائبریری اسلام آباد کو ''سائنس و ٹیکنالوجی کی قومی لا ۹.۱

ئبریری'' بنانے کی تجویز تھی۔ (۱۸) باب ۱۰۔ (Development of Social

:Sciences) میں کیا گیا تھا کہ

قومی لائبریری کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد فراہم کی جائے گی تاکہ وہ سماجی ۱۰.۳.۱۳

(علوم میں زیدہ علمی ذرائع کا اضافہ کرسکے۔ (۱۹

(National Education Policy 1998-2010) (قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۹۸ء۔۲۰۱۰ء

اس وقت پاکستان میں قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۸ء (۱۹) پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ وہ واحد پالیسی ہے جو بارہ سال کی مدت (۱۹۹۸ء تا ۲۰۱۰ء) کے لئے مرتب کی گئی۔ یہ پالیسی اس اعتبار سے بھی خوش قسمت ہے کہ نئی حکومت نے اس پالیسی کو منسوخ نہیں کیا اور نہ ہی اب تک نئی تعلیمی پالیسی پیش کی۔ ملک میں کتب خانوں اور لائبریرین شپ کے حوالے سے بھی یہ پالیسی جامع اور اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں کتب خانوں کے قیام، ترقی اور فروغ کے لئے زیادہ اقدامات تجویز کئے گئے ہیں۔

(Services of Mr. M. H. Shabab) : ایم ایچ شباب کی خدمات

ملازم حسین شباب ' ایم ایچ شباب کے نام سے جانے جاتے تھے ۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ مینجمنٹ ، وزارت تعلیم، حکومت پاکستان ، اسلام آباد میں چیف ڈاکیومنٹیشن آفیسر وانچارج (ایمن و فائنانس) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ پاکستان کی قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۸ء میں ''لائبریریز اور دستاویزی خدمات'' کے حوالے سے شباب صاحب کی خدمات قابل تعریف ہیں اور ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

۱۹۹۷ء میں جب نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی جانے لگے تو شباب صاحب نے اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ پالیسی میں لائبریری پروفیشن اور کتب خانوں کی ترقی کے حوالے سے اہم اور ضروری نکات اس میں شامل ہو جائیں۔ عام طور پر پالیسی کے حتمی اعلان سے قبل حکومت اس کے مسودہ پر ماہرین اور عوامی نمائندوں کی رائے لیا کرتی ہے چناچہ پالیسی کا مسودہ مکمل ہونے کے بعد موضوع کے ماہرین سے ان کی رائے اور تجاویز مانگی گئیں۔ ' لائبریری اور ڈاکیومنٹیشن ' سے متعلق مواد پر

لائبریری سائنس سے تعلق رکھنے والے احباب کو اپنی تجاویز متعلقہ افسران کو ارسال کرنے کے لئے شباب صاحب نے ایک خط ارسال کیا۔ شباب صاحب کا یہ خط جو راقم الحرف کے علاوہ دیگر کئی احباب کے نام تھا درج ذیل ہے :

میں نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۸ء۔۲۰۱۰ء میں سے '' لائبریری اینڈ ڈاکیومنٹیشن ''

ارسالِ خدمت کر رہا ہوں ۔ جن مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے Chapter سروسز'' کا

راقم نے اس چیپٹر کو نئی تعلیمی پالیسی کا حصہ بنوانے میں

کامیابی حاصل کی ہے وہ ایک الگ داستان ہے۔ بہر طور لائبریرین کمیونیٹی کے لئے نہ
صرف یہ امر خوش آئند ہے بلکہ یقیناً بہتر مستقبل کی نوید بھی ہے۔ جیساکہ آپ ملاحظہ
فرمائیں گے کہ پالیسی ڈاکیومنٹ بڑا جامع اور مربوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن
آخری مراحل میں ایک مہرباں نے اس میں سے چند آئیٹم مثلاً آئندہ دس سالوں کے
دوران مختلف سطح کے کتب خانوں کے قیام وانصرام اور توسیع وترقی پر اٹھنے والے
بھی دیا گیا تھا۔ تکہ اس شعبہ کے مختلف (Final Layout) اخراجات کا تخمینہ یا
پروگراموں کے عملی نفاذ کو موثر اور یقینی بنایا جاسکے جس طرح دیگر شعبوں مثلاً ابتدائی
تعلیم، ثانوی تعلیم، فنی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے لئے باقاعدہ علیحدہ علیحدہ رقومات مختص
۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ اس طرح کتب (Appendix 'o , r') کی گئیں ہیں
خانوں کے لئے بھی خاطر خواہ رقم مختص ہوسکے لیکن بیروکریسی کے منفی رویے کے
کے تحت اس ضمن میں (Library & Texbooks) باعث ایسا ممکن نہ ہوسکا اور
محض ۲۰۰ ملین روپے کی رقم رکھی گئی ہے جو کہ پالیسی کے صفحہ ۱۱۸ پر دئے گئے فزیکل
کے (Routine) ٹارگیٹ یا اہداف کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ناکافی ہے یہ تو محض
اخراجات کو بہ مشکل پورا کرسکے گی جب کہ میں نے تقریباً ۱۲؍۳ ملین روپے مختص کر
نے کی تجویز پیش کی تھی۔ نیز میں نے صوبائی دارالحکومت بشمول اسلام آباد ایک ایک
ماڈل لائبریری کے قیام کی تجویز بھی رکھی تھی جو کہ حذف کرادی گئی ہے۔ علاوہ ازیں
اسکولوں اور کالجوں کے لا

ئبریرین کے لئے ۱۹۷۲ء کی پالیسی کے ہم آھنگ اساتذہ کے برابر اور گریڈااور
کی بھی تجویز دیگئی تھی جو کہ آخری مراحل میں ایک مہربان نے ختم Status
کرادی۔ نیز فیڈرل لائبریری فاؤنڈیشن کی بھی تجویز تھی تاکہ کتب خانوں کی توسیع و
ترقی کو بیوروکریسی سرخ فیتے سے نکالا جائے اس کے علاوہ شعبہ ہائے لائبریری و
انفارمیشن سائن کے نصاب کو جدید طرز پر ڈھالنے اور ان کو جدید سہولیات سے مزین
کرنے ساتھ لائبریری وانفارمیشن سائنسز کے مضمون کو بے اے کی سطح تک بطور
امتیازی مضمون متعارف کرانے کے لئے بھی کہا گیا تھا۔

chapter کا مندرجہ کوائف کی روشنی میں جناب سے پر زور درخواست ہے کہ مرسلہ
مطالعہ فرمائیں اور علاوہ ازیں جو بھی قابل عمل تجاویز آپ نے تجربہ اور پیشہ ورانہ
مہارت کی بناپر مناسب سمجھیں مرتب کرکے دئے گئے پتوں متعلقہ ارباب بست وکشاد
کو براہ راست ارسال فرمائیں۔ یہ آپ کی ایک بہت بڑی پیشہ ورانہ خدمت ہوگی۔ اسی
کو بھی بھجورہاہوں تاکہ حکومتی سطح پر اس شعبہ کی اہمیت PLA نوعیت کی غزارشات
کو اجاگر اور نمایاں کیا جاسکے۔ نیز ہم انہی پالیسی image اور افادیت اوراس کا
کے اندر بھی رکھوانے SAPII شفارشات کو پروگرام ۲۰۱۰ء نویں پانچسالہ منصوبہ اور
ہیڈکواٹر کو بھی متحرک کیا ہوا ہے۔ پالیسی کے مطالعہ PLA کی کوشش کرینگے۔ میں نے
کے بعد اس ڈاکیومنٹ کی جامعیت کا آپ کو بخوبی احساس ہوگا کہ اس میں سب کچھ ہے،
یعنی جامع

وغیرہ legislation ،انفارمیشن سروس پالیسی کا نفاذ، سروس اسٹرکچر، معیارات بندی کے کردار کو نہ صرف حکومتی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ اس کی PLA اور پہلی بار شراکت کو بھی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مان لیا گیا ہے۔ لیکن یہ اب ہم پر منحصر ہے کہ working paper کرکے translate ان پالیسی سفارشات کو کسی موثر طریقہ سے کی صورت میں حکومتی ایوانوں مین لے کر جاتے ہیں ۔ ان تمام امور میں آپ کی (معاونت ، رہنمائی مشاورت ، اور شراکت ہمارے لئے مشعل راہ ہوگی۔'' (۲۰

فروری ۱۹۹۸ء ایم ایچ شباب ، اسلام آباد ۲۵

: تعلیمی پالیسی کے لئے پاکستان ببلوگرفیکل ورکنگ گروپ کی تجاویز

پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ لائبریری پروفیشن میں قائم ہونے والا ایک قومی کی سفارش پر حکومت پاکستان (UNESCO) ادارہ ہے جس کا قیام ۱۹۵۰ء میں یونسکو کے تعاون عمل میں آیا تھا۔ ملک میں کتابیات کے فروغ اور لائبریری تعلیم کی ترویج کے لئے گروپ کی خدمات ۵۴ سال پر محیط ہیں۔ پاکستان کی قومی کتابیات ۱۹۴۷ء تا ء تدوین گروپ کا ایک اہم قومی کارنامہ ہے ۔ گروپ کے زیر اہتمام ۱۹۶۰ء میں ۱۹۶۱ قائم ہونے والا لائبریری اسکول گزشتہ ۴۴ سال سے انڈر گرجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تربیت کا اہتمام کر رہا ہے۔ وزارت تعلیم کی درخواست پر گروپ نے پاکستان کی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۸ء ۔۲۰۱۰ء کے لئے جو تجاویز ارسال کیں ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے ۔

۱۔ ملک میں ''نیشنل میڈیکل لائبریری'' قائم کی جائے۔ جیسا کہ بنگلہ دیش میں نیشنل میڈیکل لائبریری ڈھاکہ میں قائم ہو چکی ہے۔

۲۔ ملک میں ''نیشنل ایگریکلچرل لائبریری'' کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۳۔ ملک میں ایک '' نیشنل لائبریری برائے معزورین'' قائم کی جائے۔

۴۔ کالجوں کے کتب خانوں میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی سہولتوں کو یقینی بنایا جائے۔

۵۔ ملک میں '' نیشنل سینٹر برائے رسائل و جرائد قائم کیا جائے۔

۶۔ ۱۷اکتوبر سر سید احمد خان کا یوم پیدائش ہے اس تاریخ کو قومی سطح پر ''ٹیچرس ڈے (Teacher's Day) '' کے طور پر منایا جائے۔(۲۱

تعلیمی پالیسی میں لائبریریز و دستاویزی خدمات کے بارے میں بیان کردہ حقائق و معلامات ٔ اعداد و شمار و تجاویز حسب ذیل ہیں:

۱۱۔ لائبریری و دستاویزی خدمات (Library and Documentation Services)

۱۱۔۱ پالیسی کا خاکہ (Conceptual Framework)

۱۱۔۱۔۱ملک کی سماجی و معاشی ترقی کے لئے لوگوں میں فہم وفراست بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں مفت لائبریری سروس شروع کی جا ئے کسی بھی ملک میں بحیثیت مجموعی تعلیم اور تحقیق کی ترقی میں لائبریریاں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پاکستان میں تعلیم کے میدان میں نئ

سمت اور راہیں پیدا کرنے کے لئے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں تک پہنچانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا بھرپور طریقہ سے مقابلہ کیا جاسکے۔ یہ نتائج اس وقت ہی حاصل کئے جاسکتے ہیں جب پرائمری کی سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک بہت منظم لائبریریاں موجود ہوں ساتھ ساتھ اکیڈمی لائبریریوں کی مدد سے پبلک لائبریریوں کا ایک مضبوط جال بچھانے کی ضرورت ہے تاکہ ایسے باعلم شہری پیدا ہوں جو معاشرہ میں پروقار اور بااعتماد طریقہ سے اپنی خدمات انجام دے سکیں۔ ملکی ترقی کا تیز کرنے میں لائبریری کی سہولتوں اور معلومات کی فراہمی کے طریقہ کار کو بھی اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

۱۱۔۱۔۲ کسی بھی ملک کے لئے سب سے ضروری معاشی ذرائع سمجھے جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لئے اطلاعات و معلومات ایک انجن کی حیثیت رکھتے ہیں جو ملک کی معیشت کو چلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی مجموعی آموزش اور بنیادی ڈھانچے کی تکمیل میں لائبریریاں اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی آبادی کو زندگی بھر مہارت اور معلومات کی فرہمی کے لئے طریقہ کار کو سہارا دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لائبریری محض لوگوں کو مواد کی فراہمی کا طریقہ نہیں بلکہ معاشی سیکٹر میں عوام کی مختلف النوع کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ معلومات اور

اطلاعات کی فراہمی سے قطع نظر لائبریریاں ملک کی ثقافت اور تہذیب کا مرکز بھی تصور کی جاتی ہیں۔ لائبریری کا ایک مقصد لوگوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا کرنا ہے۔

۱۱۔۱۔۳ تقابلی جائزہ: ۱۹۹۰ء میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں اس وقت ۱۹۳۰ لائبریریاں موجود ہیں جس میں ۱۴۰ اکیڈمی اور یونیورسٹی لائبریریاں ہیں جہاں کتابوں کی تعداد ۳۹ لاکھ ہے (جو پاکستان بھر کی لائبریریوں میں پانچویں نمبر پر ہے) جب کہ ۶۸۰ کالجوں میں کتب کی تعداد ۳۶،۴۰،۰۰۰ (۳۶ لاکھ ۴۰ ہزار) ہے۔ اسی طرح ۲۸۰ پبلک لائبریریوں میں کتابوں کا ذخیرہ ۲۱۵۰۰۰ (۲ لاکھ ۱۵ ہزار) کے قریب ہے جو ملک بھر میں تیسرے نمبر پر سب سے زیادہ انتخاب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ملک کی خصوصی لائبریریوں میں ۲،۵۰۰،۰۰۰ (۲۵ لاکھ) کتب موجود ہیں اس وقت ملک بھر کے ۱۵۰،۰۰۰ (ایک لاکھ ۵۰ ہزار) پرائمری اسکولوں میں صرف ۴۸۱ لائبریریاں ہیں جہاں کتب کی تعداد ۹۸۰،۸۰۰ (۹ لاکھ ۸۰ ہزار ۸ سو) ہے۔ ان لائبریریوں میں صرف ۳۰ ماہر لائبریرینز موجود ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ملک بھر کی لائبریریوں میں سے ۵۰ فیصد تعلیمی اداروں سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ ۲۵ فیصد ۲۰۰ مخصوص اداروں سے منسلک ہیں، جب کہ ۲۵ فیصد لائبریریاں دوسرے قسم کی ہیں۔ پاکستان کی ۱۴ ملین کی آبادی میں اتنی لائبریریاں انتہائی کم ہیں۔ جہاں ناکافی سہولتوں کے باعث ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔

۱۱۔۱۔۴ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں ہماری لائبریریاں اور ان کے ذرائع ایک تکلیف دہ تصویر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ۳۱،۲۵۴ لائبریریاں ہیں جس میں دس ہزار اسپیشل لائبریریاں بھی شامل ہیں، کانگریس امریکہ) کی لائبریری میں ۹،۰۰،۰۰،۰۰۰ آئیٹمز موجود ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے اعداد) وشمار کے مطابق اسرائیل کی ۵۰ لاکھ آبادی میں ۳۴۱۹ لائبریریاں موجود ہیں، تنزانیہ جس کی خام قومی پیداوار ۷۰ ڈالر ہے اس کی حالیہ دیہی لائبریریوں کی تعداد ۳۲۰۰ ہے جب کہ ہماری قومی لائبریری میں کتب کا انتخاب تقریباً ۱،۲۵،۰۰۰ (ایک لاکھ ۲۵ ہزار) کے قریب ہے۔ لائبریری میں سہولتوں کے فقدان کے باعث ہمارے ملک کے لوگوں میں پڑھنے پڑھانے کی عادت تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ ملک کی ۴۳۰ لائبریریوں میں ایک کروڑ ۵۰ لاکھ کے قریب کتب موجود ہیں جو کہ ۰۱ء (0.1) فی قاری بنتی ہے۔ جب کہ جاپان میں ایک شہری پا ۵۸ کتب موجود ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں سے اس وقت ۱۴۰ روزنامے شائع ہوتے ہیں جو مختلف زبانوں میں ہوتے ہیں جن کی مجموعی سرکولیشن ۳۰،۶۴،۲،۱۷ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اخبار کو ۱۷ قارئین پڑھتے ہیں۔ ملک میں لائبریریوں کی تعداد اور ان کا استحکام ملک کی سماجی و معاشی ترقی کی سطح کا ظاہر کرتے ہیں خواندگی کی کوئی بھی مہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب کہ ملک بھر میں لائبریریوں کو منظم طریقہ پر

استوار نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں لائبریریوں کا جال بچھانے کے لئے بنیادی اقدامات کی فوری ضرورت ہے۔

۱۱۔۱۔۵ تعلیم، تحقیق اور تربیت کے شعبہ میں متعلقہ معلومات کی بر وقت فراہمی کے لئے سازوسامان سے آراستہ ایک بھرپور خودکار قومی دستاویزی مرکز کھولنے کی ضرورت ہے۔ یہ دستاویزی مرکز ملکی ترقی میں شامل دیگر شعبہ جات کو معلومات فراہم کرے گا۔ اس وقت مختلف قسم کا تحقیقی مواد اور ادبی لٹریچر مختلف تنظیمون کی جانب سے بمشکل حاصل کیا جاسکتاہے اور تحقیق کرنے والے افراد اس وجہ سے کافی مشکل میں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا یہ مرکز محققین، اساتذہ، ماہر تعلیم اور طالب علموں کو ایک مرکز میں یہ تمام معلوماتی مواد مہیا کرے گا۔

۱۱۔۱۔۶ مختلف کیٹگری (Category) کے حساب سے ملکی لائبریریوں کا مرتبہ درج ذیل ہے:

i) اسکول لائبریریاں: اسکول رسمی تعلیم کی بنیاد تصور کیا جاتاہے۔ لہٰذا اس کو معیاری تعلیم کا سب سے اہم دور سمجھنا چاہیے۔

اسکول کی سطح پر تعلیمی معیار کو بڑھانے لائبریریوں کو وہ اہمیت نہیں دیجاتی جو ان پر واجب ہے۔ ملک بھر کے تقریباً ۸۰ فیصد اسکول لائبریری کی

سہولتوں سے محروم ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے سروے کے مطابق اس وقت ملک بھر کے اسکولوں میں ۴۸۱ لائبریریاں قائم ہیں جہاں قلیل انتخاب ۹،۸۰،۸۰۰،۱،۵۰،۰۰۰ کتب مشتمل ہے۔ ان میں سے بیشتر اسکولوں میں یہ لائبریریاں بچوں کی پہنچ سے دور ہو تی ہیں جس کی وجہ مخصوص جگہ کی کمی، ماہر اور تربیت یافتہ اسٹاف کا فقدان شامل ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں ۱۳۰ اسکولوں میں تربیت یافتہ لائبریریز کی زیر نگرانی کتب خانے موجود ہیں۔

ii) کالج لائبریریاں: کالج کی لائبریریاں جو ملک بھر کی سب سے بڑی لائبریریاں تصور کی جاتی ہیں خراب خدمات، پرانی کتب اور پڑھنے کے مواد، غیر موزوں اسٹاف، ناکافی مالیاتی وسائل کے باعث مختلف مسائل کا شکار ہیں۔ مختلف کالجوں اور اداروں میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ داخلہ لیتے ہیں ایک لائبریرین پوری لائبریری کے انتظام و انصرام کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی کتابوں کو صحیح طریقہ سے رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام طلبہ کو ایک ہی جیسی سروس فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر طلبہ اور اساتذہ کی تعداد کو بڑھایا جائے تو یہ بھی مدِ نظر رکھا جائےلائبریری سروس کو بہتر کیا جائے اس وقت ۶۸۰ کالجوں میں ۳۶،۴۰،۰۰۰ کتب موجود ہیں۔ ان میں پانچ سو سے دو لاکھ کے قریب کتب ایک جگہ موجود ہوتی ہیں جن میں سے ۶۰ فیصد کے قریب سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کی کتابیں فرسودہ ہیں۔

iii) یونیورسٹی لائبریریاں: اس وقت ملک کی لائبریریوں اوران سے منسلک اداروں میں ۱۴۰ لائبریریاں موجود ہیں جہاں ۴۵۲ خدماتی مراکز ہیں جن میں ۳۹،۰۰،۰۰۰ کتب موجود ہیں جو ملک بھر کی لائبریریون میں پانچویں نمبر پر سے زیادہ انتخاب شمار کیا جاتا ہے۔ یہ لائبریریاں دیگر لائبریریوں کے مقابلے میں قدرے بہتر ہیں۔ مگر ناکافی سازوسامان، مالیاتی ذرائع معلومات اور ٹیکنالوجی تک رسائی نا ہونے کے باعث پھر بھی اچھی حالت میں نہیں۔ یونیورسٹیاں اوران سے ملحقہ ادارے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی جگہ ہوتے ہیں بدقسمتی سے پاکستان میں کیڈمی لائبریریاں انتہائی شکستہ حالت میں ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے یونیورسٹی لائبریریاں فنڈز کی کمی شکار ہیں جس کے باعث نئی کتب اور تحقیقی رسالہ نہیں خریدے جا سکتے۔ لہٰذا نئے تحقیقی رسالے، کتابیں، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے فنڈز مہیا کئے جائیں گے تاکہ ان کو برقیاتی میڈیا کیساتھ منسلک کیا جاسکے۔

iv) اسپیشل لائبریریاں: آر اینڈ ڈی تنظیموں اور ایس اینڈ ٹی کے اداروں میں ۳۳۰ اسپیشل لائبریریاں مختلف سطحوں پر کھولی جائیں گی تاکہ مختلف تنظیموں اور اداروں می اطلاعاتی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس وقت یہ لائبریریاں ۲۵،۰۰،۰۰۰ کتابوں پر مشتمل ہیں۔ مگر یہ بھی ذرائع کی کمی سازوسامان اور سہولتوں کے فقدان کے باعث اپنا مطلوبہ معیار برقرار نہیں رکھ

سکیں۔ اس ضمن میں ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ضروری اقدامات کی فوری ضرورت ہے۔

۷) پبلک لائبریریاں: ہمارے یہاں کی پبلک لائبریریاں سوائے چند کے انتہائی خراب حالت میں قائم ہیں۔ یہ محض اخبارات اور جرائد پڑھنے کے لئے ریڈنگ روم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حکومت کی اس وقت سب سے اولین ترجیح رسمی اور غیر رسمی تعلیم کو لوگوں میں مقبول بنانا ہے۔ اگر پبلک لائبریریوں میں تربیت یافتہ اور ماہر افراد کی زیر نگرانی کا م ہو اور کتب اور دیگر سہولتیں مہیا ہوں تو ملک کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی رویوں میں بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ملک میں ۲۸۰ پبلک لائبریریاں ہیں جو زیادہ تر شہری علاقوں میں ہیں۔ پبلک لائبریریاں خود آموزش کے ذریعہ محض خواندگی کو بڑھانے کا ہی ذریعہ نہیں ہیں بلکہ طبقے اور فرد کے لئے معلوماتی، تعلیمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس کامیاب پالیسی اور منصوبے پر منصوبہ ساز افراد اور پالیسی میکرز نے کبھی توجہ نہیں دی۔ لہذا سب سے اہم ضرورت اس وقت پبلک لائبریریوں کی تعداد کو قانونی اور دیگر طریقوں سے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ معلوماتی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکے۔

vi) دیہی لائبریریاں : ہمارے ملک کی ۶۵ فیصد آبادی دیہی علاقوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ لائبریریوں کی تعداد ان علاقوں میں ناکافی ہے۔ دیہی علاقوں میں لائبریریوں کی اہمیت سے قطع نظر یہ ان علاقوں کے لوگوں کے مطالعے کی عادت کو پروان چڑھانے میں سازگار ثابت ہوتی ہیں۔ س کے علاوہ بھی مختلف النوع معملات میں بھی طبقے کی دیگر ایجنسیوں کے علاوہ یہ لائبریریاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہلائبریریاں دیہی افراد میں شعور بیدار کرنے اور ان میں تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے مختلف افراد کے درمیان مباحثے اور مذاکرے کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ کتب میلے اور مختلف اہم دن کی مناسبت سے مختلف پروگرام اور عورتوں اور بچوں کے لئے معلوماتی فلمیں اور کہانیاں دکھانے کا انتظام کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں اور اقوام کے رویے کو بہتر بنانے اور محاذ آرائی کی فضاء کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں لوکل گورنمنٹ دیہی علاقوں میں لائبریریوں کی یونین کونسل کو بہتر بنانے کے لئے کام کرے گی۔ محدود ذرائع کے تناظر میں دیہی علاقوں میں ان خدمات کو فوری پر وسیع نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اس مقصد کے لئے دیہی اور پس ماندہ علاقوں میں ہر پچاس ہزار افراد کی آبادی پر ایک موبائل لائبریری متعارف کرائی جائیگی۔ یہ تجربہ امریکہ اور افریقہ کے چند ممالک میں اس صدی کے اوائل میں کامیابی کے ساتھ چلتا رہا ہے۔ یہ موبائل لائبریری سروس ۱۹۹۰ء میں لاہور ڈویژن میں شروع کی جاچکی ہے جو

لاہور کے سات یا آٹھ نیم شہری علاقوں میں اپنے دورے کر چکی ہے۔

vii) نیشنل لائبریری آف پاکستان: پاکستان کی آزادی کے ۴۵ سال بعد اگست ۱۹۹۳ء میں نیشنل لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ یہ لائبریری ۱۲۵،۰۰۰ کتب اور ۵۲۵ مخطوطات پر مشتمل ہے۔ کمپیوٹر اور سوفٹ ویئر کی سہولتوں کی فراہمی اب آخری مراحل میں ہے۔ مگر موجودہ صورت حال میں ناکافی عملے اور مالیات کے باعث انتہائی خراب حالت میں ہے۔ترقی کو بڑھانے' پالیسی' پروگروموں اور اس کے کاموں کے دائرہ کار کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس قانونی طور پر تائید کی ضرورت ہے۔

:۱۱۔ ۲ لائبریری کے مقاصد اور دستاویزی خدمات

۱۱۔ ۲۔۱ لائبریریاں تعلیمی نظام کا اہم جزو و معاشی و معاشرتی تبدیلی کا اہم عامل ہیں۔ لائبریریوں کے ذریعہ عوام الناس میں مطالعاتی ذوق کی ترویج] معلومات کی فراہمی اور تحقیقی مواد کے بہم پہنچاکر خواندگی کی تحریک کو تر تر بنانا۔

۱۱۔ ۲۔ ۲ الیکٹرنک اور پرنٹ میڈیا میں جدید اطلاتی ذرائع اور وسائل کی اضافی ترسیل کے ذریعہ موجودہ تعلیمی نظام کو تعداد اور معیار کے اعتبار سے مزید

بہتر بنانا۔

اا۔ ۲۔۳ نوجوانوں اور دیگر افراد کی حوصلہ افزائی اور انہیں خودآموزش اور تعمیری سرگرمیوں کی جانب رغبت دلانے کیلئے یونین کونسل ابتدائی سطح پر ملٹی میڈیا لائبریریاں اور انفارمیشن ریسورس سینٹر (Resource Centre) قائم کرے گی۔

اا۔ ۲۔۴ معلومات پر مبنی سرگرمیوں کے ذریعہ رواداری اور قومی یکجہتی کو فروغ دینا۔ یہ امر ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے خاتمے میں بھی مددگار ہوگا۔

اا۔ ۲۔۵ لائبریری کے ذریعہ تعلیم کے وسیع تر مواقع فراہم کرنا تاکہ سماجی اور جمہوری اقدار کے شعور کے ساتھ ان لوگوں میں مطالعہ کی دادت پختہ ہوسکے۔

اا۔ ۲۔۶ قارئین کی ضروریات معلوم کرنے کیلئے سروے مختلف کتب خانوں کی مطالعاتی جانچ کرنا ہوگی تاکہ ان کی کمزوریوں تعین ہوسکے۔درست منصوبہ بندی اور مناسب انتظاملک میں کتب خانوکے نظام عمل کو استحکام حاصل ہوسکے۔

اا۔ ۲۔۷ لائبریری و دستاویزی خدمات کو لائبریری معیارات اور لائبریری قانون کے ذریعہ معیاری اور بہتر بنانا۔

اا۔ ۲۔۸ کتب خانوں میں کھلی ہوئی الماریوں کے نظام (Open Shelve System)

کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ قارئین کی معلومات تک رسائی جلد اور آسانی سے ہو سکے۔

۱۱۔۲۔۹ ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو فروغ کے لئے تربیت یافتہ اور پیشہ ورانہ اعتبار سے اہل لائبریرین پیدا کرنا۔

۱۱۔۲۔۱۰ تمام اقسام کے کتب خانوں کے پیشہ ورانہ عملے کے لئے جامع اور قابل عمل "ملازمت کا ڈھانچہ" (Service Structure) بنانا۔

۱۱۔۲۔۱۱ لائبریری و انفارمیشن سائنس کو اسکولوں، کالجوں اور جامعات کی سطح تک بطور ایک مضمون متعارف کرنا۔

۱۱۔۳ پالیسی قرار دادیں (Policy Provisions)

۱۱۔۳۔۱ خواندگی میں اضافے کے لئے لوگوں کو خود آموزش اور مطالعے کے وسیع مواقع فراہم کرنا اس مقصد کے لئے بلدیاتی اداروں کے تعاون سے ابتدائی سطح پر بہتر سہولتوں سے آراستہ کتب خانوں کا جال بچھایا جائے گا۔

۱۱۔۳۔۲ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے کتب خانوں کو جدید مطالعاتی مواد اور انتظامات سے مزین کرنا۔ الیکٹرانک لائبریری کی اضافی سہولت کیلئے ہر لائبریری کو انٹرنیٹ سے رابطے کے لئے کمپیوٹر فراہم کئے جائیں گے۔

۱۱۔۳۔۳ خصوص کتب خانوں میں معلومات کی جدید ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اور ڈیٹا بیس، سی ڈی روم ٹیکنالوجی وغیرہ کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۱۱۔ ۳۔ ۴ دور افتادہ دیہات اور نیم شہری علاقوں کے محروم لوگوں کی معلاماتی ضروریات پورا کرنے کیلئے موبائل لائبریری سروس کا آغاز۔

۱۱۔ ۳۔ ۵ ملک میں لائبریری سہولتوں کے جامع استعمال کے لئے کثیر رقم مختص کی جائے گی۔

۱۱۔ ۳۔ ۶ لائبریری خدمات کی مؤثر اور بہتر فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے مختلف نوعیت کی لائبریریوں جیسے پبلک ' خصوصی اور یونیورسٹی ' اسکول اور کالج کی لائبریریوں کے لئے یکساں معیار تیار کرنا۔

۱۱۔ ۳۔ ۷ کتب خانے استعمال کرنے والوں کی سہولت کے لئے کتب خانوں میں کھلی ہو ئی الماریوں کے نظام (Open Shelve System) کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۱۱۔ ۳۔ ۸ لائبریرینز کی ملازمت کو زیادہ پیشہ ورانہ بنانے کے لئے ''ملازمت کا ڈھانچہ (Service Structure) '' بنایا جائے گا۔

۱۱۔ ۳۔ ۹ اسکولوں ' کالجوں اور جامعات کی سطح پر لائبریری وانفارمیشن سائنس کو ایک مضمون متعارف کرایا جائے گا۔ لائبریری سائنس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کئے جائیں گے۔

۱۱۔ ۳۔ ۱۰ اسکولوں ' کالجوں کے طلباء میں مطالعہ کی عادت پیدا کرنے کی غرض سے لائبریری پیریڈ شروع کئے جائیں گے۔

۱۱۔ ۳۔ ۱۱ ملک میں کتب خانوں کے باقاعدہ قیام اور ترقی کے نظام ' لائبریری خدمات اور سہولتوں کو بہتر اور مستحکم بنانا تاکہ یہ عالمی معیار کے مساوی

ہو سکیں۔

۱۱۔۳۔۱۲ شہریوں کی معلوماتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پانچ ماڈل عوامی کتب خانے ہر صوبے کے دارالخلافہ میں ایک بشمول اسلام آباد میں مقامی حکومتوں کے تعاون سے قائم کئے جائیں گے۔

۱۱۔۳۔۱۳ ملک میں پالیسی کے ایداف کے حصول، عوامی کتب خانوں کے نیٹ ورک پر یقینی عمل درآمد اور نگرانی کے لئے پنجاب لائبریری فاؤنڈیشن (۱۹۸۵ء) کی طرز پر قائم (Federal Library Foundation) ''ایک مکمل ''فیڈرل لائبریری فاؤنڈیشن کی جائے گی جو پیشہ ورانہ عملے پر مشتمل ہو گی۔

۱۱۔۳۔۱۴ کتب خانوں کے باقاعدہ پھیلاؤ اور قابل برداشت ترقی اور سہولتوں کے لئے مالی ذرائع کو بڑی حد تک بڑھایا جائے گا۔

(Physical Targets) ۱۱۔۴ مادی اہداف

لائبریریوں کی تعداد (Nature of Libraries) لائبریریوں کی نوعیت

اسکول لائبریریاں (۱) پرائمری ۱۴۵۰۰۰

صرف ۲۰ فیصد اسکولوں کی لائبریریوں بہتر حالت میں ہیں) (۲) مڈل ۱۵۰۰۰)

ثانوی ۱۱۰۰۰ (۳)

مجموعی تعداد ۱۷۱،۰۰۰

کالج لائبریریاں (آرٹس + سائنس + پیشہ ورانہ کالج) ۹۷۵

یونیورسٹی لائبریریاں ۳۵

مخصوص شعبہ جاتی لائبریریاں ۱۵۰۰

پبلک دیہی لائبریریاں (یونین کونسل کی سطح پر) (۱) پنجاب ۲۳۹۳

سندھ ٦١٢ (۲)

سرحد ٦۵۵ (۳)

بلوچستان ۳۱۵ (۴)

مجموعی تعداد ۳۹۷۵ موبائل لائبریریاں (ہر ۵۰ ہزار آبادی کے لئے ایک) ۲۰۰۰

تعلیم کے شعبہ میں قومی دستاویزی مرکز کا قیام لائبریری + ادستاویزی مرکز

ملک بھر میں مربوط تحقیقی سرگرمیوں کے لئے علمی دستاویزار اور کمپیوٹرائزڈ خدمات)

کی فراہمی اور اس کے ذریعے ماہرین تعلیم ، محققین ، اساتذہ طالب علموں کی معلوماتی

(ضروریات کی تکمیل

۱۱۔۵ حکمت عملی کا نفاذ (Implementation Strategy)

۱۱۔۵۔۱ تعلیم کے شعبے میں ۵۰،۰۰۰ ہزار تحقیقاتی رپورٹوں پر مشتمل قومی دستاویزی مرکز قائم کیا جائے گا۔

۱۱۔۵۔۲ اطلاعات کے قومی وسائل میں تمام لائبریریوں کی شرکت کے لئے جامعات کی لائبریریوں کا انٹرنیٹ کے ذریعہ نیشنل لائبریری آف پاکستان سے رابطہ قائم کیا جائیگا۔

۱۱۔۵۔۳ مستحق طلباء کو نصابی کتب کی مفت فراہمی کے لئے تمام درسی کتب خانو

ں میں بک بینک قائم کیے جائیں گے۔

۱۱۔۵۔۴ ملک میں کتب خانوں کی ترقی اور شعبہ میں پیشہ ور عملی کی خدمات کو بہتر بنا نے، مالیاتی ضروریات کی تکمیل اور قانونی مدد کے لئے ایک ایکٹ کے ذریعہ لائبریری اور انفارمیشن سائنس کی جامع پالیسی وضع کی جائے گی۔

۱۱۔۵۔۵ ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ کے لئے ضروری ہوگا کہ تعلیمی اور عوامی کتب خانوں میں تربیت یافتہ اور پیشہ ورانہ ماہر لائبریرینز کا کیڈر (Cader) قائم کیا جائے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں پیشہ ورانہ لائبریرینز کے مناسب سروس اسٹرکچر (Service Structure) تشکیل دینے کے لئے ضروری اقدامات کریں۔

۱۱۔۵۔۶ نیشنل لائبریری آف پاکستان کو خاص حیثیت دینے کے لئے نیشنل لائبریری ایکٹ (National Library Act) جاری کیا جئے گا۔

۱۱۔۵۔۷ دیگر شعبوں اور مضامیں کی طرح لائبریری وانفارمیشن سائنس کے شعبہ میں بھی اندرون ملک اور بیرون ملک تعلیم وتربیت کے اسکالرشپ دئے جائیں گے۔

۱۱۔۵۔۸ کتب خانوں کی ترویج کے لئے عطیات دینے والی ایجنسیوں کے تعاون سے فنڈ (Endowment Fund) مقرر کیا جائے گا۔

۱۱۔۵۔۹ اسکول ٹائم ٹیبل میں لائبریری پیریڈ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۱۱۔۵۔۱۰ لائبریری معیارات کی تشکیل اور لائبریری قانو سازی کے لئے ماہرین

کی کمیٹی تشکیل (۴) دی جائے گی۔ تربیتی کورسیز اور سروےزکے لئے امداد میں اضافہ کیا جائے گا۔

اا۔۵۔اا سال کی پانچ بہترین لائبریریوں اور لائبریرینزکے لئے ایوارڈ جاری کئے جائیں گے۔

اا۔۵۔۱۲ قارئین کی ضروریات کاتعین کرنے کے لئے مختلف قسم کے کتب خانوے سروے اور مطالعات کئے جائیں گے جو مناسب منصوبہ بندی میں معاون ثابت ہوں گے۔

اا۔۵۔۱۳ کھلے ہوئی الماریوں کے نظام (Open Shelves System) کی حوصلہ افزائی کے لئے (Write-off) اور (Weeding-Out) کی تفصیلی اور قابل عمل منصوبہ بندی کی جائے گی۔

اا۔۵۔۱۴ ملک میں مناسب لائبریری خدمات کے فروغ کے لئے، پاکستان لائبریری نظام کے قابل عمل ڈھانچے، مناسب تنظیم اور تسلی بخش مالی امداد کو قانونی تحفظ دینے کے لئے لائبریری قانون تشکیل متعارف کرانا ہوگا

اا۔۵۔۱۵ وزارت تعلیم میں اباہم رابطے، انتظامی امور میں مشوروں، عام معاملات، قانون اور پالیسی کے معاملات کے لئے ایک مکمل اور علیحدہ سیل (Cell) قائم کرنا ہوگا۔

اا۔۵۔۱٦ پالیسی کے اہداف کے حصول کے لئے کتب خانوں کاترقیاتی فنڈ ۰۔۲ فیصد سے مناسب حد تک بڑھانا ہوگا۔

پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے اور کتب خانے (Five Years Development Plans and Libraries) قیام پاکستان کے سات سال بعد حکومت نے باقاعدہ ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی کی اور ایک تسلسل کے ساتھ ترقیاتی منصوبے تشکیل دیئے جارئے ہیں۔ ۱۹۵۵ء سے ۲۰۰۳ء تک نو ترقیاتی منصوبے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان ترقیاتی منصوبوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کتب خانوں اور لائبریری تحریک کے فروغ کیلئے کیا منصوبہ بندی کی گئی، ملک کے منصوبہ سازوں نے کتب خانوں کو کیا مقام دیا۔ اس کا اندازہ ان منصوبوں کے جائزے سے بخوبی لگایا جاسکتاہے۔ ذیل۔

۱۔ پہلا ترقیاتی منصوبہ ۱۹۵۵۔۶۰ء (First Five Year Plan 1955-60) (۲۲

پہلا ترقیاتی منصوبہ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء کے دور کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے میں کتب خانوں کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیگئی اور نہ ہی ملک میں لائبریری خدمات کی شروعات کے لئے کوئی تجویز شامل کی گئی (۲۳)۔ البتہ باب ۳ میں ٹیچر ٹریننگ و ایجوکیشن ریسرچ کے تحت ملک میں جامعات کے حوالے سے صرف اس بات پر اکتفا کیا گیا کہ " ملک میں چھ میں سے چار جامعات (راجشاہی، پشاور، حیدرآباد، کراچی) ابتدائی دور میں ہیں اور پرانی لاہور اور ڈھاکہ کو بھی ترقی دینا ہوگی۔ ان کی اولین ضرورت اسٹاف، سازوسامان، لیبارٹری اور لائبریریز کو بہتر بنانا جائیگا (۲۴)۔

(۲۔ دوسرا ترقیاتی منصوبہ ۶۵۔۱۹۶۰ء (۲۵ (Second Five Year Plan 1960-65)

دوسرا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ پہلے منصوبے سے مختلف نہ تھا۔ اس منصوبے میں بھی کتب خانوں کے قیام یا لائبریری تحریک کے لئے کوئی تجویز نہیں تھی۔ یونیورسٹیز کے تحت لائبریری، اسٹڈی روم اور دیگر ضروری عمارات کی تعمیری ضرورت پر زور دیا گیا (۲۶)۔

(۳۔ تیسرا ترقیاتی منصوبہ ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۷۰ء (۲۷ (Third Five Year Plan 1965-70)

اس منصوبہ میں پہلی بار کتب خانوں کی اہمیت کو محسوس کیا گیا کہ " لائبریری کسی بھی تعلیم ادارے کے دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہت سے کالجوں میں کتب خانے خراب حالت میں ہیں۔ اس سمت میں شدید تگ و دو کی ضرورت ہے۔ کتب خانوں میں معیاری اور جدید کتب، تحقیقی نوعیت کے رسائل وجرائد اور دیگر علمی مواد وافر تعداد میں ہونا چاہیے۔ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لائبریریز بھرتی کئے فائیں۔ کتابوں اور دیگر مواد تک رسائی تیز، آسان اور کھلی الماریوں میں کتابوں کے رکھنے کا نظان متعارف کیا جائے۔ لائبریری اور مطالعاتی مراکز میں مطالعہ کی سہولت کالج کے اوقات کے بعد بھی فراہم کی جائے (۲۸)۔

(۴۔ چوتھا ترقیاتی منصوبہ ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۵ء (۲۹ (Fourth Five Year Plan 1970- 75)

اس ترقیاتی منصوبے میں کتب خانوں کی ترقی اور لا ئبریری تحریک کے فروغ کے لئے متعدد اقدامات تجویز کئے گئے اور تفصیل کے ساتھ "لا ئبریری خدمات" کے عنوان سے کتب خانوں، لا ئبریری سائنس کی تربیت اور لا ئبریریز کے موضوع پر بات کی گئی۔

۱۲۲ : ملک میں کتب خانوی خدمات (Library Services) بڑی حد تک ناکافی ہیں۔ کئی کتب خانے قومی زبان میں معیاری کتب کی عدم دستیابی، تربیت یافتہ لا ئبریرین کی غیر موجود اور مناسب مالی وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آرہے۔ ملک میں بہتر لا ئبریری خدمات کے لئے ادامات کرنا ہوں گے۔

۱۲۳ : عام طور پر صوبائی حکومتیں تعلیمی اداروں کو لا ئبریری گرانٹ کے طور پر مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ کتب خانوی خدمات کی ترقی کے لئے وزارت تعلیم کے تحت ڈائیریکٹریٹ آف آرکائیوز و لا ئبریریز قائم ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ صوبوں کو بہتر کتب خانوی خدمات کی تنظیم میں اپنی خدمات فراہم کرے۔

۱۲۴ : صوبوں میں ڈسٹرکٹ، ذیلی ڈسٹرکٹ اور تھانہ وہیڈ کواٹرس میں عوامی کتب خانوں کے قیام کے لئے کچھ ادامات کئے گئے ہیں۔ پاکستان کی بعض جامعات میں لا ئبریری سائنس میں ڈپلومہ، ڈگری اور سرٹیفیکیٹ کورسز شروع کئے ہیں۔ امید ہے کہ چوتھے منصوبہ کے اختتام تک شہر اور
دیہات میں ملازمت کے لئے کافی تعدام میں پیشہ ورانہ لا ئبریریز موجود ہوں

گے۔ لائبریریز کی تربیت کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۲۵ : ہر ڈسٹرکٹ اسکول اتھارٹی لوکل باڈیز کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہاں ایک لائبریری مناسب تعداد میں کتابوں اور دارالمطالعہ کے ساتھ موجود ہو۔ عوامی کتب خانوں کے مابین کتابوں کے باہمی تبادلے کا نظام بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ تربیت یافتہ لائبریریز کی ایک جماعت ملک میں لائبریری خدمات کو منظم کر سکتی ہے۔

۱۲۶ : بچوں کا ادب ، ناول ، مہماتی ادب ، لوک ادب ، رسائل و جرائد ہمارے نوجوان قارئین کے لئے مہیا ہونا چاہیے۔ غیر معیاری غیر ملکی کتابیں ، مضحکہ خیز مواد ، جنسی رسائل کے لئے ان کی کشش کو معیاری اور مفید بچون کے ادب سے بدلنا ہوگا۔ مذید برآں شہروں اور گاؤں میں کتب خانوں کے ایک نیٹ ورک کے ذریعہ مفید اور دلچسپ مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ عوام الناس میں مطالعہ کی دادت پیدا کرنے کے لئے دیہی علاقوں میں موبائل لائبریری سروس شروع کی جاسکتی ہے۔ ملک میں توسیعی لائبریری خدمات کی فراہمی کے لئے ترقیاتی منصوبہ میں مالی وسائل فراہم کئے گئے ہیں (۳۰) ۔اس منصوبہ میں سماجی و ثقفتی سرگرمیوں مشمول لائبریری خدمات کے لئے ۱۲۱ ملین کی رقم رکھی گئی تھی۔ لیکن اس یہ واضح نہں تھا کہ کتب خانوں پر کس قعر رقم خرچ کی جا ئیگی (۳۱)۔

۵۔ پانچواں ترقیاتی منصوبہ ۱۹۷۸ء۔۱۹۸۳ء (Fifth Five Year Plan 1978. 83) (۳۲)

یہ پہلا ترقیاتی منصوبہ ہے جس میں پرائمری اسکولوں میں کتب خانوں کے قیام کی تجویز سامنے آئی اور کتب خانوں کے لئے ۳۶ ملین روپے کی رقم مختص کی گئی۔ منصوبہ میں کہا گیا تھا کہ " منصوبہ کے دنوں میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ ابتدا میں محدود تعداد میں قارئین پیدا کرنے کیلیے پرائمری اسکولوں میں چھوٹے (Supplementary) اضافی کتب خانے قائم کئے جائیں۔ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں لائبریری کی کتابوں کے صحیح استعمال اور تنظیم کو یقینی بنانے کے لئے اسکولوں کے اساتذہ کے لئے چھوٹے کتب خانوں کی تنظیم وترتیب اور استعمال کی بنیادی معلومات پر مبنی تربیت کے پروگرام تشکیل دئے جائیں۔ پاکستان کے قومی کتب خانے کا زیر تکمیل منصوبہ مکمل ہوگا۔ صوبوں کے اہم اور بڑے کتب خانوں کو ترقی دیجائیگی۔ ایک ہزار گاؤں میں (Community Oriented Libraries) تعلیم بالغان کے تکمیل شدہ پروگرام کی مدد کے لئے قائم کئے جائیں گے (۳۳)۔ تعلیم بالغان کے پروگرم میں معاونت کے لئے ایک سو دیہی کتب خانوں کا قیام بھی منصوبہ میں شامل تھا۔

۶۔ چھٹا ترقیاتی منصوبہ ۱۹۸۳ء۔۱۹۸۸ء (Sixth Five Year Plan 1983-88) (۳۴)

منصوبہ کا باب ۱۸ بعنوان تعلیم۔ انسانی وسائل کی ترقی میں اہم سرمایہ کاری کے تحت اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے کے حوالے سے "لائبریری کی سہولتیں" کے

عنوان سے تجویز کیا گیا کہ پبلک لائبریریوں کا ایک نظام قائم کیا جائے۔ ان سفارشات کے مطابق جو وزیر خزانہ کی سراہی میں کابینہ کمیٹی کی طرف سے آئی ہیں۔ قومی لائبریری کا منصوبہ جس پر کام ہو رہا ہے محدود نوعیت کا ہے اس امر کا از سر نو جائزہ لیا جا رہا ہے کہ قومی لائبریری دنیا کے بہترین اداروں کر طرز پر قائم کی جائے تاکہ یہ موجودہ نسل کی دوررس نظر کو مستقبل مزاج پیش کرسکے" (۳۵)۔

(۷۔ ساتواں ترقیاتی منصوبہ ۹۳۔۱۹۸۸ء (۳۶) (Seventh Five Year Plan 1988-93)

کے تحت کہا "منصوبہ کے باب ۲۹ میں "لائبریری خدمات (Library Services) لائبریریز کی ترقی کے لئے (Institutional) گیا کہ ' ساتواں منصوبہ عوامی اور تعلیم مناسب رقم مہیا کریگا۔ عوامی کتب خانوں کا نظام جو چھٹے منصوبہ میں تجویز کیا گیا تھا کو ساتویں پلان مین فوقیت دیجا ئیگی۔ نیشنل لائبریری کی عمارت مکمل ہو گی اور اسے متعلقہ محکمہ کی تحویل میں دیدیا جائیگا۔ چلڈرن لائبریری کمپلیکس لاہور مکمل ہوگا۔ عوامی کتب خانوں کی ترقی کی اسکیم جو لوکل باڈیز کے تحت موجود ہے کو عملی جامہ پہنایا جائیگا۔ دینی مدارس کے کتب خانوں کو بہتر بنایا جئیگا۔ صوبہ سرحد میں خوشحال خان خٹک لائبریری قائم کی جائیگی۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی معیاری کتب کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اردو زبان میں ترجمہ کرکے لائبریریز میں تقسیم کیا جائے گا (۳۷)۔

(۸۔ آٹھواں ترقیاتی منصوبہ ۹۸۔۱۹۹۳ء (۳۸ (Eight Five Year Plan 1993-98)

حکومت نے ساتویں منصوبہ میں عوامی اور تعلیم کتب خانوں کے قیام ان کے لئے مالی وسائل مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ملک میں عوامی کتب خانے کا ایک نظام قائم کرنے کی بات می تھی لیکن اا منصوبہ میں حکومت نے کتب خانوں کے سلسلے میں بالکل خاموشی کا مظاہرہ کیا۔ البتہ جامعات میں کتابوں اور رسائل کی خریداری ے لئے اقرا فنڈ سے بڑی رقم رکھی گئی (۳۹)۔

(۹۔ نواں ترقیاتی منصوبہ ۲۰۰۳ء۔۱۹۹۸ء (۴۰ (Ninth Five Year Plan 1998-2003)

جدید حالات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور کی منسبت سے اس منصوبہ میں دیگر باتوں کے علاوہ کتب خانوں میں جدید سہولیات مثلاً انٹرنیٹ ، ای میل کی سہولیات فراہم کرنے کی تجویز شامل ہے۔ منصوبہ میں یونیورسٹی کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ " کتب خانے کو بین القوامی معیار کے مطابق بنایا جائے۔ یہ نہ صرف کتابوں ' رسائل اور جدید سمعی و بصری مواد سے آراستہ ہوں ، ساتھ ہی یہ تیز رفتاری سے کام کریں اور زیادہ وقت کے لئے کھلے رہیں۔ کتب خانوں میں انٹر لائبریری لون (Inter Library Loan) کا نظام متعارف کرایا جائے۔ لائبریرز میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کو بھی متعارف کرایا جائے ۔ انٹرنیٹ '

کی سہولیات کتب خانوں میں مہیا کی (Electronic Inter-link) ای میل اور جائیں (۴۱)۔

حاصل مطالعہ و تجاویز

قومی تعلیمی پالیسیوں اور ترقیاتی منصوبوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومتوں نے تعلیمی پالیسیوں اور ترقیاتی منصوبوں میں کتب خانوں کو وہ مقام نہیں دیا جو دینا چاہیے تھا۔ ابتدائی سالوں کی حکومتوں نے تو انہیں برائے نام ہی اہمیت دی جس کے نتیجے یہ شعبہ ترقی کے بجائے تنزلی کا شکار ہوگیا۔ ۱۹۷۲ء میں قائم ہونے والی حکومت نے پہلی مرتبہ ملک میں ۵۰ ہزار عوامی کتب خانے قائم کرنے کا اعلان تو کیا لیکن اس پر عمل ممکن نہ ہوا۔ قومی تعلیمی پالیسی جس پر اس وقت عمل درآمد ہورہا ہے ایک اعتبار سے کتب خانوں کی ترقی کے لیے اپنے اندر گنجائش رکھتی ہے لیکن اس پالیسی پر عمل درآمد کو نو سال ہوچکے ہیں کتب خانوں کی ترقی کے لیے کی گئی سفاشات پر تاحال عمل درآمد نہیں ہوا۔ گو یہ پالیسی ۱۹۹۸ء سے ۲۰۱۰ء تک کے لیے بنائی گئی تھی موجودہ حکومت نے اب نئی تعلیمی پالیسی تشکیل دینے کی عملی کوششیں شروع کردی ہیں لیکن یہ تاحال ابتدائی مراحل میں ہیں۔ حکومت کے منصوبہ سازوں کو چاہیے کہ وہ کتب خانوں کی اہمیت کے پیش نظران کی ترقی اور فروغ کے لیے سابقہ پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے، موجودہ ضروریات اور جدید تقاضوں

کو سامنے رکھتے ہوئے پالیسی ترتیب دیں۔

ہمارے ملک میں بنیادی مسئلہ منصوبوں، پالیسیوں اور قوانین پر عمل درآمد کا ہے۔ منصوبے، پالیسیاں اور قوانین تو بن جاتے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آتی۔ موجودہ تعلیمی پالیسی جو گزشتہ نو سال سے قابل عمل ہے کم از کم کتب خانوں کے لیے جو باتیں اس پالیسی میں کہیں گئیں ہیں ان پر دس فیصد بھی عمل درآمد نہیں ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو بھی پالیسی، منصوبہ یا قانون تشکیل پائے اس پر حقیقی طور پر عمل درآمد کیا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ نجمی، صفدر علی۔ قائدِ اعظم کا تصور تعلیم اور پاکستان۔ کراچی : یونیورسل پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص۔ ۱۹۴

2. Pakistan. Ministry of Education and Scientific Research. The New Education Policy .of the Government of Pakistan.Islamabad: The Ministry, 1970.

3. Samdani, Rais Ahmed. Education Policy 1992-2002 and Libraries. Pakistan Library Bulletin. 25(102): January -June 1994. p. 11.

4. Sabzwari, Ghaniul Akram. The New Education Policy (Editorial). Pakistan Library Bulletin. 1(4): June 1969.

5. Pakistan. Ministry of Education. The Education Policry (1972-1980)/ Islamabad: The Ministry, 1972.

6. Samdani, Rais Ahmed. Education Policy 1992-2002 and Libraries. op. cit. p. 11

۷۔ محمد زبیر۔ تعلیمی پالیسی ۔ ایک جائزہ۔ پاکستان لائبریری بلیٹن۔ ۵(۱۔۲): ستمبر۔ دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص۔ ۹۸

8. Qamar Mirza. Some Reflection on the New Education Policy. Pakistan Library Bulletin. 5(1-2): Sept.-December 1972.p.8

9. Hanif, Shaikh Muhammad. People's Public Libraries and New Education Policy. Pakistan Library Bulletin. 5(1-2): Sept.-December 1972.p.22

10. Resolution No. 1. Quoted in., Pakistan Librarianship (1970-71, the proceeding of the 8th annual

coference of the Pakistan Library Association, January 22-24, 1971 held at Karachi/ed. by Anis Khurshid.- Karachi: Pakistan Library Association, 1972. p.435

11. Sabzwari, Ghaniul Akram. The New Education Policy (Editorial). Pakistan Library Bulletin. 5(1-2): September- December. 1972.

12. Pakistan. Ministry of Education. National Eduycation Policy and Implementation Programme. Islamabad: M. O. Ed. , 1979.

13. Pakistan. Ministry of Education. Draft Work Plan for implementation of the National Eduycation Policy. Islamabad: The Ministry, 1978.

14. Samdani, Rais Ahmed. Education Policy 1992-2002 and Libraries. op. cit. p. 11-12.

15. Naqvi, Z. H. National Education Policy and Academic Library. Pakistan Library Bulletin. 12 (2) : 19-25. June 1981.

16. Pakistan. Government of , Ministry of Education. The Education

Policy 1992-2002. Islamabad: The Ministry, 1998.

17. Ibid. p.25-27

18. Ibid. p. 35.36

18. Ibid. p. 42.

19. Pakistan. Government of . Ministry of Education. National Education Policy اقرا 1998 - 2010. Islamabad: The Ministry, 1998.

۲۰۔ ایم ایچ شباب ۔ خط مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۹۸ء بنام رئیس احمد صمدانی۔ (خط راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے)

21. Pakistan Bibliographical Working Group. Proposals for New Education Policy 1998-2010. Karachi: Ministry of Education. (Mimeo).

22. Pakistan, Givernment of , National Planning Board. The First Five Year Plan 1955-60. KarachiL The Planning Board. 1957. 652p.

23. Saify, Obaidullah. Five Year Plan and Libraries. Pakistan Library Review. 1(1):

March 1958. p. 31

24. Thee First Five Year Plan 1955-60. op. cit. p. 52

25. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The Second Five Year Plan 1960-65. Islamabad: The Commission. June 1960. 414p.

26. Ibid. p. 349.

27. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The Third Five Year Plan 1965-70. Islamabad: The Commission. June 1950. 517p.

28. Ibid. p. 202-03.

29. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The Fourth Five Year Plan 1970-75. Islamabad: The Commission. Ju;y 1970. 574p.

30. Ibid. p. 167

31. Chaudhry, Shafiqur Rehman. The 4th Five Year Plan and the School Libraries in Pakistan. In., Pakistan Librarianship: 1970-71, the Proceeding of the 8th Annual

Conferecne of the Pakistan Library Association, January 22-
34 , 1971 held at
Karachi/ed. by Anis Khurshid.-Karachi: Pakistan Library
Association. 1972. p. 151.
32. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The
Fifth Five Year Plan 1978. 83.
Islamabad: The Commission. June 1978. 266p.
33. Ibid. pp. 157-158
34. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The
Sixth Five Year Plan
1983-88. Islamabad: The Commission. October 1983.
۳۵۔ پاکستان، حکومتِ ۔ منصوبہ بندی کمیشن ۔ چھٹا پنجسالہ منصوبہ: ۸۸ ۔ ۱۹۸۳ء
اسلام آباد: کمیشن ، اکتوبر ۱۹۸۳ء ۔ ص ۔ ۳۸۰
36. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The
Seventh Five Year Plan
1988-93. Islamabad: The Commission, 1988.
37. Ibid. p. 253.
38. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The
Eight Five Year

Plan

1993-98. Islamabad: The Commission. June 1994.

39. Ibid. 319

40. Pakistan, Givernment of , Planning Commission. The

Ninth Five Year Plan

1998-2003. Islamabad: The Commission. 1999.

41. Ibid.pp. 68-69.

Published in

Pakistan Library & Information Sciecne Journal PLISJ,

V.38, No.2, June 2007, Page: 5-23

حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم

قائد اعظم محمد علی جناح کے قریبی ساتھ اور سندھ کی معروف سیاسی و سماجی شخصیت
برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں بعض شخصیات کی کلیدی حیثیت ہے
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان نیک سیرت، پرخلوص، بے باک، نڈر اور سچے مسلمان
رہنماؤں کی بے پناہ محنت، خلوص و دیانت، عظیم جدوجہد اور قربانیوں کے باعث
ہمیں آج یہ سعادت حاصل ہے کہ ہم آزاد فضاء میں زندہ ہیں اور ایک آزاد، خود مختار
اور مسلم ریاست کے شہری ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔جدوجہد آزادی کے حریت
پرستوں کی جماعت کی سربراہی اور قیادت بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کو
حاصل تھی جب کہ سر حاجی عبداللہ ہارون مرحوم اس جماعت اور تحریک کے ایک اہم
ذِمہ دار، مخلص، بے باک اور صف اول کے مجاہدوں نیز قائد اعظمؒ کے قریبی ساتھیوں
میں سے تھے۔ قائد اعظم کو آپ پر مکمل اعتماد تھا یہی وجہ ہے کہ سر حاجی عبداللہ
ہارون ہر مرحلہ پر قائد اعظم کے ہمراہ دکھائی دیتے ہیں جس کا ثبوت پیر علی محمد
راشدی کے اس بیان سے ملتا ہے کہ" قائد اعظم محمد علی جناح ۱۹۳۸ء میں اور اس کے
بعد

عبداللہ ہارون مرحوم کے انتقال تک جب بھی کراچی تشریف لاتے ان کا قیام ہمیشہ سیفیلڈ" یعنی سر حاجی عبداللہ ہارون کی رہائش واقع کلفٹن میں ہوتا۔"

قائد اعظم محمد علی جناح کے قریبی ساتھی، تحریک پاکستان کی عظیم شخصیت، برصغیر کے معروف تاجر اور سب سے بڑھ کر انسان دوست حاجی سر عبداللہ ہارون جن کی برسی ہر سال ۲۷ اپریل کو انتہائی عقیدت و احترام اور سادگی سے منائی جاتی ہے۔ آپ کی سیاسی، سماجی، طبی، تعلیمی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بے لوث خدمات سے کسی کو انکار نہیں۔ آپ نے فلاحی سرگرمیوں، غریبوں، مسکینوں اور یتیموں اور سب سے بڑھ کر قومی مقاصد پر بے دریغ دولت صرف کی۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جس شخص کی ابتدائی زندگی اس قدر کٹھن مراحل سے گزری ہو اور وہ صرف چار برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گیا ہو اس قدر فراخدل، باہمت، استقامت پسند، سادہ طبعیت بے لوث اور یتیموں، مسکینوں، لاورثوں، بیواؤں اور غریب و نادار افراد کا سہارا ثابت ہوا۔ بے پناہ دولت کے مالک کے گھر کے دروازے ہر چھوٹے بڑے امیر غریب کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ ان کا گھر 'سیفیلڈ' ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھا، اس گھر میں برصغیر کا شاید ہی کوئی مسلمان رہنما ایسا ہو جس کا گزر نہ ہوا ہو جن میں قائد اعظم محمد علی جناح، سر آغا خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، آزاد سبحانی، فضل

، حسین، فضل الحق، سر سکندر حیات، مسعود اللہ، اکرام خان
سلطان احمد، صاحبزادہ عبد القیوم، ڈاکٹر انصاری، عبد الرحمٰن صدیقی، بہادر یار جنگ شامل ہیں وغیرہ۔

سر حاجی عبد اللہ ہارون مرحوم کا تعلق میمن برادری سے تھاآپ کے آباؤ اجداد ہندوستان کی ریاست 'کچھ' میں مستقل قیام پذیر تھے جن کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔آپ کے والد کا نام 'ہارون' تھا۔ چوبیس برس کی عمر میں ریاست 'کچھ' سے مستقل نقل مکانی کرکے سندھ میں آباد ہوئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنایااور یہاں بھی تجارت شروع کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ معمولی سے کاروبار سے گزر بسر مشکل سے ہو پاتا لیکن عبد اللہ ہارون مرحوم کی والدہ حنیفہ بائی انتہائی سمجھداراور سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھیں ان مشکل حالات میں با عزت زندگی گزارتی رہیں۔ عبد اللہ ہارون کو اعلیٰ مقام ان کی والدہ حنیفہ بائی کے ذریعہ حاصل ہوا۔

عبد اللہ ہارون ۱۸۷۲ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام عثمان تھا یہ ابھی صرف چار برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور عبد اللہ ہارون کی، پرورش ، تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داری کا بوجھ آپ کی والدہ محترمہ حنیفہ بائی پر پڑ گیا، والدہ نے آپ کو کراچی کے ایک گجراتی اسکول

میں داخل کرایا، آپ نے تقریباً دو یا تین جماعتوں تک تعلیم حاصل کی ،شاید مالی حالات کے باعث آپ کی طبعیت

اس جانب مائل نہ ہوئی ۔ آپ کی والدہ نے اس رجحان کو محسوس کیا تو آپ نے فیصلہ کیا کہ انہیں تجارت کی طرف مائل کیا جائے۔

سر حاجی عبد اللہ ہارون نے عملی زندگی کا آغاز بچوں کے کھلونے اور معمولی ساز و سامان فروخت کرنے سے کیا۔اس وقت آپ کی عمر ۶ برس تھی لیکن بہت جلد اس کام کو چھوڑ کر ایک دکان پر ملازمت اختیار کرلی۔ یہ دکان سائیکلوں کی مرمت کی تھی۔ اس ملازمت کے بارے میں پیر علی راشدی نے حاجی عبد اللہ ہارون کا بیان کردہ واقعہ تحریر کیا کہ ہم نے مسلم لیگ کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو ہم تقریباً روزانہ شام کو کلفٹن" کے ساحل پر ایک آنا کرایہ پر کرسیاں لے کر بیٹھ جاتے اور مستقبل کے بارے میں بات چیت ہوتی۔ ایک دن حاجی عبد اللہ ہارون نے اپنی زندگی سے متعلق تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ میں کچھ بھی نہیں تھا یتیم بچہ تھا پردیس یعنی "کچھ" ہندوستان سے سندھ میں منتقل ہوئے ابھی چار برس ہوئے ہونگے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سارا بوجھ میری ماں پر پڑ گیا جو خود غریب تھی میں نے شروع میں دو تین درجے تعلیم حاصل کی اور مالی مشکلات کے باعث نوکری کرنا پڑی، صدر کراچی میں رہائش تھی اور نوکری جونا مارکیٹ کراچی میں سائیکلوں کی مرمت والی دکان پر ملی، میری ماں روزانا

روکھی سوکھی روٹی پکا کر کپڑے میں باندھ کر دیتی اور میں صدر یعنی اپنی رہائش گاہ سے جونا مارکیٹ پیدل جایا کرتا تھا۔ اس وقت میری حالت کچھ اس قسم کی ہوتی کہ پیر میں ٹوٹی ہوئی چپل اور کبھی وہ بھی ندارد ہوتی اور میں ننگے پاؤں دکان جایا کرتا تھا۔ دکاندار چار آنے یومیہ مزدوری دیتا۔

آپ طبیعتاً نیک، دیانتدار اور صوم و صلواۃ کے پابند تھے چنانچہ اپنی محنت اور ماں کی تربیت، دعاؤں اور ایک فرض شناس اور عقلمند رفیقہ حیات کی رفاقت سے تجارت میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے۔ حاجی عبداللہ ہارون کے ماموں اور بہنوئی سیٹھ صالح محمد ہندوستان کے بڑے تاجروں میں سے تھے اور ان کا کاروبار بڑے پیانے پر چل رہا تھا چنانچہ حاجی عبداللہ ہارون نے ابتدا میں ان سے مل کر تجارت شروع کی رفتہ رفتہ آپ اس میدان میں پاؤں جماتے گئے۔ تجارت کی غرض سے آپ نے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور پھر کراچی کے جوڑیا بازار میں ایک دوکان کھولی اور یہاں سے اپنے طور پر تجارت کا آغاز کیا۔ دکان خوب چل پڑی ساتھ ہی آپ نے ایک گجراتی ہندو پرشوتم داس سے مل کر شکر کا کاروبار شروع کیا لیکن یہ ہندو پاٹنر جلد مرگیا چنانچہ آپ نے تنہا شکر کا کاروبار شروع کیا جو وقت کے ساتھ ساتھ چمکتا گیا۔

حاجی عبداللہ ہارون کی سماجی اور فلاحی کاموں کی ابتدا جوڑیا بازار کی دکان

کے زمانے میں ہوئی ۔آپ کی فلاحی سرگرمیوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ کاروبار میں بھی اضافہ ہوا یہاں تک کہ لوگ آپ کو'' شکر کا راجہ'' کہنے لگے اور کراچی کا تاجر طبقہ آپ کو سیٹھ حاجی عبد اللہ ہارون کہنے لگا۔ تجارت بڑھتی گئی ، دولت میں اضافہ ہو تا گیا ساتھ ہی حاجی عبد اللہ ہارون کی سخاوت اور فراخ دلی میں بھی اضافہ ہو تا گیا۔ حکومت وقت تجارت کے سلسلے میں آپ سے صلاح و مشورے کرنے لگی اور آپ کو ایک بڑے تاجر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ حکومت نے آپ کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے آپ کو' ریزروبنک' کے ڈائریکٹر کے عہدے کی پیش کش کی جو آپ نے قبول نہیں کی لیکن آپ اس بنک کے شیئرز کی الاٹمنٹ کرنے والی کمیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے اپنے تجارتی مرکز کو جوڑیا بازار سے منتقل کر کے ڈوسلانی منزل میں منتقل کر دیا۔ ابتدا میں وکٹوریہ روڈ پر ایک بنگلہ خریدا بعد ازاں جائیداد میں بے پناہ اضافہ ہو تا گیا اور سیاسی و سماجی سرگرمیوں کے شروع ہوجانے کے بعد اپنی رہائش 'سیفیلڈ' واقع کلفٹن میں شروع کی جو بعد میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کا گڑھ بن گئی۔

حاجی عبد اللہ ہارون کی ازدواجی زندگی کی ابتدا ۱۸۸۷ء میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۱۵ برس تھی۔ آپ کی والدہ نے آپ کی شادی رحیمہ بائی سے طے کی۔ شادی کے بعد آپ حج پر تشریف لے گئے ۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے دوسری شادی کی اور ۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء میں آپ نے تیسری شادی ایرانی نژاد ڈاکٹر حاجی خان کی صاحبزادی لیڈی

نصرت سے کی۔آپ کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ صاحبزادوں میں یوسف ہارون، محمود ہارون اور سعید ہارون ہیں۔یوسف ہارون جو آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں نے پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ مغربی پاکستان کے گورنر رہے۔ محمود ہارون نے بھی ملکی سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا، مسلم لیگ کے زبردست حامیوں میں سے تھے، مختلف وزارتوں پر فائز رہے۔ حاجی عبد اللہ ہارون کے چھوٹے بیٹے 'سعید ہارون' بھی ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ہمیشہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے، کراچی کی قدیم اور پسماندہ بستی لیاری ان کی سیاست اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ الیکشن میں بھی حص لیتے رہے، ذوالفقار علی بھٹو کے بر سر اقتدار آنے کے بعد ان کے لیے الیکشن میں کامیابی مشکل ہو گئی تھی۔

سر حاجی عبد اللہ ہارون کی سیا سی و سماجی خدمات تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔آپ نے اپنی زندگی کا آغاز معمولی حیثیت سے کیا لیکن اپنی ذہانت، تدبر، محنت، کوشش اور اپنی ماں کی تربیت کی بدولت ہندوستان کی صفِ اول کی شخصیات میں ان کا شمار ہونے لگا۔آپ سلجھی ہوئی طبیعت کے آدمی تھے بقول انعام درانی 'گتھیاں ان کے ناخنِ تدبیر کی آہٹ سے سلجھ جاتی تھیں' میونسپل کارپوریشن سے لے کر مرکزی مجلس قانون ساز تک کوئی ادارہ، کوئی منصوبہ، کوئی مشن ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کی بہتری کے لیے ہو اور عبد اللہ ہارون اس میں شریک نہ

ہوں۔خلافت تحریک، ریشمی رومال، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی تحریک، سیاسی کانفرنسیں، تعلیمی کانفرنسیں، آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ خصوصاً سندھ مسلم لیگ غرض ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۲ء یعنی انتقال تک مسلمانوں کی تمام تحریکوں میں عبد اللہ ہارون نے کلیدی کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں سندھ مسلم لیگ کی سرپرستی حاصل ہوئی تو آپ نے نہ صرف ایک بڑی جماعت اس کے حامیوں کی تیار کی بلکہ پورے صوبے میں پاکستان کی تحریک کی روح بھونک ڈالی۔ سندھ کے بچے بچے میں پاکستان کی تحریک کی امنگ اور لگن پیدا ہو گئی۔ اس قسم کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ دیگر رہنما جنہیں قومی ہیرو ہونے کا تو شرف حاصل ہے، انہوں نے تحریک آزادی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا اور ایک بڑی جماعت کو اپنا ہم نوا بنا لیا آپ نے مسلمانوں کی آواز کو دنیا میں پہنچانے اور عام کرنے کے لیے ۱۹۲۰ء میں ایک اخبار الوحید" جاری کیا جس نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی، انگریز اور ہندو" بوکھلا اٹھے، آخر کار مقصد میں کامیابی ہوئی لیکن افسوس کہ قیام پاکستان تک عبد اللہ ہارون کی عمر نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو حاجی عبداللہ ہارون نے اس تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ابتدا میں آپ صوبائی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے بعد ازا ں آپ کو سینٹرل خلافت کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ مولانا سید محمد

میاں جو تحریک ریشمی رومال کے اہم کارکن تھے نے اپنی کتاب 'تحریک شیخ الہند و ریشمی خطوط سازش کیس' کے صفحہ ۴۸ پر لکھا کہ تحریک ریشمی رومال میں حاجی عبد اللہ ہارون جو بہت بڑے تاجر تھے ہر دور اور ہر عہد میں قومی کاموں کے لیے مقتدر رقمیں نکالتے رہے موجودہ صدی کے اوائل میں سندھ کے اندر تبلیغ اسلام کے لیے جو کام جاری ہوا تھا اس میں بے شمار روپیہ خرچ کیا گیا۔ خلافت لیگ اور مسلم کانفرس کی تنظیم میں چپ چاپ گرانقدر امداد دیتے رہے قابل غور امر یہ ہے کہ امداد کے سوا انہیں کوئی غرض نہ تھی''۔ آپ جن اداروں کی مالی امداد کیا کرتے ان کا حساب کبھی نہیں رکھا۔ کراچی کے دو اداروں کا پورا خرچ ان کے ذمہ تھا۔ تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں ایک مرحلہ ایسا آیا جب حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کو تحریک کے سلسلے میں کابل جانے کا حکم دیا تاکہ وہ افغانستان کے سربراہ امیر حبیب اللہ خان کو اس نازک وقت میں اسلام کے لیے جانبازانہ اقدامات کرنے کے لیے تیار کریں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کابل جانے کے لیے تیار ہوگئے تو اس سلسلے میں پہلا اہم مسئلہ اخراجات کا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی عبد اللہ ہارون سے ملاقات کی۔ انھوں نے بلا تامل پانچ ہزار روپے پیش کر دیئے۔

حاجی عبد اللہ ہارون مرحوم ۶ سال تک مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن کی حیثیت سے سندھ کی نمائندگی کرتے رہے آپ پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں مرکزی مجلس قانون

ساز کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۲ء یعنی اپنے انتقال تک اس ادارے میں سندھ کی نمائندگی کرتے رہے۔ آپ نے قانون منظور کرایا جس کی رو سے مسلمان خواتین کو اسلامی قانون وراثت کے مطابق" عورتوں کو آبائی جائیداد سے ان کا جائز حق ملنے لگا۔ آپ نے ۱۹۲۸ء میں مجلس قانون ساز میں ایک قرارداد پیش کی جس کی منظوری کے بعد حکومت نے حج تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی اور حاجی عبد اللہ ہارون کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا۔ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد شروع ہوا اور عازمین حج کی بیشتر تکالیف دور ہو گئیں ۔ کراچی میں پرانے حاجی کیمپ کی تعمیر حاجی عبد اللہ ہارون کی زیر نگرانی اور آپ کی جدوجہد کے نتیجے میں عمل میں آئی، حکومت نے آپ کو ۱۹۳۴ء میں حج کمیٹی کا چیئر مین نامزد کیا اور آپ تین سا

ل تک اس کمیٹی کے چیئر مین رہے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ بمبئی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اس سال آپ نے بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی تحریک کے مطالبے کو تسلیم کیا اور اس کی حمایت میں جدوجہد شروع کی۔

۱۹۳۰ء میں حاجی عبد اللہ ہارون کو آل انڈیا مسلم کانفرس کا سیکریٹری نامزد کیا گیا یہ اجلاس مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں منعقد ہوا یہی وہ اہم اجلاس تھا جس میں مسلم کانفرنس نے گاندھی کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کیا اور اعلان کیا کہ کانفرنس برطانوی سامراج کے خلاف ہی نہیں بلکہ وہ ہندو.

تسلط کے خلاف بھی تحریک چلائے گی۔ مسٹر گاندھی کی تحریک انڈیا کی مکمل آزادی کے لیے نہ تھی بلکہ وہ سات کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانا چاہتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس کا نصب العین مسلمانوں کی بہبود تھا حاجی عبداللہ ہارون نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی آپ ۱۹۲۰ء میں سندھ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۲ء یعنی اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلم لیگ صوبہ سندھ کے صدر کی حیثیت سے جدوجہد آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ ہندوستان کی تقسیم کی پہلی قرارداد سندھ کی مجلس قانون ساز نے منظور کی۔ عبداللہ ہارون نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سندھ کے مسلمانوں میں پاکستان کے قیام کی تحریک کو اس قدر مقبول کردیا کہ سندھ کا بچہ بچہ پاکستان کے قیام کا حامی بن گیا۔ قائداعظم کو عبداللہ ہارون پر مکمل اعتماد تھا اور آپ قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ مسلم لیگ کے مسلمانوں کی بہتری کے تمام پروگرام حاجی صاحب کے گھر پر تیار ہوتے ۱۹۳۸ء میں سندھ پراونس مسلم لیگ کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا،، قائداعظم محمد علی جناح نے اس اجلاس کی صدارت کی، عبداللہ ہارون نے سندھ کے مسلمانوں کے نام ایک اپیل جاری کی جس میں سندھ میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ کانفرنس نہ صرف سندھ بلکہ بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے اہم کانفرنس ثابت

ہوئی۔ حاجی عبد اللہ ہارون نے مختلف اسلامی ممالک کے اخبارات کے نام خطوط بھی ارسال کیے جس میں کہا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں
کے نقطہ نظر کی وضاحت واضح اور درست طور پر کریں۔

حاجی عبد اللہ ہارون ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک بعد از آں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۳ء اکیس سال تک کراچی میونسپل کارپوریشن کے رکن کی حیثیت سے کراچی کے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ آپ کا تعلق کراچی کی قدیم اور پسماندہ بستی 'لیاری' سے تھا چنانچہ آپ نے کراچی کی اس قدیم بستی کو جدید اور عام سہولتوں سے آراستہ کرنے اور عوام کو تمام بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ایک منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق لیاری کو بارہ (۱۲) گاؤں یعنی لیاری کو چھوٹی موٹی بستیوں میں تقسیم کرکے ہر بستی کو یکے بعد دیگرے تمام سہولتوں سے آراستہ کیا جانا تھا۔ اس منصوبے کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے حاجی صاحب نے بارہ میں سے ایک بستی کو نموںتاً تعمیر کرنے کے لیے اپنی جانب سے پونے دو لاکھ روپے کی رقم کا اعلان کیا لیکن نا معلوم کن وجوہات کے سبب حاجی صاحب کے اس منصوبے پر عمل درآمد نہ ہو سکا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی شہر کی یہ بستی آج تک ان تمام سہولتوں سے محروم رہی۔

حاجی عبد اللہ ہارون نے ۱۹۲۳ء میں کراچی کی قدیم آبادی لیاری میں کھڈا مارکیٹ

کے مقام پر جس کا موجودہ نام میمن سوسائٹی (نوآباد) ہے جامعہ اسلامیہ و یتیم خانہ قائم کیا۔اس جامعہ اور یتیم خانے کے تمام اخراجات حاجی عبد اللہ ہارون اپنی زندگی میں خود پورا کیا کرتے تھے۔اب اس ادارے کے انتظامی امور حاجی عبد اللہ ہارون ایسو سی ایشن کے سپرد ہیں۔یہ ایسو سی ایشن حاجی صاحب کے انتقال کے بعد قائم کی گئی۔ایسو سی ایشن نے حاجی عبد اللہ ہارون کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے کئی فلاحی پروجیکٹ شروع کیے جس میں پرائمری و سیکنڈری اسکول یعنی حاجی عبد اللہ ہارون اسکول، حاجی عبد اللہ ہارون ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ اور حاجی عبد اللہ ہارون کالج اور اسپتال کا قیام جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ کے احاطہ میں عمل میں آیا۔کراچی کی پسماندہ بستی میں تعلیمی اور فلاحی اداروں کا قیام مالی منفعت سے قطع نظر غریب و نادار افراد کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنا تھا یہی حاجی عبد اللہ ہارون کا مشن بھی تھا جسے اس

ایسو سی ایشن نے عملی جامہ پہنایا۔حاجی عبد اللہ ہارون اپنے قائم کردہ جامعہ اسلامیہ اور یتیم خانہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

حاجی عبد اللہ ہارون نے برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً سندھ کے مسلمانوں میں علم کی روشنی اجاگر کرنے، آزادی کی تحریک، سیاسی بیداری پیدا کرنے اور مسلمانوں کی آواز برصغیر کے برسراقتدار حکمرانوں تک پہنچانے کے لیے ۱۹۲۰ء میں ترکی کے خلیفہ سلطان " وحیدالدین کے نام پر اخبار "الوحید

جاری کیا۔ سندھ کی ممتاز شخصیت اور حاجی عبد اللہ ہارون کے قریبی ساتھی شیخ عبد المجید سندھی اخبار کی ادارت میں شامل تھے وہ اس اخبار کے اولین ایڈیٹر بھی تھے۔ الوحید کی اشاعت بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوئی، اس وقت کے نامور مسلمان ادیبوں، عالموں، سیاسی شخصیات اور دانشوروں نے مضامین لکھنا شروع کیے جن کا مثبت اثر ہوا۔ اس وقت یہ اخبار مسلمانوں کا واحد ترجمان تھا، اس اخبار کو جاری ہوئے مشکل سے سات ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا ہندو اور انگریز اس کی مقبولیت سے بوکھلا اٹھے اور بمبئی کی حکومت نے اخبار کی مقبولیت، شہرت اور اس کے اس مشن سے جو وہ بر صغیر کے مسلمانوں خصوصاً سندھ کے مسلمانوں میں جدوجہد آزادی کے سلسلے میں جوش و جذبہ پیدا کر رہا تھا ایک مضمون کی اشاعت کا سہارا لیتے ہوئے اخبار سے ۲۵ ہزار روپے زر ضمانت کے طور پر طلب کیے اور اخبار کے مدیر قاضی عبد الرحمٰن کو گرفتار کرکے ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا۔

مولانا دین محمد وفائی جو الوحید کے نائب مدیر تھے اور اخبار میں مسلسل مضامین بھی لکھ رہے تھے کو اخبار کا مدیر مقرر کیا گیا جو بیس سال تک مدیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا وفائی کی سرپرستی میں الوحید نے روزنامہ کے علاوہ ایک تحریک کی حیثیت اختیار کر لی اور یہ اخبار سندھ کے مسلمانوں کی آواز اور ترجمان بن گیا۔ الوحید نے سندھ میں آزاد اور بے باک صحافت کی نہ

صرف ابتدا کی بلکہ صحافت میں ایک مثالی کردار ادا کیا۔اس خبار نے بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی تحریک کو عوام میں عام کرنے اور حکومت وقت پر عوامی نقطہ نظر کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔سندھ کی بمبئی سے علیحدگی الوحید کے مشن کا ایک حصہ تھی۔ ۱۹۳۰ء میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے بعد الوحید کا ایک خاص نمبر ''سندھ آزادی نمبر'' شائع کیا جس کی ایک تحقیقی اور تاریخی حیثیت ہے۔یہ خاص نمبر سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی مکمل داستان ہے الوحید نے خلافت تحریک میں بھی اہم کردار ادا کیا۔الوحید کے ایڈیٹر قاضی عبدالرحمن کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں پر کراچی کے خالقدینا ہال میں بغاوت کا مقدمہ چلایا جارہا تھا۔الوحید نے سندھ میں چلنے والی 'تحریک نصرت اسلام'' کو نہ صرف روشناس کرایا بلکہ مسلمانوں پر واضح کیا کہ وہ ہندوؤں کے ناپاک عزائم کا مقابلہ کس طرح کریں۔المختصر حاجی عبداللہ ہارون کے روشن کردہ چراغ نے.بر صغیر خصوصاً سندھ کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے اور انہیں منظم کرنے میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

سندھ کے معروف محقق، ادیب و دانش ور پیر محمد علی راشدی نے اپنے کالم ''، مشرق و مغرب'' جو اخبار جنگ (٦ ستمبر ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا سیفیلڈ کی قومی حیثیت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی راشدی صاحب لکھتے ہیں ''برصغیر کے

دور زریں کا شاید ہی کوئی مسلمان رہنما ایسا ہو جس کا گزر یہاں (سیفیلڈ) میں نہ ہوا ہو، کیا کیا صورتیں وہاں (سیفیلڈ) میں میں نے خود نہیں دیکھیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح، سر آغا خان، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، آزاد سبحانی، فضل حسین، فضل الحق، سر سکندر حیات، سعد اللہ، اکرام خان، سلطان احمد، صاحبزادی عبدالقیوم، ڈاکٹر انصاری، عبد الرحمٰن صدیقی، بہادر یار جنگ اور بہت سے بزرگ ہیں جن کے نام یاد نہیں عبد اللہ ہارون مرحوم کے گھر سیفیلڈ میں دیکھے اور ایسے سیاسی اور مذہبی رہنما جن کی مسلم لیگ سے نہیں بنی جب کبھی کراچی آئے تو عبد اللہ ہارون کے سلام کے لیے لازمی حاضر ہوئے۔ قائد اعظم ۱۹۳۸ء میں اور اس کے بعد عبد اللہ ہارون کے انتقال تک جب بھی کراچی تشریف لاتے ان کا قیام ہمیشہ ’سیفیلڈ‘ میں ہی رہا۔ مسلم لیگ تحریک خصوصاً نظریہ پاکستان کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً آل انڈیا ورکنگ کمیٹی اور سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی میٹنگیں یہیں ہوتی تھیں۔ یہیں تحریک پاکستان کے فیصلہ کن دور کے منصوبے بنے، یہیں حاجی صاحب کا وہ معرکتہ آلارا خطبہ تیار ہوا جس میں پہلی بار کھل کر یہ اعلان کیا گیا کہ ہم ہندو کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے ہمارے لیے ہندوستان کا بٹوارہ کرکے ایک علیحدہ فیڈریشن بنانا چاہیے، یہیں انہی خطوط پر شیخ عبدالمجید سندھی کی قرارداد قائد اعظم کے سامنے آئی (وہ اسی خواب گاہ میں اسی پلنگ پر سلیپنگ سوٹ میں لیٹے ہوئے تھے جب اس حقیر نے بحیثیت جنرل سیکریٹری سندھ مسلم لیگ

کانفرنس، ان کی خدمت میں پیش کی)، یہیں نظریہ پاکستان کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے لانے کے لئے بین الصوبائی وفود کا پروگرام بنا، یہیں قائداعظم کی صدارت میں سندھ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی میٹنگ ہوئی، یہیں میں (پیر علی محمد راشدی) نے قائداعظم کے جوابی اخباری بیان کا وہ مسودہ پیش کیا جو ان کے نام سے دوسرے روز اللہ بخش مرحوم کے بارے میں شائع ہوا، یہیں پاکستان اسکیم کی تفصیل مرتب ہوئیں جن کی بنا پر بعد میں (یعنی ۱۹۴۰ء میں) قرارداد لاہور لکھی گئی، یہیں پاکستان اسکیم کے سلسلے میں مطالعاتی میٹنگیں ہوتی رہیں جو کبھی کبھی ۲۰ ونڈسر پیلس دہلی میں بھی ہوئیں جہاں وقتی طور پر مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے سلسلے میں مرحوم حاجی صاحب کی رہائش ہوتی، یہیں پر توقف کرنے کے بعد قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان مرحوم لندن روانہ ہوئے، یہیں سکوٹرا فوٹو گرافر نے قائد کی وہ تصویر لی جو بعد میں آفیشل تصویر شمار ہوئی اور آج پاکستان کے کرنسی نوٹوں کی زینت ہے، یہیں سندھ میں مسلم لیگ کو منظم کرنے کے بارے میں وقتاً فوقتاً میٹنگیں ہوتی رہیں، یہیں سے مسجد منزل گاہ سکھر کی واگزاری کے لیے تحریک کا منصوبہ بنا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کے مسلمان ہندو کے پنجے سے نکل کر اور مسلم لیگ کے زیر اثر آ کر پاکستان کے حامی بن گئے، مختصر یہ کہ کانگریس تحریک میں جو مقام آنجہانی موتی لال نہرو کے انند بھون الہ آباد کو حاصل ہوا وہ مسلم لیگ تحریک میں عبداللہ ہارون کے اس سیفیلڈ کو میسر تھا۔ فرق صرف یہ رہا کہ

انند بھون اس تعلق کے تقدس کی بنا پر قومی یادگار بن گیا، اور سیفیلڈ پر تالا لگ گیا اور گنبد افراسیاب' بن کر رہ گیا''۔ پیر علی محمد راشدی کی اس تجویز پر میں اپنی بات ختم' کرتا ہوں کہ 'اگر ''سیفیلڈ' عبد اللہ ہارون میوزیم بن جاتا تو نظریہ پاکستان کی جڑوں کو اچھی طرح سے واضح کردینے کا موجب بنتا۔ کئی تاریخی اہمیت کی چیزیں یہاں جمع کی جاسکتی تھیں جو اب مختلف جگہوں پر بکھری پڑی ہیں اور مرورایام سے ضائع ہو جائیں گی مثلاً عبداللہ ہارون کے ذاتی سیاسی نوعیت کے کاغذات، قائدِ اعظمؒ سے پاکستان کے بارے میں ان کی خط وکتابت کے فائل، قائدِ اعظمؒ کے خطوط ان کے نام، تقریریں، سیاسی خطبات، پمفلٹ، کتابیں، اشتہار، اخباری آرٹیکل ان کے روزمرہ کے استعمال اور خود قائدِ اعظمؒ کی وہاں رہائش سے متعلق یادگار چیزیں، اخبارات کے فائل وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ چیزیں جمع ہو جائیں تو اندرون ہندوستان ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کی جملہ مسلمان تحریکوں کے ارتقاء کی تاریخ لوگوں کے سامنے آجاتی اور ان کو معلوم ہو جاتا کہ نظریہ پاکستان کس طرح بنا، کن منازل سے گزرا، اور اس کے حقیقی محرکات کیا تھے۔

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' میں شامل)

جمیل نقوی - لائبریرین، شاعر، مصنف و مولف

تابش دہلوی کے بقول ' عظیم شخصیتوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے '۔ میں اپنے آپ کو ان خوش نصیبوں میں تصور کرتا ہوں کہ جس نے پاکستان لائبریرین شپ کی عظیم شخصیات کو نہ صرف دیکھا بلکہ بہت ہی قریب سے دیکھا، ان محترم شخصیات میں جمیل نقوی مرحوم بھی شامل ہیں۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان میں لائبریرین شپ کی بنیاد رکھی اور اس پیشہ کو اپنی منجملہ صلاحیتوں اور انتھک محنت سے اسے ایک تناور درخت بنایا۔ پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں ان اکابرین کی خدمات کو ہمیشہ بلند مقام حاصل رہے گا۔ مجھے ان میں سے اکثر کا قرب حاصل رہا اور بعض کے ساتھ عمروں کے فرق اور نیاز مندی کے باوجود دوستی کا شرف حاصل ہوا۔ جمیل نقوی مرحوم نہ صرف ایک فرض شناس لائبریرین، لائبریری سائنس کے استاد بلکہ استاد لااساتذہ میں سے تھے۔ انگریزی اور اردو کے شاعر، نثر نگار، لائبریرین شپ اور دیگر موضوعات پر آپ نے متعدد کتب تصیف کیں۔ نعتیہ شاعر کی حیثیت سے آپ کی بعض نعتیں بہت مقبول ہیں اور ریڈیو اور ٹیلی وژن پر پیش ہوتی ہیں۔

لائبریرین شپ کے موضوع پر آپ اردو زبان کے ابتدائی مصنفین میں سے ہیں، آپ

کے تحریر کردہ مضامین مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے رسالہ ''کتاب نما'' میں مسلسل ایک سال (۱۹۳۸ء) تک شائع ہوئے۔اردو میں معاشیاتِ کتب خانہ پر فنی حیثیت سے یہ مضامین نقش اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ان مضامین پر مشتمل آپ کی کتاب ''انتظام کتب خانہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کی تھی۔اس وقت جمیل نقوی،برطانوی عہد کی امپیریل لائبریری کلکتہ میں دار المطالعہ اور عملی شعبہ کے سربراہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔اس تصنیف کو بجا طور پر اردو زبان میں لائبریری سائنس کی اولین کتاب کا درجہ حاصل ہے۔بقول ڈاکٹر انیس خورشید ''جمیل نقوی صاحب کا کتاب سے بہت پرانا تعلق ہے،کتاب کی خوشبو کے نصف سے زائد طویل سفر میں جمیل نقوی کو خط کیٹلاگ سے لے کر کمپیوٹرائی نوری نستعلیق تک کئی منزلیں طے کرنا پڑیں اس سفر میں جب بھی آپ رکے 'کتاب ہی آپ کا مسلک رہا اور اس حوالہ سے آپ نے جو بھی کام انجام دیا اتنے سلیقہ اور رچاؤ کے ساتھ کیا کہ آپ خود بھی لوگوں کی نگاہ کے مرکز بنے رہے''۔

جمیل نقوی مرحوم ۹ جنوری ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔پورا نام جمیل احمد نقوی، فقہ کے اعتبار سے حنفی اور والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ سرسید احمد خان سے ملتا ہے غالباً اسی تعلق کے باعث آپ میں ادب دوستی اور علم پروری کے ساتھ ساتھ ترسیل علم کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔معلومات کا

وسیع خزانہ اپنے اندر رکھتے ہیں، حافظہ بھی لاجواب تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کو کتابوں کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ابتدائی تعلیم امروہہ ہی میں حاصل کی ، لائبریری سائنس میں ڈپلومہ اور اردو میں ایم اے کی سند حاصل کی۔لائبریری سائنس کے علاوہ ادب ان کا خاص موضوع تھا۔ نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔ ایک بیٹا طاہر جمیل نقوی اور چار بیٹیاں ہیں۔آپ کی دنیاوی زندگی ۸۶ سالوں پر محیط ہے جو ہندوستان کے شہر امروہہ سے شروع ہو کر ۱۹۹۹ء میں پاکستان کے شہر کراچی میں اختتام پذیر ہوئی، یعنی ۳۴ سال غیر منقسم ہندوستان میں اور

سال پاکستان میں خدمات انجام دیں۔ ۵۲

جمیل نقوی نے ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ علوم شرقی کی ’’لٹن لائبریری‘‘ (حالیہ مولانا آزاد لائبریری) سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں بعد ازاں امپریل لائبریری کلکتہ میں شعبہ دار المطالعہ کے نگراں اور مخطوطات کی کیٹلاگ سازی کا اہم کام آپ کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ وائس رائے آف انڈیا نیو دہلی کے اکنامکس ایڈوائزر کے لائبریرین اور ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔امپریل لائبریری کلکتہ کے اسکول آف لائبریرین شپ سے

بھی آپ وابستہ رہے۔ اسکول کے منتظم خان بہادر اسد اللہ خان تھے اور ایک استاد کی حیثیت سے لائبریری سائنس کی تعلیم کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا لائبریری منصوبہ بندی و کیٹلاگ سازی آپ کے مخصوص موضوعات تھے۔ آپ کو بمبئی یونیورسٹی کے اسکول آف لائبریرین شپ کے وزیٹنگ استاد (۶۰ء۔۱۹۶۱ء) کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

لائبریری تحریک میں بھی آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں، انڈین لائبریری ایسو سی ایشن (۱۹۳۳ء) کے بنیادی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایسو سی ایشن کے بہت ہی ممتاز اور مستعد سیکریٹری (۱۹۶۰ء۔۱۹۶۶ء) خلیفہ محمد اسد اللہ خان کے بااعتماد اسسٹنٹ سیکریٹری کے فرائض بھی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔آپ انڈین لائبریری ایسو سی ایشن کے ماہانہ میگزین ''انڈین لائبریرین'' کی اداراتی ذمہ داریوں میں خان بہادر صاحب کے شریک کار رہے۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں جامعہ ملیہ لائبریری دہلی، مسلم یونیورسٹی ڈے اسکالر لائبریری، علی گڑھ، انڈین میوزیم لائبریری، کلکتہ اور کلکتہ کلب لائبریری کی تنظیم وترتیب بھی آپ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

۱۹۴۸ء میں جمیل نقوی نے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔پاکستان میں آپ کی لائبریری خدمات ۵۲ برس پر محیط ہیں۔ حکومت پاکستان کے ادارہ

فروغ برآمدات سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور ۱۹۷۱ء تک لائبریری خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ آپ نے خیر پور اسٹیٹ کے وزیر اعلیٰ کے لائبریری ایڈوائزر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ ایک بڑے طباعتی ادارے 'الیٹ پبلشرز لمیٹڈ' سے وابستہ ہوگئے۔

جمیل نقوی جو ہندوستان میں انڈین لائبریری ایسوسی ایشن سے وابستہ رہ چکے تھے پاکستان میں قائم ہونے والے لائبریرین شپ کے ان ابتدائی اداروں کے قیام اور تنظیم میں فعال ثابت ہوئے۔ آپ کراچی لائبریری ایسوسی ایشن اور پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے بنیادی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ان دونوں اداروں نے یکے بعد دیگرے لائبریری کورسز کا آغاز کیا تو جمیل نقوی ان کورسز کا اہم حصہ ہی نہیں بلکہ ایک تجربہ کار استاد بھی تھے۔ اس کورس میں جمیل نقوی کو ڈاکٹر انیس خورشید اور محمد عادل عثمانی صاحب کے استاد ہونے کا رتبہ بھی حاصل ہے۔ آپ نے پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے انتظامی امور میں بھی اہم کردار ادا کیا، اسکول آف لائبریرین شپ کی داغ بیل ڈالی اور ایک استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

لائبریرین شپ کے حوالے سے جمیل نقوی مرحوم کا ایک اہم کارنامہ ڈیوی

اعشاریائی درجہ بندی کے نمبر ۲۹۷ کی اسلام اور مشرقی علوم کی توسیعات ہیں۔اپنے موضوع پر ابتدائی کام ہونے کے باوجود ان توسیعات کو 'شفیع توسیعات' کے مقابلے میں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، شاید اس کی وجہ یہ رہی کہ جمیل نقوی کو نہ تو ستائش کی تمنا تھی اور نہ ہی انہوں نے اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی عملی کوشش کی، البتہ اس بات کا شکوہ انہوں نے اپنی کتاب 'انتظام کتب خانہ اور اس کی فن وار تقسیم' اشاعت دوم ۱۹۹۲ء میں ان الفاظ میں کیا ''پاکستان میں اس موضوع پر کام کیا گیا اور اس خاکسار کی کاوش کا اشارتاً بھی حوالہ دیے بغیر اس میں کتر بونت کرکے بین الاقوامی طور پر پیش کرنے کا فخر حاصل کیا گیا نہ صرف یہ بلکہ میرے ہی ایک نامور شاگرد نے (غالباً بغیر تحقیق کے سہواً میرے ایک مرحوم بزرگ ہمعصر لائبریرین کے سیکشن ۲۹۷ کی توسیع کا کریڈٹ دیتے ہوئے (شاید گزشتہ سے پیوستہ سال) اس موضوع پر ایک کتابچہ بھی شائع کردیا۔ درآنحالیکہ شاگرد موصوف کے پاس ڈیوی اعشاریائی اسکیم کے کئی شعبوں کی بشمول ۲۹۷) میری توسیعات کے اصل مسودے تک موجود ہیں''۔ اس ضمن مین)
جمیل نقوی مرحوم مزید لکھتے ہیں کہ ''بہر حال ایسی صورت میں یہ مناسب معلوم ہوا کہ تاریخی ریکارڈ صحیح کرنے کی غرض سے مذکورہ الصدر میلول ڈیوی اسکیم سیکشن ۲۹۷ کی اولین توسیع ''انتظام کتب خانہ'' (جو اپنے موضوع پر اردو میں سب سے
پہلی کتاب اور اپنی نوعیت کی مختصر تالیف بھی ہے) کی طبع ثانی میں ضمیمہ کے

طور پر شامل کر رہا ہوں تاکہ سند رہے'' ۔

رکھنا غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف''۔''

جمیل نقوی کی اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر انیس خورشید صاحب ہی کا تحریر کردہ ہے جس میں جمیل نقوی کی کاوش کو اولین کوشش قرار دیا گیا ہے۔ جمیل نقوی کے اس شکوہ کی وضاحت ڈاکٹر انیس خورشید صاحب نے اپنے ایک طویل مضمون ''شفیع اعشاریائی توسیعات برائے اسلام اور انڈین لائبریری ایسو سی ایشن کی دستاویزات'' ، شائع شدہ پاکستانی لائبریرین''، شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، جامعہ پنجاب، لاہور، جلد'' اول میں کیا ہے۔ یہ موضوع اپنی اہمیت کے پیش نظر تحقیق و جستجو کا تقاضا کرتا ہے لیکن دستاویزات اور موجود حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ جمیل نقوی کی یہ کاوش ابتدائی نوعیت کی ہے ،تاریخی حقائق چھپا نہیں کرتے اگر واقعی غلطی ہوئی ہے تو تاریخ کبھی نہ کبھی اسے

درست کر ہی لے گی۔

جمیل نقوی کی شاعری

جمیل نقوی کی شخصیت کئی جہتوں پر مشتمل ہے وہ ایک خوش فکر شاعر، صاحب نظر نقاد، منتظم، مولف، مصنف اور دقیقہ رس محقق بھی تھے۔آپ کو علی گڑھ کی علمی و

ادبی ، شعری اور ثقافتی حلقوں میں معتبر مقام حاصل تھا، پاکستان میں آپ نے اپنے آپ کو ادبی اور شعری حلقوں میں نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، آپ کو بہت ہی کم مشاعروں میں دیکھا یا سنا گیا حالانکہ آپ کے بلند پایہ شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔آپ کی شاعری میں پختگی ، درد اور والہانہ پن بدرجہ اتم موجود ہے۔نعت گوئی جمیل نقوی کی پہچان ہے، آپ کی بعض نعتیں بے حد مقبول ہیں اگر آپ مشاعروں کے شاعر بھی ہوتے تو یقیناً آپ کی شہرت کسی بھی طرح بڑے اور معروف شعراء سے کم نہ ہوتی لیکن جمیل نقوی نے اپنا کلام مشاعروں میں نہ پڑھا اور نہ ہی وہ اسے اپنی شہرت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ پاکستان کی معروف نعت خواں ''اُم حبیبہ'' کی آواز میں بعض نعتیں جو کئی برس سے سماعتوں میں رس گھول رہی ہیں سرکار دوعالم خاتم الانبیاء کے حضور جمیل نقوی کا ہی نذرانہ عقیدت ہے یہ نعتیں ریڈیو، ٹیلی ویژن ، کیسٹ اور نعت کی محفلوں میں بہت ہی ذوق و شوق اور عقیدت سے سنی جاتی ہیں۔آپ کی بعض

نعتوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا
یوں ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوق تماشا بھول گیا
پہنچا جو حرم کی چوکھٹ تک اِک ابر کرم نے گھیر لیا
باقی نہ رہا یہ ہوش مجھے، کیا مانگ لیا کیا بھول گیا

عشق کو حسن کے انداز سکھا لوں تو چلوں
منظر کعبہ نگاہوں میں بسا لوں تو چلوں
کرلوں اک بار ذرا پھر سے طواف کعبہ
روح کو رقص کے انداز سکھا لوں تو چلوں

ڈاکٹر سید ابو لخیر کشفی نے جمیل نقوی کے نعتیہ مجموعہ کلام ''ارمغان جمیل'' میں نعت گوئی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''سرکارؐ سے چاہت والے تو ہم سب ہیں جمیل نقوی سرکار کی چاہت والے ہیں انہیں سرکار کی محبت عطا ہو گئی ہے اور ان کی نعت گوئی ان کی حضورؐ کی داستان ہے''۔آپ مزید لکھتے ہیں کہ '' جمیل نقوی نے اپنے علم ، اپنے ورثہ ایمان، لفظوں سے اپنے رشتہ .... ان سب کو گوندھ کر نعت گوئی کی ہے ان کی نعت کے خمیر میں ان کی ذات، ان کا ورثہ سب کچھ خوشبو بن کر شامل ہے۔ حضور ﷺ کی ذات کے مہر درخشاں کے حضور، اس قطرہ شبنم نے ، کہ جسے جمیل نقوی کہتے ہیں اپنے آپ کو یوں رکھ دیا کہ یہ قطرہ وجود کھو بیٹھے کہ یہی عشرت قطرہ ہے''۔ جمیل نقوی کی شعر گوئی کے

بارے میں پروفیسر سحر انصاری کا کہنا ہے کہ '' اس قسم کے نعتیہ کلام میں جمیل نقوی کا لہجہ مفکرانہ اور فلسفیانہ ہو جاتا ہے ان کے کلام میں جو بے ساختگی ، والہانہ پن اور مستی نظر آتی ہے اس میں رسمیت کو قطعاً دخل نہیں

شاید اس لیے ان کی بعض نعتیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کو سن کر سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے"۔ جمیل نقوی نے غزل بھی کہی، مراثی، نوحہ و سلام کے علاوہ قومی نظمیں بھی کہیں۔ڈاکٹر وقار احمد رضوی کا کہنا ہے کہ " جمیل نقوی نے محبت رسولؐ میں ڈوب کر نعت کہی ان میں تخلیقی شان پائی جاتی ہے نیز ان کی نعتوں میں روانی، جوش اور شیرینی ہے"۔

تصانیف جمیل نقوی

جمیل نقوی نے تقریباً ۲۵ کتابیں تخلیق کیں۔آپ کی تحریر کے بارے میں ڈاکٹر انیس خورشید کا کہنا ہے کہ " آپ کی تحریر بھی آپ کی شخصیت کی طرح دلکش، جامع اور پر اثر ہوتی ہے"۔ جمیل نقوی کی تصانیف میں انتظام کتب خانہ، شبلی کی رنگین زندگی، انتخاب اصغر، پرچم کا ہلال جگمگایا، اردو کے بہترین افسانے، عمر خیام (ہیرالڈ کے ناول کا ترجمہ)، آپ بیتی جسٹس سید امیر علی (ترجمہ)، تنقید و تفہیم، اردو تراجم قرآن، کف خاکستر، اردو نثر کا ارتقاء، روداد لہو رنگ، ارمغان جمیل، آغاز اسلام: شبلی کی کتاب کا ترجمہ، اردو تفاسیر القرآن (کتابیات)، اردو احادیث (کتابیات)، مکشفات غوثیہ، مسند عائشہ، مسند علی، بزم سہروردیہ، دیوان میر انیس، اردو مخطوطات کی توجہی فہرست شامل ہیں۔ جب انگریزی میں The Traveller اور Lyric Homage to the Last Prophet (PBUH) شامل ہیں۔

جمیل نقوی مرحوم میرے براہ راست استاد تو نہیں تھے لیکن لائبریری سائنس میں آپ کو استاد الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا، آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور لکھا جائے گا۔ آپ کی زندگی کا مقصد تحصیل علم ، فروغ علم اور ترسیل علم نظر آتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے آپ تمام زندگی تن من دھن سے مصروف رہے۔ نمود و نمائش سے اپنے آپ کو دور رکھا، خاموشی کے ساتھ لکھتے رہے۔ آپ طباعتی رموز سے بھی واقف تھے۔ قدرت نے آپ کو خوش خطی کے ہنر سے بھی نوازا چنانچہ کتاب کا صفحہ عنوان از خود ڈیزائن کرنا حتیٰ کہ ضرورت کے وقت کتابت بھی از خود کرلیا کرتے۔ مختصر یہ کہ جمیل نقوی بے شمار خوبیوں کا مرقع تھے آپ جیسے با صلاحیت ، نفیس ، پابند وضع اور مخلص انسان مشکل ہی سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔۱۹ جنوری ۱۹۹۹ء عین عید الفطر کے روز رات دس بجے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

کتنی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

(مطبوعہ ' پاکستان لائبریری بلیٹن '۔ جلد ۳۳، شمارہ ا۔۲، مارچ۔جون ۲۰۰۲ء)

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

مولانا محمد عارف الدین

لائبریری تحریک کے فروغ میں شہید حکیم محمد سعید کے دستِ راست
پاکستان میں لائبریرین شپ کے پیشے کی ترقی اُن اکابرین لائبریری سائنس کی مرہون منت ہے جنھوں نے آزادی کے پرچم تلے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔انہوں نے پاکستان میں لائبریرین شپ کے پودے کا بیج بویا، اس کی آبیاری کی اور اپنی تمام زندگی اس پیشے کے فروغ اور ترقی کے لئے وقف کرتے ہوئے اسے ایک تناور درخت بنا دیا جس کے فیض سے آج نئی نسل فیض یاب ہو رہی ہے۔ان محترم شخصیات میں ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم ، سید ولایت حسین شاہ مرحوم ، فضل الٰہی مرحوم ، محمد شفیع مرحوم، اختر ایچ صدیقی مرحوم، جمیل نقوی مرحوم،فرحت اللہ بیگ اور مولانا محمد عارف الدین شامل ہیں۔ کراچی میں ابتدائی لائبریری سرگرمیاں انہی احباب کی مرہون منت تھیں۔ کراچی لائبریری ایسو سی ایشن (۱۹۴۹ء)، پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ (۱۹۵۰ء) ،انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات اسپل (۱۹۶۰ء) ، کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس المنائی ایسو سی ایشن (۱۹۵۷ء) کے قیام اور خدمات میں ان احباب نے کلیدی کردار ادا کیا۔

۱۹۶۰ء تا ۱۹۹۸ء کے درمیان انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات ،اسپل (Sociey for Promotion and Improvement of the Libraries, SPIL)، شہید حکیم محمد سعید اور مولانا عارف الدین ایک ایسی مثلث تھی کہ جس کے تینوں ستون ملک میں کتب خانوں کی تحریک اور ترقی کے حوالے سے ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔ عارف صاحب نے کالج لائبریرین کی حیثیت سے پیشہ ورانہ خدمات کا آغاز کیا، نیپا (NIPA) کے ریسرچ لائبریرین کے فرائض انجام دیے، بلدیہ عظمی کراچی کے سٹی لائبریرین رہے اور ہمدرد لائبریری کے لائبریرین اور ڈائریکٹر کے فرائض بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیے لیکن اسپل (SPIL) کے حوالے سے آپ کی پہچان ہے، اسپل آپ جانے جاتے ہیں اس انجمن نے عارف الدین صاحب ہی کی وجہ سے نصف صدی کا پیشہ ورانہ سفر انتہائی جوش وجذبہ کے ساتھ طے کیا اس دوران انہیں شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔

راقم الحروف کو پاکستان لائبریرین شپ کی جن شخصیات پر سوانحی و تعارفی مضامین لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ان میں ڈاکٹر عبدالمعید، محمد عادل عثمانی، الحاج محمد زبیر، ابن حسن قیصر، جمیل نقوی، آئی اے ایس بخاری، پروفیسر اختر حنیف، فرحت اللہ بیگ، الطاف شوکت، رشید الدین احمد اور سمیع اللہ شامل ہیں۔ بعض احباب سے انٹرویوز بھی کیے۔ عارف الدین صاحب سے گفتگو کی خواہش

اور کوشش ایک عرصہ دراز سے تھی ۔ اکثر آپ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے ہمیشہ اپنے بارے میں بات کرنے سے گریز کیا۔ عارف صاحب بہت ہی محبت کرنے والے ، شفیق ، نرم گو اور انکساری اور عاجزی کا پیکر ہیں۔ انتہائی محنت اور جوش و جذبہ کے ساتھ کام کرنا، اپنے آپ کو پیچھے رکھنا ، خاموشی کے ساتھ اس طرح کام کرنا کہ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس پروگرام میں عارف صاحب کہیں بھی نظر نہیں آئے در حقیقت وہ تمام کا تمام انہیں کا کارنامہ تھا۔ اسپل (SPIL) کے تحت بڑے اور اعلیٰ پیمانے پر سیمینار، کانفرنسیں اور ورکشاپ منعقد ہوئے کسی پروگرام میں بھی عارف صاحب اسٹیج پر نظر نہیں آئے۔ وجہ یہ نہیں کہ آپ اسٹیج پر بول نہیں سکتے تھے در اصل یہ آپ کا مزاج اور عادت کا حصہ تھا۔ خود کو پیچھے رکھتے ہوئے دوسروں کو آگے بڑھانا، یہ بات بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ عارف صاحب کو سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں اس وقت دیکھا جب راقم الحروف نے جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں داخلہ لیا۔ شیروانی اور علی گڑھ پاجامے میں ملبوس لیاقت علی خان کیپ لگائے ٹرمپ (Trupm) موٹر سائیکل پر اکثر عادل عثمانی صاحب اور ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب کے پاس ڈاکٹر محمود حسین لائبریری اور شعبہ لائبریری سائنس جو لائبریری کی پانچویں منزل پر تھا آیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ موٹر سائیکل ویسپا Vespa اسکوٹر اور پھر سوزوکیری میں تبدیل ہوگئی ۔ سنا ہے کہ کبھی عارف صاحب سائیکل پر بھی دوڑے پھرا کرتے تھے۔ آپ سے باقاعدہ تعارف ۱۹۷۳ء

میں اس وقت ہوا جب راقم الحروف نے ہمدرد لائبریری کی تنظیم وترتیب کے کام میں عارف صاحب کی سربراہی میں حصہ لیا۔کچھ عرصہ بعد اسپل (SPIL) عارف صاحب سے تعلق کا باعث ہوئی۔۱۹۹۶ء میں ایسا وقت بھی آیا کہ شہید حکیم محمد سعید اسپل کے صدر، عارف صاحب سیکرٹیری اور مجھے جوائنٹ سیکرٹیری ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

عارف صاحب ۲۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا قیام پاکستان کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۵۵ء میں کراچی لائبریری ایسوسی ایشن کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا، ۱۹۶۲ء میں امریکہ کی یونیورسٹی آف ساؤتھرن کیلی فورنیہ سے لائبریری سائنس کا کورس کیا۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۵۵ء میں سندھ مسلم کالج کے لائبریرین کی حیثیت سے کیا ۱۹۶۱ء تک کالج لائبریرین رہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۵ء تک نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (NIPA) کے لائبریرین رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بلدیہ کراچی کے سٹی لائبریرین اور ۱۹۷۶ء میں ہمدرد لائبریری سے منسلک ہوئے۔بیت الحکمہ کے ڈائریکٹر کے فرائض بھی انجام دیے۔ عربی سوسائٹی سے بھی منسلک ہوئے اور کئی برس سوسائٹی کی ترقی کے لیے کام کیا۔ عارف صاحب کی پیشہ ورانہ

خدمات اسپل کے حوالہ سے ہیں ۔آپ اس انجمن کے بانی رکن ہیں اس کی تمام تر

سرگرمیاں شہید حکیم محمد
سعید کی سرپرستی میں اور عارف صاحب کی رہین منت تھیں۔

راقم الحروف نے عارف صاحب سے یہ گفتگو ۳۱ دسمبر ۲۰۰۳ء بروز بدھ جناب عادل عثمانی صاحب کی رہائش گاہ واقع گلستان جوہر میں کی تھی اس گفتگو کے دوران جناب عادل عثمانی بھی موجود تھے۔ عارف الدین صاحب کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں اسپل (SPIL) کے حوالے سے رہی ہیں در حقیقت
ہی آپ کی پہچان ہے یہی وجہ ہے کہ آپ سے گفتگو کا محور اسپل (SPIL) اسپل
رہی۔ (SPIL)

سوال۔ سب سے پہلے کیا آپ اپنے پس منظر پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔

جواب ۔ میرا تعلق ہندوستان کی ریاست حیدرآباد دکن سے ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک کرنے کے بعد پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔ اب کراچی سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، کراچی یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں کراچی لائبریری ایسوسی ایشن کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا اس کی بنیاد پر سندھ مسلم کالج کراچی کے لائبریرین کی ملازمت مل گئی، اس طرح لائبریرین شپ کے پیشہ سے منسلک ہوگیا۔ ۱۹۶۲ء میں امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں لائبریرین کی تربیت کے لیے گیا۔ سندھ مسلم کالج کے علاوہ

میں ریسرچ (NIPA) نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈ مینسٹریشن
لائبریرین کے فرائض انجام دئے، بلدیہ عظمیٰ کراچی میں سٹی لائبریرین رہا اور ہمدرد
لائبریری کے چیف
لائبریرین اور بیت الحکمہ کے ڈائریکٹر کے فرائض بھی انجام دئے۔
کب اور کیسے قائم ہوئی؟ (SPIL) سوال۔ اسپل
جواب ۔ میری سوچ یہ تھی کہ کتب خانوں کی ضرورت شہریوں کو ہے لائبریریز کو نہیں وہ تو ان کا نظام چلانے اور شہریوں کو بہتر سے بہتر لائبریری خدمات فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، میں یہ سمجھتا تھا کہ ملک میں لائبریری تحریک کا فروغ اور کتب زیادہ فعال اور موثر کردار ادا (Citizen Body) خانوں کی ترقی میں شہریوں کی تنظیم کر سکتی ہے۔ میں نے اس کا ذکر مسز گل کے مینوالا سے کیا، انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک خط ڈرافٹ کیا اس پر میرے اور مینوالا کے دستخط تھے، یہ جنرل باڈی کا اجلاس تھا جس میں کراچی سے تعلق رکھنے والی علمی اور ادبی شخصیات، دانشوروں اور دیگر مقتدر لوگوں نے شرکت کی لائبریرین شپ کے حوالے سے میرے علاوہ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے صدر فضل الٰہی، ابن حسن قیصر اور سید ولایت حسین شاہ شریک تھے۔ اس اجلاس میں ایک دستور ساز کمیٹی تشکیل پائی اس کے سربراہ پروفیسر اے بی اے حلیم، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی تھے، اراکین میں مسز گل کے

مینوالا، ڈاکٹر سرور حسن، سید امجد علی اور میں شامل تھا۔ کمیٹی نے کئی اجلاسوں کے بعد اسپل کا دستور تشکیل دیا۔ دستور کے مطابق جنرل باڈی کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں بورڈ آف ڈائریکٹرز
کا انتخاب عمل میں آیا۔ پھر اس بورڈ آف ڈائریکٹرز نے مجلس منتظمہ کا انتخاب کیا۔ چنانچہ دستور کی رو سے اسپل کا اولین بورڈ آف ڈائریکٹرز ایس ایم کالج میں منعقد ہونے والے جنرل باڈی اجلاس میں معرض وجود میں آیا اس کے مطابق حکیم محمد سعید شہید اس کے تاسیسی صدر منتخب ہوئے جو اپنی شہادت تک اس عہدہ پر فائز رہے، پروفیسر احمد علی پہلے اور میں جوائنٹ سیکریٹری (Treasurer) جنرل سیکریٹری، مسز گل کے مینوالا ٹریژرر ، تھا، اراکین میں پروفیسر اے بی اے حلیم،، ڈاکٹر محمود حسین، جناب ممتاز حسین سید امجد علی، مس صفیہ خان اور سید ولایت حسین شامل تھے۔ اس طرح اسپل معرض وجود میں آئی۔

سوال۔ اسپل کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ ملک میں کئی انجمنیں کام کر رہی تھیں؟

جواب ۔ ٹھیک ہے اس وقت بعض پروفیشنل ایسوسی ایشنز قائم ہو چکی تھیں ایک تو بات یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر محسوس کرتا تھا کہ کتب خانوں کی ترقی ملک کے با اثر اور کتب خانوں کا ادراک رکھنے والے شہری جب تک اس تحریک میں عملی طور پر

شریک نہیں ہوں گے بات آگے نہیں بڑھے گی میں چاہتا تھا کہ کتب خانوں سے محبت
کرنے والا شہریوں کاایک مضبوط گروپ (Strong Group of Library Friends)
تشکیل دیاجائے ان کی وجہ سے Development بڑھے گی ایک اور بات جو میں
محسوس کرتا تھا کہ لائبریرین شپ سے وابستہ لوگوں کی اکثریت ابھی نچلے (Lower)
گریڈ میں ہے کتب خانوں کی ترقی اورفروغ کی بات حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں اس
قدر توجہ سے نہیں سنی جائے گی، جو بات بااثر شہریوں کی ہوگی،ان کی وجہ سے کتب
خانوں کی ترقی ہوگی اور وہ فروغ پائیں گے۔

سوال۔ اسپل (SPIL) نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی
ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟

جواب ۔ اسپل کی تاریخ دیکھیں اس کے تحت پورے ملک میں لائبریری تحریک اور کتب
خانوں کی ترقی اورفروغ کے لیے جو سیمینار ، ورکشاپ اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ان
کے ذریعہ ہم نے پہلے کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کی
کوشش کی اورجب رائے عامہ ہموار ہو گئی اور شعور
بیدار ہوگیا تو اس کے بعد کتب خانوں کی ترقی اورفروغ کے لیے پلان، تجاویز اور ترقیاتی
اسکیمیں تیار کی گئیں اور حکومت کو پیش کی گئیں۔اسپل نے تین کتب خانے مکمل طور پر
قائم کئے ان میں دو کراچی میں اور ایک کوئٹہ میں ، بے شمار کتب خانوں کے قیام میں
عملی طور پر حصہ لیا ان کی مدد کی، اسپل ہی نے سب سے

پہلے ملک میں لائبریری قانون کے عملی نفاذ کی جدوجہد کا آغاز کیا۔۱۹۶۱ء لائبریری قانون کا ایک مسودہ تیار کیا اور نفاذ کے لیے حکومت کو پیش کیا گیا۔پہلا لائبریری ترقیاتی منصوبہ اسپل نے تیار کیا، کراچی پبلک لائبریری اسکیم تیار کی، کراچی میں لائبریری بورڈ اسپل کی جدوجہد کے باعث تشکیل پایا، ۱۹۶۸ء میں نیشنل کمیشن برائے افرادی ترقی کو کتب National Commission on Manpower and Education اور تعلیم خانوں کی ترقی کے لیے یادداشت پیش کی،چوتھے پانچ سالہ منصوبہ میں لائبریرینز کی ترقی کو ملک میں (National Pay Commission) کی تجاویز پیش کیں،۱۹۷۰ء میں لائبریرین شپ کے پیشے سے وابستہ افراد کی تنخواہوں کی تجاویز پیش کیں۔اپنی شہادت سے دو سال قبل ۱۹۹۶ میں حکیم محمد سعید نے پاکستان نیشنل لائبریری کے دورے کے موقع پر پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے عہدیداران سے ملاقات کی اور پی ایل اے کا تیار کردہ لائبریری قانون کا مسودہ حکومت پنجاب و سندھ کو نفاذ کے لیے پیش کیا۔اسی طرح اور بے شمار ترقیاتی کام ہیں جو اسپل نے گزشتہ ۴۳برسوں میں انجام دیئے ہیں، یہ تمام معلومات آپ کو اسپل کی مطبوعات میں تفصیل کے ساتھ مل جائیں گے۔

سوال۔ شہید حکیم محمد سعید نے اپنی بیٹی کو جہیز میں ایک لائبریری بھی دی تھی سنا ہے کہ اس لائبریری کی کتب کا انتخاب آپ نے کیا تھا؟

جواب۔ جی ہاں یہ درست ہے حکیم صاحب نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جہیز میں منتخب

کتب پر مشتمل ایک

دیا۔اس لائبریری کی کتابوں کا انتخاب میں نے اور مسز للی (Library Collection)

اینی ڈی سلوا

نے مل کر کیا تھا۔

(مطبوعہ پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل جلد۳۶ شمارہ ۵۔ دسمبر ۲۰۰۵

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

میاں الطاف شوکت - پنجاب لائبریرین شپ کے باباجی

پاکستان لائبریرین شپ کی ترقی اور فروغ میں بزرگ لائبریریز کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے پیشے کو عبادت تصور کیا اور اسے ایک تناور درخت بنانے میں انتھک محنت کی۔ان احباب کی خدمات کو سراہنا اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا قومی و اخلاقی فرض ہی نہیں بلکہ یہ ہماری اسلامی روایات و تشخص کا ایک حصہ ہے۔میاں الطاف شوکت پاکستان لائبریرین شپ کی ان محترم شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی کتب خانوں کی تنظیم ،ترتیب، ترقی اور فروغ کے علاوہ کتب خانوی تعلیم کو عام کرنے میں گزاری۔میاں صاحب نہ صرف ایک اچھے منتظم تھے بلکہ ایک اچھے استاد، کہنہ مشق لائبریرین نیز اردو زبان میں لائبریری سائنس جیسے فنی موضوع کے ابتدائی مصنفین میں سے تھے۔آپ نے اس موضوع پر اس وقت قلم اٹھایا جب کہ اس موضوع پر لکھنے والے چند ہی تھے۔ میاں صاحب نے ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو پنجاب کے مردم خیز ضلع جالندھر کے قصبہ شاہکوٹ میں ایک پڑھے لکھے اور دین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ننگل انبیاء ہائی اسکول سے میٹرک، رندھیر کالج کپور تھلہ سے ایف اے، اسلامیہ کالج

ریلوے روڈ لاہور سے گریجویشن اور پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا۔ میاں صاحب میں خدمت خلق اور سماجی کام کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ نے طلبہ سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ آپ تقسیم سے قبل طلبہ تنظیم ''انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ'' (بعد ازاں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن) کے بانی اراکین میں سے تھے اور اس کی قیادت بھی کی۔ اسی تنظیم کے تحت آپ کو شاعر مشرق علامہ اقبال کی زندگی ہی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو پہلا ''یوم اقبال'' منعقد کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس تاریخی تقریب کے موقع پر پڑھے گئے منتخب مقالات کو ''مقالات یوم اقبال'' کے عنوان سے آپ نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ آپ کو شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت تحریک پاکستان کے سلسلے میں طلبہ کے ساتھ بھرپور حصہ لینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ میاں صاحب کو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ''قرارداد پاکستان'' پیش کیے جانے والے تاریخی جلسہ عام میں شرکت کا شرف بھی حاصل ہے۔ آپ نے تحریک پاکستان کے دوران ہندو پراپیگنڈہ کے خلاف مسجد شاہ چراغ لاہور میں ''تعمیر ملت لائبریری'' قائم کی۔

آپ نے ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج برائے خواتین ، لاہور سے بطور لائبریرین کے کیا بعد ازاں ہیلی کالج آف کامرس لاہور کے لائبریرین ہوئے اور اسی حیثیت

سے ریٹائر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے فلاحی سرگرمیاں جاری رکھی لائبریری پروفیشن کی ترقی میں عملی جدوجہد کے ساتھ ساتھ آپ نے لاہور ہی میں سمن آباد کے قریب گیارہ کنال اراضی حاصل کرکے احباب کے تعاون سے ''عالی مسجد''، ''جامعہ فضلیہ'' اور فضلیہ پبلک ڈسپنسری کی بنیاد رکھی جس سے اس علاقے کے مکینوں کو صحت مند ماحول میسر آیا۔ عالی مسجد سے ملحق ملتان روڈ پر لائبریری کے لیے ایک وسیع ہال خالصتاً جیب خاص سے تعمیر کروایا اور اس میں ایک لائبریری قائم کی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے عقیدت مندوں، دوستوں اور شاگردوں نے اس لائبریری کو آپ ہی کے نام سے منسوب کیا اور اب یہ لائبریری ''میاں الطاف شوکت میموریل پبلک لائبریری'' کہلاتی ہے۔ لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس اب اسی لائبریری میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ کورس بھی میاں صاحب کے علمی کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔

میاں صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ آپ حد درجہ نیک، دیانت دار، عجز و انکساری کا پیکر، سادہ طبیعت، ہمدرد اور اخلاص کا مجموعہ تھے۔ آپ کی شخصیت شہر اور دیہات کی ملی جلی فضا لیے ہوئے تھی۔ میاں صاحب سے میرا باقاعدہ تعلق ۱۹۷۷ء میں قائم ہوا، اس سے قبل میں ۷۲-۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی میں لائبریری سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے میاں صاحب کی تحریر کردہ کتاب سے استفادہ کر چکا تھا، آپ کی یہ کتاب اردو زبان میں لائبریری سائنس پر

ابتدائی مواد فراہم کرتی ہے۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا تحریر کردہ میاں صاحب کا خط آپ سے براہ راست تعلق کی بنیاد بنا، یہ تعلق آپ کے انتقال تک قائم رہا۔ اپنے اس خط میں میاں صاحب نے راقم کو پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن کے تحت ہونے والے لائبریری سائنس کے سرٹیفیکیٹ کورس کا ممتحن مقرر کرنے کی نوید دی۔ آپ نے تحریر فرمایا، ''آپ سے تعارف نہیں لیکن اب ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء سے انڈر گریجویٹس کے لیے ایک لائبریری ٹریننگ کلاس جاری ہے سولہ سال میں انیس سیشن ہوئے میں شروع سے اس کلاس کا انچارج چلا آرہا ہوں ۔ اتفاق کی بات ہے کہ پہلا پرچہ آج تک کراچی سے سیٹ ہوتا رہا ہے چنانچہ ڈاکٹر انیس خورشید، عادل عثمانی صاحب، سبزواری صاحب، ایس وی حسین مرحوم ، نسیم فاطمہ وغیرہ ممتحن رہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ایسو سی ایشن نے اس سلسلہ میں آپ سے خدمات لینی ہیں آپ کو پرچہ نمبر ایک کا ممتحن مقرر کیا گیا ہے امید ہے آپ اسے منظور فرمائیں گے''۔ میاں صاحب کے اس خط کے بعد میں ان کی نگرانی میں ہونے والے سرٹیفیکیٹ کورس کا ممتحن بن گیا ساتھ ہی میاں صاحب سے ناطہ بھی قائم ہو گیا۔

میاں صاحب سے ملاقات کا شرف پہلی بار ۱۹۹۰ء میں حاصل ہوا۔ لاہور میں یوں تو کئی دوست تھے لیکن امریکن سینٹر کے محمد اصغر صاحب سے قریبی دوستی تھی انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا وہ اپنی موٹر بائیک پر مجھے میاں صاحب کے

گھر لے گئے، مغرب ہو گئی تھی، رات کی تاریکی اور تنگ و تاریک گلی میں مکان تلاش کرنا اصغر صاحب ہی کا کام تھا، تنہا میرے لیے میاں صاحب کا گھر تلاش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا۔ دروازہ پر دستک دی، اصغر صاحب نے اپنے نام کے ساتھ میرا نام بھی بتایا، بہت تپاک کے ساتھ ملے۔ خلوص و محبت واضح تھا، خاطر تواضع کی، مختلف پیشہ ورانہ موضوعات پر گفتگو ہوئی، کراچی کے ہم پیشہ احباب کی خیریت دریافت کی، دوبارہ آنے پر اصرار بھی کیا، ساتھ ہی اپنی طبیعت کی ناسازی کے بارے میں بھی بتایا جو آپ کی ظاہری کیفیت سے عیاں ہو رہی تھی۔ یہ میاں صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جیسے برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں، خلوص و محبت سرتاپا انکساری، اپنائیت اور پیشہ سے سچی ہمدردی و لگن کی جھلک نمایاں تھی۔

میاں صاحب سے دوسری ملاقات پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی ۱۵ ویں کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۹۴ء کے موقع پر ہوئی۔ کراچی سے دیگر احباب کے علاوہ اسکول آف لائبریرین شپ، پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے کئی اساتذہ نے بھی شرکت کی تھی۔ میاں صاحب صاحب نے بطور خاص کراچی کے لائبریری اسکول کے اساتذہ کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا، یہ تقریب پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کے سرٹیفیکیٹ کورس کے ساتھیوں کی جانب سے ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ میاں صاحب کے علاوہ مقصود علی کاظمی، ایم ایچ شباب مرحوم، سر

فراز حسین چشتی، محمد اسلم مرحوم، محمد تاج، منیر احمد نعیم عابد علی گل اور دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے نصرت علی اثیر نے بھی شرکت کی۔ لائبریری کے سروے کے دوران مختلف شعبہ جات اور لائبریری آٹومیشن کے بارے میں بریفنگ دی گئی۔اس موقع پر میاں صاحب بھی ہمارے ساتھ موجود رہے۔ تقریب میں میاں صاحب نے لائبریری سائنس سرٹیفیکیٹ کورس کے حوالہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نے اپنی خدمات کا آغاز ٹرسٹ کے چیئرمین جسٹس ایس اے رحمان مرحوم کی درخواست پر میاں صاحب کی زیر نگرانی ہی میں شروع کیا، میاں صاحب طویل عرصہ تک لائبریری میں خدمات انجام دیتے رہے۔

میاں صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر لاہور سے تھا،لائبریرین شپ تعلق رکھنے والے احباب انہیں ''باباجی'' کے نام سے پکارا کرتے تھے، باباجی اب ہمارے درمیان نہیں لیکن پاکستان میں انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری تعلیم کے فروغ وترقی میں باباجی کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پنجاب میں انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری تعلیم میاں صاحب ہی کی مرہون منت ہے۔ آپ نے پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن سابقہ مغربی پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے زیر اہتمام لائبریری تعلیم کو نامساعد حالات میں نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کا دائرہ لاہور سے بڑھا کر راولپنڈی اور بہاولپور تک وسیع کر دیا۔

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن نے ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کو لاہور میں اور ایسٹ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کو ڈھاکہ میں لائبریری ٹریننگ اسکول قائم کرنے کی سفارش کی چنانچہ مغربی پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن (جس کا موجودہ نام پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن ہے) نے ۱۹۶۳ء میں لاہور میں لائبریری سائنس کی ٹریننگ کلاس کا اجراء کیا۔ میاں صاحب شروع ہی سے اس کلاس کے منتظم اعلیٰ چلے آرہے تھے۔ میاں صاحب کی کوششوں سے ۱۹۸۳ء میں ایسو سی ایشن کی خدمات کا دائرہ لاہور سے بڑھا کر راولپنڈی تک وسیع ہوا، ٹریننگ کلاس کا ایک مرکز راولپنڈی میں بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۸۳۔۱۹۸۸ء تک ٹریننگ کلاس کے راولپنڈی سے نو سیشن مکمل ہوئے اور کل ۲۶۰ طلبہ نے ٹریننگ حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء کے بعد بہاولپور میں بھی ایک مرکز قائم کیا اس طرح اس ایسو سی ایشن نے ۲۵ سالوں میں ۱۸۱۲ طلبہ کو انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تربیت سے آراستہ کیا، جو پنجاب کے مختلف کتب خانوں میں پیرا لائبریری اسٹاف کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں حکومت پاکستان کی وزارتِ تعلیم کے شعبہ لائبریریز ملک میں انڈر گریجو یٹ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے فروغ اور اس کی اہمیت کو

محسوس کرتے ہوئے کراچی میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے تحت جاری سرٹیفیکیٹ کورس اور لاہور میں پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن کے سرٹیفیکیٹ کورس کو باقاعدہ منظور کرتے ہوئے احکامات جاری کیے حکومتی سطح پر ملک میں انڈر گریجویٹ لائبریری تعلیم کی باقاعدہ سرپرستی و قدر شناسی کی یہ پہلی مثال تھی جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

سرٹیفیکیٹ کورس میں یکسانیت پیدا کرنے کے سلسلہ میں، میں نے میاں صاحب کو تحریر کیا کہ اگر کراچی اور لاہور میں جاری سرٹیفیکیٹ کورسز کا نصاب یکساں ہو جائے اور اس میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے تو یہ زیادہ ترقی کا باعث ہوگا۔ میاں صاحب نے میری اس تجویز کو نہ صرف سراہا بلکہ اسے ایک

عمدہ تجویز قرار دیا، آپ نے اپنے خط (۳ مارچ ۱۹۷۹ء) میں تحریر فرمایا "ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی کلاس کے متعلق پڑھا۔ کیا یہ وہی کلاس ہے جس کے کرتا دھرتا اے۔ آر۔ غنی اور ایس وی حسین تھے۔ میں دو دفعہ اس کلاس کا ممتحن بنا تھا۔ ہماری اور آپ کی کلاس کا نصاب ایک ہونا چاہیے۔ یہ بہت عمدہ خیال ہے میں کوشش کروں گا کہ یہ خیال عملی جامہ پہن لے"۔ بعد ازاں ایسا ہوا۔ جس کا تمام تر سہرا میاں صاحب ہی کو جاتا ہے۔ میاں صاحب سرٹیفیکیٹ کورس کے ابتدا ہی سے ڈائریکٹر تھے اور تمام امور از خود سرانجام دیا کرتے تھے۔ جس میں ممتحن سے خط وکتابت، پرچہ ارسال کرنا، یاددہانی کرانا، پرچہ پریس

پہنچانا، پروف ریڈنگ کرنا وغیرہ شامل تھا۔ ممتحن کی حیثیت سے میری پوری کوشش ہوا کرتی کہ بروقت پرچہ تیار کرکے بھیج دوں، میں کئی سال ممتحن رہا۔

پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن پاکستان میں لائبریرین شپ کے پیشے میں قائم ہونے والی اولین ایسوسی ایشن ہے جس کا قیام ۱۹۴۸ء میں " مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے نام سے عمل میں آیا۔ فضل الٰہی مرحوم اس ایسوسی ایشن کے قیام میں پیش پیش" تھے۔ تقسیم ہند سے قبل برطانوی ہندوستان میں پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن لاہور میں قائم ہوئی تھی ۔ لاہور ہی اس انجمن کی سرگرمیوں کا محور تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں موجود لائبریری پروفیشن سے تعلق رکھنے والوں نے کسی بھی پروفیشنل تنظیم کی موجودگی کو محسوس کیا۔ فضل الٰہی مرحوم لاہور میں (M.A.O.) کالج سے وابستہ تھے ۔آپ نے کوشش کی کہ پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کو از سر نو منظم کیا جائے ۔اس وقت پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کے صرف دو اراکین میاں الطاف شوکت لائبریرین ہیلے کالج اور محمد صدیق لائبریرین گورنمنٹ کالج ساہیوال ایسوسی ایشن کے رکن کی حیثیت سے موجود تھے ۔دونوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کو از سر نو منظم کیا جائے۔ فضل الٰہی نے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں ایسوسی ایشن کے اراکین کی ایک میٹنگ منعقد کی جس میں اسلامیہ کالج کے لائبریرین سید نصیر احمد نے بھی شرکت کی۔ یہ میٹنگ اسلامیہ

کالج لائبریری میں منعقد ہوئی۔ اس سال ابتدائی نوعیت کا کام ہوا اور انتخابات کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ انتخابات اپریل ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئے جس کے نتیجے میں خواجہ نور الٰہی لائبریرین پنجاب پبلک لائبریری صدر، میاں الطاف شوکت سیکریٹری، محمد صدیق اسسٹنٹ سیکریٹری اور محمد اسلم خازن منتخب ہوئے۔ مجلس منتظمہ کے اراکین پنجاب کی مختلف ڈسٹرکٹ سے لیے گئے۔ تمام صوبوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے جنرل باڈی اجلاس میں متفقہ طور پر ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں اس ایسوسی ایشن کا نام "مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن" اور اس کا صدر مقام لاہور قرار پایا۔ "ون یونٹ کے اختتام (جولائی ۱۹۷۰ء) میں اس انجمن کو پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کا نام دیا گیا جو آج تک قائم ہے۔ مقصود کاظمی کے مطابق تادم مرگ میاں الطاف شوکت اس ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ڈاکٹر جلال حیدر نے مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کو برطانوی ہندوستان

کی پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کا جانشین قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۶۱ء کو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری میں ہوا۔

۱۹۶۰ء میں جب میاں صاحب پہلے کالج آف کامرس کے لائبریرین تھے تو آپ نے کیٹلاگ سازی پر انگریزی زبان میں ایک مختصر سی کتاب تحریر کی جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی، یہ اپنے موضوع پر ابتدائی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ میاں صاحب ابتداء ہی سے لائبریری پروفیشن کی عملی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔پہلے کالج کے بعد میاں صاحب دارالسلام لائبریری سے منسلک رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ لائبریری سائنس کے سرٹیفیکیٹ کورس سے کل وقتی منسلک ہوگئے اور اپنے انتقال تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔میاں صاحب کی دوسری کتاب بعنوان ''نظام کتب خانہ'' ۱۹۷۰ء کی دہائی کی ایک مقبول کتاب تھی اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔کتاب کے بارے میں بیوروآف ایجوکیشن حکومت پنجاب کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالرؤف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا کہ '' محترم الطاف شوکت نے اس اہم موضوع پر ایک ایسی قابل قدر تصنیف پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے جس میں ان کی فنی بصیرت اور طویل تنظیمی تجربہ کی صحیح عکاسی ہوتی ہے، نظام کتب خانہ ہر اعتبار سے قابل ستائش تخلیق ہے''۔ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے ایک مضمون ''کتابیں کتاب کاروں کی : ایک کتابیاتی مضمون'' میں میاں صاحب کی کتاب پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا'' ۱۹۷۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز نے بھی ایک کتاب شائع کی یہ کتاب ملک کے کہنہ مشق لائبریرین الطاف شوکت کی تصنیف 'نظام کتب خانہ' ہے ۔ یہ کتاب اوسط درجہ کے کتب خانوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔اپنے بہت سے اضافوں کے ساتھ ابتدائی سطح پر لائبریری سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے یہ ایک مفید کتاب ثابت ہوگی''۔ میاں صاحب کی ایک کتاب ۱۹۸۴ء میں ''ابتدائی نظام کتب خانہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی جو آپ نے

اپنے دستخط کے ساتھ ۱۵ اپریل ۱۹۸۴ء کو مجھے ارسال کی، یہ کتاب چھوٹے کتب خانوں کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔

آپ خود بھی مصنف تھے اور دیگر لکھنے والوں کی قدر اور حوصلہ افزائی کھلے دل سے کیا کرتے۔ میں نے ۱۹۷۹ء میں اپنی کتاب ' کتب خانے تاریخ کی روشنی میں '' آپ کو ارسال کی ، اپنے خط (۱۶ فروری ۱۹۷۹ئ) میں میاں صاحب نے لکھا کہ ''آپ کی مفید کتاب کا میں نے خود کلاس میں ذکر کیا تھا، میں تو یہی چاہتا ہوں ، طلبہ و طالبات ہر پرچے سے متعلق تین چار کتابیں ضرور پڑھیں۔ میں نے کاظمی صاحب کو تاکید کی تھی کہ آپ کی کتاب کا تعارف کرائیں اور اسے پڑھوائیں ، انہوں نے ایسا کیا بھی''۔ ۱۹۸۰ء میں میں نے اپنی ایک کتاب ''ابتدائی لائبریری سائنس'' میاں صاحب کی خدمات میں پیش کی آپ نے اپنے خط (۱۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں لکھا کہ '' آپ کی کتاب موصول ہو گئی تھی، بہت بہت شکریہ، آپ نے لگن اور محنت سے کتاب تیار کی ہے ہم نے اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے''۔

میاں صاحب ایک سچے اور کھرے انسان تھے ، درست کو درست اور غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ لائبریری مواد کا مطالعہ باریک بینی سے کیا کرتے اور اس پر اپنی رائے کا اظہار برملا کر دیا کرتے۔ آپ نے اپنے خط (۱۹ دسمبر ۱۹۸۱ء) میں تحریر فرمایا'' سبزواری صاحب آجکل مکہ ہی میں ہیں ، یا کراچی

آئے ہوئے ہیں؟ مجھے ان کا ایڈریس درکار ہے۔ ان کی درجہ بندی کی کتاب کا پہلا حصہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی تھی دوسرا حصہ دیکھ کر اتنی ہی مایوسی ہوئی ہے۔ انھوں نے ادب اور اسلام کے نمبر یکسر تبدیل کردئے ہیں، ہمارے کتب خانوں میں ڈیوی کے نمبر رائج ہیں، نئے نمبروں کی adjustment
کیسے ہوگی، میں انھیں خط لکھنا چاہتا ہوں، ہمارے بھائی کس طرف چل نکلے"۔ الطاف شوکت۔

میاں صاحب میں ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا ان کے قرب و جوار کے ساتھی اس سے بخوبی واقف تھے ہر ایک سے محبت اور ہمدردی سے پیش آتے خیریت معلوم کرتے کسی بھی مشکل یا پریشانی میں کام آنے کی پوری کوشش کرتے۔ یہ جذبہ سینکڑوں میل دور رہنے والوں کے لیے بھی یکساں
تھا اس کا اظہار آپ کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے۔

جیسا کہ میں ابتدا میں تحریر کرچکا ہوں کہ میں الطاف شوکت صاحب کے کورس میں کئی سال
ممتحن رہا ہوں، میری کوشش ہوا کرتی تھی کہ پرچہ وقت پر تیار کرکے بھجوادوں پھر بھی مصروفیات کے باعث تاخیر ہو جایا کرتی، ایک بار ایسا ہی ہوا میں باوجود کوشش کے پرچہ شاید وقت پر نہیں بھیج سکا، میاں صاحب کے خط (۳ مئی

۱۹۸۱ء) میں پرچہ دیر سے پہنچنے اور کورس کے امور سرانجام دینے کی تصویر خوبصورت طریقے سے واضح ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا " عزیز صمدانی ! السلام علیکم۔ ۲۸ تک بھی آپ کا پرچہ نہ ملا تو اسلم صاحب نے مشورہ دیا کہ تار بھیج دیا جائے مگر سوچا وقت گزر چکا تھا، ۲۹ بھی گزر گئی، تو محترم عادل عثمانی صاحب کی یاد تازہ ہو گئی، ایک دفعہ وہ ممتحن تھے، تو ایسا ہی ہوا تھا، ۲۹ گزر گئی، اب صرف ۳۰ اپریل کی تاریخ باقی رہ گئی، چنانچہ ۲۹ کی رات ۱۱ بجے بیٹھ کر میں نے پرچہ تیار کر لیا اور ۹ بجے پریس میں بھجوا دیا۔ وہ آخری تاریخ تھی، بارہ بجے خود پہنچ کر پروف پڑھے اور ساڑھے چار بجے باقی پرچوں کے ہمراہ آپ کا پرچہ بھی وقت پر چھپ گیا۔ یکم کو جمعہ تھا اور ۲ مئی کو سب سے پہلا آپ کا پرچہ تھا، کل پرچہ ہو گیا، گھر واپس پہنچا تو آپ کی رجسٹری موصول ہو چکی تھی، عثمانی صاحب کی رجسٹری پرچہ کے ایک دن بعد موصول ہوئی تھی۔ امید ہے پرچے بھی آپ کو ساتھ ہی موصول ہو جائیں گے" الطاف شوکت۔

میاں صاحب یکم فروری ۱۹۹۸ء بروز اتوار کو خالق حقیقی سے جا ملے، وہ اب ہمارے درمیان میں نہیں لیکن ان کی یادیں آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا اخلاق ان کی تخلیقات اور لائبریری سائنس ٹریننگ کلاس ایسے فیوض جاریہ ہیں جن سے موجودہ اور آئندہ نسل فیض حاصل کرتی رہے گی۔ لائبریری ٹریننگ کلاس کی سرپرستی اب میاں صاحب کے رفیق کار سید مقصود علی کاظمی صاحب کو حاصل ہے۔ وہ

اس خدمت کو اسی جذبہ اور لگن سے سرانجام دے رہے ہیں جیسے میاں صاحب برسہا برس تک دیتے رہے۔ میاں صاحب کے فرزند جناب مشتاق آزاد بھی اس کورس میں معاون ہیں۔

اگست ۲۰۰۷ء کے ابتدائی دنوں کی کوئی تاریخ تھی ٹیلی فون پر معلوم ہوا کہ کوئی مشتاق صاحب بات کرنا چاہتے ہیں، میں نے بعد از سلام عرض کیا آپ کون صاحب ہیں کہنے لگے میرا نام مشتاق آزاد ہے لاہور سے آیا ہوں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ آپ ضرور ملاقات کریں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا، گویا ہوئے کہ میں الطاف شوکت کا بیٹا ہوں، ان کا یہ کہہ دیناہی میرے لیے کافی تھا، میں نے کہا کہ بس اسقدر تعارف کافی ہے آپ پہلی فرصت میں تشریف لائیں، اپنے گھر کا پتہ اچھی طرح لکھوایا، میں انتظار کرتا رہا، لیکن وہ نہ آئے شاید وقت نہ مل سکا ہو، کئی دن گزرنے کے بعد ۲۹ اگست کو آپ نے مجھے پھر فون کیا کہ میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں، راستے میں ہوں ناظم آباد سے واپس اپنے بیٹے کے گھر ملیر کینٹ جارہا ہوں، میں نے اپنے گھر کا پتہ بتایا، تھوڑے ہی دیر بعد وہ اپنی بیگم کے ہمراہ تشریف لے آئے، وہی الطاف شوکت جیسا ڈیل ڈول، چہرہ پر سفید داڑھی، گفتگو کا انداز بھی کچھ کچھ ملتا جلتا۔ مجھے ایسا لگا کہ میاں صاحب قدرِ جوان ہو کر آگئے ہیں۔ ان سے تعلق کی ایک فلم نظروں کے سامنے چلنے لگی، باتیں مشتاق

صاحب سے کر رہا تھا، ذہن میں میاں صاحب تھے۔ بہت خوشی ہوئی، میاں صاحب کی یاد تازہ ہو گئی، مشتاق صاحب بھی خوش نظر آ رہے تھے، میں نے اپنے پاس محفوظ میاں صاحب کے متعدد خطوط انہیں دکھائے جو انہوں نے بہت ہی محبت سے دیکھے اور پڑھے۔ان کی بیگم میری بیگم سے محوِ گفتگو رہیں، مشتاق صاحب نے بتایا کہ ان کا بیٹا پاکستان آرمی میں میجر ہے اور آجکل کراچی میں اس کی پوسٹنگ ہے وہ اس کے پاس ہی آئے ہوئے ہیں اور اکثر آتے رہتے ہیں۔

میاں الطاف شوکت نے لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا جو چراغ ۱۹۶۲ء میں لائبریری ٹریننگ اسکول کی صورت میں روشن کیا تھا،آج 45برس گزر جانے کے بعد بھی اپنا فیض جاری رکھے ہوئے ہے۔ علمی خدمت کی ایسی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔جس کام میں خلوص، سچائی، خدمت خلق کا حقیقی اور بے لوث جذبہ ہو وہ زندہ رہتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، عظمت کی مثال بن جاتا ہے۔ معروف شاعر جمیل نقوی مرحوم کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

چھوڑ جاتی ہے، جو صدیوں نہیں مٹنے پاتے
ذہن کی سطح پر کچھ ایسے نشان زنجیریں

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

ابن حسن قیصر۔ لائبریری تحریک کا خاموش مجاہد

پاکستان میں لائبریری تحریک کی داغ بیل ڈالنے والوں میں ایک نام ابن حسن قیصر کا بھی ہے جو خاموشی کے ساتھ اس وقت کے لائبریرینز کے شانہ بہ شانہ لائبریری تحریک کی جدوجہد میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ پاکستان میں لائبریری تحریک کی تاریخ ابن حسن قیصر کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگی۔ قیصر صاحب کا تعلق فوج سے رہا ہے چناچہ ان میں ایک خاص قسم کا نظم و ضبط اور کام کرنے کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ نے کبھی اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ مقصد کو فوقیت دی اور لائبریری تحریک میں اپنے آپ کو ایک ادنی کارکن تصور کرتے ہوئے جدوجہد میں شریک رہے۔ بعض اہم کام آپ نے سرانجام دیے لیکن اپنی ذات کو اس سے دور رکھا نتیجے کے طور پر ان سے بعض لوگوں نے فائدہ حاصل کیا اور خوب نام کمایا اور مشہور ہوئے مگر قیصر صاحب نے پھر بھی اپنے مشن کو جاری رکھا اور لائبریری تحریک کو پروان چڑھانے میں مصروف رہے بلاشبہ قیصر صاحب لائبریری تحریک کے خاموش

مجاہد ہیں۔

لائبریری تحریک اور ابن حسن قیصر

لاہور جو کتب خانوں کا شہر اور لائبریری تحریک کا مرکز تھا قیام پاکستان کے وقت رونما ہونے والے واقعات کے باعث اس کی تمام تر لائبریری سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ کتب خانوں میں کام کرنے والے عملے کی اکثریت ہندوؤں کی تھی ان کے ہندوستان چلے جانے کی وجہ سے کتب خانے بند ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں قائم ہونے والا ' لائبریری اسکول' بند ہو گیا، لائبریری پروفیشن کا ترجمان رسالہ 'ماڈرن لائبریرین' کی اشاعت بند ہو گئی۔ ایسی صورت حال میں کتب خانوں کا قیام اور لائبریری تحریک کو بالکل ہی ابتداء سے شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ دور مصائب و مشکلات اور جدوجہد کا دور تھا۔ لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والی محترم شخصیات اور وہ لوگ جنھوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تھی سب ہی نے ان مشکل حالات میں لائبریرین شپ کے فروغ اور ترقی کے لیے خلوص دل کے ساتھ دن رات محنت کرکے نہ صرف لائبریری تحریک کی بنیاد رکھی بلکہ اسے پروان چڑھانے کی مسلسل انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کرتے رہے ان احباب نے ایسی منصوبہ بندی کی کہ آج پاکستان لائبریرین شپ ترقی کے اعتبار سے دوسرے شعبوں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ان قابل تعریف شخصیات میں خان بہادر اسد اللہ خان، محمد شفیع، نور محمد خان، خواجہ نور الٰہی، فضل الٰہی، عبدالسبحان خان، عبدالصبوح قاسمی، عبدالرحیم، ڈاکٹر محمد علی قاضی، الطاف شوکت، فرحت اللہ بیگ، جمیل نقوی، الحاج محمد زبیر، سید ولایت حسین شاہ

حبیب الدین احمد، ڈاکٹر عبدالمعید اور ابن حسن قیصر شامل ہیں۔لائبریری تحریک کو منظم کرنے اور فروغ دینے میں یہ احباب انفرادی اور اجتماعی کوششیں کرتے رہے، ان میں ڈاکٹر عبدالمعید اگلی صف میں نظر آتے ہیں اور دیگر احباب ان کے شانہ بہ شانہ تھے، قیصر صاحب اس دور کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ لاہور ہی میں برطانوی ہندوستان میں قائم ہونے والی پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے نام سے قائم ہوئی لیکن صوبوں کے ادغام کے بعد اسے دوبارہ پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کا نام دے دیا گیا۔ اس ایسوسی ایشن نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں ''ماڈرن لائبریرین'' (نیو سیریز) شائع کیا لیکن یہ جولائی ۱۹۵۰ء میں بند ہوگیا۔ ۱۹۴۸ء میں پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن نے لائبریری سائنس میں سرٹیفکیٹ کورس شروع کیا لیکن یہ ایک سال میں بند ہوگیا۔ اسی دوران ڈاکٹر عبدالمعید سندھ یونیورسٹی کے لائبریرین مقرر ہوئے اور لاہور سے کراچی منتقل ہوگئے۔ اب کراچی میں لائبریری سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ کراچی لائبریری ایسوسی ایشن ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن نے لائبریری سائنس میں سرٹیفکیٹ کورس بھی شروع کیا جو کراچی میں اپنی نوعیت کا اولین کورس تھا اس کورس نے لائبریرین شپ کو بنیاد فراہم کرنے میں بہت مدد

دی۔ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ ۱۹۵۰ء اور پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی بنیاد کراچی میں مارچ ۱۹۵۷ء میں رکھی گئی۔ قیصر صاحب ان اداروں کے قیام اور سرگرمیوں میں دیگر احباب کے ہمراہ خاموشی سے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان لائبریرین شپ میں ایک ایسی انجمن معرض وجود میں آئی کہ جس نے مختصر وقت میں کتب خانوں اور لائبریری تحریک کے فروغ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر دکھایا۔ یہ انجمن شہید حکیم محمد سعید کی سرپرستی میں 'انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات، اسپل (SPIL) کے نام سے قائم ہوئی۔ ایسوسی ایشن نے ملک کے مختلف شہروں میں لائبریرین شپ کے مختلف موضوعات پر یکے بعد دیگرے قومی نوعیت کے سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسیں منعقد کیں، کتب خانوں کے فروغ ورترقی کے منصوبے اور تجاویز حکومت کو پیش کیں۔ شہید حکیم محمد سعید نے نہ صرف اسپل (SPIL) کے پرچم تلے کتب خانوں کی ترقی کے لیے جدوجہد کی بلکہ دیگر لائبریری انجمنوں کی بھی سرپرستی کی اور ان کے تحت ہونے والے کتب خانوں کی ترقی کے پروگراموں کے ذریعہ حکومت کو ملک میں کتب خانوں کے قیام اور ترقی کا احساس دلاتے رہے۔

قیام پاکستان کا ابتدائی دور مسائل اور مشکلات کا دور تھا۔حکومت بعض اہم اور قومی نوعیت کے امور کی انجام دہی میں مصروف رہی جس کے نتیجہ میں تعلیم بشمول کتب خانوں کی جانب فوری توجہ نہ ہو سکی۔ ملک میں کتب خانوں کے قیام

اور لائبریری تحریک کے سلسلے میں حکومت پاکستان کی جانب سے جو اولین اقدام سامنے آیا وہ امپیریل لائبریری کلکتہ کے سابق لائبریرین ' انڈین لائبریری ایسوی ایشن کے بانی سیکریٹری، لائبریری ایسوسی ایشن لندن کے فیلو اور اساڈان ڈکنسن کے شاگرد خان بہادر خلیفہ محمد اسداللہ خان کا تقرر وزارت تعلیم حکومت پاکستان میں بطور "آفیسر بکار خاص" (Officer on Special Duty) تھا جنھوں نے ہندوستان کو خیر باد کہتے ہوئے پاکستان ہجرت کی۔
خان بہادر صاحب کو ہندوستان لائبریرین شپ میں بہت ہی بلند مقام حاصل تھا۔ ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے انہیں اُن کی اعلیٰ لائبریری خدمات کے اعتراف میں " خان بہادر" کے خطاب سے نوازا۔ قدرت نے خان بہادر صاحب کو پاکستان میں بہت کم مہلت دی وہ ۲۳ نومبر ۱۹۴۸ء کو رحلت کر گئے۔ مختصر عرصہ میں بھی انہوں نے پاکستان میں لائبریری تحریک اور ملک کی قومی لائبریری کی بنیاد رکھی۔ بقول ڈاکٹر ممتاز انور ' اسداللہ نے افسر بکار خاص کی حیثیت سے کراچی میں مختصر عرصہ خدمات انجام دیں جہاں انہوں نے بنیادی نوعیت کے کام کیے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز و لائبریریز اور نیشنل لائبریری ۱۹۴۹ء میں اسداللہ کے کام کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئے '۔ ڈاکٹر حیدر کا کہنا ہے کہ " حقیقت خواہ کچھ بھی ہو ایک بات مسلمہ ہے وہ یہ کہ ۱۹۴۹ء میں ڈائریکٹریٹ آف آرکائیوز و لائبریریز کا قیام بہادر صاحب کی کوششوں کا مرہون منت ہے" ۔

اس طرح پاکستان مین لائبریری تحریک کا آغاز کراچی سے اور لاہور سے بیک وقت شروع ہوا۔ گویالاہور سے انجمن سازی کا آغاز ہوااور کراچی سے کتب خانوں کے قیام اور فروغ کے لیے منصوبہ بندی کی گئی۔ بعد ازاں انجمن سازی کی سرگرمیاں کراچی سے پورے آب وتاب سے شروع ہوگئیں۔

لائبریرین شپ میں شمولیت

ابن حسن قیصر نے ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اردو میں ایم اے کیااور ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے لائبریری سائنس میں سٹ ٹیفیکیٹ کورس حاصل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اس وقت آپ آرمی میں تھے۔ فوری طور پر کوئٹہ پوسٹنگ ہوئی لیکن جلد ہی ریٹائرمنٹ لے لی اور لاہور منتقل ہوگئے۔فروری ۱۹۴۹ ء میں پنجاب لائبریری سے وابستہ ہوئے یہ لائبریرین شپ میں شمولیت کا آغاز تھا۔ابتداء میں جونیئر اسسٹنٹ پھر اسسٹنٹ کیٹلاگر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں اکتوبر ۱۹۵۱ء تک آپ اس ادارے سے منسلک رہے۔ گویا پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، میں آپ نے ۲ سال ۸ ماہ خدمات انجام دیں اس کے بعد آپ کراچی منتقل ہوگئے۔لیاقت میموریل لائبریری سے اپنی وابستگی کے بارے میں قیصر صاحب نے ااپنے ایک مضمون میں لکھا ”میں ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت ترک کرکے نیشنل لائبریری سے وابستہ ہوگیا جہاں پیشہ ورانہ عملے میں

سب سے پہلا تقرر مبلغ دو سو روپے ماہوار پر میرا عمل میں آیا، میرے آنے کے چھ ماہ بعد سید ولایت حسین مرحوم بحیثیت لائبریرین تشریف لائے جنھوں نے جی جان سے ایسا کام کیا کہ نہ دن دیکھا نہ رات"۔ لیاقت میموریل لائبریری اس وقت نیشنل لائبریری تھی۔ قیصر صاحب کا تقرر سینئر ٹیکنیشن کی حیثیت سے ہوا پھر آپ اسسٹنٹ لائبریرین ہوئے، قائم مقام لائبریرین کے فرائض انجام دئے اور آخر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد ۲۰ نومبر ۱۹۶۹ء میں اس کتب خانے سے سبکدوش ہوگئے۔

قیصر صاحب کے ایک ہمعصر فرحت اللہ بیگ صاحب لکھتے ہیں کہ "جب میں سینٹرل سیکریٹریٹ اور نیشنل لائبریری آف پاکستان سے منسلک ہوا تو یہاں ہم دونوں کو ایک بار پھر دیگر ساتھیوں کے ہمراہ کام کرنے کا موقع ملا۔ سینٹرل سیکریٹریٹ لائبریری یا عارضی نیشنل لائبریری (جو عام طور پر اس وقت کہلاتی تھی) کراچی میں لائبریری سرگرمیوں کا مرکز بن گئی جہاں پر حسب ذیل سینئر لائبریریز نے باہم مل کر لائبریری پروموشن کے لیے کام کیا۔ ان سینئر لائبریریز میں فضل الٰہی مرحوم، الحاج محمد شفیع، نور محمد خان، سید ولایت حسین شاہ، ڈاکٹر عبدالمعید، ابن حسن قیصر اور فرحت اللہ بیگ شامل تھے، اس مختصر سے پانچ سالوں (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۵ء) میں ہم نے باہم مل کر کھلے دل سے کام کیا اور حسب ذیل اداروں کی بنیاد رکھی، ڈاکٹر عبدالمعید کا کردار زیادہ نمایاں تھا۔ ان

اداروں میں کراچی لائبریری ایسو سی ایشن، پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن، اسکول آف لائبریرین شپ اور پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ شامل تھے"۔ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ میں ان اداروں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ قیصر صاحب کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ان اداروں کے بانی رکن رہے۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن جس کا قیام ۱۹۵۷ء میں عمل میں آیا، ڈاکٹر عبدالمعید اس کے بانی سیکریٹری اور قیصر صاحب اس کی منتظمہ کے رکن تھے۔ قیصر صاحب پی ایل اے کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے۔ ایسو سی ایشن کی پہلی کانفرنس کی صدارت اس وقت کے صدر مملکت میجر جنرل اسکندر مرزا نے کی تھی جو ایسو سی ایشن کی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ قیصر صاحب نے اسکندر مرزا کی صدارت کا ذکر اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا" میں ابتداء ہی سے لائبریری ایسو سی ایشن کا ممبر تھا پہلے سال ڈاکٹر عبدالمعید اس کے سیکریٹری تھے۔ جب طے پایا کہ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کا اجلاس کراچی میں کیا جائے تو ہم لوگوں نے اس وقت بڑی ردو قدح کے بعد طے کیا کہ وزیر تعلیم پاکستان سے صدارت کی درخواست کی جائے چنانچہ ایک وفد وزیر تعلیم کی خدمات میں حاضر ہوا اس سے رسائی نہ ہوئی تو ایک وفد جوائنٹ سیکریٹری کے پاس بھیج دیا گیا انہوں نے فرمایا کہ " پاکستان میں تعلیم کا تناسب ہی اس قدر امید افزا کہاں ہے کہ ہمیں کتب خانوں کی ضرورت ہو۔ ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت نہ پڑھ سکتی ہو کتب خانے عیاشی نہیں تو اور کیا ہیں"۔ اس تلخ جواب پر غور کرتے

ہوئے مجھے آج بھی شرم محسوس ہوتی ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جو وزارت تعلیم کا حاکم ہونے کے باوجود کتب خانوں کی اہمیت اور وقعت سے اس قدر بے بہرہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ وفد وہاں سے ناکام و نامراد لوٹا۔ اس واقعہ سے ہمارا پست ہمت ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ اس ناامیدی میں ڈاکٹر محمود حسین نے ہماری ہمت بندھائی اور فرمایا مجھے سوچنے کا موقع دو میں کوئی اور صورت نکالتا ہوں۔ ہمیں اس وقت خیال یہ تھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب نواب صاحب خیرپور یا بہاولپور سے رجوع کریں گے لیکن ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس وقت کے صدر پاکستان جناب اسکندر مرزا نے صدارت کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ چنانچہ یہ اجلاس اسکندر مرزا ہی کی صدارت میں وائی ایم سی اے ہال کراچی میں ہوا''۔

پی ایل اے کے علاوہ پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ جس کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا۔ گروپ کی پہلی مجلس منتظمہ میں ڈاکٹر عبدالمعید نائب صدر اور قیصر صاحب اس کے بانی خازن تھے۔ اسی طرح ۱۹۵۹ء میں گروپ کے زیر اہتمام اسکول آف لائبریرین شپ قائم ہوا تھا تو کورس کے نگرانِ اعلیٰ فضل الٰہی تھے جب کہ اساتذہ میں دیگر کے علاوہ ابن حسن قیصر بھی تھے۔ قیصر صاحب جامعہ ملیہ میں منعقد ہونے والے لائبریری سائنس کے سرٹیفیکیٹ کورس میں بھی ایک استاد کی حیثیت سے پڑھایا۔

لیاقت میموریل لائبریری سے ریٹائر ہو جانے کے بعد

قیصر صاحب دسمبر ۱۹۶۹ء میں علامہ اقبال کالج کی لائبریری سے منسلک ہو گئے اور لائبریری کی تنظیم و ترتیب کے فنی کام خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ آپ ستمبر ۱۹۷۲ء تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔

اردو اشاریہ سازی اور ابن حسن قیصر

اشاریہ سازی ایک اہم فن ہے جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کا اشاریہ کتاب کی اہمیت کا باعث ہوتا ہے، رسائل و جرائد کے اشاریے، رسائل و جرائد اور اخبارات میں شامل مضامین کے اشاریے مصنفین اور محققین کی ان کے مطلوبہ مواد تک رسائی میں معاون ہوتے ہیں۔ پاکستان مین اردو رسائل کی اشاریہ سازی میں ابن حسن قیصر کی خدمات قابل قدر ہیں۔ آپ نے اس اہم اور فنی کام کو عام کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ''افادات نیاز'' کے عنوان سے علامہ نیاز فتح پوری پر اشاریہ مرتب کیا۔ یہ اشاریہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ یہ موضوعی اشاریہ علامہ نیاز فتح پوری پر مضامین، نظم و نثر شائع شدہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۲ء یعنی ۲۳ سالوں کا احاطہ کرتا ہے۔ قیصر صاحب کا مرتب کردہ دوسرا اشاریہ بابائے اردو مولوی عبدالحق پر ''اشاریہ عبدالحق'' کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں مرتب کیا، یہ اشاریہ عبدالحق کی تحریروں اور انپر جو کچھ تحریر کیا گیا ان تمام تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔ ''غالب نما'' کے عنوان سے قیصر صاحب نے ایک اور اہم اشاریہ مرتب کیا یہ ۱۹۶۹ء ادارہ یادگار غالب نے شائع

کیا۔ یہ توضیحی اشاریہ ہے یعنی تخلیقات پر مختصر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ غالب پر کتب و مضامین جو اردو زبان کے رسائل و جرائد میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۹ء کے درمیان شائع ہوئے یہ اشاریہ ان تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے علاوہ آپ نے بے شمار کتب کے اشاریے بھی مرتب کیے ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کا اشاریہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی نہ جانے ان کو کس طرف

(مطبوعہ ''پاکستان لائبریری بلیٹن''، ۲۴(۴) دسمبر ۱۹۹۳ء، ۱۸۔۲۶)
(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' ۲۰۰۹ء میں شامل)

میری محبتوں کا محور - محمد صائم عدیل

معروف سفرنامہ نگار اور ٹی وی اینکر مستنصر حسین تارڑ کی پیدائش کی خبر سن کر ان کے دادا نے اپنی پگڑی اتار کر صحن میں بچھا کر کہا کہ سارے گاؤں کو اطلاع دے دو کہ میرے ہاں پوتا ہوا ہے اور یہ پگڑی میں نے مبارکباد جمع کرنے لیے بچھائی ہے'۔ یہ عمل خوشی کی انتہاہ کو ظاہر کرتا ہے۔ پوتے کی دنیا میں آمد کی خوشی کو وہی محسوس کر سکتاہے جو اس عمل سے گزرا ہو۔ پوتے اپنے دادا اور دادی کے محبتوں کے مہور ہوتے ہیں۔ ان کی دنیا میں آمد کے بعد پھر کوئی اور جی کو نہیں بھاتا۔ میرے بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا یعنی میرا بڑا پوتا پیدا ہوا تو میری خوشی بھی مستنصر حسین تارڑ کے والد کی طرح ہی تھی۔ مَیں کیونکہ شہری ماحول کا مکین ہوں اس لیے صحن میں پگڑی تو نہیں بچھائی اور بچھاتا بھی کیسے مَیں تو فلیٹ میں رہتا ہوں البتہ جوں ہی پوتے صاحب کی دنیا میں آمد کا معلوم ہوا خوشی کے سمندر میں غوطے مارتا ہوا اسپتال جا پہنچا۔ اولین عمل اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا، اور نومولود کے کان میں اذان دی ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پوتے صاحب آپ مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے ہو ہم نے آپ کا نام ''محمد صائم'' رکھا ہے۔ صائم کا مطلب 'روزہ دار'۔ دوسرا کام اپنے موبائل سے تمام رشتہ داروں کو اس بات کی اطلاع ایک عدد ایس ایم ایس کے

ذریعہ دی کہ ہمارے ہاں ایک عدد پوتے صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ جیسے جیسے مبارکباد کے پیغامات آ رہے تھے ہم انہیں پڑھ پڑھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ اس وقت شوگر کا مرض لاحق نہیں ہوا تھا چنانچہ خوب خوب مٹھائی احباب کو کھلائی اور خود بھی کھائی۔ صائم صاحب دنیا میں آئے تو سرخ سفید، گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، صحت مند تھے۔ یہ شروع ہی سے شباہت میں اپنی ماں پر ہیں۔ بعض نے انہیں ان کے 'چاچو' سے ملایا تو کسی نے ان کی اکلوتی پھوپھی سے۔ اب یہ چھ سال کے ہو چکے ہیں اول کلاس میں آ گئے ہیں۔ اب یہ وہ صائم نہیں ہیں، ان کی شخصیت مختلف ہو چکی ہے۔ کتابی چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، اَبرُو (بھویں) تیر کمان، صبیح پلکیں، سیاہ گھنے کالے بال، کھڑے نقش، ناک قدرے پھیلی ہوئی جو ہمارے خاندان کا ٹریڈ مارک ہے، کشادہ پیشانی، گلابی ہونٹ، چھوٹا بابا، مخروطی انگلیاں، چھوٹے چمکدار دانت، پر کشش مسکراہٹ، مسکراتے اور ہنستے وقت گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں، فربہ جسم، لمبا قد، چال میں بانکا پن، جلد رو دینا، سر دست ان میں ڈر کی کیفیت پائی جاتی ہے راہ چلتے گاڑی آ جائے کوئی چھوٹا سا جانور قریب آ جائے تو یہ ڈر جاتے ہیں حالانکہ ان کا نشان شیر ہے اور عنصر سورج انہیں بہادر ہونا چاہیے ممکن ہے کہ یہ خصوصیت آگے چل کر ظاہر ہو اور یہ بہادری کے جوہر دکھائیں۔ اس وقت یہ ڈر پھوک ہیں۔

عقیقہ بچے کی پیدائش سے ساتویں دن کرنے کی ہدایت احادیث میں ملتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے جانور کے عوض رہن ہوتا ہے جو ساتویں دن اس کی طرف سے قربانی کیا جائے اس کا سر منڈوایا جائے اور نام رکھا جائے۔ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی) عقیقہ کے جانور کی قربانی میں نر یا مادہ کی قید نہیں، بکرا یا بکری، گائے یا اونٹ جس میں سات حصے ہوتے ہیں، یعنی اگر دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا عقیقہ کرنا ہو تو ایک گائے قربان کی جا سکتی ہے۔ عقیقہ کر دینے سے بچے کی بلائیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ عقیقہ کے جانور کے عوض بچے کے رہن ہونے کی وجہ علامہ محمد منظور نعمانی نے 'معارِف الحدیث' میں یہ بیان کی ہے کہ ''دل کو زیادہ لگنے والی بات یہ ہے کہ بچہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اور صاحب استطاعت کے لیے عقیقہ کی قربانی اس کا شکرانہ اور گویا اس کا فدیہ ہے۔ جب تک یہ شکریہ پیش نہ کیا جائے اور فدیہ ادا نہ کر دیا جائے وہ بار باقی رہے گا اور گویا بچہ اس کے عوض رہن رہے گا''۔ جامعہ ترمذی کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ 'حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپ ﷺ نے (اپنی صاحبزادی سیدہ) فاطمہؓ سے فرمایا کہ اس کا سر صاف کردو اور بالوں کے وزن کے بھر چاندی صدقہ کردو وزن کیا تو وہ

ایک

درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

پیدائش کے ساتویں روز صائم صاحب کا عقیقہ ہوا، سر کے بال صاف ہوئے اور دو عدد بکرے صدقے کے طور پر ذبح کرائے گئے۔ اب ہمارے پوتے صاحب کے سر پر موجود کالے گھنے بالوں کی جگہ صاف ستھرے چٹیل میدان نے لے لی تھی۔ اب وہ قدرے مختلف نظر آرہے تھے۔ بلکہ زیادہ حسین لگ رہے تھے۔ عقیقہ کی تقریب دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام قریبی احباب نے بھرپور شرکت کی۔

صائم صاحب تمام گھر والوں کی محبتوں کے محور تھے، ہیں اور رہیں گے۔ میرا چھوٹا بیٹا نبیل گھر میں سب سے چھوٹا تھا جو ایم بی بی ایس کر چکا تھا۔ گھر میں آنے والا بچہ صائم ہی تھا اس وجہ سے یہ ہر وقت ہر لمحہ کسی نہ کسی کی توجہ کا مرکز رہا کرتے تھے۔ ابھی یہ دو سال ہی کے تھے کہ عدیل کو سعودی عرب ملازمت مل گئی۔ پاکستان کے حالات کے پیش نظر یہ ایک بہتر موقع تھا ہم نے بادل نخواستہ، دل پر جبر کرکے اپنے بیٹے، بہو اور پوتے صاحب کو سعودی عرب کے لیے رخصت کیا۔ اب ہم تھے اور پوتے صاحب کی یادیں۔ بھلا ہو انفارمیشن ٹیکنالوجی کا کہ اس نے فاصلوں کو دوریوں کو مٹا دیا ہے۔ انٹر نیٹ پر تصویر کے ساتھ گفتگو کی سہولت نے بڑی حد تک اطمینان فراہم کر دیا ہے۔

پہلے تو روز ہی کافی کافی دیر تک اسکائپ بات کیا کرتے رفتہ رفتہ دل کو اطمینان آگیا اورجدائی کی شدت کم سی گئی۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک سال بعد ہی ہمارے چھوٹے بیٹے نبیل صاحب کا بھی پروانہ سعودی عرب سے آگیا اور دونوں بیٹا بہو بھی سعودی عرب چلے گئے۔ اب ہماری کیفیت جنگل میں تنہا شکاری والی ہوئی۔ گھر جس میں رونق ہی رونق تھی ، چہل پہل ، ہنسی مزاق، خوشی ہی خوشی تھی خاموشی نے ڈیرے ڈال لئے۔ دونوں میاں بیوی کس قدر باتیں کریں ، جب کے میں پہلے ہی خاموش طبع. جلد ہی ہمارا وزٹ وزا بھی آگیا اور ہم بھی اپنے بچوں اور پوتے کے پاس چلے گئے۔ درمیان میں ایسا بھی ہوا کہ ہم سعودی عرب میں اور ہمارے پوتے صاحب کراچی ہی میں تھے۔ ان کے ویزہ کی کچھ مشکلات تھیں۔ لیکن یہ بھی جلد سعودی عرب چلے گئے۔ ہمیں ایک سال بعد دوبارہ سعودی عرب جانے کی سعادت نصیب ہوئی اور پوتے صاحب کے ساتھ وقت گزارا۔ اب یہ اسکول جارہے ہیں جدہ کے پاکستان انٹر نیشنل اسکول پڑھتے ہیں۔ ابتدائی کلاسوں کے بعد ونچ میں آگئے ہیں۔

ستاروں کے علم پر اکثر لوگوں کا اِعتقاد نہیں مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایمان بھی ہے کہ غیب کا علم صرف اور صرف اللہ کو ہے۔ لیکن علمِ فلکیات اُن علوم میں سے ہے جسے قدیم علم کہا جاتا ہے۔ اللہ کی مخلوق نے بے شمار کاموں کے

لیے چاند، سورج اور ستاروں سے مدد لی ہے۔ ماہر فلکیات کی باتوں پر یقین کرنا یا نا کرنا اپنی جگہ لیکن اس کی حقیقت سے انکار بھی مشکل ہے۔ اسے صرف ایک علم اور سائنس کے طور پر لینا چاہیے۔ صائم جس تاریخ کو اس دنیا میں وارد ہوئے اس اعتبار سے ۔۲۴ جولائی تا ۲۳ اگست کے درمیان پیدا ہونے (Leo) سے ان کا اسٹار 'اسد' یعنی والے 'اسد' ہوتے ہیں۔ ماہرین فلکیات نے 'اسد' افراد کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کے مطابق 'اسد' افراد کا نشان شیر ہے جسے جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے، ان کا عنصر سورج ہے جو سیاروں کے نظام میں تمام سیاروں کا بادشاہ ہے۔ ان دونوں چیزوں کا اثر اسد افراد پر ہوتا ہے اور یہ انہیں بہادر، ذہین اور گرم مزاج بناتی ہیں۔ اسد افراد تخلیقی صلاحیتوں اور مضبوط شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ بہادری میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ پاکستان کی فوج میں نشان حیدر حاصل کرنے والے تین فوجی (سرور شہید، طفیل محمد شہید، شیر خان شہید) اسد گزرے ہیں۔ سب سے پہلے چاند پر قدم رکھنے والا امریکی نیل آرم اسٹارنگ اسد تھا۔ ان میں حکمرانی کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ امریکی صدر بل کلنٹن اور بارک اوباما اسد ہیں۔ پاکستان کے دو فوجی صدر (ضیاء الحق، پرویز مشرف) اسد گزرے ہیں۔ مزاج میں تیزی کے باعث ان میں برداشت کا مادہ نہیں رہتا اس وجہ حاکمانہ، (Bossy) سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ باوفا، محبت کرنے والے، پھول دار مزاج رکھتے ہیں۔ یہ کامیاب تخلیق کار ثابت ہوتے ہیں ان کی تخلیقی حس انہیں مختلف تخلیقی شعبوں میں لے جاتی ہیں۔

معروف بھارتی اداکار کشور کمار، سیف علی خان، سنجے دت، سونو نگم اور کے بالاجی اسد ہیں۔یہ اچھے مصنف بھی بن سکتے ہیں۔اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کسی بھی شعبے میں کر سکتے ہیں۔ان میں ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے، یہ خدمت خلق کرکے خوش ہوتے ہیں یعنی یہ سماجی کارکن بھی ہوتے ہیں۔اسد افراد کی شخصیت جاذب نظر اور پر کشش ہوتی ہے۔یہ دوسروں کی توجہ جلد اپنی جانب کرلیتے ہیں۔جن شعبوں میں یہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں ان میں سیاست، سماجی خدمات، کسی بھی ادارے کی سربراہی، فوٹو گرافی، ماڈلنگ یا اداکاری۔ان کا رجحان مذہب کی جانب بھی ہوتا ہے اگر یہ اپنی علمی صلاحیتیں دینی علوم کی جانب مرکوز کردیں تو اچھے مذہبی اسکالر اور مقرر بھی بن سکتے ہیں۔امام ربانی حضرت مجدالف ثانی شیخ احمد سرہندی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۹اگست ۱۸۶۳ء)، اسد ہیں۔

معروف 'اسد' افراد میں امام ربانی حضرت مجدالف ثانی شیخ احمد سرہندی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۹اگست ۱۸۶۳ء)، جنرل محمد ضیاء الحق (۱۲اگست ۱۹۲۴ء) جنرل پرویز مشرف (اگست ۱۱، ۱۹۴۳ء)،نشان حیدر سرور شہید (۲۷ جولائی ۱۹۱۰ء)،، نشان حیدر طفیل محمد شہید (۷ اگست ۱۹۱۴ء)،نشان حیدر کیپٹن کرنل شیر خان شہید (۵ جولائی ۱۹۷۰ء)، بارک اوباما (۴۴واں پہلا افریقی امریکی صدر

پیدائش۔ ۴ اگست ۱۹۶۱ء)، ۴۲ واں امریکی صدر بل کلنٹن (پیدائش۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۶ء)، اداکارہ میڈونا (۱۶ اگست ۱۹۵۸ء)، پاکستانی ادیب کرنل محمد خان (۵ اگست ۱۹۱۰ء)، بھارتی اداکار کشور کمار، سیف علی خان، سنجے دت، سونو نگم۔کے بالاجی شامل ہیں۔اسد افراد کی (Leo)

جن نمایاں چیزوں کی نشاندھی کی گئی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رنگ: گولڈن، نارنجی پیلا

عنصر: آتش آگ

جواھر: ہیرا، لہسنیا

بہترین شریک حیات: حمل، قوس، ثور

ناموافق ساتھی: عقرب، ولو

دن: اتوار

حروف: م، ٹ

عدد: ۱

(سیارہ: شمس (سورج

بیماریاں: ہائی بلڈ پریشر، ریڑھ کی ہڈی یا کمر کی تکالیف، دل کی تکلیف

نشان: شیر

(Intellectual) گروپ: دانش ور

لکی نمبر: 1, 3, 9, 23

لکی مہینہ : جنوری، اکتوبر

لکی دن: اتوار

فائدہ مند پھل: آم، پھول گوبی، سلاد

جہاں تک چاند، سورج اور ستاروں کی باتوں کا تعلق ہے انہیں ہر گز حتمی تصور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک علم ہے اسے علم کی حد تک ہی لینا چاہیے۔ غیب کی باتوں کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اللہ تعالی ہمارے پوتے صائم کو عمر دراز عطا کرے اور علم کی دولت سے مالا مال کرے۔ آمین۔

علم نجوم اور ستاروں کے علم کے ذریعہ شخصیت کے بارے میں معلومات کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ موجودہ سائنسی اور برقی دنیا کی نئی ایجاد نے انسان کی جین اور خون کے گروپ کے توسط سے اس شخص کے بارے میں بہت کچھ بتایا جانے لگا ہے۔ روزنامہ جنگ کی اشاعت ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء میں فریحہ سلیم کے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جاپان میں ہونے والی تازہ ترین تحقیق کے مطابق دنیا میں بسنے والے خواتین و حضرات میں چار اقسام کے بلڈ گروپ پائے جاتے ہیں اور ہر گروپ کے حامل افرد مختلف خصوصیات رکھتے ہیں۔

اس تحقیق کے مطابق ہمارے پوتے صائم صاحب کا بلڈ گروپ ’بی + ‘ ہے۔ اس بلڈ

کے حامل افراد میں B کہا گیا ہے۔ دنیا بھر میں گروپ (Active) گروپ کو متحرک تقریباً ۹ فیصد لوگ بی پازیٹو اور ۲ فیصد بی نیگیٹو ہیں۔ یہ لوگ خوش مزاج، مثبت سوچ رکھنے والے، حساس شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن غیر منتظم اور لاپروا بھی ہوتے ہیں۔ ان میں عام لوگوں کی نسبت پھرتیلا پن زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ شور پیدا کرتے ہیں اور اپنی مرضی کو فوقیت دیتے ہیں۔ ان میں منزل پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتے بلکہ اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ صرف اپنے لیے کام کرتے ہیں۔ مضبوط شخصیت کے حامل یہ افراد خودسر اور اپنی مرضی چلانے اور من مانی کرنے والے ہوتے ہیں۔ انفرادی کوموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے محقق، سیکریٹری، گالف کے کھلاڑی اور کک بھی بن سکتے ہیں۔ اس تجزیے کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی ایک علم ہے۔ بہت کچھ ان باتوں کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ اسے محض علم تصور کرتے ہوئے درج کی گئیں باتوں پر سنجیدہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

.برطانیہ کی ایک جامعہ کی تحقیقی رپورٹ منظر عام پر آئی۔ اس رپورٹ کی تفصیل روزنامہ جنگ کی اشاعت ۲ اپریل ۲۰۱۴ء میں ہوئی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ خواتین اور مردوں کو بلڈ گروپ کی مناسبت سے پیشوں کے انتخاب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق 'بی' گروپ کے لوگ تنہائی میں کام کرنا

پسند کرتے ہیں اور انہیں ایسے پیشے اپنانے بھی چاہیں جن میں دوسرے لوگوں کا بطور ساتھی کارکن کوئی کردار نہ ہو۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 'اے' اور 'بی' ایسے لوگوں کا گروپ ہے جو بہترین انداز میں ترجمانی اور وکالت کے فرائض سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ منطقی رویے کو پسند کرتے ہیں اب سامنے غیر ضروری باتوں سے کام نہیں چلایا جاسکتا ۔'اے بی' کی مشہور شخصیت جان ایف کینڈی کی تھی جسے بہترین معاونوں کا تعاون حاصل تھا۔ ایسے افراد بہترین لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کا ہنر جانتے ہیں ۔اس علاوہ ساتھی ساتھیوں کی تجاویز اور خیالات کو بھی خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔

۲۳ اپریل کتاب وکاپی رائٹ کا عالمی دن

کتاب حاضر، قاری غائب۔ کمپیوٹر اسکرین کسی طور مطبوعہ نگارش کا متبادل نہیں
اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں دنوں، ہفتوں، سالوں اور دس
سالوں کا انتخاب کیا جس کا بنیادی مقصد عالمی سطح کے مسائل اور issues جن میں
اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے دلچسپی رکھتے تھے کو اجاگر کرنا تھا۔ بسا اوقات یو این
کے ذیلی ادروں نے اپنے پروگرام کے مطابق بعض مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے
مخصوص دنوں کو مقرر کرلیا جیسے عالمی ادارہ صحت WHO نے صحت کا عالمی دن،
گردوں کا عالمی دن دل کا عالمی دن، ٹی بی کا عالمی دن، World No-Tobacco Day
وغیرہ کے انعقاد کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح یونیسکو نے بھی بعض موضوعات کو اجاگر
کرنے اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف دنوں کا انتخاب کیا اور اس
دن اس موضوع کی مناسبت سے سیمینار، ورکشاپ، کانفرنسیز اور نمائش کا اہتمام کیا
جانے لگا۔ جیسے 'پانی کا عالمی دن'، عالمی لٹریسی ڈے'، عالمی ماحولیاتی ڈے'، ماں کا عالمی
دن، باپ کا عالمی دن، مادری زبان کا عالمی دن اور اسی طرح دیگر موضوعات پر دنوں
کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں کتاب اپنا مُماثل نہیں رکھتی اور اسے حصول علم، ترسیل علم اور فروغ علم میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ پڑھنا یعنی اقراء ہمارے ایمان کا حصہ ہے ہماری کتاب 'قرآن مجید' کی ابتداء ہی لفظ 'اقراء' سے ہوئی۔ اہلِ مغرب کے لیے، کتاب جتنی اہمیت رکھتی ہے مسلمانوں کے لیے بھی کتاب اتنی ہی اہم اور افضل ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ نے خطبۂ حجتہ الوَداع کے موقع پر ارشاد فرمایا "میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ کبھی گمراہ نہ ہوگے اگر اس پر قائم رہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے"۔

کتاب کے عالمی دن کے لیے یونیسکو نے ۲۳ اپریل کا انتخاب کیا اور اس دن کو "کتاب اور کاپی رائٹ کا عالمی دن" قرار دیا۔ بنیادی مقصد عوام الناس میں کتاب کی اہمیت اجاگر کرنا، کتاب سے محبت اور انسیت کا شعور بیدار کرنا، لوگوں میں مطالعہ کی عادت کا فروغ شامل ہے اس کے علاوہ کاپی رائٹ یعنی حقِ تصنیف کا بنیادی مقصد ادیبوں، شاعروں، مصنفین و مؤلفین کے حقوق کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے جو انہیں قلمی کاوشوں اور تخلیقات کی نسبت سے ان کو ادا کیا جانا چاہیے، پاکستان میں یہ قانون "پاکستان کاپی رائٹ ایکٹ ۱۹۶۲ء" کے نام سے نافذ العمل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس قانون پر نظر ثانی بھی کی جاتی رہی۔ ۲۳ اپریل کے انتخاب کی وجہ اور اس کا تاریخی پس منظر دلچسپ بھی ہے اور منطقی بھی۔ کتاب کسی بھی انسانی عمل کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے، اس کا

خالق عرفِ عام میں مصنف کہلاتا ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ نے کتاب اور ان کے خالقوں یعنی مصنفین کو عالمی سطح پر خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے اس دن ''کتاب کے عالمی دن'' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۳ اپریل اہل مغرب کے اعتبار سے مناسب دن ضرور ہے لیکن اسلامی اعتبار سے یا مسلمانوں کے حوالے اس دن میں کوئی منطق اور معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخ متعدد مغربی مصنفین اور دانشوروں کی پیدائش یا اس دنیا سے رخصت ہوجانے کا دن ہے۔اس دن کا کتاب سے کیا تعلق ہے ؟ تحقیق سے واضح ہوا کہ سب سے پہلے اسپین کے شہر کیٹالونیا Catalonia میں کتب فروشوں نے اس دن کو تقریب کے طور پر منانے کا اہتمام کیا جس کا مقصد معروف مصنف Miguel de Cervantes کو خراج عقیدت پیش کرنا تھا جس کا انتقال ۲۳ اپریل کو ہوا تھا۔ پھر اس ریجن میں یہ تقریب Saint Georg's Day کا حصہ بن گئیں۔ عہد قدیم medieval era سے ایک روایت یہ بھی چلی آرہی تھی کہ اس دن مرد حضرات خواتین کو گلاب کا پھول پیش کیا کرتے تھے، ۱۹۲۵ء میں اس روایت میں ایک خوش گوار تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ جواب میں خواتین مردوں کو کتاب تحفے میں دینے لگیں۔ کیٹالونیا شہر میں اس دن چار لاکھ کتابیں فروخت ہونے لگیں اور اس کے مقابلے میں چار ملین گلاب کے پھول خریدے جاتے تھے۔

۲۳ اپریل عالمی ادب کے لیے ایک symbolic date for world literature تھی

کے علاوہ مغربی دنیاکے معروف دانشور Catalonian festival کیونکہ اس دن
کی موت ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء کو واقع ہوئی، ولیم Shakespear)اور مصنفین شیکسپئر
اپریل ۱۸۵۰ء کو اس دنیا سے رخصت ۲۳ (William Wordsworth)ورڈسورتھ
انکا گارسیلا سو ویگا ڈرؤن ،(Carvantes) ہوا،، کارویٹنئیس (Inca Garcilaso de
ولاڈیمور نابوکو (K. Laxness)کے لیکسنئیس ، la Vega Maurice Druon)
اور میونیل ماجیا ولیجوکا(Josep Pla) جوزیف پلا ،(Valdimir Nabokov)
کی تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات بھی ہے۔ دنیا کی (Manuel Mejia Vallejo)
معروف ادبی شخصیات کا اس دن سے تعلق یونسکو کے لیے وجہ بنا کہ وہ اس دن کو عالمی
پیش کرے کے لیے اختیار کرے۔ ۱۹۹۵ء tribute سطح پر کتاب اور اس کے خالق کو
میں یونیسکو جنرل کانفرنس پیرس میں پہلی بار منعقد ہوئی جس میں عالمی سطح پر کتب اور
مصنفین کو خراج عقیدی پیش کیا گیا اور ریڈنگ، پبلشنگ اور کاپی رائٹ کے فروغ کے
لیے ہر سال اس دن کو عالمی سطح پر منانے کی سفارش کی۔ اس کا بنیادی مقصد to
ہے۔اور مصنفین، promote reading, publishing and copyright
ناشرین، لائبریریز اور پڑھنے والوں کے مابین رابطہ، تعلق پیدا کرنا اور انہیں خراج
تحسین پیش کرنا ہے۔کتاب لکھنے والوں کو لکھنے کی ترغیب دینا اور ان کے حوصلہ افزائی
کرنا، مطالعہ کی عادت پیدا کرنا اور لوگوں کو کتاب کی جانب مائل کرنے کی ترغیب دینا،
کتاب شائع کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔کتاب کی اہمیت ہر دور اور ہر
زمانے میں رہی ہے، آج بھی ہے اور آئندہ بھی

رہے گی۔ بعض احباب کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے کتاب کی اہمیت اور وقعت ختم ہو گئی ہے نہیں ہر گز نہیں، کتاب کی اہمیت آج بھی وہی ہے، آج بھی best seller منظر عام پر آ رہی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب چھپ رہی ہے، فروخت ہو رہی ہے اور پڑھی بھی جا رہی ہے۔ البتہ لوگوں میں مطالعہ کی عادت بہت خفیف ہو گئی ہے۔ مطبوعہ کتاب پڑھنے کا جو لطف ہے وہ کمپیوٹر اسکرین پر کتاب پڑھنے میں ہر گز نہیں۔ برقی ترقی کے حوالے سے ہم کتنی ہی ترقی کرلیں کتاب کی وقعت اپنی جگہ مسلم رہے گی۔

کتاب سے محبت و عقیدت کی بے شمار مثالیں تاریخ کا حصہ ہیں جن سے کتاب کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ ابن رشد نے ساری عمر کتب بینی میں صرف کر دی اس کی عمر میں صرف دو '۲' راتیں ایسی گزری کہ جب وہ مطالعہ نہ کر سکا، ایک شادی کی اور دوسری والدہ کی وفات کی رات۔ اسی طرح مشہور عالم جاحظ نے تو اپنی جان ہی ذوق مطالعہ کی نظر کر دی وہ آخری عمر میں مفلوج ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی کتابیں اس کے چاروں طرف لگی رہتی تھیں اور وہ مطالعہ میں منہمک رہتا تھا ایک دن کتابیں جاحظ پر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے دب کر مر گیا۔ جاحظ کا کہنا تھا کہ ''جب تک آپ چاہیں کتاب خاموش رہتی ہے جب آپ بات کرنا چاہیں تو یہ فصاحت کے ساتھ بولنے لگتی ہے اگر آپ کسی کام میں مصروف ہیں تو یہ خلل اندازی نہیں کرتی اور اگر آپ تنہائی محسوس کریں تو

وہ آپ کی ایک شفیق ساتھی بن جاتی ہے، وہ ایک ایسا دوست ہے جو آپ کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا نہ آپ کی چاپلوسی کرتا ہے اور ایسا ساتھی ہے جو کبھی آپ سے اُکتاتا بھی نہیں''۔ ہمایوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسے کتابوں سے خاص رغبت تھی، ہمایوں کا کتب خانہ تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ہمایوں کا ستاروں کے علم سے خاص لگاؤ تھا ایک روز وہ اپنے کتب کانے کی چھت پر ستارہ زہرہ کا مشاہدہ کرنے گیا، مغرب کی اذان سن کر نیچے اُتر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر پھسل کر گر گیا اور اس صدمہ میں ہی وفات پا گیا۔

ایک اور عالم کا کہنا ہے کہ ''کتاب مُردوں کی زبان اور زندوں کی آواز ہے وہ شام کے وقت آپ سے ملنے والا ایسا دوست ہے جو اس وقت تک نہیں سوتا جب تک آپ خود نہ سو جائیں اور ہمیشہ وہی بات کرتا ہے جس سے آپ کو خوشی ہتی ہے۔ کبھی آپ کا راز فاش نہیں کرتا وہ انتہائی درجہ کا وفادار ہمسایہ ہے اور معقول دوست، فرمابردار ساتھی، منکسر المزاج استاد اور ایک ماہی و مفید غم غسار ہے''۔

اسحاق بن سلیمان کی عمر سو برس کی ہوئی انہوں نے شادی نہیں کی جب کسی نے ان سے اولاد کے بارے میں دریافت کیا تو کتابوں کے اس شیدائی نے جواب دیا کہ ''اپنی کتاب حمیات'' کے ہوتے ہوئے اولاد ہونے کا خیال بھی مجھ کو نہیں آیا۔ خان بہادر'' خدابخش مرحوم نے پٹنہ میں ''خدابخش اورینٹل لائبریری'' جیسے عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ کتابیں حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب

نے ہر طریقہ خواہ وہ اخلاقاً معیوب کیوں نہ تھا اپنے لئے روا رکھا، حالانکہ وہ ایک متقی اور راست باز انسان تھے۔ مولوی خدا بخش کا کہنا تھا کہ 'نادر و نایاب چیزوں کے جمع کر نے کا فن ہر پابندی سے مستثنیٰ اور فوج داری قانون سے بالا ہے۔ کتاب کے بارے میں آپ نے کہا کہ اندھے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کی بصارت زائل ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو آنکھیں رکھنے کے باوجود اپنی کوئی بیش قیمت کتاب کسی دوست یا واقف کار کو مطالعے کے لیے مستعار دے دیتے ہیں اور تیسرے اندھے وہ لوگ ہیں جو ایک بار ایسی کتابوں پر قبضہ پالینے کے بعد انھیں واپس بھی کر دیتے ہیں۔

مولانا حسرت موحانی پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلا اور دو سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی، حسرت جیسے درویش کے پاس اتنی رقم کہا تھی چنانچہ ان کی بیش بہا اور نادر و نایاب کتب کو جنھیں انھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا تھا صرف ساٹھ روپے میں حکومت کی جانب سے نیلام کر دیا گیا۔ حسرت نے لکھا کہ اس جرم کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان دردناک'' ہے۔ جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دِقتوں سے بہم پہنچایا تھا، ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں اس طرح بھر کر لے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بُھس لے جاتے ہیں''۔ سر سید احمد خان مطالعہ کے بے حد شوقین تھے آپ نے لکھا کہ 'حیات جاوید' جس

کی ضخامت ایک ہزار صفحات تھی میں نے دو شب میں ختم کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول پر کم از کم ایک وقت کا کھانا کھانا ضرور فراموش کر دیتا تھا اس دن بھی میں شام کا کھانا نہیں کھایا، اس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا''۔

ممتاز مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کو کتب بینی کا شوق ہمیشہ رہا یہ بھی ہوتا تھا کہ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں اور کتاب بائیں ہاتھ میں ہے۔ استاد داغ دہلوی ہر نئی شائع ہونے والی کتاب فوراً خرید لیا کرتے اور اسی وقت اس کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے اور اسے مکمل پڑھ کر چھوڑتے، انھوں نے اپنے دولت کدے کا ایک بڑا کمرا کتب خانے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ شہید حکیم محمد سعید نے ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تو ان کے ہمراہ کئی سو کتابیں بھی تھیں جو ان کی ذاتی لائبریری تھی، کتاب سے محبت اور عقیدت کے باعث اس میں اضافہ ہوتا رہا جس کے نتیجے میں یہ ذاتی ذخیرہ کتب پہلے ہمدرد لائبریری ہوا اور پھر اسی نے بیت الحکمہ کی صورت اختیار کی جس میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ نامور قانون داں خالد اسحاق مرحوم کتابوں کی خریداری پر ۳.۵ ملین روپے سالانہ خرچ کیا کرتے تھے ان کے کتب خانہ لاکھوں کتابوں سے آراستہ تھا۔ مشفق خواجہ بلند پایہ محقق نکتہ رس نقاد اور منفرد مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب کے سچے عاشق تھے ان کا ذاتی

کتب خانہ انفرادی ملکیت کے عظیم الشان کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ کتابوں کا یہ عاشق جس مکان میں رہائش پذیر تھا، اس کی نچلی اور پہلی منزل پر کل ملا کر دس کمرے تھے اور ایک کمرہ دوسری منزل پر بنا ہوا تھا۔ اس مکان میں صرف ایک کمرہ رہائش کے لیے تھا، باقی سب میں کتابیں تھیں۔ سقراط کا کہنا تھا کہ '' جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ گھر حقیقتاً گھر کہلانے کا مستحق نہیں ہے وہ تو زندہ مردوں کا قبرستان ہے''۔ فلسفی ایمرسن کا کہنا ہے کہ ''اچھی کتاب بے مثال دوست ہے جو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنے کی صلاح دیتا ہے'' کارلائل کے خیال میں ''اچھی کتابوں کا مجموعہ دور جدید کی سچی یونیورسٹی ہے'' ۔ ملٹن کا کہنا تھا کہ ''ایک اچھی کتاب عظیم روح کے قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے۔ اس کو محفوظ کرنے کا مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو اس عظیم روح سیر وشناس کرانا ہے'' ۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالعہ کا رجحان روز بروز کم ہوتا جارہا ہے، ہماری ترجیحات سے کتاب خارج ہو گئی ہے، علم پسندی کی روایت معدوم ہوتی جارہی ہیں، بقول فاطمہ ثریا بجیا کتابیں چھپ رہی ہیں ، قاری کہیں گم ہوگیا ہے'، پروفیسر سحر انصاری کے خیال میں ' نئی نسل کتابوں کے مطالعے سے گریزاں ہے''۔ وجوہات کیا ہے ہم کتاب سے کیوں'' دور ہوتے جارہے ہیں۔ مختلف ماہرین مختلف وجوہات اور تاویلیں دیتے ہیں ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ

الیکٹرونک میڈیا کی برق رفتاری اور انٹرنیٹ کی سہولت نے نئی نسل کو کتاب سے دور کردیا ہے'۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی مرحوم نے اس کا ذمہ دار نظام تعلیم کو ٹھہرایا تھا، مسعود احمد برکاتی والدین کو ذمہ دار تصور کرتے ہیں، ڈاکٹر وقار احمد رضوی کتاب سے لاتعلقی کی وجہ ادب اور فلسفے سے عدم دلچسپی کو تصور کرتے ہیں، ڈاکٹر فاطمہ حسن کا خیال ہے کہ کتاب عام قاری کی پہنچ سے دور ہوگئی ہے، لوگوں میں قوت خرید نہیں رہی۔

پروفیسر منظر ایوبی ادب سے لاعلمی کو کتاب سے دوری کا سبب گردانتے ہیں۔ وجوہات جو بھی ہوں یہ ایک اہم اور قومی نوعیت کا مسئلہ ہے اس پر قومی سطح پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہماری حکومتیں اس اہم اور قومی مسئلہ کو کبھی خاطر میں نہیں لائیں۔ ملک کے دانشور اور صاحبِ علم طبقے کو اس اہم قومی مسئلہ پر توجہ دینا ہوگی۔

(شائع شدہ روزنامہ جنگ ۲۸ اپریل ۲۰۱۳ء)

!ادب، روبہ زوال نہیں ہوسکتا

اہل قلم متحرک ہیں اور ادب تشکیل پا رہا ہے

ادب دوامی ہے ۔ اسے زندگی کے کسی موڑ پر زوال ہوا، نہ اِس وقت ہے اور نہ ہی کبھی روبہ زوال ہوگا۔ یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ہم کتاب سے دور ہوگئے ہیں، ہم نے مطالعہ کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیاہے، ہمارے ملک میں کتب خانے اول تو ہیں ہی نہیں اگر موجود بھی ہیں تو ان کی حالت ابتر ہے، کتابیں مہنگی اور قوت خرید سے باہر ہوگئیں ہیں، کتابیں چھپنا شاید بند ہوگئیں ہیں، لکھنے والوں نے خدانا خواستہ قلم کی بساط لپیٹ دیے، المختصر یہ کہ ادب زوال پزیر ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو کہی جاتی ہیں۔ کچھ باشعور طبقہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ احباب جس چیز کو قصور وار گردانتے نظر آتے ہیں وہ ہے.برقی میڈیا پر.برق رفتاری سے معلومات کا تبادلہ اور انٹر نیٹ جس نے ہمیں کتاب سے دور اور مطالعہ سے دور کردیا ہے۔ گویا کتاب اور پڑھنا ہماری ترجیحات کی فہرست سے خارج ہوگیا ہے۔

بات .برقی میڈیا، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل کی نہیں ۔ اگر ہم اپنی

زندگی کی دیگر جہتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ انحطاط کا شکار ہے، ہر شعبے میں ابتری کا غلبہ نمایاں ہے۔ کھانے پینے میں، رہن سہن، لباس، عزیز رشتہ داروں، دوست احباب، پڑوسیوں سے راہ و رسم میں ہے کوئی ایک بھی ایسا کوئی شعبہ جہاں ہم یہ کہیں کہ اس میں بہتری آئی ہے، جو کچھ پہلے نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے برابر والے فلیٹ میں کون رہتا ہے، محلے پڑوس میں کسی کا انتقال ہو جائے تو ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی اور ہم خبر حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ قریبی رشتہ داروں سے خوشی یا غمی کے موقع پر ملاقات کو کافی سمجھتے ہیں۔ بڑوں نے چھوٹوں کا خیال ترک کر دیا اور چھوٹے تو ماشاء اللہ ارسطو اور افلاطون ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی خواہش اور مقصد کی تکمیل فوری، بغیر کسی تبدیلی کے ہر قیمت پر حاصل کرنے پر گامزن رہتے ہیں۔ شدت پسندی ہمارے مزاج کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ اچھائی نظر بھی آئے تو اسے معمولی حیثیت دیتے ہیں، برائی کی جھلک بھی نظر آ جائے تو اسے نمک مرچ اور مصالحے کے ساتھ خوب خوب چرچا کرتے ہیں۔ اپنے برقی میڈیا کو ہی لے لیں۔ کیا دن بھر میں اچھے کام نہیں ہوتے یقیناً بے شمار خیر کی باتیں ہوتی ہیں، میڈیا پر ان کے بارے میں کیا رجحان پایا جاتا ہے، اول تو خیر کی باتوں کا ذکر ہی نہیں ہوتا اگر ہو بھی جائے تو بدمزہ ہو کر، ہلکے پھلکے معمولی الفاظ کے ساتھ۔ اس کے مقابلے میں کہیں کوئی شر والی بات میڈیا کو سنائی دے جائے خواہ چلتی گاڑی کا ٹائر پھٹنے سے زور دار آواز ہی

کیوں نہ آجائے، گھروں میں یا دوستوں میں باہمی رنجش پر تلخ کلامی ہی کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے جلی حروف میں لکھا آئے گا 'بریکنگ نیوز'، پھر نیوز پرسن یا اینکر پرسن حلق پھاڑ پھاڑ کر مسلسل اس خبر کو دھراتے رہتے ہیں جب تک کہ ٹی وی دیکھنے والا ریموٹ سے اس چینل کو بدل نہ دے۔ ریٹنگ کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ذرا غور کریں کے ہمارا برقی میڈیا ادب، کتاب، مطالعہ بینی یا کتب خانوں کے حوالے سے کتنے پروگرام نشر کرتا ہے۔ کتنے ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے پروگراموں میں مدعوں کیا جاتا ہے۔ گویا کوئی ادیب، شاعر، دانشور کسی موضوع پر گفتگو کے قابل نہیں۔ ٹاک شو میں شرکت کا پیمانہ کسی بھی سیاسی جماعت خواہ وہ تانگا پارٹی ہی کیوں نہ ہو سے وابستگی یا پھر کسی بھی چینل کا اینکر پرسن ہونا ہے۔ آج کا دانشور یہی طبقہ ہے۔ ہمیں ان رویوں پر غور کرنا ہوگا۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کے اثرات ادب کی تخلیق پر بھی پڑ رہے ہیں۔ اہل قلم جن کو اپنے قلم کی روشنائی کاغذ پر منعکس کرنا ہے ان کے لکھنے کا پہیا تو اسی طرح رواں دواں ہے۔ کتاب اسی طرح لکھی جارہی ہے، پڑھی جارہی ہے اور فروخت ہورہی ہے۔ آج بھی 'بیسٹ سیلر' سامنے آرہی ہیں۔ دسمبر ۲۰۱۲ء میں ایکسپو کراچی میں لگنے والے کتابوں کی نمائش میں کتابوں کی فروخت ریکارڈ سطح پر جا پہنچی۔ نمائش میں شامل کتابوں کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ کراچی کے حالات کا اندازہ کیجئے، اس کے باوجود شائقین کتاب جوق در جوق کتابوں کے لیے ایکسپو جاتے رہے۔ یہ کتاب

سے محبت، مطالعہ کا شوق اور ادب نوازی نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

اس حوالے سے ایک اور مثال دینا چاہوں گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے کتب خانے بہت برے حال میں ہیں ان میں کتابیں نہیں، ماحول اچھا نہیں، مناسب خدمات کا فقدان ہے وغیرہ وغیرہ اس کے باوجود جن کتب خانوں میں پڑھنے والوں کو سہولت کی ایک کرن بھی نظر آجائے تو وہ پروانوں کی طرح وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ان سہولتوں سے مستفیض ہوتے ہیں۔ میں ایک نہیں متعدد کتب خانوں کے نام گنوا سکتا ہوں جہاں طالبان علم کا جم غفیر ہوتا ہے۔ شہر کراچی میں کتنے ہی کتب خانے ایسے ہیں جو صبح نو بجے سے رات دس بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی آسمانی مخلوق مطالعہ کرتی نظر نہیں آتی، ہمارے طالب علم ہی ہوتے ہیں۔

بات سہولیات اور مواقعے کی فراہمی کی ہے۔ پیاسوں کے لیے پیاس کا اہتمام تو کریں پھر دیکھیں کہ پیاسے کس طرح کھیچے چلے آتے ہیں۔ادب سے وابستگی کی ایک اور مثال دسمبر ۲۰۱۲ء میں آرٹس کونسل میں پانچویں بین الاقوامی ادبی نمائش تھی جہاں ادب کے شائقین کا ذوق و شوق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ راقم کو اپنی آنکھوں سے ادب کے پروانوں کا یہ عظیم الشان منظر دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔الحمرا لاہور میں ہونے والی ادبی کانفرنس ادبی کانفرنس بھی قابل دید تھی۔ یہ ادب سے محبت اور ادب نوازی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم

آرٹس کونسل کے انتخابات میں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ادب سے سچی محبت اور لگن کا جمہوری انداز ہے۔ میں نے پاکستان کی قومی کتابیات کے گزشتہ چالیس سالوں کے شمارے دیکھے اس مقصد سے کہ ادب پر کتابوں کی اشاعت کی رفتار کا اندازہ کیا جاسکے۔ اعداد و شمار کے مطابق اسلام کے بعد ادب ایسا موضوع ہے جس پر پاکستان میں سب سے زیادہ کتب شائع ہوئیں۔ ابھی تو ہمارے ملک میں ملک می قومی لائبریری کو کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت کتابیں بھیجنے اور بین الاقوامی عالمی کتاب نمبر حاصل کرنے کا رواج عام نہیں اس کے باوجود ادب کی مختلف اصناف پر کتب کی اشاعت قابل ذکر ہے۔

میں اس بات سے متفق نہیں کہ ادب زوال پذیر ہے۔ ادب تو ہمیشہ رہنے والی شہ ہے۔ گزشتہ چونسٹھ سالوں میں کبھی بھی زوال پذیر نہیں رہا۔ البتہ حالات اور واقعات اس پر اثر انداز ہوتے رہے اسی مناسبت سے اس کی رفتار بھی کبھی سست اور کبھی تیز رہی۔ بعض احباب کا کہنا ہے کہ ادب جتنا یورپ میں ترقی کی راہ پر منزل پر گامزن ہے ہمارے ملک میں کچھ بھی نہیں۔ یورپ کا مقابلہ ہم اپنے ملک سے کیسے کر سکتے ہیں جہاں لٹریسی ریٹ چند فی صد ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی گاؤں دیہاتوں میں رہتی ہے۔ خواتین کل آبادی کا پچاس فیصد سے زیادہ ہیں جن کی اکثریت امور خانہ داری تک محدود ہے۔ ہمار اور یورپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ہمارے جو وسائل ہیں، ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد اور صلاحیت کے

مطابق جو ادب تخلیق پا رہا ہے وہ قابل تعریف تو نہیں لیکن امید امید افزا ضرور ہے۔ایک اور بات جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے وہ ہماری ترجیحات اور ہمارا نقطہ نظر ہے۔ جس میں تبدیلی آچکی ہے۔ ہم ہزاروں کی شاپنگ کرتے وقت مہنگائی کو بھول جاتے ہیں، ہوٹل میں مرغن کھانے کھاتے وقت ہزاروں کا بل خوشی خوشی ادا کردیتے ہیں لیکن جب کتاب خریدنے کی بات آتی ہے تو مہنگائی بھوت کی مانند ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں اس جانب سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ اپنی ترجیحات پر اور نقطہ نظر پر ایک بار پھر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ کتاب سے، علم سے اور ادب سے اپنا رشتہ جوڑنا ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ریاستی سطح پر ادب اور ادیب کی صحیح معنوں میں حوصلہ افزائی کی جائے۔ ادب کے فروغ اور ادبی کتب کی اشاعت کے زیادہ سے زیادہ ادارے قائم ہوں۔ اہل قلم کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ معاشی و سماجی نہ ہمواری سے آزاد ہو کر ادب کی تخلیق میں مصروف بہ عمل رہیں۔

لکھنے والے کی تخلیق کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ ادبی رسائل اور اب اخبارات ہیں۔ ہمارے ہاں ادبی رسائل کا فقدان ہے۔ ادبی جریدہ شائع کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس وقت جو ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں وہ ادیبوں کی ذاتی تگ ودو، ادب سے دلی وابستگی، سچی لگن اور عظیم مقصد ہے جو انہیں ادب کے ان چراغوں کو روشن رکھنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ ہر لحہ انہیں یہی فکر

دامن گیر رہتی ہے کہ ادب کی یہ شمع کہیں بجھ نہ جائے۔ بعض اداروں اور انجمنیں بھی ادبی رسائل شائع کرہی ہیں۔ اگر ادب زوال پذیر ہوتا تو ادبی رسائل کی مانگ اور اہمیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ جو ادبی رسائل ادب کی ترویج کا پختہ مقصد لے کر شروع ہوئے انہیں زوال نہیں آیا، مسائل ضرور حائل ہوئے، مالی پریشانیوں نے ضرور گھیرا لیکن اس وجہ سے کوئی ادبی رسالہ بند نہیں ہوا کہ اس کے پاس چھاپنے کو مواد نہیں ہوا، ادب تخلیق پاتا ہے، طبع ہوتا ہے تو پڑھا بھی جاتا ہے۔ صہبا لکھنوی مرحوم انتہائی دبلے پتلے انسان تھے لیکن 'افکار' کے معاملے میں ان کا حوصلہ چٹان کی مانند تھا۔ جب تک جئے افکار کو گرنے نہیں دیا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ضعیف العمری اور خراب صحت کے باوجود یہ فکر دامن رہتی ہے کہ 'نگار' وقت پر شائع ہوجائے، شاہد علی خان صاحب 'الحمرا' کی اشاعت میں تساہلی نہیں دکھاتے، 'سیپ'،

فنون'، 'تر نگار'، 'نقوش'، اور دیگر ادبی رسائل اپنی اشاعت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔' ایسی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

ادبی جریدہ جتنا پرانہ ہوتا ہے اتنا ہی قیمتی بھی۔ فٹ پات پر پرانی کتابوں کے انبار لگے ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں ادبی رسائل کم کم نظر آتے ہیں، شاید آٹے میں نمک کے برابر، کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب سے، ادبی پرچوں سے آج بھی محبت، عقیدت اور انسیت موجود ہے۔ اب اخبارات میں بھی ادب کو خاص

مقام حاصل ہوگیا ہے۔ جنگ اخبار کی مثال موجود ہے۔ ہر ہفتہ سنڈے میگزین، ہر بدھ میڈ ویک ، ان میں چھپنے والی نگارشات ہمارے سامنے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک لمبی فہرست ایسے لکھنے والوں کی بھی چھپتی ہے کہ جن کی نگارشات کو قابل اشاعت نہیں سمجھا جاتا۔ معیاری اور غیر معیاری ہونے کا معاملہ الگ ہے۔ یورپ میں بھی ہر تحریر معیاری نہیں ہوتی۔ کسی نے درست کہا کہ بڑے ادبی جرائد کے قارئین پہلے سیکڑوں میں تھے، اب یہ تعداد ہزاروں میں اور لاکھوں تک جا پہنچی ہے، ادب پڑھنے والوں کا دائرہ سمٹا نہیں ، پھیلا ہے۔ اس لیے کہ ادب کو دوام حاصل ہے ، یہ زوال پذیر نہیں ہوسکتا۔ (روزنامہ جنگ : ۳۰ جنوری ۲۰۱۳ء (مڈ ویک میگزین (قلم و قرطاس : ۳۰ جنوری تا ۵ فروری ۲۰۱۳ء))

بیٹی : رحمت بھی، نعمت بھی۔ اپنے باپ کی طرف در۔۔ اگر بچھڑ جائے تو

بیٹی رحمت ہے ، بیٹی نعمت ہے۔ ماں باپ کے لیے بیٹی کا رشتہ کس قدر پیارا ہوتا ہے اس کا احساس والدین ہی کر سکتے ہیں۔ یہ احساس اس وقت زیادہ شدید ہو جاتا ہے اگر بیٹی دنیا میں آنے کے بعد جدا ہو جائے۔ بیٹیوں کو تو ویسے بھی پرائے گھر جانا ہی ہوتا ہے لیکن وہ جانا اس جانے سے بہت مختلف ہے جس میں بیٹی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتی ہے۔ میری بھی ایک بیٹی دنیا میں ٦ جون ١٩٨٠ء کو آئی تھی اور چند دن محبت سمیٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ امیرِ خسرو کے مطابق ’ بیٹی اصل میں باپ کی طرف دار ہوتی ہے بیٹا ماں کا، بیٹا دنیاوی چپقلش میں پڑ کر بھول بھال جاتا ہے، بیٹیاں باپ کا ورثہ سینت کر ، بنا سنوار کر دنیا کے آگے سنوارتی ہیں‘‘۔ اس اعتبار سے میں بھی اپنی ایک طرف دار سے محروم ہو گیا۔ اس رشتہ میں جو سچائی ہے، اپنائیت ہے، پیار ہے اُسے شاید الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اپنی بیٹی ’ سحر ‘ کی جدائی کے کرب کو قلم بند کرنے کی سعی کی ہے۔

بات ہے ٦ جون ١٩٨٠ء کی ہمارے آنگن میں ایک زندگی نے آنکھ کھولی ، ستارے مسکرا اُٹھے ۔ سَحر (میری بیٹی) نمودار ہوئی تو زندگی کی حرارت بخش نرم نرم

کرنیں بکھرنے لگیں، ہر سُو سونا پھیلانے لگیں۔
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا غنچوں نے مسکرا کر اس نو دمیدہ کلی کو دیکھا، پھول فرطِ انبساط سے ہنس پڑے، باغباں نے احساسِ طمانیت سے آنکھیں بند کرلیں، دل خدا کے حضور احساسِ تشکر سے جُھک گیا۔ کلی پھلنے، پھولنے لگی، مگر فلکِ کج رفتار کو گلستاں کا رنگ و بو ایک آنکھ نہ بھایا، آتشِ حسد سے جل اُٹھا، تیور بدلنے لگے۔ چرخ کہن کی جبیں شکن آلود ہو گئی۔ ہواؤں نے اس کی حاسد تمازت جذب کرلی اور اپنی نرم لطافت آسودگی کھو بیٹھیں، رات کے بگولے اُڑنے لگے، ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔
پھول خوف سے زرد ہوگیا۔ ٹہنیاں جُھک جُھک گئیں، غنچے سہم کر پھول کی اوٹ میں چھپ گئے اور باغباں حیران و پریشان ہواؤں کا رنگ دیکھ رہا تھا کہ معصوم سی، کومل سی، کہکشاں کی طرح جگمگاتی مسکراتی 'سحر' ہواؤں کی تپش سے جُھلسنے لگی، تپنے لگی، اس کا کیُوا ں چمکتا دمکتا رنگ تمازتِ آفتاب سے سُرخ ہونے لگا، ننھے ننھے لب کانپنے لگے، خوبصورت آنکھیں جھپکنے لگیں، ننھا سا سہا سہا وجود فضاؤں کی بے رُخی کی تاب نہ لا کر دھیرے دھیرے لرزنے لگا، مگر اب خاموش تھے صرف آنکھیں بولتی تھیں۔ وہ جو پھول کی نرم نرم آغوشِ محبت کی لطیف سی حرارت کی عادی تھی بے رحم ہواؤں کی تپش سے مُرجھانے لگی، شاخ پر ڈولنے لگی۔ ساتھی پھولوں نے سہارا دیا مگر وہ ننھی

سے کومل جان جو ابھی پوری طرح طلوع بھی نہیں ہوئی تھی کہ بے مہریٔ زمانہ کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنی کرنوں کو سمیٹنے لگی، شمع کی مانند بھڑکنے لگی، وہ جو چشم براہ تھی، نہ جانے اسے کسی مہرباں کا انتظار تھا۔ نہ جانے کس مسیحاٗ نفس کی تلاش تھی کہ آنکھیں جانبِ در اور گوش برآواز تھے۔

یکایک وہ باغباں جس نے خونِ دل سے کلیوں کی آبیاری کی تھی، غنچوں کو گدگدایا تھا، ہنسایا تھا، شگفتہ پھولوں کو مہک عطا کی تھی آ پہنچا۔ مگر دیر ہو چکی تھی وقت کا صیاد اپنا تیر چلا چکا تھا۔ باغباں کا مہرباں ہاتھ حفاظت 'سحر' کو اُٹھا تو وہیں جم کر رہ گیا، وہ آنکھیں جو محوِ انتظار تھیں ہاتھ کے لمس کو پہچان کر مطمئن سی ہوئیں اور پھر انجان بن گئیں۔

کلی نے چپکے سے آنکھ موند لی۔

باغباں تھرا گیا، پھول کا چہرہ فرطِ غم سے سفید پڑ گیا، غنچے بلک بلک کر رو دیئے۔ مگر کلی تو ایسی روٹھی پھر منائی نہ جا سکی۔ آفتاب کی کرنیں دھندلانے لگیں، دونوں وقت ملنے لگے تو وہ نازک سے کلی، وہ نودمیدہ 'سحر' پیوند خاک ہو گئی۔ وہ 'سحر' جو آنکھ کا نور، دل کا سرور تھی، باغباں تہی دست رہ گیا اور گل رنگ تتلی کو فضا میں تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ آفاق کی لامتناہی تنہائیوں میں کھو گئی، وہ چلی گئی ایک ایسی جگہ جہاں دنیا کا

رکھوالا اس کی نگہداشت کو موجود ہے۔ وہ سحرَ تھی میری بیٹی ۔ کہ پوری آب وتاب سے طلوع ہوئی اور پھر یکدم غروب ہو گئی کبھی طلوع نہ ہونے کے لیے۔ لیکن میرے دل میں تو وہ ہمیشہ جگمگاتی رہے گی ، مجھے حوصلہ دیتی رہے گی کہ باغباں اپنے فرض سے غافل نہ ہو اور بھی غنچے ہیں جنہیں تجھے پروان چڑھانا ہے اور انہیں تن آور سایہ دار بنا نا ہے تاکہ وہ بھی باغباں بن جائیں گل چیں نہ بنیں کہ یہی رسمِ گلستاں ہے ، رسمِ دنیا ہے اور مرضی مولا بھی یہی ہے ۔

طلوعِ سحر ہوئی بھی نہ دیکھنے پائے
غروب سحر کا منظر نہ بھولنے پائے
مآلِ دردِ محبت جو ہم نے دیکھا ہے
الٰہی میرا عُدو بھی نہ دیکھنے پائے
ہوا ہے کیسا اندھیرا مرے گلستان میں
کلی جو چٹکی تو غنچہ نہ دیکھنے پائے
کسے مناؤں کوئی اب کہاں ملے گا مجھے
وہ چار دن بھی جھولا نہ جھولنے پائے
جو میں نہ تھا تو میرا انتظار تھا اس کو
جو مجھ کو دیکھا تو دنیا نہ دیکھنے پائے
وقت سحر درِ جنت سے یہ ندا آئی

اُٹھو اُٹھو چڑیوں سحر آئی

درباں نے جو آواز سنی ایک ہل چل سی مچی

فلک گونج اٹھا بہار آئی بہار آئی

غنچے مسکرائے ، پھول مہکے، کلیاں چٹکنے لگیں

باغباں کہہ اٹھا ایک پھول آئی ایک پھول آئی

فرطِ مسرت سے یوں ہوا جنت میں استقبالِ سحر

بیبیاں گویا ہوئیں کیا خوب آئی کیا خوب آئی

فرشتے لیے ڈولی حاضر ہوئے باادب واحترام

کلی چٹک کے بولی خاتونِ جنت سحر آئی سحر آئی

سحَر میری بیٹی تھی جو اس دنیا میں ٦ جون ١٩٨٠ء کو آئی تھی اور صرف ٣٩ دن بعد ١٤)

(جولائی ١٩٨٠ء کو اللہ کو پیاری ہوئی

خورشید اختر انصاری شہید

۵ نومبر ۲۰۰۹ء جمعرات کا دن تھا، دن کی مصروفیات کے بعد رات ۹ بجے میں نے کمپیوٹر کھولا ہی تھا کہ موبائل پر ایک پیغام موصول ہوا، لکھا تھا کہ ٹی وی پر پٹی چل رہی ہے کہ کوئٹہ میں لائبریری و انفارمیشن سائنس شعبہ کے استاد پروفیسر خورشید اختر انصاری کو نا معلوم افراد نے شہید کر دیا، پیغام بھیجنے والے تھے نوشاد غضنفر جو جامعہ ذکریا کے کتب خانے میں کام کرتے ہیں اور میرے عزیز بھی ہوتے ہیں۔ یقین نہیں آیا، پیغام کو دوبارہ پڑھا، کسی بھی قسم کا ابہام نہیں تھا۔ پھر بھی ایک اِضطِراب کی کیفیت قائم رہی، اولین فرصت میں اپنے دوست ڈاکٹر خالد محمود کو لاہور فون کیا۔ انہیں یہ خبر معلوم ہو چکی تھی لیکن وہ بھی خبر کی تصدیق کے اقدامات کر رہے تھے۔ گویا ہوئے کہ ہاں مجھ تک بھی یہ خبر پہنچی ہے میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اس کی تصدیق ہو، اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے کوشش کی کہ کوئٹہ میں دوستوں سے رابطہ کیا جائے، شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، بلوچستان یونیورسٹی کے صدر شعبہ جناب رحمت اللہ بلوچ کو فون ملایا ، ان کا نمبر بند مل رہا تھا، دوسرے دوست محمد الیاس سے بمشکل تمام رابطہ ہوا، انہوں نے بتایا کہ خبر بالکل درست ہے میں اور دیگر دوست اس وقت ان کے گھر پر ہی ہیں، مرحوم عشاء کی نماز کے لیے اپنے گھر سے

مسجد کے لیے نکلے ہی تھے ،نا معلوم دہشت گردوں نے ان پر گولیا برسائیں اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

مرحوم سے دیرینہ تعلق کی فلم میرے ذہن میں چلنے لگی۔ کس قدر نفیس، خاموش طبع، ملن سار انسان تھا۔ میری ان سے آخری ملاقات کراچی میں ہائر ایجو کیشن کمیشن کی قائم کردہ قومی نصابی کمیٹی National Curriculum Revision Committee in LIS بمقام HEC ریجنل سینٹر، لیاقت HEC کی میٹنگ منعقدہ ۱۶۔۱۸ اپریل ۲۰۰۹ء بمقام in LIS میموریل لائبریری بلڈنگ میں ہوئی تھی۔خورشید انصاری اس کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے کوئٹہ سے آئے تھے دیگر اراکین میں پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان، پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر ڈاکٹر کنول امین، ڈاکٹر روبینہ بھٹی، ڈاکٹر نثار احمد صبح پوتو، ڈاکٹر محمد رمضان، پروفیسر ملاحت کلیم شیروانی، شیریں گل سومرو، عذرا قریشی، محمد شعیب خان، حامد رحمان، منظور احمد خان انجم، چودھری یعقوب علی اور گلناز اختر کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ پروفیسر خورشید اختر انصاری سے یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔

خورشید اختر انصاری سے اپنے تعلقات کو شمار کرتے کرتے رات ہوگئی، اس دوران ڈاکٹر خالد محمود کا فون بھی آیا اور مرحوم سے اپنے ملاقاتوں کا مختصر ذکر

ہوا، اب خیال ہوا کہ اس افسوس ناک خبر سے دیگر احباب کو بھی آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ
پر موجود پایا PakLAG میل بکس کھولا تو لاہور سے پروفیسر ڈاکٹر کنول امین کا پیغام
"It is very جو انہوں نے رات ۱۱ بجے جاری کیا تھا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں لکھا
sad to read the news of

target killing of such a humble yet promising person like Khurshid Sahib. I met him few months back in Karachi in HEC meeting. It was my first meeting with him. He was very decent, composed and cordial. Really it was pleasure meeting him. It is really disappointing that humans are becoming much worse than animals. I deeply mourn his leaving us in such a way. The Dept. shares the grief of colleagues at University of Baluchistan. Its a common loss.May God rest the departed soul in

peace and grant the strenght to family, friends and colleagues".

پروفیسر ڈاکٹر کنول امین نے سچ کہا کہ انسان جانوروں سے بھی بدتر ہوتے جارہے ہیں،
پر جاری کیا یہ تھا PAKLG کوئی بیس منٹ بعد پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود نے اپنا تعزیتی پیغام
:

I am shocked to know the news about the murder of my friend Khurshid Akhtar Ansari, Assistant Professor of LIS at University of Balochistan,

Quetta. According to the initial reports he was shot dead near his house when he was going to the mosque for Isha prayer. All friends are requested to pray for this nice fellow and his family.

ان پیغامات کے بعد میں نے بھی افسوس اور دکھ کے اس اظہاریے کو جاری رکھتے ہوئے اپنا تعزیتی پیغام جاری کیا، پھر احباب کے تعزیتی پیغامات کا سلسلہ جاری ہوگیا اور کیوں نہ ہوتا یہ غم اور دکھ تھا بھی اسی قدر شدید اور افسوس ناک۔

پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب پر جاری ہوا خورشید انصاری کو PakLAG نے امریکہ سے اپنے پیغام میں جو ٦ نومبر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا "It is really a very shocking and painful to know that Prof. Khurshid Akhtar Ansari was attacked and killed by some miscreants. Inn Lilillah wa Inna Elehey Rajeon. May Allah (Swt) rest his soul in peace and reward him a high palace Jannatul Firdous. Ameen. It is strange how innocent people are being killed in our country. May Allah (Swt)

restore peace and tranquility in our country.

خورشید اختر انصاری پنجاب کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، بجا طور پر self made انسان تھے، محنت و مشقت کرکے انہوں نے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ ایک ۱۹۷۵میں جامعہ پنجاب کے کتب خانے سے ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۸۴ء تک اسسٹنٹ لائبریرین اور لائبریرین کے فرائض انجام دیے ، ۱۳اپریل ۱۹۸۵ء میں ان کا تقرر لیکچرر کی حیثیت سے شعبہ لائبریری سائنس ، بلوچستان یونیورسٹی میں ہوااور اپنی شہادت تک وہ شعبہ کے ایک استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ یکم مئی ۲۰۰۰ء سے ۲ فروری ۲۰۰۴ء کے درمیان وہ صدر شعبہ بھی رہے اور شعبہ کی ترقی کے لئے کوئی کسّر نہ اٹھا رکھی۔

جامعہ پنجاب سے ۱۹۸۲میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا، بلوچستان یونیورسٹی سے منسلک ہونے کے اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۹۷ء میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی ۔ایم فل کرنے کے بعد خورشید انصاری اس تگ ودو میں تھے کہ کسی طرح پی ایچ ڈی کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ چنانچہ اپنے شعبہ میں پی ایچ ڈی شروع کرانے میں کامیاب ہوئے۔ مجھے ۲۰۰۵ء میں ''بورڈ آف اسٹڈیز، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، جامعہ بلوچستان کا ممبر ''ایکسپرٹ'' منتخب کیا گیا۔ اس وقت جناب رحمت اللہ ، بلوچ شعبہ کے سربراہ تھے

اور خورشید انصاری بورڈ میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔بورڈ کی جس میٹنگ میں خورشید انصاری اور محمد الیاس کے پی ایچ ڈی کے (Synopces) کی منظوری دی گئی اس میٹنگ میں راقم کے علاوہ ڈاکٹر فاضل خان صاحب، ڈاکٹر خالد محمود، لیاقت علی اور رحمت اللہ بلوچ شامل تھے۔ خورشید انصاری بہت خوش تھے کہ انہوں نے جو منصوبہ بندی کی تھی وہ اس میں کامیاب ہوئے اب مرحلہ کام کا تھا، ابتدا میں خورشید انصاری کی تھیسس سپروائزر ڈاکٹر سکینہ ملک مقرر ہوئیں جب کہ ڈاکٹرافتخار خواجہ، محمد الیاس کے پی ایچ ڈی سپر وائیزر مقرر ہوئے، ڈاکٹر سکینہ ملک امریکہ چلی گئیں تو خورشید انصاری نے ڈاکٹرافتخار خواجہ کو ہی اپنا گائیڈ بنا لیا، کیوں کہ وہ کوئٹہ میں ہی موجود تھے۔ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا "Standards for Public Libraries in Pakistan" ۔ان کی شہادت کے بعد معلوم ہوئی۔اس بات کی کوشش کی گئی کہ مرحوم کو ڈگری دیدی جائے، لیکن تاحال اس سلسلے میں جامعہ کی جانب سے کوئی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

تحقیق کے حوالہ سے میں نے ۲۰۰۴ء میں خورشید انصاری سے ایک انٹرویو کیا جو میرے پی ایچ ڈی مقالہ میں شامل ہے۔ موضوع کی مناسبت سے ان سے بعض سوالات کیے جن کے جوابات انہوں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر دیے، بعض باتیں ان کے حوالہ سے بھی تھیں،انٹرویو کی تفصیل درج ذیل

:ہے

آپ نے لائبریرین شپ کا پیشہ کب اور کیسے اختیار کیا؟ : ۱

ج: لائبریرین شپ کا آغاز ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کی اعظم علی اورک زئی میموریل لائبریری میں بحثیت لائبریری اسسٹنٹ کیا۔۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی ایل ایس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں بتائیں۔ لائبریری سائنس کی تعلیم کب اور : ۲ کہاں سے حاصل کی؟

ج: ۱۹۷۹ میں اسی لائبریری میں بطور لائبریرین تعینات ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں تبادلہ ہوااور اسی سال ایم ایل ایس میں داخلہ لیااور ۱۹۸۳ء ایم ایل ایس میں کامیاب ہوا۔ اس میں میری تیسری پوزیشن بھی تھی۔۱۹۸۶ء میں بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس میں بطور لیکچرر میرا تقرر ہوگیااور میں پنجاب سے کوئٹہ منتقل ہوگیا۔ نیزاب میرے کام کی نوعیت بھی بدل چکی تھی ۔ میں لائبریرین کے بجائے لائبریری سائنس کا استاد تھا۔ ۱۹۹۰ء میں اسی شعبہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں ایم فل کیا۔ ۲۰۰۰ء میں شعبہ کے چیر مین کے اختیار

سنبھالے اور یہ ذمہ داریاں اب بھی میرے پاس ہیں

لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کاآغاز جامعہ کراچی سے : ۳

۱۹۶۷ء میں ہو چکا تھا۔ ۳۷ برس میں صرف تین لوگ یہ سند حاصل کرکے ، آپ کے خیال میں اس کی وجہ اپنے مضمون سے عدم دلچسپی رہی یا کوئی اور رکاوٹ ؟

ج : میرے خیال میں پاکستان میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند رکھنے والے حضرات کی تعداد میں کمی کی وجوھات کئی ہی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :

۱۔ پنجاب یونیورسٹی کے اسکالرشپ پر ڈاکٹریٹ کرنے والوں نے اپنی مادر علمی اور اس پیشہ کی ترقی کے بجائے بیرون ملک ملازمت اور ذاتی مفادکے
حصول میں مصروف رہے۔

۲۔ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام کا طریقہ کار انتہائی پیچیدہ ' سست اور حوصلہ شکن ہے۔

۳۔ بیرونی یونیورسٹیوں کے مطالعاتی پروگرام اوراعلی تعلیمی وظائف کے بارے میں وزارت تعلیم یا تو اس کی تشہیر نہیں کرتی یا قلیل معیادکے نوٹس پر معلومات فراہم کی جا تی ہے۔

۴۔ بعض یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے قوانین بہت سخت ہیں ۔ مثلاً بلوچستان یونیورسٹی میں ایم فل مکمل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت ہے۔ایم فل میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے سیمینار لیکچر کے لئے حاضرین میں ۳۰ اساتذہ کی حاضری کا کورم پورا ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ سیمینار منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حربے حوصلہ شکنی کے مترادف ہیں۔

آپ لائبریری سائنس کے استاد ہیں یہ فرمائیں کہ آپ پاکستان میں لائبریری سا : ۴
ئنس کی تعلیم کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

ج : بحیثیت لائبریری کے استاد کے مجھے تو اس کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ خاص طور پر نظرثانی شدہ نصاب پر مستقبل کے تقاضوں کے پیش نظر جو تبدیلیاں کی گئیں ہیں ان کی بدولت اس کی تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ خاص طور پر automation اور کمپیوٹرائزیشن کے حوالے سے جو انقلابی تبدیلیاں کی گئی ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نچلی سطح پر انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں یہ مضمون سندھ، پنجاب اور سرحد میں شروع ہو چکا ہے، البتہ بلوچستان میں تاحال اس پر عمل نہیں ہوا اسے یہاں پر بھی کالجوں میں شروع ہونا چاہیے۔ یہ واحد شعبہ ہے جس میں اعلیٰ تعلیم سے پہلے اور درمیان اور
نچلی سطح پر تعلیم بعد میں شروع ہوئی۔ اس مضمون کی ترقی و ترویج میں علاقائی اور مرکزی لائبریری ایسوسی ایشن اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

لائبریری کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم محمد سعید کے کردار کو کس نظر : ۵
سے دیکھتے ہیں؟

ج : حکیم صاحب پیشہ حکمت کے علاوہ علم و حکمت کا پیکر تھے۔ کتب علم کا ریکارڈ ہوتی ہیں، انہوں نے اپنی تمام زندگی علم و حکمت کی ترویج کے لیے وقف

کر دی تھی ، علم کے ان سچے موتیوں اور جوہرات کے خزانے جنہیں ہم ادنی قیمت پر بھی نہیں خرید سکتے، وہ ہمارے لیے بیت الحکمہ کی صورت میں چھوڑ گئے

۶ :بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لا ئبریری میں کمپیوٹر کے آ جانے کے بعد لا ئبریری کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے،اس سلسلے میں آ پ کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ محض ایک مفروضہ ہے، کمپیوٹر آ جانے سے لا ئبریری کے کاموں میں تیزی اور بہتری آ گئی ہے، لا ئبریری سائنس کی تعلیم میں کمپیوٹر کا استعمال عصری تقاضوں کے ہم آ ھنگ ہونے میں اور اس علم کو دوسرے علوم کے برابر لانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے، کمپیوٹر بذات خود ایک ذریعہ علم نہیں ہے بلکہ معلومات کی Processing اور Retrieval کا ایک ذریعہ ہے کمپیوٹر پر موجود معلومات کو آخر کار پرنٹ کی صورت میں کاغذ پر منتقل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو کتاب کی انفرادی شکل ہی ہے۔

۷ :آپ کی رائے میں اسپل کے منعقد کردہ سیمینار، ورکشاپ کے لا ئبریرین شپ پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج: SPIL اور کے منعقد کردہ سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسوں نے کتب خانوں کی ترقی اور لا ئبریری تحریک پر انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ ان منعقد کردہ اجلاسوں کی روددادیں لا ئبریرین شپ کے لٹریچر میں گراں قدر اضافہ ہے یہ لٹریچر کتب خانوں کی بہتری اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لئے رہنما کا کام دیتا ہے۔ پاکستان میں لا ئبریرین شپ کی تاریخ اس کے ارتقاء اور مستقبل کی

ضروریات کے لئے ایک اہم دستاویز ہے، نیز لائبریرین شپ میں بنیادی قانون سازی کے لیے بھی راہ متعین کرتا ہے۔

کیا "اسپل گولڈ میڈل" پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو : ۸ سکا؟

ج : ستائش اور حوصلہ افزائی کسی بھی طالب علم کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے، کراچی یونیورسٹی کے MLIS طلباء کے لیے گولڈ میڈل کا اجراء بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس ضمن میں دوسرے اداروں اور انفرادی اشخاص کو بھی حوصلہ افزائی کے کاموں میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور یہ اقدام یقیناً فروغ علم میں اور پیشے کی ترقی میں معاون ثابت ہوا ہے۔

اس موضوع کے بارے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟ : ۹

ج : آپ جس موضوع پر تحقیق کرنے جا رہے ہیں وہ حکیم محمد سعید کی ان خدمات کو جو انہوں نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے لیے انجام دیں۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم الشان خراج تحسین ہوگا۔ یہ موضوع تحقیقی نقطہ نظر سے حکیم محمد سعید کی کتب خانوں کے بارے میں خدمات اور کوششوں کو بین الاقوامی سطح پر منظر عام پر لانے میں مد ومعاون ثابت ہوگا۔ اس سے دنیا بھر کے اہل علم کو معلوم ہوسکے گا کہ سرزمین پاکستان کیسے کیسے دردمند اہل علم مشاہیر سے بھری پڑی ہے۔ کتب خانوں کے حوالے سے حکیم صاحب کی پچاس سالہ علمی خدمات اس امر کی مستحق ہیں کہ ان پر ڈاکٹریٹ کی سطح کا علمی مقالہ سپرد قلم کیا

جائے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے یہ موضوع انتہائی وسیع ہے اور یقیناً حکیم صاحب کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلو اُجاگر کرنے میں بے حد کامیاب ثابت ہوگا۔ یہ تحقیق بلا شبہ پاکستان میں لائبریرین شپ کے تحقیقی مواد میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگی جس کے ذریعہ، طلباء، اساتذہ اور پروفیشنل حضرات کی ذہنی تربیت ہوسکے گی۔

دہشت گردی کی اس لہر میں نا معلوم کتنے ہی بے قصور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، انہیں یہ نہیں معلوم کہ انہیں کیوں مارا جارہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ گولی چلانے والے کو بھی یہ معلوم نا ہو کہ وہ کیوں گولی چلا کر کسی بے قصور کی جان لے رہا ہے، عجب ستم ظریفی ہے کہ افسوس اور دکھ کے سوا انسان کچھ نہیں کرسکتا، اللہ تعالی پروفیسر خورشید انصاری کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

(شائع شدہ پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جنرل۔ ۴۱ (۲) جون ۲۰۱۰)

نعیم فاطمہ توفیق کا مجموعہ کلام ’لمحہ فکر‘ ایک نظر میں

.’لمحہ فکر‘ کی شاعرہ نعیم فاطمہ توفیق کا مجموعہ کلام ’آئینہ فکر‘ کا میں پہلے ہی تفصیل سے مطالعہ کر چکا تھا اور ان کی شاعری سے متاثر بھی ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے اپنے ہی جیسی شاعرہ لگیں، یعنی آسان سے آسان الفاظ کا استعمال، جو بات کہنی ہے سادہ پیرائے میں کہہ دی جائے اس کے لیے شاعری کے اصولوں کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ کرنی پڑ جائے۔ انہوں نے اس بات کا برملا اظہار بھی کتاب کے تعارف میں کر دیا ہے کہ انہوں نے شاعری میں علم و عروض کی تختی سے پابندی نہیں کی۔ یہ کوئی قابل گرفت بات نہیں بعض شعراء اس بات کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ شاعری میں علم و عروض کی تختی سے پابندی کے قائل نہیں۔ اس حوالے سے اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے لیکن نظیر اکبر آبادی کا کوئی بھی شعر علم و عروض سے باہر نہیں۔ لفظیات میں بھی نظیر کا کوئی ثانی نہیں۔ بقول پروفسر سحر انصاری ’’وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عامیانہ, سوقیانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کو بھی شاعری بنا دیا ہے‘‘۔

جب ان کا دوسرا مجموعہ کلام ’’لمحہ فکر‘‘ طباعت کے مراحل میں تھا تو میرے دوست عبد الصمد انصاری نے شعری مجموعے کا مسودہ مجھے اس غرض سے دیا کہ میں

اس کا پیش لفظ لکھوں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ میرا دوست مجھ سے مزاق کر رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ کسی قد آور علمی شخصیت سے میرے توسط سے یہ کام کرانے کی خواہش رکھتا ہو لیکن ان کا اصرار جاری رہا۔ میں نے بہت ٹال مٹول سے کام لیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر 'لمحہ فکر' کا مطالعہ شروع کیا، یہ مجموعہ مجھے نیٹ پر دیا گیا تھا، یعنی اس کی میرے پاس سافٹ کاپی تھی اور کمپیوٹر اسکرین پر مجھے اس کا مطالعہ کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا جو ایک مشکل کام بھی تھا لیکن میں ایسے مشکل کاموں کا عادی ہوں۔

شاعری کی جانچ اور پرکھ کا ایک کلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاعر نے کیا کہا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس کا انداز یا اس نے شعر کس طرح کہا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ شاعری میں یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ شاعر نے کیا کہا ہے، اس کے مقابلے میں دوسری بات یعنی کس طرح کہا ہے کم اہم ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

خیالات کو خوب صورت اور اچھے انداز سے پیش کرنے سے ہی بات بنتی ہے اور دونوں کے اشتراک سے اچھی شاعری جنم لیتی ہے۔ پیش نظر مجموعے کی خالق نعیم فاطمہ توفیق کی شاعری کے پس پردہ خیالات، افکار اور احساسات پاکیزہ اور حساس نوعیت کے ہیں نہیں انہوں نے صاف صاف طریقے سے شاعری کا روپ دے دیا ہے اور وہ اس میں کامیاب و کامران نظر آتی

ہیں۔

مجموعہ کلام ''لمحہ فکر'' کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس مجموعہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایمانداری، سچائی، دردمندی، جان سوزی اور جذبہ حیات اثار کے احساسات کے ساتھ کہا گیا ہے۔اس میں حمد بھی ہیں، دعا بھی، نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی، نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی، قطعات بھی ہیں رباعیات بھی۔ ان کے کلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ موصوفہ اختصار کی قائل ہیں، مصرعے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن ان کے پیچھے وسیع مفہوم پوشیدہ نظر آتا ہے۔ گویا ان کا ظاہری پن مختصر لیکن باطن میں ان کے کلام کا قد کاٹ بلند ہے۔

شاعری میں دکھ و تکلیف، غم واندوہ، دکھ اور کرب کے احساسات کو خوبصورت الفاظ میں ڈھالنا شاعر کا فن قرار پاتا ہے۔ زندگی میں شاعر پر جو گزرتی ہے یا معاشرے میں جو کچھ اس نے دیکھا، محسوس کیا اسے اشعار کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ لمحہ فکر کی شاعرہ بھی ایک دردمند دل اور حساس طبیعت رکھتی ہیں، انہوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا ہے۔ ان کی شاعری گویا ان کے انہی طویل تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔

ان کی نظم ''پاکستانی نوجوانوں سے خطاب'' ایک خوبصورت احساس ہے۔

وہ دیار غیر میں رہتی ہیں لیکن اپنے دیس، اپنے ملک اور اپنی قوم سے بے تعلق نہیں۔ان کی نظم ''پردیس میں دیس کی یاد'' ان کے اندر کی آواز ہے۔ پاکستان کے حالات سے آگاہ اور اسی کرب میں مبتلا ہیں جس میں آج پاکستانی قوم مبتلا ہے اس کا اظہار انھوں نے اپنی نظموں میں درد بھرے لہجے میں ''پاکستان کی بد حالی کا باعث بے خبری'' اور ''سیلاب پاکستان'' کے عنوان سے کیا ہے۔پاکستانی حکمرانوں سے مخاطب ہو کر پاکستان کے ایک اہم اور حساس موضوع پر خوبصورت شعر دیکھئے۔

اپنے حکمرانوں کی غیرت تو دیکھئے
لیتے ہیں دولت غیر سے تفریح کو آج کل
دیتے ہیں ڈرون حملوں کا پرمٹ وہ بخوشی
کرتے ہیں قتل قوم کو مل کر وہ آج کل

عورت، نوجوان اور بچے بھی ان کا موضوع ہیں۔ ''ماں'' کے عنوان سے ان کی آزاد نظم، ''عورت'' کے عنوان سے ان کی نظم اپنی مثال آپ ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ غزل تو ہر شاعر کی شان ہے، اس کے بغیر تو شاعری ادھوری سی ہے۔ ان کا ایک خوب صورت شعر دیکھیے۔

اے دوست میرے دل میں ذرا جھانک کر تو دیکھ

آساں نہیں شمار، میرے غم کا ہو سکے

نعیم فاطمہ توفیق علیگ ہیں اس حوالے سے علیگیو ں والی خوبیاں ان کے کلام میں بدرجہ اتم نمایاں ہیں۔ پاکستان کے بعد اب بیرون ملک عرصہ دراز سے قیام رکھتی ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھتی ہیں اور افسانہ نگار بھی ہیں، سنا ہے عنقریب ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی آنے والا ہے۔ادبی ذوق یقینا انہیں علی گڑھ اور بریلی کی فضاؤں سے ملا، ان کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں شوہر بھی بھوپال کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے علم و ادب کے پرستار مل گئے، شوہر کی رفاقت نے نعیم فاطمہ صاحبہ کی ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ان کے شوہر توفیق محمد خان بھی شاعر تھے ان کا شعری مجموعہ ''اجالے دل کے داغوں کے'' شائع ہو چکا ہے۔آخر میں دل کی بات کہتے ہوئے کہتی

ہیں ۔

خود غرضیاں ہیں غالب، ہمدردیاں ہیں غائب

یاں پیار نہیں ملتا، اخلاص نہیں ملتا

(میں نے موت کو قریب سے دیکھا (رپورتاژ

مئی ۲۰۱۰ء کے ابتدائی دنوں میں مجھے سرگودھا یونیورسٹی کی جانب سے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس میں ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر نامہ موصول ہوا، میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا چنانچہ میں نے کراچی سے رخت سفر باندھا، ۱۰ مئی کے لیے شاہین ائر لائن سے لاہور کے لیے سیٹ ریزرو کرالی، یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا لیکن ایک بڑے مقصد کے لیے کیا گیا۔ کراچی کے تمام معاملات کو تیزی سے سمیٹا، گھروالوں کو اپنے اس فیصلہ پر تیار کیا جس کے لیے مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی البتہ میری شریک سفر شہناز زیادہ فکر منداور پریشان تھیں، لیکن اس بناپر کہ مجھے جو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے مجھے اس کو لبیک کہنا چاہیے وہ بھی خوشی سے مجھے خدا حافظ کہنے پر تیار ہوگئیں۔ میری بیٹی جو لاہور میں کئی سالوں سے مقیم ہے اس خبر پر خوش تھی کیونکہ اس فیصلہ پر عمل کی صورت میں اس کے والدین مستقبل میں اس کے نددیک ہو رہے تھے۔ پیر ۱۰ مئی نے دستک دی ، تیاری مکمل ہوئی، خوشی خوشی ائرپورٹ پہنچ گیا۔ شہناز، مہوش (میری بڑی بہو)،ڈاکٹر نبیل ،ڈاکٹر ثمرہ (میری چھوٹی بہو) میرا ہر دلعزیز پوتا صائم عدیل مجھے ائرپورٹ خدا حافظ کہنے میرے ساتھ تھے، بعد ازآں میرا بڑا بیٹا عدیل بھی اپنے آفس سے ائر

پورٹ آگیا۔ جیسے جیسے اپنوں سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا، میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔جذبات کو قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا، میں کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا، محسوس ہوا جیسے میری آواز بند ہو گئی ہے، کوشش کی کے کچھ بول سکوں مگر الفاظ نہ نکل سکے۔ مشکل سے آنسوؤں کو روک سکا پھر بھی انہوں نے میرا ساتھ نہ دیا، بند گلے، بھیگی آنکھوں اور افسردہ چہرے کے ساتھ خاموشی سے اپنوں کو ایک ایک کرکے گلے لگایا، اپنے پوتے صائم کو ایک سے زیادہ بار پیار کیا، دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے سینے سے جدا نہ کروں، مجھے سب سے زیادہ صائم سے بچھڑنے کا افسوس تھااور رہے گا۔سامان کی ٹرالی کو دھکا دیتا ہوا، نیچی نگاہ کیے اپنی آئندہ منزل کی جانب چل دیا۔ بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج کی جانب چلا، دل بیٹھا جارہا تھا، سر بوجھل تھا، پھر بھی بھاری قدموں سے لاؤنج کی طرف بڑھا، ائر پورٹ کے مرکزی دروازہ کے ساتھ رنگین شیشے کے پیچھے لائن سے میرے جگر گوشے کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے، میں نے بھی ان کی جانب دیکھا، لیکن نظر نیچے کرکے ہاتھ ہلاتا رہا، مجھ میں انہیں دیکھنے کی تاب نہ تھی، میرا پوتا صائم اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مجھے خدا حافظ کر رہا تھا۔اس کی اس ادا نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا، میں نے سوچا کہ کہیں میں نے
غلط فیصلہ تو نہیں کیا، میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر سب کو غور سے دیکھاایک ایک کرکے سب کو دعا دی، خدا حافظ کہا اور آگے کی جانب بڑھ گیا۔

جنت نگاہ شہر کراچی کو جہاں میرا سنہرا بچپن گذرا، رسیلی جوانی کی بہاریں پھلی پھولیں اور پھر بڑھاپے کی دہلیز پر بھی اسی شہر میں قدم رکھا۔ اس کی رونقوں کو، بہاروں اور محفلوں کو، دوستوں کو، عزیزوں کو، پیاروں کو الغرض ہر ایک کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ وسیم فاضلی کے یہ اشعار میرے جذبات کی کچھ

عکاسی کر رہے تھے۔

مجھ کو مت روک کہ ترے لیے جانا ہے مجھے

تجھ سے جو سیکھا ہے، دنیا کو سکھانا ہے مجھے

اپنا غم کیا، غمِ دوراں کو مٹانا ہے مجھے

اب میں جاتا ہوں میرے گلشنِ امید سلام

جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھا، بیلٹ کسی، موبائل پر ایک بار پھر شہناز کو خدا حافظ کہا، اسی دوران لاہور سے میری بیٹی فاطمہ کا بھی فون آیا اسے بھی اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔ فضائی میزبان نے سفر کی دعا پڑھی اور اعلان کیا کہ ہم انشاء اللہ ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں لاہور پہنچیں گے۔ کیپٹن اسد بھٹ ہمارے جہاز کا ناخدا تھا۔ میں ذہن کو دوسری جانب مائل کرنے کے لئے مضامین کی پروف ریڈنگ میں مصروف ہوگیا،

میرے اس عمل نے میرے خیالات کو مختلف سمت منتقل کر دیا، بیشتر وقت مضامین کی پروف ریڈنگ میں گزر گیا۔

جہاز کی پرواز ہموار ہوئی تو ہوائی میزبانوں نے تواضع کا اہتمام شروع کیا، طبیعت کھانے کی طرف بالکل مائل نہیں تھی، بس منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ذہن میں بار بار تمام لوگوں کے افسردہ چہرے آرہے تھے، آنکھ میں آئے ہوئے آنسوؤں کو خاموشی سے پونچھتا رہا، اپنے آپ کو یہ تسلی دیتا رہا کہ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے اور اپنی خوشی سے کیا ہے۔ یہ فیصلہ میں نے ایک عظیم مقصد کے لیے کیا اسی کے لیے میں اپنے بسے بسائی اور ہر طرح کی سہولتوں سے مزین گھر کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ میرے پیش نظر ملازمت کا حصول یا اس سے ملنے والی رقم ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ میں تمام زندگی قناعت پسند رہا ہوں اور اس اصول پر عمل پیرا بھی کہ انسان کو اتنے ہی پیر پھیلانے چاہیں جتنی بڑی چادر ہو۔ الحمداللہ میری تمام زندگی بہت خوش گوار اور مطمئن رہی۔ میں تو اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی لاج رکھنا چاہتا ہوں جو قدرت نے مجھے انتھک محنت اور کوششوں کے بعد عطا کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی مجھ میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہے کہ میں اپنے علم سے دوسروں کو فیض یاب کرسکوں۔ جامعہ سرگودھا میں میرا بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر تقرر میرے لیے ایک اعزاز تھا، میں اس اعزاز کی ہر صورت میں تکریم چاہتا تھا۔ باوجود اس کے کہ سرگودھا جو شاہینوں

کا شہر کہلاتا ہے، عوام الناس کے لیے ائیر پورٹ کی سہولت سے بھی محروم ہے۔جب کہ میں اپنی کمر کی تکلیف کے پیش نظر ریل یا بس کے ذریعہ طویل سفر نہیں کر سکتا، مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے لاہور یا فیصل آباد تک ہوائی سفر کرنا ہوگا اس کے بعد بذریعہ تقریباً ڈھائی گھنٹے کا سفر کرنا ہوگا۔ ان سب قباحتوں کے باوجود میں (ڈیوو Deawo) بس نے اس اعزاز کے حصول کو اپنا مقصد بنایا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کبھی افسردہ ہو جاتا اور کبھی اپنے فیصلہ پر اطمینان کا اظہار کرتا رہا۔ میری آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھر جاتیں اور میں رازداری سے انہیں پونچھ لیتا، بار بار آنسوؤں کو سمجھاتا رہا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔بقول میر دردؔ ؂

کرتا رہا میں دیدۂ گریا کی احتیاط
پر ہو سکی نہ اشک کے طوفاں کی احتیاط

کیپٹن اسد بھٹ پرواز کی انتہائی بلندی پر ہوائی جہاز کو اپنی منزل کی جانب تیزی سے لیے جا رہا تھا، فضاء میں سکوت تھا، خاموشی چھائی ہوئی تھی، مسافر کھا پی کر غنودگی میں چلے گئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ فضائی میزبان اعلان کرے گی کہ خواتین و حضرات ہم تھوڑی ہی دیر میں لاہور کے علامہ اقبال انٹر نیشنل ائر پورٹ پر اترنے والے ہیں ، وقت قریب آ رہا تھا، ہوائی جہاز کی کھڑکیوں سے نیچے کی جانب بہت ہی معمولی معمولی روشنیاں محسوس

ہو رہی تھیں، محسوس ہوا کہ جہاز نے بلندی سے نیچے کی جانب رخ کیا، گویا لینڈنگ کی ابتدا کی۔اس کے ساتھ ہی فضاء میں شدید شور بپا ہوگیا، جہاز کبھی دائیں اور کبھی بائیں ڈولنے لگا۔ ہوائی جہاز کی کھڑکیوں سے باہر کی جانب آسمانی بجلی شدید طریقے سے اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ہوا انتہائی تیز چل رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم کسی ایسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں جو انتہائی تیز چل رہی ہو اور وہ گاڑی بغیر ٹائر کے ہو۔

تمام مسافر اس صورت حال میں بوکھلا کر رہ گئے۔ اللہ ہو اکبر، کلمہ طیبہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں، چند ہی لمحوں میں کپتان جہاز کو بلندی جانب لے گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فضاء ناہموار ہے۔ اس عمل سے غیر یقینی کی کیفیت ختم ہو گئی۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی جہاز کو دوبارہ لینڈنگ کی غرض سے نیچے لایا گیا، وہی کیفیت دوبارہ شروع ہو گئی۔ نا معلوم کیوں کپتان نے اس عمل کو تیسری بار بھی دھرایا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر صورت میں ہوائی جہاز کو لاہور ہی میں لینڈ کرنا چاہتا ہے۔ تیسری بار جب یہی صورت حال ہوئی تو مسافروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، ہر ایک کی زبان پر کلمہ طیبہ تھا، آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم نے موت کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ جہاز میں انتہائی شور برپا تھا۔ لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ کپتان سمیت عملے کی بے حسی کا یہ عالم کہ کوئی کچھ بتانے کو تیار نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ بالآخر کپتان جہاز کو لاہور شہر پر بلندی پر لے گیا، جس کے

باعث جہاز کی استقرای کیفیت میں ٹہراؤ آگیا، مسافروں نے شکر کا سانس لیا، فلائٹ نارمل ہو گئی، جہاز کی رفتار وہی تھی، جو روشنیاں نظر آئی تھیں وہ نظر آنا بند ہو گئیں، اب فضائی میزبان نے اعلان کیا کہ خواتین وحضرات لاہور میں موسم خراب ہونے کے باعث پرواز ناہمور ہو گئی تھی، تاہم یہ صورت حال غیر متوقع نہیں تھی، پریشانی کی کوئی بات نہیں، اب بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ اب ہمارا سفر کس جانب ہے۔ یہ اعلان کرکے وہ خاموش ہوئی، جہاز مسلسل مائل با پرواز تھا، اب تک تو جہاز کو لاہور میں اتر جانا چاہیے تھا، لیکن نہیں معلوم ہم کہاں جارہے ہیں، سفر طویل ہوتا جارہا تھا، رات کے نج چکے تھا، جہاز اندھیری فضاء میں مسلسل دوڑے چلے جارہا تھا، ساڑے دس بجے ۱۰ محسوس ہوا کہ جہاز کسی شہر کے اوپر پرواز کر رہا ہے، روشنیاں نظر آنے لگیں، خیال تھا کہ لاہور کا موسم کچھ بہتر ہوگیا ہے اور ہم جلد اپنی منزل کو پالیں گے۔ جہاز نے لینڈنگ کی ابتدا کی، کسی قسم کی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی، اس دوران فضائی میزبان نے اپنا مائیک کھولا اور بناوٹی آواز سے گویا ہوئی' خواتین وحضرات ہم بے نظیر بھٹو انٹر نیشنل ائر پورٹ پر اترنے والے ہیں'۔ سب مسافر حیران وپریشان کہ ہم لاہور کے بجائے اسلام آباد پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ اللہ نے ہمیں دوسری زندگی دی، اکثر عورتیں یہ کہتی ہوئی سنائی دیں کہ اس جہاز میں کوئی نیک انسان سفر کر رہا ہے، بے شک کچھ اسی قسم کا معاملا رہا ہوگا، اللہ نے ہم سے ابھی کچھ کام لینا ہونگے

کہتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے، آج ہمارے لیے وہ دن نہیں آیا تھا، یہ تو ایک جھٹکا تھا، جو قدرت نے دیا، یہ ہمارے لیے ایک پیغام تھا کہ اب بھی وقت ہے ہم اپنے برے اعمال سے توبہ کرلیں۔ اللہ نے بڑا کرم کیا، تھوڑی دیر تو مسافروں کو جہاز ہی میں رکھا گیا، جب یہ فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر لاہور جانا مناسب نہیں تو ہمیں جہاز سے لاؤنج میں منتقل کردیا گیا جہاں پر اکثر مسافر سجدہ شکر ادا کرتے نظر آئے۔

اسلام آباد ائرپورٹ لاؤنج میں رات کے بارہ بج رہے تھے، منزل کی جانب سفر کے آثار دور دور نظر نہیں آرہے تھے ، تمام ہی مسافر پریشانی کی کیفیت میں تھے، ہر ایک کو اپنی منزل پر پہنچنے کی فکر تھی ، ائر لائن کی انتظامیہ کی جانب سے جب کسی بھی قسم کا تسلی بخش جواب موصول نہیں ہوا، مسافروں کو اپنے ذرائع سے لاہور کا موسم بہتر ہو جانے کی اطلاعات مل چکی تھیں ، وہ باد و باراں ، شدید گرج و چمک جو عین اس وقت شروع ہوئی تھی جب ہمارا جہاز لاہور کی سرزمین کو چھو لینے جارہا تھا، قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ہم اس وقت لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ، انتظامیہ کے رویہ کے خلاف چند احباب نے احتجاج شروع کردیا، اس احتجاج میں خواتین بھی شامل ہوگئیں جس سے احتجاج میں گرمی آگئی جو کارگر ثابت ہوئی، رات ساڑے بارہ بجے اعلان ہوا کہ مسافر لاہور جانے کے لیے جہاز پر تشریف لے چلیں۔ سفر دوبارہ شروع ہوا، ڈیڑھ بجے ہم

لاہور پہنچ گئے۔ میں شروع ہی میں اپنی بیٹی فاھینہ اور عاصم کو ائرپورٹ آنے کے لیے منع کرچکا تھا، بیٹی کے گھر پہنچا، اس وقت رات کے دو بج رہے تھے، میری بیٹی میری منتظر تھی، صبح سات بجے کے لیے ڈیوو میں میری سیٹ بک ہوچکی تھی، وقت مقررہ پر سرگودھا کا سفر شروع ہوا، صبح کا وقت اور پنجاب کے خوبصورت لہلہاتے سرسبز علاقے حسین نظارہ پیش کررہے تھے، دو دریاؤں کے بیچ واقع سرگودھا خوبصورت شہر ہے جو شاہینوں کا شہر کہلاتا ہے، ۹ بجے سرگودہ پہنچا، بس اسٹاپ پر سرگودہ یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفامیشن سائنس کے چیرمین پرفیسر ڈاکٹر محمد فاضل اور شعبہ کے ایک سینئر استاد میاں محمد اسلم بھٹی جو میرے ایم اے کے کلاس فیلو بھی ہیں مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ پہلے شیخ الجامعہ سے ملاقات کی جائے، چنانچہ ہم تینوں شیخ الجامعہ کے دفتر پہنچے، شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر چودھری محمد اکرم سے ملاقات ہوئی، خوش ہوئے اور خوش اخلاقی سے ملے، فاضل صاحب کو میرے قیام کے بارے میں کچھ ہدایات دیں، پھر ایڈیشنل رجسٹرار چودھری اظہارالحق صاحب سے ملاقات کی، انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میرا تعلق پنجاب کے شہر میلسی سے ہے تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیا، اس ملاقات کے بعد ہم اپنے شعبہ میں آگئے، احباب سے تعارف ہوا، ٹیچرز ہاسٹل کا کمرہ نمبر ۵ میرے لیے مختص کیا گیا تھا۔ دوری اور تنہائی کا احساس ایک قدرتی عمل تھا لیکن جس راستہ کا انتخاب اپنی خوشی سے کیا جائے اس کے راستہ میں آنے والی مشکلات اور پریشانیاں اتنا

دکھ نہیں پہنچاتیں کیوں کہ ہم انہیں برداشت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔
گھر سے باہر تنہا رہنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا، اپنے خیالوں میں گم بہت دیر تک مختلف باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اللہ سے دعا کی کہ اللہ تعالی مجھے اپنے اس مقصد میں کامیاب کرے، راستے میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت دے اور مجھے ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

۱۹ مئی ۲۰۱۰ء سرگودھا

ڈاکٹر رئیس صمدانی کا خاکوں کا مجموعہ ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' ڈاکٹر خالد ندیم کی نظر میں

''جھولی میں ہیرے اور موتی'' میرے تحریر کردہ ۱۱ خاکوں اور یادوں کے دریچے کے عنوان سے ۵ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جو خاکے کتاب میں شامل ہیں ان میں اردو کے معروف ادیب 'ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ اردو ادب کا روشن ستارہ'، امریکہ میں مقیم عبد الوہاب خان سلیم۔ ایک کتاب دوست، فیض احمد فیضؔ۔ میرا پرنسپل، معروف ادیبہ افسانہ نگار فرخندہ لودھی۔ ایک ادیب ایک کتاب دار، پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام۔ محترم و معزز، پروفیسر لطیف اللہ۔ نفیس انسان، پروفیسر محمد احمد۔ خوش گفتار، عبد الستار ایدھی۔ خدمت و عظمت کی لازوال مثال، عبد الصمد انصاری۔ دھیما لہجہ تھوڑی سے شوخی، میری ماں۔ صفیہ سلطانہ (خاکہ) اور 'اپنی تلاش' کے عنوان سے اپنا خاکہ بھی شامل ہے۔

کتاب کا پیش لفظ جامعہ سرگودہ کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد ندیم نے تحریر کیا جو کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں مفید، مستند اور خوبصورت معلومات فراہم کرتا ہے۔ کتاب کے بارے میں ڈاکٹر خالد ندیم کی رائے کتاب کا تفصیلی تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پیش لفظ انہوں نے ''کشادہ پیشانی، روشن

آنکھیں، متبسم ہونٹ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اگر ظاہری زندگی سے قبل روحوں کے باہمی تعلقات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو عالمِ ارواح میں راقم اور ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کے درمیان خلوص و مروّت کے تعلقات کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ شرق پور، شیخوپورہ، منکیرہ (بھکر)، نارووال، نوشہرہ ورکاں اور حافظ آباد میں زندگی کے بائیس برس گزارنے کے بعد جب مجھے جامعہ سرگودھا میں تدریسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا تو یہاں کالجوں کی فضا سے مختلف اور بہتر ماحول میسر آیا۔ اپنے رفقاے کار کی علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ جس ہستی نے اپنے کارناموں اور اندازِ گفتگو سے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا، وہ ڈاکٹر طاہر تونسوی تھے۔ یوں تو ان کی شخصیت کے بارے میں ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں راے دیتا ہے، لیکن مجھے اس سلسلے میں صرف ایک ہی بات کہنی ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مجھ سے پہلے ہی دِن محبت کا جو رشتہ استوار کیا، میری بعض کوتاہیوں کے باوجود انھوں نے اس میں کبھی کمی نہ آنے دی اور آج اگر مَیں طوفانوں اور آندھیوں کے رُو بہ رو کھڑا ہوں اور میرے قدموں کے نیچے زمین ہے تو یہ طاہر تونسوی کی دین ہے۔ اگرچہ ہم صبح سے شام پانچ ساڑھے پانچ بجے تک تدریسی ذمے داریوں کی بجاآوری کے لیے ایک ہی شعبے میں رہتے تھے اور فرصت کے اکثر لمحات اکٹھے گزارتے تھے، لیکن مَیں رات آٹھ ساڑھے آٹھ

بجے کسی نہ کسی بہانے پھر ان کی سرکاری رہائش پر پہنچ جاتا۔ ان کے ہاسٹل کے کسی استاد کا ادب سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا، تاہم ان کی محفل آرائی نے سب کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ سب تو ان کی رفاقت میں خوش تھے، لیکن طاہر تونسوی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے اُلجھنے سے بہت بے زار رہتے؛ چناں چہ ان کا بھی جی یہی چاہتا کہ مَیں ایسے ہی چلتے پھرتے اِدھر کا چکر لگاتا جاؤں۔

شب و روز کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک رات تونسوی صاحب کہنے لگے کہ آؤ، کمرہ نمبر پانچ میں چلتے ہیں، تمھیں ایک انسان سے ملواتے ہیں۔ مَیں حیران تھا کہ طاہر تونسوی، جو کسی کے بارے میں کوئی توصیفی کلمہ بلاوجہ نہیں کہتے، پھر ہاسٹل میں کسی کے ساتھ ان کا کوئی خلوص کا ایسا رشتہ بھی نہیں، جس کا تعارف یوں کراتے۔ مَیں یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں سے کوئی مہمان آیا ہو گا، چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہم جس کمرے میں داخل ہوئے، وہاں دائیں بائیں دو بیڈ لگے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک میز رکھا ہوا تھا۔ ایک بیڈ خالی اور دوسرے پر ایک صاحب کمبل میں لپٹے لپٹائے لیپ ٹاپ لیے جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ پہلی نظر میں ان کے چہرے کے خد و خال سامنے نہ آسکے، لیکن جونہی انھوں نے چہرہ اوپر اٹھایا؛ کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، متبسم ہونٹوں اور شیریں لب و لہجے نے ہمارا استقبال کیا۔ ایک شریف النفس انسان سے مل کر مَیں نہ صرف خوش ہوا

بلکہ مجھے یوں محسوس ہوا، مَیں ایک مدتوں سے جس پُرخلوص انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، ڈاکٹر طاہر تونسوی کے توسط سے آج مجھے وہ مل گیا ہے۔

شیخوپورہ کی علمی و ادبی تنظیم 'دریچہ' کے دوستوں کے بعد سرگودھا میں اگر کسی ادبی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تو وہ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی تھے۔ ان کی رفاقت میرے لیے اس قدر خوش گوار تھی کہ سرگودھا مجھے اپنے شہر کی طرح محسوس ہونے لگا۔ ان سے اکثر علمی موضوعات پر گفتگو رہتی اور وہ میرے کاموں کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ مَیں انھیں ایک علمی شخصیت سمجھنے کے باوجود محض ایک کتاب دار کی حیثیت دیتا رہا؛ لیکن ایک دِن انھوں نے اپنا خاکوں کا مجموعہ یادوں کی مالا عنایت کیا تو مجھے ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ ساتھ اپنے سابقہ رویے پر سخت ندامت بھی ہوئی۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہیں کہیں سے پڑھتا بھی جاتا تھا اور بعض مقامات پر میری حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ میرے مشاہدے میں اکثر یہی آیا ہے کہ لائبریری سائنس کے لوگ بالعموم علم و ادب سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ کتاب کے عنوان کے علاوہ ان کا کتاب سے کم ہی تعلق ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر صمدانی کی تحریر نے میری رائے کو یک سر بدل کے رکھ دیا۔ اس کتاب میں انھوں نے تقریباً چوبیس شخصیات پر قلم اٹھایا، جن کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات، افکار اور انعکاسات پیش کیے تھے۔

ایک وقت آیا کہ ڈاکٹر صمدانی کو سرگودھا سے واپس اپنے شہر (کراچی) جانا پڑا۔ ان کی رفاقت سے مجھے جس قدر اطمینان ہوا تھا، ان کی واپسی میرے لیے اسی قدر اذیت ناک بھی تھی؛ لیکن کیا کیا جائے، زندگی اپنے سفر پر رواں دواں رہتی ہے۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ ڈاکٹر تونسوی اور ڈاکٹر صمدانی کے جامعہ سرگودھا سے جانے کے بعد بھی اگرچہ مَیں روزانہ اس ہاسٹل کے قریب سے گزرتا ہوں، لیکن کبھی اس کے اندر جھانکنے کی ہمت نہیں پا سکا کہ اس ہاسٹل کی ساری رعنائی صرف انھی شخصیات کے دم قدم سے تھیں۔

خاکہ نگاری اور سوانح نگاری میں بنیادی فرق لطافت اور ذمہ داری کا ہے۔ جہاں خاکہ نگار اپنے موضوع سے متعلق چند واقعات کے بیان سے ایک بھرپور تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے، وہیں سوانح نگار تحقیقی بنیادوں پر ممدوح سے متعلق تمام تر معلومات قاری کے سامنے پیش کرنے کی تگ و دَو میں مصروف نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے اپنی ان تحریروں کو خاکہ نگاری سے متعلق نہیں کہا، بلکہ انھوں نے ان نگارشات کو سوانحی خاکے اور سوانحی مضامین کا نام دیا ہے۔ البتہ اس مجموعے کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ مصنف ان شخصیات سے جذباتی طور پر متاثر نہیں اور نہ ہی وہ ان کی قصیدہ خوانی کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے ان شخصیات کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ

ساتھ اپنی شخصیت کو بھی ان میں شامل کرکے انھی واقعات کے بیان تک محدود نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے تخلیقی حرارت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں ان کے سوانحی خاکے اور مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعہ سابقہ مجموعے سے اگلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صمدانی نے اپنے تخلیقی سفر کو بدرتیج طے کیا ہے اور اب وہ اس صنف کی اس منزل پر ہیں، جہاں خاکہ نگاری میں ان کا رنگ اپنی انفرادیت کا اظہار کرنے لگا

ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قریبی شخصیات پر لکھنے کے لیے خاکہ نگار کے پاس زیادہ مواد ہوتا ہے، اس لیے ایسے موضوعات پر وہ زیادہ سہولت سے لکھ سکتا ہے، لیکن یہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے۔ شخصیت جتنی زیادہ قریب رہی ہو، اس پر طبع آزمائی کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے اور پھر بعض لمحوں کو قلم بند کرنے میں بعض شخصیات کی تقدیس بھی حائل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے والدہ محترمہ کے خاکے میں زیادہ فنی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے ایک بیٹے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ادیب کا کردار بھی ادا کیا ہے۔ ایسا خاکہ مصنف کے لیے بالعموم پل صراط پر چلنے سے کم دشوار نہیں ہوتا اور پھر

صحیح سلامت منزلِ مراد تک پہنچ جانا یقیناً ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر صمدانی اس خاکے میں اپنی تمام تر تخلیقی توانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ فقط ایک اقتباس دیکھیے اور خاکہ نگار کو داد دیجیے ’’میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ امی نے بتایا تھا کہ نہیں معلوم کیا وجوہات ہوئیں، پیدائش کے وقت دائی نے بتایا کہ نومولاد کو الٹا پیدا ہونا ہے، جس کی وجہ سے پیدائش کے وقت مشکلات پیدا ہو گئیں۔ امی نے بتایا تھا کہ اس وقت دائی کو یہ کہتے سنا گیا کہ زچہ و بچہ دونوں میں سے کسی ایک کی زندگی کو خطرہ لائق ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل میری نانی کا انتقال بھی بچے کی پیدائش پر ہوا تھا۔ میری والدہ کے لیے یہ لمحات اس حوالہ سے بھی پریشان کن رہے ہوں گے‘‘۔

خاکہ نگاری شروع ہی سے دو مختلف سمتوں میں رواں دواں رہی ہے۔ ایک طرف شخصیت سے انس، محبت اور ہمدردی کا پہلو غالب رہا، جس نے شگفتگی کے باوجود تحریر کو غیر سنجیدہ نہیں ہونے دیا؛ جب کہ دوسری طرف خاکہ نگاری لطافت سے مزاح، مزاح سے ظرافت اور ظرافت سے جملے بازی تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر صمدانی اپنی نستعلیق شخصیت کی بدولت شگفتہ سنجیدگی کو اپنانے پر مجبور تھے، چناں چہ ان کی تحریروں میں روانی، سادگی، بے ساختگی اور لطافت کا پایا جانا فطری امر ہے۔

ڈاکٹر صمدانی کسی شخصیت کی مضحکہ خیزی یا کرداری تضادات کے باعث اسے خاکے کا موضوع نہیں بناتے، بلکہ وہ مہر و وفا اور خلوص و مروّت کے رشتوں سے انھیں منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے تعلقات کی بنیاد پر دھیمے سروں میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور کسی دعوے یا ادعا کے بغیر اپنی ملاقاتوں اور ممدوح کی فتوحات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی شخصیت نہ تو فرشتہ ہے اور نہ ہی وہ مجسمہ شر؛ بلکہ وہ انسانوں سے ملواتے ہیں، جو خوبیوں اور خامیوں کا امتزاج ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صمدانی نے ان خاکوں کے روپ میں تہذیبی شکست و ریخت اور سیاسی انتشار سے جنم لینے والی بعض بدنمائیوں کو واضح کیا ہے؛ چناں چہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام

گورنمنٹ کالج، ناظم آباد، کراچی) کے ان خیالات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ)

۱۹۴۷ء کے بعد حالات بالکل بدل گئے، دنیا ہی بدل گئی، وہ دنیا الگ تھی یہاں کی دنیا الگ ہے؛ وہاں استاد کا احترام تھا، عزت کی جاتی تھی؛ طلباء میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ اور لگن تھی، جس کا اب فقدان پایا جاتا ہے۔آج کا استاد سیاست میں شامل ہوگیا۔

بعض مقامات پر شاہد احمد دہلوی کی طرح ڈاکٹر صمدانی نے بھی حلیہ نگاری پر

توجہ دی ہے۔ ایسے مقامات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میدان کی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ عبدالصمد انصاری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ' نوجوان دیکھنے میں خوبصورت، مناسب، گورا رنگ، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، مضبوط جسم، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دست ترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، کالے گھنے بالوں میں اب رنگنے کے باوجود سفیدی نمایاں، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ؛ المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوش گوار اظہار'۔

چوں کہ فی زمانہ نام نہاد 'حقیقت نگاری' کی آڑ میں گھٹیا سے گھٹیا حرکت کو آرٹ کا نام دیا جانے لگا ہے، چناں چہ جوش ملیح آبادی کی 'آپ بیتی' کے بعد کئی ایک 'پاپ بیتیاں' سامنے آئی ہیں، جن کے مصنف لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی 'حرکات' کا فخریہ اظہار کرتے ہیں؛ لیکن ڈاکٹر صمدانی کا خدا بھلا کرے، ابھی ان کی صورت میں مشرق کی آنکھ میں کچھ روشنی باقی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق بات کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کرتے، چناں چہ صمد انصاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ " اسے مَیں نے جتنے قریب سے دیکھا، شاید ہی کسی اَور نے دیکھا ہوگا۔ یہ میرے اور مَیں ان کے بہت سے ظاہری اور

خفیہ رازوں کا امین بھی ہوں۔ امانت دار کی حیثیت سے میں اپنے دوست کی صرف ظاہری خصوصیات پر ہی قلم اٹھاؤں گا، کیوں کہ امانت میں خیانت کسی بھی طرح اچھا فعل نہیں"۔ڈاکٹر صمدانی کا یہ کہنا ان کے کردار کی طہارت کا آئینہ دار ہے کہ مَیں نے زندگی میں اپنے دوستوں کو ممکن حد تک سنبھال کر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی؛ جس کسی سے تعلق دوستی قائم ہوگیا، اس سے ناتا جوڑے رکھا۔ ڈاکٹر صمدانی کا یہ مقولہ ان کے زیرِ نظر خاکوں میں کئی مقامات پر عملی صورت اختیار کرتا ہوا دِکھائی دیا ہے۔

فیض احمد فیض کے خاکے میں معلومات کی فراہمی کے لیے انھوں نے اپنی یادداشتوں کے ساتھ ساتھ دیگر منابع سے بھی استفادہ کیا، لیکن اپنی تحریر کو تخلیقی توانائی سے ادبی شہ پارہ بنا دیا۔ڈاکٹر طاہر تونسوی سے اپنے تعلق کو خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں "مجھے کچھ عرصہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی قربت کا شرف حاصل ہوا، یہ قربت جامعہ سرگودھا کے ٹیچرز ہاسٹل نے فراہم کی، جہاں پر وہ کمرہ نمبر ۲ مَیں اور میں کمرہ نمبر کا مقیم تھا۔ یہ تحریر اسی قرابت داری کا پیش خیمہ ہے۔ اس مختصر سے عرصہ میں مجھے ۵ اپنے موضوع کو سمجھنے اور پرکھنے میں آسانی ہوئی، مَیں نے اُنھیں قریب سے دیکھا، مختلف موضوعات پر کھل کر سیر حاصل گفتگو کی، سادہ طبیعت کے مالک ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مَیں اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں ڈاکٹر طاہر تونسوی پر

آسانی سے کچھ لکھ لوں گا، جیسے جیسے میں ان کی شخصیت کو ٹٹولتا گیا' میری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب مَیں نے ان کے کام کا مطالعہ کیا اور ان مضامین، خاکوں، ان پر لکھی گئی کتابوں اور رسائل کے خاص نمبروں کا مطالعہ کیا تو ایک مرحلے پر مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اپنا قلم بس یہیں روک لوں۔ ڈاکٹر صاحب سے اپنے اس ارادے کا ذکر کر چکا تھا کہ سوانحی مضامین یا خاکہ نویسی میرا مشغلہ ہے اور مَیں آپ پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس وجہ سے حوصلہ نہیں ہوا یہ کہنے کا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کام میرے بس کا نہیں۔ آپ پر تو بے شمار قلم کار طبع آزمائی کر چکے۔ بعض تو اردو ادب کا بڑا نام ہیں، مَیں کہاں؟ میرا مقام کہاں؟

لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحبت نے مجھے حوصلہ دیے رکھا اور میں اپنی منزل کی جانب بڑھتا گیا''۔

اسی طرح فرخندہ لودھی کے خاکے میں بھی انھوں نے دیگر ذرائع سے معلومات یکجا کیں، لیکن ممدوح کی شخصیت کے جو نقش قلم بند کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کا اندازہ خاکے سے محض دو مختصر اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''سرخ سفید، صحت مند اور خوب رُو شخص کو 'سانولی سلونی'، سیاہ، متجسس آنکھیں کیسے بھا گئیں؟ صابر لودھی کو فرخندہ کی وہ متجسس

آنکھیں ایسی اچھی لگیں کہ انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں اپنا لیا۔ اس طرح پروفیسر صابر لودھی کو فرخندہ کے رُوپ میں وہ ملاحت مل گئی، جس کو دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں''۔ ''لائبریرین کا عہدہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں بہت ہی منفرد ہوا کرتا ہے؛ کام سب سے زیادہ، تنخواہ سب سے کم۔ تعلیمی استطاعت اساتذہ کے مساوی، بسا اوقات ان سے بھی زیادہ؛ لیکن عزت واحترام میں ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک عام سی بات تھی۔ فرخندہ نے اس ماحول اور رویے کا مقابلہ کرنے اور اس میں بہتری کی عملی جدوجہد کا بیڑا اٹھایا۔ وہ ایک حساس طبیعت کی مالک تھیں، اپنے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والے نارَوا سلوک اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کھڑی ہوئیں تو منزل کو پا کر ہی دم لیا''۔

زیرِ نظر خاکوں میں سوانحی معلومات بھی ہیں اور خاکہ نگار کا تخلیقی لمس بھی۔ ان کے مطالعے سے قاری کو صرف شخصیت کے ماہ و سال سے آشنائی ہوتی ہے، بلکہ بعض مواقع پر خاکہ نگار کے لب و لہجے اور تاثرات کی مدد سے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہونے لگتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے قبل یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارے خاکہ نگار کو، اپنے قاری کو متاثر کرنے کی جلدی نہیں۔ وہ جملے بازی سے قاری کے لیے

کوئی سامانِ ضیافت پیش نہیں کرنا چاہتے؛ انھیں شہرت کی احتیاج بھی نہیں، وہ تو اپنے اردگرد پھیلے ہوئے چند کرداروں کے ذریعے اُس تہذیبی روشنی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو بتدریج تاریکی کی نذر ہوتی جا رہی ہے اور جس کے خاتمے کے بعد اگر انسان زندہ رہا بھی تو وہ شرفِ انسانیت سے ضرور محروم ہو جائے گا۔ انھوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں اپنے ہر موضوع کے بارے میں وہ کچھ لکھ دیا ہے، جو حقیقت ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے روزمرہ باتوں اور واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور محض اسلوب کا جادُو جگانے کے بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کی تحریر کی خصوصیت بھی ہے اور ہمارے بعض ادیبوں کے لیے باعثِ تقلید بھی۔

قارئین کرام! زیرِ نظر خاکے ڈاکٹر صمدانی کے روشن ادبی مستقبل کی پیش گوئی کر رہے ہیں۔ راقم کو یقین ہے کہ اس میدان میں وہ کئی ایک فتوحات حاصل کریں گے اور اگر مستقل مزاجی سے کام لے سکے تو خاکہ نگاری کی تاریخ میں اپنے لیے ایک مقام مختص کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر خالد ندیم

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، جامعہ سرگودھا

۲۲ فروری ۲۰۱۲

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف ’’یادوں کی مالا‘‘ اکرام الحق کی نظر میں

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی کتاب ’’ یادوں کی مالا‘‘ مختلف شخصیات کے بارے میں ان کے تاثرات ،افکار اور انعکاسات کا مجموعہ ہے اس کتاب کو الفیصل ناشران وتاجران کتب ،لاہور نے جولائی۲۰۰۹ء میں شائع کیاکتاب پر ۳۵۰روپے قیمت درج ہے۔کتاب میں ۲۵ شخصیات پر مشتمل ابواب ۲۴۴صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔پندرہ شخصیات کا تعلق براہ راست لائبریرین شپ کے پیشے سے ہیں۔جو اس مقدس پیشے کا قیمتی اثاثہ ہیں۔مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مضامین گذشتہ تیس برس میں لکھے گئے اور وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے۔ مصنف ایک کہنہ مشق لائبریرین اور منجھاہوا لکھاری ہے۔ ۱۵مارچ ۱۹۴۹ء کو ضلع وہاڑی کے علاقے میلسی میں پیدا ہوئے ان کے والد انیس احمد صمدانی اسی سال بھارت سے ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے۔ مصنف نے حاجی عبداللہ ہارون کالج سے ۱۹۷۰ء میں بی اے کیا۱۹۷۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں اسی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ حکیم محمد سعید کی لائبریری خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر ۲۰۰۹ء میں مصنف کو ہمدرد یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ) پی ایچ ڈی (کی ڈگری سے نوازا۔ان کی یہ تحقیق پروفیسر نعیم الدین زبیری اور پروفیسر غنی الاکرم

سبزواری کی زیر نگرانی تکمیل کو پہنچی۔پیشہ وارنہ زندگی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ سپیریئر کالج کراچی سے کیا۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۷ء تک حاجی عبداللہ ہارون کالج کراچی گورنمنٹ (BPS-19) میں اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔۱۹۹۷ء میں کالج فار مین ناظم آباد کراچی میں آئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔لائبریرین شپ کے ساتھ مختلف تعلیمی اداروں میں لائبریری سائنس مضمون کے طور پر بھی پڑھاتے رہے ہیں۔۹۷۔۱۹۹۵ء کے دوران کراچی یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری سائنس میں جزوقتی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔پاکستان ببلیوگرافیکل ورکنگ گروپ کے لائبریری سکول میں بھی ایک عرصے تک تدریس کرتے رہے۔یونیورسٹی آف سرگودھا کے شعبہ لائبریری سائنس میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی صاحب تیس سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں بیشتر کا تعلق لائبریرین شپ سے ہیں۔ان کے ۲۵۰ سے زیادہ مضامین شائع ہوچکے ہیں۔پاکستان لائبریری انفارمیشن سائنس جرنل کے ایسوی ایٹ چیف ایڈیٹر رہے۔بے شمار پیشہ وار، تعلیمی اور سماجی تنظیموں کے نہ صرف ممبر رہے بلکہ ان میں انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں ۔پاکستان لائبریری ایسوی ایشن سندھ برانچ کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔پروفیسر انیس خورشید نے صمدانی صاحب کو" دھن کے پکے لائبریرین "کے خوبصورت الفاظ سے نوازاہے۔ یہ بات تو صاحب کتاب کی تھی اب

آتے ہیں کتاب کی طرف جس میں مصنف نے یاد کے ایک ایک موتی کو لفظوں کی مالا میں پرو یا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون حکیم محمد سعید شہید کی قدآور شخصیت پر لکھا گیا ہے جنہیں مصنف کتاب اور کتب خانوں کا شیدائی قرار دیتے ہیں۔ دوسرا مضمون عالم اسلام کے نامور ماہر تعلیم ڈاکٹر طلحہ حسین پر ہے۔ جنہیوں نے بصارت سے محروم ہونے کے باوجود تعلیم کے میدان میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ تیسرا مضمون حاجی سر عبداللہ ہارون پر لکھا ہے، جو قائداعظم کے قریبی ساتھی ہونے کے ساتھ سندھ کی معروف سیاسی اور سماجی شخصیت ہیں۔ چوتھا مضمون شیخ محمد ابراہیم آزاد کی محترم شخصیت پر ہے۔اس مضمون میں آزادؔ کے سوانحی خاکے کے ساتھ ان کی نعتیہ شاعری پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں موجود تیرھواں مضمون آزاد صاحب کے پوتے اور نعت گو شاعر تابش صمدانی صاحب پر لکھا گیا ہے جس میں ان کے عشق رسول ﷺ اور نعتیہ شاعری کی تفصیل درج ہے مصنف نے کتاب میں اُن قابل توجہ مگر گمنام لوگوں کو اپنے قلم کی تحریر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے جنہوں نے مصنف کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ جس میں محبوب احمد سبزواری جو مصنف کے ماموں ہے۔ مشکور احمد صاحب، یہ بھی مصنف کے رشتہ دار ہے مگر انتہائی خود دار اور ہمت والے انسان۔ایک درویش صفت اور ولی کامل سید امام کا تذکرہ بھی موجود ہے جو عملیات کے ذریعے جنات کا توڑ کرتے تھے

۔مصنف نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس میں کسی جن سے ملاقات کا حوالہ بیان کیا گیا ہے۔۔ شیخ لئیق احمد مصنف کے قریبی رشتہ دار ہے جن کی زندگی نشیب وفراز کی داستان ہے۔ منظور احمد بٹ ،ایک مخلص سماجی کارکن، جن کی زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا ہے۔ان شخصیات پر لکھے گئے یہ اولین مضامین ہیں۔ مصنف
نے اپنے قلم کی طاقت اور جذبے کی حرارت سے ان شخصیات کو ہمیشہ کے لئے زندہ کردیا ہے۔

بحیثیت ایک شاگرد کے اپنے استاد پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید کوزبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں دنیائے لائبریرین شپ کی ایک عہد ساز شخصیت کہاہے۔پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید ،صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کے خطوط ، یاداشتیں اور تاثرات کو بھی کتاب کی زینت بنایا۔ نرم دل، ہمدرد اور صلہ رحمی کرنے والے کراچی یونیورسٹی کے سابق لائبریرین جناب عادل عثمانی سے اپنی محبت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری) مصنف کے چچااور مصنف کو لائبریرین شپ میں لانے والے بھی ۔اپنی ذات میں ایک انجمن اور ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔پروفیسر ڈاکٹر سید جلال) الدین حیدر کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ " ڈاکٹر حیدر تہذیب کے ایک یادگار نمائندے ہیں ایسے پروقار نمائندے اب معدوم ہوتے جارہے ہیں۔آپ کی گفتگو میں ،شائستگی

دھیما پن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے سادہ طبیعت پائی ہے رہن سہن سادہ ہے دکھاوے اور بناوٹ کے قائل نہیں''۔ جمیل نقوی صاحب جو علی گڑھ یونیورسٹی کی لٹن لائبریری اور امپیریل لائبریری کلکتہ میں اپنے پیشہ وارنہ فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ لائبریرین شپ کے موضوع پر اردو زبان میں ان کے مضامین جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے رسالے ''کتاب نما'' میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوتے رہے۔ڈاکٹر انیس خورشید نے ان کے بارے میں لکھا کہ ''کتاب ہی ان کا مسلک رہا ہے اور اس حوالے سے انھوں نے جو بھی کام انجام دیئے اتنے سلیقے اور رچاؤ کے ساتھ کئے کہ خود ہی لوگوں کی نگاہ کے مرکز بنے رہے''۔ جمیل صاحب ۲۵ کتابوں کے خالق ہیں۔لائبریرین اور مصنف کے ساتھ ساتھ جمیل صاحب نعت گو شاعر بھی ہیں ان کی کئی نعتیں ذوق وشوق اور عقیدت سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔

مصنف نے پنجاب لائبریری ایسوی ایشن کے باباجی میاں الطاف شوکت کو بھی نہایت خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔پاکستان میں لائبریری تحریک کے خاموش مجاہد ابن حسن قیصر سے اپنی محبت اور عقیدت کو بھی قلم بند کیا۔ اس مضمون میں وہ تفصیل موجود نہیں جو باقی مضامین میں شامل ہیں۔ پروفیسر اختر حنیف کا تذکرہ بھی ہے جو ۱۹۵۴ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کرکے ۱۹۵۶ء میں پاکستان ہجرت کرآئے۔ کراچی یونیورسٹی میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا اور اسی شعبہ کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۹۵ میں اس

جہان رنگ وبو کو چھوڑ کر دار البقاء کے لئے کوچ کر گئے۔ایک طویل عرصے تک پاکستان لائبریری بلیٹن کے انگریزی شعبہ کے ایڈیٹر رہے۔مصنف نے محمد زبیر صاحب سے اپنی وابستگی اور رفاقت کو دلنشیں انداز میں پیش کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین رہے ۔اسلامی کتب خانوں پر ان کی کتاب کسی اتھارٹی سے کم نہیں اگرچہ انھوں نے ایک درجن کے قریب کتابیں لکھیں ۔اپنی تحریر سے لائبریری سائنس کے دامن کو مالا مال کیا۔ لائبریرین شپ کے نامور ستاروں میں مولانا محمد عارف الدین جو لائبریری تحریک کے فروغ میں شہید حکیم محمد سعید کے دست راست تھے ۔ہارڈنگ پبلک لائبریری دہلی اور خیر پور پبلک لائبریری کے لائبریرین فرحت اللہ بیگ ،برٹش کونسل والے سید اتیفہان علی شاہ بخاری اور ہمدرد یونیورسٹی والے رشید الدین احمد سے صمدانی صاحب نے اپنی محبت اور رفاقت کا ذکر بڑے پیارے انداز میں کیا ہے۔

صمدانی صاحب کا اسلوب تحریر دلکش اور سلیس ہے ۔اشعار کا استعمال بھی شاندار اور موقع کی مناسبت سے ہے۔ہر مضمون میں شخصیات کی مختصر سوانح عمری ،ان کے عادات اور خصائل اور مصنف کے ساتھ ان کا برتاؤ خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے مضامین کا آغاز بڑے ہی موثر انداز میں کیا گیا ہے اور عموماً شعر پر مضمون ختم کیا گیا ہے ۔ کتاب کے آخر میں ایک رپورتاژ بھی شامل ہے جو مصنف نے اپنی ۳۹ دن کی بیٹی کے غم میں لکھی ۔ جس میں دل سوزی اور

اداسی کی لہر چھائی ہوئی ہے۔بڑے لوگوں کی زندگیاں عام لوگوں کے لئے مشعل راہ ہیں ۔ان کے کارنامے ہماری ہمت بڑھاتے ہیں اور ہمیں بے لوث خدمت کرنے پر ابھارتے ہیں۔ عظیم لوگ خدا کا عطیہ ہوتے ہیں۔انہیں لوگوں کی وجہ سے دنیا ترقی کی منازل تیز تر طے کرتی ہے۔ صمدانی صاحب نے کتاب لکھ کر جہاں ان عظیم شخصیات سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا وہیں یہ بھی ثابت کردیا ہے آپ کہنہ مشق لائبریرین اور مشفق استاد ہی نہیں ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔

تبصرہ نگار: اکرام الحق : لائبریرین ،آرمڈ فورسز پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ،راولپنڈی

(شائع شدہ، پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جرنل، جلد ۴۲، شمارہ ۱، مارچ ۲۰۱۱ ء)

جامعہ کراچی میں میرا زمانہ طالبِ علمی۔ گزرے دنوں کی کچھ یادیں

یوں تو طالب علمی کا پورا زمانہ کسی بھی انسان کی زندگی کا ایک یادگار اور خوش گوارار دور ہوا کرتا ہے لیکن یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے گزارے ہوئے دنوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس کی ایک وجہ بہ طور طالب علم اس کا یہ دور شباب کا دور ہوتا ہے اور اس کی حیثیت بہ طور طالب علم اختتام پذیر ہو رہی ہوتی ہے، وہ طالب علمی کو خیر باد کہنے اور عملی زندگی میں داخل ہونے جارہا ہوتا ہے۔ علم حاصل کرنے کا عمل کسی مرحلے پر بھی اختتام نہیں ہوتا، یہ عمل تو ساری زندگی جاری و ساری رہتا ہے۔ اسکول اور کالج کے دور سے گزر کر انسان میں سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہوچکی ہوتی ہے، یونیورسٹی کے تجربات اس کی اس صلاحیت کو نکھار اور سنوار کر زندگی کے دھارے میں بہنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ جامعہ میں گزارے ہوئے شب و روز تمام زندگی ذہن پر نقش رہتے ہیں، اساتذہ اور ساتھیوں کے ساتھ بیتا ہوا دور ایک یادگار بن کر انسان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔ مَیں نے اول جماعت سے ایم اے تک ریگولر تعلیم حاصل کی، سولہ سال کے اس تعلیمی عمل میں کوئی گیپ نہیں آیا، میرے والدین کی مالی حیثیت معمولی تھی لیکن چاہتے تھے کہ ان کی اولاد تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو اور ایسا ہی ہوا۔ مَیں نے

گھر پر قرآن کریم پڑھا، اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ کراچی کا رخ کیا، لائبریری سائنس میں پھر علم سیاسیات میں ایم اے کیا، حصول تعلیم کا عمل جاری رکھتے ہوئے ۲۰۰۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ترکی زبان، سندھی زبان، کمپیوٹر، انتظامیات اور دیگر کئی موضوعات کے کورسیز بھی کیے۔

مَیں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس کیسے پہنچا؟ اس کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ مَیں ۱۹۷۰ میں بی اے کرنے کے بعد معاشیات میں ایم اے کرنے کی خواہش لیے جامعہ کراچی پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ جامعہ کے شعبہ لائبریری سائنس میں اکرم صاحب ہوتے ہیں۔ اکرم صاحب اور میرے والد حقیقی ماموں، پھوپھی زاد بھائی ہیں اس رشتہ سے آپ میرے چچا ہوئے، نجی زندگی میں ہم انہیں اکرم چچا کہتے ہیں، ان سے بہتر رہ نمائی کون کرسکتا تھا۔ چنانچہ مَیں سیدھا ان کے شعبے میں چلا گیا، شعبہ لائبریری سائنس اس وقت جامعہ کراچی کی مرکزی لائبریری کی پانچویں منزل پر تھا۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے تھے، ایک میز کرسی اکرم صاحب کی تھی، ایک پر سید جلال الدین حیدر اور ایک پر اظہار الحق ضیاء براجمان تھے، بعد میں تینوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں بیٹھنے لگے تھے۔ مدعا بیان کیا کہ میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لینے کی خواہش رکھتا ہوں تا کہ اکنامکس میں ایم اے کرسکوں، ارادہ بینکر بننے کا ہے۔ اکرم صاحب

جو شعبے کے ایک سینئر استاد اور انتظامی امور سے بھی وابستہ تھے ، محبت اور پیار سے بٹھایا خوش ہوئے کہنے لگے کہ میں کلاس میں جارہا ہوں واپس آ کر تفصیل سے بات کرتے ، ہیں۔ کلاس سے واپس آئے دائیں بائیں ، اِدھر اُدھر کالے گاؤن پہنے ہوئے کئی طلبہ اور طالبات تھے اپنے کمرے میں آئے کچھ دیر ان سے باتیں کرکے انہیں فارغ کیا۔ اب میری جانب متوجہ ہو کر گویا ہوئے ہاں میاں تو آپ اکنامکس میں ایم کرنا چاہتے ہیں ، بہت خوب اچھا خیال ہے، کیا تم نے فارم لے لیا میں نے کہا کہ نہیں' ابھی نہیں لینا ہے۔ پھر گویا ہوئے کہ بھئی یہ جو ہمارا سبجیکٹ ہے لائبریری سائنس یہ بھی ایک پروفیشنل اور ٹیکنکل مضمون ہے اور خاصا اسکوپ ہے اگر تمہیں لکھنے پڑھنے اور کتابوں سے دلچسپی ہے تو اس کے بارے میں بھی سوچو میرا خیال ہے کہ یہ مضمون بھی تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد کہنے لگے چلو گھر چلتے ہیں باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔ کیمپس میں رہا کرتے تھے دس منٹ میں گھر پہنچ گئے۔ محترمہ چچی صاحبہ (بیگم ڈاکٹر سبزواری) سے تعارف کرایا کہنے لگے کہ یہ انیس بھائی کے بڑے صاحبزادے ہیں ماشاء اللہ بی اے کرلیا ہے اور اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ چچی بھی خوش ہوئیں خیریت پوچھی امی ابا اور بہن بھائیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ کچھ دیر میں کھانا میز پر لگ گیا۔ کھانے کے دوران شعبہ لائبریری سائنس میں داخلہ لینے کی پھر بات کی ، محسوس ہوا کہ ان کی یہی خواہش ہے کہ میں اسی شعبہ میں داخلہ لوں ۔

میرے خاندان کے سب ہی لوگ

اکرم صاحب سے بہت متاثر تھے۔ نجی محفلوں میں آپ کا ذکر بہت ہی اچھے الفاظ میں ہوا کرتا تھا اور اب بھی یہی صورت حال ہے میں بھی اکرم صاحب سے بہت متاثر تھا۔ ہمارے خاندان میں اکرم صاحب پہلے فرد تھے جو امریکہ پڑھنے گئے اور یونیورسٹی میں استاد ہوئے۔

میں نے اکرم صاحب کے گھر ہی میں فیصلہ کرلیا کہ میں معاشیات میں نہیں بلکہ لائبریری سائنس میں داخلہ لوں گا۔ لائبریرین شپ میں داخل ہونے کی یہ اولین گھڑی تھی چنانچہ ایک داخلہ فارم اکنامکس میں اور ایک لائبریری سائنس میں جمع کرادیا گیا۔ شعبہ لائبریری سائنس کے انتظامی معاملات میں اس وقت اکرم صاحب ہی کرتا دھرتا تھے چنانچہ داخلہ فہرست میں نام آنا لازمی تھا ایسا ہی ہوا۔ میں نے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ جاکر دیکھا بھی نہیں کہ وہاں کی داخلہ فہرست میں نام آیا یانہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ فیصلے کرچکا تھا۔ اس فیصلہ پر میرے والد صاحب خوش اور مطمئن تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ میں اکرم صاحب کی نگرانی میں بہتر طور پر تعلیم حاصل کرسکوں گا اور شاید ایسا ہی ہوا۔ میں اس وقت تک درمیانہ درجے کا طالب علم ہی تھا جامعہ میں دو سال کے دوران میری صلاحیتوں کو جلا ملی حتیٰ کہ مجھ میں لکھنے کا ذوق پیدا ہوا جو اُسی ماحول، تربیت اور سرپرستی کا نتیجہ ہے۔

پاکستان میں جامعہ کی سطح پر لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ۱۹۵۶ء میں جامعہ کراچی سے ہوا پھر دیگر جامعات نے اس کی تقلید کی۔پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔انھوں نے ڈاکٹر محمود حسین کی کاشوں سے جامعہ کراچی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس کی تدریس کے لیے ملک کا پہلا شعبہ، ۱۰اگست، ۱۹۵۶ء میں قائم کیا۔ ابتدائی طور پر شعبہ جامعہ کے سٹی کیمپس واقع پرنسز اسٹریٹ کی کیمسٹری بلڈنگ میں قائم ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ جامعہ کراچی کے موجودہ کیمپس میں جامعہ کے مرکزی کتب خانہ کی پانچویں منزل پر منتقل ہوا، ۱۹۸۲ء میں اسے کلیہ فنون کے تیسرے بلاک کی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔اب یہ وہیں پر قائم ہے۔

تعلیمی سال ۱۹۷۱ء کے ابتدائی دنوں میں سے کوئی دن تھا، شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ تمام کمروں کے چاروں اطراف کھلی ہوئی جگہ نے کلاس روم کو ضرورت سے زیادہ روشن کردیا تھا بلکہ چبھتی ہوئی روشنی کا احساس نمایاں تھا۔کلاس روم میں کل ۷۷ طلباء جن میں ۴۴ طلباء اور طالبات تھیں۔ یہ ایم اے سال اول (لائبریری سائنس) کی کلاس تھی۔ تمام طلباء ۳۳ نے جامعہ کے شوق میں کالے رنگ کے گاؤن زیب تن کیے ہوئے تھے (اُس زمانے میں جامعہ کے ہر طالب علم کے لیے کالا گاؤن

پہننا لازمی تھا)۔ کلاس روم میں مکمل خاموشی، پہلے دن کے خوف نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی خاموش بنا دیا تھا۔ پہلی کلاس تعارفی کلاس تھی شعبے کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری (مشیر امور طلبہ)،ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر اور اظہار الحق ضیاء کلاس میں موجود تھے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے تمہیدی کلمات کہے، شعبے کا تعارف کرایا، اساتذہ کے بارے میں بتایا، ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی عالم فاضل شخص گفتگو کر رہا ہے۔ گندمی رنگ، قد میں چھوٹے، گٹھا ہوا جسم، روشن آنکھیں، سیاہ بال، کلین شیو، کالے رنگ کے چشمے نے ان کی شخصیت کو حسین بنا دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے ایک استاد اور بھی ہیں جو بیماری کے باعث اوپر نہیں چڑھ سکتے وہ تھے پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید۔

ڈاکٹر عبدالمعید میرے ان اساتذہ میں سے تھے جن کی شخصیت، علمیت اور قابلیت نے میری پیشہ ورانہ زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے، میں نے آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ معید صاحب کو پہلی بار دیکھ کر میرا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک عام انسان نہیں بلکہ علمیت اور قابلیت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ان چند انسانوں میں سے ہیں جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کا حافظہ زبر دست تھا، کتب خانوں کی تاریخ کے حوالے سے آپ کو تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ تاریخیں بھی یاد تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک کہنہ مشق اور قابل استاد اور ایک اچھے مقرر

بھی تھے۔ تقریر کے فن سے خوب واقف تھے البتہ آپ کا تحریری سرمایہ مختصر ہے۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے بنگال لائبریری ایسو سی ایشن ، کلکتہ سے لائبریری سائنس میں سر ٹیفیکیٹ کورس ، مشیگن یونیورسٹی ، امریکہ سے لائبریری سائنس میں ایم ایل ایس ، یونیورسٹی آف ایلونائے ، امریکہ سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی ۔

۱۹۸۱ء میں شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی کی سلور جوبلی کے موقعے پر ایک کتاب بعنوان '' پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستان لائبریرین شپ '' شائع کی تھی ،کتاب کی تعارفی تقریب ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء کو لیاقت میموریل لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی ، اس وقت کے صوبائی وزیر تعلیم جسٹس سید غوث علی شاہ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر عبد المعید صاحب بھی اس تقریب میں شریک تھے جو نائجیریا سے بطور خاص شعبے کی سلور جوبلی میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے اپنے خطاب میں کہا کہ آپ حضرات نے میری جس قدر قدردانی کی ہے معلوم نہیں میں اس کا مستحق ہوں یا نہیں مقررین نے جو کچھ میرے متعلق کہا میں ان کا بے حد
مشکور ہوں۔کتاب کے بارے میں کئی مقررین نے اظہار خیال کیا۔ڈاکٹر اسلم فرخی کا کہنا تھا کہ '' ڈاکٹر عبدالمعید بڑے خوش نصیب استاد ہیں کہ ان کی خدمت میں تحریری تاثرات کا انمٹ یہ ہدیہ دعقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب در اصل وہ جذبہ عقیدت وخلوص

ہے جو نئی نسل نے پرانی نسل کی خدمت میں پیش کیا ہے۔یہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب کی خدمت عملی کا اعتراف ہی نہیں بلکہ اس شرف سعادت کا اعتراف ہے جو علم اور اہل علم کی خصوصیت ہوتا ہے''۔ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کا خاکہ بھی تحریر کیا جو میری کتاب یادوں کی مالا'' میں شامل ہے۔آپ ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء کو کراچی میں اس دنیائے'' فانی سے رحلت کر گئے۔آپ جامعہ کراچی کے قبرستان میں مدفون ہیں، مجھے تجہیز و تدفین میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید کم گفتار، دھیمہ لہجہ، اکثر پیچھے بیٹھے ہوئے طلباء آپ کے لیکچر سے محروم ہی رہا کرتے ،اللہ نے آپ کو قلم کی طاقت سے نوازا، مَیں نے ڈاکٹر صاحب کو مسلسل لکھتے دیکھا،آپ نے بہت لکھا اور خوب لکھا، اپنی بیماری، کمزوریِ صحت کے باوجود قلم کی روانی کو کم نہ ہونے دیا، لکھتے رہے اور چھپتے رہے۔آپ کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جسمانی کمزوری انسان کے بلند مقاصد کے آڑے نہیں آسکتی ۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نگاہ جن کی بلند ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

ڈاکٹر انیس خورشید صاحب نے کراچی لائبریری ایسو ی ایشن کے سرٹیفکیٹ کورس (۱۹۵۲ء) سے پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز کیا، ۱۹۵۷ء میں جامعہ کراچی سے

لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور امریکہ سے ۱۹۵۹ میں ایم ایل آئی
سے ۱۹۶۹ء میں لائبریری (University of Pittsburgh)ایس کیا۔ امریکہ کی
سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان لائبریرین شپ کی وہ
واحد شخصیت ہیں جنھیں حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں
صدارتی تمغہ حسن کارکردگی" سے نوازاجو پاکستان لائبریرین شپ کے لیے بھی ایک"
اعزاز ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے میری ایک کتاب کے بارے میں اپنے ایک خط (۱۸ مئی ۱۹۹۷ء) بہ
نام اختر صدیقی مرحوم اپنی رائے کا اظہاران الفاظ میں کیا"مجھے خوشی ہے کہ تم نے
کی ایک کاپی Bio-Bibliographical Study اپنے بارے میں شائع ہونے والی
مجھے عنایت فرمائی ورنہ میں ایک اچھی کتاب سے شاید محروم رہتا۔ میں نے سرسری
بہت ہی اچھے طورپر کی presentation ، طورپر ہی اسے دیکھا ہے مجھے کتاب اچھی لگی
کو پیش کیا گیا ہے۔کتاب سے آپ کی بھرپورdata گئی ہے اور نہایت عمدگی سے
شخصیت اپنی طرح داری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔تدوین اور ترتیب بھی اچھی ہوئی ہے
یوں کہنا چاہیے کہ اختر ایچ صدیقی کی متنوع اور سدا بہار شخصیت اپنی پوری کتابیاتی سر
گرمیوں کے ساتھ اس کتاب کے ذریعہ بھرپور طورپر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اپنے ایک اور
خط مورخہ ۱۱۹کتوبر ۲۰۰۴ء میں آپ نے تحریر فرمایا، "تمہارا گیارہ اکتوبر کا خط ملا، محمد
(عادل عثمانی (سرکار

کی سوانحی کتابیات کی خوبصورت جلد ملی اور مجلّہ ''روایت'' بھی، خوشی ہوئی، پڑھ تو نہ سکا ہوں لیکن خوشی ہوئی تم جیسے دھن کے پکے لائبریرین نے مرتب کیا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب اب اس دنیا میں نہیں،

پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر شعبے کے با صلاحیت اور محنتی استاد تھے۔ لانبا قد، بھاری جسم، کتابی چہرہ، گندمی رنگت، گھنے سیاہ بال، داڑھی مونچھیں صاف یعنی کلین شیو، ستواں ناک، آنکھیں چھوٹی اور کسی قدر اندر کی جانب، مضبوط ہاتھ پیر، ہونٹ قدرے بڑے ہنستے ہوئے ایک جانب زیادہ ہو جایا کرتے، زیادہ تر پینٹ شرٹ اور کوٹ پتلون لیکن کبھی کبھی شیروانی اور علی گڑھ کاٹ کے پیجامے میں بھی ہوا کرتے تھے جوانی میں بھی وضع دار تھے تمام زندگی اسی وضع داری میں گزار دی، وقت اور، اصولوں کے سخت پابند۔ کلاس میں کبھی دیر سے نہیں پہنچے کلاس میں آئے راسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر مخصوص انداز سے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر کلائی کی جانب وقت دیکھا ساتھ ہی کلاس پر ایک معنی خیز نظر دوڑائی انداز بتا رہا ہوتا کہ دیکھو میں بالکل وقت پر کلاس میں آگیا ہوں۔ جو کچھ پڑھاتے عالمانہ اور فنی انداز سے پڑھاتے البتہ لہجے میں قدرے کرختگی ضرور تھی۔ آپ نے ۵۶ سال کی عمر میں ۱۹۹۴ء میں

لفبرویونیورسٹی، برطانیہ (Loughborough University, UK) سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اب اس دنیا میں نہیں۔ مَیں نے ان کا خاکہ تحریر کیا جو میری کتاب

یادوں کی مالا'' میں شامل ہے۔ان کا انتقال ۱۷ نومبر ۲۰۰۸ء بروز پیر کراچی میں ہوا، سپر ہائی وے پر قائم قبرستان وادیٔ حسین میں تدفین ہوئی۔

ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری شعبے کے مقبول استاد تھے۔ایک اچھے استاد کی طرح خود بھی محنت کرتے اور طلباء سے بھی محنت لیا کرتے تھے۔جی جان سے پڑھایا کرتے تھے،آپ نے اپنے اور طلباء کے درمیان کبھی فاصلہ نہیں رکھا ان سے ہمیشہ پیار، محبت، ہمدردی سے پیش آیا کرتے،آپ نے سعودی عرب میں قیام کے دوران ۱۹۸۳ء میں سینیچری یونیورسٹی کیلی فورنیا،امریکہ سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی، لائبریری سائنس کے موضوع پر شائع ہونے والے رسالہ پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس کے بانی مدیر اعلیٰ ہیں۔امریکن انفارمیشن سینٹر کراچی، شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی اور جامعہ اُم القرآ، مکہ المکرمہ میں خدمات انجام دینے کے بعد اب، امریکہ، کنیڈا اور پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں اور تصنیف وتالیف واشاعت میں وقت گزارتے ہیں۔لمبا قد،دبلے پتلے (اب چھوٹی سی تونداور جسم بھی بھاری)، گورا رنگ، گھنی بھنوئیں، کھڑے خوبصورت نقش، کلین شیو (اب سفید چھوٹی داڑھی)، روشن پیشانی،کتابی چہرے پر وجاہت، شرافت،آنکھوں میں چمک،شائستہ اور شگفتہ لہجہ،مزاج میں بڑی معصومیت، گفتگو میں سوجھ بوجھ اور علمیت کا امتزاج و سنجیدگی اور بردباری، سرتاپا انکسار،چہرے مہرے اور وضع قطع سے مضبوط

ارادے اور قوت فیصلہ کے حامل ، دیکھنے والے ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ، عام طور پر پینٹ اور شرٹ گھر میں ڈھیلے پائچے کا پیجامہ پہنتے ہیں ۔ ساری زندگی وضع داری میں گزاری۔ وقت اور اصولوں کے پابند، کلاس میں کبھی دیر سے نہیں آئے ، شادی و دیگر تقریبات میں وقت مقررہ پر پہنچتے ہیں ۔ متعدد کتابوں اور مضامین کے مصنف و مولف ہیں۔ مَیں نے ان پر ایک سوانحی کتاب 'ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری: شخصیت و علمی خدمات' بھی تحریر کی اس کے علاوہ ان کا خاکہ میری کتاب یادوں کی مالا'' میں شامل ہے ۔''

سبزواری صاحب نے اپنی آپ بیتی ''کیا بیت گئی ؟ قطرہ پہ گہر ہونے تک'' میں میرے بارے میں لکھا ''رئیس میاں ماشاء اللہ تقریر و تحریر میں ماہر القادری ہیں۔ سوانح نگاری میں کمال حاصل کیا ہے۔ اختر صدیقی صاحب ، محمد عادم عثمانی صاحب ، میری اور کئی حضرات کے سوانحی خاکے اور مضامین کی شکل میں شائع کر چکے ہیں۔ اپنے پر دادا شیخ محمد ابرہیم آزاؔد صاحب کا دیوان اپنے چچا مغیث احمد صمدانی صاحب کی خواہش پر دوبارہ شائع کیا ہے۔ شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں جو اُن کو ورثہ میں ملا ہے۔ غالباً شاعری کرتے ہیں لیکن باقاعدہ ابھی منظر عام پر نہیں لا رہے ہیں۔ حال ہی میں جامعہ ہمدرد سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرکے اب ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی بن گئے ہیں''۔

ڈاکٹر سبزواری کی بڑائی تو دیکھیے کہ اپنی اس آپ بیتی میں مجھ کم تر سے ' اظہاریہ ' لکھوایا۔ کیوں کہ استاد کا حکم تھا اس لیے تعمیل کی اور اس آپ بیتی کے بارے میں لکھا

یہ آپ بیتی ڈاکٹر سبزواری کی ۷۳ سالہ زندگی کی یادوں ، ذاتی تاثرات و مشاہدات " اور تجربات کی ایک حسین ، دلچسپ ، تاریخی و سماجی واقعات کی دستاویز ہے۔ اس میں مصنف کے حوالہ سے واقعات بھی ہیں، تاثرات بھی،، تجربات بھی ہیں مشاہدات بھی، شخصیات بھی ہیں ادارے بھی، والدین بھی ہیں بہن بھائی بھی، شریک سفر بھی ہے بچے بھی، دوست بھی ہیں رشتے دار بھی، استاد بھی ہیں شاگرد بھی، محبوب بھی ہیں محبان بھی، الغرض اس

آپ بیتی کی صورت میں ڈاکٹر سبزواری کی یادوں کی بارات چھم چھم کرتی چلی آئی ہے "۔

استادوں میں اظہار الحق ضیاء بھی تھے۔ ابتدا میں سندھ مسلم کالج کے لائبریرین تھے، یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز، آسٹریلیا سے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کرکے واپس آئے تو شعبے میں استاد ہو گئے، پھر نائیجیریا چلے، آج کل ریٹائر لائف امریکہ میں گزار رہے ہیں۔ لمبا قد، گورا رنگ، بھاری گٹھا ہوا مضبوط جسم، چوڑا سینہ، کالے بال، کشادہ پیشانی، تیکھے نقوش، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، بھرا بھرا چہرہ، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی

مسکراہٹ، طلباء ان سے خوش رہا کرتے تھے کیونکہ یہ طلباء سے دوستانہ مراسم رکھنے کے قائل تھے۔ تعلق بہار شریف سے تھا،ڈاکٹر عبد المعید صاحب کے دور پرے کے عزیز وں میں سے تھے۔بہت سالوں سے انہیں نہیں دیکھا، ای میل پر رابطے میں رہتے ہیں۔
ممتاز بیگم جزو وقتی استاد تھیں اور اسپیشل لائبریری کا کورس پڑھایا کرتی تھیں۔ان کی اس کلاس میں سائنس گریجویٹ یا پڑھائی میں ذہین طلباء ہی ہوا کرتے تھے، میرے پاس بھی یہ کورس تھا۔ ممتاز بیگم کراچی یونیورسٹی سے بوٹنی میں ایم ایس سی اور لندن سے لائبریری وانفارمیشن سائنس میں ایم اے تھیں۔اس سے پہلے جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کر چکی تھیں،پینسڈاک (PANSDOC) جو بعد میں پاسٹک (PASTIC) بن گیا سے وابستہ تھیں ، پھر لیاقت میموریل لائبریری کی ڈپٹی ڈائریکٹر پرنسپل لائبریرین بھی رہیں، خوش مزاج، خوش گفتار،پر خلوص ، ملن سار، شائستہ اور مہذب۔درمیانہ قد، دبلی پتلی ، کالا رنگ، جاذبِ نظر نقوش، کھڑی ناک، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک،کالے بال اب سفیدی نمایاں، سفید موتی جیسے دانت جو مسکراتے وقت زیادہ حسین لگا کرتے ، سنجیدہ طرز گفتگو، صورت شکل، وضع قطع،چہرے مہرے سب سے شرافت ، تحمل ، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار اور مشرقیت کا اعلیٰ نمونہ۔ادبی ذوق کی مالک ، شاعرہ بھی۔کار از خود ڈرائیو کرکے آیا کرتی

تھیں، عام طور پر کلاس شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی شعبہ میں آجایا کرتیں لیکن کلاس کے وقت کا انتظار اپنی کار میں بیٹھ کر کیا کرتیں۔ محنت سے پڑھایا کرتیں۔ میرے زمانہ طالب علمی میں شعبہ میں تمام ہی اساتذہ اپنے اپنے طور پر قابل اور موضوع پر مکمل گرفت رکھتے تھے۔ مجھے اپنے تمام ہی اساتذہ پر فخر ہے۔

محمد عادل عثمانی صاحب جامعہ کی لائبریری میں اس وقت ڈپٹی لائبریرین اور شعبے میں جذوقتی استاد بھی تھے لیکن جب میں نے داخلہ لیا تو آپ بہ سلسلہ ملازمت سعودی عرب آچکے تھے جس کے باعث میں ان کی براہِ راست شاگردی سے محروم رہا۔ جب میں نے ایم اے کر لیا تو عثمانی صاحب واپس آگئے، میں ایم اے مکمل کرکے فارغ ہوا ہی تھا ابھی نتیجہ آئے ہوئے مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ سبزواری صاحب نے کہا کہ آپ یونیورسٹی لائبریری میں عادل عثمانی صاحب کے پاس چلے جائیں، میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ میں پہلی فرصت میں لائبریری چلا گیا، میں نے اپنا نام بتایا اور اکرم صاحب کا حوالہ دیا۔ بہت ہی شفقت اور محبت سے بیٹھنے کو کہا۔ عثمانی صاحب کو پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انتہائی بردبار، مہذب، بااخلاق، درمیانہ قد، مناسب جسم، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، گھنے سیاہ بال، کلین شیو، ستواں ناک، روشن پیشانی، کتابی چہرہ، روشن آنکھیں، وضع دار، وقت اور اصولوں کے سخت پابند۔ گفتگو

میں شگفتگی، شائستگی، دھیمہ پن اور عالمانہ انداز گفتگو جیسی صفات آپ میں نمایاں تھیں۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ایک فارم دیا کہ اسے بھر دیجیے اور متعلقہ آفس میں جمع کرادیں کل سے آپ کی نوکری شروع۔ یہ میری زندگی کی اولین ملازمت تھی جو ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ کاغذی کاروائی کے بعد مجھے لائبریری کے ریسرچ ریڈنگ روم میں بھیج دیا گیا یہ دور ذوالفقار علی بھٹو کا تھا انہوں نے تعلیم یافتہ افراد کے لیے ایک اسکیم کا آغاز کیا تھا جو NDVP کہلاتی تھی میرا یہ تقرر بھی اسی پروگرام کے تحت تھا جو صرف چار ماہ قائم رہا کیوں کہ میرا تقرر حکومت سندھ کے محکمہ تعلیم کے ایک کالج میں گریڈ ۱۷ میں ہوگیا۔ اس طرح عثمانی صاحب کے ساتھ میرا آفیسر اور ماتحت کا تعلق قائم ہوا۔ عثمانی صاحب سے بعد میں بھی تعلق قائم رہا۔ مَیں نے ۲۰۰۴ء میں عادل عثمانی صاحب پر انگریزی میں ایک سوانحی کتاب بھی مرتب کی تھی، عثمانی صاحب کا خاکہ بھی لکھا جو میری کتاب ''یادوں کی مالا'' میں شامل ہے۔ عثمانی صاحب کافی عرصے بیمار رہے، سعودی عرب میں ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو حکم الٰہی کو لبیک کہا، جنت المعلیٰ میں جگہ پائی ہے۔

جامعہ کراچی میں سمسٹر نظام رائج نہیں ہوا تھا بلکہ سالانہ طریقہ امتحان ہی پر عمل ہو رہا تھا۔ لائبریری سائنس ہم تمام طلباء کے لیے بالکل ہی نیا موضوع تھا۔ ہم نے کیٹلاگ یا کیٹلاگنگ ، ببلو گرافی، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفیکشن ، ریفرنس سروس جیسے الفاظ پہلی بار ہی سنے تھے۔ یہ ہمارے اساتذہ کا کمال ہی تھا کہ نئے موضوعات کو اس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ سمجھایا اور سکھایا کہ ہماری دلچسپی اس مضمون سے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ راقم الحروف کیوں کہ یہ ارادہ لیے جامعہ میں داخل ہوا تھا کہ اس سبجیکٹ میں ماسٹر کرنا ہے چنانچہ تمام تر سرگرمیوں سے دور رہتے ہوئے پڑھائی کی جانب توجہ مرکوز رکھی۔ایک وجہ چچا کا خوف اور ڈر بھی تھا۔ میں تو اسکول سے گریجویشن تک درمیانے درجے کا طالب علم رہا تھا لیکن شعبہ لائبریری سائنس میں تعلیم کے دوران زیادہ محنت کی، مضمون میں حد درجہ دلچسپی لی، غیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ نہیں لیا شرکت کی حد تک شامل ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ میری فرسٹ ڈویژن آئی اور لکھنے اور پڑھنے کی جانب بھی مائل ہو گیا۔ایم اے فائنل میں تھیسس لکھنا اس وقت لازمی تھا چنانچہ میں نے بھی مقالہ تحریر کیا، مقالہ کا عنوان تھا 'اردو میں سائنسی و فنی ادب ؛ منتخبہ کتابیات ۱۹۴۷ء ۔ ۱۹۷۱ء '، اس مشقت اور محنت نے مجھے کتابوں کے زیادہ قریب کر دیا اور مجھ میں لکھنے کا شوق اور لگن پیدا ہوئی ۔

فائنل ایر کے امتحانات نزدیک آئے تو کلاس کے چند ساتھیوں نے زیادہ محنت کرنے اور اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی حکمت عملی یہ اختیار کی کہ وہ ساتھی جو کیمپس سے باہر رہا کرتے تھے کیمپس میں کچھ دن کے لیے کوئی جگہ لے لیں اور وہاں منتقل ہو جائیں، تاکہ پڑھائی میں یک سوئی پیدا ہو سکے۔ اب جگہ کی تلاش شروع ہوئی، ہاسٹل میں جگہ نہیں ملی ، میرے دوست عابد قریشی نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے جامعہ کراچی کے پولٹری فام کے نزدیک ایک کمرہ حاصل کرلیا اب مَیں، عابد قریشی اور عزیز خان اس کمرے میں منتقل ہو گئے، سبزواری صاحب کیمپس میں رہا کرتے تھے انھیں ہمارے اس منصوبے کا علم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہم پولٹری فارم کے کسی کمرہ میں منتقل ہوگئے ہیں تو پہلے تو انھوں نے ہمیں اپنے گھر منتقل ہونے کو کہا، جب ہم سب نے معذرت چاہیں تو وہ خاموش ہوگئے لیکن ہر روز رات میں ہمارے کمرہ میں آجایا کرتے اور ہماری رہنمائی کیا کرتے ۔اس حکمت عملی کا یہ نیتجہ ہوا کہ ہم تینوں دوست اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اس وقت ڈویژن ہوا کرتی تھی ہماری فرسٹ ڈویژن آئی۔

جامعہ میں میرے یہ دو سال بہت ہی یادگار تھے، جب میں جامعہ میں داخل ہوا، شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب تھے، جب میں فائنل ایر میں آیا تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ریٹائر ہوگئے اور پروفیسر ڈاکٹر محمود

حسین نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ذمے داریوں کا آغاز کیا، ہمارے شعبے کی جانب سے دونوں شخصیات کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے لیے الوداعیا تھا جب کہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے لیے ویلکم پارٹی تھی۔جامعہ کراچی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے دور میں ہی عمل میں آیا، انھوں نے شعبے کے قیام کی حوصلہ افزائی بھی کی جب کہ ڈاکٹر محمود حسین جو پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے اولین صدر تھے اور لائبریرینز کی بہت حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی پہلی کانفرنس جو ۱۹۵۸ء میں کراچی میں منعقد ہوئی تھی کی صدارت اس وقت کے صدر مملکت میجر جنرل اسکندر مرزا نے کی تھی، یہ ڈاکٹر محمود حسین کی کوششوں سے ہی یہ ممکن ہو سکا تھا۔

ایم اے سال دوم کی کلاس ۶۰ اور فائنل کی ۷۰ طلباء و طالبات پر مشتمل تھی، طالبات کی تعداد زیادہ تھی۔ویسے تو تمام ہی ساتھیوں سے تعلقات اچھے تھے لیکن عام طور پر کلاس میں چھوٹے چھوٹے گروپ لازمی تشکیل پاتے ہیں،ایک طالبہ عطیہ عباس تھی، وہ برقعہ پہنا کرتی تھی، اس کا ظاہری روپ ، عادات و اطوار اس کی سادگی اور ذہین ہونے کا پتا دیتی تھیں۔ فارغ وقت میں انگریزی ناول پڑھتی نظر آیا کرتی تھی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی زندگی میں ایسا تغیر آیا کہ وہ زمانہ طالب علمی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی، برقعہ اتر گیا تھا

بال کٹ گئے تھے، ماڈرن ہو گئی تھی ، پھر پتا چلا کہ وہ کسی ایسے ماحول میں پھنس گئی کہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی،ایک اور طالبہ یاسمین شفیع بھی تھی،پڑھنے میں تو عام سی تھی لیکن اس کی آواز میں سریلا پن تھا، سر وتار سے آشنا تھی، غزلیں اچھی گایا کرتی تھی، اس کے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ وہ بھی ایسے ماحول میں پھنسی کہ اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی۔ جبار اور منظور کی منفرد جوڑی تھی، یہ دونوں ایک ساتھ رہتے، مزاہیہ جملوں کا استعمال خوب کیا کرتے تھے۔ منظور کو اللہ نے جلد اپنے پاس بلا لیا۔ یہ پہلے ملک سے باہر چلے گئے واپس آ کر این ای ڈی یونیوسٹی لائبریری سے وابستہ رہے۔ غلام اقبال الدین کو ہم کمانڈر کہا کرتے تھے، یہ بنگلہ دیش سے آئے تھے، کالج لائبریرین رہے، بہار کالونی میں رہائش تھی، اکثر میرے گھر آ جایا کرتے، یہ بھی جلد اللہ کے گھر چلے گئے۔ دیگر کلاس فیلوز میں عذرا قریشی کلاس کی قابل اور ذہین طالبہ میں سے تھی، یہ ملک سے باہر رہی تھی ، انگریزی روانی سے بولا کرتی تھی، امریکہ کی کینٹ اسٹیٹ یونیورسٹی، اوہی او سے بھی لائبریری سائنس میں ایم اے کیا، انٹر نیشنل اسکول بنکاک امریکن سینٹر کراچی، کنگ عبد العزیز یونیورسٹی، جدہ اور ۲۰۰۹ء میں آغا خان، یونیورسٹی کی چیف لائبریرین کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں،آجکل میرے ساتھ اسکول آف لائبریرین شپ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ مختار اشرف اردو یونیورسٹی کی ڈاکٹر مولوی عبد الحق لائبریری سے وابستہ رہے، عابد قریشی پی آئی اے کی ٹیکنکل لائبریری سے

منسلک تھے۔یامین قریشی۔برٹش کونسل میں تھے ، پھر باہر چلے گئے اب واپس آکر کسی لائبریری سے منسلک ہیں۔جاوید سلطانہ ملک سے باہر چلی گئی تھیں اب شاہ ولایت اسکول کی لائبریری سے منسلک ہیں۔امتہ الاشمیم، عائشہ نگہت، سید اکبر علی اکبر بھائی کہے جاتے تھے، کالج لائبریرین رہے،غلام سرور، ارجمند بانو، محمد اسلم، محمد ایوب، عزیز خان جامعہ کراچی کے کتب خانے سے وابستہ تھے ، فرخندہ جبیں، سید ہدایت اللہ ہادی ، عربی اور اسلامیات میں بھی ایم اے ہیں ، لیاقت میموریل لائبریری سے وابستہ رہے، کنیڈا میں مقیم ہیں، اس وقت جامعہ احمدیہ کنیڈاکے اعزازی فیکلٹی ممبر ہیں، محمد ادریس، سید افتخار حسین، جہان خان، عذرا جمیل ، کالج لائبریرین رہیں، محمد جمیل حسین مرحوم پریمئر کالج میں تھے ، خوشنود قیصر۔برٹش کونسل میں تھے پھر ملک سے باہر چلے گئے، خالدہ اختر، بابئے جمشید مالی، بشارت حسین مرزا، مفتی مقصود احمد، سید محمد احمد مرحوم، مختار اختر جامعہ کراچی کی لائبریری سے منسلک تھیں، ریٹائر ہوگئیں، مظفر احمد ، ظفر حسین نقوی، نسرین اختر، سید ناظر علی ڈی جے کالج سے وابستہ تھے ، قمر جہاں، قمر قاضی،عذرا نسرین قریشی، رابعہ سلطانہ، رفعت، محمد رشید، شبنم سلطانہ رضوی ، کالج لائبریرین رہیں ، سمیع اللہ مرحوم، کالج لائبریرین رہے ،سائرہ بانو،ثروت جہاں، جمیلہ شکور، مسرت شمس الدین، شمس القمر، طیبے شیرازی، ادیبہ بانو صدیقی، فرزانہ طلعت صدیقی، عبدالکریم، طلعت نسرین ، کالج لائبریرین رہیں، تنور حسین، حبیب جہاں وارثی، ، محمد یعقوب

محمد یاسین خان اور محمد یوسف کالج لائبریرین تھے، اب امریکہ میں ہیں شامل تھے۔
شعبے میں نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ہم نصابی سرگرمیوں پر بھی بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔ کتب خانوں کے مطالعاتی اور تفریحی دورے ہر سال ترتیب پاتے، کراچی سے پشاور، اسلام آباد، لاہور، ملتان، بہاولپور، کوئٹہ عام سے بات تھی۔۱۹۷۱ء میں کوئٹہ زیارت کا تعلیمی پروگرام ترتیب دیا گیا۔ تقریباً ۶۰ طلبا کا قافلہ کراچی سے بذریعہ ٹرین، کوئٹہ کے لیے روانہ ہوا، کوئٹہ میں تمام طلباء ریلوے اکیڈمی کے بڑے آڈیٹوریم میں ٹھرے جب کہ اساتذہ اور طالبات برابر گیسٹ روم میں تھے۔ افتخار خواجہ (اب ڈاکٹر افتخار خواجہ ہیں) جو ایک سال قبل اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس کوئٹہ میں اپنی ملازمت شروع کر چکے تھے اور آبان رستم جی اپنے اساتذہ اور شعبے کے طلباء کے میزبان تھے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر تمام لوگ بشمول اساتذہ کے آڈیٹوریم میں بیٹھ گئے اور پروگرام یہ بنا کہ ہر ایک کچھ نہ کچھ سنائے گا۔ اس پر مکمل طور پر تو عمل نہ ہو سکا لیکن کئی طلباء نے اپنے جوہر دکھائے۔ اساتذہ میں صرف اکرم صاحب نے طلباء کا ساتھ دیا ایک غزل ترنم کے ساتھ سنائی۔ بعض اچھے گانے والے بھی تھے ان میں ایک طالبہ یاسمین شفیع (مرحومہ) کی آواز اور طرز بہت اچھی تھی۔اس پروگرام کو خاموشی سے ریکارڈ بھی کیا جا رہا تھا۔ پروگرام ختم ہوا

سب لوگ سو گئے۔ کسی کو یہ شرارت سوجھی صبح سویرے ابھی پوری طرح روشنی بھی نہیں ہوئی تھی البتہ پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ آڈیٹوریم میں مائک موجود تھا اکرم صاحب کی گائی ہوئی غزل ' آہ یہ
دور زندگی ' ۔۔ تیز آواز میں لگا دی گئی اب تمام لوگ حیران و پریشان کہ صبح ہی صبح اکرم صاحب کو کیا ہوگیا حتیٰ کہ اکرم صاحب خود بھی آ موجود ہوئے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کرکے ٹیپ بند کرایا۔

کوئٹہ سے زیارت کا پروگرام بھی تھا ہم تمام طلباء و طالبات دو بسوں میں کوئٹہ سے زیارت کے لیے روانہ ہوئے، صبح سویرے سب نے ڈٹ کر ناشتہ کیا، کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ ہم نے بلندی پر جانا ہے، آدھے سے زیادہ سفر آرام سے گزرگیا، بسیں تیز رفتاری سے اوپر کی جانب دوڑے چلی جارہی تھیں،انڈے اور پراٹھوں نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا، کسی ایک کو متلی شروع ہوئی، آہستہ آہستہ متلی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مجبوراً بسوں کو روکنا پڑا، اب یہ منظر قابل دید تھا، سڑک کے کنارے میدان ہی میدان، تمام طلبہ و طالبات بسوں سے اتر کر اِدھر اُدھر کھڑے متلی کر رہے تھے۔ جب تمام کے انڈے اور پراٹھے باہر آ گئے، سب نے سکون کا سانس لیا، سفر دوبارہ شروع ہوا، زیارت پہنچ کر قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بیماری کے دنوں کی آخری آرام گاہ کو دیکھا، یہاں سے کافی فاصلے پر کسی بزرگ کا مزار ہے، پروگرام میں اس مزار

پر جانا بھی تھا تمام طلباء و طالبات کا قافلہ اساتذہ کی سربراہی میں آگے پیچھے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پر خطر راستے سے ہوتے ہوئے اس مزار پر پہنچے، ڈاکٹر عبد المعید مرحوم، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری، ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر مرحوم اور اظہار الحق ضیاء ہمارے ساتھ تھے، یہ ایک یادگار سفر تھا، کوئٹہ میں موجود شعبے کے سابق طلباء خاص طور پر ڈاکٹر خواجہ افتخار ہمارا خوب خیال رکھا، خواجہ افتخار جواب پروفیسر ڈاکٹر خواجہ افتخار ہیں، شعبہ ایجوکیشن سے صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے انتہائی سنجیدہ، بردبار ہیں زمانہ طالب علمی میں اتنے ہی شوخ و چنچل ہوا کرتے تھے، کوئٹہ اکیڈمی میں طلباء کے قیام کے دوران ان کا سائیکل چلانا، کلو پیٹرا کی حیثیت کا روپ اختیار کرنا، غلام اقبال الدین کا پریشان کرنا، اس زمانہ کی یادگاریں ہیں۔

ایم اے سال سال دوم میں اسلام آباد جانے کا پروگرام ترتیب دیا گیا، سفر ٹرین سے کرنا تھا، ریل کی ۶۵ افراد کی بوگی ریزرو کرانے کی ذمہ داری میری تھی، میرے والد صاحب کے ایک جاننے والے ریزرویشن میں تھے مَیں نے ان کے توسط سے ریل کی بوگی کراچی سے لاہور میں قیام کے بعد راولپنڈی جانے اور واپسی تک وہ بوگی ہمارے زیر استعمال رہی، کئی اسٹیشنز پر شعبے کے سابق طلباء جنہیں اس پروگرام کا علم ہوا آتے رہے اور اپنے اساتذہ کی خدمت میں مختلف

قسم کی چیزیں لاتے۔ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں قیام رہا، اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی جو تعمیر کے مراحل میں تھی میں قیام تھا۔ ایک دن کے لیے مری بھی گئے۔ شعبے کے تمام طلبا پکنک منانے ساحل سمندر گئے شعبہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر عبدالمعید، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزوری (اس وقت ڈاکٹر نہیں تھے)، ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر (اس وقت ڈاکٹر نہیں تھے)، اختر حنیف، اظہار الحق ضیاء اور ممتاز بیگم بھی تھیں۔ چند طلباء جن میں افتخار خواجہ (اب ڈاکٹر افتخار الدین خواجہ ہیں) بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے بانی صدر شعبہ ہوئے بعد از آں شعبہ تعلیم سے ریٹائر ہوئے، رموز احمد خان (اس وقت شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے صدر شعبہ ہیں)، عبدالجبار اور منظور الکریم (مرحوم) اس تماشے کے بنیادی کردار تھے۔ رموز احمد خان کو سر سے پیر تک سفید چادر ڈال کر زمیں پر لٹا دیا گیااور افتخار خواجہ نے ان سے سوالات دریافت کرنا شروع کیے۔ ان کے چاروں جانب طلباء اور اساتذہ کھڑے تھے۔ پہلے ڈاکٹر عبد المعید کی جانب اشارہ کیااور پوچھا یہ کون ہیں ؟ جواب دیا گیا کہ ڈاکٹر عبد المعید، پوچھا کہ یہ اس وقت کہاں ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں جواب دیا گیا کہ یہ اس وقت آشور بنی پال کے کتب خانے میں ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ میں اس کتب خانے کی کتابیں جو مٹی کی

تختیاں ہیں کس طرح اپنے ساتھ لے جاؤں۔ (زور دار قہقہ اور تالیاں)، پھر سبزواری صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں؟ جواب دیا کہ یہ سر اکرم ہیں اور اس وقت سوچ رہے ہیں کہ پکنک پر آئے ہوئے جن طلباء نے چندہ نہیں دیا ان سے کیسے وصول کیا جائے اس کے بعد تماشہ گر نے جلال صاحب کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں؟ جواب دیا یہ سر جلال ہیں اور اس وقت سوچ رہے ہیں کہ ۲۵ نمبر میں سے کس کس کو زیرو نمبر دوں اس جواب پر تمام لوگوں نے زور دار قہقہہ لگایا (واضح رہے کہ جلال صاحب دوران لیکچر ۲۵ نمبروں کا خوف بہت زیادہ دلایا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض طلبہ نے انہیں سر ۲۵ نمبر بھی کہنا شروع کر دیا تھا)، اسی طرح اختر حنیف صاحب مرحوم کے لیے بھی ان کی خصوصیات کی مناسبت سے مزاحیہ جملہ کہا گیا۔

شعبے میں منظر اور اسلام الدین دو دفتری تھے، منظر کو طلباء ڈاکٹر منظر بھی کہا کرتے تھے یہ تمام ہی اساتذہ کا چہیتا تھا خاص طور پر ڈاکٹر عبدالمعید اور سبزواری صاحب کا یہ اعتماد، خدمت گزار، اس نے شعبے میں چائے خانہ بھی قائم کیا ہوا تھا جو ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کے اوپر کی منزل پر تھا، ایک طرح سے اس کا قہوہ خانہ مخصوص طلباء کے ملاپ اور وقت گزارنے کی جگہ بھی تھی، اکثر طلباء جب آئندہ ملنے کا پروگرام طے کرتے تو دن اور وقت طے کرکے

یہ کہا کرتے کہ "ٹھیک ہے پھر ڈاکٹر منظر کے پاس ملتے ہیں"، منظر کا قہوہ خانہ طلباء و طالبات سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔

ڈاکٹر انیس خورشید صاحب اپنی ٹانگوں کی تکلیف کے باعث اوپر نہیں جا سکتے تھے، ان کا کمرہ لائبریری کی زمینی منزل پر تھا، اسلام الدین ڈاکٹر انیس خورشید کا خدمت گزار تھا، یہ زیادہ تر نیچے ہی رہا کرتا تھا، سنجیدہ ،بردباراور اچھی عمر کاانسان تھا، ایک دن ہم ڈاکٹر انیس خورشید صاحب کی ببلو گرافی کی کلاس جو نیچے ہی ہوا کرتی تھی لے کر نکلے ہی تھے کہ اسلام الدین شیخ ڈاکٹر انیس خورشید صاحب کے کمرہ کے سامنے دھڑام سے نیچے گر گیا، ہم اس کے قریب ہی تھے ایک دم اس کی جانب لپکے، دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا، ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اس کے اوپر پانی کی بالٹی الٹ دی ہے، ہم اپنی کتابوں سے اسے ہوا کرتے رہے، محسوس ہوا کہ اسے دہ ہوئیل کا دورہ پڑا ہے، اُسے اٹھا کر جامعہ کی ڈپنسری لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی ، میرا ایک ہاتھ اس کی نس پر تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نس ڈوبتی ہی چلی گئی اور وہ ہمارے ہاتھوں اور نظروں کے سامنے اللہ کو پیارا ہوگیا، ملیر میں رہا کرتا تھا، ہم اس کے جسد خاکی کو جامعہ کی ایمبولینس میں لے کر اس کے گھر ملیر گئے اور اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی، اسلام الدین کے بیٹے کو جامعہ میں ملازمت دیدی گئی، وہ جامعہ کے انتظامی یونٹ میں کام کرتا ہے۔

جب کبھی اسے دیکھتا ہوں تو اسلام الدین یاد آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے۔

جامعہ کراچی میں طالب علم کی حیثیت سے گزارے ہوئے دو سال میری زندگی کا قیمتی سرمایا ہیں۔ انھی دو سالوں میں مَیں نے زندگی کو صحیح معنوں میں برتنے کا سلیقہ سیکھا، عملی زندگی میں قدم رکھنے کے طور طریقے سیکھے۔ جامعہ کراچی میں گزارے ہوئے انھی دو سالوں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مجھ میں زندگی کو سمجھنے، برتنے اور گزارنے کا ڈھنگ آگیا، آج میں جو کچھ بھی ہوں، مَیں نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اور اپنے علم، تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر نئی نسل کو تحریر کی صورت میں کچھ بھی دے سکا ہوں اسی مادر علمی کے طفیل ممکن ہوا۔ تیس سے زیادہ کتابیں اور ۲۵۰ سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اردو ویب سائٹ ''ہماری ویب Hamari Web'' پر ۵۰ مضامین آن لائن ہیں۔

کراچی ۱۶ نومبر ۲۰۱۱ء

(مصنف کی کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' میں شامل)

،سعودی عرب کے شہر جدہ کی 'پانی پر تیرتی مسجد

(Floating Mosque, Jeddah)

مساجد اللہ کا گھر ہوتی ہیں انہیں خوب سے خوب تر تعمیر کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ رہا ہے۔ یوں تو دنیا کے ہر ملک میں حسین سے حسین مساجد موجود ہیں لیکن سعودی عرب مکمل طور پر مسجدوں کو ملک ہے۔دنیا کی اولین عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے معرض وجود میں آئی خانہ کعبہ تھی۔ یہ اللہ تبارک و تعالٰی کا پہلا گھر ہے۔کلام مجید کی سورۃ آلِ عمران آیت ۹۶، ۹۷ میں ارشاد باری تعالٰی ہے (ترجمہ) ''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔اس کو خیر و برکت دی گئی اور تمام جہاں والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں' ابراہیم علیہ السلام کا مقام عبادت ہے' اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہوگیا''۔

سعودی عرب میں مساجد کی تعمیر اور دلکشی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ہر مسجد اپنی جگہ متبرک ہونے کے ساتھ ساتھ حسین ہے لیکن اماں حوا کے شہر جدہ

میں ایک مسجد ایسی بھی ہے جو پانی پر تیرتی مسجد کہی جاتی ہے۔ دستاویزات میں اس کا نام 'الرحمہ مسجد' (Al-Rahma) ہے، عام شہری اسے 'فاطمۃ الزہرہ مسجد' بھی کہتے ہیں لیکن یہ پانی پر تیرتی مسجد (Floating Mosque) کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس طرح کی ایک مسجد ملائشیاء میں بھی موجود ہے لیکن جدہ کی یہ مسجد جدید طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلامی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ۶ دسمبر ۲۰۱۳ء کی شام میں، شہناز، عدیل، مہوش اور اپنے پوتے صائم کے ہمراہ جدہ کے ساحل پر تھا۔ جوں ہی ہم یہاں پہنچے عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ اسی مسجد میں نماز باجماعت ادا کی۔

سعودی عرب کی مساجد میں خواتین کے علیحدہ جگہ موجود ہوتی ہے۔ مسجد کے اندر کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل تھی۔ مکمل قالین اور ائر کنڈیشن تو سعودی عرب میں عام سے بات ہے۔ مسجد کی کھڑکیوں سے باہر کی جانب کا نظارہ کس قدر حسین منظر پیش کر رہا تھا۔

تین جانب دور دور تک بحر احمر اپنی دلکشی دکھا رہا تھا، پانی کی لہریں سبک رفتاری کے ساتھ ساحل کی جانب آتی نظر آرہی تھیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے

ہم پانی کے جہاز میں موجود ہیں۔ مسجد کے چاروں جانب صحن نما کوریڈور ہے جب ہم
اس میں آئے تو بے مرد، عورتیں اور بچے فرش پر چادر یا قالین بچھائے پکنک کے مزے
لے رہے تھے۔ چاروں جانب آدھی دیوار پر کھڑے ہوئے تو ہر جانب پانی ہی پانی تھا۔
یہی نظارہ مسجد کے باہر بھی تھا ساحل کے کنارے لوگ چادر اور قالین بچھائے اپنی اپنی
فیملی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کئی لوگ تو اپنے ہمرہ تکہ بوٹی، انگھیٹی،
کوئلے، سیخیں اور کھانے کا دیگر سامان بھی لائے ہوئے تھے۔ ہمارے برابر میں جو فیملی
موجود تھی انہوں نے تو آگ جلا کر دھواں اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ جس سے خوش کن
فضاء دھواں آلود ہو گئی ۔ یہاں ایک وقت میں دو کام ہو رہے تھے ایک بحر احمر پر تیرتی
ہوئی مسجد کا نظارہ کرنا دوسرے ساحل سمندر پر پکنک کا لطف اٹھانا۔ بعض بچے اور مرد
سمندر میں نہا بھی رہے تھے۔ ساحل پر لہریں بے جان سی ہیں۔ یہاں کراچی والے
سمندر کا جوش، جذبہ، لہروں کا چنچل اور بپھرا پن نہیں ہے۔ یہاں لہریں آرہی ہیں لیکن
خراماں، خراماں، سبک رفتاری سے۔ اس کی وجہ جدہ کے اس ساحل کا قدرتی پن ہے۔
اللہ نے بحر عرب میں سے بحر احمر کا رخ بطور خاص سعودی عرب کی جانب کر دیا۔ یہ
ہے۔اس مقام سے بحر عرب سعودی عرب کی جانب ہو جاتا (Djibouti) مقام جیبوتی
ہے یہاں سے یہ بحر احمر کہلاتا ہے۔ اولین بندرگاہ جیذان ہے، مجھے جیذان جانے کا بھی
اتفاق ہوا۔ یہ سعودی عرب کا ایک صوبہ ہے۔ اس کے ایک پہاڑی دیہات نما شہر
فیفاء 'میں مجھے کئی ماہ گزارنے کا موقع ملا۔ اس وقت میرا چھوٹا بیٹا نبیل '

اس فیفاء کے اسپتال میں ملازم تھا۔ یہ پاکستان کے شہر مری کی طرح ہے۔ تمام گھر پہاڑ وپر بنے ہوئے ہیں۔ بحر احمر کی یہ ساحل جدہ سے ہوتا ہوا مدینہ منورہ کی جانب جاتا ہے جہاں پر 'الوجہ' مدینہ سے ۳۶۷ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، دوسرا بحری مرکز ہے یہ سعودی عرب کے شمال مغرب میں مدینہ منورہ(Yanbu al Bahr) 'ینبع البحر' سے ۳۰۰ کلومیٹر پر واقع ہے۔

۱۹۷۵ء تک اس کا استعمال بندرگاہ کے طور پر ہوتا رہا۔

پانی پر تیرتی مسجد اپنے حسن اور انفرادیت کے باعث دنیا کی اہم مساجد میں سے ہے۔ یہاں آکر اپنی آنکھوں سے اس مسجد کو پانی پر تیرتا دیکھ کر خوش گوار احساس ہوا۔ ہم نے مغرب کی نماز بھی اسی مسجد میں ادا کی۔ یہ مسجد جدہ کی کورنش روڈ پر بحر احمر کے ساحل کے کنارے تعمیر کی گئی ہے۔ عام دنوں کے علاوہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں ہوتی ہیں اور سمندر کی لہریں ساحل کو چھوتی ہیںhigh tide جب کے سمندر میں تومسجد کے گرد زیادہ پانی جمع ہوجاتا ہے۔ دیکھنے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسجد پانی میں تیر رہی ہے۔ یہ دلکش نظارہ دیکھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ اُس وقت یہ مسجد انتہائی حسین اور دلکش منظر پیش کرتی ہے۔ عام دنوں میں مسجد کے تین جانب پانی ہوتا ہے۔ مسجد پانی میں مضبوط سطونوں پر معلق نظر آتی ہے۔ سعودی عرب میں مکہ اور اور مدینہ کے بعد جدہ کا یہ مقام اور یہ مسجد اور اس میں نماز کی ادئیگی میری

زندگی کا سب سے اہم لمحہ تھا جس کی یاد ہمیشہ رہے گی۔

جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین

(Shah Fahad Fountain, Jeddah)

سعودی عرب کے شہر جدہ جو کہ اماں حوا کا شہر بھی کہلاتا ہے میں رہتے ہوئے جدید شاپنگ سینٹرز کے علاوہ جدہ فاؤنٹین (شاہ فہد فاؤنٹین) کو دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا ضروری عمل ہوتا ہے۔ پچھلی بار (۲۰۱۲ء) میں جب میں جدہ آیا تو میرا چھوٹا بیٹا بھی سعودی عرب کے شہر جیذان کے پہاڑی علاقے فیفاء کے سعودی اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ جدہ سے بذریعہ سڑک جیذان اور پھر وہاں سے ٹیکسی کے ذریعہ فیفا جایا جاتا ہے۔ یہ سفر تقریباً دو گھنٹے کا ہے۔ ڈاکٹر نبیل ہم سے ملاقات کرکے واپس جارہا تھا۔ سیبکو بس اسٹینڈ پر اسے چھوڑنے شہناز، عدیل، میں نبیل اور ڈاکٹر ثمرا بھی تھے۔ رات کا وقت تھا۔ بس کے جانے میں کچھ وقت تھا ہم عدیل کے ہمراہ فاؤنٹین دیکھنے چلے گئے۔ رات میں فاؤنٹین کا نظارہ بہت ہی دلفریب ہوتا ہے۔ ساحل پر کچھ دیر ٹھہرے، فاؤنٹین کا نظارہ تو دلفریب تھا لیکن ساحل جاذب نظر نہیں تھا، ہمارے ذہنوں میں کراچی کا ساحل تھا، وہ بھی کلفٹن کا ساحل، سعودی عرب میں پردے کی وجہ سے لوگ اندھیرے میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، ساحل پر لائٹ کا انتظام بھی نہیں اس

وجہ سے بھی ساحل بے رونق سا لگ رہا تھا۔ ہم کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ گھر آ کر اس فاؤنٹین کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح سے ہیں۔

جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین کو دنیا کی سب سے اونچی فاؤنٹین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ جدہ فاؤنٹین کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ بحر احمر کے ساحل پر بنائی گئی یہ فاؤنٹین جدہ شہر کی حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ یہاں کے باسیوں کو اور جدہ میں آنے والے سیاحوں کے لیے یہ فاؤنٹین تفریح کی منفرد جگہ ہے۔ یہ فاؤنٹین سعودی عرب کے فرماں رواں شاہ فہد بن عبدلعزیز نے از خود تعمیر کرائی تھی جو جدہ شہر کے مکینوں کے لیے شاہ فہد کی جانب سے ایک تحفہ تھا۔ یہ فاؤنٹین ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان بنی جب کہ ۱۹۸۵ء میں اس کا آغاز ہوا۔ یہ

فاؤنٹین جینوا اور سوئیزر لینڈ میں قائم فاؤنٹینوں کی طرز کی ہے۔ فاؤنٹین میں اوپر جانے والا پانی ۱۰۲۴ فٹ (۳۱۲ میٹر) تک جاتا ہے، جب کے اس کے پانی کی رفتار ۳۵۷ کلو میٹر (۲۳۳) میل فی گھنٹہ ہے۔ فاؤنٹین میں بحر احمر کا پانی ہی استعمال ہوتا ہے۔

جدہ کی پر رونق شارع فلسطین روڈ پر بحر احمر کے ساحل پر یہ فاؤنٹین خوبصورت

نظارہ پیش کرتی ہے۔ خاص طور پر رات میں یہ فاؤنٹین ساحل کے حسن کو دوبالا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ دنیا میں اور بھی کئی فاؤنٹین ہیں ان میں ابوظہبی کی والکانو سنگاپور، (Volcano Fountain)لاس اینجلس کی بیلاجیو، (Bellagio Fountain) بارسلونہ کی میجو، (Fountain of Wealth, Suntec)کی فاؤنٹین آف ویلتھ فاؤنٹین (Magu Fountain of Montjuic)،چین کی بگولد Bigwild Pagoda Fountains) پاگو(،روس کی پیپلز فرینڈسپ فاؤنٹین (People's Friendship اٹلی کی، (Fountain)،روم کی ٹراوی فاؤنٹین (Trevi Fountain, Rome) شامل ہیں۔(Oval Fountain, Villadi Est)اوول فاؤنٹین

ان تمام فاؤنٹینوں میں جدہ کی اس فاؤنٹین کو سب سے اونچی فاؤنٹین ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

سفر نامہ حج۔ مصنف " بشیر الدین خورشید" ایک جائزہ

سفر نامہ حج : ۱۴ا اکتوبر سے ۲۳ نومبر ۲۰۱۰ء، کراچی سے دبئ اور وہاں سے جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، جمرات اور قرب و جوار کا حال اور تصاویر بشیر الدین خورشید۔ کراچی : مصنف، ۲۰۱۱ء، ۳۸ ص

تبصرہ جدہ میں قیام ستمبر ۲۰۱۱ء میں لکھا گیا۔

مَیں جون ۲۰۱۱ء میں سعودی عرب آنے لگا تو میرے عزیز دوست عبد الصمد انصاری مجھ سے ملنے آئے ساتھ ہی ایک کتاب "سفر نامہ حج" بھی مجھے دی، ان کا کہنا تھا کہ میں پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل کے لیے اس پر تبصرہ لکھ دوں، میرے پاس وقت کم تھا اور مصروفیات بھی،مَیں نے معزرت چاہی، ان کا اسرار تھا کہ مَیں اس کتاب کو اپنے ساتھ سعودی عرب لے جاؤں اور فوری نہ سہی آئندہ کسی شمارہ (پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل) کے لیے تبصرہ لکھ کرانہیں بھیج دوں، یہ شرط میرے لیے قابل قبول تھی اور یہ مختصر سی کتاب میرے ساتھ سعودی عرب آ گئی یہاں بھی یہ میرے ساتھ مختلف شہروں جدہ، مکہ، مدینہ، جیذان اور فائیفا کا سفر کرتی رہی، اس کے ساتھ ایک حادثہ یہ بھی پیش آیا کہ یہ میری کتابوں کے کارٹن کے ساتھ ائرپورٹ پر گم ہوئی، یعنی جب میں

جدہ ائر پورٹ پر اترا تو میرا تمام سامان مجھے مل گیا سوائے میرے کتابوں کے کارٹن کے، یہ کراچی ہی میں رہ گیا تھا، اس کے حصول میں مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، ایک ماہ بعد یہ کارٹن مجھے مل سکا، میں صمد انصاری صاحب سے کیا ہوا وعدہ وفا نہ کرسکا۔ چند دن ہوئے ان کی ایک ای میل پھر ملی، جس میں اس کتاب پر تبصرہ کی یاد دہانی کرائی گئی۔ اس دوران میں نے مکہ اور مدینہ کے خوب خوب چکر لگائے۔ عمرہ ادا کیا، کئی طواف کیے اور ان جگہوں کو از خود دیکھنے اور زیارت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اب مجھے اس کتاب پر کچھ لکھنے کا زیادہ لطف آیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے (ترجمہ) ''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو' وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دُنیا والوں سے بے نیاز ہے'' (سُورۃ آلِ عمران ۹۷)

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اللہ رب العزت نے استطاعت دی اور حج جیسے سفر کے لیے چن لیے گئے۔ بشیر الدین خورشید اور ان کی بیگم بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے یہ استطاعت دی اور انھوں نے اللہ کی آواز پر لبیک کہا۔ انھوں نے صرف حج کی سعادت ہی حاصل نہیں کی بلکہ حج کے ایام میں اپنی

مصروفیات کو قلم بند بھی کردیا۔ یہ سفرنامہ گو بہت مختصر ہے لیکن اس میں حج سے متعلق تمام ضروری باتیں آگئیں ہیں۔ اگر وہ کتاب کی اشاعت میں جلدی نہ کرتے تو اسے اور زیادہ ضخیم بنا سکتے تھے۔ لیکن یہ زمانہ اختصاریت کا ہے، لوگ کم وقت میں زیادہ معلومات کا حصول چاہتے ہیں اس اعتبار سے یہ کتاب سفر حج کی داستان ہی نہیں بلکہ اس متبرک سفر اختیار کرنے والوں کے لیے رہنما کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ فاضل مصنف قلم کار ہیں، لکھنے کا فن جانتے ہیں، یہ ان کی چوتھی کتاب ہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم کے چھوٹے بھائی بھی ہیں۔ حج و عمرہ کرنے والوں کے لیے اہم معلومات سے سفر نامے کا آغاز ہوا ہے، نقشہ مناسک حج اور چارٹ مناسک حج ، افعال عمرہ، طواف کعبہ، زیارت مکہ معظّمہ، جس میں جبل ثور، غار حرا (جبل نور)، مسجد عائشہ، مسجد جن، جمرات، منیٰ، جبل رحمت، عرفات، مزدلفہ، رمی، مدینہ میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ریاض الجنہ، کھجور مارکیٹ، مسجد قبا، مسجد قبلتین، مسجد جمعہ، جنت البقیع، مسجد ابو بکر صدیق، بیر عثمان، حضرت سلمان فارسی کا باغ، مکتبہ مسجد نبوی کے بارے میں مختصر معلومات درج کی گئی ہیں۔ کتاب کا ہدیہ سو روپے ہے جو کہ آدھی قیمت میں دستیاب ہے۔

دُعا کی اہمیت و فضیلت

دُعا کے معنی اور تعریف

فرہنگ آصفیہ میں دُعا کے لغوی معنی '' حاجت، درخواست، التجا، استدعا، التماس، عرض، ارداس، چھوٹے کا بڑے سے مانگنا، وظیفہ، مناجات، مغفرت کی طلب '' بیان کیے گئے ہیں۔ جامعہ پنجاب کے شائع کردہ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ '' میں دُعا کے لغوی معنی '' بلانا، پکارنہ، منسوب کرنا، عبادت کرنا اور مدد طلب کرنے '' کے ہیں۔ لفظ دُعا نام رکھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے '' دَعَوتُ اِبنی صائم '' یعنی میں نے اپنے بیٹے کا نام 'صائم' رکھا۔ دعا کے اصطلاحی معنی پروردگار سے اپنے یا کسی اور کے لیے استمداد و استغاثہ ہے۔

دُعا کی عظمت قرآن کریم کی روشنی میں

دُعا کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالی نے متعدد جگہ ہدایت دی ان آیات مبارکہ سے دعا کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ سورۃ البقریٰ ۲، آیت ۱۸۶ میں ارشاد باری تعالی ہے:

''وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا

ابیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ o

ترجمہ : ” اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہُوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہُوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں“۔قرآن مجید کی سورۃ الاعراف ۷ ،آیت،۵۵، ۵۶ میں اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ط اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ج وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ o (سورۃ الاعراف ۷ ،آیت، ۵۵، ۵۶)

ترجمہ: لوگوں اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا“۔ ”اور ملک میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرنا اور خدا سے خوف کرتے ہوئے اور اُمید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا۔ کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے“۔ اسی سورۃ مبارکہ کی آیت ۲۰۵ میں اللہ تعالٰی ارشاد فرماتا ہے۔

فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ o

ترجمہ: اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے صبح و شام یاد کرتے رہو اور (دیکھنا) غافل نہ ہونا۔

حدیث مبارکہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " دعا مانگنا بعینہٖ عبادت کرنا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دلیل قرآن کریم کی سورۃ المؤمن ۴۰) آیت ۶۰ کی تلاوت فرمائی (وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ) ، ترجمہ "" اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ سے دعا مانگا کرو میں تمہاری دعا قبول (کرونگا"۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، النسائی

قرآن مجید میں لفظ دُعا جن جملہ معانی میں استعمال ہوا ہے ان میں بلانا، پکارنا (سورۃ النور ۲۴ آیت ۶۳) منسوب کرنا (سورۃ الاحزاب ۳۳، آیت ۵)، عبادت کرنا (سورۃ الاعراف ۷، آیت ۱۹۴)، استمداد و استغاثہ (سورۃ البقرۃ ۲، آیت ۲۳) ،قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعوت دی کہ وہ اس سے دعا کریں۔ اس بات کا ذکر قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے۔

دُعا کی عظمت احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی عظمت، اس کی برکتیں، دُعا کے آداب اور دعا کرنے کے بارے میں واضح ہدایات دی ہیں۔ایسی

بے شمار احادیث ہیں جن میں دعا کا ذکر ہے اور دعا کی اہمیت وفضیلت کو واضح کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اللہ کے یہاں کوئی چیز اور کوئی عمل دعا سے زیادہ عزیز نہیں (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

حدیث مبارک جامعہ ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نقل کی گئی ہے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا" دعا عین عبادت ہے" اور حدیث مبارک حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عبادت کا مغز اور جوہر قرار دیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا"دعا عبادت کا مغز اور جوہر ہے"۔ (جامع ترمذی)

حضر جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ عمل بتاؤں جو تمہارے دشمنوں سے تمہارا بچاؤ کرے اور تمہیں بھر پور روزی دلائے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے اللہ سے دُعا کیا کرو رات میں اور دن میں' کیونکہ دُعا مؤمن کا خاص ہتھیار یعنی اس کی خاص طاقت ہے" (معارف الحدیث)

 دُعا مانگنے کی ہدایت

اللہ سے اس کا فضل طلب کرنے، دعا مانگنے اور دعا کا اہتمام کرنے کی خاص ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دعا کارآمد اور نفع مند ہوتی ہے اور ان حوادث میں بھی جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل (نہیں ہوئے' پس اے خدا کے بندوں دعا کا اہتمام کرو''۔ (جامع ترمذی

ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اللہ سے اس کا فضل مانگو یعنی دعا کرو کہ وہ فضل و کرم فرمائے، کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کے بندے اس سے دعا کریں اور مانگیں'' اور فرمایا کہ '' اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید رکھتے ہوئے اس بات کا انتظار کرنا کہ وہ بلا اور پریشانی کو اپنے کرم سے دور فرمائے گا اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے (جامع ترمذی) ''

جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں حدیث مبارکہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' تمہارے پرور دگار میں بدرجہ غایت حیا اور کرم کی صفت ہے' جب بندہ اس کے آگے مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کو خالی واپس کرے

کچھ نہ کچھ عطا فرمانے کا فیصلہ ضرور فرماتا ہے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے)
روایت ہے ۔ فرمایا آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ”جب اللہ سے مانگو اور
دعا کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ ضرور قبول کرے گا اور عطا فرمائے گا، اور جان
لو اور یاد رکھو کہ اللہ اس کی دعا قبول نہیں کرتا جس کا دل (دعا کے وقت) اللہ سے
(غافل اور بے پرواہ ہو“۔ (جامع ترمذی

دُعا کے آداب

اللہ تعالٰی رحیم ہے، کریم ہے، مہربان ہے، سننے والا ہے، دینے والا ہے، مانگنے والے
بندے پر اسے پیار آتا ہے ، بندے کا اپنے رب سے مانگنے کا عمل اسے عزیز ہے، بندہ
اپنے رب سے خاموشی کے ساتھ ، عاجزی کے ساتھ ، انکساری کے ساتھ ، اطاعت کے
ساتھ ،فرمابرداری کے ساتھ ، فقیری کے ساتھ ، گدائی کے ساتھ ،چپکے چپکے، دھیمی
آواز کے ساتھ، خشوع و خضوع کے ساتھ ، اعتراف گناہ اور احساس ندامت کے ساتھ ،
گڑگڑا کر دعا کرے ، یہ افضل ہے اور اللہ کو بے حد پسند بھی ہے ۔ اس کے برعکس وہ
اپنے اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اس سے نہ مانگے، اس سے وہ ناراض ہوتا ہے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و
سلم نے فرمایا ” جو اللہ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالٰی ناراض ہوتا ہے“۔ (جامع تر
(مذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جسے سنن ابی داؤد نے نقل کیا ہے کہ فرمایا آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے " اللہ سے اس طرح ہاتھ اٹھا کے مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رخ سامنے ہو ہاتھ الٹے کرکے نہ مانگا کرو اور جب دُعا کر چکو تو اٹھے ہاتھ چہرے پر پھیر لو"۔ (سنن ابی داؤد) حدیث مبارکہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اگر کوئی کسی دوسرے کے لیے دعا کرنی ہو تو پہلے اللہ تعالی سے اپنے لیے مانگے اس کے بعد دوسرے کے لیے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اگر صرف دوسرے کے لیے دعا کی جائے تو اس دعا کی حیثیت ایک سفارش کی سی ہوگی جو کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ دعا کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ بندہ جب اپنے مالک سے دعا کرے تو با وضو ہو، دو رکعت نماز پڑھ کر ساتھ ہی دعا سے قبل اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے اور اپنے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ فضالہ بن عبید سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا اس نے نماز میں دعا کی جس میں نہ اللہ کی حمد کی نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اس آدمی نے دعا میں جلد بازی کی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور اس سے یا اس کی موجودگی میں دوسرے آدمی کو مخاطب کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو (دعا کرنے سے پہلے) اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے، پھر اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے اللہ

سے مانگے"۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی) اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور دعا سے قبل اللہ کی حمد و ثنا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا چاہیے۔ دعا کے آداب میں یہ بھی شامل ہے اور حدیث مبارکہ بھی ہے کہ دعا کے خاتمہ پر آمین کہنا چاہیے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ پروردگار میری یہ دعا قبول فرما۔

اللہ تعالٰی نے آدابِ دُعا خود سکھائے۔ قرآن کریم کی سورۃ اعراف ۷، آیت ۵۵ میں ارشادِ ہوا " اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً" اپنے رب کو گڑگڑا کر پکارو اور یہ سمجھو کہ میرا رب میری بات کو سنتا اور میری تمام حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے۔ وہ میرے سامنے موجود ہے، وہ اپنے مانگنے والوں کو ضرور دیتا ہے، محروم نہیں کرتا ہے اور جو اپنی حاجت کو رغبت سے طلب کرے، ایسے لوگوں کی اللہ تعریف کرتا ہے۔

دعا کے مخصوص احوال و اوقات

دُعا اللہ اور بندے کے درمیان ایک ایسا مخصوص تعلق ہوتا ہے جس میں بندہ اپنے معبود سے اپنے دل کا حال بیان کرتا ہے، اپنی مشکل کا اظہار کرتا ہے، اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہے، بخشش کی درخواست کرتا ہے، مختصر یہ کہ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ سیدھے سادہ طریقے سے بیان کر دیتا ہے

دعا دراصل منگتے اور اس کے خالق کے درمیان براہ راست رابطہ ہوتی ہے، مخصوص زبان یا مخصوص الفاظ کا سہارا نہیں لیتا وہ دعا میں اللہ تعالیٰ سے خطاب اپنی حاجت کی نسبت سے کرتا ہے اللہ کو اپنے بندے کی یہی ادا پسند بھی ہے، دعا کے لیے مخصوص الفاظ ضروری نہیں، بندہ اپنے پروردگا سے دن یا رات کے کسی بھی حصے میں دُعا مانگ سکتا ہے، کوئی خاص وقت اس مقصد کے لیے مقرر نہیں ،تاہم احادیث مبارکہ سے دعا کے لیے خاص احوال واوقات ثابت ہیں۔ان احوال واوقات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کی خاص امید کی جاتی ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " اذان اور اقامت کے درمیان دُعا رَد نہیں ہوتی قبول ہی ہوتی ہے"۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

یوں تو اپنے خالق سے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ حاجت طلب کی جاسکتی ہے اور وہ ہر وقت سنتا ہے۔مگر اس نے اپنے فضل و کرم سے اپنی عبادت و مناجات کے لیے کچھ مخصوص اوقات مقرر کر دئے ہیں کہ ان وقتوں میں دعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

☆ رات کا آخری حصہ (یعنی پچھلی شب بیدار ہو کر نماز تہجد پڑھنا اس وقت دعُاؤں کو قبولیت کا درجہ عطا ہوتا ہے)

☆ جمعہ کے دن میں بھی ایک قبولیت کی ساعت (گھڑی) ہے ، اس میں دعا قبول ہوتی

ہے۔ (بیشتر علماء کے خیال میں وہ وقت عصر

(کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک کا وقت ہے

☆ شب قدر اس شب کی قرآن و حدیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔

☆ اذان کے وقت۔

☆ فرض نمازوں کے بعد۔

☆ سجدے کی حالت میں۔

☆ قرآن مجید کی تلاوت اور ختم قرآن کے وقت۔

(☆ عرفہ کے دن (ذی الحجہ کی نویں تاریخ

☆ رمضان شریف کے مہینے میں اور روزہ افطار کرتے وقت۔

☆ نماز میں جب امام "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" پڑھ کر آمین کہنے کے بعد۔

دعا کے لیے مخصوص مقامات کی بھی قید نہیں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہر جگہ ہر مقام پر سنتا ہے۔ پھر بھی بعض مقامات پر دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ یہ ہیں : ☆ بیت اللہ

(شریف (طواف کرتے ہوئے

☆ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

☆ ملتزم پر چمٹ کر (ملتزم اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو حجر اسود اور خانہ کعبہ کے

،دروازے کے درمیان ہے۔ ملتزم کا مطلب ہے چمٹنا

کیونکہ اس جگہ چمٹ کر دعا کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس جگہ کو ملتزم کہا جاتا

ہے

☆ میزاب کے نیچے (خانہ کعبہ کی چھت سے پانی بہہ کر نیچے آنے کا جو پرنالہ ہے میزاب ہے)، اسے میزاب رحمت بھی کہا جاتا ہے اور حطیم میں گرتا ہے اس کے نیچے دعا قبول ہوتی ہے۔

☆ بیت المقدس

☆ رکن و مقام ابرہیم کے درمیان

☆ صفا و مروہ پہاڑیوں پر

☆ مقام ابراہیم کے پیچھے

☆ جہاں سعی کی جاتی ہے۔

☆ عرفات میں۔

☆ زمزم کا پانی پیتے وقت۔

☆ مشعر الحرام مزدلفہ میں۔

☆ رکن یمانی اور حجرا سود کے درمیان۔

☆ دونوں جمروں کے پاس جمرہ صغریٰ اور جمرہ وسطیٰ کے پاس کنکریاں مارنے کے بعد۔

روحِ دُعا

صحیح مسلم کی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا محمد

صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ " رات میں ایک خاص وقت ہے جو مؤمن بندہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے دنیا آخرت کی کوئی خیر اور بھلائی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور عطا فرمادے گا اور اس میں کسی خاس رات کی خصوصیت نہیں بلکہ اللہ کا یہ کرم ہر رات میں ہوتا ہے"۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ """" سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب سے بہت قربت حاصل کر لیتا ہے پس تم اس حالت میں خوب خوب دعا مانگا کرو"۔ اس کے علاوہ احادیث مبارکہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بندہ مؤمن کی دعا راہِ خدا میں جنگ کے وقت، بارش کے دوران، خانہ کعبہ نظر کے سامنے ہو، فرض نماز کے بعد، قرآن مجید ختم کرنے کے بعد اپنے پروردگار سے خلوص دل سے حاجت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی حاجت پوری کرتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک بندہ مؤمن حسب ذیل خاص احوال و اوقات اور کیفیات میں اپنے پرور دگار سے صدق دل سے بھلائی کے لیے مانگے تو وہ اسے ضرور ملے گا۔ مفتی منیب الرحمٰن کے مطابق روحِ دُعا اور جوہر دُعا یہ ہے کہ اخلاص، نیت ہو، لِلّٰہیت ہو، حُضوریِ قَلب ہو، قلب و قالب، جسم و جان حتیٰ کہ بدن کا ایک ایک رواں معبودِ مطلق کی جانب متوجہ ہو، زبان ہیبت الٰہی سے لرز رہی ہو، آنکھیں اشک بار ہوں، اس کیفیت میں ڈوب کر جو دعا مانگی جائے، وہ ضرور شرفِ قبولیت سے سرفراز ہوگی۔ چنانچہ بندہ دُعا کرے: با وضو ہو کر، یقین کے ساتھ، اعتراف گناہ کے ساتھ، احساس ندامت کے ساتھ، خشوع و خضوع کے ساتھ، اخلاص نیت کے ساتھ، امید اور یقین کے ساتھ اشک

بار آنکھوں کے ساتھ، گڑگڑا کر اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر، قبلہ رخ ہو کر، التجا اور استدعا کرتے ہوئے، سجود میں اور اقامت کے دوران اذان کے دوران، دو رکعت ادا کرنے کے بعد، فرض نماز کی ادئیگی کے بعد، قرآن مجید ختم کرنے کے بعد اللہ تبارك و تعالی کی حمد و ثنا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے بعد، جلد بازی سے کام نہ لیتے ہوئے، اگر کسی کے لیے دعا کرنا مقصود ہو تو پہلے اپنے لیے مانگے، راہِ خدا میں جنگ (میدان جہاد) کے وقت، برسات کے وقت (رحمت کا سماں ہو)، خانہ کعبہ نظروں کے سامنے ہو، جنگل بیابان یا ایسی جگہ جہاں خدا کے سوا اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو، رات کے آخری حصہ میں اللہ کے حضور کھڑا ہو دعا کرے انشاء اللہ دعا قبول ہو گی۔

دعا میں جلد بازی سے کام نہ لینا

دعا بندے کی جانب سے اپنے پروردگار کے حضور درخواست اور التجا ہے، وہ اپنے بندے کی سنتا ہے، بندے کا کام اس کے حضور اپنی خواہش کا مسلسل اظہار کرتے رہنا ہے۔

انسان جلد باز واقع ہوا ہے، وہ نہ صرف یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی خواہش جوں کی توں پوری ہو بلکہ فوری اسے وہ کچھ مل جائے جس کی وہ خواہش رکھتا ہے۔ بسا اوقات جب اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ مایوس ہو جاتا ہے، اپنے عمل سے پیچھے ہٹ جاتا ہے، دعا کا عمل ترک کر دیتا ہے۔ ہمیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے، یہ ہماری سخت غلطی ہو گی اگر ہم مایوس ہو جائیں اور اس

بنا پر دعا کرنا چھوڑ دیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا یہ عمل ہی ہماری محرومی کا سبب ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " تماری دعائیں اس وقت تک قابل قبول ہوتی ہیں جب تک کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ جلد بازی یہ ہے کہ بندہ کہنے لگے کہ میں نے دُعا مانگی تھی مگر وہ قبول نہیں ہوئی"۔ دُعا و استغفار تین مرتبہ کرنی چاہیے۔ ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین بار دعا فرماتے تھے

دُعا جس کی ممانعت ہے

اللہ تبارک و تعالی نے سورۃ المومن (۴۰)، آیت ۶۰ میں دعا کے لیے بظاہر کوئی شرط نہیں ۔ حتیٰ کہ مسلمان ہونا بھی قبولیت دعا کی شرط نہیں ہے۔ کافر کی دعا بھی اللہ تعالی قبول فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ ابلیس کی دعا تا قیامت زندہ رہنے کی قبول ہو گئی۔ نہ ہی دعا کے لیے کوئی خاص وقت یا جگہ اور نہ ہی طہارت اور باوضو ہونا شرط ہے مگر احادیث معتبرہ میں بعض چیزوں کو موانع قبولیت فرمایا گیا ہے ان چیزوں سے اجتناب لازم ہے۔

انسان بسا اوقات پریشانیوں اور مشکلات سے گھبرا کر یا نہ دانستگی میں ایسی

دعا یا ایسے جملے اپنی زبان سے ادا کرنے لگتا ہے کہ اگر وہ قبول ہوجائیں تو اس میں خود اسی کا نقصان ہوجائے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی دعاؤں سے منع فرمایا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " تم کبھی اپنے حق میں یا اپنی اولاد اور مال و جائیداد کے حق میں بد دُعا نہ کرو' مبادا وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہو' اور تمہاری وہ دعا اللہ تعالی قبول فرمالے جس کے نتیجے میں خود تم پر تمہاری اولاد یا مال و جائیداد پر کوئی آفت آجائے)۔ (صحیح مسلم شریف)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " تم میں سے کوئی اپنی موت کی تمنا نہ کرے' نہ جلدی موت آنے کے لیے اللہ سے دعا کرے"۔ (صحیح مسلم شریف)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " تم لوگ موت کی دُعا اور تمنا نہ کرو، اور کوئی آدمی ایسی دعا کے لیے مضطر ہو (اور کسی وجہ سے زندگی اس کے لیے دو بھر ہو) تو اللہ کے حضور میں یوں عرض کرے" اے اللہ جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے مجھے زندہ رکھ،

(اور جب میرے لیے موت بہتر ہو تو دنیا سے مجھے اٹھالے''۔ (سنن نسائی
مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اپنی کتاب '' معارف الحدیث '' میں دعاؤں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے :

۱۔ ایک وہ جن کا تعلق خاص اوقات اور مخصوص حالات سے ہے مثلاً صبح نمودار ہونے کے وقت کی دعا، شام کے وقت کی دُعا سونے کے وقت کی دعا، نیند سے بیدار ہونے کے وقت کی دعا، آندھی یا بارش کے وقت کی دعا، کسی مصیبت اور پریشانی کے وقت کی دعا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ دوسری وہ دعائیں ہیں جو عام نوعیت کی ہیں، کسی خاص وقت اور مخصوص حالات سے ان کا تعلق نہیں ۔ یہ دعائیں اکثر جامع قسم کی ہیں۔

۳۔ تیسری قسم کی دعائیں وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یا نماز سے فارغ ہو کر یعنی سلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں کیا کرتے تھے۔ (مصنف کی کتاب (دعا کی اہمیت وفضیلت' شائع شدہ ۲۰۰۸ء میں شامل'

مکہ لائبریری، سعودی عرابیہ میں ایک دن

مکہ المکرمہ میں حرم شریف کی حدود میں موجود پیدائش گاہ (مَولِدُالنبی) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب ایک عوامی لائبریری ہے جو مَکتبہ مکۃُ المکرمہ (مکہ لائبریری) کہلاتی ہے۔ یہ گھر جو اب لائبریری ضرور ہے لیکن پیدائش گاہ (مَولِدُالنبی) کے نام سے ہی معروف ہے۔ اس جگہ اور اس گھر کو اس وجہ سے ہی اہمیت، فوقیت اور بلند مرتبہ حاصل ہے کہ اس جگہ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے۔ یہ گھر حرم شریف کے میدان میں باب الافتح کے سامنے، باہر کی جانب، پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ گھر اپنی اصلی حالت میں نہیں یہ تعمیر کے کئی مراحل سے گزرا ہے لیکن خطہ زمین اور جگہ وہی ہے۔ لائبریری کی تفصیل میں جانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے جس کی تعمیر نو کرکے یہاں اب ایک عوامی کتب خانہ (مَکتبہ مکۃُ المکَرمہ) قائم کردیا گیا ہے۔ تفسیر کبیر میں درج ہے کہ قرآن مجید میں سرزمین مکہ "بَکَہ" اور "مَکَہ" جیسے ذی شان ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بَکَہ" اور "مَکَہ" حقیقت میں ایک ہی لفظ ہے لیکن بَکَہ" کی با' میم سے بدل کر "مَکَّہ" بن گیا۔ تورات میں مکہ کا نام اوّلاً "مَدْبار" یعنی بادیہ

بتایا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو وَادٍی غَیْرِ ذِی زَرْعٍ'''بن کھیتی کے زمیں' کہا ہے۔

مکہ المکرمہ کے محلے

تصانیف ''تاریخ مَکۃُ المُکرمۃ''اور ''تاریخ مَدِینۃُ المُنوَّرۃ'' کے مصنف محمد عبد المعبود نے الشیخ پاشا و اسرائے مصر کے حوالہ سے خلافت عثمانیہ میں مکہ کے محلوں کی تفصیل بیان کی ہے ا۔ اس وقت مکہ میں محلّہ جرول، مسفلہ، جیاد، قشاشیہ، الغزہ، اشامیہ، القرافہ، السلیمانیہ کے علاوہ محلّہ 'شعب بنی عامر بھی تھا۔ مولد النبی ﷺ اسی محلّہ شعب بنی عامر میں تھا۔ یہ محلّہ غزہ کے شمال میں ہے اس میں مولد النبی ﷺ مولد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور بنی ہاشم کے مکانات تھے۔اس کے شرقی حصہ میں زمانۂ جاہلیت میں بنی عبدالمطلب آباد تھے۔ لیکن آج کل یہاں اشرافِ مکہ مقیم ہیں۔ ریش کے مکانات زیادہ تر حرم کے شمال کی طرف تھے۔

مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَولِدُ النَّبِی یا وہ مقدس گھر جس میں آفتاب نبوت طلوع ہوا تھا۔ یہ جگہ اس اعتبار سے اہم اور متبرک ہے کہ اس گھر میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت بروز پیر، ۱۲ ربیع الاول عام الفیل مطابق

اپریل ۵۷۱ء شعب بنی ہاشم میں مکہ معظّمہ کے اسی گھر میں ہوئی۔ڈاکٹر انگاوی کے ۲۲ مطابق یہ گھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم عبداللہ ابن عبد المطلب کی ملکیت تھا۔جب عبد المطلب نابینا ہوگئے تو انہوں نے اپنی جائیداد اپنی زندگی ہی میں اپنے بچوں میں تقسیم کردی، اس عمل کے نتیجے میں یہ گھر یعنی مَولِدُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے گرد جو کچھ بھی تھا شہ کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبد اللہ ابن عبد المطلب کے حصے میں آیا اور ان کے بعد یہ جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوگئی۔جب آپ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ جانے لگے تو آپ ﷺ نے اپنی یہ ملکیت اپنے چچازاد بھائی عقیل بن ابی طالب کو ہبہ کردی۔آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت کے وقت فرمایا تھا ’’کیا عقیل ہمارے لیے چھت یا گھر رہنے دیں گے‘‘ عقیل بن ابی طالب سے یہ گھر محمد بن یوسف ثقفی جو حجاج بن یوسف کا بھائی تھا‘ نے خرید کر اپنے مکان میں شامل کرلیا تھا اور اسی کے نام ’’بیت ابن یوسف‘‘ سے مشہور ہوا حتیٰ کہ ۱۷۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ ’’خیزران‘‘ جب حج بیت اللہ کو گئیں تو انہوں نے اس مکان کو خرید کر وہاں مسجد تعمیر کرادی۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت اور اس کے بعد اس گھر کے بارے میں ’تاریخ مکہ‘‘ کے مصنف محمد عبد المعبود نے الشیخ رفعت پاشاؒ کے حوالہ لکھا سے لکھا ہے کہ ’’نبی ﷺ کا مکانِ ولادت سڑک سے تقریباً ڈیڑھ میٹر

نشیب میں واقع تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لیے پتھر کی بنی ہوئی چند سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا تھا۔ شمالی دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی ۱۲ میٹر لمبا اور ۶ میٹر چوڑا صحن تھا۔ اس کے دائیں جانب ایک دروازہ چھوٹے سے کمرہ کی طرف کھلتا' جس کے اندر لکڑی کا ایک چبوترا بنا ہوا تھا' جس میں سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے جو درمیان سے کھود کر گہرا کیا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہی نبی ﷺ کی ولادت گاہ ہے''۔ اس جگہ کا کل رقبہ تقریباً ۸۰ مربع میٹر تھا۔ اب اس گھر اور اس عمارت کی یہ صورت نہیں ۔ یہ گھر اور یہ جگہ وقت، حالات اور زمانہ کے ہاتھوں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا موجودہ صورت تک کئی صدیوں میں پہنچا ہے۔ البتہ یہ بات انتہائی یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس جگہ پر قائم ہونے والی عمارت مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی لیکن یہ جگہ وہی مقام ہے جہاں نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت ہوئی۔ اب یہ گھر نشیب میں نہیں بلکہ حرف شریف کی حدود میں دروازہ باب الفتح کے سامنے پہاڑ کے دامن میں وسیع و عریض کھلے اور صاف ستھرے میدان میں نمایاں طور پر دو منزلہ عمارت کی صورت میں موجود ہے۔ نہ وہ چھوٹے کمرے ہیں نہ ہی کس جگہ کوئی چبوترا موجود ہے۔ حرف شریف کی جانب اس کا بنیادی دروازہ ہے۔ جوں ہی عمارت میں داخل ہوں ایک وسیع اور دیدہ ذیب حال جس کے چاروں جانب لکڑی کی شیشے والی خوبصورت الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی دلکش نظارہ پیش کرتی ہیں۔ بالکل سامنے کی جانب منتظمینِ لائبریری کی میزیں ہیں اندر کی

جانب بھی کمرے ہیں جن میں لائبریری کے فنی امور کی انجام دہی کی جاتی ہے۔انتہائی بائیں جانب لائبریری کے مہتمم اعلیٰ کا دفتر ہے۔لائبریری کمپیوٹرائزڈ کرنے کا کام جاری ہے۔ گویا لائبریری کا کمپیوٹرائی کیٹلاگ تیزی سے تیاری کے مراحل میں ہے۔ مہتمم اعلیٰ کے دفتر کے چاروں جانب الماریوں میں مجلد کتابیں رکھی ہیں۔بتایا گیا کہ یہ نایاب اور قدیم کتابوں اور قلمی نسخے ہیں جنہیں جلد کراکے محفوظ کیا گیا ہے۔ لائبریری کی اوپر کی منزل پر بھی الماریاں ہیں جن میں کتابیں رکھی ہیں۔کتابوں کی ترتیب موضوعی ہے۔ زیادہ کتابیں اسلامی موضوعات پر اور عربی زبان کی ہی ہیں۔لائبریری کی چھت پر نصب حسین فانوس لائبریری کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔

مولد النبی ﷺ یعنی یہ گھر اپنی اصل حالت میں نہیں ، یہ وقت ، حالات اور زمانے کے ہاتھوں ایک سے زیادہ بار اپنی ظاہری شکل و صورت بدل چکا ہے۔ اس کی تعمیر نو کئی بار ہوئی۔ لیکن یہ مقدس گھر اپنی اصل جگہ پر قائم یہ گھر مسجد بنا اور پھر اس مسجد سے دوبارہ گھر میں تبدیل ہونے کے بعد اس کی تعمیر و مرمت مختلف سلاطین اپنے اپنے دور میں کرتے رہے۔ مصنف محمد عبد المعبود نے 'مراۃ الحرمین (جلد ۲ ص ۱۸۸) کے حوالہ سے لکھا ہے ۵۷۶ھ میں خلیفہ الناصر عباسی، ۶۶۶ھ میں ملک مظفر صاحب یمن، ۷۴۰ھ میں حفیدہ المجاہد، ۷۵۸ھ میں مصر کے ایک رئیس، ۷۶۶ھ '۸۰۱ھ میں ملک اشرف شعبان، ۹۳۵ھ میں سلطان سلیمان خان نے

یہ خدمت انجام دی۔ ۹۶۳ء میں سلطان سلیمان خان نے تین بیش بہا قندیلیں بھیجیں جن میں سے دو کعبہ شریف کے لیے اور ایک مولد النبی ﷺ میں آویزاں کرنے کے لیے۔ ۱۰۰۹ھ میں سلطان مراد خان نے اس کی ازسرِ نو تعمیر کرائی اور اس پر ایک عظیم الشان گنبد اور مینار بنوایا۔ بعد ازیں دولت عثمانیہ میں اس جگہ دینی درسگاہ قائم کردی گئی۔

محمد عبد المعبود نے تاریخ القویم (جلد ا، ص ۱۷۲) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علامہ طاہر کردی دامت امرکاتہم تحریر کرتے ہیں کہ ۱۳۴۳ھ میں یہ عمارت منہدم ہوگئی تھی جسے الشیخ عباس بن یوسف القطان المتوفی ۱۳۷۰ھ نے اپنے ذاتی اخراجات سے تعمیر کرنا شروع کیا تھا لیکن دو ہی ماہ بعد ان کا وصال ہوگیا۔ چنانچہ اس کے خلف الرشید الشیخ امین نے کام مکمل کرایا۔ مرحوم نے وصیت کی تھی کہ یہاں ایک عالی شان لائبریری بنائی جائے جس سے علماء اور طلباء استفادہ کریں۔ بہر حاصل اس وقت وہاں افادۂ عوام کے لیے عالی شان لائبریری بنی ہوئی ہے اور دروازہ پر ''مکتبہ مکۃُ المکرمہ'' کا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔

ڈاکٹر سامی محسن انگاوی جو اسلامک آرچیٹیکچر میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہیں نے اخبار ''البلاد السعودیہ'' میں شائع ہوئے والے مضمون بعنوان "A School

کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سعودی "and a Library at the Historical Sites" فرماں رواں شاہ عبدالعزیز نے شیخ عباس قطان کو یہ متبرک جگہ جو خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر تھا اس مقصد کے لیے دیا کہ اس گھر کی چھت پر قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کریں اور مولد النبی ﷺ میں ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام عمل میں لائیں۔

لائبریری

راقم الحروف نے ۲۰۱۱ء میں عمرہ کی ادائیگی کے بعد اپنے قیام جدہ کے دوران ۷ ستمبر ۲۰۱۱ء مطابق ۹ شوال ۱۴۳۲ھ بدھ کے روز مکہ لائبریری جسے مکتبہ مکۃ المکرمہ کہا جاتا ہے کا تفصیلی دورہ کیا۔ لائبریری کے مطالعہ کے دوران مہتمم اعلیٰ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم باصَفار سے ملاقات کی اور لائبریری کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا۔ ڈاکٹر سامی محسن انگاوی نے لکھا ہے کہ یہ گھر حضور ﷺ کی پیدائش گاہ کے طور پر ہی جانا ہے۔ لائبریری قشاشیہ اسٹریٹ پر مولد النبی ﷺ میں قائم ہے جو سوق الیل (نائٹ مارکیٹ) کے نام سے معروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب اس گھر کے اردگرد ہفتہ میں ایک دن پرانے سامان کی خرید وفروخت کا بازار لگتا ہے۔ کردی خاندان' کے 'ماجد کرد' سے ''مجیدیہ لائبریری'' جو ان کی ذاتی لائبریری تھی خریدی گئی، یہ لائبریری نایاب اور قیمتی کتب پر مشتمل ہے۔ کتابیں سلیقے سے دیدہ زیب الماریوں میں ترتیب وار

رکھی ہیں۔ کتب خانہ کے مدیر کا کمرہ (آفس) وہی جگہ ہے جہاں پر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں آمد ہوئی، یہ بات مجھے مدیر مکتبہ (لائبریرین) یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفار نے ہی بتائی، الحمد اللہ مجھے اس کمرہ میں بیٹھنے اور کچھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، یسلم صاحب سے جب مَیں نے اپنا تعارف کرایا توانہوں نے مجھے خصوصی توجہ دی، اپنے آفس میں لے گئے، قہوا پلایا، کتب خانے میں موجود قدیم اور نادر کتب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفار اہل بیت میں سے ہیں، جامع مسجد امام البخاری کے امام وخطیب بھی ہیں

۔

: مجیدیا لائبریری کا قیام

مصنف و مولف ڈاکٹر عبد الطیف عبد اللہ بن ڈوہائش نے اپنی کتاب ''پرائیویٹ لائبریریز ان مکہ'' (انگریزی) جو کراچی سے لائبریری پروموشن بیورو نے ۱۹۹۵ء میں شائع کی تھی میں لکھا ہے کہ ''مجیدیا لائبریری کا قیام ۱۳۲۸ھ میں عمل میں آیا۔ محمد ماجد بن صالح بن فیض اللہ بن حسن الکرد مکہ المکرمہ میں ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے یہ لائبریری انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری کے طور پر قائم کی تھی۔ ماجد کرد ایک علمی وادبی شخصیت تھے انہوں نے ہمیشہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ماجد کرد کو کتابوں سے محبت تھی، وہ بنیادی طور پر تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے انہوں نے ۱۳۲۷ھ

مطابق ۱۹۰۹ء میں مکہ مکرمہ میں ایک پرنٹنگ پریس بھی قائم کیا تھا جو مجیدیا پرنٹنگ پریس کے نام سے معروف تھا۔اس چھاپا خانہ کے توسط سے سرزمین حجاز میں طباعت کو اور کتابوں کی اشاعت کو فروغ حاصل ہوا۔ علمی مواد کی اشاعت بڑے پیارے پر ہونے لگی۔اس پریس سے متعدد عربی کی اہم و معروف مطبوعات شائع ہوئی۔ان میں ''اخبار مکہ ازراقی'' دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ علماء کے وہ لیکچر جو مختلف اسلامی موضوعات پر حرم میں دئے گئے بطور خاص موضوعاتی ترتیب سے شائع کئے گئے۔اسی طرح تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ اسلام پر کتب شائع ہوئیں''۔

۱۳۶۴ھ میں شاہ عبدالعزیز نے ماجد کرد کا تقرر سیکریٹری تعلیم کی حیثیت سے کیا۔ ماجد کردنے تعلیم کے میدان میں قابل ذکر کام کیا اور اپنے تقرر کو درست ثابت کر دکھا یا۔ انہوں نے اپنی تمام تر ذمہ داریاں محنت اور ایمانداری سے انجام دیں۔اس دور میں سعودی طلبہ کو بیرونی ممالک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی بھیجا گیا۔خاص طور پر مصر کی جامعات میں اور دیگر تعلیمی اداروں میں سعودی طلبہ نے تعلیم حاصل کی۔بعد میں ماجد کرد کو شعبہ وقف (Endowment) کا سربراہ مقرر کیا گیا۔انہوں نے یہاں بھی ایمانداری اور تندہی سے خدمات انجام دیں وہ اپنے انتقال تک اس شعبہ کے سربراہ رہے۔مکہ المکرمہ کے محقق احمد جمال نے ماجد کرد کے بارے میں لکھا ہے''یہ کتاب کے

عاشق تھے، ہمیشہ قابل لوگوں کا احترام کیا کرتے اور انہیں خراج تحسین پیش کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتے، وہ اہل علم حضرات کو اپنے گھر بلایا کرتے اور ان کی عزت و تکریم کیا کرتے۔ وہ محققین، مصنفین و مولفین کی ہر طرح مالی اور طبی مدد کیا کرتے تھے۔

ماجد کردکے کتب خانہ کا ذخیرہ کتب ۱۰ہزار نادر و نایاب کتب اور مخطوطات پر مشتمل تھا۔ یہ کتب مختلف موضوعات پر تھیں۔ماجد کرد کو جہاں سے بھی کتاب منگوانا ہوتی وہ اس کتاب کو ہر صورت میں منگولیا کرتے۔ اس ذخیرہ میں زبان پر بھی کتب موجود تھیں۔ تمام کتابیں خوبصورت و خوشنما جلدوں سے مزین ہیں۔ ایک کتاب ''معجم المشحرات'' بہت ہی نایاب کتاب تھی۔کتب خانہ کا کیٹلاگ موضوعی ترتیب میں تھا جو ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر تھی۔ سعودی مصنف 'محمد علی مغربی'' نے شیخ ماجد کردکے بارے میں لکھا'' شیخ ماجد علم کے حصول کے شدت سے طالب تھے وہ مکمل طوپر علم و فضیلت کے لیے ہمہ وقت مصروف رہا کرتے، اچھی کتب کی خریداری اور حصول میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ان کے اس شوق اور عمل نے ایک عمدہ اور نایاب کتب خانہ کی بنیاد ڈالی۔انہوں نے اپنی دولت بلا دریغ کتب اور مخطوطات کی خریداری پر صرف کی ۔ اللہ نے انہیں بے پناہ دولت سے نوازا تھا'' ۔ شیخ ماجد کرد کا انتقال ۱۹ ذالحجہ ۱۳۴۹ھ کو ہوا، ان کے بعد ان کے بیٹے نے بھی اس لائبریری کو ترقی دی۔ ۱۳۷۰ھ میں شاہ عبد العزیز

نے حکم دیا کہ پیدائش مَولِدُ النبی یعنی اس گھر میں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت ہوئی عوامی لائبریری قائم کر دی جائے جو شعیب علی میں واقع تھی۔اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے انتہائی مقدس و محترم جگہ کو ایسی جگہ بنا دیا جائے جہاں پر دنیائے اسلام سے اہم علم، محققین و مصنفین اور علم و حکمت سے وابستہ لوگ آزادی سے آ سکیں اور علم کی پیاس بجھا سکیں۔اس مقصد کے لیے شیخ ماجد کردی کی ذاتی لائبریری کا ذخیرہ کتب جو ہر اعتبار سے منتخب، موضوع، قیمتی و نایاب کتب پر مشتمل تھا خریدا گیا۔ سعودی حکومت کے محکمہ وقف کے زیر انتظام یہ لائبریری قائم کر دی گئی۔عمرہ یا حج پر جانے والے زارین کو چاہیے کہ وہ اپنی عبادات میں حرف شریف کی حدود میں قائم مولد النبی ﷺ پر بھی حاضری دیں اس لائبریری اور اس گھر کو دیکھ لینا اس جگہ پہنچ جانا بھی ہمارے لیے باعث رحمت و برکت ہے۔

دال' جھال چکیاں (سرگودھا) دی'

معاشرے میں بعض چیزیں خاص طور پر کھانے پینے کی اشیاء بہت معمولی ہونے کے باوجود اہم اور معروف ہوجاتی ہیں۔ دال ہی کو لے لیں ، ہماری خوراک میں شاید سب سے سستی چیز تصور کی جاتی تھی لیکن اب نہیں، اب تو دال بھی گوشت کے برابر مہنگی ہوگئی ہے۔ کھانے پینے کے اشیاء کے حوالے سے بعض چیزوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی جیسے کراچی کی اسٹوڈینٹ بریانی، سرگودھاکے نذدیک گاؤں ' جھال چکیاں ' کی مشہور و معروف دال جو 'دال جھال چکیاں دی'کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح جی ٹی روڈپر لالہ موسیٰ اور کھاریاں کے درمیان ایک ریسٹورانٹ جو کبھی ڈھابہ ہوا کرتا تھا کی 'میاں جی کی دال' مشہور ہے جس کا ذکر معروف کالم نگار 'عطاء الحق قاسمی نے اپنے کالم 'میاں جی کی دال اور سیاسی ماعتیں' کے عنوان سے ۵ ستمبر ۲۰۱۳ء کے کالم میں کیا۔ میاں جی کی دال کی تفصیل جو قاسمی صاحب نے بیان کی ان کے کالم میں پڑھی جاسکتی ہے۔

ذکر ہے ۲۰۱۱ء کا جب میں اپنی کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر سرگودھا یونیورسٹی سے بہ حیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر منسلک ہوگیا۔ مجھے ایک سال بعد ہی جامعہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ کیونکہ مجھے کئی ماہ کے لیے سعودی عرب جانا

تھا اور ایسا ہی ہوا۔ جامعہ سے رخصت ہونے کے موقع پر میرے کئی کرم فرماؤں دوستوں اور شاگردوں نے مجھے الوداع کرنے کے لیے دعوتوں کا اہتمام کیا۔ مجھے مجبوراً ان فرمائشوں کو قبول بھی کرنا پڑا۔ میں کسی کے خلوص کو ٹھکرانے کا قائل بھی نہیں۔ سرگودھا میں میرے ایک شاگرد کا شادی ہال تھا اس نے کسی کے ولیمہ کی دعوت میں مجھے اور چند دیگر دوستوں کو فارغ کر ڈالا۔ یہ بھی اس کا خلوص ہی تھا۔ میرے چند شاگردوں نے جامعہ سرگودھا روڈ پر ایک ہوتل میں دعوت کی، تمام شاگردوں کے نام یاد نہیں اس لیے کسی کا بھی نام نہیں لکھ رہا، دو شاگرد رحیم اور سائمہ کے نام یاد ہیں اس وجہ سے بھی کہ اب یہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔ میرا ایک شاگرد ارشد سجرا جسے مَیں کلاس میں ارشد بھٹی کہا کرتا تھا حالانکہ وہ بھٹی نہیں تھا، اسی کلاس کا ایک طالب علم عرفان گوندل تھا، یہ ارشد کا قریبی دوست تھا، اس نے ایک کارنامہ انجام دیا، پہلے سیمسٹر کا امتحان تھا، مجھے چھٹی پر کراچی جانا پڑا، اپنا پرچہ بنا کر نور مصطفیٰ کو دیدیا، جس دن میرے مضمون کا امتحان تھا سنا ہے کہ عرفان نے اپنی جگہ کسی دوسرے لڑکے کو امتحان دینے کے لیے بٹھا دیا اور وہ پکڑا بھی گیا،ڈاکٹر فاضل خان صاحب بھلا ایسی حرکت کو کب معاف کرنے والے تھے۔ انہوں نے سخت ایکشن لیا، صرف نوبت پولس کیس تک نہیں پہنچی۔ اس کے بعد سے عرفان گوندل نے کلاس میں آنا ترک کردیا، مَیں جب واپس سرگودھا آیا تو یہ قصہ معلوم ہوا، میں نے معلوم کیا یہ عرفان کون سا، معلوم ہوا کہ وہ ارشد کے

ساتھ بیٹھتا تھا اور اس کا قریبی دوست تھا اب مَیں نے ارشد کو اس کے دوست کی دوستی کی بنا پر ارشد بھٹی کہنا شروع کر دیا۔ کیونکہ عرفان 'بھٹی' کے نام سے معروف تھا۔ ارشد میری کلاس کا بہت ہی سیدھا سادھا طالب علم تھا، دیکھنے میں زیادہ عمر کا لگتا، عام طور پر خاموش اور پچھلی سیٹوں پر ہی بیٹھا کرتا۔ کم گو لیکن با اخلاق اور عزت کرنے والوں میں سے تھا۔ اس موقع پر ارشد نے مجھے اپنے گاؤں 'جھال چکیاں لے جانے اور وہاں کی مشہور دال ''دال جھال چکیاں دی'' کھلانے کی دعوت دی، اس کا گاؤں سرگودھا شہر سے کوئی بارہ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، میں نے یہ پیش کش قبول کر لی، مقررہ وقت ارشد موٹر بائیک پر مجھے جھال چکیاں لے گیا، راستے میں بارش بھی ہوئی لیکن یہ مجھے موٹر بائیک پر سرپٹ دوڑاتا ہوا اس مشہور ہوٹل لے گیا جہاں کی یہ دال سرگودھا ہی میں نہیں بلکہ پورے پنجاب میں مشہور ہے، اس سڑک سے گزرنے والے مسافر اس دال کو ضرور کھاتے ہیں، بلکہ یہاں لوگ دور دراز سے یہ دال کھانے آتے ہیں۔ اس تو اس ہوٹل کی کئی برانچیں بھی کھل گئیں ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کراچی میں اسٹوڈنٹ بریانی، ملتان میں حافظ کا سوہن حلوہ، خوشاب کے ڈوڈے، حیدر آباد میں حاجی کی ربڑی، لاہور میں پھجے کے سری پائے، چکوال کے پہلوان کی ریوڑیاں، کراچی میں کبھی عبدالخالق کے رس گلے بہت مشہور ہوا کرتے تھے، فریسکو کی مٹھائی بہت مشہور تھی، کراچی میں ڈھاکہ یا بھاشانی کی مٹھائیاں پسند کی جاتی ہیں، محمود کی مٹھائی بہت مشہور ہے، بدایوں کے

پیڑے، برنس روڈ کی نہاری بہت پسند کی جاتی ہے،آجکل جاوید کی نہاری کی دھوم ہے، کراچی ہی میں مشہور حلیم یا کراچی حلیم بہت کھایا جاتا ہے۔ پی آئی ڈی سی ہاؤس پر موجود پان کی دکانوں کے پان خوب خوب کھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بے شمار کھانے پینے کی اشیاء مختلف شہروں میں ہوں گی جو پسند کی جاتی ہیں۔اب تو فوڈ اسٹریٹ کا رواج عام ہوتا جارہا ہے.بڑے شہروں میں فوڈ اسٹریٹ قائم ہو چکی ہیں جہاں پر ہر طرح کی کھانے کی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں اور لوگ.بڑی تعداد میں وہاں جاتے ہیں۔

ہوٹل.بڑا تھا، لوگ جوق درجوق چلے آرہے تھے، صفائی کا فقدان تھا، دلچسپ اور خاص بات یہاں کی یہ تھی کہ ہوٹل میں دال روٹی کا ریٹ فکس تھا یعنی ڈیڑ سو روپے میں ایک شخص جس قدر دال اور جس قدر روٹیاں کھا سکتا ہے کھالے، خوش خوراکوں کے تو وارے نیارے اور ہم جیسوں کے لیے ایک وقت کی دال روٹی ڈیڑھ سو روپے میں، لیکن یہ عام دال نہیں بلکہ سرگودھا کی مشہور و معروف دال ہے،دال گرینڈ کی ہوئی تھی، کچھ کچھ کراچی کے حلیم کا مزاہ تھا لیکن یہ دال ہی تھی، ۔بارش ہورہی تھی لیکن لوگ جوق درجوق دال روٹی کھانے آرہے تھے۔ ہوٹل ایک اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ ویٹر حضرات کی نظریں کھانے والوں کی دال کی پلیٹ پر رہتیں جوں پلیٹ میں دال ختم ہوئی وہ اسے بغیر کہے دوبارہ بھر دیا کرتے۔ وہ ایسا اس وقت تک کرتے رہتے ہیں جب آپ ان سے نہ کہیں کہ

قبلہ بس کافی ہوگیا۔ہم نے خوب دال اڑائی ، واقعی مزیدار تھی۔ کھانے کے بعد ارشد مجھے اپنے گھر بھی لے گیا۔ دیہاتوں نے شہروں کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کے گھرکے باہر مہمانوں کے لیے اوطاق بنی ہوئی ہے اسی میں ہم بیٹھے اور چائے پی۔ اس وقت تک ارشد کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن اب وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے۔

تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم نے واپسی کی راہ لی اور اس نے مجھے جامعہ کے ٹیچر ہاسٹل میں چھوڑا۔ دال تو اپنی جگہ اچھی تھی لیکن ارشد کے خلوص اور محبت کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

سرگودھا کو خیرباد کہے تین سال ہونے کو ہیں ارشد نے مجھ سے ناتا جوڑا ہوا ہے، اکثر فون کرلیتا ہے۔کینوؤں کا موسم آتا ہے تو یہ کینوؤں کی کم از کم دو پیٹیوں کا تحفہ بھیج کر مجھے مطلع کردیتا ہے کہتا ہے 'سرجی فلاں گاڑی سے پیٹیاں روانہ کردی ہیں وصول کر لیجیے گا۔کلینڈر کا نام، بس کا نمبر اور فون نمبر ایس ایم ایس کر رہا ہوں'۔ کئی سال سے ارشد شاگرد ہونے کا حق ادا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔اب تو شادی بھی ہو گئی ہے کسی لائبریری میں ملازمت کرتا ہے۔ اس کے بڑے بزرگ کچھ سیاسی ہیں اس علاقے سے ایم پی اے اور ایم این اے کا الیکشن بھی لڑتے ہیں۔

ارشد کے علاوہ بھی کئی شاگرد ہیں جو سرگودھا سے مجھے اکثر یاد کرلیتے ہیں۔

میری تحریروں پر اپنے تاثرات تحریر کرتے ہیں انہیں پسند کرتے ہیں۔ ابھی چھوٹے دیہات نما شہروں میں اپنے اساتذہ سے محبت، احترام اور عقیدت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

سلام: ایک مسنون عمل، اسلام کا بنیادی شعار

یہ معاشرے میں امن و سلامتی کے فروغ کا اہم اور موثر ذریعہ ہے

سلام کے معنی و تعریف

لفظ سلام عربی زبان کا مصدر ہے، جو مصدری معنی ہونے کے علاوہ بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں ’ امن و عافیت، براءت، مُتارکہ (ترک جنگ) یا صلح، میانہ روی و اعتدال، پختہ قسم کی گفتگو، کمال یعنی کامل و سلم ہونا، بقا، نجات، صحت، دعا اور درود، تبریک و تَحِیَّۃَ یا کورنش اور ’’بس‘‘ یا ’’ بات ختم ہوئی‘‘ کے معنی میں۔ موخر الذکر معنی دراصل خط وکتابت کے انداز سے مرتب ہوئے (خط کے آخر میں لکھتے تھے ’’ والسلام‘‘ اسی سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ بس اب بات ختم ہوئی)۔ عربی میں سلام کرنے یا نماز کے اختتام پر سلام کو ’’تَسلِیمَۃ‘‘ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ۳۵ آیات میں تنکیر (’’سَلَام‘‘) اور تعریف (’’اَلسَلَامُ‘‘) دونوں شکلوں میں مختلف معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ’’اَلسَلَامُ‘‘ اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے اور اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جو باعث خیر و برکت ہے۔ اس کے معنی ہیں ’’امن و

سلامتی کا سرچشمہ یا ہر عیب و نقصان سے پاک''۔ (اردو دائرۂ معارفِ (اسلامیہ، جلد ۱۱، ص ۱۲۲

سلام کرنے کی ابتدا

تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تمام قوموں اور گروہوں میں ملاقات کے شروع میں ایک دوسرے کو جذبہ خیر سگالی کا اظہار کرنے اور ایک دوسرے کو مسرور کرنے کے لیے مخصوص جملے ادا کیے جاتے تھے، اظہار مسرت و شادمانی کا یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ قبل از اسلام عربوں میں ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو دیکھتے ہی خیر سگالی کے طور پر دعائیہ کلمہ ادا کرنے کا رواج تھا۔ صحابی رسول ﷺ عمران بن حصینؓ سے حدیث مروی ہے جسے سنن ابی داؤد نے نقل کیا ہے کہ ''ہم لوگ اسلام سے قبل آپس میں ملاقات کے وقت 'أَنْعَمَ اللهُ بِكَ عَيْنًا' (اللہ آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کرے)، یا پھر 'أَنْعِمْ صَبَاحًا' (آپ کی صبح خوشگوار ہو) کہا کرتے تھے، جب ہم لوگ دائرہ اسلام میں' داخل ہوگئے تو ان الفاظ کے ادا کرنے کی ممانعت کردی گئی، اس کے بجائے ہمیں (اَلسَّلامُ عَلَيْكُمْ'' کی تعلیم دی گئی''۔ (سنن ابی داؤد''

سلام کا رواج دیگر اقوام اور ممالک میں ان کی ثقافت، تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور زبان کے مطابق رائج ہے۔ انگریزوں کے صبح، شام و رات کے سلام الگ

صبح بخیر یا اچھی صبح، شام کے وقت (Good Morning) الگ ہیں یعنی صبح کے وقت
(Good Evening) شام بخیر یا اچھی شام اور رات کے وقت (Good Night)
رات بخیر یا اچھی رات کہا جاتا ہے۔ ہندو تہذیب میں ''نمستے'' یا '' رام رام''، ''پر
نام'' کہا جاتا
ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں ''آداب'' یا ''آداب عرض'' ، ''تسلیم یا 'تسلیمات ''،
بھی کہا جاتا ہے۔

سلام کی ابتداکے بارے میں صحیح بخاری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو مکمل طور پر ان کی صورت میں پیدا کیا ان کی لمبائی تقریباً ساٹھ ہاتھ یعنی تیس میٹر تھی۔جب (اللہ تعالی) انہیں حضرت آدم علیہ السلام) کو پیدا کر چکا تو فرمایا کہ 'جاؤ ان فرشتوں کو جو بیٹھے ہوئے) ہیں سلام کرو اور سنو کہ تمہارے سلام کا یہ کیا جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا''۔ حضرت آدم علیہ السلام نے (فرشتوں سے جا کر) کہا ! اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم'' ، فرشتوں نے جواب دیا۔ 'وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ' انھوں نے'' حضرت آدم علیہ اسلام پر' رحمتہ اللہ' کا اضافہ کیا۔ پس جو شخص بھی جنت میں جائے گا حضرت آدم علیہ السلام کی صورت کے مطابق ہو کر جائے گا۔ ''اَلسَّلَامُ

عَلَیْکُم'' ایک مکمل کلمہ ہے جس سے باہمی مسرت و تعلق، اکرام و خیر اندیشی کا سچا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا دعائیہ کلمہ ہے جس کا مطلب ہے 'تم پر سلامتی ہو یا تم سلامت رہو''۔ معارف الحدیث میں السلام علیکم کے معنی ''اللہ تم کو ہر طرح کی سلامتی نصیب فرمائے'' بیان کیے گئے ہیں۔

سلام کا احسن طریقہ

سلام کا احسن طریقہ وہ ہے جو ہمیں احادیث مبارکہ سے ملتا ہے۔ اس سے آسان، بہتر اور افضل کلمہ سلام کرنے کا کوئی اور نہیں۔ جب ایک شخص دوسرے سے کہے ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُم'' (تم پر سلامتی ہو) تو جواب میں '' وَعَلَیْکُم السَّلَامُ وَرَحمَۃُاللہ'' (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)۔ اگر کوئی شخص السلام علیکم کے ساتھ ''ورحمۃُاللہ '' کا اضافہ کرے اور کہے '' اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحمَۃُاللہ'' (تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) تو جواب دینے والا شخص وعلیکم السلام کے ساتھ ''وَبَرَکَاتُہٗ' (اور اللہ کی برکتیں بھی تم پر ہوں) کا اضافہ کرتے ہوئے اس طرح جواب دے '' وَعَلَیْکُم السَّلَامُ وَرَحمَۃُللہ 'وَبَرَکَاتُہٗ''(تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی برکتیں بھی تم پر ہوں)۔ علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ کلام مجید میں اللہ تعالیٰ نے سلام کے جواب میں بہتر کلمے سے جواب دینے کی ہدایت کی ہے۔ سورۃ النساء (۴) کی آیت ۸۶ میں کہا گیا ہے ترجمہ: اور جب تم کو کوئی

سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو یا ویسے ہی الفاظ کہدو۔
بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لیں گے'۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے کہا ''اَلسَّلَامُ عَلَیکُم'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا '' وَعَلَیکُم السَّلَامُ وَرَحمَۃُاللہ'' اور جب ایک صحابی نے '' اَلسَّلَامُ عَلَیکُمُ وَرَحمَۃُاللہ'' کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں '' وَعَلَیکُم السَّلَامُ وَرَحمَۃُاللہ وَبَرَکَاتُہٗ '' فرمایا؛ لیکن جب ایک شخص نے کہا '' اَلسَّلَامُ عَلَیکُمُ وَرَحمَۃُاللہ وَبَرَکَاتُہٗ '' تو آپ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں صرف ''وَعَلَیکَ'' فر ما دیا۔ وہ شخص کلام مجید کی سورۃ النساء کی مذکورہ آیت پڑھنے کے بعد کہنے لگا: یا رسول اللہ ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجھے ناقص جواب دیا ہے ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چونکہ تم نے میرے لیے کوئی لفظ فضیلت باقی نہیں چھوڑا اس لیے میں نے ویسے ہی جواب دے دیا ہے۔ تفسیر القرطبی میں القرطبی نے لکھا ہے کہ بہترین جواب سلام کا) یہی الفاظ ہیں اس پر مزید اضافہ نہیں ہوگا۔ یعنی لفظ '' برکاتہٗ'''' آخری حد ہے اس پر اضافہ نہ ہو۔ اور مناسب یہی ہے کہ سلام ہمیشہ ضمیر جمع کے ساتھ ہو (یعنی ''علیک'' کی بجائے ''علیکم'' کہا جائے خواہ مخاطب واحد ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اس کے ساتھ ملائکہ (کِرَاماً کَاتِبِین) ہوتے ہیں۔ (اردو دائرۃ

(معارفِ اسلامیہ، جلد ۱۱، ص ۱۲۴

السلام علیکم کی فضیلت اور اہمیت

اسلام میں سلام کی فضیلت اور اہمیت مختلف احادیث مبارکہ سے واضح ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام میں (یعنی اسلامی اعمال میں) کون سی حالت (کون سا عمل) افضل ہے، زیادہ اچھا ہے۔آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک) یہ کہ تم اللہ کے بندوں کو کھانا کھلاؤ اور (دوسرے) یہ کہ سلام کرو اسے)" بھی جسے تم پہچانتے ہو اور اسے بھی جسے تم نہیں پہچانتے"۔

سلام کرنے کا اجر و ثواب

سلام کرنے اور اس کا جواب دینے کا اجر اور ثواب احادیث مبارکہ سے واضح ہے۔ مالک دوجہاں نے اپنے نیک و صالح بندوں کے لیے ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر مقرر کیا ہے، اللہ تعالٰی نے یہ خصوصیت اپنی آخری امت کے لیے ہی رکھی ہے۔ سلام کرنے کے عوض نیکیوں کے بارے میں جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمات میں حاضر ہوا اور اس نے کہا ''اَلسَّلَا مُ عَلَیْکُمْ ''' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا' پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اس کو دس نیکیاں ملیں (یعنی اس بندے کے لیے سلام کی وجہ سے دس نیکیاں لکھی گئیں)۔ پھر ایک اور شخص آیا' اس نے کہا ''اَلسَّلَا مُ عَلَیْکُمْ'' وَرَحْمَۃُ اللہِ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا' پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اس کو بیس نیکیاں ملیں (یعنی اس بندے کے لیے سلام کی وجہ سے بیس نیکیاں لکھی گئیں)۔ پھر تیسرا شخص آیا' اس نے کہا ''اَلسَّلَا مُ عَلَیْکُمْ'' وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ'''' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دیا' پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اس کو تیس (نیکیاں ملیں (یعنی اس بندے کے لیے سلام کی وجہ سے تیس نیکیاں ثابت ہو گئیں

سلام میں سبقت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو کوئی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُسے سلام کرنے میں سبقت فرماتے اور آنے والے کے سلام کا جواب بھی دیتے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا"لوگوں میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے"۔ (مسند احمد' جامع ترمذی' سنن ابی داؤد) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد (فرمایا کہ " سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے"۔ (شعب الایمان للبیہقی

(کون کس کو سلام کرے (احکام اور ضابطے

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کون کس کو سلام کرے، یعنی سلام کرنے کے حسب ذیل اصول احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " چھوٹا بڑے کو سلام کیا کرے اور راستہ سے گزرنے اور چلنے والا بیٹھے ہوؤں کو سلام کیا کرے' اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کی جماعت کو سلام کریں "۔ (صحیح بخاری)۔

: اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ

☆ چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام میں پہل کریں

☆ بڑوں پر لازم ہے کہ انہیں جب کوئی سلام کرے خوش اخلاقی سے سلام کا جواب دیں۔

☆ اگر چھوٹے سلام کرنے میں پہلا نہ کریں تو بڑوں کو چاہیے کو وہ چھوٹوں کو سلام کر نے میں آر یا جھجک محسوس نہ کریں اور انہیں سلام کریں۔

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں سلام کیا کرتے۔

☆ کم تعداد والے زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔

☆ کسی بھی سواری پر سوار، پیدل چلنے والوں کو سلام کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”سوار آدمی کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے“۔

☆ تیز رفتار سواری والا سست رفتار سوار کو۔

☆ راہ گیر یا گزرنے والے راستے میں بیٹھے ہوئے شخص یا لوگوں کو سلام کریں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب سے روایت ہے ”انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرکے بیان فرمایا کہ گزرنے والی جماعت میں سے اگر کوئی ایک سلام کرلے تو پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے، اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک جواب دیدے تو سب کی طرف سے کافی ہے“۔

☆ جب کوئی کسی محفل میں جائے یا چند لوگوں کے ہمراہ گزرے تو ان تمام لوگوں میں سے کسی ایک کا سلام کرنا کافی ہے، ساتھ ہی محفل میں موجود لوگوں میں سے کسی ایک کا جواب دے دینا کافی ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام لوگ سلام کریں اور محفل میں موجود تمام لوگ ہی سلام کا جواب دیں۔

☆ تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کریں۔

☆ سلام میں پہل کرنا زیادہ مستحسن ہے۔ حضرت قتادہ (تابعی) سے (مرسلًا) روایت

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تم کسی گھر میں جاؤ تو گھر والوں کو سلام کرو اور پھر جب گھر سے نکلو اور جانے لگو تو وداعی سلام کرکے نکلو“۔ (معارف الحدیث)

☆ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو داخل ہونے سے قبل اہل خانہ سے اجازت لو اور گھر والوں کو سلام کرنے میں پہل کرو۔

☆ سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہترین شخص وہ ہے جو سلام میں سبقت لے جائے۔

☆ ہم اکثر کسی کے ذریعہ اپنے کسی جاننے والے کو سلام کہلواتے ہیں۔ جب کوئی کسی کو سلام کہلائے تو سلام کہلانے والے کے سلام کے جواب میں ”وَعَلَیْکُمُ السَّلَام“ و رحمتہ اللہ کہنا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ”وَعَلَیْکُمُ السَّلَام“ و رحمتہ اللہ“ کہا تھا۔

☆ اگر کوئی شخص کسی کا سلام لائے تو سلام بھیجنے والے اور اور لانے والے دونوں کو جواب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میرے والد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا ”عَلَیْکَ و

(عَلٰی اَبِیْکَ السَّلام“ تجھ پر اور تیرے والد پر سلام ہو

(تفسیر القرطبی)

☆ محرمات اور بیوی کو سلام کرنے کا حکم ہے، مگر اجنبی عورت خواہ جوان ہو یا عمر رسیدہ اسے سلام کرنے سے روکا گیا ہے (تفسیر القرطبی

☆ قبرستان جانے والے اہل قبور کو سلام کریں۔ سلام کے الفاظ یہ بیان کیے گئے ہیں۔ا اَلسَّلَامُ عَلَیکُم یااَھلَ القُبُورِ یَغفِرُ اللہ لَنَا وَلَکُمْ وَاَنتُمْ سَلَفُنَا وَنَحنُ بِالاُثرِ ترجمہ: ''اے قبروں میں رہنے والو تمہیں ہمارا سلام پہنچے بخشے اللہ ہم کو اور تم کو۔ اور تم آگے جانے والے ہو اور ہم تمہارے قدم پر (پیچھے آنے والے ہیں''۔

☆ اگر کوئی سلام کا جواب نہ دے تو اسے دوسری بار اور پھر تیسری بار سلام کرنا چاہیے لیکن اگر وہ پھر بھی نہ سنے تو خاموش ہو رہے اور پھر اس وقت سلام نہ کرے۔

☆ سلام کرنا اسلام کی افضل ترین حالت ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

☆ سلام کے جو الفاظ احادیث مبارکہ میں آئے اور جن کا حکم دیا گیا ان کے بجائے دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے سلام نہیں ہوتا، مسلمان کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے کہ ہم سلام کے لیے ان احکامات اور ضابطوں پر سختی سے عمل کریں۔

☆ سلام کا جواب انہی الفاظ میں دینا جو احادیث مبارکہ میں آئے اور ان کے بجائے دوسرے الفاظ کا استعمال کرنے سے جواب نہیں ہوتا۔

جواب کی افضل صورت ''وعلیکم السلام'' ، اس سے افضل صورت ''وعلیکم اسلام و رحمتہ اللہ'' اور افضل ترین صورت '' وعلیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہ'' ہے۔

☆ سلام کرنا سنت اوراس کا جواب فرض ہے، اس لیے جس طرح سنت کا تارک اتنا گناہ گار نہیں ہوتا جتنا تارک فرض؛ اسی طرح سنت ادا کرنے والا فرض کے ادا کرنے والے سے زیادہ اجر کا مستحق ہے۔

سلام کرنے یا جواب دینے کی ممانعت

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں بعض صورتوں میں سلام نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں سلام کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کے لیے بیٹھے تھے ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اسی طرح خطبہ ، نماز، تلاوت ، حمام اور رفع حاجت کے وقت سلام کا جواب واجب نہیں۔ (جامع ترمذی)

سلام کرنے میں احتیاط سے کام لینا

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں بعض صورتوں میں احتیاط سے سلام کرنا چاہیے۔ یعنی ہمارے سلام سے کسی سوئے ہوئے

شخص کی آنکھ نہ کھل جائے، یا کسی کو بھی کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچے۔ حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اصحابِ صفہ کے پاس تشریف لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح آہستہ اور احتیاط سے سلام کرتے کہ سونے والے نہ جاگتے اور جاگنے والے سن لیتے۔ (معارف الحدیث۔ (حصہ ششم

غیر مسلموں کو سلام کا جواب

غیر مسلم اہل کتاب کے سلام کے جواب کے الفاظ کیا ہوں ؟ بعض علمانے قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت ۸۶ کے الفاظ ''اَو رُدُّوھا'' (یا کیسے کم ویسا ہی جواب (سلام کا دے دیا کرو) کی تشریح یہ بھی کی ہے ایک یہ کہ سلام کے جواب کا درجہ کم سے کم یہ ہے کہ کہ سلام کرنے والے کے الفاظ کو ہی دوہرایا جائے ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس دوسرے حصے سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اہل کتاب سلام کرے تو اس کے جواب میں اسی کے الفاظ دھرا دیے جائیں، چنانچہ یہود مدینہ کے سلام کا جواب دینے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کے جواب میں صرف ''وعلیک'' کے لفظ پر اکتفا کیا جائے۔

(مصافحہ، معانقہ (لپٹنا) اور تقبیل (چومنا

مصافحہ کرنا، معانقہ (لپٹنا یا بغل گیر ہونا) اور (تقبیل) چومنے کے بارے میں ہمیں مختلف احادیث ملتی ہیں۔ مصافحہ کرنا ہمارے معاشرے میں ایک عام رواج ہے، در اصل ملاقات کے وقت محبت و مسرت اور احترام و عقیدت کے اظہار کا ایک ذریعہ مصافحہ کرنا ہے۔ عام طور پر سلام کے ساتھ ساتھ مصافحہ بھی کیا جاتا ہے۔ مصافحہ در اصل تکمیل سلام ہے لیکن ضروری نہیں، سلام کے الفاظ ادا کر دینے سے بھی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''سلام کا تکملہ مصافحہ ہے''۔

ایک اور حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہو اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ کی حمد اور اپنے لیے مغفرت طلب کریں تو ان کی مغفرت ہو ہی جائے گی''۔ (سنن ابی داؤد)۔ عطا خراسانی تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تم باہم مصافحہ کیا کرو اس سے کینہ کی صفائی ہوتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے باہم محبت پیدا ہوگی (اور دلوں سے دشمنی دور ہوگی''۔ (موطا امام مالک

معانقہ (لپٹنا یا بغل گیر ہونا) یا تقبیل (چومنا) کی اجازت موقع محل کے اعتبار سے اور شرعی مصلحت کے خلاف نہ ہو، اس عمل کے پیچھے کسی بھی قسم کی منفی سوچ، لالچ، دنیا دکھاوا یا کسی مقصد کا حصول نہ ہو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معانقہ اور تقبیل سے منع فرمایا، لیکن اکثر علمائے اکرم کی رائے دیگر احادیث کی روشنی میں یہ ہے کہ اس عمل کا تعلق اس صورت سے ہے کہ معانقہ کرنے اور تقبیل کرنے میں کسی برائی یا اس کے شک و شبہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ بعض احادیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ ملانے اور چومنے کے واقعات مروی اور ثابت ہیں۔

سنن ابی داؤد میں ایوب بن بشیر قبیلہ بنو عنزہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے وقت آپ لوگوں سے مصافحہ بھی کیا کرتے تھے؟آپ نے جواب دیا ''میں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات میں حاضر ہوا' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مجھ سے مصافحہ فرمایا۔ اور ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے گھر سے بلوایا میں اس وقت اپنے گھر پر نہیں تھا' جب میں گھر آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلوایا تھا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات میں حاضر ہوا' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر آرام فرماتے،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے اٹھے اور مجھ سے لپٹ گئے اور گلے لگا لیا' اور آپ کا یہ معانقہ بہت خوب اور بہت ہی خوبصورت تھا (بہت دلکش اور بہت ہی مبارک تھا)۔

امام شعبی (تابعی) سے مرسلاً روایت ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر بن ابی طالب کا استقبال کیا (جب وہ حبشہ سے واپس آئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لپٹ گئے (یعنی معانقہ فرمایا) اور دونوں آنکھوں کے بیچ میں (ان کی پیشانی کو) بوسہ دیا"۔ (سنن ابی داؤد، شعب الایمان للبیہقی) مندرجہ بالا احادیث سے یہ ثابت ہے کہ محبت اور احترام کے جذبہ سے معانقہ اور تقبیل (یعنی ہاتھ یا پیشانی وغیرہ چومنا) جائز' اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

کون کس سے مصافحہ کرے

مصافحہ کیسے کیا جائے اور کون کس سے مصافحہ کرے ؟ اس سلسلے میں علماء اکرم نے بہت واضح الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ مردوں کو چاہیے کہ وہ مردوں سے مصافحہ، معانقہ اور تقبیل کریں جب کہ خواتین صرف اور صرف خواتین سے ہی مصافحہ ، معانقہ اور تقبیل کریں۔ عورتوں کو مردوں سے مصافحہ، معانقہ یا تقبیل سے منع کیا گیا ہے۔ مسلمان جب مسلمان بھائی سے مصافحہ کریں تو اپنے

دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں دیں، بسا اوقات ہم مصافحہ کے لیے صرف ایک ہاتھ بڑھا دیتے ہیں، بعض لوگ تو محض دو انگلیاں ہی آگے بڑھاتے ہیں جو اس بات کی واضح علامت ہوتا ہے کہ ہاتھ ملانے والا نہ پسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔ ایسا کرنے والے ثواب کے بجائے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، لہٰذا اس عمل سے بہتر ہے کہ زبان سے سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا جائے تاکہ ہم نے دوسرے مسلمان کو سلام کرکے جو ثواب کمایا اور سنت نبوی صلی اللہ علیہو سلم پر عمل کیا، بیزاری کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنے ثواب کو ضائع نہ ہونے دیں۔ (روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) ستمبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہوا ۲۹،

محمد ارسل نبیل۔ جس نے دنیا میں سب سے پہلے میری آواز سنی

جولائی ۲۰۱۳ء (۱۴۳۴ھ) رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہمارے پوتے صاحب کی آمد بھی متوقع تھی۔ وہ اپنی زندگی کا اولین دور اپنی ماں کی کوکھ میں مکمل کر چکے تھے۔اب انہیں اس دنیا میں آنا تھا۔ جس کی تیاری انہوں نے شروع کردی تھی۔ ان کے استقبال کے لیے ہم بھی تیار تھے۔ سائنسی ترقی نے بہت سی چیزوں کو آسان تر بنا دیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ آخری وقت تک یہ معلوم نہیں ہوپاتا تھا کہ دنیا میں آنے والا مہمان آدم کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے یا اماں حوا کی نسل سے ہے۔ آخری لمحے جب یہ راز افشا ہوتا کہ موصوف ابنِ آدم ہیں تو خوشیوں کے شادیانے بج جایا کرتے اور دوسری صورت میں جب یہ معلوم ہوتا کہ آنے والی مہمان بنتِ حوا ہے تو شادیانوں کی آوازیں مدہم ہوجاتیں اور خاموشی سے خوشی منا لی جاتی۔ اسلام میں تو مرد اور عورت برابر ہیں پھر بھی نہ معلوم ہمارے معاشرے میں یہ رواج عام کیوں ہوگیا ہے۔ حالانکہ بیٹی رحمت تو ہے اور نعمت بھی، بیٹی باپ کا مان ہے تو ماں کا سکون، آنکھ کا نور، دل کا سرور اور زندہ رہنے کی پہچان بھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ ”یہ فیصلہ صرف ہم کرتے ہیں کہ کس جوڑے کو لڑکی یا لڑکا دیا جائے یا دونوں سے نوازا جائے‘ یا انہیں بے اولاد رکھا جائے“۔ اللہ

کی ہر بات پر ایمان ہم پر لازم ہے اور ہم ایمان رکھتے ہیں تو پھر اپنے پروردگار کے ہر فیصلے کو صدق دل سے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کائینات کا مالک ہے جس سے چاہے نوازے یا ہمیں اس نعمت سے ہی محروم رکھے اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ ہم تو اللہ سے اپنی خواہش کی تکمیل کی دعا ہی کر سکتے ہیں اب اس کی مرضی وہ ہماری خواہش کے مطابق ہمیں نوازے یا اس کے برخلاف، ہمیں ہر صورت میں اس کا شکر گزار مُطیع وفرماں بردار رہنا چاہیے۔

آج کی جدید ترقی کئی ماہ قبل یہ اعلان کر دیتی ہے کہ والدین بیٹے کے باپ بننے والے ہیں یا بیٹی سے ان کی خوشیاں دوبالا ہوں گی۔ ساتھ ہی اب یہ رواج بھی عام ہوگیا ہے کہ بچے کی پیدائش کی قدرتی تکلیف برداشت کرنے کے بجائے عمل جراحی (سیزر) کو فوقیت دی جانے لگی ہے۔ بعض کے ساتھ تو واقعتاً مجبوری ہوتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قدرتی تکلیف سے بچنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی میں پرائیویٹ اسپتالوں کا کلیدی کردار ہے۔ رہی سہی کثر اسپتالوں میں پینل سسٹم نے پوری کردی ہے۔ اب اکثر مائیں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ نومولود آپریشن کے ذریعہ دنیا میں آجائے اور سیزیرین کہلائے۔

ڈاکٹر کی جانب سے ہمارے پوتے صاحب کی دنیا میں آمد کی تاریخ، دن اور وقت

طے کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ اختیار تو صرف اور صرف اللہ ہی کو ہے کہ وہ کس کو کب دنیا میں بھیجے اور کب واپس بلالے لیکن یہ بھی ہے دستور اب زندگی کا۔ پوتے صاحب کی آمد کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ جمعہ ۷ جون ۲۰۱۳ء ۲۷ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ کی شب مَیں، شہناز اور نبیل اپنی بہو ثمرا اور نئے آنے والے مہمان کا صدقہ دینے کے لیے ایدھی ہوم گئے۔ صدقے کا بکرا نکلوایا گیا بہو نے بکرے پر ہاتھ پھیرا اور سامنے ذبح کر دیا گیا۔ اب تو ہر چیز کی سہولت ہو گئی ہے۔ اگر ہم چاہیں تو بعض فلاحی ادارے صدقے کا بکرا گھر پر بھی لے آتے ہیں اور ذبح کرکے لے جاتے ہیں۔ صدقہ مصیبتوں کو، بلاؤں کو، پریشانیوں کو ٹالتا ہے۔ صدقہ و ذکوۃ ایک ہی مفہوم میں استعمال کیے گئے ہیں، تاہم صدقہ کا عام استعمال رضاکارانہ طور پر خیرات کرنے کے معنوں میں ہے۔ امام مالک نے اسے انسانوں کا میل کچیل کہا ہے۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی ابنِ سینا اسپتال ہے۔ چھوٹا لیکن صاف ستھرا، ڈاکٹر بھی اچھے جب ایسی سہولت نزدیک موجود ہو تو دور جاکر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہمارے بڑے پوتے 'محمد صائم عدیل' کی آمد بھی اسی اسپتال میں ہوئی تھی۔ ہفتہ ۸ جون ۲۰۱۳ء ۲۸ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ، صبح ۹ بج کر ۴۰ منٹ پر ہمارے پوتے صاحب نے اعلان کیا کہ وہ دنیا میں آچکے ہیں۔ شہناز، نبیل کے علاوہ ان کے نانا، نانی، ماموں اور خالہ بھی موجود تھیں۔ مَیں دعاؤں کے ساتھ

ثمرا کولیبر روم رخصت کرکے گھر آگیا تھا۔سب آپریشن تھیٹر کے باہر اس خبر کے منتظر تھے ، ہر کوئی دل ہی دل میں اچھی خبر سننے کی دعا کر رہا تھا۔جیسے ہی یہ خبر ملی سب نے اللہ کا شکرادا کیا، اللہ نے خوشی کا موقع دکھایا۔ نبیل نے فوری طور پر گھر آ کر مجھے خبر دی ۔ پہلے عمل کے طور پر شکرانے کے نفل ادا کیے اور اپنے پروردگار سے اپنی بہو اور نو مولود پوتے کی صحت اور درازی عمر کی دعا کی اور اسپتال پہنچ گیا۔ پوتے صاحب بالکل ٹھیک ٹھاک، ہشاش بشاش، چیختے، چلاتے ، شور مچاتے تشریف لے آئے انہیں احتیاطی تدابیر کے طور پر انکیوبیٹر میں لٹا دیا گیا۔

نو مولود بچے کے دنیا میں آجانے کے بعد مسلمان کی حیثیت سے ہمارا پہلا عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس کے کانوں کے ذریعہ اس کے دل اور دماغ میں یہ بات پہنچائیں کہ وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہے ، اللہ ایک ہے ،اس کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ یہ پیغام اذان کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ اذان کے کلمات دین کی روح بلکہ دین کے پورے بنیادی اصولوں کی تعلیم و دعوت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنے نواسے حسن بن علی کے کان میں نماز والی اذان پڑھتے ہوئے دیکھا (جب آپ کی صاحبزادی) فاطمہ رضی اللہ عنہاکے ہاں ان کی ولادت ہوئی (۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد

معارف الحدیث میں علامہ محمد منظور نعمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دوسری حدیث سے جو ''کنزالعمال'' میں مسند ابو یعلی موصلی کی تخریج سے حضرت حسین بن علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو مولود بچہ کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھنے کی تعلیم و ترغیب دی، اور اس برکت اور تاثیر کا بھی ذکر فرمایا کہ اس کی وجہ سے بچہ اُمّ الصبیان کے ضرر سے محفوظ رہے گا (جو شیطانی اثرات سے بھی ہوتا ہے)

پیارے نبی ﷺ کی اس سنت کی ادائیگی میں دیر کرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ اسپتال کے عملے سے استدعا کی گئی کہ نومولود کے کان میں اذان دینا ضروری ہے انہوں نے یہ سہولت فراہم کر دی۔ ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ہمارے پوتے صاحب لنگوٹ کسے شیشے کے چھوٹے سے گھر میں جلوہ نما تھے۔ آنکھیں بند تھیں لیکن ہاتھ پیر چل رہے تھے۔اللہ اکبر کی صدائیں سننے کے لیے بے قرار تھے۔ نرس نے کہا کہ آپ انکیو بیٹر کے نزدیک ہو کر اذان دیدیں ۔یہ مناسب نہیں لگ رہا تھا میری کہنے پر نرس نے پوتے صاحب کو کپڑے میں لپیٹ کر ہمارے ہاتھوں میں دے دیا۔ ماشاء اللہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔اس موقع پر پوتے صاحب کی دادی، نانا

نانی اور ان کے بابا (نبیل) موجود تھے۔ میں نے قبلہ رو ہو کر اذان کے لیے پہلے اس کا داہنا کان اوپر کیا اور اذان دی، پھر بائیں کان کو اوپر کیا اور اقامت کہی۔ ساتھ ہی پوتے صاحب کے کان میں یہ بھی کہا کہ آپ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو آپ کا نام ''محمد ارسل نبیل'' رکھا گیا ہے۔ جو ہم سب کی طرف سے آپ کے لیے پہلا تحفہ ہے۔ 'ارسل' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ' وہ جو بھیجا گیا'، کلام مجید میں یہ لفظ بے شمار جگہ بھیجے جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فوٹو گرافی کا سیشن بھی ہوا، نانا نانی اور دادی نے گود میں لے کر نو مولود کو پیار کیا اور دعائیں دیں۔ الحمد اللہ۔

ہمارے پوتے صاحب کو اس دنیا میں سب سے پہلے اپنے دادا کی آواز سننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس سے قبل ہمارے بڑے پوتے 'محمد صائم عدیل' جو اب ماشاء للہ چھ سال کے ہو چکے ہیں نے بھی سب سے پہلے اپنے دادا کی ہی آواز سنی تھی۔ دادا کی بھی خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے اتنی عمر اور یہ سعادت نصیب فرمائی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں حمل سے تھیں جب ہجرت کرکے مدینہ آئیں تو قباء میں ان کے ہاں ولادت ہوئی اور عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے کہتی ہیں کہ میں نو مولود بچے کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوہارا منگوایا

اور اس کو چبایا پھر اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور پھر اس کے تالو پر ملا، پھر اس کے لیے دعا کی اور برکت سے نوازا''۔ اس عمل کو ''عمل تحنیک'' کہتے ہیں۔ (صحیح مسلم و صحیح بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے خیر و برکت کی دعا فرماتے تھے اور تحنیک فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے اس لیے چاہیے کہ اس کا نام اچھا رکھے۔ (معارف الحدیث)۔ ہم نے بھی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے پوتے صاحب کے کان میں اذان دی اور ان کا اچھا سا نام بھی رکھ دیا۔

عقیقہ بچے کی پیدائش سے ساتویں دن کرنے کی ہدایت احادیث میں ملتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے جانور کے عوض رہن ہوتا ہے جو ساتویں دن اس کی طرف سے قربانی کیا جائے اس کا سر منڈوایا جائے اور نام رکھا جائے۔ (سنن ابی داؤد، سنن نسائی) عقیقہ کے جانور کی قربانی میں نر یا

مادہ کی قید نہیں، بکرا یا بکری، گائے یا اونٹ جس میں سات حصے ہوتے ہیں، یعنی اگر دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا عقیقہ کرنا ہو تو ایک گائے قربان کی جا سکتی ہے۔ عقیقہ کر دینے سے بچے کی بلائیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ عقیقہ کے جانور کے عوض بچے کے رہن ہونے کی وجہ علامہ محمد منظور نعمانی نے 'معارِف الحدیث' میں یہ بیان کی ہے کہ ''دل کو زیادہ لگنے والی بات یہ ہے کہ بچہ اللہ تعالی کی ایک بڑی نعمت ہے اور صاحب استطاعت کے لیے عقیقہ کی قربانی اس کا شکرانہ اور گویا اس کا فدیہ ہے۔ جب تک یہ شکریہ پیش نہ کیا جائے اور فدیہ ادا نہ کر دیا جائے وہ بار باقی رہے گا اور گویا بچہ اس کے عوض رہن رہے گا''۔

جون ۲۰۱۳ء مطابق ۶ شابان المعظم ۱۴۳۴ھ بروز ہفتہ ارسل صاحب کا عقیقہ ہوا۔ ۱۵ سر کے بال صاف ہوئے اور دو عدد بکرے صدقے کے طور پر ذبح کرائے گئے۔ اب ہمارے پوتے صاحب کے سر پر موجود چمک دار کالے اور گھنے بالوں کی جگہ صاف ستھرے چٹیل میدان نے لے لی تھی۔ اب وہ قدرے مختلف نظر آ رہے تھے۔ بلکہ زیادہ حسین لگ رہے تھے۔

جامعہ ترمذی کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ 'حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپ ﷺ

نے (اپنی صاحبزادی سیدہ) فاطمہؓ سے فرمایا کہ اس کا سر صاف کردو اور بالوں کے وزن کے بھر چاندی صدقہ کردو ہم نے وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

ہمارے گھر گویا ایک کھلونا آچکا تھا۔ ہمارے پاس اب کرنے کوئی کوئی کام نہ تھا۔ ہم تھے اور ارسل صاحب، ہر دم ہر پل ان سے کھیلنا، ان کی باتیں کرنا، انہیں دیکھنا ہمارا کام رہ گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے بڑے پوتے صاحب کئی سال قبل اپنے امی اور ابا کے ساتھ سعودی عرب کے شہر جدہ جاچکے تھے۔ جب تک وہ ہمارے پاس تھے اپنے دادا، دادی، چاچا اور چاچی کے لیے خوشیوں اور توجہ کا مرکز تھے۔ اب بھی کوئی دن ان کی یاد کے بغیر نہیں گزرتا۔ صائم صاحب جدہ جاتے ہوئے چپ کے سے اپنے دادا کے کان میں یہ کہہ گئے تھے۔ ایک شعر تضمیم کے ساتھ ۔

مَیں جاتا ہوں دادا، دل کو آپ کے پاس چھوڑے
مری یاد آپ کو یہ ہر پل دلاتا رہے گا

ہم نے بھی اپنے پوتے صائم صاحب کے دل کو اپنے پاس بہت سنبھال کے رکھا ہوا ہے ہر روز ہم ان کے دل سے اپنی یادوں کو بہلا لیتے ہیں ۔ اسی دوران وزیر علی صبؔا کی زمین میں ایک شعر کچھ اس طرح سے ہوا ۔

دل میں اک آہ سی اٹھی ، آنکھوں سے ہوئے اشک جاری
آج یہ بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا خوب اپنے صائم کی یاد آئی

جون کو ارسل صاحب الحمد اللہ ایک سال کے ہوگئے ۔اب یہ وہ ارسل نہیں ہیں۔ ۸ ان کے معمولات بھی بدل گئے ہیں ، کب اٹھنا ہے کب جاگنا ہے کوئی پتا نہیں اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ سوتے میں مسکراتے ہیں۔ بھوک لگی ہو تو پھر ان سے ایک منٹ.برداشت نہیں ہوتا دادی اور ماما کو فیڈر بنانا مشکل کردیتے ہیں۔ نہانے کے شوقین ہیں انہیں باتھر میں کتنی ہی دیر نہلاتے رہیں مجال ہے کے یہ کہہ دیں کہ بس بہت ہوگیایا نہاتے ہوئے رونا تو دور کی بات آواز بھی نکال لیں۔ پوٹی کرنے کے بعد چلا چلا کر بتاتے ہیں کہ جلدی سے صفائی ستھرائی شروع کردی جائے۔ جوں ہی کسی نے ان کے پیمپر کو ہاتھ لگایا اور یہ خاموش ہوئے اور سمجھ گئے کے صفائی والے آچکے ہیں اور اپنا کام شروع کردیاہے۔آثار بتا رہے ہیں کہ یہ نفاست پسند، صفائی ستھرائی کو پسند کرنے والا مزاج رکھتے ہیں۔

ان کے بارے میں پہلے تو سب کا یہ کہنا تھا کہ یہ اپنے بابا نبیل سے ملتے ہیں، کچھ نے دادا سے بھی ملانے کی ناکام کوشش کی ، کچھ دیکھنے والے انہیں ان کی ماما ڈاکٹر ثمرا سے ملاتے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ اپنے اکلوتے

ماموں کی مثل ہیں۔ مشابہت یقیناً قریبی خون کے رشتوں سے ہی ہوا کرتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضرت حسنؓ اپنے نانا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مُشابِہ تھے۔ ارسل صاحب بھی اپنے دادا، نانا یا کسی اور کی مشابِہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ تو اپنی ہی شکل و صورت لے کر آئے ہیں۔ کتابی چہرہ، شروع میں رنگ گورا تھا اب کچھ کمی آتی جارہی ہے، گول گول بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، کھڑے نقش، چوڑی ناک ہمارے خاندان کا ٹریڈ مارک ہے لیکن اس معاملے میں یہ مختلف ہیں ان کی ناک کھڑی اور خوبصورت ہے، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ چمکدار اور گھنے بال، گلابی باریک چھوٹے ہونٹ، چھوٹا بایا، ہاتھ چہرہ سے زیادہ گورے اور خوبصورت، مخروطی انگلیاں، قد ابھی سے لمبائی کی جانب ،بڑے ہو کر اپنے ماموں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ لگتا ہے۔ آواز میں بانکی انداز جو کانوں کو بھلا لگتا ہے۔

ستاروں کے علم پر اکثر لوگوں کا اِعتِقاد نہیں مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایمان بھی ہے کہ غیب کا علم صرف اور صرف اللہ کو ہے۔ لیکن علمِ فلکیات اُن علوم میں سے ہے جسے قدیم علم کہا جاتا ہے۔ اللہ کی مخلوق نے بے شمار کاموں کے لیے چاند، سورج اور ستاروں سے مدد لی ہے۔ ماہر فلکیات کی باتوں پر یقین کرنا یا نا کرنا اپنی جگہ لیکن اس کی حقیقت سے انکار بھی مشکل ہے۔ ارسل صاحب جس تاریخ کو اس دنیا میں وارد ہوئے اس اعتبار سے ان کا اسٹار 'جوزا'

ہے۔ ۲۱ مئی تا ۲۰ جون کے درمیان پیدا ہونے والے ’جوزا‘ ہوتے (Gemini) یعنی ہیں۔ارسل میاں کی ایک پھوپھو ’ سحر ‘ بھی جوزا تھی، کم سنی میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی ۔ ماہرین فلکیات نے ’ جوزا‘ افراد کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کے مطابق ’جوزا‘ مرد دانش مند، بذلہ سنج، نکتہ سنج، ظریف الطبع ہونے کے ساتھ دلربا، دلفریب ، دل پسند، دلچسپ اور لوگوں کے لیے پسندیدہ ہوتا ہے۔ یہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اکثر اوقات لوگوں کی توجہ اور نظروں کا مرکز رہتے ہیں کیونکہ یہ انہیں اپنے اوپر بیتی ہوئی باتوں پر مشتمل قصے کہانیاں خوبصورت انداز سے سنا کر انہیں محظوظ کرتے ہیں۔ ’جوزا‘ مرد ایک اچھا مقرر بھی ہوتا ہے۔ بعض ماہرین فلکیات نے تو ’جوزا‘ مرد کو علم خطابت کا دیوتا کہا ہے کیونکہ یہ بہترین مبصر اور شارح ہوتے ہیں۔ متاثر کن گفتگو کے ساتھ ساتھ ان میں لکھنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے یہ اگر لکھنے کی جانب آجائیں تو اچھے لکھاری ثابت ہوتے ہیں۔ کسی حد تک سادہ لوح بھی ہوتے ہیں۔ یہ فوری طور پر بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے بلکہ فرد مخاطب کے ظاہری خلوص سے فوراً متاثر ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کی سادہ لوحی ہوتی ہے۔ بسا اوقات یہ لوگوں کی زیادتیوں اور کوتاہیوں کو بھی فراموش کردیتے ہیں اپنی انہی عادتوں کے باعث کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔ معروف ’جوزا‘ افراد میں امریکی صدر جارج بش (۱۲ جون ۱۹۲۴ء)، بابرا بش (۸ جون ۱۹۲۵ء)،امریکی صدر جان ایف کنیڈی (۲۹ مئی ۱۹۱۷ء) ،پرنس فلپس (جون ۱۹۲۱ء)، پاکستان کے سابق صدر فیلڈ ۱۰

مارشل محمد ایوب خان (۱۴ مئی ۱۹۰۷ء)، رابرٹ منٹگمری (۲۱ مئی ۱۹۰۴ء)، کوئین میری (۲۶ مئی ۱۸۶۷ء)، معروف شاعر داغ دہلوی (۲۵ مئی ۱۹۳۱ء)، بنگلہ دیش کے معروف شاعر نذرالسلام (۲۵ مئی ۱۸۹۹ء)، ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۲ جون ۱۹۲۹ء) سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی، یوسف رضا گیلانی (۹ جون ۱۹۵۲ء) سابق وزیر اعظم پاکستان صحافی انصار عباسی ۱۲ جون ۱۹۶۵ء) شامل ہیں۔۔

میں جوزاافراد/www.horoscopeurdu.com/gemini نیٹ پر موجود ویب گاہ کی جن نمایاں چیزوں کی نشاندھی کی گئی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رنگ: پیلازرد

عنصر: بادی

جواھر: زمرد، زبرجد، زرد عقیق

بہترین شریک حیات: میزان، دلو

ناموافق ساتھی: سنبلہ، قوس، حوت

دن: بدھ

حروف: ق، ک

عدد: ۵

سیارہ: عطارد

بیماریاں: نمونیہ، سینے کے عوارض، کمر اور سائنس کی تکلیف، اعصابی تکالیف

پیشے : پروفیسر، مصنف، شاعر، صحافی، وکیل، اداکار، مزاح نگار، براڈکاسٹر، ٹریول ایجنٹ، سیلز مین، ڈپلومیٹ

مثبت خصوصیات : دانش ور، بہادر، ایماندار، مصلحت پسند، وسیع الخیال، سوشل، سربراہ، تحقیق پسند، پرمزاق، ظریف، محبت کرنے والا، مہذب، خلیق، شائستہ، نرم مزاج۔

مفید پھل : اورینجیز (موسمی، کینو، مالٹا)، پپیتہ

لکی نمبر : ۲، ۹

لکی مہینہ : اپریل، اگست

جہاں تک چاند، سورج اور ستاروں کی باتوں کا تعلق ہے انہیں ہرگز حتمی تصور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک علم ہے اسے علم کی حد تک ہی لینا چاہیے۔ غیب کی باتوں کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اللہ تعالٰی ہمارے پوتے ارسل کو عمر دراز عطا کرے اور علم کی دولت سے مالا مال کرے۔ آمین۔

علم نجوم اور ستاروں کے علم کے ذریعہ شخصیت کے بارے میں معلومات کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ موجودہ سائنسی اور برقی دنیا کی نئی ایجاد نے انسان کی جین اور خون کے گروپ کے توسط سے اس شخص کے بارے میں بہت کچھ بتایا جانے لگا ہے۔ روزنامہ جنگ کی اشاعت ۲۴ ستمبر ۲۰۱۳ء میں فریحہ سلیم کے مضمون میں بتایا

گیا ہے کہ جاپان میں ہونے والی تازہ ترین تحقیق کے مطابق دنیا میں بسنے والے خواتین وحضرات میں چار اقسام کے بلد گروپ پائے جاتے ہیں اور ہر گروپ کے حامل افرد مختلف خصوصیات رکھتے ہیں۔

اس تحقیق کے مطابق ہمارے پوتے ارسل صاحب کا بلڈ گروپ 'بی +' ہے۔ اس بلڈ کے حامل افراد میں B کہا گیا ہے۔ دنیا بھر میں گروپ (Active) گروپ کو متحرک تقریباً ۹ فیصد لوگ بی پازیٹو اور ۲ فیصد بی نیگیٹو ہیں۔ یہ لوگ خوش مزاج، مثبت سوچ رکھنے والے، حساس شخصیت کے ھامل ہوتے ہیں۔ لیکن غیر منتظم اور لاپروا بھی ہوتے ہیں۔ ان میں عام لوگوں کی نسبت پھرتیلا پن زیادہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ شور پیدا کرتے ہیں اور اپنی مرضی کو فوقیت دیتے ہیں۔ ان میں منزل پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتے بلکہ اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ صرف اپنے لیے کام کرتے ہیں۔ مضبوط شخصیت کے حامل یہ افراد خودسر اور اپنی مرضی چلانے اور من مانی کرنے والے ہوتے ہیں۔ انفرادی کاموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے محقق، ہمدرد معالج، سیکریٹری، گالف کے کھلاڑی اور کک بھی بن سکتے ہیں۔ اس تجزیے کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی ایک علم ہے ۔ بہت کچھ ان باتوں کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ اسے محض علم تصور کرتے ہوئے درج کی گئیں باتوں پر سنجید ہر گز ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔

حال ہی میں برطانیہ کی ایک جامعہ کی تحقیقی رپورٹ منظر عام پر آئی ۔ اس رپورٹ کی تفصیل روزنامہ جنگ کی اشاعت ۲ اپریل ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی ۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ خواتین اور مردوں کو بلڈ گروپ میں موجود خصوصیات کی مناسبت سے اپنے لیے پیشے کا انتخاب کرنا چاہیے ۔ اس رپورٹ کے مطابق 'بی' گروپ کے لوگ تنہائی میں کام کرنا پسند کرتے ہیں اور انہیں ایسے پیشے اپنانے بھی چاہیں جن میں دوسرے لوگوں کا بطور ساتھی کارکن کوئی کردار نہ ہو۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 'اے' اور 'بی' ایسے لوگوں کا گروپ ہے جو بہترین انداز میں ترجمانی اور وکالت کے فرائض سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ منطقی رویے کو پسند کرتے ہیں ان کے سامنے غیر ضروری باتوں سے کام نہیں چلایا جاسکتا ۔ 'اے بی' کی مشہور شخصیت جان ایف کینڈی کی تھی جسے بہترین معاونوں کا تعاون حاصل تھا۔ ایسے افراد بہترین لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کا ہنر جانتے ہیں ۔ یہ اپنے ساتھیوں کی تجاویز اور خیالات کو بھی خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر والدین کی اولاد ڈاکٹر ہی بنتی ہے۔ دیگر پیشوں میں ایسا کم کم ہوتا ہے ۔ میڈیکل کا شعبہ ایسا واحد پیشہ ہے جس میں ڈاکٹر والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ گمان اور اندازہ ہے کہ ہمارے پوتے صاحب ڈاکٹر ماں اور ڈاکٹر باپ کے نقش قدم پر چلیں گے اور والدین بھی انہیں اپنے نقش قدم

پر چلنے کی سعی کریں گے۔

عالمی اردو کانفرنس ۲۰۱۰ء جامعہ سرگودھا۔ میری زندگی کے یادگار لمحات

(جامعہ سرگودھا کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس بہ عنوان 'اردو زبان اور عصری آگہی' میں شرکت میری زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ اس وقت میں جامعہ کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز میں استاد کی حیثیت سے منسلک تھا رہائش جامعہ کے ٹیچرز ہاسٹل میں تھی چنانچہ کانفرنس کے تقریباً تمام ہی اجلاسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ کانفرنس کی روداد اسی وقت لکھ لی تھی اور اردو کے ایک ادبی مجلے 'نگارِ پاکستان' میں شائع ہوچکی ہے)

یونیورسٹی آف سرگودھا کے زیر اہتمام دو روزہ انٹر نیشنل اردو کانفرنس ۳۔ ۴ نومبر ۲۰۱۰ء کو جامعہ کے ایم بی اے ہال میں منعقد ہوئی، کانفرنس کا موضوع تھا 'اردو زبان اور عصری آگہی'۔ کانفرنس کو بلا شبہ ایک تاریخ ساز کانفرنس اورایک موثر اقدام قرار دیا سکتا ہے۔ شاہینوں کے شہر سرگودھا میں اردو زبان کے حوالے سے اس نوع کا بین الا اقوامی اجتماع اور بڑی تعداد میں بیرون ملک اور اندرون ملک کے اہل علم و دانش کا یکجا ہونا اور ادبی و تحقیقی مقالات پیش کرنا، خیالات و افکار کا تبادلہ کرنا، اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے اجتماعی آواز بلند کرنا اور مکالمہ کی صورت ترتیب دینا قابل تعریف بات

ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

کسی بھی جامعہ میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تعلیمی سرگرمیوں کا فروغ اس جامعہ کے سربراہ کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ جامعہ سرگودھا اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اُسے ایک علم دوست، علم پرور، ادیب و محقق اور عربی زبان کے عالم کی سربراہی نصیب ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نام ہے ایک ایسی شخصیت کا کہ جس نے جامعہ سرگودھا کی سربراہی سنبھالتے ہی اسے پاکستان کی دیگر بڑی اور نامور جامعات کی صف میں لا کھڑا کیا، ایچ ای سی کی رپورٹ برائے سال ۲۰۱۰ء کے مطابق علم و تحقیق میں جامعہ سرگودھا پاکستان بھر کی تمام جامعات میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ وہ ایک نفیس انسان اور محنت پر یقین رکھنے والے انسان ہیں۔ بقول عطاء الحق قاسمی 'وہ صرف اسکالر ہی نہیں بلکہ نہایت خلیق اور منکسر المزاج انسان بھی ہیں'۔ انٹر نیشنل اردو کانفرنس دراصل محترم شیخ الجامعہ کی فکر اور اردو زبان سے ان کی محبت و عقیدت کا عملی مظہر ہے۔

سرگودھا جیسے شہر میں جہاں عوام الناس کے لیے ائر پورٹ کی سہولت بھی میسر نہیں' انٹر نیشنل اردو کانفرنس کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا اگر شعبہ اردو اور کانفرنس کے انعقاد میں اردو کی ایک نامور شخصیت کی عملی

جدوجہد شامل نہ ہوتیں، وہ شخصیت ہے پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کی۔ جن کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا کہ ’ وہ طبعناً فعال شخصیت ہیں اور جس کام کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کو ہر زاویے سے قابل توجہ بنا دیتے ہیں‘۔ عطاء الحق قاسمی نے روزنامہ جنگ میں اپنے کالم ’روزنِ دیوار سے‘ میں تونسوی صاحب کے بارے میں لکھا کہ ’یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر طاہر تونسوی جیسا ایک فعال سربراہ میسر ہوا۔ شوگر کا مرض انسان کو بے بس بنا کر رکھ دیتا ہے لیکن طاہر تونسوی نے شوگر کو بے بس بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انھوں نے متذکرہ کانفرنس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا اور اس بار بھی ایسے ہی ہوا۔ قاسمی صاحب کا کانفرنس کو کامیاب قرار دینا سو فیصد درست ہے۔ میں کانفرنس کی تیاریوں سے لے کر کانفرنس کے اختتامی اجلاس تک ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شب و روز کی تگ و دو کا چشم دید گواہ ہوں، کیونکہ ڈاکٹر طاہر تونسوی اور میں جامعہ سرگودھا کے ٹیچرز ہاسٹل کے مکین ہیں، وہ کمرہ نمبر ۲ اور میں کمرہ نمبر ۵ کا رہائشی ہوں، ہماری شامیں ایک ساتھ گزرتی ہیں۔اس کی ایک وجہ غالباً عمر میں یکسانیت اور ہم مزاج ہونا ہے،ڈاکٹر تونسوی نے جس دن سے کانفرنس کا ڈول ڈالا تھا وہ مسلسل اس کی کامیابی کے لیے متحرک نظر آئے،آخری دنوں میں انتظامی امور کا اتنا دباؤ تھا کہ وہ اکثر پریشان بھی نظر آتے لیکن وہ معاملات کو مہارت کے

ساتھ حل کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔کانفرنس کی کامیابی ان کی اور ان کی ٹیم کی محنت کا ثمر ہے۔

شاہینوں کا شہر سرگودھا اردو کے حوالہ سے ایک نئی تاریخ رقم کرنے جارہا تھاجہاں بھارت، بنگلہ دیش، مصر، امریکہ کے علاوہ پاکستان کے تمام بڑے شہروں سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانش کی بڑی تعداد اردوزبان کی قدر میں اضافہ کرنے جارہی تھی ،جامعہ سرگودھا کو یہ اعزاز مل نے جارہا تھا کہ وہ پنجاب کے دو دریاؤں کے بیچ واقع اس شہر کو عالمی سطح پر متعارف کراسکے۔مندوبین ۳ نومبر کی صبح سے ہی آڈیٹوریم میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے، یونیورسٹی کے علمی ،ادبی اور سرسبز و شاداب فضاء کو ادبی ستاروں نے چار چاند لگا دئے تھے۔کانفرنس گاہ خوبصورت منظر پیش کررہی تھی، کانفرنس کے آغاز کا وقت قریب آیا، شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری معزز مہمانوں کے ہمراہ اسٹیج پر تشریف لائے اور کرسیٔ صدارت پر جلوا افروز ہوئے، ان کے ہمراہ مہمان محترم بھی اسٹیج پر تشریف فرما ہوئے، کانفرنس کے روح رواں معروف استاد، محقق و دانش وصدر شعبہ اردو، جامعہ سرگودھا پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔آپ نے کہا کہ ہم اہل علم اور اہل قلم اور صاحب دل و نظر کی اس کہکشاں میں شامل روشن اور چمکتے ہوئے ستاروں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔اس موقع پر آپ نے جی

آیاں نوں، آوے وے سئیں ، اکھیں ٹھرن، دل خوش تھیوے،پخیر راغلے، میں قربان کہہ کر معزز مہمانان کو خوش آمدید کہا۔آپ نے کہا کہ یہ جو میلہ سرگودھا میں سج گیا ہے ایک ایسی تاریخ رقم کر رہا ہے جو تازیست اردو ادب کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ثابت ہوگی اور اس کے دور رس نتائج نکلیں گے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نے اپنے صدارتی خطاب میں مندوبین کی آمد کا شکریہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ اردو دنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے اور بہت سے ممالک میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔جو قومیں اپنی زبان سے پیار نہیں کرتیں انجام کار وہ عالمی سطح پر گونگی ہوجاتی ہیں اور ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔آپ نے کہا کہ سرگودھا یونیورسٹی نے جہاں سائنسی و تحقیقی حوالوں ست ملک بھر میں اپنی شناخت کو مستحکم کیا ہے وہاں سماجی اور لسانی علوم کی ترقی اور فروغ کے لیے ہمہ وقت مصروف عمل ہے اور اردو کانفرنس کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

کانفرنس کی پہلی نشست کا موضوع 'اردو زبان اور عصری آگہی' تھا۔اس نشست کی صدارت شیخ الجامعہ نے کی ، مہمان اعزاز اردو کے عالمی شہرت یافتہ ادیب و دانشور ڈاکٹر خلیق انجم تھے جو بھارت سے تشریف لائے تھے ،آپ کے مقالے کا

عنوان تھا 'آزادی کے بعد برِ صغیر میں اردو کے مسائل'، معروف شاعر افتخار عارف نے 'اردو زبان اور عصری شعور' کے حوالہ سے گفتگو کی، آپ نے کہا زبانیں قوموں کی پہچان ہوا کرتی ہیں اور کوئی بھی قوم اپنی شناخت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ معروف ادیب ڈاکٹر سلیم اختر نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی زبان عصری آگہی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ زبان کی سماجی ضرورت ہے، آپ کے مقالہ کا عنوان تھا 'اردو زبان اور عصری آگہی کا تناظر'۔ ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم جن کا تعلق مصر سے تھا کے مقالہ کا موضوع تھا 'مصر میں اردو' آپ نے کہا کہ اردو کا غیر ملکی سفر ایک کامیاب سفر ہے کیونکہ مصر میں اردو کی تاریخ ۷۵ سال پر محیط ہے۔ کراچی سے آئے ہوئے معروف استاد، شاعر و ادیب پروفیسر سحر انصاری کے مقالہ کا موضوع تھا 'اردو غزل اور عصر آگہی'۔ آپ نے کہا کہ اردو غزل مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے، تاہم اس کی بعض مجبوریاں بھی ہیں، جیسے ہم یہ شعر کہ 'تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا'، اسی طرح کہا جا سکتا تھا اسے اس طرح ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ 'تم میرے پاس ہوتی ہو گویا جب کوئی دوسری نہیں ہوتی' ۔ سحر صاحب کی اس دلیل پر حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ جامعہ کراچی کے پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال کے مقالہ کا موضوع تھا 'کتب کا تنقیدی جائزہ'۔ ملتان سے تعلق رکھنے والے معروف استاد، شاعر و ادیب پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلیم انصاری نے 'اردو زبان میں عصری آگہی اور شعور' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر

فخر الحق نوری کا موضوع تھا 'اردو زبان پر تحریکوں کے اثرات (ترقی پسند تحریک کے حوالے سے)'، ڈاکٹر سید جاوید اقبال نے 'اردو تنقید اور عصری آگہی' پر مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر رشید امجد کے مقالہ کا موضوع تھا 'اردو افسانہ اور عصری آگہی'۔ کانفرنس کی اولین نشست میں نو مقالات پیش کئے گئے۔

کانفرنس کی دوسری نشست کے مہمان خصوصی سینئر مشیر وزیر اعلیٰ پنجاب جناب سردار ذوالفقار علی خان کھوسہ تھے، صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نے کی۔ اس نشست کا موضوع تھا 'اردو اور دیگر زبانوں کے لسانی روابط'، جس میں کل سات مقالات پیش کئے گئے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے 'اردو اور پاکستانی زبانوں کے لسانی روابط' پر، ڈاکٹر آفتاب اصغر نے 'اردو اور فارسی زبانوں کے لسانی روابط' پر، ڈاکٹر روبینہ ترین نے 'اردو اور دیگر زبانوں کے لسانی روابط' پر، ڈاکٹر محمد یوسف خشک نے 'اردو اور سندھی کی مشترکہ تخلیقی تشکیل' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا، ڈاکٹر امجد علی بھٹی نے 'اردو اور پنجابی زبانوں کے لسانی روابط' پر، حمید الفت ملغانی نے 'اردو اور سرائیکی زبانوں کے لسانی روابط'، پروفیسر شوکت مغل نے 'اردو اور سرائیکی کی مشترکہ لسانیات' پر مقالہ پیش کیا۔ نشست کے اختتام پر مہمان خصوصی سینئر مشیر وزیر اعلیٰ پنجاب جناب سردار ذوالفقار علی خان کھوسہ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ اس قومی اردو کانفرنس کے انعقاد سے اردو زبان کی قدر اور اہمیت

میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔آپ نے کہا کہ ملک کی دیگر جامعات بھی جامعہ سرگودھا کی تقلید کرتے ہوئے ایسی مجالس کا اہتمام کریں جس سے ہماری قومی زبان کو اس کا جائز مقام دلانے میں مدد مل سکے گی۔ اس موقع پر سینئر مشیر وزیر اعلیٰ پنجاب جناب سردار ذوالفقار علی خان کھوسہ نے سرگودھا یونیورسٹی کے زیر اہتمام قائم ہونے والے ''تشخیصی مرکز کا بھی افتتاح کیا۔

عالمی کانفرنس کی تیسری نشست محفل مشاعرہ تھی جو رات گئے شروع ہوئی۔ صدارت معروف شاعر،ادیب و دانش ورپروفیسرڈاکٹر محمد اسلم انصاری نے کی جب کہ مہمان خصوصی بھارت کے شاہد ماہلی اور کراچی کے پروفیسر سحر انصاری تھے۔ محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض طارق حبیب نے خوبصورتی کے ساتھ انجام دیے۔جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں عطاء الحق قاسمی،پروفیسرڈاکٹر محمد اسلم انصاری، سحر انصاری، شاہد ماہلی، یونس اعجاز، ڈاکٹر انعام الحق جاوید،ڈاکٹر طاہر تونسوی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈکٹرراشد متین، حسن عباسی، حرارانا، ڈاکٹر صغریٰ صدف، ڈاکٹر فخرالحق نوری، ارشد ملک، شفیق آصف، عابد خورشید، عاشر وکیل راؤ، شاکر کنڈان، شیخ محمد اقبال، مقبول نثار ملک، احمد عبد اللہ، افتخار عاکف، طارق کلیم، نوشین صفدر، طارق حبیب اور سید مرتضیٰ حسن نے اپنا کلام سنایا۔ منتخب شعرا کا منتخب کلام:

پروفیسرڈاکٹر محمد اسلم انصاری:

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھُلایا بھی نہیں
وہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں پہنچا تھا
تونے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں
: پروفیسر سحؔر انصاری
دعائے موسمِ گُل اُن کو راس آ ہی نہیں سکتی
جو شاخِ گُل کے بدلے تازیانہ یاد رکھتے ہیں
: عطاؔء الحق قاسمی

میں وہ دعا ہوں عطاجو ہر ایک لب پر ہے
بس اتنا ہے کہ ابھی عرصہء قبول میں ہوں
: پروفیسر ڈاکٹر طاہؔر تونسوی
یہ دورِ اہلِ قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
گناہ کو بھی ثواب کہنا، ببول کو بھی گلاب لکھنا
: شاہدؔ ماہُلی
زخم بھر جائے گا رہ جائیگی تا عمر چبھن
یہ جو کانٹا ہے کسی طور نکل جائے گا
: ڈاکٹر تحسین فراقیؔ
صدائیں سلب ہوئیں کس مقامِ حیرت پر

کہ میں پکارتا ہوں اور نہ تو پکارتا ہے

:خالد اقبال یاسرؔ

کسی کا کھوٹا نصیب یاسرؔ کسے خبر کس گھڑی کھرا ہو

جلوسِ شاہی کے ساتھ اک بے زباں پیادہ بھی کم نہیں

:ڈاکٹر راشد متینؔ

کیا بستی تھی کون گلی گھر بھول گیا

دستک دینا چاہی تو در بھول گیا

:ڈاکٹر صغریٰ صدفؔ

کرنے ہیں گلے اس سے رنجش بھی رکھنی ہیں

پیار بھی ستم گر کو بے شمار کرنا ہے

:ڈاکٹر محمد فخرالحق نوریؔ

دھڑکنوں کا کچھ اعتبار نہیں

اور وہ دھڑکنوں میں رہتا ہے

:ڈاکٹرانعام الحق جاویدؔ

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن

ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو

کر لیا ہے جو تم نے بی اے تو

ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

یونس اعجاز:

لپٹ کر میرے بدن سے ہر اجنبی خوشبو
یہ پوچھتی ہے کہ ہم پہلے کہاں ملے ہوئے ہیں

طارق حبیب:

کسی بھی رستے میں ایک پل کو رُکی نہیں ہے
ہوا نے اپنی کہی ، ہماری سُنی نہیں ہے

حسن عباسی:

ہجرِ مسلسل اور مسلسل ہجرت بھی
روز مجھے سامان اُٹھانا پڑتا ہے

ارشد ملک:

سارے سورج کے گرد گھومتے ہیں
بس یہی نقص تھا کہانی میں

شاکر کنڈان:

سوائے جسم کے اب جسم میں رہا کیا ہے
نکل گئی ہے کہیں جاں ، جان میں آ کر

عابد خورشید

کسی کی آنکھ کے بھیگے ہوئے منظر میں رہتے ہیں
ہمارا گھر نہیں ہے ہم کسی کے گھر میں رہتے ہیں

شفیق آصف:

جس نے سیکھا تھا تکلّم کا قرینہ مجھ سے
مرے لہجے سے وہ اک شخص بھی انکاری ہے

نوشین توقیر:

میں تیری نوشین ہجر کی گرد سے اٹی ہوں
تو اپنے لہجے کی بارشوں سے اجال مجھ کو

طارق کلیم:

یہ اور بات کہ تجھ سے نہ کہہ سکے کچھ بھی
وگرنہ شہر میں ہم کو کلیم کہتے ہیں

کانفرنس کی چوتھی نشست ۴ نومبر کی صبح منعقد ہوئی اپنے اندر دلچپی لیے ہوئے تھی اس کا موضوع تھا ''اردو زبان کے سماجی عمل میں میڈیا کا کردار''۔اس نشست کے مہمان خصوصی معروف صحافی ،کالم نگار،دانش ور، سیاسی تجزیہ نگار اور روزنامہ 'پاکستان لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب مجیب الرحمٰن شامی تھے جب کہ صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نے کی، نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی نے انجام دیے۔ قاضی جاوید، ڈاکٹر حسین احمد پراچہ، ڈاکٹر شبیہ الحسن اور سماٹیلی وژن کے حبیب اکرم نے خوبصورت تقریر کی۔

کانفرنس کی اختتامی نشست جس کی صدارت شیخ الجامعہ نے کی۔ اس نشست کا موضوع تھا اردو زبان مسائل اور مکانات''۔ عالمی شہرت یافتہ دانش ور ڈاکٹر خلیق انجم نے'' صدارت کی اور پر مغز مقالہ بھی پیش کیا۔ڈاکٹر معین الدین جینابڑے 'اردو میں تحلیق وتدوین کی رفتار، ایک تجزیہ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا، بھارت ہی کے جناب شاہد ماہلی جو غالب اکیڈمی کے روح رواں بھی ہیں کے مقالہ کا عنوان تھا 'اردو میں غالب شناسی کی روایت'۔بنگلہ دیش سے آئی ہوئی دانش ورہ ڈاکٹر کلثوم ابو لبشر نے بنگلہ دیش میں اردو زبان کے مسائل اور امکانات' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ان' کے علاوہ ڈاکٹر مظفر عباس نے 'تدریس اردو کے مسائل'، ڈاکٹر عطش درانی نے 'اردو کے عمومی مسائل و امکانات'، ڈاکٹر نجیب جمال نے 'اردو زبان مسائل اور امکانات عمومی کا جائزہ'، ڈاکٹر تحسین فراقی نے اردو میں اقبال شناسی کی روایت: مسائل و امکانات'، خالد اقبال یاسر نے 'اردو زبان مسائل اور امکانات'، ڈاکٹر عبد الکریم خالد نے ' اردو زبان مسائل اور امکانات: ایک جائزہ'، ڈاکٹر صوفیہ یوسف نے ' اردو زبان مسائل اور امکانات'، ڈاکٹر سہیل عباسی نے 'اردو داستانوں میں کہاوتوں کا منظر نامہ' اور ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان نے اردو طنز ومزاح: مسائل اور امکانات' کے موضوعات پر مقالات پیش کئے۔ عالمی کانفرنس کے اختتام پر مختلف قرار دادیں

پیش کی گئیں ۔ ایوان نے ان تمام قراردادوں کو متفقہ طور پر منظور کر لیا۔
کانفرنس کے اختتام پر مہمانوں کو اعزازی شیلڈ سے بھی نوازا گیا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودھری نے معزز مہمانان کی آمد پر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا اور ان تمام مہمانان کا جو پاکستان سے باہر اور دیگر شہروں سے تشریف لائے بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس کے منتظم اور روح رواں پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح یہ عالمی اردو کانفرنس دو دن جاری رہنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچی ۔اس کانفرنس کے یقیناً دیرپا اثرات مرتب ہوں گے۔ سرگودھا میں جامعہ سرگودھا کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی یہ عالمی کانفرنس اردو ادب کی تاریخ کے ایک سنہرے باب کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔کانفرنس کی روشن یادیں تادیر دل و دماغ کو تازہ رکھیں گے۔ بقول سحر انصاری ایسے ہی لمحات تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔

محبوب احمد سبزواری۔سب کے محبوب

ہمارے مورث اعلیٰ حضرت باری بخش رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان کے ایک حکمران خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔یہ خاندان شروع میں ہندوستان کی معروف اور تاریخی ریاست بیکانیر میں آباد تھا۔ قریباً سن گیارہ سو ہجری میں اس خاندان کے جد امجد اعلیٰ حضرت عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ (۱۶۲۷ء۔۱۶۶۲ء) نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر کے قصبہ 'حسین پور' میں سکونت اختیار کی اس مناسبت سے یہ خاندان ''حسین پوری'' کہلایا۔ ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ ''بنت'' میں ایک اور خاندان سکونت پذیر تھا جو اپنے نام کے ساتھ ''سبزواری'' لگایا کرتا تھا کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے جد امجد مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے میں ایران کے شہر ''سبزوار'' سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آباد ہوئے۔ سبزوار ایران کے شہر خراسان کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔اس خاندان کے لوگوں نے ابتدا میں دہلی کو اپنا مسکن بنایا اس کے بعد مختلف شہروں جن میں فرید کوٹ، بگرہ، سہارنپور، کوٹکاپورہ، بیکانیر، مالیر کوٹلے، فیروز پور، امرتسر شامل ہیں آباد ہوئے لیکن ان کی زیادہ تعداد ضلع مظفر نگر کے قصبے ''بنت'' میں آباد ہوئی۔

ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری کے مطابق ایران سے ہجرت کرکے دہلی منتقل ہونے

والے چار بھائی تھے۔ ہندوستان میں رہائش اختیار کر لینے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے اپنے ناموں کے ساتھ اپنے آبائی شہر ''سبزوار'' کی مناسبت سے لفظ '' سبزواری'' لکھا کریں گے جو ان کا خاندانی نام ہوگا۔ چنانچہ یہ رسم اس وقت سے شروع ہوئی اور آج تک ان چاروں بھائیوں کی اولاد اپنے نام کے ساتھ سبزواری تحریر کر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سبزواری خاندان کے ان چاروں بھائیوں کی والدہ کا نام ''بنتِ'' تھا انھوں نے اس علاقے کا نام اپنی والدہ کے نام کی مناسبت سے ''بنتِ'' رکھا جو رفتہ رفتہ یہ بَنت ہو گیا۔ یہ آج بھی قائم و دائم ہے اور خاندان کے کئی احباب اس قصبہ میں رہائش پذیر ہیں۔ رفتہ رفتہ خاندان کے لوگ بہ سلسلہ روزگار ہندوستان کے دیگر شہروں میں منتقل ہو گئے۔ بنت میں رہائش پذیر خاندان کے لوگ ''محل والے'' کہلایا کرتے تھے۔

مظفر نگر کے قصبے 'بنت' میں سبزواری خاندان اور دوسرے قصبے ''حسین پور''میں خاندان باری بخش جو خاندان حسین پوری کے نام سے جانا جاتا تھا آباد تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں خاندان اس اسقدر شیر و شکر ہوئے کہ آپس میں شادیاں ہونے لگیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے آباؤ اجداد کے مزاج، طور طریقے اور رسم و رواج، رہن سہن میں مطابقت پائی جاتی تھی۔ باہمی ملاپ کا یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور دونوں خاندان مختلف نسل، قوم

زبان اور زمین کے باوجود ایک قوم، ایک زبان اور ایک ملک کے ایسے باسی بنے کے ، ایک دل دو جان ہو گئے اور یہ رشتہ ایسا پختہ ہوا کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود دونوں میں تفریق مشکل ہو گئی ہے۔

میں جب اپنے آباؤ اجداد کی ازدواجی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میرے پر دادا اعلیٰ حضرت شیخ محمد ابراہیم آزادؔ (۱۸۶۸ء۔ ۱۹۴۷ء) کی والدہ یعنی قبلہ نبی بخش صاحب کی شریک حیات محترمہ بو یعقوماً جناب کرامت علی صاحب کی دختر تھیں جن کا تعلق سبزواری خاندان سے تھا ان کا انتقال فرید کوٹ میں ہوا۔ آزادؔ صاحب نے دو شادیاں کیں دونوں کا تعلق سبزواری خاندان سے تھا اس خاندان کے دو بھائی جناب سلطان حسن اور حکیم ممتاز علی سبزواری قبلہ آزادؔ صاحب کے ماموں تھے آپ کی پہلی شادی جناب سلطان حسن صاحب کی دختر ہما بیگم سے ہوئی۔ ہما بیگم کے انتقال (۱۹۲۸ء) کے بعد آپ نے حکیم ممتاز علی سبزواری کی صاحبزادی محمودہ خاتون سے عقد ثانی فرما یا۔ آزادؔ صاحب کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں ان میں حقیق احمد مرحوم میرے دادا ہوئے ۔ آپ کی شادی جناب محمد زکریا سبزواری صاحب کی صاحبزادی محترمہ امتہ الباقی سے ہوئی۔ میری والدہ محترمہ صفیہ سلطانہ بھی سبزواری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ جناب امید حسن سبزواری مرحوم کی صاحبزادی ہیں ۔ اس طرح میرے سکڑ دادا (نبی بخش مرحوم) ، پر دادا (شیخ محمد ابراہیم آزادؔ مرحوم)، دادا (حقیق

احمد مرحوم) اور قبلہ والد صاحب (انیس احمد مرحوم) صاحب سبزواری خاندان کی خواتین سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح حسین پوری خاندان کی بے شمار خواتین کی شادیاں سبزواری خاندان میں ہوئیں اور یہ باہمی رشتے اسقدر بڑے پیمانے پر ہوئے کہ آج سبزواری اور خاندان حسین پور میں تفریق مشکل ہو گئی ہے۔

سبزواری خاندان کی شخصیت جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا قبلہ محبوب احمد سبزواری صاحب کی ہے جو میرے حقیقی ماموں بھی ہیں۔آپ کا حسنِ اخلاق ، عادات واطوار ، شفقت اور محبت مثالی ہے، مجھ پر بہت زیادہ شفقت فرماتے ہیں درحقیقت آپ اپنی تہذیب کے ایک یادگار نمائندے ہیں۔ عرصہ دراز سے آپ پر لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا جب بھی قلم اٹھایا کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی رہی اور میں اپنے اس مقصد کی تکمیل نہ کرسکا۔ ستمبر ۱۹۹۷ء میں آپ میرے والد صاحب قبلہ انیس احمد صمدانی (وفات ستمبر ۱۹۹۷ء) کی وفات کے بعد کراچی تشریف لائے ، باوجود غم والم کی کیفیت کے ۵ میرا ارادہ تازہ ہوگیا،۲۸ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو میں نے آپ سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا اور ان سے گفتگو کی درخواست کی ۔آپ نے ازراہ عنایت میرے چند سوالات کے جوابات دئے جو میں نے اس مقصد کے لیے بنائی گئی اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیے تھے۔جب کبھی ڈائری کھولتا یہ انٹر ویو سامنے آتا اور اپنے ارادے کو زندہ کر لیا کرتا۔ وقت

گزرتا گیا حتیٰ کہ آپ ۲۰۰۵ء میں دوبارہ کراچی تشریف لائے۔ کمزوری، قوت سماعت اور بینائی کا متاثر ہو جانا نیز یادداشت کا کمزور ہو جانا ضعیف العمری کے تحفے ہیں۔ ہر وہ انسان جو عمر کے اس حصے کو پہنچے اور یہ تمام تحفے اسے اللہ کی طرف سے میسر آئیں تو خندہ پیشانی کے ساتھ اللہ کا انعام واکرام سمجھ کر قبول کر لینے چاہئیں۔ان میں بھی زندگی کا مزہ ہے۔آپ نے بتایا کہ آپ اپنی زندگی کی ۹۰ بہاریں دیکھ چکے ہیں یعنی آپ کی عمر ۹۱ برس ہے، صحت بھی اچھی ہے۔بغیر سہارے کے چلنا پھرنا، تمام کام از خود کرنا آپ کا معمول ہے۔

آپ کے والد امید حسن پٹواری تھے اور ہندوستان کے قصبے 'کوٹ کپورا' میں آپ کی پوسٹنگ تھی اسی مقام پر آپ ۱۴ جون ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے، بچپن فرید کوٹ میں گزرا، کیوں کہ آپ کے والد پٹواری کی حیثیت سے فرید کوٹ آ گئے تھے۔آپ کی والدہ صحیفہ) عنایت اللہ حسین پوری کی بیٹی تھیں۔آپ ملنسار اور پڑھی لکھی خاتون تھیں،) محلے میں اگر کسی کا خط آ جاتا تو اسے پڑھ دیا کرتی تھیں۔ اپنی اولاد کو پڑھنے کی جانب راغب کیا کرتی تھیں۔فرید کوٹ میں قائم ''برجندر اسکول'' سے آپ نے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کیا۔آپ نے بتایا کہ فرید کوٹ میں کالج نہیں تھا اس کے لیے فیروز پور جانا تھا اس وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد مئی ۱۹۳۱ء میں آپ کی شادی جناب

حکیم محمد ممتاز علی سبزواری کی صاحبزادی ''زبیدہ خاتون'' سے ہوئی۔ یہ حضرت شیخ محمد ابراہیم آزآد مرحوم (مصنف کے پر دادا) کی دوسری شریک حیات محمودہ خاتون کی ہمشیرہ تھیں۔اس رشتہ سے آپ آزآد صاحب کے ہم زُلف تھے آپ نے بتایا کہ بارات جناب حقیق احمد (مصنف کے دادا) کی بس میں فرید کوٹ سے بنت گئی تھی۔اپنی شریک حیات کو منہ دکھائی میں مبلغ دو (۲) روپے دئے تھے۔آپ کی شریک حیات (زبیدہ خاتون) دراز قد، سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور خوبصورت تھیں ان کے مقابلے میں آپ کا رنگ سیاہ مائل تھا۔البتہ جوانی میں لحیم شحیم، کڑیل جوان ضرور تھے۔ شاید رنگت آپس میں بہت زیادہ خوشگوار ازدواجی تعلقات میں حائل رہی ،آپ کی شریک حیات کا بہت جلد انتقال ہوگیا۔آپ نے باوجود دباؤ اور اصرار کے دوسری شادی اپنے بچوں کی بہتر نگہداشت اور انہیں سوتیلی ماں کے سلوک سے محفوظ رکھنے کی وجہ سے نہیں کی ۔آپ نے اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت از خود کی اور اپنی خواہشات کو بچوں پر قربان کر دیا۔ یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ اپنے بچوں سے قبل آپ نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش بھی کی تھی جس کی وجہ آپ کی والدہ اور والد کا جلد انتقال ہو جانا تھا۔ پیسے کی ہمیشہ ریل پیل رہی حتیٰ کہ اب بھی اللہ کا فضل ہے۔آپ کے دو بیٹے شکیل احمد ور وکیل احمد)اور دو بیٹیاں (شکیلہ اور طاہرہ) ہوئیں۔آپ نے اپنی چھوٹی) بیٹی کو اپنے ہمراہ رکھا اور ضعیفی کے ایام سکون اور آرام سے گزار رہے ہیں۔

لمبی قامت ، گول ہنس مکھ چہرہ ، دل میں گہرائی تک اتر جانے والی آنکھیں ، گھنی بھنویں ، جوانی میں کلین شیو ہوا کرتے تھے اب کالی مگر زیادہ سفید داڑھی ، فراخ پیشانی ، کالا رنگ مگر دل کے انتہائی شفاف ، چھوٹا سر ، مضبوط ارادے ، حوصلے اور قوت فیصلہ کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ انداز میں شائستگی اور وضع داری ، شہر اور دیہات کی ملی جلی فضاء کے پروردہ ۔بزرگ بلکہ دیہات کے ماحول کا غلبہ نمایاں ، گفتگو میں سوجھ بوجھ اور علمیت کا امتزاج ، سنجیدگی اور بردباری ، بات میں وزن ، ہر ایک کی بات توجہ سے سننا اور تسلی و تشفی بخش جواب دینا آپ کی عادت ہے۔ اکثر گفتگو میں شعر بھی پڑھتے ہیں۔زبان میں شیرینی اور مٹھاس ، گفتگو میں کسی کی للو پتو نہیں کرتے بات ایمان کی اور دھڑالے کی کہتے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ سامنے والا برا بھی مان سکتا ہے۔اس وقت چہرے مہرے اور انداز سے یہ ہر گز معلوم نہیں ہوتا کہ آپ اپنی عمر کی دسویں دھائی میں ہیں اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

آپ کی والدہ (مصنف کی نانی) کا انتقال ۱۹۳۲ء میں فرید کوٹ کی ' بلبیر بستی ' میں ہوا اجب کہ والد جناب امید حسن (مصنف کے نانا) نے ۱۵ سال بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں ، رحلت فرمائی۔آپ کے والد صاحب شدید بیمار تھے لیکن خواہش یہ تھی کہ ان کی بیٹی ،صفیہ (مصنف کی والدہ) کی شادی ان کی زندگی ہی میں ہو جائے

کہتے ہیں کہ ایک پل انسان کی دعا کی قبولیت کا بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول کر لی تھی چنانچہ رشتہ طے ہوگیا۔ دوسری جانب بیماری شدید صورت اختیار کر تی گئی اسی دوران شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ بارات آئی آپ بستر علالت پر تھے بیٹی کو اسی حالت میں رخصت کرکے اللہ کا شکر ادا کیا۔ حالت بگڑتی گئی اس موقع پر آپ کے چھوٹے بھائی وصی احمد سبزواری بھی موجود تھے۔انہوں نے کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا کہ ''بھائی یہ جان اللہ کی امانت ہے اسے خوشی سے اللہ کے سپرد کر دیں'' لیکن آپ نے رات بھر اپنی نوبیاہتا بیٹی کی واپسی کا انتظار کیا۔ آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ صبح ہوئی۔ ٹرین نے دوپہر کو آنا تھا۔ باغباں کو اپنی اس کلی کا شدت سے انتظار تھا جو عنقریب پھول بننے جارہی تھی لیکن دوسری جانب درخت جھک رہا تھا۔ پتے مرجھا رہے تھے۔ ٹہنیاں زرد ہو رہی تھیں۔ ہواؤں کا رنگ بدل رہا تھا۔ وقت کا صیاد اپنا تیر چلانے کو تیار بیٹھا تھا۔ مہلت ختم ہونے کو تھی۔ یکایک کلی نمودار ہو ئی اور منتظر باپ کے سینے سے جالگی۔ باغباں کے مہربان ہاتھوں نے اپنی کلی کو سینے سے لگایا۔ منتظر آنکھوں کو ٹھنڈا کیا لیکن وہ ہاتھ وہیں جم کر رہ گئے وہ آنکھیں جو محوِ انتظار تھیں سینے کی ٹھنڈک کو پہچان کر مطمئن سی ہوئیں اور پھر انجان بن گئیں۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کی اس خواہش کی تکمیل بھی کر دی جس کی آرزو انہوں نے بیماری کی حالت میں کی تھی۔ کلمہ طیبہ پڑھا اور اسی حالت

میں جب کہ آپ کی بیٹی سرخ جوڑے میں ملبوس اپنے منتظر باب کے سینے سے لگی اپنے سینے کو بھی ٹھنڈا کر رہی تھی باغباں نے چپکے سے آنکھ موند لی اور آپ کی روح اس دنیا ئے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرواز کر گئی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی ہجرت کی داستان بیان کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو ہماری ٹرین انبالہ سے امر تسر ہوتے ہوئے لاہور پہنچی ، رات لاہور ہی میں بسر کی ، ہماری منزل ابھی دور تھی ، اگلے روز مال گاڑی میں منٹگمری ہوتے ہوئے بھورے والا آ گئے، فرید کوٹ کے بے شمار لوگ بھورے والا آ چکے تھے ، رات بھورے والا میں گزاری ، ۲۰ اگست کو وہاڑی آئے یہاں سے ہمیں کرم پور جانا تھا جہاں پر ڈاکٹر انوار پہلے سے موجود تھے ، جب ہم یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ میلسی منتقل ہو چکے ہیں ، رات کرم پور میں ڈاکٹر انوار کے ڈیرے پر بسر کی اگلے روز ۲۱ اگست کو میلسی پہنچ گئے ، ایک روز بعد بقر عید تھی ، میں اگلے ہی روز میلسی کے تحصیلدار سے ملا اور بتایا کہ میں میٹرک پاس ہوں پٹوار کا امتحان بھی پاس کر چکا ہوں ، ہندوستان کے شہر فرید کوٹ میں پٹواری تھا، اس نے مجھے فوری کلرک بھرتی کر لیا، میری ذمہ داریوں میں میلسی پہنچنے والے مہاجرین کی آبادکاری تھی جو مہاجر آتے میں انہیں ہندوؤں کے مکان اور دکانیں الاٹ کیا کرتا تھا میلسی میں مجھے بھی ایک مکان الاٹ ہو گیا تھا یہ مکان میلسی شہر کے وسط میں ہے (میں اسی مکان میں ۱۵

اگست ۱۹۴۸ء کو عالم وجود میں آیا) آپ کا کہنا تھا کہ کچھ عرصہ بعد انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور ایک وکیل شیخ محمود علی کے ساتھ منشی ہو گئے ۔ ۱۹۵۱ء میں پھر سے پٹواری ہو گئے ۔آپ کے چھوٹے بھائی مطلوب بھی پٹواری تھے ۔آپ پٹوری کی ملازمت ترک کرکے دوبارہ ایک وکیل کے ساتھ کام کرنے لگے اور ۱۹۷۵ء تک باقاعدہ کام کر تے رہے رہا، آپ نے بتایا کہ آپ کی پھوپھی (زوجہ جناب خلیق احمد صدانی مرحوم) نے آپ کو ساڑے پانچ ایکڑ زرعی زمین تحفہ کے طور پر دی تھی جو آج بھی موجود ہے اور ان کی آمدنی کا ذریعہ یہی زمین ہے۔ یہ ہیں سب کے محبوب '' محبوب احمد سبزواری'' اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے ۔آمین۔ (یہ تحریر ۶ نومبر ۲۰۰۵ء کی ہے۔ محبوب ماموں نے طویل عمر پائی وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ ان کا اچھا اخلاق ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ (مصنف کی (کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل

پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین

(عالم اسلام کی ایک نامور شخصیت جنھوں نے بصارت سے محروم ہونے کے باوجود تعلیم کے میدان میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے)

پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۳ء) دنیائے عرب کی ایک ایسی عظیم شخصیت کانام ہے جس کی تمام زندگی حصول علم، فروغ علم اور ترسیل علم سے عبارت ہے۔ مصر کے اس مردآھن نے تعلیم کے میدان میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے جنھیں تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنہرے حروف سے لکھا جاچکاہے۔ وہ رہتی دنیاتک ایک مثال اور ایک نمونہ کے طورپر یاد رکھے جائیں گے۔ بصارت سے محروم ہوتے ہوئے علم و تحقیق کی انتہا کو پہنچے، تحصیل علم کے لیے آپ کی جدوجہد اور اس راہ میں حائل مسائل ومشکلات کو برداشت کرنا قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے ایک چھوٹے سے شہر میں ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ یہ اپنے تیرہ (۱۳) بھائیوں میں ساتویں اور گیارہ بہنوں میں پانچویں نمبر پر تھے۔ آپ نے اپنی بصارت ے محرومی کا واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا کہ " دیہاتی اور شہری عورتوں کا فلسفہ مہمل ہوتا ہے وہ مختلف قسم کے ٹوٹکوں ' جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں پر بھروسہ رکھتی ہیں، مریض کی مناسب اور بروقت دیکھ بھال

ان کے نزدیک ثانوی حیثیت ہوتی ہے''۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ ''میری آنکھیں دکھنے لگیں، اس وقت عمر کوئی تین برس تھی، چند دن تو یونہی چھوڑ دیا گیا اس کے بعد ایک نائی کو بلایا گیا اور اس نے ایسا علاج کیا کہ آنکھیں جاتی رہیں''۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بصارت سے محرومی کو کبھی اپنے مقاصد کے حصول میں حائل نہ ہو نے دیا اور نہ ہی آپ نے اپنے آپ کو زندگی میں کسی لمحہ بے بس، مجبور اور قابل رحم تصور کیا بلکہ جب کبھی آپ کے خاندان یا عزیز رشتہ دار نے آپ سے اظہار ہمدردی کرنے کی کوشش بھی کی تو آپ نے اسے سخت ناپسند کیا، آپ نے اپنی زندگی میں کبھی ہمت نہیں ہاری اور کٹھن سے کٹھن حالات میں آپ علم کے حصول میں مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ علم کی انتہائی منزل کو پالینے کے بعد اسے اپنے تک محدود نہ رکھا بلکہ ایک استاد کی حیثیت سے ترسیل علم کا فریضہ انجام دیتے رہے آپ تحصیل علم کو ہر شخص کا پیدائشی حق تصور کرتے تھے۔فروغ علم کے لیے آپ کی عملی جدو جہد تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھی جاچکی ہے۔کلام مجید حفظ کرنے اور ابتدائی مذہبی تعلیم کے حصول کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم بھی مصر ہی میں حاصل کی۔آپ ابتدا ہی سے آزاد خیال اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل تھے چنانچہ ابتدائی مذہبی تعلیم کے دوران آپ کو دینی مدارس کے روایتی استادوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔آپ نے اپنی سوانح عمری میں

ان اسباب کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور متعدد واقعات ان استادوں کی کم علمی ، فرقہ پرستی ، محدود نظری اور قناعت علمی کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ آپ جامعہ الازہر بھی جارتے رہے ، ساتھ ہی شام کے اوقات میں جدید تعلیم کے ادارے یعنی کالج بھی جانے لگے جہاں سے وہ علوم جدیدہ کی طرف مائل ہوئے ، اس نتیجے پر پہنچے کہ علم چند کتابوں تک محدود نہیں۔ جامعہ الازہر سے فارغ ہوجانے کے بعد جہاں پر آپ کو کچھ اختلاف بھی ہوا جس کا آپ نے برملا اظہار بھی کیا آپ مصری یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے جہاں سے آپ نے ۱۹۱۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ 'آپ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے گیارہویں صدی کے شاعر ابو العلا پر مقالہ تحریر کرکے یونیورسٹی سے ڈگری کے حصول کا اعزاز حاصل کیا'۔ ڈاکٹریٹ کر لینے کے باوجود ڈاکٹر طٰہٰ حسین میں مزید علم حاصل کرنے کی جستجو برقرار رہی اس طرح آپ نے سمندر پار کی دنیا کو اپنی بند آنکھوں لیکن کھلے دل و دماغ سے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں جامعہ مصر نے آپ کی بھرپور رہنمائی اور معاونت کی اور آپ کو فرانس بھیج دیا گیا جہاں آپ فرانس کی یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے اور ۱۹۱۸ء میں مزید ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ گویا آپ ڈبل پی ایچ ڈی ہوگئے۔ علم کی ان اعلیٰ ترین اسناد کے حصول میں آپ کی بصارت سے محرومی آپ کے آڑے نہ آئی جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اگر انسان کسی مقصد کے حصول میں سچائی اور لگن کے ساتھ مصروف عمل ہوجائے تو کوئی مشکل 'کسی بھی

قسم کی رکاوٹ اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ یہ پیغام ہے نئی نسل کے لیے، ان لوگوں اور دوستوں کے لیے جو ذرا سی مشکل کو دیکھ کر ہمت ہار دیتے ہیں اور اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔

فرانس میں اپنے قیام اور مشکلات کا ذکر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی ایک کتاب میں ان الفاظ میں کیا کہ ”مجھے اپنی خصلتوں میں صبر واولاالعزمی کی فرانس میں جس قدر شدید ضرورت محسوس ہوئی اپنی زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے وہاں اپنے گرد و پیش کی ہر چیز اور انسان نیا معلوم ہوتا تھا۔ اسی طرح وہاں کی ہر چیز اور ہر شخص نے مجھے اجنبی سمجھا لیکن صبر اور غیر متزلزل قوتِ برداشت ہی وہ خصلتیں ہیں جنھوں نے مجھے لوگوں اور چیزوں کو موقع دیا کہ وہ مجھے سمجھیں اور انہیں خصلتوں کی مدد سے میں فرانس میں باوجود ابتدائی مشکلات و مصائب کے زندہ رہا اور بالآخر پہلے دو سالوں کے بعد وہاں کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہونے لگیں“۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ایک غیر متزلزل قوتِ برداشت کے مالک تھے ان کی اسی خصوصیت نے انہیں زندگی میں کامیاب وکامران کیا۔ فرانس میں قیام کے دوران ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی ملاقات ایک فرانسیسی خاتون سیوزانی برسیو سے ہوئی جو طبعیتاً نرم دل، ہمدرد اور تعلیم یافتہ تھی۔ رفتہ رفتہ وہ

ڈاکٹر طٰہٰ کے نزدیک آ گئی اور انہوں نے سیوزانی بر سیو سے شادی کر لی۔ فرانس سے واپسی پر بر سیو ڈاکٹر طٰہٰ کے ہمراہ مصر آ گئی اور بقیہ زندگی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزار دی۔ زندگی کے سفر میں سیوزانی کو دیگر مصروفیات کے علاوہ ایسے کام بھی اضافی کرنا پڑے مثلاً ڈاکٹر صاحب کو اخبارات ، رسائل اور کتب پڑھ کر سنانا، ان سے ایڈوائس لینا، تقاریر تحریر کرنا وغیرہ۔ سیوزانی یہ تمام کام خوشی خوشی سر انجام دیا کرتی جس کی وجہ سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی شریک حیات کو اپنا ہمدرد اور خیال کرنے والی ساتھی قرار دیا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شخصیت ان کے بعض نظریات اور خیالات کے باعث سخت تنقید کا نشانہ بنی ، وہ ایک جانب تو عربی زبان کے بڑے اور ممتاز ادیب کی حیثیت رکھتے تھے دوسری جانب ان پر ناقدین نے سخت تنقید بھی کی اور ان کے خلاف مصر میں بہت سی کتابیں اور بے شمار تنقیدی مضامین تحریر کیے گئے خاص طور پر جامعہ الازہر کے علماء نے انہیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا، ڈاکٹر طٰہٰ کی بعض اختلافی باتیں بہت زیادہ بلکہ خطرناک حد تک سامنے آئیں۔ ان کی کتاب ''الشعر الجاھلی'' پر سخت تنقید ہی نہیں ہوئی بلکہ حکومت نے اس کتاب کو ضبط کر لیا۔ اسی زمانے کے ایک مصنف عبد الصمد صارم الازہری نے اپنی کتاب 'تنقیدات طٰہٰ حسین' میں یہاں تک تحریر کیا کہ اس میں شک نہیں کہ طٰہٰ حسین عربی

کے مشہور نقادوں میں سے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ تنقید کی ہے وہ تخریبی ہے تعمیری نہیں۔ اپنی اس کتاب کے پیش لفظ میں صارم الزہری نے لکھا ہے کہ 'کیونکہ انہوں نے بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے کسی طرح بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا، وہ اپنے زور قلم کی بناپر، بات کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں اور واقعات کی کڑی سے کڑی ملاتے چلا جاتے ہیں کہ کہیں بھی جھول محسوس نہیں ہوتا لیکن ہم دیگر اسلامی مفکرین و مورخین کو سراسر ان کے خلاف پاتے ہیں'۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین پیرس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس لوٹتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق عربی ادب کے پروفیسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ تدریس علم کے ساتھ میرے اندر موجود بے باکی اور حق گوئی کی خصلت نے ظاہر ہونا شروع کر دیا اور میں نے حکام بالا کی توجہ نصاب تعلیم کی جانب دلانے کے ساتھ ساتھ تعلیم کو عام کرنے کے لیے آواز بلند کی جو حکومت وقت کو پسند نہ آئی۔ چنانچہ طٰہٰ حسین پر حکومتی زیادتیاں شروع ہو گئیں ادھر طٰہٰ کے رویے میں بھی شدت آتی گئی اور انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، طٰہٰ کی پروفیسری بھی جاتی رہی لیکن اپنے ارادوں میں پختہ یہ شخص اپنی بات عام لوگوں تک پہنچاتا رہا، ہر حکومت کو اس بات کا احساس دلاتا رہا کہ علم حاصل کرنا ہر ایک کا حق ہے۔

۱۹۳۶ء میں مصر وفد پارٹی کی حکمرانی قائم ہوئی اس پارٹی میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے نظریات سے اتفاق پایا جاتا تھا چنانچہ حکومت نے ڈاکٹر طٰہٰ کو دوبارہ شعبہ ادب کا سربراہ مقرر کیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ نے اپنے نظریات و خیالات کا پرچار جاری رکھا، انہیں وقت کے ساتھ ساتھ مقبولیت حاصل ہوتی رہی، تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں ان کے خیالات کو پذیرائی حاصل ہوئی حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں انہیں حکومت میں شمولیت کا موقع میسر آگیااور انہیں محکمہ تعلیم میں ثقافتی امور کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا بعد میں وزارت تعلیم کے ٹیکنکل مشیر مقرر ہوئے۔ اسوقت آپ نے تحریر کیا کہ مجھے ایک بار حکومت میں شرکت کا موقع مل گیا، اس وقت مجھے شرم آئی کہ میں لوگوں کے اس مطالبے کو پورانہ کروں جس کا خود میں نے انہیں سبق دیا ہے، چنانچہ میں نے اس سلسلے میں تمام امکانی کوششیں صرف کر دیں، آپ کی کوششوں سے مصر میں ابتدائی تعلیم عام اور مفت ہوئی، اسکندریہ یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک بار پھر مخالف پارٹی کی حکومت بر سر اقتدار آ گئی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین ایک بار پھر مصائب و مشکلات کا شکار ہوگئے۔ اس بار بھی آپ نے ہمت نہ ہاری اور مسائل کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنے مشن کو جاری و ساری رکھا حتیٰ کہ حکومت کی باگ ڈور ڈاکٹر طٰہٰ کے ہم خیال ساتھیوں کے ہاتھ آ گئی اور ڈاکٹر طٰہٰ کو مصر کی وزارت تعلیم کا قلمدان سونپ دیا گیاچنانچہ آپ نے اپنی

دیرینہ خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے بارہ سال تک مفت تعلیم دینے کا قانون پاس کرالیا، اعلیٰ تعلیم کے لیے اقدامات کیے گئے، مصر کے طلبہ یورپی ممالک اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جانے لگے اور مصر میں جدید علوم پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تمام زندگی جدوجہد سے عبارت ہے، بصارت سے محروم ہوتے ہوئے آپ نے حصول تعلیم میں بلندیوں کو چھوا، عملی زندگی میں قدم رکھاتو مصائب و مشکلات کو برداشت کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنالیا حتیٰ کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی، تصنیف وتالیفات کے میدان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے نمایاں خدمات انجام دیں، بے شمار مضامین و خطبات کے علاوہ آپ نے چالیس سے زیادہ کتب تخلیق کیں۔ آپ کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ۱۹۷۳ میں عرب دنیا کا یہ عظیم انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے فانی سے کوچ کرگیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، آمین۔ امیرؔ مینائی کے بقول ؎

ہوئے بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

(شائع شدہ مجلہ افق، گورنمنٹ ریاض گرلز کالج، کراچی ۲۰۰۳ء، مصنف کی کتاب
(یادوں کی مالا" میں شامل"

پروفیسر اختر حنیف

پروفیسر اختر حنیف۔ شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ کراچی کے ایک استاد دنیا فانی ہے، موت ایک فطری عمل اور حقیقت ہے اس بات پر پختہ یقین اور ایمان ہونے کے باوجود کبھی کبھی کسی کی موت ایک قابل یقین واقعہ بن جاتی ہے اور دل و دماغ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔پروفیسر اختر حنیف کی موت بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگئے۔انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

پروفیسر اختر حنیف اب ہم میں نہیں لیکن ان کی یادیں ، اعلیٰ کردار اور حسن اخلاق ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ وہ شرافت کا پیکر، تصنع و بناوٹ سے پاک ، کم گو اور خاموش طبع ہونے کے ساتھ ساتھ صاف ذہن و دل کے مالک تھے۔ ہندوستان کے شہر میرٹھ میں ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے ، بی اے ۱۹۵۴ء میں میرٹھ کالج سے کیا، دو سال بعد ۱۹۵۶ء میں پاکستان ہجرت کی اور اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی کی ایک قدیم بستی ''بہار کالونی'' کو اپنا مسکن بنایا۔ ہندوستان سے نقل مکانی، ڈاکٹر عبدالمعید سے تعلق اور پاکستان لائبریرین شپ

سے اپنی وابستگی کا ذکر اختر حنیف نے اپنے ایک مضمون اس طرح کیا کہ ''ہم لوگ ۱۹۵۶ ء میں ہندوستان سے نقل وطن کرکے پاکستان آئے اور کراچی میں بہار کالونی میں سکونت اختیار کی اپنے مکان کے سامنے سے سوٹ میں ملبوس ایک پر کشش شخصیت کو صبح وشام آفس جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ مکان کے سامنے سے بہت سے لوگ آتے جاتے تھے مگر اس انسان میں کچھ عجیب سے جاذبیت تھی جو میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے ایک دن تعارف بھی ہوگیا۔ مسلم لیگ کے اخبار 'منشور' کے ایڈیٹر حسن ریاض صاحب جو بہار کالونی ہی میں مقیم تھے سے ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ آپ عبدالمعید ہیں اور کراچی یونیورسٹی کے لائبریرین ہیں۔ اب سلام دعا ہونے لگی۔ایک دن ہمارے ہاں بڑے بھائی صاحب کے دوست محمود اختر صاحب آئے اور 'پاکستان لائبریری ریویو' کا پہلا شمارہ دیا وہ اس کے ناشر تھے اور کراچی یونیورسٹی کے ڈپلومہ (لائبریری سائنس) کی پہلی کلاس کے طالب علم ۔ انھوں نے لائبریری سائنس کی تعلیم اور لائبریری کے پیشہ کی بڑی مسحور کن تصویر پیش کی اور مجھے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ کرنے کی کی ترغیب دی، میں ہندوستان سے بی اے کرکے آیا تھا اور اب تک کسی مناسب پیشہ سے وابستہ نہیں ہوا تھا لائبریری سائنس میں داخلہ لینے کے لیے راضی ہوگیا۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے اب معید صاحب پڑوسی کے ساتھ ساتھ استاد بھی ہوگئے''۔

'' اپنی ملازمت کے بارے میں اختر حنیف صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا کہ

اب ملازمت کا سوال ہوا دبے الفاظ میں معید صاحب سے بات ہوئی صاف صاف الفاظ میں فرمایا کہ میں آپ کو یونیورسٹی میں تو نہیں لے سکتا کسی اور جگہ سفارش کردوں گا۔ مجھے بعد میں آئی بی اے میں ملازمت مل گئی اور اب میں لائبریرین ہونے کے ناطے معید صاحب کا ہم پیشہ ہوگیا، پھر شعبہ لائبریری سائنس سے منسلک ہونے کی وجہ سے ماتحتی میں بھی کام کیا''۔ اختر حنیف صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے کہ جنہوں نے جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا اور اسی تعلیمی استطاعت کی بنیاد پر نہ صرف آئی بی اے کے لائبریرین ہوئے بلکہ جامعہ کراچی شعبہ لائبریری سائنس میں لیکچرر، بعد ازاں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک آپ نے نائیجیریا میں بھی خدمات انجام دیں۔۱۹۶۰ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ، ۱۹۶۳ء میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۰ء میں کینٹ پبلک اسکول کے لائبریرین ہوئے، ۱۹۶۱ء میں آئی بی اے کے لائبریرین مقرر ہوئے، ابتدا میں شعبہ لائبریری سائنس میں جزو وقتی لیکچرر مقرر ہوئے بعد ازاں ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے ترقت پاتے ہوئے پہلے ایسو سی ایٹ پھر پروفیسر ہوئے اس دوران صدر شعبہ کے فرائض بھی انجام دئے۔ آپ نے جامعہ کراچی کے مرکزی کتب خانے 'ڈاکٹر محمود حسین لائبریری' کے جزو وقتی لائبریرین کے فرائض بھی انجام دئے۔ جامعہ کراچی سے منسلک رہتے ہوئے آپ پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے زیر انتظام اسکول آف لائبریرین شپ میں

اعزازی استاد بھی رہے ریٹائر منٹ کے بعد آپ اس اسکول کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں جامعہ کراچی سے ریٹائر منٹ کے بعد آپ کالج آف فزیشن اینڈ سرجن کے کتب خانہ سے منسلک ہوئے۔ اسی دوران آپ کو بیماری نے آگھیرا جس کے باعث طویل سفر مشکل ہوگیا چنانچہ آپ نے یہ ملازمت ترک کردی اور سرسید یونیورسٹی کی لائبریری سے منسلک ہوئے اور اپنی زندگی کے اختتام تک اس سے وابستہ تھے۔

پیشہ ورانہ انجمنوں میں بھی اختر حنیف نے فعال کردار ادا کیا، پاکستان لائبریری ایسو سی
ایشن کے تاحیات رکن تھے۔ کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس المنائی ایسو سی ایشن
کے ۱۹۷۵ میں سیکریٹری اور ۱۸۷۰ء میں اس کے چیرمین رہے، اس (KULSAA)
انجمن کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسالہ 'پاکستان لائبریری ریویو' کے ایڈیٹر کے
فرائض بھی انجام دیے، پی ایل آر کے ڈاکٹر رنگا ناتھن نمبر کے ایڈیٹر اختر حنیف صاحب
کے سیکریٹری اور دیگر اہم ، (SPIL) ہی تھے۔ انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات
عہدوں کے علاوہ اس انجمن کے خبر ناموں کی ادارتی کمیٹی سے بھی آپ وابستہ رہے۔
کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا، اس (PBWG) پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ
کے تحت چلنے والے اسکول آف لائبریرین شپ کے استاد اور ڈائریکٹر کے فرائض انجام
دیے۔ لائبریری پروموشن بیورو اور اس کے تحت شائع ہونے والے رسالے 'پاکستان
لائبریری بلیٹن

کے انگریزی شعبہ کے ایڈیٹر کے فرائض بہت عرصہ انجام دئے۔آپ کو اس کے " اولین اداراتی بورڈ جو ۱۹۶۸ء میں تشکیل پایا تھا کا رکن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لائبریری فورم کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا جس کے تحت ایک کتاب بھی شائع ہوئی۔

اختر حنیف اپنوں کی نظر میں

ماں، باپ، بھائی، بیوی، بچے اور دیگر قریبی عزیز رشتہ دار معاشرتی تعلق کی بنیادی اکائیاں ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں سب سے زیادہ وقت انہیں اکائیوں میں گزارتا ہے جس طرح ایک استاد کے بارے میں اس کے شاگرد ہی صحیح رائے رکھتے ہیں اسی طرح کسی بھی شخص کی زندگی کے بارے میں یہ بنیادی اکائیاں درست تصویر پیش کرتی ہیں۔ میں نے اختر حنیف سے تعلق رکھنے والی ان بنیادی اکائیوں سے رابطہ کیا اور ان کے بارے میں حقائق معلوم کرنے کی کوشش کی ۔اختر حنیف مرحوم نے اپنے والد، والدہ، ایک بھائی اور ایک ہمشیرہ کے ہمراہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔آپ کے والد کا انتقال اپریل ۱۹۷۴ء میں ہوا،آپ کی والدہ بقید حیات اور ضعیف ہیں۔بیٹے کی جدائی کے غم نے انہیں مزید کمزور کر دیا ہے۔آپ کی والدہ کا کہنا تھا کہ " اختر حنیف بچپن ہی سے کم گو اور فرمانبردار تھے، شرارت بالکل نہیں کرتے تھے، میرا حد درجہ احترام کیا کرتے جامعہ جانے سے قبل ان کے پاس ضرور جاتے۔ بیماری کے ایام میں جب کہ

سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہوگیا تھا اکثر اپنی بچیوں سے میری خیریت معلوم کراتے اور کہلواتے کہ جیسے ہی میں اس قابل ہوا کہ سیڑھیاں چڑھ سکوں آپ کے پاس ضرور حاضر ہوں گا۔ اختر حنیف کے ایک بھائی اور ایک بہن ہیں ان کے بڑے بھائی کا ۱۹۸۴ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہمشیرہ فردوس خاتون جو اختر حنیف سے بڑی ہیں ایک مقامی اسکول میں استاد ہیں، آپ نے اپنے بھائی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ "اختر حنیف مجھ سے چھوٹے تھے اس لیے بھی وہ میرا بہت زیادہ احترام کیا کرتے، بہت ہی خیال انہوں نے میرا کیا، یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں تنہا ہوں، مجھے پڑھنے کی ترغیب دی خاص طور پر بی ایڈ میں میں نے ان کے نہ صرف کہنے پر داخلہ لیا بلکہ انہوں میری عملی مدد کی، ان کی وجہ سے ہی میں نے بی ایڈ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مثالی بھائی تھے، انہوں نے اس رشتہ کا حق ادا کردیا، ان کا وہ رویہ جو ان کی شادی سے پہلے تھا بعد میں بھی وہ اس انداز سے پیش آتے رہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے ورنہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسان کے برتاؤ میں عام طور پر تبدیلی آ ہی جاتی ہے۔ وہ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں"۔

پروفیسر اختر حنیف کی چار بیٹیاں ثمیرا، صوبیہ، ثمن اور فرحین ہیں۔ ثمیرا اور صوبیہ کی شادی انہوں نے اپنی زندگی ہی میں کی بلکہ بیماری کے ایام میں فریضہ انجام دیا۔ ثمن اور فرحین چھوٹی ہیں۔ ٹیلی فون پر گفتگو (بروز جمعہ ۵

اپریل ۱۹۹۶ء) کرتے ہوئے ثمن اور فرحین نے بتایا کہ ان کے ابو بہت اچھے تھے ہر طرح کا خیال رکھتے۔ اسکول خود چھوڑنے جاتے، اگر ہم میں سے کوئی کبھی بیمار ہوجاتا تو فوری ڈاکٹر کے پاس لے جاتے اس دوران بہت زیادہ خیال رکھتے۔ ہمارے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھتے، چاہتے تھے کہ ہم زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں لیکن ہم چاروں بہنوں پر کبھی یہ زبردستی نہیں کی کہ ہم سائنس پڑھیں، کامرس یا آرٹس بلکہ یہ چوائس ہم پر چھوڑ دی تھی''۔ فرحین نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس کے ابو خود سادگی پسند تھے لیکن ہم پر کبھی پابندی نہیں تھی کہ ہم کس قسم کا لباس پہنیں البتہ سادگی کو بے حد پسند کیا کرتے تھے۔ گھر کو بھی صاف ستھرا اور جاذب نظر دیکھنا پسند کرتے، ثمن نے بتایا کہ اس کے ابو کو ہم بہنوں پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ ہمیشہ مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے۔ کھلکھلا کر شاید ہی کبھی ہنسے ہوں زیر لب مسکرانا ان کی خاص عادت تھی''۔ ثمیرا اختر حنیف کی سب سے بڑی بیٹی ہیں امریکہ کے شہر کیلی فورنیا میں رہتی ہیں ان کے شوہر شفاعت کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ ثمیرا نے اپلائیڈ کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا انہوں نے اپنے ابو کے بارے میں فون پر (بروز ہفتہ ۴ مئی ۱۹۹۶ء) کو بتایا ہمارے ابو ایک حقیقت پسند اور مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی چاروں بیٹیاں Bold ہوں، کسی پر بھروسہ اور انحصار نہ کریں بلکہ تمام تر حالات کا مقابلہ از خود کریں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیں خود اعتمادی کا درس دیا جس کی ایک چھوٹی سی مثال

یہ ہے کہ انھوں نے ہم تینوں بہنوں کو از خود کار چلانا سکھایا۔ ثمیرا نے بتایا کہ انہیں اسکول و کالج کے زمانے سے ہی کمپیئرنگ کا شوق تھا چنانچہ جامعہ میں منعقد ہونے والی ایک بین الا قوامی فوڈ کانفرنس کی کمپیئرنگ مجھے سونپی گئی اس کی تیاری میں ابو نے بھر پور مدد کی اس کانفرنس میں غیر ملکی مندوبین بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس کے اختتام پر اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر سید ارتفاق علی، شعبہ کی سربراہ بیگم راشدہ علی اور مسٹر بار لو سے میں نے اپنے امی اور ابو کا تعارف کرایا۔ مسٹر بار لو نے ابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا 'you must be proud on your daughter' یہ جملہ میری کمپیئرنگ سے متاثر ہو کر کہا تھا اس جملہ کو سن کر ابو کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی جو لہر تھی اس سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ جیسے اس جملہ سے انہیں اپنی فتح اور کامیابی کا یقین ہو گیا ہو''۔ ثمیرا نے اپنی امریکہ روانگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے رخصت کرتے وقت ابو کی اشک بار آنکھیں بتا رہی تھیں کہ انہیں یقین ہے کہ وہ اپنی اس بیٹی کو زندگی میں دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے اور یہ کہ وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ر خصت کر رہے ہیں۔اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا میں ابو کی زندگی میں پاکستان نہ آ سکی اور وہ مجھ سے ملے بغیر ہی اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے جس کا مجھے بے انتہا افسوس ہے۔ گھر کے ماحول کے بارے میں ثمیرا کا کہنا تھا کہ ہم سب لوگوں میں بہت زیادہ understanding تھی۔ ابو ہم لوگوں سے ہر قسم کے موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

وہ بہت کشادہ ذہن کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک شفیق باپ ہی سے محروم نہیں ہوئے بلکہ ایک ہمدرد دوست اور محبت کرنے والے ساتھی سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ابو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے''۔ صوبیہ ثمیرا سے چھوٹی ہیں ان کی شادی کراچی ہی میں ہوئی انہوں نے اپنے ابو کے بارے میں بتایا کہ ابو کو وقت ضائع کرنا پسند نہیں تھا وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہنے کو اچھا سمجھتے تھے۔ جب کبھی ہم کسی تقریب میں ابو کے ساتھ عزیز رشتہ دار کے ہاں جاتے تو ابو ہمیں سب لوگوں سے نہ صرف ملایا کرتے بلکہ ہمیں یہ بھی بتاتے کہ ہمارا اُن سے کیا رشتہ ہے۔

پروفیسر اختر حنیف کی شادی ۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو اپنے ہی خاندان میں محترمہ نزہت جمال سے ہوئی۔ یہ شادی گھر والوں کی پسند کی تھی۔ نزہت جمال ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں جنھوں نے معاشیات میں ایم اے کیا ہے۔ اختر حنیف بحیثیت شوہر کیسے تھے اور ان کی زندگی کے آخری ایام کی کیا روداد ہے۔ اس موضوع پر آپ سے گفتگو ٹیلی فون پر (۱۹ مارچ، ۵ اپریل ۱۹۹۶ء) کو ہوئی، آپ نے بتایا کہ ان کے شوہر بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، کبھی اونچی آواز میں بات نہ کرتے اگر کسی بات پر غصہ آجاتا تو خاموشی اختیار کرلیتے، گھریلو کاموں میں بھی برابر کے شریک رہتے، تمام خاندانی معاملات یا کسی بھی مسئلہ پر مشورہ کرتے البتہ حتمی فیصلہ خود ہی کیا کرتے، طویل اور بے مقصد گفتگو نہ تو خود کرتے اور نہ

ہی پسند کیا کرتے۔ جہاں تک ممکن ہوتا اختصار سے کام لیتے ، ہم دونوں میں حد درجہ ہم آہنگی تھی۔ بیگم حنیف نے بتایا کہ انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ ہمارا بیٹا نہیں ۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری بیٹیاں ہی ہمارے بیٹے ہیں۔ بچیوں کا بہت خیال رکھتے ۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی منصوبہ بندی نہیں کی بلکہ میرے تمام کام خدا کی مرضی سے خود بخود ہوتے چلے گئے۔ مرحوم اپنے رشتہ داروں میں پسند کیے جاتے تھے ان کے تمام احباب سے یکساں مراسم تھے۔ بیگم حنیف نے بتایا کہ اختر حنیف کی خواہش تھی کہ ان کی بچیاں زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں وہ بچیوں میں strong education کے قائل تھے۔ خواتین کو ملازمت کرنا چاہیے یا نہیں ۔اس سوال کے بارے میں بیگم حنیف کا کہنا تھا کہ میں تعلیم یافتہ تھی لیکن مجھے کبھی منع نہیں کیا کہ میں ملازمت نہ کروں لیکن یہ کہا کرتے کہ اگر بیوی نوکری کرتی ہے تو بچوں کی تربیت متاثر ہوتی ہے اور بچوں کی بہتر تربیت نوکری سے زیادہ مقدم ہے۔ اختر حنیف کے دھیمے لہجے کا ذکر کرتے ہوئے بیگم نزہت جمال نے کہا کہ میں اکثر کہا کرتی تھی کہ خدارا کسی وقت تو بلند آواز سے بات کر لیا کریں تاکہ اس گھر کے در و دیوار بھی مردانہ آواز سن لیں۔

اختر حنیف کو لاحق مرض اور ان کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے بیگم نزہت جمال نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ جامعہ سے ریٹائر منٹ کے بعد انہیں

ہچکیاں آنے لگی تھیں، رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ علاج بدستور جاری رہا یہ معلوم نہیں تھا کہ بظاہر ہچکیوں کی تکلیف ہے لیکن اندر ہی اندر خطرناک مرض پرورش پا رہا ہے جو بہت جلد انہیں اس دنیا سے دور لے جائے گا۔ آپ نے بتایا کہ ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ء کو تمام ترچیک اَپ (ٹیسٹ) کی رپورٹس دیکھنے اور پوری طرح تسلی کرنے کے بعد ڈاکٹر نے واضح کیا کہ انہیں جس مرض نے اپنے نرغے میں لے لیا ہے شاید وہ اب اس سے پیچھا نہ چھڑا سکیں یہ مرض بلڈ کینسر تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کے پاس ڈھائی برس کی مہلت ہے۔ بقول اختر حنیف ان باتوں کا اثر فطری تھا لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اس ڈر سے بھی کہ بچیوں کو اگر یہ بات معلوم ہو جائے گی تو ان کا کیا بنے گا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ء کی شب بہت ہی تکلیف میں گزری، اندر ہی اندر ہم دونوں میاں بیوی اس طرح روئے کہ دونوں کو اس بات کی خبر نہ ہو جائے حالانکہ دونوں ہی اس بات سے باخبر تھے۔ صبح اٹھ کر حسب معمول مصروفیات میں لگ گئے۔ کہنے لگے کہ ”دیکھو یہ تو زندگی کی حقیقت ہے اسے خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے“۔ اس گفتگو کے بعد بیگم حنیف خاموش ہو گئیں۔ میں نے انہیں تسلی دی، اپنے طور پر حوصلہ بڑھانے کی باتیں کیں اور ان سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی۔

واقعی اختر حنیف بہت ہی مضبوط اعصاب کے مالک تھے اگر کوئی اور شخص ہوتا تو

وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی ڈھائی برس کی مہلت تو کجا وہ ڈھائی ماہ مشکل سے زندہ رہتا۔ یہ مرحوم کی مضبوط قوت ارادی اور اللہ کی ذات پر پختہ یقین ہی تھا کہ انہوں نے نہ صرف ڈاکٹر کی دی ہوئی مہلت پوری کی بلکہ دو سال ساتھ ماہ کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ بلند ہمتی اور قوت ارادی کے ساتھ انہوں نے اس مرض کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن پھر بھی اختر حنیف ہار گئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالی نے ان کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی انہیں وقت مقررہ پر اس دنیا سے چلے ہی جانا تھا۔ کینسر یا کوئی اور مرض تو بہانا تھا ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اپنی زندگی میں جو کچھ کرنا تھا بھرپور انداز سے کیا۔ بیٹے کی حیثیت سے والدین کی خدمت کی، ان کا آخری وقت تک خیال رکھا، بھائی کی حیثیت سے بہن کو بھائی کی محبت دی، شوہر کی حیثیت سے بیوی کو اطمینان اور سکون دیا، باپ کی حیثیت سے بچوں کی مثالی پرورش کی انہیں زندگی گزارنے کے طور طریقوں سے بخوبی آگاہ کیا، استاد کی حیثیت سے بے شمار طالب علم پیدا کیے جو آج سینکڑوں خاندانوں کی کفالت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ لائبریرین کی حیثیت سے کئی کتب خانوں کی معیاری تنظیم وترتیب

میں بھرپور حصہ لیا، منتظم کی حیثیت سے مثالی انتظام کی روایت ڈالی، ایک مصنف، مولف اور محقق کی حیثیت سے بے شمار علمی مواد تخلیق کیا۔

کس کو معلوم یونہی راہ پر چلتے چلتے
کون کس موڑ پہ کس وقت جدا ہو جائے

انسان مین بشری کمزوریوں کا ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ اختر حنیف میں بھی بشری کمز وریاں تھیں لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت میں خوبیوں کے رنگ زیادہ پائے جاتے تھے۔۔ پاکستان لائبریرین شپ کے لیے وہ ایک اثاثہ تھے ان کے انتقال سے لائبریرین شپ کے پیشہ میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی نہ بھر سکے۔ ان تمام احباب کا خاص طور پر بیگم اختر حنیف کے شکریہ کے ساتھ جنھوں نے مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ میں مجھ سے عملی تعاون کیا۔ اس دعا پر اپنے اس مطالعہ کا اختتام کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اختر حنیف مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب ہو۔ آمین۔ (مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل)

شیخ لئیق احمد۔ایک شخصیت۔۔ایک مطالعہ

یو تو زندگی میں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، کسی سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے تو کسی سے اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں۔ایسی شخصیات بہت کم ہوتی ہیں کہ جن سے ملکر خوش گوار تاثر قائم ہو اور آئندہ پھر سے ملنے کی خواہش برقرار رہے میرے خاندان میں ایسی ہی ایک شخصیت شیخ لئیق احمد کی تھی۔وہ بہ ظاہر تو معمولی آدمی تھے لیکن میں سمجھتا ہوں وہ ہرگز ہرگز معمولی آدمی نہیں تھے کیونکہ جس آدمی نے ساری زندگی حالات، ماحول اور معاشرے سے جنگ کی اور کبھی ہار نہیں مانی وہ معمولی آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔لئیق احمد جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے،وہ بوڑھے ضرور ہو چکے تھے لیکن بڑھاپے کی اس منزل تک ہرگز نہ پہنچے تھے جس کے ساتھ موت کا تصور وابستہ ہے۔مگر موت تو برحق ہے، کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا بلاوا کب اور کس وقت آجائے، ہمیں ہر حال میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ موت برحق ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

لئیق احمد ان لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت نظر آتی ہے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا، ہم کراچی کی ایک کچی بستی آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے۔ کچھ کچا اور کچھ پکّا لیکن کشادہ مکان تھا، جس میں ہمارا خاندان یعنی امی، ابا، سات بہن بھائیوں کے علاوہ ہمارے دو چچا (جلیس احمد اور مغیث احمد) اور دو پھوپھیاں (موبینہ خاتون اور تسلیمہ خاتون) بھی رہا کرتے تھے۔ کمانے والے ہمارے والد صاحب ہی تھے ہم سب بہن بھائی چھوٹے اور پڑھ رہے تھے، شاید ہمارے چچا بھی کچھ کرنے لگے تھے،، صحیح یاد نہیں، گزر بسر اچھے طریقے سے ہو رہا تھا کیوں کہ والد صاحب اور والدہ دونوں ہی فضول خرچ نہیں تھے، قناعت پسند تھے، تھوڑے کو بہت جانتے تھے، ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو ہی دیکھا کرتے تھے، ہم نے انہیں کبھی اپنے سے اوپر والوں کے بارے میں بات کرتے نہیں سنا۔ ہماری امی کے حقیقی بھائی اور بہنیں کراچی میں نہیں تھے، لئیق احمد صاحب ہماری امی کے کسی رشتہ سے بھائی ہوتے تھے، ان کی حقیقی بہن ہماری امی کے بڑے بھائی جناب زبیر احمد سبزواری کی شریک حیات تھیں۔ اس رشتہ سے ہماری امی انہیں ''بھائی لئیق'' اور ان کی بیگم کو ''بھابی'' کہا کرتیں اور ہم سب انہیں لئیق ماموں اور ان کی بیگم کو ''مامی'' کہتے ہیں، مامی (بیگم لئیق احمد) کے ایک حقیقی بھائی جناب 'احمد حسن'' ان دنوں ہمارے پڑوسی بھی تھے، انہیں سب لوگ کیپٹن صاحب کہا کرتے تھے کیوں کہ یہ فٹبال کے بہت اچھے کھلاڑی ہونے کے ساتھ پاکستان ٹوبیکو کمپنی

کی فٹبال ٹیم کے کیپٹن تھے، بہت ہی ہنس مکھ، خیال کرنے والے اور ملنسار انسان تھے۔انہیں بھی ہم ماموں ہی کہا کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کا ہمارے گھر آنا جانا تھا، شیخ لئیق اُن دنوں پوسٹ آفس میں کام کیا کرتے تھے اور کورنگی کریک میں ان کی پوسٹنگ تھی اس سے پہلے کسی اور جگہ رہی ہوگی میرے علم میں نہیں، ہمارے اور ان کے گھر میں کئی میل کا فاصلہ تھا اس کے باوجود آنا جانا رہتا تھا، اکثر عید و بقرا عید سے ایک روز قبل یہ ہمارے گھر آجاتے ایک ساتھ خوشیاں منانے کی روایت قائم تھی۔اس وقت ان کے دو ہی بچے ''مینا اور پپو'' تھے ، خوش حال زندگی بسر ہو رہی تھے ، وقت گزرتا گیا، بچے دو سے نو ہوگئے ، ملازمت بدستور جاری رہی اسی دوران وہ نامساعد حالات سے دوچار ہوئے ملازمت جاتی رہی لیکن خوددار تھے، حالات کا مقابلہ کرتے رہے ، اتنی مشکل آن پڑی کے کرائے کے گھر میں رہنا بھی مشکل ہوگیا، مجبو رناً ہمارے والد صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا انہوں نے بے چوں وچراں کرایہ کا مکان چھوڑ کر اپنے گھر منتقل ہونے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ انہیں بمعہ ساز و سامان اپنے گھرلے آئے۔ ہمارے والد صاحب اللہ مغفرت کرے کسی بھی اپنے یا پرائے کا دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا اس کی مدد کرنے میں کسی سے مشورہ کرنا تو دور کی بات دیر نہیں کرتے تھے۔ یہ پہلا واقعہ نہ تھا وہ ایسا پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔

میرے والد صاحب قبلہ انیس احمد مرحوم کے ماموں جناب غلام مصطفیٰ سبزواری مرحوم کے سالے ضمیر حسن سبزواری مالی طور پر پریشانی کا شکار ہوئے اور ان کے ساتھ بھی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کرایہ کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت بھی ہمارے والد صاحب نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی، ہمارے گھر کا صحن کافی بڑا تھا، کمرے تو شاید ایک یا دو ہی تھے، آنگن میں جھونپڑی ڈالی اور ہنسی خوشی کافی عرصہ رہتے رہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ناظر بھائی پڑھ رہے تھے، بعد میں انہوں نے بی ای کیا اور سول انجینئر ہو گئے۔ ہم ناظر بھائی کے والد صاحب کو ضمیر تایا کہا کرتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے بے حد ہنس مکھ اور مذاقیہ واقع ہوئے تھے، وہ جتنے دن ہمارے گھر میں رہے، گھر میں ہر وقت محفل جمی رہتی اور سب ان کے لطیفوں جن میں زیادہ تر ان کی آپ بیتی ہوا کرتی تھی محظوظ ہوتے رہتے۔ ایک واقعہ سنایا کہ وہ ہندوستان میں چند دوستوں کے ہمراہ رات میں شاید اپنی نوکری سے فارغ ہو کر آرہے تھے راستہ سنسان تھا، گھپ اندھیرا بھی، کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک خوبصورت عورت ہمارے سامنے آگئی ہمارے اوسان اس وقت خطا ہو گئے جب ہماری نظر اس کے پیروں پر پڑی، اس کے پیر الٹے تھے ان کے کہنے کے مطابق وہ چڑیل تھی، کہنے لگے کہ وہ کبھی ہمارے آگے اور کبھی ہمارے پیچھے، یہی نہیں بلکہ کچھ دیر بعد وہ عورت کے بجائے بکری کا بچہ بن کر ہمارے آگے اور پیچھے چلنے لگی، انہوں نے کہا کہ میں چڑیل کو بھگانے کی ترکیب اپنے کسی بزرگ سے سن چکا تھا، ہم اس زمانے میں دھوتی پہنا

کرتے تھے، اس وقت بھی دھوتی پہنی ہوئی تھے ، میں نے تو بھی اپنی دھوتی نیچے سے اٹھائی اور اوپر کاندھوں پر ڈال لی۔ جوں ہی میں نے یہ ترکیب استعمال کی چڑیل رفو چکر ہو گئی اور ہم دوستوں کی جان میں جان آئی ۔اسی طرح کی بے شماری باتیں اور لطیفے وہ ہر وقت سناتے رہتے تھے۔ مچھلی کے شکار کے بے انتہا شوقین تھے۔ یہ خاندان ہمارے گھر کے آنگن میں کافی عرصہ رہا۔ جب حالات بہتر ہوگئے تو انھوں نے اپنا مکان کرائے پر لے لیا۔ اسی طرح لئیق ماموں کے خاندان نے بھی ہمارے گھر میں کچھ وقت گزارا، یہ وہ وقت تھا جب ان کے تمام ہی بچے چھوٹے تھے کسی بچے نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود بہت اچھا وقت گزرا، لئیق ماموں اور مامی دونوں ہی فراخ دل، در گذر کرنے والے اور رنیک طبیعت تھے، کچھ عرصے بعد حالات بہتر ہو گئے تو انھوں نے ہمارے گھر کے سامنے ہی کرایے کا مکان لے لیا اور اس میں رہنے لگے۔

خاندانوں کو اپنے گھر پناہ دینے کے علاوہ انفرادی طور پر مختلف شخصیات کو دوران تعلیم اپنے گھر رکھنا، ان کے کھانے پینے کا ااہتمام کرنا بھی ہمارے والد صاحب مرحوم کی زندگی کا حصہ تھا۔ ہمارے خاندان کے وہ احباب جو اندرون ملک سے کراچی میں حصول تعلیم کے لیے آئے اکثر کو ہمارے والد صاحب نے اپنے گھر پناہ دی اور جب تک انہوں نے اپنی تعلیم مکمل نہ کر لی، ان کی تمام تر سہولیات کا خیال رکھا، مجھے ان میں سے بعض کے بارے میں علم ہے ،ایک شیخ

طاہر حسن جو میرے والد صاحب کے چچا'' مفیق احمد مرحوم'' کے متبنیٰ بیٹے تھے، اس وقت ملتان میں وکالت کرتے ہیں، دوسرے شاہد احمد صدیقی واجد احمد مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ ہم نے کسی لمحے اپنے والد صاحب کی زبان سے یہ بات نہیں سنی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی احسان کیا، گویا وہ نیکی کرکے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ یہی حکم خداوندی بھی ہے۔ سورۃ النحل آیت نمبر ۹۰، ارشاد باری تعالیٰ ہے'' خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔'' ۔ میری یاد داشت میں ہے کہ شکیل احمد سبز واری جو میرے ماموں زاد بھائی ہیں جب پنجاب سے کراچی آئے تو ہمارے ہی گھر قیام کیا۔ صوفی محمد احمد مرحوم بھی بہت عرصہ ہمارے ہی گھر میں رہے۔

۱۹۶۸ء کی بات ہے میں میٹرک کر چکا تھا، میرا تعلیمی ریکارڈ بہت نمایاں نہیں تھا، بس نارمل تھا۔ ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ فیصلہ ہوا کہ میں کوئی ٹیکنکل لائن اختیار کروں، ساتھ ہی اپنی پڑھائی بھی جاری رکھوں۔ چنانچہ میں نے عبداللہ ہارون کالج میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا۔ لئیق ماموں جو پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں ملازم تھے، انہوں نے مجھے فیکٹری میں شروع ہونے والی اپرنٹس شپ (Apprenticeship میں بھرتی کرادیا۔ یہ خالصتاً ٹیکنکل کام تھا۔ شروع کے دو ماہ پر (Bench) لوہے کے ٹکڑوں کو چ

کس نے کے بعد فائل کے ذریعہ مخصوص طریقے سے گھسنا ہوتا تھا۔ دو ماہ کے بعد کا (Lathe Machine)کارکردگی کی بنیاد پر کوئی مشین مین بن جاتا، کوئی خراد مشین کاریگر تو کوئی پچ فٹر ہی رہتا، میں ہر روز فجر کے وقت گھر سے نکلتا، بس کے ذریعہ سٹی اسٹیشن پہنچتا اور وہاں سے مہران ایکسپریس کے ذریعہ جو ۶ بجے چلا کرتی تھی مشین ٹول فیکٹری پہنچا کرتا۔ مرپٹ کر میں نے دو ماہ گزار لیے اس کے بعد مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں اسے جاری رکھ سکتا، چنانچہ میں نے بغیر اطلاع کے ٹول فیکٹری جانا بند کر دیا۔ لئیق ماموں کیوں کہ آفس میں تھے اس وجہ سے میری جاں بخشی ہو گئی ورنہ شاید پولس کے ذریعہ بلوالیا جاتا۔ یہ میری زندگی کی اولین ملازمت یا ایسی پڑھائی تھی کہ جس کے بعد روزگار کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لئیق ماموں اکثر کہا کرتے تھے کہ تمہارا بیچ ٹول فیکٹری کا اولین بیچ تھا، کافی ترقی ہوتی ، لیکن اس قدر سخت محنت کا کام میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو قلم چلانا تھا اور تعلیم کے میدان میں رہنا تھا خراد مشین کا ''خرادیہ'' کیسے بن سکتا تھا۔

شیخ لئیق احمد خوبصورت انسانوں میں سے تھے، ہنستی صورت ، موہنی مورت ، گوری رنگت، لمبا قد، دلکش کتابی چہرہ، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، غلافی آنکھیں، صورت شکل ، وضع قطع ، چہرے مہرے سب سے شرافت ، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوش گوار اظہار، اردو غزل میں محبوب کا جو نقشہ شاعر کے ذہن میں

ہوتا ہے وہ سب کچھ آپ کی شخصیت میں نمایاں تھا۔ خوش پوشی، جامہ زیبی، عام لباس میں بھی ایک پھبن، باوقار، حلیم و بردبار، معاملہ فہم، گفتار میں نرمی اور مٹھاس، جب بھی ملاقات ہوئی لطافت اور محبت کا احساس ہوا۔ اگر کوئی صنف نازک ان صفات کی ہو تو بھلا کیسے شاعروں اور عاشقوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکتی ہے اسی طرح ایک مرد آہن اس قدر خوبصورت، پر وجاہت اور جاذب نظر ہو تو نا چاہتے ہوئے بھی صنف نازک کی نظروں سے کیسے بچ سکتا تھا۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا، اپنے آپ کو بہت بچایا، محفوظ رکھا لیکن انسان تو پھر انسان ہے، خطا کا پتلا بھی چنانچہ وہ بھی زندگی کے کسی حصہ میں جب کہ ان کی پوسٹنگ جناح اسپتال کے پوسٹ آفس میں تھی کسی چاہنے والے کی چاہت میں گرفتار ہوگئے۔ لیکن انہوں نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ ان پر بہت ذمہ داریاں ہیں، وہ تو ایک ایسے گلشن کے باغباں ہیں کہ جسے کئی ننھے ننھے پودوں کی آبیاری کرنا ہے انہیں پروان چڑھانا ہے، ابھی تو کلیوں نے پھول بننا ہے، پودوں نے تناور درخت کا روپ دھارنا ہے۔ اگر باغباں نے اپنے گلشن سے توجہ کہیں اور کرلی تو گلشن اجڑ جائے گا اور وہ تمام کلیاں اور پھول بن کھلے ہی مرجھا جائیں گے۔ باغباں کو یہ کیسے گوارا ہوسکتا تھا اس نے اپنے رب سے توبہ کی اور اپنا راستہ بدل لیا۔

پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں ملازمت مل چکی تھی اور ملیر کے علاقے کھوکھرا

پار کالونی میں مکان خرید لیا تھا۔آپ اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم رہنے لگے۔زندگی کی گاڑی پھر سے پٹری پر آ گئی۔ بچے بڑے ہو رہے تھے کچھ تعلیم حاصل کر رہے تے اور کچھ بر سر روزگار بھی ہو چکے تھے۔ بڑی بیٹی اور بڑے دو بیٹوں کی شادی بھی کر چکے تھے۔ یہ ۱۹۹۰ء کی دیہائی تھی جو پاکستان میں منفرد سیاسی کلچر لیے ہوئے تھی جس نے سندھ کے شہری علاقوں کو ایک نیا سیاسی کلچر دیا۔ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد عملی سیاست میں حصہ لینے لگی، گھر کے بڑے بزرگ دیکھتے ہی رہ گئے، شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کے بچے اس سیاست سے محفوظ رہے ہوں۔ لئیق احمد کے بچے بھی اس سیاست سے دوچار ہوئے ،بڑے بیٹے خالد مرتضٰی نے اسٹیل مل میں ملازمت کے ساتھ ساتھ مزدور یونین میں نام پیدا کیا، اس دور میں یونین کا چیر مین اسٹیل مل کے چیر مین سے کچھ کم نہ تھا، ہزاروں مزدوروں کی سربراہی بڑا اعزاز تھا ساتھ ہی روب و دب دبہ، دوسرے بیٹے بھی بر سر روزگار ہو گئے، حالات بہتر ہوئے، مالی خوش حالی آئی، گلشن پھلنے پھولنے لگا، باغ باں فرط مسرت سے پھولے نہ سماتا تھا،اپنے گلستان کی کلیوں اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا، مگر فلکِ کج رفتار کو گلستاں کا رنگ و بو ایک آنکھ نہ بھایا، آتشِ حسد سے جل اُٹھا، تیور بدلنے لگے۔ چرخ کہن کی جبیں شکن آلود ہو گئی۔ ہواؤں نے اس کی حاسد تمازت جذب کر لی اور اپنی نر م لطافت ، آسودگی کھو بیٹھیں،رات کے بگولے اُڑ نے لگے ، ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ حالات نے پھر سے پلٹا کھایا، کراچی کی

ایک سیاسی جماعت کے خلاف فوجی آپریشن شروع ہوا، آگ اور خون کا بازار گرم ہوا، بے شمار لوگ مارے گے، کچھ روپوش ہوگئے، بعض ملک سے ہی فرار ہوگئے۔ معروف شاعر پروفیسر عنایت علی خان نے اپنی ایک نظم ''یہ کراچی ہے'' میں اس دور کے کراچی کا حقیقی نقشہ کھینچا ہے:

یار دکھلانا شام کا اخبار
کون زخمی ہیں کون مردہ؟
شکر ہے ان میں اپنا نام نہیں
گویا ہم شام تک تو زندہ ہیں؟

ان حالات سے لئیق احمد کا خاندان بھی متاثر ہوا، نوبت یہاں تک پہنچی کے اپنے بھرے گھر کو رات کی تاریکی میں خیر باد کہنا پڑا، بالکل اس طرح جیسے ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے بے سروسامانی کے عالم میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تھی، لئیق احمد کو پاکستان میں ایک اور ہجرت کرنا پڑی، انھوں نے اپنے بھرے گھر کو خیر باد کہا۔ ابتدا میں تمام اہل خانہ نے ہمارے ہی گھر قیام کیا،
بعد میں کہیں اور رہائش اختیار کی، حالات بہتر ہونے کے بعد اپنے گھر گلبرگ منتقل ہوگئے۔

سیاسی حالات کے بہتر ہو جانے کے بعد زندگی میں ایک بار پھر سے ٹھہراؤ آیا، حالات اچھے ہو گئے، تمام بچے بر سر روزگار ہو گئے، آپ نے اپنی دو بیٹیوں (شمو، بانو) کی شادی کر دی اور وہ اپنے گھر کی ہوئیں۔ اس سے قبل آپ اپنی دو بیٹیوں (مینا، گوگی) کی شادی پہلے ہی کر چکے تھے۔ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ مرحلہ تیسرے بیٹے کامران (منے) کی شادی کا تھا۔ ایک دن میں شہناز کے ہمراہ ان کے گھر گیا ہوا تھا باتوں ہی باتوں میں شادی کا ذکر آیا، شہناز نے کہا کہ میری ایک دوست کی بیٹی اچھی ہے اگر مناسب خیال کریں تو دیکھ لیں۔ ان دنوں میرا تبادلہ عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج، سے گورنمنٹ گرلز کالج، فیڈرل بی ایریا، بلاک ۱۶ میں ہو گیا تھا، اس وقت یہ بچی (سعدیہ) اس کالج میں انٹر میں پڑھا کرتی تھی، میں نے بھی اسے دیکھا ہوا تھا، میں نے شہناز سے اتفاق کرتے ہوئے رشتہ سے اتفاق کیا، ماموں اور مامی دونوں نے کہا کہ ٹھیک ہے دیکھ لیتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد ہم ان کے ہمراہ شہناز کی دوست (عشرت زبیر) کے گھر گئے ماموں نے ایک نظر اس بچی کو دیکھا اور فیصلہ کیا کہ ہمیں منظور ہے، بات آگے بڑھی اور شادی ہو گئی، الحمد اللہ آج یہ جوڑی اپنے گھر میں مثالی تصور کی جاتی ہے۔ دونوں گھرانے خوش ہیں۔ اتنی ہی خوشی ہمیں بھی ہے۔

لئیق احمد صاحب کے ایک بیٹے شوکت ضیاء (شبو) کا مجھ پر ایک ایسا احسان ہے

جسے میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے میں نے ایم اے کرنے کے بعد ملازمت اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنے کی ابتدا کی تھی، اردو میں ایک کتاب مرتب تو کر لی تھی اس کی اشاعت سے قبل ٹائپنگ کا مرحلہ درپیش تھا، کیوں کہ اس کتاب پر کم سے کم خرچ کرنا تھا، چنانچہ طے ہوا کہ اس کتاب کے اردو ٹائپ رائٹر پر اسٹینسل کٹوا لیے جائیں، اس وقت کمپیوٹر ہمارے ملک میں نہیں آیا تھا، یہ اردو ٹائپ رائٹر اور اسٹینسل کا زمانہ تھا، نہ معلوم کیسے شوکت (شبو) سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنی اس مشکل کا ذکر اس سے کیا، اس وقت وہ کسی کمپنی میں شاید بن قاسم میں ملازم تھا اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ٹائپنگ بھی جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ کام کرنے کو کہا میں نے بھی موقع غنیمت جانا اسے مسودہ دے دیا۔ شبو نے چند روز میں پوری کتاب کے اسٹینسل کاٹ کر لادئے، اس طرح میری پہلی کتاب ''پاکستان میں سائنسی و فنی ادب'' کے عنوان سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی، لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ جو آج سے ۳۲ سال قبل شروع ہوا تھا الحمداللہ آج بھی جاری ہے۔ شبو نے اسٹینسل اپنے ہی پاس سے استعمال کیے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم اسٹینسل کی قیمت ہی ادا کر دوں لیکن اس نے ایک نا سنی، میں جب بھی اپنی اس کتاب کو دیکھتا ہوں شبو کے عمل کو یاد ضرور کرتا ہوں۔اس کے اس عمل نے مجھے لکھنے اور چھپنے کی ایسی راہ دکھائی کہ میں طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسی راہ کا مسافر ہو کر رہ گیا ہوں۔

۳۱ مارچ ۲۰۰۶ء جمعہ کی نماز پڑھ کر گھر میں جوں ہی داخل ہوا شہناز جو ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں میری جانب متوجہ ہوئیں اور کہا کہ لئیق ماموں کا انتقال ہوگیا، میرے پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی ہو۔ نا بیماری کی خبر، نہ اسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع، پھر اچانک یہ کیا ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ لیاقت نیشنل اسپتال میں ہیں، میں فوری طور پر اسپتال پہنچ گیا، وہ ایمرجنسی وارڈ کے ایک بیڈ پر سفید چادر میں ملبوس تنہا موجود تھے، معلوم ہوا کہ ان کے ہمراہ جو احباب ہیں وہ اسپتال سے ان کی رخصت کی کاروائی میں مصروف ہیں، ایسا محسوس ہوا کہ اسپتال کا عملہ انہیں اس دنیا سے رخصت کر کے کچھ دیر پہلے ہی فارغ ہوا ہے، چادر پر تازہ خون واضح تھا، دونوں ہاتھ بینڈیج کے ذریعہ بیڈ سے بندھے ہوئے اور دونوں ہاتھوں میں انجکشن یا ڈریپ کے لیے کینولا (Cannula) لگا ہوا تھے، گردن میں بھی ایک جانب کینولا لگا ہوا تھا جس کے ذریعہ ایک ٹیوب دل کی جانب پاس کی گئی تھی۔ شیو بڑھی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ چند روز سے اس قابل نہیں تھے کہ شیو ہی بنا لیتے، ورنہ وہ تو عام زندگی میں صاف شفاف رہنے کے عادی تھے، چہرے سے نقاہت، افسردگی، تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے، ان کے چہرے سے یہ احساس نمایاں تھا کہ موت نے انہیں ابھی ابھی مات دی ہے، روح کو ان کے جسے رخصت ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی ہمت و طاقت کے مطابق ملک الموت کا مقابلہ کیا لیکن

پھر یہ سوچ کر ہتھیار ڈالدئے کہ یہ من جانب اللہ ہے ، میرا وقت پورا ہوچکا ہے، جس قدر زندگی مجھے عطا کی گئی تھی وہ پوری ہوئی ، یہ سفر اب اختتام کو پہنچا اور اب اس عالم فانی سے ایک نئے اور ابدی سفر کا آغاز ہونا ہے، اور پھر اپنی جان اپنے خالق کے سپرد کری۔ میں ان کے برابر موجود تھا، انہیں ٹک ٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، ان سے تعلق کے حوالے سے ایک فلم ذہن میں چل رہی تھی ، ان کے ساتھ گزرے لمحات ، ملاقاتیں اور واقعات ایک ایک کرکے نظروں کے سامنے تھے۔ اسپتال کے ایک کارکن نے انہیں اسپتال سے رخصت کرنے کے انتظامات شروع کیے، گردن میں داخل ایک ٹیوب باہر نکالی جس کے ساتھ ان کا تازہ خون بھی باہر آیا، دونوں ہاتھوں میں لگے ہوئے کینولے' نکالے گئے، نئی سفید چادر میں لپیٹا گیا، اس عمل میں میں اس کارکن کی مدد کر' تا رہا۔ تیاری مکمل ہوئی اور ایمبولینس میں گھر کی جانب روانہ ہوئے ، میں اپنی گاڑی میں ساتھ ساتھ تھا، گھر پہنچے جہاں ان کے اہل خانہ نے آہوں اور سسکیوں میں ان کا استقبال کیا، وہاں موجود ہر فرد آنسوں بہا رہا تھا، بین کرتی ہوئے ان کی بیٹیاں اور بیٹے اور دیگر عزیز و عقارب نوحہ کناں تھے۔ لاہور اور اسلام آباد سے ان کی ایک بیٹی اور بیٹے کو پہنچنا تھا، رات ہوچکی تھی چنانچہ فیصلہ ہوا کہ تدفین صبح ہو ، غسل دینے کے بعد ان کے جسد خاکی کو ایدھی کے سرد خانہ میں رکھوا دیا گیا، ، صبح تدفین ہوئی ، سیکڑوں کی تعدا میں احباب ان کے سفر آخرت میں شریک تھے جن میں ان کے عزیز رشتہ دار، دوست احباب اور

کراچی کی انتظامیہ کے لوگ بھی بڑی شامل تھے۔ قومی وصوبائی اسمبلی کے بعض اراکین، وزراء اور متحدہ قومی موومنٹ کے بے شمار کارکن بھی شریک سفر تھے۔ اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ اپنے جد امجد شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

ہم نشیں پوچھتے کیا ہو میرے دل کی حالت
صدمہ کیا دے گئے دنیا سے جانے والے

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل)

رضا علی عابدی اپنی تصنیف ''کتب خانہ'' کی روشنی میں

پاکستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا، ریڈیو ہی عوام الناس کے لیے معلومات اور تفریح و طباع کا ذریعہ تھا۔ ۱۹۷۵ میں بی بی سی لندن کی اردو سروس سے ایک پروگرام بعنوان ''کتب خانہ' شروع ہوا، اس وقت میں شعبہ لائبریری وانفامیشن سائنس سے منسلک ہو چکا تھا نیز اسی سال میری ایک کتاب ''کتب خانے تاریخ کی روشنی میں'' منظر عام پر آچکی تھی۔ اس حوالہ سے میری دلچسپی کتب خانوں، خصوصاً کتب خانوں کی تاریخ کے بارے میں زیادہ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے رضا علی عابدی کی مدھر آواز بی بی سی لندن کی اردو سروس سے بارہا سنی، ان کے اس پروگرام کے متعدد نشریے بڑی دلچسپی سے سنے۔ یہ پروگرام کوئی سال بھر سے زیادہ مسلسل نشر ہوا، بقول رضا علی عابدی 'یہ پروگرام ۱۴۰ ہفتے نشر ہوا اور یہ کہ اس کا بند ہونا بے شمار سننے والوں کی خفگی کا باعث بنا'۔ اسی قسم کا دوسرا پروگرام ۱۹۸۲ء میں اسی عنوان سے نشر ہوا۔ بات درست ہے یہ پروگرام تھا ہی اس قدر لچسپ، مفید اور معلوماتی، ساتھ ہی اس پروگرام کو رضا علی عابدی کی منفرد آواز و انداز نے خوب سے خوب تر بنا دیا تھا۔ اس پرگرام کا بنیادی مقصد پرانی اردو کتابوں کو جو مختلف عوامی کتب خانوں اور مختلف علمی و ادبی شخصیات کے ذاتی ذخیرہ میں

محفوظ تھیں متعارف کرانا تھا۔اس پروگرام میں کتابوں کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کا ذکر آجانا یقینی تھا۔اس پروگرام کو ترتیب دینے کی غرض سے رضا علی عابدی نے کوچہ کوچہ ،قریہ قریہ سفر کیا۔برطانیہ کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف شہروں میں گئے بقول عابدی صاحب 'اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ موقع پر جاکر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی پہاڑیوں سے لے کر مدراس کے ساحل تک اور بنگال کے سبزہ زاروں سے راجستھان کے ریگ زاروں تک قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں ، اور کس حال میں ہیں'۔ عابدی صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ، ان علاقوں میں موجود نایاب و نادر کتابوں کا حال اور ان کی خستہ حالی کی داستان اس خوبصورت انداز سے ریڈیو پر بیان کی کہ اس وقت کے سنے والے جو کتاب و ادب اور کتب خانوں سے دلچسپی رکھتے تھے عابدی صاحب کو جی بھر کر داد دینے میں پیچھے نہ رہے۔

عابدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس تحقیق کے دوران انہوں نے بہت کونے جھانکے ۔ کسی میں نور بھرا تھا اور کہیں اندھیروں کا راج تھا۔ کہیں کتابیں بچائی جارہی تھیں اور کہیں کیڑوں کی غذا بن رہی تھیں'۔یہ جستجو تو تھی ریڈیو کے لیے پروگرام ترتیب دینے کی جو کامیاب رہی ، اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ عابدی صاحب کو اپنی اس تحقیق کو کتابی شکل دینے کا خیال آیا اور اس نے عملی جامہ بھی پہن لیا جس کا نام ہے "برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال

میں ہیں: کتب خانہ'' جو ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئی اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس عمل سے کتاب اور کتب خانوں کے بارے میں کی گئی تحقیق جو ریڈیو پر نشر ہوئی ہواؤں میں بکھرنے کے ساتھ ساتھ صفحہ قرطاس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ وہ پروگرام جو آج سے تین دھائی قبل نشر ہوا، جو لوگ پروگرام نہ سن سکے تھے وہ اس کتاب کے ذریعہ سالوں پرانی پھیلنے والی خوشبوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب دیگر کتب سے مختلف ہے، کیونکہ یہ ریڈیو کے ایک دستاویزی پروگرام پر مبنی ہے اس کتاب کی تحریر کا انداز بھی وہی ریڈیائی ہے لیکن دوران مطالعہ خوبصورت انداز دل کو لبھاتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کی ورق گردانی کی جاتی رہے۔کتاب چوبیں ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کسی نہ کسی شہر، گاؤں، دیہات میں موجود نایاب کتب کی تفصیل بیان کرتا ہے۔کتاب کا پیش لفظ برطانیہ میں اردو کے نامور محقق اور استاد رالف رسل نے تحریر کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ ''ایک طرح سے یہ کتاب ایک پرزور اپیل کی تمہید ہے اس کتاب نے افراد، انجمنوں اور ارباب حل و عقد، کی توجہ اس طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پبلک اور ذاتی کتب خانوں اور مدرسوں، خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہا کتابوں اور

مخطوطات کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول مصنف ''اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آ جائے''۔

کتاب کو شائع ہوئے پچیس برس ہو چکے لیکن اس کے مطالعہ کے دوران یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں آج سے بیس یا تیس برس پرانی ہیں۔جو باب بھی پڑھا جائے دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔انداز بیان شائستہ، ادبی اور دل کو لبھانے والا ہے۔کتاب کی اہمیت کے پیش نظر پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے ''پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جنرل''جو کراچی سے شائع ہوتا ہے نے اس کتاب کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے، اس کی کئی اقساط شائع ہو چکی ہیں جسے قارئین پسند کر رہے ہیں۔المختصر رضا علی عابدی کی یہ تصنیف قدیم کتابوں کے بارے میں معلوما ت کا منفرد خزانہ ہے۔اس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے نایاب کتب کے بارے میں معلومات کی بارات چھم چھم کرتی چلی آ رہی ہیں۔

۲۲نومبر ۲۰۱۰ء، سرگودھا

منظور احمد بٹ۔ایک مخلص سماجی کارکن۔ شخصی خاکہ

۹مارچ ۲۰۰۷ء جمعہ کا دن میں کالج جانے کی تیاری میں تھا ٹیلی فون کی گھنٹی بجی بیگم نے کہا کہ ممتاز زیدی صاحب کا فون ہے۔زیدی صاحب میرے بچپن سے جوانی تک کے ساتھی، عمر میں فرق کے باوجود میرے دوست، کرم فرما اور محبت سے پیش آنے والوں میں سے ہیں۔ میرے گھر کا ہر فرد ممتاز زیدی صاحب سے اچھی طرح واقف اور متعارف ہے۔ سلام دعا ہوئی، گھر کے تمام افراد کی خیریت دریافت کی، چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد گویا ہوئے رئیس بھائی ایک افسوس ناک خبر یہ ہے کہ منظور بٹ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ میں یہ جملہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ منظور بٹ صاحب ہمارے دیرینہ ساتھی، دوست بلکہ گھر کے فرد کی طرح تھے۔زیدی صاحب نے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے ظفر صدیقی نے فون کرکے بتایا ہے شاید رات کے کسی پہر دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔زیدی صاحب نے بتایا کہ ابھی کوئی ایک ہفتہ قبل انہوں نے مجھے اور جمال صاحب کو بلایا تھا اور ہم ان کے گھر گئے تھے تو وہ بالکل ٹھیک تھے کسی بھی قسم کی کوئی بات نہ تو انہوں نے کی اور نہ ہی ہمیں ان کی گفتگو یا ظاہری صحت کے حوالہ سے محسوس ہوئی۔ مختصر یہ کہ میں اور زیدی صاحب کافی دیر بٹ صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ خدا حافظ اس

بات پر کیا کہ بٹ صاحب کے گھر ملاقات ہو گی۔

جمعہ کا دن تھا میں پہلے ہی کالج سے لیٹ ہو گیا تھا، کالج جانا بھی ضروری تھا کیوں کہ ہفتہ کو چہلم کی چھٹی آ رہی تھی، اسی روز میرے بیٹے نبیل کا ایم بی بی ایس فائنل ائر کا دوسرا پرچہ بھی تھا۔ میں اپنے تمام بچوں کو امتحان والے روز امتحانی مرکز پر از خود چھوڑ کر آتا ہوں، یہ میرا معمول رہا ہے، آج بھی مجھے ایسا ہی کرنا تھا، کالج کے لیے روانہ ہوا، راستہ میں گاڑی چلاتے ہوئے ذہن منظور بٹ صاحب کے بارے میں سوچتا رہا، ان کے ساتھ گزرے طویل دور کی ایک ریل چلتی رہی۔ کالج پہنچنے تک میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے کالج سے براہِ راست بٹ صاحب کے گھر چلے جانا چاہیے، سو ایسا ہی کیا، کالج میں حاضری لگا کر میں سائٹ سے ہوتا ہوا بٹ صاحب کے گھر آگرہ تاج کالونی پہنچ گیا۔ بٹ صاحب کے بیٹے ''گوگے'' سے ملا وہ مجھے سیدھا بٹ صاحب کے پاس لے گیا جو نہائے دھوئے، سفید لباس میں ملبوس گھوارہ میں ابدی نیند سو رہے تھے۔ شبانہ روز سماجی، سیاسی اور جمہوری سرگرمیوں میں مصروف رہنے والا، سراپا حرکت اور سراپا فکر و عمل، سیماب صفت اور پیہم مضطرب و مضطر، جہاں گشت و جہاں گرد نہایت ہی اطمینان و سکون میں آچکا تھا۔ ان کے گرد دیگر خواتین کے علاوہ بھابی (بیگم منظور بٹ) اور ان کی بیٹیاں افسردہ، غموں سے چور موجود تھیں۔ بھابی نے مجھے دیکھا تو شدت غم سے گویا ہوئیں کہ ' رئیس

تمہارے بٹ صاحب چلے گئے، انہیں دیکھ لو' میں نے خواتین کو راستہ دینے کا اشارہ کیا اور گہوارے کے بالکل نزدیک چہرے کی جانب ہو گیا، کچھ دیر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، چہرہ متغُوب ، غموں اور فکروں سے آزاد ، ایسا لگا کہ کوئی مسافر طویل مسافت طے کرنے کے بعد آخر کار تھک کر سوگیا ہے اور یہ سوچ کر آنکھیں موند لی ہیں کہ اب بہت ہو چکا، یہ آنکھیں ساری زندگی کھلی رہی تھیں ، یہ جسم ساری زندگی متحرک رہا تھا، بٹ صاحب کو رات کے کسی پہر بھی کسی نے مدد کے لیے پکارا تو ہر بات کی پرواکیے بغیر وہ اس کے ساتھ ہو لیا کرتے ، لیکن آج یہ آنکھیں بند تھیں، جسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر متحرک ہو چکا تھا۔ چند منٹ میں اپنے دوست کو دیکھتا رہا لیکن اس کیفیت کو زیادہ دیر جاری رکھنا مشکل تھا، بچیاں اپنے باپ کے گرد بیٹھیں بین کر رہی تھیں، میں نے اپنے اندر اسقدر سکت بھی نہ پائی کہ انہیں تسلی دیتا، میں ان کے کرب کو محسوس کر رہا تھا، ما ں یا باپ کی ہمیشہ کی جدائی ایک ایسا تکلیف دہ صدمہ ہوتا ہے جس کی کسک انسان تمام زندگی محسوس کرتا ہے۔ میں نے اپنے دوست کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر واپس ہوا۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

عزیز رشتہ دار، دوست احباب، سماجی اور سیاسی کارکن جوق در جوق چلے آرہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم بٹ صاحب کے سفر آخر میں شمولیت کے لیے پہنچ گیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد آگرہ تاج کالونی کے ''دہلی پارک'' جس کے قیام میں منظور بٹ صاحب نے رات دن صرف کیے تھے ان کی نماز جنازہ ہونا تھی۔ بٹ صاحب کے تمام دوست پہنچ چکے تھے۔ لوگ ٹولیوں میں ادھر اُدھر کھڑے بٹ صاحب کے بارے میں ماضی کی یادوں کو تازہ کررہے تھے۔ ان میں سید جمال احمد، سید ممتاز علی زیدی، مغیث احمد صمدانی، سبطین رضوی، ظفر احمد صدیقی، شیث احمد صمدانی، بابو اسماعیل، ارشاد قاضی، صادق حسین دور دراز سے پہنچنے والوں میں سے تھے یہ تمام بٹ صاحب کے تاج ویلفیئر سینٹر کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ایک جانب بٹ صاحب کے بھانجے زاہد رفیق بٹ جن کا تعلق مسلم لیگ (ن) سے ہے لوگوں کے ہمراہ اپنا غم بانٹ رہے تھے۔ ایک طرف شہنشاہ حسین اپنے پی پی کے دوستوں کے درمیان تھے، مسلم لیگ (ن) کے رہنما سلیم ضیاء بھی موجود تھے جو اپنی جسامت کی وجہ سے نمایاں تھے ان کے ساتھ ان کی جماعت کے ساتھی بھی تھے۔ امان اللہ، اور تاج الدین صدیقی بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ محوِ گفتگو تھے۔ مختلف سیاسی وسماجی شخصیات نے بھی تدفین میں شرکت کی ان میں وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر طارق رحیم، ممبر سندھ صوبائی اسمبلی، سلیم ھنگورو، ناظم ہمایوں خان، شاہ میر خان، ماما یونس بلوچ، بابو اسماعیل، رانا اشفاق رسول، فاروق اعوان، اعجاز حسن، سعید اختر پرویز، مجیب الرحمٰن صدیقی، ملک رفیق

اعوان، راجہ مشتاق ملک حیات، محمد انور نیازی شامل تھے۔ روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق سابق وزیر اعظم نواز شریف اور سید غوث علی شاہ نے منظور بٹ صاحب کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

جمعہ کی نماز کا وقت قریب آگیا، تمام لوگ نماز کے لیے جانے لگے، قریب میں موجود میرے دوست قاضی ارشاد نے کہا کہ میں تو تاج مسجد میں نماز ادا کروں گا، اس کے جواب میں، میں نے برجستہ کہا کہ تم اپنے باپ کی مسجد میں جاؤ میں اپنے باپ کی مسجد حنفیہ جامع مسجد ''میں نماز پڑھوں گا، میرے اس جملہ پر قریب میں موجود لوگ محظوظ'' ہوئے، دراصل جب ہم آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے تو قاضی ارشاد تاج مسجد کے سامنے رہا کرتے تھے اس وجہ سے ان کے والد اس مسجد میں نماز پڑھتے اور اس کے انتظامی امور میں شامل تھے جب کہ میرے گھر کے قریب حنفیہ جامع مسجد تھی، اس مسجد کی تعمیر میں میں نے اپنے والد کو مزدوری کرتے ہوئے دیکھا، بعد میں وہ اس کے انتظامی معاملات میں شریک رہے، اس تعلق کے حوالے سے میں نے اُس وقت یہ کہا کہ میں اپنے باپ کی مسجد میں نماز ادا کروں گا، مجھے اس مسجد سے اس وجہ سے بھی زیادہ عقیدت اور محبت ہے کہ میرے والد مرحوم اس کی تعمیر میں شریک رہے تھے اور انہوں نے اس مسجد میں کئی برس نماز ادا کی۔ ہم آگرہ تاج کالونی سے دستگیر سوسائٹی منتقل ہوئے تو میرے والد صاحب یٰسین آباد کی مسجد قبا میں نماز ادا کرنے

لگے اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس مسجد میں اور ایک مخصوص جگہ یعنی اول صف میں امام صاحب کے انتہائی دائیں جانب وہ نماز ادا کیا کرتے تھے، وہ اذان ہوتے ہی مسجد چلے جایا کرتے اس وجہ سے انہیں اپنی مخصوص جگہ ہی مل جایا کرتی، اس مناسبت سے میں جب کبھی اس بستی میں جاتا ہوں تو میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس مسجد میں اور اس جگہ پر نماز ادا کروں جہاں میرے والد صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کے نا معلوم کتنے سجدے ادکیے۔ اس مسجد اور اس مخصوص جگہ سے مجھے ایک خاص عقیدت اور انسیت ہے مجھے وہاں سے اپنے والد مرحوم کی خوشبو آتی ہے۔ میں نماز کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس جگہ کو بطور خاص بوسہ بھی دیتا ہوں جہاں پر میرے مرحوم والد سجدہ میں رہا کرتے تھے۔

منظور بٹ صاحب کا جنازہ آہوں اور سسکیوں میں دہلی گراؤنڈ لایا گیا، دہلی گراؤنڈ بٹ صاحب کے عقیدت مندوں، محبت کرنے والوں، عزیز و اقارب اور دوستوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، نماز جنازہ کسی غیر معروف امام نے ادا کی، نماز پڑھا کر وہ امام صاحب تیز قدموں، مجمع کو چیرتے ہوئے واپس لوٹتے دیکھے گئے،شاید ان کے عقائد میں نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ضروری نہیں۔ مولانا غلام دستگیر افغانی جو حنفیہ جامعہ مسجد کے پیش امام اور منظور بٹ صاحب کے دوستوں میں سے تھے نماز جنازہ تو نہ پڑھا سکے البتہ نماز کے بعد انہوں نے دعا کرائی، ہر آنکھ نم تھی، سارے دل افسردہ تھے، سب

لوگ بٹ صاحب سے اپنے تعلق کے حوالے سے محو گفتگو تھے، لوگ ان کی اچھائیوں کو بیان کررہے تھے۔ بلا تفریق ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والا، غریبوں کا ہمدرد، علاقے کے مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے جس نے اپنی زندگی وقف کردی، اپنے چاہنے والوں، ہمدردوں، عزیزوں، رشتہ داروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے ابدی سفر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔کاروں، بسوں اور موٹر سائیکلوں پر مشتمل قافلہ شیر شاہ قبرستان پہنچا جہاں بٹ صاحب کی آخری آرام گاہ ان کے انتظار میں اپنا دامن واہ کیے ہوئے تھی۔ مرحوم کو اپنے جواں سال بیٹے مسعواحمد بٹ عرف پپو کی قبر کے.برابر ہی جگہ ملی ان کا یہ بیٹا جوانی میں ایک حادثہ میں جاں بہ حق ہوگیا تھا۔ وہ جو زندگی میں کسی کا احسان اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا تھا دوش احباب پر سوار بہ مجبوری اللہ کے گھر پہنچ گیا۔

شہر خموشاں میں جسد خاکی کو لحد میں اتارنے کی تیاریاں ہورہی تھیں لوگ دور دور تک ادھر اُدہر قبروں کے درمیان ٹولیوں میں محوِ گفتگو تھے۔ میں بھی افسردہ ایک قبر کی اونچی سی دیوار پر ٹیک لگائے اپنے محلّہ ،پڑوس ، رشتہ دار، دوست، احباب، جانے انجانے جو اس قبرستان میں ابدی نیند سورہے ہیں کے بارے میں سوچ رہا تھا، ان تمام احباب کی قبریں ایک ایک کرکے میری نظروں کے سامنے آرہی تھیں جن کے سفر آخرت میں میں شریک رہا تھا، ان میں میرے حقیقی

دادا جناب حقیق احمد مرحوم (بارشوں اور سیلاب نے ان کی قبر کا نشان ہی مٹادیا)، حنیف احمد صمدانی، حمیرہ صمدانی (میرے حقیقی عم جناب مغیث احمد صمدانی کی شریک حیات)، خادم الانبیاء سبز واری (میرے والد صاحب کے ماموں) اور میرا دوست محمد وسیم جو عین جوانی میں موٹر سائیکل کے حادثہ میں جاں بحق ہوگیا تھا، ان احباب کے قبریں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں، جمیلہ خاتون (والدہ ڈاکٹر غنی الا کرم سبز واری)، سید امام، والدہ اور ہمشیرہ سید امام، شعیب صمدانی، والدہ شعیب صمدانی کے علاوہ ننھی معصوم سی بھانجی (ناہید کی بیٹی)، جلیس چچا مرحوم کا ننھا سا بیٹا، فیاض صاحب، عثمان اور دیگر دوست احباب، پڑوسی جو اس قبرستان میں مدفون ہیں سب کی مغفرت کی دعا کررہا تھا کہ اچانک سامنے والی قبر پر نظر گئی جس کے کتبے کو پڑھ کر میں اپنے ماضی میں کھوگیا، لکھا تھا" عبد الستار عرف ملو ولد کلو، عمر ۹۰ برس آگرہ تاج کالونی"، یہ اس دودھ والے کی قبر تھی جس کے دودھ کے باڑے سے ہم ایک طویل عرصہ تک دودھ لاتے رہے تھے، آگرہ تاج کالونی میں ملو کا باڑہ بہت مشہور تھا، میں نے اپنے دوستوں ظفر، سبطین اور جمال صاحب جو میرے قریب ہی موجود تھے متوجہ کیا اور پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ انہوں نے بھی کتبہ پڑھا اور کہا کہ یہ تو ملو دودھ والے کی قبر ہے۔اب ہم سب اپنے ماضی کی یادوں میں چلے گئے، ملو کا باڑہ، حاجی مراد راشن شاپ والے جہاں سے ہم راشن لایا کرتے تھے (اس زمانے میں راشن کارڈ کا نظام رائج تھا)، بلدیہ کا لگا ہوا پانی کا

وہ نل جہاں سے ہم 'بہنگی' (ایک بانس یا ڈنڈا جس کے دونوں طرف پانی کے ڈول اٹھا نے کے لیے رسیاں بندھی ہوتی ہیں) کے ذریعہ پانی لایا کرتے تھے، حاجی کی لکڑی کی وہ ٹال جہاں سے ہم لکڑیاں لایا کرتے تھے، کبیر صاحب اور فیروز صاحب کی پرچون کی دکانیں، قدیر خان کی کرائے کی سائیکلوں کی دکان جہاں سے ہم کرائے پر سائیکل لے کر گھر والوں کو بتائے بغیر خوب گھوما کرتے تھے اور شیخ صاحب بڑے گوشت کی دکان والے
المختصر یہ کہ قبرستان کی اس غم ناک فضاء میں ہم سب اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے اور پھر دکھی دل کے ساتھ بٹ صاحب کا جسد خاکی لحد میں اتار دیا گیا، فاتحہ ہوئی اور ہم اپنے ایک دیرینہ دوست کو اپنے ہاتھوں مٹی کے سپرد کرکے واپس ہوئے۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا' خدا مغفرت کرے

مجھے یاد نہیں آتا کہ میں منظور بٹ صاحب سے پہلی بار کب ملا تھا لیکن ماضی کی یادوں میں ادھر اُدھر ہاتھ مارتا ہوا قدم بڑھاتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ میں نے بٹ صاحب کو کشمیر کے ایک حسین نوجوان کے روپ میں دیکھا تھا جس نے تازہ تازہ شیو بنانا شروع کی تھی، اس نوجوان کو باڈی بلڈنگ کا شوق تھا، لمبا قد، دبلا پتلا، گورا رنگ، گھنی بھنویں، روشن پیشانی، کتابی چہرہ پر وجاہت اور شرافت، آنکھوں میں چمک، لہجہ میں معصومیت اور معمولی سی

لکنت، چہرے مہرے اور وضع قطع سے کشمیر کا حسن نمایاں تھا، ابتدا میں پینٹ اور شرٹ بعد میں پینٹ اور بوشرٹ پہنا کرتے تھے ، گھر میں ڈھیلے پائینچے کا پیجامہ (پتلون نما) اور اس کے اوپر اسی رنگ کا بوشرٹ ان کا خاص لباس تھا ، وضع دار انسان تھے۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھا کرتا تھا اور اپنے محلے کے ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود کے علاوہ فلاحی کاموں میں بھی شریک رہا کرتا۔ ان میں سے اکثر مجھ سے عمر میں بڑے بھی تھے، ان نوجوانوں نے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سماجی ادارہ ''تاج ویلفیئر سینٹر'' ۱۹۶۰ ء میں قائم کیا تھا، جہاں اہل محلّہ چھوٹے بڑے کھیل کود کے علاوہ فلاحی کاموں میں مصروف رہا کرتے ۔ بہت ہی اچھا ماحول تھا، بڑے اپنے چھوٹوں کا حد درجہ خیال کیا کرتے ، چھوٹے اپنے بڑوں کے احترام کے ساتھ ان کے شریک رہا کرتے، گویا چھوٹوں کے لیے یہ ایک تربیت گاہ تھی۔ در حقیقت میں نے اس ماحول سے بہت کچھ سیکھا، محفل میں گفتگو کرنا، مجمع کے سامنے اسٹیج پر تقریر کرنے کا حوصلہ مجھ میں اسی دور میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن اور جوانی اسی جگہ گزری، میں نے اسی علاقے کے اسکولوں پہلے قومی انجمن پرائمری اسکول بعدہ غازی محمد بن قاسم ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ایس ایم کالج سے انٹر، عبداللہ ہارون کالج سے بی اے کیا، بعد ازاں اسی کالج میں ۲۳ سال ملازمت کی۔ اس ماحول سے میں تہذیبی اور تمدنی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف ہوا، یہی وجہ ہے کہ لڑکپن کے یہ تہذیبی نقوش میرے ذہن و دل پر آج بھی مرتسم ہیں۔

تاج ویلفئر سینٹر ایک ایسا فلاحی ادارہ تھا جس نے اپنے اراکین میں خدمت خلق کا مثالی جذبہ پیدا کر دیا تھا، مختلف سیاسی نظریات کے حامل، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف قومیتوں سے تعلق اور مختلف مذہبی عقائد رکھنے کے باوجود اس ادارے سے منسلک لوگ اپنے آپ کو ایک ہی خاندان کا فرد تصور کیا کرتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد خوشی یا غمی میں عزیز رشتہ داروں سے بڑھ کر شریک رہا کرتے۔خلوص، محبت، ہمدردی، باہمی شفقت، اخوت، بھائی چارہ کے اس ماحول کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ شاید ہم میں سے کسی کو بھی وہ ماحول زندگی میں دوبارہ نہیں مل سکا۔ منظور احمد بٹ نے بھی اسی ماحول سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، ان کی فلاحی کاموں کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی جس نے انہیں
ایک مخلص، بے لوث اور کبھی نہ تھکنے والا سماجی کارکن بنا دیا۔ اس شخص کو شب و روز لوگوں کی خدمت کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہ تھا۔

تاج ویلفئر سینٹر کے ہر سال انتخابات ہوا کرتے تھے جس میں عہدیداران کا انتخاب عمل میں آتا، ۱۹۷۳ء کے انتخابات میں منظور احمد بٹ صاحب صدر اور میں جنرل سیکریٹری منتخب ہوا،اس سے قبل ان عہدوں پر جناب مظہر الحق ،انیس فاروقی، سید ممتاز علی زیدی، سید جمال احمد، شیش احمد صمدانی اور دیگر

احباب خدمات انجام دے چکے تھے۔ بٹ صاحب سے میری قریبی دوستی کا یہ نقطہ آغاز تھا۔ نائب صدور سید ممتاز علی زیدی اور سید جمال احمد، جوائنٹ سیکریٹری ظفر احمد صدیقی، سوشل سیکریٹری سید سبطین رضوی، تعلیمی سیکریٹری ابرار حسین، اسپورٹس سیکریٹری جلیس احمد، ہیلتھ سیکریٹری سراج الحق، آفس سیکریٹری محمد اقبال اور خازن سید اختر حسین شاہ منتخب ہوئے تھے۔ اس ادارے کی تاریخ میں پہلی بار سینئر اور جونیئر ایک ساتھ عہدیدار منتخب ہوئے، جس کا بنیادی مقصد اپنے چھوٹوں کی تربیت اور انہیں مستقبل کے لیے تیار کرنا تھا۔

منظور بٹ صاحب کی زبان میں لکنت تھی اور وہ جملے کی ادائیگی کے درمیان کسی کسی وقت اٹک جایا کرتے تھے، اسی لیے وہ تقریر کرنے سے بھی گریز کیا کرتے تھے۔ نئی مجلس منتظمہ کی تقریب حلف برداری منعقد ہوئی۔ الیکشن چیئرمین کے فرائض محمد اشرف چودھری نے انجام دیے تھے، تقریب میں وہ نو منتخب صدر سے حلف لے رہے تھے۔ منظور بٹ صاحب نے ہکلاتے ہوئے حلف نامہ پڑھنا شروع کیا ''میں منظور احمد بٹ ولد۔۔اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ میں ۔۔وغیرہ وغیرہ) خالی جگہ انہیں اپنے والد صاحب کا نام لینا تھا، انہوں نے حلف نامہ پڑھنا شرع کیا اور اپنے نام کے بعد اپنے والد کا نام ''اللہ دتہ'' لینے کے بجائے انہوں نے کہا'' میں منظور احمد بٹ ولد اللہ تعالیٰ ۔۔'' جب انہوں نے یہ جملہ ادا کیا تو تقریب میں موجود تمام لوگ محظوظ ہوئے

بغیر نہ رہ سکے۔ زور دار قہقہ لگا۔ بٹ صاحب کی یہ بات ہمیشہ انہیں یاد دلائی جاتی تھی، وہ بھی اس پر ہنس دیا کرتے۔

منظور بٹ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، ایک طویل عرصہ بٹ صاحب کے ساتھ گزرا، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو گا جب کہ ہم دوست آپس میں نہ ملا کرتے ہوں۔ ہمدرد، در گزر کرنے والے، انہیں کبھی غصہ میں نہیں دیکھا، غریبوں کی خاموشی سے مدد کرنے والے، دوستوں پر پیسہ خرچ کرکے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ مالی طور پر خوش حال تھے، اللہ نے آپ کو خوب دولت دی تھی انہوں نے اسے فیاضی کے ساتھ خرچ بھی کیا۔ خرچ کرکے کبھی زبان پر نہیں لائے، الیکٹرک کنٹریکٹر تھے، روزنامہ جنگ کی تقریباً تمام عمارتوں کی الیکٹریفیکیشن انہوں نے ہی کی تھی، طارق روڈ پر طارق سینٹر کی وائرنگ، حسین ڈی سلوا اور کئی بڑی عمارتوں کی وائرنگ انہوں نے کی تھی۔ وہ کراچی کے بڑے ٹھیکیداروں میں سے تھے۔ سادگی کا یہ عالم کہ پوری زندگی ویسپا اسکوٹر پر گزار دی، حالانکہ وہ کار ہی نہیں بلکہ پجیرو بھی رکھ سکتے تھے، میں اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا کہ اگر آپ کو بٹ صاحب سے ملاقات کرنی ہے تو کراچی کے کسی بھی راؤنڈ اباؤٹ پر کھڑے ہو جائیں بٹ صاحب اپنی ویسپا پر کم از کم ایک بار وہاں سے ضرور گزریں گے۔

منظور بٹ پیدائشی مسلم لیگی تھے۔ ہارون برادران (یوسف ہارون، محمود ہارون اور سعید ہارون) ان کے سیاسی لیڈر تھے۔ وہ ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ جب تک یہ احباب محمود ہارون اور سعید ہارون حیات تھے بٹ صاحب کے سیاسی معاملات انہیں کے زیر عصر رہے۔ وہ مرتے دم تک مسلم لیگی رہے لیکن ان کے دیگر سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم تھے۔ وہ ۱۹۸۸ء میں علاقے کے ''کونسلر'' بھی منتخب ہوئے اور علاقے کے بے شمار دیرینہ مسائل حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دہلی پارک جس میں ان کی نماز جنازہ بھی ادا کی گئی مرحوم کی عملی کاوشوں کا ہی ثمر ہے۔ اس پارک کے افتتاح (۱۹۷۹ء) پر انہوں نے ایک سوونیئر بعنوان ''حلقہ نمبر ا، بلدیہ دور کی دو سالہ کارکردگی'' بھی شائع کیا جو ان کی عوامی خدمات کی دستاویز ہے۔ تاج ویلفیئر سینٹر کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے اس ادارے کی ترقی کے لیے جو کوششیں کیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں لیکن افسوس وہ اس ادارے کی عمارت اپنی زندگی میں تعمیر نہ کراسکے۔ زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے کسی ٹھیکیدار کے ہاتھوں کوئی معاہدہ کرلیا تھا جس کے مطابق وہ ٹھیکیدار اس جگہ عمارت تعمیر کرے گا اور زمینی منزل اس ادارے کو دیدیگا۔ افسوس وہ اس ادارے کی عمارت کی تعمیر سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تاج ویلفیئر سینٹر کے عہدیداران اور بٹ صاحب کے دوستوں کا ایک تعزیتی اجلاس

جناب محمد اشرف چودھری (ایڈووکیٹ) کی رہائش گاہ واقع گلشن اقبال میں منعقد ہوا جس میں بڑی تعداد میں احباب نے شرکت کی۔ شریک دوستوں نے بٹ صاحب سے تعلق اور تاج ویلفیئر سینٹر میں گزرے دنوں کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان میں سید ممتاز علی زیدی، سید جمال احمد، سید حیدر رضاء، مغیث احمد صمدانی، چودھری محمد اشرف، شیث احمد صمدانی، سبطین رضوی، ظفر احمد صدیقی، احمد حسین، محمد صادق، قاضی محمد ارشاد، شکیل احمد اور راقم الحروف شامل تھا۔ اجلاس میں بٹ صاحب مرحوم کی ان خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا جو انہوں نے ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے انجام دیں۔

کوئی بھی انسان خامیوں سے مبرا نہیں ہوتا، منظور بٹ میں بھی خامیاں اور بعض کمزوریاں تھیں۔ ان کے دوست ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا کرتے اور برملا ان باتوں کا اظہار بھی ان سے کیا کرتے تھے وہ ان باتوں کو ہنس کر ٹال جاتے اور ایک خاص جملہ ''کوئی نہ، کوئی نہ'' کہہ کر خاموش کرا دیا کرتے۔ اب وہ اچھی جگہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین !

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی نہ جانے ان کو کس طرف

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' میں شامل)

(Father's Day) جون ۲۰۱۴ء ۱۵

فادرز ڈے کے موقع اپنے والد انیس احمد صمدانی مرحوم کو خراج تحسین

جدا ہوئے ۱۸ سال ہو گئے لیکن ان کی یاد آج بھی تازہ ہے

ماں کے ساتھ ساتھ والد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں فادرز ڈے ہر سال جون کی تیسری اتوار کو منایا جاتا ہے۔ بعض ممالک دیگر دنوں میں بھی اس دن کو اہتمام کرتے ہیں۔ ۲۰۱۳ میں یہ ۱۶ جون کو منایا گیا، اس سال ۲۰۱۴ء میں جون کی تیسری اتوار ۱۵ جون کو اس دن کو فادرز ڈے کے طور پر منایا جا رہا ہے۔
ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے''۔ ایک اور حدیث جو ترمذی شریف ہی کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس حدیث کے روی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کی اطاعت ''والد'' کی فرماں برداری میں ہے''۔

ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ 'صحابی رسول حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''باپ'' جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اگر تو چاہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اسے بند کردے'۔اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور یہ جنت ماں کی اطاعت، فرماں برداری اور اس کے رضا میں رکھی گئی ہے تو'باپ' کی خدمت ، اطاعت اور فرماں برداری اور اس کی رضا کا صلہ جنت میں داخلے کا باعث اور اس کا درمیانی دروازہ ہے۔ گویا ماں کی خدمت اور اطاعت کے ساتھ ساتھ باپ کی اطاعت وفرماں برداری بھی لازم وملزوم ہے۔ کوئی اگر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ماں کی خدمت کرکے جنت میں چلا جائے گا خواہ باپ کی فرماں برداری نہ کرے تو یہ ممکن نہیں ۔ دونوں کی خدمت، اطاعت وفرماں برداری لازم وملزوم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ارشاد فرماتے ہیں'تین آدمی ایسے ہیں جن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی، باپ، مظلوم اور مسافر'۔تابعی حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں' باپ کی دعا اور اللہ عزوجل کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا'۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ یہ (بزرگ) کون ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ میرے

والد بزرگوار ہیں۔ یہ سن کر آں حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ' والد کے ادب واحترام کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے آگے ہر گز نہ چلنا کہ اس سے ان کی بے ادبی ہو گی۔ اپنے والد کے بیٹھنے سے پہلے ہر گز نہ بیٹھنا اور ان کا نام لے کر انہیں نہ بلانا اور ان کی وجہ سے کسی کو گالی نہ دینا کہ جواباً وہ بھی تمہارے والد کو گالی دے '۔ان احادیث مبارکہ سے باپ کی قدر و منزلت واضح ہو جاتی ہے۔بقول شاعر عاتی لکھنوی ؎

اگر ہو گود ماں کی تو فرشتے کچھ نہیں لکھتے
جو ممتا رُوٹھ جائے تو کنارے پھر نہیں دکھتے
یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دکھ عاتی
سُنا ہے باپ زِندہ ہو تو کانٹے بھی نہیں چُبھتے

میرے والد محترم کا نام انیس احمد صمدانی تھا۔ ہم انہیں 'پاپا' کہا کرتے تھے۔ جب کے والدہ کو ہمیشہ 'امی' کہا۔ باوجود اس کے کہ جس گھر میں ہم سات بہن بھائی یکے بعد دیگر آئے ہم سے پہلے ہمارے والد صاحب کے دو بھائی (جلیس احمد، مغیث احمد) اور تین بہنیں نسیمہ خاتون، مبینہ خاتون اور تسلیما خاتون) موجود تھے اور وہ سب ہمارے والد صاحب کو بھائی صاحب اور ہماری امی کو بھابی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اکثر گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے دیگر افراد اپنے بڑوں کو جو کہتے ہوں وہی ان کے بچے بھی کہنے لگتے ہیں لیکن

ہم نے اپنے والدین کو بھائی صاحب اور بھابی نہیں کہا۔ اس کی بنیادی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے امی اور ابا رشتوں کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ جس سے جو رشتہ ہے اس کا احترام اور اہمیت دینے کا درس ان کا پہلا سبق تھا۔ بعض احباب اس بات کو اہمیت نہیں دیتے یا انہیں شوق ہوتا ہے کہ بچے انہیں بڑے رشتہ سے مخاطب کریں مثلاً رشتہ چچا یا یا ،تائی یا چچی کا ہے انہیں ممی یا ڈیڈی پکارا جارہا ہے، رشتہ پھوپی یا پھوپا کا ہے بچے ا، نہیں پاپا اور امی کہہ کر پکار رہے ہیں۔ بظاہر یہ عام اور چھوٹی بات لگی ہے لیکن انسان جس رشتہ سے پکارا جاتا ہے اس سے اس کے وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ دادا، دادی، نانا اور نانی کے رتبے پر پہنچتے ہیں تو وہ اپنے پوتوں، پوتیوں ، نواسے اور نواسیوں سے دادا ، دادی، نانا یا نانی کہلوانا پسند نہیں کرتے ۔ حالانکہ جب بچے انہیں ان کے رتبے سے پکارتے ہیں تو ان کی ان کی اس پکار سے جو خوشی محسوس ہوتی ہے اس کا کوئی مول نہیں۔ ہمارے والدین نے ہمیشہ رشتوں کو اہمیت دی۔ جس کا جو رشتہ ہے اسے اسی نام سے مخاطب کرانے کی تلقین کی۔ میں بھی اپنے والدین کی طرح رشتوں کی سچائی اور اہمیت کا قائل ہوں میرے بچے مجھے ’ابو‘ اور اپنی ماں کو ’امی‘ ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح میرے پوتے مجھے ’دادا‘ او دادی کو’دادی‘جب کہ میرا نواسہ ارحم اور نواسیاں نیہا اور کشف نانا اور نانی ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ وقت ہوتا ہے جب ان کی اس پکار سے میرے اندر خوشی کی ایسے لہر دوڑتی ہے جو مجھے توانا کر دیتی ہے۔اردو کے

شاعر معراج فیض آبادی نے کہا کہ میرے بچے مجھے بوڑھا ہونے نہیں دیتے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے پوتے، (پوتی ابھی نہیں ہے)، نواسہ اور نواسیاں مجھے توانا اور تندرست رکھتے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر اور ان کی زبان سے دادا اور نانا سنتا ہوں تو میری روح توانا ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر۔

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

میرے والد صاحب نے ایک حویلی نما گھر میں آنکھ کھولی۔ یہ حویلی آزاد منزل کہلاتی تھی۔ حویلی کے مالک میرے والد صاحب کے دادا شیخ محمد ابراہیم آزاد تھے اسی مناسبت سے یہ حویلی آزاد منزل کہلاتی تھی۔ آزاد صاحب ہندوستان ریاست بیکانیر کے نامی گرامی وکیل تھے۔ بعد میں بیکانیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ پیسہ اچھائی اور برائی دونوں کام خوب خوب انجام دیتا ہے۔ والد صاحب کے دادا حضور کی دولت نے ان کی اولاد کو سہل پسند بنادیا، آٹھ بیٹوں میں سے ایک یا دو ہی اپنے والد کے نقش قدم پر چلے باقیوں نے اپنے والد کی دولت کو ہی اپنا مستقبل سمجھا ان میں سے ایک میرے دادا بھی تھے یعنی میرے والد صاحب کے والدِ محترم جو خود دار، دادی ان سے بھی زیادہ خود دار تھیں۔ دولت کی چمک کچھ ہی دن میں ماند پڑ گئی۔ دادا نے مختلف کاروبار کیے لیکن کسی میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس صورت

حال نے ہمارے والد صاحب کو کم عمری میں ملازمت کرنا پڑی۔ اس زمانے میں وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ منشی ہونا بھی پڑھے لکھے لوگوں کا خاص ذریعہ معاش تھا چنانچہ والد صاحب منشی ہوگئے۔ مالی حالات نے انہیں صرف مڈل تک ہی تعلیم حاصل کرنے دی اور وہ میٹرک بھی نہ کرسکے۔ اس زمانے کا مڈل پاس آج کل کے ایم اے سے بہت آگے تھا۔ ان کی ملازمت کا سلسلہ جو ہندوستان میں شروع ہوا تھا زندگی کے اختتام تک جاری و ساری رہا لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو پڑھائی کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ ہمارے پڑھنے کے سب تمام وسائل مہیا کیے۔ والد صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔

میری امی اور ابا ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء بروز ہفتہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، گویا قیام پاکستان سے صرف چھ ماہ قبل۔ والد صاحب ملازمت کی وجہ سے راجستھان کے شہر گنگا نگر میں بہ سلسہ ملازمت رہا کرتے تھے، جب کہ دیگر اہل خانہ بیکانیر میں رہتے تھے۔

میرے والدین کی شادی کو چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوگیا۔ ہندوستان سے مسلمان ہجرت کرکے پاکستانی علاقوں میں آنے لگے۔ میرے والد صاحب ہندوستان کے شہر گنگا نگر کی عدالت میں پیشکار تھے انہوں نے وہاں سے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا، ان کے والد اور بہن بھائیوں نے بعد میں ہجرت کی اور کراچی منتقل ہوئے۔

پاپا مستقل مزاج تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے کراچی ہجرت کی۔ ابتداء میں ایک پرائیویٹ کمپنی 'انٹر نیشنل فارورڈنگ' میں ملازمت کی جب یہ کمپنی بند ہو گئی تو ایک اور کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کے مالکان پارسی تھی۔ تین بھائیوں کی یہ کمپنی 'ایس پی گاندھی اینڈ کمپنی' کہلاتی تھی۔ تین بھائیوں میں مینو، بہرام اور خورشید تھے۔ پاپا اسی کمپنی سے ریٹائر ہوئے۔ پرائیویٹ کمپنی میں کام کرنے والے بہت جلد دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ ملازمت کرتے ہیں لیکن والد صاحب میں حوصلہ، قوت برداشت، در گزر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اپنی زندگی کا طویل عرصہ ایک ہی کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے گزارا۔

پاپا رحم دل اور دوسروں کی پریشانیوں اور مشکلات کو حل کرنے میں ہر وقت تیار رہا کرتے۔ ہم کراچی کی ایک کچی بستی آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے۔ کچھ کچا اور کچھ پکا لیکن کشادہ مکان تھا، جس میں ہمارا خاندان یعنی امی، ابا، سات بہن بھائیوں کے علاوہ ہمارے دو چچا (جلیس احمد اور مغیث احمد) اور دو پھوپھیاں (موبینہ خاتون اور تسلیمہ خاتون) بھی رہا کرتے تھے۔ کمانے والے ہمارے والد صاحب ہی تھے، ہم سب بہن بھائی چھوٹے اور پڑھ رہے تھے، شاید ہمارے چچا بھی کچھ کرنے لگے تھے، صحیح یاد نہیں، گزر بسر اچھے طریقے سے ہو رہا تھا کیوں کہ والد صاحب اور والدہ دونوں ہی فضول خرچ نہیں تھے، قناعت پسند

تھے، تھوڑے کو بہت جانتے تھے، ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو ہی دیکھا کرتے تھے، ہم نے انہیں کبھی اپنے سے اوپر والوں کے بارے میں بات کرتے نہیں سنا۔ ہمارے خاندان کے کئی احباب کو جب رہائش کی مشکلات کا سامنا ہوا تو والد صاحب نے بے چون وچرا انہیں اپنے گھر میں جگہ دی۔ ان میں لئیق احمد مرحوم جو ہماری امی کے رشتہ کے بھائی ہوتے تھے۔ وہ نامساعد حالات سے دوچار ہوئے ملازمت جاتی رہی لیکن خوددار تھے، حالات کا مقابلہ کرتے رہے، اتنی مشکل آن پڑی کے کرائے کے گھر میں رہنا بھی مشکل ہوگیا، مجبوراً ہمارے والد صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا انہوں نے بے چوں وچراں کرایہ کا مکان چھوڑ کر اپنے گھر منتقل ہونے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ انہیں بمعہ ساز و سامان اپنے گھرلے آئے۔ ہمارے والد صاحب اللہ مغفرت کرے کسی بھی اپنے یا پرائے کا دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا اس کی مدد کرنے میں کسی سے مشورہ کرنا تو دور کی بات دیر نہیں کرتے تھے۔ یہ پہلا واقعہ نہ تھا وہ ایسا پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔ میرے والد صاحب کے ماموں جناب غلام مصطفٰی سبزواری مرحوم کے سالے ضمیر حسن سبزواری مالی طور پر پریشانی کا شکار ہوئے اور ان کے ساتھ بھی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کرایہ کے مکان میں رہنا مشکل ہوگیا۔ اس وقت بھی ہمارے والد صاحب نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی، ہمارے گھر کا صحن کافی بڑا تھا، کمرے تو شاید ایک یا دو ہی تھے، آنگن میں چھونپڑی ڈالی اور ہنسی خوشی کافی عرصہ رہتے رہے۔

خاندانوں کو اپنے گھر پناہ دینے کے علاوہ انفرادی طور پر مختلف شخصیات کو دوران تعلیم اپنے گھر رکھنا، ان کے کھانے پینے کا ااہتمام کرنا بھی ہمارے والد صاحب مرحوم کی زندگی کا حصہ تھا۔ ہمارے خاندان کے وہ احباب جو اندرون ملک سے کراچی میں حصول تعلیم کے لیے آئے اکثر کو ہمارے والد صاحب نے اپنے گھر پناہ دی اور جب تک انہوں نے اپنی تعلیم مکمل نہ کر لی، ان کی تمام تر سہولیات کا خیال رکھا، مجھے ان میں سے بعض کے بارے میں علم ہے ،ایک شیخ طاہر حسن جو میرے والد صاحب کے چچا'' مفیق احمد مرحوم'' کے متبنیٰ بیٹے تھے، دوسرے شاہد احمد صدیقی واجد احمد مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ میری یاد داشت میں ہے کہ شکیل احمد سبزواری جو میرے ماموں زاد بھائی تھے جب پنجاب سے کراچی آئے تو ہمارے ہی گھر قیام کیا۔ صوفی محمد احمد مرحوم بھی بہت عرصہ ہمارے ہی گھر میں رہے۔ ہم نے کسی لمحے اپنے والد صاحب کی زبان سے یہ بات نہیں سنی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی احسان کیا، گویا وہ نیکی کرکے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ یہی حکمِ خداوندی بھی ہے۔ سورۃ النحل آیت نمبر ۹۰، ارشاد باری تعالی ہے'' خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔'' ۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری گھر کی قریب ترین مسجد جس میں پاپا نماز پڑھنے جایا کرتے اور اس کی انتظامی امور میں بھی شریک رہے کے پیش امام طویل عرصے تک ہمارے

گھرایک وقت کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔

ہمارے خاندان کے بزرگ فقہ حنفی سے تعلق رکھتے تھے،نذر و نیاز ، محفل میلاد اوردرود و سلام کے قائل تھے ۔ میرے والد صاحب بھی انہی نظریات پر عمل پیرا رہے۔ہم نے انہیں جوانی میں بھی نماز سے غافل نہیں دیکھا، ہمارے گھر کا ماحول مذہبی تھا، گھر میں نعتِ رسول مقبول ﷺ اورمیلاد کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ہر اسلامی مہینے میں اس کے تقدس کی مناسبت سے پروگراموں کااہتمام کیا جاتا جس میں ہمارے قریبی عزیز رشتہ دار بھرپور شرکت کیا کرتے۔ محرم الحرام میں عاشورہ کے دن گھر میں حلیم کی دیگ پکا کرتی،ہمارے قریبی عزیز شروع شب ہمارے گھرآ جایا کرتے ، رات بھر رَت جگا رہتا، صبح ہوتے ہی حلیم کی تقسیم شروع ہوجاتی، گھر میں کھانے کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ ہماری امی ذوق وشوق سے ہر سال اس کا اہتمام کیا کرتیں، ماہ ربیع الاول میں گھر کا ماحول زیادہ مذہبی ہوا کرتا تھا، محفل میلاد کا انعقاد ہوا کرتا۔ گیارھویں شریف کو نیاز کی دیگ ، ماہِ رجب کی ۲۲ تاریخ کو گھر میں کونڈوں کی ٹکیاں تیار ہوتیں، اس رات بھی ہمارے قریبی عزیز رشتہ دار شروع رات سے ہمارے گھرآ جاتے ، رات بھر جشن کا سماں ہوا کرتا تھا،دن بھر مہمانوں کی آمد جاری رہتی تھی۔ماہِ شعبان کی پندرھویں شب خصوصی عبادت کا اہتمام ہوا کرتا، امی اس دن سوجی اور چنے کی دال کا حلوہ پکایا کرتیں اور رات میں ہمیں قبرستان

جانے کی تاکید کیا کرتیں، شروع میں ہم شیر شاہ کے قبرستان جایا کرتے تھے جہاں پر میرے دادا اور دیگر احباب مدفن ہیں، جب ہم دستگیر منتقل ہوگئے تو یاسین آباد کے قبرستان جانا ہمارا معمول بن گیا، اب میرے ابا اور امی اِسی قبرستان میں مدفن ہیں۔

ماہِ رمضان کا پورا مہینہ موسم بہار کی طرح ہوا کرتا تھا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ پاپا کھانے کے شوقین تھے، عام دنوں میں بھی اور ماہ رمضان میں خاص طور پر دستر خوان بے شمار قسم کے کھانوں کی اشیاء سے بھرا ہوا ہوتا۔ پاپا کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوا پھر ختم ہی ہوگیا۔

ہم نے کبھی امی اور ابا کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتے نہیں دیکھا، حتیٰ کہ دونوں کو کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔ اس میں ہمارے پاپا کا بھی کمال تھا۔ وہ انتہائی صلح جو قسم کے انسان تھے، پان دان ہمارے گھر کی روایت تھی، پاپا اور امی دونوں ہی پان کھایا کرتے، پاپا اپنے ساتھ پان کی ڈبیا اور بٹوا رکھا کرتے تھے، امی کی دیگر ذمہ داریوں میں پان بنا کر دینا بھی تھا، مجھے یاد ہے کہ پاپا شروع میں سگریٹ بھی پیا کرتے تھے، جب پان کھانا شروع کیا تو سگریٹ پینا چھوڑ دی۔ میرے سب ہی بہن بھائیوں نے اپنے امی ابا کی اس روایت کو جاری رکھا ہوا ہے لیکن مَیں ان دونوں ہی چیزوں یعنی پان اور سگریٹ سے ہمیشہ بچا رہا اور اب بھی بچا ہوا ہوں۔

ہمارے گھر کا دستر خوان ہمیشہ دراز رہا جو ہمیشہ فرشی ہوا کرتا تھا، ہم نے ہمیشہ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ طویل عرصہ رہنے والے مہمان بھی ہمارے گھر میں اکثر رہے۔ دراصل ہمارے ابا جان انتہائی نرم دل، مہمان نواز اور کسی کی دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے، جب بھی کسی رشتہ دار نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو وہ فوراً اپنی خدمات حاضر کر دیا کرتے ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ شخص ہمارے ہاں مستقل مہمان ہو جایا کرتا۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں ۔ حتیٰ کہ پوری پوری فیمیلی کو ہمارے ابا جان اور امی نے اپنے گھر میں پناہ دی وہ کافی عرصہ تک ہمارے گھر میں رہتے رہے۔ گویا ہمارا گھر مہمان سرائے بھی تھا، ہم میں سے کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے فیصلہ پر اُف بھی کرتے بلکہ وہ وقت بہت ہی ہنسی خوشی گزرتا۔

جب ہم سب بھائی بڑے ہوگئے ، کسی حد تک مالی طور پر آسودہ حال بھی، باہمی مشورہ سے کراچی کے کسی اچھے علاقے میں منتقل ہونے کی منصوبہ بندی کی گئی،اس منصوبہ پر عمل کی صورت ایک ہی تھی کہ اس مکان کو جس میں ہم گزشتہ کئی دہائیوں سے رہ رہے تھے، جسے پاپا نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے رفتہ رفتہ تعمیر کیا تھا سیل آوٹ کر دیا جائے۔پاپا کے لیے یہ ایک تکلیف دہ فیصلہ تھا۔ امی بھی پاپا کے ساتھ تھیں، شروع میں وہ تیار نہ ہوئے لیکن جب انہوں نے

دیکھا کہ ان کی اولاد کی یہی خواہش ہے تو وہ اپنی اولاد کی خواہش کے آگے دست بردار ہوگئے۔ انہیں آمادہ کرنے میں ہماری امی نے اہم کردار ادا کیا، مغیث چچا بھی پاپا کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے میں پیش پیش تھے۔ نومبر ۱۹۸۶ء میں ہم دستگیر سوسائیٹی کی آبادی آصف نگر میں منتقل ہوگئے۔ یہ ۱۲۰ گز پر بنا ہوا مکان تھا، گنجائش کم تھی، مکین زیادہ تھے، لیکن اس وقت دلوں میں کشادگی تھی، رفتہ رفتہ مکان میں بھی بڑھاوا آتا گیا یعنی ۱۲۰ گز کا مکان جو زمینی منزل پر مشتمل تھا گراؤنڈ پلس ٹو ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۹۷ء میں ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ہمارے والد صاحب کا صدمۂ ارتحال تھا۔ پاپا انجائینا کے بھی مریض تھے، شوگر بھی تھی لیکن انہیں پیشاب میں تکلیف کے باعث ابن سینا اسپتال، گلشن اقبال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں پر ان کا پراسٹینڈ گلینڈ کا آپریشن ہوا، نہیں معلوم کیا پیچیدگی ہوئی دوسرے دن ہی طبیعت بگڑ گئی، ۵ ستمبر، بروز جمعہ، صبح صادق کے وقت اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجیعون، باغباں نے اپنے گلشن کے ایک ایک پودے کی دل و جان سے آبیاری کی تھی، اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا، دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا، اس کی محنت کا ثمر تھا کہ باغباں کا لگایا ہوا ہر ہر پودہ تناور درخت بن چکا تھا، ہر درخت چھاؤں دینے کے قابل ہو چکا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ باغباں کو اپنے درختوں کی چھاؤں سے راحت میسر آتی، وہ سکون و آرام سے زندگی بسر کرتا، لیکن مالکِ کائنات نے قسمت میں کچھ اور

ہی لکھا تھا۔ باغباں کا کام پورا ہو چکا تھا، اب اُسے اُس دنیا میں جانا تھا جس کی تیاری بھی اس نے کر لی تھی۔ اس نے خاموشی سے اللہ کے حکم کو لبیک کہا اور اپنے ہرے بھرے گلشن کو الوداع کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا وہاں بسالی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ پرنم آنکھوں، دکھے دل کے ساتھ پاپا کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور دیگر احباب نے انہیں آخری آرام گاہ پہنچایا، ہم بھائیوں نے لرزتے ہاتھوں پاپا کے جسد خاکی کو لحد میں اتارا اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا۔

آج میں از خود دادا اور نانا بن چکا ہوں لیکن جب کبھی کوئی مشکل یا پریشانی آتی ہے والد صاحب کی یاد شدت سے آجاتی ہے۔ وہ میرا آئیڈیل تھے۔ میں نے اپنی زندگی ان کے بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزارنے کی کوشش کی ہے۔ چند دن پہلے کی بات ہے کہ پاپا کی جائیداد یعنی ہمارے آبائی گھر کی شرعی تقسیم کے وقت ہم سب بہن بھائی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تاکہ اپنا شرعی حصہ حاصل کرسکیں۔ مکان کی فروخت کے بعد شرعی تقسیم کی یہ صورت نکالی گئی کہ یہ مکان قانونی طور پر اب میرے نام ہو جائے اور پھر اس کی فروخت عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ رجسٹرار کے سامنے میرے تمام بہن بھائیوں نے اپنا حق میرے نام منتقل کرنے کا اقرار کیا۔ یہ مجھ پر ان کا اعتماد، بھروسہ تھا اور مجھ پر بھاری ذمہ داری بھی، اللہ تعالیٰ مجھے اس ذمہ داری کو ایمان داری

اور سچائی کے ساتھ سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری ہرگز ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ جائیداد کی شرعی تقسیم اس طرح ہو لیکن قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے یہی صورت شاید آسان تھی۔ جتنے وقت میں رجسٹرار کے آفس میں رہا پاپا کے متعلق سوچتا رہا ان کی زندگی جو ایک کھلی کتاب تھی میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح چلتی رہی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو سب کچھ دیا دنیا سے رخصت ہو کر بھی اپنی اولاد کو لاکھوں دے گئے۔ بے شک باپ ایک عظیم ہستی کا نام ہے۔ پاپا آپ کو ہمارا سلام، پروردگار عالم ہمارے والد صاحب کی مغفرت فرمانا، ان کے چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف فرمانا، انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانا۔ آمین۔

مشکور احمد۔ چند یادیں ۔۔۔ چند باتیں

بعض سانحے ایسے ہوتے ہیں کہ ہر دل شکن منظر کھلی آنکھوں دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ مشکور احمد صاحب کی موت بھی میرے لیے ایک ایسا ہی سانحہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ اب بھی یہیں کہیں موجود ہیں حالانکہ اس سانحہ کو ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں اور میں نے انہیں زندگی کے آخری ایام میں (ایک سے زیادہ بار) بہت قریب سے دیکھا حتیٰ کے ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہوا لیکن ان سے طویل رفاقت، دوستانہ مراسم اور خاندانی ایسو سی ایشن "ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن" جس کے وہ صدر اور میں سیکریٹری رہ چکا تھا کی سرگرمیوں کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ہم سالوں سرگرم عمل رہے یہ سب کچھ نظروں کے سامنے ایسے گھومنے لگتا ہے کہ جیسے ایک ویڈیو چل رہی ہو۔ جانا تو ہم سب کو ہے لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔

میں اور مشکور صاحب خاندان باری بخشؒ سے تعلق رکھتے ہیں جو خاندان حسین پور کے نام سے بھی معروف ہے۔ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت دیوان باری بخش علیہ الرحمتہ

ہندوستان کے ایک حکمراں خاندان سے تھے۔ ان کا زمانہ ۱۱۴۸ بکرمی یا ۱۰۸۸ء تھا۔ یہ خاندان ہندوستان کے علاقہ راجستھان میں ریاست بیکانیر کے مقام پر آباد تھا جو بھٹنیر ہنومان گڑھ) کہلاتا تھا۔ پندرھویں صدی میں یہ سرزمین راجپوتوں کے زیر اثر تھی۔) اسی قوم کے ایک راٹھور راجپوت سردار راؤ بیکا جی نے ۱۴۸۸ء میں اس علاقہ پر اپنی حکمرانی کا باقاعدہ آغاز کیا ساتھ ہی اس علاقے کا نام اس نے اپنے نام کی مناسبت سے بیکانیر'' رکھا۔''

غزنوی حکمراں سلطان محمود غزنوی نے جب بھٹنیر پر حملہ کیا تو ہمارے خاندان کے جدِ امجد بھٹنیر (موجودہ بیکانیر) سے دہلی منتقل ہو گئے اور دہلی سے منسلک شہر کھڈی ضلع شکار پور کو اپنا مسکن بنایا غزنوی حکمراں کی جانب سے اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو کھڈی ضلع شکارپور کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اس طرح یہ خاندان ابتدائی طور پر بیکانیر سے کھڈی ضلع شکار پور منتقل ہو گیا۔ شہاب الدین شاہجہاں کے عہد میں حسین خان صاحب کو ہندوستان کے ضلع مظفر نگر میں ایک وسیع جاگیر انعام میں ملی۔ انھوں نے اس علاقہ کا نام حسین پور رکھا اور چونکہ ان کو انتظام جائیداد اور ریاست کے لیے ایک صاحب تجربہ و عقل وفرزانہ کی ضرورت تھی اس لیے آپ کی نظر ہمارے مورث عبدالقدوس صاحب پر پڑی، بڑے اصرار کے بعد خان صاحب موصوف عبدلقدوس صاحب کو باعزاز حسین پور لائے اور دیوان مقرر کیا چنانچہ آپ معہ اہل وعیال شکار پور سے منتقل ہو کر قصبہ

حسین پور میں مقیم ہو گئے اور اس وقت سے یہ خاندان حسین پوری مشہور ہو گیا۔ حسین پور ضلع مظفر نگر میں ہمارے جدِ امجد جناب عبدالقدوس کو وہ تمام اعزازات حاصل تھے جو ایک صوبے کے گورنر کو حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ اعزاز اور مرتبہ خاندان باری بخش کے لیے نئی بات نہیں تھی، یہ خاندان ابتداہی سے حکمراں خاندان میں سے رہا۔ خاندانی ایسو سی ایشن ''ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن'' ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت سے فعال چلی آ رہی ہے لیکن کبھی کبھی تعطل کا شکار بھی ہوئی۔ اس قسم کے فلاحی ادارے اکثر غیر متحرک بھی ہو جایا کرتے ہیں سو یہ انجمن بھی وقفہ وقفہ سے غیر متحرک رہی۔ میں نے باقاعدہ طور پر ۱۹۸۰ء میں بہاولپور میں منعقد ہونے والے اجلاس عام سے اس خاندانی انجمن میں شمولیت اختیار کی۔ جس میں مشکور صاحب کے بڑے بھائی منظور احمد صاحب ایسو سی ایشن کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں ایسو سی ایشن کا فائینانس سیکریٹری اور کراچی کا لوکل سیکریٹری بن گیا اس طرح اس ایسو سی ایشن کی سرگرمیوں میں خاصا فعال رہا۔ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۳ء ایسو سی ایشن کا سیکریٹری اور مشکور صاحب اس کے صدر رہے۔ اس عرصہ میں ہم ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے۔ ایسو سی ایشن کو فعال اور سرگرم کرنے کی منصوبہ بندی کی جس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ فیصل آباد کے گاؤں 'بابے والا' میں جہاں پر خاندان کے متعدد لوگ رہائش پذیر ہیں

ایسو سی ایشن کی تاریخ کا سب سے بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں صرف کراچی سے ۲۶ خواتین و حضرات بابے والا پہنچے جلسہ عام میں شریک خواتین، مرد اور بچوں کی تعداد تھی جو ۱۹۴۰ء (امرتسر) سے ۱۹۹۰ء (کراچی) کے تمام جلسوں سے زیادہ تھی۔ یہ ۱۶۱ سب کاوش مشکور صاحب ہی کی تھی اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے پاکستان کے مختلف شہروں کے دورے بھی کیے اور خاندان کے افراد کو ایسو سی ایشن کی جانب مائل کیا جس کے نتیجے میں دور دراز کے شہروں سے سے تعلق رکھنے والے بے شمار احباب ایسو سی ایشن میں شامل ہوئے۔

جناب مشکور احمد نے ایسو سی ایشن کے صدر کی حیثیت سے ۱۹۹۰میں جناب تابش صمدانی مرحوم، رشید احمد صمدانی مرحوم، جناب خالد احمد، جناب فہیم احمد صدیقی اور ملتان شہر میں رہائش پذیر دیگر اہل خاندان کو ایسو سی ایشن کی سر گرمیوں میں فعال کردار ادا کر نے کی دعوت دی۔ مشکور صاحب کی دعوت پر نہ صرف تابش صمدنی نے بلکہ ملتان سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام ہی حسین پوریوں نے لبیک کہا اور ایسو سی ایشن کی سر گرمیوں میں بھر پور کردار ادا کیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ایسو سی ایشن کا اجلاس عام فیصل آباد کے شہر "بابے والا" میں منعقد ہوا جس میں صرف ملتان شہر سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۲۰ اراکین نے شرکت کی جن میں جناب تابش صمدانی مرحوم، رشید احمد صمدانی مرحوم بھی شامل تھے۔ اجلاس عام میں جناب تابش صمدانی نے تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا

ے

ذرے میں آنکھ ملتا نظر آئے آفتاب

قطرے میں سانس لیتا سمندر دکھائی دے

آپ نے کہا ''کبھی بچپن میں ایسو سی ایشن کے بارے میں سنا تھا اب مشکور صاحب کے ملتان آنے کے بعد مجھ تک یہ پیغام پہنچا کہ ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن کا اجلاس ہو رہا ہے تو میرے ذہن میں کچھ سوالات ابھرے ، میرے سامنے ایسو سی ایشن کا منشور نہیں تھا اس لیے نے میں سوچا کہ ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن کے لیے میں مدعو کیا جارہا ہوں ، میں تو اب پچاس کے پیٹھے میں ہوں ، میں بڑی الجھن میں رہا کہ مجھے اس میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں ، میرے برادر گرامی رشید احمد صمدانی اس میں جائیں یا اپنے بچوں کو بھیجیں تو اس کے نام میں ایک ابہام ہے اسے دور ہونا چاہیے''۔آپ نے مزید فرمایا کہ '' میں موجودہ انتظامیہ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں ان کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ مجھ جیسے رسوائے زمانہ اور گوشہ عافیت میں رہنے والے شخص کو وہ اسٹیج پر لے آئے تو کیا یہ ان کی ولایت نہیں ہے۔ میں تو مشکور صاحب کو صدر ہی نہیں سمجھتا بلکہ دور حاضر کا ولی سمجھتا ہوں اور جناب مشکور احمد کا کردار یہ کہہ رہا ہے ۔

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں

گھروں پر گئے اور انہیں ایسو سی ایشن کی سر گرمیوں میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس تحریک میں جناب مشکور صاحب کو بھی ایسو سی ایشن میں فعال کردار ادا کرنے پر تیار کرلیا گو وہ بہت عرصہ تک ٹال مٹول سے کام لیتے رہے بالآخر وہ اس کے لیے تیار ہوگئے۔ اب ہم اور مشکور صاحب ایسو سی ایشن کو فعال رکھنے ، خاندان کے احباب کو اس میں شریک کرنے کے حوالے سے اکثر و بیشتر ملا کرتے اور گھنٹوں مختلف معاملات پر گفتگو ہوا کرتی۔ بقول شاعر :

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی نہ جانے ان کو کس طرف

ایسو سی ایشن کے حوالے سے مشکور صاحب کا ایک عظیم کارنامہ جناب خالد پرویز کے اشتراک سے ''شجرہ خاندان حسین پور'' کی تدوین ہے جسے ایسو سی ایشن نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ خاندان حسین پور کا اولین شجرہ ۱۹۲۵ء میں جناب محمد حنیف صاحب نے مر تب کیا تھا۔ مرتبین نے ۶۵ سال کے وقفہ کے بعد خاندان کی لڑیوں کو خوبصورتی سے تر تیب دیا۔ شجرہ کا بنیادی مقصد موجودہ نسل کو اس اہم بات سے باخبر رکھنا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کون تھے اور ہمارے رشتہ دار کون ہیں۔ مشکور صاحب کے مرتب کردہ شجرہ میں خاندان حسین پور کے ذکور واناث کا تذکرہ حتی الوسع کیا گیا ہے ۔ایسو سی ایشن کے صدر جناب انعام احمد صدیقی نے پیشوائی کے عنوان سے تحریر فرمایا کہ '' یہ شجرہ انہی دونوں

حضرات (مشکور احمد۔ خالد پرویز) کی کاوشوں اور جانکاہی کا ثمر ہے۔ تحقیق و جستجو کی وادیٔ پُرخار سے سلامت روی سے گزرنا اور گوہر مقصود کا حاصل کر لینا بے شک ان حضرات کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس کے لیے وہ ہم سب کی داد و تحسین کے جائز حقدار ہیں''۔

قیام پاکستان کے وقت آپ کا خاندان ہندوستان کے شہر امرتسر میں مقیم تھا۔ آپ نے اپنے والد صاحب (میاں احمد مرحوم) کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا، آپ کے والد درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے چنانچہ لاہور میں ایم اے او کالج میں استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور اسی کالج میں رہائش بھی مل گئی۔ مشکور صاحب کی شادی جناب حسن عسکری صاحب کی صاحبزادی محترمہ آمنہ پروین سے ۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو کراچی میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد ذکور (عادل، عارف اور عاصم) اور اولاد اناث (سہلا، ثمرہ اور سبیلہ) سے نوازا۔ آپ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ دیو بندی عقائد رکھتے تھے۔ ان کے بھائی محبوب احمد صاحب کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا، جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا گیا، فاتحہ ہوئی بعد میں کسی نے کہا کہ سوئم کا اعلان کر دیں، مشکور صاحب میرے برابر میں ہی تھے گویا ہوئے جسے جو کچھ پڑھنا اور ایصال ثواب کرنا ہے اپنے اپنے طور پر ہی کر دے۔ مالی طور پر خوش حال تھے ساتھ ہی دریا دل واقع ہوئے تھے، ہمدرد، محبت کرنے والے اور مدد

کرکے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ مستحقین کی مدد اس طرح کرتے کہ کسی کو کانو ں کان پتہ نہ چلتا۔ خاندان میں کون ضرورت مند ہے انہیں اس کی مکمل آگاہی ہوتی اور ان سے مسلسل روابط ہوتے۔ اپنا کاروبار تھا۔ جبیں ہوٹل کے برابر فرید چیمبر میں ساتویں منزل پر آفس تھا۔ اکثر ایسو سی ایشن کے معاملات کے لیے جانا ہوتا۔ رفتہ رفتہ کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی ، عاصم ابھی پڑھائی کے مراحل میں تھا اور عارف ملک سے باہر ، عادل ہی تمام کاروبار کے ذمہ دار تھے ۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ متعدد بار سوئیزرلینڈ، امریکہ ، برطانیہ، اٹلی ، آسٹریا بھی گئے۔

مشکور صاحب کراچی میں کرایہ کے مکان میں رہے، عام طور پر تجارت پیشہ لوگ کرایہ کے مکان میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نوے کی دھائی میں گلستان جوہر میں اپنا مکان بہت ہی شوق سے بنوایا، ستمبر ۱۹۹۵ء میں اس میں منتقل بھی ہوئے ان دنوں کراچی کے حالات خراب تھے چوری اور ڈاکہ زنی عام تھے ۔ گلستان جوہر میں اس قسم کے واقعات زیادہ ہی ہو رہے تھے چنانچہ مشکور صاحب اور ان کے اہل خانہ بھی اس سے دوچار ہوئے ان کے گھر ڈاکہ پڑا اور تمام مال و متاع جاتا رہا، شاید اس سانحہ کا بھی ان کے ذہن پر اثر ہوا اور دل برداشتہ ہو کر انہوں نے دسمبر ۱۹۹۵ء میں کراچی کو الوداع کہا اور لاہور منتقل ہو گئے۔ ابتدا میں کرایہ کے مکان میں رہے پھر جوہر ٹاؤن میں اپنا گھر بنایا۔

انسان کی پہچان اس کے ساتھ سفر کرنے سے بھی ہوتی ہے مجھے مشکور صاحب کے ہمراہ ایک سے زیادہ بار سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ کراچی سے بہاولپور (۱۹۸۰ء) ، راولپنڈی (۱۹۸۳ء)اور فیصل آباد، بابے والا (۱۹۹۲ء) ایسو سی ایشن کے اجلاسوں میں ہم نے دیگر احباب کے ساتھ سفر کیا، فیصل آباد اور پھر بابے والا کے سفر میں ہمارے اہل خانہ بھی ساتھ تھے ۔ تمام سفر بہت یاد گار تھے۔ مشکور صاحب دوران سفر انتہائی خوشگوار موڈ میں ہوا کرتے ۔ سفر سے پہلے سفر کے لوازمات کا بہت خیال کیا کرتے ۔

مشکور صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں ہماری دوستی نے ایک نیا موڑ اختیار کیا جس کے بارے میں کم از کم میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور یقیناً مشکور صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ ہمارا یہ تعلق قریبی رشتہ داری اختیار کرلے گا جس کے نتیجے میں وہ اور میں ایک دوسرے کے ''سَمدھی'' بن جائیں گے۔ ۱۹۹۹ء کی بات ہے مجھے اپنے فلیٹ (واقع نارتھ کراچی) منتقل ہوئے (۸ جولائی ۱۹۹۹ء) صرف ایک مہینہ ہی ہوا تھا اپنے چھوٹے ہم زلف ''شفیق'' کی زبانی پیغام ملا کہ مشکور صاحب اپنے چھوٹے صاحبزادے 'عاصم' کا رشتہ میری بیٹی فاہینہ سے چاہتے ہیں۔ میرے فلیٹ میں ابھی ٹیلی فون بھی

نہیں لگا تھا چنانچہ وقت طے کرکے میں ارم اور شفیق کے گھر گیا، آمنہ بھابی (بیگم مشکور احمد) نے اپنا مدعا بیان کیا۔ میں نے ان کی بات سنی اور چند روز میں جواب دینے کے لیے کہا۔ میں ان دنوں شدید الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنوں اور پرایوں کی سنگ باراں سے دوچار تھا۔ ۵۱ سال (۱۹۴۸ء۔ ۱۹۹۹ء) کی اپنائیت کو ہمیشہ ہمشہ کے لیے خیر باد کہتے ہوئے اپنے ہی گھر سے (والدین کا گھر ہر اعتبار سے اپنا ہوتا ہے) اپنے ذاتی گھر منتقل ہوا تھا۔ اپنی ماں کو روتا اور افسردہ چھوڑ آیا، اس عمل سے میرے مرحوم والد کی روح کو بھی یقینا دکھ ہوا ہوگا۔ کرتا بھی کیا، میری سمجھ میں صرف یہی بات آئی کہ مسئلہ کو جڑ سے ختم کردینا ہی مسئلہ کا صحیح حل ہے پھر یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا آخر دنیا اسی طرح ہی تو پھیلی ہے۔ اس فیصلہ پر میں بہت پہلے عمل کر چکا ہوتا لیکن میں دل سے محسوس کرتا تھا کہ میرے والد نہیں چاہتے تھے کہ میں ان سے جدا ہو جاؤں چنانچہ ان کی خواہش کو ہر بات پر مقدم جانا، اپنی طبعیت اور مزاج کے خلاف ہونے والی ہر بات کو صرف اور صرف سننے سنانے تک ہی محدود کر دیا اور ایک اچھا سامع بن گیا، یہ عادت بھی بہت خوب ہے، بہت کام آتی ہے، بہت سی برائیوں اور پریشانیوں سے انسان کو دور رکھتی ہے حالانکہ اس دوران کبھی کبھی بہت ہی تکلیف دہ باتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ بات مشکور صاحب سے قریبی تعلقات قائم ہونے کی ہو رہی تھی، یہ ماضی کے دریچے بھی خوب ہوتے ہیں جب یاد آجاتے ہیں تو گو یا یادوں کی

ایک بارات بن کر انسان کو ماضی میں دھکیل دیتے ہیں۔ میں نے مشکور صاحب کے بیٹے عاصم سے اپنی بیٹی کے رشتہ کے بارے میں تنہا خوب غور کیا، ہر ہر پہلو سے سوچا آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ من جانب اللہ ہے۔ میرے سامنے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ خاندان ایک، خوش حال، تمام لوگ بلند اخلاق اور اچھے کردار کے مالک، ملنسار عاصم تعلیم یافتہ، خوب شکل و خوب سیرت، برسر روزگار، سب سے بڑھ کر میرا، مشکور صاحب سے تعلق، ان سب باتوں نے مجھے اس رشتہ کو قبول کرنے کی ترغیب دی البتہ ایک بات جس کی جانب میرے بعض کرم فرماؤں نے توجہ دلائی وہ یہ تھی کہ، تمہاری اکلوتی بیٹی تم سے دور یعنی لاہور چلی جائے گی۔ مجھے اس بات میں وزن محسوس نہیں ہوا، کیوں کہ بیٹی کو ایک نہ ایک دن پرائے گھر جانا ہی ہوتا ہے وہ نزدیک ہو یا دور، اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش و خرم رہے۔ الحمد اللہ آج وہ اپنے گھر میں خوش ہے، میری پیاری سی نواسی 'نہا' اسکول جانے لگی ہے، کیوٹ سا نواسہ 'ارحم' دو برس کا ہو چکا ہے۔ خوب شرارتیں کرتا ہے، فون پر اپنے نانا سے باتیں بھی کرنے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں بچوں کو سلامت رکھے، علم کی دولت سے مالا مال کرے۔
ایک ماہ کے بعد (۲ ستمبر ۱۹۹۹ء) مشکور صاحب اپنے تمام اہل خانہ کے ہمراہ کراچی تشریف لائے مقصد رشتہ کو باقاعدہ قائم کرنا تھا۔ تقریب سے ایک روز قبل وہ اور ان کے تمام اہل خانہ میرے گھر آئے، معمولی سی دعوت کا اہتمام تھا

بعد اختتام دعوت تمام لوگ کھڑے تھے مشکور صاحب میری بیٹی کا ہاتھ اوپر اٹھاتے، ہوئے گویا ہوئے ''یہ اب ہماری ہوئی''، یہ ان کا خاص انداز تھا جس سے خلوص، محبت اور اپنائیت صاف عیاں تھی۔ مشکور صاحب سے کئی سال بعد ملاقات تھی ملے تو اسی طرح لیکن مختصر گفتگو کے بعد بالکل ایسے ہو جاتے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی، میں اس وقت تک ان کی بیماری کے بارے میں لاعلم تھا لیکن اندر ہی اندر فکر بھی لاحق تھی کہ ضرور کوئی بات ہے۔ اس سے قبل ۱۹۹۷ء میں میرا اپنی فیملی کے ساتھ لاہور جانا ہوا تھا۔ ہوٹل میں پڑاؤ تھا دیگر احباب سے ملاقات کے ساتھ ساتھ مشکور صاحب سے ملاقات ایجنڈے کا حصہ تھی چنانچہ ہوٹل سے انہیں فون کیا گفتگو شروع ہوئی اپنا بتا یا کہ میں لاہور میں ہوں اور آپ سے ملاقات بھی ہو جائے تو اچھا ہے گفتگو میں وہ بات نہیں تھی ایسا لگا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ خیر ملاقات نہ ہو سکی بات آئی گئی ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ مشکور صاحب یادداشت کمزور ہو جانے والی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسے میڈیکل کی اصطلاح میں (Parkinsonism) بھی کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مریض لڑکھڑا کر چلتا ہے اور بدن میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انگلیاں اور ہاتھ تھرانے اور لڑکھڑانے لگتے ہیں، چہرے سے کسی قسم کے تاثرات نہیں ملتے، نظر ملانے سے کتراتا ہے، بات کم کرتا ہے، بسا اوقات عجیب و غریب

باتیں کرتا ہے، چھوٹے چھوٹے قدم سے چلتا ہے لیکن تیز تیز۔ الفاظ کی ادیگی درست نہیں ہوتی، دھیمہ لہجہ اختیار کرلیتا ہے، پہچان جاتی رہتی ہے مختصر یہ کہ مریض ذہنی طور پر دنیا سے دور چلا جاتا ہے۔ یہ مرض عام طور پر بڑھاپے میں لاحق ہوتا ہے۔ خدا معلوم مشکور صاحب کو یہ مرض کیوں کر لاحق ہوگیا۔ علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی حتیٰ کہ انہیں علاج کی غرض سے امریکہ بھی لے جایا گیا۔ جولائی ۲۰۰۰ء میں وہ امریکہ اپنے بڑے بیٹے عارف کی شادی کے سلسلے میں امریکہ گئے لیکن ان کے لیے یہ بیماری بہت سی بیماریوں کی طرح لاعلاج ہو گئی۔

میں اپنی بیگم (شہناز) کے ہمراہ ستمبر ۲۰۰۰ء میں مشکور صاحب کو دیکھنے لاہور گیا۔ ہم ایئرپورٹ سے گھر پہنچے تو وہ اپنے بیڈ پر سفید کپڑوں میں ملبوس لیٹے ہوئے تھے دیکھ کر فوری طور پر گرم جوشی سے ملے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا شاید ایک آدھی بات بھی کی ہوگی اس کے بعد گفتگو میں تسلسل نہیں رہا۔ میں دل ہی دل میں بے انتہا دکھی ہو رہا تھا کہ ہم اس قدر قریب آئے بھی تو اس کیفیت میں کہ قریب آکر دور اور بہت دور بلکہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ ان کی اس کیفیت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ باہمی مشورے سے ہم دونوں خاندانوں نے اپنے بچوں (عاصم۔ فاھینہ) کی شادی کی تاریخ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۱ء طے کر دی۔

شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی ۵ انومبر ۲۰۰۱ء کو میں اور شہناز لاہور گئے، مقصد شادی کے جملہ معاملات کو حتمی شکل دینا تھا مشکور صاحب ذہنی طور پر دنیا سے اپنا تعلق ختم کر چکے تھے، میں اندر ہی اندر ہاتھ ملتا رہ گیا،ایک لمحے کو ان کے اچھے دنوں کی ایک فلم چل پڑی کہ کس قدر صحت مند،ہشاش بشاش، خوش اخلاق، مسکراہٹ سے لبریز چہرے کو کس کی نظر لگ گئی۔ تندرست و توانا شخص چند مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ باغ باں کی فکر میں ہر کلی غم زدہ تھی، ہر پھول محو حیرت تھا، غنچے سہمے ہوئے تھے، ٹہنیاں جھک جھک رہی تھیں لیکن باغ باں جس نے خون دل سے کلیوں کی آبیاری کی تھی، شگفتہ پھولوں کو مہک عطا کی تھی، غنچوں کو گدگدایا تھا رفتہ رفتہ اپنا ناتا اپنے ہی گلشن سے توڑتا جارہا تھا۔ وہ اس فکر سے آزاد تھا کہ اس کے بعد اس کے گلشن کا کیا ہوگا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وقت کا صیاد اپنا تیر چلانے کو تیار بیٹھا ہے، مہلت ختم ہونے کو ہے۔

میں اور شہناز دکھی دل کے ساتھ رمضان سے ایک روز قبل واپس آ گئے۔ فکر لگی ہوئی تھی کہ ایسی صورت حال میں شادی کیسے اور کس طرح ہوگی، ادھر امریکہ میں موجود مشکور صاحب کا بڑا بیٹا عارف اپنی بیگم اور بچے کے ہمراہ شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ انہیں یکم دسمبر ۲۰۰۱ء

رمضان المبارک) کو لاہور پہنچنا تھا، جوں ہی ان کا طیارہ لاہور کی سرزمین پر اترا، ۱۵)
عارف، بیگم عارف اور مشکور صاحب کے پوتے طلحٰہ نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا
مشکور صاحب جو کئی روز سے بے چین اور مشکل میں تھے سکون میں آ گئے، انتظار کی
تمام گھڑیاں اختتام کو پہنچیں، انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی تمام اولاد اب ان
کے پاس ہے، شاید انہیں اسی لمحے کا انتظار تھا، جوں ہی بیٹے کا سفر اختتام پزیر ہوا اور وی
منزل پر پہنچا باغ باں جو اپنے سفر پر جانے کے لیے بے تاب تھا ہر چیز کی پرواہ کیے بغیر
اس نے رخت سفر باندھا، اس جانب جہاں سے انسان دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا، یکم
دسمبر ۲۰۰۱ء مطابق ۱۵ رمضان المبارک آپ نے اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد
کر دی۔ میں نے بھی تدفین میں شرکت کی میری خواہش تھی کہ شادی ملتوی کر دی
جائے لیکن آمنہ بھابی (بیگم مشکور احمد)، نجم الحسن (برادر آمنہ بھابی)، عبد الخالد (مشکور
صاحب کے ہم زلف)، خورشید احمد (برادر مشکور احمد)، مبین الحسن (داماد مشکور احمد)،
عابد علی خان (داماد مشکور احمد)، عبدالوحید، (داماد مشکور احمد) عادل، طلعت عادل،
عارف، نورین عارف، سہلہ، ثمرہ، سبیلہ اور دیگر احباب نے بہت ہی ہمت، حوصلے اور
جرآت کا مظاہرہ کیا، شادی طے شدہ تاریخ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۱ء پر ہی ہوئی۔ آج ہم ایک
دوسرے کے 'سمدھی' تو بن چکے ہیں لیکن مشکور صاحب کے بغیر یہ تعلق ادھورا سا لگتا
ہے۔ مجھے ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اللہ
تعالیٰ

مشکور صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین ۔

چراغ بجھتے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

میں نے یہ مضمون کئی نشستوں میں لکھا شاید اسے ایک سال کا عرصہ لگا۔ جب بھی لکھنے بیٹھتا مشکور صاحب کی صورت آنکھوں میں آ جاتی ، وہ صورت بھی جب وہ تندرست و توانا تھے اور وہ کیفیت بھی جب وہ بستر سے لگ گئے تھے ، متوسط قد، ہنستا مسکراتا زندگی سے بھرپور کتابی چہرہ ، پیشانی کشادہ قدرے باہر کی جانب ابھری ہوئی، روشن آنکھیں، بالوں میں قدرے سفیدی، آخر میں سفیدی نمایاں تھی اور سر پر چند بال ہی رہ گئے تھے۔ پہلے کلین شیو تھے زندگی کے آخری سالوں میں داڑھی اور وہ بھی زیادہ سفید، لہجے میں نرمی، آواز میں اعتماد، اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی الفاظ کا استعمال نمایاں تھا، ہر ایک سے جھک کر ملنا اور محبت سے پیش آنا ، میں نے کبھی کوئی بھدی بات ان کی زبان سے نہیں سنی، کس قدر نفیس انسان اور کیسا پیارا دوست تھا، کس قدر جلد چلا گیا۔ شاید اچھے لوگ جلد ہی چلے جاتے ہیں : ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اُس گھر کی نگہبانی کرے

(مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق لائبریرین۔الحاج محمد زبیر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق لائبریرین الحاج محمد زبیر ایک مستند کتاب کار، معلم کتاب داری، صاحب علم، شائق مطالعہ، مشرقی تہذیب کا پیکر، قدیم وضع داریوں کا اعلیٰ نمونہ، اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔آپ ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے بزرگوں میں کئی نامور شخصیات مصنف اور عالم گزرے ہیں۔آپ کے جدامجد حکیم عنایت حسین نامور مصنف، مورخ اور طبیب تھے۔ حاجی صاحب کا مولد مارہرہ، یوپی کا ضلع ایٹہ ہے یہ مارہرہ شریف کے نام سے مشہور ہے۔آپ کا سلسلہ نسب حضرت زبیر کی ذات اقدس پر منتہی ہوتا ہے اسی نسبت سے یہ خاندان زبیری کہلاتا ہے۔ علی گڑھ کا یہ نامور سپوت ۸۶ بس کی عمر میں لائبریرین شپ کے علمی سرمایہ کو اپنی علمی کاوشوں سے منور کرکے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

زبیر صاحب کے انتقال سے پاکستان لائبریرین شپ میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پر نہ ہوسکے گا کیونکہ آپ بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے مالا

مال تھے۔ آپ کی سب سے بڑی اور انفرادی خصوصیت یہ تھی کہ آپ باوجود ضعیف العمری اور مسلسل علالت کے تصنیف وتالیف میں مصروف تھے اور اردو زبان میں لائبریرین سپ کے علمی سرمائے میں مسلسل اضافہ فرمارہے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے باخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنی آخری طبع شدہ کتاب میں تحریر فرمایا قارئین کرام مجھے اس امر کا پورا پورا احساس ہے کہ پیش کردہ کتاب 'میری یادوں کی کہکشاں' مرتب کرنے کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا جاسکا جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہ ان ایام میں مرتب ہوا ہے جب کہ میری ۸۴ سالہ عمر کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہے''۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد آپ ایک اور کتاب کی تالیف میں مصروف تھے اور اس کتاب کو اپنی زندگی ہی میں مکمل کرنا چاہتے تھے ، اس کتاب کے کئی ابواب تحریر کر چکے تھے بعض ابواب کی کتابت بھی ہو چکی تھی ، آپ کا کہنا تھا کہ یہ میری زندگی کی آخری کتاب ہو گی اس وجہ سے آپ نے اپنی اس کتاب کا عنوان ''میری زندگی کی آخری کتاب'' رکھا تھا، مجھے اس کتاب کے متعدد ابواب کی پروف ریڈنگ کا اعزاز بھی حاصل ہے۔افسوس زندگی نے آپ سے وفا نہ کی اور آپ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، لیکن آپ نے پاکستان لائبریرین شپ کو جس علمی سرمائے سے مالا مال کیا اس کا فیض برسہا برس جاری و ساری رہے گا اور لائبریری سائنس کے طالب علم اس سے مستفیض ہوتے رہیں گے :

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہوگئے دل میں سما گئے

کتابیں زبیر صاحب کی رفیق اور ہمدم تھیں، اپنی کتاب ''کتاب زیست'' میں آپ نے تحریر فرمایا 'میری زندگی کا یہ بڑا روشن باب ہے کہ لائبریری سے منسلک ہونے کے بعد یعنی ۱۹۲۲ء سے ۱۹۸۱ء تک ہزارہا کتابیں خلوت اور جلوت میں میری رفیق و ہمدم رہی ہیں۔ کتابوں کی گہری قربتوں سے مجھے بڑے روحانی، علمی اور فنی فائدے پہنچے انھوں نے مجھے فہم و فراست اور شعور و تدبر کی راہیں دکھائیں، طرح طرح کے علوم و فنون سے آگاہی بخشی، کتاب داری کے نظری و علمی پہلوؤں پر دسترس حاصل کرنے کی صلاحیتیں عطا کیں اور اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ میری عمر کے اس آخری دور میں بھی وہ میرا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی ہیں۔ان کا مطالعہ کیے بغیر مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب کبھی ناسازی طبع کے باعث خود مطالعہ نہیں کر سکتا تو اپنی بیوی سے کتابیں پڑھوا کر بیمار طبعیت کو بحال رکھتا ہوں، دراصل :

کتاب من معشوقہ من است

بستہ دل من بدو کشادہ است

زبیر صاحب کی تخلیقات جو ان کی زندگی میں طبع ہوئیں ۱۲ ہیں۔ مضامین ان کے علاوہ ہیں جو مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ آپ کی پہلی کتاب ''شاہان مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا نظام'' ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر

آئی جبکہ آخری کتاب بعنوان ''میری یادوں کی کہکشاں'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔آپ کی قابل قدر کتاب ''اسلامی کتب خانے'' ۱۹۶۱ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی تھی اس کا دوسراایڈیشن ۱۹۷۸ء میں کراچی سے شائع ہوا۔اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جس میں اسلامی کتب خانوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء بروز اتوار آل پاکستان ایجو کیشنل کانفرنس میں اس کتاب کی تقریب رونمائی عمل میں آئی جس کی صدارت کے فرائض جسٹس (ر) قدیر الدین احمد صاحب نے انجام دئے اور اس تقریب میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مہمان خصوصی تھے۔مقررین میں سید الطاف علی بریلوی، ڈاکٹر انیس خورشید، ڈاکٹر معین الدین عقیل، سید ریاض الدین، گلستان خان کے علاوہ راقم بھی شامل تھا۔ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی موجودگی میں کسی بھی تقریب میں تقریر کرنے کا یہ میراپہلا اور آخری موقع تھا جسے میں اپنے لیے ایک اعزاز تصور کرتا ہوں۔میں نے ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی میں ایم اے سال میں داخلہ لیا توڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جامعہ کراچی کے وائس چانسلر تھے، ۱۹۷۲ء میں جب میں فائنل میں آیا تو ڈاکٹر قریشی ریٹائر ہوگئے اور ڈاکٹر محمود حسین وائس چانسلر ہوگئے۔اس طرح مجھے دونوں محترم شخصیات کی سربراہی میں تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔تقریب میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے زبیر صاحب کے حوالے سے کتاب پر مدلل خیالات کا اظہار فرمایا،آپ نے کہا کہ'' میں زبیر صاحب کی سنجیدگی اور ذوق علمی کا

شروع سے قائل ہوں بلاشبہ زبیر صاحب نے یہ کتاب نہایت محنت اور لگن سے تیار کی، مجھے اندازہ ہے کہ اس قسم کی کتابوں کی تالیف میں سخت محنت اور استقلال سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک ایک پتی اور ایک ایک پھول جمع کرکے گلدستہ بنایا جاتا ہے''۔ سید الطاف علی بریلوی نے زبیر صاحب سے اپنے تعلق خاطر کا باانداز خاص ذکر فرمایا اور کتاب کو ایک قیمتی اثاثہ قرار دیا۔

الحاج زبیر صاحب کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء میں اس وقت ہوا جب آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۴ء تک برصغیر کی اس جامعہ سے منسلک رہے۔اس دوران آپ لائبریری میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں کتب خانہ کے قائم مقام لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دی ساتھ ہی لائبریری سائنس کے استاد بھی رہے۔ ۱۹۶۴ء میں آپ علی گڑھ سے کراچی تشریف لائے۔ ہجرت کے بارے میں آپ نے تحریر فرمایا''اس وقت میرے لیے عجیب کشمکش اور تذبذب کا عالم تھا کہ ایک طرف علی گڑھ کی زمین میرا دامن پکڑے ہوئے تھی تو دوسری طرف پاکستان مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بالآخر علی گڑھ سے جدائی اختیار کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔لیکن میں اس سے اتنا وابستہ رہا ہوں کہ میری روح تو کبھی اس سے جدا ہو ہی نہیں سکتی''۔ کراچی آمد کے بعد جامعہ کراچی کے کتب خانے سے منسلک ہوئے بعد میں نیشنل کالج کے لائبریرین کے فرائض انجام دئے ساتھ ہی پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے اسکول آف لائبریرین شپ سے

منسلک ہوئے اور لائبریری سائنس کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔
۱۹۷۳ء میں اسکول کے ڈائریکٹر سید ولایت حسین شاہ کے انتقال کے بعد آپ اسکول کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، زندگی کے آخری ایام تک آپ یہ فرائض انجام دیتے رہے۔
زبیر صاحب بلا شبہ لائبریری سائنس کے میر کارواں تھے۔ اپنی تحریر سے لائبریری سائنس کے دامن کو خوب مالا مال کیا۔ آپ ایک محنتی لائبریرین اور ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ منصوبہ سازی میں آپ کا جواب نہیں تھا۔ نرم لہجہ اور ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے والے انداز میں گفتگو کرتے، ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی شفیق باپ اپنی اولاد کو سمجھا رہا ہو، وضعداری اور انکساری آپ کا شعار تھا :

مثالی استاد علم و فن تھے
دکھائے علم و ہنر کے جوہر
وہ کل بھی تھے رہنما، ہمارے
وہ آج بھی ہیں، ہمارے رہبر

آپ کو مطالعہ کا شوق تھا، کتاب یا مضمون انتہائی غور اور توجہ سے پڑھا کرتے، اپنی کتاب ہونے کی صورت میں خاص خاص باتوں پر نشان لگاتے جاتے بصورت

دیگر کتاب یا مضمون سے خاص خاص باتوں کو نوٹ کر لیا کرتے۔ لائبریری سائنس کے علاوہ اسلام آپ کا خاص موضوع تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اسلامی موضوعات پر متعدد مضامین اور کتب بھی لکھیں۔ 'ہم حج کیسے کریں' آپ کی معروف کتاب ہے۔ ماہانہ : الانسان' میں آپ آخری وقت تک مضامین تحریر کرتے رہے'

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو سب آتے ہیں مرنے کے لیے

زبیر صاحب سے میرا تعلق ۱۹ سالوں پر محیط رہا، یہ تعلق اس وقت قائم ہوا جب میں نے ۱۹۷۴ء میں اعزازی طور پر اسکول آف لائبریرین شپ میں پڑھانا شروع کیا۔ یہ تعلق اس وقت مزید بڑھ گیا جب زبیر صاحب اسکول کے ڈائریکٹر تھے اور میں ۱۹۷۹ء میں اسکول کا سیکریٹری اور منتظم مقرر ہوا۔ اسکول کے انتظامی امور کی انجام دہی کے سلسلے میں بار ہا زبیر صاحب کے گھر جانا ہوتا اور کافی کافی دیر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ شاید انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے خاص انسیت ہو گئی تھی۔ اسکول کے معاملات کے علاوہ زیادہ تر لائبریری سائنس حتیٰ کہ ذاتی مسائل پر بھی کھل کر گفتگو ہوا کرتی، کچھ عجیب سے کشش تھی کہ جانے کے بعد اٹھنے کو جی نہ چاہتا، اکثر کئی کئی ہفتے ہو جاتے تو محبت بھرے انداز میں فرماتے کہ ''صمدانی صاحب اگر میں صحت مند ہوتا تو از خود آپ کے پاس چلا آتا، ان کے اس جملے سے میں شرمندہ ہو جایا کرتا اور آئندہ کوتاہی

نہ کرنے کا وعدہ کرتا۔ مرحوم کو اس بات کا شدت سے دکھ تھا کہ اُن کی اولادوں میں لائبریرین تو بنے لیکن تصنیف وتالیف کی جانب کوئی مائل نہ ہوا، اپنی تصانیف کی تکمیل خصوصاً پروف ریڈنگ کے سلسلے میں اپنی شریک حیات کی خدمات کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے۔ اپنی شریک زندگی کی جدائی کا آپ کو شدید صدمہ ہوا آپ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے، اکثر کہتے ''صمدانی صاحب میری بیوی نہیں مری بلکہ میں مرگیا''۔ اس حادثے کے بعد آپ کو پروف ریڈنگ میں مشکلات پیش آنے لگیں، جن کا ذکر آپ نے بارہا کیا، یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کی آخری کتاب جس کا عنوان ہی ''میری زندگی کی آخری کتاب'' تھا مکمل نہ کرسکے، شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

وہ مجھ پہ مہرباں تھے ابھی کل کی بات ہے
اور سوچئے تو جیسے زمانہ گزرگیا

یہ عظیم ہستی بروز اتوار ۲ فروری ۱۹۹۲ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی اور ہم ایک محبت کرنے والے شخص سے محروم ہوگئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

(مطبوعہ پاکستان لائبریری بلیٹن۔ جلد ۲۴ شمارہ ۴، دسمبر ۱۹۹۲ئمصنف کی کتاب)

(یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل''

آزادؔ بیکانیری شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں

جنابِ آزادؔ بیکانیری کا زمانہ انیسویں صدی عیسویں کے نصف آخر سے بیسویں صدی عیسویں کے تقریباً نصف آخر تک ہے۔اس دور کے ممتاز سخنوروں میں حالیؔ (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴ء)، احمد رضاؔ بریلوی (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۲۱ء)، داغؔ دہلوی (۱۸۳۱ء۔ ۱۹۰۵ء)، سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی (۱۸۷۱ء۔ ۱۹۲۷ء)، امیرؔ مینائی (۱۸۲۶ء۔ ۱۹۰۰ء)، محسنؔ کاکوروی (۱۸۲۶ء۔ ۱۹۰۵ء)، شادؔ عظیم آباد (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۷ء) ، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء)، مولانا محمد علی جوہرؔ (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۱ء)، حسرتؔ موہانی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۱ء)، مولانا غلام شہیدؔ، آسیؔ غازی پوری، حسنؔ بریلوی، علامہ ضیاء القادری، محمد عبداللہ بیدلؔ، حافظ خلیل الدین حسن حافظؔ پیلی بھیتی، محمد یوسف راسخؔ، منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری، محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولہا صوفیؔ، ممتاز علی ممتازؔ ناصری سبزواری، نثار احمد نثارؔ، محمد عابد حسین عابدؔ آغائی اور خلیلؔ صمدانی شامل ہیں۔یہی شعراء جناب آزادؔ کے ہم عصر کہے جاتے ہیں۔ان میں سے بعض معاصرین شعراء اور دیگر احباب نے آزادؔ صاحب کے کلام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نثر اور نظم میں کیا اور تقریظیں لکھیں جو آپ کے روح پرور نعتوں کے مجموعے ”دیوان آزاد“ میں شامل ہیں۔ذیل میں ان ادیبوں، دانشوروں م اہم علم اور آزادؔ

صاحب کے قریبی رشتے داروں کے خیالات نقل کیے جا رہے ہیں۔

امتیاز الشعراء سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی

خمخانہ بیخود کے جرعہ کشوں میں ایک حاجی شیخ محمد ابراہیم صاحب آزاد کا نام بھی درج رجسٹر شاگردان ہے۔ صوفی منش انسان ہیں حمد و نعت کہتے ہیں عاشقانہ شعر نہیں کہتے۔ ان کا کلام بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چنداں محتاج نہیں ہے کئی سال ہوئے میں نے ان کو اپنا

خلیفہ بنادیا تھا۔

نام آزاد وضع کے پابند

میرے شاگرد و میرے عاشق زار

ہیں یہ مداح سیرتِ نبوی

اور مداح ان کا بیخود زار

محمد عبداللہ بیدل

جناب منشی محمد عبداللہ بیدل جو آپ کے ہم عصر تھے اور قبلہ استاد بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آزاد صاحب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آزاد نے شاعری کا چراغ ہر جگہ روشن کیا اور یہ اصول کہ عشقیہ شاعری ایک بیہودہ گوئی اور خلافِ شریعت ہے کو بہ احسن خوبی اپنے دیوان کے ذریعہ عوام الناس تک پہنچایا ہے۔ بیدل نے قطعہ تاریخ

دیوان آزاؔد پر ایک بڑی نظم لکھ کر

دیوان آزاؔد کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔آپ نے آزاد کے کلام کو کچھ اس طرح داد تحسین دی ہے۔

نیا یہ نعت کا گلشن کھلا ہے
لب جبریل پر صل علے ہے
کلام آزاؔد چھپ گیا ہے
نرالا ہے انوکھا ہے نیا ہے
بشر سے ہو بھلا توصیف شہ کی
خدا کرتا ہے جب تعریف شہ کی
حدیثوں سے لکھی سیرت نبی کی
کلام اس میں کرے طاقت کسی کی

بیدلؔ نے آزاد کے دیوان حصہ دوم پر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا۔

مسائل جو تصوف کے عیاں ہیں
خزینے گنج معنی کے نہاں ہیں
کلام ان کا عجب معجز نما ہے
سراپردہ حقیقت کا کُھلا ہے
دکھائی ہے کہیں شمع ہدایت

بتائی ہے کہیں راہ طریقت
صلا آزاد کو بیدل ملا ہے
عجب جو نعت کا دفتر کھلا ہے
(عزیز احمد (آزاد صاحب کے چھوٹے بھائی
میرے مخدومی محترم اخی معظم نے جو ثنائے محبوب کا گلدستہ پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر انصاف سے بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ جس سچائی اور سلاست سے بپابندی زبان اردو صحیح صحیح واقعات سیرت نبوی بیان کیے ہیں اور جو مضامین نکالے ہیں یہ رنگ اور دیوان یا کلیات میں بہت کم ملے گا معلوم ہوتا ہے قدرت نے یہ اخی محترم کے لیے محفوظ کر رکھا تھا جو آپ کو دیا گیا۔
این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ
ثنائے محبوب خالق کو سامنے رکھیئے اور اس کا ہر شعر پڑھیئے اور مزاق سلیم سے مزے لیجئے ہر غزل ہر شعر میں آپ کو جدت و خوبی معلوم ہوگی۔ ثنائے محبوب خالق کے دوسرے حصہ کو جب آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ نہایت نازک و دقیق مسائل تصوف کو جو زبان سے اور نثر میں بھی مشکل سے ادا ہوتے ہیں اس کو نہایت خوبی سے نظم میں بیان کیا گیا اور قصائد میں بجائے بہاریہ تشبیت کے نئے نئے طریقہ سے حمد و نعت بیان کی گئی ہے گویا نعت گو قصائد گاران کو صحیح راستہ دکھایا گیا ہے بعض موقعہ پر نعت سے حمد پیدا کی گئی

فرماتے ہیں ۔

جب عالم امکاں ہی میں تو سب سے سوا ہو
تو جس کا ہو بندہ وہ بھلا کیوں نہ خدا ہو

تصورات اس قدر عالی ہیں جو دیکھنے و سنے میں نہیں آئے ۔

بہت ہی مسکرئے شہ جو دیکھا حشر میں مجھ کو
سیہ نامہ بغل میں ہاتھ میں دیوان مدحت ہے
کیا تھا ڈرتے ڈرتے پیش کچھ میں نے سیہ نامہ
تو ہنس کر شہ نے فرمایا کہ اس کی کیا ضرورت ہے
تصور میں کہا کرتا ہے مجھ سے لطف حضرت کا
خدا تک تجھ کو پہنچا دونگا آگے تیری قسمت ہے

(محمد اسرئیل (آزاد صاحب کے چچازاد بھائی

آپ کے کلام میں حسن فصاحت و اسلیب بلاغت کی جھلک شروع سے آخر تک نظر آتی ہے ۔ ترکیب کی دلاویزی روز مرہ محاوروں کی بے تکلفی نے چار چاند لگا رکھے ہیں ۔ بے ساختہ پن اور روانی کا یہ عالم ہے کہ ایک بحر مواج موجزن ہے جس کی لہروں میں تکلف و آورو خس وخاشاک کی طرح بہے چلے جارہے ہیں اور زور طبیعت ان کی پروا نہیں کرتا واقعہ نگاری اور جزئی واقعات کی تفصیل قادرالکلام پر دلالت کررہی ہے اور لطف یہ ہے کہ جو کچھ کہا نرالے ڈھنگ سے کہا سچ یہ ہے کہ مصنف اپنی طرز حسنہ کا موجد ہے جس نے ارباب سخن کے لیے ایک شاہراہ کامیابی

تیار کر دیا ہے جس کے اتباع میں منزل مقصود تک رسائی یقینی ہے۔دیوان کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ کوئی لفظ بھی شریعت کے دائرہ سے باہر نہیں۔

شیخ علی احمد

آزادؔ صاحب کہنہ مشق اور خوش بیان ہیں غلط ترکیبوں اور غیر مانوس الفاظ سے آپ کا کلام بالکل پاک ہے۔ہر غزل محشرِ نعت اور جنتِ حمد ہے۔ بعض مقامات پر احادیث اور آیتِ قرآنی کا ترجمہ اس خوبی سے نظم فرمایا ہے کہ پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے۔آپ کی شاعری صاف زبان اور اچھے محاورات کا آئینہ دار ہے اسی طرح جذبات بھی بہ کثرت رکھتی ہے۔ میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب آزاد دنیاوی شاعری میں کیا پوزیشن رکھتے ہیں۔آزادؔ صاحب حضرت بیخودؔ دہلوی جانشین فصیح الملک مرزا داغؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور راجپوتانہ کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔

محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولھا صوفیؔ

فصاحت و بلاغت دونوں

اس میں کلام آزادؔ کا صل علیٰ ہے

نہ کیوں سر پر رکھیں دیوان آزادؔ

کہ اس میں حمد و نعت مصطفیٰ ہے

حسن احمد حسنؔ

محبوب خالق ، اللہ اللہ کیا جلوۂ ناز مرغوب ہے نعت شمع ہدایت کا نیا اسلوب ہے

حرف حرف تفسیر عاطفت ہے لفظ لفظ خرمن گل بہجت ہے ہر شعر چمن مدحت شگفتہ ہے ہر غزل پر لعبت چین آشفتہ نیا ساز ہے ہر خیال۔ نظم آئینہ افروز ہے روائی طبع رفرف معرفت سے سوا ہے تخیل عالی نغمہ جبریل کی ادا ہے۔دل کہ واقف اسرار گفتار ہے لطف اٹھاتا ہے خرمن گل پر بہار کو دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا ہے الحق حکایات شیخ وہ نگار پُر بہار ہے کہ کیف حسب یثرب جس کا سنگھار ہے حیران ہوں اسے آزاد کی تحریر کہوں دفتر تنویر سمجھوں سارا کلام عجیب ہے ثمر سخن گنجینہ غریب ہے بالخصوص میرے لیے چراغ لامعہ ہے کہ اس کی روشنی میں گل مدح مرغوب نظر آیا ہے اگر قسمت سے دیار حبیب پہنچ گیا تو اس گل کو نذر گلشن کرونگا۔

دیوان نعت وہ کہا آزاد نے حسن
بے شبہ جو کمال میں اپنی ہے خود نظیر
دیکھی جو مدح اس میں شہ بے مثال
لکھا ہے سال طبع بھی اوصاف بے نظیر
محمد یوسف راسخ

آزاد تیری آج زمانے میں دھوم ہے
دیوان تیرا طبع ہوا ہے وہ لاجواب
حق تو یہ ہے کہ ناصح عامل کہوں تجھے
مد نظر ہے تیرے شریعت کی ہر کتاب

تونے دکھائیں نعت میں جدت طراریاں
ایجاد واختراع میں ہر شعر انتخاب
جو بھی کہی ہے تونے پتے کی کہی ہے سب
تاریخی حیثیت سے ہے ہر نکتہ اک کتاب
ہے سیرۃ النبی ترے دیوان کا ہر ورق
تاریخ اور سیرت کا خلاصہ ہے یہ کتاب
ارباب ذوق لکھیں گے تقریظ دل پسند
راسخ سے ایک شعر بھی نکلا نہ کامیاب
حکیم محمد ممتاز علی ممتازؔ ناصری سبزواری

میرے عزیز کی اللہ نے ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے تمنائیں پوری کی ہیں آخر میں حج و زیارت روضہ اقدس اور اس دیوان کے طبع ہونے کی بڑی آرزو تھی جو یہ بھی اس کے کرم سے پوری ہوئیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو ہمیشہ مقاصد دارین میں کامیاب رکھے اور یہ دیوان مقبول خدا و رسول ہو کر سرمہ چشم اہل بینش رہے۔
نثار احمد نثارؔ

آنکھوں کی ضیا کیوں نہ ہو آزادؔ کا دیوان
ہے نور فشاں مہر درخشان مدینہ
ہر بات کے قرآن واحادیث ہیں شاہد

ثابت ہے تیری نظم سے یوں شان مدینہ
محمد عابد حسین عابدؔ آغائی اکبر آبادی
ہوا طبع دیوان نعت پیمبر
کہ تابندہ ہیں جس میں انوار مخفی
کہا میں نے عابدؔ یہ سال طباعت
ہے دیوان آزاد یا نظم عرفی

جناب آزادؔ کے کلام میں خلوص و محبت ، عقیدت و احترام کی خوشبو مشک و عنبر کی مانند موجود ہے۔آپ کے نعتیہ کلام کو پڑھ کر ہماری روح تازہ ہو جاتی ہے اور دل و دماغ پر خوشگوار اثرات رونما ہوتے ہیں بسا اوقات وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سمجھنے والا بہ خوبی محسوس کر سکتا ہے کہ جناب آزادؔ نے رسمی طور پر نعت نہیں کہی بلکہ ان کی فضا میں عشق رسول ﷺ سے عقیدت و محبت کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔انہوں نے ہر نفس میں بوئے رسول ﷺ کو محسوس کیا جس کی واضح مہک ان کے کلام میں رقصاں دکھائی دیتی ہے۔آپ کے کلام کو توجہ سے پڑھنے والا یہ تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاعر کو اپنے محبوب سے بے پناہ وابستگی ہے۔ ان کے کلام سے ان کی علمیت، خاص طور پر قرآن، تفسیر اور حدیث نبوی ﷺ اور فن شاعری کے ادراک کا علم ہوتا ہے۔آپ کے بارے میں جناب بیخودؔ دہلوی کی یہ رائے کہ ”ان کا کلام شعری اصلاح کا چنداں محتاج نہیں ہے“ اہمیت رکھتا ہے اور آزادؔ صاحب کو ایک عظیم شاعر تسلیم کرنے کے لیے کافی

ہے۔

پروفیسر عبد المحصی

آزآد صاحب کے خاندان کی ایک علمی و ادبی شخصیت عبد المحصی صاحب گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج (S.E. College)، بہاولپور میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور خاندانی انجمن 'ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن' کے بانی و متحرک رکن کی حیثیت سے انجمن کی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔ پروفیسر محصی نے ایسو سی ایشن کے اجلاس منعقدہ کراچی ۲۵۔۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے آزآد صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا یہ خطبہ ایسوایشن کی شائع کردہ کتاب 'سرودِ رفتہ' میں شامل ہے ۔

جناب محمد ابراہیم آزآد مرحوم نے ایک مردِ حق اور حق اندیش کی طرح حق و صداقت کے دیئے کو بیکانیر کے ویران صحرا میں روشن رکھا جس کی روشنی نے بہت سی نیک روحوں کو منور کیا آپ کا ضخیم نعتیہ دیوان جس کی ایک کاپی آپ نے بکمال مہربانی اُس ایسو سی ایشن کو بھی مرحمت فرمائی تھی میرے دعویٰ کا ثبوت ہے آپ معتقدات کی مدافعت میں ایک بے باک اور نڈر وکیل تھے۔ اس کے شاہد ''پیام اتحاد'' کے وہ صفحات ہیں جہاں آپ ایک مضبوط حزب مخالف کے مقابلہ پر تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اپنے مخصوص نظریات کی تائید میں یکہ و تنہا لڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہمارے خاندان کے ایسے ستارے تھے جو اپنی دوری کے باوجود اُس کو روشن اور منور کرتا رہا۔

: انعام احمد صدیقی

حضرت شیخ محمد ابراہیم آزآد صاحب سے میرا یعنی ہمارے خاندان کا ہمہ جہتی تعلق اور رشتہ ہے۔آپ میرے پڑ دادا اور پڑ نانا حضرت نبی بخش اور پڑنانی محترمہ بو یعقو بأ زوجہ نمبر تین) کے بڑے صاحبزادے تھے۔ہمارے پڑ دادا و نانا کی زوجہ محترمہ بو) نصری دختر محمد اسحاق کی پانچ بیٹیاں تھیں، پسری اولاد نہیں ہوئی، جیسا کہ سینہ بہ سینہ روایات اور بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ پڑدادی و نانی بو نصری دختر محمد اسحاق از خود بی بی بیگم دختر مقصود علی کو بیاہ کر لائیں۔ حوصلہ مندی اور وسعتِ قلب کی یہ درخشاں مثال ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔پڑ دادای و نانی محترمہ بی بی بیگم سے تین بیٹے ہوئے ۔ شریف احمد، امداد علی اور علی احمد۔ علی احمد میرے دادا ہیں۔جناب نبی بخشؒ کی تیسری شادی بو یعقو بأ دختر کرامت علی صاحب سے ہوئی ۔ ان کی اولاد جناب محمد ابر ہیم آزآد، جناب عزیز احمد، محترمہ کنیز رابعہ اور امِ فاطمہ ہیں۔ جناب عزیز احمد میرے نانا ہیں۔ اس وجہ سے جناب ابراہیم آزاد صاحب سے میرا دوہرا رشتہ ہے۔آپ میرے دادا جناب علی احمد اور میرے نانا جناب عزیز احمد کے بھائی ہیں۔ ہمارے بزرگ آپس میں ، میل جول اور ایک دوسرے کی خبر گیری میں نمایاں تھے فاصلوں اور دوسری دشواریوں کے باوجود ایک دوسرے سے مستقل رابطے رکھتے تھے اور وقتِ ضرورت ایک دوسرے کی معاونت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

جناب ابرہیم آزاؔد صاحب سے میری ملاقات کا واقعہ جو مجھے یاد ہے ذرا ذرا کچھ یوں ہے۔ میری چار پانچ سال کی عمر ہوگی جب ہم اپنی والدہ محترمہ رقیبہ خاتون کے ہمراہ فرید کوٹ اپنے نانا عزیز احمد کے پاس گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے بیکانیر جانے کا پروگرام بنایا گیا یا پہلے سے طے شدہ تھا۔ بیکانیر میں میری خالہ محترمہ عتیقہ خاتون رہتی تھیں۔ خالہ عتیقہ جناب خالو خلیل احمد (جو معروف نعت گو شاعر اور مشہور وکیل تھے) سے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں۔ خالو خلیل احمد شیخ محمد ابراہیم آزاؔد صاحب کے ساتویں صاحبزادے تھے جو آزاد منزل بیکانیر میں سکونت پذیر تھے۔ ہم لوگ نیچے کی منزل میں مقیم تھے۔ دوسری منزل پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک روز والدہ صاحبہ خاص طور پر اپنے ہمراہ دوسری منزل پر لے کر گئیں۔ خاص ہدایت کے ساتھ کہ ادب کے ساتھ خاموش بیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ وہاں سب لوگ معدب انداز میں بیٹھے بات چیت میں مصروف تھے۔ ایک بزرگ ہستی نے بڑے شفقت و محبت کے ساتھ مسکراتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا یہ یقیناً قبلہ حضرت ابراہیم آزاؔد صاحب ہی تھے۔ خالہ عتیقہ کا گھر صاف ستھرا رہتا تھا۔ باورچی خانہ میں جالی لگی ہوئی تھی۔ جالی کا دروازہ تھا جو مجھے اچھا لگتا تھا۔ مرغیاں پلی ہوئی تھیں انکا جگہ جگہ فارغ ہوجانا نہایت بد تمیزی لگتی تھی۔ سوچتا تھا ان کی مرغیوں کو ایک طرف یہ کام کرنا کیوں نہیں آتا۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے معمول کے مطابق دروازہ تھا۔ دوسری جانب ایک بہت بڑا اور اونچا محراب نما کھلا ہوا راستہ تھا جہاں سے

اونٹ پانی سے لدی ہوئی پکھالوں سمیت اندر داخل ہوتے تھے ساتھ ہی بہت بڑا حوض تھا جس میں پکھالوں کا پانی انڈیل دیا جاتا تھا یہ کام اونٹ کے کھڑے کھڑے ہی ہوتا تھا۔ آزاد منزل میں تہہ خانہ بھی تھا ہمیں وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ وہاں بھوت رہتے ہیں۔ سڑک کی جانب کھڑکی دروازے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارا رابطہ آزاد منزل بیکانیر سے مستقل رہتا تھا۔ قبلہ محمد ابراہیم آزادؔ صاحب میرے والد احتشام احمد صدیقی کے سگے چچا تھے اور والدہ محترمہ رقیبہ خاتون کے سگے تایا۔ والد صاحب جناب ابراہیم آزادؔ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ والد بزرگوار بھی جناب پیر سید جماعت علی شاہ صاحب سے بیعت تھے اس طرح آزادؔ صاحب اور میرے والد پیر بھائی بھی تھے والد صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ (میری چھوٹی پھوپھی) جنابہ خدیجہ کی شادی جناب لئیق احمد پھوپھا سے ہوئی تھی۔ لئیق پھوپھا جناب ابرہیم آزادؔ صاحب کے پانچویں نمبر کے صاحبزادے تھے جو آزاد منزل بیکانیر میں مقیم تھے۔ میرے ماموں اور ان کی اولاد بھی آزاد منزل کے باسی تھے۔ میرے بڑے بھائی جناب احترام احمد صدیقی صاحب کا رشتہ پھوپھا لئیق اور پھوپھی خدیجہ کی بڑے صاحبزادی حامدہ خاتون سے طے تھا۔ اس طرح روابط اور قرابتوں کے کئی سلسلے تھے جو باہم ملاقتوں اور خط و کتابت کے ذریعے مدتوں خاندانوں میں قائم تھے۔

نعتیہ مشاعرے، محفلیں، جشنِ عید میلاد النبی وغیرہ کا سالانہ اہتمام آزادد

منزل بیکانیر کی منفرد خصوصیت تھی۔ دعوت نامے، تذکرے حال احوال چلتے رہتے تھے۔ میرے بڑے بھائی جناب احترام احمد صدیقی صاحب کی بھی ان میں شرکت ہوتی رہتی تھی۔آزآد صاحب کا دیوان آگرہ کی مرتضائی پریس میں ۱۹۳۲ء میں چھپا جس کا اہتمام پریس کے مالک جناب قمرالدین خان صاحب نے کیا۔ جناب قمرالدین خان صاحب کی بیگم سے ہماری قریبی عزیزداری بھی ہے۔ ابراہیم آزآد صاحب سے متعلق ایک واقعہ جو زبانی در زبانی سنا ہے کہ مہاراجہ بیکانیر کا مقدم جو لندن میں زیر سماعت تھا۔ حضرت ابراہیم آزآد صاحب اس مقدمے کی پیروی کے لیے لندن تشریف لے گئے اور مقدمہ جیت گئے۔ راجہ بیکانیر اس پر اتنا خوش ہوا کہ حضرت صاحب کی واپسی پر از خود انہیں لینے پہنچا اور اپنے کندھوں پر بٹھا کر اپنے محل تک لایا۔ سبحان اللہ کیا شان تھی۔ایک روز بیکانیر سے خط موصول ہوا غالباً پوسٹ کارڈ تھا والد صاحب پڑھ کر آبدیدہ ہوگئے فرمایا خاندان کے سب سے بڑی بزرگ ہستی ہم سے جدا ہو گئی ۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی تھے

رہبؔر صمدانی : ایڈیٹر سہ ماہی 'فروغِ نعت' ملتان

رہبؔر صمدانی کاآزآد صاحب سی وہی رشتہ اور تعلق ہے جو میرا آزآد صاحب سے وہ بھی آزآد صاحب کے پڑپوتے ہیں۔ یہ خلیل احمد مرحوم کے صاحبزادے اور جناب تابشؔ صمدانی کے بڑے بیٹے ہیں۔ سخن فہمی کا تسلسل صحیح معنوں میں اگر

موجود ہے تو آزادؔ صاحب کے بیٹے جناب خلیل صمدانی سے ہے ، ان کے بیٹے تابشؔ صمدانی اور اب رہبرؔ و سرورؔ سخن فہم ہیں ۔آزادؔ صاحب کی نعت نگاری پر اپنے خیالات اظہار ان الفاظ میں کیا۔مجھے بات کا آغاز یہیں سے کرنا چاہیے کہ یہ پروردگارِ عالم کا خاص کرم ہے کہ میری شناخت کا ایک حوالہ جناب محمد ابراہیم آزادؔ صمدانیؒ نقشبندی مجدی خلیفہ مجاز سیدنا پیر جماعت علی شاہ نقشبندی مجدی سے بھی بنتا ہے۔جناب آزادؔ کے ایک صاحبزادے جناب خلیل احمد صمدانی میرے دادا صاحب ہوتے ہیں جو خود بھی ایک صاحب طرز معروف نعت گو شاعر تھے۔ جناب خلیل صمدانی کا نعتیہ مجموعہ کلام ''گلزار خلیل'' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں جے پور راجستھان (بھارت) سے شائع اشاعت پذیر ہوا۔ جناب خلیل صمدانی کو اپنے والدِ گرامی جناب ابرہیم آزادؔ سے شاعری ورثے میں ملی۔ جناب خلیل صمدانی کے بڑے صاحبزادے یعنی میرے والدِ گرامی جناب طفیل احمد تابشؔ صمدانی جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ایل ایل بی کی ڈگری ملتان آ کر حاصل کی۔آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں فضا کو نعتِ نبی سے معمور پایا۔ جس کا اظہار آپ کے اس شعر سے ہوتا ہے ۔

جس دن سے قدم رکھا ہے ہستی میں عدم سے
وابستہ ہوں میں سایۂ دامانِ کرم سے

جناب تابشؔ صمدانی کے دو مجموعہ ہائے نعت ''برگ ثنا'' اور ''مرحبا سیدی'' ملتان سے شائع ہوئے۔ جنابِ آزادؔ کی شاعری پر گفتگو کرنے کے لیے یہ تمہید

ضروری تھی کہ جناب ابراہیم آزادؔ کی نعتیہ شاعری کا یہ تسلسل پہلی نسل سے، دوسری نسل، اور دوسری نسل سے تیسری نسل، اور تیسری نسل سے چوتھی نسل تک جاری و ساری ہے جو خلیل صمدانی سے تابشؔ صمدانی اور تابشؔ صمدانی سے رہبرؔ صمدانی اور سرورؔ صمدانی تک پہنچی اور اب میں جناب آزادؔ کی نعتیہ شاعری پر اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔ میرے آباؤاجداد نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو تا قیامت رکھنے کے لیے صنفِ نعت ہی کا انتخاب کیا اور محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو اپنا مرکز و محور تسلیم کیا۔

میرے آباؤ اجداد کی ہر نعت اور نعت کا ہر شعر ادب اور مقامِ ادب سے پوری طرح آگہی رکھتا ہے اور مکمل حالتِ بیداری میں منازلِ نعت کی جانب گامزن رہا۔ جناب آزادؔ کے ہاں نعت کہنے کا ایک خاص انداز اور ایک خاص کیفیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔آپ نے حبِّ رسولِ پاک ﷺ کو اپنے دل و دماغ میں اس حد تک رچا بسالیا کہ ہر شعر سے ان کی حضور پر نور سے والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔یقیناً وہ نعت کہتے ہوئے خود کو حضوری و حاضری کی کیفیت میں محسوس کرتے ہوں گے۔پروردگار عالم آپ کی مرقد پر رحمتوں کا نزول فرمائے۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؂

تمہیں نورِ خدا سمجھے، تمہیں خیر البشر جانا
تمہاری شان کو پھر بھی نہ اے والا گہر جانا
شبِ معراج تیرا بن کے مہماں عرش پر جانا
مقدر تیری امت کا تھا پستی سے ابھر جانا

کس قدر پاکیزہ طلب ہے ۔

زباں سے نبیؐ کی ثنا چاہتا ہوں

میں کیا چیز ہوں اور کیا چاہتا ہوں

فنا جس کو ہے وہ بقا کب بقا ہے

بقا جس کو ہے وہ فنا چاہتا ہوں

جہاں تک جنابِ آزآد کے اسلوب کا تعلق ہے میرا دعویٰ ہے اور میں پورے اعتبار و اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ نعت گوئی کی صداؤں کے ہجوم میں ان کے ہاں زبان و بیان کی اتنی نکتہ طرازیاں، اتنی لطافتیں اور اس قدر وسعتیں ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ، ہر شعر اور ہر مصرعے میں ایک نئی مہک، تازگی، دلکشی اور توانائی ہے۔ لفظی تراکیب کی ایجاد اثر افرینی آج بھی اپنے دامن میں وسعتیں لیے ہوئے ہیں جیسے یہ ۱۳۵۰ ہجری نہیں ۱۹۳۲ء کی شاعری نہیں آج کی شاعری ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دور میں اس قدر جدید شاعری اور وہ بھی صنفِ نعت میں پاکستان میں جب کبھی نعتوں کو یکجا کرنا ضروری سمجھا گیا تو جناب ابراہیم آزآد، جناب خلیل صمدانی اور جناب تابش صمدانی کے نعتیہ اشعار متعدد بار حوالوں کے طور پر تحریر کیے جائیں گے۔ جناب آزآد کے چند اشعار عنوانات کے ساتھ ملاحظہ کیجئے ۔

امید شفاعت کے تناظر میں

مہرباں اس پہ نہ کیوں حشر میں رحماں ہوگا

نام لیوا جو ترا شافعِ عصیاں ہوگا

اشک ندامت

وہاں اشکِ ندامت موتیوں میں تولے جاتے ہیں
خدا کے واسطے اے چشمِ تر دامن کو بھر جانا

التماس قیام

رہنما تو ہو تو پھر خضر کی حاجت کیا ہے
تو نے پہنچایا ہمیں راہ دکھانا کیسا

تصورِ حضوری و حاضری

نگاہیں روضۂ شہ سے نہیں آئیں میں آیا ہوں
الجھ کر جالیوں سے رہ گیا تارِ نظر میرا

نسبت حضرت حسان بن ثابت ؓ

تم پہ ہے حضرت حسان ؓ کا سایا آزاد
نعت گوئی میں بتاتا ہے تمہارا انداز

آزادؔ بیکانیری کی شخصیت و شاعری پر مصنف کی مرتب کردہ کتاب ''شیخ محمد ابراہیم (آزادؔ: شخصیت و شاعری'' سے ماخوذ)

بیکانیر۔ میرے پرکھوں کی سرزمین

(مصنف کی کتاب شیخ محمد ابراہیم آزاد۔ شاگردِ رشید استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی جانشیں فصیح الملک داغؔ دہلوی شخصیت و شاعری سے موخوذ)

میرے پرکھوں کی سرزمیں بیکانیر، جو کبھی ریاست تھی اب ہندوستان کے بڑے صوبے راجستھان کا مرکزی شہر ہے۔ اسے بر صغیر میں بعض خوبیوں کے باعث منفرد مقام حاصل ہے۔یہ سرزمین مختلف قسم کی ثقافت' تاریخی یادگاروں' سحرا' دریاؤں' ہمالیہ' مذاہب اور آب و ہوا کے باعث انفرادیت رکھتی ہے۔ دہلی ، ہیماچل پردیس، جموں و کشمیر، پنجاب، یوپی اور راجستھان صوبوں پر مشتمل ہے۔ راجستھان سب سے زیادہ رنگین اور متحرک ریاست شمار ہوتی ہے۔ بیکانیر ہندوستان کے صوبے راجستھان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔یہ مشہور ترین قلعوں فصیلوں اور محلوں کے باعث اپنا ثانی نہیں رکھتا۔اس کی تین چیزیں بہت مشہور ہیں جو اس شہر کو دیگر علاقوں سے منفرد کرتی ہیں ایک اونٹ دوسرے ریل کا نظام اور تیسرے جنگلی یا ریتیلی مرغی۔اس کی سرحد پاکستان کے صوبہ پنجاب کے علاقہ بہاولپور سے ملتی ہے۔ بیکانیر اور بہاولنگر کے درمیان طویل صحرا ہے۔ غزنوی خاندان کا حکمراں سلطان محمود غزنوی ملتان سے بیکانیر ہوتا ہوا اجمیر

اور آبو ہو کر گجرات پہنچا اور سومناتھ فتح کیا۔ راجستھان بھارت کے شمال میں واقع ہے
اس کا صدر مقام جیپور ہے ۔بڑے شہروں میں اجمیر، جودھ پور، بیکانیر، کوٹہ اور اودھے
پور شامل ہیں۔ بیکانیر ۱۹۴۹ء تک ریاست بیکانیر کا دارالخلافہ رہا، تقسیم ہندوستان کے
بعد یہ ریاست بھارت میں شامل کر دی گئی۔ یہ

اناج، صنعت، علم وادب اور فنونِ لطیفہ کے اعتبار سے ہندوستان کا ایک ذرخیز شہر ہے۔
میرے پرکھوں کی سرزمین راجستھان تھی، راجستھان آج کل آبادی کے لحاظ سے
بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہے، تقسیم سے قبل اس صوبے کا نام راجپوتانہ تھااور یہ
صوبہ بائیس راجواڑوں (ریاستوں) کا مجموعہ تھا۔ راجپوتانہ نے بھی بڑی بڑی شخصیتیں
پیدا کی ہیں، میرابائی، مہدی حسن اور ریشماں کو مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان کے
تین طرفہ تحفے قرار دیا ہے جن کے وہ قائل اور گھائل ہیں حالانکہ وہ خود
بھی راجپوت ہی ہیں

محل وقوع

بیکانیر ہندوستان کے صوبہ راجستھان کے تقریباً وسط میں واقع ہے اس کے شمال

میں کشمیر' چین کے علاوہ ہندوستان کا صوبہ پنجاب ، امرتسر، ھنومان گڑ، مشرق میں امرتسر اور شاجہاں پور، جنوب میں گجرات' احمد آباد اور جونپور، مغرب میں پاکستانی علاقہ پنجاب کی سرحد ہے جب کہ شمال مشرق میں دہلی' گنگا نگر' مظفر نگر' میرٹھ' ہریانہ ، شمال مغرب میں پاکستانی شہر بہاولپور اور بہاولنگر کی سرحد ملتی ہے، جنوب مشرق میں جیپور جب کہ جنوب مغرب میں جودھپور' رن کچھ نیز پاکستان کے صوبہ سندھ کے بعض علاقوں میرپور خاص، کھوکھراپار واقع ہے۔

رقبہ اور آبادی

ریاست بیکانیر کا رقبہ ۲۴۵ میل یا ۳۹۴ کلو میٹر پر مشتمل ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا نے ۱۹۴۱ء میں ریاست بیکانیر کی آبادی ایک لاکھ ۲۷ ہزار تحریر کی۔ اردو انسائیکلو پیڈیا فیروز سنز کے مطابق ۱۹۴۷ء میں اس کی آبادی ۱۲،۹۲،۹۳۸ تھی۔ صرف شہر بیکانیر کی آبادی ۱۹۷۰ء میں ایک لاکھ ۹۰ ہزار ۹۶۸ سو تھی۔ انٹرنیٹ پر بیکانیر کی آبادی کی تفصیل حسب ذیل دی گئی ہے۔ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس شہر کی آبادی تھی، ۲۰۱۱ء کی مردم شماری میں لوگوں کی کل تعداد1,674,2712,367,745 ہے۔ ان میں مردوں کی آبادی 367,745, اور عورتیں 1,674,271 ہے۔ یعنی مرد کل آبادی کا 35 فیصد اور خواتین کل آبدی 47 فیصد ہیں۔

آب و ہوا اور زبانیں

بیکانیر ہندوستان کے صحرائی راجستھان میں واقع ہے اس اعتبار سے یہاں کی آب و ہوا انتہائی گرم ریگستانی ہے۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ سیر و سیاحت کے لیے بہترین موسم اکتوبر سے مارچ کے درمیان ہوتا ہے۔ بیکانیر کی بنیادی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن راجستھانی، سارد وا اور مارواڑی بولنے والے بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

: تاریخی پس منظر اور سربراہانِ ریاست

پندرھویں صدی میں مارواڑ (جودھپور) پر ایک راٹھور راجپوت راؤ جودھا جی حکمرانی کررہا تھا۔ اس راجہ کے کئی بیٹے تھے اس نے اپنے ایک بیٹے راؤ بیکا جی جو چھٹے نمبر پر تھا راجستھان میں کسی بھی جگہ اپنی علیحدہ حکمرانی قائم کرنے کی ہدایت کی۔ راؤ بیکا جی نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ۱۴۶۵ء میں بھٹنیر (ھنومان گڑھ) پر فوج کشی کا آغاز کیا۔ اس حکمت عملی میں اسے اپنے باپ کے علاوہ اپنی قوم کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔ یہ سورش کئی سال جاری رہی حتیٰ کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور راؤ بیکا جی نے ۱۴۸۸ء میں علاقہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اپنی حکمرانی کا آغاز کیا ساتھ ہی اس علاقہ بھٹنیر (ھنومان گڑھ) کا نام اپنے نام کی مناسبت سے "بیکانیر" رکھا۔ یہ ریاست بیکانیر اور نواحی بستیوں پر مشتمل

تھی۔ بیکانیر کو ریاست کا دارالخلافہ بنایا گیا جو تقسیم ہند تک قائم رہا۔ اپنی حکمرانی کے ساتھ ہی راؤبیکا جی نے شہر کی تعمیر نو کی جانب خصوصی توجہ کی خاص طور پر ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرایا جو آج بھی بیکانیر کے بانی حکمراں کی یادگار کے طور پر قائم ہے۔ راؤبیکا جی کا انتقال ۱۵۰۴ء میں ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغل بادشاہ محمد ظہیرالدین بابر (۱۴۸۳ء۔۱۵۳۰ء) نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد علاقہ میں فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا اور مغل حکمراں اپنی سلطنت کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی غرض سے فتوحات کر رہے تھے۔ راؤبیکا جی نے ان حالات سے بھی فائدہ اٹھایا ہوگا۔ راؤبیکا جی کے انتقال کے بعد کلیان سنگھ جانشین ہوا یہ دور مغل بادشاہ اکبر اعظم (۱۵۵۶ء۔۱۶۵۱ء) کا تھا۔ بیکانیر کے حکمرانوں نے خطے کی خصوصی کیفیت کے باعث مغل فرمارواؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے۔ کلیان سنگھ کو دربار اکبری میں خصوصیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بیکانیر کا سربراہ سلطنت دہلی کا بہت ہی بہ اعتماد اور ثابت قدم رہنے والا وفادار حاکم اور اکبر بادشاہ کے بہت قریب تھا۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر بادشاہ نے کلیان سنگھ کی بیٹی سے شادی کی اس طرح بیکانیر کا حاکم مغل سلطنت سے مزید قریب آگیا۔ کلیان سنگھ کا بیٹا 'رائے سنگھ' مغل سلطنت میں فوجی اعتبار سے

اہمیت رکھتا تھا۔ یہ ایک جنرل تھا اور اکبر بادشاہ کا بہت ہی قابل اعتبار اور معتبر لوگوں میں سے ایک تھا۔ اپنے باپ کے بعد بیکانیر کا حکمراں مقرر ہوا اکبر اعظم نے اسے خاص انعام و اکرام سے نوازا اور یہ بیکانیر کا پہلا ''راجہ '' مقرر ہوا یعنی بیکانیر ریاست کے حاکم اعلیٰ کو راجہ کی حیثیت رائے سنگھ سے حاصل ہوئی بعد میں رائے سنگھ کی بیٹی کی شادی سلیم سے ہوئی۔

راجہ کرن سنگھ

راجہ کرن سنگھ (۱۶۳۱ء-۱۶۶۹ء) بیکانیر اسٹیٹ کا ایک ممتاز حکمراں تھا اس نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ملکر سلطنت کی ترقی کی جدوجہد کی۔ اس کے بعد انوپ سنگھ (۱۶۶۹ء-۱۶۹۸ء) نے بھی ریاست کی حدود کو وسیع کرنے کی جدجہد کی ، اس زمانے میں ریاست بیکابیر کے ریاست دکن سے انتہائی دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے ۔اٹھارویں صدی میں بیکانیر اسٹیٹ اور جودھپور کے مابین وقفہ وقفہ سے معرکہ آرائی ہوتی رہی، بالآخر دونوں ریاستیں امن پر متفق ہوئیں، ۹ مئی ۱۸۱۸ء کو دونوں کے درمیان ایک امن معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں برطانوی فوج نے ریاست کو باقاعدہ تسلیم کیا۔

رتن سنگھ

۱۸۲۸ء میں رتن سنگھ نے اپنے باپ کی جگہ ریاست کا اقتدار سنبھالہ ۔ علاقے

میں ٹھاکروں نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ رتن سنگھ تنہا اس سورش کو ختم نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے برطانوی حکومت سے مدد کی درخواست کی جس کے بعد حالات قابو میں آ گئے۔ ریاست بیکانیر کا یہ حاکم انگریز کا وفادار تھا۔ ۱۸۴۲ء میں ہونے والی افغان جنگ میں رتن سنگھ نے انگریز کی بھرپور مدد کی ہر طریقہ سے انگریز کا وفادار رہا۔ کئی سو اونٹ بغرض جنگ انگریز کو تحفہ میں دئے اس زمانے میں جنگ میں دیگر اشیاء کے علاوہ اونٹ ایک مال و اسباب اور لوگوں کی سواری کا ایک اہم زریعہ تھا۔ بیکانیر اسٹیٹ شروع ہی سے اونٹوں کی افزائش نسل کے لیے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔

سردار سنگھ

رتن سنگھ کے بعد اس کا بیٹا سردار سنگھ (۱۸۵۱ء۔۱۸۷۲ء) ریاست بیکانیر کا حاکم بنا اس نے اپنے سابقہ حاکموں کی پالیسی پر عمل درآمد کیا اور انگریز سے بدستور تعلقات استوار رکھے چنانچہ انگریز نے اسے بے شمار انعام و اکرام سے نوازا۔ ریاست کے گرد و نواہ کی مزید زمین ریاست بیکانیر میں شامل کی گئی۔ اس کے نتیجے میں رتن سنگھ نے اجناس و دیگر ساز و سامان جو اس کے علاقے سے گزر کر دیگر ریاستوں کو جاتا تھا اس پر عائد ٹیکس میں کمی کر دی۔

ڈونگرا سنگھ

سردار سنگھ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس کا انتقال ۱۸۷۲ء میں ہوا چنانچہ جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا اس کی بیوہ اور ریاست کے خاص وزیروں کے مشورے سے 'ڈونگرا سنگھ' کو سردار سنگھ کا جانشیں مقرر کیا گیا۔ڈونگرا سنگھ کی جانشینی میں .برطانوی حکومت کی رضامندی بھی شامل تھی ۔ڈونگرا سنگھ کے دور حکمرانی میں ریاست میں استحکام نہ ہو سکا مختلف قوموں نے اسے اپنا حاکم قبول نہ کیا اور ریاست میں امن قائم نہ رہا۔سب سے زیادہ سوزش ۱۸۸۳ء میں ٹھاکروں نے برپا کی یہ ایک طرح کی بغاوت تھی،اس کی بنیاد ریاست کی جانب سے لگائے جانے والے مختلف ٹیکسوں کو بنایا گیا۔ڈونگرا سنگھ کا انتقال ۱۸۸۷ء میں ہوا اس کا بھی کوئی بیٹا نہیں تھا لیکن اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے ایک چھوٹے بھائی گنگا

سنگھ کو بیٹا بنا لیا تھا چنانچہ ریاست کی حاکمیت اعلیٰ گنگا سنگھ کو سونپی گئی۔

سری گنگا سنگھ

سری گنگا سنگھ ریاست بیکانیر کا اکیسواں مہاراجہ تھا اس نے اپنی حکمرانی کا آغاز ۱۸۸۷ء میں کیا۔تاج برطانیہ نے گنگا سنگھ کی حکمرانی کے لیے باقاعدہ اجازت نامہ ۱۸۹۸ء میں جاری کیا۔گنگا سنگھ ایک نیک انسان تھا اس نے اپنے دور حکمرانی میں ریاست بیکانیر کی تر قی کے لیے بے شمار عملی اقدامات کیے

بیرونی دنیامیں بھی اس نے ریاست کے وقار میں اضافہ کیا۔گنگا سنگھ ریاست بیکانیر کے مہاراجوں اور حکمرانوں میں اس اعتبار سے منفرد تھا کہ اس نے تاج برطانیہ کے ساتھ نہ صرف دوستانہ مراسم قائم کیے بلکہ برطانوی حکومت کی نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔گنگا سنگھ نے ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کا پہلا سرکاری دورہ کیا جہاں پر انہوں نے کنگ ایڈورڈ کی رسم تاجپوشی میں شرکت کی اس موقع پر سری گنگا سنگھ کو پرنس ویلس کا اے ڈی سی مقرر کیا گیا ان کی یہ حیثیت کنگ جارج تک قائم رہی پہلی جنگ عظیم میں سری گنگا سنگھ نے فرانس میں بحیثیت اسٹاف آفیسر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۵ء میں مصر میں بھی انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۹۱۷ء میں مہاراجہ گنگا سنگھ کو امپیریل وار کانفرنس کا رکن نامزد کیا گیا اور ہندوستان کے لیے سیکریٹری کی معاونت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں منعقد ہونے والی امن کانفرنس اور ۱۹۲۴ء میں لیگ آف نیشن اسمبلی جینوا میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔گنگا سنگھ نے ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔گنگا سنگھ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سری سادل سنگھ جی بہادر ۱۹۴۳ء میں ریاست کا سربراہ بنا اور ۱۹۴۹ء میں دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ بیکانیر ریاست کو بھارت کا حصہ بنا دیا گیا اس طرح ریاست بیکانیر میں سرداروں کی حکمرانی کا آغاز جو ۱۴۸۸ء میں شروع ہوا تھا ۱۹۴۹ء میں اختتام کو پہنچا۔ سردار راؤ بیکا جی ریاست کا پہلا حکمران جب کہ سری گنگا سنگھ کا بیٹا سری سادل سنگھ جی بہادر ریاست کا آخری مہاراجہ تھا۔

حفاظتی دیوار

ریاست بیکانیر کے چاروں اطراف پتھر کی چار دیواری بنوائی گئی تھی جس کی موٹائی تقریباً چھ فٹ، اونچائی ۱۵ سے ۳۰ فٹ تھی۔ ریاست میں داخل ہونے کے لیے پانچ دروازے تھے جب کہ تین خفیہ راستے اس کے علاوہ تھے۔ دیوار بنانے کا مقصد شہر کو بیرونی حملہ وروں سے محفوظ رکھنا تھا۔

قلعہ اور میوزیم

ریاست بیکانیر کے حکمراں قلعہ اور قلعہ نما عمارات کی تعمیر میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ بیکانیر کے اولین حکمراں راؤبیکا جی نے اپنی حکمرانی قائم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرایا جو اپنی خوبصورتی میں لاجواب تھا یہ قلعہ ریاست کے انتظامی امور کی انجام دہی کا مرکز بھی تھا۔ جو ناگڑھ قلعہ پندرھویں صدی میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے ایک جنرل راجہ رائے سنگھ نے تعمیر کرایا جو آج بھی قائم ہے۔ لعل گڑ پیلس بیکانیر کے راجہ سری گنگا سنگھ نے تعمیر کرایا۔ اس کی ڈیزائنگ برطانوی ماہرین نے کی تھی یہ مشرقی اور مغربی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ گنگ گولڈن جوبلی میوزیم میں قدیم تہذیبوں کے نوادرات، قلمی نسخے، پینٹنگ، سکے اور دیگر نوادرات محفوظ ہیں۔

تعلیمی ادارے

بیکانیر ریاست تعلیمی اداروں کے اعتبار سے بھی خود کفیل تھی اور اب بھی ہے۔
حکمرانوں نے جہاں دیگر امور کی جانب توجہ دی وہاں تعلیم کے فروغ اور تعلیمی اداروں کے قیام پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انٹرنیٹ پر حسب ذیل تعلیمی اداروں کی تفصیل موجود ہے (۱۲۳)۔

Colleges :

1. Shri. Dungar College

2. College of Engineering & Technology, Bikaner

3. Government Engineering College Bikaner

4. Sardar Patel Medical College, Bikaner

5. Marudhar Engineering College, Bikaner

Universities :

1. Maharaja Ganga Singh University

2. Rajasthan University of Veterinary and Animal Sciences,

Jaisalmer Road, Bikaner

3. Swami Keshwanand Rajasthan Agricultural University

Schools :

1. Saint Public Sr. Sec. School, Old Ginani

2. R.S.V., JNV Colony

3. K.V. No. 1 (Jaipur Road)

4. K.V. No. 2 Bikaner (inside Army campus).

5. K.V. No. 3 Nal Bikaner (inside Air Force Station Nal Bikaner)Sophia

Senior Secondary School,Jaipur Road

6. Bikaner Boys School

7. Govt City Senior Sec. School

8. Delhi Public School,Bikaner

9. Dayanand Public School.

10. Sophia Senior Secondary School,Jaipur Road

11. St.N.N R.S.V, Pawan Puri South Extension

12. Central Academy Senior Secondary School {Sadul Ganj}

13. Teresa Children Academy Sr. Sec. School (K.K Colony Bikaner)

14. Bal Bari, Gangashahar

15. Aadarsh Vidhya Mandir, JNV Colony & Gangashahar

16. St. vivekanand sr. sec. school

17. Seth Tolaram Bafna Academy,Gangashahar,Nokha Road

18. Pink Model Senior Sec. School

19. Fort Senior Sec. School

20. Army Public School (Inside Army campus)

21. Sadul Sports School Bikaner (Only Sports School In Rajasthan)

22. Sadul Sr. Secondary School(Kotegate Bikaner) 23. H.S.R.

Vidyaniketan, Bikaner

انوپ سنسکرت لائبریری

بیکانیر میں قائم انوپ سنسکرت لائبریری دنیا میں سنسکرت مخطوطات کے وسیع ذخیرہ کے اعتبار سے معروف ہے۔یہ لائبریری بیکانیر کے راجہ انوپ سنگھ کے نام سے منسوب ہے۔ لائبریری بیکانیر میں موجود 'لعل گڑھ پیلس' کے ایک حصے میں قائم ہے جسے 'سادلنواس' (Sadul Niwas) کہا جاتا ہے۔راجا انوپ سنگھ نے یہ قیمتی مخطوطات سترویں صدی میں حیدرآباد سےحاصل کیے تھے۔

بیکانیر اسکول آف آرٹ

سترھویں صدی کے اختتام پر بہت سے مغل مصور دہلی سے ترک وطن کرکے بیکانیر میں آباد ہوگئے انہوں نے اپنے پیشے کی ترقی اور فروغ کے لیے اپنے فن کاآغاز کیااور مصوری کے ایک خاص اسلوب کی بنیاد رکھی ۔ اس اسلوب مصوری کو

شہرت حاصل ہوئی اپنی انفرادیت اور مخصوص اسلوب نگاری کے باعث اسے ''بیکانیر اسکول آف آرٹ'' کا نام دیا گیا۔ اس میں جلال کم اور جمال زیادہ تھا۔ رکن الدین

اور رضا

عباس اس اسکولِ مصوری کے بانیوں میں سے تھے۔

اونٹ میلا

اونٹ جسے صحرائی جہاز کا نام دیا جاتا ہے بیکانیر کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بیکانیر میں موٹر کار کے بجائے گھروں میں اونٹ پالے جاتے تھے گویا اونٹ پالنا اس علاقے کی خاص روایت تھی۔ بیکانیر کے مختلف مہاراجہ اونٹ بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔اونٹ جنگ کے دوران بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ سواری ، مال برداری کے علاوہ اونٹوں کو میدان جنگ میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بیکانیر مین اونٹوں کی خاص نسلیں پائی جاتی تھیں یہاں ہر سال جنوری کے مہینے میں اونٹوں کا میلا منعقد کیا جاتا جس میں لوگ دور دور سے شرکت کرنے آیا کرتے تھے۔

سید امام۔بندر روڈ سے مسان روڈ تک

بعض شخصیات اس قدر متاثر کن ہوتی ہیں کہ انسان ان کی شخصیت اور اثرات سے ہمیشہ متاثر رہتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بلند اخلاق کی حامل شخصیت محسوس کرنے والے کو اپنے اثرات کی گرفت میں اس طرح محبُوس کر لیتی ہے کہ وہ اس کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے۔ میری زندگی میں ایک ایسی ہی شخصیت سید امام مرحوم کی تھی۔

آپ ایک ملن سار، با اخلاق و با کردار،، حق گو،،برد بار، وضع دار، عجز و انکساری کا پیکر، مُتَدبِر و مُتَدیِن، مُتَشرِع و مُتَشکِر انسان تھے۔ میری رائے میں وہ وحشتؔ کلکتوی کے اس شعر کا نمونہ تھے ۔

وحشتؔ کروں غرور تو کس بات پر کروں

پاتا ہوں میں تو اپنے سے بہتر ہر ایک کو

خوش اخلاقی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس سے آپ کا کوئی تعلق ہو یا جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہو اس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنا۔ دوسرے یہ کہ خوش اخلاقی کو اپنی عادت بنا لینا اور ہر ایک سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ خوش اخلاقی کی پہلی قسم سے بھی آدمی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ملتا ہے مگر خوش اخلاقی کی دوسری قسم کے فائدے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار

نہیں کیا جاسکتا۔ میٹھی زبان ، اچھا سلوک اس وقت بھی جب بہ ظاہر اس کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو تب بھی مفید ہے لیکن اگر وہ آدمی کا عام اخلاق بن جائے تو اس کے فائدوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ سید امام ان ہی آدمیوں میں سے تھے کہ جن کا اچھا اخلاق ان کی عام عادت بن چکا تھا وہ اپنے سے بڑوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ چھوٹوں کے ساتھ بھی ملنساری اور شفقت سے پیش آیا کرتے تھے ، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ۔

خدا تو ملتا ہے ، انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

گہرا سانولا رنگ ،کتابی چہرہ ،بڑی آنکھیں ، کشادہ پیشانی ، لانبا قد ، چوڑا سینہ ، مضبوط جسم ، چہرے پر مسکراہٹ ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک ،آنکھوں پر گہرا سا چشمہ لگا ہوا۔ ابتدا میں کلین شیو بعد میں مختصر سی داڑھی رکھ لی تھی ، کالے رنگ پر سفید بال حسین امتزاج تھا پھر سر کے بالوں اور داڑھی پر مہندی لگا کر سرخ کرنے لگے تھے ۔ سنجیدہ طرز گفتگو ، معلومات کا وسیع خزانہ ، ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرنے میں ماہر ، سیاست سے گفتگو کی حد تک گہری دلچسپی ، میں نے انہیں ایک مثالی انسان پایا۔ شادی ہوئی رخصتی کے وقت دلھن تو روتی ہی ہے (اُس زمانے میں ایسا ہی تھا اب قدریں بدلتی جارہی ہیں ، بیوٹی پارلر سے ہزاروں روپوں میں کرائے گئے میک اپ کی خاطر دلھن کو تلقین کی جاتی

ہے کہ خبر دار رخصتی کے وقت اگر ایک بھی آنسو نکالا) لیکن امام صاحب کی آنکھوں میں آنسو نمایاں تھے، دولھا بنے ہوئے رخصتی کے وقت تمام لوگوں کو صبر کی تلقین کررہے تھے، شادی کے بعد عید آئی سسر نے کچھ رقم عیدی کے طور پر دی آپ نے عید کے حوالے سے مختصر باتیں کیں اور کہا کہ میری خوشی اس میں ہے کہ میں عیدی کے طور پر صرف ایک روپیہ لوں، چنانچہ آپ نے تمام رقم واپس کر دی اور صرف ایک روپیہ عیدی کے طور پر لے لیا۔یہ وہ باتیں ہیں جو امام صاحب کو دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ان کا اخلاق و کردار مشعل راہ ہے اور باعث تقلید بھی۔

رہن سہن انتہائی سادہ، بندر روڈ پر ریڈیو پاکستان کے پیچھے ایک پرانی بلڈنگ کی دوسری منزل پر ایک کمرے کے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔شادی مسان روڈ کی ایک بستی میں رہنے والے خاندان میں ہوئی ان کے ہمراہ ان کی ضعیف والدہ اور ایک بہن بھی تھیں، شادی کے بعد اپنے فلیٹ کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تعمیر کرا لیا تھا۔گھر کا ماحول انتہائی مذہبی تھا، ماں، بہن اور بیٹے صوم و صلواۃ کے سخت پابند، ہر وقت فرش پر جائے نماز بچھی ملتی تھی، نماز کے علاوہ کلام مجید کی تلاوت اور تسبیحات پڑھنا آپ کا معمول تھا ۔ میں ان دنوں برنس روڈ پر واقع ایس ایم کالج کا طالب علم تھا، کبھی کبھار کالج سے واپسی پر امام صاحب کے گھر چلا جایا کرتا، امام صاحب بہت ہی محبت اور پیار سے ملتے

ان کی والدہ اور بہن بھی بہت نیک اور پر خلوص تھیں۔ امام صاحب کی شادی میرے والد صاحب کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی شادی سے قبل وہ اور ہم نزدیک ہی رہا کرتے تھے، آپس میں قرابت اور محبت مثالی تھی جو بعد میں دوری میں بدل گئی۔ان کی چھوٹی بہن ''حمیرہ صمدانی'' میرے حقیقی عم جناب مغیث صمدانی کی شریک حیات تھیں۔ محترمہ عمہ حمیرہ صمدانی مرحومہ نیک، با اخلاق، ملن سار، محبت کرنے والی خاتون تھیں، دنیا سے بہت جلد چلی گئیں، نیک لوگ دنیا سے جلد ہی چلے جاتے ہیں، ان کے انتقال کی خبر مجھے اسلام آباد میں وکیل صمدانی صاحب کے گھر ملی تدفین میں شرکت نہ کر سکا جس کا مجھے ہر دم ملال رہتا ہے۔

سید صاحب کی شادی کا ایک واقعہ یہاں قلم بند کرنا ضروری سمجھتا ہوں ، اس واقعہ سے یقین اور ایمان کی پختگی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی شادی کی تاریخ تو یاد نہیں البتہ اسقدر یاد ہے کہ اس دن قیامت کی بارش ہوئی گلیوں میں اسقدر پانی جمع ہوگیا کہ گھروں تک میں داخل ہوگیا، بارات کا وقت قریب آگیا جو اسی موسلا دھار بارش میں آئی ، اس زمانے میں شادی ہال کا فیشن نہیں تھا، گھروں کے سامنے شامیانے لگا کرتے تھے، بارش نے ان شامیانوں کو کملا کے رکھ دیا تھا، ہر ایک پریشانی کے عالم میں تھا، سب کے اوسان خطا تھے ، بارات کالی پیلی ٹیکسیوں میں آئی ، کم ہی لوگ ہوں گے، جس ٹیکسی میں

دولھا تھا اسی ٹیکسی میں بری کا سامان اور زیورات بھی تھے ، بارش نے سب کو مخبوط الحواس کرکے رکھ دیا تھا، باراتیوں کے حواس بھی باختہ تھے جس کے باعث وہ ٹیکسی سے بری کا سامان نکالنا بھول گئے اور ٹیکسی والا معمول کے مطابق چلا گیا، اللہ کی رحمت جاری و ساری تھی، نکاح کا وقت قریب آیا تو باراتیوں کو سامان کی سوجھی، ایک دوسرے سے معلوم کیا جاتا رہا، ہر ایک نے یہی کہا کہ ہم نے تو نہیں نکالا، اب سارا کھیل دھرا کا دھرا رہ گیا، لوگ ہکا بکا رہ گئے ، یہ بات عام ہوئی کہ بری کا تمام تر سامان ٹیکسی سے نکالا ہی نہیں گیا، اب کیا ہو سکتا تھا، ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے ہاں اس قسم کی باتوں کا رواج ہے ، تمام لوگ شدید بارش اور طوفان سے تو پریشان تھے ہی اس ناگہانی نے رہی سہی کسر پوری کردی، سید صاحب دولھا بنے ہوئے بھی مطمئن نظر آرہے تھے، انہیں اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ اور یقین تھا، انہیں دوسروں کو یہ کہتے سنا گیا کہ ' اللہ بہتر کرے گا انشاء اللہ سامان مل جائے گا'، یقیناً ان کے دل و دماغ میں اس وقت قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم رہا ہوگا جس کا ترجمہ یہ ہے ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے'' گو مہ گوں کی کیفیت جاری تھی ، فیصلہ ہوا کہ نکاح کی رسم شروع کردی جائے، قاضی نے رسم نکاح شروع کی، سید صاحب ایجاب و قبول کے جملے ادا کررہے تھے دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو نیک ہدایت سے نوازا، اس نے جوں ہی وہ سامان اپنی ٹیکسی میں دیکھا موسلا

دھار بارش میں الٹے پاؤں سامان واپس کرنے پہنچ گیا افسردہ چہروں اور بھیگے بدن کے ساتھ نکاح میں شریک لوگوں کے ہاتھ دعا کے لیے دراز تھے، بظاہر یہ دعا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے نو بیاہتا جوڑے کے لیے تھی لیکن سید صاحب کے دل میں کچھ اور ہی تھا جسے پروردگار نے قبول فرمایا، دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو منہ پر پھیرنے سے قبل وہ تمام سامان لوگوں کی نظروں کے سامنے تھا۔ یقین پختہ ہوگیا کہ دنیا میں نیک لوگ موجود ہیں، ٹیکسی ڈرائیور جو مالی طور پر یقیناً کمزور ہوگا شیطان کے دھوکے میں نہ آسکا، اس پر نیکی غالب آ گئی، نیک صفت انسان کو کس کس نے دعا نہیں دی ہوگی۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے نیک عمل سے بہت کچھ کرگیا جسے ہم آج بھی اچھے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سید صاحب عالم تو نہ تھے البتہ عامل ضرور تھے ۔ جادو ٹونا، عملیات ، سفلی عمل ،اثرات کا اتار بھی کیا کرتے تھے لیکن یہ عام نہیں تھا، جاننے والے اگر ایسی مشکل میں آجاتے تو امام صاحب سے ہی رجوع کیا جاتا۔ جِنّات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی اور ان سے پہلے جنات کو آگ سے پیدا کیا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ترجمہ ”اسی نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہے پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا۔“ (سورۃ الرحمٰن: آیت ۱۴۔۱۵)۔ اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسان و جن کو ایک ساتھ مخاطب کیا ہے ترجمہ ”سوائے

جن وانس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤگے" (سورہ رحمن، آیت نمبر ۱۳) ۔جنات اچھے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں کو پریشان کرنے والے بھی، ایسی مثالیں عام ملتی ہیں یہ اس زمانے کا ذکر ہے کہ ہماری رہائش لیاری کے علاقے آگرہ تاج کالونی میں تھی ، اسے مسان روڈ بھی کہا جاتا ہے، یہ رہائشی بستی جس قطعہ زمین پر مشتمل ہے یہاں قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کی رہائش کے ساتھ ساتھ مسان گھاٹ بھی تھا، اس بستی میں قائم غازی محمد بن قاسم اسکول جس میں راقم نے پہلی تا ششم تک تعلیم بھی حاصل کی ہندوؤں کی رہائش گاہ تھی ۔تاج جامعہ مسجد کے پاس ہندوؤں کا مسان گھاٹ بھی تھا جہاں پر ہندو اپنے مردوں کو جلایا کرتے تھے، یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک جاری رہا، مسلمانوں کی اکثریت جب اس علاقے میں آباد ہو گئی تو ہندو یہاں سے منتقل ہو گئے۔ اس بستی کے قیام کے ابتدائی دنوں میں اکثر زمین کی کھدائی کے دوران انسانی اعضاء نکلا کرتے تھے۔ یہاں ایک عامل "پانی والا بابا" کے نام سے مشہور تھا۔ میں اپنے دوستوں سبطین، ظفر، سعید، احمد، شکیل پیارے) کے ہمرہ اکثر اس عامل کے گھر جو غوثیہ روڈ پر واقع تھا اور ہر خاص و عام کے) لیے کھلا رہتا چلے جاتے ،اس وقت مقصد تماشہ دیکھنا ہوتا تھا۔ اس عامل کے پاس مرد، عورت اور بچے ایسے آتے جن کے بارے میں یہ یقین ہوتا کہ ان پر جن یا بھوت کا اثر ہے، یہ عامل تمام لوگوں کی موجودگی میں ہاتھ میں تسبیح لیے کچھ پڑھتا تھا ساتھ ہی مخصوص الفاظ بھی ادا کیا کرتا تھا، اس کے اس پڑھنے کے

بعد جن یا بھوت کے اثر کا حامل مریض ہاتھ پیر مارنے لگتا اس کے قریب کے لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کیا کرتے ۔ اس کے بعد عامل اس مریض سے پوچھتا کہ کہ بتا کہ تو کون ہے جن یا بھوت ؟ وہ اسے جواب دیتا کہ وہ کون ہے، یہ پوچھتا کہ تو نے اسے کب، کہاں اور کیوں پکڑا، جواب میں مریض کہتا کہ فلاں درخت کے نیچے ، سنسان جگہ قبرستان وغیرہ وغیرہ سے، وہ ان کی تعداد بھی معلوم کیا کرتا کہ وہ تعداد میں کتنے ہیں ، جواب میں وہ کبھی کہتا کہ ایک ہی ہوں ، کبھی اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کرتا۔ اس کے بعد عامل اس کو جانے کے لیے کہتا اگر جن کمزور ہوتا تو چلا جاتا ، کبھی عامل اسے بوتل میں بند کردیا کرتا اور کبھی لوبان کی دھونی کے ذریعہ جلا دیا کرتا۔ ہم نے یہ صورت حال کئی برس دیکھی، یہ عامل ذات کا کچھی یاتُرک تھا۔اس طرح راقم کوجِنّاَت کو سننے ،انسانی روپ میں دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا تجربہ رہا۔

میں نے اپنے گھر میں اپنی امی کی زبانی یہ بات کئی بار سنی ہوئی تھی کہ وہ جب چھوٹی سی تھیں ابھی چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا تو اکثر ایک سانپ ان سے کھیلا کرتا تھا، وہ ان کے گلے میں کبھی ایک جانب کبھی دوسری جانب گھومتا رہتا اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے پکڑتی اور کھیلا کرتی تھیں ، جب کوئی ان کے پاس آجاتا تو وہ غائب ہو جاتا، ان کے والدین نے کسی عامل کے ذریعے اس سانپ کو جو دراصل 'جن' تھا چلتا کیا۔ ہم بہن بھائی اکثر اپنی امی

کو اس واقعہ کی یاد دلا کر مذاق کیا کرتے تھے۔ جن کے انسان پر وارد ہونے کا ایک واقعہ ہمارے خاندان میں یہ بھی مشہور تھا کہ امام صاحب کے سسر محترم حنیف احمد مرحوم جو میرے والد کے حقیقی پھوپھا تھے ہندوستان میں ایک مرتبہ ان پر ایک جن آگیا بتانے والوں نے بتایا کہ جس وقت وہ ان پر یا ان میں موجود ہوتا تو وہ انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے، گویا جن انگریز تھا یا اس کی زبان انگریزی ہوگی۔ واللہ عالم با لثواب، والد صاحب مرحوم (انیس احمد صدانی) نے بتایا تھا کہ ان کے والد یعنی میرے حقیقی دادا حقیق احمد مرحوم) بھی عامل تھے اور جنات وغیرہ کے اثرات کا توڑ کیا کرتے تھے) ۔جناب حنیف احمد مرحوم پر جو جن وارد ہوا اس کو انہوں نے ہی اپنے عمل کے ذریعہ دور کیا۔ میں بچپن ہی سے جنات وغیرہ کے بارے میں سنتا چلا آرہا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں امریکہ کے صدر آئیزن آور پاکستان تشریف لائے انہوں نے پی اے ایف بیس مسرور (اس وقت اس کا نام بیس ماری پور تھا) پر اترنا تھا ماری پور روڈ کے کنارے جو کچی بستیاں تھیں جن میں آگرہ تاج کالونی، انجام کالونی، پچھی کالونی وغیرہ انہیں حکومت نے منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ امریکی صدر کو پاکستان کے غریب لوگوں کی غریب بستیاں دیکھنے کو نہ ملیں، لیاری ندی سے موجودہ وزیر مینشن تک ماری روڈ کے کنارے آباد ان بستیوں کو منتقل کرکے ملیر کے علاقے کھوکھرا پار کالونی میں آباد کر دیا گیا۔ ان بستیوں کو راتوں رات مسمار کیا گیا، پھر بھی کچھ گھر کھنڈرات کی صورت میں

باقی رہ گئے۔ آئیزن آور ماری پور ائیرپورٹ پر اترے اور ماری پور روڈ سے گزرے، انھوں نے اسی سڑک پر بشیر احمد ساربان کو اپنی اونٹ گاڑی لیے دیکھا، وہ اس پر عاشق ہوئے اور اپنے ہمراہ امریکہ لے گئے۔ اس قصہ کی کہانی اخبارات کی زینت بھی بنی۔ ہمارا گھر محفوظ رہا لیکن اب اس کے سامنے دور تک ٹوٹے پھوٹے مکان، مٹی کے ڈھیر اور کھنڈرات تھے، رات کے وقت خاص طور پر خوف ناک منظر ہوتا، ایک شب میں تنہا اپنے گھر کی جانب آرہا تھا گھپ اندھیرا تھا، ٹوٹے پھوٹے گھر اور کھنڈرات خوف ناک منظر پیش کررہے تھے ابھی میں اپنے گھر سے چند قدم پر ہی تھا کہ دو سے تین فٹ اونچا انسان نما، دیکھنے میں بونے قد کا انسان لگ رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے میرے سامنے آگیا لیکن چند قدم دور آکر رک گیا، اب میں اور وہ آمنے سامنے تھے وہ تو اطمینان سے تھا لیکن میرے اوسان خطا ہوچکے تھے، بدن کپ کپا رہا تھا، قدم وہیں رک گئے، واپسی کی صورت میں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر میں نے واپسی کی اور اس کی جانب سے پیٹ ہوگئی تو یہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے، اس وقت میرے آس پاس کوئی دوسرا نہیں تھا، میں ابھی فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنا رخ میری جانب سے واپس موڑا اور تیزی کے ساتھ چلتے چلتے غائب ہوگیا۔ میں بمشکل تمام گھر پہنچا، تیز بخار اور سردی جو دراصل خوف تھا، بعض لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ جن تھا جو انسانی روپ میں اس جگہ اکثر نظر آتا ہے۔

۱۹۷۰ء کی بات ہے میری امی کو بخار آگیا، معمولی سی بات تھی، علاج ہوا اتر گیا لیکن کھانسی نہ گئی، ایسا بھی اکثر ہوتا ہے، کھانسی کی دوا استعمال کرتی رہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آواز سے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی مرد کھانس رہا ہے، سب کو تشویش ہوئی، امام صاحب کی شادی میرے والد صاحب مرحوم کی چھو پھی زاد بہن سکفیلہ (بائی) سے ہو چکی تھی، ان کی سسرال کا راستہ ہمارے گھر سے ہو کر جاتا تھا چنانچہ امام صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ زیادہ تر رات کو اپنے گھر واپس جاتے ہوئے ضرور آیا کرتے اور بہت بہت دیر بلکہ رات گئے تک باتیں کرتے رہتے، ہر موضوع پر تفصیل سے گفتگو کیا کرتے، ان کی گفتگو اس قدر شیریں اور پر اثر ہوا کرتی تھی کہ ہم سب ان کے ساتھ خوشی سے بیٹھے رہتے۔جب انہیں امی کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں کل آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں گا، اگلے ہی دن وہ آئے اور کچھ تعویذ، پڑھا ہوا پانی اور ساتھ ہی ہمیں پڑھنے کے لیے کچھ بتایا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان پر (ہماری امی پر) کسی مرد جن کا اثر ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ کچھ نہیں کرے گا، اسے جانے میں کچھ وقت لگے گا۔ سارے بہن بھائی چھوٹے تھے، خوف زدہ ہو جانا ایک قدرتی عمل تھا، ان کی کھانسی اسی طرح جاری رہی، کھانستے وقت مرد کی آواز نمایاں ہوا کرتی لیکن کوئی اور بات کبھی نہیں ہوئی۔ امام صاحب کا عمل جاری رہا انہوں نے نے بتایا کہ وہ رات میں پڑھائی بھی کرتے ہیں۔چند روز گزرنے

کے بعد ایک دن امی پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا لیکن اس دورے کے باوجود ان میں وہ نقاہت یا کمزوری دیکھنے میں نہیں آئی۔ بیٹھے بیٹھے کھانس رہی تھیں البتہ اس دن انہوں نے مرد کی آواز میں بولنا شروع کیا چند جملے ہی ذہن میں ہیں ، مرد کی آواز میں کہا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا"، " وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"، "تم لوگ مت ڈرو" میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" وغیر وغیرہ، میں امی کے پاس ہی تھا، میری کسی بہن سے چائے کے لیے کہا کہ میں چائے پیوں گا، چائے بنادی گئی، تھوڑی سے چائے پی، آدھا کپ چائے باقی تھی، مجھے مخاطب کیا، کہنے لگیں ! تو میرا بیٹا ہے، میں نے کہا کہ ہاں ہوں، گویا ہوئیں ! میرا ایک کام کرے گا میں نے کہا کرونگا، پھر کہا کہ یہ کپ میں جو چائے ہے اسے دروازے کے باہر پھینکدے، بظاہر یہ عام سی بات تھی، لیکن اس وقت کچھ عجیب سا ڈر اور خوف کی کیفیت طاری تھی، میں نے کہا کہ اسے میز پر رکھ دیں، پھینکنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن مصر ہوئیں کہ میں اسے باہر پھینک دوں، میں ان کے اصرار پر سمجھ گیا کہ بات کچھ اور ہے، میں نے ڈرتے ڈرتے انکار کردیا، کھانسی کے دورے میں بے انتہا اضافہ ہوا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ کھانسی بند ہوگئی اور ان کی اس کیفیت میں بھی تبدیلی آگئی یعنی وہ اپنی آواز میں باتیں کرنے لگیں، رات میں امام صاحب آئے تو انہیں اس کیفیت سے آگاہ کیا گیا انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ چائے باہر دروازے پر نہیں پھینکی، ایسا کرنے کی صورت میں 'جن' ان کے اوپر سے تو چلا

جاتا لیکن باہر دروازے پر اپنا بسیرا جمالیتا۔اس طرح امام صاحب نے ہمیں ایک بڑی مشکل سے نجات دلائی۔

اکثر لوگ جِنّات کے ہاتھوں مشکل میں گرفتار ہونے والوں پر یقین نہیں کرتے اور انہیں نفسیاتی مریض سمجھتے ہیں۔ میرے کالج کے ایک پروفیسر ساتھی آجکل اسی پریشانی سے دوچار ہیں، خود میں جس گھر میں کوئی ۱۴برس (۱۹۸۵ء۔۱۹۹۹ء) رہائش پذیر رہا میرے منتقل ہوجانے کے بعد وہاں کے رہائشی اسی پریشانی سے دوچار ہوئے۔ چند سال ، پہلے کی بات ہے میں نارتھ کراچی سے گلشن اقبال منتقل ہوا ہی تھا میرے ایک دوست جوایک مقامی کالج کے پروفیسر ہیں کی بیوی (وہ بھی پروفیسر ہے) اس مشکل سے دو چار ہوئی۔ میرا دوست سخت پریشانی میں تھا، ہر طرح کا علاج کرایا، حتیٰ کہ نفسیاتی معالج کا علاج بھی ہوا لیکن تمام علاج بے سود ثابت ہوئے۔خاتون کی بعض حرکات جن کا ذکر میرا دوست کیا کرتا ایسی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ جِنّات کے اثر وغیرہ کا ہے۔ بہت عرصہ بعد اسے کسی عامل کے بارے میں معلوم ہوا، سردیوں کا زمانہ تھا میرے دوست نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں مجھے کسی نے ایک عامل کے بارے میں بتایا ہے جو ڈیفنس کے پاس کسی کچی بستی میں رہتا ہے اس کے پاس بیگم کو لے جانا ہے اچھا ہے ایک سے دو ہوں گے ، نہ معلوم کیا صورت ہو، میں تیار ہوگیا، اس کی طبیعت واقعی خراب تھی ، میں اس کے ساتھ ہو لیا، مغرب کے بعد وہ عامل

مریضوں کو دیکھا کرتا تھا، ہم بعد نماز مغرب وہاں پہنچ گئے۔کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے ان کو فارغ کرنے کے بعد اس عامل نے میرے دوست کی بیوی کو سامنے بٹھایا، اس کے برابر میرا دوست بیٹھا تھا اور اس کے برابر میں تھا، عامل نے تفصیل معلوم کی اور عمل شروع کردیا، خاتون کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا،بڑی بڑی آنکھیں باہر کی جانب، ہم سب کو گھور گھور کر دیکھنے لگی، عامل نے یہ محسوس کیا کہ جن آسانی سے نہیں جائے گا چنانچہ اس نے اپنے کارندوں کو کوئلے دہکانے کے لیے کہا، کمرے کی لائٹ مدھم کردیں، عامل بہت زیادہ موٹے دانے والی تسبیح لے کر کھڑا ہوگیا اور تسبیح پڑھنے لگا، اتنے میں کوئلے دھک گئے، عامل نے دھکتے کوئلوں کو ایک مخصوص برتن میں ڈالکر اس عورت کی ناک کے نیچے کیا اور ان پر چھوٹی سرخ مرچیں جن پر اس نے تسبیح پڑھنے کے بعد پھونک ماری تھی کوئلوں پر ڈالدیا، مرچوں کی دھونی سے ہم سب کا برا حال لیکن وہ عورت جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا، اس عامل نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال پکڑے دوسرے ہاتھ سے مرچوں کی دھونی اس کی ناک میں زبردست طریقے سے دی، کافی دیر کے بعد اس پر کچھ اثر ہوا، عامل اس سے مخاطب ہوا، پوچھا کہ 'بتا تو کون ہے'؟ مردانہ آواز میں جواب دیا کہ 'میں جن ہوں'، دیگر سوال کیے کہ تو اس عورت کو چھوڑ دے، کہنے لگا کہ یہ میری بیوی ہے میں نہیں جاؤنگا وغیرہ وغیرہ، عامل نے یہ عمل دہرایا، مرچوں کی دھونی نے اس کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں کا برا حال کر دیا تھالیکن وہ عورت اطمینان سے تھی، آخر کار عامل نے

جن' کو جانے پر مجبور کر دیا، اس نے جانے کا وعدہ تو کرلیا لیکن فوری طور پر نہیں گیا، ' ہم یہ سمجھے کہ وہ چلا گیا، واپسی کا سفر شروع ہوا، میرا دوست پہلے ہی بیمار تھا اس صورت حال کے بعد اسے سردی اور بخار ہوگیا، ڈیفنس سے گلشن اقبال تک کا سفر خاصا طویل تھا، میرے دوست کے لیے گاڑی چلانا ممکن نہیں تھا، اس نے مجھ سے گاڑی چلانے کے لیے کہا، یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، وہ جب اگلی سیٹ پر بیٹھنے لگا اور بیوی کو پیچھے سیٹ پر بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اس کی بیوی نے مردانہ آواز میں کہا '' ہٹو میں آگے بیٹھونگا''، میں گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا، میں نے جب یہ جملہ سنا تو میرے ہوش گم ہو گئے میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ یعنی 'جن' اس عورت میں موجود ہے، اب کیا ہو سکتا تھا، میرا دوست پیچھے بیٹھ گیا، اس کے ساتھ اس کی کوئی ۱۲ سال کی بیٹی بھی اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھی، میرا دوست بھی صورت حال محسوس کر رہا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھا کہ گاڑی چلا سکتا، اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہوئے، وہ عورت نظر نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، میں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ رازداری کے ساتھ اس عورت پر نظر رکھے ہوئے تھا، میں بھی یہ چاہتا تھا کہ خاموشی ٹوٹے، اسی لمحے میرے دوست نے اپنی بیوی کی خیرت پوچھی، شاید وہ بھی چاہتا تھا کہ خوف کا ماحول خوش گوار ماحول میں بدل جائے، اس کے بولتے ہی وہ عورت مردانہ آواز میں چلائی ''خاموش بیٹھا رہے''، اس کے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی، کہنے

لگی ’’ تو خاموشی سے گاڑی چلا‘‘۔ میں نے اپنے دوست سے کچھ کہا، اس کے جواب میں وہ عورت مردانہ آواز میں مجھ پر برس پڑی، بولی، ’’ خاموش نہیں رہے گا، ابھی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا‘‘، اس کے اس جملے نے میرے ہوش گم کردیے، میں اس خوف میں مبتلا ہوگیا کہ اگر اس نے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیا تو کیا ہوگا، میرے بدن کا ایک ایک رُواں کھڑا تھا، بدن کپ کپانے لگا، وہ یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی، میں بدستور گاڑی چلاتا رہا، جس قدر قرآنی آیات یاد تھیں وہ تمام مسلسل پڑھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ کسی بھی طرح منزل آجائے، جب ہم شہید ملت روڈ کے پل پر پہنچے تو وہ پھر مخاطب ہوئی، کہنے لگی ’’ پان کھلا اور سگریٹ پلا‘‘، میں نے جواب دیا کہ میں دونوں چیزیں نہیں استعمال کرتا اپنے میاں سے کہو وہ کھلائے گا، اب تو جناب وہ زور سے دھاڑی کہنے لگی ’سگریٹ کی دکان پر گاڑی روک ، سنا نہیں تونے، میں نے کہا کہ اچھا دکان آجائے تو روکتا ہوں لیکن میں نے گاڑی کی اسپیڈ کم نہیں کی، وہ بھی اس کے بعد خاموش ہو رہی، گھر آگیا، خدا کا شکر ادا کیا، چابی اپنے دوست کے حوالے کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ میرے دوست نے بتایا کہ وہ رات بھر سوتی رہی، صبح اٹھی تو اسے ان تمام باتوں کا علم نہیں تھا کہ اس نے رات میں دو مردوں کو کس قدر خوف میں مبتلا کیا، اس نے بتایا کہ اس عمل کے بعد اس کی بیوی ٹھیک ہو گئی۔امام صاحب کی طرح کتنے ہی لوگ انسانوں کو مشکل سے نجات دلانے میں مصروف ہیں۔اللہ تعالی انہیں اس نیک کام کی یقینا جزا دے گا۔یہ میری زندگی کا

نہ بھولنے والا واقعہ ہے۔جب کبھی مجھے اس کا خیال آجاتا ہے' جن' سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو جاتی ہے۔اس واقعہ سے جنات پر میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔یقینا اللہ کی یہ مخلوق موجود ہے۔ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔کلام مجید کی سُورۃ جن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ترجمہ ''اور ہم میں سے (پہلے سے بھی) بعض نیک (ہوتے آئے ہیں) اور بعض اور طرح کے (ہوتے آئے ہیں''۔(آیت نمبر ۱۱)،اسی سُورۃ میں کہا گیا کہ '' آپ ان لوگوں سے کہیے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر (اپنی قوم میں واپس جا کر انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور اب اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے''۔(سُورۃ جن ،آیت نمبر ۱۔۲)۔امام صاحب اب ہم میں نہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب ہو۔میں ان کی شخصیت سے متاثر تھا،ان کے اچھے اخلاق اور حُسنِ تعلق نے مجھے ان کی شخصیت پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔(۳۰ دسمبر ۲۰۰۶ء)۔مصنف کی کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع شدہ ۲۰۰۹ء میں شامل)

شیخ محمد ابراہیم آزادؔ شخصیت وشاعری

ڈاکٹر رئیس صمدانی کی تصنیف ’’شیخ محمد ابراہیم آزادؔ شخصیت وشاعری‘‘ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں

(ڈاکٹر رئیس صمدانی کی تصنیف ’’شیخ محمد ابراہیم آزادؔ شخصیت وشاعری‘‘ کا پیش لفظ اردو کے معروف استاد محقق و دانشور پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم نے تحریر شدہ ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی کا یہ آخری پیش لفظ ہے جو انہوں نے اپنے انتقال سے چند یوم قبل تحریر فرمایا)

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی سوانح نگاری اور خاکہ نویسی کے حوالے سے کسی تعارف کے محتاج نہیں کچھ عرصہ قبل ان کا خاکوں کا مجموعہ ’جھولی میں ہیرے اور موتی‘ منظر عام پر آچکا ہے۔اس سے قبل سوانحی مضامین پر مشتمل کتاب ’یادوں کی مالا‘ بھی شائع ہوچکی ہے۔ صمدانی صاحب کی ان دونوں کتابوں پر میری رائے شامل ہے۔اپنے موضوع پر بہت خوب لکھتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک صاحب نظر ادیب و محقق کی ہے۔ ایک اور خوبی جو میں نے ان میں محسوس کی کہ وہ صلہ و ستائش کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس بار انھوں نے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جن کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے بیسویں صدی عیسویں کے تقریباً آخر کا ہے۔ یہ راجستھان کے معروف مداح سرا شیخ محمد ابراہیم آزاد ؔ ہیں جو صاحب دیوان شاعر تھے جن کا مجموعہ کلام آگرہ سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اس دور کے ممتاز شاعروں میں الطاف حسین حالیؔ، احمد رضا بریلوی، داغؔ دہلوی، سید وحید الدین بیخودؔ دہلوی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، شاد عظیم آباد، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور دیگر معروف شعراء اور ادیب شامل ہیں۔ پیش نظر کتاب آزادؔ صاحب کی شخصیت، شاعری، خاندان، آبائی شہروں اور آزادؔ صاحب کے بارے میں ماہنامہ نعت لاہور کے خاص شماروں کے تعارف پر مبنی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مواد اور معیار دونوں اعتبار سے ، یہ کتاب آزادؔ صاحب کے متعلق گراں قدر اضافہ ہے۔

تخلیقی صلاحیت رکھنے والے کسی بھی تخلیق کار کے سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ وہ ایک سے زائد اصنافِ سخن میں اظہار ذات کا ذریعہ بنانے پر قادر ہو۔ ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جنھوں نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں سے ہر ایک میں خوب لکھا ہے۔ ڈاکٹر صمدانی ان لکھنے والو میں سے ہیں جنھوں نے اپنے موضوع لائبریری سائنس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ساتھ ہی مختلف ادبی موضوعات خاص طور پر سوانح نگاری اور خاکہ نویسی

کو اپنا موضوع بنایا اور ایک سوانح نگار کے طور پر ادب کی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی۔
پیشِ نظر کتاب کی اساس شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کی شخصیت اور نعت گوئی ہے۔ اس لیے اس کا موضوع اس امر کا متقاضی ہے کہ ' نعت' کے حوالے سے کچھ تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کروں۔ اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال میں اپنی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' میں کرچکا ہوں جو ۱۹۷۲ء میں آئینہ ادب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اردو شاعری کی محترم و مقبول صنف ''نعت'' ہے'' نعت'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی کا تعلق مدحت و ثنا سے ہے۔ شعری اصطلاح اور صنف کی صورت میں یہ براہِ راست عربی سے نہیں بلکہ دوسری اصناف کی طرح فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُردو فارسی میں شعر و سخن کے حوالے سے نعت کا جو مفہوم متعین ہے وہ عربی میں نہیں ہے۔ عربی میں اس جگہ ''مدح'' یا ''وصف'' کا لفظ مُستعمل ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں اشعار کہنے والوں کو ''نعت گو'' نہیں بلکہ مدّاحِ رسول یا وصّافِ رسول کہا جاتا ہے۔ عموماً ''مدح'' کے لفظ سے وہی کام لیا جاتا ہے جو اردو فارسی میں لفظِ نعت سے لیا جاتا ہے۔ لیکن اپنے اصطلاحی مفہوم میں ''مدح'' کا لفظ نعت سے وسیع تر ہے کہ اس کا اطلاق، عربی نثر و نظم دونوں پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حضور اکرم ﷺ کی شان میں لکھا ہوا ہر ٹکڑا یا مضمون، نعت کے دائرے میں شامل

ہے۔ عربی کے اولین نعت نگاروں میں جناب ابو طالب اور اُمِ معبد کے نام آتے ہیں۔ مختصراً عرض کروں کہ عربی میں نعت گوئی کا رواج صرف ذوقِ شعر گوئی کی تسکین یا کمال زباندانی کے اظہار کے لیے نہ تھا۔ اُس کا اصل مقصد، اسلام اور مسلمانوں پر، ہجویہ حملہ کرنے والے شعرا کا جواب دینا تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کو اسی غرض سے شعر گوئی اور نعتیہ قصیدہ نگاری کی اجازت دی گئی تھی کہ اُس کے ذریعہ کفار مکہ کے
ہجو نگاروں کو لاجواب کرنا اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کو اُن کے حملوں سے تحفظ و نجات دلانا مقصود تھا ورنہ حضورِ اکرم ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ ان کی تعریف میں قصیدے لکھیں۔ ان قصائد کا بنیادی مقصد حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتی بزرگی و عظمت کا اظہار نہیں بلکہ دین اسلام کی برکات و احسانات سے عوام الناس کو دلکش پیرائے میں متعارف کرانا اور غیر مسلم شعرا کے خلاف جہاد باللسان والقلم کو موثر و کارگر بنانا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری میں رسمی نعت گو شعرا سے قطع نظر، بے شمار ایسے شعرا موجود ہیں جن کی نعتیہ شاعری یکسر وجدانی اور رسمیات سے پاک ہے۔ ان شعرا کے نعتیہ کلام نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی زندگی پر کم و بیش

وہی اثر ڈالا ہے جو نعت گوئی کا مقصودِ اصلی تھا۔ شیخ محمد ابراہیم آزادؔ بھی ان شعرا میں سے ہیں کہ جن کے نعتیہ کلام میں رسولِ اکرم ﷺ کی ذات صفات سے والہانہ عشق صاف عیاں ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جنابِ آزادؔ سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں جن کی شاعری کے بارے میں خود بیخودؔ دہلوی نے کہا کہ 'ان کا کلام بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چندہ محتاج نہیں'۔ بیخودؔ دہلوی جیسے استاذ الشعرا جانشین فصیح الملک داغؔ دہلوی کی اس رائے کے بعد گنجائش نہیں رہ جاتی کے آزادؔ صاحب کی شاعری پر کچھ کہا جائے۔

پیش نظر کتاب سے اندازہ ہوا کہ صمدانی صاحب ایک شاعر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شعر و ادب کا مذاق کئی نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ متعدد احباب ادیب و شاعر اور صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ خود صمدانی صاحب کے بعض اشعار اس کتاب میں کہیں کہیں نظر سے گزرے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے والوں کے لیے تسکین کا وسیلہ ہوگی۔ اہلِ ذوق کو انبساطِ روح اور نشاطِ قلب کے اسباب فراہم کرے گی۔ غور و فکر کی راہیں کھولے گی اور مصنف کے قلم کو مزید معتبر و محترم بنائے گی اور ہر اعتبار سے اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہوگی۔

ہندوستان کا ضلع مظفر نگر (یو پی) ۔ میرا آبائی وطن

(مصنف کی کتاب شیخ محمد ابراہیم آزآد۔ شاگردِ رشید استاذ الشعراء افتخارالملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی جانشیں فصیح الملک داغ دہلویشخصیت وشاعری سے موخوذ)

مظفر نگر ہندوستان کے یو پی (اترپردیس) کا ایک ضلع ہے، یہ شمالی مغربی اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ مظفر نگر کی چار تحصیلیں بڑھانہ، کیرانہ، جھنجھانہ اور شاملی ہیں۔اس کی آبادی مسلمانوں اور ہندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اطراف نزدیک ترین شہروں میں بجنور، کرنال، پانی پت، ہسار، ہریانہ، روھتک، بڑہانہ، میرٹھ، سہارنپور، آگرہ، اور دیوبند واقع ہیں۔ خاندان باری بخش (حسین پور) کے بے شمار گھرانے آج بھی مظفر نگر اور اس کے گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں آباد ہیں۔ مبشر احمد واحدی نے اپنی تحقیق ''گلشن واحدی'' میں قصبہ بڑھانہ ضلع مظفر نگر کے بارے میں تحریر کیا کہ ''

قصبہ بڑھانے میں ہر قسم کے لوگ بکثرت آباد تھے ۔آب و ہوا خوشگوار، علاقہ بارونق اور پرُ فضا تھا۔ دکانوں کا تو ذکر کیا منڈی میں باون مہاجن فقط ہنڈی والے تھے۔ لین دین میں ہنڈی کا کاروبار ایسا تھا جیسا آج کل بنک سرانجام دیتے ہیں۔ شاہان مغلیہ کے دور میں یہ قصبہ دارالقضا، دار لا فتا اور دارالعلم تھا۔

دارالقضا' یعنی بذریعہ قاضی مقدمات کے فیصلوں کا مرکز، 'دارالفتا' جہاں سے بذریعہ' مفتی سند فتویٰ حاصل کی جاتی تھی، 'دارالعلم' یعنی رائج الوقت تعلیم کا مرکز۔ چونکہ باشندگان علاقہ کو علما، فقہا اور صوفیہ کی صحبت حاصل تھی اس لیے عرصۂ دراز سے مظفر نگر نہایت مردم خیز علاقہ مشہور ہے۔ یہاں سے بڑی بڑی نامور ہستیاں وجود میں آئیں''۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد مظفر نگر کا موضع 'پھلت' تھا، اسے قریہ اولیاء بھی کہا جاتا ہے۔ معروف عالم دین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ میں بمقام قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے، وہ اپنے والد کی جانب سے فاروقی اور والدہ کی جانب سے علوی تھے۔ ابتدائی تعلیم تھانہ بھون اور میرٹھ میں حاصل کی۔ احمد حمید نے اپنے مضمون ''حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی'' میں حکیم الامت کی ولادت و سیادت کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم سنگھ نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے بسایا جو تھانہ بھیم'' کہلایا۔ پھر مسلمانوں کی آمد و سکونت پر اس کا نام ''محمد پور'' رکھا گیا مگر'' یہ نام مقبول و مشہور نہ ہوا اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ تھانہ بھیم سے ''تھانہ بھون'' ہوگیا۔ آگرہ شہر کے نواح میں واقع یہ چھوٹا سا قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آ رہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت و وقوت اور صاحب

فضل و کمال رہے ہیں ۔ مجد دالملتہ حضرت شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے اجداد نے آج سے صدیوں قبل تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کرکے تھانہ بھون میں اقامت اختیار کی تھی"۔

پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان کا تعلق بھی مظفر نگر سے تھا۔ کہا جاتا ہے لیاقت علی خان کے سلسلۂ نسب شہرۂ آفاق ایرانی بادشاہ نوشیر وان عادل سے ملتا ہے۔آپ کے آباؤاجداد نے ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا۔ جب آگرہ اکبر آباد بنا تو اس خاندان کے چند افراد نے بھی پایۂ تخت کو جا بسایا اور بعض ہندوستان کے ضلع مظفر نگر منتقل ہوگئے جہاں انہیں جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔انیسویں صدی عیسویں کے شروع میں مغل سلطنت زوال پزیر ہوئی اور برطانوی حکومت زور پکڑ رہی تھی ، اس خاندان والوں نے مظفر نگر کو بھی خیر باد کہا اور کرنال میں سکونت اختیار کی کیونکہ ان دنوں وہاں کی فضا زیادہ سازگار اور ماحول زیادہ دلپزیر تھا۔ مظفر نگر سے کرنال منتقل ہونے والوں میں سے ایک نوجوان نواب احمد علی خان کا خاندان بھی تھا۔نواب احمد علی خان نے کرنال کے قریب راجپورہ ضلع سہارنپور کے ایک نواب ماہر علی خان کی صاحبزادی سے شادی کرلی موصوف ذوقِ علم وادب رکھنے کے علاوہ فن سپہ گری میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے۔ان کی شہرت و نیکنامی کا حال سن کر سرکارِ انگلشیہ نے ان کا اچھی طرح نوازا۔

رکن الدولہ"، "شمشیر جنگ" اور" نواب بہادر" کے خطابات کے علاوہ انہیں" مزید جاگیریں عطا کیں اور اپنے مشیران میں شامل کرلیا۔ان کے انتقال کے بعد سرکاری خطابات ان کے بڑے بیٹے عظمت علی خان کو مل گئے اور سرکاری منصب بھی بدستور قائم رہا۔ لیکن اولاد سے محرم ہونے کے باعث وہ بہت جلد متاع دینوی سے بیزار ہوگئے ۔ چنانچہ ظاہری جاہ وجلال کو چھوڑ کر اور ذاتی جائیداد نیک کاموں کے لیے وقف کرکے وہ ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہوگئے۔ حکومت نے ان کے اعزازات وخطابات ان کے چھوٹے بھائی نواب رستم علی خان کو تفویض کر دیئے۔نواب رستم علی خان نہ صرف جائداد بلکہ خاندانی روایات کے بھی جائز وارث ثابت ہوئے۔ انھوں نے آباواجداد کی طرح خدمتِ خلق میں اس طرح حصہ لینا شروع کیا کہ ان کی شہرت کرنال اور سہارنپور کے محدود دائرے سے نکل کر سارے شمالی ہند میں پھیل گئی، ان کے ہاں نواب زادی محمودہ بیگم سے چار بیٹے ہوئے، سجاد علی خان

لیاقت علی خان، خورشید علی خان اور صداقت علی خان۔ لیاقت علی خان یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے۔

معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد (پیدائش ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء وفات ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء)، کا تعلق خاندان حسین پور ضلع مظفر نگر سے تھا، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ) خاندان حسین پور سے تعلق رکھتے ہیں ضلع مظفر نگر ان

کا آبائی شہر ہے۔ جناب مبشر احمد واحدی صاحب جن میں ادبی ذوق بدرجہ اتم پایا جاتا ہے انھوں نے خاندان واحدی کا نسب نامہ (شجرہ) بھی مرتب فرمایا۔اس کے علاوہ مضامین کا مجموعہ بعنوان ''تمنائے نا تمام'' ۱۹۹۸ء (۶) میں شائع ہوا کا تعلق بھی مظفر نگر سے ہے۔معروف شاعر احسانؔ دانش جو شاعر مزدور بھی کہلاتے ہیں مظفر نگر سے تعلق رکھتے تھے،آپ اسی ضلع کے شہر کاندھلہ میں ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے اور ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔احسانؔ دانش کے خاندان کا تعلق تو ضلع میرٹھ کے شہر باغپت سے تھا لیکن ان کے والد قاضی دانش علی نے باغپت کو خیر باد کہہ کر ضلع مظفر نگر کے شہر کاندھلہ میں سکونت اختیار کر لی تھی،احسان دانش نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ ''میں قصبہ کاندھلہ مظفر نگر (یو پی) میں ایک مزدور کے گھر پیدا ہوا۔ کاندھلہ کی سرزمین علم نوازی' اور ادب پروری کے لحاظ سے تاریخی اور مشہور جگہ ہے۔چناں چہ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولانا روم کے ساتویں دفتر کا شاعر اسی خاک پاک سے اٹھا تھا۔ اور آج تک برابر یہاں سے علمی چشمے پھوٹتے رہے ہیں''۔تابشؔ صدانی معروف نعت گو شاعر، جن کے نعتیہ مجموعے 'برگ ثنا'، 'مرحبا سیدی' کے علاوہ کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔آپ کے والد بزرگوار محترم خلیل احمد صدانی بھی شاعر تھے آپ کا مجموعہ کلام 'گلزار خلیل' کے عنوان سے جناب تابش صدانی نے ہی مرتب کیا۔ ہندوستان کے ضلع مظفر نگر سے تعلق رکھتے ہیں۔معروف ادیب،افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی کا وطن بھی تھانہ

بھون مظفر نگر تھا۔

رقم الحروف کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کی ایک ایسی مردم خیز خطے سے ہے جس کا نام ہندوستان کے جغرافیہ میں 'مظفر نگر' کے نام سے معروف ہے۔اس سرزمین نے علماء دین، صوفیائے اکرم اور فقہا اسلام کو جنم دیا، اہل دانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ،اعلیٰ منتظمین، معلّمین ، منصفین و مصنفین پیدا کیے ہیں ، جن کے خیالات اور تصنیفات سے ہمارے کتب خانے مالا مال ہیں ۔ان کی خدمات کو عالمی سطح پر معتبر حیثیت حاصل ہے ۔ ان نامور شخصیات نے برصغیر پاک وہند میں علم وادب، اسلامی علوم۔ تہذیب و ثقافت پر گہرے نقوش
چھوڑے ہیں۔ کبھی میں نے عرض کیا تھا ۔

مظفر نگر تری عظمت کو سلام
کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تو نے

مارگریٹ من: کیٹلاگ سازی کی عالمی شہرت یافتہ استاد و مصنفہ

لائبریری سائنس کی عالمی شہرت یافتہ لائبریرین، استاد، محققہ و مصنفہ مسیز مارگیرٹ من کو ''آسٹریلین لائبریری جرنل'' نے بیسویں صدی کی سب سے زیادہ منفرد لائبریرین قرار دیتے ہوئے اس کی علمی خدمات کو سنہرے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ ''من'' ۹ اپریل ۱۸۷۳ء میں امریکہ کے ایک قصبہ 'لوا' (LOWA) میں پیدا ہوئی۔ شیکاگو کے اینگل وڈ ہائی اسکول سے ۱۸۹۳ء میں گریجویشن کیا۔ کیتھرائن شارپ کے مشورہ پر ''من'' نے آرمور انسٹی ٹیوٹ، شگاگو (Armour Institute, Chicago) کے شعبہ لائبریری اکانومی (Library Economy) سے لائبریری سائنس کی تعلیم کا آغاز کیا۔ آرمور انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۳ء کے درمیان قائم ہونے والے چار لائبریری اسکولوں میں سے ایک تھا اور مغرب کے درمیان میں پہلا لائبریری اسکول تصور کیا جاتا تھا۔ امریکہ میں لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا آغاز جسٹن ونسر (Justin Winsor)، ولیم فیڈرک پول (William Frederick Poole) اور میلول ڈیوی (Melvil Dewey) کے سات نکاتی پروگرام سے ہوا۔ اس منصوبے کا اصل خالق میلول ڈیوی تھا۔ طویل جدوجہد کے بعد ڈیوی ۱۸۸۷ میں کولمبیا یونیورسٹی میں ''اسکول آف لائبریری اکانومی'' (School of Library Economy) شروع کرنے میں کامیاب ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں

ڈیوی کا یہ اسکول البانی کے مقام پر نیویارک اسٹیٹ لائبریری میں منتقل ہوا اور (New York State Library School) کہلایا۔ ڈیوی بدستور اس کا سربراہ رہا۔ امریکہ کے دیگر شہروں میں قائم ہونے والے لائبریری اسکولوں میں پراٹ انسٹی ٹیوٹ (Pratt Institute) ۱۸۹۰ء، ڈریکسل انسٹی ٹیوٹ (Drexel Institute) ۱۸۹۲ء، آرمور انسٹی ٹیوٹ، شکاگو (Armour Institute, Chicago) ۱۸۹۳ء میں قائم ہوا یہ اسکول ۱۸۹۷ء میں ایلونائے یونیورسٹی (University of Illinois) منتقل ہو گیا۔

مارگریٹ من نے ۲۰ برس کی عمر میں آرمور انسٹی ٹیوٹ، شکاگو (Armour institute, Chicago) کے شعبہ لائبریری اکانومی (Library Economy) سے لائبریری سائنس کی ابتدائی تربیت حاصل کی اور اس سند کی بنیاد پر اسے ''کیٹلاگر'' کی حیثیت سے ملازمت بھی مل گئی۔ 'من' نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے اسی انسٹی ٹیوٹ میں سال دوم میں داخلہ حاصل کرلیا 'من' شروع ہی سے ذہین اور محنتی واقع ہوئی تھی، اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے آرمور انسٹی ٹیوٹ کی انتظامیہ نے اسے انسٹی ٹیوٹ میں تدریس کی پیش کش کی جسے 'من' نے قبول کرلیا، اس طرح وہ لائبریری کے عملی کاموں کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی تعلیم دینے لگی۔ ۱۸۹۶ء میں 'من' یونیورسٹی آف وسکنسن (University of Wisconisn) میں بھی لائبریری سائنس کی استاد مقرر

کے (University of Illinois) ہوئی۔ ایک سال بعد ہی اسے الینائے یونیورسٹی
اسٹیٹ لائبریری اسکول میں استاد کی حیثیت سے پڑھانے کا موقع ملا اس وقت اسکول کی
ڈائریکٹر کیتھرائن شارپ (Katharine Sharp) تھیں۔ الینائے میں من تدریس کے
ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے کتب خانے کے شعبہ کیٹلاگنگ کی نگرانی بھی کرتی رہی۔ ۱۹۰۰
ء میں اس لائبریری کو اسٹیٹ لائبریری کا درجہ حاصل ہوا اور مارگیٹ من شعبہ
کیٹلاگ کی سربراہ مقرر ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں وہ کارنیگی لائبریری، پٹسبرگ
(Carnegie Library of Pitsburgh) کے شعبہ کیٹلاگ سازی کی سربراہ مقرر
ہوئی اور اس نے کتب خانے کا درجہ بند کیٹلاگ طباعت کے لیے مرتب کیا، یہ کیٹلاگ
اپنی نوعیت کا منفرد کیٹلاگ تھا جو طویل عرصہ تک ایک اہم حوالہ جاتی ماخذ کے طور پر
استعمال ہوتا رہا، اس دوران 'من' باقاعدگی کے ساتھ لائبریری اسکول میں کیٹلاگ
سازی کی تعلیم بھی دیتی رہی۔ 'من' کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو رہا تھا، کیونکہ وہ
لائبریرین ہونے کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی تدریس سے بھی منسلک تھی۔
ساتھ ہی تحقیق کی جانب بھی مائل تھی۔ لائبریری میں عملی کام کرنے اور ایک استاد کی
حیثیت سے تدریسی امور کی انجام دہی نے اس کی تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں کا جلا بخشی۔
۱۹۲۳ء میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے پیرس میں ایک لائبریری اسکول قائم کیا
تو 'من' اس اسکول سے منسلک ہو گئی، 'من' ۱۹۲۶ء میں امریکہ واپس چلی گئی۔ مشیگن
یونیورسٹی میں William Warner Bishop نے ایک لائبریری اسکول قائم کیا ہوا تھا،
بشپ اور من

پہلے ہی آر مور اسکول میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کر چکے تھے جس کے باعث 'من'
اس اسکول سے منسلک ہو گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب 'من' کو کیٹلاگ سازی کے ایک
استاد اور ماہر کیٹلاگ سازی کی حیثیت سے بین القوامی حیثیت حاصل ہوچکی تھی۔

مارگریٹ من نے پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ لائبریرین شپ کے
پیشہ سے منسلک ہوجانے کے بعد 'من' نے ۱۸۹۶ء میں امریکن لائبریری ایسو سی ایشن
کی رکنیت حاصل کی۔ کیٹلاگ سازی ابتداء ہی سے 'من' کا خصوصی شعبہ تھا (ALA)
چنانچہ ۱۹۱۰ء میں اسے امریکن لائبریری ایسو سی ایشن کے کیٹلاگنگ شعبہ کا سربراہ بنا،
(Committee on Cataloguing Rules for -13 دیا گیا، ساتھ ہی یہ
کی رکن بھی رہی۔ اس کے علاوہ یہ اے ایل اے کی مختلف Small Libraries)
کمیٹیوں سے بھی وابستہ رہی، ۱۹۱۷ء میں ڈیسیمل کلاسیفیکیشن ایڈ دوائزری کمیٹی کی
رکن نامذد کیا گیا، اسی سال اے ایل اے کونسل کی تین سال کے لیے رکن منتخب کی گئی
کی رکن منتخب کیا گیا۔ امریکن (Cataloguing Rules Committee) اور
لائبریری ایسو سی ایشن کے لیے 'من' کی پیشہ ورانہ خدمات کا دائرہ وسیع ہے، جن کے
لیے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مارگریٹ من تحقیق و جستجو سے بھی وابستہ تھی، لائبریری سائنس کے مختلف

موضوعات پر 'من' کے تحریر کردہ مضامین شائع ہورہے تھے، کیٹلاگ سازی اور درجہ بندی 'من' کے خاص موضوعات تھے۔ موضوعی سرخیوں پر بھی 'من' نے تحقیقی کام کیا تھا، اس کی مرتب کردہ موضوعی سرخیوں کی فہرست بعنوان (List of Subject Headings for a Juvenile Catalogue) ۱۹۱۶ء میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے شائع کی یہ اپنے موضوع پر ابتدائی نوعیت کی تحقیق تھی۔ اس فہرست سے مدتوں فیض حاصل کیا جاتا رہا۔ ۱۹۲۶ء میں امریکہ کے بورڈ آف ایجوکیشن برائے لائبریرین شپ نے 'من' کو کیٹلاگ سازی پر سات نصابی کتب کی سیریز تحریر کرنے کی درخواست کی جن کی اشاعت پر ہونے والے اخراجات امریکن لائبریری ایسوسی ایشن (American Library Association, ALA) اور کارنیگی کارپوریشن (Carnegie Corporation) نے برداشت کئے۔ چنانچہ 'من' نے اس منصوبے پر کام کا آغاز کیا اور ۱۹۲۸ء میں اے ایل اے نے (Introduction to Cataloguing and Classification of Books) شائع کی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ 'من' کی تحریر کردہ کیٹلاگ و کلاسیفیکیشن کی کتاب کا دنیا بھر میں پذیرائی حاصل ہوئی، کیٹلاگ سازی پر 'من' کو جو authority حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ 'من' کی تصانیف دنیائے لائبریرین شپ میں بنیادی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ لائبریری سائنس کا شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جو 'من' اور کیٹلاگ سازی پر اس کی تصانیف سے واقف نہ ہو۔

من' ۱۹۳۸ء میں ۶۵ سال کی عمر میں ریٹائر ہو گئی لیکن وہ امریکن لائبریری ایسوسی' ایشن کے کیٹلاگنگ کوڈ کی نظرثانی کمیٹی (ALA's Catalogue Code Revision Committee) کی سرگرمیوں میں ۱۹۴۲ء تک سرگرم عمل رہی، عمر کے آخری حصے میں 'من' کیلی فورنیہ کے قصبہ چولا وستہ منتقل ہو گئی جہاں پر ۲۲ اگست ۱۹۶۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔

(شائع شدہ پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جلد ۳۸، شمارہ ۳، ستمبر ۲۰۰۷ء)

اردو کے خوش فکر ادیب و محقق۔ڈاکٹر رئیس صمدانی

By: Syed Muhammad Asghar Kazmi

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی ان ادیبوں اور محققین میں سے ہیں جو گزشتہ چار دیہائیوں سے اپنی صلاحیتِ فکر، دانشوری، تخلیقی فکر، تصنیفی و تالیفی آگہی سے قلم و قرطاس کی دنیا کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہ ایک خوش فکر ادیب، خوش بیاں مقرر، صحافی، محقق، اپنے موضوع کے معروف استاد، بتیس کتابوں اور ڈھائی سو سے زیادہ تحقیقی و ادبی مضامین کے خالق ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی کے لکھنے کی ابتداء ایک سوانحی مضمون سے ۱۹۷۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ سوانحی مضمون خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہا کی سیرت سے متعلق تھا۔ یہ تحریر ڈاکٹر صمدانی کو شخصیات کی جانب لے آئی اور انہوں نے اپنے بنیادی موضوع لائبریری سائنس کے ساتھ ساتھ شخصیات پر لکھنا شروع کیا۔ سوانح نگاری سے وہ خاکہ نگاری کی جانب مائل ہوئے اور معروف ادبی شخصیات کے خاکے تحریر کیے۔ آپ بیتی، رپورتاژ، سفرنامہ، تبصرہ نگاری ان کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کی ذہانت اور محنت انہیں علمی و ادبی دنیا کی جانب کھینچ لائی۔ لائبریری سائنس پر ان کی متعدد کتابیں اور درجنوں مضامین اخبارات، رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔

صحافی کے حیثیت سے انہوں نے کئی جرائد کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ سہ ماہی رسالے پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل کے ۳۵ سال ایڈیٹر رہے بعد ازاں ۲۰۱۲ء میں چیف ایڈیٹر سے اصولی اختلاف کے باعث رسالے کی ایڈیٹرشپ سے مستعفی ہو گئے۔

جامعہ کراچی کے کتب خانے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں کیا، ۱۹۷۴ء میں کالج کی ملازمت مل گئی اور ۲۳ برس حاجی عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج اور ۱۲ سال گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد میں خدمات انجام دے کر ۲۰۰۹ء میں اسی کالج سے ریٹائر ہوئے۔ کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں کے نگران پروفیسر ہونے کے علاوہ کالج میگزین ''روایت'' کے دو شمارے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے مرتب کیے۔ کالج کی ملازمت سے فارغ ہو کر وہ جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنسز میں ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ ساتھ ہی لکھنے کا عمل جاری و ساری رہا۔ سرگودھا میں انہیں ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر خالد ندیم جیسی علمی و ادبی شخصیات کی دوستی اور قربت حاصل ہوئی جس نے ڈاکٹر صمدانی کی ادبی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کر دیا اور ڈاکٹر طاہر تونسوی، عبدالوحاب خان سلیم، فرخندہ لودھی اور فیض احمد فیض جیسے ادیبوں کے شخصی خاکے ان کے قلم سے منظر عام پر آئے۔ اردو کے معروف ادیبوں اور شعراپر سوانحی مضامین بھی ڈاکٹر صمدانی نے تحریر کیے جن میں بیخود

ہلوی، شیخ محمد ابراہیم آزاد، بہادر شاہ ظفر، جمیل نقوی، حسرت موہانی، احسان دانش، حبیب جالب، فرمان فتح پوری، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر طاہر تونسوی، حکیم محمد سعید، شفیع عقیل اور دیگر اہل علم شامل ہیں۔ جامعہ سرگودھا سے فارغ ہو کر سعودی عرب میں کچھ وقت گزارا آج کل منہاج یونیورسٹی، لاہور کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں پروفیسر اور شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ علامہ اقبال اوپن یونورسٹی میں استاد ہیں۔ اس سال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے آپ کو Best University Teacher Award 2013 سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر صمدانی کا تصنیفی وتالیفی گزشتہ چار دیہائیوں سے جاری ہے۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۷۵ء میں، جب کہ پہلا مضمون ۱۹۷۸ء میں کراچی کے ایک مقامی جریدے میں شائع ہوا۔ دوسری ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد تواتر کے ساتھ کتابوں اور مضامین شائع ہونے کا سلسلہ جاری رہا، ان کی کتابوں کو تعلیمی بورڈ اور ملک کی جامعات کے نصاب میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کی بعض کتابوں کے بیس بیس ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں، لائبریری سائنس کی کسی اور کتاب کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔ سوانح نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر صمدانی کی اولین تصنیف ڈاکٹر عبدالمعید کے حوالے سے تھی جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی، عادل عثمانی، اختر ایچ صدیقی، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزوری پر سوانحی کتب شائع

ہو چکی ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ہندوستان کے ایک نعت گو شاعر 'شیخ محمد ابرہیم آزادؔ' کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے شائع ہوئی ہے۔ سوانح نگاری پر مضامین کی تعداد بے شمار ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی سفر کو خاکہ نگاری کی جانب گامزن کیا اور ان کی اولین شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب ''یادوں کی مالا'' 'الفیصل' پبلشرنے لاہور سے ۲۰۰۹ء میں شائع کی۔ جس میں ۲۵ شخصیات پر سوانحی مضامین شامل ہیں۔ صفِ اول کے ادیب و دانشور، استاد الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ڈاکٹر صمدانی کی اس کتاب پر اپنے رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ''یادوں کی مالا'' لفظی اور معنوی اعتبار سے ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب مشہور قلم کار ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف ہے اور ان کے ذاتی تجربوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف لائبریرین شپ سے متعلق حضرات کے لیے نہیں بلکہ استفادۂ عام کا حق ادا کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تبصرہ نما خاکوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جو کچھ ہے وہ قدر و قیمت میں بلند پایہ ہے۔ صمدانی صاحب ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اب بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔ کتاب بلحاظ زبان و بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا

ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی''۔

ڈاکٹر صمدانی کی خاکوں کی دوسری کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' کے عنوان سے ۲۰۱۲ء میں کراچی سے ' فضلی سنز' نے شائع کی۔ اس کتاب میں زندہ لوگوں کے خاکے بھی ہیں اور ان کے بھی جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صمدانی نے اپنی والدہ مرحومہ کا خاکہ ''میری ماں'' قلم بند کرکے حق فرزندگی ادا کیا ہے۔ جو بقول ڈاکٹر صمدانی ''''اپنے ان تمام خاکوں میں مجھے اپنی ماں کا خاکہ لکھ کر جو اطمینان اور سکون میسر آیا وہ اپنی کسی اور تحریر سے نہیں ملا، ماں جیسی ہستی جب جدا ہو جاتی ہے اس وقت یہ احساس شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے ہماری کس قدر قیمتی شے جدا ہو گئی ہے''۔ انہوں نے اپنا خاکہ بھی '' اپنی تلاش'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے جس میں ان کے بقول انہوں نے '' اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ''۔ یہ خاکہ ہی نہیں بلکہ ان کی مختصر آپ بیتی کہی جا سکتی ہے جس طرح ایک مصور اپنی مہارت اور ہنر مندی سے پینسل کی لکیروں سے کسی بھی شخصیت کے خدوخال کو خوبصورت انداز سے نمایاں کر دیتا ہے اسی طرح ایک لکھاری خاص طور پور خاکہ نویس اپنے موضوع کی شخصیت کے رَنگ رُوپ ، چمک دمک، آب وتاب، رنگ روغن، حتہ کہ چہرہ مہرہ کی ایک ایک کیفیت کو دلچسپ انداز سے اس طرح قلم بند کرتا ہے کہ پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس نے اس شخصیت کو از خود دیکھا اور محسوس کیا ہو۔ ڈاکٹر صمدانی کے لکھے ہوئے خاکے شخصیت کی خوبصورت تصویر

کشتی کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم جو شعبہ اردو، جامعہ سرگودھا کے سینئر استاد ہیں نے ڈاکٹر صمدانی کے بارے میں لکھا ''شیخوپورہ کی علمی و ادبی تنظیم 'دریچہ' کے دوستوں کے بعد سرگودھا میں اگر کسی ادبی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تو وہ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی ہیں۔ ان کی رفاقت میرے لیے اس قدر خوش گوار تھی کہ سرگودھا مجھے اپنے شہر کی طرح محسوس ہونے لگا۔ایک شریف النفس انسان سے مل کر مَیں نہ صرف خوش ہوا، بلکہ مجھے یوں محسوس ہوا، مَیں ایک مدتوں سے جس پُرخلوص انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، ڈاکٹر طاہر تونسوی کے توسط سے آج مجھے وہ مل گیا ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے اپنے تخلیقی سفر کو بتدریج طے کیا ہے اور اب وہ اس صنف کی اس منزل پر ہیں، جہاں خاکہ نگاری میں ان کا رنگ اپنی انفرادیت کا اظہار کرنے لگا ہے۔ وہ اپنی نستعلیق شخصیت کی بدولت شگفتہ سنجیدگی کو اپنانے پر مجبور ہیں، چنانچہ ان کی تحریروں میں روانی، سادگی، بے ساختگی اور لطافت کا پایا جانا فطری امر ہے۔ ابھی ان کی صورت میں مشرق کی آنکھ میں کچھ روشنی باقی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق بات کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کرتے'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صمدانی کے خاکوں میں سوانحی معلومات بھی ہیں اور خاکہ نگار کا تخلیقی لمس بھی۔ ان کے مطالعے سے قاری کو صرف شخصیت کے ماہ و سال سے آشنائی ہوتی ہے، بلکہ بعض

مواقع پر خاکہ نگار کے لب و لہجے اور تاثرات کی مدد سے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں اپنے ہر موضوع کے بارے میں وہ کچھ لکھ دیا ہے، جو حقیقت ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے روزمرہ باتوں اور واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور محض اسلوب کا جادو جگانے کے بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کی تحریر کی خصوصیت بھی ہے اور ہمارے بعض ادیبوں کے لیے باعثِ تقلید بھی''۔

ڈاکٹر صمدانی کے طویل ادبی، تصنیفی و تالیفی سفر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مقصد کے حصول کی لگن کیا ہوتی ہے اور یہ کہ محنت، لگن، متانت اور سنجیدگی سے کیا ہوا انسان کا عمل اُسے معاشرہ میں با عزت کرتا ہے۔ وہ طبعاً کم گو ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ، انعام و اکرام کی خواہش سے مبّرا ہو کر اپنے کام میں لگے رہے، لکھتے رہے اور چھپتے رہے، یہی ان کی زندگی کی متاع اور انعام و اکرام ہے۔ انہوں نے اس طویل سفر میں جو ادب تخلیق کیا وہ معیار و مقدار کے اعتبار سے قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ اردو ادب کے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈاکٹر صمدانی کو درویش صفت انسان قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے باوجود ادب اور ادیبوں، قلم اور اہل قلم، علم اور اہل علم سے رشتہ استوار رکھا اس کا اظہار دوستوں پر محبت کی روشنائی سے تحریر کردہ

خاکوں سے ہوتا ہے۔ 'یادوں کی مالا' کے بعد اب 'جھولی میں ہیرے اور موتی'
خاکوں کا تازہ مجموعہ پیش ہے جو دس خاکوں ، اپنے بارے میں ایک مضمون ، ماضی کی
یادوں کے حوالہ سے دو مضامین اور ایک رپوتاژ پر مشتمل ہے۔ یہ ہیں وہ ہیرے اور
موتی جن سے اس درویش صفت انسان کی جھولی بھری ہے۔ اس میں میرے ان دو
عزیز دوستوں ڈاکٹر طاہر تونسوی اور عبد الوہاب خان سلیم کے خاکے بھی شامل ہیں۔
ان کی محبت سرمایہ حیات ہے۔ ان کے علاوہ فیض احمد فیضؔ ڈاکٹر عبدالسلام، عبد الستار
ایدھی کے خاکے بھی ہیں رئیس صمدانی صاحب نے والدہ محترمہ کا خاکہ بھی قلم بند کیا ہے
۔فرزندگی کے اسلوب میں۔مجھے یقین ہے کہ شخصیت اور شخصیت نگاری سے دلچسپی رکھنے
والے خوش ذوق قارئین سے یہ کتاب داد کے ہیرے اور تحسین کے موتی حاصل کرے
گی''۔

۲۰۱۲ء سے ان کے مضامین روزنامہ جنگ کے سنڈے میگزین اور مڈویک میگزین میں
شائع ہورہے ہیں۔ ان میں مضامین میں ''میں کیوں لکھتا ہوں،پیکر الفت، ملنسار مسیحا
حکیم محمد سعید: نام ہی نہیں ، عمل کے بھی سعید تھے ہم سے بچھڑے ۱۴برس بیت
گئے،ایک رشتہ: جس نے دنیا میں صرف میری آواز سنی اور۔۔، مَولِدُالنّبی ﷺ:
حضرت محمد ﷺ اس مبارک گھر میں پیدا ہوئے، اب یہاں ''مکتبۃ مکۃ
المکرمۃ'' (لائبریری) قائم ہے، ادب' روبہ زوال نہیں ہوسکتا! اہل قلم متحرک ہیں
اور ادب تشکیل پر رہا ہے، شاعرِ عوام' حبیب جالب کی مزاحمتی

شاعری ایسے دستور کو' صبح بے نور کو' میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا انھوں نے ہر آمر وقت کے سامنے کلمہ حق بلند کیا، جس کی پاداش میں زندگی بھر آزمائشوں سے گزرے، کتاب حاضر، قاری غائب: کمپیوٹر اسکرین کسی طور مطبوعہ نگارش کا متبادل نہیں'۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق :انھوں نے اردو کی ترویج کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں، بہترین مبصر 'لوک داستانوں کے امین۔ شین عین رخصت ہوئے، سلام: ایک مسنون عمل، اسلام کا بنیادی شعار، یہ معاشرے میں امن وسلامتی کے فروغ کا اہم اور مؤثر ذریعہ ہے، اردوادب میں دیباچہ نگاری کی روایت۔ تقریظ صرف ثنائی نہیں ، اصلاحی بھی ہونی چاہیے، تَبصِرَہ نگاری ادب کی منفرد صنف اور یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے۔۔ میری ماں بطور خاص شامل ہیں۔ ان سے قبل بھی ان کے مضامین روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ مقدمہ اور روزنامہ جنگ میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۰۱۳ء میں ان کے مضامین کی اشاعت نے ایک نئی جہت اختیار کی اور ان کے مضامین اردو کی ایک معروف اور سب سے زیادہ دیکھی اور پڑھی جانے والی ویب سائٹ ''ہماری ویب (Hamariweb) پر آن لائن ہونا شروع ہوئے ۔اب تک ان کے تقریباً ۸۰ مضامین ہماری ویب پر ان لائن ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں پہلے سے شائع شدہ مضامین بھی ہیں اور نئے لکھے گئے مضامین بھی ان مضامین کو ویب سائٹ

http://www.hamariweb.com/articles/userarticles.aspx?id=11511 پر پڑھا

جا سکتا ہے۔

سعودی عرب کے شہر جدہ میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اپنی تحریر کو ایک نیا رنگ دیا اور کئی مضامین سفر نامہ کی صورت میں تحریر کیے۔ جن میں ''سعودی عرب کے شہر جدہ کی 'پانی پر تیرتی مسجد'، جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین، مکہ لائبریری۔ سعودی عربیہ میں ایک دن، اماں حوا کے شہر جدہ کا پاکستان انٹر نیشنل اسکول حب الوطنی اور پاکستانیت کی اعلیٰ مثال اور دیگر مضامین شامل ہیں۔ انہوں نے رپورتاژ، آپ بیتی ''اپنی تلاش'' کے عنوان سے لکھی، اپنے والد اور اپنی ماں پر بھی مضامین تحریر کیے۔ جامعہ سرگودھا میں رہے تو وہاں کی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا اور ایک مضمون ''دال' جھال چکیاں (سرگودھا) دی' تحریر کیا جو ہماری ویب پر آن لائن ہے۔ کتابوں پر اظہار خیال یا تبصرے بھی کیے۔ بے شمار کتابوں پر ان کے تبصرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تبصرہ نگاری پر ان کا مضمون روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر صمدانی نے جامعہ کراچی سے سیاسیات اور لائبریری سائنس میں ماسٹر اور جامعہ ہمدرد سے سوشل سائنسز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ حکیم محمد سعید پر ڈاکٹر صمدانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے محقق ہیں ادب کی مختلف اصناف پر ڈاکٹر صمدانی کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں ان میں تنقید و

تحقیق ان کے خاص موضوعات رہے، تاریخی موضوعات سے انہیں خاص دلچسپی رہی ہے۔

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کے آباؤاجدا کا تعلق ہندوستان کے ضلع مظفر نگر سے ہے۔ شاعر مزدور احسان دانش کا وطن بھی مظفر نگر ہی تھا۔ بقول ڈاکٹر طاہر تونسوی 'یہی وجہ ہے کے ڈاکٹر صمدانی، احسان دانش کی طرح محنتی، واقعات و مناظر کی تصویر کشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے والے لکھاری ہیں'۔ ڈاکٹر صمدانی ایک شاعر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان کے کئی احباب صاحب

دیوان شاعر گزرے ہیں۔ انہیں شاعری وراشت میں ملی ہے۔ اپنی اسی خصوصیت کا ذکر انہوں نے اپنے اس شعر میں اس طرح کیا ہے ۔

ہو کیوں نہ ناز مجھے سخنوری پہ رئیسؔ

میرے ہی اجداد کا ورثہ ہے جو مجھے ملا ہے

ڈاکٹر صمدانی پنجاب کے شہر میلسی میں پیدا ہوئے لیکن ان کی پوری زندگی شہر کراچی میں گزری۔ اپنی جنم بھومی کے بارے میں ان کا ایک شعر اس طرح ہے۔

میلسی ہے ایک شہر، پانچ دریاؤں کی سرزمین پر

میں ہوں رئیسؔ اُسی آسماں کا ایک ستارہ

شاعری ان کے مزاج کا حصہ ہے لیکن انہوں نے شاعری کو اپنی پہچان نہیں بنایا۔ شعر کہے لیکن ضرورت کے وقت ۔ وہ اپنے آپ کو مشاعروں کا شاعر بھی نہیں کہتے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کی شاعری آورد ہے آمد نہیں۔ شاعری کا آغاز کب ہوا یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ اُن کی غزلیں، نظمیں اور قطعات مختلف جگہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا رجحان حمد و نعت نگاری کے جانب زیادہ ہے۔ اس کی وجہ ان کے آباؤ اجداد کا نعت گو شاعر ہونا ہے۔ سماجی اور معاشرتی موضوعات پر انہوں نے زیادہ توجہ دی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے

متعدد بار عمرہ کی سعادت نصیب فرمائی ۔ خانہ کعبہ پر حاضری کے موقع پر کہا ۔

مانگنے تو بہت کچھ گیا تھا، پر ہوا عجب حال
تھے اشک جاری ، اندر تھا ایک طلاطم برپا
سوچتا ہی رہا کروں پیش اپنی سیاہ کاریاں
نہ دل نے دیا ساتھ نہ زباں پہ ہی کچھ آسکا

اسی حوالے سے ان کے یہ اشعار ان کے اندر کی کیفیت کا اظہار اچھی طرح کرتے ہیں ۔

کچھ ایسی تصویر بس گئی ہے دل میں کعبہ شریف کی

آنکھوں میں ہر دم رہتی ہے تصویر کعبہ شریف کی
پیاس بجھی ہے، نہ بجھے گی یہ تو ہے مجھے معلوم
پھر بھی اک چاہت سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی

روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے احساسات کو منظوم میں اس طرح بیان کیا ہے

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پاگیا ہوں
کہاں میں بے کس و بے نوا کہاں میرا نصیب
مدینہ کی فضاء میں شفاء پاگیا ہوں
تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب
جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پاگیا ہوں
نگاہیں کیسے ہٹتیں رئیسؔ روضے کی جالیوں سے
برسوں کی پیاس کا احساس پاگیا ہوں

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

رفتگانِ عہد کو یاد رکھنا چاہتا ہوں
ہے یہ ایک فرض سو نبھانا چاہتا ہوں
زندگی کے سفر میں جو ہوا حاصل رئیسؔ
زندگی کو بہ احترام لوٹانا چاہتا ہوں

حصول علم ہے ہر ایک کام سے بہتر
دوست نہیں ہے کوئی کتاب سے بہتر
صاف گوئی بھی کیا بلا کی چیز ہے رئیسؔ
کر دیتی ہے اپنو کو بھی پرایا پل بھر میں
خوف نہیں زرا بھی فشار کا مجھے رئیسؔ
ہے زمیں کو معلوم کہ نبیؐ کا عاشق ہوں میں
کاتبِ اعمال کے خوف سے کانپ جاتا ہوں
سوار کاندھوں پہ ہر دم مصروفِ کار ہیں وہ
پاتا نہیں ہوں حوصلہ جو ثناء اُس کی لکھوں
پر سخن وروں کا یہ بھی دستور رہا ہے
مَیں بھی عاشق ہوں رئیسؔ حسان بن ثابت کا
پر ان جیسی نبیؐ سے محبت کہاں سے لاؤں

شکریہ کے عنوان سے ڈاکٹر صمدانی کے یہ اشعار دیکھئے ۔

مرقد تک میرے ساتھ آنے والو تمہارا شکریہ
میری خاطر زحمت اٹھانے والو تمہارا شکریہ
ہے اب جو سفر باقی کرلیں گے وہ تنہا ہی ہم
حوصلہ بڑھا کر لحد تک پہنچانے والو تمہارا شکریہ
اگلا پڑاؤ ہے کٹھن اور رستہ بھی ہے اڑچن اڑچن
مغفرت کی دعا دینے والو تمہارا شکریہ
منزل اب قریب ہے سوال و جواب کی
کٹھن وقت میں ساتھ نبھانے والو تمہارا شکریہ
بنا تھا جس خاک سے رئیسؔ آ پہنچی ہے منزل پہ وہ
مٹھی بھر خاک نچھاور کرنے والو تمہارا شکریہ

ڈاکٹر صمدانی کے اس شعر پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین

یوہی کبھی کسی دن اچانک کام تمام ہوگا میرا
دیکھتے ہی رہ جائیں گے احباب حال میرا

جامعہ شاہ عبدالعزیز لائبریری جدہ میں ایک دن

سعودی عرب کے بجٹ میں تعلیم پر بیس فیصد رقم رکھی گئی ہے اس سے بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سعودی عرب تعلیم کا کس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ سعودی عرب کے تقریباً صوبوں میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے جن میں کالج اور جامعات شامل ہیں قائم ہیں ۔ان میں ریاض، مدینہ، مشرقی صوبہ، صوبہ آسر، القاسم، جیذان، ہیل، مخزان، تبوک اور نار تھرن باڈر شامل ہے۔ سب سے زیادہ جامعات صوبہ ریاض میں ہیں۔ جدہ میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کا قیام ملک شاہ الفیصل کے دور حکومت میں ۱۹۶۷ء میں عمل میں آیا۔ اسلامی شعار کے مطابق جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ کے دو کیمپسز ہیں ایک طالبات (خواتین) کے لیے دوسرا مردوں کے لیے۔ دونوں کیمپسز ساتھ ساتھ ہیں لیکن دونوں کے تمام تر انتظامی اور تعلیمی امور علیحدہ علیحدہ انجام پاتے ہیں۔ جامعہ عبدالعزیز جدہ کے اہم اور خوبصورت علاقے ''رحاب'' میں ایک وسیع و عریض قطعہ زمین پر واقع ہے۔ اس کے مغربی سمت مکہ روڈ ہے جو جدہ ائر پورٹ، مدینہ منورہ سے مکہ کی جانب جارہی ہے۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۳ء کی صبح مَیں اپنے بیٹے کے ہمراہ جامعہ کی حدود میں داخل ہوا۔ مجھے جامعہ کے مرکزی کتب خانے جانا تھا۔ اس سے قبل جامعہ کے مختلف شعبہ جات جو ایک دوسرے سے دور دور ہیں دیکھتا رہا۔

جامعہ میں مرکزی کتب خانے کی تلاش

میں ہم جامعہ میں اس طرح دوڑ رہے تھے کہ جیسے ہم جدہ سے مکہ جارہے ہوں۔ جامعہ میں ٹریفک کی صورت حال کچھ ایسی تھے کہ جیسے لوگ جوق در جوق اپنے کام کا اپنی اپنی گاڑیوں میں رواں دواں ہوں۔ کافی تلاش اور گھوم پھرنے بعد ہمیں جامعہ کے مرکزی کتب خانے کی عمارت مل گئی۔

جامعہ میں تقریباً علوم و فنون کی تعلیم کا اہتمام ہے۔ یہ جامعہ سعودی عرب میں قائم بے شمار جامعات کی ماں بھی ہے۔ وہ اس طرح کے ابتداء میں اس جامعہ کے کیمپسیز مختلف شہروں میں کھولے گئے بعد میں انہیں مکمل جامعہ کا درجہ دے دیا گیا۔ جامعہ کے موجودہ صدر پروفیسر اوسامہ ایس طیب ہیں۔ خواتین کے شعبے میں جانا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا یہاں صرف مردو کے حصے کا حال ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں شعبہ جات میں ایک جیسی سہولتیں فراہم ہیں۔ عمارات بھی ایک جیسی بنائی گئیں ہیں۔

جامعہ کا مرکزی کتب خانہ

جامعہ کے مرکزی کتب خانے کی عمارت بہت بڑی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کتب خانے کی ایک اور عمارت بن چکی ہے یہ کتب خانہ جلد اس عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔ سعودی عرب میں سب بڑا مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جامعہ میں طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں یہاں عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی

فراوانی سے بولی جارہی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کتب خانے کی عمارت کی تلاش میں ہمیں کئی جگہ رک کر معلوم کرنا پڑا زیادہ تر لوگ عربی ہی بول رہے تھے کچھ نے انگریزی میں بھی بات کی۔ تلاش کے بعد آخر کتب خانہ کی عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ جامعہ میں جس قدر گھومے ہیں میرا تو خیال تھا کہ آج ناکام ہی لوٹنا پڑے گا۔ لیکن میرا بیٹا عدیل بڑی تگ و دو کے بعد آخر کامیاب ہوگیا اور ہم کتب خانے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ یہاں یہ خیال ذہن میں تھا کہ کوئی نہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی ضرور مل جائے گا اس سے آسانی ہوجائے گی۔ ایک نچلی سطح کا کارندہ نظر آیا ظاہری کیفیت بتا رہی تھی کہ یہ بنگلہ دیش سے تعلق رکھتا ہے۔ رابطہ کرنے پر ہمارا خیال درست ثابت ہوا جب اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہاں لائبریری میں دو پاکستانی کام کرتے ہیں ایک چھٹی پر گیا ہوا ہے دوسرا وہ سامنے آخر میں جاکر دائیں جانب والے حصے میں بیٹھتے ہیں۔ میں عدیل کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ گیٹ میں داخل ہوئے چاروں جانب سعودی سفید پوشاک میں اپنی اپنی میزوں پر کام کر رہے تھے۔ انتہا یہ دائیں جانب کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے ایک ایسی شکل نظر آئی جو پاکستانی ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ چہرے مہرے سے پاکستانی لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل کو اطمیان ہوا۔ ہم بغیر ادھر ادھر دیکھے سیدھے ان کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھا اور ہماری جانب دیکھ رہے تھے سمجھ گئے تھے کہ یہ دونوں اشخاص پاکستانیت شناخت لیے ہوئے ہیں میری ہی تلاش میں ہیں۔ ہم ان کے سامنے

اور وہ ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ سلام اور مصافحہ کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ گورا رنگ، لمبا قد، مناسب جسم، کشادہ پیشانی اوپر کی جانب، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، چوڑا سینہ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، چشمہ لگا ہوا، اونچی ناک جس کے نیچے سپاٹ میدان یعنی داڑھی موچھ صاف، سر پر کچھ کچھ چاندی نمایاں، سنجیدہ طرز گفتگو، طبیعت میں شائستگی اور مٹھاس، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔ یہ تھے جناب محمد رفیق جو جامعہ کے کتب خانے گزشتہ بیس سال سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت یہ کتب خانے کے شعبہ کیٹلاگ سازی میں کام کر رہے ہیں۔ بیٹے کو آفس جانا تھا چنانچہ وہ ان سے مجھے متعارف کرا کے رخصت ہوا۔ جاتے جاتے رفیق صاحب کا موبائل نمبر بھی لیا لگ رہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے لیے متفکر ہے۔ راستے میں بھی پوچھتا رہا کہ آپ واپس کیسے جائیں گے۔ ٹیکسی والے کو اپنا ایڈریس اچھی طرح بتایئے گا۔ گھر کا ایڈریس لکھ کر اپنی اوپر والی جیب میں رکھ لیں وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کی ان باتوں پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ مجھے یہ ایک کیئرنگ چائلڈ لگا۔ والدین کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے اپنی اولاد کے اچھے رویے، خیال کرنے والے طرز عمل کی چاہت ہوتی ہے۔ بصورت دیگر وہ ان تمام مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں جن سے ان کی اولاد گزر رہی ہوتی ہے۔ بچے خیال کرنے والے ہوں تو والدین کی بڑھاپے کی زندگی میں اطمینان اور سکون غالب آ جاتا ہے۔ اگر صورت حال اس کے

برعکس ہو تو ضعیف اور ناتواں زندگی اور بھی ضعف اختیار کرلیتی ہے۔ جینا تو ہر دو صورتوں میں ہوتا ہی ہے۔ بات کہی اور نکل گئی ۔ عدیل نے خدا حافظ کہا اور وہ اپنے آفس کے لیے روانہ ہوا۔

رفیق صاحب کو جب مَیں نے اپنا نام بتایا اور وزیٹنگ کارڈ دیا تو گویا ہوئے کہ آپ کا نام سنا ہے۔ اب ہم اور وہ آمنے سامنے تھے۔ ابتدائی گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق پنجاب سے ہے جامعہ پنجاب سے ۱۹۸۲ء میں لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ ایک ایم برطانیہ سے بھی کیا۔ میرے دو دوستوں ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر خالد ندیم کے گاؤں شرق پور سے ہے جو شیخوپورہ کی ایک تحصیل ہے۔لاہور میں قائد اعظم لائبریری میں کام کیاپھر یہاں جامعہ عبد العزیز جدہ کے کتب خانے میں آگئے اور تاحال یہیں ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس کتب خانے میں ڈاکٹر ممتاز انور بھی کئی سال رہے۔ڈاکٹر انیس خورشید کے بھائی بدر الدین خورشید بھی اس کتب خانے سے منسلک رہے۔ میں نے رفیق صاحب کو بتایا کہ میں وزٹ ویزا پر جدہ تیسری بار آیا ہوں ، اپنا سفر نامہ مکمل کرنا چاہتا ہوں اس سلسلے میں جامعہ عبد العزیز جدہ کے کتب خانے کے بارے میں معلومات چاہتا ہوں۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیات ترک کرکے میرے ساتھ ہولیے۔ جہاں ہم بیٹھے تھے شعبہ کیٹلاگ سازی تھا۔ خاصہ بڑا حال چارو جانب سعودی اپنی اپنی میزوں پر سر جھکائے کام میں مصروف تھے۔ ایک دو جگہ گفتگو بھی ہورہی تھی۔ ہر

میز کتابوں سے لدی ہوئی تھی۔ ابتدا کتب خانے کے ڈین لائبریری افیئر سے ملاقات سے ہوئی۔ ڈاکٹر نبیل عبداللہ کمشانی کتب خانے کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے اسی جامعہ سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ رفیق صاحب نے تعارف کرایا۔ نشست سے اٹھ کر ملے، خوش ہوئے، یہ جان کر زیادہ خوش ہوئے کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ رفیق صاحب سے اشارہ کیا کہ انہیں کتب خانے میں جاب دے دی جائے۔ رفیق صاحب نے ڈاکٹر کمشانی کو بتایا کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں، میری عمر بھی دریافت کی، اب سعودی قانون کے مطابق مشکل ہے۔ میں خود بھی ملازمت کا خواہش مند نہیں تھا ان کی اس پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت چاہی۔ جناب سمیر رملی عبدالغنی فلیبان سے ملاقات ہوئی جو ڈائریکٹر ہیں ٹریننگ وڈیولپمنٹ کے۔

اب ہم کتب خانے کے دیگر شعبہ جات میں گئے۔ شعبہ فنی خدمات حصول کتب، کیٹلاگ سازی اور درجہ بندی پر مشتمل ہے۔ درجہ بندی کے لیے میلول ڈیوی کی اسکیم پر عمل ہوتا ہے۔ کیٹلاگ سازی جدید طریقہ پر کی جارہی ہے۔ کمپیوٹر پر تمام ریکارڈ موجود ہے۔ شعبہ حوالہ جاتی خدمات OPAC مرتب کیا جاتا ہے۔ آن لائن کیٹلاگ جدید ماخذات سے آراستہ ہے۔ گفٹ اور تبادلہ کا شعبہ بھی ہے۔ کتب خانے کا خصوصی ذخائر کا شعبہ بہت اہم اور وسیع ہے۔ یہاں کے سربراہ نے ہمیں بہت ہی تفصیلات سے شعبہ کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس شعبے میں رسائل وجرائد

کا شعبہ بھی ہے۔ سعودی عرب کی اہم معروف علمی شخصیات نے جو کتب عطیہ کیں انہیں بھی اس شعبہ میں بہت عمدہ طرقے سے رکھا گیا ہے۔ ان میں عبد اللہ افیصل کا ذخیرہ، شیخ محمد نصیف کا ذخیرہ کتب، حسن احمد بھکلی کا ذخیرہ کتب اور محمد السنوسی کا ذخیرہ کتب شامل ہے۔ یہاں مخطوطات کا شعبہ بھی ہے جہاں قدیم مخطوطات کو شیشے کے شوکیسوں میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ سمعی و بصری مواد بھی اس شعبہ کا حصہ ہے۔ کتب خانے میں ایک شعبہ فوٹو کاپی خدمات کا بھی ہے۔ اس کت علاوہ انٹرنیٹ لیب موجود ہے جہاں طلباء کو نیٹ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ کتب خانے کی کتب دو حصوں میں منقسم ہیں انگریزی کتب اور عربی کتب۔ شلف پر ڈیوی اسکیم کے درجہ بندی نمبر نمایاں طور پر درج ہیں۔ کتب خانے کا تفصیلی مطالعہ کرکے دل خوش ہوا۔ اس بات کی بھی خوشی ہوئی کہ کتب خانے کو جدید طرز پر قائم کرنے میں جہاں سعودی حکومت کا اہم کردار ہے وہاں پاکستانیوں کی بھی کچھ محنت، توجہ اور لگن شامل حال ہے۔

کنگ فہد پبلک لائبریری

اماں حوا کے شہر جدہ میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ۔ مدرس، اسکول، کالج اور جامعات شہر کی خصوصیت شمار ہوتے ہیں۔ البتہ عوامی کتب خانوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ کنگ فہد پبلک لائبریری کا افتتاح شاہ عبد اللہ بن عبدالعزیز نے ۲۷ فروری ۱۹۸۷ء کو کیا تھا۔ یہ لائبریری اپنی نئی عمارت میں از سر نو شروع

ہونے والے ہے۔ لائبریری جامعہ عبد العزیز کی حدود میں ہے۔ جامعہ سے واپسی پر رفیق صاحب نے میری درخواست پر کنگ فہد لائبریری بھی دکھائی جو جامعہ کی چار دیواری میں لیکن مرکزی شاہرہ پر واقع ہے۔ عمارت بہت وسیع اور دیدہ ذیب تیار ہوچکی ہے۔ رفیق صاحب کا کہنا تھا کہ اس لائبریری کا افتتاح بہت جلد ہونے والا ہے۔ سعودی عرب میں ظہر کی اذان سوا بارہ ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی تمام ترکاروبار بند ہوجاتا ہے۔ میں نے رفیق صاحب سے اجازت چاہی انہوں نے دریافت کیا کہ کیسے جائیں گے جواب تھا ٹیکسی سے ، میں نے بہت چاہاکے وہ مجھے میری رہائش تک مجھے چھورنے کی زحمت نہ کریں لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے میری رہائش تک چھوڑنے کا آئے۔ راستے میں بھی ہم کچھ کتب خانے کے بارے میں اور کچھ ذاتی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ رفیق صاحب نے کنیڈا کی قومیت حاصل کر لی ہے ۔ ان کے بچے کنیڈا ہی بھی زیر تعلیم ہیں۔یقیناً وہ بھی یہاں کی خدمات کے بعد اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کنیڈا ہی میں مقیم ہو جائیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادکیا اس طرح جامعہ شاہ عبد العزیز اور اس کے مرکزی کتب خانے کا مطالعہ اپنے اختتام کو پہنچا۔
رفیق صاحب کے حسن اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ

دروازہ پر دستک ہوئی ساتھ ہی اردو میں اونچی آواز سے گفتگو بھی سنائی دی۔ میرا بیٹا عدیل گھر پر ہی تھا دروازہ کھولا تو وہاں رفیق صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر خالد محمود، محمد اجمل اور ڈاکٹر ندیم صدیق موجود تھے۔ گرم جوشی سے ملاقات ہوئی۔ جب عدیل نے کہا کہ ابو آپ کے دوست ڈاکٹر خالد محمود آئے ہیں تو میں حیران ہوا کہ انہیں میرا پتہ کس طرح چلا لیکن رفیق صاحب کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ رفیق صاحب ہی کی مہربانی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر خالد محمود، اجمل صاحب اور ڈاکٹر ندیم صدیق دہران کی جامعہ میں بہ سلسلہ ملازمت آگئے ہیں۔ ڈاکٹر خالد نے بتایا کہ ہم دہران سے عمرہ کرنے مکہ المکرمہ آئے تھے جدہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی لائبریری گئے تو رفیق صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے آپ کا ذکر کیا واپسی پر ہم نے ان سے آپ کا پتہ معلوم کی تو انہوں نے کہا کہ میں آپ کو اس بلڈنگ کے سامنے لے جاسکتا ہوں جس میں وہ میری کار سے اتر کر گئے تھے مجھے اپارٹمنٹ کا معلوم نہیں۔ ڈاکٹر خالد کا کہنا تھا کہ ہم نے ان سے کہا کہ آپ وہاں تک لے چلیں آگے ہم خود گھر تلاش کرلیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ کافی دیر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ اس دوران فراست شفیع اللہ کا تزکرہ بھی آیا جو ان کے ساتھ ہی جامعہ دہران میں ہے کسی وجہ سے ان کے ہمراہ نہ آسکا۔ سب سے ملاقات کرکے بہت اچھا لگا، خوشی ہوئی اور احساس ہوا کہ اگر انسان چاہے تو نہ ممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ دوستی اور خلوص کی ایسی مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

میں کیوں لکھتا ہوں

لکھنے کا عمل تخلیق کے زمرہ میں آتا ہے۔ گویا لکھنے والا اپنے خیالات، نظریات اور فکر کو جب قلم کی زبان عطا کرتا ہے، اس کی سوچ تحریر کا روپ دھارتی ہے تو تخلیق عمل میں آتی ہے گویا لکھاری دیگر فنکاروں اور ہنر مندوں کی طرح ایک تخلیق کار، قلم کار، فن کار یا ہنر مند ہی ہوتا ہے۔ لکھنے کا تعلق لکھاری کے تحت الشعور میں موجود وہ حس ہوتی جسے قلم کار اپنے ارادہ کو مدِ مقابل لاتے ہوئے قلم کو جنبش دیتا ہے تو الفاظ اور جملے قرطاس پر تحریر کا روپ دہار لیتے ہیں۔ لکھنے کی وجوہات کیا ہوتی ہے، قلم کار کیوں لکھتا ہے؟ اس سوالیہ عنوان کے تحت اپنی رائے کے اظہار کی دعوت جنگ اخبار کے میڈ ویک میگزین میں دی گئی ہے۔ یہ ایک اچھا اور منفرد موضوع ہے۔ بظاہر عام سا لگتا ہے لیکن یہ اپنے اندر گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔ مَیں بھی ایک ادنیٰ سا قلم کار ہوں جسے عرف عام میں لکھاری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ موضوع اس بات کا تقاضہ نہیں کرتا کہ میں اس تفصیل میں جاؤں کہ میں نے اب تک کیا کیا لکھا ہے، کن کن موضوعات پر لکھا ہے۔ اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں گزشتہ ۳۷برس سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے آپ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں کیوں لکھ رہا ہوں؟ بس ایک سلسلہ ہے جو مسلسل جاری ہے۔ روز نامہ جنگ کی اس دعوت کو پڑھ کر یہ خیال آیا کہ

واقعی یہ سوچا جائے کی آخر ایسی کون سی مجبوریاں اور مشکلات ہیں یا خوبیاں اور کشش ہے جو مجھے مسلسل لکھنے اور چھپنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں۔ میں کئی ہفتوں سے یہ کالم پڑھ رہا ہوں اور سوچ و فکر میں ہوں کہ آخر مَیں کیوں لکھ رہا ہوں ۔جب کہ مجھے کوئی چیز مجبور نہیں کرتی کہ میں ایسا کروں۔ میں پیشہ ور لکھاری بھی نہیں یعنی مَیں اخبار نویس بھی نہیں، کالم نویس بھی نہیں پھر آخر کیوں میں نے لکھنے کو ایک خود ساختہ مجبوری کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔

شاعری ہو یا نثر نگاری ان کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے ہوتا ہے۔ جس طرح شعر کسی بھی شاعر کے ذہن میں غیب سے آتے ہیں، بعض شعرا کا کہنا ہے کہ وہ خود شعر نہیں کہتے بلکہ کوئی طاقت ان سے یہ کام کراتی ہے۔ میرے خیال میں یہ غیبی طاقت شاعر یا نثر لکھنے والے کے وہ جذبات اور احساسات ہوتے ہیں جن کا اظہار شاعر اپنے شعر کے ذریعہ اور نثا نگار اپنی نثری تحریر سے کرتا ہے۔ اپنے ان احساسات کا اظہار کرکے اسے ذہنی اور قلبی راحت میسر آتی ہے۔ جس طرح ایک مصور اپنا شاہکار تخلیق کرنے کے بعد اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہے اسی طرح شاعر اور نثر نگار اپنی تخلیق کو کاغذ پر بکھرا دیکھ کر دلی خوشی محسوس کرتا ہے اور یہی وہ جذبہ اور احساسات ہوتے ہیں جو ایک لکھنے والے کو آئندہ بھی لکھتے رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قلم کار کے جذبات کے حوالہ

سے اپنے استاد ڈاکٹر الاکرم سبزواری صاحب کے احساسات اور شیر کرنا چاہوں گا۔ وہ استاد ہیں کئی کتابوں، بے شمار مضامین کے خالق ہیں ریٹائر ہوگئے، سعودی عرب اور اب امریکہ اور پاکستان میں آتے جاتے ہیں پر لکھنے پڑھنے سے ایسے چمٹے ہوئے ہیں کہ جیسے دیوار پر دیمک، مجھے علم ہے لکھنے پڑھنے سے انہیں مالی منفعت بالکل نہیں اور نہ ہی انہیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ جب میری کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا ایک بیٹا اور پیدا ہوگیا ہو۔ عمر کے اعتبار سے وہ اس وقت ستر سے اوپر کے ہیں، ماشاء اللہ تین بیٹے امریکہ میں مستقل مقیم ہیں۔ یہ ہے وہ وجہ جس کی وجہ سے ایک لکھاری بے غرض ہو کر، مالی منفعت سے قطعہ نظر لکھتا ہے۔ میرے پیش نظر بھی کبھی مالی منفعت نہیں رہی، میں صرف اور صرف اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اس عمل سے گزرنے کے بعد جو سکون اور راحت میسر آتی ہے وہ کھانا کھانے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔یہی جذبہ مجھے قلم ہاتھ میں لیے رہنے پر مجبور کیے ہوئے ہے۔جہاں تک میری تحریر سے دوسروں کو فوائد حاصل ہونے کا تعلق ہے میری نظر میں اس کی حیثیت ثانوی ہے لیکن جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے خواہ نثر میں ہو یا نظم میں ہو اس کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا مطلب اس موضوع کو طول دینے کے سوا کچھ نہیں۔ میرے لکھنے کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ لکھنے سے مجھے ذہنی اور قلبی راحت اور سکون ملتا ہے۔

۲۔ لکھنے سے میں ذہنی طور پر صحت مند رہتا ہوں۔
۳۔ لکھنے کا عمل مجھے غیر ضروری کاموں سے محفوظ رکھتا ہے
۴۔ لکھنے کی عادت نے مجھے مطالعہ کا عادی بنایا ہوا ہے۔
۵۔ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں لٹریچر میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے
۶۔ میری تحریر سے اگر وہ طلبہ کے لیے ہوتی ہے تو انہیں نصابی ضروریات میں فائدہ پہنچاتی ہے
۷۔ میری تحریر میں اگر مزاح ہوتا ہے تو گویا پڑھنے والے کو لمحہ بھر کے لیے میں نے راحت اور خوشی پہنچائی۔
۸۔ شخصیات میرا موضوع ہوتے ہیں۔ میری تحریر سے شخصیت کے مختلف پہلو اور اس کی زندگی کی کہانی محفوظ ہو سکی
۹۔ میں اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ اپنی زندگی کے اچھے یا برے تجربات آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جاؤں۔ شاید کبھی ان کے
کام آئیں
۱۰۔ آخری بات یہ کہ میں اس وجہ سے لکھتا ہوں کہ لکھنے کی ابتدا پڑھنے سے ہوتی ہے اور مالک کائینات نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے جو کلام اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا اس کا پہلا لفظ ''پڑھ'' ہی تو ہے گویا ہمیں پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایسا کرکے گویا ہم اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔

میری نظر میں لکھنے کا تعلق جبر سے ہر گز نہیں، نہ تو شاعر جبراً ایسا کرتے ہیں اور نہ ہی نثر نگار جبراً لکھتے ہیں۔ شاعری اور نثر دونوں کا تعلق تخلیق کار کی خواہش، مرضی و منشاء سے ہوتا ہے۔ میرے موضوعات عام طور پر شخصیات ہوتی ہیں۔ کسی کسی پر میں ایک ہی نشست میں پر لکھ لیتا ہوں، بعض بعض پر مہینوں لگ جاتے ہیں اور بعض ایسے بھی کہ جنھوں نے مجھ سے اشاروں کناروں میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان پر قلم اٹھاؤں سالوں گزر جانے کے بعد بھی طبیعت اس جانب مائل نہیں ہوئی۔ اردو کے ایک ادیب ڈاکٹر انیس ناگی نے لکھنے کو ایک جنون قرار دیا ہے، میں ڈاکٹر ناگی کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں، واقعی لکھنا ایک جنونی کیفیت کا نام ہے۔ احباب کو مختلف قسم کی عادتیں ہوتی ہیں اور وہ بھی جنون کی حد تک، سگریٹ نوشی، پان خوری، نسوار خوری، چائے پینے کی عادت وغیرہ وغیرہ، اسی طرح جسے لکھنے کی عادت ہو جائے، شاعری کرتا ہو وہ عادت اس کے لیے جنون ہی ہوا کرتی ہے۔ ڈکٹر ناگی نے کہا کہ 'بس عمر اسی جنونی کیفیت میں گزر گئی ہے۔ مجھے کوئی گلہ نہیں کہ مجھے تسلیم نہیں کیا گیا۔ مجھے انعامات نہیں دیئے گئے۔ میں اپنی بقا لکھنے میں ہی پاتا ہوں'۔ گویا لکھنے والا اپنی بقا اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ لکھتا رہے اور چھپتا رہے۔ مَیں بھی اپنی بقا اسی میں پاتا ہوں کہ میں لکھتا رہوں اور چھپتا رہوں۔

شائع شدہ۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ مڈویک میگزین۔ ۳۰ مئی تا ۵ جون ۲۰۱۲ء، ص ۔)

۴)

اللہ کی دی ہوئی ہر چیز بشمول اولاد اللہ کی امانت ہے

مسلمان کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں جو چیز بھی عطا کی ہے حتیٰ کہ اولاد بھی اس کی عطا کردہ امانت ہے وہ جب چاہیے اپنی یہ امانت ہم سے واپس لے سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی عطا کردہ نعمتوں کا ہر دم شکرادا کرتے رہیں اور اگر کسی وقت وہ اپنی عنایت کردہ کوئی چیز خواہ اولاد، ماں، باپ، بھائی بہن یا کوئی اور عزیز ہی کیوں نہ ہو واپس لے لے تو بھی اس کا شکر بجا لائیں اور صبر کریں۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا دو سال کی عمر میں انتقال ہوا تو آپ ﷺ کو اس کا شدید ملال اور دکھ پہنچا اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا ''آنکھیں اشک بار ہیں، دل غمگین ہے اور ہم تو وہی بات کہیں گے، جو ہمارے رب کی مرضی کے مطابق ہو۔ ابراہیم! ہمیں تمہاری جدائی کا بہت صدمہ ہے، صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو اس کیفیت میں دیکھا تو انہیں تعجب ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا ''یہ تو (اولاد کے لیے)

رحمت و شفقت کا ایک جذبہ ہے، جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے''۔

اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کے مؤلف ڈاکٹر محمد عبد الحئی عارفی نے ترمذی، حصن حصین، معارف الحدیث کے حوالے سے حضور اکرم ﷺ کا مکتوبِ تعزیت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کے بیٹے کی وفات پر نقل کیا ہے جس میں آپ ﷺ نے اولاد کے دنیا سے رخصت ہوجانے کی صورت میں صبر کرنے کی تلقین کی۔رسول اکرم حضرت محمد ﷺ نے اپنے مکتوب میں معاذ بن جبل کے بیٹے کی وفات پر انہیں لکھا:ترجمہ ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔اللہ کے رسول محمد ﷺ کی جانب سے معاذ بن جبل کے نام، تم پر سلامتی ہو، میں تمہارے سامنے اللہ تعالی کی تعریف کرتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حمد و ثنا کے بعد اللہ تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور صبر کی توفیق دے اور ہمیں اور تمہیں شکر ادا کرنا نصیب فرمائے۔ اس لیے کہ بے شک ہماری جانیں، ہمارا مال، ہمارے اہل و عیال اور ہماری اولاد (سب) اللہ بزرگ و برتر کے خوشگوار عطیے اور رعایت کے طور پر سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں، جن سے ہمیں ایک معین مدت تک فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے اور مقررہ وقت پر اللہ تعالی (واپس) انہیں لے لیتا ہے۔ پھر ہم پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ جب وہ دے تو ہم شکر ادا کریں اور جب وہ آزمائش کرے اور ان کو واپس لے لے تو صبر کریں۔ تمہارا بیٹا بھی اللہ تعالی کی ان ہی خوشگوار نعمتوں اور سپرد کی ہوئی عاریتوں میں سے (ایک عاریتی عطیہ) تھا۔ اللہ تعالی نے تمہیں اس سے قابل رشک اور لائق مسرت صورت میں نفع پہنچایا اور (اب) اجر عظیم رحمت و مغفرت اور ہدایت کے عوض لے لیا بشرط کہ

تم صبر (وشکر) کرو۔ لہٰذا تم صبر (وشکر) کے ساتھ رہو (دیکھو) تمہارا رونا دھونا تمہارے اجر کو ضائع نہ کردے، کہ پھر تمہیں پشیمانی اٹھانی پڑے اور یاد رکھو کہ رونا دھونا کچھ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی غم واندوہ کو دور کرتا ہے اور جو ہونے والا ہے وہ تو ہو کر رہے گا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سلامتی ہو تم پر۔ فقط''۔

راحم ۱۱ نومبر ۲۰۱۲ء سعودی وقت کے مطابق صبح نو بینتالیس پر 'جدہ نیشنل اسپتال' میں دنیا میں آیا۔ یہ اسپتال جدہ کی مروہ روڈ پر واقع ہے۔ یہ پھول میرے بڑے بیٹے عدیل اور مہوش کے آنگن میں نمودار ہوا، خوشی وانبساط کے ساتھ سب نے ننھے 'راحم' کا استقبال کیا، دل خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا، میری خوشی کی انتہا نہ تھی میں دل ہی دل میں فخر محسوس کر رہا تھا کہ ایک اور میرے نام کو دنیا میں آگے لے جانے والا آگیا ہے۔ پھول نے اپنی مہک سے اس دنیا کو جلد منور کر دیا، وقت سے قبل دنیا میں آگیا، کہ یہ حکم خداوندی تھا، جس روح کو جس وقت دنیا میں آنا ہے وہ وقت مقرر پر آکر رہتی ہے۔ مہینوں، دنوں اور ہفتوں کا حساب وکتاب تو انسانوں کے لیے ہے اللہ نے جو وقت مقرر کر دیا وہی وقت آنے اور جانے کا ہوتا ہے۔ دنیاوی حساب وکتاب کے مطابق ہمارا ننھا 'راحم' بھی وقت سے پہلے آگیا، اب کیا ہو سکتا تھا، ہمیں کیا معلوم تھا کہ اُسے آنے کی بھی جلدی تھی اور اس کی واپسی کا وقت بھی مقرر

کیا جاچکا تھا۔ بہت کم وقت تھا اس کے پاس، دنیا میں آتے ہی وہ اپنی ماں (مہوش)، باپ (عدیل) اور بھائی (صائم) کی آنکھ کا تارا بن گیا، ہزاروں میل دور پاکستان میں اس کے دادا، دادی، چچا اور چچی بھی اس کی آمد پر پھولے نہ سماتے تھے۔ انہوں نے پاکستان میں جشن منایا، ننھے راحم کی درازی عمر اور صحت کے لیے دعا کرتے رہے، راحم کو تو اپنی واپسی کا انتظار تھا، وہ ایک ایک دن مشکل سے گزار رہا تھا، اسے آنے کی بھی جلدی تھی اور جانے کے لیے بھی بے قرار تھا۔ دنیا میں آتے ہی قبل از وقت پیدائش کے پیچیدہ معاملات سے دور چار ہوگیا۔ آئی سی یو، انکیوبیٹر، دوائیں انجیکشن اور ڈرپ وغیرہ وغیرہ۔ جدہ متبرک سرزمین ضرور تھی لیکن اجنبیت، زبان، تنہائی، اکیلا پن، کوئی عزیز رشتہ دار نہیں، پڑوسی بھی تمام سعودی یا غیر ملکی۔ ساتھ ہی ایک ایسا بچہ بھی جسے کسی کے پاس چھوڑا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک کے حالات بہتر ہوتے تو پاکستانیوں کو کسی بھی ملک جاکر اجنبیوں کی سی زندگی گزارنے کی کیا ضرورت تھی لیکن ہمارے ملک کے حالات بجائے ٹھیک ہونے کے بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ نہیں معلوم اس ملک کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ جب کبھی اس قسم کا حادثہ پیش آجاتا ہے تو اجنبی ملک کی تمام تر آسائشیں، سہولتیں اور مالی منفعت ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ اپنا ملک پھر اپنا ہوتا ہے۔

اس مشکل وقت میں عدیل پر کیا گزری اس نے تنہا تمام معاملات کا مردانہ وار مقابلہ کس طرح کیا یہ وہی جانتا ہے لیکن وہ ہمیں جس جس طرح تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا اگر ہمارے پر ہوتے تو ہم اڑ کر وہاں پہنچ جاتے لیکن سعودی عرب شاید دنیا کا ایسا واحد ملک ہے کہ جہاں کسی بھی طرح کی ایمرجنسی میں آنا تو ممکن ہے لیکن فوری جانا ممکن نہیں اور ہم بھی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ عدیل کو ہدایت کی کہ نومولود کے کان میں اذان دے ، نام ''محمد راحم عدیل' طے پایا۔ ساتویں دن اس کا عقیقہ بھی ہم نے کر دیا اس لیے کہ عقیقہ بچے کی پیدائش سے ساتویں دن کرنے کی ہدایت احادیث میں ملتی ہے۔ عقیقہ کردینے سے بچے کی بلائیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ راحم مسلسل اسپتال میں رہا چند روز بہتر صورت حال رہی لیکن رفتہ رفتہ مشکلات سے دوچار ہوتا گیا۔ اس صورت حال میں ۳۵ دن گزر گئے لیکن راحم بہتری کی جانب نہ آیا۔ آخر کار وہ وقت آگیا کہ جب اس کی سانس کی رفتار سست پڑ گئی، ڈاکٹروں نے دوا کے بجائے دعا کے لیے کہا۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا پروردگار ہی ہمارا آخری سہارا ہوتا ہے۔ ہم سب راحم کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتے رہے۔ عدیل نے خانہ کعبہ جا کر طواف کیا اور نومولود کی درازیِ عمر اور صحت یابی کی دعا بھی کی۔ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۲ء بعد نماز عشاء فضا ابر آلود ہو گئی ، آسمان تیور بدلنے لگا۔ رات کے بگولے اُڑنے لگے ، ہواؤں کے جھکڑ

چلنے لگے۔ پھول کا رنگ زرد ہوگیا۔ ٹہنیاں جُھک جُھک گئیں، غنچے سہم کر ٹہنیوں کی اوٹ میں چھپ گئے اور باغباں (عدیل) حیران و پریشان ہواؤں کا رنگ دیکھ رہا تھا کہ معصوم سا، کومل سا، کہکشاں کی طرح جگمگاتا مسکراتا 'راحم' ہواؤں کی تپش سے جُھلسنے لگا، تپنے لگا، ننھے ننھے لب کانپنے لگے، خوبصورت آنکھیں بند ہونے لگیں، ننھا سا سہا سہا وجود فضاؤں کی بے رُخی کی تاب نہ لا کر دھیرے دھیرے لرزنے لگا، مگر لب خاموش تھے صرف بند آنکھیں بولتی تھیں۔ ٹہنیاں جو پھول کی نرم نرم آغوش محبت کی عادی تھی بے رحم ہواؤں کی تپش سے مُرجھانے لگیں، شاخ پر ڈولنے لگیں۔ سا تھی پھولوں نے سہارا دیا مگر وہ ننھا سا کومل جان جو ابھی پوری طرح کھلا بھی نہیں تھا بے مہریٔ زمانہ کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنی کرنوں کو سمیٹنے لگا، نہ جانے اسے کس مہرباں کا انتظار تھا۔ باغباں (عدیل) جس نے خونِ دل سے پھول کی آبیاری کی تھی، غنچوں کو گدگدایا تھا، ہنسایا تھا، شگفتہ پھولوں کو مہک عطا کی تھی اسپتال آ پہنچا۔ مگر دیر ہو چکی تھی وقت کا صیاد اپنا تیر چلا کر جاچکا تھا۔ وہ بند آنکھیں جو محوِ انتظار تھیں اپنے بابا کو اپنے نزدیک پا کر مطمئن سی ہوئیں اور پھر انجان بن گئیں۔ پھول نے چپکے سے آنکھ موندلی۔ ہمیشہ کے لیے۔ باغباں تھرا گیا، پھول کا چہرہ فرطِ غم سے سفید پڑ گیا، غنچے بلک بلک کر رو دیئے۔ مگر پھول تو روٹھ گیا۔ آفتاب کی کرنیں دھندلانے لگیں، فضاء میں 'اذانِ عشاء کی آوازیں بلند ہوئیں تو وہ نازک سا پھول، وہ نودمیدہ راحم

پیوند خاک ہو گیا۔ وہ 'راحم' جو آنکھ کا نور، دل کا سرور تھا، باغباں تہی دست رہ گیا اور ننھے سے حسین پھول کو فضا میں تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ آفاق کی لامتناہی تنہائیوں میں کھو گیا، وہ چلا گیا ایک ایسی جگہ جہاں دنیا کا رکھوالا اس کی نگہداشت کو موجود ہے۔ وہ راحم تھا عدیل اور مہوش کا بیٹا اور میرا پوتا۔ اماں حوا کے شہر جدہ کے قبرستان التوفیق مقبرۃ التوفیق) واقع حی مشرفۃ اشارع الصحافۃ، جدہ مشرق کی قبر نمبر ۱۲، لائن نمبر ۱۱)

میں آسودۂ خاک ہے۔ بقول شیخ ابرہیم ذوقؔ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

راحم ! ہمیں تمہاری جدائی کا بہت صدمہ ہے۔ تم عجلت میں دنیا میں آئے عجلت ہی میں واپس بھی چلے گئے۔ تمہارے دادا اور دادی تو تمہیں دیکھ بھی نہ سکے۔ ہمیں کم از کم اتنا وقت تو دیتے کہ ہم تمہیں ایک نظر دیکھ ہی لیتے۔ تمہیں پیار کر لیتے، اپنے سینے سے لگا لیتے۔ لیکن خیر اس میں تمہارا کیا قصور یہ تو من جانب اللہ تھا۔ تم اللہ سے اتنی ہی عمر لکھوا کر لائے تھے۔ یہی ہمارے رب کی مرضی تھی۔ کوتاہی تو ہماری ہی رہی تم نے تو ہمیں ایک ماہ دیا، ہم نے ہی تمہارے پاس آنے کی تگ و دو نہیں کی۔ اگر ہم کوشش کرتے تو شاید تمہیں اپنے سینے سے لگا لیتے۔ جی بھر کے تمہیں پیار کرتے، تمہارے آخری سفر میں تمہارے

دادا بھی اس مختصر سے قافلے کا حصہ ہوجاتے۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں اس مقدس مٹی کے سپرد کرتا۔ ہمارے یہ جذبات تو اپنے نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق اولاد کے لیے رحمت و شفقت کا جذبہ ہے۔ہمارے نبی ﷺ نے بھی تو اپنے لخت جگر ابراہیم کو اس وقت رخصت کیا تھا جب وہ صرف دو سال کے تھے۔ ابراہیم بن محمد ﷺ مدینہ کی مقدس سرزمین جنت البقیع میں آسودۂ خاک ہیں تمہاری خوش نصیبی کے اماں حوا کے شہر جدہ کی مقدس خاک تمہارا مقدر بنی۔ تمہیں یہ سعادت مبارک ۔

مجھے یقین ہے راحم ! کہ جب تم نے جنت میں قدم رکھا ہوگا تو خاتون جنت نے تمہیں بڑھ کر چوم لیا ہوگا، یقیناً تمہیں نبی اکرم ﷺ کے لخت جگر ابراہیم کی صحبت نصیب ہوئی ہوگی۔ جنت کی فضاؤں میں تمہیں تمہارا ایک بھائی محمد سبحان نبیل بھی تو ملا ہوگا۔ تمہیں دیکھتے ہی اس نے تمہیں اپنے سینے سے لگا لیا ہوگا۔ تمہاری ایک پھوپھی ''سحر'' بھی تمہیں ملی ہوگی، تمہیں اپنے ساتھ پا کر یقیناً بے حد مسرور ہوئی ہوگی۔ اپنے دونوں بھتیجوں کو پا کر وہ تو بہت خوش ہوگی اس نے بھی تمہیں بڑھ کر گلے سے لگا لیا ہوگا۔ میرے گلشن کے پھولوں دنیا و آسمانوں کا نگہبان تم تینوں کی نگہداشت کو موجود ہے۔

کہتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ خون پھر خون ہوتا ہے، اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا راحم کے ماموں نسیم جو ریاض میں تھے خبر سنتے ہی جدہ

پہنچے اور راحم کے سفر آخر میں پیش پیش رہے، عدیل کے ماموں ارشد جو مکہ میں تھے خبر سنتے ہی جدہ دوڑے چلے آئے۔ اس بات کی صداقت میں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان جملوں کی صداقت واضح ہوجائے۔ یہ سنی سنائی بات نہیں بلکہ خود مجھ پر بیتی داستان ہے جس میں اپنے خون کا کردار بھرپور انداز سے ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ۲۰۱۲ء کی بات ہے عدیل کے بعد میرا چھوٹا بیٹا نبیل بھی سعودی عرب چلا گیا۔اب ہم دونوں میاں بیوی تنہا پاکستان میں رہ گئے۔ ایک دن اچانک دائیں ہاتھ میں درد ہوا نوبت کارڈیو اسپتال تک پہنچی، آنن فانن میں طے ہوا کہ اینجو گرافی ہوگی اور ہم اینجو گرافی کے بعد اینجو پلاسٹی کے لیے آپریشن بیڈ پر پہنچ گئے۔ دونوں بچے ہزاروں میل دور، بیٹی لاہور میں، لیکن اس لمحے اسپتال میں میرے تمام قریبی عزیز موجود تھے۔ شہناز کو یہ تو پریشانی تھی کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن مالی یا افرادی قوت کی کمی نہ تھی۔ اینجو پلاسٹی ایک مہنگا طریقہ علاج ہے۔ اس میں کھڑے پیر ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہناز (میری شریک حیات) کو اس بات کا کہا ہوش کہ کتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی لیکن آفرین ہے میرے بھائیوں پر کہ انھوں نے چند منٹوں میں لاکھوں کی ادائیگی کردی اور جب تک میں اسپتال میں رہا میرے بھائی اسپتال کے باہر کھلے آسمان تلے اس لیے موجود رہے کہ نہیں معلوم کب اور کس وقت کس دوا کی ضرورت پڑجائے۔ بیٹی لاہور سے رات تین بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچی، صبح پانچ بجے ہی مجھ سے ملنے اسپتال آگئی جسے دیکھ کر

میں حیران و پریشان رہ گیا۔ نبیل اور ثمرا جیذان سے جدہ اور پھر کراچی اگلے ہی دن پہنچ گئے۔ عدیل بعد میں آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خون پھر خون ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے اپنا ملک، اپنا شہر اور اپنے لوگ۔ زندگی دینے اور لینے والی خدا کی ذات ہے لیکن مشکل گھڑی میں اپنا خون ہی کام آتا ہے۔اللہ تعالی ہمیں ایک دوسرے کی مشکل میں کام آنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی حوالے سے ایک اور واقعہ ۱۶ فروری ۲۰۱۴ء کو حیدر آباد سے کراچی آتے ہوئے شاہین شنوار ہوٹل کے سامنے پیش آیا۔ ایک موٹر سائیکل سوار رانگ سائڈ سے گاڑی کے سامنے آ گیا، نتیجے میں گاڑی بے قابو ہو گئی ۔ موٹر سائیکل سوار اپنی جان سے گیا، جس کا ہمیں انتہائی دکھ ہے۔ ہماری کار لہراتی ہوئی فٹ پات سے ٹکرائی اور قلابازیاں کھاتی ہوئی دونوں سڑکوں کے درمیان گھڑے میں جا گری، اللہ نے زندگیاں بچانا تھیں ہم سب بچ گئے۔ لوگوں نے مشکل سے گاڑی سے نکالا۔ صرف میرے دائیں بازو کے مونڈھے اور کہنی کے درمیان کی ہڈی کوئی پانچ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ تین ماہ پلاسٹر چڑھا رہا۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مزید تین ماہ ہینڈ سپورٹ استعمال احتیاط کرنا ہوگی۔ ہاتھ کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کا پتا دے رہی ہے۔ایکسی ڈینٹ کے بعد ایمبولیس ہمیں لے کر بعد میں پٹیل اسپتال پہنچی میرے بھائی اور بھتیجے ہم سے پہلے اسپتال پہنچ چکے تھے۔ہم کوئی ۱۵ دن اپنے بھائی پرویز کے گھر ہی رہے۔ سب نے دل و جان سے خدمت کی۔ اپنوں کی اپنائیت کی بے شمار مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنا پھر اپنا ہوتا ہے، خون پھر خون ہوتا ہے۔

مشکل وقت میں وہی کام آتا ہے۔ اللہ ہمیں اپنوں سے بہتر تعلقات قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سچ ہے ۔

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

ہارڈنگ پبلک لائبریری دھلی اور خیر پور پبلک لائبریری کے لائبریرین۔فرحت اللہ بیگ

پاکستان میں لائبریرین شپ کے پیشے کی ترقی اُن اکابرین لائبریری سائنس کی مرہون منت ہے جنھوں نے آزادی کے پرچم تلے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔انھوں نے پاکستان میں لائبریرین شپ کے پودے کا بیج بویا، اس کی آبیاری کی اور اپنی تمام زندگی اس پیشے کے فروغ اور ترقی کے لئے وقف کرتے ہوئے اسے ایک تناور درخت بنادیا جس کے فیض سے آج نئی نسل فیض یاب ہو رہی ہے۔ان محترم شخصیات میں ڈاکٹر عبدالمعید جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور بہت جلد کراچی منتقل ہو گئے۔آپ ابتدا میں سندھ یونیورسٹی اور پھر کراچی یونیورسٹی کے لائبریرین ہوئے، سید ولایت حسین شاہ (۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء) ایس ایم کالج کے لائبریرین تھے ، بعد ازاں لیاقت لائبریری کے لائبریرین ہوئے، فضل الٰہی بھی لاہور سے کراچی آگئے اور لیاقت لائبریری (۱۹۵۰ء۔۱۹۵۱ء) سے منسلک ہو گئے، ابن حسن قیصر بھی لاہور سے کراچی منتقل ہوگئے اور ۱۹۵۲ء میں لیاقت لائبریری سے منسلک ہو گئے، محمد شفیع مرحوم نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی اور قومی اسمبلی کے لائبریرین ہوگئے، آپ ۱۹۵۸ء تک اس سے منسلک رہے، اختر ایچ صدیقی این ای ڈی انجینیئرنگ گورنمنٹ کالج کے (۱۹۴۸ء۔۱۹۵۱ء) لائبریرین تھے، جمیل نقوی مرحوم جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی ، ہندوستان میں

لا ئبریرین شپ کے پیشے سے منسلک تھے ،آپ انڈین لا ئبریری ایسو سی ایشن سے بھی وابستہ رہ چکے تھے، کراچی میں پاکستان ادارہ فروغ برآمدات سے منسلک ہو گئے اور فرحت اللہ بیگ دہلی کی ہارڈنگ پبلک لا ئبریری سے وابستہ تھے آپ نے ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور سیکریٹیریٹ لا ئبریری کے لا ئبریرین (۱۹۴۸ء ۔ ۱۹۵۵ء) ہوئے۔ کراچی میں ابتدائی لا ئبریری سرگرمیاں انہی احباب کی مرہون منت تھیں۔ کراچی لائبریری ایسو سی ایشن ۱۹۴۹ء میں اور پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ ۱۹۵۰ء میں معرض وجود میں آئے یہی ادارے بعد میں پاکستان لا ئبریری ایسو سی ایشن کے قیام کا سبب بنے۔ یہ قابل احترام شخصیات اور بعض دیگر جن میں خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ خان،ڈاکٹر عبد الصبوح قاسمی، ڈاکٹر محمد علی قاضی، خواجہ نور الہی، الطاف شوکت، اے رحیم،، نور محمد خان،، عبداللہ خان شامل ہیں پاکستان لا ئبریرین شپ کے حقیقی pioneers ہیں۔

فرحت اللہ بیگ اس وقت پاکستان لا ئبریرین شپ کے بزرگ ترین لا ئبریرین ہیں جو فضل تعالی اپنی زندگی کے ۹۰ برس مکمل کر چکے ہیں۔ پاکستان میں آپ کی لا ئبریری خدمات ۵۶ برسوں پر محیط ہیں۔ راقم الحروف نے آپ سے بروز جمعرات ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ء آپ کی قیام گاہ واقع ناظم آباد میں ملاقات کی اور لا ئبریری پروفیشن کے حوالے سے گفتگو کی، آپ کی صحت بہتر ہے، چل پھر لیتے ہیں لیکن آپ کی یادداشت اور قوت سماعت عمر کے باعث متاثر ہو چکی ہے پھر بھی آپ نے اپنے

ماضی کی یادداشتوں کو بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی جسے میں نے قلم بند کیا۔ بیگ صاحب اپنے ذاتی مکان کی پہلی منزل پر رہتے ہیں زمینی منزل پر ان کے ایک صاحبزادے اسداللہ بیگ قیام پزیر ہیں جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں اسسٹنٹ ڈائیریکٹر ہیں۔ بیگ صاحب تک پہنچنے میں کچھ مشکلات پیش آئیں ، کافی دیر انتظار کے بعد ان کی بیٹی جو ان ہی کے ساتھ رہتی ہیں سے اپنا تعارف کرایا اور ساتھ ہی مدعا بھی بیان کیا ، انہیں یہ بات سننے کے بعد قدرِ اطمینان ہوا کہ میں بیگ صاحب کا ہم پیشہ ہوں۔ اسی دوران ڈاکٹر معید کا ذکر بھی انہوں نے کیا وہ معید صاحب کی بیٹی عطیہ سے بھی واقف تھیں۔ اس طرح انہوں نے میری اور بیگ صاحب کی ملا قات کا اہتمام کر دیا۔ اس مرحلے میں اسداللہ بیگ کی بیگم بھی معاون ثابت ہوئیں ، بیگ صاحب تک پہنچنے میں انہوں نے ہی میری مدد کی۔ بیگ صاحب اُسی وقت سو کر اٹھے تھے ۔ فوری طور پر انہیں بھی پہچاننے میں دشوارای ہوئی، ایک دو حوالوں کے بعد آپ گفتگو پر آمادہ ہو گئے۔

بیگ صاحب نے بتایا کہ میرا تعلق دہلی سے ہے، میں دہلی ہی میں اگست ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوااور اب میری عمر۹۰برس ہو چکی ہے۔ آپ نے ہندوستان سے ماسٹر کیا اور دہلی کی ہارڈنگ پبلک لائبریری میں ۱۳برس (۱۹۳۵ء ۔ ۱۹۴۸ء) لائبریری خدمات انجام دیں۔ آپ نے بتایا کہ ہارڈنگ لائبریری میں ڈاکٹر رنگا

ناتھن کی سرپرستی میں ایک ورکشاپ منعقد ہوئی تھی انہوں نے اس ورکشاپ میں شمولیت اختیار کی۔ ہارڈنگ لائبریری ہندوستان میں لائبریری سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے اسی لائبریری سے لائبریری سائنس کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ آپ نے بتایا کہ معید صاحب سے ان کی پہلی ملاقات دہلی کی اسی لائبریری میں ہوئی تھی۔ انہی دنوں اس لائبریری میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ جس کے انتظامی امور میں بیگ صاحب نے بھرپور کردار ادا کیا۔

آپ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ لائبریری میں اپنی ملازمت کے بارے میں آپ نے بتایا کہ ڈپٹی سیکریٹری تعلیم اختر حسین رائے پوری تھے انہوں نے آپ کا تقرر بحیثیت لائبریرین سیکریٹریٹ لائبریری جو اس وقت قومی لائبریری بھی تھی کر دیا۔ میں جب اس لائبریری میں آگیا تو یہ لائبریری کراچی کے لائبریرینز کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ میرے پاس تمام لوگ جمع رہتے۔ کراچی میں لائبریری سرگرمیوں کی ابتدا اسی سیکریٹریٹ لائبریری سے ہوئی جس نے ایک قومی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ آپ نے بتایا کہ ان لوگوں میں جن کی کوششوں سے پہلے کراچی لائبریری ایسوسی ایشن اسکول آف لائبریرین شپ، پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ اور پھر قومی انجمن پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن قائم ہوئی ڈاکٹر

عبدالمعید، فضل الٰہی، سید ولایت حسین شاہ، محمد شفیع، جمیل نقوی، ابن حسن قیصر، نور محمد خان، اختر ایچ صدیقی اور وہ خود شامل تھے۔آپ نے کہا کہ ہم نے مل کر لائبریرینز اور لائبریری پروفیشن کی ترقی کے منصوبے تشکیل دیئے۔ سب لوگ انتہائی خلوص، لگن اور محنت سے کام کیا کرتے تھے۔ لوگ اپنی ڈیوٹی ادا کرکے لائبریری آجاتے اور دیر تک منصوبہ بندی کرتے رہتے۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کی بنیاد رکھ دی گئی۔اس کے پہلے صدر حسن علی اے رحمان اور سیکریٹری سید ولایت حسین شاہ تھے۔ اس کے تحت کچھ پروگرام تشکیل دئے ۱۹۵۲ء میں اس ایسو سی ایشن کے تحت ایک لائبریری اسکول قائم ہوگیا، محمد شفیع اس کے ڈائریکٹر بنے اور ولایت صاحب سیکریٹری۔ یہ لائبریری اسکول صحیح معنوں میں انڈر گریجویٹ سطح پر ملک کا پہلا لائبریری اسکول تھا۔ جس نے اس پیشے کی جانب لوگوں کو مائل کیا جو لوگ اس کورس میں آئے انہوں نے بعد میں اس پروفیشن کے لئے بہت کام کیا۔ ان میں خاص طور پر ڈاکٹر انیس خورشید اور عادل عثمانی قابل ذکر ہیں جن کی لائبریری پروفیشن کے لئے بڑی خدمات ہیں۔ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر عبدالمعید کے جانشین بھی ہوئے یعنی ڈاکٹر انیس خورشید شعبہ کے سربراہ اور عادل عثمانی یونیورسٹی لائبریرین ہوئے۔

کے ایل اے کے بعد پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ قائم ہوا۔ اس کے قیام

میں ڈاکٹر معید کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے کے قیام میں بین الاقوامی ادارے یونسکو اور حکومت پاکستان نے بھی دلچسپی لی تھی۔ کتابیات کے شعبے میں یہ ملک کا اولین کتابیاتی ادارہ تھا۔ اس کے قیام کے سلسلے میں کراچی یونیورسٹی لائبریری مرکز تھی۔ اس کے قیام کے سلسلے میں پہلی میٹنگ اسی لائبریری مین غالباً اگست ۱۹۵۳ء میں ہوئی تھی اس میں ڈاکٹر معید، ولایت صاحب، جعفری صاحب، میں اور اختر صدیقی شریک تھے۔ اس کی تشکیل میں کوئی ایک سال لگ گیا ۱۹۵۴ء میں گروپ کی پہلی مجلس منتظمہ تشکیل پائی۔ گروپ کے صدر حکومت پاکستان کے مشیر تعلیم ایم ایس محی الدین کو منتخب کیا گیا جب کہ شفیع صاحب، معید صاحب نائب صدر، سیکریٹری ولایت صاحب، جوائنٹ سیکریٹری جمیل نقوی اور مجھے (فرحت اللہ بیگ) خازن بنایا گیا دیگر لوگوں میں اے آر غنی، ابن حسن قیصر اور اختر ایچ صدیقی شامل تھے۔

۱۹۵۵ء میں میرا تقرر خیر پور پبلک لائبریری کے لائبریرین کی حیثیت سے ہو گیا۔ یہ بر صغیر کی ایک قدیم پبلک لائبریری تھی۔ میں نے اسی سال ایک بین الاقوامی سیمینار میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی تھی۔ خیر پور پبلک لائبریری میں میرا تقرر اس وقت کے ایک وزیر ممتاز حسین قزلباش اور ڈاکٹر محمود حسین نے کیا تھا۔ بیگ صاحب نے اس لائبریری میں ۱۹ جولائی ۱۹۵۵ء سے ۷ اگست ۱۹۷۱ء تک خدمات انجام دیں۔ بقول ڈاکٹر اللہ رکھیو بٹ سندھ کے محکمہ

ثقافت کے تحت یہ واحد لائبریری ہے جو پیشہ ورانہ اور انتظامی اعتبار سے مستحکم ہے۔ پہلے لائبریرین جناب بیگ صاحب (۱۹۵۷ء۔۱۹۷۱ء) ایک بیرون ملک کے فارغ التحصیل، ماہر اور تجربہ کار تھے، جنھوں نے لائبریری کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ ۱۹۶۱ء میں بیگ صاحب آسٹریلیا تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ آسٹریلیا کے قیام کے دوران آپ نے لائبریری کی ترقی کی منصوبہ بندی کی جس پر بعد ازاں عمل درآمد بھی ہوا۔ لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۶ مارچ ۱۹۶۵ء کو کیا۔ فرحت اللہ بیگ صاحب جو لائبریرین ہونے کے علاوہ لائبریری کمیٹی کے رکن بھی تھے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس لائبریری کا موجودہ نام ''سچل سرمست سندھ گورنمنٹ پبلک لائبریری'' ہے۔ خیر پور میں قیام کے دوران بیگ صاحب نے ۱۹۷۰ء میں سندھ لائبریری ایسوسی ایشن کی بنیاد بھی رکھی۔ بیگ صاحب سے یہ ملاقات اس اعتبار سے مفید تھی کہ اس میں آپ نے پاکستان لائبریرین شپ کی ابتدائی تاریخ کے بعض نکات بیان کئے جو تاحال عام لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔ یہ بزرگ پاکستان لائبریرین شپ کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے۔ آمین۔

(مطبوعہ پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل جلد ۳۵ شمارہ ۴۔ دسمبر ۲۰۰۴ء)

یادوں کی مالا' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں '

یادوں کی مالا میرے سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۹ء میں لاہور کے نامور ناشر الفیصل نے شائع کی۔ اس کتاب میں ۲۵ شخصیات پر سوانحی مضامین شامل ہیں۔ اردو کے معروف استاد و محقق پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب پر اپنی رائے کا اظہار کیا جو ان کے اپنے ادبی جریدے ''نگارِ پاکستان میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں

''یادوں کی مالا'' لفظی اور معنوی ہر اعتبار سے ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب اردو کے قلم کار ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف ہے اور ان کے ذاتی تجربوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب صرف لائبریرین شپ سے متعلق حضرات کے لیے نہیں بلکہ استفادہ عام کا حق ادا کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تبصرہ نما اور خاکوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جو کچھ ہے وہ قدر و قیمت میں بلند پایہ ہے۔ صمدانی صاحب ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اب بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔

کتاب بلحاظ زبان و بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی۔
کتاب نہایت صاف ستھرے انداز میں شائع ہوئی

ہے اور قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ مضامین کی فہرست میں کچھ تو مختصر خاکے ہیں کچھ تنقیدی جائزے ہیں اور کچھ مختصر تذکرے۔ مگر اختصار میں بھی وہ سب کچھ آگیا ہے جو موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری تھا۔

مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے جس میں لائبریرین شپ کی تقریباً تمام ہی معروف اور اہم شخصیات کا قابل توجہ احاطہ کیا گیا۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سارے علمی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی اور شخصیات پر لکھنے والوں کی رہنمائی کرے گی۔

سید فیصل علی سبزواری صوبائی وزیر، حکومت سندھ سے ایک مکالمہ

(صوبائی وزیر سے یہ انٹرویو ۲۰۰۸ء میں گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کے مجلّہ 'رایت'' کے لیے لیا گیا جو مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس ملاقات میں کالج کے ایک استاد عبد الرشید بھی شریک تھے)

راقم اس وقت گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے علمی مجلّہ ''روایت'' کا مدیر اعلیٰ تھا۔ ۲۶ مئی ۲۰۰۸ء کالج پرنسپل پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی صاحب نے فرمایا کہ وزیر برائے امورِ نوجوانان، حکومت سندھ جناب فیصل سبزواری سے بات ہوگئی ہے انھوں نے آج دوپہر کا وقت دیا ہے آپ چلے جائیں اور کالج میگزین کے لیے ان کا نٹرویو کرلیں۔ چنانچہ میں اور عبدالرشید وزیر موصوف جناب فیصل سبزواری صاحب کے آفس واقع سندھ سیکریٹریٹ ۴ بی کی بیرک نمبر ۹۳ پہنچ گئے۔ وزیر موصوف تو اس وقت موجود نہیں تھے، پرائیویٹ سیکریٹری جناب خورشید علی شیخ صاحب سے اپنا تعارف کرایا، انہیں ہماری آمد کا پہلے ہی سے علم تھا اور انھوں نے تیاری کی ہوئی تھی۔ حکومت سندھ کے انفارمیشن شعبہ کے رپورٹر اور کیمرہ مین پہلے سے موجود تھے تھوڑی ہی دیر میں رنگ ٹیلی وژن کے کیمرہ مین بھی آگئے۔ خورشید شیخ صاحب سے ابتدائی گفتگو ہوہی رہی تھی کہ فیصل سبزواری

صاحب وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔ خوبصورت، اسمارٹ، چاق و چوبند، مسکراتا کتابی چہرہ، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، سادہ لباس، تہذیب و شائستگی کا حسین نمونہ۔ چند لمحے یہ احساس ہوا کہ اس قدر کم عمر اور اس پر یہ عزت و توقیر، اللہ نظر بد سے بچائے اس نوجوان کو جس نے انتہائی مختصر عرصہ میں کامیابی کی ان منزلوں کو چھو لیا ہے جن کو حاصل کرنے میں لوگوں کی عمر گزر جاتی ہے۔ اپنے آپ کو خیالوں سے نکالتے ہوئے میں وزیر موصوف کی جانب متوجہ ہوا اور کہا کہ آمد بہ سر مقصد، بسم اللہ کرتے ہیں، انہوں نے میری تائید کی اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ پیدائش، ابتدائی تعلیم اور خاندان کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا :

میرے آباؤاجداد کا تعلق ہندوستان کے شہر میرٹھ سے ہے۔ اس سے قبل ہمارے اجداد نے ایران کے شہر ''سبزوار'' سے ہندوستان ہجرت کی۔ سبزوار ایران کا ایک شہر ہے جو مشہد کے قریب ہے۔ میرے دادا نے پاکستان ہجرت کی ابتداء میں فیصل آباد کو اپنا مسکن بنایا اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں کراچی میں آباد ہوئے۔ ناظم آباد میں ہماری رہائش تھی۔ میں کراچی کے علاقے ناظم آباد میں ہی پیدا ہوا۔ نرسری سے میٹرک تک تعلیم ''فرح ماڈل اسکول'' ناظم آباد میں حاصل کی، ۱۹۹۱ء میں اسی اسکول سے میٹرک کیا۔ یہ اسکول تعلیم و تدریس کے اعتبار سے معیاری اور منظم اسکول تھا۔ میری بنیاد اسی اسکول میں بنی۔ انگریزی میڈیم اسکول ہونے کے باعث میری بنیاد بھی اسی طرز کی قائم ہوئی اور میں بہتر

تعلیمی استطاعت کا حامل طالب علم ہوگیا۔ بہتر رزلٹ تھا۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں داخلہ لینے اور کالج کے اس دور کے حالات اور واقعات کا ذکر کرتے ہوئے جناب فیصل سبزواری صاحب نے کہا کہ میٹرک میں میرے نمبر بہت اچھے تھے اور میرا داخلہ ڈی جے سائنس کالج میں ہو سکتا تھا لیکن ایک وجہ تو یہ رہی کہ یہ کالج میرے گھر سے بہت نزدیک تھا دوسرے گورنمنٹ کالج اس وقت کراچی کے اچھے تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا تھا اور ایک منظم ادارہ تھا۔ چنانچہ میں انٹر سائنس میں غالباً اکتوبر ۱۹۹۱ء میں کالج میں داخل ہوا۔ اس وقت پروفیسر سید کمال الدین صاحب کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج تعلیمی ماحول بہت اچھا تھا۔ طلبہ تنظیم اے پی ایم ایس او کا میں سرگرم کارکن تھا جون ۱۹۹۲ء میں کراچی میں آپریشن شروع ہوا، میری مارکس شیٹ ایک مخالف طلبہ تنظیم نے روک لی اور میں دربدر رہا، چچا شہید ہوئے اور میری پوری فیملی نے بڑے مسائل کا سامنا کیا۔ وہ مشکل وقت بھی گزر گیا۔

آپ نے کہا کہ پروفیسر سید کمال کالج میں پڑھائی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ کالج کے دیگر اساتذہ بھی بہت محنت اور لگن کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے، ساتھ ہی ہم نصابی سرگرمیوں کے انعقاد میں بھی بھرپور دلچسپی لیا کرتے تھے۔ پروفیسر ربانی اردو کے استاد تھے، امان صاحب انگریزی پڑھایا کرتے تھے

ابو حازم صاحب کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ میرے ساتھ جو طالب علم ساتھی تھے ان میں منصور انصاری میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اب وہ ڈاکٹر منصور انصاری ہیں۔اپنی تعلیم اور سیاسی کیریئر کے بارے میں آپ نے واضح کیا کہ میں نے انٹر سائنس کرنے کے بعد بی اے کیا، معاشیات میں ایم اے کیا اور چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کا فائنلسٹ ہوں، جامعہ کراچی کی سینڈیکیٹ کا رکن رہا، پہلے ۲۰۰۲ء میں صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا پھر ۲۰۰۸ ء میں صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا اور نوجوانوں کے امور کی وزارت کا قلم دان سونپا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی جماعت میں مختلف حیثیتوں سے خدمات انجام دیتا رہا ہوں اور یہ خدمات اب بھی جاری ہے۔

صوبائی وزیر جناب سید فیصل علی سبزواری نے کہا کہ ہماری نوجوان نسل میں ٹیلنٹ کی قطعی کمی نہیں اگر ان کو صحیح رہنمائی اور معاونت فراہم کی جائے تو وہ ملک کی معاشی و اقتصادی ترقی میں انقلاب برپا کر سکتی ہے۔انہوں نے اساتذہ کرام پر زور دیا کہ وہ تندہی، لگن اور سچے جذبے کے ساتھ طلبہ کی تعلیم پر توجہ مرکوز کریں اور طلبہ کو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں کی اہمیت سے آگاہ کریں کیونکہ اس سے نہ صرف طالب علموں کا ٹیلنٹ سامنے آئے گا بلکہ ان میں ایک صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا ہوگا جو کہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔انہوں نے کہا کہ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ

طالب علموں کی اپنے تعلیمی اداروں میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہو کیونکہ اگر طالب علم پابندی سے اپنی کلاسز اٹینڈ کرے تو زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوگا اور مستقبل میں ملک و قوم کا نام روشن کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ جب میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد کا طالب علم تھا تو کلاس باقاعدگی سے اٹینڈ کرنے کے ساتھ ساتھ تقریری، بیت بازی، شاعری اورادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا کرتا تھا۔اس عمل سے میری صلاحیتوں کو جلا ملی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت کالجوں میں اس قسم کے مقابلے ہوتے تھے جس میں طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو اسی بنیاد پر اچھے تعلیمی اداروں میں داخلے ملتے تھے جس سے نہ صرف طلبہ کے حوصلے بلند ہوتے تھے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی۔انہوں نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ طلبہ کو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی مصروف رکھیں تاکہ وہ منفی سرگرمیوں سے بھی محفوظ رہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ تو نوجوانوں کے امور کے وزیر ہیں، ہمارے نوجوانوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے۔جناب فیصل سبزواری صاحب نے کہا کہ نوجوان ہی تو سب کچھ ہیں۔چالیس سال سے اوپر کے لوگ انقلاب نہیں لا سکتے۔ انقلاب صرف نوجوان ہی لا سکتے ہیں۔ میں اپنے نوجوانوں کو یہ بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ پڑھائی صرف اچھی نوکری کے لیے ہی نہ کریں، صحت مند

مسابقت بہت ضروری ہے جو آگے بڑھنے میں مدد کرتی ہے۔ سوسائٹی اور ملک کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے نوجوانوں کو تیار رہنا چاہیے''۔ وزیر موصوف کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی سے متاثر ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکے، دوران گفتگو وہ پوری طرح ہماری جانب متوجہ رہے، نرم لہجے، خوشگوار موڈ میں گفتگو کا آغاز ہوا اور اسی ماحول میں گفتگو اختتام پذیر ہوئی۔ محترم وزیر کے ساتھ ہماری گفتگو کی تفصیل روزنامہ 'امن' کراچی کی (اشاعت ۲۷ مئی ۲۰۰۸ء میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ (۲۶ مئی ۲۰۰۸ء

پروفیسر محمد مظہر الحق

پروفیسر محمد مظہر الحق، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد سے ایک مکالمہ

(یہ انٹرویو گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کے مجلّہ 'رایت'' کے لیے لیا گیا جو مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔
اس ملاقات میں کالج کے ایک استاد عبدالرشید بھی شریک تھے)

پروفیسر محمد مظہر الحق گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے چار سال اور چار ماہ (۲۷ اگست ۱۹۹۶ء - ۳۰ دسمبر ۲۰۰۰ء) پرنسپل رہے،آپ کو کراچی کے اولین ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر (E.D.O) ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آپ کی تعلیمی خدمات ۴۶ سال پر محیط ہیں۔ آپ نے ۱۹۶۲ء میں لیکچرر کی حیثیت سے درس وتدریس کا آغاز کیا، گورنمنٹ کالج تروب' بلوچستان، گورنمنٹ کالج، کوئٹہ، گورنمنٹ سائنس کالج، لیاری، ڈی جے گورنمنٹ سائنس کالج کراچی کے وائس پرنسپل اور گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں، ۲۰۰۲ء میں بحیثیت ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ آفیسر ریٹائر ہوئے۔ مجلّہ

روایت'' ۲۰۰۸ء کے خصوصی شمارے کے لیے ہم نے آپ سے خصوصی انٹرویو کیا۔''
ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ ہماری درخواست پر کالج تشریف لائے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سوال: اپنی پیدائش، ابتدائی تعلیم اور بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میری جائے پیدائش 'ابو پور'' پٹنہ، صوبہ بہار ہے جہاں میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ہندوستان میں مختلف شہروں کلکتہ، آگرہ، شاہجہاں پور میں قیام رہا۔ قیام پاکستان کے وقت میری عمر پانچ برس تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر والد صاحب سے ہی حاصل کی۔ یاد پڑتا ہے کہ مجھے اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب والد صاحب نے پڑھنے کو دی جسے میں نے پڑھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا اور والد صاحب نے لاہور میں قیام کیا۔ سیالکوٹ کے قومی ہائی اسکول (رام تلائی) میں پانچویں جماعت تک پڑھا۔ رام تلائی کی تاریخی اہمیت اس اعتبار سے اہم ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے تقریر کے دوران اپنا ''تاریخی مکا'' اسی جگہ لہرایا تھا۔ پرائمری کے بعد مڈل تک ٹیکسلا میں پڑھا ہم چونکہ واہ کینٹ میں رہتے تھے اور وہاں اسکول کا قیام ۱۹۵۴ء میں عمل میں آیا۔ میٹرک واہ کینٹ ہی سے کیا۔ میرے والد صاحب کی شدید خواہش تھی کہ میں اپنی پڑھائی پر خصوصی توجہ دوں اور اس سلسلے کو ہر قیمت پر جاری رکھوں واہ کینٹ میں اس وقت کالج نہیں تھا اس لیے صرف اس مقصد کے حصول کے

لیے ہم پنجاب سے کراچی منتقل ہوگئے۔ کراچی میں ایس ایم سائنس کالج سے انٹر سائنس کیا، میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، نمبر بھی اچھے خاصے آ گئے تھے لیکن عمر کم ہونے کی وجہ سے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہو سکا، چنانچہ جامعہ کراچی کے شعبہ 'حیوانیات' میں داخلہ لیا، پہلے بی ایس سی آنرز اور پھر ۱۹۶۲ء میں زولوجی میں ایم ایس سی کیا۔ یہ کہانی ہے میرے بچپن سے ماسٹرز کرنے تک کی۔

سوال: تعلیم کے شعبہ میں کب اور کیسے آئے، لیکچرر سے پرنسپل اور پھر ای ڈی او تک کا سفر کیسے طے کیا؟ (E.D.O) (تعلیم)

جواب: جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میری خواہش اور ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا اور میرے اتنے نمبر بھی تھے کہ میڈیکل کالج میں داخلہ ہو سکتا تھا لیکن جب میں نے انٹر کیا تو میری عمر کم تھی جس کی وجہ سے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں ہو سکا، اس وقت صرف ایک ہی میڈیکل کالج یعنی ڈاؤ میڈیکل کالج تھا، آجکل کی طرح پرائیویٹ کالج بھی نہیں تھے۔ اس وجہ سے یونیورسٹی کا رخ کیا ایم ایس سی کرنے کے بعد اسی سال یعنی ۱۹۶۲ء میں ہی میرا تقرر بلوچستان کے علاقے 'ژوب' میں گورنمنٹ کالج میں بحیثیت لیکچرر ہوگیا، وہاں سے گورنمنٹ کالج کوئٹہ ٹرانسفر ہوا کچھ عرصہ وہاں پڑھایا وہاں سے میرا ٹرانسفر کراچی میں ڈی جے سائنس گورنمنٹ کالج میں ہوگیا، گورنمنٹ سائنس کالج، لیاری میں

بھی کئی سال پڑھایا، اسی دوران میں نائجیریا چلا گیا اور دو سال غیر ملک میں بھی درس وتدریس سے منسلک رہا، واپس آیا تو ڈی جے سائنس کالج میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے خدمات کا آغاز کیا،۲۶ اگست ۱۹۹۵ء تک اس کالج کا پرنسپل رہا، اب میں درس و تدریس کے علاوہ انتظامی امور کی طرف بھی آگیا، یہ ایک اچھا تجربہ تھا، ۲۷ اگست ۱۹۹۶ء کو میں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد بطور پرنسپل آگیا۔ ملک میں بلدیہ کی سطح پر نیا نظام متعارف ہوا، اور ای ڈی او یعنی ایگزیکٹیو ڈسٹرکٹ آفیسر (ایجوکیشن) کا عہدہ قائم ہوا جس کے ماتحت کراچی کے تمام تعلیمی ادارے یعنی پرائمری وسیکنڈری اسکول اور تمام کالجوں کا انتظام تھا، مجھے اس نئے نظام کے تحت کراچی کا ایگزیکٹیو ڈسٹرکٹ آفیسر۔ تعلیم) بنایا گیا۔ ۱۴اگست

۲۰۰۱ء کو میں نے یہ عہدہ سنبھالا اور اسی حیثیت سے اپنی مدت ملازمت پوری ہونے پر مئی ۲۰۰۲ء میں ریٹائر ہوا۔

سوال: آپ نے بہ حیثیت پرنسپل کالج کی بہتری کے لیے کیا اقدامات کیے اور مسائل پر کیسے قابو پایا؟

جواب: میں جب پرنسپل کی حیثیت سے اس کالج میں آیا تو اس وقت کراچی کے حالات ہر اعتبار سے بہتر نہیں تھے۔ یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا کہ میں ایسے حالات میں اور پھر اس کالج کے خصوصی حالات میں تمام مسائل سے کیسے خوش اسلوبی سے

نمٹوں۔کالجوں میں سب سے اہم اور گھمبیر مسئلہ داخلوں کا تھا۔اس وقت داخلوں کی سینٹرل پالیسی متعارف نہیں ہوئی تھی، ہر کالج اپنے طور پر داخلہ دیا کرتا تھااور سارا پریشر پرنسپل پر ہوا کرتا تھا۔میں نے اولین فیصلہ یہ کیاکہ داخلے صرف میرٹ پر ہوں اور اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے میں نے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرلیا، اس فیصلے پر عمل کے دوران میں کئی بار شدید دباؤ کی کیفیت سے بھی دوچار ہوا لیکن میں کسی دباؤ کو خاطر میں نہیں لایااور اصولی طور پر داخلے اپنے دور میں ہمیشہ میرٹ کی بنیاد پر دیے۔میرے اس اقدام سے کالج کے تعلیمی ماحول پر خوشگوار اثرات مرتب۔

میری دوسری ترجیح یہ تھی کہ کالج میں نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں پر بھرپور توجہ دی جائے۔اس دور میں ہم نصابی سرگرمیاں کراچی کے کالجوں میں مفقود ہوچکی تھیں بوجوہ کالج پرنسپل صاحبان سوائے بورڈ اور یونیورسٹی کے اسپورٹس میں حصہ لینے کے لیے طلبہ بھیجتے تھے۔کالج کی حدود میں کسی قسم کی ہم نصابی سرگرمی کا انعقاد ناممکن ہوچکا تھا۔میں نے ایک عرصہ کے بعد اس سلسلے کو کامیابی سے جاری کیااور پھر یہ سلسلے دیگر کالجوں میں بھی شروع ہوگئے۔ہم نصابی سرگرمیوں میں کھیل کے مقابلوں کے علاوہ حمد، نعت، تقریری مقابلے، بیت بازی، مقابلہ معلومات عامہ وغیرہ کے انعقاد پر خصوصی توجہ دی، بین الجماعتی مقابلوں کے علاوہ بین الکلیاتی مقابلوں کے انعقاد

کو ممکن بنایا، مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کالج کے طلبہ نے پورے ملک میں ہونے والے ہم نصابی مقابلوں میں بھرپور شرکت کی اور نمایاں مقام حاصل کیا، کراچی کے مختلف کالج ہر سال اس بات کا انتظار کیا کرتے تھے کہ اس کالج میں سالانہ پروگرام کب منعقد ہوں گے۔اس کالج کو اس حوالے سے ایک خاص مقام حاصل ہوا، کالج کے طلبہ نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے، اس دور کے بعض طلبہ اب ملک کی سطح پر معروف ہیں۔

امتحانات میں نقل کے رجحان پر قابو پانے کے اقدامات کیے، امتحانی سینٹر پر سخت نگرانی کی، اساتذہ کو بھی پابند کیا کہ وہ بھی کالج میں جب بھی امتحانی سینٹر قائم ہو اپنے اس قومی فرض کو ایمانداری سے انجام دیں اور ایسا ہوا، میرے دور میں یہ کالج کراچی بھر میں مشہور ہو گیا تھا کہ یہاں امتحان کے دوران بہت سختی ہوتی ہے۔ ایک اور قدم یہ بھی اس حوالہ سے کیا کہ کالج میں ہونے والے عملی امتحانات میں جو بے قاعدگیاں تھیں انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کی، عملی امتحان کا پروگرام واضح الفاظ میں اور نمایاں جگہ لگانے کو یقینی بنایا تاکہ طلبہ کو بروقت یہ معلوم ہو سکے کہ انہیں کس دن امتحان دینے آنا ہے۔ طلبہ سے براہِ راست مخاطب ہوا کرتا تھا، تمام کلاسیں مقررہ وقت پر ہوں اس بات کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کی۔

کالج لائبریری عرصہ دراز سے ایک چھوٹے سے ہال میں چلی آرہی تھی، میرے دور میں لائبریری کے لیے مزید ایک کمرے کا اضافہ ہوا جس کے باعث طلبہ کو ریڈنگ روم کی سہولت میسر آئی، میں نے کتب کی خریداری پر کبھی قدغن نہیں لگائی ، میری طرف سے پوری آزادی تھی کہ جس قدر لائبریری بجٹ موجود ہے کتابیں خریدی جائیں اور ایسا ہوا کہ ہزاروں روپے کی کتابیں خریدی گئیں۔یہ وہ بڑے بڑے اقدامات تھے جو میں نے اس کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ اس کالج کی بہتری کے لیے ، اس کالج کی ترقی کے لیے جو بھی ممکن ہو کروں۔میں اس کام میں اکیلا شامل نہیں ہوں ۔چند اساتذہ اگر انہیں استاد کہہ سکیں) کے علاوہ سب استادوں نے میری بھرپور مدد کی۔ ان کی مدد) کے بغیر یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے تو صرف اپنا فرض نبھایا اور ربِ کائنات نے میری مدد کی۔

سوال: آپ استاد اور شاگرد کے رشتہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ؟

جواب: استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا مقدس رشتہ ہے عام طور پر شاگرد اپنے استاد کو ہی اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے۔اس وجہ سے یہ استاد کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ اپنے علم اور اپنی شخصیت کو اتنا باوقار بنالے کہ شاگردوں کے دلوں میں ہمیشہ اپنے اساتذہ کی عزت اور تکریم برقرار رہے۔

سوال: کالج کیا ہے مختصر الفاظ میں وضاحت کیجئے؟

جواب: کوئی بھی کالج دراصل طلبہ، اساتذہ، عمارت اور اپنی روایات سے مل کرتا ہے۔

سوال: اپنی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ بتایئے؟

جواب: جب میری تقرری ای ڈی او (ایجوکیشن) کے طور پر ہوئی اور میں پہلے دن جب اپنے دفتر پہنچا تو ایک مفلوک الحال عورت کو دیکھا جو سخت پریشانی کے عالم میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بلایا اور اس کا مسئلہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے مرحوم شوہر کی پینشن' جو کہ ایک پرائمری اسکول ٹیچر تھا' ایک سال سے جاری نہیں ہو رہی تھی اور وہ سخت مفلسی اور لاچاری سے دوچار تھی۔ میں نے اسی وقت اس کی فائل طلب کی اور اس کی پینشن جاری کروائی۔ اس کام کے بعد میں نے باقاعدہ ایک حکم نامہ جاری کیا کہ کسی بھی ملازم کی پینشن کا معاملہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں رکنا چاہیے اور بڑی سختی کے ساتھ میں نے اس حکم نامہ پر عمل درآمد کروایا۔

سوال: یہ فرمائیں کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ نے اس کالج میں آپ نے اپنے جانشین کا انتخاب درست کیا؟

جواب: بالکل! میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے جانشین کا انتخاب بالکل درست

کیا۔ خورشید زیدی صاحب نے کالج کی بہتری کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور آج اگر کراچی میں گورنمنٹ کالج ، ناظم آباد اچھے معیاری کالجوں میں گردانا جاتا ہے تو اس میں یقینا خورشید زیدی صاحب کا ایک بہت اہم اور گرانقدر حصہ ہے۔

سوال: نوجوان نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟

جواب: نوجوان نسل کو میرا پیغام یہی ہے کہ اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کریں اور پھر پوری محنت کے ساتھ اس کے حصول کی کوشش کریں۔ تعلیم پوری تندہی سے حاصل کریں اور پھر اپنی تعلیم اور قابلیت سے اپنا، اپنے خاندان اور اپنے ملک کا نام روشن کریں تاکہ معاشرے میں ایک قابل رشک مقام حاصل کرسکیں۔

جنوری ۲۰۰۸ء ۳۰

نیّر سوز۔ شاعر و ادیب۔ ایک مطالعہ

(یہ انٹرویو گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کے مجلّہ 'روایت'' کے لیے لیا گیا جو مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے)

معروف شاعر و ادیب نیّر سوز گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے ابتدائی سالوں کے طالب ہیں آپ کا مجموعہ کلام ''غزل بساط'' ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ نیّر سوز کا تعلق شاہجہانپور کے ایک ادبی گھرانے سے ہے، شاعری آپ کو ورثے میں ملی، آپ کے والد سوزؔ شاہجہانپوری اپنے وقت کے پختہ مشق شاعر، ادیب، مشاق انشاپرداز تھے جن کا اردو ادب میں ایک بلند مقام ہے۔ آپ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ آپ کا مجموعہ کلام ۱۹۳۸ء میں 'سوز و ساز' اور 'کلیات سوزؔ' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئے۔ بقول سحرؔ انصاری '' نیّر نے نہ شاہجہانپور دیکھا اور نہ لکھنو لیکن ان دونوں شہروں کا تہذیبی اور لسانی رچاؤ جو سوزؔ صاحب کی شخصیت میں تھا نیّر کے یہاں آ گیا ہے''۔ نیّر سوز کو طالب علم کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد میں گزارے ہوئے اپنے ماہ و سال کی داستان بہت اچھی طرح یاد ہے۔

پیر ۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء کی بات ہے میں کالج پہنچا خورشید صاحب سے کہا کہ میں رات نیّر سوز کو فون کرچکا ہوں وہ گھر پر نہیں تھے شاید اس وقت موجود ہوں آپ بھی کوشش کرلیں ۔ خورشید صاحب نے فون کیا ، نیّر سوز صاحب سے بات ہوئی ۔ انہوں نے کہا کہ میں ابھی فارغ ہوں یہ کام ابھی ہوسکتا ہے ۔ اپنے گھر کا ایڈریس لکھوایا جو کالج کے نزدیک ہی تھا، میں کچھ دیر ہی میں نیّر صاحب کے گھر پہنچ گیا، وہ کچھ توقف کے بعد تشریف لائے، وضع قطع شاعرانہ تھی، تپاک سے ملے۔ آنے کا مقصد بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی ، وہ میرے ساتھ مکالمے کے لیے تیار تھے۔ نیّر سے مل کر سحؔر انصاری کی نیّر سوز کے بارے میں یہ رائے جو انہوں نے نیّر کے مجموعہ کلام 'غزل بساط' کے تعارف میں لکھی ہے سو فیصد درست لگی کہ "نیّر سوز ایک بے حد مخلص ،

شائستہ، مہمان نواز اور یار باش انسان کا نام ہے۔ اس میں ایک خاص نوع کی زندہ دلی اور قہقہہ فشانی ہمہ وقت موجود رہتی ہے"۔ گفتگو کا آغاز ہوا آپ نے سب سے پہلے تو ان طلبہ ساتھیوں کے نام بیان کیے جو ان کے ہمراہ گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے طالب علم رہ چکے تھے۔ان میں سحر انصاری جو ان سے سینئر تھے، محمد احمد فاروقی (مرحوم) میں تھے، نفیس صدیقی، امیر حیدر کاظمی، علی اختر NSF سید منور حسن جو اس وقت، خان، مسرور علی خان، محمد غوری، س۔م۔صولت، رسول احمد کلیمی ، شکیل احمد (اداکار)، انور مقصود، حسن علی، احمد علی (موجودہ سینیٹر)، سید احمد فاروقی ، کمال احمد صدیقی، عقیل دانش،زاہد محمود، ڈاکٹر حفصہ علیم، عمیم اختر اور

انیس زیدی جو اس وقت انیس احمد تھے شامل ہیں۔آپ نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اس دور کا ایک واقعہ سنایا کہ اس زمانے میں یونین کے الیکشن ہوا کرتے تھے۔ بعض ساتھیوں نے مجھے یونین کے صدر کا امیدوار نامزد کر دیا، میں اس دور میں این ایس ایف کا سرگرم رکن تھا nomination فارم بھر کر میں اپنے گھر چلا آیا، اس دور میں ہمارے کالج میں شہنشاہ حسین کا بہت نام تھا، اس کا مقابلہ رانا اظہر علی خان سے چلتا تھا اس کا تعلق نیشنل کالج سے تھا۔ شام میں دروازے پر دستک ہوئی، میں باہر گیا تو وہاں ضیاء الحسن خان کھڑے تھے، سلام دعا کے بعد وہ مجھے گلی کے کونے پر لے گئے وہاں شہنشاہ حسین، امداد، کبیر اور دیگر چند لڑکے بھی کھڑے تھے۔ شہنشاہ حسین نے مجھ سے کہا کہ تم نے صدر کے انتخاب کے لیے فارم بھرا ہے، میں نے جواب دیا کہ ہاں، کہنے لگا کہ اگر جیت جاؤگے تو کیا پروگرام کراسکوگے، کہنے لگا کہ دیکھو یہ رہا تمہارا nomination form، واقعی یہ وہی فارم تھا جو میں نے کالج یونین کے انتخابات کے انچارج استاد کے پاس جمع کرایا تھا۔ کہنے لگا بہتر یہ ہے کہ آپ اپنا نام واپس لے لیں، جب میں صدر ہو جاؤں گا تو وعدہ کرتا ہوں کہ تمام پروگرام آپ لوگوں کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہوں گے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس تجویز کو ہی اپنے لیے بہتر جانا اور شہنشاہ حسین صدر مقرر ہوگیا لیکن اس نے اپنے وعدے کا پاس کیا ہم نے کالج میں ادبی پروگراموں کا انعقاد کیا، مشاعرے منعقد کیے ان تمام پروگراموں میں اس نے ہماری مدد کی۔ اس

سے قبل کہ وہ اپنی گفتگو کو وہ مزید آگے بڑھاتے میں نے معذرت کرتے ہوئے تیر صاحب سے درخواست کی کہ بہتر ہے کہ ہم اپنی گفتگو کو سوالوں کی اس ترتیب سے آگے بڑھائیں جو میں میرے پاس موجود ہے۔ انہوں نے میری تائید کی ، اب گفتگو جس ترتیب سے ہوئی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سوال : اپنی پیدائش، ابتدائی تعلیم اور بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب : میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لکھنو میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم لکھنو ہی میں ہوئی، اسلامیہ اسکول کالج لکھنو میں پڑھا، ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی اس وقت عمر نو سال تھی۔ پی آئی بی کالونی میں رہائش اختیار کی، مارٹن روڈ پر ٹینٹو والا اسکول' میں داخلہ لیا، وہاں جو دوست بنے ان میں معروف آرٹسٹ طلعت حسین، ٹی وی پروڈیوسر محسن صدیقی مرحوم، سید نسیم حیدر شامل تھے۔ یہ اسکول آٹھویں جماعت تک تھا، چنانچہ ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر ا، ناظم آباد میں داخلہ ہوا اور میٹرک اسی اسکول سے کیا۔ یہاں ہمارے ساتھی نعمت اللہ صدیقی، ڈاکٹر مظاہر حسین اشرف، منور حسین، ضیاء عباس تھے۔ ۵۷۔۱۹۵۶ء میں میٹرک کیا، شروع میں داخلہ رضا علی کالج میں لیا لیکن سیکنڈ ائر میں سینٹرل گورنمنٹ کالج موجودہ گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ، یہاں جو ساتھی تھے ان کے تفصیل میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔

سوال : آپ نے جب گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو یہاں کا ماحول کیسا تھا، اساتذہ ہم کون کون تھے ؟

جواب : اس دور کے اساتذہ واقعی طلبہ کی سرپرستی و رہنمائی کیا کرتے تھے۔ شاعری و ادب کی تمام تر سرگرمیاں جناب انجم اعظمی، سعیدہ عروج مظہر اور ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر صفدر حسین اور ڈاکٹر عبد السلام کی سرپرستی میں ہوا کرتی تھیں۔ میں شروع ہی سے شاعری کی جانب مائل تھا چنانچہ ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں نصیر ترابی اور میں (تیرؔ سوز) نئی نسل کے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس دور میں طلبہ کے مشاعروں کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھا۔ کالج کا ماحول ہر اعتبار سے اچھا تھا حالانکہ اس زمانے میں کالج میں طالبات بھی ہوا کرتی تھیں لیکن کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صفدر حسین کے دور میں کالج نے بہت ترقی کی، ان کی ایک خاص بات جو مجھے یاد ہے کہ ان کی قمیض کا کالر ہمیشہ دوسرے رنگ کا ہوا کرتا تھا۔

سوال : آپ اپنے زمانہ طالب علمی کا موازنہ موجودہ دور سے کریں تو کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب : میرے زمانہ کے طالب علم اپنے اساتذہ کے مقبول اور قریب ہوا کرتے تھے لیکن تہذیب کی جو حد تھی اس سے کبھی تجاوز نہیں کیا مثلاً مجال نہیں کہ

ہم اپنے کسی استاد کے سامنے سگریٹ پی لیں حالانکہ بہت بے تکلف تھے لیکن ایک دائرے کے اندر آج تمیز ختم ہو گئی ہے۔ اُس دور میں ادب ایک ذریعہ تھا، ادب کی جو تربیت ہو رہی تھی وہ تمام طالب علموں کے لیے یکساں تھی آج کا طالب علم ادب سے نہ آشنا ہے، باہمی اختلافات، رنجشیں، حتیٰ کہ لڑائی اور مارپیٹ بھی ہوا کرتی تھی اس میں زیادہ سے زیادہ ہاکی کا استعمال ہو جایا کرتا تھا آج کی طرح ٹی ٹی اور بندوق کا استعمال عام نہیں تھا۔ حصول تعلیم ذریعہ روزگار نہیں تھا بلکہ ذہن کی پرورش مقصود ہوا کرتی تھی، آج حصول تعلیم صرف اور صرف ذریعہ روزگار ہے۔ ہمارے دور میں تعلیمی ماحول خوشگوار، اساتذہ کی عزت و تکریم تھی۔ کالج کے پہلے پرنسپل پروفیسر اطہر رشید صاحب کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوا کرتی تھی جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتے تو سناٹا ہو جایا کرتا تھا، ڈاکٹر صفدر حسین صاحب جو بعد میں پرنسپل ہوئے، شاعر تھے ان کی کتاب کا عنوان شاید ''رخت تاؤس'' ہے۔ کالج کی تزئین و آرائش، رنگ و روغن اور پھولوں کی سجاوٹ پر وہ بہت توجہ دیا کرتے تھے کالج کو خوبصورت بنانے میں صفدر صاحب کا بہت ہاتھ ہے۔

سوال: جب آپ اس کالج میں طالب علم تھے، کوئی ناقابل فراموش واقعہ، اگر آپ کو یاد ہو۔

جواب: طلبہ یونین کے انتخابات تھے، ہمارا امیدوار امیر حیدر کاظمی تھا،

ہم کالج میں اس کا انتظار کر رہے تھے وقت گذرتا گیا وہ نہیں آیا، ہم سمجھ گئے کہ کوئی بات ہے، ہم نے تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی، پتا چلا کے اسے اغوا کرکے سمندر کے کنارے لے گئے ہیں، وہاں کھڑا کرکے سمندر کی لہریں گنوا رہے تھے، جب وقت گزر گیا تو اسے کالج کے سامنے چھوڑ گئے، ہماری درج شدہ رپورٹ کام آئی اور اسے فارم جمع کرنے کا موقع دیا گیا۔ میرے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ میں آپ کو شروع ہی میں سنا چکا ہوں۔

سوال : اپنا کوئی شعر سنائیں جو آپ نے گورنمنٹ کالج کے زمانہ میں کہا ہو۔

جواب: ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو میں نے ایک نظم کہیں تھی اس کا ایک شعر سنیے ۔

قمری کے گلے میں طوق پڑا گلشن عنادل بھاگ گئے

ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء

سید امتینان علی شاہ بخاری۔ شخصی مطالعہ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہی
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

بخاری صاحب جن کا پورا نام سید امتینان علی شاہ بخاری تھا اللہ کو پیارے ہوئے۔ پاکستان لائبریرین شپ کی دنیا میں بخاری صاحب مرحوم کو ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ اپنے منفرد اور اثر پذیر انداز میں گفتگو اور جاذب نظر شخصیت کے باعث وہ ہر محفل میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جایا کرتے۔ برٹش کونسل بخاری صاحب کی پہچان تھی کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ برٹش کونسل حیدر آباد اور لاہور میں گزرا تھا۔ حیدر آباد، اندرون سندھ اور کراچی کے تعلیم یافتہ لوگ بخاری صاحب کی لائبریری خدمات سے مستفیض ہو چکے تھے اور وہ مرحوم کی بہت عزت کیا کرتے، اس کی وجہ بخاری صاحب کا وہ برتاؤ اور خدمات تھیں جو انھوں نے ایک لائبریرین کی حیثیت سے فراہم کی تھیں۔ سندھ کے کئی لکھنے والوں نے اپنی تصانیف میں بخاری صاحب کی لائبریری خدمات کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

بخاری صاحب ۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، ۱۹۴۶ء میں میٹرک پاس کیا

۱۹۵۴ء میں بی اے، بعد ازاں جامعہ پنجاب سے انگریزی اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں، اسی جامعہ سے ۱۹۵۶ء میں لائبریری سائنس میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا، برطانیہ سے لائبریرین شپ کا مختصر کورس بھی کیا۔ آپ نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز پی سی ایس آئی آر کے لائبریرین کی حیثیت سے کیا اور تین سال اس ادارے سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں برٹش کونسل سے منسلک ہوئے اور حیدرآباد اور لاہور میں مختلف حیثیتوں میں ۱۵ سال خدمات سرانجام دینے کے بعد لیاقت میموریل لائبریری کے پرنسپل لائبریرین (ڈپٹی ڈائریکٹر) ہوئے اور چار سال خدمات انجام دیں۔ اسی دوران آپ بیرون ممالک بھی گئے اور پیرس کی French Proficiency اور جرمنی میں German Proficiencey (Bonn) سے بھی وابستہ رہے۔

بحیثیت استاد بھی بخاری صاحب کی خدمات قابل قدر ہیں۔ جامعہ سندھ، حیدرآباد میں لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کلاس کا آغاز ڈاکٹر محمد علی قاضی کی عملی جدجہد کے نتیجہ میں ۷۰۔۱۹۷۱ء میں ہوا۔ ابتدائی کلاس (جس میں ۳۸ طلبہ تھے) کو پڑھانے کے لیے جن اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا ان میں ڈاکٹر محمد علی قاضی کے علاوہ جناب معین الدین خان اور بخاری صاحب شامل تھے۔ بخاری صاحب پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے اسکول آف لائبریرین شپ سے بھی وابستہ رہے۔ راقم نے ۱۹۹۲ء میں بخاری صاحب سے ہائر سرٹیفیکیٹ کورس کی کلاس

کو پڑھانے کی استدعا کی جو آپ نے قبول کر لی اور دو سال ریفرنس کا کورس محنت کے ساتھ پڑھاتے رہے۔ وقت کی پابندی، احساس ذمہ داری اور اپنے پیشہ سے دلی وابستگی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس دوران جب کہ سیشن جاری تھا آپ کی ہمشیرہ اچانک رحلت کر گئیں اور آپ کو فوری پنجاب جانا پڑا، آپ نے پنجاب سے راقم کو خط تحریر کیا جس میں اس افسوس ناک خبر کی اطلاع کے علاوہ اپنے اچانک چلے جانے اور ان کی غیر موجودگی میں کلاس لینے کی درخواست کی تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

بخاری صاحب کی شخصیت تصنع و بناوٹ سے پاک تھی، سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ گفتگو بہت ہی سوچ سمجھ کر کیا کرتے، ادب وآداب، لحاظ و مروت کا ہمیشہ پاس رکھتے۔ کبھی اخلاق سے گری ہوئی بات نہ کرتے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا کہ ایک ایسا پڑھا لکھا شخص بات کر رہا ہے جس کے اندر علم کی گہرائی موجود ہے۔ مردانہ وجاہت، خو
بصورت، کھڑے نقوش، گورا رنگ، دبلے اور لانبا قد اور اس کے ساتھ خوش لباسی مرحوم کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ ملنسار، خوش طبع و خوش گفتار تھے، گفتگو میں اکثر شعر سنایا کرتے، ادبی رنگ ان کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ بخاری صاحب کی انگریز سے مشابہت رکھتا تھا۔ انگریزی میں ایم اے کی سند نے look شخصیت کا ظاہری انہیں مزید گوروں سے مشابہ بنا دیا تھا اور پھر رہی سہی کسر برٹش کونسل کی ملازمت نے پوری کر دی تھی اور وہ مکمل

انگریز بن گئے لیکن کبھی اپنی انگریز نما شخصیت سے کسی کو مرعوب کرنے کوشش نہیں کی حتیٰ کہ عام گفتگو میں بھی انگریزی بولنے سے اجتناب کرتے۔ راقم الحروف کے نام اپنے ایک خط جو اردو زبان میں ہے مرحوم نے انگریزی زبان میں اپنے جذبات اور احساسات کو واضح انداز سے اظہار نہ کرنے کی جانب اشارہ کیا، آپ نے لکھا ''صمدانی صاحب ! بعض اوقات ہم انگریزی زبان میں اپنے جذبات اور احساسات کو جس انداز سے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں شاید نہیں کرپاتے''۔

بخاری صاحب کی انگریز نما شخصیت میں پاکستان ٹیلی وشرن کے سینئر پروڈیوسر سید حیدر امام رضوی کو جنھوں نے معروف ڈرامہ ''جناح سے قائد'' پیش کیا۔ برطانوی سامراج کی ایک معروف شخصیت ''لارڈ ماؤنٹ بیٹن'' سے مشابہ نظر آئی چنانچہ اس ڈرامہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مختصر سا کردار سید اتیمنان علی شاہ بخاری نے کامیابی سے ادا کیا۔

لائبریرین شپ کی محفلوں ، مجالس و مذاکرہ اور کانفرنسوں میں بخاری صاحب بھرپور طریقے سے شریک ہوا کرتے ان کی عادت یہ تھی کہ خود کو پیچھے رکھتے دوسروں کو آگے بڑھانے کی سعی کرتے رہتے۔ شعلہ بیان مقرر تو نہ تھے البتہ کسی بھی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کیا کرتے جو ہر اعتبار سے مدلل اور impresive ہوا کرتی۔ مجھے متعدد بار لائبریرین شپ پر منعقد ہونے والے

پروگراموں میں بخاری صاحب کے ساتھ بولنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں امریکن لائبریری سینٹر نے چوتھے لائبریری ویک کے سلسلے میں مئی میں ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا ۔ شریک گفتگو بخاری صاحب ، ڈاکٹر نسیم فاطمہ ، معین الدین خان صاحب اور راقم الحروف شامل تھا۔ مذاکرہ کا موضوع ''مستقبل کے کتب خانے'' تھا۔ تمام مقررین کے علاوہ بخاری صاحب نے موضوع پر بھرپور انداز سے گفتگو کی اور شرکاء کو متاثر کیا۔
پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے علاوہ بخاری صاحب اپنے پیشہ کے فروغ ، ترقی اور سربلندی کے لیے انفرادی طور پر بھی جو کچھ ممکن ہوتا کیا کرتے۔ لیاقت میموریل لائبریری کی ڈائریکٹر کی حیثیت سے محترمہ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ نے جب چارج سنبھالا ، اس وقت بخاری صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر تھے ، آپ نے کراچی کے سینئر لائبریرینز کی ایک میٹنگ ڈائریکٹر صاحبہ کے ساتھ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو منعقد کی ۔ بخاری صاحب نے اس تعارفی تقریب میں اپنے پیشے اور لائبریرینز کا بھرپور تعارف محترمہ سے کرایا۔ ۱۹۹۶ء میں بخاری صاحب سندھ آرکائیوز میں بیٹھے لگے ، آپ نے راقم کو ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ایک خط تحریر کیا جس میں لائبریری قانون کے مسودات کی کاپی فراہم کرنے کی درخواست کی گئی وہ اپنے شعبہ کے تحت اس کوشش میں بھی رہے کہ کسی طرح سندھ میں لائبریری ، قانون کا نفاذ عمل میں آجائے۔ راقم نے انہیں لائبریری قانون کے مسودات کی کاپی فراہم

کر دیں۔

بخاری صاحب مجلسی آدمی تھے لوگوں کے درمیان رہنا، گفتگو کرنا پسند کیا کرتے تھے۔ گفتگو میں شائستگی، ادب و آداب اور لحاظ ان کی طبیعت کا ایک اہم جزو تھا۔ بیہودہ گفتگو کرتے نہ ہی کسی دوسرے کی ایسی بات برداشت کیا کرتے۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے تاحیات رکن تھے، پاکستان ببو گرافیکل ورکنگ گروپ کے رکن اور اسکول کے ایک قابل استاد تھے۔ پاکستان لائبریری بلیٹن کے مستقل پڑھنے والوں میں سے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی رسالہ کے بارے میں ضرور پوچھتے، تعریف کے ساتھ ساتھ غلطیوں کی بھی نشاندھی کیا کرتے۔ لائبریرین شپ کے گرتے ہوئے معیار پر فکر مندی کا اظہار کیا کرتے، اکثر کہا کرتے تھے کہ اس پیشہ میں ذہین لوگوں کو آنا چاہیے۔ بخاری صاحب اب ہم میں نہیں۔ اللہ تعالٰی مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

(مطبوعہ پاکستان لائبریری بلیٹن۔ جلد ۳۱، شمارہ ۳۔۴، ستمبر ادسمبر ۲۰۰۰ء)

پروفیسر سید کمال الدین سابق ڈائریکٹر کالجز سے مکالمہ

(پروفیسر سید کمال الدین ڈائریکٹر آف کالجز و پرنسپل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد بھی رہے یہ انٹرویو گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کے مجلّہ 'رایت'' کے لیے لیا گیا جو مجلّہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس ملاقات میں کالج کے لیکچرر محمد عاصم اور عبدالرشید بھی شریک تھے)

پروفیسر سید کمال الدین طویل تعلیمی اور انتظامی تجربہ رکھتے ہیں، آپ نے اکتوبر ۱۹۸۹ ء سے مارچ ۱۹۹۳ء تک گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے پرنسپل کے فرائض انجام دیے۔ آپ نے کراچی کے علاوہ اندرون سندھ کے مختلف شہروں میرپور خاص، حیدرآباد، دادو، ہالہ، خیرپور میں بھی تدریس کے فرائض انجام دئے۔ کراچی میں آپ نے گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے علاوہ گورنمنٹ سائنس کالج لیاری، گورنمنٹ کالج (حامد بدایونی گورنمنٹ کالج) اورنگی ٹاؤن کے پرنسپل اور ڈائریکٹر کالجز کے فرائض بھی انجام دئے۔ آپ کی تعلیمی خدمات ۴۵ سالوں پر محیط ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا، ۱۹۹۴ء میں مدت ملازمت پوری ہونے پر ریٹائر ہوئے۔ آپ ایک باوقار اور پرکشش شخصیت کے مالک ہیں، گفتگو میں دھیما

پن لیکن پر جوش طرز تکلم، عمدہ اسلوب بیان، طرز فکر غیر روایتی، مذہب کا عنصر غالب، خوبصورت الفاظ کے ساتھ پر کشش جملوں کا استعمال، اردو اور انگریزی پر مکمل عبور، جوش وجذبے کے ساتھ ساتھ بے باکی اور حوصلہ نظر آیا۔ آپ کی گفتگو سے عمومی تعلیمی صورت حال، کالج کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات، اور مختلف امور میں آپ کے نقطہ نظر کو جاننے کا موقع ملا۔ پروفیسر کمال کے ساتھ ہونے والی گفتگو قارئین کے لیے معلوماتی اور دلچسپی کا باعث ہوگی۔

سوال: کچھ اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں کب اور کہاں پیدا ہوئے، آپ کا بچپن کیسا گزرا؟

جواب: میری پیدائش ہندوستان کی سرزمین راجستھان کی ریاست جےپور میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جے پور میں حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کرکے ہم حیدرآباد آگئے اور میٹرک سٹی ہائی اسکول حیدرآباد سے ۱۹۴۷ء میں دہلی بورڈ کے تحت کیا، ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج حیدرآباد سے گریجویشن کیا بعد ازاں سندھ یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کیا۔ تعلیمی سفر کے دوران یونین کا صدر منتخب ہوا۔

سوال: تعلیم کے بعد اپنے پیشہ ورانہ سفر کے بارے میں بتائیں۔

جواب: ۱۹۵۵ء میں ڈیمانسٹریٹر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا دو سال بعد

۱۹۵۷ء میں لیکچرر ہو گیا۔ پہلے میرپور خاص میں تعیناتی ہوئی، وہاں سے دادو اور پھر گورنمنٹ کالج حیدر آباد میں تبادلہ ہوا۔ یہاں سے پھر ہالہ، سپیریئر سائنس کالج خیرپور کے بعد سپیریئر سائنس کالج ڈرگ کالونی کراچی میں تبادلہ ہوگیا۔ پہلی بار عبد الحامد بدایونی گورنمنٹ کالج، اورنگی ٹاؤن کا پرنسپل بنایا گیا۔ میں اس کا اولین پرنسپل تھا۔ لیاری میں قائم گورنمنٹ سائنس کالج لیاری کے حالات قابو سے باہر ہوئے تو مجھ سے کہا گیا کہ میں وہاں کا پرنسپل بن جاؤں، میں وہاں چلا گیا اور لیاری جیسے علاقے میں جہاں طلبہ کو کنٹرول کرنا معمولی بات نہ تھی میں نے اس کالج کو امن اور سکون کی پٹری پر ڈال دیا۔ میں شروع ہی سے نڈر واقع ہوا ہوں، اسپورٹس مین تھا، اسکاؤٹس کا سرگرم رکن رہ چکا تھا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ طلبہ کی بات کو سنا جائے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ چنانچہ لیاری کے کالج میں طلبہ جب بھی آپس میں دست و گریباں ہوئے میں بلا خوف و خطر ان کے درمیان چلا جایا کرتا تھا اور انہیں اپنی گفتگو سے قائل کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ ۱۹۸۹ء میں اس گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے حالات ابتر ہو گئے، شاید انتظامیہ کے قابو سے باہر بھی مجھے لیاری سے اس کالج کا انتظام سنبھالنے کو کہا گیا میں نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج، سمجھا اور اس کالج کا پرنسپل ہو گیا۔ یہاں بھی میں نے اپنی حکمت عملی کو اپنایا طلبہ سے براہِ راست تعلق قائم کیا، معلوم کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اللہ کے فضل سے

حالات قابو میں آ گئے، امن ہوگیااور تعلیمی ماحول معمول پر آ گیا۔ یہاں پر کام کر رہا تھا کہ ہمارے ڈائریکٹریٹ میں حالات خراب ہوئے اور مجھے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ایک بڑا ٹاسک دیا گیا، میں نے اسے بھی قبول کیا اور مختصر عرصہ کے لیے ڈائریکٹر آف کالجز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

سوال : آپ زمانہ طالب علمی میں بہت بہادر رہے ، بعض کالجوں میں بحیثیت پرنسپل طلبہ کے ساتھ دلیرانہ طریقے سے مقابلہ کیا۔

جواب : زمانہ طالب علمی سے ہی ایتھلیٹ ہونے کی وجہ سے مضبوط قد و قامت رکھتا تھا۔ نڈر ہونے کی وجہ سے طلبہ کو دہشت زدہ کرنے والی سرگرمیوں سے مرعوب نہیں ہوتا تھا۔ میرا یہ طرز عمل اور دلیری کے ساتھ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا میرا معمول رہا، جب میں عملی زندگی میں آیا تو طلبہ کے جذبات ، ان کے احساسات اور اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ جب وہ اپنے جذبات اور مطالبات کے حق میں شدید رویہ اختیار کریں تو ان سے کس طرح نمٹا جائے۔ جب مجھے لیاری میں کالج پرنسپل بنایا گیا اور میں نے اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ جب میں پہلے دن کالج پہنچا تو طلبہ کالج پر قابض تھے، پرنسپل آفس ان کے قبضے میں تھا، چھت کا پنکھا بری طرح ٹوٹا ہوا تھا، یہی حال دیگر اشیاء کا تھا،ان سب باتوں کا مقصد نئے پرنسپل کو مرعوب کرنا اور خوف زدہ کرنا تھا۔ میں نے صورت حال کا جائزہ لیااور فیصلہ کیا کہ طلبہ سے

براہِ راست بات کرنا چاہیے اور ان کے اصل مسائل معلوم کرنا چاہیں۔ میں جوں ہی کالج میں داخل ہوا طلبہ نے آوازیں کسنا شروع کیں ، میں نے اپنے آپ کوان سے بات کرنے پر آمادہ کیا، میں جوں ہی ان کے قریب پہنچا وہ خاموش ہوگئے اور میری اس غیر متوقع آمد اور ان سے قربت پر وہ حیران بھی ہوئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تمہارے مسائل حل کرنے آیا ہوں، تم مجھ سے بات کرو اپنے مسائل مجھے بتاؤ تاکہ میں انہیں حل کرسکوں ، میں نے انہیں اخلاقیات کا درس دیا انہیں سمجھایا اور ان کی شدت کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ تعلیمی اداروں میں اکثر ہی نہیں کرتے۔ میرا یہی طرز face مسائل اس لیے حل نہیں ہوتے کہ ہم لوگ انہیں عمل تھا کہ اکثر کالجوں میں طلبہ نے مجھ سے پوجنے کی حد تک محبت کی وہ میرے لیے آنسوؤں سے روئے حتیٰ کہ جب میں دادو سے ٹرانسفر ہوا اور رخت سفر باندھا تو طلبہ نے میری محبت میں میرے ٹرانسفر کے خلاف احتجاج کیا اور جب میں ٹرین کے ذریعہ دادو سے روانہ ہونے لگا تو اکثر طلبہ ٹرین کے آگے لیٹ گئے۔ یہ تھی طلبہ کی ایک استاد سے محبت۔

سوال : جب آپ نے گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے پرنسپل کا چارج لیا تو آپ کی ترجیحات کیا تھیں؟

کیا جائے۔ ان channelized جواب : میری کوشش رہی کہ طلبہ کی سرگرمیوں کو میں ہم نصابی سرگرمیاں جن میں قرآت ،نعت ڈیبیٹ، تقریری مقابلے، معلومات عامہ کے

teacher مقابلے، کھیل اور ان میں لیڈرانہ صلاحیت پیدا کی جائے۔ میری نظر میں
tutorial اس مقصد کے حصول is a friend, phylosopher and a guide
شروع کیے۔ ہم طلبہ کی تمام معاشرتی زندگی میں درپیش مسائل کے حل کے لیے group
رہنمائی کرتے تھے یہ سلسلہ اس قدر مقبول تھا کہ طلبہ اپنے والدین سے زیادہ اپنے
اساتذہ کی عزت کیا کرتے تھے اور والدین اپنے بچوں کی یہ شکایت لے کر آیا کرتے تھے
۔ اگر ہم طلبہ کو ایک اچھا انسان بنا دیں تو وہی ہماری بخشش کا سبب بن سکتا ہے۔

سوال: تعلیمی اداروں کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ طلبہ نے کالجوں کے بجائے کوچنگ سینٹرز کا رخ کر لیا ہے اب انہیں کالج کیسے لایا جاسکتا ہے؟

جواب: کوچنگ سینٹرز پر پابندی لگانے کے بجائے کالجوں میں کل وقتی تدریس کا عمل شروع کردیا جائے ۔ اساتذہ کل وقتی کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دیں۔ نظام ایسا مرتب کیا جائے کہ اساتذہ اور طلبہ ہمہ وقت مصروف رہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں میں مکمل سہولتیں بھی مہیا کی جائیں۔ پروفیسر کمال ایک بار پھر ماضی کے جانب لوٹ گئے اور بتایا کہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ایک نشست میں سوال کیا کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کا قتل عام کیوں؟ جب میں نے تقریر کی تو میں نے ان سے سوالات کیے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے طلبہ کا استحصال کیوں؟ دانشور اور صحافی

مصلحتوں کا شکار کیوں ؟کار نبوت کے جانشین مصلحتوں کا شکار کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اب وہ استاد ہی نہ رہے اصل ضرورت استاد کی ہے، جو استاد دینے والا تھا اب وہ لینے والا بن گیا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر کمال نے گورنمنٹ کالج حیدرآباد کے سابق کاتذکرہ بہت ہی محبت سے کیااور بتایا کہ وہ ان سے بہت زیادہEdru Devart پرنسپل متاثر ہیں۔آپ کا کہنا تھا کہ وہ کالج میں زیادہ تر آخری پیریڈ ہی لیا کرتے تھے اس کلاس میں طلبہ بڑی تعداد میں موجود ہوا کرتے تھے۔آپ کا کہنا تھا کہ لیاری میں اتوار کے روز میں خصوصی کلاس لیا کرتا تھا جس میں دیگر کالجوں کے طلبہ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔آپ کا کہنا تھا کہ میں حالت وضو میں کلاس میں جایا کرتا تھا اور لیکچر کے دوران یہ تصور ہوا کرتا تھا کہ گویا میں حالت نماز میں ہوں۔

سوال : آپ موجودہ دور میں طلبہ سے کیا توقعات رکھتے ہیں اور انہیں کیا پیغام دینا چاہیں گے۔

جواب : نوجوان تدبر اور تجسس کی طرف گامزن ہو رہے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ میرے بعد اجالا ہے، میں تبدیلی دیکھ رہا ہوں، نوجوان طلبہ کا جوش و ولولہ ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی میں ہونے والی کوتاہیوں کا اعتراف کیا جائے اور احتساب کے ساتھ صحیح سمت کی جانب پیش قدمی کی جائے۔آپ نے مزید کہا جو قدیم ہے وہ میرا ورثہ ہے اور جو

جدید ہے وہ بھی میرا ہے۔ استاد کبھی ریٹائر نہیں ہوتا، وہ علم کا چراغ ہے جو کبھی گل نہیں ہوتا بشرطیکہ اخلاص موجود ہو۔

۱۴ فروری ۲۰۰۸ء

جبلِ ثور کے دامن میں چند ساعتیں

۳۱ دسمبر ۲۰۱۳ء مَیں اپنی شریکِ سفر شہناز کے ہمراہ صبح سویرے جدہ سے مکہ پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ آج حرم شریف میں جانے سے قبل مکہ کی تاریخی مساجد، پہاڑوں، غاروں اور میدانوں کی زیارت کریں گے۔ اتفاق کہیے یا ہمارے نیک اور صالحہ ارادے کی برکت کہ ہمیں پاکستان کے شہر ملتان کا ایک باسی نوجوان محمد رضوان مل گیا جو مکہ میں ٹیکسی چلا کر اپنا گزر بسر کر رہا ہے۔ ہم رضوان کے ہمراہ عازمِ سفر ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا، بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ مکہ کے کشادہ شاہراہوں پر سفر کرتے ہوئے ہم خیالوں میں بھی سفر کر رہے تھے۔ ایک پہاڑ ختم ہوتا دوسرا شروع ہوجاتا۔ رضوان سے گفتگو بھی جاری رہی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک چھوٹے سے میدان میں ٹیکسی روک کر اس نے کہا کہ دیکھئے وہ رہا جبلِ ثور اس پر غار ثور ہے۔ ہم سے پہلے کئی لوگ یہاں موجود تھے۔ تیس چالیس خواتین و حضرات پر مشتمل ایک گروہ ہندوستان سے آیا ہوا بھی یہاں موجود تھا۔ جوں ہی جبل ثور پر نظر پڑی یادوں کے دریچے کھل گئے۔ ابھی تک تو کتابوں میں ہی غارِ ثور کے بارے میں پڑھا تھا آج ہم اس کے نیچے موجود ہیں اور یہ ہماری نظروں کے سامنے مردانہ وجاہت کے ساتھ فخریہ انداز سے اپنی بہاریں دکھا رہا ہے۔ فخر کر رہا ہے کہ اللہ کے پیارے نبیؐ نے ہجرت مدینہ سے قبل اپنے ساتھی

دوست اور رفیقِ غار حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ مجھے شرف بخشا۔ یہاں تین دن اور تین راتیں قیام کیا۔ ہم اس پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے نظریں مسلسل پہاڑ کی چوٹی پر موجود غار کو تلاش کر رہی تھیں۔ شاید کسی طرح ہمیں غار کی ایک جھلک ہی نظر آ جائے۔ اس کی بلندی کو دیکھتے ہوئے غار تک جانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ لیکن بے شمار اللہ کے بندے اور بندیاں اپنے پیارے نبیؐ کی مختصر سے پناہ گاہ کی زیارت کے لیے دیوانا وار اوپر کی جانب رواں دواں تھے۔ اللہ نے انہیں ہمت اور حوصلہ عطا کیا، یہاں آ کر مجھے یہ احساس ضرور ہوا کہ میں اپنی جوانی میں یہاں کیوں نہ آیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اللہ کو یہی منظور تھا کہ میں عمر کے اس حصے میں یہاں موجود ہوں جب کہ پہاڑ پر چڑھنا میرے لیے ممکن نہیں، یہ بھی مالک کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے اس سعادت سے سرفراز کیا کہ آج میں اس مقدس جگہ موجود ہوں اور اپنی آنکھوں سے اس مقدس پہاڑ کی زیارت کر رہا ہوں۔

غار ثور میں آنحضرت ﷺ کا قیام کرنا، حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ان کے ہمراہ ہونا، پہاڑ پر سفر کے دوران جب نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھک جاتے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ آپ ﷺ کو اپنے کاندھوں پر اٹھالینا، غار کی صفائی کرنا، ایک سوراخ جو کے کھلا رہ گیا تھا اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کا اپنی ایڑی رکھنا، سانپ کا کاٹنا، شدت تکلیف سے آنسوؤں کا آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ٹپک

پڑنا، آنحضرت ﷺ کا ایڑی پر دہن مبارک لگا دینا، غار کے منہ پر مکڑی کا جالا بنا دینا، کبوتری کا گھونسلہ بنا کر انڈے دیدینا اور اپنے رفیق اور غار کے ساتھی کو فکر مند دیکھ کر آپ ﷺ کا یہ کہنا "آپ فکر نہ کریں اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ حضرت ابو بکر صدیق کی بیٹی حضرت اسماء کا آنحضرت ﷺ اور اپنے والد بزرگوار کو خوراک پہنچانا، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے عبداللہ بن ابو بکر کا رات کی تاریکی میں غار میں معلومات پہنچانا، آپ کے غلام عامر بن فہیرہ کا غار کے ارد گرد بکریاں چرانا اور حضرت عبداللہ بن ابو بکر سے تعلق رکھنا یہ سب باتیں اور واقعات اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں۔ مسلمان گھرانے کا کوئی بھی فرد ایسا نہ ہو گا جو ان واقعات سے واقف نہ ہو۔

یہ وہی متبرک و محترم پہاڑ ہے جس کا ذکر پروردگار نے کلام مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق غار حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ اس طرح کیا۔ (ترجمہ) اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد نہیں کروگے تو نبی کو کوئی فرق نہیں" پڑے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا اور وہ دونوں شخص (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ) غار میں چھپے ہوئے تھے اور نبی اپنے ساتھی (حضرت ابو بکر صدیق) سے کہہ رہے تھے "غم (نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ (سورۃ التوبہ ۴۰

نظریں پہاڑ پر تھیں اور سوچ کا دھارا اپنے پیارے نبی ﷺ اور رفیق نبیؑ کے پہاڑ پر چھڑنے اور تین دن قیام تک کے لمحات کو ایک ایک کرکے نظروں سے گزارتا رہا۔ کس راستے سے آپ ﷺ اوپر چھڑے ہوں گے، ہو سکتا ہے جہاں میں اس وقت اپنی شریک حیات شہناز کے ہمراہ موجود ہوں آپ ﷺ اپنے رفیق حضرت ابو بکر صدیق رضی للہ تعالیٰ عنہا اسی جگہ سے ہو کر پہاڑ پر گئے ہوں۔ جو راستہ مجھے نظر آرہا ہے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ اسی راستے سے اوپر چڑھے ہوں، یقناً آپ نے اوپر چھڑتے وقت اس پہاڑ پر اپنی نظریں تو ضرور ڈالی ہوں گی جس پر اس وقت میری نظر مرکوز ہے۔ اپنی اس سعادت پر فخر کرتے ہوئے غار ثور کے مکمل واقعے کا احاطہ کرتا رہا۔ پہاڑ کی قسمت پر رشک کرتا رہا اس غار میں موجود پتھروں کے بارے میں سوچتا رہا، خوش قسمت مکڑی کے بارے میں خیال آیا، اس کبوتری کا خیال آیا جس نے اپنا گھونسلو بنایا اور انڈے بھی دیدئے۔ غار میں آپ ﷺ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق کی عظمت اور نبی ﷺ سے عقیدت و محبت کا کیا کہنا، بے مثال اور بے بہا، عقیدت و محبت کا سمندر، حضرت اسماء بنت ابو بکر صدیق کی بہادری کا خیال آیا کہ وہ کس طرح رات کی تاریکی میں اس پہاڑ پر چھڑا کرتی ہوں گی اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوراپنے والد بزرگوار کو طعام و غذا پہنچاتی ہوں گی۔ حضرت عبداللہ بن ابو بکر صدیقؓ کس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر رات کی تاریکی میں پہاڑ پر آنا جانا کیا

کرتے ہوں گے۔ وہ دن بھر مکہ میں مشرکین کے درمیان میں رہتے اور رات میں غار آجایا کرتے اور کفار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے غار کے مکینوں کا آگاہ کیا کرتے ۔ ابو بکر صدیقؓ کے غلام عامر بن فسیرہؓ کی سعادت مندی اور حکمت علمی کا خیال آیا، وہ دن بھر بکریاں چراتے اور شام ہوتے ہی بکریوں کے ریوڑ کو غار کے پاس لے آتے تاکہ مکین غار ان بکریوں سے دودھ لے سکیں اور صبح ہوتے ہی عبداللہ بن ابو بکر صدیق کے پیچھے پیچھے اپنی بکریوں کو واپس نیچے لے آتے ۔ اس عمل کے پیچھے یہ حکمت تھی کہ جب عبداللہ غار سے واپس ہوں تو بکریوں کے ریوڑ ان کے پیروں کے نشانات مٹا دیں تاکہ کفار مکہ کو یہ معلوم نہ ہوسکے کہ اس راستے پر کسی کا آنا جانا ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ کیا حکمت عملی تھی۔ ان خیالات کے ساتھ میں نے اس عظیم پہاڑ کے ایک ایک چھوٹے بڑے پتھر، ریت اور کنکر سے اپنے پیارے نبی ﷺ اور آپ کے یار غار حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خوشبو اور احساس کو اپنے جسم میں سرائیت کرتے محسوس کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بھی اس پہاڑ کا ایک ادنیٰ سا پتھر بن گیا ہوں اے کاش میری عقیدت و محبت کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوجائے۔ ٹیکسی والے نے چلنے کے لیے کہا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے اس غار کو اس پہاڑ کو نم آنکھوں، دکھی دل کے ساتھ خدا حافظ کیا اور اگلی منزل کی جانب چل دیے۔

اگلی منزل کی جانب ٹیکسی رواں دواں تھی لیکن میری سوچ کا دھارا سفر ہجرت کے آغاز پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن سے اس طرح پس پردہ رہنا، تین دن بہ ظاہر تاریک غار میں گزارنا مالک کائینات کی کیا حکمت تھی۔ اس کے لیے اپنے نبیؐ کو پلک جھپکتے مکہ سے مدینہ پہنچادینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اللہ تعالی اپنے کسی فرشتے کو حکم دیتا وہ یہ کام پلک جھپکتے میں کردیتا، کوئی براق بھیج کر بھی یہ کام کرسکتا تھا۔ پھر اپنے پیارے نبی ﷺ کو اس مشکل سے کیوں دوچار کیا گیا۔ دراصل اللہ کی حکمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر ہر عمل ہمارے لیے حکمت اور روشنی کا پیغام لیے ہوئے ہے۔ اس عمل سے ہمیں ایک پیغام، ایک سبق دینا تھا کہ دشمن سے کس طرح نبردآزماں ہوا جائے، جنگ کی صورت میں، دشمنی کے صورت میں کس طرح اپنی حفاظت کی جائے، جان بچانا، مخالفین اور مشرکین کی آنکھوں میں کس طرح دھول جھونک کر اپنی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ بے شک اللہ کی ہر بات میں حکمت ہے۔

محمد عبد المعبود نے اپنی کتاب 'تاریخ المکہ المکرم' میں اس پہاڑ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ پہاڑ ۷۵۹ میٹر اونچا اور حرم سے تقریباً ۴ کلو میٹر دور ہے۔ اس پہاڑ کے قریب ثور بن عبد نے اقامت اختیار کی تھی جس کے باعث اس پہاڑ کا نام ثور مشہور ہوگیا۔ غار ثور کی لمبائی ۱۳۶ فٹ یعنی ۴ میٹر سے کچھ زائد جب کہ اس کا منہ ۳.۹ فٹ لمبا تھا اور منہ کی چوڑائی صرف ۱۹ انچ تھی۔

لوگوں کے بکثرت داخل ہونے اور نکلنے کے باعث اس وقت منہ تقریباً ایک میٹر کشادہ ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۳۳۷)

خلیل صمدانی۔ شخصیت و شاعری

بیکانیر کے معروف شاعر شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کے ساتویں بیٹے اپنے آبائی گھر ''آزاد منزل'' بیکانیر میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ جب آپ نے ہوش سنبھالا تو آزاد منزل کی فضاء شعر و سخن سے منور تھی۔ آپ کی تربیت اپنے والد کے زیر سایہ ایسے ادبی ماحول میں ہوئی کہ آپ کے اندر فہم و سخن کا پیدا ہو جانا لازمی امر تھا، آپ کو ذوق سلیم ورثہ میں بھی عطا ہوا تھا۔ مجموعہ کلام ''گلزار خلیل'' میں آپ رقمطراز ہیں کہ '' میں قبلہ و کعبہ کے سایہ عاطفیت میں اسی فضاء میں پلا اور مشق سخن کرتا رہا۔ آزاد منزل میں اکثر نعتیہ مشاعروں کے چرچے رہتے تھے۔ شعرا کرام حوصلہ افزائی کے خیال سے مجھے بلبل گلزار سخن کہتے تھے اور داد و تحسین سے نوازتے تھے''۔ خلیل صمدانی مرحوم کو ذوق علم و ادب، شعر گوئی و شعر فہمی اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی چاہت و عقیدت اپنے والد بزرگوار محمد ابرہیم آزادؔ سے ورثہ میں ملیں، ساتھ ہی آپ میں خداداد صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔ آپ کی طبیعت قدرتی طور پر شاعرانہ تھی جو شعر و سخن کا ماحول آپ کو بیکانیر میں میسر آیا اس نے آپ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی بلکہ چار چاند لگا دیئے۔

خلیل صمدانی کا کہنا تھا کہ اگر آپ کو کسی مسلّم الثبوت استاد کی شاگردی حاصل ہو جاتی تو حصولِ تلمذ کے بعد آپ کے کلام میں چار چاند لگ جاتے۔ آپ کا یہ بھی کہنا تھا کہ آپ اپنے والد سے ''بوجہ ادب و لحاظ فیضِ اصلاح حاصل نہ کر سکے''۔ استاد الشعراء جناب بیخودؔ دہلوی کی شاگردی کے بارے میں جناب خلیل صمدانی نے ایک واقعہ اپنے مجموعہ کلام ''گلزار خلیل'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔'' ایک دفعہ سرمایہ نازش زبان دہلی جانشینِ حضرت داغؔ، علامہ بیخود دہلوی بیکانیر تشریف لائے۔ صاحب موصوف نے میرے والد ماجد سے ارشاد فرمایا'' آزادؔ، خلیل کو ہمارا خلیل کر دیجئے، دو سال میں انشاءاللہ بیخود ثانی بنادیں گے۔ بیخود صاحب قبلہ نے خود جلیبیاں منگوائیں اور کچھ پڑھ کر میرا منہ جلیبی سے بھر دیا اور باقی حاضرین میں تقسیم کر دیں اور دعا فرمائی''۔ جناب خلیل صمدانی لکھتے ہیں کہ '' حضرت آزادؔ مجھے اس فن میں الجھانا ہی نہیں چاہتے تھے''۔ آپ نے اس موقع پر بیخودؔ دہلوی کی صدارت میں آزادؔ منزل میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں جو اشعار پڑھے جن

سے خلیل صمدانی کے ذوق، شعر فہمی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ مجھ کج مج زباں کو داد دیتے ہیں

یہ استادِ زماں ہو کر شہنشاہِ زباں ہو کر

مجھے شاگرد کرتے ہیں ابھی میں طفل مکتب ہوں

یہ کیا کرتے ہیں بیخودؔ آپ استادِ زباں ہو کر

نہیں کچھ شک بڑوں کا شیوہ چھوٹوں کو بڑھانا ہے
کریں تحسین وہ میرے شعر کی اہل زباں ہو کر
خلیل خوشنوا نے کیا جمایا رنگ محفل میں
کئے ہیں دل مسخر آج تو معجزہ بیاں ہو کر

خلیل صمدانی کی شاعری انسانی ذہن کو متاثر کرنے والی ہے، شعریت سے بھرپور، زبان وبیان کے من جملہ قواعد کے عین مطابق نظر آتی ہے، شاعری آپ کو ورثہ میں ضرور ملی لیکن آپ فطرتاً شاعر ہیں اور آپ کو ایک حقیقی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ محمد حسن سلیمانی کا کہنا تھا کہ خلیل صاحب ے نہایت نازک اور حساس طبیعت پائی۔ آپ خیالات میں اور طرز نگارش میں ہر اعتبار سے رَوشِ نو کو پسند کرتے تھے''۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی کا کا خیال ہے کہ خلیل صمدانی زبان کی صحت اور محاوروں کا بر محل استعمال ہے جو ان کی وسعت مطالعہ اور پختہ مشق کا بین ثبوت ہے''۔ قاضی امین الدین حسین اثر عثمانی کا خلیل صمدانی کی شاعری کے بارے میں کہنا ہے کہ ''خلیل صمدانی کو ذوقِ شعر وسخن ورثہ میں ملا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ علالت و یورشِ امراض میں بسر ہوا لیکن مذاقِ شعر وسخن انتہا کی سرحدوں کو عبور کرکے رہا۔ باوجود علالت کے آپ کے مزاج میں بیحد شوخی و بذلہ سنجی بدرجہ اتم ہے۔ اثر عثمانی لکھتے ہیں کہ ''اگر موصوف کے کلام کو بہ نظر غائر دیکھا جائے

تو اس میں میرؔ کی آہ، سوداؔ کی واہ، دردؔ کی صوفیت، ناسخؔ کی پہلوانی، آتشؔ کا بانکپن، انشاءؔ کا تمسخر، جراتؔ کی بے باکی، ذوقؔ کی روانی، مومنؔ کی رنگینی کی عکاسی پائی جاتی ہے''۔ انصار محشرؔ عباسی امروہوی نے خلیلؔ صمدانی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ انہوں نے تمام عمر غزل سے اٹھکھیلیاں کیں مگر اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں رہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ انہوں نے آنکھ کھولی کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھل کر کہا۔

آ رہی ہے دل کی دھڑکن سے یہی پیہم صدا

کچھ شہیدانِ وطن کا بھی فسانہ یاد ہے

لڑانا اور لہو سے کھیلنا یہ کس سے سیکھا ہے

تباہی اور وطن کی یہ کہاں کی آدمیت ہے

خلیلؔ صمدانی کی نعت گوئی کے بارے میں محشرؔ عباسی کا کہنا ہے کہ ان کے یہاں نعت شریف میں روکھا پھیکا انداز نہیں ان کی نعت میں تغزل ہے۔ ان کے یہاں روح کو تڑپانے اور دل کو گرمانے والے اشعار کی کمی نہیں''۔

خلیلؔ صمدانی کی زندگی کا طویل عرصہ بیماری میں گزرا۔ اس کی تفصیل آپ نے از خود اس طرح بیان کی ہے ''میں اپنے متعلق کیا عرض کروں، آشفتہ حال و پریشان

خیال، میری عمر کا بہترین زمانہ اکثر و بیشتر علالت میں گزرا۔ قریب تیس برس مہلک و جاں فرسا مرض کینسر اور دیگر بیماریوں میں مبتلا رہا، فکر سخن کیا کرتا اور کیسے کرتا اللہ کا فضل اور انعام ہے اب جس حال میں ہوں اس کا بہت شکر و احسان ہے"۔ اس صورت حال کے باوجود آپ نے حوصلہ نہیں ہارا اور خندہ پیشانی سے ان حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ راقم الحروف کے والد محترم انیس احمد مرحوم جو اپنے چچا جناب خلیل صمدانی مرحوم سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے کے بارے میں یہ واقعہ اکثر سنایا کرتے تھے کہ ان کے مرض کا تعلق ان کے حلق اور گلے سے تھا جس کے باعث آپ کی آواز بند ہو گئی تھی، ہر طرح کا علاج کیا مگر کوئی صورت نہیں بنی اور کافی وقت گزر گیا، آپ اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ کئے ہوئے تھے، آپ اپنے گھر 'آزاد منزل' کی چھت پر نماز مغرب ادا کر رہے تھے، سلام پھیرا تو سامنے چاند نظر آیا جو محرم الحرام کا چاند تھا، آپ نے اس وقت دل سے دعا مانگی اور یقیناً آپ نے نواسہ رسول اور آل محمد کے حوالے سے اپنی بیماری اور آواز کی بحالی کے لئے خصوصی دعا مانگی ہو گی۔ والد صاحب کے مطابق دعا کے دوران آپ کو کھانسی اٹھتی ہے اور آپ کے حلق سے اچانک کچھ مادہ خارج ہوتا ہے اسی اثنا آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی آواز بحال ہو گئی ہے، آپ اس بات کی اطلاع اپنے اہل خانہ کو جاء نماز پر بیٹھے بیٹھے دیتے ہیں اس طرح آپ از سر نو بات کرنے لگتے ہیں۔ یہ یقیناً ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔

خلیق صمدانی غزل کے علاوہ نعت گو شاعر بھی تھے، غزل کی طرح آپ کی نعت میں بھی فنی حسن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ عقیدت و احترام اور ڈوب کر شعر کہنا آپ کا خاصہ ہے۔ خلیل صمدانی پہلے اپنے چچا جناب عزیز احمد کی دختر محترمہ عجیبہ خاتون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے جن سے آپ کی ایک صاحبزادی عقیلہ خاتون ہوئیں جن کی شادی جناب وکیل احمد صمدانی سے ہوئی، محترمہ عجیبہ خاتوں کے انتقال کے بعد آپ کی دوسری شادی محترم عزیز احمد کی دوسری صاحبزادی عتیقہ خاتون سے ہوئی جن سے آپ کے تین بیٹے تابش صمدانی مرحوم طالب احمد صمدانی اور حسین صمدانی ہیں اور چار بیٹیاں طیبہ مرحومہ زوجہ حافظ ضیاء احمد مشتاق مرحوم، طاہرہ (بے بی) زوجہ جناب رضاء احمد مشتاق، قدسیہ زوجہ وہاج الحق اور سعدیہ مرحومہ زوجہ خالد قریشی جو کم عمری میں ہی انتقال کر گئیں۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے بہت ہی خوش مزاج تھیں۔ خلیق صمدانی کے بڑے صاحبزادے جناب تابش صمدانی مرحوم کو شعری ذوق اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا، آپ صاحب دیوان نعت گو شاعر تھے، وکالت آپ کا پیشہ تھا۔ آپ کے نعتیہ مجموعہ کلام ''مرحبا سیدی، برگ ثنا''، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ 'نذر سعید' گلزار خلیل' اور 'منقبت کے پھول' جناب تابش صمدانی کی مطبوعات ہیں۔ آپ کے' انتقال سے کوئی ایک ماہ قبل راقم الحروف کو مرحوم سے ملاقات اور تیمارداری کا شرف حاصل ہوا لیکن افسوس آپ کے انتقال پر ملتان

پہنچ کر بھی تدفین میں شرکت کا شرف حاصل نہ ہو سکا جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

۱۹۷۰ء میں جناب خلیل صمدانی مرحوم اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اپنے بڑے بھائی محترم انیق احمد مرحوم کی تیمار داری کے لئے ملتان تشریف لائے۔ پاکستان میں آپ کی آمد عارضی اور صرف تین ماہ کے لئے تھی۔ اس دوران آپ عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے، اچانک دل کو دورہ پڑا اور آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۱۵ جون ۱۹۷۰ء کو مالک حقیقی سے جا ملے اور ملتان کی سرزمین مدینتہ الاولیاء کو اپنی ابدی آرام گاہ بنایا۔

منتخب اشعار:

ملک پر قربان ہونا ہے حیاتِ جاوداں
دردمندانِ وطن کی قوم سے فریاد ہے
آؤ سب مل کر بدل دیں اب نظام زندگی
زندگی میں اِک نئی روح و رواں پیدا کریں
لڑانا اور لہو سے کھیلنا یہ کس سے سیکھا ہے
تباہی اور وطن کی یہ کہاں کی آدمیت ہے
پہلی نظر کے پڑتے ہی پتلی پھڑک اٹھی
دیکھا جو باب روضۂ اطہر کھلا ہوا

رات بھر شمع نے گھل گھل کے بہائے آنسو
صبح کو ختم تھی یہ سوگ تھا پروانے کا

اِک وہ کہ دو قدم بھی نہ ہمراہ چل سکے
اک ہم کہ ساتھ لے کر گم دو جہاں چلے

سَر اِس لیے ملے ہیں کہ محو سجود ہو
لَب اِس لیے ملے ہیں کہ میں ان کا نام لوں

لگا اللہ کے گھر سے پتہ ہم کو ترے گھر کا
ترے گھر سے خبر ہم کو ملی اللہ کے گھر کی

حُسن تو مَعصوم ہے کیا حُسن کو الزام دوں
میری قاتل بن گئی میری نظر میرے لیے

وہ دل نہیں جس میں کوئی ارماں نہیں ہوتا
وہ گھر نہیں جس میں کوئی مہماں نہیں ہوتا

جبل رحمت پر چند ساعتیں

مَیں تیسری مرتبہ ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو اماں حوا کے شہر جدہ پہنچا۔ قیام اپنے بڑے بیٹے عدیل کے گھر رہتا ہے۔اجنبیت کا احساس اب نہیں ہوتا، ہر چیز جانی پہچانی سے لگتی ہے۔ اب ہم جدہ سے مکۃ المکرمہ بہ آسانی از خود آنے جانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جدہ پہنچنے کے فوری بعد خانہ کعبہ میں حاضری اور عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ اب ہمارا معمول ہوتا ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی جدہ ہر دوسرے یا تیسرے دن حرم شریف چلے جاتے ہیں۔ طواف کرتے ہیں اور کسی بھی ایسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں جہاں سے خانہ کعبہ نظروں کے سامنے ہو۔ عجیب لطف ہوتا ہے۔ عبادت کرتے ہیں، توبہ استغفار کرتے ہیں اور مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔آج ۳۱ دسمبر ۲۰۱۳ء ہے ہمیں جدہ آئے ہوئے ایک ماہ ہوچکا ہے۔آج ہم جدہ سے بطور خاص اس ارادے سے نکلے تھے کہ آج حرم شریف میں جانے سے قبل مکہ کی تاریخی مساجد، پہاڑوں، غاروں اور میدانوں کی زیارت کریں گے۔ اس مقصد کے لیے کسی ٹیکسی والے کی خدمات درکار تھیں۔اتفاق کہیے کہ آج ہمیں پاکستان کے شہر ملتان کا ایک باسی نوجوان محمد رضوان مل گیا جو مکہ میں ٹیکسی چلا کر اپنا گزر بسر کرتا ہے۔ رضوان کے ہمراہ ہم عازمِ سفر ہوئے۔ مکہ کا موسم خوشگوار تھا، بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔مکہ کی کشادہ اور حسین شاہراہوں پر سفر کرتے

ہوئے ہم خیالوں میں بھی سفر کر رہے تھے۔ ایک پہاڑ ختم ہوتا دوسرا شروع ہو جاتا۔ رضوان سے گفتگو بھی جاری رہی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک چھوٹے سے میدان میں ٹیکسی روک کر اس نے کہا کہ دیکھئے وہ رہا جبلِ ثور اس پر غار ثور ہے۔ جبل ثور پر گزرے لمحات کی تفصیل علیحدہ سے تحریر کی جا چکی ہے۔ جبل ثور کے بعد ہم جبلِ حرا کے پاس سے گزرے جس پر غارِ حرا واقع ہے۔ اس پہاڑ کو جبل نور بھی کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ غار ہے جہاں سے انوارِ نبوت کی کرنیں پھوٹیں ۔یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمارے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلام نبوت سے پہلے عبادت میں مشغول رہے یہی وہ مقام ہے جہاں سے نزولِ وحی کا آغاز ہوا۔ جبل حرا حرم شریف سے صرف دو، یا ڈھائی کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ آج ہمارے پروگرام میں غار حرا شامل نہیں تھا۔

ارادہ تھا کہ کسی اور دن زیادہ وقت کے ساتھ اس متبرک پہاڑ اور غار کی زیارت کی جائے گی۔ چنانچہ ہم نے دور ہی سے اس متبرک پہاڑ کی زیارت کی ۔اللہ کے حضور اپنے لیے اور تمام امت مسلمہ کی بھلائی کے لیے دعا کی۔ اس متبرک پہاڑ پر جس قدر گہری نظر ڈال سکتے تھے نظر ڈالی۔ میرے نذدیک مکہ کی تاریخی مساجد، پہاڑوں، غاروں اور میدانوں، گھروں حتیٰ کہ زمین ، پتھروں اور کنکروں کی زیارت جن پر ہمارے نبی ﷺ نے قیام کیا، نماز ادا کی، آپ کے قدم مبارک ان پر پڑے ،آپ ﷺ نے انہیں دیکھا جیسے پہاڑوں پر کو آپ ﷺ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ ان تمام کی زیارت باعث اطمینان و سکون اور باعث ثواب ہے۔

جبل حرا سے ہوتے ہوئے ہم عرفات کے مشرق میں واقع جبل رحمت پہنچے۔رضوان نے بتایا کہ یہ جبل رحمت ہے حج کے موقع پر حجاج اکرم یہاں آتے ہیں اور کچھ دیر قیام کرتے ہیں۔یہ بہت بلند پہاڑ نہیں ۔ مجھ جیسا پینسٹھ سالہ دل کا مریض بھی بہ آسانی اس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ سکتا ہے۔ صاف ستھرا میدان ۔ جوں ہی ہماری ٹیکسی پہاڑ کے دامن میں رکی چند قدم کے فاصلے پر لوگ جوق در جوق پہاڑ کی چوٹی پر دیوانہ وار چھڑتے نظر آرہے تھے۔ حج کے دنوں میں اس میدان اور پہاڑ کا نظارہ شاید یہ لطف نہ دیتا ہو کیوں کہ اس وقت حاجیوں کا جم غفیر یہاں موجود ہوتا ہے اس وقت جبل رحمت کا نظارہ ہی کچھ اور ہے۔ ٹیکسی سے اترتے ہی رحمت ہی رحمت کا احساس ، حسین خوش کن منظر، متاثر کرنے والا روحانی منظر ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ کہا جاتاہے کہ اس پہاڑ پر دعا قبول ہوتی ہے۔اس پر ایک سفید مینار بنا ہوا ہے جو سیدہ ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہے۔ ہم نے بھی یہاں جی بھر کر دعائیں کیں اپنے لیے اپنے تمام عزیز و اقارب ، دوست احباب اور جاننے والوں کی بھلائی کے لیے خاص طور اپنے ملک پاکستا ن کے لیے اللہ کے حضور خصوصی دعا کی ۔ اللہ ہمارے وطن کو سلامت رکھے، اندرون و بیرونی دشمنوں سے اسے محفوظ رکھے۔

اس کے حکمرانوں کونیک ہدایت دے کہ وہ اس کی ترقی اور عوام الناس کی فلاح و

بہبود پر خصوصی توجہ دیں۔

جبل رحمت وہ جگہ ہے کہ جہاں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے آخری خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور اماں حوا علیہم السلام کو دنیا میں بھیج دیا تو ہمارے یہ دونوں جدا ای جبل رحمت پر ایک دوسرے سے ملے ، دنیا میں یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اب تک تو ہم نے جبل رحمت کے بارے میں، دنیا میں حضرت آدم اور اماں حوا علیہم السلام کی ملاقات کے بارے میں، نبی کرم حضرت محمد ﷺ کے آخری خطبہ کے بارے میں کتابوں میں ہی پڑھا تھا آج ہم اس جگہ پر موجود تھے، یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اپنی اس سعادت پر پروردگار کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ (۱۵ اگست ۲۰۱۴ء)

کتب خانے تاریخ کی روشنی میں' اہل علم کی نظر میں'

(راقم الحروف کی تصنیف کتب خانے تاریخ کی روشنی میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی جو عہد اسلامی اور عہد قدیم کے کتب خانوں کی مختصر تاریخ ہے۔ کسی بھی موضوع پر یہ میری اولین تصنیف تھی۔ کراچی کے ایک پبلشر قمر کتاب گھر نے اسے شائع کیا تھا۔ کتاب پر مختلف ماہرین لائبریری سائنس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں اس کتاب پر تبصرے بھی شائع کیے۔ ذیل میں ان تبصروں اور ذخیالات کی مختصر تفصیل درج ہے)

ڈاکٹر صمدانی کی یہ دوسری تصنیف تھی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔بنیادی طور پر یہ کتاب لائبریری سائنس کے نصاب کے مطابق تحریر کی گئی اور لائبریری سائنس کے مضمون 'کتب خانوں کی تاریخ' کا احاطہ کرتی تھی۔کتاب کا تعارف لائبریری سائنس کے استاد اور جامعہ کراچی کے لائبریرین جناب محمد عادل عثمانی نے تحریر کیا۔ ''فاضل مصنف کی یہ کتاب اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اسے ایک مقصد سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ مقصد لائبریری سائنس کے موضوع پر نصابی کتب کے فقدان کو دور کرنا ہے'' ۔ لائبریری سائنس کے ایک استاد و مصنف ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کے بارے

میں لکھا" تاریخ کے موضوع پر ایک مختصر کتاب رئیس احمد صمدانی کی ہے جسے " کتب خانے تاریخ کی روشنی میں" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں کراچی سے قمر کتاب گھر نے شائع کیا ہے۔ یوں تو نام کے اعتبار سے اس کتاب میں کتب خانوں کی پوری تاریخ کو شامل ہونا تھا لیکن کتب صرف عہد قدیم اور برصغیر پاک و ہند کے قدیم شاھان اودھ تک کے کتب خانوں کا احاطہ سرسری طور پر کر پائی ہے"۔ڈاکٹر انیس خورشید کا یہ مضمون

ماہنامہ کتاب ، لاہور۔۱۵(۴) : ۷۰، فروری۱۹۸۱ء

میں شائع ہوا تھا۔

لائبریری سائنس کے معروف مصنف الحاج محمد زبیر نے کتاب کے بارے میں تحریر فرمایا "میرے ہم پیشہ و ہم مشرب رئیس احمد صمدانی نے کتب خانوں پر کتب لکھ کر بڑی عمدہ مثال قائم کی ہے۔ یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے میری یہ دعا ہے کہ خدا انہیں یہ سلسلہ قائم رکھنے کی توفیق دے۔ میری رائے میں یہ قابل قدر کتاب اس نوجوان نسل کے لیے خاص طور پر بڑی سود مند ہوگی جو کتب خانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ خیال رہے کہ میری یہ رائے محض رسمی رائے نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کی رائے ہے جو خود بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہے اور جس نے اپنی عمر کے ۵۵ برس کتب خانوں اور فن کتب داری کی خدمت میں گذارے ہیں"۔ (الحاج محمد زبیر۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۸ء)۔ پروفیسر سید لطف اللہ سابق

پرنسپل سراج الدولہ گورنمنٹ کالج و گورنمنٹ غزالی کالج حیدرآباد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "میرے خیال میں یہ بات بلا خوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ صمدانی صاحب کی یہ کتاب لائبریری اور لائبریری سائنس کے علم میں بہترین اضافہ ہے "(۳۰ اپریل ۱۹۷۹ء)۔

اس کتاب پر ماہنامہ افکار، کراچی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "کتابچہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ترتیب دیا گیاہے، زبان تحقیقی ہونے کے علاوہ خاص رواں اور شگفتہ ہے اور قاری کو معلومات بھی بہم پہچاتی ہے اور اس کی دلچسپی بھی قائم رکھتی ہے"۔ (ماھنامہ افکار، کراچی۔ ۳۴(۱۔۲) : ۷۱۔۷۲، ستمبر ۱۹۷۸ء)

ماہنامہ تخلیق لاہور نے لکھا "کتاب لائبریری سائنس کے موضوع پر نصابی کتب کی کمیابی کو پورا کرتی ہے دوسرے حضرات جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے"۔ (ماہنامہ تخلیق لاہور ۱۰ (۹۔۱۰) : ۱۳۲، ۱۹۷۹ء)

ماہنامہ قومی زبان کراچی نے تبصری کرتے ہوئے لکھا "تاریخ اسلام کے کتب خانوں کے بارے میں جو معلومات یکجا کی جاسکتی تھیں مولف نے نہایت خوبی کے ساتھ جمع کر دی ہیں جن کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں"۔ (ماہنامہ قومی

(زبان کراچی۔ ۴۷ (۱۲) : ۵۲، دسمبر ۱۹۷۷ء

ہفت روزہ ادراک سیالکوٹ نے لکھا ''فاضل مصنف نے کافی مواد قارئین کے لئے جمع کیا ہے اور عرق ریزی سے ایک ایسی دستاویز کتابی شکل میں پیش کی ہے جو وقت کی ایک ضرورت تھی''۔ (ادراک، سیالکوٹ۔ ۱۰)۵۔۶) : ۲۶، یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۷۸ء

معروف شاعر رئیس امروہوی مرحوم نے روزنامہ جنگ کراچی میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا'' ابتدا سے اب تک اہم کتب خانوں کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں اور آشور بنی پال اور اسکندریہ سے لے کر خدابخش پٹنہ لائبریری اور شاہان اودھ کے کتب خانوں تک کا اجمالی مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے''۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء)۔ روزنامہ جنگ نے اپنی اشاعت ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کرتے ہوئے کتاب کو اپنے موضوع پر مفید اور معلوماتی کتاب قرار دیا۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی نے اپنی اشاعت ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء میں لکھا کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں ایک منفرد کتاب ہے اور عہد در عہد تک کتب خانونے کس طرح اور کہاں کہاں قائم ہوئے اور یہ جاننے کے لئے فاضل مصنف صمدانی صاحب نے بیش قیمت معلومات یکجا کی ہیں۔

روزنامہ حریت کراچی نے اپنی اشاعت ۹ ستمبر ۱۹۷۸ء میں کتاب کے بارے میں لکھا "جس موضوع پر رئیس احمد صمدانی نے قلم اٹھایا ہے وہ ایک عرصہ سے تشنہ تھا۔ مصنف نے بڑی محنت سے اس کتاب میں مواد جمع کیا ہے۔ یہ کتاب کتب خانوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک اچھی کوشش ہے"۔

شاہ حسن عطا کی تصنیف ''نقشِ کفِ پا'' ایک نظر میں

(شاہ حسن عطا 'نقشِ کفِ پا : متعدد شخصیتوں سے متعلق مصنف کے تاثرات، انفعالات اور انعکاسات کا مرقع'،کراچی :

شاہ عمر عطا، ۲۰۰۷ء۔۱۶۰ص، ۵۰۰ روپے)

شاہ حسن عطا نام ہے ایک ایسی صاحب علم شخصیت کا جو اپنے زمانہ طالب علمی میں بے مثال خطیبانہ صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور طالب علم لیڈر، شعلہ بیان مقرر، بہترین تعلیمی ریکارڈ کے حامل، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ایک بے باک اور پرجوش کارکن، اردو اور انگریزی کے بااعتبار فصاحت و بلاغت بہترین مقرر اور مسلم یونیورسٹی یونین کے اولین سیکریٹری اور ونائب صدر۔ آپ ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں ، خاندان کے بے شمار لوگ عالم ،فاضل ، شاعر اور دانشور تھے۔ شاہ حسن عطا نے اپنے خاندانی اور مذہبی اقدار و روایات کو قائم و دائم رکھا، آپ اردو کے علاوہ عربی ، فارسی، ترکی اور انگریزی زبانوں پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ان زبانوں کے آپ بہترین مقرر اور لکھاری بھی تھے۔ راقم کو شاہ حسن عطا کو دیکھنے اور سننے کا اعزاز حاصل ہے۔آپ نے مختلف موضوعات پر لکھا جس میں

تفسیر عَمّ یتسآلون، علامہ البو لفرج ابن جوزیؒ، نظام الملک طوسی اور ڈاکٹر طہٰ حسین مصری کی معرکتہ الآرا عربی اور فارسی تصانیف کے اردو تراجم، افصح العرب والعجم، حکایات گلستان و بوستان، شعری مجموعہ حریر سنگ، مبادیات مدنیت، سو سے زائد انگریزی اور اردو میں مضامین اور اب زیر تبصرہ کتاب ''نقشِ کفِ پا'' شامل ہے جو ان کے انتقال (۱۹۸۱ء) کے ۲۶ سال بعد ان کے صاحبزادوں شاہ عمر عطا، شاہ حسین عطا اور شاہ احمد عطا نے ترتیب دی ہے۔ اس کا پیش لفظ بھی شاہ عمر عطا نے لندن سے تحریر کیا ہے۔کتاب کے صفحہ عنوان یا طباعتی صفحہ پر سال اشاعت درج نہیں البتہ پیش لفظ کے اختتام پر ''لندن ۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ'' درج ہے جس سے یہ خیال کیا کہ یہ کتاب اسی سال یعنی ۲۰۰۷ء ہی میں شائع ہوئی ہے۔

سوانح نگاری یا خاکہ نویسی ادب کی ایک صنف ہے جس میں اشخاص اور ذاتیات سے محبت کی جاتی ہے، انسانی زندگی کے اتار چڑھاو، خوبیوں خامیوں، گناہ ثوات کو سچائی اور ایمانداری کے ساتھ قلم بند کیا جاتا ہے۔خاکہ نویسی اس اعتبار سے سوانح نگاری سے مختلف ہے کہ اس میں ہم کسی شخص کی زندگی اور اس کے شخصیت کے واقعات کو تاریخوں اور سنین سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتے، گو اسے یو کہنا بہتر ہوگا کہ جو فرق ناول اور افسانے میں ہوتا ہے وہی سوانح نگاری اور خاکہ نویسی میں ہے۔اب سوانح لکھنے والے خاکہ نویسی کو ترجیح دے رہے ہیں، وجہ یہ

معلوم ہوتی ہے کہ اس میں واقع کی تاریخوں یا سنین نیز تمام باتوں کو قلم بند کرنا ضراری نہیں ہوتااور چند واقعات کی بنیاد پر خاکہ تشکیل پا جاتا ہے۔ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ اگر خاکہ نویسی کے دوران اگر کسی واقع کی تاریخ یا کم از کم سن معلوم ہو تو وہ ضرار لکھ دینا چاہیے ۔شاہ حسن عطا نے ایک خاکہ اپنے والد کی بہن ''حمیرہ بی بی کا تحریر کیا جس میں انہوں نے لکھا''یوں تو ب تک میرے قلم سے بہت ی تحریریں '' نکل چکی ہیں مگر میں نے لکھنے میں اب تک وہ احتیات نہ برتی تھی جو اب مجھے مطلوب ہے۔ یہ کتاب جسے مین ترتیب دے رہاہوں اور جو ''نقشِ کفِ پا'' کے نام سے موسوم ہوگی اس میں بہت سے اچھے شریف اور با کردار اشخاص کے بارے میں لکھنے کا ارادہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم میری یہ تالیف کینی عمرپاسکے گی۔ البتہ اس کتاب کے ایک وصف کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی شک نہیں اور اس کا وہ وصف یہ ہوگا کہ اس میں غلط بیانی کسی مرحلہ پر نہیں ہوگی اور حقائق کو مسخ کہیں بھی نہیں کیا جائے گا''۔ایک اہم اور پیاری بات جو عطا صاحب نے اس مرحلہ پر کہی کہ '' بڑا دب اس اس وقت تک بڑاادب نہیں بن سکتا جب تک وہ جھوٹ سے پاک نہ ہو۔لیکن اگر اس میں جھوٹ کی آمیزش ہو تو حسین ترین اسلوب نگارش اور فقید المثال ہنر مندی اور زانشائی چابکدستی بھی ادب کو زوال اور اِدبار سے نہیں بچاسکتے''۔

زیر تبصرہ کتاب میں شاہ حسن عطا کے تحریر کردہ ۱۸ شخصی خاکے اور دو مضامین 'حج بیت اللہ' اور 'ذکر علیگڑھ' شامل ہیں۔ شخصی خاکو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا، حمیرہ بی بی عطا صاحب کے دادا کی بہن)، مولوی می سید خورشید حسین (شاہ حسن کے بڑے بابا)،) قائد اعظم (ارشاداتِ قائد اعظم کی تشریح)، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید طلحہ (شاہ حسن کے والد کے احباء گرامی)، پروفیسر عمر الدین (استاد)، سید عبد اقادر گیلانی، فخر ماتی، جمشید رضاًالرحیم (دوست)، محمد ارشاد، ہارون احمد، جسٹس سید محمود، نواب محمد اسمٰعیل خان، جسٹس قدیر الدینا حمد، پروفیسر رشید الدین صدیقی شامل ہیں۔شاہ حسن عطا ایک مستند محقق، مصنف، مولف اور مترجم بھی تھیں انہیں زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے۔آپ نے شخصیت نگاری کے فن کو اپنی ان نگارشات کے ذریعہ اوج کما عطا کیا ہے۔ جن شخصیات پر آپ نے قلم فرسائی کی ہے انہیں اپنی کتاب ''نقش کفِ پا'' کے توسط سے نگاہوں میں محبوب سے محبوب تر اور دل کش سے دل کش بنا دیا

ہے۔آپ تعمیری اور مثبت سوچ کے ساتھ ساتھ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کسی بھی شخصیت پر قلم فرسائی کے قائل ہیں اس حقیقت کا ادراک ہمیں عملی طور پر آپ کی اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں اللہ کو پیارے ہوئے ،آج ۲۶ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنی تحریر کی صورت میں ہمارے درمیان میں موجود ہیں اور انشاء اللہ ان کی تخلیقات انہیں رہتی دنیا تک زندہ رکھیں گی۔ شاہ حسن عطا

کے اس شعر پر جو اس کتاب کے سر ورق کے پیچھے درج ہے اپنے اس اختصاریے کو ختم کرتا ہوں۔ شاہ صاحب مہدوی تخلص کیا کرتے تھے۔

ہیں کتنے نامور کہ تہہ خاک جا بسے
جن کا کہیں نشاں نہ کہیں ننگ و نام ہے

(شائع شدہ پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جلد ۳۸، شمارہ ۲، جون ۲۰۰۷ء)

جامعہ کراچی کا شعبہ لائبریری سائنس۔اچھے دنوں کی باتیں اور یادیں

جامعہ کراچی کا شعبہ لائبریری سائنس جو اب لائبریری و انفارمیشن سائنس ہے ۱۰ اگست ۱۹۵۶ء کو معرض وجود میں آیا۔الحمد اللہ شعبہ نے ۲۰۰۶ء میں ۵۰ سال مکمل کر لیے ۔راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں مادر علمی کے اس شعبہ میں تعلیم حاصل کی اور لائبریری سائنس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کر سکا۔ میری زندگی کا یہ ایک اہم ترین زمانہ تھا جس کی بنیاد پر میں نے اپنی زندگی کے ماہ و سال اس پروفیشن میں گزارے۔ اس شعبہ اور پروفیشن نے مجھے بہت کچھ دیا ذاتی زندگی میں بھی اور پروفیشنل لائف میں بھی میں اپنے آپ کو کامیاب تصور کرتا ہوں۔ شعبہ کی گولڈن جوبلی (۱۹۵۶ء۔۲۰۰۶ء) کے موقع پر شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ کراچی کی جانب سے بھی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ''پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل'' نے ''خصوصی شمارہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ درج ذیل تاثرات ان نکات کی روشنی میں تحریر کیے گئے جو مدیر اعلیٰ کی جانب سے جاری کیےگئے تھے۔ یہاں یہ تحریر ایڈٹ کر کے پیش کی جا رہی ہے۔

میں شعبہ میں کیسے پہنچا؟

راقم الحروف نے ۱۹۷۰ میں بی اے پاس کیا اور جامعہ کراچی میں معاشیات میں ایم اے کرنے کی خواہش لیے غنی الاکرم سبزواری (اب ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ہیں) سے مشورہ اور مدد حاصل کرنے شعبہ لائبریری سائنس گیا۔ اس وقت شعبہ کراچی یونیورسٹی لائبریری (جو اب ڈاکٹر محمود حسین لائبریری ہے) کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ مدعا بیان کیا کہ میں اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لینے کی خواہش رکھتا ہوں تا کہ اکنامکس میں ایم اے کرسکوں ، ارادہ بینکر بننے کا ہے۔ اکرم صاحب جو شعبہ کے ایک سینئر استاد اور انتظامی امور سے بھی وابسطہ تھے نے محبت اور پیار سے بٹھایا ، خوش ہوئے کہنے لگے کہ میں کلاس میں جارہا ہوں واپس آکر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ کلاس سے واپس آئے دائیں بائیں ، اِدھر اُدھر کالے گاؤن پہنے ہوئے کئی طلبہ اور طالبات تھے اپنے کمرے میں آئے کچھ دیر ان سے باتیں کرکے انہیں فارغ کیا۔ اب میری جانب متوجہ ہوئے گویا ہوئے ہاں میاں تو آپ اکنامکس میں ایم کرنا چاہتے ہیں ، بہت خوب اچھا خیال ہے، کیا تم نے فارم لے لیا میں نے کہا کہ نہیں ابھی نہیں لیا لینا ہے۔ پھر گویا ہوئے کہ بھئی یہ جو ہمارا سبجیکٹ ہے لائبریری سائنس یہ بھی ایک پروفیشنل اور ٹیکنکل مضمون ہے اور خاصا اسکوپ ہے اگر تمہیں لکھنے پڑھنے اور کتابوں سے دلچپی ہے تو اس کے بارے میں بھی سوچو میرا خیال ہے کہ یہ مضمون بھی تمہارے لیے بہتر رہے گا۔ میں نے اس ، وقت فیصلہ کرلیا کہ میں معاشیات میں نہیں بلکہ لائبریری سائنس میں داخلہ لوں گا۔

لائبریرین شپ میں داخل ہونے کی اولین گھڑی تھی چنانچہ ایک داخلہ فارم اکنامکس میں اور ایک لائبریری

سائنس میں جمع کرادیا گیا۔لائبریری سائنس شعبہ کے انتظامی معاملات میں اس وقت اکرم صاحب ہی کرتا دھرتا تھے چنانچہ داخلہ فہرست میں نام آنا لازمی تھا ایسا ہی ہوا۔میں نے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ جاکر دیکھا بھی نہیں کہ وہاں کی داخلہ فہرست میں نام آیا یانہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ فیصلہ کرچکا تھا۔اس فیصلہ پر میرے والد صاحب خوش اور مطمئن تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید شعبہ کے بانی سربراہ

۱۹۷۱ء کے ابتدائی دنوں میں سے کوئی دن، شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ تمام کمروں کے چاروں اطراف کھلی ہوئی جگہ نے کلاس روم کو ضرورت سے زیادہ روشن کردیا تھا بلکہ چبھتی ہوئی روشنی کا احساس نمایاں تھا۔کلاس روم میں کل ۷۷ طلبہ جن میں ۴۴ طلبہ اور ۳۳ طالبات تھیں۔ یہ ایم اے سال اول (لائبریری سائنس) کی کلاس تھی۔ تمام طلبہ نے جامعہ کے شوق میں کالے رنگ کے گاؤن ذیب تن کیے ہوئے تھے (اُس زمانے میں جامعہ کے ہر طالب علم کے لیے کالا گاؤن پہننا لازمی تھا)۔ کلاس روم میں مکمل خاموشی، پہلے دن کے خوف نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی خاموش

بنا دیا تھا۔ پہلی کلاس تعارفی کلاس تھی شعبہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید، غنی الا کرم سبزواری (مشیر امور طلبہ)، سید جلال الدین حیدر اور اظہار الحق ضیاء کلاس میں موجود تھے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب نے تمہیدی کلمات کہے، شعبہ تعارف کرایا، اساتذہ کے بارے میں بتایا، ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی عالم فاضل شخص گفتگو کر رہا ہے۔ گندمی رنگت، قد میں قدرِ چھوٹے، گٹھا ہوا جسم، روشن آنکھیں، سیاہ بال، کلین شیو، کالے رنگ کے چشمہ نے ان کی شخصیت کو حسین بنا دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے ایک استاد اور بھی ہیں جو پیروں میں تکلیف کے باعث اوپر نہیں چڑھ سکتے وہ تھے پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید صاحب۔

ڈاکٹر عبدالمعید بہ حیثیت استاد اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ کا حافظہ زبردست تھا، کتب خانوں کی تاریخ کے حوالے سے آپ کو تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ تاریخیں بھی یاد تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک بہترین مقرر تھے۔ تقریر کے فن سے خوب واقف تھے البتہ آپ کا تحریری سرمایہ مختصر تھا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر انیس خورشید صاحب اپنی تکلیف کے باعث کم گفتار، دھیمہ لہجہ، اکثر پیچھے بیٹھے ہوئے طلبہ آپ کے لیکچر سے محروم ہی رہا کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر کی بے بہا نعمت سے نوازا آپ کا تحریری سرمایا ہر اعتبار سے یعنی معیار اور تعداد کے اعتبار سے لائبریری سائنس کے لکھنے والوں میں

زیادہ ہے۔ سید جلال الدین حیدر (اب ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر ہیں) شعبہ کے با صلاحیت اور محنتی اساتذہ میں سے تھے۔ اظہار الحق ضیاء صاحب کالج لائبریرین تھے آسٹریلیا سے لائبریری سائنس میں
پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ تھے۔
جامعہ کراچی میں سیمسٹر نظام رائج نہیں ہوا تھا بلکہ سالانہ طریقہ امتحان ہی پر عمل ہو رہا تھا۔ لائبریری سائنس ہم تمام طلبہ کے لیے بالکل ہی نیا موضوع تھا۔ ہم نے لفظ کیٹلاگ یا کیٹلاگنگ، ببلو گرافی، ڈیوی ڈیسیمل کلاسیفیکشن، ریفرنس سروس وغیرہ پہلی بار ہی سنے تھے۔ یہ ہمارے اساتذہ کا کمال ہی تھا کہ نئے موضوعات کو اس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ سمجھایا اور سکھایا کہ ہماری دلچسپی اس مضمون سے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ راقم الحروف کیوں کہ یہ ارادہ لیے جامعہ میں داخل ہوا تھا کہ اس سبجیکٹ میں ماسٹر کرنا ہے چنانچہ تمام تر سرگرمیوں سے دور رہتے ہوئے پڑھائی کی جانب توجہ مرکوز رکھی۔ میں تو اسکول سے گریجویشن تک درمیانہ درجہ کا طالب علم رہا لیکن شعبہ لائبریری سائنس میں تعلیم کے دوران میں نے زیادہ محنت کی، مضمون میں حد درجہ دلچسپی لی، غیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ نہیں لیا شرکت کی حد تک شامل ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ میری پہلی ڈویژن آئی اور لکھنے اور پڑھنے کی جانب بھی مائل ہو گیا۔ ایم اے فائنل میں تھیسس لکھنا اس وقت لازمی

تھا چنانچہ میں نے اپنے استاد ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری کی نگرانی میں ''اردو میں سائنسی موضوعات کی کتب کی توضیحی کتابیات'' مرتب کی۔ اسی مشقت اور محنت نے مجھے کتابوں کے زیادہ قریب کر دیا اور مجھ میں لکھنے جستجو اور لگن پیدا ہوئی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلی توقع تو یہ ہوا کرتی ہے کہ جلد کوئی ملازمت حاصل ہو جائے اور اساتذہ ہماری رہنمائی اور سرپرستی کرتے رہیں۔ مجھے شعبہ کے اساتذہ کی وجہ سے ہی اولین ملازمت ڈاکٹر محمود حسین لائبریری میں ملی جس میں کوئی چار ماہ کام کیا یہ زندگی کا اولین تجربہ تھا بعد ازاں حکومت سندھ کے شعبہ تعلیم میں گریڈ ۱۷ کی ملازمت مل گئی۔ شعبہ کے اساتذہ کی رہنمائی اور سرپرستی کا ہی نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے موضوع پر لکھنا سیکھا، میرے مضامین شائع ہوئے اور آج اللہ کے فضل سے ۳۳ کتابیں اور ۲۵۰ سے زیادہ مضامیں شائع ہو چکے ہیں انٹر میڈیٹ اور بی اے کے نصاب میں راقم کی نصابی کتب کو اولین شائع ہونے اور سب سے زیادہ پڑھی اور شائع ہونے والی کتب کا درجہ حاصل ہے۔

شعبہ لائبریری سائنس جو ۱۹۸۹ء سے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ہے کا موازنہ اپنے زمانہ طالب علمی سے کرتا ہوں تو مجھے اس شعبہ کے در و دیوار تو

وہی نظر آتے ہیں البتہ تعلیم دینے والے وہ شفیق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ نظر نہیں آتے۔ڈاکٹر عبدالمعید اللہ کو پیارے ہو چکے باقی تمام اساتذہ اگر شعبہ میں موجود بھی ہوتے تو ریٹائر ہو چکے ہوتے۔ میرے زمانہ طالب علمی میں پانچ اساتذہ تھے جب کہ تھے (Foreign qualified) ایک خاتون جذ وقتی استاد تھیں۔ تمام کے تمام اساتذہ ان میں سے ڈاکٹر عبدالمعید (بنگال لائبریری ایسو سی ایشن ، کلکتہ سے لائبریری سائنس میں سرٹیفیکیت ، مشیگن یونیورسٹی ، امریکہ سے لائبریری سائنس میں ایم ایل ایس، یونیورسٹی آف الینائے ، امریکہ سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی تھے اور ڈاکٹر انیس خورشید (کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کے تحت سرٹیفکیٹ کورس، جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ، امریکہ کی (Rutgers-State University of N J) سے ایم ایل آئی ایس اور امریکہ کی (University of Pittsburgh) سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی ہیں اس کے علاوہ لائبریری سائنس کے شعبے میں صدارتی تمغہ حسن کارکردگی حاصل کرنے والے آپ اولین شخص ہیں۔ غنی الاکرم سبزواری مشیگن یونیورسٹی (Michigan University) سے بعد میں امریکہ کی سینچری یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا، سید جلال الدین حیدر رٹگرس اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیوجرسی، (Rutgers,TheState University, NJ) سے ایم اے بعد میں لفبرو یونیورسٹی ، برطانیہ (Loughborough University, UK) سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ، اظہار الحق ضیاء یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز، آسٹریلیا (University

سے لائبریری سائنس میں پوسٹ of New South Wales, Australia) گریجویٹ ڈپلومہ تھے اور ممتاز بیگم کراچی یونیورسٹی سے بوٹنی میں ایم ایس سی اور لندن سے لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ایم اے تھیں۔
آج سے ۳۴ (۷۱۔۱۹۷۲ء) سال قبل جب راقم الحروف اس شعبہ کا طالب علم تھا اور آج کا زمانہ ترقی اور علم کے فروغ نیز وسائل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ یہ دور معلومات کے پھیلاؤ اور انفارمیشن سائنس کی دولت سے مالا مال ہے چنانچہ شعبہ موجودہ حالات اور ضروریات کے مطابق ایک جدید تعلیمی ادارہ ہے جہاں پر سیمینار لائبریری، کمپیوٹر لیب اور زیادہ اساتذہ طالب علموں کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔
راقم الحروف کو شعبہ کی سلور جوبلی تقریب (۱۹۸۱ء) اور اس سال (۲۰۰۶ء) میں گولڈن جوبلی تقریب میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے۔ گولڈن جوبلی تقریبات ۱۸۔۱۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کو منعقد ہوئیں۔ سلور جوبلی تقریبات کا افتتاح اس وقت کے گورنر سندھ نے کیا تھا جب کہ گولڈن جوبلی تقریبات کا افتتاح جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ نے کیا۔ پاکستان میں لائبریرین شپ کے بانی پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید سلور جوبلی تقریبات میں موجود تھے جب کہ ان تقریبات کے انعقاد میں پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید اور ڈاکٹر سید جلاالدین حیدر پیش پیش تھے۔ ڈاکٹر

عبدالمعید اللہ کو پیارے ہو چکے جب کہ ڈاکٹر انیس خورشید صاحب صاحب فراش ہیں جس کے باعث وہ تقریب میں حاضر نہ ہو سکے تاہم ان کا پیغام جو ان کی اپنی نحیف آواز میں تھا سنایا گیا۔ ڈاکٹر سید جلاالدین حیدر صاحب شعبہ سے ریٹائر ہو چکے ہیں آپ نے گولڈن جوبلی تقریبات میں مجلس مزاکرہ کی صدارت کی۔ راقم الحروف نے ایک مجلس مزاکرہ بعنوان ''لائبریرینز اور لائبریرین شپ'' کی صدارت کی جب کہ ایک اور مجلس مزاکرہ بعنوان ''پاکستان میں لائبریری انجمنوں کا کردار'' میں ایک مقرر کی حیثیت سے شرکت کی۔ تقریب کے اختتام پر شعبہ کی جانب سے مختلف احباب کو اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ راقم کو بھی 'Professional Achievement Award' سے نوازا گیا -

(مطبوعہ پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل جلد ۳۷، شمارہ ۴، دسمبر ۲۰۰۶ء)

جبلِ اُحد کے دامن میں چند ساعتیں

۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو ہم جدہ پہنچے، عمرہ کیا، کئی بار خانہ کعبہ میں حاضری دی۔ ۱۲ ربیع الا ول قریب ہی تھی۔ خواہش تھی کہ ۱۲ ربیع الاول مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ کے سامنے گزاریں۔ اس بار یہ آروزو لیے ہی ہم سعودی عرب آئے تھے۔ جیسے جیسے یہ تاریخ قریب آرہی تھی اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اپنے بیٹے عدیل سے اس بات کا ذکر کیا کہ ہم ایک ہفتہ مدینہ منورہ میں خاص طور پر ۱۲ ربیع الاول کی شب مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ کے سامنے گزارنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پروردگار نے ہماری یہ دعا قبول کرلی تھی۔ ۹ جنوری ۲۰۱۴ء بروز جمعرات رات ۱۱ بجے عدیل کے ہمراہ ہم عازمِ سفر ہوئے۔ سعودی عرب میں رہنے والے رات میں سفر کو فوقیت دیتے ہیں۔ جدہ سے مدینہ کے لیے ہماری کار سرپٹ دوڑی چلی جارہی تھی۔ ابھی مدینہ کا سفر دو گھنٹے کا باقی تھا کہ طوفانی ہوا، گرج چمک کے ساتھ موسلادھار بارش نے ہمارا استقبال کیا۔ بارش کی شدت اس قدر تھی کے گاڑی کو ایک جگہ روکنا پڑا اور جب بارش کم ہوئی تو سفر دوبارہ شروع ہوا صبح پانچ بجے مدینہ پہنچ گئے۔ جوں ہی ہماری کار مدینہ کی حدود میں داخل ہوئی اللہ کے شکر کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں سلام کا نظرانہ بھی پیش کیا۔ عدیل جدہ میں مقیم ہونے کے باعث مدینہ ،

مکہ، طائف، ریاض اور دیگر شہروں کے راستوں اور ہوٹلوں سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ مسجد بلال کے اطراف میں قائم ہوٹل 'لؤلؤ الخلیج' پہنچے جہاں ہمیں ایک مناسب کمرہ بھی مل گیا۔ اس سے قبل بھی ہم نے اسی ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ یہاں پر قیام کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نیچے کئی پاکستانی ہوٹل ہیں جہاں پاکستانی کھانا بہ آسانی مل جاتا ہے ۔ مسجد نبوی بھی بہت قریب ہے۔ ہوٹل کے سامنے مین روڈ ہے پل کے نیچے سے سامنے کی جانب جائیں تو مسجد نبوی کی دیوار شروع ہو جاتی ہے یہ راستہ جنت البقیع کے بنیادی دروازے کی جانب نکلتا ہے۔ رات بھر کے سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ کر ہوش ہی نہیں رہا آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا آج جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ مسجد نبوی میں پڑھی، رش کے باعث مسجد نبوی کی دیوار اور جنت البقیع کی دیوار کے درمیانی راستے میں جگہ ملی۔ روضہ رسول ﷺ نظروں کے سامنے تھا سبز گنبد بھی سامنے اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد سیدھے روضہ رسول ﷺ کا رخ کیا، شہناز خواتین کے حصے کی جانب چلی گئیں مَیں نے اور عدیل نے نبی اکرم ﷺ کی خدمات میں سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ ریاض الجنہ میں نفل کی ادائیگی بہ آسانی نصیب ہوئی روضہ رسول ﷺ کی جالیوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے اور نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھ آرام فرما آپ کے رفیق حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خدمات میں سلام کا نظرانہ پیش کیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے یہ سعادت بخشی۔

ہمارا بیٹا عدیل ہمیں مدینہ چھوڑ کر جمعہ کی شام جدہ واپس ہوئے کیونکہ میری بہو مہوش اور پوتا صائم گھر پر اکیلے تھے۔ رات گئے جدہ پہنچنے کی اطلاع ملی۔اللہ کا شکر ادا کیا۔ ہمیں ایک ہفتہ مدینہ منورہ میں رہنا تھا۔ نمازیں مسجد نبوی میں ادا کیں، عصر کی نماز کے بعد جنت البقیع کا دروازہ کھولا جاتا ہے تاکہ لوگ اس مقدس قبرستان میں آرام فرما محترم ہستیوں کی قبور کی زیارت کر سکیں اور فاتح پڑ سکیں۔ خواتین کا داخلہ جنت البقیع میں ممنوع ہے چنانچہ میں تنہا ہی قبرستان میں جاتا رہا اور فاتح پڑھتا رہا۔ ۱۲ ربیع الاول کا شدت سے انتظار تھا۔ پیر ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء (سعودی عرب میں) ہم نے تمام شب روضہ رسول ﷺ کے سامنے اور مسجد نبوی میں گزاری، نفل پڑھتے رہے، دعائیں کرتے رہے۔ نصیب کی بات ہے اللہ نے یہ سعادت بخشی۔ ریاضہ الجنہ میں متعدد بار نفل کی ادائیگی کرتے رہے۔پاکستان میں آج کی رات سماء ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ مسجدوں میں خاص اہتمام، ٹیلی وشرن رات بھر خصوصی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سعودی عرب مختلف نظریات رکھتا ہے۔ مدینہ میں یا مسجد نبوی میں اس حوالے سے خاموشی تھی۔ مجھ جیسے کتنے ہی لوگ اپنے اپنے طور پر دل ہی دل میں حضواکرم ﷺ کی پیدائش کے حوالے سے خصوصی دعائیں کررہے تھے وہ بھی اس طرح کہ ہمارے کسی عمل سے یہ ظاہر نہ ہو کہ ہم کیا کررہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی بدعت اور شرک سے محفوظ رکھے۔
اتوار ۱۲ جنوری ۲۰۱۴ء ۱۰ بجے صبح ہم جبلِ اُحد کے دامن میں تھے۔ ہمارے دائیں جانب اُحد اپنی وجاحت لیے فخریہ انداز سے یہاں آنے والوں کا استقبال کر رہا تھا تو بائیں جانب ایک بڑی چار دیواری جس کے اوپر کی جانب جنگلہ لگا ہوا تھا موجود تھی۔ گاڑی سے اتر کر معلوم ہوا کہ وہ سامنے جو اونچا وسیع و عریض پہاڑ ہے جبلِ اُحد ہے اور یہ چار دیواری جنگ احد میں شہادت حاصل کرنے والے شہدا کی قبروں پر مشتمل ہے۔ شہدا کی یادگار کے بعد ایک اور کم اونچا پہاڑ بھی نظر آ رہا تھا جس پر لوگ کافی تعداد میں موجود نظر آ رہے تھے معلوم ہوا کہ یہ چھوٹا سا پہاڑ جسے اب ٹیلہ کہا جا سکتا ہے" جبلِ روما" ہے۔ اس چھوٹے سے پہاڑ پر اور اس کے ارد گرد جنگِ احد کا معرکہ عمل میں آیا، ۷۰ جلیل القدر صحابہ اکرمؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کی قبریں جبلِ احد اور جبلِ روما کے درمیان چار دیواری میں موجود ہیں۔ ان شہدا میں سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے چچا سید الشہدا سیدنا حمزہؓ بن عبدالمطلب کی قبر مبارک بھی ہے۔
ہم اپنی قسمت پر نازاں تھے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تک تو ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا، علماء اکرم

سے جنگ اُحد کے معرکے کی تفصیل سنی تھی کہ غزوہ اُحد جبلِ اُحد کے دامن میں ۳ ہجری بروز جمعہ ۱۵ شوال کو وقوع پذیر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا لشکر اُحد کے دامن میں کرانہ وادی میں درہ (شعب) کے نزدیک جمع ہوا۔ جس میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے کفار کے ساتھ جنگ میں از خود حصہ لیا اور اس جنگ میں ۷۰ صحابہ اکرامؓ نے شہادت نوش کیا۔ آج میں یہ سب کچھ ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس مقدس زمین پر موجود تھے۔ پروردگار تیرا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔

جبلِ اُحد تیری عظمت کو لاکھوں سلام
نبیؐ سے تیری محبت و عقیدت کو سلام

اول جبلِ احد کی جانب رخ کیا اسے غور سے، نگاہ جما کر، جی بھر کر دیکھا اور سلامِ عقیدت پیش کیا۔ پہاڑ تو بے جان ہے پھر اسے سلام عقیدت پیش کرنا؟ جی ہاں میں نے اس عظیم المرتبت، مقدس پہاڑ کو سلامِ عقیدت پیش کیا اس لیے کہ جمادات میں دوستی و دشمنی نیک بختی و سعادت مندی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فرمان خداوندی ہے ترجمہ) ''اور ہر ایک چیز اللہ کی حمد بیان کرتی ہے''۔ (سورۃ بنی اسرائیل)۔ جبلِ اُحد) سے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو بھی خاص انسیت و محبت تھی۔ ارشاد نبوی ہے کہ ''کوہِ اُحد سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ہماری محبت کا دم بھرتا ہے''۔ ایک اور حدیث نبوی ہے جس کے راوی حضرت انس

ہیں آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کی نظر شفقت جبلِ اُحد پر پڑی تو آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بے ساختہ 'اللہ اکبر' کہا اور فرمایا کہ ' یہ پہاڑ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے'۔ جبلِ اُحد کے بارے میں ایک اور حدیث جو کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کوہِ اُحد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہوگا جب تم اس کے پاس سے گزرو تو اس کے درختوں کا میوہ کھا لیا کرو اگر کچھ بھی نہ ملے تو وہاں صحرا کی گھاس ہی چبا لیا کرو'' ۔ یہ حدیث میں نے بعد میں پڑھی، انشاء اللہ اب اگر یہ سعادت حاصل ہوئی تو حدیثِ مبارکہ کے مطابق اُحد کے درختوں کا میوہ میسر آیا تو ضرور کھاؤں گا اگر وہ نہ ملا تو وہاں کے صحرا کی گھاس ہی چباؤں گا۔ جبلِ اُحد کی عظمت کا اندازہ اس روایت سے بھی لگایا جاسکتا ہے ۔ سیدنا انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ '' جب اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر نور کی تجلی ڈالی تو وہ عظمتِ خداوندی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ جس میں سے تین ٹکڑے مکہ مکرمہ میں اور تین ٹکڑے مدینہ منورہ میں جا پڑے۔ مکہ مکرمہ میں جبلِ حرا، جبلِ ثبیر اور جبلِ ثور معرضِ وجود میں آئے اور مدینہ منورہ میں جبلِ اُحد، جبلِ ورقان اور جبلِ رضوی ظہور پذیر ہوئے''۔ الحمد للہ مجھے ان پہاڑوں میں سے جبلِ حرا، جبلِ ثور اور جبلِ اُحد کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ زندگی نے وفا کی ، اللہ کی رضا ہوئی تو دیگر تین پہاڑوں جبلِ ثبیر، جبلِ ورقان اور جبلِ رضوی کی زیارت کی بھی سعی

کروں گا۔ جبلِ اُحد کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ اس پہاڑ پر جب نظر پڑتی ہے تو ٹھنڈک ، خوشبو، پیار و محبت کا منفرد احساس ہوتا ہے،اس کے اوپر شفقت کی کرنیں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں، آنکھوں میں ٹھنڈک اور نمی کا احساس ہوتا ہے، یہ عظمت و بزرگی لیے ہوئے ہے۔

جبلِ اُحد کی زیارت کے بعد ہم نے شہدائے اُحد جو اُحد کے دامن میں ایک چار دیواری میں ابدی نیند سو رہے ہیں کا رخ کیا۔ شہدائے اُحد کی عظمت اور مقام تاریخ اسلام میں سنہرے حروف سے درج ہے۔ اُحد کے دامن میں ایک چار دیواری جسے خستہ حال ہی کہا جائے گا موجود ہے نیچے کوئی چار فٹ پکی دیوار ہے اس کے اوپر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چاردیواری ایک مستطیل ہے اندر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر نظر آرہے ہیں جن کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ قبریں ہیں اس مستطیل کے درمیان میں ایک قبر ہے جس کے اوپر صرف ایک پتھر ہی لگا ہوا ہے اس کے چاروں طرف کوئی دو فٹ اونچی بوسیدہ دیوار بھی ہے ۔

یہ قبر شہداء اُحد کے سردار سید الشہدا سیدنا حمزہؓ کی قبر مبارک ہے۔ سعودی حکومت نے اسے محفوظ رکھا ہوا ہے نہیں معلوم اس میں کیا مصلحت ہے ورنہ اس قسم کے نشانات کو مٹادینا عام سے بات ہے۔

اس چاردیواری میں صرف اُحد کے شہدا ہی دفن نہیں بلکہ ان کے بعد مختلف ادوار

میں لوگوں کی تدفین اس میں ہوتی رہی ہے۔ ''تاریخ مدینہ منورہ'' کے مصنف محمد عبد المعبود نے موطا امام مالک کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شہدائے اُحد کے ۴۶ سال بعد ایک مرتبہ سیلاب کی وجہ سے سیدنا عمرو بن الجموع اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی قبریں کھل گئی تھیں۔ یہ دونوں انصار غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ ان کے وجود اس طرح تروتازہ پائے گئے گویا کہ کل ہی دفن ہوئے تھے۔ دونوں میں سے ایک نے ہاتھ زخم پر رکھا ہوا تھا۔ اور اسی حالت میں دفن کردیا گیا۔ پس جب ان کا ہاتھ اس زخم سے ہٹایا گیا تو چھوڑتے ہی وہ فوراً زخم پر حسب سابق آگیا''۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ شہداء احد کی زیارت کو ہر سال تشریف لے جاتے تھے اور ان الفاظ میں سلام پیش کیا کرتے تھے۔ ''سلام علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار'' ۔ہم نے بھی شہدائے احد اور دیگر اہل قبور کے لیے مغفرت کی دعا کی اور اب ہم اس مقام کی جانب چل دئے جہاں پر شہدائے احد کی شہادتیں ہوئیں اور معرکہ اُحد وقوع پذیر ہوا۔ ویسے تو یہ پورا میدان جہاں پر اس وقت شہدا کی قبریں ہیں میدان جنگ بنا ہوا ہوگا۔

غزوہ اُحد کا معرکہ جبلِ اُحد کے دامن میں ہوا۔ وادیٔ کرانہ میں ایک چھوٹا سا پہاڑ بھی موجود ہے جسے 'جبلِ روما' کہا جاتا ہے۔ میں اپنی شریک حیات شہناز کے ہمراہ جبل روما کی چوٹی پر ہوں یہ ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس کی اونچائی ۲۰ سے ۲۵ فٹ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سب ہی لوگ بہ آسانی موجود

ہیں ۔اس کے چوٹی پر پہنچ کر شہدائے اُحد کی یادگار واضح طور پر نظر آتی ہے اس میں موجود تمام قبروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نیز اسی جانب جبل اُحد تا حد نظر انتہائی اونچا صاف طور پر جلوا نما ہے۔ جبل روما پر پہنچ کر میری سوچ کا دھارا غزوہ احد کی جانب ہوگیا اور وہ تمام واقعات جو میں نے غزوہ کے حوالے سے پڑھ رکھے تھے ایک ایک کرکے نظروں کے سامنے آنے لگے۔

جنگِ بدر میں شکست کھا کراس وقت کے قریشِ مکہ کی حالت اس مچھلی کی طرح تھی جسے پانی سے نکال کر خشکی میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک ایک دن مشکل سے گزار رہے تھے اور بھرپور انداز سے جنگی تیاروں میں مصروف تھے۔

ہجرت کا تیسرا ہی سال تھا۔ مشرکین مکہ نے تین ہزار کا لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں تیار کیا۔ عورتوں کی سرپرستی ابوسفیان کی بیوی ”ہندہ بنتِ عتبہ“ کر رہی تھی ۔ یہ وہی ہندہ ہے جس نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی شہادت کے بعد ان کا جگر نکال کر چبایا جب نگلا نہ جاسکا تو تھوک دیا تھا۔ مسلمانوں کو جب مشرکین کی اس سورش کا علم ہوا تو نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ نے مشرکین کامقابلہ کرنے کے اقدامات کیے ، صرف ایک ہزار کا لشکر تیار ہوسکا ۔ ان میں سے ۳۰۰ افراد کی کمان عبداللہ بن اُبی کے ہاتھ میں تھی ۔ عبداللہ بن اُبی نے عین وقت پر غداری کی اوراپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس مدینہ چلا گیا اب ۱۰۰۰ مشرکین کے مقابلے میں صرف ۷۰۰ مسلمان رہ گئے۔اس موقع

پر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی (ترجمہ۔ پس کیا ہے واسطے تمہارے بیچ منافقوں کے دو فرقے ہو رہے ہو۔ اور اللہ نے الٹا کیا اب ان کو بسبب اس چیز کے کہ کمایا انہوں نے۔ کیا ارادہ کرتے ہو تم یہ کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا! اللہ نے ؟ اور جس کو گمراہ کرے اللہ پس ہر گز نہ پائے گا تو واسطے اس کے راہ'') ایک طرف کفار تعداد میں بہت زیادہ اور جنگی ساز و سامان سے آراستہ تھے تو دوسری جانب مسلمانوں میں جذبہ اور ایمان کی قوت تھی۔ معرکہ جبلِ اُحد کے دامن میں ہوا جہاں اس وقت ہم موجود ہیں۔ میری سوچ کا دھارا اس معرکہ پر مرکوز تھا، نظروں کے سامنے مسلمان اور کفار آمنے سامنے نظر آ رہے تھے۔ مسلمانوں کی سرپرستی اور رہنمائی نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کر رہے ہیں جب کہ کفار کا لشکر ابو سفیان کی کمان میں تھا۔ اس جنگ میں مشرکین کا پلڑا بھاری رہا، بظاہر انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کامیاب ہوئے اور انہوں نے جنگِ بدر کا بدلہ لے لیا۔ دوسری جانب اللہ کے نبی ﷺ اور ان کے ساتھی تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور غزوہ احد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کا جوش و جذبہ بلند تھا اور وہ مشرکین کو بہادری کے ساتھ پے در پے وار کرکے ختم کر رہے تھے۔ مشرکین پسپا ہو رہے تھے محسوس ہوا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کے ۵۰ تیر انداز جنہیں آنحضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کی پشت پر موجود کوہ عینین میں ایک شگاف یا درہ پر معمور کر دیا تھا جہاں سے مشرکین کے حملے کا خطرہ تھا۔ ان تیر اندازوں کی کمان حضرت عبد اللہ بن جبیرؓ کر رہے تھے

۔آپ ﷺ نے انہیں تاکید فرمائی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے اس درہ کو کسی صورت نہیں چھوڑنا۔

پیراویسی تبسم نے اپنے مضمون 'غزوہ امت اور تعلیم امت' میں 'صحیح بخاری کتاب الجہاد' کے حوالے سے حضور ﷺ کی اس ہدایت کو اس طرح نقل کیا ہے ''اگر تم دیکھو کہ کہ پرندے ہم کو اچک لیے جا رہے ہیں تو اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمہارے پاس کسی کو بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور مار کر پامال کر دیا ہے تب بھی ایسا نہ کرنا''۔جب ان تیر اندازوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔کفارِ مکہ شکست کھاتے اور بھاگتے نظر آئے تو انہوں نے سمجھا کہ فتح ہو گئی ہے چنانچہ ان تیر اندازوں کی اکثریت نے درہ کو چھوڑ دیا اور میدان جنگ میں چلے آئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔درہ پر صرف ۱۰ تیر انداز رہ گئے تھے۔مشرکین کی فوج میں شامل خالد بن ولید جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور عکرمہ بن ابی جہل درہ کی جانب سے آ نکلے اور عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر کے مسلمانوں کے لشکر پر چڑھ دوڑے۔ان کے اس حملے نے جنگ کا نقشہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔مشرکین کی فتح کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست کا سامنا کرنا پڑا۔حضور ﷺ کی اس ہدایت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کسی صورت بھی اس درہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔درہ پر معمور مسلمانوں نے

حضور ﷺ کی اس ہدایت پر عمل نہ کیا جس کے نتیجے میں فتح شکست میں بدل گئی۔
جبلِ روما کے اوپر سے بہت کوشش کی کہ اس درہ کو تلاش کر سکوں جہاں پر آنحضرت محمد ﷺ نے ۵۰ تیر اندازوں کو معمور کیا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ ہر صورت میں اس جگہ پر موجود رہیں اور اسے خالی نہ چھوڑیں۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا جس کے نتیجے میں فتح شکست میں تبدیل ہوئی۔ گویا نبی ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نے فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ بہت کوشش کے باوجود مجھے یہ درہ دکھائی نہیں دیا۔ خیال ہے کہ جبلِ اُحد کے کسی بھی حصے میں یہ درہ موجود ہوگا، ہو سکتا ہے کہ اب یہ درہ میدان بن گیا ہو یا کسی بھی وجہ سے اس نے اپنی ہیئت بدل لی ہو۔
غزوہ احد کے حوالے سے دوسرا اہم واقعہ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا ہے۔ میں اس سوچ میں گم تھا اور خیال کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مَیں اس وقت جس جگہ موجود ہوں حضرت حمزہؓ کو اسی جگہ وحشی نے شہید کیا ہو۔ ان کا خون اسی جگہ گرا ہو اور اسی مٹی نے ان کے خون کو اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ میں نے اس جگہ اور اس مٹی
کو سلامِ عقیدت پیش کیا اپنی خوش بختی پر مسرور ہوا۔ پھر یہ سوچ کر دل بوجھل ہو گیا، آنکھیں نم ہو گئیں کہ حضر حمزہؓ کو شہادت کا رتبہ تو ملا لیکن مشرکین نے آپ کے مردہ جسم کی بے حرمتی کی، آپ کے کان، ناک اور

دیگر اعضاء کاٹ دیے۔ ابو سفیان کی بیوی ''ہندہ'' نے حضرت حمزہؓ کے شہید ہونے کے بعد ان کے جسم مبارک کو چیر کر ان کا جگر نکالا، اسے چبایا جب نگل نہ سکی تو اسے تھوک دیا۔ ہندہ نے حضرت حمزہ کو شہید کرنے پر اپنے کڑے، بالیاں اور گلے کا ہار انعام میں وحشی کو دیا۔ حضرت حمزہؓ ایک بہادر اور دلیر صحابی تھے آپ نے جنگ بدر میں بے شمار مشرکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا یہ بات مشرکین کے علم میں تھی چنانچہ وہ دیگر کے علاوہ حضرت حمزہؓ کے خون کے پیاسے تھے۔ مشرک جبیر بن مطعم نے 'وحشی' نامی ایک غلام کو آزاد کردینے کا لالچ دیگر حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کا ٹاسک دیا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا موقع دیکھ کر حضرت حمزہؓ پر ایسا وار کیا کہ وہ شہید ہوگئے۔

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت حمزہؓ کی شہادت شدہ لاش دیکھی تو بہت غم گین ہوئے فرمایا ایسا دردناک منظر میری نظر سے کبھی نہیں گزرا'۔ آپ ﷺ نے شہدائے اُحد، کے لیے فرمایا کہ ''میں قیامت کے دن ان کا شفیع ہوں''۔

وحشی بعد میں ایمان لے آیا تھا لیکن حضور ﷺ نے اسے اپنے سامنے آنے سے منع فرما دیا تھا۔

غزوہ اُحد میں آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر کا عام ہوجانا اور آپ ﷺ کے دندانِ مبارک کے شہید ہوجانے کا واقع بھی یاد آگیا۔ میں اس خیال میں گم ہوگیا کہ

کس قدر تکلیف دہ وہ لمحات ہوں گے اور ہمارے پیارے نبی ﷺ پر کیا گزری ہوگی۔ ایک لمحہ کو یہ خیال بھی آیا کہ کیا پروردگار مشرکین کو اس مکروہ عمل سے نہیں روک سکتا تھا۔ یقیناً اس کے لیے یہ کوئی مشکل عمل نہیں تھا۔ جب وہ اپنے گھر خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے ننھی ننھی ابابیلوں کو کنکریوں کے ساتھ بھیج سکتا ہے جنھوں نے ہاتھیوں جیسے لحیم شحیم جانوروں کا بھوسا بنا دیا تھا اور خانہ کعبہ مشرکین کے ہاتھوں محفوظ رہا تھا تو اس کے لیے اُحد کے میدان میں مشرکین کو تہس نہس کر دینا کیا مشکل تھا لیکن اللہ کے ہر معاملے میں، اس کے ہر فیصلے میں حکمت ہوتی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ 'جو تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں'۔ یقیناً اس عمل میں بھی کوئی حکمت رہی ہوگی۔ حضرت مُصعب بن عمیرؓ کی شکل و صورت نبی اکرم محمد ﷺ سے ملتی جلتی تھی۔ جس وقت مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں شہید کر رہے تھے تو حضرت مُصعبؓ آنحضرت ﷺ کو محفوظ رکھنے اور انہیں بچانے کی کوشش میں شہید ہوگئے۔ مشرکین نے یہ افواہ پھیلا دی کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ شہید ہوگئے۔ یہ خبر صحابہ اکرم پر بجلی بن کر گری، ایک سراسیمی پھیل گئی، افراہ تفری کا پھیل جانا ایک قدرتی عمل تھا۔ مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت دم خم تھا وہ بھی اس خبر کے پھیل جانے سے جاتا رہا۔ مشرکین کی عورتوں نے اس خبر پر خوشی کے ترانے گائے۔ لیکن یہ خبر سچ نہیں تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت ابو دجانہؓ اور دیگر صحابہ اکرم نے آپ ﷺ

کو گھیرا ہوا تھا دشمنوں نے تیروں کی بارش کی، پتھر پھینکے، صحابہ نے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا اس کے باوجود آپ ﷺ کی پیشانی اور بازو زخمی ہوگئے اور آپ ﷺ کے دو دانت مبارک بھی شہید ہوگئے۔ اس وقت بھی اللہ کے نبیؐ نے مشرکین کو بد دعا نہیں دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتی'۔ اس جنگ میں ۷۰ مسلمان شہید ہوئے۔ اس روز تکلیف اور زخموں کے باعث نبی اکرم ﷺ نے ظہر کی نماز بیٹھ کر ادا کی اور آپ ﷺ کے ساتھ مقتدیوں نے بھی بیٹھ کر ہی نماز ادا کی۔

غزوہ اُحد میں نبی ﷺ کے دندان مبارک کے شہید ہونے کی بات ہو تو یمن کے محلے قرن کے باسی حضرت خواجہ اویس قرنی کا خیال آنا لازمی ہے۔ مَیں مکمل طور پر اُحد کی اس زمین کو تکے جا رہا تھا خیال تھا کہ شاید یہ ہی وہ جگہ ہو کہ جہاں حضور ﷺ زمین پر گرے ہوں گے، صحابہ اکرم نے انہیں چاروں اطراف سے گھیر رکھا ہوگا، بہادر صحابی مشرکین کے ساتھ لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کر رہے ہوں گے۔ اس دوران عتبہ بن ابی وقاص نامی ایک مشرک نے موقع جان کر ایک پتھر حضور ﷺ کی جانب اس طاقت سے مارا کہ حضور اکرم ﷺ کا ایک دانت بعض روایت میں ہے کہ دو دانت مبارک شہید ہوگئے۔ حضرت اویس قرنی احسان و مہربانی اور نبیؐ سے محبت کے اعتبار سے محترم تابعین میں سے ہیں۔ آپ یمن کے شہر قرن کے رہنے والے تھے۔ آپ اتنے درویش منش اور ایسے فقیر تھے کہ لوگ آپ کو دیوانہ تصور

کیا کرتے تھے۔ سید علی ہجویری نے اپنی تصنیف 'کشف المحجوب' میں اویس قرنی کو اہل تصوف کا عظیم مشائخ قرار دیا ہے۔ قرنی سچے عاشقِ رسولؐ تھے عالم جسمانی میں حضرت محمد ﷺ کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا لیکن روحانی طور پر آپ اپنے نبیؐ کے خیال میں گم رہا کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اویس قرنی اپنی والدہ محترمہ کے واحد کفیل تھے اور اپنی والدہ کی خدمت کے علاوہ تنگ دستی نیز انہیں تنہا نہ چھوڑنے کے باعث قرن سے باہر نہیں جا سکتے تھے یہی وجہ رہی کہ آپ نبی اکرم ﷺ کی ظاہری زندگی میں زیارت نہ کر سکے۔ ان کا ذریعہ معاش شتر بانی یعنی اونٹ چرانہ اور زمین پر گری ہوئی کھجور کی گٹھلیاں اکٹھی کرکے انہیں بازار میں بیچ کر اپنا گزر بسر کرنا تھا۔ اویس قرنی کو جب غزوہ اُحد کے حالات خصوصاً حضرت محمد ﷺ کے دانت کی شہادت کا علم ہوا تو حضورؐ کو پہنچنے والی اذیت و تکلیف کے خیال سے آپ تڑپ اٹھے اور زار و قطار روتے تھے آنسوں تھے کہ تھم نے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ جب آپ کو احساس ہوا کہ دانت ٹوٹنے سے حضور ﷺ کو اس قدر شدید تکلیف ہوئی ہوگی تو آپ نے ایک پتھر اپنے دانت پر مار کر اپنا دانت توڑ ڈالا، پھر آپ کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ دانت نہیں بلکہ اس کے برابر والا دانت حضورؐ کا ٹوٹا ہو تو آپ نے دوسرا دانت توڑ ڈالا، پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کا نیچے والا دانت ٹوٹا ہو تو آپ نے اپنا نیچے والا دانت توڑ ڈالا۔ اس طرح آپ نے یکے بعد دیگر تمام دانت توڑ ڈالے کہ کسی طرح اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کا

کامل اتباع حاصل ہو سکے۔ اللہ اللہ اپنے نبیؐ سے محبت کی لازوال مثال ہے۔ اُحد کے مقام سے مَیں نے

حضرت اویس قرنی کو سلام عقیدت پیش کیا۔

غزوہ اُحد کے شہداء کو غسل دیے بغیر نیز ایک قبر میں کئی کئی شہدا کو دفن کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھی گئی۔ انہیں باقاعدہ کفن بھی نہیں پہنایا گیا اس کی وجہ اس وقت کفن کے کپڑوں کا میسر نہ ہونا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کفن کے لیے جو چادریں میسر تھیں اور لمبائی میں کم یا چھوٹی تھیں جس کے باعث حضور ﷺ نے ہدایت کی کہ منہ ڈھانپ دیا جائے اور پیروں کو حرمل، گھاس یا پتوں سے ڈھانپ دیا جائے۔ البتہ سید الشہدا حضرت حمزہؓ کو ایک ہی چادر میں دفن کیا گیا۔ صحابی حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری کو غسل الملائکہ کہا گیا یعنی جنہیں فرشتوں نے غسل دیا۔ اس واقع کا ذکر پیر اویسی تبسم نے اپنے مضمون 'غزوہ اُحد اور تعلیم امت' میں 'سیرت ابن ہشام' کے حوالے سے اس طرح کیا ہے کہ ' حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری نے مشرکین کے سپہ سالار ابو سفیان پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ابوسفیان کو قتل کر دیتے۔ مگر شداد بن الاسود نے ان کے وار کو روک لیا اور اپنی تلوار سے حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری کو شہید کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔ ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کرو۔ بیوی نے کہا کہ شبِ اُحد

ان کی شادی ہوئی تھی۔ صبح کو اٹھے غسل کی حاجت تھی ۔ غسل کیلیے آدھا سر دھویا تھا کہ دعوت جنگ کی آواز کان میں پڑی ۔ فوراًاسی حالت میں وہ شریک جنگ ہوگئے۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسی سبب سے اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔چنانچہ حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کہلاتے ہیں''۔روایت ہے کہ اس واقع کے کئی برس بعد آنحضرت محمد ﷺ شہدائے احد کی قبروں پر آئے اور شہداء پر نماز جنازہ پڑھی۔

اُحد کے میدان میں مسلمان خواتین بھی شریک جنگ تھیں۔ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ ،ام سلیمہؓ ،ام سیطؓ، ام ایمنؓ، حمنہ بنت حجشؓ، ام عمارہؓ، نسیبہ بنت کعب انصاریؓ، حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) اور دیگر شامل تھیں۔ یہ خواتین مشکیں بھر بھر کر لاتیں اور مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں۔بعض خواتین زخمیوں کے زخموں کو دھوتیں، انہیں صاف کرتی اور ان کی مرہم پٹی کیا کرتیں۔ سلام ان تمام مومن خواتین پر جنھوں نے اُحد کی جنگ میں مردوں کے شانا بشانہ حصہ لیا۔

واپسی کا سفر شروع کرنے سے قبل ہم نے ایک بار پھر جبلِ اُحد اور اس کے ارگرد وادی کو بغور دیکھا، اس خیال سے بھی کہ ہمارے نبیؐ اس پہاڑ سے محبت رکھتے تھے اور اس پہاڑ کو بھی نبی سے عقیدت تھی ،آپ ﷺ نے اس پہاڑ کو یقینا

بغور دیکھا ہوگا، آپ ﷺ کی نگاہ اس پہاڑ اور اس وادی پر پڑی ہوگیں۔ یہ پہاڑ آج بھی اپنی اصل کیفیت میں موجود ہے۔ پہاڑ کو، وادی کو دیکھنا ہی ہمارے لیے باعث برکت و ثواب تھا۔ اب ہم جبلِ روما سے نیچے اترے، جس راستے سے اوپر گئے تھے واپسی کا راستہ ہم نے بدل لیا اس خیال سے کہ شاید وہ مٹی، وہ جگہ ہمیں نصیب ہو جائے کہ جہاں اُحد کے شہدا کا خون زمین کے اوپر نہ سہی اندر کسی جگہ محفوظ ہو۔ آہستہ آہستہ پہاڑ سے واپسی کا سفر مکمل ہوا۔ شہدا کی یادگار کے برابر ایک کچا بازار بنا ہوا ہے جہاں مختلف سامان فروخت کرنے والی زیادہ تر کالے برقعوں میں ملبوس سیاہ فام خواتین ہیں۔ بازار سے غربت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ دکانیں پکی نہیں ہیں، ان پر سائیبان بھی نہیں تھے بلکہ کھلے آسمان تلے سامان لیے یہ خواتین اپنے اور اپنے خاندان کے لیے روزی کا سامان کیے ہوئے ہیں۔ اس بازار سے ہوتے ہوئے ہم ایک بار پھر شہدائے اُحد کی یادگار پر پہنچے۔ دوبارہ تمام شہدا کو سلام عقیدت پیش کیا خاص طور پر نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ جن کی قبر بہت واضع طور پر درمیان میں دکھائی دے رہی تھی کی خدمت میں سلام عقیدت پیش کیا اور ہاتھ اٹھائے بغیر فاتح پڑھی۔ اپنی گاڑی کی جانب بڑھے تو سامنے اُحد اپنا دامن واہ کیے ہماری جانب متوجہ تھا۔ اپنے نبیؐ کی اتباع کرتے ہوئے ہم نے اسے دیکھ کر اللہ اکبر کہا اور نبی کے فرمان کہ 'کوہ احد سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ہماری محبت کا دم بھرتا ہے'، ہم نے اس سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔

نبیؐ کے فرمان کے مطابق یہ پہاڑ' جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے' ہم نے باادب واحترام، محبت وعقیدت سے سلام پیش کیا اور خدا حافظ کہہ کر واپسی کے سفر پر چل دیے۔ پاکستان آکر جب بھی اُحد کے سفر کا حال لکھنے بیٹھتا تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی، پاکستان کے حالات، اپنی صحت کی خرابی، ۱۶فروری ۲۰۱۴ء کو پیش آنے والا حادثہ دیگر گھریلوں معاملات کے باعث اس سفر کی داستان لکھی نہ جا سکی۔ آٹھ (۸) ماہ بعد ۲۰ اگست ۲۰۱۴ء کو قسمت پھر سے اماں حوا کے شہر جدہ لے آئی، یہاں فرست ہی فرست ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر سب سے پہلے

اُحد کے سفر کی داستان کو مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔ (جدہ ۲۵ اگست ۲۰۱۴ء)

مطالعہ : اہمیت و افادیت۔ انسانی ذہن کو جِلا بخشتا ہے

اسلامی تمدن میں علم اور تحصیل علم انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ حقائق اشیاء کا علم آدمؑ نے خود ذات باری تعالیٰ سے حاصل کیا۔ اس علم نے اسے اشرف المخلوقات بنایا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی اس حقیقت پر مبنی تھی کہ پڑھنا، لکھنا اور علم حاصل کرنا انسان کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔ اس طرح اسلام نے انسانی تاریخ میں پہلی بار عالم گیر تعلیم کا نظریہ پیش کیا۔ قرآن حکیم میں علم اور تحصیل علم کی اہمیت کو متعدد آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

علم کی فضیلت اور اہمیت کے متعلق ایک نہایت جامع روایت یہ بیان کی گئی ہے جسے حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب فضل العلم میں درج کیا ہے۔ ”علم حاصل کرو۔ اس کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ علم جنت کے راستے کو روشن کرتا ہے۔ جب ہمارا کوئی دوست نہیں ہوتا تو وہ ہمارا ساتھ دیتا ہے وہ مصیبت کے وقت ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہتھیار کا کام دیتا ہے اور دوستوں کے مابین زینت ہے۔ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ قوموں کو بلند مقام عطا فرماتے ہیں اور ان کو نیک مشاغل کی طرف

رہبری کا منصب سپرد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے نقش قدم کی پیروی اور ان کے اعمال کی نقل کی جاتی ہے ان کی رائے کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے''۔اسلام نے تلقین کی کہ تحصیل علم ایک مقدس فریضہ ہے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ اسلامی دنیا میں علمی تحقیق و تجسس کا ذوق و شوق سرعت کے ساتھ پھیلتا گیا۔ کتاب و حکمت کی یہی تعلیم ہے کہ جس کی بدولت انسانوں نے طبعی کائنات کی قوتوں کو مسخر کیا اور انھیں اپنے تصرف میں لایا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کے لیے کتاب و حکمت دونوں کی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے مطالعہ انسان کو حصول علم کی جانب مائل کرتا ہے، یہ انسان کو اپنی ذات سے روشناس کراتا ہے، معاشرے اور اس میں بسنے والوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، یہ انسان کو نئی فکر عطا کرتا ہے، انسان کی سوچ کو وسیع کرنے اور س میں کشادگی کا باعث ہوتا ہے، یہ انسان میں قوت مشاہدہ پیدا کرتا ہے ، مطالعہ سے انسان میں اچھائی اور برئی کی پہچان ہوتی ہے، مطالعہ سے ہی انسان نے کائنات میں پوشیدہ رازوں کو دریافت کیا، دنیا میں جتنے بھی عالم ، فاضل، فلسفی، بلند پایا محقق، عظیم سائنسداں، مصنف، موجداور جتنے بھی اربابِ سَیف و قلم گزرے ہیں مطالعہ ان کی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ تھا۔ مطالعہ وقت گزارنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ مطالعہ کی عادت سے انسان دنیاکے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ مطالعہ کے بے شمار ذرائع ہیں ان میں اخبارات، رسائل وجرائد، کتب برقی ذرائع جن میں ریڈیو، ٹیلی،

وژن، وی سی آر، انٹرنیٹ، ڈسک، سی ڈی وغیرہ۔ ان تمام میں کتب کا مطالعہ سب سے اہم اور دیر پا ہوتا ہے کیوں کہ کتاب ہر دم تازہ رہتی ہے، اس کی حیثیت مستقل اور مسلسل ہوتی ہے۔ انسان کا جب جی چاہے اسے پڑھے جب جی چاہے اسے بند کرکے رکھدے، خرید کر پڑھے یا کسی لائبریری سے مفت لاکر مطالعہ کرے یا کسی اپنے دوست سے مستعار لے کر فیض حاصل کرلے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو ہر حال میں خوش رکھتی ہے۔یہ جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے نادر و نایاب کہلانے لگتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا۔

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا
یہ تماشا کتاب میں دیکھا

کتاب ایک مسلمہ حقیقت ہے اسے ہر دور، ہر زمانے میں فضیلت حاصل رہی ہے۔ بقول حکیم محمد سعید شہید ''انسانی تہذیب کے دور میں کتاب کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جو کتاب سے تہی دامن رہا ہو اور فکر کتاب سے آزاد ہو جائے۔ دراصل کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ کتابیں بحر حیات کی سیپیاں ہیں جن میں پراسرار موتی بند ہیں۔ اگر ہم ان کی تعریف میں ادبی اور شعری انداز بیان اختیار کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ کتابیں معلومات کے ثمر دار درختوں کے باغ ہیں، گزرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل

ہیں، حسن و جمال کے آئینے ہیں اور وقت کی گزری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں لافانی بلبلیں ہیں جو زندگی کے پھولوں پر سرمدی نغمے گاتی ہیں۔ محی الدین بن عربی کے خیال میں ''کتاب پھلوں کا ایک ایسا باغ ہے کہ اسے ساتھ لیے پھرو اور جہاں چاہو اس سے خوشہ چینی کر لو۔کتاب کے بارے میں میرا انداز فکر یہ ہے کہ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو، جس درسگاہ میں کتابیں نہ ہوں وہ ایسی درس گاہ کی مانند ہے جس میں طلبہ نہ ہوں۔ جس شہر میں کتب خانے نہ ہوں وہ ایک شہر ویراں ہے اور جس کتب خانے میں لوگوں کو کتابوں سے عشق و محبت نہ ہو وہ کتب خانہ علم کی بس ایک نمائش گاہ ہے، یہ نمائش گاہ لگی بھی رہ سکتی ہے اور یہ نمائش زمانے کے ہاتھوں تباہ بھی ہو سکتی ہے' ۔ درحقیقت، کتاب ایک ایسی روشنی ہے کہ جس نے گزرے زمانے کی شمع کو کسی لمحہ مدھم ہونے نہیں دیا۔ زمانے کی ترقی اسی مینارہ نور کی مرہون منت ہے۔ یہ ایک ایسا انمٹ لازوال سرمایہ ہے کہ جس نے انسانی ترقی کے تمام ادوار یعنی ماضی، حال اور مستقبل کو مربوط رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا خوش گوار فریضہ بھی انجام دیا ہے۔کتاب کا حصول اس قدر آسان ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ہمیں عجائبات کی سیر کراتی ہے۔ اس کے ذریعے سے سلجھے ہوئے ذہن کے مصنفین کے خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔کتاب ہمیں اسلاف اور ان لوگوں کے حالات بڑی آسانی سے مہیا کر دیتی ہے جن تک ہم پہنچ نہیں سکتے۔کتاب جیسا ساتھ کسی

کو مل سکتا ہے کہ جب آپ چاہیں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جائے اور جب آپ پسند کریں تو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے، بلکہ آپ کی خواہش ہو تو آپ کے جسم و جان کا جزو بن جائے۔ جب تک آپ چاہیں خاموش رہے اور جب آپ کا جی اس سے بولنے کو چاہے تو چہکنے لگے۔ آپ کسی کام میں مصروف ہوں وہ خلل انداز نہیں ہوتی اور آپ تنہائی محسوس کریں تو آپ اسے شفیق ساتھی محسوس کریں۔
کتاب ایک ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا اور نہ کبھی آپ کا ساتھ دینے سے جی چراتا ہے۔ شاعر خیال آفاقی کے بقول ۔
نئے ذریعہ بلاغ خوب ہیں لیکن کتاب میں جو مزاہ ہے، کتاب ہی میں رہا
سقراط کا کہنا تھا کہ " جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ گھر حقیقتاً گھر کہلانے کا مستحق نہیں ہے وہ تو زندہ مردوں کا قبرستان ہے "۔ فلسفی ایمرسن کا کہنا ہے کہ " اچھی کتاب بے مثال دوست ہے جو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنے کی صلاح دیتا ہے " کارلائل کے خیال میں " اچھی کتابوں کا مجموعہ دور جدید کی سچی یونیورسٹی ہے " ۔ ملٹن کا کہنا تھا کہ " ایک اچھی کتاب عظیم روح کے قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے۔ اس کو محفوظ کرنے کا مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو اس عظیم روح سے روشناس کرانا ہے " ۔کتاب دراصل صدائے ماضی ہے، جس کی بازگشت نے قرنہا قرن کے فاصلوں کو شکست دے کر انسان کو کامیابی اور ترقی سے ہمکنار کیا۔ کتاب وہ روشنی ہے جس نے ماضی کی شمع کو کبھی مدہم

نہ ہونے دیا اور انسان کی ترقی و ظفر مندی دراصل اسی شمع فروزاں کی مرہون منت ہے۔ یہ فاصلوں کی بازگشت ہے اور خاموشیوں کی آوازیں ہیں۔ یہ ہمیں پرانے زمانے کی روحانی اور ذہنی کاوشوں کا وارث بناتی ہیں۔ یہ علم و آگہی کا وہ خزانہ ہے، جس کی دولت کبھی ختم نہیں ہوتی اور جو نسل در نسل وراثتاً سونپا جاسکتا ہے۔ کتاب

ایک زندہ اور متحرک شے ہے جس نے تاریخ، اقتصادیات، ثقافت، تہذیب و تمدن غرض کہ ہر مکتبہ فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ کتاب کے حوالے سے میرا ایک شعر ۔

حصول علم ہے ہر اک فعل سے بہتر
دوست نہیں ہے کوئی کتاب سے بہتر

مطالعہ کے عدم فروغ اور کتاب سے دوری کی وجوہات

یہ امر باعث افسوس ہے کہ ہم مطالعے سے دور ہو گئے ہیں اور مطالعہ کا شوق خطرناک حد تک زوال پذیر ہے۔ عام لوگوں میں کتاب پڑھنے کا رجحان ناپید ہو چکا ہے۔ اس کی اہم وجہ معاشرے میں رونما ہونے والی وہ تبدیلی ہے جس کے باعث ہر فرد کم سے کم وقت اور کم سے کم محنت کرکے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی فکر میں مصروف ہو گیا ہے، مہنگائی کے باعث لوگوں میں قوت خرید باقی نہیں رہی، والدین نے اپنے بچوں کو کتابیں دلانا چھوڑ دی ہیں، طالب علموں نے اپنے آپ کو صرف اور صرف نصابی ضروریات کی تکمیل اور امتحان

پاس کرنے تک محدود کر لیا ہے، وہ نصابی کتب کے علاوہ کچھ پڑھنے کی جانب راغب نہیں ہوتے۔ نوٹس کا سلسلہ بھی کتب اور مطالعہ کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سرکاری اسکولوں میں لائبریری کا تصور ہی نہیں، کالجوں اور جامعات کے کتب خانوں کو مناسب فنڈز راہم نہیں کئے جاتے۔ دیگر پڑھے لکھے لوگ بھی اپنا زیادہ تر وقت ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کی نظر کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس اہم اور قومی مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ ہر زمہ دار توجہ دے۔ ہمارا نظام تعلیم بھی فروغ مطالعہ کے فروغ کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی سے خالی نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں موجودہ نظام تعلیم سے ڈگری یافتہ طلبہ تو پیدا ہو رہے ہیں لیکن تعلیم یافتہ لوگ پیدا نہیں ہو رہے۔

: مطالعہ کی عادت کو فروغ دینے کے طریقے

امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے مطالعہ کی عادت کو فروغ دینے کے لئے والدین کے لئے حسب ذیل چند تجاویز دیں ہیں :

☆ والدین اپنے بچوں کو وقتاً فوقتاً لائبریری لے جائیں اور لائبریرین سے اپنے بچے کو متعارف کرائیں تاکہ وہ لائبریری کے عملے سے مدد لینے اور کتاب کے حصول میں آسانی محسوس کرے۔

☆ آپ لائبریرین سے کتاب کے انتخاب کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ وہ آپ کے بچے کو

وہ کتاب پڑھنے کے لئے دے جو وہ پسند کریں۔

☆ لائبریری کے استعمال میں اپنے آپ کو ایک نمونے کے طور پر پیش کریں تاکہ آپ کا بچہ دیکھے کہ آپ بھی لائبریری سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

☆ اسکول و کالج کے اوقات کے بعد نیز گرمیوں کی چھٹیوں کے پروگرام سے فائدہ اٹھائیں

۔

☆ لائبریری سے اپنی تعاون کا اظہار کیجئے، اپنا وقت لائبریری کو دیں یا کتب اور دیگر مواد اپنے علاقے کی یا بچے کے اسکول کی لائبریری کو تحفہ کے طور پر دیجئے۔

☆ اپنے گھر میں مطالعہ کی حوصلہ افزائی کریں۔جب بھی وقت ملے از خود مطالعہ کریں۔ آپ کا بچہ دیکھے کہ آپ بھی مطالعہ میں مصروف ہیں۔ گھر میں لائبریری قائم کریں یا ہفتہ وار مطالعہ کے اوقات مقرر کریں۔

والدین کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی طلبہ میں مطالعہ کو فروغ دینے میں اہم اور بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کلاس میں نصابی موضوعات کے ساتھ ساتھ معلوماتی اور دلچسپ کتابوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں، نیز انہیں مطالعہ کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔

فروغ مطالعہ میں لائبریری کا کردار

مطالعہ کو فروغ دینے میں کتب خانے طلبہ اور عام لوگوں میں اہم اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ان میں اہم نکات حسب ذیل ہیں :

☆ لائبریری کے استعمال میں طلبہ اور قارئین کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ کتب خانے اپنے قارئین کی علمی ضروریات کی تکمیل کے لئے قائم کئے جاتے ہیں ۔اگر لائبریری میں قارئین نہیں ہوں گے تو ان کے قیام کا مقصد جاتا رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ اور قارئین کو کتب خانے کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کیا جائے انہیں مختلف طریقوں سے کتب خانوں کے بارے میں بتایا جائے ۔

☆ لائبریری کی ترتیب و تنظیم بھی لائبریری استعمال کرنے والوں پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔

☆ لائبریری کیٹلاگ یا لائبریری کا کمپیوٹرائی ہونا قارئین پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہیاور وہ مطالعہ کی جانب راغب ہوتے ہیں۔

☆لائبریری کے نوٹس بورڈ پر نئی آنے والی کتابوں کے بارے معلومات فراہم کرنے سے بھی قارئین اپنی پسند اور ضرورت کی کتاب کے مطالعہ کی جانب راغب ہوتے ہیں۔

☆ قارئین کی راہنمائی کرنالائبریری کا بنیادی فریضہ ہے۔ طلبہ اور قارئین کو لائبریری کے استعمال کے بارے میں مکمل اور موثر راہنمائی فراہم کرنے سے فروغ مطالعہ کے عمل میں تیزی لائی جاسکتی ہے۔ لائبریری میں آنے والے اکثر قارئین کولائبریری کیٹلاگ سے ناواقف ہوتے ہیں ، وہ طلب نمبر ، کیٹلاگ کارڈ

پر موجود کتاب کے بارے میں معلومات، الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کی ترتیب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ انہیں لائبریری سے اپنی مطلوبہ کتاب کا حصول انتہائی مشکل نظر آتا ہے جس کے باعث وہ بددل ہو کر لائبریری میں نہیں آتے۔ لائبریرین یا دیگر عملے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں قارئین کی مدد اور رہنمائی کرے۔

☆ لائبریری میں وقفے وقفے سے کتابوں کی نمائش، مختلف موضوعات پر ماہرین کے لیکچر سیمینار اور ورکشاپ کا انعقاد کرکے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔

☆لائبریری میں قارئین کی انجمن یا "ریڈرز کلب" کے ذریعہ بھی لوگوں کو مطالعہ کی جانب راغب کیا جاسکتا ہے۔

☆لائبریری میں نئی کتابوں کی تعارفی تقریب لوگوں میں مطالعہ کا رجحان پیدا کر سکتی ہے ۔

☆ لوگ کیاپڑھنا چاہتے ہیں ؟ لائبریری اس قسم کا جائزہ (سروے) لے کر ان کی دلچسپی کا مواد فراہم کر سکتی ہے۔لائبریری کا یہ عمل فروغ مطالعہ کا باعث ہو گا۔

☆ پرنٹ میڈیا (اخبارات، رسائل وجرائد) اور برقی میڈیا (Electronic Media ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ وغیرہ)کے ذریعہ عوام الناس میں مطالعہ کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا جاسکتاہے۔

☆کستی یا موبائل لائبریری کے ذریعہ دور دراز کے علاقوں میں لوگوں کو کتاب پڑھنے کی سہولت فراہم کی جا سکتی ہے۔

اہل علم میں ذوق مطالعہ

اسلامی کتب خانے'' کے مصنف الحاج محمد زبیر نے ذوق مطالعہ کی بے شمار مثالیں'' تحریر کیں ہیں۔ حسن بصریؒ کی زندگی کے چالیس سال ایسے گزرے کہ سوتے جاگتے کتاب ان کے سینے پر رہتی تھی۔ اموی خلیفہ ثانی کا ذوق مطالعہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کے کتب خانے کی چار لاکھ کتابوں میں سے بہت کم ایسی تھیں جن کو اس نے پڑھا نہ ہو۔ علامہ ابن رشد نے ساری عمر کتب بینی میں صرف کر دی اس کی عمر میں صرف دو '۲' راتیں ایسی گزری کہ جب وہ مطالعہ نہ کر سکا، ایک شادی کی اور دوسری والدہ کی وفات کی رات۔ منجم ابو معشر کے انہماک مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے خراسان سے مکہ جاتے ہوئے بغداد کا ایک کتب خانہ خزائنتہ الحکمت دیکھنے کا قصد کیا مگر وہاں پہنچ کر مطالعہ میں اتنا محو ہوا کہ مکہ جانا بھول گیا۔ بصرہ کے ایک مشہور عالم جاحظ نے تو اپنی جان ہی ذوق مطالعہ کی نظر کر دی وہ آخری عمر میں مفلوج ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی کتابیں اس کے چاروں طرف لگی رہتی تھیں اور وہ مطالعہ میں منہمک رہتا تھا ایک دن کتابیں جاحظ پر گر پڑیں اور وہ ان کے نیچے دب کر مر گیا۔ فتح ابن خاقان کو کتابوں کے مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ اس کے ہاتھ میں

ہر وقت ایک کتاب رہتی تھی یہاں تک کہ وہ بیت الخلا میں بھی کتاب کا مطالعہ کر لیا کرتا تھا۔

کتابیں ہیں چمن اپنا'' کے مصنف عبدالمجید قریشی نے بعض شخصیات کے ذوق مطالعہ اور'' کتب بینی کا ذکر کیا ہے۔خان بہادر خدا بخش مرحوم نے پٹنہ میں ''خدا بخش اورینٹل لائبریری'' جیسے عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد ڈالی ۔کتابیں حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب نے ہر طریقہ خواہ وہ اخلاقاً معیوب کیوں نہ تھا اپنے لئے روا رکھا، حالانکہ وہ ایک متقی اور راست باز انسان تھے۔آپ نے '' مشرقی کتب خانہ'' کے مصنف اسکاٹ' کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی خدا بخش کا کہنا تھا کہ 'نادر و نایاب چیزوں' کے جمع کرنے کا فن ہر پابندی سے مستثنیٰ اور فوج داری قانون سے بالا ہے۔کتاب کے بارے میں آپ نے کہا کہ اندھے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کی بصارت زائل ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو آنکھیں رکھنے کے باوجود اپنی کوئی بیش قیمت کتاب کسی دوست یا واقف کار کو مطالعے کے لئے مستعار دے دیتے ہیں اور تیسرے اندھے وہ لوگ ہیں جو ایک بار ایسی کتابوں پر قبضہ پا لینے کے بعد انھیں واپس بھی کر دیتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کا کتب خانہ ان کی نصف صدی سے زیادہ عرصہ تلاش کا سرمایہ تھا مولانا حسرت موحانی پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلا اور دو سال قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی، حسرت جیسے درویش

کے پاس اتنی رقم کہا تھی چنانچہ ان کی بیش بہا اور نادرونایاب کتب کو جنھیں انھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے جمع کیا تھا صرف ساٹھ روپے میں حکومت کی جانب سے نیلام کر دیا گیا۔ حسرت نے لکھا کہ ''اس جرم کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلّٰی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم الحروف نے معلوم نہیں کن کن کوششوں اور دِقتوں سے بہم پہنچایا تھا، ان سب کو پولیس کے جاہل جوان ٹھیلوں میں اس طرح بھر کر لے گئے جس طرح لوگ لکڑی اور بُھس لے جاتے ہیں''۔ حکیم اجمل خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں ذوق مطالعہ کا بے انتہا شوق تھا، سر سید احمد خان مطالعہ کے بے حد شوقین تھے آپ نے لکھا کہ 'حیات جاوید' جس کی ضخامت ایک ہزار صفحات تھی میں نے دو شب میں ختم کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول پر کم از کم ایک وقت کا کھانا کھانا ضرور فراموش کر دیتا تھا اس دن بھی میں شام کا کھانا نہیں کھایا، اس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا''۔علامہ شبلی نعمانی کو کتب بینی کا بے انتہا شوق تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھا ہے کہ '' انھیں مطالعے میں بے حد شغف تھا گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا''۔ نواب محسن الملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں مرتے دم تک مطالعے کا شوق رہا۔ ممتاز مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کو کتب بینی کا شوق ہمیشہ رہا یہ بھی ہوتا تھا کہ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے

ہیں اور کتاب بائیں ہاتھ میں ہے۔استاد داغ دہلوی ہر نئی شائع ہونے والی کتاب فوراً خرید لیا کرتے اور اسی وقت اس کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے اور اسے مکمل پڑھ کر چھوڑتے۔ انھوں نے اپنے دولت کدے کا ایک بڑا کمرا کتب خانے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ عبدالمجید قریشی کتاب بینی کا شغف رکھتے ہیں آپ لکھتے ہیں کہ ’’ ہر نئی کتاب بشرطِ کہ وہ میرے مزاج اور معیار سے مطابقت رکھتی ہو میرے لئے پیام مسرت اور نویدِ شادمانی لے کر آتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ کتابوں کے سلسلے میں میرے جذبات و احساسات انتہائی نازک ہیں مجھے جوں ہی اپنی کسی دلپسند کتاب کے شائع ہونے کی اطلاع ملتی ہے اس کے حصول کے لیے بیتاب ہو جاتا ہوں‘‘۔

نامور قانون داں خالد اسحاق مرحوم کتابوں کی خریداری پر ۳،۵ ملین روپے سالانہ خرچ کیا کرتے تھے ان کے کتب خانے میں کتابوں کی تعداد لاکھوں میں ہیں۔ مشفق خواجہ بلند پایہ محقق نکتہ رس نقاد اور منفرد مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب کے سچے عاشق تھے ان کا ذاتی کتب خانہ انفرادی ملکیت کے عظیم الشان کتب خانوں میں سے ایک ہے۔کتابوں کا یہ عاشق جس مکان میں رہائش پذیر تھا، اس کی نچلی اور پہلی منزل پر کل ملا کر دس کمرے تھے اور ایک کمرہ دوسری منزل پر بنا ہوا تھا۔اس مکان میں صرف ایک کمرہ رہائش کے لیے تھا، باقی سب میں کتابیں تھیں۔ شہید حکیم محمد سعید نے ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان سے پاکستان

ہجرت کی تو ان کے ہمراہ کئی سو کتابیں بھی تھیں جو ان کی ذاتی لائبریری تھی، کتاب سے محبت اور عقیدت کے باعث اس میں اضافہ ہوتا رہا جس کے نتیجے میں یہ ذاتی ذخیرہ کتب پہلے ہمدرد لائبریری ہوا اور پھر اسی نے بیت الحکمہ کی صورت اختیار کی جس میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔

رشید الدین احمد (ماسٹر رشید)۔ شخصی مطالعہ

بیت الحکمہ، ہمدرد یونیورسٹی کے لائبریرین

یہ آج کی بات نہیں تقریباً ۳۰ برس پہلے کی بات ہے جامعہ کراچی کا شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ کی لائبریری (ڈاکٹر محمود حسین لائبریری) کی پانچویں منزل پر قائم تھا۔ شعبہ کے سابق طلبہ کی انجمن 'کراچی یونیورسٹی لائبریری سائنس المنائی ایسو سی ایشن (کلسا) کے انتخابات منعقد ہو رہے تھے۔ میں اس وقت ایم اے سال دوم کا طالب علم تھا۔ کیوں کہ سال اول (پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ) مکمل کر چکا تھا للذا کلاس کے تمام ساتھی اس انجمن کے رکن کی حیثیت سے ووٹ دینے کے حقدار تھے۔ انتخابات میں دو گروپ مدِ مقابل تھے ان میں سے ایک گروپ کی سربراہی رشید الدین احمد کر رہے تھے جو ماسٹر رشید کے نام سے معروف تھے۔آپ ایسو سی ایشن کے چیرمین کے عہدے کے امیدوار تھے۔انتخابی مہم کے سلسلے میں ماسٹر صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شعبہ میں س تشریف لائے، اپنا تعارف کرایا اور ہم طلبہ کو اپنے حق میں ووٹ دینے لیے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ماسٹر صاحب کی شخصیت متاثر کرنے والی تھی۔ گفتگو بہت ہی دہیمے لہجے میں ٹھہر، ٹھہر کرنا آپ کی عادت تھی۔لیڈرانہ تمکنت قطعاً نہیں تھیں۔۔برٹش کونسل میں ملازم تھے، ظاہری طور پر بھی صاف ستھرا

لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب سے جو تعلق ۱۹۷۲ء میں قائم ہوا وہ پیشہ ورانہ معاملات کے حوالے سے قائم رہا جو تقریباً ۲۷ برس پر محیط ہے۔ اس دوران آپ بارہ برس لیبیا میں بھی رہے۔ اپنے انتقال کے وقت آپ بیت الحکمہ (ہمدرد لائبریری) سے وابستہ تھے۔ ۲۵ جون ۱۹۹۵ء بروز اتوار دوران غسل پاؤں پھسل کر گر جانے کے باعث سر کی چوٹ سے جانبر نہ ہوسکے اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ماسٹر رشید مرحوم ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو ہندوستان کے شہر کانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کانپور میں ہی حاصل کی ۱۹۴۴ء میں اے ایس جوبلی کالج مرزاپور سے میٹرک، پرسٹ پرچ کالج کانپور سے ۱۹۴۶ء میں بی اے اور ۱۹۵۱ء میں آگرہ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ پاکستان ہجرت کے بعد ۱۹۵۵ء میں بی ٹی کیا اور ایک استاد کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۶ء میں دوران ملازمت آپ نے شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ کراچی میں داخلہ لیا۔ آپ کے ساتھیوں میں عبدالقیوم لطفی، مطلوب حسین مرحوم، ممتاز بیگم، واصل محمد صدیق اور علامہ واصل عثمانی خاص طور پر شامل تھے۔ ڈپلومہ میں آپ کی اول پوزیشن تھی، ڈپلومہ کرنے کے بعد لائبریرین شپ کے پیشہ سے وابستہ ہوگئے جس کے باعث ایم اے فائنل نہ کرسکے، امریکن سینٹر مین ملازمت مل گئی۔ چار سال بعد ایم اے لائبریری سائنس میں دوبارہ داخلہ لیا، اس بار

بھی آپ کی اول پوزیشن تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماسٹر رشید ایک ذہین اور محنتی شخص تھے آپ کی قابلیت میں کوئی شک نہ تھا۔ آپ کو بجا طور پر لائبریری شپ کا درخشاں ستارہ کہا جاسکتا ہے۔

ماسٹر رشید نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز چرسٹ کالج لائبریری کانپور سے کیا جہاں پر آپ شام کی شفٹ کے انچارج لائبریرین تھے۔ ساتھ ہی انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے بھی ایک سال خدمات انجام دیں۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول، ملیر کینٹ میں استاد کی حیثیت سے تدریس کا آغاز کیا۔ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ لائبریری کے انچارج بھی تھے۔ یہاں آپ نے ۸ سال (۱۹۵۵ء۔ ۱۹۶۲ء) خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۲ء میں امریکن سینٹر سے منسلک ہوئے جہاں پر ۱۲ سال (۱۹۶۲ء۔۱۹۷۴ء) لائبریری خدمات انجام دیں اور اسسٹنٹ لائبریرین، سپر وائزر اور چیف لائبریرین کی حیثیت سے کراچی، حیدرآباد، پشاور اور کوئٹہ میں کام کرتے رہے۔ کوئٹہ میں ہوتے ہوئے آپ نے بلوچستان پبلک لائبریری کوئٹہ کے کیٹلاگ کی از سر نو تدوین اور ترتیب کے کاموں کی نگرانی کی۔ ۱۹۷۴ء میں آپ کا تقرر سینٹرل لائبریری الفتح یونیورسٹی ٹریپولی، لیبیا میں بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین ہوا اور آپ نے بارہ سال (۱۹۷۴ء۔۱۹۸۶ء) خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۷ء میں آپ واپس وطن آئے اور حکیم محمد سعید کے کتب خانہ ہمدرد لائبریری سے منسلک ہوگئے۔ یہ لائبریری جو ابتداء میں حکیم محمد

سعید کا ذاتی کتب خانہ تھا ہمدرد لائبریری بنی بعد ازاں "بیت الحکمہ" کہلائی۔ رشید الدین احمد کو بیت الحکمہ کا اولین لائبریرین ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آپ اپنے انتقال (جون ۱۹۹۵ء) تک اس کتب خانہ سے وابستہ تھے۔ یہاں آپ کی خدمات ۸ سال ۵ ۲۵ ماہ پر محیط ہیں اس طرح ماسٹر صاحب کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کے شہر کانپور سے ہوا اور ۵۴ سال بعد پاکستان کے شہر کراچی میں اختتام پذیر ہوا۔

ماسٹر صاحب ایک ملنسار ار دوسروں کے کام آنے والے انسان تھے انہیں دوسروں کی مدد کرکے تسکین ہوتی تھی۔ امریکن سینٹر کے کامیاب ترین ریفرینس لائبریرین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ پیشہ ورانہ سرگرمیوں اور فلاح و بہبود کے کاموں میں ذوق و شوق سے حصہ لیا کرتے۔ ۱۹۴۸ء۔ ۱۹۴۹ء میں آپ چرسٹ کالج کانپور کے کالج میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۶ء میں آپ حریت ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ لائبریرین شپ میں آپ کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۶۲ء میں ہوا، اسی سال آپ کو پاکستان لائبریری ریویو کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا بعد ازاں ۱۹۷۰ء میں آپ کو اسی رسالہ کا ایسوسی ایٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا، شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی کے قدیم طلبہ کی انجمن (کلسا) کے آپ دوبارہ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۲ء میں چیرمین منتخب ہوئے۔ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اس کے خازن بھی منتخب

ہوئے۔

رشید صاحب کے علم کی روشنی میں ان کا عملی کام بہت مختصر ہے۔ کیٹلاگ سازی پر انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب Introduction of Cataloguing: theory and practice کے مشترکہ مصنف تھے۔ یہ کتاب لبیا سے شائع ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی کتاب Choice of Turks کا اردو ترجمہ بعنوان "ترکوں کا انتخاب" کیا۔ پیشہ ورانہ موضوعات پر آپ کے ۸ مضامین طبع ہوئے جب کہ ادب کی مختلف اصناف پر آپ کے ۹ مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے لیکن آپ کا زیادہ تر کام دوسروں کے کھاتے میں ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ نے مختلف مصنفین و محققین کی مدد اور معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

خواجہ بدر الحسن اور ماسٹر رشید

ماسٹر رشید نے امریکن سینٹر میں بارہ سال خدمات سرانجام دیں جہاں پر خواجہ بدر الحسن ان کے ساتھی، دوست بعد ازاں آفیسر بھی رہے۔ خواجہ صاحب امریکن سینٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکے ہیں خواجہ صاحب سے ماسٹر صاحب کے حوالہ سے جو تفصیلی گفتگو ہوئی ذیل میں درج ہے خواجہ صاحب کے مطابق" ماسٹر صاحب نے ۱۹۶۲ء میں امریکن سینٹر میں ملازمت کا آغاز کیا تو وہ مکمل طور پر لائبریری میں تو نہ تھے البتہ ثقافتی امور کے ساتھ ساتھ لائبریری کے

امور بھی سرانجام دیا کرتے تھے۔رشید صاحب لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کرکے آئے تھے"۔اس وقت خواجہ صاحب کے پاس کسی بھی قسم کی پیشہ ورانہ سند نہیں تھی۔ خواجہ صاحب کا کہنا ہے کہ ماسٹر صاحب کی شخصیت نے انہیں لائبریری کے امور کی جانب مائل کیا اس کے بعد خواجہ صاحب نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کا سرٹیفیکیٹ کورس کیا اس وقت سید ولایت حسین شاہ مرحوم کورس ڈائریکٹر تھے، خواجہ صاحب نے ڈپلومہ نمایاں حیثیت سے پاس کیا آپ کی پہلی پوزیشن آئی۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ رشید صاحب نے انہیں متعدد لائبریری امور سے آگاہ کیا۔رشید صاحب ریفرنس

لائبریرین تھے جب کہ خواجہ صاحب لائبریری کے انتظامی امور کے نگراں۔ اس وقت دونوں ایک ہی گریڈ میں تھے۔علوی صاحب ڈائریکٹر تھے۔

خواجہ صاحب نے امریکن سینٹر پر حملہ اور آگ لگ جانے کا واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۶۵ء میں لائبریری پر حملہ ہوا اور آگ لگانے کا واقعہ رونما ہوا، اس وقت خواجہ صاحب اور دیگر عملہ ڈیوٹی پر تھا۔جب عمارت کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، تمام لوگ اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے خواجہ صاحب نے بتایا کہ اس وقت ایک کمرہ کے کونے میں ہماری ڈائریکٹر جو انگریز تھی ڈری اور سہی ہوئی اور چھپی کھڑی تھی، انہوں نے حالات کا احساس کرتے ہوئے اپنی ڈائریکٹر کو جو جسامت میں خواجہ صاحب سے کسی بھی طور کم نہ تھی اپنے

کاندھوں پر اٹھایا اور بیرونی دیوار سے باہر کی جانب پھینک دیا اس طرح اس کی جان تو بچ گئی لیکن ٹانگیں وغیرہ شدید زخمی ہوگئیں۔ آپ کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ ڈائریکٹر یقینی طور پر جل جاتی۔ خواجہ صاحب کو اس کارنامہ پر State Department سے نوازا گیا ساتھ ہی آپ امریکن سینٹر کی انتظامیہ کے قریب Award of Heroism آ گئے۔ چنانچہ جب لائبریری کے عملہ کو مختلف شعبہ جات میں تبادلہ کرنے کا مرحلہ آیا تو خواجہ صاحب سے مشورہ کے بعد مختلف احباب کا مختلف جگہ تبادلہ کیا گیا۔ رشید صاحب کو PACC کا لائبریرین مقرر کیا گیا۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ کچھ عرصہ بعد امریکن سینٹر لائبریری کو از سر نو فیروز خان نون کی کوٹھی مین ترتیب دیا گیا تو اس کے کاموں میں انہوں نے رشید صاحب نے اور ارشاد احمد نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ آپ نے بتایا کہ ماسٹر صاحب بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن امریکیوں کی نظر میں ان کی سست روی ایک کمزوری تھی ۔ وہ تمام امور بہت ہی سلیقے سے انجام دیا کرتے لیکن ان میں دھیمے پن کا عنصر شامل تھا۔ شاید یہی سبب بنا کہ علوی صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد ماسٹر صاحب کے بجائے خواجہ صاحب کو لائبریری کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ خواجہ صاحب کے بقول امریکی سست روی کے مقابلہ میں تیز کام کرنے والوں کو ترجیح دیتے ہیں اور شاید یہی وجہ میری ترقی کا باعث

بنی۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ میں اور رشید صاحب کوئی سال سے ساتھی تو تھے ہی میری ترقی کے بعد ہم آفیسر اور ماتحت کے رشتہ میں منسلک ہوگئے لیکن ہمارے درمیان دوستی کے تانے بانے مزید بڑھتے گئے اور ہمارا تعلق جو دفتر کے حوالہ سے تھا گھریلو مراسم میں تبدیل ہوگیا ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگے۔ کیرم کھیلنا ہمارا مشترکہ مشغلہ تھا، ماسٹر صاحب کیرم کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ جوانی میں ہاکی بھی کھیلا کرتے تھے۔ صاف ستھرا لباس زیب تن کیا کرتے، آفس میں ہمیشہ شرٹ یا سوٹ جب کہ گھر میں بڑے پائچے کا پیجامہ اور کرتا ان کا مخصوص لباس تھا۔ پان زیادہ کھایا کرتے، پان کی ڈبیہ اور بٹوا ان کے ہمراہ ہمیشہ ہوتا۔ وہ ایک فرمانبردار بیٹے، ذمہ دار بھائی، خیال کرنے والے شوہر اور ایک فرض شناس باپ تھے۔ آپ کی ابتدائی نجی زندگی مشکلات سے دور چار رہی۔ شادی بھی تاخیر سے کی، چاہتے تھے کہ وہ اپنی بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔ آپ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

بیت الحکمہ اور ماسٹر رشید

لیبیا سے وطن واپس آنے کے بعد آپ فروری ۱۹۸۷ء میں ہمدرد لائبریری (بیت الحکمہ) کے چیف لائبریرین مقرر ہوئے اور اپنے انتقال ۲۵ جون ۱۹۹۵ء تک اسی کتب خانے سے منسلک تھے۔ یہاں آپ کی خدمات ۸ سال ۵ ماہ پر محیط ہیں۔ آپ سے قبل اس عہدہ پر حکیم نعیم الدین زبیری، مولانا عارف الدین، عبیداللہ سیفی، خورشید

عالم، ممتاز الاسلام خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس کتب خانہ میں خدمات سرانجام دینا مشکل اور کٹھن ہے۔ ماسٹر صاحب نے اپنے عمل سے اس تاثر کو غلط ثابت کر دکھایا اور یہ ثابت کیا کہ اگر انسان چاہے تو ہر طرح کے حالات میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

ہمدرد لائبریری یا بیت الحکمہ حکیم محمد سعید کے خوابوں کی تعبیر اور ایک ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک حکیم محمد سعید کو زندہ و جاوید رکھے گا۔ اس کتب خانے کے حوالے حکیم نعیم الدین زبیری کا ذکر بھی لازمی ہے۔ آپ نے تحریری طور پر اپنے خیالات سے نوازا۔ آپ لکھتے ہیں " ۱۹۸۶ء کے اواخر میں ہمدرد فاؤنڈیشن میں لائبریرین کے انتخاب کے لیے انٹرویو ہوئے۔ امیدواروں میں سے ایک صاحب کی سنجیدگی اور متانت نے مجھے بطور خاص متوجہ کیا۔ یہ مرحوم رشید الدین صاحب تھے۔ رشید صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو اپنا حیات نامہ منسلک کیا تھا' اس کی تفاصیل نے میرے احساس کو تقویت پہنچائی پھر گفتگو کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ اعلیٰ تعلیمی قابلیت ' طویل تجربے اور فن میں مہارت کے باوجود انتہائی منکسر المزاج بھی واقع ہوئے ہیں۔ انٹرویو لینے والے دیگر حضرات کی رائے بھی کم و بیش یہی تھی۔ اس بنا پر رشید صاحب کا انتخاب باا تفاق ہوگیا اور جلد ہی ان کا تقرر ہو گیا۔ فروری ۱۹۸۷ء میں رشید صاحب نے ایک باوقار اور تجربہ کار لائبریرین کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جو

حضرات پاکستان سے باہر جا کر کام کرتے ہیں' پاکستان آنے کے بعد ان کی توقعات اندازے ہمیشہ زائد ہوتے ہیں مگر رشید صاحب نے ہماری پیشکش کو' جو بہت زیادہ نہیں تھی خندہ پیشانی سے قبول کر لیا' انہوں نے ابتدائی ملاقات میں جو تاثر چھوڑا تھا اسے اپنے ایام کار کے آخری روز تک برقرار رکھا۔ ہمدرد لائبریری میں جو ناظم آباد سے مدینہ الحکمہ منتقل ہو چکی تھی ان کی بے مثال اور بیلوث کارگزاری کا آخری دن ۳۰ مئی ۱۹۹۵ء تھا۔ دفتری اوقات کار کے دوران میں نے انہیں سب سے زیادہ مصروف پایا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہیں کسی نے مجلس باری میں وقت ضائع کرتے دیکھا ہو۔ امور کتب خانہ میں ان کی تجربہ کاری اور سنجیدہ مصروفیت نے سب کو متاثر کیا۔ امور کتب خانہ سے متعلق لوگ انہیں ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے۔ ان میں جو خصوصیات موجود تھیں وہ سب اکتسابی خصوصیات تھیں اور ان کے رکھ رکھاؤ سے ان کے ایک انتہائی لائق اور محنتی استاد ہونے کی خصوصیت نمایاں تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اپنی خدمات کے آٹھ سال کے دوران کسی سے غصے میں بات کرتے انہیں نہیں دیکھا' ماتحت کارکنوں کے ساتھ ان کا سلوگ ایک معیاری سربراہ کا سلوک رہا۔ رفقائے کار میں کسی کو کبھی ان کا شاکی نہیں پایا۔ فن میں مہارت اور مثالی عملی قابلیت کے حامل افراد میں بردباری اور انکساری کا اس طرح یکجا ہونا میرے خیال مین اگر معدوم نہیں تو نادر ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اعمال کا بہتر صلہ عطا فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور رشید الدین احمد مرحوم کا تصور آنکھوں کے سامنے ہے۔
لمبا قد جس کے باعث کمر قدرے جھکی ہوئی، سنجیدہ اور بردبار چہرہ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، گندمی رنگ، بچے بالوں میں قدرے سفیدی اور سلیقہ سے اوپر کی جانب ستے ہوئے، گرمیاں ہیں تو قمیض پتلون ٹائی، جاڑے ہیں تو صاف ستھرا سوٹ، لہجے میں نرمی، آواز اعتماد اور دھیما پن، گفتگو میں شائستگی] کسی بھی بات پر قہقہہ لگانے کی ضرورت ہوئی تو زیر لب مکراہٹ پر کتفا کرنا، ہر شخص سے جھک کر ملنا، محبت سے پیش آنا آپ کا روز مرہ کا معمول تھا۔جب کبھی میرا ہمدرد لائبریری جانا ہوتا خندہ پیشانی سے ملتے۔ کبھی کوئی ہلکی یا ناروا بات آپ کی زبان سے نہیں سنی۔ کیا خوب شخص تھا، للہ مغفرت کرے آمین۔

(مطبوعہ پاکستان لائبریری بلیٹن۔ جلد ۳۴، شمارہ ۱۔۲، مارچ ۔ جون ۲۰۰۳ء)

محمد گلستان خان۔ ایک شخصیت ایک مطالعہ

پاکستان لائبریرین شپ کے سینئر لائبریرین محمد گلستان خان جنھیں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی اولین کانفرنس منعقدہ ۱۹۵۷ء (اس کانفرنس کی صدارت پاکستان کے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا نے کی) میں شرکت اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا اعزاز حاصل ہے۔ خان صاحب کی پیشہ ورانہ خدمات ۵۵ سالوں (۱۹۵۴ء۔ ۲۰۰۸ء) پر محیط ہیں۔اس طویل عرصہ میں آپ نے پاکستان کے علاوہ بیرون ممالک کے کتب خانوں میں بھی خدمات انجام دیں۔آپ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے علاوہ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ (قیام ۱۹۵۰ء) کے بانی اراکین میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔آپ اپنی عمر کی ۷۳ بہاریں دیکھ چکے ہیں آپ کی لائبریری خدمات کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ لائبریری سائنس میں سرٹیفیکیٹ کورس سے اپنی پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز کیا، ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس سے ایم اے کیا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے یونیسکو کے تعاون سے ہندوستان میں کتابیات کی عملی تربیت کے لیے گئے۔ پاکستان کی قومی کتابیات برائے سال ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء کی تدوین خان صاحب کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔آپ نے اس کی تدوین میں شب و روز محنت کی، مواد کو

جمع کرنے سے اس کی فنی ترتیب تک کے مراحل آپ نے خوبصورتی سے سرانجام دیے۔ لائبریری سائنس کے استاد کی حیثیت سے پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے اسکول آپ لائبریرین شپ
میں کئی سال پڑھایا۔ ذیل میں ان سے ملاقات کی تفصیل ہے جو لائبریری وانفارمیشن سائنس کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

س: آپ نے اپنی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج: میں ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو پنجاب کے شہر چکوال میں پیدا ہوا جہاں کی فضاء عسکریت کی خوشبو لیے ہوئے ہے کیوں کہ اس شہر کی ہر گلی میں کوئی نہ کوئی فوجی رہائش پذیر ہے۔ یہاں کے باسی مارشل ریس کہلاتے ہیں۔ کرنل محمد خان کے بقول یہ قلم سے نہیں اپنے خون سے تاریخ مرتب کرتے ہیں۔۱۹۴۸ء میں معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے قائداعظم کے شہر جو شہر قائد کہلاتا ہے کو اپنا
مسکن بنایا اور پھر اس شہر کا ہو رہا۔

س: وہ کیا محرکات تھے جن کے باعث آپ کو لائبریری سائنس کے پیشہ سے رغبت ہوئی؟

ج: ۱۹۵۴ء کے اوائل میں نے اپنی پہلی سروس کا آغاز "فریئر ہال پبلک لائبریری

کی ملازمت سے کیا یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں تمام شعبے ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ عوام میں جذبہ حب الوطنی کی تازگی تھی۔ لائبریری پروفیشن اختیار کرنے کی اہم وجہ مطالعہ کا شوق، علم و دانش کا حصول اور کتب خانے کا علمی ماحول تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان جس ماحول میں ہوتا ہے اُسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

س: آپ نے لائبریری سائنس کی تعلیم کن اداروں سے حاصل کی اس دور میں کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔

ج: ۱۹۵۵ء میں کراچی لائبریری ایسو سی ایشن سے ابتدائی لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس پاس کیا۔ اس وقت حسن علی اے رحمان صاحب جو ایس ایم لا کالج کے پرنسپل تھے کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کے صدر تھے۔ لائبریری کلاس اسی کالج میں ہوا کرتی تھی۔ محمد شفیع مرحوم، جمیل نقوی مرحوم، سید ولایت حسین شاہ مرحوم، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے لائبریرین نور محمد مرحوم اساتذہ میں شامل تھے۔

کچھ عرصہ بعد کراچی میں امریکن سینٹر کے تعاون سے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے تحت لائبریری اسکول کا آغاز ہوا اور لائبریری و کتابیات میں اسپیشل ڈپلومہ کورس ترتیب دیا گیا۔ پاکستان کے چارٹرڈ لائبریرین اس کورس

کے نگراں تھے۔اس وجہ سے پاکستان کے بے شمار ورکنگ لائبریریز نے اس کورس میں داخلہ لیا، امتحان کے بعد جو جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوااس میں Miss L. C. Morch چیف لائبریرین ، لائبریری آف کانگریس مہمان خصوصی تھیں۔ اس کورس میں میری اول پوزیشن تھی۔ صفحہ اول کی امریکن لائبریرین نے مجھے طلائی تمغے سے نوازہ۔ یہ میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس کے پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ لیا، اس وقت ڈاکٹر عبد المعید شعبہ کے سربراہ تھے۔ اس کورس میں میری فسٹ کلاس پوزیشن تھی۔ ۱۹۶۳ء میں مجھے یونسکو ملایہ تعلیمی اوارڈ یونیسکو ریڈنگ مٹیریل سینٹر ساؤتھ ایشیا کو (award) تعلیمی اوارڈ جانب سے تھا اس دور میں جناب اختر حسین رائے پوری اس ادارے کے سربراہ تھے ان کی کوشش سے مجھے ببلوگرافی کے فن میں مہارت پانے کے لیے ہندوستان بھیجا گیااور میں نے تین ماہ کے پروگرام کے تحت ہندوستان کے قومی کتب خانے سے کتابیات کی عملی تربیت حاصل کی۔ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے شعبہ لائبریری سائنس ، جامعہ کراچی میں داخل ہوتے ہی ایسے استاد ملے جن کی بے لوث خدمات اور انتھک کوشش نے اس شعبہ کو اعلیٰ مقام پر پہنچایا اور میرے جیسے فرد کو صلاحیت نکھارنے کا موقع ملا۔

س: آپ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کن اداروں میں گزاری اپنی پیشہ ورانہ خدمات پر روشنی ڈالیئے ؟

ج: میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی ۱۹۵۴ء میں فریئر ہال پبلک لائبریری سے شروع کی، لائبریری سائنس کا سرٹیفکیٹ کورس کرنے کے بعد میں ۶۸۔۱۹۵۵ء کے دوران میں لیاقت نیشنل لائبریری سے منسلک رہا۔ اس وقت اس لائبریری کے سربراہ سید ولایت حسین شاہ تھے ان کی زیر نگرانی میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، میرے ساتھیوں میں سید ابن حسن قیصر، عبیداللہ سیفی، عبدالحلیم چشتی، سید نیاز احمد اور اشرف علی شامل تھے۔ان احباب کے ساتھ مجھے کئی برس کام کرنے کا شرف حاصل ہوا یہ احباب بعد میں لائبریرین شپ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور اپنی اعلیٰ کارکردگی اور صلاحیت کی بدولت پروفیشن میں نام پیدا کیا۔۱۹۶۸ء۔ ۱۹۷۹ء کے درمیاں میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کا لائبریرین رہا ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب چلا گیا، ریاض میں قائم انسٹی ٹیوٹ آف پرسنل مینجمنٹ میں لائبریرین کی خدمات انجام دیں، اس کے بعد کنگ سعود یونیورسٹی سے وابستہ ہوگیا جہاں پر میں نے بارہ برس خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۸ئ میں ریٹائر ہو کر وطن واپس آیا اور ہمدرد یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سے بطور لائبریرین منسلک ہوا اور آٹھ سال خدمات انجام دیں آج اپنی رہائش گاہ کے نزدیک قائم ایک نجی اسکول کی لائبریری میں خدمات انجام دے رہا ہوں۔ان اداروں کے علاوہ میں پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے اسکول آف لائبریرین شپ سے بھی وابستگی رہی۔ ۱۹۷۲ء میں گروپ کا سیکریٹری بنا اور اسکول کا انتظامی سربراہ بھی، ساتھ ہی ایک استاد کی حیثیت سے لائبریری

سائنس کی عملی تعلیم بھی دیتا رہا۔ سعودی عرب سے واپس آنے کے بعد بھی میں اس اسکول سے منسلک ہوں ، بعض مشکلات کے باعث باقاعدہ کلاس تو نہیں لیتا لیکن کبھی کبھار اپنی یادوں کو تازہ کرنے چلا جاتا ہوں۔

س: آپ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ سے بھی منسلک رہے اور پاکستان کی قومی کتابیات (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء) کی ترتیب وتدوین میں شریک رہے ،کچھ اس کے بارے میں بتائیں کہ قومی نوعیت کا یہ کام کیسے پائے تکمیل کو پہنچا؟

ج: پاکستان میں کتابیات کی تدوین واشاعت کیلئے پہلا کتابیاتی ادارہ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ ۱۹۵۰ء میں عالمی تنظیم یونسکواور حکومت پاکستان کے تعاون سے کراچی میں قائم ہوا۔اس ادارے کے قیام کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ یونسکو نے کتابیات کے موضوع پر ۱۹۵۰ء میں پیرس کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی ۔ جس کے اختتام پر ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں کہ گیا تھا کہ سیمینار میں شریک ممالک اپنے اپنے ملک میں کتابیات کی تدوین اور فروغ کے لئے ایک کتابیاتی ادارہ تشکیل دیں۔ یونسکو اس ادارے کی تشکیل اور مقاصد کے حصول میں معاون ومددگار ہوگا۔پاکستان میں یونسکو کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالمعید اور دیگر ہم پیشہ ساتھیوں جن میں فضل الٰہی سید ولایت حسین شاہ، محمد شفیع، قاضی حبیب الدین احمد، اے آر غنی، جمیل نقوی،فر، حت اللہ بیگ، ابن حسن قیصر، نور محمد خان اور اختر ایچ صدیقی

شامل تھے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی بنیاد رکھی۔یونسکو کے علاوہ حکومت پاکستان نے بھی اس ادارے کے قیام میں معاونت کی۔پہلے کتابیاتی ادارے کے طور پر یہ گروپ ۱۹۵۰ء میں معرض وجود میں آیا۔ ابتدائی دو سالوں میں گروپ کی کارکردگی خط وکتابت کی حد تک محدود رہی۔ ۱۹۵۳ء میں گروپ کو از سر نو منظم کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا ڈاکٹر عبدالمعید نے اس ادارے کو فعال بنانے کے لئے لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والوں سے تجاویز طلب کیں۔ ۱۳اگست ۱۹۵۳ء کو کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ایک میٹنگ سید ولایت حسین شاہ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالمعید، فرحت اللہ بیگ، ڈبلیو اے جعفری، اختر ایچ صدیقی نے شرکت کی۔ شریک اراکین نے گروپ کو از سر نو منظم کرنے کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لیا، ڈاکٹر عبدالمعید نے گروپ کی تشکیل نو کے سلسلے میں پاکستان کے مختلف حصوں سے موصول ہونے والے لائبریرین حضرات کے خطوط پڑھ کر سنائے۔ اس میٹنگ میں گروپ کو فعال بنانے کی حتمی منظوری دی گئی۔ گروپ کی اسی میٹنگ میں ایک دستور ساز کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جو ڈاکٹر عبدالمعید، محمد شفیع، سید ولایت حسین شاہ اسر فرحت اللہ بیگ پر مشتمل تھی۔وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ کمیٹی میں ردو بدل بھی ہوا۔ ۷انومبر ۱۹۵۵ء کو گروپ کی ایک میٹنگ میں ایک اور دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ڈاکٹر عبدالمعید، قاضی حبیب الدین اور ایک غیر ملکی ماہر ایل سی کی (L.C. Key) شامل تھے۔یہ میٹنگ گروپ کے صدر ڈاکٹر امداد حسین کی صدارت میں منعقد ہو

ئی۔ دستور سازی کا عمل طویل عرصہ تک جاری رہا۔ کمیٹی کے تیار کردہ دستور کے مسود
نے آخری (Mr. L. C. Key) ے کو آسٹریلین ماہر لائبریری سائنس ایل سی کی
شکل دی۔ گروپ کے دستور کی منظوری قاضی حبیب الدین کی صدارت میں منعقد ہو
نے والی میٹنگ منعقدہ ۴ جون ۱۹۵۶ء میں دی گئی۔ میٹنگ میں شریک دیگر اراکین میں
ڈاکٹر عبدالمعید، اے آر غنی، مہدی حسن، ابن حسن قیصر، اختر ایچ صدیقی کے علاوہ مسٹر
اورجے (Mr. A. L. Gardner) اے ایل گارڈنر، (Mr. L. C. Key) ایل سی کی
شامل تھے۔ گروپ پاکستان لائبریرین شپ کا واحدادارہ (J. C. Sharp) سی شارپ
ہے جس کے دستور کو پاکستانی ماہرین کے علاوہ بیرون ممالک کے تین ماہر لائبریری
سائنس کی، گارڈنر اور شارپ نے آخری شکل دی۔ گروپ نے مسٹر 'کی' کی خدمات کے
اعتراف میں جو انھوں نے گروپ کے دستور کی تدوین کے لئے فراہم کیں ایک پارٹی کا
ہتمام کیا، اس پارٹی کے انعقاد کا فیصلہ گروپ کی میٹنگ منعقدہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء میں کیا
گیا۔

گروپ کی پہلی مجلس منتظمہ کا انتخاب جامعہ کراچی کی لائبریری میں منعقد ہونے والی
میٹنگ منعقدہ ۱۷ مارچ ۱۹۵۴ء میں ہوا جس کی صدارت سید ولایت حسین شاہ نے کی۔
صدارت کے لئے حکومت پاکستان کے ڈپٹی ایجوکیشن ایڈوائیزر ایم ایس محی الدین پر
اتفاق کیا گیا جب کہ دیگر عہدیداران میں ڈاکٹر عبدالمعید اور محمد شفیع نائب صدر، سید
ولایت حسین شاہ سیکریٹری، جمیل نقوی جوائنٹ

سیکریٹری، فرحت اللہ بیگ خازن اور اراکین میں اے آر غنی، ابن حسن قیصر اختر ایچ صدیقی شامل تھے۔ بعد ازآں ڈاکٹر امداد حسین گروپ کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونسکو کے زیر اہتمام پیرس میں بین الاقوامی کتابیاتی مشاورتی کمیٹی (International Bibliographical Advisory Committee) کے اجلاس میں ڈاکٹر عبدالمعید نے پاکستان کی نمائندگی کی جو اس وقت گروپ کے نائب صدر تھے۔ڈاکٹر صاحب نے پیرس میں گروپ اور یونسکو کے درمیان ہونے والے ''ببلوگرافیکل پروجیکٹ'' کو آخری شکل بھی دی جس کے تحت گروپ نے ملک میں کتابیات کی تدوین و اشاعت میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔یونسکو کے اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالمعید کی بطور نمائندہ کا فیصلہ گروپ کی ایک میٹنگ منعقدہ ۱۷ مئی ۱۹۵۴ء میں کیا گیا ۔اس سے قبل وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے گروپ کے نائب صدرڈاکٹر عبدالمعید کو یونسکو کے لئے پاکستان کا Correspoding Member مقرر کر دیا تھا، معید صاحب کے بعد ولایت صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ گروپ اغراض و مقاصد میں پاکستان میں کتابیاتی ضروریات کی تکمیل،کتابیات کی تالیف وترتیب، حوالہ جاتی مواد کی سے متعلق سائنس نقطہ (Documentation)ترتیب وتالیف،کتابیات و دستاویزات نظر کا فروغ اورپاکستان میں کتابیات کی تدوین اور لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا شامل تھا۔

پاکستان میں کتابیات و حوالہ جاتی ماخذ کی تدوین واشاعت کی ابتدا گروپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں گروپ کے دو حوالہ جاتی ماخذ شائع ہوئے ان میں خواجہ نور الہی ، عبدالمعید اور اختر صدیقی کی مرتب کردہ پاکستان میں شائع ہونے والے حوالہ جاتی ذرائع ، رسائل وجرائد اور اخبارات کی گائیڈ شائع ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں گروپ نے پاکستان کی لائبریریز، سائنسی و تعلیمی اداروں ، میزیم و آرٹ گیلریز پر مشتمل ایک ماخذ شائع کیا جس کا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا جس میں لائبریریز کی سوانح کا اضافہ بھی کیا گیا۔ ایک سال بعد ایک کتابیات کی کتابیات شائع ہوئی۔ ۱۹۶۱ء ہی میں گروپ نے پاکستانی کتب خانوں میں موجود سماجی علوم کے رسائل کا یونین کیٹلاگ شائع کیا جسے فضل الہی اور اختر صدیقی نے مرتب کیا تھا۔ یہ یونین کیٹلاگ یونسکو کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔

قومی (Retrospective) پاکستان میں کاپی رائٹ قانون کی غیر موجودگی میں گزشتہ کتابیات کی تدوین ایک مشکل کام تھا۔ حکومت نے اس دور کی قومی کتابیات کی تدوین کا کام پاکستان ببلو گرفیکل ورکنگ گروپ کو سونپ دیا جسے گروپ نے انتہائی مہارت اور محنت کے ساتھ ایک قومی فریضہ تصور کرتے ہوئے پہلے جناب اے آر غنی اور بعد میں جناب رئیس احمد صمدانی کی نگرانی میں پائے تکمیل کو پہنچایا۔ یونسکو نے قومی کتابیات کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے

کے تحت گروپ کو مالی امدادفراہم کرنے (Reading Materials Project) اپنے کے لئے باقاعدہ ایک معاہدہ کیا جو نومبر ۱۹۹۶۱ء کو گروپ اور یونسکو کے درمیان طے پایا۔یونسکو نے اس سلسلے میں انڈین نیشنل لائبریری ،کلکتہ میں گروپ کے دونمائندوں کو انڈین نیشنل ببلوگرافیکل یونٹ کے ساتھ تین ماہ کی تربیت کے تمام تراخراجات کی بھی پیش کش کی جسے عمل درآمد کی صورت میں گروپ کے نمائندے کی حیثیت سے مجھے کلکتہ بھیجاگیا جہاں پرمیں نے کتابیات کی تدوین کی عملی تربیت حاصل کی۔گروپ نے قومی کتابیات کی تدوین پر کام کاآغاز کیا۔پاکستان کی قومی کتابیات برائے سال ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء کی ترتیب و تنظیم میں میری خدمات شامل رہیں۔مجھے جناب اے آر غنی کی سربراہی میں ملک کی قومی کتابیات کی ترتیب کا موقع ملا،اس کتابیات کے حصہ اول کے مدیران میں میرے علاوہ سید ولایت حسین شاہ، ابن حسن قیصر، عبدالحلیم چشتی، اے اے بسواس، اختر صدیقی شامل تھے۔کتابیات کے دو حصے (جنرل ورک تا اسلام، ۰۰۰ تا ۲۹۷ اور سوشل سائنس تا لسانیات، ۳۰۰ تا ۴۰۰) ۱۹۷۲ء میں نیشنل بک سینٹر نے ۱۹۷۲ء میں شائع کئے۔اس کتابیات کے تیسرے حصے کی اشاعت حکومت پاکستان کے شعبہ کتب خانہ جات کے جانب سے ۱۹۹۹ء میں عمل میں آئی۔جو سائنس تا تاریخ و سوانح، ۳۰۰ تا ۹۰۰) تک موضوعات پر مشتمل ہے۔اس حصے کے مدیر اعلیٰ رئیس احمد صمدانی ہیں مجھے اس حصے کے اداراتی بورڈ میں بھی شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔قومی کتابیات کی یہ جلد حکومت پاکستان کے محکمہ کتب خانہ جات

نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی۔
۱۹۵۹ء میں گروپ نے انڈر گریجویٹ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک لائبریری اسکول قائم کیا۔ پہلا سیشن ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک جاری رہنے والا پروگرام (Diploma in Bibliography and Special Librarianship) کہلاتا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان لائبریری ایسوایشن کی درخواست پر (Higher Certificate in Library Science) کورس کا نام تبدیل کر کے کر دیا گیا جو اب بھی جاری ہے۔ چھ ماہ کا یہ سرٹیفیکیٹ کورس حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم، ڈیپارٹمنٹ آف لائبریریز سے باقاعدہ منظور شدہ ہے جس کا گزٹ نوٹیفیکیشن جاری کیا۱۹۸۶ء میں جاری ہوا۔ انڈر گریجویٹ لائبریری ایجوکیشن کو حکومتی سطح پر تسلیم کیا جانا ایک حوصلہ افزا امر ہے جس کے لئے عبدالحفیظ اختر بجا طور پر قابل ستائش ہیں۔ کورس کے اولین ڈائریکٹر فضل الٰہی مرم تھے۔ان کے بعد سید ولایت حسین شاہ، الحاج محمد زبیر، پروفیسر اختر حنیف اس عہدے پر فائز ہوئے۔اب رئیس احمد صمدانی اسکول کے ڈائریکٹر ہیں۔میں ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۹ء تک اسکول کے انتظامی امور کا نگراں اور گروپ کا سیکریٹری تھا۔
س: آپ کو پیشے میں کن امور سے خصوصی دلچسپی ہے؟

ج: اشاریہ سازی اور کتابیات سازی میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ میں نے کئی کتابیات اور اشاریے مرتب کیے۔ کراچی کے ایک اشاعتی ادارے رائل بک کمپنی کی شائع کردہ بے شمار کتب کے اشاریے میرے ہی مرتب کردہ ہیں۔ کتابیات کی تدوین کا شوق مجھے اپنے ایک استاد اختر ایچ صدیقی کو دیکھ کر پیدا ہوا وہ پاکستان کے صفحہ اول کے کتابیات ساز ہیں انہوں پچاس سے زیادہ کتابیات تن تنہا مرتب کیں۔ پاکستان کی قومی کتابیات (۱۹۴۷ء۔۱۹۶۱ء) کی تفصیل میں آپ کو پہلے ہی تفصیل سے بتا چکا ہوں۔

س: موجودہ دور میں کتاب کلچر ناپید ہوتا جارہا ہے۔ مطالعہ میں رجحان کی کمی کے کیا اسباب ہیں؟

ج: مطالعہ میں رجحان کی کمی کی کئی وجوہات ہیں دو تین دھائیوں میں ہماری طرز زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔ پہلے انسان مغرب تک واپس گھر آجایا کرتا تھا، وقت گزارنے کے ذرائع محدود تھے، کتاب کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ایسا نہ تھا جسے کتاب کا نعمل بدل کہا جاسکے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو بے شمار آپشن مل گئیں جیسے ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ، کیبل کے ذریعہ بے شمار چینل تک رسائی، کمپیوٹر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان چیزوں نے ہمیں کتاب سے دور کر دیا ہے۔ بقول امجد اسلام امجد" معاشرے نے ہماری طرز زندگی بدل دی ہے پہلے تبدیلیاں اخلاقیات اور تربیت کی بنیاد پر آتی تھیں اب

معاشیات کی بنیاد پر آتی ہیں''۔اس کے علاوہ گھر اور تعلیمی اداروں کے ماحول میں تبدیلی آئی ہے۔ مطالعہ کا رجحان کم ہی نہیں بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔کتابوں کی قیمتیں لوگوں کی قوت خرید میں نہیں۔ معاشی مسائل کی وجہ سے انسان مصروف ہوگیا ہے۔ہر شخص کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ افادیت کا خواہشمند ہے۔ کمپیوٹر سے اطلاعات کی رسائی نہ صرف آسان ہے بلکہ فوری ممکن ہے۔انٹرنیٹ کے ذریعہ معلومات تک رسائی کے باعث قاری لائبریری میں نہیں جاتا۔ ہمیں یہ رجحان بدلنے کے لیے کتب خانوں میں کمپیوٹر اور

انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کرنا ہوگی تاکہ لائبریری فروغ مطالعہ کا رجحان پیدا کیا جاسکے۔

(مطبوعہ پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جرنل جلد ۳۹، شمارہ ۳، جون ۲۰۰۸ء)

حکیم محمد سعید کی تصانیف و تالیفات۔ تحقیق کے آئینہ میں

مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور
کتب خانوں کی ترقی میں
شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے ماخوذ)

کتاب ایک مسلمہ حقیقت ہے اسے ہر دور، ہر زمانے میں فضیلت حاصل رہی ہے۔
بقول حکیم محمد سعید ''انسانی تہذیب کے دور میں کتاب کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔
بلاخوف تَردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں ہو سکتا جو کتاب
سے تہی دامن ہو جائے اور فکر کتاب سے آزاد ہو جائے۔ دراصل کتابیں بلند خیالات
اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ کتابیں بحر حیات کی سیپیاں ہیں
جن میں پراسرار موتی بند ہیں۔ اگر ہم ان کی تعریف میں ادبی اور شعری انداز بیان
اختیار کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ کتابیں معلومات کے ثمر دار درختوں کے باغ ہیں،
گزرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل ہیں، حسن و جمال کے آئینے ہیں اور وقت کی
گزری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں لافانی بلبلیں ہیں جو زندگی کے پھولوں پر
سرمدی نغمے گاتی ہیں۔ محی الدین بن عربی کے خیال میں ''کتاب پھلوں کا ایک ایسا باغ
ہے کہ اسے ساتھ

لیے پھرو اور جہاں چاہو اس سے خوشہ چینی کر لو'' ۔کتاب کے بارے میں اپنے انداز فکر کی وضاحت کرتے ہوئے شہید پاکستان حکیم محمد سعید نے تحریر فرمایا کہ ''کتاب کے بارے میں میرا انداز فکر یہ ہے کہ جس گھر میں کتابیں نہ ہوں وہ ایک ایسے جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو، جس درسگاہ میں کتابیں نہ ہوں وہ ایسی درس گاہ کی مانند ہے جس میں طلبہ نہ ہوں۔ جس شہر میں کتب خانے نہ ہوں وہ ایک شہر ویراں ہے اور جس کتب خانے میں لوگوں کو کتابوں سے عشق و محبت نہ ہو وہ کتب خانہ علم کی بس ایک نمائش گاہ ہے، یہ نمائش گاہ لگی بھی رہ سکتی ہے اور یہ نمائش زمانے کے ہاتھوں تباہ بھی ہو سکتی ہے'

کتاب کے بارے حکیم صاحب نے مشہور عالم حافظ کی رائے بیان کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ مطالعہ میں غرق تھا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر اور ایک تودہ اس پر گرا، وہ جاں بحق ہوگیا اور کتابوں ہی کے درمیان وہ ابدی نیند سو گیا۔ حافظ کہتا ہے کہ کتاب کا حصول اس قدر آسان ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ہمیں '' عجائبات کی سیر کراتی ہے۔ اس کے ذریعے سے سلجھے ہوئے ذہن کے مصنفین کے خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ کتاب ہمیں اسلاف اور ان لوگوں کے حالات بڑی آسانی سے مہیا کر دیتی ہے جن تک ہم پہنچ نہیں سکتے۔ کتاب جیسا ساتھ کسی کو مل سکتا ہے کہ جب آپ چاہیں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جائے اور جب آپ پسند کریں تو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی

رہے، بلکہ آپ کی خواہش ہو تو آپ کے جسم و جان کا جزو بن جائے۔ جب تک آپ چاہیں خاموش رہے اور جب آپ کا جی اس سے بولنے کو چاہے تو چہکنے لگے۔ آپ کسی کام میں مصروف ہوں وہ خلل انداز نہیں ہوتی اور آپ تنہائی محسوس کریں تو آپ اسے شفیق ساتھی محسوس کریں۔ کتاب ایک ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا اور نہ کبھی آپ کا ساتھ دینے سے جی چراتا ہے''۔ حکیم محمد سعید کی پوری زندگی، حصول علم، تحصیل علم، اشاعت علم اور محفوظ علم سے عبارت نظر آتی ہے۔ آپ نے اسلام کی اس تلقین کو کہ تحصیل علم ایک مقدس فریضہ اور ہر فرد کا بنیادی حق ہے اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ آپ بلا شبہ قابل مبارک باد ہیں کہ آپ نے بے شمار کتابیں تحریر کرکے 'سرطاق فن اک دیا رکھ دیا ہے'۔ حکیم محمد سعید کا کہنا تھا کہ ''علم و حکمت میری زندگی کا ایک مشن ہے''۔ حکیم محمد سعید کا علمی سرمایہ نصف صدی پر محیط ہے۔ بچپن ہی سے آپ کو مطالعہ کا شوق تھا، لاہور سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ، 'پھول'، بجنور کا 'غنچہ'، دہلی کا 'پیام' آپ کے پسندیدہ رسائل تھے ان کے علاوہ 'معارف' اعظم گڑھ، 'نگار' لکھنو، 'ساقی' دہلی، 'منادی' دہلی اور 'کارواں' لاہور کا باقاعدہ مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حکیم محمد سعید نے اپنے شوق کی خاطر سب سے

پہلی کتاب خریدی، یہ سجاد حیدر یلدرم کی ''استدلال'' تھی اس وقت آپ کی

عمر دس برس تھی۔

حکیم محمد سعید کے مطابق'' شوکت تھانوی کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو انھوں نے پڑھی نہ ہو۔ مُلا رمزوی کی گلابی اردو میں بھی ان کے لیے بہت دلچسپی تھی، خواجہ حسن نظامی کی ہر کتاب پڑھی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی سے دریا گنج دہلی میں تعارف ہوا۔ ان کی تمام کتابیں ان کے مطالعے میں رہی ہیں''، پطرس کے مضامین اور افسانے بھی پڑھے، لیکن افسانوی ادب میں رفتہ رفتہ دل چسپی کم ہوتی گئی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ بھی آپ کے پسندیدہ مصنف تھے۔ روزنامچہ لکھنے کا آغاز خواجہ حسن نظامی کی تقلید میں ۱۹۳۶ء سے ہوا اور تادم آخر یہ سلسلہ قائم رہا، اس وقت آپ کی عمر ۱۶ برس تھی اور آپ طبیہ کالج دہلی میں طبّی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ آپ کے لکھنے کی ابتدا تھی۔ اپنی پہلی تحریر اور تصنیف کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے بتایا تھا کہ میری پہلی تحریر دہلی کے اخبار وطن میں شائع ہوئی شاید عنوان ''زندگی کی آرزوئیں'' تھا۔ پروفیسر آفاق صدیقی کے مطابق ''حکیم محمد سعید کے ادبی سفر کا آغاز ایک کہانی سے ہوا جو ''تسبیح'' کے عنوان سے ۱۹۳۶ء سے اخبار وطن دہلی میں چھپی''۔ جب کہ پہلی تصنیف ''یورپ نامہ'' ۱۹۵۶ء پھر ''جرمنی نامہ'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ آپ کو کتاب سے محبت عقیدت کی حد تک تھی۔ اپنے ایک سفر نامے ''ایک مسافر چار ملک'' میں کتابوں کے حصول کے بارے

میں آپ نے لکھا کہ ’’ میری حالت یہ ہے کہ اگر مجھے اچھی کتابیں کہیں نظر آجائیں تو میں اپنے کپڑے فروخت کرکے خرید لوں‘‘۔

۱۹۳۷ء میں حکیم محمد سعید کو رسالہ ’’ہمدرد صحت‘‘ کا مدیر مقرر کیا گیا جو ان کی صحافتی زندگی کا آغاز تھا ساتھ ہی تحریر و تصنیف کی بنیادیں رکھی گئیں‘ ہمدرد صحت میں مختلف موضوعات پر مختصر مضامین لکھنا رسالہ کی ضرورت تھی، چنانچہ آپ نے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے قلم اٹھایا اور لکھنے کا آغاز کیا، اس کے ساتھ ہی لکھنے کا نہ رکنے والا سلسلہ ایسا شروع ہوا جو زندگی کے اختتام تک جاری رہا۔ اپنی شہادت سے کچھ وقت قبل بیت الحکمہ (لائبریری) کے نام آپ کی آخری تحریر ملتان سے شائع ہونے والے رسالہ ماہنامہ السعید سے متعلق تھی اس نوٹ میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ’’ماہنامہ السعید کے سابقہ نمبروں پر ذرا ایک نگاہ ڈالیے اگر تعلیم پر کوئی مضمون ہو تو مجھے بھجوا دیں‘‘۔

پاکستان میں ہمدرد کی بنیادیں جوں ہی مضبوط ہوئیں آپ تصنیف و تالیف کی جانب متوجہ ہوئے اور سب سے پہلے ’’ہمدرد صحت کراچی‘‘ کا اجرا کیا۔ ہمدرد صحت کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا، لیکن اس کی جلدوں کا تسلسل دہلی سے نکلنے والی ۱۹ جلدوں سے برقرار رکھا گیا۔ چنانچہ اس کی جلد نمبر ۲۰ کا پہلا

شمارہ کراچی سے نکلنے والے ہمدرد صحت کا پہلا شمارہ تھا۔ اس کے بعد حکیم محمد سعید کی ادارت میں متعدد جرائد جاری ہوئے۔ پاکستان میں تصنیف و تالیف کی ابتدا اِسی رسالے سے ہوئی۔ ڈاکٹر فرحت حسین کے مطابق '' شہید حکیم محمد سعید نے جو تصنیفی کارنامے انجام دیے وہ ان کی انسان سے محبت اور فلاح کے شاہد ہیں۔ انھوں نے عام لوگوں کے لیے بھی لکھا اور امت مسلمہ کے لیے بھی، عوام کے لیے بھی لکھا اور صاحبان اقتدار کے لیے بھی، صنعت کاروں کو بھی مخاطب کیا اور محنت مزدوری کرنے والوں کو بھی دولت مندوں کے لیے بھی لکھا اور غریبوں اور محتاجوں کے لیے بھی، صحت مندوں، کے لیے بھی لکھا اور بیماروں کے لیے بھی اور خاص طور پر نونہالوں کے لیے بھی'' ۔
حکیم محمد سعید پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے، لیکن زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا جس پر آپ نے قلم نہ اٹھایا ہو، پیار، محبت، امن، بھائی چارہ، اخوت، سچائی، نیکی، بھلائی الغرض اصلاح انسان، اصلاح معاشرہ، اصلاح ملک، اصلاح قوم، اصلاح مسلمانان عالم، اصلاح عالم آپ کی تحریر، تقریر کا مقصد اور آپ کے عمل کا آئینہ دار تھا۔ شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی تصانیف و تالیفات کے تحقیقی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حیات انسانی کا شاید ہی کوئی موضوع اور کوئی پہلو ایسا باقی رہ گیا ہو جس پر آپ نے نہ لکھا ہو، لیکن آپ کی تحریر، خیالات و نظریات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ مذہب اسلام کے سچے عاشق

تھے۔ انسان سے محبت اور سچائی آپ کا ایمان تھا۔ طب آپ کا پیشہ تھا چنانچہ طبّی و سائنسی موضوعات پر دسترس کا ہونا لازمی امر تھا۔ اپنے خیالات و نظریات کا سچائی، ایمان داری اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ بے باکی سے اظہار کرنا آپ کا معمول تھا۔ حتیٰ کہ صاحبان اختیار و اقتدار پر بھی بلاخوف جائز تنقید کی۔ آپ کی تحریر تمام تصنیفی تکلفات سے بھی آزاد نظر آتی ہے بقول ڈاکٹر فرحت حسین ''حکیم صاحب کے تصنیفی و تخلیقی سرمائے کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انھوں نے اپنی تحریر کو ادبی معیار یا ضابطوں کا قیدی نہیں بنایا۔ اس کے برعکس موقع و محل کے لحاظ، موضوعات کی مناسبت اور مقصد کے ابلاغ و ترسیل کے پیش نظر جو بات جس طرح کہنا زیادہ پر اثر سمجھا، اس کا اسی طرح اظہار کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں اسلوب بیان کا کوئی اہتمام یا تکلف نظر نہیں آتا۔ اس آزاد بیانی کی وجہ سے تصانیف کی روشنی میں حکیم صاحب کے کسی ایک خاص اسلوب نگارش کی نشان دہی نہیں ہو پاتی۔ ان کی ہر تحریر کا اپنا رنگ اپنا انداز اور اپنا تاثر ہے۔ اگر اس کو امتیاز کے نقطہ نظر سے ایک آزاد اسلوب بیان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

اخبارات اور رسائل میں شہید پاکستان کے شائع شدہ مضامین کا شمار یا اشاریہ مرتب کرنا ایک الگ تحقیق ہے اور راقم کے دائرہ کار میں نہیں۔ مطبوعات اور تالیفات کے جائزے سے یہ بات سامنے آئی کہ شہید حکیم محمد سعید کی تحریر کر

وہ تصانیف و تالیفات جن کی تعداد ۲۷۳ ہے ۱۹۵۶ء سے ۲۰۰۲ء تک شائع ہوئیں۔ ان میں ۲۰۹ اردو زبان میں اور ۶۴ انگریزی زبان میں ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے شہید پاکستان کی اردو اور انگریزی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے شہید حکیم محمد سعید کی تصانیف و تالیفات

اسلام، دین و اخلاق، سیرت ﷺ، اسلامی ریاست و قانون۔

☆ اخلاقیات نبوی ﷺ

☆ تذکار محمد ﷺ

☆ تربیت خودی کا ایک لائحہ عمل۔

☆ تصور ریاستِ اسلامی۔

☆ خودی: مذاکرہ ملی۔

☆ خودی تعلیمات نبوی ﷺ

☆ خودی اور مفکرین اسلام۔

☆ دانائے سبل سیرت نبوی ﷺ

(☆ دنیا کے سب سے بڑے انسان ﷺ (اردو

(☆ دَتولونہ لوئے انسان ﷺ (پشتو ترجمہ دنیا کے سب ے بڑے انسان ﷺ

(☆ سب کان وڈو انسان ﷺ (سندھی ترجمہ دنیا کے سب سے بڑے انسان ﷺ

(☆ مہانتم انسان (گجراتی ترجمہ۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان حضرت محمد ﷺ

☆ شاہراہ زندگی۔

☆ عرفانستان۔

☆ عروس الاقرآن ، سورہ رحمٰن۔

☆ فکرستان۔

☆ قرآن پاک مقصد و منہاج۔

☆ نورستان۔

(☆ قرآن روشنی ہے (اس موضوع کے تحت حسب ذیل ۲۴ کتابچے تحریر فرمائے

☆ آدابِ مجلس: قوموں کو بنانے بگاڑنے میں مجلسی زندگی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

☆ اعتدال: ہماری صحت اور ملی و ملکی عافیت کا تقاضہ ہے کہ ہم حدودِ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھیں۔

☆ ایمان روشنی ہے، کفر تاریکی ہے: قرآنِ حکیم کا مقصدِ نزول کفر کی تاریکی کو ایمان کی روشنی سے بدل دینا ہے۔

☆ بے جا تمنائیں: بے جا تمنائیں انسان کو سب سے زیادہ یہ نقصان پہنچاتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے۔

☆ پاکیزگی اور صحت: روح کی پاکیزگی کا اثر جسم کی پاکیزگی اور صحت پر بھی پڑتا ہے۔

☆ تقویٰ: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو متقی ہو۔

☆ تیمارداری : اِسلام نے تیمارداری اور عیادت کے بھی آداب سکھائے ہیں۔

☆ جاں فشانی : درحقیقت زندگی کا لطف جاں فشانی ہی میں ہے۔

: ☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت سربراہِ ملّت

☆ حفظِ صحت : فطرت سے لڑ کر انسان صحت و عافیت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

☆ رسموں کی پابندی : رسموں کو فضول خرچی ، نمائش اور دوسروں پر برتری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

☆ روزہ اور صحت : روزہ روزے دار میں حرص اور مرض سے مقابلے کی قوت پیدا کرتا ہے۔

☆ زندگی صحت سے عبارت ہے : صحت اللہ تعالٰی کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔

☆ صحت اور اِسلام : اِسلام نے اصُولِ صحت کو ایک نظم و ربط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

☆ صحتِ جسم اور طہارتِ فکر : بقائے صحت کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے قلب کو بھی پاک صاف رکھے۔

☆ صحت و تن درستی : جب تک انسان ضوابطِ فطرت کا پابند رہتا ہے اس کی صحت محفوظ رہتی ہے۔

☆ صحت و صفائی : اسلام کو پیروی کے لیے شرطِ اوّل طہارت اور پاکیزگی ہے۔

☆ صحت اور پاکیزگی : تزکیہ و طہارت انبیائے کرام کی بعثت کے مقاصد میں شامل ہے۔

☆ علم و حکمت : علم کو محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے عام ہو کر ہر انسان تک پہنچنا چاہیے۔

☆ فرائض سے کوتاہی : یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ فرائض ادا کیے بغیر حقوق حاصل ہو جائیں۔

☆ فلاحی ریاست کا تصور : ایسی ریاست جس میں ہر انسان مطمئن اور محفوظ ہو اسلامی فلاحی ریاست ہے۔

☆ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ : ملاوٹ ایک ایسا جعل ہے جس کے اثرات غیر محدود ہوتے ہیں۔

☆ میانہ رَوی : غلو سے پرہیز، انتہاپسندی سے گریز اور میانہ روی اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے۔

☆ ہمدَردی اور ایثار: معاشرے کوپُر سکون بنانے کے لیے، ہمیں ایک دوسرے کا ہمدرد ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان میں آپ نے حسب ذیل کتب تحریر فرمائیں۔

☆ Nuristan

☆ The Employer and the Employees

☆ Islamic Concept of State

☆ Essays on Islam (Volumes 4)

☆ Vol. I Felicitation Vol. in Honour of Dr. Hamidullah.

☆ Vol. II Felicitation vol. in Honour of Prof. W. Montgomery Waltt.

☆ Vol. III Felicitation vol. in Honour of Dr. Hakim Abdul Hamid.

☆ Vol. VI Felicitation vol. in Honour of Dr. Abdul Qadeer Khan.

☆ Voice of Morality

☆ Man - The World - Peace

طب، تاریخ طب و صحت

☆ اخلاقیات طبیب ۔

☆ ایڈز (نئی بیماری)۔

☆ تجربات طبیب ۔

☆ تعلیم صحت ۔

☆ حکیم محمد سعید کے۔ طبی مشورے۔

☆ حیات جنسی ۔

☆ دق و سل ۔ اسباب علامات و علاج ۔

☆ ذیابیطس نامہ۔

☆ صحت اور درس گاہ۔

☆ صحت ذہن طب اور سائنس ۔

☆ طب اور سائنس۔

☆ قلب اور صحت ۔

☆ کتاب الابدان (جلدیں ۔ ۲)

☆ ہمدرد مطب۔

☆ یہ معمولی نزلہ نہیں۔

انگریزی زبان میں آپ کی حسب ذیل کتب طبع ہوئیں۔

☆ Al-Biruni's Book on Pharmacy and Meteria Medica (Eng & Arabic.

☆ Cardiovascular Diseases

☆ Diseases of Liver

☆ Ethics for Medics.

☆ Traditional Greco-Arab and Modern Western Medicine:Conflict or Symbiosis.

☆ Pharmacy and Medicine through the Ages.

☆ Medcine in China.

☆ Oral Health.

☆ Ethics of Medics.

☆ Hamdard Pharmacopoeia for Eastern Medicine.

☆ Background of Unani, Arab and Islamic Medicine and Pharmacy.

☆ Medicinal Herbal.

☆ Pakistan Encyclodedia Planta Medica (Volumes-2)

☆ Pharmacy and Medicine through the Ages.

☆ The History of Medicinal and Aromatic Plants.

سائنس و ٹیکنالوجی

☆ سائنس اور معاشرہ۔

☆ سائنس اور قنیات کے ۱۴ سال۔

☆ ہمدرد سائنس انسائیکلوپیڈیا (جلدیں۔ ٦)

انگریزی زبان میں آپ کی حسب ذیل کتاب سات جلدوں میں شائع ہوئیں۔

☆ Essays on Science 7 Volumes 1986- 1995

☆ Vol. I Felicitation volume in Honour of Dr. Salimuzzaman Siddiqui.

☆ Vol. II Felicitation volume in Honour of Dr. S. Mahdihassan.

☆ Vol. III Felicitation volume in Honour of Dr. Joseph Needham. .

☆ Vol. IV Felicitation volume in Honour of Dr. Raziuddin Siddiqui.

☆ Vol. V Felicitation volume in Honour of Dr. S. M. Sham.

☆ Vol. VI Felicitation volume in Honour of Prof. Dr. Attaur Rehman

☆ Vol. VII Felicitation volume in Honour of Dr. M. A. Kaz. .

ادب و ثقافت، سماجیات

☆ ادبی مقالات سعید۔

☆ اسلوب زندگی۔

☆ افکار و اشخاص۔

☆ اقدار حیات۔

☆ اکیسویں صدی کی جانب (جلدیں ۔ ۲)

☆ تاثرات ملا واحدی۔

☆ پاکستان کے پچاس سال ۔

☆ تاثرات ملا واحدی۔

☆ کتابوں کی کتاب ۔

☆ محبت کی باتیں۔

☆ مسائل و افکار۔

☆ مقالات ابن الہیثم۔

☆ مقالات شام ہمدرد (۱۹۶۳ء ۔ ۱۹۶۴ء)

☆ مقالات شام ہمدرد (۱۹۶۵ء ۔ ۶۶ء)

☆ مقالات شام ہمدرد (احترام ۱۹۷۲ء)

☆ مقالات شام ہمدرد (آؤ محبت کریں ۱۹۸۵ء)

تعلیم

☆ تعلیم ۔ مقاصد و مسائل۔

☆ مقدمہ تعلیم ۔

☆ تعلیم و تربیت کے بعد میرا میدان عمل۔

☆ نظریہ و فلسفہ تعلیم (جلدیں ۔ ۲)

(شخصیات (سوانح

☆ مجھے یہ شخصیت کیوں پسند ہے۔

☆ ہمارے عظیم سائنس دان۔

(☆ بھائی جان میرے استاد (بنگلہ

☆ چند مشہور طبیب اور سائنس داں۔

☆ حکیم عبدالمجید: نونہالان وطن کے لیے عظیم انسان کی کہانی۔

انگریزی زبان میں آپ کی حسب ذیل کتب طبع ہوئیں۔

☆ Al-Birun:his time, life and works

☆ Personalities Noble.

خود نوشت

☆ حکیم محمد سعید کے انٹرویوز: حالات حاضرہ پاکستان پر پرخلوص تبصرہ، فکر و نظر کا سامان، صراطِ مستقیم کی دعوت۔

☆ بچوں کے حکیم محمد سعید: شہید پاکستان کی زندگی کی کہانی، خود ان کی زبانی۔

(☆ سچی کہانی: میری ڈائری کی زبانی جنوری تا دسمبر ۱۹۹۲ء (۱۲ حصے

☆ وہ بھی کیا دن تھے۔

تاریخ پاکستان اور قائد اعظم

☆ Road to Pakistan

☆ Letters to Quaid -e- Azam

☆ Main Currents of Contemporary thought in Pakistan.

سفر نامے

☆ ایک مسافر چار ملک۔

☆ درونِ روس: دید و شنید۔

☆ ریگِ رواں۔

☆ جرمنی نامہ۔

☆ سوئزرلینڈ میں چند شب و روز۔

☆ شب و روز مع تاثرات سفر دمشق، حلب وجدہ۔

☆ کوریا کہانی۔

☆ ماوراء البحار۔

☆ ماہ روز روزنامچہ سفر روس۔

☆ ماہِ سعید۔

☆ نقشِ سفر۔

☆ یورپ نامہ۔

نوجوانوں کے لیے

☆ استنبول کا آخری سفر۔

☆ بالیدگی فکر۔

☆ پروازِ فکر: کویت کا سفر۔

☆ تین شہروں کا مسافر۔

☆ جاپان کہانی۔

☆ داستانِ امریکا۔

☆ داستانِ حج۔

☆ داستانِ جرمنی۔

☆ داستانِ لندن۔

☆ فکرِ جواں: امریکہ، کنیڈا اور لندن کا سفر۔

نونہالوں کے لیے

☆ ابنِ رشد۔

☆ ارضِ قرآن: حکیم محمد سعید کے روز و شب۔

☆ بحر اوقیانوس کے پار۔

☆ تین دن بغداد میں۔

☆ درۂ خیبر۔

☆ دہلی میں تین دن۔

☆ دہلی کی سیر۔

☆ ڈھاکا میں سعید سیاح کے چار دن۔

☆ ڈیلفی سے سونے کی کان تک۔

☆سعید سیاح اردن میں۔

☆سعید سیاح اسکندریہ میں ۔

☆سعید سیاح امریکا میں۔

☆سعید سیاح پھر عمان میں ۔

☆سعید سیاح پھر لندن میں ۔

☆سعید سیاح ترکی میں۔

☆سعید سیاح تیونس میں ۔

☆سعید سیاح تہران میں۔

☆سعید سیاح ٹورنٹو میں ۔

☆سعید سیاح جرمنی میں۔

☆سعید سیاح جاپان میں ۔

☆سعید سیاح چین میں ۔

☆سعید سیاح ڈھاکہ میں۔

☆سعید سیاح سری لنکا میں۔

☆سعید سیاح سلطنت عمان میں ۔

☆سعید سیاح شیراز میں۔

☆سعید سیاح عمان میں۔

☆سعید سیاہ فن لینڈ میں۔

☆سعید سیاح قاہرہ میں۔
☆سعید سیاح قطر میں ۔
☆سعید سیاح کویت میں ۔
☆سعید سیاح نیویارک اور واشنگٹن میں۔
☆لندن اور کیمبرج ۔
☆یہ ترکی ہے۔
☆یہ جاپان ہے۔
نونہال ادب
☆آوازِ اخلاق۔
☆آؤ صحت کی فکر کریں ۔
☆اعضاء بولتے ہیں ۔
☆اقوالِ زرین۔
☆امن۔
☆انسانی جسم کے عجائبات۔
☆ایک واقعہ جو مجھے پسند ہے۔
☆پھول اور کانٹے۔
☆تلاش امن۔
☆جاگو جگاؤ۔

☆ حلال اور حرام اسلام میں۔

☆ خوب سیرت (اول ودوم)

☆ خوشبوئیں محبت اور امن۔

☆ سال گرہ: تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے آئینے میں

☆ سب کے پیارے۔

☆ سچ بولو۔

☆ سپہ سالار جمہوریہ پاکستان مدینتہ الحکمہ میں۔

☆ سنہرے اصول۔

☆ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان مدینتہ الحکمہ میں۔

☆ صراطِ مستقیم، عروس القرآن سورہ رحمٰن۔

☆ صحت نامہ: میرے نونہالوں کے لیے۔

☆ صحت کا قاعدہ۔

☆ قاعدہ صحت۔

☆ قرینہ حیات۔

☆ کتاب دوستاں۔

☆ کہکشاں۔

☆ گولڈن جوبلی پاکستان۔

☆ لمحہ لمحہ سوچ کر قدم قدم تول کر۔

☆ لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب۔
☆ مدینتہ الحکمہ میں بے نظیر کی آمد۔
☆ مضبوط نونہال مضبوط پاکستان۔
☆ نقوش سیرت (اردو) پانچ حصے۔
☆ نقوش سیرت (سندھی) پانچ حصے۔
☆ نماز پڑھیے۔
☆ نور کے پھول۔
☆ نونہال دینیات (اول تا ہفتم)
☆ نونہالوں کے خطوط عالمی شخصیات کے نام۔
☆ نونہال کی توقعات ہمدرد پبلک۔
☆ ہمدرد پبلک اسکول میں کھیلوں کا یادگار دن۔
انگریزی زبان میں آپ کی حسب ذیل کتب طبع ہوئیں۔

☆ Love and Peace

☆ Dostan (Parts- 4)

☆ The Best of Goodness.

☆ Peace Primer.

☆ The Greatest Man.

☆ A World with Polio.

☆ Naqoosh-e-Serat. (Parts:5)

☆ Let us Talk Health.

☆ A Primer of Health for Children of the World.

رودادیں

☆ Al-Biruni Commemorative Volume, 1979

☆ Elements in Health and Disease; Proceedings of the First International Conference on Elements in Health and Disease, 1987.

☆ Elements in Health and Disease: Proceedings of the Second International Conferecne, 1989.

☆ Health of the Nation Conference Proceedings, 1971.

☆ Ibn-al-Haitham: Proceedings of the 1000th Anniversary, 1969.

☆ Proceedings of the Intenational Congress of the History and Philosophy of Science, 1980.

☆ New Research in Biology and Genetics: Problems of Science and Ethics: Proceedings of the International Symposium, Islamabad, 1979.

☆ Elements and Liver Diseases

☆ Collection of Essays (1973-1979), Voluke I, 1999.

☆ Collection of Essays (1975-1976), Volume II, 2000.

☆ Collection of Essays (1980-1987), Volume III, 2000.

☆ Collection of Essays (1990-1995), Volume IV, 2002.

مطبوعات کی سالانہ اشاعت کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی سالوں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء کے درمیان کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، ۱۹۵۶ء کتب کی اشاعت کا آغاز تھا جس میں ایک کتاب شائع ہوئی، ۱۹۵۷ء میں دو کتابیں منظر عام پر آئیں اس کے بعد ۱۰ سال (۱۹۵۸ء۔۱۹۶۸ء) کا ایسا وقفہ آیا کہ جس میں کوئی بھی کتاب شائع نہیں ہوئی غالباً اس دوران آپ نے ہمدرد کے کاروبار کو فروغ دینے پر خصوصی توجہ دی۔۱۹۶۹ء میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا جو آپ کی شہادت (۱۹۹۸ء) تک مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۹۲ء میں آپ کی سب سے زیادہ کتب طبع ہوئیں جن کی تعداد ۲۹ ہے۔ اس سال آپ نے بچوں کے لیے اپنی زندگی کی کہانی بھی تحریر کی جو بارہ حصوں پر مشتمل ہے۔ ایسی کتب جن پر سال اشاعت درج نہیں کی تعداد ۲۷ ہے۔

رسائل و جرائد

حکیم محمد سعید کی ادارت میں جاری ہونے والے رسائل و جرائد حسب ذیل ہیں:

۱۔ ماہنامہ ہمدرد صحت کراچی سے اجراء جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوا لیکن تسلسل ہندوستان سے جاری کی گئی جلدوں سے

ہی برقرار رکھتے ہوئے اس کی جلد نمبر ۲۰ کا اولین شمارہ جنوری ۱۹۵۱ء کو جاری ہوا۔

۲۔ ہمدرد نونہال اجرا ۱۹۵۳ء

۳۔ پیامی یونیسکو کے جریدے کوریئر (Courier) کا اردو ایڈیشن ۱۹۷۷۔ ۱۹۹۰ء

۴۔ اخبار الطب اجرا یکم نمبر ۱۹۵۵ء

۵۔ جریدہ جون ۱۹۸۳ء

۶۔ خبرنامہ ہمدرد ۱۹۶۰ء

۷۔ سہ ماہی ہسٹاریکس جنرل آف پاکستان ہسٹاریل سوسائٹی

۸۔ ہمدرد ڈائجسٹ اردو ۱۹۶۵ء ۔ ۱۹۷۲ء

۹۔ سہ ماہی ہمدرد اسلامیکس (Hamdard Islamicus) انگریزی ، اپریل ۱۹۷۸ء

۱۰۔ سہ ماہی ہمدرد میڈیکس (Hamdard Medicus) انگریزی، اپریل ۱۹۵۷ء

۱۱۔ سہ ماہی میڈیکل ٹائمز (Medical Times) انگریزی ستمبر ۱۹۵۹ء

۱۲۔ Endeavour ۱۹۸۷ء

۱۳۔ Spem ۱۹۹۵ء

شہید حکیم محمد سعید پر تحریر کی جانے والی کتب، رسائل کے خاص نمبر اور تحقیقی مقالات

کتب

حکیم محمد سعید کی شہادت کے بعد آپ کی شخصیت، کردار اور خدمات کے حوالے سے لکھنے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ مضامین لکھے گئے، کتابیں مرتب ہوئیں، اخبارات اور رسائل نے آپ پر خصوصی مضامین شائع کیے بعض رسائل نے خصوصی نمبر بھی شائع کیے۔ تعلیمی اداروں خصوصاً کالجوں اور جامعات میں بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کا آغاز ہوا، کئی تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں اور کچھ پر تحقیقی کام جاری ہے۔

حیات سعید'' کے عنوان سے ستار طاہر کی مرتب کردہ کتاب شہید پاکستان حکیم محمد'' سعید کی واحد سوانح حیات ہے جو آپ کی زندگی میں ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی اس کا دوسرا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کا نام حکیم محمد سعید کے حوالے سے معروف اور معتبر ہے۔ آپ شہید پاکستان کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ہیں۔ حکیم صاحب کی کتابوں کی تدوین و اشاعت، ہمدرد سے شائع ہونے والے مختلف رسائل کی ادارت و اشاعت کا اہتمام برکاتی صاحب ہی کے فرائض میں شامل رہا ہے۔ آپ نے حکیم صاحب کی شہادت کے بعد متعدد کتابیں مرتب کیں اور مضامین تحریر کیے۔ ان میں انکل حکیم محمد سعید، سعید پارے، وہ بھی کیا دن تھے، کے علاوہ میڈم ڈی سلوا کے اشتراک

سے انگریزی میں حکیم محمد سعید کی پروفائل شامل ہے۔

کتاب سعید ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے مرتب کی جس میں ۸۰ مضامین اردو میں اور چار مضامین انگریزی میں ہیں۔ ۶۲۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب شہید پاکستان کی زندگی اور کارناموں پر سیر حاصل مواد فراہم کرتی ہے۔ لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر اسلم فرخی، بشریٰ رحمان، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، امجد اسلام امجد، امراؤ طارق، ستار طاہر، پروفیسر اشرف بخاری، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جنرل فضل مقیم، ڈاکٹر محمد عذیر، بریگیڈیئر ظفر اقبال، صہبا لکھنوی مرحوم، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، پروفیسر نظیر صدیقی، ریئر ایڈمرل اسحاق ارشد، حکیم مفتی صادق انیس، ائر کموڈور انعام الحق مرحوم، ڈاکٹر سعیدہ بھٹی، شایان علی قدوائی، زاہدہ حنا، میر حسین علی امام، پروفیسر محمد ارشد بھٹی، مختار زمن، ڈاکٹر ایم اے صوفی، پروفیسر اقبال پراچہ، ثریا شہاب، عبدالقادر حسن، مجیب الرحمان شامی، قطب الدین عزیز، علی حسن، تاج سعید، نور الحسن جعفری، نصیر ترابی، افضل ریکوٹی، محترمہ اختر بیگانہ، ڈاکٹر انیس خورشید، ڈاکٹر نسیم صدیقی، ڈاکٹر صلاح الدین، محمد اسلم کمال، حکیم نثار احمد علوی، پروفیسر کرار حسین مرحوم، محمود الرحمٰن، انتظار حسین، ڈاکٹر سحر انصاری، ڈاکٹر ظفر علی راجہ، عزیز ملک، ڈاکٹر سرور اکبر آبادی، ، حکیم عبدالوہاب ظہوری، اشفاق احمد، ساجد انور شاہد، گلزار جاوید، ذالفقار بھٹی

فیاض اعوان، عبداللہ فاروقی، دلاور فگار مرحوم، علی حسن، اقبال ریاض، ڈاکٹر برکت اعوان، انگریزی میں مضامین لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالمتین، زہرہ اشرف، مہدی مسعود اور ڈاکٹر عطاالرحمٰن شامل ہیں۔

رفیع الزماں زبیری صاحب جو ہمدرد سے منسلک تھے اور ہمدرد مطبوعات خصوصاً بچوں کی کتابوں کی اشاعت کے ذمہ دار تھے۔ آپ نے اقوال سعید کے علاوہ شہید حکیم محمد سعید کے انٹرویوز پر مشتمل کتاب ' روبرو، "یادیں اور باتیں" ، کے نام سے مرتب کی۔ لکھنے والوں میں محترمہ سعدیہ راشد، ڈاکٹر نوید الظفر، خورشید بیگم، بیگم جمیلہ عبدالرشید، بیگم بشریٰ قمرالاسلام، گنگ خان، بشریٰ رحمٰن، حکیم سید ظل الرحمٰن، پروفیسر نور السلام، مولانا جمال میاں فرنگی محلّی، پروفیسر خورشید احمد، محمد رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ)، مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، وسیم احمد اعظمی (نئی دہلی)، شاہد حسین قاسمی (نئی ہلی) ، احمد ندیم قاسمی، سید ہاشم رضا، حکیم قاسم مجاہد (حیدرآباد دکن)، رفعت مہدی، جسٹس (ر) حاذق الخیری، سید محمد اظہر حسین، کریم بخش خالد، میجر جنرل (ر) خواجہ راحت لطیف، رضوان احمد، پروفیسر انعام الحق کوثر، مسعود احمد برکاتی، پروفیسر، نعیم الدین زبیری، حکیم عبدالحنان، تصویر حسین حمیدی، حکیم محمد عثمان، توفیق احمد، طیبہ انوری بیگم، عبدالرحیم پاشا، عاشق علی خان، رفیع الزماں زبیری شامل ہیں۔ زبیری صاحب نے ایک کتاب انگریزی میں Hakim

کے عنوان سے بھی مرتب کی جس میں شہید پاکستان کی کہانی ، Mohammed Said تصاویر کی زبانی بیان کی گئی ہے۔

پاکستانی ادب کے معمار ، کے نام سے پروفیسر صادق حسین طارق کی کتاب اسلام آباد سے منظر عام پر آئی جو ایک اچھی کوشش ہے۔ ۱۹۹۹ء میں نسرین نثار نے بی ایڈ کی سند کی تکمیل کی غرض سے ایک مقالہ تحریر کیا جو بعد میں کتابی صورت میں بعنوان شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی تعلیمی خدمات ، کراچی سے شائع ہوئی۔ جناب انصار زاہد خاں نے ۱۹۹۹ء میں انگریزی زبان میں (Shaheed Hakim Mohammed Said Remembered) مرتب کی جس میں محترمہ سعدیہ راشد، سید اعجاز حسین، مختار زمن، ایس ایم ظفر، مہدی مسعود، قطب الدین عزیز، چودھری عبدالغفور، رفیع الزماں زبیری اور انصار زاہد کی تحریریں شامل ہیں۔

رسائل وجرائد کے خاص نمبر

نئی دہلی سے شائع ہونے والے طبی رسالے ' الشفاء طبی ڈائجسٹ ، نے اپریل ۱۹۹۹ء میں '' شہید حکیم حافظ محمد سعید نمبر'' شائع کیا۔ اس خاص نمبر میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے احباب نے حکیم محمد سعید شہید کی شخصیت، خدمات اور کارناموں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے جو آپ کی شہادت کے وقت حیات تھے، اپنے تاثرات مختصراً لکھے

ہیں۔

پندرہ روزہ ' ہمدرد دہلی' نے '' شہید حکیم محمد سعید نمبر'' شائع کیا۔ جس کے سرپرست و رہنما حکیم عبدالحمید تھے اور ایڈیٹر جناب حماد احمد ہیں۔ اس میں زیادہ تر تاثراتی مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف اخبارات اور رسائل نے حکیم صاحب کی شہادت پر جو مضامین اور اداریے شائع کیے انھیں بھی اس خصوصی شمارہ میں دوبارہ شائع کر دیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں مولانا اخلاق حسین قاسمی، طاہر صدیقی ایڈووکیٹ، مسعود احمد برکاتی، رضوان احمد (کراچی)، حسن ثانی نظامی، حکیم محمد عثمان، گلزار آفاقی، رضوان احمد (پٹنہ)، غفران احمد، اکبر رحمانی (مدیر، آموزگار)، عبدالرحمٰن مومن، انجینئر سید صفدر رضوی، پروفیسر انور معظم، سید محمد احمد مدنی، مولانا سید کلب صادق، ظفر صمدانی، فرخ سعید خواجہ، جاوید چودھری، مسرت انور قدوائی، سید قمر ہاشمی، ڈاکٹر خاور ہاشمی، احمد ندیم قاسمی، الطاف حسین قریشی، شاہ مصباح الدین شکیل، حکیم فیاض عالم اصلاحی، انتظار حسین، محمد صہیب قریشی، جمیل الدین عالی، محمد علی خالد، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، ڈاکٹر شمس الطیف، دستار علی شاہ، ڈاکٹر اسلم فرخی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف رسالوں کے اداریے جن میں ' عوام' نئی دہلی، ماہنامہ 'البلاغ' ممبئی، ہفت روزہ ' نشیمن 'بنگلور، روزنامہ ' اردو ٹائمز' ممبئی، ماہنامہ ' تہذیب الاخلاق' لاہور، ،ماہنامہ 'ایوان اردو' دہلی

ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، کے علاوہ حکیم صاحب کی اردو کتابوں کی فہرست، انٹرویو، خطاب، حکیم عبدالحمید کے نام آخری خط، مختلف شعرا کا منظوم خراج عقیدت بھی شمارہ کا حصہ ہیں۔

کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ہمدرد صحت نے اکتوبر ۱۹۹۹ء میں خاص نمبر شائع کیا۔ اس میں شہید پاکستان پر ۶ مضامین ہیں، حکیم سعید کے بارے میں تحریر شدہ مضامین کے علاوہ طب کے بعض موضوعات پر بھی مضامین شمارہ کا حصہ ہیں۔ حکیم سعید کی مطبوعات کے حوالے سے ڈاکٹر فرحت کا مضمون اپنے موضوع پر سیر حاصل مواد فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد حفیظ، پروفیسر محسن احسان، حکیم سید منظور علی اور مسعود احمد برکاتی کے مضامین شہید پاکستان کے حوالہ سے اہم اور معلوماتی ہیں۔

مجیب الرحمٰن شامی کی زیر ادارت، قومی ڈائجسٹ، لاہور نے 'شہید پاکستان نمبر' شائع کیا۔ شہید پاکستان پر شائع ہونے والے رسائل کے خاص نمبروں میں قومی ڈائجسٹ کا یہ خاص شمارہ حکیم سعید کی شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے زیادہ معلوماتی ہے۔ اس میں تقریباً ۵۵ دانش وروں اور مصنفین کی نگارشات کے علاوہ حکیم سعید کے انٹرویوز، خطوط اور توصیف سعید کے عنوان سے تحاریر شامل ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'وطن دوست' ، نے شہید پاکستان نمبر شائع کیا۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ شہید پاکستان سے خاص عقیدت اور انسیت رکھتی ہیں۔ حکیم صاحب پر تحریر کردہ آپ کا مضمون '' کرسٹل کا گلدان''، بہت معلوماتی اور حکیم صاحب کی شخصیت پر سیر حاصل مواد فراہم کرتا ہے۔ وطن دوست کے اس خاص نمبر میں دیگر لکھنے والوں میں ایس ایم ظفر، معین باری، ڈاکٹر محمد رشید، احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، محمد بدر منیر، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، بریگیڈئر (ر) ظفر اقبال، ممتاز جاوید منہاس، خواجہ عابد نظامی، احمد عقیل روبی، عبداللہ دانش شامل ہیں۔

ماہنامہ ' عبادت ' اسلام آباد کی اشاعت خاص میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تعزیت نامہ، جون ایلیا کا ماتم مسیحائی، مرزا اسلم بیگ کا سانحہ قتل سعید ملت پر خصوصی تجزیے کے علاوہ حکیم محمد عثمان، احمد ندیم قاسمی، مسرت لغاری، محمد خان شنواری، محمد وسیم انجم کے مضامین شامل ہیں۔ ماہنامہ ' تحریر و تصویر'، حیدرآباد کے اس خصوصی شمارہ میں مختلف اخبارات اور رسائل میں شہادت سعید پر جو مضامین اور تعزیتی تحریریں شائع ہوئیں انھیں بھی شامل اشاعت کر دیا گیا ہے۔ 'پاکستان لائبریری بلیٹن' (موجودہ نام پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس جرنل) کے سلور جوبلی نمبر میں اپنے پیغام میں شہید پاکستان نے تحریر فرمایا۔ '' یہ امر قابل تعریف ہے کہ ایک پیشہ ورانہ

رسالہ خصوصاً لائبریری و انفارمیشن

''سائنس پر ربع صدی سے اپنی اشاعت بغیر کسی رکاوٹ کے برقرار رکھے ہوئے ہے

تحقیقی مقالات

مقالات ایک ایسی بنیادی دستاویز ہوتے ہیں جو کسی بھی تعلیمی یا تحقیقی ادارے میں کسی مخصوص موضوع پر حصول سند کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ حکیم محمد سعید کی شہادت کے بعد مختلف تعلیمی اداروں میں شہید پاکستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور خدمات کے حوالے سے تحقیق کا آغاز ہوا۔ پایہ تکمیل کو پہنچنے والے مقالات میں بی ایڈ کی سند کے لیے تین اور ایم فل کی سطح پر ایک مقالہ منظر عام پر آچکا ہے۔ مختلف تعلیمی اداروں بشمول جامعہ کراچی میں شہید پاکستان کی شخصیت کردار اور خدمات پر محققین تحقیق میں مصروف ہیں۔

بی ایڈ کی سند کے حصول کے لیے ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، ہمدرد یونی ورسٹی میں دو اور گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، کراچی میں ایک مقالہ تحریر کیا گیا۔ ہمدرد یونی ورسٹی میں ثمینہ یاسمین نے حکیم محمد سعید کی علمی و تعلیمی خدمات جب کہ مسز اصغر نے حکیم محمد سعید کی تعلیمی ،

اور علمی خدمات پر مقالات تحریر کیے۔ یہ دونوں مقالات سرسری نوعیت کے ہیں۔
گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، کراچی کی طالبہ نسرین نثار نے بی ایڈ کی سند کے لیے ۱۹۹۹ء میں حکیم محمد سعید کی تعلیمی خدمات کا مطالعہ کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، ہمدرد یونی ورسٹی میں ایم فل کی سطح پر محمد جاوید سواتی نے ڈاکٹر اسماعیل سعد کی زیر نگرانی ایک مقالہ نصاب تعلیم کے بارے میں ''حکیم محمد سعید کے افکار'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ مقالہ کا موضوع بہت ہی اہم ہے مقالہ نگار نے اپنی دانست میں موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع کو مستقبل

کا محقق مزید آگے بڑھائے۔

حاصل مطالعہ

حکیم محمد سعید کی تصانیف وتالیفات کے مطالعہ سے حسب ذیل حقائق سامنے آئے۔

☆ آپ کی تحریر سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ آپ ایک مستند اور مستقل لکھنے والے تھے۔

☆ حیات انسانی کا شاید ہی کوئی موضوع اور کوئی پہلو ایسا ہو جس پر آپ نے نہ لکھا ہو۔

☆ آپ کی تحریر، خیالات ونظریات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ مذہب اسلام کے سچے

عاشق، انسان سے محبت کرنے
والے تھے اور سچائی آپ کا ایمان تھا۔
☆آپ کو طبّی و سائنسی موضوعات پر مکمل دسترس حاصل تھی اور ان موضوعات پر
آپ کی گرفت انتہائی مضبوط تھی۔
☆آپ نے اپنے خیالات و نظریات کا سچائی، ایمان داری، حقیقت پسندی اور بے باکی
سے اظہار کیا۔
☆آپ نے اپنی تحریر کو ادبی معیار یا ضابطوں کے تابع نہیں کیا بلکہ موقع و محل،
موضوعات اور مقصد کو ہمیشہ اہمیت دی، جو بات
جس طرح کہنا زیادہ پر اثر سمجھا، اس کا اسی طرح سچائی اور ایمانداری کے ساتھ اظہار کر
دیا۔
☆آپ کا اسلوب بیان آسان، سادہ، تکلفات اور بناوٹ سے پاک ہے اور اس کا اپنا
رنگ، اپنا انداز اور اپنا تاثر ہے۔
☆آپ نے پاکستان کی قومی زبان اردو کو اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کا ذریعہ
بنایا۔آپ کے کل تحریری سرمایہ کا ۷۷ فیصد اردو زبان میں اور ۲۳ فیصد انگریزی میں
ہے۔
☆ طب کے علاوہ سفر نامہ نگاری، بچوں کا ادب، اسلام اور اسلامی موضوعات آپ کے
پسندیدہ موضوع تھے، سفر ناموں کی تعداد ۵۶ ہے جو کل تحریر کا ۲۰٫۵۱ فیصد ہے، بچوں
کے ادب پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۷۰ ہے جو آپ کی کل تحریر کا

۲۵ء۶۴ فیصد ہے۔اسلام اور اسلامی موضوعات پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۵۱ ہے جو آپ کی کل تحریر کا ۱۸ء۶۸ فیصد ہے۔ بچوں کے لیے لکھے گئے سفر نامے جن کی تعداد ہے کو بچوں کے ادب میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ۱۰۴ ہو جاتی ہے جو کل ۳۴ تحریر کا ۳۸ فیصد ہے۔جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے سب سے زیادہ بچوں کے لئے لکھا، بچوں کے ادب کے لکھنے والے ادیبوں میں معیار و تعداد کے اعتبار سے آپ کو ایک منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

☆ بچوں کے لیے سفر نامے لکھنے کے بارے میں شہید پاکستان نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''ایک صنف ادب میں اضافہ نونہالوں کے لئے بہ حیثیت سعید سیاح سفر ناموں کا لکھنا ہے۔تاریخ ادب میں، خواہ مشرق کی ہو کہ مغرب کی کسی نے نونہالان وطن کے لیے سفر نامے نہیں لکھے اس میدان میں مجھے اولیت حاصل ہے ہوئی ہے''۔ تحقیق سے آپ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

☆ ۱۹۵۴ء میں حکیم محمد سعید کی تحریر کردہ تصنیف سب سے پہلے منظر عام پر آئی، ۱۹۹۸ء میں آپ نے جام شہادت نوش فرمایا،اس طرح ۴۲ سالوں میں آپ کی ۲۵۲ تصانیف وتالیفات منظر عام پر آئیں جب کہ آپ کی شہادت کے بعد ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۲ء کے درمیان آپ کی ۲۱ تصانیف شائع ہوئیں۔اس طرح کل تصانیف وتالیفات کی تعداد ۲۷۳ ہے یعنی ۶ء۵ فیصد سالانہ۔ان میں آپ کے تحریر کردہ بے شمار مضامین شامل نہیں ، اگر انہیں بھی کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تو یقیناً آپ کی مطبوعات کی تعداد کہیں زیادہ ہو جائے گی۔

☆ حکیم محمد سعید کی شخصیت، کردار اور کارناموں کے حوالے سے ۱۳ تصانیف وتالیفات شائع ہوئیں ان میں ۱۰ اردو زبان میں اور تین انگریزی میں ہیں، لکھنے والوں میں ستار طاہر، مسعود احمد برکاتی، مسز للی ڈیسلوا، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، رفیع الزماں زبیری صادق حسین طارق، نسرین ثار اور انصار زاہد خان شامل ہیں۔

☆ رسائل وجرائد نے شہید حکیم محمد سعید پر خاص نمبر شائع کیے۔ان میں دو ہندوستان سے اور چھ پاکستان سے شائع ہوئے۔

☆ آپ کی شہادت کے بعد کالجوں اور جامعات میں آپ کی زندگی اور خدمات کے حوالے سے تحقیق کا آغاز ہوا، بی ایڈ کالج کراچی میں ایک، ہمدرد یونیورسٹی میں بی ایڈ میں ۲ اور ایک ایم فل کی سطح پر مقالا لکھاگیا۔ جامعہ کراچی، جامعہ ہمدرد میں آپ کی زندگی اور خدمات پر تحقیق کا عمل جاری ہے۔

☆ حکیم محمد سعید نے کبھی لکھنے کا معاوضہ نہیں لیا۔پاکستان کے معروف دانشور اشفاق احمد نے حکیم صاحب کی کتاب ”ایک مسافر چار ملک“ کی تعارفی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ” ماہنامہ ’ہم سفر‘ کے لیے حکیم صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا اور جس کے جواب میں رسالے والوں نے اٹھارہ سو روپے کی خطیر رقم حکیم صاحب کو اعزازیے کے طور پر بھجوائی تھی لیکن حکیم صاحب نے رقم لینے سے انکار کر دیا، جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ”میں علمی خدمت کا معاوضہ نہیں لیا کرتا“۔

☆ حکیم محمد سعید نے اپنی آپ بیتی لکھنے کے لیے ابتدائی کام کر لیا تھا۔ اس کا اظہار آپ نے ایک انٹرویو میں کیا۔ آپ نے کہا کہ ''میں نے آپ بیتی لکھنے کا ارادہ کیا ہے کوئی بارہ سو فائل مرتب بھی کر لیے ہیں کوشاں ہوں کہ چند ماہ مل جائیں تو یہ آپ بیتی تحریر کر دوں''۔ افسوس آپ کو مہلت نہ مل سکی۔ ضرورت ہے کہ ان فائلوں کی روشنی میں جو حکیم صاحب نے اس مقصد کے لیے جمع کر لیے تھے ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی محقق اسے اپنا موضوع بنائے یا ادارہ سعید کے تحت حکیم صاحب کی مستند سوانح تحریر کی جائے۔

☆ حکیم محمد سعید کی تصانیف وتالیفات اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان پر تحقیق کی جائے۔

پروفیسر انیس زیدی۔ایک شخصیت ایک مطالعہ

(گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے سابق طالب علم اور گورنمنٹ نیشنل کالج کے سابق پرنسپل سے ایک مکالمہ۔
اس گفتگو میں جو یکم مارچ ۲۰۰۸ء کو ہوئی کالج کے استاد محمد عاصم بھی شریک گفتگو تھے۔ یہ مکالمہ گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے مجلّہ ''روایت'' کے گولڈن جوبلی نمبر ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا)

تعارف :

گونمنٹ کالج برائے طلبہ ، ناظم آباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس مادر علمی نے بے شمار گوہر یکتا پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان میں اپنے اپنے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔پروفیسر انیس زیدی ان میں سے ایک ہیں۔زمانہ طالب علمی میں انیس احمد تھے اب انیس زیدی کے نام سے معروف ہیں۔ استاد ہونا ان کی پہچان ہے، لیکچرر سے پروفیسر تک کے منازل طے کرتے ہوئے گورنمنٹ نیشنل کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ادبی، سماجی و ثقافتی محفلوں میں شروع ہی سے نمایاں کردار ادا کرتے رہے ، عملی زندگی میں آپ کی ان خوبیوں میں مزید نکھار آگیا،بہترین مقرر ، شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ جس محفل

میں آپ ہوں ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے۔ مزاح ان کی شخصیت کا ایک اہم عنصر ہے، اپنے مزاحیہ فقروں، دلچسپ باتوں سے محفل کو بور نہیں ہونے دیتے۔ دوران گفتگو موضوع کی مناسبت سے شعر بھی سناتے ہیں۔ مجلسی انسان ہیں۔ کراچی کی ادبی ثقافتی، سماجی محفلوں میں کبھی کمپیئر، کبھی منتظم، کبھی مقرر اور کبھی عام سامع کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر انیس زیدی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک گونمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد کے طالب علم تھے۔ آپ نے اس کالج سے انٹر اور بی اے کیا۔ انیس زیدی صاحب نے جب اس کالج میں ایک طالب علم کی حیثیت سے قدم رکھا تو کالج کی عمر صرف چار برس تھی۔ انیس زیدی صاحب اپنے زمانہ طالب علمی کو اس دور کو کالج کا ''گولڈن پیریڈ'' کہتے ہیں۔ ہم نے پروفیسر انیس زیدی صاحب سے یہ گفتگو بطور خاص ان کے زمانہ طالب علمی کے حوالے سے کی۔ آپ کی گفتگو سے اس دور کی شخصیات جن میں کالج پرنسپل، اساتذہ اور طالب علموں کے بارے میں اہم اور دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔

انٹرویو کے دوران پرفیسر انیس زیدی بھی اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہوتے دکھائی دیے، کسی کسی وقت جذبات میں بھی آئے، آپ کا حافظہ ماشاء اللہ غضب کا ہے، کالج کے اساتذہ کے بارے میں، اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے بارے میں

چار سال کے دوران رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں انہوں نے تفصیلی گفتگو کی، اپنا نقطہ نظر خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انگریز فلاسفر، شاعروں کے اقوال اور خوبصورت اشعار بھی سناتے رہے۔ آج کی گفتگو میں پروفیسر انیس زیدی ایک مختلف شخصیت نظر آئے جن کی گفتگو میں مزاح بہت کم اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ آج وہ اپنے آپ کو ۴۸ سال پہلے والا انیس احمد محسوس کررہے ہوں گے جس نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں اس کالج میں قدم رکھا ہوگا۔ کالج کا زمانہ کسی بھی طالب علم کے لیے سب سے یادگار زمانہ ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو بڑا محسوس کرتا ہے۔ یعنی وہ اسکول کے ماحول کو خیر باد کہہ کر ایک نئی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ ہم نے اس گفتگو میں کالج کی پچاس سالہ تاریخ کے ابتدائی خدوخال کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔

سوال : اپنی پیدائش، ابتدائی تعلیم اور بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

جواب : میں ۱۵ فروری ۱۹۴۵ء کو کانپور (ہندوستان) میں پیدا ہوا، آبائی وطن فتح پور ہسوہ ہے۔ ابتدائی تعلیم والدہ سے حاصل کی، میری تربیت و تعلیم میں میری والدہ کا بنیادی کردار ہے۔ انہوں نے میری نہ صرف عملی تربیت کی بلکہ 'چکر ورتی' جیسی کتب بھی میں نے اسی دور میں پڑھ لی۔ رسالہ 'آستانہ' مستقل میرے مطالعہ میں رہتا تھا، اخبار جنگ اور اکابرین کی تحریریں میرے مطالعہ

میں رہتیں، مولانا ابو لکلام آزاد کی نگارشات نظروں سے گزریں، میری طبیعت میں شرارت کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی پس منظر کو جاننے کی جستجو پائی جاتی تھی۔ میں اخبارات میں سیاسی بیانات کو بہت غور سے پڑھا کرتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں چھٹی کلاس میں تھا اور عمر کوئی ۱۱ برس کی رہی ہوگی سوئس کینال کا مسئلہ سامنے آیا، امریکہ اور برطانیہ کے مظالم کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے تو میں نے جوشیلے انداز میں لوگوں کو اس کی مذمت کرنے کی ترغیب دی۔ سیاسی جماعتوں کے جلسوں میں بھی شرکت کی اس زمانے میں برداشت، تحمل اور اختلاف رائے کا احترام دیکھا جو موجودہ زمانے میں ناپید ہے۔ اس زمانے میں کراچی کا جہانگیر پارک اور آرام باغ اجتماعات کا مرکز تھے، زیادہ تر سیاسی جلسے انہی جگہوں پر ہوا کرتے تھے۔ ہم برنس روڈ پر رہا کرتے تھے۔ ایک واقعہ آپ کو سناؤں جس سے مجھے اختلاف رائے کا احترام اور برداشت و رواداری کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ ری پبلکن پارٹی کی حکومت تھی، ڈاکٹر خان صاحب ۱۸۸۲ء۔۱۹۵۸ء)، خان عبدالغفار خان کے بھائی، پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے ۱۹۳۰ء) میں عملی سیاست میں آئے، صوبہ سرحد میں کانگریس کی طرف سے پہلی کانگریسی وزارت انہوں نے قائم کی تھی، قیام پاکستان کے بعد ان کی وزارت برطرف کردی گئی ۱۹۵۵ء میں وہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ نشتر پارک کے ایک جلسے میں جب، تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک لڑکا جو سامنے ہی بیٹھا تھا کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگ کانگریسی ہو، پاکستان دشمن

ہو، وغیرہ وغیرہ۔ رضاکاروں نے اس لڑکے کو پکڑ کے بٹھانا چاہا۔ ڈاکٹر خان نے رضاکاروں کو منع کیا اور اس لڑکے کو اسٹیج پر بلایا اور کہا کہ تمہیں جو کچھ کہنا ہے مائک پر کہو تاکہ سب سن سکیں، اس لڑکے نے اپنی بات کہی، ڈاکٹر خان نے بہت ہی تحمل سے اس لڑکے کی بات سنی اور اپنی تقریر میں اس کا جواب دیا،اس واقع سے جو اہم بات میں بتانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس زمانے میں ہمارے اکابرین میں ، سیاست دانوں میں کس قدر برداشت اور اختلاف رائے کا احترام تھا وہ اب ناپید ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہم بے شمار مسائل کا شکار ہیں۔ میری باتیں طویل ہوگئیں آپ نے سوال کیا تھا کہ تعلیم کہاں سے حاصل کی، قیام پاکستان کے بعد ہم لوگ کراچی آئے اور ''گورنمنٹ بوائز اسکول'' سمرسٹ اسٹریٹ صدر سے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کیا۔

سوال : میٹرک کرنے کے بعد آپ نے گونمنٹ کالج ناظم آباد میں داخلہ لیا۔انٹر اور بی اے اس کالج سے کیا، چار سال آپ نے اس کالج میں
گزارے، اس دور کا حال خاص طور پر پرنسپل، اساتذہ اور اپنے طلبہ ساتھیوں کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

جواب : اس زمانے میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد واحد گورنمنٹ کالج تھا جہاں آرٹس فیکلٹی میں بی اے کرایا جاتا تھا باقی سارے آرٹس کالج پرائیویٹ تھے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کرنے کے بعد اسی سال میں نے اس کالج میں فرسٹ ائر میں

داخلہ لیا۔ سیاسیات، تاریخ اور نفسیات میرے اختیاری مضامین تھے۔ میں جب اس کالج میں آیا تو پروفیسر عبدالباطن کالج کے پرنسپل (۲۰ ستمبر ۱۹۵۹ء۔۶ جون ۱۹۶۱ء) تھے وہ کالج کے اولین پرنسپل ڈاکٹر اطہر رشید (۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء۔۱۹ ستمبر ۱۹۵۹ء) کے بعد، پرنسپل بنے تھے۔ اساتذہ میں پروفیسر احمد سعید صاحب، پروفیسر سید محمد سبطین صاحب، اسلم فرخی صاحب، مسز سومرو صاحبہ، پروفیسر میزان الرحمان صاحب، ڈاکٹر احمد صاحب، انجم اعظمی صاحب، شاہد عشقی صاحب، ڈاکٹر عبدالسلام صاحب، مسیح الدین صدیقی صاحب، احسن صاحب انگریزی کے استاد تھے اور سجاد ساجد صاحب اس وقت لائبریرین تھے۔

میرا زمانہ طالب علمی اس کالج میں چار سالوں پر محیط رہا ہے۔ جیسا میں نے پہلے کہا اس وقت پروفسیر باطن صاحب پرنسپل تھے ان کے بعد پروفیسر محمد عبد الرؤف پرنسپل ہوئے پھر ڈاکٹر صفدر حسین صاحب پرنسپل ہوئے، ڈاکٹر گیلانی کے بعد ڈاکٹر صفدر دوبارہ، پرنسپل ہوئے جہاں تک اس دور کے طلبہ کا تعلق ہے تو آپ کو ایسے ایسے نام نظر آئیں گے جنھوں نے زندگی کے تقریباً تمام ہی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ اپنے اپنے شعبوں کے معروف ترین لوگوں میں سے ہیں۔ ان میں امیر حیدر کاظمی (سیاست داں پی پی پی)، لاکھانو خان بلوچ، علی یاور، علی حیدر، صابر نقوی، محمد فاروقی، سید احمد فاروقی، فرقان احمد فاروقی، سحر انصاری (جو اس وقت انور مقبول انصاری تھے)، نفیس صدیقی (سیاست

داں پی پی پی)، ایم کیو ایم کے شعیب بخاری، شہنشاہ حسین، سینیٹر احمد علی، انور مقصود، شکیل احمد (معروف ٹی وی آرٹسٹ)، قمر مسعود، مسرور احسن (سیاست داں پی پی پی)، حسن فیروز، احمد دارا، منور حسن (جماعت اسلامی)، اور دیگر شامل ہیں۔

اساتذہ طلبہ سے قریبی، دوستانہ، مشفقانہ تعلق رکھا کرتے تھے، دونوں کے مابین خوشگوار ہم آہنگی تھی۔۱۹۶۲ء کی طلبہ تحریک عروج پر تھی۔ طلبہ اپنے استادوں کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے۔ایک واقعہ سنیے کہ ڈاکٹر باطن جب پرنسپل تھے۔ احتجاجی جلسہ کے نتیجے میں کالج کے گیٹ پر پولس آگئی، وہ چند طلبہ کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ باطن صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے آفس سے نکل کے مین گیٹ پر پہنچے اور پولس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ ”مجھے گرفتار کر لو میں اپنے طلبہ کو تمہارے حوالے نہیں کرونگا“۔

زم ادب کے نگراں انجم عظمی صاحب ہوا کرتے تھے۔ مسیح الدین صدیقی صاحب انگریزی ادبی سوسائٹی کے سرپرست تھے۔کالج میں ادبی، ثقافتی، سماجی سرگرمیاں زور و شور کے ساتھ پورے سال جاری رہا کرتی تھیں۔ مشاعرہ، ادبی محفلوں کا انعقاد معمول کی بات تھی، مباحثے، مذاکرے، معلومات عامہ کے پروگراموں میں طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ میں بزم ادب کا سیکریٹری

بھی رہا، انجم عظمی اور اسلم فرخی صاحب جیسے استاد ہماری سرپرستی و رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ہم نے اپنے ان کابرین سے بہت کچھ سیکھا، اس دور میں ہفتہ طلبہ بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا، پورے ہفتہ مختلف مقابلوں کے پروگرام جاری رہتے، ایک مجلّہ "المنورہ" جاری کیا گیا تھا۔ میں ادب کی جانب مائل ہوچکا تھا۔ مجلّہ کی ادارت و اشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ میری ایک نظم جو گورنمنٹ کالج سے متعلق تھی اس مجلّہ میں شائع ہوئی تھی میں وہ نظم آپ کو "گولڈن جوبلی نمبر" کے لیے دونگا۔اس دور میں کراچی کی سطح پر ایک Inter Collegiate Body, (ICB) ہوا کرتی تھی جسے کراچی کالجوں کی یونین کے منتخب عہدیدار منتخب کرتے تھے، ہر کالج کا صدر، سیکریٹری جنرل ووٹر ہوا کرتا تھااور یونین کے منتخب نمائندے ہی اس انتخاب میں حصہ لے سکتے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ نے اس باڈی میں ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۳ء میں مشرقی پاکستان میں طوفان آیا، بہت تباہی و بربادی ہوئی ، پورے ملک سے امداد جمع کی گئی، گورنمنٹ کالج کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کالج کے طلبہ نے امدادی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور امدادی سامان لے کر طلبہ کا ایک وفد گورنمنٹ کالج کے صدرِ یونین کی قیادت میں مشرقی پاکستان گیا۔ ہم طلبہ نے ایک lending library بھی قائم کی تھی جس کے قیام اور ترتیب میں اس وقت کے لائبریرین سجاد ساجد صاحب نے ہماری رہنمائی کی تھی۔کتابوں کی نمائش کے علاوہ آرٹس و کرافٹ کی نمائش کا اہتمام کالج میں کیا جاتا تھا۔اس زمانے میں

طلبہ کی ایک مضبوط انجمن تھی۔ ۱۹۶۰ء میں ایس ایم جعفری اس (NSF) این ایس ایف کے نائب صدر تھے پھر شہنشاہ حسین اس کے بعد امیر حیدر کاظمی منتخب ہوئے۔ لاکھانو خان بلوچ اس وقت وہ واحد طالب علم تھا جو شلوار قمیض میں کالج آیا کرتا تھا، ۱۹۶۴ء میں وہ طلبہ یونین کا صدر منتخب ہوا۔اس زمانے میں اس کالج کا طرّۂ امتیاز کالج کے طلبہ میں ذہنی بیداری پیدا کرنا تھا، بلاامتیاز رنگ و نسل، زبان، علاقہ سب کے ساتھ یکساں تعلق اور برتاؤ روا رکھا جاتا تھا۔ لاکھانو خان بلوچ اس وقت طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔جب پرے کالج میں چند ہی سندھی طالب علم ہوں گے۔ لاکھانو بلوچ نیشنل کے امیدوار تھے۔ (NSF) اسٹوڈینس فیڈریشن

سوال: یہ فرمائیں کہ آپ اپنے دور میں اور موجودہ دور میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں ؟

جواب: بات یہ ہے کہ اس زمانے میں طلبہ کے ہیرو، مشاہیر، مفکر، آرٹسٹ، شاعر، ادیب ہوا کرتے تھے جب کہ آجکل صرف مشتہر رہ گئے ہیں۔ پہلے تصویر حقیقی بنادوں پر چھپتی تھی اب کوشش کرکے چھپوائی جاتی ہے۔ اب آئیڈیل شوبزنس کے لوگ ہیں، تفریح ضرور ہے لیکن معاشرے کی صورت گری نہیں، کم از کم مجھے آج نظر نہیں آتی۔اس وقت سب غریبوں کے دوست، خیر خواہ تھے اب نہیں ہیں،اس دور کے افراد کا ،کتاب سے رشتہ تھا اب طلبہ و نوجوان کتاب سے دور چلے گئے ہیں

ہماری لائبریریاں ویران ہو چکی ہیں، اساتذہ پریشان، اہل الرائے اور درد مند افراد مایوس اور بجھے بجھے ہیں۔اس وقت اساتذہ طلبہ کے لیے امید کی شمع تھے۔اُس وقت کا استاد معاشرے کو بدلنا چاہتا تھا، اب ایسا نہیں ہے۔ تحریر و تقریر' انسان دوستی کی بنیاد پر رہنمائی کی جاتی تھی، تصادم نہیں ہوتے تھے، میرٹ کو اہمیت دی جاتی تھی آج میرٹ نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہم ماہرین تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اچھے انسان نہیں۔

سوال: یہ فرمائیں کہ کیا اب ہم بہتری کی جانب لوٹ سکتے ہیں؟

جواب: انقلاب مفکرین و اساتذہ ہی لے کر آتے ہیں اور طلبہ ہی انقلاب کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔میں مایوس نہیں ہوں مجھے یقین ہے ہم اختلافِ رائے احترام بھی کریں گے اور اعتماد و تعاون کے ذریعہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کریں گے۔

سوال: کالجوں کا سب سے اہم مسئلہ کوچنگ سینٹرز یا ٹیوشن مافیا ہے، طلبہ کالج کے بجائے کوچنگ سینٹر کو ترجیح دیتے ہیں۔اس رجحان کو کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

جواب: میری نظر میں اس کے ذمہ دار والدین ہیں۔ پہلے تعلیم کا مقصد ایک اچھا انسان بننا تھا آج تعلیم کا مقصد ایک ماہر کی تخلیق ہے۔ ہماری توجہ اس

جانب نہیں کہ ہمارا بچہ معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنے، ایک اچھا انسان بنے اس کے برعکس آج ہم یہ سوچتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں کہ ہمارا بچہ کس طرح منافع بخش پیشے کا ماہر بن جائے۔ دوسرا بڑا مسئلہ بچوں کے تحفظ کا ہے، والدین بچوں کے تحفظ کے باعث نہیں چاہتے کہ وہ پہلے کالج جائے، پھر کوچنگ سینٹر جائے، ہمارے کالج Registration Centre بن کر رہ گئے ہیں۔ آج تعلیمی اداروں میں طلبہ کی تنظیمیں سیاسی جماعتوں کی ذیلی تنظیمیں ہیں۔ ایسی صورت میں قوم کیسے بنے گی۔

سوال: یہ فرمائیں کہ تعلیمی اداروں میں مسائل اور اپنے زمانے کی باتیں آپ نے کیں۔ کیا آپ نے بحیثیت پرنسپل اس بات کی کوشش کی کہ اس دور کی باتوں پر عمل درآمد کرایا جائے، یا بہتری کے کیا اقدامات کیے؟

جواب: میں نیں کوشش کی کہ کالج کے تمام انتظامی اور تعلیمی معاملات کو خوش اسلوبی سے چلاؤں۔ طلبہ تنظیموں کے درمیان تصادم میرے زمانے میں نہیں ہوا، میں نے برداشت، تحمل پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، کالج کی دیواروں پر طلبہ تنظیموں کے جھنڈے اور نعرے میرے دور میں نہیں لکھے گئے۔ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی کوئی بات سنی نہیں جاتی، میں جب پرنسپل تھا تو بھی کلاس میں جایا کرتا تھا تاکہ ان کے مسائل از خود معلوم کرسکوں۔ میں نے کوشش کی طلبہ کی ہم نصابی سرگرمیاں کالج میں ہوتی رہیں اور ہوئیں۔

، طلبہ یونینوں پر عائد پابندیوں سے بہت زیادہ نقصان ہوا ہے
انہیں بحال ہونا چاہیے۔
سوال : کوئی ناقابل فراموش واقع بیان کرنا چاہیں ؟
جواب : ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کا شہید کیا جانا
میری زندگی کے ناقابل فراموش واقعات ہیں۔آپ نے یہ شعر
پڑھا۔
کوئی اور تو نہیں ہے پس خنجر آزمائی
ہم ہی قتل ہو رہے ہیں ہم ہی قتل کر رہے ہیں
سوال : نوجوان نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے ؟
جواب : میرا یہ مقام تو نہیں ، نوجوانوں سے یہ کہنا چاہوں گا کہ غیبت بدگمانی سے ہر
قیمت پر بچیں، ہر قسم کا تعصب اور اپنی بات پر نامناسب اصرار انسانی معاشرہ مین نفاق
پیدا کرتا ہے۔ حالات یقینا بہتر ہوں گے کیونکہ نوجوان تو تازہ ہوا کا جھونکا ہوتے ہیں
اوران کی محنت ، اخلاص یقینی طور پر معاشرہ میں خوشگوار تبدیلی لائے گا۔
خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رُت بھی حوصلہ رکھنا

یکم مارچ ۲۰۰۸ء

'ہماری ویب' پر میرے مضامین کی سینچری (۱۰۰)

نومبر ۲۰۱۳ء کی بات ہے مَیں سعودی عرب کے شہر جدہ میں تھا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ (۲۰۰۹ء) کے بعد میں تیسری بار سعودی عرب آیا تھا مختلف کالجوں میں ۳۵ سال خدمات اور جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں تدریسی خدمات (۲۰۱۰ء۔۲۰۱۱ء) انجام دینے کے بعد میں نے ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک وجہ مقدس سرزمین سے بلاوے کی تھی۔ شروع میں میرے دونوں بیٹے (عدیل اور نبیل) سعودی عرب میں تھے اب میرا بڑا بیٹا عدیل جدہ میں ہے اوراللہ کے بلاوے پر مجھے ہر سال ہی یہ سعادت نصیب ہورہی ہے کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کررہا ہوں اور نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کے شہر مدینہ اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری نصیب ہورہی ہے۔ سعادت، نصیب اور بلاوے کی بات ہے۔ سعودی عرب میں میرا معمول ہوتا ہے کہ میں اپنا لیب ٹاپ اپنے ساتھ رکھتا ہوں اور لکھنے اورپڑھنے کا کام کرتا رہتا ہوں۔ الحمد للہ مجھے انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں ٹائپ کرنے کی مہارت حاصل ہے۔ میں قلم و کاغذ کے بغیر کمپیوٹر پر روانی سے اردو و انگریزی لکھ لیتا ہوں۔ نیٹ پر اپنے مضامین آن لائن کرنے کی فکر میں بھی رہتا ہوں۔ نومبر ۲۰۱۳ء میں مَیں اسی تلاش و جستجو میں تھا کہ اماں حوا کے شہر جدہ میں مجھے 'ہماری ویب' (Hamariweb) مل گئی۔ میں نے اس کا بہ خوبی مطالعہ کیا، مضامین آن

لائن کرنے کا طریقہ دیکھا اور اللہ کا نام لے کر اپنا ایک مضمون بھیج دیا۔ دو روز بعد ہی ہماری ویب کی جانب سے ایک ای میل میرے میل بکس میں تھی کہ آپ کا مضمون ہماری ویب' کی ویب سائٹ پر آن لائن کردیا گیا ہے۔یقیناً یہ میرے لیے خوشی کی' بات تھی۔ اس سے قبل بھی میرے کچھ مضامین اور تصانیف آن لائن تھے لیکن کسی بھی اردو ویب سائٹ پر میرے مضامین کا آن لائن ہونا یہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ گویا میں نومبر ۲۰۱۳ء میں ہماری ویب پر متعارف ہوا۔

الحمد اللہ میں گزشتہ چار دیہائیوں سے قلم و قرطاس سے وابستہ ہوں۔ پہلی کتاب ۱۹۷۵ء میں اور پہلا مضمون جنوری ۱۹۷۸ء میں کراچی کے ایک جریدے میں شائع ہوا تھا بعد ازاں مضامین اور تصانیف و تالیفات کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہماری ویب پر آکر رکا ہے۔ اب میں اخبارات اور رسائل میں مضامین شائع ہونے کی فکر سے آزاد ہوچکا ہوں۔ ہماری ویب ہے اور مَیں ہوں۔ اس دوران میرے مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔دو سال سے روزنامہ جنگ کے سنڈے میگزین اور مڈ ویک میگزین میں مضامین شائع ہو رہے ہیں۔انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کو آن لائن کرنے کا میرا خواب ہماری ویب' نے پورا کردیا۔'

کا آغاز آج سے ۷ سال قبل (۱۴اگست ۲۰۰۷ء) کو (Hamariweb)'ہماری ویب' ہوا تھا۔

ویب کے بانی اسرار احمد اور بابر حفیظ صاحب ہیں۔جب کے اس کے پراجیکٹ ڈائریکٹر رضوان شیخ صاحب ہیں۔ یہ احباب انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جملہ رموز کے ماہر نظر آتے ہیں۔کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا ولولہ بدرجہ اتم رکھتے ہے۔ ہماری ویب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ جدین ویب سائٹ ہے جس کے مقاصد میں پاکستانی کلچر کا فروغ، معاشرتی اقدار کی ترویج، قومی زبان اردو کے فروغ وترقی کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں آن لائن پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔ اس ادارے کے بارے میں جاننے کا موقع مجھے اس وقت ملاجب اس نے اپنے کالم نگاروں کے اعزاز میں ایک پر وقار تقریب کا اہتمام کیا اور مجھے بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی۔ان دنوں میرے ہاتھ میں فریکچر تھا اور تین ماہ کا پلاسٹر میرے جسم کا حصہ بنا ہوا تھا۔ میں ١٦ فروری ۲۰۱۴ء کو حیدرآباد سے بہ راستہ سپر ہائی وے کراچی آرہا تھا کہ ایک خطرناک حادثہ کا شکار ہوا۔ اللہ نے کرم کیا میری فیملی کے احباب محفوظ رہے۔ میرے ہاتھ میں فریکچر ہوگیا۔ اللہ کے کرم سے اب وہ بھی بہتر ہو چکا ہے۔ میرے لیے گاڑی ڈرائیو کرنا ممکن نہیں تھا ڈاکٹر کی جانب سے یہ پابندی آج بھی ہے۔ اس موقع کو جب کے مجھے ہماری ویب کے بارے میں جاننے کا موقع مل رہا تھا ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اپنے بھتیجوں ناجد صمدانی اور ذین صمدانی کے تعاون سے تقریب میں شرکت کو ممکن بنایا۔ اس موقع پر ہماری ویب کے بانی

اسرار احمد صاحب اور ان کی ٹیم خاص طور پر جناب مصدق صاحب سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ انہیں دیکھنے اور سننے کا موقع ملا اور اس ادارے کے بارے میں تفصیل سے آگاہی ہوئی۔

ہماری ویب کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ایک مقبول ویب سائٹ کا درجہ حاصل ہے۔اس نے اپنے قیام سے مسلسل معلوماتی، تفریحی، کھیل، تعلیمی اور ادب و ثقافت سے متعلق بے شمار پروگراموں کا انعقاد کیا ہے جو بہت کامیاب اور مقبول ہوئے اور اس کے قارئین نے انہیں بے انتہا پسند بھی کیا ہے۔ ہماری ویب نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی اداروں اور ویب سائٹ کی پارٹنر ہے اور متعدد ایوارڈ بھی حاصل کرچکی ہے۔ اپنے صارفین کی ضروریات اور خدمت میں مسلسل رواں دواں ہے۔ اپنی عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ہماری ویب کی سرپرست کمپنی 'Webiz Media' اس وقت پاکستان کی ۱۰۰ تیزی سے ابھرتی کمپنیوں (Pakistan 100) اور علاقائی ۵۰۰ کمپنیوں (Arabia 500) کی فہرست میں شامل ہوچکی ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں پاکستان کے نوجوان اپنی فیلڈ میں بہت کچھ کر گزرنے کی بھرپور صلاحیت اور جذبہ رکھتے ہیں۔ہماری ویب کے ان اعزازات کی بنیادی وجہ ہماری ویب اور اس کے صارفین کے مابین اعتماد کا تعلق ہے۔ امید ہے مستقبل قریب اس تعلق میں مزید بہتری اور

پختگی آئے گی جس کی وجہ سے ہماری ویب کو نہ صرف اندرون ملک بلکہ عالمی سطح پر بھی پاکستان کی ایک اعلیٰ اور معیاری ویب سائٹ کے طور پر پہچانا جائے گا۔

مَیں سعودی عرب میں رہتے ہوئے اپنے مضامین ' ہماری ویب ' کے لیے بھیجتا رہا، پاکستان آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا اور میرے مضامین ہماری ویب کی زینت بنتے رہے۔ اب جب کہ میں چھ ماہ بعد ۲۰ اگست ۲۰۱۴ء کو حوالے شہر جدہ میں پھر سے آیا تو میرے مضامین کی تعداد سو (100) ہو چکی ہے۔ پیش نظر مضمون کا عنوان میں نے 'ہماری ویب' پر میرے مضامین کی سینچری (۱۰۰)'' رکھا ہے یہ مضامین کی سینچری کا آخری مضمون ہے۔ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ کسی بھی ویب پر سو مضامین ایک ساتھ دیکھے جا سکتے ہوں۔ ایک جانب یہ میرے لیے باعثِ فخر ہے تو دوسرے جانب ہماری ویب کے سربراہ جناب ابرار احمد صاحب اور ان کی ٹیم بھی قابل مبارک باد ہے۔ ہماری ویب پر لکھنے والے مصنف عبدالماجد ملک نے اپنے مضمون ''میں اور کی جانے والی visit ہماری ویب'' میں درست لکھا ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ ہی ہے۔ ''Hamariweb مضامین کی دنیا کی ویب سائٹ ''ہماری ویب

کے دی (URL) ذیل میں ہماری ویب پر موجود ۱۰۰ مضامین کی فہرست بمعہ ان کے

(URL) جارہی ہے۔ میرے ان مضامین کا

URL:

http://www.hamariweb.com/articles/userarticles.aspx?

id=11511 ہے جس پر ان مضامین کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مضامین کی ترتیب وہی ہے
جس ترتیب سے مضامین ہماری ویب میں شامل ہوتے رہے یعنی یہ ترتیب تاریخی ہے۔

۱۔ عبد الوہاب خان سلیم۔ایک کتاب دوست : شخصی خاکہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41376

۲۔ شعری مجموعہ ''لمس''۔ شاعر عابد خورشید

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41159

۳۔ فیض احمد فیضؔ۔ میرا پرنسپل

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41587

۴۔ عبدالستار ایدھی۔ خدمت و عظمت کا نشان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41542

۵۔ فرخندہ لودھی ۔ ایک ادیب ایک کتاب دار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41726

۶۔ دینائے لائبریرین شپ کی ایک عہد ساز شخصیت۔پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41679

۷۔ شفیع عقیل (شمیس عین) بہترین مبصر' لوک داستانوں کے امین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=41763

۸۔ مولودالنبیؐ (پیدائش گاہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41762

۹۔ بجیا: فاطمہ ثریا بجیا پر شائع ہونے والی کتاب ''بجیا'' ۔ تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41852

۱۰۔ حکیم محمد سعید۔ تحقیق کے آئینے میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41803

۱۱۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ اردو ادب کا روشن ستارہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41920

۱۲۔ اردو کے ادب و نقاد سید محمد اصغر کاظمی کی تصانیف و تالیفات کا جائزہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41855

۱۳۔ بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=42004

۱۴۔ اردو کے نامور استاد، ادیب و محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر آخر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41952

۱۵۔ بہادر شاہ ظفر۔ ایک شاعر ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=42215

۱۶۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42061

۱۷۔ پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر۔پاکستان لائبریرین شپ کے معروف استاد و محقق

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42433

۱۸۔ استاذ الشعرا افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42330

۱۹۔ احسان دانش۔شاعر مزدور اور میرے ہم وطن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42531

۲۰۔ شاعر عوام حبیب جالب کی مزاحمتی شاعری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42638

۲۱۔ شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت و شاعری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42815

۲۲۔ مولانا حسرت موہانی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42728

۲۳۔ عبد الصمد انصاری ۔دھیمہ لہجہ تھوڑی سی شوخی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42954

۲۴۔ میری ماں (شخصی خاکہ)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=42897

۲۵۔ اماں حوا کے شہر جدہ کا پاکستان انٹر نیشنل اسکول (انگلش سیکشن) یہاں میرا پوتا محمد صائم زیر تعلیم ہے۔

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=43106

۲۶۔ تابش صمدانی ۔ شخصی خاکہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=43006

۲۷۔ جامعہ سرگودھا میں میرے شب و روز (آپ بیتی)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44193

۲۸۔ برصغیر میں کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ کتب خانہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=43135

۲۹۔ اردو ادب میں دیباچہ نگاری کی روایت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44597

۳۰۔ ادب میں تبصرہ نگاری کی اہمت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44505

۳۱۔ اپنی کہانی اپنی زبانی 'آپ بیتی' (حصہ اول)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44666

۳۲۔ ادب میں خلاصہ نگاری کی روایت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44598

۳۳۔ پروفیسر لطیف اللہ ۔ علم و ہنر کا پیکر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44770

۳۴۔ پروفیسر محمد احمد۔ پیکرِ بے مثال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44724

۳۵۔ محمد عادل عثمانی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44890

۳۶۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام۔ متاعِ دیدۂ تر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44771

۳۷۔ حاجی سر عبد اللہ ہارون مرحوم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45071

۳۸۔ قومی تعلیمی پالیسیاں، ترقیاتی منصوبے اور کتب خانے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=44984

۳۹۔ مولانا محمد عارف الدین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45573

۴۰۔ جمیل نقوی۔ لائبریرین، شاعر، مصنف و مولف

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45496

۴۱۔ ابن حسن قیصر۔ لائبریری تحریک کا خاموش مجاہد

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45799

۴۲۔ میاں الطاف شوکت۔ پنجاب لائبریرین شپ کے بابا جی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45673

۴۳۔ ۲۳ اپریل کتاب و کاپی رائٹ کا عالمی دن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46059

(۴۴۔ میری محبتوں کا محور۔ محمد صائم عدیل (میرا پوتا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=45991

(۴۵۔ بیٹی رحمت بھی، نعمت بھی۔اپنے باپ کی طرف دار اگر بچھڑ جائے تو۔۔۔ (رپوتاژ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46250

۴۶۔ ادب روبہ زوال نہیں ہو سکتا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46178

۴۷۔ خورشید اختر انصاری شہید

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46359

۴۸۔ نعیمہ توفیق کا مجموعہ کلام 'لمحہ فکر' ایک نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46383

(۴۹۔ مَیں نے موت کو قریب سے دیکھا (رپورتاژ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=46492

۵۰۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی کا خاکوں کا مجموعہ 'جھولی میں ہیرے اور موتی' ڈاکٹر خالد ندیم کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46493

۵۱۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی کی تصنیف 'یادوں کی مالا' اکرام الحق کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46599

۵۲۔ جامعہ کراچی میرا زمانہ طالب علمی ۔ گزرے دنوں کی کچھ یادیں (آپ بیتی)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46606

۵۳۔ سعودی عرب شہر جدہ کی 'پانی پر تیرتی مسجد' (سفر نامہ)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46728

۵۴۔ جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین (سفر نامہ)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46894

۵۵۔ سفر نامہ حج۔ مصنف بشیر الدین خورشید ایک جائزہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=46968

۵۶۔ دعا کی اہمت و فضیلت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=47007

۵۷۔ مکہ لائبریری ۔ سعودی عربیہ میں ایک دن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=47072

۵۸۔ 'دال' جھال چکیاں (سرگودھا) دی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=47302

۵۹۔ سلام: ایک مسنون عمل، اسلام کا بنیادی شعار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47442

۶۰۔ محمد ارسل بنیل ۔ جس نے دنیا میں سب سے پہلے میری آواز سنی (میرا پوتا)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47483

۶۱۔ عالمی اردو کانفرنس ۲۰۱۰ء جامعہ سرگودھا۔ میری زندگی کے یادگار لمحات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47629

۶۲۔ محبوب احمد سبزواری۔سب کے محبوب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47747

۶۳۔پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47868

۶۴۔پروفیسر اختر حنیف۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، جامعہ کراچی کے ایک استاد

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47954

۶۵۔ شیخ لئیق احمد۔ایک شخصیت۔۔ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=47987

۶۶۔ رضا علی عابدی اپنی تصنیف ''کتب خانہ'' کی روشنی میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48039

۶۷۔ منظور احمد بٹ۔ایک مخلص سماجی کارکن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48070

(والد محترم انیس احمد مرحوم) (Father's Day)۶۸۔ ۱۵ جون ۲۰۱۴ء

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48195

۶۹۔ مشکور احمد۔ چند یادیں ۔ چند باتیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=4828

۷۰۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق لائبریرین۔الحاج محمد زبیر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48385

۷۱۔آزاد بیکانیری شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48506

۷۲۔ بیکانیر میرے پرکھوں کی سرزمین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48674

سید امام ۔بندر روڈ سے مسان روڈتک ۷۳

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48758

۷۴۔ڈاکٹر رئیس صمدانی کی تصنیف ''شیخ محمد ابراہیم آزادؔ شخصیت وشاعری'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48759

۷۵۔ ہندوستان کا ضلع مظفر نگر(یو پی) ۔ میرا آبائی وطن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48831

۷۶۔ کیٹلاگ سازی کی عالمی شہرت یافتہ استاد و مصنفہ۔ مار گریٹ من

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=48903

۷۷۔ اردو کے خوش فکر ادیب و محقق ۔ڈاکٹر رئیس صمدانی (اردو کے ادیب سید محمد اصغر کاظمی کی تحریر)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49197

۷۸۔ جامعہ شاہ عبدالعزیز لائبریری جدہ میں ایک دن (سفر نامہ)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49322

۷۹۔ میں کیوں لکھتا ہوں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49451

۸۰۔ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز بشمول اولاد اللہ کی امانت ہے (اپنے پوتے محمد راحم کے بارے میں ایک تاثراتی تحریر)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49539

۸۱۔ ہارڈنگ پبلک لائبریری دھلی اور خیر پور پبلک لائبریری کے لائبریرین۔فرحت اللہ بیگ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49653

۸۲۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی کی تصنیف ''یادوں کی مالا'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49749

۸۳۔ سید فیصل علی سبز واری صوبائی وزیر، حکومت سندھ سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49817

۸۴۔ پروفیسر محمد مظہر الحق، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49890

۸۵۔ شاعر و ادیب نیّر سوز سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=49944

۸۶۔ سید اطمینان علی شاہ بخاری۔ شخصی مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50042

۸۷۔ پروفیسر سید کمال الدین سابق ڈائریکٹر کالجز سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50138

۸۸۔ جبلِ ثور کے دامن میں چند ساعتیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50278

۸۹۔ خلیق صدانی۔ شخصیت و شاعری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50410

۹۰۔ جبلِ رحمت پر چند ساعتیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50525

۹۱۔ 'کتب خانے تاریخ کی روشنی میں' اہل علم کی نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50634

۹۲۔ شاہ حسن عطا کی تصنیف ''نقشِ کفِ پا''ایک نظر میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50658

۹۳۔ جامعہ کراچی کا شعبہ لائبریری سائنس۔اچھے دنوں کی باتیں اور یادیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50679

۹۴۔ جبلِ اُحد کے دامن میں چند ساعتیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50732

۹۵۔ مطالعہ :اہمیت و افادیت۔ انسانی ذہن کو جِلا بخشتا ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50842

۹۶۔ رشید الدین احمد (ماسٹر رشید)۔ شخصی مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50847

۹۷۔ محمد گلستان خان ۔ایک شخصیت ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50925

۹۸۔ حکیم محمد سعید کی تصانیف وتالیفات ۔ تحقیق کے آئینہ میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=50993

۹۹۔ پروفیسر انیس زیدی ۔ایک سخصیت ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=51183

(۱۰۰۔ ہماری ویب پر میرے مضامین کی سینچری (۱۰۰

میں نے اوپر بھی لکھا کہ میرے لکھنے کی ابتدا سوانحی مضمون سے ہوئی تھی ۔ یہ مضمون خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی سیرت پر تھا جو کراچی کے ایک جریدے میں شائع ہوا تھا۔ یہ بات ہے ۱۹۷۸ء کی ۔مَیں نے پہلاایم اے لائبریری سائنس میں (۱۹۷۲ء)کیا تھا دوسرا سیاسیات (۱۹۸۵ء) میں اور پی ایچ ڈ ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے کیا ۔اپنے بنیادی موضوع لائبریری سائنس پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور زیادہ تر اسی موضوع پر لکھا۔ مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ۔ کتب کی تعداد ہے ، بعض نصابی کتب کی اشاعت بیسویں ایڈیشن تک پہنچ چکی ہے ۔ یہ نصابی کتب ۳۲ پاکستان کے مختلف تعلیمی بورڈوں اور جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ ادب سے دلچسپی خاندانی ہے۔ ادب کے مختلف موضوعات پر بھی لکھتا رہا۔ شخصیات میرا خاص موضوع رہی ہیں۔ ہماری ویب پر مضامین کی سینچری میں جو مضامین شامل ہیں ان میں زیادہ تر سوانحی مضامین، خاکے، رپوتاژ، آپ بیتی، کتب پر تبصرے، سفر نامہ، ادب و دیگر موضوعات شال ہیں۔ میرے نزدیک لکھنا ایک عبادت ہے بشر طیکہ وہ تحریر برائی اور خرابی پیدا نہ کرتی ہو ۔ نیز زندگی میں انسان نے جو کچھ حاصل کیا اگر اس تجربے سے ہماری آنے والی نسل کچھ حاصل کرلے تو وہ بھی صدقہ جاریہ کے زمرہ میں آتا ہے۔ لکھنے کے حوالے سے میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف یہ رہا ہے کہ میں اپنے زمانے کے ان احباب کی اچھی باتوں کو تحریر میں لے آؤں اور جو کچھ میرے علم میں ہے اسے تحریر کی صورت میں آئندہ آنے والی زندگی کو لوٹا دوں ۔ اس

حوالے سے میں نے کہا۔

رفتگانِ عہد کو یاد رکھنا چاہتا ہوں

ہے یہ ایک فرض سو نبھانا چاہتا ہوں

زندگی کے سفر میں جو ہوا حاصل رئیسؔ

زندگی کو یہ احترام لوٹانا چاہتا ہوں

جن شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ان میں شاعر بھی ہیں ادیب بھی، استاد بھی ہیں شاگرد بھی، نثر نگار بھی ہیں تنقید نگار بھی، کالم نگار بھی ہیں افسانہ نگار بھی،کتاب دار بھی ہیں کتاب دوست بھی ، سماجی شخصیات بھی ہیں سیاست داں بھی،تاریخ ساز بھی ہیں تاریخ داں بھی ،دوست بھی ہیں عزیز رشتہ دار بھی باپ بھی ماں بھی، پوتا صائم اور ارسل بھی، مَیں خود بھی ہوں اور میری وہ بیٹی اور پوتے (سبحان،راحم) بھی جو اب اس دنیا میں نہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے مضامین کی اس سینچری کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

اردو ادب

ادب کے مختلف موضوعات جن پر مضامین لکھے جو ہماری ویب میں شامل ہیں ان میں ’اردو ادب میں دیباچہ نگاری کی روایت‘، ’ادب میں تبصرہ نگاری کی اہمیت‘، ’ادب میں خلاصہ نگاری کی روایت‘، ’ادب روبہ زوال نہیں ہو سکتا‘، ’آزاد

بیکانیری شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں'، 'میں کیوں لکھتا ہوں' شامل ہیں۔

رپوتاژ

رپوتاژ کے تحت 'میں نے موت کو قریب سے دیکھا'، 'جامعہ کراچی میرا زمانہ طالب علمی۔ گزرے دنوں کی کچھ یادیں'، 'جامعہ کراچی کا شعبہ لائبریری سائنس۔ اچھے دنوں کی باتیں اور یادیں'، 'جامعہ سرگودھا میں میرے شب و روز'، 'بیٹی رحمت بھی، نعمت بھی۔ اپنے باپ کی طرف دار اگر بچھڑ جائے تو'۔ 'اللہ کی دی ہوئی ہر چیز بشمول اولاد اللہ کی امانت ہے (محمد راحم)'۔

آپ بیتی

اپنی آپ بیتی 'اپنی کہانی اپنی زبانی' کے عنوان لکھی، اپنی ماں کا خاکہ 'میری ماں' کے عنوان سے اپنے والد پر مضمون 'فادر ڈے' کے عنوان سے لکھا۔ اپنے پوتوں، 'میری محبتوں کا محور۔ محمد صائم عدیل' اور محمد ارسل نبیل کو اپنا موضوع بنایا۔

(سیر و سیاحت (سفر نامہ

بہ فضلِ تعالیٰ ۲۰۱۱ء سے میں تقریباً ہر سال سعودی عرب آ رہا ہوں۔ قیام جدہ میں ہوتا ہے لیکن مکہ، مدینہ، جذان، طائف اور دیگر شہروں میں جانا ہوا۔

سفر نامے کے حوالے سے اسکول، جامعات، کتب خانے، مسجدیں، پہاڑ، تفریحی مقامات میرا موضوع رہے۔ ان میں ' جبل اُحد کے دامن میں چند ساعتیں، ' جبل ثور کے دامن میں چند ساعتیں'، ' جبل رحمت پر چند ساعتیں' ، پاکستان انٹر نیشنل اسکول (انگلش سیکشن) جدہ، مولودالنبیؐ (پیدائش گاہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، شہر جدہ کی 'پانی پر تیرتی مسجد'، جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین، جامعہ شاہ عبدالعزیز لائبریری میں ایک دن اور مکہ لائبریری شامل ہیں۔

سوانحی مضامین ، شخصی خاکے

ادب میں شخصیات میرا خاص اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ میرے لکھنے کی ابتدا ۱۹۷۸ء میں سوانحی مضمون سے ہوئی تھی۔ سوانحی مضامین کے ساتھ ساتھ خاکے تحریر کیے ۔ میرے خاکوں کی کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' کے عنوان سے اور سوانحی مضامین میری کتاب ''یادوں کی مالا'' شائع ہو چکی ہیں۔ ہماری ویب پر جن شخصیات پر مضامین اور خاکے شامل ہیں ان میں فیض احمد فیضؔ، عبدالستار ایدھی،فرخندہ لودھی پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید، شفیع عقیل (شمیس عین)، حکیم محمد سعید،اکٹرطاہر تونسوی ،، بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹرفرمان فتح پوری ، بہادر شاہ ظفر،ڈاکٹر انیس خورشید ، پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر،استاذ الشعراافتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی، احسان دانش ، حبیب جالبؔ ، شیخ محمد ابراہیم آزادؔ، مولانا حسرت موہانی، تابشؔ

صمدانی، پروفیسر لطیف اللہ، پروفیسر محمد احمد، محمد عادل عثمانی، پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام حاجی سر عبد اللہ ہارون مرحوم، مولانا محمد عارف الدین، جمیل نقوی۔ ابن حسن، قیصر، میاں الطاف شوکت، خورشید اختر انصاری شہید، محبوب احمد سبزواری۔ پروفیسر ڈاکٹر طحٰہ حسین، پروفیسر اختر حنیف، شیخ لئیق احمد، منظور احمد بٹ، مشکور احمد، الحاج محمد زبیر، سید امام، فرحت اللہ بیگ، عبد الوہاب خان سلیم، عبد الصمد انصاری، سید فیصل علی سبزواری، پروفیسر محمد مظہر الحق، نیّر سوز، سید اطمینان علی شاہ بخاری، پروفیسر سید کمال الدین، خلیق صمدانی، رشید الدین احمد (ماسٹر رشید)، محمد گلستان خان، پروفیسر انیس زیدی، لائبریری سائنس کی مصنفہ مارگریٹ من شامل ہیں۔

تعارفِ کتب

کتب پر تبصرے اور مختلف مصنفین کی تصانیف وتالیفات کا تحقیقی جائزہ بھی لیا۔ کتب جن پر تبصرے اور جائزہ شامل ہے شعری مجموعہ 'لمس عابد خورشید'، کتاب 'بجیا''

اردو کے ادیب و نقاد سید محمد اصغر کاظمی کی تصانیف وتالیفات کا جائزہ'، رضا علی عابدی' کی کتاب ' کتب خانہ' کا جائزہ، نعیمہ توفیق کا مجموعہ کلام 'لمحہ فکر'، 'جھولی میں ہیرے اور موتی ڈاکٹر خالد ندیم کی نظر میں، 'یادوں کی مالا' اکرام الحق کی نظر میں، 'شیخ محمد ابراہیم 'آزادؔ شخصیت وشاعری' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں، ' یادوں کی مالا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نظر میں، 'کتب خانے تاریخ کی روشنی میں (تبصرہ)۔شاہ حسن عطا کی تصنیف 'نقشِ کفِ پا'۔ حکیم محمد سعید کی تصانیف وتالیفات کا تحقیقی جائزہ، سفر نامہ حج۔بشیر الدین خورشید شامل ہیں۔

اسلامی موضوعات

اسلامی موضوعات میں 'دعا کی اہمت وفضیلت' اور 'سلام: ایک مسنون عمل، اسلام کا بنیادی شعار'۔

تعلیم وکتب خانے

مطالعہ کی اہمیت وافادیت'، 'قومی تعلیمی پالیسیاں، ترقیاتی منصوبے اور کتب خانے'، "اپریل کتاب وکاپی رائٹ کا عالمی دن'، 'عالمی اردو کانفرنس ۲۰۱۰ء جامعہ سرگودھا ۲۳ ۔میری زندگی کے یادگار لمحات اور مکہ لائبریری۔ایک تعارف شامل ہیں۔

متفرق موضوعات

متفرق موضوعات میں، 'بیکانیر میرے پرکھوں کی سرزمین'، ' ہندوستان کا ضلع مظفر نگر یوپی) ۔میرا آبائی وطن'، 'دال' جھال چکیاں (سرگودھا) دی'،شامل ہیں۔)

ہماری ویب پر میرے مضامین کی سینچری میں وہ مضامین بھی ہیں جو مختلف اخبارات و رسائل اور میری ہی کتب میں شائع ہوئے اور ایسے مضامین بھی ہیں جو میں نے بطور خاص ہماری ویب ہی کے لیے لکھے۔

شاعری

شاعری میرے پرکھو کی میراث ہے، شاعری کا ذوق میرے خاندان میں کئی نسلوں سے چلا آرہا ہے۔ اگر یہ کہوں کہ میرا خاندان شاعروں کا خاندان ہے تو غلط نہ ہوگا۔ خاندان کے اکثر احباب شاعر تھے اور ہیں اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ میرے جدِ امجد شیخ محمد ابراہیم آزآدؔ صاحبِ دیوان شاعر تھے جن کا دیوان ''دیوانِ آزاد'' ۱۹۳۲ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن میر عم جناب مغیث احمد صمدانی کی کوششوں سے ۲۰۰۵ء میں کراچی سے منظر عام پر آیا۔ آزآدؔ صاحب سے پہلے بھی کئی احباب شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ آزآدؔ صاحب کے بعد بھی کئی شاعر ہوئے خاص طور پر جناب خلیقؔ صمدانی، تابشؔ صمدانی اپنے وقت کے معروف اور صاحب دیوان شاعر ہیں جن کا قیام ہندوستان کے شہر بیکانیر کے بعد پاکستان کے شہر ملتان میں رہا۔ ان کے بیٹے رہبر اور سرور بھی اپنے آباؤاجداد کے ادبی ورثہ کے امین ہیں۔ اگر میں نثر کی جانب نہ آتا تو شاید شاعری ہی کر رہا ہوتا لیکن میں نثر نگاروں میں پھنس گیا اور ساری

عمر نثر لکھنے میں لگ گئی اور نہ ہی شاعری کو اپنی پہچان بنایا لیکن شاعری کے جراثومے میرے خون میں موجود ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ کل بلاتے ہیں اور حیلے بہانے سے ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ ضرورت ہوئی تو شعر کہہ لیا کرتا ہوں ۔ میری نثر میں میرے ٹوٹے پھوٹے شعر موجود ملیں گے۔ اپنے خاندانی ورثے کا ذکر ایک شعر میں اس طرح کیا ۔

ہو کیوں نہ ناز مجھے سخنوری پہ رئیسؔ
میرے ہی اجداد کا ورثہ ہے جو مجھے ملا ہے

مَیں ملتان کے قریب واقع ایک دیہات نما شہر میلسی میں پیدا ہوا۔ میلسی سے اپنے تعلق کا اظہار میں نے اپنے اس شعر میں اس طرح کیا ۔

میلسی ہے ایک شہر، پانچ دریاؤں کی سرزمین پر
میں ہوں رئیسؔ اُسی آسماں کا ایک ستارہ

مکہ المکرمہ اور مدینہ منورہ جانے کی خواہش کس مسلمان کے دل میں نہیں ہوتی ۔ اپنی اس خواہش، آرزو، تمنا اور دعا کا اظہار اس طرح کیا ۔

ہے تمنا کہ جیتے جی دیکھ لوں تیرا گھر یارب
روضۂ اقدس کی بھی ہو جائے زیارت یارب
گناہ گار ہوں اور خطا کار بھی ہوں میں

پر رحمت کا تیری طلب گار ہوں میں یارب

چوم لوں اپنے لبوں سے ہجرہ اسود کو ایک بار

ہوجائے پوری میری یہ تمنا یارب

نادم ہوں پنے اعمال پہ اور شرم شار بھی

بخش دینا صدقے میں نبیؐ کے مجھے یارب

کر لوں طواف کعبہ اپنے پیروں چلتے میں

آرزو ہوجائے پوری یہ رئیسؔ کی یارب

اللہ تبارک و تعالٰی نے عمرہ کی سعادت نصیب فرما ئی بلکہ یہ سعادت متعدد بار نصیب ہو چکی ہے۔ ۲۰۱۱ء سے ہر سال یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے۔خانہ کعبہ پر حاضری کے موقع پر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا۔

رَحمتَ کا تیری منظر دیکھ رہا ہوں

دعاؤں کا اپنی ثَمَر دیکھ رہا ہوں

عظمت تیرے گھر کی دیکھ رہا ہوں

ناچیز پہ تیرا اَبرِ کرم دیکھ رہا ہوں

جدہ میں قیام کے دوران مکہ المکرمہ جانا میرا معمول رہتا ہے، تقریباً ہر دوسرے روز خانہ کعبہ جایا کرتا اور طواف کعبہ کی سعادت حاصل ہوا کرتی اس

کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح سے ہوا۔

ایسی تصویر بس گئی ہے دل میں کعبہ شریف کی
آنکھوں میں ہر دم رہتی ہے تصویر کعبہ شریف کی
پیاس بجھی ہے، نہ بجھے گی یہ تو ہے مجھے معلوم
پھر بھی اک چاہت سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی
ایک بار اور جاؤں، پھر جاؤں اور جا کر واپس نہ آؤں
بس یہی اک تدبیر سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی

مجھے روضۂ رسول ﷺ پر ایک سے زیادہ بار حاضری کی سعادت نصیب ہو چکی ہے ۔اسی سال ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء کی شب مجھے اپنی شریک حیات کے ہمراہ روضۂ رسول ﷺ پر گزارنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ یہ رات میری زندگی کی سب سے افضل اور متبرک رات تھی، اس رات مجھے جو دلی سکون و راحت میسر آئی کسی اور رات میں نہیں ملی۔شاید پروردگار اس شب کے صدقے میں ہی میری بخشش فرمادے۔ اس
کیفت کا اظہار اس طرح کیا۔

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پاگیا ہوں
تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب

جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پا گیا ہوں
نگاہیں کیسے ہٹتیں روضے کی جالیوں سے رئیس
برسوں کی پیاس کا احساس پا گیا ہوں

ہماری ویب پر حمد، نعت اور ایک نظم شائع ہوئی جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا۔ خالق ہے تو تیری حمد ہو بیاں محال ہے (حمدِ باری تعالی

http://www.hamariweb.com/poetries/Poetry.aspx?

id=55800

۲۔ روضہ رسول ﷺ پر حاضری

http://www.hamariweb.com/poetries/Poetry.aspx?

id=55800

(۳۔ شکریہ (نظم

http://www.hamariweb.com/poetries/poetry.aspx?

id=57888

آخر میں اپنی بات اپنے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ ہماری ویب پر مضامین شائع کرنے کا سفر انشاء اللہ جاری و ساری رہے گا۔

حصول علم ہے ہر ایک کام سے بہتر
دوست نہیں ہے کوئی کتاب سے بہتر

☆

صاف گوئی بھی کیا بلا کی چیز ہے رئیس

کر دیتی ہے اپنو کو بھی پرایا پل بھر میں

☆

خوف نہیں زرا بھی فشار کا مجھے رئیسؔ
ہے زمیں کو معلوم کہ نبیؐ کا عاشق ہوں میں

☆

کاتبِ اعمال کے خوف سے کانپ جاتا ہوں
سوار کاندھوں پر ہر دم مصروفِ کار ہیں وہ

☆

پاتا نہیں ہوں حوصلہ جو ثناء اُس کی لکھوں
پر سخن وروں کا یہ بھی دستور رہا ہے

☆

مَیں بھی عاشق ہوں رئیسؔ حسان بن ثابت کا
پر ان جیسی نبیؐ سے محبت کہاں سے لاؤں

☆

ہم بھی کسی دن کسی وقت چپ چاپ چلے جائیں گے
تکتے کے تکتے رہ جائیں گے احباب ، ہم نہ ہوں گے

شکریہ' کے عنوان سے مَیں نے اپنے ان احباب کا شکریہ ادا کر دیا ہے جو میرے '

سفر آخر میں میرے ہمراہ ہوں گے۔ نہیں معلوم پھر اُن سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔

مرقد تک میرے ساتھ آنے والو تمہارا شکریہ
میری خاطر زحمت اٹھانے والو تمہارا شکریہ
ہے اب جو سفر باقی کریں گے وہ تنہا ہی ہم
حوصلہ بڑھا کر لحد تک پہنچانے والو تمہارا شکریہ
اگلا پڑاؤ ہے کٹھن اور رستہ بھی ہے اڑچن اڑچن
مغفرت کی دعا دینے والو تمہارا شکریہ
بنا تھا جس خاک سے رئیسؔ آ پہنچی ہے منزل پہ وہ
مٹھی بھر خاک نچھاور کرنے والو تمہارا شکریہ

آج ۵ ستمبر ہے میں اماں حوا کے شہر جدہ میں ہوں۔ میرا یہ یادگار مضمون آج ہی پائے تکمیل کو پہنچا۔ ۳، ۴ اور ۵ ستمبر میری زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میرے والد محترم ۵ ستمبر کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ حادثہ ۱۹۹۷ء کو پیش آیا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ کل کی بات ہے۔ میری والدہ محترمہ ۲۰۰۹ء میں ۳ ستمبر کو اللہ کو پیاری ہوئیں اور ۴ ستمبر کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ حوا کے شہر جدہ کی مقدس سرزمین سے میں اپنی ان دونوں محترم ہستیوں کو جو مجھے سب سے زیادہ عزیز و محترم ہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ان کی مغفرت

کی دعا کے ساتھ اپنے اس یادگار مضمون کو بھی ختم کرتا ہوں۔ (۵ ستمبر
۲۰۱۴ء، جدہ، سعودی عرابیہ)

خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہار

اللہ کے مہمان فریضہ حج کی ادئیگی کے لیے اللہ کے گھر خانہ کعبہ میں جمع ہونا شروع ہو چکے ہیں بلکہ بہت بڑی تعداد مکہ المکرمہ پہنچ چکی ہے باقی ماندہ حاجی بھی چند دنوں میں مدینہ منورہ اور دیگر ممالک سے مکہ المکرمہ پہنچ جائیں گے۔ گویا اس وقت خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہار آئی ہوئی ہے۔ مَیں حج کرنے تو آیا البتہ مجھے عمرہ کی سعادت حاجیوں کے درمیان دوسری مرتبہ حاصل ہورہی ہے۔ خوش قسمت ہیں یہ مسلمان جنہیں اس وقت میری نظریں خانہ کعبہ کے ارد گرد اور مسجد حرام کے چھت تلے اور باہر کے صحن میں دیوانہ وار اپنے خالق سے توبہ استغفار کرتے دیکھ رہی ہیں۔ آج جمعرات کا دن ہے ۱۱ ستمبر ۲۰۱۴ء سعودی عرب میں ۱۶ ذیقعد ۱۴۳۵ھ ہے، صبح کے ۸ بج رہے ہیں مَیں نے اپنی شریک حیات شہناز کے ہمراہ عمرہ ادا کیا۔ پیر ۱۵ ستمبر ۲۰۱۴ء مطابق ۲۰ ذیقعد ۱۴۳۵ھ کو الودعائی طواف کیا کیوں کہ ۱۸ ستمبر کو میری واپسی تھی۔ سعودی عرب آ کر کمر میں تکلیف ہوگئی جس کے باعث اپنے پیروں پر چل کر عمرہ کرنا مشکل ہوگیا چنانچہ ویل چیئر پر عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویل چیئر والے خانہ کعبہ کے گرد حال ہی میں بنائے جانے والے دو منزلہ گول ریمپ کی دوسری منزل پر عمرہ کے سات پھیرے کرتے ہیں۔ ریمپ پر عمرہ ادا کرنے کا یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ طواف ریمپ کی پہلی منزل پر کیا۔

یہ بھی پہلی بار ہو رہا تھا۔ ریمپ پر طواف کرتے وقت خانہ کعبہ کا منظر زیادہ دل کش، جاذب نظر اور حسین ہوتا ہے۔ کعبہ کی چھت واضح طور پر نظر آ رہی ہوتی ہے۔ طواف کرنے والا اپنے آپ کو خانہ کعبہ کے زیادہ نذدیک محسوس کرتا ہے۔ اللہ کے گھر کے پھیرے کرتے ہوئے مسلمان دیوانہ وار تسبیح پڑھتے ہوئے، اللہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے، گڑگڑاتے آنسوں بہاتے ہوئے طواف کیے جا رہے تھے۔ انسانوں کا سیلاب، اوپر سے سر ہی سر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، کوئی کسی سے ٹکراتا ہے تو کوئی کسی سے، حتیٰ کے مرد سے عورت اور عورت سے مرد ٹکرا بھی جائیں تو کسی کو اس بات کا ہوش نہیں ہوتا کہ کون کس سے ٹکرایا بس اپنے اللہ کی جانب راغب، اللہ اللہ کرتے، کوئی بلند آواز سے تو کوئی دل ہی دل میں اپنے خالق سے توبہ استغفار بس کچھ اور نہیں۔

حج اور عمرہ اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادات ہیں جنہیں ادا کرنے کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ ۲، آیت ۱۹۵ میں ارشاد فرمایا گیا۔ ''حج اور عمرے کو اللہ کے لیے پورا کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو''۔ حیوۃ المسلمین میں ہے کہ '' عمرہ سنتِ مؤکدہ ہے، یہ حج کی طرز کی ایک عبادت ہے، جس کی حقیقت حج ہی کے بعضے عاشقانہ افعال ہیں اس لیے اس کا لقب حج اصغر ہے''۔ حج اکبر کا لفظ حج اصغر کے مقابلے میں ہے اہل عرب عمرے کو چھوٹا حج کہتے ہیں اس کے مقابلے میں جو حج ذی الحجہ کی مقررہ تاریخوں میں ہوتا ہے حج اکبر

کہلاتا ہے۔

معارف الحدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ حج اور عمرہ کے لیے جانے والے خدا کے خصوصی مہمان ہیں وہ خدا سے دعا کریں تو خدا قبول فرماتا ہے اور مغفرت طلب کریں تو بخش دیتا ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جس نے پچاس بار بیت اللہ کا طواف کرلیا وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک جیسے اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنم دیا ہے''۔ رایت کے مطابق نبی محمد ﷺ نے ہجرت سے قبل دو حج کیے بعض مورخین کے مطابق تین حج کیے اور آپ ﷺ کے عمروں کی تعداد چار بتائی جاتی ہے۔

خانہ کعبہ میں حاضری اور روضہ رسول ﷺ پر سلام عرض کرنے کی خواہش کس مسلمان کے دل میں نہیں ہوئی۔ میرے دل میں بھی یہ خواہش تھی جو الحمد اللہ پہلی بار ۲۰۱۱ء میں پوری ہوئی۔ اپنی اس آرزو کا اظہار میں نے اشعار میں اس طرح کیا تھا ؂

ہے تمنا کرلوں طوافِ کعبہ ایک بار
پھر چاہے میرا دم آخر ہو جائے
عطا ہو جائے آبِ زم زم کا ایک گھونٹ ہی
تشنہ لبی میری اب تو تمام ہو جائے

خوب خوب مانگا، دل کھول کر مانگا، بے جھجک مانگا، اپنے لیے اوروں کے لیے، جن جن احباب نے دعاؤں کے لیے کہا ان سب کی دعائیں نام لیے بغیر کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ سب کے نام لیے جا سکتے، دعائیں کیں۔ جس لمحہ میں طواف کر رہا تھا اور حاجی صاحبان میرے ارد گرد تھا یکایک میرے لبوں پر سید فصیح رحمانی کا یہ کلام آگیا۔ ۔

کعبہ کی رونق کعبہ کا منظر، اللہ اکبر اللہ اکبر

دیکھوں تو دیکھے جاؤں برابر، اللہ اکبر اللہ اکبر

حیرت سے خود کو کبھی دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کبھی میں حرم کو

لایا کہاں مجھ کو میرا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

تیرے کرم کی کیا بات ہے مولا، تیرے حرم کی کیا بات ہے مولا

تا عمر کر دے آنا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

اس بار میرے اوسان قدرِ قابو میں تھے۔ مئی ۲۰۱۱ء میں جب پہلی بار کعبہ کے سامنے آیا تھا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، کیا مانگوں، کیا نہ مانگوں، جو جو دعائیں سوچ کر آیا تھا کہ جب پہلی نظر خانہ کعبہ پر پڑے گی تو یہ مانگوں گا وہ مانگوں گا، جب نظروں کے سامنے وہ منظر آیا تو اوسان خطا ہو گئے، جسم کے روئیں روئیں میں تھر تھراہٹ تھی، حیران و

پریشان ، وجد کی کیفیت تھی، اے اللہ میں گناہ گار تمام عمر اس سعادت کی آرزو کرتا رہا، آج تونے میری دعا کو قبول کیا۔میں نے اُس وقت کی کیفیت کو نظم میں اس طرح بیان کیا۔

رحمتوں کا منظر دیکھ رہا ہوں
دعاؤں کا اپنی ثمر دیکھ رہا ہوں
رونق اللہ کے گھر کی دیکھ رہا ہوں
ناچیز پر ابرِ کرم دیکھ رہا ہوں

میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھا، آنکھوں سے اشک جاری تھے، تمام دعائیں بھول گیا، یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس موقع کے لیے دعاؤں کی ایک طویل فہرست تیار کرکے لایا تھا، لیکن پروردگار تو ہماری شہہ رگ سے بھی قریب ہے، تو ہمارے ظاہری اور باطنی ارادوں کو، خواہشات کو، تمناؤں کو، احساسات کو، خوب جانتا ہے،یقینا میری تمام دعائیں اور خواہشات اس کے دربار میں قبولیت کی منتظر ہوں گی، ان میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ اے پروردگار مجھے اس جگہ یعنی اپنے گھر خانہ کعبہ بار بار آنے کی توفیق عطا فرما، آج اپنی اسی دعا کی قبولیت کا عملی منظر دیکھ رہا تھا، اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا کہ میں مئی ۲۰۱۱ء کے بعد سے چوتھی بار تیرے حضور حاضر تھا اور اس کا شکرادا کر رہا تھا لیکن ہم اس کی کس کس نعمت کا شکر ادا کریں گے، یہ تو پروردگار نے از خود

سورہ رحمٰن میں کہہ دیا کہ ”اے جنس وانس تم اپنے رب کی کون کون سے نعمتوں کے منکر ہو جاؤگے“۔ اے مالکِ کل اپنی خطاؤ پر شرمندہ ہیں، نادم ہیں، تیرے حضور معافی کے طلب گار ہیں، ہمیں معاف کردے۔ مالک کائینات کا احسان اور کرم ہے کہ اس نے مجھے ایک بار پھر یہ سعادت عطا کی۔ حاضری کی صورت حال کو میں نے اشعار میں اس طرح بیان کیا تھا۔

ماننگے تو بہت کچھ گیا تھا، پر ہوا عجب حال
تھے اشک جاری، اندر تھا ایک تلاطم برپا
سوچتا ہی رہا کروں پیش اپنی سیاہ کاریاں
نہ دل نے دیا ساتھ نہ زباں پہ ہی کچھ آسکا

صحیح بخاری و مسلم شریف کی حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ایک عمرہ سے دوسرے عمرے تک کفارہ ہوجاتا ہے اس کے درمیان کے گناہوں کا اور حج مبرور (پاک اور مخلصانہ حج) کا بدلہ تو بس جنت ہے“۔ طبرانی نے بیان کیا ہے کہ ”آپ ﷺ کی نظر مبارک کعبہ شریف پر پڑی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ترجمہ ” اے اللہ اپنے اس گھر کی عزت، حرمت و عظمت و بزرگی اور زیادہ بڑھادے“۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہاتھ اٹھاتے اور تکبیر کہتے تھے اور فرماتے تھے۔ ترجمہ ”اے اللہ جو تیرے اس گھر کا حج یا عمرہ کرے اس کی بھی بزرگی، عزت، بڑائی اور عظمت اور نیکوکاری میں زیادہ اضافہ فرما“۔ میں اپنے آپ کو خوش

نصیب سمجھتا ہوں کہ مئی ۲۰۱۱ء کے بعد سے چوتھی بار اللہ کے گھر حاضر ہو رہا تھا۔ اللہ تعالی میری یہ عبادت قبول فرمائے۔ تاحال حج کی سعادت نصیب نہیں ہوئی لیکن دوسری بار حاجیوں کے درمیان رہتے ہوئے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتا ہوں۔

بارہ (۱۲) ربیع الاول ۱۴۳۵ھ کی شب روضہ رسول ﷺ پر

اسلامی مہینوں میں ربیع الاول کے مہینے کو بعض اعتبار سے فوقیت اور فضیلت حاصل ہے ۔ یہ وہ بابرکت ماہ ہے کہ جس میں ابوالقاسم محمد ابن عبداللہ ابن عبد المطلب ابن ہاشم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بہ سعادت بروز پیر ۱۲ ربیع الاول عام الفیل مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ھ شعب بنی ہاشم میں ہوئی۔ بعض جگہ ۱۷ ربیع الاول بھی درج ہے۔اسلامی تاریخ کے معروف مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے آپ ﷺ کی پیدائش کا سال ۵۶۹ تحریر کیا ہے۔آپ ﷺ کی دنیاوی زندگی ۶۳ سال ہے اس اعتبار سے کہ آپ ﷺ کی ولادت ۵۷۱ میں ہوئی تو آپ ﷺ نے ۶۳۴ میں وصال فرمایا۔آپ ﷺ کا وصال مدینہ منورہ میں اسی ماہ کی ۱۲ تاریخ کو ہوا لیکن بعض نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔

اللہ کے گھر خانہ کعبہ میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں ، خطاؤں ، غلطیوں، لغزشوں کی معافی مانگنے اور مدینہ منورہ اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری اور سلام و درود کا نذرانہ پیش کرنے کی آرزو، خواہش اور تمنا کس مسلمان کے دل میں نہیں ہوتی ۔ مسلمان کا ایمان ہے کہ ان مقدس و معتبر مقامات پر حاضری بلاوے کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اگر بلاوا ہے تو کسی نہ کسی صورت اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور

اگر بلاوا نہیں تو اسباب ہونے کے باجود انسان نہیں جا سکتا۔

سرکاری ملازمت اور دیگر مسائل نے مجھے ریٹائرمنٹ تک اس جانب سوچنے کی مہلت نہیں دی ، یہ میری کوتاہی بھی تھی اور غلطی بھی جس کا احساس اب شدت سے ہوتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ میرا بلاوا ہی نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی دو سال گزر گئے نہیں جا سکا۔ جب عمرِ عزیز ٦٢ کی ہوئی اور حالات بھی سازگار تھے، وسائل بھی مہیا تھے ۔ دونوں بیٹے سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلے میں چلے گئے۔ گویا اب جانے میں مسائل و مشکلات نہیں تھیں۔ اس مقصد کے لیے میں جامعہ سرگودھا کی ملازمت چھوڑ کر آ گیا۔ ویزا آ چکا تھا جانے میں چند دن ہی باقی تھے کہ ایک دن میرے دل شریف نے مجھے گدگدانا شروع کیا، مچلا، پسلا، شور مچایا یہاں تک کہ میں کارڈیو سینٹر پہنچ گیا، آ ن فانن میں انجو گرافی ، چند منٹ بعد انجو پلاسٹی ہو گئی اور میں ایک عام انسان سے کارڈک پیشنٹ بن گیا۔ بظاہر جانے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن میرا بلاوا آ چکا تھا۔ میں نے تمام مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود رخت سفر باندھا اور اللہ کے گھر پہنچ گیا۔ یہ بات ہے ٢٠١١ء کی ، پہلی بار پانچ ماہ سعودی عرب میں قیام رہا، خانہ کعبہ میں کتنی بار حاضری ہوئی نہیں معلوم۔ اب اللہ نے بلاوا نصیب میں لکھ دیا اور میں گزشتہ تین سال سے سال میں دو بار سعودی عرب جا رہا ہوں۔ نصیب اور بلاوے کی بات ہے۔ روضہ رسول ﷺ پر حاضری بھی ہوتی رہی۔ پروردگار مجھ پر یہ عنایت

خصوصی تازندگی جاری و ساری رکھے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ نبی پاک حضرت محمد ﷺ کے روضہ اقدس کی زیارت اورآپ ﷺ پر درود و سلام کانذرانہ پیش کرنا اہم اور افضل عبادت ہے۔ یہ اپنے پروردگار کی خوشنودی اوراس کاقرب حاصل کرنے کاقریب ترین ذریعہ بھی ہے۔ یہ اپنی خطاؤں اورگناہوں کی بخشش اوراللہ کی رحمت و برکت و مغفرت کا قوی سہارا بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود (یعنی رحمت) بھیجتے ہیں ۔ اے ایمان والوتم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو“۔ (سورۃ احزاب ۔ ۳۳:۵۶) کلام مجید کی سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے ”اور اگر یہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو اے محبوب وہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اللہ سے مغفرت طلب کریں اور اللہ کے رسول ﷺ بھی ان کے لیے سفارش کریں تو وہ ضرور بہ ضرور اللہ کو خوب توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا پائیں گے“۔ گویا دربارِ نبوی ﷺ میں حاضری، گناہوں سے توبہ و استغفار اور نبی ﷺ کی سفارش کے نتیجے میں قربِ الٰہی کا حصول ممکن ہے۔

مدینہ منورہ کے لیے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے دعافرمائی صحیح بخاری کی حدیث ہے ”آپ ﷺ نے دعافرمایا اے اللہ! جس طرح مکہ مکرمہ کی محبت ہمارے دلوں

میں ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت مدینہ منورہ کی ہمارے دلوں میں ڈال دے اور آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ مولا! جو برکتیں تو نے مکہ المکرمہ میں رکھی ہیں ان میں چار گناہ اضافہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں رکھ دے"۔ایک حدیث مبارکہ زیارت روضہ اطہر کے حوالہ سے یہ بیان کی گئی ہے کہ "حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میرے روضہ اطہر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو چکی ہے"۔ مسند امام احمد میں حدیثِ مبارکہ ہے۔فرمایا آنحضرت محمد ﷺ نے کہ "جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کرے اور اس سے کوئی نماز نہ چھوٹی ہو تو اس کے لیے دوزخ اور عذاب سے خلاصی لکھ دی گئی اور وہ نفاق سے محفوظ و بری ہو گیا"۔ مَیں تیسری بار ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو اپنی شریک حیات شہناز کے ہمراہ جدہ پہنچا، عمرہ کیا، کئی بار خانہ کعبہ میں حاضری دی۔ ۱۲ ربیع الاول قریب ہی تھی۔ خواہش تھی کہ ۱۲ ربیع الاول کی شب مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ کے سامنے گزاریں۔ اس بار یہ آرزو لیے ہی ہم سعودی عرب آئے تھے۔ جیسے جیسے یہ تاریخ قریب آ رہی تھی اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اپنے بیٹے عدیل سے اس بات کا ذکر کیا کہ ہم ایک ہفتہ مدینہ منورہ میں خاص طور پر ۱۲ ربیع الاول کی شب مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ کے سامنے گزارنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پروردگار نے ہماری یہ دعا قبول کر لی تھی۔ ۹

جنوری ۲۰۱۴ء بروز جمعرات رات ۱۱ بجے عدیل کے ہمراہ ہم مدینہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ سعودی عرب میں رہنے والے رات میں سفر کو فوقیت دیتے ہیں۔ جدہ سے مدینہ کے لیے ہماری کار سرپٹ دوڑی چلی جارہی تھی۔ ابھی مدینہ کا سفر دو گھنٹے کا باقی تھا کہ طوفانی ہوا، گرج چمک کے ساتھ موسلادھار بارش نے ہمارا استقبال کیا۔ بارش کی شدت اس قدر تھی کے گاڑی کو ایک جگہ روکنا پڑا اور جب بارش کم ہوئی تو سفر دوبارہ شروع ہوا صبح چار بجے مدینہ پہنچ گئے۔ جوں ہی ہماری کار مدینہ کی حدود میں داخل ہوئی اللہ کے شکر کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں سلام کا نظرانہ بھی پیش کیا۔ میری ایک نعت کے چند اشعار ۔

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پاگیا ہوں
کہاں میں بے کس و بے نوا کہاں میرا نصیب
مدینہ کی فضاء میں شفاء پاگیا ہوں
تھی یہ آرزو مدت سے مدینہ دیکھوں
کرم پہ اپنے نبیؐ کے مراد پاگیا ہوں

ہمارا بیٹا عدیل جدہ میں مقیم ہونے کے باعث مدینہ، مکہ، طائف، ریاض اور دیگر شہروں کے راستوں اور ہوٹلوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ مسجدِ بلال کے ندیک

قائم ہوٹل 'لؤلؤ الخلیج' پہنچے جہاں ہمیں ایک مناسب کمرہ بھی مل گیا۔ اس سے قبل بھی ہم نے اسی ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ یہاں پر قیام کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نیچے کئی پاکستانی ہوٹل ہیں جہاں پاکستانی کھانا بہ آسانی مل جاتا ہے۔ مسجد نبوی بھی بہت قریب ہے۔ ہوٹل کے سامنے مین روڈ ہے پل کے نیچے سے سامنے کی جانب جائیں تو مسجد نبوی کی دیوار شروع ہوجاتی ہے یہ راستہ جنت البقیع کے بنیادی دروازے کی جانب نکلتا ہے۔ رات بھر کے سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ کر ہوش ہی نہیں رہا آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا آج جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ مسجد نبوی میں پڑھی، رش کے باعث مسجد نبوی کی دیوار اور جنت البقیع کی دیوار کے درمیانی راستے میں جگہ ملی۔ روضہ رسول ﷺ نظروں کے سامنے تھا سبز گنبد بھی سامنے اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد سیدھے روضہ رسول ﷺ کا رخ کیا، شہناز خواتین کے حصے میں چلی گئیں مَیں نے اور عدیل نے نبی اکرم ﷺ کی خدمات میں سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ ریاض الجنہ میں نفل کی ادائیگی بہ آسانی نصیب ہوئی روضہ رسول ﷺ کی جالیوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے اور نبی اکرم ﷺ اور ان کے ساتھ آرام فرما آپ کے رفیق حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خدمات میں سلام کا نظرانہ پیش کیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے یہ سعادت بخشی۔

عدیل ہمیں مدنیہ چھوڑ کر جمعہ کی شام جدہ واپس ہوئے کیونکہ میری بہو مہوش اور پوتا صائم گھر پر اکیلے تھے۔ رات گئے جدہ پہنچنے کی اطلاع ملی۔ اللہ کا شکرادا کیا۔ ہمیں ایک ہفتہ مدینہ منورہ میں رہنا تھا۔ نمازیں مسجد نبوی میں ادا کیں، عصر کی نماز کے بعد جنت البقیع کا دروازہ کھولا جاتا ہے تاکہ لوگ اس مقدس قبرستان میں آرام فرما محترم ہستیوں کی قبور کی زیارت کرسکیں اور فاتح پڑھ سکیں۔ خواتین کا داخلہ جنت البقیع میں ممنوع ہے وہ جنت البقیع کی دیوار کے باہر سے ہی اہل قبور کو سلام پیش کرتی ہیں۔ میں تنہا ہی قبرستان جاتا رہا اور فاتح پڑھتا رہا۔ ۱۲ ربیع الاول کا شدت سے انتظار تھا۔ پیر ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء (سعودی عرب میں) ہم نے تمام شب روضہ رسول ﷺ کے سامنے اور مسجد بنوی میں گزاری، نفل پڑھتے رہے، دعائیں کرتے رہے۔ نصیب کی بات ہے اللہ نے یہ سعادت بخشی۔ ریاض الجنہ میں متعدد بار نفل کی ادائیگی کرتے رہے۔ پاکستان میں آج کی رات سماء ہی کچھ اور ہوتا ہے۔
مسجدوں میں خاص اہتمام، ٹیلی وژن رات بھر خصوصی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سعودی عرب مختلف نظریات رکھتا ہے۔ مدینہ میں یا مسجد نبوی میں اس حوالے سے خاموشی تھی۔ مجھ جیسے کتنے ہی لوگ اپنے اپنے طور پر دل ہی دل میں حضواکرم ر ﷺ کی پیدائش کے حوالے سے خصوصی دعائیں کررہے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمارے ہاتھ غلطی سے بھی روضہ مباک کی جانب نہ اٹھ جائیں۔ اگر کبھی غلطی سے ایسا ہو بھی جائے تو قریب میں موجود شرتہ حرام حرام کی صدائیں لگا کر

ہمارے ہاتھوں کو قبلہ کی جانب کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بدعت اور شرک سے محفوظ رکھے۔

مکمل شب روضہ رسول ﷺ کے سامنے اس طرح بسر ہوئی کہ کبھی نفل پڑھتا، کبھی قرآن مجید کی تلاوت، پھر ریاض الجنہ میں چلا جاتا وہاں بھی عبادت کا عمل جاری رہتا۔ ریاض الجنہ میں مَیں آہستہ آہستہ راستہ بناتا ہوا بالکل روضہ رسول ﷺ کی دیوار سے جا ملتا۔ مجھے روضہ رسول ﷺ کی دیوار جس کے برابر کوئی تین یا چار فٹ کا کوریڈور ہے جس میں منتظمین یا شرتے موجود ہوتے ہیں بیٹھ کر نفل ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مَیں کیوں کہ کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ اس وقت بھی کرسی میرے ساتھ تھی۔ جب میں کرسی پر بیٹھ کر نفل ادا کر رہا تھا تو میرے جسم کا دائیاں حصہ روضہ رسول ﷺ کے اس دیوار کے ساتھ موجود کوریڈور کی دیوار سے لگ رہا تھا۔ جب میں بائیں جانب سلام پھیرتا تو روضہ رسول ﷺ کی جالیوں سے اندر موجود قبریں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ نہیں معلوم یہ قبر مبارک آنحضرت ﷺ کی تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ یا پھر حضرت عمر فاروقؓ کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حجرہ مبارک، سیدنا عائشہ صدیقہؓ میں قبلہ کی جانب پہلی قبر مبارک نبی اکرم ﷺ کی ہے آپ ﷺ کا سر مبارک مغرف کی طرف اور پاؤں مبارک مشرق کی جانب ہیں اور آپ ﷺ کا چہرہ مبارک قبلہ کی جانب یعنی مغرب کی طرف ہے۔ آپ ﷺ کے رفیق سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا سر آپ ﷺ کے کندھوں کے

برابر اور حضرت عمر فاروقؓ کا سر آنحضرت محمد ﷺ کے پاؤں مبارک کے برابر میں ہے۔ اللہ اللہ کیا سعادت میرے نصیب میں آئی۔ ریاض الجنہ میں ایک سجدہ ہی مقدم اور افضل ہے، مجھے تو کئی بار یہ سعادت ملی اور میں نے ریاض الجنہ کے ہر ہر حصہ میں نماز ادا کی۔ اللہ تعالی میری اس عبادت کو قبول فرمائے۔

رات کا ایک پہر ایسا بھی آیا کہ میں مسجد نبوی کے موجودہ منبر جہاں سے امام مسجد نبوی امامت کراتے ہیں کے ساتھ اس طرح بیٹھ گیا کہ میری کمر منبر کے برابر دیوار سے لگی تھی میرا منہ اور میرے نظریں روضۂ ﷺ کی جالیوں کی جانب تھا۔ اس کیفیت میں بہت دیر تک بیٹھا رہا جالیوں کو تکتا رہا، دعائیں مانگتا رہا۔ جی چاہتا ہے کہ بس نظریں اس منظر کو دیکھتی رہیں اور اسی کیفیت میں زندگی تمام ہو جائے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو مدینہ میں ہیں، مدینہ میں ان کی زندگی کا اختتام ہوتا ہے اور وہ جنت البقیع میں ہمیشہ کے لیے مدفن ہو جاتے ہیں۔ میری نظریں جالیوں سے لپٹ لپٹ جارہی تھیں۔ خوش نصیبی پر رشک کر رہا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں روضۂ مبارک کے اندر کا منظر بھی نظروں کے سامنے آرہا تھا۔ نظریں جالیوں سے ہٹانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس حسین دل فریب منظر کو میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میری ایک نعت کا شعر کچھ اس

طرح ہے۔

نگاہیں کیسے ہٹتیں رئیسؔ روضے کی جالیوں سے

برسوں کی پیاس کا احساس پا گیا ہوں

مسجد نبوی اور روضہ رسول ﷺ کے نزدیک یہ مقدس و عظیم المرتبت جگہ ہے۔ اس مقام کو آنحضرت محمد ﷺ کی زبان مبارک سے ریاض الجنہ کا لقب نصیب ہوا۔ مالک دو جہاں نے جنت کا یہ ٹکڑا مسجد نبوی میں اتارا، یہاں نفل پڑھنا ایسا ہے کہ جیسے جنت میں نماز پڑھنا۔ اس حصہ کے مشرق میں روضہ رسول ﷺ ہے۔ اس مقدس و متبرک حصہ کے بارے میں متعدد احادیثِ مبارکہ احادیث کی کتب میں ملتی ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ ''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے''۔ ایک حدیث سیدنا ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا رسول اکرم ﷺ نے کہ '' میری قبر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے''۔ (مسلم شریف)۔ مسلم شریف ہی کی ایک حدیث ہے فرمایا نبی اکرم ﷺ نے جو شخص جنت کے باغات میں سے کسی باغ میں نماز پڑھنے کا خواہش مند ہو تو اسے میری قبر اور میرے منبر کے درمیان نماز پڑھ لینی چاہیے''۔ ریاض الجنہ میں آٹھ ستون ہیں ان ستونوں کو ستوں ہائے رحمت کہا جاتا ہے۔ ہر ستون فضیلت رکھتا ہے، دعا قبول ہونے کا مقام ہے، نجات و مغفرت کی جگہ ہے۔ ریاض الجنہ میں منبر نبوی شریف روحانی مرکز فضیلت، متبرک اور دعائے نجات و مغفرت ہے۔ منبر کے بارے،

میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''میرے منبر کے پاس جنت کے مراتب ہیں''۔ محمد عبد اللہ معبود نے اپنی کتاب 'تاریخ مدینہ' میں کنز العمال کے حوالے سے ایک حدیث یہ نقل کی ہے کہ فرمایا نبی اکرم ﷺ نے ''میرا منبر جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر رکھا جائے گا اور میرے منبر اور گھر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک ہے''۔ آپ ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ منبر رسول ﷺ کے قریب نماز و عبادت، تسبیح و تہلیل جنت کے حصول کا باعث ہے۔ ریاض الجنہ میں قیام، عبادت، ادائیگی نماز، تسبیح و ذکر کرنے والا ایسا ہی ہے کہ وہ شخص جنت میں بیٹھا ہے۔ الحمد اللہ مجھ ناچیز کو جنت الجنہ کے ستون ہائے رحمت اور منبرِ رسول ﷺ کے پاس نفل ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میری ایک نعتِ رسول ﷺ کا ایک شعر ہے ؎

تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب
جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پا گیا ہوں

رات میں کچھ وقت ایسا بھی آیا کہ میری کمر میرا ساتھ چھوڑتی محسوس ہوئی، میں کافی عرصے سے کمر کی تکلیف میں مبتلا ہوں چنانچہ میں نے بھی دیگر لوگوں کے ساتھ روضہ اطہر کے سامنے ہی اپنے جسم کو دراز کر لیا۔ ابھی کچھ ہی وقت ہوا تھا خواتین کا روضہ اطہر کے نزدیک سے زیارت کا مرحلہ اختتام کو پہنچا تو اس حصہ کی صفائی کا اہتمام شروع کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں سب

لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ اب میں اس جانب چلا گیا جہاں سے خواتین روضہ اقدس کے نزدیک ہو کر سلام پیش کرتی ہیں۔ گویا روضہ اطہر کی مشرق کی جانب والی دیوار کی جانب۔ میں یہاں ابھی تک نہیں گیا تھا۔ اب میں نے روضہ اطہر کے چاروں جانب سے اپنے نبیؐ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ جسم تھک گیا تھا۔ نیند کا خمار بھی طاری ہو چکا تھا۔ لیکن اس حصہ میں جو لطف آ رہا تھا اس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ میں روضہ اطہر کے سامنے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نظریں روضہ اقدس پر جمی ہوئی تھیں۔ اب میری سوچ کا دھارا اعلانِ نبوت، مکہ میں اہل قریش کی زیادتیاں، مکہ سے مدینہ ہجرت اور آپ ﷺ کی مدینہ منورہ میں گزری زندگی کی جانب ہو گیا۔ تمام غزواۃ کے بارے میں سوچتا رہا جن میں آنحضرت ﷺ سپہ سالار کی حیثیت سے شریک رہے۔ فتح اور شکست دونوں پیش آئیں۔ جن جن تکلیفات اور پریشانیوں سے آپ اور صحابہ اکرم گزرے ان کا احاطہ کرتا رہا۔ غار ثور میں آپ ﷺ کا اپنے رفیق حضرت ابو بکر صدیق کے ہمراہ قیام نظروں کے سامنے تھا۔ جبلِ ثور پر اپنی حاضری کی روداد میں ایک مضمون 'جبلِ ثور کے دامن میں چند ساعتیں' کے عنوان سے قلم بند کر چکا ہوں۔ آپ ﷺ کی مدینہ آمد، آپ ﷺ کا استقبال، مساجد کی تعمیر، مدینہ منورہ میں اسلام کی تبلیغ اور اسے پھیلانے کے مراحل اور ان میں پیش آنے والی مشکلات، کفار کے ساتھ مختلف غزواۃ ایک ایک کر کے تمام واقعات ذہن میں آتے رہے۔ غزوۂ احد کا حال میں اپنے ایک مضمون 'جبلِ احد کے دامن میں چند ساعتیں' کے عنوان سے لکھ چکا ہوں۔

وہ پہاڑ اور وہ میدان جہاں کفار اور مسلمان آنحضرت محمد ﷺ کی رہبری میں صف آرا ہوئے میری نظروں کے سامنے تھا۔ احد میں شہادت پانے والے شہداء کی یادگار جہاں شہدائے احد مدفن ہیں میری نظروں کے سامنے تھی۔ سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے چچا سید الشہدا سیدنا حمزہؓ بن عبدالمطلب کی بہادری کے کارنامے اور پھر ان کی شہادت کا واقع، حضرت حمزہؓ کے شہادت کے بعد ابو سفیان کی بیوی ''ہندہ'' کا ان کے جسم مبارک کو چیر کر ان کا جگر نکالنا، اسے چبانا جب نگل نہ سکی تو اس کا تھوک دینا۔ ہندہ نے حضرت حمزہ کو شہید کرنے پر اپنے کڑے، بالیاں اور گلے کا ہار انعام میں 'وحشی' کو دیے۔ حضرت حمزہؓ ایک بہادر اور دلیر صحابی تھے آپ نے جنگ بدر میں بے شمار مشرکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا یہ بات مشرکین کے علم میں تھی چنانچہ وہ دیگر کے علاوہ حضرت حمزہؓ کے خون کے پیاسے تھے۔ مشرک جبیر بن مطعم نے 'وحشی' نامی ایک غلام کو آزاد کردینے کا لالچ دیگر حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کا ٹاسک دیا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا موقع دیکھ کر حضرت حمزہؓ پر ایسا وار کیا کہ وہ شہید ہوگئے۔

آنحضرت ﷺ نے جب حضرت حمزہؓ کی شہادت شدہ لاش دیکھی تو بہت غم گین ہوئے فرمایا ایسا دردناک منظر میری نظر سے کبھی نہیں گزرا'۔ آپ ﷺ نے شہدائے اُحد، کے لیے فرمایا کہ ''میں قیامت کے دن ان کا شفیع ہوں''۔ وحشی بعد میں ایمان لے آیا تھا لیکن حضور ﷺ نے اسے اپنے سامنے آنے سے منع فرما دیا تھا۔

حضرت حمزہ اور دیگر صحابہ اکرم کی بہادری اور اپنے نبیؐ سے محبت کا عملی مظاہرہ احد کے میدان میں نمایاں تھا تو دوسری جانب حضور سے میلوں دور رہنے والے نبیؐ کے ایک دیوانے کو جب یہ اطلاع ملی کے جنگ احد میں نبیؐ کا ایک دانت شہید ہوگیا ہے تو انہوں نے اس خیال سے کہ نہیں معلوم حضور ﷺ کا کونسا دانت شہید ہوا ہوگا انہوں نے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔ یہ واقع ہے تابعین عاشقِ رسول حضرت اویس قرنی کا جو ملک یمن کے ایک محلّہ قرن کے رہنے والے تھے۔ آپ اتنے درویش منش اور ایسے فقیر تھے کہ لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے تھے۔ معروف صوفی بزرگ سید علی ہجویری نے اپنے تصنیف 'کشف المحجوب' میں لکھا ہے کہ اویس قرنی اہل تصوف کے عظیم مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ رسول اللہ کے زمانے میں تھے مگر زیارت نہ کر سکے۔ اویس قرنی اپنی والدہ ماجدہ کے واحد سہارا تھے اور ان کے نگہداشت اور دیکھ بھال کے باعث حضور اکرم ﷺ کی ظاہری زندگی میں زیارت نہ کر سکے اور نہ ہی آپ کے اتنے وسائل تھے کہ والدہ کو اپنے ہمراہ مدینہ لے جاتے اور انہیں آکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ میدان احد میں رسول اکرم ﷺ کا دندانِ مبارک شہید ہوگیا۔ جنگ احد کا حال اویس قرنی کو معلوم ہوا تو تڑپ اٹھے اور زار و قطار روتے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کو اتنی تکلیف دانت ٹوٹنے سے ہوئی ہوگی اور تم یہاں آرام سے ہو تو انہوں نے پتھر مار کر اپنا دانت توڑ ڈالا، پھر خیال ہوا کہ یہ نہیں، یہ دانت ہو سکتا ہے اس لیے اسے توڑ دیا پھر سوچا کہ ممکن ہے کہ آپ کا نیچے کا

دانت ٹوٹا ہو تو اس لیے نیچے کا دانت توڑ دیا پھر اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے اس کے برابر والا دانت ٹوٹا ہو برابر والا دانت توڑ ڈالا۔ غرض انہوں نے ایک ایک کرکے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے کہ کسی بھی طرح اپنے نبی ﷺ کا کامل اتباع ہو سکے۔ اپنے نبی ﷺ سے محبت کا اعلیٰ نمونہ تھے آپ ﷺ نے بھی اویس قرنی کو اپنا بہترین دوست قرار دیا۔

یہاں تمام غزوات کی تفصیل میں نہیں جا سکتا جی چاہتا ہے کہ کم از کم مدینہ میں جو غزوات ہوئیں ان کی مختصر تفصیل بیان کروں لیکن طوالت کے باعث ایسا ممکن نہیں البتہ غزوات کے صرف نام لکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ یہ غزوات ۲ ہجری سے شروع ہوئیں اور ۹ ہجری کے درمیان لڑی گئیں۔ یعنی ان جنگوں میں حضور اکرم ﷺ از خود شامل رہے اور سپہ سالار کی حیثیت سے مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی کی۔ ا۔ غزوہ ودان یا الابواء مکہ میں ماہ صفر ۲ ہجری، ۲۔ غزوہ بواط مدینہ میں ۲ ہجری، ۳۔ غزوہ سفوان یا بطب کرزین جابر فہری، مدینہ میں جمادی الآخر ۲ ہجری، ۴۔ غزوہ ذی لا عشیرہ، مدینہ میں جمادی الآخر ۲ ہجری، ۵۔ غزوہ بدر، بدر کے مقام پر مدینہ کے نزدیک رمضان المبارک ۲ ہجری، ۶۔ غزوہ بنی قینقاع، مدینہ میں شوال ۲ ہجری، ۷۔ غزوہ سویق، مدینہ ین محرم الحرام ۲ ہجری، ۸۔ غزوہ قرقرۃ الکدر یا قرارۃ الکدر، مکہ و عراق کے راستہ میں محرم الحرام ۲ ہجری، ۹۔ غزوہ بنی غطفان انمار یا ای امر، نجد کے مقام پر ربیع الا

اول ۳ ہجری، ۱۰۔ غزوہ بحران یا بنی سلیم، مدینہ میں، جمادی الاول ۳ ہجری، ۱۱۔ غزوہ احد۔ احد کے مقام پر مدینہ میں، شوال ۳ ہجری، ۱۲۔ غزوہ حمراء لاسر مکہ کے راستے میں شوال ۳ ہجری، ۱۳۔ غزوہ نبی نضیر، مدینہ میں۔ ربیع الاول ۴ ہجری، ۱۴۔ غزوہ بدر الموعد یا غزوہ بدر الثالث، بدر کے مقام پر ذیقعد ۴ ہجری، ۱۵۔ غزوہ ذات الرقاع، نجد کے مقام پر محرالحرام ۵ ہجری، ۱۶۔ غزوہ دومۃ الجندل، شام کے راستے میں ربیع الثانی ۵ ہجری، ۱۷۔ غزوہ المریسع یا غزوہ بنی مصطلق قدید کے پاس شعبان ۵ ہجری، ۱۸۔ غزوہ لا احزاب یا غزوہ خندق مدینہ میں ذیقعد ۵ ہجری، ۱۹۔ غزوہ بنی القریظی، مدینہ میں ذلحجہ ۵ ہجری، ۲۰۔ غزوہ بنی الحیان، مکہ ربیع الاول ۶ ہجری، ۲۱۔ غزوہ نمابر یا دی قرد، مدینہ میں ربیع الاول ۶ ہجری، ۲۲۔ غزوہ حدیبیہ، صلح حدیبیہ، جدہ و مکہ کے درمیان، ذیقعد ۶ ہجری، ۲۳۔ غزوہ خیبر و وادی القری، مدینہ میں ربیع الاول ۷ ہجری، ۲۴۔ غزوہ فتح مکہ، مکہ المکرمہ میں رمضان المبارک ۸ ہجری، ۲۵۔ غزوہ حنین یا غزوہ ہوازان، مکہ میں شوال ۸ ہجری، ۲۶۔ غزوہ طائف، طائف کے مقام پر ذیقعد ۸ ہجری، ۲۷۔ غزوہ تبوک یا غزوہ عسرت، تبوک مدینہ کے مقام پر رمضان المبارک ۹ ہجری میں پیش آئی۔

صبح کے چار بج رہے تھے تہجد کے لیے روضۂ رسول ﷺ سے باہر جاکر وضوع کی اور باہر ہی نماز ادا کی۔ مسجد نبوی کے صحن میں بے شمار لوگ موجود تھے۔ صحن

مسجد نبوی روشن تھا، رحمت برس رہی تھی، بھینی بھینی خوشبو مہک رہی تھی، ٹھنڈک تھی، آقا کے دیوانے، بندگان خدا بڑی تعداد میں قرآن مجید کی تلاوت، تسبیح و تہلیل، ذکر واذکار، تہجد کے نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ بعض چہل قدمی بھی کر رہے تھے۔ مَیں نے نفل نماز ادا کرنے کے بعد جنت الا لبقیع کی جانب رخ کیا تو وہ تمام، محترم ہستیاں جن میں آلِ رسول ﷺ، ازواج مطہرات، صاحبہ کرام، تابعین، تبع تابعین، آئمہ کرام، علماء، صالحین یاد آگئے جو اس عظیم قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ یہ مدینہ کا محترم و متبرک قبرستان ہے جو مسجد نبوی ﷺ کے مشرقی سمت واقع ہے۔ یہ قبرستان زمانہ جاہلیت سے مدینہ منورہ کے مکینوں کا قبرستان رہا ہے۔ یثرب سے مدینہ بن جانے کے بعد صحابہ اکرم یہاں مدفون ہوئے۔ عثمانیوں کے دور میں اس قبرستان میں قبروں پر کتبے لگے ہوئے تھے لیکن نجدی حکمرانوں کے دور میں قبروں پر سے کتبے ہٹا دیے گئے۔ اس قبرستان کی تعظیم کے حوالے سے ہمیں کئی احادیث ملتی ہیں۔ ایک حدیث مبارکہ ہے کہ آنحضرت محمد ﷺ نے فرمایا ''کہ جو شخص مدینہ میں مرے اور بقیع میں دفن کیا جائے وہ میری شفاعت سے ممتاز ہوگا''۔ ایک اور حدیث مبارکہ ہے کہ سب سے پہلے آنحضرت محمد ﷺ زمین سے اٹھیں گے، ان کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ، ان کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ، ان کے بعد اہل بقیع اور پھر اہل مکہ اٹھیں گے''۔ تاریخ مدینہ 'کے مصنف مولانا محمد عبد المعبود نے مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث یہ نقل 'کی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ سے روایت

ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ''قیامت کے قریب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے ۴۵ سال تک زندہ رہیں گے' شادی کریں گے اور اولاد بھی ہوگی جب ان کا وصال ہوگا تو میرے ساتھ ہی ان کی تدفین ہوگی۔ اور قیامت کے دن میں عیسیٰ علیہ السلام ، ابوبکرؓ و عمرؓ اکٹھے اٹھیں گے''۔ کہا جاتا ہے کہ حجرہ مقدسہ کے شرقی جانب ایک قبر کی جگہ خالی ہے۔ مَیں عصر کی نماز کے بعد بقیع کئی بار جا چکا تھا۔ میری نظروں کے سامنے خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کی قبر مبارکہ تھی ، مرکزی دروازے سے داخل ہوں انتہائی دائیں جانب سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی قبر اطہر ہے جس کے چار جانب پرانے پتھر کی چھوٹی سے دیوار بنی ہوئی ہے۔ آنخضرت محمد ﷺ کے صاحبزادے سیدنا ابراہیمؓ بھی اسی قبرستان میں مدفن ہیں ، دختران رسول ﷺ، حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جنھوں نے آپ ﷺ کو اپنا دودھ پلایا، آنخضرت محمد ﷺ کی ازواج مطہرات میں سوائے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جو جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں اسی قبرستان میں مدفن ہیں، حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہہ ، سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہہ، اما جعفر صادقؓ اور بے شمار صحابہ اکرم اسی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ بقیع کے قبرستان میں کسی بھی قبر پر کسی کے نام کا کتبہ نہیں، البتہ سر کی جانب چھوٹے چھوٹے پتھر ضرور لگے ہوئے ہیں، وہاں موجود اکثر احباب اپنے ہمراہ نقشہ لاتے ہیں کہ یہ فلاں کی قبر ہے یہ فلاں کی قبر ہے۔ بعض قبروں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ واقعی یہ درست ہو سکتا ہے۔ بعض

قبروں کے گرد بڑا احاطہ بنا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قطریں حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضور کے صاحبزادے سیدنا ابراہیمؓ کی ہیں۔

اب مَیں نے جنت البقیع سے واپس روضۂ رسول ﷺ کی جانب رخ، مسجد نبوی کا روشن و کشادہ صحن، کھلا آسماں، سبز گنبد، صبح کے چار بج رہے تھے لیکن چاروں جانب نبیؐ کے دیوانے موجود تھے۔ نہ تھکن کا احساس، نہ نیند کے آثار۔ اس حسین و جمیل نظارہ کا لطف لیتے ہوئے یکایک میرے ذہن میں سلطان نور الدین زنگی کا خواب اور اس پر اس کا عمل کرنا یاد آگیا۔ یہ واقعہ اب تک کتابوں میں پڑھا تھا تفصیل نیٹ پر بھی موجود ہے۔

بعض مورخین نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ واقعہ ۱۱۶۲ء کا ہے۔ ترکی نظام سلطنت کے تحت شام و عراق کے مغربی حصہ پر سلطان نور الدین زنگی کی حکومت تھی۔

اس کی بادشاہت کا دور ۱۱۴۰ء سے ۱۱۷۴ء ہے۔ سلطان نور الدین کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ یہ سربراہ دین دار، نمازی و پرہیز گار تھا۔ ایک دن عشاء کی نماز پڑھ کر سوئے کہ اچانک اٹھ بیٹھے اور نم آنکھوں سے فرمایا میرے ہوتے ہوئے میرے آقا، میرے نبیؐ کو کون ستا رہا ہے آپ اس خواب کے متعلق سوچ رہے تھے جو مسلسل تین روز سے آ رہا تھا اور آج پھر چند لمحے قبل آیا جس میں سرکار نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دو چہرے دکھائے اور فرمایا کہ مجھے ستا رہے ہیں۔ اب سلطان زنگی کو

قرار نہ تھا انھوں نے چند ساتھی اور سپاہی لے کر دمشق سے مدینہ جانے کا ارادہ کیا اُس وقت دمشق سے مدینہ کا راستہ بیس سے پچیس دن کا تھا مگر سلطان نے بغیر آرام کیے یہ راستہ ۱۴ دن میں طے کیا۔ مدینہ پہنچ کر سلطان نے مدینہ آنے اور جانے والے تمام راستے بند کرادئے اور تمام خاص و عام کو اپنے ساتھ کھانے پر بلایا۔ اب لوگ آرہے تھے اور جارہے تھے سلطان ہر چہرے کو بغور دیکھتا لیکن اسے وہ دو چہرے نظر نہ آئے جو اُسے خواب میں دکھائے گئے تھے۔ اَب سلطان کو فکر دامن گیر ہوئی اور گورنر مدینہ سے کہا کہ کیا کوئی ایسا بھی ہے جو اِس دعوت میں شریک نہیں۔ جواب ملا کہ مدینہ میں رہنے والوں میں سے تو کوئی نہیں البتہ دو مغربی زائر ہیں جو روضۂ رسول ﷺ کے قریب کرائے کے ایک مکان میں قیام پذیر ہیں تمام دن عبادت کرتے ہیں شام کو جنت البقیع میں لوگوں کو پانی پلاتے ہیں ۔یہ عرصہ دراز سے مدینہ میں رہ رہے ہیں یہ گھر جس میں یہ دونوں قیام پذیر ہیں جنت البقیع اور روضۂ رسول ﷺ کے درمیان واقع ہے۔ سلطان نور الدین نے ان زائرین سے ملاقات کی خواہش کی ۔ دونوں زائرین کا حلیہ مسلمانوں والا تھا، دیکھنے میں عبادت گزار لگتے تھے۔ ان کے گھر کچھ بھی نہ تھا دو عدد چٹائیاں اور چند ضرورت کی اشیاء ۔ انہیں سلطان کے رو برو پیش کیا گیا جوں ہی سلطان نے ان کو دیکھا اس کی نظروں کے سامنے وہی چہرے آگئے جو اسے خواب میں دکھائے گئے تھے۔ سلطان فوراً اس جگہ پہنچا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ جوں ہی اس نے اس جگہ کو دیکھا جہاں بیٹھ کر وہ عبادت کیا کرتے

تھے سلطان کو چٹائی کے نیچے کا فرش لرزتا محسوس ہوا۔ اس نے اس چٹائی کو اٹھایا تو اس کے نیچے ایک سرنگ کے آثار نظر آئے ۔ سلطان نے اپنے سپاہیوں کو سرنگ میں جانے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے واپس آ کر بتایا کہ یہ سرنگ نبی پاک حضرت محمد ﷺ کے روضہ اطہر کے نذدیک جا چکی ہے۔ سلطان نورالدین زنگی غیظ و غضب میں آگیا اس نے ان دونوں زائرین سے دریافت کیا کہ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو، تمہارے مقاصد کیا ہیں اور تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ چھل و صحت کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ نصرانی ہیں اپنی قوم کی طرف سے مسلمانوں کے پیغمبر کے جسم اقدس کو چوری کرنے پر مامور کیے گئے ہیں۔ یہ سن کر سلطان آب دیدہ ہوگیا اسی وقت ان دونوں کی گردنیں اڑا دی گئیں ۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان روتا جاتا اور کہتا جاتا کہ 'میرا نصیب کہ پوری دنیا میں سے اس خدمت کے لیے اس غلام کو چنا گیا'۔

اس واقع کو ذہن میں لانے کے بعد میں نے جنت البقیع اور روضۂ مبارک کے درمیان کی جگہ کو بغور دیکھا کہ اگر وہ ملعون زائرین جنت البقیع کے اس بنیادی دروزہ سے آگے کی جانب بھی کسی مکان میں قیام پذیر ہوں گے تو ان کے لیے سرنگ کے راستے روضۂ رسول ﷺ تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں بہت دیر تک جنت البقیع اور روضۂ اطہر ﷺ کے درمیانی جگہ کو دیکھتا رہا۔ واقعی سلطان نور الدین زنگی خوش نصیبوں میں سے تھا کہ اسے اس خدمت کے لیے چنا گیا۔ غیر

مسلموں کی مسلمان دشمنی ابتدا سے ہے جو آج بھی جاری ہے۔ نہیں معلوم کتنے غیر مسلم کس کس بھیس میں مکہ اور مدینہ جاچکے ہوں گے ۔اس حوالے سے مجھے ایک غیر مسلم کا مکہ اوار مدینہ جانا یاد آگیا۔ یہ واقعہ مَیں نے حال ہی میں رفیع الدین زبیری کی مرتب کردہ کتاب 'حرمین کے مسافر: سر رچرڈ برٹن ، حافظ احمد حسن ، عبدالماجد دریابادی' میں پڑھا تھا۔ مکہ المکرمہ میں غیر مسلموں کا داخلہ شروع ہی سے ممنوع ہے۔ مکہ کی حدود شروع ہوتی ہے تو گیٹ پر واضح حروف میں لکھا ہے کہ 'غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے'۔ سر رچرڈ برٹن ایک انگریز تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی میں کیپٹن تھا مہم جوئی اس کا شوق تھا اس میں بے شمار خصوصیات تھیں وہ ایک فوجی مہم جو، کھوجی، جغرافیہ داں، ادیب ، شاعر ، لسانیات کا ماہر، جاسوس اور سفارت کار ہونے کے ساتھ کئی کتابوں کا مصنف بھی تھا۔ سر رچرڈ برٹن نے ۱۸۵۳ء میں مسلمان کا بھیس بدل کر مکہ المکرمہ ، مدینہ منورہ ، ساتھ ہی حج کے جملہ امور میں مسلمانوں کے ساتھ رہا۔ برٹن نے اس سفر کی داستان اپنی کتاب 'پلگرم ٹو مدینہ اینڈ مکہ' میں قلم کی ہے۔ زبیری صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اپنے اس سفر کی تیاری اس نے سندھ میں بھیس بدل کر مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے کی۔ اسلامی شعائر کا مطالعہ کیا، مسلمانوں کے طرز زندگی ٔ آداب اور رسم و رواج سے واقفیت حاصل کی۔ اس نے بہت ہی ہوشیاری، دور اندیشی سے کام لیا۔ سفر حجاز پر جانے سے قبل اس نے اپنی ختنہ بھی کرالی اس سے اس کی احتیاط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

برٹن پانی کے جہاز کے ذریعہ مسلمانوں کے قافلے میں شریک ہو کر مکہ اور مدینہ میں حج کے ایام گزارے۔ سر رچرڈ برٹن کا مقصد محض سیاحت تھا۔ حجاز کے حالات اور مسلمانوں کے اس مذہبی طریقہ کا مطالعہ کرنا تھا، ماحول کا مطالعہ کرنا تھا۔ برٹن کے سفر کا تفصیلی مطالعہ اس کی کتاب یا رفیع الدین زبیری کی کتاب سے کیا جاسکتا ہے۔

نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد ہم مسجد نبوی سے واپس اپنے ہوٹل آ گئے۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہماری دیرینہ خواہش کی تکمیل کی اور ہم نے ۱۲ ربیع الاول کی شب روضۂ رسول ﷺ اور مسجد نبوی میں گزاری۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس عبادت کو قبول و منظور فرمائے۔ آمین۔ (۲۹ ستمبر ۲۰۱۴ء)

حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سے سعدیہ راشد سے ایک مکالمہ

متولی اعلیٰ: ہمدرد (وقف) پاکستان، چیرپرسن: ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان
صدر: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، مدینتہ الحکمہ، ہمدرد شوریٰ، ہمدرد نونہال اسمبلی
(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ سعدیہ راشد کا یہ انٹرویو ۱۴ دسمبر ۲۰۰۴ء کو لیا گیا)

تعارف:

سعدیہ راشد صاحبہ شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی بیٹی ہیں۔ شہادت کے بعد اپنے والد محترم کی جانشین ہوئیں۔ آپ نے ۱۹۸۰ء میں ہمدرد میں شمولیت اختیار کی۔ انتظامی امور کی تربیت آپ کو حکیم صاحب نے اپنے زندگی ہی میں دینا

شروع کر دی تھی۔ اس وقت ہمدرد وقف کی متولیہ اعلیٰ، چیرپرسن ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان، صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، صدر مدینتہ الحکمہ، صدر ہمدرد شوریٰ، صدر ہمدرد نونہال اسمبلی ہیں۔ سعدیہ راشد صاحبہ نے ازراہ عنایت راقم الحروف کو پاکستان میں کتب خانوں کی تحریک اور ترقی کے حوالے سے شہید پاکستان پر کی جانے والی اس تحقیق کے لیے وقت دیا۔ آپ سے یہ گفتگو آپ کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر، المجید، ناظم آباد میں ۱۴ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ہوئی۔

ا۔ آپ نے جب ادارہ ہمدرد میں شمولیت اختیار کی تو سب سے پہلے آپ کو حکیم محمد سعید کی کتاب Medicine in China کی ترتیب و تدوین کا کام سونپا گیا، اس وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟

ج: بالکل ابتدائی تاثرات تو فکر مندی کے تھے کہ یہ کام تو اس سے پہلے کیا ہی نہیں تھا، لیکن تجربے نے بتایا کہ کام خود استاد ہوتا ہے۔ آدمی دل سے جو کام کرے اس میں لطف بھی آنے لگتا ہے۔ چنانچہ میں نے جب کام شروع کیا تو مجھے لطف بھی آنے لگا، لیکن محنت بہت کرنی پڑی۔ خانم ڈی سلوا اس کام کا تجربہ رکھتی ہیں، ان کے مشورے اور تعاون شامل تھا۔ اس لیے میری فکر یا گھبراہٹ دور ہو گئی۔

۲۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی زندگی میں قرآن مجید کے بعد کونسی کتاب کا مطالعہ کیا۔

ج: مجھے جہاں تک یاد ہے میں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبتہ النصوح، مراۃ العروس بالکل ابتدائی عمر میں پڑھے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد کی کتابوں کا مطالعہ بھی یاد آتا ہے۔ شاعری میں غالب اور اقبال کا کلام ذہن میں آتا ہے۔ ویسے میں نے شاعری کا مطالعہ باقاعدہ نہیں کیا۔

آپ نے اپنے والد محترم کے پیشہ حکمت کو نہیں اپنایا اس کے برعکس سوشیالوجی : ۳ میں ایم۔ اے کیا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔

ج: مجھے اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ نہیں آتی۔ اصل میں طب کی تعلیم ہو یا کسی اور فن کی، اس سے پہلے عام تعلیم ضروری ہوتی ہے، اس لیے میں نے ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد مجھے طب کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے تھی، جس طرح میرے ماموں زاد بھائی حکیم محمد یسین صاحب نے جامعہ طبیہ شرقیہ (موجودہ کالج آف ایسٹرن میڈیسن) سے حاصل کی، لیکن شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے حکیم صاحب نے ہمدرد کے مختلف عمومی، تحریری، اور انتظامی کاموں کے لیے تیار کیا۔ میری بڑی بیٹی ڈاکٹر ماہم منیر احمد نے جدید طب کی تعلیم حاصل کی ہے اور اس طرح علاج معالجے کے پیشے سے وابستہ ہیں۔

حکیم محمد سعید کو کتاب سے شدید محبت تھی، کیا آپ اس کی وجہ بتا سکتی ہیں؟ : ۴

ج: بچپن کے علم دوست ماحول، بڑے بھائی اور ان کے اہل علم احباب کی صحبت ملی۔ حکیم صاحب کے برادر بزرگ محترم حکیم عبدالحمید صاحب کے حلقۂ احباب میں حکماء کے علاوہ خواجہ حسن نظامی صاحب، مولانا احمد سعید صاحب مولانا قاضی سجاد حسین کرتپوری صاحب جیسے لوگ شامل تھے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں شہید پاکستان کو مطالعے کی اہمیت معلوم ہوئی اور کتاب کی محبت پیدا ہوئی۔

شہر علم یعنی مدینۃ الحکمہ کی شروعات شہید پاکستان نے لائبریری یعنی بیت الحکمہ کی : ۵ تعمیر سے کی۔ آپ ان کے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج: اس اقدام کو تحسین اور مسرت کے علاوہ کس نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حکیم صاحب کی علم اور کتاب سے محبت نے کتب خانے کو سب سے اولیت دی۔ وہ جانتے تھے کتاب اور کتب خانہ علم کا خزانہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی تعلیمی، علمی اور ثقافتی کام نہیں کیا جا سکتا۔

کیا حکیم صاحب آپ کو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے؟ : ٦

ج: حکیم صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ زبان سے درس دینے یا نصیحت کرنے کے بجائے نمونہ پیش کرکے اپنے چھوٹوں کو سکھاتے تھے۔ میری تعلیم و تربیت میں

بھی ان کا یہی اصول اور طریقہ تھا۔

کیا حکیم صاحب نے کبھی آپ کو کتابوں یا لائبریری کے بارے میں کوئی خاص : ۷
ہدایت دی؟

ج: شہیدِ پاکستان ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب پڑھو اور اچھی کتابیں پڑھو۔

بیرون ممالک جب کبھی آپ ان کے ہمراہ ہوتیں اور حکیم صاحب اپنا زیادہ وقت : ۸
کتابوں کے انتخاب اور خریداری میں صرف کیا کرتے تو اس وقت آپ کے کیا تاثرات
ہوا کرتے تھے؟

ج: مجھے بھی اچھا لگتا تھا اور میں کتابوں کے انتخاب میں حکیم صاحب کو مشورہ دیا کرتی
تھی ، جس کو وہ زیادہ تر خوشی سے قبول فرمالیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب دوران سفر ہوائی جہاز میں بھی عام طور پر لکھنے اور پڑھنے کا کام کیا : ۹
کرتے تھے۔اِس دوران جب کبھی آپ ان کے ہمراہ ہوتیں تو کیا اس صورت میں بھی وہ
لکھنے کا عمل جاری رکھتے اِس وقت آپ کے تاثرات کیا ہوا کرتے تھے۔

ج: جی ہاں، حکیم صاحب سفر کے دوران میں بھی لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے

تھے اور کوئی نہ کوئی ایسا کام اپنے ساتھ رکھتے تھے جس کو مکمل کرنا ہوتا تھا۔ کبھی وہ اپنا سفرنامہ بھی سفر کے دوران لکھا کرتے تھے، کبھی کسی رسالے مثلاً ہمدردِ صحت کے مضامین کی اصلاح یا ایڈیٹنگ کا کام بھی کرلیا کرتے تھے۔ اگر وہ مجھے کوئی کام دیتے تو میں وہ کام کردیا کرتی ورنہ میں کوئی دل چسپ کتاب پڑھنے لگتی تھی۔

۱۰ : کتاب کے حوالہ سے حکیم صاحب کی ناراضگی یا غصہ ہونے کا کوئی واقعہ جو آپ کے ذہن میں ہو۔

ج : کوئی متعین واقعہ تو اس وقت ذہن میں نہیں آرہا ہے۔ وجہ یہ بھی ہے کہ کتاب اور کاغذ حکیم صاحب کو سب سے زیادہ عزیز تھے، اس لیے گھر کے سب لوگ حکیم صاحب کی کتابوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔

۱۱ : آپ کے خیال میں حکیم صاحب کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ کسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

ج : حکیم صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ تو میرے خیال میں پاکستان میں "ہمدرد" کا قیام اس کا استحکام، اس کی توسیع و ترقی ہی ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جس نے پاکستان میں، مشرقی دواسازی کا معیار قائم کیا، اس کو وسعت دی اور اس کی وجہ سے ملک میں بہت سی جڑی بوٹیاں پیدا ہونے لگیں، کئی ادارے قائم ہوئے ان

اداروں نے اہم خدمات انجام دیں اور اللہ کا شکر ہے اب بھی انجام دے رہے ہیں۔

آپ کو حکیم صاحب کی کس عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟ : ۱۲

ج: میں کہہ سکتی ہوں کہ حکیم صاحب کی وقت کی قدر کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی عادت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

(انٹرویو مورخہ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۴ء کو سعدیہ صاحبہ کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر، المجید، ناظم آباد، کراچی میں کیا گیا)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ میرے مہرباں

وہ مجھ پہ تھے مہرباں ابھی کل کی بات ہے۔ میرا یہ اعزاز بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں آخری دیباچہ میری کتاب کا تحریر فرمایا

میرے مہربان، محبت کرنے والے استادلااساتذہ، معروف ادیب، دانش ور، محقق، نقاد، ماہر تعلیم، ماہر لسانیات، سوانح نگار،تذکرہ نویس ، نعت گو، مورخ، ماہر اقبات ، ماہر غالبیات، لغت نگار ومدیر سب سے بڑھ کر ایک ہمدر انسان ، محبت کرنے والے، قلمکاروں کی مدد کرکے خوش ہونے والے، تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے والوں کی دل و جان سے مدد کرنے والے اگست ۲۰۱۳ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اس کا جس قدر دکھ اور غم کیا جائے کم ہے ۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر صاحب سے میرے مراسم ادب اور کتاب کے حوالے سے قدیم تھے۔ وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ان کی محبت اور شفقت کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ میرااور ڈاکٹر صاحب سے تعلق کب اور کیسے ہوا یقیناً اس کا ذریعہ کتاب ہی تھی۔ ۱۹۹۷ء کی بات ہے میری ایک کتاب جو ایک ماہر کتابدار اختراتچ صدیقی

کی کتابیاتی واشاریہ جاتی سرگرمیوں کا جائزہ تھا شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تعارفی تقریب ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ایچ ای سی آڈیٹوریم کراچی میں منعقد ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے تقریب کے مہمانِ خصوصی کے لیے درخواست کی جو ڈاکٹر صاحب نے قبول کرلی جب کہ اس وقت کے ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمٰی کراچی سید انظار حسین زیدی نے تقریب کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ مقررین میں پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر، پروفیسر لطیف احمد انور، معین الدین خان، پروفیسر سراج الدین قاضی شامل تھے۔ڈاکٹر صاحب نے مہمان اعزار ہونے کے ناتے کتاب کی اہمیت اور افادیت پر سیر حاصل گفتگو کی ساتھ ہی میری کتاب پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ میرا ڈاکٹر صاحب کا براہِ راست پہلا تعلق تھا جو بعد میں قربت کے تعلقات کی صورت میں آخر تک قائم رہا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میری تفصیلی ملاقات ' حلقہ نیاز و نگار' کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۲۰۱۰ء بمقام ڈاکٹر قدیر خان آڈیٹوریم ،وفاقی اردو یونیورسٹی کے موقع پر ہوئی۔ مَیں ان دنوں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنسز میں ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے منسلک تھا اور دسمبر کی تعطیلات میں کراچی آیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈین آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ وچیر مین۔ شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد جو اس وقت سرگودھا یونیورسٹی سے منسلک تھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے کراچی

تشریف لائے۔ ان کا قیام میرے گھر ہی تھا۔ڈاکٹر تونسوی صاحب سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ تونسوی صاحب اور مَیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے گلشن اقبال گئے جہاں کچھ وقت ان کے ساتھ گزرا اور مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ڈاکٹر صاحب علیل تو تھے ہی لیکن ان میں اتنی قوت تھی کہ جب انھوں نے ہماری آمد کا علم ہوا تو اپنے ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے اور کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارا۔

نیاز و نگار کی اس ادبی کانفرنس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مخصوص احباب کے لیے جامعہ کراچی کے کیمپس میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اس ڈنر میں بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کافی وقت گزرا۔اس موقع پر ڈاکٹر صاحب سے نیاز و نگار اور دیگر ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔اس موقع پر ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب جو اب شیخ الجامعہ اردو ہیں اُس وقت جامعہ کراچی کے ڈین آف آرٹس تھے نے اپنی قیام گاہ واقع کراچی یونیورسٹی کیمپس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کے اعزاز میں پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں تونسوی صاحب کے ساتھ راقم کو بھی شریک اعزاز حاصل ہوا۔اس موقع کی جو باتیں اور یادیں ہیں کبھی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

مَیں مارچ ۲۰۱۱ء میں جامعہ سرگودھا سے واپس آگیا اور ملازمت نہ کرنے کا

ارادہ کیا ساتھ ہی اردو ادب کے حوالے سے لکھنے کی جانب مائل ہوا۔ گو اس سے قبل بھی میں بہت کچھ لکھ چکا تھا اور وہ چھپ بھی چکا تھا لیکن اب اپنی مکمل توجہ اردو ادب کے موضوعات پر لکھنے کی جانب مرکوز کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب جو بہت زیادہ فعال تو نہیں تھے لیکن اپنے ادبی جریدے ''نگارِ پاکستان '' کی تدوین واشاعت میں مکمل فعال تھے۔ رسالے کے مدیر سید محمد اصغر کاظمی میرے ساتھ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں رہ چکے تھے اس حوالے سے کاظمی صاحب سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور کاظمی صاحب کی نظر کرم سے میرے متعدد مضامین نگار پاکستان میں شائع ہوئے۔ ان مضامین فیض احمد فیضؔ پر میرا خاکہ ''فیض احمد فیضؔ ۔ میرا پرنسپل'' ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ، فاطمہ ثریا بجیاپر شائع ہونے والی کتاب ''بجیا'' برصغیر کی عظیم ڈرامہ نویس ...فاطمہ ثریا بجیا کی کہانی کی تعارفی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال، حبیب جالب ۔ شاعر عوام، شہید حکیم محمد سعید تحقیق کے آئینے میں، انٹر نیشنل اردو کانفرنس اردو زبان اور عصری آگاہی منقدہ جامعہ سرگودھا کی روداد شامل ہیں۔ ''

سوانحی مضامین پر مشتمل میری کتاب 'یادوں کی مالا: مختلف شخصیات کے بارے میں مصنف کے تاثرات، افکار اور انعکاسات''' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا''یادوں کی مالا'' لفظی اور

معنوی ہر اعتبار سے ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب مشہور قلم کار ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف ہے اور ان کے ذاتی تجربوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف لائبریرین شپ سے متعلق حضرات کے لیے نہیں بلکہ استفادۂ عام کا حق ادا کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تبصرہ نما اور خاکوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جو کچھ ہے وہ قدر و قیمت میں بلند پایہ ہے۔ صمدانی صاحب ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اب بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔کتاب بلحاظ زبان و بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی۔ کتاب نہایت صاف ستھرے انداز میں شائع ہوئی ہے اور قاری کو متوجہ کرتی ہے ۔ مضامین کی فہرست میں کچھ تو مختصر خاکے ہیں کچھ تنقیدی جائزے ہیں اور کچھ مختصر تذکرے، مگر اختصار میں بھی وہ سب کچھ آگیا ہے جو موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے جس میں لائبریرین شپ کی تقریباً تمام ہی معروف اور اہم شخصیات کا قابل توجہ احاطہ کیا گیا ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سارے علمی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی اور شخصیات پر لکھنے والوں کی رہنمائی کرے گی''۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی بصیرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس مقام پر تھے کہ بڑے بڑے ادیب و شاعر اپنی

تصانیف پر ان کے دیباچے اور تقریظ کے خواہشمند ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے قائل تھے۔ ان کی حوصلہ شکنی کے نہیں۔ کتاب پر تبصرہ کرنے میں بھی انہیں کبھی جھجک نہیں ہوئی انھوں نے سو سے زیادہ کتابوں کے دیباچے اور تقریظیں لکھی ساتھ ہی چھ سو سے زائد کتابوں پر تبصرہ بھی کیا۔

میری شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا'' خاکہ نویسی کا فن ایک بہت مشکل فن ہے اور قطرے میں دریا بند کردینے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' کے ادبی خاکے اُن صاحبانِ ادب کے بارے میں ہیں جو تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کا حق ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی کا قلم کسی طویل تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں اور جو کچھ لکھ رہے ہیں نہایت کارآمد انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی یادداشتیں بہت مضبوط ہیں، ان کی نگاہ حقائق اور واقعات پر بڑی گہری رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی ایک باشعور صاحب قلم ہیں، مقبولیت و عدم مقبولیت یا کسی رسالے میں چھپنے نہ چھپنے پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے بلکہ ادب کی خدمت نہایت سلیقے اور لطیف پیرائے میں انجام دے رہے ہیں۔ ان کی

تحریروں کی سادہ بیانی و حق گوئی میں ایسا جادو ہے کہ وہ اپنے قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری کتاب ختم کیے بغیر اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا قلم اسی طرح چلتا رہے گا اور فکر و نظر پر قابلِ توجہ تاثر چھوڑتا رہے گا۔ جن شخصیات و موضوعات پر خاکے لکھے گئے ہیں وہ اگرچہ جانے پہچانے ہیں لیکن صاحبِ کتاب یعنی ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے ان کی قدر و قیمت کو اتنا بلند و بالا کر دیا ہے کہ خاکہ نگاری کی خاص صنف میں رئیس احمد صمدانی کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ ہو گیا ہے''۔ میں لکھاریوں میں اپنے آپ کو ادنیٰ لکھنے والا اور ادیبوں کی فہرست میں اپنے آپ سب سے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری تحریر پر جو رائے دی یہ میری نہیں بلکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بڑائی ہے۔ بلاشبہ وہ ادب کی دنیا کی بڑی شخصیت تھے۔

جولائی ۲۰۱۳ء کی بات ہے مَیں اپنی ایک کتاب بیکانیر راجستھان کے ایک معروف شاعر آزادؔ بیکانیری جو میرے جدِامجد بھی ہوتے ہیں کی شخصیت و شاعری پر مشتمل کتاب شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت اور شاعری'' مکمل کر چکا تھا۔ خواہش تھی کہ اس کتاب'' پر بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا دیباچہ ہو۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب بہت زیادہ ع علیل تھے نقاہت اور کمزوری زیادہ ہو چکی تھی ۔اپنی اس بات کا اظہار میں نے سید محمد اصغر کاظمی ، جو رسالہ 'نگارِ پاکستان' کے

مدیر ہیں سے کیا۔ وہ رسالے کے سلسلے میں ہر اتوار کی صبح ڈاکٹر صاحب کے پاس جایا کرتے تھے۔ مجھے اس بات کا علم بھی تھا کچھ عرصہ قبل مَیں ان ہی کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے بھی جاچکا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے جو صاحب فراش تھے ان کے لیے اٹھنا اور بولنا بھی مشکل تھا اس بات کا اظہار کیا کہ صمدانی صاحب اپنی ایک کتاب پر ان کے دیباچے کے خواہش مند ہیں ۔ڈاکٹر صاحب کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ بھی سکیں۔ پھر بھی انہوں نے میری خواہش کو رد نہیں کیا اور کہا کہ جوں ہی انہوں نے اپنی طبیعت بہتر محسوس کی وہ یہ کام کردیں گے۔ یہ بات جولائی کے ابتدائی ایام کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بستر پر لیٹے لیٹے کاظمی صاحب کو دیباچے کے نکات ڈکٹیٹ کرائے۔ چند دن بعد کاظمی صاحب نے دیباچہ مکمل کرکے ڈاکٹر صاحب کو پڑھ کا سنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیباچے سے بعض جملے نکالنے اور بعض میں ردو بدل کرنے کی ہدایت کی۔ڈاکٹر صاحب کا تصحیح شدہ دیباچہ کاظمی صاحب نے مجھے ۱۷ جولائی کو لاکر دیا اس دیباچے پر ۱۱ جولائی کی تاریخ درج ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کاظمی صاحب کو یہ بھی ہدایت کی کہ دیباچے کے آخر میں درج تاریخ نہ لکھی جائے۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب دیگر احباب کو اس طرح کے کاموں کے لیے معزرت کرچکے ہوں گے اور اس پر تاریخ درج ہوجانے سے دیگر مصنفین ان سے دیباچے یا تقریظ کے لیے رجوع کرسکتے تھے۔ اس طرح مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دمِ رخصت آخر میری کتاب کا

دیباچہ تحریر فرمایا۔ مَیں اس اعزاز پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ میری یہ کتاب ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب اس قدر جلد چلے جائیں گے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ مجھ پر تھے مہرباں ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ میں ان کے سفر آخر میں شریک رہا اور دیگر احباب کے ہمراہ انہیں منزل مقصود جامعہ کراچی کے قبرستان تک پہنچایا۔ اس سفر کا حال 'اردو کے نامور استاد، ادیب و محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر آخر' عنوان سے لکھ چکا ہوں جو ہماری ویب پر آن لائن موجود ہے۔اس کا یو آر ایل

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41952 ہے۔پروردگار ڈاکٹر صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن۔ ایک جائزہ

(مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور
کتب خانوں کی ترقی میں
شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے ماخوذ۔ مقالے میں یہ مضمون لائبریری تحریک اور
کتب خانوں کی ترقی میں
پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کا کردار کے عنوان سے شامل ہے ،۔
جگہ کی کمی کے باعث مضمون کو مختصر کیا گیا)

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن ۱۹۵۷ء میں قائم ہوئی اس سے قبل ملک میں کئی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن جو مغربی پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے نام سے اپنی سر گرمیوں کا آغاز ۱۹۴۸ء میں کر چکی تھی، کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کا قیام ۱۹۴۹ء میں عمل میں آیا اور پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔ لاہور کے بعد کراچی لائبریری سر گرمیوں کا مرکز بنا۔ اس کی اہم وجہ ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم ، فضل الٰہی مرحوم، سید ولایت حسین شاہ مرحوم، محمد شفیع مرحوم، جمیل نقوی مرحوم ، نور محمد خان مرحوم ، قاضی حبیب الدین احمد، اختر ایچ صدیقی مرحوم اور ابن حسن قیصر مرحوم کی کراچی میں موجودگی تھی

جو کراچی لائبریری ایسو سی ایشن اور پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی سرگرمیوں کو آب وتاب کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے۔ قومی سطح پر انجمن کی موجودگی شدت سے محسوس کی جارہی تھی ۔ ڈاکٹر عبدالمعید کے مطابق پاکستان کی سطح پر انجمن قائم کرنے کی ضرورت ۱۹۵۰ء میں اس وقت سے محسوس کی جانے لگی جب کراچی لائبریری ایسو سی ایشن نے 'پاکستان لائبریری کنونشن' کے انعقاد کی ایک اپیل شائع کی ، لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا۔ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ نے ۱۹۵۴ء میں عبدالمعید اور اختر صدیقی کی تحریک پر ایک کمیٹی ایچ اے قاضی کی سربراہی میں قائم کی جس کا مقصد ملک کے لائبریرینز سے رابطہ کرکے پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے قیام کے بارے میں خیالات سے آگہی حاصل کرنا تھا۔ ڈاکٹر انیس خورشید نے پی ایل اے کے قیام کی ابتدا کے بارے میں لکھا کہ ' پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی میٹنگ منعقدہ ۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو قاضی حبیب الدین احمد کی سربراہی میں ایک ایڈہاک کمیٹی 'قومی ایسو سی ایشن قائم کرنے کی غرض سے قائم کی'۔ '

ملک میں قومی انجمن کے قیام کو حتمی شکل دینے کے لیے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی میٹنگ ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء بمقام سینٹرل سیکرٹیریٹ لائبریری میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت گروپ کے صدر ڈاکٹر امداد حسین نے کی۔ایک ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جناب قاضی حبیب الدین احمد جو گروپ کے نائب صدر تھے

اور حکومت پاکستان کے شعبہ لائبریریز وآرکائیوز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی تھے کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ اراکین میں اختر صدیقی، سید ولایت حسین شاہ مرحوم، خواجہ نور الٰہی مرحوم اور فضل الٰہی مرحوم شامل تھے۔ اختر صدیقی نے جو پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے بانیوں میں سے ایک تھے اپنے انٹرویو میں پی ایل اے کے قیام کے بارے میں بتایا کہ '' پاکستان بننے کے ۱۰ سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں لائبریری تحریک کا تیسرا دور کراچی سے شروع ہوا۔ پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ نے اپنی ایک میٹنگ ۶ جولائی ۱۹۵۴ء میں ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ وقت ہے کہ اب پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کو قائم کرنے کے لیے کام شروع کیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم اس وقت امریکہ میں تھے ان کی واپسی پر انہیں بھی ایڈ ہاک کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ ان کے علاوہ ابن حسن قیصر، عبیداللہ سیفی، حامد حسن رضوی اور وکیل احمد جعفری کو بھی ایڈھاک کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ پی ایل اے (PLA) کے قائم کرنے میں جو لائبریریز حضرات پیش پیش تھے ان میں ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم، قاضی حبیب الدین احمد، اختر صدیقی، خواجہ نور الٰہی مرحوم (لاہور)، عبدالصبوح قاسمی مرحوم (پشاور)، ڈاکٹر محمد علی قاضی مرحوم (حیدرآباد)، ابن حسن قیصر مرحوم، حامد حسن رضوی مرحوم (کراچی)، عبیداللہ سیفی (کراچی) ، محمد صدیق خان (سابقہ مشرقی پاکستان)، احمد حسین (ڈھاکہ)، مطاہر علی خان (ڈھاکہ) اور حمایت علی شامل تھے۔

پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کی ایڈہاک کمیٹی کی جدوجہد کے نتیجے میں قومی ایسو سی ایشن کی رکنیت سازی کی مہم شروع ہوئی، پوسٹل بیلٹ کے ذریعہ انتخابات مارچ ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئے۔اختر صدیقی کے مطابق پی ایل اے (PLA) قائم ہوجانے کے بعد پورے ملک سے ۴۰ لائبریرین حضرات نے ممبر شپ حاصل کی، سالانہ چندہ پانچ روپے مقرر کیاگیااس طرح کل ۲۰۰ روپے حاصل ہوئے یہ رقم الیکشن اور دیگر اخراجات کے لیے بہت کم تھی اس میں مزید اضافہ چند مقامی بک سیلرز کے مالی تعاون سے ہو سکا۔ ممبر سازی کے بعد الیکشن کا مرحلہ شروع ہوا، انتخابات ڈاکٹر محمود حسین مر حوم کی سربراہی میں ہوئے، الیکشن کے نتیجے میں پی ایل اے (PLA) کی جو منتظمہ منتخب ہوئی اس کے عہدیداران میں نائب صدور، قاضی حبیب الدین احمد (کراچی)، اے رحیم خان (لاہور)، محمد صدیق خان (ڈھاکہ) سیکریٹری جنرل، ڈاکٹر عبدالمعید؛ اسسٹنٹ سیکریٹری، اختر ایچ صدیقی؛ خازن، عبیداللہ سیفی؛ اراکین، خواجہ نورالہی، احمد حسین، ڈبلیو اے جعفری، ابن حسن قیصر، عبدالصبوح قاسمی شامل تھے۔ صدارت کے لیے مجلس منتظمہ نے متفقہ طور پر ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کو پی ایل اے کی صدارت کی پیش کش کی جو ڈاکٹر صاحب نے قبول کر لی، وہ پی ایل اے کے ۱۹۵۷ء ۔ ۱۹۶۱ء اور دوسری بار ۱۹۷۳ء ۔ ۱۹۷۵ء تک صدر رہے۔ خواجہ نورالہی مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر حیدر نے لکھا ہے کہ 'خواجہ صاحب تو اس مملکت خداداد میں لائبریری تحریک کی

بنیاد کے معماروں میں سے تھے۔ موصوف کا شمار پاکستان میں تحریک کتب خانہ کے ہراول دستے میں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا شمار تو اس دستے کے سالاروں میں ہوتا ہے''۔

دستورِ اساسی

پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کے آئین کے مطابق ابتدا میں ایسوسی ایشن کا ہیڈ کوارٹر اس کے منتخب سیکریٹری کی رہائش کی جگہ ہوا کرتا تھا۔ اگر سیکریٹری درمیان میں کسی وقت اپنی ملازمت کے باعث ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہو جائے تو ایسوسی ایشن کا مرکز بھی اس کے ساتھ اسی شہر میں خود بخود چلا جاتا تھا۔ اس کے باعث مشکلات پیش آنے لگیں۔ ایسوسی ایشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس منعقدہ لاہور ۲۶۔۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء میں اصولی طور پر ہیڈ کوارٹر دو سال کے بجائے تین سال بعد تین شہروں کراچی، ڈھاکہ اور لاہور منتقل کرنے کی منظوری دی۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد ایسوسی ایشن کے آئین میں ترمیم لازمی ہو گئی تھی۔ چنانچہ کراچی میں اس مقصد کیلیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں نویں سالانہ کانفرنس (۴۔۵ اگست ۱۹۷۳ء بمقام سوات) میں ایسوسی ایشن کے دستور میں ترمیم کرتے ہوئے ڈھاکہ کی جگہ دارالخلافہ اسلام آباد اور صوبہ بلوچستان و سرحد کو اس نظام کا حصہ بنانے کی تجویز دی۔ ساتھ ہی آئین میں ترامیم مرتب کرنے کیلیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی۔ اس

کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ایسو سی ایشن کا نیا آئین دسویں سالانہ کانفرنس (۳۱ اگست ۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۵ء بمقام لاہور) میں منظور ہوا۔ آئین کے آرٹیکل نمبر ۲ کے مطابق ایسو سی ایشن کا ہیڈ کواٹر خود بہ خود ہر دو سال بعد اسلام آباد، لاہور، کراچی، کوئٹہ اور پشاور منتقل ہو گا۔

کانفرنسیز

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن نے سالانہ کانفرنس کے انعقاد کو اپنانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن کئی وجوہات کے باعث ایسا ممکن نہیں ہوا اور یہ ایسو سی ایشن ۵۶ سالوں (۱۹۵۷ء سے ۲۰۱۲ء) میں صرف ۱۸ کانفرنسیں منعقد کر سکی۔ اولین کانفرنس (۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء) کو ہوئی جس کا افتتاح اس وقت کے ملک کے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا نے کیا جب کے صدارت کے فرائض ایسو سی ایشن کے صدر ڈاکٹر محمود حسین نے انجام دیئے۔ یہ ایک خوشگوار آغاز تھا۔ اس اقدام سے لائبریری ایسو سی ایشن کو تقویت ملی، اراکین اور لائبریریز کے حوصلے بلند ہوئے جب کہ لائبریری پروفیشن کو پاکستان میں پہلی بار عوام الناس میں پذیرائی حاصل ہوئی اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ شہرت اور بلند اس کے بعد یہ اعزاز حاصل نہ کر سکی ۔پاکستان لا (PLA) مقام حاصل ہوا۔ پی ایل اے ئبریری ایسو سی کی منعقدہ کانفرنسوں نے پروفیشن پر دور رس اثرات مرتب کیے اور لا ئبریرین شپ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کانفرنسوں نے

ایک جانب اراکین کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع فراہم کیا تو دوسری جانب لائبریری پروفیشن کے مسائل ومشکلات پر تبادلہ خیال کرنے اور ان کے حل کی تجاویز نکالنے میں مدد دی، یہ کانفرنسیں لائبریری لٹریچر کی تدوین واشاعت کا ذریعہ بھی بنیں، ان کانفرنسوں میں منظور ہونے والی قرار دادوں نے لائبریری پروفیشن کے لیے ایک قوت کا کام کیا۔ ایسو سی ایشن کی تجاویز حکومت اور دیگر ترقیاتی اداروں کے لیے کتب خانوں کی منصوبہ بندی کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ حکومت کی تعلیمی پالیسوں اور ترقیاتی منصوبوں میں ایسو سی ایشن کی تجاویز شامل کی گئیں۔ ایسو سی ایشن نے حکام بالا کو لائبریری قانون کی اہمیت کو باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی، اس مقصد کے لیے قومی سطح پر ایک کانفرنس بھی منعقد کی۔ بد قسمتی سے ایسو سی ایشن اپنے اس مقصد میں تا حال کامیاب نہیں ہو سکی۔ ملک میں ڈیپارٹمنٹ آف لائبریریز کا قیام، قومی کتب خانے کا قیام، ٹیکنکل ورکنگ گروپ کا قیام، لائبریری تعلیم کے فروغ اور ترقی کے اقدامات، لائبریرینز کو بہتر ملازمت کے مواقع اور بہتر گریڈ کے حصول میں ایسو سی ایشن کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے ۲۰۰۵ء کے درمیان منعقد ہونے والی قومی کانفرنسوں کی تعداد ۱۸ ہو چکی ہے۔

ایسو سی ایشن کی منعقدہ کانفرنسوں کے دور رس اثرات رونما ہوئے۔ ان میں منظور ہونے والی قراردادوں نے بہت سے پیشہ ورانہ مسائل کے حل میں اہم کر

دار ادا کیا۔ کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے مقالات لائبریری مواد میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ پاکستان لائبریری ایسو سی نے قومی کانفرنسوں کے علاوہ متعدد سیمینار، ورکشاپ، لائبریری ویک، تربیتی کورسیز بھی ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کیے۔

مطبوعاتی پروگرام

کسی بھی پروفیشنل ایسو سی ایشن کے لئے مطبوعات جن میں کتب، ڈائریکٹریز، گائیڈ بکس، تجاویز و سفارشات، رپورٹ، روداد، رسالے اور خبر نامے کی اشاعت ایک لازمی امر ہوتا ہے۔ یہ ماخذ کسی بھی ایسو سی ایشن کو استحکام دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن نے اپنے قیام کے فوری بعد مطبوعات کی تدوین و اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ سہ ماہی رسالہ ''پاکستان لائبریر ایسو سی ایشن جرنل (PLA Journal)'' کے نام سے جولائی ۱۹۶۰ء میں جاری کیا جو وقفہ وقفہ سے شائع ہوتا رہا، خبرنامے بھی مرکز اور برانچ کونسلیں اپنے اپنے طور پر شائع کرتی رہی ہیں۔ ایسو سی ایشن کی پہلی کانفرنس ۱۹۵۸ء میں جب کہ ۱۹۹۷ء میں اس کی سولھویں کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔ روداد کی اشاعت پر ایسو سی ایشن نے خصوصی توجہ دی جس کے نتیجے میں اکثر کانفرنسوں کی رودایں د شائع ہوئیں۔ سیمینار، ورکشاپ، توسیعی لیکچرز اور میٹنگز کی رپورٹس بھی شائع ہو تی رہیں ہیں۔

جریدہ جرنل

ایسو سی ایشن نے جولائی ۱۹۶۰ میں ایک سہ ماہی رسالہ "پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن جرنل" (PLA Journal) کی اشاعت شروع کی۔ابتدائی دو سالوں میں صرف تین شمارے شائع ہونے کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں اشاعت دوبارہ شروع ہوئی لیکن دو شماروں کے بعد رسالے کی اشاعت ۱۹ برس منقطع رہی۔ ۱۹۸۷ء سے رسالہ وقفہ وقفہ سے شائع ہونا شروع ہوا، اس دوران ۱۹ شمارے شائع ہوئے، آخری شمارہ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا اس کے بعد سے رسالے کی اشاعت منقطع ہے۔ رسالہ کی اشاعت کے تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہنے کی ایک اہم وجہ ایسو سی ایشن کے مستقل صدر مقام کا نا ہونا اور انتخابات کی صورت میں اس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے۔۴۵ سالوں (۱۹۶۰ء۔ ۲۰۰۵ء)تک رسالہ کے صرف ۲۵ شمارے شائع ہوسکے۔پی ایل اے جرنل کے مضامین کے اشاریہ کے مطابق ۲۵ شماروں میں ۱۹۳ مضامین شائع ہوئے۔

رودادیں اور مطبوعات

سیمینار، توسیعی لیکچرز، ورکشاپز اور کانفرنسوں کی رودادوں کو تحقیق میں خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لائبریرین شپ کی عالمی انجمنیں اپنے اجلاسوں کی رودادیں باقاعدگی سے شائع کرتی ہیں۔اس طرح نہ صرف ایسو سی ایشن کی کار

کردگی طباعتی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے ساتھ ہی یہ لائبریری مواد میں گراں قدر اضافہ بھی ہوتا ہے۔ عام قارئین اور محققین ان سے مستفیض بھی ہوتے ہیں۔ پاکستان اور پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (SPIL) میں انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے بڑی حد تک اپنے منعقدہ اجلاسوں کی (PLA) روداديں شائع کیں۔ یہ رودادیں نہ صرف پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں ایک گران قدر اضافہ ہیں بلکہ انہیں تحقیقی اہمیت بھی حاصل ہے۔ پاکستان لائبریرین شپ پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی محقق انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایسوسی ایشن نے کل ۱۶ کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان میں سے ۱۱ کانفرنسوں کی رودادیں شائع ہوئیں۔

پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن سہ ماہی جرنل کے علاوہ خبر نامے بھی شائع کرتی رہی ہے۔ یہ خبر نامے مرکز اور برانچ کونسلوں نے اپنے اپنے طور پر بھی شائع کیے۔ ۱۹۹۰ء پر پی ایل اے کے ذریعہ (NLDP)) کے بعد جب نیدر لینڈ لائبریری ڈیولپمنٹ پروجیکٹ عمل ہو رہا تھا پنجاب برانچ کونسل اور فیڈرل برانچ کونسل کے خبر نامے ''خبر نامے کم رسائل زیادہ'' ہو گئے تھے۔ ان خبر ناموں میں خبروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کے اختتام کے (NLDP)) مضامین بھی شائع ہوئے۔ یہ ایک اچھی روایت تھی۔ لیکن ساتھ ہی نہ صرف یہ روایت ختم ہو گئی بلکہ خبر ناموں کی اشاعت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں ایک ماہانہ اور ۱۹۶۰ء

میں ایک سہ ماہی خبر نامہ جاری کیا۔ دونوں خبر نامے بالترتیب ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء میں بند ہو گئے۔

پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے خبر ناموں اور جرنل کے علاوہ بھی مطبوعات شائع کیں ۔۱۹۷۸ء میں سندھ برانچ کونسل نے اپنے ایک سیمینار (Problems of Libraries and Librarians in Sindh کی روداد شائع کی۔ ۱۹۸۸ء میں فیڈرل برانچ نے بشیر چوہان اور محمد جاوید کی مرتب کردہ لائبریری ڈائریکٹری ، ۱۹۸۱ء میں سید ارشاد علی کی مرتب کردہ ڈائریکٹری، ۱۹۸۵ء میں بلوچستان ہیڈ کواٹر نے ۱۹۹۰ء میں اراکین کی ڈائریکٹری، ۱۹۹۶ء میں اسلام آباد ہیڈ کواٹر (Who's Who) نے ڈیپارٹمنٹ آف لائبریریز ،حکومت پاکستان کے تعاون سے ایک جامع پاکستانی لائبریریز پر مشتمل ڈائریکٹری شائع کی ۔ ۱۹۸۰ء کے بعد ہیڈ کواٹر پشاور منتقل ہوا اور کئی مختصر مطبوعات منظر عام پر آئیں ۔ ان میں لائبریریز کے لئے ضابطہ اخلاق، انٹر میڈیٹ لائبریری سائنس کا نصاب ،کالج لائبریریز کے لیے معیارات ، خصوصی کتب خانوں کے لیے معیارات ،ایسوسی ایشن کا ترمیم شدہ دستور، شامل ہیں ۔ ۱۹۸۹ء میں کراچی مرکز نے لائبریری خدمات میں معیارات کے حوالے سے ایک سیمینار منعقد کیا جس کی روداد شائع کی گئی اسی سال لائبریریز واطلاعاتی مرکز کے کردار کے حوالے سے توسیعی لیکچر کا اہتمام کی گیا جس کی روداد صادق علی خان نے مرتب کی۔

اسی سال ایسوسی ایشن نے ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ وترقی کے لیے 'لائبریری کا ہفتہ' (Library Week) کا اہتمام کیا۔ جس میں افتتاحی سیشن کے علاوہ تعلیمی اجلاس، صحافیوں کا اجلاس، ماہرین قانون کا اجلاس (Bench and Bar)، سائنس دانوں کا اجلاس، طلبہ کا اجلاس، مصنفین کا اجلاس اور دانشوروں کا اجلاس شامل تھا۔ اس کی روداد سندھ برانچ نے شائع کی۔ پی ایل اے کی جانب سے لائبریری کا ہفتہ' (National Library Week) ۲۷ اکتوبر سے ۲ نومبر ۱۹۶۶ء میں ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کیا گیا، اس وقت ہیڈ کوارٹر لاہور (۱۹۶۶ء۔۱۹۶۹ء) میں تھا۔ ایسوسی ایشن نے کئی اور قابل تعریف پروگرام بھی اس دوران منعقد کئے جیسے ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی یاد میں مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا اس کی روداد 'خورشید نشاں' کی جانب سے شائع کی۔ پنجاب میں بھی ایک مجلس مذاکرہ ''کالج لائبریریز کے مسائل'' پر شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ پنجاب، پی ایل اے، پنجاب اور پنجاب کالج لائبریریز ایسوسی ایشن کے اشتراک سے اپریل ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوا۔ اس مذاکرہ کی روئیداد ڈاکٹر ممتاز انور نے مرتب کی اور شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ پنجاب نے شائع کیا۔ڈاکٹر محمود حسین کی صدارتی تقاریر، خیالات و نظریات پر مبنی کتاب کراچی یونیورسٹی نے ۱۹۷۴ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب لائبریری مواد میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ سندھ برانچ کونسل نے کارکردگی کی رپورٹ بھی شائع کی۔

پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن لائبریرینز کی ایک قومی اور نمائندہ تنظیم ہے۔ اس نے اپنے قیام سے آج تک قومی نوعیت کے مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر ملک کی نمائندگی کی۔ عالمی اداروں یونسکو، اِفلا اور دیگر مما لک کی انجمنوں سے یہ رابطہ اور تعاون جاری رکھے ہوئے ہے۔ نیدرلینڈ حکومت نے پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی کے پروگرام نیدرلیند لائبریری ڈیولپمنٹ پروگرام پر عمل درآمد کیلیے پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کو ہی ذمہ داری سونپی۔ یہ پروگرام پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی عملی کوششوں سے ہی کامیاب ہو سکا۔ لائبریری سائنس کے مختصر مدت کے کورسیز کے علاوہ ملک میں لائبریری آٹومیشن کی ابتدا اور فروغ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ایسوسی ایشن نے لائبریری پروفیشن کی ترقی کے لیے دیگر کئی اہم کارنامے بھی انجام دئے۔ ان میں ملک میں کاپی رائٹ ایکٹ (Copyright Act) کا نفاذ، ڈائریکٹریٹ آف لائبریرینز کا قیام، قومی کتابیاتی یونٹ کا قیام، اسلام آباد میں قومی لائبریری کا قیام، ملک کی مختلف جامعات میں لائبریری اسکولوں کے قیام کی سفارش، ملک میں کتب خانوں کی ترقی کے لیے کیبنٹ کمیٹی کی تشکیل، ٹیکنکل ورکنگ گروپ کی تشکیل، پنجاب میں ڈائریکٹریٹ آف پبلک لائبریرینز اور پنجاب لائبریری فاؤنڈیشن کا قیام، قومی نصاب کمیٹی کا قیام، پاکستانی ناموں کی کیٹلاگ سازی کے اصول وضع کرنا جنھیں پیرس کانفرنس میں منظور کیا گیا، ملک

میں لائبریری ویک کا انعقاد، لائبریری سائنس کی تعلیم میں معیار قائم کرنے کی کوشش، لائبریریز کے لئے بہتر اور ٹیچرس کے مساوی تنخواہوں کے اسکیلوں (Salary Scales) کا حصول، ملک میں قائم دیگر لائبریری انجمنوں سے اشتراک عمل اور تعاون، عالمی اداروں سے تعاون، ملک میں لائبریری آٹومیشن کے قیام کے لیے جدوجہد، کتب خانوں کے قیام اور انہیں جدید طرز پر قائم کرنے میں معاونت اور فنی مہارت کی فراہمی، ملک میں عوام الناس میں لائبریری شعور پیدا کرنے کے اقدامات شامل ہیں۔ اس تمام جدوجہد کے باوجود ایسو سی ایشن کی ۴۸ سالا تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ایسو سی ایشن اپنے مقاصد میں مکمل طور پر کامیاب نہیں رہی۔ اس نے جو بھی پروگرام تشکیل دیے وہ عارضی نوعیت کے تھے۔ مستقل اور طویل مدت کے ترقیاتی پروگرام سامنے نہیں آئے۔ایسو سی ایشن کا مستقل صدر مقام یا سیکرٹیریٹ کا نا ہونا سب سے اہم اور بنیادی سبب رہا جس کے باعث ایسو سی ایشن وقفے وقفے سے ملک کے مختلف شہروں میں پناہ لیتی رہی۔ منتخب ہونے والے سیکریٹری کا قیام جس شہر میں ہوتا یہ اسی کے ساتھ گزر بسر کرتی رہی۔ پھر ایک اور تجربہ یہ کیا گیا کہ اسے ملک کے پانچ شہروں تک وسیع کر دیا گیا۔ اس صورت میں یہ ہر دو سال بعد کبھی اس سے بھی زیادہ حتیٰ کے دس دس سال ایک ہی جگہ غیر فعال رہی۔ موجودہ ہیڈ کواٹر ۱۹۹۷ء میں پشاور منتقل ہوا آئین کی رو سے تین سال بعد انتخابات اور کانفرنس کا انعقاد ہونا تھا لیکن آٹھ برس گذر جانے کے بعد

بھی آئینی تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ اس قسم کی صورت حال سے ایسو سی ایشن کی کارکردگی متاثر ہوئی، اس کا ریکارڈ ملک کے مختلف شہروں اور اشخاص میں تقسیم ہو گیا۔ اگر کوئی محقق اس ایسو سی ایشن کی کارکردگی کا تحقیقی نقطہ نظر سے جائزہ لینا چاہے تو اسے ملک کے متعدد شہروں میں جانا ہوگا اس کے باوجود یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ اس کی رسائی اس کے ریکارڈ تک ممکن ہو سکے گی یا نہیں کیوں کہ یہ ریکارڈ کسی آفس یا لائبریری میں محفوظ نہیں بلکہ اپنے اپنے دور کے سیکریٹریز صاحبان کے گھروں میں نا معلوم کس حال میں ہوگا۔ اب کوشش کی جارہی ہے کہ قومی ایسو سی ایشن کا صدر مقام دارالخلافہ اسلام آباد میں مستقل طور پر قائم رہے۔

پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جرنل (Pakistan Library & Information Science Journal) نے اپنے اداریوں میں پی ایل اے (PLA) کی کارکردگی کا تنقیدی نقطہ نظر سے کئی بار جائزہ لیا اور مسائل کے حل کی تجاویز بھی پیش کیں۔ اس کا خیال ہے کے پی ایل اے (PLA) نے اپنی کانفرنسوں میں جن مسائل کو موضوع بنایا اور وہ مسائل تا حال حل طلب ہیں ان میں لائبری قانون کا نفاذ، قومی لائبریری نظام، لائبریریز کے تنخواہوں کے اسکیل، لائبریری معیارات، قومی کیٹلاگنگ کوڈ، یکساں درجہ بندی نظام، قومی یونین کیٹلاگ، کتابیاتی اور معلوماتی ضبط شامل ہیں۔ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ایسو سی ایشن

مختلف مسائل کے لیے کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں تشکیل دے اور ذمہ داران ان مسائل کے حل کے لئے سنجیدگی اور محنت سے کام کریں۔۔ ۲۰۰۳ء کے شمارے میں ایسو سی ایشن کے عہدیداران کو ایسو سی ایشن کی موجودہ صورت حال کا احساس دلاتے ہوئے ایسو سی ایشن کو متحرک کرنے کی تجاویز پیش کی گئیں۔

ڈاکٹر انیس خورشید کی اس بات میں بہت وزن ہے کہ ' یہ ایسو سی ایشن کے لیے اچھا ہے اس سے زیادہ پیشے کے لیے کہ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن اب بھی مضبوط، زندہ رہنے کے قابل اور متحرک ہو جائے اپنی سوچ اور لائبریری مسائل کو حل کرنے میں جن سے یہ ملک دو چار ہے'۔ ایسو سی ایشن کو درپیش مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ حکومتی سطح پر اسے تسلیم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۹۸ء۔ ۲۰۱۰ء) کی تشکیل کے موقع پر شباب مرحوم نے اس بات کی کوشش کی کہ پی ایل اے کے کردار کو حکومتی سطح پر تسلیم کر لیا جائے اور اس کی شراکت کو پیشہ ورانہ سرگمیوں میں مان لیا جائے۔ پالیسی کا وہ ڈرافٹ جو حکومت نے ماہرین کو اپنی رائے دینے کے لئے بھیجا شباب مرحوم کی یہ تجویز شامل تھی لیکن پالیسی کے حتمی مسودے سے حذف کر دیا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کو پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل (Pakistan Medical and Dental Council, PMDC) کی طرز پر تسلیم کرے اور اسے بھی وہی مراعات، اختیارات اور حیثیت حاصل ہوں جو PMDC کو حا

صل ہیں۔ ایسی صورت میں پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن ایک مضبوط، فعال اور سر گرم ایسو سی ایشن کے طور پر پیشہ ورانہ مسائل کے حل میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ قومی ایسو سی ایشن کے مضبوط اور فعال ہونے سے لائبریرین شپ کو عروج اور وقار حاصل ہوگا اور اس پیشے سے وابستہ افراد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

حاصل مطالعہ

لائبریرین شپ کو ایک پیشہ کی حیثیت سے متعارف کرانے، اس کی ترقی اور فروغ میں پیشہ ورانہ انجمنوں نے مثالی کردار ادا کیا ہے۔ پیشہ ورانہ انجمنوں کی عملی جدو جہد کے نتیجہ میں لائبریرین شپ کو عروج حاصل ہوا۔ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کی ابتدا انہی پیشہ ورانہ انجمنوں کے ذریعہ ہوئی۔ جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں نے یہ ذمہ داری بہت بعد میں قبول کی۔ پاکستان میں لائبریری تحریک، کتب خانوں کے قیام و ترقی اور پیشہ کے فروغ میں پیشہ ورانہ انجمنوں کا کردار تاریخ ساز اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں پورے ملک کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ ۱۹۵۷ء سے مصروف عمل ہیں۔

اس کے تحت منعقد ہونے والی پیشہ ورانہ سرگرمیاں قومی سطح پر اثر انداز ہوئیں، ان کی آواز کو حکومتی سطح پر سنا گیا۔اس کی پیش کردہ تجاویز، سفارشات، میمورینڈم اور قراردادوں نے حکومت کی تعلیمی پالیسوں، ترقیاتی منصوبوں اور کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے اعلانات میں جگہ پائی۔اس کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔

پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن نے لائبریری تحریک، کتب خانوں کے فروغ و ترقی، ملک میں لائبریری خدمات کی بہتری، لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے فروغ، پیشہ ورانہ عملے کی بہبود و ترقی اور لائبریری لٹریچر کی تدوین و اشاعت میں جو خدمات انجام دیں مختصراً حسب ذیل ہیں۔

☆ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی پہلی کانفرنس منعقدہ ۱۹۵۸ء جس کی صدارت اس وقت کے صدر مملکت جنرل اسکندر مرزا نے کی لائبریری پروفیشن کے لیے خوش گوار ثابت ہوئی اس سے پیشہ سے منسلک افراد کے حوصلے بلند ہوئے اور پیشہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

☆ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی قائم کردہ 'نیشنل کمیٹی برائے کیٹلاگنگ پرنسپلز' کے مرتب کردہ اصولوں کو بین الاقوامی کیٹلاگنگ کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۱ء میں منظور کیا گیا۔

☆ سیمینار، کانفرنسوں، ورکشاپ، توسیعی لیکچر، لائبریری ویک کے انعقاد سے

ملک میں لائبریری شعور بیدار ہوا، کتب خانوں کے قیام اور ترقی کی راہ ہموار ہوئی۔ حکومت وقت نے اپنے منصوبوں اور پالیسیوں میں ایسو سی ایشنوں کی تجاویز کو جگہ دی۔

☆ مرکزی سطح پر ۱۹۴۹ء میں ڈائریکٹریٹ آف لائبریریز کا قیام۔

☆ ۱۹۶۱ء میں کاپی رائٹ کمیٹی کی تشکیل دی گئی۔

☆ ملک میں کاپی رائٹ ایکٹ ۱۹۶۲ء کا نفاذ ممکن ہوا۔

☆ ڈائریکٹریٹ آف لائبریریز کے تحت 'قومی کتابیاتی یونٹ' کا قیام اور ۱۹۶۲ء سے قومی کتابیات کی اشاعت۔

☆ ڈائریکٹریٹ آف پبلک لائبریریز پنجاب کا قیام۔

☆ پنجاب لائبریری فاؤنڈیشن کا قیام۔

☆ صوبہ سرحد میں ڈائریکٹریٹ آف پبلک لائبریریز کا قیام۔

☆ اسلام آباد میں پاکستان کی قومی لائبریری کا قیام۔

☆ ملک کی مختلف جامعات میں شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کا قیام۔

☆ ۱۹۸۱ء میں لائبریری ایڈوائزری کمیٹی کا قیام۔

☆ ملک میں کتب خانوں کی ترقی وفروغ کے لیے کیبنٹ کمیٹی کا قیام۔

☆ ۱۹۸۲ء میں ٹیکنکل ورکنگ گروپ کا قیام۔

☆ وزارت تعلیم حکومت پاکستان کے تحت قومی نصاب کمیٹی کا قیام اور انٹرمیڈیٹ و بی اے کے نصاب کی تشکیل۔

☆ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے تحت Standing Committee for Librarians) (کا قیام۔

☆ ملک میں لائبریری قانون کے نفاذ کی عملی جدوجہد کی گئی۔

☆ لائبریری معیارات تشکیل دیے گئے۔

☆ پیشہ ورانہ عملے کی تنخواہوں کے لیے اسکیل مرتب کیے گئے۔

☆ لائبریرینز کو اساتذہ کے مساوی گریڈ کا حصول ممکن ہو سکا۔

☆ ملک میں قومی ہفتہ لائبریرینز (لائبریری ویک) کے انعقاد کی روایت قائم کی گئی۔

☆ کراچی سٹی لائبریری کے قیام کو ممکن بنانے کی عملی جدوجہد کی گئی۔

☆ پاکستان کے کالجوں میں انٹر اور بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون کے اجراء کی جدوجہد۔

☆ ملک میں لائبریری آٹومیشن کی عملی کوشش۔

مسعود احمد برکاتی، پاکستان کے سینئر صحافی و مدیر سے مکالمہ

سینئر ڈائریکٹر: پبلی کیشنز ڈویژن، ہمدرد (وقف) پاکستان

(مسعود برکاتی صاحب سے یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے حوالے سے ۲۳ دسمبر ۲۰۰۴ء کو کیا یہ موضوع کی تحقیقی ضرورت تھا۔انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے "پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار" ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔برکاتی صاحب سے تحقیقی موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ۔برکاتی صاحب نے تمام سوالات کے تفصیلی جوابات دیئے۔)

تعارف:

مسعواحمد برکاتی صاحب ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کا تعلق ہندوستان کی ایک مردم خیز ریاست ٹونک سے ہے جس نے بے شمار نابغہ روزگار شخصیات کو جنم دیا۔ ادارہ ہمدرد سے وابستگی کی چھٹی دہائی میں ہیں یعنی نصف سینچری مکمل کر چکے ہیں۔ شہید حکیم محمد سعید کے انتہائی قریبی اور با اعتماد ساتھیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے،آپ کو ۴۷برس شہید پاکستان کی قربت

کا شرف حاصل رہا۔ حکیم صاحب نے برکاتی صاحب کے بارے میں تحریر فرمایا کہ " ان کا علمی مزاج ہمدرد کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اور ہمدرد کی علمی خدمات میں ان کی شرکت میرے لئے باعث مسرت و سہولت ہے"۔

بچوں کے معروف رسالہ " ہمدرد نونہال" کی ادارت ۱۹۵۳ء سے مسلسل کر رہے ہیں، ہمدرد صحت 'کے مدیر منتظم بھی ہیں۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ملک میں کوئی ' ادیب مسلسل ۵۲ برس تک بچوں کے ادب سے وابستہ اور بچوں کے رسالے کا مدیر نہیں رہا۔ صحافیوں کی تنظیم APNS نے ۲ مارچ ۱۹۹۶ء میں آپ کو "نشان سپاس" سے نوازا۔ برکاتی صاحب کے کرشماتِ قلم سے اب تک ۱۵ سے زیادہ کتب اور سینکڑوں مضامین منظر عام پر آچکے ہیں، شہید پاکستان پر آپ کو بلا شبہ ایک مستند اور معتبر لکھاری ہونے کا درجہ حاصل ہے، شہید پاکستان پر آپ نے بہت کچھ لکھا مضامین کے علاوہ آپ کی مختصر تصانیف 'انکل حکیم محمد سعید '، 'سعید پارے ' ، ' وہ بھی کیا دن تھے ' کے علاوہ انگریزی میں حکیم صاحب کی 'پروفائل' شامل ہے۔

مختلف علمی و ادبی اور سماجی اداروں اور انجمنوں کے رکن ہونے کے علاوہ ہمدرد وقف پاکستان کے ٹرسٹی اور پبلی کیشنز ڈویژن کے سینئر ڈائریکٹر ہیں۔ شہید پاکستان پر کی جانے والی تحقیق کے لیے راقم الحروف نے برکاتی صاحب

سے تفصیلی مکالمہ (انٹرویو) کیا، یہ مکالمہ کئی نشستوں میں مکمل ہوا۔ مصروفیات کے با وجود برکاتی صاحب نے تمام سوالات کے جوابات انتہائی تحمل سے دیے۔ انٹرویو کی آخری نشست ۲۳ دسمبر ۲۰۰۴ء کو آپ کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر، ناظم آباد میں ہوئی۔

کیا آپ اپنے پس منظر پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟ : ۱

ج: میرا پس منظر کئی پشتوں سے علمی ہے۔ پردادا سے آج تک علم و ادب اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ پر دادا عالم اور حکیم، دادا عالم اور حکیم، والد عالم اور حکیم، بھائی عالم اور حکیم، میں عامی اور مریض۔ پیدائشی صحافی ہوں ۱۴۔۱۵ سال کی عمر میں شوقیہ ایک قلمی رسالہ دادا علامہ حکیم برکات احمد کے نام پر'' البرکات'' نکالا تھا۔ ۱۹۵۲ء سے ادارۂ ہمدرد سے وابستہ ہوں۔ ۱۹۵۳ء سے ہمدرد نونہال کا مدیر ہوں اور اب کئی سال سے مدیرِ اعلیٰ۔ اس کے علاوہ رسالہ ہمدرد صحت کا مدیرِ منتظم ہوں۔ پاکستان میں اس لحاظ سے سب سے سینئر ایڈیٹر ہوں کہ کوئی اور صاحب مسلسل اتنا عرصہ ایڈیٹر نہیں رہے۔ اس کے علاوہ ہمدرد لیبارٹریز وقف کا ٹرسٹی (رکن مجلس امینان) ہوں۔ ہمدرد فاؤنڈیشن میں سینئر ڈائرکٹر پبلی کیشنز اور کوئی ۲۰ کتابوں کا مؤلف، مترجم اور مرتب ہوں۔

آپ حکیم محمد سعید کو کب سے جانتے ہیں اور ان سے آپ کے تعلقات کی نوعیت : ۲

کیا تھی؟

ج: میں حکیم صاحب محترم کو جانتا تو پہلے سے تھا، لیکن ملاقات ۱۹۵۲ء میں ہوئی اور اسی سال میں ادارہ ہمدرد سے منسلک ہوا۔

ان سے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ وہ بزرگ تھے، میں خورد۔ وہ افسر تھے، میں ماتحت۔ وہ رہنما تھے میں راہرو۔ حکیم صاحب کے ساتھ میں نے ۴۷ سال کام کیا۔ سیکھنے کے علاوہ کام کرنے کا جذبہ اور ڈھن بھی ان کی صحبت سے مجھ میں پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب کام کرنے والے کی بڑی قدر کیا کرتے تھے،کام کرنے والے اور کام سے خلوص رکھنے والوں کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی برداشت کرتے تھے۔ ان کی قدر دانی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے دل سے کام کرتے تھے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروے کار لاتے تھے۔

آپ ہمدرد سے کب اور کیسے منسلک ہوئے، ہمدرد سے آپ کا منسلک ہونا ایک مشن : ۳ تھا یا محض روزگار؟

ج: اس سے پہلے سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں کہ میں ۱۹۵۲ء میں ہمدرد میں شامل ہوا اور آج تک شامل ہوں اور انشاء اللہ رہوں گا۔ ہمدرد میں شمولیت کا محرک ہمدرد کی خدمات سے ذہنی تعلق تھا۔ اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے

قوتِ لایموت کا ذریعہ بھی ہمدرد بنا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میں ہمدرد کے مشن کا حصہ بنتا گیا اور ہمدرد کی علمی، اشاعتی اور تحریری جدوجہد میں سرگرم

ہوتا گیا۔ اب میری زندگی کا بہت بڑا حصہ ہمدرد سے متعلق ہے اور مجھے ہمدرد کا مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

حکیم صاحب آپ پر بھرپور اعتماد کیا کرتے تھے، کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟ : ۴

ج: ویسے تو میں اس سوال کے جواب میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس کا جواب تو حکیم صاحب ہی دے سکتے تھے، اور میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے مخلص سمجھتے تھے اور میری صلاحیتوں کے بارے میں بھی حسنِ ظن رکھتے تھے۔ حکیم صاحب کی عادت تھی کہ جب وہ تجربے سے کسی شخص کے متعلق یہ اندازہ کر لیتے کہ یہ شخص غیر مخلص نہیں، خود غرض نہیں بلکہ باوفا ہے، یعنی ان سے تعلق خاطر رکھتا ہے۔ ان کی تحریک، ان کے مشن کا سچائی کے ساتھ حامی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اس مشن کے لیے استعمال بھی کرتا ہے تو وہ اس کی قدر کرتے تھے، اس پر اعتماد کرتے تھے، اس کی خامیاں بھی بڑی حد تک برداشت کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شہید حکیم محمد سعید مجھے بھی قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔

حکیم صاحب سے آپ کس حد تک فکری ہم آہنگی رکھتے تھے؟ : ۵

ج: فکری ہم آہنگی اور آراء سے ”کامل اتفاق“ میں میرے نزدیک فرق ہے۔ دو

افراد میں فکری ہم آہنگی ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ لازماً ہر مسئلے، ہر معاملے، ہر فیصلے میں ہم خیال اور ہم رائے ہوں۔ حکیم صاحب سے میں بڑی حد تک فکری ہم آہنگی رکھتا تھا۔ ملک وملت کے بارے میں ان کی سوچ، میری سوچ اور طرزِ فکر ایک تھی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ اور بات کہ تفصیلات میں یا بعض مسائل کی بابت حکیم صاحب سے مختلف رائے رکھتا تھا اور اس کا مناسب طریقے سے اظہار بھی کیا کرتا تھا۔

حکیم صاحب کی شخصی خصوصیات اور اوصاف کے بارے میں کچھ بتایئے۔ : ٦

ج: شہید حکیم محمد سعید کے ذاتی اوصاف کو بہت کم الفاظ میں بیان کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ ذہانت اور محنت ان کی شخصیت اور کردار کے اہم ترین اوصاف تھے۔ حکیم صاحب کی زندگی محنت سے عبارت ہے۔ ان کو میں نے ان کی جوانی ہی سے لگن اور استقلال کے ساتھ کام کرتے دیکھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محنت کی عادت پختہ تر ہوتی گئی۔کام سے انتہائی دلچسپی اور یکسوئی کے ساتھ محنت انسان کے پوشیدہ جوہروں کو بروے کار لاتی ہے اور وہ اپنے کام میں نئی نئی باتیں اور نئی نئی راہیں تلاش کرلیتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک فی صد ذہانت اور ۹ فی صد محنت کے ملنے سے ایک عبقری (جینئس Ginius) بنتا ہے۔

کیا آپ حکیم صاحب کی فکر پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے ؟ : ۷

ج: فکر پر روشنی ڈالنے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ حکیم صاحب کی فکر تو اُن کے کاموں سے، اُن کی خدمات سے ظاہر ہے۔ انسانوں کی بھلائی کے لیے سوچتے رہنا اُن کی فکر کا محور تھا۔ طب، تعلیم، ادب، تحریر سب میں حکیم صاحب کی فکر اسی کے گرد گھومتی ہے۔

حکیم صاحب انتھک محنت کیا کرتے تھے، اس کا راز کیا تھا؟ : ۸

ج: کیا واقعی اس کا راز آپ کو بتادوں ؟ آپ مجھ سے یہ راز اگلوانا ہی چاہتے ہیں تو لیجیے بتائے دیتا ہوں۔ غور سے سنیں اور یاد رکھیں۔ ''مقصد سے محبت، یکسوئی اور عزم'' بس یہ تھا حکیم صاحب کی محنت اور انتھک محنت کا راز۔ یہ ایسا راز ہے جو ہم میں سے، بہت سوں کو معلوم تو ہوگا، لیکن اس پر عمل اتنا آسان نہیں۔ بعض لوگ عمل کرتے ہیں، مگر پوری طرح نہیں، محض نیم دلی سے اور بس۔ حکیم صاحب 'نیم دلی' کے لیے جو لفظ استعمال کرتے تھے وہ تھا ''تھڑدلی''۔ حکیم صاحب کوئی عمل تھڑدلی سے نہیں بلکہ پورے انہماک، التزام اور استقلال سے کیا کرتے تھے۔

! حکیم صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کو مختصر الفاظ میں بیان فرمائیں : ۹

:ج: حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت کا خلاصہ چند لفظوں میں یہی ہو سکتا ہے

ذہانت، عزم، عمل، حوصلہ، یقین، اعتماد۔ ان کی پوری وضاحت کے لیے تو صفحات کے صفحات درکار ہیں۔ مختصراً میں کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب ایک نہایت ذہین، پُر عزم انسان تھے۔ انھوں نے اپنی ذہانت کو پوری طرح استعمال کیا اور عزم و اعتماد کے ساتھ زندگی کی جدوجہد شروع کی اور ایک کے بعد ایک کام یابی حاصل کرتے گئے۔

۱۰ : حکیم صاحب کی شخصیت کے خاص پہلو جنھوں نے آپ کو متاثر کیا؟

ج: حکیم صاحب محترم کی شخصیت کا خاص بہت خاص پہلو ''عمل'' تھا، مسلسل عمل، مستقل عمل، دوسرے تمام پہلو، اسی پہلو کی بنیاد پر قائم ہوئے۔

۱۱ : آپ کے خیال میں کیا حکیم صاحب کو اقبال کا مردِ مومن کہا جا سکتا ہے؟

ج: اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔

۱۲ : حکیم صاحب نے بے شمار کارنامے انجام دیے آپ کے خیال میں سب سے بڑا یا اہم کارنامہ کسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: یہ فیصلہ بھی بہت مشکل ہے کہ حکیم صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے۔ مختلف لوگوں کی رائے میں مختلف کارناموں کو اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً مشہور ماہرِ قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم صاحب کہتے ہیں کہ حکیم محمد سعید صاحب کا

سب سے اہم کارنامہ بچوں کے لیے رسالہ ہمدرد نونہال نکالنا ہے۔ ان کے خیال میں دوسرے نمبر پر ہمدرد صحت کا شائع کرنا ہے کہ جو تعلیم یافتہ طبقے میں صحت کے اصولوں کو مسلسل پھیلا رہا ہے اور تعلیم صحت پر مفید معلومات کو عام کر رہا ہے۔ میرے نزدیک ان کے ساتھ تعلیم کی اشاعت کے لیے اداروں کا قیام بھی حکیم صاحب کا اہم ترین کام ہے، مثلاً ۱۹۵۸ء میں طبیہ کالج کا قیام، جس نے اب تک ہزاروں مستند اطباء پیدا کیے اور طبِ مشرقی کو باقی رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہمدرد پبلک اسکول اور ہمدرد یونی ورسٹی قائم جیسے SPIL کرنا بھی معمولی کارنامہ نہیں۔ پھر کتب خانوں کے فروغ و ترقی کے لیے اداروں کے لیے مسلسل کام کرکے کتاب کلچر کو فروغ دینا بھی بہت دور رس نتائج کا حامل ہے۔

حکیم صاحب کو کتاب اور کتب خانے سے عشق تھا، کیا آپ اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟ : ۱۳

ج: جی ہاں، حکیم صاحب کتاب کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی ابتدا ہی سے بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ۱۹۵۲ء سے تعلق رہا۔ دہلی سے کراچی ہجرت کرتے وقت ہی وہ خاصی کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے اور وہ ان کے گھر (ہمدرد ہاؤس) میں ہی موجود رہیں۔ اس کی ترتیب و تنظیم میں، میں بھی شریک رہا۔ نئی کتابوں کی خریداری کے علاوہ کتب فروش جو پرانی کتابیں فروخت کرتے تھے وہ ہمدرد ہاؤس پر کتابوں کے ''بنڈل'' لاکر دے جاتے تھے۔ میں

ان میں سے انتخاب کرتا اور ان کی قیمت طے کرتا۔ حکیم صاحب میرے انتخاب سے سو فی صد اتفاق کرتے ہوئے ان کی قیمت ادا کرنے کی منظوری دے دیتے۔ اس طرح بعض نادر کتابیں بھی حاصل ہوجاتیں اور ہمدرد کتب خانہ مالا مال ہوتا گیا پھر ساٹھ کی دہائی میں حکیم صاحب نے جناب جی اے مدنی (سابق کمشنر کراچی) کا مکان (نزد مزار قائدِاعظم) کرایے پر لیا اور حکیم صاحب سے متعلق (صدر ہمدرد کا سیکریٹریٹ) دفاتر اور کتب خانہ نئے مکان میں منتقل ہوگیا۔ یہاں چوں کہ گنجائش تھی، کتابوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب کتب خانے سے متعلق ہوگئے۔ پھر ہم وہاں سے ہمدرد سنٹر ناظم آباد میں منتقل ہوگئے۔ یہاں کتب خانے کے لیے بہت کشادہ ہال بنایا گیا تھا۔ (حکیم زبیری صاحب کتب خانے کے سربراہ تھے۔) پھر یہاں سے کتب خانہ مدینتہ الحکمہ منتقل ہوگیا اور اب مستقلاً وہیں ہے اور ہمدرد یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ اس سے خوب استفادہ کررہے ہیں۔ اسی دوران میں حکیم صاحب نے ایک انجمن کی بِنا ڈالی جس کا نام انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات Society for the Promotion and Improvement of Libraries, SPIL) رکھا گیا۔ اس انجمن نے لائبریری موومنٹ کے لیے بہت کام کیے۔ حکیم صاحب اس کام کے لیے بہت وقت دیتے تھے۔ اس انجمن میں مولانا عارف الدین صاحب سیکریٹری تھے اور بہت سرگرم اور فعال تھے وہ سائیکل پر انجمن کے کام کے لیے رابطے کرتے اور بہت محنت سے کام کرتے۔ عارف الدین صاحب نے اس انجمن میں کئی ممتاز لوگوں کو شامل کیا اور حکیم صاحب کی

صدارت میں اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس انجمن کے جملہ مصارف ''ہمدرد'' برداشت کرتا تھا۔ عارف صاحب کے علاوہ جناب عادل عثمانی بھی اس تحریک میں بہت مستعد اور معاون تھے۔

۱۴ : حکیم صاحب کے قائم کردہ شہر علم ''مدینتہ الحکمہ'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : اس میں رائے کیا مسئلہ ہے! یہ منصوبہ شہید حکیم محمد سعید کے پُر عزم منصوبوں میں سے ہے اور اب اس میں ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد کالج برائے اعلیٰ تعلیم کے علاوہ ہمدرد یونی ورسٹی بھی پھل پھول رہی ہے اور اب مدینتہ الحکمہ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مجھے یہ مسرت اور فخر حاصل ہے کہ اس منصوبے میں میرے نام کا سنگِ بنیاد بھی نصب ہے۔

۱۵ : مدینتہ الحکمہ میں قائم ہونے والی پہلی عمارت بیت الحکمہ (لائبریری) ہے، نہ صرف عمارت بلکہ لائبریری اپنی موجود صورت میں سب سے پہلے تکمیل کو پہنچی اور یہ تمام تر سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ تھی؟

ج : اس کی وجہ حکیم صاحب کی علم دوستی اور کتاب دوستی تھی، وہ اس بات کا ادراک رکھتے تھے کہ کتابوں کے بہترین ذخیرے یعنی اچھے کتب خانے کے بغیر

کوئی علمی اور تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔

حکیم صاحب طبیب ہونے کے علاوہ مصنف، مؤلف اور مدیر بھی تھے اور مختلف : ۱۶
موضوعات پر بے شمار لکھا۔ آپ نے انکی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوگا ! کیسا پایا؟

ج: مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں شہید حکیم محمد سعید کی تصانیف اور تالیفات اور تراجم میں ان کا شریک اور معاون رہا ہوں۔ اس سے آپ خود اندازہ اور فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کی تحریروں کے بارے میں میری کیا رائے ہوگی۔

حکیم صاحب نے طب و سائنس کے علاوہ تعلیم کے میدان کا انتخاب کیا اور اپنی بقیہ : ۱۷
زندگی تعلیم کے فروغ میں لگادی۔ آپ کے خیال میں کیا یہ اقدام درست تھا؟

ج: شہید حکیم محمد سعید صاحب کا یہ اقدام درست بلکہ بہت صحیح، قابل قدر اور لائق تحسین تھا۔

بیت الحکمہ جسے ایشیا کا سب سے بڑا کتب خانہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، کے بارے : ۱۸
میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: بیت الحکمہ دراصل حکیم محمد سعید شہید کی ذاتی لائبریری تھی۔ کچھ

کتابیں وہ اپنے ساتھ ہندستان سے لے آئے۔ اس کے بعد یہاں بھی مسلسل نئی اور پرانی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ جاری رہا اور یہ لائبریری زیادہ مال دار ہوتی گئی۔ پھر جب مدینتہ الحکمہ کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے لائبریری کی عمارت بنوائی اور اب یہ کتب خانہ عام اہلِ علم کے علاوہ ہمدرد یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت اچھا علمی خزانہ ہے۔

نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے SPIL آپ کے خیال میں حکیم محمد سعید اور : ۱۹
فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟

ج: اس سوال کا تفصیلی جواب دینا تو میرے لیے مشکل ہے، بلکہ اس کا جواب تو آپ خود زیادہ صحت اور وضاحت کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ بہرحال اس تحریک نے اپنے اثرات کے طفیل حکیم محمد سعید صاحب (SPIL) پیدا کیے۔ ایک فائدہ تو یہ بھی ہوا کہ اس ادارے اور ڈاکٹر محمود حسین صاحب جیسے ممتاز دانشوروں کی شرکت سے معاشرے میں خوش کی تعلیم پر بھی نوجوانوں کی توجہ بڑھی۔ حکومت Library Science گوار اثر پڑا، پھر کے متعلقہ محکموں پر اس تحریک نے اثر ڈالا اور وہ کتاب اور کتب خانوں کو اہمیت دینے لگے۔

حکیم صاحب سے آپ کی آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ : ۲۰

ج: حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دفتر (ہمدرد سنٹر) میں ہوئی۔ ہمدرد صحت

اور ہمدرد نونہال کی ترتیب کے بارے میں مختلف امور پر مشورہ ہوا۔ دو سال پہلے میں نے حکیم صاحب کی ایک کتاب ''حکیم محمد سعید کے طبی مشورے'' مرتب کی تھی۔ یہ کتاب صحت کے مسائل کے بارے میں نونہالوں کے مختلف سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے، جو حکیم صاحب لکھا کرتے تھے اور ہر ماہ ہمدرد نونہال میں یہ سوال و جواب شائع ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۸ء سے جاری تھا۔ ۱۹۹۶ء میں، میں نے ۱۸ سال کے سوال و جواب کو جمع اور مرض وار مرتب کیا اور مناسب عنوانات قائم کیے۔ کتاب مرتب کرنے سے پہلے حکیم صاحب کو بتایا نہیں تھا بلکہ جب کتاب طبع ہو کر آئی تو حکیم صاحب کو پیش کی۔ کتاب دیکھ کر حکیم صاحب حیرت و مسرت کے جذبات سے بے اختیار کہا جاسکتا ہے کہ) اچھل پڑے۔ ۱۶ء اکتوبر (۱۹۹۸) کی اس آخری ملاقات میں) بھی اس کتاب کا ذکر آیا کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے اور دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں، اب تیسرا ایڈیشن تیار کیا جارہا ہے تو اس کتاب میں کچھ اضافوں کی بات ہوئی۔ حکیم صاحب نے اس کتاب کی مقبولیت پر بھی خوشی کا اظہار فرمایا اور اضافوں کے سلسلے میں تبادلہ خیال ہوا۔ اس کے علاوہ بعض انتظامی اور دفتری امور پر مشورہ ہوا۔ میرے شعبے (ادارت) میں ایک نئے کارکن کا اضافہ حال میں ہوا تھا، ان کے معاوضے کی بات ہوئی۔ میری تجویز کو حکیم صاحب نے منظور فرمالیا، اور یہ بھی فرمایا کہ '' آپ ان کی درخواست پر نوٹ لکھ کر میرے دستخط بھی کروالیجیے گا۔'' یہ بات مجھے کچھ نئی سی لگی، کیوں کہ کافی عرصے سے حکیم صاحب نے اس قسم کے چھوٹے کاغذات پر دستخط کرنا چھوڑ دیے

تھے، اور میں زبانی مشورے کی بنا پر خود دستخط کرکے انتظامیہ کو بھیج دیا کرتا تھا، لیکن اس روز انھوں نے یہ بات فرمائی کہ میرے دستخط بھی کروالیجیے گا، چنانچہ میں نے ہدایت کے مطابق نوٹ لکھ کر شام کو فائل ہمدرد ہاؤس معمول کے مطابق بھجوادی اور حکیم صاحب نے اسی دن اس پر اپنے دستخط کردیے یہ فائل مجھے اتوار ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ کو واپس ملی۔ میرے شعبے کے کسی کارکن کی تقرری کے کاغذ پر حکیم صاحب کے یہ آخری دستخط ہیں۔

! حکیم صاحب کی عظمت کی دلیل میں کوئی واقعہ جو آپ کے ذہن میں ہو : ۲۱

ج : حکیم صاحب، یعنی شہیدِ پاکستان حکیم حافظ محمد سعید دہلوی کی عظمت کے لیے کوئی ایک واقعہ بیان کرنا مناسب نہیں ہوگا، کیوں کہ ان کی پوری زندگی علم و عمل ، اخلاق، خدمتِ وطن، خدمتِ خلق سے عبارت ہے اور عمر بھر ان کا یہی نصب العین رہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے ان کی عظمت کا۔

آپ کو حکیم صاحب کی کس عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟ : ۲۲

ج : مجھے حکیم صاحب کی کام کی عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور یہی عادت ان کی تمام کامیابیوں کی کلید ہے۔ حکیم صاحب نے اپنی یہ عادت اپنے رفقائے کار میں بھی پیدا کی۔ جس رفیق نے ان کی یہ عادت زیادہ اپنائی وہ زیادہ آگے بڑھا اور خوب کامیاب ہوا، جس نے یہ عادت کم اختیار کی وہ تھوڑا کامیاب ہوا

جو یہ عادت اختیار نہ کر سکا وہ ناکام رہا اور حکیم صاحب کے ساتھ نہ چل سکا۔

۲۳ : شخصی اداروں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ ادارے متعلقہ شخصیت کی وفات کے بعد انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں، اس تاثر کی روشنی میں آپ یہ فرمائیں کہ ہمدرد اور جملہ ذیلی اداروں کا مستقبل کیا ہے؟

ج: یہ عام تاثر غلط نہیں ہے۔ اب تک زیادہ تر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ادارہ اپنے بانی کے ساتھ ہی اپنی زندگی کھونے لگتا ہے۔ کارپردازوں کے باہمی اختلافات یا خود غرضیاں یا اہلیت کی کمی ادارے کو کمزور کر دیتی ہے اور پھر ادارہ اپنے مقاصد سے دور ہونے لگتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ مسلمان مزاجاً ادارہ ساز نہیں، ادارہ شکن ہیں، چنانچہ آپ اپنے ملک میں ہر قسم کے اداروں کا جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ سیاسی ادارے ہوں یا ثقافتی، صنعتی و تجارتی ادارے ہوں یا تعلیمی، رفاہی ادارے ہوں یا فلاحی۔ کچھ مدت کے بعد اختلافات و انتشار کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ جہاں تک ہمدرد اور اس کے مختلف اداروں کا تعلق ہے الحمدللہ اب تک تو اپنی وضع پر قائم ہیں۔ حکیم صاحب کی جانشین محترمہ سعدیہ راشد میں ''ٹیم ورک'' کی رہنمائی کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ کام کرنے والوں کی قدر اور احترام کا جذبہ رکھتی ہیں، اس لیے رفقائے کار ان سے دلی تعاون کر رہے ہیں اور حکیم صاحب کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار رفقا بھی موجود ہیں، اس لیے امید ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور

ہمدرد کے ادارے اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بانی شہید حکیم محمد سعید کے عزائم پورے کریں گے انشاء اللہ۔

حکیم صاحب نے قریباً ۲۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں اور کئی رسائل کی ادارت کی۔ : ۲۴
آپ کو حکیم صاحب کی تخلیقی کاوشوں کا ستون تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بتائیں کہ حکیم صاحب یہ سب کچھ کس طرح کیا کرتے تھے؟

ج: حکیم صاحب وقت کی بہترین تنظیم کے ماہر تھے، وقت کی تنظیم اصل میں نام ہے ذہن کی تنظیم کا۔ آپ کو اپنے دل و دماغ پر پورا عبور تھا، سیکھنے اور اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت لے کر آئے تھے۔ وہ مشورے کے قائل تھے اور تعاون کے فوائد کو خوب جانتے تھے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ اچھے مشورے کو فوراً مانتے اور مشورہ دینے والے کی قدر اور عزت کرتے تھے۔ حکیم صاحب مزاجاً شرمیلے واقع ہوئے تھے ابتداً زبان میں لکنت بھی تھی، لیکن اپنی مسلسل محنت سے انھوں نے اپنی ہر صلاحیت کو پروان چڑھایا اور اہلیت و مہارت میں تبدیل کیا۔ تصنیف و ادارت کے امور میں بھی یہی کیفیت تھی۔ میں ان کا معاون تھا اور ان کی متعدد کتابوں کی تدوین کا شرف مجھے حاصل ہے۔ بہت سی تحریریں ہم نے ساتھ بیٹھ کر مکمل کیں۔ تقریر میں بھی مشق و مزاولت سے حکیم صاحب نے بڑا اعتماد اور روانی حاصل کرلی تھی۔ ابتدا میں وہ لکھی ہوئی تقریر پڑھتے تھے، لیکن بعد میں برجستہ اور برمحل تقریریں کرنے لگے۔ رسائل کی ادارت میں، میں

ان کا مزاج سمجھ گیا تھا اور ان کی معاونت کرتا تھا۔

حکیم صاحب کے قائم کردہ کتب خانوں میں صرف مدینتہ الحکمہ میں کتابوں کی : ۲۵
تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہے جب کہ مجلد رسائل اور اخبارات کے تراشاجات ہزاروں کی تعداد میں ہیں آپ کے خیال میں یہ ایک عظیم کارنامہ نہیں؟

ج: بے شک یہ ایک بڑا اہم کارنامہ ہے۔

جس موضوع پر میں تحقیق کر رہا ہوں اس پر کچھ کہنا چاہیں گے؟ : ۲۶

ج: میں آپ کی اس خدمت کو بڑی وقعت دیتا ہوں۔ اس وجہ سے بھی کہ اس پہلو سے ابھی تک کسی نے حکیم صاحب کی خدمات پر کوئی اہم کام نہیں کیا۔ اس کام میں آپ کو بے شک محنت تو بہت ہو رہی ہے۔ لیکن کتب خانوں کی تنظیم اور تحریک کے لیے یہ کام ایک مثال بن سکتا ہے۔ تجویز کیا ہے۔ صرف یہی کہوں گا کہ اپنی تحقیق میں کسی کم زور اور غیر محقق بات کو راہ نہ دیجیے گا۔

انٹرویو مورخہ ۲۳ دسمبر ۲۰۰۴ء کو برکاتی صاحب کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر، المجید،)
(ناظم آباد، کراچی میں لیا گیا

سید شعیب احمد بخاری، سابق وزیر حکومت سندھ سے ایک مکالمہ

(سابق صوبائی وزیر سے یہ انٹرویو ۲۰۰۸ء میں گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد کے مجلہ 'رایت'' کے لیے لیا گیا جو مجلہ روایت ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس ملاقات میں کالج کے ایک استاد عبد الرشید بھی شریک تھے)

کالج میگزین روایت کے گولڈن جوبلی نمبر میں ان شخصیات کے تاثرات شامل کرنے کی حکمت عملی بنائی گئی تھی جنھوں نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں تعلیم حاصل کی اور معاشرہ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ جناب شعیب احمد بخاری صاحب کے تاثرات حاصل کرنا ہماری ترجیحات میں شامل تھا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں ایک یہ کہ آپ اس کالج کے سابق طالب علم ہیں، دوم یہ کہ آپ لیاقت آباد ٹاؤن میں برسہا برس سے رہائش پذیر ہیں کالج بھی اسی ٹاؤن میں واقع ہے، سوم یہ کہ آپ سیاست کے میدان میں نامی گرامی شخصیت ہیں، ۱۹۹۰ء میں اورنگی ٹاؤن، ۱۹۹۳ء میں لیاقت آباد ،۱۹۹۷ء اونگی ٹاؤن، ۲۰۰۲ء لیاقت آباد اور ۲۰۰۸ء لیاقت آباد سے انتخابات میں سلسل رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں، چہارم یہ کہ آپ ۱۹۹۷ء میں وزارت محنت کے صوبائی وزیر رہے، ۲۰۰۲ء میں وزیر منصوبہ بندی رہے اور اب بھی صوبائی وزیر ہیں، سب سے اہم بات یہ کہ محترم شعیب

بخاری صاحب کالج کے تمام معاملات میں خصوصاً کالج کی عمارت کی دوبارہ تعمیر میں کلیدی کردار کے حامل ہیں۔ کالج میں منعقد ہونے والے متعدد پروگراموں میں آپ بطور خاص شرکت کرتے رہے ہیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی صاحب نے آپ کو جب بھی کالج آنے کی دعوت دی آپ فوراً چلے آئے، اس کالج سے آپ کی محبت اور عقیدت قابل تعریف ہے۔

کئی ماہ قبل آپ سے درخواست کی تھی کہ کالج میگزین کے لیے آپ کے تاثرات قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی بے پناہ مصروفیات اور ملک کے سیاسی حالات نے موقع نہیں دیا۔ بلاآخر وہ وقت آ ہی گیا، ۲۸ مئی ۲۰۰۸ء کو آپ نے ہمیں اس مقصد کے لیے اپنے دفتر آنے کی دعوت دی، ہم نے موقع غنیمت جانا اور وقت مقررہ پر وزیر موصوف کے دفتر پہنچ گئے۔ تپاک سے ملے، وقت ضائع کیے بغیر ہم نے سوالات کا آغاز کیا۔ پیدائش، ابتدائی تعلیم اور خاندان کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا :

میرا تعلق ہندوستان کے شہر الہ آباد سے ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہم نے ۱۹۵۷ء میں ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا، یہاں لیاقت آباد میں رہائش اختیار کی اور آج بھی اسی جگہ رہ رہے ہیں۔ میں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول ناظم آباد سے کیا، اس وقت تاج الدین صاحب اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں داخلہ لیا، اس کی

وجہ یہ تھی کہ میری رہائش لیاقت آباد میں تھی ، غربت تھی، اسکول اور کالج پیدل ہی آتے جاتے تھے۔ ڈی جے کالج ہمارے گھر سے بہت دور تھا، بسیں بھی بہت کم چلا کرتی تھیں۔ گورنمنٹ کالج کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا۔ مرکزی حکومت کے تحت کالج کو قائم ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت تدریس کا معیار بہت بلند تھا۔ باطن صاحب پرنسپل تھے احسن صاحب انگریزی کے استاد تھے ۔ سید احمد علی (سید حسن علی کے بھائی) ان کے پاس اس وقت ٹرمپ موٹر سائیکل تھی، نفیس صدیقی، منور حسن، اظہرالدین، سعید جعفری عقیل دانش (بی بی سی)، علاء الدین غوری (ایڈیٹر ڈان) انور مقصود، شکیل احمد (اداکار)، شبیہہ فاروقی، مرزا عادل مصطفےٰ بیگ (اسلم بیگ کے ، بھتیجے) اور شہنشاہ حسین میرے کلاس فیلو تھے۔

کالج کے تمام اساتذہ بہت محنت سے پڑھایا کرتے تھے، طلبہ اساتذہ کا بے حد احترام کرتے، کالج میں بہت ہی اچھا ماحول تھا، ساتھ ہی طلبہ سرگرمیاں ، طلبہ میں اختلافات بھی تھے، اس دور میں این ایس ایف ایک تنظیم ہوا کرتی تھی، ہم شہنشاہ حسین کے مخالف گروپ میں تھے، تمام تر اختلافات کے باوجود کالج میں درس وتدریس کا عمل متاثر نہیں ہوتا تھا، سرگرمیاں بھی جاری رہتیں اور تعلیم بھی۔ اگر کبھی کوئی بات طلبہ کے درمیان ہوجاتی اور نوبت پولیس تک پہنچ جاتی تو اس وقت پرنسپل کا اس قدر رعب اور دبدبہ تھا کہ پرنسپل کی مرضی کے

بغیر پولیس کالج کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتی تھی ۔ ایک دفعہ ہنگامہ اس قدر شدید ہوا کہ کالج کے کئی طلبہ کو پولس نے پکڑلیا، اور حوالات میں بند کردیا، میں پہلی بار حوالات میں بند ہوا، اس وقت کالج کے پرنسپل نے ہی رہائی دلوائی۔ میں ہاکی اور ہائی جمپ میں زیادہ دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اپنے کالج کی نمائندگی انہی کھیلوں میں کی۔ میری خواہش تھی کہ انجینئر بنتا، این ای ڈی میں داخلہ مالی وسائل محدود ہونے کے باعث نہیں لے سکا۔

اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے جناب شعیب بخاری صاحب نے بتایا کہ کیمسٹری کے ایک استاد نسیم اللہ اور ریاضی کے نوراللہ صاحب میرے آئیڈیل اساتذہ میں سے تھے۔ لیکن سب ہی استاد اچھے تھے۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں انٹر اس کالج سے کیا اور بی اے نیشنل سے کالج ۱۹۶۶ء میں کیا، ایل ایل بی ۱۹۶۸ء میں کیا، معاشیات میں ایم اے ۱۹۸۱ء میں کیا اسی سال سے وکالت کے پیشے کو اختیار کیا۔

رکن صوبائی اسمبلی اور وزیر کی حیثیت سے اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے جناب شعیب بخاری صاحب نے بتایا کہ سابقہ دور حکومت میں جب کہ میں منصوبہ بندی کا وزیر تھا کراچی کے بے شمار کالجوں کی عمارتوں کی از سر نو تعمیر کرائی، چھ نئے کالج تعمیر ہوئے، ۱۹ کرایا گیا، کراچی میں ریاض گرلز refurnished سیکنڈری اسکولوں کی عمارت کو گورنمنٹ کالج وہ واحد کالج ہے جس کی عمارت نہ صرف

نئے سرے سے تعمیر ہوئی بلکہ اس میں لفٹ بھی نصب کرائی گئی ہے۔

آپ نے ملک میں تعلیم کی پستی کا ذمہ دار پورے معاشرے کو ٹھرایا، آپ کا کہنا تھا کہ اس میں والدین اور اساتذہ بھی برابر کے ذمے دار ہیں۔ ہمارا طالب علم تعلیم برائے ملازمت حاصل کرتا ہے جب کہ تعلیم برائے علم ہونی چاہیے۔ ترقی کے لیے تعلیم کا عام ہونا بہت ضروری ہے۔

فرقان احمد شمسی ڈائریکٹر جنرل۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان سے ایک مکالمہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ یہ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار " ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی)

تعارف :

فرقان احمد شمسی صاحب گزشتہ ۳۹ برس (یکم فروری ۱۹۶۶ء تا حال) سے ہمدرد سے منسلک ہیں۔آپ کو شہید حکیم محمد سعید کے قریبی اور با اعتماد ساتھیوں میں ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ کو ۳۲ برس حکیم صاحب کی قربت کا شرف حاصل رہا۔آپ کا شعبہ حساب داری ہے ۱۹۶۶ء میں آپ ایک حساب دار (Accountant) کی حیثیت سے ہمدرد سے منسلک ہوئے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔آپ ایک دین دار انسان ہیں، عجز وانکساری آپ کے مزاج کا حصہ ہے۔ نمود ونمائش سے دور رہتے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں آپ سے انٹر ویو کی اِستدِعا کی تھی ۔

آپ اپنے مزاج کے مطابق گریزاں رہے اور راقم مسلسل گزارشات کرتا رہا۔ بالآخر دس ماہ کی صبر آزما جدوجہد کے بعد راقم کو کامیابی ہوئی اور فرقان صاحب نے وقت عنایت فرمایا۔

فرقان صاحب کا تعلق یو پی ہندوستان کے قصبہ نگینہ ضلع بجنور سے ہے۔ ابتدائی تعلیم، میٹرک اور انٹر اپنے آبائی وطن سے کیا۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور سابق مشرقی پاکستان کو اپنا مسکن بنایا، بی کام قائد اعظم کالج، ڈھاکہ سے کیا۔ آٹھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں کراچی آگئے جہاں پر آپ کے برادر نسبتی جناب حافظ عتیق الرحمٰن ہمدرد سے منسلک تھے آپ نے انہیں کے توسطُ سے ہمدرد فاؤنڈیشن میں بطور حساب دار (Accountant) ملازمت اختیار کی۔ اس وقت آپ ہمدرد فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ آپ سے یہ گفتگو بروز منگل ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۵ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۶ء کو آپ ہی کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر میں ہوئی۔

ا : سب سے پہلے تو آپ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ ہمدرد سے کب اور کیسے منسلک ہوئے؟

ج: آپ نے گفتگو کا آغاز حدیث نبوی ﷺ میں موجود ایک دعا سے کیا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ "اے اللہ مجھے میری نظر میں چھوٹا بنادے اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنادے"۔ بعد ازاں آپ نے اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں

بتایا جس کی تفصیل آپ کے تعارف میں بیان کی جاچکی ہے۔

شہید حکیم محمد سعید سے آپ کا تعلق کب، کہاں اور کیسے ہوا۔یعنی حکیم صاحب سے : ۲
آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟

ج : ۱۹۶۴ء کی بات ہے میں ڈھاکہ میں تھا اردو ڈائجسٹ اپنے ہر شمارہ میں کسی نہ کسی شخصیت کا انٹرویو شائع کیا کرتا تھا۔ غالباً نومبر ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں حکیم صاحب کا انٹرویو شائع ہوا۔ اسے پڑھ کر میں حکیم صاحب سے بہت متاثر ہوا۔ درحقیقت حکیم صاحب سے میرے تعلق کی یہی ابتدا تھی ۔اپنے اس انٹرویو میں حکیم صاحب نے بتایا تھا کہ انھوں نے وقت کی پابندی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سیکھی اور دولت سے اِستغنا اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید سے سیکھا۔ میرے کراچی آنے سے پہلے ہی جناب حافظ عتیق الرحمٰن صاحب جو اکاؤنٹس ایگزیکیوٹو ہمدرد وقف تھے نے حکیم صاحب سے میری ملازمت کے بارے میں بات کرلی تھی چنانچہ میں ۳۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو کراچی آیا اور یکم فروری ۱۹۶۶ء کو ہمدرد سے منسلک ہوگیا۔ اب حکیم صاحب سے میرا براہِ راست تعلق ہوگیا جو الحمد اللہ آخر وقت تک قائم رہا۔

وقت کی پابندی کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ آپ وقت کے کس قدر پابند اور قدر کرنے والے تھے۔ وقت ضائع کرنے کا تصور آپ کے ہاں قطعاً نہیں

تھا۔ دولت کے معاملے میں بھی آپ نے اپنے بڑے بھائی کی پیروی کرتے ہوئے ہمدرد وقف) کا کاروبار جو ۱۹۴۸ء میں آپ نے قائم کیا تھا جب مستحکم ہو گیا تو آپ نے اس (Family Income) کاروبار کو ۱۹۵۳ء میں وقف کر دیا ساتھ ہی اپنے لیے کچھ رقم کے طور پر مختص کر لی۔ پہلے تو محکمہ انکم ٹیکس نے ہمدرد کو (وقف) تسلیم نہیں کیا اس سلسلے میں قانونی موشگافیاں ہوتی رہیں ۱۹۸۲ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے فیصلہ دیا کہ ہمدرد کی آمدنی وقف ہونے کے ناطے ٹیکس سے مستثنیٰ ہے تو CBR نے یہ قانون وضع کیا کہ جس وقف میں کسی فرد کی ذاتی آمدنی بھی ہو گی اس کو وقف تصور نہیں کیا جائے گا۔ اس قانون کے آنے کے بعد حکیم صاحب محترم نے اپنا SHARE(حصہ) ہمدرد (وقف) سے ختم کرنا چاہا اس پر ممبرانِ ٹرسٹیز نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی

SHARE کو ختم کرنے لیکن حکیم صاحب نے اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے اور بورڈ آف ٹرسٹیز سے اپنی تنخواہ مقرر کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ دراصل آپ ہمدرد کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے حتیٰ کے آپ کو اپنے بیوی بچوں سے زیادہ ہمدرد اور مدینتہ الحکمہ سے محبت تھی۔

حکیم صاحب آپ پر مکمل اعتماد کیا کرتے تھے اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟ : س

ج: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ رتبہ عطا فرمایا۔ حکیم صاحب نے مجھ پر اعتماد کیا اس کی وجہ میں خود نہیں جانتا۔

کتابوں کی خریداری اور لائبریری کے دیگر اخراجات کے سلسلے میں آپ کو حکیم صا : ۴
حب کی جانب سے کوئی خاص ہدایات ہوا کرتی تھیں یا نہیں؟
ج: جی نہیں اس سلسلے میں کبھی کوئی ہدایت نہیں فرمائی، حکیم صاحب اپنی مرضی کے
مالک تھے، جو وہ بہتر سمجھتے تھے وہی کرتے تھے۔
حکیم صاحب جب کسی لائبریری کو امداد یا گرانٹ دیا کرتے تھے تو کیا آپ سے : ۵
مشورہ کیا کرتے تھے؟
ج: جی نہیں۔
جنرل لائبریری سکھر کی گرانٹ سالانہ پانچ ہزار تھی ۱۹۸۴ء میں اسے ۱۰ ہزار کر : ۶
دیا گیا، کیا یہ پالیسی کا حصہ تھا یا حکیم صاحب کی اپنی مرضی ہوا کرتی تھی؟
ج: اس سوال کے جواب کے لیے آپ نے دفتر سے جنرل لائبریری سکھر کی فائل منگو
ائی اور بتایا کہ کسی بھی لائبریری یا ادارے کی امداد حکیم صاحب کا کلی اختیار ہوا کرتا
تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۸۴ء کو لائبریری کی جانب سے حکیم صاحب کے اعزاز میں ایک
استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا، تقریب کی صدارت سکھر کے میئر اسلام الدین شیخ نے
کی۔ جنرل لائبریری کو ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی جانب سے سالانہ پانچ ہزار روپے
گرانٹ ملتی تھی اس موقع پر حکیم

صاحب نے اس گرانٹ کو دس ہزار روپے سالانہ کرنے کا اعلان بھی فرمایا۔ گرانٹ کی ادائیگی کے بارے میں حکیم صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ تحریر فرمایا جس میں آپ نے لکھا کہ اس تقریب میں میئر سکھر نے جنرل لائبریری کے لیے کئی مراعات کا اعلان کیا اس موقع پر میں نے بھی لائبریری کی گرانٹ پانچ ہزار سے دس ہزار کرنے کا اعلان کیا۔ (فرقان صاحب نے حکیم صاحب کے اس نوٹ کی فوٹو کاپی راقم کو عنایت فرمائی جو مقالہ کے ضمیمہ نمبر ا میں شامل ہے)

ے : حکیم صاحب بہ حیثیت منتظم (Administrator) آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو جو چیز عطا کرنا چاہتے ہیں وہ اسے عطا فرمادیتے ہیں۔ حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے قوت فیصلہ اور کام کرنے کی قوت بہ درجہ اتم عطا فرمائی تھی انہوں نے بھی اپنی اس خداداد صلاحیت سے بھرپور کام لیا۔ میرے خیال میں کوئی بھی کار خیر کرنے والا اتنا کام نہیں کرتا جس قدر حکیم سعیدؒ کیا کرتے تھے۔ دفتر کے معمولات کچھ اس طرح تھے کے ہر کام وقت پر انجام پاتا۔ روز کا یہ معمول تھا کہ دفتری اوقات ختم ہونے سے قبل شعبہ جات کے سربراہان کو حکیم صاحب سے اگر کسی بھی قسم کے مشورہ یا ہدایت حاصل کرنا ہوتی تو متعلقہ فائل آپ کو پہنچا دیے جاتے جو آپ

کے ہمراہ آپ کے گھر چلی جاتی تھیں اگلے روز صبح وہ تمام فائلیں حکیم صاحب کی ہدایات کے ساتھ متعلقہ شعبہ کے سربراہ کی ٹیبل پر موجود ہوا کرتی تھیں۔ حکیم صاحب خواہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، رات کو دو بجے بیرون سفر سے واپسی ہوئی ہو تب تو بھی آپ پہلے فائلوں کے پلندے دیکھتے ان پر ہدایاتی نوٹ تحریر فرماتے اس کے بعد بستر پر لیٹتے تھے۔

۸۔: آپ کو حکیم صاحب کی کس عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ایک مرتبہ میں نے حکیم صاحبؒ کو حضرت نظام الدین اولیؒا کا واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیؒا بیمار ہوگئے ان کے مریدین نے آپ سے کہا کہ حضرت ایک سادھو یہاں رہتا ہے جو مریض کے جسم سے مرض کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے اس سے بیماری جاتی رہتی ہے اگر آپ کہیں تو اسے بلا لیا جائے۔ حضرت صاحب نے انکار کر دیا، کچھ عرصہ بعد آپ دوبارہ علیل ہو گئے، مریدین اس بار اس سادھو کو بغیر اجازت بلا لائے اس نے حضرت صاحب کا مرض اپنے اندر جذب کر لیا اور آپ صحت یاب ہو گئے۔آپ نے سادھو سے دریافت کیا کہ اسے یہ قوت کیسے حاصل ہوئی اس نے جواب دیا کے میں نے اپنے نفس کو مارا ہے، میں نے کبھی وہ کام نہیں کیا جس کے لیے میرا جی چاہا ہے۔ حضرت صاحب نے دریافت کیا کے کیا تیرا کبھی مسلمان ہونے کو جی چاہا ہے اس نے جواب دیا کے نہیں، آپ نے فرمایا تو مسلمان ہو جا، اپنے نفس کی چاہت کے خلاف کام کرو سادھو آپ کی اس

دلیل پر لا جواب ہو گیا اور آپ کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا۔ حکیم صاحب نے بھی اپنے نفس کو مار دیا تھا۔

آپ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میری دعا قبول کرتے ہیں میری کسی بات کو رد نہیں فرماتے۔ افسوس حکیم صاحب ایک حسرت اپنے ساتھ لے کر ہی چلے گئے۔ حکیم صاحب کے ایک سعودی دوست جناب ذکی یمنی صاحب نے مدینتہ الحکمہ میں الفرقان کے نام سے ایک یتیم خانہ قائم کیا تھا جہاں پر بے سہارا بچوں کے قیام، طعام اور تعلیم کا اہتمام ہو نا تھا۔ آپ نے یہ زمین جو ہمدرد فاؤنڈیشن کی ملکیت تھی Yapco Foundation کو فروخت کر دی یتیم خانہ تعمیر ہو گیا لیکن اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکا اور بند ہو گیا، بعد میں حکیم صاحبؒ نے اس عمارت کو خرید لینے کی خواہش کی اس ادارے نے اس کی قیمت کروڑ روپے مقرر کی۔ حکیم صاحب اس پر تیار ہو گئے تھے لیکن ادائیگی ان کی زندگی ۲۴ میں نہ ہو سکی اب انشاء اللہ ہمدرد اس عمارت کو متعلقہ ادارے کو رقم ادا کرکے حکیم صاحب کی خواہش کی تکمیل کرے گا۔

بیت الحکمہ کی عمارت چار منزلہ تعمیر ہونا تھی کیا اس منصوبے پر عمل درآمد کا : ۹ پروگرام ہے یا اسے ملتوی کر دیا گیا ہے؟

ج: ہمدرد یونیورسٹی میں متعدد عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ لائبریری کی

میں ہے۔ process عمارت بھی انشاء اللہ مکمل ہوگی۔ یہ منصوبہ
حکیم صاحب سے آپ کی آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ : ۱۰
ج: ہماری ملاقات عموماً دفتر میں روزانہ ہی ہوتی تھی غالباً ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء سے قبل
ملاقات ہوئی ہوگی اس لیے کہ ۱۱۲ اکتوبر سے میں چھٹی پر تھا اور بیرون ملک چلا گیا تھا
مجھے وہاں پر یہ افسوس ناک خبر ملی۔ میری واپسی ۱۱۹ اکتوبر کو ممکن ہو سکی اور میں آپ
کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکا جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔
(یہ انٹرویو بتاریخ ۱۲۵ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو فرقان صاحب کے دفتر واقع ہمدرد سینٹر، ناظم
آباد میں لیا گیا)

پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری۔ایک شخصیت ایک مطالعہ

تاحیات پروفیسر و ڈائریکٹر۔ ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ہمدرد یونیورسٹی، کراچی

(شہید حکیم محمد سعید کے دستِ راست جامعہ ہمدرد کے تاحیات پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری سے یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے حوالے سے ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء کو کیا یہ موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔

مقالے کا عنوان ہے ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری میرے ریسرچ سپروائیزر بھی تھے۔ تحقیق کی تکمیل میں انھوں نے میری بھرپور رہنمائی کی ۔ جامعہ ہمدرد کے بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے بعض اراکین نے بورڈ کی منٹنگ میں عنوان کی مخالفت کی جس کے باعث ایم فل سے پی ایچ ڈی میں کنورٹ ہونے میں مشکلات پیش آئیں اور وقت بھی بہت لگ گیا۔ محترم زبیری صاحب مرحوم نے اس معاملے کو عمدگی سے اور دلائل کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ مقالہ ۲۰۰۶ء میں جمع کرادیا گیا تھا ڈگری ۲۰۰۹ء میں جاری ہوئی جس کی وجہ

جامعہ کے ہی بعض احباب تھے۔ زبیری صاحب اب اس دنیا میں نہیں۔ مجھے یہ ڈگری ان کی زندگی میں ہی ایوارڈ ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین)

تعارف :

پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری حکیم محمد سعید اور ہمدرد لائبریری کے حوالے سے ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کو حکیم محمد سعید کے قریبی ساتھی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ ۱۹۶۱ء میں ہمدرد سے منسلک ہوئے، حکیم محمد سعید کی ذاتی لائبریری سے بیت الحکمہ تک تمام مراحل آپ کی زیر نگرانی تکمیل کو پہنچے۔ آپ کی ۳۵ سالہ ہمدرد لائبریری خدمات حکیم محمد سعید اور لائبریری سے محبت کا واضح ثبوت ہے۔ اس وقت زبیری صاحب ' انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ' ہمدرد یونیورسٹی کے ڈائریکٹر ہیں۔ لائبریری کے علاوہ تحقیق بھی آپ کا میدان عمل ہے۔ کئی کتابوں اور بے شمار تحقیقی مضامین کے مصنف ہیں۔ مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں زبیری صاحب سے کیا گیا انٹرویو ذیل میں درج ہے۔ یہ انٹرویو آپ کے دفتر واقع بیت الحکمہ (ہمدرد یونیورسٹی لائبریری) مدینتہ الحکمہ میں بروز پیر بتاریخ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء کو لیا گیا۔

۱ : آپ ہمدرد سے کب اور کیسے منسلک ہوئے۔ ہمدرد سے آپ کا منسلک ہونا ایک مشن تھا یا محض روزگار؟

ج : ۱۹۶۱ء میں ہمدرد سے منسلک ہوا، میں نے حیدرآباد دکن سے طب کی تعلیم حاصل

کی تھی، پاکستان آکر روزگار کی تلاش تھی، اس وقت تو ہمدرد سے منسلک ہونا محض ایک روزگار ہی تھا لیکن بعد میں یہ ایک مشن بن گیا۔

۲

ہمدرد میں آپ سب سے پہلے کس حیثیت میں آئے اور ہمدرد لائبریری کی سربراہی : تک کے مراحل کس طرح طے کیے؟

ج: میں نے ہمدرد ایک طبیب کی حیثیت سے ہی جوائن کیا تھا لیکن میں اپنے آپ کو مطب کے ماحول میں فٹ نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ میری تعلیم 'دارالعلوم ندواۃ العلماء' لکھنو میں ہوئی تھی اس وجہ سے پڑھنے لکھنے کی جانب رجحان تھا، کتاب سے دلچسپی تھی۔ لائبریری سے قربت اور لائبریری کے تنظیمی معاملات میں میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی بنی کہ حیدرآباد دکن میں امریکن سینٹر کی لائبریری میں لائبریری کے استعمال پر ایک تربیتی کورس منعقد ہوا میں نے اس کورس میں پورے انہماک سے شرکت کی، اس کورس نے مجھے لائبریری کے قریب کردیا اور مجھے لائبریری کی تنظیم سے دلچسپی ہو گئی۔ میں نے عربی کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں تاج المساجد بھوپال میں ایک مدرسہ تھا اس میں ایک لائبریری بھی تھی میں نے اس لائبریری کی ترتیب و تنظیم بھی کی تھی۔ اس طرح میں کتاب اور لائبریری سے محبت کرنے لگا یہی سبب مجھے مطب سے ہمدرد لائبریری تک لے گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہمدرد لائبریری کو جو اس وقت حکیم صاحب کی ذاتی لائبریری تھی لائبریرین کی ضرورت ہے میں نے خواہش کا

اظہار کیا۔ حکیم صاحب نے منظور کر لیا اور میں لائبریری میں آگیا۔ یہ لائبریری قائدا عظم کے مزار کے پاس ہمدرد ہاؤس میں تھی۔ اس وقت کتابوں کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰۰ ہزار تھی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد لائبریری المجید سینٹر ناظم آباد منتقل ہو گئی اور پھر یہی لائبریری آج بیت الحکمہ ہے۔ مجھے حکیم صاحب کی ذاتی لائبریری سے بیت الحکمہ تک کی سربراہی کا اعزاز حاصل رہا ہے جس پر مجھے فخر حاصل ہے۔

حکیم صاحب آپ پر بھرپور اعتماد کرتے تھے کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟ :۳

ج: دراصل حکیم صاحب آدمی پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ اس میں از خود اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی با قاعدہ کوشش نہیں کی بس حکیم صاحب کو اعتماد ہو گیا۔

آپ شہید پاکستان کے ہم پیشہ ہیں یعنی طب آپ کا بنیادی شعبہ ہے لیکن آپ نے :۴ کتب خانہ کے سربراہ کی حیثیت سے زندگی کا زیادہ وقت گزارا، اس کی کوئی خاص وجہ ۔کتاب سے محبت یا حکیم صاحب کی خواہش کی تکمیل؟

ج: ابتدائی سوال کا جواب میں آپ کے پہلے سوال میں ہی دے چکا ہوں کہ حالات اور واقعات جن کا میں نے اوپر ذکر کیا اس نے مجھ میں کتاب سے محبت اور لائبریری سے قربت پیدا کر دی تھی۔ طب میں میری دلچسپی زیادہ تر طبی لٹریچر میں تھی۔ رفتہ رفتہ کتاب اور لائبریری سے محبت حکیم صاحب سے دلچسپی میں بدل گئی۔

س: ۵ بیت الحکمہ سب سے پہلے 'کتب خانہ حکیم محمد سعید' تھا پھر ہمدرد لائبریری بنی اس کے بعد بیت الحکمہ معروض وجود میں آیا۔ اس منصوبے میں آپ یقیناً شریک رہے، یہ مدارج کیسے طے ہوئے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیے؟

ج: حکیم صاحب کے ذہن میں جو تبدیلی آئی اس کے ساتھ ساتھ لائبریری کے نام بدلتے رہے۔ ابتداء میں یہ لائبریری حکیم صاحب کی ذاتی لائبریری تھی اور زیادہ تر ان کتابوں پر مشتمل تھی جو حکیم صاحب ہندوستان سے قیام پاکستان کے وقت اپنے ہمراہ لائے تھے اس وقت ان کی تعداد بہت کم تھی، بعد میں ان میں اضافہ اور یہ تعداد تقریباً ۱۵۰۰۰ ہزار ہو گئی۔ اس وقت یہ لائبریری 'کتب خانہ حکیم محمد سعید' کہلاتی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں جب کہ کتابوں کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق ۳۳ ہزار تھی حکیم صاحب نے اس لائبریری کو ادارہ کی لائبریری میں بدل دیا اور اس کا نام ''ہمدرد لائبریری آف حکیم محمد سعید'' قرار پایا۔ گویا اب یہ لائبریری ذات سے ہٹ کر ادارہ کی جانب آ گئی اور یہ ہمدرد ہاوس اور کچھ حصہ حمید منزل سے الجید سینٹر، ناظم آباد منتقل ہو گئی۔ اب یہ لائبریری تیسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہے، حکیم صاحب شہر علم مدینتہ الحکمہ کا منصوبہ تشکیل دیتے ہیں۔ اس شہر علم میں سب سے پہلے تعمیر ہونے والی عمارت لائبریری کی ہی ہے جس کا نام حکیم صاحب نے بیت الحکمہ رکھا،۱۹۸۹ء میں بیت الحکمہ کی عمارت مکمل ہوئی اور اور یہ لائبریری الجید سینٹر، ناظم آباد سے اس عالی شان عمارت میں منتقل ہو گئی اور اب یہ ''بیت الحکمہ'' ہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۳ء تک میں

نے اس کے ذمہ دار کی حیثیت سے کام کیا،الجید منتقل ہوجانے کے بعد لائبریری کے کام بہت بڑھ گئے تھے، میری توجہ بھی طب اور ریسرچ پر زیادہ تھی چنانچہ لائبریرین کے طورپر کئی پروفیشنلز اس لائبریری میں آئے ان میں جناب عبیداللہ سیفی، مولانا عارف الدین، جلیل نقوی، خورشید عالم اورجب یہ لائبریری بیت الحکمہ بنی تو مرحوم رشید الدین احمد اس کے چیف لائبریرین تھے۔اس دوران میں بدستور لائبریری کاڈائریکٹر رہا۔بیت الحکمہ نے بہت وسعت اختیار کرلی، میں ریسرچ کی جانب مائل ہوگیا ساتھ ہی میری رٹائرمنٹ ہوگئی اور میں فاؤنڈیشن سے یونیورسٹی میں آگیا اب بیت الحکمہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے لوگ آئے ان میں مولانا عارف الدین، ممتاز الاسلام شامل تھے ، اس وقت افضال احمد اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ایک اور بات واضح کردوں کہ بیت الحکمہ یعنی لائبریری ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی ملکیت ہے اس کا اسٹاف بھی فاؤنڈیشن کاملازم ہے بلکہ مدینتہ الحکمہ بھی فاؤنڈیشن کی ملکیت ہے۔

٦: لائبریری میں کتابوں کے حصول کے سلسلے میں حکیم صاحب کی کیاپالیسی ہوا کرتی تھی؟

ج: ڈان اخبار کے ایک صاحب نے حکیم صاحب سے سوال کیا کہ لائبریری کا بجٹ کتنا ہوتاہے آپ نے جواب دیاکہ ' ہمارابجٹ ہماری ضرورت ہے 'حکیم صاحب کی یہ ہدایت تھی کہ کوئی بھی کتاب اگر ضروری اور اہم ہو تو لے لی جائے،اُسے ہرگز نظر

اندازہ نہ کیا جائے۔

Free کتابوں کی خریداری کے لیے آپ کو کوئی خاص ہدایت ہوا کرتی تھی یا :۷

حاصل تھا؟Hand

ج: جی ہاں فری ہینڈ حاصل تھا۔ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان میں کتابوں کی نمائش تھی میں نمائش میں کتابوں کا انتخاب کر رہا تھا حکیم صاحب امریکہ گئے ہوئے تھے وہ بھی اچانک وہاں پہنچ گئے میرے پاس رقم ختم ہو چکی تھی ، میں نے حکیم صاحب سے کہا،آپ نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈالا جو کچھ تھا دے دیا جب احساس ہوا کہ یہ رقم کم ہے تو اپنے بڑے بھائی کے پاس سے مزید رقم لے لی یہ بھی دے دی اس طرح کل رقم نوہزار ڈالر تھی۔

آپ بیت الحکمہ کے اولین بانی ڈائریکٹر ہیں،اس کی ترتیب و تنظیم کیسے عمل میں آئی؟ :۸

ج: لائبریری ابتداء ہی سے لائبریری سائنس کے اصولوں کے مطابق ترتیب و تنظیم پارہی تھی یعنی جب یہ لائبریری حکیم صاحب کی ذاتی لائبریری تھی اس وقت بھی درجہ بندی اور کیٹلاگ سازی کی جاتی تھی،الجید سینٹر ناظم آباد منتقل ہو جانے کے بعد لائبریری مکمل طور پر منظم و مرتب ہو گئی، بیت الحکمہ میں لائبریری کو کمپیوٹرائز کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی، اس کے لیے

لائبریری سوفٹ ویئر بنوایا گیا اور اب یہ لائبریری بڑی حد تک ایک جدید اور کمپیوٹرائز لائبریری ہے۔

مدینتہ الحکمہ ''میں قائم ہونے والی پہلی عمارت 'بیت الحکمہ' تھی نہ صرف عمارت '' :۹ بلکہ لائبریری اپنی موجودہ صورت میں سب سے پہلے تکمیل کو پہنچی اور یہ تمام تر سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ تھی؟

ج: حکیم صاحب نے ''بیت الحکمہ'' عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے قائم کردہ ادارے بیت الحکمت کی طرز پر قائم کیا جو اس وقت لائبریری کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کا مرکز تھا۔چنانچہ بیت الحکمہ کے قیام کے بعد یہ تمام تر علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔بیت الحکمہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب نے اپنی شہادت سے کچھ دن قبل اپنی آخری آرام گاہ یعنی اپنی لحد کا انتخاب از خود بیت الحکمہ کے سامنے انتہائی دائیں جانب کردیا تھا۔

بیت الحکمہ میں چار لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں جب کہ مجلد رسائل اور اخبارات کے :۱۰ تراشاجات ہزاروں میں ہیں۔یہ ذخیرہ کتب آپ کی زیر نگرانی جمع ہوا۔یہ سب کیسے ہوا؟

ج: دراصل لائبریری پر حکیم صاحب کی مکمل توجہ رہا کرتی تھی۔کتابوں کے انتخاب

کے علاوہ شعبہ تراشہ جات حکیم صاحب کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا آپ ۱۹۵۱ء سے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اخبارات کا از خود مطالعہ کرتے اور ان پر نشانات لگایا کرتے تھے ان اخبارات کی تعداد ۱۸ کے قریب تھی۔کتابوں کے انتخاب اور حصول کے لیے مجھے مکمل آزادی تھی،ایک بار میں کتابوں کے انتخاب اور خریداری کے سلسلے میں مصر (Egypt) گیا حکیم صاحب نے ۵۰ ہزار ڈالر (تقریباً ۵ لاکھ روپے) لے جانے کو کہا،ہم اسٹیٹ بنک گئے اور مدعا بیان کیا،اسٹیٹ بنک نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن حکیم صاحب کا ہر جگہ خیال کیا جاتا تھا،ان کی وجہ سے یہ رقم مجھے مل گئی،واپسی پر جو رقم یعنی بچا وہ اسٹیٹ بنک کو واپس کر دیا گیا اس پر بنک کے متعلقہ Foreign Exchange لوگ بہت حیران بھی ہوئے دراصل حکیم صاحب جب کبھی ملک سے باہر جاتے تو واپسی پر جو رقم بچتی وہ تمام کی تمام Foreign Exchange کی شکل میں اسٹیٹ بنک کو واپس کر دیا کرتے تھے یہ ان کا معمول اور عادت تھی،شاید ہی کوئی اور مثال ایسی ہو۔تو میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ ہر وہ کتاب خواہ اس کی قیمت کتنی ہی کیوں نا ہو اگر لائبریری کے لیے ضروری اور اہم ہوتی مجھے خریدنے کا پورا اختیار تھا،پاکستان کے علاوہ جب بھی ملک سے باہر جاتے جو کتاب انھیں اچھی لگتی لے لیا کرتے،واپسی پر ان کے ہمراہ کتابیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔میں کئی بار ملک سے باہر کتابوں کے حصول کے لیے گیا۔اس طرح لائبریری میں کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔

کتابوں کے انتخاب اور خریداری کے لیے کیا پالیسی رائج تھی؟ : ۱۱

ج: کوئی پالیسی نہیں تھی، مکمل آزادی اور اختیار حاصل تھا ہر اچھی کتاب خریدنے کا۔

کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں آپ حکیم صاحب کے ہمراہ ملک سے باہر بھی : ۱۲
تشریف لے گئے اس دوران حکیم صاحب کی کیا خواہش ہوتی کہ کتابیں کس قسم کی لی جائیں، سستی یا اس سلسلے میں وہ دریا دل تھے؟

ج: کتاب کے سلسلے میں حکیم صاحب دریا دل تھے، کتاب کی اہمیت کے سامنے قیمت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

حکیم صاحب کو کتاب اور کتب خانہ سے عشق تھا، کیا آپ اس پر روشنی ڈالنا : ۱۳
پسند کریں گے۔

ج: کتابوں سے حکیم صاحب کو واقعی عشق تھا، لائبریری میں جگہ کا مسئلہ پیدا ہوا تو میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جائے، ہمارے بار بار کہنے پر حکیم صاحب نے اس مسئلے کے حل کے لیے مقتدر حضرات کی ایک کمیٹی تشکیل دی، ان احباب میں خالد اسحاق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور دیگر شامل تھے، کمیٹی نے رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ پرانی کتابوں کو لائبریری سے نکال دیا جائے اور انہیں دیگر لائبریریز کو دے دیا جائے، حکیم

صاحب نے کمیٹی کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا، حالانکہ لائبریریز میں جگہ کی کمی کا ایک حل یہ بھی ہوتا ہے۔کتاب سے حکیم صاحب کو بے پناہ محبت تھی،آج بیت الحکمہ میں ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جن پر حکیم صاحب کے اپنے دستخط موجود ہیں۔

۱۴: لائبریری اسٹاف کے انتخاب، انہیں مراعات دینے میں اور ان کے کام سے حکیم صاحب کس حد تک مطمئن تھے؟

ج: عام طور پر لائبریری کے لیے جب بھی اسٹاف کے انتخاب کی ضرورت ہوتی اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی، کمیٹی جو تجویز بھی حکیم صاحب کو دیا کرتی آپ اس سے اتفاق کیا کرتے تھے،اسٹاف کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کیا کرتے۔

۱۵: حکیم صاحب کے قائم کردہ کتب خانوں کی تعداد تقریباً ۱۵ ہے آپ ان کے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: ہمدرد یونیورسٹی کے قیام کے بعد مختلف ادارے وقفہ وقفہ سے قائم ہونا شروع ہوئے ہر ایک ادارے کی اپنی ضروریات سامنے آئیں اور بیت الحکمہ کے لیے ان اداروں کی لائبریری ضروریات کو پورا کرنا مشکل ہوگیا چنانچہ حکیم صاحب نے طلبہ اور اساتذہ کی لائبریری خدمات کی تکمیل کے لیے سیمینار لائبریری کے قیام کا سلسلہ شروع کیا،بیت الحکمہ کے علاوہ اس وقت ہمدرد کے مختلف اداروں

کی الگ الگ سیمینار لائبریریز ہیں۔بیت الحکمہ کو مرکزی لائبریری کی حیثیت حاصل ہے۔
حکیم صاحب ابتداء ہی سے کتب خانوں کے قیام ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں تھے :۱۶
کا قیام شہید پاکستان کی سربراہی میں عمل میں آیا اور آپ اپنی SPIL ۱۹۶۰ء میں
شہادت تک اس کی سرپرستی کرتے رہے۔آپ حکیم صاحب کے اس اقدام کو کس نظر سے
دیکھتے ہیں؟

ج: حکیم صاحب کتب خانوں کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔آپ کا خیال تھا کہ عوام میں
مطالعہ کا فروغ کتب خانوں کے باعث ہی ممکن ہے۔چنانچہ جب ملک کی مقتدر علمی
(SPIL) 'شخصیات نے ملک میں کتب خانوں کے قیام،ترقی اور فروغ کے لیے 'اسپل
کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی اور حکیم صاحب سے اس کی سرپرستی کی درخواست کی
توآپ نے اسے خوشی سے قبول کرلیا، حکیم صاحب کی صدارت میں اس ادارہ نے بے
مثال خدمات انجام دیں۔لائبریری کے قیام میں حکیم صاحب نے ہمیشہ خوش دلی
اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا بدین، کوئٹہ حتیٰ کہ ملک کے دور دراز کے علاقوں میں بھی اگر
لائبریری کے قیام کی بات ہوئی توحکیم صاحب نے اسے سراہا اور عملی تعاون کیا۔

کے تحت ملک میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کی ایک طویل (SPIL)اسپل :۱۷

جدوجہد نصف صدی پر محیط ہے جس میں قومی اور بین الاقوامی سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیز کا انعقاد شامل ہے آپ کی رائے میں پاکستان لائبریرین شپ پر ان کے کیااثرات مرتب ہوئے؟

ج: لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والوں میں حکیم صاحب کا اعتماد بحال ہوا وہ اپنے مختلف، مسائل کے سلسلے میں حکیم صاحب سے رجوع کرنے لگے اور وہ بھی ان مسائل کو حل کرنے میں پوری پوری دلچسپی لیا کرتے بے شمار خطوط جو انھوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدیداران کو لائبریرینز کے معاملات کے سلسلے میں تحریر کئے اس کا واضح ثبوت ہیں۔

۱۸: اسپل (SPIL) کے تحت ملک میں کتب خانوں کی ترقی، فروغ، بہتر منصوبہ بندی لائبریری قانون کے نفاذ، لائبریری تعلیم کے فروغ کے لیے حکیم صاحب کے کارناموں، کوآپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: حکیم صاحب تعلیم کو بنیادی اہمیت دیا کرتے تھے اس کے لیے آپ نے ہر ایک فورم کا استعمال کیا، کیوں کہ تعلیم کی ترقی اور فروغ کا انحصار کتب خانوں کے ذریعہ ہی ممکن ہے یہی وجہ ہے حکیم صاحب کتب خانوں کی ترقی اورفروغ کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔آپ کو اس بات کا ادراک تھا کہ ملک میں لائبریری قانون کا نفاذ لازمی ہے اس کے بغیر ملک میں لائبریری کا فروغ مشکل ہوگا چنانچہ آپ نے ابتدا ہی سے اس کے لیے کوشش کی، اسی طرح سے آپ نے لائبریری ترقیاتی منصوبہ

تیار کرایا مقصد یہ تھا کہ ملک میں کتب خانوں کو فروغ حاصل ہو ملک کا شاید ہی کوئی لائبریرین ایسا ہو جو حکیم صاحب کی کتب خانوں کے لیے کی گئی جدوجہد سے واقف نہ ہو۔

حکیم صاحب انتھک محنت کیا کرتے تھے اس کا راز کیا تھا :۱۹

ج: مقصدیت، حکیم صاحب نے اپنی زندگی کا مقصد متعین کرلیا پھر اس کے حصول کے لیے کوششیں کرتے رہے۔آپنے اپنی زندگی کے معمولات کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کردیا تھا وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو تھکا دیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی شخصیت کے خاص پہلو جنھوں نے آپ کو متاثر کیا؟ :۲۰

ج: بروقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت غیر معمولی تھی اور کام کو اسی وقت نمٹا دینا یعنی Pending میں نہ رکھنا۔آپ فائل کو کبھی روکتے نہ تھے۔آپ کی خواہش کوئی چیز ہوا کرتی تھی کہ ساتھ کام کرنے والوں میں بھی یہ عادت پیدا ہوجائے۔

حکیم صاحب نے طب وسائنس کے علاوہ تعلیم کے میدان کا انتخاب کیا اور اپنی بقیہ :۲۱ زندگی تعلیم کے فروغ میں لگادی۔

آپ کے خیال میں کیا یہ اقدام درست تھا؟

ج: جی ہاں بالکل درست تھا، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے

سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل حتیٰ کہ امتہ مسلمہ کے مسائل کی جڑ تعلیم کا فقدان ہے جب تک اسے درست نہ کر دیا جائے اس وقت تک زندگی ممکن نہیں۔

حکیم صاحب سے آپ کی آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ :۲۲

ج: ہمدرد یونیورسٹی میں بدھ کا دن تھا، لائبریری کے معاملات پر ان سے تبادلہ خیال ہوا، دو دن بعد یعنی ہفتہ کی صبح آپ کو شہید کر دیا گیا۔

آپ کو حکیم صاحب کی کس عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟ :۲۳

ج: اپنے سابقہ فیصلوں اور اشخاص کو یاد رکھنے کی عادت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

یہ انٹرویو مورخہ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۳ء کو زبیری صاحب کے دفتر واقع بیت الحکمہ (ہمدرد (یونیورسٹی لائبریری) میں لیا گیا

حکیم محمد سعید شہید پر اولین پی ایچ ڈی تحقیق

''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار''

حکیم محمد سعید پر کتاب اور کتب خانوں کے حوالے سے اولین پی ایچ ڈی تحقیق کا اعزاز راقم الحروف کو حاصل ہوا۔ یہ تحقیق جامعہ ہمدرد کے تاحیات پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری کی نگرانی میں پائے تکمیل کو پہنچی۔ ۲۰۰۶ء میں مقالہ جمع کرایا گیا بعض پیچیدگیوں کے باعث ۲۰۰۹ء میں راقم الحروف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ ہوئی۔ تحقیق کا موضوع تھا ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار''۔ ذیل میں تحقیق کا صرف خلاصہ (Abstract) دیا جارہا ہے۔

خلاصہ

اس تحقیق کا بنیادی مقصد پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید اور انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات، اسپل (SPIL) جس کے حکیم محمد سعید تاسیسی صدر تھے، کے کردار اور کارناموں کا

جائزہ لینا تھا اس مقصد کے حصول کے لیے محقق نے دستاویزی و تاریخی طریقہ تحقیق کے تمام مروجہ اور ممکنہ طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے متعلقہ موضوع پر تحقیق کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ پہلے مرحلے میں موضوع پر سابقہ مواد کا جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا گیا جس میں حکیم محمد سعید کی شخصیت کے علاوہ پاکستان میں لائبریری تحریک اور کتب خانوں کی ترقی و فروغ سے متعلق طباعتی اور برقی ذرائع (Electronic Sources) شامل ہیں۔ تحقیق کے مقاصد، دسترس اور حدود (Limitations) کی وضاحت کے ساتھ تحقیق کے طریقہ کار، ترتیب، افادیت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔

مقالہ نو ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب تعارف ہے اور آخری باب تجزیہ، جائزہ اور تجاویز پر مبنی ہے۔ حکیم محمد سعید کے سوانحی مطالعہ میں آپ کی شخصیت کے چیدہ چیدہ اور اہم پہلوؤں کو دائرہ تحریر میں لایا گیا ہے کیوں کہ محقق کا دائرہ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کی نصف صدی پر محیط خدمات اور کارناموں تک محدود تھا۔ شہید پاکستان کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۲۷۳ ہے جن کا تجزیاتی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور جداول (Tables) اور گرافس (Graphs) کی صورت میں اعداد و شمار مرتب کیے گئے ہیں۔ آپ پر شائع ہونے والی مطبوعات، رسائل و جرائد کے خاص شماروں اور تحقیقی مقالات کا جامعیت کے ساتھ مطالعہ بھی کیا

گیا، ضمیمہ میں کتابیات شہید حکیم محمد سعید بھی شامل ہے۔

پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم، تربیت اور اس شعبہ میں ہونے والی تحقیق کا مطالعہ کرتے ہوئے کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم کا آغاز اور دنیا کے مختلف ممالک میں لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے اداروں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کی ابتدا، اداروں اور ماہرین لائبریری سائنس کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ لائبریری سائنس کی تعلیم و تر بیت جن سطحوں پر دی جارہی ہے ان کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔انٹر اور بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون اور فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا تفصیلی جائزہ بھی اس باب کا حصہ ہے لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے فروغ میں انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات اور حکیم محمد سعید نے جو کردار ادا کیا شواہد اور دستاویزات کی روشنی میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پاکستان میں لائبریری تحریک اور کتب خانوں کے قیام و ترقی کی ۵۸ سالہ (۱۹۴۷ء۔ ۲۰۰۵ء) تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے قدیم ہندستان میں قائم ہونے والے کتب خانوں کی مختصر صورت حال، برطانوی ہندوستان میں انیسویں اور بیسویں

صدی میں قائم ہونے والے تعلیمی اور عوامی کتب خانوں خاص طور پر سرزمین پاکستان پر قائم ہونے والے کتب خانوں کے بارے میں معلومات تحریر کی گئی ہیں۔ثرودہ لائبریری تحریک، پنجاب لائبریری تحریک، آسا ڈان ڈکنسن (Asa Don Dickinson) کی لاہور آمد اور ۱۹۱۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں قائم ہونے والے اولین لائبریری اسکول کے بارے میں حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ تقسیم ہندستان (۱۹۴۷ء) کے وقت سرزمینِ پاکستان میں قائم کتب خانوں کی صورتِ حال حقائق و دستاویزات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کے قیام وترقی کو دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''کتب خانوں اور لائبریری تحریک کے فروغ میں حکومت کے کردار'' پر مبنی ہے۔ دوسرے حصہ میں لائبریرین شپ میں قائم ہونے والی مختلف انجمنوں کی جانب سے کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے لیے کیے گئے اقدامات کی تفصیل ہے۔

لائبریری انجمنوں اور پیشہ ورانہ اداروں کی مثبت سرگرمیوں کے جو اثرات پاکستان لائبریرین شپ پر رونما ہوئے ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔لائبریری انجمنوں کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے دنیا کے مختلف ممالک میں لائبریری انجمنوں کے قیام اور ان کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے ،امریکن لائبریری ایسوسی ایشن ، لائبریری ایسو سی ایشن، برطانیہ اور ہندوستان میں لائبریری انجمنوں کی تاریخ اختصار سے بیان کی گئی ہے۔ پاکستان میں

لائبریری انجمنوں کا قیام اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی ۴۸ سالہ تاریخ (۱۹۵۷ء۔ ۲۰۰۵ء) خدمات اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات (اسپل) کی ۴۵ سالہ (۱۹۶۰ء۔ ۲۰۰۵ء) سرگرمیوں کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ایسو سی ایشن کا قیام وتاریخی پس منظر، حکیم محمد سعید کی انجمن میں شمولیت، اغراض و مقاصد، عوام الناس میں لائبریری شعور اجاگر کرنے اور پاکستان میں کتب خانوں کے قیام اور لائبریری تحریک کے فروغ کے لیے منعقد کیے جانے والے سیمینار، کانفرنسیں اور ورکشاپ کی تفصیل ، عوامی کتب خانوں اور اسکولوں کے کتب خانوں، ملک میں لائبریری قانون کے نفاذ ، لائبریری منصوبہ بندی و لائبریری معیارات کی تشکیل ، لائبریری سائنس کی تعلیم کے فروغ وتربیت میں انجمن اور حکیم محمد سعید کی عملی کوششوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ سو سائٹی کے قائم کردہ کتب خانوں کی تفصیل ،اس کی مطبوعات اور رودادوں کا جائزہ اوران کے بارے ماہرین لائبریری سائنس کی آراء اس باب کا حصہ ہیں۔ آٹھواں باب شہید حکیم محمد سعید کی آرزوؤں کے مرکز ''مدینتہ الحکمہ''میں قائم تعلیمی اداروں ہمدرد یونیورسٹی ،کراچی، اسلام آباد اور فیصل آباد کیمپس) ، کالج، اسکولوں)

پروفیشنل کالجوں، انسٹی ٹیوٹس اور تحقیقی اداروں کے کتب خانوں کے مطالعے پر مبنی ہے جن کی تعداد ۱۷ ہے۔ ''بیت الحکمہ'' کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے لائبریری کے اعداد و شمار کی وضاحت جداول اور گراف کی مدد سے کی گئی ہے۔ بیت الحکمہ کے ذخیرہ کتب کا موازنہ پاکستان کی دیگر جامعاتی کتب خانوں، بڑے عوامی کتب خانوں اور ملک کی قومی لائبریری کے ذخیرہ کتب سے کرتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ حکیم محمد سعید کا قائم کردہ کتب خانہ (بیت الحکمہ) ذخیرہ کتب کے اعتبار سے پاکستان میں سب سے بڑا ہے۔

آخری باب تجزیہ، جائزہ اور تجاویز کے علاوہ آئندہ تحقیق کے عنوانات تجویز کرتا ہے۔ حکیم محمد سعید کے قریبی ساتھیوں، ادارہ ہمدرد کے ذمہ داران کے علاوہ لائبریری سائنس کے ماہرین اور ہمدرد کے مختلف کتب خانوں میں خدمات انجام دینے والے سینئر لائبریرینز سے انٹرویو کیے گئے جن کا متن ضمیمہ (۱۲) میں، لائبریری تحریک اور کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے حوالے سے حکیم محمد سعید کی تحریروں اور خطوط کے عکس اور امریکی حکومت کے درمیان کوئٹہ ڈویژنل پبلک (SPIL) ضمیمہ (۱) میں، اسپل لائبریری کے حصول کے لیے ہونے والے معاہدوں کے عکس ضمیمہ (۲، ۳) میں شامل ہیں۔ ضمیمہ جات کی تعداد ۱۵، ٹیبل ۵۳ اور گرافس ۴ ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت و شاعری' ادیب و محقق محمود عزیز کی نظر میں '

(ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت و شاعری پر یہ تبصرہ اردو کے معروف ادیب و محقق جناب محمود عزیز نے تحریر کیا جو انجمن ترقی اردو کے معروف ادبی ماہنامہ ' قومی زبان 'کی جلد ۸۶ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا)

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کا تعلق لائبریری سائنس کے شعبہ سے ہے مگر ان میں علم و ادب ، شاعری رچی بسی ہے۔ ان کے خانوادہ میں اکثر افراد صاحب دیوان شاعر ہیں اور بے دیوان شاعروں میں بھی علم و ادب اور شاعری کی یہی چٹیک ان کو بھی لگی ہوئی ہے۔ گزشتہ ۳۸ برسوں میں رئیس احمد صمدانی نے ۳۲ کتابیں اور ۲۵۰ مضامین تحریر کیے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب مصنف کے پر دادا شیخ محمد ابرہیم آزادؔ شخصیت و شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔آزادؔ استاد ا؛ شعرا افتخار املک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی جانشین فصیح الملک داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔راجستھان کے معروف نعت گو شاعر تھے. نعت کے علاوہ حمد، قصیدہ، رباعیات، قطعات، سلام اور دیگر اصناف شاعری پر بھی حاوی تھے۔خوبصورت انداز بیان کے یہ شاعر جن کے بارے میں حضرت بیخودؔ نے ارشاد فرمایا کہ ان کا ذوق شعری اصلاح کا چنداں محتاج نہیں.آزادؔ کا زمانہ ۱۸۶۸ء ۔ ۱۹۴۷ء کا ہے۔ یہ وہ

زمانہ ہے کہ جس میں اردو زبان کے ممتاز شعرا اپنے کلام سے برصغیر کی فضاء کو گرمائے ہوئے تھے۔ جن میں مولانا حالی، داغ، امیر مینائی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، جیسے سخنور شامل تھے۔ آزاد کے ہم عصروں کی ان کے کلام کے بارے میں رائے تھی کہ آزاد کے کلام میں رسول اکرم ﷺ کے لیے خلوص و محبت، عقیدت و احترام کا والہانہ جذبہ پایا جاتا ہے اور ان کا دل و دماغ عشق رسول ﷺ سے سرشار اور روح بالیدہ ہے۔ آزاد کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس کی وجہ ان کا اردو، فارسی اور عربی پر عبور تھا اس کے علاوہ ان کی دینی علوم پر بھی گہری نظر تھی۔ ان کا نعتیہ کلام سلیس و بلیغ اور رواں ہے دلکش تراکیب اور محاوروں کے برجستہ استعمال سے ان کے کلام میں دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ نعت میں افراط و تفریط سے بچتے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی کے چند نمونے دیکھیے ۔

تری سیرت کی تو کیا بات ہے میرے مولا
تری صورت سے تو بن جاتے ہیں سیرت والے

مغرب کی طرف سے یہ بات پھیلائی جاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا اس کو موضوع سخن بناتے ہوئے آزاد کہتے ہیں ۔

یا نبی تیرا مبارک ہو آنا کیسا
تجھ سے پہلے تھا جہالت کا زمانہ کیسا

پھونکی اک نئی روح تیرا آنا کیسا

اللہ اللہ بنا تجھ سے زمانہ کیسا

جُھوٹ کہتے ہیں کہ تلوار سے پھیلا اسلام

کام باتوں سے لیا تیغ چلانا کیسا

اور اس سے پہلے وہ خاک کے پتلے کو انسان سے مسلمان بنانے پر حق تعالی کی شکر گزاری یوں کرتے ہیں ۔

اللہ تونے خاک کو انسان بنادیا

انسان کیا بنایا مسلماں بنا دیا

مطلع نے حمد کے مجھے سحباں بنادیا

مطلع نے نعت کے مجھے حساں بنادیا

آزادؔ نام جپتے ہیں اُس بے نیاز کا

رحمت سے جس نے ہم کو مسلماں بنادیا

آزادؔ کے دل میں امت کا درد تھا جس کا اندازہ ان کے دل سوز اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ۔ پہلے تو اپنی صورت کو بگاڑنے کے باب میں کہتے ہیں ۔

ہم نے خود پاؤں میں اپنے ہی کلہاڑی ماری

توڑ کر دین کے ارکان رسولِؐ اکرم

پھر ملت اسلامیہ کا اجتماعی صورت حال پر نظر ڈالتے ہوئے اس کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوتے ہیں ۔

علم مولا میں ہے جو حال مراکش اب ہے
کیسا مظلوم ہے ایران رسولِ اکرم
شہ کو معلوم ہیں اٹلی کے مظالم جو ہیں
اب غضب ڈھاتا ہے بلقان رسولِ اکرم
سلطنت مُلکِ مراکش کی بھی رکھنا قائم
اور سلامت رہے ایران رسولِ اکرم
اس پہ سایا رہے الطاف و کرم کا تیرے
جو یہ کابل کا ہے سلطان رسولِ اکرم
ہند والے بھی مسلماں ہوں ایسے آقا
جیسے تھے اگلے مسلماں رسولِ اکرم
ختم آزادؔ کی فریاد ہے مولا اس پر
ہو درود آپ پہ ہر آن رسولِ اکرم

آزادؔ نے تمام زندگی نعت کہی اور عشقیہ شاعری سے احتراز کیا۔

شیخ محمد ابراہیم آزاؔد ۲۵ فروری ۱۸۶۸ء کو یوپی کے ضلع مظفر نگر کے قصبے حسین پور میں پیدا ہوئے ۔انھوں نے ۷۹ سال عمر پائی۔ وہ بیکانیر کے اپنے آبائی قبرستان مین مدفون ہوئے۔ آزاؔد نے اس طویل زندگی کو بے مقصد نہیں گزارا بلکہ زندگی کو اللہ کی امانت سمجھتے ہوئے اس کی ہدایت کے مطابق گزانے کی کوشش کی۔ وہ ایک دین دار اور متقی شخص تھے۔ وہ عام لوگوں میں گھل مل کر رہتے تھے۔ان کی خوشی وغم میں حصہ لیتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ بیکانیر کے چیف جسٹس رہے اور اپنی نیک سیرتی سے بڑا نام کمایا۔ وہ ذات برادری کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ تحریک نسواں کے تعمیری کاموں کے حامی اور مددگار تھے۔ ان کا نثری سرمایہ محفوظ نہ کرنے کی وجہ سے ضائع ہوگیا۔ ان کا نعتیہ دیوان ۱۹۳۲ء میں آگرہ میں چھپا اور اس کی اشاعت دوم ۲۰۰۵ء میں کراچی میں ہوئی۔ ان کی وفات کے ۶۶ سال بعد ان کے پڑپوتے ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کو اللہ نے توفیق دی کہ وہ اپنے اجداد کی میراث کو محفوظ کریں چنانچہ ان کی شخصیت اور شاعری پر زیر تبصرہ کتاب وجود میں آئی۔ اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ آزاؔد کی شخصیت اور شاعری ااور ان کی سرگرمیوں سے ان کے اہل وطن اور اردو ادب پر خوش گوار اثرات مرتب ہونے کا پتا چلتا ہے بلکہ ان کے آبائی شہروں بیکانیر، مظفر نگر، حسین پور کی امتیازی خصوصیات کا بھی علم ہوتا ہے۔

آخر میں مصنف کے سادہ مگر دلنشین اسلوب کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

دبلے پتلے ،میانہ قد،کتابی چہرہ، سانولا نکھرا نکھرا رنگ ، چہرے پر معصومیت، جسم و ’’ جسہ معدوم و موہوم ، متانت اور سنجیدگی ، معمولی مونچھوں کے ساتھ کالی داڑھی، کھڑے نقش، ستواں ناک، کرنجی آنکھیں، کشادہ پیشانی، جھدرے بال ، ہنستا مسکراتا چہرہ، ہنستے وقت دانت نمایاں ہوا کرتے، مخروطی انگلیاں،نرم گفتار، سبک رفتار، مرنجاں مرنج،خوش لباس گھر میں کرتا پاجامہ عدالت جاتے وقت سر پر راجستھانی امامہ‘‘۔

کتاب میں اور بھی محاسن ہیں مثلاً نعت کے ارتقا پر نظر ڈالی گئی ہے۔آزاد صاحب کے ہم عصروں کی ان کی شاعری کے بارے میں آرا ہیں۔ان کے خاندان اور مصنف نے صاف گوئی سے اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں ذکر کرکے قاری کو اپنا بے تکلف دوست بنالیا

ہے۔(شائع شدہ ماہنامہ ’قومی زبان‘ ، انجمن ترقی اردو، جنوری ۲۰۱۴ء جلد ۸۶ شمارہ ۱ (ص ۷۸۔۸۰

حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر سے مکالمہ

(ڈاکٹر حیدر جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس استاد اور صدر شعبہ رہے۔ یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ یہ گفتگو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر حیدر اب اس دنیا میں نہیں ۔اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔آمین)

تعارف:

پاکستان لائبریرین شپ کی ایک محترم ومعتبر شخصیت۔جامعہ کراچی سے ۱۹۶۰ء میں لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ۱۹۶۴ء میں رٹگرس ،اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیوجرسی (Rutgers,The State University, NJ) امریکہ سے ایم ایل ایس اور ۱۹۹۴ء میں لفبرویونیورسٹی (Loughborough University, UK) سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔آپ کے مقالہ کاعنوان ہے (Acquiring Foreign Materials for Pakistani Libraries: A Study) ۱۹۶۰ء میں جامعہ کراچی کے کتب خانے سے پیشہ

ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔۱۹۷۰ء میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، صدر شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء میں ریٹائر ہوئے۔آپ کی پیشہ ورانہ خدمات ۳۸برس پر محیط ہیں۔آپ کو پاکستان لائبریرین شپ میں ایک مستند اور معروف مصنف کی حیثیت حاصل ہے،آپ کے تحریر کردہ مضامین پاکستان اور بیرون ملک معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔آپ کا تحریری سرمایہ لائبریرین شپ کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔آپ سے یہ گفتگو ۱۲مارچ ۲۰۰۴ء بروز جمعہ آپ ہی کی قیام گاہ پر ہوئی۔

آپ نے لائبریرین شپ کا پیشہ کب اور کیسے اختیار کیا؟ : ۱

ج : ۱۹۵۹ء میں شعبہ لائبریری سائنس ،جامعہ کراچی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس میں داخلہ لیا۔کورس پاس کرنے سے قبل ہی کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت مل گئی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد کتب خانوں کی کیا صورت حال تھی اس میں بہتری کی : ۲ ابتدا کیسے عمل میں آئی یعنی پاکستان میں لائبریری تحریک کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟

ج : زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح کتب خانوں کی بھی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔اس علاقہ میں جواب پاکستان کہلاتا ہے ماسوائے چند کتب خانوں کے کوئی کتب خانہ

موجود نہ تھا۔ موجود کتب خانوں کی حالت کچھ اچھی نہ تھی کیوں کہ ان کے اسٹاف میں زیادہ تر ہندو تھے جو تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے لہذا ایک بہت بڑا خلا پید اہوگیا۔ قابل ذکر کتب خانوں میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، فریئرہال لائبریری کراچی، دیال سنگھ لائبریری لاہور، فورٹ سینڈیمن لائبریری کوئٹہ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں چند لائبریریز نے ایک میٹنگ منعقد کی ان لائبریریز میں عبدالمعید، فضل الٰہی، خواجہ نورالٰہی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ میٹنگ اسلامیہ کالج لاہور میں ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس میں پی ایل اے قائم ہوئی (اس کا ذکر ماڈرن لائبریرین کے شمارہ اول میں ہے) اور بعد میں اسے پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن میں بدل دیا گیا اس نے ایک ڈپلومہ کورس کا اعلان بھی کیا، کچھ لوگوں کو سرٹیفکیٹ بھی دیئے گئے اگرچہ عملی طور پر کورس کا انعقاد نہیں ہوا تھا، اس بات کا ذکر معید صاحب نے مجھ سے کیا تھا۔ اس وقت کی یہ روایت تھی دوسرے سبجیکٹ والے بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں لائبریری تحریک کا آغاز ۱۹۵۶ء میں اس وقت ہوا جب کراچی یونیورسٹی نے لائبریری سائنس ڈپلومہ کورس قائم کیا اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ پورے ملک میں پھیل گئے۔ اس سے قبل کراچی لائبریری ایسو سی ایشن سرٹیفکیٹ کورس شروع ہو چکا تھا اور یہی کورس پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس کی بنیاد بنا۔

۳ : ۱۹۸۱ء میں اسپل کے (Board of Directors) میں آپ ایک رکن کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ یہ بتائیں کہ اسپل نے ایک (Citizens Committee) کے طور پر ملک میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ میں کیا نمایاں کردار ادا کیا؟

ج : اسپل نے کتب خانوں سے متعلق عمومی طور پر اور عوامی کتب خانوں سے متعلق خصوصی طور پر شعور (Awareness) پیدا کیا لیکن یہ شعور ایک خاص طبقہ تک محدود تھا جو کہ شاید اس وقت کی ضرورت تھی۔ اس بات کا پتہ ہمیں اسپل (SPIL) کے سیمینار ورکشاپ اور کانفرنسیز کی پروسیڈنگ میں شرکاء کی فہرست سے پتہ چلتا ہے۔ شرکاء میں اکثر صاحب اقتدار یا بااثر لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ بہت کم عام لائبریرین حضرات کو ان سیمینار اور کانفرنسیز میں فعال پایا گیا، انھیں صرف سامعین میں رکھا جاتا تھا، لہٰذا انھیں صرف نشستاً گفتاً اور برخاستاً تک دلچسپی رہتی تھی۔

۴ : پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا نقطہ آغاز کیا تھا۔ پوسٹ گریجویشن سے پی ایچ ڈی تک تعلیم کے مراحل کیسے طے ہوئے؟

ج : کراچی لائبریری ایسوسی ایشن (KLA) نے اپنے سرٹیفکیٹ کورس سے لائبریری سائنس کی تعلیم کا آغاز کیا اور اس کورس کے فارغ التحصیل لائبریرینز میں انیس خورشید اور عادل عثمانی کا نام بھی شامل ہے جو بعد میں کراچی یونیورسٹی کے قائم

کردہ کورس کے اساتذہ کے طور پر عبدالمعید کے ساتھی تھے۔علاوہ ازیں دونوں حضرات نے کتب خانوں کی ترویج اور ترقی میں نمایاں کردارادا کیالیکن صحیح معنوں میں لائبریری سائنس کی تعلیم کی ابتدا۱۹۵۶ء میں کراچی یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس تھا۔اس کے ابتدائی طلبہ میں انیس خورشید، عادل عثمانی، عبید اللہ سیفی، سجاد ساجد

پروگرام کی (M.A) صادق علی خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۱۹۶۲ء میں ایم اے ابتدا بھی کراچی یونیورسٹی نے کی۔

پروگرام شروع کیااور سب سے پہلے عادل (Ph.D) اسی ڈیپارٹمنٹ نے ۱۹۶۷ میں عثمانی کا رجسٹریشن ہوااس کے بعدچھ دیگرلائبریریز نے اس پروگرام میں داخلہ لیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ابتدائی سالوں کے پی ایچ ڈی کے طلبہ میں سے صرف عبدالحلیم چشتی صاحب نے اپنا مقالہ مکمل کیااور ڈاکٹریٹ کی سند۱۹۸۱ء میں حاصل کی ان کے گائیڈ ڈاکٹر عبدالمعید صاحب تھے۔

(M.Phil)۱۹۸۵ء میں بہت سے لائبریریز کے اسرار پر جامعہ کراچی نے ایک ایم فل پر مبنی تھا لیکن یہ پروگرام (Thesis)پروگرام شروع کیا جو کہ کورس ورک اور مقالہ ناکام رہااور کسی ایک شخص نے بھی پروگرام میں داخلہ نہیں لیا۔۱۹۸۷ء میں پی ایچ ڈی پروگرام دوبارہ شروع کیاگیاجب کہ نسیم فاطمہ

کا رجسٹریشن اس پروگرام میں ہوا اور انھیں ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے تھیسس سپروائیزر تھے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی پروگرام شروع ہوا، ۱۹۹۱ء میں محمد فاضل خان بلوچ جو کہ شعبہ کے چیر مین بھی تھے کو پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی ان کی تھیسس سپروائزر ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ تھیں۔ اب اس شعبہ میں کچھ اور لوگ بھی ڈاکٹریٹ میں رجسٹرڈ ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں پنجاب یونیورسٹی نے بھی پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا اور اس کے اولین طلبہ اسی شعبہ کے استاد خالد محمود اور کنول امین شامل ہیں، دونوں کا سپروائزر میں خود ہوں۔ ۲۰۰۳ء میں بلوچستان یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا اس کے اولین طلبہ میں خورشید اختر انصاری جو اس وقت شعبہ کے انچارج بھی ہیں اور محمد الیاس شامل ہیں۔ ڈاکٹر سیکنہ ملک، خورشید انصاری کی اور ڈاکٹر افتخار خواجہ، محمد الیاس کے تھیسس سپروائزر ہیں۔ ہمدرد یونیورسٹی نے ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹیڈیز اینڈ ریسرچ کے تحت مختلف مضامین میں ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا۔ اب تک آٹھ طالب علم رجسٹر ہو چکے ہیں ان میں سے لائبریری سائنس کے اولین طالب علم آپ خود ہیں۔ غالباً آپ کا داخلہ ۲۰۰۳ء میں ہوا۔

۵ : آپ کے خیال میں اسپل (SPIL) نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور

کتب خانوں کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ نیز اسکے منعقد کردہ سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیز کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

وجود میں کیوں آئی، اس کا پس (SPIL) ج: سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسپل منظر کیا ہے، اس کے مقاصد کیا تھے اور پھر یہ دیکھنا ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے سوسائٹی نے کیا طریقے بشمول سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیز اپنائے۔

۱۹۶۰ء میں وجود میں آئی یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان لائبریری ایسوسی (SPIL) اسپل اپنے شباب پر تھی لیکن ایسوسی ایشن میں سیاست زوروں پر تھی، واضح (PLA) ایشن طور پر دو گروپ تھے ایک گروپ اقتدار میں تھا دوسرا حزبِ مخالف کا کردار ادا کر رہا تھا لیکن دونوں جانب بہ صلاحیت اور فعال لوگ موجود تھے۔ حزب اختلاف کے حضرات نے جب یہ دیکھا کہ انہیں پی ایل اے میں جائز مقام نہیں مل رہا ہے اور نہ مل سکتا ہے کہتے (SPIL) تو انھوں نے اپنے لیے ایک الگ پلیٹ فارم کا انتخاب کیا جسے اسپل ہیں۔ چونکہ پی ایل اے کی تشکیل اور ترقی میں ایک بڑا نام ڈاکٹر محمود حسین کا شامل تھا لہٰذا اسپل کو بھی ایسا ہی شخص چاہیے تھا جو انھیں حکیم صاحب کی شخصیت میں مل گیا۔ اس سوسائٹی میں شروع میں صرف ایک لائبریرین صحیح معنوں میں شامل تھا، کچھ لوگ پس پردہ تھے جو بعد میں سوسائٹی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر کی حیثیت سے

شامل ہوئے۔ بہ حیثیت ایک سٹیزن کمیٹی کے اسپل نے شروع میں اپنے مقاصد میں کراچی میں ایک پبلک لائبریری کا قیام شامل کیا،اس سلسلے میں ایک جامع اسکیم بھی تیار کی لیکن ہنوز عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اسپل نے کتب خانوں کے سلسلے میں عوام میں شعور بیدار کرنے کی بھی پلاننگ کی اوراس مقصد کے لیے سوسائٹی نے کانفرنسیز اور سیمینار کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کئے گئے ان سے کتب خانوں کی تحریک کو تقویت ملی ان سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسوں کی رودادیں باقاعدہ شائع ہوتی رہیں جو لائبریرین شپ کے لٹریچر میں احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اسپل (SPIL) نے اسکول کے کتب خانوں کی ترقی کے لیے بھی جدوجہد کی،اس سلسلے میں سوسائٹی کے زیر اہتمام مختلف سرٹیفکیٹ کورسز کا اہتمام کیاگیا،ساتھ ہی ساتھ اسکول کے کتب خانوں سے متعلق ایک ہینڈبک بھی شائع ہوئی۔ مختصر یہ کہا جاسکتاہے کہ سوسائٹی نے کتب خانوں سے متعلق لائبریری شعور (Library Awareness) پیدا کرنے میں قابل تعریف کارنامہ انجام دیا لیکن یہ شعور صرف Elite Class تک محدود رہا۔

س ۶: اسپل گولڈ میڈل کے پاکستان لائبریرین شپ پر کیا اثرات پڑے؟

ج: اس گولڈ میڈل کے بارے میں طلبہ کو علم نہیں ہوتا، انھیں اس وقت اس کا پتہ چلتاہے جب پوزیشن کا اعلان ہوجاتاہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی باقاعدہ تشہیر کی جائے تاکہ طلبہ ابتداہی سے اس کے حصول کے لیے محنت کریں۔

اسپل کی مطبوعات لائبریری لٹریچر میں کس حدتک مفید ثابت ہوئیں۔ : ۷

ج: ان مطبوعات کو اہم خدمات میں شامل کیاجاسکتاہے اور طلبہ اساتذہ اور محققین کے لیے یہ بے حد مفید ہیں۔

بیت الحکمہ (ہمدرد یونیورسٹی لائبریری) اور ہمدرد کے دیگر تعلیمی اداروں کے کتب : ۸ خانوں کوآپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: تعلیمی اداروں کے ساتھ کتب خانوں کا وجود لازمی امر ہے۔بیت الحکمہ اور دیگر کتب خانوں کے قیام میں حکیم صاحب کی دلچپی کو اہمیت حاصل ہے۔اس کا کریڈٹ حکیم صاحب کو جاتا ہے۔

لائبریری تحریک کے فروغ اورکتب خانوں کی ترقی میں ڈاکٹر محمود حسین مرحوم : ۹ اور حکیم محمد سعید شہید خاص طورپر قابل ذکر ہیں۔ یہ فرمائیں کہ آپ لائبریری تحریک اسپل اور حکیم محمد سعید شہید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟،

ج: حکیم صاحب نے لائبریری تحریک کی سرپرستی کی،کتب خانوں کے قیام اور فروغ کے لیے ان کا نام اور وسائل استعمال ہوئے ڈاکٹر محمود حسین ماہر تعلیم تھے میرے خیال میں دونوں کاتقابل نہیں کیاجاسکتا۔لائبریری تحریک کے فروغ اور

ملک میں کتب خانوں کی ترویج وترقی میں دونوں شخصیات کی خدمات لائق تحسین ہیں۔

۱۰ : ڈاکٹر عبدالمعید کے علاوہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی،ڈاکٹر محمود حسین اور حکیم محمد سعید شہید کو پاکستان میں لائبریری تحریک کا Pioneers تصور کیا جاتا ہے آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: میں صرف ڈاکٹر عبدالمعید کو پاکستان میں لائبریرین شپ کا بانی تصور کرتا ہوں۔اس وجہ سے میں اس مفروضہ سے اتفاق نہیں کرتا اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر محترم شخصیات ملک میں لائبریری تحریک کے بڑے سرپرست اور Supporters رہے ہیں۔

۱۱ : لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغاز ۱۹۶۷ء میں شروع ہو چکا تھا۔اب تک صرف ۲ جامعہ کراچی اور ایک اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور سے یہ سند حاصل کرسکے۔یعنی ۳۶ سال میں تین،آپ کے خیال میں اس کی وجہ اپنے مضمون سے عدم دلچسپی رہی یا کوئی اور رکاوٹ؟

ج: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ پی ایچ ڈی کیوں کریں؟جب کہ انھیں بغیر پی ایچ ڈی کے وہ مراعات مل جاتی ہیں جنھیں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی لوگ مدتوں تک ان کے لیے ترستے ہیں۔علاوہ ازیں لوگ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پی ایچ ڈی

کرنے کے بعد اس نے کیا کچھ حاصل کیا جو اُسے پہلے حاصل نہیں تھا۔

پی ایچ ڈی میں داخلہ ایک مشکل امر بنادیا گیا ہے، جو خود پی ایچ ڈی نہیں تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا شخص بھی پی ایچ ڈی ہو لہٰذا وہ ہمیشہ ایسی مشکلات پیدا کرتے رہے جس سے لوگ ناامید ہو جائیں، پی ایچ ڈی کو ایک ہوا بنادیا گیا جب کہ دوسرے شعبوں میں اس سلسلہ میں کافی حوصلہ افزائی کی گئی۔پڑوسی ملک ہندوستان میں تقریباً ۴۰۰ لوگ لائبریری سائنس کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرچکے ہیں۔ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ملک میں جو پی ایچ ڈی تھے وہ ملک سے باہر رہ کر اپنا مستقبل روشن رکھنا چاہتے تھے، ملک سے متعلق صرف اپنی ذات تک دلچسپی رہی، یہاں کی ہر چیز ان کو بری لگتی تھی۔ایسے حالات میں پی ایچ ڈی پروگرام کا قیام اور اس کی کامیابی کیسے ممکن ہوسکتی تھی۔

۱۲ : آپ کے خیال میں تحقیق میں کن امور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے؟

ج: اب تک ملک میں جو پی ایچ ڈی کے مقالات تحریر کیے گئے ان کا تعلق کتب خانوں کے مسائل سے قطعی نہیں تھا۔ان کا مقصد صرف پی ایچ ڈی کا حصول تھا۔اسی طریقہ سے ہمارے اکثر حضرات جنھوں نے بیرون ملک سے پی ایچ ڈی حاصل کیا وہ بھی Problem Oriented تحقیق سے بہت دور نظر آتے ہیں، ان تمام مقالات کا لائبریرین شپ پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔لوگ انفرادی طور پر تو ضرور مستفیض

ہوئے لیکن ملک اور پروفیشن کو کوئی قابل ذکر فائدہ نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ تحقیق ان مسائل پر ہو جن سے آج پاکستان لائبریرین شپ دوچار ہے۔

(یہ انٹرویو ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء کو ڈاکٹر حیدر کی رہائش گاہ واقع نارتھ ناظم آباد میں لیا گیا)

ماہر کتابیات و کتابدار۔ اختر ایچ صدیقی سے ایک مکالمہ

سابق چیف لائبریری وڈاکیو من ٹیشن۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس، اسلام آباد

(اختر صدیقی صاحب مئی ۲۰۰۵ء میں انتقال کر گئے، یہ ان کی زندگی کا آخری انٹر ویو ہے)

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا گیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے '' پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی، صدیقی صاحب سے یہ مکالمہ ۱۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کو اس وقت ہوا جب وہ اسلام آباد سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ جون ۲۰۰۳ء میں میرا داخلہ پی ایچ ڈی میں ہو چکا تھا اور میں نے تحقیقی کام کا آغاز کر دیا تھا۔ صدیقی صاحب سے میرے مراسم باوجود عمر کے فرق کے دوستانہ تھے۔ میں نے ان پر انگریزی میں ایک کتابیات بعنوان Akhtar H. Siddiqui: A Bio-Bibliographical Study بھی مرتب کی تھی جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ صدیقی صاحب کو پاکستان میں کتابیات سازی کا ماہر کہا جاسکتا ہے جنھوں نے تن تنہا ۵۰ سے زیادہ کتابیات مرتب کیں۔ صدیقی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے

جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ پیش نظر مکالمہ سے ایک ماہر کتابیات اور کتابدار کے خیالات پیشہ ورانہ موضوعات اور شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت پر سامنے آتے ہیں جن (سے نئے لکھنے والے استفادہ کر سکتے ہیں

: تعارف

اختر ایچ صدیقی پاکستان لائبریرین شپ کے سینئر ترین لائبریرینز ڈاکٹر عبدالمعید، فضل الٰہی ،سید ولایت حسین شاہ، محمد شفیع، جمیل نقوی، ابن حسن قیصر، نور محمد خان اور فرحت اللہ بیگ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ کراچی لائبریری ایسو سی ایشن ، پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن اور پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے بانی رکن ہیں اوران کی پیشہ ورانہ سر گرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں ۔آپ نے ۱۹۴۸ء میں پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بطور لائبریرین این ای ڈی گورنمنٹ انجینئرنگ کالج کراچی (اب یہ انجینئرنگ یونیورسٹی ہے) سے کیا۔ حکومت کے محکمہ ٹیرف کمیشن، پاکستان نیشنل سائنٹیفک و ٹیکنکل ڈاکیو من ٹیشن سینٹر میں خدمات انجام دینے کے بعد پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس (PIDE) کے چیف لائبریری و ڈاکیو من ٹیشن آفیسر کی حیثیت سے ۱۹۸۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ اسلامک ڈاکیو من ٹیشن و انفارمیشن سینٹر کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ اختر صدیقی صاحب نے پیشہ ورانہ تعلیم کی ابتدا ۱۹۵۰ء میں لائبریری سائنس کے سرٹیفیکٹ کورس سے کی ، ۱۹۶۲ء میں آپ نے

(Loughborough)

سے ڈاکیو من ٹیشن وانفارمیشن سائنس کا سرٹیفیکٹ کورس پاس کیا۔ مصنف کی حیثیت سے آپ نے متعدد کتابیں اور کئی مضامین تحریر کئے،کتابیات سازی آپ کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے آپ نے تن تنہا ۵۴ سے زیادہ حوالہ جاتی ماخذ مرتب کئے۔ صدیقی صاحب سے یہ گفتگو آپ کی کراچی آمد کے موقع پر آپ کے بیٹے کی رہائش گاہ واقع بہادرآباد میں دسمبر ۲۰۰۳ء کو ہوئی۔ ۱۵

آپ پاکستان لائبریرین شپ کی ان شخصیات میں سے ہیں جو قیام پاکستان کے فوری : ا بعد ملک میں کتب خانوں کے قیام وترقی اور لائبریری تحریک کی عملی جدوجہد میں شریک رہے۔ یہ فرمائیں کہ اس تحریک کا آغاز کیسے ہوااور فعال کردار ادا کرنے والوں میں کون کون لوگ شامل تھے؟

ج: پاکستان میں لائبریری تحریک کا آغاز ۱۹۴۸ء میں لاہور سے ہوا جب پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا نام تبدیل کرکے مغربی پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن رکھ دیا گیا۔اس ایسو سی ایشن نے لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی کے لئے تو کوئی کام قابل ذکر نہیں کیا البتہ اس کے تحت اسکول آف لائبریرین شپ قائم کیا گیا۔ ڈپلومہ کی سطح پر ۴۔۶ ماہ کے دورانیے کا لائبریری سائنس کا کورس شروع کیا گیا، اس کا صرف ایک چھ ماہ کے دورانیے کا سیشن ہو سکا اس کے علاوہ Correspondence کے ذریعہ سے بھی تعلیم دی گئی۔اس ایسو سی ایشن کا بنیادی

کا اسکول ۱۹۵۰ء تک قائم رہا۔ اس کے بانیوں میں فضل WPLA مقصد شاید یہی تھا۔ یہ الٰہی مرحوم جو اسکول کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے، ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم، خواجہ نور الٰہی مرحوم، ڈکٹر عبداللہ مرحوم جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سر براہ تھے ساتھ ہی یونیورسٹی کے اعزازی لائبریرین بھی تھے اور محمد امین جو لاہور کے ایک مشہور تھا جو اب بھی قائم ہے۔ Publishers United بک سیلر تھے ان کی دکان کا نام اور اس کا اسکول اس وجہ سے قائم نہ رہ سکے کہ اس کے کرتا دھرتا یعنی فضل الٰہی WPLA اور عبدالمعید مرحوم کراچی آ گئے۔ ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم سندھ یونیورسٹی کے لائبریرین مقرر ہوئے (سندھ یونیورسٹی ان دنوں کراچی ہی میں تھی) اس طرح فضل الٰہی مرحوم نے لائبریرین کی حیثیت سے لیاقت پبلک لائبریری کا چارج سنبھال لیا، یہ لا ئبریری نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں قائم کی گئی۔ یہ لائبریری اس وقت مسلم لیگ ھال میں واقع تھی جو کراچی کے علاقے بولٹن مارکیٹ کے گھنٹہ گھر کے سامنے ایم اے جناح روڑ (بندر روڈ) پر واقع تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس لائبریری کا نام تبدیل کرکے لیاقت نیشنل لائبریری رکھ دیا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ لائبریری پاکستان سیکرٹیریٹ میں منتقل کر دی گئی، یہ پاکستان میں لائبریری تحریک کا پہلا آغاز تھا۔ تین سال بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں دوسری تحریک کا آغاز بھی کراچی میں ہوا جب کراچی لائبریری ایسو سی ایشن قائم کی گئی اس کے تحت بھی ایک لائبریری اسکول قائم کیا گیا جس کی

KLA کا بنیادی تعلیم کا دورانیہ غالباً چار ماہ کا تھا اور یہ سرٹیفیکیٹ کی سطح کا تھا۔
KLA کا مقصد لائبریری سائنس کی تعلیم دینا تھا۔ اس ایسوسی ایشن نے کوئی خاص کام نہیں کیا اور صرف اسکول پر ہی قناعت کی۔ KLA اور اسکول کو قائم کرنے میں سید ولایت حسین شاہ مرحوم، مولانا محمد شفیع مرحوم، نور محمد خان مرحوم اور جمیل نقوی مرحوم نے نمایاں کردار ادا کیا، یہی حضرات اسکول میں تعلیم دیتے تھے اس کے پہلے صدر حسن علی عبدالرحمٰن تھے جو کراچی کے مشہور ایڈووکیٹ اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل بھی تھے۔ ایک سال بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ اور اس کے تحت اسکول آف لائبریرین شپ بھی قائم ہوا۔ اس ادارے نے ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔

پاکستان بننے کے ۱۰ سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں لائبریری تحریک کا تیسرا دور کراچی سے شروع ہوا۔ پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ نے اپنی ایک میٹنگ ۶ جولائی ۱۹۵۴ء میں ایک قرارداد پاس کی جس کے تحت کہا گیا کہ یہ وقت ہے کہ اب پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کو قائم کرنے کے لیے کام شروع کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جناب قاضی حبیب الدین احمد جو گروپ کے نائب صدر تھے اور حکومت پاکستان کے شعبہ لائبریریز و آرکائیوز کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی تھے ان کو کنوینر مقرر کیا گیا تھا اور ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی تھی جس کے

اراکین میں اختر صدیقی، سید ولایت حسین شاہ مرحوم، خواجہ نورالٰہی مرحوم، فضل الٰہی مرحوم شامل تھے۔ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم اس وقت امریکہ میں تھے ان کی واپسی پر انہیں بھی ایڈہاک کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ان کے علاوہ ابن حسن قیصر، عبیداللہ سیفی، حامد حسن رضوی اور وکیل احمد جعفری کو بھی ایڈہاک کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ پی ایل اے کے قائم کرنے میں جو لائبریرینز حضرات پیش پیش تھے ان میں ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم، قاضی حبیب الدین احمد، اختر صدیقی، خواجہ نورالٰہی مرحوم (لاہور)، عبدا لصبوح قاسمی مرحوم (پشاور)، ڈاکٹر محمد علی قاضی مرحوم (حیدرآباد)، ابن حسن قیصر مرحوم، حامد حسن رضوی مرحوم (کرچی)، عبیداللہ سیفی (کراچی)، محمد صدیق (سابقہ مشرقی پاکستان)، احمد حسین (ڈھاکہ)، مظاہر علی خان (ڈھاکہ) اور حمایت علی مرحوم شامل تھے۔

پی ایل اے قائم ہوجانے کے بعد پورے ملک سے ۴۰ لائبریرین حضرات نے ممبر شپ حاصل کی، سالانہ چندہ پانچ روپے مقرر کیا گیا اس طرح کل ۲۰۰ روپے حاصل ہوئے یہ رقم الیکشن اور دیگر اخراجات کے لئے بہت کم تھی اس میں مزید اضافہ چند مقامی بک سیلرز کے مالی تعاون سے ہو سکا۔ ممبر سازی کے بعد الیکشن کا مرحلہ شروع ہوا،

انتخابات ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی سر براہی میں ہوئے، الیکشن کے نتیجے میں پی ایل اے کی جو منتظمہ منتخب ہوئی اس کے عہدیداران میں نائب صدور، قاضی حبیب الدین احمد (کراچی)، اے رحیم خان (لاہور)، ایم ایس

خان (ڈھاکہ)، سیکریٹری جنرل، ڈاکٹر عبدالمعید، اسسٹنٹ سیکریٹری، اختر ایچ صدیقی، خازن، عبیداللہ سیفی، اراکین میں خواجہ نور الہٰی، احمد حسین، ڈبلیو اے جعفری، ابن حسن قیصر، عبدالصبوح قاسمی شامل تھے۔ صدارت کے لئے مجلس منتظمہ نے متفقہ طور پر ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کو پی ایل اے کی صدارت کی پیش کش کی جو ڈاکٹر صاحب نے قبول کر لی، وہ پی ایل اے کے صدر ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۶۱ء اور دوسری بار ۱۹۷۳ء تک صدر رہے۔

پی ایل اے کی پہلی کانفرنس کراچی میں ۹۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی صدارت میں ہوئی جس کا افتتاح اس وقت کے صدر مملکت میجر جنرل اسکندر مرزا نے کیا۔ اس کی سولھویں کانفرنس ۱۹۹۷ء میں اسلام آباد میں منعقد ہو چکی ہے۔ تیسرا آغاز دیرپا ثابت ہوا، یہ ایسوسی ایشن اپنی عمر کے ۴۷ سال پورے کر چکی ہے۔ لائبریری تحریک کے فروغ 'کتب خانوں کی ترقی اور پروفیشن کی بہتری کے لیے پی ایل اے کا کام جاری وساری ہے۔

اور حکیم محمد سعید کے (SPIL) پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ میں اسپل : ۲ کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

اور حکیم محمد (SPIL) ج: کتب خانوں کے قیام 'ترقی اور لائبریری تحریک میں اسپل سعید کا کردار اہم اور بنیادی نوعیت کا ہے۔ آپ کا یہ اقدام تحسین کی

نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

حکیم محمد سعید شہید کے قائم کردہ شہر علم مدینتہ الحکمہ کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ : ۳

ج: شہر علم مدینتہ الحکمہ شہید حکم محمد سعید کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مدینتہ الحکمہ کا نام لیتے ہی حکیم محمد سعید شہید کی یاد آ ئیگی اس علم کے شہر کے قیام سے حکیم محمد سعید شہید نہ صرف طب اور حکمت کے شعبوں میں بلکہ علم کی دنیا میں زندہ جاوید رہیں گے۔

آخر میں کیا آپ اس موضوع کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟ : ۴

ج: آپ نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور لائبریری پروفیشن کے لیے شہید حکیم محمد سعید اور انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات کی خدمات ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں پاکستان لائبریرن شپ کے کسی بھی پہلو پر تحقیق کرنے والا کوئی بھی مورخ شہید حکیم محمد سعید اور انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات کی بے مثال خدمات کا احاطہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ میں حکیم محمد سعید شہیدؒ کے کردار سے متعلق یہ تحقیقی کارنامہ نہایت ہی مفید ثابت ہوگا۔ میری رائے میں یہ تحقیق لائبریری لٹریچر میں ایک گرانقدر

اضافہ ثابت ہو گی۔ اس سے نہ صرف پروفیشنل بلکہ وہ حضرات جو اس پروفیشن سے تعلق نہیں رکھتے ان کے لئے بھی یہ تحقیق مفید ہو گی اور لائبریرین حضرات تو اس تحقیق سے بہت استفادہ کریں گے۔

(یہ انٹرویو صدیقی صاحب کی کراچی آمد کے موقع پر آپ کے بیٹے کی رہائش گاہ واقع بہادر آباد میں ۱۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کو لیا گیا)

بے جا تعریف اعجابِ نفس اور خود پسندی کا باعث ہوتی ہے

ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے کی تعریف کرنا عام سے بات ہے۔ تعریف کا یہ عمل گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی انتہائی احتیاط اور محتاط رویہ چاہتا ہے۔ کسی شخص کی تعریف میں خواہ اس کا ہم سے تعلق اور رشتہ کچھ بھی ہو احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعریف یا کسی کے لیے ایسا عمل کرنا جس سے اس کی عزت اور وقات میں اضافہ ہوتا ہو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ عام طور پر ایسا عمل جذبات میں آکر دیا جاتا ہے۔ تعریف و توصیف دراصل اس بات کی گواہی اور شہادت ہے جو ہم دوسرے کی تعریف کرکے اس کے حق میں دیتے ہیں۔ یہ بظاہر عام سی بات ہے لیکن ہمارا یہ عمل بہت بڑی ذمہ داری ہے۔اگر اس عمل کو سوچ سمجھ کر احتیاط کے ساتھ نہ کیا جائے تو ہمارے اس عمل سے اس شخص میں جس کی ہم بے جا تعریف کر رہے ہوتے ہیں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اس میں اعجابِ نفس اور خود پسندی کے جراثیم جنم لے لیں اور وہ خود پسندی کی اس منزل پر پہنچ جائے کے اپنے خلاف چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی پسند نہ کرے۔

سیاست دانوں میں یہ جذبہ زیادہ ہی پایا جاتا ہے ان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہیں ،کچھ بھی کریں ، اچھا ہو یا برا وہ درست اس پر

ہر کوئی ان کی تعریف کرتا رہے۔ یہی صورت حال مذہبی احباب میں بھی پائی جاتی ہے۔ چاہنے والے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں گے لیکن وہ ان کو اس بات سے منع ہرگز نہیں کریں گے۔ بلکہ اس عمل سے انہیں تسکین ملتی ہے۔ الغرض چاہت تو ہر ایک کی یہ ہوتی ہے کہ اسے بس اچھا اور اچھا ہی کہا جائے اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان ایک کردیا جائے یہ ذمہ داری ہم پر آئد ہوتی ہے کہ ہم کسی کی تعریف کرنے سے پہلے بہت اچھی طرح سوچ بچار کریں کہ کیا وہ واقعی اس قابل ہے کہ ہم اس کی تعریف میں اتنے آگے چلیں جائیں بعد میں مشکلات پیش آنے لگیں۔

اسلام میں کسی کی تعریف سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کرلینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مولانا منظور نعمانی نے اپنی کتاب ''معارِف الحدیث'' میں لکھا ہے کہ 'کسی کی تعریف کرنا دراصل اس کے حق میں ایک شہادت اور گواہی ہے جو بڑی ذمہ داری کی بات ہے اور اس سے اس کا بھی خطرہ ہے کہ اس آدمی میں اعجابِ نفس اور خود پسندی پیدا ہوجائے' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں سخت احتیاط کی تاکید فرمائی ہے''۔ قرآن مجید کی سورۃ النساء آیت ۳۶ میں تکبر کرنے والوں کے باے میں کہا گیا ہے کہ 'اللہ تکبر کرنے والے ،بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا'۔ اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیت ۸۷ میں فرمان خداوندی ہے کہ 'اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا'۔ اللہ ہمیں تکبر، غرور،بڑائی کی

لعنت سے محفوظ رکھے اور اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کی تعریف کی اور اس تعریف میں بے احتیاطی کی) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے اپنے) اس بھائی کی (اس طرح تعریف کرکے) گردن کاٹ دی (یعنی ایسا کام کیا جس سے وہ ہلاک ہوجائے) یہ بات آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمائی۔ (اس کے بعد فرمایا) جو کوئی تم میں سے (کسی بھائی کی) تعریف کرنا ضروری ہی سمجھے اور اس کو اس تعریف و مدح کا مستحق سمجھے تو یوں کہے کہ میں فلاح بھائی کے بارے میں ایسا گمان کرتا ہوں اور میری اس کے بارے میں یہ رائے ہے) اور اس کا حساب کرنے والا اللہ تعالی ہے) جس کو حقیقت کا پورا علم ہے) اور ایسا نہ کرے کہ خدا پر کسی کی پاکیزگی کا حکم لگائے یعنی کسی کے حق میں ایسی بات نہ کہے کہ وہ بلاشبہ اور یقینا عنداللہ پاک اور مقدس) ہے' کیونکہ یہ خدا پر حکم لگانا ہے اور کسی بندہ کو اس کا حق نہیں ہے''۔

اس حدیث پاک سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہمیں کسی بھی شخص خواہ اس کا ہم سے کسی بھی قسم کا رشتہ و تعلق ہی کیوں نہ ہو کی بے جا اور حد سے زیادہ

تعریف و توصیف سے گریز کرنا چاہیے۔ اعتدال اور میانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

جن احباب کی بے جا تعریف کی جائے ان کے لیے تو واضح حدیث موجود ہے ساتھ ہی مداحین' یعنی تعریف کرنے والوں کی بھی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ صحیح مسلم' کی حدیث مبارکہ حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں فرمایا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ''تم 'مداحین' (بہت زیادہ تعریف کرنے والوں) کو دیکھو تو ان کے مُنہ پر خاک ڈال دو''۔ اس حدیث شریف کے حوالے سے اور حدیث حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے ان کی موجودگی میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک کی تعریف کی تو انہوں نے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے مٹی زمین سے اُٹھاکے اس شخص کے منہ پر پھینک ماری''۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولانا منظور نعمانی نے ''معارِف الحدیث'' میں لکھا ہے کہ 'اس حدیث میں ''مداحین'' سے غالباً وہ لوگ مراد ہیں جو لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کے لیے اور پیشہ ورانہ طور پر ان کی مبالغہ آمیز تعریفیں اور ان کی قصیدہ خوانی کیا کرتے ہیں''۔

بے جا تعریف کرنے والے مداحین کے لیے عیش برنی کا ایک شعر ۔

ہر ایک عیب میں خوبی نکالنے والے
یہی تو ہیں مجھے مشکل میں ڈالنے والے

اللہ تعالی ہمیں غلط کاموں سے محفوظ رکھے۔ نیک اور صالح ارادے سے کسی بھی بھلے اور نیک شخص کی تعریف کرنے میں کوئی برائی نہیں بشرطیکہ اس بات کا یقین ہو کہ وہ شخص اپنی تعریف سے خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائے گا۔ تعریف کرنا، اچھائی بیان کرنا، خوبیوں کے بارے میں آگاہ کرناتاکہ دوسروں کو بھلائی کی ترغیب ملے ایک اچھا عمل ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان بلوچ۔بے بہا خوبیوں کے حامل

چیئرمین: شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنسز، جامعہ سرگودھا
سابق ایچ ای سی پروفیسر چیئرمین۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، علامہ اقبال
اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
سابق چیئرمین شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

(ڈاکٹر فاضل خان صاحب سے یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار" ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر فاضل سے یہ مکالمہ ۲ مئی ۲۰۰۴ء کو ہوا جب وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کے سربراہ تھے۔ اس کے بعد وہ اسلام آباد سے جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنز کے سربراہ، ساتھ ہی جامعہ کی لائبریری کے سربراہ بھی ہوئے۔ آجکل وہ شعبہ کے سربراہ ہیں۔ ۲۰۱۱ء

اور ۲۰۱۲ء میں خان صاحب نے میرا تقرر شعبہ میں ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے کرادیا اور مجھے سرگودھا کی سرزمین تک کھینچ لے جانے میں کامیاب بھی ہوگئے۔ میں نے کوئی ایک سال ڈاکٹر صاحب کی سربراہی میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ جہاں وہ میرے اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ میرے آفیسر بھی ہوگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت اچھی گزری۔ فاضل صاحب بے بہا خوبیوں کے مالک ہیں۔ خاکہ نگار کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے ان میں وہ تمام پائی جاتی ہیں۔ میں جامعہ سرگودھا سے واپس آیا تو فاضل صاحب کا خاکہ لکھنے کا ارادہ لے کر آیا تھا مصروفیات ، صحت اور سعودی عرب آنے جانے تاحال نے مہلت نہیں دی۔ زندگی نے وفا کی تو خان صاحب کو خاکہ قلم بند کرنے کی کوشش کرونگا۔ خان صاحب کے بارے میں مختصراً اپنے ایک مضمون '' جامعہ سرگودھا میں میرے شب و روز: کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں لکھ چکا ہوں۔ پیش نظر انٹرویو میں فاضل صاحب کے خیالات لائبریرین شپ کے بارے میں اور شہید حکیم محمد سعید کے بارے میں واضح
ہوتے ہیں۔

: تعارف

پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے بانی چیرمین ہونے کا اعزاز حاصل ہے آپ یو

نیورسٹی لائبریرین بھی رہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کرنے والے اولین اور پاکستان بھر میں تیسرے شخص ہیں۔ اس وقت آپ کی نگرانی میں تقریباً بارہ اسکالرز لائبریری سائنس میں تحقیق کر رہے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کا تقرر بطور ایچ ای سی پروفیسر کے ہوا اور اس وقت آپ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے سربراہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر فاضل نے پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز ۱۹۷۲ء میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے ڈپلومہ کورس سے کیا۔ ۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ۱۹۹۴ء میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ آپ نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں علامہ اقبال لائبریری رحیم یار خان سے بطور لائبریرین کیا۔ ۱۹۷۹ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے لائبریرین اور ۱۹۸۳ء میں شعبہ لائبریری سائنس کے قیام کے بعد صدر شعبہ کے فرائض ریٹائرمنٹ تک انجام دئے۔

ڈاکٹر فاضل پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ متعدد پیشہ ورانہ انجمنوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے منسلک ہیں۔ اس وقت آپ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن پنجاب کے صدر ہیں۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی جانب

سے آپ کو ۱۹۹۷ء میں گولڈن جوبلی گولڈ میڈل اور ۲۰۰۲ء میں لائبریری پروفیشن میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں شیلڈ سے نوازا گیا ڈاکٹر فاضل سے یہ گفتگو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے دورہ کے موقع پر ۲ مئی ۲۰۰۴ء کو ہوئی۔

آپ نے لائبریرین شپ کا پیشہ کب اور کیسے اختیار کیا؟ : ا

ج : لائبریرین شپ کا پیشہ اختیار کرنے سے قبل میں اسسٹنٹ کمشنر کا ریڈر تھا۔ میرے ایک ہم جماعت اور دوست محمد عارف ایڈووکیٹ نے مشورہ دیا کہ جب آپ رشوت لیتے ، دیتے نہیں تو آپ کے لیے لائبریرین شپ کا پیشہ مناسب رہے گا۔ چنانچہ عارف صاحب کے مشورہ کے مطابق میں نے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے اسکول آف لائبریرین شپ سے رجوع کیا جہاں میری ملاقات سید ولایت حسین شاہ مرحوم سے ہوئی۔ صاحب موصوف اس بات پر خوش ہوئے کہ میں ریڈر ٹو اے ۔ سی کے بجائے لائبریرین بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کی شفقت اور مہربانی نے میری مزید ڈھارس بندھائی اور میں نے ۱۹۷۲ء میں گروپ سے ڈپلومہ ان ببلوگرافی اینڈ اسپیشل لائبریرین شپ حاصل کر لیا اور اسی ڈپلومہ کی بنیاد پر ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء میں علامہ اقبال لائبریری بلدیہ رحیم یار خان میں بطور لائبریرین تعینات ہوا۔

اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں بتائیں، لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم کب :۲ اور کہاں سے حاصل کی؟

ج: علامہ اقبال لائبریری میں ملازمت کے استقرار پر مجھے اس پیشہ میں تکمیل تعلیم کی فکر دامن گیر ہوئی۔ سب سے پہلے میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے چیرمین جناب (ڈاکٹر) ممتاز علی انور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن انہوں نے بوجوہ مجھے داخلہ نہ دیا بعد ازآں میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے چیرمین جناب (ڈاکٹر) غنی الاکرم سبزواری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب موصوف نے جس شفقت اور مہربانی سے مجھے داخلہ دیا اُسے بھول جانا میرے بس میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء میں ڈپلومہ اور ۱۹۷۶ء میں ایم۔اے لائبریری سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں دو سال قیام کے دوران تمام اساتذہ کرام نے جس شفقت اور مہربانی کا مظاہرہ فرمایا اُس نے میری زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے چنانچہ ۱۹۸۳ء میں جب میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ کا چیرمین بنا تو اُس وقت سے اپنی ریٹائرمنٹ بطور چیرئمین فروری ۲۰۰۲ء تک اپنے محترم و مکرم اساتذہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔

رحیم یار خان کے بعد میں ۲ فروری ۱۹۷۹ء کو بطور یونیورسٹی لائبریرین اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی سروس میں داخل ہوا۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک جب

پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد شیخ صاحب اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو میری سادگی' صاف گوئی اور محنت سے لگن کچھ اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران میری کسی التجا کو نہیں ٹھکرایا بلکہ جب موصوف نے پنجاب یونیورسٹی میں بطور وائس چانسلر منصب سنبھالا تو اس بندہ ناچیز کی مثالیں دیتے تھے جو فقط ان کی اعلیٰ ظرفی اور بندہ نوازی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پروفیسر ڈاکٹر ظفر صاحب پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے تو ایک دفعہ فرمانے لگے کہ آپ نے ہمارے وائس چانسلر صاحب پر جادو کیا ہوا ہے۔ بہر حال میں نے ڈاکٹر صاحب کی شفقت اور عنایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک تو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں لائبریرین کیلیے بغیر رخصت لیے ہوئے پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت حاصل بنوایا۔ دوسرا اہم کام ۱۹۸۳ء میں شعبہ کا قیام تھا اور (Rule) کی بلکہ قاعدہ اور قانون میں سمجھتا ہوں کہ اس شعبہ کا امتیاز یہ ہے کہ ڈپلومہ سے متصل ایم۔اے لائبریری سائنس کی کلاس کا اجرا ہوا اور یہ بھی اس شعبہ کا اعزاز ہے کہ یونیورسٹی آف کراچی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی گئی اور اب کم سے کم دس ریسرچ اسکالرز

سلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

جہاں تک میری پی ایچ ڈی کا تعلق ہے تو میں سب سے پہلے اس سلسلہ میں استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' استاد محترم نے فرمایا کہ میں آپ کو پی ایچ ڈی کرانے کے لیے تیار ہوں لیکن کم از کم دو سال کی رخصت حاصل کر لو۔ چنا چہ میں نے اُس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد شیخ صاحب کو رخصت کے لیے درخواست دی تو انہوں نے میری درخواست پر بہت واضح طور پر لکھا (Your interest is dear to me but the interest of the University is more dear than your interest. Who run the library and the Department during your absence) اس عبارت سے ظاہر ہے شعبہ لائبریری سائنس کے قیام کے بعد بھی میں یونیورسٹی لائبریرین تھا یہ دونوں ذمہ داریاں میں نے ۱۹۹۰ء تک نبھائیں اور یہ بھی واضح ہے کہ مجھے کراچی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے چھٹی نہ مل سکی۔ بعد ازآں میں جناب پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید صاحب مرحوم ومغفور کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ وہ میری پی ایچ ڈی کے لیے سپروائیزر بن جائیں۔ انہوں نے میری توقع سے بھی زیادہ شفقت اور مہربانی کا اظہار فرمایا۔تاہم وہ جلد ہی راہی ملک عدم ہو گئے۔ اللہ تعالی انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔بڑے عظیم انسان تھے۔

بعد ازآں استاد محترم جناب صادق علی خان صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہو

ئے پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے بطور چیر
پرسن اور ان کے رفقاء کار نے سندھ کی روائتی مہمان نوازی کا ثبوت دیا لیکن بوجوہ مجھے
اپنے ہاں پی ایچ ڈی کی رجسٹریشن نہ دی۔ تاہم میں نے ڈاکٹر صاحبہ کو اپنے شعبہ لا
ئبریری سائنس کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر بنوالیا۔ جب ڈاکٹر صاحبہ بہاولپور تشریف لا
ئیں تو اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میرا تعلق مظلوم طبقہ سے ہے۔ چنانچہ انہوں
نے کمال مہربانی سے میری پی ایچ ڈی کی سپروائیزر بننے کی درخواست قبول فرمالی۔

۳ : آپ لائبریری تحریک کے فروغ اور ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: حکیم محمد سعید شہیدؒ لائبریری کی اہمیت اور قومی ترقی میں اِس کے کردار کی اہمیت کے راز سے کماحقہ' واقف تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے اس پیشہ کی ترقی وترویج کیلئے ممکنہ حد تک کاوشیں کیں۔

۴ : آپ پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

ج: شعبہ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس یونیورسٹی آف کراچی اور جامشورو حیدرآباد میں سینئر اساتذہ موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اِن ہر دو شعبہ جات کی کارکردگی اُمید افزا ہے اور قابل تعریف بھی۔ دیگر شعبہ جات کی

حالت بہت ابتر ہے خدا کرے انہیں بھی قابل اور تجربہ کار اُستاد مل جائیں۔ تجربہ کار اساتذہ بیرون ملک سے آکر بھی اِن شعبہ جات میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن سازشیں ہیں اور شعبہ جاتی مفاد کو ذاتی مفاد پر قربان کیا جا رہا ہے۔ تاہم مایوسی کفر ہے۔ اگر بنا دے اور شعبہ Library Oriented حکومت مخلصانہ رویہ اختیار کرے اور نظام کو جات کو یہ سہولت مہیا کی جائے کہ وہ مارکیٹ کی ضرورت کے مطابق افرادی قوت پیدا کرے تو ہمارا مستقبل یقیناً تابناک ہوگا۔

ڈاکٹر عبد المعید کے علاوہ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم اور حکیم محمد سعید شہید کو : ۵
تصور کیا جاتا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا Pioneers پاکستان میں لائبریری تحریک کا کہنا چاہیں گے ؟

ج : اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم اور حکیم محمد سعید شہیدؒ، دونوں حضرات کتاب اور کتب خانوں کے فروغ میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور انھوں نے عملی طور پر جو کردار ادا کیا ہے وہ علم کتب خانہ داری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

کے تحت ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی (SPIL)اسپل : ۶
ترقی کی جدوجہد نصف صدی پر محیط ہے جس میں قومی سطح پر سیمینار، ورکشاپس

اور کانفرنسیز کا انعقاد شامل ہے۔ آپ کی رائے میں پاکستان لائبریرین شپ پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج: اسپل (SPIL) کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسیز نے نہ صرف پیشہ ور حضرات کے علم کو تازگی بخشی بلکہ اُنھیں اپنے پیشہ کی عظمت اور بلندی کا شعور دیا اور یہی بات دیگر شرکاء کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ورنہ اکثر و بیشتر حضرات جن کا شمار ارباب حل و عقد میں ہوتا ہے وہ لائبریری اور لائبریرین شپ کے مقام و مرتبہ سے بے خبر ہوتے ہیں۔

۷: اس تحقیق کا تعلق حکیم محمد سعید شہید کی ان خدمات سے ہے جو آپ نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی کے لئے انجام دیں۔ کیا آپ اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ حکیم محمد سعید شہیدؒ یوں تو پوری قوم کے لیے باعث رحمت اور شفقت تھے لیکن ہمارے پیشہ کیلئے ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ اگر حکیم صاحب جیسی شخصیت پر پی ایچ ڈی نہ کی جائے تو احسان فراموشی ہو گی۔ جس طرح بُرائی سے بُرائی پیدا ہوتی ہے اِسی طرح نیکی، نیکی کا باعث بنتی ہے۔ حکیم محمد سعید شہیدؒ پر کتب خانوی خدمات کے حوالہ سے جو تحقیق ہو رہی ہے جو نہایت مفید ہے۔ ہو سکتا ہے اس سے دیگر اہل ثروت اور علم دوست ارباب کی توجہ مبذول ہو۔

یہ انٹرویو مورخہ ۲ مئی ۲۰۰۴ء کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ لائبریری و (انفارمیشن سائنس میں لیا گیا)

داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں

قیام پاکستان کے بعد سے آج تک اقتدار میں آنے والی حکومتوں نے ظاہری، وقتی اور نمود و نمائش جیسے اقدامات پر زیادہ توجہ دی جن سے یہ ظاہر ہو کہ حکومت ملک و عوام کی خیر خواہ ہے۔ اس کے برعکس داخلی استحکام، طویل المدتی اور بنیادی باتوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی پر گامزن رہے۔ حکمراں یہ بات بھولے رہے اور آج بھی یہی صورت حال ہے کہ تمام تر صلاحیتیں اور وسائل وقتی اور دکھاوے پر لگائے جارہے ہیں حقیقی ترقی کی جانب توجہ نہیں حالانکہ داخلی استحکام اور ترقی کے بغیر خارجی ترقی ممکن ہیں۔

جب تک قومی سطح پر تسلسل کے ساتھ ٹھوس اقدامات نہیں کیے جائیں گے ملک کو داخلی استحکام نصیب نہیں ہوگا ملک میں خارجی اور حقیقی ترقی کا پہیا جام رہے گا۔ مولانا وحید الدین خان نے اپنی کتاب 'رازِ حیات' میں داخلی استحکام کی مثال درخت سے دی ہے کہ ' درخت کاایک حصہ تنا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ اس کی جڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا جتنا حصہ اوپر ہوتا ہے تقریباً اتنا ہی حصہ زمیں کے نیچے جڑ کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ درخت اپنے وجود کے نصف حصے کو سرسبز و شاداب حقیقت کے طور پر اس وقت کھڑا کر پاتا ہے جب کہ وہ

اپنے وجود کے بقیہ نصف حصہ کو زمین کے نیچے دفن کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

درخت کا یہ نمونہ انسانی زندگی کے لیے خدا کا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تعمیر اور استحکام کے لیے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے'۔ ملک کی ترقی کی بھی یہی صورت ہے جس طرح درخت زمین کے اوپر کھڑا ہے مگر وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں جماتا ہے۔ وہ نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا ہے نہ کہ اوپر سے نیچے کی طرف۔ درخت کا یہ عمل ہمیں یہ سبق دے رہا ہے کہ داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں۔

منصوبہ سازوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ترقی کے دو طریقے ہیں ایک مختصر مدتی منصوبے دوسرے طویل المیعاد تیرقی کے منصوبے۔ طویل المیعاد منصوبے ملک کو استحکام اور مضبوطی کی جانب لے جاتے ہیں جب کہ مختصر المیعاد منصوبے عوام کو فوری ریلیف دینے کے لیے شروع کیے جاتے ہیں۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جب اقتدار میں آتی ہیں تو عوام کو وقتی طور پر خوش کرنے کی جانب اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیتی ہیں۔ طویل المیعاد منصوبے تیار نہیں کیے جاتے۔ چھوٹے چھوٹے منصوبے عوام کے لیے ظاہری چمک کے سوا کچھ اور نہیں ہوتے۔ ابھی وہ منصوبے بھی مکمل نہیں ہو پاتے کہ حکومت کے خلاف مختلف قسم کے جھوٹے سچے الزامات شروع ہو جاتے ہیں۔ اب حکومت ان منصوبوں کو بھی ادھورا چھوڑ کر اپنے خلاف اٹھنے والی سیاسی ہوا کا رخ موڑنے میں لگ

جاتی ہے۔ انجام حکومت کے اختتام پر ہوتا ہے ۔ ایک ایک کرکے تمام حکومتوں کا جو حال ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

آصف علی زرداری کی سابقہ حکومت (۲۰۰۸ء ۔ ۲۰۱۳ء) کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ اس حکومت نے اپنی مقررہ میعاد تو مکمل کی جو سیاسی اعتبار سے ایک اچھا پیغام سامنے آیا لیکن اس کی کارکردگی صفر ہی رہی، اس حکومت نے اپنی تمام تر توانائیاں اس بات پر لگادیں کہ سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اس کے پیچھے صرف اور صرف ایک مقصد صاف نظر آتا ہے وہ یہ کہ ہر صورت حکومت برقرار رہے۔ اس دور میں ملک میں داخلی استحکام اور طویل المیعاد ترقیاتی منصوبوں پر توجہ نہیں دی گئی اس کے برعکس ظاہری منصوبوں ، مختصر المیعاد پروگراموں پر اپنی صلاحیتیں صرف کی گئیں۔ ایک پروگرام ایسا شروع کیا گیا جس میں فی خاندان ایک ہزار روپے ماہانہ امداد دی گئی۔ بھلا اس دور میں ایک ہزار روپے کی کیا حیثیت ہے۔ اس پروگرام کی تشہیر پر قومی خزانہ خوب لٹایا گیا۔ یہی حال باقی منصوبوں کا بھی ہوا۔ حکومت ختم ہوئی ، چین کی بانسری بجانے لگے، پانچ سال حکومت میں رہنے والی سیاسی جماعت اب حکومتِ وقت سے مطالبہ کررہی ہے کہ کراچی کو بڑی امداد کا پروگرام دیا جائے ۔ حیرت کی بات ہے کہ اب کراچی کے لیے بڑے منصوبے کا خیال آرہا ہے جب اپنی حکومت تھی تو کراچی کو کتنے بڑے منصوبے دیے گئے تھے؟

موجودہ حکومت کا حال یہ ہے کہ اسے ابھی سال ہی ہوا تھا کہ اس کے خلاف مضبوط قسم کی انقلابی اور تبدیلی مہم شروع ہو گئی دھرنوں، جلسے، جلوسوں اور ریلیوں کی سیاست عروج ہے۔ اس کی نوبت اس قدر جلد کیوں آئی۔ اس امر پر ہی غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حکومت نے ہوم ورک نہیں کیا تھا، ملک کو حقیقی معنوں میں ترقی دینے کے لیے منصوبے ہی نہیں تھے۔ وہی عارضی اور مختصر المیعاد پروگرام سامنے آئے، کوئی ایک بھی ٹھوس قسم کا منصوبہ جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس کی تکمیل سے ملک میں دخلی استحکام آئے گا اور ملک میں خارجی ترقی ممکن ہوسکے گی سامنے نہیں لایا گیا۔ دانش اسکول منصوبہ شروع ہوا اور بلبلے کی مانند بیٹھ گیا، جنگلا بس ایک شہر کے لیے سہولت، ھنر مند نوجوان اسکیم کے تحت ۹۸ ہزار ذہین طلبہ کو لیپ ٹاپ کا منصوبہ جس پر چار بلین قومی سرمایہ صرف ہوگا، غریب و نادار طلبہ کی فیس کی واپسی کا منصوبہ، قرض حسنہ اسکیم، سود سے مبرا لون اسکیم، اپنا روزگار اسکیم یا غیر ملکی دوروں کے دوران مختلف قسم کے معاہدوں پر دستخط ایسے منصوبے اور اقدامات ہیں کہ جنہیں ملک کی حقیقی ترقی کا ضامن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ڈاکٹر شاہد مسعود نے پاکستان کو ایم او یوز کا گریویارڈ قرار دیا ہے۔ پا بجلی کے بحران کی جانب ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا، پیٹرول اور گیس کی قیمتیں مسلسل اوپر کی جانب گامزن ہیں، وزارتِ منصوبہ بندی و ترقی کی ویب سائٹ کو دیکھیں تو اس

میں تصاویر، امدادی چیک دیتے ہوئے، میٹنگ کرتے ہوئے یا تقریر کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ اگر حکومت نے ٹھوس بنیادوں پر منصوبہ بندی کی ہوتی، سچائی اور ایمانداری سے ملک کو ترقی کی جانب لے جانے کے منصوبوں پر عمل کرتی تو اس قدر جلد حکومت کے خاتمے کی تحریکیں شروع نہ ہوتیں۔ اگر واقعی چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک خارجی اعتبار سے ترقی کی جانب گامزن ہوجائے تو ہمیں ملک کے داخلی استحکام پر توجہ دینا ہوگی۔

بصورت دیگر ہماری آئندہ نسلیں بھی ہماری طرح اچھائی کی امید کے سہانے خواب دیکھتے دیکھتے اپنی زندگی پوری کرلیں گیں۔ (۴ نومبر ۲۰۱۴ء)

لائبریرین شپ کے فروغ میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کا کردار

(مصنف کے پی ایچ ڈی مقالہ بعنوان 'پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں
حکیم محمد سعید شہید کا کردار' سے ماخوذ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔)

تلخیص :کتابیات کی اہمت اور ضرورت مسلمہ ہے، پاکستان میں کتابیات کی تدوین، ترقی اور فروغ کے لیے قائم ہونے والا ادارہ قدیم ترین ادارہ ہے جو اپنے قیام ۱۹۵۰ء سے آج تک کتابیات اور لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ یہ مضمون اس کتابیاتی ادارے کی ۶۰ سالہ تاریخ اور اس کی کتابیاتی خدمات کا احاطہ کرتاہے۔ قومی کتابیات پاکستان (۱۹۴۷ء۔۱۹۶۱ء) کی تدوین واشاعت اس ادارہ کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے۔ مضمون میں قومی کتابیات پاکستان کی تفصیل بھی تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: ا۔کتابیات سازی۔ ۲۔پاکستان ۔ قومی کتابیات۔ ۳۔ قومی کتابیات پاکستان (۱۹۴۷ء۔۱۹۶۱ء)

ابتدائیہ :پاکستان میں کتابیات کی تدوین واشاعت کیلئے پہلا کتابیاتی ادارہ پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ (Pakistan Bibliographical Working

۱۹۵۰ء میں عالمی تنظیم یونسکواور حکومت پاکستان کے تعاون سے (Group, PBWG
کراچی میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کے قیام میں ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم کی خدمات سر
فہرست ہیں۔ یونسکو نے کتابیات کے موضوع پر ۱۹۵۰ء میں پیرس کے مقام پر ایک
کانفرنس منعقد کی ۔ جس کے اختتام پر ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ
سیمینار میں شریک ممالک اپنے اپنے ملک میں کتابیات کی تدوین اور فروغ کے لیے ایک
کتابیاتی ادارہ تشکیل دیں۔ یونسکو اس ادارے کی تشکیل اور مقاصد کے حصول میں
معاون ومددگار ہوگا۔ پاکستان میں یونسکو کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ پاکستان ببلو
گرافیکل ورکنگ گروپ کی بنیاد رکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالمعید کے علاوہ فضل الٰہی مر
حوم ، سید ولایت حسین شاہ مرحوم، محمد شفیع مرحوم، قاضی حبیب الدین احمد، اے آر
غنی مرحوم، جمیل نقوی مرحوم،فرحت اللہ بیگ، ابن حسن قیصر مرحوم، نور محمد خان مر
حوم اور اختر ایچ صدیقی مرحوم شامل تھے ۔ یونسکو کے علاوہ حکومت پاکستان نے بھی
اس ادارے کے قیام میں معاونت کی۔ پہلے کتابیاتی ادارے کے طور پر یہ گروپ ۱۹۵۰ء
میں معرض وجود میں آیا۔ ابتدائی دو سالوں میں گروپ کی کارکردگی خط وکتابت کی حد
تک محدود رہی۔ ۱۹۵۳ء میں گروپ کو از سر نو منظم کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوا
ڈاکٹر عبدالمعید نے اس ادارے کو فعال بنانے کے لئے لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے
والوں سے تجاویز طلب کیں۔ ۱۳اگست ۱۹۵۳ء کو کراچی یونیورسٹی لائبریری میں ایک
میٹنگ سید ولایت حسین شاہ مرحوم کی

صدارت میں منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عبدالمعید، فرحت اللہ بیگ، ڈبلیو اے جعفری، اختر ایچ صدیقی نے شرکت کی۔ شریک اراکین نے گروپ کو از سر نو منظم کرنے کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لیا، ڈاکٹر عبدالمعید نے گروپ کی تشکیل نو کے سلسلے میں پاکستان کے مختلف حصوں سے موصول ہونے والے لائبریرین حضرات کے خطوط پڑھ کر سنائے اس میٹنگ میں گروپ کو فعال بنانے کی حتمی منظوری دی گئی (۱)۔ گروپ کی اسی میٹنگ میں ایک دستور ساز کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جو ڈاکٹر عبدالمعید، محمد شفیع، سید ولایت حسین شاہ اور فرحت اللہ بیگ پر مشتمل تھی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ کمیٹی میں ردوبدل بھی ہوا۔ ۱۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو گروپ کی ایک میٹنگ میں ایک اور دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ڈاکٹر عبدالمعید، قاضی حبیب الدین اور آسٹریلین ماہر شامل تھے (۲) یہ میٹنگ گروپ کے (L. C. Key) لائبریری سائنس ایل سی کی صدر ڈاکٹر امداد حسین کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ دستور سازی کا عمل طویل عرصہ تک جاری رہا۔ کمیٹی کے تیار کردہ مسودے کو آسٹریلین ماہر لائبریری سائنس ایل سی نے آخری شکل دی۔ گروپ کے دستور کی منظوری قاضی حبیب (L. C. Key) کی الدین کی صدارت میں منعقد ہونے والی میٹنگ منعقدہ ۴ جون ۱۹۵۶ء میں دی گئی (۳) ۔ میٹنگ میں شریک دیگر اراکین میں ڈاکٹر عبدالمعید، اے آر غنی، مہدی حسن، ابن اے ایل گارڈنر، (L. C. Key) حسن قیصر، اختر ایچ صدیقی کے علاوہ مسٹر ایل سی کی شامل تھے۔ گروپ (A. L. Gardner) اور جے سی شارپ (J. C. Sharp)

پاکستان لائبریرین شپ کا

واحد ادارہ ہے جس کے آئین کو پاکستانی ماہرین کے علاوہ بیرون مما لک کے تین ماہر لا ئبریری سائنس 'کی'، 'گارڈنر' اور 'شارپ' نے تشکیل دیا۔ گروپ نے مسٹر 'کی
کی خدمات کے اعتراف (Key) '
میں جو انہوں نے گروپ کے آئین کی تدوین کے لئے فراہم کیں ایک پارٹی کا اہتمام کیا، اس پارٹی کے انعقاد کا فیصلہ گروپ کی میٹنگ منعقدہ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء میں کیا گیا تھا (۴)۔

گروپ کی پہلی مجلس منتظمہ کا انتخاب جامعہ کراچی کی لا ئبریری میں منعقد ہونے والی میٹنگ منعقدہ ۱۷ مارچ ۱۹۵۴ء میں ہوا (۵) جس کی صدارت سید ولایت حسین شاہ نے کی۔ صدارت کے لیے حکومت پاکستان کے ڈپٹی ایڈوائیزر ایم ایس محی الدین پر اتفاق کیا گیا جب کہ دیگر عہدیداران میں عبدالمعید اور محمد شفیع نائب صدر، سید ولایت حسین شاہ سیکریٹری، جمیل نقوی جوائنٹ سیکریٹری، فرحت اللہ بیگ خازن اور اراکین میں اے آر غنی، ابن حسن قیصر اختر ایچ صدیقی شامل تھے۔ ڈاکٹر امداد حسین گروپ کے صدر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونسکو کے زیر اہتمام پیرس میں بین الاقوامی کتابیاتی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس (International Bibliographical Advisory Committee)
میں ڈاکٹر عبدالمعید نے پاکستان کی نمائندگی کی جو گروپ کے نائب صدر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پیرس میں گروپ اور یونیسکو کے درمیان ہونے والے 'ببلو گرافیکل پروجیکٹ' کو آخری

شکل بھی دی جس کے تحت گروپ نے ملک میں کتابیات کی تدوین و اشاعت میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یونسکو کے اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالمعید کی بطور نمائندہ کا فیصلہ گروپ کی ایک میٹنگ منعقدہ ۱۷ مئی ۱۹۵۴ء میں کیا گیا (۶)۔ وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے گروپ کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالمعید کو یونیسکو کے لیے پاکستان کا مقرر کیا، گروپ کے اغراض و مقاصد میں پاکستانCorresponding Member میں کتابیاتی ضروریات کی تکمیل، کتابیات کی تالیف و ترتیب، حوالہ جاتی مواد کی ترتیب و تالیف، کتابیات و دستاویزات سے متعلق جدید نقطہ نظر کا فروغ، پاکستان میں کتابیات کی تدوین و اشاعت اور انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا شامل ہے (۷)۔

(Publications) مطبوعات پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ

پاکستان میں کتابیات و حوالہ جاتی ماخذ کی تدوین و اشاعت کی ابتدا گروپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں گروپ کے دو حوالہ جاتی ماخذ شائع ہوئے ان میں خواجہ نور الہی، عبدالمعید اور اختر صدیقی کی مرتب کردہ پاکستان میں شائع ہونے والے حوالہ جاتی ذرائع (۸)، رسائل و جرائد اور اخبارات کی گائیڈ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی (۹)۔ ۱۹۵۶ء میں گروپ نے پاکستان کی لائبریریز، سائنسی و تعلیمی اداروں، میوزیم و آرٹ گیلریز پر مشتمل ایک ماخذ (۱۰) شائع کیا جس کا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں (۱۱) شائع ہوا جس میں لائبریریز کی

سوانح کا اضافہ بھی کیا گیا۔ایک سال بعد ایک کتابیات کی کتابیات شائع ہوئی (۱۲) ۔
۱۹۶۱ء ہی میں گروپ نے پاکستانی کتب خانوں میں موجود سماجی علوم کے رسائل کا یونین کیٹلاگ شائع کیا جسے فضل الٰہی اور اختر صدیقی نے مرتب کیا تھا (۱۳)۔یہ یونین کیٹلاگ یونیسکو کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔

پاکستان کی قومی کتابیات کی تدوین واشاعت میں گروپ کا کردار

پاکستان کی قومی کتابیات ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء کی تدوین گروپ کا ایک اہم قومی کارنامہ ہے۔ملک میں کاپی رائٹ قانون کی غیر موجودگی میں پاکستان کی گزشتہ قومی کتابیات کی تدوین ایک (Retrospective Pakistan National Bibliography) مشکل کام تھا۔حکومت نے اس دور کی قومی کتابیات کی تدوین کا کام پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کو سونپ دیا جسے گروپ نے انتہائی مہارت اور محنت کے ساتھ ایک قومی فریضہ تصور کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔یونسکو نے قومی کتابیات کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اپنے (Reading Materials Project) کے تحت گروپ کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے باقاعدہ ایک معاہدہ کیا جو نومبر ۱۹۹۶۱ء میں گروپ اور یونسکو کے درمیان طے پایا (۱۴)۔یونسکو نے اس سلسلے میں انڈین نیشنل لائبریری، کلکتہ میں گروپ کے دو نمائندوں کو انڈین نیشنل ببلو گرافیکل یونٹ کے ساتھ تین ماہ کی تربیت کے تمام تر اخراجات کی بھی پیش کش کی۔ گروپ کے نمائندے کی حیثیت سے محمد

گلستان خان کلکتہ تشریف لے گئے جہاں پر انھوں نے کتابیات کی تدوین کی عملی تربیت حاصل کی (۱۵)۔ گروپ نے قومی کتابیات کی تدوین پر کام کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا حصہ جو جنزل ورکس اور اسلام کی کتب پر مشتمل (۱۶) اور دوسرا حصہ سماجی علوم اور لسانیات کی کتب پر مشتمل (۱۷) ۱۹۷۲ء میں نیشنل بک کونسل آف پاکستان نے شائع کیا۔ جب کہ سائنس، ٹیکنالوجی، فائن آرٹس، ادب، تاریخ اور سوانح پر مشتمل کتب جلد سوم کے طور پر حکومت پاکستان کے ڈیپارٹمنٹ آف لائبریریز، نیشنل لائبریری آف پاکستان نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی (۱۸)۔ آمنہ خاتون نے قومی کتابیات پاکستان کی جلد سوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ " قومی کتابیات کی تیاری کو جدید اصولوں و ضوابط سے ہم آہنگ کیا گیا، جو اندراجات نامکمل تھے ان کو مکمل کیا، تمام اندراجات کی نئے سرے سے درجہ بندی و کیٹلاگ سازی کی گئی۔ اس کتابیات کی تیاری کا کام اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس میں وہ تمام زبانیں شامل ہیں جو پاکستان میں بولی جاتی ہیں۔ پھر کسی کیے ہوئے کام کو سدھارنا اور سنوارنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن مدیر اعلیٰ نے بہت مہارت اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس مشکل کام کو بحسن خوبی انجام دیا اس طرح قومی کتابیات کے سلسلے کی ٹوٹی ہوئی کڑی بہت خوبی سے جوڑ دی گئی (۱۹)۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان گروپ نے دیگر اداروں کیلئے کچھ کتابیات مرتب

کیں۔ ۱۹۷۲ء کے بعد گروپ کا کتابیات کی تدوین و اشاعت کا سلسلہ طویل عرصہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ اس دوران لائبریری اسکول پر ہی گروپ کی توجہ مرکوز رہی۔ بیس سال بعد ۱۹۹۲ء میں گروپ نے 'کتابیات طب و صحت' شائع کی (۲۰)۔ ۱۹۹۳ء میں اسلام پر حوالہ جاتی ماخذ کی کتابیات (۲۱)، اختر ایچ صدیقی مرحوم گروپ کے بانی اراکین میں ہونے کے علاوہ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے پاکستان میں اب تک سب سے زیادہ کتابیات مرتب کیں۔ ۱۹۹۸ء میں گروپ نے اختر صدیقی پر سوانحی کتابیات شائع کی (۲۲) ۔۱۹۹۸ء میں پاکستان لائبریری ریویو کا اشاریہ شائع ہوا (۲۳) ۔۱۹۹۹ء میں گروپ کی قومی کتابیات کا تیسرا حصہ منظر عام پر آیا، اسی سال پاکستان کے قیام کی گولڈن جوبلی کے موقع پر لائبریری و انفارمیشن سائنس کے رسائل و جرائد کے مضامین کا ۵۰ سال (۱۹۴۷ء۔ ۱۹۹۷ء) پر مشتمل اشاریہ شائع ہوا (۲۴) اس اشاریہ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ انٹرنیٹ پر پاکستان میں اپنے مکمل متن کے ساتھ شائع ہو نے والی لائبریری سائنس کی یہ اولین کتاب ہے (۲۵) ۲۰۰۴ء میں گروپ نے پاکستان کے معروف لائبریرین و ببلو گرافر جناب عادل عثمانی کو ان کی اپنی تصانیف و تالیفات کی روشنی میں متعارف کرایا اور سوانحی کتابیات شائع کی (۲۶)۔

''تحقیقی مقالہ ''پاکستان میں کتابیات کے فروغ میں گروپ کا کردار

جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے سیشن (۲۰۰۳ء) میں ”پاکستان میں کتابیات کے فروغ میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے کردار“ پر مبنی تحقیقی مقالہ شعبہ کی صدر پروفیسر ڈاکٹر نسیم فاطمہ کی نگرانی میں سعادیہ کنول نے تحریر کیا (۲۷) مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے تعارف کے تحت کتابیات کی اہمیت، اقسام اور کتابیاتی کنٹرول میں دیگر کتابیاتی اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

گروپ کی ۵۳ سالہ کتابیاتی خدمات پر جامعہ کی سطح پر ہونے والی یہ اولین تحقیق ہے۔

اسکول آف لائبریرین شپ (School of Librarianship)

۱۹۵۹ء میں گروپ نے انڈر گریجویٹ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک لائبریری اسکول قائم کیا۔ پہلا سیشن ۱۹۶۰ء میں مکمل ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک جاری رہنے والا پروگرام (Diploma in Bibliography and Special Librarianship) کہلایا۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان لائبریری ایسوایشن کی درخواست پر کورس کا نام تبدیل کرکے (Higher Certificate in Library Science) کر دیا گیا جو اب بھی جاری ہے۔ چھ ماہ کا یہ سرٹیفیکیٹ کورس حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم، ڈیپارٹمنٹ آف لائبریرنز سے باقاعدہ منظور شدہ ہے جس کا گزٹ نوٹیفیکیشن ۱۹۸۶ء میں جاری ہوا (۲۸)۔ انڈر گریجویٹ لائبریری ایجوکیشن کو

حکومتی سطح پر تسلیم کیا جانا ایک حوصلہ افزا امر ہے، کورس کے اولین ڈائریکٹر فضل الٰہی مرحوم تھے۔ان کے بعد سید ولایت حسین شاہ، الحاج محمد زبیر، پروفیسر اختر حنیف اس عہدے پر فائز ہوئے۔انتظامی امور کے نگراں اور گروپ کے سیکریٹری گلستان خان تھے۔ راقم الحروف نے ۱۹۷۴ء میں اعزازی استاد کی حیثیت سے کورس میں شمولیت اختیار کی، ۱۹۷۹ء میں گلستان خان کے بعد اسکول کے انتظامی امور کا نگراں مقرر کیا گیا، ۱۹۹۵ء میں پروفیسر اختر حنیف کے انتقال کے بعد جو اسکول کے ڈائریکٹر تھے راقم الحروف کو اسکول کا اعزازی ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔۱۹۶۰ء میں پہلا سیشن ہوا جس میں ۴۶ طلبہ نے داخلہ لیا، ان میں سے ۴۴ طلبہ پاس ہوئے۔ ۲۰۰۵ میں منعقد ہونے والا ۵۲ واں سیشن تھا جس میں طلبہ کی تعداد ۲۰ تھی ۔اس طرح ۴۵ سیشن ہوئے جن میں کل طلبہ نے کورس مکمل کیا ان میں ۵۰۰ مرد اور ۷۵۰ خواتین تھیں (۲۹) گروپ ۱۲۳۰ کے تحت انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

حوالہ جات

1. Pakistan Bibliographical Working Group. Minutes of the Meeting of Pakistan Bibliographical Working Group held on 3-8-1953, at 6.00 p.m. at Karachi

University Library, Karachi. Prepared by A. Moid and
Confirmed by S.V. Hussain as Chairman
(Typewritten)
2. Ibid. Thursday the 17th November 1955
3. Ibid. Monday the 4th June 1956,
4. Ibid. Thursday the 20th September 1956
5. Ibid. Wednesday, the 17th March 1954
6. Ibid. 17th May 1954.
7. Usmani, M. Adil. Bibliographical Services Throughout
Pakistan. 2nd. ed.
(Karachi: Library Promotion Bureau. 1981), p.9
8. Pakistan Bibliographical Working Group. A Guide to
Works of Reference
Published in Pakistan. Khawaja Nur Elahi, A. Moid and
Akhtar H. Siddiqui ed.,
(Karachi: PBWG, 1953) 36p.
9. Pakistan Bibliographical Working Group. A Guide to
Periodical Publications and

Newspapers of Pakistan. A. Moid and Akhtar H. Siddiqui ed., (Karachi: PBWG, 1953), 60p.

10. Pakistan Bibliographical Working Group. A Guide to Pakistan Libraries . Learned and Scientific Societies and Educcational Institutions including Museums and Art Galleries (Karachi: PBWG, 1956), 131p.

11. Ibid. 166p.

12. Pakistan Bibliographical Working Group. Bibliography of Bibliographies published in Pakistan. Akhtar H. Siddiqui ed., (Karachi: The Group, 1961), 8p.

13. Union Catalogue of Periodicals in Social Sciences held by the Libraries in Pakistan. Fazal Elahi and Akhtar H. Siddiqui ed., (Karachi: PBWG, 1961), 166p.

14. Ghani, A. R. National Bibliography of Pakistan (August 1947 - Dec.1961).

Unesco Information Bulletin on Reading Materials .IV no 2 , (July 1962)

۱۵۔ خان ٔ محمد گلستان ۔لائبریرین ، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز، ہمدرد یونیورسٹی ،انٹرویو از محقق،۷ اگست ۲۰۰۴ء ، کراچی۔

16. The Pakistan National Bibliography : 1947-1961, Fascicule I, General Works to Islam (001-297). Pakistan Bibliographical Working Group. ed., (Karachi: National Book Centre of Pakistan. 1972. 79p.

17. The Pakistan National Bibliography : 1947-1961, Fascicule II, Social Sciences to Languages (300-492). Pakistan Bibliographical Working Group ed., (Karachi: National Book Centre of Pakistan. 1972), 178p.

18. The Pakistan National Bibliography : 1947-1961; Pure Sciences to Geography and History (500-900). Fascicule - III. Pakistan Bibliographical Working Group ed., (Islamabad:: Government of Pakistan, Department of Libraries, National Library of Pakistan, 1999), 560p.

۱۹۔ آمنہ خاتون۔ پاکستان کی گزشتہ قومی کتابیات (حصہ سوم) : ایک تعارف۔

پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جرنل۔
۳۔۴) : ۳۷، ستمبر۔دسمبر ۲۰۰۱۔)۳۲
۲۰۔کتابیات طب وصحت: طب وصحت کے موضوع پر اردو زبان میں شائع ہونے
والی مطبوعات۔ رئیس احمد صمدانی۔ (کراچی:
پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ، ۱۹۹۲ء) ،۷۰ص

21. Bibliographical Sources on Islam. Rais Ahmed Samdani ed., (Karachi: PBWG, 1993), 44p.

22. Samdani, R. A. ed., Akhtar H. Siddiqui: A Bio-bibliographical Study. (Karachi: Pakistan Bibliographical Working Group, 1995) 79p.

23. Samdani, R. A. ed., Cumulative Index of Pakistan Library Review (PLR) (Karachi: PBWG, 1998), 40p.

24. Samdani, R. A. and Khalid Mahmood. ed., Periodical Literature in Library and Information Sciecne: An Index of 50 Years Work in Pakistan , 1947 - 1997. (Karachi: PBWG, 1999) 182p.

25. Web Site:httap:/www.angelfire.com/ma3/mahmood khalid.

26. Samdani, R. A. ed., Muhammad Adil Usmani: A Bio-bibliographical Study. (Karachi: Library Promotion Bureau and PBWG, 2004), 17p.

27. Sadia Kanwal. Role of Pakistan Bibliographical Working Group in the

Development of Bibliography in Pakistan. (MLIS Thesis Department of Library and Information Science , University of Karachi. 2003), 56p.

28. Pakistan, Govt. of Pakistan. Notification No. F-2-3/86-PR, Dated 22th Dec.1996.

29. School of Librarianship, Pakistan Bibliographical Working Group, Karachi. G. R. Register.

بے طرز کالم نگار۔ڈاکٹر صفدر محمود

کالم نگاری ادب کی ایک صنف قرار پا چکی ہے۔ لکھاریوں اور صحافیوں نے مل کر اس صنف کو باقاعدہ پروان چڑھیا۔ کسی بھی موضوع کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو قلم کی زبان دینا کالم ہی کے زمرہ میں آتا ہے۔ ان موضوعات میں ادبی ، معاشی ، معاشرتی، سماجی، سیاسی، مزاح، تعلیمی شامل ہیں۔کالم نگاری نے جس قدر وسعت اور شہرت اختیار کی ادب کی کسی اور صنف نے نہیں کی۔ ایک زمانہ تھا کہ ادب کی کسی ایک صنف سے وابستگی پر ادیب اکتفا کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ناول نگار اپنے آپ کو ناول نگار کہلانے میں فخر محسوس کیا کرتا تھا، افسانہ نگار اپنے آپ کو افسانہ نگار کہلانے میں فخر محسوس کیا کرتا تھا، مزاح لکھنے والا مزاح نگاری کو اپنے لیے باعث اطمینان تصور کیا کرتا تھا، شاعر تو بس شاعری میں مگن رہتا اور شاعری ہونا اس کے لیے اعزاز ہوا کرتا تھا، یہی صورت حال دیگر اصناف سے وابستہ لکھاریوں کی بھی تھی۔ اللہ بھلا کرے سیاست کا اور سیاست دانوں کا، دونوں کے بیچ ایسا دنگل شروع ہوا ہے کہ ہر بہ شعور شخص جو پڑھنا جانتا ہے سیاست پر لکھے گئے کالم پڑھنے لگا اور وہ باشعور جو پڑھ نہیں سکتا تھا،برقی میڈیا نے اس ان پڑھ کو سیاسی ٹاک شو کے ذریعہ یہ تفریح فراہم کردی۔ دوسری جانب لکھاریوں نے جب یہ دیکھا کہ اب کالم نگاری کی سیل جاری ہے تو سنجیدہ

لکھنے والوں، مزاح لکھنے والوں، معاشی و معاشرتی موضوعات پر لکھنے والوں، سائنس و فنون پر لکھنے والوں، تعلیم کے موضوعات پر لکھنے والوں، شاعروں، ڈاکٹروں اور صحافیوں نے اپنے اصل یا بنیادی موضوع کے ساتھ ساتھ سیاسی موضوعات کو اپنا مرکز و منبع بنایا، سیاسی موضوعات پر کالم لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ٹھہرا، جس کو برقی میڈیا میسر ہاتھ آگیا وہ سیاسی تجزیہ نگار بن گیا۔ حتیٰ کہ مجھ جیسا عام موضوعات پر لکھنے والا بھی کالم نگاروں کی صف میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

تمہید کچھ زیادہ طویل ہوگئی مجھے تو سیاسی تجزیہ نگار و کالم نگار ڈاکٹر صفدر محمود کی کالم نگاری کا پوسٹ مارٹم کرنا تھا جو برقی میڈیا پر سیاسی تجزیہ نگار کی حیثیت سے اکثر و بیشتر سیاسی مسائل پر اپنی آراء سے عوام الناس کو مستفیض کرتے ہیں اور پرنٹ میڈیا میں روزنامہ جنگ میں ''صبح بخیر'' کے عنوان سے ہر اتوار کو جلوہ افروز ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی موضوع پر خوبصورت انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علاوہ تمام کالم نگاروں کو 'صاحب طرز' کالم نگار اور اپنے ایک کالم 'مٹی' میں اپنے آپ کو ''بے طرز'' لکھاری قرار دیا ہے۔ میرے کالم کے عنوان سے ہو سکتا ہے کہ قارئین یہ سمجھ رہے ہوں کہ مَیں نے ڈاکٹر صفدر محمود کو بے طرز کالم نگار تصور کرتا ہوں۔ جناب میری کیا مجال کہ میں ایک مستند، قابل، خوبصورت تحریر کے

مالک، وسیع علم، وسیع مطالعہ اور وسیع تجربہ رکھنے والے لکھاری کو بے طرز کالم نگار لکھوں۔

ڈاکٹر صفدر محمود پاکستان کے ان چند کالم نگاروں میں سے ہیں جو کمپنی کی مشہوری کے لیے یا روٹی روزی کے لیے نہیں لکھتے۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت اور دولت سے نوازا ہے سینئر سپیریئر سروس میں اعلیٰ عہدوں پر رہے، وفاقی سیکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کا قلم سچائی کی تلاش، درست سمت رہنمائی، سچ کو سچ اور غلط کو غلط کہنے میں مصروفِ عمل ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہترین منتظم تھے۔ پاکستانیت اور محب الوطنی ان کی نس نس میں رواں دواں ہے۔ بقول خود ان کے 'میری زندگی کا معتدبہ حصہ پاکستان کی تاریخ و سیاست پر تحقیق کرتے اور کتابیں لکھتے گزرا ہے اس کے باوجود میں سیاسی تجزیوں سے 'پرہیز' کرتا ہوں لیکن کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدل اور قارئین کو تبدیلی کا احساس دلانے کے لیے سیاست کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے باز نہیں آتا'۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق گجرات کے گاؤں 'ڈنگا ٹاؤن' سے ہے۔ اسی حوالے سے فخرِ گجرات کہے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ تاریخ اور تاریخ پاکستان ان کا خاص موضوع ہے۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔

آئینِ پاکستان ۱۹۷۳ء'، 'پاکستان کیوں ٹوٹا'۔ 'پاکستان تاریخ و سیاست' دردِ آگہی''
ان کی خاص کتابیں ہیں۔ ان کی کتابوں کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ تاریخ
میں نمایاں کارکردگی پر انہیں حکومتِ پاکستان نے 'پرائیڈ آف پرفارمینس' سے نوازا۔
تاریخ پاکستان کے ساتھ ساتھ بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح کے حوالے سے ڈاکٹر
صاحب کے متعدد کالم روزنامہ جنگ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں قائدِاعظم کی اردو ان
فہمی، مولوی قائدِاعظم محمد علی جناح، اقبال سے قائدِاعظم محمد علی جناح تک، قائدِاعظم
اور قائدِاعظم ثانی، گیارہ ستمبر اور قائدِاعظم، معاملہ ہے بابائے قوم کا دوستوں احتیاط
سے کام لو، قائدِاعظم ادھورے سچ، قائدِاعظم کے حوالے سے چند ضروری
وضاحتیں، قائدِاعظم کیا چاہتے تھے، قائدِاعظم محمد علی جناح؟، قائدِاعظم کے بارے میں
وضاحتیں تحقیق کی روشنی میں، قائدِاعظم کے بارے میں بدگمانی، افکار قائد کی ایک
جھلک، قائدِاعظم جگن ناتھ آزاد اور قومی ترانہ، جناب الطاف حسین کے قائدِاعظم پر
ڈرون حملے، قائدِاعظم نظریہ پاکستان اور موجودہ سیاست، پاکستان اور قائدِاعظم شوشوں
کی زد میں، قائدِاعظم اور مولانا اشرف علی تھانوی، قائدِاعظم کا پاکستان چلے چلو کہ وہ
منزل ابھی نہیں آئی، خدارا قائدِاعظم کو معاف کردو، پاک بھارت تعلقات اور
قائدِاعظم، قائدِاعظم کا اے ڈی سی اور زیارت کے آخری ایام، قائدِاعظم پر بہتان
لگانے والے، قائدِاعظم کیا چاہتے تھے، اقبال، قائدِاعظم، بندے ماترم اور، مخالفین
پاکستان، کیری لوگر بل اور قائدِاعظم پر

الزام، قائدِاعظم کا ماٹو اور ہم وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان کے مسائل اور تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے کالم کی تعداد بے شمار ہے۔ ان کالموں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ قائدِاعظم محمد علی جناح اور پاکستان کے سچے عاشق اور سچے محب وطن ہیں۔

سیاسی تجزیہ نگاری اب عام سے بات ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ عوام الناس میں سیاسی شعور و آگہی کا پایا جانا ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی ڈگری یا باقاعدہ کسی کی شاگردگی اور تربیت کی ضرورت نہیں یہی وجہ ہے کہ اب سیاسی تجزیہ نگار کی اکثریت وہ ہے جنہیں پرنٹ میڈیا یا برقی میڈیا میں کسی ہائی فائی شخصیت کی آشیرباد حاصل ہو جائے وہ اگر کوئی اور کام نہیں کرسکتا تو تجزیہ نگار ہی بن جاتا ہے۔ بے شمار نام اس حوالے سے گنوائے جاسکتے ہیں جو اعلانات کیا کرتے تھے، خبریں پڑھا کرتے تھے، عوام الناس کی دل جوئی کے پروگراموں کی میزبانی کیا کرتے تھے آج وہ مقبول تجزیہ نگار ہیں۔ البتہ پرنٹ میڈیا پر یہ صورت حال نہیں یہاں صرف زبان چلانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ عقل و سمجھ، علم و دانش، سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی مضبوط گرفت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہاں پر لکھی ہوئی بات جو چھپ چکی ہو آسانی سے گرفت میں آسکتی ہے۔ برقی میڈیا پر آپ نے اگر کوئی غیر اخلاقی جملہ کہہ بھی دیا تو سننے والوں نے سن لیا بعد میں اسے سننا مشکل ہوتا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ایسے تجزیہ نگار

بھی پائے جاتے ہیں جو کی اعلیٰ تعلیم کسی ایسے شعبہ کی میں ہے جس کا دور دور تک سیاست سے تعلق نہیں، تجربہ بھی کسی ایسے شعبہ کا ہے جس کا میڈیا سے تعلق نہیں لیکن پرچی کی بنیاد پر تمام تر تعلیم اور تجربہ کو دور رکھ کر وہ اسکرین پر اپنے جوہر دکھا رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود ان سیاسی تجزیہ نگاروں میں سے نہیں وہ تعلیم، انتظامی تجربے کے ساتھ ساتھ تاریخ و سیاست کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ ان کے سیاسی تجزیے سیاست کے کھلاڑیوں کو درست سمت دکھا رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ازراہ انکساری اپنے آپ کو بے طرز کالم نگار لکھ دیا بصورت دیگر وہ ہر گز گز بے طرز نہیں وہ بجا طور پر صاحب طرز سیاسی، سماجی، تاریخی اور معاشی تجزیہ نگاروں کی صف میں اول درجہ کے شہسوار ہیں۔ مَیں اپنے آپ کو بے طرز تجزیہ نگار کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے سیاست میں ماسٹرز ضرور کیا لیکن میری اعلیٰ ڈگری یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری سماجی علوم میں ہیں۔ میں حکیم محمد سعید کی کتاب سے محبت اور کتب خانوں سے گہری وابستگی کے حوالے سے پی ایچ ڈی کی سطح پر اولین تحقیق ہے۔ میں بھی ڈاکٹر صفدر محمود کی مانند انتظامی، تدریسی، تصنیفی وتالیفی تجربہ ہی رکھتا ہوں۔ ادب سے وابستگی میرا خاندانی ورثہ ہے۔ میرے لکھنے کے موضوعات ادب میں شخصیات ہیں۔ شخصی خاکوں اور مضامین پر مشتمل میرے مجموعے ''یادوں کی مالا'' اور ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح لائبریری و انفارمیشن سائنس کے موضوعات، اسلام، سماجی علوم کے موضوعات پر لکھتا رہا

ہوں۔ بات ڈاکٹر صفدر محمود سے شروع ہوئی میں بلاوجہ درمیان میں آگیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کی کالم نگاری خصوصاً سیاسی کالم نگاری کو خراج تحسین

پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

کپتان کا لاڑکانہ شو۔ حکمت عملی پر نظر ثانی کی ضرورت

انقلاب دھرنا اور آزادی دھرنا اپنی آب وتاب دکھا کر نہ صرف اپنی اصلی حیثیت کو بدل چکے ہیں ساتھ ہی دونوں نے اپنی اپنی سمت جدا جدا کرلی ہے۔ ڈاکٹر طاہر القادری نے انقلاب کو سرِدست ممکن نہیں قرار دیتے ہوئے اسے ملک میں ہونے والے انتخابات سے مشروط کردیا ان کا فرمانا ہے کہ اگر عوام نے ان کی پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیاب کیا تو وہ ملک میں انقلاب برپا کرکے دم لیں گے۔ اسلام آباد میں بیٹھ کر انقلاب نہیں لایا جاسکتا اور اس حکمت عملی سے موجودہ حکومت کو بھی گرانا مشکل ہے۔ کیوں کہ جن پر تکیہ تھا وہ ایسا کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول 'ڈاکٹر صاحب سے کوئی ایسی کمٹ منٹ کی گئی تھی' ۔ ایک اعتبار سے ڈاکٹر قادری کا یہ فیصلہ یعنی انقلابیوں کو اسلام آباد سے اپنے اپنے گھروں کو بھیج دینا اور انتخابات کے لیے اپنی پارٹی کو تیار کرنا مستحسن اقدام ہے۔ کسی بھی جمہوری معاشرے میں تبدیلی کا یہی درست طریقہ ہے۔دنیا میں انتظامی تبدیلی کے دو ہی طریقے رائج ہیں ایک انتخابات جس میں سیاسی جماعتیں اپنا منشور عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں عوام جس کے منشور کو مناسب سمجھتے ہیں انہیں منتخب کرکے ایوانوں بھیج دیتے ہیں۔ اب اس گروہ یا جماعت پر موقوف ہے کہ اپنے منشور پر عمل کریں یا اپنے کاروبار کو ترقی دیں

اور خوب خوب ملکی سرمایا بیرونِ ملک منتقل کریں تاکہ کسی بھی مشکل وقت میں یہ سرمایا ان کے کام آسکے۔ تبدیلی اور انقلاب کا دوسرا راستہ اور بھی ہے وہ ہے طاقت رکھنے والے اپنی طاقت کے زور پر ملک میں تبدیلی کا اعلان کردیں جیسا کہ ہمارے ملک میں متعدد بار ہوچکا۔ ایوب خان صاحب، یحییٰ خان صاحب، قبلہ ضیاء الحق صاحب اور محترم پرویز مشرف صاحب اپنے اپنے عمل کے بعد چاہتے تو ملک میں دودھ کی نہریں بہا سکتے تھے۔ اگر خود میں اس قدر صلاحیت نہ تھی تو کسی ایک یا ایک سے زیادہ جماعتوں کو اپنا ہم رکاب بنالیتے اور انقلاب برپا کردیتے لیکن کیا ہوا۔ یہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ بہتری کی امید لیے بچے جوان، جوان بوڑھے اور بہت سے بوڑھے ملکِ ادم کو سدھار گئے پر ہمارے ملک میں بہتری نہ آئی۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے اپنے دھرنے کو انتخابات سے مشروط کرکے مناسب حکمت عملی اختیار کرلی۔ اب وہ اور ان کی سیاسی جماعت ملک میں انتخابات میں شرکت کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوچکی ہے۔ البتہ ہمارے کپتان پویلین میں روز اول کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے دھرنے نے بھی تبدیلی اختیار کرلی ہے۔ کپتان کو فیلڈ میں موجود کھلاڑیوں اور شائقین کا اسٹیمنا کم ہوتا دکھائی دیا اور ایسا ہونا ہی تھا آخر لوگ کتنے دن اپنے معمولات زندگی کو چھوڑے رہتے۔ کپتان نے نئی حکمت عملی اپناتے ہوئے دھرنے کو ملک کے مختلف شہروں تک

وسیع کر دیا۔ ویسے بھی انقلاب دھرنے اور آزادی دھرنے میں فرق تھا۔ علامہ طاہر القادری کے پرستار دن رات اسلام آباد میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ وہیں سونا، وہیں کھانا، وہیں ضروریات زندگی۔ گویا وہاں رات دن ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ تحریک انصاف کا دھرنا شام میں سجا کرتا اور رات گئے جاری رہتا۔ کپتان کے پرستار اپنے معمولات زندگی سے فارغ ہو کر شام میں آتے ہیں اور رات گئے گو نواز گو کے نعرے لگاتے رہتے۔ لیکن ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے۔ سو دن ہو چکے ہیں کپتان صاحب ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور ان کے چاہنے والوں کے اسٹیمنا کی داد دینا چاہیے۔ صحیح یا غلط یہ الگ بات ہے۔ اس قدر تھکا دینے والا عمل اس قدر طویل وقت تک جاری رکھنا کوئی آسان نہیں۔

حال ہی میں تحریک انصاف نے سندھ کے اہم شہر، پیپلز پارٹی کے مرکز لاڑکانہ سے بارہ میل کی دوری پر ایک گاؤں میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا مقصد پیپلز پارٹی کو احساس دلانا تھا کہ ہم تمہارے گھر میں بھی اپنی طاقت رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لاہور، سرگودھا، رحیم یار خاں اور دیگر شہروں میں اپنی طاقت کا اظہار کرکے مسلم لیگ نواز) کو اپنی طاقت کا احساس دلا چکی ہے اور کراچی میں جلسہ کرکے ایم کیو ایم کو اپنی) طاقت دکھانا تھی۔ لاڑکانہ شہر میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ پیپلز پارٹی نے اسے ناکام کوشش قرار دیا جب کہ کپتان کے بیانات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس بات

میں کوئی شک نہیں کہ جلسہ گاہ میں لوگ موجود تھے۔ تعداد میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ جلسہ کرنے والے لاکھوں کی تعداد کہتے ہیں جب کہ ان مخالف اسے ہزاروں میں کہہ کا ناکام جلسہ قرار دے دیتے ہیں۔ ایک حکمت عملی سیاسی جماعتوں کی یہ بھی ہوتی ہے کہ جلسہ جس مقام پر منعقد ہوتا ہے نزدیک نزدیک شہر سے لوگ اس جلسہ میں بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ لاڑکانہ کے جلسے کے لیے کہا گیا کہ یہاں کراچی سے بہت بڑی تعداد کو شرکت پر مجبور کیا گیا۔ ایسا ہر جماعت کیا کرتی ہے۔ مخالفین کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں۔ کیا پیپلز پارٹی نے کراچی کے جلسے میں اندرون شہر سے لوگوں کو شرکت کے لیے مجبور نہیں کیا۔ یہی حکمت عملی دیگر جماعتیں بھی اپناتی ہیں۔ اگر کپتان نے ایسا کیا تو کوئی بری بات نہیں۔ البتہ جو چیز قابل غور رہی وہ جلسہ گاہ میں موجود لوگوں میں کپتان سے چاہت کم کم نظر آئی۔ کپتان کی تقریر کے دوران لوگوں کا جوش و جذبہ بھی کچھ بجھا بجھا تھا۔ کپتان کی زیادہ باتوں کو خاموشی سے کے ساتھ ایک کان سے سنا دوسرے سے نکال دیا۔ کپتان نے اپنی تقریر میں یہ بات بھی کہی کہ ''مجھے فخر ہے کہ سندھ اسمبلی نے میرے خلاف قرارداد منظور کی' یہ بات کہنا ضروری نہیں تھا ۔بات اس حد تک نہیں رکھی بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ ' سندھ کے لوگوں کو حقوق نہیں دئے ۔ حقوق انسانوں کے ہوتے ہیں غلاموں کے نہیں'، گویا سندھ کے عوام غلام ہیں۔ واہ ری سندھ کی عوام تیرے بھولے پن پر قربان کس خاموشی سے کپتان کی یہ بات سن لی۔

شاہ محمود قریشی نے صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے کیونکہ اس جلسہ گاہ میں ان کے ہزاروں مرید بھی موجود ہوں گے اپنی پارٹی کے منشور سے ہٹ کر بات کہی تاکہ عوام کے جذبے کا ابھارا جاسکے انہوں نے اپنی تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی شان میں چند جملے کہے اور ان کی خدمات کا ذکر کیا تو عوام نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اسی طرح انہوں نے کالا باغ ڈیم کی تعمیر کو سندھ کے عوام کی مرضی سے وابستہ کیا تو عوام نے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ تیسرا موقع وہ تھا جب کہا گیا کہ سندھ کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے جس پر سب سے زیادہ نعرے بازی ہوئی اور تالیاں' بجائی گئیں۔ یہ باتیں کیا پیغام دے رہی ہیں اس کا ادراک کپتان کو کرنا چاہیے۔
کپتان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اگر ایمانداری سے ، غیر جانب دار ہو کر تجزیہ کریں تو کپتان کی زیادہ تر باتوں میں سچائی ہے۔ وہ کسی بھی طور غلط نہیں۔ انتخابات میں دھاندلی کوئی نئی بات نہیں۔ ہر ایک انفرادی طور پر اور ہر سیاسی جماعت جو جیتی یا ہاری دھاندلی ہوئی دھاندلی ہوئی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ اب اگر واقعی بد دیانتی کی گئی کسی کا حق چھینا گیا تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا غلط بات تو نہیں۔ غیر جانب دار طریقے سے اس کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اگر دھاندلی نہیں ہوئی

تو نواز حکومت بدستور حکمرانی کے مزے لیتی رہے گی اگر واقعی پنجاب کے شہروں میں دھاندلی سے الیکشن کو ہائی جیک کیا گیا ہے تو' گو نواز' ہو جانا چاہیے بلکہ حکمراں از خود کنارہ کش ہوجائیں اس میں ان کی عزت اور وقار میں اضافہ ہی ہوگا۔ کپتان کا یہ کہنا کہ حکمرانوں کی جائیدادیں اور سرمایا بیرون ملک بنکوں میں جمع ہے اس میں بھی صداقت ہے۔ آج نواز شریف اور زرداری صاحب اعلان کردیں کہ وہ اپنا تمام تر سرمایا جو بیرون ملک بنکوں میں جمع ہے پاکستان منتقل کر رہے ہیں ۔اس عمل سے ان کا قدکاٹ اور بڑھ جائے گا اگر مدٹرم انتخابات ہوئے تو دونوں جماعتوں کو بھاری اکثریت آسانی سے مل جائے گی۔ کپتان کی باتوں میں بڑی حدتک سچائی ہے لیکن ایک وزیر اعظم نواز شریف کے استعفے کا مطالبہ کچھ زیادہ بھاری پتھر ہے جسے موجودہ حکومت کسی بھی طور اپنے سر پر مارنے کی آخری وقت تک ہمت نہیں کرے گی۔ اس کی وجہ حکومتی وزیروں کے مطابق درست بھی ہے کہ انہیں عوام نے حق حکمرانی کثرت رائے سے دیا ہے۔ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا نہیں معلوم۔ ۳۰ نومبر کو کیا ہونے والا ہے یہ بھی نہیں معلوم۔ البتہ ظاہری صورت حال جو دونوں جانب سے بیانات کی صورت میں سامنے آرہی ہے وہ بھیانک ناک اور افسوس ناک ہے۔ خدا کرے حکمراں سانحہ ماڈل ٹاؤن کے واقعہ سے سبق سیکھ چکے ہوں ۔ وہ دردناک کہانی کسی صورت نہ دھرائی جائے۔ کپتان کو بھی سوجھ بوجھ اور سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔دھرنے اور جلسوں میں مخالفین کو للکارنا، پھٹکارنا، ھانکنا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا، یہاں تک کے بے

ہودہ زبان استعمال کرنا جو کہ نہیں ہونی چاہیے درست لیکن عملاً ایسی حکمت عملی اپنائی جائے جس میں خون خرابہ نہ ہو، ایک جان بھی نہ جائے۔ تصادم کی صورت میں جانی و مالی نقصان کے ساتھ ساتھ ملک میں جمہوری نظام کی بساط بھی الٹ جائیگی چنانچہ دونوں فریق افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنا ہی دانشمندی ہوگی۔

سندھ کے عوام جو اندرون سندھ میں رہتے ہیں اپنا ایک مخصوص مزاج اور سوچ رکھتے ہیں۔ انہیں روٹی ملے یا نہ ملے، ان کے شہر میں ترقی ہو یا نہ ہو، انہیں نوکریاں ملیں یا نہ ملیں، تھر میں قحط سالی ہو کوئی پروا نہیں، معصوم بچے بھوک سے مرجائیں پھر بھی کوئی پروا نہیں ۔ ان کی سوچ اور سیاست کا محور ایک ہی شخصیت ہے اس کا نام ہے 'بھٹو'۔ ان کے اندر ایک بھٹو موجود ہے وہ کسی بھی طرح اپنے اندر کے بھٹو کو خود سے جدا نہیں کر سکتے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بات آج سے چالیس برس قبل کہی تھی کہ 'ایک بھٹوان کے اندر موجود ہے اور ایک بھٹو عوام کے اندر بستا ہے'۔ یہ جملہ اور یہ جذبہ سندھ کے عوام کے دلوں میں رچ بس چکا ہے وہ اس کے سحر سے تاحال نکل نہیں سکے۔ یہ سوچ ایک نسل سے دوسری اور دوسری سے تیسری نسل میں منتقل ہوچکی ہے۔ گزشتہ چالیس سال میں کئی حکومتیں آئیں ، پیپلز پارٹی عتاب میں بھی رہی لیکن جب بھی سندھ کے ان لوگوں کو آزادی ملی ان کے اندر کا بھٹو باہر آگیا۔ اسی جذبہ نے آصف علی

زرداری کو اور اس کی اولاد کو زرداری سے بھٹو بنادیا۔

سندھ میں دوسرا اہم فیکٹر شہروں میں آباد عوام ہیں جہاں کی اکثریت کے دلوں میں بھٹو نہیں بستا بلکہ سر دست ان کے دلوں میں الطاف بھائی کی محبت نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ سندھ کی اس مخصوص صورت حال کے پیش نظر کپتان کو اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ بصورت دیگر نیا پاکستان بننے کا خواب کیسے پورا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں کپتان پنجاب کو پی ایم ایل (ن) کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے جس کی بنیاد پر وہ حکومت بھی بنالیں لیکن سندھ کی صورت حال کچھ اسی طرح کی ہوگی جیسے مسلم لیگ (ن) مرکز میں حکومت میں ہے اور سندھ پیپلز پارٹی کے پاس ہے۔

تبدیلی یا انقلاب کا ایک راستہ تو بند ہو چکا جو راولپنڈی سے ڈی چوک آتا نظر آرہا تھا۔ انقلاب دھرنا اور سونامی اب صرف شہر شہر نگر نگر جلسوں کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔ البتہ کپتان کا آزادی دھرنا شہر شہر نگر نگر دھرنیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔اب اگر کوئی معجزہ ہو جائے یا آب پارہ راولپنڈی سے کوئی طاقت گو نواز گو کے نعرے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کردار ادا کر دے تو شاید حکومت انتخابات کرانے پر مجبور ہو جائے ۔ جس کے نتیجے میں نئی قیادت نیا پاکستان بنانے میں کوئی کردار ادا کر سکے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کام کپتان

کے ہی حصہ میں آ جائے۔

گورنمنٹ کالج، ناظم آباد میں میری خدمات کے بارہ سال

یکم اکتوبر ۱۹۹۷ء کو میں حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ۲۳ سال اور ۷ ماہ خدمات انجام دینے کے بعد گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں آیا۔ اس وقت کالج کے پرنسپل پروفیسر مظہر الحق تھے۔ حاجی عبداللہ ہارون کالجوں کی دنیا میں کالے پانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کالجوں کے منتظمین جس کو سزا دینا چاہتے اس کو اس کالج میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اگر متعلقہ شخص کی پرچی بھاری بھرکم ہوتی تو وہ یہاں سے کسی دوسرے کالج میں چلا جاتا ورنہ تمام عمر اسی کالج میں گزار دیتا۔ منتظمین تو سزا کے طور پر لوگوں کو یہاں بھیجا کرتے لیکن یہ تو سکون و آرام اور بے فکری کی دنیا تھی۔ یہاں کے تمام ہی پرنسپل نیک اور ہمدرد تھے جس کے باعث لوگ یہاں اطمینان و سکون کے ساتھ یہاں وقت گزارا کرتے۔ میری زندگی کی تعلیمی خدمات کا زیادہ عرصہ اسی کالج میں گزرا۔ پرنسپل کے ساتھ ساتھ جو اساتذہ یہاں رہے وہ بھی انتہائی نفیس انسان تھے۔ اس کالج میں اپنی خدمات کی کہانی کسی اور وقت تحریر کروں گا۔ یہاں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد جہاں میری خدمات یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شروع ہوئیں اور ۲۵ مارچ ۲۰۰۹ء تک جاری رہیں یعنی ایک دیہائی سے ڈیر سال سے پر زیادہ پر محیط ہیں کا احاطہ مقصود ہے۔ یہ تحریر میں سید مقصود علی کاظمی جو اس وقت کالج کے میگزین ''روایت''

کے مدیر اعلیٰ ہیں کی فرمائش پر تحریر کر رہا ہوں۔ اس حیثیت سے یہ میرے جانشین بھی ہیں۔ جب میں اس کالج میں تھا تو یہی ذمہ داری اس وقت کے پرنسپل پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی نے مجھے سونپی تھی اور میں نے کالج کے دو میگزین چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے مرتب کیے۔ اس کی تفصیل نیچے درج کروں گا۔

جیسا کہ مَیں نے کہا کہ کراچی میں حاجی عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج سے ٹرانسفر انتہائی مشکل کام تھا۔ میری رہائش لیاری سے پہلے دستگیر سوسائیٹی میں پھر نارتھ کراچی میں ہوچکی تھی میں مسلسل اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح نذدیک کے کالج میں ٹرانسفر ہوجائے۔ ۱۹۹۰ میں مجھے ایک پرچی مل گئی اور میرا مکمل ٹرانسفر تو ممکن یہ ہوسکا مگر ڈیپٹیلمنٹ پر گورنمنٹ کالج برائے سائنس و کامرس ، فیڈرل بی ایریا بلاک ۱۶ میں ٹرانسفر ہوگیا۔ یہ عارضی تھا چنانچہ ایک سال بعد جوں ہی حکومت تبدیل ہوئی تمام ڈیپٹیلمنٹ ختم کردئے گئے اور ہم لوٹ کے بدھو گھر کو آئے واپس حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج پہنچ گئے۔ خدمت کا عمل جاری رہا ساتھ ہی ٹرانسفر کی کوششیں بھی۔

سے نہ صرف (SPLA) مَیں اساتذہ کی انجمن سندھ پروفیسرز اینڈ لیکچرر ایسو سی ایشن منسلک تھا بلکہ کچھ کچھ سرگرم بھی رہتا تھا، میں کئی سال 'سپلا' کی الیکشن کمیٹی کا رکن رہا ۔ سید ریاض احسن مرحوم جو 'سپلا' کے کرتا دھرتا اور اساتذہ برادری کے فعال رہنما تھے سے میرے مراسم دوستانہ اور مشفقانہ تھے۔ اس کی ایک وجہ

تو میرا اسپلا کے الیکشن کمیشن کا رکن ہونا تھا دوسرا تعلق ریاض احسن کی دو بہنوں کا لائبریری پروفیشن سے وابستہ ہونا تھا۔ مَیں پہلے ہی سید ریاض احسن سے یہ بات کہہ چکا تھا کہ مَیں اب حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج سے ٹرانسفر چاہتا ہوں۔ انہی دنوں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد کے لائبریرین سمیع اللہ کا انتقال ہوگیا اور گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد میں جگہ خالی ہو گئی اب میں نے کوشش کی کہ میرا اس کالج میں ٹرانسفر ہو جائے۔ ریاض احسن نے وعدہ کیا کہ میں آپ کا ٹرانسفر کرادوں گا آپ اس کالج کے پرنسپل جو کے قدرِ سخت مزاج انسان ہیں سے بات کرلیں کہ وہ آپ کو جوائن کرالیں گے۔ چنانچہ میں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد آیا اور پروفیسر مظہر الحق صاحب سے ملاقات کی اور مدعا بیان کیا کہ میں یہ خواہش رکھتا ہوں۔ کیا آپ مجھے جوائن کرالیں گے۔ اس سے قبل میرے دوست سید ناظر علی مظہر صاحب سے میرے بارے میں انہیں کچھ بتا چکے تھے۔ مظہر صاحب لیاری گونمنٹ کالج میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے یقین دھانی کرائی کہ وہ جوائن کرالیں گے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

ستمبر ۱۹۹۷ء میں میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا میرے والد ۵ ستمبر کو اللہ کو پیارے ہوگئے میں اس غم اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ انہیں دنوں سید ریاض احسن نے میرے ٹرانسفر آڈر جاری کرا لیے۔ مجھے اس بات کو علم نہیں تھا اس کی وجہ اپنے ذاتی معاملات میں پریشانی تھی۔ اس دوران میرے ایک ہم پیشہ مستحسن

کلیم شیروانی جو لیاری کالج میں لائبریرین تھے کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اپنا ٹرانسفر لیاری کالج سے گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد میں جاری کرائے اور خاموشی سے مظہر الحق صاحب کے پاس پہنچ گئے اور جوائن کرنے کے لیے کہا۔ مظہر صاحب مستحسن سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مستحسن سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں صمدانی صاحب سے وعدہ کرچکا ہوں اس وجہ سے آپ کو جوائن نہیں کراسکتا۔ میرے یار نے بہت کوشش کی مظہر صاحب کو مختلف لوگوں سے کہلوایا بھی لیکن پروفیسر مظہر الحق واقعی زبان کے پکے اور بہ اصول انسان ہیں انہوں نے مستحسن کو کالج میں گھس نے نہیں دیا۔ وقت گزرتا گیا ایک دن سید ریاض احسن نے مجھے فون کیا اور پوچھا کہ کیا آپ نے ناظم آباد کالج جوائن کر لیا۔ یہ بات میرے فرشتوں کے علم میں بھی نہیں تھی کہ میرے ٹرانسفر آڈر جاری ہوچکے ہیں۔ میرا جواب جو ہونا چاہیے تھا وہی تھا کہ مجھے علم ہی نہیں کہ میرا ٹرانسفر ہوچکا ہے مَیں نے انہیں اپنے والد کے انتقال کے بارے میں بھی بتایا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ٹرانسفر آڈر کئی دن قبل جاری کرادیے تھے اور سپلا کے اطہر مرزا کو دے دیے تھے۔ اطہر مرزا نے مجھے نہیں بتایا اور وہ میرے ٹرانسفر آڈر اپنے پاس رکھے رہے۔ نہیں معلوم کیوں؟ میں نے اولین فرصت میں اطہر مرزا سے رابطہ کیا اور سید ریاض احسن کا پیغام پہنچایا، وہ فرمانے لگے کہ ہاں وہ آڈر میرے پاس ہیں آپ میرے گھر آکر لے جائیں میں اسی رات ان کے فلیٹ پر گیا اور آڈر وصول کیے۔ صبح ۴ اکتوبر کو

پروفیسر مظہر الحق صاحب کے آفس پہنچا اور ٹرانسفر آڈر ان کی خدمات میں پیش کیے۔ انہوں نے ہی مجھے مستحسن کلیم شیروانی کی ان کے پاس آمد اور ٹرانسفر آڈر کی تفصیل سے مجھے کیا۔ اس طرح ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو میں نے حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج کو ۲۳ سال ۷ ماہ اور تین دن بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۷ء سے گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد میں اپنی خدمات کا آغاز کیا جو میری ریٹائر منٹ ۲۴ مارچ ۲۰۰۹ء تک جاری رہیں۔

حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ۲۳ برس گزانے کا تجربہ اور مختلف پرنسپل صاحبان سے معاملات طے کرنے کے طور طریقے مجھے اچھی طرح آچکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ میں طبیعتا صلاح جو، نرم مزاج اور ہر ایک سے اچھے تعلقات رکھنے کے فلسفے پر عمل پیرا رہا ہوں۔ اپنی اسی سوچ اور عمل کو میں یہاں بھی بروئے کار لایا۔ پرنسپل صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں جن میں منفی زیادہ تھیں سن چکا تھا۔ لیکن میرا تجربہ بالکل مختلف رہا۔ مظہر صاحب محنتی، ایماندار، مخلص اور کالج کے معاملات کو احسن طریقے سے انجام دینے کی جدوجہد میں تھے۔ وہ کالج کے بعض اساتذہ کا ٹیوشن اور پریکٹیکل میں دلچپی لینا پسند نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ وہ از خود بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانی کاموں کے علاوہ ٹیبولیشن رجسٹر ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ یہ کام سب اساتذہ ہی کیا کرتے تھے اور اب بھی یہ عمل

جاری ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مظہر صاحب سے اختلاف اور کسی بھی قسم کی کشیدگی سے دور رکھا۔ میری ذمہ داریوں کے حوالے سے مظہر صاحب نے جو پہلی بات مجھ سے کہی وہ یہ تھی کہ لائبریری میں الماریوں کی اوٹ میں ایک گوشہ بنا ہوا ہے جہاں پر بعض دوست فارغ وقت میں بیٹھا کرتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں ؟ نہ تو میں نے ان سے معلوم کیا اور نہ ہی انہوں نے مجھے بتایا۔ صرف اس قدر کہا کہ اس سرگرمی کو لائبریری سے ختم کردیا جائے۔ میرے لیے یہ پرنسپل کا حکم تھا۔ میں نے رفتہ رفتہ اس گوشہ کو ختم کردیا ویسے بھی وہ اساتذہ جن کی اس جگہ بیٹھک تھی میرے ساتھ ان کے قریبی اور بے تکلفانہ تعلقات نہیں تھے۔ میں خود سامنے بیٹھا کرتا تمام لوگ اسی جگہ آکر بیٹھا کرتے۔ مظہر صاحب نے میرے ہر مشورہ کو جو میں نے لائبریری کی ترقی کے لیے دیا ہمیشہ اہمیت دی۔ جتنی رقم کتابوں کی خریداری کے لیے طلب کی انہوں نے وہ فوری دے دی۔ لائبریری سے منسلک ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو مجھ سے بہت پہلے اساتذہ امتحانی کاموں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے میرے کہنے پر مظہر صاحب نے وہ کمرہ لائبریری میں شامل کرنے کی اجازت دی اور پھر یہ کمرہ میرا آفس بن گیا۔

پروفیسر محمد مظہر الحق گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم آباد کے چار سال اور چار ماہ (اگست ۱۹۹۶ء۔ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۰ء) پرنسپل رہے،آپ کو کراچی کے اولین ایگزیکٹیو ڈ ۲۷ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔آپ کی تعلیمی (E.D.O) سٹرکٹ آفیسر

خدمات ۴۶ سالوں پر محیط ہیں۔ آپ نے ۱۹۶۲ء میں لیکچرر کی حیثیت سے درس و تدریس کا آغاز کیا، گورنمنٹ کالج ژوب' بلوچستان، گورنمنٹ کالج، کوئٹہ، گورنمنٹ سائنس کالج، لیاری، ڈی جے گورنمنٹ سائنس کالج کراچی کے وائس پرنسپل اور گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں، ۲۰۰۲ء میں بحیثیت ایگزیکٹیو ڈسٹرکٹ آفیسر ریٹائر ہوئے۔ پرنسپل کی حیثیت سے آپ نے کالج کی بہتری کے لیے کیا جو اقدامات کیے ان کے بارے میں آپ نے ایک انٹرویو میں واضح کیا کہ ''میں جب پرنسپل کی حیثیت سے اس کالج میں آیا تو اس وقت کراچی کے حالات ہر اعتبار سے بہتر نہیں تھے۔ یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا کہ میں ایسے حالات میں اور پھر اس کالج کے خصوصی حالات میں تمام مسائل سے کیسے خوش اسلوبی سے نمٹوں۔ کالجوں میں سب سے اہم اور گھمبیر مسئلہ داخلوں کا تھا۔ اس وقت داخلوں کی سینٹرل پالیسی متعارف نہیں ہوئی تھی، ہر کالج اپنے طور پر داخلہ دیا کرتا تھا اور سارا پریشر پرنسپل پر ہوا کرتا تھا۔ میں نے اولین فیصلہ یہ کیا کہ داخلے صرف میرٹ پر ہوں اور اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے میں نے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرلیا، اس فیصلے پر عمل کے دوران میں کئی بار شدید دباؤ کی کیفیت سے بھی دوچار ہوا لیکن میں کسی دباؤ کو خاطر میں نہیں لایا اور اصولی طور پر داخلے اپنے دور میں ہمیشہ میرٹ کی بنیاد پر دیے۔ میرے اس اقدام سے کالج کے تعلیمی ماحول پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ میری دوسری ترجیح یہ تھی کہ کالج میں نصابی

سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں پر بھرپور توجہ دی جائے۔ اس دور میں ہم نصابی سرگرمیاں کراچی کے کالجوں میں مفقود ہو چکی تھیں بوجوہ کالج پرنسپل صاحبان سوائے بورڈ اور یونیورسٹی کے اسپورٹس میں حصہ لینے کے لیے طلبہ بھیجتے تھے۔ کالج کی حدود میں کسی قسم کی ہم نصابی سرگرمی کا انعقاد ناممکن ہو چکا تھا۔ میں نے ایک عرصہ کے بعد اس سلسلے کو کامیابی سے جاری کیا اور پھر یہ سلسلے دیگر کالجوں میں بھی شروع ہو گئے۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں کھیل کے مقابلوں کے علاوہ حمد، نعت، تقریری مقابلے، بیت بازی، مقابلہ معلومات عامہ وغیرہ کے انعقاد پر خصوصی توجہ دی، بین الجماعتی مقابلوں کے علاوہ بین الکلیاتی مقابلوں کے انعقاد کو ممکن بنایا، مجھے یہ بتاتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کالج کے طلبہ نے پورے ملک میں ہونے والے ہم نصابی مقابلوں میں بھرپور شرکت کی اور نمایاں مقام حاصل کیا، کراچی کے مختلف کالج ہر سال اس بات کا انتظار کیا کرتے تھے کہ اس کالج میں سالانہ پروگرام منعقد ہوں، اس کالج کو اس حوالے سے ایک خاص مقام حاصل ہوا، کالج کے طلبہ نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے، اس دور کے بعض طلبہ اب ملک کی سطح پر معروف ہیں۔ امتحانات میں نقل کے رجحان پر قابو پانے کے اقدامات کیے، امتحانی سینٹر پر سخت نگرانی کی، اساتذہ کو بھی پابند کیا کہ وہ بھی کالج میں جب بھی امتحانی سینٹر قائم ہو اپنے اس قومی فرض کو ایمانداری سے انجام دیں اور ایسا ہوا، میرے دور میں یہ کالج کراچی بھر میں مشہور ہو گیا تھا کہ

یہاں امتحان کے دوران بہت سختی ہوتی ہے۔ ایک اور قدم یہ بھی اس حوالہ سے کیا کہ کالج میں ہونے والے عملی امتحانات میں جو بے قاعدگیاں تھیں انہیں دور کرنے کی پوری کوشش کی، عملی امتحان کا پروگرام واضح الفاظ میں اور نمایاں جگہ لگانے کو یقینی بنایا تاکہ طلبہ کو بر وقت یہ معلوم ہو سکے کہ انہیں کس دن امتحان دینے آنا ہے۔ طلبہ سے براہِ راست مخاطب ہوا کرتا تھا، تمام کلاسیں مقررہ وقت پر ہوں اس بات کو یقینی بنانے کی پوری کوشش کی۔ کالج لائبریری عرصہ دراز سے ایک چھوٹے سے ہال میں چلی آ رہی تھی، میرے دور میں لائبریری کے لیے مزید ایک کمرے کا اضافہ ہوا جس کے باعث طلبہ کو ریڈنگ روم کی سہولت میسر آئی، میں نے کتب کی خریداری پر کبھی قدغن نہیں لگائی، میری طرف سے پوری آزادی تھی کہ جس قدر لائبریری بجٹ موجود ہے کتابیں خریدی جائیں اور ایسا ہوا کہ ہزاروں روپے کی کتابیں خریدی گئیں۔ یہ وہ بڑے بڑے اقدامات تھے جو میں نے اس کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ اس کالج کی بہتری کے لیے اس کالج کی ترقی کے لیے جو بھی ممکن ہو کروں'۔ مجھے مظہر صاحب کی ان باتوں میں، سچائی اور کالج کے لیے کچھ بہتر کر گزرنے کی امنگ نظر آئی۔

پروفیسر مظہر الحق صاحب نے اپنے جانشین کے طور پر پروفیسر خورشید حیدر زیدی صاحب کا انتخاب کیا۔ اپنے جانشین کے لیے مظہر الحق صاحب کا کہنا تھا کہ

میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے جانشین کا انتخاب بالکل درست کیا۔ خورشید زیدی صاحب نے کالج کی بہتری کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور آج اگر کراچی میں گورنمنٹ کالج، ناظم آباد اچھے معیاری کالجوں میں شمار کیا جاتا ہے تو اس میں یقینا خورشید

زیدی صاحب کااہم اور گرانقدر حصہ ہے'۔ پروفیسر محمود احمد کا کہنا تھا کہ خورشید صاحب کے دور میں کالج نے ایک نیا جنم لیا، کالج کی پرانی عمارت جسے پچاس سال ہو چکے تھے انہی کی کوششوں سے اس کی از سرِ نو تعمیر نہ صرف شروع ہوئی بلکہ اس کے دو حصے مکمل ہوئے'۔ پروفیسر ہمایوں اقبال نے اپنے ایک مضمون میں خورشید صاحب کے حوالے سے کہا کہ 'کالج کی موجودہ ترقی آپ ہی کی مرہونِ منت ہے، شعبہ حیوانیات کا میوزیم کراچی کے کالجوں میں خوبصورت اور کلیکشن کے اعتبار سے پر کشش ہے جس کا سہرا پروفیسر خورشید کو جاتا ہے'۔ اسی طرح کالج کی پچاس سالہ لائبریری جو ایک قدیم اور پرانے ہال میں تھی خورشید صاحب کی علم دوستی اور کتاب سے محبت کے باعث نیا جنم لے سکی اور اسے ایک جدید لائبریری ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

خورشید صاحب کا وطن مرادآباد ہے، پاکستان میں ہجرت کرکے ان کے خاندان نے سندھ کے شہر خیر پور کو اپنا مسکن بنایا۔ تعلیم اسی شہر میں حاصل کی، جامعہ سندھ سے ماسٹرز کیا ۱۹۷۰ء میں لیکچرر کی حیثیت سے تدریس کا آغاز کیا

خیر پور کے بعد کراچی تبادلہ ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے پرنسپل ہوئے اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ متحرک اور بے باک انسان ہیں، ڈرو خوف ان کے پاس سے بھی نہیں گزرا، جیسے بھی حالات ہوں ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی پرنسپل شپ کا زمانہ کراچی میں سیاسی ہلچل کا تھا سیاسی جماعتوں کی زیر اثر طلباء تنظیمیں آپس میں مرد مقابل تھیں۔ ان سب سے نبرد آزماں ہونا معمولی بات نہ تھی۔ خورشید صاحب نے عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے کالج کے معاملات کو خوش اسلوبی سے رواں دواں رکھا۔ یہ ان کی علمی و سیاسی بصیرت تھی۔ خورشید صاحب مجلسی آدمی ہیں۔ محفل سجانے اور محفل میں چھائے رہنے کے گر خوب جانتے ہیں۔ ان کی محفل میں موجودگی کسی کو بور ہونے نہیں دیتی۔ ان اس خصوصیت

کے لیے الطاف حسین حالی کا یہ شعر ہی کافی ہے ۔

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُس کی
وہ اپنی ذات سے اِک انجمن ہے

خورشید صاحب کی پرنسپل شپ میں مجھے لائبریری کی ترقی کے ساتھ ساتھ کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بہت زیادہ مصروف عمل رہنے کا موقع ملا۔ نہیں معلوم زیدی صاحب کو مجھ میں کیا خوبی نظر آئی اور میں نے بھی انہیں اپنا ہم مزاج محسوس کیا کہ انھوں نے مجھ جیسے شخص کو متعدد قسم کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔

لائبریری کے لیے خورشید صاحب نے میرے مشورہ پر کالج کی نئی بلڈنگ میں ایک وسیع ہال تعمیر کرانے کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا۔کالج کی پچاس سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ لائبریری کے لیے ایک وسیع ہال تعمیر ہوسکا۔ لائبریری کے علاوہ خورشید صاحب نے مجھے طلباء کی ہم نصابی سرگرمیوں کی نگرانی بھی سونپ دی۔ حالانکہ مجھ سے قبل یہ ذمہ داری کئی سالوں سے کالج کے سینئر اور معروف استاد پروفیسر ربانی خان صاحب انجام دے رہے تھے۔ کہاں ربانی خان صاحب اور کہاں میں ۔ کیا ہوسکتا تھا۔ پرنسپل کا حکم اور خواہش۔ میں نے جو حکمت عملی اختیار کی اور خورشید صاحب نے سمجھتے بوجتے ہوئے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یعنی میں نے ربانی خان صاحب کو ہر کام میں اپنا شریک رکھا۔ ربانی خاں صاحب بھی سمجھتے تھے انہوں نے بھی حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میری ہر طرح سے معاونت کی اور میرے تمام کاموں میں شریک کار رہے۔ مجمع چھوٹا ہو یا بڑا مجھے اس سے خطاب کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی یعنی میں تقریر کے فن سے واقف تھا۔ شاہد میری یہی خوبی خورشید صاحب نے پسند کی اور مجھے طلباء کی ہم نصابی سرگرمیوں کا پروفیسر انچارج بنادیا اور میں نے یہ ذمہ داری اپنے طور پر احسن طریقے سے انجام دی۔ اس حوالے سے بے شمار پروگرام منعقد ہوئے جن میں وزیروں ، سیکریٹری تعلیم، ڈائریکٹر جنرل، ڈائریکٹر اور بے شمار سیاسی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ان پروگراموں میں کالج کے تمام ہی اساتذہ ساتھیوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

ایک اور ذمہ داری جو مجھے خورشید صاحب نے سونپی وہ کالج میگزین ''روایت'' کا چیف ایڈیٹر ہونا تھا۔ یہ ذمہ داری میرے لیے ایک بڑا چیلنج تھی۔ مجھ سے قبل یہ ذمہ داری کالج کے سینئر پروفیسران جن کا ادب میں قابل ذکر مقام ہے ادا کرچکے تھے ان میں ڈاکٹر اسلم فرخی، پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام، پروفیسر مسیح الدین احمد صدیقی، پروفیسر ایس ایم لطیف اللہ، پروفیسر سراج الدین قاضی، ڈاکٹر حسن محمد خان شامل تھے۔ اب یہ کام مجھے کرنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کہ کسی کام کو انجام دینے کی سچی لگن ہو، جذبہ صادق ہو، خلوص اور اخلاص کی چاشنی شامل حال ہو تو مشکل سے مشکل کام خوش اسلوبی سے پائے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی جذبہ کالج کے مجلّہ ۲۰۰۴ء اور بعد میں مجلّہ ۲۰۰۸ء جو کالج کا گولڈن

جوبلی نمبر بھی تھا میں شامل تھا جس کے باعث ہی میں اس مقصد میں کامیاب ہوا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

کام کچھ مشکل نہیں عزم مصمم چاہیے
پھول صحراؤں میں بے شک کھلا سکتے ہیں آپ

کالج کی پچاس سالہ تاریخ کو جمع کرنا ایک مشکل اور تحقیق طلب کام تھا۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی کی حوصلہ افزائی و رہنمائی نے

حوصلہ مند رکھا۔ کالج کے ساتھیوں نے جو مجلّہ کی تدوین میں میرے شریک سفر تھے بھر پور ساتھ دیا اور ہم نے یہ خصوصی شمارہ
مکمل آب وتاب سے شائع کیا۔ کہتے ہیں ۔
عزائم جن کے اونچے اور اونچا بخت ہوتا ہے
زمانے میں انہی کا امتحان سخت ہوتا ہے

مجلّہ ' روایت ' کے گولڈن جوبلی نمبر سے قبل مجلہ برائے سال ۲۰۰۴ء بھی میری ادارت میں شائع ہوچکا تھا۔ اس مجلّہ کے حوالے سے اچھی باتیں تو بہت سی ہیں ایک دلچسپ بات یہاں شامل کرنا مناسب لگ رہا ہے میرے پروفیسر انچارج ہم نصابی سرگرمیاں ، چیف ایڈیٹر مجلّہ روایت اور کالج مینجمنٹ کمیٹی جو دراصل طلباء کے والدین اور اساتذہ پر مشتمل ہوتی ہے کا سیکریٹری مقرر ہونا اور کالج کے مختلف انتظامی امور میں پیش پیش ہونا بعض کرم فرماؤں کی نظر میں تیر بن گیا۔ بظاہر اس کا اظہار بھی مشکل تھا۔ جب یہ میگزین شائع ہوا تو اور تو کچھ نظر نہ آیا میگزین کے سرورق پر پاکستان کا نقشہ بیک گراؤنڈ میں چھاپا گیا تھا جس کے اوپر کا حصہ میگزین کے پشتہ اور اور اس کے گہرے نیلے رنگ میں چھپ گیا تھا۔ اسی جگہ پر کشمیر ہے بس جناب اب کیا تھا۔ اس مسئلہ کو موضوع بنایا گیا۔ کرم فرماؤں نے ایک اخبار میں خبر لگوادی کہ گورنمنٹ کالج کے مجلّہ سے کشمیر غائب۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے اور کیسے ہوسکتا تھا کہ کسی

بھی کالج کے اساتذہ اس قسم کی سوچ بھی رکھتے ہوں۔ فوری طور پر تو میری پریشانی جائز تھی لیکن خورشید صاحب نے مجھ سے اس بابت کسی بھی قسم کی وضاحت یا بازپرس بھی نہیں کی اور اخبار کے ایڈیٹر کو فون کرکے اس کی طبیعت صاف کردی۔

میں کالج میں قائم اساتذہ و والدین کی انجمن جو کالج مینجمنٹ کہلاتی تھی کا فائینانس سیکریٹر بھی مقرر کردیا گیا۔ اس حیثیت سے کئی سال اس انجمن کے اجلاسوں کی کاروائی کو احسن طریقے سے چلاتا رہا۔ جس کی تفصیل مجلّہ روایت بھی میں تفصیل سے موجود ہے۔ کالج کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے مشاعرہ کا اہتمام تھا۔ مشاعرہ کا انعقاد پروفیسر خورشید کا شوق تھا جسے ہم سب نے مل کر پائے تکمیل کو پہنچایا۔ مشاعرے کے لیے بے پناہ جدوجہد کی گئی۔ شہر کراچی کے چیدہ چیدہ شاعروں کو مدعوں کیا گیا تھا یہ ایک کامیاب مشاعرہ تھا جس کا چرچا بہت عرصہ تک رہا۔ صدارت پروفیسر سحر انصاری صاحب نے کی ۔ مشاعرہ کا حال اردو کے ادیب سرور جاوید نے روزنامہ جنگ کی اشاعت یکم مئی ۲۰۰۶ء متاع نظر' کے عنوان سے تحریر کیا۔ کالم کا ذیلی عنوان تھا ''گورنمنٹ کالج ناظم آباد کے ' جشن طلائی پر مشاعرہ'' تھا۔ سحر انصاری صاحب نے اس موقع پر کہا کہ 'کسی درس گاہ کے جشن طلائی کی تقریبات ہمیشہ خوش آیند ہوتی ہیں۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر خورشید حیدر زیدی اس اہتمام کے لیے قابل مبارک باد ہیں۔ یہ اس کالج

کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے بہت سے نام ور لوگ پیدا کیے ہیں۔ جنھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نام پیدا کیا ہے'۔ یہ مشاعرہ شہر میں بہت مشہور ہوا اور کافی عرصہ تک اس کا چرچا رہا۔ اس کالج کے سابق طلبہ میں خود پروفیسر سحر انصاری صاحب بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جماعت اسلامی کے سید منور حسن، پروفیسر عبدالماجد شیخ، سید قاسم جلالی، پروفیسر انیس زیدی، حسن فیروز، احمد دارا، سید مسرور احسن، ڈاکٹر ایثار احمد ابن صفی، پروفیسر ضیاء الرحمن ضیاء، ناظم الدین، کرنل شاہ علی، شعیب احمد بخاری، سید فیصل علی سبزواری، پروفیسر ضرار خان، نیر سوز اور دیگر شامل ہیں۔
گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم میں میری بارہ سالہ خدمات میں پروفیسر خورشید حیدر زیدی کا مجھ پر بھرپور اعتماد اور بھروسہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اگر کالج کی بہتری کے لیے کچھ کیا ہے تو وہ پروفیسر خورشید حیدر زیدی کا ہی مرحون منت ہے۔ انھوں نے مجھے اس لائق سمجھا مجھے نہیں معلوم کہ میں ان کے اعتماد پر پورا اترا یا نہیں۔ لیکن میں نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ مجھ میں جس قدر بھی صلاحیت ہے اسے کالج کے کاموں میں لگا دوں۔ میں خاموش طبع اور دھیما انسان ضرور ہوں لیکن جہاں بھی رہا اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ میں خاموشی کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنے کا قائل ہوں۔ اپنی ٦٦ سالہ زندگی میں کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا میری زندگی

کا سب سے اہم مقصد رہا ہے اور میں آج بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔ لکھنے کی بات کے حوالے سے یہاں صرف اس قدر کہنا چاہوں گا کہ میری طبع شدہ تصانیف و تالیفات کی تعداد ۳۲ ہو چکی ہے، کچھ کتابیں پاکستان کے تقریباً تمام ہی تعلیمی بورڈوں اور کچھ جامعات میں بی اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ ۳۰۰ سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اردو کی ایک معروف ویب سائٹ ''ہماری ویب'' پر میرے آن لائن مضامین کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہو چکی ہیں۔ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم سے قبل مَیں حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ۲۳ سال رہا وہاں بھی اپنے شعبہ کے علاوہ کالج کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ اس کا ذکر اس کالج کے حوالے سے کبھی کسی اور موقع پر کروں گا۔

لائبریری کے لیے وسیع ہال کالج کی نئی تعمیر ہونے والی عمارت میں مختص کر دیا گیا۔ یہ اعزاز بلاشبہ پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی کو ہی جاتا ہے ان کی عملی کوشش سے ہی یہ ممکن ہو سکا۔ لائبریری کی نئے ہال میں منتقلی خورشید صاحب کی موجودگی میں شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح اس وقت ہوا جب خورشید صاحب ریٹائر ہو چکے تھے اور ان کی جگہ پروفیسر محمد ضرار خان صاحب کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے پروفیسر ضرار صاحب بھی علم پرور اور کتاب دوست انسان ہیں اور ساتھ ہی مجھ پر مہربان بھی رہے انھوں نے پرنسپل بننے کے بعد میری حیثیت کو اسی طرح برقرار رکھا اور میں اسی طرح تمام امور کی انجام

دہی کرتا رہا۔ ان کے دور میں لائبریری کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس وقت کے سندھ کے وزیر جناب سید شعیب احمد بخاری صاحب مہمان خصوصی تھے۔ پروفیسر محمد ضرار خان کی بڑائی تھی کہ انھوں نے لائبریری کی افتتاحی تختی پر اپنے نام کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی لکھوایا۔ یہ ایک یادگار اور تاریخی عمل ہے اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

پروفیسر ضرار خان صاحب جنہیں اس کالج کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ طویل عرصہ شعبہ کیمیاء میں استاد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے ۲۰۰۸ء میں پروفیسر خورشید کے جانشین ہوئے۔ وہ ایک سیدھے سادھے، نیک سیرت، مذہبی ذہن کے مالک ہیں۔ کراچی کے پیدائشی اور ناظم آباد کے رہائشی رہے۔ کچھ عرصہ ہوا گلستان جوہر کو آباد کرچکے ہیں۔ اب جب کہ وہ اور میں ریٹائر ہوچکے ہیں کبھی موبائل پر اور کبھی بل مشافہ ملاقات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے بڑے ہونے کی دلیل ہے۔

مجھے ۱۲ سال کے دوران کالج میں تقریباً تمام ہی اساتذہ ساتھیوں سے بے حد محبت ملی۔ یہاں جو بھی اساتذہ میرے زمانے میں رہے نیک، ملن سار، خیال کرنے والے اور کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے تھے۔ بعض ساتھی اب اس دنیا میں نہیں رہے ان میں احمد الدین شیخ، ریاض مسعود شامل ہیں۔ خالد محی

الدین مرحوم کا انتقال کالج میں ہی ہوا وہ کالج میں ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے شاید اسی وقت انہیں دل میں تکلیف محسوس ہوئی سب لوگ اس جانب دوڑے میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا میری گاڑی کالج گیٹ کے نذدیک ہی تھی انہیں میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا اور ہم عباسی شہید اسپتال کی جانب چلے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے میری گاڑی میں ہی آخری سانسیں لیں اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ تمام مرحوم اساتذہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ جی چاہتا ہے کے کالج کے ہر اس ٹیچر کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھوں جن سے میرا ساتھ رہا اور ان کی رفاقتیں میرے لیے یادگار ہیں ۔ اس قرض کو بھی آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ زندگی نے وفا کی تو ان دوستوں کی دوستی اور اپنے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو اپنا موضوع ضرور بناؤں گا۔ (۲۵ نومبر ۲۰۱۴ء)

کپتان کا پلان 'سی' اور نواز حکومت

۳۰ نومبر کو کپتان کے آزادی دھرنے اور پلان بی کی دھرنیوں (مختلف شہروں میں جلسوں) کو پورے ۱۰۹ دن یعنی تین ماہ اور ۱۹ دن پورے ہوئے۔ ۳۰ نومبر کو ہونے والے دھرنے یا جلسے میں کپتان نے اپنا پلان 'سی' پیش کیا۔ گویا نواز حکومت پر تحریک انصاف کی جانب سے دباؤ بڑھانا اس پلان کا بنیادی مقصد سمجھ میں آتا ہے۔ اسلام آباد میں اس شو کی تیاری بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھیں اور دونوں جانب سے شدید گولا باری ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس روز اسلام آباد کے ڈی چوک میں حکومت اور آزادی کے متوالوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑے گا اور کچھ دن قبل کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ ہو جائے گی، ایمبولینسیں چیخ و پکار کرتی ہوئی ڈی چوک سے اسلام آباد کی کشادہ اور دونوں جانب ہرے بھرے درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی زخمیوں کو اسپتال منتقل کرتی نظر آئیں گی لیکن خدا کا شکر ہے حکومت اور کپتان نے ہوش مندی، صلح فہمی اور فہم و فراست کا ثبوت دیا اور قوم ایک اور سانحہ ماڈل ٹاؤن سے محفوظ رہی۔ اس ہوش مندی پر دونوں فریق قابل مبارک باد بھی ہیں اور یہ صورت حال اس جانب بھی اشارہ کر رہی ہے کہ کہیں یہ ملی بھگت یا نورا کشتی تو نہیں۔ کپتان اپنے پروگرام کا اعلان کرتے ہیں ان کی بی ٹیم حکومت کو للکارنے کا، ڈرانے کا،

تہس نہس کرنے کا، حکومت کو چلتا کرنے کا،کام اپنے بیانات سے کرتی ہے۔ جواب میں نواز شریف کی بی ٹیم کپتان اور ان کے دائیں بائیں موجود ساتھیوں پر طرح طرح کے الزامات وہ بھی بے ہودہ زبان میں دے کر قوم کو ذہنی پریشان میں مبتلا کرتے ہیں اور تجزیہ
کاروں، کالم نگاروں کو تمام تر تخلیقی کاموں سے ہٹا کر اپنے پیچھے لگائے رکھتے ہیں۔
کپتان کے پلان 'سی' کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے ۳۰ نومبر سے پہلے دونوں فریقوں کی زبان و بیان کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تاکہ اندازہ ہوسکے کہ جن کے ہاتھوں میں اس وقت پاکستان ہے اور آئندہ ہوگا ان کا طرزِ عمل، سوچ اور اندازِ گفتگو کیا ہے، وہ کس طرح کے لب و لہجہ رکھتے ہیں، اپنے مخالف کے لیے ان میں کس قدر برداشت ہے، اگر نہیں تو اس کا اظہار کس انداز سے کرتے ہیں۔ اور پھر پاکستان کی سیاست ۶۷ سالوں سے ایک ہی ڈگر پر چلی آرہی ہے۔ جس دورِ حکومت کا بھی جائزہ لے لیں سیاست دانوں کا یہی طرزِ عمل نظر آتا ہے۔ ہم اچھے، باقی سب برے، جو ہمارے ساتھ وہ دودھ میں نہایا ہوا جو ہمارے ساتھ نہیں یا ہمیں چھوڑ جائے وہ فوری طور پر گندہ انڈا قرار پائے۔
وفاداریاں بدلنا ایک عام سے بات ہے۔ جو پارٹی کمزور ہوتی نظر آئی اس سے کنارہ کشی اور جو ابھرتی اور طاقت میں آتی نظر آئی وہ ان کی نورِ نظر ٹھہری۔ ابھی دو دن

پہلے کی بات ہے مسلم لیگ نون کے حلقہ ۱۰۸ منڈی بہاء الدین کے رکن قومی اسمبلی محمد اعجاز احمد چودھری نے نون لیگ سے دلبرداشتہ ہو کر تحریک انصاف میں چمک محسوس کرتے ہوئے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اب سنیئے اس عمل پر ہمارے ایک سیاست داں جو کل کے سربراہ مملکت بھی ہو سکتے ہیں موجودہ حکومت کے وزیر اطلاعات ،جو کہ ایک اہم وزارت ہوا کرتی ہے انہوں نے فوری طور پر بیان داخ دیا کہ ''عمران کو ایک اور گندہ انڈا مبارک ہو''۔

گویا دو دن قبل تک اعجاز چودھری اچھا انڈا تھے جوں ہی انہوں نے نواز لیگ چھوڑی وہ گندہ انڈا ہو گئے ۔

اب وزیر موصوف سے کوئی یہ پوچھے کے موجودہ حکومت میں کتنے ہی لوگ مسلم لیگ ق) کے اہم عہدوں اور وزارتوں پر براجمان ہیں، آپ کے وزیر قانون زاہد حامد حال) ہی میں کیوں مستعفی ہوئے۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے ۔وہ گندے انڈے نہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ نوز شریف کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بن چکے ہیں۔ اس طرزِ بیانی اور اس منفی سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ محترم پرویز رشید صاحب ان لیڈروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم وقت میں ترقی کی منزلیں طے کیں ۔ گورڈن کالج لاہور سے فائن آرٹس میں صرف بی اے کی ڈگری رکھتے ہیں۔ پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن میں ملازمت کا آغاز کیا۔ نواز شریف کی قربت نے انہیں ۱۹۹۷ء میں پاکستان ٹیلی وژن کارپوریشن کا چیئرمین بنا دیا جو ۱۹۹۹ء تک

جاری رہا۔ پھر ان کے ہم نام پرویز مشرف نے انہیں شاید اس عہدہ کے لیے مناسب نہ سمجھا اور انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ اب سینیٹر ہیں اور حکومت کے اہم وزیر۔ یہ معلومات نیٹ پر دستیاب ہیں اس لیے یہاں لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ تاکہ ان کے ماضی کے تجربے اور تعلیم کا اندازہ ہو سکے۔ یہی زبان و انداز دیگر احباب کا بھی ہے خاص طور پر خواجہ سعد رفیق، عابد شیر علی، یہ تو اپنے نام کے ساتھ ساتھ لب ولہجے کے بھی شیر ہیں۔ چودھری نثار کبھی کبھی سخت، تند و تیز جملے سے مخالف پر وار کرتے ہیں۔ ہمارے کپتان کی تو بات ہی اور ہے۔ نواز حکومت کی مخالفت اپنی جگہ صحیح یا غلط لیکن زبان و بیان میں وہ بہت آگے چلے گئے ہیں۔ اپنے خراب زبان کا دفعہ کرتے ہوئے ۳۰ نومبر کی تقریر میں انہوں نے کہا کہ 'نواز شریف بتاؤ میں کیا کروں۔ جب انصاف کے تمام دروازے بند ہو جائیں اور کہیں سے انصاف نہ ملے تو میرے پاس کونسا راستہ بچا ہے'۔ بقول تجزیہ نگار حسن نثار 'وہ تو کھلاڑی اور شکاری ہے سو درباری زبان سے دور پار کا بھی رشتہ نہیں'۔ ہمارے سیاست دانوں میں ایک دوسرے پر الزام تراشی اور مختلف چیزوں سے انہیں تشبیہ دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔ ایک دور میں ایوب خان کو ایک جانور سے تشبیہ دے کر ہائے ہائے کے نعرے لگے، ذوالفقار علی بھٹو کی زبان بھی عوامی تھی اس دور میں بلی اور چوہے سے ایک دوسرے کو نوازا گیا۔ بے نظیر، اس سے پہلے بیگم ذوالفقار علی بھٹو کے لیے کی گئی زبان کیا تھی؟ اور یہی زرداری صاحب تھے جنہوں نے کہا تھا 'اوے نوز شریف مجھ سے

سیاست کا سبق سیکھو'۔ اب عمران کو بھیڑیا کہہ کر مخاطب کیا۔ جس کا جواب کپتان نے یہ دیا کہ 'ہاں میں زرداری کے لیے بھیڑیا ہی ہوں'۔ شیخ رشید کو چپڑاسی بھی نہ لگانے کی بات ہو چکی ہے۔ شیخ صاحب حال ہی میں بلاول کو 'بلو رانی' کے خطاب سے نواز چکے ہیں۔ اپنے پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف ۲۰۱۳ء کی انتخابی مہم میں کس قدر شائستہ زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ زرداری صاحب کو سڑکوں پر گھسیٹنے اور 'زر بابا چالیس چور' کس انداز اور کس لہجے میں کہا گیا۔ ٹیکس چوری کا الزام، درباری، بادشاہ، جوتے کے برابر ہونا، اوے، ابے، تبے نہ جانے کیا کیا یہ سیاست داں ایک دوسرے کو کہتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔ ہمارے ملک کی سیاست کا یہی رنگ شروع سے ہی چلا آ رہا ہے۔
مبشر علی زیدی نے پاکستانی سیاست کی تصویر کشی ایک جونئیر اور ایک سینئر ڈاکٹر اور ایک مریضہ کے حوالے سے 'آئی سی یو' کے عنوان
سے اپنی آزاد نظم میں کچھ اس طرح کی ہے۔

میں اسپتال تو وہ ''آئی سی یو'' میں تھی۔
کچھ لوگ پریشانی میں باہر ٹہل رہے تھے۔
جونیئر ڈاکٹر اندر اُس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔
میں نے بطور سینئر ڈاکٹر، پیشنٹ کی رپورٹس طلب کیں۔
پھر اپنا اسٹیتھ اسکوپ اُس کے سینے پر رکھا۔
مجھے دھڑکن سنائی نہ دی۔

افسوس ! یہ چل بسی'' میرے منہ سے نکلا۔''

سر! کیسے اندازہ لگایا؟'' ایک جونیئر نے پوچھا۔''

اس کے سینے میں دھڑکن نہیں ہے''۔ میں نے جواب دیا''

،سر! یہ پاکستان کی سیاست ہے''۔ جونیئر ڈاکٹر بولا''

آپ جانتے ہیں نا، سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا''۔''

واقعی سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا اور ہمارے ملک کی سیاست میں نہ دل ہوتا ہے نہ ہی دماغ۔ ہمارے سیاست داں نہ سوچتے ہیں نہ ہی احساس کرتے ہیں بس اپنی ہی اپنی کیے رہتے ہیں۔ ملک کا خیال اور قوم کا درد اس وقت جاگتا ہے جب اقتدار میں نہیں ہوتے جب اقتدار مل جاتا ہے تو دل و دماغ سے ملک و قوم کا خیال نکل جاتا ہے بس اقتدار کے قائم رہنے اور جاری و ساری رہنے کی فکر اور تمام تر تدابیر اسے بچانے میں صرف کیے رہتے ہیں۔

اسلام آباد میں ۳۰ نومبر کی سرد شام کا سیاسی پارہ انتہائی بلند درجہ پر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسم تو سہانا تھا لیکن سیاسی موسم آگ اگل رہا تھا۔ آزادی دھرنے کے متوالے کمر کس کے آئے تھے۔ وہ ہر طرح تیار تھے کہ اگر حکومتی اہل کاروں سے مڈھ بھیڑ ہو جائے تو اس کا مقابلہ کس طرح

کرنا ہے۔ حکومت نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا کہ کپتان کو پریڈن گراونڈ میں اپنا شو کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ اجازت نامہ تحریک انصاب اور مقامی انتظامیہ کے درمیان ایک معاہدے کے نتیجے میں جاری ہوا جو ۴۵ شقوں پر مشتمل تھا۔ ساتھ ہی وزیر داخلہ کا کہنا تھا کہ اگر ' ریڈزون گئے تو قانون پوری طرح قوت سے حرکت میں آئے گا'۔ کپتان سے قبل پی ٹی آئی کے دیگر لیڈران نے اپنا زورِ خطابت دکھاتے ہوئے حکومت کو خوب خوب للکارااور وزیروں کے لگائے گئے الزامات کے جوابات بھی دئے۔ شیخ رشید نے جوشیلی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ 'سانپ کی چال اور نواز شریف کی سیاست میں کوئی فرق نہیں'۔ انہوں نے جلاؤ، گھیراؤ کی باتیں بھی کیں۔ شاہ محمود قریشی نے کا کہنا تھا کہ تقریر کا وقت ختم ہوا، فیصلے کا وقت آن پہنچا ہے'۔ کچھ اسی طرح کی گفتگو دیگر مقررین نے بھی کی۔

کپتان نے اپنے مخصوص انداز سے تقریر کا آغاز کیا اور الیکشن ۲۰۱۳ء میں دھاندلی کو میچ فکسنگ قرار دیا، انہوں نے پاکستان کے دانش وروں سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ ہر سیاسی جماعت کہہ رہی ہے کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی تو پھر اس کے خلاف بات نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرے خلاف ٹی وی پر اشتہارات چلائے جارہے ہیں یہ قوم کا پیسہ اس طرح بہایا جارہا ہے اس کے لیے ہم عدالت جارہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ حکومت کے دور میں ایک روز

کی کرپشن ۱۲ ارب روپے یومیہ پر پہنچ گئی ہے۔انہوں نے کہاکہ انتخابات فکس تھے۔ ۷۰ لاکھ اضافی بیلٹ پیپرز چھپوائے گئے۔انہوں کہاکہ نواز شریف کی حکومت سڑکوں، پلوں، موٹر وے بنانے کو ملک میں ترقی تصور کرتی ہے اگر یہ چیزیں ملک کو ترقی دے سکتی ہیں تو پھر ملک ریاض کو ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے۔یاد رہے کہ گزشتہ دنوں یہی بات الطاف بھائی نے بھی اس وقت کہی تھی جب ملک ریاض نائن زیرو حیدر آباد اور کراچی میں دو عدد جامعات قائم کرنے کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔عمران خان نے اپنی تقریر میں نواز حکومت سے مذاکرات کی تفصیل بھی بتائی اور نواز شریف سے کہا کہ مذاکرات کرو، فیصلہ کرو۔ ۱۰۹ دن ہوجانے کے باوجود وہ پر عزم دکھائی دیے۔ دھرنے کو جاری رکھنے کا عزم دھرایا۔ تمام لوگوں کو کپتان کے پروگرام ’ سی ‘ کا انتظار تھا، حکومت بھی اسی انتظار میں تھی کہ کپتان کا پلان سی کیا ہوگا۔ کپتان کا پلان ’سی‘ جو جلسے میں پیش کیاگیا وہ کچھ اس طرح تھا بعد میں شہر اور ملک بند کرنے کی تاریخوں میں ردوبدل کیاگیا۔تاریخوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ شٹر ڈاؤن نہیں ہوگا صرف احتجاج ہوگا۔کپتان نے اپنے پلان ’سی‘ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ :

۴ دسمبر کو لاہور بند کردونگا۔اب ۴ دسمبر ۱۵ دسمبر ہوگئی۔

۸ دسمبر کو فیصل آباد بند کردونگا۔

۱۲ دسمبر کو کراچی بند کردونگا۔

دسمبر کو پورا پاکستان بند کر دونگا۔ یہ اب ۱۸ دسمبر ہو گئی۔ نیز بند کرنے کے بجائے ۱۶ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ شٹر ڈاؤن نہیں ہو گا صرف احتجاج ہو گا لیکن کپتان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عوام از خود ملک کو جام کر دیں گے۔

یہ ہے کپتان کا پلان 'سی' یعنی رفتہ رفتہ کپتان ،حکومت پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لیے حکمت عملی تبدیل کر رہے ہیں۔ کپتان نے یہ بھی کہا کہ اگر پلان سی کامیاب نہ ہوا تو پھر پلان 'ڈی' اور پھر پلان 'ای' لایا جائے گا۔ پلان 'ڈی' اور 'ای' کو سرِ دست چھوڑ دیتے ہیں۔ پلان 'سی' سامنے آتے ہی حکومتی مشینری کے مشیران و وزیرانِ بے لگام فوری طور پر حرکت میں آ گئے۔ سوچا نہ سمجھا بس مخالفت برائے مخالفت۔ دنیا کو مجمع نظر آ رہا تھا۔ ہر چینل کیمرے کی آنکھ سے مسلسل اسے دکھا رہا تھا لیکن ہمارے وزیرانِ بے تدبیر کو لاکھوں کو مجمع ہزاروں میں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے محترم رعنا ثناء اللہ صاحب کو بھی یہ مجمع چند ہزار ہی لگا ساتھ ناکام جلسہ اور یہ بھی کہ تمام لوگ کے پی کے سے لائے گئے تھے ،پرویز رشید کو تو ہر صورت کپتان کی نفی کرنی ہی تھی انہوں نے کہا کہ جلسے کو ناکام قرار دیتے ہوئے عمران کو مذاکرات کی جانب آنے کا مشورہ دیا۔ جناب سعد رفیق نے فوری طور پر کہا کہ 'گالیاں ہمیں جھکا نہیں سکیں گی'۔ حالانکہ یہی سعد رفیق بقول خود ان کے ۲۰۰۶ء میں وہ تحریک انصاف میں شمولیت اختیار کرنے جا رہے تھے ۔انہوں نے آج ہی اے آر وائی

پر ٹاک شو میں یہ اقرار بھی کیا کہ عمران ان کے پاس آئے تھے اور کیوں کہ میرے اپنی پارٹی سے اختلافات تھے اس وجہ سے میں سوچ رہا تھا کہ کپتان کے ساتھ چلا جاؤں۔

اسی پروگرام میں ایک سینئر صحافی ہارون رشید نے یہ بھانڈا پھوڑا کہ سعد رفیق تحریک انصاف میں شامل ہونے کے لیے بے قرار تھے۔ تحریک انصاف کی سیکرٹری شپ کے خواہش مند تھے وہ یعنی ہارون رشید صاحب عمران خان کو سعد رفیق کے پاس لے کر گئے تھے۔اور بھی بہت کچھ کہا گیا مختصر یہ کے معاملہ بنا نہیں۔ شہباز شریف نے کپتان کے پلان سی' کو' پاکستان کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا'۔اسی قسم کا بیان نون لیگ کے مشاہد' اللہ کا بھی کہ 'عمران ٹنکی سے نیچے اتر آئیں پھر مذاکرات ہونگے'۔ گویا نون لیگ اب بھی

کپتان سے معملات کو طے کرنے میں سنجیدہ نظر نہیں آ رہی۔

سابق صدر آصف علی زرداری صاحب کو بھی کپتان نے للکارا تھا انہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کپتان کو بولنگ کرنے دو ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ کپتان بالنگ کرلے پھر ہم کرکے دکھائیں گے۔ انہوں نے اسلام آباد میں ہونی والی سیاسی سرگرمی کو سازش قرار دیا اور کہا کہ ہم اس سازش کا حصہ نہیں بنیں گے ، جمہوریت کی کشتی کو ڈوبنے نہیں دیں گے۔ یعنی نواز حکومت کا ساتھ دیتے رہیں گے۔انہوں نے کہا کہ اگر ہم دھرنے میں شریک ہوجاتے تو'میرے ہم وطنو' ہوجاتا۔ دوسری جانب اسی روز جس تقریب سے آصف علی زرداری خطاب کر رہے

تھے اس میں گو نواز گو کے نعرے بھی لگ رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے اہم رکن اور قائد اختلاف سید خورشید شاہ کا فوری بیان یہ تھا کہ اگر حکومت مزاکرات نہیں کرے گی تو اپنے پیر پر کلھاڑی مارے گی۔اسی روز پاکستان پیپلز پارٹی کے روٹھے ہوئے رکن ڈاکٹر بابر اعوان نے کہا کہ پیپلز پارٹی کا ورکر وہیں کھڑا ہے جہاں پی ٹی آئی کھڑی ہے۔ یعنی پی پی میں کپتان کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے نواز حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ' ان کا طرز حکمرانی ضیاء الحق والا ہے'۔ پی پی کے اہم رہنما اعتزاز احسن کا کہنا ہے کہ 'عمران خان کی باتوں میں سچائی ہے، مگر وہ اپنے لیے ہدف مشکل چنتے ہیں۔ عمران خان مکمل ناکام ہوتے ہیں اور نواز شریف کامیاب ہوتے ہیں تو بڑا دکھ ہوگا'۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عمران خان جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں سچائی ہے صداقت ہے۔ طریقہ کار، طرز عمل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کپتان کے معاملے کو سنجیدگی کے ساتھ ایڈریس کرے۔ اپنے وزراء کو فضول قسم کے بیانات دینے سے منع کرے۔ حکومت مخالف قوتوں کا کام تو حکومت پر تنقید کرنا ہوتا ہی ہے۔ حکومت میں آ جانے کے بعد حکمراں جماعت پر بھاری ذمہ داری آ جاتی ہے کہ وہ اپنے اندر برداشت اور تحمل پیدا کرے۔ حکومتی رویے سے ان کے عمل اور ظاہری حرکات و سکنات تو اس بات کا پتا دے رہیں ہیں کہ یہ کپتان کو تھکا کر میدان مارنا چاہتے ہیں جس طرح علامہ

ڈاکٹر طاہر القادری کا انقلاب دھرنا بنیادی طور پر تھک کر میدان چھوڑ گیا۔ حکمرانوں کا خیال یہی ہے کہ کپتان اور اس کے پرستار بھی کتنا برداشت کریں گے بلاآخر دھک ہار کر رخصت ہو جائیں گے۔ یہ بات کپتان نے اپنی تقریری میں بھی کہی۔ ساتھ ہی کہا کہ میں تھکنے والا نہیں اگر ساتھی چلے بھی گئے تو میں تنہا اسلام آباد میں دھرنا دیے رہوں گا۔ ۱۰۱ دنوں میں اکتوبر میں ایسا وقت بھی آیا تھا جب کپتان کا دباؤ زیادہ ہوا تو نوز شریف نے کپتان کے گھر جانے کا پیغام بھی بھجوایا لیکن چند شرائط کے ساتھ جو کپتان کو منظور نہ تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس وقت تک منطقی انجام کو نہیں پہنچے گا جب تک کوئی طاقت دونوں فریقوں کو مجبور نہ کردے کہ مسئلہ حل کیا جائے۔ طاقت کون سی ہو سکتی ہے۔ سیاست دانوں میں تو کوئی ایسا سیاستداں نہیں جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور دونوں فریق اس کی بات مان کر کوئی حل نکال لیں۔ عدلیہ ایک طاقت ہو سکتی ہے اس نے پہلے بھی مشورہ دیا تھا کہ دونوں لیڈروں کا باہم مل کر اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے اسی اشارے پر تو نواز شریف کپتان سے ملاقات پر آمادہ ہوئے تھے۔ اور آخری قوت وہی ہے جو سب سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ جس کی طاقت کا مظاہرہ ہم کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ان دونوں کو از خود معاملا حل کرنے کے لیے اس جانب مائل کردے کہ یہ کسی قوت کا انتظار کیے بغیر آپس میں مل کر تمام معاملات کو حل کرلیں۔ کپتان کی تحریک کا حتمی انجام ملک میں نئے انتخابات خواہ انہیں مڈ ٹرم کا نام ہی دیا جائے، پر ختم

ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ کب ہوتے ہیں شیخ رشید کی پیشن گوئی تو ۲۰۱۵ء کی ہے۔
سیاسی پیشنگوئیاں ضروری نہیں کہ درست ثابت ہوں لیکن بعض بعض درست بھی
ثابت ہو جاتی ہیں لگتا ہے کہ ۲۰۱۵ء ملک میں انتخابات کا سال ہو گا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔
(دسمبر ۲۰۱۴ء ۲)

پرویز مشرف اور ۶۰۰ شریک ملزمان ۔ قصہ تمام ہوا

سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف پر چلائے جانے والے آئین کی دفعہ ۶ کے تحت سنگین غداری کے مقدمے میں اب ایک اہم اور دلچسپ صورت حال پیدا ہوچکی ہے۔ پرویز مشرف کے وکلاء صفائی کی جانب سے عدالت میں اسدعا کی گئی تھی کہ اس مقدمہ میں پرویز مشرت کے علاوہ مزید ۶۰۰ افراد کو شریک ملزم کے طور پر شامل کیا جائے۔ کیونکہ ایمر جنسی کے عمل کا اقدام تنہا جنرل (ر) پرویز مشرف نے نہیں کیا تھا بلکہ ان کے شریک محفل ، شریک حکومت جن کی تعداد ۶۰۰ سے بھی زیادہ ہے.برابر کے شریک تھے۔ صفائی کی جانب سے اس درخواست کی سماعت معزز عدالت نے انتہائی تحمل اور غیر جانب سے کی اور عدالتی فیصلہ جاری کرتے ہوئے درخواست کو قابل سماعت قرار دے دیا۔ یہ خصوصی عدالت جسٹس فیصل عرب جو اس عدالت کے سربراہ ہیں کے علاوہ جسٹس طاہرہ صفدر اور جسٹس یاور علی پر مشتمل ہے۔ عدالتی فیصلہ دو ایک کی اکثریت سے سنایا گیا ہے۔ فیصلے میں معزز عدالت نے وفاقی حکومت کو ہدایت کی کہ ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کو ایمرجنسی نافذ کرنے کے حوالے سے اس وقت کے وزیر اعظم شوکت عزیز ، چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر اور اسوقت کے وفاقی وزیر قانون زاہد حامد (جو موجودہ حکومت میں بھی اسی عہدہ پر فائز ہیں لیکن اس فیصلہ کے بعد اپنے عہدے سے استعفیٰ دے چکے ہیں) کو شریک ملزم بنا کر ان کے بیانات دوبارہ قلم بند

کئے جائیں اور رپورٹ ۱۵ یوم میں عدالت میں جمع کرائی جائے۔ فیصلے کے مطابق چونکہ ۳ نومبر کا اقدام صرف اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کو گھر بھجوانے کے لیے اٹھایا گیا تھا، اس سلسلے میں ایمرجنسی کے نفاذ اور چیف جسٹس (ر) عبدالحمید ڈوگر کو چیف جسٹس بنانے کے لیے وزارت قانون سے سمری تیار کرا کر وزیراعظم شوکت عزیز کو بھجوائی گئی تھی، انھوں نے اسے منظور بھی کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس عمل میں شامل ہیں۔ فیصلے میں مزید کہا گیا ہے کہ ملزم کو دوران سماعت یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دیگر افراد کو شریک ملزم بنانے پر زور دے لیکن عدالت میں پیش کیے گئے ثبوت اور ریکارڈ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کہ بعض دیگر افراد کو بھی شریک مقدمہ بنایا جانا چاہیے'۔ عدالت کے ایک معزز رکن جسٹس یاور علی نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے ریمارکس میں واضح کیا کہ '۳ نومبر کا اقدام پرویز مشرف نے کسی سے مشاورت کے بغیر تنہا کیا تھا اس لیے دیگر افراد کو اس اقدام میں شریک ملزم نہیں بنایا جاسکتا'۔ کیونکہ فیصلہ دو ایک کی اکثریت سے آیا ہے اس لیے یہ بات حتمی ہو گئی کہ جنرل (ر) پرویز مشرف کی درخواست عدالت نے منظور کر لی اب حکومت کو اس پر عمل کرنا لازمی ہوگا۔

حکومت نے طویل وقت گزانے کے بعد شاید مجبوراً یہ فیصلہ کیا تھا وہ بھی اُس وقت جب اسے یہ محسوس ہوا کہ پرویز مشرف ملک کی ایک مظبوط سیاسی قوت بن سکتے

ہیں گو انہیں ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں ناکامی ہو چکی تھی لیکن اس بات کے امکانات روشن تھے کہ وہ منتخب ایوان سے باہر رہتے ہوئے دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد بنا کر حکومت کو مشکل میں ڈال سکتے ہیں۔ کل یعنی ۲۸ نومبر کی شب اے آر وائی کے پروگرام 'سیاست اور سازش' میں ڈاکٹر معید پیرزادہ اور فواد چودھری کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل صاحب نے تیسری سیاسی قوت بنانے کی بات کی اور یہ بھی کہا کہ نون لیگ اور پیپلز پارٹی کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے گروپس کو باہم ملا کر ملک کی تیسری سیاسی وقت بنایا جاسکتا ہے۔ یہ بات انہوں نے عمران خان کے 'دھرنوں' اور اس کی تن تنہا سیاست کرنے کے حوالے سے کہی۔ بالکل اسی طرح جیسے عمران خان کا اتحاد ڈاکٹر طاہر القادری سے باقاعدہ اتحاد نہیں بنا لیکن دونوں 'انقلاب دھرنے' اور 'تبدیلی دھرنے' کے حوالے سے آپس میں کزن بنے تو صورت حال بدلتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

حکومت بھی اس موقع پر زیادہ خوف زدہ ہوتی دکھائی دی۔

بات پرویز مشرف پر غداری کے مقدمہ کے حوالے سے عدالت سے جو فیصلہ آیا اس کے تناظر میں ہو رہی تھی۔ یہ فیصلہ جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے پرویز مشرف کے وکلاء کی اس درخواست کے حوالے سے آیا ہے کہ غداری کا جو الزام جنرل صاحب پر لگایا گیا ہے وہ اس کاروئی میں یعنی ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کے تنہا ذمہ دار نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار ۶۰۰ افراد بھی ہیں جن کی فہرست یقینا

صفائی نے عدالت میں فراہم کی ہو گی۔ عدالت نے اس درخواست کو قابل سماعت ہونے کا حکم دیتے ہوئے تین احباب کو صدر صاحب کا شریک قرار دیا ان میں سابق وزیراعظم شوکت عزیز، سابق وزیر قانون زاہد حامد اور سابق چیف جسٹس (ر) عبد الحمید ڈوگر کو شریک قرار دیا۔ کالم نگار عبد الرؤف کا تجزیہ درست ہے کہ 'اگر یہ کام شوکت عزیز نے کیا ہے اور معاونت زاہد حامد کی ہے تو لازماً ساری کی ساری کیبنٹ اس میں ملوث رہی ہو گی۔ پرائم منسٹر جب کسی کام کے لیے صدر کو ڈرافٹ بھیجتا ہے تو پہلے کیبنٹ میٹنگ طلب کرتا ہے اور اس میں اس طرح کے ڈرافت خاص طور پر اس لیے بھی کہ ۳ نومبر کو ایمرجنسی نافذ کرنے کے لیے صدر کو ڈرافٹ بھجوانا کوئی عام کام نہیں تھا ۔ سو اس ڈرافٹ پر لازماً بحث ہوئی ہو گی'۔ میرے خیال میں ڈرافٹ کی تیاری یا اس قسم کے مسودات کی تیاری نہ تو وزیر اعظم خود کرتے ہیں ، نہ ہی وزیر قانون البتہ وہ اس قسم کے ڈرافٹ میں تھوڑی بہت تبدیلی یا فل اسٹاپ اور کامہ کی درستگی ضرور کرتے ہوں گے۔ یہ کام تو وفاقی سیکریٹری ، ڈپٹی سیکریٹری اور سیکشن آفیسر صاحبان کیا کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ان کاموں کے ماہر اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی عالم فاضل ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں مخصوص ماہرین سے مدد لی جاتی ہے۔ جیسے معروف قانون داں جناب شریف الدین پیرزادہ قانونی معاملات میں حکومتوں کو اور سیاست دانوں کو مشورہ اور ماہرانہ رائے دیتے رہے ہیں۔اس معاملے میں یہ ضرور ہوا ہوگا اور ہوتا بھی ہے کہ احکامات ، ہدایات اور گائیڈ لائن اوپر سے ہی

آیا کرتی ہیں۔ صدر صاحب کیونکہ فوجی سربراہ بھی تھے اس اعتبار سے انہوں نے اپنے فوجی دوستوں اور ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔ اس جانب بعض تجزیہ نگاروں نے بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ چنانچہ اس جرم میں صدر جنرل مشرف کے ساتھ ساتھ کئی سیاسی، فوجی اور بیوروکریٹ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ سیاست دانوں میں چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی تو از خود بیان دے چکے ہیں کہ وہ پرویز مشرف کے ۳ نومبر کے ایمرجنسی کے اقدام میں شریک تھے۔ ۶۰۰ افراد کی فہرست سامنے آجانے سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ صفائی نے کس کو شامل کیا اور کس کو نہیں۔ تیسرے شریک جو پرویز مشرف کے اس اقدام کے شریک ٹھہرائے گئے ہیں وہ اُس وقت کے چیف جسٹس (ر) عبد الحمید ڈوگر ہیں۔ یقیناً عدالت نے محسوس کیا ہوگا کہ اس اقدام میں ان کا بھی کوئی عمل دخل تھا اسی لیے انہیں فریق بنا دیا گیا۔ شراکت داری یہاں آکر ختم نہیں ہوگی نظر آرہا ہے کہ ۶۰۰ افراد میں سے اگر تمام نہیں تو ایک صفر ہٹا کر ۶۰ ضرور شریک ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ مقدمہ جسے حکومت دائر ہی نہیں کرنا چاہتی تھی، کیونکہ اپنی انتخابی مہم میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جارہا تھا کہ پرویز مشرف جو کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر ہیں کے خلاف غداری کا مقدمہ قائم کریں گے۔ نون لیگ کے تمام لیڈران اپنی تقاریر میں اور ٹی وی شوز میں پرویز مشرف کو سخت تنقید کا نشانا بنایا کرتے تھے۔ غداری کا مقدمہ دائر کرنے کا اعلان کیا کرتے تھے۔ اب جب وہ اقتدار میں آئے تو اپنے وعدہ کو پورا کرنے کا پریشر دیگر کے علاوہ ان کی اپنی جماعت کے

بعض اہم لیڈروں کی جانب سے تھا کہ مقدمہ قائم کیا جائے ورنہ کئی نون لیگی اس بات کے حق میں تھے کہ پرویز مشرف کو سیف راستہ دیتے ہوئے ملک سے باہر جانے دیا جائے اور اس مشکل کو اپنے گلے کی ہڈی نہ بنایا جائے۔ لیکن نواز شریف پر ان لوگوں کا پریشر کام کر گیا جو مقدمہ قائم کرنے کے حق میں تھے۔ شاید ان کا خیال ہو کہ مقدمہ دائر ہوگا اور چند دنوں یا چند مہینوں میں مشرف صاحب کو عدالت غدار قرار دے دیگی۔ بھلا غداری کے مقدمے بھی اس طرح اپنے حتمی انجام کو پہنچا کرتے ہیں۔ اور پھر پرویز مشرف کا معاملہ کئی اعتبار سے مختلف بھی ہے۔ کئی قوتیں ان کے پیچھے موجود ہیں جو بظاہر نظر نہیں آ رہیں لیکن یہ ایک فیکٹر ہے جسے پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ غدار تو پہلے والے بھی تھے جنہوں نے وہی کام کیا تھا جو پرویز مشرف نے تو پھر انہیں کیوں چھوڑ دیا جائے ؟ یہ کوئی منطق نہیں کہ جو کچھ ماضی میں ہو چکا سو ہو چکا، ان میں سے سب ہی اب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی باقیات تو ابھی موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ معاملہ اتنا سہل نہیں بلکہ بہت گھمبیر اور پیچیدہ ہے۔ نون لیگ نے انتخابی مہم میں پرویز مشرف کے علاوہ بھی تو بہت سی باتیں کیں تھیں۔ ان سب پر کون سا عمل ہو رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف اس وقت کے صدر مملکت جناب آصف علی زرداری صاحب کے بارے میں کیا کچھ فرمایا کرتے تھے۔ ان الفاظ کو دہرانا بھی مناسب نہیں کیا شہباز شریف نے ایسا کیا بلکہ ان سے تو محبت اور دوستی کی پینگیں بڑھ چکی ہیں۔ ملک کو ترقی پر گامزن کرنے، عوام کی

حالت کو بہتر کرنے کے بہت سے وعدے انتخابی مہم کا حصہ تھے ان پر سنجیدگی سے، محنت اور توجہ سے عمل کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

مختصر یہ کہ یہ مقدمہ طول پکڑتا نظر آ رہا ہے۔ کم از کم موجودہ حکومت کے دورانِ حکومت میں تو اس کا حتمی فیصلہ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ طوالت سالوں پر محیط ہو سکتی ہے۔ تجزیہ کار نجم سیٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ 'چلو چھٹی ہوئی، اب مقدمہ چار پانچ برس چلتا رہے گا۔ ایسے میں وکلاء کوئی اور سقم تلاش کر لیں گے اور پھر ٹائیں ٹائیں فش'۔ عدالت کے اس فیصلے کے نتیجے میں ایک بات بہت اچھی اور جمہوری روایات کے لیے قابل تقلید ہوئی لیکن ہمارے ملک میں ایسی روایات ہیں نہیں وہ یہ کہ جناب زاہد حامد صاحب جو موجودہ حکومت میں وزیر قانون تھے اور پرویز مشرف کی حکومت میں بھی خاص طور پر جب ۳ نومبر کی ایمرجنسی لگائی گئی وزیر قانون تھے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں انہیں ملزم قرار دیا تو انہوں نے اولین فرصت میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان میں بھی ایسے سیاست داں موجود ہیں جو جمہوری روایات کو زندہ رکھنے کے لیے ذاتی عنا کو قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مقدمہ اب پیچیدگی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ طوالت بھی دکھائی دے رہی ہے۔ معاملہ اب حکومت وقت کے ہاتھ سے تقریباً نکل چکا ہے عدالتیں جو فیصلہ کریں گی وہی حق اور پاکستان کے مستقبل، جمہوری نظام کے تسلسل اور پرویز مشرف اور ان کے

پرستاروں کے لیے قابل قبول اوراس کے مثبت اثرات ہمارے مستقبل پر رونماں ہوں گے۔

۲۸ نومبر کی شب اے آر وائی کے پروگرام 'سیاست اور سازش' میں ڈاکٹر معید پیرزادہ اور فواد چودھری کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل صاحب بہت زیادہ کانفیڈینٹ لگ رہے تھے۔ انہوں نے بہت تفصیل سے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا دفعہ کیا۔ ان کی کہنا تھا لگتا ہے کہ ۲۰۰۷ء میں میرے خلاف منظم طور پر مہم چلائی گئی، انہوں نے اپنے دور' میں ہونے والے تین اہم واقعات لال مسجد، بلوچستان آپریشن اور چیف جسٹس (ر) افتخار چودھری کے خلاف اقدامات کو درست قرار دیا۔ انہوں نے چودھری شجاعت کی تعریف کی اور پرویزالہی کو کریڈٹ دیا کہ انہوں نے پنجاب کو اچھا چلایا۔ وہ ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے حکومتِ وقت سے درخواست کرنا نہیں چاہتے۔ کپتان کو ایک اچھی شخصیت قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عوام الناس کی ڈیمانڈ ہے کہ اب تبدیلی آنی چاہیے۔ انہوں نے واضع کیا کہ پاکستان میں سوائے ملٹری حکومت کے کسی نے عوام کو خوشحالی نہیں دی۔ خصوصی عدالت کے فیصلے کے بعد جنرل صاحب کو یہ پہلا انٹرویو تھا۔ عدالتی فیصلے کے بعد سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف پر غداری کے مقدمہ کا مستقبل نون لیگیوں کی توقعات کے برخلاف ہوتا نظر آرہا ہے۔ اس فیصلہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ قصہ تمام ہوا۔

مَیں یہ کالم لکھ چکا تھا کہ بیچ میں ۳۰ نومبر آ گئی جس نے حکومت کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں کو خوف اور تشویش میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ لیکن حکومت اور کپتان کی فہم و فراست کے باعث خطرہ ٹل گیا۔ اس اہم موضوع پر کالم لکھنا ضروری محسوس ہوا وہ کالم ’ کپتان کا پلان ’سی‘ اور نواز حکومت ‘ کے عنوان سے ہماری ییب پر شائع ہوا۔ آج اپنا یہ کالم ہماری ویب کو ای میل کرنے ہی والا تھا کہ آج (۴ دسمبر ۲۰۱۴ء) کے روزنامہ جنگ کے صفحہ اول پر سابق وزیر اعظم شوکت عزیز کی وضاحت پڑھی جس میں شوکت عزیز نے وٹی کن سٹی میں جنگ کے رپورٹر سے گفتگو میں کہا کہ ’ ایمرجنسی کے نفاذ میں جنرل پرویز مشرت نے ان سے کوئی مشاورت نہیں کی تھی یہ فیصلہ جنرل صاحب نے اپنی صوابدید پر کیا تھا۔ مجھے ان کے اس فیصلہ کا علم اس وقت ہوا جب اس کا نوٹیفیکشن جاری ہوچکا تھا‘۔ رپورٹر کا کہنا ہے کہ شوکت عزیز صاحب نے یہ بات مشروط گفتگو کرتے ہوئے کی۔ شوکت عزیز ہی کیا اب تو پرویز مشرف کے دور چھوٹے سے چھوٹا قریبی یہی کہے گا کہ وہ تو پرویز مشرف کو جانتا بھی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب شوکت عزیز جانتے تھے کہ پرویز مشرت کسی سے مشورہ کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے تو پھر بھی پرویز مشرف کے ہاتھوں کھلونا کیوں بنے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ خود کو اس معاملہ میں کسی بھی حوالے سے قصور وار نہیں سمجھتے۔ ٹھیک ہے سر، دست ان کی بات مانی جاسکتی ہے جب عدالت انہیں طلب کرے گی اس وقت دودھ کا دودھ پانی

کا پانی ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعی لاعلم ہوں۔ مَیں نے پرویز مشرف کے دور میں ایک قطعہ کہا تھا جو شوکت عزیز اور سرتاج عزیز کے پرویز مشرف اور نوز شریف کے چہیتے ہونے کے حوالے سے تھا۔ سرتاج عزیز آج بھی نواز شریف کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔

کل تھے سرتاج عزیز، آج ہیں شوکت عزیز
اُنہیں تھے شریف عزیز، انہیں مشرف عزیز
ملک کی فکر نہ کل تھی عزیز، نہ آج ہے عزیز
کرسی تھی اُنہیں عزیز، کرسی اِنہیں ہے عزیز

معذوروں کا عالمی دن ۔ نابینا افراد پر تشدد

دنیا ۳ دسمبر کو معذوروں کے عالمی دن پر اُن سے اِظہار یکجہتی کر رہی تھی اُن سے ہمدردی اور ان کے مسائل اور مشکلات کو کم سے کم کرنے کی تجاویز پر غور کر رہی تھی اور ہم معاشرے کے اس مظلوم طبقے پر جو بینائی سے محروم ہے اپنی پولس کے ہاتھوں تشدد کر رہے تھے۔ لمحہ فکر ہے پوری قوم کے لیے خصوصاً حکمرانوں کے لیے کہ ہم کہاں جارہے ؟ہماری ذہنی ابتری کی کوئی منزل ہے،آخر ہم اپنے آپ کو کتنا پستی میں لے جائیں گے۔ پنجاب پولس آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ بالکل مادر پدر آزاد، نہ کوئی روکنے والا، نہ کوئی کہنے والا، نہ کسی کا ڈر، نہ کسی کا خوف۔ کہتے ہیں کے وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ پنجاب دونوں حکمراں ملک سے باہر تھے اس وجہ سے نابیناؤں پر ظلم ڈھانے والے پولس اہلکاروں کے خلاف کاروائی نہ ہو سکی۔ بہت خوب۔ کیا دلیل ہے۔ گویا جتنا چاہے کسی پر ظلم وزیادتی ہوجائے میاں برادران کوئی قدم اٹھائیں گے تو انصاف ہوگا ورنہ وقت انتظار میں ہی گزر جائے گا۔آخر وزیروں کی فوج ظفر موج کس لیے ہے۔ تجزیہ کار حسن نثار نے بہت درست کہا کہ ’ نابیناؤں پر ظلم کے لیے اندھا ہونا ضروری ہے نا درندہ ہونے کی شرط ہے‘۔ پنجاب پولس اندھی تو نہیں البتہ اس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ درندہ ضرور ہے۔ اس کے اس عمل سے پاکستان کے ہر ایک فرد

کا سَر شرم سے جھک گیا ہے۔ بیرون دنیا والے ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ہم بیہودگی کے گھڑے میں اس قدر گر چکے ہیں کہ کسی سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں۔ بیرون ملک مقیم پاکستانی کس منہ سے مقامی لوگوں کا سامنا کرتے ہوں گے۔
پنجاب پولس کے اس عمل پر اسے جس قدر بھی لعن طعن کیا جائے کم ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ آنکھ والوں نے نابینا افراد پر تشدد نہیں کیا بلکہ نابینا پولس والوں نے بینا افراد کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس لیے کوئی بھی بہ شعور کسی ایسے شخص پر جس کے ہاتھ میں سفید چھڑی ہو ڈنڈا اٹھانا تو دور کی بات ہاتھ اٹھانے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیا ہم ایسا نہیں کرتے کہ اگر سڑک کے کنارے کوئی سفید چھڑی لیے ہوئے نظر آ جائے تو ہم لپک کر اُسے سڑک کراس نہیں کراتے ؟۔ بس میں سفر کے دوران اگر سفید چھڑی بردار نظر آ جائے تو ہم فوراً اس کے لیے اپنی سیٹ خالی نہیں کر دیتے تو پھر اس پنجاب پولس میں آخر کون سی مخلوق بھرتی کر لی گئی ہے کہ جو آنکھوں سے اندھی، کانوں سے بہری، عقل سے کوری، سمجھ سے عاجز، فہم سے ناپید، شعور سے خالی ، ادراک نہ رکھنے والی ہے۔
لاہور سے تعلق رکھنے ولے نابینا افراد نے جو تعداد میں صرف دو سو کے قریب تھے بدھ ۳ دسمبر کو اپنے جائز مطالبات کے حق میں پہلے پریس کلب کے سامنے احتجاج کیا۔ اس کے بعد انھوں نے وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ جانے کی کوشش کی تاکہ

اپنی آواز متعلقہ حکام تک پہنچا سکیں۔ مظاہرے کا یہ سلسلہ ڈیوس روڈ تک بڑھ گیا مظاہرین مال روڈ پہنچے تو کلب چوک پر صدر مملکت جناب ممنون حسین کی سواری وہاں، سے گزرنا تھی جس کے لیے وہاں پروٹوکول لگا ہوا تھا۔ (رات مختلف چینل پر ایوان صدر کے ترجمان کی جانب سے اس کی تردید کی جارہی تھی) اب بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ سربراہ مملکت نے جس راستے سے گزرنا ہو وہاں پر لوگ احتجاج کریں خواہ وہ بینا ہوں یا نابینا۔ پولیس یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چنانچہ ہماری پولس کے فرض شناس جوانوں کو احتجاج کرنے والوں کے ہاتھوں میں سفید چھڑی بھی نظر نہ آئی۔ کیونکہ اس وقت وہ خود عقل کے اندھے ہوچکے تھے۔ انھوں نے نہتے نابیناافراد پر خوب چھترول کیا کہ انہیں لگ پتا چل گیا کہ پنجاب پولس اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں کس قدر چوکس ہے۔ جب وہ اپنا ڈنڈا گھماتی ہے تو اسے کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کے سامنے کوئی بچہ ہے، خاتون ہے، سفید داڑھی والا کوئی بزرگ ہے یا جوان اس کے سامنے سارے احتجاجی محمود و ایاز ہوجاتے ہیں۔ بقول مظہر برلاس 'اگر آنکھوں والے اندھے ہوجائیں تو کیا کہا جاسکتا ہے'۔ لگتا ہے کہ اس جگہ پولس کا کوئی بھی ذی شعور افسر ڈیوٹی پر نہیں تھا تمام کے تمام افسران وزیر اعلیٰ کے ساتھ بیرون ملک دورے پر تھے۔ کچھ جسمانی طور پر اور باقی ماندہ ذہنی طور پر خادم اعلیٰ کے ہمراہ ہی ملک سے باہر تھے۔ اگر کوئی ایک بھی معقول افسر اس

جگہ ہوتا تو یقیناً یہ واقعہ ہرگز ہرگز پیش نہ آتا۔

خبر یہ ہے کہ نابینا افراد پر تشدد کرنے والے پانچ اہلکاروں کو معطل کر دیا گیا ہے۔ یہ کاروائی ڈی آئی جی آپریشن ڈاکٹر حیدر اشرف نے کی۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے باہر بیٹھ کر واقعہ کا سخت نوٹس لیا اور سی سی پی او لاہور سے رپورٹ طلب کر لی اور ذمہ داروں کے خلاف کاروائی کا حکم دے دیا۔ تحقیقات کے لیے کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ یہ ضابطے کی کاروائی ہے۔ اس قسم کے واقعہ کے بعد یہی کچھ ہوتا ہے۔ بعد میں ٹائیں ٹائیں فش۔ نابیناؤں پر تشدد کی کاروائی تمام ہی ٹی وی چینل نے دکھائی۔ دیکھ کر ہر ایک کا دل خون کے آنسو رویا۔ صدر مملکت نے افسوس کا اظہار دو دن بعد کیا، حالانکہ یہ واقعہ ان کی لاہور موجودگی میں ہی ہوا۔ روزنامہ جنگ کے مطابق ' پولس والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے صدر مملکت کو گورنر ہاؤس سے آرام سے نکلنے کا راستہ فراہم کرنے کے لیے ان نابینا افراد کو روکا جس کے بعد مسلم لیگ ہاؤس کے قریب بلائنڈ ایسوسی ایشن کی جانب سے دھرنا دینے پر معاملات خراب تر ہو گئے'۔ نابینا مظاہرین کے کیا مطالبات تھے۔ کیا وہ 'گو نواز گو' کے نعرے لگا رہے تھے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ کیا وہ حکومت گرانے کے ارادے سے آئے تھے، نہیں ہر گز نہیں، کیا سفید چھڑی والے یہ دو سو افراد صدر صاحب کے قافلے کے سامنے آنا چاہتے تھے؟ یہ بھی نہیں تو پھر وہ کیا چاہتے تھے۔ سنیئے سفید چھڑی والوں کے مطالبات یہ تھے کہ شوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ میں ۹۵۰ اسامیاں خالی

ہیں انہیں پر کیا جائے۔ ان اسامیوں پر معذور افراد کو میرٹ پر بھرتی کیا جائے۔ نابینا افراد یہ بھی چاہتے ہیں کہ انہیں ملازمتوں میں ان کا جائز حق یعنی دو فیصد کے حساب سے ملازمت کو یقینی بنایا جائے جو قانونی طور پر طے شدہ ہے۔ یہ حق معذوراں کو ۱۹۸۱ء میں جاری ہونے والا ایک آرڈیننس دیتا ہے یہ آرڈیننس Disabled Persons (Employment and Rehabilitation) Ordinance 1981 ہے۔ پاکستان میں معذور افراد کل آبادی کا 2.49 فیصد ہیں۔ اب جب کہ نادرا نے ۸۲ ہزار معذور افراد کو کارڈ بھی جاری کر دیے ہیں۔ حکومت پر لازم ہے کہ مختلف محکموں میں جو 4049 اسامیاں خالی ہیں معذور افراد سے فل کرے۔ تاکہ معاشرے کے اس اہم طبقے کو اس کا جائز حق مل سکے۔ ۲۰۰۲ء میں حکومت کی جانب سے National Policy for Persons with Disabilities بھی جاری کی جاچکی ہے۔ معذوروں کے لیے کیے جانے والے ان اقدامات پر اگر ایمانداری سے عمل درآمد کیا جائے تو معاشرے کا یہ محروم طبقہ دیگر کی مانند خوش حال زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گا۔ ایسا کرنا ہمارا اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔ اس حوالے سے ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ قومی اسمبلی نے اس واقعہ کا فوری ایکشن لیتے ہوئے متفقہ طور پر ایک قرار داد منظور کر لی۔

ان ۲۰۰ افراد پر جو اپنے ہاتھوں میں مطالبات کے بینر اور اپنی شناخت سفید چھڑی لیے ہوئے تھے تشدد کرنے کے بجائے انہیں پیار و محبت سے کسی مناسب جگہ

بُلا کر ان سے گفتگو کی جاتی، ان کی بات ہمدردی سے سنی جاتی، انہیں تسلی و تشفی دی جاتی اور ان کے جائز مطالبات حکام متعلقہ تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا جاتا تو وہ معصوم لوگ یقیناً خاموشی سے، خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ یہ کام پنجاب کا کوئی بونے سے بونا وزیر بھی کرسکتا تھا، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی دستیاب نہیں تھا کیونکہ وہ سب آجکل دھرنے والوں کے خوف سے دم بخود ہیں چند بہادر ہیں دن بھر شام کوئی وی پر ٹاک شو میں شرکت کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں، ان کا بیشتر وقت بیوٹی پارلر میں گزرتا ہے۔ لیکن وزیر خواہ مرکز کے ہوں یا حکومت پنجاب کے یہ کسی بھی ایسی بات کو جو حکومت کے خلاف جاتی محسوس ہو اسے سرے سے مانتے ہی نہیں۔ یہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اب پنجاب کے سابق وزیر قانون رعنا ثناء اللہ محترم کو ہی لے لیں۔ ۱۴ جون 'واقعہ ماڈل ٹاؤن' ان کی وزارت ہڑپ کرچکا لیکن وہ اب بھی اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ وہ جیو نیوز کے اینکر پرسن مسعود رضا کے ساتھ پروگرام کرتے ہوئے اس بات پر چراغ پا ہوگئے جب اینکر نے نابیناافراد پر لاٹھی چارج کو شرمناک کہا تو سابق وزیر یک لخت غصے میں لال پیلے ہوگئے فرمایا کہ۔ فرمایا کوئی تشدد نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی شرمناک ہے یہ تو دھکم پیل تھی۔ میڈیا کے لوگ بلاوجہ اسے بڑھا چڑھا کر اور شرم ناک جیسے الفاظ کا نام دے کر بھڑکا رہے ہیں۔ رعناء صاحب کا کیا قصور۔ بندے کی چھوٹی موٹی نوکری چلی جائے تو وہ مشکل میں آجاتا ہے پنجاب حکومت کی وزارت وہ بھی قانون دانی

کی۔بڑی چیز ہے۔ انہوں نے تو ایسا ہی کرنا ہیں۔ چلیں چھوڑیں وزیر و کو یہ کام تو کسی بھی محکمے کے سیکریٹری سے لیا جاسکتا تھا اگر وہ بھی دستیاب نہیں تھا تو سوشل ویلفیئر کا ڈائریکٹر ہی بلایا جاسکتا تھا، اگر وہ بھی پولس افسران کی پہنچ میں نہیں تھا تو یہ کام کوئی بھی معقول پولس افسر بہت آسانی سے کرسکتا تھا۔جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو وسائل ہونے کے باوجود وہ کام نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کچھ اس معاملے میں بھی ہوا۔

بات چیت نہیں کرنا تھی، نہیں کی، لاٹھیاں برسانا تھیں وہ برسادی گئیں۔ اب صدر مملکت، وزیر اعظم، خادم اعلیٰ، وزیر صاحبان لاکھ مذمتی بیانات دیں، افسوس اور دکھ کا اظہار کریں وہ رسمی اور ضابطے کی کاروائی سے کچھ اور زیادہ نہیں ہوگی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقتدار تیسری بار جھولی میں آن گرا ہے اس لیے اپنی قدر کھو چکا ہے۔

اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں دنوں، ہفتوں، سالوں اور دس سالوں جن میں اقوام متحدہ issues کا انتخاب کیا جس کا بنیادی مقصد عالمی سطح کے مسائل اور اور اس کے ذیلی ادارے دلچسپی رکھتے تھے کو اجاگر کرنا تھا۔ بسا اوقات یو این کے ذیلی اداروں نے اپنے پروگرام کے مطابق بعض مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے مخصوص دنوں کو مقرر کرلیا جیسے عالمی ادارہ صحت WHOنے صحت کا عالمی دن، World No-Tobacco Day، ٹی، دل کا عالمی دن، گردوں کا عالمی دن،

بی کا عالمی دن وغیرہ کے انعقاد کی بنیاد رکھی ۔ اسی طرح یونیسکو نے بھی بعض موضوعات کو اجاگر کرنے اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف دنوں کا انتخاب کیا اور اس دن اس موضوع کی مناسبت سے سیمینار، ورکشاپ، کانفرنسیز اور نمائش کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جیسے 'پانی کا عالمی دن'، عالمی لٹریسی ڈے'، عالمی ماحولیاتی ڈے'، ماں کا عالمی دن، باپ کا عالمی دن،مادری زبان کا عالمی دن ،کتاب کا عالمی دن اور اسی طرح دیگر موضوعات پر دنوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اسی طرح معذور افراد سے اظہار یکجہتی اور ان کے مسائل و معاملات کو اجاگر کرنے کے لیے ۱۹۹۲ء میں اقوام متحدہ نے ۳ دسمبر کو معذوروں کا عالمی دن' قرار دیا ۔ اس دن دنیا بھر میں معذوروں کے حوالے سے ' مختلف پروگرام ترتیب دئے جاتے ہیں۔ہر سال کا موضوع مختلف ہوتا ہے۔ ۲۰۱۴ء کا Sustainable development: the promise of technology موضوع تھا۔اس موضوع کے حوالے سے سیمینارز، کانفرنسیز اور لیکچر اور دیگر پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ پاکستان میں بھی معذوروں کی فلاح و بہبود سے متعلق فلاحی تنظیموں نے معذوروں کے لیے مختلف پروگرام ترتیب دئے۔ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ حکومتِ وقت کو نابینا افراد کے جائز مطالبات سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن پنجاب پولس میں شامل بعض اہلکاروں کی لاپروئی اور تساہلی سے معاملہ خراب سے خراب تر ہوگیا اور نوبت نابیناؤں پر لاٹھی چارج تک پہنچ گیا جن کو یہ تک معلوم نہیں کہ انہیں کون مار رہا ہے، کیا چیز ان کے سر پر ماری جاری ہے، لاٹھی چارج کے

نتیجے میں وہ اگر گر رہے ہیں تو کس جگہ گر رہے ہیں۔ آنکھوں والا تو اپنے آپ کو کسی حد تک بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ بیچارے تو اس سے بھی محروم ہیں۔ ان پر ظلم وزیادتی کسی بھی طور قابل معافی نہیں۔ اظہار ہمدردی کے بیانات اس کے لیے کافی نہیں، زیادتی کرنے والوں کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔

نابینا اور دیگر معذور افراد کے تمام مسائل کو اولین فرصت میں اور ترجیحی بنیادوں پر حل کیا جانا چاہیے۔ (۸ دسمبر ۲۰۱۴ء)

حکیم محمد سعید شہید پر پی ایچ ڈی تحقیق اور عذرا قریشی۔ ایک مکالمہ

سابق چیف لائبریرین۔ آغا خان میڈیکل یونیورسٹی، کراچی

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ پاکستان میں لائبریری پروفیشنلز میں عذرا قریشی اعلیٰ مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ جامعہ کراچی کے علاوہ امریکہ سے بھی لائبریری سائنس میں ایم اے کی سند رکھتی ہیں۔ پاکستان کے علاوہ جامعہ جدہ کی لائبریری میں بھی خدمات انجام دے چکی ہیں۔ امریکن سینٹر کے علاوہ آغا خان یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کی سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔ اس وقت اعزازی طور پر کراچی کے اسکول آف لائبریرین شپ سے استاد کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ میرا یہ اعزاز بھی ہے کہ عذرا قریشی اور مَیں ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں ایم اے کے طالب علم رہے۔ یہ انٹرویو میرے پی ایچ ڈی مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار " ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ۔ جس سال مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تویض ہوئی یہی سال سرکاری ملازمت

سے میری ریٹائرمنٹ کا بھی تھا۔ گویا مجھے بہت لیٹ یہ اعزاز حاصل ہوا اس کی متعدد وجوحات رہیں۔ اس موقع پر عذرا قریشی کی مبارک باد کے ساتھ ایک جملہ بھی تحریر تھا جو میں اکثر احباب کو بتایا کرتا ہوں کہ ''محنت رنگ لاتی ہے''۔ انگریزی میں ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ یہ انٹرویو ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء کو ہیلتھ سائنسز لائبریری، آغا خان میڈیکل یونیورسٹی' کراچی میں لیا گیا۔ شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت، خدمات اور تحقیقی موضوع کے حوالے سے عذرا قریشی صاحبہ کے رائے اور خیالات اس گفتگو کے (نتیجہ میں سامنے آئے جو تحقیق میں معاون ثابت ہوئے

: تعارف

عذرا قریشی صاحبہ پاکستان کی ایک سینئر لائبریرین ہیں ۔ ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا، ۱۹۹۰ء میں آپ نے اسی مضمون میں دوسرا ایم اے کینٹ اسٹیٹ یونیورسٹی، اوہائیو، امریکہ (Ohio, USA) سے کیا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز امریکن سینٹر کراچی سے کیا اور چھ برس (۱۹۷۴ء ۔ ۱۹۷۹) خدمات انجام دیں، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ میں تین برس (۱۹۷۹ء ۔ ۱۹۸۲ء) لائبریری خدمات انجام دیں۔ مئی ۱۹۹۱ء سے آغا خان میڈیکل یونیورسٹی کی ہیلتھ سائنسیز لائبریری کی سربراہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ آپ پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں بھی فعال ہیں آپ کو میڈیکل لائبریری

کی بانی صدر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے، پا (MELAP) ایسو سی ایشن آف پا کستان کستان لائبریری ایسو سی ایشن کی لائف ممبر ہیں۔ عذرا قریشی صاحبہ سے یہ گفتگو ان کے دفتر واقع ہیلتھ سائنسز لائبریری، آغا خان میڈیکل یونیورسٹی' کراچی میں ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء کو ہوئی۔

آپ نے لائبریرین شپ کا پیشہ کب اور کیسے اختیار کیا؟ : ا

ج : ایک حسن اتفاق ہی کہوں گی، گورنمنٹ ویمن کالج سے بی اے کرکے جب میں تھائی نیسٹو واپس گئی جہاں میری زندگی کے ابتدائی ۲۶ سال گزرے وہاں میرے والد کا قیام ملازمت کے سلسلے میں رہا تو انہوں نے چاہا کہ میں کہیں نہ کہیں مصروف رہوں، جس میں سیکھنے کا عمل بھی جاری رہے۔ اسکول میں درس وتدرس انہیں مناسب لگا، وہ عورتوں کی معاشی خود مختاری کے بھی حامی تھے۔ بیٹوں کی طرح وہ بیٹیوں کو بھی اپنے پیروں پر کھڑا دیکھنا چاہتے تھے۔ اچھے اسکولوں میں جہاں میرے لیے ملازمت ممکن تھی وہ انگریزی میڈیم امریکن اسکول تھے جہاں وہ اپنے سسٹم کے تربیت یافتہ لوگوں کو ہی رکھتے تھے۔ چنانچہ انٹر نیشنل اسکول کی بچوں کی لائبریری میں مجھے عارضی کام کی پیشکش ہوئی ان کا کوئی استاد دو چار ماہ کی چھٹی پر تھا وہ عارضی کام میرے لیے مستقل پیشے کی صورت اختیار کر گیا۔

۲ : اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں۔ لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم کب اور کہاں سے حاصل کی؟

ج: میری ابتدائی تعلیم تھائی لینڈ اور پاکستان کے درمیان منقسم ہے۔ لائبریری سائنس میں نے میڈیکل MLIS میں ماسٹرز ۱۹۷۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے کیا، دوسرا لائبریرین شپ میں سترہ سال بعد کینٹ اسٹیٹ یونیورسٹی، اوہائیوں، امریکہ سے ۱۹۹۰ء میں کیا۔

۳ : آپ پاکستان میں لائبریری سائنس کا مستقبل کیسا دیکھتی ہیں؟

ج: لائبریری سائنس کا مستقبل دنیا میں بہت روشن ہے۔ افراد بھی جو اس کی اہمیت پہچان لیں وہ اپنا مقام محنت، لگن اور مسلسل علم حاصل کرکے بنا سکتے ہیں۔ پاکستان میں البتہ پچھلے تیس سالوں میں اگر چیدہ چیدہ افراد اور اداروں کو چھوڑ دیں تو معیار تعلیم مسلسل گرا اور اب وقت بہت آگے نکل چکا ہے بہت محنت اور وسائل درکار ہیں بین الاقوامی معیار تک پہنچنے کے لیے۔ بہر حال محنت اور امید دونوں کا دامن تھامے رہنا ضروری ہے اور مایوسی کفر ہے۔

۴۔ آپ لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

ج: حکیم صاحب کا کردار بہت نمایاں ہے مگر ان کا اپنا ایک منفرد انداز اور

سوچ بھی ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ، اسلامی تعلیم اور اسلامی تشخص کے ساتھ جدیدیت کے حامی تھے اور اپنی قدروں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے جو ان کے اپنے طرززندگی اور قائم کردہ اداروں میں بھی نظر آتا ہے۔

۵۔ اسپل (SPIL) سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسیز کے پاکستان لائبریرین شپ پر کیااثرات مرتب ہوئے؟

ج: اسپل (SPIL) کے حوالے سے اس کے طویل عرصہ پر محیط رہنے والے کام کو اگر دیکھا جائے تو وہ ابتدائی دور میں کتب داری اور کتب خانوں کی دنیا میں بہت حدتک اثر انداز ہوا بلکہ اس دنیا سے متعلق لوگوں کی حوصلہ افزائی اور سرگرمی میں بڑی حدتک مدومعاون ثابت ہوا، لیکن وہ اچھے وقت تھے اور اب وقت کی رفتار وانداز بے حد مختلف ہے۔ اب بالکل دوسرے طرز کے لوگوں کی بھی ضرورت ہے ان حالات سے نمٹنے کے لئے فی الوقت وہ قیادت نظر نہیں آرہی۔ شاید کچھ عرصے بعد ابھرتی ہوئی نظر آئے۔

۶۔ کیا ''اسپل گولڈ میڈل'' پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو سکا؟

ج: گولڈ میڈل چاہے اسپل کا ہو، حکومت اور یونیورسٹی کی طرف سے، ایوارڈ ایوارڈ ہوتا ہے۔ ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی انتہائی ضروری ہے اور انسان

کی فطرت کا ایک حصہ بھی۔ وہ پہچانا اور اپنے کام کو منوانا چاہتا ہے۔ اللہ کی طرف سے بھی تو جزا اور سزا شاید یہی تصور پیش کرتا ہے کہ اچھے کاموں کا صلہ جنت ہے اور جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی والے کام اور مشقت ضروری ہے۔ دنیا میں بھی وہ incentive ضروری ہیں تعلیم و تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے۔

۷ : آخر میں کیا آپ اس موضوع کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی۔ تحقیق کے نقطہ نظر سے آپ اس موضوع کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج : حکیم صاحب ہم سب کے لئے قابل احترم اور علم دوست شخصیت تھے۔ وہ ایک بے لوث محب وطن پاکستانی اور ایک سچے مسلمان تھے جن کی زندگی سب کچھ آسائش میسر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی اور مسلسل وطن عزیز کی خدمت میں گزری، میں اور میرا گھرانہ ذاتی طور پر ان سے بہت لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں۔ بحیثیت حکیم میرے والدین ان کی تشخیص اور دواؤں پر بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ میں بحیثیت لائبریرین بھی یہ سمجھتی ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی اور تحریک کتب خانوں کے ملک میں فروغ میں نمایاں کردار، ان کی کتاب دوستی یقینا اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے موضوع بنا کر اس پر تحقیق ہو اور ان کی خدمات پر مواد یکجا کیا جائے۔ آپ کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ بسم اللہ کر رہے ہیں لیکن ان کی ہمہ جہت شخصیت کے لیے ایک مقالہ کافی نہیں ہوگا غالباً ابتدا ہو

گی مزید تحقیق کے لیے۔ اسے اس ڈھنگ سے کیجئے گا کہ مزید تحقیق کی راہ کھلے اور موضوع سے مختلف پہلو نکلیں۔ وہ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت تھے۔ تعلیم کو عام کرنے کے لیے کوشاں تھے اور جاتے جاتے "مدینتہ الحکمہ" جیسا ادارہ پاکستان کو تحفے میں دے گئے۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دونی رات چوگنی ترقی دے اور صحیح معنوں میں حکیم صاحب کے خواب کی تعبیر بنے۔ آمین۔

(یہ انٹرویو ۱۱ جنوری ۲۰۰۵ء کو ہیلتھ سائنسز لائبریری، آغا خان میڈیکل یونیورسٹی، کراچی میں لیا گیا)

سانحہ فیصل آباد کے بعد کپتان کا کراچی میں کامیاب شو

کپتان کے ۳۰ نومبر کے اعلان کردہ پلان 'سی' کے مطابق ۸ دسمبر کو فیصل آباد سانحہ ظہور پذیر ہوا۔ جس کی تفصیل پرنٹ اور برقی میڈیا پر آچکی ہے۔ متعدد کالم نگار، تجزیہ کار اور ٹی وی اینکر اس واقع کو حکومت کی ناقص منصوبہ بندی اور ملک میں موجود طویل عرصے سے سیاسی کشیدگی کو سہل انداز سے لینے، ٹال مٹول کی حکمت عملی قرار دے چکے ہیں۔ عدالت عظمٰی نے 'ساڑھے آٹھ کروڑ روپے کے فراڈ میں ملوث ملزمان کی عدم گرفتاری سے متعلق کیس' کی سماعت کے دوران جسٹس جواد ایس خواجہ نے سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ریمارکس میں کہا کہ 'ملزمان دندناتے پھر رہے ہیں ملک صرف مراعات یافتہ لوگوں کا بن کر رہ گیا ہے، پسماندہ طبقے کو کوئی پوچھنے والا نہیں، حالات ایسے ہیں کہ 'نینداڑانے والے حالات ہیں مگر چین کی بانسری بجائی جارہی ہے'۔ عدالت عظمٰی کے یہ ریمارکس بظاہر تو ایک کیس میں دیے گئے لیکن یہ ریمارکس ملک میں سیاسی صورت حال اور حکمرانوں کی بے حسی کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ سانحہ فیصل آباد کے بعد جس میں ایک سیاسی کارکن اپنی جان سے گیا ہر جانب یہی صدائیں تھیں کہ حکومت آخر کب تک اس معاملے سے آنکھیں چراتی رہے گی۔ ہر ایک حکومت کو پہل کرنے، مذاکرات کی میز پھر سے بچھانے، سیاسی معاملات کو سیاسی طور پر حل کرنے کی تجویز دے رہا تھا۔ تمام

سیاسی جماعتوں نے حکومت سے صاف صاف الفاظ میں مذاکرات کرنے کو کہا۔ خورشید شاہ نے سخت الفاظ میں حکومت کو مذاکرات کرنے کی ہدایت کی۔ اس واویلے کا کچھ اثر حکومت پر ہوا اور مذاکرات کی نوید سنائی دی۔ کپتان نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اگر حکومت تحقیقاتی ٹریبونل قائم کردے اور ٹریبونل اپنا کام شروع کردے تو دھرنے اور کراچی و لاہور کا احتجاج ختم کردیں گے۔ خیال تھا کہ حکومت اب سنجیدگی سے نہ صرف مذاکرات شروع کرے گے بلکہ تحقیقات کے لیے جوڈیشل کمیشن کی تشکیل کو فوری طور پر ممکن بنادے گی۔ لیکن ہوا وہی جس کے لیے مسلم لیگ نون مشہور ہے یعنی بیان بازی، لارے لپوں سے وقت گزارا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۲ دسمبر آن پہنچی۔ کپتان نے کراچی کے احتجاج کی تیاری پہلے ہی سے کی ہوئی تھیں۔ شروع رات ہی سے تحریک انصاف کی ریلیاں کراچی کی مختلف علاقوں میں گشت کرتی نظر آئیں۔ تین تلوار کلفٹن پر دھرنے کاآغاز سب سے پہلے ہوا۔ عوام بے حد پریشان تھے کہ کیا ملک میں سانحہ ماڈل ٹاؤن، سانحہ اسلام آباد اور سانحہ فیصل آباد کے بعد خدا نا خواستہ 'سانحہ کراچی' وقوع پذیر ہونے جارہا ہے۔ اب جب کہ کراچی شو ساتھ خیریت سے گزر گیا لاہور میں احتجاج کرنا ابھی طے ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ حکومت سنجیدگی کا مظاہر کرے اور لاہور کے احتجاج سے قبل مذاکرات کے ذریعہ سیاسی حل نکالنے کی کوشش کی جائے۔ مذاکرات کی ابتدا ملک و قوم کے لیے نیک شگون ہے۔ مذاکرات کا نتیجہ کچھ بھی ہو یہ اگر شروع ہوجاتے ہیں تو گرم سیاسی ماحول کا نارمل کرنے میں

سازگار ثابت ہوں گے۔ ان کا شروع ہونا ملک و قوم کے لیے حوصلہ افزا پیغام ہے۔
پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر سید خورشید شاہ، سندھ کے وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ عمران خان کو کراچی میں احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے اگر قانون کی خلاف ورزی ہوئی تو قانون حرکت میں آ جائے گا۔ بات اپنے طور پر درست تھی۔ اور سب سے بڑھ کر کراچی میں اپنا سیاسی غلبہ اور کنٹرول رکھنے والی جماعت کے قائد جناب الطاف حسین نے یہ بیان دے کر کہ 'تحریک انصاف کو کراچی میں احتجاج کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن اس احتجاج میں تشدد نہیں ہونا چاہیے' پاکستانی عوام خصوصاً کراچی کے عوام کو اطمینان اور سکون سے ہمکنار کر دیا۔ اب یہ یقین ہو گیا کہ کپتان کے احتجاج کے سامنے کوئی سیاسی جماعت مزاحمت نہیں کرے گی جس طرح فیصل آباد میں نون لیگ کے کارکنوں نے پی ٹی آئی کے کارکنوں کے سامنے آ کر نعرے بازی ہی نہیں کی بلکہ کھلے عام اَسلِحَہ کا استعمال بھی کیا جس کے نتیجے میں تحریک انصاف کا ایک کارکن ہلاک ہو گیا۔ نجم سیٹھی کی چڑیا نے یہ اطلاع دی کہ 'کراچی متحدہ نے بند کرایا' ۔ بہت خوب اگر بہتر حکمت عملی اپنائی جائے، دانائی اور ہوش مندی سے کام لیا جائے تو اس کی تعریف کے بجائے اس پر شکوک و شبہات کے نشتر چلائے جائیں۔ اگر متحدہ اس کے خلاف کام کرتی تو چڑیا نے تب بھی تنقید ہی کرنا تھی۔

گویا جب تنقید مقصد ہو تو کوئی اچھی بات بھی بری محسوس ہوتی ہے۔ بیرسٹر خواجہ نوید احمد کی یہ رائے ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ سندھ کے سیاستدانوں نے بردباری اور عقلمندی کا مظاہرہ کیا جناب خورشید شاہ اور الطاف بھائی نے جمہوری حق اور احتجاج کے حق کی حمایت میں بیان دیئے اور ماحول سازگار رہا۔ کپتان کا' کراچی شو کامیاب رہا۔ کسی بھی قسم کا ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ کپتان کے ساتھ ساتھ سندھ کی سیاسی قوتوں کو بھی کریڈٹ جاتا ہے کہ کراچی میں امن رہا۔

کراچی میں احتجاج ہوا، کپتان کراچی تشریف لائے، کارکنوں سے مختصر خطاب کے بعد واپس اپنے کنٹینر اسلام آباد پہنچ گئے۔ کراچی کے عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ کپتان کے جاں نثار رات گئے تک بھنگڑا ڈالتے رہے، خوشیاں مناتے رہے اور رفتہ رفتہ اپنے اپنے گھروں کو بخیریت واپس لوٹ گئے۔ کاش یہی حکمت عملی جو متحدہ قومی موومنٹ کے قائد نے دکھائی، پاکستان پیپلز پارٹی کے حکمرانوں نے اس کا عملی مظاہرہ کیا، اور مسلم لیگ نون کے نا ہونے کے برابر کارکنوں نے کراچی میں دکھائی فیصل آباد میں بھی حکمرانوں، نون لیگ کے فیصل آباد کے سیاسی لیڈروں خاص طور پر رعنا ثنا اللہ اور عابد شیر علی اور کارکنوں نے دکھائی ہوتی تو قوم سانحہ فیصل آباد سے دوچار نہ ہوتی اور حکومت کے ماتھے پر ایک اور بدنما داغ نہ سجتا۔ جب چڑیاں چگ گئی کھیت اب پچھتاوت کیا

ہو وت'، اب عابد شیر علی بہ نفس نفیس فیصل آباد تھانے پہنچ گئے اپنی بے گناہی ثابت کرنے حالانکہ وہ اس سانحہ کی ایف آر میں شریک ملزم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی عام شہری جس کا نام کسی بھی ایف آر میں ہو وہ اپنے پیروں چل کر کنویں کے پاس چلا جائے تو پیاسا اس پر عقاب کی مانند جھپٹ پڑتا ہے اور پنجاب پولس تو نابیناؤں کو نہیں بخشتی۔ لیکن یہ بھی انداز ہے ہمارے ملک میں حکمرانی کا۔ طاقت کے سامنے طاقت بے بس و لاچار دکھائی دیتی ہے۔ سانحہ فیصل آباد کے اگلے ہی روز رعنا صاحب نے ان تمام ملزمان کے مَعیت میں پریس کانفرنس کر ڈالی۔ جوں ہی یہ پریس کانفرنس ختم ہوئی آزاد میڈیا نے ان تمام چہروں کو دکھانا شروع کردیا جو ایک جانب تو تحریک انصاف کے کارکنوں پر پستول تانے ہوئے تھے تو دوسری جانب شیر نواز لیگ کی پریس کانفرنس میں پیچھے کھڑے ہوئے فاتحانہ انداز میں سینے چوڑے کرکے کہہ رہے تھے کرلو جو کرنا ہے۔ یہ بھی ہمارا اندازِ حکمرانی ہے۔

کپتان کا مطالبہ صرف چار حلقوں کو کھولنا ہی تو تھا۔ یہ چار حلقے بڑھ کر کئی حلقے ہوئے، پھر پورا الیکشن ۲۰۱۳ء کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا، بعد ازآں 'گو نواز گو' اور انتخابات کی آزادانہ تحقیق پر دھرنوں کے ساتھ ساتھ، مختلف شہروں میں جلسوں کا روپ اختیار کرگیا، پھر کپتان نے پلان 'سی' پیش کیا اور اب کہنا ہے کپتان کا کہ ' سی' کے بعد 'ای' اور پھر پلان ' ڈی' سامنے آئے

گا۔ کپتان کی اس بات میں صداقت نظر آتی ہے کہ حکومت پر دباؤ کم ہو جائے تو یہ سونے کے ساتھ ساتھ خراٹے لینے لگتی ہے۔ واقعتاً ایسا ہوا، جب علامہ طاہر القادری اور کپتان کے دھرنوں کی طاقت سرچڑھ کر بولنے لگی تو حکومتی مشینری فوراً حرکت میں آ گئی اور مطالبات ماسوائے ایک 'گو نواز گو' کے ماننے کو تیار ہو گئی۔ جوں ہی ڈاکٹر قادری نے اپنی بساط لپیٹی، واپسی کی راہ لی، حکومت کو اسلام آباد میں طاقت کمزور پڑتی دکھائی دی فوراً حکومتی طرز عمل تبدیل ہوگیا۔ کہاں کے دھرنے، کہاں کے مذاکرات، کیسے مذاکرات۔ یہ پالیسی مناسب نہیں۔ کپتان نے اپنے پروانوں کی جماعت کو بہت وسیع کر لیا ہے۔ ملک کے کونے کونے میں ان کے چاہنے والے اب پائے جانے لگے ہیں، تحریک انصاف ملک کی بڑی اور اہم سیاسی قوت بن کر سامنے آچکی ہے۔ اس سے آنکھیں ہرگز بند نہیں کی جا سکتیں۔ اگر حکومت نے ایسا کیا تو یہ خرگوش شیر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لے اور یہ سمجھے کہ شیر اسے پیار کرکے چلا جائے گا۔ شیر تو شیر ہوتا ہے۔

آخر حکومت کو تھیلے کھولنے میں کیا ڈر یا خوف ہے۔ ایک نہ ایک دن تو بلی تھیلے سے باہر آئے گی اور سب کو چیخ چیخ کر یہ بتائے گی کہ اسے تھلے میں کیوں بند رکھا گیا۔ اگر حکمراں سمجھتے ہیں کہ وہ بے قصور ہیں، انہوں نے یا ان کی جماعت نے انتخابات میں دھاندلی نہیں کی، عوام نے انہیں حقیقی حمایت

دی ہے تو تھیلے کھلنے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ کپتان کا مطالبہ جائز نہیں لیکن کپتان کو یقین ہے کہ تھیلے کھل گئے تو انتخابات میں گڑبڑ کرنے والوں کے کالے کرتوت کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ بقول بیرسٹر خواجہ نوید احمد 'جوں جوں تھیلے کھلیں گے کئی راز کھل جائیں گے'۔ حکمراں جماعت چاہتی ہے کہ بیگ نہ کھولے جائیں۔ کیوں؟ اس میں کیا ڈر ہے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جانے دیں۔ اگر آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ تھلوں کو بند ہی رکھا جائے انہیں ہرگز ہرگز نہ کھولا جائے تو اس کے پیچھے یقینا کوئی ڈر ہے، کوئی راز ہے، کوئی بھید ہے، کوئی سِر ہے، کوئی اندیشہ ہے یا پھر آپ کو ھَول ہے اس بات کا کہ سچ سامنے نہ آ جائے گا۔ تجزیہ کار ایاز امیر کا کہنا ہے کہ ' اسحٰق ڈار کا یہ کہنا کہ حکومت پی ٹی آئی سے غیر مشروط مذاکرات پر آمادہ ہے، کسی دانائی یا بصیرت کا اظہار نہیں بلکہ اب حکومت کے پاس 'دانائی' کے سوا کوئی اور آپشن بچا ہی نہیں۔ پہلے اسلام آباد میں ۳۰ نومبر کے عظیم الشان جلسے اور پھر آٹھ دسمبر کو فیصل آباد بند ہو جانے کی ٹھکائی سے حکومت کی عقل ٹھکانے آنا شروع ہو گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کہاں کی بات چیت کہاں کے مذاکرات۔۔ دراصل لاتوں کے بھوت لاتوں سے کم پر راضی نہیں ہوتے'۔ اپنی اپنی رائے ہے۔ پروردگار حکمرانوں کو ملک کی فکر عطا فرما۔ اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ میاں صاحب اگر آپ سچ پر ہیں تو پھر ڈر و خوف نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو چوتھی بار بھی اقتدار مل جائے گا۔ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ سچ تو پھر سچ ہوتا ہے آج

نہیں تو کل سامنے آ کر ہی رہے گا۔ انشاء اللہ۔ تین ماہ اور پندرہ دن کے تھکا دینے تکلیف دہ ایکسر سائز کے بعد مذاکرات کی بحالی کی کرن نظر آ رہی ہے۔ سیاسی حل ہی سیاسی مسائل کا واحد حل ہے۔ سنجیدگی، ایمانداری، سچائی، خلوص کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے مفاد کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو قوی امکان ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو پھر سے دہرانے میں لگ جائیں گے۔ تمام تر خواب، تجزیے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ نہ کپتان کو کچھ حاصل ہوگا نہ ہی نواز شریف صاحب کے پاس کچھ رہ جائے بلکہ کوئی اور دونوں کی بساط کو الٹ دیگا اور پھر پوری قوم ایک بار پھر سے جمہوریت کی گاڑی کو پٹری پر چڑھانے نے کی جدوجہد میں لگ جائے گی۔ اس ایکسر سائز سے ملک ایک بار پھر سے سالوں پیچھے چلا جائے گا۔ دنیا میں جگ ہنسائی بھی قوم کا مقدر ٹھہرے گے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم ہوش کے ناخون لیں اور ایمانداری سے، خلوص کے ساتھ وہ کام کریں جس میں ملک و قوم کی بھلائی ہو۔ دوسری اہم بات جس طرح سندھ کے سیاست دانوں اور اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعتوں نے کراچی میں عمران خان کے احتجاج کے ساتھ کھلے دل اور وسیع القلبی دکھائی جس کے نتیجے میں ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔ کپتان کے اس احتجاج سے سندھ کی کسی بھی سیاسی جماعت پر کوئی منفی اثر نہیں ہوا بلکہ سب نے پیپلز پارٹی اور متحدہ قومی موومنٹ کے اس فیصلے کو دانشمندانہ اور جمہوریت کے عین مطابق قرار دیا۔ امید کی جاسکتی ہے کے اگر لاہور یا کسی اور شہر میں کپتان یا کوئی اور جماعت سیاسی مظاہرہ یا

احتجاج کرے تو وہاں کے سیاسی رہنما اور سیاسی جماعتیں بھی اسی قسم کی فراغ دلی کا مظاہرہ کریں گی۔ اس طرح کے اقدام سے مثبت سیاسی کلچر فروغ پاتا ہے۔ کارکنوں میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ملک جانی و مالی نقصان سے محفوظ رہتا ہے۔ (۱۳ دسمبر ۲۰۱۴ء)

حیدرآباد میں ' الطاف حسین یونیورسٹی ' کا قیام۔ایک مستحسن اقدام

گزشتہ دنوں گورنر ہاؤس میں گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد، تعمیرات کی دنیا کی معروف شخصیت ملک ریاض جو سماجی و فلاحی خدمات کے والے سے بھی جانے جاتے ہیں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کراچی اور حیدرآباد میں ایک ایک عالمی معیار کی جامعات بنانے کا اعلان کیا۔اس پریس کانفرنس کے بعد یہ شخصیات متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے مرکز نائن زیرو تشریف لے گئیں جہاں پر ایک پر وقار تقریب منعقد ہوئی جس سے جناب الطاف حسین نے بھی لندن سے ویڈیو لنک پر حاضرین سے خطاب کیا۔ کراچی خصوصاً حیدرآباد میں یونیورسٹی کے قیام کو سندھ بھر کے عوام نے بالعموم جب کہ حیدرآباد کے عوام نے بالخصوص نہ صرف سراہا بلکہ بحریہ ٹاؤن کے چیئرمین ملک ریاض کے اس اقدام کو ےندھ میں تعلیم کے فروغ کی جانب ایک مستحسن اقدام قرار دیا۔

اس موقع پر جناب الطاف حسین نے خطاب کرتے ہوئے کہا ' ملک ریاض پاکستان کا سچا بیٹا اور کراچی اور حیدرآباد کی عوام کے لیے رحمت کا فرشتہ ہے، ملک ریاض کو ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے تو ملک سے نہ صرف مسائل ختم ہو جائیں گے بلکہ پاکستان کی طرف کوئی میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکے گا، انہوں نے

وہ کام کیا ہے جو بڑے بڑے دعوے کرنے والے حکمراں نہیں کرپائے'۔ جناب الطاف حسین نے کہا کہ ملک ریاض نے کراچی اور حیدرآباد سے تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ کام کیا کہ میں ان کو کراچی اور حیدرآباد کے لیے فرشتہ قرار دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ 'ملک ریاض نے تعلیم کی روشنی پھیلانے کی جو کوشش کی ہے اس سے سندھ میں وڈیرانہ اور جاگیردارانہ سوچ کے خاتمے میں مدد ملے گی'۔ اس موقع پر ملک ریاض نے نائن زیرو پر اپنے شاندار استقبال پر ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف حسین اور ایم کیو ایم کی پوری قیادت کا شکریہ ادا کیا انہوں نے کہا کہ 'انہوں نے کراچی اور حیدرآباد کی عوام پر کوئی احسان نہیں کیا ان کو اس ملک نے جو کچھ دیا وہ اس ملک کو واپس لوٹانا چاہتے ہیں'، اس موقع پر ملک ریاض نے اپنے ماضی کو بھی یاد کیا، یہ وہ موقع تھا جب ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے کہا' ملک ریاض اس قابل نہیں جو اس کو ایم کیو ایم کے مرکز پر جو عزت ملی میں نے وہ تمام کام کیے ہیں جو مجھے کرنا چاہیے'۔ ملک ریاض کی یہ گفتگو اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ ایک شریف اور نیک انسان ہیں، بے پناہ دولت ہونے کے باوجود وہ اپنے ماضی کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔

حیدرآباد میں یونیورسٹی کی ضرورت طویل عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ حیدرآباد سندھ کا دوسرا بڑا شہر ہے اس شہر کے باسی گزشتہ ٦٧ سال سے یونیورسٹی کے

قیام کے طالب تھے۔ ان کی اس دیرانیہ اور جائز خواہش کی تکمیل ملک ریاض کے توسط سے پائے تکمیل کو پہنچنے جا رہی ہے۔ یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔ ملک میں تعلیم کے فروغ کی جانب ایک اہم قدم بھی۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ سندھ کی اہم سیاسی جماعت ایم کیو ایم بھی حیدرآباد سندھ میں یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد کرتی رہی ہے۔ لیکن متعدد بار اقتدار میں ہوتے ہوئے بھی حیدرآباد سندھ کے عوام کی اس ضرورت کو پائے تکمیل تک پہچانے سے قاصر رہی جس کی بے شمار سیاسی وجوہ ہیں۔ مخالفت اپنی جگہ، سیاسی ہو، لسانی ہو، نسلی ہو، ذاتی ہو لیکن جہاں علم کے فروغ اور تعلیم کو عام کرنے کی بات آجائے وہاں پر تمام قسم کے تعصبات کو بالائے طاق رکھ دینا ملک و قوم کے مفاد میں ہوتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ہمارے ملک کی سیاست ہی نرالی ہے یہاں سیاست داں مخالفت میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ کسی دانا نے درست کہا کہ 'پہلے بولو پھر تولو' ہمارے سیاسی اکابرین پہلے بولتے ہیں پھر افسوس کرتے اگر برملا نہیں تو دل میں ضرور کرتے ہوں گے۔ جیسے کسی بھلی سیاسی شخصیت نے بغیر سوچ سمجھے کہہ دیا کہ 'حیدرآباد میں یونیورسٹی ان کی لاش پر ہی بن سکتی ہے' ۔ مخالفت کی یہ کون سی قسم قرار دی جائے گی۔ بقول ادریس بختیار 'تعلیم سے اتنا بغض، اور اس کا بے محابہ اظہار، ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے'۔ پروفیسر سید اسرار بخاری نے اس عمل پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ' وزیر

اعلیٰ سندھ نے ترپ کا پتہ پھینکا ہے جس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے، سندھ میں جو بھی رہتے ہیں پاکستانی ہیں، اور یہ وہ قدر مشترک ہے کہ اس کے علاوہ کوئی قدر ڈھونڈنا گویا شرک ہے، قومی وحدت کے لیے، سندھی، پٹھان، پنجابی ار جن کی مادری زبان اردو ہے، یہ چاروں طبقے دراصل اردو بھی بولتے ہیں اور پکے کھرے پاکستانی ہیں، پھر فرق کیا رہ گیا تینوں میں شاید کوئی، پانچواں ہے جو ان میں تفرقہ ڈال رہا ہے، کیا امریکہ برطانیہ میں مختلف طبقات نہیں لیکن ان کا ہر فرد خود کو امریکی کہتا ہے اسی طرح کوئی مسلمان کسی بھی مکتب فکر سے ہو اس کی اصل پہچان مسلم ہونا ہے'۔

۹ دسمبر ۲۰۱۴ء کو سندھ اسمبلی نے سندھ میں تین جامعات کے بل متفقہ طور پر منظور کر لیے۔ یہ جامعات کراچی اور حیدرآباد میں 'الطاف حسین یونیورسٹی' کے نام سے اور تیسری یونیورسٹی بحریہ ٹاؤن نوابشاہ میں ' بینظیر بھٹو یونیورسٹی ' قائم کی جائے گی۔ سندھ اسمبلی نے تین جامعات کی قرارداد منظور کرنے کے بعد ارکان نے بحث کے دوران بحریہ ٹاؤن کے سربراہ ملک ریاض، سابق صدر آصف زرداری، متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین، گورنر سندھ، وزیر اعلیٰ سندھ اور دیگر رہنماؤں کو یونیورسٹیوں کے قیام پر خراج عقیدت پیش کیا۔ سابق صدر آصف علی زرداری کی ہدایت پر لطیف آباد حیدرآباد میں حکومت سندھ کی جانب سے یونیورسٹی کے لیے ۵۰ ایکٹر زمین عطیہ کر دی گئی۔ اب اُس سیاسی

رہنما کے اس بیان کی کیا حیثیت رہ گئی۔ یقیناً اب ان کو اپنے اس بیان پر شرمندگی نہ سہی افسوس ہو رہا ہوگا۔ بزرگوں نے اسی وقت کے لئے کہا تھا کہ 'پہلے تولو پھر بولا'۔ لیکن ہمارے سیاسی رہنما پہلے بولتے ہیں بعد میں سوچتے ہیں۔ ان کا یہ اقدام بے شمار قسم کی مشکلات اور بلاوجہ مسائل کا باعث ہوتے ہیں۔

حیدرآباد کو سندھ کے دوسرے بڑے شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کبھی سندھ یونیورسٹی ہوا کرتی تھی جسے حیدرآباد سے دور جام شورو منتقل کر دیا گیا۔ حیدرآباد کے طلباء و طالبات طویل سفر کرکے جامشورہ ہی جا رہے ہیں۔ شہر کی وسعت اور تعلیمی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک یونیورسٹی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ جامعات قائم ہو جانی چاہیے تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حیدرآباد کی آبادی ۲۰۱۲ء کی مردم شماری کے مطابق 4.5 ملین ہے ان میں 60.07 فیصد شہری آبادی ہے۔ کراچی کے بعد یہ سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ باوجود اس کے کہ یہاں کئی اہم سیاسی شخصیات کا تعلق اس شہر سے رہا اس کے باوجود یہ شہر سرکاری جامعہ سے محروم رہا ہے۔

حیدرآباد شہر ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ اس کا ماضی بڑا دلکش ہے کبھی اسے 'سندھ کا پیرس Paris of Sindh' کہا جاتا تھا۔ جب یہاں کی شاہراہوں کو

خوشبو سے دھویا جاتا تھا اور روشنی کے لیے لگے ہوئے لیمپ جو شہر کے مختلف جگہ لگے ہوئے تھے خالص گھی سے جلائے جاتے تھے۔ لیکن سب کچھ اس وقت ختم ہوگیا جب ۱۸۴۳ء میں برطانوی راج یہاں قائم ہوا۔پکہ قلعہ حیدرآباد کی شناخت ہے، سندھ یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کی بلڈنگ ۱۹۱۲ء میں قائم ہوئی، گورنمنٹ ہائی اسکول، سابقہ رائے ہیرانند اکیڈمی ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی، سول اسپتال برطانوی راج میں ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا، یہاں کا ریلوے اسٹیشن ۱۸۹۰ء میں قائم ہوا، کینٹونمنٹ (صدر) ۱۸۵۱ء سے ۱۸۵۶ء کے درمیان قائم ہوا، نور محمد ہائی اسکول کی عمارت ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئی، سرکٹ ہاس ۱۹۱۲ء میں اور ٹھنڈی سڑک شہر کی اہم شاہرہ ہے جس کے دونوں جانب بڑے بڑے درخت ہیں جن کی بنیاد پر اسے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا ہے۔ حیدرآباد بعض باتوں کے لیے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ دن میں یہاں جس قدر بھی گرمی ہو اور گرم ہوائیں چلیں یہاں کی راتیں ٹھنڈی تیز ہواؤں کے حوالے سے اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ایشیا کا طویل ترین بازار 'شاہی بازار' جو کلہوڑا حکمرانوں نے قائم کیا 4.5 کلومیٹر لمبا ہے جو مارکیٹ چوک سے شروع ہو کر قلعہ حیدرآباد پر ختم ہوتا ہے۔ چوڑیوں کی تیاری کے حوالے سے یہ یہاں دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے۔ پورے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بیرون ممالک بھی یہاں سے چوڑیاں درآمد کی جاتی ہیں۔ سندھ کا تحفہ اجرک بھی یہاں کی پہچان ہے۔ یہاں پر قائم بمبئی بیکری کا کیک بہت مشہور ہے، پلہ مچھلی یہاں کی خاص سوغات ہے۔ ایشیا کا سب سے بڑا ذہنی مریضوں کا اسپتال

گدو' میں قائم ہے۔ یہ تمام چیزیں حیدرآباد شہر کی تاریخی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔اس کے باوجود یہ تاریخی اور آبادی کے لحاظ سے وسیع شہر طویل عرصے سے جامعہ سے محروم ہے۔

سندھ کے اس تاریخی شہر نے کئی اہم اور معروف شخصیات کو جنم دیا ان میں ڈاکٹر، انجینئر، ماہر قانون، پروفیسر، شاعر، ادیب، محقق، براڈکاسٹر، سی ایس پی آفیسر، صحافی شامل ہیں۔ان اہم شخصیات میں ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان، ڈاکٹر عشرت حسین، سابق چیف جسٹس ناظم الدین صدیقی، ڈاکٹر الیاس عشقی، حیدر بخش جتوئی، علامہ آئی آئی قاضی، قاضی محمد اکبر، قاضی عبدالمجید عابد، غلام محمد گرامی، نواب مظفر حسین، میر علی احمد تالپور، میر رسول بخش تالپور، مرزا خلیج بیگ، میراں شاہ، حکیم شمس الدین شامل ہیں۔ گورنمنٹ کالج فار مین ناظم آباد کے میرے کلیگ پروفیسر سراج الدین قاضی نے اپنی کتاب 'تذکرہ احباب حیدرآباد (سندھ) 'میں حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے احباب کا مختصر تذکرہ دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر احسن ۱۵۴ فاروقی، سفر نامہ نگار و براڈکاسٹر قمر علی عباسی، شفیق پراچہ سابق کمشنر کراچی، اظہر نقوی، جمال نقوی، معروف شاعر پروفیسر عنایت علی، ڈاکٹر نعیم نقوی، ڈاکٹر نظر کامرانی سابق ڈائریکٹر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کراچی ریجن، پروفیسر امجد علی، پروفیسر ،برجیس سلطانہ صدیقی، خالد وہاب، رضوان صدیقی

پروفیسر فیروزہ نثار، پروفیسر نثار حسین، پروفیسر محمد صالحین خان لودھی، پروفیسر محمد محسن اتاکے علاوہ گورنمنٹ کالج برائے طلباء ناظم میں خدمات انجام دینے والے اساتذہ جن میں سے چند میرے دور میں بھی رہے شامل ہیں ان میں پروفیسر احمدالدین شیخ، ڈاکٹر حسن محمد خان، پروفیسر خالد محی الدین، پروفیسر عبدالرشید ملک، پروفیسر ابو حازم، اور خود سراج الدین قاضی شامل ہیں۔

حیدرآباد سندھ کے حوالے سے میری اپنی یادیں بڑی گہری اور یادگار ہیں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کی بات ہے میں لطیف آباد نمبر ۱۱ اور ۹ کے درمیان قائم گورنمنٹ غزالی کالج جو گورنمنٹ سائنس کالج لطیف آباد نمبر ۹ کے برابر قائم ہے کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک ٹینٹ میں دوپہر ایک بجے دولھا بنا بیٹھا تھا اور قاضی صاحب مجھ سے حجاب و قبول کرا رہے تھے۔ بارات کراچی سے حیدرآباد گئی تھی۔ میری سسرال لطیف آباد نمبر ۱۱ میں تھی جو رفتہ رفتہ مجسم طور پر کراچی منتقل ہو چکی ہے۔ جب تک سسرالی حیدر آباد میں رہی میں نے حیدرآباد کی سڑکوں کی خوب خوب دھول کھائی ساتھ ہی اس شہر کی ٹھنڈی اور حسین ہواؤں سے لطف اندوز بھی ہوا۔ آخرکار میرے سسرالیوں کو مجھ غریب پر ترس آ ہی گیا اور انہوں نے حیدرآباد کو ہمیسہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا۔ یہ راز بھی افشاں کر رہا ہوں کہ میں نے خاموشی کے ساتھ اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ میرے

تینوں سالے حیدرآباد چھوڑ دیں، سالیوں کی شادی کراچی ہی میں ہو جائے تاکہ کراچی سے حیدرآباد لگنے والی میری دوڑ اختتام کو پہنچے اور یہی ہوا میں اس مقصد میں کامیاب ہوا،ایک ایک کرکے میرے تینوں سالے حیدرآباد سے کراچی منتقل ہو گئے۔ سالیوں کی شادی بھی کراچی میں ہو گئی، اس طرح کراچی سے حیدرآباد میری دوڑ اختتام کو پہنچی۔

سندھ میں ترقی کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں تعلیم کو کسی بھی حکومت نے اپنی ترجیحات میں نہیں رکھا۔ ویسے تو پاکستان بھر میں یہی صورت حال ہے۔ ہمارا تعلیمی بجٹ 2.7 ہے جب کے دفاع پر 3.4 فیصد خرچ ہوتا ہے ۔ تعلیم کو فوقیت دینے والی قومیں ترقی کے سفر میں آگے نکل چکی ہیں ۔ جن ممالک نے تعلیم کے مقابلے میں دیگر شعبوں کو فوقیت دی وہ طاقت ور ہونے کے باوجود ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل نہیں۔ صوبہ سندھ کے بعض سیاست داں ملک کے حاکم بھی رہے لیکن انہوں نے بھی سندھ دھرتی کو تعلیم کے میدان میں ترقی دینے کی خاطر خواہ سعئی نہیں کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا دور سنہری موقع تھا کہ سندھ میں تعلیم کے فروغ کے لیے اقدامات کیے جا سکتے تھے لیکن خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ بے نظیر بھٹو شہید اور جناب آصف علی زرداری کے دورِ اقتدار بھی حکمراں سندھ کے عوام کو تعلیم کے میدان میں خاطر خواہ اضافہ دینے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ حیدرآباد جیسے شہر کو

تعلیم کے حوالے سے نظر انداز کرنے کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ کہ یہاں ۶۷ سال میں ایک بھی سرکاری سطح پر جامعہ قائم نہیں کی گئی۔ سیاست دان اور کالم نگار نفیس صدیقی نے اپنے کالم 'یونیورسٹیوں کا قیام ۔ملک ریاض کا بڑا کام' میں درست کہا ہے کہ پاکستان ایک بڑا اسٹریٹجک پوزیشن والا ملک ہے لیکن یہاں کی لیڈر شپ کا وژن نہیں ہے۔ ۷۰ کی دیہائی میں تعلیم کا معیار ٹھیک تھا۔ تعلیمی اداروں کی نیشنلائزیشن کا عمل درست نہیں تھا۔ اس سے تعلیم میں انحطاط شروع ہوا اور آج انتہا یہ ہے کہ کالجوں اوور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے بچوں میں لکھنے پڑھنے کی بنیادی صلاحیت بھی نہیں ہے'۔ صوبہ سندھ کے جن شہروں میں سرکاری جامعات موجود ہیں ان میں کراچی، نواب شاہ، خیر پور، لاڑکانہ اور ٹنڈو جام شامل ہیں۔ یہاں حیدرآباد کو کیوں اگنور کیا گیا؟ صوبہ پنجاب اس حوالے سے بہت آگے نظر آتا ہے۔یہاں لاہور کے علاوہ سرگودھا، فیصل آباد، ملتان، گجرات، بہاولپور اور راولپنڈی میں سرکاری جامعات موجود ہیں۔ خیبر پختون خواہ میں پشاور کے علاوہ مردان ، ڈی آئی خان، مانسہرہ، کوہاٹ، دیر، مالاکنڈ ، بنو اور سوات میں سرکاری جامعات موجود ہیں۔ بلوچستان میں کوئٹہ اور خضدار میں جب کہ آزاد کشمیر میں میرپور اور مظفرآباد میں سرکاری جامعات موجود ہیں۔ اب جب کے ملک ریاض نے اس شہر میں عالمی معیار کی جامعہ قائم کرنا کا اعلان کیا ہے تو ضروری ہے کہ یہ جامعہ ہر اعتبار سے سرکاری جامعہ کے مساوی ہو۔ کیونکہ حیدرآباد شہر میں میڈیکل

یونیورسٹی بھی نہیں ماسوائے ایک پرائیویٹ میڈیکل یونیورسٹی کے اس لیے مجوزہ یونیورسٹی میں ابتدا ہی سے شعبہ میڈیکل یا میڈیکل کالج کی منصوبہ بندی کر لی جائے اور ساتھ ہی اسپتال کی منصوبہ سازی بھی ضروری ہے۔ ملک ریاض از خود اس بات کا اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں کہ ان جامعات میں طلباء سے سرکاری جامعات کی فیس سے بھی کم وصول کی جائے گی۔ یہ اعلان بھی قابل تعریف ہے۔ (۱۷ دسمبر ۲۰۱۴ء

کپتان کے ۱۲۶ دنوں کا احتجاج۔ واپسی دانشمندانہ اقدام

کپتان کا دھرنا اور احتجاجی جلسے پلان 'سی' کے مطابق فیصل آباد اور کراچی کے بعد تختِ لاہور کی بنیادوں کو ہلانے کے بعد ابھی پوری طرح اپنے گھروں کو پہنچا بھی نہ تھا کہ ۱۶ دسمبر کا خونی دن آن پہنچا۔ دہشت گردوں نے آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم اور بے گناہ بچوں کو اپنی دہشت اور بربریت کا نشانہ بناتے ہوئے آگ اور خون میں نہلا دیا۔ عمران خان نے دانشمندی کا عملی ثبوت دیتے ہوئے اپنے ۱۲۶ دن کا دھرنا اور احتجاج کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اختلاف اپنی جگہ دہشت گردی کے خلاف سب کو متحد ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے اتحاد کو وقت کی ضرورت قرار دیا اور حکومت سے تعاون کرنے کا اعلان کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب قومی سطح کے لیڈروں کے فیصلے اس کی حقیقی تصویر پیش کرتے وہی ہوا کہ عمران نے یہ فیصلہ کرکے خود کو غیر ذمہ دار سیاست داں کی بجائے قابل اعتبار قومی رہنما ثابت کیا۔ انہوں نے اپنا سیاسی قد بڑھا لیا، اس فیصلے نے انہیں سیاسی سطح پر قد آور سیاست دان بنا دیا۔ لاہور کے احتجاج کے بعد تحریک انصاف اور حکومتی نمائندوں کے مابین مذاکرات تو شروع ہو چکے تھے لیکن دونوں جانب کے سیاسی لیڈروں کی بیان بازی یہ اشارہ دے رہی تھی کہ معاملہ اس قدر گھمبیر ہو چکا ہے کہ حکومت کسی بھی طور پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں اور کپتان

محاذ پر ڈٹے رہنے پر ہر صورت میں تیار ہے۔ حکومتی وزیروں کے بیانات سے مسئلے کو حل کرنے کے بجائے محاذ آرائی اور ٹکراؤ کے اندیشے ظاہر ہو رہے تھے۔

اچانک ۴۸ گھنٹوں میں نیا پاکستان وجود میں آگیا۔ ۱۵ دسمبر صبح سے شام تک کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ مذاکراتی عمل دنیا دکھاوا ہے۔ لیکن تختِ لاہور میں کپتان کے احتجاج کے دوسرے روز دہشت گردوں نے آرمی پبلک سکول و کالج میں جو خون کی ہولی کھیلی اس کے نتیجے میں کپتان نے دھرنا ختم کرنے اور احتجاج ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ کپتان کی اس حکمت علمی کو ہر محبِ وطن نے سراہا اور اسے ملک و قوم کے عظیم تر مفاد میں تصور کیا۔ یہ واقعہ تھا ہی اس قدر دردناک کے اس کے بعد ملک میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت لازم ہو گئی تھی۔ دہشت گردوں کے اس عمل نے ان لوگوں کو بھی اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا جو دہشت گردوں کے معاملے میں مصلحت کا شکار تھے۔ ملک کی ایک سیاسی اور مذہبی جماعت کے رہنما مولانا فضل الرحمن نے واضح طور پر کہا کہ 'نونہالوں کو خون آلود مستقبل دینے پر ہم شرمندہ ہیں۔ معصوم بچوں کے لہو سے ہولی کھیلنے والے کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ طالبان نے مذاکرات کا راستہ بند کر دیا اس طرز عمل کو جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ قومی یکجہتی سے ہی بچوں کے خون کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ سفاک قاتلوں نے ہمارے بچوں کو

چھین لیا، سانحہ پشاور تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ ہے'۔ مولانا صاحب نے دو ٹوک الفاظ میں دہشت گردی کی مذمت کی۔ ملک کے تمام سیاسی جماعتوں نے بھی اس مکروہ فعل کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ جماعت اسلامی جو طالبان کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے نے اس واقعہ پر انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ البتہ مولونا عبدالعزیز لال مسجد کے سابق خطیب واحد ایسے فرد ہیں جنھوں نے اس دردناک واقعہ پر طالبان کا دفاع کیا۔ عثمان احسان نے اپنے مضمون 'مسجد ضرار سے لال مسجد تک' میں مولانا عزیز کے اس نفرت انگیز بیان پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا' یہ ملا عزیز صاحب جو بڑے ٹیپو سلطان بنے پھرتے ہیں برقع پہن کر فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے اور غازی بن گئے جیسے دوارکا کا قلعہ فتح کرکے لوٹے ہوں۔ ملاجی کی جان تو بچ گئی مگر عزت وآبرو کا جنازہ نکل گیا۔ موصوف مولوی عبدالعزیز سے مولوی برقع بن گئے یہ برقع قبر تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے'۔ مولانا کے اس طرز عمل کو کسی بھی باشعور شخص نے اچھا نہیں سمجھا اور اس کی کھلے الفاظ میں مذمت کی۔

بات نئے پاکستان کی شروع کی تھی کہ ۴۸ گھنٹوں میں پاکستان کی فضاء کیسے تبدیل ہوگئی۔ کہاں تو دو سیاسی قوتیں آمنے سامنے تھیں۔ تیر و نشتر چلائے جارہے تھے۔ حکمراں جماعت اور ان کے اتحادیوں وحمائیتیوں کے نذدیک عمران خان اور تحریک انصاف پاکستان دشمن تھی، عمران خان یہودیوں کے ایجنٹ تھے کہاں

ایک ہی رات میں سب کچھ بدل گیامعروف تجزیہ نگار ہارون رشید کے مطابق 'آرمی پبلک اسکول پشاور میں معصوم بچوں کا قتلِ عام کا واقعہ تو یاایسا المناک اور سنگین ہے کہ پاکستانی قوم کا اندازِ فکر بدل گیا، ترجیحات ہی تبدیل ہو گیں'۔ عمران خان نے اپنا تمام تر احتجاجی پروگرام منسوخ کر دیا۔ حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ ایسا کیا جاتا، عمران نے یہ فیصلہ کرکے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا اور نواز شریف نے عمران کو جو اہمیت اور مقام دیا جس کے وہ مستحق تھے ایک اچھا قدم ہے۔ دوسری جانب وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے عمران خان کے فیصلوں کی تعریف کرتے ہوئے انہیں سیاسی جماعتوں کی میٹنگ میں اہمیت دے کر ثابت کر دیا کہ وہ بھی ملک و قوم کے مفاد کو مقدم رکھتے ہیں۔ کپتان اور تحریک انصاف مخالفت میں بڑے بڑے لکھنے والے بھی نا جانے کہاں سے کہا ں نکل جاتے ہیں اس کی ایک مثال عطاء الحق قاسمی صاحب کی ہے جو پاکستان کے ایک محترم اور سینئر کالم نگار، شاعر و ادیب ہیں۔ بڑے اخبار میں ہفتہ میں کئی کئی کالم تحریری فرماتے ہیں ان کا مقام اپنی جگہ لیکن ان کے کالموں میں نواز شریف سے چاہت اور قربت کا عنصر غالب ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ پکے نوازیے ہیں۔ اس حوالے سے ان سے اختلاف کیا جانا کوئی بری بات نہیں۔ انہوں نے اپنے کالم ' فاشسٹ جماعت بمقابلہ جمہوری جماعت' یہ کالم ۱۵ دسمبر روز نامہ جنگ میں شائع ہوا۔ آپ نے عمران خان کو فاشسٹ اور ان کی جماعت

تحریک انصاف کو ایک غیر سیاسی جماعت قرار دیا اور لکھا کہ 'یہ ان غیر مہذب افراد کا ایک ٹولہ ہے جس کے لیڈر نے جھوٹ، بہتان، گالی، تشدت اور دھونس ایسے گناہوں کو اپنا وتیرہ اور اسے معاشرے میں عام کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ جنہیں صرف دینی طبقے ہی نہیں، سیکولر اور دہریئے طبقے بھی گناہ عظیم میں شمار کرتے ہیں اس جماعت کے بدزبان اور بدلگام لوگوں کی اس روش کے خلاف آواز سے سے پہلے میں نے اٹھائی تھی'۔ جہاں تک لب ولہجہ اور زبان کا تعلق ہے تو نواز شریف کے وزراء پرویز رشید، سعد رفیق، عابد شیر علی اپنی گفتگو میں پھول نہیں اگلے ان کی گفتگو بھی سب نے سنی ہے اور ریکارڈ پر موجود ہے۔ شکر ہے قاسمی صاحب نے عمران کے اس اقدام کی کہ عمران نے نواز شریف کی بلائی گئی ایمرجنسی میٹنگ میں شرکت کو تعریف کی نظر سے دیکھا آپ نے اپنے کالم 'مذہبی شدت پسندی (ا)' شائع شدہ ۱۹ دسمبر میں لکھا 'وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے سانحہ پشاور کے پس منظر میں دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جتنے کم وقت میں تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے اور عمران خان اور جماعت اسلامی سمیت تمام سیاسی قائدین (سبحان اللہ عمران خان سیاسی قائد بن گئے اور تحریک انصاف فاشسٹ جماعت سے سیاسی جماعت بن گئی) نے جس طرح بلا حیل وحجت وزیر اعظم کی آواز پر لبیک کہا، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے'۔ بہت خوب! اب عمران خان سیاسی قائد بھی بن گئے اور ان کی جماعت سیاسی جماعت بھی بن گئی۔

رہا سوال اس بات کا یہ میٹنگ نواز شریف صاحب نے بلائی ، بے شک ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس درد ناک واقعہ پر عوامی ردِ عمل اس قدر شدت اختیار کرگیا اور ہونا بھی چاہیے تھا کہ وزیر اعظم صاحب کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی صحیح یہ اقدام قابل تعریف اور لائق تحسین ہے۔

کپتان نے وقت ، حالات اور موقع کی نذاکت کو دیکھتے ہوئے جو فیصلہ کیا حالانکہ اس فیصلے کی اس کی اپنی پارٹی میں کچھ مخالفت بھی تھی لیکن اس ردِ عمل کے باوجود عمران خان نے اپنے سیاسی لائحہ عمل کو تبدیل کرتے ہوئے حکومت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے اس فیصلے کو عوام کے ہر طبقہ ہائے فکر نے سراہا اور اسے درست قرار دیا۔ تمام تر مخالفت، سیاسی رنجش اور مخالفت اپنی جگہ ملک اور قوم پر کڑا وقت آئے ، قوم مشکل میں ہو تو عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملک و قوم کے مفاد میں کام کیا جائے۔ ایک سمجھدار، قوم کا درد رکھنے والا، ملک کے مفاد میں سوچنے ولا قومی لیڈر وہی ہوتا ہے جو ملک و قوم کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھے۔ اپنے ذاتی، اصولی یا پارٹی کے مفادات کو قومی مفادات پر قربان کردے۔

۱۶ دسمبر کے درد ناک واقعہ نے پاکستان کے عوام کو ہی نہیں بلکہ دنیا کے عوام کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر شخص اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اتحاد و اتفاق سے

ہی دہشت گردی سے نمٹا جاسکتا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے گورنر ہاوس پشاور میں پاکستان کی پارلیمانی سیاسی جماعتوں کی قومی کانفرنس طلب کی ۔ وزیر اعظم کے اس اقدام کو ہر طبقہ فکر نے سراہا۔ سیاسی و مذہبی جماعتیں ایک پیج پر آگئیں۔ عمران خان جو گزشتہ ۱۲۶ دنوں سے انتخابات ۲۰۱۳ کے خلاف بھرپور مہم چلا رہے تھے۔ اسلام آباد میں مستقل دھرنا اور پاکستان کے بڑے شہروں فیصل آباد، کراچی اور لاہور میں اپنی سیاسی قوت اور حکومت پر دباؤ بڑھانے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے تھے۔ ان کے اسی دباؤ کی بدولت حکومت تحریک انصاف سے دوبارہ مذاکرات پر آمادہ ہوئی۔ اچانک پشاور واقعہ نے جہاں دیگر جماعتوں کو اتحاد و اتفاق پر مجبور کیا وہاں عمران خان نے بھی اپنا تمام تر احتجاج کو ملتوی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس مشکل گھڑی میں حکومت کا ساتھ دینے کی ضرورت ہے۔ سیاسی قیادت نے شدت پسندی اور انتہا پسندی کے خلاف کاروائی کو اپنی جنگ قرار دیتے ہوئے شدت پسندوں اور دہشت گردوں کے خلاف افواج پاکستان کے ساتھ برابر کا ساتھ دینے کا عزم کیا۔ دیگر جماعتوں کے ساتھ ساتھ تحریک انصاف بھی اگلی صف میں کھڑی نظر آئی۔ یہی عمران خان کی سیاسی بصیرت قومی رہنما ہونے کی دلیل ہے۔ کپتان کے اس فیصلے کو میاں نواز شریف اور ملک کے باشعور عوام نے سراہا اور اسے ایک دانشمندانہ فیصلہ قرار دیا۔ (۲۳ دسمبر ۲۰۱۴ء)

طاہرہ قاضی شہید۔ بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال

۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء ملک کی تاریخ کا سیاہ ترین دن۔ دل کو ہلا دینے، خون کو گرما دینے، دماغ کو ماعوف کر دینے والا سانحہ پیش آیا۔ آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم بچوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہلا دیا۔ ۱۳۲ معصوم بچے اور دیگر ۹ افراد شہید کر دیئے گئے۔ اسکول کی پرنسپل طاہرہ قاضی نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کی۔ کہا جاتا ہے کہ فوجی کمانڈوز آپریشن کے دوران انہیں دہشتگردوں کے شکنجے سے بہ حفاظت باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن وہ یہ کہہ کر دوبارہ اسکول میں واپس چلی گئیں کہ میں اپنے اسکول کے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ جس کے نتیجے میں درندہ صفت دہشتگردوں نے بے رحمی، صفاکی، بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں زندہ جلا دیا۔ طاہرہ قاضی نے جرأت اور قربانی کی جو تاریخ رقم کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ رات گئے تک ان کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں آیا زندہ ہیں یا انہیں بھی دہشتگردوں نے شہید کر دیا ہے۔ کافی تلاش کے بعد جب اسکول میں پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھا گیا تو ان میں ایک لاش طاہرہ قاضی کی بھی تھی جن کی شناخت بھی نہیں ہو پا رہی تھی کیونکہ جلنے سے ان کی لاش مسخ ہو چکی تھی۔ ان کے لواحقین نے ان کے زیوارات

سے انہیں پہچانا۔ طاہرہ قاضی نے شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر پوری قوم کو یہ سبق دیا کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی بھی مشکل آئے ہمیشہ اپنے فرض کو مقدم رکھا جائے، ظلم و جبر کے سامنے فرار ہونے سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے ڈٹ جایا جائے حتیٰ کہ اپنی جان چلی جانے کا اندیشہ ہو تو اس کی بھی پروانہ کی جائے۔

دہشتگردوں کی سفاکی، بربریت اور درندگی کا اندزہ اس بات سے لگ یاجاسکتاہے کہ اسکول کے ایک طالب علم جو قسمت سے زندہ بچ گیا کا کہنا تھا کہ ان کی پرنسپل کو ان کے سامنے آگ لگائی گئی۔ دہشتگرد بچوں سے ان کے نام پوچھتے اور ان کے والد کے پیشے کے بارے میں سوال کرتے۔ جن کا تعلق پاک افواج سے ہوتا انہیں اسی وقت بے رحمی سے ختم کردیا جاتا۔ طاہرہ قاضی کے بارے میں یقیناان کے پاس معلومات ہوں گی کہ ان کے شور کرنل (ریٹائر) قاضی ظفراللہ ہیں۔اسی وجہ سے انہوں نے طاہرہ قاضی کے ساتھ انتہائی بربریت کا سلوک کرتے ہوئے طالب علموں کے سامنے انہیں جلا کر شہید کردیا۔ دہشتگروں کا یہ عمل انہیں جنت میں لے جائے گا۔ کس قدر گمراہ ہیں اور لاعلم ہیں ان کے سربراہ اور یہ دہشتگرد خود۔ یہ عمل کرنے والے مسلمان توکیا انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں۔

طاہرہ قاضی گزشتہ ۱۵سال سے آرمی پبلک اسکول و کالج میں درس وتدریس سے

وابستہ تھیں۔اس اسکو کی پرنسپل مقرر ہونے سے قبل وہ اسی اسکول کی جونیئر ٹوڈ.برانچ کی پرنسپل بھی رہ چکی تھیں۔ان کا تعلق لنڈی ارباب سے تھا۔لنڈی ارباب پشاور سے بہت نذدیک صرف ۱۵ منٹ کی مسافت پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔طاہرہ قاضی اور ان کے شوہر کرنل (ریٹائر) قاضی ظفر اللہ کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں میں زیادہ تر احمد زئی، قاضی، ارباب، فتح خان خیل اور گورگشت آباد ہیں۔اس گاؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس گاؤں سے پشاور شہر کے علاوہ پشاور کے اہم جگھوں جن میں ائر پورٹ، رنگ روڈ شامل ہے کو راستہ جاتا ہے۔زراعت اور چھوٹی صنعتوں سے وابستگی اس گاؤں کے لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔گاؤں لنڈی ارباب چپلی کباب کے لیے بھی مشہور ہے۔طاہرہ قاضی کو ۱۵دسمبر ۲۰۱۲ء کو'پرنسپل آف دی ائر' کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ طاہرہ قاضی ایک اچھی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی منتظم بھی تھیں۔

فرض شناسی کی حسین مثال طاہرہ قاضی نے پیش کرکے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اگر موت کے سائے واضع طور پر نظر آرہے ہوں ظلم و.بر.بریت کے سامنے ڈٹ جایا جائے، اپنے فرائض سے غفلت نہ.برتی جائے۔طاہر قاضی کو بہ حفاظت درندوں کے شکنجے سے نکال لیا گیا تھا وہ فوجی کمانڈوز کے کہنے پر باہر تو چلیں آئیں لیکن ان کے ضمیر نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ اپنے معصوم بچوں، اساتذہ اور

اسکول کے دیگر عملے کو دہشتگردوں کے رحم و کرم پر رہنے دیں۔ وہ یہ دیکھ آئیں تھیں کہ دہشتگرد سفاکی کے ساتھ انہیں شہید کر رہے ہیں انہوں نے واپس اسکول کے اندر جانے کا فیصلہ کیا حالانکہ انہیں احساس ہوگا کہ ان کے اس عمل سے ان کی اپنی جان بھی جا سکتی ہے۔ پھر بھی وہ واپس چلی گئیں۔ اپنے بیٹے احمد قاضی سے ٹیلی فون پر آخری گفتگو کرتے ہوئے کہ 'فون بند کرو میں نے بچوں کے والدین کو اطلاع کرنی ہے' ۔ سر پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے اور طاہرہ قاضی اپنے فرائض کی انجام دہی میں فکر مند تھیں۔ ان کے بیٹے نے درست کہا کہ انہیں اپنی ماں کی اس قربانی پر فخر ہے۔ احمد قاضی نے یہ بھی کہا کہ ان کی ماں کو جلایا نہیں گیا۔ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو اور بیٹے نے اپنی ماں کا آخری دیدار کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہو۔ طاہر قاضی کی اس بے مثال قربانی پر پوری قوم کو ان پر فخر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے فرض شناسی اور قربانی کی لازوال مثال پیش کرکے پوری اساتذہ.برادری کا ہی نہیں بلکہ پوری قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ طاہرہ قاضی کی جرٔت اور بہادری پر پوری قوم کا انہیں سلام۔

سانحۂ آرمی پبلک اسکول پشاور۔ معصوم شہیدوں تمہیں سلام

پاکستان گزشتہ کئی سالوں سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اب تک ۵۵ ہزار لوگ دہشت گردی کا نشانہ بن چکے ہیں اور ایک کھرب ڈالر سے زیادہ کا مالی نقصان ہوچکا ہے۔ دہشت گردی کی لپیٹ میں پاکستان ہی نہیں دنیا کے بے شمار ممالک حتیٰ کے امریکہ جیسا بڑا ملک بھی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ کچھ ممالک دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے کرتے اپنی معیشت کو تباہ و برباد کر چکے ہیں ۔ کئی ممالک تو پچیس تیس سال تک اس عذاب میں مبتلہ رہے ۔ دہشت گردی تو پاکستان کے قیام کے فوری بعد ہی شروع ہوچکی تھی ۔ پاکستان کا پڑوسی ملک جس سے ہم کئی جنگیں بھی لڑچکے ہیں نے پاکستان کو دل سے قبول ہی نہیں کیا۔ چنانچہ روزِ اول سے ہی پاکستان کے خلاف قسم قسم کے حربے اور ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے اس کا یہ عمل اب بھی جاری ہے ان کا مقابلہ پاکستانی عوام ، پاکستانی حکومتیں اور پاکستان کی مسلح افواج بہادری سے کرتی رہیں ہیں اور کررہی ہیں ۔ پشاور سانحہ کے پیچھے بھی ہمارے اس پڑوسی کی کارستانی ہوسکتی ہیں جس کی جانب ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے پروگرام ’ صبح پاکستان ‘ میں اشارہ بھی کیا اور اس کے جواب میں بھارتی وکرم سود بھڑک گیا اور نہ جانے کیا کیا اپنے مضمون میں عامر لیاقت کے بارے میں لکھ ڈالا۔ خیر اس کا جواب تو عامر لیاقت

نے اپنے پروگرام میں تسلی بخش اور بہت خوب دے ڈالا، کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ موجودہ دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز نائن الیون کے بعد شروع ہوا۔امریکہ میں رونما ہونے والا ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ دہشت گردی کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔جسے 9/11 کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دہشت گردی کے اس واقعہ میں القاعدہ کے 19 دہشت گردوں نے ائر لائن کے چار ہوائی جہاز اغوا کرنے کے بعد دو بوئنگ 767 جن میں ۲۰،۰۰۰ ہزار گیلن پیٹرول (جیٹ فیول) موجود تھا منگل ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صبح 8.45 پر نیو آرک کے 'ولڈ ٹریڈ سینٹر' سے ٹکرادیا، ایک بوئنگ واشنگٹن کے باہر پینٹاگان میں جب کے تیسرا بوئنگ پینسلوینیا کے میدان میں کریش کردیا گیا۔اس خود کش حملے میں ۳ہزار افراد جن میں ۴۰۰ پولیس آفیسرز اور فائر فائیٹر بھی شامل تھے لقمہ اجل بن گئے۔ دنیا کی تاریخ کا الم ناک واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دہشت گردی کے بعد امریکہ نے افغانستان میں اپنی فوجیں منتقل کردی اور وہاں پر موجود القاعدہ اور دیگر دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کا عمل جاری رہا۔ افغانستان سے یہ دہشت گردی پاکستان منتقل ہوگئی جس کا مقابلہ پاکستانی قوم آج تک کررہی ہے۔

نائن الیون کے بعد پاکستان میں دہشتگردی کے بے شمار واقعات رونما ہوچکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۴ء کے درمیان ۵۵۸۷۸ پاکستانی دہشت گردی کا نشانہ بنے، ۲۰۰۲ء سے ۲۰۱۴ء کے درمیان پاکستان میں کل ۴۱۰ خود کش

حملے ہوئے ۔ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۴ء کے درمیان مجموعی طور پر ۵۰۹۵ بم دھماکے ہوئے۔ وزارت داخلہ کا کہنا ہے کہ پچھلے چار سالوں کے درمیان ملک بھر میں ۶۱۰۴ خود کش حملے اور دھماکے ہوئے ۔ مختلف بم دھماکوں اور خود کش حملوں میں جام شہادت نوش کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے۔بے نظیر بھٹو پر ہونے والا حملہ ، کوئٹہ میں بلیرڈ ہال دھماکہ، پشاور مارکیٹ بم حملہ ،یمس اور سکرزئی میں اینٹی طالبان قبائلی بمباری،کاکا غذ بمباری، ۸ جون شیعہ زائرین کی بس ایران سے کوئٹہ آتے ہوئے بس پر حملہ ہوا، اسی روز کراچی ائر پورٹ پر دہشت گردوں کے ہاتھوں ۳۰ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتا نا، ۲ نومبر واگہہ بارڈر پر خود کش حملہ، لیکن ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح رونما ہونے والا دہشت گردی کا واقعہ اپنی نوعیت کا شاید پہلا واقعہ تھا جس میں دہشت گردوں نے معصوم بچوں ، اسکول کے پرنسپل، اساتذہ اور دیگر لوگوں کو نشانہ بنایا۔سات دہشت گرد بھی افواج پاکستان کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ دن ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا ۔دل کو ہلا دینے ، خون کو گرمادینے ، دماغ کو ماعوف کردینے والا دن۔آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم پھولوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہلا دیا۔۱۳۲ معصوم بچے اور دیگر ۹ افراد شہید کر دیئے گئے۔دل دہلادینے والا شوکت رضا شوکتؔ کا شعر ۔

پھول دیکھے تھے جنازوں پر ہمیشہ شوکتؔ
کل میری آنکھوں نے پھولوں کے جنازے دیکھے

جب سے پاکستان میں دہشت گردی شروع ہوئی ہے ہر شہر اس کی لپیٹ میں رہا لیکن پشاور کو دہشت گردوں کا مرکز کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس دوران پشاور شہر نے دہشت گرد کے بے شمار واقعات دیکھے اپنی بہادر فوج کے عظیم اور بہادر فوجیوں کے جنازے اٹھائے، بے گناہ مردوں، خواتین اور بچوں کو اپنے ہاتھوں دفن کیا۔ لیکن ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء نے پورے ملک کے عوام کو خون کے آنسو رلادیا۔ اس نے تمام واقعات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا، ہر ایک خواہ وہ پاکستان میں ہو یا پاکستان سے باہر، مسلمان ہو یا غیر مسلم ہر ایک پر لرزہ طاری ہوگیا، بچوں کے بہیمانہ قتل سے درد کی ایسی ٹیس اٹھی ہے کہ اس نے ہر ایک کو بے چین کرکے رکھ دیا ہے۔ پشاور شہر تو حادثات کا گڑھ بنا گیا ہے یہاں کے عوام حادثات کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہیں۔ خیبر پختون خواہ کے عوام حوصلہ مند ہیں، بہادر ہیں، حالات کا مقابلہ کرنے کی جرت رکھتے ہیں۔ دہشت گرد تھک جائیں گے لیکن پاکستان خصوصاً خیبر پختون خواہ کے عظیم حوصلہ مند لوگ ہمت ہارنے والے نہیں۔ دہشتگردوں کی سفاکی،.بر.بریت اور درندگی کا اندزہ اس بات سے لگ یا جاسکتا ہے کہ اسکول کے ایک طاالب علم جو قسمت سے زندہ بچ گیا کا کہنا تھا کہ ان کی پرنسپل کو ان کے سامنے آگ لگائی گئی۔ دہشتگرد بچوں سے ان کے نام پوچھتے اور ان کے والد کے پیشے کے بارے میں سوال کرتے۔ جن کا تعلق پاک افواج سے ہوتا انہیں اسی وقت بے رحمی سے خون میں

نہلا دیا جاتا، طاہرہ قاضی کے بارے میں یقیناً ان کے پاس معلومات ہوں گی کہ ان کے شوہر کرنل (ریٹائر) قاضی ظفر اللہ ہیں ۔اسی وجہ سے انہوں نے طاہرہ قاضی کے ساتھ انتہائی بربریت کا سلوک کرتے ہوئے طالب علموں کے سامنے انہیں جلا کر شہید کر دیا۔ دہشتگروں کا یہ عمل انہیں جنت میں لے جائے گا؟۔ کس قدر گمراہ ہیں اور لا علم ہیں ان کے سربراہ اور یہ دہشتگرد خود۔ یہ عمل کرنے والے مسلمان تو کیا یہ درندے تو انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں۔

توں تم سید بھی ہو، مرزا بھی ہو افغاں بھی ہو

تم سب کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟؟؟

اسکول کی پرنسپل طاہرہ قاضی نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کی۔ کہا جاتا ہے کہ فوجی کمانڈوز آپریشن کے دوران انہیں دہشتگردوں کے شکنجے سے بہ حفاظت باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن وہ یہ کہہ کر دوبارہ اسکول میں واپس چلی گئیں کہ میں اپنے اسکول کے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ جس کے نتیجے میں درندہ صفت دہشتگردوں نے بے رحمی ، سفاکی، بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کی نیند سلا دیا۔ طاہرہ قاضی نے جرَت اور قربانی کی جو تاریخ رقم کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

طاہرہ قاضی نے شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر پوری قوم کو یہ سبق دیا کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی بھی مشکل آئے ہمیشہ اپنے فرض کو مقدم رکھا جائے، ظلم و جبر کے سامنے فرار ہونے سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے ڈٹ جایا جائے حتیٰ کہ اپنی جان چلی جانے کا اندیشہ ہو تو اس کی بھی پروانہ کی جائے۔ ان کے بیٹے نے درست کہا کہ انہیں اپنی ماں کی اس قربانی پر فخر ہے۔ طاہر قاضی کی اس بے مثال قربانی پر پوری قوم کو ان پر فخر ہے۔ حقیقیت یہ ہے کہ انھوں نے فرض شناسی اور قربانی کی لازوال مثال پیش کر کے پوری اساتذہ برادری کا ہی نہیں بلکہ پوری قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ طاہرہ قاضی کی جرَات اور بہادری پر پوری قوم کا انہیں سلام۔ اسکول کی ایک اور بہادر استاد افشاں احمد نے بھی بہادری کی لازوال داستان رقم کی۔ اسکول کے ایک طالب علم عرفان اللہ نے ایک گفتگو میں بتایا کہ اس کی ٹیچر افشاں احمد چھلانگ لگا کر بچوں اور دہشت گردوں کے درمیان آ گئیں اور انہیں للکار کر کہا کہ 'تم میرے مردہ جسم پر میرے بچوں کو مار سکتے ہو۔ میں اپنے بچوں کو فرش پر خون میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی'۔ دہشت گردوں نے انہیں زندہ جلا ڈالا لیکن وہ پھر بھی بچوں کو بھاگنے کا کہتی رہیں۔ سلام ہو ایسی بہادر ماؤں اور بیٹیوں پر۔

ظلم کرنے والوں کی ڈھٹائی، بے رحمی، بے غیرتی تو دیکھیں کہ اپنے بے رحمانہ

عمل پر ان کے ہاتھ کا کانپنا تو دور کی بات ، دل نہیں دھلا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کر گزرنے کے احکامات و ہدایت کے منتظر دہشت گردوں نے اسکول کے آڈیٹوریم میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو خون میں نہلانے کی کاراوئی کے بعد موبائل پر بات کرتے ہوئے اپنے آقاؤں سے کہا اور پوچھا کہ ' آڈیٹوریم میں تمام بچوں کو مار دیا ہے اب کیا کریں؟ یہ وہ الفاظ تھے جو دہشت گرد نے کسی سے کہے۔ اس کے جواب میں اسے کہا گیا کہ ' فوج کا انتظار کرو' خود کو بم سے اڑانے سے پہلے انہیں اڑادو'۔ دہشت گرد اور ان کے رہنما اس قدر سنگ دل اور سفاک ہو چکے ہیں کہ انہیں ان کے سامنے ان کے حقیقی والدین، بچے، بیوی بھی ہو تو وہ انہیں بھی اسی بے دردی سے قتل کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے کیونکہ انہیں تو یہ باور کرایا جا چکا ہے کہ ان کے عمل کے عوض انہیں جنت ملنے والی ہے۔ کاش انہیں کوئی یہ باور کرا سکے کہ انہیں جنت نہیں بلکہ انہیں تو دوزخ بھی قبول نہیں کرے گی۔ پروردگار نے اگر دوزخ سے بھی بدتر کوئی ٹھکانہ بنایا ہوگا تو یہ دہشت گرد اس کا ایندھن ہوں گے۔

طالبان نے بچوں کو قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کی بلکہ اپنے عمل کے حق میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک حدیث بھی بیان کی دہشت گردوں کا یہ بیان سوشل میڈیا فیس بک) پر ایک پیغام کے ذریعہ دیا گیا۔ ترجمان طالبان محمد خراسانی نے کہا کہ) مجاہدین (دہشت گردوں) کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ صرف بڑے

بچوں کا قتال کریں۔ پشاور کی کاروائی سنت نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی بنو قریظہ کے قتال کے وقت یہی شرط مبارک عائد کی تھی کہ صرف ان بچوں کو قتل کیا جائے جن کے زیر ناف بال دکھائی دینا شروع ہوگئے ہیں، بچو اور عورتوں کا قتل عین رسولِ پاک ﷺ کی تعلیم کے مطابق ہے، اعتراض کرنے والے صحیح بخاری جلد پانچ (۵) حدیث ایک سو اڑتالیس (۱۴۸) کا مطالعہ کریں'۔ اُف میرے خدا، اپنے غلط اور مکروہ فعل کا بے باکی اور غلط بیانی کے ساتھ دفعہ کرنا، اللہ نے ان کے دلوں کو سیاہ کردیا ہے۔ سچائی کیا ہے۔ کسی طور بھی یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے نبی ﷺ نے ایسا کرنے کا حکیم دیا ہوگا۔ ہمیں اس سلسلے میں تحقیق کرنے یا علماء اکرم سے رجوع کرنے کی بھی ضرورت نہیں اس بات کو ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث کے سیاق و سباق کو بدل کر غلط طور پر حدیث بیان کی گئی ہے۔ ویسے ہمارے علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ اس کی صحیح تصویر پیش کریں۔ غزوہ خندق میں بنو قریظہ کو معاہدے کی خلاف ورزی کی سزا دینے کا واقعہ ہے۔ جس میں بچوں اور عورتوں کو مارنے کے بجائے قیدی بنانے کا حکم ہے۔کالم نگار اور شاعر جناب عطاء الحق قاسمی صاحب نے اپنے ایک کالم 'دہشت گردی براستہ مذہبی شدت پسندی' میں اپنے بیٹے علی عثمان قاسمی جنھوں نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی سے ڈاکٹریٹ اور لندن یونیورسٹی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ہے کہ حوالے سے طالبان کی اس حدیث کا جواب دیا ہے' ڈاکٹر علی عثمان کے مطابق 'یہ حدیث غلط کوٹ کی گئی ہے۔ اصل

واقعہ یہ ہے کہ غزوہ خندق میں یہودیوں کے قبیلہ بنو قریظہ کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ تھا کہ وہ کسی جنگ میں مشرکین کا ساتھ نہیں دیں گے لیکن جب غزوہ خندق کے دوران ایک بھگدڑ سی مچی تو بنو قریظہ نے یہ سمجھ کر کہ مسلمان شکست کھا رہے ہیں، ان پر عقب سے حملہ کر دیا۔ جب غزوہ اپنے اختتام کو پہنچا تو بنو قریظہ کو معاہدے کی خلاف ورزی کی سزا دینے کے لیے ان کے قبیلے کا محاصرہ کیا گیا جو ۲۵ دن جاری رہا، بالآخر بنو قریظہ نے خود کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا اور معاہدے کی خلاف ورزی پر سزا کے لیے اوس قبیلے کے سردار سعد بن معاذ کو ثالث مقرر کیا اور کہا کہ اس کا ہر فیصلہ ان کے لیے قابل قبول ہوگا۔ سعد بن معاذ نے یہودیوں کی مقدس کتاب تورات کے مطابق اپنا فیصلہ سنایا اور وہ یہ تھا کہ بنو قریظہ کے سارے مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے یہ اصل واقعہ تھا مگر اس میں تحریف کر کے پشاور کے سانحہ عظیم کا جواز پیش کیا گیا'۔

سانحہ پشاور کے بعد حکومت کے ساتھ ساتھ مخالفینِ حکومت نے جس لائحہ عمل ،اتفاق و اتحاد کا عملی مظاہرہ کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت تھی۔ معصوم بچوں کے بہیمانہ قتل اور شقاوتِ قلبی کی خون آلود واردات نے پاکستان کی قومی قیادت کو سر جوڑ کر بیٹھنے ، سیاسی اختلافات ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ سیاسی و عسکری قوت نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ملک قوم کو اس

سانحہ سے نکالنے اور ملک سے دہشت گردی کی جڑیں اکھاڑ نے کا عزم کیا۔ عمران خان نے اپنے ۱۲۶ دن کے دھرنے کو سانحہ آرمی پبلک اسکول کے پیش نظر رول بیک کیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر دہشت گردی کے خلاف حکومت کے ساتھ چلنے اور افواج پاکستان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے پر اتفاق کیا۔ حکومت، مخالفین سیاست اور افواج پاکستان ایک پیج پر آ گئے۔ حکومتی ذمہ داران اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے ۲۴ دسمبر کو ہونے والے اجلاس کا دورانیہ ۱۱ گھنٹے تھا۔ اس طویل اجلاس کے بعد قوم کے نمائندوں نے دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی تیاری کی اور ۲۰ نکاتی ایکشن پلان تیار کیا۔ ایکشن پلان کے مطابق دہشت گردی میں ملوث سزا یافتہ مجرموں کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے گا، فوجی افسران کی سربراہی میں اسپیشل ٹرائل کورٹ کا قیام، خصوصی عدالتوں کی مدت دو سال ہوگی، انسداد دہشت گردی کے ادارے نیکٹا کو مضبوط اور فعال بنایا جائے گا۔ نفرتیں ابھارنے ، گردنیں کاٹنے ، انتہا پسندی اور فرقہ واریت اور عدم برداشت کو فروغ دینے والے لٹریچر اخبارات اور رسائل کے خلاف موثر اور بھرپور کاروائی کا فیصلہ، دہشت گردوں کی مالی اعانت کے تمام وسائل کو مکمل طور پر ختم کرنا، کالعدم تنظیموں کو کسی دوسرے نام سے کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اسپشل اینٹی ٹیررازم فورس کا قیام، مذہبی انتہا پسندی کو روکنے اور اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنانا، دینی مدارس کی رجسٹریشن اور ضابطہ بندی

کا اہتمام، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر دہشت گردوں اور ان کے نظریات کی تشہیر پر مکمل پابندی، بے گھر افراد کی فوری واپسی، فاٹا میں انتظامی اور ترقیاتی اصلات کے عمل کو تیز کرنا، دہست گردوں کے مواصلاتی نیٹ ورک کا مکمل خاتمہ، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر دہشت گردی کے فروغ کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنا، کراچی میں جاری آپریشن کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانا، وسیع تر سیاسی مفاہمت کے لیے تمام فریقین کی طرف سے حکومت بلوچستان کو مکمل اختیارات دینے کا فیصلہ، فرقہ واریت پھیلانے والے عناسر کے لیے فیصلہ کن کاروائی، افغان مہاجرین کی رجسٹریشن جیسے اقدامات قومی ایکشن پلان کا حصہ ہیں۔فیض احمد فیض کی غزل کے اشعار ۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارض وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں گے

دہشت گردی کا نشانہ تو بے شمار پاکستان بن چکے ہیں لیکن آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ملک کے عوام میں دہشتگردی سے نمٹنے کا شعور بیدار کر دیا ہے، ملک کی سیاسی قوت کو باہمی اختلافات کو بھلا کر باہم مل کر دہشت گردی جیسے ناسور کو پاکستان سے نکال باہر کرنے کا حوصلہ

عطا کیا ہے۔ فوجی قوت جو دہشت گردی سے پہلے ہی نبرد آزما تھی اس میں نیا جوش و ولولہ پیدا ہوا ہے۔اب امید ہو چلی ہے کہ ملک کی سیاسی قوت اسی طرح متحد اور متفق رہی تو پاکستان کے بے شمار مسائل خاص طور پر دہشت گردی کی لعنت سے پاکستانی قوم چھٹکارا پالے گی۔آرمی پبلک اسکول کے معصوم اور بے گناہ بچو اب تم اس دنیا میں نہیں رہے۔ تم تو شہادت کا مرتبہ پا چکے ہواور شہیدوں کے لیے جنت کی نوید ہے۔ تمہیں جنت مبارک ہو ،جنت کے پھولو تمہیں سلام۔ (۲۷ دسمبر ۲۰۱۴ء)

بھارتی 'وکرم سود' کی ہرزہ سرائی اور ڈاکٹر عامر لیاقت حسین

بھارتی سیاست دانوں، حکمرانوں، صحافیوں اور لکھاریوں کی جانب سے پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہر دور میں پاکستان کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں۔ کیونکہ بھارتیوں نے پاکستان کو بہ حیثیت ایک ملک و قوم کبھی تسلیم ہی نہیں کیا اس وجہ سے انہیں پاکستان کسی بھی اعتبار سے برداشت نہیں۔ بھارت کے ہندو کینہ پروروں کے خون میں پاکستان کے لیے نفرت رچ بس گئی ہے۔ ہندو بھارتی بچوں کو بچپن ہی سے پاکستان سے نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے۔انہیں جب بھی موقع ملتا ہے پاکستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کردیتے ہیں۔پاکستان کی مخالفت کا کوئی موقع یہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بھارت ایک منصوبہ بندی کے تحت پاکستان کو کمزور کرنے، اس کی سرزمین پر ہلچل مچانے، دہشت گردی کو ہوا دینے حتیٰ کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے اور کررہا ہے۔ اس کے واضح اور بے شمار ثبوت ہر دور میں ملتے رہے ہیں۔ کیا مشرقی پاکستان بھارتی تخریب کاری اور دخل اندازی کے بغیر پاکستان سے جدا ہوسکتا تھا؟ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں اہم اور مکروہ کردار ادا کیا۔ اب یہ مکروہ فعل بلوچستان میں دوہرانا چاہتا ہے۔ بھارتی خفیہ ادارے افغانستان سے اپنے قونصل خانے کے ذریعہ دہشت گردوں کی

کر رہے ہیں۔ بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کا کام ہی یہ ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف عملی طور پر کام کرتی رہے۔

16 دسمبر ۲۰۱۴ء کو ہونے والے آرمی پبلک اسکول پشاور کے واقع میں بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کے ملوث ہونے کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں کرسکتا جو کچھ آرمی پبلک اسکول پشاور میں دہشت گردوں نے کیا۔ مسلمان تو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے، اسلامی تعلیمات تو دشمن کو بھی معاف کرنے کا درس دیتی ہیں، اسلام تو امن و سلامتی کا مذہب ہے چہ جائے کہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بے دردی، بے رحمی اور سفاکی سے خون میں نہلادیا جائے۔ ایسا کام کرنے والے ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتے، یقیناً ان دہشت گردوں کے ذہنوں کو مخصوص انداز سے گمراہ کیا گیا ہے۔ انہیں برسوں دنیا سے الگ تھلگ رکھ کر صرف یہی بتایا گیا کہ پاکستانیوں کو خواہ ان میں مرد ہوں، عورتیں ہوں یا بچے ہی کیوں نہ ہوں قتل کرنے سے وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں کرسکتا اُسے جنت اور دوزخ کے بارے میں اچھی طرح علم ہے۔ اس طرح کے مکروہ اور شیطانی عمل سے جنت کا کیا تعلق۔

ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اپنے پروگرام ’ صبح پاکستان ‘میں کون سی ایسی بری بات یاخلاف بھارت بات کہہ دی۔ انہوں نے تو بھارت کو اس کا اصلی چہرہ ہی تو دکھایا ہے۔ یہ کام تو ہم شروع ہی سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے بچے بچے کو یہ علم ہے کہ بھارت ہمارا دشمن نمبر ایک ہے۔ پاکستان میں ہونے والے دہشت گردی، تخریب کاری، علیحدگی پسندی کی کوئی بھی واردات ہو اس میں بھارت کی خفیہ ایجنسی ملوث ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے سانحۂ آرمی پبلک اسکول میں بھارتی خفیہ ایجنسی کے کردار پر شبہ کا اظہار کرکے کوئی غلط بات نہیں کی۔ ایسے شواہد موجود ہیں، بھارت کی ٦٧ سالہ پاکستان دشمنی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس واقعہ میں بیرونی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کی اس جائز تشکیک پر بھارتی خفیہ ایجنسی ’را‘ کے سابق سربراہ ’وکرم سود‘ (Vikram Sood) تو ایسے بھڑک گئے کہ چراغ پا ہوکر نا معلوم کیا کیا بک گئے۔ عامر لیاقت حسین کو جی ایچ کیو کا غنڈہ اور زر خرید ایجنٹ قرار دینے کے علاوہ اس نے پاک فوج کے خلاف ہرزہ سرائی بھی کی۔ غالبؔ نے شاید ان جیسوں کے لیے ہی یہ شعر کہا تھا ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!

کچھ نہ سمجھے ’ خدا کرے ‘ کوئی

یہ کوئی نئی اور اچنبے کی بات نہیں بھارتی سیاست داں ہوں، لکھاری ہوں،

صحافی ہوں یا فوجی پاکستان کو اپنا دشمن ہی نہیں سمجھتے بلکہ کوئی دقیقہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اگر انہیں کبھی موقع مل جائے پاکستان کے خلاف بات کرنے کا۔ پاکستان کا نام آتے ہی ان کا چہرہ بندر کی بچھاڑی کی مانند سرخ ہو جاتا ہے اور منہ سے جھاگ کے ساتھ انگارے اگلنے لگتے ہیں۔ وکرم سود! تمہیں اگر ہم صرف 'سود' کہیں تو پتہ ہے مسلمانوں میں سود کی کیا حیثیت ہے۔ تم ہمارے لیے سود ہی ہو۔ تمہاری تمام تر باتیں جو تم نے پاکستان، پاکستانی فوج اور اے ایس آئی کے خلاف بھارتی اخبار 'مڈوے' میں لکھی ہیں۔ فضولیات سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں۔ ویسے ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اگلے ہی دن 'صبح پاکستان' پروگرام میں حساب برابر کر دیا تھا۔ بہت خوب ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، مزاح آگیا۔ وکرم سود! اگر تم نے وہ پروگرام دیکھا ہو تو بہت اچھا ہوا اگر نہیں تو اُسے ضرور دیکھنا، پڑھنے میں تمہیں وہ لطف نہیں آئے گا جو مزاح عامر لیاقت کی باتوں میں تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے میں آئے گا۔ لیکن بھارتیوں میں اتنا حوصلہ ہے کہاں۔ سنو مسٹر 'سود' عامر لیاقت نے تمہاری ہرزہ سرائی کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'سانحہ پشاور میں بھارت کو ملوث کرنے پر بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کا سابق سربراہ میرے خلاف انگاروں پر لوٹ رہا ہے اور مجھے GHQ کا غنڈہ اور زر خرید ایجنٹ قرار دے رہا ہے، میں اُسے ببانگ دہل یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستانی اپنی فوج کے لیے بکتے نہیں بلکہ اُن پر مرتے ہیں، ہمیں کوئی نہیں خرید سکتا

کونکہ ہم نے تو اپنے آپ کو پیدا ہوتے ہی اپنے آقا مصطفیٰ ﷺ کی غلامی میں بن داموں بیچ دیا تھا اور اس غلامی نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ وطن کا دفاع کرنے والوں کے دفاع میں صرف ہم عاشقوں کو نکلنا ہے۔ سنو وکرم سود جی ایچ کیو والے غنڈے نہیں شاہین پالتے ہیں۔ بھارتی خفیہ ایجنسی کا معیار اس قدر مخدوش ہے کہ ایک ایسے شخص کو اپنا سربراہ بنایا جسے یہ ہی خبر نہیں کہ ماں کی محبت اور اس کی حرمت کی حفاظت کے لیے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنے والے بچوں کو ان کی ماں چپیے نہیں دیتی۔ میں آج بھی اپنے اس بیان پر قائم ہوں کہ سانحہ پشاور کا ماسٹر مائنڈ بھارت ہے۔ میرے پاس اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ پاک فوج پر انتہا پسندی کا الزام لگانے والے خود شیو سینا، وشوا ہندو پریشد، راشٹر یہ سیوک سنگھ، ہندو مہا سبھا اور بجرنگ دل جیسی انتہا پسند تنظیموں کی سرپرستی کرتے ہیں جو بھارت میں مقیم مسلمانوں کو جبراً ہندو بنا رہے ہیں جس سے تمہارا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے کھل کر واضح ہو رہا ہے'۔ ابھی تو میں نے بہت سی باتوں کو تحریر ہی نہیں کیا۔ اچھا نہیں لگ رہا وہ تمام باتیں لکھتے ہوئے۔

وکرم سود! عامر لیاقت نے کیا غلط کہا یہی نا کہ 'پشاور سانحہ کا ماسٹر مائنڈ بھارت' ہے۔ تم تو 'را' کے سربراہ رہ چکے ہو تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کو ہوا دینے کے لیے 'را' کیا کچھ نہیں کرتی۔

بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو تم آدھے بھارتی سمجھتے ہو، مسلمانوں پر تعلیمی اداروں اور سرکاری محکموں میں ملازمت کے لیے کوٹہ سسٹم کی پابندی بھی موجود ہے۔ بھارت میں بھوک وافلاس کے مارے مسلمانوں کو ہندو مذہب میں شامل کرنے کے بارے میں منیر احمد بلوچ نے اپنے مضمون 'پرکھوں کی گھر واپسی' (شائع شدہ روزنامہ 'دنیا' ۲۷ دسمبر ۲۰۱۴ء) میں لکھا ہے کہ 'دسمبر ۲۰۱۴ء کے اوائل میں بھارت کی حکمران جماعت بی جے پی کی اتحادی اور نریندر مودی کی بنیادی تربیت گاہ طاقتور راشٹریہ سیوک سنگھ اور بجرنگ دل نے یوپی آگرہ میں ایک مذہبی تقریب میں مسلمان گھرانوں کے ۲۰۰ سے زائد افراد کو دوبارہ ہندومذہب میں شامل کرتے ہوئے جشن منایا اور اس تقریب کو' جس میں ہزاروں ہندوؤں نے باجے گاجے کے ساتھ بھجن گاتے ہوئے شرکت کی، اسے ''پرکھوں کی واپسی'' کا نام دیا گیا۔ ان ۵۷ خاندانوں کو دوبارہ ہندومت میں لاتے ہوئے کہا گیا کہ یہ صبح کے بھولے اب گھر آ گئے ہیں۔ یہ ہندو خاندان نسلوں سے مسلمان نہیں تھے بلکہ آج سے صرف تیس برس قبل مسلمان بنا دیے گئے تھے' اس لیے ان کے ہندو دھرم میں واپس آنے سے کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ آگرہ میں منعقد کی گئی اس تقریب میں بجرنگ دل اور دھرم جگران سمان و بھاگ کے مقامی اور ضلعی رہنماؤں نے تقریریں کرتے ہوئے ہندو بنائے جانے والے ان خاندانوں کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا کہ اب ان کے لیے بھارت کے کسی بھی تعلیمی ادارے یا سرکاری محکمے میں ملازمت کے لیے کوٹہ سسٹم کی پابندی نہیں رہے گی کیونکہ اب وہ

آدھے نہیں بلکہ "مکمل بھارتی" بن چکے ہیں'۔ یہ ہے بھارت کا اصلی چہرہ اور اصلی کرتوت۔ تم مجبور و بے کس مسلمانوں کو پھر سے ہندو مت میں شامل کرنے کی منصوبہ بندی کرلو۔

یاد رکھو ان اوچھے اور گھٹیا ہتھکنڈوں سے مذہب اسلام ختم ہونے والا نہیں،نہ ہی کم ہونے والا ہے، اللہ نے اس دین کو سلامت رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس دین کی فطرت میں اس قدر وسعت اور لچک ہے کہ تا قیامت بڑھتا ہی رہے گا۔ مولانا صفی کا شعر۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

اُتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس عمل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ تم ہندو، ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو پورا بھارتی تصور نہیں کرتے بلکہ آدھا شہری تصور کرتے ہو۔بھارتی حاکموں نے پاکستان کو پہلے دن سے ہی تسلیم ہی نہیں کیا۔ بھارت کا وہ سیاسی لیڈر، صحافی یا لکھاری جو پاکستان کی جس قدر شدید الفاظ میں مخالفت کرے،،برا بھلا کہے، حتیٰ کے گالیاں دے وہ بھارتیوں کی پسندیدہ شخصیت ہوتی ہے۔ بھارت میں حکومتیں ہی ان سیاسی جماعتوں کی قائم ہوتی رہی ہیں جنھوں نے اپنے انتخابی منشور میں پاکستان دشمنی کو بنیاد بنایا اور اس پر

عمل کیا۔ نتیجے کے طور پر بھارتیوں کے دل و دماغ میں پاکستان مخالف، پاکستان دشمن عزائم رچ بس گئے ہیں۔ بھارتی سیاست دونوں ہی نہیں بلکہ بھارتی صحافیوں، لکھاریوں اور اب الیکٹرانک میڈیا پر آکر پاکستان کے خلاف زہر اگلنے والے بھارت کے پسندیدہ تجزیہ نگار قرار پاتے ہیں۔ پچھلے دنوں پی جے میر کے پروگرام میں پاکستانی تجزیہ نگار اور صحافی بھارتی تجزیہ کاروں اور صحافیوں کے آمنے سامنے تھے۔ موضوع پشاور سانحہ ہی تھا۔ بھارتی صحافیوں میں دو خواتین اور دو مرد نمائندے گفتگو میں شریک بھارتی تجزیہ نگاروں کی جو باڈی لینگویج تھی اس سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ ان کے اندر پاکستان سے کس قدر نفرت پائی جاتی ہے۔ لکھاریوں، تجزیہ نگاروں، کالم نگاروں، ٹی وی اینکرز کا کام تو انتہائی تحمل، بردباری، شائستگی اور سلجھے ہوئے طریقے سے سوال سننا اور اس کا جواب دینا ہوتا ہے۔ جہاں کسی پاکستانی تجزیہ نگار نے کشمیر کا لفظ استعمال کیا تو بھارتی ایسے بھڑک جاتے ہیں جیسے کسی نے ان کی دم پر پیر رکھ دیا ہو۔ حقیقت تو حقیقت ہے، تمہارے بھڑکنے، اول فول بکنے سے کشمیر کا مسئلہ تو اپنی جگہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ اس پروگرام کو دیکھ کر بھارتی لکھاریوں اور گفتاریوں کا اصلی چہرہ سامنے
آگیا۔ بھارتیوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چاہے تم اپنا تن من دھن اس بات پر لگا دو کے پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹا دوگے یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے پاکستان کے غیور عوام ڈرنے والے نہیں۔ پاکستان ختم ہونے کے لیے نہیں یہ ہمیشہ قائم

ودائم رہنے کے لیے بنا ہے۔ تمہارے آنجہانی لیڈر نہرو، اندرا گاندھی اور دیگر یہ خواہش لیے اس دنیا سے جا چکے ان کی خواہش پوری نہیں ہوئی اب جو باقی پاکستان دشمن بھارتی ہیں ان کا انجام بھی انہی جیسا ہی ہوگا۔

بھارت نے پاکستان میں صوبائیت کو پروان چڑھانے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کیا مشرقی پاکستان اندرونی معاملات کی وجہ سے بنگلہ دیش بن گیا؟ نہیں ہر گز نہیں۔ اس میں بھی بھارت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ہماری آپس کی غلطیاں، زیادتیاں ہو سکتی ہیں وہ ہمارا آپس کا معاملا تھا، ایک بھائی دوسرے بھائی کے ساتھ زیادتی کر سکتا ہے، اختلافات کس گھر میں نہیں ہوتے لیکن بھارت نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں صوبائیت کے زہر کو ہوا دے کر پاکستانی قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے سیاسی تدبر کو سلام انہوں نے قیام پاکستان کے فوری بعد ہی بھارت کی پاکستان دشمنی کو کھلے الفاظ میں بے نقاب کر دیا تھا۔ ہم ہی کم عقل اور بد قسمت ہیں کہ ہم نے اپنے محسن کی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۸ء جب کہ پاکستان کو قائم ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا بھارت کی مکاری کو بھانپ لیا تھا ۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا ’ہندوستان قیام پاکستان کے حوالے سے شکست کا انتقام لے رہا ہے اور تمہارے اندر تعصبات کو ہوا دے رہا ہے۔ اپنے پڑوسی کے عزائم کے ہاتھوں میں مت کھیلو‘۔ ایک اور بات

جو قائدِ اعظمؒ نے کہی کہ ' صوبائیت زہر ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ صوبائیت کا زہر قومی جسم میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ قوم کو اندرونی طور پر تقسیم کرنے کی سازش ہے۔ میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں کہ صوبائیت کے زہر کو اپنے ذہن سے نکال کر باہر پھینک دو اور اپنی صفو میں اتحاد پیدا کر لو'۔ یہ وہ باتیں ہیں جو بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے بھارتی عزائم کے بارے میں قیام پاکستان کے صرف چھ ماہ بعد ہی محسوس کر لیے تھے اور ان سے پاکستانی قوم کو بانگِ دہل آگاہ بھی کر دیا تھا لیکن ہم نے اس جانب توجہ ہی نہیں دی اور شاید اب بھی بھارت کی اس دشمنی سے غافل ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت کا اگلا حدف بلوچستان ہے ،بے شمار شواہد ہیں جو بھارت کی پاکستان خلاف سرگرمیوں کا اعلان کر رہے ہیں۔ سانحہ پشاور ہی کیا اس سے قبل ہونے والے تخریب کاری کے واقعات کا ماسٹر مائنڈ بھارت ہی تھا۔ بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کو اسلحہ اور امداد کون فراہم کر رہا ہے؟ خیبر پختونخواہ میں ہونے والے دہشت گردی کی کاروائیوں میں بھی 'را' کے ملوث ہونے کے واضح ثبوت موجود ہیں۔ کراچی میں ہونے والے ڈاکیارڈ پر حملہ 'را' کی کاروائی نہیں تھی ؟جس میں ملوث کچھ کیمشنڈ افسران حملے کی ناکامی کے بعد افغانستان فرار ہوتے ہوئے بلوچستان کی پاک افغان سرحد پر پکڑے نہیں گئے تھے ؟افغان حکومت ، فوج اور خفیہ اداروں کو بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' کی سرپرستی حاصل ہے۔ انہوں نے تحریک طالبان پاکستان کے سینئر لیڈروں کو افغانستان میں پناہ نہیں دے

رکھی؟ کوئی ایک واقعہ ہے جس میں بھارت کی خفیہ ایجنسی 'را' کے ملوث ہونے کے شواہد موجود نہ ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھارت کی پاکستان دشمنی پر کڑی نظر رکھیں، آپس میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں تب ہی دشمن کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ قوم متحد ہو اور ہماری سیاسی و عسکری قیادت مسائل کو حل کرنے میں سنجیدہ ہو، بنیادی نوعیت کے مسائل کو سنجیدگی کے ساتھ ایڈریس کرنے کا پختہ عزم ہو تو بھارت تو کیا بڑے سے بڑے دشمن کو مقابلہ کرنا مشکل نہیں۔ (۴ جنوری ۲۰۱۵ء)

عارف احمد صدیقی۔سیلف میڈ انسان

عارف احمد صدیقی جو میرے عارف بھائی تھے ۸ فروری ۲۰۱۵ء کو ہم سے جدا ہوئے دو سال ہو چکے ہیں ۔ انہوں نے جمعہ ۸ فروری ۲۰۱۳ء (۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ) کو اس دنیا کو خیر باد کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ حسب ذیل مضمون ہیچمدان کی جانب سے مرحوم کی دوسری برسی پر ایک نذرانہ ہے۔ گر قبول افتد۔۔
جمعہ ۸ فروری ۲۰۱۳ء کی صبح پونے نو بجے سعودی ائرلائن سے جدہ کے لیے میری روانگی تھی۔اچانک جمعرات کی شام اطلاع ملی کہ میرے پھوپی زاد بھائی عارف احمد صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ کئی دنوں سے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ مَیں اور شہناز انہیں اسپتال میں دیکھنے بھی گئے تھے۔تکلیف میں تو وہ بہت عرصہ سے تھے لیکن اب جس بیماری نے انہیں آ لیا تھا، ان کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھتے ہوئے سوچ کا دھارا اسی طرف جارہا تھا لیکن یہ خیال ہر گز نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ اللہ تو تنکے میں جان ڈالنے کی طاقت رکھتا ہے۔بے شمار لوگ ایسے ہیں جو کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہونے کے باوجود برس ہا برس سے جی رہے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ زندہ رکھے۔ اصل بات بلاوے

کی ہے جس کا بلاوا آگیا اسے جانا ہوتا ہے۔ پھر موت سے بھلا کون بچ سکتا ہے۔ اسے تو ایک نہ ایک دن آنا ہی 'اللہ تعالیٰ کا فرمان سورہ الانبیاء آیت ۳۵ میں 'ہر ذی روح موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے'۔ کسی نے کہا کہ موت ایک ایسا پیالہ ہے جسے ہر شخص پی کر رہے گا اور قبر ایک ایسا دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہو کر رہے گا۔ عبد الرحمن عاجزؔ نے اپنی کتاب 'موت کے سائے۔ موت کہاں ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں' لکھا' موت سے قارون کو اس کی دولت ،فرعون کو اس کی بادشاہی ، نمرود کو اس کی سرکشی، رستم کو اس کی شہ زوری، جمشید کو اس کا جاہ وجلال، ارسطو کو اس کی دانش ، حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی درازیٔ عمر بھی نہ بچا سکی۔ موت سے اگر کوئی بچ سکتا تو انبیاء علیہ السلام کی جماعت اس کی مستحق تھی ۔ یہ ہر ایک کا مقدر ہے'۔ بقول میر تقی میرؔ ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

شوقؔ کا یہ شعر بھی موت کے حوالے سے بہت خوب ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

عارف بھائی میری حقیقی پھوپی انیسہ خاتون مرحومہ کے بڑے بیٹے تھے، ان کی پہلی شادی میرے حقیقی ماموں مطلوب احمد سبزواری مرحوم کی بیٹی رخسانہ سے

ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ان سے میرا دوہرا رشتہ اور خاصی قربت تھی پھر یہ بھی کہ جب رخسانہ اس دنیا سے جلد چلی گئی تو عارف بھائی کی دوسری شادی میرے ہی توسط سے شپ اونر گورنمنٹ کالج کے کیمسٹری کے پروفیسر خلیق علوی کی ہمشیرہ حاجرہ علوی سے ہوئی۔ قربت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ کراچی میں ہم اور عارف بھائی نندیک نندیک بہت عرصہ رہے۔ ہمارے درمیان محبت تھی، خلوص تھا، خیال کرنے والے ہمدرد انسان تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ ابھی میٹرک بھی پاس نہ کیا تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پانچ بہنیں تھیں زیادہ تر بڑی تھیں ایک بھائی جو ان سے بھی چھوٹا تھا۔ کمانے والا کوئی نہ تھا۔ ملتان کے علاقے نوا شہر میں رہائش تھی۔ ان کی والدہ کی ہمت اور استقامت کو سلام کہ انھوں نے ایک بڑے خاندان کو اپنے پروں میں سمیٹے رکھا، ان کی پرورش اور تربیت اس انداز سے کی کہ تمام کے تمام اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد ہوئے۔ عارف بھائی کو میٹرک کرتے ہی واپڈا میں ملازمت مل گئی جس کا اختتام ریٹائرمنٹ پر ہوا۔ ملتان سے ٹرانسفر کوئٹہ کا ہوگیا۔ وہاں سے حیدرآباد ٹرانسفر ہوا۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ بہنوں کی شادیاں، بھائی کی شادی کے بعد اپنے بچوں کی پرورش خوش اسلوبی سے کی اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ بڑی ہمت اور حوصلہ کی بات ہے۔ ان کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت نظر آتی ہے۔ اب جب کہ دونوں بیٹے اچھے روزگار پر پہنچے، آرام و سکون سے زندگی گزارنے کے دن آئے تو باغ باں کو یہ گوارہ نہ ہوا، اور باغ

باں نے ملک ادم کے سفر کی راہ لی۔ اللہ ان کی مغرفت کرے۔

چراغ بجھتے جارہے ہیں سلسلہ وار

میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

میں متفکر تھااور سیٹ کینسل کرانے کی سوچ رہا تھا، سفر کرنا میرے لیے دشوار ہو رہا تھا لیکن اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ سیٹ کینسل کرائی جاتی۔ ان کی تدفین اگلے روز بعد نماز جمعہ طے پائی کیوں کہ ان کے بڑے بیٹے کاشف کوابو ظہبی سے رات میں کسی وقت کراچی پہنچنا تھا۔ میری سیٹ اسی روز صبح نو بجے کی تھی۔ اطلاع ملتے ہی میں سفر کے تمام معاملات کو چھوڑ چھاڑ ان کے گھرچلا گیا۔ جسد خاکی اسپتال سے گھرلایا جاچکا تھا۔ گھر پہنچتے ہی لپک کر اس کمرے میں گیا جہاں پر ان کا جسد خاکی موجود تھا۔ چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مسافر تھک ہار کر سکون کے ساتھ ، بلا ڈر و خوف سو رہا ہے۔ انہیں میں نے زندگی میں نمازی دیکھا۔ نیک انسان تھے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت میں سخت گیر تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بچے اعلی تعلیم اور عمدہ اخلاق کا نمونہ ہیں۔بڑا بیٹا کاشف ابو ظہبی میں چھوٹا عاطف مصر میں ہے۔

بر سر روزگار اور بیوی بچوں والے ہیں۔بڑی بیٹی رومانہ ڈاکٹر ہے اوراپنے

گھر میں خوش و خرم ہے، دردانہ نے ایم ایس سی کیا، میڈیکل کے کسی ذیلی پروفیشن سے منسلک ہے۔ فرحانہ نے بھی بہت کچھ کیا ہوگا اپنے شوہر اور بچوں میں خوش ہے۔ غرض اعلیٰ تعلیم اس گھرانے کی پہچان ہے۔ اس میں ان کی شریکِ حیات حاجرہ بھابی کا بھی برابر کا حصہ ہے جو پڑھی لکھی اور سمجھ دار خاتون ہیں۔ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہیں۔ گویا استاد ہیں۔ ریٹائر ہو چکی ہیں۔ بچوں میں اچھے اخلاق و نیک سیرت کی بنیاد ان کی حقیقی ماں رخسانہ مرحومہ نے ہی رکھ دی تھی وہ بھی سیدھی سادھی نیک سیرت تھی ۔ پنجاب کے دیہات نما شہر میلسی جو میری جنم بھومی بھی ہے میں اُس کی پرورش اور تربیت ہوئی تھی۔ بچے اپنی دونوں ماؤں اور اپنے باپ کی نگرانی اور تربیت سے معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرسکے۔ عارف بھائی کا بڑا بیٹا نارمل نہیں وہ اس کی طرف سے متفکر رہا کرتے تھے۔ اپنے ہی گھر میں چھوٹی سی دکان بنادی تھی وہ اس قابل ضرور ہے کہ اس دکان میں مصروف رہتا ہے۔ دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ دنیا سے جانا سب ہی کو ہے پر وہ جلد چلے گئے۔ غالبؔ نے اپنی ایک غزل کے ایک شعر

میں لفظ ' عارف ' کا استعمال کیا ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرع بہت مشہور ہے۔ 'کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دن اور' شعر کچھ اس طرح ہے ۔

ہاں ، اے فلک پیر ! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دن اور

عارف بھائی کی تدفین بعد نماز جمعہ ہونا تھی، ان کے بے روح جسم کو گھر میں رکھا نہیں جاسکتا تھا چنانچہ غسل وکفن کے بعد ایدھی کے سرد خانے میں رکھنا طے ہوا، میں ان کے غسل میں شریک رہااور ان کے بیٹے عاطف کو غسل میں پیش پیش رکھنے کی کوشش کی۔ میری سوچ اور تجربہ یہ رہاہے کہ مرنے والے کو غسل اپنے قریبی عزیز یعنی بیٹا، بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ کا عزیز بہتر اور دل سے غسل کے امور انجام دیتا ہے۔اپنے والد مرحوم کو اپنے ہاتھوں غسل دینے کے عمل میں مَیں نے جونے اطمینان اور سکون محسوس کیا تھا اسے کبھی نہیں بھولتا۔ غسل دینے والوں میں اس مسجد کے پیش امام شامل تھے جس مسجد میں عارف بھائی نماز پڑھا کرتے تھے ان کے علاوہ عارف بھائی کا بیٹا عاطف، ان کے دونوں داماد شاہد اور کاشف بھی شامل تھے۔ ہم سب نے مل کر غسل دیا، نہا دھو کر، نئے صاف ستھرے اور سفید کپڑے پہن کر ان کا چہرہ اور بھی زیادہ نورانی ہوگیا تھا، چہرے پر خاموشی کے ساتھ ساتھ اطمینان اور سکون غالب تھا۔ موت کی جلا چہرہ پر نمایاں تھی اور رنگت میں کچھ عجیب سی طلسمی پیلاہٹ اپنا حسن دکھا رہی تھے ۔مجھے یہ معلوم تھا کہ میں صبح ان کے آخری سفر میں ساتھ نہیں ہونگا، مجھے کاندھا دینے کی سعادت بھی حاصل نہ ہوسکے گی چنانچہ جی بھر کر ان کے چہرہ کو دیر تک تکتا رہا،اچھی طرح چھوا،ان کے سر کے بالوں، ابروں اور ان کی ریش مبارک کے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سیدھا کیا اور خاموشی سے ان

سے اجازت چاہی۔ انہیں تیار کرکے ایدھی کے سرد خانے میں پہنچایا جانا تھا، اب یہی ان کے حق میں بہتر تھا۔ گویا ان کے جسم نے دنیا میں آخری رات اپنے گھر میں نہیں بلکہ ایدھی کے سرد خانے میں گزارنا تھی۔ خالد شریف کا شعر ؎

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اللہ کا نظام بھی کیا خوب ہے کہ روح کے جسم سے جدا ہوتے ہی روح تو اپنے مقام پر پہنچ جاتی ہے لیکن بے روح جسم جب تک انسانی ہاتھوں میں رہتا ہے 'مردہ' کہلاتا ہے۔ احباب یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ میت گھر کب لائی جائے گی، میت کب اٹھائی جائے گی، میت کی نماز جنازہ کب ہوگی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی کی صورت میں تابوت coffin ہوائی جہاز میں ''سفری سامان گاہ luggage'' میں رکھا جاتا ہے، تابوت ہی میں رکھا جاتا ہے۔ تابوت کو luggage ریل سے منتقلی کی صورت میں بھی تابوت مسافروں کے ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں یا روایت نہیں۔ اس میں کیا حکمت اور کیا منطق ہے، کیا راز پوشیدہ ہے، مجھے نہیں معلوم۔ میت کی تعظیم کا پہلو اس عمل سے ظاہر نہیں ہوتا، ڈر و خوف دکھائی دیتا ہے جو ہر اعتبار سے بے معنی اور منطق سے عاری ہے۔ پھر ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ امیرؔ مینائی خوبصورت شعر ؎

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں، پھر چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

ہمارے ملک میں زیادہ تر مساجد میں نماز جنازہ مسجد سے باہر میدان میں، لان میں، حتیٰ کے سڑک پڑھانے کا رواج ہے۔ کیا مردہ نہا دھو کر بھی پاک صاف نہیں ہوتا کہ اسے مسجد کے اندر داخل ہونے کی اجازت ہو۔ البتہ اہلحدیث کی مساجد میں مرنے والے کے گھوارے یا تابوت کو مسجد کے اندر لے جایا جاتا ہے گھوارہ (مہد) مسجد میں اگلی صف میں رکھ کر نمازِ جنازہ بہ آوازِ بلند پڑھائی جاتی ہے۔ میری رہائش گلشن اقبال بلا ٦ میں تھی اور میں ہمیشہ جامعہ ستاریہ میں جمعہ کی نماز پڑھتا رہا۔ جب بھی جنازہ آتا لوگ گھوارے کو مسجد میں لے آتے اور نمازِ جنازہ ادا کر دی جاتی۔ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ مسجد حرام، خانہ کعبہ میں بھی تو تابوت یا گھوارہ خانہ کعبہ کے نزدیک سامنے رکھا جاتا ہے، نماز بھی مائیک پڑھائی جاتی ہے۔ دینی معاملہ ہے اس لیے زیادہ بات مناسب نہیں۔

عارف بھائی کا رشتہ دنیا سے ٹوٹ چکا تھا، ان کی روح پرواز کر چکی تھی، جسم خاکی کو اپنے مقام پر جانے کی جلدی تھی لیکن تدفین میں ان کے بیٹے کاشف کی شرکت کو لازمی بنانے کے لیے انہیں ایک رات دنیا میں گزارنا تھی اور انھوں نے

یہ رات دینا میں ہی گزاری۔رات گئے ان کے جسد خاکی کو گھر سے ایدھی سرد خانے
منتقل کیا گیا ساتھ ہی مَیں نے اور شہنازنے بھی احباب سے جن کو یہ علم تھا کہ میں صبح
کی

فلائٹ سے جدّہ جارہا ہوں الوداعی ملاقات کی اور گھر واپس ہوا۔بقول شاعر ؎

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی نہ جانے ان کو کس طرف

میری فلائٹ سوا نو بجے صبح کی تھی، فجر کی نماز پڑھ کر ہم صبح چھ بجے گھر سے نکل گئے، چھوٹا بیٹا ڈاکٹر نبیل اور بہو ڈاکٹر ثمر ائر پورٹ چھوڑنے آئے۔انہیں خدا حافظ کہا اور ائر پورٹ کے سفری لوازمات میں مصروف ہوگئے۔ سعودی ائر لائن کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ وقت مقررہ پر اپنے سفر کا آغاز کرتے ہے اور طے شدہ وقت پر منزل پر قدم رکھ دیتے ہے۔پینتالیس منٹ قبل اعلان کردیا گیا کہ سعودی عرب کی پرواز سے جدہ جانے والے مسافر ہوائی جہاز پر تشریف لے چلیں، ہم نے بھی اس اعلان پر لبیک کہا اور لائنج سے جہاز کی جانب روانہ ہوئے۔ کراچی ائر پورٹ پر لاؤنج سے ہوئی جہاز تک کا سفر بس میں کرنا نہیں پڑتا اور نہ ہی واپسی پر یہ صورت حال ہوتی ہے بلکہ یہاں جہاز ائر پورٹ پر بنی ہوئی ''کیوب'' میں لگ جاتا ہے اور مسافر جہاز میں لاؤنج سے ایک 'ٹنل' میں چلتے ہوئے جہاز میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک دیدہ ذیب اور

خوشگوار مختصر سفر ہوتا ہے جو چلتے ہوئے مسافر کو فرحت بخش احساس سے دور چار کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لاؤنج سے ہوائی جہاز تک کا سفر بس کے ذریعہ مسافر کو کوفت اور پریشانی سے دوچار کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم کراچی میں W 11 میں سفر کر رہے ہیں۔ شکر ہے کراچی ائر پورٹ اپنے مسافروں کو ڈبلیو گیارہ میں سفر کی کوفت سے محفوظ رکھتا ہے۔ جہاز میں ہماری سیٹ شروع ہی میں تھی ۔ دستی سامان جس میں لیب ٹاپ بھی تھا جہاز کے اوپر خانے میں رکھا، اس میں رکھی ایک کتاب جو ایک معروف قلمکار مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''غارِ حرا میں ایک رات'' باہر نکال لی ۔ دوران سفر اس کتاب کا مطالعہ کرنے کا منصوبہ میں نے پہلے ہی بنا لیا تھا۔ میں کنارہ والی سیٹ پر تھا میرے برابر شہناز تھیں اور ان کے برابر ونڈو سیٹ پر ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ جب ہم نے اپنی سیٹ سنبھالی تو یہ خاتون پہلے ہی سے اپنی ونڈو سیٹ پر براجمان کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھیں۔ دیکھنے میں بردبار، سنجیدہ اور پڑھی لکھی لگ رہیں تھیں ۔ دوران سفر شہناز سے گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ واقعی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ جدہ کے اسکول کے انتظامی امور کی نگرانی پر معمور ہیں ۔ دورانِ سفر میں بظاہر کتاب پڑھنے میں مشغول رہا لیکن میری سوچ کا دھارے میں عارف بھائی تھے۔ ان کی زندگی کی ایک فلم چلی جاری تھی جو رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ملتان میں نوا شہر کے چھوٹے سے مکان میں جانا، کوئٹہ میں ان کے گھر جانا اس وقت رخسانہ حیات تھی پھر کراچی میں ان

کے ساتھ وقت گزارنا تمام باتیں اور واقعات ایک ایک کرکے نظروں کے سامنے تھے۔ وہ میرے والد مرحوم اور والدہ مرحومہ جو ان کے بڑے ماموں اور ممانی تھے بہت عزت واحترام کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ہر اتوار کی صبح ان کا ہمارے گھر آنا دراصل اپنے ماموں اور ممانی سے ملاقات کرنا اور خیر و عافیت معلوم کرنا ہوتا تھا۔ اسی سوچ میں اور مستنصر حسین تارڑ کی کتاب کے مطالعہ کے دوران وقت کیسے گزر گیا معلوم ہی نہ ہو سکا۔ جدہ ائرپورٹ پر عدیل اور صائم لینے آئے ہوئے تھے۔ گھر پہنچے مسجد سے جمعہ کے خطبے کی آواز آرہی تھی۔ فوری وضوع کیا اور مسجد چلے گئے۔ نماز جمعہ کے بعد دیگر دعاؤں کے علاوہ عارف بھائی کی مغفرت کی دعا کی۔ سعودی عرب اور پاکستان میں دو گھنٹے کا فرق ہے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد میں مسجد میں بیٹھا تھا میرے خیالوں میں عارف بھائی تھے۔ جنہیں میں نے رات ہی کو اپنے ہاتھو غسل دیا تھا۔ میں سوچ میں تھا کہ اب انہیں ایدھی کے سرد خانے سے گھر لایا گیا ہوگا۔ لوگ ان کے سفر آخر میں شرکت کے لیے آنا شروع ہوگئے ہوں گے۔کچھ ہی دیر بعد وہ قبر کی گود میں ابدی نیند سو جائیں گے اور وہ وہاں چلے جائیں گے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ ۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

دو دن بعد یعنی اتوار کے روز میں اور شہناز مکہ المکرمہ کے لیے روانہ ہوئے ۔ ہمیں جدہ سے مکہ جانا ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہم اپنے ہی شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہوں۔ نہ کوئی ڈر، نہ کوئی خوف ۔ عدیل کے گھر سے ٹیکسی میں 'کلو عشرہ' جو مکہ جانے والی ٹیکسیوں کا اسٹینڈ ہے پہنچے وہاں سے کسی بھی ٹیکسی میں ۱۰ ریال فی سواری کے حساب سے حرم پہنچ گئے۔ اللہ کے گھر پہنچ کر شکرانہ ادا کیا دعائیں کیں ۔ خاص طور پر عارف بھائی کے لیے دعا کی ۔ بعد ازاں عارف بھائی کے ایصال ثواب کے لیے طواف کعبہ ادا کیا۔ اللہ کے گھر کے سات پھیرے لیے اور مرحوم کی مغفرت کی دعا کی۔ اللہ تعالی عارف بھائی کی مغفرت فرمائے۔ ان کے بہن بھائی اور بچوں کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کوشش کی ہے کہ عارف بھائی کو خراج تحسین پیش کر سکوں ۔ پروردگار میری اس کوشش کو بھی قبول فرمائے آمین۔ اپنے جد امجد شیخ محمد ابراہیم آزادؔ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ۔

ہم نشیں پوچھتے کیا ہو میرے دل کی حالت
صدمہ کیا دے گئے دنیا سے جانے والے

مَیں نے اپنے سفرِ آخر کے ساتھیوں، مجھے لحد تک پہنچانے والوں ، میری قبر پر مٹھی بھر خاک ڈالنے والوں کا نظم میں پیشگی شکریہ ادا کیا ہے۔ شکریے کے یہ نثری الفاظ عارف بھائی مرحوم کی جانب سے ان تمام احباب تک پہنچا رہا ہوں

جنھوں نے ان کے سفر آخر میں شرکت کی، چالیس قدم ان کے جنازے میں شریک رہے، گہوارے کو کاندھا دیا اور مٹھی بھر خاک ان کی لحد پر نچھاور کی ۔

مَرقَدتک میرے ساتھ آنے والو تمہارا شکریہ
میری خاطر زحمت اٹھانے والو تمہارا شکریہ
ہے اب جو سفر باقی کرلیں گے وہ تنہا ہی ہم
حوصلہ بڑھا کر لحد تک پہنچانے والو تمہارا شکریہ
اگلا پڑاؤ ہے کٹھن اور رستہ بھی ہے اڑچن اڑچن
مغفرت کی دعا دینے والو تمہارا شکریہ
بنا تھا جس خاک سے رئیسؔ آ پہنچی ہے منزل پہ وہ
مٹھی بھر خاک نچھاور کرنے والو تمہارا شکریہ

یہاں آخری شعر کو اس طرح پڑھا جائے ۔

بنا تھا جس خاک سے عارف آ پہنچی ہے منزل پہ وہ
مٹھی بھر خاک نچھاور کرنے والو تمہارا شکریہ

(جنوری ۲۰۱۵ء ۸)

دہشت گردی کے خلاف قومی اتفاق رائے۔ وقت کی ضرورت

دہشت گردوں نے ۱۳۱ پھولوں ، ان کی پرنسپل ، اساتذہ اور دیگر افراد کے جنازے دے کر پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کو مجبور کردیا کہ وہ باہم مل کر دہشت گردی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع کریں۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کے المناک سانحۂ نے پاکستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کو ایک نکتہ پر متفق کردیا کہ پاکستان سے دہشت گردی کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ ہماری ۶۷ سالہ تاریخ کا انتہائی دردناک اور اذیت ناک واقعہ ہے ۔ ایسی مثال تو پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ حادثہ دہشت گردی کی ایسی بد ترین مثال ہے کہ مسلمان تو کیا کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کا دل کانپ جاتا ہے، روح تڑپ اٹھتی ہے۔ اس واقعہ کو رونما ہوئے کئی دن گزرچکے ہیں لیکن آج بھی ٹی وی اسکرین پر یا اخبار میں کسی ہنستے مسکراتے پھول کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے، دل میں ایک آہ سی اٹھتی ہے۔ افسوس صد افسوس ایسا دردناک عمل کرتے ہوئے ظالم دہشت گروں کے ہاتھ اس نہیں لرزے ، ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا، ان کے دل پتھر کے ہوگئے جب انہوں نے معصوم پھولوں کو بے دردی، بے رحمی اور درندگی کے ساتھ خون میں نہلا کر شہید کیا۔ اس بے رحمانہ فعل کے نتیجے میں بھی ہماری سیاسی قیادت

انتہائی فیصلے نہ کرتی تو شاید قوم تو انکا کچھ نہ بگاڑ سکتی لیکن اللہ کی لاٹھی کبھی نہ کبھی انہیں ضرور اپنی گرفت میں لیتی۔

پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف قومی اتفاق رائے وقت کی اہم ضرورت تھی اسے ہر صورت میں ہونا چاہیے تھا۔ معصوم بچوں کے بہیمانہ قتل اور شقاوتِ قلبی کی خون آلود واردات نے پاکستان کی قومی قیادت کو سر جوڑ کر بیٹھنے، سیاسی اختلافات ختم کرنے پر مجبور کردیا۔ سیاسی و عسکری قوت نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ملک قوم کو اس سانحہ سے نکالنے اور ملک سے دہشت گردی کی جڑیں اکھاڑنے کا عزم کیا۔ وزیر اعظم محمد نواز شریف نے قومی و پارلیمانی رہنماؤں کی تین آل پارٹیز کانفرنسز بلائیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر دہشت گردی کے خلاف حکومت کے ساتھ چلنے اور افواج پاکستان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے پر اتفاق کیا۔ حکومت، مخالفینِ سیاست اور افواج پاکستان ایک پیج پر آ گئے۔ حکومتی ذمہ داران اور سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے ۲۴ دسمبر کو ہونے والے اجلاس کا دورانیہ ۱۱ گھنٹے تھا۔ اس طویل اجلاس کے بعد قوم کے نمائندوں نے دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی تیاری کی اور ۲۰ نکاتی ' قومی ایکشن پلان تیار کیا۔ ایکشن پلان کے نکات حسب ذیل ہیں۔'

۱۔ دہشت گردی میں ملوث سزا یافتہ مجرموں کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد کو

یقینی بنایا جائے گا۔

۲۔ فوجی افسران کی سربراہی میں اسپیشل ٹرائل کورٹ کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

۳۔ خصوصی عدالتوں کی مدت دو سال ہوگی۔

۴۔ملک میں مسلح اور دہشت گرد گروپ کے قیام اور سرگرم عمل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۵۔انسداد دہشت گردی کے ادارے نیکٹا کو مضبوط اور فعال بنایا جائے گا۔

۶۔ نفرتیں ابھارنے ، گردنیں کاٹنے ، انتہا پسندی اور فرقہ واریت اور عدم برداشت کو فروغ دینے والے لٹریچر اخبارات و رسائل کے خلاف موثر اور بھرپور کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔

۷۔ دہشت گردوں کی مالی اعانت کے تمام وسائل کو مکمل طور پر ختم کردیا جائے گا۔

۸۔کالعدم تنظیموں کو کسی دوسرے نام سے کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۹۔ اسپیشل اینٹی ٹیررازم فورس کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

۱۰۔ مذہبی انتہا پسندی کو روکنے اور اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۱۔ دینی مدارس کی رجسٹریشن اور ضابطہ بندی کا اہتمام ۔

۱۲۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر دہشت گردوں اور ان کے نظریات کی تشہیر پر

مکمل پابندی۔
۱۳۔ بے گھر افراد کی فوری واپسی عمل میں لائی جائے گی۔
۱۴۔ فاٹا میں انتظامی اور ترقیاتی اصلاحات کے عمل کو تیز کیا جائے گا۔
۱۵۔ دہشت گردوں کے مواصلاتی نیٹ ورک کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔
۱۶۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر دہشت گردی کے فروغ کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنا۔
۱۷۔ کراچی میں جاری آپریشن کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانا۔
۱۸۔ وسیع تر سیاسی مفاہمت کے لیے تمام فریقین کی طرف سے حکومت بلوچستان کو مکمل اختیارات دینے کا فیصلہ۔
۱۹۔ فرقہ واریت پھیلانے والے عناصر کے لیے فیصلہ کن کاروائی۔
۲۰۔ افغان مہاجرین کی رجسٹریشن جیسے اقدامات قومی ایکشن پلان کا حصہ ہیں۔

وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف ان نکات پر اتفاق رائے حاصل کرنے، تمام سیاسی جماعتوں کو اس پر متفق کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب مرحلہ تھا قومی ایکشن پلان پر عمل درآمد کا۔ قومی ایکشن پلان کے پہلے نکتے ' دہشت گردی میں ملوث سزا یافتہ مجرموں کی پھانسی کی سزا پر عمل درآمد' تو شروع کر دیا گیا اور کئی پھانسی کے مجرموں کو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا ہے اور دیگر کی سزاؤں پر عمل درآمد تمام تر قانونی کاروائی مکمل ہونے پر عمل درآمد شروع کر دیا

جائے گا۔ ایکشن پلان کا دوسرا اہم نکتہ 'فوجی عدالتوں کا قیام' اہم قانونی، سیاسی و جمہوری پیچیدگی کا حامل تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی جمہوری ملک میں، جمہوری حکومت کی موجودگی میں فوجی عدالتوں کا قیام حکومت اور جمہوریت پر ایک سوالیہ نشان ہوا کرتا ہے۔ جمہوریت اور فوجی عدالتیں دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہماری سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں فوجیوں کی قائم کردہ حکومت کے خلاف ہمیشہ ڈنڈا ہاتھ میں لیے رہی ہیں اور جمہوری حکومت کے قائم ہوجانے کی صورت میں جمہوری حکومت کو ختم کرنے کے لیے فوجیوں کی جانب دیکھتی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ اب بھی بعض سیاسی رہنما بانگِ دہل کہہ رہے ہیں کہ فوج کو ملک کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ یہی سیاسی رہنما فوجی قیادت کو ڈکٹیٹر کی حکومت کہتے نہیں تھکتے۔ انہیں سولی پر چڑھانے کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ کارکردگی کے حوالے سے پاکستان کی تاریخ میں جو ترقی فوجی قیادت کے ادوار میں ہوئی وہ جمہوری دور میں نظر نہیں آئی۔ حکومت اور مخالف سیاسی جماعتوں کے اتفاق رائے پر پاکستانی عوام نے نہ صرف سکھ کا سانس لیا بلکہ ان کے اندر ایک امید کی کرن دکھائی دی کے اب پاکستان میں دہشت گردی اور دہشت گردوں کے خلاف ایسی حتمی اور فیصلہ کن کاروائی ہوگی کہ عوام کو ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ پاکستان کے قانون ساز ادارے قومی اسمبلی نے ادھر فوجی عدالتوں کا قانون کثرت رائے سے منظور کیا چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ ملک کی ایک

بڑی سیاسی جماعت جمعیت علمائے اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمن نے پریس کانفرنس کرکے اپنے تحفظات میڈیا کے سامنے بیان کردئے۔ دوسری جانب جماعت اسلامی بھی مولانا کی حامی نظر آئی، شیخ رشید بھی اسمبلی میں موجود نہیں تھے، کپتان تو پہلے ہی سے اسمبلی سے باہر تھے دوسرے یہ بھی کہ وہ ان دنوں اپنی نجی زندگی میں زیادہ ہی مصروف رہے، ان کی مصروفیات اب سب کے سامنے آہی چکی ہیں۔ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل مناسب نہیں،انہوں نے کچھ غلط نہیں کیا، البتہ غلط وقت کا انتخاب کیا، کچھ تَوَقُّف کر لیاجاتا تو وہ ان ہی کے حق میں بہتر ہوتا، پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے دورے کے موقع پر انہیں شہید بچوں کے والدین کے احتجاج کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

۲۱ ویں ترمیم کی حمایت کرنے والوں میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) اور ان کے قائد الطاف حسین پیش پیش تھے انہوں نے قومی اتفاق رائے کو اپنے موقف کی کامیابی قرار دیا، متحدہ نے ملک بھر میں یوم تشکر بھی منایا۔ ترمیم کی حمایت کرنے والوں میں پاکستان پیپلز پارٹی بھی شامل تھی،جب ساتھ دیا تو اس پر قائم رہیں ۔اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ آم کھاتے وقت تو ساتھ تھے بعد میں تھو تھو۔ سینٹ میں پیپلز پارٹی کے رہنما رضا ربانی نے کہا' ضمیر کے خلاف ووٹ دیا، جتنا شرمندہ آج ہوں پہلے کبھی نہ ہوا'۔ تقریر کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے انہوں نے کہا کہ ' مجھے ۱۰ سال سینٹ میں ہوچکے ہیں

تین تجاویز دیں ان میں ایک دہشت گردی کے ساتھ مذہب اور مسلک کو نہ جوڑا جائے۔ دوسری تجویز فوجی عدالتوں کے لیے دی جانے والی دو سالہ آئینی مدت میں کسی بھی صورت توسیع نہ کی جائے۔ مولانا کی تیسری تجویز یہ تھی کہ فوجی عدالت کے فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ امیر جماعتِ اسلامی سراج الحق نے کہا' دہشت گردی کے خلاف قوم میں جو اتفاق رائے پیدا ہوا ہے حکومت اپنے ہاتھوں سے اسے تباہ کرنے کی کوشش نہ کرے انہوں نے کہا ہم نے اکیسوی آئینی ترمیم میں جو ترمیم پیش کی تھی اس میں سب کی بھلائی تھی۔ ہم نے کہا تھا کہ مدارس کے بجائے ترمیم میں تعلیمی اداروں کا لفظ لکھا جائے'۔ مولانا فضل الرحمٰن، ساجد میر یا سراج الحق کی تجاویز ایسی نہیں کہ انہیں شامل کرنے سے کوئی قیامت آجائے گی۔ انہیں احسن طریقے سے پہلے ہی شامل کیا جاسکتا تھا لیکن مولانا کی سیاسی تاریخ کچھ اسی قسم کی ہے وہ پہلے نانا کرتے ہیں پھر ہاں ہاں کر دیتے ہیں۔ حکومت انہیں بلالے وہ فوراً مان جائیں گے۔ ویسے وزیر اعظم صاحب نے آج ہی (۱۱ جنوری) کہا ہے کہ 'آئینی ترامیم پر تحفظات دوور کرینگے، غیر معمولی حالات کے باعث غیر معمولی فیصلے کیے، دہشت گردی کے خلاف جنگ کو تنہا نہیں جیتا جاسکتا، سب مل کر ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں'۔

اس میں شک نہیں کہ ترمیم منظور ہوجانے سے قبل ہی مذہبی جماعتوں نے اپنے

تحفظات کا اظہار کردیا تھا اور یہ بھی اچھا عمل تھا وزیراعظم صاحب کا کہ انہوں نے ان کے تحفظات دور کرنے کی ہداہت کردی تھی کہا جاتا ہے کہ ایک جانب مولانا صاحب سے ترمیم پر تحفظات دور کرنے کے لیے مذاکرات ہورہے تھے تو دوسری جانب قومی اسمبلی میں بل پر رائے شماری شروع ہوچکی تھی۔۲۱ویں ترمیم صرف چار گھنٹے میں بل سے ایکٹ بن کر نافذ ہوگئی۔ یہ کوئی اچھی راویت نہیں وزیراعظم صاحب نے تحفظات دور کرنے کے لیے ٹیم کو ہدایت دی تھیں تو مولانا کے ساتھ ہونے والے نتیجے کا انتظار کرلینا چاہیے تھا۔ اس جگہ مولانا کا غم و غصہ جائز نظر آتا ہے۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں اکیسویں ترمیم کی منظوری اس اعتبار سے متفقہ تھی کہ ایوان میں موجود کسی بھی رکن نے مخالفت میں ووٹ نہیں دیا اور ترمیم اتفاق رائے منظور کرلی گئی۔ قومی اسمبلی میں ۲۴۷ اور سینٹ میں ۷۸ ارکان نے بل اور ترمیم کے حق میں ووٹ دے۔ مولانا فضل الرحمٰن ، جماعت اسلامی نے اسمبلی میں موجود رہتے ہوئے مخالفت میں ووٹ دینا مناسب نہیں سمجھا اور رائے شماری کے وقت بائیکاٹ کیا۔ اسمبلی میں رہتے ہوئے مخالفت میں ووٹ دینا مناسب نہیں سمجھا گویا یہ طریقہ کار 'چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' والا معاملہ رہا۔ گویا صاف مخالفت سے گریز کرنا ہے تجزیہ نگار رؤف طاہر نے اسے انگریزی لفظ abstain سے تعبیر کیا ہے۔ فوجی عدالتیں جمہوریت کی روح کے خلاف ہوتی ہیں ، فوجی عدالتوں کی جمہوری حکومت میں گنجائش ہی نہیں۔ کوئی بھی سیاسی جماعت یا سیاست داں یہ نہیں چاہتا کہ

فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں آئے لیکن پاکستان میں دہشت گردی کے حوالے سے حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ اب یہ کڑوی گولی نگلے بغیر چارا نہیں، مختلف صورت حال میں مختلف فیصلے کرنا پڑ جاتے ہیں۔ دو سال کے لیے فوجی عدالتوں کا قیام ملک کی بقا کے لیے لازمی ہے

یہ فوجی عدالتیں ۶ جنوری ۲۰۱۷ء کو خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔

انسدادِ دہشت گردی کے خلاف قومی ایکشن پلان کی اہم ترین شق 'فوجی عدالتوں' کے قیام کے لیے قانون بن چکا، ہفتوں نہیں بلکہ دنوں میں ہی اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ دوسری جانب قتل و غارت گری کے ملزمان کو پھانسی کا عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔ اسی طرح کے بعد دیگر قومی ایکشن پلان کی دیگر باتوں پر عمل درآمد پر سنجیدگی، ایمانداری، حب الوطنی کے جذبے اور پاکستان کو دہشت گردی کی لعنت سے محفوظ کرنے کے لیے ان پر عمل درآمد کیا جائے تو پاکستان بہت جلد دہشت گردی کی کارروئیوں سے نجات حاصل کر لے گا اور عوام کا امن و سکون دوبارہ لوٹ آئے گا۔ آخر میں اپنی بات صحافی و تجزیہ نگار مظہر عباس کی اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ 'اکیسویں آئینی ترمیم اور آرمی ایکٹ میں ترمیم کے خلاف ایک بھی ووٹ نہیں پڑا۔ اس کے باوجود ہر کوئی (سیاست داں) کچھ آنسوؤں کے ساتھ اور باقی بغیر اس کے شرمسار ہیں ۔ لیکن آپ اس بات پر نادم کیسے ہو سکتے ہیں جس کے حق میں ووٹ دیا؟ جس کے خلاف موقع ملا اور آپ نے ووٹ

نہیں دیا سے کیسے مسترد کر سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ فوجی عدالتیں قانون بننے کے بعد اب آئینی عدالتیں ہیں لہٰذا سیاست دانوں کو اپنے آنسو روک لینے اور دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے کچھ عملی طور پر کرنا چاہیے'۔ رہا سوال تحفظات کا تو یقیناً وہ دور ہو ہی جائیں گے۔ وزیر اعظم بھی یہ بات کہہ چکے ہیں اور شہباز شریف سے مولانا فضل الرحمٰن کی ملاقات میں بھی ان کی شکایات کے ازالے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر دینی جماعتوں کی شکایات بھی دور ہو جاتی ہیں تو یہ آئینی ترمیم زیادہ جامع اور متَنفّس ہو جائے گی اور حکومت و عسکری قوت کو زیادہ قوت کے ساتھ دہشت گردو سے نمٹنے میں سہولت ہو گی۔ (۱۵ جنوری ۲۰۱۵ء)

پروفیسر صابر لودھی بھی اللہ کو پیارے ہوئے

معروف افسانہ نگار فرخندہ لودھی کے بعد ان کے شوہر پروفیسر صابر لودھی بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔انا اللہ وانا علیہ راجعون۔ جنگ اخبار پڑھنا میری پرانی عادت ہے۔ باوجود اس کے کہ بعض اوقات اس میں اشتہاروں کی مارکیٹ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے، کئی بار سوچا کہ اب اسے خدا حافظ کہہ دوں لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں اس کا عادی ہوچکا ہوں۔ حالانکہ میں اس کی بعض پالیسیوں سے بھی اختلاف رکھتا ہوں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میری چھوٹی موٹی تحریریں کبھی کبھار سنڈے میگزین اور میڈ ویک میگزین کی زینت بن جاتی ہیں۔ حال ہی میں اتوار ۱۳ جنوری کے اسپیشل سنڈے میگزین میں میرا مختصر سا مضمون آرمی پبلک اسکول پشاور کی شہید پرنسپل پر بعنوان ''پرنسپل' طاہرہ قاضی: بہادری 'فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال'' شائع ہوا۔ ایک اور اہم بات یہ کہ میں پڑھتا ہوں تو لکھتا ہوں۔ کچھ عرصہ سے میں نے حالاتِ حاضرہ پر اردو کی سب سے بڑی اور معروف ویب سائٹ 'ہماری ویب' پر کالم بھی لکھ رہا ہوں۔ حالاتِ حاضرہ پر کالم لکھنے کے لیے کالم نگاروں کی تحریروں اور تجزیہ کاروں کی آراء کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔مَیں دیگر اخبارات کے کالم کا مطالعہ نیٹ پر کرلیتا ہوں جب کہ جنگ اخبار خرید کر پڑھتا ہوں۔

۱۶ جنوری ۲۰۱۴ء کو شائع ہونے والے کالم پڑھتے پڑھتے کشور ناہید کا کالم ''افضل توصیف اور نجمہ صادق بھی گئیں'' پڑھ رہا تھا۔ان دونوں خواتین کے تذکرے کے بعد کالم نگار کو ایک ادیب کی موت بھی یاد آ گئی، اس ادیب کا نام پڑھ کرمَیں تھوڑی دیر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ اردو کے نامور ادیب، افسانہ نگار، خاکہ نگار اور میرے پروفیسر صابر لودھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔کشور ناہید نے یہ تحریر نہیں کیا کہ ان کا انتقال کب اور کیسے ہوا۔ پہلے کشور ناہید کے مختصر تاثرات بیان کرتا ہوں پھر بات کو آگے بڑھاؤں گا۔کشور ناہید لکھتی ہیں ''یہیں پہ مجھے ایسے ادیب کی موت بھی یاد آ گئی جس نے پورے دو سال اپنی بیوی یعنی فرخندہ لودھی کی خبر گیری کی۔ یہ شخص تھا ڈاکٹر صابر لودھی۔ فرخندہ کے لیے صابر نے نہ دن دیکھا نہ رات دیکھی۔ اس کا ہر کام کپڑے بدلنے سے نہلانے تک، سب وہ اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہر محفل میں دونوں اکٹھے آتے تھے۔ فرخندہ کے رخصت ہونے کے بعد، صابر لودھی مضمحل رہتا تھا۔ کہیں اکیلے جانے سے گریز کرتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا اسٹاف اسے بلاتا، کہتے کہ تھوڑی دیر لائبریری ہی میں گزار لیا کرو۔ مگر فرخندہ کا دکھ اس کی رگوں میں پھیل گیا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بیویوں کے مرنے کے بعد بہت سے شوہر اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتے ہیں۔ ہمارے ادب میں تو ایسی بہت سی مثالیں ہیں''۔ناصؔر کاظمی کا شعر ؎

وُہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا

سدا رہے اس کا نام سُنا ہے کل رات مرگیا وہ

سب سے پہلے تو کشور ناہید کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا کہ ان کے توسط سے مجھے اپنے دوست صابر لودھی کے بچھڑنے کا علم ہوا۔ مختصر سا ذکر اتنا بڑا ادیب خیر یہی کیا کم ہے کہ کسی نے تو ذکر کیا۔ نم آنکھوں، بوجھل دل کے ساتھ کٹک لیے اخبار لیٹا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اب میری سوچوں میں صابر لودھی تھے، ان سے تعلق کی ایک فلم چلنے لگی ۔ میں پریشان تھا کہ کیسے معلوم ہو کہ میرا یہ ادیب دوست کب ، کہاں، کیسے اور کس حال میں دنیا سے رخصت ہوا۔ خیال آیا کہ صابر لودھی کی خاکوں کی کتاب 'بھلایا نہ جائے گا' میرے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے ۔ گو میں نے اپنی تمام تر لائبریری جامعہ اردو کے کتب خانے 'ڈاکٹر مولوی عبد الحق میموریل لائبریری' کو عطیہ کر دی ہے لیکن چند کتابیں اپنے بار بار کے مطالعے کے لیے رکھ لی تھیں ان میں سے ایک صابر لودھی کی یہ کتاب بھی ہے۔ کتاب تلاش ہی کر رہا تھا کہ خیال آیا کہ ان کا موبائل نمبر میرے موبائل میں محفوظ ہونا چاہیے اس لیے کہ میری ان سے متعدد بار بات ہو چکی تھی۔ اپنا موبائل اٹھایا تو ان کا نمبر محفوظ تھا۔ میں نے فوراً ڈائل کیا گھنٹی بجنے سے اندازہ ہوا کہ ابھی ان کا موبائل کسی قریبی کے استعمال میں ہے بند نہیں ہوا۔ 'السلام علیکم کہنے والے نوجوان نے اپنا نام'

سہیب بتایا اور اس خبر کی تصدیق کی کہ لودھی صاحب اب ہم میں نہیں ۔ میرا خیال تھا کہ یہ ان کے بھتیجے ہوں گے لیکن یہ لودھی صاحب کے دوست پروفیسر حق نواز صاحب کے بیٹے تھے۔ بعد میں لودھی صاحب کے بھتیجے عادل خان شہریار بھی آ گئے انہوں نے بھی لودھی صاحب کے رخصت ہوجانے کی تفصیل بتائی۔ لودھی صاحب ۱۳ دسمبر ۲۰۱۴ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۔جب وہ بیمار ہوئے تو خیال تھا کہ دل کا معاملا ہے چنانچہ دل کے ڈاکٹر کا علاج ہوا لیکن بعد میں پتا چلا کے ان کی کمر کے مہرے شدید متاثر ہو چکے ہیں۔ لاہور کے ڈاکٹر حامد عزیز نے ان کی تکلیف کا علاج آپریشن تجویز کیا۔آپریشن بھی ہوا لیکن اسی تکلیف میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ واپڈا ٹاؤن میں رہائش تھی ۔وہیں قبر ستان میں تدفین ہوئی ۔

بکھری ہیں فضاؤں میں اس طرح تری یادیں
جس سمت نظر اُٹھی ' آواز تری آئی

مَیں صابر لودھی سے ان کی شریکِ حیات فرخندہ جو میری ہم پیشہ بھی تھی کے توسط سے متعارف ہوا۔فرخندہ نے ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ مَیں نے اسی ماہ کی ۱۱ تاریخ کو سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ایسو سی ایٹ پروفسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی تھی۔خیال یہی تھا کہ اپنی اولین فرصت میں فرخندہ لودھی کا خاکہ لکھوں گا

لیکن شعبے میں پڑھانے کی مصروفیات، ہاسٹل لائف وہ بھی ریٹائر منٹ کے بعد کی عمر میں، میرے لیے بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا، شہر نیا، لوگوں کے درمیان اجنبی، الغرض بے شمار قسم کی وجوہات آڑے آتی گئیں۔ مصروفیات کے باوجود میں نے فرخندہ کا خاکہ لکھنا شروع کردیا تھا بعض مجبوریوں کے باعث مجھے جامعہ سرگودھا سے رخصت ہونا پڑا اور میں فرخندہ کے ادھورا خاکہ لے کر سعودی عرب چلا گیا۔ سعودی عرب کے شہر جدہ میں میری رہائش تھی جہاں پر میرے عبادت اور پاس پڑھنے اور لکھنے کے علاوہ کچھ نہ تھا ۔ چنانچہ اسی مقدس سرزمین پر فرخندہ لودھی کا خاکہ بعنوان 'فرخندہ لودھی ۔ایک ادیب ایک کتابدار' مکمل کیا۔ یہ خاکہ ماہنامہ 'الحمراء' لاہور، کی جلد ۱۲ شمارہ ۳ مارچ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ یہ میری خاکوں کے مجموعے 'جھولی میں ہیرے اور موتی' میں بھی شامل ہے ۔ یہ کتاب ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ یہ خاکہ اردو کی سب سے بڑی اور معروف ویب سائٹ ''ہماری ویب'' پر آن لائن بھی ہے جس کا یو آر ایل

(http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=41726) ہے۔ فرخندہ لودھی سے میرا تعلق ہم پیشہ ہونے کے علاوہ لکھاری کا بھی تھا وہ معروف افسانہ نگار تھی اور میں لکھاریوں کی فہرست میں اپنے آپ کو سب سے نیچے شمار کیا کرتا ہوں۔ اپنے موضوع کے علاوہ شخصیات میرا محبوب موضوع رہی ہیں۔ لکھتے لکھتے ادب کی کئی اصناف مثلاً خاکہ نگاری، سفر نامہ، رپوتاژ اور اب کالم نگاری بھی کیا کرتا ہوں۔

جامعہ سرگودھا کا ٹیچرس ہاسٹل کا کمرہ نمبر ۵ جہاں میری رہائش تھی فرخندہ کا خاکہ لکھنے کے حوالے سے مَیں پروفیسر صابر لودھی کے خاکوں کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کتاب کا تعارف پڑھا اختتام پر لودھی صاحب کے گھر کا پتا اور فون نمبر درج تھا، میں نے انھیں فون کیا، انھوں نے ہی اٹھایا، مَیں نے اپنا تعارف کرایا، کہنے لگے میں آپ سے بخوبی واقف ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے آپ کی کتابوں کو جو فرخندہ کی کتابوں کی الماری میں رکھی تھیں جھاڑ پونچھ کر دوبارہ وہیں رکھا ہے۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں خاکے بھی لکھ لیتا ہوں، فرخندہ کا خاکہ لکھ رہا ہوں، کتاب میں آپ کا نمبر دیکھا تو سوچا کہ آپ سے بات کروں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ خوش ہوئے، میرا ایڈریس نوٹ کیا کہا کہ فرخندہ پر لکھا ہوا میرا خاکہ جو حال ہی میں چھپا ہے آپ کو بھیج دونگا، اس سے، کافی مدد مل جائے گی۔ ایسا ہی ہوا، چند روز میں مجھے وہ خاکہ مل گیا میری مشکل اور آسان ہو گئی۔ یہ تھی میرے اور پروفیسر لودھی کے ملاپ کی کہانی اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ اکثر فون پر گفتگو ہوا کرتی، میری بیٹی لاہور میں رہتی تھی اب تو جرمنی منتقل ہو چکی ہے چنانچہ لاہور آنا جانا رہتا تھا۔ ایک روز لودھی صاحب کو فون کر کے ان کے گھر واپڈا ٹاؤن پہنچ گیا۔ محبت اور خلوص سے ملے۔ میری خاکوں کے مجموعے کی تعریف بھی کی۔ دورانِ ملاقات فرخندہ مرحومہ کی شخصیت پر گفتگو کے ساتھ ساتھ میں لودھی صاحب کے

سراپا کا جائزہ لیتا رہا اور ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو بھی جاری رہی۔ ڈبلے پتلے، گورے چٹے، صاف ستھری نازک سی شخصیت، دراز قامت، کتابی چہرہ، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، سر پر کھچڑی بال جن میں سفیدی نمایاں، ہلکے رنگ کا قمیض شلوار زیب تن کیا ہوا، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت تحمل وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار، دھیرے دھیرے تسلسل کے ساتھ زیادہ تر فرخندہ کو ہی یاد کرتے رہے۔ پروفیسر لودھی کا یہ حلیہ میری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ بقول عدم ؂
ان سے ملے تو قلب کی تالیف ہو گئی

پروفیسر صابر لودھی کا خاندان بستی پٹھانا (ریاست پٹیالہ) میں آباد تھا۔ وہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ زندگی کی ۸۱ بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۳ دسمبر ۲۰۱۴ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے ضلع انبالہ کے قصبے 'کورالی' سے پاکستان ہجرت کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور (ضلع مظفر گڑھ) سے میٹرک پاس کیا۔ انٹر اور بی اے ایمرسن کالج ملتان سے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں پروفیسر لودھی نے ملتان کی سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کی۔ بعد میں اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ پروفیسر لودھی اردو کے پروفیسر تھے، ایچی سن کالج لاہور سے ۱۹۵۸ء میں لیکچرر کی حیثیت سے

خدمات کا آغاز کیا تھا، مختلف کالجوں (اوکاڑا، مظفر گڑھ) میں خدمات انجام دیں، پروفیسر اردو کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ ناصر کاظمی کا شعر ؂

اُٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

پروفیسر صابر لودھی ۱۵اگست ۱۹۶۱ء کو فرخندہ لودھی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، ۴۹برس فرخندہ کی رفاقت میں اور صرف چار برس اس کی جدائی میں گزرے۔ صابر لودھی نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ 'انھوں نے جس خانوادے میں آنکھ کھولی وہاں صباحت کا راج تھا۔ ملاحت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں''۔ پختون خواہ کی سرزمین جہاں کے لوگ اپنے ظاہری پن میں سرخ سفید، صحت مند اور خوبرو شخص کو 'سانولی سلونی، اداس، سیاہ، متجسس آنکھیں' کیسے بھا گئیں۔ صابر لودھی کو فرخندہ کی متجسس آنکھیں ایسی اچھی لگیں کہ انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انھیں اپنا لیا۔ اس طرح پروفیسر صابر لودھی کو فرخندہ کے روپ میں وہ ملاحت مل گئی جس کو دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں۔ شوہر اور بیوی دونوں سے ادب کی کرنیں پھوٹتیں ہوں، ترسیل علم دو طرفہ ہو تو یہ سونے پہ سہاگہ ہی ہے۔ دونوں کی زندگی کا سفر ادب کی ترویج و ترسیل سے عبارت رہا۔ فرخندہ ترسیل علم کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج میں بھی کردار

ادا کرتی رہی اور صابر صاحب بھی اسی منزل کے شہ سوار رہے۔ یہ دوسری بات بقول صابر لودھی ۔''اصل میں فرخندہ روایتی ہے' یونانی مفکر زینو کی شاگرد اور صابر لودھی یونانی فلسفی اپی غورس کا پیرو ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی سوچ ہے، اپنے اپنے دائرے ہیں، تاہم فرخندہ پرسکون زندگی گزار رہی ہے، اضطراب 'محرومی'شکست کے باوجود پرسکون....اس اطمینان میں اُس کے اپنے فلسفے کا دخل ہے۔میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں 'ساتھ ساتھ چلو' دُور دُور رہو'' سو دونوں دُور دُور رہ کر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں'' ۔ایک اور جگہ پروفیسر صابر لودھی نے لکھا''جب کوئی المیہ ،ماضی کا کوئی دکھ، محرومی کا کوئی احساس ، نارسائی کا کوئی لمحہ اُسے بے کل کر دیتا تو وہ کتھارسس کے لیے لکھنے بیٹھ جاتی اور جب کوئی افسانہ یا ناول کا ایک ٹکڑا مکمل ہو جاتا تو اطمینان کا سانس لیتی، تھک کر لیٹ جاتی یا کسی معصوم بچے سے باتیں کرنے لگتی۔ مجھ سے وہ اجنبی رہتی اور یہ اجنبیت زندگی بھر ہمارے درمیان قائم رہی۔ دونوں ایک ساتھ ، ایک گھر میں اپنے اپنے خیالات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہوئے (وہ کم ، میں زیادہ) ایک.... دوسرے سے خوف زدہ یہی ہماری کامیاب زندگی اور پچاس سالہ رفاقت کا راز تھا''۔ یہ تھی پروفیسر صابر لودھی اور فرخندہ کی ازدواجی زندگی۔ بقول شاعر ؂

ساتھ رہ کے بھی دور ہی رہے ہم تم
دھوپ چھاؤں کی دوستی عجب گزری

پروفیسر صابر لودھی نے افسانے بھی لکھے ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'راوی افسانے' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آیا، وہ دراصل خاکہ نگاری کے بادشاہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ' میں شاعری اور فکشن کو تخلیقی ادب میں شمار کرتا ہوں، فکشن لکھنے والا اپنے کرداروں کے ذریعے شخصیت کی تخلیق کرتا ہے اور خاکہ نگار شخصیت کے وجود سے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ شخصیت کے طلسم کدے سے اپنے فن میں نکھار لاتا ہے'۔ شوہر کی بیوی سے محبت اور عقیدت ، سوچ اور اس پر عمل کا اچھوتا اور خوبصورت انداز تو دیکھئے پروفیسر صابر کہتے ہیں کہ ' ہمارے گھر میں فرخندہ لودھی توانا افسانے اور بناول تخلیق کرتی تھی، اس لیے میں نے اپنے خاکوں کو کبھی اہم نہیں سمجھا۔ انہیں کتاب کی شکل میں محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مگر اب فرخندہ اپنا کام سمیٹ کر صاحب فراش ہوچکی ہے اور مجھے مجبوراً گھر میں مقید ہونا پڑا تو ان بکھرے ہوئے اجزاء کو لڑی میں پرونے کا ارادہ کر لیا'۔ یعنی فرخندہ کے انتقال کے بعد پروفیسر لودھی کے خاکوں کا مجموعہ 'بُھلایا نہ جائے گا' منظر عام پر آیا۔ خاکہ نگاری کے بارے میں مَیں کیا لکھ سکتا ہوں ایک منجھے ہوئے لکھاری جس کا قلم روانی کے ساتھ خوبصورت الفاظ اور جملوں کے موتی بکھیرتا ہوا ایسے رواں دواں رہتا جیسے آسماں سے قوسِ قُزح اتر رہی ہو۔ ان کی شریک سفر فرخندہ نے ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھا تھا کہ

دوستوں کے اصرار پر ان کا خاکہ لکھ دیتے ہیں، خاکہ اڑانے سے احتراز کرتے ہیں، قلم ' کو ایسا کنٹرول میں رکھ کر چلاتے ہیں کہ خاکہ لکھوانے والا باغ باغ ہو جاتا ہے '۔ خاکہ نگار کی خوبی بھی یہی ہے کہ قلم اس کے مکمل اختیار میں رہے اس کی تحریر میں شخصیت کی تضحیک یا مزاق اڑانا نہ ہو بلکہ اس کی ظاہری اور چھپی ہوئی اچھائیوں اور کمزوریوں کو خوبصورت الفاظ میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دے۔ان کی تحریر کا ہر ہر جملہ خوبصورت اور دعوت فکر دیتا نظر آتا ہے ساتھ ہی ادب کی چاشنی لیے ہوتا ہے۔

پروفیسر لودھی اپنے آپ کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی سوچ کی راہیں متعین کرنے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریروں نے مدد کی ہے۔ یہ بات انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا پر تحریر کیے گئے اپنے خاکے 'وزیر آغا۔ نظریہ ساز راوین' میں بیان کی ہے۔ لیکن ان کی شریک حیات فرخندہ لودھی ترقی پسند ضرور تھی لیکن وہ ادب میں گروہ بندی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کا وہ برابر کا احترام کرتی تھی۔ پروفیسر لودھی کا کہنا تھا کہ 'شاعری میں ہی نہیں نثر میں بھی خیال عالم بالا سے اترے ہیں'۔ بقول غالب ۔۔آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں'۔پروفیسر لودھی کو آپریشن سے خوف تھا ۱۹۹۱ء میں انہیں ہرنیا کی تکلیف ہوئی، ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر نے صبح آپریشن کا

مشورہ دیا۔ میں نے سوچا، کل کے بعد کیا ہوگا؟ کس کو خبر؟ اس لیے سکون سے سونے کے بجائے فرخندہ کا خاکہ لکھ ڈالا'۔ دسمبر ۲۰۱۴ء میں بھی ان کا آپریشن ہوا، وہی خوف یقیناً رہا ہوگا لیکن نہیں معلوم آپریشن سے پہلے کی رات انہوں نے کس کا خاکہ لکھا؟ یا پھر اپنے خاکے کے خدوخال تیار کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ کیسے کیسے گنج ہائے گرانمایہ دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ؎

مقدور ہو، تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم !
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے ؟

(جنوری ۲۰۱۴ء ۱۹)

شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز السعود کی وفات

سعودی عرب کے چھٹے فرمانرواخادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ بن عبدلعزیز السعود طویل علالت کے بعد جمعرات اور جمعہ (۲۲ اور ۲۳ جنوری ۲۰۱۵ء) کی درمیانی شب ایک بجے اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ۹۰ سال ۴ ماہ اور ۲۳ دن دنیا میں گزار۔ شاہ عبداللہ کی تدفین سعودی عرب کے دارالخلافہ ریاض میں ان کے آبائی قبرستان 'العود' میں ہوئی۔ شاہ عبداللہ یکم اگست ۱۹۲۴ء میں ریاض ہی میں پیدا ہوئے تھے ۔ نماز جنازہ وتدفین بروز جمعہ بعد نماز عصر عمل میں آئی ۔ شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ کئی اسلامی ممالک کے سربراہان جن میں پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف، مصر کے وزیر اعظم ابراہیم ملہب، سوڈان کے صدر عمر حسن البشیر اور ترکی کے صدر رجب طیب اردگان کے علاوہ ایتھوپیا، خلیجی ریاستوں کے نمائندگان نے شرکت کی۔ شاہ عبداللہ کئی سالوں سے بیمار چلے آرہے تھے۔ ان کی کمر کے مہروں کے کئی آپریشن ہوچکے تھے۔ پھیپھڑوں کی بیماری میں بھی مبتلا تھے۔ اب انہیں نمونیا بھی ہوگیا تھا۔ وہ کئی دنوں سے وینٹی لیٹر پر تھے۔ صحت کی بگڑتی صورت حال نے شاہ عبداللہ کو اس بات پر مجبور کردیا تھا کہ وہ عملی طور پر مملکت کے امور چلانے کی ذمہ داری کسی اور کو سونپ دیں اور ایسا ہی تھا انہوں نے اپنی زندگی ہی میں مملکت کے امور اپنے چھوٹے بھائی

ولی عہد سلمان بن عبدالعزیز کو سونپ دئے تھے۔ کئی سال سے شاہ سلمان بن عبد
العزیز مختلف سرکاری تقریبات میں شاہ
عبداللہ کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔

شاہ عبداللہ سعودی عرب کے ان فرمانرواؤں میں سے تھے کہ جن کا دور حکمرانی تو ۱۰ برس (۲۰۰۵ء تا ۲۰۱۵ء) پر محیط رہا لیکن وہ ۱۹۶۱ء سے سعودی حکومت میں کسی نہ کسی عہدہ پر فائز رہے۔انہوں نے مختلف حیثیتوں میں رہتے ہوئے سلطنت کے امور سر انجام دیے۔ ۱۹۶۱ء میں مکہ شہر کے میئر مقرر ہوئے، ۱۹۶۲ء میں شاہ فیصل نے انہیں سعودی عربین نیشنل گارڈ کا کمانڈر مقرر کیا، وہ ڈپٹی ڈیفنس منسٹر کے عہدہ پر بھی فائز رہے ۔ ۱۹۷۵ء میں نائب وزیراعظم دوم مقرر کیے گئے، ۳ جون ۱۹۸۲ء میں جب شاہ خالد بن عبدالعزیز کا انتقال ہوا اور ان کے سوتیلے بھائی شاہ فہد بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو انھوں نے شاہ عبداللہ کو 'کراؤن پرنس' کے مرتبے پر براجمان کیا۔ شاہ فہد کی وفات کے بعد ۲ اگست ۲۰۰۵ء کو شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز سعودی عرب کے بادشاہ بنے۔ وہ سعودی عرب کے چھٹے بادشاہ تھے، وزرا کی کونسل کے سربراہ اور نیشنل گارڈز کے کمانڈر بھی تھے۔۱۹۹۵ء میں شاہ فہد کو فالج کا شدید حملہ ہوا تو شاہ عبداللہ نے مملکت کے تمام امور شاہ فہد کی جانب سے سرانجام دیے۔ شاہ عبداللہ سعودی عرب کے ان بادشاہوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں بادشاہ بننے سے قبل مملکت کے امور میں کلیدی

کردار ادا کیا۔ مملکت کے امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ انہیں مذہب، تاریخ اور عرب ثقافت کے موضوعات سے خاص دلچسپی تھی۔

شاہ عبداللہ اعتدال پسند لیکن سخت گیر عناصر سے لڑنے والے متحمل مزاج اور صلاح پسند انسان تھے۔ وہ مملکت سعودی عرب کی ترقی کے لیے ابتدا ہی سے سرگرم عمل رہے۔ سعودی عرب کی جانب میلی آنکھ سے دیکھنے والے کو انھوں نے ہمیشہ سخت الفاظ میں للکارااور دوٹوک جواب دیا وہ سعودی عرب کی وحدت کا دفاع کرنے کا نہ صرف حوصلہ رکھتے تھے بلکہ سعودی عرب کی سلامتی کو نقصان پہنچانے والوں سے انتہائی سخت طریقے سے نمٹنے کی پالیسی پر ہمیشہ گامزن رہے۔شاہ عبداللہ دہشت گردی کو ایک مہلک مرض اور عالمی مسئلہ تصور کیا کرتے تھے۔ وہ اسلام کو اعتدال پسندی اور تحمل کا مذہب گردانتے تھے۔ وہ اختلاف کے بجائے اتفاق پر یقین رکھتے تھے۔ اسلامی اتحاد اور اسلامی ممالک کے مابین دوستانہ اور اچھے مراسم چاہتے تھے۔ پاکستان سے انہیں خصوصی محبت اور لگاؤ تھا۔ پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف تھے۔ وہ وزیر اعظم محمد نواز شریف سے خصوصی انسیت و محبت رکھتے تھے۔ چند روز قبل نواز شریف اپنی ٹیم کے ہمراہ عمرہ ادا کرنے بھی گئے۔یقیناان کا مقصد شاہ عبداللہ کی عیادت کرنا بھی رہا ہوگا۔

شاہ عبداللہ کے دور میں سعودی عرب نے تمام ہی شعبہ جات میں ترقی کی۔ لیکن شہروں کو جو وسعت، کشادگی و ترقی شاہ عبداللہ کے دور میں حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاہ عبداللہ نے تعلیم کے شعبے کو خصوصی اہمیت دی اور ملک میں تعلیم کے فروغ اور سعودی نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع فراہم کرنے کے منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ جس کے نتیجے میں سعودی نوجوانوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک سے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ صحت کے شعبے کو شاہ عبداللہ کے دور میں خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ حکومت نے اسپتالوں کے قیام اور ان کے انتظامات بہتر سے بہتر بنانے کے ہر منصوبے کی حوصلہ افزائی کی۔ سعودی عرب میں سعودیوں کے لیے علاج معالجے کی بہترین سہولیات مہیا ہیں البتہ غیر سعودی یا وہ زائرین جو سعودی عرب عمرہ، زیارت یا حج کے لیے جاتے ہیں یا وہ والدین جو وزٹ ویزا پر اپنے بچوں سے ملنے سعودی عرب جاتے ہیں اگر بیمار ہو جائیں تو ان کے لیے علاج کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بیماری کی صورت میں انہیں انتہائی مشکلات اور پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاہ عبداللہ کے دور شہنشاہیت میں سعودی عرب نے معیشت کے میدان میں بھی ترقی کی۔ معیشت نہ صرف مستحکم ہوئی بلکہ معیشت کے شعبے میں متعدد بڑے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچے کچھ پر اب بھی کام ہو رہا ہے۔

شاہ عبداللہ کے قابل تعریف کارناموں میں سے ایک کارنامہ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کی توسیع کے منصوبے ہیں۔ راقم الحروف کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے شاہ عبداللہ کے دورِ حکومت میں چار مرتبہ سعودی عرب جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلی بار ۲۹ مئی ۲۰۱۱ء تا ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء، دوسری بار ۸ فروری ۲۰۱۳ء تا ۸ مارچ ۲۰۱۳ء، تیسری بار ۲۹ نومبر ۲۰۱۳ء تا ۳۰ جنوری ۲۰۱۴ء اور چوتھی بار ۲۰ اگست ۲۰۱۴ء تا ۸ ستمبر ۲۰۱۴ ء۔

اس دوران سعودی عرب کے مختلف شہروں جدہ، مکہ، مدینہ، طائف، جیذان اور رفیفاء میں قیام رہا۔ جہاں پر ہونے والی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ توسیع حرم کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ حرم شریف کی اولین توسیع حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور ۱۷ھ میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸ ہجری میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے توسیع کا کام کرایا۔ اموی خلیفہ امیر معاویہ نے مکہ کی ترقی اور فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک نے کعبتہ اللہ کی حفاظت کے لیے حرم شریف کے چاروں طرف ایک مضبوط پشتہ تعمیر کرایا۔ گورنر مکہ خالد بن عبداللہ نے کعبہ میں کئی ترقیاتی کام کیے۔ عقبہ بن الازرق نے کعبہ میں سب سے پہلے روشنی کا انتظام کیا۔ عہد عباسی میں مکہ کی تعمیر میں بہت کام ہوئے، نہر زبیدہ ان میں سے ایک ہے، خلافت عثمانیہ کے ہر حاکم نے مکہ کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ حرم شریف کی

توسیع کا کام بھی کرایا۔

تمام سعودی فرماں رواں سعودی عرب کی ترقی اور توسیع کے ایک نہ رکنے والے منصوبے پر عمل پیرا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب کا ہر شہر تیزی سے ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ جس شہر میں چلے جائیں ترقیاتی کام بڑے پیانے پر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ سعودی حکمران شاہ عبد لعزیز آلِ سعود نے ۱۳۶۸ھ میں حرم شریف کی توسیع کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ حرم شریف کی تاریخِ توسیع کا اہم ترین منصوبہ تھا۔ اس منصوبے پر بیس سال مسلسل کام ہوتا رہا۔ حرم شریف کی خارجی سمت کی توسیع نہایت اہم تھی اس کا کل رقبہ ساٹھ ہزار مربع میٹر تھا مسجد حرام کی دونوں منزلوں کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں ٹائل لگائے گئے۔ ساتھ ہی عثمانی دور کی تعمیرات کی بھی اصلاح و ترمیم سے سنوارو گیا اور سعودی دور کی توسیع کو عثمانی دور کی توسیع سے باہم ملا دیا گیا۔ مطاف کو بھی وسیع کیا گیا۔ اس میں سفید سنگِ مرمر کا استعمال کیا گیا جس کی خوبی یہ ہے کہ یہ گرمی کی تپش سے گرم نہیں ہوتا۔ زم زم کے کنوے تک پہنچنے کے لیے دروازے لگائے گئے کعبہ شریف کا دروازہ تبدیل کیا گیا جس میں خالص سونے کی پلیٹیں جڑی گئیں جن کا وزن ۲۸۶ کلو گرام ہے۔ اس عظیم توسیع میں صفا و مروا کے درمیانی جگہ بھی شامل تھی۔ دوسری منزل پر بھی سعی کی سہولت فراہم کی گئی۔

سعودی فرمانروا شاہ فہد بن عبد العزیز نے حرم شریف کی توسیع میں ذاتی دلچسپی لی۔ ماہِ صفر ۱۴۰۹ھ میں مزید توسیع کا فوری طور پر حکم دیا۔ ان کے دور میں توسیع کا کام جاری رہا۔ ان کے دورِ حکمرانی میں ''مسعا'' کے درمیانی حصے میں پل نما چھ گزرگاہیں بنائی گئیں۔ نمازیوں کی سہولت کے لیے دوسری منزل پر چڑھنے کے لیے خودکار زینے نصب کیے گئے۔ مسجد حرام کی چھت کو نماز کے قابل بنایا گیا تاکہ وقت ضرورت یہ چھت نماز کے لیے استعمال ہو سکے۔

خادم حرمین شریفین شاہ عبد اللہ بن عبد العزیز مرحوم کے دور حکمرانی میں مسجد الحرام اور مسجد نبوی کے عظیم الشان توسیعی منصوبوں کا آغاز ہوا۔ اس منصوبے پر اخراجات کا تخمینہ 10.7 بلین تھا۔ اس کا افتتاح خود شاہ عبد اللہ نے ۱۹ اگست ۲۰۱۱ء کو کیا۔ حرم شریف کے شمالی و جنوبی صحنوں میں انتہائی توسیع کے منصوبے پر دن رات کام ہو رہا ہے۔ سڑکوں کا نیا جال بچھایا جا رہا ہے۔ اس کے تحت گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کے لیے برقی زینو، خودکار راستوں اور ٹنل کی تعمیر شامل ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد صحن میں دو منزلہ ٹریک جو گولائی میں ہے بنایا گیا ہے جس کی پہلی منزل پیدل چل کر طواف کرنے والوں کے لیے ہے جب کہ دوسری منزل وہیل چیئر پر طواف کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہیلی پیڈ بھی منصوبے کا حصہ ہے تاکہ حرم شریف سے مریضوں کو تیزی کے ساتھ اسپتال منتقل

کیا جاسکے۔اس منصوبے کے علاوہ مکہ المکرمہ کو جدہ کے راستے مدینہ منورہ سے ملانے کے لیے ہائی اسپیڈ ٹرین کے منصوبے پر تیزی سے کام جاری ہے۔اس توسیعی منصوبے کی تکمیل کے نتیجے میں مسجد حرام میں 2.5 ملین لوگ ایک وقت میں نماز ادا کرسکیں گے اور حرم شریف کے شمال اور مغربی صحنوں میں آمد و رفت آسان ہوجائے گی، زائرین ٹریفک کے اژدھام سے متاثر ہوئے بغیر حرم شریف آجاسکیں گے۔میں نے حرم شریف اور مسجد نبوی میں ہونے والی توسیع کو اپنے آنکھوں سے دیکھا۔کام کی نوعیت اور تیزی سے ہونے والی توسیع قابل تعریف ہے۔اس کے علاوہ سعودی عرب کے چار اقتصادی شہروں کے قیام کا منصوبہ، شاہ عبداللہ یونیورسٹی، پرنسس نورا یونیورسٹی شاہ عبداللہ کے عہد حکمرانی کے عظیم منصوبوں میں سے ہیں۔شاہ عبداللہ نے سعودی عدالتی نظام کی تاریخی تشکیل نو کی بھی منظوری دے دی تھی۔خواتین کو ووٹ کا حق اور اولمپکس میں شریک ہونے کا حق بھی شاہ عبداللہ نے دیا۔

شاہ عبداللہ کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ سعودی رسم و رواج کا حصہ تھے اور ان پر سختی سے عمل پیرا بھی تھے۔وہ اپنے والد شاہ عبدالعزیز السعود کے دسویں بیٹے تھے۔سعودی تہذیب و رسم ورواج میں شادیاں کرنا عام سے بات ہے۔شاہی خاندان میں تو اس روایت کو زیادہ ہی پذیرائی حاصل ہے۔کہا جاتا ہے کہ شاہ عبداللہ نے تیس شادیاں کیں جن سے ان کے ۳۵ سے زیادہ

بچے ہیں۔ ان میں لڑکے بھی ہیں اور لڑکیاں بھی۔

شاہ عبداللہ کے انتقال کے بعد سعودی عرب کی بادشاہت کا تاج ان کے ۷۹ سالہ رضائی بھائی شاہ سلمان بن عبد العزیز کے سر سجایا گیا۔شاہ سلمان کو دو سال قبل شہزادہ نائف بن عبد العزیز کی وفات کے بعد ولی عہد کا منصب عطا ہوا تھا۔ شاہ سلمان بن عبد العزیز ۲۰ سال کی عمر میں وزیر بنا دیئے گئے تھے۔وہ ۴۸ سال تک ریاض کے گورنر کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ سعودی عرب کے نئے فرمانروا بننے کے بعد شاہ سلمان نے کہا کہ سعودی عرب کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ انہوں نے کہا کہ تمام مسلمانوں کو متحد ہو کر رہنا چاہیے ، جب کہ سعودی عرب کی سمت میں تبدیلی نہیں آئے گی اور ملک موجودہ سمت میں ہی آگے بڑھتا رہے گا۔ انہوں نے شہزادہ مقرن بن عبد العزیز کو سعودی ولی عہد اور نائب وزیر اعظم اور شہزادہ محمد بن نائف بن عبدالعزیز کو نائب وزیر اعظم دوم کے مرتبے پر فائز کیا۔ان کے علاوہ شاہ سلمان نے اپنے بیٹے کو وزیر دفاع مقرر کیا ہے۔یہ بات نئی اور قابل غور ہے کہ شاہ سلمان بند عبد العزیز کے دور میں پہلی مرتبہ شاہ عبد العزیز کی تیسری نسل اقتدار میں شریک ہو رہی ہے۔

واضح رہے کہ مرحوم شاہ عبد اللہ اس بات کے حق میں تھے کہ ابھی اقتدار شاہ عبد العزیز کے بیٹوں میں ہی رہے۔ لیکن ایسا تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے۔ آج نہیں تو کل ۔ دعا یہ ہونی چاہیے کہ شاہ عبد العزیز اور ان

کی اولادوں میں سرزمین مقدس کے لیے جو عقیدت اور محبت پائی جاتی ہے جو آلِ سعود کا ورثہ بھی ہے آئندہ نسل میں جاری و ساری رہے۔ سعودی عرب کے نئے فرمانروا شاہ سلمان بن عبد العزیز نے اعلان تو کر دیا کہ سابق حکمراں کی پالیسیاں برقرار رہیں گی۔ نئے فرمانروا نے بادشاہ بننے کے فوری بعد جو بیان دیا جس میں کہا گیا ہے کہ سیکورٹی اور استحکام برقرار اور سلطنت کی تمام برائیوں سے حفاظت کرنے میں اللہ' میری مدد کرے'۔ یہ بیان حوصلہ افزا ہے اور نئے بادشاہ کے عزائم کی نشاندھی کر رہا ہے۔

ہماری ویب ’رائیٹرز کلب۔برقی میڈیا کے مصنفین کا ادارہ‘

ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے فروغ اور ترقی کے لیے پاکستان میں بے شمار ادارے کام کررہے ہیں جن کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اردو کے فروغ کے لیے بھی مخصوص ادارے سرگرم عمل ہیں۔اسی طرح ملک میں کتاب کی اشاعت اور کتاب کلچر کو پروان چڑھانے اور مصنفین کو لکھنے اور ان کی تحریروں کو شائع کرنے، ان کی رہنمائی کے لیے بھی کئی ادارے موجود ہیں۔ان اداروں میں انجمن ترقی اردو پاکستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، آرٹس کونسل آف پاکستان، اکادمی ادبیات پاکستان، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مجلس ترقی ادب، اردو اکیڈمی، اقبال اکیڈمی، بزم اقبال، ادارہ یادگار غالب، ادارہ مصنفین پاکستان، مجلس یادگار غالب، جامعہ پنجاب، سندھی ادبی بورڈ، پنجابی ادب اکیڈمی، پنجاب آرٹس کونسل ، ادارہ فروغ قومی زبان کے علاوہ اور بھی کئی حکومتی اور نجی ادارے اردو زبان کے فروغ اور ترقی ، ادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادب میں اپنا ایک منفرد نظریہ پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا وہ ادب پڑھنے اور لکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔ رائیٹر گلڈ اپنا ایک منفرد مقام رکھی ہے۔

کمپیوٹر اور نیٹ کی ایجاد اور جدید ٹیکنالوجی کے عام ہو جانے کے بعد پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ برقی میڈیا (Electronic Media) نے تیزی سے مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ برقی میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ کتب، اخبارات و رسائل جو مطبوعہ شکل میں پڑھے جاتے تھے اب ان کی برقی ہئیت عام ہوتی جارہی ہے۔ تاہم مطبوعہ کتاب کی جو اہمیت ہے اور پڑھنے کا لطف ہے وہ اپنی جگہ مٹھاس لیے ہوئے ہے۔ برقی میڈیا نے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو اخبارات اور رسائل کے مدیران کی منت سماجت کرنے، مہینوں بسا اوقات سالوں اپنی تحریر کی اشاعت کا انتظار کرنے سے آزاد کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کے عام ہو جانے سے لکھنے والوں کو اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے نہ تو اخبارات اور رسائل کے مدیر کے دفتروں کے چکر لگانا پڑتے ہیں، نہ ہی ان کے بے جا نخرے اٹھانا پڑتے ہیں، ان کی ناک بھویں چڑھی ہوئی دیکھنا پڑتی ہے اور نہ ہی مفت میں اپنی نگارش چھاپ کر مدیران کے احسان تلے دبنا پڑتا ہے۔ اب بے شمار ویب سائٹ ایسی معرض وجود میں آچکی ہیں کہ جو لکھنے والوں کی نگارشات کو نہ صرف فوری شائع کر دیتی ہیں بلکہ لکھنے والا ویب سائٹ مینیجر یا مدیر کا سامنا کیے بغیر اپنی نگارش نیٹ پر آسانی سے شائع کرا لیتا ہے۔

برقی ذرائع یا (Electronic sources) ادب کی دنیا میں اپنا منفرد اور مسلمہ

مقام حاصل کر چکے ہیں۔۔برقی ذرائع سے مراد معلومات کے حصول کے وہ ذرائع ہیں جن سے استفادہ کمپیوٹر کے ذریعہ کیا جاسکے یا ان کا مطالعہ کمپیوٹر اسکرین پر کیا جائے۔ ان میں آن لائن ذرائع (Online sources) یعنی ڈیٹا بیسیز (Databases) اور ویب سائٹ (Websites) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ فلاپی ڈسک اور سی ڈیز بھی برقیاتی ذرائع کا حصہ ہیں۔ ان سے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ بہ آسانی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ انگریزی میں ڈیٹا بیسیز یا ویب سائٹ کا استعمال بہت عام اور استعمال بہت آسان ہے لیکن اردو زبان میں مواد کو ویب سائٹ پر محفوظ کرنے اوراس سے استفادہ کرنے میں تاحال مشکلات اور پریشانیاں ہیں۔ برقی دنیا میں اردو ویب سائٹ تعداد کے اعتبار سے اتنی کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں کئی ویب سائٹ بنائیں گئیں ہیں جو اردو میں علمی مواد کو سافٹ شکل میں محفوظ کرنے اور استعمال کی سہولت مہیا کر رہی ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں بھی کئی اداروں نے ایسی ویب سائٹ تشکیل دی ہیں جہاں پر اردو زبان میں کتب، مضامین اور دیگر دستاویزات محفوظ کی جاسکتی ہیں۔ پاکستان میں 'ہماری ویب' ایسی ویب سائٹ ہے جس نے اردو میں لکھنے والوں کو ایک ایسا برقی ذریعہ فراہم کردیا ہے جس سے بے شمار لکھنے والے کئی سالوں سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔

'ہماری ویب' (Hamariweb) کا آغاز آج سے ۸ سال قبل ابرار احمد صاحب نے کیا۔

اسرار صاحب نوجوان ہیں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جملہ رموز کے ماہر بھی۔ صحافت ایک پیشہ بھی ہے اور تجارت بھی اسی طرح برقی صحافت بھی ایک پیشہ ہے لیکن اس میں مہارت کا بڑا دخل ہے، اسے تجارت کا درجہ بھی حاصل ہے۔ ہماری ویب بنیادی طور پر تجارت ضرور ہے لیکن خدمت کا ایک ایسا جذبہ یہاں پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر لکھنے والوں کے لیے برقی پلیٹ فارم مہیا کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے منفرد اور قابل ستائش ہے۔ اسرار صاحب کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار ہیں اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا ولولہ رکھتے ہیں۔ ہماری ویب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ جدید ویب سائٹ ہے جس کا ایک اہم مقصد لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ہے۔ اس ادارے کے بارے میں جاننے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب اس نے اپنے کالم نگاروں کے اعزاز میں ایک پر وقار تقریب کا اہتمام کیا۔ بات ہے مارچ ۲۰۱۴ء کی۔ایک حادثے میں میرے ہاتھ میں فریکچر ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے بھتیجوں کے تعاون سے اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ اس موقع پر ہماری ویب کے سربراہ اسرار احمد صاحب اور ان کی ٹیم خاص طور پر خواجہ مصدق رفیق صاحب سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ انہوں نے اس ادارے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔اس سے قبل میں ہماری ویب سے اس وقت روشناس ہوچکا تھا جب میں جدہ میں تھا۔ یہ بات ہے نومبر ۲۰۱۳ء کی۔ وہیں سے میں نے اپنے مضامین ہماری ویب کو بھیجنا شروع کر دئے تھے اور وہ ہماری ویب کی زینت بن رہے تھے۔ پاکستان آکر بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کی بات ہے

میں پھر جدہ میں تھا اور ہماری ویب پر میرے مضامین کی سینچری ہوچکی تھی۔ جدہ سے ہی میں نے اپنا مضمون 'ہماری ویب پر میرے مضامین کی سینچری' تحریر کیا۔ میرا تعلق ہماری ویب سے مسلسل جڑا رہا۔ میں مضامین ارسال کرتا وہ ہماری ویب میں آجاتے ہیں۔ اب تک یہ تعداد ۱۳۵ ہوچکی ہے۔ ہماری ویب نے اپنے لکھنے والوں کو جب جب یاد کیا میں نے اس کے اجلاسوں میں شرکت کی اور لکھنے والوں کے حوالے سے ہماری ویب کے لیے اپنی تجاویز دیتا رہا۔

کی جانے والی مضامین کی دنیا کی ویبvisit ہماری ویب اس وقت سب سے زیادہ ہی ہے۔ پہلی میٹنگ مارچ ۲۰۱۴ء میں منعقد ''Hamariweb سائٹ ''ہماری ویب ہوئی تھی میں دیگر امور کے علاوہ ہماری ویب کے زیر اہتمام رائیٹرز کلب کے قیام کی ابتدائی گفتگو ہوئی۔ میٹنگ میں موجود احباب نے اس خیال کو پسند کیا اور تعاون کا یقین بھی دلایا۔ اس لیے کہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، بہبود، کتب و مضامین کی اشاعت کے حوالے سے ملک میں بے شمار ادارے قائم ہیں لیکن آن لائن لکھنے والوں کے لیے رائیٹرز کلب 'کا قیام روایتی اداروں سے ہٹ کر جدید ٹیکنالوجی کی دنیا میں پہلا قدم' ہے۔ لکھنے والے جو برقی میڈیا سے وابسطہ ہیں یہ ادارہ ایک خوشگوار احساس کا باعث بنے گا۔ کئی ماہ کے بعد دوسری میٹنگ ۲۰۱۴ کے اختتام پر ہوئی جس میں رائٹرز کلب کے قیام کو حتمی شکل دینے کی منظوری دی گئی۔ تیسری میٹنگ ۱۰ جنوری ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوئی جس میں

ہماری ویب کے تحت رائیٹرز کلب کے قیام اور اس کے ابتدائی عہدیدارں کے ناموں کا اعلان بھی کیا گیا۔ رائیٹرز کلب کی تفصیل نیچے دیے گئے
یو آر ایل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=56246۔

رائیٹرز کلب کے نو منتخب عہدیدران :

چیئر مین ۔۔۔ابرار احمد

صدر۔۔۔۔ڈاکٹر رئیس احمد صمدنی

سیکریٹری۔۔ عطا محمد تبسم

کوآرڈینیٹر۔ محمد اعظم عظیم اعظم

رائیٹرز کلب کے اغراض و مقاصد:

ا۔ رائٹرز کلب کے عہدیداران ہر دو ماہ میں لازمی طور پر ہماری ویب پر لکھنے والوں کی ایک میٹنگ منعقد کیا کریں گے جس میں مختلف ادبی موضوعات کے علاوہ کالم نگاروں کی حوصلہ افزائی کے موضوعات پر بھی گفتگو ہوا کرے گی۔

۲۔ رائٹرز کلب کا کوئی رکن کسی ادبی یا اسی قسم کی کوئی تعمیری سرگرمیوں سے بھرپور تقریب منعقد کرنا چاہتا ہے تو ہماری ویب مکمل تعاون کرتے ہوئے ان کو مدد فراہم کرے گی۔

۳۔ رائٹرز کلب کا کوئی رکن یا لکھنے والا اپنی کوئی کتاب شائع کروانا چاہتا ہو تو ہماری ویب اس سلسلے میں بھی اس سے مکمل تعاون کرے گی، ساتھ ہی کتاب کی تشہیر میں بھی مدد فراہم کرے گی۔

۴۔ ہماری ویب پر لکھنے والے احباب کے تمام تحریری مجموعے پر مشتمل ہر ممبر کی ڈیجیٹل بک کی اشاعت سہ ماہی اور سالانہ بنیاد پر کی جائے گی۔

۵۔ رائٹرز کلب کا کوئی بھی رکن محسوس کرتا ہے کہ کسی اور ادبی، تعلیمی و ثقافتی ادارے کے تحت ہونے والی ادبی یا تعلیمی تقریبات میں ہماری ویب کو بھی شرکت کرنی چاہیے تو وہ ہماری ویب کی انتظامیہ کو آگاہ کرے، تاکہ اس تقریب میں شرکت کو یقینی بنایا جاسکے۔

۶۔ رائٹرز کلب کے اراکین ہماری ویب پر لکھنے والوں کی رہنمائی بھی کریں اور جو لکھنا چاہتے ہیں انہیں اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازیں گے۔

۷۔ رائٹرز کلب کے ذریعے ہماری سیب کے کسی بھی کالم نگار کی کتاب کی رونمائی بھی ممکن ہوسکے گی اور اس تقریب میں کوشش کی جائے گی کہ ادب سے تعلق رکھنے والی اعلیٰ شخصیات کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا جائے۔

۸۔ رائٹرز کلب کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہماری ویب پر لکھنے والے ایک دوسرے سے مستقل رابطے میں رہیں اور ایک دوسرے کو جان سکیں۔

۹۔ رائٹرز کلب کے ممبران مختلف سماجی موضوعات کے حوالے سے تقریب کا انعقاد بھی کرسکیں گے جس پر باقاعدہ رپورٹ بنا کر شائع کی جائے گی اور پریس ریلیز

بھی جاری کی جائے گی۔

۱۰۔ سالانہ رائٹر ایوارڈ کا انعقاد ایڈیٹوریل بورڈ کی نگرانی میں کیا جائے گا۔ جس میں سالانہ بہترین کالم نگار اور شعرا کا انتخاب کیا جائے گا۔

رائیٹرز کلب کے اغراض و مقاصد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلب آن لائن لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی ہر طرح رہنمائی بھی کرے گا۔ نئے لکھنے والوں کو برقی پلیٹ فارم پر اپنی صلاحیتوں کے اظہار پر آمادہ کرے گا۔ کتاب کلچر کے فروغ کے لیے کام کرے گا۔ لکھنے والوں کی برقی کتب وقت کے ساتھ ساتھ مرتب ہوتی جائیں گی جنہیں ہماری ویب پر ایک وقت میں ایک ساتھ پڑھا جاسکے گا۔

ہماری ویب پر مضامین کی تعداد

ہماری ویب پر لکھنے والوں کی تعداد پانچ سے چھ ہزار ہے جو ہر موضوع پر اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کر رہے ہیں۔ مضامین کی تعداد ہر روز بڑھتی جاتی ہے۔ ذیل میں موضوعات کے اعتبار سے دیے گئے اعداد و شمار سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہماری ویب پر مختلف موضوعات پر کس قدر مواد موجود ہے۔ موضوعات اور مضامین کی تعداد حسب ذیل ہے۔ مختلف موضوعات پر مضامین کی تعداد ۲۸ جنوری ۲۰۱۵ء تک کی ہے۔ اس تعداد میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

۱۔ سیاست (Politics) 15824

۲۔ معاشرہ اور ثقافت (Society and Culture) 8266

۳۔ مذہب (Religion) 6622

۴۔ ادب ومزاح (Literature and Humor) 2129

۵۔ متفرقات (Other/Miscellaneious) 2084

۶۔ تعلیم (Education) 1594

۷۔ صحت (Health) 1100

۸۔ معروف شخصیات (Famous Personalities) 969

۹۔ سائنس ٹیکنالوجی (Science & Technology) 935

۱۰۔ سچی کہانیاں (True Stories) 431

۱۱۔ کھیل (Sports) 336

۱۲۔ تعارف کتب (Book Introduction) 322

۱۳۔ ناول (Novel) 302

۱۴۔ شعر وشاعری (Poetry) 247

۱۵۔ بچوں کی دنیا (Kinds Corner) 228

۱۶۔ انٹرٹینمنٹ (Entertainment) 219

۱۷۔ سیر وسیاحت (Travel & Tourism) 179

۱۸۔ کیریئر (Career) 164

۱۹۔ ہنر (Arts) 44

کل تعداد: 41995

ہماری ویب ۔رائیٹرز کلب' کے قیام کا اعلان ایک ای میل کے ذریعہ کیا گیا۔ جس میں ' ہماری ویب ۔رائیٹرز کلب کے عہدیداران کی تفصیل کے علاوہ کلب کے اغراض و مقاصد بھی درج تھے۔ ہماری ویب پر مطالعہ کرنے والے بے شمار احباب نے ہماری ویب کے اس فیصلے کو سراہا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ بہت سے دوستوں نے اپنی آرا سے بھی نوازا۔ان تمام احباب کے شکریہ ، ان کی رائے ہمارے لیے قابل قدر ہے۔

مَیں تو بس ایک لکھاری ہوں۔ گزشتہ چار دہائیوں سے لکھ رہا ہوں۔ جو کچھ لکھا ہے اس کی تفصیل میں یہاں جانے کا موقع نہیں۔ صرف اس قدر بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری نصابی کتب جو پاکستان کے مختلف تعلیمی بورڈوں اور مختلف جامعات کے بی اے کے نصاب میں شامل ہیں کے علاوہ شخصی خاکوں پر مشتمل دو مجموعے 'یادوں کی مالا' اور' جھولی میں ہیرے اور موتی' شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے جد امجد کی شخصیت اور شاعری پر کتاب 'شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت و شاعری' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ میرے مضامین کی تعداد تو ۳۰۰ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ان میں سے ' ہماری ویب' پر ۱۳۵ مضامین آن لائن ہیں۔ ہماری ویب نے میرے

تحریری سرمائے کو برقی فارم میں محفوظ کیا اس وجہ سے میں ہماری ویب سے متاثر ہوتے ہوئے اس کے بلائے گئے اجلاسوں میں شرکت کرتا رہا۔ یہ بات ہر گز ہر گز میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ رائیٹرز کلب میں مجھے کوئی عہدہ لینا ہے۔
ہماری ویب کی تیسری میٹنگ میں شرکت کا مقصد ہماری ویب کے اس کاز (مقصد) کو تقویت دینا تھی کہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ خاص طور پر نئے لکھنے والوں کی اس لیے کہ مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ لکھنے کے بعد اس تحریر کا شائع ہونا کس قدر مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اخبارات اور رسائل کے مدیران نئے لکھنے والوں سے کس طرح کادل شکن طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ اسرار صاحب جو ہماری ویب کے سربراہ اور رائیٹرز کلب کے چیئرمین بھی ہیں نے رائیٹرز کلب کے عہدیداران کا اعلان کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے مجھے اس ادارے کا صدر مقرر کردیا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ معذرت کرلینی چاہیے لیکن اس خیال سے خاموش رہا کہ عزت دی جارہی ہے، اعزاز دیا جارہا ہے انکار کا عمل اللہ کو برا نہ لگ جائے۔ پروردگار نے تو واضح طور پر کہا ہے کہ 'جسے چاہیں عزت دیں جسے چاہیں ذلت دیں'۔ جب اللہ کے بندے عزت دے رہے ہیں تو یہ من جانب اللہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے پروردگار کا شکر ادا کیا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ پروردگار مجھے اس امتحان میں سرخرو کرنا۔ مجھے جس کام کے لیے منتخب کیا جارہا ہے اسے خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی ہمت و طاقت بھی عطا فرمانا۔ حالانکہ میں نے دوسری میٹنگ میں یہ بات کہی تھی

کہ رائیٹرز کلب کے عہدے نوجوانوں اور توانا احباب کو دیے جائیں ۔ میں اور میری عمر کے احباب اپنی زندگی میں اس طرح کے عہدوں سے اچھی طرح عہدہ.برآ ہو چکے ہیں۔ اب خواہش اور تمنا نہیں صدر یا سیکریٹری بننے کی۔ لیکن دوستوں نے پھر بھی ذمہ داری ناتواں کاندھوں پر ڈال دی۔ پروردگار کامیابی دینے والا ہے۔

رائیٹرز کلب عنقریب اپنی سرگرمیوں کا آغاز کردے گا۔ ہماری ویب پر لکھنے والے اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیں۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کو کسی بھی قسم کی مشکل پیش آئے وہ کلب کے کسی بھی عہدیدار سے رابطہ کر سکتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے رابطہ کرنا چاہے تو میرے ای میل

drraissamdani@yahoo.com یا سیل نمبر 03332142076 پر رابطہ کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر رئیس صمدانی

صدر: ہماری ویب ۔رائیٹرز کلب

فرانسیسی اخبار 'ہیبڈو' کے مکروہ عزائم اور مغرب کو اسلام فوبیہ

فرانسیسی ہفت روزہ (چارلی) اخبار 'ہیبڈو' گستاخانہ خاکے شائع کرکے مسلمانوں کے جذبات کو ایک بار پھر مجروح۔ اس مکروہ اخبار نے یہ مکروہ حرکت پہلی بار نہیں کی یہ اس قسم کی بیہودہ حرکت پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ لیکن اسلام دشمنوں کو یہ نہیں معلوم کہ نبی ﷺ کے چاہنے والے اپنی جان دینے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے نبی ﷺ سے اپنے ماں باپ سے بھی بڑھ کر محبت اور عقیدت ہے۔ ان کی شان میں ہیبڈو کے خاکہ نویس نے جو گستاخانے خاکے بنائے اور اخبار نے انہیں شائع کیا، اس کے بعد اس اخبار اور اس کے مدیر کا جو انجام ہونا تھا وہی ہوا۔ مسلمانوں کے دشمنوں نے شدت پسندی کی تو ان کے خلاف بھی شدت پسندی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ کسی فرانسیسی، جرمن، امریکی، آسٹریلین، یہودی، عیسائی، ہندو، سکھ کے لیے یہ بات عام سی ہو سکتی ہے لیکن کسی بھی مسلمان کے لیے ہرگز ہرگز یہ عام نہیں وہ کسی صورت یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا جو حرکت ہیبڈو اخبار نے کی۔ مسلمان اپنی جان تو دے سکتا ہے لیکن اپنے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہر غیر مسلم اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے والی مثال ہے۔ ان گستاخانہ خاکوں سے ہیبڈو کا مدیر کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ اخبار کی سرکلیشن میں اضافہ؟ نہیں یہ

مقصد نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی دل آزاری کرنا، ان کے جذبات کو مجروح کرنا انہیں ٹھیس پہنچانا ہی تھا۔ بد بختوں کا تکبر اور غرور کہہ رہا ہے کہ دیکھو مسلمانوں ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ انتہائی گری ہوئی، پچ، گھنوانی اور گھٹیا حرکت تھی۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں بستا ہو، کوئی سی بھی زبان بولتا ہو، کالا ہو یا گورا، مشرقی ہو یا مغربی، شمالی ہو جنوبی، امریکی ہو یا افریقی، ایشیائی ہو یا یورپی اپنے نبی ﷺ کے نام پر اپنا تن من دھن قربان کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ فرانسیسی اخبار ہیبڈو کے بعد جرمن اخبار 'ہیمبر گرمارگن پوسٹ' نے شاغلے ہیبڈو پر حملے کے بعد فرانسیسی اخبار کی جانب سے شائع کردہ تین گستاخانہ خاکوں کو اپنی ہیڈ لائن میں دوبارہ شائع کیا۔ جس کے نتیجے میں اخبار کے دفتر واقع ہیمبرگ میں گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے اخبار کے دفتر پر حملہ کرکے اسے جلانے کی کوشش کی ۔ حملے میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اخبار کے دفتر کی کھڑکی سے پتھراؤ کیا اور اس کے بعد آتش گیر مواد پھینکا۔ آتش گیر مواد سے عمارت کی نچلی منزلوں میں دو کمروں کو آگ لگنے سے کچھ ریکارڈ جل گیا۔ جرمن وزیر انصاف نے اسلام مخالف ریلی کو منسوخ کرنے کی اپیل کی ۔ جرمنی کے بعد جاپان میں بھی یہی کچھ کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے یہ فیصلہ کر لیا ہے وہ مسلمونوں کی دل آزاری

کرتے رہیں گے۔ لیکن ابھی کچھ ایسے مغربی بھی ہیں جو اس قسم کی حرکت کو اچھا نہیں سمجھتے۔ان کے نذدیک کسی کی دل آزاری اچھا فعل نہیں۔

فرانسیسی صدر کا یہ بیان حقیقت پسندانہ ہے کہ مذہبی جنونیت سے خود مسلمان سب سے زیادہ متاثر ہیں۔فرانسیسی صدر نے چالی ہیبڈو کی اس بیہودہ حرکت کی حمایت نہیں کی اور اس عمل کو مذہبی آزادی کے منافی قرار دیا۔کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ فرانس نے پیرس کے جریدے میں گستاخانہ خاکے کی اشاعت کی شدید مذمت کی ۔ ان کا کہنا تھا کہ ' اظہار رائے کی آزادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ اس کی آڑ میں کسی بھی مذہب کی توہین نہیں کی جا سکتی۔نازیبا زبان استعمال کرنے والوں کو جوابی گھونسے کے لیے تیار رہنا چاہئے '۔اس کے برعکس امریکہ ،برطانیہ آسٹریلیا کو دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات کی کوئی پروا نہیں وہ توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کو 'اظہار رائے کی آزادی قرار دے رہے ہیں ان کی یہ بھی منطق ہے کہ کسی کو بھی اس آزادی کو دبانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے فرانسیسی اخبار چارلی ہیبڈو پر حملے میں ۱۷ افراد مارے گئے ۔ مغرب کے متعصبوں اور مسلمانوں کے مخالف ممالک جن کی تعداد کسی نے چالیس بتائی ، کسی نے ۵۲ اور کسی نے ۴۴ بیان کی اخبار پر حملے

کو انتہا پسندی قرار دیتے ہوئے اظہار یکجہتی کے لیے ان ملکوں کے سربراہوں نے پیرس میں ریلی نکالی اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر مسلم امہ کو یہ پیغام دیا کہ گستاخانہ خاکے اتنی بڑی بات نہیں کہ اس کی سزا اس قدر بڑی دی جائے۔ اس ریلی میں ترک وزیر اعظم اور بعض اسلامی ملکوں کے سربراہ بھی شامل تھے۔ مغرب کی جانب سے ہیبڈو کی حمایت میں اظہار یکجہتی دراصل اسلام سے خوف اور اسلام فوبیہ ہے انہیں یہ ڈر اور خوف ہے کہ کہیں دنیا کے مسلمان یک جانہ ہو جائیں، اگر ان میں اتحاد اور اتفاق قائم ہوگیا تو وہ مغرب کے لیے مشکلات پیدا کردے گا۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ دنیا کے مسلمان تمام امور پر الگ الگ ہو سکتے ہیں، ان کی سوچ میں اختلاف ہو سکتا ہے، بعض معاملات میں وہ دست و گریباں بھی ہو سکتے ہیں لیکن ناموس رسالت ﷺ کی جب بات آتی ہے تو کسی مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دینے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ نہ صرف ایک ہیں بلکہ اپنے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو منہ توڑ جواب دینے کا مکمل عزم رکھتے

ہیں۔

مغرب کی جانب سے اظہار یکجہتی ریلی کے لیے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ یہ اظہار یکجہتی ریلی نہیں بلکہ یہ اسلام سے اظہار نفرت ریلی تھی۔ ۱۷ افراد کی موت پر مغرب کا واویلا سمجھ سے باہر ہے۔ مغرب نے اس بات سے اپنی آنکھیں بند

کرلی کہ ییبڈو اخبار نے دنیا بھر کے مسلمانوں کی دل آزاری کی ، انہیں تکلیف پہنچائی اس کے برخلاف مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کا اظہار کرنا کھلا مزاق اور حقیقت کے برخلاف اقدام کو فروغ دینا ہے۔ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اظہار یکجہتی میں شامل مغربی ممالک کے سربراہان کو ییبڈو کے مدیران سے اظہار یکجہتی کے لیے اپنے ملک سے فرانس کھینچ لایا انہیں عراق اور افغانستان میں شہید ہونے والے مسلمانوں پر اظہار افسوس کرنا بھی مناسب نہ لگا، فرانس میں الجزائر باشندوں کا قتل یاد نہ رہا، غزہ میں ہزاروں فلسطینیوں کو شہید کردینا بھول گئے، میانمار میں روہنگیا مسلمانوں کی شہادت اور مقبوضہ کشمیر میں کشمیریوں پر بھارتی مظالم مغرب کو نظر نہیں آتے۔ مغرب کی آنکھوں پر مسلمان دشمنی اور تعصب کی عینک لگی ہوئی ہے۔ انہیں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم نظر نہیں آتے ، انہیں مسلمانوں کی دل آزاری نظر نہیں آتی۔ درحقیقت یہ اسلام فوبیہ ہی تو ہے جس کا مغرب شکار ہے۔فرانس میں مغربی ممالک کے سربراہان کو ییبڈو پر حملہ کرکے گستاخانہ خاکے بنانے اور شائع کرنے والوں سے اظہار یکجہتی کرنے میں دیر نہیں لگائی ، مغربی میڈیا نے اس اظہار یکجہتی کو خوب خوب بڑھا چڑھا کر بیان اور نشر بھی کیا لیکن مغربی میڈیا کو دنیا کے بے شمار ممالک کے کروڑوں عوام جنھوں نے گستاخانہ خاکوں کے خلاف آواز بلند کی اور ییبڈو کی گھنوانی حرکت پر اظہار مذمت کیا نظر نہیں آیا۔ مسلمانوں کے دشمن مل کر اظہار یکجہتی کریں

تو وہ مغربی میڈیا کے نزدیک واہ واہ ہے۔ مغرب کا یہ دوہرا کردار مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے۔

حالات کا تقاضہ ہے کہ اقوام متحدہ تمام اقوام اور مذاہب کے چیدہ چیدہ نمائندوں کو ایک میز پر بٹھا کر انہیں شدت پسندی، مذہبی منافرت، ایک دوسرے کے مذہب اور عقیدے کے خلاف شدت پسندی کو روکنے کے لیے عالمی قوانین تشکیل دیئے جائیں۔ جن کی رو سے کسی بھی مذہب اور مذہب کے پیشواؤں پیغمبروں اور انبیائے کرام کی کسی بھی طرح اہانت کو قابل جرم قرار دیا جائے۔ یہ قوانین دنیا کے تمام اقوام اور ممالک کے لوگوں پر بلا تفریق لاگو ہوں جو کوئی انفرادی طور پر، اجتماعی طور پر یا کسی بھی طریقے سے ان کی خلاف ورزی کرے اس کا سختی کے ساتھ مواخذہ کیا جائے۔ اس ملک کو جس کا وہ شہری ہو مجبور کیا جائے کہ وہ اسے اس عالمی قانون میں دی گئی سزا پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔

کیا ’پاکستان‘ سعودی حکمراں شاہ سلمان کا بھی دوسرا گھر ہوگا

سعودی عرب کے شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز مرحوم کی پاکستان سے محبت اور چاہت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ پوری امت مسلمہ سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ وہ پاکستان کو اپنا بھائی اور دوسرا گھر سمجھتے تھے۔ پاکستان سے محبت اور تعلق کا اظہار انھوں نے متعدد بار دوٹوک انداز میں کیا۔ انھوں نے اپنے عمل سے بھی یہ ثابت کیا کہ وہ واقعی پاکستان کے عوام سے محبت رکھتے ہیں۔ پاکستان نے ہندوستان کے جواب میں ایٹمی دھماکے کیے تو پورا مغرب پاکستان سے ناراض اور اقتصادی پابندیاں عائد کرنے پر آمادہ تھا اس نازک اور مشکل وقت میں ساتھ دینے والا ملک سعودی عرب اور حمایت کرنے والے شاہ عبداللہ ہی تھے۔ پاکستان کو ’ڈیفرڈ ادائیگی‘ پر تیل فراہم کرنے والے شاہ عبداللہ ہی تھے جنھوں نے دنیا کی پروا کیے بغیر پاکستان کو تنہا نہیں چھوڑا اور اعلانیہ، بلا ڈر و خوف پاکستان کا ساتھ دیا۔ ڈیفرڈ ادئیگی پر تیل کی فراہمی تقریباً مفت میں تیل کی فراہمی کے برابر تھی۔ اقتصادی طور پر پاکستان کے لیے یہ مشکل گھڑی تھی، دنیا کے اکثر ممالک ایٹمی دھماکوں پر پاکستان سے خوش نہ تھے۔ بہت سے ملکوں نے پاکستان کی امداد بند یا مختصر کردی تھی۔ اس مشکل وقت میں شاہ عبداللہ کا پاکستان کی حمایت کرنا اس بات کا ثبوت ہی تو تھا کہ وہ پاکستان کو اپنا

دوسرا گھر تصور کرتے تھے۔ اُس وقت شاہ عبداللہ نے جس وقت کہ وہ بھارت کے دورہ پر تھے کسی صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ 'پاکستان کے لیے زندگی اور موت کے اس مرحلے پر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم اسے تنہا چھوڑ دیں گے'۔ شاہ عبداللہ مرحوم سعودی عرب کے ان سربراہان میں سے تھے کہ جنھیں نیک نام اور اچھے بادشاہ کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ شاہ عبداللہ نے شاہ فہد بن عبدالعزیز کی زندگی میں ہی مملکت کے امور چلانا شروع کردیے تھے۔ ان کی پاکستان دوست پالیسیاں ڈھکی چھپی نہیں تھیں بلکہ وہ کھلے بندو پاکستان سے اظہار ہمدردی اور چاہت کا عملی مظاہرہ کرتے تھے شاہ عبداللہ کے دور حکومت میں پاکستانیوں کو جو سعودی عرب میں ملازمت کررہے تھے اور پاکستانی جو سعودی عرب ملازمت کے سلسلے میں جانا چاہتے تھے کے لیے خصوصی احکامات جاری کیے تھے۔ سعودی عرب میں مقیم پاکستانی شاہ عبداللہ مرحوم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سعودی عرب کے نئے بادشاہ شاہ سلمان بن عبدالعزیز السعود کے اقدامات کس قسم کے ہوں گے کیا وہ شاہ عبداللہ کی پالیسیوں کو ریاست میں جاری و ساری رکھیں گے یا ان کی پالیسیاں مختلف ہوں گی؟۔ خصوصاً پاکستان کے حوالے سے ان کا طرز عمل کس قسم کا ہوگا؟۔ عالمی معاملات اور دیگر ممالک سے تعلقات میں شاہ عبداللہ کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہوں گے یا نہیں لیکن یہ بات یقین سے کہی

جاسکتی ہے کہ پاکستان کے معاملات میں ان کا رویہ اور عمل شاہ عبد اللہ سے مختلف نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ شاہ سلمان ،شاہ عبد اللہ کی زندگی میں ہی سلطنت کے معاملات میں عملی طور پر سرگرام ہوگئے تھے اگر انہیں پاکستان سے کسی بھی قسم کا اختلاف ہوتا تو وہ اختلاف شاہ عبداللہ کی زندگی میں ہی سامنے آنا شروع ہوجاتا۔ شاہ سلمان بھی پاکستان کے ہمدردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

شاہ سلمان بن عبد العزیز نے تختِ شاہی پر براجمان ہوتے ہی جو بیان جاری کیا اس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔ ’سیکورٹی اور استحکام برقرار رکھنے اور سلطنت کی تمام برائیوں سے حفاظت کرنے میں اللہ میری مدد کرے‘۔ شاہ سلمان کا یہ بیان ان کے عزائم اور مستقبل کے رویے کی غمازی کرتا ہے۔ وہ نہ صرف سعودی عرب کو مستحکم بنیادوں پر آگے لے کر چلیں گے بلکہ شاہ عبد اللہ کے پیروکار کے طور پر کام کریں گے۔ تاہم ریاست کے لیے بعض تبدیلیاں لازمی کرنا ہوں گی ، وہ انہوں نے کیں اور آئندہ مزید سامنے آئیں گی۔ ان تبدیلیوں کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ وہ شاہ عبد اللہ سے مختلف سمت میں چلیں گے بلکہ بعض تبدیلیاں نئے آنے والے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔شاہ سلمان نیک اور صالح انسان ہیں۔ ان کے صالح ہونے اور جرات کے اظہار کے لیے یہ واقع ہی کافی ہے کہ دنیاکے سب سے بڑی قوت امریکہ کے صدر اوباما کو گارڈ آف آنر کی تقریب کے دوران نماز کی ادائیگی کے لیے تقریب سے اٹھ کر چلے جانا، پھر ان کے ہمراہ تقریب میں موجود

تمام سعودیوں کا شاہ کے ساتھ اٹھ کر چلے جانا شاہ سلمان کی دین سے گہری وابستگی اور تقویٰ کا مظہر ہے۔ گو ہر مسلمان کو ہی یہ عمل کرنا چاہیے لیکن طاقت اور قوت کے پہاڑ کے سامنے بڑے بڑے سر جھکائے یہ وقت خاموشی سے گزار دیتے ہیں۔

شاہ سلمان دو سال قبل شہزادہ نائف بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد ولی عہد کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ شاہ سلمان ابھی صرف ۱۹ برس کے تھے کہ انہیں ۱۹۵۴ء میں ریاض شہر کا میئر بنا دیا گیا تھا۔ ایک سال بعد ہی یعنی ۲۰ سال کی عمر میں انہیں وزیر کا منصب عطا کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب کہ ان کی عمر ۲۷ برس تھی انہیں ریاض شہر کا گورنر بنا دیا گیا۔ شاہ سلمان کا یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ۴۸ سال (۱۹۶۳ء تا ۲۰۱۱ء) ریاض شہر کے گورنر رہے۔ ریاض شہر کو ایک چھوٹے اور دیہات نما شہر سے دنیا کے جدید اور ترقی یافتہ شہروں میں سے ایک شہر بنا دینا شاہ سلمان ہی کا کارنامہ ہے۔ ۵ نومبر ۲۰۱۱ء کو انہیں وزیر دفاع کا قلم دان سونپا گیا اور ۱۸ جون ۲۰۱۲ء کو اپنے بھائی شہزادہ نائف کے انتقال کے بعد ولی عہد کا منصب عطا ہوا اور پھر شاہ عبد اللہ کے انتقال کے بعد سعودی فرماں روا بنے۔

سعودی روایت ہے کہ جب خوشی کے موقع پر اپنی عوام کو بھی خوش کرتے ہیں۔ شاہ

عبداللہ مرحوم صحت یاب ہوئے تو انہوں نے سعودی عرب کے ملازمین کو ریالوں کے انعام واکرم سے نوازا۔ موجودہ شاہ سلمان نے اقتدار سنبھالا تو یہ بھی ایک خوشی کی بات تھی چنانچہ تمام ملازمین کو دو ماہ کی تنخواہ دینے کا اعلان کیا ہے۔جب کہ طلباء اور ریٹائرڈ ملازمین کو بھی اسی طرح بونسز دیے جائیں گے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے جو شاہ سلمان نے قائم رکھی۔ شاہ سلمان نے اقتدار سنبھالتے ہی مملکت کے امور میں ردو بدل کرتے ہوئے سعودی کابینہ میں پرانے چہروں کی جگہ نئے چہروں کو شامل کرنے کے اقدامات شروع کر دیے ہیں۔ سابق شاہ عبد اللہ کے دو بیٹوں شہزادہ مشعال جو مکہ کے گورنر تھے اور شہزادہ ترکی جو دارالحکومت ریاض کے گورنر تھے کو برطرف کر دیا گیا۔اسی طرح انٹیلی جنس سربراہ اور قومی سلامتی کے سیکریٹری اور مذہبی پولس کے سربراہ کو بھی تبدیل کر دیا گیا ہے۔جب کہ شاہ عبد اللہ کے تیسرے بیٹے شہزادہ متعب نیشنل گارڈ کے انچارج وزیر کی حیثیت پر برقرار رہے۔اسی طرح ثقافت، اطلاعات، سماجی امور، سول سروس، انفارمیشن ٹیکنالوجی جیسی وزارتوں پر نئے چہرے سامنے لائے گئے ہیں۔ اسی طرح بندرگاہ اور قومی انسداد کرپشن کمیشن کے سربرہوں کو کو بھی فارغ کر دیا گیا ہے۔شاہ سلمان نے اپنے ٹیوٹر اکاؤنٹ پر عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ’آپ اس سے بھی زیادہ کے حقدار ہیں جو میں آپ کو نہیں دے سکتا‘۔ان تبدیلیوں سے سعودی عرب مزید ترقی کرے گا اور وہاں کی معیشت اور مستحکم ہو گی۔

سعودی پریس ایجنسی کے مطابق شاہی فرمان کے مطابق خالد بن بندر بن عبد العزیز کی جگہ جنرل خالد بن علی کو ملک کے خفیہ ادارے کا نیا سربراہ مقرر کیا گیا ہے جن کا عہدہ وزیر کے برابر ہوگا۔ اسی طرح شاہ عبداللہ کے بھتیجے اور امریکہ میں ۲۲ سال تک سعودی عرب کے سفیر رہنے والے شہزادہ بندر بن سلطان کو قومی سلامتی کونسل کے سیکریٹری جنرل اور بادشاہ کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔ شاہ سلمان نے اپنے بیٹے محمد بن سلمان کو ملک کا نیا وزیر دفاع اور شہزادہ مقرن کو ولی عہد اور وزیر داخلہ ، شہزادہ محمد بن نائف کو نائب ولی عہد مقرر کیا ہے۔ شہزادہ مقرن سعودی نسل کی نئی نسل کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے شاہی تخت جانے والی سیڑھی پر قدم رکھا ہے اور شاہی انتظامی ٹیم میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا ہے۔

سعودی عرب کی پاکستان سے دوستی رسمی، عارضی، مصلحت کی دوستی نہیں بلکہ پاکستان اور سعودی عرب کے عوام ایک دسرے سے روحانی تعلق کے تحت باہم جڑے ہوئے ہیں۔ پاکستانیوں کے وجود کا مرکز و محور مکہ ان کی روح ہے تو مدینہ میں ان زندگی ہے۔ پاکستان اپنی روح اور زندگی کے بغیر ادھورے ہیں۔ وہ ان دونوں کے بغیر نہ مکمل اور کچھ بھی نہیں۔ سعودی عرب اس بات کو بخوبی سمجھتا۔ شاہ عبد اللہ ہی نہیں بلکہ ان سے پہلے تمام سعودی سربراہوں نے پاکستان کے

اس تعلق کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاہ فیصل بن عبد العزیز السعود (۱۹۰۶ء۔ ۱۹۷۵ء) بھی پاکستان سے اتنی ہی محبت کیا کرتے تھے اس کا ثبوت فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی براہی کانفرنس تھی جس میں شاہ فیصل کے علاوہ معمر قذافی، یاسر عرفات کے علاوہ متعدد اسلامی ممالک کے سربراہان نے شرکت کی تھی۔ سعودی عرب کے دیگر سربراہان نے مختلف مواقع پر پاکستان کے موقف کی برملا حمایت کی۔ دونوں ممالک او آئی سی Organization of Islamic Coopertation (OIC) کے سرگرم رکن ہیں اور دونوں ممالک نے اس ادارے تحت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا سعودی عرب نے پاکستان کی حمایت کی وہ ہندوستان کے طرز عمل سے خوش نہیں تھا اور پاکستان سے ہمدردی رکھتا تھا۔ کشمیر تنازع میں پاکستان کے موقف کا حامی رہا ہے۔ دہشت گردی میں پاکستان کی کھل کر مدد کی اور کر رہا ہے۔ان کے علاوہ دیگر بے شمار معاملات میں سعودی عرب اور پاکستان باہم ساتھ رہے ہیں۔پاکستان بھی سعودی عرب کی مدد کرنے میں جب کبھی ضرورت پڑی کبھی پیچھے نہیں رہا۔

پاک، سعودی تعلقات میں پاکستان کے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کی شخصیت بھی اہم رہی ہے۔ میاں صاحب کا جیل سے سعودی عرب جانا وہاں قیام کرنا شاہ عبداللہ کے دور میں ہی ممکن ہوا اور یہ عمل میاں صاحب اور شاہ عبد اللہ کی قربت

کی نشاندھی کرتا ہے۔ میاں صاحب کے علاوہ پاکستان کے سابق فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف اور شاہ عبداللہ کے مراسم بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ایک جانب شاہ عبد اللہ میاں صاحب کے دوست تھے تو دوسری جانب پرویز مشرف کی بعض خوبیوں اور اقدامات نے شاہ عبد اللہ کو پرویز مشرف کا قریبی دوست بنا دیا تھا۔ تب ہی تو خصوصی طیارہ کراچی ائر پورٹ پر پرویز مشرف کے انتظار میں کھڑا رہا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاہ عبد اللہ کے پاکستانی شخصیات سے ذاتی نوعیت کے مراسم کے اثرات موجودہ سعودی قیادت پر بھی پڑیں گے یا نہیں۔ جیسا کہ کہا جارہا ہے کہ نئے پرنس بعض معاملات میں نواز شریف سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن شخصیات آنی جانی ہوتی ہیں، شخصیات کے کیے ہوئے فیصلے اہم اور دور رس ہوتے ہیں ان کے اثرات کئی نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ شاہ سلمان انتظامی و اصلاحات کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، سعودی خاندان میں سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کے حامل ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سابق سعودی شاہ ان کے مشوروں سے مستفیض ہوا کرتے تھے۔ امید یہی ہے کہ شاہ عبداللہ کی پاکستان سے خصوصی محبت اور چاہت کا عمل شاہ سلمان بن عبد العزیز اور ان کے بعد بھی جاری و ساری رہے گا اور پاکستان شاہ سلمان بن عبد العزیز السعود کا بھی دوسرا گھر ہو گا۔ (۳ مارچ ۲۰۱۵ء)

حکیم محمد سعید پر پی ایچ ڈی تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار"۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی، یہ مکالمہ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ہوا۔ پیشہ ورانہ موضوعات اور شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت پر آپ کی رائے آج بھی اہم ہے اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے)

تعارف :

فرحت اللہ بیگ اس وقت پاکستان لائبریرین شپ کے بزرگ ترین لائبریرین ہیں جو فضل تعالی اپنی زندگی کے ۹۰ برس مکمل کر چکے ہیں۔ پاکستان میں آپ کی لائبریری خدمات ۵۶ برسوں پر محیط ہیں۔ آپ ۱۹۷۴ء میں خیر پور پبلک لائبریری سے ریٹائر ہوئے۔ راقم الحروف نے آپ سے بروز جمعرات ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ء آپ کی قیام گاہ واقع ناظم آباد میں ملاقات کی اور تحقیقی موضوع کی مناسبت سے گفتگو کی۔ آپ کی صحت بہتر ہے، چل پھر لیتے ہیں لیکن آپ کی یادداشت اور قوت سماعت عمر

کے باعث متاثر ہو چکی ہے پھر بھی آپ نے اپنے ماضی کی یادداشتوں کو بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بیگ صاحب نے بتایا کہ میرا تعلق دہلی سے ہے، میں دہلی ہی میں اگست ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا اور اب میری عمر ۹۰ برس ہو چکی ہے۔ آپ نے ہندوستان ۱۹۴۸ء) لا ó سے ماسٹر کیا اور دہلی کی ہارڈنگ پبلک لائبریری میں ۱۳ برس (۱۹۳۵ء ئبریری خدمات انجام دیں۔ آپ نے بتایا کہ ہارڈنگ لائبریری میں ڈاکٹر رنگاناتھن کی سرپرستی میں ایک ورکشاپ منعقد ہوا تھا انہوں نے اس ورکشاپ میں شمولیت اختیار کی۔ ہارڈنگ لائبریری ہندوستان میں لائبریری سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالمعید نے بھی اسی لائبریری سے لائبریری سائنس کی تربیت حاصل کی تھی۔ آپ نے بتایا کہ معید صاحب سے ان کی پہلی ملاقات دہلی کی اسی لائبریری میں ہوئی تھی۔ انہی دنوں اس لائبریری میں آل انڈیا لائبریری کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ جس کے انتظامی امور میں بیگ صاحب نے بھرپور کردار ادا کیا۔

لائبریری میں اپنی ملازمت کے بارے میں آپ نے بتایا کہ ڈپٹی سیکریٹری تعلیم اختر حسین رائے پوری تھے انہوں نے آپ کا تقرر بحیثیت لائبریرین سیکریٹریٹ لائبریری جو اس وقت قومی لائبریری بھی تھی) کے کر دیا۔ میں جب اس لائبریری میں آگیا تو) یہ لائبریری کراچی کے لائبریرینز کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ میرے پاس تمام لوگ جمع رہتے۔ کراچی میں لائبریری سر

گرمیوں کی ابتدا اسی سیکریٹیریٹ لائبریری سے ہوئی جس نے ایک قومی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ آپ نے بتایا کہ ان لوگوں میں جن کی کوششوں سے پہلے کراچی لائبریری ایسو سی ایشن، اسکول آف لائبریرین شپ، پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ اور پھر قومی انجمن پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن قائم ہوئی، ڈاکٹر عبدالمعید، فضل الٰہی، سید ولایت حسین شاہ، محمد شفیع، جمیل نقوی، ابن حسن قیصر، نور محمد خان، اختر ایچ صدیقی اور وہ خود شامل تھے۔ آپ نے کہا کہ ہم نے مل کر لائبریرینز اور لائبریری پروفیشن کی ترقی کے منصوبے تشکیل دیئے۔

آپ نے بتایا کہ ۱۹۵۵ء میں میرا تقرر خیر پور پبلک لائبریری کے لائبریرین کی حیثیت سے ہوگیا۔ یہ برصغیر کی ایک قدیم پبلک لائبریری تھی۔ بیگ صاحب نے اس لائبریری میں ۱۹ جولائی ۱۹۵۵ء سے ۷ اگست ۱۹۷۱ء تک خدمات انجام دیں۔ اس لائبریری کا موجودہ نام سچل سرمست سندھ گورنمنٹ پبلک لائبریری ہے۔ ۱۹۶۱ء میں بیگ صاحب آسٹریلیا تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ خیر پور میں قیام کے دوران بیگ صاحب نے ۱۹۷۰ء میں سندھ لائبریری ایسو سی ایشن کی بنیاد بھی رکھی۔

کی سرگرمیوں کے بارے میں بیگ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ملک کی وہ (SPIL) اسپل

واحد انجمن ہے جس نے ملک کے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے علاقوں میں بھی عوام میں لائبریری شعور پیدا کرنے کی جدوجہد کی۔ اسپل نے ۱۹۶۶ء میں ملک کے تین شہروں حیدرآباد، سکھر اور کوئٹہ میں اسکول لائبریری ورکشاپ منعقد کیا۔ کسی بھی لائبریری انجمن کی جانب سے ملک میں ۲۰ روزہ ورکشاپ اپنی نوعیت کی اولین مثال تھی۔ شعبہ لائبریری سائنس، جامعہ کراچی کے اساتذہ محمد جہانگیر مرحوم، ڈاکٹر غنی الا کرم سبزواری اور عارف الدین صاحب ان شہروں میں لائبریرینز کی تربیت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس دوران اسپل کی جانب سے ہماری لائبریری میں بھی ایک ورکشاپ رکھا گیا۔ اس موقع پر ورکشاپ کے شریک طلبہ نے خیر پور پبلک لائبریری کا مطالعاتی دورہ بھی کیا۔

اس موقع پر خیر پور ڈویژن میں اسکول لائبریریز کے فروغ اور ترقی کے لیے ''اسکول لائبریری ایسوسی ایشن'' کا قیام عمل میں آیا اور مجھے اس ایسوسی ایشن کا چیرمین مقرر کیا گیا۔ بیگ صاحب نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ حکیم صاحب نے سکھر کی جنرل لائبریری کی سو سالہ تقریبات میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ان کی کتب خانوں سے محبت ہی تو تھی کہ وہ اندرون شہر بھی کتب خانوں میں جایا کرتے تھے۔

یہ انٹرویو بروز جمعرات ۳۰ ستمبر ۲۰۰۴ء بیگ صاحب کی رہائش گاہ واقع ناظم آباد میں) لیا گیا(

کڑوا سچ بولنے والا کھرا انسان' چودھری محمد سرور

کڑوا سچ بولنے والے کھرے انسان چودھری محمد سرور ۲۹ جنوری کو گورنر ہاؤس پنجاب سے رخصت کر دیے گئے۔آج انہیں مستعفی ہوئے صرف ۱۰ واں دن ہے ان مختصر سے دنوں میں چودھری صاحب کے حوالے سے کالم نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے انہیں اپنا موضوع بنایا۔تاحال میری نظر سے کوئی ایک کالم بھی ایسا نہیں گزرا جس میں کسی کالم نگار نے چودھری صاحب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہو، ان کی خامیاں گنوائی ہوں، انہیں ناکام منتظم قرار دیا ہو، سیاست کرنے والا گورنر لکھا ہو، حکومت کے خلاف کسی اقدام کا ذکر کیا ہو۔ البتہ نواز شریف کا دم بھرنے والے ، اپنے کالموں میں نواز شریف حکومت کو دنیا کی سب سے کامیاب حکومت قرار دینے والے کالم نگاروں نے اتنا کرم کیا کہ وہ اس موضوع پر خاموشی اختیار کیے رہے۔ جیسے چودھری سرور کوئی عام سا انسان تھا، حکومت نے کہا چلے جاؤ اور وہ چلا گیا۔ یہ بھی ان کالم نگاروں کی چودھری سرور کی سچائی ، ایمانداری اور نیک نامی کے حق میں فیصلہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر چودھری صاحب کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ سن گن ہے ہمارے کالم نگار مظہر برلاس کا خیال ہے کہ ' چودھری سرور کی اگلی منزل تحریک انصاف ہے '۔ کوئی پیپلز پارٹی تو کوئی انہیں جماعت اسلامی میں شامل کرنا چاہتا ہے۔

اگر ایسا ہوا تو اب تک خاموش رہنے والے کالم نگار چودھری سرور کو کسی صورت نہیں بخشیں گے اور ان پر یہ الزام یقینا لگے گا کہ وہ دورانِ گورنری اندرون خانہ کپتان کے لیے ہمدردی رکھتے تھے۔ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری سے دوستی اور ان سے میل ملاقات بھی کپتان سے تعلق کی ایک کڑی تھی۔

چودھری سرور پر خواہ کچھ بھی الزام لگایا جائے لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ پاکستان کے لیے حقیقی معنوں میں محبت رکھتے ہیں، عوام کی فلاح چاہتے ہین، سچے اور ایماندار ہیں۔ انہوں نے پنجاب کی گورنری کے دوران نواز حکومت کواور نواز شریف کے دائیں بائیں موجود لیگیوں کو نذدیک سے اور اندر سے دیکھا محسوس کیا، پرکھا، آزمایا اور کردار ادا کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی اور نہ امیدی دیکھنا پڑی۔ چودھری صاحب برطانیہ سے یہ امید لے کر آئے تھے کہ وہ پاکستان کی سیاست کو برائیوں سے پاک کریں گے، عوام کے مسائل کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے ۔انہیں معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کی سیاست برائیوں کی دلدل میں اس قدر دھنس چکی ہے کہ اسے اللہ ہی سیدھے راستے پر ڈالنے والا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کے غریب عوام کی زندگی میں سدھار لانے کی غرض سے پنجاب کے گورنر بنے تھے، لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔

مَیں بھی ایسے کالم نگاروں میں ہوں جن کا چودھری سرور سے دور نزدیک کا کوئی تعلق نہ رہا نہ ہی اب ہے ، انہیں قریب سے نہ دور سے دیکھا، اگر دیکھا تو صرف ٹیلی ویژن پر دیکھا، اخبارات میں ان کے بارے میں پڑھا اور لکھنے والوں نے ان کی جو اچھائیاں ، خوبیاں لکھیں انہیں پڑھا۔ ان کی باتوں میں سچائی لگی، محسوس ہوا کہ جو شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں حقیقت ہے، سچائی ہے۔ ایسا ہمدرد، نیک سیرت، عوام کا ہمدرد، مسائل کو حل کرنے کی خواہش رکھنے والا موجودہ حکومت میں کیسے چل سکتا ہے۔ حالانکہ جب چودھری سرور نے یہ عہدہ سنبھالا تھا اس وقت ہی بعض تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ ایک شریف انسان کہا پھنس گیا۔ چودھری سرور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہونے والے پہلے مسلمان ہیں اور وہ اس پارلیمنٹ کے مسلسل تین مرتبہ رکن رہے۔ ان کا شمار برطانیہ کی لیبر پارٹی کے معروف اور اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ تو برطانیہ سے پاکستانی معاشرے کی خرابیوں کا تدارک کرنے کے عزائم لے کر پاکستان آئے تھے۔

جن دنوں علامہ ڈاکٹر طاہر القادری اور کپتان احتجاجی سیاست کر رہے تھے جس کے نتیجے میں اسلام آباد میں دھروں کی بہار آئی ہوئی تھی اس وقت چودھری سرور نے جو کردار ادا کیا، ڈاکٹر طاہر القادری نے چودھری سرور پر اعتماد کرتے

ہوئے انہیں ثالث کے طور پر قبول کیا۔ یہ بات نواز شریف کے علاوہ ان کے تمام ہی قریبی ساتھیوں کو نہ پسند تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ چودھری سرور کے تانے بانے کسی نہ کسی راستے سے ڈاکٹر طاہر القادری اور کپتان سے ملتے ہیں۔ یا پھر چودھری سرور کے دل میں دونوں کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب نون لیگی لیڈروں میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ چودھری سرور کا حکومت میں رہنا مناسب نہیں۔ چنانچہ گورنر اور نواز لیگ میں دوریوں کا آغاز ہوگیا۔ چودھری سرور کہا کہنا ہے کہ جب وہ برطانیہ میں تھے اور کوئی ان سے کسی کام کو کہہ دیتا اور وہ اس کے کام کے لیے نواز حکومت کے کسی بھی شخص کو فون پر وہ کام کرنے کا کہتے تو وہ کام فوری ہو جایا کرتا تھا لیکن گورنر کی حیثیت سے جب انہوں نے نواز حکومت کے صاحب اختیار سے کچھ کرنے کو کہا تو انہیں ہری جھنڈی دکھائی جانے لگے۔ دراصل یہی وہ عمل تھا جو نواز شریف کے ارد گرد پائی جانے والی مخلوق اور چودھری سرور کے درمیان تھا۔ چودھری صاحب برطانیہ کی سیاست کے صاف ستھرے کھلاڑی رہے چکے تھے۔ جب کہ ہماری سیاست اور سیاست داں کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے بہت ہی درست کہا کہ وہ' پاکستانی سیاست کو منافقت کے مترادف سمجھتے ہیں'۔ یہاں سیاست میں جھوٹ، دروغ گوئی، لوٹ کھسوٹ، ہیرا پھیری، منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ ہم ان لوگوں کو جو پاکستان سے باہر سے سیاست میں لائے گئے۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قسمت انہیں پاکستان لے آئی اور ان کی قسمت میں

پاکستان میں اعلیٰ منصب لکھا تھا۔ ان میں شرافت، سچائی، پاکستان سے محبت، ایمانداری، حب الوطنی اور پاکستان کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ نظر آیا۔ ان لوگوں سے اختلاف اپنی جگہ لیکن ان کی نیک نامی، شرافت قابلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر معین الدین قریشی، شوکت عزیز اور اب چودھری سرور کی شرافت، ایمانداری، سچائی اور پاکستانی عوام کے لیے کچھ کر گزرنے کی خواہش سب کے سامنے ہے۔ بیرون ملک سے درآمد کیے جانے والے اعلیٰ منصب کے حامل اشخاص نے دولت کی لوٹ کھسوٹ کو اپنا نصب العین نہیں بنایا، بیرون ملک جائیدادیں نہیں بنائیں، فلیٹ نہیں خریدے، تجارت کو وسیع سے وسیع تر نہیں کیا، بینک بیلنس نہیں بڑھایا، اپنے عزیز رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدوں پر براجمان نہیں کیا، محل نہیں خریدے، فضول خرچی اور بے جا دولت خرچ نہیں کی۔ اس لیے کہ وہ پاکستان کی خدمت کے جذبہ لے کر پاکستان آئے تھے۔ ہمارے سیاست دانوں کا حال اس کے برعکس ہے وزیر، ایم این اے یا ایم پی اے تو دور کی بات ہے اقتدار میں موجود پارٹی کا کوئی عہدہ ہی مل گیا تو اس کے وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔ وزیر تو زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتے۔

چودھری محمد سرور نے پنجاب کی گورنری کو خیر باد کہتے ہوئے پریس کانفرنس میں اُن وجوہات کا تفصیل سے احاطہ کیا جن کی وجہ سے انہوں نے گورنری کو

خدا حافظ کہا۔انہوں نے ایمانداری ، سچائی کے ساتھ اپنی ناکامی کا کھلے بند واعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں سچائی کا قحط ہے، قبضہ گروپ اور مافیا گروپ تمام معاملات پر حاوی ہے۔ تمام طرح کی برائیاں بڑھ چکی ہیں جن میں عورتوں پر تیزاب پھینکنا، بچوں کو اغوا کرنا، بچوں کے ساتھ زیادتی کرنا، قتل و غارت گری عام ہو چکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ان تمام برائیوں اور نہ انصافیوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ چودھری صاحب کی گفتگو اور باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ سچ بول رہے ہیں۔ یہ پریس کانفرنس درحقیقت نواز حکومت کے خلاف چارج شیٹ تھی۔ نواز حکومت کی جانب سے ان الزامت کا جواب تو نہیں دیا گیا لیکن انہوں نے چودھری صاحب کو عزت و احترام کے ساتھ گورنر ہاؤس سے رخصت کرنے میں ہی عافیت جانی۔چودھری صاحب یہ تمام کام پاکستان کے دستور کی رو سے اب صدر پاکستان یا گورنروں کے کرنے کے ہیں ہیں یہ تو وزیر اعظم اور ان کی سیاسی ٹیم کو کرنا ہوتے ہیں۔

بتانے والے بتاتے ہیں کہ چودھری سرور اور نواز لیگ کے درمیان فاصلوں کی بنیادی وجہ سانحۂ ماڈل ٹاؤن تھا۔ حکومت نے از خود گورنر پنجاب اور گورنر سندھ کو اپنی جانب سے ڈاکٹر طاہر القادری سے مذاکرات کرنے کا اختیار دیا، چودھری سرور کو حکومتی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا گیا۔اس وقت تک تو چودھری سرور بہت اچھے تھے لیکن جب انہوں نے اپنی رپورٹ میں حکومت کو مشورہ دیا کہ

سانحۂ ماڈل میں شہید کرنے والوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی جانی چاہیے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے تک حکومتی ذمہ داروں کو حکومت سے علیحدہ کردیا جائے۔ یہ بات نواز شریف کے اردگرد ساتھیوں کو پسند نہ آئی۔آتی بھی کیسے؟ بھلا کوئی نواز لیگ کا لیڈر یہ برداشت کرسکتا ہے کہ ان کے لیڈر کے بھائی کو پنجاب کی وزارت اعظمی سے اس طرح ہٹادیا جائے۔ چنانچہ چودھری سرور سے نون لیگ کے فاصلے بڑھنے شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ چودھری صاحب کو قادری صاحب کا دوست قرار دے دیا گیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ مخالفت میں شدت نہیں آئی، بیان بازی نہیں ہوئی، اس کی وجہ نواز شریف کا از خود چودھری سرور کے لیے نرم
گوشہ ہے جو ان کے جانے بعد بھی پایا جاتا ہے۔

چودھری سرور کی گفتگو جو انہوں نے پریس کانفرنس میں کی اور اس کے بعد ایک نجی ٹیلی وژن پر لندن سے اپنے ایک انٹرویو میں کی ہے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد برطانیہ میں پھر سے رہائش اختیار نہیں کریں گے بلکہ وہ پاکستان کی سیاست میں کوئی عملی کردار ادا کرنے کا ارادہ رکھتے
ہیں۔ اینکر پرسن نے چودھری صاحب کو بہت کریدنے کی کوشش کی پر انہوں نے صاف الفاظ میں یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے مقاصد جن کا ذکر انہوں نے اپنی پریس کانفرنس میں کیا تھا ملک میں موجود کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو کر حاصل کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ اپنی کوئی سیاسی جماعت بنا

کر غریب و نادار عوام کے مسائل کو حل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ جو کچھ بھی وہ مستقبل میں عوام کی بہبود کے لیے کریں گے ' مل جل کر کریں گے '۔ اس بات سے اشارہ ملتا ہے کہ شاید وہ کسی اتحاد کا حصہ ہونے جا رہے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسائل اس قدر گھمبیر اور زیادہ ہیں کہ انہیں کوئی شخص واحد یا کوئی ایک سیاسی جماعت تنہا حل نہیں کر سکتی۔ سب کو مل جل کر یہ کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے جن مسائل کا ذکر کیا ان کا کہنا تھا کہ یہ ۱۸ کروڑ عوام کے دل کی آواز ہے جو وہ کہہ رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے گورنر ہاؤس میں جن لوگوں سے ملاقاتیں کیں ان میں اکثریت نون لیگ کے ورکروں کی تھی ۔ انہوں نے ان سے ملاقات سے ہی یہ محسوس کیا کہ عوام کے مسائل حل نہیں ہو رہے ۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان میں گڈ گورننس چاہتے ہیں، سینٹرالائزیشن کے خلاف ہیں ۔ اختیارات کی تقسیم اوپر سے یونین کونسل کی سطح تک منتقل ہونی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان میں فوجی حکومتیں بلدیاتی نظام قائم کرتی ہیں جب کہ جمہوری حکومتیں اس نظام کے خلاف نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ایسی جمہوریت دیر پا نہیں ہوتی جس میں بلدیاتی نظام نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم باہر کے ملکوں کی باتیں کرتے ہیں ،۔برطانیہ میں تو جانور بھی بیمار ہو جائے تو اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا جاتا ہے جب کہ ہمارے ملک میں عوام بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی ترجیح بلدیاتی انتخابات ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں

ادارے سیاسی ہو گئے انہیں ڈی پالیٹیسائز کرنے کی ضرورت ہے۔انہوں نے میاں برادران سے اپنے تعلقات کے حوالے سے کسی بھی قسم کے اختلاف کی نفی کی۔

چودھری سرور نے اپنے آپ کو بے اختیار گورنر کہا۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے یہ اہم عہدہ قبول کرنے سے قبل اور نئی آئینی ترامیم کے بعد ملک کے صدر اور گورنر کے اختیارات کا مطالعہ نہیں کیا۔ یا پھر یہ عہدہ قبول کرنے سے قبل انہیں کسی قسم کا عندیہ دیا گیا تھا یا وعدہ کیا گیا تھا جو پورا نہیں کیا گیا۔ جو کچھ بھی ہوا گورنر کا جانا اچھا نہیں ہوا۔ ہم حکومت میں شامل ایک اہم اور بلند عہدہ پر فائز نیک سیرت ، سچ بولنے والے (کھرے انسان سے محروم ہو گئے۔ (۸ فروری ۲۰۱۵

جامعہ بلوچستان کے پروفیسر ڈاکٹر افتخار الدین خواجہ سے ایک مکالمہ

بانی چیرمین : شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ ڈاکٹر خواجہ جامعہ بلوچستان کے شعبہ تعلیم سے ریٹائر منٹ کے بعد جامعہ کی لائبریری میں consultant) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ راقم الحروف نے اس مقصد کے لیے کوئٹہ کا بطور خاص دورہ کیا اور خواجہ صاحب سے اپنے تحقیقی عنوان کے حوالے سے گفتگو کی۔ یہ گفتگو ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۵ء بلوچستان یونیورسٹی لائبریری، کوئٹہ میں ہوئی۔ یہ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ’’ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار‘‘ ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ۔

تعارف :

پروفیسر ڈاکٹر افتخاالدین خواجہ نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز گورنمنٹ کالج ضلع ژوب بلوچستان کے لائبریرین کی حیثیت سے کیا۔ جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ماسٹرز کرنے کے بعد امریکہ سے Continuing Education

میں بھی ماسٹرز کیا۔ آپ نے امریکہ ہی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، تحقیق کا موضوع اسکول لائبریری سے متعلق ہے اس طرح آپ بہ یک وقت لائبریری سائنس اور تعلیم کے شعبوں سے وابستہ رہے۔ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ کے شعبہ تعلیم سے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اس دوران آپ نے بلوچستان یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کی بنیاد ڈالی اور اس کے اولین صدر شعبہ بھی ہوئے۔ اس وقت آپ بلوچستان یونیورسٹی لائبریری میں Library Consultant کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے متعدد مضامین اور حال ہی میں دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ''سماجی تغیرات کا شماریاتی تجزیہ: توضیعی قاعدے'' مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی، دوسری کتاب آپ کی خود نوشت ہے جو ''ہر موڑ پر مسافر نواز'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکی ہے۔ راقم الحروف نے (۱۳۔۱۶) اکتوبر ۲۰۰۵ء کوئٹہ کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر افتخاالدین خواجہ سے یہ گفتگو ۱۵
اکتوبر ۲۰۰۵ء کو بلوچستان یونیورسٹی لائبریری کوئٹہ میں ہوئی۔

سب سے پہلے تو اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں بتائیں۔ لائبریری سائنس کی تعلیم کب اور کہاں سے حاصل کی۔ : ا

ج: ۱۹۶۳ء کی بات ہے بلوچستان کے شہر 'ژوب' میں گورنمنٹ کالج قائم ہوا، میں ملازمت کی تلاش میں تھا حالانکہ اس وقت میری عمر ۱۹ برس تھی۔ یہ

لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا ابتدائی دور تھا اس وجہ سے اکثر اداروں میں غیر
سند یافتہ لوگوں کو ملازمت مل جایا کرتی تھی ۔ میں نے بھی اپنے ذرائع استعمال کیے اور
مجھے گورنمنٹ کالج، ژوب کے لائبریرین کی ملازمت مل گئی ۔ اس دوران میں نے
پرائیوٹ بی اے کیا۔ ۱۹۶۶ء میں ماسٹر پروگرام کے لیے امریکن اسکالرشپ کا اعلان ہوا،
میں نے کوشش کی کامیابی نہ ہو سکی ، اگلے سال پھر اسی اسکالرشپ اعلان کیا گیا اس بار
خلیل احمد صدیقی کالج کے پرنسپل تھے ان کی کوششوں سے مجھے یہ اسکالرشپ مل گیا اور
میں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔
سبزواری صاحب اس پروگرام کے انچارج تھے انھوں نے میری بہت مدد کی لائبریری
سائنس کی فیلڈ کے بارے میں میرے ذہن میں ایک اچھا تاثر تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ
میری ایک خالہ Indiana سے لائبریری سائنس میں ایم اے کر چکی تھیں، درحقیقت
انہی کہ وجہ سے میرے اندر تحریک پیدا ہوئی۔اس طرح میں نے جامعہ کراچی سے
۱۹۶۹ء میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کیااس دوران میں یونیورسٹی کی سماجی سرگرمیوں
میں بہت سرگرم رہتا تھا۔ میں ڈپلومہ کرکے واپس بلوچستان آگیا،ژوب میں میری جگہ
کوئی اور آچکا تھا چنانچہ مجھے گورنمنٹ کالج سبی میں پوسٹ کردیا گیا۔ اب میں ایک تر
بیت یافتہ لائبریرین تھا۔ چاریا پانچ ماہ بعد میں گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ آگیا۔ ۱۹۷۱ء
میں
لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے پھر کراچی چلا گیا۔ واپس آیا تو میرا

تبادلہ گورنمنٹ کالج مستونگ میں ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء میں مجھے امریکہ کی Livingston, Allabama یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا جہاں سے میں نے Continuing Education میں ماسٹرز کیا۔ ۱۹۷۳ء میں ورجینیا یونیورسٹی امریکہ میں پی ایچ ڈی پروگرام میں رجسٹر ہوا، کورس ورک کرنے کے بعد لائبریری سائنس کی بنیاد پر موضوع اسکول لائبریری سے متعلق ہو گیا۔ یہ یونیورسٹی پی ایل ۴۸۰ پروگرام میں شامل تھی چنانچہ مجھے پاکستانی لٹریچر کے حصول میں دشواری نہیں ہوئی۔ اس طرح میرا رابطہ لائبریری سائنس سے پھر سے ہو گیا۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان واپس آ کر بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ ایجوکیشن میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گیا۔ ۱۹۸۰ء میں وائس چانسلر نے میرے لائبریری سائنس کے تعلق کی وجہ سے مجھے شعبہ لائبریری سائنس قائم کرنے کے لیے کہا، میں نے شعبہ کی بنیاد رکھی اور اس کا اولین صدر شعبہ بھی ہوا، ۱۹۸۷ء تک تنہا شعبہ کی تمام تر ذمہ داریاں نبھائیں، بعض اوقات میں تمام کے تمام پیریڈ بھی لیا کرتا تھا۔ بعد میں دیگر اساتذہ کا تقرر ہوا اور میں اپنے شعبہ میں خدمات انجام دیتا رہا ۱۹۸۸ء میں یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کا چیرمین مقرر ہوا۔ ۴ جنوری ۲۰۰۴ء کو ریٹائر ہونے کے بعد اسلام آباد چلا گیا۔ موجودہ وائس چانسلر غلام محمد تاج صاحب سے گورنمنٹ کالج ژوب کے زمانے سے تعلقات تھے جہاں پر وہ بھی استاد تھے اور میں لائبریرین تھا، انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے کہا اور میں اگست ۲۰۰۵ء میں دوبارہ اس جامعہ

کی حیثیت سے منسلک ہو گیا۔ یہ ہے میری داستان اگر Library Consultant سے آپ اور تفصیل چاہتے ہیں تو میری حال ہی میں شائع ہونے والی خود نوشت بعنوان ہر موڑ پر مسافر نواز" سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد : ۲ سعید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی فرمائیں کہ اسپل کے منعقد کردہ سیمینارز اور کانفرنسوں کے پاکستان لائبریرین شپ پر کیا اثرات رونما ہوئے ؟

ج : میرا تعلق حکیم صاحب سے رہا ہے میں یہ سمجھتا ہوں پاکستان میں کتب خانوں کے قیام اور ترقی میں حکیم صاحب کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ آپ کو کتب خانوں کی اہمیت اور ضرورت کا جس قدر ادراک تھا کسی اور میں نہیں دیکھا بلکہ کوئی ان کے قریب بھی نہیں۔ جب میں شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی میں طالب علم تھا تو حکیم صاحب کو اکثر دیکھا کرتا تھا کئی پروگراموں میں مجھے ان سے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ کتب خانے آپ کی ترجیحات میں شامل ہوا کرتے تھے۔ وہ تو role model تھے۔ اسپل کے منعقد کردہ سیمینارز، ورکشاپ اور کانفرنسوں کے پاکستان لائبریرین شپ پر مثبت اور تعمیری اثرات رونما ہوئے۔ ملک میں لائبریری شعور پیدا کرنے اور کتب خانوں کے قیام اور ترقی کی تجاویز اور لائبریرینز کی آواز حکومت وقت تک پہچانے میں اسپل نے اہم

ہوا کرتے تھے اور ان میں ملک کے دانش well organized کردار ادا کیا۔ پروگرام
ور اور ماہرین تعلیم کے علاوہ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شریک ہوا کرتے تھے اس
سے لائبریری پروفیشن کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اس کا وقار بلند ہوا۔

آپ کے خیال میں ''اسپل گولڈ میڈل'' پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ : ۳
میں معاون ہو سکا ؟

ج : اس سے طلبہ میں مقابلے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ ایک مثبت اقدام تھا۔ اس کی تشہیر ضروری ہے تاکہ تمام طلبہ اس کے بارے میں علم ہو اور وہ اس کے حصول کے لیے تیاری کر سکے۔

کی مطبوعات لائبریری مواد میں کس حد تک مفید اور کارآمد ثا (SPIL).: اسپل ۴
بت ہوا؟

ج : پاکستان لائبریرین شپ کے لٹریچر میں انہیں بنیادی مواد کی حیثیت حاصل ہے۔ لائبریری سائنس کے موضوع پر تحقیق کرنے والا محقق انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس سے ان مطبوعات کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ آخر میں یہ فرمائیں کہ آپ اس موضوع کو تحقیق کے نقطہ نظر سے کس طرح

دیکھتے ہیں؟

تحقیقی خاکے کی جو تفصیل مجھے معلوم ہوئی ہے اس کے پیش نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تحقیق کے نقطہ نظر سے یہ عنوان one of the best topic ہے۔

(یہ انٹرویو ۱۱۵کتوبر ۲۰۰۵ء بلوچستان یونیورسٹی لائبریری، کوئٹہ میں لیا گیا)

کشمیر سے اظہارِ یکجہتی کا دن۔۵ فروری

یوم یکجہتی کشمیر ہر سال ۵ فروری کو منایا جاتا ہے جس کا مقصد بھارتی قبضے میں مقبوضہ کشمیر کے کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی ، ہمدردی اور انہیں یہ باور کرانا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں تنہا نہیں ہیں۔ پاکستانی عوام ان کے ساتھ ہیں وہ اپنے کشمیری بھائیوں کے موقف کو دنیا کے سامنے ، عالمی اداروں تک پہنچاتے رہیں گے۔ یہ دن (۵ فروری) کشمیر کے ساتھ تجدید کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یوم یکجہتی کشمیر بھارتی ظلم و ستم کے خلاف ہر سال ۵ فروری ۱۹۹۰ء سے منایا جارہا ہے۔ اسی سال کشمیریوں نے جہاد کا علم تھام کر قابض بھارتی فواج سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۵ سال گزر جانے کے بعد بھی کشمیریوں کا جذبہ پہلے دن کی مانند تازہ اور پرُ عزم ہے۔

بھارتی پنڈت جواہر لال نہرو نے اقوام متحدہ میں کشمیریوں سے استصواب رائے کا جو وعدہ کیا تھا۔ بھارت مسلسل اس سے منحرف اور بھاگ رہا ہے۔ سلامتی کونسل بھارت کو اس کے کیے ہوئے وعدہ پر عمل درآمد کرانے میں ناکام نظر آتی ہے۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے جب کہ پاکستان کا اصولی موقف یہ ہے کہ 'کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے'۔ پڑوسی ہونے کے باوجود دونوں ملکوں کے

مابین کشمیر کا مسئلہ وجہ کشیدگی بنا ہوا ہے۔ بھارت نے ہٹ دھرمی اور وعدہ خلافی کی انتہا کردی ہے۔ وہ تو پاکستان ہی کو تسلیم نہ کرنے کے درپے ہے۔ اس کی پاکستان دشمنی روز وشن کی عیاں ہیں۔ ۱۷۹۱ء میں وہ یہ گھناؤنا کھیل بنگلہ دیش کی صورت میں کھیل چکا ہے۔ اب بھی بلوچستان میں مکروہ کردار ادا کر رہا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دے دیا تھا۔ یہ بات ہے ۶۴۹۱ء کی، قائداعظم نے مسلم کانفرنس کی دعوت پر سرینگر کا دورہ کیا جہاں قائد کی دور اندیش نگاہوں نے سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور جغرافیائی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کو پاکستان کی 'شہ رگ' قرار دیا۔ مسلم کانفرنس نے بھی کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ۹۱ جولائی ۷۴۹۱ء کو سردار ابراہیم خان کے گھر سری نگر میں باقاعدہ طور پر قرارداد الحاقِ پاکستان منظور کی لیکن جب کشمیریوں کے فیصلے کو نظر انداز کیا گیا تو مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی کی قیادت میں ۳۲ اگست ۷۴۹۱ء کو مسلم جدجہد کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ ۵۱ ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد موجودہ آزاد کشمیر آزاد ہوا۔ اگر قائداعظم اپنے سیاسی تدبر کا اظہار اس وقت نہ کرتے تو بھارت کی شاطر نگاہیں آزاد کشمیر کو بھی مقبوضہ کشمیر کی طرح اپنی گرفت میں لے لیتیں۔ قائداعظم کا تدبر ہی تھا کہ جس کے باعث کشمیر کو آزاد حیثیت ملی۔

حق خود ارادیت کشمیریوں کا پیدائشی حق ہے۔ اپنے اس حق کے حصول کے لیے کشمیری طویل عرصے سے عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ جس کے لیے سینکڑوں کشمیری اپنی جانوں کی قربانی دے چکے ہیں۔ پاکستان ان کے اس جائز اور اصولی موقف پر ان کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی قیام پاکستان کے بعد سے شروع نہیں ہوئی بلکہ یہ جدوجہد ۱۳۹۱ء میں اس وقت شروع ہوچکی تھی جب پاکستان کا خواب دیکھنے والے مفکرِ پاکستان علامہ اقبال نے سب سے پہلے ۴۱ اگست ۱۳۹۱ء کو لاہور میں یوم کشمیر منایا۔ حامد میر کی تحقیق کے مطابق ' کشمیر کی تحریک آزادی ۲۳۸۱ء میں پلندری اور رنگ کے علاقے میں شروع ہوئی جہاں باغی مسلمانوں کی کھالیں اتار کر درختوں پر لٹکادی گئیں۔ ۱۳۹۱ء میں قرآن پاک کی توہین پر کشمیر میں دوبارہ تحریک شروع ہوئی، سری نگر جیل کے سامنے ۲۲ کشمیریوں نے جام شہادت نوش کیا اور علامہ اقبال نے ۴۱ اگست ۱۳۹۱ء کو لاہور میں یوم کشمیر منایا '۔ کشمیر دراصل لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ کی سازش اور گٹھ جوڑ کے نتیجے میں بھارت کے قبضے میں گیا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل اختلاف کی وجہ یہی مسئلہ کشمیر ہی ہے۔ اس اہم مسئلہ پر دونوں جانب سے کشیدگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ پاکستان کی اب تک بھارت سے تین جنگیں ہوچکی ہیں۔ اقوام متحدہ اور دیگر بڑی قوتیں بھی اس مسئلہ کو حل کرانے میں سنجیدہ نظر نہیں آتیں۔ ان تمام کی خاموشی

ایک سوالیا نشان ہے۔

بھارت سمجھتا تھا کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر کشمیریوں سے حق خود ارادیت کی خواہش اور لگن کو ختم کر دے گا۔ اس نے ظلم و زیادتی کے تمام حربے آزمائے، مقبوضہ کشمیر کے نہتے کشمیریوں پر ظلم و زیادتی کی انتہا کر دی لیکن آفرین ہے ان بہادر کشمیریوں پر کہ ان کے اندر سے جذبہ حریت کم نہ ہوا اور بھارت اب ظلم و جبر کے نئے نئے گر استعمال کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ مسلمان اپنی گردن کٹوا تو سکتا ہے لیکن ظلم و جبر کے آگے، کفر کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ انشاء اللہ بھارت کی ہر سازش، ہر حربہ، بڑے سے بڑا ظلم و بربریت کشمیری مسلمانوں کے جذبہ حق خود ارادیت کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بھارت یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو از خود مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں لے گیا۔ جب اقوام متحدہ نے کشمیریوں کو ان کے حق خود ارادیت کی قرارداد منظور کی تو مسلسل اس سے روگردانی کر رہا ہے۔

۵ فروری کو پورے کشمیر میں، اس خطے (مقبوضہ کشمیر) میں بھی جہاں بھارت کی حکومت کا سکہ چلتا ہے، اس خطے میں بھی جسے آزاد کشمیر کہتے ہیں، پاکستان بھر میں، دنیا کے ہر ہر ملک میں جہاں جہاں کشمیری اور پاکستانی آباد ہیں

کشمیریوں سے اظہار یکجہتی کے لیے اجتماعات، جلسے و جلوس، احتجاجی مظاہرے کیے جاتے ہیں، کشمیریوں کے حق خود ارادیت تسلیم کروانے کے حق میں قرار دادیں منظور کی جاتی ہے۔دنیا کو باور کرانے کی سعی کی جاتی ہے کہ بھارت اپنے آپ کو جمہوریت کا چیمپیئن کہتا ہے۔اس نے کشمیریوں کی آزادی کو سلب کیا ہوا ہے۔علامہ اقبال کا یہ شعر

جس خاک کے ضمیر ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

ایک اور جگہ اقبال نے کہا

پاکستان کی قومی اسمبلی کی ایک 'کشمیر کمیٹی' بھی ہے۔جس کی ذمہ داریوں میں کشمیر کے معاملات کو مختلف فورم پر اٹھانا، کشمیر کی آزادی اور جدوجہد کی حمایت کرنا ہے۔کمیٹی میں پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے ۵۳ قومی اسمبلی کے اراکین اس کے ممبر ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب اس کمیٹی کے چیرمین ہیں۔مولانا صاحب گزشتہ آٹھ سال سے کشمیر کمیٹی کے چیئر مین چلے آرہے ہیں۔اس حوالے سے مولانا صاحب کی کارگزاری قابل ذکر نہیں۔مولانا صاحب کے بیانات اکثر کشمیر کے حوالے سے اخبارات کی زینت ضرور بنتے رہے ہیں۔سال بھر یہ کمیٹی کچھ نہ کرے کم از کم ۵ فروری جو کشمیر سے یکجہتی کا دن ہے اس کمیٹی کو خصوصی پروگرام ترتیب دینے چاہیے لیکن نظر یہ آتا ہے کہ جس کمیٹی کا سربراہ سیاسی معاملات میں زیادہ مصروف ہو تو اراکین اس حوالے سے کچھ

نہیں کر سکتے۔ مولانا صاحب کو اس عہدہ پر فائز کرنا حکومت کی سیاسی مصلحت پسندی کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔ حکومت کو اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ قومی اسمبلی کی اسٹینڈنگ کمیٹیاں ملک کے مختلف معاملات کے حل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ مولانا صاحب کی سیاسی سوچ، سیاسی عمل سب کے سامنے ہے، وہ ملک کی ایک بڑی سیاسی و دینی جماعت کے سربراہ ہیں اس حوالے سے ان کی ذمہ داریاں اور مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ اگر وہ اپنے بجائے اپنی ہی جماعت کے کسی رکن کو یہ عہدہ سونپ دیں تو شاید کمیٹی زیادہ بہتر کام کر سکے۔

کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا نہ رکنے والا عمل انشاء اللہ اُس وقت تک جاری وساری رہے گا جب تک کشمیری اپنا یہ جائز حق حاصل نہیں کر لیتے۔ پاکستان کے غیور اور کشمیر سے محبت کرنے والے عوام اور بہادر کشمیری اپنے اتحاد و اتفاق سے کشمیر دشمن قوت بھارت کو شکست دینے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر ایک ایسا عنصر ہے کہ جس کے نتیجے میں دونوں ممالک ہر وقت حالت جنگ میں رہتے ہیں، تین باقاعدہ جنگوں کے علاوہ چھوٹے معرکے الگ ہیں۔ اس کی وجہ سے دونوں ممالک اپنا دفاعی بجٹ زیادہ سے زیادہ کرنے کی تدابیر میں لگے رہتے ہیں۔ یہی بجٹ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو تو خلق خدا کی بھلائی اور عوام خوش حال ہو جائیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ دونوں ممالک کے سربراہان کشمیر کے اس دیرینہ مسئلہ کو باہم مل کر حل کر لیں۔

کشمیر، کشمیریوں کا ہے اسی طرح کہ جیسے ہندوستان ہندوستانیوں کا اور پاکستان پاکستانیوں کا ہے۔ ۸۶ سال کی کشیدہ تاریخ ہمیں کیا پیغام دے رہی ہے، ہم نے دشمنی سے کیا حاصل کیا۔ کشت وخون سے دونوں کو کیا ملا، بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں نہتے کشمیریوں کو خون میں نہلا کر کیا حاصل کیا، کیا اس عمل سے بھارت کے عوام خوش حال ہوئے، بھارتی عوام نے اپنی حکومتوں کو شاباش دیتے ہوئے انہیں مسلسل اقتدار میں رکھا۔ نہیں کا انجام سب کے (BJP) بھارتیہ جنتہ پارٹی، (INC) کا انڈین نیشنل کانگریس کا انجام سامنے ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، آج ہی کی خبر ہے کہ نئی دہلی اسمبلی کے انتخابات میں موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی کی پارٹی کا انجام کس قدر دردناک ہوا، مودی کی پارٹی کا اپنے دارالحکومت میں صفایا ہوگیا اس کے مقابلے میں 'عام آدمی پارٹی' نے ۷۰ میں سے ۶۷ نشستیں جیت لیں۔ کہاں گئی نریندر مودی کی پاکستان دشمنی۔ عوام کو امن چاہیے، سکون چاہیے، روزگار چاہیے، مہنگائی کا خاتمہ درکار ہے، خوش حالی کا دور دورہ ہو، دونوں ملکوں کے عوام آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہاں کسی بھی قسم کے ڈر وخوف کے ساتھ آجا سکیں۔ کشمیریوں سے ان کا حق خود ارادی کوئی نہیں چھین سکتا، وہ انہیں ایک نہ ایک دن ضرور حاصل ہو کر رہے گا۔ آخر میں اپنی بات کالم نگار منصر آفاق کی اس بات پر ختم کرتا ہو جس میں سچائی ہے، حقیقت بھی کہ 'آؤ صلح کرلیں'۔ (۱۰ فروری ۲۰۱۵ئ)

ادیب، شاعر، دانش ور عطاأ الحق قاسمی ۷۲ کے یا ۴۳ کے

(عطاأ الحق قاسمی کی ۷۲ ویں سالگرہ منعقدہ ۲ فروری بروز پیر ۲۰۱۵ء کی تقریب کے حوالے سے)

اردو کے معروف ادیب، شاعر، دانش ور و کالم نگار عطاأ الحق قاسمی سے محبت اور عقیدت رکھنے والی جماعت "محبان عطاأ الحق قاسمی" نے ۲ فروری بروز پیر ۲۰۱۵ء لاہور میں اپنے مُحِبّ کا ۷۲واں جنم دن منایا۔ سالگرہ کی باقاعدہ تقریب کا اہتمام ہوا۔ اردو کی معروف شخصیات نے عطاء الحق قاسمی صاحب کی شان میں تقریریں کیں اور ان کی تعریف و توصیف میں خوب خوب بولے۔ تقریب کا دولھا جسے ہونا چاہیے تھا وہی تھا یعنی محترم عطاء الحق قاسمی اپنے مخصوص انداز میں پھولے نہ سما رہے تھے۔ ھَشاش بَشاش، خوش وخرم، باغ باغ، شاداں وفراواں قاسمی صاحب اپنے چاہنے والوں کی کچھ میٹھی کچھ کھٹی، کچھ چٹخارے دار باتیں جو تمام کی تمام ان کے بارے میں ہی تھیں مزے لے لے کر سن رہے تھے اور مَحظُوظ ہورہے تھے۔ اللہ قاسمی صاحب کو تادیر زندہ رکھے۔ بہادر شاہ ظفر نے دعائیہ شعر کہا جس کے جواب میں غالبؔ نے بہادر شاہ ظفر کو طویل عمر کی دعا دیتے ہوئے دعائیہ شعر کہا۔ دونوں شعر قاسمی صاحب کی نظر۔

بہادر شاہ ظفر:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

تم جیو ہزاروں سال

سال کے دن ہوں پچاس ہزار

پروگرام کی کمپیئرنگ ٹیلی وژن کی بھولی بھالی، تیز آواز والی نیوز کاسٹر و اینکر پرسن غریدہ فاروقی نے اپنے مخصوص انداز میں انجام دئے۔ محترم قاسمی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے ۷۲واں جنم دن مبارک ہو۔ پروردگار انہیں صحت و تندروستی کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے۔ وہ اسی طرح خوش و خرم و شاداب رہیں۔ روزنامہ جنگ میں ان کے کالم اسی طرح چھپتے رہیں اور وہ اسی طرح نواز شریف کے گن گاتے رہیں۔ سچ پوچھیں تو مَیں بھی مُحبانِ قاسمی میں سے ایک ہوں بہت ہی معمولی سے سیاسی اختلاف کے ساتھ۔ وہ یہ کہ قاسمی صاحب نوازیے ہیں، اپنے کسی بھی کالم میں نواز شریف، خادم اعلیٰ اور نواز لیگ کی شان میں کبھی منفی بات نہیں کرتے، اور کرنی بھی نہیں چاہیے، ہمیشہ شان ہی بیان کرتے ہیں۔ کپتان سے سیاسی اختلاف رکھتے ہیں، اسے فاشسٹ اور اس کی جماعت کو فاشسٹ جماعت لکھ چکے ہیں، جب کہ نواز لیگ کو جمہوری جماعت لکھا حالانکہ اس جماعت میں آج تک انتخابات نہیں ہوئے۔ آصف زرداری تو ،انہیں بالکل ہی پسند نہیں

یہ بھی ٹھیک ، اپنی اپنی پسند ہے۔ رہ گئے چودھری.برادران تو وہ بھی بس یوں ہی ہیں، ایم کیوایم تو ہے ہی کراچی کی پارٹی اسے بھلا وہ کیوں خاطر میں لائیں گے۔ سیاسی اختلاف اپنی جگہ لیکن جناب قاسمی صاحب کی علمی و ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ پاکستان کے ان چند ادیبوں، شاعروں، دانش وروں میں سے ہیں جو روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ شاید یہ شعر علامہ اقبالؔ نے قاسمی صاحب جیسی شخصیات کے لیے ہی کہا ہوگا ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بات قاسمی صاحب کے جنم دن کی تقریب کی ہو رہی تھی اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ تقریب کا انعقاد لاہور کی آرٹس کونسل میں پیر ۲ فروری کی شب ہوا۔ اخبارات نے تو اس تقریب کی رپورٹنگ کی ہی خود قاسمی صاحب نے روزنامہ جنگ میں اپنا کالم بعنوان '۲۷ ویں یا ۹۳ ویں سالگرہ ؟' کے عنوان سے تحریر کیا اور اس تقریب کا آنکھو ں دیکھا حال خوبصورت پیرائے میں ، ادبی چاشنی کے ساتھ قلم بند کیا جو پڑھنے کے قابل ہے۔ مجھے یہ کالم پڑھ کر ہی جوش آیا کہ قاسمی صاحب سے میرا براۓ راست تو صرف ادب کے حوالے سے ہی تعلق ہے لیکن ایک تعلق یہ بھی ہے کہ میرے ایک انتہائی محترم دانش ور و ادیب دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی کے دوست ہیں۔ اس اعتبار سے قاسمی صاحب گویا میرے دوست بھائی ہیں۔

عطاالحق قاسمی صاحب کو میں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب برقی میڈیا متعارف نہیں ہوا تھا۔ قاسمی صاحب اپنی شاعری اور نثری تحریروں کے ساتھ اخبارات کی زینت بنا کرتے تھے۔ برقی میڈیا کے آجانے کے بعد انہیں ٹیلی وژن پر بھی دیکھا۔ کبھی شرف ملاقات حاصل نہ ہوا۔ نہ ہی قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہی ہوا۔ کالج سے ریٹائرمنٹ (۲۰۰۹ء) کے بعد ۲۰۱۰ء میں مَیں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہوگیا۔ کیمپس میں رہائش ٹیچرز ہاسٹل کے کمرہ نمبر ۵ میں تھی۔ میرے کمرہ کے سامنے کمرہ نمبر ۲ تھا جس میں شعبہ اردو کے چیئر مین پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی رہائش رکھتے تھے۔ ذہنی ہم آہنگی کہیے، مزاج میں مطابقت کہا جائے، ہم عمر ہونا کہا جائے، کچھ بھی سہی وہ میرے دوست ہوگئے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ سرگودھا کی سردی، کراچی والوں کے لیے تو برداشت سے باہر تھی، اب سرگودھا کے سرد شامیں میرے کمرے میں گزرنے لگیں، مغرب کی نماز کے بعد بیٹھک ہوتی اور دنیا کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر گفتگو نہ ہوتی ہو۔ اس دوران کئی احباب ہماری محفل کا حصہ بننے لگے، ان میں ڈاکٹر ظفر اقبال اور ڈاکٹر عبدالرشید رحمت ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، ڈاکٹر خالد ندیم، ڈاکٹر شاہد راجپوت' شعبہ کے ایک شاگرد، طارق کلیم وغیرہ شامل تھے۔ بات مختصر کرکے آگے بڑھتا ہوں۔ سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے بین

اقوامی اردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتما کیا۔ اب کانفرنس کے حوالے میرا کمرہ مرکز بن گیا۔یہ دو روزہ انٹر نیشنل اردو کانفرنس ۳۔۴ نومبر ۲۰۱۰ء کو جامعہ سرگودھا کے ایم بی اے ہال میں منعقد ہوئی۔ میں عملی طور پر اس میں شریک نہیں ہوتا تھا لیکن اس حوالے سے ہونے والی گفتگو کا سامع بن گیا اور مجھے ایسا لگا کہ میں اس کانفرنس کا ایک حصہ ہوں۔

کانفرنس میں اردو ادب کی عالمی اور قومی شہرت یافتہ شخصیات شریک ہوئیں۔ مہمان اعزار اردو کے عالمی شہرت یافتہ ادیب و دانشور ڈاکٹر خلیق انجم تھے جو بھارت سے تشریف لائے تھے ، ڈاکٹر ابراہیم محمد ابر ہیم کا تعلق مصر سے تھا، پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال جو اب وفاقی جامعہ اردو کے وائس چانسلر ہیں، ملتان کے معروف استاد، شاعر و ادیب پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری، ڈاکٹر فخر الحق نوری،، ڈاکٹر سید جاوید اقبال ،ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر آفتاب اصغر ، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر محمد یوسف خشک ، ڈاکٹر امجد علی بھٹی، حمید الفت ملغانی، پروفیسر شوکت مغل شامل تھے۔کانفرنس کی تیسری نشست محفل مشاعرہ تھی ، صدارت معروف شاعر ،ادیب و دانش ور پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری نے کی جب کہ مہمان خصوصی بھارت کے شاہد ماہلی اور کراچی کے پروفیسر سحر انصاری تھے۔ محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض طارق حبیب نے خوبصورتی کے ساتھ انجام دیے۔ جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں عطاء الحق

قاسمی، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم انصاری، سحر انصاری، شاہد ماہلی، یونس اعجاز، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر طاہر تونسوی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈکٹر راشد متین، حسن عباسی، حرارانا، ڈاکٹر صغریٰ صدف، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ارشد ملک، شفیق آصف، عابد خورشید، عاشر وکیل راؤ، شاکر کنڈان، شیخ محمد اقبال، مقبول نثار ملک، احمد عبد اللہ، افتخار عاکف، طارق کلیم، نوشین صفدر، طارق حبیب اور سید مرتضی حسن شامل تھے۔اس مشاعرے میں قاسمی صاحب جو اپنا کلام سنایا اس کا ایک شعر مجھے یاد رہ سکا ہے۔ قاسمی صاحب لاہور سے سرگودھا بہت جلدی میں اور رات کی تاریکی میں تشریف لائے اور اسی تاریکی میں ہی واپس بھی چلے گئے تھے۔ شعر یہ ہے۔

میں وہ دعا ہوں عطؔا جو ہر ایک لب پر ہے
بس اتنا ہے کہ ابھی عرصہء قبول میں ہوں

سرگودھا یونیورسٹی وہ جگہ اور مقام تھی جہاں میں نے قبلہ عطاء الحق قاسمی کو قریب سے دیکھا اور ملاقات کی۔ انہیں تو شاید میرا ملنا یاد بھی نہ ہوگا۔ اس وقت قاسمی صاحب نہ ۲۷ کے تھے نہ ۴۳ کے بلکہ وہ اتنے تھے کہ جتنا کہ میں اب ہوں یعنی ۶۷ کے۔ خوبصورت تو وہ اب بھی ہیں اور اس وقت زیادہ حسین تھے۔ قاسمی صاحب کا جسہ اگر بیان کیا جائے تو وہ میری رائے میں کچھ اس طرح کا بنتا ہے۔ گندمی رنگ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، درمیانہ قد

چوڑا سینہ، مضبوط جسم، چہرے پر مسکراہٹ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، کلین شیو، داڑی موچھ سے پاک صفاچٹ میدان، اونچی مگر پھیلی ہوئی ناک، گھنی بھنویں، ہونٹ قدرے موٹے، چھوٹی آنکھیں، سنجیدہ طرز گفتگو، معلومات کا خزانہ، ہر موضوع پر تفصیلی اور حوالائی گفتگو، گفتگو میں بر محل خوبصورت اشعار کا استعمال، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔

تقریب تھی قاسمی صاحب کی سالگرہ کی جس میں کون کون نہیں مدعو کیا گیا ہوگا اور کون ہوگا جسے معلوم ہو جائے کہ قاسمی صاحب کی سالگرہ کی تقریب آرٹس کونسل میں محفل موسیقی کے تڑکے کے ساتھ منعقد ہورہی ہے نہیں آنا چاہے گا۔ تقریب میں قاسمی صاحب کی شان میں قصیدہ گوئی تو ہونا ہی تھی بعد از قصیدہ گوئی محفل موسیقی کا بھی اہتمام تھا۔ لوگوں کا کھنچے چلے آنا لازمی تھا۔ قاسمی صاحب نے فرمایا کہ لوگ تقریروں کے درمیان اور بعد میں محفل موسیقی میں جم کے بیٹھے رہے۔ قاسمی صاحب اگر یہ محفل صرف آپ کے ساتھ ایک شب ہوتی تو لوگ اسی دلجمعی سے آپ کو سنتے رہتے۔

منتظمین نے اسٹیج کے اوپر پینا فلیکس پر دیگر تعریفی کلمات کے علاوہ یہ بھی تحریر کرایا تھا کہ قاسمی صاحب کی ۷۲ ویں سالگرہ کی تقریب ہے اور یہ کہ قاسمی صاحب کو زندگی کی بہاریں ۷۲

دیکھنا مبارک ہو۔ تقریب سالگرہ کی ہو، نمایاں طور پر عمرِ مبارک بھی درج ہو تو جو مقرر بھی آئے گا اس بات کا ذکر تو ضرور کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، ہر مقرر نے قاسمی صاحب کو ۷۲ ویں سالگرہ کی مبارک دیتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ قاسمی صاحب کا کہنا ہے کہ ان سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا، بقول ان کے 'عزت سادات' خطرہ میں دیکھ کر وہ مائیک پر آئے اور یہ اعلان کیا کہ خواتین و حضرات میری عمر ۷۲ سال نہیں ۔ یہ مغالطہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ دراصل میرا سالِ پیدائش ۱۹۷۲ء ہے ۔اس حساب سے تو میں صرف ۴۳ سال کا بنتا ہوں'۔

غالبؔ نے اسی سادگی پہ تو یہ شعر کہا تھا ۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے' اَے خُدا !

لڑتے ہیں' اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

قاسمی صاحب کی وضاحت کو کوئی مقرر خاطر میں نہیں لایا اور لاتا بھی کیسے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ قاسمی صاحب جن کو نہ معلوم کتنے لوگ ہوں گے مجھ جیسے ۷۰ کے قریب قریب پہنچنے والے ایسے ہوں گے جو انہیں اپنے بچپن سے قاسمی صاحب کو ایسا کا ایسا ہی دیکھتے چلے آرہے ہیں، تب ہی تو مجیب الرحمان شامی اپنی تقریر میں قاسمی صاحب کو 'بابا عطاء الحق قاسمی' کہتے رہے، اوریا مقبول جان نے قاسمی صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر اس وقت سے کیا جب وہ خود

بچے تھے۔ دیگر مقررین میں حسین احمد شیرازی جو تقریب کے منتظم میں سے تھے،
وجاہت مسعود، اصغر ندیم سید، مسعود اشعر، کیپٹن عطا محمد خان، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر
سلیم اختر، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اور قاسمی صاحب کے
بیٹے علی عثمان قاسمی شامل تھے۔

کسی لکھاری نے یہ بھی کہا ہے، ہو سکتا ہے کہ قاسمی صاحب نے ہی لکھا ہو یاد نہیں آرہا
کہ کسی بھی لکھنے والے کی عمر وہ ہوتی ہے کہ جب سے اس نے لکھنا شروع کیا ہو۔ اگر
قاسمی صاحب نے ۱۹۷۲ء سے لکھنا شروع کیا تو پھر تو وہ اپنی بات میں سچے ہیں ان کی عمر
واقعی ۴۳ ہی ہوگی۔ جیسے میرا پہلا مضمون ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا اس اعتبار سے میری
عمر ۴۰ ہی ہوئی لیکن اس دنیا میں آنے کا سال ۱۹۴۹ء ہے اس اعتبار سے عمر ۶۶ ہوئی۔
اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم ۴۰ کے ہوں یا ۶۶ کے، ۷۲ کے ہوں یا ۴۳ کے، جو عمر
ہم اپنے ساتھ لکھوا کر لائے ہیں ہم اس سے ایک لمحہ بھی زیادہ جی نہیں سکتے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جس شعبہ سے بھی وابستہ ہوں کچھ نہ کچھ کرتے رہیں،
اگر لکھاری ہیں تو اپنی بساط کے مطابق لکھتے رہیں اور علم میں اضافہ کرتے رہیں۔
جناب عطاء الحق قاسمی شاعر تو اچھے ہیں ہی وہ مزاح کی حس بہت عمدہ رکھتے ہیں۔ مزاح
لکھنے کی جو صلاحیت ان میں پائی جاتی ہے وہ منفرد اور اعلیٰ ہے۔

اس حس کے ساتھ ان کی تحریر پڑھنے والے کو بور اور اداس نہیں ہونے دیتی۔ معاشرے میں موجود برائیوں، خرابیوں اور نہ انصافیوں پر ان کے کالم پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کا اچھوتا انداز ہے۔ جمہوریت پسند ہیں، ڈکٹیٹر اور ڈکٹیٹر شپ کو سخت نہ پسند کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ڈکٹیٹر شپ کے خلاف مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ نواز شریف ان کے نذدیک بہت شریف النفس سیاست داں ہیں، ان کی حکومت کو پسند کرتے ہیں ان کے حمایت میں لکھتے رہتے ہیں۔ نواز حکومت کے ۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۹ء میں وہ ناروے اور تھائی لینڈ میں پاکستان کے صفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موجودہ حکومت کو دوسرا سال ہونے والا ہے دیکھیں اس دور حکومت میں کیا تحفہ عطا کو عطا ہوتا ہے۔ ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں ان میں خواجہ اینڈ سنز، شب دیگ، شیدا ٹالی اور سارے گامہ شامل ہے۔ قاسمی صاحب ناول نگار اور سفر نامہ نگار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ان کا سفر نامہ نما ناول 'شوقِ آوارگی' شائع ہو چکا ہے۔ صفِ اول کے کالم نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ روزنامہ جنگ میں 'روزن دیوار' کے عنوان سے مسلسل کالم لکھتے ہیں۔ ان کے کالم ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل، سیاسی و سماجی احوال و حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ لاہور آرٹس کونسل کے اعزازی صدر ہیں۔ سنا ہے کہ موجودہ حکومت قاسمی صاحب کو لاہور آرٹس کونسل کا تاحیات صدر بنے رہنے کی درخواست کرنے والی ہے۔ اس خبر میں کس قدر صداقت ہے نہیں معلوم۔ اگر ایسا ہے تو قاسمی صاحب کو پیشگی

مبارک باد۔ ویسے تو اس وقت پنجاب کے گورنر کی کرسی بھی خالی ہو چکی ہے۔ معلوم نہیں کیوں ہمارے سیاست داں ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، لکھاریوں کو صدر اور گورنر جیسے عہدوں کا اہل کیوں نہیں سمجھتے۔ اب جب کے صدر اور گورنر کا عہدہ آئینی اعتبار سے شو پیس ہو کر رہ گیا ہے اس عہدہ پر کسی سیاست داں کے بجائے کسی اہل علم و دانش ور کو بیٹھا دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کم از کم وہ چودھری سرور کی طرح یہ خواہش نہیں کرے گا کہ اسے عملی طور پر لوگوں کے مسائل حل کرنے کے اختیارات حاصل نہیں تھے۔

تمام مقررین نے قاسمی صاحب کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور یقیناً بہت خوب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر سلیم اختر گو بیمار ہیں لیکن خوب بولے، قاسمی صاحب کی خدمات کا سیر حاصل احاطہ کیا، انتظار حسین صاحب کی گفتگو کا کیا کہنا، لگتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، دھیمی آواز، شیریں الفاظ، نفیس انداز گفتگو کی حامل یہ شخصیت اپنی مثال آپ ہے۔ عبد اللہ حسین جو تقریب کے مہمان خصوصی تھے کا یہ جملہ جسے قاسمی صاحب نے بھی پسند کیا اپنے کالم میں نقل کیا، کو میں بھی نقل کرتے ہوئے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ ’عطاء الحق قاسمی کا ذہن پنجاب کی زمین کی طرح زرخیز ہے کہ اس کے ہاں بھی ایک فصل کے بعد دوسری فصل تیار ہوتی ہے‘۔ اچھی اور خوبصورت بات ہے۔ کوئی بات قاسمی صاحب کو یا ان کے چاہنے والوں کا نا

گوارا لگی ہو تو راقم اس کی معزرت کا طلب گار ہے۔ قاسمی صاحب میرے بھی آئیڈیل کالم نگاروں میں سے اللہ انہیں آئندہ برس ہی نہیں بلکہ طویل عرصہ زندگی دے اور وہ ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔ عطا الحق قاسمی صاحب کی ایک غزل ۔

بھٹک رہی ہے عطا خلق بے اماں پھر سے
سروں سے کھینچ لیے کسی نے سائباں پھر سے
دلوں سے خوف نکلتا نہیں عذابوں کا
زمیں نے اوڑھ لیے سر پر آسماں پھر سے
میں تیری یاد سے نکلا تو اپنی یاد آئی
ابھر رہے ہیں مٹے شہر کے نشاں پھر سے
تیری زباں پہ وہی حرف انجمن آرا
میری زباں پہ وہی رائیگاں پھر سے
ابھی حجاب سا حائل ہے درمیاں میں عطاؔ
ابھی تو ہوں گے لب و حرف رازداں پھر سے

(فروری ۲۰۱۵ء ۱۷)

شہید کی ماں

شہید کا رُتبہ و مرتبہ یقینا اعلیٰ و افضل ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ایک مسلمان کی بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ، لاشریک تسلیم کرنے اور نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے اقرار کو شہادت کہا گیا ہے۔ روئے زمین پر اللہ کی حاکمیت اور کلمتہ اللہ کی اشاعت کی غرض سے ایک مسلمان کا اپنی جان دے دینا بھی شہادت ہے۔ شہید کی تعریف اردو ترقی بورڈ کی اردو لغت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ''دین اسلام کی خاطر جان دینے والا، خدا کی راہ میں قربان ہونے والا، امر حق پر جان دینے والا، شہادت کا ترب پانے والا''۔ لفظ شہید' شہادت ہی سے مشتق ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں بمعنی شاہد آیا ہے۔ شہید وہ شخص جس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے۔

مرے خاک وخُون سے تُونے یہ جہاں کیا ہے پیدا

صِلۂ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاو دانہ

شہید خدا تعالیٰ کا ایک وصفی نام بھی ہے۔

یا عظیمُ یا حلیمُ یا رقیبُ یا مجیب

یا حمیدُ یا معیدُ یا شہیدُ یا حسیب

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں شہدا کو مُردہ یا مرا ہوا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے ترجمہ "اور جو لوگ خدا کی رہا میں مارے جائیں یہ نہ کہنا کہ وہ مَرے ہوئے ہیں (وہ مُردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے" (سورۃ البقرا آیت ۱۵۴)، قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹ میں ارشادِ خداوندی ہے۔ترجمہ "جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے اُن کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں اور اُن کو رزق مل رہا ہے"۔اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز شہدا کو انبیاء، صدیقین، صالحین اور نیک لوگوں کے ساتھ ہونے کی نوید بھی سنائی ۔ارشاد باری تعالیٰ ہے ترجمہ "اور جو لوگ خدا اور اُس کے رسُول کی اطاعت کرتے ہیں وہ قیامت کے روز ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء، صدیقین، صالحین اور شہید اور نیک لوگ اور اُن لوگوں کی رفاقت بہت ہی (خوب ہے"۔(سورۃ النساء آیت ۶۹

شہدا کا اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ قیامت کے روز وہ شفاعت کرنے والوں میں شامل ہوں گے۔ابن ماجہ کی حدیث ہے حضرت عثمان بن عفانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" قیامت میں تین طرح کے لوگ (خصوصیت سے) شفاعت کریں گے۔انبیاء، پھر دین کا علم رکھنے والے اور پھر شہداء"۔شہید کی قدر و قیمت کا اندازہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس شعر سے بھی واضح ہے۔

اُن شہیدوں کی دِیَت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خُون جن کا حرم سے بڑھ کر
شہادت کا رتبہ پانے والے کو جب اس قدر اعلیٰ و عرفہ ، بلند و بالا مرتبہ حاصل ہے تو اس ماں کا کیا مقام ہو گا کہ جس نے اس شہید کو نو ماہ اپنی کوک میں رکھا، پیدائش کی شدید تکلیف برداشت کی، اس کے لیے خود گیلے میں لیٹی اسے سوکھا بستر فراہم کیا، خود بھوکی رہی اپنے لخت جگر بھوک سے رونے نہ دیا، سرد اور گرم راتوں میں اٹھ کر اسے دودھ پلایا، اس کے لیٹے رہنے سے بیٹھنے تک، بیٹھنے سے انگلی پکڑ کر چلنے تک ، بچپن سے جوانی تک اس کا ایک پل ، اس کی ایک ادا کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سمانے والی ماں فوجی وردی میں ملبوس اپنے کڑیل ، بانکے ، سجیلے ، حسین و جمیل بیٹے پر واری اور نثار، جانے والی ماں پر اس وقت کیا گزری ہو گی جب اس کے لال کی یہ خبر اس نے اپنے کانوں سے سنی ہو گی کہ
اس کے لال کو شہادت کا رتبہ نصیب ہو چکا ہے۔یقینا ماں جس کے پیروں تلے پہلے ہی جنت رکھ دی گئی ہے شہید بیٹے کی شہادت پر اسے بھی شہادت کا درجہ ہی حاصل ہو گا۔
مسرور جالندھری کا شعر ؎
دیکھ لو شہیدوں کے پر وقار چہروں کے
کیا نکھار آتا ہے خون میں نہانے سے

اس تمہید کے بعد میں ایسی ہی ایک ماں اور ایک بیوی کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں ، سلام عقیدت کے پھول نچھاور کرنا چاہتا ہوں کہ جس کا شوہر میجر محمد شریف ، جس کے ایک بیٹے میجر شبیر شریف شہید (نشان حیدر، ستارہ جرات) جنھوں نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں شہادت نوش کیا، ایک بیٹا کیپٹن ممتاز شریف (تمغہ بسالت) اور ایک بیٹا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی فوج جو کہ دنیا کی سب سے ڈسیپلن فوج ہے کا سپہ سالار ہے۔ یہ سپہ سالار ہیں جنرل راحیل شریف اور یہ عظیم خاتون ان تینوں بیٹوں کی ماں ہے کہ جس نے ہفتہ ۱۴فروری ۲۰۱۵ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے شہید بیٹے میجر شبیر شریف شہید سے جاملی۔ اپنے شہید بیٹے کی جدائی میں ۴۴ سال کا طویل عرصہ گزارا۔ اب ماں نے اپنے شہید بیٹے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے سینے کو ٹھنڈا کیا ہوگااور شہید بیٹا بھی اپنی ماں کو پا کر کس قدر خوش ہوا ہوگا۔ جنت میں شہید بیٹے اوراس کی ماں کے اس حسین ملاپ پر آسماں بھی پھولے نہ سمایا ہوگا۔ شہیدوں نے آگے بڑھ کر شہید کی ماں کو لبیک کہا ہوگا۔

یہ عظیم ماں پاکستان آرمی کے ایک مثالی خاندان جسے 'میجر محمد شریف کا خاندان' کا کہا جاسکتا ہے کا اٹوٹ حصہ تھی۔ میری ذاتی رائے میں شہیدوں کی مائیں شہید ہی تو ہوتی ہیں۔ جنرل راحیل شریف کی ماں صرف میجر محمد شریف کے

خاندان کی ماں ہی نہیں تھی بلکہ پاکستانی قوم کی قابل احترام ہستی تھی۔ شہید مرتے نہیں انہیں مردہ مت کہو وہ تو زندہ ہیں، انہیں تو رزق مہیا ہوتا ہے۔ شہید کی یہ ماں ۹۶ برس کی عمر میں ہفتہ ۱۴ فروری ۲۰۱۵ء کو راولپنڈی کے ایک اسپتال میں ہمیشہ کے لیے اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ وہ فوجی ادارہ قلب (ایف آئی سی) راولپنڈی میں زیر علاج تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین نسلوں کو پاکستان کی فوج میں شامل ہو کر بہادری، جواں مردی اور وطن عزیز کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے کی عملی ترغیب دی اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب و کامران نظر آتی ہیں۔ پہلی نسل ان کے والد اور ان کے پانچ بھائی تھے، ان کے شوہر اور دیگر عزیز رشتہ دار جنھوں نے افواج پاکستان میں شامل رہ کر وطن عزیز کی خدمت کی، دوسری نسل ان کی اولاد یعنی بیٹے میجر شبیر شریف شہید (نشان حیدر، ستارہ جرات)، بیٹا کیپٹن ممتاز شریف (تمغہ بسالت) اور بیٹا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی فوج کا سپہ سالار (جنرل راحیل شریف)اور اس نسل کے دیگر افراد شامل ہیں۔ موجودہ نسل ان کی اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے ہیں جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر افواج پاکستان میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ عزیز بھٹی شہید (نشان حیدر) کی قریبی عزیز تھی، میجر عزیز بھٹی کی والدہ ان کی خالہ تھیں اس اعتبار سے میجر عزیز بھٹی شہید ان کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ نماز جنازہ چکلالہ گیریژن راولپنڈی میں ادائیگی کے بعد ان کا جسد خاکی لاہور لایا گیا اور مرحومہ کو کیولری گراؤنڈ

قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے ماں کے لیے جن احساساس اور جذبات کا اظہار اپنی اس نظم میں کیا وہ ہر کے اپنی ماں کے لیے۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
! مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
! نُور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا
!آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
! سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میجر محمد شریف کا خاندان بنیادی طور پر راجپوت ہے۔پاکستان میں یہ خاندان پنجاب کے ضلع گجرات کے شہر کنجاہ (Kunjah) سے تعلق رکھتا ہے۔یہاں کے رہائشی کنجاہی کہلاتے ہیں۔ یہ پنجاب کا چھوٹا سا شہر نما گاؤں ہے جس کی آباد تقریباً ۴۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی۔یہ قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۱۰۵ میں شامل ہے جہاں سے چودھری پرویز الٰہی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا زریعہ معاش زراعت ہے تاہم فوج میں خدمات سرانجام دینا اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے ہیں۔کنجاہ کے معروف لوگوں میں میجر محمد

شریف کا خاندان اور ان کے بہادر بیٹے میجر شبیر شریف شہید (نشان حیدر، ستارہ جرات)، کیپٹن ممتاز شریف (تمغہ بسالت) اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی فوج کے سپہ سالار جنرل راحیل شریف ہیں۔ ان کے علاوہ محمد اکرم غنیمت کنجاہی معروف محقق تھے جنھوں نے 'نیرنگ عشق' لکھی تھی، شریف کنجاہی (۱۹۱۵ء۔۲۰۰۷ء) پنجابی زبان کے معروف شاعر اور مصنف و استاد تھے۔ یہ ۱۹۷۰ء میں جامعہ پنجاب لاہور کے شعبہ پنجابی کے اولین اساتذہ میں سے تھے۔ شاعر، نثر نگار اور پنجابی ادب کے نامور تخلیق کار تھے۔ انھوں نے پنجابی ادب کو اپنی تخلیقات سے مالامال کیا۔ پنجابی شاعری اور ادب کے حوالے سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

جنرل راحیل شریف کی ماں نے اپنے شہید لخت جگر نشان حیدر حاصل کرنے والے میجر شبیر شریف کی شہادت پر کہا تھا کہ 'میرے شبیر نے اپنے وطن پر جان قربان کرکے ماں کا سر فخر سے بلند کردیا ہے'۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے اپنے بیٹوں پر ناز ہے راحیل اور ممتاز بھی ایک سیکنڈ نہیں لگائیں گے اگر انہیں پاکستان پر اپنی جان نچھاور کرنا پڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ ' مجھے اپنے بیٹوں کے کارناموں پر فخر ہے، ہمارا پورا خاندان آرمی میں فرائض انجام دیتا آرہا ہے۔ میرے پانچوں بھائی اور والد آرمی میں تھے اور پھر میرے شوہر محمد شریف بھی آرمی افسر اور اب پاکستان پر مرمٹنے

کے لیے تیار راحیل اور ممتاز بھی اپنی باری کے منتظر' ۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بس میں اتنا کہوں گی کہ سب کو سخت محنت اور ایمانداری سے کام کرنا چاہئے ، والدین کی خدمت کریں کیونکہ ماں باپ کی خدمت اور محنت ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ جنرل راحیل کی والدہ مرحومہ کے یہ خیالات ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اپنے کالم 'شہدائے وطن کی ''امی جان'' (جنگ ۷ افروری ۲۰۱۵ء) میں تحریر کیے ہیں۔

اللہ اللہ ایک خاتون اور ایک ماں ہوتے ہوئے وطن سے محبت ، عقیدت اور قربانی کا لازوال اور مثالی جذبہ رکھنے والی ماں کو سلام، پروردگار انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ بہادر بیٹے کی ماں نے اپنے بیٹے میجر شبیر شریف کی شہادت کی خبر سنی تو انہیں اس وقت اپنے بہادر بیٹے کی یہ بات یاد آ گئی جو کبھی اس نے اپنی ماں سے کہی ہو گئی کہ 'امی جی ! شہیدوں پر ماتم کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے'۔ اپنے بیٹے کی اس دلیل پر ایک ماں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا ، سہارا دیا اور فخر کیا کہ اس کے بہادر بیٹے نے جام شہادت نوش کیا اور وہ اعزاز کے ساتھ دنیا چھوڑ گیا اور اپنے خاندان اور ملک کے لیے باعث فخر بنا۔ سلام ہو اس ماں پر جس نے نہ صرف بہادر بیٹوں کو شہادت کے لیے تیار کیا، وطن سے محبت اور اس کے لیے جان قربان کر دینے کی ترغیب دی۔ ماں پھر ماں ہے اس کی جدائی کا احساس وہ لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں کہ

جن کی ماں دنیا سے جاچکی ہوں۔
پیار کہتے ہیں کسے اور مامتا کیا چیز ہے
کوئی ان بچوں سے پوچھے جن کی مرجاتی ہے ماں
ماں کی جدائی کا دکھ اور صدمہ یقینا جنرل راحیل شریف اور مرحومہ کی تمام اولادوں کو ہوگا۔ اللہ تعالی مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین اور جنرل رحیل شریف کو صبر جمیل عطا فرمائے،آمین .آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے! (۱۹فروری ۲۰۱۵ء)

اردو میں نعتِ رسول ﷺ کی روایت

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ’وصف‘ یا ’مدح‘ کے ہیں یا ’’کسی شخص میں اچھی اور قابل ذکر صفات و خوبیوں کا پایا جانااور ان خوبیوں کا بیان کیا جانا‘۔ لیکن اسلامی معاشرہ میں لفظ ’نعت‘ کا استعمال مجازاً صرف اور صرف سید المرسلین خاتم الا نبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے توصیف ثنایعنی تعریف کے لیے ہوا ہے۔ اردو اور فارسی میں لفظ نعت سے مراد حضرت محمد ﷺ کی مدح و ثنا مراد ہوتی ہے۔ عربی میں ’مدح النبی‘ یا ’المدائح النبویہ‘ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد رفیع الدین اشفاق جنھوں نے اردو میں نعتیہ شاعری پر پہلا تحقیقی مقالہ تحریر کیا جس پر انہیں ناگپور یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی کے خیال میں ’اس صفت کا تعلق دینی احساس اور عقیدت مندی سے ہے اور اسے خالص دینی اور اسلامی ادب میں شمار کیا جاتا ہے‘۔ اسی طرح ڈاکٹر شاکر اعوان کی تصنیف ’’عہد رسالت میں نعت‘‘ اردو ادب میں اپنے موضوع پر قابل تعریف کام ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ’’اردو کی نعتیہ شاعری‘‘ اپنے موضوع پر معتبر حوالہ ہے۔

نعت کہنا یا نعت کا پڑھنا مسلمان کی حیثیت سے باعث برکت اور باعث ثواب

تصور کیا جاتا ہے۔ بے شمار شعراء جو صرف عشقیہ شاعری کیا کرتے ہیں انھوں نے حصول ثواب کی غرض سے نعت بھی کہی بعض نے تو ثواب کی خاطر اور بعض نے صرف اس لیے نعت کہی تاکہ وہ اپنے آپ کو نعتیہ شعراء کی صف میں بھی کھڑا کر سکیں۔ نعت کہنے والوں کے نعتیہ کلام میں نبی اکرم ﷺ سے والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار نمایاں پایا جاتا ہے۔ نعت کی خوبی تو یہ ہوتی ہے کہ جس کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہو کہ کہنے والا عشق رسول ﷺ میں مجسم ڈوبا ہوا ہے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔ نعتیہ اشعار بسا اوقات پڑھنے والے پر اس قدر شدید اثر ڈالتے ہیں کہ وہ اندر سے تڑپ کر رہ جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ از خود اپنے نبی کی شان بیان کر رہا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے قرآن کریم میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کی ہدایت واضح طور پر موجود ہے۔ سورۃ الاحزاب (۳۳) کی آیت (۵۶) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ترجمہ ''بلاشبہ اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی کریمؐ پر۔اے لوگوں جو ایمان لائے ہو درود بھجو آپؐ پر اور خوب سلام بھیجا کرو''۔اللہ نے کلام مجید کی متعدد آیاد میں نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی تعریف و توصیف یعنی نعت بیان کی ہے۔ سورۃ اَلْبَقَرَة (۲) میں کہا 'اول المومنین ہیں'، سورۃ آلِ عمران (۳) میں کہا 'وہ مصطفےٰ ہیں'، سورۃ اَلنِساء (۴) میں فرمایا' حاکم برحق ہیں'، سورۃ

اَلْمآئدَہ (۵) میں کہا 'نور ہیں'، سورۃ اَلْانعام (٦) میں کہا' اول المسلمین ہیں'، سورۃ اَلتّوبہ (۹) میں آپ ﷺ کو 'رؤف و رحیم' کہا گیا، سورۃ اِبراھیم (۱۴) میں بتایا گیا کہ آپ ﷺ 'تاریکیوں سے نکالنے والے ہیں'، سورۃ اَلاَنبیآء (۲۱) میں کہا گیا' سراپا رحمت ہیں'، سورۃ اَلاحزاب (۳۳) میں کہا گیا ''خاتم النبیین ہیں'، سورۃ یٰسین (۳٦) میں آپؐ کو 'یاسین کہا گیا' ، سورۃ اَلفتح (۴۸) میں کہا گیا 'محمد ہیں'، سورۃ اَلصّفت (٦۱) میں فرمایا 'احمد ہیں'، سورۃ اَلْمُزّمّل (۷۳) میں فرمایا 'کملی والے ہیں'، سورۃ اَلْمُدّثّر (۷۴) میں آپؐ کو 'چادر والے ہیں' کہا گیا اور کہا گیا کہ آپؐ سراپا ہدایت ہیں۔ سورۃ الم نشرح میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا 'اور بلند کر دیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا ذکر'۔

جس کی تعریف و توصیف مالکِ کائینات نے بیان کی ہو اس کی شانِ اقدس میں عقیدت کے پھول کسی بھی بندے کی جانب سے پیش کیے جائیں۔بڑی سعادت کی بات ہے۔ آنخضرت محمد ﷺ کی مدح و ثنا بیان کرنے کا شرف آپ کے چچا جناب ابو طالب کو حاصل ہے جنھوں نے بنوں ھاشم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ محمد ﷺ کو کفار مکہ کی زیادتیوں سے بچائیں۔ دوسرا مدح جاہلیت کا نامور شاعر اعشیٰ بن قیس کو کہا جاتا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ عربی کے اولین نعت

نگاروں میں جناب ابو طالب اور اُمِ مُعبد کے نام آتے ہیں۔ دونوں کی نعتیں، عربی ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں اور ان کے حوالے، بعد کے اکثر نعت گو شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ اُمِ معبد کا نام عاتکہ بنتِ خالد ہے اور اس کی نثری نعت کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے ہے کہ اسے متعدد عربی شعرا نے منظوم کیا ہے، اس کے مواد کو بطورِ تلمیح اپنے کلام میں صرف کیا ہے، اور حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس کے حوالے سے ایک پورا نعتیہ قصیدہ کہہ کر اپنے دیوان کو مُزین کیا ہے''۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ عہد رسالت کے مادحین رسولؐ میں سے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت کو عہد نبوی میں ہی منبر عطا کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنی شعری تخلیقات (نعت) پیش کر سکیں۔ حضرت حسان بن ثابت کے علاوہ عہد رسالت میں جن مادحینِ رسولؐ کا ذکر ملتا ہے ان میں حضرت حمزہؓ بن عبد لمطلب، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبداللہ ابن رواحہ، حضرت سید ابن ابی ناس اکنانی، حضرت مالک بن المنط، حضرت عباسؓ، حضرت ابو سفیان بن الحارث، حضرت کعب بن مالکؓ حضرت مالک بن نمطہ شامل ہیں۔ خواتین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمہ الزہرہؓ سے بہت سے نعتیہ اشعار منسوب ہیں۔ حضرت صفیہؓ بنت ابی طالب، حضرت عاتکہ

بنت عبد لمطلب شامل ہیں۔ حضرت حسان کا یہ خوبصورت شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ

'الفِسَاء

ترجمہ (اے حسن و جمال کے آقا ﷺ آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھوں نے کسی کو نہیں دیکھا اور آپ ﷺ سے بڑھ کر جمیل کسی عورت نے بچہ پیدا نہیں کیا)۔ حضرت حسانؓ کو شاعر اسلام اور شاعر النبیؐ' ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ نعت رسول ﷺ کے بیان کرنے میں ہر نعت گو کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ حضرت حسان بن ثابت ارضی اللہ عنہ کا مقلد ہو۔ میرا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

مَیں بھی عاشق ہوں رئیسؔ حسان بن ثابت کا
پر ان جیسی نبیؐ سے محبت کہاں سے لاؤں

حضرت کعب بن زبیر عہد رسالت کے مداحین میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ حضرت کعبؓ نے جب اپنا قصیدہ بردہ شریف حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپؐ سن کر اتنے خوش ہوئے کہ اپنی چادر مبارک اتار کر انعام میں دے دی اسی لیے اس قصیدے کا نام قصیدہ بردہ پڑ گیا۔ عباسی عہد میں مداح سرا ابو لاعتاجیہ کا نام ملتا ہے۔ ان کے علاوہ ابن الفارض، عبد اللہ الیافعی، صرصری اور امام البوصیری، ابن نباتہ مصری، شہاب الدین محمود الحلبی، ابن جابر الاندلسی، ابن خلدون، عبد اللہ اشیرازی، حسین دجانی، عبد الغنی النابلسی قابل ذکر ہیں۔

صحابہ اکرم کے بعد مداح سرائی کا سلسلہ بطور مقدس فن کے جاری رہا۔ صوفیاء

اکرام بھی محبت رسول ﷺ میں سرشار نظر آتے ہیں۔امام ابو حنیفہ کے نعتیہ قصائد مشہور ہیں۔امام زین العابدین، غوث اعظم، خواجہ بختیار کاکی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت شمس تبریزی، مولانا روم، سعدی شیرازی، بو علی شاہ قلندر، خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت امیر خسرو، مولانا جامی، مولانا احمد رضاء خان بریلوی، فردوسی، بابا طاہر، ابو سعید ابوالخیر، عبداللہ انصاری، حکیم سنائی، فریدالدین عطار، نظامی، خاقانی، فردوسی، سوری، نظامی، عرفی، قدسی، رامی اور علامہ اقبال فارسی اور اردو زبان کے نعتیہ کلام کے سرمائے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔فارسی شعرا میں جامیؔ کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

نسیما جانبِ بطحا گزر کن
زاحوالم محمد ﷺ را خبر کن

جامیؔ کا ہی یہ فارسی شعر کس قدر مشہور ہے اس شعر کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے ۔

لا یُمکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

سعدی شیرازی کی عربی کی یہ نعت زبانِ زد خاص و عام ہے ۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدّجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ صلو علیہ و آلہٖ

امیر خسرو کی نعت کا یہ شعر دیکھئے ۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمد ﷺ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

جان محمد قدسی کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اردو زبان کے قدیم و جدید شعراء میں یوں تو بے شمار نام ملتے ہیں لیکن گیسو دراز ، فخر الدین نظامی ،قدسی ، بیدل ، غالب ، ملا وجہی، عوارحق، ابن نشاطی، نصرتی، ولی، سید محمد اکبر حسینی، سراج، سودا، شیراز، باقر آ قاہ، نظیر اکبر آبادی، شہید،، مومن ، لطف، راجہ مکھن لال، منشی شنکر لال، ساقی، ولی دکنی، جگر، میر، انیس، دبیر، امیر مینائی، محسن

،کارکوروی

شائق، حالیؔ، شبلیؔ، ظفرؔ علی خان، حالی، حفیظؔ جالندھری، نظمؔ طباطبائی، طوفان نیرت، جلیل، شاہ نیاز بریلوی، بیدم وارثی بہزادؔ لکھنوی، مولانا احمد رضاؔ خان، ، ماہرؔ القادری، خلیلؔ صمدانی کے علاوہ شیخ محمد ابرہیم آزادؔ شامل ہیں۔ دور حاضر کے نعت گو شعراء میں اثر صہبائی، احسان دانش، اخترؔ لکھنوی، ادیب رائے پوری، ارمان اکبر آبادی، اعجاز رحمانی، اقبال صفی پوری، انور جمال، تابش دہلوی، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، خالد بزمی، ذوق، ظفر نگری، ذہین شاہ تاجی، راغب مراد آبادی، ستار وارثی، سرشار صدیقی، سعید وارثی، اقبال عظیم، سیماب اکبر آبادی، صبیح رحمانی، صہبا اختر، عاصی کرنالی، محشر بدایونی، جمیل نقوی، تابشؔ صمدانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طاہر حسین طاہرؔ سلطانی ادبی جریدے ماہنامہ ''ارمغانِ حمد'' اور سہ ماہی ''جہان حمد'' کے مدیر نعت گو شاعر کی حیثیت معروف ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والا رسالہ 'نعت' قابل ذکر ہے۔ راجا رشید محمود بہت ہی محنت، عقیدت اور خلوص سے ماہنامہ نعت شائع کر رہے ہیں۔ الطاف حسین حالیؔ کی دیگر شاعری کے علاوہ نعتیہ کلام کس قدر مشہور ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

امیر مینائی کا نعتیہ کلام متاثر کن ہے۔

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں

حسرت آتی ہے کہ یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

دو قدم بھی نہیں چلنے کی ہے طاقت مجھ میں

شوق کھینچے لیے جاتا ہے میں چلا جاتا ہوں

حسرت موہانی بے شمار صلاحیتوں کے مالک۔ شاعر، ادیب، صحافی، محقق، تذکرہ نگار اور سیاسی رہنما۔ ان کی نعتیں دل میں اترنے والی ہیں۔ اپنے بارے میں کیا خوب شعر کہا۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

علامہ اقبال ایک قومی شاعر ہیں یوں تو ان کا شمار نعت گو شعراء میں نہیں ہوتا لیکن ان کے فارسی اور اردو کلام میں خوبصورت نعتیں موجود ہیں۔ اقبال کے یہ خوبصورت شعر۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

کی محمد ﷺ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جمیل نقوی کو ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے 'سرکار کی چاہت والے' کہا ہے۔ ان کی کہی ہوئی حمد و نعت بہت مقبول ہیں۔

کعبہ پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بُھول گیا

یو ہوش و خرد مفلوج ہوئے دل ذوقِ تماشا بُھول گیا

سید فصیح رحمانی جتنی اچھی نعت پڑھتے ہیں ان کی کہی ہوئی نعت بھی خوب ہوتی ہے۔

کعبہ کی رونق کعبہ کا منظر، اللہ اکبر اللہ اکبر

دیکھوں تو دیکھے جاؤں برابر، اللہ اکبر اللہ اکبر

حیرت سے خود کو کبھی دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کبھی میں حرم کو

لایا کہاں مجھ کو میرا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

تیرے کرم کی کیا بات ہے مولا، تیرے حرم کی کیا بات ہے مولا

تا عمر کر دے آنا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

مجھے روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، میں پیر ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ کی شب روضہ رسول ﷺ کے سامانے رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

روضہ روسول ﷺ پر حاضری

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پا گیا ہوں
کہاں میں بے کس و بے نوا کہاں میرا نصیب
مدینہ کی فضاء میں شفاء پا گیا ہوں
تھی یہ آرزو مدت سے مدینہ دیکھوں
کرم پہ اپنے نبیؐ کے مراد پا گیا ہوں
دیکھا جو اِن آنکھوں نے روضہ نبیؐ کا
دل میں اترتی ٹھنڈک کا مٹھاس پا گیا ہوں
تھی تمنا دیکھیں یہ آنکھیں بھی سبز گنبد کو
گنبد خضراء کا حسین سا یہ پا گیا ہوں
تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب
جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پا گیا ہوں
نگاہیں کیسے ہٹتیں رئیسؔ روضے کی جالیوں سے

برسوں کی پیاس کا احساس پا گیا ہوں

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود: تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

سابق چیئرمین۔ شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ پنجاب، لاہور

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے حوالے سے کیا جو موضوع کی تحقیقی ضرورت تھا۔ پاکستان میں لائبریری پروفیشنلز میں ڈاکٹر خالد محمود اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ پاکستان لائبریرین شپ کی ایک جانی پہچانی ، فعال ، مستعد، زیرک، تیز فہم، ذی اِستعداد، لائق فائق شخصیت ہیں ۔ جامعہ پنجاب میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کے شعبہ میں انقلابی تبدیلی اور ایم فل و پی ایچ ڈی کی تعلیم کو مستحکم بنیادوں پر رائج اور عام کرنے میں ڈاکٹر خالد کا کلیدی کردار ہے۔یہی نہیں بلکہ پاکستان میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کی اعلیٰ تعلیم (ایم فل و پی ایچ ڈی) کو جامعات کی سطح پر جاری و ساری کرنے اور ملک میں اس شعبے میں تحقیقی کلچر کو شروع کرنے میں ڈاکٹر خالد محمود نے جو کردار ادا کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا مثالی اور تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ راقم الحروف نے جب یہ انٹرویو کیا (۲۸ دسمبر ۲۰۰۴ء) تو وہ شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ پنجاب لاہور میں پروفیسر و چیرَمین تھے۔ انہوں نے اسی شعبہ سے ایم ایل آئی ایس کیا

اوراسی شعبہ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ کالج لائبریرین کی حیثیت سے پیشہ ورانہ خدمات کا آغاز کیا۔ لیکچرر کی حیثیت سے شعبہ میں شمولیت اختیار کی اور تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں عبور کرتے ہوئے پروفیسر اور شعبہ کے سربراہ کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔ انہیں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، لاس اینجلس کے شعبہ انفارمیشن اسٹڈیز، گریجویٹ اسکول آف ایجوکیشن و انفارمیشن اسٹڈیز سے ۲۰۱۱ء میں HEC sponsored post-doctoral research مکمل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اپنے مضمون کے نامور و معتبر لکھاری ہیں۔ متعدد کتابوں اور مضامین کے خالق ہیں۔ پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا ان کے محبوب مشاغل ہیں۔ ۲۰۱۳ء سے یونیورسٹی آف دمام، سعودی عرابیہ کے انفارمیشن لرننگ و ریسرچ کامن (Infromation Learning & Research Commons, ILRD) ڈین شپ آف لائبریری افیئر کے ہیڈ کی حیثیت سے منسلک ہیں۔

یہ انٹرویو میرے پی ایچ ڈی مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار ۔'' اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ۔ شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت ، خدمات اور تحقیقی موضوع کے حوالے سے ڈاکٹر خالد محمود کی رائے اور خیالات جو اس گفتگو کے نتیجہ میں سامنے آئے تحقیق میں معاون ثابت ہوئے۔

: تعارف

ڈاکٹر خالد محمود پاکستان لائبرین شپ کی ان چند شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت، قابلیت اور محنت سے لائبریری پروفیشن میں جلد وہ مقام حاصل کر لیا جس کے لیے طویل جدوجہد اور وقت درکار ہوتا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایل آئی ایس کرنے کے بعد کالج لائبریرین کی حیثیت سے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ قائداعظم لائبریری، لاہور میں بھی ایک سال خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۳ء میں شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرار منتخب ہوئے اور تاحال ایک استاد کی حیثیت سے مصروف عمل ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس جامعہ پنجاب نے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا، پی ایچ ڈی میں، داخلہ لینے والے پہلے تین امیدواراں میں سے ایک آپ بھی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ۲۰۰۴ء میں پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر خالد محمود لائبریری وانفارمیشن سائنس کے ان پاکستانی مصنفین میں سے ایک ہیں جن کی تحریریں پاکستان کے علاوہ بین الاقوامی پیشہ ورانہ رسائل وجرائد میں شائع ہوئیں۔ لائبریری آٹومیشن ڈاکٹر خالد کا خاص موضوع ہے۔ اس موضوع پر آپ کی ایک کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ راقم الحروف اور ڈاکٹر

خالد محمود کی مرتب کردہ کتاب ''لائبریری وانفارمیشن سائنس کے رسائل وجرائد کا ۵۰ سالہ اشاریہ'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں لائبریری سائنس کی اولین کتاب ہے جس کا ویب ورژن سب سے پہلے انٹرنیٹ پر آیا۔ ''پاکستان جنرل آف لائبریری وانفارمیشن سائنس''، لاہور اور ''پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس جنرل'' کی ادارت میں شامل ہیں۔ڈاکٹر خالد محمود سے یہ گفتگو ان کے کراچی آمد کے موقع پر، بروز منگل بتاریخ ۲۸ دسمبر ۲۰۰۴ء کو راقم الحروف کی رہائش گاہ پر ہوئی۔

ا : لائبریری سائنس کے استاد کی حیثیت سے آپ پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

ج : میں تو پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم اور اس پیشے کا مستقبل روشن دیکھتا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جہاں پر ترقی اور تبدیلی نہ ہوئی ہو، کتب خانوں میں بھی تبدیلیاں آرہی ہیں لیکن میرے خیال میں لائبریری کا جو تصور ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی وہ وہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کتب خانوں نے بھی ترقی کی ان کے بغیر کوئی ملک ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تبدیلیاں آئی ہیں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے ابھی تو مزید ترقی ہوگی، تبدیلیاں آئیں گی لیکن ان تمام کے باوجود اس پروفیشن کا مستقبل روشن ہے۔

۲۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لائبریریز میں کمپیوٹر کے آجانے کے بعد لائبریری سائنس کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اس سلسلے میں آپکی کیا رائے ہے؟

ج: میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ کمپیوٹر کے آجانے کے بعد لائبریری سائنس کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ ایک چیلنج ضرور ہے۔ کمپیوٹر کے باعث معلومات یا انفارمیشن کے حصول ، نظام بازیافت (Retrieval System) اور ترسیل میں تبدیلی اور تیزی ضرور آئی ہے ۔ جن ممالک نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر اپنایا وہاں پر زیادہ تیزی سے ترقی ہوئی۔ کتب خانے اس جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے اپنے آپ کو زیادہ بہتر محسوس کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر لائبریری کا نعم البدل ہر گز نہیں یہ تو ان کے لئے ایک بہترین مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳: آپ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں اسپل (SPIL) اور اس کے تاسیسی صدر حکیم محمد سعید شہید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ملک یا خطہ میں کتب خانوں کی ترقی میں لائبریری سائنس کے علاوہ ان اشخاص کا کردار بھی اہم ہوتا ہے۔ ان کی مدد اور رہنمائی کے بغیر کتب خانے ترقی نہیں کر سکتے۔امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک

جیسے شخص نے عوامی کتب خانوں کے قیام اور تر(Andrew Carnegie) میں کارنیگی
قی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے بے شمار کتب خانوں کی عمارات تعمیر کرائیں۔ ۱۹۱۵ء
نے کارنیگی لائبریریز کا ایک سروے (Alvin S, Johnson) میں ایلون ایس جانسن
کیا جس کے مطابق کارنیگی کتب خانوں میں بہتر لائبریری خدمات موجود نہیں تھیں
کیوں کہ ان میں تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے، جانسن نے کارنیگی کارپوریشن کو یہ مشورہ
دیا کہ وہ کتب خانوں کی عمارات کی تعمیر کے لئے رقم دینے سے قبل لائبریریز کی تربیت
میں (Introduction to Librarianship) کا اہتمام بھی کریں۔ ولیم گیٹس نے
لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں امریکہ میں سٹی لائبریریز کے قیام کے
نے مالی امداد فراہم کی، ۱۸۸۱ء سے (Andrew Carnegie) لیے اینڈریو کارنیگی
ء کے درمیان کارنیگی نے ۱۶ میونسپل لائبریریز قائم کیں اس کے بعد کارنیگی نے ۱۸۹۸
امریکہ ہی کی مختلف اسٹیٹس اور علاقوں میں ۳۰ کتب خانوں کے لیے چار ملین ڈالر کی
رقم فراہم کی تھی۔ پاکستان میں بھی کتب خانوں کی اہمیت اور ضرورت کا احساس رکھنے
والی شخصیات کی کمی نہیں۔ حکیم محمد سعید نے لائبریرین شپ کے پیشے کی اہمیت کا احساس
کرتے ہوئے لائبریریز برادری کو عزت دی وہ انہیں ساتھ لے کر چلنے والے تھے عام
طور پر لوگ ایسا نہیں کرتے۔

منعقدہ سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسیز کے پاکستان لا (SPIL) اسپل : ۴

ئبریرین شپ پر کیا اثرات مرتب ہوے؟

کے منعقد کردہ سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسیز ایک اچھی اور (SPIL)ج: اسپل کامیاب کوشش تھی۔ میرے خیال میں لائبریری تحریک پر ان کے اثرات کراچی اور سندھ تک محدود رہے اس کے باوجود ملک میں لائبریری تحریک کے لیے اس سے زیادہ جدوجہد کی ضرورت تھی جو ایک شخص کے گرد گھومنے والی ایسوسی ایشن مکمل طور پر نہیں کر سکتی ان کی اپنی کوششیں لائق تحسین ہیں لیکن ملکی سطح پر اس کے مثبت اثرات مرتب کرانے کیلیے ناکافی تھیں۔

۵۔ کیا ''اسپل گولڈ میڈل'' پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو سکا؟

کے اس اقدام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ انجمن لائبریرین (SPIL)ج: اسپل شپ کی پیشہ ورانہ تعلیم کو لازمی قرار دیتی ہے اور یہ انجمن چاہتی تھی کہ جامعات میں لائبریری کے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ جب عملی میدان میں جائیں تو زیادہ محنت اور بہتر طریقے سے خدمات انجام دیں۔

کی مطبوعات لائبریری مواد میں کس حد تک (SPIL)آپ کے خیال میں اسپل : ٦ مفید اور کارآمد ثابت ہوئیں؟

کے لائبریری لٹریچر جن میں (SPIL)ج: اسپل Guide ، Proceedings

Books ،

اور نصابی کتب بھی شا Memorandums رپورٹس اور تجاویز و Library Plan ' مل ہیں۔ یہ لٹریچر پاکستان لائبریرین شپ کے اولین لٹریچر میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو بھی کام ہوا ہے یہ اس کی بنیاد ہے، پاکستان میں لائبریرین شپ کی تاریخ میں اور اس کی سرگرمیوں نیز اس کے لٹریچر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس (SPIL) اسپل کی مطبوعات کا ذکر کیے بغیر اس ملک میں لائبریرین شپ کی تاریخ ادھوری رہے گی۔ معیار کے اعتبار سے بھی یہ ادب بہتر اور معیاری ہے۔

حکیم محمد سعید شہید کے قائم کردہ کتب خانے بیت الحکمتہ کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ :ے

ج: بیت الحکمہ کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا، میری رائے یہ ہے کہ یہ کتب خانہ پاکستان ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیاء کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ ذخیرہ کتب، عمارت اور اس میں قائم مختلف شعبہ جات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم محمد سعید شہید لائبریری کے لئے کس قدر شدید محبت رکھتے تھے۔ کتب خانہ جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہے قارئین و محققین کے لیے تمام طرح کی سہولیات مہیا ہیں خاص طور پر اس کا شعبہ 'تراشہ جات' اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے شعبہ مخطوطات بھی قابل تعریف ہے۔ اسٹاف کا خدمات مہیا کرنے کا انداز بھی اچھا ہے۔

۸ : لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغاز جامعہ کراچی سے ۱۹۶۷ء میں ہو چکا تھا۔ ۳۷ سال میں صرف ۲ جامعہ کراچی سے اور ایک اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے یہ سند حاصل کر سکے اب آپ چوتھے فرد ہیں یہ سند حاصل کرنے والے، آپ کے خیال میں اس کی وجہ اپنے مضمون سے عدم دلچسپی رہی یا کوئی اور رکاوٹ؟

ج: ۱۹۶۷ء میں کافی لوگ رجسٹر ہوئے ان کے کام نہ کرنے کی وجہ میرے خیال میں عدم دلچسپی تھی بعد میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے فروغ نہ پانے کی دو وجوہات ہیں۔

(۱) جن احباب نے پی ایچ ڈی کر لیا انہوں نے دیگر لوگوں کو اس جانب راغب نہیں کیا، یعنی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے حوصلہ شکنی کرتے رہے۔

(۲) پی ایچ ڈی ایک مشکل کام ہے ہمارے لائبریرینز نے ہمت نہیں کی کہ وہ اس مشکل کام کو کر گذرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً کر سکتے تھے۔

۹ : آخر میں یہ فرمائیں کے آپ اس تحقیق کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج: مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ آپ نے حکیم محمد سعید شہید کی لائبریری سے متعلق خدمات کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے تو میں نے اس پر خوشی محسوس کی، مجھے

یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ حکیم صاحب واقعی اس لائق ہیں کہ ان کی اس شعبے کے لیے جو خدمات ہیں اور جو اس قدر زیادہ ہیں کہ یہ موضوعِ تحقیق ایک خراج تحسین ہوگا اور اس لحاظ سے بھی یہ موضوع بہت اچھا ہے کہ پاکستان میں جس شخص نے اس شعبے کے لیے اتنا کام کیا اس پر اس قسم کی تحقیق دوسرے لوگوں کے لیے و معاشرے کے سر کردہ افراد ہیں کے لیے یہ تحقیق متوجہ کا باعث ہو گی کہ اس پیشے کے لوگ اپنے محسنوں اور ان کی خدمات کو یاد رکھتے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ یہ تحقیق جامع ہو کوئی گوشہ خالی نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر سکینہ ملک : : تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

(ڈاکٹر سکینہ ملک سے یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیقی ضرورت تھا۔ راقم الحروف نے کوئٹہ کا بطور خاص دورہ کیا اور مختلف پیشہ ورانہ شخصیات سے تحقیقی موضوع کے حوالے سے ملاقات کی ان میں ڈاکٹر سکینہ ملک بھی شامل تھیں جو اس وقت جامعہ بلوچستان کے مرکزی کتب خانے کی مہتمم اعلیٰ تھیں۔ یہ بنیادی طور پر کراچی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جامعہ کراچی کے کتب خانے میں خدمات انجام دے چکی ہیں۔ امریکہ سے پی ایچ ڈی کیا اور وطن واپس ہوئیں تو جامعہ بلوچستان نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ جامعہ بلوچستان میں چیف لائبریرین کی حیثیت سے کام کیا پھر واپس امریکہ چلی گئیں۔ڈاکٹر سکینہ ملک سے اپنے تحقیقی موضوع کے حوالے سے گفتگو کی۔ یہ گفتگو ۱۳اپریل ۲۰۰۴ء بلوچستان یونیورسٹی لائبریری، کوئٹہ میں ہوئی۔ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے ’’ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار‘‘ ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ شہید حکیم محمد سعید کی شخصیت ، خدمات اور تحقیقی موضوع کے حوالے سے

عذرا قریشی صاحبہ کے رائے اور خیالات اس گفتگو کے نتیجہ میں سامنے آ کے جو تحقیق (میں معاون ثابت ہوئے

تعارف :

ڈاکٹر سکینہ ملک پاکستان لائبریرین شپ کی دوسری خاتون ہیں جنھوں نے بیرون ملک سے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحبہ کا تعلیمی ریکارڈ بہت نمایاں ہے۔ آپ نے لائبریری سائنس کے علاوہ اسلامیات اور معاشیات میں بھی ایم اے کی سند حاصل کی۔ لائبریری سائنس میں جامعہ کراچی سے ۱۹۷۸ء میں اور پھر پنسلوا اسٹیٹ یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ ۲۰۰۰ء میں (Concordia University, USA) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر سکینہ ملک نے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بلوچستان یونیورسٹی لائبریری میں کیٹلاگر کی حیثیت سے کیا۔ اس وقت وہ اسی لائبریری کی چیف لائبریرین ہیں یہ عہدہ اعزاز اور مرتبہ کے اعتبار سے پروفیسر کے مساوی ہے۔ اس مقام پر پہنچنے میں ڈاکٹر صاحبہ نے ۲۲ سال کا طویل سفر طے کیا۔ مختلف حیثیتوں سے ملک میں اور امریکہ کے کتب خانوں میں خدمات انجام دیں۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس بلوچستان یونیورسٹی کے قیام کے وقت آپ شعبہ قائم کرنے والوں کے شانہ بہ شانہ تھیں۔ آپ نے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے لائبریری اسکول میں لائبریری سائنس کے استاد کے

فرائض بھی انجام دیئے۔ ڈاکٹر صاحبہ بلوچستان میں لائبریری سائنس کے فروغ و ترقی کے لیے بھی کوشاں ہیں۔

آپ نے لائبریرین شپ کا پیشہ کب اور کیسے اختیار کیا؟ : ا

ج: لائبریرین شپ کا آغاز ۸ اپریل ۱۹۸۰ء کو ہوا جب بلوچستان یونیورسٹی لائبریری میں کیٹلاگر کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا۔ اس وقت یہاں یونیورسٹی لائبریرین ایم اے کاظمی صاحب تھے۔ انہوں نے جامعہ کراچی آکر مجھے اس عہدہ کے لیئےمنتخب کیا تھا۔

اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں بتائیں۔ لائبریری سائنس کی تعلیم کب اور : ۲ کہاں سے حاصل کی؟

ج: جائے پیدائش کراچی ہے۔ ابتدائی تعلیم انگریزی میڈیم اسکول میں ہوئی، اپوا کالج سے ۱۹۷۴ء میں گریجویشن کیا، جامعہ کراچی سے ۱۹۷۶ء علوم اسلامی میں پہلا ایم اے کیا۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ۱۹۷۸ء میں ایم اے کیا۔ فوراً ہی بلوچستان یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت مل گئی۔ ۱۹۸۵ء میں کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز پاکستان میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ایک فعال ٹیم کے ساتھ ڈا

کٹر افتخار خواجہ کی سر براہی میں شعبہ لائبریری سائنس، بلوچستان یونیورسٹی میں قا
ئم کیا جو آج بھی سدا بہار شجر کی طرح قائم ہے اور ماشاء اللہ میرے طلباء جواب قا
بل اساتذہ ہیں بلوچستان میں ہر سال ہنر مند افراد کی خاصی تعداد فراہم کرتے
ہیں۔ مئی ۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری میں ریفرنس لائبریرین کی
حیثیت سے کام کا آغاز کیا اس دوران پاکستان ببلوگرافیکل ورکنگ گروپ کے لائبریری
اسکول میں اعزازی طور پر پڑھاتی رہی۔ اگست ۱۹۷۹ء میں امریکہ چلی گئی اور پنسلونیا کی
پنسلوا اسٹیٹ یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ماسٹرز کیا۔ ۲۰۰۰ء میں مرحلہ وار کا
سے لائبریری سائنس میں (Concordia University, USA) م کرتے ہوئے
ڈاکٹریٹ کیا۔ میرے مقالہ کا عنوان ہے لائبریری سائنس کی تعلیم کے مسائل با
لخصوص ایشیائی ممالک میں اور ان کا حل و تجاویز۔ میں پاکستان واپس آ گئی ایک سال
اسلام آباد میں قائم میڈیکل کالج میں چیف لائبریرین کے فرائض انجام دئے اور اب
بلوچستان یونیورسٹی میں چیف لائبریرین کی حیثیت سے لائبریری کی بہتری کے لیے کو
شاں ہوں۔

آپ پاکستان میں لائبریری سائنس کا مستقبل کیسا دیکھتی ہیں؟ : ۳

ج: لائبریری سائنس کی تعلیم کے مستقبل کا انحصار بنیادی طور پر حکومت کی پالیسیوں پر
ہے۔ اگر حکومت تمام تعلیمی اداروں میں پرائمری سے اعلیٰ سطح

تک کتب خانوں کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ان کے قیام کو لازمی بنائے تو یقینا پیشہ ور افراد کی ضرورت ہو گی اس کو پورا کرنے کے لئے جامعات کے شعبہ لائبریری سائنس سے ہی افراد فراہم ہوں گے اس طرح لائبریری سائنس کی تعلیم کے رجحان میں اضافہ ہوگا۔ سابق وفاقی وزیر تعلیم زبیدہ جلال صاحبہ کے بیان کے مطابق بلوچستان میں ۲۰ ہزار اسکول کھولے جائیں گے۔ دیگر عملہ کے ساتھ ساتھ اگر ہر اسکول میں لائبریرین کے تقرر کو بھی یقینی بنادیا جائے تو ان نئے کھلنے والے اسکولوں میں ۲۰ ہزار لائبریریز درکار ہوں گے۔ میری رائے میں پرائمری سطح پر عادات مطالعہ کا فروغ بچوں کی اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت پوری نہ ہونے کے سبب اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی طالب علموں میں عادت مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف استاد کے کہنے پر ضرورت کے پیش نظر کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴ : لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغاز جامعہ کراچی سے ۱۹۶۷ء میں ہو چکا تھا۔ ۳۷ برس میں صرف تین لوگ یہ سند حاصل کر سکے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ اپنے مضمون سے عدم دلچسپی رہی یا کوئی اور رکاوٹ؟

ج: ۳۶ سال میں پاکستان کی جامعات سے لائبریری سائنس میں صرف تین افراد کا پی ایچ ڈی حاصل کرنا افسوس ناک صورت حال ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب مضمون میں عدم دلچسپی نہیں بلکہ مواقع کا فراہم نہ ہونا اور بے شمار

رکاوٹیں ہیں لیکن ان میں سے چند یہ ہیں

تحقیق کا ارادہ کرنے والے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بالخصوص اساتذہ کی (۱)
طرف سے

تحقیقی مواد کی کمیابی اور اس کے حصول میں مشکلات۔ (۲)

تحقیق کروانے والے سپروائزر دستیاب نہیں۔ (۳)

بیرون ملک جامعہ میں داخلے کے اخراجات اور دیگر مسائل پاکستان میں بسنے وا (۴)
لے ملازمت پیشہ افراد کے لئے ناممکنات میں سے ہیں۔

تحقیق کے آغاز میں محقق کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً موضوع کا انتخاب (۵)
کی تیاری، مواد کی حصولیابی، (Synopcis) کتابیات کی تیاری، تحقیقی خاکہ ،
سوالنامہ کی تیاری وغیرہ ایسے مراحل ہوتے ہیں کہ جن میں کسی مخلص رہنمائی کرنے
والے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر رہنمائی کرنے واے مخلص نہیں ہوتے
اور مشکلات بتا کر حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔

تحقیق کے مکمل ہونے کا وقت معین نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا (۶)
سکتا ہے کہ پاکستان میں لائبریری سائنس میں اول پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے وا
لے ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی جنھوں نے ڈاکٹر عبد المعید مرحوم کی زیر نگرانی تحقیق کی ان کا
کام گیارہ سال میں اختتام کو پہنچا۔ لائبریری سائنس میں تحقیق کے حوالہ سے مثبت
تبدیلی آئی ہے جامعہ کراچی کے علاوہ دیگر جامعات میں بھی تحقیق کا عمل شروع ہو چکا
ہے۔ تحقیق

میں معاونت کرنے والوں کی فکر بھی تبدیل ہوئی ہے۔اعلیٰ تعلیمی اداروں خاص طور پر جامعات میں تقرری وترقی کے لئے نئے قوانین کے سبب امید ہے کہ باوجود مشکلات کے مزید افراد تحقیق کے میدان میں قدم رکھیں گے۔ کیونکہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے قانون کے مطابق اب کوئی استاد پی ایچ ڈی کئے بغیر گریڈ ۱۹یا۲۰ میں ترقی نہیں پاسکے گا اور نہ ہی اس کا اس عہدہ پر تقرر ہوگا۔ بلکہ گریڈ ۱۸کے لئے بھی ایم فل ضروری ہے۔ شعبہ لائبریری سائنس، بلوچستان یونیورسٹی میں اسوقت تین اساتذہ ایم فل موجود ہیں اور پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کروارہے ہیں۔

حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سے قمر مرزا سے ایک مکالمہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ یہ انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار" ۔ اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی)

تعارف :

قمر مرزا پاکستان کے سینئر لائبریرینز میں سے ہیں جنھوں نے ۱۹۵۱ء میں لائبریری سائنس کے سرٹیفیکیٹ کورس سے پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول آغاز کیا، ۱۹۶۹ء میں امریکہ کی (Pittsburg University) سے لائبریری سائنس میں ماسٹر زیا۔ ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی کے گورنمنٹ کالج کے لائبریرین کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پشاور یونیورسٹی لائبریری میں خدمات انجام دیں، شعبہ لائبریری سائنس ، جامعہ پشاور میں استاد رہے۔،برطانیہ کی (Northumberland Country) لائبریری اور (Twickenham Public Library)، آسٹریلیا کے Western) Institute of Technology) کی لائبریری کے علاوہ ۲۱برس امہ القریٰ

یونیورسٹی، مکہ المکرمہ میں لائبریرین کے فرائض انجام دینے کے بعد آجکل اپنے آبائی شہر گوجرانوالہ میں ریٹائر لائف گزار رہے ہیں۔آپ نے اپنی آنکھوں کے آپریشن کے باوجود ازراہ عنایت راقم کے سوالات کے جوابات مورخہ ۳ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ارسال فرمائے۔

۱ : شہید حکیم محمد سعید نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟

ج: حکیم محمد سعید شہید نے بطور مربی خاموش مگر فعال کردار ادا کیا اور مالی وسائل بھی مہیا کیے۔ رنگدار چشمے کے پیچھے ان کی آنکھوں میں کتنی گہرائی تھی اسے ناپنا آسان نہیں۔

۲ : اسپل کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار اور ورکشاپس کے پاکستان لائبریرین شپ پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج: سیمینار، کانفرنسیز اور ورکشاپ سے لائبریریز کو مل بیٹھنے اور مسائل پر گفتگو کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مقالات لکھنے کی حوصلہ افزائی ہوئی جس سے لائبریری ریسرچ میں بہت مدد ملی نیز بالواسطہ طور پر ان لائبریرینز کو بھی شہرت ملی جہاں سے شرکت کے لیے لائبریرین حضرات تشریف لائے۔

اسپل نے لائبریری سائنس کے طلباء کے لئے 'اسپل گولڈ میڈل جاری کیا۔ آپ : ۳
اس اقدام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ؟

ج : اسپل گولڈ میڈل لائبریری سائنس کے طلبہ میں حوصلہ افزائی اور ان میں مقابلے کے رجحان کا باعث ہے۔ لائبریرین شپ میں ایسی کوئی اور مثال پاکستان میں قائم نہیں ہوئی۔ جن طلبہ نے گولڈ میڈل حاصل کیا یہ ان کے لیے فخر کی بات بھی ہوئی۔ عام طور پر نام کے ساتھ ''گولڈ میڈلسٹ'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

کی مطبوعات لائبریری لٹریچر میں کس حد تک مفید اور کارآمد ثا (SPIL)اسپل : ۴
بت ہوا؟

کی مطبوعات کو لائبریری سائنس کے لٹریچر میں خاص مقام حاصل (SPIL) ج: اسپل
ہے۔ یہ لائبریری پلاننگ اور تعمیر کے مطالعہ میں کارآمد ہیں۔

پشاور یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام کب اور کیسے عمل میں آیا، کچھ : ۵
اس کے بارے میں بتائیں؟

ج : صوبہ سرحد میں تربیت یافتہ لائبریریز کی کمی کافی عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ پورے صوبے میں صرف چند تربیت یافتہ افراد لائبریریوں میں کام کر رہے تھے۔ چنانچہ پشاور یونیورسٹی میں مرحوم ڈاکٹر عبدالصبوح قاسمی کی

رہنمائی میں ڈپلومہ کورس کا اجرا ہوا۔ یہ ۱۹۶۲ء میں ممکن ہوا جب کہ راقم کی انگلستان سے آنے کے بعد پشاور یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ لائبریرین تقرری ہوئی۔ شروع کے سالوں میں ان افراد کو داخلہ دینے میں ترجیح دی گئی جو لائبریریوں میں کام کرتے تھے ان کے پاس کوتعلیمی قابلیت نہیں تھی۔ اول دوسالوں میں ۳۳ طالب علم لائبریری سائنس میں ڈپلومہ لے کر فارغ ہوئے۔ شعبہ کا علیحدہ قیام بعد میں ممکن ہوا۔ مرحوم اے یو خان کا تقرر اگرچہ بطور اسسٹنٹ لائبریرین ہوا مگر وہ زیادہ وقت ڈپلومہ کورس کو دیتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کو بطور ماڈل سامنے رکھا گیا۔ یونیورسٹی لائبریرین بطور چیر مین شعبہ لائبریری سائنس بھی کام کرتے تھے۔ ڈپلومہ کورس کا نصاب بنانے میں پنجاب یونیورسٹی اور برٹش لائبریری ایسوسی ایشن (اس وقت کے A.L.A.) کے کورسز سے استفادہ کیا گیا تھا۔ عملی ببلوگرافی اور انڈکسنگ پر خاص توجہ دی گئی۔ (جناب قمر مرزا صاحب نے سوالات کے جوابات مورخہ ۳۷ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ارسال فرمائے)

محمد خورشید عالم: تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے حوالے سے کیا جو موضوع کی تحقیقی ضرورت تھا۔ انٹر ویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار " ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی)

تعارف :

محمد خورشید عالم ایک سینئر لائبریرین ہیں جنہوں نے ۱۹۵۷ء میں سرٹیفیکیٹ کورس سے لائبریری سائنس کی تعلیم کا آغاز کیا ۱۹۵۹ء میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ۱۹۶۴ ء میں جامعہ کراچی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز لیاقت میموریل لائبریری سے کیا، چھ سال (۱۹۵۹ء ۔ ۱۹۶۵) ء ۔برٹش کونسل ، نو سال (۱۹۶۵ء ۔ ۱۹۷۴ء) PCSIR کے چیف لائبریرین رہے، ۱۲ سال (۱۹۷۴ء ۔ ۱۹۸۴ء) لیبیا میں ایگریکلچرل جامعہ الفتح کی لائبریری میں خدمات انجام دیں، ۱۹۸۴ء ۔ ۱۹۸۵ ء میں ہمدرد لائبریری کے چیف لائبریرین رہے ، گیارہ سال (۱۹۸۵ء ۔ ۱۹۹۶ء) ڈاکٹر محمود حسین لائبریری جامعہ کراچی کے

لائبریرین رہے اور ریٹائرمنٹ حاصل کی، ۱۹۹۶ء سے ضیاء الدین میڈیکل یونیورسٹی کے چیف لائبریرین کی حیثیت سے لائبریری خدمات انجام دے رہے ہیں۔پیشہ ورانہ سر گرمیوں میں بھی فعال نظر آتے ہیں، قومی اور بین الاقوامی لائبریری کانفرنسیز اور سیمینارز میں شرکت کر چکے ہیں ،آپ کے کئی مضامین بھی پیشہ ورانہ رسائل میں شائع ہوئے۔ خورشید عالم صاحب سے یہ گفتگو ان کی رہائش گاہ پر بروز ہفتہ ۲۲ جنوری 2005ء کو ہوئی۔

آپ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کے کر : ا
دار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم صاحب کا اہم اور مثبت کردار رہا، خاص طور پر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان اسپل جس کے حکیم صاحب صدر تھے لائبریری سر گرمیوں میں پیش پیش تھی۔ حکیم صاحب سوسائٹی کے بارے میں بہت زیادہ پر جوش (Enthusiastic) تھے۔ میں جب ہمدرد لائبریری میں تھا تو اکثر اسپل کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اسپل کے سر گرم اراکین ملک سے باہر چلے گئے تو انہیں وہ قوت محرکہ (Impetus) نہ مل سکی۔

کے منعقدہ سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسوں کے پاکستان لا (SPIL) اسپل : ۲

ئبریرین شپ پر کیااثرات مرتب ہوئے؟
کے منعقد کردہ سیمینار، ورکشاپس اور کانفرنسوں کے (SPIL)ج: اسپل
اثرات پڑے۔ اس وقت یہ انجمن فعال نہیں ہے اس کا یہ جمود دور ہو (Positive)
سکتا ہے بشرطیکہ سنجیدہ لوگ اس کا بیڑا اٹھائیں۔

کیا ''اسپل گولڈ میڈل'' پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو : ۳
سکا؟

ملا جو اس کے حق دار (Inspiration) گولڈ میڈل سے طلبہ کو (SPIL)ج: اسپل
قرار پاتے ہیں ان میں تحقیق کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک مستحسن قدم
تھا ہے۔

کی مطبوعات لائبریری مواد میں کس حد تک مفید اور کارآمد ثا (SPIL)اسپل : ۴
بت ہوئیں؟

ج: یہ لائبریری لٹریچر مفید تھا اور مفید رہے گا۔ ریسرچ کے لیے جب بھی کوئی محقق قلم
اٹھائے گا تو لازمی طور پر تاریخ کے لیے وہ ان مطبوعات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اگر
کوئی بھی ایسوسی ایشن اپنے منعقد کردہ سیمینار یا کانفرنس کی روودادیں شائع نہیں کرے
تو کچھ عرصہ کے بعد اس کا یہ اقدام لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے اگر روودادیں
شائع کر دی جائے تو

اس ایسو سی ایشن کا وہ اقدام ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے اسپل نے ایک اچھی روایت یہ قائم کی کہ اس نے اپنے تمام تر سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسوں کی رودادیں شائع کیں جو آج ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں اور اس کا یہ اقدام ان رودادوں کے ذریعہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ پی ایل اے نے بھی اپنی بیشتر کانفرنسوں کی رودادیں شائع کیں ہیں۔

۵ : آپ نے ہمدرد لائبریری کب جوائن کی، یہ فرمائیں کہ آپ نے حکیم محمد سعید کو بہ حیثیت منتظم کیسا پایا؟

ج: میں نے ۱۹۸۴ء میں ہمدرد لائبریری جوائن کی تھی اس وقت یہ لائبریری ہمدرد سینٹر ناظم آباد میں تھی لیکن بیت الحکمہ کے لیے ابتدائی کام کا آغاز ہو چکا تھا، میرا تقرر جامعہ کراچی میں ہو گیا جس کے باعث مجھے ہمدرد سے جانا پڑا، میرے اس تقرر پر حکیم صاحب خوش نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ میں ہمدرد ہی میں رہوں۔ حکیم صاحب اچھے منتظم تھے حافظہ کمال کا تھا ہر چیز کو یاد رکھتے تھے اس کا پتہ ان کی تحریر سے ہوتا تھا۔ میرے پاس ان کی ہرے رنگ کی پرچیاں جن پر لال روشنائی سے لکھا ہوتا اکثر آیا کرتی تھیں جن پر مختلف قسم کی ہدایات ہوا کرتی تھیں۔ آپ کی یہ خوبی تھی کہ اگر کسی اسٹاف سے کوئی چیز پوچھی ہے تو وہ اسے یاد رکھا کرتے تھے بسا اوقات اسٹاف کا ٹیسٹ بھی لیا کر تے تھے، اگر کسی اسٹاف ممبر سے کوئی غلطی ہو جایا کرتی تو وہ اس کی

(Fire) کے قائل تھے (Hire) سرزنش بھی کیا کرتے تھے لیکن الفاظ کی حدتک ، وہ بھی ہے، اچھے کام پر تعریف بھی کیا کر (Security of Job) کے نہیں، ہمدرد میں تے تھے۔ ایک بار حکیم صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے انتظامی امور کی انجام دہی میں کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میرا لندن جانے کا اتفاق ہوا، لندن میں بی بی سی کے آصف جیلانی سے ملاقات ہوئی انہوں نے مجھ سے انٹرویو کے لیے کہا جسے میں نے بہ خوشی قبول کر لیا، میں واپس کراچی آگیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ انٹرویو صبح کی نشریات میں نشر ہوا، میں جب ہمدرد پہنچا تو حکیم صاحب کی ایک پرچی میرے نام آئی جس پر لکھا تھا ” آج صبح بی بی سی کی صبح کی نشریات میں ہمدرد کے لیے چند کلماتِ خیر نشر ہوئے، انٹرویو خورشید عالم“ گویا حکیم صاحب نے یہ انٹرویو سنا اور ناراض ہونے کے باوجود میرے اس انٹرویو کی تعریف کی جس میں ہمدرد کی لائبریری کے لیے میں نے تعریفی باتیں کیں تھیں۔ حکیم صاحب یوں تو بے شمار خوبیوں کے مالک تھے لیکن انہیں کتاب اور لائبریری سے بے انتہا عشق تھا۔ کبھی کبھار آپ لائبریری آتے خاص طور پر اس وقت جب ہم شیلف پر کتابیں رکھ رہے ہوتے تو لائبریری اسٹاف کے ساتھ مل کر شیلف پر کتابیں رکھنے کے عمل میں شامل ہو جاتے۔ آپ کا یہ عمل لائبریری کے اسٹاف کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بھی ہوتا ساتھ ہی تمام لوگ زیادہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کرتے۔

آخر میں یہ فرمائیں کہ آپ اس موضوع کو تحقیق کے نقطہ نظر سے کس طرح دیکھتے : ۶
ہیں؟

ج: یہ اچھا موضوع ہے اس پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔اس سے (Philanthropy) کو فروغ ملے گا۔ جن لوگوں نے کتب خانوں کے فروغ اور ترقی کے لیے کاوشیں کیں وہ قابل ستائش ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر عبدالمعید جو پاکستان میں لائبریری سائنس کے بانی ہیں ، ان کی خدمات بھی قابل تعریف ہیں ان پر بھی کام ہونا چاہیے۔ (یہ انٹرویو بروز ہفتہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو جناب خورشید عالم کی رہائش گاہ پر لیا گیا)

جامعہ پشاور کے استاد سید لیاقت علی سے ایک مکالمہ

سابق چیرمین۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، یونیورسٹی آف پشاور

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ یہ انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے " پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار " ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی)

تعارف :

پروفیسر سید لیاقت علی کا آبائی شہر " نوشہرہ " ہے۔ پشاور یونیورسٹی سے بی ایل آئی ایس اور ایم ایل آئی ایس کیااور دونوں میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔۱۹۸۷ء میں شعبہ لائبریری سائنس جامعہ پشاور میں لیکچرر کی حیثیت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۷ء سے شعبہ کے سر براہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔لائبریری وانفارمیشن سائنس پر آپ کے کئی مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیاقت صاحب نے راقم الحروف کی تحقیق کے حوالے

سے ۱۰ فروری ۲۰۰۴ء کو بھیجے گئے سوالات کے جوابات از راہ عنایت مورخہ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ارسال فرمائے۔

۱۔ آپ لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی کے لئے دور جدید میں جو کوششیں حکیم محمد سعید شہید نے کیں اور عملی اقدامات کیے شاید ہی لائبریری سائنس سے وابستہ کسی شخصیت نے کیے ہوں گے۔ ان کی واضع علامات آپ کو بیت الحکمہ، اسپل اور اسپل گولڈ میڈل کی صورت میں ملیں گے۔ ہمدرد یونیورسٹی کے قیام سے انہوں نے نہ صرف اپنے ملک میں لائبریریز کے ذریعہ مختلف قسم کے لٹریچرز کو فروغ دیا بلکہ باہر کے ممالک میں بھی اس سلسلے میں آپ کی گراں قدر خدمات ہیں جو کے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پاکستان میں کتاب دوست اگر کوئی رہا ہے تو وہ حکیم محمد سعید ہیں۔ جن کی ساری زندگی کتاب کے لئے وقف تھی۔

۲۔ لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم میں کمی اپنے مضمون سے عدم دلچسپی تھی یا کوئی اور رکاوٹ؟

ج: میرے خیال میں اس میں نہ صرف یہ دو عوامل شامل ہیں بلکہ اور بھی کئی

ہیں جو کہ 'ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی'' ایک معلم کے علاوہ میرے خیال میں لائبریری سائنس کے اپنے لوگوں کی عدم دلچسپی بھی رہی اور کچھ لوگوں نے اس جاب کی Thankless سلسلے میں مشکلات بھی پیدا کیں اور یہی وجہ ہے کے یہ ایک Brain Drain حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ علاوہ اس کے پروان نہ چڑھنے کی ایک وجہ بھی ہے جن لوگوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی وہ باہر کے ملکوں میں چلے گئے جب کے اپنے ملک کے لیے ان میں سے چند ایک ہی باقی رہے اور اسی وجہ سے لوگوں کی اس مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے ،میں عدم دلچسپی بھی رہی اور کسی حد تک رکاوٹ بھی۔

۳۔ حکیم محمد سعید کو کتاب اور کتب خانے سے عشق تھا آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: حکیم محمد سعید کا کتاب اور کتب خانوں سے عشق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی تمام زندگی ''اقراء'' کے فروغ کے لیے وقف رہی اور شہادت تک اسی پر قائم و دائم رہے۔

نے قومی سطح پر سیمینار' ورکشاپس' اور کانفرنسیز کا انعقاد کیا۔ آپ کی (SPIL) ۴۔ اسپل رائے میں پاکستان لائبریرین شپ پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج: اسپل پاکستان میں وہ واحد سوسائیٹی ہے جو پاکستان میں لائبریرینز کے قیام اور ان کی ترقی میں پیش پیش رہی۔ اس نے نہ صرف لائبریری لٹریچر فراہم کیا تاکہ لوگوں میں لائبریری سائنس کے علوم کی پہچان کو اجاگر کیا جاسکے۔ اس کے عملی اقدامات میں کانفرنسیز کا انعقاد اور ورکشاپ شامل ہیں۔

۵۔ اسپل (SPIL) نے جامعہ کراچی کے MLIS کے طلباء کے لیے ''اسپل گولڈ میڈل'' جاری کیا۔ آپ اسپل کے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی فرمائیں کہ یہ اقدام پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو سکا؟

ج: اسپل (SPIL) نے جامعہ کراچی کے MLIS کے طلباء کے لیے ''اسپل گولڈ میڈل'' کا جو اہتمام کیا تھا اس کی وجہ سے طلبہ میں مقابلے کا جذبہ پروان چڑھا اور کافی اچھے طلبہ سامنے آئے جو بعد میں مختلف اداروں میں بہ حیثیت ایک Competent اور معلم یا کتاب دار منسلک ہوئے۔ میرے خیال میں اسپل کا یہ اقدام مناسب اور معاون ثابت ہوا۔

۶۔ اس موضوع پر کچھ کہنا چاہیں گے۔

ج: حکیم محمد سعید شہید کا نام ان گراں قدر شخصیات میں ہوتا ہے جو کہ کتاب دوست اور کتاب شناس ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر یہ تحقیق نہ صرف کتب خانوں کی ایک عظیم خدمت ہو گی بلکہ حکیم محمد سعید کی وہ علمی خدمات جو

انہوں نے پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے لئے سرانجام دیں ابھی تک عوام کے سامنے نہیں آئیں وہ بہت حد تک اجاگر کرنے میں یہ اہم کاوش ہوگی اور یقیناً یہ گراں قدر تحقیق ہوگی۔

(پروفیسر لیاقت نے سوالات کے جوابات اپنے خط مورخہ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو ارسال فرمائے)

پروفیسر رحمت اللہ خان بلوچ: تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

چیرمین: شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

(یہ مکالمہ راقم الحروف نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق کے لیے کیا جو موضوع کی تحقیق ضرورت تھا۔ یہ انٹرویو مقالے میں شامل ہے۔ مقالے کا عنوان ہے "پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار" ۔اس تحقیق پر راقم الحروف کو ۲۰۰۹ء میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔

تعارف:

پروفیسر رحمت اللہ خان بلوچ مارچ ۲۰۰۵ء میں شعبہ کے سربراہ ہوئے۔ آپ ۱۹۹۳ء سے جامعہ بلوچستان کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس سے وابستہ ہیں اس سے قبل آپ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے لائبریری (۱۹۸۱ء ۔ ۱۹۸۶ء) ، پروڈیوسر ریڈیو پاکستان کوئٹہ (۱۹۸۶ء ۔ ۱۹۸۷ء) اور امریکن سینٹر لائبریری کوئٹہ کے لائبریرین (۱۹۸۷ء ۔ ۱۹۹۲ء) رہ چکے ہیں۔ آپ نے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ سے ۱۹۸۵ء میں ایم ایل ایس کیا، آپ معاشیات

میں بھی ایم اے کر چکے ہیں۔ راقم الحروف نے (۱۳۔۱۶) اکتوبر ۲۰۰۵ء کو کوئٹہ کا دورہ کیا۔ بلوچ صاحب سے یہ گفتگو ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو بلوچستان یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس (جہاں پر راقم مقیم تھا) میں ہوئی، گفتگو میں ڈاکٹر خالد محمود بھی موجود تھے۔

۱ : آپ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کے کردار کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج: پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم صاحب کی خدمات ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ وہ تو عظیم انسان تھے۔ وہ تو استادوں کے استاد تھے، وہ علم کے بادشاہ تھے۔ لائبریری قانون سے لے کر کتب خانوں کی ترقی تک آپ کی خدمات قابل قدر ہیں۔

۲ : آپ کے خیال میں ''اسپل گولڈ میڈل'' پاکستان میں لائبریری تعلیم کے فروغ میں معاون ہو سکا؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا اقدام تمام شعبہ جات میں ہونا چاہیے۔ یہ طلبہ کے لیے بہت مفید ہے اس سے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، مقابلہ کا رجحان پیدا ہوتا ہے وہ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ اس کی تشہیر کی ضرورت ہے۔

۳ : اسپل (SPIL) کی مطبوت لائبریری مواد میں کس حد تک مفید اور کارآمد ثابت ہوئیں۔

ج: اتفاق سے یہ مطبوعات میری نظر سے نہیں گزریں۔

۴ : لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغار جامعہ کرچی سے ۱۹۶۷ء میں ہو چکا تھا۔ اب تک صرف تین لوگ یہ ڈگری حاصل کر سکے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ اپنے مضمون سے عدم دلچپسی رہی یا کوئی اور رکاوٹ۔

ج: دراصل اس پروفیشن میں آنے والوں کی اکثریت درمیانہ درجہ سے تعلق رکھتی تھی انہیں مواقع کم ملے۔ میرے خیال میں پی ایچ ڈی کرنے اور کروانے والوں میں professionlaism کی کمی رہی۔

۵ : فاصلاتی تعلیم کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

ج: لائبریری سائنس ایک ٹیکنکل مضمون ہے۔ فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت اس کی تعلیم میرے خیال میں مناسب نہیں۔

٦ : لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون ملک کے بے شمار کالجوں میں انٹر اور بی اے میں پڑھایا جارہا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ اقدام لائبریرین شپ کے

فروغ اور ترقی کا باعث ہے یا لائبریری ایجوکیشن میں مشکلات پیدا کر رہا ہے۔

ج: یہ ایک اچھا اقدام ہے اسے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

۷: بہ حیثیت صدر شعبہ آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟

ج: مجھ سے قبل جن احباب نے شعبہ کی ترقی کے لیے جو کچھ کیا میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ میری کوشش ہو گی کہ شعبہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرے۔ میں نے شعبہ کے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کیا، ہائر ایجوکیشن کمیشن کا نظرثانی شدہ نصاب تاحال ہمارے شعبہ میں رائج نہیں ہوا تھا میں نے اولین فرصت میں کوشش کی کہ یہ نصاب ہمارے ہاں بھی رائج ہو جائے۔ کل ہی بورڈ آف اسٹڈیز نے اس کی منظوری دے دی ہے انشاء اللہ آئندہ تعلیمی سال سے اس پر عمل درآمد ہو جائے گا، شعبہ میں کمپیوٹر لیب بہت ضروری ہے میری کوشش ہو گی کہ جلد از جلد یہ تشکیل پا جائے، سیمینار لائبریری کو ترقی دینے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ شعبہ کے تمام اساتذہ کو تحقیق کی جانب مائل کرنا میری ترجیحات ہیں۔

۸: آخر میں یہ فرمائیں کہ آپ اس موضوع کو تحقیق کے نقطہ نظر سے کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج: میری رائے میں لوگوں کی کاوشوں کو آگے لانا، انہیں متعارف کرانا ایک قابل تعریف عمل ہے۔ یہ نئی نسل کے لیے بھی سبق آموز ہو گا۔ حکیم صاحب کو خراج

تحسین پیش کرکے آپ حق ادا کر رہے ہیں۔ تحقیق کے نقطہ نظر سے یہ موضوع جامع
ہے۔
کی نصف صدی پر مبنی لائبریری خدمات کو (SPIL) یہ تحقیق حکیم صاحب اور اسپل
عوام الناس کے سامنے لائے گی۔
(یہ انٹرویو ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو بلوچستان یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس نمبر ۱ میں لیا گیا)

ناصرؔ کاظمی

(پیدائش 8 دسمبر 1925 ۔ وفات 2 مارچ 1972)

دل تو میرا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
دائم آباد رہے گی دُنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

آج پاکستان کا ہر بڑا شہر دہشتگردی کے ہاتھوں سائیں سائیں ہی تو کر رہا ہے اور پوری قوم بے بسی کے عالم میں ہر روز بے قصور ہلاک ہونے والوں کے غم میں اُداس رہتی ہیں۔ ناصر کاظمی نے 40 سال پہلے ہی اس صورت حال کا ذکر کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اس قدر اداس تھا تو آج اس کی کیا کیفیت ہوتی۔ دنیا بھی اُسی طرح آباد ہے لیکن وہ خوبصورت شاعر آج ہم میں نہیں ۔ اسے ہم سے جدا ہوئے 43 سال ہو چکے ہیں ۔ ناصر کی بیماری نے رفتہ رفتہ معدے کے کینسر کا روپ اختیار کر لیا اور اس نے 2 مارچ 1972 کو طویل علالت کے بعد البرٹ وکٹر اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ہمیشہ ہمشہ کے لیے ہم سے دور چلا گیا۔ لیکن اس کی یاد ہمارے درمیان آج بھی موجود ہے اس کی خوبصورت شاعری اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ ناصرؔ کاظمی نے اپنے والدین کے ہمراہ ہندوستان سے ہجرت کی اس

کی پیدائش بھی.برطانوی ہندستان کے شہرانبالہ میں 8دسمبر 1925 کو ہوئی۔اس حوالے سے ناصؔر کوانبالہ سے خاص محبت تھی۔اس شہر کے بارے میں ناصؔر نے کہا تھا۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

ناصؔر کاظمی کا اصل نام سید ناصر رضا کاظمی تھا لیکن وہ ناصؔر کاظمی کے نام سے ہی معروف تھا۔ناصؔر کے والد محمد سلطان بن شریف الحسن فوج میں ملازم تھے بلکہ سپہ گری اور فوج میں خدمت ناصؔر کے خاندان کا طرّہ امتیاز تھا۔چنانچہ ناصؔر کی پرورش اور تربیت بھی فوج کے مخصوص ماحول میں ہوئی۔ناصؔر کا کہنا تھا کہ وہ بھی فوج میں خدمات انجام دینا چاہتا تھا اور فوج میں ملازمت کی بھی لیکن جلد فوج کی ملازمت سے کنارہ کشی کر لی۔اس کی وجہ ان کا ادبی مزاج اوران کے اندر کا وہ شاعر تھا جس نے فوج کے ماحول کو قبول نہیں کیا۔وہ تو شاعری کے لیے پیدا ہوا تھا، شاعری اس کی نس نس میں رچی بسی ہوئی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ وہ بچپن ہی سے جن مشاغل کی جانب مائل تھا وہ فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے تھے۔دیہاتی موحول میں رہتے ہوئے اس سے لطف اندازہونا، دریاکے کنارے بیٹھ کر پانی کے اتارچڑھاؤ سے خوش ہونا، گھڑسواری، شکارکھیلنا، پہاڑوں کا نظارہ کرنا، پھولوں، درختوں، کلیوں اور پتوں کو دیکھ

دیکھ کر قدرت کی کرشمہ سازی کو داد دینا اور قدرت کے حسین نظاروں ، سورج، چاند، طلوع و غروب کے مناظر، صبح و شام کے مناظر، آسمان، ستاروں ، بارش، سردی اور گرمی کے اتار چڑھاؤ سے ناصرؔ اور شاعری لازم و ملزوم ہوگئے۔ ناصر کے گھر کا ماحول بھی ادبی تھا، اس کے گھر میں کتابیں تھیں، جنہیں پڑھا جاتا تھا، ان پر گفتگو کی جاتی تھی، شاعروں سے محبت اس کے گھر کی پہچان تھی، شاعروں کو پڑھا جاتا تھا، ان کے کلام کو محبت اور عقیدت کے ساتھ ایک دوسرے کو سنایا جاتا، خاص طور پر میر انیسؔ اس گھرانے کے پسندیدہ شاعر تھے۔ ناصر کا کہنا تھا کہ اس نے شاعروں کو پڑھا، ان کا مطالعہ کیا، شیخ سعدی اور فردوسی کو بھی ناصرؔ نے دلچسپی سے پڑھا۔ ناصرؔ کا کہنا تھا کہ 'اساتذہ کا کلام جب میں پڑھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ زمانے اور صدیاں ، میرے ساتھ ہم کلام ہیں بلکہ میں اُن صدیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ ایسے ماحول نے ناصرؔ کو شاعر بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ناصر کی شاعری کی ابتدا 1940 سے ہوئی، اس وقت ناصرؔ زندگی کی پندرھویں بہاروں کا لطاف لے رہے تھے یعنی 15 سال کے تھے۔ یقیناً اسکول سے فارغ ہونے کا وقت ہوگا یا کالج کی دہلیز پر قدم رکھ لیا ہوگا۔ اس نے پہلا شعر کب کہا اور وہ کون سا شعر تھا ناصر کا کہنا ہے کہ ایسے صحیح تو یاد نہیں لیکن جب پہلا شعر کہا تو ناصرؔ اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ شعر کچھ اس طرح تھا ۔

قبول ہے جنہیں غم بھی تیری خوشی کے لیے

وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے

ناصؔر کاظمی نے ابتدائی تعلیم مسلم ہائی اسکول انبالہ سے حاصل کی۔ ہائی اسکول میں آئے تو والد بہ سلسلہ ملازمت پشاور چلے گئے چنانچہ ناصؔر نیشنل ہائی اسکول پشاور کے طالب علم بھی رہے۔ شملہ میں بھی ناصر نے پڑھا، میٹرک کے بعد کالج کا رخ کیا جس کے لیے لاہور کا انتخاب کیا۔

لاہور شہر ناصؔر کو پسند تھا۔ پڑھائی کے بعد بھی ناصؔر نے لاہور ہی کو اپنا مستقل مسکن بنا یا۔ لاہور کے حوالہ سے ناصؔر نے یہ شعر کہا۔

شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہَوا کھینچ کے لائی مجھ کو

فوج میں شمولیت اور جلد ہی اس سے واپسی کے بعد ناصؔر نے 1950 میں رسالہ اوراقِ نو' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ کچھ عرصہ بعد ہی ناصؔر معروف رسالے' ہمایوں' کے مدیر اعلیٰ رہے اور پانچ سال اس کی ادارت کی لیکن یہ رسالہ ناصؔر کاظمی' کے ہاتھوں ہی بند ہوا۔ اب ناصؔر رسائل و جرائد کی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت بن چکے تھے۔ انہیں کسی بھی معروف ادبی رسالے کی ادارت کا مل جانا مشکل نہیں تھا لیکن انھوں نے ملازمت کے بجائے اپنا ادبی رسالہ

خیال' کے نام سے جاری کیا۔ یہ سال تھا 1957۔ لیکن بات کچھ بنی نہیں ۔ رسالے کو' جاری و ساری رکھنے کے لیے منتظم یا انتظامیہ کو بہت کچھ اپنے ظمیر کے خلاف بھی کرنا پڑتا ہے۔ رسالہ بڑے بڑے لکھاریوں کے ناموں اور ان کے کلام و مضامین سے نہیں چلتے بلکہ اس کے لیے تجارتی اداروں سے راہ و رسم رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اشتہارات ملتے رہیں اور رسالہ نکلتا رہے۔ ناصؔر کا تو یہ مزاج ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے رسالے کے لیے تجارتی اداروں اور مخیّر حضرات سے رسالے کو جاری رکھنے کے لیے اپنا ہاتھ پھیلاتے ۔ چنانچہ ان کا اپنا رسالہ جلد خاموش ہوگیا۔ اب انہوں نے محکمہ سماجی بہبود پھر محکمہ ولیج ایڈ میں ملازمت اختیار کرلی۔ محکمہ کے رسالے 'ہم لوگ' کی ادارت بھی کی۔ یہ سلسلہ 1964 تک جاری رہا۔ اب وہ پاکستان کے معروف اور معتبر شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے چنانچہ انہیں ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہوگئے اور ریڈیو پاکستان سے وابستگی ان کی باقی ماندہ زندگی تک قائم رہی۔

اِن سہمے ہُوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سُنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

ناصؔر کاظمی کو پاکستان کے ان شعراء میں جنہوں نے پاکستان میں آکر یا پاکستان میں پیدا ہونے کے بعد شاعری کی دنیا میں قدم رکھا میں ایک منفرد اور بلند مقام حاصل ہے۔ غزل ناصؔر کی پہچان ہے جسے اس نے ایک نئی زندگی

دی۔ ناصرؔ میر تقی میرؔ اور فانیؔ بدایونی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں میرؔ اور فانیؔ کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے ابتدائی دنوں کی شاعرمیں میرؔ والا جذباتی دھیما پن، کسک، سپردگی کا لہجہ اور انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ میرؔ اور فانیؔ کے علاوہ ان کی شاعری پر ہندی شاعری کے اثرات بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سایے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج والم
گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

کہا جاتا ہے کہ ناصرؔ کے ہاں 'احساسِ محرومی' کی وجہ بھی ناصرؔ کا میرؔ سے متاثر ہونا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد ناصرؔ نے شاعری میں اخترؔ شیرانی کی قربت حاصل کی لیکن جلد وہ باقاعدہ حفیظ ہوشیار پوری کے شاگرد ہوگئے اور غزل کہنے کا باقاعدہ سلسلہ انہی کی شاگردگی میں شروع ہوا۔

ناصرؔ غم والم اور دکھوں بھری شاعری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔

سایے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج والم
گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

ہمارے گھر کی دیواروں پہ، ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں

میرے خمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

شاعری کے بارے میں ناصؔر نے اپنے ایک انٹرویو میں جو ان کی زندگی کا آخری انٹرویو تھا اور انتظار حسین نے بطور خاص لیا کہا کہ 'شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں۔ شاعری تو ایک نقطۂ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا، اُن کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے'۔ ناصؔر کا کہنا تھا کہ 'میری شاعری میں رات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ، رات، اندھیری رات یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو، سمندر میں تموج ہوتا ہے رات کو، خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ، فجر تک، فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی'۔ ناصؔر نے غزل کے علاوہ نظم بھی کہی، نثر میں بھی طبع آزمائی کی، ڈرامے لکھے، فیچر تحریر کیے اور تراجم بھی کیے لیکن ناصؔر کی پہچان غزل ہی ٹھہری۔ ناصؔر غزل کہنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس کی کہی ہوئی غزلیں جس قدر مقبول اور عام ہوئیں اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔

کہتے ہیں، غزل قافیہ پیمائی ہے، ناصؔر

یہ قافیہ پیمائی ذرا کرکے تو دیکھو

شاعری کے بارے میں ناصؔر کا کہنا تھا کہ 'شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کردیتی ہے۔ وقت جو مرگیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کرسکتا، شاعر زندہ کرسکتا ہے۔ شاعری صرف مصرے لکھنے کا نام نہیں بلکہ خیالات وافکار کو اچھوتے اور دلکش انداز سے شعر کا روپ دینے کا نام شاعری ہے۔

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سُن

ناصؔر کاظمی کو بجا طور پر عہد ساز شاعر کا رتبہ حاصل ہے۔ اس کی شاعری میں پیکر تراشی کا منفرد پہلو جلوہ نما ہے۔ ناصؔر کی پیکر تراشی پر ہندوستان کی ایک مصنفہ سمیہ تمکین نے ایک کتاب ' ناصر کاظمی کی شاعری میں پیکر تراشی' بھی مرتب کی۔ ناصؔر کے حوالے سے بہت کام ہوا۔ پاکستان میں بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے او الکھا جاتا رہے گا۔ تحقیق کی جاچکی اور آئندہ بھی ناصؔر پر تحقیق کا عمل جاری رہے گا۔ ناصؔر کی شاعری میں ناامیدی بھی ہے اور حوصلہ بھی۔ پاکستان ہجرت کے بعد بے شمار لوگوں کے حالات اچھے تھے تو بہت سوں کے اچھے نہیں بھی تھے۔ ہجرت میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ ناصؔر نے اچھے وقت کی امید کا اظہار اپنے اس شعر میں خوبصورت انداز سے کیا۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

اپنے ہم عصروں کی دنیا سے رخصتی یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے جدا ہو جانے کا غم کسے نہیں ہوتا۔ ناصؔر کا انداز دیکھئے۔

جنہیں دیکھ کر جیتے تھے ناصؔر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

زندگی میں اکثر قریبی دوستوں اور ساتھیوں سے بگاڑ کا پیدا ہو جانا، اَن بن ہو جانا، اس اَن بن کا بڑھ کر قطع تعلق تک نوبت پہنچ جانا بھی ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کو ناصؔر نے کس خوبصورتی سے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصؔر کاظمی کی غزلوں کا مجموعہ 'برگِ نے' کے عنوان سے پہلی بار 1952 میں شائع ہوا۔ پھر سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ لاہور کے ادارے مکتبہ کارواں نے شائع کیا تھا۔ 'دیوان' ناصر' کا دوسرا مجموعہ تھا جو 1972 میں شائع ہوا۔ پہلی بارش' 1975 میں، 'نشاطِ خواب' 1977 میں شائع ہوا۔ ناصؔر کا منظوم ڈرامہ' سر کی چھایا' 1981 میں منظر عام پر آیا تھا۔ ناصؔر کی نثری تحریروں پر مبنی کتاب 'خشک' چشمے کے کنارے' 1982 میں شائع ہوئی تھی۔ ناصؔر نے چند کلاسیکی شعراء کے انتخاب بھی کیے جن میں 'انتخاب میر' 1989 میں شائع ہوا، 'انتخاب نظیر' 1990 میں شائع ہوا، 'انتخاب ولی' 1991 میں شائع ہوا اور انتخاب انشاء' 1991 میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے علاوہ بہترین شاعری 1963 اور 1969 یہ مجموعے ناصؔر نے مرتب کیے۔ فراق گورکھپوری کی غزلوں کا انتخاب کے علاوہ سر کی چھایا چودہ سو مصرعوں نظم ادبی رسالے 'سویرا' میں شائع ہوئی۔ بے شمار فیچر، ترجمے کیے، کتابیں ایڈٹ کیں۔ کئی کتابیں ناصؔر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد منظر عام پر آئیں۔ ناصؔر کی ڈائری بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

شام سے سوچ رہا ہوں ناصؔر
چاند کس شہر میں اُترا ہوگا

ناصؔر مجلسی آدمی تھے، دوستوں کے درمیان رہنا، قصہ سنانا اور شعر سنانا اس

کا محبوب مشغلہ تھا۔ کیفے ٹیریا، کافی ہاؤس اس کے ٹھکانے ہوا کرتے تھے۔ اسے رات میں نیند نہ آنے کی بیماری تھی ۔ لکھنے ، پڑھنے والوں کو یہ مرض عام ہوتا ہے، مَیں بھی اسی دیگر امراض کے ساتھ ساتھ اس مرض کا پرانہ مریض ہوں۔ ناصرؔ نے اس بیماری کا ذکر کرتے ہوئے اسے دولتِ بیدار کہا ہے۔ شعر دیکھیئے ؂

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصرؔ
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

اپنی شاعری کی ابتدائی دنوں میں ناصرؔ مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ جیسے جالبؔ ترنم سے اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ کلام اور مضمون کے ساتھ ساتھ ان کا انداز سننے والوں کو مست کر دیتا تھا۔ ناصرؔ کا انداز بھی اچھا تھا مجھے ناصرؔ کو مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا۔ ناصرؔ جب ہم سے جدا ہوے تو میں جامعہ کراچی سے ماسٹر کرچکا تھا۔ جامعہ میں رہتے ہوئے ناصرؔ کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا تفاق ہوا۔ ناصرؔ کا کہنا تھا کہ ایک روز اسے یہ احساس ہوا کہ اسے ترنم سے اپنا کلام سنانے کے باعث داد ملتی ہے۔ ناصرؔ کا کہنا تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مشاعرے کے بعد میں نے یہ عہد کیا کہ اب مشاعرے میں ترنم سے نہیں پڑھوں گا اور ایسا ہی ہوا اس کے بعد ناصرؔ نے ترنم سے غزل نہیں پڑھی۔ وہ تحت اللفظ

سے بھی اسی پسندیدگی اور چاہت سے سنا جانے لگا جیسے لوگ اسے ترنم کے ساتھ سنا کرتے تھے۔
ناصؔر کاظمی سے سوال کیا گیا کہ آپ شعر کیوں کہتے ہو؟ تو ناصؔر کا جواب تھا اس کا ایک سبب یہ ہے کی خوبصورت چیزیں جو فطرت میں دیکھتا ہوں، میرے بس میں نہیں آتیں۔ میری گرفت سے نکل نکل جاتی ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہیں۔ جو وقت مرجاتا ہے، وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا، مگر شاعری میں زندہ ہوسکتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر توصیف تبسم نے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے شائع کردہ ناصر کے پاکٹ سائز انتخاب بعنوان 'دل تو میرا اُداس ہے ناصؔر' میں اپنے ابتدئیہ میں تحریر کیا ہے۔مَیں نے ناصؔر اپنی تحریر کا آغاز ناصؔر کے اسی شعر سے کیا تھا کہ ' دل تو میرا اُداس
ہے ناصؔر۔ شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے' سے کیا تھا اور اسی شعر پر اپنی اس تحریر کا اختتام بھی کرتا ہوں۔

دائم آباد رہے گی دُنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصؔر تم نے صحیح کہا تھا کہ دنیا آباد رہے گی وہ واقعی آباد و دائم ہے لیکن اس دنیا میں تم نہیں اور نہ ہی تم جیسا کوئی اور ہے نہ ہوسکتا ہے، تم

تو تم تھے۔ لیکن تم اپنی شاعری کے ذریعہ اس دنیا میں موجود ہو اور جب تک یہ دنیا آباد ہے موجود رہو گے۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
اِن خالی کمروں میں ناصرؔ اب شمع جلاؤں کس کے لیے

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا، کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر' وہ تیرا شاعر' وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا' پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصرؔ آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خُدا کچھ کہتی ہے

دیکھ ناصرؔ زمانے میں کوئی کسی کا نہیں
بُھول جا اُس کے قول و قسم' صبر کر صبر کر

آخر میں ناصرؔ اس خوبصورت شعر پر اپنی تحریر کا اختتام کرتا ہوں جس میں ناصرؔ کو اپنے آپ کو دبستان اَلم کا دل کہا اور پھر یہ بھی کہا کہ دنیا اس شادمانی کو تا دیر روئے یعنی یاد رکھے گی اور یہ حقیقت ہے کہ آج ناصرؔ

جدا ہوئے 43 سال ہو گئے ادبی دنیا اسے نہیں بھلا سکی اس کے بعض بعض شعر تو ایسے محسوس ہوتے ہیں کہ جیسے ناصؔر زندہ ہے اور وہ شعر اس نے ابھی ابھی کہا ہے۔ اللہ ناصؔر کی ادبی خدمات کو قبول فرمائے اور اس کی مغفرت کرے۔ آمین۔ (3 مارچ 2015)

میری علمی و ادبی خدمات معاصرین کی نظر میں

مَیں گزشتہ چار دیہائیوں سے علم و ادب کے میدان میں مصروفِ عمل ہوں۔ خاندان کے احباب صاحب دیوان اور بے دیوان شاعر گزرے ہیں۔ میرے پر دادا کا دیوان 'دیوانِ آزادؔ' 1923 میں ہندوستان سے شائع ہوا تھا۔ میرے پرکھوں کی سرزمین پہلے راجستھان اور پھر یو پی کا ضلع مظفر نگر تھی۔ ہندوستان کا ضلع مظفر نگر نہایت مردم خیز خطے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس سرزمین نے علماء دین، صوفیائے اکرم اور فقہائے اسلام اور اہل دانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی، پائے کے سیاست ،اعلیٰ منتظمین، معلّمین، منصفین و مصنفین کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ہے ،ان اعلیٰ شخصیات کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی خدمات کو عالمی سطح پر معتبر حیثیت حاصل ہے۔ بعض احباب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان ،حاجی ولی اللہ صاحب قدس سرہ، محمد احمد صاحب سراوے والے، جناب زاہد حسین اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، زاہد حسین کے صاحبزادے جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، جناب محمد ابصار حسین قرنی، مفتی و محدث مولانا عبدلمالک، مولانا عبد الخالق کاندھلہ والے، معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ)، شیخ محمد ابراہیم آزاد سابق

چیف جسٹس بیکانیر چیف کورٹ (میرے پردادا)، جناب مبشر احمد واحدی، نعت گو شاعر تابش صدانی، معروف ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی، صاحبزادہ عاشق کیروانوی مرحوم شامل ہیں۔ مَیں نے کبھی اپنے وطن کے لیے کہا تھا۔

مظفر نگر تری عظمت کو سلام

کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تو نے

1972 میں جامعہ کراچی سے پہلا ماسٹر کرنے کے بعد کالج کی نوکری ملی گئی اور اپنی مستقل مزاجی کو سلام کہ بس اسی پر اکتفا کرتے ہوئے، پڑھنے، پڑھانے، پڑھنے والوں کی رہنمائی کرنے اور لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ پہلا مضمون 1975 میں اور پہلی کتاب 1977 میں شائع ہوئی تھی۔ ابتداء میں لائبریری و انفارمیشن سائنس میرا موضوع تھا چنانچہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور شائع بھی ہوا۔ اسی موضوع کے ایک ادارے اور اس کے تحت شائع ہونے والے رسالے سے منسلک ہوا اور اس کا ایسو سی ایٹ چیف ایڈیٹر 37برس رہا۔ اپنی جوانی حتیٰ کے اپنا بڑھاپا بھی اس کی نظر کر دیا۔ 2012 میں اس رسالے کے چیف ایڈیٹر سے اصولی اختلاف کے باعث خاموشی سے اپنی 37 سالہ خدمات سے علیحدہ ہوگیا۔ شخصیات میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ میں نے اب تک 50 سے زیادہ شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ شخصیات پر سوانحی مضامین اور خاکوں پر مشتمل میری کتب کی تفصیل

نیچے درج ہے۔ مضامین بھی لکھے جو تعداد کے اعتبار سے اب 300 سے زیادہ ہوچکے ہیں۔

یہ زمانہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا ہے ۔ میری خوش قسمتی کے مجھے اردو کی ایک معروف اور سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی ویب ''ہماری ویب Hamari Web'' مل گئی اور میری تحریریں اس پر آن لائن ہونے لگیں۔ اس ہماری ویب نے مجھے کالم نگاری کی جانب بھی مائل کیا اور میں سیاسی اور نیم سیاسی موضوعات پر کالم بھی لکھنے لگا۔ ہماری ویب پر میرے مضامین و کالم کی تعداد 150 سے زیادہ ہوچکی ہے۔ یہ مضمون تعداد کے اعتبار سے ایک سو پچاسواں مضمون ہے۔ ہماری ویب کے تحت ایک ادارہ ''رائیٹرز کلب'' بھی تشکیل دیا گیا۔ احباب کی نظر مجھ ناچیز پر ایسی پڑی کے مجھے اس آن لائن لکھنے والوں کے پہلے کلب کا صدر بنا دیا گیا۔

ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' کے مقاصد میں آن لائن لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا، انہیں علمی اور فنی معاونت فراہم کرنا ہے۔ ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' نے اب ''ای بکس'' کی تدوین و اشاعت کا پروگرام بھی تشکیل دیا ہے۔ جس میں ہماری ویب پر لکھنے والوں کی تحریروں پر مشتمل ای بکس تیار کی جائیں گی اور انہیں آن لائن کر دیا جائے گا۔ پہلے مرحلے میں دس ای کتب کی تیاری کی منصوبہ بندی

کی گئی ہے۔ میری خوش نصیبی کے میرے 150 مضامین پر مشتمل 'ای بک' تدوین کے آخری مراحل میں ہے۔ زیر تحریر مضمون اسی ای بک کا آخری مضمون ہے۔ انشاء اللہ ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' اپنے اس مقصد کے حصول میں آگے بڑھتا رہے گا۔

ذیل میں میری تصانیف و تالیفات کے حوالے سے میری محترم و کرم فرما علمی و ادبی شخصیات نے میرے بارے میں یا میری تصنیف و تالیف کے بارے میں جو کچھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اسے اختصار کے ساتھ پیش کررہا ہوں۔ مضمون کے دوسرے حصے میں میری تصانیف و تالیفات ہیں جن پر جو تبصرا خبارات و رسائل میں کیے گئے انہیں متعلقہ کتاب کے نیچے درج کردیا گیا ہے۔ مضامین کی تعداد زیادہ ہے اس وجہ سے انہیں اس مضمون کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ میرا ایک مضمون 'ہماری ویب' میں میرے مضامین کی سینچری' کے عنوان سے اس ای بک میں شامل ہے۔ جس میں سو مضامین کے بھی درج ہے۔URO عنوانات دیکھے جاسکتے ہیں عنوان کے ساتھ مضمون کا

علمی ادبی خدمات اہل علم کی نظر میں

:پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی کتاب ''یادوں کی مالا'' کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار معروف دانش ور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ''کتاب بلحاظ زبان و

بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی۔ کتاب نہایت صاف ستھرے انداز میں شائع ہوئی ہے اور قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ مضامین کی فہرست میں کچھ تو مختصر خاکے ہیں کچھ تنقیدی جائزے ہیں اور کچھ مختصر تذکرے، مگر اختصار میں بھی وہ سب کچھ آگیا ہے جو موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے جس میں لائبریرین شپ کی تقریباً تمام ہی معروف اور اہم شخصیات کا قابل توجہ احاطہ کیا گیا۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سارے علمی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی اور شخصیات پر لکھنے والوں کی رہنمائی کرے گی۔

ڈاکٹر صمدانی کی دوسری خاکوں کی کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' کا فلیپ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تحریر کیا۔ آپ لکھتے ہیں ''ڈاکٹر رئیس صمدانی کا قلم کسی طویل تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں اور جو کچھ لکھ رہے ہیں نہایت کارآمد انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی یادداشتیں بہت مضبوط ہیں، ان کی نگاہ حقائق اور واقعات پر بڑی گہری رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی ایک باشعور صاحب قلم ہیں،

مقبولیت و عدم مقبولیت یا کسی رسالے میں چھپنے نہ چھپنے پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے بلکہ ادب کی خدمت نہایت سلیقے اور لطیف پیرائے میں انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کی سادہ بیانی و حق گوئی میں ایسا جادو ہے کہ وہ اپنے قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری کتاب ختم کیے بغیر اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا قلم اسی طرح چلتا رہے گا اور فکر و نظر پر قابلِ توجہ تاثر چھوڑتا رہے گا۔ جن شخصیات و موضوعات پر خاکے لکھے گئے ہیں وہ اگرچہ جانے پہچانے ہیں لیکن صاحبِ کتاب یعنی ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے ان کی قدر و قیمت کو اتنا بلند و بالا کر دیا ہے کہ خاکہ نگاری کی خاص صنف میں رئیس احمد صمدانی کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ ہو گیا ہے'' (۱)۔

ڈاکٹر صمدانی اپنے موضوع پر بہت خوب لکھتے ہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک صاحب نظر ادیب و محقق کی ہے۔ ایک اور خوبی جو میں نے ان میں محسوس کی کہ وہ صلہ و ستائش کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ان لکھنے والو میں سے ہیں جنھوں نے سوانح نگاری اور خاکہ نویسی کو اپنا موضوع بنایا اور ایک سوانح نگار کے طور پر ادب کی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی۔ پیش نظر کتاب سے اندازہ ہوا کہ صمدانی صاحب ایک شاعر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شعر و ادب کا مذاق کئی نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ متعدد احباب

ادیب و شاعر اور صاحبِ دیوان شاعر ہیں ۔ خود صمدانی صاحب کے بعض اشعار اس کتاب میں کہیں کہیں نظر سے گزرے ۔امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے والوں کے لیے تسکین کا وسیلہ ہو گی۔ اہلِ ذوق کو انبساطِ روح اور نشاطِ قلب کے اسباب فراہم کرے گی۔ غور و فکر کی راہیں کھولے گی اور مصنف کے قلم کو مزید معتبر و محترم بنائے گی اور ہر اعتبار سے اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہو گی۔

ڈاکٹر سلیم اختر: ادیب و دانشور، لاہور

اردو ادب کے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر سلیم اختر جنہوں نے ڈاکٹر صمدانی کی کتاب جھولی میں ہیرے اور موتی کا فلیپ تحریر کیا، ڈاکٹر صمدانی کی شخصیت اور کتاب میں " شامل خاکوں کے حوالے سے ڈاکٹر صمدانی کو ایک درویش صفت انسان قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ " ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے باوجود ادب اور ادیبوں ، قلم اور اہل قلم، علم اور اہل علم سے رشتہ استوار رکھا اس کا اظہار دوستوں پر محبت کی روشنائی سے تحریر کردہ خاکوں سے ہوتا ہے۔ 'یادوں کی مالا' کے بعد اب جھولی میں ہیرے اور موتی' خاکوں کا تازہ مجموعہ پیش ہے جو دس خاکوں ، اپنے بارے' میں ایک مضمون ، ماضی کی یادوں کے حوالہ سے دو مضامین اور ایک رپوتاژ پر مشتمل ہے۔ یہ ہیں وہ

ہیرے اور موتی جن سے اس درویش صفت انسان کی جھولی بھری ہے۔ اس میں میرے ان دو عزیز دوستوں ڈاکٹر طاہر تونسوی اور عبد الوہاب خان سلیم کے خاکے بھی شامل ہیں۔ ان کی محبت سرمایہ حیات ہے (۲)۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی: ڈین آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ وچیئرمین۔ شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کا تعلق شاعرِ مزدوراحسان دانش کے وطن مظفر نگر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ احسان دانش کی طرح محنتی، واقعات و مناظر کی تصویر کشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے والے لکھاری ہیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے۔ اپنے موضوع پر خوب لکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی حیثیت ایک صاحب نظر ادیب و محقق کی ہے۔ واقعہ نگاری اور واردات کے بیان کو خوبصورتی سے قلم بند کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ادب میں سوانح نگاری، خاکہ نویسی اور رپوتاژ ان کے خاص موضوعات ہیں۔ سوانح نگار کی حیثیت سے انہوں نے بے شمار علمی و ادبی شخصیات پر مضامین، خاکے اور تصانیف مرتب کیں۔ ادب کی دنیا میں انہوں نے سوانح نگاروں اور خاکے لکھنے والوں میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ڈاکٹر صمدانی کی تحریروں میں دھیما پن اور سادگی ہے وہ اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں شخصیت کا دلفریب اور مکمل نقشہ چھوڑنے میں کامیاب وکامران نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی

ڈاکٹر خالد ندیم نے ڈاکٹر صمدانی کی کتاب ''جھولی میں ہیرے اور موتی کا پیش لفظ تحریر کیا جس میں آپ نے لکھا ''شیخوپورہ کی علمی و ادبی تنظیم 'دریچہ' کے دوستوں کے بعد سرگودھا میں اگر کسی ادبی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تو وہ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی تھے۔ ان کی رفاقت میرے لیے اس قدر خوش گوار تھی کہ سرگودھا مجھے اپنے شہر کی طرح محسوس ہونے لگا۔ایک شریف النفس انسان سے مل کر مَیں نہ صرف خوش ہوا، بلکہ مجھے یوں محسوس ہوا، مَیں ایک مدتوں سے جس پُرخلوص انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، ڈاکٹر طاہر تونسوی کے توسط سے آج مجھے وہ مل گیا ہے''۔

ڈاکٹر صمدانی کی خاکہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر خالد ندیم لکھتے ہیں'' ڈاکٹر صمدانی نے اپنے تخلیقی سفر کو بدریج طے کیا ہے اور اب وہ اس صنف کی اس منزل پر ہیں، جہاں خاکہ نگاری میں ان کا رنگ اپنی انفرادیت کا اظہار کرنے لگا ہے۔ وہ اپنی نستعلیق شخصیت کی بدولت شگفتہ سنجیدگی کو اپنانے پر مجبور تھے، چنانچہ ان کی تحریروں میں روانی، سادگی، بے ساختگی اور لطافت کا پایا جانا فطری امر ہے۔ ابھی ان کی صورت میں مشرق کی آنکھ میں کچھ روشنی باقی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق بات کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات کو نظر انداز

نہیں کرتے'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صمدانی کے خاکوں میں سوانحی معلومات بھی ہیں اور خاکہ نگار کا تخلیقی لمس بھی۔ ان کے مطالعے سے قاری کو صرف شخصیت کے ماہ و سال سے آشنائی ہوتی ہے، بلکہ بعض مواقع پر خاکہ نگار کے لب و لہجے اور تاثرات کی مدد سے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں اپنے ہر موضوع کے بارے میں وہ کچھ لکھ دیا ہے، جو حقیقت ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے روزمرہ باتوں اور واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور محض اسلوب کا جادُو جگانے کے بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کی تحریر کی خصوصیت بھی ہے اور ہمارے بعض ادیبوں کے لیے باعثِ تقلید بھی'' (۳)۔

حکیم محمد سعید شہید

تعلیم اور لائبریری کا باہم گہرا تعلق ہے اور لائبریری کی ترتیب و تنظیم ہمیشہ کی طرح آج بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے اب سائنس کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ آپ نے طلبہ لائبریری سائنس کے لیے مبادیات لائبریری سائنس ایک اچھی اور مفید کتاب مرتب فرمادی ہے۔ میرے طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے (۴)۔

پروفیسر محمد احمد۔ سابق پرنسپل۔ اسلامیہ گورنمنٹ کالج سکھر و گورنمنٹ عبد اللہ ہارون کالج کراچی

فاضل مصنف کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم وجدید واقفیت ، علمی تجربہ اور ادبی ذوق ، نقاد اور مورخ کی حقیقت پسندیدگی اور سنجیدگی، ادباء اور انشاپردازواں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت جمع ہو گئی ہیں جو شاذونادر جمع ہوتی ہیں۔ان کی تصانیف پر اجمالی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مصنف کا ذوق و مطالعہ، تحقیق اور علمی میدان کس قدر وسیع ہے۔فاضل مصنف میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور سلیقہ ہے۔انہوں نے اپنے اپنے وسیع مطالعہ اور معلومات کو اپنی فطری انہماک ونشاط کے ساتھ قلم بند کیا ہے جو ان کی صلاحیت ، قوت عمل اور فکری ارتقاء کا نمونہ ہے۔

احقر فاضل مصنف سے ایک عرصہ سے واقف ہے اور بغیر تکلف کے کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ ان کی عملی گفتگو، ذوق سلیم ، غیر معمولی حافظہ، تاریخی شعور سے نہ صرف متاثر ہے بلکہ کافی استفادہ کیا ہے۔ان کی باغ و بہار شخصیت لائبریری سائنس کی اعلیٰ ترین ڈگری سے مزین ہے ۔انہوں نے لائبریری کے علوم میں ایک ماہر فن کا درجہ حاصل کر لیا ہے" (۵)۔

ڈاکٹر انیس خورشید۔سابق صدر۔ شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ کراچی۔

رئیس احمد صمدانی کی مرتب کردہ کتاب (Akhtar H. Siddiqui: A bio-bibliographical Study) کے بارے میں ڈاکٹر انیس خورشید نے ختراتج صدیقی کے نام اپنے تحریر کردہ خط میں کتاب کے بارے میں حسب ذیل رائے کا اظہار فرمایا : "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے بارے میں شائع ہونے والی -Bio Bibliographical Study کی ایک کاپی مجھے عنایت فرمائی ورنہ میں ایک اچھی کتاب سے شاید محروم رہتا۔ میں نے سرسری طور پر ہی اسے دیکھا ہے مجھے کتاب اچھی لگی۔ dataکو بہت ہی اچھے طور پر کی گئی ہے اور نہایت عمدگی سےPresentation پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے آپ کی بھرپور شخصیت اپنی طرحداری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔تدوین اور ترتیب بھی اچھی ہوئی ہے یوں کہنا چاہیے کہ اختراتج صدیقی کی متنوع اور سدا بہار شخصیت اپنی پوری کتابیاتی سرگرمیوں کے ساتھ اس کتاب کے ذریعہ بھرپور طور پر نمایاں ہو جاتی ہے" (٦)۔ قومی کتابیات پاکستان (١٩٤٧ء۔١٩٦١ء) جلد سوم جو رئیس احمد صمدانی نے بطور چیف ایڈیٹر مرتب کی اور حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے شعبہ لائبریریز نے ١٩٩٩ء میں شائع کیا کے بارے میں ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط ٢٠ فروری ٢٠٠٠ء میں تحریر فرمایا: "تمہارے خط مورخہ ١٣ فروری کے ساتھ PNB-47-61 (500-900) ملا' بے حد شکریہ۔ غالباً اس ببلوگرافی کے ساتھ باقی حصہ جو چھپنے سے رہ گیا تھا وہ بھی شامل ہو گیا ہے' یہ کام قابل تعریف ہے۔

مبارکباد قبو کریں (۷)۔
رئیس احمد صدانی اور خالد محمود نے ۱۹۹۷ء میں پاکستان سے شائع ہونے والے لائبریری وانفارمیشن سائنس کے رسائل وجرائد کا پچاس سال کا اشاریہ مرتب کیا ۔ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے خط مورخہ ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء میں تحریر فرمایا : ''تمہاری ملی' بے حد شکریہ۔ یہ Periodical Literature in LIS اور خالد محمود کی کتاب کوشش قابل مبارک باد ہے۔ اس کام کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اسے رسائل تک محدود رکھنا وہ بھی مقامی رسائل تک سود مند ہوگا۔ میری دعائیں تم لوگوں کے ساتھ ہیں'' (۸) جناب محمد عادل عثمانی کی تصانیف وتالیفات اور ان کی پیشہ ورانہ خدمات پر مبنی سوانحی کتابیات Muhammad Adil Usmani: A Bio-Bibliographical Study) جو رئیس احمد صدانی نے مرتب کی کے بارے میں ڈاکٹر انیس خورشید اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''تمہارا ۱۱ اکتوبر ۱۱ کا خط ملا، محمد عادل عثمانی (سرکار) کی سوانحی کتابیاتی کتاب کی خوبصورت جلد ملی خوشی ہوئی، پڑھ تو نہ سکا ہوں لیکن خوشی ہوئی تم سے دھن کے پکے لائبریرین نے مرتب کیا ہے'' (۹)۔
ڈاکٹر جمیل جالبی ۔ سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی
آپ کی ''کتابیات طب وصحت'' کا ایک نسخہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار''

ہوں ۔آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے محنت سے ، یہ بکھرا ہوا مواد سلیقے سے جمع کرکے ترتیب دیا ہے (۱۰)۔

الحاج محمد زبیر۔سابق لائبریرین ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈائریکٹر، اسکول آف لائبریرین شپ

میرے ہم پیشہ و ہم مشرب رئیس احمد صمدانی نے کتب خانوں پر کتب لکھ کر بڑی عمدہ'' مثال قائم کی ہے۔ یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے میری یہ دعا ہے کہ خدا انہیں یہ سلسلہ قائم رکھنے کی توفیق دے ۔میری رائے میں یہ قابل قدر کتاب اس نوجوان نسل کے لیے خاص طور پر بڑی سود مند ہوگی جو کتب خانوں سے دلچپی رکھتے ہیں۔ خیال رہے کہ میری یہ رائے محض رسمی رائے نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کی رائے ہے جو خود بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہے اور جس نے اپنی عمر کے ۵۵ برس کتب خانوں اور فن (کتب داری کی خدمت میں گذارے ہیں''۔ (الحاج محمد زبیر۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۸ء

فرخندہ لودھی۔ادیب و افسانہ نگار، گورنمنٹ کالج ، لاہور

آپ نے جس جذبے سے اس میدان میں کام کی پہل کی ہے میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھارہی ہوں ۔ سوچئے اگر آپ کی کتاب نہ ہوتی تو طالبات کیا پڑھ تیں۔ اس وقت میری کلاس میں ۱۷ طالبات ہیں۔ کلاس شروع ہوئی تو پتہ کروانے پر معلوم

ہوا کہ ابتدائی اور مبادیات لائبریری سائنس کراچی میں بھی دستیاب نہیں۔ بڑی پریشانی ہوئی کریکلم ونگ لاہور کے رسرچ آفیسر (لائبریری سائنس) چوہدری نذیر احمد نے اس سلسلے میں بے حد مدد کی اور کہیں سے آپ کی کتاب حاصل کرکے فوٹوں کاپیاں تیار کرکے طالبات کو دیں۔ نیا مضمون ہونے کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھیں (۱۱)۔

پروفیسر محمد واصل عثمانی

ڈاکٹر سبزواری کے ایک شاگرد جو ان کے بھتیجے بھی ہیں نیز اپنے چچا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تصنیف و تالیف کے میدان میں اُسی تیزی کے ساتھ رواں دواں ہیں، میں صمدانی صاحب کی زیرِ نظر تصنیف کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ انہوں نے ایک ایسی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا ہے جو ہر اعتبار سے اس لائق ہے کہ ان پر لکھا جائے۔ یہ مختصر سی کتاب سبزواری صاحب کی شخصیت اور علمی کارناموں کا ابتدائی تعارف ہے لیکن خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی صمدانی صاحب کے اس عمل کو قبول فرماوں عطا فرمائے اور مزید علمی خدمات کی توفیق ارزانی ہو (۱۲)۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان بلوچ ،چیئرمین۔ شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، منہاج یونیورسٹی، لاہور

مَیں ڈاکٹر رئیس صمدانی کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ وہ میرے ہم پیشہ اور قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔ ان سے قربت اس وقت زیادہ ہو گئی تھی جب وہ اپنی کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہو جانے کے بعد میرے مشورہ پر شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس جامعہ سرگودھا میں چلے آئے تھے جہاں پر میں اس وقت شعبہ کا چیرَمین تھا۔ ڈاکٹر، صمدانی نے ایسو سی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے شعبہ میں تدریس آغاز کیا اور تقریباً ایک سال وہ میرے کلیگ اور ساتھی رہے۔ اس طرح وہ مَیں اور وہ زیادہ قریب آگئے اور مجھے ان کو اور انہیں مجھے جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ ان کی میرے بارے میں کیا رائے ہے یہ تو وہی بتا سکتے ہیں البتہ میں نے انہیں بہت ہی نفیس انسان پایا، دھیمہ لہجہ اور شائستگی ان کی شخصیت کی پہچان ہے۔ اپنے مضمون پر مکمل عبور رکھتے ہیں محنت کے عادی ہے، محنت اور تیاری کے ساتھ کلاس میں جاتے ہیں۔ طلباء میں مقبول استاد رہے۔ ان کے واپس کراچی چلے جانے کے بعد طلباء نے انہیں طویل عرصہ تک یاد رکھا اور وہ طالب علم جنہوں نے ڈاکٹر صمدانی سے پڑھا تھا آج بھی ان کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔

عبد الصمد انصاری

رئیس احمد صمدانی صاحب لکھنے کا فن خوب جانتے ہیں انہوں نے ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری صاحب پر یہ کتاب لکھ کر دنیائے لائبریری سائنس میں نئے آنے

والوں پر ایک احسان کیا ہے جس طرح انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ہر باب اور شخصیت کی ہر جہت کو ایک جگہ اکھٹا کرکے قارئین کے لیے پیش کیا ہے یہ وہی کر سکتے تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد، رشتے کے بھتیجے اور پیروکار اور اگر میں کمانڈو کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ان دو شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کی لکھنے پڑھنے اور انتھک کام کرنے کی عادت کی نہ صرف تقلید کی بلکہ اس کو مستقل اپنا لیا اور ڈاکٹر صاحب کی ہدایات اور نگرانی میں اپنا پیشہ ورانہ سفر آگے بڑھایا اور ایک مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک اور خصوصیت جس کو صمدانی صاحب نے بالخصوص اپنایا، یا وہ ان میں ڈاکٹر صاحب کا رشتہ دار ہونے کے سبب پہلے ہی سے موجود تھی' وہ ہے ڈاکٹر صاحب کی وضع داری، ملنساری اور سب سے بڑھکر برداشت اور صبر اور صبر بھی کیا قیامت سا! میں نے خود ان کی برداشت اور خاموشی کے ایسے مظاہرے دیکھے ہیں جس نے کئی طوفانوں کے رُخ موڑ دیے اور بعد میں طوفان اٹھانے والوں کو خود ہی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا (۱۳)۔

اکرام الحق: لائبریرین، آرمڈ فورسز پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ، راولپنڈی
ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی صاحب دو درجن سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں بیشتر کا تعلق لائبریرین شپ سے ہیں۔ ان کے ۸۰ سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں

۔پاکستان لائبریری انفارمیشن سائنس جرنل کے ایسوی ایٹ چیف ایڈیٹر ہے۔ بے شمار پیشہ وار، تعلیمی اور سماجی تنظیموں کے نہ صرف ممبر رہے بلکہ ان میں انتظامی عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں ۔پاکستان لائبریری ایسوی ایشن سندھ.برانچ کے صدر بھی رہ چکے ہیں ۔پروفیسر انیس خورشید نے صمدانی صاحب کو'' دھن کے پکے لائبریرین ''کے خوبصورت الفاظ سے نوازا ہے (۱۴)۔

پروفیسر ڈاکٹر عبد الرشید رحمت: ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی آف سرگودھا

محترم رئیس احمد صمدنای' جن کا اصل فن لائبریری سائنس ہے، لیکن اسلامی تعلیمات سے دلچسپی کی وجہ سے آپ نے اسلام کے مختصر موضوعات مثلاً دُعا کی اہمیت وفضیلت کے حعالے سے علمی میدان میں ان کا ایک مجالہ دوسری بات چھپ چکا ہے۔ اب کی دفعہ آپ نے 'سلام' کے حوالے سے ایک نہایت مفید و مختصر معلوماتی کتابچہ مرتب کیا ہے۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے اس کی تمام معلومات قرآن و سنت کے عین مطابق ہیں ۔ چونکہ آپ کا مقصد عوام الناس کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے، اس لیے اس کی زبان بھی عام فہم رکھی گئی ہے۔امید کی جاسکتی ہے کہ آپ کا یہ مجالہ نافعہ پہلے کام کی طرح قبولیت عامہ حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر سردار احمد: پروفیسر اسلامیات، گورنمنٹ کالج برائے طلباء، ناظم آباد، کراچی
جناب رئیس احمد صمدانی جو لائبریری سائنس کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں نے اس ”
موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور مختلف کتب کی مدد سے ایک عمدہ مجموعہ تیار کر دیا ہے۔
زندگی میں مختلف مواقع پر اور مختلف اوقات میں کی جانے والی دعائیں تقریباً اس میں
سب آ گئی ہیں۔ یہ ایک اچھی کاوش ہے جو قارئین کے لیے انشاء اللہ قابل قدر، دلچسپی
اور فائدہ کا باعث ہوگی۔ اللہ پاک مؤلف کی سعی قبول فرمائے اور قارئین کو اس سے
استفادہ کی توفیق بخشے“۔

Abdul Hafeez Akhtar: Ex, Director General, Department of Libraries, Government of Pakistan

Mr. Abdul Hafeez Akhtar, former Director General Department of Libraries, Government of Pakistan stated in his Forward " that the task was assigned to the Pakistan Bibliographical Working Group as the bibliographic entries were available with them. A great deal of labour has gone in the editing and compilation of this Fascicule for which the members of the Editorial Committee of the Pakistan Bibliographical Working Group headed by its Secretary Mr. Rais Ahmed Samdani deserve our

special thanks. They have done a wonderful job in bridging the gap of bibliographic records".(15)

Muhammad Adil Usmani

Mr. Samdani is an important member of the editorial board of PLB whose written contributions are now well known in the library world of Pakistan. His books viz. Elementary Library Science (in Urdu) which is in its 9th edition, Introduction to Library Science (in Urdu) which is in its 6th edition are holders of rise distinction which none of the other books in the field have ever achieved in Pakistan. These books are prescribed in Intermediate and B. A. classes of library science courses. He has developed a good skill of writing books in the field of library science in Urdu which are very helpful to the students and equally used by library science teachers and librarians. He had remarked about Mr. Samdani's capabilities and devotion in the following words: "Truly speaking the Bulletin (Pakistan Library Bulletin) owes its life due to untiring efforts of these two devoted persons who have taken the entire burden of publication of PLB in absence of M

. Adil Usmani and G. A. Sabzwari".(16)

Prof. Dr. Syed Jalaluddin Haider

Prof. Dr. Syed Jalaluddin Haider, former Chairman, Department of Library and Information Science, University of Karachi and a prolific writer in library and information science stated of foreword of Mr. Samdani's books as ''He is one of the few young Librarians, I must add here, who is continually making contribution to the limited literature of Pakistan Librarianship.(18)

''I would like to record my appreciation about all, to the editors, who are well known in the field for their writing skills and dedication to their works, for their cheerful acceptance of comments and suggestions at all stages in the planning and preparation of the index''. (19)

Moinuddin Khan

In the Launching Ceremony of Mr. Samdani's book "Akhtar H. Siddiqui:a bio-bibliographical study" which was held on October 30, 1997 at UGC

Auditorium, Liaquat Memorial Library Building, Karachi, organized by the Pakistan Library Association (Sindh Branch). Mr. Moinuddin Khan as a key speaker had remarked about Mr. Samdani's capabilities in the following words: "I shall be failing in my duty if I don't turn to the author of this exhaustive study. Mr. Rais Ahmed Samdani has done as equally scholarly work in gathering the prolific works of his outstanding biographies within the two covers of a slim book. It is often said, librarian do not write but they do take good care of other's writings, but in this case a librarian has volunteered to compile a fellow librarian's life-long output in profuse admiration and regard. Mr. Samdani struck me as a hard and meticulous worker. He is indefatigable and follows almost a punishing schedule. He has been the main prop of the only professional journal of Pakistan librarianship Pakistan Library Bulletin (Pakistan Library and Information Science Journal) which is coming out uninterruptedly for last 27 years. I wish more power to the elbows of Mr. R. A. Samdani, the bibliographer, and look forward to a few more products from their formidable efforts".

Mr. Khan in his foreword of Samdani's compilation work titled Cumulative Index of Pakistan Library Review (PLR) stated that "I felt greatly honoured when I was asked to write a foreword to this book, which is valuable clue to yet another untapped source of professional literature contained in the volumes of Pakistan Library Review encompassing those formative years (1958 -1969) of professionalization of librarianship in Pakistan. In to the lasting credit of Mr. Rais Ahmed Samdani that be has indexed these two leading national library journals. He compiled Index of PLB in 1995 and within the space of two years he has come up with this Cumulative Index of PLR. Mr. Samdani thus carries the day in chronicling history and growth of a discipline which, today enjoys university status. Indexing is a painstaking and back-breading task and at the same time demands precision to help search the needle in haystack. Mr. Samdani will be a more satisfied man than anyone else to have provided a finding tool for working librarians. Students and teachers of Library and Information Science for generations to come. He deserves our abiding gratitude".(20)

Prof. Dr. Rafia Ahmed Sheikh

Prof. Dr. Rafia Ahmed Sheikh has contributed in the foreword of the book titled 'Akhtar H. Siddiqui: a bio-bibliographical Study'. In her words 'No such work existed prior to this (written by any other Pakistani writer), and thus I regard it as a pilot study and an original and comprehensive piece of work, where Mr. Siddiqui truly exhibits his competence. His expert handling of the progress made in the library scene in Pakistan deserves credit. It is one of my favorite books on Pakistan librarianship.'(21)

M. Gulistan Khan : Senior Librarian

Dr. Samdani did serious research work on librarianship , editing bibliographic source material and indexing of several articles journals published during his life time single handedly. It was infect a job of a large institution. It may be said that he is a one man institution. He embarked on a one man mission to promote librarianship in Pakistan. His contribution have supported the life the Pakistan Bibliographical

Working Group.

Mr Samdani has the honour to compiled the National Bibliography of Pakistan 1947 to 1961, fascicule III (Pure Science to History) which has been published by the Government of Pakistan, Ministry of Education, Department of Libraries in 1999. This part of national bibliography was in the continuation of previously published Fascicule I (General Work to Islam ; 000 - 297) & II (Social Sciences to Languages; 300 - 400) published by National Book Council of Pakistan in 1972 and 1975 respectively. The gap in the National Bibliography of Pakistan has been filled by the publication of this fascicule. Now the Pakistan have a complete National Bibliography being right from the year 1947. Credit goes to Mr. R. A. Samdani, for completing this huge task in spite of several handicaps. The task has been done in the absence of the Copyright Act, or the Delivery of Books and Newspapers Act or similar legislation.

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم غوری وائس چانسلر، منہاج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر صمدانی کی علمی و ادبی کاوشوں پر مشتمل کتابیاتی جائزے کا جب میں نے سرسری مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، اردو ادب اور اسلامی موضوعات پر ان کی ۳۳ تصانیف و تالیفات اور تین سو سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ علمی خدمات کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہے کہ انسان دنیاوی معاملات بھی سر انجام دیے ساتھ ہی قلم و قرطاس سے اپنے آپ کو مستقل طور پر وابستہ رکھے۔ ڈاکٹر صمدانی کا علمی سرمایا تعداد اور معیار کے اعتبار مثالی ہے۔

محمود عزیز: محقق و مصنف

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کا تعلق لائبریری سائنس کے شعبہ سے ہے مگر ان میں علم و ادب، شاعری رچی بسی ہے۔ ان کے خانوادہ میں اکثر افراد صاحب دیوان شاعر ہیں اور بے دیوان شاعروں میں بھی علم و ادب اور شاعری کی یہی چٹیک ان کو بھی لگی ہوئی ہے۔ گزشتہ ۳۸ برسوں میں رئیس احمد صمدانی نے ۳۲ کتابیں اور ۲۵۰ مضامین تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کو اللہ نے توفیق دی کہ انہوں نے اپنے اجداد کی میراث کو ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کریں چنانچہ شیخ محمد آزادؔ کی شخصیت اور شاعری پر کتاب وجود میں آئی۔ اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ آزادؔ کی شخصیت اور

شاعری اور ان کی سرگرمیوں سے ان کے اہل وطن
اور اردو ادب پر خوش گوار اثرات مرتب ہونے کا پتا چلتا ہے بلکہ ان کے آبائی شہروں بیکانیر، مظفر نگر، حسین پور کی امتیازی خصوصیات کا بھی علم ہوتا ہے۔

سید محمد اصغر کاظمی : محقق و مصنف

پروفیسر ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی ان ادیبوں اور محققین میں سے ہیں جو گزستہ چار دیہائیوں سے اپنی صلاحیتِ فکر، دانشوری، تخلیقی فکر، تصنیفی و تالیفی آگہی سے تحریر و فن کی دنیا کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ وہ ایک خوش فکر ادیب، خوش بیان مقرر، صحافی، محقق، اپنے موضوع کے معروف استاد، ۳۳ کتابوں اور ۳۰۰ سے زیادہ تحقیقی و ادبی مضامین کے خالق ہیں۔ کراچی کے مختلف کالجوں میں تدریسی اور پیشہ ورانہ خدمات انجام دے کر ۲۰۰۹ء میں ریٹائر ہوئے اور جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنز میں بہ حیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر ایک سال خدمات انجام دیں۔ صحت کی خرابی کے باعث جامعہ سرگودھا کو خیر باد کہا اور چند ماہ مقدس سرزمین سعودی عرب میں قیام کیا۔ جنوری ۲۰۱۲ء سے آپ منہاج یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے صدر شعبہ (۲۰۱۲ء تا جنوری ۲۰۱۵) رہے۔ اب پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ آپ کو منہاج یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے بانی سربراہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل

ہے۔

کراچی کے ایک پیشہ ورانہ ادارے ''اسکول آف لائبریرن شپ، پاکستان.ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے ڈائریکٹر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ڈاکٹر صمدانی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم ایل آئی ایس کے ٹیوٹر بھی ہیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے آپ کو Best University Teacher 2013کا اعزاز عطا کیا۔

ڈاکٹر صمدانی کے ۴۰ سالہ ادبی، تصنیفی وتالیفی اور تحقیقی سفر سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مقصد کے حصول کی لگن کیا ہوتی ہے اور یہ کہ محنت، لگن، متانت اور سنجیدگی سے کیا ہوا انسان کا عمل اُسے معاشرہ میں مُعتَبرَ کرتا ہے۔ وہ طبعاً کم گو ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ، انعام واکرام کی خواہش سے مبّرا ہو کر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، لکھتے رہتے ہیں اور چھپتے رہتے ہیں،یہی ان کی زندگی کی مَتاع اور انعام و اکرام ہے۔ یہ امر بھی قابل بیان ہے کہ انہوں نے اپنی قلمی کَدوکاوِش کو شہرت یا روٹی روزی کا ذریعہ نہیں بنایا۔اس طویل سفر میں جو ادب بھی انہوں نے تخلیق کیا وہ معیار و مقدار کے اعتبار سے قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ان کی تصانیف و

تالیفات کی تعداد ۳۳ ہے جب کہ ۲۰۰ سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فلیپ 'جھولی میں ہیرے اور موتی (شخصی خاکے)، رئیس احمد صمدانی۔

، کراچی: فضلی بک سپر مارکیٹ، ۲۰۱۲

،۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، پیش لفظ

۴۔ حکیم محمد سعید۔ خط بنام رئیس احمد صمدانی۔ حوالہ نمبر ھ ف پ۸۵،۴۱۱۸، بتاریخ ۲۳ جولائی ۱۹۸۵ء

۵۔ رئیس احمد صمدانی۔ ابتدائی لائبریری سائنس کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۰ء، ص ۵۔۶

۶۔ ڈاکٹر انیس خورشید۔ خط بنام اختر ایچ صدیقی۔ بتاریخ ۱۸ مئی ۱۹۹۷ء۔

۷۔ ڈاکٹر انیس خورشید۔ خط بنام رئیس احمد صمدانی، بتاریخ ۲۰ فروری ۲۰۰۰ء۔

۸۔ ڈاکٹر انیس خورشید۔ خط بنام رئیس احمد صمدانی، بتاریخ ۱۵ مارچ ۲۰۰۰ء۔

۹۔ ڈاکٹر انیس خورشید۔ خط بنام رئیس احمد صمدانی، بتاریخ ۱۱۹ کتوبر ۲۰۰۴ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ بنام رئیس احمد صمدانی۔ حوالہ نمبر ذ۔۱۴۱۸، بتاریخ۱۰اکتوبر
۱۹۹۲ء
۱۱۔ فرخندہ لودھی، لاہور خط بنام رئیس احمد صمدانی۔ تاریخ درج نہیں، ۱۹۸۵ء
۱۲۔ تاثرات: عبد الصمد انصاری، در، ڈاکٹر غنی لاکرم سبزواری: شخصیت و علمی
خدمات از
رئیس احمد صمدانی کراچی: بزم اکرم و لائبریری پروموشن بیورو، ۲۰۰۶، ص۔۹
۱۳۔ ایضاً۔ ص۔۲۰
۱۴۔ اکرام الحق۔ تبصرہ ''یادوں کی مالا'' از رئیس احمد صدمانی۔ پاکستان لائبریری و
انفارمیشن سائنس جرنل، جلد ۴۲، شمارہ ا، مارچ۲۰۱۱ء
15) Abdul Hafeez Akhtar. Foreword in The National
Bibliography of Pakistan: Volume III (Pure
Sciences Geography and History, (500 to 900)/
(Retrospective Pakistan National
Bibliography) Islamabad: Department of Libraries, Ministry
of Education, Govt. of Pakistan, 1999ء
580p:
16) M. AdilUsmani . Pakistan Library Bulletin: Impact of its
writings on

Librarianship in Pakistan.
PLB. XXVI (3-4): September - December 1995. p:17, 22
17) Ghaniul Akram Sabzwari. Library Promotion Bureau.
PLB. XXVI (3-4): Sept.- Dec. 1995. p: 47
18) Syed Jalaluddin Haider. Foreword inBibliographical
Sources on Islam/by Rais Ahmed Samdani.-
Karachi: PBWG. 1993. p:3
19) Syed Jalaluddin Haider. Foreword in Periodical
Literature in Library and Information Science:an
Index of 50 Years Works in Pakistan (1947-1997) /by Rais
Ahmed Samdani and
Khalid Mahmood.- Karachi: Pakistan Bliographical Working
Group, 1999, 182p:
20) Moinuddin Khan. Foreword in Cumulative Index of
Pakistan Library Review (PLR)/by Rais
Ahmed Samdani.- Karachi: PBWG. 1998. pp: 9-10
21) Rafia Ahmed Sheikh. Foreword in Akhtar H. Siddiqui: A
Bio- Bibliographical Stud/by Rais Ahmed

Samdani.- /Karachi: Pakistan Bibliographical Working Group,

1995, 79p: (ISBN: 9969-8170-02-2)

تصانیف وتالیفات کاتَوضیحی جائزہ

(اردوادب (سوانح، خاکے، شاعری وشخصیات

1۔ شیخ محمد ابراہیم آزاؔد: شاگردِ رشید استاذ الشعراء افتخارالملک سید وحید الدین احمد بیخوؔد دہلوی جانشیں فصیح الملک داغ دہلوی۔ شخصیت وشاعری کراچی: صمدانی اکیڈمی، 2013

شیخ محمد ابراہیم آزاؔد ہندوستان کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے صوبے راجستھان کے معروف شہر بیکانیر سے تھا۔آپ کا نعتیہ دیوان ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اشاعت دوم ۲۰۰۵ء میں کراچی سے ہوئی۔کتاب کے مصنف ڈاکٹر رئیس احمد صمدنی نے کتاب کے تعارف میں لکھا ہے کہ " آزاؔد صاحب کی شخصیت اور ان کی سخن فہمی ادبی تاریخ خصوصاً نعتیہ شاعر کی حیثیت سے اہم اور لائق توجہ ہے۔ ادبی حوالے سے یہ کتاب آزاؔد صاحب کی سوانح اور تخلیقی خدمات پر اہم دستاویزاور آئندہ کے محقق کے لیے مفید ماخذ ہوگی۔کتاب کا پہلا باب آزاؔد صاحب کی شخصیت کو نمایا کرتا ہے۔ معلومات کا بنیادی ماخذ خود آزاؔد صاحب کا دیوان ہے ۔ اس کے علاوہ راقم الحروف نے جو باتیں اپنے والدِ بزرگوار قبلہ انیس احمد صمدانی مرحوم اور خاندان کے دیگر احباب سے

سنیں انہیں اس باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

باب دوم آزاؔد صاحب کی نعتیہ شاعری پر مبنی ہے۔آپ بنیادی طور پر نعت گو شاعر ہیں اردو شاعری کے دامن میں عشق مصطفیٰ ﷺ کی شان اقدس میں صالح شعر و ادب کے بے مثال ہیرے اور موتی بکھیرے جو اپنی مثال آپ ہیں۔اس باب میں آزاؔد صاحب کے ہمعصر شعراء اور اہل قلم نے آپ کی شخصیت اور کلام پر جو رائے پیش کی ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔کتاب کا تیسرا باب آزاؔد صاحب کے خاندان جو 'خاندان باری بخش' بعد میں 'خاندان حسین پور' کہلایا کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

باب چہارم میں آزاؔد صاحب کے آبائی شہروں بیکانیر، مظفر نگر اور حسین پور کا احاطہ کیا گیا ہے۔پانچواں باب 'دیوان آزاؔد طبع اول و دوم ، لاہور سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہنامہ 'نعت' کے خاص نمبر 'آزاؔد بیکانیری کی نعت' کا احاطہ کرتا ہے۔

اردو کے معروف دانشور، استاد و محقق پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب مرحوم کا کسی بھی کتب کے لیے ان کی زندگی کا آخری دیباچہ ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری میں رسمی نعت گو شعرا سے قطع نظر، بے شمار ایسے شعرا موجود ہیں جن کی نعتیہ شاعری یکسر وجدانی اور رسمیات سے پاک ہے۔ان شعرا کے

نعتیہ کلام نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی زندگی پر کم و بیش وہی اثر ڈالا ہے جو نعت گوئی کا مقصود اصلی تھا۔ شیخ محمد ابراہیم آزادؔ بھی ان شعرا میں سے ہیں کہ جن کے نعتیہ کلام میں رسولِ اکرم ﷺ کی ذات صفات سے والہانہ عشق صاف عیاں ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنابِ آزادؔ قبلہ سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں جن کی شاعری کے بارے میں خود بیخودؔ دہلوی نے کہا کہ 'ان کا کلام بقدر ان کے ذوق شعری اصلاح کا چندہ محتاج نہیں'۔ بیخودؔ دہلوی جیسے استاذ الشعرا جانشین فصیح الملک داغؔ دہلوی کی اس رائے کے بعد گنجائش نہیں رہ جاتی کے آزادؔ صاحب کی شاعری پر کچھ کہا جائے۔ پیش نظر کتاب سے میرے علم میں یہ بھی اضافہ ہوا کہ صمدانی صاحب ایک شاعر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شعر و ادب کا مذاق کئی نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ متعدد احباب ادیب و شاعر اور صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ خود صمدانی صاحب کے بعض اشعار اس کتاب میں کہیں کہیں نظر سے گزرے ۔امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے والوں کے لیے تسکین کا وسیلہ ہوگی۔ اہلِ ذوق کو انبساطِ روح اور نشاطِ قلب کے اسباب فراہم کرے گی۔ غور و فکر کی راہیں کھولے گی اور مصنف کے قلم کو مزید معتبر و محترم بنائے گی اور ہر اعتبار سے اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہوگی''۔

کتاب کے فلیپ پر پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی (ڈین آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرنگ ویچیر مین۔ شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد) کی رائے ہے۔ ڈاکٹر تونسوی کے خیال میں ’’پیشِ نظر کتاب صمدانی صاحب کے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزآد کی سوانح اور شاعری سے متعلق ہے۔جہاں تک جنابِ آزآد کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ اپنے شعری اظہار کے حوالے سے کلاسیکل لب و لہجے کو بڑی عمدگی اور فنی مہارت سے شعروں کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا دیوان ۱۹۳۲ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ آزآد کو بیخوؔد دہلوی جیسے معروف اور پختہ فکر شاعر کی شاگردی کا بھی اعزاز حاصل ہے اور بیخوؔد حضرتِ داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے اس اعتبار سے ادب کی یہ تکون یعنی داغؔ، بیخوؔد اور آزآد اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ جو کتاب آزآد صاحب کی سوانح و شاعری پر روشنی ڈالتی ہے اور اس تناظر میں ایک ایسے شخص و شاعر کو منظر عام پر لاتی ہے جو اوراق کی تہہ میں محفوظ تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رئیس صمدانی ہدیہ تکریم کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک باکمال شخص و شاعر کو ادبی دنیا میں روشناس کرانے کے لیے ایک اہم اقدام کیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر عمدہ کاوش ہے۔

۔ جھولی میں ہیرے اور موتی: شخصی خاکے کراچی: فضلی بک سپر مارکیٹ،، 22012

،

عالمی معیاری کتاب نمبر: ISBN:978-969-441-164-7

کتاب کا فلیپ معروف استاد و ادیب پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے تحریر کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ''ڈاکٹر رئیس صمدانی کا قلم کسی طویل تعارف کا محتاج نہیں، وہ ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں اور جو کچھ لکھ رہے ہیں نہایت کارآمد انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر رئیس صمدانی کے لکھے ہوئے خاکے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی یادداشتیں بہت مضبوط ہیں، ان کی نگاہ حقائق اور واقعات پر بڑی گہری رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صمدانی ایک باشعور صاحب قلم ہیں، مقبولیت و عدم مقبولیت یا کسی رسالے میں چھپنے نہ چھپنے پر ذرا بھی توجہ نہیں دیتے بلکہ ادب کی خدمت نہایت سلیقے اور لطیف پیرائے میں انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کی سادہ بیانی و حق گوئی میں ایسا جادو ہے کہ وہ اپنے قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری کتاب ختم کیے بغیر اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔

معروف ادیب و استاد پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں اپنے فلیپ میں لکھا ''اگر سوانح عمری آراستہ ڈرائنگ روم ہے تو خاکہ روزن در کہ کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہوئے اختصار کے اسلوب میں شخصیت سے متعارف کرادیا جاتا ہے یو یہ چند واقعات کچھ کوائف اور مجمل اشارات کی مدد سے شخصیت سے مصافحہ ہوجاتا ہے۔ مصوری کی اصطلاح میں بات کریں تو خاکہ

اسکیچ ہے پورٹریٹ نہیں۔ ڈاکٹر صمدانی نے ادب اور ادیبوں ، قلم اور اہل قلم، علم اور اہل علم سے رشتہ استوار رکھا اس کا اظہار دوستوں پر محبت کی روشنائی سے تحریر کردہ خاکوں سے ہوتا ہے۔ 'یادوں کی مالا' کے بعد اب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' خاکوں کا تازہ مجموعہ پیش ہے جو دس خاکوں ، اپنے بارے میں ایک مضمون ، ماضی کی یادوں کے حوالہ سے دو مضامین اور ایک رپوتاژ پر مشتمل ہے۔ یہ ہیں وہ ہیرے اور موتی جن سے اس درویش صفت انسان کی جھولی بھری ہے''۔اس کتاب میں میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں میرے ان دو عزیز دوستوں ڈاکٹر طاہر تونسوی اور عبد الوہاب خان سلیم کے خاکے بھی شامل ہیں۔ ان کی محبت سرمایہ حیات ہے۔ ان کے علاوہ فیض احمد فیض داکٹر عبدالسلام، عبد الستار ایدھی کے خاکے بھی ہیں ۔ رئیس صمدانی صاحب نے والدہ محترمہ کا خاکہ بھی قلم بند کیا ہے۔فرزندگی کے اسلوب میں۔

کتاب کا پیش لفظ ، شعبہ اردو، جامعہ سرگودھاکے استاد ڈاکٹر خالد ندیم کا تحریر کردہ ہے انہوں نے لکھا ''شیخوپورہ کی علمی و ادبی تنظیم 'دریچہ' کے دوستوں کے بعد سرگودھا میں اگر کسی ادبی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تو وہ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی تھے۔ ان کی رفاقت میرے لیے اس قدر خوش گوار تھی کہ سرگودھا مجھے اپنے شہر کی طرح محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹر صمدانی نے اپنی ان تحریروں کو خاکہ نگاری سے متعلق نہیں کہا، بلکہ انھوں نے ان نگارشات کو

سوانحی خاکے اور سوانحی مضامین کا نام دیا ہے، البتہ اس مجموعے کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ مصنف ان شخصیات سے جذباتی طور پر متاثر نہیں اور نہ ہی وہ ان کی قصیدہ خوانی کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے ان شخصیات کے بارے میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو بھی ان میں شامل کرکے انھی واقعات کے بیان تک محدود نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے تخلیقی حرارت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں ان کے سوانحی خاکے اور مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعہ سابقہ مجموعے سے اگلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صمدانی نے اپنے تخلیقی سفر کو بدرتیج طے کیا ہے اور اب وہ اس صنف کی اس منزل پر ہیں، جہاں خاکہ نگاری میں ان کا رنگ اپنی انفرادیت کا اظہار کرنے لگا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قریبی شخصیات پر لکھنے کے لیے خاکہ نگار کے پاس زیادہ مواد ہوتا ہے، اس لیے ایسے موضوعات پر وہ زیادہ سہولت سے لکھ سکتا ہے، لیکن یہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے۔ شخصیت جتنی زیادہ قریب رہی ہو، اس پر طبع آزمائی کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے اور پھر بعض لمحوں کو قلم بند کرنے میں بعض شخصیات کی تقدیس بھی حائل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے والدہ

محترمہ کے خاکے میں زیادہ فنی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے ایک بیٹے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ادیب کا کردار بھی ادا کیا ہے۔ ایسا خاکہ مصنف کے لیے بالعموم پل صراط پر چلنے سے کم دشوار نہیں ہوتا اور پھر صحیح سلامت منزلِ مراد تک پہنچ جانا یقیناً ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر صمدانی اس خاکے میں اپنی تمام تر تخلیقی توانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صمدانی کسی شخصیت کی مضحکہ خیزی یا کرداری تضادات کے باعث اسے خاکے کا موضوع نہیں بناتے، بلکہ وہ مہر و وفا اور خلوص و مروّت کے رشتوں سے انھیں منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے تعلقات کی بنیاد پر دھیمے سروں میں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور کسی دعوے یا ادعا کے بغیر اپنی ملاقاتوں اور ممدوح کی فتوحات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی شخصیت نہ تو فرشتہ ہے اور نہ ہی وہ مجسمہ شر؛ بلکہ وہ انسانوں سے ملواتے ہیں، جو خوبیوں اور خامیوں کا امتزاج ہوتے ہیں۔

بعض مقامات پر شاہد احمد دہلوی کی طرح ڈاکٹر صمدانی نے بھی حلیہ نگاری پر توجہ دی ہے۔ ایسے مقامات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میدان کی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ چوں کہ فی زمانہ نام نہاد 'حقیقت

نگاری' کی آڑ میں گھٹیا سے گھٹیا حرکت کو آرٹ کا نام دیا جانے لگا ہے، چناں چہ جوش ملیح آبادی کی 'آپ بیتی' کے بعد کئی ایک 'پاپ بیتیاں' سامنے آئی ہیں، جن کے مصنف لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی 'حرکات' کا فخریہ اظہار کرتے ہیں؛ لیکن ڈاکٹر صمدانی کا خدا بھلا کرے، ابھی ان کی صورت میں مشرق کی آنکھ میں کچھ روشنی باقی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق بات کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ فیض احمد فیضؔ کے خاکے میں معلومات کی فراہمی کے لیے انھوں نے اپنی یادداشتوں کے ساتھ ساتھ دیگر منابع سے بھی استفادہ کیا، لیکن اپنی تحریر کو تخلیقی توانائی سے ادبی شہ پارہ بنا دیا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی سے اپنے تعلق کو خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح فرخندہ لودھی کے خاکے میں بھی انھوں نے دیگر ذرائع سے معلومات یکجا کیں، لیکن ممدوح کی شخصیت کے جو نقش قلم بند کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ زیرِ نظر خاکوں میں سوانحی معلومات بھی ہیں اور خاکہ نگار کا تخلیقی لمس بھی۔ ان کے مطالعے سے قاری کو صرف شخصیت کے ماہ و سال سے آشنائی ہوتی ہے، بلکہ بعض مواقع پر خاکہ نگار کے لب و لہجے اور تاثرات کی مدد سے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہونے لگتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قبل یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہمارے خاکہ نگار کو، اپنے قاری کو متاثر کرنے کی جلدی نہیں۔ وہ جملے بازی سے قاری کے لیے کوئی سامانِ ضیافت پیش نہیں کرنا چاہتے؛ انھیں شہرت کی احتیاج بھی نہیں، وہ تو اپنے ارد گرد پھیلے

ہوئے چند کرداروں کے ذریعے اُس تہذیبی روشنی کو زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو بتدریج تاریکی کی نذر ہوتی جارہی ہے اور جس کے خاتمے کے بعد اگر انسان زندہ رہا بھی تو وہ شرفِ انسانیت سے ضرور محروم ہو جائے گا۔ انھوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں اپنے ہر موضوع کے بارے میں وہ کچھ لکھ دیا ہے، جو حقیقت ہے۔ ڈاکٹر صمدانی نے روزمرہ باتوں اور واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور محض اسلوب کا جادُو جگانے کے بجائے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کی تحریر کی خصوصیت بھی ہے اور ہمارے بعض ادیبوں کے لیے باعثِ تقلید بھی۔

روزنامہ جنگ کراچی نے اپنی اشاعت مورخہ ۶ جنوری ۲۰۱۳ء میں کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''اصنافِ ادب میں خاکہ کسے کہتے ہیں؟ خاکہ نگاری کے اصول یا حدود و قیود کیا ہیں؟ کیا شخصیات کے بارے میں تعریفی توصیفی مضامین کو خاکہ کہا جائے گا؟ یا پھر عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' خاکے کی تعریف میں آتا ہے؟ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے جس پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بہر صورت اردو ادب میں اکابرین نے بھی خاکے تحریر کیے ہیں اور موجودہ دور میں بھی بہت سے ادیب لکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مولونا حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے بھی بہت پہلے اردو کے قدیم تذکروں میں کسی نہ کسی صورت میں ملتا ہے۔ اس طرح اگر خاکہ نویسوں کی فہرست ترتیب کی جائے تو طویل ہوجائے گی۔ دراصل ہمارے ہاں خاکہ

نویسی کا کوئی امتیاز نظر نہیں آتا، چنانچہ یاد نگاری بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ سوانح نگاری بھی در آئی ہے، آراء نویسی بھی اس کا حصہ بن گئی ہے اور مصنف کے گزشتہ حالات و واقعات بھی اسی میں شریک ہوجاتے ہیں۔ بہر صورت خاکوں پر مشتمل کئی کتابیں اردو کا سرمایہ بن گئی ہیں اور حوالے کے طور پر ان کا تذکرہ آتا ہے۔ ''جھولی میں ہیرے اور موتی'' میں بھی شخصی خاکے شامل ہیں۔ مصنف کا تعلق لائبریری سائنس سے ہے اور وہ پاکستان کی مختلف جامعات میں رہے ہیں، اس لیے ان کا مختلف علمی و ادبی شخصیات سے تعلق رہاہے، جن میں سے بعض کے انھوں نے خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان خاکوں میں سوانحی پہلو بھی ہیں اور خود مصنف کی اپنی یادداشتیں بھی شامل ہیں۔ انھوں نے ان شخصیات کو کیسے دیکھا، ان

کے مشاہدے میں کیا کیا باتیں آئیں؟ ان باتوں کا اظہار اس کتاب میں ہے۔ آخر میں جامعہ کراچی سے متعلق یادیں تحریر کی گئی ہیں''۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ۱۱ خاکے ہیں ان میں ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ اردو ادب کا روشن ستارہ، عبد الوہاب خان سلیم۔ ایک کتاب دوست، فیض احمد فیضؔ۔ میرا پرنسپل، فرخندہ لودھی۔ ایک ادیب ایک کتابدار، پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد، پروفیسر لطیف اللہ۔ سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم

آباد، پروفیسر محمد احمد۔ سابق پرنسپل اسلامیہ کالج، سکھر، حاجی عبداللہ ہارون، گورنمنٹ کالج کراچی عبدالستار ایدھی۔ خدمت و عظمت کی لازوال مثال، عبدالصمد انصاری۔ دھیما لہجہ، میری ماں۔ صفیہ سلطانہ (خاکہ)، اپنی تلاش (خاکہ)۔ رئیس احمد صمدانی شامل ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے اپنی یادوں کے دریچے کے تحت اپنی کچھ پرانی یادوں کو قلم بند کیا ہے ان میں جامعہ سرگودھا میں میرے شب و روز (کچھ یادیں کچھ باتیں)، جامعہ کراچی میں میرا زمانہ طالبِ علمی: گزرے دنوں کی کچھ یادیں میں نے موت کو قریب سے دیکھا: (رپورتاژ)، یادوں کی مالا پر پروفیسر ڈاکٹر فرمان، فتح پوری کی رائے اور اکرام الحق کا تبصرہ شامل ہے۔ معروف صحافی، ادیب و محقق محمد احمد سبزواری صاحب نے کتاب پر تبصرہ تحریر فرمایا جو ماھنامہ 'قومی زبان' جولائی ۲۰۱۳ء جلد ۸۵، شمارہ ۷ میں شامل ہے۔

۔ یادوں کی مالا: مختلف شخصیات کے بارے میں مصنف کے تاثرات، افکار اور 3 انعکاسات لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، 2009، عالمی معیاری کتاب نمبر

:ISBN:969-503-763-1

آرمڈ فورسز پوسٹ گریجوایٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ، راولپنڈی کے لائبریرین اکرام الحق نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی کتاب" یادوں کی مالا" مختلف شخصیات کے بارے میں ان کے تاثرات، افکار اور

انعکاسات کا مجموعہ ہے۔کتاب پر ۳۵۰ روپے قیمت درج ہے۔کتاب میں ۲۵ شخصیات پر مشتمل ابواب ۲۴۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔پندرہ شخصیات کا تعلق براہ راست لائبریرین شپ کے پیشے سے ہیں۔جو اس مقدس پیشے کا قیمتی اثاثہ ہیں۔مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مضامین گذشتہ تیس برس میں لکھے گئے اور وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے۔ مصنف ایک کہنہ مشق لائبریرین اور منجھا ہوا لکھاری ہے ۔انہوں نے اپنی یاد کے ایک ایک موتی کو لفظوں کی مالا میں پرو دیا ہے ۔

کتاب کا پہلا مضمون حکیم محمد سعید شہید کی قد آور شخصیت پر لکھا گیا ہے جنہیں مصنف کتاب اور کتب خانوں کا شیدائی قرار دیتے ہیں۔ دوسرا مضمون عالم اسلام کے نامور ماہر تعلیم ڈاکٹر طلحہ حسین پر ہے ۔جنہیوں نے بصارت سے محروم ہونے کے باوجود تعلیم کے میدان میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے ۔تیسرا مضمون حاجی سر عبداللہ ہارون پر لکھا ہے، جو قائداعظم کے قریبی ساتھی ہونے کے ساتھ سندھ کی معروف سیاسی اور سماجی شخصیت ہیں۔ چوتھا مضمون شیخ محمد ابراہیم آزاد کی محترم شخصیت پر ہے ۔اس مضمون میں آزاد کے سوانحی خاکے کے ساتھ ان کی نعتیہ شاعری پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔کتاب میں موجود تیرھواں مضمون آزاد صاحب کے پوتے اور نعت گو شاعر تابش صدانی صاحب پر لکھا گیا ہے جس میں ان کے عشق رسول ﷺ اور نعتیہ شاعری کی تفصیل درج ہے مصنف نے کتاب میں

اُن قابل توجہ مگر گمنام لوگوں کو اپنے قلم کی تحریر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے جنھوں نے مصنف کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ جس میں محبوب احمد سبز واری جو مصنف کے ماموں ہے۔ مشکور احمد صاحب، یہ بھی مصنف کے رشتہ دار ہے مگر انتہائی خود دار اور ہمت والے انسان۔ ایک درویش صفت اور ولی کامل سید امام کا تذکرہ بھی موجود ہے جو عملیات کے ذریعے جنات کا توڑ کرتے تھے۔۔ شیخ لئیق احمد مصنف کے قریبی رشتہ دار ہے جن کی زندگی نشیب وفراز کی داستان ہے۔ منظور احمد بٹ، ایک مخلص سماجی کارکن، جن کی زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا ہے۔ ان شخصیات پر لکھے گئے یہ اولین مضامین ہیں۔ مصنف نے اپنے قلم کی طاقت اور جذبے کی حرارت سے ان شخصیات کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ بحیثیت ایک شاگرد کے اپنے استاد پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں دنیائے لائبریرین شپ کی ایک عہد ساز شخصیت کہا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید، صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کے خطوط، یادداشتیں اور تاثرات کو بھی کتاب کی زینت بنایا۔ نرم دل، ہمدرد اور صلہ رحمی کرنے والے کراچی یونیورسٹی کے سابق لائبریرین جناب عادل عثمانی سے اپنی محبت کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر غنی الاکرم سبز واری) مصنف کے چچا اور مصنف کو لائبریرین شپ میں لانے والے بھی (۔ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر، جمیل نقوی صاحب جو علی گڑھ یونیورسٹی کی لٹن لائبریری اور امپیریل لائبریری کلکتہ میں

اپنے پیشہ وارنہ فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں ،ڈاکٹر انیس خورشید پر سوانحی مضامین ہیں۔

مصنف نے پنجاب لائبریری ایسوی ایشن کے باباجی میاں الطاف شوکت کو بھی نہایت خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔پاکستان میں لائبریری تحریک کے خاموش مجاہد ابن حسن قیصر سے اپنی محبت اور عقیدت کو بھی قلم بند کیا۔پروفیسر اختر حنیف کا تذکرہ بھی ہے، مصنف نے محمد زبیر صاحب سے اپنی وابستگی اور رفاقت کو دلنشیں انداز میں پیش کیا۔ ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین رہے ۔اسلامی کتب خانوں پر ان کی کتاب کسی اتھارٹی سے کم نہیں، مولانا محمد عارف الدین ، سید اتینان علی شاہ بخاری اور ہمدرد یونیورسٹی والے رشید الدین احمد سے صمدانی صاحب نے اپنی محبت اور رفاقت کا ذکر بڑے پیارے انداز میں کیا ہے۔

صمدانی صاحب کا اسلوب تحریر دلکش اور سلیس ہے ۔اشعار کا استعمال بھی شانداراور موقع کی مناسبت سے ہے۔ہر مضمون میں شخصیات کی مختصر سوانح عمری ،ان کے عادات اور خصائل اور مصنف کے ساتھ ان کا برتاؤ خوبصورت انداز میں پیش کیا گیاہے۔ بہت سے مضامین کا آغاز بڑے ہی موثر انداز میں کیا گیا ہے اور عموماً شعر پر مضمون ختم کیا گیاہے۔ کتاب کے آخر میں ایک رپورتاژ بھی شامل

ہے جو مصنف نے اپنی ۳۹ دن کی بیٹی کے غم میں لکھی ۔ جس میں دل سوزی اور اداسی کی لہر چھائی ہوئی ہے ۔بڑے لوگوں کی زندگیاں عام لوگوں کے لئے مشعل راہ ہیں ۔ ان کے کارنامے ہماری ہمت بڑھاتے ہیں اور ہمیں بے لوث خدمت کرنے پر ابھارتے ہیں ۔ عظیم لوگ خدا کا عطیہ ہوتے ہیں ۔ انہیں لوگوں کی وجہ سے دنیا ترقی کی منازل تیز تر طے کرتی ہے ۔ صمدانی صاحب نے کتاب لکھ کر جہاں ان عظیم شخصیات سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا وہیں یہ بھی ثابت کر دیا ہے آپ کہنہ مشق لائبریرین اور مشفق استاد ہی نہیں ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ (شائع شدہ ، پاکستان لائبریری و انفارمیشن سائنس (جرنل، جلد ۴۲، شمارہ ا، مارچ ۲۰۱۱ء

معروف ادیب ، محقق واستاد پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ”یادوں کی مالا“ لفظی اور معنوی ہر اعتبار سے ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب مشہور قلم کار ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تصنیف ہے اور ان کے ذاتی تجربوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف لائبریرین شپ سے متعلق حضرات کے لیے نہیں بلکہ استفادۂ عام کا حق ادا کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تبصرہ نما اور خاکوں پر مشتمل ہے۔ لیکن جو کچھ ہے وہ قدر و قیمت میں بلند پایہ ہے۔ صمدانی صاحب ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اب بھی ان کا قلم رواں دواں

ہے۔کتاب بلحاظ زبان و بیان معتبر ہے اور مصنف نے جو کچھ لکھا ہے پورے غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ لکھا ہے اور مختصر نویسی کا حق ادا کیا ہے۔ یقین ہے کہ کتاب ''یادوں کی مالا'' رئیس احمد صمدانی کے نام اور کام کو بلند و بالا کرے گی۔کتاب نہایت صاف ستھرے انداز میں شائع ہوئی ہے اور قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ مضامین کی فہرست میں کچھ تو مختصر خاکے ہیں کچھ تنقیدی جائزے ہیں اور کچھ مختصر تذکرے، مگر اختصار میں بھی وہ سب کچھ آگیا ہے جو موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ضروری تھا۔

مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے جس میں لائبریرین شپ کی تقریباً تمام ہی معروف اور اہم شخصیات کا قابل توجہ احاطہ کیا گیا۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سارے علمی ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی اور شخصیات پر لکھنے والوں کی رہنمائی کرے گی۔

۔ ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری : شخصیت و علمی خدمات کراچی: بزم اکرم و لائبریری4 پروموشن بیورو، 2006 ،۶ ۹۶ص، عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN:97-969-459-035-3

پیش نظر کتاب پاکستان لائبریرین شپ کے استاد، مصنف و مولف ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری کی شخصیت اور علمی کارناموں کا اجمالی جائزہ ہے۔کتاب کا پیش لفظ معروف شاعر اور ادیب پرفیسر محمد واصل عثمانی نے تحریر کیا ہے۔

۔ ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستان لائبریرین شپ (مشترک مؤلف) کراچی: لائبریری 5
پروموشن بیورو، 1980ء، ۱۵۱ص

پاکستان میں لائبریرین شپ کے بانی پروفیسر ڈاکٹر عبدالمعید کی شخصیت، خدمات اور کارناموں پر مشتمل کتاب ۱۹۸۱ء میں مرتب کی گئی اور شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس جامعہ کراچی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر لائبریری پروموشن بیورو نے شائع کی۔ معروف شاعر رئیس فروغ نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''اس مجموعہ میں ڈاکٹر عبدالمعید کو پاکستان لائبریرین شپ کا مینارہ نور کہا گیا ہے اور ان کے کارناموں کو ان اوراق میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کانامے ہی دراصل پاکستان میں لائبریری سائنس کی تاریخ ہیں اس تاریخ کو بنانے میں ڈاکٹر صاحب کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔ یہ کتاب ایک اہم شخصیت کا تفصیلی تعارف کراتی ہے، ایک ادارے کی بتدریج ترقی کی داستان سناتی ہے، قومی زندگی کے ایک شعبے کی بنتی ہوئی تاریخ کی مرحلہ وار عکاسی کرتی ہے اور کارکنوں کے ایک گروپ کے خلوص کار جنونی عمل اور باہمی تعاون کی دستاویز فراہم کرتی ہے۔ (رئیس فروغ۔ پاکستان لائبریری بلیٹن، جلد ۱۲ شمارہ (۳۔۴، ستمبر۔ دسمبر ۱۹۸۱ء، ص۔۲۱۔۲۲

کتاب کی تعارفی تقریب ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء کو لیاقت میموریل لائبریری کے آڈیٹوریم

میں منعقد ہوئی۔ تقریب مہمان خصوصی اس وقت کے وزیر تعلیم جسٹس سید غوث علی شاہ صاحب تھے۔ ڈاکٹر عبد المعید صاحب اس وقت شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی کی ۲۵ سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر نائجیریا سے تشریف لائے تھے۔ محترم حکیم محمد سعید شہید نے بھی اس تقریب میں خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔

(۔ محمد عادل عثمانی : کتابیاتی سوانحی جائزہ (انگریزی 6

Muhammad Adil Usmani: A Bio-Bibliographical Study/ Karachi: Pakistan Bibliographical Working Group & Library Promotion Bureau, 2004. 117p. (ISBN: 969-8170-05-7)

The book is a humble tribute of a person who devoted his whole life in the profession of Librarianship and one of the founder's of Library Movement of Pakistan. Adil Usmani's name is regarded and respected among the great names of Library and Information Science profession. He possesses multifarious abilities and qualities, which raised him to a most honorable and respectable position.He contributed a good number of research publications. His publications are a great source of research in the field of Library and information Science. Mr. Usmani had a very brilliant academic and professional career. He graduated from Allahabad

University (India), Post-Graduate Diploma in Library Science from University of Karachi and Master in Library Science from the State University of Rutgers (USA). He was awarded Fulbright and Asia Foundation scholarship to study in USA.

Dr. Ghanuul Akram Sabzwari who has written forward of this book stated "Mr. Rais Ahmed Samdani devoted extensive energy and time in compiling Bio-bibliography on Mr. Usmani. He has made available to the librarianship a wealth of information on the life and works of Mr. Adil Usmani. One could get an idea of Mr. Usmani's contribution and dedication in the profession. He has written and compiled several books on Library and Information Science specially text books in Urdu at Intermediate and Degree level which are prescribed in Library Science Courses. Mr. Samdani can safely be quoted as one of the outstanding figure of Pakistan Librarianship to whom goes the credit of compiling highest number of bio-bibliographies in the field of Library and Information Science in Pakistan. He has a number of bibliographical works to his credit. His most significant contribution in the field of

National Bibliography appeared under the title The National Bibliography of Pakistan, from 1947 to 1961 (Social Sciences to History), Fascicule III published by the Government of Pakistan, Ministry of Education, Department of Libraries in 1999. He is actively engaged in running the Pakistan Bibliographical Working Group and its Library School. He is associated with Library Promotion Bureau and Pakistan Library Association".

(۔ اختر ایچ صدیقی : کتابیاتی سوانحی جائزہ (انگریزی 7

Akhtar H. Siddiqui: A Bio-Bibliographical Study/Karachi: Pakistan Bibliographica Working Group, 1995, 79p: ; (ISBN: 969-8170-02-2)

The book has foreword which has written by an eminent scholar Prof. Dr. Rafia Ahmed Sheikh now Pro-Vice Chancellor University of Sindh. She says 'no such work existed prior to this (written by any other Pakistani writer), and thus I regard it as a pilot study and an original and comprehensive piece of work, where Mr. Siddiqui truly exhibits his competence. His expert handling of the progress made in the library

scene in Pakistan deserves credit. It is one of my favorite books on Pakistan Librarianship.

Mr. Moinuddin Khan's words:"I shall be failing in my duty if I don't turn to the author of this exhaustive study. Mr.Samdani has done as equally scholarly work in gathering the prolific works of his outstanding biographies within the two covers of a slim book. It is often said, librarian do not write but they do take good care of other's writings, but in this case a librarian has volunteered to compile a fellow librarian's life-long output in profuse admiration and regard.

M. Gulistran Khan's words, "the book is an excellent record of life and works of a person who held various positions in library profession starting as a librarian, later documentation offer, Director and advisor. He has been vary enthusiastic and zealous which later qualified him to hold senior position in various organizations. Mr. Samdani has taken painstaking efforts in tracing wide record of information on the

life career of Mr. Siddiqui. There is a long career of his professional life and it is not easy to highlight various activities and achievements in such a useful manner. The whole book provides a fascinating record of informative material, which is of great value to the people engaged in research and person interested in published bibliographies. The book is of great interest to the book world at home and abroad. The publicationj would have been more useful if a complete index of the publication cited in the text had been provided at the end". (PLB: 30(1-2): March-June 1999, p. 36

لائبریری وانفارمیشن سائنس کے معروف استاد و مصنف پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید مرحوم نے اپنے ایک بنام اختر صدیقی اس کتاب کے بارے میں تحریر کیا: ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے بارے میں شائع ہونے والی Bio-Bibliographical Study کی ایک کاپی مجھے عنایت فرمائی ورنہ میں ایک اچھی کتاب سے شاید محروم رہتا۔ میں نے سرسری طور پر ہی اسے دیکھا ہے مجھے کتاب اچھی لگی۔ بہت ہی Presentation کو پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے آپ کی data اچھے طور پر کی گئی ہے اور نہایت عمدگی سے بھرپور شخصیت اپنی طرحداری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ تدوین اور ترتیب بھی اچھی ہوئی ہے یوں کہنا چاہئے کہ

اختر ایچ صدیقی کی متنوع اور سدا بہار شخصیت اپنی پوری کتابیاتی سرگرمیوں کے ساتھ اس کتاب کے ذریعہ بھرپور طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔

کتاب کی تعارفی تقریب ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ایچ ای سی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے جب کہ ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمیٰ کراچی سید انظار حسین زیدی نے تقریب کی صدارت کی۔ مقررین میں پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر، پروفیسر لطیف احمد انور، معین الدین خان، پروفیسر سراج الدین قاضی شامل تھے۔

8۔ ادب و کتب خانہ (مشترک مولف) کراچی: بزم اکرم۔ 1980ء، ۲۲۸ص

لائبریری سائنس کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کی ادبی انجمن ''بزم اکرم'' کا قیام ۱۹۷۹ء میں عمل میں آیا۔ یہ کتاب اس بزم کا دوسرا مجلہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا اس میں لائبریرین ضرات اور دیگر اہل قلم حضرات کی نگارشات شامل ہیں۔

اسلامی موضوعات

9۔ دعا کی اہمیت و فضیلت اور ۱۰۱ قرآنی و مسنون دعائیں معہ ترجمہ کراچی: صمدانی اکیڈمی، اشاعت اول ۲۰۰۸ء، اشاعت دوم 2011، ۸۸ص۔ عالمی معیاری کتاب

ISBN:978-969-9267-00-0 :نمبر

کتاب کا موضوع دُعا ہے جس میں دُعا کے معنی اور تعریف، دُعا کی عظمت قرآن کریم کی روشنی میں، دُعا کی عظمت احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں، دُعا مانگنے کی ہدایت، دُعا کے آداب، دعا کے مخصوص احوال واوقات، روحِ دُعا، دعا میں جلد بازی سے کام نہ لینا، دُعا جس

کی ممانعت ہے وغیرہ کی تفصیل شامل ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ قرآنی ومسنون دعاؤں پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۱۰۱ ہے۔ اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ۱۰۱ قرآنی دعائیں اور رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ ہر دعا کے آخر میں قرآن مجید کی سورۃ کا نام و نمبر اور آیت کا نمبر درج کیا گیا ہے ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔احادیث مبارکہ میں جن دعاؤں کا ذکر آیا ہے ان دعاؤں کے آخر میں احادیث کی کتب کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو میں دُعا بیان کی گئی ہے یعنی اگر کوئی عربی میں کسی وجہ سے دعا کا مآنگنا ممکن نہ ہو یا مشکل ہو تو اردو زبان میں دعا مانگی جا سکتی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سردار احمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو نہ صرف

اسلامیات کے پروفیسر ہیں ساتھ ہی وفاق المدارس العربیہ پاکستان ''شہادۃ العالمیہ'' (مساوی ایم اے) کی سند بھی رکھتے ہیں۔آپ نے تحریر فرمایا کہ ''جناب رئیس احمد صمدانی جو لائبریری سائنس کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور مختلف کتب کی مدد سے ایک عمدہ مجموعہ تیار کر دیا ہے۔زندگی میں مختلف مواقع پر اور مختلف اوقات میں کی جانے والی دعائیں تقریباً اس میں سب آ گئی ہیں۔ یہ ایک اچھی کاوش ہے جو قارئین کے لیے انشاء اللہ قابل قدر، دلچسپی اور فائدہ کا باعث ہوگی۔اللہ پاک مؤلف کی سعی قبول فرمائے اور قارئین کو اس سے استفادہ کی توفیق بخشے''۔

۔سلام : (السلام علیکم)قرآن کی روشنی میں کراچی: صمدانی اکیڈمی، 102002

ISBN:978-969-9267-01-7: عالمی معیاری کتاب نمبر

یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں سلام کے معنی و تعریف، سلام کرنے کی ابتدا، سلام کا احسن طریقہ، السلام علیکم کی فضیلت اور اہمیت، سلام کرنے کا اجر و ثواب، سلام میں سبقت، کون کس کو سلام کرے (احکام اور ضابطے)، سلام کرنے یا جواب دینے کی ممانعت، سلام کرنے میں احتیاط سے کام لینا، غیر مسلموں کو سلام کا جواب، مصافحہ، معانقہ (لپٹنا) اور تقبیل یعنی (چومنا) اور کون کس سے مصافحہ کرے کی مختصر تفصیل قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ڈاکٹر عبد الرشید رحمت: ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی آف سرگودھا نے تحریر فرمایا ہے۔ کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں ''محترم رئیس احمد صمدانی' جن کا اصل فن لائبریری سائنس ہے، لیکن اسلامی تعلیمات سے دلچسپی کی وجہ سے آپ نے اسلام کے مختصر موضوعات مثلاً دُعا کی اہمیت وفضیلت کے حوالے سے علمی میدان میں ان کا ایک مجالہ دوسری بات چھپ چکا ہے۔ اب کی دفعہ آپ نے 'سلام' کے حوالے سے ایک نہایت مفید و مختصر معلوماتی کتابچہ مرتب کیا ہے۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے اس کی تمام معلومات قرآن و سنت کے عین مطابق ہیں۔ چونکہ آپ کا مقصد عوام الناس کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے، اس لیے اس کی زبان بھی عام فہم رکھی گئی ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ آپ کا یہ مجالہ نافعہ پہلے کام کی طرح قبولیت عامہ حاصل کرے گا۔

لائبریری وانفارمیشن سائنس

۔ کتب خانے تاریخ کی روشنی میں کراچی: قمر کتاب گھر، 1977 ،111ص 11

ڈاکٹر صمدانی کی یہ دوسری تصنیف تھی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ کتاب لائبریری سائنس کے نصاب کے مطابق تحریر کی گئی اور لائبریری سائنس کے مضمون کتب خانوں کی تاریخ' کا احاطہ کرتی تھی۔ کتاب کا تعارف'

لائبریری سائنس کے استاد اور جامعہ کراچی کے لائبریرین جناب محمد عادل عثمانی نے تحریر کیا۔ آپ نے لکھا'' ''فاضل مصنف کی یہ کتاب اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اسے ایک مقصد سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ مقصد لائبریری سائنس کے موضوع پر نصابی کتب کے فقدان کو دور کرنا ہے'' ۔ لائبریری سائنس کے ایک اور محترم استاد و مصنف ڈاکٹر انیس خورشید نے اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کے بارے میں لکھا'' تاریخ کے موضوع پر ایک مختصر کتاب رئیس احمد صمدانی کی ہے جسے '' کتب خانے تاریخ کی روشنی میں'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں کراچی سے قمر کتاب گھر نے شائع کیا ہے۔ یوں تو نام کے اعتبار سے اس کتاب میں کتب خانوں کی پوری تاریخ کو شامل ہونا تھا لیکن کتب صرف عہد قدیم اور برصغیر پاک و ہند کے قدیم شاہان اودھ تک کے کتب خانوں کا احاطہ سرسری طور پر کرپائی ہے''۔ڈاکٹر انیس خورشید کا یہ مضمون ماہنامہ کتاب ، لاہور۔۱۵(۴) : ۷۰، فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

لائبریری سائنس کے معروف مصنف الحاج محمد زبیر نے کتاب کے بارے میں تحریر فرمایا ''میرے ہم پیشہ و ہم مشرب رئیس احمد صمدانی نے کتب خانوں پر کتب لکھ کر بڑی عمدہ مثال قائم کی ہے۔ یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے میری یہ دعا ہے کہ خدا انہیں یہ سلسلہ قائم رکھنے کی توفیق دے۔ میری رائے میں یہ قابل قدر کتاب اس نوجوان نسل کے لیے خاص طور پر بڑی سود مند ہوگی جو

کتب خانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ خیال رہے کہ میری یہ رائے محض رسمی رائے نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کی رائے ہے جو خود بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہے اور جس نے اپنی عمر کے ۵۵ برس کتب خانوں اور فن کتب داری کی خدمت میں گذارے ہیں''۔ الحاج محمد زبیر۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۸ء)۔ پروفیسر سید لطف اللہ سابق پرنسپل سراج الدولہ) گورنمنٹ کالج و گورنمنٹ غزالی کالج حیدرآباد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ میرے خیال میں یہ بات بلا خوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ صمدانی صاحب کی یہ '' کتاب لائبریری اور لائبریری سائنس کے علم میں بہترین اضافہ ہے''۔ (۳۰ اپریل ۱۹۷۹ء)

اس کتاب پر ماہنامہ افکار، کراچی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''کتابچہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ترتیب دیا گیاہے، زبان تحقیقی ہونے کے علاوہ خاص رواں اور شگفتہ ہے اور قاری کو معلومات بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کی دلچسپی بھی قائم رکھتی ہے''۔ (ماھنامہ افکار، کراچی۔ ۳۴ (۱۔۲) : ۷۱۔۷۲، ستمبر ۱۹۷۸ء

ماہنامہ تخلیق لاہور نے لکھا ''کتاب لائبریری سائنس کے موضوع پر نصابی کتب کی کمیابی کو پورا کرتی ہے دوسرے حضرات جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے''۔ (ماہنامہ تخلیق لاہور۱۰ (۹۔۱۰) : ۱۳۲، ۱۹۷۹ء

ماہنامہ قومی زبان کراچی نے تبصری کرتے ہوئے لکھا " تاریخ اسلام کے کتب خانوں کے بارے میں جو معلومات یکجا کی جاسکتی تھیں مولف نے نہایت خوبی کے ساتھ جمع کر دی ہیں جن کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں"۔ (ماہنامہ قومی زبان کراچی۔ ۴۷ (دسمبر ۱۹۷۷ء، ۵۲ : (۱۲)

ہفت روزہ ادراک سیالکوٹ نے لکھا "فاضل مصنف نے کافی مواد قارئین کے لئے جمع کیا ہے اور عرق ریزی سے ایک ایسی دستاویز کتابی شکل میں پیش کی ہے جو وقت کی ایک ضرورت تھی"۔ (ادراک، سیالکوٹ۔ ۱۰ (۵۔۶) : ۲۶، یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۷۸ء

معروف شاعر رئیس امروہوی مرحوم نے روزنامہ جنگ کراچی میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا" ابتدا سے اب تک اہم کتب خانوں کے بارے میں قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں اور آشور بنی پال اور اسکندریہ سے لے کر خدابخش پٹنہ لائبریری اور شاہان اودھ کے کتب خانوں تک کا اجمالی مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے"۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء)۔ روزنامہ جنگ نے اپنی اشاعت ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کرتے ہوئے کتاب کو اپنے موضوع پر مفید اور معلوماتی کتاب قرار دیا۔ روزنامہ نوائے وقت کراچی نے اپنی اشاعت ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء میں لکھا کہ

اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں ایک منفرد کتاب ہے اور عہد در عہد تک کتب خانوں نے کس طرح اور کہاں کہاں قائم ہوئے اور یہ جاننے کے لئے فاضل مصنف صمدانی صاحب نے بیش قیمت معلومات یکجا کی ہیں۔

روزنامہ حریت کراچی نے اپنی اشاعت ۹ ستمبر ۱۹۷۸ء میں کتاب کے بارے میں لکھا'' جس موضوع پر رئیس احمد صمدانی نے قلم اٹھایا ہے وہ ایک عرصہ سے تشنہ تھا۔ مصنف نے بڑی محنت سے اسکتاب میں مواد جمع کیا ہے۔ یہ کتاب کتب خانوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک اچھی کوشش ہے''۔

۔ ابتدائی لائبریری سائنس کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، 1980۔ ۲۲۸ص، 12، ایڈیشن اول ۱۹۸۰ء، ایڈیشن 2012، 22

اس کتاب کو پاکستان میں لائبریری سائنس کی سب سے زیادہ پڑھی اور شائع ہونے والی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔اس کا اولین ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا اور ۲۰۰۵ء میں اس کا اٹھارواں ایڈیشن منظر عام پر آیا جو ''سلور جوبلی ایڈیشن تھا''۔ ۲۰۱۲ء میں اس کتاب کا ۲۲واں ایڈیشن شائع ہوا اس اعتبار سے یہ تصنیف گزستہ ۳۳ سال سے لائبریری سائنس کے طلبہ کی تدریسی ضروریات کی تکمیل کر رہی ہے۔ کسی بھی کتاب کے مقبول اور معیاری ہونے کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ کتاب اپنی اشاعت کی چوتھی دھائی میں داخل ہوچکی ہے اور کتاب

کی مانگ بدستور قائم ہے۔ صرف کراچی اور سندھ ہی میں نہیں بلکہ پنجاب کے تمام شہروں، سرحد اور بلوچستان میں یہ نصابی کتاب طلبہ کی علمی ضروریات کی تکمیل احسن طریقے سے کر رہی ہے اور لائبریری سائنس کی مقبول کتاب تصور کی جاتی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر محمد احمد سابق پرنسپل۔ اسلامیہ گورنمنٹ کالج سکھر و گورنمنٹ عبد اللہ ہارون کالج کراچی نے تحریر فرمایا آپ نے تحریر کیا ''فاضل مصنف کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تجربہ اور ادبی ذوق، نقاد اور مورخ کی حقیقت پسندیدگی اور سنجیدگی، ادباء اور انشاپردازواں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت جمع ہو گئی ہیں جو شاذونادر جمع ہوتی ہیں۔ ان کی تصانیف پر اجمالی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مصنف کا ذوق و مطالعہ، تحقیق اور علمی میدان کس قدر وسیع ہے۔ فاضل مصنف میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور سلیقہ ہے۔ انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ اور معلومات کو اپنی فطری انہاک و نشاط کے ساتھ قلم بند کیا ہے جو ان کی صلاحیت، قوت عمل اور فکری ارتقاء کا نمونہ ہے۔ احقر فاضل مصنف سے ایک عرصہ سے واقف ہے اور بغیر تکلف کے کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ ان کی عملی گفتگو، ذوق سلیم، غیر معمولی حافظہ، تاریخی شعور سے نہ صرف متاثر ہے بلکہ کافی استفادہ کیا ہے۔ ان کی باغ و

بہار شخصیت لائبریری سائنس کی اعلیٰ ترین ڈگری سے مزین ہے۔انہوں نے لائبریری کے علوم میں ایک ماہر فن کا درجہ حاصل کر لیا ہے''۔

معروف قلم کار فرخندہ لودھی نے اپنے ایک مکتوب میں صمدانی صاحب کو لکھا ''آپ نے جس جذبے سے اس میدان میں کام کی پہل کی ہے میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہوں۔ سوچئے اگر آپ کی کتاب نہ ہوتی تو طالبات کیا پڑھ تیں۔اس وقت میری کلاس میں ۱۱۷ طالبات ہیں۔کلاس شروع ہوئی تو پتہ کروانے پر معلوم ہوا کہ ابتدائی اور مبادیات لائبریری سائنس کراچی میں بھی دستیاب نہیں۔بڑی پریشانی ہوئی کریکلم ونگ لاہور کے ریسرچ آفیسر (لائبریری سائنس) چوہدری نذیر احمد نے اس سلسلے میں بے حد مدد کی اور کہیں سے آپ کی کتاب حاصل کرکے فوٹو کاپیاں تیار کرکے طالبات کو دیں۔ نیا مضمون ہونے کی وجہ سے وہ بے حد پریشان تھیں''۔

۔ مبادیات لائبریری سائنس کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، 1985، 13۲۰۰ ص، ایڈیشن اول ۱۹۸۰ء ایڈیشن ۲۱، ۲۰۱۲ء

۱۹۷۶ء میں انٹرمیڈیٹ میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون متعارف ہو جانے کے بعد نصابی کتاب کی ضرورت سب سے اہم تھی ۔ڈاکٹر صمدانی کو یہ اعزاز حاصل ہے ''کہ انہوں نے سب سے پہلے سال اول کے لیے ''ابتدائی لائبریری سائنس

۱۹۸۰ء میں اور سال دوم کے لیے ”مبادیات لائبریری سائنس “ تحریر کی۔ یہ دونوں نصابی کتب طلبہ میں یکساں مقبول ہیں اور ان کی اشاعت مسلسل جاری ہے۔ ۲۰۱۳ء میں اس کتاب کا ۲۱واں ایڈیشن منظر عام پر آیا۔

ویں ایڈیشن کے دیباچہ میں مصنف نے تحریر کیا کہ ”جو کتاب اس وقت آپ کے ۱۷ ہاتھوں میں ہے یہ آج سے ۲۰ سال قبل یعنی ۱۹۸۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ الحمداللہ اس کتاب کا ۱۷واں ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ یہ کتاب بھی سال اول کی کتاب ابتدائی لائبریری سائنس “ کی طرح پاکستان میں لائبریری سائنس کی سب سے زیادہ” چھپنے اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس دوران کراچی اور دیگر شہروں سے متعدد کتابیں اس کتاب کو بنیاد بنا کر لکھی گئیں اور یقیناً یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا لیکن اس کتاب کی طلب میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ کراچی کے علاوہ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے بے شمار کالجوں میں طلبہ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کسی بھی مصنف کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کے طالب علم اس کی کتاب سے استفادہ کرتے ہیں۔ آپ کی محبت کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اس کتاب کی مانگ برقرار ہے اور کتاب شائع ہو رہی ہے۔ ابتدائی سالوں میں تو کوئی اور کتاب اس موضوع پر نہیں تھی لیکن اب تو کئی سالوں سے متعدد کتابیں مارکیٹ میں موجود ہیں اس کے باوجود اس کتاب کی اشاعت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب

اپنے متن، زبان، ترتیب اور نصابی ضرورت کو احسن طریقے سے پوری کر رہی ہے اور طلبہ و قارئین کی ضروریات کے مطابق ہے''۔

شہید حکیم محمد سعید نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ''تعلیم اور لائبریری کا باہم گہرا تعلق ہے اور لائبریری کی ترتیب و تنظیم ہمیشہ کی طرح آج بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے اب سائنس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔آپ نے طلبہ لائبریری سائنس کے لیے مبادیات لائبریری سائنس ایک اچھی اور مفید کتاب مرتب فرمادی ہے۔ میرے طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے''۔

ء۔ نظری لائبریری سائنس کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، 1994۔ ۲۲۸ص 14 ISBN: 969-459-004-3 ایڈیشن ۵، ۲۰۰۵ء۔

نظری لائبریری سائنس کے عنوان سے مصنف کی یہ کتاب بی اے سال اول کے لیے ہے جو ۱۹۹۴ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۷ء، تیسرا ۲۰۰۰ء اور چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا۔ ہائر ایجو کیشن کمیشن (Higher Education Commission) کی قومی نصاب کمیٹی برائے لائبریری و انفارمیشن سائنس نے ۲۰۰۲ء میں بی اے سال اول و دوم کے نصاب سے بعض موضوعات کو خارج کر دیا گیا جب کہ بعض موضوعات کو سال اول سے دوم میں اور بعض کو سال دوم سے اول میں شامل کر دیا گیا۔ جیسے درجہ بندی اب صرف سال اول میں

اور کیٹلاگ سازی اور حوالہ جاتی خدمات کے ابواب صرف سال دوم میں ہیں۔اسی طرح بعض نئے موضوعات بھی نصاب میں شامل کیے گئے جن میں لائبریری مواد، کمپیوٹر کا تعارف، کتب خانوں میں کمپیوٹر کا استعمال،.برقیاتی ذرائع (Electronic Source) وغیرہ شامل ہیں۔یہ کتاب نظرثانی شدہ نصاب کے مطابق " نظری لائبریری سائنس" شائع ہے۔

،۔ تعلیمی لائبریری سائنس کراچی: لائبریری پروموشن بیورو،1995۔ ۲۲۸ص 15

بی اے سال دوم کے نصاب کے مطابق مصنف کی یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء اور تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء اور چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔مصنف نے اپنے دیباچہ میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "یہ بات آپ کے علم میں یقیناً ہوگی کہ بی اے سال اول و دوم کا نصاب تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اسی نظرثانی شدہ نصاب کے مطابق ہے۔ نصاب میں تبدیلی اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی ضرورت کئی سالوں سے محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ ہائر ایجوکیشن کمیشن (Higher Education Commission) کی قومی نصاب کمیٹی برائے لائبریری و انفارمیشن سائنس نے ۲۰۰۲ء میں منظور کیا۔بی اے سال اول و دوم کے نصاب سے بعض موضوعات کو خارج کردیاگیاجب کہ بعض موضوعات کو سال اول سے دوم میں اور بعض کو سال دوم سے اول میں شامل کردیاگیا۔جیسے درجہ بندی اب صرف سال اول میں اور کیٹلاگ

سازی اور حوالہ جاتی خدمات کے ابواب صرف سال دوم میں ہیں۔ اسی طرح بعض نئے موضوعات نصاب میں شامل کیے گئے جن میں لائبریری مواد، کمپیوٹر کا تعارف، وغیرہ (Electronic Source) کتب خانوں میں کمپیوٹر کا استعمال، برقیاتی ذرائع شامل ہیں۔ یہ کتاب نظر ثانی شدہ نصاب کے مطابق ہے

۔جدید لائبریری و اطلاعاتی سائنس (مشترک مولف) کراچی: لائبریری پروموشن 16 بیورو، 1993

۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آنے والی اکٹر صمدانی کی یہ کتاب لائبریری سائنس کے ان مضامین کا مجموعہ جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب ایم ایل آئی ایس کے طلبہ کی نصابی ضروریات کے مطابق ہے۔ لائبریری سائنس کی تعلیم میں کمپیوٹر اور برقی خود کار مشینوں کے نظان نے خدمات کتب خانہ کو بجا طور پر متاثر کیا ہے۔ معلومات کے حصول، تذخیر اور بازیافت کے عمل میں ان مشینی خودکار نظامات کے ذریعہ بحث ہوتی ہے، جدید طریقوں سے وسائل میں شرکت، دستاویز سازی، لائبریری معمولات میں کمپیوٹر کا استعمال ناگزیر ہے۔ فی زمانہ کتب خانہ کی خدمات جدید تربیت کا اور تعلیم جدید نصابی ضروریات کا تقاصہ کرتی ہیں۔ یہ کتاب انہیں ضروریات کو مد، نظر رکھتے ہوئے مرتب کی ہے جو لائبریری سائنس کے طلبہ کی نصابی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اس مجموعہ میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں ان میں وسائل میں شرکت، دستاویزیت، نٹ ،ورک نظام

کمپیوٹر کے ذریعہ خدمات، قومی و بین الاقوامی کتابیای نظان، عالمی معیاری کتب نمبروں کے نظاماتنیز بچوں کے لیے کتب خانوی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مضامین ایم اے لائبریری و انفارمیشن سائنس کے مختلف موضوعات میں جزوی طور پر شامل ہیں۔

کتاب کا مقدمہ معروف محقق، ادیب و دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی نے تحریر کیا ہے، جب کہ پیش لفظ لائبریری سائنس کے معروف استاد و محقق پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں کہ میرے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی کی" فاضل استاد نے اپنے ایک فاضل رفیق کار جناب رئیس احمد صمدانی کے ساتھ مل کر، نصاب اور طلبہ کے پیش نظر یہ ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جس میں جدید معلومات ار تصورات پر مبنی معیاری مضامین شامل ہیں، مجھے امید ہے کہ طلبہ و اساتذہ میں یہ کتاب یکساں طور پر مقبول ہو گی"۔

۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایم ایل آئی ایس کے کورس "سیریلز مینج منٹ" کی 17 اسٹڈی گائیڈ۔

17) Serials Management: A Study Guide for MLIS/

Islamabad: Allama Iqbal

Open University. 2002.135p.

Serials Management is a full credit course of MLIS, Allama Iqbal Open University consists of eighteen units. The guide explain and discussed definition of serial and importance, origin and development of the serials. It also explain types of serials, their selection, evaluation and problems of handling them. It also enumerate acquisition and their bibliographical control. Describe the technique of in indexing, abstracting, classification and cataloguing of serials. The guide explain the method of retrieving electronic journals and discuss the process of serials' automation. It discuss the technique of union list/catalogue of serials' preparation, their binding, preservation and conservation of serials. It also discuss the procedure of vendors' selection and learn the skills of serials librarianship.

The Department of Library and Information Science, Allama Iqbal Open University, Islamabad has published this book under its MLIS publication programme in 2002

کتابیات اشاریے کیٹلاگ

کتابیات طب و صحت کراچی: پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ، 1992ء 18
موضوعی کتابیات کی اہمیت مسلمہ ہے، یہ کسی بھی محقق کی تحقیق کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ مؤلف نے 'کتابیات طب و صحت' کے عنوان سے جو کتابیات مرتب کی اس میں قیام پاکستان سے ۱۹۹۰ء تک طب و صحت کے موضوع پر اردو زبان میں شائع ہونے والی مطبوعات کا اندراج کیا گیا ہے۔اس میں طب یونانی، طب جدید، (ایلوپیتھی)، ہومیوپیتھک، آیورویدک اور صحت عامہ کے موضوعات شامل ہیں۔ کتابیات میں طب و صحت کے موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کا سالانہ جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ جس کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ ۴۴ سالوں میں اس موضوع پر اردو زبان میں صرف ۹۱۳ کتب شائع ہوئیں یعنی ایک سال میں ۲۱ کتب ۔ کتابیات اس موضوع سے تعلق رکھنے والے طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے معلوماتی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔
کتاب کے بارے میں معروف محقق، ادیب و دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی، کا کہنا ہے کہ """"آپ کی "کتابیات طب و صحت" کا ایک نسخہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں ۔ آپ یقینا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے محنت سے ، یہ بکھرا ہوا مواد سلیقے سے جمع کرکے ترتیب دیا ہے"۔

۔ پاکستان کی قومی کتابیات : ۱۹۴۷ء۔۱۹۶۱ء، جلد سوم19

19) The National Bibliography of Pakistan: Volume III (Pure Sciences Geography and History, (500 to 900)/ (Retrospective Pakistan National Bibliography) Islamabad: Department of Libraries, Ministry of Education, Government of Pakistan, 1999, 580p: ISBN:969-8170-05-7; ISNN:10190678

Dr. R. A Samdani has the honour to compiled the National Bibliography of Pakistan 1947 to 1961, fascicule III (Pure Science to History) which has been published by the Government of Pakistan, Ministry of Education, Department of Libraries in 1999. This part of national bibliography was in the continuation of previously published Fascicule I (General Work to Islam ; 000 - 297) & II (Social Sciences to Languages; 300 - 400) published by National Book Council of Pakistan in 1972 and 1975 respectively. The gap in the National Bibliography of Pakistan has been filled by the publication of this fascicule. Now the Pakistan have a complete National Bibliography being right from the year 1947. Credit goes to Mr. R. A. Samdani, Secretary General Pakistan Bibliographical Working Group (PBWG) for completing this huge task in spite of several

handicaps.

The Department of Libraries, Government of Pakistan realized the necessity and importance of this publication and very kindly acceded to the request of the group. The credit goes to the than Director General Mr. Abdul Hafiz Akhtar and Mr. Asrar Ahmed Saiddiqui, the then Deputy Director of the Department of Libraries, Govt. of Pakistan. It was due to their deep interest and cooperation it has become possible to accept the responsibility of publication of the last volume of the Retrospective National Bibliography of Pakistan .

Mr. Abdul Hafeez Akhtar, former Director General Department of Libraries, Government of Pakistan stated in his Forward " that the task was assigned to the Pakistan Bibliographical Working Group as the bibliographic entries were available with them. A great deal of labour has gone in the editing and compilation of this Fascicule for which the members of the Editorial Committee of the Pakistan Bibliographical Working Group headed by its Secretary Mr. Rais Ahmed Samdani deserve our special thanks. They have done a wonderful job in bridging the gap of bibliographic records".

لائبریری و انفارمیشن سائنس پر شائع ہونے والے رسائل و جرائد کے مضامین کا 20۔
پچاس سالہ اشاریہ۔

20) Periodical Literature in Library and Information Science:an Index of 50 Years Works in Pakistan (1947-1997)/by Rais Ahmed Samdani and Khalid Mahmood.- Karachi: Pakistan Bibliographical Working Group, 1999, 182p: ISBN:969-8170-04-9

Web Version available on:

http://www.angelfire.com/ma3/mahmoodkhalid

The indexes published prior to this work are covering some particular period or a particular journal. This index is a comprehensive one and covers the period of 50 years from 1947 to 1997. It also cover all professional journals published in Pakistan. This index gives an overall picture of the library literature produced in Pakistan during the span of fifty years from the dawn of Pakistan to 1997. This is the only subject bibliography in Pakistan which is so complete and so up to date. This is the first book in the field of library and information science which is available on net with full text.

Prof. Dr. Syed Jalaluddin Haider in his foreword stated that the pattern adopted for the index represents the practice followed by leading indexing services. Indeed, this is an important reference source. I recommend this index to all librarians, teachers and students of Pakistan librarianship. I would like to record my appreciation, above all, to the editors, who are well known in the field for their writing skills and dedication to their work, for their cheerful acceptance of comments and suggestions at all stages in the planning and preparation of the index. Before concluding I wish the book and its editors. I am grateful for having been chosen to write this foreword.

پاکستان لائبریری بلیٹن کا اشاریہ21

21) Index of Pakistan Library Bulletin: 1968 - 1994/ Karachi: Library Promotion Bureau,1996, 115p: (ISBN: 969-459-012-4)

Indexing of journals is very important for research and planning for the present and future. Pakistan Library Bulletin, a quarterly journal in the field of library and information science published regularly since

1968. Now this journal is published under the title of "Pakistan Library and Information Science Journal". The index is a continuation of indexes published first in 1979 and than published in 1985. The present index cumulates the period of twenty six years from September 1968 to December 1994. In this period 25 volumes of the Bulletin were published.

پاکستان لائبریری ریویو کا اشاریہ

21) Cumulative Index of Pakistan Library Review (PLR) Karachi:

Pakistan Bibliographical Working Group, 1998, 40p: (ISBN: 969-8170-03-0

An index is a key reference source which reveals or point out the place where the required information or topics exist. It scarves as a finger-post or a bridge between the scholars and the source of information. PLR was Pakistani's first professional library journal started in 1957. It remained on the publishing scene for almost twelve years. It had noble objectives and created good scope for writing and reading. This journal provided a forum for expression of ideas and thoughts in the field of library and information science as well as Pakistan librarianship, particularly when there was no other media existing in the country. The basic purpose of this particular periodical

index is to rejuvenate a professional journal of Pakistan librarianship and bring to li9ght the work contributed by eminent scholars of library and information science. Senior library professional M. Moinuddin Khan in his foreword stated that "I felt greatly honored when I was asked to write a foreword to this book, which is valuable clue to yet another untapped source of professional literature contained in the volumes of Pakistan Library Review encompassing those formative years (1958 -1969) of professionalization of librarianship in Pakistan. In to the lasting credit of Mr. Rais Ahmed Samdani that be has indexed these two leading national library journals. He compiled Index of PLB in 1995 and within the space of two years he has come up with this Cumulative Index of PLR. Mr. Samdani thus carries the day in chronicling history and growth of a discipline which, today enjoys university status. Indexing is a painstaking and back-breading task and at the same time demands precision to help search the needle in haystack. Mr. Samdani will be a more satisfied man than anyone else to have provided a finding tool for working librarians. Students and teachers of Library and Information

Science for generations to come. He deserves our abiding gratitude".

Mr. M. Gulistan Khan in his review on this index stated that "there are 219 entries. They are arranged by the names of the author and subject in alphabetical order. Any needed information or article can be located in the index with minimum effort. The compiler has taken great pain to record 110 articles, editorials and messages that have been contributed by 69 authors on 50 different topics".

اسلام پر کتابیاتی ماخذ

22) Bibliographical Sources on Islam / Karachi : Pakistan Bibliographical Working Group, 1993. 44p. ISBN: 969-8170-10-4

The bibliography of bibliography is a specific reference source on Islam. It contains bibliographies, catalogues, indexes, abstracts, concordances, glossaries, bibliographies of theses and other reference sources on Islam. It is an useful reference tools for the scholars of Islam as well as librarians, ublishers, booksellers, teachers and the students of library and information science. The bibliography has foreword which has written by an eminent scholar

Prof. Dr. Syed Jalaluddin Haider, Ex-Chairman Department of Library and Information Science , University of Karachi. He says that the importance of reference works, especially on a subject like Islam, cannot be over emphasized. Libraries, both in Pakistan and elsewhere, are striving hard to develop their reference resources on Islam in order to meet the varying needs of researchers, scholars and students. To meet this objective the libraries have had to go through many sources for selection which are not usually available at one place. This problem has been solved to a large etent by this compilation, for which Rais Ahmed Samdani deserves appreciation. He is one of the few young librarians, I must add here, who is continually making contribution to the limited literature of Pakistan Librarianship. I congratulate Mr. Samdani for adding a useful publication to the literature of Pakistan Librarianship , I am sure that this book will find a place in reference collection of libraries in Pakistan and elsewhere. Apart from its usefulness to researchers and scholars it is as useful

reference source for students of librarianship".

حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج لائبریری میں پاکستان پر کتابیں

23) Books on Pakistan in Haji Abdullah Haroon Govt College Library (English and Urdu) / Karachi: The College, 1993, 62p;

The book is a printed catalogue of a academic library(Haji Abdullah Haroon Government College, Karachi). It contain books on Pakistan. Bibliographies, Indexes, Catalogues and other reference tools are the sources through which the research scholars can get their required material. They can keep themselves informed and up-to-date in their specialized field only through these sources which are generally made available by libraries.

The catalogue includes all books available in the Haji Abdullah Haroon Government College Library covering various aspects of Pakistan such as: Pakistan Movement, History of Pakistan from 1947 to-date, Politics of Pakistan including Foreign Policy, Economic History and condition of Pakistan, Cultural and Social aspects of Pakistan, Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, father of the Nation, Our Freedom Fighters, Statesmen and

Political Leaders of Pakistan, Educationists and Historians of Pakistan, Muslim League and other Political Parties of Pakistan.

The catalogue consists of books in three languages, i.e. English, Urdu and Sindhi. The catalogue is divided into three sections namely, i)Books in English, ii) Books in Urdu and iii) Books in Sindhi. The entries are arranged alphabetically under the surname or under that part of the name of the author by which he or she is commonly known. Each entry gives full bibliographical description of the work according to AARC-e.

ڈائریکٹری

24) First Famous Facts of Muslim World/Compiled by Dr. Ghaniul Akram Sabzwari and Dr. Rais Ahmed Samdani.- Karachi: Library Promotion Bureau, 2012, 122p. Price: 495/-,

ISBN:878-969-459-047-9

This book contain discoveries and inventions made by Muslims in past and near present in the field of Agriculture, Achitecture, Arts, Aviation, chemistry, Commerce, Engineering, Medicine, Milling, Military, Philosophy, Poetry, Sciences, etc. during their magnificent history. The arrangemnt of the book is alphabeticl.

It also provide an relativce index at the end of the book.

کتابچہ

25) Prospectus: School of Librarianship, P.B.W. G.:/

Karachi: Pakistan Bibliographical Working Group, 1990.

rev. ed. 2008.

This is an introductiion of the School of Librarianship, sponsored by Pakistan Bibliographical Working Group. It provide all information about the course and subjects.

رودادیں

رو داد گولڈل جوبلی واجلاس عام ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن ۲۲۔۲۳ مارچ 26

۱۹۹۰ء کراچی: ایسو سی ایشن، ۱۹۹۰ء، ۱۲۸ص

ڈاکٹر صمدانی مختلف نیم سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی تنظیموں سے وابستہ بھی رہے، بعض اداروں میں اہم عہدوں پر رہتے ہوئے سماجی، ثقافتی اور تعلیمی خدمات بھی انجام دیں۔ ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن ڈاکٹر صمدانی کے خاندانی احباب کی سماجی انجمن ہے۔ جس کے تحت خاندان کے احباب کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صمدانی اس انجمن کے رکن ہی نہیں بلکہ چند سال اہم عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اس انجمن کے اجلاسوں کی روداد کی تدوین و اشاعت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر کتابچہ"

روداد گولڈل جوبلی واجلاس عام ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن ۲۲۔۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء پر مشتمل ہے۔ جس میں اجلاس عام کی تفصیل سادہ اور عام فہم زبان میں دی گئی ہے۔

روداد اجلاس عام ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن ۲۶۔۲۷ دسمبر ۱۹۹۲ء، ۹۶ ص 27

یہ کتابچہ بھی ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن کے اجلاس عام منعقدہ ۱۹۹۲ء کی روداد ہے۔ ۹۶ صفحات کے اس کتابچے میں اجلاس عام کی روداد سادہ الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

رپورٹ جنرل سیکریٹری، ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن، یکم جولائی ۱۹۹۰ء۔ 28 جون ۱۹۹۱ء، کراچی: ایسو سی ایشن، ۱۹۹۱ء، ۱۳ص ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے مرتب گئی یہ رپورٹ چھ ماہ کے کارگزاری کی تفصیل بیان کرتی ہے۔

۔ رپورٹ کارگزاری، ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن، ۱۹۹۰ء۔ ۱۹۹۱ء، کراچی: 29 ایسو سی ایشن، ۱۹۹۱ء، ۳۱ص

ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے ایک سال کی کارکردگی کی رپورٹ اس کتابچے کا حصہ ہے۔

تحقیقی مقالات

پی ایچ ڈی :

۱۔ پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی میں حکیم محمد سعید شہید کا کردار۔ (پی ایچ ڈی مقالہ) ہمدرد یونیورسٹی کراچی، ۲۰۰۶ء (۶۳۹ص۔ (غیر مطبوعہ ،xxi

ایم اے :

۲۔ اردو میں سائنسی و فنی ادب ؛ منتخبہ کتابیات ۱۹۴۷ء ۔ ۱۹۷۱ء (ایم اے مقالہ) ، شعبہ ،لائبریری سائنس ، جامعہ کراچی ، ۱۹۷۲ء
(۱۴۷ص (غیر مطبوعہ

On-Line Publications : Dr. Rais Samdani

1) Periodical Literature in Library and Information Science: an Index of 50 Years

Works in Pakistan (1947-1997)/by Rais Ahmed Samdani and Khalid Mahmood Pakistan Bibliographical Working Group. 1999

Web Site http://www.angelfire.com/ma3/mahmoodkhalid

http://onlinebooks.library.upenn.edu/webbin/book/lookupname?key=Samdani%2C%20Rais%20Ahmed

2) On-Line Index of Pakistan Library Bulletin: Volume 1 - 33 (1968 -

2002)

Web Site: http://www.geocities.com/plbindex

http://onlinebooks.library.upenn.edu/webbin/book/lookupname?key=Samdani%2C%20Rais%20Ahmed

4) Muhammad Adil Usmani: an eminent Pakistani Librarian. Pakistan Library Bulletin. XXIV(4), pp: 10-16, December 1993. Also on internet with photograph of Mr. M. Adil Usmani Web side "http://www.twsu.edu/-systems/adil.htm"

http://works.bepress.com/cgi/viewcontent.cgi?article=1002&context=drrais_samdani

http://www.academia.edu/3618437/Muhammad_Adil_Usmani_A_Bio-bibliographical_Study_by_Rais_Ahmed_Samdani

5) List of Urdu Writers and Poets/by Rais Ahmed Samdani. on the Wiki:

http://pakistan.wikia.com/wiki/List_of_Urdu_language_writers

6) Doctoral Research in Library and Information Science by Pakistani Professionals: An Analysis/by Dr. Rais Ahmed Samdani and Dr. Rubina Bhatti. Library Philosophy and Practice 2011. http://www.webpages.uidaho.edu/

mbolin/samdani-bhatti.htm

7) SARGODHA UNIVERSITY LIBRARY: A CASE STUDY/by Dr.

Rais Ahmed Samdani, Noor Mustufa Khan & Safia Kokab.

URL: http://raissamdani.blogspot.com/

8) Articles and Columns on HAMARI WEB

http://www.hamariweb.com/articles/userarticles.aspx?id=11511

9) Johli meen Heree our Moti : Shakshi Khake (Biographical Articles/

https://www.academia.edu/3673956/Johli_meen_Heree_our_Moti_Shakshi_Khake_Biographical_articles_

10) Yadoon Ki Mala: (Biographical Articles

ریاکاری دکھاوا نام و نمود

دکھاوا، ریاکاری یا نام و نمود اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اسلام میں اس عمل کی مہانت کرتے ہوئے اسے ایک ایسا عمل قرار دیا گیا جس کی سزا انتہائی سخت ہوگی۔ دنیاوی دکھلاوے کی خاطر کیا گیا بڑے سے بڑا عمل روز قیامت اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول نہیں ہوگا، اس کی سخت باز پرس کی جائے گی۔ آیئے دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دکھاوا، ریاکاری اور نمود و نمائش کے بارے میں کیا کہا ہے:

سورۃ البقرہ آیت 264 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے ایمان والو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اُس شخص کی طرح برباد نہ کردینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اُس (کے مال) کی مثال اُس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سے مٹی پڑی ہو اور اُس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صِلہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔ اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا"۔

اسی طرح سورۃ الانفال آیت 47 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے " اور اُن لوگوں

جیسے نہ ہونا جو اتراتے ہوئے (یعنی حق کا مقابلہ کرنے کے لیے) لوگوں کو دکھانے کے لیے گھروں سے نکل آئے اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور جو اعمال یہ کرتے ہیں خدا اُن پر احاطہ کیے ہوئے ہے"۔

سورۃ الماعون آیت 7-4 میں کہا گیا" تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں۔ اور برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے"۔

قرآن کریم فرقان حمید کی مندرجہ بالا آیات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ریاکاری، دکھاوا اور نمود و نمائش بالکل پسند نہیں۔ جو لوگ اس کے مرتکب ہوں گے ان کی سخت گرفت ہوگی اور وہ سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ احادیث مبارکہ میں دکھاوا، ریاکاری اور نام و نمود کے بارے میں کیا کہا گیا۔

صحیح مسلم' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے' ارشاد فرمایا کہ' قیامت کے دن سب سے پہلے تین لوگوں کے متعلق عدالت الٰہیہ سے جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ ان میں سب سے پہلے اس شخص کی پیشی ہوگی جو جہاد میں شہید ہوا ہوگا۔ وہ جب حاضر عدالت ہوگا تو اللہ تعالیٰ پہلے اس کو

نعمتیں جتائے گا اور یاد دلائے گا وہ اس کو یاد آ جائیں گی پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بتلا تو نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ اور کیا عمل کیے؟ وہ شخص عرض کرے گا خداوند! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور تیری رضا طلب کی اور میں نے اپنی جان تک قربان کردی اور شہید کردیا گیا۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے صرف اس لیے جہاد کیا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، تیری بہادری کا چرچہ ہوچکا، پھر اللہ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا شخص ایک 'عالم دین' اور 'عالم قرآن' ہوگا جس نے علم دین سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، قرآن مجید پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا، یہ شخص حاضر عدالت کیا جائے گا، اس سے بھی اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ تو نے کیا اعمال کیے؟ وہ ان تمام نعمتوں کا اقرار کرے گا جو اس پر کی گئی تھی، وہ کہے گا میں نے تیرے دین اور تیری کتب کے علم کو پڑھا اور دوسروں کو سکھایا اور آپ ہی کی رضا کی خاطر قرآن مجید پڑھا۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے علم دین اس لیے سیکھا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور قرآن پاک اس لیے پڑھا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہیں۔ پھر حکم خداوندی سے اس کو بھی دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسرا وہ شخص ہوگا جسے اللہ نے بہت کچھ مال و دولت دیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی دی ہوئی نعمت کا اظہار فرمائیں گے جو اس پر کی گئی تھی، اس سے سوال کیا جائے گا کہ تونے کیا کیا؟ وہ ان تمام کا جو اسے دی گئیں اقرار کرے گا، وہ عرض کرے گا کہ خداوندا میں نے خیر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں تیری رضا جوئی کے لیے اپنا مال نہ خرچ کیا ہو، حق تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تونے صرف اس لیے مال خرچ کیا تھا کہ دُنیا تجھ کو سخی کہے تو دُنیا میں تیری سخاوت کا خوب چرچہ ہو، پھر اس کو بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا'۔پروردگار ہم سب کو ریاکاری دکھاوے اور نام و نمود سے محفوظ رکھے۔
حکم خداوندی اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کا بڑے سے بڑا عمل اخلاص، للّٰہیت اور صالح نیت سے خالی ہو کر کیا جائے گا وہ عمل اس انسان کو ہلاک ہی کردے گا اور دوزخ اس کا مقدر ہوگی۔اللہ تعالیٰ کے حضور انسان کا صرف اور صرف وہی عمل قبول ہوگا جو دکھاوے، ریاکاری، نام و نمود کے بجائے اخلاص، صالح نیت اور رضائے الٰہی کے لیے کیا گیا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جو کام بھی کریں اس میں دکھاوا نا ہو،نام و نمود کا اظہار نا ہو، ریاکاری نا ہو بلکہ ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اخلاص پر

مبنی ہوں۔ کیوں کہ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔

حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'خزائنِ شریعت و طریقت' میں لکھا ہے کہ ریاء کبیرہ گناہ ہے لیکن چھوٹے گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھو۔ نافرمانی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چھوٹا گناہ کرنے میں کوئی حرج نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو تھوڑا سا ناراض کرنا ان کے نزدیک معمولی بات ہے۔ اعلیٰ حضرت حکیم صاحب نے رِیاء کے لیے ایک مسنون دعا یہ درج کی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُکَ لِمَالَآ اَعْلَمُ ہ

یااللہ ! میں شرک یعنی دکھاوے سے پناہ چاہتا ہوں، اس دکھاوے سے بھی جس کو میں جانتا ہوں اور معافی مانگتا ہوں اور اس دکھاوے سے بھی جس کا مجھے علم نہیں یعنی جو اتنا خفی ہے جو دل کی گہرائی میں چھپا ہوا ہے اور مجھے اس کا احساس بھی نہیں"۔

تقسیم میراث یا ترکہ اور ہمارے والدین کی میراث کی شرعی تقسیم

(آپ بیتی سے ماخوذ)

قرآن کریم میں 'مسئلہ میراث' کو خاص اہمیت حاصل ہے اور حقِ وراثت کی منصفانہ اور شرعی تقسیم پر انصاف سے کام لینے کی ہدایت دی گئی ہے۔ کسی بھی حق دار کو وراثت میں سے محروم کرنا بدترین گناہ ہے جس کا ارتکاب کرنے والے قیامت کے دن سخت ترین عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہ میراث کی اہمیت ہی ہے کہ نبی رحمت حضرت محمد ﷺ نے علمِ میراث سیکھنے اور سکھانے والوں کے فضائل بتائے اور میراث میں ناانصافی کرنے والوں کے لیے وعید سنائی ہے۔ صحیح بخاری کی حدیثِ مبارکہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

" میراث (مقررہ حصے) اس کے حقداروں تک پہنچا دو اور جو کچھ باقی بچے وہ سب سے زیادہ قریبی مرد عزیز کا حصہ ہے"۔

میراث یا ترکہ وہ جائیداد ہے جو میت چھوڑ کر فوت ہو گیا ہے۔ وہ نقد رقم، زرعی زمین ، مکان یا مکانات یا وہ حقوق جنہیں اس نے زندگی میں ادا کرنا تھا اور وہ ادا نہیں کر سکا۔ 'اسلام کا قانونِ وَراثت' کے مصنف صلاح الدین حیدر لکھوی نے میت کے ترکہ سے متعلق چار حقوق بیان کیے

ہیں۔

۱۔ میت کی تدفین کے اخراجات

۲۔ قرض کی ادائیگی۔

۳۔ وصیت کی ادائیگی۔

۴۔ وارثوں کا حق۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے وراثت یا میراث کی آیت نازل فرمائی جس میں بہت واضح طور پر مرنے والے کی جائیداد یا جو کچھ بھی وہ دنیا میں چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے کی منصفانہ تقسیم کس طرح کی جائے صاف الفاظ میں ہدایت موجود ہیں۔ ' کلالہ ' کی میراث کے حوالے سے بھی قرآن کریم کی سورۃ النساء کی آخری آیت (176) میں واضح احکامات دیے گئے ہیں۔ کلالہ سے مراد اختلاف کے ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کلالہ وہ شخص ہے جو لاوَلد (اس کی اولاد نہ ہو) ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ محض لاوَلد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ کلالہ کی وضاحت خود قرآن کریم سے بھی ہوتی ہے۔ کلالہ کی میراث کے حوالے سے صحیح بخاری کی حدیث ہے حضرت جابر بن عبداللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ بیمار پڑا تو نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ پیدل میری عیادت کو تشریف لائے۔ ان بزرگوں نے دیکھا کہ مجھ پر بے ہوشی غالب ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی

مجھ پر چھڑکا' اس سے مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ حضورﷺ تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ! میں اپنے مال میں کیا کروں' کس طرح اس کا فیصلہ کروں؟ آنحضرت نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ میراث کی آیت نازل ہوئی۔

قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت 11،12، 33 اور آخری آیت 176 کَلالہ سے متعلق ہے۔ پہلے سورۃ انساء کی آیت 33 کا ترجمہ "اور ہم نے ہر اُس ترکہ کے حق دار مقرر کردیے ہیں جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیماں ہوں تو اُن کا حصّہ اُنھیں دو۔ یقیناًاللہ ہر چیز پر نگراں ہے'۔ اسی سورۃ کی آیت 11 اور 12 میں وراثت کی تقسیم کی کھلے اور صاف صاف الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے۔ آیت 11 کا ترجمہ "تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ : مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو اُنھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارِث ہو تو آدھا ترکہ اس کا حق ہے۔ اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکہ میں چھٹا حصہ بشرطیکہ میت کے اولاد ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اُس کے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ اور (یہ سب اس وقت نکالے جائیں گے)جب کہ وصیّت جو میّت نے کی ہو، پوری کردی جائے اور جو قرض

اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ اور تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناسب حقیقتوں سے واقفِ اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے''۔

اِسی سورۃ کی آیت 12 کا ترجمہ ہے '' اور تمہاری بیویوں نے کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصّہ تمہیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصّہ تمہارا ہے، جب کہ وصیّت جو انھوں نے کی ہو پوری کردی جائے ، اور قرض جو اُنھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں اُن کا حصّہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیّت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیاجائے۔ اور اگر وہ مرد یاعورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زِندہ نہ ہوں مگر اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کُل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔ ، جب کہ وصیّت جو کی گئی ہو پوری کردی جائے، اور قرض جو میت نے چھوڑا ہوادا کر دیا جائے ، بشرطیکہ وہ ضرررساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا وبینا اور نرم خُو ہے''۔

وہ شخص جس کے اولاد نہ ہو اور وہ لاوَلد دنیا سے رخصت ہوگیا ہو عربی میں اس کے لیے کَلالہ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایسے شخص کی جائیداد یا ترکہ کی تقسیم کے لیے سورۃ النساء' کی آخری آیت 176 ہے۔ اس آیت میں پروردگار نے کَلالہ کے بارے میں وضاحت کی نبیؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ترجمہ ''اے نبیؐ، لوگ تم سے کَلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو تو اس ترکہ میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میّت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔ اور اگر کئی بھائی بہن ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مَردوں کا دوہرا حِصّہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے، تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے''۔

میراث یا ترکہ کے بارے میں آنحضرت محمد ﷺ نے بہت واضح ہدایت کی اور اسے حق دار کو ادا کرنے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی مرنے والے پر اگر قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکہ میں سے اس قرض کو ادا کرنے کی تاکید فرمائی۔ حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کسی ایسی میت کو لایا جاتا جس پر کسی کا قرض ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ کیا اس نے اپنے قرض کے ادا کرنے کے لیے بھی

کچھ چھوڑا؟ پھر اگر کوئی آپ کو بتا دیتا کہ ہاں اتنا مال ہے جس سے قرض ادا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ اس کی نماز پڑھاتے' ورنہ آپ ﷺ مسلمانوں ہی سے فرمادیتے کہ اپنے ساتھی کی نماز پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ پر فتح کے دروازے کھول دیئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خود ان کی ذات سے بھی زیادہ مستحق ہوں۔اس لیے اب جو بھی مسلمان وفات پا جائے اور وہ مقروض رہا ہو تو اس کا قرض ادا کرنا میرے ذمے ہے۔ اور جو مسلمان مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا حق ہے (صحیح بخاری)۔

صحابیِ رسول سیدنا زید بن ثابتؓ ان صحابیوں میں سے تھے جو وراثت کے مسائل کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے ۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیثِ مبارکہ ہے جس کے راوی سیدنا انسؓ ہیں۔ فرمایا رسول اکرم ﷺ نے ایک دفعہ سیدنا زید بن ثابتؓ کے متعلق فرمایا 'وراثت کے مسائل کو حل کرنے کے بارے میں میرے صحابہ میں سے سب سے زیادہ ماہر ہیں'۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ وراثت کے بارے میں سوال پوچھنا ہو تو سیدنا زید بن ثابتؓ سے جا کر پوچھو۔ حضرت عمرؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا 'وراثت کے قوانین سیکھو کیونکہ یہ تمہارے دین کا حصہ ہیں'۔

وراثت کا موضوع اور مسئلہ اس قدر اہم اور بنیادی نوعیت کا ہے کہ اس کا تعلق

دنیا کے ہر ہر گھر اور خاندان کا لازمی حصہ ہے۔ کسی نے بہت درست لکھا کہ وراثت کے معاملات اس قدر زیادہ اور گھمبیر ہو گئے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا ایک پیشہ یعنی بے شمار وکیلوں کے گھروں کی روزی مہینوں نہیں بلکہ سالوں تک انہیں وراثت کے مقدمات کے ذریعہ چلتی رہتی ہے۔ ہماری عدالتوں نے اس اہم مسئلہ کو طول دینے اور وکیلوں کے لیے کمائی کا ذریعہ بنانے میں کچھ زیادہ ہی کردار ادا کیا ہے۔ وراثت کے مقدمات بسا اوقات ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ حتمی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔اس کی بنیادی وجہ اس موضوع اور مسئلہ کے حوالے سے اسلام سے دوری، قرآن و حدیث سے ناواقفیت،جذبات سے کھیلنا، ھَوَس،لالچ خدا پر بھروسہ نہ ہونا، ماں باپ کے مرنے کے بعد یا کسی بھی ایسے فرد کے دنیا سے چلے جانے کے بعد جو جائیداد ، مکان، دکان، گھر، پلاٹ، نقد رقم، بنک بیلنس چھوڑ کر مرا ہو، اس کے علاوہ سادے الفاظ میں زر، زمین اور دولت کا حصول سامنے نظر آئے تو اس پر صرف اور صرف اپنا حق نظر آنے والے مسائل و مشکلات سے دوچار رہتے ہیں۔انہیں اس بات کا یقین نہیں ہوتا کہ اللہ نے انہیں جو کچھ دینا ہے وہ انہیں ضرور ملے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے ہڑپ نہیں کر سکتی۔ ھَوَس ،لالچ اور جلد بازی میں ہم اپنے خون کو بھی بھلا بیٹھتے ہیں۔ عزیز رشتہ دار کو زیادہ حقدار قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی آیت الاحراب کی آیت 6 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ’ اور رشتے دار کتاب اللہ کی رو سے بہ نسبت دوسرے مومنوں اور (مہاجروں کے آپس میں زیادہ حقدار ہیں (ہا

مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو یہ حکم کتاب (الٰہی) میں لکھا ہے'۔

وراثت یا مرنے والے کی جائیداد کی تقسیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بہت صاف صاف اور عدل و انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کو کہا ہے۔ ہر وارث کو اس کا حق دینے بلا تفریق وہ مرد ہے، عورت ہے، بچہ ہے، بوڑھا ہے، طاقت ور ہے، کمزور ہے، چھوٹا ہے بڑا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بچہ ماں کے پیٹ میں ہے، ابھی اسے دنیا میں آنے کے لیے مہینے درکار ہوں یعنی ماں کے پیٹ میں موجود حمل کی وراثت کا بھی تعین کر دیا گیا۔اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا شخص جو اپنی حاملہ ماں، حاملہ بیوی یا حاملہ بہو کو زندہ چھوڑ کر مر گیا ہو، قرآن نے اس حمل کو بھی میت کا وارث مقرر کیا ہے۔ اسلام سے قبل مختلف قوموں اور نسلوں میں وراثت کا قانون غیر منصفانہ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہود، سیدنا عیسیٰ علیہ والسلام کی قوم عیسائی یا نصاری میں وراثت کا قانون اسلام سے مختلف ہے۔ عدل و انصاف حق دار کو حق کی ادائیگی کا قانون قرآن کریم میں پیش کیا گیا جس کی مزید تشریح اور وضاحت نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی اور اسی طرح اس کے بعد جیسے جیسے مسائل و مشکلات آتی رہیں خلفائے راشدینؓ، صحابہ اکرام رضوان اللہ علیہم، تابعین، تبع تابعین، اولیائے اکرام ،،بزرگانِ علم و فضل اور اس کے بعد بھی ان مسائل کے حل کا

سلسلہ جاری و ساری رہا۔

قانون وراثت کے بارے میں اہل علم اور علماء اکرم نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس موضوع پر بے شمار تصانیف موجود ہیں۔ معروف عالم دین علامہ کوکب نورانی نے اس پر موضوع پر اپنے ایک مضمون میں لکھا 'تاریخ شاید ہے کہ طلوعِ اسلام سے قبل عورتیں اور بچے حق میراث سے محروم تھے ، اسلام نے اُنہیں حق وراثت میں شریک کیا اور ان کے حقوق کی پاسداری کے لیے واضح احکامات اور قوانین بیان کیے ان احکامات سے معاشرہ میں انسانی حقوق کے تحفظ کا احساس بیدار ہوا، انہی میں سے ایک اہم اصول قانونِ میراث' ہے۔اس قانون کو نصف العلم بھی کہا جاتا ہے۔ (روزنامہ جنگ ۷' جنوری ۲۰۱۵ء)۔ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اپنے ایک ٹی وی پروگرام میں جسے میں نے از خود سنا کہا کہ 'ہمارے معاشرے میں یہ تاثر عام ہے کہ کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اُس کے ترکہ پر کوئی ایک وارث یا چند ورثا مل کر قابض ہو جاتے ہیں حالانکہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ مرنے والے کی جیب سے اگر ایک الائچی بھی نکلے تو کسی وارث کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ وہ اس الائچی پر اکیلا قابض ہو جائے کیونکہ اس میں تمام ورثا کا حق ہے۔

وصیت وہ ہدایت یا فیصلہ ہے جو مرنے والا اپنے چھوڑے ہوئے مال ، جائیداد یا

ترکہ کے بارے میں کوئی مخصوص ہدایت کرتا ہے۔ وصیت صرف اور صرف اسی شخص کو کرنا ہوتی ہے جس کی ملکیت میں کچھ مال، جائیداد، نقد رقم یا بنک بیلنس ہو اور وہ چاہتا ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کی تقسیم شرعی اعتبار کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ یا جو لوگ اس کے مال کے شرعی وارث بھی ہیں ان میں سے کسی کو کچھ زیادہ دینے کی خواہش رکھتا ہو۔ وصیت صرف مال و دولت کے بارے میں ہی نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ اپنی بیوی کے بارے میں ہو سکتی ہے، وصیت یہ ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد اسے فلاں قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اکثر احباب یہ خواہش رکھتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ اگر ہماری موت مدینہ منورہ میں واقع ہو جائے تو تدفین جنت البقیع میں کر دی جائے، اگر موت مکہ مکرمہ میں ہو تو اسے جنت المعلیٰ میں دفن کیا جائے۔ اکثر احباب یہ وصیت کر جاتے ہیں کہ ان کی قبر ان کی ماں یا باپ کے پہلو میں بنائی جائے وغیرہ وغیرہ۔ وصیت پر عمل کرنا بشرطیکہ وہ وصیت اللہ کے احکامات اور طریقہ کار کے مطابق کی گئی ہو عین شرع ہے، اس میں ردو بدل کر دینا یقیناً گناہ ہے۔

قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیات 180، 181 اور 240، سورۃ المائدہ کی آیات 106 تا 108 میں وصیت کے بارے میں واضح احکامات، ہدایات اور طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت 180 اور 181 کا ترجمہ ”تم پر فرض کیا

گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتے داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیّت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ پھر جنھوں نے وصیّت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا، تو اُس کا گناہ اُس بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیت کرنے والے نے نادنستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اُس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔ مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودُودیؒ نے 'اس سورہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جب کہ وراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہُوا تھا اس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصے بذریعہ وصیّت مقرر کرجائے تاکہ مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیم وراثت کے لیے اللہ تعالٰی نے خود ضابطہ بنادیا (جو سورۃ النساء میں بیان کیا گیا ہے) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا کہ وارثوں کے جو حصے اللہ تعالٰی نے مقرر کردیے ہیں ان میں وصیّت سے کمی بیشی نہیں کی جاسکتی اور غیر وارث کے حق میں کل جائیداد کے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیّت نہ کرنی چاہیے اور مسلم وکافر ایک دوسرے کے وارِث نہیں ہوسکتے''۔اسی سورۃ النساء کی آیت 240 میں بھی وصیّت کے ضمن میں کچھ بیان شوہر کے مرجانے کی صورت میں دنیا

میں رہ جانے والی ان کی بیوی یا بیویوں کے حقوق کے حوالے سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ترجمہ ''تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ ہاں اگر وہ خود گھر سے چلی جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کرلیں، تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر''۔ اسی طرح کلام مجید کی سورۃ المائدہ کی آیت 106 تا 108 میں بھی وصیّت کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے وصیّت کرنے والے کے لیے ہدایات اور احکامات کا بیان کیے ہیں۔ ابن ماجہ میں سیدنا ابی ہریرہؓ سے روایت ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قرض کی ادائیگی کو وصیت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے ' ثابت ہے۔ سیدنا علیؓ نے فرمایا کہ تم قرآن میں ترجمہ ' یعنی وصیت قرضہ سے پہلے ہے لیکن رسول ﷺ نے قرض کا فیصلہ وصیت سے پہلے فرمایا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وراثت کی تقسیم کے حوالے سے مَیں اپنے ذاتی تجربے اور اپنے بہن بھائیوں کے صالح عمل کو عام قارئین کے لیے بیان کروں۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ خاص طور پر ہماری اپنی اولادوں کو اپنی آئندہ زندگی میں

وراثت کی تقسیم کا مرحلہ پیش آئے تو وہ میری اس تحریر سے استفادہ بھی کریں اور اپنے بزرگوں کے اچھے عمل کو اپنے لیے بھی اپنائیں تاکہ بلاوجہ کی رنجشوں، پریشانیوں اور باہمی اختلاف سے محفوظ رہ سکیں۔ ہمارے والدین کی جائیداد محض ایک سو بیس (120 گز کا تین منزلہ مکان تھا اور وہ بھی کراچی کے علاقے فیڈرل بی ایریا میں۔ ہمارے والدین نے اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ 1947 میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی یہ وہ وقت تھا جب ہمارے والدین کی شادی تو ہوچکی تھی لیکن اولادوں میں سے صرف مَیں تھا وہ اپنی ماں کے پیٹ میں۔ دنیا میں میری آمد مارچ 1948 میں ہوئی۔ والاد صاحب نے کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ کراچی آکر وہ کراچی پورٹ پر کام کرنے لگے تھے اس وجہ سے پورٹ کے نزدیک ہی لیاری کے علاقے پہلے بہار کالونی میں پھر آگرہ تاج کالونی میں دو سو گز کا سستا سا پلاٹ خرید کر گھر بنا لیا۔ یہ پلاٹ پہلے جھونپڑی بنا پھر کچے پکے مکان میں تبدیل ہوا۔ میرے دنیا میں آنے کے بعد تین بھائی اور تین بہنیں دنیا میں اور آگئیں اب ہم سات بہن بھائی ہوگئے دو عدد والد صاحب کی بہنیں اور دو عدد ان کے بھائی بھی ساتھ ہی تھے اس کے باوجود 13 افراد کا خاندان اس کچے پکے مکان میں سالوں خوش و خرم رہتا رہا۔ والد صاحب کی بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں تو یہ خاندان سکڑ کر نو لوگوں پر مشتمل رہ گیا۔ 1988میں جب ہم بہن بھائی بڑے ہوگئے کمانے بھی لگے، دو کی شادیاں بھی ہوگئیں تھیں کسی بہتر علاقے میں منتقل ہونے کی منصوبہ بندی شروع ہوئی۔ یہ

ایک قدرتی عمل ہے کہ انسان وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر کی جانب اپنا سفر جاری و ساری رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم بھائیوں کی بھی یہ سوچ پیدا ہوئی اور ہم نے بہتر جگہ رہائش کی منصوبہ بندی کی۔ والد صاحب اپنی جائیداد کے حوالے سے جذباتی نظر آئے یعنی وہ اس کے حق میں نہیں تھے کہ وہ مکان فروخت کیا جائے۔ لیکن جب اولاد بڑی ہو جاتی ہے تو والدین اس کی مرضی کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔ والد صاحب نے بھی اپنی اولاد کی خوشی کی خاطر اس فیصلے کو قبول کر لیا۔

اب ہمارا خاندان لیاری سے فیڈرل بی ایریا کے علاقے دستگیر سوسائیٹی میں قائم کسی کنسٹرکشن کمپنی کے بنائے ہوئے مکانات 'آصف نگر' میں منتقل ہوگیا۔ یہ گھر زمینی منزل پر مشتمل تھا۔ گھر خریدنے کے بعد کچھ پیسہ بچ گیا وہ اسی مکان پر لگا دیا گیا۔ بعد میں ہم بھائیوں نے اس مکان کو زمینی منزل سے دوسری اور پھر تیسری منزل تک پہنچایا۔ اس کی مزید تعمیر اور ترقی میں میرے چھوٹے بھائی ندیم کا زیادہ کردار تھا اس کی وجہ اس کا کنسٹرکشن کے کاروبار سے وابستہ ہونا ہے۔ 1997 میں والد صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس دوران چاروں بھائیوں اور تینوں بہنوں کی شادیاں بھی ہوگئیں اور وہ اپنے اپنے گھروں کی ہوگئیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد حالات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی جو ایک قدرتی عمل تھا۔ اب ہم بھائیوں کے بچے بھی ہو چکے تھے اور وہ بڑے بھی

ہو رہے تھے۔ گھر میں کشادگی کے باوجود دلوں میں تنگی آنا شروع ہو گئی تھی۔ ویسے بھی دل کے کسی کونے میں یہ بات ضرور تھی کہ یہ ہمارے والدین کا اثاثہ ہے۔ اس پر ہماری بہنوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہمارا۔ لیکن ابھی یہ بات زبان پر آنا شروع نہیں ہوئی تھی ۔اس کی بنیادی وجہ ہماری والدہ کی موجودگی تھی وہ چاہتی تھیں کہ ان کی اولاد اسی طرح ساتھ رہتی رہے۔ لیکن یہ ایک حد تک ممکن ہوتا ہے۔ دنیا اسی طرح پھلی پھیلی ہے۔ ایک گھر سے دو اور دو سے چار گھر بنتے چلے جاتے ہیں۔1998 میں پہل کرتے ہوئے مَیں نے اپنے والدین کے گھر کو خیر باد کہا اور ایک فلیٹ میں شفٹ ہوگیا۔ یہ میرا اپنا فلیٹ تھا جو صرف اس وجہ سے بن سکا کہ میں اپنے والدین کے ساتھ ایک چھت تلے اپنی شادی کے 24 سال بعد تک رہتا رہا۔ جوائنٹ فیمیلی سسٹم یا ایک ساتھ رہنے کی مشرقی روایات کے بہت سے فوائد ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی جائیداد آسانی سے بنا سکتا ہے۔ میرے علاوہ میرے چھوٹے بھائی ندیم نے بھی ایسا ہی کیا اور اس نے بھی ساتھ رہتے ہوئے اپنا ایک گھر بنا لیا تھا جہاں پر اب میں اور وہ آمنے سامنے اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔1998 میں اٹھنے والا میرا یہ قدم وراثت کی تقسیم کی جانب پہلی ابتدا تھی ۔ میرے یہاں سے منتقل ہوجانے کے
بعد میرے تینوں بھائی اسی مکان میں رہتے رہے۔ 2009 میں ہماری والدہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اب وہ وقت آن پہنچا کے حق داروں کو ان کا حق ادا کردیا جائے جیسا کہ قرآن و حدیث میں آیا ہے۔

قانونی تقاضے پورے کرنے کی غرض سے میرے بھائیوں اور بہنوں نے اپنا حقِ وراثت میرے نام منتقل کر دیا۔ تمام بہن بھائیوں کا یہ مجھ پر اعتماد اور بھروسہ تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو شاید تقسیمِ وراثت میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا۔ اب وہ جائیداد میرے نام منتقل ہو چکی تھی۔ اب یہ ذمہ داری میری تھی کہ مکان کی فروخت سے حاصل شدہ رقم کی تقسیم شرعی اور قانونی طریقے، نیز شفافیت کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ میرے والد اور میری ولدہ پر کسی کا کسی قسم کا قرض نہیں تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت جب انہیں قبر کی گود میں پہنچا دیا گیا تو میں نے قبر کے گرد موجود تمام احباب سے باآوازِ بلند یہ کہا تھا کہ اگر میرے والد صاحب پر کسی بھی شخص کا کچھ بھی قرض واجب ہے تو میں اس کی ادائیگی کروں گا وہ مجھ سے رابطہ کرلے۔ ہمارے والدین نے اپنی زندگی میں کوئی وصیت بھی نہیں کی تھی۔ کم از کم میرے علم میں نہیں۔ اگر وصیت ہوتی تو وہ ہر صورت میں سامنے آجاتی۔ میں نے سب سے پہلے قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کی، صلاح الدین حیدر لکھوی کی کتاب 'اسلام کا قانونِ وَراثت: زندگی میں اور مَرنے کے بعد جائیداد کی تقسیم سے بَرپا ہونے والی تباہیوں سے بچنے کا نسخہ' کا تفصیلی مطالعہ کیا اور فیصلہ کیا کہ اس اہم فریضے کی ادئیگی قرآن و سنت کے مطابق، قانونِ وَراثت کے عین مطابق نیز تمام امور

تحریری طور پر سرانجام دیے جائیں۔ چنانچہ میں نے ایک خط اپنے تمام بہن بھائیوں کے نام تحریر کیا جس میں کچھ بنیادی قسم کی ہدایات اور باتیں درج کیں۔ یہ خط کچھ اس طرح تھا۔

52014 جولائی ،

بنام پرویز احمد صمدانی ابن انیس احمد صمدانی، تسلیم احمد صمدانی ابن انیس احمد صمدانی، ندیم احمد صمدانی ابن انیس احمد صمدانی، ناہید شاہد احمد بنتِ انیس احمد صمدانی، شاہین خالد بنتِ انیس احمد صمدانی، روحی ندیم بنتِ انیس احمد صمدانی۔

آپ سب نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے امی اور پاپا کے گھر واقع آصف نگر کی فروخت اور رقم کی شرعی تقسیم کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ اطلاعاً تحریر ہے کہ ابتدائی طور پر مکان کی فروخت کی کاروائی شروع ہو چکی ہے۔ مکان کے خریدار اور میرے درمیان Sale Agrement قانون کے مطابق طے پا گیا ہے۔ قانون کے مطابق خریدار نے کل رقم کا ۱۰ فیصد بنک ڈرافٹ کی صورت میں ادا کر دیا ہے۔ میں نے اس رقم کو اپنے کرنٹ اکاؤنٹ میں 2 جولائی 2014 کو جمع کرا دیا ہے۔ واضح رہے کہ کرنٹ اکاونٹ میں بنک سود نہیں دیتا۔ گویا شرعی حصہ آپ تک پہنچنے تک سود سے پاک ہوگا۔ اگلا مرحلہ قانون کے مطابق تین ماہ کے اندر اندر مکمل ہونا ہے۔

جس کے لیے آپ سب کو درج ذیل امور کو سامنے رکھنا ہوگااور ان پر عمل بھی کرنا ضروری ہوگا۔

۱۔ رقم کی ادائیگی اخراجات منہا کرنے کے بعد شرع کے مطابق ہوگی۔

۲۔ رقم کے ادائیگی بذریعہ کراس چیک متعلقہ فریق کے نام ہوگی۔ اگر آپ میں سے کسی کا بنک اکاؤنٹ نہیں تو وہ تین ماہ کے اندر اندر اپنا بنک کاؤنٹ کھلوالے۔ چیک کسی بھی صورت متعلقہ فریق کے کسی بھی قریبی مثلًا بیوی شوہر بیٹا یا بیٹی کے نام سے نہیں دیا جائے گا۔

۳۔ خریدار اُسی وقت مکمل رقم ادا کرے گا جب اسے مکان کا قبضہ دیا جائے گا۔ چناں چہ مکان تین ماہ کے اندر اندر خالی ہونا ضروری ہے۔ مکان میں رہائشی بطور خاص اس امر کو یقینی بنائیں ۔

امید ہے میری تمام بہنیں اور بھائی اس قانونی و شرعی مرحلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے میں میرے مدد و معاون ہوں گے اور ہر طرح سے تعاون بھی کریں گے۔

اللہ تعالٰی ہمیں اس نازک گھڑی میں ثابت قدم رکھے ۔ (ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی)، ۵، جولائی ۲۰۱۴ء مطابق ۶ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

مکان کے فروخت کے معاملات بھی شروع کردیے گئے۔ ہم بھائیوں کا یہ فیصلہ تھا کہ ہم نے اس جائیداد پر جو کچھ بھی لگایا وہ لگا چکے ۔ اس سے تمام دستبردار ہوگئے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ خاص طور پر میرے چھوٹے بھائی کی زیادہ رقم اس پر لگی تھی لیکن اس نے بھی بڑے پن کا ثبوت دیا اور یہ معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہوگیا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ والدین کے گھر میں رہائش رکھنے والے بیٹے، بیٹی یا داماد اس وقت کے حالات کے پیش نظر اس مکان پر رقم خرچ کرکے اپنے لیے ایک یا دو کمرے بسااوقات ایک منزل، کبھی مکان کی آرائش و زیبائش پر ہزاروں یا لاکھوں خرچ کردیتے ہیں ۔ جب اس جائیداد کی شرعی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو جنھوں نے اس جگہ اپنا پیسہ لگایا ہوتا ہے وہ اس رقم کو علیحدہ سے وصول کرنے کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس جگہ کئی برس رہ چکے ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ اب رنجش اور باہمی اختلاف کا باعث ہوجاتا ہے۔ جو لوگ وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہاں یہ مسئلہ بہ آسانی اتفاق رائے سے حل ہوجاتا ہے۔ سخت گیر لوگوں کے سخت رویے کے باعث مسئلہ عدالتوں میں چلا جاتا ہے اور برسوں چلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمام طرح کے مسائل و مشکلات سے بچائے رکھا۔

ہمارا گھر فروخت ہوگیا جو رقم موصول ہوئی اسے اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے حقِ وراثت (تقسیمِ میراث) کے مطابق تقسیم کرنے کا عمل شروع کیا

گیا۔ یہ اہم ذمہ داری جو مجھ پر آن پڑی تھی جملہ بہن بھائیوں کے عملی تعاون سے خوش اسلوبی کے ساتھ پائے تکمیل کو پہنچی۔ تمام معاملات تحریری صورت میں عمل میں لائے گئے۔ رقم کی تقسیم بنک کی پابندیوں کے باعث وقفہ وقفہ سے کی گئی۔ ہر ایک کو کراس چیک کے ذریعہ رقم کی ادائیگی کی گئی۔ کس کے حصے میں کتنی رقم آئی یہ پرچی موصول ہوجانے کے خوف سے لکھا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ آج کل پرچی سسٹم بہت عام ہو چکا ہے۔چیک کے ساتھ بھی رقم کی تقسیم کی تفصیل کا خط منسلک کیا گیا تھا اس خط کو یہاں درج کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس میں رقم تحریر تھی ۔ رقم کی تقسیم کا عمل کوئی دو ماہ پر مشتمل رہا اور یہ دو ماہ کا عرصہ میری زندگی کا کٹھن وقت تھا۔ متعلقہ فریق کو چیک دینے کے بعد میں اس فکر میں بے چین رہتا تھا کہ جس کو چیک دیا ہے وہ جلد سے جلد اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادے اور اس کی رقم میرے اکاؤنٹ سے اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجائے۔ اس دوران میری ایک بہن پنجاب چلی گئی جتنے دن وہ واپس نہیں آئی میں انتہائی کرب میں رہا۔اس کی امانت میرے پاس تھی جسے امانت دار ہی کو دینا تھا۔ آخر کار میں نے اس کے نام کا دستخط شدہ چیک بنایا اور اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ اگر اُس کے کراچی آنے سے قبل مجھے کچھ ہوجاتا ہے تو یہ امانت اس تک پہنچا دی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ میری زندگی ہی میں واپس آ گئی ۔ باوجود اس کے کہ وہ میرے گھر سے بہت دور سرجانی ٹاؤن میں رہتی ہے میں دوسرے دن ہی شہناز کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا اور اس کی امانت اس کے حوالے کی۔

اللہ کا شکرادا کیا کہ اس نے مجھ پر میرے والدین کے ترکہ کی تقسیم کی جو ذمہ داری ڈالی میں نے کوشش کی کہ اسے احسن طریقے سے پائے تکمیل کو پہنچا دوں۔ مجھے قوی امید ہے کہ میرا یہ عمل اللہ کے بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرے گا ساتھ ہی میرے مرحوم والد اور میری امی کی ارواح کو بھی سکون اور خوشی عطا ہوئی ہوگی۔ فرتاش سید کا شعر۔

کل بزرگوں کے اثاثوں کی جو تقسیم ہوئی

مال وزر چھوڑ دیا میں نے، قناعت رکھ لی

ہم اللہ کا لاکھ لاکھ شکرادا کرتے ہیں کہ وراثت (جائیداد) کی تقسیم جیسے نازک معاملات انتہائی خوش اسلوبی سے اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔ کسی ایک کو بھی کسی بھی قسم کی شکایت نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے مرحوم والدین کی سوچ اور اولاد کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ہم نے اپنے والد کو کبھی غلط کام کرتے، ھَوس، لالچ کرتے نہیں دیکھا حالانکہ جب وہ 1947 میں کراچی آئے تھے تو بے شمار طریقوں سے لوگوں نے مکانات، فلیٹ اور پلاٹ بنائے لیکن ہمارے والد قناعت پسند، اعتدال پسند تھے۔ حوص اور لالچ ان کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا۔ یہ سب انہی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ ہم تقسیم وراثت جیسے اہم اور نازک مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

NBF کراچی میں بک شاپ کا افتتاح۔ کتاب کلچر کے فروغ میں اہم پیش رفت

نیشنل بک فاؤنڈیشن مرکزی حکومت کے تحت قائم ایک قومی ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد ملک میں کتاب کلچر کا فروغ ہے ۔ یہ کتابیں شائع کرکے کیا جائے، کتابیں لکھوا کر کیا جائے ، کتابیں لکھنے کی جانب مصنفین کو مائل کرکے ہو، کتاب سستی فروخت کرکے کیاجائے مقصد کتاب، مصنف اور قاری ، علم کی اس مثلث کے مابین رابطہ کار کا کردار ادا کرنا ہے۔اس ادارے کا یہ بھی کام ہے کہ یہ کتاب کے تخلیق کار یعنی مصنفین، کتاب کی اشاعت اور قاری یعنی پڑ ھنے والوں کو باور کرائے کہ علم کی یہ مثلث ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے اور معاشرے میں کتاب کلچر کو فروغ دنے میں بنیادی کردار ادا کرسکتی ہے۔ فاؤنڈیشن کا صدر دفتر اسلام آباد میں ہے جب کہ ریجنل آفیسز پاکستان کے تمام ہی بڑے شہروں میں قائم ہیں۔ یہ ادارہ 1972 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت قائم ہوا تھا۔ جس کے اولین ایم ڈی یونس سعید تھے۔ کئ معروف شخصیات اس ادارے کی سربراہ رہیں ہیں اس وقت اس کے سربراہ معروف ادیب و دانش ورپرفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید ہیں جو جنوری 2014 سے اس کے سربراہ ہیں۔

راقم الحروف کو 19 مارچ 2015 کو اس کے کراچی مرکز میں ہونے والی نئ عمارت میں

کتابوں کی دکان کے از سر نو قیام اور اس کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ تقریب کی سب سے اہم اور اچھی بات یہ رہی کہ تقریب کے مہمان خصوصی حکومت سندھ کے سینئر وزیر نثار کھوڑو صاحب کو منتظمین نے جو وقت تقریب شروع کرنے کا دیا تھا وہ اس سے کچھ وقت پہلے ہی تشریف لے آئے جس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ انہیں کسی اور اہم میٹنگ میں جانا تھا۔ یہ واقعہ تقریبات کے حوالے سے اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے کہ مہمان خصوصی تشریف لے آئیں اور مہمان تو کجا میزبان بھی غائب ہوتے ہیں۔ سینئر وزیر نثار کھوڑو نے وقت سے پہلے تقریب ہال میں پہنچ کر اچھی روایت کی بنیاد ڈالی۔ اس سے پہلے کہ میں تقریب کا حال مزید بیان کروں اس حوالے سے ایک مہمان کے بروقت پہنچنے کا واقعہ بیان کرنا ضروری ہے، 1980 کی بات ہے میری ایک کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ حکومت سندھ کے وزیر تعلیم سید غوث علی شاہ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ حکیم محمد سعید صاحب کو بھی اس تقریب میں دعوت دی گئی تھی۔ ابھی مہمان بھی نہ آئے تھے، میزابان بھی چند ہی تھے حکیم محمد سعید صاحب یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے کہ بھئی مجھے جو وقت دیا گیا تھا میں اس کے مطابق آگیا ہوں۔ ان کی بڑائی تھی کہ انہوں نے اس صورت حال کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ نثار کھوڑو صاحب کی جلد آمد سے مجھے حکیم صاحب یاد آگئے۔ ویسے ابھی کچھ لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے پائے جاتے ہیں جو وقت کے پابند اور اچھی روایات کا خیال رکھتے ہیں۔

نثار کھوڑو صاحب نے بھی اس صورت حال کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ بک شاپ کا افتتاح کیا، مختصر تقریر کی اور چلے گئے۔ تقریب کے اختتام پر جب میں نے محترم انوار احمد زئی صاحب سے سلام دعا کی تو انھوں نے بتایا کہ وزیر موصوف کا کہنا تھا کہ وہ طویل تقریر کے لیے کچھ لوگوں سات رکھتے ہیں آج میری جگہ انوار احمد زئی صاحب کئی گھنٹے تقریر کریں گے۔ وزیر موصوف کی جو بات ریکارڈ ہوئی وہ یہ کے نیشنل بک فاؤنڈیشن ملک میں کتاب کلچر کے فروغ کے لیے جو اقدامات کر رہا ہے یہ ایک اچھا قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں سستی کتاب فروخت کرنا بہت بڑی بات
ہے۔ فاؤنڈیشن اس خدمت پر قابل ستائش ہے۔ میں جب تقریب میں پہنچا تو پروفیسر انوار احمد زئی تقریر فرمارہے تھے۔ انھوں نے بھی نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اقدامات کی تعریف کی اور کتاب اور مطالعہ کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ انجمن ترقی اردو کی سیکریٹری محترمہ فاطمہ حسن نے بتایا کہ انجمن اور فاؤنڈیشن کے مابین کتاب کلچر کے فروغ کے حوالے سے کوئی ایگریمنٹ ہو رہا ہے جس کے تحت دونوں ادارے ایک دوسرے کی مطبوعات کی تشہیر اور فروخت میں کردار ادا کریں گے۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن کے موجودہ ایم ڈی جو پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں مصنفین میں اچھی شہرت کے مالک ہیں ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب نے تفصیلی ، گفتگو کی اور فاؤنڈیشن کے ماضی کے ساتھ ساتھ حال کا اچھا حال بیان

کیا اور مستقبل کے لیے سنہرے خوابوں کی ایک لمبی فہرست بھی بیان کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں یہاں آئے کوئی ایک سال ہی ہوا ہے اس ایک سال (2014-01-31) کے دوران انہوں نے فاؤنڈیشن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ سب سے اچھی بات جو انہوں نے کہی کہ یہاں آکر انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ ' میں نہ خود کھاؤں گا اور نہ کھانے دونگا' کاش یہ نعرہ ہماری بیورو کریسی، ہمارے حکمران اور سیاست داں بھی لگانے لگ جائیں بلکہ انعام الحق جاوید کی طرح اس پر عمل بھی کرنے لگ جائیں۔ جاوید صاحب نے فاؤنڈیشن کی آمدنی کی تفصیل بیان کی وہ حیران کن تھی کہ کوئی بھی سرکاری ادارہ کتابیں چھاپ کر اور بیچ کر کروڑوں میں بھی کما سکتا ہے۔ جب کہ وہ کتابیں سستی فروخت کرتا ہو۔ اور بہت سے باتیں جاوید صاحب نے کیں جو دل کو لگیں، وقت اجازت نہیں دے رہا کہ انہیں بیان کروں ۔ بس ایک چیز کی کمی کا احساس ہوا وہ یہ کہ فاؤنڈیشن کو قائم ہوئے 43 سال ہو چکے ، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اس کے پندھرویں ایم ڈی ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لیے سابقہ سربراہان کے صرف نام لکھ رہا ہوں یہ خراج تحسین ہے فاؤنڈیشن کے حوالے ان تمام سربراہان کو۔ یونس سعید اس کے اولین ایم ڈی تھے، پھر ڈاکٹر اے آر ملک ، اے کیو رضی الرحمٰن ، ارشاد احمد، محمد محسن، ڈاکٹر ڈبلیو ایم زکی، عبد الحفیظ اختر، احمد فراز، افتخار عارف، غیاث الدین احمد، محمد کاشف مرتضٰی، محمد اسلم راؤ، جاید اختر، مظہر الا سلام ، مظہر علی خان شامل ہیں۔ کاش جاوید صاحب اس ادارے کے سابقہ تمام نہ صحیح چند

معروف شخصیات جیسے معروف و محترم شاعر احمد فراز مرحوم کا ذکر ہی ہو جاتا تو اچھا تھا وہ فروری 1994 سے 21 جون 2005 تک اس کے ایم ڈی رہے۔ افتخار عارف بھی اس 2 کے سربراہ رہے۔ یہ ادارہ چند سال قبل نہیں بنا اسے قائم ہوئے 43 سال ہو چکے ہیں جاوید صاحب جب اس کے ایم ڈی بنے تو اس کی عمر 42 سال تھی۔ اس موقع پر اگر ان محترم شخصیات کا کو خراج تحسین پیش کر دیا جاتا تو اچھا لگتا احمد فراز کی روح بھی خوش ہو جاتی۔ چلیے ہو سکتا ہے کہ ایم ڈی صاحب سینئر وزیر کے جلد آ جانے سے کچھ اپ سیٹ ہو گئے ہوں اور ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہو۔ ایسی غلطیاں تو انسان سے ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ تقریر ماشاء اللہ انہوں نے خوب کی اور کرنی بھی چاہیے تھے۔ فاؤنڈیشن کی جس بلند و بالا اور خوبصورت بلڈنگ کے زیر سائع یہ تقریب منعقد ہو رہی تھی یہ عمارت قبلہ جاوید صاحب کے دور میں مکمل ضرور ہوئی لیکن اس کی تعمیر بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اس عمارت کی بنیادوں کو نیچے سے اوپر آتے دیکھا ہے۔ بک شاپس گو ان کا حال اچھا نہ تھا لیکن قائم تھیں۔ آپ نے جو بہتری اور اچھائی کے اقدامات کیے وہ لائق ستائش ہیں۔ اگر ہمارے دیگر اداروں کے سربراہان بھی آپ کے نقش قدم پر چل پڑیں تو ہمارے ملک کی تقدیر بدل جائے۔

زاہدہ حنا بھی بہت لیٹ تشریف لائیں۔ معزرت کے ساتھ مختصر تقریر کرتے ہوئے اپنا تعلق کتاب سے بیان کیا۔ وہ تو واقعی کتاب دوست، مطالعہ کرنے والی ہیں

تب ہی تو دھڑا دھڑ کالم دے مارتی ہیں۔ بغیر پڑھے لکھنا دشوار ہی نہیں نہ ممکن ہے شاعری کی اور بات ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں یہ نہیں مانتی کہ کتابیں نہیں پڑھی جاتی میں کہتی ہوں کہ کتابیں پڑھی جاتی ہیں لیکن انگریزی کی، وہ اس لیے کہ انگریزی میڈیم، اسکول والے بچوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ فلاں کتاب پڑھ کر آنا ہے۔ بچوں کو لائبریری میں باقاعدہ لے کر جایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سرکاری اسکولوں میں کتب خانوں کا برا حال ہے۔ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ذاہدہ حنا صاحبہ کی رائے سے میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ سرکاری اسکولوں میں کتب خانوں کا تصور ہی نہیں۔ اس کے برعکس انگریزی میڈیم اسکولوں میں باقاعدہ لائبریری سسٹم موجود ہے۔ کتب خانے کمپیوٹرائزڈ ہیں۔ ان میں پیشہ ورانہ اور نیم پیشہ ورانہ عملہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ سب سرکاری سطح پر کرنے کے کام ہیں۔ ہماری حکومتیں اقتدار میں آکر اقتدار کو بچانے میں تمام وقت صرف کردیتی ہیں۔ تعلیم اور پھر کتب خانوں یا کتاب کلچر کی بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ البتہ زبانی جمع خرچ خوب ہوتا ہے۔

سینئر وزیر کے چلے جانے کے بعد تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی تھے جو نظر آتے ہی ہیں پروفیسر اور بولنے میں ہیں وہ ماہر القادری۔ کیا خوب بولتے ہیں۔ مدھر آواز، سریلا پن، دھیمی لے کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی فیڈریشن کی کاوشوں کو سراہا انہوں نے کہا کہ اس

زمانے میں کتاب کی بات کرنا اور سستی کتاب بیچنا، بڑی بات ہے۔ کتب خانوں کا حال ابتر سے ابتر ہے۔ کتاب کی اہمیت اور ضرورت ہر دور میں رہی ہے، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے حکیم محمد سعید اور ان کے کتب خانے بیت الحکمہ کے حوالے سے ایک واقعہ یاد دلایا کہنے لگے کہ بیت الحکمہ کا افتتاح ہوا تو ہم حکیم صاحب کے ساتھ کتب خانے کا دورہ کر رہے تھے، ہر جانب کتابیں ہی کتابیں، سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک گوشہ ایسا بھی نظر آیا کہ جہاں الماریوں پر بعض معروف دانشوروں، مصنفین، علم و دانش کے نام بھی نمایاں طور پر لکھے ہوئے تھے۔ کتب خانے کے اس گوشہ کو دیکھ کر ڈاکٹر پیرزادہ نے اس کی تعریف کی۔ ڈاکٹر پیرزادہ کے مطابق حکیم صاحب نے سرگوشی میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کمال میرا نہیں بلکہ یہ ان دنشوروں کے ناخلق اولادوں کا ہے۔ جن کے والدین کتاب سے عشق کرتے ہیں اور زندگی انہیں جمع کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ جب وہ بوڑھے ہوجاتے ہیں یا اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں تو ایسی اولادیں اس قیمتی سرمائے کو اپنے گھر سے باہر نکال پھینکنا چاہتی ہیں۔ یا پھر وہ دانش ور جب یہ دیکھتا ہے کہ میری اولاد کو کتب سے کوئی رغبت نہیں میری آنکھ بند ہوتے ہی یہ کباڑی کو چلی جائیں گی تو وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ اس کا جمع کیا ہوا علمی سرمایا کسی ایسی لائبریری میں محفوظ ہوجائے جو کم ازکم فٹ پاتھ پر جانے سے محفوظ رہے۔ حکیم صاحب موصوف نے کہا کہ میں ایسے لوگوں کی تلاش اور فکر میں رہتا ہوں ان کا سراغ لگاتا رہتا ہوں جو بھی نظر

آتا ہے اس سے اس کا ذخیرہ علم خرید لیا یا پھر اس نے از خود عطیہ کر دیا۔ اس طرح بیت الحکمہ میں کئی بڑے بڑے عالم فاضل شخصیات کا علمی سرمایا محفوظ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ کہ کہنا تھا کہ میں بھی کتابیں جمع کرنے کا شوقین رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ اب میں بھی اسی فکر میں مبتلا ہوگیا کہ میرے علمی سرمائے کا کیا ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ یا تو میں بھی اپنی کتابیں کسی لائبریری کو دے دیتا دوسری صورت یہ تھی کہ میں اپنے اولاد کو کتاب سے محبت کرنے والا بنا دوں۔ چنانچہ میں نے اپنے بچوں کو مکمل اجازت دی کہ انہیں جو کتاب جتنے کی خریدنا ہوں آزادی سے خریدیں۔ ایسا ہی ہوا کہ میرے بچوں نے جب اور جتنے کی بھی کتب خریدیں میں نے کبھی روک ٹوک نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے بچے بھی کتاب سے محبت کرنے والے ہوگئے اور میں اس فکر سے آزاد ہوگیا ہوں کہ اب میرے بعد میرے علمی ذخیرہ کا کیا ہوگا۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے اپنی تقریر میں بتایا تھا کہ کراچی کے علاوہ کئی شہروں میں فاؤنڈیشن نے موبائل لائبریری جسے انھوں نے 'بکس آن ویل' کا نام دیا ہے کئی بسیں دور دراز کے شہروں، دیہاتوں میں جاتی ہیں، وہ چاہتے تھے کہ کراچی میں بھی دو بسوں کے لیے مہمان خصوصی سینئر وزیر سے درخواست

کریں گے کہ وہ اس کا انتظام کردیں لیکن وہ بہت جلدی میں آئے اور جلدی میں چلے گئے۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے وعدہ کیا کہ وہ

کراچی کے لیے دو بسوں کے حصول میں فاؤنڈیشن کی مدد کریں گے تاکہ یہ سہولت کراچی کے مضافاتی علاقوں کو بھی حاصل ہوجائے۔

کتابیں جمع کرنا میرا بھی مشن رہا ہے۔ اسکول کے زمانے سے ہی میں نے اپنی کتابوں کو سلیقے کے ساتھ سجا کر رکھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ گھر میں کوئی شیلف یا الماری نہیں تھی ۔ اس وقت میں نے اپنی کتابوں کو ایک تختے کے دونوں جانب اینٹیں رکھ کر شیلف بنایا اور ان پر کتابوں کو ترتیب سے رکھ لیا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد ایک کباڑیے سے پرانا شیلف خرید لیا اس میں کتابیں رکھنا شروع کیں۔ پھر ایک پرانی الماری خرید لی۔ آج سے چند سال قبل میرے اندر بھی یہ سوچ پیدا ہوئی کہ میرا ذاتی ذخیرہ علم کئی ہزار کتابوں پر مشتمل ہوچکا ہے۔ بچوں میں کتاب سے ایسا تعلق اور عقیدت نظر نہیں آتی کہ وہ میرے مرنے کے بعد انہیں اسی طرح سجائے رکھیں گے۔ اس کی ایک وجہ دونوں کا پروفیشن ہے۔ ایک ڈاکٹر ہے دوسرا دواؤں کی کمپنی میں سینئر ایگیزیکیٹو آفیسر اور وہ بھی سعودی عرب میں ۔ چنانچہ میں اپنی کتابوں کے حوالے سے پریشان رہنے لگا۔ یہ بات ایسی تھی کہ کسی سے شیر بھی کیا کرتا۔ جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ یہی بہتر جانا کے اب انہیں کسی ایک یا چند کتب خانوں کو عطیہ دیا جائے۔

اکثر لوگ کتابیں بیچ دیتے ہیں اور بعض کتب خانے ایسی کتابیں خرید بھی لیتے ہیں لیکن میں اپنی جمع کردہ کتابوں کو بیچنے کے حق میں نہیں تھا۔ چنانچہ ایک ہزار کے قریب کتب کراچی کے ایک عوامی کتب خانے کو عطیہ کردیں۔ ان کی عنایت کے انہوں نے میرے نام کی تختی کتب خانے میں لگائی۔ کئی ہزار کتب بہت سوچ بچار کے بعد وفاقی جامعہ اردو کے کتب خانے 'بابائے اردو مولوی عبدالحق میموریل لائبریری' گلشنِ اقبال کے کتب خانے کو عطیہ کردیں، وہ کتابیں اچھے طریقے سے الماریوں میں رکھ دی گئیں ہیں۔ الماریوں پر میرا نام بھی درج ہے۔ کچھ کتابیں میرپور خاص میں قائم 'ڈاکٹر یوسف میمن کے کتب خانے کو عطیہ کردیں۔ ان سے میری بہت پرانی دوستی ہے۔

تقریب کے اختتام پر چائے اور وائے سے مہمانوں کی تَواضُع کی گئی۔ شہر کراچی جو روز روز کے ہنگاموں، دھماکوں، چھاپوں کی زد میں رہتا ہے۔ احتجاج، جلسے، جلوس، ریلیاں یہاں کا معمول بن چکی ہیں، شاہراہوں پر پولس اور رینجرس بڑی تعدادا میں گشت کرتے نظر آتے ہیں۔ خوف کی اس فضاء میں کتاب کلچر کے فروغ کی باتیں کرنے کے لیے کسی بھی اجتماعی کوشش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں۔ اس خوف زدہ ماحول میں کتاب کی بات کرنا، مطالعہ کے فروغ کی بات کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی گھپ اندھیرے میں کوئی دیا جلا کر روشنی کردے۔ (21امارچ2015)

سرسید احمد خان۔ ایک عہد ساز شخصیت

(5 ذی الحج 1232ھ 17 اکتوبر 1817 ۔ 5 ذی قعدہ 1315 ھ 27 مارچ

(1898

سرسید پر لکھنے کے حوالے سے بابائے اردو مولوی عبد الحق کا کہنا تھا کہ 'اس عہد اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر سرسید کی زندگی کے کارناموں کی صحیح تصویر کھینچنا بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کام کا اہل بھی نہیں'۔ایک ایسا شخص جسے کئی سال سرسید کو قریب سے دیکھنے ، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہو ، لکھنے کی عمدہ ترین استطاعت رکھتا ہو اور پھر یہ کہ وہ سرسید کے مداح اور ان کے خیالات و نظریات سے ہم آہنگ بھی ہو اپنے آپ کو سرسید جیسی شخصیت پر لکھنے کا اہل نہیں سمجھ رہا تو میں کیا میری بساط کیا ، نہ ہی یہ میرا مقام ہے کہ میں علم کے اتنے عظیم مدبر، مصلح، مصنف، ہَمَہ داں وھمہ صفت، رہبر و رہنما، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی ، جدید علم کی ترسیل و تبلیغ کے مُخترع،ایک نقطہ نظر و تحریک کے مبدع شخصیت پر قلم اٹھاؤں۔ لیکن یہ بھی دستور ہے زمانے کا ، لکھاریوں کا، مورخین کا کہ وہ بساط بھر حصہ ڈالتے ہیں عظیم شخصیات کی عظمت کو اور زیادہ عظیم کرنے میں حالانکہ وہ تو پہلے ہی عظمت کی بلندیوں کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح عظیم لوگوں کو دیکھ لینا عظمت ہے اسی طرح عظیم شخصیات پر اپنی بساط کے مطابق قلم

کی روشنی کو روشن چراغ کے ایندھن میں شامل کر لینا ہی مجھ جیسے ہیچ مدان کے لیے بڑی بات ہے۔ مَیں تو علم و عمل کے اس کلاں کو ان کی 117 ویں برسی کے موقع پر خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سر سید احمد خان جو 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے 27 مارچ 1898 کو دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے رخصت ہوئے۔ سر سید کو جدائے ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن وہ مسلمانوں کے دلوں میں آج بھی موجود ہیں۔ ان کا علمی و تحریری سرمایا ہماری رہنمائی و رہبری کے لیے آج بھی موجود ہے۔ کسی شاعر نے سر سید کے لیے کیا خوب کہا۔

صورت سے عیاں جلالِ شاہی
چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سُپیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

سر سید جنھوں نے کمشنر کے دفتر میں نائب منشی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ذہین تھے منشی ہو گئے، پھر منصفی کے امتحان میں شریک ہوئے کامیاب قرار پائے اور منصف (جج) بن گئے۔ انصاف پسند، نڈر، بے باک، اپنے فیصلے پر قائم رہنے والے تھے چنانچہ بے شمار مخلوق کو انصاف فراہم کیا۔ اللہ نے سر سید سے اس کے علاوہ بھی بہت سے کام لینا تھا۔ 1876 میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور علی گڑھ کو اپنا مرکز و منبع بنایا۔ امپیریل کانسل کے رکن

ایجوکیشن کیمشن کے رکن اور پبلک سروس کمیشن کے رکن کی حیثیت سے خدمات ، انجام دیں۔ سرسید بنیادی طور پر مصنف تھے ، سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے لکھنے کا آغاز کر دیا تھا اور کئی کتابیں بھی لکھ چکے تھے۔ اسی زمانے میں انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ سرکاری ملازمت ان کے اصل مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ حالانکہ حکومت ان کی ایمانداری، سچائی، محنت سے کام کرنے کی دل سے قدر داں تھی یہی وجہ ہے کہ حکومت نے انہیں 'سر' کے خطاب سے نوازا اور اسی حوالے سے وہ سرسید' کے نام سے معروف ہوئے حالانکہ ان کا اصل نام 'احمد' ہے۔ اس کے باوجود' انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ آئندہ زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس میں سرکار انہیں برداشت نہیں کرے گی چنانچہ انہوں نے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور آزادی سے تصنیفی، تالیفی اور علم کے فروغ کی تحریک میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ سرسید ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی حیثیت میں جو کچھ لکھا وہ تو اپنے جگہ معیار و تعداد کے اعتبار سے منفرد ہے مسلمانوں میں علم کے حصول کی جو تحریک انہوں نے شروع کی اور انگریزی سیکھنے کا مشورہ دیا اس کی بنیاد بنا کر انہیں فتووں اور کافروں کا ساتھی قرار دیا گیا لیکن یہ مردآہن ، استقامت پہاڑ ثابت قدمی کے ساتھ ، لوہے کی لاٹھ اور چٹان کی طرح مضبوطی سے اپنے موقف

پر ڈٹا رہااور کامیاب و کامران رہا۔ایک وقت آیا کے لوگوں نے سر سید کی خیالات کی و نظریات کی نہ صرف تائید کی بلکہ انہیں وقت کی ضرورت قرار دیا اس طرح سر سید نے مسلمانوں کے لیے حصول علم کی جو تحریک شروع کی تھی اس میں وہ تنہا نہیں رہے بلکہ بڑی تعداد میں لوگ ان کے ہمنوااور ساتھی بن گئے۔ان کی مثال اس شعر کی مانند ہے

ے

میں آکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اپنے نظریے کو عام کرنے ، اپنی بات کو سمجھانے اور مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے سر سید نے اپنی تحریروں کا سہارا لیا۔ان میں تصانیف وتالیفات بھی ہیں اور اخبارت و رسائل میں شائع شدہ مضامین بھی۔وہ مسلسل لکھتے رہیے اور چھپتے رہے۔ان کی حیثیتوں کا تعین کرنا کہ ان کی خدمات میں سے سے زیادہ کسے مقدم رکھا جائے مشکل ہے۔وہ ہمیں منصف بھی نظر آتے ہیں، وہ مذہبی مصلح بھی دکھائی دیتے ہیں،جدید علم الکلام کی بنیاد ڈالی جس کی بناء بپر قرآن مجید کے مندرجات کو عقل و سائنس کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا، قومی رہنما تو وہ تھے ہی، تعلیمی خدمات میں انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ترقی کرنی ہے تو علم حاصل کرو۔سر سید بلا تفریق ہندوستان کے تمام لوگوں بشمول ہندو اور مسلمانوں کو یکساں تعلیم حاصل کرنے کے خواہ تھے۔اس دور میں وہ دونوں

قومیتوں کو ایک ہی نظر سے دیکھ رہے تھے ۔ پھر ان کی سوچ میں تبدیلی آئی اور انہوں نے مسلمانوں کو خاص طور پر تعلیم حاصل کرنے اور وہ اردو زبان کے لیے سوچنے لگے۔ سرسید انگریزی کے علاوہ فارسی، عربی اردو زساتھ ہی دینی علوم پر بھی دسترس حاصل تھی ۔ انہوں نے مسلمان مفکرین کے خیالات و نظریات کا مطالعہ کیا خاص طور پر صحابی، رومی اور غالبؔ کو پڑھا۔ سرسید جو دیکھنے میں مولوی لگتے تھے باوجود اس کے کہ انہیں دینی علوم پر بے انتہا دسترس حاصل تھی وہ ایک اچھے تیراک، پہلوانی کے ماہر اور دیگر کھیلوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔

انہوں نے مغلیہ دور کی عدالتوں کی ثقافتی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سرسید کے ادبی کارناموں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ان کی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی ہے وہ اپنے دور کے بڑے اور اعلیٰ مضمون نگار تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مضامین اور طویل مقالے انتہائی تحقیق و تدقیق، محنت و کاوش اور لیاقت و قابلیت سے لکھے ۔ اور اپنے پیچھے نادر و تحقیقی مضامین اور بلند پایہ مقالات کا یک عظیم الاشان ذخیرہ چھوڑ گئے۔ سرسید کے مضامین میں حقائق بھی ہیں اور ادبی لطائف بھی، سیاست بھی ہے اور

معاشرت بھی، اخلاقیات بھی ہے موعظمت بھی، مزاح بھی ہے طنز بھی، درد بھی ہے سوز بھی، دلچسپی بھی ہے دلکشی بھی، نصیحت بھی ہے سرزنش بھی الغرض ان کی تحریریں ہر موضوع پر لکھنے اور تحقیق کرنے والے کے لیے رہنمائی کا بہترین ماخذ ہیں۔ جہاں تک ان کی تصانیف وتالیفات کا تعلق ہے وہ تعداد اور معیار کے اعتبار سے مختلف شعبہ جات میں رہنمائی کررہی ہیں ان کی تصانیف وتالیفات میں 'تسہیل فی جر ثقیل' 1844، یہ کتاب ابو علی کے رسالے معیار الحق کا ترجمہ تھا، 'آثار الصنفادید' 1847، 'قول متین در ابطال حرکت زمین' 1848 اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے لیکن بعد میں سرسید یورپین فلسفہ کہ زمین سورج کے گومتی ہے کے قائل ہوگئے تھے۔ یہ تصانیف سرسید کی سائنسی موضوعات سے دلچسپی ظاہر کرتی ہیں، رسالہ راہ سنت وبدعت '1850، سلسلہ الا مملوک 1852، 'آئین اکبری' 1855، 'اسباب بغاوت ہند' 1858 'سرکشی ضلع بجنور' 1858، 'تبئین الکلام فی تفسیر التورات و انجیل' 1862، 'تبئین الکلام (بائیبل کی تفسیر) 1863، 'تزکِ جہانگیری' 1864 رسالہ احکام طعام اہل کتاب '1868، 'انگریزی میں تاریخ بغاوت بجنور' 1869، الخطبات الاحمدیہ' 1870، 'رسالہ تہذیب الاخلاق' کا اجراء 24 دسمبر 1870 سے '، 1872 یہ کتاب ڈاکٹر، 'On Hunter's our Indian Musalmans'، شروع ہوا ہنٹر کی کتاب کا جواب تھا جس میں ہنٹر نے مسلمانوں اور وہابیت کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ 'بغاوت ہند 1858 کے اسباب (انگریزی)، 1873، 'ذلا القلب

ذکر الا محبوب '1879، 'ازالہ الاذولا قرنین' 1889، 'طرقیم فی قصہ اشب الکھاف والا راقم' 1889 'خلاق الانسان الامافی القرآن' 1891, 'تفسیر الاجن والاجنا ن الامافی اقرآن' 1891، 'ابتالِ غلامی' 1893، جس میں سر سید نے ثابت کیا کے غلامی قدرت کے خلاف ہے اور آزادی اور غلامی دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ 'صراط فریدیہ' انتخاب الا خوانین یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ'، تاریخ فیروز شاہی، کلمتہ الحق،'، 1896, تحقیق لفظ نصاریٰ، 'خلاق الا انسان الامافی القرآن' قرآن کی تفسیر ستھرویں پارے تک لکھ پائے تھے کہ

انتقال ہوگیا۔اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ' کے نام سے جاری کیا۔

الطاف حسین حالؔی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا کہ سر سید احمد خان نے اپنی کتاب آئینِ اکبری' ۱۸۵۵ء میں مکمل کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ' ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جو ان کی اس علمی کاوش اور محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ سر سید نے مرزا غالبؔ سے رابطہ کیا کہ وہ اس کتاب کی تقریظ (اس وقت کی روایت کے مطابق ثنائیہ پیش لفظ) تحریر کردیں۔ غالبؔ نے سر سید کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ان کی کاوش کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ غالبؔ نے کتاب کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے طور پر ایک اصلاحی نظم لکھی جو فارسی میں تھی۔ سر سید نے اس تقریظ کو آئین اکبری میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ نظم سر سید کی کتاب آئینِ اکبری' کا پیش لفظ یا تقریظ ضرور ہے

لیکن اس کتاب کا حصہ نہیں۔ یہ دیباچہ یا مثنوی تعریفی نہیں بلکہ اس میں مصنف کی سرزنش بھی کی گئی اور بہت سے مفید مشورے غالبؔ نے سرسید کو دئے۔ دیباچہ نگاری کے سفر میں یہ اہم پیش رفت تھی اور غالبؔ کی جانب سے دیباچہ نگاروں کو یہ پیغام بھی تھا کہ دیباچہ یا تقریظ صرف ثنائی ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اصلاحی یا تنقیدی بھی ہو سکتی ہے۔

سرسید کا شمار ایسے ذہین اشخاص میں ہوتا ہے کہ جو خداداد صلاحیتوں کے مالک ہی نہیں بلکہ طبعی طور پر ذہین ہوتے ہیں۔ وہ جدید علم الکلام کے خالق تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بات کو، نظریات کو دلائل کے ساتھ، علم و فراست کی روشنی میں، قرآنی موضوعات کو سائنسی اصولوں کی روشنی میں بیان کرنے کے لیے تحریر کا سہارا لیا۔ وہ زبانی جمع خرچ کرنے والے انسان نہ تھے بلکہ ایک پریکٹیکل انسان تھے جو بات کہنا چاہتے اپنی تحریر کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاتے۔ وہ انسان کی بھلائی اور بہتری کے خواہش مند تھے۔ مسلمانوں کی ترقی اور آگے بڑھنے کے خواہش مند تھے۔ اس کے لیے انہوں نے بھرپور طریقے سے اپنے قلم کا سہارا لیا، اسے استعمال کیا اور کامیاب و کامران ہوئے۔ علی گڑھ تحریک کا فیض سے سے دنیا ایک طویل عرصے تک فیض حاصل کرتی رہے گی۔ سرسید کے قائم کردہ اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پاکستان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ علی گیرین ہونا ایک اعزاز تصور کیا جاتا

ہے۔ سرسید ہمہ گیر اور کثیرالاقسم خصوصیات اور اوصاف کے حامل تھے۔ ایسے لوگ دنیا میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ (26 مارچ 2015)

پاکستانی۔امریکن' پر مرتب تصنیف 'وہاب نامہ' ۔ایک مطالعہ '

تلخیص : یہ تحریر ایک پاکستانی محبِ وطن، کتاب دوست، شاعروں، ادیبوں، دانشوروں ، تخلیق کاروں اور لکھاریوں سے محب کرنے والے، تخلیقی عمل میں ان کے معاون، ادبی دنیا کی ہر چھوٹی بڑی شخصیت کے دوست، دردمند و ہمدرد، کتاب دوست و کتابدار، اردو دوست و اردو کی ترقی کی خواہشمند، ادب نواز، وادب پرور، عبدالوہاب خان سلیم کی شخصیت، علم نوازی وعلم دوستی پر ہندوستان کے شہر دہلی سے معروف شاعر وادیب وقارمانوی کی مرتب کردہ تصنیف 'وہاب نامہ' کا تجزیہ اور جائزہ ہے۔(ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی: صدر۔ہماری ویب ''رائیٹرز کلب''، پاکستان)

'وہاب نامہ 'کے عنوان سے ہندوستان کے معروف شاعر وقارمانوی کی مرتبہ کتاب نئ دہلی سے اسی سال 2015 میں منظر عام پر آ ئی ۔ اس کی ایک کاپی مجھے بھی بھجوائی گئ۔ کیسے ؟ یہ مجھے بھی نہیں معلوم ، رائیٹرز کلب کے میرے ایک دوست نے کہا کہ ایک کتاب آپ کے لیے آئی ہے جامعہ کراچی میں کسی کے پاس ہے ان سے لے کر آپ کو پہنچانا ہے۔کتاب ملی جس پر درج ہے 'ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کے لیے ، منجانب عبدا لوہاب خان سلیم ' ۔کتاب دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ تو وہی عبدالوہاب خان سلیم ہیں' جن کا خاکہ میں نے 2011 میں 'ایک کتاب

دوست' کے عنوان سے لکھا تھا اُس وقت مَیں جامعہ سرگودھا میں تھا۔ہاٹل میں رہائش تھی ، یہ مضمون وہیں پر تحریر کیا گیا تھا۔ یہ مضمون پاکستان لائبریری وانفارمیشن سائنس میں شائع ہوا۔ یہ خاکہ میری خاکوں پر مشتمل کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی'میں بھی شامل ہے۔ خاخوں کا یہ مجموعہ 2013 میں شائع ہوا تھا۔ یہ خاکہ اردو کی معروف ویب سائٹ' ہماری ویب' پر اور اب میری 'ای بک' جو ہماری ویب کے تحت قائم آن لائن (E-Book) 'رائیٹرز کلب' نے مرتب کی میں بھی شامل ہے۔ یہ' ای بک' ہوچکی ہے۔اس کا یو آر ایل

(http://hamariweb.com/articles/ebook/Dr-Rais-Samdani)

ہے۔'وہاب نامہ'میں شامل مضامین پر نظر دوڑائی تو میرا یہ خاکہ بھی اس میں شامل پایا اور زیادہ خوشی ہوئی۔ اُسی وقت ارادہ کر لیا کہ اس کتاب پر اپنی رائے تحریر کروں گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں چند دن بعد ہی ایک ماہ کے لیے سعودی عرب کے شہر جدہ آگیا۔ گزشتہ پانچ سالوں سے مجھے یہ سعادت مل رہی ہے کہ میں تقریباً ہر سال ہی یہاں آتا ہوں۔ بلاوے کی بات ہے۔ عمرہ وزیارت تو یہاں رہتے ہوئے زندگی کا لازمی حصہ ہوتا ہے میں یہاں لکھنے ، لکھانے کا عمل بھی جاری رکھتا ہوں، جو کام کرنا ہوتا ہے اس سے متعلق کتب اپنے ہمرہ لے آتا ہوں، لیب ٹاپ اب میرا ساتھی ہے۔ اس بار دیگر کتب کے علاوہ' وہاب نامہ' بھی میرے سفر میں میرا شریک تھا، سفر میں بھی اس کا مطالعہ کیا اور جدہ شہر میں ہی اس کتاب کے بارے میں یہ تحریر لکھی گئی۔

2013 کی بات ہے میں جدہ ہی میں تھا نیٹ پر اردو ویب سائٹ کی تلاش میں 'ہماری ویب' سے ملاقات ہو گئی، جہاں پر مضامین کا بھی ایک شعبہ قائم ہے جہاں پر لکھنے والوں مضامین ان کے نام کے تحت آن لائن ہوتے ہیں۔ میں بھی اس ویب سائٹ کا حصہ بن گیا اور یہاں سے جو مضمون سب سے پہلے ہماری ویب کو بھیجا وہ عبد الوہاب خان سلیم پر میرا لکھا ہوا خاکہ تھا جو آن لائن کر دیا گیا۔ بعد میں ہماری ویب نے 'رائیٹرز کلب' تشکیل دیا تو اس ناچیز کو اس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ رائیٹرز کلب کے مقاصد میں آن لکھنے والوں کی حوصلہ افزئی کرنا، برقی کتب تیار کرکے آن لائن کرنا بھی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی اولین کوشش 15 لکھاریوں کی ای بک ترتیب دی گئیں جن میں راقم الحروف کی ای بک بھی سرِ فہرست تھی۔ 8 اپریل کو ان برقی کتب کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی، معروف شاعر سحر انصاری اس کے مہمان خصوصی تھے۔ المختصر وہاب صاحب کا خاکہ اسی شہر جدہ سے 2013 میں آن لائن ہوا اور اب ان پر مرتب کی جانے والی کتب وہاب نامہ کا مطالعہ و تجزیہ بھی اسی شہر جدہ میں لکھا گیا اور آن لائن بھی ہوا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے وہاب خان صاحب کو اس سرزمین سے بے پناہ محبت و عقیدت ہے ویسے تو ہر مسلمان کی یہی خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے گھر خانہ کعبہ پر حاضری دے اور روضہ رسول ﷺ پر بار بار حاضر ہوتا رہے خان صاحب کئی سالوں سے ہر سال یہاں آتے ہیں عمرہ ادا کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں

اور اہل علم سے ملاقات کرتے ہیں۔ عبد الوہاب خان سلیم کا ذکر چھیڑنا لازمی تھا حالانکہ میرا موضوع 'وہاب نامہ' ہے اور وہاب نامہ ہے عبد الوہاب خان سلیم کی زندگی کی داستانِ حیات ۔ ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی نے درست لکھا کہ عبد الوہاب خان سلیم کا ذکر چھیڑیے تو یہ مصرع یاد آئے گا کہ :

''سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے''

وہاب نامہ' کے مطالعہ کے حوالے سے لفظ 'پاکستانی امریکن' میری یا کسی اور مصنف' کی اِختراع نہیں بلکہ وہاب صاحب نے اپنے ایک مکتوب بنام پروفیسر نگار سجاد ظہیر (صفحہ 99) میں از خود لکھا کہ 'مَیں پاکستانی امریکن ہوں'۔ میں نے خان صاحب کے اِسی جملے کو اپنی تحریر کے عنوان کا حصہ بنایا ہے۔ حالانکہ وہ صرف پاکستانی ہی نہیں بلکہ وہ' ہندوستان کے پاکستانی امریکن' ہیں ۔ اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں ، انہوں نے پہلے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی پھر پاکستان سے امریکہ کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے اپنے مضمون میں لکھا' عبد الوہاب خان سلیم نہ تو دانش ور ہیں نہ ہی حکیم و عبقری ، اس کے باوجود خان صاحب دانشوروں ، حکما اور عباقر کے چہیتے'۔ عظیم اختر نے اسی بات کو اس طرح کہا کہ 'اردو دنیا میں ایک ایسا اردو والا بھی موجود ہے جو بنیادی طور پر شاعر ہے نہ ادیب ،

پروفیسر ہے نہ نقاد، بس اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والا ایک عام سا اردو والا ہے، جس کو اردو رسائل وجرائد اور کتابیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے' ۔ وہاب صاحب اردو کی ہزاروں کتابیں امریکہ جیسے شہر میں جمع کر چکے ہیں جہاں پر لوگوں کو سر چھپانے کے لیے ایک کمرہ مشکل سے نصیب ہوتا ہے یہ شخص ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ کیے ہوئے ہے۔ یہ نہ صرف اپنے لیے کتابیں جمع کرتا ہے بلکہ دنیا میں جس کو کتاب کی ضرورت ہوئی اس نے اسے وہ کتاب اپنے خرچ سے پہنچانے کو اپنا فرض سمجھا۔ ہندوستان سے کتابیں پاکستان ور پاکستان سے کتابیں ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ کرنا اس فرشتہ صفت انسان کا محبوب مشغلہ ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری میں میری متعدد کتابیں اگر موجود ہیں تو صرف اور صرف اس شخص کی وجہ سے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہ کتابیں خرید کر وہاں پہنچائیں۔ ایسی صفات اور خصوصیات کا مالک دنیا میں شاید ہی پایا جاتا ہوں۔ تحفہ میں کتاب بھجوانا، کتاب ہی نہیں بلکہ دیگر چیزیں پہنچانا بھی اس شخص کا محبوب مشغلہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے عبد الواہاب خان سلیم کے خاکے میں لکھا کہ وہاب ''ہندوستان' پاکستان بلکہ یورپین ممالک سے کتابیں اور جرائد خریدتا اور پڑھتا رہتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اردو دنیا کے تمام اہل قلم سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھتا ہے۔ آپ پاک و ہند کے کسی بھی بڑے ادیب اور دانشور کا نام لیں، وہ وہاب کا دوست نکلے گا اور اس سے بھی بڑی بات.... جس کے لیے حوصلہ' ظرف اور زر کی ضرورت

ہے... یہ ہے کہ جو کتاب اسے پسند آجائے اسے خرید کر احباب اور معزز اہل قلم کو بطور تحفہ پیش کرتا ہے اور سنیے ... ابھی اور بھی بتانے کو بہت کچھ ہے۔ گرما کے آغاز میں نیویارک میں بیٹھے وہاب کی جانب سے روح افزا کی نصف درجن بوتلیں حاضر اور جولائی میں آم۔ خود شوگر کا مریض مگر دور بیٹھا احباب کی تواضع کا اہتمام کر رہا ہے''۔

عبد الوہاب خان سلیم کے ہم وطن قمر سنبھلی (ندوۃ العلما لکھنؤ، یوپی) نے اپنے مضمون ایک منفرد عاشقِ اردو اور علم دوست شخصیت' میں لکھا کہ ' وقار مانوی صاحب نے کچھ' اس ڈگر سے ہٹ کر کتابی صورت میں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا ہے جو نہ اپنی شاعری کے لیے جانی جاتی ہے نہ کسی افسانہ نگاری کی حیثیت سے اہل علم کے حلقوں میں موضوع گفتگو ہے۔ بلکہ جو اپنی علم دوستی، ادب پروری اور اہل علم کی قدر افزائی کے حوالے اور اردو کی ترویج واشاعت میں تن، من، دھن سے اپنی پوری توانائی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ صرف کر چکی ہے اور پیرانہ سالی کے باوجود جس کا اردو سے، اردو والوں سے، علم سے اور علم والوں سے عشق شباب پر ہے وہ عظیم ہستی ہے الحاج عبد الوہاب خان سلیم صاحب مدظلہ العالی کی جن کا وطنی تعلق تو یوپی کے ایک مردم خیز خطہ سنبھل مراد آباد سے ہے لیکن جو تقسیم ملک کے بعد

پاکستان ہجرت کر گئے اور پھر وہاں سے 1973 میں نیویارک امریکہ جا بسے اور اب وہیں سے اردو کی مخلصانہ خدمت میں مصروف ہیں۔'

مَیں عبد الوہاب خان سلیم پر لکھے گئے اپنے خاکے میں ان کی تمام تر خصوصیات، حالات و واقعات اپنے تعلق کے حوالے سے بہت تفصیل سے لکھ چکا ہوں یہاں ان پر مرتب کی جانے والی کتاب میرا موضوع ہے۔ کتاب کی سرِ فہرست خصوصیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ یہ پاک وہند کے نامور لکھاریوں کے تاثرات، افکار اور انعکاسات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی تدوین ہندوستان میں ہوئی، ایک معروف و معتبر شاعر نے کی اور ہندوستان ہی سے یہ کتاب اشاعت پذیر بھی ہوئی اس وجہ سے عبد الوہاب خان سلیم پر لکھنے والے احباب تعداد کے اعتبار سے ہندوستان سے زیادہ ہیں۔ یعنی 36 کا تعلق بھارت سے ہے جب کہ پاکستانی مصنفین بشمول راقم کے تعداد صرف 8 ہے۔ دو پاکستانی امریکن بھی ہیں۔ اس طرح مضامین کی کل تعداد 46 ہے۔

ادیب، دانشور اور شاعر ملکوں کی تقسیم سے ماورا ہوتا ہے، وہ صرف لکھاری ہوتا ہے خواہ دنیا کے کسی خطہ میں بھی رہائش رکھتا ہو۔ پاکستانیوں کے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ ایک پاکستانی کتاب دوست کے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اتنے دانشور عاشق ہیں۔ عبد الوہاب خان سلیم نے بھی ہندوستانی دانشوروں

ادیبوں اور شاعروں کو اسی طرح ٹوٹ کر چاہا جیسے انہوں نے پاکستانیوں سے تعلق روا رکھا۔ امریکہ میں بیٹھ کر دونوں ممالک کے دانشوروں سے جس طرح تعلق انہوں نے رکھا وہ قابل تقلید مثال ہے۔ اب جب کہ ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہے وہ رابطوں کے لیے موبائل تو استعمال کرتے ہیں لیکن روایتی خطوط نویسی کو وہ اب بھی ای میل طریقہ کار پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر کوئی عبدالوہاب خان سلیم کے خطوط پاکستان و ہندوستان کے دانشوروں کے نام کے حوالے پر تحقیق کرے گا تو اسے ہزاروں کی تعداد میں بے شمار اور معروف دانشوروں کے پاس ان کے خطوط مل جائیں گے۔ یقینا عبدالوہاب خان سلیم کے پاس بھی دنیا کے نامور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے خطوط بھی بڑی تعداد میں محفوظ ہوں گے۔ خطوط نویسی کا ذکر اس کتاب میں متعدد لکھنے والوں نے کیا ہے۔ بعض نے تو عبدالوہاب خان سلیم کے خطوط بھی نقل کر دیے ہیں۔ راقم کے نام بھی خان صاحب کا یک خط محفوظ ہے جو انہوں نے فروری 1983 میں امریکہ ہی سے لکھا تھا۔ میں نے بھی اسے ان کے خاکے میں نقل کر دیا ہے۔ وہاب صاحب مکتوب نویسی کے حوالے سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ خط لکھنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے، جواب نہ آئے تو گلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ خط لکھ کر جواب کے منتظر رہتے ہیں۔ امریکہ جیسے ملک سے موبائل پر گھنٹوں گفتگو کرنا منفرد مثال ہے۔ گفتگو کرتے وقت اس بات کا قطعناً خیال نہیں کرتے کہ فون پیسوں سے ہو رہا ہوتا ہے۔ جن دنوں میرا خاکہ چھپا انہوں نے کئی بار فون کیا اور بہت اطمینان اور طویل گفتگو کیا کرتے۔

ہاب خان سلیم نے از خود کیا لکھا، کہاں لکھا، کیسا لکھا، کیا وہ خود بھی لکھاری ہیں یا نہیں ؟ اس کی تفصیل کسی جگہ نہیں ملتی لیکن دنیا کے معروف اور بڑے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے قلم سے مخاطب کرنے والا، ہزاروں کی تعداد میں انہیں خط لکھنے والا خود لکھاری نہ ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ایک ایم اے تو انہوں نے مجھ سے دو سال قبل جامعہ کراچی سے کیا تھا۔ یہ بات ہے 1970-71 کی وہ سینئر اور میں جونیئر تھا، اس سے قبل انہوں نے اردو میں جامعہ پنجاب سے ایم اے کیا۔ تب ہی تو ان کے خطوط شائستہ اور نفیس جملوں سے آراستہ نظر آتے ہیں، لکھاریوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ جب ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ طویل ہوتی ہے ان کا لب و لہجہ شیریں، محبت ، احترام اور شائستگی سے بھرپور ہوتا ہے۔ ممکن ہے خان صاحب کسی بھی وقت اپنی آپ بیتی کا دھماکہ کردیں یا پھر اپنے کیے ہوئے بے شار حج و عمرہ کا سفر نامہ منظر عام پر لے آئیں۔ کیونکہ انہیں حج و عمرہ کے سفر ناموں سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ان کے پاس اس قسم کے جس قدر سفر نامے محفوظ ہیں شاید ہی دنیا میں کسی جگہ پر ہوں۔

وہاب نامہ میں ہندوستان کے متعدد نامور شاعر، ادیب اور دانشور شامل ہیں جب

کہ پاکستانی ادیب و دانشوروں نے بھی وہاب صاحب کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کتاب کے مرتب وقار مانوی نے کتاب کی تدوین کے لیے بطور خاص ہندوستان اور پاکستان کے احباب سے خان صاحب پر لکھنے کے لیے درخواست کی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین بطور خاص اس کتاب کے لیے ہی لکھے گئے ہیں۔ سید جمیل احمد رضوای جنھوں نے خان صاحب پر ایک کتاب بعنوان ' عبدالوہاب خان سلیم۔ پیکرِ جودو عطا'، بھی مرتب کی، وہاب نامہ کے لیے مضمون تحریر کیا۔ پروفیسر ایمریٹس عبدالحق، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے درست لکھا کہ ''معاش و مفاد کے دورِ ناہنجار میں قرطاس و قلم کی آبرو کا احترام اور حفاظت مردِ نیکو کار ہی کر سکتا ہے''۔ مرتب وقار مانوی نے اس مجموعے کو'' ایک علم دوست، ادب نواز کی شخصیت اور ان کے ادبی اور فلاحی کارناموں کا ایک اشاریہ کہا ہے''۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ 'وہاب خان سلیم کی شخصیت کے لیے کوئی کلیدی لفظ (یا ترکیب) تلاش کرنا چاہیں تو 'اہلِ کتاب' سے زیادہ موزوں ترکیب نہیں ملے گی، کتاب سے ان کا عشق دیرینہ بیماری کی طرح مزمن ہے'۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے وہاب صاحب کی شادی کی پچاس ویں سالگرہ کی رپورتاژ اچھوتے انداز میں تحریر کی ہے۔ وقار مانوی نے اسی موضوع کو دعائیہ مبارک باد نظم کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون ''دوستی کا گلِ سر سبز'' بہت پہلے لکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب عبدالوہاب خان سلیم کے ابتدائی دنوں کے ساتھی اور دوست ہیں۔ ان کا مضمون وہاب صاحب پر سیر حاصل مواد فراہم کرتا ہے۔ در حقیقت مجھے وہاب صاحب پر لکھنے کا حوصلہ ڈاکٹر سلیم اختر کے اسی مضمون سے ملا۔ سید معراج جامی کا مضمون 'دردِ دل کے واسطے پیدا کیا گیا وہاب کو' ۔ جامی صاحب کا مضمون بہت جامع متعدد لکھنے والوں کی آرا سے مزین ہے۔ اس میں تقریباً دس حوالے ہیں۔ یہ مضمون میرے مضمون کے بعد لکھا گیا کیونکہ اس میں جامی صاحب نے میرے مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے۔ وہاب خان سلیم پر دیگر لکھنے والوں میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، سید ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، تصور حسین جنجوعہ، پروفیسر سلیم قدوائی، پروفیسر خالد حسین خان، فیروز الدین احمد فریدی، پروفیسر توقیر احمد خان، ڈکٹر صلاح الدین دہلوی، ڈاکٹر تابش مہدی، مودود صدیقی، پروفیسر فیروز احمد، ڈاکٹر عطا خورشید، ڈاکٹر عقیل احمد، ابرار کرت پوری، نرگس سلطانہ، ڈاکٹر محمد شہاب الدین، ڈاکٹر معصوم شرقی، ڈاکٹر مفتی محمد عامر صدانی، مہر الٰہی ندیم، محمد عارف اقبال، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری، سہیل انجم، فاروقی جائسی، شمس رمزی، ڈاکٹر مشیر احمد، انور نزہت، راشد خلیل، تفسیر حسین، شفیق احمد، ماسٹر نثار احمد منیر انجم شامل ہیں۔

، مرتبِ کتاب وقار مانوی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایک کتاب دوست

اردو دوست، دانشور دوست، ادیب دوست کو خوبصورت انداز سے متعارف کرایا۔ کتاب ہر اعتبار سے قاری کو دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ عبد الوہاب خان سلیم کو بھی مبارک باد کے ان کی تمام زندگی کے سرمائے کو، محنت کو، علم وادب سے محبت کو، لکھاریوں سے محبت اور معاونت کو اچھے اخلاق اور اعلیٰ انسانی اقدار کو لکھنے والوں نے بھی اس کا جواب اسی جذبے سے، لگن سے، عقیدت سے، محبت سے دیا۔ اللہ تعالیٰ وہاب صاحب کی علم وادب اور ادیبوں کی خدمت کو قبول فرمائے اور ادیبوں کے اس جذبہ وہاب کو بھی شرف قبولیت کا درجہ عطا ہو۔ (23اپریل 2015، جدہ)

(اماں حوا کے شہر جدہ میں کچھ دن (سفر نامہ

(راقم الحروف 8 اپریل کو جدہ آیا تھا۔ جدہ میں مستقل قیام ہوتا ہے انشاء اللہ ایک ماہ قیام رہے گا۔ عمرہ کی سعادت حاصل کر لی ہے، اپنے نبی ﷺ کی خدمات میں سلام عرض کرنے مدینہ منورہ آئندہ دنوں جانے کا ارادہ ہے۔ پروردگار عمرہ قبول فرمائے اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کی توفیق بھی عطا فرمائے)

کلام مجید کی سورۃ النساء آیت نمبر ایک ترجمہ "اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلائیں"۔ مفسرِ قرآن حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا جیسے آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے۔ دُوسرے جاندار کا جاندار سے بلا طریقہ توالد متعارف پیدا ہونا جس طرح حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔اور تیسرے جاندار سے جان دار سے بطریقِ توالدِ متعارف پیدا ہونا جیسا اور آدمی آدم وحوا سے اِس وقت تک پیدا ہوتے آ رہے ہیں۔ اور فی نفسہٖ عجیب ہونے میں اور قدرت کے سامنے عجیب نہ ہونے میں تینوں صورتیں

برابر ہیں''۔

اماں حوا کی پیدائش کے بارے میں قرآن مجید کی سورۃ النساء کی اولین آیت میں لفظ نفس'' استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی 'نفس، جاندار، روح، شخص، پسلی، ہڈی کے لیے'' گئے ہیں۔ صحیح بخاری کی حدیث 7.114 ،جس کے راوی حضرت ابو حریرہ ہیں۔

آنحضرت محمد ﷺ نے فرمایا''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ عورتوں کا خیال رکھو، کیوں کہ انہیں بنایا گیا ہے ہڈی (پسلی) سے ،اور پسلی کے سب سے خم دار حصہ جو اس کے اوپر کا حصہ ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے ، یہ ٹوٹ جائے گی، اگر اسے چھوڑ دوگے ، یہ بدستور غم دار رہے گی۔ اس وجہ سے میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ عورتوں کا خیال رکھنا''۔ اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اماں حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے بنایا گیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالی نے جب حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کو دنیا میں اتار دیا تو تو دونوں مختلف جگہ تھے دونوں کی ملاقات عرفات کے میدان میں واقع پہاڑ (جبل رحمت) پر ہوئی۔ میں اپنی شریک حیات شہنازکے ہمراہ جبل رحمت پر تھا۔ کس قدر حسین منظر تھا۔ پہلے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہی جگہ ہے جہاں قیامت کے دن حشر کا میدان کھڑے پہاڑی کو تکے جا رہے تھے۔

خوبصورت منظر تھا، ساتھ ہی نور ہی نور پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے شوق و ذوق کے ساتھ جبل رحمت پر جا رہے تھے۔ کچھ اوپر چوٹی پر، کچھ اس سے نیچے اور ہم اس سے بھی نیچے تھے۔ جبل رحمت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نبی پاک پر آخری وہی اسی جگہ اتری۔ نیز زمین پر آدم اور حوا کی ملاقات اسی عرفات کے میدان میں واقع جبل رحمت پر ہوئی۔ اللہ اللہ کیا وقت ہو گا جب دنیا میں ہمارے بابا اور اماں زمین پر پہلی بار ملے ہوں گے۔ ہر سال حج کے موقع اللہ کے تمام مہمان میدان عرفات میں جمع ہوتے ہیں۔ اس وقت یہاں کا منظر مختلف ہوتا ہوگا، ہر جانب انسانوں کا ٹھاٹے مارتا ہوا سمندر، سر ہی سر لیکن اس وقت یہ جگہ مختلف نظارہ پیش کر رہی ہے۔ اطمینان ہے، سکون ہے، اسی میدان سے آگے کی جانب مسجد نمرا میں خطبہ ہوتا ہے۔ آج ہم نے اس مسجد کو بھی بہت ندیک سے دیکھا۔ عام دنوں میں یہ مسجد بند ہوتی ہے۔ آج بھی بند تھی اس کا دروازہ نمبر ۴ کھلا ہوا تو نہیں تھا لیکن وہاں کوریڈور میں نماز پڑھنے کی سہولت فراہم تھی یہاں آنے والے نفل ادا کرتے ہیں ہم نے بھی یہاں دو رکعت نفل ادا کی۔

علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے آنحضرت محمد ﷺ پر درود بھیجنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اور حضرت حوا کی بھی ولادت ہو گئی۔ اب آدم علیہ السلام نے اماں حوا کا قرب چاہا تو اللہ رب

العزت نے روکا ملائیکہ کو حکم دیا کہ رک جاؤ تمہارا نکاح کراتے ہیں ، نکاح کے بعد تم مہر ادا کرنا تب حوا تمہارے لیے آدم حلال ہوگی۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا پروردگار نکاح اور حجاب و قبول تو ٹھیک ہے لیکن مہر کیا دونگا؟ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "مدارج البنوت' میں بیان کیا اور بھی کئی انبیاء اولیاء اھل اللہ نے اسے اپنی کتب میں بیان کیا ۔آپ نے عرض کیا میرا مہر کیا ہوگا۔ تو باری تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے فرمایا کہ آدم تو اور حوا دونوں مل کر میرے مصطفیٰ پر 20 مرتبہ درود پڑھ لینا۔ دونوں نے تین مرتبہ یا 20 مرتبہ مصطفیٰ پر درود پڑھا تو حضرت حوا ھلال ہو گئیں۔

جدہ کے لغوی معنی عظمت وجلال کے ہیں یہ عربی زبان کا لفظ ہے ۔عربی میں جدہ کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ایک روایت کے مطابق تمام grandmother دادی' یا' انسانوں کی ماں 'اماں حوا' کی قبر مبارک جدہ کے ایک قبرستان میں ہے۔ جسے 'مقبرہ اماں' حوا کہا جاتا ہے۔ میں نے اس قبرستان میں حاضری دی۔ قبرستان بہت صاف ستھرا، تمام قبریں ایک ترتیب سے بنی ہوئی ہیں، ہر قبر پر نمبر ڈلا ہوا ہے۔ جہاں تک اماں حوا کی قبر کا تعلق ہے اسے مقفی رکھا گیا ہے۔ قبرستان میں خدمت انجام دینے والوں کو یقینا معلوم ہوگا لیکن وہ عام لوگوں کو اس قبر کے بارے میں نہیں بتاتے۔ کہا جاتا ہے کہ میں اماں حوا کی قبر کو بجری اور سیمنٹ سے محفوظ کر دیا گیا تھا اس کی وجہ یہ 1975 بیان کی گئی کہ

مسلمان بڑی تعداد میں قبر پر جانے لگے تھے۔ سعودی عرب میں رائج عقیدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگ قبر پر حاضری دیں اور فاتح پڑھیں۔ یہ صورت حال صرف اماں حوا کی قبر کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ یہاں ہر تاریخی قبرستان میں معروف اور اہم شخصیات کے قبروں کے نشانات مٹا دیئے گئے ہیں۔ایسا سعودی عرب میں رائج مسلک اس کی بنیاد ہے۔ یہاں قبروں پر کتبہ لگانے کا رواج نہیں اور نہ ہی مرنے والے کا نام قبر پر لکھا جاتا ہے۔ مکہ میں جنت المعلیٰ ، مدینہ میں جنت البقیع جیسے قبرستانوں میں کیسے کیسے عظیم المرتبت ہستیاں آسودہ خاک ہیں ان کی قبریں بے نام ونشان ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ اس قبرستان میں کون کون ابدی نیند سو رہا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا اعتراض اپنی جگہ لیکن سعودی اپنے اس عمل پر سختی سے قائم ہیں۔

اماں حوا کا شہر جدہ، سعودی عرب کا دوسرا بڑا شہر اور اہم تجارتی مرکز ہے۔سب سے بڑھ کر اس شہر کی انفرادیت، خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ یہ شہر اسلام کے مقدس شہروں مکہ المکرمہ اور مدینہ المنورہ کے لیے بنیادی گزرگاہ ہے۔ حجاج اکرم ، عمرہ پر آنے والے تمام تر زائرین جدہ کے شاہ عبدالعزیز انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ہی اترتے ہیں اور وہاں سے زمینی راستے پر سفر کرتے ہوئے مکہ اور مدینہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔جب تک سمندری راستے کے ذریعہ دنیا کے مختلف ممالک سے زائرین مکہ اور مدینہ کے لیے آیا کرتے تھے تب بھی

یہی اماں حوا کا شہر جدہ ہی ان کے پہلے قیام کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ شہر مکہ
اورمدینہ کے نذدیک جدہ ہی وہ شہر ہے جہاں بحر احمر یعنی Red See
کا ساحل اور اس پر بندرگاہ موجود ہے۔ بحر احمر کے ساحل پر موجود بندرگاہ ہی اماں حوا
کا لقب بھی حاصل ہے۔جدہ Gamma World City کے شہر کی بنیاد ہے۔اس شہر کو
کرنسی کے کاروبار کی وجہ سے اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ شیخ سلیم بن محفوظ اپنے زمانے
کے بہت بڑے کرنسی کے تبادلے کے تاجر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے سعودی عرب کو
معاشی ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

BC ماہرین ارضیات کی تحقیق سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اماں حوا کا شہر 'جدہ' 500
میں مچھیروں کی ایک چھوٹی سے بستی کے طور پر بحر احمر کے ساحل پر آباد ہوا۔اس
نے آباد کیا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین (Quda'a tribe) 'بستی کو یمن کے قبیلے 'قضاعة
نے یہ مطالعہ بھی پیش کیا ہے کہ اس مقام پر جہاں جدہ شہر واقع ہے پتھر کے زمانے کے
انسانوں کے قیام اور ان کی بود و باش کے آثار بھی پائے گئے ہیں۔۔بربری سیاح ابن
بطوطہ 1368-1304)) نے اپنے دنیا کے سفر کے دوران جدہ کا سفر بھی کیا۔ ابن
درج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکندر اعظم (Juddah) بطوطہ کی ڈائری میں جدہ کا نام
نے اس شہر میں قیام کیا تھا۔(Alexander the Great,356BC-323BC)
نے جدہ میں موجود بندرگاہ کو (ADخلافت راشدہ کے دور میں حضرت عثمانؓ (647
مسلمانوں کے لیے جو مکہ حج کے لیے آتے تھے کو استعمال کیا

اس وقت سے جدہ صوبہ حجاز کا بنیادی شہر قرار پاگیااور وہ مسلمان جو حج کے لیے پانی کے راستے آیا کرتے جدہ کی بندرگاہ پر آتے اور پھر دیگر سواریوں کے ذریعہ مکہ المکرمہ اور مدینہ المنورہ جایا کرتے۔ آج بھی جدہ شہر کو یہ فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ حج اور عمرہ کے لیے آنے والے جدہ ائر پورٹ پر ہی آتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ بحر احمر پر واقع ہونے اور متبرک شہروں کے لیے گزرگاہ کے طور پر استعمال ہونے کے باعث جدہ کو تاریخ میں اہم مقام حاصل رہا۔ فاطمین نے (969AD) میں مصر کا کنٹرول حاصل کیا اور اپنی حکمرانی کو حجاز اور جدہ تک وسیع کردیا ۔فاطمین نے اپنے تجارتی نیٹ ورک کو بحر احمر کے راستے بحر روم اور بحر ہند تک وسیع کیا۔ ان کے حکومتی روابط اور تجارت کو چین تک رسائی حاصل ہوئی جس سے حجاز کی معیشت کو ترقی حاصل ہوئی۔ 1171 میں یروشلم (Jerusalem) کی فتح کے بعد صلاح الدین ایوبی نے فاطمین سلطنت کو معزول کرتے ہوئے ایوبی سلطنت قائم کی حجاز بشمول جدہ ایوبی سلطنت کا حصہ قرار پایا۔ اسی سال یہ شریف ابن ابو الہاشم الطالب (1094-1201) کی سربراہی میں رہا۔ اس دور میں یہاں سنی مسلمانوں کا غلبہ رہا۔ ہر طرح کی ترقی ہوئی۔ تعلیم کے میدان میں نمایاں کام ہوا۔ اس دور میں یہ خطہ سندھ، جنوبی مشرقی ایشیاء، مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کے لیے جاذب نظر اور ملاحوں اور سمندری کے راستے سفر اور سیاحت کرنے والوں کے لیے پر کشش بن گیا تھا۔ ایوبی سلطنت کا اختتام 1254 میں ہوا اور حجاز مملوک سلطنت کا حصہ

قرار پایا۔ پرتگالی سیاح واسکوڈی گاما بھی یہاں سے گزرا۔ اس دور میں شہر کے گرد ایک حفاظتی دیوار تعمیر کی گئی جس کے آثار آج بھی قدیم شہر میں نظر آتے ہیں۔ پرتگالیوں سے مقابلے کے نتیجے میں 1517 میں ترک عثمانیوں نے مملوک سلطنت کو شکست دی اور کو فتح کر لیا۔ حجاز سلطنت جدہ اور مکہ پر مشتمل قائم ہوئی۔ عثمانیوں نےSyria مصر و کمزور دیوار کو1525 میں از سرِ نو تعمیر کیا۔ نئی ترکی دیوار چھ گھڑیالی ٹاوروں اور چھ مشرقی دروازہ تھا(Gate of Makkah)دروازون پر مشتمل تھی۔ ان میں مکہ دروازہ اور 'المغربیہ' دروازہ پورٹ کی جانب کھلتا تھا یہ مغربی دروازہ تھا۔ 'شریف دروازہ '(Gate of Sharif) شمال (ساؤتھ) دیگر دروازوں میں البنت(Al-Bunt)، اسے الشریف دروازہ بھی کہا جاتا تھا اور مدینہ ،(Gate of Al-shan) دروزہ شام نارتھ کی جانب کھلتا تھا۔ ترکیوں نے شہر کے سپاہیوں (Gate of Medina)دروازہ کے لیے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا تھا۔ 19ویں سینچری میں اوپر بیان کیے گئے ساتوں دروازوں کو ملا کر ایک دیو ھیکل گیٹ جس کے چار ٹاور تھے بنا دیا گیا تھا۔ ان دیو نما دروازوں میں شام دروازہ جو شمال کی جانب ، مکہ دروازہ مشرق کی جانب شریف دروازہ ساؤتھ کی جانب اور دروازہ مغربیہ سمندر کے ساحل کی جانب کھلتا تھا۔

خلافت عثمانیہ 1517 میں یہاں اپنا اقتدار قائم کیا جو دو سو سال سے زیادہ

عرصہ تک قائم رہا۔1745 میں عبدالوھاب کی وہابی تحریک پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی ۔ عثمانیوں نے میں مصریوں کے ساتھ مل کر وہابیوں کے خلاف تحریک شروع کی لیکن 1802 میں نجدی افواج نے عثمانیوں سے مکہ اورجدہ کا کنٹرول حاصل کرلیا۔جب شریف غالب آفندی نے سلطان محمد دوم کو اپنی اس فتح کے بارے میں مطلع کیا تو سلطان نے مصری وائسرئے محمد علی پاشا کو حکم دیا کہ وہ ان شہروں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کرلے۔ محمد علی نے 1813 میں جدہ کی جنگ کے بعد شہر کا قبضہ دوبارہ حاصل کرلیا۔پہلی جنگ عظیم کے دوران شریف حسین بن علی نے عثمانی ترک سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے شاہ حسین نے' مملکت حجاز' کے قیام کا اعلان کیا۔ابھی مملکت مستحکم بھی نہ ہوئی تھی کہ شاہ حسین بن علی کے تعلقات ابن سعود کے ساتھ خراب ہوگئے اوردونوں کے مابین جنگ شروع ہوگئی۔ابن سعود اس وقت نجد کا حاکم تھا۔ابن سعود کے مکہ شہرپر کنٹرول کے نتیجے میں حسین بن علی دسمبر 1924 کو مستعفی ہوگیااور اس کا بیٹا علی بن حسین حجاز کا نیا سربراہ بنایا گیا۔دسمبر1925 میں وہابی لیڈر ابن سعود نے سعودی مملکت پر قبضہ کرلیا۔ 1926 میں ابن سعود جو نجد کا گورنر تھا نے اپنے مرتبے میں اضافہ کرلیااور' شاہ حجاز' کے مرتبے پر فائز ہوا۔یہاں سے سعودی خاندان کی حکمرانی کاآغاز ہوا جو تا حال جاری ہے۔شاہ عبدلعزیز 1950 تک اس مملکت کے فرمانرواں رہے۔ان کے انتقال کے بعد شاہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشیں ہوئے۔جدہ کی وہ حیثیت بھی جاتی رہی کیوں کہ اس شہر

کو کئی حصوں میں منقسم کردیا گیا۔ اب جدہ سعودی عرب کے صوبے مکہ کا ایک اہم شہر ہے۔ 1928 سے 1932 کے درمیان جدہ میں شاہ عبدالعزیز کے نئے شاہی محل کی تعمیر کی گئی۔ 1963 کے بعد یہ محل شاہی مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔
سے اسے ریجنل میوزیم برائے آثار قدیمہ اور تراد نامہ (وصف اأعراق 1995 البشریہ) کے لیے مختص کردیا گیا۔ شہر کی قدیم حفاظتی دیوار اور دروازوں کو 1947 میں بے نشان کردیا گیا۔ 1982 میں لگنے والی آگ نے شہر کی قدیم اور یادگار عمارات جنہیں 'البلد' کہا جاتا ہے تباہ کردیا۔ لیکن ان میں سے بعض اب بھی موجود ہیں جیسے نفیس ہاؤس، گابل ہاؤس وغیرہ۔
جدہ اپنی قدیم تاریخی روایات کے ساتھ جدید بلند و بالا اور خوبصورت عمارات، کشادہ شاہراہوں ، طویل پلوں، بے شمار تعلیمی اداروں، حسین مساجد اور جدید رہائشی سہولتوں وسیع و حسین مالوں کے ساتھ سعودی عرب کا ہی نہیں بلکہ دنیا کا ایک مثالی شہر بن چکا ہے۔ یہاں سعودیوں کے علاوہ بے شمار غیر ملکی بھی آباد ہیں۔ میرا قیام جدہ کے جدید رہائشی علاقے 'حی الصفاء ڈسٹرکٹ 9 میں اپنے بڑے بیٹے عدیل کے پاس ہوتا ہے۔ گھر کے ہی نزدیک ہی 'مسجد ابی عبیدہ عامر بن الجراح' میں نمازیں ادا ہوتی ہیں۔ مسجد ائر کنڈیشن، خوبصورت قالین سے مزین ہے۔

جدہ میں رہتے ہوئے جدید شاپنگ سینٹرز کے علاوہ جدہ فاؤنٹین کو دیکھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا ضروری عمل ہوتا ہے۔ رات میں فاؤنٹین کا نظارہ بہت ہی دلفریب ہوتا ہے۔ جدہ میں قائم شاہ فہد فاؤنٹین کو دنیا کی سب سے اونچی فاؤنٹین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ جدہ فاؤنٹین کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ بحر احمر کے ساحل پر بنائی گئی یہ فاؤنٹین جدہ شہر کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔جدہ کا موجودہ ائر پورٹ 2006 میں تعمیر ہوا۔ یہ دنیا کے جدید ائر پورٹس میں سے ایک ہے۔ جدید سہولتوں سے آراستہ۔ اس ائر پورٹ میں سالانہ 17 ملین سے زیادہ مسافروں کو خدمات فراہم کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس وقت اس کے دو ٹرمینل ہیں ایک نارتھ جو غیر ملکی مسافروں کے لیے جب کہ ساؤتھ سعودی عرب یعنی داخلی مسافروں کے لیے ہے۔ عمرہ اور حج ٹرمنل ان کے علاوہ ہے۔ جہاں پر صرف عمرہ اور حج پر آنے والے
زائرین ہی آتے ہیں۔

مساجد کو خوبصورت سے خوبصوت تعمیر کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ اور طرّہ امتیاز رہا ہے۔ یوں تو دنیا کے ہر ملک میں حسین سے حسین مساجد موجود ہیں لیکن سعودی عرب میں مساجد کی تعمیر اور دلکشی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ہر مسجد اپنی جگہ متبرک ہونے کے ساتھ ساتھ حسین ہے لیکن اماں حوا کے شہر جدہ میں ایک مسجد ایسی بھی ہے جو پانی پر تیرتی مسجد (Floating Mosque) کہی جاتی

ہے، عام شہری اسے (Al-Rahma) ' ہے۔ دستاویزات میں اس کا نام 'الرحمہ مسجد فاطمۃ الزہرہ مسجد' بھی کہتے ہیں لیکن یہ پانی پر تیرتی مسجد کے نام سے زیادہ مشہور ' ہے۔اس طرح کی ایک مسجد ملائشیاء میں بھی موجود ہے لیکن جدہ کی یہ مسجد جدید طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلامی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مجھے اس مسجد میں نماز کی ادائیگی کا شرف حاصل ہوا۔

جدہ میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کا قیام ملک شاہ الفیصل کے دور حکومت میں 1967 میں عمل میں آیا۔ اسلامی شعار کے مطابق جامعہ ملک عبدالعزیز جدہ کے دو کیمپسز ہیں ایک طالبات (خواتین) کے لیے دوسرا مردوں کے لیے۔ دونوں کیمپسز ساتھ ساتھ ہیں لیکن دونوں کے تمام تر انتظامی اور تعلیمی امور علیحدہ علیحدہ انجام پاتے ہیں۔ دونوں کے درمیان اونچی دیوار پردہ کیے ہوئے ہے۔جامعہ عبدالعزیز جدہ کے اہم اور خوبصورت علاقے ''رحاب'' میں ایک وسیع و عریض قطعہ زمین پر واقع ہے۔ اس کے مغربی سمت مکہ روڈ ہے جو جدہ ائر پورٹ، مدینہ منورہ سے مکہ کی جانب جارہی ہے۔ راقم کو اس جامعہ اور اس کی وسیع لائبریری کو دیکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ جدہ میں اسکولوں، کالجوں، جامعات کے علاوہ میوزیم بھی ہیں۔ سرکاری میوزیم کے ساتھ ساتھ نجی میوزیم

بھی ہیں۔ ان میں جدہ میونسپلٹی میوزیم، عبدالرؤف خیل میوزیم،الطیب میوزیم،جدہ سائنس و ٹیکنالوجی میوزیم،خوزم میوزیم،جدہ ریجنل میوزیم (Jedda Regional Museam of Archaeology and Ethnography،نفیس ہاؤس اور (Human Heritage Musuam)ہیں۔

پاکستان انٹر نیشنل اسکول جدہ (انگلش سیکشن) ' جدہ کے خوبصورت علاقے رحاب میں واقع ہے۔ اس اسکول کا قیام محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے دوسرے دور حکومت میں 1995 میں عمل میں آیا تھا۔ اس کی عمارت وسیع، کشادہ، دلکش اور جاذب نظر ہے۔اسکول انگلش میڈیم ہے اس حوالے سے یہ کیمرج انٹر نیشنل پرائمری پروگرام اور (CIPP) سے الحاق شدہ ہے۔ میرا پوتا صائم عدیل بھی اس اسکول میں زیر تعلیم ہے اب وہ کلاس سوم میں ہے۔ اسکول میں بچوں کے والدین کاان کے اساتذہ سے ملاقات کا Parents Meeting اہتمام تھا یعنی تھی۔ ہم بھی ساتھ ہولیے۔ سوچا کہ اس بہانے اسکول کو اندر سے ہی دیکھ لیں گے۔ باہر سے تو اکثر دیکھا ہی کرتا تھا۔ اسکول کے چاروں طرف بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ پاکستان کے قومی پرچم کی تصویریں آویزاں ہیں۔ دیکھ کر اچھا لگا اور خوشی ہوئی۔ مرکزی دروازہ پر Rising Pakistan کا بورڈ آویزاں ہے۔جوں ہی ہم اسکول میں داخل ہوئے انتہائی خوشگوار احساس نے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان اور پاکستانیت اپنے عروج پر تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ اپنی بہاریں

دکھا رہا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم پاکستان کے کسی اچھے سے اسکول میں ہی ہیں۔ صاف ستھرا، روشن، ہوادار ماحول۔ ایک بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا Happy Saudi National Day، 23 اکتوبر سعودی عرب کا قومی دن ہے۔ اس دن سعودی عرب میں عام تعطیل بھی ہوتی ہے۔

جدہ شہر کا ساحل اور اس پر موجود ایکوریم اور ڈالفن مچھلیوں اور پانی کی بلیوں کا انوکھا، منفرد اور دلچسپ شو قابل تعریف ہے۔ ایکوریم ایک عام سے بات ہے ہر ملک، ہر شہر میں مچھلیوں کی خوبصورت اور نایاب اقسام کو ایکوریم میں قدرتی انداز سے شیشے کے گھروں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ کراچی کے ساحل پر بھی اس قسم کا ایکوریم موجود ہے لیکن جدہ کے ساحل پر موجود فقیہ ایکوریم ہر اعتبار سے عمدہ اور حسین ہے۔ اس میں مچھلیوں کی انواع و اقسام کا کیا کہنا۔ ہر رنگ، ہر سائز، بناوٹ اور جسامت کے اعتبار سے حسین و جمیل مچھلیاں یہاں رکھی گئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر مچھلیوں کو محض شیشے کے شوکیسو میں محفوظ ہی نہیں کیا گیا بلکہ ان شوکیسوں کو قدرتی رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ایکوریم میں ایک جگہ ایسی بھی آتی ہے کہ جہاں وہاں موجود لوگوں کے تین جانب دائیں، بائیں اور اوپر شیشے کے پیچھے رنگ برنگی، چھوٹی بڑی خوبصورت و حسین مچھلیاں ادھر ادھر لہراتی پھر رہی ہوتی ہیں۔ یعنی فرش کو چھوڑ کر تین جانب شیشہ گولائی میں اور شیشے کے پیچھے مچھلیاں چہل قدمی کرتی نظر آ رہی

ہوتی ہیں۔ اوپر کی جانب شیشہ اتنا ہی اوپر تھا کہ ہمارا ہاتھ بہ آسانی اس پر لگ رہا تھا۔ اس وجہ سے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ کوئی بڑی مچھلی ہمارے اوپر ہی آ جائے گی۔ یہ ایک حسین، دلچسپ اور دیدہ ذیب منظر تھا۔ شیر، ہاتھی اور دیگر جنگلی جانوروں کو انسانی حکم کے مطابق عمل کرنے کے عملی مظاہرے ہم نے بہت دیکھے لیکن ڈولفن اور پانی کی بلی کے ساتھ انسانوں کی دوستی اور ان کے کہنے کے مطابق عملی مظاہرہ جدہ شہر کے اس فقیہ ایکوریم میں موجود ڈالفن شو میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پانی کے حوض پول)کے ایک جانب پویلین بنا ہوا ہے جیسے اسکوئش کورٹ کے ایک جانب شائقین کے) لیے آڈیٹوریم بنا ہوا ہوتا ہے۔ ڈالفن شو کے لیے بھی اسی طرح کا سوئمنگ پول اور ایک جانب خوبصورت آڈیٹوریم بنا ہوا ہے۔ یہاں آنے والوں کی بھاری اکثریت اپنے بچوں کو اس منفرد شو سے لطف اندار کرانے آئی تھی۔ صاف ستھرے پانی کے حوض میں چھ ڈالفن موجود تھیں۔ کبھی کبھی اوپر بھی آتیں۔ اس حوض کے برابر ایک الگ حوض تھا جس میں چند پانی کی بلیاں ادھر ادھر مستا رہی تھیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد مچھلیوں اور بلیوں سے کرتب کرانے والے نمودار ہوئے، ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹوکریاں تھیں جن میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں۔ یہ مچھلیاں بلیوں اور ڈالفن کی خوراک تھی جو انہوں نے کرتب کے دوران انہیں کھلائیں۔ اب دو کرتب باز پانی کی بلیوں کے حوض کی جانب گئے اور کچھ دیر میں دونوں کے ساتھ ایک ایک پانی کے بلی چلی آ رہی تھی۔ سب نے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں

بلیاں سامعین کے سامنے لکڑی کے بنے ہوئے اسٹینڈ پر اپنے اگلے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنے منہ کو اوپر کی جانب کرکے سامعین کی تالیوں کا جواب دیا۔ دونوں بلیوں کے پاس ایک ایک کرتب باز موجود تھا۔اب انہوں نے ان بلیوں سے کرتب کرانے شروع کیے۔ ایک ایک کرکے بلیوں نے اپنے اگلے پیر سے سلام کیا، ہر عمل کے بعد کرتب باز ان کے منہ میں باسکٹ سے ایک ایک مچھلی نکالتا ان کے منہ میں ڈال دیتا۔ مچھلی کھانے کے لیے بلیاں اپنا منہ کھولتیں۔ باری باری بلیاں کرتب کررہی تھیں اور سامعین ان کو تالیاں بجا کر داد دے رہے تھے۔کچھ دیر بعد بلیوں کا شو ختم ہوا۔ اب ڈالفن مچھلیوں کا شو شروع ہوا۔ مائیک پر عربی دھن شروع ہوئی محسوس ہو رہا تھا کہ گانا بھی ساتھ میں گایا جارہا ہے۔ اس دھن کے ساتھ ہی ڈالفن مچھلیوں نے جو تعداد میں چھ تھیں پانی میں اچھل کود شروع کردی۔ جیسے وہ میوزک پر ڈانس کررہی ہوں۔ تین کرتب باز تھے ہر کرتب باز کے ساتھ دو دو ڈالفن تھیں ایک دائیں جانب دوسری بائیں طرف پانی میں ۔ مچھلیوں نے کرتب شروع کیے۔ سب سے پہلے پانی سے منہ نکال کر سامعین کو سلام کیا، کرتب باز نے باری باری ایک بانس سامنے کیا مچھلیوں نے باری باری اس بانس کے اوپر چھلانگ لگائی۔ حوض کے کافی اوپر گیندیں لٹک رہی تھیں مچھلیوں نے اوپر اُچک کر ان گیندوں کو چھوا، دو ننھی بچیوں کو لائف جیکٹ پہنا کر چھوٹی سی بوٹ میں بیٹھایا گیا ایک کرتب باز اس بوٹ کو بیچ حوض میں لے گیا جہاں چھ کی چھ مچھلیاں موجود تھیں، ہر مچھلی نے کرتب بازوں کے اشاروں پر بوٹ کے اوپر ایک

جانب سے دوسری جانب چھلانگ لگائی، ایک کرتب باز پانی میں کود گیا مچھلیوں نے اس کرتب باز کو پیار کیا، اسے پیچھے سے دھکا دیتے ہوئے حوض میں تیزی سے تیرایا، اسی طرح کے بے شمار کرتب ڈالفن دکھاتی رہیں کرتب باز کرتب پر ایک ایک چھوٹی مچھلی خوراک کے طور پر ہر مچھلی کے منہ میں ڈالتے اور وہ منہ کھول کر مچھلی نگل لیا کرتیں۔ ڈالفن کا یہ شو واقعی منفرد اور دلکش تھا۔ لطف آیا۔ڈالفن مچھلیوں کو کرتب بازوں نے اپنے اشاروں پر مختلف کرتب کرنا کس طرح سکھایا اور وہ خوبصورتی سے یہ کرتب کررہی ہیں۔ شو کے آخر میں ڈالفنوں نے اپنے منہ کو نیچے کرکے اپنی دم کو پانی سے باہر نکالا اور دیکھنے والوں کو دم ہلا کر سلام کیا۔ اس طر یہ شو اختتام کو پہنچا۔

سعودی عرب کا شہر جدہ جدید دنیا کا حسین شہر ہے۔ یہاں کی چوڑی چوڑی صاف ستھری شاہراہیں اور ان پر بڑی بڑی رنگ برنگی کاریں اور گاڑیاں اس شہر کے حسن کا احساس دلا رہی ہوتی ہیں۔ راقم کو گزشتہ چار سالوں میں پانچویں مرتبہ یہاں آنے اور رہنے کا اتفاق ہوا، اب تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میں اسی شہر کا باسی ہوں۔ البتہ زبان ہمارے اور یہاں کے مستقل باسیوں کے درمیان بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ حکومتی سطح پر عربی کو قومی زبان اور سرکاری طور پر رائج کرنے کی تجویز پر غور کیا گیا تھا لیکن اس پر کئی وجوہات کے باعث عمل نہ ہو سکا۔ کاش ایسا ہو جاتا تو جس طرح

ہمارا روحانی رشتہ مکہ اور مدینہ سے ہے یہاں کی زبان کے ساتھی بھی ہو جاتے۔ یہاں آ کر کام کرنے والوں کا سب.بڑا مسئلہ رابطے کا ہوتا ہے اور زبان کی وجہ سے بے شمار مسائل موجود رہتے ہیں۔ عربی زبان سے بھی ہمارا روحانی تعلق ہے۔ سر دست اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو اس شہر کے بارے میں اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ (24اپریل 2015)

کراچی این اے246 انتخابی معرکہ ،ایم کیو ایم نے میدان مار لیا

کراچی میں قومی اسمبلی کے حلقہ 246 میں ہونے والا ضمنی انتخاب اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ دودھ کا دودھ ، پانی کا پانی ہوگیا۔ کراچی کو فتح کرنے والی سیاسی جماعتوں کے مطالبہ پر یہ ضمنی انتخاب رینجرز کی نگرانی میں اور سی سی ٹی وی کیمروں کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ تحریک انصاف عمران خان نے ہار تسلیم کرکے انتہائی ہوش مندی، سیاسی.بردباری اور جمہوری انداز فکر کو فروغ دینے کی روایت کو آگے.بڑھایا ہے ۔جب کہ تیسرے نمبر پر آنے والی سیاسی جماعت جسے کئی سیاسی جماعتوں بشمول نواز لیگ، مولانا فضل الرحمٰن، سمیع الحق، سنی تحریک اور دیگر کی حمایت بھی حاصل تھی نے اس کے.برخلاف غیر جمہوری، غیر دانشمندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے 'میں نہ مانوں' والی پالیسی پر قائم رہنے کی نوید سنائی جو سیاسی و جمہوری اعتبار سے مثبت نہیں کہی جاسکتی۔

گزشتہ ایک ماہ سے جاری اعصاب شکن ماحول کا ڈراپ سین ہوگیا جس نے پورے پاکستان کے سیاسی حلقوں کو 246کے گرد ایسے جکڑا ہوا تھا کہ ہر جماعت، ہر سیاسی گروہ، ہر سیاسی ورکر کراچی کے اس ضمنی انتخاب کو نہ معلوم کیوں اس قدر اہمیت دے رہا تھا۔ جب بھی ٹی وی کھولیں ، کوئی سا بھی چینل سامنے آئے

بات کراچی کی، ایم کیو کی، الطاف حسین کی ہی ہو رہی ہوتی تھی۔ میڈیا نے اسے اور بھی زیادہ گھمبیر اور ایسی ہائپ کریٹ کر رکھی تھی کہ جیسے 246 میں ہونے والا معرکہ پاکستان میں کیا انقلابی تبدیلی لے آئے گا یا اس کے نتائج سے پاکستان میں سیاسی صورت حال تبدیل ہو جائے گی، شاید اس کے مختلف نتائج سے کراچی پیرس بن جائے گا، یہاں دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی، امن وامان کی صورت حال بدل جائے گی، ہر روز بے گناہ مرنے والوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، موبائل چھیننے کی وارداتیں ختم ہو جائیں گی۔ کیا پاکستان کے تین صوبوں میں امن ہے، کیا وہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں، امن وامان کی صورت حال تسلی بخش ہے، لوگ بے گناہ نہیں مارے جارہے، اغوا برائے تاوان کے واقعات نہیں ہو رہے، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، موبائل چھیننے کی وارداتیں نہیں ہو رہیں۔ پھر صرف کراچی کے حلقہ 246 سے یہ امیدیں کیوں لگائی جارہی تھیں۔ دراصل لکھنے والے اور ٹی وی پر بڑھ چڑھ کر گفتگو کرنے والوں کو اصل حقیقت معلوم تھی کہ اصل معاملہ کیا ہے، اس کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں۔ بعض سیاسی حلقے کیا چاہتے ہیں۔ پورے کراچی، حیدرآباد، سکھر اور دیگر شہری علاقوں کو تو چھوڑ دیجئے صرف اس ایک حلقے یعنی 246 کے انتخابی نتائج 1970 سے موجودی ضمنی انتخاب تک کی صورت حال پر ایک نظر ڈالیں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں سیاسی میدان کس کس نے مارا اور یہاں پر سیاسی معرکہ آرائی کرنے والوں کو لوگوں نے کس انداز سے لیا، کسے مسترد کیا

کسے کامیاب کیا۔

1970 کی دیہائی میں یہ حلقہ ڈبلیو32 کراچی 5 تھا، پورے پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی لیکن اس حلقے والوں نے پیپلز پارٹی کے مقابلے میں جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد کو اپنا امید وار منتخب کیا۔یہاں سے وہ 39ہزار ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے۔1977 کی دیہائی میں یہ حلقہ 186 کراچی 8784 تھا، اس انتخاب میں بھی اس حلقے کے لوگوں نے پروفیسر غفور احمد پر ہی اعتماد کیا جبکہ پورے پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی پیپلز پارٹی کے مقابلے میں جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد کو 55 ہزار139ووٹ ملے اور وہ کامیاب ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ اس دوران جب کہ پاکستان بھر میں بھٹو شہید کی حکومت تھی کراچی میں جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد اور پروفیسر محمود اعظم فاروقی مرحوم یہاں کے نمائندہ تھے۔اس وقت الطاف حسین ملک کی سیاست میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی مہاجر قومی موومنٹ وجود تھا، نہ ہی مہاجر کی بنیاد پر انتخابات میں کوئی سیاسی جماعت حصہ لیا کرتی تھی۔یہ دونوں قومی رہنماء کراچی کے ہر دلعزیز سیاسی رہبر ہوا کرتے تھے۔لیکن یہی وہ دور تھا کہ جب سیاست میں قومیت کا عنصر پیدا کیا گیا، یہ عنصر کوٹہ سسٹم تھا جس نے تفریق کا بیج بویا، ایک دوسرے کے خلاف زبان اور علاقے کی بنیاد پر لوگوں کو آمنے

سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں سے سندھ کے شہری علاقوں خصوصاً کراچی کی سیاست میں تبدیلی آئی ، لوگوں کی سوچ بدلنے لگی، نہ انصافی کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ لیکن ہمارے سیاست دانوں نے نفرت کے اس ناسور کا علاج کرنے کے بجائے اسے اور بڑھاوا دیا، لسانی بل پاس کرکے یہ پیغام دیا گیا کہ تم جو چاہو کر لو ہم تو وہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔ اب حلقہ 246 کے آئندہ ہونے والے انتخابات کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد یہاں کے باسیوں نے کسے سر پر بٹھایا اور کسے مات دی۔

اب کراچی کی سیاسی فضاء میں تبدیلی آئی، الطاف حسین کی طلبہ سیاست اور پھر ملکی سیاست میں پیدائش ہوئی ۔وہ سیاست کا طالب علم تو نہیں تھا لیکن سیاست اس کے خون میں رچی بسی تھی، کراچی کے ایک بڑے اور مخصوص طبقے کی محرومی ، ان میں پائی جانے والی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے اس پیدائشی سیاست کے کھلاڑی نے ایسی چال چلی کہ کراچی ہی نہیں بلکہ سندھ کے شہری علاقوں کے مکینوں کو اپنے سیاسی چکر میں ایسا جکڑا کہ وہ آج تک اس بھنور سے نکل نہیں سکے۔ یہاں تک کہ اس کے خلاف ریاست کی پوری مشینری لگا دی گئی، بار بار اسے پچھاڑنے کے طرح طرح کے حربے استعمال کیے گئے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں لیکن وہ تو سیاسی چٹان ثابت ہوا۔ 1988 کے انتخابات پھر 1990 میں یہ حلقہ الطاف حسین کے زیر اثر چلا گیا۔ یہاں سے ڈاکٹر عمران فاروق مرحوم دو بار بھاری اکثریت

سے کامیاب ہوئے۔ اس وقت یہ حلقہ 187 کہلاتا تھا۔ یہاں کے کچھ علاقے حلقہ 188 تھے اس جگہ سے ایم کیو ایم کے ایس ایم سلیم کامیاب ہوئے اور انہوں نے 31ہزار12 ووٹ حاصل کیے تھے۔1993کے عام انتخابات میں ایم کیو ایم حصہ نہیں لیااور انتخابات کا بائیکاٹ کردیتی ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت یہاں نہیں بنتی۔ وجوہات کا سب کو علم ہے۔اب ڈاکٹر عمران فاروق کا قتل ہوجاتا ہے ایم کیوایم1997 میں ان کے والد فاروق احمد کو ٹکٹ دیتی ہے وہ بھی اس حلقہ سے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتے ہیں انہیں 62ہزار621ووٹ ملتے ہیں۔ یہاں کے دوسرے حلقے سے ایم کیوایم کے حسن مثنیٰ ایک لاکھ 5ہزار323ووٹ لے کر کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ عمل اس صورت میں ہورہا ہوتا ہے جب الطاف حسین ملک سے باہر لندن میں بیٹھ کر اپنی جماعت کو چلارہے ہوتے ہیں۔

اکتوبر2002کے انتخابات میں ایم کیو ایم عزیز اللہ بروہی کو ٹکٹ دیتی ہے باوجود10 اس کے کہ یہ حلقہ اور علاقہ مخصوص زبان بولنے والوں کا ہے لیکن ایم کیو ایم کا امیدوار ہونا کامیابی کی دلیل تصور کی جارہی تھی ۔۔بروہی صاحب کامیاب ہوجاتے ہیں وہ 53 ہزار134ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ 18فروری2008کے الیکشن ہوتے ہیں، اس حلقہ سے سفیان یوسف ایم کیو ایم کے امیدوار ہوتے ہیں انہیں ایک لاکھ86ہزار933ووٹ ملتے ہیں اور وہ کامیاب قرار پاتے ہیں۔اب ہم آجاتے ہیں 11 مئی2013کے عام انتخابات کی جانب اس انتخاب میں ایم کیوایم پاکستان

پیپلز پارٹی سے ٹوٹ کر آنے والے رکن اسمبلی بلوچ سردار نبیل گبول کو اس حلقہ سے اپنا امیدوار نامزد کرتی ہے۔ نبیل گبول صاحب کو ایم کیوایم راس نہیں آئی حالانکہ انہیں اس حلقے سے 37 ہزار 824 ووٹ ملے۔ انہوں نے مئی 2013 سے کوئی مارچ تک یعنی دو سال اسلام آباد میں گزارے، حلقے میں آنا تو دور کی بات کراچی 2015 میں ہی نہیں آئے، سردار، شاہی مزاج، خاندانی رئیس بھلا ایم کیوایم کے جلسوں میں دریوں پر کیسے بیٹھ سکتے تھے۔ گھنٹوں الطاف حسین کا خطاب سننا ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ایم کیو ایم کو آگے جانے کی سواری سمجھا تھا۔ انہیں جانا آگے ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے وہ واپس پی پی میں بھی جا سکتے ہیں۔ زرداری صاحب سے بات بن نہیں رہی۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے زرداری صاحب نے سچ کہا کہ جو پیپلز پارٹی سے گیا وہ گمنامی میں چلا گیا۔ پیپلز پارٹی میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ یہی نہیں کیوایم میں بھی ایسے مثالیں ہیں کہ جن کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی، ہر روز ٹی وی شو میں فلسفی بنے گفتگو کیا کرتے تھے جس دن ایم کیوایم سے گئے بے نام ونشان ہوگئے۔ اس بات کا اشارہ خود الطاف حسین نے اپنی تقریر میں ان لوگوں کے نام لے کر کیا اور واقعی ایسا ہی ہے۔

اب تک کے انتخابات کی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے 23 اپریل 2015 کے ضمنی الیکشن کو دیکھیں تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ الیکشن کا رزلٹ یک سر الٹ

جائے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ الطاف حسین ان دنوں کئی معاملات جیسے عمران فاروق کیس، منی لانڈرنگ کیس اور رہی سہی کثر نائن زیرو پر رینجرز کے چھاپے، وہاں سے گرفتار ہونے والے ملزمان، سزا یافتہ قیدی، بھتہ خوری میں مطلوب لوگ اور نہ جانے کیسے کیسے گھناؤنے عمل کرنے والوں کی وہاں سے گرفتاری، غیر ملکی اسلحہ وغیرہ وغیرہ، اور اس کے نتیجے میں میڈیا کی جانب سے کی جانے والی طوفانی مہم، پاکستان کی ہر سیاسی جماعت کی جانب سے ایم کیو ایم پر تیروں کی بارش، کالم نگاروں کے ایم کیو ایم اور الطاف حسین کے خلاف نہ جانے کیسے کیسے الزامات اور تجزیے۔ سب سے بڑھ کر کپتان کو موقع مل گیا کہ وہ ایک بار پھر الطاف حسین کی کھل کر مخالفت شروع کردے اور کی، حالانکہ اپنے دھرنوں کے دوران اور اس کے بعد کپتان کو ایم کیو ایم اور الطاف حسین کے طرف سے چپ سی لگ گئی تھی۔ کیا یہ مصلحت تھی، وہ صرف گو نواز گو پر اپنی پوری توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ اب موقع مل گیا تھا، تحریک انصاف کا ہر کارکن شیر کی طرح دھاڑتا، ایم کیو ایم کو للکارتا نظر آنے لگا، جماعت اسلامی اور دیگر جماعتیں بھی یہی کچھ کرتی دیکھائی دے رہی تھیں۔ زرداری صاحب نے اپنے بندوں کو خاموش رکھا اور وہ اس پالیسی میں کامیاب بھی رہے۔ زرداری صاحب کے سابقہ دوست پیپلز پارٹی کے بے لگام سیاسی ورکر سابق وزیر داخلہ ذوالفقار مرزا نے اس دوران پر پرزے نکالے پریس کانفرنسیز کیں، بیانات بھی دیے لیکن وہ اپنی چال میں کامیاب نہ ہوئے۔

الیکشن کمیشن نے حلقہ 246 میں ضمنی الیکشن کا اعلان کر دیا اور 23 اپریل کو یہ میدان سجا، بے شمار سیاسی لوگوں، تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ الطاف حسین سخت دباؤ میں ہے، ایم کیو ایم میں دھڑے بنے ہوئے ہیں وہ کسی بھی وقت نعرہ تکبیر کہہ کر باہر آ سکتے ہیں۔ اس بات کے خواہشمند ان کے انتظار میں رہے، ناامیدی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ خیال تو یہ تھا کہ کپتان میچ جیت ہی جائے گا بلکہ الطاف حسین کو کلین بولڈ کر دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، کپتان اور اس کے ساتھی جو کراچی میں 23 اپریل کے میچ میں شامل تھے ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے۔ حالانکہ کراچی میں تبدیلی کی جانب ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی لیکن کپتان نے بعض ایسے بیانات دے ڈالے جیسے کہا کہ 'میں کراچی فتح کرنے جارہا ہوں' پتہ نہیں یہ بیان درست ہے یا غلط لیکن اس قسم کے بیانات اور کپتان کے فرنٹ فٹ پر کھیلنے والے کھلاڑیوں نے بعض اوچھے ہت کنڈے استعمال کیے جس سے اس حلقے کے لوگوں نے الٹا کپتان اور اس کی ٹیم کو ناک آؤٹ کر دیا۔ ایم کیو ایم کے امیدوار کنور نوید جمیل کو 93 ہزار ووٹ ملے جب کے کپتان کے امیدوار عمران اسمٰعیل کو 23 ہزار ووٹ ملے، جماعت اسلامی کے امیدوار راشد نسیم کو 9 ہزار ووٹ ملے۔ یعنی کپتان کے امیدوار سے ایم کیو ایم کے امیدوار کو 70 ہزار زیادہ ووٹ ملے اور جماعت اسلامی کے امیدوار سے 84 ہزار زیادہ ووٹ ملے۔ بھلا کوئی موازنہ ہے۔ اب تو ٹھپے لگانے کا الزام بھی نہیں لگایا

جاسکتا، جعلی ووٹنگ کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نبیل گبول کے الیکشن میں اس کے مخالف امیدوار احمد شرجیل کو 31 ہزار 874 ملے تھے۔ اس اعتبار سے ضمنی انتخاب میں ایم کیو ایم کے امیدوار کو زیادہ ووٹ پڑے اور مخالف امیدوار نمبر دو کو پہلے سے کم ووٹ ملے۔ باوجود اس کے کہ یہ الیکشن رینجرز کی نگرانی میں ہوا، اور ہر پولنگ اسٹیشن میں سی سی ٹی وی کیمرے بھی نصب تھے۔ دھاندلی اور جالی ووٹنگ کی جو شکایات سامنے آئی ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکست تسلیم کر لی۔ یہی سیاسی دانشمندی تھی۔ اب کپتان کے ساتھیوں کو بھی الیکشن کی گرمی سے باہر آ جانا چاہیے۔ کراچی یہاں رہنے والے تمام لوگوں کا ہے۔ الیکشن میں جو کچھ ہوا اسے بھلا کر عوام کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہیے۔ تمام سیاسی جماعتوں کو بھی جنھوں نے کسی مصلحت کے باعث ایم کیو ایم مخالف جماعت کی حمایت کی، حکومت کو بھی، سیاسی اور دیگر مقتدر اداروں کو بھی اس حلقہ کے رزلٹ کو تسلیم کرتے ہوئے ایم کیو ایم کے مینڈیٹ کو تسلیم کرنا چاہیے۔ سابق صدر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے صدر آصف علی زرداری نے درست کہا ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے مینڈیٹ کو تسلیم کریں اور باہمی رواداری اور برداشت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ (جدہ، سعودی عربیہ 24 اپریل 2015)

طائف کے پہاڑوں کے درمیان کچھ لمحات۔ سفر نامہ

طائف، سعودی عرب کے صوبے مکہ المکرمہ کا ایک خوبصورت شہر، مکہ کے بالکل .برابر پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔مکہ کی امہ القراء یونیورسٹی روڈ پر جہاں مکہ کی حدود ختم ہوتی ہیں طائف کی حدود کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ پہاڑوں کے درمیان خوبصورت وادی ہے جو اپنے اندر ایک تاریخ لیے ہوئے ہے۔قرآن کریم ہیںاللہ تبارک و تعالی نے مکہ اور طائف کو 'القریاتین' کہا ہے۔

طائف کے معنی 'طواف کرنے والا، خواب، رکھوالا، نگہبان اور پاسبان کے ہیں۔ یہ شہر 6 ہجری میں مکہ کے شمال میں کوئی سو کلومیٹر اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان بنو طاقف نے آباد کیا تھا۔ اس قبیلے کے لوگ اب بھی طائف کے باسی ہیں۔ یہاں کی آبادی 60 لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ انگور یہاں کا خاص پھل ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ نے طائف والوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے طائف کا سفر کیا تھا۔

طائف کی آب و ہوا خوش گوار، صحت افزا اور سرد ہے۔ یہاں آکر پاکستان کے پر فضاء شہروں مری، ایوبیہ، بارہ گلی، نتھیا گلی، سوات اور دیگر پہاڑ وں پر واقع شہروں کا احساس ہوتا ہے۔ فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان شہروں کو جانے والے راستے آج بھی قدیم ہیں جب کہ یہاں سعودی عرب کے

اونچے اونچے پہاڑوں پر قائم شہروں کو جانے والے راستے جدید طرز کی شاہراہوں، چوڑی چوڑی سڑکوں، خوبصورت درختوں اور چمکتی دمکتی بجلی کے کھمبوں پر لگی لائیٹوں سے آراستہ ہیں۔ان اونچے پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر رات کے کسی پہر بھی سفر کرتے ہوئے دن سے زیادہ حسن نکھار دکھائی دیتا ہے۔

سعودی عرب اپنی آمد کے بعد عمرہ کی ادائیگی کے علاوہ مقدس مقامات کی زیارت ہر مسلمان کے معمولات ہوتے ہیں ہمارے معمولات میں بھی یہ شامل ہوتا ہے۔ جہاں ہم از خود جاسکتے ہیں چلے جاتے ہیں اب کیونکہ کئی بار یہاں آنا ہوا ہے اس وجہ سے اکثر راستے جانے پہچانے ہوگئے ہیں البتہ دور دراز جگہ پر ہمارا بیٹا ہی ہمیں لے جاتا ہے۔ 13 دسمبر 2013ء نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد جدہ سے طائف کے لیے ہمارے سفر کا آغاز ہوا۔ شہناز (میری شریک حیات)، میرے بڑی بہو مہوش، پوتا صائم اور عدیل جو گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ اس سفر میں ہماری رہنمائی بھی کر رہے تھے۔ جدہ سے طائف جانے سے قبل مکہ تک کا سفر کرنا ہوتا ہے۔ اب یہ راستہ ہماری نظروں میں سماچکا تھا۔ بے شمار باراس راستے پر سفر کر چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ہم مکہ کی حدود میں داخل ہوگئے۔ شاہراہ مکہ پر رحل نما گیٹ سے حرم کی حدود کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس گیٹ پر آغازِ حرم تحریر بھی ہے۔ یہاں سے حرم چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ کچھ آگے جانے کے بعد ہماری منزل طائف کی جانب تھی۔ حرم کے لیے سیدھا جانا ہوتا ہے ہم دائیں جانب شاہراہ

جامعہ امہ القراپر مڑ گئے۔مکہ کی جامعہ امہ القرا کی خوبصورت عمارت ہمارے دائیں جانب تھی۔اس جامعہ اور اس کے کتب خانے کو دیکھنے کی تمنا تھی تاحال پوری نہیں ہوئی انشاءاللہ آئندہ کے پروگرام میں اس جامعہ کو دیکھیں گے۔عمارت دیدہ زیب اور، خوبصورت نظر آرہی تھی۔ یہ شاہرہ آگے جاکر شاہراہ طائف میں بدل جاتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔کچھ فاصلے پر مکہ کی حدود اختتام پذیر ہوئیں اور طائف کی سرزمین نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ گاڑی اوپر کی جانب رواں دواں تھی۔ دونوں جانب پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، ٹھنڈک کے احساس کے ساتھ سرد ہوا کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔ عدیل جو پہلے بھی طائف آچکے تھے ہماری رہنمائی کررہے تھے۔جیسے جیسے ہم پہاڑوں کی جانب بڑھ رہے تھے تیز ٹھنڈی ہوائیں بدن میں داخل ہوتی محسوس ہورہی تھیں۔ دونوں جانب رنگ برنگے پہاڑ قدرت کا حسین نظارہ پیش کررہے تھے۔ سفید بادل جھوم جھوم کر پہاڑوں سے بغل گیر ہورہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج بادل بھی طائف کے پہاڑوں سے ملاقات کے لیے آئے ہیں یا پھر یہ وقت ان کے یہاں آمد کا ہوتا ہوگا۔ سڑک کے کنارے جگہ جگہ لوگ اپنی فیملی کے ہمراہ گاڑی روکے ہوئے حسین نظاروں کا لطف لے رہے تھے۔ کھانے پینے کے ساتھ گرم گرم چائے ،کافی یا عربی قہوا لوگوں کو گرمارہا ہوگا۔

عصر کی نماز کا وقت ہوچکا تھا۔ جوں ہی مسجد نظر آئی ہم سب وہاں رک گئے۔ یہ

طائف کی وادی ' محرم ' تھی۔ مسجد کا نام 'مسجد المیقات قدیم ۔ وادی محرم ' تھا۔ مسجد کے دروازے پر اس کے قیام کا سال ۱۴۰۰ ہجری درج تھا۔ سعودی عرب میں مسجد شہر میں ہو، گاؤں یا دیہات میں ، پہاڑ پر ہو یا جنگل بیاباں میں ہر اعتبار سے مکمل، خوبصورت ، دیدہ زیب ، مکمل قالین اور ائر کنڈیشن ہوتی ہیں۔ یہ مسجد بھی ایسی ہی تھی۔ البتہ وضو کرنے کی جگہ پر صفائی کا فقدان نظر آیا غالباً اس کی وجہ مسافروں کا زیادہ تعداد میں یہاں آنا ہوگا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہم اُسی سڑک پر آگے چل دئے۔

دونوں جانب پہاڑوں کے درمیان طائف کی مختلف بستیاں آباد تھیں۔ یہ بستیاں اب قدیم زمانے کی نہیں تھیں بلکہ جدید طرز کی کئی کئی منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ تیز اور سرد ہوائیں اپنے عروج پر تھیں۔ شاید عدیل اور مہوش کو اندازہ نہیں تھا کہ طائف میں اس قدر سردی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے پاس سردی سے بچاؤ کا مکمل سامان نہیں تھا۔ اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس سے اپنے اپنے سر اور کانوں کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوشش یہ تھی کہ ہمارے کان اور ناک گرم کپڑے سے ڈھک جائیں ایسا کرنے سے سردی کا احساس کم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اب ہم نے بھی سڑک کے کنارے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، یہ طائف کے درمیان کی کوئی جگہ تھی، ہمارے علاوہ کئی اور لوگ بھی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کپڑا بچھا دیا

گیا۔ فٹ پاتھ صوفہ کا کام دے رہی تھی۔ بیٹھنا کس نے تھا۔ سرد ہوائیں جسم میں گھس رہی تھیں، ٹھنڈ سے ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ لیکن ہم نے بھی اس جگہ میں کچھ وقت گزارنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چائے اور دیگر کھانے کا سامان ہمراہ تھا۔ چائے جو کچھ گرم تھی نے خوب لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ اندر کچھ گرمی پہنچی ہے لیکن ہاتھ جسم سے جدا ہونے کی نوید دے رہے تھے۔ اس صورت حال میں بھی ہم طائف سے پورا پورا لطف لے رہے تھے۔

حسین سرد نظاروں کے ساتھ ساتھ میری سوچ اونچے اونچے پہاڑوں، بادلوں اور پہاڑوں کے حسین ملاپ کو دیکھتے دیکھتے اہل طائف کے اس سلوک پر جا پہنچی جو انہوں نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا۔ یہ بات تو حقیقت ہے کہ طائف کا نام آتے ہی ہر مسلمان کے دل و دماغ میں قدیم طائف کے لوگوں کا وہ سلوک یاد آ جاتا ہے جو انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ نبوت کے نو سال تک آپؐ مکہ میں خدا کے پیغام کو قوم کی ہدایت و اصلاح کی سعئی فرماتے رہے لیکن کم لوگوں کے ایمان لانے کے باعث کفار آپؐ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مستقل تکلیف پہنچا رہے تھے۔ آپ کے چچا ابو طالب مکہ کے مقتدر شخصیات میں سے تھے ساتھ ہی نیک دل لوگوں میں گردانے جاتے تھے وہ مسلمان تو نہ ہوئے تھے لیکن وہ آپؐ کی ہر طرح مدد کیا کرتے۔ نبوت کے دسویں سال ابو طالب وصال فرما گئے تو مکہ کے کفاروں کو اور بھی زیادہ شہ مل گئی اور انہوں

نے آپؐ کے ساتھ اور بھی خراب سلوک شروع دیور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک حیات حضرت بی بی خدیجہؓ بھی وفات پاچکی تھیں۔اب مکہ میں آپ کے لیے مشکلات بڑھ گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام اہل طائف کو پہنچانے کا قصد کیا۔ اس موقع پر آپ کے ہمراہ زید بن حارثؓ تھے۔طائف سے آپ ﷺ کا ایک تعلق یہ تھا کہ آپ ﷺ کی والدہ حلیمہ سعدیہ طائف کے قبیلے بنی سعد سے تعلق رکھتی تھیں۔اس وجہ سے بھی آپ ﷺ نے طائف میں جانے اور انہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔آپ ﷺ کا خیال تھا کہ اگر طائف کے لوگ ایمان لے آتے ہیں تو مسلمانوں کو ان مشکلات سے نجات حاصل ہوجائے گی۔ طائف بلند و بالا پہاڑوں کی وادی تھی۔ نبی ﷺ نے اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے طائف کا قصد کیا، زید بن حارثؓ آپ کے ہمراہ تھے۔

طائف پہنچ کر آپ نے طائف کے سرداروں اور مقتدر شخصیات کو اپنے مقصد سے آگاہ کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام اہل طائف کو پہنچایا تو وہ آگ بگولہ ہوگئے ۔انھوں نے عرب کی مہمان نوازی کی روایات کے برخلاف آپ کے ساتھ سلوک کیا۔آپ ﷺ نے طائف میں کئی مقامات پر لوگوں کو سمجھانے اور اللہ کے پیغام سے انہیں آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے آپؐ کی ایک نہ سنی۔جب آپؐ واپس ہونے لگے تو وہاں کے کچھ نوجوان اپنے بڑوں کے اکسانے پر اس قدر آپے سے باہر ہوئے کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آوازیں کسیں، تالیاں

بچائیں، یہاں تک کہ آپؐ پر پتھروں کی بارش کر دی۔ جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر خون میں تر گیا یہاں تک کہ خون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاو ں مبارک تک پہنچ گیا۔ بعض جگہ لکھا ہے کہ آپؐ بیہوش بھی ہو گئے۔ اس کیفیت میں ﺡ حضرت زید بن حارثؓ کے سہارے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیچے کی جانب ایک جگہ پناہ لی۔ تاکہ اپنی تکلیف کے احساس کو کم کر سکیں۔ حضرت زید بن حارثؓ کے حوالے یہ روایت جسے ڈاکٹر محمد عبد الحئی نے اپنی کتاب 'اُسوہ ﺡ رسولِ اکرمؐ' میں نقل کیا ہے کہ 'میں حضور ﷺ کا ہمسایہ تھا جب حضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ مجھے بلاوا بھیجتے میں حاضر ہو کر اس کو لکھ لیتا تھا'۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے آپ ﷺ کو حضرت زید بن حارثؓ سے خاص محبت تھی۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ طائف کے سفر میں صرف انہیں ہی اپنے ہمراہ لیا، حالانکہ نو سالا دور نبوت میں مکہ میں متعدد صحابہ اکرام اور قریبی ساتھی موجود تھے۔ یقینا اس میں اللہ کی مصلحت تھی کہ آپ نے طائف کا یہ سفر صرف حضرت زید بن ثابتؓ کے ہمراہ ہی کیا۔ حضرت زید بن حارثؓ کا حافظہ بھی بلا کا تھا، کم عمری ہی میں آپ نے قرآن مجید کے کئی پارے حفظ کر لیے تھے۔ جیسے جیسے آپ احادیث لکھتے وہ انہیں از بر بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آ نحضرت ﷺ کے بعد بھی چاروں خلفاء کے قریبی ساتھیوں میں رہے۔

خداوند قدوس کی شان قہاری کو اس پر جوش آیا اور جبرائیل امین نے آپکی کی خدمات میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا اور کہا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کی قوم کی وہ تمام گفتگو اور وہ عمل سنا اور دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو بھیجا ہے، جس کا کام پہاڑوں کی خدمت ہے۔ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ اُس فرشتہ نے آپ ﷺ کو سلام عرض کیا کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں تاکہ یہ لوگ ان پہاڑوں کے درمیان آکر اپنے انجام کو پہنچ جائیں اور کچل جائیں۔ یا جو سزا بھی آپ ان کے لیے تجویز کریں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو پورے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے کو یہ گوارہ نہ ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُسے منع فرماتے ہیں۔ کفارانِ طائف کے اذیت پہنچانے کے باوجود اس وقت آپ ﷺ نے جو دعا مانگی وہ کچھ اس طرح سے تھی۔ ترجمہ:۔

اے اللہ میں اپنے ضعف اور، بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی تحقیر اور بے" سروسامانی کی فریاد تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین ! اے درماندہ ناتوانوں کے مالک ! تو ہی میرا رب ہے۔ اے میرے آقا ! تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے بیگانوں کے جو ترش رو ہوں گے یا دشمن کے جو میرے نیک و بد پر قابو رکھے گا۔ لیکن جب تو مجھ سے ناخوش نہیں ہے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں، کیونکہ تیری عافیت اور بخشش میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات پاک کے نور کی پناہ چاہتا ہوں، جس سے آسمان روشن ہوئے اور جس سے تاریکیاں دور ہوئیں اور دنیا و

آخرت کے کام ٹھیک ہوئے۔ تجھ سے اس بات کی پناہ چاہتا ہوں کہ مجھ پر غضب نازل کرے یا تیری ناخوشی مجھ پر وار عتاب کرنے کا تجھی کو حق ہے اور تجھ کو منانا ہے حتیٰ کہ تو راضی ہوجائے اور تیری مدد اور تائید کے بغیر کسی کو کوئی قدرت نہیں' (تاریخ طبری جلد 2، ص 81)۔ اس واقع کے بعد آنحضرت ﷺ طائف سے واپس ہوئے اور پھر فرمایا: "میں ان لوگوں کی تباہی کے لیے کیوں دعا کروں۔ اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ضرور اللہ پر ایمان لانے والی ہوں گی"۔ آپ کی یہ دعا قبول ہوتی ہے اور اسلام قبول کرنے والوں میں طائف مدینہ کے بعد دوسرا شہر قرار پاتا ہے۔ آج طائف میں ہر شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا چاہنے والا ہے۔ اسلام کا بول بالا ہے۔

اس واقع کے ذہن میں آتے ہی مجھے یہ خیال بھی آیا کہ یہ پہاڑ جو اِس وقت میری نظروں کے سامنے ہے وہی پہاڑ تو نہیں کہ جس کے دامن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے۔ اس پہاڑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تکلیف میں دیکھ کر کس طرح اپنے آپ کو قابوں میں رکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے یہ وہی پہاڑ ہو کہ جس پر میں اس وقت بیٹھا ہوا ہوں آپ کا خون مبارک بہا ہو۔ ہر صورت میں وہ پہاڑ بھی اس وقت میری نظروں کے سامنے تھے جن جن کے دامن میں آپ ﷺ نے اہل طائف کو اسلام کی دعوت دی تھی ۔ یقیناً ان پہاڑوں کو آنحضرت ﷺ نے دیکھا ضرور ہوگا جن

پر آج میری نظریں بھی ہیں۔آج میں اس سرزمین پر بیٹھا ہوں جس پر میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر کھا کر، زخمی ہو کر، خون بہ خون ہو کر اہل طائف کو دعا ہی دی۔ اسی شہر طائف میں آج نبی صلی اللہ پر علیہ وسلم کے دین کا بول بالا ہے۔ مسجدوں کا ایک وسیع جال اس شہر میں بچھا ہوا ہے۔ پانچ وقت اذان کی صدائیں گونجتی ہیں تو ہر قسم کا کاروبار بند ہو جاتا ہے لوگ مسجدوں کا رخ کرتے ہیں اور اللہ کا حکم بجا لاتے ہیں۔

باغ یا قطعہ زمین یا گھر جہاں حضور ﷺ نے زخمی حالت میں کچھ دیر قیام کیا تھا طائف کے شائیبہ اور عتبہ نامی سرداروں کا تھا۔ وہ اس صورت حال کو اس وقت دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اظہار ہمدردی کے طور پر اپنے ایک عیسائی کسان 'عداس' کو انگوروں کا ایک خوشہ دے کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ عداس اپنے آقاؤں کا حکم بجا لاتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انگوروں کا خوشہ آپؐ کی خدمات میں پیش کیا۔ عداس کا تعلق نینوا کی سرزمین سے تھا۔ نینوا جو اب عراق میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ وسلام کو اس سرزمین میں اپنا پیغام دے کر بھیجا تھا۔ عداس نے جب آپ ﷺ کو دیکھا اور گفتگو کی تو اسے اپنے خاندان کے بڑوں کی کچھ باتوں کا خیال آیا وہ سمجھ گیا کہ یہ اللہ کے نبیؐ ہیں ۔ اس نے اُسی وقت کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ طائف میں اس جگہ جہاں آنحضرت ﷺ نے زخموں کی حالت میں قیام کیا تھا اور عداس نامی عیسائی نے

اسلام قبول کیا تھا یہاں ایک ' مسجدِ عداس ' بنادی گئی ہے۔ ہماری کوشش تھی کہ مسجد عداس کو تلاش کریں لیکن رات شروع ہو چکی تھی ۔ رات کے اندھیرے اور پہاڑوں کے درمیان مسجد عداس تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ ہم طائف میں بہت آگے کی جانب جاچکے تھے بہت ممکن تھا کہ وہ مسجد ہمارے آس پس ہی موجود
ہوگی۔طائف میں ایک مسجد عبد اللہ بن عباس کے نام سے بھی ہے جو قدیم مساجد میں سے ہے۔ مرکز بنی سعد بھی قائم ہے اس کے علاوہ طائف سے الہٰی کی جانب جائیں تو 60 کلومیٹر کے فاصلے پر بنی سعد کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ حلیمہ سعدیہ طائف کے بنو سعد قبیلے سے تعلق رکھتی تھی ان کا گھر اسی جگہ تھا جو اب بے نام ونشان ہوچکا ہے اس طرح کی بے شمار تاریخی و نادر چیزوں، متبرک مقامات کو محفوظ کرنے کے بجائے انہیں ختم کردیا گیا۔

پہاڑوں کے درمیان کی کھلی ہوئی ٹھنڈی اور روشن فضاء اندھیری رات میں تبدیل ہونا شروع ہوچکی تھی ، سردی نے بھی ہمیں مجبور کردیا کہ ہم اب یہاں سے اُٹھ جائیں اور واپسی کی راہ لیں ۔ گاڑی میں ہیٹر چلا تو جان میں جان آئی۔ اب ہم طائف سے واپسی کے سفر پر تھے۔ طائف شہر کی بلند و بالا عمارتیں ہمیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں،اور ہم پہاڑوں کے درمیان تیز رفتاری سے نیچے کی جانب رواں دواں تھے۔ مغرب کی اذان ہوئی ہم نے پھر ایک مسجد کے سامنے گاڑی پارک کردی۔ یہاں ہر مسجد میں خواتین کے لئے نماز کی جگہ علیحدہ ہوتی ہے۔ طائف کی

یہ مسجد کشادہ، حسین ، صاف ستھری تھی۔ نماز پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ مسجد کے ساتھ ہی چھوٹا سا بازار بھی تھا اسے دیکھا، ٹوپیاں اور صائم کو دستانے دلوائے اور واپس ہوئے۔ راستے میں پھلوں کی بہت بڑی مارکیٹ تھی ۔ دکانوں پر تمام طرح کا فروٹ خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ خوبصورت روشن قم قموں نے اس جگہ کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کیا ہوا تھا۔ کچھ پھل خریدے اور واپس ہوئے۔ اب مکمل اندھیرا ہوچکا تھا ہمارا سفر جاری تھا۔ سڑکیں کشادہ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لائیٹیں لگی ہوئی تھیں ۔ دور دور تک سڑک روشن نظر آرہی تھیں ۔ اب ہمارا سفر اوپر سے نیچے کی جانب تھا۔ سڑک کے کنارے لگے بجلی کے بلب خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہم ایک جگہ اور ٹھہرے تاکہ اوپر اور نیچے کا نظارہ کر سکیں۔ کس قدر حسین منظر تھا۔ اوپر دیکھ کر یہ خوف آیا کہ ہم اتنی بلندی پر تھے اور نیچے دیکھ کر یہ خوف آرہا تھا کہ ہم ابھی اتنے نیچے جائیں گے۔ روشنی میں بل کھاتی ہوئے سڑک انتہائی حسین اور دیدہ ذیب منظر پیش کررہی تھی۔

طائف کی حدود اختتام کو پہنچی ہم مکہ کی حدود میں داخل ہوئے۔ رات کے وقت گاڑی چلانے میں اکثر بھول ہوجاتی ہے۔ جہاں سے آپ کو مڑنا ہے اگر وہ یوٹرن نکل جائے تو آپ کو خاصا طویل راستہ طے کرنا پڑجاتا ہے یہی ہوا جہاں سے جدہ کے لیے مڑنا تھا عدیل سے وہ یوٹرن مس ہوگیا اب تو ہمارا راستہ اور طویل

ہوگیا لیکن اس میں بھی کچھ مصلحت تھی ہم ایک بار پھر خانہ کعبہ کے سامنے جا پہنچے۔ گاڑی سے اترے تو نہیں لیکن حرم شریف کے بالکل سامنے سے ہوتے ہوئے ہم اپنی منزل جدہ کے سفر پر تھے جو رات نو بجے اختتام پذیر ہوا۔

قارئین اکرام میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سفر نامے کا مقصد صرف یہ ہی نہیں ہونا چاہیے کہ سفر نامہ نگار اپنی مصروفیات اور جہاں جہاں وہ جائے اس کا آنکھو دیکھا حال خوبصورت جملوں میں ادب کی چاشنی کے ساتھ قارئین تک پہنچا دے۔ میری نظر میں سفر نامے کو سفر نامہ نگار کی مصروفیات اور اس نے جس جس جگہ کو دیکھا، جو کچھ اس دوران اس پر گزرا، ان حالات اور واقعات کو خوبصورت انداز سے اپنے قارئین تک پہنچائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفر نامہ جس شہر، ملک یا علاقے کا ہو اس کے بارے میں بھی بنیادی معلومات سفر نامے میں شامل ہوں تاکہ وہ سفر نامہ قاری کے لیے ایک گائیڈ و رہنما کا کام بھی دے۔ میری اسی سوچ کے پیش نظر آپ کو جا بجا کچھ تاریخی واقعات اور حقائق بھی ملیں گے۔ (29 اپریل 2015 جدہ، سعودی عرب)

دبئ ائر پورٹ روشن و حسین۔کچھ دیر قیام

اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بار بار بلاوا آرہا ہے اور میں اپنے مالک کے حکم پر لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ لَبَّیکَ لَا شَرِیکَ لَکَ لَبَّیکَ اِنَّ الحَمْدَ والنِّعمَۃَ لَکَ وَالمُلکَ لَا شَرِیکَ لَکَ "میں حاضر ہوں ، یا اللہ میں حاضر ہو' میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں۔ بیشک تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں اور ملک بھی تیرا کوئی شریک نہیں"۔ کہتا ہوا اللہ کے گھر خانہ کعبہ میں حاضر ہوجاتا ہوں، عمرہ ادا کرتا ہوں اور پھر اپنے پیارے نبی ﷺ کے شہر مدینہ اور روضہ مبارک پر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ مئی 2011 کے بعد اب 2015 میں پانچویں بار میں جدہ آیا ہوں۔اب تک میں اپنے مرکز کراچی سے سیدھا جدہ اور وہاں سے سیدھا واپس کراچی آتا رہا ہوں۔ اس بار میرا جدہ کا سفر کراچی بہ راستہ دبئ تھا، بھلا ہو ائر لوئنوں کا۔ سیٹ نہ ہونے کے باعث مجھے دبئ ائر پورٹ کی چکا چوند روشن بہاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ 10اپریل 2015 کی شب دبئ ائر پورٹ پر میرا قیام سات گھنٹے کا تھا۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں دبئ ائر پورٹ ایسا ائر پورٹ ہے کہ جہاں پر لوگ دو دو تین تین دن بھی گزار دیتے ہیں۔ ویسے تو اگر ائر لائن کی وجہ سے آپ کا قیام آٹھ گھنٹے کا ہو تو ائر لائن پابند ہوتی

ہے کہ آپ کو ہوٹل کی سہولت فراہم کرے۔اگر کسی اور وجہ سے مسافر کو کئی دن اس ائر پورٹ پر گزارنا پڑ جائیں تو وہ بہ آسانی گزار سکتا ہے۔ نہ اس کو کمرے کی ضرورت ہوگی نہ کسی اور چیز کی، یہاں ہر سہولت دستیاب ہے۔ سونے کے لیے آرام دے کرسیاں ہیں، صاف ستھرے باتھ روم، کشادہ غسل خانے، کھانے کے لیے ریسٹورانٹ، وسیع و عریض شاپنگ سینٹر جہاں پر ہر چیز دستیاب، دبئ کی ثقافت کا منہ بولتا یہ ائر پورٹ ہر اعتبار سے جدید ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ، وسیع و عریض جس میں ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک جانے کے لیے خوبصورت ٹرین کا سفر بھی کیا جاسکتا ہے۔ خودکار ذینے اور خودکار لفٹ میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک وقت میں چمک دھمک کے دو کمروں میں کھڑے ہیں، لفٹ کے پیچھے کی جانب اوپر سے نیچے کی جانب گرتی ہوئی آبشار اور نیچے حسن و جمال بکھیرتے ہوئے فوارے حسین منظر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔اسی شاپنگ سینٹر میں دبئ کے مردوں کے لباس کی آرائش، خواتین کے لباس وانداز کا منفرد نمونہ، دبئ کے لوگوں کی مہمان نوازی کا انداز، فرشی نشست کا دیدہ ذیب منظر اور ان کی نشست و برخاست کا منظر بھی دکھایا گیا ہے۔ گویا دبئ کے عرب کیسا پہنتے ہیں، کیسے رہتے ہیں، ان کے گھر کیسے ہوتے ہیں، تہذیب و ثقافت کے اس منظر کو دیکھ کر لطف انداز ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

یہاں ہر قوم، ہر نسل، ہر زبان، ہر علاقے اور ملک کے لوگ ادھر سے ادھر دنیا و

عافیت سے بے پروا، اپنی اپنی سوچوں میں گم پھرتے نظر آتے ہیں، سعودی لباس میں مرد اپنی خواتین کے ساتھ جو عبایہ پہنے یہاں تک کہ اپنے منہ پر بھی پردہ ڈلا ہوا لیکن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے نظر آتے ہیں، عام پاکستانی و ہندوستانی بھی ۔ گورے انگریز بھی کالے انگریز بھی، ایسے جوڑے بھی کہ جن کے مرد سوٹ میں ملبوس اور عورتوں کے جسم پر لباس کی کمیابی لیکن اپنے کام سے کام کوئی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا، ہم جیسے لکھاریوں کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ اگر دیکھیں گے نہیں تو لکھیں گے کیسے ۔ اس مجبوری کے سبب ہم لکھاری ہر ایک چیز کو تجسس کے ساتھ ، شوق کے ساتھ ، غور کے ساتھ دیکھتے، محسوس کرتے ہیں، اس لیے بھی کہ شاید کچھ لکھنے کو نکل آئے، کہنے کو مل جائے۔ ہم لکھاری خاص طور پر کالم نگاروں کی کیفیت کھوجیوں کی سی ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت میں کھوجیوں والی حس پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ انہیں ہر روز لکھنا ہے، روز نہیں تو دوسرے دن ورنہ ہر ہفتہ تو کالم لکھنا ہی ہے۔ اسے مجبوری کہیں، ضرورت کا نام دیں یا شوق ۔ لکھنا لکھاری کی مجبوری بن جاتا ہے۔ میں بھی اپنی اسی مجبوری کے ہاتھوں دبئی ائرپورٹ کو تجسس کے ساتھ ، کھوجی کیفیت میں اور شوق کے ساتھ دیکھتا رہا اور اس ماحول کو، اس منظر کو اپنے اندر محفوظ کرتا رہا کہ وقت آنے پر اسے قلم و قرطاس پر منتقل کرسکوں۔ دبئی ائرپورٹ پر میرے پاس وقت بھی تھا، لیپ ٹاپ بھی لیکن ایک مجبوری تھی کہ دبئی ائرپورٹ پر بجلی کے جو پوائنٹس لگائے گئے ہیں وہ کرسیوں کے پاس نہیں

ہیں بلکہ اُس سپاٹ دیوار کے نیچے کی جانب لگے ہوئے ہیں کہ آپ زمین پر بیٹھ سکتے ہوں تو بیٹھ جائیں ، اپنے لیب ٹاپ لگا لیں، موبائل چارج کر لیں اور بعض لوگ سوٹ میں ملبوس اپنے لیب ٹاپ کھولے زمین پر بیٹھے تھے ، کچھ اپنے موبائل چارج کر رہے تھے لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں زمین پر بیٹھ نہیں سکتا، میں تو عرصہ دراز سے نماز بھی کرسی پر بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ منکر نکیروں نے اگر حکم دے دیا کہ چلو اُٹھ کر بیٹھو اور پھر ہمارے سوالوں کے جواب دو، تو پھر کیا ہوگا۔ یقیناً ان سے معذرت کرنی ہوگی، معافی مانگنا ہوگی کہ حضور میں اٹھ کر زمین پر بیٹھ نہیں سکتا، کرسی کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کھڑا ہونا بھی ممکن نہیں ہوگا، شاید انہیں میری اس کیفیت پر ترس آ جائے اور ذیادہ نہ سہی پاسنگ مارکس ہی دے ڈالیں تو بیڑا پار ہو جائے

گا۔ یہ تو صرف مزاق ہی ہے، اللہ رحم کرنے والا، بڑا مہربان اور بخشش کرنے والا ہے۔ پنجاب کی کہاوت ہے کہ جس نے 'لاہور نہیں ویکھا اُو جمیا ہی نہیں' یعنی جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ گویا پیدا ہی نہیں ہوا۔ اب دبئی ائیر پورٹ دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس نے دبئی نہیں دیکھا گویا اس نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ دبئی کو حسین و جمیل ، چمکتی دمکتی اور اونچی اونچی عمارتوں کا شہر

بھی کہا جاتا ہے۔ برج خلیفہ جو برج دبئ کے نام سے بھی معروف ہے ابھی تک انسانی تخلیق کی سب سے اونچی عمارت ہے اس کی لمبائی 829.8 میٹر یا 2722 فٹ ہے، اس کی تعمیر 6 جنوری 2004 میں شروع ہوئی تھی یکم اکتوبر 2009 کو مکمل ہوا 4 جنوری 2010 کو اسے عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ خلیفہ برج سر دست دبئ کا مخصوص نشان بن چکا ہے۔ اس برج کی تصویریں اور اس کی شیلڈ ہر چھوٹے بڑے سائز میں بڑی تعداد میں دستیاب ہیں۔ دنیا میں اور بھی اونچی عمارات موجود ہیں ان میں ایفل ٹاور کی لمبائی 301 میٹر ہے، امپائر اسٹیٹ بلڈنگ 381 میٹر ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی اونچائی 541 میٹر تھی۔ دنیا کے امیر ممالک کے درمیان اونچی اونچی بلڈنگ بنانے کا ایک مقابلہ جاری ہے۔ سعودی عرب کے شہر مکہ المکرمہ میں قائم 'مکہ کلاک رائل ٹاور' کی اونچائی 60 میٹر یا 1972 فٹ ہے اس میں 120 فلور ہیں، کل ہی یعنی 29 اپریل کو ہم طواف کرنے گئے تھے۔ وہاں موجود اپنے سالار اعظم ارشد قریشی سے مختصر ملاقات بھی کی۔ موصوف نے حسب سابق اس ہوٹل کی مہنگی چائے اسی مکہ ہوٹل کے چوتھے فلار پر ریسٹورانٹ کی جگہ چائے پلائی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اس کا نظارہ بھی کرتے رہے۔ ظفر قریشی بھی اسی جگہ ہیں۔ چند روز قبل ان کے والد علیم الدین قریشی کا کراچی میں انتقال ہوگیا، وہ کافی عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے، کراچی سے چلنے سے قبل ہم انہیں اسپتال دیکھنے بھی گئے تھے۔ عزیزم ظفر سے ان کے والد کا پرسہ بھی کرنا تھا۔ سو وہ بھی کیا۔ یہ مکہ کے چند مہنگے ہوٹلوں میں سے ہے۔ نظر آرہا ہوتا ہے کہ

پیسہ پانی کی مانند بہایا گیا ہے۔اللہ عربوں پر شروع ہی سے مہربان ہے۔ خوب عطا کر رہا ہے وہ اسی فراغ دلی سے خوب خرچ کر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل حرم کے اتنے قریب ہے کے اس کے اندر نماز کی ادائیگی گویا حرم میں ادائیگی ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اس ہوٹل کے نچلے کوریڈور میں کئی بار نماز ادا کی۔دبئی کے شیخوں نے برج خلیفہ بنایا تو سعودی شیخ کب پیچھے رہنے والے تھے۔انہوں نے سعودی عرب کے شہر جدہ میں دنیا کی سب سے اونچی عمارت 'کنگ ڈم ٹاور (Kingdom Tower)' برج الاَمملکہ (Burj Al-Mumlakah) کی بنیاد رکھ دی۔یہ عمارت بحر احمر کے کنارے زیر تعمیر ہے۔یہ اونچائی میں دنیا کی سب اونچی بلڈنگ ہوگی اس کی اونچائی 1007 میٹر یا 3304 فٹ ہوگی اور اس کے 186 فلور ہوں گے۔اب دیکھنا یہ ہوگا کہ کنگ ڈم ٹاور کے تیار ہوجانے کے بعد دبئی کے حکمران کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ خاموش ہو رہے ہوتے ہیں یا پھر کوئی اور منصوبہ تیار کرتے ہیں ابھی تک اس سلسلے میں کوئی سنوائی نہیں آئی، لگتا ہے کہ انہوں نے برج خلیفہ پر بات ختم کر دی ہے۔

ہوائی جہازوں کے پروگرام بورڈ پر ہماری فلائٹ کا ابھی نام و نشان نہیں تھا اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اسے جانے میں ابھی بہت دیر ہے میں تو کچھ پریشان ہو رہا تھا لیکن میری بہو مہوش اور پوتا صائم عدیل اس سے قبل بھی دبئی آچکے تھے اور ائر پورٹ پر بھی کئی گھنٹے اگلی فلائٹ کا انتظار کر چکے تھے

انہوں نے ہمارا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اب ہمیں صبح ۷ بجے تک انتظار کرنا تھا۔ کچھ وقت ائرپورٹ کا نظارہ کیا ایک گھنٹے بعد ہماری فلائٹ کا وقت بھی فلائٹ شیڈول بورڈ پر آگیا۔ اب ہمیں اطمینان ہوا کہ چلو دیر سہی یہ تو معلوم ہوا کہ فلائٹ کب اور کس گیٹ سے ہمیں جانا ہوگا۔

ہم ایریٹس ائر لائن کی پرواز سے 10 اپریل کی شب ہم کراچی سے دبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میرے ہمراہ میری شریک حیات شہناز، میری بڑی بہو مہوش عدیل، پوتا محمد صائم، پوتی حبیبہ بھی تھی۔ ایریٹس ائر لائن کی جو فلائٹ دبئی سے جدہ جاتی ہے اس میں کوئی آٹھ سے ہزار افراد کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب فلائٹ کا اعلان ہوا تو جو جم خفیر موجود تھا اس سے طبیعت پریشان تھی۔ ہم بخیر و عافیت جدہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

(یکم مئی 2015جدہ، سعودی عرب)

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بھی اللہ کو پیارے ہوئے

علم و ادب کا درخشندہ آفتاب، گوہر نایاب، بے شمار کتابوں کے مصنف، بلوچستان پر تحقیق کا معتبر حوالہ، تاریخ دان و مورخ، نفیس انسان کوئٹہ کے سابق ڈائریکٹر تعلیمات پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ مجھے ان کے سانحہ ارتحال کا علم ہماری ویب پر لکھنے والے ساتھی غلام ابن سلطان (غلام شبیر) کے مضمون 'ڈاکٹر انعام الحق کوثر: وقت کی گود میں لحات نے دم توڑ دیا' سے ہوا۔ میں گزشتہ ایک ماہ سے جدہ میں ہوں، یہاں دنیا سے بے خبری کا راج ہوتا ہے۔ نیٹ پر اخبار پڑھ لیا تو کچھ احوال اپنے ملک کا مل گیا ورنہ بلیک آؤٹ والی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر میں ہماری ویب پر موجود یہ مضمون نہ دیکھتا تو اس قدر اہم خبر سے نہ معلوم کب تک بے خبر رہتا۔ اردو ادب کا یہ لکھاری میرا مہربان، شفقت سے پیش آنے والا، بلوچستان میں میری میزبانی اور مجھے کچھ وقت سے نوازنے والا 14 دسمبر 2014 کو لاہور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگیا۔ میری لاعلمی ہی تھی کہ مجھے اپنے اس مہربان دوست کے انتقال کا بر وقت علم نہ ہوسکا۔ بہت دکھ اور افسوس ہے۔ میں تو اپریل کے شروع میں جدہ آیا تھا۔ آج حسب معمول ہماری ویب کے مضامین دیکھ رہا تھا کہ یہ مضمون نظر سے گزرا، مضمون پڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے

اپنے تعلق اور ان کی محبت کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ابھی کل ہی کراچی میں علم کا ایک اور چراغ بجھادیا گیا۔ جامعہ کراچی کے ایک استاد ڈاکٹر سید وحید الرحمٰن کو نا معلوم افراد نے گولیوں سے ایسا چھلنی کیا کہ علم کی یہ شمع اسی جگہ ، اسی لمحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی۔ آج مجھے مدینہ بھی جانا ہے ارادہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد کراچی میں ہونے والے علم و ادب کے معماروں کے بلا جواز ، افسوس ناک سانحات پر لکھوں گا۔ جوں ہی ڈاکٹر کوثر کی خبر سامنے آئی میری سوچ کا دھارا اپنے اس مہربان کی جانب ہو گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے میری انگلیاں ساتھ نہیں دے رہیں ، دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہو رہی ہے ، نظروں کے سامنے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا چہرہ اور ان کی بردبار شخصیت گفتگو کرتی نظر آ رہی ہے۔ لیکن موت تو ایک حقیقت ہے ، ہر ایک کو جو اس دنیا میں آیا ایک نہ ایک دن واپس لوٹنا ہی ہے۔ بس وقت مقرر ہے۔ ڈاکٹر کوثر نے 83 سال عمر پائی ، بھرپور زندگی گزاری، جی بھر کے ادبی و علمی کام کیا، علم و ادب کی خدمت کی اور طبعی طور پر دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں انشاءاللہ خانہ کعبہ میں اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لیے بلند درجات کی دعا کروں گا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ، ان کی علمی و ادبی خدمات کو قبول فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے میرا تعلق ایک محقق کی حیثیت سے شروع ہوا۔ میری پی ایچ ڈی تحقیق حکیم محمد سعید کی کتاب اور کتب خانوں سے تعلق کے حوالے سے تھی۔ اس حوالے سے مجھے ان لوگوں سے جو حکیم صاحب سے زیادہ قریب تھے اس موضوع پر گفتگو کرنا تھی یعنی انٹرویوز کرنا تھے اور وہ میں نے کیے جو میرے تحقیقی مقالے میں شامل ہیں۔ان شخصیات میں پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بھی شامل تھے کیونکہ وہ بھی حکیم صاحب کے ان قریبی ساتھیوں میں سے تھے جو بلوچستان میں ہمدرد کے تحت ہونے والے علمی وادبی پروگراموں مثلاً شامِ ہمدرد کے انعقاد اور دیگر امور کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے میری پہلی ملاقات 2003 میں کوئٹہ میں ہوئی۔ اس وقت وہ بلوچستان کے ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔جب میں نے انہیں ملاقات کی وجہ سے آگاہ کیا تو انھوں نے مجھے اسی دن اپنے گھر آنے کی دعوت دی کوئٹہ میں سیٹلائٹ ٹاؤن میں ان کی رہائش تھی۔ ان سے جو گفتگو ہوئی وہ ذیل میں درج ہے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی سادہ مزاج انسان تھے۔ دن بھر آفس میں مصروف رہنے کے باوجود جوں ہی گھر پہنچے نماز سے فارغ ہو کر مجھ سے تفصیلی گفتگو کی۔ میں کراچی آکر اپنی مصروفیات میں کھو گیا۔ پی ایچ ڈی مکمل ہو گئی

ڈگری بھی مل گئی، ڈاکٹر صاحب کوئٹہ سے ریٹائر ہو کر لاہور چلے گئے۔ یہ بات ہے، 2014 کے ابتدائی دنوں کی ایک دن میرے موبائل پر فون آیا، انہوں نے سلام کیا میں نے جواب دیا، گویا ہوئے میں پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر لاہور سے بات کر رہا ہوں۔ آپ نے مجھے پہچانا، یہ آواز اور جملہ سن کر میں فوری طور پر حیرت اور ندامت کے احساس میں کھو گیا، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میں کوئٹہ میں آپ کی عنایت کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ مجھے آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ میں کوئٹہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور آگیا تھا اور اب یہی پر ریٹائر لائف گزار رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس بھی غالباً واپڈا ٹاؤن کا نوٹ کرایا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اب یہ ںجب بھی لاہور آیا آپ سے لازمی ملاقات کروں گا۔ میرے ایک اور علمی دوست صابر لودھی بھی واپڈا ٹاؤن میں رہتے ہیں میں ان سے ملنے جایا کرتا ہوں آپ سے بھی ضرور ملاقات کرونگا۔ یہ ہوتی ہے انسان کے نیک، بلند کرادار اور واقعتاً بڑا ہونے کی نشانی۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں نے پی ایچ ڈی مکمل کی یا نہیں۔ کہنے لگے کہ آج میری ڈائری میں آپ کا نمبر سامنے آیا تو سوچا کہ آپ سے سلام دعا کر لوں۔ میں اپنے دیگر سفر کے معاملات اور کراچی کی ادبی و علمی مصروفیات میں ایسا مصروف ہوا کہ اس سال لاہور جانا ہی نہیں ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب قبلہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ جس طرح شہید مرا نہیں کرتے اسی طرح علمی و

ادبی کام کرنے والے دنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن ان کی علمی ، ادبی، تصنیفی وتالیفی خدمات انہیں امر رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا علمی سرمایا خاص طور پر بلوچستان کے حوالے سے انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا، محققین، مصنفین اور طالب علم اُس سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔اللہ تعالیٰ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ذیل میں وہ انٹرویو ہے جو راقم نے ۱۹ جون ۲۰۰۳ء بروز جمعرات ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ واقع سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ، بلوچستان میں لیا تھا اور یہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے میں بھی شامل ہے۔

تعارف :

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا تعلق پاکستان کے صوبہ بلوچستان سے ہے۔آپ ایک ماہر تعلیم ' ادیب ' دانشور ' مصنف و مترجم ہونے کے علاوہ بلوچستان میں حکیم محمد سعید شہید کے دستِ راست اور قریبی ساتھی تھے ۔ بلوچستان میں ہمدرد کے تحت تمام علمی و ادبی پروگرام آپ ہی کی نگرانی میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کوثر کے بارے میں شہید پاکستان کا کہنا تھا کہ 'بلوچستان میں یہ میرا مرد سعید ہے' ۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی علمی و تحقیقی خدمات سے عبارت ہے۔آپ سو(100) سے زیادہ کتابوں اور سے زیادہ تحقیقی مقالات کے خالق ہیں۔کتاب اور کتب خانوں کے حوالے سے 150 بلوچستان کے تعلیمی اور ادبی حلقوں میں آپ کو ایک معتبر اور اعلیٰ مقام حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ

وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کے قائم کردہ 'ٹیکنکل ورکنگ گروپ' جسے پاکستان میں عوامی کتب خانوں کے لئے ایک مربوط نظام تشکیل دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی نے ملک کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کی اہم شخصیات سے انٹرویوز کئے تو بلوچستان سے ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے بھی تفصیلی انٹرویو کیا۔

آپ کی علمی و تحقیقی خدمات اور شہید پاکستان سے تعلق کے حوالے سے راقم نے شہید حکیم محمد سعید کے بارے میں ڈاکٹر کوثر کے خیالات سے استفادہ کرنے لئے خصوصی انٹرویو کیا۔ 19 جون 2003ء بروز جمعرات بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کے بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ میں شرکت کے موقع پر راقم نے ڈاکٹر صاحب سے ان کے آفس فون پر مدعا بیان کیا اور ملاقات کی درخواست کی۔ آپ نے ازراہِ عنایت گھر کا پتہ بتایا اور کہا کہ میں ظہر کی نماز پڑھ کر گھر پہنچ رہا ہوں آپ بھی آجایئے۔ انتہائی شفقت اور محبت سے ملے۔ یہ جان کر بے انتہا خوش ہوئے کہ میں شہید پاکستان کی ان خدمات پر تحقیق کر رہا ہوں جو انہوں نے پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی کے لئے انجام دیں۔ آپ نے اس موضوع کو انتہائی اہم اور وقت کی آواز قرار دیا۔

ڈاکٹر کوثر نے اپنے بارے بتایا کہ وہ بلوچستان کے پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد 1963ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے تدریس کا آغاز کیا۔ 1969ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے، پہلے گورنمنٹ کالج مستونگ بعد ازآں گورنمنٹ کالج لورالائی کے پرنسپل کے فرائض انجام دیئے، بلوچستان یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1980ء میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کوئٹہ کے چیرمین مقرر ہوئے۔ 1985ء میں ڈائریکٹر تعلیمات بلوچستان کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور اسی حیثیت سے 1991ء، میں ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر کوثر کو ان کی تعلیمی اور علمی خدمات کے اعتراف میں بے شمار علمی' ادبی' سماجی تنظیموں کی جانب سے انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ ہمدرد کی جانب سے 1982ء میں آپ کو وثیقہ اعتراف پیش کیا گیا، 1998ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کو صدارتی تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بطور اقبال شناس' محقق' غالب شناس 'مصنف و مترجم اور نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کا تحریری سرمایہ ہماری تاریخ کا اہم ورثہ ہے۔ بلوچستان کے حوالے سے آپ نے بے شمار تحقیقی کام کیا۔

شہید پاکستان سے اپنے تعلق کے بارے میں ڈاکٹر کوثر نے بتایا کہ شام ہمدرد کے حوالہ سے حکیم محمد سعید سے تعلق قائم ہوا وقت کے ساتھ ساتھ یہ تعلق گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ قلبی تعلق میں بدل گیا۔ وہ بہت ہی صاف ستھری شخصیت کے مالک تھے ۔ جیسے وہ باہر سے صاف شفاف نظر آتے تھے ان کا اندرون اس سے بھی زیادہ شفاف تھا۔ صاف گو اور بے باک ساتھ ہی نڈر جو بات درست سمجھتے برملا اس کا اظہار کر دیا کرتے تھے ۔انہوں نے احکام خداوندی اور شریعت محمدی پر عمل پیرا ہو کر بیمار انسانوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا اور ان کی دلنواز گفتگو نے ہزاروں انسانوں کے لیے مرہم کا کام کیا۔

ڈاکٹر کوثر کا کہنا ہے کہ حکیم صاحب کی شہادت کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر شہید پاکستان کو " فخر ملت " کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر کوثر کی ذاتی لائبریری انتہائی نایاب و نادر کتابوں سے مزین ہے ۔ آپ نے بتایا کہ قیام پاکستان سے قبل آپ کے گھر کی لائبریری میں نادر و نایاب تصانیف کے علاوہ فارسی کے قلمی نسخے بھی تھے ،تاسیس پاکستان کے وقت یہ سب قیمتی اسناد اور کتابیں ضائع ہو گئیں۔ آپ کو کتابوں سے محبت اور کتابیں جمع کرنے کا شوق ابتدا ہی سے ہے۔ آپ نے کہا کہ میرے پاس ملا محمد حسن براہوی کا دیوان موجود ہے جو ایک نایاب تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب کتاب کلچر کے فروغ کے لئے مصروف عمل ہیں۔

آپ کو تحقیقی مقالہ " باباشیرازی فغانی اور اس کے عہد کے شعراء" اور " بلوچستان میں اردو" جیسی کتاب نے شہرت بخشی۔ آپ بلوچستان کے ماضی و حال کے علمی ورثہ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ بلوچستان کی تاریخ اور ادب مین تحقیقی اور تخلیقی کام کو آپ نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔

بلوچستان کے حوالے سے شاید ہی کوئی موضوع یا گوشہ ایسا ہوگا جو ڈاکٹر صاحب کی نظر سے اوجھل ہو اور آپ نے اس پر کام نہ کیا ہو۔ آپ کو بلاشبہ بلوچستان پر ایک مستند اور معتبر محقق کی حیثیت حاصل ہے۔

مدینہ منورہ میں وادِی جن۔ آنکھوں دیکھی، کانوں سنی کچھ باتیں

سعودی عرب کے متعدد شہروں خصوصاً مکہ المکرمہ، مدینہ منورہ میں خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ کے علاوہ بے شمار جگہیں ایسی ہیں کہ جن کی زیارت اور ان مقامات پر حاضری کو مسلمان اپنے لیے باعث عبادت و برکت تصور کرتے ہیں۔ مکہ میں عمرہ کی ادائیگی یا حج کے بعد زائرین پیدائش گاہ آنحضرت محمد ﷺ ، مختلف مساجد، مختلف پہاڑ جیسے جبل حرا، جبل ثور، منیٰ، مذدلفہ، قبرستان جیسے جنت المعلیٰ، جدہ میں مقبرہ اماں حوا، مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ پر سلام عقیدت پیش کرنے کے بعد شہدائے احد، جبل احد، مساجد، کوئیں، باغات (حضرت سلمان فارسی کا باغ)، حتیٰ کے مدینہ سے دور بدر جیسے مقامات کی زیارت کو اپنے لیے متبرک اور باعث ثواب تصور کرتے ہیں۔ مَیں جب بھی مکہ و مدینہ جاتا ہوں کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایسی یادگار اور متبرک جگہوں کو دیکھا جائے اور ان کی زیارت کی جائے ، میں یہ سعادت حاصل کرتا رہا ہوں۔ غار حرا کی زیارت کے لیے میرا جبل حرا پر چڑھنا ممکن نہیں اس لیے تاحال یہ سعادت حاصل نہ کرسکا، تاہم خواہش موجود ہے اگر اللہ تعالیٰ نے کبھی ہمت و طاقت دی تو یہ سعادت بھی حاصل کرونگا۔ اسی طرح جبل ثور کے دامن میں تو کچھ وقت گزارا لیکن غار ثور تک پہنچنا اب میرے بس کی بات نہیں۔ بدر کی خواہش تھی اس بار پروردگار نے وہ پوری کی اور بدر

کا شہر، بدر کا میدان اور شہدائے بدر کی قبروں کو دیکھا اور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ علیحدہ سے لکھوں گا۔

مدینہ منورہ میں 'وادی جن' کے نام سے ایک جگہ ایسی بھی مشہور ہے جو نہ تو متبرک ہے اور نہ ہی اس میں زیارت کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔ اسے سعودیوں کے لیے تفریحی مقام کا درجہ حاصل ہے۔ اس وادی کا اصل نام 'وادی البیدا (Wadi Al-Baida)' ہے۔ یہ وادی مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں 30 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہراہِ 'خلیل' پر واقع ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے چل کر بیان کرونگا۔ ویسے تو پورا مدینہ ہمارے لیے متبرک اور قابل احترام ہے۔ اس کی ایک ایک گلی، ایک ایک پہاڑ، اس کی مٹی کا ایک ایک زرہ یہاں کا چپہ چپہ ہمارے لیے محترم اور عقیدت لیے ہوئے ہے۔ سرکارِ دوعالم حضرت محمد ﷺ کے اس شہر مدینہ کی فضاؤں میں، گلیوں میں، سڑکوں پر، زمین پر پہاڑوں پر، درختوں پر جو نور اور مسحورکن مہک و راحت کی بھینی بھینی خوشبو پائی جاتی ہے وہ دنیا میں کہیں اور نہیں۔ یہاں آکر ٹھنڈک، قلبی سکون، راحت، اطمینان کا احساس جسم میں سرائیت ہوتا محسوس ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ ہم بس اسی مٹی کے ہو رہیں۔

گزشتہ برس (2014) جب میں سعودی عرب آیا اور مدینہ میں ایک ہفتہ قیام کیا تو دیگر زیارات کے علاوہ میری خواہش تھی کہ 'وادی جن' کو بھی دیکھا جائے کہ اس

کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اگر اس جگہ جن موجود ہیں تو لوگ یہاں کیوں اور کس لیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں گاڑیاں انجن بند ہونے کے باوجود خود بہ خود سڑک پر دوڑتی ہیں، بقول لوگوں کے انہیں جنات دوڑاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہاں کی زمین میں ، یہاں کے پہاڑوں میں مخصوص مقناطیسی قوت (Megnetism Force) موجود ہے ، کوئی کہتا ہے کہ یہاں کوئی روحانی یا غیر جسمانی قوت (Spiritual Force) ہے جو ایسا کرتی ہے، کیا راز (Mystery) ہے کہ یہاں پہنچ کر گاڑیاں جن کا انجن بند کردیا جاتا ہے سڑک پر دوڑتی ہیں۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا، لوگوں کی سنی سنائی باتیں تھیں، کچھ چیزیں لوگوں نے 'یو ٹیوب' پر بھی ڈالی ہوئی ہیں لیکن تجسس اور حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی لگن تھی ۔ گزشتہ برس مدینہ میں ایک ہفتہ قیام کے دوران شہناز میرے ہمراہ تھیں جب میں نے ان سے وادی جن جانے کا ذکر کیا تو بس 'No' کے سوا کچھ اور سننے کو نہیں ملا، لفظ جن ہمارے لیے خوف لیے ہوئے ہے۔ مختصر یہ کہ میری یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی تھی۔ تمام ہی جگہ گئے مسجد قبا، مسجد قبلاطین، سباح مساجد، جبل احد، حضرت سلمان فارسی کا باغ، حضرت عثمانؓ کا 'کنواں' اور دیگر زیارات شامل تھیں ۔اس سال بھی بلاوا آیا اور ہم 8 اپریل 2015 کو جدہ پہنچے۔ عمرہ کی سعادت حاصل کی اور زیارات بھی کیں۔
یکم مئی بروز جمعہ کی نماز پڑھ کر جدہ سے ہم عدیل کی کار نما جیپ میں مدینہ

منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ شہناز، میری بڑی بہو مہوش، پوتا صائم اور پوتی حبیبہ پر مشتمل یہ قافلہ عدیل کی رہنمائی میں اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے روضہ مبارک پر سلام عرض کرنے کے ارادے سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں ذکر نبی ﷺ کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ حرم شریف میں نماز مغرب ہو رہی تھی اور ہم مدینہ میں داخل ہو کر حرم کے قریب تر اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ نماز مغرب ادا کی اور سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ اگلے روز ہفتہ 2 مئی کو مدینہ منورہ میں مختلف زیارات کا پروگرام تھا۔ صبح ہی نکل کھڑے ہوئے۔ پھر بھی نکلتے نکلتے دیر ہو گئی، نماز ظہر مسجد قباء میں باجماعت ادا کی، دو نفل بھی ادا کیے جس سے ہمیں ایک عمرہ کا ثواب بھی مل گیا۔ یہاں سے شہدائے احد کو سلام عرض کرنے کا پروگرام تھا، جبل احد کے دامن میں رکے، شہدائے احد کی قبور کی زیارت کی اور سلام پیش کیا۔ اب ہماری منزل 'وادی جن' تھی۔ یہ تجویز عدیل کی جانب سے تھی میں تو یہ سن کر دل ہی دل میں خوش ہوگیا، بیگم نے اپنے بیٹے کی بات پر قدرِ تردد کیا لیکن پھر خاموش ہو رہیں یعنی رضامندی تھی۔ اب ہم جبل احد سے وادی جن یعنی وادی بیدا کی جانب روانہ ہوئے۔

سفر کا مزاہ ہی کچھ اور تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے، موسم ابر آلود تھا، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور مدینہ کے شمال جنوب کی جانب ہماری گاڑی دوڑی چلی جارہی تھی۔ گاڑی میں گفتگو کا محور جنوں کی وادی ہی تھا۔ شہناز مسلسل

اپنے خوف کا اظہار کر رہی تھیں لیکن اپنے بیٹے کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچ گئے کہ جس کے دونوں جانب کھجور کے خوشنما درخت اور بعد میں اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ سعودی عرب میں عام طور پا سڑکیں دو رویا ہوتیں ہیں یعنی ایک جانے والے دوسری آنے والی لیکن یہ سڑک ایک رویا ہی تھی لیکن صاف شفاف، اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان دور تک یہ منظر اپنی جاذبیت دکھا رہا تھا۔ دونوں جانب پہاڑو کے بالکل دامن میں جگہ جگہ شیڈ (سائیابان) لگے ہوئے تھے ان سائیابانوں کے نیچے چارو جانب پکی سیمنٹ کی بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھیں۔ کسی کسی سائیابان میں کچھ سعودی اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے نظر بھی آ رہے تھے۔ اندازہ ہوا کہ یہ جگہ باقاعدہ تفریح کے لیے بنائی گئی ہے۔ فضاء میں پراسرار خاموشی تھی لیکن یہ خاموشی خوف ناک نہیں تھی بلکہ پرسکون تھی۔ اس کی وجہ گاڑیوں کا کم ہونا تھا۔ کوئی اور خوف کی بات نہیں تھی۔ جوں ہی ہم اس علاقے میں داخل ہوئے عدیل نے کہا کہ ابو گاڑی کی اسپیڈ اس طرح کم ہو رہی جیسے ہم اونچائی پر چڑھ رہے ہوں، حالانکہ سامنے جو سڑک نظر آ رہی تھی وہاں ایسی کوئی صورت نہیں تھی۔ سڑک ہموار تھی۔ رفتہ رفتہ گاڑی کی رفتار کم سے کم ہوتی گئی لیکن چلتی رہی، دیگر ساتھ چلنے والی گاڑیاں بھی ہماری گاڑی کی طرح سست رفتاری کا شکار تھیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مقام شروع ہو چکا ہے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ سڑک کے کنارے بعض لوگ گاڑی روک کر سڑک پر پانی ڈال کر یہ دیکھ رہے تھے کہ پانی کس

رخ پر بہہ رہا ہے۔ یعنی یہاں یہ بھی ہے کہ اگر پانی سڑک پر ڈالا جائے تو وہ سامنے کی سمت نہیں جائیگا بلکہ وہ اس کے بر خلاف بہے گا۔ بعض لوگوں نے گاڑی روک کر بند کردی، جب ہینڈ بریک نیچے کیا تو گاڑی سامنے کے بجائے پیچھے کی جانب چلنا شروع ہورہی تھی۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا، گاڑی بند کی، جوں ہی ہینڈ بریک نیچے کیا گاڑی پیچھے کی جانب چلنا شروع ہو گئی۔ ہم اس نظارے سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے کچھ کچھ خوف بھی ہمیں پریشان کر رہا تھا۔اب ہم اور آگے بڑھے ، دیگر گاڑیاں بھی آگے جارہی تھیں۔ آگے جاکر یہ سڑک پہاڑ کے دامن میں ختم ہوجاتی ہے۔ اب تمام گاڑیاں واپس ہونا شروع ہوئیں ہم نے بھی اپنی گاڑی کا رخ واپسی کی جانب کیا اور اب عدیل نے گاڑی بند کردی، سوچ بھی بند تھا، جوں ہی ہینڈ بریک نیچے کیا گاڑی نے آہستہ آہستہ آگے کی جانب چلنا شروع کردیا، رفتہ رفتہ گاڑی کی رفتار سو سے اوپر تھی۔ اگر بریک لگایا جائے تو گاڑی رک جاتی ، ورنہ اس کی رفتار میں مسلسل تیزی آتی ہے ، ہم نے ایک جگہ سائیابان میں پڑاؤ ڈالا، گاڑی ایک پہاڑ کے دامن میں لے گئے اور اتر کر اس سائیابان میں سب لوگ بیٹھ گئے، موضوع یہی وادی اور یہاں کی صورت حال تھی۔ کچھ دیر اس سائیابان میں رکے، کھایا پیا بھی، واپسی کا سفر شروع ہوا، عدیل نے کہا کہ ابو اب آپ گاڑی چلائیں۔ میں نے اب تک سعودی عرب میں گاڑی نہیں چلائی تھی۔ اس کی وجہ گاڑیوں میں بائیں جانب اسٹیرنگ کا ہونا اور گاڑیوں کا دائیں جانب چلنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ نظام بالکل اس کے بر عکس ہے۔ دوسرے

میں اب تک آٹو میٹک گاڑی چلانے کا عادی نہیں تھا۔ سعودی عرب آنے سے قبل میں نے چھوٹی آٹو میٹک گاڑی لے لی تھی اور چلانے بھی لگ گیا تھا۔ یہ گاڑی ایک تو بڑی جیب ہے۔ میں اسے چلانے کا عادی بھی نہیں (Fortuner) طاقت ور ٹویوٹا فارچیونر پھر بھی اس جگہ پر خود کار طریقے سے گاڑی چلنے کا تجربہ از خود بھی کرنا چاہتا تھا۔ ایک روایت یہاں کے بارے میں یہ بھی پائی جاتی ہے کہ بند گاڑی کو ' جن' چلاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اسٹیرنگ تک آنے سے قبل گاڑی کے پیچھے اچھی طرح دیکھا کہ کوئی غیر جسمانی مخلوق تو موجود نہیں ، مجھے اس قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آئی، اگر موجود بھی ہوگی تو جنات عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ یہاں ہم نے سڑک پر کچھ پانی بھی گرایا، پانی کا رخ چڑھائی پر تھا کیونکہ گاڑی قدرِ چڑھائی پر کھڑی تھی۔ یہاں اس بات کی تصدیق ہوئی کہ واقعی پانی کا رخ بھی ڈھلان کے بجائے اوپر کی جانب ہے۔اب میں نے اسٹیرنگ سنبھالا، ہینڈ بریک نیچے کیا، گاڑی آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئی، گاڑی کی رفتار دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی، میں بیچ بیچ میں بریک لگا کر اطمینان کر رہا تھا کہ گاڑی رک بھی جائے گی یا نہیں، جب بھی بریک لگاتا گاڑی آہستہ ہو جاتی۔ اس طرح میں نے 70 کی اسپیڈ تک گاڑی چلائی، خود ہی محتاط رہا، اب محسوس ہوا کہ گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ گویا یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ مخصوص جگہ اختتام ہونے جا رہی ہے اور گاڑی کی رفتار 20 تک آ گئی ، اب میں نے اکسیلیٹر کے ذریعہ گاڑی کو چلانا شروع کیا اور تھوڑی دور جا کر اس تجربے

کو ، مشاہدے کو خدا حافظ کہا، اسٹیرنگ سے نیچے آکر پیچھے کی جانب پھر نظر دوڑائی کے شاید کوئی جن بھائی جو یہاں اس قدر محنت کر رہے ہیں نظر آ جائیں لیکن کوئی بندہ بشر نہیں تھا۔

یہ تو تھا وادی جن کا آنکھو دیکھا حال، جس میں کسی بھی طرح کی مبالغہ آمیزی نہیں اور ضرورت بھی نہیں کہ بلاوجہ وہ بات کی جائے جو نظر نہیں آ رہی۔ جہاں تک کانوں سنی باتوں کا تعلق ہے تو اس سفر سے پہلے اور بعد میں اکثر یہاں کے رہنے والے جو اردو سمجھتے تھے سے اس وادی اور جنات کے بارے میں بات کی اور حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ مجھے مختلف جوابات ملے ، بعض کا کہنا تھا کہ اس خطہ زمین میں یا یہاں کے پہاڑوں میں مخصوص مقناطیسی قوت (Megnetism Force) موجود ہے جو کسی بھی ایسی لوہے کی چیز جس میں ویل لگے ہوں کو مخالف سمت میں چلاتی ہے، لیکن پانی میں تو لوہا نہیں ہوتا وہ کس طرح مخالف سمت بہتا ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ یہاں کوئی روحانی یا غیر جسمانی قوت (Spiritual Force) ہے جو ایسا کرتی ہے اس سے مراد جنات ہیں، آخر راز (Mystery) کیا ہے۔اس کا جواب یہاں آکر از خود دیکھ کر، مشاہدہ کرکے بھی حاصل نہ ہوسکا۔ بعض احباب کا کہنا تھا کہ یہاں ایکسیڈنٹ بہت ہوتے ہیں، مجھے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ واپسی پر جب گاڑیاں بغیر انجن اسٹارکیے، ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھے چل رہی ہوتی ہیں تو چلانے والے کے کنٹرول میں ہوتی ہیں، جو ہی ہم ایکسیلیٹر سے

پاؤں اٹھاتے ہیں انجن اپنی طاقت واپس لے لیتا ہے گاڑی کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور بریک لگانا آسان ہوتا۔ ایسی صورت حال میں جب گاڑی بغیر اسٹارٹ کیے 120 سے اوپر چلائی جائے گی تو اسے کنٹرول کرنا مشکل ہوگا، یہی وجہ حادثات کا باعث ہوتی ہوگی۔ یہاں پہاڑوں کے دامن میں سڑک کے کنارے جو سائیابان اور بیٹھنے کی جگہیں بنائی گئیں ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پر سعودی رات میں ٹہرتے بھی ہیں، بار بی کیو بھی کرتے ہیں کیونکہ یہاں جگہ جگہ لکڑی کے جلنے اور راکھ کی موجودگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ بعض نے یہ بھی بتایا کہ یہاں رات میں مختلف قسم کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ایک صاحب نے جو زبان سے بنگلہ دیشی لگ رہے تھے نے بتایا کہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں جانے والوں میں سے کوئی کوئی ذہنی توازن بھی کھو بیٹھا ہے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ شاہرہ خلیل پہاڑوں کے اوپر اس طرح بنائی گئی ہے کہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ سڑک اوپر جارہی ہے جب گاڑی واپس آتی ہے تو ڈھلان کے باعث گاڑی خود بہ خود چلنے لگتی ہے۔ مجھے یہاں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے سعودی عرب کے شہر جیذان سے پہاڑوپر موجود شہر 'فیفائ' کا سفر کئی مرتبہ بذریعہ کار کیا پہاڑ کی چڑھائی الگ محسوس ہوجاتی ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں، اگر ہمیں عربی زبان آتی تو اس کی حقیقت وہاں کے سعودیوں سے معلوم کرتے لیکن اس چیز کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ وادی کے صورت حال کو دیکھتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ یہاں جنات وغیرہ یا کوئی غیر جسمانی قوت پائی جاتی ہے جو یہاں

آنے والی ہر گاڑی کو دھکا دے کر دوڑاتی ہے۔ ویسے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا، جن تو پھر جن ہی ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے ان کے کسی سردار جن نے اپنی قوم کو یہاں اس کام پر لگا دیا ہو۔ لیکن یہاں موجود رہتے ہوئے کسی بھی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوا، جب کہ ہمارے ساتھ چھوٹے بچے بھی تھے۔ جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ اس پر مزید بہتر تحقیق کر سکتے ہیں۔

اس شاہراہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے شروع میں دونوں جانب کھجوروں کے گھنے باغ موجود ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب جگہ جگہ اونٹوں کے اسٹال لگے تھے جہاں پر اونٹنیاں تھیں۔ یہاں پر دراصل اونٹنی کا دودھ بیچا جاتا ہے۔ بعض لوگ اونٹنی کا دودھ لے کر اسی وقت پی بھی رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک جگہ رک کر اس بات کا مشاہدہ کیا کہ دودھ ہے یا کوئی اور چیز، تھا تو دودھ ہی لیکن حفظان صحت کے اصولوں کے برخلاف، صفائی کے فقدان کے ساتھ، اونٹنیاں ہر باڑے میں کئی کئی موجود تھیں اس جگہ میز پر گندے برتنوں میں دودھ بھی تھا۔ بعض لوگ اسی وقت دودھ نکلوا کر لے جارہے تھے۔ اونٹنی کے دودھ کی کیا تاسیر ہے، فوائد کیا ہیں ؟ نقصانات کیا ہیں ؟۔

اونٹ تو یہاں کی روایتی سواری، اور تاریخی جانور ہے، یہ یہاں سڑک کے کنارے بڑی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اونٹنی پر ہی تو ہمارے نبی ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ جب آپ ﷺ مدینہ شہر میں داخل ہوئے تو ہر ایک انصاری کی یہ خواہش تھی کہ حضور ﷺ اس کے

مہمان بنیں، ہر کوئی اس بات کو اپنے لیے اعزاز تصور کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر اونٹنی کو حکم دیا کہ وہ مجھے جہاں ٹھہرنے کو کہے گی وہ اس جگہ کو ہی میزبانی کا شرف بخشیں گے۔ ابتدا میں اونٹنی ایک خالی میدان میں رکی، پھر آگے بڑھ کر اس کا منہ حضرت ایوب انصاری کے گھر کی جانب ہوگیا۔ گویا نبی ﷺ نے حضرت ابو ایوب انصاری کو یہ اعزاز بخشا۔ اونٹنی کو ہمارے نبی ﷺ نے استعمال کیا، یقینا وہ انہیں پیاری بھی ہوگی، اس کا گوشت اور اس کا دودھ فائدہ مند ہی ہو سکتا ہے، نقصان دہ ہے، نہیں۔ مدینہ کی 'وادی جن' جس کا تاریخی نام 'وادی البیدا (Wadi Al-Baida)' جو شاہرہ خلیل پر واقع ہے کا سفر اختتام کو پہنچا اور ہم اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ (5 مئی 2015، جدہ)

جنگِ بدر کے میدان میں چند لمحات۔ سعادت و نصیب

آج کا دن (اتوار 3 مئی 2015) میری زندگی کا خوش نصیب دن ہے جسے میں کبھی بھلا نہ سکوں گا۔ میں گزشتہ دو روز سے مدینہ میں تھا آج جدہ واپسی تھی۔ ہوٹل حرم شریف کے نزدیک ہی تھا میں صبح تین بجے مسجد نبوی چلا گیا، رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دی اور سلام عرض کیا، اس وقت لوگ کچھ کم تھے جس وجہ سے مجھے ریاض الجنہ میں آسانی سے جگہ مل گئی، دو رکعت نفل ادا کی، استغفار اور دعائیں کیں، اپنے لیے بھی، اوروں کے لیے بھی، نماز کے بعد جب بھی بائیں جانب سلام پھیرتا تو روضہ رسول ﷺ نظروں کے سامنے ہوتا، اسی جگہ بیٹھے بیٹھے تہجد کی اذان ہو گئی، تہجد پڑھی اور یہی ٹکا رہا، اذانِ فجر ہو گئی، فجر کی جماعت میں شریک رہا، بعد میں کسی خوش نصیب کی نماز جنازہ بھی اسی مقدس مقام پر ہی پڑھی۔ نصیب اور سعادت کی بات ہے۔ میری قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی سو مجھے ملی۔ اب جنت البقیع کا رخ کیا دروازہ کھل چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق بقیع جارہے تھے، میں بھی ان میں شامل ہوگیا، تمام اہل قبور کو سلام عرض کیا، جن جن کی قبروں کا علم تھا، یا وہاں موجود لوگ نقشوں کے ذریعہ بتارہے تھے کہ یہ فلاں کی قبر ہے، یہ فلا کی، خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عثمانؓ، حضور ﷺ کے ننھے صاحبزادے

ابراہیمؓ اور دیگر کی قبروں پر کچھ دیر قیام کیا اور فاتحہ پڑھی، ہوٹل واپسی ہوئی۔ آج ہی جدہ روانگی تھی، راستے میں جنگ بدر کے میدان کی زیارت کرنا تھی۔ دوپہر بارہ بجے مدینہ سے ینبو جانے والے راستے سے بدر کے مقام کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں جانب پہاڑ ہی پہاڑ۔ بدر سے کوئی پانچ کلو میٹر پہلے ' راکا' پر کچھ دیر رکے، یہاں ایک مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی اس کے بعد بدر کی جانب روانہ ہوئے۔ دوپہر اپنی جولانی دکھا رہی تھی۔ خاموشی تھی لیکن سکون اور اطمینان کی فضاء نے ماحول کو خوش گوار بنایا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت تھی پھر بھی ٹھنڈنک کا احساس ہو رہا تھا، گرم ہوا چل رہی تھی لیکن سرور کی کیفیت طاری تھی، نہ آدم نہ آدم زاد، بدر کے چاروں جانب کئی کئی منزلہ رہائشی مکانات ہیں اس وقت سارے مکین اپنے اپنے گھروں میں تھے، اس کی وجہ یقیناً گرم موسم ہی تھا۔ اس جگہ اجنبی ہونے کے باوجود خوف کا احساس نہیں تھا، میدانِ بدر سورج کی روشنی سے منور و روشن تھا، چاروں جانب اونچے اونچے مکانوں پر چبھتی ہوئی دھوپ نے نور بکھیرا ہوا تھا۔ میں نے اپنی ساٹھ سالا زندگی میں کسی ایسی جگہ کو جہاں اس قدر سکوت طاری ہو، ہو کا عالم ہو، قبروں کے ماحول میں پہلی بار اجنبی کی حیثیت سے قدم رکھا ہو اس کے باوجود ڈر و خوف دور دور نہ ہو۔ اس کی وجہ جو مجھے سمجھ آئی وہ شہدائے بدر ہیں جو یہاں ابدی نیند سو رہے ہیں، نبی اکرم حضرت محمد ﷺ اور صحابہ اکرام جنہوں نے غزوہ بدر حصہ لیا تھا کا اس میدان میں اپنی موجودگی عطا کرنا تھا، ان کے قدم مبارک اس زمین پڑے تھے، اس

جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد و نصرت چاہتا تھا جس کے لیے اللہ نے کفار سے مقابلے کے وقت فرشتوں کو میدان میں بھیجا۔ یہی فیوض و برکات ہیں کہ ہم اس وقت جب کہ ہر جانب خاموشی ہے، سنناٹا ہے، ہم اجنبی ہوتے ہوئے بھی اپنائیت محسوس کر رہے ہیں۔

شریک سفر لوگوں میں شہناز (شریک حیات)، بیٹا عدیل، بہو مہوش، پوتا صائم اور پوتی حبیبہ تھے۔ ہم اس وقت اس متبرک اور تاریخی مقام جنگِ بدر کے میدان میں موجود ہیں، میری نظروں کے سامنے شہدائے بدر کی قبریں ہیں، دوسری جانب اسی میدان میں کوئی ڈھائی فٹ چوڑی کچی مٹی کی اونچی اونچی دیواریں پاس پاس موجود ہیں جن میں جگہ جگہ سوراخ بھی نظر آرہے ہیں۔ انہیں مورچے ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس جگہ گھروں کا بنانا تو سمجھ میں نہیں آتا، جنگی ضرورت کے تحت ممکن ہے کہ دیوروں کو مورچے کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہو۔ یہ ہے اِس وقت کا بدر کا میدان۔ میدان کو چاروں جانب سے ایک اونچی دیوار نے اپنے حسار میں لیا ہوا ہے۔ سعودی حکومت کی جانب سے میدان کی حفاظت کے نقطہ نظر سے یہ دیوار بنا دی گئی ہے۔ اندر جانے کے لیے ایک دروازہ بھی نظر آرہا ہے جو اس وقت بند ہے۔ کوئی محافظ، چوکیدار جسے یہاں حارث کہا جاتا ہے موجود نہیں، پولس کا کوئی کارندہ جسے یہاں شرطہ کہا جاتا ہے دکھائی نہیں دے رہا۔ دیوار کے باہر کئی جگہ لوگوں نے اس میدان اور شہداء کی قبروں کی زیارت کرنے

کی غرض سے اوپر نیچے کچھ اینٹیں رکھ دی ہیں۔ جن پر چڑھ کر دیوار کے اوپر سے میدان کے اندر کا نظارہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس جگہ اور مقام کی حرمت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہاں اندر جانے کے لیے ہمہ وقت انتظام ہوتا، سعودی عرب کے قبرستانوں میں لوگوں کے لیے دھوپ سے بچاؤ کے لیے سائبان بنے ہوئے ہیں، پانی کے چھوٹے چھوٹے گلاس ڈی فریزروں میں موجود ہوتے ہیں لیکن یہاں اس سہولت کا فقدان کیوں؟ ہم مدینہ سے دو گھنٹے کا طویل سفر کرکے صرف اور صرف اس میدانِ مبارک کی زیارت کرنے، شہدائے بدر کو سلام عرض کرنے ہی تو آئے تھے، ہماری طرح بے شمار لوگ ہر روز یہاں آتے ہیں۔ اب ہماری بھی مجبوری تھی ہم نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا دیوار کے باہر رکھی اینٹوں پر چڑھ کر میدان بدر میں موجود تاریخی و متبرک ورثے اور شہدائے بدر کی قبروں کی زیارت کی، انہیں سلام عرض کیا۔ اس سے قبل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میدان کے چارو جانب چکر بھی لگایا۔ خیال تھا کہ کوئی راستہ نظر آجائے گا تو اس سے اندر جاکر جی ٹھنڈا کریں گے لیکن یہاں کی صورت حال دیکھ کر دکھ ہوا، ہر ملک و قوم اپنے تاریخی ورثہ کی حفاظت کیا کرتی ہے۔ جہاں چلے جائیں تاریخی مقامات، تہذیب و ثقافت، تاریخی چیزوں کو جوں کا توں محفوظ کرنے کی روایت پائی جاتی ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے ساتھ تو دوہرا معاملا ہے تاریخی ورثہ بھی اور مذہبی عقیدت بھی۔ بے شمار لکھنے والوں نے سعودیوں کی توجہ اپنی تحریروں سے اس جانب دلائی۔ بات بدر کے میدان کی ہی نہیں، غارِ حرا کا کیا حال ہے، مستنصر

حسین تارڑ کا سفر نامہ "غارِ حرا میں ایک رات" ' پڑھ لیجئے حقیقت واضح ہو جائے گی، غارِ ثور کس حالت میں ہے،ڈاکٹر آصف محمود جاہ کا سفر نامہ " 'اللہ، کعبہ اور بندہ' کا مطالعہ کر لیجئے۔ تاریخی باغات اور کنویں کہاں اور کس حال میں ہیں؟ مکہ میں آنحضرت ﷺ کی پیدائش گاہ کو محفوظ کر دیا گیا ہے باقی کس کا گھر محفوظ رہا، حضرت خدیجہؓ کا گھر کہاں ہے؟ حضرت علیؓ کا گھر کیا ہوا؟ قبروں کی تو بات ہی کیا ہے، شہدائے احد کی یادگار کس حال میں ہے؟ 90 سال بعد یہاں مسجد بنانے کا خیال آیا ہے۔ اب وہاں ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ 'سبا مساجد' میں موجود سابقہ مسجدوں کا کیا حال ہے؟ کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔ اللہ کی رحمت اور خصوصی عنایت اس سرزمین پر ہے۔ قبر پرستی کسی بھی صورت جائز نہیں لیکن قبرستان میں جانا تو گناہ نہیں، شہیدوں کا احترام کرو، شہید مرتے نہیں، وہ زندہ ہیں، کہا گیا ہے کہ 'انبیاء علیہم السلام اپنی قبرون میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح دنیا میں زندہ تھے بلکہ ان کی برزخی زندگی دنوی زندگی سے بھی زیادہ حقیقی ہے' (یہ بات معروف کتاب 'قبر پرستی ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ' میں کہی گئی ہے۔ اگر وہ زندہ ہیں تو وہ جگہ جہاں وہ ہیں ہمارے لیے اہم اور محترم ہونی چاہیے۔

بدر کا میدان وہ متبرک جگہ ہے کہ جہاں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ اور

صحابہ اکرام نے کفار کے ساتھ اولین جنگ کی ، اس جنگ میں کون کون صحابی رسول شریک نہیں تھے۔ وہ تمام اسی سرزمین پر تو کفار سے برسرپیکار ہوئے ہوں گے جس جگہ اس وقت ہم کھڑے ہیں۔ یہ وہی معرکہ تھا کہ جس کے بارے میں قرآن مجید کی متعدد آیات میں ذکر موجود ہے۔اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کرنے کے لیے اپنے محبوب اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی۔ یہی وہ دن تھا جب اسی جگہ پروردگار نے اپنے محبوب کی مدد کے لیے فرشتوں کی بڑی جماعت کو اس میدان میں مقرر کیا۔ کلام مجید کی آیات میں واضح کہا گیا ہے کہ لڑائی شروع ہونے سے قبل تو دونوں فریقین کو ایک دوسرے کی تعداد مختلف نظر آرہی تھی اور جب لڑائی شروع ہوئی تو تعداد کم اور زیادہ ہو گئی۔ یہ لوگ کون تھے؟ یقیناًاللہ کے فرشتے ہی تو تھے۔ مسلمان تعداد میں 313 اور جنگی ساز و سامان کے اعتبار سے دو گھوڑے اور 70 اونٹ باقی سب پیدل۔ بہت کم اور کمزور تھے پھر بھی کفار پر غلبہ حاصل کرتے گئے۔ جنگ کے دوران آنحضرت ﷺ کا میدان سے مٹھی بھر مٹی کفار کی جانب پھینک دینا جو صرف مٹی نہ رہی بلکہ کفار کی آنکھوں کو اس نے چندھیا دیا اور انہیں کچھ سجائی نہ دے رہا تھا۔ یہ سب اللہ کی جانب سے مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کرنا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت میں جس جگہ موجود ہوں اسی جگہ ہمارے نبی ﷺ ، ان کے صحابہ اکرام کھڑے ہوں، فرشتے اس جگہ موجود رہے ہوں۔ جنگ صرف اس حصہ میں تو ہوئی نہیں جسے چار دیواری سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جنگ تو اس پورے میدان میں ہوئی ہوگی، جہاں پر اب کشادہ

سڑکیں،اور مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔ میں اس سعادت پر فخر کے ساتھ ساتھ اللہ کا شکر بجالا رہا تھا۔

اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ کہاں میں گناہ گار اور کہا یہ متبرک و محترم مقام۔ بدر کا میدان سمٹ کر چھوٹا سا ہو گیا اور اس کے ارد گرد ایک حسین و جمیل شہر 'بدر' کے نام سے آباد ہو چکا ہے۔ میدان بدر کے چاروں جانب اونچی اونچی رہائشی عمارات ہیں۔ صاف ستھرا، کشادہ اور پر سکون شہر۔ میدان کے گیٹ کے باہر بالکل سامنے سڑک کا اختتام ہوتا ہے، یہ 'شہید چوک' ہے۔ یہاں ایک بڑا بورڈ نصب ہے جس پر 14 شہیدو ں کے نام جنھوں نے غزوہ بدر کے اسی میدان میں جام شہادت نوش فرمایا جو اس وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔ لیکن یہاں صرف 14 ہی قبریں نہیں ہیں، قبروں کی تعداد بہت زیادہ دکھائی دے رہی ہے، نہیں معلوم 70 کفاروں کو بھی اسی جگہ دفن کر دیا گیا تھا یا بعد میں یہاں کی مکینوں نے اس قبرستان کو اپنے

مردے دفن کرنے کے لیے استعمال کیا۔ کافی قبریں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ غزوہ بدر کے 14 شہداء کے نام حسب ذیل ہیں :

۔ عمیر بن ابی وقاص 1

۔ صفوان بن وھب 2

۔ نواشمالین بن عمرو 3

۔ مھجع بن صالح 4

۔ عاقل بن الکبیر 5

۔ عبیدہ بن الحارث 6

۔ سعد بن خیثمۃ 7

۔ مبشر بن عبدالمنذر 8

۔ حارثہ بن سراقۃ 9

۔ رافع بن المعلا 10

۔ عمیر بن الحمام 11

۔ زید بن الحارث 12

۔ معوذ بن الحارث 13

۔ عوف بن الحارث 14

شہر بدر کا نام 'بدر حنین' ہے۔ یہ صوبہ مدینہ کا ایک اہم شہر شمار ہوتا ہے جو سعودی عرب کے مغربی حصے میں مدینہ سے ینبو کی بندرگاہ والے راستہ پر واقع ہے۔ مدینہ سے اس کا زمینی فاصلہ تقریباً 150 کلو میٹر ہے۔ یہاں کی آبادی 2010 کی مردم شماری کے مطابق 58,088 نفوس پر مشتمل تھی۔ مکہ سے تجارت کے لیے یہ راستہ اہمیت رکھتا تھا جو جنگ کی وجہ بنا۔ بدر حنین کو جنگ بدر کی وجہ سے جو اہمیت اور مرتبہ حاصل ہے اس کے پیش نظر اس شہر کو اتنی ترقی اور بلندی

حاصل نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ مدینہ سے نذدیک بندرگاہ 'ینبو' کو بھی نظر انداز کردیا گیا۔ ابتدائی دور میں حجاج اکرام جومدینہ آیا کرتے تھے وہ بحری سفر کے لیے ینبو کو ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ علاقہ میدانی ہے، پہاڑوں کے ساتھ ساتھ بڑا حصہ ریگستان ہے۔ جیسے ہی بدر کا میدان نذدیک آتا ہے یہاں کے پہاڑوں کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ پہاڑ مٹی کے محسوس ہونے لگے ہیں، یا تو یہ پہاڑ مکمل مٹی کے ہیں یا پھر ریگستان کی مٹی نے اڑ اڑ کر ان پہاڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ان پہاڑوں کے فوری بعد میدانی اور ریگستانی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی میدانی اور ریگستان میں آگے جاکر بدر کامیدان ہے۔

جنگ بدر پہلی جنگ ہے جو مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش قبیلے جو کافر تھے کے درمیان 17 مارچ 624 عیسوی مطابق 17 رمضان المبارک 2 ہجری کو ہوئی۔ اس دن کو 'یوم الفرقان' کہا گیا کیونکہ یہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کو فتح و غلبہ دے کر واضح کر دیا گیا کہ اسلام حق ہے اور کفر و شرک باطل ہے۔ یہ جنگ بعض اعتبار سے اہم جنگ تھی، اہمیت کے اہم اسباب حسب ذیل بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ یہ جنگ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان پہلی جنگ تھی۔

۲۔ یہ جنگی منصوبہ بندی کے بغیر ہوئی۔ ابو سفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے

تھے) کی سر کردگی میں ایک تجارتی قافلہ شام سے سامان تجارت لے کر مکہ جا رہا تھا۔
چونکہ مسلمانوں کا بھی بہت سا مال اور اسباب ہجرت کی وجہ سے مکہ میں رہ گیا تھا یا کافروں نے چھین لیا تھا، نیز کافروں کی قوت و شوکت کو توڑنا بھی وقت کی ضرورت تھی ان اسباب کے باعث رسول اللہ ﷺ نے اُس تجارتی قافلے کو بدر کے مقام پر روکنے کا پروگرام بنایا اور مسلمان اس نیت سے مدینہ سے چل پڑے،ابو سفیان کو بھی اس کی اطلاع مل گئی ، اس نے اپنے قافلے کا راستہ تبدیل کر لیااور مکہ اطلاع بھجوا دی جس کی بنا پر ابو جہل ایک لشکر لے کر اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے بدر کی جانب چل پڑا۔ کفار مکہ اپنی طاقت و کثرت میں مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور مقام بدر میں پہلا معرکہ برپا ہوا۔

۳۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو اللہ تعالی کی خصوصی مدد حاصل ہوئی جس کا ذکر قرآن کی مختلف آیات میں موجود ہے۔

۴۔ اس جنگ میں کافروں کو کو عبرت ناک شکست ہوئی جس سے آئندہ کے لیے کافروں کے حوصلے پست ہوگئے۔ لیکن انہوں نے بدلہ لینے کی تیاری شروع کر دی اور جنگ احد میں انہوں نے کسی حد تک اس کا بدلہ لے بھی لیا۔

جنگ بدر کے مختلف پہلوؤں پر قرآن کی کئی سورتوں میں ذکر ملتا ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت 13 ، 121-123اور سورہ الانفال کی آیت 17 اور 44 خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سورۃ آل عمران کی آیت 13 میں کہا گیا ترجمہ 'یقینا تمہارے لیے

عبرت کی نشانی تھی ان دو جماعتوں میں جو گتھ گئی تھیں ایک جماعت تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا وہ انہیں اپنی آنکھوں سے اپنے سے دگنا دیکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی مدد سے قوی کرتا ہے۔ یقیناً اس میں آنکھ والوں کے لیے بڑی عبرت ہے'۔ اس آیت کی تفسیر مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو اپنے سے دوگنا دیکھتا تھا۔ کافروں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی' انہیں مسلمان دو ہزار کے قریب دکھائی دیتے تھے۔ مقصد اس سے ان کے دلوں میں' مسلمانوں کی دھاک بٹھانا تھا۔ اور مسلمانوں کی تعداد 313 تھی' انہیں کافر 600 اور 700 کے درمیان نظر آتے تھے، حالانکہ ان کی اصل تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ مقصد اس سے مسلمانوں کے عزم و حوصلہ میں اضافہ کرنا تھا۔

اسی طرح سورۃ الانفال کی آیت 44 میں کہا گیا ترجمہ 'جب کہ اس نے بوقت ملاقات انہیں تمہاری نگاہوں میں بہت کم دکھائے اور تمہیں ان کی نگاہوں میں کم دکھائے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو انجام تک پہنچا دے جو کرنا ہی تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں'۔ اس سب کا مقصد یہ تھا کہ اللہ نے جو فیصلہ کیا ہوا تھا وہ پورا ہو جائے۔ اس لیے اس نے اس کے اسباب پیدا فرما دیے۔ یہ وہی میدان جنگ ہے کہ جس میں قریش کا نامی گرامی سردار ابو جہل جو بڑی شان و شوکت سے مسلمانوں کو سبق سکھانے بدر آیا تھا جہنم رسید ہوا، عتبہ بھی ایک

بڑا سردار تھا وہ بھی مارا گیا۔ کافروں کو اس جنگ میں بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ 70 مارے گئے 70 کو قیدی بنا لیا گیا۔ حضرت انسؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ جنگ بدر کے آغاز سے قبل رسول اللہ ﷺ بدر کے میدان میں ایک خاص جگہ اپنا ہاتھ رکھتے اور فرماتے کہ فلاں کافر کے ہلاک ہونے کی یہ جگہ ہے، فلاں کی یہ ہے۔ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ اکرام فرماتے ہیں کہ دوسرے روز جب جنگ ختم ہوئی تو ہم نے ان نشانات کی جگہ کو دیکھا ہر کافر اسی جگہ مرا پڑا تھا جس جگہ آپ ﷺ نے نشان لگایا تھا۔ جنگ کے میدان سے کچھ فاصلہ پر ایک کیمپ بنایا گیا تھا کہ جہاں پر آنحضرت ﷺ اور دیگر صحابہ رات میں آرام کیا کرتے تھے۔ اس جگہ اب ایک ’مسجد عریش‘ تعمیر کردی گئی ہے۔ جو وسیع اور خوبصور ہے اور جنگ بدر کی یاد دلاتی ہے۔ بدر کے شہیدوں کو سلام عرض کرکے اور چند لمحات یہاں گزار کر ہمارا سفر جدہ کے لیے شروع ہوا، نماز مغرب پر گھر پہنچے۔ (8 مئی 2015، جدہ)

جنت المعلیٰ میں کچھ لمحات

(مکہ المکرمہ کا متبرک و مقدس قبرستان)

دنیا سے رخصت ہونے جانے کے بعد ہمارے جسم کا مقام قبر ہے، قبر ہی میں منکر نکیر ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں سوالات کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے پرور دگار سے قبر کی سختی، قبر کی تنگی، قبر کی مشکلات اور قبر کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے ہیں۔ بار بار اپنے اللہ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش مانگتے ہیں، استغفار کرتے ہیں۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''خدا کی قسم میں دن میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ و استغفار کرتا ہوں''۔ صحیح مسلم کی حدیث حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' لوگو! اللہ کے حضور میں توبہ کرو، میں خود دن میں سو سو دفعہ اس کے حضور میں توبہ کرتا ہوں''۔ معارف الحدیث میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے درست ارشاد فرمایا کہ بندے کو چاہئے کہ توبہ کے معاملے میں ٹال مٹول نہ کرے، معلوم نہیں کس وقت موت کی گھڑی آجائے اور خدا نخواستہ توبہ کا وقت ہی نہ ملے۔

کلام مجید کی متعدد آیات میں قبر، موت، قبر میں دفن ہونے، قبر سے دوبارہ اٹھائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ سورۃ الحج کی آیت 7 میں کہا گیا کہ 'اور یہ کہ خدا سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں جلد اٹھائے گا'، سورۃ عبس آیت 22 میں بھی کہا گیا 'پھر جب چاہے گا اُسے اٹھا کھڑا کرے گا'، سورۃ الانفطار آیت 1۔5 کہا گیا' جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے، اور جب دریا بہہ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گے، اور جب قبریں اُکھیڑ دی جائیں گی تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ اُس نے آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا تھا'، اور سورۃ التکاثر کی آیا 1 اور 2 میں کہا گیا ''لوگو تم کو (مال کی) بہت سی طلب نے غافل کردیا یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں'۔

قبر میں موجود مردے کے لیے افضل تحفہ استغفار ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'قبر میں مدفون مُردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ پکار کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں یا باپ، بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے مغفرت کا تحفہ اسے پہنچے۔ جب کسی طرف سے اسے کوئی دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتا ہے اور دنیا میں بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مُردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی سکتی ہے۔

، اور مُردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لیے دعائے مغفرت ہے

(معارف الحدیث)

سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ''میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کردیا تھا (اب اجازت دیتا ہوں کہ) تم قبروں کی زیارت کرلیا کرو، کیونکہ (اس کا یہ فائدہ ہے کہ) اس سے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر پیدا ہوتی ہے''۔اس حدیث کی تشریح معارف الحدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ 'شروع شروع میں جب تک کہ توحید پوری طرح مسلمانوں کے دلوں میں راسخ نہیں ہوئی تھی اور انہیں شرک اور جاہلیت سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر جانے سے منع کر دیا تھا، کیونکہ اس سے ان لوگوں کے شرک اور قبرپرستی میں ملوث ہوجانے کا خطرہ تھا۔ پھر جب امت کا توحیدی مزاج پختہ ہوگیا، اور ہر قسم کے جلی خفی شرک سے دلوں میں نفرت بھر گئی اور قبروں پر جانے کی اجازت دے دی اور یہ بھی واضح فرمایا دیا کہ یہ اجازت اس لیے دی جارہی ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر دلوں میں پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔ علامہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے شریعت کا یہ بنیادی اصول معلوم ہوا کہ اگر کسی کام میں خیر اور نفع کا کوئی پہلو ہے اور اسی کے ساتھ کسی بڑے ضرر کا بھی اندیشہ ہے تو اس اندیشہ

کی وجہ سے خیر کے پہلو سے صرف نظر کرکے اس کی ممانعت کردی جائے گی، لیکن اگر کسی وقت حالات میں ایسی تبدیلی ہو کہ ضرر کا اندیشہ باقی نہ رہے تو پھر اس کی اجازت دے جائے گی'۔ جامع ترمذی کی حدیث جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں 'ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ ہی میں چند قبروں پر ہوا، آپ ﷺ نے ان کی طرف رخ کیا اور فرمایا ''السلام علیکم یا اھل القبور' (سلام ہو تم پر اے قبر والو! اللہ تعالی ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے، تم ہم سے آگے جانے والے ہو اور ہم پیچھے پیچھے آرہے ہیں'۔

اللہ کے متبرک شہر مکہ المکرمہ کی فیوض و برکات کا تو شمار ہی نہیں۔ خانہ کعبہ مقدس ہے اسی نسبت سے شہر مکہ مقدس جسے اللہ نے 'بلد اللہ لحرام قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ شہر بھی مقدس ہے اس کی سرزمین کا چپہ چپہ مقدس ہے، اس میں پائے جانے والی ہر چیز قابل احترام ہے۔ مکہ المکرمہ کے چارو جانب کئی کئی میل کے علاقے کو 'حرم' کی حدود قرار دیا گیا ہے۔ حرم کے معنی ہی واجب الترام' کے ہیں۔ مکہ شہر میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے، یہاں شکار نہیں کیا' جاسکتا، جنگ و جدل کی اجازت نہیں، درخت حتیٰ کے پتوں کو جھاڑنے کی اجازت نہیں۔ یہ سب اس سرزمین کا تقدس و حترام ہے۔ حرم کی حدود کا تعین اول اول حضرت ابراہیمؑ نے پھر آنحضرت محمد ﷺ نے اپنے عہد میں اس کی تجدید فرمائی۔ شہر مکہ کی تعظیم و

احترام میں متعدد احادیث مستند احادیث کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے جس کے راوی عیاش بن ابی ربیعہ رضہ اللہ عنہ ہیں۔ فرمایا رسول اکرم ﷺ نے 'میری امت جب تک اس حرام مقدس کا پورا احترام کرتی رہے گی اور اس کی حرمت و تعظیم کا حق ادا کرتی رہے گی خیریت سے رہے گی اور جب اس میں یہ بات باقی نہ رہے گی برباد ہو جائے گی'۔ جامعہ ترمذی کی حدیث ہے جسے عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور معارف الحدیث میں نقل کیا گیا ہے۔ 'آپ ﷺ مکہ میں حزورہ (ایک ٹیلے) پر کھڑے تھے اور مکہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے: خدا کی قسم! تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر جگہ ہے، اور اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے، اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا، تو میں ہر گز تجھے چھوڑ کے نہ جاتا'۔ اس احادیث سے اور دیگر احادیث مبارکہ سے مکہ شہر کی عظمت اور تعظیم واضح ہے۔ ایسی مقدس زمین میں دفن شخصیات کے مقدس اور افضل ہونے میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مکہ کا قبرستان 'جنت المعلیٰ' یقیناً افضل اور مقدس ہے۔ جو مسجد حرام، خانہ کعبہ کے نذدیک ہی واقع ہے۔ حدود حرام میں شامل ہے۔ اسے اس اعتبار سے بھی فضیلت و بلند مرتبہ حاصل ہے کہ یہاں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے خاندان کے بے شمار بزرگ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان میں وہ بزرگ بھی ہیں جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور وہ بزرگ بھی ہیں جنھوں نے اعلان نبوت کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو نبی آخر الزماں مانا اور اسلام لے آئے۔

اہل قبور کو

سلام عرض کرنا، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرسنت رسول ﷺ اور باعثِ ثواب ہے۔ مکہ میں جانے والے مسلمانوں کی خواہش، تمنا اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ اسلام کے ان محترم شخصیات کی قبور پر پہنچے اور سلام کا ندرانہ پیش کریں اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔

ہمارا قیام جدہ میں ہوتا ہے۔ مکہ المکرمہ چلے جانا ہمارے لیے اب بہت سہل ہوگیا ہے۔ دسمبر بدھ 2014 کا دن تھا۔ مَیں اور شہناز صبح ہی حرم پہنچ گئے۔ ہمارے بیٹے 18 عدیل نے آفس جاتے ہوئے ہمیں کلو عشرہ اسٹاپ جہاں سے مکہ کے لیے گاڑیاں جاتی ہیں پہنچادیااور ہم وہاں ٹیکسی کے ذریعہپینتالیس منٹ میں حرم پہنچ گئے۔ اولین فرصت میں خانہ کعبہ کے سامنے دعا کی۔ ہماری خوش قسمتی کہ حجراسودکے بوسے کے لیے لائنیں لگیں تھیں۔ ہم اپنی اپنی لائن میں لگ گئے دس منٹ میں ہم دونوں نے یہ سعادت حاصل کرلی۔ بلکہ میں نے تو دو بار بوسہ لیا۔ سعادت کی بات ہے ورنہ عام دنوں میں ہم جیسے دل کے مریض کے لیے یہ کسی بھی طور ممکن نہیں کہ ہم حجراسود کے بوسے کے لیے اس جم غفیر میں شامل بھی ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکراور احسان کہ وہ بلاتا ہے تو سعادتیں بھی نصیب کرتا ہے۔ آج ہم نے جنت المعلیٰ میں مدفن اہل قبور کو سلام عرض کرنے اور مغفرت کی دعا کا ندرانہ پیش کرنے کا پروگرام بنایا۔ جنت المعلیٰ مکہ کا معروف قبرستان ہے۔ یہ مکہ کے علاقے حجون میں ہے، حرم شریف کے شمال میں

واقع ہے۔ حرم سے اس کا فاصلہ ایک میٹر سے بھی کچھ کم ہے۔ حرم شریف سے قبرستان جانے کے لیے دو طریقے تھے ایک یہ کہ ہم سعٔی کرکے باہر آنے والے دروازے سے باہر آتے اور مولودالنبیؐ (حضورؐ کی پیدائش گاہ) کے سامنے سے پیدل جنت المعلیٰ چلے جاتے۔ اس صورت میں پیدل اچھا خاصہ چلنا پڑتا۔ ابھی ہم نے طواف بھی کرنا تھا۔ دوسری صورت ٹیکسی کے ذریعہ جنت المعلیٰ چلے جانا تھا۔ ہم نے ٹیکسی والے سے بات کی اتفاق سے ٹیکسی والا اردو بول رہا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا تعلق بہاولپور سے ہے اس سے اور بھی سہولت ہو گئی۔ اس سے جانے اور واپس آنے کا طے کیا بیس ریال پر اتفاق ہوا اس نے ہمیں جنت المعلیٰ کے دروازہ پر پہنچا دیا۔ اللہ اکبر، کبھی کتابوں میں اور حج سے واپس آنے والوں کی زبانی سنا کرتے تھے کہ اس قبرستان میں ہماری بہت ہی پیاری پیاری اور قابل تعظیم ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ آنحضرت محمد ﷺ جب کبھی حضرت خدیجہؓ کے مقبرہ پر تشریف لاتے تو فرمایا کرتے "کیا ہی اچھا ہے یہ مقبرہ" ۔ عربی میں مقبرہ قبر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مقبرہ جنت المعلیٰ، مقبرہ جنت البقیع، مقبرہ اماں حوا، مقبرہ شہدائے بدر، مقبرہ شہدائے احد۔ جنت المعلیٰ آج بھی اسی طرح پر سکون ہے۔ رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ صاف ستھرا، ایک ترتیب سے تمام قبریں بنائی گئیں ہیں۔ آج اللہ نے یہ موقع دیا کہ ہم ان عظیم ہستیوں کی قبروں کے سامنے کھڑے ہیں ۔ قبرستان ہر وقت نہیں کھلتا۔ اس وقت یہ قبرستان بند تھا لیکن اس کی چار دیواری بڑی بڑی جالیوں کی ہے اندر

موجود قبریں واضح نظر آ رہی ہیں۔ سپاٹ زمین پر جگہ جگہ پتھر رکھے ہیں، یعنی یہی قبریں ہیں۔ یہاں کی قبریں اوپر اٹھی ہوئی نہیں بلکہ زمین سے ہموار کرکے پتھر رکھ دئے جاتے ہیں۔ لیکن اب ہم نے دیکھا کہ بعض قبرستانوں میں قبریں اسی طرح اوپر اٹھی ہوئی بنائی جارہی ہیں۔ حتیٰ کہ جنت البقیع میں قبروں پر کالے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر قبروں کو اوپر کی جانب اٹھا دیا گیا ہے۔ ہم نے جالیوں کے باہر سے ہی تمام اہل قبور کو سلام پہنچایا اوران کی مغفرت کی دعا کی۔

جنت المعلیٰ میں جو شخصیات ابدی نیند سو رہی ہیں جن کے بارے میں مجھے علم ہو سکا ان میں خاتون جنت حضرت خدیجہؓ کی قبر اس قبرستان میں ہے۔ اب تو یہ قبر چاروں جانب سے چھوٹی سے دیوار کے اندر نظر آ رہی ہے۔ جس طرح جنت البقیع میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عثمانؓ، حضورؐ کے فرزند ابرہیمؓ اور چند دیگر شخصیات کی قبروں کے گرد چھوٹی سی دیوار بنی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سعودی حکومت کے قیام سے قبل حضرت خدیجہؓ کی قبرِ مبارک ایک وسیع اور خوبصورت مقرہ میں تھی۔ یہ مقبرہ (Mausoleum) سعودی حکومت سے قبل کسی دور میں بنایا گیا ہوگا۔ 1925 میں سعودی حکمراں ابن سعود کے دورِ حکمرانی میں قبر پر تعمیر شدہ مقبرہ کو شہید کردیا گیا اور صرف قبرِ مبارک ہی رہنے دی گئی۔ یہاں مقبرہ سے مراد قبر مبارک کے اوپر گنبد نما عمارت ہے۔ کیونکہ سعودی

عرب میں مقبرہ' قبرستان کو کہا جاتا ہے۔ کسی بھی قبر پر مقبرہ یا اس کی عمارت کو منہدم کرنے کی یہ واحد مثال نہیں تھی بلکہ پورے سعودی عرب میں جس قبرستان میں بھی کسی قبر پر مقبرہ بنا ہوا تھا اسے منہدم کر دیا گیا۔ ماسوائے روضۂ رسول ﷺ کے۔اس کی وجہ سعودی عقیدہ ہے جس پر وہ آج تک سختی کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔ صحیح یا غلط ، یہ الگ بحث ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔اماں خدیجہؓ کی قبر پر بنے ہوئے مقبرے کی تصویر انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ یہ بات سینہ بہ سینہ ہے کہ یہ فلاں کی قبر ہے اور یہ فلاں کی قبر۔ ہر شخص نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔بس ایسی متبرک ہستیوں کی قبروں کو ویران اور کھنڈر کی مانند دیکھ کر کرب اور شدید دکھ ہوتا ہے۔

جنت المعلیٰ میں مدفون بعض قابل تعظیم ہستیاں جن کے نام کتابوں سے معلوم ہو سکے، جو اس قبرستان میں ابدی نیند سو رہی ہیں ۔ ان میں عبد المطلب (آنحضرتؐ کے دادا)، ابو طالب ابن عبد المطلب (آنحضرتؐ کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد) ، عبد اللہ بن عبدالمطلب، سیدہ آمنہ (والدہ ماجدہ آنحضرت ﷺ) (ایک روایت یہ ہے کہ سیدہ آمنہ 'ابوا' میں مدفن ہیں)، اماں خدیجہؓ (پہلی شریک حیات حضرت محمد ﷺ)، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کی والدہ، حضرت اسماء بنت ابو بکر صدیقؓ ، عبدالمناف، ابوتراب الزہری، محمد علاوی المالکی کے علاوہ بے شمار

جلیل القدر صحابہ اکرم، اہل مکہ اور بعض زائرین اس قبرستان میں مدفن ہیں۔ میرے والد مرحوم کے حقیقی ماموں غلام مصطفیٰ سبزواری، میرے کرم فرما ساتھی محمد عادل عثمانی بھی اسی قبرستان میں مدفن ہیں۔ اس وقت مجھے ان کی یاد شدت سے آرہی ہے اور ان کے ساتھ گزرے اچھے دن یاد آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ہم کچھ دیر یہاں ٹھہرے فاتحہ پڑھی اور مسلسل ان قبروں کو دیکھتے رہے۔ اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے رہے اپنی قسمت پر رشک کرتے رہے۔ یہاں استراحت فرما تمام ہی اہل قبور کو سلام پیش کرتے رہے اور مغفرت کی دعا کے ساتھ واپس ہوئے۔ اب اس ٹیکسی والے نے ہمیں حرم کے اس حصہ میں اتارا جہاں سے پیدل چل کر ہم پہلے مولود النبیؐ حضورؐ کی پیدائش گاہ) پہنچے۔ اس گھر کی زیارت کی اس بار شہناز بھی میرے ہمراہ) تھیں۔ اس گھر میں قائم لائبریری کو دیکھا اس کمرے کو دیکھا جہاں حضور ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتے ہوئے ہم دوبارہ حرم میں داخل ہوئے طواف کیا، عصر کی نماز پڑھ کر ہم جدہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ مغرب جدہ (جاکر ادا کی۔ (11 مئی 2015

شَعبان المعظم: متبرک اسلامی مہینہ اور شبِ براءت

شَعبان قمری سال کے آٹھویں مہینے کا نام ہے، شَعبان کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس مہینے میں عرب پانی وغیرہ کی تلاش میں یا لوٹ مار کے لیے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے شُعبان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان آتا ہے۔ کتب احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم شعبان کے مہینے میں کثرت سے روزے رکھا کرتے اکثر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعبان کو رمضان سے ملا دیتے، مگر امت کو شعبان میں بکثرت روزے رکھنے سے منع فرما دیا، البتہ نصف شعبان کی رات کو قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی۔ حدیث مبارکہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ سب سے نیچے کے آسمان (سماء الدنیا) پر اُتر آتا ہے اور انسانوں کو ان کے گناہ معاف کرنے کے لیے پکارتا ہے۔ مسلمان اس مہینے کی چودھویں رات کو مُردوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور غریبوں میں کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ بعض گھروں میں حلوہ بھی پکایا جاتا ہے اور نیاز بھی دلائی جاتی ہے۔ یہ رات لیلۃ البراءۃ کہلاتی ہے جس کے معنی "مغفرت کی رات" کے ہیں۔ شعبان المعظم کا پورا مہینہ برکت و سعادت اور حرمت تعظیم والا ہے۔ اس مہینے کو بطور خاص بعض فضیلتیں، امتیازات اور شرف بھی عطا کیے گئے ہیں۔ یہ

مہینہ توبہ کا مہینہ بھی کہلاتا ہے۔ اس مہینے میں مسلمانوں پر برکتوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اسلامی مہینہ شَعبان المعظم کی پندرہویں شب مغفرت اور بخشش والی رات ہے، اس وجہ سے اس رات کو "شبِ برات" کہا جاتا ہے۔ یہ رات شعبان کی چودہ تاریخ کو سورج غروب ہونے سے شروع ہوتی ہے اور پندرہویں تاریخ کی صبح صادق ہونے تک برقرار رہتی ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ " ماہ شَعبان المعظم بہت ہی برگزیدہ مہینہ ہے اس ماہ مبارک کی عبادت کا بے حد ثواب اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے"۔

قرآن کریم کی سورۃ" الدخان"، آیت 1-6 ، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ترجمہ " قسم اس) روشن کتاب کی ۔ بلاشبہ ہم نے اسے برکت والی رات میں نازل کیا، یقیناہم) عذاب سے) ڈرانے والے ہیں۔ اس (رات) میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کر دیا) جاتا ہے۔ ہماری جانب سے حکم (نافذ) ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے"۔ ان آیات مبارکہ میں جس مبارک شب کا تذکرہ ہے۔ مفسرین نے شب قدر سے مراد لی ہے جو نزول قرآن کی رات ہے اور جس کا تذکرہ" سورۃ القدر"میں ہے۔

بقول مفتی منیب الرحمٰن

حضرت عکرمہ اور بعض دیگر مفسرین کرام نے اس سے شعبان المعظم کی پندرھویں شب ' مراد لی ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مبارک رات کے متعلق ارشاد فرمایاہے" اس رات میں ہمارے حکم سے ہر حکمت والا کام تقسیم کر دیا جاتا ہے"۔ یعنی شب برات میں بندوں کا رزق ، ان کی اموات و پیدائش کے امور، آئندہ رونما ہونے والے حادثات واقعات غرض سال بھر میں ہونے والے تمام امور کے احکام الگ الگ تقسیم کردیے جاتے ہیں، اور ہر کام کے فرشتوں کواُن کا کام سونپ دیا جاتا ہے، جس کی وہ سال بھر طے شدہ دن اور وقت پر سختی سے تکمیل کرتے ہیں۔

ڈاکٹرعلامہ طاہر القادری نے اپنے ایک مضمون میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شعبان میں اچھی تیاری کرے گا اس کا رمضان اچھا گزرے گا اور وہ ماہِ رمضان کی برکتوں اور سعادتوں سے لطف اندوز اور بہرہ مند ہو گا"۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا"جب شعبان کی درمیانی رات آئے تو اس رات کو قیام کرو اور دن کا روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات کو غروب آفتاب ہی سے آسمانِ دنیاپر نزول رحمت فرماتا ہےاور (اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے) ہے کوئی بخشش کا طلب گار کہ میں اسے بخش

دوں، ہے کوئی (کشادگی) رزق کا خواستگار کہ میں اسے رزق عطا کروں، ہے کوئی مبتلائے مصیبت کہ میں اسے مصیبت سے نجات دوں، اسی طرح تمام حاجت مندوں کی حاجات کا ذکر کرکے رحمت باری انہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور یہ (فیضان عطا اور (سلسلہ لطف و کرم

طلوع فجر تک جاری رہتا ہے"۔ (سنن ابن ماجہ) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتی ہیں کہ "ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لیے کھڑے ہوئے، نماز شروع کی، اور سجدے یں پہنچے تو اتنا طویل سجدہ کیا کہ مجھے یہ خطرہ ہوگیا کہ شاید خدانخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح قبض ہوگئی ہے، یہاں تک کہ میں پریشان ہوکر اٹھی اور پاس جاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انگوٹھے کو حرکت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ حرکت فرمائی، جس سے مجھے اطمینان ہوگیا اور میں اپنی جگہ لوٹ آئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو تھوڑے سے کلام کے بعد) فرمایا، تم جانتی ہو کہ یہ کون سی رات ہے، میں نے) عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ نصف شعبان کی رات ہے۔ خداوندِ عالم اس رات میں خاص طور سے اہل عالم کی طرف توجہ فرماتا ہے اور مغفرت مانگنے والوں کی مغفرت اور رحم کی دُعا کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے"۔

شَعَبان کی پندرہویں شب کو قبرستان جانا

شَعَبان المعظّم کی شب قبرستان جانا اور اپنے مرحوم عزیز و اقارب، احباب اور عامتہ المسلمین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا اور ایصال ثواب کرنا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ اس شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری میرے ہاں (آرام فرمانے کی) تھی کہ اچانک میں نیند سے بیدار ہوئی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں نہ پایا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنّت البقیع میں پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی آمد کو محسوس کرکے) فرمایا "کیا تمہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ زیادتی کریں گے"۔انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ! میں نے بشری تقاضے کے تحت) یہ سمجھا کہ شاید آپ کسی اور زوجہ مطہرہ کے حجرہ انور میں) تشریف لے گئے ہوں۔اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالٰی نصف شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے"۔اس حدیث مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے شعباب کی نصف شب کو مدینہ منورہ کے قبرستان 'جنت البقیع' میں جانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسلمان

اس شب قبرستان جاتے ہیں اور اپنے اپنے عزیز رشتہ داروں، جاننے والوں کے علاوہ عام مسلمونوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں، ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ گویا اس رات بطور خاص قبرستان جانا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے البتہ خواتین کو قبرستان جانے سے منع کیا گیا ہے۔ قبروں پر موم بتیاں اور اگربتیاں جلانا مناسب نہیں اگربتی جلانے کا مقصد خوشبو ہو تو اسے قبر سے ذرا دور لگا دینا چاہیے، موم بتی، تیل یا، گھی کے چراغ روشنی کے لیے یا تلاوت کلام پاک کے لیے لگانا مقصود ہوں تو وہ بھی قبر سے ذرا دور فاصلے پر جلانا چاہیے۔

شَعبان کی پندرہویں شب کی نفلی عبادات

فضیلت اور برکت کے اعتبار سے شب ِبرات ایک مقدس اور اہم رات ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس رات ہمارے لیے کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یہ رات کس قدر نازک اور کتنی اہم ہے ہماری قسمت میں کیا لکھ دیا جائے گا، ہم اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ غنیتہ الطالبین بیان ہے کہ " بہت سے کفن دھل کر تیار رکھے ہوتے ہیں، مگر کفن پہننے والے ان سے بے خبر بازاروں میں گھوم پھر رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی قبریں کھدی ہوئی تیار ہوتی ہیں، مگر ان میں دفن ہونے والے خوشیوں میں مست خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہنس رہے ہوتے ہیں حالانکہ ان کی موت کا وقت قریب آ چکا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے

اپنے مکانات کی تعمیر کاکام مکمل ہونے والا ہوتا ہے ، مگر ان کے مالکوں کی موت کا وقت بھی قریب آچکا ہوتا ہے"۔چنانچہ اس مقدس رات کو کسی صورت بھی غفلت ، بھول، بے توجہی میں ہر گز ہر گز نہیں گزارنا چاہیے، نہیں معلوم کہ یہ رات ہمیں آئندہ سال نصیب ہوگی بھی یا نہیں۔اس اہم رات میں خصوصی نفلی عبادات کا اہتمام کرنا چاہیے ۔ یہ وہ رات ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔ہمیں چاہیے کہ اس رات کی آمد سے قبل ہی اس رات کے فیوض و برکات کے حصول کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔یہی نہیں بلکہ اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کرلیں،اور یہ بھی عہد کریں کہ ہم آئندہ غلط کاموں کے مرتکب نہیں ہوں گے۔اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ایک حدیث مبارکہ غنیتہ الطالبین میں بیان کی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " اس رات میں سال بھر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کا نام لکھا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مرنے والے کا نام بھی لکھا جاتا ہے۔ اسی رات مخلوق کا رزق تقسیم ہوتا ہے اور اسی رات ان کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں"۔ ایک اور حدیث مبارکہ ہے کہ ارشاد فرمایااللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات مخلوق کی عمر، ان کی روزی اور حاجیوں کے نام بھی لکھے جاتے ہیں"۔ شعبان" المعظم کی اس مقدس رات میں جو شب برات کہلاتی ہے حسب ذیل نفلی عبادات کی فضیلت ہے۔

غروبِ آفتاب کے وقت کا کلمہ اور درود شریف

علمائے اکرام نے لکھا ہے کہ غروب آفتاب کے وقت لَاحُولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ العَلِیُّ العظیم چالیس بار پڑھا جائے۔

ساتھ ہی درود شریف سو مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے چالیس سال کے گناہ معاف فرمادے گا۔

نماز تحیتہ الوضو

مغرب کی نماز سے قبل غسل کیا جائے اگر کسی سبب غسل کرنا ممکن نہ ہو تو باوضو ہو کر دو رکعت تحیتہ الوضو پڑھے، ہر رکعت میں سورہ ٔ فاتحہ کے بعد آیتہ الکرسی ایک بار، سورہ ٔ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھنا باعث ثواب ہے، یہ نماز بہت افضل ہے۔

درازی عمر کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ درازی عمر بالخیر عطافرمائے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے 21 مرتبہ سورہ اخلاص، ایک مرتبہ سورۃ یٰسین پڑھیں ۔ بعد اختتام اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر، گڑگڑا کر اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ درازیٔ عمر بالخیر عطا فرمائے۔ حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جسے سنن ابی داؤد نے نقل کیا ہے کہ فرمایا آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے " اللہ سے اس طرح ہاتھ اٹھاکے مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رخ سامنے ہو ہاتھ الٹے کرکے نہ مانگا کرو اور جب دُعا کر چکو تو اٹھے ہاتھ چہرے پر پھیر لو"۔

'نماز خیر'

شعبان المعظم کی پندرھویں شب میں سو رکعتوں کی نماز کو" نماز خیر" کا نام حضرت شیخ المشائخ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی معروف کتاب "غنیتہ الطالبین" میں دیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ سو رکعتوں میں ایک ہزار بار سورۃ الاخلاص یعنی ہر رکعت میں دس بار قل ہوُ اللہ احد پڑھیں۔ اس نماز کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت حس بصریؒ نے فرمایا کہ مجھ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابیوں نے بیان کیا ہے کہ اس رات جو شخص یہ نماز پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر بار نگاہ کرتا ہے، اور ہر بار اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے، جن میں کم
سے کم حاجت گناہوں کی مغفرت ہے۔

بلاؤں سے حفاظت کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ

اللہ تبارک و تعالیٰ تمام بلاؤں، جادو ٹونا اور آفات سے محفوظ رکھے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورہ آیت الکرسی ایک مرتبہ ، سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے 21 مرتبہ سورہ اخلاص ، 21 مرتبہ سورۃ آیت الکرسی ، 21 مرتبہ درود شریف پڑھ کر صدق دل سے اللہ سے دعا کریں،اللہ تعالیٰ ہر طرح کی بلاؤں ، جادو، ٹونا اور آفات سے محفوظ رکھے۔ بلاؤں اور جادو سے محفوظ رہنے کی ایک صورت بعض دینی کتب میں یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ شعبان المعظم کی پندرھویں رات بیری (یعنی بیر کے درخت) کے سات پتے پانی میں جوش دے کر (جب پانی نہانے کے قابل ہو جائے تو اس پانی سے) غسل کیا جائے۔ یہ عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے کرم سے تمام سال جادو اور بلاؤں کے اثر سے محفوظ رہے گا۔

اللہ اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے ایک مرتبہ سورۃ یٰسین ، 21 مرتبہ درود شریف پڑھ کر صدق دل سے اللہ
سے دعا کریں کہ وہ اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔

رزق میں کشادگی اور برکت کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد آیتہ الکرسی ایک بار، سورۃ اخلاص پندرہ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام اشک بار آنکھوں کے ساتھ، صدق دل سے، خشوع و خضوع کے ساتھ درود شریف ایک سو مرتبہ پڑھ کر ترقی رزق، کشادگی رزق، برکت رزق کی دعا کریں انشاءاللہ تعالیٰ اس نماز کے پڑھنے اور دعا سے اللہ پاک دعا قبول فرمائے گا اور رزق میں ترقی ہوگی۔

عذابِ قبر سے نجات کے لیے نماز و دعا

آٹھ رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص دس دس مرتبہ پڑھیں ۔ بعد سلام صدق دل سے، خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے عذاب قبر سے نجات کی التجا کریں، یقینا اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے فرشتے مقرر کرے گا جو اسے عذاب قبر سے نجات اور داخل بہشت ہونے کی خوشخبری دیں گے۔

گناہوں کی توبہ کے لیے نماز و دعا

شبِ برات کی رات آٹھ رکعت نماز چار سلام سے واسطے مغفرت گناہ پڑھیں، پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ آیت الکرسی 10 مرتبہ، دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ نشرح دس مرتبہ، تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ قدر دس مرتبہ اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص دس

مرتبہ پڑھیں۔پھر چار رکعت اسی ترتیب سے پڑھیں۔ بعد سلام سجدے میں گریا وزاری کرتے ہوئے ،اعتراف گناہ کے ساتھ،احساس ندامت کے ساتھ، خشوع وخضوع کے ساتھ،اخلاص نیت سے،امید اور یقین کے ساتھ اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرتے ہوئے ستر مرتبہ اسغفار اور ستر مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے گناہوں کی توبہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اللہ سے اس کا فضل مانگو یعنی دعا کرو کہ وہ فضل و کرم فرمائے، کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کے بندے اس سے دعا کریں اور مانگیں " ۔ (جامع ترمذی

سلامتی حفاظت جان و مال کے لیے نماز و دعا

شبِ برات کی شب سورۃ البقرہ کا آخری رکوع "امن الرسول سے کافرین تک اکیس مرتبہ پڑھنا واسطے امن و سلامتی حفاظت جان و مال افضل ہے۔

قبولیت دعا

دعا خواہ دنیاوی ہو یا دینی اس مقدس رات میں چودہ رکعت نماز سات سلام سے پڑھیں ہر رکعت میں بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ کافرون ایک مرتبہ، سورۃ اخلاص ایک مرتبہ، ، سورۃ ناس ایک مرتبہ پڑھیں، بعد سلام سورۃ آیت الکرسی ایک مرتبہ

سورۃ توبہ کی آخری آیات لقد± جاؤکم رسول‘ تا عظیم‘ تک ایک مرتبہ پڑھ کر اللہ، کے حضور قبولیت دعا کی استدا کریں، ضروری ہے کہ دل ہیں اعتراف گناہ ہو، ندامت کا احساس ہو، اخلاص ہو اور اپنے پروردگار سے امید اور یقین ہو، اللہ تعالیٰ تمام دعائیں قبول کرے گا۔

سورۃ دخان (پارہ 25) سات مرتبہ پڑھنا افضل ہے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ستر حاجات دنیاوی اور ستر حاجات عقبیٰ کی قبول فرمائے گا۔ اس روز حسب ذیل دعا کثرت کے ساتھ پڑھنا باعث ثواب ہے، اس دعا کے پڑھنے والو کے لیے اللہ تعالیٰ ہزار سال کی عبادت کا ثواب لکھ دیتا ہے اور اس کے ہزار سال کے گناہ مٹا دیتا ہے اور وہ روز حشر قبر سے اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہا

ہوگا۔ دعا: لَااِلٰہَ اللہُ وَلَانَعبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ مُخلِصِینَ لَہُ الدِّینَ وَلَوکَرِہَ الکٰفِرُونَ ترجمہ: "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، ہم اس کے "دین کے لیے مخلص ہیں، اگرچہ کافروں کو ناگوار گزرے

حضرت عارف باللہ اور ڈاکٹر محمد عبدالحٰ نے اپنی ’کتاب اُسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم‘ میں حدیث بیان کی ہے جس کی راوی حضرت عائشہ صدیقہ ر اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ شعبان کی پندرھویں شب جب کہ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نماز میں یہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ صبح کو ان کلمات دعائیہ کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ تم ان کو سیکھ لو اور اوروں کو سکھاؤ۔ مجھے جبریل علیہ السلام نے یہ کلمات سکھائے ہیں اور کہا ہے کہ میں انہیں سجدے میں بار بار پڑھا کروں۔ (بیہقی، مشکوٰۃ، الترغیب والترہیب) دعائیہ کلمات: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِعَفْوِکَ مِنْ عِقَابِکَ وَاَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَاَعُوْذُ مِنْکَ جَلَّ وَجْھُکَ لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ ط' ترجمہ: "میں پناہ چاہتا ہوں آپ کے عفو و درگذر کے ذریعہ آپ کے عذاب سے اور پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کے ذریعہ آپ کی ناراضگی سے اور آپ کی شایان شان تعریف نہیں کر سکتا۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے خود اپنی ثنا فرمائی"

شَعبان کی پندرہویں شب کا روزہ

مفتی منیب الرحمٰن نے (سنن ابن ماجہ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جب شعبان کی درمیانی رات آئے تو اس رات کو قیام کرو اور دن کا روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات کو غروب آفتاب ہی سے آسمانِ دنیا پر نزول رحمت فرماتا ہے اور (اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے) ہے کوئی

بخشش کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں؟ ہے کوئی (کشادگی) رزق کا خواست گار کہ میں اسے رزق عطا کروں؟ ہے کوئی بتلائے مصیبت کہ میں اسے مصیبت سے نجات دوں؟ اسی طرح تمام حاجت مندوں کی حاجات کا ذکر کر کے رحمت باری انہیں اپنی (جانب متوجہ کرتی ہے اور یہ (فیضان عطا اور سلسلہ لطف و کرم

طلوع فجر تک جاری رہتا ہے "۔اس دن روزہ رکھنے کا بہت ثواب ہے، جس نے اس روز روزا رکھا اسے دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ شعبان المعظم کی پندرھویں شب 'شب برات رحمتوں اور برکتوں والی رات ہے۔اس رات میں پروردگار اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے ،مالک دوجہاں کی طرف سے انوار و تجلیات ، رحمت وبخشش کی بارش ہوتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی جانب سے جاری اس رحمت کے سمندر سے کیسے فیض حاصل کریں۔اگر ہم اس امید اور یقین کے ساتھ دعا طلب کریں کہ وہ ہمارا مالک ہے، ہماری دعا کبھی رد نہیں کرتا، وہ ہر مانگنے والے کی توقعات کے مطابق اسے دیتا ہے ، وہ رحیم ہے ، وہ کریم ہے، وہ رازق ہے، وہ دوجہاں کا مالک ہے ہماری دعا یقینا قبول کرے گا۔ہمیں چاہیے کہ اس مبارک رات کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں، غروب آفتاب کے فوری بعد عبادات کا اہتمام کریں۔

ہمارے معاشرے میں بعض غیر شرعی اور بے

ہودہ رسم و رواج جن میں آتش بازی جیسی رسم پروان پاچکی ہے اس کی ہر طرح نفی کریں، اپنے بچوں، محلے ،پڑوس اور شہر میں جو لوگ اس غیر شرعی فعل میں شریک ہوں انہیں اس کام کے غیر شرعی اور خطرناک حدتک نقصان دہ ہونے کا احساس دلائیں۔اپنے بچوں کو خاص طوپر اس کام سے دور رکھیں۔

(مئی 152015)

جنت البقیع میں چند لمحات

(مدینہ منورہ کا متبرک، مقدس اور تاریخی قبرستان)

مکہ المکرمہ کے بعد مدینہ منورہ کو جو اعلیٰ مقام، عظمت و مقدس حیثیت حاصل ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا 'حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کو 'حرم' ہونے کا اعلان کیا تھا اور میں مدینہ کے 'حرم' قرار دیئے جانے کا اعلان کرتا ہوں، اس کے دونوں طرف کے دروں کے درمیان پورا رقبہ واجب الا احترام ہے'۔ جس سرزمین کے حرم یعنی مقدس ہونے کا اعلان ہمارے نبی نے کیا ہو وہ ہر مسلمان کے لیے ، اس سرزمین کا چپہ چپہ مقدس ،توقیر وحُرمت والا ہے۔ حج کے لازمی فرائض میں تمام ارکان کی ادائیگی مکہ المکرمہ میں ہی انجام پاتی ہے لیکن ہر ہر حاجی، ہر ہر عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والا مکہ میں فرائض کی ادیگی کے بعد مدینہ منورہ میں اپنے قیام ، عبادات اور وہاں کے مقدس مقامات کی زیارت کو اپنے لیے باعث سعادت تصور کرتا ہے۔ مدینہ کی سرزمین میں، وہاں کی فضاؤں میں، وہاں کی ہواؤں میں جو لطف ہے، ٹھنڈک ہے، بھینی بھینی خوشبو ہے، جو کشش ہے وہ دنیا میں کسی اور جگہ موجود نہیں۔ ہر مسلمان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے زندگی میں ایک بار مدینہ جانا نصیب ہوجائے، روضہ رسول ﷺ کی وہ زیارت

کرلے اور سلام عقیدت پیش کردے۔ حتیٰ کہ یہ خواہش بھی ہر ایک مسلمان کے دل میں ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ بالخیر مدینہ میں ہوجائے اور اسے مدینہ کے مقدس و عظمت والے قبرستان 'جنت البقیع' میں دو گز جگہ نصیب ہو جائے۔ لیکن یہ سعادت و نصیب کی بات ہے۔ اس کا اختیار پروردگار نے اپنے پاس رکھا ہے کہ کس نے کب اس دنیا میں آنا ہے اور کب اور کس جگہ لوٹ کر جانا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس مٹی سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے وہ مرنے کے بعد واپس اسی مقام پر چلی جاتی ہے۔ میرے جدِ امجد محمد ابراہیم آزادؔ کی نعت کا ایک شعر ۔

آزادؔ نہیں اور تمنا کوئی دل میں
روضے کا ہے ارماں مدینے کی تمنا

الباقی کے معنی ہے' درختوں کا باغ'، یہ جنت الباقی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام 'بقیع الغرقد' ہے' غرقد عربی میں جھاڑیوں کی زمین کو کہتے ہیں۔ 'جنت البقیع' کی عظمت و تعظیم کا کیا کہنا۔ بقیع رسولِ اکرم ﷺ کے زمانے سے اب تک مدینہ کا قبرستان ہے۔ جہاں پر ہمارے پیارے نبی کے خاندان کے بے شمار لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ تو وہ مقدس زمین ہے جہاں پر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لختِ جگر 'ابراہیمؓ' کو کم سنی میں انتقال کرگئے تھے اس مٹی کے سپرد کیا تھا، یہ وہ مقدس زمین ہے کہ جس میں آپ ﷺ کی ماسوائے حضرت خدیجہؓ کے تمام ازواج مطہرات اپنی اپنی قبروں میں آرام فرما ہیں۔ حضرت خدیجہؓ

مکہ کے جنت المعلیٰ قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ یہ تو وہ قبرستان ہے کہ جس میں آپ ﷺ کی چھیتی بیٹی حضرت سیدہ فاطمہ زہرہؓ کی قبر اطہر ہے، آپؐ کی پھوپھیاں حضرت حفصہ، حضرت عاتکہ، فاطمہ بنت الاسد، چچا حضرت عباس ابن عبد المطلبؓ، حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت نافع مولی عمر اور حضرت امام مالک، یہاں مدفن ہیں، ہمارے نبی کے ہر دل عزیز نواسے حضرت امام حسنؓ اسی مقدس زمین میں آرام فرما ہیں، یہاں خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کی قبرِ مبارک ہے، حضرت سجادؓ، حضرت امام جعفر صادقؓ امام علی ابن الحسینؓ، امام محمد ابن علیؓ کے علاوہ مسلم اسکالر ملک ابن انس بھی اسی، قبرستان میں آرام فرماں ہیں۔ ان کے علاوہ اس قبرستان میں ہزاروں صحابہ اکرم، تابعین، تبع تابعین، صلحاء، علماء، ائمہ کرام اس قبرستان میں محوِ خواب ہیں۔ مدینہ پہنچ کر روضہَ رسول ﷺ پر سلام پیش کرنے، مسجد نبوی میں نماز کی ادائیگی، مسجد قباء میں نفل کی ادائیگی کے بعد یہاں آنے والے ہر مسلمان کی خواہش جنت البقیع میں حاضری اور وہاں کے اہل قبور کو سلام عقیدت پیش کرنا اور ان کی مغفرت کی دعا کرنا ہوتا ہے۔

قبرستان جانا اور اہل قبور کے لیے دعائے مغفرت کرنا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ ہمارے بنی حضرت محمد ﷺ ار خود اسی جنت البقیع میں حاضر ہوتے۔ام

المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ شَعبان المعظّم کی پندھرویں شب تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی باری میرے ہاں (آرام فرمانے کی) تھی کہ اچانک میں نیند سے بیدار ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم کو اپنے ہاں نہ پایا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنّت البقیع میں پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی آمد کو محسوس کرکے) فرمایا کیا تمہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ زیادتی کریں گے'۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ! میں نے (بشری تقاضے کے تحت) یہ سمجھا کہ شاید آپ کسی اور زوجۂ مطہرہ کے حجرۂ انور میں تشریف لے گئے ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے''۔ اس حدیث مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعبان کی نصف شب کو مدینہ منورہ کے قبرستان 'جنت البقیع' میں جانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ گویا اس رات بطور خاص قبرستان جانا سنت نبوی ﷺ ہے البتہ خواتین کو قبرستان جانے سے منع کیا گیا ہے۔

معارف الحدیث' میں ہے کہ قبر میں موجود مردے کے لیے افضل تحفہ استغفار ہے۔'

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'قبر میں مدفون مُردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ پکار کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں یا باپ، بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے مغفرت کا تحفہ اسے پہنچے۔ جب کسی طرف سے اسے کوئی دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتا ہے اور دنیا میں بسنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مُردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی سکتی ہے۔ اور مُردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لیے دعائے مغفرت ہے' ۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔فرمایا رسول اللہ ﷺ نے میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کر دیا تھا (اب اجازت دیتا ہوں کہ) تم قبروں کی" زیارت کر لیا کرو، کیونکہ (اس کا یہ فائدہ ہے کہ) اس سے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر پیدا ہوتی ہے"۔ اس حدیث کی تشریح معارف الحدیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ 'شروع شروع میں جب تک کہ توحید پوری طرح مسلمانوں کے دلوں میں راسخ نہیں ہوئی تھی اور انہیں شرک اور جاہلیت سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر جانے سے منع کر دیا تھا، کیونکہ اس سے ان لوگوں کے شرک اور قبر پرستی میں ملوث ہو جانے کا خطرہ تھا۔ پھر جب امت کا توحیدی مزاج پختہ ہو گیا، اور ہر قسم کے جلی خفی شرک سے دلوں میں نفرت بھر گئی اور

قبروں پر جانے کی اجازت دے دی اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ اجازت اس لیے دی جارہی ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر دلوں میں پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔ علامہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے شریعت کا یہ بنیادی اصول معلوم ہوا کہ اگر کسی کام میں خیر اور نفع کا کوئی پہلو ہے اور اسی کے ساتھ کسی بڑے ضرر کا بھی اندیشہ ہے تو اس اندیشہ کی وجہ سے خیر کے پہلو سے صرف نظر کرکے اس کی ممانعت کردی جائے گی ، لیکن اگر کسی وقت حالات میں ایسی تبدیلی ہو کہ ضرر کا اندیشہ باقی نہ رہے تو پھر اس کی اجازت دے دی جائے گی'۔جامع ترمذی کی حدیث جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ ہی میں چند قبروں پر ہوا، 'آپ ﷺ نے' ان کی طرف رخ کیا اور فرمایا''السلام علیکم یا اھل القبور' (سلام ہو تم پر اے قبر والو! اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے، تم ہم سے آگے جانے والے ہو اور ہم پیچھے پیچھے آرہے ہیں'۔

یکم مئی 2015 جمعہ کے دن نماز جمعہ جدہ میں ادا کرنے کے بعد ہم مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے بیٹے کی اپنی گاڑی تھی ، ہم سفروں میں عدیل کے علاوہ شہناز میری شریک حیات)،.بڑے بیٹے عدیل کی بیگم ، میری بڑی بہو مہوش عدیل،.بڑا پوتا) صائم اور آٹھ ماہ کی میری پوتی حبیبہ شامل تھے۔ اس بار عدیل

تھی۔ سعودیوں میں بڑی سے بڑی (Fortuner)کے پاس جیپ نما کار ٹویوٹا فارچیونر گاڑی رکھنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ وہاں رہنے والے غیر سعودی بھی سعودیوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی بڑی سے بڑی گاڑی کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ایک تو پیٹرل کا سستا ہونا ہے دوسرے یہاں کے رہنے والے لانگ ڈرائیو زیادہ کرتے ہیں۔خاص طور پر مکہ اور مدینہ سے دور کے شہروں میں رہنے والوں کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ مکہ اور مدینہ کا رخ کرتے ہیں۔ یہاں بائی روڈ سفر کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ہائی وے پر 120 فی گھنٹہ گاڑی چلانے کی اجازت ہے۔ اس سے اوپر رفتار جوں ہی ہوتی ہے ایک تو گاڑیوں میں الارم بجنے لگتا ہے دوسرے سڑک کے کنارے جگہ جگہ خفیہ کیمرے نصب ہیں ۔ جو گاڑی مقررہ رفتار سے زیادہ رفتار اختیار کرتی ہے خفیہ کیمرہ اس کی تصور اور رفتار کو نوٹ کر لیتا ہے اور گاڑی کے مالک کو اس کے موبائل پر چالان جسے عربی میں ’ گراما‘ کہا جاتا ہے آجاتا ہے۔ اس ڈر اور خوف سے ہائی وے پر گاڑی چلانے والے مقررہ رفتار کے اندر اندر ہی رکھتے ہیں۔ جو لوگ ان راستوں پر آتے جاتے رہتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ کہاں کہاں کیمرے لگے ہیں وہ اس جگہ اپنی گاڑی کی رفتار مقررہ رفتار میں رکھتے ہیں اور پھر اپنی رفتار 150 حتیٰ کے 180 تک لے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب میں ہائی وے پر روڈ ایکسی ڈینٹ کا مطلب عام طور پر زندگی کا اختتام تصور کیا جاتا ہے۔ کوئی قسمت والا ہی زندہ بچ جاتا ہے۔ خیر بات میں اپنے سفر کی کر رہا تھا۔ جدہ سے جمعہ

کی نماز ادا کرکے نکلے راستے میں عصر پڑھی اور مغرب کی اذان مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کی سنی۔ اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ جمیل نقوی کی ایک نعتِ رسول ﷺ کا ایک شعر ۔

اللہ اللہ مدینہ کی فضا کا منظر
نُور ہی نُور ہے نکہت بھری رعنائی ہے

مسجد نبوی کے نزدیک ہی ہوٹل تھا، سامان کمرہ میں رکھ کر میں اپنے پوتے صائم کے ساتھ مسجد نبوی چلا گیا اور روضۂ مبارک پر حاضری دی، سلام عرض کیا، اللہ کا شکر ادا کیا وہ مجھے گزشتہ چار سال سے بار بار مقدس سرزمین پر آنے کی سعادت عطا کر رہا ہے۔ میں مئی 2011 میں پہلی بار سعودی عرب آیا تھا۔ چار سالوں میں مَیں وقفے وقفے سے یہاں آتا رہا ہوں ۔ مئی 2015 میں مجھے پانچویں بار سعودی عرب اور مدینہ منورہ میں تیسری حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے، یقینا بلاوے کی بات ہے اس پر جس قدر فخر کروں کم ہے۔ میری ہی ایک نعت کے دو اشعار ۔

بلاوے پہ نبیؐ کے میں مدینے آگیا ہوں
خوش ہوں زندگی میں یہ مرتبہ پا گیا ہوں
کہاں میں بے کس و بے نوا کہاں میرا نصیب

مدینہ کی فضاء میں شفاء پاگیا ہوں

مدینہ منورہ کے بارے میں حضرت محمد ﷺ نے دعا فرمائی صحیح بخاری کی حدیث ہے آپ ﷺ نے فرمایا" اے اللہ! جس طرح مکہ مکرمہ کی محبت ہمارے دلوں میں" ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت مدینہ منورہ کی ہمارے دلوں میں ڈال دے اور آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ مولا! جو برکتیں تو نے مکہ المکرمہ میں رکھی ہیں ان میں چارگناہ اضافہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں رکھ دے"۔ مسند امام احمد میں حدیثِ مبارکہ ہے۔فرمایا آنحضرت محمد ﷺ نے کہ "جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کرے اور اس سے کوئی نماز نہ چھوٹی ہو تو اس کے لیے دوزخ اور عذاب سے خلاصی لکھ دی گئی اور وہ نفاق سے محفوظ و بری ہوگیا"۔

میری خوش نصیبی تھی کہ میں گزشتہ برس جنوری 2014 میں ایک ہفتہ مدینہ میں رہا اور پیر 12 ربیع الاول 1435ھ مطابق 13 جنوری 2014 کی تمام شب روضۂ رسول ﷺ کے سامنے گزاری۔ اس بار تین روز کے لیے مدینہ آنا ہوا کیونکہ ہمارا مکمل قیام صرف ایک ماہ کے لیے تھا۔

اتوار 3 مئی 2015) میری زندگی کا خوش نصیب دن تھا جسے میں کبھی بھلا نہ سکوں گا۔ میں گزشتہ دو روز سے مدینہ میں تھا آج جدہ واپسی تھی۔ میں صبح تین بجے

مسجد نبوی چلا گیا، رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دی اور سلام عرض کیا، اس وقت لوگ کچھ کم تھے جس وجہ سے مجھے ریاض الجنہ میں آسانی سے جگہ مل گئی، دو رکعت نفل ادا کی ، استغفار اور دعائیں کیں، اپنے لیے بھی ، اوروں کے لیے بھی ، نماز کے بعد جب بھی بائیں جانب سلام پھیرتا تو روضہ رسول ﷺ نظروں کے سامنے ہوتا، اسی جگہ بیٹھے بیٹھے تہجد کی اذان ہو گئی، تہجد پڑھی اور یہی ٹکا رہا، اذانِ فجر ہو گئی ، فجر کی جماعت میں شریک رہا، بعد میں کسی خوش نصیب کی نماز جنازہ بھی اسی مقدس مقام پر ہی پڑھی ۔ نصیب اور سعادت کی بات ہے۔ میری قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی سو مجھے ملی۔ایک حدیث مبارکہ زیارت روضہ اطہر کے حوالہ سے یہ بیان کی گئی ہے کہ ”حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے میرے روضہ اطہر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو چکی ہے“۔ ’ریاض الجنہ‘ اللہ نے جنت کا ٹکڑا مسجد نبوی ﷺ میں اتارا ہے یہاں نفل پڑھنا ایسے ہے جیسے جنت میں نفل پڑھے۔ صحیح مسلم و بخاری کی حدیث ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرمایا رسول ﷺ نے ’میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنگ کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہے، اور میر منبر میرے حوض کوثر پر ہے‘۔ جب پہلی بار مدینہ منورہ گیا اور مسجد نبوی ﷺ اور روضہ مبارک پر حاضری ہوئی ، سلام پیش کیا اور اس وقت بھی ریاض الجنہ میں نفل پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی تو میں نے ایک نعت نبوی ﷺ کہی اس کا صرف ایک شعر ریاض الجنہ کے حوالے سے یہ ہے۔

تھی تمنا ریاض الجنہ میں ہو ایک سجدہ نصیب
جبیں کو جنت میں جھکانے کا اعزاز پا گیا ہوں

اب مَیں نے جنت البقیع کا رخ کیا۔ مدینہ کا یہ قبرستان روضہ مبارک ﷺ کے مشرق کی جانب ہے، قبرستان کے گرد سیمنٹ کی پکی دیوار کچھ سرخی مائل بنادی گئی ہے۔ جنت المعلیٰ میں تو چاروں جانب جالی کی دیوار ہے کہ باہر ہی سے اندر کی صورت حال نظر آجاتی ہے لیکن یہاں بقیع میں باہر سے اندر کی جانب کچھ دیکھا نہیں جاسکتا۔ مسجد نبوی کے صحن کی دیوار اور قبرستان کی دیوان کے درمیان چوڑی صاف ستھری جگہ ہے یعنی مسجد بنوی ﷺ کا گیٹ اور بقیع کا مرکزی دروازہ آمنے سامنے ہے۔ اس کھلی جگہ میں نماز کے اختتام پر کچھ وقت کے لیے بازار لگ جاتا ہے، بیچنے والے جن میں برقعہ پوش کالی عورتیں بھی شامل ہوتی ہے چلا چلا کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے ہوتے ہیں۔ آوازیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں 'پانچ ریال ریال'، مدینہ مدینہ پانچ ریال پانچ ریال، یا دو ریال دوریال' کوئی چیز دو یا پانچ ریال سے کم کی نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ بہت سستی چیز مل رہی ہے اس لیے ان کے گرد جمع رہتے ہیں۔ یہ پاکستان کے جمعہ بازار اور اتوار بازار کا سا ہوتا ہے۔ جنت البقیع میں ہر وقت جانے کی اجازت نہیں صرف عصر کی نماز کے بعد کچھ دیر کے لیے اور فجر کی نماز کے بعد زائیرین کو اندر جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ بھی مختصر وقت کے لیے۔ خواتین تو

بالکل ہی اندر نہیں جاسکتیں۔ مجھے اس بات کا علم تھا، کل ہی عصر کے نماز کے بعد کچھ لیٹ ہوگیا تھا چنانچہ گیٹ بند کردیا گیا تھا، باوجود اس کے کہ مغرب میں ابھی بہت دیر تھی، بہت سے کام سعودی اہل کاروں کی مرضی اور موڈ سے انجام پاتے ہیں ان میں کوئی شرعی، قانونی یا اخلاقی منطق دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ میں فجر کی نمازاور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد تیزی سے بقیع جانب روانہ ہوگیا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق بقیع جارہے تھے، میں بھی ان میں شامل ہوگیا، تمام اہل قبور کو سلام عرض کیا، بقیع کے اس دروازے سے سیڑھیاں اوپر کی جانب جارہی ہیں۔ یہاں بھی آہنی گیٹ لگے ہیں۔ یہ مرکزی دروازے اندر جانے اور ساتھ ہی واپس آنے کے ہیں۔ قبرستان میں سیکیوریٹی گارڈ (شرتے) اور سعودی لباس میں اہلکار جگہ جگہ موجود نظر آتے ہیں۔ جہاں بھی کسی کو ہاتھ اٹھائے دیکھا، حرام حرام کی سدا بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی کوئی سعودی مولوی قبروں کے بارے میں کچھ تبلیغ کرتا بھی نظر آتا ہے۔ وہ عربی میں بول رہا ہوتا ہے اس لیے نہیں معلوم کیا کہتا ہے۔یقینا وہ یہ تبلیغ کررہا ہوتا ہے کہ یہ قبریں بے معنی ہے، ان پر حاضری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، خیر یہ عقیدے کی بات ہے، اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ مرکزی دروازے سے جیسے ہی اندر جائیں تو بائیں جانب شروع ہی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی قبر اطہر ہے لیکن اس قبر کے نزدیک جانے نہیں دیا جاتا، لوگ دور ہی سے سلام عرض کرتے ہیں، آگے بڑھیں تو دائیں طرف چھوٹی چھوٹی بوسیدہ پتھروں کی دیواروں کے اندر

قبریں حضرت فاطمہ الزہرہؓ، حضرت امام حسینؓ ، اور دیگر سات ام المومناتؓ کی قبور مبارک ہیں اور آگے بڑھیں تو ایک اور چھوٹی سی چار دیواری جو انتہائی بوسیدہ ، کالے رنگ کے پتھر ، قبر کا سائز کیونکہ چھوٹا ہے اس لیے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ قبر نبی اکرم ﷺ کے فرزند حضرت ابرہیمؓ نے جنھوں نے حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے جنم لیا اور کم سنی میں ہی اللہ کو پیارے ہوئے کی قبر اطہر ہے، حضرت ابرہیمؓ کو تو حضور ﷺ نے اپنے ہاتھوں ہی یہاں قبر میں اتارا تھا۔ اس جگہ تو حضور کے قدم مبارک پڑے ہوں گے، اس بڑی ہماری خوش قسمتی اور کیا ہوگی کہ اس وقت میں اُسی جگہ موجود ہوں، میں بیٹھنے کے لیے کرسی اپنے ساتھ قبرستان میں لے گیا تھا اس لیے بہت دیر تک کرسی پر اطمینان سے قبر کے نزدیک ہی بیٹھا رہا، اور حضرت ابرہیمؓ کی تدفین کی منظر کشی کرتا رہا۔ اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا۔ قبرستان میں آگے کی جانب بڑھتے جائیں تو وسط سے بھی کچھ آگے حضرت عثمان غنیؓ کی قبر مبارک ہے جو اسی طرح بوسیدہ سی چھوٹی چار دیواری کے اندر موجود ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عثمانِ غنیؓ کی جنت البقیع میں تدفین کی مخالفت کی گئی تھی اس لیے انہیں ان کے اپنے گھر کے احاطے میں ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان کا گھر اور قبر مبارک بقیع کا حصہ بن گئی۔ یہ قبرستان اس وقت ایک سے دو میل کے درمیان لمبا ہوگا۔ تمام اہل بیت و دیگر خاص احباب کی قبور مبارکہ حضرت عثمانؓ کی قبر مبارک تک ہیں اس کے بعد کی قبریں بعد کی ہیں۔ تدفین تو اب بھی بقیع میں

ہوتی ہے۔ گزشتہ برس جب میں اسی طرح فجر کے بعد بقیع میں موجود تھا دیکھا کہ قبرستان کے آگے کی جانب کنارے پر ایک گاڑی کھڑی ہے اور اس میں سے ہری رنگ میں لپٹا کسی کا جسد خاکی نکالا جا رہا ہے۔ مشکل سے چار یا پانچ افراد ہوں گے۔ زائیرین نے جوں ہی انہیں دیکھا اس جانب دوڑ پڑے۔ میں نے بھی اس جانب چلنے کی کوشش کی لیکن میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی تدفین عمل میں آچکی تھی۔ مکہ میں بھی میں نے یہ دیکھا کہ کفن تو نہیں معلوم سفید ہوتا ہے یا نہیں لیکن مردہ ہرے رنگ کی چادر میں لپٹا ہوتا ہے۔ 1925 سے قبل یہاں جنت البقیع میں کئی قبروں پر مقبرے تعمیر تھے سعودی حکرانوں نے اپنے عقیدے پر عمل کرتے ہوئے تمام مقبروں کو منہدم کردیا۔ بعض تو کہتے ہیں کہ ٹریکٹر چلا دیا گیا۔ اس حوالے سے معروف سفر نامہ نگار مستنصر حسین تارڑ نے اپنے حج کے سفر نامے 'مُنہ وَل کعبے شریف' کے صفحہ 277 پر لکھا ہے کہ ترکوں نے بے شک وہ ایک جابر اور قابض قوت تھے لیکن انہوں نے تحقیق اور جستجو سے حیات ، محمدؐ کی نشاندہی کی.. تاکہ تاریخ محفوظ ہوجائے یہ ان کا دستور تھا.. اور آل سعود کا دستور یہ ہے کہ وہ ہر ایسے عمل کو بدعت اور شرک گردانتے ہیں۔۔ تاریخ کو محفوظ کرنے کو وہ کفر سمجھتے ہیں، اس لیے جو کچھ ترکوں نے تعمیر کیا، انہوں نے ڈھا دیا.. مٹا دیا.. ان کے ندیک خانہ کعبہ کے سوا ہر عمارت شرک اور بدعت ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس میں کہاں تک سچائی ہے کہ وہ روضۂ رسولؐ کو بھی برداشت نہ کرتے تھے اور اسے مسمار کرنے کے بھی درپے تھے.. شاید یہ افوہ

ہو، مخالف عقیدے کے لوگوں کا الزام ہو.. میں نہیں جانتا'۔ مستنصر صاحب کی بات میں وزن ہے، منطق ہے، سچائی ہے، خلوص ہے، عقیدت ہے۔ اور کئی مصنفین اس قسم کی باتیں اپنے سفر ناموں میں ،تاریخ کی کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔

اس وقت جنت البقیع میں جو صاف ستھرے ، کشادہ راستے بنے ہوئے ہیں نہیں معلوم کے ان راستوں کے نیچے یا جس وقت ہم یہاں کھڑے ہیں ہمارے پاؤں تلے کن کن قابل احترام شخصیات کی قبریں ہوں گی۔ اللہ معاف کرے۔ اس قبرستان میں داخل ہوتے وقت دل لرز جاتا ہے۔ بعض بعض تو قبرستان میں ننگے پیر ہوتے ہیں، وہ اپنے جوتے باہر ہی اتار کر آتے ہیں۔ ایسے لوگ سعودی ہر گز نہیں ہوتے، دیکھنے میں پاکستان ، ہندوستان، بنگلہ دیش یا ایران سے تعلق لگتا ہے۔ سعودیوں کے لیے یہ عام سی بات ہے لیکن فقہ حنفی میں کسی بھی قبر کی بے حرمتی کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کسی بھی قبر پر کتبہ نہیں ، اس بات کی واضح نشان دھی نہیں ہوتی کہ قبر کس کی ہے۔ جن جن کی قبروں کا علم تھا خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ ، حضرت عثمانؓ ، حضور ﷺ کے ننھے صاحبزادے ابراہیمؑ ، حضرت فاطمہؓ ، امام حسنؓ اور دیگر کی قبروں پر کچھ دیر قیام کیا اور فاتحہ پڑھی ، تمام قبریں بے نام ونشان ہیں۔ اکثر لوگوں کے پاس کچھ نقشے ہوتے ہیں جن پر اہل قبور کی قبروں کی نشاندھی کی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ نشانیاں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں لوگ انہیں پر صبر شکر کرکے دعاؤں کا نذررانہ پیش کردیتے ہیں۔

سعودیوں کے اس عقیدے سے بے شمار مسلمانوں کے دل دکھتے ہیں،ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے جب وہ عظیم ہستیوں کی قبروں کو کھنڈر کی صورت میں دیکھتے ہیں۔اللہ کو اس مخلوق میں یقینا کچھ اچھا نظر آیا ہوگا تب ہی تو انہیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ مکہ و مدینہ اور یہاں کے ہر چیز کے مالک و مختار ہیں۔ لیکن انہیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی کہ ان کے اکابرین مکہ میں جنت المعلیٰ میں یا مدینہ میں جنت البقیع میں جگہ پاسکیں، شاہی قبرستان ریاض میں ہے، ریاض شہر سعودی عرب کا مرکزی شہر ضرور ہے لیکن اسے وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں جو مکہ، مدینہ، طائف کو حاصل ہے۔ ان کا قبرستان ریاض میں ہے۔ شاہی خاندان کے تمام لوگ ریاض ہی میں دفن کیے جاتے ہیں حالانکہ ان کے لیے ان دونوں قبرستانوں میں جگہ پانا مشکل نہیں لیکن نصیب و مقدر کی بات ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ انہیں مدینہ میں جگہ ملے اس حوالے سے متعدد احادیث اور واقعات تاریخ کا حصہ ہیں، بظاہر ایسا ممکن نظر نہیں آتا تھا، بعض احباب نے حضرت عمرؓ سے کہا بھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کو شہادت کا مرتبہ بھی ملے اور آپ مدینہ میں بھی دفن ہوں، حضرت عمرؓ کا ایمان سچا تھا، اللہ نے ان کی خواہش پوری کی، ان ہونی، ہونی میں تبدیل ہو گئی،جب حضرت عمر مدینہ میں تھے تو ابو لوء لو نے مسجد نبوی ﷺ کے محراب میں آپ کو زخمی کر دیا اور آپ شہادت کے مرتبہ فائز ہوئے اور آپ کی تدفین مدینہ ہی میں بلکہ آنحضرت محمد ﷺ کے ساتھ ایک ہی حجرے میں عمل ہوئی۔ مولانا محمد عبد

المعبود نے اپنی کتاب 'تاریخ مدینہ منورہ' میں لکھا ہے کہ 'تاجدار مدینہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ 'قیامت کے دن جنت البقیع سے ستر ہزار افراد اٹھیں گے۔ جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے اور وہ خوش نصیب بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے'۔ سیدنا ابی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ 'جو آدمی ہمارے اس قبرستان میں دفن ہوا۔ تو میں اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہی دوں گا'۔ (21، مئی 2015)

جنّات کا انسانی روپ میں مجھ سے مخاطب ہونا۔آپ بیتی

مجھے زندگی میں جِنّات کے حوالے سے بھی تجربات ہوئے، جن انسانی روپ میں مجھ سے مخاطب بھی ہوئے، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی لیکن نقصان نہیں پہنچایا۔جِنّات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں کو پریشان کرنے والے بھی۔اللہ تبارک و تعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی اور ان سے پہلے جنات کو آگ سے پیدا کیا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ترجمہ '' اس نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہے پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا۔'' (سورۃ الرحمٰن: آیت ۱۴۔۱۵)۔اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسان و جن کو ایک ساتھ مخاطب کیا ہے ترجمہ ''سوائے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے''

(سورہ رحمٰن، آیت نمبر ۱۳) ۔قرآن مجید میں ایک سورۃ 'جن' بھی ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے 'معجم القرآن' میں لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق انسان کی آبادکاری سے پہلے زمین پر جن آباد تھے۔جِنّات کے اجسام شفاف ہوتے ہیں اور یہ ہماری دنیا میں مختلف روپ دھار کر داخل ہوتے ہیں۔کالے کتوں، کالی بلیوں، کالی چمگادڑوں اور سانپوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور

بسا اوقات یہ انسانی روپ میں بھی سامنے آتے ہیں۔ سورۂ جن کی گیارہویں آیت میں جنوں کی زبان سے یہ اعتراف ملتا ہے کہ ہم جنوں میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ بد۔

بعض علماء نے جِنات کی جو پانچ قسمیں بیان کی ہیں،۔

پہلی قسم :اُن میں سے ایک قسم جان' کہلاتی ہے جو کہ نہایت ضعیف اور بزدل جن ہوتا ہے۔ غالباً مجھ سے جو جو جِنات اب تک مخاطب ہوئے وہ ضعیف اور بزدل جِنات ہی تھے ورنہ تو میں اب تک اس دنیا میں نہ ہوتا۔

دوسری: یہ قسم 'شیطان' کہلاتی ہے جو کہ بری ارواح ہوتی ہیں۔

تیسری قسم: یہ 'عفریت' کہلاتی ہے، یہ ایک طاقتور بد روح ہوتی ہے۔ اللہ اس سے محفوظ رکھے۔

چوتھی قسم: یہ 'مَرید' اُس سے بھی زیادہ طاقت ور بد روح ہوتی ہے اور

پانچویں قسم: یہ 'پریوں' کی ہے، جنھیں نیک جن عورتیں کہا جاتا ہے۔

یہاں مَیں اپنے وہ تجربات اور مشاہدات بیان کروں گا جو مجھے اللہ کی ایک

مخلوق ''جِنات'' کے حوالے سے ہوئے۔ ایک سے زیادہ بار 'جن' مجھ سے مخاطب ہوا، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی، ڈرایا دھمکایا بھی، نرمی اور پیار سے بات بھی کی اور حتیٰ کہ چلتی گاڑی سے نیچے پھینکنے کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ الحمد للہ ہر بار میں ان کے شر سے محفوظ رہا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس مخلوق کے شر سے محفوظ رکھے۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میری رہائش لیاری کے علاقے آگرہ تاج کالونی میں تھی، اسے مسان روڈ بھی کہا جاتا ہے، یہ رہائشی بستی جس قطعہ زمین پر آباد ہے یہاں قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کی رہائش کے ساتھ ساتھ مسان گھاٹ بھی تھا، اس بستی میں قائم غازی محمد بن قاسم اسکول جس میں راقم نے پہلی تا ششم تک تعلیم بھی حاصل کی ہندوؤں کی رہائش گاہ تھی۔ اسی علاقے میں اور میری رہائش گاہ کے نزدیک تاج جامعہ مسجد کے پاس ہندوؤں کا مسان گھاٹ بھی تھا جہاں پر ہندو اپنے مردوں کو جلایا کرتے تھے، یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک جاری رہا، مسلمانوں کی اکثریت جب اس علاقے میں آباد ہو گئی تو ہندو یہاں سے منتقل ہو گئے۔ اس بستی کے قیام کے ابتدائی دنوں میں اکثر زمین کی کھدائی کے دوران انسانی اعضاء خاص طور پر انسانی کھوپڑیاں وغیرہ نکلا کرتی تھیں۔ یہاں ایک عامل ''پانی والا بابا'' کے نام سے مشہور تھا۔ میں اپنے دوستوں سبطین، ظفر، سعید، احمد، شکیل (پیارے) کے ہمراہ اکثر اس عامل کے گھر جو

غوثیہ روڈ پر واقع تھااور ہر خاص و عام کے لیے کھلا رہتا چلے جاتے ،اس وقت مقصد تماشہ دیکھنا ہوتا تھا۔اس عامل کے پاس مرد، عورت اور بچے ایسے آتے جن کے بارے میں یہ یقین ہوتا کہ ان پر جن یا بھوت کا اثر ہے، یہ عامل تمام لوگوں کی موجودگی میں ہاتھ میں تسبیح لیے کچھ پڑھتا تھا ساتھ ہی مخصوص الفاظ بھی ادا کیا کرتا تھا، اس کے اس پڑھنے کے بعد جن یا بھوت کے اثر کا حامل مریض ہاتھ پیر مارنے لگتا اس کے قریب کے لوگ اُسے پکڑنے کی کوشش کیا کرتے ، اس کے بعد عامل اس مریض سے پوچھتا کہ کہ بتا کہ تو کون ہے؟ جن یا بھوت ؟اگر جن یا بھوت کمزور ہوتا تو فوری بول پڑتا ، اگر ڈھیٹ یا طاقت ور ہوتا تو بولنے میں دیر لگاتا، اس طاقت ور جن کے لیے بابا صاحب لوبان والا چمچہ جس میں کوئلے دھک رہے ہوتے ان پر لوبان ڈالتا بسا اوقات چھوٹی سرخ مرچے ڈالتا اور اس چمچے سے نکلتا ہوا دھواں متعلقہ جن کے حامل مرد یا عورت کی ناک میں ڈالتا، بسا اوقات بابا جی اپنی تسبیح اس جن کے حامل مرد یا عورت کے سر پر پھیرتا تو وہ شخص فوری بول پول پڑتا، آواز اس مرد یا عورت کی ہوتی لیکن اصل میں وہ جن ہوا کرتا تھا۔اب بابا جی جن سے سوال و جواب کرتے کہ تو کون ہے؟ جن صاحب اسے جواب دیتے کہ جن ہے یا بھوت، بابا جی پوچھتے کہ تو نے اسے کب، کہاں اور کیوں پکڑا، جواب میں مریض کہتا کہ فلاں درخت کے نیچے ، سنسان جگہ ، قبرستان وغیرہ وغیرہ سے، وہ ان کی تعداد بھی معلوم کیا کرتا کہ وہ تعداد میں کتنے ہیں جواب میں وہ کبھی کہتا کہ ایک ہی ہوں ، کبھی

اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کرتا۔ اس کے بعد عامل اس کو جانے کے لیے کہتا اگر جن کمزور ہوتا تو چلا جاتا، کبھی عامل اسے بوتل میں بند کر دیا کرتا اور کبھی لوبان کی دھونی کے ذریعہ جلا دیا کرتا۔ یہ باتیں سنی سنائی نہیں بلکہ میں نے کئی برس دیکھی، یہ عامل ذات کا کچھی یا تُرک تھا۔ اس طرح مجھے جِنّات کو سننے، انسانی روپ میں دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا تجربہ ہوا۔

مَیں نے اپنی امی کی زبانی یہ بات کئی بار سنی کہ وہ جب چھوٹی سی تھیں ابھی چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا تو اکثر ایک سانپ ان سے کھیلا کرتا تھا، وہ ان کے گلے میں کبھی ایک جانب کبھی دوسری جانب گھومتا رہتا اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے پکڑتی اور کھیلا کرتی تھیں، جب کوئی ان کے پاس آجاتا تو وہ غائب ہو جاتا، ان کے والدین نے کسی عامل کے ذریعے اس سانپ کو جو دراصل 'جن' تھا رفو چکر

کیا۔ ہم بہن بھائی اکثر اپنی امی کو اس واقعہ کی یاد دلا کر مذاق کیا کرتے تھے۔ جن کا سانپ کے روپ میں ظاہر ہونا مستند بات ہے۔ ہاکس بے یا پیراڈائزڈ پوائنٹ جاتے ہوئے گلبائی سے آگے جائیں تو بائیں نیول کولانی آتی ہے اس سے بھی آگے جائیں تو ہاکس بے میں داخل ہونے سے قبل دکانیں آتی ہیں جہاں پر تفریح کے لیے جانے والے کھانے پینے کا سامان خرید رہے ہوتے ہیں۔ یہاں سے آگے جائیں تو دو راستے ایک دائیں جانب سینڈس پٹ یا منوڑہ کے لیے راستہ جاتا

ہے دوسرا بائیں جانب ہاکس بے کی جانب راستہ جاتا ہے۔ اگر ہاکس بے کی جانب جائیں تو شروع ہی میں دائیں ہاتھ آبادی شروع ہو جاتی ہے جو گوٹھ نما ہے۔ یہ بلوچ گوٹھ ہے۔ یہاں کسی منی بس کا آخری اسٹاپ بھی ہے۔ اس گوٹھ کے اندر ایک قدیم قبرستان ہے جس میں ایک قبر بھی ہے۔ یہ قبر لمبائی میں پندرہ سے بیس فٹ لمبی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ کسی صحابی یا کسی بزرگ کی قبر ہے۔ جو لوگ یہاں جاتے ہیں اس قبر پر فاتح بھی پڑھتے ہیں۔ اس قبر کے برابر ایک اونچائی ٹیلا ہے، پہاڑی اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ بہت اونچی نہیں ہے اس ٹیلے کے اوپر ایک چورس چبوترا بنا ہوا ہے اس کے اوپر مٹی کے کونڈے (جس طرح کے کونڈے دھی جمانے کے ہوتے ہیں) رکھے ہوئے ہیں، ان کونڈوں میں لوگ دودھ لا کر ڈالتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہاں پر ایک جن کا مستقل بسیرا ہے اور وہ جن بہادر سانپ کی صورت میں یہاں آتا ہے اور لوگوں کا ڈالا ہوا دودھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ سنی سنائی بات ہے کہ بعض لوگوں نے اس جن کی زیارت بھی کی۔ میں کئی بار جناب جن کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن مجھے ان کی کبھی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ لوگ عقیدت رکھتے ہیں کہ یہاں موجود جن بابا کو دودھ پلانے سے ان کی مرادیں پوری پوتی ہیں۔ میں اس جگہ اپنی کسی مراد کے لیے نہیں گیا۔ میرا کچھ اور مقصد تھا جو پورا بھی ہوا۔

۱۹۷۰ ء کی بات ہے میری اِمی کو بخار آگیا، معمولی سی بات تھی، علاج ہوا اتر

گیا لیکن کھانسی نہ گئی، ایسا بھی اکثر ہوتا ہے، کھانسی کی دوا استعمال کرتی رہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آواز سے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی مرد کھانس رہا ہے، سب کو تشویش ہوئی، ہمارے خاندان میں سید امام صاحب جِنّات کا اتار کیا کرتے تھے جب انہیں امی کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے عمل کے ذریعہ بتایا کہ اِمی پر کسی جن کا اثر ہے، انھوں نے اس کا اتار شروع کر دیا، کچھ تعویذ، پڑھا ہوا پانی اور ساتھ ہی ہمیں پڑھنے کے لیے کچھ بتایا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان پر (ہماری امی پر) کسی مرد جن کا اثر ہے، ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ کچھ نہیں کرے گا، اسے جانے میں کچھ وقت لگے گا۔ سارے بہن بھائی چھوٹے تھے، خوف زدہ ہو جانا ایک قدرتی عمل تھا، ان کی کھانسی اسی طرح جاری رہی، کھانستے وقت مرد کی آواز نمایاں ہوا کرتی لیکن کوئی اور بات کبھی نہیں ہوئی۔ امام صاحب کا عمل جاری رہا انھوں نے بتایا کہ وہ رات میں پڑھائی بھی کرتے ہیں۔ چند روز گزرنے کے بعد ایک دن امی پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا لیکن اس دورے کے باوجود ان میں وہ نقاہت یا کمزوری دیکھنے میں نہیں آئی۔ بیٹھے بیٹھے کھانس رہی تھیں البتہ اس دن انھوں نے مرد کی آواز میں بولنا شروع کیا چند جملے ہی ذہن میں ہیں، مرد کی آواز میں کہا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا''، '' وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''، ''تم لوگ مت ڈرو''، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا'' وغیر وغیرہ، میں اِمی کے پاس ہی تھا

میری کسی بہن سے چائے کے لیے کہا کہ ’ میں چائے پیوں گا‘، چائے بنادی گئی، تھوڑی سی چائے پی، آدھا کپ چائے باقی تھی، مجھے مخاطب کیا، کہنے لگیں ! تو میرا بیٹا ہے، میں نے کہا کہ ہاں ہوں، جن گویا ہوا ! میرا ایک کام کرے گا میں نے کہا کروں گا، پھر کہا کہ یہ کپ میں جو چائے ہے اسے دروازے کے باہر پھینک دے، بہ ظاہر یہ عام سی بات تھی، لیکن اس وقت کچھ عجیب سا ڈر اور خوف کی کیفیت طاری تھی، میں نے کہا کہ اسے میز پر رکھ دیں، پھینکنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن بضد ہوئیں کہ میں اسے باہر پھینک دوں، میں ان کے اصرار پر سمجھ گیا کہ بات کچھ اور ہے، میں نے ڈرتے ڈرتے انکار کردیا، کھانسی کے دورے میں بے انتہا اضافہ ہوا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ کھانسی بند ہو گئی اور ان کی اس کیفیت میں بھی تبدیلی آ گئی یعنی وہ اپنی آواز میں باتیں کرنے لگیں، امام صاحب کو اس کیفیت سے آگاہ کیا گیا انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا کہ چائے باہر دروازے پر نہیں پھینکی، ایسا کرنے کی صورت میں ’جن‘ ان کے اوپر سے تو چلا جاتا لیکن باہر دروازے پر اپنا بسیرا جمالیتا۔اس طرح امام صاحب نے ہمیں ایک بڑی مشکل سے نجات دلائی اور اِمی ٹھیک ہو گئیں۔

جنات کے حوالے سے ایک اور واقعہ جو دلچسپ اور خوف ناک بھی ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی (جو پروفیسر تھی) اس مشکل سے دو چار ہوئی۔پروفیسر صاحبہ کی بعض حرکات ایسی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ جِنّات کے اثر

وغیرہ کا ہے۔ میرے دوست کو کسی عامل کے بارے میں معلوم ہوا، سردیوں کا زمانہ تھا میرے دوست نے کہا کہ میری کی طبیعت ٹھیک نہیں مجھے کسی نے ایک عامل کے بارے میں بتایا ہے جو ڈیفنس کے پاس کسی کچی بستی میں رہتا ہے اس کے پاس بیگم کو لے جانا ہے اچھا ہے ایک سے دو ہوں گے، نہ معلوم کیا صورت ہو، میں تیار ہو گیا، اس کی طبیعت واقعی خراب تھی، میں اس کے ساتھ ہو لیا، مغرب کے بعد وہ عامل مریضوں کو دیکھا کرتا تھا، ہم بعد نماز مغرب وہاں پہنچ گئے۔ایک چھوٹا سا کمرہ تھا کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ عامل درمیان میں بڑی سی تسبیح لیے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک فرشی میز رکھی تھی۔ دیگر لوگوں کو فارغ کرنے کے بعد اس عامل نے پروفیسرنی صاحبہ کو اپنے دائیں جانب بٹھا دیا، اس کے برابر میرا دوست بیٹھا تھا، عامل نے تفصیل معلوم کی اور عمل شروع کر دیا، خاتون کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا، بڑی بڑی آنکھیں باہر کی جانب، ہم سب کو گھور گھور کر دیکھنے لگی، عامل نے یہ محسوس کیا کہ جن آسانی سے نہیں جائے گا چنانچہ اس نے اپنے کارندوں کو کوئلے دہکانے کے لیے کہا، کمرے کی لائٹ مدھم کر دیں، عامل بہت زیادہ موٹے دانے والی تسبیح لے کر کھڑا ہو گیا اور تسبیح پڑھنے لگا، اتنے میں کوئلے دھک کر آ گئے، عامل نے دھکتے کوئلوں کو ایک مخصوص برتن میں ڈال کر پروفیسرنی صاحبہ کی ناک کے نیچے کیا اور ان پر چھوٹی سرخ مرچیں جن پر اس نے تسبیح پڑھنے کے بعد پھونک ماری تھی کوئلوں پر ڈال دیں، مرچوں کی دھونی سے ہم سب کا برا حال لیکن وہ

خاتون جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا، اس عامل نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال پکڑے دوسرے ہاتھ سے مرچوں کی دھونی اس کی ناک میں زبردست طریقے سے دی، کافی دیر کے بعد اس پر کچھ اثر ہوا، عامل اس سے مخاطب ہوا، پوچھا کہ 'بتا تو کون ہے'؟ مردانہ آواز میں جواب دیا کہ ' میں جن ہوں'، تعداد کیا ہے، اکیلا ہوں، اس عورت کو چھوڑ دے، کہنے لگا کہ یہ میری بیوی ہے میں نہیں جاؤں گا وغیرہ وغیرہ، عامل نے یہ عمل دہرایا، مرچوں کی دھونی نے کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں کا برا حال کر دیا تھا لیکن وہ عورت اطمینان سے تھی، آخر کار عامل نے 'جن' کو جانے پر مجبور کر دیا، اس نے جانے کا وعدہ تو کر لیا لیکن فوری طور پر نہیں گیا، ہم یہ سمجھے کہ وہ چلا گیا، واپسی کا سفر شروع ہوا، میرا دوست پہلے ہی بیمار تھا اس صورت حال کے بعد اسے سردی کے ساتھ بخار ہو گیا، ڈیفنس سے گلشن اقبال تک کا سفر خاصا طویل تھا، میرے دوست کے لیے گاڑی چلانا ممکن نہیں تھا، اس نے مجھ سے گاڑی چلانے کے لیے کہا، یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، وہ جب اگلی سیٹ پر بیٹھنے لگا اور بیوی کو پیچھے سیٹ پر بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اس کی بیوی نے مردانہ آواز میں کہا'' ہٹو میں آگے بیٹھوں گا''، میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا، میں نے جب یہ جملہ سنا تو میرے ہوش گم ہو گئے میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ حضرت 'جن' اس عورت میں موجود ہیں، اب کیا ہو سکتا تھا، میرا دوست پیچھے بیٹھ گیا، اس کے ساتھ اس کی کوئی ۱۲ سال کی بیٹی بھی پچھلی سیٹ پر تھی، اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہوئے،

وہ عورت نظر نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، میں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ راز داری کے ساتھ اس عورت پر نظر رکھے ہوئے تھا، میں بھی یہ چاہتا تھا کہ خاموشی ٹوٹے، اسی لمحے میرے دوست نے اس کی خیریت پوچھی، شاید وہ بھی چاہتا تھا کہ خوف کا ماحول خوش گوار ماحول میں بدل جائے، اس کے بولتے ہی وہ عورت مردانہ آواز میں چلائی ''خاموش بیٹھا رہے'' ۔ اس کے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی ، کہنے لگی '' تو خاموشی سے گاڑی چلا''، میں نے اپنے دوست سے کچھ کہا، اس کے جواب میں وہ عورت مردانہ آواز میں مجھ پر برس پڑی، بولی، '' خاموش نہیں رہے گا، ابھی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا''، اس کے اس جملے نے میرے ہوش گم کر دیے، میں اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ اگر اس نے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیا تو کیا ہو گا، میرے بدن کا ایک ایک رُواں کھڑا تھا، بدن کپکپانے لگا، وہ یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی، میں بدستور گاڑی چلاتا رہا، جس قدر قرآنی آیات یاد تھیں وہ تمام مسلسل پڑھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ کسی بھی طرح منزل آجائے، جب ہم شہید ملت روڈ کے پل پر پہنچے تو وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ، کہنے لگی'' پان کھلا اور سگریٹ پلا''، میں نے جواب دیا کہ میں دونوں چیزیں نہیں استعمال کرتا اپنے میاں سے کہو وہ کھلائے گا، اب تو جناب وہ زور سے دھاڑی کہنے لگی 'سگریٹ کی دکان پر گاڑی روک ، سنا نہیں تونے، میں نے کہا کہ اچھا دکان آجائے تو روکتا ہوں لیکن میں نے گاڑی کی اسپیڈ کم نہیں کی، وہ بھی اس کے بعد خاموش ہو رہی، گھر آگیا

خدا کا شکر ادا کیا، چابی اپنے دوست کے حوالے کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ میرے دوست نے بتایا کہ وہ رات بھر سوتی رہی، صبح اٹھی تو اسے ان تمام باتوں کا علم نہیں تھا کہ اس نے رات میں دو مردوں کو کس قدر خوف میں مبتلا کیا، اس نے بتایا کہ اس عمل کے بعد اس کی بیوی ٹھیک ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا نہ بھولنے والا واقعہ ہے،جب کبھی مجھے اس کا خیال آجاتا ہے ’جِن‘ سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ سے جِنّات پر میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔(23 مئی 2015)، مصنف سے.برائے راست

رابطے کے لیے:Mail:drraissamdani@yahoo.com

ایگزیکٹ ،میڈیا چینل اور جعلی ڈگریوں کا اسکینڈل

پاکستان میں اسکینڈلز کی کمی نہیں ، ایک سے ایک بڑھ کر اور بڑی سے بڑی جعل سازی، اسکینڈلوں کی فیکٹریاں اگر دنیا میں کہیں پائی جاتی ہیں تو وہ ہماری سرزمین ہے۔ کل کی خبر تھی کہ سعودی عرب میں 80 سے زیادہ لوگوں کو پھانسیوں پر لٹایا گیا ان میں 10 پاکستانی تھے۔ اگر پاکستان میں جنم لینے والے اسکینڈلوں کی فہرست بنائی جائے تو صرف فہرست ہزاروں صفحات پر مشتمل ہو گی۔ دھوم تھی کہ ہمارا میڈیا آزاد ہوگیا ہے، خاص طور پر الیکٹرونک میڈیا نے اپنی طاقت کا ڈنکا بجایا ہوا تھا۔ پاکستان کی تمام طاقت ور قوتوں کا ڈر ختم ہوگیا تھا اگر ڈر اور خوف رہ گیا تھا تو الیکٹرنک میڈیا کا یا خود کش بمباروں کا، دہشت گردی کا، چورں کا لٹیروں کا، ڈاکوؤں کا، موبائل چھیننے والوں کا۔ پاکستان میں نجی چینلوں کی تعداد سو سے اوپر ہے ان کا کام اگر کچھ رہ گیا تھا تو وہ یہ کہ وہ دکاندار، فیکٹری مالکان ،اسپتال، ڈاکٹر، حکیم ، طبیب ، عامل، جعلی پیر، جادو گر، فال نکالنے والے ، مٹھائی بنانے والے ، اچار و مربہ بنانے والے ، سوئف سپاری، گٹکے کا کاروبار کرنے والے ، ساحل سمندر پر تفریح کی غرض سے موجود جوڑوں ، سیاست دانوں کا ٹاکرا کرنے انہیں نیچا دکھانے یا مند پسندوں کو سیڑھی کا سہارا دیتے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی خوف کھاتا تھا تو الیکٹرنک میڈیا

سے کہ نہیں معلوم کب اور کون سے چینل کی خاتون اینکر پرسن ہاتھ میں مائیک لیے اپنے ہمراہ کیمرہ اٹھائے ساتھیوں کی ٹیم کے ساتھ آ موجود ہوگی اور سلطان راہی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے گویا ہوگی کہ 'اُوئے اے کی کاروبار ہو ریا ہے' ۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ساحل سمندر یا تفریح مقام پر کسی جوڑے سے نکاح نامہ طلب کرنا، ایک سے ایک بڑھ کر، ترم خان، صحافت کے علمبردار، سچ دکھانے اور سچ بولنے کے دعویٰ کرنے والوں نے کبھی اپنا احتساب نہیں کیا، کبھی کسی چینلز کے گریبان میں جھانکنے کی توفیق نہیں ہوئی، کسی چینلز کے مالک سے آنکھ مٹکا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، ایک چینل چھوڑا دوسرا، دوسرا چھوڑا تیسرا، تنخوائیں اور مراعات کا موازنہ دیگر پیشوں سے کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اینکروں نے تمام پیشے والوں کو پیچھے چھوڑ دیا، تعلیم کیا صرف گریجویٹ، زیادہ سے زیادہ ماسٹر، سارے ماہر، تجربہ رکھنے والے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والے سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہیں کروڑوں میں یا ان چلتے پھرتے اینکروں کے مساوی تو کیا آدھی مراعات بھی حاصل کر سکیں گے۔ اگر کسی نے اینکر پرسن کی تنخواہوں کی تفصیل دیکھنا ہو تا نیٹ پر موجود ہے، چھوٹے سے چھوٹا ڈیڑھ لاکھ، بڑے نامور کئی کئی لاکھ ماہانہ لے رہے ہیں۔ اتنی آمدنی تو وزیروں سفیروں کی بھی نہیں ہوگی، بس ایک بار موقع مل جائے تو کسی بھی بڑے سیاست داں کا انٹرویو کرلیں اور اسے خوب دوڑائیں پھر دیکھیں کہ چینل مالکان آپ کی کسی منت سماجت کرتے ہیں، آپ کی دلیرانہ گفتگو آپ کو بھی

لاکھوں ماہانہ کا انسان بنا دے گی۔

ہمارے میڈیا نے کبھی یہ نہیں سوچا نہ ہی تحقیق کی کہ ان کے بعض ساتھیوں کو جو نہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، بہت طویل تجربے کے حامل بھی نہیں، پھر انہیں کوئی چینل انہیں غیر معمولی تنخواہ اور مراعات سے کیسے نواز رہا ہے۔ ہر کوئی اس فکر اور جدوجہد میں لگا رہا کہ اسے بھی کوئی ایسا ہی چینل ہاتھ آ جائے۔ بھلا ہو ڈیکلن والش کا کہ لندن میں بیٹھ کر پاکستانی ادارے کے بارے میں ایسی رپورٹ تیاری کی کہ جس کی صداقت کو تاحال کوئی چیلنج نہیں کر سکا۔ اس کی رپورٹ کے تمام باتیں سچ کا پتا دیتی نظر آ رہی ہیں۔ جعلی ڈگریوں کی فروخت کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ صدر مشرف نے پارلیمان کا رکن ہونے کے لیے گریجویٹ ہونے کی شرط لگائی تو کیسے کیسے پارسا، عوام کی بھلائی کا دم بھر نے والے، خاندانی شرافت، معزز و محترم، خاندان کے بزرگ ہمیشہ عوام کے نمائندہ رہے، جعلی ڈگریوں کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کیے نظر آئے، مقدمات کا سامنا کیا، نہ اہل ہوئے، رسوا اور بدنامی الگ۔ راقم کا تعلق کیونکہ تعلیمی ادارں سے رہا ہے، 35 سال تعلیمی اداروں اور وہاں ہونے والی مثبت اور منفی سرگرمیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جعلی کام جسے عرف عام میں دو نمبری کام کہا جاتا ہے ہر جگہ، ہر ادارے میں ہوتا ہے۔ اس کی بھی بے شمار وجوہات ہیں، سیاسی، معاشی و معاشرتی نہ ہمواریوں نے بعضوں کو مجبور

کر دیا ہے، کچھ کو سیاسی جماعتوں نے بے بس کر دیا، بعض حالات اور ماحول کے ہاتھوں برائی کے کاموں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ جو ایگزیکٹ اسکینڈل سامنے آیا اس نے تو پاکستان کا نام باہر کی دنیا میں زیادہ ہی روشن کر دیا اور وہ ہمارے ملک کی پہچان بن کر ابھرے ہیں۔ معروف شاعر انور شعورؔ نے 'قدر' کے عنوان سے کیا خوب قطعہ کہا ہے ۔

ہم نے یہ مانا کہ اپنے بعض لوگ

بد دیانت اور بے ایمان ہیں

قدر کرنی چاہیے اُن کی ہمیں

وہ ہمارے ملک کی پہچان ہیں

واقعی ایگزیکٹ اسکینڈل ہمارے ملک کی پہچان بن رہا ہے۔ اچھے کام کرنے سے ہی نام وری حصہ میں نہیں آتی، مال بنانا مقصد ہو تو پھر کچھ بھی کیا جاسکتا ہے، کسی بھی حد کو عبور کیا جاسکتا ہے۔آج 27 مئی جنگ کی خبر ہے آئی ٹی سے متعلق ادارہ جو ایک معروف چینل جس کا چرچہ دو سال سے ہے چل رہا تھا تا حال شروع نہیں ہوا، بس اب آیا کہ جب آیا، بتایا جاتا ہے کمپنی کا سی ای او شعیب شیخ کو جعلی ڈگریاں برآمد ہونے کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔ حکومت نے اس کمپنی کے خلاف تحقیقات کا دائرہ وسیع تر کر دیا ہے۔ رپورٹر کی اطلاع ہے کہ کراچی کے دفتر سے لاکھوں کی تعداد میں اسٹوڈنٹ کے کارڈ اور

دیگر دستاویزات بھی برآمد کی گئیں جو دنیا بھر میں آن لائن فروخت کی گئی جعلی ڈگریوں کا ریکارڈ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایگزیکٹ سے منسلک بیلفرڈ یونیورسٹی کو امریکی عدالت جعل سازی کے جرم میں بائیس ملین ڈالر جرمانے کی سزا سنا چکی ہے جب کہ ایگزیکٹ کے سی ای او شعیب شیخ بیلفرڈ یونیورسٹی سے کسی بھی قسم کے تعلق سے انکار کر چکے ہیں۔ سلیم قریشی نامی پاکستانی نے بیلفرڈ کے معاملے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ کمپنی کے اعلیٰ افسران ایک ایک کرکے کمپنی سے اپنے لاتعلقی کا اظہار کر چکے ہیں۔ کچھ انتظار میں ہیں کہ اگر معاملا یہیں پر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو بھاری بھر کم تنخواہ کا مزاہ لوٹتے رہیں گے، اگر معاملا اور بگڑتا نظر آتا ہے تو وہ بھی مستعفی ہو جائیں گے۔ اسی طرح اس کمپنی کا چینل اور اس کے اعلیٰ افسران صحافی بھی اپنی علیحدگی کا بیان دے چکے ہیں۔ ڈیکلن والش کی رپورٹ پر حکومت نے تحقیقات کو سچائی اور ایمانداری سے آگے بڑھایا تو بات بہت دور تک جا پہنچے گی۔ اپنی علیحدگی کا اعلان کرنے والے بڑے لنگر پرسن بھی اس تحقیقات کا حصہ بنتے نظر آئیں گے۔ بھاری بھر کم مراعات حاصل کرنے والوں کا احتساب ہوا تو آئندہ اس قسم کے جرم کی روک تھام ہو سکے گی۔ اگر اس اسکینڈل کو دیگر اسکینڈلوں کی مانند سرد خانے کی نذر کر دیا گیا تو نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔

ایگزیکٹ کے سی ای او سے بعض چینل نے انٹرویوز لیے اور ان سے اس اسکینڈل کے

حوالے سے بہت سے سوالات کیے۔ ان کی گفتگو سن کر، ان کی پرسنالٹی دیکھ کر، زبان و بیان اور انداز تکلم سے مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے صحافی برادری کی بڑی بڑی شخصیات کس طرح فریب میں آ گئیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف لاکھوں کی نہیں بلکہ کروڑوں کی تنخواہ اور مراعات کے سحر میں پھنس گئے۔ صحافی خاص طور پر سینئر اینکر پرسن تو بڑے جہان دیدہ ہوتے ہیں، یہ تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں، سامنے والی بڑی سے بڑی شخصیت کو اس طرح گھیرتے ہیں کہ کیا کوئی شکاری اپنے شکار کو قابو میں کرتا ہوگا ۔ پھر یہ بھی کہ چلیے آپ روپے پیسے کی چمک سے آپ کی آنکھیں چندھیا گئیں تھیں ، دو سال سے چینل شروع ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا، یہ سوچنے کی بات تھی کہ چینل چل نہیں رہا تو پھر مالک اس قدر بھاری بھرکم اخراجات کہاں سے کر رہا ہے۔ اس کا کاروبار کیا ہے؟ اگر یہ چینل کسی بڑے ادارے کا ذیلی ادارہ بھی ہے تو اس بڑے ادارے کا کاروبار کیا ہے؟ اتنا کثیر سرمایہ کہا سے آ رہا ہے ؟ اور کس طرح آ رہا ہے۔ ہمارے بعض سینئر صحافی آسائشوں اور روپے پیسوں کی چمک کے سامنے اپنی عقل و سمجھ ہی کھو بیٹھے۔ ایگزیٹ کے سی ای او کی گفتگو سے ہر گز ہر گز یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ، بردبار، عقل و سمجھ رکھنے والا، اس قدر بڑے ادارے کا مالک گفتگو کر رہا ہے۔ ان کی باتوں میں جذباتی پن تھا، پاکستانیت

کا شیلٹر لینے کی کوشش کر۔ اپنی شرٹ پر پاکستان کا جھنڈا لگا لینے سے ہمیں جعلی ڈگری کے کاروبار کا لائسنس نہیں مل جاتا، ایمانداری کو ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھانا منفی عمل تصور کیا جاتا ہے۔ بعض سیاست دانوں نے قرآن سر پر رکھ کر اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کی، لیکن لاحاصل۔ محترم سی ای او صاحب نے اپنے دفعہ میں جو دلائل دیے وہ ناکافی اور ان میں وزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ماں یا بچوں کی باتیں کرکے ہمدردی حاصل کرنے سے آپ کا جرم چھپ نہیں جائے گے اس کے لیے آپ کو ٹھوس ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو جو کاروبار انہوں نے گنوائے وہ ایسے نہیں تھے کہ ان سے اس قدر منافع ہو جو سامنے آیا ہے۔ کیا یہ کمپنی آن لائن ڈگریاں دینے والوں کو صرف اور صرف ویب سائٹ کی سہولیات فراہم کرتی تھی؟ ایسا کام کرنے والے آئی ٹی کی دنیا میں بے شمار ادارے موجود ہیں جو اس قسم کا کاروبار کررہے ہیں لیکن ان کی آمدنی بے حساب نہیں۔ اس شعبہ میں محض ایگزیکٹ ہی تو نہیں ، سخت مقابلہ ہے، موصوف سی ای او صاحب کی ذات آئی ٹی کے حوالے سے کوئی معتبر و معروف بھی نہیں۔ محترم سی ای او صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ ان کمپنیوں کو چیٹ اور دوسری سہولتیں فراہم کرتے تھے۔ آن لائن خدمات کی فراہمی اور جعلی ڈگریوں کی فروخت دو الگ الگ چیزیں اور کام ہیں دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق اور ربط نہیں، ڈگریوں کی فروخت میں غیر ملکی بھی ملوث پائے گئے ہیں لیکن اصل کنٹرول اس کمپنی یعنی ایگزیکٹ کے پاس ہی تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہر ادارہ خواہ اس کا

تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو اپنا احتساب از خود کرے۔چینلز کو بھی ، لنکر پرسن بھی اب غیر اہم فوٹو گرافی، ڈرامے بازی کے بجائے ٹھوس شواہد کے ساتھ ، تحقیق کرنے کے بعد معاملے کو کیمرے کے سامنے لانا چاہیے۔ امریکہ کے ڈیکلان والش سے سبق حاصل کریں ، ممکن ہے کہ والش کی مدد کسی پاکستانی نے ہی کی ہو لیکن اس کی اسٹوری سے کتنی بڑی حقیقت سامنے آئی۔

ساری باتیں ، اسکینڈل اپنی جگہ، ایگزیکٹ غلط کاموں میں ملوث ہوگی، پاکستان کے متعلقہ ادارے تحقیقات کر رہے ہیں، وزیر داخلہ نے اس اسکینڈل کے حوالے سے مناسب بیان دیا ہے کہ ہر سطح پر تحقیقات کی جائے گی، اب یہاں تک ہوچکا ہے کہ کمپنی کے سی ای او کی گرفتاری عمل میں آچکی ہے،یقینا دیگر ذمہ داران بھی قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے، سالوں سے بھاری تنخواہیں اور مراعات لینے والوں سے بھی حساب کتاب ہوگا، کہ وہ کس طرح مزے لیتے رہے، اس دوران انہوں نے کتنا انکم ٹیکس ادا کیا، کیا وہ اپنی تعلیم، تجربہ اور حیثیت کے مطابق اس لائق تھے کہ انہیں کوئی بھی کمپنی اتنی بھاری رقم تنخواہ کے طور پر ادا کرے۔ یہ سب باتیں وقت آنے پر ہوں گی۔ اس اسکینڈل کو منظر عام پر لانے والے ڈیکلان والش بھی دودھ میں دھلا نہیں، وہ بھی پاکستان اور پاکستانی عوام اور حکومت کا خیر خواہ نہیں، اسے 2013 میں پاکستان سے expelled کر دیا گیا تھا۔ وہ کم عمر ہے، قسمیں اور پاکستان سے محبت نہیں بلکہ اسے اپنی شہرت

درکار ہے۔ وہ پاکستان میں نیویارک ٹائم کا بیورو چیف ہے، ماضی میں گارڈین کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ اب وہ لندن میں بیٹھ کر پاکستان پر اپنی بری نظر رکھے ہوئے ہے، وہ گزشتہ دیہائی سے پاکستانی تہذیب و ثقافت، پاکستانی سوسائیٹی، پاکستان کی سیاست اور سیاست دانوں کے علاوہ دہشت گردی کے حوالے سے لکھتا رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اگزیکٹ، میڈیا چینل اور جعلی ڈگریوں کے حوالے سے اس نے اس اسکینڈل کو بڑھا چڑھا کر، نمک مرچ لگا کر پیش کر دیا ہو۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہمارے تحقیقاتی ادارے ہر ایک سے انصاف اور قانون کے مطابق معاملا کریں گے جس کے نتیجے میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ (28 مئی 2015، مصنف سے براے راست رابطے کے لیے ای میل:drraissamdani@yahoo.com)

یوم تکبیر' 28 مئی'

28 مئی 1998 میں اسلامی جمہوریہ پاکستان عالم اسلام کی اولین اور دُنیا کی ساتویں نیوکلیئرپاور ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ پاکستان کا یہ عمل علاقے میں امن کے لیے طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت نے ایٹمی دھماکہ کرکے خطہ میں توازن بگاڑ پیدا کردیا تھا۔ مغربی دنیا اس عمل پر خوش نہیں تھی، خوش ہوتی بھی کیسے ،پاکستان ایک اسلامی ملک تھااور اسلامی دنیا میں نیوکلیئرپاور ہونے والا پہلا ملک ہونے جارہا تھا۔ امریکہ نے تو پاکستان کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا کر پاکستان سے محبت یا نفرت کا عملی مظاہرہ کردیا تھا، ان اقتصادی پابندیوں کو پاکستان نے برداشت کیا، دیگر ممالک بھی امریکہ کی طرح پاکستان کے اس عمل پر خوش نہ تھے، بعض مغربی ممالک جو پاکستان کے دوست تصور کیے جاتے ہیں انہوں نے بھی پاکستان کو ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا، پاکستان نے ان کا مشورہ خوش دلی سے سن لیا لیکن قبول نہیں کیا، انہوں نے اس کا برا نہیں منایا، کسی قسم کی پابندیوں کی بات نہیں کی۔ جہاں اس عمل کی مخالفت پائی جاتی تھی دوسری جانب بعض ممالک جن مغربی اور اسلامی ممالک شامل تھے پاکستان کے اس عمل کے حق میں تھے۔ بعض نے اعلانیہ اور بعض نے خاموشی سے پاکستان کی حمایت کی۔ سعودی عرب نے بہت عرصے پاکستان

کو مفت تیل فراہم کرکے ثابت کیا کہ وہ پاکستان کے اس عمل کو جائز و درست سمجھتا ہے اور اس کا حقیقی دوست ہے۔

دنیا کے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی ایٹمی تباکاریاں تھیں انہیں کے پیش نظر بعض ممالک چاہتے تھے کہ کہیں دنیا میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تاریخ دھرائی نہ جائے۔ پاکستان سے بھارت کی عناد اور دشمنی سب کے سامنے تھی، دونوں ممالک ایک سے زیادہ بار روایتی جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آچکے تھے۔ ایٹمی جنگ یقینا زیادہ تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا تب بہت سے مغربی ممالک نے خاموشی اختیار کیے رکھی، اس کی مذمت تک نہیں کی۔ کیا بھارت کا ایٹمی دھماکہ امریکہ کی مرضی کے بغیر ہوسکتا تھا؟ ہرگز نہیں، امریکہ کی آشیرباد بھارت کو اندرونِ خانہ حاصل رہی تھی۔ اس کے جواب میں پاکستان نے جب یہی عمل کیا تو امریکہ اپنے کیے ہوئے ہیروشیما اور ناگاساکے ظلم اور تباہی و بربادی یاد آگئی۔ پاکستان تو دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت بننے جارہا تھا، اس سے قبل چھ ممالک نیوکلیئر پاور کی حیثیت سے یہی طاقت رکھتے تھے۔ جہاں چھ تھے وہاں سات ہوگئے تو کون سی قیامت آگئی اب اگر آٹھ یا نو ہوجائیں گے تو کیا دنیا کو ختم کردیں گے۔ جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم گرا کر انسانیت سوز کردار ادا کیا، اگر اس وقت جاپان بھی ایٹمی قوت ہوتا تو

امریکہ کو سو بار سوچنا پڑتا کے وہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم برسا کر انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہلاک کر دینا کیا ہوتا ہے۔ امریکہ جس قدر طاقت ور اور بڑی طاقت ہے اپنے لوگوں کے معاملے میں بہت ہی بزدل اور کمزور بھی ہے۔ اس کا ایک باشندہ کوئی پکڑ لے پھر دیکھیں اس کی کیفیت۔ باولے کتے کی طرح متعلقہ فریق کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ریمن ڈیوس کی رہائی ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ کس طرح اس نے چند دنوں میں ایک قاتل کو آزاد کرایا۔ بات کہی سے کہی چلی گئ۔ اصل موضوع یوم تکبیر ہے۔ جو ہر سال بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے اور منانا بھی چاہیے۔ اس لیے کہ اس دن ہم دنیا کے ان ممالک کی صف میں شامل ہوئے جو اپنے آپ کو ترقی تافتہ اور ایٹمی قوت کہتی ہے۔ یہ دوسرے بات ہے کہ ہماری اقتصادی اور دیگر حالات ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے لیکن اپنے ازلی دشمن کی دشمنی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی ضروری تھا۔ ہم زندہ رہیں و قائم رہیں گے تو اپنے اقتصادی اور دیگر معاملات کو بھی صیحح رخ دے سکیں گے۔

جس دن پاکستان نے نیوکلیئر دھماکہ کیا اس دن کو 'یوم تکبیر' کے طور پر ہر سال منایا جاتا ہے۔ قابل مبارک ہے ہماری سیاسی قوت جو اس وقت برسر اقتدار تھی کہ اس نے تمام تر عالمی قوتوں کی مخالفت اور امریکہ جیسی ایٹمی قوت کے آگے سر خم تسلیم نہیں کیا اور 28 مئی 1998 کو ایٹمی دھماکے کرکے پاکستان کے

عوام کو دشمنوں کے سامنے برابری کی حیثیت میں لا کھڑا کیا۔ میاں نواز شریف اس وقت وزیراعظم پاکستان تھے اس لیے یہ اعزاز ہر اعتبار سے انہیں جاتا ہے کہ انہوں نے اس وقت ملک اور قوم کے مفاد کو ہر چیز پر فوقیت دی، یہ اقدام دلیری اور بہادری کے بغیر ممکن نہیں تھا، اپنوں سے ناراضگی، دوست ممالک کی اس درخواست کو رد کردینا کہ ہم ایسا ہر صورت میں کریں گے، آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ ایٹمی قوت کا خوف، امریکہ کی ناراضگی، اس کی اقتصادی پابندیوں کا سامنا کیسے کیا جائے گا، الغرض انہوں نے تمام تر خطرات کو بالائے طاق رکھ کر ایٹمی دھماکہ کرنے کو ترجیح دی، اور ایسا ہوگیا، اقتصادی پابندیاں بھی پاکستان اور پاکستان کے عوام کا کچھ نہ بگاڑ سکیں، بھارت بھی پاکستان کا کچھ نہ کرسکا، بلکہ اب وہ جو کچھ کرے گا سو بار سوچے گا۔ اس لیے کہ اب ہم اسے اسی کی زبان میں جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو وہ کرے گا وہ ہم کریں گے۔ اس نے گولی چلائی تو جواب میں گولی ہی ملے گی، ایٹم بم گرایا تو جواب میں ہار اور پھول نچھاور نہیں کیے جائیں گے۔

ایٹمی دھماکے ایک دم نہیں ہوئے، ادھر بھارت نے یہ عمل کیا تو ہم نے بھی بٹن دبایا اور دھماکے ہوگئے۔ اس کے لیے برس ہا برس کی تحقیق، عملی جدوجہد، مصمم ارادہ اور نیک دلی شامل تھی۔ پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت نے بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ پاکستان کا ایٹمی قوت بننا بہت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو

بھارت جس نے پاکستان کو پہلے ہی دن سے تسلیم نہیں کیا، اپنی ایٹمی قوت کا خوف دلاتا رہے گا اور ہمیں بلیک میل کرتا رہے گا۔ ایٹمی طاقت کی جدوجہد کا آغاز پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں 1976 میں ہوا تھا، یعنی ایٹمی قوت بننے کے تانے بانے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں بنے گئے۔ پاکستان کو عبدالقدیر خان، مبارک ثمن اور دیگر سائنس دانوں کی ایک ٹیم ایسی میسر آئی کے جو اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بننا ضروری ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی کام کو انجام دینے کے لیے ارادے کا ہونا بنیادی شرط ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی سیاسی و عسکری قوت اور سائنس دانوں نے پختہ عزم کر لیا کہ پاکستان کو ایٹمی طاقتوں کے طور پر دنیا کے سامنے لا کھڑا کرنا ہے۔ یہ عمل ظاہری نہیں تھا، بلکہ ایسے کام خاموشی سے اور اندرون خانہ کیے جاتے ہیں، آفرین ہے ذوالفقار علی بھٹو پر کہ جنھوں نے اس مقصد کی بنیاد ڈالی اور ان قوتوں کی اخلاقی، معاشی، مالی مدد اور حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ عبدالقدیر خان کا کہنا ہے کہ ' اللہ ذوالفقار علی بھٹو کو جنت نصیب کرے، میں اچھی خاصی نوکری کر رہا تھا اور مجھ پر غیر ممالک میں اعتبار کیا جاتا تھا، میں چھٹی پر آیا تو مجھے جانے نہ دیا اور یہ کام سونپ دیا، اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا، ہم سب نے مل کر وہ کارنامہ انجام دیا جس نے مغربی ممالک کو حیران کر دیا اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے'۔ در حقیقت ایسا صرف اور صرف اس وجہ سے ہی ممکن ہوا کہ اس عمل کے ابتدائی مرحلے میں کام کرنے والوں

کی حوصلہ افزائی کی گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو 22 سال بعد ہمارے سائنس دان ہر گز اس پوزیشن میں نہ ہوتے کہ نیوکلیئر طاقت بننے کے خواب کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ملک میں فوجی قوت نے اقتدار سنبھالا جسے عرف عام میں آمریت کا دور کہا جاتا ہے۔ یقیناً آمریت کسی بھی ملک کے لیے اچھی چیز نہیں، آمر کی حیثیت سے حکمرانی کی مثالیں بہت پائی جاتی ہیں۔ جنہیں اچھا تصور نہیں کیا جاتا کہتے ہیں کہ بری جمہوریت اچھی آمریت سے بہتر ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کا آمرانہ دور سیاسی اعتبار سے بہتر تصور نہ کیا جائے لیکن اس اعتبار سے اس آمر کو یہ کریڈٹ دیا جائے گا کہ اس نے پاکستان کو نیوکلیئر طاقت بننے کے عمل میں رکاوٹ نہیں ڈالی اور اس عمل کو اُسی طرح جاری و ساری رکھا، بعض کا تو کہنا ہے کہ ضیاء الحق نے اس عمل میں تیزی لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں کولڈ ٹیسٹ کیا گیا۔ افغان جہاد بھی اسی دور میں شروع ہوا۔ اس ماحول نے پاکستان کو اور زیادہ مجبور کیا کہ وہ ایٹمی طاقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ اس دور میں پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں نے دن رات محنت کی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے خاموشی کے ساتھ لگے رہے۔ سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کا عمل حکمرانوں کی جانب سے جاری رہا۔ اس طرح پاکستان کے ایٹمی قوت بننے کا سفر جاری و ساری رہا۔ عبدالقدیر خان کا کہنا

ہے کہ 1984 میں ضیاء الحق کو کہہ دیا تھا کہ ہم ایک ہفتہ کے اندر اندر ایٹمی دھماکہ کر سکتے ہیں۔ مگر کوئی بھی یقین نہیں کر رہا تھا۔

ایٹمی طاقت کی جدوجہد کو 22 سال پورے ہو چکے تھے۔ بھارت نے اچانک ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ یہ دھماکہ تو اچانک ہوا لیکن بھارت بھی اس کی تیاری یقینا کئی برس سے کر رہا تھا۔ کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ بھارت ایسا کر دے گا۔ جب اس نے دھماکہ کر دیا تو دنیا کو علم ہوا، لیکن اندرونِ خانہ بھارت کے دوست ممالک کو اس بات کا علم ہو گا کہ بھارت ایٹمی دھماکہ کرنے جا رہا ہے۔ اب پاکستان کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا کہ اپنے دشمن کو اسی زبان میں جواب دے۔ ادھر سائنس دان اپنا مقصد پورا کر چکے تھے اور بے تابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ میاں نواز شریف پھر سے ملک کے وزیر اعظم تھے۔ گویا یہ سعادت میاں صاحب کے نصیب میں تھی کہ اس کا کریڈٹ انہیں ملے۔ یہ نصیب اور سعادت کی بات ہے۔ وہ چاہتے تو سیاسی طور پر اس عمل کو روک بھی سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں یہ عمل کرانا تھا چنانچہ ان کے دل میں یہ عزم اور حوصلہ ڈال دیا کہ انہوں نے بھارت کے ایٹمی طاقت کا جواب ایٹمی طاقت بن کر ہی دینا ہے۔ انہوں نے بھی یہی ارادہ کیا اور اللہ نے ان کی مدد و رہنمائی کی 28 مئی 1998 کی صبح نے پاکستان کو نیوکلیئر طاقت کے طور پر دنیا کے نقشہ پر نمودار کیا۔ تمام تر سازشیں دم توڑ گئیں، اقتصادی پابندیاں اپنی موت

آپ مر گئیں، ساری کی ساری دھمکیاں، گیدڑ بھپکیا دھری کی دھری رہ گئیں جب بلوچستان کے مقام پر وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف اور ان کے ایک جانب عالمی شہرت کے مالک سائنس دان عبد القدیر خان تھے دوسری جانب دوسرے سائنس دان ثمر مبارک تھے ، اعلیٰ سیاسی وعکسری قیادت کی موجودگی میں میاں صاحب نے اپنی شہادت کی انگلی سے بٹن دبایا اور پاکستان کا اسلامی ایٹم بم بھارت کے کلیجے پر دھم سے جاکر لگا جس سے اس کی نیندیں حرام ہو گئیں، بو کھلاہٹ، حسد و جلن، غم وغصہ میں نہ معلوم کیا کیا بکتا رہا بالآخر بھونک بھونک کر خاموش ہو رہا۔اس کی مثال اس وقت ایسی تھی۔

بک رہا ہوں جنوں میں نہ جانے کیا کیا
کوئی نہ سمجھے خدا کرے کوئی

28مئی1998 سے ہر سال یومِ تکبیر کے طور پر منایا جاتا ہے۔یہ ہمارے ملک کے لیے قوم کے لیے ایک یادگار دن ہے۔ یہ ایک ایسا دن ہے جس دن پاکستان کواسلامی ممالک میں پہلی ایٹمی قوت ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، دنیاکے ممالک میں ساتویں ایٹمی قوت ہونے کا مقام ملا۔ بھارت سے برابری کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اب بھارت پاکستان کو اپنے ایٹمی طاقت ہونے کا ڈر و خوف نہیں دے پائے گا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بھارت اب بھی اپنے مذموم مقاصد پاکستان دشمنی سے بعض نہیں آیا، وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرکے پاکستان کے لیے

مشکلات اور مصائب پیدا کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ پاکستان دشمنی اس کی شرشت میں ہے، اس کے خون میں ہے، اس کی بنیادوں میں ہے کہ پاکستان اس کو کھٹکتا ہے۔ وہ اِسے پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ہمیں اس سے ہر دم ہوشیار اور چوکنا رہنا ہوگا۔ پتھر کا جواب اینٹ سے دینا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ اس کی سرزمین پر ہمارے بے شمار مسلمان بھائی آباد ہیں، پاکستان کی آبادی کے ایک بڑے طبقے نے بھارت کے مختلف شہروں سے پاکستان ہجرت کی اور وہ پاکستان میں آباد ہوئے۔ بہتر یہ ہے کہ دونوں ممالک اپنے مسائل کو افہام و تفہیم سے حل کرلیں۔ اپنے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں، کشمیر اصل میں دونوں کے درمیان بنیادی تنازعہ ہے۔ اسے اقوام متحدہ کی قرارداد کی روشنی میں اور کشمیری عوام کی اپنی مرضی سے حل ہوجانا چاہیے۔ دنیا میں کسی کو بھی جبر و ظلم کے ذریعہ، دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ اپنے زیر اثر نہیں رکھا جاسکتا۔ کشمیریوں کو ان کا حق آزادی ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔ بھارت کو حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیریوں پر زیادتی بند کردینی چاہیے۔ اقوام متحدہ کی قرارداد بہت واضح ہے اس کی روشنی میں انہیں ان کا حق دے دینا

چاہیے۔ پاکستان کے عوام ہر سال یوم تکبیر منا کر بھارت کو اور دنیا کو یہ باور کراتے رہیں گے کہ ہم ایک پر امن قوم اور پر امن ملک کے باسی ہیں، جیو اور جینے دو ہمارا مشن ہے۔ ایٹمی طاقت ہونا ہماری مجبوری تھی، اور وقت کی ضرورت بھی لیکن یہ ایٹمی صلاحیت پر امن مقاصد کے لیے استعمال

ہوگی۔انشاءاللہ۔ (28 مئی 2015، مصنف سے رابطے کے لیے ای میل (E-mail:
drraissamdani@yahoo.com)

نورِ فکر' مجموعہ کلام ریاضؔ انصاری جیوری۔ ایک مطالعہ'

ہندوستان کے شاعر ریاضؔ انصاری جیوری کا زمانہ 1898 سے 1974 کا ہے۔ گویا یہ مجموعہ کلام شاعر کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے 35 سال بعد 2010 میں منظر عام پر آیا۔ کتاب پر ناشر کا پتہ نیو آرک، امریکہ کا ہے لیکن اس مجموعہ کے تانے بانے امریکہ، ہندوستان اور پاکستان میں تشکیل پائے، طباعت بھی لگتا ہے کہ پاکستان میں ہی ہوئی۔ ہر اعتبار سے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ریاضؔ انصاری جیوری کی باقیات نے انہیں شاعر کی حیثیت سے بے نام ونشان ہونے سے محفوظ رکھا، ان کی شاعری کی روشنی کو پھر سے زندہ جاوید کردیا۔ یہی ریاضؔ انصاری جیوری کی خواہش بھی تھی جیسا کہ اس شعر میں انہوں نے روشنی کے باقی رہنے کی نوید سنائی ہے ۔

جنگ ظلمت سے رہے گی میرے نورِ فکر کی
میں چلا جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی

'نورِ فکر' نے ریاضؔ انصاری جیوری کی شاعری کی روشنی کو زندہ کردیا ہے۔ ان کے خاندان کے ایک چشم وچراغ عبدالصمد انصاری جنہیں شاعری خاندانی ورثہ کے طور پر ملی تاحال بے قاعدہ شاعر ہیں، کبھی کبھی شعر کہتے ہیں اور میرے

دوست بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ مجموعہ دیا ساتھ ہی فرمائش کی کہ میں اس پر کچھ لکھوں۔ تصنیفی بوجھ زیادہ ہونے کے باعث میں نے ان کی فرمائش کی حوصلہ افزائی نہیں کی ساتھ ہی صاف انکار بھی نہیں کیا، پھر سوچا کہ کیوں نہ اس مجموعہ پر سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔ مَیں نے اُسی وقت کتاب کے ابتدائی صفحات پر نظر دوڑائی تو یہ شاعر مجھے کچھ اپنا اپنا سا لگا، کچھ باتیں میرے خاندان اور میرے جدِ امجد شیخ محمد ابرہیم آزآد سے مطابقت رکھتی تھیں۔ غزلوں میں داغؔ، میرؔ اور نوحؔ ناروی کا رنگ و عکس نظر آیا، میں نے کتاب لے لی اور کہا کہ جوں ہی فرصت ملی اس پر اپنی بساط بھر کچھ لکھوں گا۔

ریاضؔ انصاری جیوری سے میرا ایک تعلق یہ نکلا کہ اس شاعر کا شجرۂ شاعری جنابِ داغؔ دہلوی سے جا ملتا ہے وہ اس طرح کہ انہوں نے نوحؔ ناروی، شاگرد رشید داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور میرے دادا شیخ محمد ابراہیم آزآد، حضرت بیخودؔ دہلوی کے خلیفہ اول تھے اور بیخودؔ دہلوی فصیح الملک داغؔ دہلوی کے جانشین تھے۔ اس طرح ریاضؔ انصاری اور میرے دادا محمد ابراہیم آزآد دونوں داغؔ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اپنے دادا کی شخصیت و کلام پر ایک کتاب بعنوان ' شیخ محمد ابرہیم آزآد۔ شاگردِ رشید استاذ الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخود ' دہلوی جانشین فصیح الملک داغؔ دہلوی: شخصیت و شاعری' مرتب کرچکا ہوں جو 2013 میں کراچی سے فضلی سنز نے شائع کی

تھی۔ ریاضؔ انصاری جیوری سے دوسرا تعلق مجھے یہ نظر آیا کہ یہ ہندوستان کے ضلع' بلند شہر' سے تعلق رکھتے ہیں، میرے خاندان کے متعدد احباب بھی بلند شہر سے تعلق رکھتے تھے ویسے ہمارا تعلق ہندوستان کی سرزمین یوپی کے ضلع مظفر نگر سے ہے۔ تیسرا تعلق یہ کہ ریاضؔ انصاری جیوری میرے دوست کے قریبی عزیز ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے جو خصوصیات ریاضؔ انصاری جیوری میں ہیں وہ اپنی جگہ مسلمہ ہیں جن کا ذکر نیچے ہوگا۔

ریاضؔ انصاری جیوری کا زمانہ بیسویں صدی عیسویں کے آغاز سے 1974تک کا ہے۔ کیونکہ انھوں نے 17برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا تھا گویا پہلا شعر میں کہا ہوگا۔ اس دور کے ممتاز سخنوروں میں احمد رضاؔ بریلوی(1856 -1915 سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی (1871-1927)، شادؔ عظیم آباد(،1921 علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938)، مولانا محمد علی جوہرؔ(، 1846-1927 حسرتؔ موہانی(1878-1951)، شیخ محمد ابراہیم آزادؔ(، 1931 - 1878 مولانا غلام شہیدؔ، آسیؔ غازی پوری، حسنؔ بریلوی، علامہ ضیاء، 1867-1947) القادری، محمد عبداللہ بیدلؔ، حافظ خلیل الدین حسن حافظؔ پھیلی بھیتی، محمد یوسف راسخؔ، منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری، محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولھا صوفیؔ، جمیل نقوی مرحوم (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء)، خلیل صمدانی (1905-1970)، ناصرؔ کاظمی (1925 ۔ 1972) شامل ہیں۔ یہی شعراء جناب ریاض

انصاری جیوری کے ہم عصر کہے جاسکتے ہیں۔ ریاضؔ انصاری جیوری کے خاندان اور دیگر شعراء نے ریاضؔ انصاری جیوری کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار نثر اور نظم میں کیااور تقریظیں لکھیں جو اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ نثر میں خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں سلیمؔ کوثر، گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیسؔ، ندؔا فاضلی، وکیل انصاری، شکیلؔ گوالیاری، وقار صدیقی گوالیاری، ڈاکٹر اے ایم زتشی گلزار دہلوی، محفوظ الرؤف انصاری شامل ہیں جب کہ نظم میں خراج تحسین پیش کرنے والوں میں محمد خالدؔ کفایت، رئیس الدین رئیسؔ، فیاض گوالیاری شامل ہیں۔ مجموعہ کی تدوین و اشاعت کی اہم اور بھاری ذمہ داری ریاضؔ انصاری جیوری کے خاندان کے جناب وکیل انصاری جو امریکہ میں مقیم ہیں مجموعہ کے لیے مواد جمع کرنے کے روح رواں ہیں۔ ’نور فکر‘ کی بازیافت کے حوالہ سے انہوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا ہندوستان کا ایڈیشن بھی شائع ہوگااور کچھ مضامین جو اس ایڈیشن میں شامل نہیں اُس میں شامل کیے جائیں گے۔ یہ ایک اور بھی اچھی بات ہوگی کہ اس کتاب کا ایک ایڈیشن
ہندوستان سے بھی منظر عام پر آئے گا۔

بھارت کے معروف ادیب و دانشور گوپی چند نارنگ نے اس کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔جو شاعرِ موصوف کے شاعری میں بلند درجات کا واضح ثبوت ہے۔

ریاضؔ انصاری جیوری کے بارے میں گوپی چند نارنگ کا ایک خوبصورت جملہ دیکھئے لکھتے ہیں ’ سترہ برس کی عمر سے زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے شاعری کی دیوی کی پوجا ارچنا میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ‘۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی شاعری کے بارے میں ان کا مزید کہنا ہے کہ ’ ریاضؔ انصاری جیوری کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کو کبھی سود و زیاں کا کھیل نہیں سمجھا بلکہ زمینی سچائیوں کو اپنی سوچ سے جہاں تک ممکن ہوا پیش کیا۔ اُن کی شاعری میں جو رکھ رکھاؤ اور نظم و ضبط ہے اور محاسنِ کلام کا جو معیار نظر آتا ہے وہ اُن کی مشاقی کی دلیل ہے ‘۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی شخصیت اور شاعری پر ان کے خاندان کے متعدد احباب جو ذوقِ ادب و شاعری رکھتے ہیں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ وکیل انصاری نے لکھا کہ ’ ریاضؔ انصاری جیوری کا تعلق قصبہ ضلع بلند شہر سے تھا لیکن وہ تمام زندگی گولیار کو آباد کیے رہے۔ وہ گوالیار کی علمی و ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ وہ صرف ایک کہنا مشق شاعر ہی نہ تھے بلکہ اردو زبان سے محبت ، چاہت اور اس کے فروغ و ترقی کے لیے بھی سر گرم رہے ‘۔ پیشہ کے اعتبار سے استاد تھے۔ اسکول میں ٹیچر ہونے کو فخر سمجھا اور ہمیشہ اسکول ہی میں پڑھاتے رہے۔ لفظ ماسٹر ان کے نام کا لازمی جذو بن چکا تھا،اکثر لوگ انہیں ماسٹر جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اسی حوالہ سے وقار صدیقی گوالیاری نے لکھا کہ ’ ریاضؔ انصاری جیوری نے صرف مدرس کی حیثیت سے اردو زبان کی خدمت ہی نہیں کی بلکہ پوری طرح اردو تحریک کا ساتھ بھی دیا۔

گوالیار میں جب بھی اردو کی تعلیم و ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی گئی اس کے خلاف ہر احتجاج میں انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ 1915 میں گوالیار میں بزم ادب' کی سرگرمیوں کے روح واں رہے۔ 1947-1972 تک وہ 'بزم اردو' کے معتمد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1955 میں انجمن ترقی اردو کی گوالیار شاخ کا قیام دوبارہ عمل میں آیا ریاض صاحب انجمن کے سرپرست کی حیثیت سے ابتداء سے آخر دم تک ہر کام اور موقع پر برابر عملی تعاون کرتے رہے۔ وہ جلسے میں بلاناغہ شرکت کرتے اور ہر منظور شدہ تجویز کو عملی صورت دینے میں انتہائی مستعدی کا ثبوت دیتے۔انہوں نے انجمن کے اَن گنت وفود کی سربراہی کی'۔

شکیل گوالیاری نے ان کی شخصیت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے۔ 'گورا رنگ، میانہ قد چہرے پر سنجیدگی و متانت رحم و انصاف شفقت و محبت کی جھلک، خود ستائی، تکبر اور غیبت جیسے اخلاقی و روحانی امراض سے پاک صاف، تصنع اور تکلف سے کوسوں دور صبر و تحمل کے خوگر، مدح وزم سے بے نیاز، دوست نوازی اور احباء پروری کی زندہ تصویر، شاعری زندگی دونوں میں سادگی پسند، ہر اصلاحی اور علمی و ادبی کام میں پیش پیش ، قوم وملت کی خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے سرشار، زبان اردو کے حقیقی سرپرست، اتحاد و یکجہتی کے حامی، ہندو اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول صاف دل صاف گو لیکن کسی کی دل آزاری سے محترز، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہر محفل میں زینت صدارت، ہر تقریب

میں مرکزِ توجہ عمر کے آخری ایام تک مذکورہ اوصاف سے متصف، ضعیفی میں بھی خوش الحان، ایسے تھے قاضی ریاض الدین انصاری جیوری'۔ وقار صدیقی گوالیاری نے لکھا کہ ' ریاض صاحب فطری طور پر بڑے خوش طبع، زندہ دل، ملنسار، خلیق، بچوں میں بچے، بوڑھوں میں بوڑھے واقع ہوئے تھے۔ ہر قسم کے تعصب سے قطعاً پاک، نفرت اور برہمی سے مبر، گفتگو میں طوالت پسند تھے لیکن انداز گفتگو کی دلچسپی اس طوالت کی عیب پوشی تھی اور یہ طوالت پسندی طلباء کو ایک بات کئی کئی طور سمجھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ طبعاً انتہائی پر سادگی پسند تھے ہمیشہ کرتا پاجامہ، شیروانی یا کوٹ اور ٹوپی بس یہ ان کا لباس تھا۔ خواہش نام و نمود سے عمر بھر متنفر رہے'۔

ریاضؔ انصاری جیوری کیونکہ داغ اسکول سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ان کی شاعری میں داغؔ کی آن بان اور شان ہونا ہی تھی، ساتھ ہی میرؔ سے بھی متاثر تھے۔ اور نوحؔ ناروی کے تو وہ باقاعدہ شاگرد تھے۔ اسی لیے گوپی چند نارنگ نے کہا کہ 'ریاضؔ کے ابتدائی غزلوں میں نوحؔ ناروی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں'۔ ریاضؔ انصاری کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے اپنے آپ کو داغؔ اور میرؔ کے خوشہ چینوں میں ہونے کا اعتراف کیا ہے ۔

زبانِ داغؔ کہاں درد اور سوزِ میرؔ کہاں

ریاضؔ ہم ہیں فقط ان کے خوشہ چینوں میں

ریاضؔ انصاری جیوری نے داغ اسکول سے اپنی وابستگی کو اپنے لیے اعزاز تصور کیا اس کا حق ہمیشہ ادا کرتے رہے۔

آپ گھبرائیں نہ زلفوں کی پریشانی سے
یہ سنور جاتی ہیں کچھ اور پریشان ہو کر

ریاضؔ انصاری جیوری نے ہمیشہ غزل کہی وہ غزل کے شاعر گردانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محاورات کی خوبی، زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں میرؔ کی سی تیزی کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان میں نرمی، سادگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی غزلوں کے چمن زار میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوجاتا کہ یہ کس قدر نفیس اور پختہ شاعر ہے۔ ریاضؔ کی غزل شفاف، اجلی اجلی، جھومتی ہوئی، سرور فراہم کرتی ہے۔ شکیل گوالیاری نے درست کہا کہ ’ہر شعر ریاض صاحب کے دکھو سے جو جھتی ہوئی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زندگی کی تلخیوں کو خوش گوار بنانے اور خود کو مذاقِ عالم کے سانچے میں ڈھالنے کی مسلسل کوشش شاعر کی حوصلہ مندی کا پتہ دیتی ہے‘۔

عشق کو دیکھئے منزل سے بھی آگے پہنچا

دل ابھی منزلِ اُلفت کے مقامات میں ہے

ریاضؔ انصاری جیوری نے زندگی کو سلگتا ہوا جہنم قرار دیا۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

اک اضطراب مسلسل ہے شورِ پیہم ہے
یہ زندگی تو سلگتا ہوا جہنم ہے

لطف نہیں، سکوں نہیں، چین نہیں، خوشی نہیں
یہ بھی ہے کوئی زندگی یہ کوئی زندگی نہیں

پروفیسر قمر رئیسؔ نے ریاضؔ انصاری جیوری کو 'مجاہد اردو' کا خطاب دیا۔ کیونکہ ریاضؔ انصاری جیوری صرف استاد اور شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی فکر مند رہے، عملی طور پر جدو جہد کرتے رہے۔ ندا فاضلی نے اپنے مضمون میں ریاضؔ انصاری جیوری کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے مراسم اور گوالیار میں ان کی آمد اور ریاضؔ انصاری جیوری سے ملاقات کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جس سے ریاضؔ انصاری جیوری کی اردو زبان سے محبت اور عقیدت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ذاکر حسین صدر ہندوستان گوالیار آئے تھے۔ ملاقات میں ریاضؔ انصاری جیوری بھی شامل تھے۔ ذاکر حسین نے ان سے پوچھا ''قاضی صاحب آپ اتنی ڈگریوں کے ساتھ ابھی تک

اسکول کے ٹیچر ہیں، فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں‘۔ اب یہ امتحان کا وقت تھا، ریاضؔ انصاری جیوری نے اپنے لیے کچھ نہ مانگا۔ انہوں نے صدر جمہوریہ ہند سے کہا ”میرے لیے آپ اتنا کر دیجئے کہ اردو جو آزادی کے بعد سے سیاست کے نرغے میں ہے اس کی حفاظت فرمائیں۔ میری خواہش ہے میری زندگی تک یہ خوب صورت زبان وراثت کے طور پر نئی نسل کو ملے“۔ اگر ریاضؔ انصاری جیوری چاہتے تو اپنی اعلیٰ تعلیم و تجربہ کی بنیاد پر کالج کیا جامعہ میں پروفیسری تو لے ہی سکتے تھے لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی ذات سے زیادہ اجتماعی مفاد کو عزیز رکھتے ہیں۔

ریاضؔ انصاری جیوری نے تقسیم ہند کو عملی طور پر دیکھا، باوجوہ انہوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ جب انہوں نے ہند کے مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ رویہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اندر ایک کرب اور درد محسوس کیا اور اس ستم گری پر اپنے جذبات کا کھلے بندو اپنے اشعار میں اظہار کیا ۔

جس کے ہاتھوں نے گلستان کو سنوارا برسوں
اب وہ گلشن میں رہے ننگِ گلستان ہو کر!

ریاضؔ انصاری جیوری نے ہندوستان کی مٹی کو اپنے لیے انتخاب ضرور کیا لیکن ان کے اپنے کہتے ہیں اور ریاضؔ کے بعض اشعار سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ

ہندوستان میں اپنوں کی جدائی اور تنہائی انہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنوں کو یاد کرتے تھے۔

ہزاروں گھر جہاں ویران ہوں اپنوں کی دوری
وہاں نظارۂ سیر چراغاں دیکھتے کیا ہو
گلوں میں دل کشی اب وہ غنچوں میں دلآویزی
گلستاں میں ہے اب کیا، اب گلستاں دیکھتے کیا ہو

پاکستانی سیاست میں آجکل انقلاب اور تبدیلی کی بہت باتیں ہورہی ہیں۔ ریاضؔ انصاری جیوری نے اس موضوع پر کیا خوب کہا۔

زر پرستوں پر عتاب آجائے گا
زرد چہروں پر شباب آجائے گا
جب سمجھ لیں گے کہ دشمن کون ہے
بس اسی دن انقلاب آجائے گا

اپنے اس شعر میں ریاضؔ انصاری جیوری نے کس قدر پیاری بات کہی ہے۔

یہی ریاضؔ دعا ہے کہ جیتے جی نہ اٹھیں
کسی کے آگے میرے ہاتھ التجا کے لیے

ریاضؔ انصاری جیوری کی غزلوں سے چند منتخب اشعار۔

کسی کو عیش میسر ہوا، کسی کو سکوں
مرے نصیب میں غم ہائے روزگار آئے

ہمارے بعد بھی آئی بہار گلشن میں
مگر سنا ہے کہ پھر پھول مسکرا نہ سکے

ریاضؔ اس میں لاکھوں نے غوطے لگائے، کچھ اس طرح ڈوبے اُبھر نے نہ پائے
محبت وہ بے تھاہ ہے اک سمندر، کہیں جس کا دنیا میں ساحل نہیں ہے

ہم چاہتے ہیں جتنا اُن کو، وہ بھی ہمیں چاہیں مشکل ہے
ہم اُن سے نباہیں لاکھ مگر، وہ ہم سے نباہیں مشکل ہے

نہیں تمھیں مجھ سے گر محبت تو پھر جتانے سے فائدہ کیا؟
جو بات دل میں نہ ہو، زباں پر وہ بات لانے سے فائدہ کیا؟

خدا کے لیے یوں شبِ ماہ میں تم، نہ نکلا کرو گھر سے باہر اکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے، کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لے لے

ہنس ہنس کے یوں خوب فریبِ محبت نہ دو مجھے
پہچانتا ہوں خوب تمہاری نظر کو میں

کرو ہلاک یوں بجلیاں گرا کے مجھے
خدا کے واسطے دیکھو نہ مسکرا کے مجھے

"ہمارے نام نہ اب بھیجنا کبھی نامہ"

یہ نامہ بر نے دیا ہے جواب لا کے مجھے

آئے، بیٹھے اور اُٹھ کر چل دیے

یہ بھی ملنے کا کوئی انداز ہے؟

فیاض گوالیاری نے ریاض انصاری جیوری کے سانحہ ارتحال پر منظوم خراج تحسین اس طرح پیش کیا۔

غروب ہوگیا وہ آفتاب پچھلے دنوں

جو روشنی ہی نہیں، روشنی کا معدن تھا

وہ داغ و نوح کی فنی روایتوں کا امیں

نگار خانۂ فطرت کا ایک نقشِ مہیں

بس ایک شورشِ تحسین و داد باقی ہے

نہیں ہے وہ تو مگر اس کی یاد باقی ہے

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی نظم و نثری کا سرمایہ اس کے انتقال کے طویل عرصے بعد مطبوعہ صورت میں منظر عام پر آ جائے۔ پینتیس برس بہت طویل عرصہ ہوتا ہے عام طور پر اتنے عرصے میں کسی بھی شاعر کا کلام یا نثر نگار کا تحریری سرمایہ زمانے کے سرد و گرم ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ قابل مبارک باد ہیں ریاض انصاری جیوری کے وہ احباب جنھوں نے طویل

عرصہ گزجانے کے باوجود ریاضؔ انصاری جیوری کی بیاض کو جمع کیا اور اسے کتابی صورت دے کر ریاضؔ انصاری جیوری کو زندہ جاوید بنا دیا۔ (3جون 2015، مصنف سے رابطہ کے لیے ای میل

E-Mail:drraissamdani@yahoo.com)

بول کا بول بالا ہوگا یا.....بولتی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی'

گزشتہ دو سال سے الیکٹرانک میڈیا میں ایک دھوم تھی، شور تھا، گرما گرم بحث تھی کہ ایک ایسا چینل آنے والا ہے جو تمام چینلوں کو تھس نہس کر دے گا۔ الیکٹرانک میڈیا میں صرف اسی کا بول بالا ہوگا۔ جی ہاں یہ چینل تھا 'بول'۔ اسکول وینوں پر بول،گاڑیوں پر بول، رکشاؤں پر بول' ، دیواروں پر بول، کھمبوں پر بول الغرض بول نے اور تو کچھ نہ کیا جگہ جگہ بول کو اس طرح پہنچایا کہ ہر چھوٹا بڑا اس کے نام سے واقف ہوگیا۔ شروع شروع میں تو حیرانی ہوئی کہ یہ کوئی چینل ہے یا اشتہاری کمپنی، اتنا بڑا نیٹ ورک، اس کی اتنی بڑی تعداد میں گاڑیاں جن میں رکشا اور چنچیاں بھی شامل ہیں سڑکوں پر دوڑتی پھر رہی ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ گاڑیوں کو اپنے نام و نشان سے رنگتا بھی ہے اور الٹے انہیں پیسے بھی دیتا ہے۔ مگر افسوس پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ غریب بول نہ سکا، اس کی بولتی اس کے اجراء سے قبل ہی ایک صحافی ہی کی اسٹوری سے بند ہو گئی ۔ اسے جنم دینے والا ادارہ ' ایگزیکٹ' جعلی ڈگریوں کے کاروبار کی ناجائز دولت سے اِسے پروان چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غلط ذرائع سے سرمایا آ رہا تھا، چینل کو بنانے ، سنوانے اور اس میں روح پھونکنے کی ناکام کوشش کرنے والے بڑے بڑے صحافی آنکھ بند کیے پرآسائش زندگی کے مزے لُوٹ رہے تھے۔ گزشتہ دو سال کے عرصے میں کسی بھی چھوٹے

یا بڑے صحافی کو یہ نظر نہیں آیا کہ چینل کا مالک ہمیں ہر ماہ بھاری رقم دے رہا ہے، چینل شروع ہو کر نہیں دے رہا، آخر یہ مالک کس خزانے کا مالک ہے، علادین کا چراغ اس کے پاس ہے، غیب سے اس کے اوپر دولت کی بارش ہو رہی ہے کہ وہ ہمیں نوازے جا رہا ہے۔ جو اس چینل کو جوائن کر چکے تھے وہ تو بہتی گنگا میں ہاتھ دھو ہی رہے تھے بے شمار نامی گرامی میڈیا پرسنز ایسے تھے جو لائن میں لگے ہوئے تھے کہ کسی بھی طرح مالک ہم پر بھی مہربان ہو جائے اور ہم بھی 'بول' کا حصہ بن جائیں۔

بھلا ہو نیویارک ٹائم کے ڈیکلن والش کا جو پاکستان کا خیر خواہ نہیں کہ لندن میں بیٹھ کر جعلی ڈگریوں کے حوالے سے ایگزیکٹ کے بارے میں ایسی رپورٹ تیاری کی کہ جس کی صداقت کو تاحال کوئی چیلنج نہیں کر سکا۔ اس کی رپورٹ کی تمام باتیں سچ کا پتا دیتی نظر آ رہی ہیں۔ 30 مئی 2015 روزنامہ جنگ کے طاہر خلیل کی مدینہ سے رپورٹ کے مطابق سعودی عرب کے صحافی حلقوں نے نیویارک ٹائمز کے دعوے کو غلط قرار دیا ہے کہ جعلی ڈگری اسکینڈل کی تحقیقاتی اسٹوری سب سے پہلے نیویارک ٹائم نے شائع کی تھی۔ اس ضمن میں سعودی عرب کی آئی ٹی خاتون صحافی مولوک باعیسی کو کریڈٹ جا رہا ہے جنھوں نے چھ برس قبل 6 اکتوبر 2009 کو ملٹی ملین ڈالر جعلی ڈگری اسکینڈل کا سب سے پہلے کھوج لگایا تھا اور خاتون صحافی اپنے تحقیقاتی مشن کے سلسلے میں نیویارک سے کراچی تک جہاں بھی

اس کا سرا ملا پہنچی تھی۔ یہ وہی خاتون صحافی ہے جس نے امریکی باشندے وکی فلپ کے ’نیسری‘ نامی کتے کو 499 ڈالر میں ’ریچویل یونیورسٹی‘ سے ایم بی اے کی ڈگری دیئے جانے کی خبر کا انکشاف کیا تھا۔ اپنی رپورٹ میں اس صحافی نے بتایا تھا کہ کراچی کی ایک کوریئر سروس کے ذریعے جعلی ڈگریاں تیار کرکے دوبئی ایگزیکٹ آفس کو بھیجی جاتی تھیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر 2009 سے 2015 تک یہ کاروبار کیسے ہوتا رہا۔ اب ایسا کیا ہوگیا، کس سے کیا معاملہ ہوا کہ ایگزیکٹ کو ’والش‘ کی اسٹوری پر گرفت میں لے لیا گیا۔ اس طرح تو یہ معاملا پرانا ہے بلی تھیلے سے اب ڈیکلن والش نے نکالی۔ کہا جارہا ہے کہ ایگزیکٹ اسکینڈل کوئی معمولی اسکینڈل نہیں اس ایک اسکینڈل سے جڑے کئی اسکینڈل سامنے آئیں گے اور اس میں کئی پردہ نشینوں کے نام بھی ہوں۔ ویسے بھی شعیب شیخ اپنی شخصیت سے اتنی بڑی توپ چیز نظر نہیں آتا۔ اصل معمہ تاحال سامنے نہیں آیا، کچھ پردہ نشین ابھی سامنے آنا باقی ہیں۔ جب شعیب شیخ پر دباؤ بڑھے گا تو یہ خوب بولے گا، فر فر بولے گا اور سب کچھ اُگل دیگا۔ معروف لینکر حامد میر کا خیال ہے کہ ’اس ایک اسکینڈل کے پیچھے کئی اسکینڈل چھپے ہوئے ہیں اور پاکستان کے دشمن کوشش کریں گے کہ اس اسکینڈل کی آڑ میں ہمارے ملک کو بدنام کیا جائے‘۔

پاکستان میں یہ کوئی نیا اسکینڈل نہیں ایک کے بعد ایک اسکینڈل کا سامنے آنا

معمول کی بات ہے۔ ان اسکینڈلز کو میڈیا ہی زیادہ ہوا دیتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ ہمارا میڈیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی خبر کے طور پر نشر ہی نہیں کرتا بلکہ مسلسل اُسے سنسنی خیز بنا کر چلاتا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میڈیا نے بم دھماکوں اور دیگر حادثات کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں میں مسخ شدہ چہرے دکھانا بند کردیے ہیں ، اسی طرح ہلاکتوں میں جان بحق ہونے والوں کی نشاندھی زبان، مذہب ، فرقہ، عقیدہ کی بنیاد پر نہیں کرتا۔ اسی طرح میڈیا کو اپنی سنسنی خیزی پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

بات 'بول' ٹی وی کی شروع کی تھی بنیادی نقطہ یہ تھا کہ اب جب کہ حکومتی اداروں کی جانب ایگزیکٹ کمپنی کے خلاف سخت اور تیز تر کاروائیاں جاری ہوچکی ہیں۔ اس کے سربراہ ہتھکڑیاں لگ چکی ہیں ،بول جو ایگزیکٹ کا ایک ذیلی ادارے کے طور پر گزشتہ دو برسوں سے اپنے قیام کے منازل طے کررہا تھا اس کا اب کیا مستقبل ہے؟ آیا 'بول' کا بول بالا ہوگا یا پھر اس کی بولتی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گی۔

بول' سے وابسطہ سینئر صحافیوں میں سے کامران خان صاحب کے ظمیر نے انہیں بول' سے وابسطہ رہنے سے روک دیا ہے۔ وہ یہ کہہ کر بول سے الگ ہوگئے کہ ایگزیکٹ کے جعلی ڈگریوں کے کاروبار کے سامنے آجانے کے بعد اب ان کا ظمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ بول کے ساتھ چل سکیں۔ کامران خاں صاحب ایک

نیک نام ، معروف اور سچ بولنے والے صحافی سمجھے جاتے ہیں ساتھ ہی ایک بڑے نامور چینل میں ان کا اعلیٰ مقام تھا وہ بول کے بول بچن میں کیسے آ گئے ، لگتا ہے مالی مراعات کے ساتھ ساتھ بول کی صدارت کی کرسی میں انہیں کچھ زیادہ ہی کشش دکھائی دی۔ تاحال یہ ایک کہانی ہے جو ابھی پس پردہ ہے یقیناً مستقبل میں اس کا پردہ چاک ہو گا۔ لگتا ہے کہ کامران خان صاحب کو اب بول کا بول بالا ہوتا نظر نہیں آ رہا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اولین فرصت میں اپنے آپ کو بول سے فارغ کر لیا۔ دوسرے سینئر صحافی نامی گرامی جناب افتخار احمد اور اظہر عباس ہیں جو کامران خان صاحب کی پیروی کرتے ہوئے خاموشی سے بول سے ناطہ توڑ چکے ہیں۔ شاید انہیں بھی اب بول کا بول بالا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ تیسرے عامر ضیاء صاحب اگزیکٹ اور بول کے محاز پر آج کی تاریخ (30 مئی) تک ڈٹے ہوئے ہیں اور بول اور اگزیکٹ کی حمایت میں خوب دلائل دیتے نظر آ رہے ہیں۔ رات ہی انہوں نے ایک نجی چینل کے پروگرام 'بے لاگ' میں 'بول' کا خوب خوب دفاع کیا۔ وہ تو یہاں تک کہہ گئے کہ ایک بڑی سازش کے تحت بول کی بولتی بند کی جارہی ہے۔ انہوں نے سازش میں سب کو شامل کردیا حتیٰ کہ پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف کو بھی بول کے خلاف سازش میں شامل کر دیا۔ اتنا بڑا صحافی اور اس قدر چھوٹی بات ، محسوس ہوتا ہے کہ انہیں بھی اپنی شاہانہ مراعات کے چھن جانے کا احساس ہو چلا ہے۔ وہ اندر سے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اب بول کی بولتی بند ہونے والی ہے۔ ڈوبنے والا آخری وقت تک اپنے ہاتھ پیر

مارتا ہے کہ کسی طرح وہ ڈوبنے سے بچ جائے۔ اس پروگرام میں سینئر صحافی ضیاء الدین صاحب بھی تھے انہوں نے بتایا کہ بول نے صرف 26 روپے انکم ٹیکس ادا کیا۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں کہ جو ادارہ اپنے ملازمین کو لاکھوں میں تنخواہیں دے رہا ہو، نچلے گریڈ کے کارندوں کو ائر کنڈیشن میں بٹھا کر کھلاتا پلاتا ہو، کام کراتا ہو، چلیں مان لیا جائے یہ ایک اچھا قدم ہے، سب ہی انسان برابر ہیں۔ سینئر صحافی ضیاء الدین صاحب نے یاد دلایا کہ جب بول کے قیام کا ڈول ڈالا جارہا تھا تو' ڈان' اخبار میں ملازمتوں کے حوالے سے ایک اشتہار چھپا تھا، ان کا کہنا ہے کہ میں اسی وقت چونک گیا تھا کہ آخر اس ادارے کی آمدنی کا کون سا ایسا ذریعہ ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو ایسی شاندار مراعات دے رہا ہے۔ لیکن یہ خیال ہمارے سینئر صحافی حضرات کو نہیں آیا، مانا کہ بول چینل ایگزیکٹ کمپنی کا تھا، لیکن انہیں معلوم تو کرنا چاہیے تھا کہ اس کی اس قدر ڈھیروں آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ غالباً وہ تمام یہ کہہ کر اور سوچ کر خاموش ہوجایا کرتے ہوں گے کہ ہمیں اس سے کیا سروکار کہ ایگزیکٹ کمپنی کا کیا کاروبار ہے؟ اس کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں؟ جو مراعات اور تنخواہ طے ہوئی ہے وہ لیتے رہنا ہے اور اپنا کام کرتے رہنا ہے۔ اس سوچ اور اس فکر کا انجام آج ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کہ 'بول' چینل بولتا رہے گا یا نہیں خاموش ہوجائے گا، لمحہ فکر یہ ہے کہ بول سے وابستہ بائیس سے تئیس سو ملازمین کا کیا ہوگا؟ بڑے بڑے صحافیوں نے تو

اتنا مال بنا لیا ہوگا کہ کئی سال بغیر ملازمت کے آرام سے زندگی بسر کرلیں گے ۔ یا ملک چھوڑ کر باہر کی راہ لیں گے۔ کوئی دوسرا چینل انہیں پھر سے کرسیٔ صدارت آفر کردے گا، اور یہ ہو بھی چکا ہے کہ کامران خان صاحب ایک نئے چینل میں اچھی پوزیشن میں جوائین کرچکے ہیں دیگر بھی ایسا ہی کرلیں گے لیکن ان 2200 میں نچلے درجے کے ملازمین بھی تو ہیں ان کا کیا بنے گا۔ عامر ضیاء صاحب نے بتایا کہ مستقبل میں صرف بول کے ملازمین کی تعداد 5000 ہونا تھی۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ شکرادا کرنا چاہیے ان لوگوں کو جو بول میں آنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ان چھوٹے ملازمین کے لیے سرکاری سطح پر کچھ اقدامات ہونا چاہیے یا پھر صحافیوں اور میڈیا ملازمین کی فلاح و بہبود کے لیے قائم تنظیمیں ان ملازمین کی فکر کریں۔

ایک زمانے میں عبدالصمد نامی شخص نے لوگوں کو ان کے سرمائے پر ڈھیروں منافہ دینے کا لالچ دیا، اس کے ساتھ دیگر کمپنیاں بھی میدان میں آگئیں ، غریب لوگوں نے اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی ان کمپنیوں کی نظر کردی، دیکھتے ہی دیکھتے یہ کمپنیاں اور اصل رقم پر بھاری منافع دینے والے سین سے غائب ہوگئے، غریبوں کو کس قدر مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنی پنشن کی رقم، جی پی فنڈ کی رقم ان ظالموں کے سپرد کردی تھی۔ کچھ عرصہ تو ان کمپنیوں نے لوگوں کو منافع دیا پھر رفتہ رفتہ وہ کم

ہوا حتیٰ کہ وہ ایک ایک کرکے غائب ہوگئے۔ میرے والد صاحب مرحوم نے بھی ایک جاننے والے کی کمپنی میں میرے ہی ذریعہ بیس ہزار روپے جمع کرائے تھے جو واپس نہ ہوئے لیکن ہم نے اس شخص کو جو کہ سرکاری محکمے میں کلرک تھا، راتوں رات امیر بنتے اور ذہنی طور پر مفلوج اور نیم پاگل ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ یقینا دیگر کا بھی اسی قسم کا انجام ہوا ہوگا۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے ایک نہ ایک دن گرفت ضرور ہوتی ہے۔ برائی کا براہی انجام ہوتا ہے۔ یہی کچھ بول اور اگیزیکٹ ملازمین کے ساتھ بھی ہوا، انہیں بھاری بھرکم مراعات کے لالچ میں پھنسا کر ان سے غلط کام لیا گیا۔ کوئی باظمیر شخص جعلی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اگر کامران خان صاحب، افتخار احمد صاحب کو یا اظہر عباس صاحب یا عامر ضیاء کو اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ اگیزیکٹ کمپنی جعلی گریوں کا کاروبار کرتی ہے تو وہ یقینا اس میں کسی بھی طور ملازمت اختیار نہ کرتے۔ کوئی بھی آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتا۔ انہیں اندھیرے میں رکھ کر کام کیا گیا۔ یا یہ تمام حضرات جو اصول پسندی، ایمانداری، سچائی اور اپنی اقدار کا اعلان اکثر و بیشتر اسکرین پر آکر کیا کرتے تھے بول اور اگیزیکٹ کی جانب سے غیر معمولی تنخواہوں اور غیر حقیقی مراعات نے انہیں ایسا مرعوب کیا کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں ، انہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا سوائے ان فوائد کے جن سے انہوں نے کئی ماہ خوب مزے لوٹے۔ شعیب شیخ کا شاہانہ دور مختصر ہی رہا بہت جلد گرفت ہوگئی۔ عبرت ہونی چاہیے ان کو جو اسی قسم کے

کاموں میں اب بھی ملوث ہیں۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ اس شخص کو بیڑیاں لگا دی جائیں گی۔ رسوائی الگ ہوئی ، اب اگر ضمانت ہو بھی جائے ، وہ اپنے اوپر لگائے گئے الزمات کو ثابت کرنے کی تمام تر کوشش بھی کریں لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔

پاکستان ایک کے بعد ایک بحران سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی تعداداس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ پاکستان کو کسی بھی طور پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ باہر کے دشمنوں سے نمٹنا آسان ہے گھر کے دشمنوں سے نمٹنا مشکل ہوتا ہے۔

ہم اخلاقیات کی پستی میں اس قدر دھنس چکے ہیں کہ اس سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔

سینئر صحافی غازی صلاح الدین کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ 'پاکستان کا حقیقی بحران نہ سیاسی ہے اور نہ معاشی بلکہ یہ فکری اور اخلاقی بحران ہے'۔ ہم اگر اخلاقی طور پو اپنے آپ کو درست کرلیں تو بے شمار مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں۔

ایگزیکٹ کمپنی اور بول کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے ، تحقیق خواہ سرکاری ادارے کریں ، عدالتیں یا کمیشن ، شفافیت اور انصاف ہوتا نظر آنا چاہیے۔

پاک چین اقتصادی راہدی منصوبہ۔اتفاقِ رائے ایک اچھی روایت

پاکستان اور چین کے مابین ہونے والا اقتصادی راہ داری منصوبہ PAk China Economic Coridoreپاکستان کی اقتصادی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔دنیا میں ہر ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ترقی اور معیشت کے فروغ کے لیے اپنے طور پر اور اپنے دوست ممالک کے تعاون سے نت نئے منصوبے تشکیل دے۔ چین کو بجا طور پر پاکستان کا ایک دیرانہ، مخلص اور ہمدرد دوست ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چین نے اپنی معیشت کومستحکم کرنے اور دنیا میں اقتصادی برتری حاصل کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں دنیا اس سے بخوبی واقف ہے۔آج دنیا کے جس ملک میں چلے جائیں چھوٹی سے چھوٹی ، بڑی سے بڑی مصنوعات چین کی تیار کردہ نظر آتی ہیں۔ چین نے دنیا کے ملکوں کو مصنوعات کی تیاری میں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔پاکستان کو چین کے اس عمل سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ایسی صورت میں جب کہ چین پاکستان کی معیشت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے تیار نظر آتا ہے۔پاکستان کو اس کا تعاون حاصل کرنے اور اپنی معیشت کو ترقی دینے میں پش و پیش سے بھی

کام نہیں لینا چاہیے اور پاکستان نے ایسا ہی کیا۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے پاک چین اقتصادی راہدی منصوبہ تشکیل دیا۔ یہ راہداری منصوبہ چین کی 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری پر مشتمل ہے۔ منصوبے کا تعلق پاکستان اور چین کی اقتصادی ترقی سے جڑا ہوا ہے۔راہداری منصوبہ پہلے سے موجود نظام کو اپ گریڈ کرنے کا منصوبہ ہے اس میں ائر پورٹ، بندرگاہیں، سڑکیں، توانائی اور تعمیر وترقی کے جامع منصوبہ بندی شامل ہے۔یہ خیبر پختونخواہ، سندھ، بلوچستان، پنجاب، گلگت، بلتستان اور آزاد کشمیر میں بنیں گے۔ کوئی بھی دوسرا ملک حتیٰ کے بھارت کا اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں کسی بھی قسم کا نقصان کا کوئی تعلق کسی طور نظر نہیں آتا۔ لیکن بھارت جو ہماراپڑوسی ہونے کے باوجود دشمنی کی انتہائی حدود کو چھو رہا ہے اس کو اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں بھارت دشمنی نظر آنے لگی اور اس کے موجودہ وزیراعظم نریندر مودی کے ساتھ ساتھ تمام حکومتی کارندوں کو اس منصوبے سے بھارت کو خطرہ محسوس ہونے لگا اور انہوں نے پاکستان دشمنی کا اظہار شروع کردیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بھارت کو پاکستانی حدود سے کوئی جانور حتیٰ کے کبوتر بھی آتا نظر آجاتا ہے تو اسے پاکستان کی جانب سے بھیجی جانے والی بھارت دشمنی نظر آنے لگتی ہے۔

پاک چین اقتصادی راہدی منصوبہ جوں ہی منظر عام پر آیا بھارت نے اپنا روایتی

واویلا شروع کر دیا۔ اس منصوبے کی مخالفت بلا جواز اور پاکستان دشمنی کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی۔ پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف نے واضح طور پر کہا کہ اس منصوبے کی مخالفت سے بھارت کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ جو عناصر پاکستان کو ترقی یافتہ اور خوشحال نہیں دیکھنا چاہتے وہ اس کی مخالفت میں لگے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے وزیر داخلہ نے بھی واضح الفاظ میں سشما سوراج اور نریندر مودی کے پاک چین اقتصادی راہداری منصوبے پر منفی بیانات کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اقتصادی راہداری کی تکمیل ہر صورت میں یقینی بنائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ منصوبے پر بھارت کا اصل چہرہ سامنے آگیا ہے۔ ان کی تنقید اور مخالفت بے معنی ہے۔ عالمی قوتوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔

بھارت کے بلاوجہ واویلا کے جواب میں چین نے بھی دوٹوک الفاظ میں بھارت کی تنقید کو بلاجواز قرار دیا۔ چین کے ترجمان کا کہنا تھا کہ پاک چین اقتصادی راہداری پر پڑوسی ملک بھارت کے واویلا کے جواب میں چین نے بھارت سے کہا ہے کہ پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ کسی تیسرے فریق کے خلاف نہیں۔ بھارت کی وزیر خارجہ سشما سوراج نے کہا تھا ہم نے چین پر واضح کر دیا ہے کہ ہمیں اقتصادی راہداری قابل قبول نہیں۔ اس کا جواب پاکستان نے تو دیا ہی ہے اس کے برخلاف چین نے بھی بہت واضح الفاظ میں بھارت کو باور کرادیا ہے کہ پاکستان

میں اقتصادی راہداری منصوبہ کسی بھی تیسرے فریق کے خلاف نہیں ، راہداری کی تعمیر پاکستان اور چین کی عمومی ترقی کے لیے انتہائی اہم ہے۔ چین کا کہنا ہے تمام شعبوں میں طویل المدتی تعاون کے فروغ کے لیے دونوں ممالک چین پاکستان اقتصادی راہداری کا ایک فریم ورک تیار کیا ہے جو چین کے چائنا بیلٹ اینڈ روڈ کے تحت ایک اہم پرجیکٹ ہے۔ چین کے ترجمان نے واضح کیا کہ اقتصادی راہداری کی تعمیر چین پاکستان عمومی ترقی، علاقائی روابط بڑھانے ، خطے میں امن ،استحکام اور ترقی کے لیے انتہائی اہم ہے۔انہوں نے پاک چائنا کا یہ تعاون مقامی معیشت اور سماجی ترقی کے لیے ہے، یہ کسی تیسرے فریق کو ہدف نہیں بناتا۔

بھارت کا واویلا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اس نے تو پاکستان کو ہر صورت تنقید کا نشانہ بنانا ہے۔ اس منصوبے کے حوالے سے پاکستان کے چھوٹے صوبوں کو بھی تحفظات اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ وزیراعظم میاں نواز شریف نے اچھی حکمت عملی اپناتے ہوئے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جس میں پنجاب اور سندھ کی قیادت نے راہداری کے مغربی روٹ کو ترجیحی بنیادوں پر تعمیر کرنے کے فیصلے پر کوئی اختلاف نہیں کیا اور کھلے دل سے اس فیصلے کی حمایت کی۔آل پارٹیز کانفرنس میں اتفاق رائے ہوگیا۔ جن لوگوں کو ڈر و خوف اور تحفظات تھے وہ باہمی گفت وشنید سے دور ہوگئے۔ اس طرح بھارت کی

جانب سے اور کچھ اندرونی عناصر کی جانب سے اس راہداری منصوبے کو متنازع بنانے کی جو ناکام کوشش شروع ہوئی تھی وہ اس وقت دم توڑ گئی جب آل پارٹیز کانفرنس میں اس پر مکمل اتفاق اور سیاسی حلقوں میں مکمل اتحاد سامنے آیا۔آل پارٹیز کانفرنس جو چھوٹے صوبوں اور کچھ سیاسی جماعتوں کی جانب سے ظاہر کیے گئے تحفظات دور کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ یہ مئی کے آخری ہفتہ میں ہوئی منصوبے کی نگرانی کے لیے پارلیمانی کمیٹی قائم کرنے پر اتفاق ہوااور گوادر سے کاشغر سے ملانے کے لیے مغربی کوریڈور کو سب سے پہلے ترقی دینا طے پایا۔آل پارٹیز کانفرنس میں بطور خاص چھوٹے صوبوں کے ان شہروں کی تفصیل بیان کی گئی جو مجوزہ راہداری اور اقتصادی زون کا حصہ ہوں گے۔ اس منصوبے سے پاکستان میں توانائی کے بحران کو ختم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ تجارتی و اقتصادی ترقی کے راستے کھلیں گے۔ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ مشرقِ وسطیٰ سے سینٹرل ایشیا تک درآمدی تجارت میں توسیع ہوگی اور چین کو مختصر ترین راستے سے بحیرہ عرب اور اس سے آگے مغربی دنیا تک رسائی حاصل ہوگی۔ یہ پاکستان کی معیشت کو ترقی دینے کا بہترین منصوبہ ہے، بھارت کو جب یہ نظر آیا کے اس منصوبے سے پاکستان کی معیشت مستحکم ہوگی، چین کو بھی تجارتی فوائد حاصل ہوں گے تو اس نے اپنے تحفظات کا واویلا شروع کردیا۔آل پارٹیز کانفرنس نے تمام تر تحفظات کا خاتمہ کردیا۔

حکومت پاکستان کی اقتصادی کونسل کے اجلاس منعقدہ یکم جون 2015 میں مالی سال 2015-16 کے دوران پاک چین اقتصادی راہداری کے مختلف منصوبوں کے لیے 171 ارب روپے مختص کرنے کی منظوری دی۔ حکومت وزارت داخلہ کو 3.5 ارب روپے دے گی تاکہ اقتصادی راہدی اور پاکستان میں مصروف کار چینی باشندوں کی حفاظت کے لیے سول آرمڈ فورسز کے 28 ونگز قائم کیے جاسکیں گے۔ قومی اقتصادی کونسل کی منظور شدہ سمری کے مطابق حکومت نے نئے مالی سال کے بجٹ میں پاک چین اقتصادی راہداری کے تحت 942 ارب روپے کے منصوبے شامل کیے ہیں اور آئندہ مالی سال کے دوران اخراجات کے لیے 171 ارب روپے کی منظوری دیدی ہے۔ منظور شدہ منصوبے کے تحت حکومت اقتصادی راہداری کے تحت مغربی روٹ کے منصوبوں پر 20.8 روپے خرچ کرے گی۔ مغربی روٹ منصوبوں کے تحت ظاہر کیے گئے 4 پر پہلے ہی کام جاری ہے۔ 5 واں منصوبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عمومی نوعیت کا ہے جس میں اقتصادی راہداری کے منصوبوں کے لیے اراضی کا حصول شامل ہے۔ اس منصوبے پر لاگت کا کل تخمینہ 60 ارب روپے ہے اور حکومت نے اس کے لیے 10 ارب روپے مختص کردیے ہیں۔ مشرقی کوریڈور منصوبوں پر ابھی بھی 95 ارب روپے خرچ ہوں گے۔ شمال لائن بندی کے لیے 31.8 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔

بھارت دنیا کی توجہ کشمیر جیسے بنیادی اور اہم مسئلہ سے ہٹانے کے لیے کسی نہ کسی مسئلہ کے حوالے سے پاکستان دشمن بیانات اور شور وغوغا کرنے کا عادی

ہوچکا ہے۔ اگر کسی وقت کوئی معاملانہ ہوتو اس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ پاکستان میں امن کیوں ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے پاکستان دشمنی کے واضح ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔ یہ سندھ، کراچی، بلوچستان میں تخریب کاری میں پاکستان دشمنوں کی ہر طرح مدد کررہا ہے۔ بھارت کے دھمکی آمیز اور پاکستان دشمن بیانات سے پاکستانی عوام بہت اچھی طرح آگاہ ہیں۔ پاکستانی فوج کے سربراہ نے اپنے بیان میں پاکستانی عوام کو پیغام دیا ہے کہ 'بھارتی دھمکی آمیز رویے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں مسلح افواج جارحیت سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بھارتی جارحیت پر فوج خاموش نہیں بیٹھے گی' ۔ جنرل راحیل شریف کے اس دلیرانہ بیان سے پاکستانی سیاست دانوں، عوام کے حوصلے بلند ہوئے اور بھارت کے پاکستان دشمن رویے پر برف پڑ گئی۔ (6جون 2015)

فاران کلب کے تحت 'مولانا محمد علی جوہر لائبریری' بیاد' خالد ایم اسحاق' مرحوم کا افتتاح

کراچی میں قائم فلاحی و سماجی ادارے 'فاران کلب' کے زیر اہتمام 'مولانا محمد علی جوہر لائبریری' بیاد' خالد اسحاق مرحوم' کی افتتاحی تقریب.بروز اتوار 7 جون 2015 منقعد ہوئی۔ لائبریری کا باقاعدہ افتتاح سابق ناظم کراچی نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ نے کیا۔لائبریری کا ایک خاص وصف اور انفرادیت یہ ہے کہ اس لائبریری میں موجود 20ہزار کتابیں لندن سے دو کنٹینزوں میں طویل سفر طے کرکے کراچی پہنچی اور اس لائبریری کی خوبصور الماریوں کی زینت بنیں۔پاکستان کی تاریخ میں شاید یہ پہلی مثال ہے کہ مغرب سے.بڑی تعداد میں علمی مواد ہمارے ملک میں آیا، ورنہ ہماری 68 سالہ تاریخ میں ہمارا علمی مواد، جائز و ناجائز طریقے سے مغرب کے کتب خانوں کی زینت بنتا رہا ہے۔پاکستان سے شائع ہونے والا بعض علمی مواد تو ایسا بھی ہے کہ وہ ہمارے کتب خانوں میں ناپید ہے لیکن وہ مغرب کے کتب خانوں میں موجود ملتا ہے۔ لندن سے بیس ہزار کتب کا تحفہ دینے کی کہانی پروگرام کے کمپیئر اور فاران کلب کے سیکریٹری ندیم اقبال جو جناب نعمت اللہ کے صاحبزادے ہیں نے سنائی کچھ اس طرح ہے کہ حاشر فاروقی معروف صحافی ہیں جو کبھی لندن سے Impact نکالا کرتے تھے، کتابیں بھی جمع کرتے رہے۔اِن بیس ہزار کتابوں میں اسی فیصد کتب Impactلائبریری کی ہی ہیں۔انہوں نے یہ بھی

کہا کہ کو ہے نور کے ھیرے کی چوری کا ذکر تو کیا جاتا لیکن اصل چوری تو وہ تھی کہ رنجیت سنگھ کے دور میں کشمیر سے قیمتی لائبریری لندن ٹرانسفر ہو گئی۔ ندیم اقبال صاحب نے بتایا کہ مطالعہ حاشر فارقی صاحب کا محبوب مشغلہ ہے، ان کی ذاتی لائبریری جو انہوں نے تحفہ میں فاران کلب کو دی ہر کتاب پر ان کے نوٹ اور یادداشتیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری کی تمام تر کتابیں تحفے میں فاران کلب کو دیں ساتھ ہی ان کی یہ بھی خواہش تھی جس کو فاران کلب نے پائے تکمیل کو پہنچایا کہ اس لائبریری کا نام 'مولانا محمد علی جوہر لائبریری' رکھا جائے۔ فاران کلب نے حاشر فاروقی کی خواہش کو عملی جامعہ دیتے ہوئے لائبریری کا نام 'مولانا محمد علی جوہر لائبریری' رکھا لیکن نام کے ساتھ ایک لائحقہ کا اضافہ کیا وہ یہ کہ یہ لائبریری 'بیاد خالد ایم اسحاق مرحوم' کی گئی۔ خالد اسحاق پاکستان کے نامور قانون دان، معروف وکیل اور سب سے بڑھ کر مطالعہ کے عادی، کتاب دوست اور کتب جمع کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ خالد اسحاق مرحوم کا ذاتی کتب خانہ جس کو دیکھنے اور اس لائبریری میں بیٹھ کر خالد اسحاق سے گفتگو کا راقم کو کئی بار موقع ملا۔ یہ لائبریری ہر اعتبار سے قیمتی اور وسیع تھی۔ افسوس یہ ذخیرہ کتب اہل کراچی کی دس ترس سے دور ہوگیا۔ لاہور کی ایک LUMS پرائیویٹ جامعہ نے اس کتب خانے کو حاصل کر لیا۔ 'مولانا محمد علی جوہر لائبریری' کو خالد اسحاق مرحوم کی یاد میں کر دینا ایک اور اچھا قدام ہے۔

لائبریری کا افتتاح شہر کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ خان صاحب نے کیا۔ وہ وقت مقررہ پر تقریب گاہ پہنچ گئے۔ راقم کو تقریب کے انعقاد کے بارے میں اطلاع قیصر خان صاحب نے دی جو ان دنوں فاران کلب کی انتظامیہ میں شامل ہیں، میرے ہمسائے اور دوست بھی ہیں۔ میرے ایک اور دوست اور مہربان 'ہماری ویب رائیٹرز کلب' کے سیکریٹری جناب عطا محمد تبسم صاحب کی جانب سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ عطا صاحب پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ کالم نگاری خوب کرتے ہیں،۔راقم کو 'ہماری ویب رائیٹرز کلب' کے صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔مَیں جو ہی فاران کلب پہنچا میرے ساتھ ہی حکومت سندھ کے ایک اعلیٰ افسر اپنی سرکاری گاڑی میں مُحافظوں کی حفاظت میں اور پروفیسر انوار احمد زئی صاحب بھی پہنچے۔پروفیسر انوار احمد زئی صاحب سے اکثر تقریبات ہی میں علیک سلیک ہوجاتی ہے۔خوب بولتے ہیں، بلکہ بولنے میں ماہر القادری ہیں۔ ابتداء میں مہمانوں کو انتظار گاہ میں بٹھایا گیا، تقریب کا باقاعدہ آغاز نماز عصر کے بعد ہوا۔ لائبریری کے مرکزی دروازہ پر افتتاحی تختی آویزاں تھی ،جناب نعمت اللہ خان صاحب نے باقاعدہ تختی کی نقاب کشائی کرکے لائبریری کا افتتاح کیا، دعا کی گئی، لائبریری میں ہی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گویا یہ نئی

لائبریری اتنی کشادہ ہے کہ اچھی خاصی تعداد کے لیے تقریب گاہ کا کام بھی دے سکے۔لائبریری ہال کے چاروں طرف لکڑی کی جاذب نظر الماریوں میں کتابیں ترتیب وار رکھی ہوئی تھیں۔کتابوں کے درمیاں بڑی تعداد میں مہمان موجود تھے۔کتاب ، لائبریری اور اچھے اچھے مقرروں نے ماحول کو خوبصورت اور جاذب نظر بنایا ہوا تھا۔ بہت عرصے کے بعد فاران کلب آکر خوش گوار احساس ہوا، ساتھ ہی فاران کلب کے بانیوں میں سے جناب عبدالرحمٰن چھاپرا مرحوم یاد آ گئے۔ان سے سلام دعا تھی ، کئی تقاریب میں ان کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ اچھے اور نفیس انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ میں چھاپرا صاحب کی دعوت پر فاران کلب کئی بار آچکا تھا اور اس ادارے سے بخوبی واقف بھی تھا۔ دراصل چھاپرا صاحب سے میری ملاقات اور تعارف میرے استاد پروفیسر سید لطف اللہ مرحوم نے جمعیت الفلاح میں کرایا تھا۔ لطف اللہ صاحب ایس ایم کالج سے میرے کالج (حاجی عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج، لیاری) میں آگئے تھے ۔اس طرح ان سے دوستی اور شفقت کا رشتہ بھی قائم ہوگیا تھا، وہ میرے کالج کے بعد سراج الدولہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ہوئے ۔ لطف اللہ صاحب طویل عرصے تک جمعیت الفلاح کے سیکریٹری اور صدر رہے۔ انہوں نے مجھے بھی جمعیت الفلاح سے منسلک رکھا، جمعیت الفلاح کی لائبریری کی ترتیب و تنظیم میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ لطف اللہ صاحب بڑے نفیس ، خوش گفتار، نرم

مزاج انسان تھے۔اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازں ندیم اقبال صاحب نے جو فاران کلب کے اِس وقت سیکریٹری ہیں اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے تقریب کی غَرض و غایَت بیان کی۔انہوں نے لندن میں مقیم ایک پاکستانی برطانوی' سے ان کی Impact حاشر فاروقی' صاحب کی شخصیت ، کتابوں سے ان کے تعلق اور وابستگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ تقریب میں کئی چہرے شناسا نظر آئے۔ان میں سے کچھ تو مقررین میں شامل تھے بعض میری ہی طرح تقریب کے عام مہمان تھے۔ ان احباب میں ادریس بختیار ، اعجاز رحمانی ، پروفیسر انوار احمد زئی، پروفیسر ہارون رشید صاحب ،آرٹس کونسل کے احمد شاہ صاحب، کراچی بار کے نعیم قریشی صاحب، خواجہ رضی حیدر صاحب، قیصر خان صاحب، عطا محمد تبسم صاحب اور دیگر شامل تھے ۔ لوگ تو اور بھی تھے لیکن میں جن جن سے واقف تھا ان کے نام تحریر کیے ہیں۔

تقریب کے پہلے مقرر کراچی بار کے جناب نعیم قریشی تھے انہوں نے اپنے ہم پیشہ خالد اسحاق مرحوم کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی اور اس لائبریری کو ان کی بیاد بنانے کے عمل کو سراہا۔آرٹس کونسل کے موجودہ سیکریٹری جنرل احمد شاہ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے منتظمینِ فاران کلب کو کراچی شہر میں ایک اچھی

جگہ اور خوبصورت لائبریری بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ خالد اسحاق مرحوم کی بہترین لائبریری سے اہل کراچی مستفید نہیں ہوسکے اور وہ لاہور کے ایک تعلیمی ادارہ نے حاصل کر لی۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب کی اشرافیہ نے یہ اچھا کام کیا انہوں نے کہا کراچی کی اشرافیہ کو پہلے اس بات کا خیال آجاتا تو ہم ایک اچھے کتب خانے سے دور نہ ہوتے۔ جناب احمد شاہ نے اعلان کیا کہ انہیں آرٹس کونسل میں جو کتب موصول ہوتی ہیں وہ کتاب دینے والوں سے یہ کہیں گے کہ وہ کتاب کے دو نسخے دیا کریں اور میں ان دو میں سے ایک کتاب اس لائبریری کو دے دیا کروں گا۔انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک سے کتاب کلچر اور لائبریریاں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔ بڑی بڑی کتابوں کی دکانوں کی جگہ پلازے اور شاپنگ سینٹر قائم ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری موجودہ نسل کتاب سے ، کتب خانوں سے دور ہوتی جارہی ہے۔

تقریب کے تیسرے مقرر تعلیمی بورڈ کراچی کے چیرٔمین پروفیسر انوار احمد زئی صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز ، خوبصورت الفاظ ، ادبی جملوں اور موضوع کی مناسبت سے تاریخی واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ ایک شخص کسی بڑے ہال جہاں پر اندھیرے تھا،ایک چراغ جلائے بیٹھا تھا۔ جس کی مَدھم مَدھم روشنی ہو رہی تھی کسی نے شخص سے کہا کہ اتنے بڑے ہال میں تم ایک چراغ چلائے ہوئے ہو اس سے کیا فائدہ ، کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے

ہو اس شخص نے جواب دیا کہ میں اس وجہ سے یہ چراغ جلائے ہوئے ہوں کہ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اندھیرے اور اجالے میں فرق ہوتا ہے، چاہے وہ روشنی مدھم ہی کیوں نہ ہو۔پروفیسر انوار احمد زئی نے لائبریری کا نام مولانا محمد علی جوہر رکھنے کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر اور سرسید احمد خان کے حوالے سے بھی گفتگو کی۔انہوں نے ڈاکٹر یوسف میمن کے انتقال کی خبر بھی تھی جو کہ میرے لیے زیادہ افسوس ناک تھی کیونکہ ڈاکٹر یوسف میمن سے میرے قدیمی اور بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ کافی عرصہ سے بیمار چل رہے تھے۔ کراچی علاج کی غرض سے آتے تو مجھے فون ضرور کیا کرتے تھے۔تاریخ ان کا موضوع تھا۔کتاب دوست اور کتابوں کے عاشق، میرپور خاص جیسے چھوٹے شہر میں ان کی ذاتی لائبریری کئی ہزار کتب اور نایاب ذخیرہ پر مشتمل ہے۔کچھ عرصہ قبل جب میں نے اپنی ذاتی لائبریری کو کسی بھی لائبریری کو تحفہ دینے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر یوسف کو بھی چند سو کتابیں ان کی ذاتی لائبریری 'یوسف لائبریری' کے لیے بھی دیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب از خود اپنی گاڑی میں وہ کتابیں لے گئے تھے۔ میں کافی عرصہ سے پروگرام بنا رہا تھا کہ میرپور خاص جاکر ڈاکٹر یوسف میمن سے ملاقات کروں، ان کی خیریت دریافت کروں اور ان کی لائبریری کو بھی دیکھوں۔ افسوس میری یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔آج پروفیسر انوار احمد زئی کی زبانی معلوم ہوا کہ میرا وہ مخلص دوست جس نے مجھے آموں کا تحفہ بھی دیا، شربت اور اچار بھی تحفے کے طور پر لائے۔ یہ

خلوص اور محبت اب ناپید ہوتا جارہا ہے۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو ڈاکٹر یوسف اور ان کی لائبریری پر کچھ لکھوں گا۔ میرپور خاص جیسے چھوٹے اور پسماندہ شہر کے لوگوں کو یوسف لائبریری کا تحفہ دینے والے کا تنا حق تو ہے کہ ہم اسے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے خراج تحسین پید کریں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر یوسف کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفروس میں اعلیٰ مقام نصیب کرے۔ آمین۔

پروفیسر انوار احمد زئی کا کہنا تھا کہ فاران کلب کی منتظمہ اگر مناسب سمجھے تو وہ ان کے ہمراہ ڈاکٹر یوسف کے گھر جانے کو تیار ہیں اور ان کی بیگم سے درخواست کریں گے کہ وہ ڈاکٹر یوسف کی لائبریری فاران کلب کو عطیہ کردیں۔ پروفیسر زئی کی تجویز مناسب ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈاکٹر یوسف نے اپنی زندگی میں اپنی ذاتی لائبریری جو کہ عام لوگوں کے استعمال کے لیے بھی تھی کا کوئی نہ کوئی اہتمام کردیا ہوگا۔ ذئی صاحب نے بڑی پیاری بات کہی کہ مولانا محمد علی جوہر کا جاری کردہ 'کامریڈ' کا تبدیل شدہ ورژن حاشر کا تسلسل فاران Impact کے نام سے لندن سے جاری کیا اور Impact فاروقی نے کلب کے زیر اہتمام قائم ہونے والی یہ مولان محمد علی جوہر لائبریری ہے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی والدہ کا بھی ذکر کیا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ حاشر فاروقی نے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے منافے کے ساتھ واپس کردیا ہے۔ جس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

پروفیسر ہارون رشید صاحب نے طویل تقریر کی۔ اپنے دیر سے پہنچنے کی تفصیل بیان کی۔ ہارون رشید صاحب کراچی کے کالجوں میں استاد رہے، اساتذہ تنظیم کے سرگرم کارکن رہے، انیتہ غلام علی موحوم کے ساتھیوں میں سے رہے، پروفیسر ہوئے، پرنسپل ہوئے اور پھر ای ڈی او بھی ہوئے اس اعتبار سے کراچی کے کالجوں میں قائم کتب خانوں کی ابتر حالی کا ذکر بھی تفصیل سے کیا۔ کراچی کے تعلیمی حالات ان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ انہوں نے اس بات کا ذکر بھی کیا کہ کالجوں میں لائبریری کے لیے بجٹ نہیں دیا جاتا، یہ صورت حال اس وقت بھی جب ہارون رشید صاحب کالجوں کے انتظامی معاملات ان کے دائرہ اختیار میں تھے، کتنا اچھا ہوتا کہ یہ اپنے دور میں کتب خانوں کا بجٹ بحال کرادیتے۔ ستم ظریفی ہے کہ جب ہم بہ اختیار ہوتے ہیں تو سب کچھ بھولے ہوئے ہوتے ہیں اور جب بے اختیار ہوجاتے ہیں تو سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ خواجہ رضی حیدر نے اپنے خطاب میں ہندوستان کے کتب خانوں کا ذکر کیا، مطالعہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی، تحریک خلافت کا ذکر کیا۔ انہوں نے مولانا محمد علی اور قائد اعظم محمد علی جناح کے تعلق سے بھی گفتگو کی۔

تقریب کے مہمان خصوصی شہر کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ خان صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ ندیم اقبال جو ان کے فرزند ہیں اور ادارہ فاران کلب کے

سیکریٹری بھی ہیں کے کسی پروگرام میں بطور مہمان خصوصی پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ انہوں نے کراچی کے قلب میں ایک شاندار لائبریری کے قیام پر منتظمین فاران کلب کو مبارک باد دی۔ انہوں نے کہا کہ فاران کلب نے کراچی میں ہونے والی دہشت گردی اور منفی حالات میں علم کے فروغ اور مطالعہ کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جو علمی قدم اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ نعمت اللہ خان صاحب نے کتب خانوں کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا کہ جب میں ناظم کراچی تھا تو کتب خانوں کے قیام اور ان کی بہتری کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ انہوں نے کہا کراچی میں قائم محمد علی سوسائٹی کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ یہ محمد علی بوگرا کے نام سے منسوب ہے لیکن جب میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ محمد علی سوسائیٹی مولانا محمد علی جوہر کے نام سے آباد کی گئی تھی۔ انہوں نے خالد دینا ہال کا ذکر بھی کیا جہاں پر مولانا محمد علی جوہر پر مقدمہ چلا تھا۔ انہوں نے کہا اس لائبریری کی کتابیں دو کنٹینروں میں سفر کر کے لندن سے کراچی ایسے وقت میں آئیں ہیں اور حاشر فاروقی نے ایسے حالات میں یہ تحفہ اہل کراچی کو دیا ہے جب کہ یہاں دہشت گردی کا دور دورہ ہے۔ یہ تو پر امن شہر رہا ہے، روشنیوں کا شہر، امن کا شہر، بھائی چارے کا شہر نہیں معلوم اسے کس کی نظر لگ گئی کہ یہاں پر دہشت گردی نے ڈیرے جما لیے ہیں۔ میرے خیال میں دہشت گردی کا بہترین جواب یہ لائبریری ہے۔کتاب ہی وہ بہترین تحفہ ہے جس کے ذریعہ دہشت گردوں کا مقابلہ

کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں دہشت گردی کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس لائبریری کی ایک ایک کتاب کراچی کے دہشت گردوں کا جواب ہے۔ یہ ایک ایسا تحفہ ہے جس کی ہم قدر کر سکتے ہیں ناقدری نہیں کر سکتے۔ یہ کراچی کے لوگوں کے لیے پاکستان کے لوگوں کے لیے بیش بہا قیمتی تحفہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نعمت اللہ خان صاحب نے خالد اسحاق مرحوم سے اپنے تعلق کا حوالہ بھی دیا۔ انہوں نے کہا کہ خالد اسحاق کتابوں سے بے پناہ عقیدت اور شوق رکھتے تھے۔ انہیں کتابوں سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ ان کی لائبریری پرائیویٹ لائبریریوں میں سب سے بڑی تھی۔ حاشر فاروقی صاحب نے ان کتابوں کو طویل سفر کراکے ہمیں بھیجا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری زندگی کتاب سے شروع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ تمہیں اس کتاب سے جسے قرآن کہتے ہیں روشنی ملے گی تمہیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ لاکھوں مسلمان اسے ہر روز پڑھتے ہیں انہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ثواب کی خاطر تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں اس کے معنی و مطلب بھی معلوم ہونے چاہیے۔ آج ہم دنیا میں ذلیل ہیں اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہمارا رویہ قرآن کے ساتھ مختلف ہوگیا ہے۔ نماز مغرب کے باعث تقریب اختتام کو پہنچی۔ مہمانوں کی تواضع چائے سے کی گئی اس طرح

(یہ پر وقار تقریب اختتام کو پہنچی۔ (8جون 2015

نواز شریف کا تیسرا دور، اسحاق ڈار کا تیسرا بجٹ

میاں محمد نواز شریف پاکستان کے وہ واحد سیاسی رہنما ہیں جو 2013 کے عام انتخابات
کے نتیجے میں تیسری بار ملک کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ پہلا دور یکم نومبر 1990
سے شروع ہوا جولائی میں غلام اسحاق خان نے انہیں جبری رخصت پر بھیج دیا
،دوسرے دور کا آغاز فروری 1997 سے ہوا 13 سال 7 ماہ اور 21 دن بعد 12
اکتوبر 1999 میں جنرل پرویز مشرف نے ان کی بِساط لپیٹ دی۔ تیسرا دور جون
2013 میں شروع ہوکر تیسرے سال میں داخل ہوچکا ہے۔ اس دوران بھی ایسے
حالات آکر گزر چکے ہیں کہ جب یہ احساس ہوچلا تھا کہ میاں صاحب اب گئے کے جب
گئے لیکن اللہ نے انہیں محفوظ رکھا۔ دھرنے اور انقلابوں کی تیز آندھی تیسری بار
چراغ گل کرنے کو تھی لیکن قسمت کی دیوی نے ساتھ دیا اور میاں صاحب اس آندھی
سے بچ نکلے۔ جمہوریت کا حسن تو یہی ہے کہ ہر ایک عوام کی طاقت سے آنے والا اپنا
مقررہ وقت پورا کرے، لیکن سیاست میں کوئی بھی چیز حتمی نہیں ہوتی، کب کیا
ہوجائے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ تھرڈ امپائر کسی بھی وقت ریڈ لائٹ جلا کر کھیل کی بساط
لپیٹ سکتا ہے خواہ وہ دیکھنے میں سیدھا سادھا، معصوم سا ضیاء الحق ہی کیوں نہ لگتا ہو۔

میاں صاحب کے تیسرے دور کا تیسرا بجٹ میاں صاحب کے محبوب وزیرِ خزانہ، سمدھی اور سینیٹر محمد اسحاق ڈار نے قومی اسمبلی میں پیش کر چکے۔ کسی نے کیا خوب لطیفہ تیار کیا ہے کہ 'اگر نواز شریف نے اعلیٰ عہدوں پر اپنے رشتہ دار تعینات کیے ہیں تو اس کی تعریف کی جانی چاہیے' ورنہ آج کے دور میں رشتہ داروں کو پوچھتا کون ہے'۔ بات تو درست ہے، عزیز رشتہ دار تو دور کی بات ہے خونی رشتوں میں خون سفید ہوگیا ہے۔ وزیرِ خزانہ کی تقریر دیکھی، سنی، اخبارات میں پڑھی اور اس پر اہل علم و دانش کے تبصرے و تجزیے بھی نظر سے گزرے۔میاں صاحب نے 1981 میں پنجاب کی حکومت کے وزیر خزانہ کے طور پر ہی اپنی سیاست کا آغاز کیا تھا۔ان کی اگلی منزل پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھی اور پھر یکے بعد دیگرے تیسری بار پاکستان کے وزیر اعظم کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ قبلہ اسحاق ڈار صاحب نے بھی وزیر خزانہ کا کافی تجربہ حاصل کر لیا ہے لیکن ان میں وہ صلاحیت دکھائی نہیں دے رہی کہ یہ بھی میاں صاحب کی طرح وزارتِ خزانہ سے وزارت اعظمیٰ کے مسند پر پہنچ سکیں۔ اول تو چھوٹے میاں صاحب اپنے بڑے بھائی کی پیروی کرتے ہوئے تخت لاہور کے بعد اپنا تخت اسلام آباد میں بچھانے کے خواہش مند ہوں گے۔ان کی موجودگی میں سمدھی صاحب نمبر دو ہی رہیں گے۔ قبلہ وزیر داخلہ بھی تو طاقت کا سرچشمہ دکھائی دیتے ہیں۔وہ بھی خوابوں کی جنت میں نظر آتے ہیں۔ کئی بار میاں صاحب کو خاموش پیغام دے چکے ہیں۔ تین تین ماہ میاں صاحب سے ملاقات نہیں کرتے، آخر کو ملک کی اہم ترین وارت

کو بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

بات بجٹ کی کرنا تھی کہاں سے کہاں نکل گئی۔ موجودہ دور حکومت کا یہ تیسرا بجٹ وزیر داخلہ ڈار صاحب نے پیش کردیا ہے۔ قومی اسمبلی میں اس پر بحث و مباحثہ کا آغاز ہوچکا ہے۔ قائد حزب اختلاف خورشید شاہ صاحب نے بجٹ پر طویل ترین تقریر کرکے سابقہ ریکارڈ توڑ دئے۔ اگر یہ بجٹ ان کی حکومت نے پیش کیا ہوتا تو یہ دنیا کا بہترین شاہکار ہوتا کیونکہ وہ اس وقت سندھ کے علاوہ حزب مخالف کا کردار ادا کررہے ہیں اس وجہ سے انہوں نے اس بجٹ میں سینکڑوں خامیاں اور کیڑے گنوادئے۔ ہماری سیاست میں حزب اختلاف نے اپنا کام اختلاف کرنا تصور کیا ہوا ہے، جب کے حزب اقتدار نے اپنے ہر عمل کو آسمانی صحیفہ تصور کرتے ہوئے اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کردینا ہے۔ جب پاکستان پیپلز پارٹی بجٹ پیش کرتی تھی تو نواز لیگ مگرمچھ کے آنسو بہایا کرتی تھی، شورشرابہ کرکے یہ دیکھانا ہوتا تھا کہ وہ حزب اختلاف میں ہے حالانکہ اس وقت وہ حکومت وقت سے اندرون خانہ ملے ہوئے تھے۔ ظاہر کچھ باطن کچھ تھا۔ اب صورت حال اس کے برعکس ہے اب پی پی ظاہری طور پر مگرمچھ کے آنسو بہارہی ہے، بجٹ کو دنیا کا خراب ترین بجٹ گردان رہی ہے حالانکہ اندر سے معاملا مختلف ہے۔ مخالفت کا اندازہ ہی بتا دیتا ہے کہ بناوٹی مخالفت ہے یا حقیقی۔ یہ نہیں کہ یہ بجٹ عوام دوست، عوام ہمدرد ہے یہ بھی سابقہ بجٹوں کی طرح ایک روایتی بجٹ

ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہر سال جون کا مہینہ غریب عوام کی جون بدل دیتا ہے۔ بجٹ خوف کی صورت میں ان پر پہاڑ بن کر گرتا ہے اور ان معصوموں کی کمر جھکا دیتا ہے۔

ہمارے سیاست دانوں کی پیدائشی تربیت اور تعلیم یہ ہے کہ اگر حکومت میں ہو تو سب اچھا اچھا کے گیت گانے کا نام سیاست ہے۔ اگر حکومت میں شامل نہیں ہوسکے، عوام نے اقتدار سے نکال باہر کیا تو اس صورت میں سب برا سب برا کی رٹ لگانا ہی سیاست ہے۔ کسی نے بہت درست کہا کہ بجٹ دراصل اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ہے۔ وزیر خزانہ خواہ کوئی بھی ہو اُسے بجٹ کی تیاری سے کیا لینا دینا، اُسے تو ہمارے بیوروکریٹ مسودہ تیار کرکے دیدیتے ہیں، وزیر موصوف رات بھر اُس کا رَٹا لگاتے ہیں صبح اسمبلی میں یا ٹی وی اسکرین پر ایسے بجٹ تقریر پڑھ رہے ہوتے ہیں کہ جیسے یہ اعداد و شمار اور یہ الفاظ اور یہ جملے خود ان ہی کے تخلیق کردہ ہوں، ماسوائے چند چیزیوں کے انہیں کچھ پتا نہیں ہوتا کہ بجٹ کیسے تیار ہوا۔ اس میں ان کا قصور بھی کیا ہے یہ تو ہماری سیاست کی روایت ہے۔ اقتدار میں آنے والی حکومتی پارٹی کا سربراہ خاص خاص حکومتی محکمے اپنے وفادار اور بہ اعتماد لوگوں کو سونپنے کی دھن میں رہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو محکمہ میں کسی شخص کے سپرد کررہا ہوں وہ اس کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے وزیر اعظم اپنے پاس کئی کئی محکمے بھی رکھے

رہتا ہے یا پھر کسی ایسے شخص کو جو اس کا قریبی اور بہ اعتماد ہو کو کئی کئی شعبے دے دیتا ہے اگر منتخب رکن اسمبلی نہ ملا تو کسی بھی بہ اعتماد شخص کو متعلقہ محکمہ کا مشیر بنا کر ذمہ داریاں اُسے سونپ دیتا ہے۔ میاں صاحب کے پاس بھی بعض محکمے رہے۔ وزیر دفاع کا قلم دان بہت بعد میں اپنے اعتمادیے خواجہ آصف جو پانی و بجلی کے وزیر تو تھے ہی کوئی دوسرا اعتمادیہ نہ ملا تو اہم وزارت ' دفاع ' کا قلم دان بھی انہیں سونپ دیا۔ ایک اور اعتمادیے پرویز رشید جو اطلاعات کا قلم دان رکھتے تھے انہیں قانون و انصاف ، ہیومن رائٹس کا اضافی قلم دان بھی دے دیا گیا، وزرارت خارجہ کے لیے کوئی بہ اعتماد کا رکن اسمبلی نظر نہیں آیا تو مشیر سے کام چلایا جارہا ہے۔ سرتاج عزیز جو کامرس میں پنجاب یونیورسٹی کے گریجویٹس ، ہاورڈ یونیورسٹی کے Development Economics ماسٹر ڈگری رکھتے ہیں کو اپنا مشیر برائے نیشنل سیکیوریٹی اور خارجہ امور کا قلم دان سونپ دیا گیا۔ سرتاج عزیز فائیناس کے آدمی ہیں ، ان کی ایکسپرٹیز معاشیات ہے انہیں بنانا ہی تھا تو وزارت خزانہ کا مشیر بنادیتے لیکن سمدھی کو چھوٹی موٹی وزارت تو دی نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی تو قریبی ہیں اور Chartered Accountant ہیں، سینئر ہیں۔ سابقہ ادوار میں بھی وزارتوں کا بوجھ اٹھا چکے ہیں۔ اہتماد کا آدمی ہے تو اُسے ایک سے زیادہ محکمے سپرد کردیے جاتے ہیں۔ ٹیلنٹ ، صلاحیت ، ملک و قوم کی بھلائی دوسرے نمبر، مقدم اعتماد کا ساتھی ہونا ہماری سیاست ہے۔ ملک میں کیسا کیسا

ٹیلنٹ، پڑھے لکھے، تجربہ کار، ھنر مند، بہ صلاحیت لوگ موجود ہیں ان سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچانا اس لیے گوارہ نہیں کہ ان کا ان کی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں ہوتا۔ ہم اس ٹیلنٹ کو یہ کہہ کر ذائع کردیتے ہیں کہ ان کا سیاست سے کیا تعلق، ٹیلنٹڈ، پڑھے لکھے شخص نے اپنی زندگی حصول علم میں صرف کی، اعلیٰ تعلیم حاصل کی اگر وہ سیاست کرتا تو اس کا ٹیلنٹ ضائع ہوجاتا، پڑھ لکھ کر اعلیٰ ڈگری حاصل کرکے اس نے نوکری ہی تو کرنی ہے۔ ہم اسے بیوکریٹ، سرکاری ملازم، پروفیسر، ڈاکٹر کہہ کر اس سے استفادہ کرنے کو اپنے شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کبھی کسی بھی جامعہ کا وائس چانسلر ریٹائر ہونے کے بعد کسی محکمہ کا سربراہ ہوا، کوئی ماہر اقتصادیات ریٹائر ہونے کے بعد کسی سیاسی جماعت میں کسی اہم عہدہ پر دکھائی دیا۔ ڈار صاحب کیونکہ سمدھی ہیں اس وجہ سے ان میں اقتصادیات کی بلندی ہے، مہارت ہے، جابک دستی
ہے تمام تر صلاحیتیں ان میں سربراہ حکومت کو نظر آتی ہیں۔

موجودہ بجٹ برائے سال 2015-16 کے اعداد و شمار کا تجزیہ تحریر کو طویل تر بنادیے گا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ اعداد و شمار ایک گورکھ دھندا ہے۔ ویسے بھی میں اقتصادیات کا ماہر نہیں اور بجٹ کے اعداد و شمار لکھ لکھ کر قاری پر روب ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا، نہ اس طرح اپنا دامن بچانا چاہتا ہوں۔ بجٹ کی جذیات میں جانے سے قارئین کے ذہن کو بوجھل کرنے کے سوا کچھ

حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کی موٹی موٹی باتوں کا ہی جائزہ لیا ہے۔ جو بات بہت صاف نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ یہ کوئی خاص بجٹ نہیں، سابقہ بجٹ کے اعداد و شمار کو الٹ پلٹ دیا گیا ہے۔ بجٹ تو وہ مثالی ہوتا ہے جو عوام دوست ہو، اس میں غریب عوام کو زیادہ سے زیادہ مراعات فراہم کی گئی ہوں۔ اشیائے خورد و نوش کے سستا ہونے کے عملی اقدامات کیے گئے ہوں۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں مہنگائی کی مناسبت سے اضافہ کیا گیا ہو، محنت کشوں، مزدوروں، غریبوں کے لیے ذریعہ معاش کے ذرائع پیدا کیے ہوں، عام کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں میں کمی کے اقدامات کیے گئے ہوں۔ جو حکومت بجٹ سے چند روز قبل پیٹرول کی قیمت بڑھا دے اور بجٹ میں کہے کہ ہم نے پیٹرلیم مصنوعات کی اشیاء کو سستا کرنے کے اقدامات کیے ہیں تو وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ بجٹ تقریر میں کہتے ہیں کہ ہائی اسپیڈ ڈیزل اور فرنس آئل پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا، گھی اور تیل پر ڈیوٹی یا پیک دودھ کی قیمت نہیں بڑھائی، موبائل فون کی قیمت میں کمی ہوئی، جب پیٹرول بڑھ گیا تو سب کچھ بڑھ گیا۔ یہ بات ہر خاص و عام جانتا ہے کہ پیٹرول کی قیمت بڑھنے کا مطلب
تمام چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔
گزشتہ سال کا بجٹ 39 کھرب کا تھا اسے وزیر خزانہ نے بڑھا کر 44 کھرب کے قریب کر دیا۔ یہ پانچ کھرب کہاں سے آئیں گے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے عوام پر اضافی

بوجھ نہیں ڈالا صرف عام دکاندار سے بڑے تاجر تک، دال سے لے کر عام اشیاء پر سو سو فیصد ٹیکس بڑھا دیا گیا۔ جن اشیاء پر ٹیکس عائد کیا گیا ان میں مشروبات، پیکٹ والا دھی، مکھن، پنیر، پیکٹ میں دستیاب دودھ، موبائل فون، سگریٹ، کاسمیٹکس شامل ہیں۔ مہنگائی نے ایک عام آدمی کو بری طرح متاثر کیا ہے، ہر کوئی اس بات سے باخوبی آگاہ ہے کہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے لیکن ہمارے وزیر خزانہ کو اس مہنگائی کے مقابلے میں سرکاری ملازمین اور پینشنرز کو صرف ساڑے سات فیصد اضافہ کافی لگا، یہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے، ہر کوئی اسے ایک مزاق گردان رہا ہے۔ حتیٰ کہ سینٹ کی قائمہ کمیٹی خزانہ، ریونیو، اقتصادی امور، شماریات اور نجکاری نے اپنے اجلاس میں جو سینٹر الیاس بلور کی زیر صدارت ہوا قائمہ کمیٹی نے سرکاری ملازین کی تنخوہوں میں دس فیصد اضافے کی شفارش کی ہے۔حکومت سندھ نے اتنا ضرور کیا کہ مرکز سے سبقت لے جاتے ہوئے دس فیصد اضافے کا اعلان کر دیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ وزیر اعظم صاحب بجٹ کے پاس ہونے تک سرکاری ملازمین اور پینشنرز کی تنخواہوں میں دس فیصد کا اعلان اپنے چھیتے وزیر خزانہ سے کرادیں گے۔

کھرب 25ارب روپے کے اس خسارے کے بجٹ میں 200ارب روپے سے زیادہ16 کے نئے ٹیکس عائد کئے گئے ہیں۔۔برآمدات کا ہدف 20.5ارب ڈالر رکھا گیا ہے۔ترقی کی شرح نمو 6فیصد رکھی ہے، ہم تو مقروض ملک ہیں ہماری شرح نمو 6کیا 5 بھی

زیادہ ہے۔ صحت کے لیے 11ارب 10کروڑ رکھے گئے ہیں، فلاح و بہبود کے لیے 5 ارب 10 کروڑ مختص کیے گئے ہیں، صنعتی ترقی کا ہدف 6.4 فیصد رکھا گیا ہے۔ ٹیکسٹائل کے لیے 64ارب روپے کا مالیاتی پیکج اور دیگر مراعات کا اعلان کیا گیا ہے۔ شمسی توانائی اور ہوا سے بجلی پیدا کرنے والی صنعتوں کو پانچ سال تک ٹیکس سے مکمل چھوٹ بجٹ کا حصہ ہے، سیمنٹ سستا کرنے کا اعلان ہے، ترقیاتی منصوبوں کے لیے 1514ارب روپے رکھے گئے ہیں، تعلیم و صحت کے لیے صرف 97ارب روپے مختص کیے گئے ہیں، سب سے اہم دفائی اخراجات کے لیے 80ارب روپے مختص کیے گئے ہیں، جو گزشتہ سالوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں ، تعلیم و صحت پر بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ نہ کرنا حکمرانوں کی سوچ کس جانب ہے اس کا پتہ دے رہی ہے۔ خیبر پختون خواہ میں 2018تک لگائے جانے والے صنعتی یونٹو کو پانچ سال ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے، کراچی پر اپنی عنایتیں کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے 16ارب روپے کی لاگت سے گرین لائن بس منصوبے کا اعلان کیا ہے۔ یہ گرین بس سروس پہلے بھی شروع کی گئی تھی جو کہ بری طرح ناکام ہوئی۔ ایک اچھی بات جو بجٹ میں نظر آئی وہ یہ کہ سرکاری محکموں میں پی ایچ ڈی ڈگری کے حامل ملازمین کو 10ہزار روپے ماہانہ کا الاؤنس دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے تو دوسری جانب ریٹائر ہوجانے والے پی ایچ ڈی ڈگری کے حامل اساتذہ سے یہ سہولت واپس لے لینا نہ انصافی اور غیر اخلاقی ہے۔ عزت و اعزاز دے کر واپس لے لینا کسی بھی طور مناسب نہیں ۔ اس سہولت کو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جاری رہنا

چاہیے۔کسانوں کے لیے قرضہ، بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام، بیت المال کے بجٹ میں اضافہ اچھا اقدام ہے۔

بجٹ میں مختلف شعبہ جات میں رقم کے ردوبدل کر دینے سے ملک ترقی نہیں کرتا۔ بلکہ بجٹ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ حکومت کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں، حکومت اپنے اخراجات کیسے پورے کرے گی، کرپشن کا خاتمہ کیسے کیا جائے گا، تعلیم و صحت کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دفاع پر توجہ دینا اہم ہے خاص طور پر جب کہ ہمارا پڑوسی ملک ہمارا دشمن نمبر ایک ہے۔ ایٹمی طاقت ہونے کے بعد اس بات کے امکانات بہت کم ہوگئے ہیں کہ اب مستقبل میں دونوں ممالک کسی بھی جنگ میں گودیں، کوئی بھی حکمراں ایسی غلطی ہرگز نہیں کرے گا۔ چنانچہ اب اس طرف سے توجہ تعلیم اور صحت پر مرکوز کرنا بہت ضروری ہے۔ تعلیم کو اہمیت نہ دینا ہماری ایسی غلطی ہے کہ جس کا تدارک ہم صدیوں نہیں کرسکیں گے۔ ہمارے ملک میں بے شمار مسائل تعلیم پر خاطر خواہ توجہ نہ دینے کے باعث جنم لے رہے ہیں، ہماری ترقی کا دارومدار بھی تعلیمی اصلاحات پر ہے۔ لیکن ہم تعلیم کو اپنی ترجیحات میں رکھ ہی نہیں رہے، ہماری ترجیحات کچھ اور ہیں جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بجٹ میں تعلیم و صحت کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھا جائے۔ تب ہی ہم حقیقی معنوں میں ترقی کرسکیں گے۔ (15جون 2015)

روزہ اور ذیابیطس (شوگر) کے مریض

رمضان المبارک ایک بابرکت اور فضیلت والا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا اور امت پر روزے فرض کیے گئے۔ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل) کو الگ الگ کرنے والا ہے، تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے"۔اس مبارک مہینے میں ہمیں قرآن مجید جیسی عظیم کتاب ملی جو ہمارا دستور حیات ہے، ہمارا رہنما ہے اور ضابطۂ زندگی ہے۔ یہ وہ مقدس مہینہ ہے جس میں پروردگار عالم نے روزے فرض کیے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی امتوں پر بھی روزوں کا حکم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر روزوں کا حکم دیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (سورۃ البقرہ، آیت ۱۸۳)، ترجمہ " اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی کی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا ہو"۔

ارکانِ اسلام میں روزہ کوایک اہم رکن کی حیثیت حاصل ہے۔اس کے فرض کرنے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ نے تقویٰ، پرہیز گاری، ضبط نفس ، صبر و برداشت قرار دیا ہے۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کو برائیوں، غلط کاموں، شیطانی خواہشات سے دور رکھتی ہے اور انسان کو نیک عمل کرنے کی جانب مائل کرتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں روزہ کو ''صبر'' قرار دیا ہے۔ روزہ انسان میں صبر ، برداشت، ثابت قدمی، اور استقلال پیدا کرتا ہے۔ حدیث مبارکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ '' جب رمضان آتا ہے توجنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں'' (صحیح بخاری ، صحیح مسلم)۔روزہ دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں ، یہ توکچھ پابندیوں کے ساتھ روزہ کی ظاہری علامت ہے۔ روزہ کا بنیادی مقصد انسانی نفس کو کنٹرول میں رکھنے کی ترغیب دینا ہے اور اس کے ذریعہ روحانی اور اخلاقی تربیت مقصود ہے۔ رمضان المبارک کو صبر کا مہینہ یعنی شہر الصبر قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہمیں صبر ، برداشت اور درگزر کا درس دیتا ہے۔ اس مبارک مہینے کو جو کوئی بھی پائے اس کے فیوض و برکات کو حاصل کرنے کا موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہ دے۔ معمولی معمولی نوعیت کی بیماریوں کو وجہ نہ بنائیں کہ ہم روزہ نہیں رکھ سکتے

نہیں معلوم آئندہ زندگی میں ہمیں یہ مہینہ نصیب بھی ہوسکے یا نہیں۔

رمضان المبارک کی آمد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ شعبان کی آخری تاریخ میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے جو بہت بڑا مہینہ ہے، بہت مبارک ہے، اس مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ الٰی میں کھڑے ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا) قرب حاصل کرنے کے لیے غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا، اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینہ میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے

گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایااللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسّی پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلادے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے۔ (اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) جو آدمی اس مہینہ میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف و کمی کردے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا، اور اسے دوزخ سے رہائی اور آزادی دے گا"۔ (شعب الایمان للبیہقی، معارف الحدیث

ذیابطیس (شوگر) کے مریض اور رمضان المبارک

ذیابطیس (شوگر) کا مرض اب عام ہوچکا ہے۔ دنیا میں اس مرض میں مبتلا لوگوں کی تعداد تقریباً 371 ملین سے زائد ہے۔ ان میں سے پاکستان میں اس مرض میں مبتلا

افراد کی تعداد 70 لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ مرض خواہ کوئی بھی ہو مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مرض کے بارے میں جس میں وہ مبتلا ہوچکا ہے آگاہی حاصل کرے۔ سارے ہی مرض تکلیف دہ ہیں لیکن ذیابیطس یا شوگر کا مرض مریض کو دیمک کی طرح خاموشی سے، آہستگی سے اس طرح متاثر کرتا ہے کہ مریض صرف ذیابیطس شوگر) کا مریض ہی نہیں رہتا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ کئی دیگر امراض میں بھی مبتلا) ہوجاتا ہے جس میں آنکھوں کا متاثر ہونا، دل کی تکلیف ہوجانا، ٹانگوں میں مسلسل درد رہنا، پیر یا انگلیوں میں ہوجانے والے زخموں کے باعث انگلی حتیٰ کہ پیر اور ٹانگ کا کاٹ دیا جانا، گردوں کا متاثر ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام خطرناک باتوں کے باوجود ذیابیطس (شوگر) کے مریض اگر اپنے مرض کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرلیں تو ان تمام خطرناک قسم کی پیچیدگیوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ مختلف اداروں کے زیر اہتمام ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کو آگاہی کے مختلف پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں، مختلف تنظیمیں اس حوالے سے کتابیں اور کتابچے بھی شائع کرتے ہیں

۔پروگراموں میں شرکت کرکے اور کتابچے حاصل کرکے ہم اس مرض کی پیچیدگیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاؤیونیورسٹی کے تحت ایک قائم ہے، نیشنل ایسوسی ایشن آف ذیابیطس اینڈ ایجوکیٹر آف پاکستانNIDE ادارہ بھی کام کررہا ہے، اس ادارے نے ’برائٹ‘ کے نام سے ایک رہنما کتابچہ بھی (NEDP) تیار کیا ہے، اس کے علاوہ میر خلیل الرحمٰن سوسائٹی، پاکستان اینڈو

کرائن سوسائیٹی، لیاقت نیشنل ہسپتال بھی سرگرم عمل ہے۔اکثر ماہرین ڈاکٹرز نے ذیابیطس (شوگر) کی رہنمائی کے لیے کتابچے بھی تحریر کیے ہیں جیسے پروفیسر ڈاکٹر عیص محمد نے حِفظانِ صحت اور مُہلک امراض سے بچنے کے ابدی اصول' کے عنوان سے کتابچہ تحریر کیا جو ایک اچھی کوشش ہے۔

ہمارا موضوع 'روزہ اور ذیابیطس (شوگر) کے مریض' ہے۔ روزہ کی اہمیت سمجھ جانے کے بعد اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا ذیابیطس (شوگر) کے مریض رمضان المبارک کے مقدس و متبرک مہینے میں روزہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس مرض میں مبتلا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ذیابیطس (شوگر) کا مریض روزے نہیں رکھ سکتا۔ حالانکہ ذیابیطس (شوگر) کا مریض بہت آرام کے ساتھ، بلا خوف و خطر اس فرضی عبادت کے حصول کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ کم علمی اور خوف کے باعث اپنے آپ کو ہرگز ہرگز اس سعادت سے محروم نہ کرے۔ بس ان باتوں پر اچھی طرح توجہ اور عمل کرے جو ڈاکٹر ہدایت کریں۔ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ذیابیطس (شوگر) کا مرض کیا ہے؟ اس کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات پر تمام ڈاکٹرز متفق ہیں کہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض روزہ رکھ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ماہرین نے کچھ احتیاطی تدابیر اور کچھ ہدایات بیان کی ہیں جن پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ذیابیطس (شوگر) کے مریض روزہ

رکھ سکتے ہیں۔پہلی بات جو ماہرین کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کے بعد روزہ رکھیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا ڈاکٹر پہلے تو یہ معلوم کرے گا کہ آپ کو کس ٹائپ کی شوگر ہے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ذیابیطس (شوگر) کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ان تین اقسام سے پہلے ایک مرحلہ یا ہوتا ہے۔اس اسٹیج کوPre-Diabeties ا سٹیج ذیابیطس (شوگر) سے پہلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس مرحلہ میں Impairedglucose tolerance شوگرلیول نارمل سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ ابھی ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کی صف میں داخل نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کے لیے خطرے کا نشان ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔ اس اسٹیج میں مریض کو پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں اسے چاہیے کہ وہ کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور اپنے شوگر لیول کو دوا کے بجائے خوراک یعنی پرہیز اور ورزش کے ذریعہ کنٹرول کر لے۔

ذیابیطس (شوگر) کی پہلی قسم کو ٹائپ 1 ذیابیطس (شوگر) کہتے ہیں۔جس میں انسان کا لبلبہ بہت کم انسولین پیدا کرتا ہے یا بالکل ہی نہیں کرتا۔عام طور پر ٹائپ 1 کے مریضوں کی عمر 20 سال کے اندر اندر بتائی گئیں ہیں۔بچے یا جوان، ماہرین نے اس قسم کے مریضوں میں ذیابیطس (شوگر) کو موروثی geneticقرار دیا

ہے۔ جن لوگوں کو ٹائپ 1 ذیابیطس (شوگر) ہوتی ہے یہ ان کی زندگی کی ساتھی کے طور پر ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس قسم کی ذیابیطس (شوگر) کے مریض دوا میں انسولین کا استعمال کرتے ہیں ، غذا، پرھیز وار ورزش پر خاص توجہ دیتے ہیں۔اس قسم کے مریض Insulin - dependent diabetes (IDDM) ذیابیطس (شوگر) کی ہوتے ہیں۔ ٹائپ 2 عام طور پر ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا وزن زیادہ ہوتا ہے، خوش خوراک ہوتے ہیں، ان کا کام دن دن بھر بیٹھے رہنا ہوتا ہے، ورزش بالکل نہیں کرتے، عموماً بڑی عمر کے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں لیکن اب یہ موروثی genetic بھی ہوتی ہے، بچوں میں بھی اس قسم کو دیکھا گیا ہے۔ تقریباً 90 فیصد ذیابیطس (شوگر) کے مریض ٹائپ 2 ہی کے ہوتے ہیں۔ یہ Non-Insulin dependent diabeties (NIDDM) مریض کہلاتے ہیں۔ ٹائپ 3 وقتی طور پر حاملہ خواتین کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ان کے جسم میں ہونے والی غیر معمولی محرکات ہوتے ہیں۔ یہ عارضی طور پر ہوتی ہے جوں ہی خواتین اس عمل سے فارغ ہوتی ہیں ان کا شوگر لیول خود بخود اصل حالت پر آجاتا ہے۔

ڈاکٹر شکیل احمد نے شدت کے اعتبار سے ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کو چار گروپس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان گروپس میں 'کم ترین شدت والے مریض'، 'درمیانی شدت والے مریض'، 'زیادہ شدت والے مریض' اور' انتہایہ شدت والے مریض'۔ ٹائپ 1 کے مریض کم ترین شدت کے گروپس میں آتے ہیں، ایسے مریضوں کی تعداد زیادہ ہوتی

ہے۔ ان مریضوں کی شوگر کنٹرول میں رہتی ہے، چاہے وہ خوراک وپرہیز، دوا اور ورزش سے کنٹرول کرتے ہوں، ٹائپ 3 جن میں حاملہ خواتین ہوتی ہیں وہ بھی اسی گروپس میں شمار کی جاتی ہیں۔ٹائپ 2 درمیانی شدت والے مریض ہوتے ہیں جن کی شوگر فوری معلوم ہوئی ہو اور ان کی شوگر کنٹرول میں نہ ہو، اس ٹائپ اور گروپس میں وہ مریض بھی شامل ہوتے ہیں جو انسولین کا استعمال کرتے ہیں۔انسولین استعمال کرنے والے اس بات کو یقینی بنائیں کہ انہیں سحری اور افطار میں کتنی انسولین لینا ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر انسولین کے ڈوز کو خود سے کم یا زیادہ نہ کرے۔

ہمارے جسم کو تندرست و توانا رکھنے اور زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے ہمیں جس ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے اسے شوگر (glucose) کہا جاتا ہے۔ یہ کھانوں میں جیسے روٹی، ڈبل روٹی، پاستا، چاول، آلو، پھلوں اور سبزیوں سے حاصل ہوتا ہے۔جو ہمارے جگر اور پٹھوں کو مضبوط اور کام کے قابل بناتا ہے۔ شوگر کے استعمال کے لیے ہمارے جسم کو انسولین کی ضرورت ہوتی ہے ۔انسولین انسانی جسم میں شوگر لیول کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔ انسولین ایک ہارمون ہے جو ایک گلینڈ ' لبلبہ ' سے خارج ہوتی ہے ۔ لبلبہ کے غیر فعال ہوجانے کی وجہ سے انسولین کا اخراج کم یا ختم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے انسانی جسم میں شوگر زیادہ ہوجاتی ہے۔

روزہ فرض عبادت ہے اور ہر مسلمان کی خواہش ہوتی کہ وہ اس فرض عبادت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دے، روزے کی برکتیں اور رحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ روزہ ترک کرنے کا خیال ہی مسلمان کو پریشان کر دیتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵ میں ارشاد فرمایا'' تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے''۔ اب ہم اللہ کے حکم پر عمل نہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی اس فرض عبادت کے حصول کو ہر صورت ممکن بنائیں۔ اس مرض میں مبتلا کچھ مریض اگر یہ تصور کرتے ہیں کہ روزہ رکھنے سے ان کی زندگی کو خطرہ لائق ہو سکتا ہے تو وہ غلط فہمی، یا لاعلمی کا شکار ہیں۔ ماہرین ڈاکٹر ذیابیطس (شوگر) کہ کہنا ہے کہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض بھی روزہ رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں اور ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ہدایات اور مشورہ پر سختی سے عمل کریں۔ ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر ہر گز ہر گز روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ عام طور پر ذیابیطس شوگر) کے مریضوں کی شوگر کنٹرول میں چل رہی ہوتی ہے تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ) اب ڈاکٹر سے مشورہ کی ضرورت نہیں اور بے خوف وخطر ہو کر روزہ رکھنا شروع کر دیتے ہیں ساتھ ہی بدپرہیزی بھی شروع کر دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو صرف شوگر لیول کا ہی خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا

بلکہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو ایک خاص مقدار میں پانی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔اگر مریض پانی کی مطلوبہ مقدار نہیں پیئے گا تو اس کے گردے متاثر ہوں گے ۔ اسی طرح اگر ذیابیطس (شوگر) کا مریض دل کا بھی مریض ہے تو اسے بھی خاص طور پر گرمی کے موسم کے روزوں میں اپنے خون کو ایک خاص حد تک پتلا رکھنے کی ضرورت ہوگی ۔ جو دوائیں وہ اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہو انہیں جاری رکھے۔ ایسی خوراک کا استعمال نہ کرے جو خون کو گاڑھا کرتی ہیں۔زیادہ گھی یا تیل اور تلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کرے۔

ذیابیطس (شوگر) کے مریض کا شوگر لیول کنٹرول میں ہے اس نے اپنے ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرلیا جس نے اچھی طرح چیک اپ کرکے یہ مشورہ دیا کہ آپ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ذیابیطس (شوگر) کا وہ مریض پرہیز کو بالائے طاق رکھ دے اور سحری میں بدپرہیزی اور افطار میں ڈھیر ساری کھجوریں، شکروالی پھلوں کی چاٹ، شربت ، مٹھائی، تلے ہوئے سمو اور رول الغرض خوب جی بھر کر بدپرہیزی کرے۔ ایسی صورت میں وہ چند روزے ہی رکھ پائے گا اور اس کے بعد اس کا شوگر لیول آسمان سے باتیں کرنے لگے گا۔ اس لیے ڈاکٹر کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے، کھانے پینے میں احتیاط کرے۔ شربت اگر پینا ہے تو اب شوگر فری شربت بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں اس کا استعمال کیا جائے، تلی ہوئی اشیاء سے گریز کیا جائے ، بغیر شکر والی چاٹ

کا استعمال کیا جائے، احتیاط اور اعتدال کو اپناتے ہوئے بیچ بیچ میں شوگر لیول کو چیک کرتے رہیں، اگر آپ عشاء کی نماز اور تراویح بھی پڑھتے ہوں تو اس صورت میں ورزش کی ضرورت نہیں۔ عشاء کی نماز اور تراویح شوگر کے مریضوں کے لیے کافی ورزش ہے۔ اگر کسی وجہ سے تراویح نہیں پڑھ سکتے تو اس صورت میں ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ورزش بھی جاری رکھیں۔ عام دنوں میں ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو عام طور پر ہفتے میں پانچ بار روزانہ تیس منٹ خالی پیٹ ورزش کرنے کی تجویز دی جاتی ہے۔

کا استعمال کیا (olive oil) سحری میں پراٹھے سے گریز کریں، ممکن ہو تو اولو آئل جائے۔ سادہ روٹی پر اولو آئل لگا لیا جاے، بعض لوگ سحری میں ناشتہ کے طور پر ڈبل روٹی کا استعمال کرتے ہیں، ذیابیطس (شوگر) کے مریض جنہیں روزہ رکھنے کی اجازت ان کے ڈاکٹر نے دے دی ہو سحری میں سادہ غذا کا استعمال کریں نیز کم نہ کھائیں، پیٹ بھر کر کھائیں تاکہ پورا دن آرام سے گزر جائے۔ پانی جتنا پی سکتے ہوں پی لیں۔ سحری کرکے فوری بعد سونے سے گریز کریں، کیوں کہ آپ نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے اگر آپ فوری سو گئے تو طبیعت خراب ہونے کا ڈر ہے۔ فجر کی نماز پڑھیں، کچھ دیر تلاوت کلام پاک کریں، تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد سو جائیں۔ افطار میں بھوکوں اور پیاسوں کی طرح سب کچھ چھوڑ کر پانی یا شربت پینا نہ شروع کریں بلکہ بہت آہستہ آہستہ کرکے پانی یا شوگر فری شربت

پئیں۔ دیگر اشیاء بھی آرام آرام سے تھوڑی کھائیں چاہیے نماز مغرب یا نماز عشاء کے بعد بھی کچھ کھالیں۔ افطار میں بھی مرغن اشیاء سے پرہیز کریں۔ روزہ دار ذیابیطس شوگر) کا مریض جس کو ڈاکٹر نے روزہ رکھنے کی اجازت دی افطار میں صرف ایک) کھجور ہی کھائے کیونکہ یہ بہت میٹھی ہوتی ہے۔ افطار میں تربوز بھی کم مقدار میں کھا سکتا ہے۔ درمیانے سائز کے صرف چار ٹکڑے کافی ہوں گے۔ پروفیسر ڈاکٹر عیص محمد نے اپنے کتابچے 'حفظانِ صحت اور مُہلک امراض سے بچنے کے ابدی اصول' میں ذیابیطس شوگر) کے مریضوں کے لیے خوراک کے متعلق جو ہدایات درج کی ہیں ان کے اس کے) مطابق :

پھل جو نہ لیں :

☆آم، انگور، کیلا، گرما، شکر قندی، جاپانی پھل، انجیر اور کھجور میں کافی شوگر ہوتی ہے ۔گنا، گنے کا رس، گنڈیریاں بھی نہ لیں۔

کھانے کی اشیاء جو نہ لیں :

☆سری پائے، کلیجی، مغز، گردے، گوشت (گائیں، بھینس، اونٹ) مٹھائیاں، سوڈے کی بوتل لی جا سکتی ہے۔ چینی چائے کے Dietبوتلیں، اگر بلڈ پریشر نہ ہو تو سوڈے کی ڈائیٹ چھوٹے چمچے کے برابر) لے سکتے ہیں، اب تو کینڈریل اور دیگر شوگر کے مریضوں کے لیے دستیاب ہیں ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسکوش یا شربت (اب

شوگر فری شربت دستیاب ہیں) نہ لیں، شہد کا ایک چھوٹا چمچہ لے سکتے ہیں، جام،
مارملیڈ، پراٹھے، حلوہ پوری، مربہ نہ لیں، سن فلاور، اولو آئل یا مکئی کا تیل استعمال
کریں، وہ بھی زیادہ نہ ہو، چپاتی ہلکی ہو، جام مارملیڈ یا مٹھائی اور بسکٹ اگر ڈائٹ بغیر
چینی کے ہوں تو معتدل مقدار میں لے سکتے ہیں۔

: پھل جو لے سکتے ہیں

سیب، آڑو، جامن، کنو، مالٹا، موسمی، فالسہ، بیر

: سبزیاں جو لے سکتے ہیں

☆ بھنڈی، ٹینڈ، کریلا، بند گوبی، گیا کدو، گھیا توری، پیاز، لہسن، ادرک، ترئی، کھیرا،
سلاد، مٹر، گاجر، مولی، شلجم، گوبھی، ساگ، پالک، بھی لے سکتے ہیں۔ ٹماٹر، شملہ مرچ
زیادہ ہے تو پھر ٹماٹر، ساگ، پالک Uric Acid بھی لے سکتے ہیں۔ تاہم اگر خون میں
کافی، چائے، سوڈے کی بوتلیں اور کلیجی نہ لیں۔ ۔

☆ دال، مونگ، مسور، (چنے کی دال درمیانی مقدار میں) لے سکتے ہیں۔

☆ اگر بلڈ پریشر نہ ہو تو کبھی کبھی سموسہ، پکوڑے، نمکین بسکٹ بھی لے سکتے ہیں۔

گولیاں Candrel گولیا یا Sweeto یا Sweetex ☆ ذائقہ میٹھا کرنے کے لیے
استعمال

پاؤڈر یا گولیا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔Sucral کریں۔
☆ ذائقہ نمکین کرنے کے لیے سالن میں تھوڑا لیمو یا سرکہ ڈال لیا کریں، تاہم اگر بلڈ پریشر نارمل ہے تو پھر نمک کے پرہیز کی ضرورت نہیں۔
☆ خشک میوہ جات میں چار یا پانچ دانے بادام، دو یا تین اخروٹ ہفتے میں دو یا تین بار لے سکتے ہیں، تاہم یہ لینے ضروری نہیں، اگر عادت ہے تو لے سکتے ہیں۔
☆ ذیابیطس کے مریض کو میٹھے بسکٹ یا چینی جیب میں رکھنی چاہیے تاکہ اگر کسی وقت شوگر کم ہو جائے تو یہ فوری لے لیں۔
☆ ذیابیطس کے مریض کو اپنی جیب میں ایک کارڈ یا کاغذ رکھنا چاہیے جس پر لکھا ہو کہ مَیں ذیابیطس کا مریض ہوں، اگر میں بے ہوش ہوجاؤں تو مجھے نزدیکی اسپتال میں لے جائیں"۔ ذیابیطس کے مریضوں کو تنگ جوتے اور تنگ جرابیں نہیں پہننی چاہئیں۔ لیکن آرام دہ بند جوتا کا استعمال مناسب ہے۔

روزوں کے دوران شوگر لیول کتنا ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اے ایچ عامر کے مطابق روزے میں سحری سے پہلے (فاسٹنگ) 80 سے 110، سحری کے دو گھنٹے بعد (رینڈم) 140 سے 200 تک، 12 بجے کے قریب 120 سے 180 تک اور افطار سے پہلے 80 سے لے کر 120 تک شوگر لیول مناسب قرار دیا ہے۔ ذیابیطس (شوگر) والا روزہ دار اسی ترتیب سے اپنا شوگر لیول چیک بھی کرے، شوگر لیول چیک کرنے سے روزہ نہیں

ٹوٹتا۔ یعنی سحری میں، سحری کے دو گھنٹے بعد، دن میں 12 بجے، افطار سے پہلے۔ اگر کسی بھی وقت روزہ دار کو احساس ہو کہ اس کی طبیعت میں کچھ غیر معمولی کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اسے چاہیے کہ سب سے پہلے اپنا شوگر لیول چیک کرے اگر شوگر لیول کم ہو گیا ہے یا بڑھ گیا ہے تو فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس جائے، اگر ڈاکٹر اسے روزہ توڑنے کے لیے کہے اس کی وجہ اس کا شوگر لیول بہت کم ہونا ہی ہوگا تو اس صورت میں روزہ دار کو جو ذیابیطس (شوگر) کا مریض ہے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق روزہ توڑ دینا چاہیے۔ اس کی وجہ اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ زندگی کو بچانے کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔
ذیابیطس (شوگر) کے ایسے مریض جو انسولین استعمال کرتے ہیں وہ بھی روزہ رکھ سکتے ہیں لیکن انہیں دیگر ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کرنا ہوگی۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے مطابق اگر تو مریض باقاعدگی کے ساتھ انسولین کا استعمال اور شوگر کنٹرول میں ہے تو یہBasalinsulin کرتا ہے خاص طور پر جدید قسم کی مریض ممکنہ طور پر روزہ رکھ سکتے ہیں لیکن اگر ایسے مریض کی شوگر کنٹرول میں نہیں انسولین استعمال کر رہا ہے اور اچانک اس کی شوگر بہت زیادہ بڑھR اورN اور روایتی جاتی ہے یا بہت زیادہ کم ہو جاتی ہے تو ڈاکٹر روزہ نہ رکھنے کی ہی تجویز دے گا۔ گویا ایسے مریض جو انسولین لے رہے ہوں اور شوگر لیول کنٹرول میں نہ ہو انہیں روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر

کنٹرول میں ہو تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہوئے روزہ رکھنا چاہیے۔اسی قسم کی ہدایت حاملہ خواتین کے لیے بھی ہے جنہیں وقتی طور پر ذیابیطس (شوگر) ہو گئی ہو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق روزہ رکھ سکتی ہیں۔

ذیابیطس (شوگر) کا مریض جو روزہ رکھنے جارہا ہوتا ہے اپنی تمام دوائیں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سحری اور افطار یا اس کے بعد پابندی سے لے۔اپنے طور پر یا کسی کے بتائے ہوئے ٹوٹکوں کا استعمال ہر گز نہ کرے۔اگر آپ چاہتے ہیں کے رمضان المبارک کے مقدس ومتبرک مہینہ کی فیوض و برکات سے آپ بھی فیضیاب ہوں، روزہ رکھیں، عبادت کریں تو اس کی مناسب صورت یہی ہے کہ ذیابیطس (شوگر) کا مریض ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور اس کی ہدایات پر سختی سے عمل کرے اس طرح وہ بہ آسانی روزہ رکھ سکے گا اور دیگر لوگوں کی طرح رمضان کے روزں کا ثواب و برکت سے بہرہ مند ہوگا۔ (

182015 جون)

نریندر مودی کی پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی

بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی بڑے ملک کے انتظامی سربراہ بن جانے کے باوجود سنجیدگی ،بردباری پر یقین نہیں رکھتے اور پاکستان دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جب تک وہ کسی ایک صوبے کے سربراہ اور ہندو تنگ نظر اور متعصب گروہ کے سرغنا تھے اس وقت تک تو ان کی تنگ نظری، پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اپنی اگلی منزل پر پہنچنے کے لیے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کو اپنی سیاست کا محور سمجھتے تھے۔ لیکن اب جب کہ انہوں نے اپنے مقاصد حاصل کر لیے، وہ دنیا کی ایک بڑی جمہوری ریاست کے پردھان منتری بن چکے انہیں گھٹیا اور نچلی سطح کی سوچ سے اپنے آپ کو باہر نکال کر بردبار، سنجیدہ اور عالمی سطح کے لیڈر کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی گھناؤنی سیاست کو خیر باد کہہ دیں۔ خود بھی دیش بھگت بنیں اور اپنے ہمسائیوں کو بھی محب وطن سمجھیں۔

نریندر مودی نے بھارت کی سیاسی کمان سنبھالی اور وزیر اعظم کے منصب پر براجمان ہوئے تو پاکستان کے سنجیدہ طبقے کو ہوشیار ہوجانا ہی تھا کیونکہ مودی کا سیاسی ماضی پاکستان اور مسلمانوں کے حوالے سے مثبت کبھی نہیں رہا

انھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں مسلمانوں کی توہین و تحقیر کی ، پاکستان کو اپنا دشمن سمجھا اور اپنے مخصوص طبقے کو پاکستان کے خلاف بڑھاکاتے اور اکساتے رہے ہیں۔ جب تک وہ وزیراعظم کے منصب پر فائز نہیں ہوئے تھے اس وقت تک تو ان کی ہرزہ سرائی کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں تھی لیکن اب جب کہ وہ اہم منصب پر براجمان ہو چکے ہیں ان کی باتوں کو سنجیدگی سے لینا لازمی ہے۔ ان کی باتوں کو ایک عام سیاست دان کی باتیں سمجھ کر، ایک متعصب سیاست داں تصور کرکے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اب وہ جو کچھ بھی کہتے اور بیان دیتے ہیں اُسے اس ملک کی پالیسی ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھارت کی پالیسی کی کیا بات ہے؟ اس نے پہلے دن سے ہی پاکستان کو ایک علیحدہ آزاد ریاست تسلیم ہی نہیں کیا۔ اب اگر وہ اس بات کا اعلان بانگِ دھل کر رہے ہیں کہ انھوں نے بنگلہ دیش بنوایا تو یہ کوئی نئی بات یا کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ۔ پاکستان کے عوام بخوبی آگاہ ہیں ، سمجھتے بوجھتے ہیں کہ ہمارا پڑوسی، ہمارا دشمن نمبر ایک ہے، بنگلہ دیش کے عوام تو دیش بھگت تھے وہ کسی بھی طور پاکستان سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ غلطیاں ہماری اپنی تھیں، جن کا فائدہ ہمارے دشمن نے اٹھایا اور ہمارے بھائیوں کو ہم سے جدا کردیا، جو آج بنگلہ دیش کی صورت میں دنیاکے سامنے ہے۔ پاکستان کے دشمن اس بات پر بہت خوش اور شادماں ہیں اور ہونا بھی چاہیے،.برسوں کی محنت رنگ لے آئی۔ لیکن ہمارے دشمن یہ بات بھول جاتے ہیں کہ فرمان رسول ﷺ ہے کہ سارے مسلمان بھائی

بھائی ہیں ، اس میں جغرافیائی حدود بے معنی ہیں۔ مسلمان بنگلہ دیش کے ہوں، پاکستان کے ہوں، سعودی عرب کے ہوں،.برما سیلون ، ہندوستان کے ہوں ان کے اس تعلق اور رشتہ کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ یاد رکھو دشمنوں ! تمہارے ملک میں جو مسلمان آباد ہیں ان سے ہمارا ایک روحانی رشتہ ہے وہ بھی ہمارے بھائی ہیں ، تم سے ان کا رشتہ بھائی بھائی کا ہر گز نہیں ہو سکتا، ہاں وہ تمہارے ہم وطن ہیں، ان کا اور تمہارا ملک ایک ہے۔ لیکن تم غیر مسلم ہو اور وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

بات نریندر مودی کی ہرزہ سرائی کی شروع کی تھی جو انہوں نے سابقہ دنوں میں بنگلہ دیش اور چین کے دورے کے دوران کی ، یہی کیا وہ تو کوئی لمحہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کہ جب بھی پاکستان کا ذکر آتا ہے پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کرکے ہی ان کا کھانا ہضم ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انہیں بد ہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ادھر ہمارے پردھان منتری قبلہ نواز شریف کو دیکھئے کہ اپنی تقریب حلف.برداری کی تقریب میں مودی کو دعوت دے ڈالی جو انہوں نے کھڑاک سے رد کر دی۔ خیر اپنی اپنی سوچ ہے۔ میاں صاحب نے سوچا ہوگا کہ اس خوشی کے موقع پر مودو کو دعوت دیدی جائے شاید وہ اسے ایک اچھا عمل تصور کرتے ہوئے قبول کر لے ، اس طرح دونوں ہمسایوں کے مابین اچھی فضاء قائم ہو سکے لیکن میاں صاحب کی سوچ کے کسی حصہ میں یہ بھی رہا ہوگا کہ مودی جو

مسلمانوں اور پاکستان کا کھلا دشمن رہا ہے ان کی دعوت کو قبول نہیں کرے گا اس طرح میاں صاحب مستقبل میں یہ کہہ سکیں گے کہ انہوں نے حلف اٹھانے سے قبل ہی دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن بھارت کے وزیر اعظم نے اسے قبول نہیں کیا۔

جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا کہ جب نریندر مودی وزیر اعظم نہیں تھے ان کی باتیں ایک پاکستان دشمن اور ایک متعصب کی باتیں تھیں ، انہیں کسی نہ کسی طرح وزارت اعظمی کی سیڑھی تک پہنچنا تھا جس کے لیے ان کے پاس اس سے بہتر سلوگن، اس سے اچھا نعرہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا جو دوران انتخابات استعمال کیا گیا۔ وہ اس میں کامیاب و کامران رہے اور وزیر اعظم بھارت بن گئے ۔ اب ان کی حیثیت اور ہے، ان کا مرتبہ مختلف ہے، ان کا مقام اور ہے اب وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ دنیا کے ایک بڑے جمہوری ملک کے سربراہ کا کہنا ہے، وہ اس ملک کے ان منصوبوں کا حصہ ہے جس پر اس نے مستقبل میں عمل کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بھارت اب بھی اپنے مذموم مقاصد پاکستان دشمنی سے بعض نہیں آیا، وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرکے پاکستان کے لیے مشکلات اور مصائب پیدا کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ پاکستان دشمنی اس کی سرِشت میں ہے، اس کے خون میں ہے، اس کی بنیادوں میں ہے کہ پاکستان اس کو ہر دم کھٹکتا ہی ہے۔ وہ اِسے پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ہمیں اس سے ہر دم ہوشیار اور چوکنا رہنا ہوگا۔ پتھر کا جواب اینٹ سے دینا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ

ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ اس کی سرزمین پر ہمارے بے شمار مسلمان بھائی آباد ہیں، دونوں کی بہتری اس میں ہے کہ دونوں ممالک اپنے مسائل کو افہام و تفہیم سے حل کر لیں۔ اپنے اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں، کشمیر اصل میں دونوں کے درمیان بنیادی تَنازع ہے۔ اسے اقوام متحدہ کی قرارداد کی روشنی میں اور کشمیری عوام کی اپنی مرضی سے حل ہو جانا چاہیے۔ کسی کو بھی جبر و ظلم کے ذریعہ، دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ اپنے زیر اثر نہیں رکھا جا سکتا۔ کشمیریوں کو ان کا حق آزادی ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔ بھارت کو حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیریوں پر زیادتی بند کر دینی چاہیے۔ اقوام متحدہ کی قرارداد بہت واضح ہے اس کی روشنی میں انھیں ان کا حق دے دینا چاہیے۔

میرا تو خیال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے آج تک بھارت اور پاکستان حالتِ جنگ میں ہیں۔ جنگ اسی عمل کا نام نہیں کہ دونوں ممالک کی فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے برسرپیکار ہوں، گولا باری جاری ہو، ایک دوسرے پر فضائی حملے ہو رہے ہوں، جانی ومالی نقصان پہنچایا جا رہا ہو اور ایٹمی جنگ کے شروع ہو جانے کا خطرہ ہو۔ یہ بھی جنگ ہی ہے کہ جب موقع ملے پاکستان کی سالمیت پر حملہ کر دو، اسے ختم کرنے کے بیانات جاری کرتے رہو، اشتعال انگیز بیان دینا اپنا معمول بنا لو، یہ بھی جنگ ہی ہے اور اس جنگ میں ہمارا پڑوسی ملک بھارت 14 اگست 1947 سے مبتلا ہے۔ اس کی وجہ سے پاکستان کو بھی حالت جنگ ہی میں

رہنا پڑ رہا ہے۔ اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے تشکیل دینے کے بجائے عسکری معاملات پر بھرپور توجہ مرکوز رکھنا پڑ رہی ہے جو دونوں ملکوں کے عوام کے حق میں ہرگز نہیں۔

ہمیں اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ آخر ایسی کونسی بات ہے کہ بھارت اور اس کے سیاسی رہنما، عسکری قیادت حتیٰ کے اس کے وہ عوام جو غیر مسلم ہیں پاکستان کے دشمن کیوں ہیں؟ کیا ہمارے کسی سیاسی رہنما نے اس بات کا نعرہ لگایا کہ ہم بھارت کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں، ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے۔۔ نہیں کسی رہنما نے کبھی یہ نہیں کہا پھر آخر بھارت کی سرزمین سے کوئی بھی پتھر اٹھالیں نیچے سے بونے سے بونا لیڈر بھی پاکستان کو توڑنے ، اُسے ختم کرنے ، اُس کی تقسیم کرنے کے خواب دیکھتا نظر آتا ہے۔آخر کیوں؟ اس پر ہر سنجیدہ لکھنے والے کو سوچنا چاہیے اور اپنے خیالات کو قلم و قرطاس پر منتقل کرنا چاہیے۔ بعض سنجیدہ کوششیں ہوتی ہیں ۔ بے شمار لکھاریوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، سیمنار اور مذاکرے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن نشستاً، گفتاً اور برخاستاً کی حد تک۔ حکومت ان کوششوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرکے آگے نہیں بڑھتی ۔ بھارتی ہرزہ سرائی کا جواب عام لکھاری پتھر کے مقابلے میں اینٹ دے مارتے ہیں دوسری جانب سرکاری حکام کا ہرزہ سرائی کا جواب تردیدی الفاظ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم ان بیانات کو مسترد

کرتے ہیں۔ رسمی بیانات سے کام نہیں چلے گا۔ امن، دوستی بھائی چارہ ہمارا بنیادی منشور ضرور ہو لیکن دشمن کی ایک آواز کے جواب میں ہمیں گھن گرج کے ساتھ بات کرنا ہوگی۔ پاکستان چھوٹا ملک ضرور ہے لیکن یہ بات سب جانتے ہیں اور کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پاکستان اب ایک ایٹمی قوت ہے۔ ہمارے ملک کے اندر کے حالات کچھ بھی ہوں لیکن ہم برابری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری مسلح افواج دنیا کی بہترین افواج میں سے ہیں۔ ہمارے عوام میں اپنے ملک پر مرمٹنے کا لازوال جذبہ موجود ہے، بھارت میں جس کا فقدان ہے۔ شہادت کا جذبہ صرف مسلمان کے اندر ہی ہے بھارتی اس کی سوچ سے بھی نہ آشنا ہیں۔ پھر ڈر و خوف کس بات کا۔

بھارت ہمیں مختلف طریقے سے کمزور کرنے کے حربے استعمال کر رہا ہے۔ بنگلہ دیش بنا تو آواز آئی کہ دو قومی نظریہ ختم ہوگیا۔ جی نہیں! پاکستان کے مسلمان ہر اعتبار سے بھارت سے مختلف ہیں، ہمارا مذہب، ہماری ثقافت، ہماری تہذیب، ہماری سوچ کسی بھی طرح بھارت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ پاکستان اور بھارت مذہبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی الگ تشخص رکھتے ہیں۔ بھارت میں جو مسلمان رہ رہے ہیں وہ ان کا وطن ہے، جغرافیائی اعتبار سے وہ بھارت کے شہری ہیں لیکن ان کا مذہب اور ان کی ثقافت بھارت کے ہندوؤں سے مختلف اور جداگانا ہے۔ بھارت بڑا ملک ہے، وہ پاکستان سے ہر اعتبار سے

بڑا ہے، اس کی سرحدیں وسیع ہیں، آبادی زیادہ ہے۔ پھر اسے پاکستان سے کیا خطرہ؟ اس کے باوجود وہ اپنے دفاعی بجٹ میں اضافے کی جانب گامزن ہے۔ آخر کیوں؟ کس بات کا ڈر اور خوف اُسے لاحق ہے۔ یہی نا کہ پاکستان چھوٹا ضرور ہے لیکن وہ بھی ایٹمی طاقت ہے، فوج ہی نہیں عوام اپنے ملک پر مر مٹنے کا لازوال جذبہ رکھتے ہیں۔ ان میں قوت مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اب عام خیال یہ ہے کہ بھارت چین پاک راہداری منصوبے کو ثبوتاث کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں چین پاکستان کا بہترین دوست ہے وہ بھارت کی ہرزہ سرائی سے بخوبی آگاہ ہے۔ دوسری جانب ایران بھی ہمارا اچھا پڑوسی دوست ہے وہ بھی اس منصوبے میں شرکت پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ روس بھی کچھ کچھ پاکستان کی جانب مائل نظر آرہا ہے ایسی صورت میں بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی چاہیں کتنی ہی ہرزہ سرائی کرلیں وہ پاکستان اور چین کے مابین ہونے والا PAk China Economic Coridore اقتصادی راہ داری منصوبہ جو پاکستان کی اقتصادی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کو کسی بھی طور نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بھارت کا اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں کسی بھی قسم کا نقصان کا کوئی تعلق کسی طور نظر نہیں آتا۔ لیکن بھارت جو ہمارا پڑوسی ہونے کے باوجود دشمنی کی انتہائی حدود کو چھو رہا ہے اس کو اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں بھارت دشمنی نظر آنے لگی اور اس کے وزیر اعظم نریندر مودی کے ساتھ ساتھ تمام حکومتی کارندوں کو اس منصوبے سے بھارت کو خطرہ محسوس ہونے لگا اور انہوں نے

پاکستان دشمنی کا اظہار شروع کردیا۔ پاک چین اقتصادی راہدی منصوبہ جوں ہی منظر عام پر آیا بھارت نے اپنا روایتی واویلا شروع کردیا۔ اس منصوبے کی مخالفت بلا جواز اور پاکستان دشمنی کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی۔ بھارت کے بلاوجہ واویلا کے جواب میں چین نے بھی دو ٹوک الفاظ میں بھارت کی تنقید کو بلاجواز قرار دیا۔ چین کے ترجمان کا کہنا تھا کہ پاک چین اقتصادی راہداری منصوبہ کسی تیسرے فریق کے خلاف نہیں۔

اقتصادی راہداری کی تعمیر چین پاکستان عمومی ترقی، علاقائی روابط بڑھانے، خطے میں امن، استحکام اور ترقی کے لیے انتہائی اہم ہے۔

تمام تر عمومی صورت حال کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بھارت کے ہندو عوام عام طور پر اور سیاسی قائدین خاص طور پر پاکستان دشمنی کے بغیر سیاسی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ نریندر مودی نے وزارت عظمٰی پاکستان دشمن بیانات، مسلمان دشمن خیالات کے اظہار کے صورت میں ہی حاصل کی ہے۔ پاکستان سے دوستی اور اچھے تعلقات کو بھارتی سیاسی قیادت اپنی موت تصور کرتی ہے۔ یہ سب وہ اپنے متعصب ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ہی کرتے ہیں حالانکہ پاکستان سے اچھے تعلقات انہیں بھارت میں موجود کروڑں مسلمانوں کی آشیرباد حاصل ہوگی لیکن یہ ان سیاسی پنڈتوں کے لیے بے معنی ہے۔ مودی اب

دنیا کے ایک بڑے جمہوری ملک کے سربراہ ہیں انہیں اپنے انداز حکمرانی کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان بازی پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ پاکستان اور پاکستان کے غیور عوام ان کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والے نہیں۔ ہم تم سے کم نہیں، تم ایٹمی قوت تو ہم بھی وہی لیکن امن، بھائی چارہ، پیار و محبت ہمارا پیغام ہے۔ سب کچھ گوارہ کشمیر پر تمہارا قبضہ گوارا نہیں ۔ کشمیری مسلمانوں پر تمہارا ظلم و ستم برداشت نہیں۔ کشمیر اصل میں دونوں کے درمیان بنیادی تنازع ہے۔ اسے اقوام متحدہ کی قرارداد کی روشنی میں اور کشمیری عوام کی اپنی مرضی سے حل ہو جانا چاہیے۔ کشمیریوں کو ان کا حق آزادی ایک نہ ایک دن ضرور ملے گا۔ نریندر مودی کی ہرزہ سرائی کشمیریوں کو ان کے جائز حق سے محروم نہیں کر سکتی۔ (

242015جون)

برقی (الیکٹرانک) میڈیا اور شترِ بے مہار آزادی

برقی میڈیا (الیکٹرانک میڈیا) پاکستان میں آزاد کیا ہوا، فحاشی، عریانیت، بے حیائی کا کھلے عام دور دورہ ہوگیا۔ جس چینل کا جی چاہتا ہے ڈراموں، اشتہاروں کے نام سے فحش، عریاں اور بے حیا قسم کے سین شامل کرکے کھلے عام دکھاتا ہے۔ اس پر شرم و ندامت بھی محسوس نہیں کرتے۔ نہیں معلوم اس عریانیت اور فحاشی سے کونسی خدمت وہ کرنا چاہتے ہیں۔ برقی میڈیا کی اس بے مہار آزادی نے گھر گھر داخل ہوکر ہماری عزت و آبرو اور ہماری مشرقی روایات کا جنازہ نکال دیا ہے۔ حکومتی مشینری لگتا ہے چین کی بانسری بجا رہی ہے۔ اُسے کچھ نظر ہی نہیں آتا، جو صاحب اختیار ان امور کی نگرانی پر مامور ہیں وہ صرف اس فکر اور تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کا عہدہ برقرار رہے۔ چینلز کیا کر رہے ہیں، کیا دکھا رہے ہیں انہیں اس کی پروا نہیں۔ نجی چینل پر بڑھتی ہوئی عریانیت اور فحاشی کے بارے میں کئی قلم کاروں نے لکھا، حکام بالا کی توجہ اس جانب دلائی، روزنامہ جنگ نے فحاشی پر مبنی ڈراموں کی تصویریں بھی شائع کیں، دیگر اخبارات بھی اس جانب توجہ مبذول کرا چکے لیکن حکومتی مشینری کی آنکھوں پر نہ معلوم کس قسم کی پٹی بندھی ہے کہ انہیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، اگر آپ اس حد کو

کراس کر جائیں گے تو ایک نہ ایک دن شعیب شیخ کی طرح پکڑ میں ضرور آ جائیں گے۔
نجی چینل کے متعلقہ حکام، ڈرامے لکھنے اور تشکیل دینے والے، بیہودہ سین اسکرین کی زینت بنانے والے ایماندار سے یہ سوچیں کہ کیا وہ بیہودہ سین، عریاں قسم کے اشتہارات اپنے گھر میں اپنی فیملی کے ہمراہ، اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکتے ہیں؟ انہیں جواب از خود مل جائے گا اور کسی کو بھی حکومت وقت یا کسی اور اتھارٹی سے اس جانب توجہ کرنے کی التجائیں کرنی نہیں پڑیں گی۔ کبھی سوچیں کہ کیا ہماری مشرقی روایات یہیں ہیں جو ہم ٹی وی اسکرین پر ڈراموں میں اور اشتہاروں میں دکھا رہے ہیں۔ کیا ہمارا مذہب ہمیں یہی درس دیتا ہے، ہر گز نہیں۔ قرآن کریم میں فحاشی سے، بے حیائی سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے 'خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نا معقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو'۔ (سورۃ النحل آیت 9)۔
آخر ہم اپنی آئندہ آنے والی نسل کو کس قسم کا تیار کرنا چاہتے ہیں۔ بے حیائی، بیہودہ اور فحش قسم کے ڈراموں، فلموں، اشتہارات سے ہماری نسل پر یقینا اچھے اثرات نہیں ہوں گے وہ بے راہ روی اور برائی کا رخ ہی کرے گی۔ یہ

ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر بے شمار لکھا گیا، لکھنے والوں نے ہر طرح سے حکمام متعلقہ کی توجہ دلائی اور دلاتے رہیں گے۔ اس لیے کہ برائی کے خلاف مسلسل جہاد کی ضرورت ہے۔اس عمل کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، فحاشی، عریانیت اور بے حیائی و بیہودگی کی جانب حکمرانوں کی توجہ مبزول کراتے رہنے سے مثبت اثرات ہوں گے۔ کبھی تو ہمارے حکمراں نوں میں سے کوئی اس جانب توجہ دے گا۔برائی کے کاموں کو انجام دینا ہی.برائی نہیں بلکہ.برائی کے کاموں کو منظر عام پر لانے والے عمل میں کسی بھی حیثیت سے شرکت گویا.برائی کو عام کرنے کے مترادف ہے۔ بعض نجی چینلوں ہی نہیں بلکہ اس قسم کی بے حیائی، بیہودہ اور فحش قسم کے سین اور کلپس سوشل میڈیا پر بھی عام ہوتے جارہے ہیں، فلموں کا تو کیا ہی کہنا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس جانب بھی توجہ دے اور اس قسم کی بے راہ روی اور فحاشی پھیلانے والوں کو قانون اور اخلاق کے دائرے میں لائے۔

اس موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم جن سے میرا روحانی، اخلاقی، دینی عقائد کے علاوہ خاندانی رشتہ بھی ہے کہ ادارے 'تنظیم اسلامی' کا ایک خط کالم نگار و تجزیہ نگار انصار عباسی نے اپنے کالم 'مشرقی روایات کا جنازہ' کے عنوان سے لکھا جو (روز نامہ جنگ اشاعت 25جون2015) میں شامل ہے اس تحریر کو میں بھی اس غرض سے شامل کررہا ہوں کہ شاید متعلقہ احباب کی توجہ اس جانب

ہو جائے اور معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اسے روکا جاسکے۔ کالم نگار کی یہ بات درست ہے کہ حکمرانوں کی جانب سے اس معاملے کو اگر اسی طرح نظر انداز کیا جاتا رہا تو اس کے نتائج ہمارے اور ہماری نسلوں کے لیے انتہائی سنگین ہوں گے۔ خط کا متن ملاحظہ یہ کچھ اس طرح ہے۔

اگرچہ ہمارے معاشرے میں ایک عرصہ سے بعض فلموں اور ڈراموں میں فحاشی اور" بے حیائی کی شکایت تھی لیکن چونکہ شریف النفس لوگ اس راستہ سے ہی گریز کرتے تھے اور پاکیزہ ذہن اور نیک فطرت لوگ تو اخبارات کے رنگین صفحات اور فلمی اشتہارات پر بھی خفا اور معترض رہتے تھے۔ لہٰذا صورت حال کبھی اتنی گھمبیر نہ تھی۔ لیکن جب سے الیکٹرونک میڈیا میں نجی چینلز کی اجازت ہوئی جنھیں پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں دیکھا جاسکتا ہے 'تب سے ہمارے یہاں فحاشی، عریانی اور بے حیائی کا ایک طوفان امڈ آیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ بھی تھا کہ مقتدر حلقوں نے ساتھ ہی یہ نوید بھی سنادی تھی کہ میڈیا اب آزاد ہوگا۔ حضور والا! ہم انتہائی دکھ اور افسو سے عرض گزار ہیں کہ یہ آزادی مادر پدر آزادی ثابت ہوئی اور اس شتر بے مہار آزادی نے گھر گھر داخل ہو کر ہماری مشرقی روایات اور اقدار کا جنازہ نکال دیا۔ ایک ایسی تہذیب ہمارے گھروں میں گھس آئی ہے جو نہ صرف اسلامی تہذیب اور شعائر کی بلفعل دشمن ہے بلکہ حیاداری اور شرافت کے عام معیار و تصورات سے بھی متصادم ہے۔ یہ بے حیا

تہذیب ہمارے معصوم بچوں اور نوجوان نسل کو ''رحمان'' سے دور اور ''شیطان'' کے قریب کر رہی ہے۔ بہر حال نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان عام گھرانوں میں جہاں شرم و حیا کا واجبی سا تصور ابھی موجود ہے وہاں ماں بیٹا اور باپ بیٹی اکھٹے ٹیلی وژن کے سامنے نہیں بیٹھ سکتے۔اس نوعیت کی شکایت بہت سے اطراف سے سامنے آئی۔ چنانچہ یہ ایک حیقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ایک قابل لحاظ حصے میں اس حوالے سے خاموش اضطراب پایا جانے لگا ہے' کیونکہ نوجوان نسل پر غیر معمولی طور پر اس کلچر کے منفی اور برے اثرات مرتب ہونے لگے ہیں۔

جناب عالی! تنظیمِ اسلامی نے مسئلہ کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے گزشتہ دنوں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں فحاشی اور عریانی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے خلاف اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل محلّہ سے رابطہ کی بنیاد پر ایک دستخطی مہم شروع کی' جس میں حکومت کے ذمہ داران سے پرزور گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان حوالوں سے فحاشی و بے حیائی کے سیلاب کو روکنے میں اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کریں اور اس سلسلے کو روکنے کے لیے حکومتی قوت اور وسائل کو بروئے کار لائیں۔ہمارے ساتھیوں کی چند ماہ کی محنت اور پاکستان کے عوام کے تعاون کے نتیجے میں نہایت قلیل مدت میں آٹھ لاکھ گیارہ ہزار دو سودس (8,11,210)افراد نے ہماری اس مہم سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے دستخط کر دیے۔ہماری خواہش تھی کہ دستخط شدہ شیٹس ہم خود وزیر اعظم کو پیش کریں تاکہ اُن سے درخواست بھی کی جاسکے کہ وہ اعلیٰ ترین حکومتی ذمہ داری

نبھاتے ہوئے اس فحاشی اور بے حیائی کا قلع قمع کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ جو معاشرے کے جسد کو کینسر کے مرض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔ لیکن صد افسوس کہ ایک طویل عرصہ تک سر توڑ کوشش کے باوجود ہمیں وزیراعظم تک رسائی نہ ملی۔ تب ہم نے اخباری اشتہارات کے ذریعے حکومت اور عوام دونوں سے درخواست کی کہ آیئے مل کر جہاد کریں اور شرم و حیا اور غیرت کو نیست و نابود کر دینے والے اس شیطانی طوفان کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو جائیں' لیکن حکومتی سطح پر ہمیں کوئی رسپانس نہ ملا۔ ہم نے سپریم کورٹ میں ایک آئینی رٹ بھی دائر کر رکھی ہے کہ عدالت عظمی آگے بڑھ کر اس کا نوٹس لے اور انتظامیہ کو حکم دے کہ الیکٹرنک میڈیا پر فحاشی کے سیلاب کے آگے بند باندھے' لیکن سر دست کوئی شنوائی نہیں ہو رہی۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس نیک کام کی انجام دہی کے لیے کسی نئی قانون سازی کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ پہلے ہی سے ایسے قوانین موجود ہیں جن کی بنیاد پر فحاشی کے فروغ کے مرتکب افراد اور اداروں کے خلاف کاروئی کی جا سکتی ہے۔ پھر یہ کے آرٹیکل 31 کے مطابق اسلامی جمہوریہ پاکستان میں حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے اقدام کرے جن سے اسلامی اقدار کا فروغ اور عوام کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جو اُن کی زندگیوں کو اسلامی طرز حیات میں ڈھالنے میں معاون و مددگار بنے۔ محترم! ہماری یہ عاجزانہ کاوش جس میں آپ کو لکھی جانے والی یہ تحریر بھی شامل ہے' اس کا حقیقی ہدف یہ ہے کہ روز قیامت اللہ کے حضور ہم یہ معذرت پیش کر سکیں کہ

ہم نے قوم کو اس گناہ عظیم سے بچانے کے لیے حکومتی اداروں سے بھی رابطہ کیا اور افراد کے سامنے بھی اپنی گزارشات رکھیں۔ جناب عالی! ہر مسلمان یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جزاو سزا کے دن اللہ کے ہاں سب کو فرداً فرداً پیش ہونا ہے۔ ظاہر ہے معاشرے میں جو شخص زیادہ اثر و رسوخ کا مالک ہوگا اور جتنا بڑا منصب ہوگا' پرسش بھی اُسی قدر کڑی اور سخت ہوگی۔ آپ سے مودبانہ التجا ہے کہ آگے بڑھیں۔ اس سے پہلے کہ فحاشی کینسر معاشرے کی روحانی موت کا باعث بنے آپ اپنا قومی اور دینی فریضہ ادا کریں تاکہ آپ بھی روز قیامت اللہ کے حضور سرخرو ہو سکیں''۔ (26 جون 2015)

سندھ میں جگر کی پیوند کاری سینٹر کا قیام۔ایک خوش آئند اقدام

دنیا میں گردے، مثانہ اور جگر کے امراض میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں جگر کی پیوند کاری (ٹرنسپلانٹیشن) کے مراکز کی کمی پائی جاتی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر ادیب رضوی کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ جنھوں نے گردہ، مثانہ اور جگر کی پیوند کاری کا مرکز قائم کرکے خدمت کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی وٹرانسپلانٹیشن (SIUT) کا قیام ابتدائی طور پر سول اسپتال میں 1970 میں عمل آیا تھا۔ 1991 میں اس انسٹیٹیوٹ کو خود مختار ادارے کی حیثیت دے دی گئی۔ 2003 میں یہاں جگر کی تبدیلی کے پہلے مرکز نے کام کرنا شروع کیا۔ کراچی میں قائم جگر کی پیوند کاری کا یہ مرکز کراچی کے علاوہ سندھ کو خاص طور پر اور پاکستان کو عام طور پر جگر کی پیوند کاری کی سہولیات فراہم کر رہا ہے۔ اس ادارے پر بے پناہ لوڈ ہے۔ عام طور پر اس مرض میں مبتلا مریضوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کا علاج اس ادارے میں ہوجائے۔ اس شعبہ میں نجی ادارے اس قدر مہنگے اور ان میں علاج کسی بھی غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہے۔ عرصہ دراز سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کراچی کے علاوہ سندھ کے دیگر شہروں میں گردہ، مثانہ اور جگر کے علاج معالجے سے متعلق مراکز کا قیام عمل میں آئے۔تاکہ دور دراز کے شہروں اور دیہاتوں سے اس مرض میں مبتلا افراد کو

میلوں سفر طے کرکے کراچی علاج کے لیے نہ آنا پڑے۔

سندھ حکومت نے اندرون سندھ جگر کی پیوند کاری کے مرکز کے قیام میں پیش رفت کی جو ایک خوش آئند قدم ہے۔ جرمنی سے تعلق رکھنے والے جگر کی پیوند کاری کے ماہر سرجن پروفیسر بیکر اور حکومت سندھ کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق گمبٹ انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (GIMS) میں دو ماہ کے اندر اندر جگر کی پیوند کاری کا آغاز کر دیا جائے گا۔ یہ اندرون سندھ کے کسی بھی شہر میں پیوند کاری کا پہلا مرکز ہوگا۔ معاہدے کے مطابق ڈاکٹر بیکر دو سال کے لیے اپنی ٹیم کے سات ارکان کے ہمراہ جی آئی ایم ایس میں کام کریں گے۔ ڈاکٹر بیکر کی ٹیم میں تین لیور ٹرانسپلاٹ سرجن ایک انیستھیٹک ڈاکٹر، اسٹاف نرس اور ایک کوآرڈی نیٹر ہوں گے۔ ڈاکٹر بیکر کی ٹیم جی آئی ایم ایس کے ڈاکٹرز اور عملے کو جگر کی پیوند کاری اور اس کے بعد کی احتیاطی تدابیر کے بارے بارے میں تربیت فراہم کرے گی۔

اگر معاہدے کے مطابق گمبٹ انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (GIMS) میں جگر کی پیوند کار کا آغاز کر دیا جاتا ہے تو یہ سندھ کے عوام کو طبّی خدمات کی فراہمی میں ایک سنگ میل ہوگا۔ اس سے قبل کراچی میں ڈاکٹر ادیب رضوی کی سرپرستی میں پیوند کاری کا مرکز siut ہی پاکستان کو اس مرکز میں کام کر رہا ہے۔

نہیں بلکہ جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ معتبر پیوند کاری کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کے مراکز سندھ ہی نہیں بلکہ پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم کیے جائیں۔ اس مرکز کے قیام سے کراچی کے مرکز پر لوڈ کم ہوگا۔ اندرون شہر سے اس مرض میں مبتلا افراد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر کراچی آنا نہیں پڑے گا اور وہ اس پریشانی سے بچ جائیں گے۔

پاکستان میں جگر کی پیوند کاری کے حوالے سے سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی و ٹرانسپلانٹیشن (SIUT) کے علاوہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی یہ سہولت محدود پیمانے پر موجود ہے۔ جیسے پاکستان کے دارالخلافہ اسلام آباد میں شفاء انٹرنیشنل اسپتال میں 2009 میں جگر کی پیوند کاری کا سینٹر قائم کیا گیا۔ اسی طرح پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (PIMS) میں جگر کی پیدوند کاری کا سینٹر 2011 میں 200 ملین کی حکومتی گرانٹ سے قائم کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سینٹر میں جگر کی پیوند کاری کا پہلا آپریشن ناکام ہوگیا تھا جس کے باعث اسے بند کر دیا گیا۔ فیصل آباد میں لیور فاؤنڈیشن ٹرسٹ (LFT) کے زیر نگرانی جگر کی تبدیلی کا مرکز 2005 میں قائم کیا گیا۔ یہ مرکز نجی ادارے کے طور پر شروع کیا گیا۔ اس ادارے کے بارے میں معلومات ویب سائٹ liverfoundation.pk پر موجود ہیں۔

جگر کی خرابی سے پیدا ہونے والی بیماری ہیپاٹائٹس دنیا کی دس خطرناک بیماریوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت دنیا میں 15 کروڑ افراد اس بیماری کا شکار ہیں۔ ایک سروے کے مطابق پچیس ہزار لوگ ہر سال جگر کے عارضے کا شکار ہوتے ہیں ان میں سے صرف دس فیصد فریض ڈائیلا سیس کی سہولت حاصل کر پاتے ہیں جب کہ 23 فیصد افراد جگر کی پیوندکاری کی سہولت حاصل کرنے میں کامیاب ہوپاتے ہیں۔ایک اور سروے کے مطابق اس وقت دنیا میں 500 ملین افراد ہیپاٹائٹس 'B' اور 'C' میں مبتلا ہیں ان میں سے 12 فیصد کا تعلق پاکستان سے ہے۔ پاکستان میں یہ مرض جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ڈائیلا سیس سینٹر کے ساتھ ساتھ جگر کی پیوندکاری کے مراکز حکومتی سرپرستی میں سرکاری اسپتالوں میں قائم کیے جائیں۔تاکہ غریب مریضوں کو سستے علاج کی سہولت حاصل ہو سکے۔اس بیماری کی ایک وجہ مریضوں کا اس مرض سے آگاہی کا نہ ہونا ہے۔ بے شمار لوگ اس بیماری میں صرف اس وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کہ انہیں درست اور بروقت علاج میسر نہیں آتا۔ انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ یہ مرج لاعلاج نہیں اگر بروقت اس کا صحیح علاج شروع ہوجائے تو مریض کے جاں بحق ہونے کے امکانات کم سے کم ہوجاتے ہیں۔

بھارت اس مرض کے علاج معالجے کے حوالے سے بہتر اور معتبر حیثیت رکھتا ہے۔

بھارت کے مختلف شہروں میں جگر کی پیوند کاری کے متعدد مراکز قائم ہیں۔ بھارت میں اس مرض کے علاج پر دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں اخراجات بھی کم آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس مرض میں مبتلا افراد علاج کے لیے بھارت کا رخ کرتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اب تک 500 سے زیادہ پاکستانیوں کا جگر کی پیوند کاری کا کامیاب علاج بھارت کے مختلف شہروں میں ہوچکا ہے۔بھارت کے Dr. A. S. Sioin،Dr. Sinlash Gupta،Dr. Dr. Vivek VijاورDr. Sanjay S. Negi جگر کی پیدوند کاری کے ماہر سرجن تصور کیے جاتے ہیں۔ ان ماہرین کے بارے میں اور پیوند کاری کے علاج کے بارے میں معلومات ویب سائٹ indian-pospital.com/liver-transplant/ پر معلومات دیکھی جاسکتی ہیں۔ پاکستان کے کے بارے میں تفصیل ویب (SIUT) سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی وٹرانسپلانٹیشن

اور ای میلwww.siut.orgسائٹ

سے حاصل کی سکتی ہیں۔infor@siut.org

ترک خاتونِ اول کا ہیروں کا ہار اور سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی

بات ہے پانچ سال پہلے 2010 کی ، پاکستان پیپلز پارٹی کے یوسف رضا گیلانی جو ایک بڑی گدی کے سجادہ نشین بھی ہیں ہمارے ملک کے چوبیسویں وزیر اعظم تھے۔اس سال بھی پاکستان میں شدید بارشوں کے بعد سیلاب نے تباہی مچادی، بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے، بے شمار گھرانے بے گھر ہوگئے۔ قدرتی آفات کے سامنے کسی کا کیا زور، یہ تو ہمارے اعمال ہیں، جن کی سزا وقتاً فوقتاً ہمیں ملتی رہتی ہے۔ایسی ہی قدرتی آفت آجکل کراچی میں شدید گرمی اور لو کی صورت میں آئی ہوئی ہے جس میں 1200 سے زیادہ افراد گرمی کا شکار ہوچکے ہیں ۔ درست کہتے ہیں ہمارے حکمراں کہ یہ ایک قدرتی آفت ہے اس میں حکومت کا کیا لینا دینا، یہ تو گرمی کے باعث مرے ہیں لوڈ شیڈنگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ لوڈ شیڈنگ کوئی آج تو نہیں ہو رہی یہ تو برس ہا برس سے چلی آرہی ہے۔ یوسف رضا گیلانی کا دور بھی قدتی آفات کے ساتھ ساتھ انسانی آفات سے لبریز تھا۔ جس میں کرپشن اپنے عروج پر تھی، بیڈ گورنس مثالی تھی، ٹارگٹ کلنگ جیسی آج ہے ایسی ہی تھی، الغرض غربت، بے روزگاری، مہنگائی ، پریشانی ، دکھو اور تکلیفوں سے عام انسان پریشان تھا۔ یہ وہ دور تھا جب جنرل پرویز مشرف کے زمانے کے قرضے جو 34 لاکھ ڈالر تھے بڑھ کر دگنے ہوگئے،

ڈالر جو 62 کا تھا 100 کو کراس کر گیا تھا۔ جنابِ یوسف رضا گیلانی جو جنرل ضیاء الحق کے دور کی پیداوار تھے 1988 میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور سیاست کی سیڑھی پر سفر کرتے ہوئے صرف 20 سال کے عرصے میں وزارت اعظمی کے منصب پر فائز ہوگئے۔ بے شمار پی پی کے رہنماء جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے پارٹی میں مستقل مزاجی سے چلے آرہے تھے زرداری صاحب کے اس انتخاب پر ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ان رہنماؤں میں صلاحیتیں بھی تھیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے، تجربہ بھی خوب رکھتے تھے، بہترین مقرر، نرم مزاج، سبک گفتار بھی لیکن گیلانی صاحب نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا اور وزارت اعظمی کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ یہ دوسری بات کہ ملک کی سپریم کورٹ نے انہیں چند سیکنڈ کی سزا سنانے کے بعد نہ صرف وزارت اعظمی بلکہ پانچ سال کے لیے الیکشن لڑنے سے بھی نااہل قرار دے دیا تھا۔

بات ترکی کی خاتون اول امینے اردگان جو موجودہ صدر طیب اردگان کی شریک حیات ہیں، اس وقت طیب اردگان ترکی کے وزیر اعظم تھے۔ سیلاب زدگان سے اظہار ہمدردی کے لیے پاکستان تشریف لائیں۔ انہوں نے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کیا وہ ہمدرد اور نرم دل واقع ہوئی ہیں سیلاب کی تباہ کاریوں سے وہ بہت زیادہ دکھی ہوئیں اور انہوں نے ترکی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے، نقد امداد کے بجائے اپنے گلے کا ہیروں اور موتیوں کا ہار اتار کر حکام متعلقہ کو دے دیا

ساتھ ہی یہ بھی فرمائش کی کہ اس ہار کو فروخت کرکے اس رقم کو سیلاب زدگان کی، بحالی اور امداد کے طور پر کام میں لے آیا جائے۔اس موقع پر انہوں نے یہ پیغام بھی دیا تھا کہ اگر ترکی کے مشکل وقت میں مسلمان خواتین اپنے زیورات دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں تو ترکی کی خواتین بھی مشکل کی اس گھڑی میں پاکستانی سیلاب زدگان کے لیے اپنے زیورات اتار کر دے سکتی ہیں۔ خواتین کا اپنے زیورات عطیہ کرنے کی روایت مسلمانوں میں قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے، شاید اس وقت بنکوں کا نظام اس قدر عام نہیں تھا، ساتھ ہی یہ عمل کہ خواتین جو زیورات پہنے ہوتی ہیں انہیں فوری طور پر اتار کر دیدنے سے لوگ بھی زیادہ متاثر ہوتے ہیں، دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے کہ وہ بھی مدد اور خیر کے کام میں شامل ہوں۔ اس طرح کے واقعات سیاسی رہنماؤں کے سامنے بہت ہوتے رہے ہیں۔ کراچی کی ایک سیاسی جماعت کے قائد نے ایک مرتبہ اپنے خواتین و حضرات کارکنوں کے بڑے مجمعے میں مدد کی اپیل کی تو دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف لاکھوں روپے جمع ہوگئے بلکہ خواتین نے وہ تمام زیوارت جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھیں اسی وقت اتار کر قائد تحریک کو عطیہ کردیے۔

ترک خاتون اول نے اس عمل سے فوری طور پر یہ ثابت کردیا تھا کہ انہیں اور ترکی کے عوام کو پاکستانی عوام سے بے پناہ ہمدری اور محبت ہیں وہ مشکل کی اس گھڑی میں پاکستان کے ساتھ ہیں۔ وہ چاہتی تو لاکھوں ڈالر کا چیک امداد کے

طور پر دے سکتی تھیں لیکن اپنے گلے سے قیمتی ہار اتار کر دینے سے جو تاثر قائم ہوا وہ لاکھوں کے چیک سے کہیں زیادہ تھا۔ خاتون اول مطمئن ہو کر وطن لوٹ گئیں۔ اب حکومت وقت کی ذمہ داری تھی کہ وہ خاتون اول کے دیے ہوئے ہار کو ایمانداری اور سچائی کے ساتھ فروخت کرتے اور اس رقم کو ان کے کہنے کے مطابق استعمال کرتے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں سے کس طرح نمٹا گیا یہ الگ داستان ہے۔ ہار کہاں گیا؟ کس نے رکھا؟ کس کو دیا گیا؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں، لوگ اس کو بھول بھی گئے۔ اس واقع کو پانچواں سال ہے۔ ہار بظاہر گم شدہ تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس ہار کا کیا بنا۔ اگر ملک میں پیپلز پارٹی کے حکومت 2008۔2113 کے بعد دوبارہ بھی بر سر اقتدار آجاتی تو اس گمشدگی پر پردہ ہی پڑا رہتا۔ ہمارے ملک میں کیونکہ مخالف کی باتوں پر کڑی نظر رکھنے کی روایت ہے جو بسا اوقات مثبت ثابت ہوتی ہے۔ پانچ سال بعد پی پی کے بجائے نواز لیگ بر سر اقتدار آئی، وزارت داخلہ کا قلم دان چودھری نثار کو سونپا گیا۔ نہیں معلوم کہ انہیں کسی نے اس واقعہ کی نشاندھی کی یا وہ خود ہی تاک میں تھے، انہیں یاد تھا کہ ہیروں کا ہار ترکی کی خاتون اول نے دیا تھا۔ چودھری نثار نے اس ہار کے بارے میں کھوج لگانے کی سعی کی تو اس ہار کو لاپتہ پایا، اس پر انہوں نے ہار کی گم شدگی کی تحقیقات کا حکم صادر فرمادیا، کھوجی تو قبر سے بھی چیز نکال لاتے ہیں۔ یہ ہیروں کا ہار تو ملتان شہر کے ایک شاہی گھرانے کی زینت بنا ہوا تھا۔ ایف آئی اے کو ہار کی تلاش کا ٹاسک دیا گیا۔

تحقیقی ادارے کو معلوم ہوگیا کہ یہ ہار اب ترک خاتون اول کے گلے کے بعد پاکستان کے سابق وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کی بیگم صاحبہ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے۔ چاہ یوسف نے اپنے دورِ عظمیٰ میں شاہی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس ہار کو ذاتی کسٹڈی میں رکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اسے کہتے ہیں اختیارات کا استعمال۔ ایف آئی اے نے وزارت داخلہ کو اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں صاف صاف بتا دیا کہ یہ ہیروں کا ہار اب کہاں ہے۔ چودھری صاحب کی بہادری کو سلام، انہوں نے قانونی کاروائی کا حکم دیا جس کے مطابق ایف آئی اے نے سید صاحب کو قانونی نوٹس دیتے ہوئے یاد دلایا کہ اگر انہوں نے یہ ہیروں کا ہار واپس نہ کیا تو قانون کے مطابق کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔ اس عمل سے وہ امانت میں خیانت کے الزام کے مرتکب قرار پائیں گے۔ اس کا مقدمہ بھی درج کیا جائے گا۔ یوسف رضا گیلانی جو اب پی پی سے کچھ کچھ نہ خوش دکھائی دیتے ہیں، اپنے جواں سال بیٹے علی حیدر گیلانی کے اغوا کے واقع سے پریشان حال بھی ہیں۔ کسی بھی قسم کی دلیل، حیلہ، بہانے اور عُذر پیش کرنے کے بجائے خاموشی سے ہیروں کا وہ ہار نادرا کے حوالے کردیا۔ نادرا کا اس ہار سے کیا تعلق؟ لیکن یوسف رضا گیلانی نے وہ ہار نادرا کو دیا اس کا مطلب ہے کہ نادرا کا یقیناً اس سے کوئی تعلق رہا ہوگا۔ جب ہی تو سید صاحب نے اس ہار کو ایف آئی اے کے بجائے نادرا کے سپرد کیا۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اس وقت یہ ہار نادرا نے خرید لیا تھا اور کثیر رقم سیلاب زدگان کے فنڈ میں جمع کرادی

تھی۔ ہار اس فکر اور ڈر سے کہ کہیں یہ نادرا کے چیرَمین کی ملکیت نہ بن جائے حکام بالا نے یوسف رضا گیلانی صاحب کو خوش کرنے کے لیے ہار اپنے پاس رکھنے کی درخواست کی۔ بیوروکریسی نے خوش نودی حاصل کی وزیر اعظم کی، پھر وزیر اعظم نے خوشنودی حاصل کی اپنی بیگم صاحبہ کی۔ قانون، اخلاق، امانت، دیانت سب ایک طرف۔گیلانی صاحب اس ہار کو غیر قانونی طور پر پانچ سال سے اپنے قبضے میں رکھے رہے۔ کوئی جواز ہے ان کے پاس، قانون کیا کہتا ہے، امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے یا نہیں؟

یوسف رضا گیلانی صاحب کا دور بطور وزیر اعظم پاکستان کوئی قابل ستائش دور نہیں تھا۔ وہ اپنی صلاحیت کی بنیاد پر، میرٹ پر اس منصب پر نہیں پہنچے، مذہبی خاندان سے تعلق، بڑی گدی کے سجادہ نشین جو انہیں وراثت میں ملی، سیاسی اعتبار دوسرے گدی نشین کی ٹکر پر پورا اترتے تھے۔ شہید بے نظیر بھٹو نے بھی انہیں اپنی کابینہ میں رکھا، بے نظیر کے بعد وہ آصف علی زرداری کے قریبی اور اعتمادیوں میں شامل ہوگئے۔ جب وزیر اعظمی کے لیے کسی شخص کی تلاش ہوئی تو زرداری صاحب کی فہم و فراست نے گیلانی صاحب کا انتخاب کیا، جب سپریم کورٹ نے انہیں وزارت اعظمی کے منصب سے نکال باہر کیا تو زرداری صاحب کی نظر ایک اور پی پی کے رہنما پرویز اشرف جن کا تعلق بھی پنجاب ہی سے تھا پر پڑی اور انہیں وزیر اعظم بنادیا گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ انہیں پارٹی کے

سینئر اور بہ صلاحیت رہنما اس منصب کے لیے نظر نہیں آئے، چودھری اعتزاز احسن مخدوم امین فہیم اور کئی ایسے بہ صلاحیت لوگ تھے جن کا انتخاب اس منصب کے لیے کیا، جاسکتا تھا لیکن حسن انتخاب ہے زرداری صاحب کا انہیں جس میں بھی صلاحیتیں نظر آجائیں۔ اب سناؤنی ہے کہ دونوں وزیراعظم گیلانی اور پرویز اشرف زرداری صاحب سے دور دور ہیں۔ تب ہی تو ہیرو کا ہار پہلی فرصت میں خاموشی کے ساتھ واپس کردیا تھا۔

ہار واپس مل گیا۔ سیلاب زدگان پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرچکے، ہار کی قانونی رکھ والی کس کی ہے ۔ اس کا تعین قانونی ماہرین کی آراء کی روشنی میں کیا جائے۔ ہار کو ترک خاتون اول جو ابھی حیات ہیں اور موجودہ صدر کی اہلیہ ہونے کے ناتے اب بھی خاتون اول ہیں کو یہ ہار شکریے کے ساتھ واپس کردیا جائے ، یا ان کی ہدایت کے مطابق ہار کو فروخت کرکے رقم قومی خزانے میں جمع کردی جائے، اس ہار کو جو اب ایک تاریخی اہمیت حاصل کرچکا ہے، پاکستان کے کسی بھی عجائب گھر میں نادر و نایاب اشیاء کے طور پر محفوظ کرلیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل میں کوئی اور وزیر اعظم پاکستان کو ملنے والے ہیروں کے ہار یا قیمتی اشیاء کو اپنی ذاتی ملکیت تصور نہ کرے۔
ضروری ہے کہ یوسف رضا گیلانی صاحب کے اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی عمل پر تحقیق کی جائے ،اس بات کا تعین کیا جائے کہ انہوں نے کس قانون کے تحت یہ عمل کیا

کیا وہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ؟اگر ہوئے تو اس کیا سزا قانون میں موجود ہے۔ اگر اس معاملے کو خاموشی کے ساتھ دبا دیا گیا تو مستقبل میں کوئی اور وزیراعظم ایسا ہی کرے گا اس کی پیش بندی بہت ضروری ہے تاکہ آئندہ کسی اور وزیراعظم کو ایسا کرنے کی جرت نہ ہو۔اس عمل سے ترکی کی خاتون اول امینے اردگان جنھوں سیلاب زدگان سے ہمدری کرتے ہوئے اپنے گلے کا ہیروں کا ہار ہمدردی اور ایثار کے جزبہ سے سرشار ہو کر دیا جب انہیں یہ خبر ہوئی ہوگی کہ یہ پانچ سال سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم کے گھر کی ملکیت بنا ہوا ہے۔ ان کی بیگم کے گلے کا ہار بنا ہوا ہے تو ان پر کیا گزری ہوگی، پاکستان اور پاکستانی عوام کے بارے میں کیا تاثر قائم ہوا ہوگا۔اللہ ہمارے حکمرانوں کو پاکستان کی عزت کا احساس عزیز رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (2 جون 2015)

میری ماں کی پانچویں برسی اور معراج الدین کا افطار دستر خوان

میری ماں کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں لیکن یقین نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ حادثہ پیش آچکا ہے۔ ماں جیسی ہستی کا سایہ سر سے اٹھ جانا نقصان عظیم سے کم نہیں۔ ماں کی محبت کو الفاظ میں بیان کرنا کسی بھی طور ممکن نہیں۔

''ماں ''ایک عظیم نام ،قدرت کا بے مثال اورانمول تحفہ ، قربانی، ایثار، مروت، صبر و رضا، پیار و محبت ،خلوص و وفا کی روشن مثال۔ ایک ایسا منفرد اورانمول رشتہ جس کی محبتوں کا، شفقت کا، قربانی کا، ایثار کا، خلوص کا ، وفاؤں کا، تقدس کااور سب سے بڑھ کر ممتا کا کوئی مول نہیں۔ماں تو نام ہے اپنے وجود کی نفی کا، قربانی کا، ایثار کا، اپنی ہستی کو مٹادینے کا۔ پانچ برس بیت جانے کے باوجود ماں کے وجود کو ہر دم، ہر جگہ، ہر احساس میں مجھے اپنی ماں نظروں کے سامنے چلتی پھرتی، محبتیں بانٹتی اور مصروف عمل نظر آتی ہے۔ میں نے اپنی ماں سے وہ کچھ سیکھا جو مجھے کسی اور سے آج تک حاصل نہ ہوا حتیٰ کہ مجھے اپنے استادوں سے بھی وہ کچھ حاصل نہ ہوا جو مجھے اپنے ماں کے اس عمل سے حاصل ہوا جو انہوں نے اپنی زندگی میں عملی طور پر کرکے دکھایا۔ قربانی کس چیز کانام ہے یہ مجھے اپنی ماں کے ذریعہ معلوم ہوا، درگزر کسے کہتے ہے یہ احساس مجھے میری ماں نے دیا، چھوٹوں سے شفقت

بڑوں کی عزت کرنا مجھے میری ماں نے سکھایا، گھر کو کس طرح جنت بنایا جاتا ہے اس کا عملی مظاہرہ میں نے اپنی ماں کے عمل میں دیکھا، مہمانوں کی کس طرح خاطر کی جاتی ہے میری ماں نے عملی طور پر کرکے دکھایا۔ زندگی کیسے گزاری جائے اس کا سلیقہ مجھے میری ماں سے ملاالغرض اگر مجھ میں کوئی ذرا برابر بھی خوبی ہے، اچھائی ہے تو وہ میری ماں کی عطا ہے۔

میرے پرکھوں کی سرزمین راجستھان تھی، اس حوالے سے میں بنیادی طور پر راجستھانی یا راجپوت ہوں، راجستھان آج کل آبادی کے لحاظ سے بھارت کا سب سے بڑا صوبہ ہے، تقسیم سے قبل اس صوبے کانام راجپوتانہ تھااور یہ صوبہ بائیس راجواڑوں ریاستوں) کا مجموعہ تھا۔ راجپوتانہ نے بھی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں، میرا بائی،) مہدی حسن اور ریشماں کو مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان کے تین طرفہ تحفے قرار دیا ہے جن کے وہ قائل اور گھائل ہیں حالانکہ وہ خود بھی راجپوت ہی ہیں۔ بعد میں ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ حسین پور کو آباد کیا۔ مظفر نگر ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی مردم خیز سرزمین ہے جس نے علمائے دین، صوفیائے کرام اور فقہائے اسلام کو جنم دیا، اہل علم ودانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی، ان شخصیات میں بعض احباب کے نام فخر سے لیے جاسکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد مظفر نگر کا موضع 'پھلت' تھا، اسے قریہ اولیاء بھی کہا جاتا

ہے۔ عالم دین مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۲۸۰ھ میں بمقام قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان کا تعلق بھی مظفر نگر سے تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، حاجی ولی اللہ محمد احمد سراوے والے، زاہد حسین، اولین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان، جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، محمد ابصار حسین قرنی عمرپور والے، مفتی و محدث مولانا عبدلمالک، مولانا عبد الخالق کاندھلہ والے، شیخ محمد ابراہیم آزاد، سابق چیف جسٹس، بیکانیر چیف کورٹ، معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ)، مبشر احمد واحدی، معروف شاعر احسان دانش، تابش صمدانی اورافسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی کا وطن بھی تھانہ بھون مظفر نگر تھا۔ اس اعتبار سے مجھے ایسی متبرک سرزمین سے نسبت حاصل ہے جس کی کوکھ نے عظیم ہستیوں کو جنم دیا۔ میرے خاندان میں اکثر احباب تدریس اور شاعری سے شغف رکھتے ہیں، صاحب دیوان شاعر بھی ہیں اور بے دیوان شاعر بھی، مَیں شعر گھڑ لیتا ہوں، شاعری میرے خمیر میں تو ہے لیکن تاحال باقاعدہ شاعری نہیں کی، موقعہ محل یا ضرورت کے لیے شعر کہہ لیتا ہوں۔

میری ماں سبزواری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور والد راجستھانی۔ گویا والد شہری بابو اور والدہ مشرقی پنجاب کی ایک دیہاتی۔ شہری اور دیہاتی ملاپ سے

جنم لینے والے بندھن نے شہر کراچی میں ایک کامیاب زندگی گزاری، دنیاوی زندگی کا دورانیہ 50 سال 5 ماہ اور 25 دنوں پر محیط رہا۔ اس ملاپ نے سات زندگیوں کو جنم دیا، ساتوں زندگیوں کی پرورش کی، انہیں تناور درخت بنایا، یہی نہیں بلکہ اپنے شوہر کی تین بہنوں اور دو بھائیوں کی بھی پرورش کی، انہیں پروان چڑھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ ہم بہن بھائیوں نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گھر میں امی ابا کے علاوہ دو چچاؤں اور تین پھوپھیوں کو بھی پایا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم سات بہن بھائی نہیں بلکہ دس بہن بھائی ہیں۔ یہ کمال ہمارے والد صاحب کا تو تھا ہی ان سے زیادہ کمال میری ماں کا تھا جنھوں نے کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ ان کے دیور اور نندیں ہیں بلکہ انہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر پیار دیا، عملی تربیت کی اور انہیں اپنے اپنے گھروں کا کیا۔ اپنی اولاد کی تو سب ہی پرورش کیا کرتے ہیں، ایسی مثال بہت کم ملتی ہے کہ ایک ماں اپنی اولاد سے پہلے اپنے شوہر کے بھائیوں اور بہنوں کی اسی طرح تربیت و پرورش کرے جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔

میری ماں نے مشرقی پنجاب کے ایک دیہات میں آنکھ کھولی، وہیں پلی بڑھی تھیں، بچپن اور جوانی دیہات کے ماحول میں گزرا تھا جہاں ان کے والد اور ایک بھائی پٹواری تھے۔ دیہات کے رہنے والے بخوبی واقف ہیں کہ پٹواریوں کا رہن سہن کس قسم کا ہوتا ہے، گندم، چاول، گھی، شکر، سال بھر کا گھر میں جمع، گائیں

بھینس، بکری اور دیگر جانور، ساتھ ہی کام کرنے والے نوکر چاکر، الغرض صحت مند آب و ہوا کے ساتھ ساتھ خالص غذا، آج کے دیہاتوں میں بھی یہ سب کچھ میسر ہے ۔فرق یہ ہوا کہ اِن دیہاتوں نے مختصر شہر کا روپ دھار لیا ہے۔جہاں بجلی، ٹیلی ویژن، فرج اور ائر کنڈیشن کی سہولیات میسر آ گئیں ہیں۔ایسی ماحول میں پروان چڑھنے والی شادی کے بعد کراچی جیسے شہر میں اور ایک بڑے گھرانے میں داخل ہوئی، جس نے شہر کا ماحول کبھی نہ دیکھا تھا، تعلیم واجبی سی بلکہ ناخواندہ ہوتے ہوئے شہری ماحول میں ایسے گھل مل گئیں جیسے یہ وہ شہری ماحول میں ہی پروان چڑھی ہوں۔

میری ماں مہمان نوازی میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔روز مرہ آنے والے مہمانوں کی خوش دلی سے خاطر مدارات کیا کرتیں۔اگر کوئی کھانے کے وقت گھر آ جاتا تو والد صاحب کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر ہر گز نہ جائے، ہماری امی نے پاپا کی اس خواہش پر ہمیشہ خوش دلی سے عمل کیا۔ہمارے گھر کا دستر خوان ہمیشہ دراز رہا۔یہ دستر خوان ہمیشہ فرشی ہوا کرتا تھا، ہم نے ہمیشہ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اِمی بہت باہمت اور قوت برداشت کی مالک تھیں، سارا سارا دن گھر کے کاموں میں لگیں رہتیں، زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا۔اِمی نے اپنی زندگی میں طویل عرصہ بیماری میں گزارا، اس کے باوجود حرفِ شکایت زبان پر نہیں دیکھا، تمام دن گھر کے کام کاج میں

مصروف رہا کرتیں۔ مارچ 2009 میں گلے کی تکلیف کی ابتداء ہوئی، کھانے پینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی، علاج مسلسل ہوتا رہا لیکن تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا گیا، نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ پانی بھی مشکل سے پیا جانے لگا۔ کہا کرتی تھیں کہ مجھے کینسر سے ڈر لگتا ہے، انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں گلے کی نالی کا کینسر ہو گیا ہے لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے۔ رمضان المبارک قریب آ رہے تھے، ادھر ان کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ صحت مند جسم آہستہ آہستہ کمزوری کی جانب مائل تھا۔ امی کو اسپتال جانے سے بھی خوف آتا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اسپتال میں داخل کرادیا گیا تو ان کے لیے بھی تکلیف کا باعث ہوگا اور ہم سب بھی پریشان ہوں گے، ان کی تکلیف کا علاج تو اب یہ رہ گیا تھا کہ غذا کے لیے نالی پاس کرادی جائے، اب انہیں آکسیجن کے بغیر سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ آکسیجن سیلنڈر بدلنے کے دوران ان کی حالت بگڑ جاتی، بلڈ پریشر ایک دم کبھی ہائی اور کبھی ایک دم کم ہو جاتا۔ میرا چھوٹا بیٹا ڈاکٹر نبیل جو عباسی شہید اسپتال میں تھا اب اسپتال سے اپنی دادی کے پاس ہی آ جاتا، ہم سب زیادہ وقت امی کے پاس ہی گزارا کرتے، ان کا کمرہ اسپتال کا کمرہ ہی بن گیا تھا، اسپتال کا ایک بیڈ بھی پڑوسی سے مل گیا تھا، اس سے اور زیادہ آسانی ہو گئی تھی، رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، امی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی، ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گئی تھیں۔ چہرہ سے

نقاہت اور کمزوری صاف عیاں ہونے لگی تھی، ستمبر کا مہینہ شروع ہونے میں کچھ دن باقی تھے، کہا کرتی تھیں کہ جمعرات مجھ پر بھاری ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے پاپا (ہمارے والد صاحب) کی اور میری فاتحہ ایک ساتھ ہی کرا دیا کرنا، اس کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب کا انتقال 5 ستمبر کو ہوا تھا، جیسے جیسے 5 ستمبر نذدیک آ رہی تھی ان کی حالت بگڑتی جارہی تھی، جمعرات ۱۲ رمضان المبارک (3 ستمبر 2009) صبح سے ہی حالت بگڑنا شروع ہو گئی تھی، دن میں کئی بار حالت بگڑی، صبح کے وقت ندیم اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر سید جمال احسن کو جو میرے ایک مرحوم دوست پروفیسر سید ریاض احسن کے بھائی ہیں کو گھر پر لائے، انہوں نے بھی ناامیدی کا اظہار کیا، اسی دن امی کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی، محسوس ہوا کہ وہ جاچکی ہیں، انہوں نے پھر سے سنبھالا لیا، تھوڑی دیر میں اُٹھ کر بیٹھ گئیں، ہم سب کو مسلسل خاموشی سے دیکھے جارہی تھیں، بالکل خاموش، شاید اللہ تعالیٰ نے انہیں ہم سب اور ہمیں انہیں سانس لیتا دیکھنے کی آخری مہلت دی تھی، اس وقت ہم سب کے اوسان خطا تھے، ہم نے بھی ان سے کوئی بات نہیں کی، ہم بھی خاموشی سے انہیں تکتے رہے، اچانک کومہ میں چلی گئیں، مَیں امی کے پیروں کی جانب کھڑا تھا، میرے برابر میری چھوٹی بہن روحی اور شاہین کھڑی تھیں، ایک جانب پرویز، تسلیم، ندیم تھے، امی کی چاروں بہویں شہناز، پروین، روبی اور اسماء بھی ایک جانب کھڑی تھیں، دائیں جانب ارشد ندیم اور بائیں جانب ڈاکٹر نبیل تھے۔ نبیل نے امی کے ہاتھ پر بلڈ پریشر کا آلہ

لگا یا ہوا تھا، ایک ہاتھ امی کی نبض پر تھا، نبض ڈوبتی جارہی تھی، بلڈ پریشر انتہائی نیچے کی جانب تھا، مسجد سے عصر کی اذان شروع ہوئی، ہماری نظریں امی کے چہرہ پر تھیں، گھڑی میں چار بجکر پینتالیس منٹ ہوئے ،یک لخت محسوس ہوا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا (جسے سرسراہٹ کہا جاسکتا ہے) امی کے پیروں سے شروع ہوا جب منہ تک پہنچا تو ان کا چہرہ ساکت اور بے جان ہو چکا تھا، اس لمحے میرے منہ سے نکلا 'نبیل امی گئیں'، اور بس ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ، ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ہمارے بند ہاتھوں سے ہماری انمول متع چھین کر لے گیا ہو ۔اِمی ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں اور ہم اپنے والد صاحب کے بعد اپنی ماں سے بھی محروم ہو گئے ۔ انا اللہ وانا علیہ راجیعون پروردگارِ عالم اِمی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس نصیب فرمائے ۔آمین۔ انہیں والد صاحب کی قبر کے قریب ہی جگہ ملی، صابرہ ، شاکرہ ، عالی حوصلہ کی زندگی کا سفر جو 1930 میں ہندوستان کی سرزمین سے شروع ہوا تھا 3 ستمبر 2009 (مطابق رمضان المبارک 1430 کو 79 سال بعد کراچی میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ ماں 12 سے قلبی تعلق اور عقیدت کا رشتہ اس قدر مستحکم اور اٹوٹ ہے کہ ماں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی یہ رشتہ اور تعلق ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔اس کی یادوں کے دیئے ہر دم روشن رہتے ہیں۔

ہر سال 12 رمضان ہمارے لیے ماں کی یاد کو خصوصیت کے ساتھ تازہ کر دیتا ہے۔ پانچ سالوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس بار اس یاد کو تازہ کرنے میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا۔ اس بار اپنی ماں کی برسی کے موقع پر مجھے دلی اطمینان کا احساس ہوا۔ اب میں اور میرا چھوٹا بھائی ندیم صمدانی صفورہ چورنگی پر' حارث بنگلوز' میں رہائش پذیر ہیں۔ جب میں یہاں شفٹ ہوا تو مجھے چند احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں ایک صاحب رمضان میں غریبوں کے لیے افطار دستر خوان سجاتے ہیں۔ یہ دستر خوان حارث بنگلوز کے لان میں سجایا جاتا ہے۔ مجھے اشتیاق ہوا کہ یہ دستر خوان کیسا ہوگا، کیا اس میں دیگر لوگ بھی حصہ لیتے ہوں گے یا نہیں، میں بہت جلد اس پروجیکٹ کے انتظامی معاملات میں شامل کر لیا گیا۔ پتا چلا کے یہاں کی ایسو سی ایشن کے نائب صدر معراج الدین صاحب ہر سال یہ دستر خوان سجاتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی، درمیانہ قد، گندمی رنگ، فربا جسم، کلین گندمی رنگ، غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، درمیانہ قد، چوڑا سینہ، مضبوط جسم، چہرے پر مسکراہٹ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، کلین شیو، سر پر کالے بال، سنجیدہ طرز گفتگو، خاصے جوشیلے، جذباتی ساتھ ہی با اصول آدمی ہیں۔ بلند آواز سے گفتگو کرتے ہیں، جس محفل میں یہ موجود ہوں دور ہی سے اس بات کا پتا دیدتی ہے کہ معروج صاحب موجود ہیں۔ انہوں نے 2004 میں ملیر سے حارث بنگولز میں سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ ان سے کئی تعلق نکل آئے، ملیر کھوکرا پار میں میرے کئی احباب رہائش رکھتے ہیں، میرے

حقیقی چچا جلیس احمد مرحوم ،اب ان کے بچے وہاں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قریبی عزیز ملیر کے باسی تھے ان سے معراج صاحب کے مراسم اور پھر یہ کہ یہ کہ معراج صاحب ایک کالج میں ملازمت کرتے ہیں، کالجوں سے تعلق رکھنے والوں کا جب بھی ذکر آتا ہے تو وہ میرے اور ان کے شناشہ ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ میری تعلق بھی کراچی کے مختلف کالجوں سے کئی برس رہا۔ میں سندھ پروفیسرز اینڈ لیکچرر ایسوایشن (SPLA) میں الیکشن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سرگرم رہا۔ یہاں عابد صاحب بھی رہا کرتے تھے جو کالج ڈائریکٹریٹ سے ریٹائر ہوئے تھے، وہ بھی میرے اور معراج صاحب کے کلیگ ہی ہوئے۔ وہ جب اس پروجیکٹ سے رخصت ہونے لگے تو ایک روز ہم دونوں مسجد میں برابر برابر بیٹھے تھے میرے کان خاموشی سے گویا ہوئے کہ ’صمدانی صاحب میں یہاں کی یونین میں فائینناس سیکریٹری کی ذمہ داری جو میرے کاندھوں پر ہے آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں میں نے یہاں کی یونین کے صدر اور دیگر احباب سے آپ کے بارے میں ذکر کردیا ہے‘۔ انھوں نے یہ سرگوشی میں اس طرح ادا کیے کہ مجھے صحیح معنوں میں پوری طرح سمجھ میں بھی نہیں آئے، اسی دوران تکبیر کا آغاز ہوگیا اور بات آئی گئی ہوگی۔ میں عابد صاحب کو انکار نہ کرسکا، اگر یہ بات کہیں باہر ہو رہی ہوتی تو میں یقینا ان سے معزرت کرلیتا۔ یہ ذمہ داری تھی یونین کے فائینانس سیکریٹری کی ۔ یعنی تمام پیسہ اور حساب کتاب رکھنا۔ حساب کتاب سے مجھے شروع ہی سے الجھن تھی، یہی وجہ ہے کہ میٹرک میں حساب کا پرچہ مشکل سے پاس کیا

تھا۔ مرزا غالب کا بھی حساب سے جی گھبراتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ ’ انہیں جوڑ لگانا نہیں آتا‘۔اب ہم عمر کے اس حصہ میں داخل ہو چکے ہیں کہ اس طرح کے کاموں کا بار اٹھانا گویا اپنے اوپر بار ڈالنے کے مترادف ہے۔ تعلیمی، سماجی، فلاحی، ثقافتی و تہذیبی کاموں شروع ہی سے دلچسپی رہی، تقریر کرنے سے لے کر پروگرام ترتیب دینے کا طویل تجربہ رہا۔ اس لیے اس قسم کے کاموں سے گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی، البتہ یہی وقت لکھنے یا پڑھنے میں لگ جائے تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ جناب عابد صدیقی صاحب اس پروجیکٹ سے رخصت ہوتے ہوئے اپنا بوجھ میرے ناتواں کاندھوں پر ڈال گئے۔ جسے میں چند ماں سے اٹھائے ہوئے ہوں دیکھیں کب کشتی ڈولنے لگے اور میں بوجھ اتار پھینکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس قسم کے کام گھاٹے کا سودا ہی ہوا کرتے ہیں، تعریف و توسیف تو دور کی بات ہے کوئی اسے سراہاتا بھی نہیں، حساب کتاب میں توجیب سے ہی دیناپڑتا ہے۔پھر بھی نہیں معلوم اللہ کو ہماری کون سی خدمت پسند آجائے اور کشتی بار لگ جائے۔ اسی جذبہ

سے کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔لکھنے کا عمل بھی یہی جذبہ لیے ہوئے ہے۔

بات اپنی ماں کی برسی اور معراج الدین کے ’ افطار دستر خوان‘ کی شروع ہوئی تھی، بیچ میری ذات آگئی پھر عابد صاحب آگئے۔ تو جناب رمضان المبارک شروع ہوا۔یکم رمضان سے ہی معراج الدین صاحب اپنے جملہ ساز و سامان کے ہمراہ

حارث بنگلوز کے مین گیٹ پر لان میں اپنے مددگاروں کے ہمراہ براجمان دیکھے گئے۔ جس چیز کو دیکھنے کا تجسس کئی ماہ سے تھا وہ اختتام کو پہنچا۔ ہم بھی ان کے دستر خوان کو دیکھنے کے لیے عصر کی نماز پڑھ کر وہی بیٹھ رہے۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ کیا بات ہے۔ اس نفسا نفسی کی دور میں، جہاں پیسہ کمانے کی ریس لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی اس ریس میں شریک ہو کر آگے سے آگے نکلنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ دنیا میں ایسے بھی ہیں جنھیں اپنی آخرت کی فکر ہے، اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی فکر ہے، غریب کی فکر ہے، بھوکے کو پیٹ بھر کھلانے کی فکر ہے۔ اب تک ہم نے کئی دستر خوان دیکھے تھے جیسے ایدھی کا دستر خوان، چھیپا کا دستر خوان، سیلانی دستر خوان وغیرہ۔ یہ افطار دستر خوان کسی بہت بڑی معروف سماجی شخصیت کا نہیں بلکہ یہ ایک ایسی شخصیت کی سوچ کا عملی مظاہرہ ہے جو غریب و نادار لوگوں کا درد اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ یہ انسانیت کی خدمت کا انفرادی اظہار ہے، مُفلِس لوگوں کو افطار کرا کے اپنے آپ کو مطمئن اور شکر بجا لانے موام ہے، ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی انفرادی طور پر اس قسم کی خدمت انجام دے جو مسلسل تیس روز تک جاری رہے۔ معراج صاحب از خود روزہ داروں کے ہمراہ افطار کرتے ہیں حالانکہ ان کا گھر دو قدم کے فاصلے پر ہے۔ انہیں یہ خدمت انجام دیتا دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، پروردگار انہیں صحت دے، ہمت دے، حوصلہ دے کہ یہ انسانیت کی خدمت اسی جوش و جذبہ کے ساتھ آئندہ بھی جاری رکھیں۔

میں نے معراج صاحب سے معلوم کیا کہ انہوں نے اس خدمت کا آغاز کب اور کیوں کر کیا، وہ کیا عوامل تھے کہ آپ نے افطار دستر خان سجانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک دو روز کا کام نہیں تھا بلکہ تیس روز وہ بھی روزہ کی حالت میں تن تنہا سامان کی خریداری کرنا، پھلوں کو کٹوانا، پلیٹوں میں لگوانا تمام کام اپنی نگرانی میں کرانا ایک صبر آزماں کام ہے۔اس کے لیے غیر معمولی حوصلہ و ہمت درکار ہوتی ہے۔ معراج صاحب نے بتایا کہ وہ 2004 میں ملیر سے حارث بنگلوز میں منتقل ہوئے۔ وہ ہر سال غریبوں کو اجناس کے بیگ جن میں کھانے پینے کی اشیاء آٹا، شکر، گھی، تیل، چاول، دالیں، چائے، مرچ مصالے وغیرہ ہوا کرتے تھے دیا کرتے تھے۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔ پھر انہوں نے ایک دن حارث بنگلوز کے لان کو دیکھا جو اتنا بڑا تھا کہ اس میں سو سے دو سو افراد کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں اپنے دوستوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ افطار دستر خوان لگانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا سب ہی نے ان کی اس خواہش کی تائید کی لیکن ان کے قریبی پڑوسی مسعود الحسن نے ان کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ عملی تعاون بھی کیا۔دستر خوان کے لیے اشیاء کی خریداری میں وہ ان کے ساتھ جوڑیا بازار بھی گئے۔ مسعود الحسن جو اب میرے بھی دوست ہو چکے ہیں 'پاکستانی امریکن' ہیں۔ کئی برس دیگر ملکوں کے علاوہ امریکہ میں رہے اب بھی

امریکہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ نستعلیق ہیں، متین، شائستہ، مہذب اور خوش خلق ہیں تعلق لکھنؤ سے ہے۔ ان کے اندر تو ایک لکھنوی انسان موجود ہی ہے ان کی ظاہری شخصیت لکھنؤیت لیے ہوئے ہے۔ چھوٹا قد، گورا رنگ، کتابی چہرہ، چھوٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، ، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت ، تحمل ، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار، چلتے ہوئے نیچے نظر، پٹی دار رنگین پاجامہ اور صاف ستھری سفید قمیض، گفتگو میں بھی لکھنؤیت کا حسین اظہار۔ مخلص اور بے لوث انسان ہیں۔ گزشتہ برس رمضان میں وہ امریکہ چلے گئے تھے تو وہاں سے افطار کے وقت معراج صاحب کو فون کیا کرتے اور افطار دستر خوان کے بارے میں معلوم کیا کرتے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سال انہوں نے افطار دستر خوان کی وجہ سے اپنے بچوں کے پاس امریکہ جانا ملتوی کر دیا۔ معراج صاحب کے مددگار حارث بنگلوز کے دو چوکیدار حبیب اللہ بلوچ اور شبیر عرف شبو بلوچ ہیں ۔ معراج صاحب کا ایک بھانجا اذلان علی بھی ہے جو عصر کے بعد موٹر سائیکل پر دوڑتا پھرتا ہے ساتھ ہی معراج صاحب کی گھن گرج والی آواز سے ڈانٹ ڈپٹ کھاتا، پھر بھی خوشی خوشی اشیاء افطار لاتا نظر آتا ہے۔ معراج حاحب کے گھر کے افراد خصوصاً ان کی بیگم بھی اس کارِ خیر میں برابر کی شریک ہیں اگر گھر کے لوگ ساتھ نہ ہوں تو انسان کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تمام

لوگ بے لوث خدمت خلق کر رہے ہیں۔ اس کی جزا اللہ ہی دینے والا ہے۔

اب میرا معمول ہوگیا کہ عصر کی نماز پڑھ کر لان میں چلا جاتا، معراج صاحب اور مسعود صاحب جنہیں ہم نواب مسعود الحسن کہتے ہیں سے سیاسی موضوعات پر گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے اور افطار کے انتظامات کی نگرانی بھی معراج صاحب کرتے رہتے ہیں۔ اس دوران مسعود صاحب ہندوستان کی یادیں بھی تازہ کرتے رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا جسم تو پاکستان آگیا ہے لیکن ان کی روح ابھی بھارت ماتا میں بھٹکتی رہتی ہے۔

افطار دستر خوان کو دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ اس بار اپنی امی کی برسی پر اس دستر خوان پر موجود روزہ داروں کی افطار کرادی جائے۔ اس خیال کی تائید میرے چھوٹے بھائی ندیم صمدانی نے بھی کی چنانچہ معراج صاحب سے گزارش کی کہ وہ 12 رمضان کی افطاری میں کھانے کا اہتمام ہمیں کرنے دیں اس کی وجہ بھی انہیں بتادی گئی انہوں نے خوشی خوشی ہماری تجویز کو قبول کرلیا۔ بعد ازاں اس پر عمل ہوا۔ یہ لمحہ میرے لیے انتہائی اطمینان کا تھا کہ اپنی ماں کی برسی کے موقع پر ان کے ایصال ثواب کے لیے مستحق و غریب لوگوں کو کھانا کھاتا دیکھ رہا تھے۔ نہیں معلوم آئندہ یہ دن نصیب ہو یا نہیں مجھے اس دن اپنی ماں کی یاد جس شدت سے آئی اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ اس بار میں نے اپنے گھر پر دعا نہیں کی بلکہ ان غریبوں، مسکینوں، بے سہارا لوگوں کے ہاتھ دعا کے لیے میرے ساتھ

اٹھے ہوئے تھے۔ کسی شاعر نہیں کیا خوب کہا اور سچ کہا۔

پیار کہتے ہیں کسے اور ماںتا کیا چیز ہے
کوئی ان بچوں سے پوچھے جن کی مر جاتی ہے ماں
موت کی آغوش میں جب تھک کر سو جاتی ہے ماں
تب جا کر تھوڑا سا سکوں پاتی ہے ماں
شکریہ ہو ہی نہیں سکتا کبھی اس کا ادا
مرتے مرتے بھی دعا جینے کی دے جاتی ہے ماں

شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی ماں کی یاد میں اپنے دُکھ بھرے جذبات اور احساسات کو جس انداز اور اسلوب میں پیش کیا "ماں" کے لیے یہ میرے ہی نہیں بلکہ ہر دکھ بھرے دل کی دردمندانہ اور پر خلوص دعا ہے :

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا !
نُور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا !
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے !

(رمضان المبارک 1436 مطابق 30 جون 122015)

اداس نسلیں' کے خالق عبداللہ حسین ۔ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھے'

معروف ناول 'اداس نسلیں' کے خالق عبداللہ حسین 4 جولائی 2015 ہفتہ کی صبح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دنیائے ادب ایک بلند پائے ناول نگار اور کہانی نویس سے محروم ہو گئی۔ عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' پاکستان، ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر میں پسند کیا گیا۔ ان کے اس شہرہ آفاق ناول کو نہ صرف قومی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر بھی بے حد پزیرائی ملی ۔ اس ناول عبداللہ حسین کو دنیا کے چوٹی کے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ پاکستان کی حکومت نے ان کی خدمات پر 2012 میں پاکستان کے سب سے بڑے لٹریچر ایواڈ کمال فن سے نوازا۔ جب کے ان کے اس ناول پر برطانوی نشریاتی ادارے نے ایک دستاویزی پروگرام ترتیب دیا جس پر انہیں آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ 2002 میں انہیں رائل سوسائیٹی آف لٹریچر کی فیلو شپ بھی دی گئی۔ عبداللہ حسین 'اداس نسلیں' کے علاوہ کئی ناولوں اور کہانیوں کے خالق بھی تھے۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں میں 'قید 2008 '، 'باگھ' ، 'نادار لوگ 2008'، 'رات 2010 '، 'فریب'، 'نشیب 2011'، باغ 2006 ' اور مجموعہ عبداللہ حسین : اداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب 2007 'میں شائع ہوئے۔ ان تمام تر ناولوں اور

کہانیوں میں عبداللہ حسین کو جو عروج اور شہرت 'اداس نسلیں' نے دی وہ قابل ذکر ہے۔ یہ ناول انہوں نے 25برس کی عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ناول پانچ برسوں میں مکمل ہوا۔ ناول کی تخلیق میں انہوں نے انتہائی محنت اور تحقیق و جستجو کی ۔وہ ناول نگاری کو ایک مشکل اور جبر سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ 'یہ محبت سے جنم لینے والے بے انت تنہائی تھی جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں نے خود کو ایک طویل حزنیہ کے حوالے کر دیا'۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ادیب اپنی ہم عصر نسل کے لیے لکھتا ہے۔ ان کے اس فلسفے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے اس لیے کہ جب ادب تخلیق پا جاتا ہے تو وہ موجودہ زمانے کے لیے تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ ادب آئندہ زمانے میں آنے والی نسل در نسل کو بھی مستفیض کرتا ہے۔ وہ نسل اس ادب کی بنیاد پر کسی بھی مصنف کی تحقیق کو آگے بڑھاتی ہے۔

عبداللہ حسین پاکستان کے شہر راولپنڈی میں 14اگست 1931کو پیدا ہوئے لیکن ان کا آبائی شہر گجرات تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گجرات ہی سے حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز ضلع جہلم سے کیا۔ ابتدا میں ایک سیمنٹ فیکٹری میں ملازمت اختیار کی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور کینڈا چلے گئے۔ کینڈا کے بعد انہوں نے برطانیہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہیں پر اداس نسلیں تخلیق پائی۔ یہ ناول پاکستان سے سب سے پہلے 1963 میں 'نیا ادارہ' نے شائع کیا۔ یہ

ناول اور یہی زمانہ عبداللہ حسین کی شہرت اور بلندیوں کا باعث بنا۔ اب وہ پاکستان کے نامور ناول نگار کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔ کہانیوں اور ناول نگاری کا سلسلہ زیادہ مستقل مزاجی اور تسلسل سے جاری رہا۔ کئی کہانیاں ان کے قلم سے منظر عام پر آئیں۔ ٹیلی وژن کے پروڈیسرز نے ان کی کہانیوں کو اپنے ڈرامے کے لیے منتخب کیا، ہندوستان کے ایک فلم ساز نے بھی ان کے ناول 'واپسی' پر ایک فلم بھی بنائی گئی۔ ان کا ناول 'نشیب' نے بھی مقبولیت حاصل کی، اسے بھی عوام نے پسند کیا اور اس نے بھی شہرت کی بلدیوں کا چھوا۔

عبداللہ حسین کی زندگی کا زیادہ تر حصہ مغربی ممالک میں گزرا، وہاں رہتے ہوئے انہوں نے اردو کو اپنے گلے سے لگائے رکھا۔ بعض لکھنے والوں کا کہنا تھا کہ عبداللہ حسین رہتے انگریزوں کے ساتھ ہیں لیکن اپنی تحریروں میں وہ پاکستان کے دیہات سے باہر نہیں نکل پاتے۔ ان کی بعض بعض تحریروں میں انگری کے الفاظ بالکل ناپید نظر آتے ہیں۔ عبداللہ حسین کافی عرصہ سے پاکستان کے شہر لاہور کے علاقے ڈیفنس میں رہائش پذیر تھے۔ انہیں بلڈ کینسر ہوگیا تھا جس سے وہ کافی عرصہ سے جنگ کررہے تھے۔ آخر کار وہ ہارگئے اور موت جیت گئی۔ ڈیفنس کے ایک نجی اسپتال میں زیر علاج رہے اور ہفتہ کے روز اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ان کے انتقال سے دنیائے ادب سے تعلق رکھنے والی برادری پائے کے ناول نگار اور کہانی نویس سے محروم ہو گئی۔ عبداللہ حسین کی وفات ملک اور ادبی حلقوں کے

لیے نقصان عظیم ہے۔ انھوں نے قومی زبان کی ترقی اور اردو ادب کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ اردو ادب کا ایک قیمتی اثاثہ تھے۔ ہماری ویب 'رائیٹر کلب' کے اراکین عبداللہ حسین کے انتقال پر اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالٰی مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفروس میں اعلٰی مقام نصیب ہو۔ (6جولائی 2015)

دنیا کا سب سے بڑا افطار دستر خوان

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید کی سورۃ البقرہ میں رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت فرمائی ۔امت کو روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہوئے اسی سورۃ کی آیت 183 میں حکم ربی ہوا ۔ترجمہ "اے ایمان والوں ! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے (روزوں کا یہ حکم تم کو اس لیے دیا گیا) تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو"۔ اللہ کے اس حکم میں تین باتیں کہی گئیں ہیں ایک یہ کہ روزے تم پر فرض کیے گئے، دوسرے یہ کہ روزے اسی طرح تم پر فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے کی امتوں پر فرض کیے گئے تھے تیسرا یہ کہ روزہ کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ اس فرض کی ادائیگی سے تم میں تقویٰ پیدا ہو گا۔ روزہ اسلام کے عناصر اربع میں سے ایک ہے یعنی جس طرح توحید و رسالت پر ایمان کے ساتھ ساتھ نماز، زکوۃ، حج پر ایمان ضروری ہے اسی طرح روزہ بھی ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ روزہ تاثیر و خصوصیت کا ذکر کلام میں بہت واضح طور پر ملتا ہے۔ روزوں کے لیے اسی مہینے کا انتخاب کیا گیا جس میں پروردگار نے اپنی کتاب قرآن کریم اپنے پیارے محبوب حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔ یہ مہینہ بے شمار و بے حساب رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اللہ کے فرشتے اللہ کے خاص احکام و پیغام کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں۔

اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث مبارکہ جو صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بیان کی گئی ہے۔ فرمایا آنحضرت محمد ﷺ نے 'جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں'۔ ابن ماجہ میں اسی حدیث مبارکہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے راوی بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرمایا رسول ﷺ نے "جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات جکڑ دئے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رہتا اور جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی دروازہ بھی بند نہیں کیا جاتا، اور اللہ کا منادی (فرشتہ) پکارتا ہے کہ اے خیر اور نیکی کے طالب قدم بڑھاکے آ، اور اے بدی اور بدکرداری کے شائق رک، آگے نہ آ، اور اللہ کی طرف سے بہت سے (گناہ گار) بندوں کو دوزخ سے رہائی دی جاتی ہے (یعنی ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمادیا جاتا ہے) اور یہ سب رمضان کی ہر رات میں ہوتا رہتا ہے"۔
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو آنحضرت محمد ﷺ نے ایک خطبہ عنایت فرمایا۔ جس میں رمضان المبارک کی عظمت و

فضیلت اور روزہ کی اہمیت نیز شب قدر جو ہزار مہینوں سے افضل رات ہے کے بارے میں بتایا۔ اس خطبے میں آپ ﷺ نے روزہ دار کا روزہ کھلوانے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا "جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو اس کے کئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ صحابہ نے آپ سے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا افطار کرادے۔ آپ ﷺ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا"۔ رمضام المبارک میں روزہ دار کا روزہ کھلوانا انتہائی ثواب اور عجبر کا باعث ہے۔

رمضان المبارک میں روزہ داروں کو انفرادی طور پر اور اجتمائی طور پر افطار کرانے کا اہتمام جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مسلمان اپنی استطاعت اور اپنے نبی ﷺ

کے فرمان کے مطابق روزہ داروں کو افطار کراتے ہیں۔ مساجد میں اجتماعی افطار کی روایت بہت پرانی ہے۔ مساجد میں اجتماعی افطار کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب افطار کا یہ سلسلہ گلی محلوں، فٹ پاتوں، سڑکوں، میدانوں، پارکوں تک وسیع ہوگیا ہے۔ فلاحی خدمت کے بے شمار ادارے جگہ جگہ افطار دستر خوان لگانے کا اہتمام کرتے ہیں۔

پاکستان میں ایدھی کا افطار دستر خوان، چھیپا کا افطار دستر خوان، سیلانی کا افطار دستر خوان اور بے شمار ادارے ملک کی جانب سے کئی شہروں میں افطار دستر خوان لگایا جاتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا افطار دستر خوان مسلمانوں کے معتبر و محترم شہر مکہ المکرمہ میں خانہ کعبہ میں پورے رمضان سجایا جاتا ہے جہاں پر بلا تفریق روزہ داروں کو روزہ افطار کرانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ میں رمضام المبارک میں ہر روز لگایا جانے والے افطار دستر خوان کی لمبائی 12 کلو میٹر ہوتی ہے۔ یہ افطار دستر خوان خانہ کعبہ کے گرد طواف کی جگہ بچھایا جاتا ہے۔اس پر روزانہ 12 لاکھ روزے دار افطار کرتے ہیں۔ اس افطار دستر خوان پر ہر روز 10 لاکھ سعودی ریال تقریباً 28 لاکھ پاکستانی روپے خرچ ہوتا ہے۔ افطار کے دوران روزہ داروں کو 50 لاکھ کھجوریں، 20 لاکھ آب زم زم کی بوتلوں کے علاوہ جوس، دودھ، کیک، روٹی اور دیگر اشیاء سے تواضع کی جاتی ہے۔ وہ تمام لوگ جو حج یا عمرہ کے لیے جاچکے اچھی طرح واقف ہیں کہ حرم میں صفائی اور

ستھرائی کا نظام کس قدر تیز رفتاری سے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا سب سے بڑا افطار دستر خوان جس کے گرد تقریبا 12 لاکھ افراد روزہ افطار کر رہے ہوتے ہیں صرف 10 منٹ میں سمیٹ لیا جاتا ہے اور مطاف کی دھلائی اور صفائی کر دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کے گھر کی برکت ہے۔ جہاں پر ہر وقت، ہر لمحہ رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ (23 رمضام المبارک 1436ھ، 11 جون 2015)

لیلتہُ القدر۔ رحمتوں ، برکتوں اور دعاؤں کی قبولیت کی رات

قرآن کریم رمضام لمبارک میں نازل ہونا شروع ہوا،اس کی مختلف آیات مختلف اوقات میں بتدریج نازل ہوئیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت 185 ترجمہ " رمضان کا مہینہ (روزوں کا مہینہ) ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے"۔ جس طرح قرآن اور اسلام کے احکامات بتدریج عائد ہوئے اسی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ رسول عربی آنخضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر ماہ تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ یہ ابتدائی حکم تھا جو رمضان کے روزوں کے متعلق 2 ہجری میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں ، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلادیا کریں۔ ایک سال بعد ایک اور آیت نازل ہوئی جس میں رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا، اور یہ عام رعایت منسوخ کردی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دُودھ پلانے والے عورت اور ایسے عمر رسیدہ لوگوں کے لیے، جن میں روزہ رکھنے کی

استطاعت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں اُس سے چھوٹ گئے تھے۔

قرآن کریم کی سورۃ 'القدر' جو کہ مکی سورۃ ہے میں بہت واضح الفاظ میں قرآن کے شبِ قدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے۔ ترجمہ :

ہم نے اِس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔ اور تمھیں کیا معلوم " کہ شب قدر کیا ہے ؟۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں رُوح (الامین) اور فرشتے ہر کام کے (انتظام کے) لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اُترتے ہیں۔ یہ (رات) طلوعِ فجر تک (امان اور) سلامتی ہے"۔

قرآن کی 'سورۃُ القدر' نزولِ قرآن، اس رات کی عظمت اور تعظیم و اہمیت کے لیے کافی ہے۔ سورۃ القدر کے علاوہ سورۃ بقرہ میں بھی ارشاد ربانی ہے "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا"، اسی طرح سورۃ دُخان کی آیت 3 میں اسی رات کو مبارک رات کہتے ہوئے فرمایا "ہم نے اسے (قرآن) ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے"۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک سے زیادہ بار قرآن کے اس مبارک رات میں اتارنے اور اس رات کو مبارک رات کہا ہے۔ اس رات میں کلام مجید کے نزول کے دو مطلب مفسرین نے بیان کیے ہیں ایک یہ کہ لیلتہُ القدر

میں پورا قرآن جبرائیل علیہ السلام کے حوالے کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت کر دی کہ وہ وقت، حالات، ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً 23 سال کے دوران اس کی آیات و سورتیں محبوب سبحانی حضرت محمد ﷺ پر نازل کرتے رہیں۔ دوسرا مطلب مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ پر قرآن کے نزول کا آغاز اور ابتدا اس رات سے ہوئی۔ پھر 23 برس تک اللہ تعالیٰ وقت، حالات اور ضرورت کے مطابق قرآنی آیات و سورتیں اپنے محبوب پر نازل کرتا رہا۔ دونوں مطالب کی صورتوں میں لیلۃُ القدر میں قرآن کا نزول اس رات کو دیگر تمام راتوں سے معتبر، محترم اور عقیدت کا حامل بناتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے لیلۃُ القدر کی صورت میں امتِ رسول ﷺ پر ایک انعام و اعزاز عطا فرمایا۔ اس متبرک رات میں نفلی عبادات اور سنتوں کی ادائیگی کا ثواب فرضی عبادات کے مشاوی عطا کیا جاتا ہے۔ اس رات میں عبادت کے بدلے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندے کو ایک ہزار مہینے کی عبادت سے بڑھ کر ثواب عطا فرماتا ہے۔

لیلۃُ القدر کے بارے میں قرآن کے بعد ارشاد نبوی ﷺ کا مطالعہ اس رات کی فضیلت و عظیمت کے دروازے اور بھی کھول دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا آنحضرت محمد ﷺ نے 'جب رمضان

آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں'۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم

ایک اور حدیث جس کے راوی بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں فرمایا رسول ﷺ نے "جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنات جکڑ دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے سارے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رہتا اور جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ان کا کوئی دروازہ بھی بند نہیں کیا جاتا، اور اللہ کا منادی (فرشتہ) پکارتا ہے کہ اے خیر اور نیکی کے طالب قدم بڑھاکے آ، اور اے بدی اور بد کرداری کے شائق رک، آگے نہ آ، اور اللہ کی طرف سے بہت سے (گناہ گار) بندوں کو دوزخ سے رہائی دی جاتی ہے (یعنی ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمادیا جاتا ہے) اور یہ سب رمضان کی ہر رات میں ہوتا رہتا ہے"۔
(جامعہ ترمذی، سنن ابن ماجہ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خیر کی بخشش اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں اللہ کے سب بندوں سے فائق تھے۔اور رمضان مبارک میں آپ ﷺ کی یہ کریمانہ صفت اور زیادہ ترقی کر جاتی تھی۔ رمضان کی ہر رات جبرائیل امین آپ ﷺ سے ملتے تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کو قرآن مجید سناتے تھے۔ تو جب روزانہ جبرائیل امین آپ ﷺ سے ملتے تو آپ کی اس کریمانی نفع رسائی اور

خیر کی بخشش میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہواؤں سے بھی زیادہ تیزی آجاتی اور زور پیدا ہوجاتا'۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم

معارِف الحدیث' کے مصنف مولانا محمد منظور نعمانی نے آنحضرت محمد ﷺ کا ماہ' شعبان کی آخری تاریخ کا خطبہ نقل کیا ہے اس میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شبِ قدر) ہزار مہینے سے بہتر ہے، اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ خداوندی میں کھڑے ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا۔ اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر (70)فرضوں کے برابر ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے، اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو اس کے کئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ صحابہ نے آپ

سے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا افطار کرادے۔آپ ﷺ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس ہی نہیں لگے گی تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا"۔اس خطبہ نبوی ﷺ کی تشریح یہ بیان کی گئی ہے کہ اس خطبہ میں سب بڑی اور پہلی عظمت وفضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں ایک ایسی رات کی خوش خبری دی گئی ہے جو ہزار دنوں اور راتوں سے نہیں بلکہ ہزار مہینوں سے بہتر اور افضل ہے۔ ایک ہزار مہینوں میں تقریباً تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں، اس لیلتہ القدر کے ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اس کے قرب و رضا کے طالب بندے اس ایک رات میں قرب الٰہی کی اتنی مسافت طے کر سکتے ہیں جو دوسری ہزاروں راتوں میں طے نہیں ہو سکتی۔

لیلتہ القدر رمضام المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے۔ یہ طاق راتیں رمضام المبارک کی 29,27,25,23,21 راتیں ہیں۔ ان راتوں میں لیلتہ القدر کو تلاش کرنے اور پانے کے لیے کہا گیاہے۔ رمضام المبارک کو تین عشروں میں

تقسیم کیا گیا ہے پہلا عشرہ پہلے روزے سے دسویں (10) روزے تک ہے جو رحمت کا عشرہ کہلاتا ہے، دوسرا عشرہ گیارویں (11) روزے سے بیسویں (20) روزہ تک، یہ گناہوں سے توبہ اور معافی کا عشرہ ہے جب کہ تیسرا عشرہ اکیسویں (21) روزہ سے شروع ہوکر اختتام رمضان تک ہے، یہ عشرہ جہنم سے نجاد کا عشرہ ہے۔ لیلتہ القدر بھی اسی عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کی جاتی ہے۔ رمضان کے اس آخری عشرہ کو پہلے اور دوسرے عشرہ کے مقابلے میں فضیلت اور برتری حاصل ہے اس کی وجہ اس عشرہ یں لمیلتہ القدر یعنی مقدس رات کا پایا جانا ہے۔ ان راتوں میں رسول اللہ ﷺ زیادہ عبادت میں مشغول رہا کرتے اور آپ ﷺ نے ان طاق راتوں میں زیادہ خشوو خضوع کے ساتھ عبادت کرنے کی ہدایت کی۔اس رات میں خصوصیت کے ساتھ عبادت کرنے ، لیلتہ القدر کوتلاش کرنے کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالے حسب ذیل احادیث کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت میں مجاہدہ کرتے اور وہ مشقت اٹھاتے جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ جب رمضان کا عشرہ اخیر شروع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے (یعنی پوری رات

عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے) اور اپنے گھر کے لوگوں (یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین) کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں میں برکتوں اور (سعادتوں میں حصہ لیں)۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں'۔ (صحیح (بخاری

لیلتہ القدر کی راتوں میں کیا پڑھا جائے، کس طرح عبادت کی جائے ۔ اس سلسلے میں مختلف کتب میں بے شمار دعائیں بہ آسانی مل جاتی ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کرنے، نفل نماز پڑھنے کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام مجید نہیں پڑھ سکتے، وہ مختلف دعائیں نہ تو انہیں زبانی یاد ہیں اور نہ ہی وہ دیکھ کر پڑھ سکتے ہیں۔ تو پھر وہ کس طرح لیلتہ القدر میں عبادت کریں؟ ان لوگوں کو پریشان ہونے، فکر کرنے، خوف کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالی اپنے بندوں کو مشکل میں ہرگز نہیں ڈالتا، وہ مہربان ہے، رحیم ہے، کریم ہے، غفور ہے، ہمارے دلوں کا حال بہتر جانتا ہے، ویسے بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ جو عربی نہیں پڑھ سکتے، انہیں دعائیں یاد نہیں نہ ہی وہ عربی میں دعائیں پڑھ سکتے ہیں۔ ایسے افراد اپنی ہی زبان

میں اردو آتی ہے تو اردو میں، سندھی آتی ہے تو سندھی میں، پنجابی آتی ہے تو پنجابی میں، پشتو یا بلوچی آتی ہے تو پشتو یا بلوچی میں ہی دعا کریں۔ جو کچھ ان کے دل میں ہے، اس بات کا خیال نہ کریں کہ اس کے لیے مخصوص الفاظ اور جملوں کی ہی ضرورت ہوتی ہے بس اپنے اللہ سے مانگتے رہیں، کچھ نہیں پڑھ سکتے تو صرف اللہ اللہ کیے جائیں، کسی پاک صاف جگہ، بہتر ہے مرد حضرات مسجد میں، خواتین اپنے گھر کے کسی کونے میں جو پاک صاف ہو تنہائی میں بیٹھ جائیں، عام دنوں میں جس طرح نماز پڑھتے رہے ہیں اسی طرح نماز پڑھیں، کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہیں، درود شریف کا ورد کرتے رہیں، آنکھیں بند کرکے، روشنی کو مدھم کرلیں، اللہ کی طرف مکمل توجہ اور یہ خیال کہ آپ اپنے رب کے سامنے موجود ہیں وہ آپ کو دیکھ رہا ہے، کسی بھی دنیاوی بات کا خیال اپنے دل میں ہرگز نہ لائیں، عجز و انکساری کے ساتھ، عاجزی کے ساتھ، خشوع و خضوع کے ساتھ، فروتنی کے ساتھ، لجاجت کے ساتھ، اپنے پروردگار کی منت ساجت کرتے ہوئے، خوشامدانہ انداز میں، اپنے مالک کو خوش کرتے ہوئے بس یا اللہ ہو، یا رحمٰنُ، یا رحیمُ، یا قیومُ کا ورد کرتے رہیں۔ جو لوگ کلام مجید پڑھ سکتے ہیں، دعائیں پڑھ سکتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ تلاوت کلام پاک کریں، جو دعائیں آپ کو مل جائیں وہ پڑھیں، بے شمار دعائیں تو کلام مجید میں موجود ہیں وہ پڑھتے رہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتایئے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی رات شبِ قدر ہے تو میں اس رات اللہ سے کیا عرض کروں اور کیا دعا مانگوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیمٌ تُحِبُّ العَفوَ فَاعفُ عَنِّی

ترجمہ "اے میرے اللہ! تو بہت معاف فرمانے والا اور بڑا کرم فرما ہے، اور معاف کردینا تجھے پسند ہے۔ پس تو میری خطائیں معاف فرمادے"۔ (مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ) (ا جولائی 2015)

وزیراعظم لیاقت علی خان اور نصف حصہ کی ملکیت کا دعویٰ

پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے خاندان کا مظفر نگر (یو پی) کے نصف حصہ کی ملکیت کا دعویٰ

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح کے دستِ راست خان لیاقت علی خان جن کا تعلق ہندوستان کے صوبے اترپردیس (یو پی) کے ضلع مظفر نگر سے تھاکے رشتہ داروں نے مظفر نگر شہر کے نصف حصے کی ملکیت کا دعویٰ دائر کردیا ہے۔ اگر ان کا خاندان یہ مقدمہ جیت گیا تو آدھا مظفر نگر شہر اس خاندان کی ملکیت ہوجائے گا۔ جس میں مظفر نگر ریلوے اسٹیشن، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی رہائش گاہ، مرکزی اسکول اور کئی اہم عمارتیں شامل ہوں گی۔

مظفر نگر ہندوستان کے یو پی (اترپردیس) کا ایک ضلع ہے، یہ شمالی مغربی اضلاع میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی چار تحصیلیں بڑھانہ، کیرانہ، جھنجھانہ اور شاملی ہیں۔ اس کی آبادی مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کے اطراف نزدیک ترین شہروں میں بجنور، کرنال، پانی پت، ہسار، ہریانہ، روھتک، بڑہانہ، میرٹھ، سہارنپور، آگرہ، اور دیوبند واقع ہیں۔

روزنامہ جنگ (18 جولائی 2015) نے بھارتی اخبار 'ٹائمز آف انڈیا' کے حوالے سے رپورٹ شائع کی جس کے مطابق ' مغربی اتر پردیش کے شہر مظفر نگر میں 674 کروڑ روپے کی جائیداد کی ملکیت کا تنازعہ مبینہ طور پر لیاقت علی خان اور ان کے رشتہ داروں کے متعلق ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے اس دعوے کو رد کرنے کے لیے تمام پرانے ریکارڈ کھول دیے ہیں 2003 میں لیاقت علی خان کے دور کے رشتہ دار ہونے کے دعوے دار چار مقامی لوگوں نے اس اراضی کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے۔انہوں نے یوپی کے ریونیو کمیشن سے رابطہ کرکے خاندان کی ملکیت 106 پلاٹوں کا قبضہ حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جو تقریباً مظفر نگر کا 50 فیصد ہے۔ مظفر نگر کے ڈی ایم کو دو ہفتے قبل ریونیو کمیشن کی جانب سے اس معاملے کی چھان بین کی ہدایت موصول ہوئی، ان چاروں پر پر فوری طور پر دھوکہ دہی کا لیبل لگا دیا گیا ہے اور ان کے خلاف ایک ایف آر درج کرکے تحقیقات شروع کردی گئی ہے۔جس کی قیادت ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (فنانس) کر رہے ہیں۔ لیاقت علی خان مظفر نگر سے 1926اور1940کے درمیان مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور صوبائی قانون ساز کونسل کے ایک رکن کے طور پر کام کیا تھا۔لیاقت علی خان کے ان چاروں رشتہ داروں کے مطابق لیاقت علی خان کے خاندان کی ضلع میں بڑی جائیداد تھی اور پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اس جائیداد کی امانتی تحویل ان کے اپنے کزن عمر دراز کو دی گئی ۔اس کے بعد دراز علی کے بیٹے اعجاز علی مالک بنے، یہ چاروں دعوی دار اعجاز کی اولاد ہیں۔مقامی تحصیلدار ارجن کانت

کا کہنا ہے کہ جمشید علی، خورشید علی، ممتاز بیگم اور امتیاز بیگم نے 26فروری 2003 میں امانتی تحویل کی دستاویز جمع کرائی۔ دو سال کے انتظار کے بعد امانتی تحویل کی دستاویزات لکھنو میں ریوینو بورڈ کو ارسال کی گئی۔ بورڈ نے ضلعی انتظامیہ کو ان پلاٹوں کی حقیقی پوزیشن اور ان پر تعمیر عمارتوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کی اور یہ بات سامنے آئی کہ دعوی کی گئی اراضی پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بنگلے، ریلوے اسٹیشن، کمپنی باغ، مرکزی اسکول، اور دیگر اہم سرکاری عمارتیں قائم ہیں۔ مظفر نگر کے ڈی ایم نکھل چندر شکلا کا کہنا ہے کہ یہ ایک فراڈ کا معاملہ ہے ہم نے ریوینو ریکارڈ کی جانچ پڑتال کی ہے اور تمام عمارتیں سرکاری زمین پر کھڑی ہیں۔تاہم انہوں نے کہا کہ اگر ان کا دعویٰ درست بھی ہے تو چار دعویداروں کے پاس اعجاز علی سے منتقلی کی اصل دستاویز کہاں ہیں۔ اتنی بڑی جائیداد کی منتقلی پر کوئی اسٹامپ ڈیوٹی ادا نہیں کی گئی۔ تاہم ان چاروں دعویداروں میں سے ایک نے نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست پر بتایا کہ ان کے پاس جائیداد کی ملکیت ثابت کرنے کا ریکارڈ موجود ہے۔انتظامیہ ایک گندہ کھیل کھیل رہی ہے۔ انہوں نے کہا جمشید علی، خورشید علی، ممتاز بیگم اور امتیاز بیگم عمر دراز علی خان کی براہ راست اولاد ہونے کی وجہ سے جائیداد کے مالک ہیں۔اس کو ثابت کرنے کے لیے ریکارڈ موجود ہے'۔ اخباری رپورٹ کے مطابق اسی طرح کا ایک قانونی مقدمہ 2005 میں سپرم کورٹ میں تھا اور آزاد بھارت میں

یہ

شاید سب سے بڑا جائیداد کا تنازع تھا۔ سیتا پور اور لکھنو میں کم از کم تین ہزار کروڑ مالیت کی جائیداد جس پر سپریم کورٹ نے محمود آباد کے سابق راجہ محمد عامر خان کی ملکیت قرار دیا جو ریاستی حکومت کے کنٹرول میں تھی۔

پاکستان کے اولین وزیر اعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان کا تعلق مظفر نگر سے تھا۔ کہا جاتا ہے لیاقت علی خان کے سلسلہ نسب شہرہ آفاق ایرانی بادشاہ نوشیر وان عادل سے ملتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد نے ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا۔ جب آگرہ اکبر آباد بنا تو اس خاندان کے چند افراد نے بھی پایہ تخت کو جا بسایا اور بعض ہندوستان کے ضلع مظفر نگر میں منتقل ہو گئے جہاں انہیں جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ انیسویں صدی عیسویں کے شروع میں مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی اور برطانوی حکومت زور پکڑ رہی تھی، اس خاندان والوں نے مظفر نگر کو بھی خیر باد کہا اور کرنال میں سکونت اختیار کی کیونکہ ان دنوں وہاں کی فضا زیادہ سازگار اور ماحول زیادہ دلپزیر تھا۔ مظفر نگر سے کرنال منتقل ہونے والوں میں سے ایک نوجوان نواب احمد علی خان کا خاندان بھی تھا۔ نواب احمد علی خان نے کرنال کے قریب راجپورہ ضلع سہارنپور کے ایک نواب ماہر علی خان کی صاحبزادی سے شادی کر لی موصوف ذوقِ علم و ادب رکھنے کے علاوہ فن سپہ گری میں بھی خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شہرت و نیکنامی کا حال سن کر سرکارِ انگلشیہ نے ان کو اچھی طرح نوازا۔" رکن

الدولہ "، " شمشیر جنگ" اور" نواب بہادر" کے خطابات کے علاوہ انہیں جاگیریں عطا کیں اور اپنے مشیران میں شامل کرلیا۔ان کے انتقال کے بعد سرکاری خطابات ان کے بڑے بیٹے عظمت علی خان کو مل گئے اور سرکاری منصب بھی بدستور قائم رہا۔ لیکن اولاد سے محرم ہونے کے باعث وہ بہت جلد متاع دینوی سے بیزار ہوگئے ۔ چنانچہ ظاہری جاہ وجلال کو چھوڑ کر اور ذاتی جائیداد نیک کاموں کے لیے وقف کرکے وہ ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہوگئے۔ حکومت نے ان کے اعزازات وخطابات ان کے چھوٹے بھائی نواب رستم علی خان کو تفویض کر دیئے۔نواب رستم علی خان نہ صرف جائداد بلکہ خاندانی روایات کے بھی جائز وارث ثابت ہوئے۔ انھوں نے آباؤاجداد کی طرح خدمتِ خلق میں اس طرح حصہ لینا شروع کیا کہ ان کی شہرت کرنال اور سہارنپور کے محدود دائرے سے نکل کر سارے شمالی ہند میں پھیل گئی، ان کے ہاں نواب زادی محمودہ بیگم سے چار بیٹے ہوئے ، سجاد علی خان، لیاقت علی خان، خورشید علی خان اور صداقت علی خان۔
لیاقت علی خان یکم اکتوبر 1895ء میں کرنال میں پیدا ہوئے۔
تاریخی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ لیاقت علی خان کے خاندان کو حکومت کی جانب سے وسیع وعریض زمین وجائیداد تحفہ میں ملی تھی۔ اس خاندان کے بے شمار افراد قیام پاکستان کے وقت مظفر نگر سے ہجرت کرکے پاکستان منتقل ہوگئے جب کہ بے شمار افراد نے مظفر نگر کو ہی اپنے مسکن کے طور پر اپنائے رکھا۔ رقم الحروف

کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے اسی مردم خیز خطے سے ہے، مظفر نگر کا قصبہ حسین پور میرے اجداد کا مسکن تھا۔ میرے خاندان کے بے شمار گھرانے آج بھی مظفر نگر اور اس کے گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں آباد ہیں۔ لیاقت علی خان یا ان کے خاندان کی جائیداد پر کس کا حق ہے اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ لیاقت علی خان کی ملکیت اگر ہندوستان میں ہے اور شواہد بتاتے ہیں کہ وسیع جائیداد وہ از خود اپنے آبادئی شہر میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اب اس جائیداد پر کیا ان کے خاندان کا حق ہے یا یہ جائیداد پاکستان کی ملکیت کے زمرہ میں آتی ہے۔

حکومت پاکستان کو اس کے حوالے سے ماہرین سے مشورہ کرنا چاہیے، اگر پاکستان کا حق ملکیت بنتا ہے تو ہندوستان سے اس کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ لیاقت علی خان کے خاندان کے متعدد افراد اس وقت پاکستان میں بھی ہیں اور وہ کوئی قابل ذکر پوزیشن بھی رکھتے۔ کیا اس جائیداد میں ان کا بھی کوئی حصہ بنتا ہے؟

مظفر نگر کی سرزمین نے علماء دین، صوفیائے اکرم اور فقہا اسلام کو جنم دیا، اہل دانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی، اعلیٰ منتظمین، معلّمین، منصفین و مصنفین پیدا کیے ہیں، جن کے خیالات اور تصنیفات سے ہمارے کتب خانے مالا مال ہیں۔ ان کی خدمات کو عالمی سطح پر معتبر حیثیت حاصل ہے۔ ان نامور شخصیات نے برصغیر پاک و ہند میں علم و ادب، اسلامی علوم۔ تہذیب و ثقافت پر

گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مبشر احمد واحدی نے اپنی کتاب "گلشن واحدی" میں قصبہ بڑھانہ ضلع مظفر نگر کے بارے میں تحریر کیا کہ " قصبہ بڑھانے میں ہر قسم کے لوگ بکثرت آباد تھے۔آب و ہوا خوشگوار، علاقہ بارونق اور پرُ فضا تھا۔ دکانوں کا تو ذکر کیا منڈی میں باون مہاجن فقط ہنڈی والے تھے۔ لین دین میں ہنڈی کا کاروبار ایسا تھا جیسا آج کل بنک سرانجام دیتے ہیں۔ شاہان مغلیہ کے دور میں یہ قصبہ دارالقضا، دار لافتا اور دارالعلم تھا۔ 'دارالقضا' یعنی بذریعہ قاضی مقدمات کے فیصلوں کا مرکز، 'دارالفتا' جہاں سے بذریعہ مفتی سند فتویٰ حاصل کی جاتی تھی، 'دارلعلم' یعنی رائج الوقت تعلیم کا مرکز۔چونکہ باشندگان علاقہ کو علما، فقہا اور صوفیہ کی صحبت حاصل تھی اس لیے عرصہ دراز سے مظفر نگر نہایت مردم خیز علاقہ مشہور ہے۔ یہاں سے بڑی بڑی نامور ہستیاں وجود میں آئیں" ۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد مظفر نگر کا موضع 'پھلت' تھا، اسے قریہ اولیاء بھی کہا جاتا ہے۔ معروف عالم دین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے،احمد حمید نے اپنے مضمون "حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی" میں حکیم الامت کی ولادت و سیادت کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم سنگھ نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے بسایا جو تھانہ بھیم" کہلایا۔ پھر مسلمانوں"

کی آمد و سکونت پر اس کا نام "محمد پور" رکھا گیا مگر یہ نام مقبول و مشہور نہ ہوا اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ تھانہ بھیم سے "تھانہ بھون" ہوگیا۔ آگرہ شہر کے نواح ہیں واقع یہ چھوٹا سا قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آرہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت و وقوت اور صاحب فضل و کمال رہے ہیں۔ مجد دالملتہ حضرت شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے اجداد نے آج سے صدیوں قبل تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کرکے تھانہ بھون میں اقامت اختیار کی تھی"۔

معروف عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد (پیدائش 26 اپریل 1923ء وفات 14 اپریل 2010ئ)، کا تعلق خاندان حسین پور ضلع مظفر نگر سے تھا، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ) خاندان حسین پور سے تعلق رکھتے ہیں ضلع مظفر نگر ان کا آبائی شہر ہے۔ جناب مبشر احمد واحدی کا تعلق بھی مظفر نگر سے ہے۔ معروف شاعر احسان دانش جو شاعر مزدور بھی کہلاتے ہیں مظفر نگر سے تعلق رکھتے تھے،آپ اسی ضلع کے شہر کاندھلہ میں 1941ء کو پیدا ہوئے اور 12 مارچ 1982ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ احسان دانش نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ "میں قصبہ کاندھلہ مظفر نگر (یو پی) میں ایک مزدور کے گھر پیدا ہوا۔ کاندھلہ کی سرزمین علم نوازی، اور ادب پروری کے لحاظ سے تاریخی اور مشہور جگہ ہے۔ چناں چہ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولانا روم کے ساتویں دفتر کا شاعر اسی خاک پاک سے

اٹھا تھا اور آج تک برابر یہاں سے علمی چشمے پھوٹتے رہے ہیں"۔ معروف ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت تھانوی کا وطن بھی تھانہ بھون مظفر نگر تھا۔ کبھی میں نے

عرض کیا تھا

مظفر نگر تری عظمت کو سلام

کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تو نے

سردار محمد عبدالقیوم خان۔ مخلص کشمیری رہنما

10جولائی 2015، رمضان المبارک کی 22 جولا،بروز جمعہ کا معروف کشمیری پاکستانی رہنما سردار محمد عبدالقیوم خان اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ اگلے روز ۱۱ جولائی کو سردار صاحب کی تدفین عمل میں آئی۔ عین اُس وقت جب سردار صاحب کی روح پرواز کر رہی تھی پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف روس کے شہر' اوفا' میں بھارتی ہم منصب نریندر مودی سے ملاقات میں مصروف تھے۔پاک بھارت معاملات زیر بحث ہوں تو کشمیر کے بغیر نہ مکمل تصور کیے جاتے ہیں۔ سردر عبدالقیوم ان کشمیری رہنماؤں میں سے تھے جو کشمیر کے ساتھ ساتھ پاکستانی سوچ رکھتے تھے۔وہ کشمیر اور پاکستان کے ہی لیڈر نہ تھے بلکہ انہیں عالمی سطح کے رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔وہ عالم اسلام میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔وہ مذہبی اسکالر، سیاست کے موضوعات کے ماہر، نامور مجاہداور شعلہ بیان مقرر تھے۔ وہ آزاد کشمیر کے چار مرتبہ صدر منتخب ہوئے، ایک بار وزیر اعظم اور قائدِ حزب اختلاف کے منصب پر بھی فائز رہے۔ سردر عبدالقیوم کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ ان کے پاکستان کے حکمرانوں کے ساتھ جن میں سول اور عسکری رہنما بھی شامل ہیں اچھے اور قریبی تعلقات بھی رہے اور ان لیڈروں کے دور میں سردار صاحب کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، حتیٰ کہ وہ جیل میں بھی ڈال دیے گئے۔

بھٹو سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک، بے نظیر سے نواز شریف تک اور اس سے پہلے
ایوب خان
کے دور میں سردار صاحب نے کشمیر کے لیے طویل جدوجہد کی۔ لیڈروں سے اختلاف
بھی ہوا، اچھے تعلقات بھی رہے۔
مجھے سردار عبدالقیوم مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ سردار صاحب برطانوی انڈین آرمی کی انجینئرنگ کور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کشمیر کی عملی سیاست میں سرگرم عمل ہو چکے تھے۔ کرنل علی احمد شاہ ریاست کے صدر تھے اس وقت پہلی مرتبہ 13 مئی 1950 کو سردار صاحب نے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تھا۔ گویا سردار عبدالقیوم کی عملی سیاست پچاس کی دھائی میں شروع ہوئی۔ یہ دور مختصر تھا۔ چھ سال کی عملی سیاسی جدوجہد کے بعد سردار عبدالقیوم ستمبر1950 میں پہلی مرتبہ آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہوئے۔ سردار صاحب کا یہ دور بھی مختصر تھا۔ اس دوران آپ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعت 'مسلم کانفرنس' سے وابستہ ہو چکے تھے، آپ میں دوسری بار کشمیر کے صدر منتخب ہوئے۔ 1962 میں کشمیر کونسل کی لوکل1956 باڈیز کے الیکشن میں رکن منتخب ہوئے۔ آپ انتخابات میں بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں بسنے والے کشمیریوں کو ان انتخابات میں حقِ رائے دہی حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان انتخابات کے سلسلے میں سردار صاحب نے کشمیری ووٹروں سے ملاقات اور

انہیں مسلم کانفرنس کو ووٹ دینے کی مہم کے سلسلے میں کراچی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ میری رہائش اس زمانے میں لیاری کی ایک آبادی آگرہ تاج کالونی میں تھی ۔ یہاں کافی تعداد میں کشمیری بھی رہائش پذیر تھے ۔ اس بستی کے نوجوانوں نے تاج ویلفیئر سینٹر کے نام سے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا ہوا تھا۔ منظور احمد بٹ مرحوم اس ادارے کے سرگرم کارکن تھے ، خود بھی کشمیری تھے سماجی کاموں کے علاوہ سیاست میں بھی سرگرم تھے ۔ وہ بنیادی طور پر تو مسلم لیگی تھے لیکن کشمیر ہونے کے ناطے وہ کشمیری معاملات میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سردار عبدالقیوم خان کو اپنے علاقے میں آنے کی دعوت دی۔ یہ 1960 کی دیہائی تھی سردار عبدالقیوم کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سچا پاکستانی ، محبت وطن ، کشمیر اور کشمیریوں کا ہمدرد گفتگو کررہا ہے۔ آواز میں نرمی ، لہجہ میں شگفتگی، آنکھوں میں سوج بوجھ کی چمک ، سر پر ٹوپی ، سادہ لباب ، بناوٹ سے پاک گفتگو ، سچی اور کھری باتوں میں کشش تھی، اپنا پن تھا۔ سیدھے سادھے اور سچے مسلمان تھے ۔ میری عمر اس وقت کم ہی تھی ، سیاسی و سماجی تقریبات میں دیگر بچوں کے ساتھ آخری صف میں ہوا کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آخری صاف سے پہلی صف میں اپنا مقام بنایا اور کئی سال تاج ویلفیئر سینٹر کے سیکریٹری کے عہدہ پر فائز رہا جب کے منظور احمد بٹ صاحب اس وقت صدر ہوا کرتے تھے۔ تاج ویلفیئر سینٹر کے تحت ہونے والی تقریبات جو سیاسی ، سماجی ، تہذیبی و ثقافتی

نوعیت کی ہوا کرتی تھیں شاید ہی کوئی سیاسی لیڈر ایسا ہو جس کو یہاں مدعو نہ کیا گیا ہو ۔یہاں ہم نے تقریباً اس دور کے تمام ہی بڑی شخصیات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔

سردار عبدالقیوم خان مرحوم کشمیری جدوجہد آزادی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاست میں مثالی کردار ادا کرتے رہے۔ ایک اعتبار سے انہوں نے پاکستان کے حکمرانوں اور مخالف سیاسی رہنماؤں کے مابین پل کا کردار ادا کیا۔ وہ کشمیر اور پاکستان کی بہتری کے لیے، بلندی کے لیے عملی جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کشمیر اور پاکستان کے لیے جئے ، اس کی سربلندی کے لیے عملی جدوجہد کرتے کرتے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ کشمیر اور پاکستان سے عشق اور سچی لگن کی مثال کم کم ملتی ہے۔ کالم نگار مجید اصغر نے سردار صاحب کی تاریخی نصیحت جسے ان کی آخری وصیت بھی کہا جاسکتا ہے اپنے کالم میں تحریر کی ہے۔ سردار صاحب کا کہنا تھا کہ میری تین باتیں یاد رکھنا ایک 'غربا و مساکین کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا، ان کی غمگساری کرتے رہنا، یہی طبقہ تمہاری اصل طاقت ہے'، دوم 'پاکستان کا پرچم ہمیشہ تھامے رکھنا، اس وقت بھی نہ چھوڑنا جب اہل اقتدار کی نالائقیوں کی وجہ سے خود اہل پاکستان مایوس ہونے لگیں'، سوم 'ہمیشہ پاکستان کی مسلح افواج کے ساتھ رہنا کہ پاکستان اور کشمیر عوام کی آخری امید انہیں سے وابستہ ہے۔

سردار صاحب نے اپنی نحیف آواز میں ایوب خان

کی ایک تقریر کا حوالہ بھی دیا جس میں ایوب خان نے کہا تھا کہ ' میں اہل کشمیر سے کہتا ہو ہوسکتا ہے پاکستان کے سیاستداں آپ کو چھوڑ دیں مگر پاکستان کی مسلح افواج کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گی'۔ مجید صاحب نے درست لکھا کہ یہ پاکستان سے سردار صاحب کی لازوال محبت ہی تھی جس نے سقوط مشرقی پاکستان کے وقت ان سے "کشمیر بنے گا پاکستان" کا نعرہ تخلیق کروایا جو پورے پاکستان میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ یہی نعرہ 'کشمیر بنے گا پاکستان' تمام زندگی سردار عبدالقیوم کی سیاست کا مہور اور مرکز رہا۔ اِسی نعرہ کے گرد ان کی سیاست ہمیشہ گردش کرتی رہی۔ معاملا کچھ بھی ہو، گفتگو کسی بھی موضوع پر ہو، ملک کوئی بھی ہو ، رہنما قومی ہو یا عالمی ان کی گفتگو کی بنیاد یہی نعرہ 'کشمیر بنے گا پاکستان' ہوا کرتا تھا۔

سردار صاحب ٹکراؤ کی سیاست کے قائل نہ تھے ، افہام و تفہیم کے ساتھ آگے بڑھنے کے قائل تھے۔ ان کے اسی عمل کے باعث کئی لوگوں نے ان کی سیاست سے اختلاف بھی کیا، وہ فوج سے ٹکراؤ کے قائل نہ تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی آخری وصیت یا نصیحت میں بھی ذکر کیا۔ سردار صاحب کے اس عمل کو بعض لوگوں نے ان کی سیاست کو فوج کی چھتری تلے سیاست کرنے سے تعمیر کیا حالانکہ ایسا ہر گز نہ تھا، وہ فوج کو سیاست سے دور رہنے کے قائل تھے، اس کی عزت کیا کرتے تھے، فوجی مارشل لاء کے مخالف تھے۔ اس کی کھلے عام مخالف کرتے رہے۔ ان

تمام باتوں کے باوجود کشمیر کی آزادی کے لیے ، کشمیر اور پاکستان کے تعلق کو ایک ایسی حقیقت تصور کیا کرتے تھے جسے دنیا کی کوئی قوت ختم نہیں کر سکتی۔ کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کے لیے ان کی عملی جدوجہد پر شک کی کبھی گنجائش نہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دورِ اقتدار میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت اور نو ستاروں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی۔ سردار صاحب کیونکہ کشمیر کی ایک سیاسی جماعت کے قائد تھے، اس سیاسی جماعت کے جھنڈے تلے وہ کشمیر میں سیاست کیا کرتے، حکومت میں شریک رہے، یہ بات درست ہے کہ انہیں پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی کشمیر میں سیاست پسند نہیں تھی اور پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو سردار صاحب کی یہ بات پسند تھی ان کی تو ہمیشہ کوشش رہی اور اب بھی ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں بھی سیاست کریں اور حکومت بنائیں۔ اس بنیادی نقطہ پر سردار صاحب کا تقریباً تمام ہی سیاسی جماعتوں سے ٹکراؤ کا پیدا ہو جانا لازمی تھا اور ٹکراؤ ہوا۔ اس کے باوجود سردار صاحب سچے پاکستان اور پکے کشمیری تھے۔

سردار صاحب کی تعلیم کیا تھی اس کے بارے میں تو صرف یہ معلوم ہو سکا کہ انہوں نے پنجاب یونیوسٹی سے 1947 میں سیکنڈری ایجوکیشن کا امتحان پاس کیا، وہ برطانوی انڈین آرمی کے انجینئرنگ کور میں کس تعلیم کی بنیاد پر شامل ہوئے؟ انہوں نے 1946 سے 1942 کے درمیان فوج میں رہتے ہوئے کشمیر کی جدوجہد میں

عملی حصہ لینے کا منصوبہ بنایا اور فوج سے فارغ ہو کر انہوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے عملی جدوجہد کی۔ کشمیر کے چار مرتبہ 1990,1985,1971,1956 میں منتخب صدر اور ایک مرتبہ وزیر اعظم 1991 رہے۔ وہ ایک مدبر، گہری سوچ رکھنے والے، تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے، مذہبی خیالات کے حامل،، بر صغیر کے سیاسی و سماجی حالات پر گہری نظر کے رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی تصانیف بھی تخلیق کیں۔ ان کی کتاب مقدمہ کشمیر' مشہور ہوئی جس میں انہوں نے کشمیر کی جدوجہد اور تحریک پر تفصیل سے ' روشنی ڈالی ہے۔ سردار صاحب کو اردو، کشمیری کے علاوہ عربی اور فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔

پاکستان سے سچی محبت رکھنے والا، کشمیر بنے گا پاکستان کے نعرہ کے خالق اور اس پر صدق دل سے جدوجہد کرنے والا، کشمیر کو ظلم و ستم سے آزادی دلانے کی عملی جدوجہد کرنے والا ہم سے ہمیشہ کے جدا ہوگیا۔ 11 جولائی بروز ہفتہ سردار صاحب کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سردار صاحب کی مغفرت فرمائے ان کی جدجہد کو قبول فرمائے۔ آمین۔ (19 جولائی 2015)

کراچی میں دو ہزار سے زیادہ ہلاکتیں: گرمی، لوڈشیڈنگ یا غفلت۔ ذمہ دار کون؟

اس بار موسم گرمانے کراچی کو 2000 سے زیادہ لوگوں کی ناگہانی موت کا ایسا درد ناک تحفہ دیا کہ ہر آنکھ اشک بار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ گرمی تو ہر سال ہی آتی ہے لیکن اس بار اس نے اہل کراچی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک جانب سورج اپنی آب وتاب دکھا رہا تھا اور شُعلَہ خُو بنا ہوا تھا، اس نے اہل کراچی کے لیے اپنی تمازت و حدت حد درجہ بڑھا دی تھی جو اہل کراچی کے لیے عذابِ جاں بن گئی، اس کی شدت نے لوگوں کے جسم و جاں کو جھلسا کے رکھ دیا۔ دوسرے جانب کراچی کو بجلی فراہم کرنے والی کمپنی کے ۔الیکٹرک ارادہ کیے ہوئے تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اس نے گرمی کی شدت سے بازی لے جاتے ہوئے لوڈشیڈنگ کا سالوں پرانہ حساب برابر کر دینا ہے۔ تیسری قوت سرکار کی بھی تھی ، یعنی نواز شریف سرکار اور زرداری سرکار جس کے کپتان 89 سالہ نوجوان وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ ہیں۔ دونوں کے وزراء نے ایک دوسرے پر چاند ماری کا مقابلہ شروع کیے رکھا، عابد شیر علی اور خواجہ آصف جو نواز سرکار کے بجلی کی فراہمی کے وزیر باتدبیر ہیں کراچی میں ہونے والی ہلاکتوں کا ذمہ دار زرداری سرکار کو ٹھہرا رہے تھے، زرداری سرکار کے ذمہ داران کون سا کم کھاتے ہیں وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر کراچی میں ہونے والی ہلاکتوں کا ذمہ دار

نواز سرکار کو ٹھہرا رہے تھے۔ یہ تماشہ بھی خوب رہا، شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو، لوگ مرتے رہیں حکومتیں آپس میں لڑتی رہیں، وہ کہتے کہ تم ان ہلاکتوں کے ذمہ دار ہو، یہ کہتے کہ نہیں تم اس کے ذمہ دار ہو، گرمی کی شدت کا ذمہ دار تو کوئی بھی نہیں تھا یہ تو آسمانی تحفہ تھا اس کی ذمہ داری تو کسی پر بھی ڈالی نہیں جاسکتی، گرمی اپنی جگہ، لوڈ شیڈنگ کا تو کوئی نہ کوئی ذمہ دار ضرور تھا۔ اس کا تو محاسبہ ہونا چاہیے تھا۔ دونوں سرکاروں کے وزیروں کے شور مچانے، واویلا کرنے سے اصل ذمہ دار بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ان دونوں کے واویلا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بری الزمہ ہوگیا۔

بات کچھ پرانی ضرور ہو گئی لیکن مرنے والوں کے لواحقین کے لیے ان کے پیاروں کی موت ہر دم تازہ رہے گی۔ وہ گرمی کی شدت، لوڈ شیڈنگ اور وزیروں کے بیانات کو کبھی بھول نہ سکیں گے۔ مرنے والوں کی تعداد جو اخبارات اور تشریاتی اداروں نے بیان کی کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کراچی کے سرد خانوں میں مردوں کو محفوظ رکھنے کی جگہ ختم ہوچکی تھی، ایدھی اور دیگر اداروں نے میتوں کی تدفین مشینوں کے ذریعہ کی، یعنی کرین اور لوڈر کے ذریعہ لمبی ٹرنک (لحد) کھود دی گئی اور اس میں اوپر سے نیچے کفن پہنی لاشوں کو لائن سے رکھ کر کرین اور لوڈر سے مٹی ڈال دی گئی۔ یہ منظر کسی جنگ میں شہید ہونے والوں کی تدفین کا نہیں

تھا، کسی آسمانی آفت کے آجانے کے بعد کی حلاکتوں کا نہیں تھا، زلزلہ آجانے سے بڑی تعداد میں حلاکتوں کا نہیں تھا بلکہ عام حالات میں کراچی کو ایسے دن دیکھنا نصیب ہوئے۔ انور شعور کے یہ اشعار اس وقت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

پا گئے وہ نجات ہر دکھ سے
لاکھ پسماندگان منائیں سوگ
جن سے گرمی نہ ہو سکی برداشت
سرد خانے پہنچ گئے وہ لوگ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غیر معمولی واقعہ کے اثرات مستقبل میں کسی سیاسی جماعت پر پڑیں گے یا نہیں۔ حکمراں سیاسی جماعتیں خوش ہیں کہ کراچی میں گرمی اور لوڈ شیڈنگ کے باعث دو ہزار سے زیادہ حلاکتوں کا سانحہ خاموشی سے گزر گیا، نہ تو شدید احتجاج ہوا، نہ ہی ہڑتال ہوئی، نہ ہی گولی چلی، نہ ہی آگ لگی، نہ بازار بند ہوئے، تمام کے تمام مرنے والے سرد خانوں سے خاموشی کے ساتھ مٹی کے سپرد کر دیے گئے۔ یہ حکمرانوں کی خام خیالی ہے، اس طرح کے واقعات کا رد عمل چاہے کتنے ہی عرصہ کے بعد کیوں نہ ہو تا ضرور ہے۔ لوگ خاموش ہو گئے اللہ تو دیکھ رہا ہے کہ حکمرانوں نے اپنی عوام کے مصیبت اور پریشانی میں کیا کردار ادا کیا۔ لوگ مرتے رہے اور جن کو مرنے والوں کی تدفین میں نہ سہی

دعائے خیر تو کرنی ہی چاہیے تھی۔ لیکن وہ تو خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہے، ٹھنڈے محل نما گھروں میں لمبی تان کے سوتے رہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ماضی کی سیاست کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس قسم کے غیر معمولی حالات اور واقعات کے اثرات لوگ قبول کرتے ہیں۔ ان کا اظہار غیر اعلانیہ طور پر اپنے ووٹ کے ذریعہ کرتے بھی ہیں۔ 2013 کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کا پنجاب سے سفایا ہوجانا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ نون لیگ دودھ میں دھلی ہوئی تھی، یا وہ عوام سے محبت اوران کی خیر خواہ تھی یا چھوٹے میاں صاحب کی زرداری کے خلاف بڑکیں کام آگئیں، زرداری کو سڑکوں پر گھسیٹنے کی بڑکیں کارگر ہوگئیں، لوڈ شیڈنگ کبھی چھ مہینے میں کبھی دوسال میں ختم کرنے کی بڑکوں نے عوام کو متاثر کردیا، ہر گز نہیں، اس کی وجہ پنجاب کے عوام کے سامنے پاکستان پیپلز پارٹی کی پانچ سالہ کارکردگی تھی اور بیڈ گورنیس تھی ،زرداری صاحب کی مصالحت کی پالیسی تھی۔ اب کراچی میں جو غیر معمولی واقعات ہوئے اور اب بھی ہورہے ہیں ان کے اثرات آئندہ ضرور ظاہر ہوں گے، گلو بٹ کو لاہور کے عوام ہرگز نہیں بھولیں گے، اسلام آباد میں کپتان کے دھرنوں میں پولیس کی ،کاروئی کو کبھی بھلایا نہیں جاسکے گا۔ بظاہر یہ واقعات ہوچکے

حالات بھی نارمل ہو چکے لیکن ان کے اثرات رفتہ رفتہ ظاہر ہوں گے، کبھی تو ضمنی انتخابات میں ہی میں عوام اپنے ردِ عمل کا اظہار کر دیتے ہیں جیسا کہ کراچی میں حلقہ 246 میں ہوا، کبھی عام انتخابات میں سیاست دانوں کی زیادتیوں، لاپروائیوں، خاموشیاں ignorence کا ایسا بدلہ لیتے ہیں کہ وہ تل ملا کر رہ جاتے ہیں جیسا کہ 2013 کے انتخابات کے نتیجے میں زرداری اور ان کے ساتھی سندھ کے علاوہ دیگر جگھوں سے اپنے مکمل صفائے پر تل ملا کر رہ گے۔اب یہی خاموشی، بے اعتنائی، لاپروائی ignorence ہے جس سے میاں صاحب نے کراچی کے عوام اور کراچی میں ہونے والے غیر معمولی حالت میں اپنی آنکھیں موندھی ہوئی ہیں، خاموشی اختیار کی ہوئی ہے، وزیر داخلہ کو کراچی کے حالات سے نمٹنے کے لیے، وزیر بجلی و پانی کو مخالفین کو للکارنے ڈرانے اور دھمکانے کا ٹھیکا دے دیا ہے۔یاد رکھنا چاہیے کہ ایسے غیر معمولی واقعات، کے اثرات مستقبل کی سیاست پر لازمی ہوتے ہیں۔کالم نگار و تجزیہ کار حسن نثار کی اس بات میں صداقت پوشیدہ ہے کہ 'ہماراالمیہ یہ ہے کہ لوگ انسان بننے سے پہلے حکمراں بن جاتے ہیں تو ثبوت سامنے ہے کہ یہ نہ دکھ میں عوام کے ساتھ نہ سکھ ہیں نہ خوشی میں عوام کے ساتھ نہ غم میں۔ یہ سب نہ عید کی خوشیوں میں عوام کے ساتھ تھے نہ سیلابی تباہیوں کے غم میں شریک تو ایسے رہنماؤں کا اچار ڈالنا ہے یا انہیں آلوؤں کے ساتھ پکانا ہے'۔ایک اور کالم نگار پروفیسر سید اسرار بخاری نے اسی صورت حال کی تصویر کشی نظم میں اس طرح کی

دل میں چھپا کر پی پی والے حکومت کا ارماں لے چلے
ن لیگ اپنی شکست و فتح کا سامان کر چلے

میاں صاحب کو معلوم ہے بلکہ یقین ہے کہ کراچی ان کے لیے پنجاب کبھی نہیں بن سکتا، یہ تو ہمیشہ سے ہی سمندر کی لہروں کے مخالف چلنے کا عادی ہے۔ ایوب خان نے سر توڑ کوشش کی کہ کراچی کو اپن بنا یں پر کراچی والے تو محترمہ فاطمہ جناح کے دیوانے تھے۔ انہوں نے گلاب کے پھول کے مقابلے میں لالٹین کو پسند کیا اور اسے بلند کیے رکھا، گلاب کے پھول کی خوشبو انہیں ایک آنکھ نہ بھائی۔ بھٹو صاحب کا جادو سر چڑھ کر بولا، پورے ملک میں جئے بھٹو جئے بھٹو کی سدائیں گونجیں، انہوں نے کلین سوئیپ کیا لیکن کراچی نے نو ستاروں کو جگمگایا، شاہ احمد نورانی قبلہ اور ان کی چابی کو جنت کی چابی تصور کرتے ہوئے انہیں اپنا رہبر بنا لیا۔ اس سے بھی پہلے کی تاریخ اگر یاد ہو تو کراچی کے رہنما جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد مرحوم اور پروفیسر محمود اعظم فارقی مرحوم ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان کی سیاست میں الطاف حسین پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ایم کیو ایم نام کی کوئی چیز دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی کراچی کا اپنا ایک الگ رنگ، الگ مزاج اور منفرد سیاسی مزاج تھا۔ الطاف بھائی نے سیاست میں قدم رکھا، ایم کیو ایم

وجود میں آئی توانہوں نے کراچی پر ایسا جادو کیا کہ لوگ انہی کہ ہو رہے۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس وقت کے موضوع میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ سیاسی جماعت جسے منتخب نمائندوں کی تعداد کے اعتبار سے ملک کی چوتھی بڑی جماعت کا درجہ حاصل ہے کراچی کی نمائندگی گزشتہ دو دیہائیوں سے زیادہ عرصہ سے کر رہی ہے۔ سیاست کا یہی تو حسن ہے، کسی بھی سیاسی جماعت پر جس قدر ظلم و زیادتی ہوتی ہے عوام کی ہمدردیاں اس سے اور زیادہ ہو جاتی ہیں۔ بھٹو صاحب نے ولی خان کو جیل میں ڈالا اور غداری کا مقدمہ چلایا، کیا حاصل ہوا؟ ولی خان اپنی طبعی موت اس دنیا سے گئے۔ کیا ان کی جماعت آج موجود نہیں، کئی جماعتوں پر پابندیاں لگیں، پر وہ ختم نہیں ہوئیں، خود میاں صاحب کی جماعت اور ان کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ میاں صاحب دوبارہ پاکستان آئیں گے اور سیاست کے افق پر چاہ جائیں گے۔ بے نظیر بھٹو کی جماعت پر کس قدر ظلم و زیادتی ہوئی، بے نظیر پھر ملکی سیاست میں چاہ گئیں۔ اس لیے میاں صاحب کو چاہیے کہ کراچی کے حالات اور واقعات پر سنجیدگی سے توجہ دیں۔ نوے کی دیہائی میں بھی ان کے دور اقتدار میں کراچی کی اس جماعت پر اسی قسم کے الزامات اور مظالم ہوئے تھے، نتیجہ سب کے سامنے ہے، نہ انصافیوں کا ازالہ کریں، جو شر پسند ہیں، غلط کام کرنے والے ہیں ان کے خلاف کاروائی ضرور ہونی چاہیے۔ بے گناہوں کے ساتھ زیادتی کسی صورت نہیں ہونی چاہیے۔

بات کراچی میں ہونے والی دو ہزار سے زیادہ ہلاکتوں کی ہو رہی تھی، گرمی کی شدت تو ایک وجہ تھی ہی ساتھ ہی لوڈ شیڈنگ نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا، اس آگ کو بجھانے کے لیے جس پیار کی، محبت کی، ہمدردی کی، توجہ کی، فوری اقدامات کی مرکزی حکومت کی جانب سے اور سندھ کی حکومت کی جانب سے ضرورت تھی وہ کہیں نظر نہیں آئی البتہ دونوں جانب کے کپتانوں کے فرنٹ پر کھیلنے والے کھلاڑی آپس میں ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے رہے۔ دراصل یہی وہ عمل ہے جس نے کراچی کی سوچ کو دیگر شہروں کی سوچ سے مختلف کردیا ہے۔ کہیں آگ لگ جائے، بڑا حادثہ ہوجائے، عمارت گر جائے، آندھی آجائے، طوفان آجائے حکمراں فوری طور پر مدد کرنے اور اس کا مداوا کرنے کے بجائے مخالفین کی جانب اپنی توپوں کا رخ موڑ دیتے ہیں، یا بیرون ملک سدار جاتے ہیں، کبھی اپنے علاج کے لیے، کبھی کسی کی مزاج پرسی کے لیے اور کبھی عمرہ کے لیے،ان کے اس عمل سے عوام کو نقصان ہوتا ہے۔ کسی کی تکلیف کا بروقت مداوا نہ ہو، بعد میں مگرمچھ کے آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔اس واقعہ کے بعد مرکزی حکومت اور سندھ کی حکومت نے جس طرح ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایااہل کراچی ان باتوں کو بھول نہیں سکیں گے۔ دوہزار افراد چند دنوں میں لقمہ اجل بن گئے۔ اس کے اثرات مستقبل میں سیاستدانوں پر ضرور پڑیں گے، سیاسی لوگوں، سیاسی جماعتوں کو اس بے حسی کا جواب ضرور ملے گا۔ کس صورت میں

(ملتا ہے سرِ دست کچھ کہنا قبل از وقت ہے (23 جولائی 2015

جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ۔کیا سبق ملا؟

پاکستان تحریک انصاف کے کپتان عمران خان، عوامی تحریک کے علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کے 126 دن کے دھرنوں، احتجاجوں، واویلا مچانے، متعدد جانوں کے ہلاک ہوجانے، بے شمار زخمی ہوجانے والوں کے نتیجے میں نواز حکومت آخر کار 2013 کے عام انتخابات میں مبینہ دھاندلی کے لزامات کی تحقیقات کے لیے سہ رکنی جوڈیشل کمیشن بنانے پر آمادہ ہوئی اور دونوں جماعتوں کے مابین ایک ایگریمنٹ دستخط کیا گیا، جس کے نتیجے میں جوڈیشل کمیشن تشکیل پایا۔ کمیشن کے سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس ناصر الملک خود تھے۔ کمیشن کو تین بنیادی سوالوں پر تحقیق کرنے اور اپنی رائے دینے کے لیے کہا گیا تھا۔وہ تین سوالات یہ تھے۔

(1) کیا 2013کے عام انتخابات غیر جانبدارنہ، منصفانہ، دیانتدارانہ اور قانون کے تقاضوں کے مطابق ہوئے؟

(2) کیا کوئی الیکشن 2013 کے انتخابات کے نتائج تبدیل کرنے کے لیے منظم دھاندلی یا سازش کے ذریعے اثر انداز ہوا؟

(3) کیا الیکشن 2013کے نتائج مجموعی طور پر عوامی مینڈیٹ کا درست اور حقیقی اظہار کرتے ہیں؟

جوڈیشل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان سوالات کے جوابات کے لیے تفصیلی تحقیق کی۔ کیونکہ الزامات اور تحقیقات کرانے کے لیے تحریک انصاف ہی پیش پیش تھی چنانچہ کمیشن نے تحریک انصاف کو اپنے موقف کا مکمل دفعہ کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔ کپتان نے کمیشن اور اس کے جملہ اراکین پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور کمیشن کے کاروائی میں بھر پور قانونی دفعہ کیا۔ معروف وکیل جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کپتان کی جانب سے وکیل تھے جن کی شہرت نامور وکیل اور سیاستداں کی بھی ہے۔ حفیظ پیرزادہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دست راست اور قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔ کپتان کے وکیل نے بھرپور انداز سے مکمل قانونی نکات اور ثبوتوں کی روشنی میں اپنی بات کو جائز قرار دینے کی بھرپور کوشش کی، کمیشن کی مکمل کاروائی کے دوران کپتان از خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ کاروائی کے دوران موجود ہوتے، کاروائی کے اختتام پر کمرہ عدالت سے باہر نکل کر میڈیا سے مخاطب ہونا، الزامات کو دہرانہ ان کا معمول تھا۔ انہوں نے کسی بھی مرحلے پر کمیشن کی کاروائی پر انگلی نہیں اٹھائی جو ایک اچھی بات تھی۔ طویل عدالتی کاروئی کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومتِ وقت کو پیش کر دی۔ کیونکہ رپورٹ میں کپتان کے الزامات کو رد کر دیا گیا تھا، ایک اعتبار سے کمیشن کی رپورٹ حکومت کے حق میں تھی، یہ نواز شریف کی فتح بھی تھی جب کپتان کی شکست۔ اس کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ نواز شریف اولین فرصت میں تمام سرگرمیوں، ملکی حالات، سیلاب کی تباکاریوں کو

بالائے طاق رکھ کر ٹیلی وژن اسکرین پر آئے اور اپنی فتح کا اعلان کیا۔ ملکی تاریخ میں شاید کسی بھی کمیشن کی یہ پہلے رپورٹ ہوگی جس کو حکومت کو پیش کرنے کے فوری بعد اس کے مندرجات کو ٹیلی وژن پر عام کیا گیا۔ ورنہ تو کمیشنوں کی رپورٹیں سرد خانے کی نظر ہوجایا کرتی ہیں۔ ایک اعتبار سے اچھی بات ہے لیکن یہ زیادہ بہتر تھا کہ نواز شریف صاحب اس رپورٹ کو ٹیلی وژن کے بجائے ملک کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کرتے یا صرف قومی اسمبلی ہی میں شرکت کرتے اور وہاں اس رپورٹ کے مندرجات کی تفصیل بیان فرمادیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ منتخب ایوان اس رپورٹ کے عام کرنے کے لیے جو بھی تجویز دیتا وہ مناسب ہوتا۔ تقریر کیونکہ لکھی ہوئی تھی اور یہ راز فاش ہوچکا کہ یہ الفاظ، جملے جناب نواز شریف کے نہیں تھے بلکہ سابق صحافی و کالم نگار اور اب وفاقی مشیر عرفان صدیقی کی سوچ، فکر اور تدبر سے ڈھلی ہوئی تقریر تھی۔ یہ کوئی بری بات نہیں اکثر حکومتی ذمہ داران تقریریں لکھوایا ہی کرتے ہیں۔ ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں، کالم نگاروں کا کام سیاست کرنا تو ہے ہیں چنانچہ وہ سیاسی میدان کے شہسواروں مشیر باتدبیر ہی بنتے ہیں اور وقت پڑنے پر ایسی ایسی تقریریں لکھ کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی واہ واہ ہوجاتی ہے۔ نواز شریف کے مشیر محترم نے بہت ہی جچی تلی، وقت اور حالات کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے الفاظ کی صف بندی اور جملوں کی جمع بندی اس خوبصورت طریقے سے کی کہ بات آسانی سے سمجھ میں آ گئی، مخالفین کوئی ’فی‘

نہیں نکال سکے۔ اس صورت حال کو پروفیسر سید اسرار بخاری نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا۔

نواز کا تدبر ہو عرفان کی زبان ہو
اب خان، خدا جانے کس طرح کہا ہو

وزیر اعظم نواز شریف نے اس رپورٹ کے جوابات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا کہ کمیشن نے ان تین سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں وہ یہ ہیں۔

الیکشن کمیشن کی حد تک رپورٹ میں بتائی گئی کوتاہیوں سے قطع نظر، ریکارڈ پر (۱) موجود تمام شواہد کو مد نظر رکھتے ہوئے 2013 کے عام انتخابات مجموعی اعتبار سے منصفانہ اور قانون کے تقاضوں کے مطابق منعقد کیے گئے۔

نہ تو انکوائری کمیشن کی کاروائی میں شامل پارٹیوں نے کسی ایسے پلان یا سازش (2) کے بارے میں کوئی ثبوت پیش کیے اور نہ ہی کمیشن کے سامنے رکھے گئے مواد سے ایسی کوئی بات سامنے آئی ہے جس سے دھاندلی کے کسی پلان یا سازش کی نشاندہی ہو۔ اسی طرح مبینہ دھاندلی میں ملوث افراد کے خلاف عائد کردہ الزامات بھی ثابت نہیں کیے جا سکے۔

جب الیکشن 2013 کو اُن کے مجموعی تناظر میں دیکھا جائے تو الیکشن کمیشن کی چند (3) کوتاہیوں کے باوجود، انکوائری کمیشن کے سامنے موجود شواہد کو مدِ

نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نتائج عوام کے مینڈیٹ کا حقیقی اظہار نہیں تھے۔
یقیناً نون لیگ کے لیے یہ لمحات خوشی کے ہیں، مسرت کے ہیں، جشن منانے کے ہیں لیکن سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی، سیاست نام ہی اتار چڑھاؤ کا ہے، کم از کم پاکستان کی سیاست تو اسی قسم کی ہے کہ آج ایک جماعت عروج پر تو کل دوسری جماعت ۔دھرنوں، احتجاج اور انتخابات پر الزامات کے حوالے سے کپتان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نواز حکومت اب گئی کہ تب گئی لیکن پھر کوئی ایسا معرکہ ہوجاتا کہ نواز حکومت سنبھل جاتی اور مخالف سیاسی گروہ نیچے جاتا دکھائی دیتا۔ نواز شریف کا استعطفیٰ، تیسرے امپائر کی انگلی اٹھنے کے اشارے تک سامنے آنے لگے تھے۔
جب تک کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی تھی کپتان کی بڑکیاں عروج پر تھیں رپورٹ آجانے کے بعد کپتان اور اس کی ٹیم بیک فٹ پر چلی گئی ۔ کمیشن کی رپورٹ نے سر دست تحریک انصاف کی بولتی بند کردی۔ کپتان کے وہ ساتھی جو میڈیا پر آکر فلسفیانہ انداز تکلم اختیار کرتے ہوئے حکومت اور دیگر جماعتوں کو آڑے ہاتھو لیا کرتے تھے اب میڈیا پر آنے سے کترا رہے ہیں کچھ آتے ہیں تو ادھر ادھر کی باتوں سے گزارا کرتے ہیں۔

اس موقع پر جو بات نواز شریف کی خوش آیند ہے وہ یہ کہ انہوں نے اپنے رفقاء کو تلقین کی ہے کہ ' وہ عدالتی کمیشن کی رپورٹ پر تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں، فیصلے کو کسی کے خلاف طعنہ زنی اور نیچا دکھانے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے ، انہوں نے کہا کہ ہماری نظر قومی اداروں اور جمہوری استحکام پر ہونی چاہیے ، انہوں نے اپنی میڈیا ٹیم سے کہا کہ ان ہی خطوط پر وہ ٹاک شوز میں اپنی بات اجاگر کریں، فیصلے کو سیاسی اختلافات یا پوائنٹ اسکورنگ کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کریں کہ یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے '۔ اس طرز عمل کو اختیار کرنے پر نواز شریف قابل مبارک باد ہیں ، ورنہ ان کے وزیروں نے تو ایسے بھنگڑے ملک میں ڈالنا تھے، ایسی ایسی گفتگو کرنا تھی کہ طویل عرصہ تک خوشی کا جشن ہی چلتا رہتا۔ ایسا دانشمندانہ فیصلہ کرکے انہوں نے اپنے بعض بد زبان وزرا کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ہمارے پانی و بجلی کے وزیر شیر نواز شریف جو عابد بھی ہیں سینہ پھلا کر، منہ کو بگاڑ کر للکارتے دیکھا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ تحریک انصاف جھوٹی ہے ان کا کپتان جھوٹا ہے، جھوٹوں کا منہ کالا ہوا، اسی محکمے کے بڑے وزیر جو پانی بجلی کے ساتھ ساتھ دفاع کا قلم دان بھی رکھتے ہیں بقول کالم نگار عطاء الحق قاسمی اس موقع پر پی ٹی آئی کو کچھ اس طرح للکارتے ' شرم کرو حیا کرو، غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے '۔ وزیر اعظم نے وزیروں پر ہی نہیں بلکہ بعض ، لکھاریوں کی خواہشات پر بھی پانی پھیر دیا جو آس لگائے بیٹھے

تھے کہ اس جشن پر اپنے قلم کو کپتان کے خلاف ایسا چلائیں گے کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ بعض بعض لکھاری اب اپنے سابقہ کالموں سے اقتباسات نقل کر رہے ہیں کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ کپتان کے پیچھے کوئی سازش ہے، اس کے دھرنوں کو کوئی فنڈنگ کر رہا ہے، قادری صاحب کا ایجنڈا کچھ اور ہے وغیرہ وغیرہ۔ سیاست میں الزامات کے سوا کچھ اور ہوتا ہی کیا ہے۔ وزیر تو صرف بیان بازی ہی کرتے ہیں لکھاری تو بند کمرہ میں ایسی ایسی ٹیبل اسٹوری تیار کر کے منظر عام پر لے آتے ہیں کہ جس کا کوئی سر نہ پیر۔ یہاں تک کہ غدار وطن قرار دے ڈالتے ہیں۔ دشمن ملک سے ایسا تعلق جوڑتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ رپوٹر بھی اسی سیاست داں کے ساتھ ہی تھا۔ معاف کر دینا بڑائی ہے، اس
سے آدمی کا قد بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا۔

وزیر اعظم نے قابل تعریف عمل کیا اور اس پر اپنے ساتھیوں کو بھی عمل کرنے کی ہدایت کی تو دوسری جانب اس تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا موجب بننے والے عمران خان نے بھی تدبر کا ثبوت دیا، کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمیں فیصلہ منظور ہے۔ کیونکہ کمیشن کے آغاز ہی پر تحریک انصاف کا موقف تھا کہ کمیشن ' جو بھی فیصلہ کرے گا وہ ہمیں منظور ہوگا'۔ یہ ان کا فوری ردِ عمل تھا جسے مثبت کہا جانا چاہیے۔ کمیشن کی رپورٹ کے تفصیلی مطالعہ کے بعد انہوں نے پریس کانفرنس میں اپنے موقف کا اظہار اس طرح کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ ' معافی مجھے نہیں میاں صاحب کو مانگنی چاہیے لیکن ہمیں جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ تسلیم، اسمبلی قبول لیکن انتخابات میں دھاندلی ہوئی، الیکشن کمیشن مستعفی ہو، کمیشن نے انتہائی محنت سے کاروائی چلائی مگر کام ادھورا چھوڑ دیا جس سے میرے خدشات بڑھے ہیں، میرے سوال وہیں کے وہیں رہ گئے'۔ کپتان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ نئے پاکستان کی طرف پہلا قدم ہے'۔ویسے اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں کہ وہ کمیشن کی رپورٹ کو من وعن تسلیم کر لیں اور الزامات جو انہوں نے مختلف سیاسی لوگوں پر لگائے اور وہ عدالت میں ان کا ثبوت پیش کرنے سے وہ قاصر رہے ان کی معزرت اور معافی مانگنے میں شرم محسوس نہ کریں۔ 35 پنکچر کے بارے میں تو وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ انہوں نے یوں ہی سیاسی مصلحت کے تحت الزام لگا دیا تھا، اسی طرح سابق چیف جسٹس افتخار چوہدھری اور جسٹس رمدے کے خلاف انہوں نے جو باتیں کیں تھیں، جو الزامات انہوں نے ان پر لگائے تھے ان کے بارے میں انہوں کمیشن کو کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ انصاف کا تقاضہ اور سیاسی تدبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کپتان کو ان سے بھی معزرت کر لینی چاہیے۔ کپتان نے اپنے ساتھیوں کو اس حوالے سے کیا مشورہ دیا اس کا علم نہ ہو سکا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اپنے طور پر اپنا نقطہ نظر بیان کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے لہجے میں نرمی آ گئی ہے، بات کرتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ، ایک نے کہا جن کا تعلق کراچی سے ہے کہ دھاندلی تو ہوئی پر ہم کمیشن میں اپنا موقف درست انداز سے

پیش نہیں کر سکے ۔ججیز کو کنوینس نہیں کر سکے۔

عمران خان اور نواز شریف کے مابین ہونے والی طویل سیاسی کشمکش جس میں علامہ ڈاکٹر طاہر القادری بھی شامل باجا ہوئے مہینوں چلنے والی سیاسی رسہ کشی تھی جس نے پاکستانی عوام کے اعصاب پر شدید دباؤ ڈالا ، ذہنی انتشار میں مبتلا کیا، انہیں گزند پہچائی اور اذیت میں مبتلا کیا اپنے منطقی انجام کو پہنچی، جس کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ طویل سیاسی عمل ہمیں کیا سبق دیتا ہے یا ہم اس فضول سیاسی رشہ کشی سے کچھ سبق سیکھیں گے یا نہیں۔ سیاست دانوں کو سنجیدگی کے ساتھ ،تدبر کے ساتھ ، پاکستانی عوام کی خاطر آئندہ کسی بھی ایسے سیاسی ایشو کو بلندی پر لے جانے سے پہلے اس کے تمام تر پہلوؤں پر اچھی طرح سوچ بچار کرلینا چاہیے۔ مخالفت برائے مخالفت کوئی اچھی چیز نہیں۔ اللہ کرے ہمارے سیاست دان ہوش کے ناخن لیں، ملک اور قوم کی فکر کریں، ذاتی مفادات کی سیاست سے بعض رہیں۔ مخالفت میں اتنے آگے نہ نکل جائیں کہ واپسی مشکل ہوجائے۔ ھَزِیمَت اٹھاناپڑے، شرمندگی سے دوچار ہوناپڑے، نگاہیں نیچی ہوجائیں، گفتگو میں الفاظ ساتھ چھوڑ دیں، کہنا کچھ چاہیں زبان سے کچھ نکل جائے۔ المختصر اعتدال کا راستہ بہت سے پریشانیوں سے بچائے رکھتا ہے۔ سیاست کرنی ہے ضرور کریں لیکن سیاست میں شرافت، ادب، لحاظ، ملک و قوم کا

مفاد مقدم ہو۔ یعنی سب سے پہلے پاکستان اور اس کے عوام پھر کوئی اور بات۔ (28 جولائی 2015)

ڈاکٹر فرزانہ شفیق' مکہ المکرمہ جاتے ہوئے حادثہ میں جاں بحق'

یہ امر حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ موت کا وقت متعین و مقرر ہے جسے کوئی انسان کسی صورت نہ تو ڈال سکتا ہے، نہ ہی آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ اور کوئی بھی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کا اصول روزِ اول سے تا قیامت جاری رہے گا یہ ضرور ہے کہ بعض اموات محض ایک فرد کی موت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس موت سے محض ایک خاندان کے افراد متاثر ہوتے ہیں بلکہ اس طرح کی اموات ایک ایسا المیہ ہوتی ہیں جس سے خاندان کے علاوہ مرنے والے کے دوست احباب، پروفیشن اور پروفیشنلز سب ہی متاثر ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح دنیا سے رخصت ہونے والے برسوں یاد رکھے جاتے ہیں۔ ایسی ہی موت 14 جولائی 2015 کو ہوئی۔ اس روز پاکستان میں 26 واں روزہ تھا جب کہ سعودی عرب میں 27 واں روزہ تھا۔ پاکستان لائبریرین شپ کی ایک جانی پہچانی خاتون متحرک و مُتَوَرِّع، معلم و مُتَعَلِّم، کتاب دار و کتاب دوست سعودی عرب کے شہر دمام سے اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ہمراہ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ کی جانب سفر پر تھی، مکہ المکرمہ سے 10 کلومیٹر کے فاصلہ پر ٹریفک حادثہ میں جاں بحق ہو گئی۔ اس کے شوہر اور دونوں بچے شدید زخمی ہوئے۔ چند روز زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد اس کے شوہر منظور احمد بھی اللہ کو پیارے ہوئے، دونوں بیٹے مکہ میں زیر علاج ہیں۔ یہ ایک ایسا دھچکا اور صدمہ ہے کہ

جس کے افسوس کے لیے الفاظ نہیں مل رہے، قلم ساتھ نہیں دے رہا، کن جملوں سے کس حوصلہ سے فرزانہ کی موت کا ذکر کیا جائے۔ بقول ڈاکٹر خالد محمود' یقین نہیں آرہا کہ ایسا ہوچکا ہے'۔ نقصان یقینا اتنا بڑا ہے کہ جس کا ازالہ ممکن نہیں لیکن کیا سعادت نصیب ہوئی ہے اس خاتون کو، باوضوع، عمرہ کی ادائیگی کا قصد، احرام میں ملبوث، روزہ کی حالت میں، مکہ کی حدود، حرم کی حدود کے ندیک، حادثے کی وجہ موت بن جانا، گویا شہادت کا رتبہ بھی حاصل ہوا۔ مرحومہ کی نماز جنازہ خانہ کعبہ میں، مسجد حرام میں ادا کی گئی، خانہ کعبہ نماز جنازہ کے وقت مرنے والے کا جسد خاکی خانہ کعبہ کے عین سامنے چند گز کے فاصلے پر رکھا ہوتا ہے، مسجد حرام میں لاکھوں اللہ کے مہمانوں نے فرض نماز کی ادائیگی کے بعد نماز جنازہ کی ادائیگی۔ مکہ المکرمہ کے قبرستان ' مقبرہ الشرائع' میں ابدی نیند سونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ اللہ کس شان سے ڈاکٹر فرزانہ اپنے اللہ کے حضور پیش ہوئی، سعادت و نصیب کی بات ہے۔ ڈاکٹر فرزانہ شفیق تمہیں یہ سعادت مبارک ہو، ہم بھی ایسی سعادت کی تمنا کرتے ہیں۔ بلکہ ہر مسلمان کی آرزو اور تمنا ہوتی ہے کہ اسے خانہ کعبہ یا مدینہ منورہ میں مرنا نصیب ہو۔

ڈاکٹر فرزانہ شفیق یونیورسٹی آف دمام، سعودی عرب کے کتب خانے کے دشعبہ خواتین میں ستمبر 2012 سے اسسٹنٹ پروفیسر ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام

دے رہی تھیں، دمام کی اس جامعہ میں اس وقت لاہور کے کئی دوست بھی موجود ہیں ان میں پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود، محمد اجمل خان، فراست شفیع اللہ اور آصف کمال شامل ہیں۔ اجمل خان صاحب بھی ان دنوں چھٹیوں پر پاکستان آئے ہوئے ہیں انہوں نے بتایا کہ فرزانہ کے دونوں بیٹے جو زخمی ہوگئے تھے الحمد اللہ بہتر ہیں،انہوں نے فرزانہ کے چھوٹے بیٹے کے حوالہ سے بتایا کہ وہ 13 جولائی کی صبح نماز فجر کے بعد مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔اگر وہ روزہ بند کرکے صبح چار یا پانچ بجے مدینہ سے روانہ ہوئے تو مکہ کا سفر اپنی گاڑی سے تقریباً پانچ سے چھ گھنٹے کا ہے، مکہ سے دس کلومیٹر دور یہ حادثہ پیش آیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حادثہ صبح 7 سے 8 بجے کے درمیان ہوا۔ گویا یہ لوگ سحری کھا کر، روزہ بند کرنے کے بعد، نماز فجر کی ادائیگی مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں ادا کرکے عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جرات الہ آبادی کا شعر۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پَل کی خبر نہیں

فرزانہ ایک دین دار، نیک، شرعی پردہ کرنے والی خاتون تھی، وہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھی لیکن عمر میں وہ میری بیٹی کی عمر ہی کی تھی۔ مجھے وہ بیٹیوں جیسی ہی عزیز تھی، وہ بھی میرا حد درجہ احترام کیا کرتی

تھی۔ میرا اس سے تعلق کئی سال پر محیط ہے لیکن اس سے صرف ایک بار ملاقات ہوئی، وہ ملاقات لاہور میں ہونے والی ایک کانفرنس تھی، درمیانہ قد، کالا عبائیہ پہنے ہوئے، چہرہ پر حجاب اس طرح کہ صرف آنکھیں ہی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، ہاتھوں پر بھی کالے دستانے تھے۔ ان آنکھوں میں حیا تھی، شرم تھی، چمک تھی، روشنی تھی، یہ آنکھیں اس کے نیک سیرت، بلند کردار، صوم و صلاۃ کی پابند، صالح صفت خاتون ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔ آواز میں دھیما پن، شائستہ انداز گفتگو، ظاہری حلیہ سادگی کا پتا دے رہا تھا۔ لاہور اس کا گھر تھا، لاہور ہی میں اس نے تعلیم حاصل کی۔ اس نے 2002 سے 2009 کے درمیان گریجویشن، ایم ایل آئی ایس اور پی ایچ ڈی جامعہ پنجاب لاہور سے کیا۔ اس سے قبل لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی سے انٹر کیا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود جو پی ایچ ڈی میں اس کے تھیسیس سپر وائیزر بھی تھے ان دنوں چھٹیوں پر کراچی آئے ہوئے ہیں انہوں نے فون پر فرزانہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ فرزانہ ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی، انٹر پاس کیا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی تھی، شادی کے بعد اس نے گریجویشن کیا، ایم ایل آئی ایس کیا اور پھر ان کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، جس کے بعد اسے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، اسلامیہ یونیورسٹی میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی، وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی، محنتی اور با صلاحیت

تھی، اس کے متعدد مضامین بین الاقوامی رسائل میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر خالد نے بتایا کہ پہلے تو وہ چھٹی لے کر دمام گئی لیکن پھر اس نے اسلامیہ یونیورسٹی کی ملازمت سے ریزائن بھیج دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چند دن قبل ہی اس کا ریزائن منظور ہوا تھا۔ گویا اس نے پاکستان سے اپنا تعلق خود ہی منقطع کر لیا تھا۔ وہ مستقل سعودی عرب میں رہنی کی خواہش مند تھی اللہ نے اس کی اس خواہش کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہی متبرک زمین کی ہو رہی۔

میرا اس سے ای میل کے ذریعہ رابطہ تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ جب وہ پی ایچ ڈی کر رہی تھی تو اس نے اپنے سوالنامے کے جواب کے سلسلے میں فون پر بھی بات کی تھی۔ اُسے بھی میری ہی طرح لکھنے پڑھنے اور اعلیٰ ترین ڈگری (پی ایچ ڈی) کے حصول کا جنون تھا۔ سینئر ہونے کے ناطے وہ مجھ سے اکثر مضامین اور اپنے پی ایچ ڈی کے موضوع کے حوالے سے رابطہ رکھا کرتی تھی۔ میں حسب توفیق و استطاعت اس کی رہنمائی کر دیا کرتا تھا۔

اتفاق دیکھئے کہ اُسے بھی 2009 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی اور مجھے بھی اسی سال یہ اعزاز حاصل ہوا، فرق یہ تھا کہ وہ زیادہ تیز دوڑی اور اپنا مقصد جلد حاصل کر لیا مَیں اس دوڑ میں سست روی کا شکار رہا، اس کی متعدد وجوہات رہیں۔ آخر میں میری ، دوڑ میں بڑی بڑی شخصیات نے اڑنگی مارنا شروع کر دیں جس کے باعث مَیں کبھی رکتا

کبھی گرتا، کبھی دل گرفتا ہوتا، کبھی ہمت ہار کر بیٹھ رہتا۔ لیکن اللہ مجھے پھر دوڑنے کی توفیق عطا کر دیتا، میرے سپر وائیزر پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری میری ہمت بندھاتے، حوصلہ دیتے اور مخالفین کو زیر کرنے کی بھرپور کوشش کیا کرتے۔ آخر کار مَیں نے 2009 میں کامیابی کی لائن کو چھو ہی لیا۔ فرزانہ میں صلاحیت تھی، کام کرنے کا جذبہ تھا، لگن تھی، جستجو تھی، اُسے بے لوث، اس کی کشتی کو پار لگانے والے، پر خلوص اساتذہ کی رہنمائی حاصل تھی ۔ انہوں نے فرزانہ میں ٹیلنٹ دیکھتے ہوئے اس کی ہمت افزائی کی، اسے آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئے ۔ وہ اپنی صلاحیت اور اساتذہ کی مدد سے آگے بڑھتی چلی گئی کامیابی نے اس کے قدم چومے اور وہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں لیکچرر ہو گئی۔ اب اس سے میرا اور بھی زیادہ رابطہ رہنے لگا۔ وہ مضامین لکھتی اور شائع کرانے کے لیے اکثر مجھے ای میل کیا کرتی تھی۔ پھر طباعت کے لیے یاد دیہانی بھی کراتی رہتی۔

مَیں نے 2010 میں جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کو جوائن کیا ۔ فرزانہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں 2007 سے لیکچرار تھی۔ جہاں پر ڈاکٹر روبینہ بھٹی پہلے سے تھیں جو فرزانہ سے سینئر تھیں ، اب شعبہ کی سربراہ ہیں۔ یہ بھی عزت و احترام سے پیش آتی ہیں۔ شعبہ کی ترقی کے لیے دل و جان سے مصروف عمل ہیں۔ جامعہ

سرگودھا میں قیام کے دوران فرزانہ سے مسلسل رابطہ رہا، علمی و پیشہ ورانہ موضوعات پر ای میل کے ذریعہ تبادلہ خیال ہوجایا کرتا تھا۔مَیں 2011 میں جامعہ سرگودھا کو خیر باد کہہ کر واپس کراچی اور پھر سعودی عرب چلا گیا جہاں میرا قیام کئی ماہ رہا۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران جب کہ فرزانہ اسلامیہ یونیورسٹی ، بہاولپور میں لیکچرر تھی اس نے مجھے اپنا سی وی اس درخواست کے ساتھ سینٹ کیا کہ میں اس کا سی وی ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں مختلف جامعات میں دے دوں۔تاکہ وہ سعودی عرب میں بہ سلسلہ ملازمت آسکے۔ گویا اس نے سعودی عرب میں ملازمت کرنے کی عملی جدوجہد شروع کردی تھی۔ اللہ اس پر مہربان تھا ، کامیابیاں اس کے قدم چوم رہیں تھیں، اب جب کہ اس نے اپنے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ مقدس سرزمین پر خدمات انجام دے تو اللہ نے اس کی اس خواہش کو بھی پورا کیا، کامیابی اور مقاصد کے حصول میں مختلف ذرائع ہی معاون ثابت ہوتے ہیں، بعض دوستوں نے اس کی رہنمائی کی اور وہ ستمبر2012 میں جامعہ دمام کے کتب خانہ سے منسلک ہوگئی۔ یقیناً سینکڑوں ارمان ہوں گے، خواہشات ہوں گی، اپنے لیے، اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے کچھ کرگزرنے کی تمنائیں ہوں گی۔ پاکستان میں وہ جس جگہ تھی ، جس حیثیت میں تھی ، یہاں بھی اس کا مستقبل روشن تھا، ترقی کے مواقع یہاں بھی تھے لیکن سعودی عرب سے بلاوا آئے تو اسے رد کردینا ممکن ہی نہیں ہوتا، وہ بلاوا ملازمت کے لیے ہو، عمرہ کے لیے ہو یا حج کے لیے ہو، ہر مسلمان اس بلاوے پر دوڑا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فرزانہ بھی اللہ کے بلاوے پر دوڑی چلی گئی ، جہاں پر اس کی زندگی کے صرف دو سال اور دس ماہ ہی لکھے تھے۔ اس نے وہ وقت پورا کیا اور لبیک کہتی ہوئی اللہ کے حضور حاضر ہو گئی۔ پروردگار اس کے بچوں کو ماں اور باپ کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

میں سعودی عرب چند ماہ گزار کر واپس کراچی آگیا۔ اب میری مصروفیات میں لکھنا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایم ایل آئی ایس کی کلاس کو پڑھانا تھا۔ 2001 میں ماسٹر پروگرام کراچی میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت سے میں کسی نہ کسی طور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے منسلک چلا آ رہا ہوں۔ 2013 میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے مجھے Best University Teacher Award 2013 سے نوازا، یہ کس کی شفارش تھی مجھے نہیں معلوم، بعد میں پتا چلا کہ کراچی کے ریجنل ڈائریکٹر نے میرا نام اس اعزاز کے لیے تجویز کیا تھا جسے یونیورسٹی کے ذمہ داران نے قبول کیا۔ ڈاکٹر فرزانہ کو بھی اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے مجھے ای میل پر مبارک باد دی۔ اب جب کہ میں نے اس مضمون کے لیے فرزانہ کی میل تلاش کیں تو یہ میل میرے ریکارڈ میں مل گئی ۔ یہ ای میل 13 جولائی 2013، کو فرزانہ نے دمام سے بھیجی تھی۔ اس وقت بھی رمضان تھے۔ اس بات کو دو سال ہو چکے ہیں۔ اس نے لکھا۔ Many many congratulations sir for this success. May Allah bless you here and hereafter. How is your health now? ramadan

greetings. Please remember in your prayers. Wassalam.

ڈاکٹر فرزانہ کے انتقال پر لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والے کئی احباب نے اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ جنھیں پاک لیگ ای میل گروپ (PLAGPK) پر دیکھا جاسکتا ہے۔ فرزانہ کے حادثہ اور اس کے جاں بحق ہونے کی اطلاع ای ای میل گروپ پر سب سے پہلے ڈاکٹر محمد رمضان نے دی۔ ڈاکٹر رمضان LUMS سے وابستہ کتب خانے کے ہیں، پاکستان لائبریری ایسوایشن پنجاب برانچ کونسل کے صدر بھی ہیں۔ بعد ازاں بے شمار ساتھیوں نے فرزانہ کو خراج تحسین پیش کیااور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی۔
جامعہ پنجاب شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے سابق چیرئمین ، سینئر استادپروفیسر ڈاکٹر ممتاز انور نے ڈاکٹر فرزانہ شفیق کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

It was a very sad news to learn that Dr. Farzana and her family had met a terrible accident resulting in her death and serious injuries to her husband and sons. She was in her prime age at which she was making a good contribution to the profession and her family needed her most to raise her children. It is a great tragedy for her young children who needed her for a long time. May Allah rest her soul in peace. We pray for her children and the family to have courage to bear this

loss which is irreplaceable especially for the immediate family.

شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، جامعہ سرگودھا کے چیرمین اور چیف لائبریرین ڈاکٹر ہارون ادریس نے ڈاکٹر فرزانہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا

It was such a depressing news that I couldn't find any words to say. A lady who represented a true spirit of 14 centuries back. The one who was equipped with knowledge, expertise, skills, confidence, hard work, responsibility, responsiveness and every thing, one wishes to have. She was a source of inspiration for those who work under stress. She told me she would conduct an interview with me to collect data, the structure / schedule of which we discussed several times and finalized, before leaving for UK this year's vacation and spending her there, working extensively, but this is something she has committed and has not done. She had no concept of vacation or leave in her life. When I arranged some facilitation during her visit of Europe last year, it was so tedious schedule of visiting so many places that it was only she who could do it, sprinting to leave one flight and taking another and

connecting rails--having no rest time. Aahhhhh..... my sister has gone such a place that she is happy there, I strongly believe and

we shall remain missing her badly. Allah bless you even higher places in heaven, Farzana!!!

ڈاکٹر ہارون کے جذبات اور احساسات فرزانہ کے لیے ہر پروفیشنل کے احساسات ہیں۔ انھوں نے فرزانہ کی پیشہ ورانہ زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ہر اعتبار سے سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ بھٹی شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی چیرَپرسن ہیں۔ ڈاکٹر فرزانہ نے ستمبر 2007 سے ستمبر 2012 تک لیکچرر کی حیثیت سے شعبہ میں خدمات انجام دیں۔ دو سال قبل وہ چھٹیوں پر دمام یونیورسٹی کی خواتین کے لائبریری میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈائریکٹر کی حیثیت سے چلی گئی۔ ڈاکٹر روبینہ بھٹی اب اس شعبہ کی چیرَپرسن ہیں انھوں نے سینئر استاد کی حیثیت سے فرزانہ کے ساتھ چند سال کام کیا۔ ڈاکٹر روبینہ بھٹی نے فون پر فرزانہ کے بارے میں بتا یا کہ وہ ایک مذہبی خاتون تھی، نیک و محنتی، طلباء اس سے مطمئن رہا کرتے تھے۔ محنت سے اور تیاری سے کلاس میں جایا کرتی۔ وہ مکمل پروفیشنل تھی۔ اپنے پروفیسن کے لیے ہما وقت مستعد رہا کرتی۔ اس میں ٹیلنٹ تھا اس نے بہت آگے جانا تھا۔ اس میں اور دیگر اساتذہ ساتھیوں میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ ڈاکٹر روبینہ نے

بتایا کہ اس نے اپنی ایک بیٹی کی شادی کردی تھی جب کہ دوسری بیٹی کے لیے فکر مند تھی، دونوں بیٹے چھوٹے تھے۔ اس نے جامعہ کو مزید چھٹی کی درخواست دی تھی۔ لیکن جامعہ کے ذمہ داران نے اسے مزید چھٹی دینے سے معذرت کرلی۔ وہ سعودی عرب میں مطمئن اور خوش تھی۔ اس نے اپریل 2015 میں اپنا استعفیٰ جامعہ کر بھیج دیا جو اس کے حادثہ کے چند روز قبل ہی منظور کر لیا گیا۔

پاکستان کی خواتین لائبریرینز کے انٹرویوز پر مبنی تصنیف ''درخشاں ستارے'' کی مولفہ ڈاکٹر نسرین شگفتہ نے ڈاکٹر فرزانہ کی الم ناک موت پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے پاکستان لائبریرین شپ کے لیے عظیم سانحہ قرار دیا، ان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر فرزانہ کی موت ایک شخصیت کی موت نہیں، نہ ہی یہ ایک ایسی موت ہے کہ جس سے صرف ایک خاندان، عزیز رشتہ دار ہی متاثر ہوئے بلکہ پورا لائبریری پروفیشن اپنے ایک بہترین ساتھی سے، بہترین استاد سے، بہترین منتظم سے، محنتی محقق سے، مصنفہ اور مؤلفہ سے محروم ہوگیا۔ اس پروفیشن میں فرزانہ کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہ ہوسکے گا۔ وہ محنتی تھی، پروفیشن کے لیے بہتر سے بہتر کرنے کے جذبہ سے سرشار تھی۔ یہ بات حقیقت ہے کہ اس طرح رخصت ہوجانے والے برسوں یاد رکھے جاتے ہیں، فرزانہ کو بھی ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ وہ اپنے بچوں کے دلوں میں نہیں بلکہ پاکستان لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والے ہر پروفیشنل کے دل میں ہمیشہ زندہ

رہے گی۔ فرزانہ کا چھوڑا ہوا علمی سرمایہ لکھنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔فرزانہ اُن خواتین لائبریریز میں سے تھی کہ جس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کرکے دکھایا کہ آج کل کے آزاد معاشرہ میں کوئی بھی خاتون اگر چاہے تو حجاب میں رہتے ہوئے وہ سب کچھ کرسکتی ہے جو دیگر لوگ سرانجام دیتے ہیں۔ حجاب یا پردہ کسی بھی خاتون کے حصول علم میں یا ملازمت میں رکاوٹ نہیں ہوتا۔ فرزانہ ان خواتین میں سے تھی کہ جس نے شرعی پردہ کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں درس وتدریس کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے، سعودی عرب کی دمام یونیورسٹی کے کتب خانے کے شعبہ خواتین کی سربراہ کی حیثیت سے ایک کامیاب منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کی موت کا افسوس ضرور ہے لیکن جس انداز سے وہ رخصت ہوئی، وہ اعزاز بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ آمین

مرنے والے مر تو جاتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

(292015جولائی)

ریـنہم لائبریری‘ اور پاکستانی صحافی و کالم نگار مسعود اشعر ’

روزنامہ جنگ کے صحافی و کالم نگار مسعود اشعر ان دنوں لندن کے سفر پر ہیں۔ انہوں نے اپنے حالیہ کالم ’ہماری عیدیں، انگلستان کے پرندے اور کتابیں‘ (30 جولائی 2015) میں لندن کے ایک گاؤں کی لائبریری ’ریـنہم لائبریری‘ Rainham Library میں جانے اور کتابیں لینے ، لائبریری اور وہاں کے گورے لائبریرین کو دعائیں دینے کا واقعہ تحریر کیا ہے۔ یہ کالم تین موضوعات پر مبنی ہے لیکن میں اس کالم کے آخری حصے کا ذکر ہی کرونگا۔ لندن کے ایک گاؤں کی لائبریری اور لائبریرین کے کردار کو دیکھتے ہوئے ہم اپنے ملک کے کتب خانوں اور ان کے مہتمم کتب خانہ کے طرز عمل کا موازنہ کرکے اصلاحات کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ اچھی باتوں کی نقل کرنے میں کوئی مزائقہ نہیں۔ پہلے مسعود اشعر کا بیان کردہ واقعہ سن لیجیے۔ پھر بات کو آگے بڑھانے میں آسانی ہوگی۔

جناب مسعود اشعر لکھتے ہیں ”کتابوں کے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کتابیں خریدنا مشکل کام ہے۔ ہمارا بیٹا ہمیں اس چھوٹے سے شہر کی لائبریری لے گیا۔ یہ لائبریری ہم نے چند سال پہلے دیکھی تھی اور یہاں سے کتابیں بھی لی تھیں۔ مگر اب یہ لائبریری دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے اس چھوٹے سے

شہر میں اتنی شاندار لائبریری۔ چند سال میں یہ لائبریری اتنی بڑی اور اتنی شاندار ہو گئی۔ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی ہیں، ایک طرف بچوں کا سیکشن ہے وہاں مائیں اپنے چھوٹے بچوں میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے تعلیمی کھلونوں اور تصویری کتابوں سے انہیں مانوس کرا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف میزوں پر بڑی عمر کے عورت مرد بیٹھے کمپیوٹر پر کتابیں پڑھ رہے تھے۔ ہم کتاب گھر لے جانا چاہتے تھے مگر ہمارا سرجن بیٹا لائبریری کا ممبر نہیں تھا۔ ظاہر ہے دن رات مصروف رہنے والے ڈاکٹروں اور سرجنوں کو کتاب پڑھنے کا وقت ہی کہا ملتا ہے مگر ہم نے کہا ہمیں زوداشی گورد کا نیا ناول چاہیے جو اسی سال چھپا ہے۔ ہم نے جب سے اس کا (Kazuo Ishiguro) پڑھا ہے اس وقت سے ہم اس کے عاشق ہو گئے The Remains of the Day ناول ہیں۔ اسے انگریزی زبان اور انگریزی بیانیے پر جو قدرت حاصل ہے وہ آج کے بہت سے انگریزوں کو بھی نصیب نہیں۔ تو، اب سوال یہ تھا کہ ناول کیسے لیا جائے؟
لائبریری کی ممبر شپ تو مفت ہے مگر ممبر بننے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ آپ اسی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ اس کے لیے بجلی کا بل یا کوئی ایسی چیز دکھانا ضروری ہے۔ اس وقت ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اب ہمارے بیٹے نے صرف یہ کیا کہ اپنا کارڈ دکھا کر اور اپنے گھر کا پتہ دیا۔ اس گورے نے کوئی جھک جھک نہیں کی اور دے دیا۔ یعنی اس نے ہماری شکلیں دیکھ کر ہمارا The Buried Giant ہمیں ناول اعتبار کر لیا اور بیٹے کو ممبر بنا لیا۔ اب آپ ہی بتایئے، اسے کیا

کہتے ہیں اور
کی لائبریری اور اس کے لائبریرین کو دعائیں دے رہے ہیں"۔ Rainham رینہم
یقینا لائبریری اور رینہم لائبریری کے لائبریرین کا عمل اس لائق تھا کہ انہیں دعائیں دی جاتیں۔ ہمارے ملک میں کتب خانوں کی کیا صورت حال ہے۔ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ چھوٹے شہر، گاؤں، دیہات تو دور کی بات ہے ہمارے ہاں تو بڑے شہروں میں بھی کتب خانے موجود نہیں اگر چند موجود بھی ہیں تو ان حالت نہ گفتہ بے ہے۔
لائبریری کو ایک نامیاتی ادارہ تصور کیا جاتا ہے یعنی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے والا ادارہ۔ بڑھنے والی چیزیں کتابیں، خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا ای بک (E-Book) کی صورت میں ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی آنے والی کتابوں کا لائبریری میں آنا لازمی ہے اگر یہ عمل رک جائے اور وقت کے ساتھ ساتھ لائبریری میں نئی کتابیں نہ خریدی جائیں تو وہ لائبریری نہیں بلکہ گودام یا کتابوں کا اسٹور ہی رہ جاتی ہے۔ ہمارے کتب خانوں میں لائبریری بجٹ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ سرکاری اداروں میں کتب خانوں کو سالانہ بنیاد پر بجٹ فراہم نہیں کیا جاتا۔ نجی کتب خانوں میں صورت حال اس لیے بہتر نظر آتی ہے کہ وہ لائبریری پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ کتب خانوں میں
لائبریری خدمات کے حوالے سے ہم روایتی طریقہ کار پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی لائبریری ایسی ہو جو رینہم لائبریری کے اس طریقہ کار پر عمل کرتے

ہوئے کسی کو ممبر شپ اتنی جلدی فراہم کردے اور اسے اسی وقت کتاب بھی جاری کردے۔ ہمارے کتب خانوں میں وہی فرسودہ نظام رائج ہے۔ اگر کسی جگہ لائبریرین کو یہ اختیار حاصل بھی ہے کہ وہ از خود ممبر شپ دے تو وہ اس مائنڈ سیٹ کے مطابق اس پر عمل نہیں کرتا۔ بلکہ لائبریری میں آنے والے ریڈر کو غیر ضروری دوڑاتا ہے۔ وہ کام جو چند ساعتوں میں ہوسکتا ہے اسے کئی گھنٹوں حتیٰ کے دنوں میں انجام دیا جاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ لائبریری کی خدمات کو وقت اور ضرورت کے مطابق انجام دیا جائے۔ جو مائنڈ سیٹ کام کو طول دینے کا بن چکا ہے اس میں تبدیلی لائے جائے۔ یہ کام لائبریری اسکول بہت اچھی طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

اس حوالے سے ایک نجی عوامی لائبریری کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ اس لائبریری میں مجھے بے شمار مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ اس کا مہتمم میرا قریبی دوست تھا۔ میں اکثر اس کے پاس جایا کرتا۔ وہ لائبریری کراچی کے علاقے گلشن اقبال کے بلاک 8 میں قائم ہے اور ایک ہاؤسنگ سوسائیٹی اُسے چلارہی ہے، اسی سوسائیٹی نے اس گلشن کے اس بلاک کو آباد کیا ہے۔ وہاں ممبر شپ دینے کا طریقہ رینھم لائبریری کی طرح ہی ہے یعنی اس علاقے میں رہنے والوں کو کوئی بھی شناخت دینا ہوتی ہے۔ لیکن لائبریرین کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ متعلقہ دستاویزات وصول کرکے ممبر شب دے سکے۔ ممبر شب فارم

وصول کرکے ، تمام دستاویزات کے ہمراہ سوسائیٹی کے سیکریٹری کو بھیجا جاتا ہے وہ ممبر شپ فارم پر احکامات جاری کرتا ہے۔ فارم جانے آنے میں کئی روز لگ جاتے ہیں۔ اس طرح میں نے اکثر وہاں پر رکنیت حاصل کرنے والوں کو کئی کئی چکر لگاتے دیکھا۔ اس طریقہ کار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ مرکزیت کو ختم کرنے ڈی سینٹرالائزیشن سے بہت سے کام جلد انجام پاتے ہیں۔ جب آپ نے ایک لائبریرین کو اس مقصد کے لیے ملازم رکھ لیا تو اسے اختیار بھی دیں کہ وہ تمام کام قاعدہ کے مطابق انجام دے۔

رینہم لائبریری جس کا ذکر مسعود اشعر صاحب نے کیا لندن کے ایک گاؤں کی لائبریری ہے۔ جس میں گزشتہ برس لائبریری استعمال کرنیوالوں کی تعداد 57,882 بتائی گئی ہے۔ اس ایک سال کے دوران 5,321 کتابیں لائبریری سے جاری کی گئیں۔ یہ لائبریری جدید لائبریری بھی کہی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں ای بکس بھی گویا یہاں ڈیجیٹل لائبریری کی سہولت بھی مہیا ہے۔ پاکستان میں ڈیجیٹل لائبریری کی سہولتیں خال خال پائی جاتی ہیں۔ یہ زمانہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ گھر گھر نیٹ موبائل فون پر استعمال کیا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں ان اداروں کو جو لائبریری کی سہولتیں فراہم کررہے ہیں۔ ڈیجیٹل لائبریری کو بھی یقینی بنانا چاہیے۔ مطالعہ کی عادت کے فروغ میں کتب خانے کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اب جب کہ حکومت کی جانب سے نئی تعلیمی پالیسی کی تدوین کا

عمل جاری ہے۔ ملک میں کتب خانوں کے قیام اور فروغ کی جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ملک میں 50 ہزار کتب خانوں کی بات کی گئی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ موجودہ حکومت کو بھٹو دور کی تعلیمی پالیسی میں شامل کتب خانوں کے قیام کی منصوبہ بندی کی طرز پر ملک میں زیادہ سے زیادہ کتب خانوں کے قیام کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ ہر تعلیمی ادارے میں جہاں لائبریری پہلے سے موجود ہو اس کے ساتھ ڈیجیٹل لائبریری کے قیام کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کمپیوٹر، کمپیوٹر لیب، انٹرنیٹ کی سہولت اور دیگر ضروری ساز وسامان کی فراہمی کے لیے بجٹ میں گنجائش رکھی جائے۔ پہلے سے موجود کتب خانوں کی جانب توجہ کی بھی اشد ضرورت ہے۔ لائبریری بجٹ کو لازمی حصہ بنایا جائے۔ بجٹ میں لائبریری کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے معقول رقم مختص کی جانی چاہیے۔ تعلیمی اداروں میں کالجوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے ملک میں کولجوں کے کتب خانے تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ، ان میں خدمات انجام دینے والے لائبریرین بھی لائبریری سائنس کی ڈگری سے مزین ہیں لیکن ان کتب خانوں کی خدمات ناقص اور توجہ طلب ہیں۔ (31 جولائی 2015)

تحریک انصاف کے اراکین اسمبلی کو ڈی سیٹ کرنا۔ نتائج کیا ہوں گے

2013 کے عام انتخابات میں منظم دھاندلی کی تحقیقات کرنے والے تین رکنی جوڈیشل کمیشن نے 237 صفحات پر مشتمل اپنے میں صاف الفاظ میں انتخابات میں منظم دھاندلی اور مینڈیٹ چرانے جیسے الزامات کو رد کرتے ہوئے متعدد بے قاعدگیوں اور کوتاہیوں کی نشان دھی کی ۔ تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ کو بادل ناخواستہ قبول کرلیا۔ ویسے بھی کپتان قبول ہے قبول ہے کرنے کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ اگر وہ ٹھان لیں کہ انہوں نے قبول ہے کرنا ہے تو حالات خواہ کیسے ہی گھمبیر کیوں نہ ہوں وہ قبول کرکے دم لیتے ہیں۔ جوڈیشل کمیشن کے فیصلے کو قبول کرنے کے باوجود کپتان مطمئن نہیں وہ کمیشن کی رپورٹ کا پیراگراف نمبر 534 کا حوالہ دیتے نظر آتے ہیں۔ جس میں بقول حامد میر کمیشن نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر رپورٹ کے نتائج حکومت کے خلاف چلے جائیں تو ریاست پر کتنے منفی اثرات مرتب ہوتے۔ دوسرے الفاظ میں کمیشن نے ریاست کا ساتھ دیا، حامد میر کا کہنا ہے کہ یہ خان صاحب کی اپنی تشریح ہے تاہم انہوں نے یہ بات میڈیا پر کھل کر نہیں کہی اور کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم کر لیا'۔ رپورٹ کا یہ 534 پیراگراف کیا ہے ؟ اسے دیکھیں اس میں کیا لکھا ہے:

534. "However on account of the potential serious consequences which it findings may have on the Governing of the State and potential criminal consequences for individuals the Commission did not deem it appropriate to adopt a standard proof lower than the balance of protabilities"

کمیشن کی رپورٹ کو سرے سے ہی تسلیم نہ کرنے سے عمران خان اور ان کی جماعت زیادہ مشکلات کا شکار ہو جاتے ساتھ ہی اُس معاہدہ کا کیا کرتے جو انہوں نے جوڈیشل کمیشن کی تشکیل کے سلسلے میں حکومتِ وقت سے کیا تھا جس میں یہ صاف اقرار کیا گیا تھا کہ ' فیصلہ جو بھی ہوگا اسے تسلیم کیا جائے گا'۔ پھر تسلیم نہ کرنے کی صورت میں ان کے پاس سوائے سڑکوں پر آنے کے کوئی دوسرا آپشن موجود ہی نہیں تھا۔ اسلام آباد کی اہم شاہراہ پر 126 دن کا دھرنا اور اس کا نتیجہ ساری قوم کے سامنے ہے۔اسمبلیوں کو کپتان نے پہلے ہی بوگس ، جعلی کہا، حکومت کو للکار کر کہا گیا کہ ہمارے استعفے منظور کرو۔ چنانچہ اب قبول لیکن، اگر، مگر کرتے ہوئے قاضی کی عدالت سے عوام کی عدالت جو کہ اسمبلیاں ہیں میں ہی جانا دانشمندی تھی۔ اب جب اسمبلی میں پہنچے تو وہاں ایک اور مشکل پیش آ گئی، سیاست میں کوئی کسی کو بخشنے والا نہیں، جیسی کرنی ویسی بھرنی، کپتان نے حکومت سے لے کر چھوٹی سیاسی جماعت، حتی کے انفرادی لوگوں سے بھی پنگے لیے ہوئے ہیں۔ سابق چیف جسٹس افتخار چوہدری، سابق

صدر جنرل پرویز مشرف، 35 پنکچر، جیو نیٹ ورک اور جنگ اخبار اور دیگر کون ہے جس کی پگڑی دھرنوں کے اسٹیج سے نہیں اچھالی گئی۔ مولانا فضل الرحمٰن کو دھرنوں کے بلند و بالا اسٹیج سے کیا کچھ نہ کہا گیا، اس بات کا بھی لحاظ نہ کیا گیا کہ وہ سیاسی جماعت کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنما بھی ہیں، عالم دین بھی ہیں، ان کے عقائد سے، نظریات سے اختلاف اپنی جگہ، ان کی ایسی پگڑی اچھالی گئی کہ بس، رہی سہی کسر تحریک انصاف کے بہادر اور جیالے ورکرز سوشل میڈیا پر پوری کردیا کرتے تھے اور اب بھی فیصلے کے خلاف کر رہے ہیں۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی، حالات نے پلٹا کھایا، بلند بانگ دعوے کرنے والے اب ندامت اور شرمندگی کے عالم میں مصنوعی ہنسی کے ساتھ اپنا دفاع کر رہے ہیں۔

الطاف حسین سے تو کپتان کو جدی پشتی بیر لگتا ہے، دھرنوں میں تو ایم کیوں ایم پر کپتان کا نہ معلوم کس مصلحت کے تحت ہلکہ ہاتھ رہا لیکن وہ وقت سب کو یاد ہے جب کپتان اپنے بریف کیس میں الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کا پلندہ لے کر برطانیہ اپنی سابق سسرال گئے تھے۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ چند دن قبل بھی تحریک انصاف کے واڈی والا نے برطانیہ جاکر ایم کیو ایم کے خلاف مظاہرہ کیا، جس کا جواب اسی طرح برطانیہ میں ہی دے دیا گیا۔ دھرنوں کے بعد کپتان اور ان کے ساتھیوں نے ایم کیو ایم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ زرداری صاحب تو کپتان کو

شروع ہی سے نہ پسند ہیں۔ یہی صورت حال دیگر سیاسی جماعتوں، سیاسی لوگوں کے ساتھ تحریک انصاف کی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اب جب کہ جوڈیشل کمیشن نے فیصلہ سنادیا جو کہ کپتان کے خلاف اور حکومتِ وقت کی حماعت میں ہے تو تحریک انصاف نے اسمبلیوں کا رخ کیا۔ باقی تو ابھی خاموش ہیں لیکن مولانا فضل الرحمٰن کی پارٹی جمعیت علمائے اسلام اور الطاف حسین کی متحدہ قومی موومنٹ نے قومی اسمبلی میں تحریک انصاف کے اراکین جو مدت سے اسمبلیوں سے غیر حاضر تھے، اپنے استعفے اسپیکر کے پاس جمع بھی کراچکے تھے کے خلاف اسمبلی سے ڈی سیٹ کرنے کی قرار داد لانے کے لیے جوڑ توڑ شروع کردیا، دونوں جماعتیں تو کھلم کھلا اس کے حق میں آگئیں، کئی جماعتوں کے اراکین بھی اس کے حق میں ہیں۔ مسلم لیگ نون کے سربراہ میاں نواز شریف نے دونوں جماعتوں سے تحریک واپس لینے کی درخواست کی جسے دونوں نے نہیں تو نہیں کیا لیکن دونوں نے سوچ نے کے لیے وقت مانگ لیا۔ مسلم لیگ ن کے بعض اراکین اسمبلی کھلم کھلا ٹی وی ٹاک شوز میں اس بات کے حامی نظر آتے ہیں کہ تحریک انصاف کے اراکین کو ڈی سیٹ کردینا چاہیے۔ اسی طرح قائد حزب اختلاف خورشید شاہ تحریک انصاف کے اراکین کو ڈی سیٹ کرنے کے خلاف ہیں، اس کے پیچھے کیا مصلحت کارفرما ہے، پیپلز پارٹی کے بعض ارکان بھی اس بات کے حق میں نظر آتے ہیں کہ تحریک انصاف کو ڈی سیٹ کردینا چاہیے۔

نواز شریف اور خورشید شاہ بہ ظاہر اپنے اپنے بیانات کی روشنی میں عمران خان کو اسمبلی میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں اور اس کے لیے عملی کوششیں بھی کر رہے ہیں۔ درپردہ مقاصد کیا ہیں؟ عدالتی فیصلے نے نواز شریف کو عمران کے لیے اس قدر نرم دل کر دیا کہ وہ عمران کی کہی ہوئی منفی باتیں تو دور کی بات ہے خود انہوں نے عمران اور اس کی پارٹی کو کیا کچھ نہیں کہا بھول گئے یا پھر اسی چیز کا نام سیاست ہے۔ کسی تجزیہ کار نے کہا ہے کہ نواز شریف 'دل میں رکھنے والا مزاج' رکھتے ہیں، اپنے مخالفین کے لیے ظاہری مصلحت پسندی، اندر سے انتقام ان کے اصل مقاصد ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اس رائے کے حوالے سے جنرل پرویز مشرف اور ان پر چلائے جانے والے غداری کے مقدمہ کی مثال دیتے ہیں۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ نواز شریف اس معاملے پر عمران کی حمایت کرکے اس سے ناک رگڑوانا چاہتے ہیں۔ گویا عمران خان کے اراکین اسمبلی کو دوبارہ اسمبلی میں بلوا کر اس پر ایک ایسا احسان کر دینا چاہتے ہیں کہ عمران خان کی نظریں، ان کے طرف سے جھکی رہیں۔ عدالتی فیصلے نے تو انہیں جھکا ہی دیا ہے اب اس معاملے میں بھی تحریک انصاف کو جھکا دینا چاہتے ہیں۔

دھرنوں کی سیاست میں ناکامی (کپتان یہ تسلیم نہیں کرتے) کے بعد عدالتی فیصلے نے کپتان اور ان کے ٹیم کو خجالت اور خفت سے دوچار کیا اور اب

اسمبلیوں سے ڈی سیٹ ہونے کی تلوار ان کی پارٹی کے سر پر لٹ رہی ہیں۔ اسپیکر نے تحریک ایک ہفتہ کے لیے موخر کر دی ہے۔ نواز شریف نے تحریک پیش کرنے والی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقاتیں کرکے انہیں تحریک واپس لینے کا مشورہ دیا جس کو سر دست قبول کرنے سے معزرت کر لی گئی ہے۔ مسئلہ کے حل کے لیے وزیروں مشتمل ٹیم دونوں جماعتوں کو قائل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مختلف قسم کی باتیں ادھر ادھر سے سنائی دے رہی ہیں، سیاست میں 'کچھ لو اور کچھ دو' اور 'نظریہ ضرورت' کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر بھی کچھ دو کچھ لو پر معاملات کو حل کرنے کی باتیں سامنے آئی ہیں۔ متحدہ آج کل پاکستان پیپلز پارٹی کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی خائف ہے۔ ان کے تحفظات ہیں، جنہیں ان کے لیڈر پریس کانفرنسوں کے ذریعہ، وزیر داخلہ سے ملاقات میں حتیٰ کے وزیر اعظم سے ملاقت کرکے ان کے گوش گزار کر چکے ہیں۔ متحدہ کے ایک رکنِ کے حوالے سے یہ بات پرنٹ میڈیا میں آچکی ہے کہ متحدہ کے بقول ان کے کارکنوں کو غیر قانونی طور پر گرفتار کیا جارہا ہے۔ بقول متحدہ اس کے کارکنوں کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا جارہا ہے اگر اس کو بند کر دیا جائے یا پھر عمران خان، الطاف حسین سے معافی مانگ لیں تو متحدہ اپنے اس مطالبہ سے پیچھے ہٹ جائے گی۔ جہاں تک عمران خان کا الطاف حسین سے معافی مانگنے کا سوال ہے تو عمران خان جس قسم کے انسان ہیں، جو عادات واطوار ان میں پائی جاتی ہیں، یا الطاف حسین کے لیے وہ جس قسم کی

سوچ رکھتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ تو ممکن نہیں ہو سکے گا۔ البتہ اگر نواز شریف تحریک انصاف کو ڈی سیٹ ہونے سے بچانے میں واقعی سنجیدہ ہوں گے تو وہ متحدہ سے کچھ دو کچھ لو کی بنیاد پر معاملے کو نمٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جہاں تک مولانا فضل الرحمٰن کا معاملہ ہے مولانا صاحب صاف الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ وہ آئین اور قانون کے خلاف کسی بھی عمل کی حمایت نہیں کریں گے۔ لیکن مولانا صاحب کی سیاست کو دیکھتے ہوئے کچھ نہیں کہا جا سکتا، ان کی جماعت اقتدار کے بغیر مشکل سے وقت گزارتی ہے۔ وہ ہر دور میں اقتدار میں کسی نہ کسی طور رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کشمیر کمیٹی کے سربراہی پر بھی انہوں نے گزارا کیا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے وزیر اعظم سے ملاقات کے بعد میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ قومی اسمبلی میں اجنبی لوگوں (اراکین تحریک انصاف) کی موجودگی میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک جعلی اسمبلی میں بیٹھے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن کا کہنا تھا کہ ' ہمیں کسی سے ذاتی پرخاش نہیں لیکن آئین اور قانون کی روشنی میں ہی معاملت کو طے کرنا ہوگا۔ انہوں نے یاد دلایا کہ اگر جاوید ہاشمی اپنے مستعفی ہونے پر ندامت کا اظہار کریں تو کیا ان کی رکنیت اسپیکر بحال کردیں گے۔ انہوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ 2007 میں سردار ایاز صادق سمیت 90 ارکان مستعفی ہوئے۔ سردار ایاز صادق ہی یہ بات بتادیں

کیاان سے استعفوں کی تصدیق کی گئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آئین کے تحت تحریک انصاف کے استعفے منظور ہو چکے اور ان کی نشستیں خالی ہو چکی ہیں اگر ایسا نہیں تو پھر تحریک انصاف کے اراکان خود کہہ دیں کہ وہ مستعفی نہیں ہوئے تھے ہم ان کا جھوٹ بھی مان لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ رعایت دیں گے تو آئین کا کیا بنے گا'۔اور دیکھئے سیاست کے کھیل کے مولانا فضل الرحمٰن اور الطاف حسین میں ٹیلی فونک رابطہ ہوا جس میں کپتان کی ٹیم کو ڈی سیٹ کرنے کے معاملے پر گفتگو کی گئی۔ نواز شریف اگر چاہیں تو مولانا صاحب کو بھی کچھ لو کچھ دو کے فارمولے پر قراردادوں کے محرکین کو قائل کرکے کپتان کی جماعت کو اسمبلی سے ڈی سیٹ ہونے سے روک سکتے ہیں۔

ڈی سیٹ کے معاملے پر اگر کوئی سمجھوتا نہیں ہوتا اور اسمبلی میں اس مسئلہ پر رائے شماری کرائی جاتی ہے۔ اس صورت میں نوز شریف اور پیپلز پارٹی اس پوزیشن میں ہیں کہ اکثریت سے فیصلہ ان کے حق میں آجائے لیکن اس معاملے میں قانونی فلا ہے۔ معاملہ عدالت میں لے جایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ پر قانون بہت واضح ہے۔ جس نے استعفٰی دے دیا اسے منظور ہوجانا چاہیے تھا، کیوں نہیں ہوا؟ اسمبلی سے اتنے لمبی غیر حاضری پر نوٹس کیوں نہیں لیا گیا، اسپیکر صاحب کیوں مصلحت کا شکار رہے۔ وغیر وغیرہ۔ دوسری جانب سابق چیف جسٹس بھی کپتان کے لیے دھار لگا رہے ہیں انہوں نے پریس کانفرنس میں کہہ دیا ہے

کہ دھرنے کی تحقیقات اور آرٹیکل 6 کے تحت کاروائی کی جائے۔ انہوں نے دھرنوں کو غیر آئینی اور غیر قانونی قرار دیا، اگر متحدہ اور جمعیت علمائے اسلام عدالت نہیں بھی گئے تو بہت ممکن ہے کہ سابق چیف جسٹس افتخار چوہدری ہی اس مسئلہ کو عدالت لے جائیں، اس لیے نظر یہی آتا ہے کہ حکومت کسی نہ کسی طرح دونوں محرکین کو کپتان کی حماعت کے لیے تیار کر ہی لے گی اور معاملہ طے ہو جائے گا۔

عمران خان یہ نہیں کہہ رہے کہ ان کے اراکین نے استعفے دے دیے تھے، قبول نہیں کیے گئے، مراعات بھی لیتے رہے، اسمبلی سے غیر حاضر بھی رہے۔ اب کپتان کا کہنا ہے کہ انہیں بڑی خوشی سے ڈی سیٹ کر دیا جائے وہ دوبارہ زیادہ اکثریت سے جیت کر اسمبلیوں میں پہنچیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ معاملہ ضمنی انتخابات تک پہنچ جائے، بڑے پیانے پر ضمنی انتخابات ملک کو ایک نئے سیاسی بحران میں ڈال دے گا۔ پوری مشینری حکومت، الیکشن کمیشن، عدلیہ، اسکول وکالج، میڈیا تمام کام چھوڑ کر الیکشن الیکشن کھیلنے میں لگ جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ تحریک انصاف احتجاج کا پروگرام بنا کر سڑکوں آجائے، دوبارہ دھرنے شروع ہوجائیں اور ملک انتشار کا شکار ہوجائے۔ حکومت نے اپنی آدھی مدت پوری کر ہی لی ہے، دو سال باقی ہیں۔ اگر کوئی بہت بڑا بحران ملک میں نہیں آتا اور حکومت اپنی تمام تر توانائیاں عوام اور ملک کی بھلائی، خیر خواہی

پر صرف کردیتی ہے تو وہ ملک و قوم کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ متحدہ اور مولانا فضل الرحمٰن کو بھی ملکی حالات کے پیش نظر درگزر سے کام لینا چاہیے۔ بے شمار کام آئین اور قانون

کے خلاف ہورہے ہیں، ہوچکے ہیں، اگر یہ بھی ہوجائے گا اور اس سے ملک سیاسی انتشار سے بچ جائے تو سودا برا نہیں۔ (2 اگست 2015)

دنیا کی بہترین ٹیچر کا اعزاز۔پہلی بار عالمی سطح پر استاد کی پذیرائی

گلوبل ٹیچر پرائز حاصل کرنیوالی امریکی خاتون نینسی ایٹول

ماں کی گود کے بعد انسان کی تعلیم و تربیت کا محور و مرکز استاد قرار پاتا ہے۔ جسے دنیا کے ہر معاشرہ میں بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ استاد معاشرہ کا ایک ایسا منفرد و بنیادی ستون ہوتا ہے کہ جس کا عمل انسانی معاشرہ کو برائیوں سے پاک صاف بنانے میں کلیدی کردار ادا ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ ’جس شخص سے کسی نے ایک لفظ بھی سیکھا ہو وہ استاد کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور استاد کا احترام ہر انسان پر واجب ہے‘۔ شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو جب اعزاز سے نوازا جانے لگا تو انہوں وہ ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے پہلے یہ ایوارڈ میرے استاد کو دیا جائے، کیونکہ میں اپنے استاد کی بدولت ہی اس مرتبہ پر پہنچا ہوں‘۔ دنیا کے ہر شخص کا کوئی نہ کوئی استاد ضرور ہوتا ہے لیکن ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ ایسی واحد ہستی ہیں کہ جن کا دنیا میں کوئی استاد نہیں۔

خدمات کے اعتراف میں اعزازات دینا، میڈل اور ایوارڈ سے نوازنے سے دوسروں کو

ترغیب ملتی ہے کہ وہ بھی اپنے اپنے شعبوں میں بہتر سے بہتر خدمات انجام دیں۔ یہ اعزازات، ایوارڈ اور انعامات قومی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر، سرکاری اداروں اور نجی تعلیمی، معاشرتی، ادبی، ثقافتی اور فلاحی اداروں کی جانب سے مختلف شعبوں میں دیے جاتے ہیں۔'نوبل انعام' عالمی سطح پر مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔پاکستان کے ڈاکٹر عبد السلام کو 1979 میں رائل سویڈش اکیڈم آف سائنسز نے فزکس میں اعلیٰ کارکردگی پر نوبل انعام سے نوازا۔ 2014 میں ناروے جین نوبل کمیٹی نے بچوں کے حقوق اور تعلیم کے فروغ کے حوالے سے پاکستان ہی ملالہ یوسفزئی کو نوبل انعام سے نوازا۔ نوبل انعام مختلف شعبہ جات میں الگ الگ دیے جاتے ہیں۔ ادبی ادارے بھی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اعزازات اور انعامات سے نوازتی ہیں۔ حکومت پاکستان ہر سال مختلف شعبہ جات میں اعلیٰ خدمات انجام دینے والوں کو اعزازات سے نوازتی ہے۔ یہ اعزازات عسکری اداروں سے تعلق رکھنے والوں کو اور سویلینز کو بھی دیے جاتے ہیں۔پاکستان کا ہائر ایجوکیشن کمیشن بھی ہر سال 'بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ' کا اعلان کرتا ہے جس میں پاکستان بھر کی جامعات کے اساتذہ میں سے ایوارڈ کے حامل اساتذہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔۔بر سر تذکرہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی بھی اپنے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے 'بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ' کا اہتمام کرتی ہے۔ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے Best University Teacher

Award 2013 نوازا

اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے پہلی مرتبہ 'گلوبل ٹیچر پرائز' کے مقابلے کا انعقاد ہوا۔ اس مقابلے کا انعقاد دبئی کے 'گلوبل ایجوکیشن اینڈ اسکلز فورم' میں کیا گیا تھا۔ اس نے خود (Nancie At Well) مقابلہ میں امریکہ کی ایک خاتون استاد نینسی ایٹ ویل کو بہترین ٹیچر ثابت کرکے 10 لاکھ ڈالر انعام جیت لیا۔ مقابلے میں شریک دنیا بھر سے منتخب 10 اساتذہ کے درمیان لکھنے، پڑھنے اور سیکھنے کی صلاحیتوں کو جانچنے کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ جن میں ایک افغانی اور ایک بھارتی ٹیچر بھی شامل تھے۔ گلوبل ٹیچر پرائز کے پرجیکٹ کو مالی طور پر معاونت فراہم کرنے والوں میں مائیکروسافٹ کے بانی بل گیٹس،، برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون اور دبئی کے حکمراں شیخ محمد بن المختوم شامل ہیں۔ بہترین استاد کے انتخاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ دنیا بھر سے مختلف ٹیچروں کی نامزدگیوں کی جانچ پڑتال ماہرین کی ایک کمیٹی کرتی ہے۔ اور ان میں ابتدائی طور پر 40 اساتذہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر گلوبل ٹیچر پرائز کے لیے مقرر کردہ پرائز کمیٹی 10 اساتذہ کا انتخاب کرتی ہے۔ اس مقابلہ میں بھی اسی طریقہ کار پر عمل کیا گیا اور 10 منتخب اساتذہ میں نینسی ایٹول کے علاوہ بھارت کی کرن بیر سیٹھی، افغانستان سے عزیز اللہ روئش، ہیٹی سے گئے ہیٹی، کینیا کی جاکوا

کھورا، امریکی ریاست میساچوسٹس سے ناؤمی وولین، کمبوڈیا کی پھالا نیانگ، امریکی شہر نیویارک کے اسٹیفن رٹنر، ملائیشیا کے مدن جیت سنگھ اور برطانیہ سے رچرڈ اسپینسر شامل تھے۔ ابتدائی 40 اساتذہ میں اردن سے 2 اور مراکش سے ایک استاد شامل تھے۔ دس اساتذہ کے درمیان مقابلے میں نینسی ایٹول نے مقابلے میں شریک نو اساتذہ پر سبقت حاصل کرتے ہوئے اول پوزیشن حاصل کرکے دنیا کی بہترین ٹیچر کا اعزاز جس کی انعامی رقم 10 لاکھ ڈالر تھی جیت لی۔ یہ مقابلہ امریکہ میں ہوا لیکن انعام دینے کی تقریب دبئی میں منعقد ہوئی جس میں نینسی ایٹول کے علاوہ امرکہ کے سابق صدر بل کلنٹن اور دبئی کے حکمران شیخ محمد المختوم نے شرکت کی۔ گلوبل ٹیچر پرائز پروجیکٹ دبئی کے حکمران کی سرپرستی میں ہر سال بہترین ٹیچر کا اعزاز دیا کرے گا۔

ورکی فاؤنڈیشن Varkey Foundation نے 2014 میں استاد کے مرتبہ کو بلند کرنے کی غرض سے گلوبل ٹیچر پرائز کا اعلان کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد نئی نسل میں استاد کے مقام اور مرتبہ کو اجاگر کرنا تھا تاکہ وہ از خود استاد بننے کے خواب کی تکمیل کرسکیں۔ ساتھ ہی یہ مقصد بھی کارفرما تھا کہ اس سے اساتذہ میں مقابلے کا رجحان پیدا ہوگا اور وہ اپنے شعبہ میں دل جمعی، محنت اور مشقت کے ساتھ ترسیل علم کا فریضہ انجام دیں گے۔

نینسی ایٹول کا تعلق امریکی ریاست 'مینی' (Maine) کے دیہی علاقے Edgecomb سے ہے۔ انعام حاصل کرنے کے بعد نینسی نے حقیقی استاد ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے انعام کی تمام رقم اپنے ہی قائم کردہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے لیے وقف کرنے کا اعلان کیا۔ نینسی نے اس اسکول کی بنیاد 1990 میں رکھی تھی ۔ اس اسکول کا نام مینی سینٹر فار ٹیچنگ اینڈ لرننگ' ہے۔ نینسی نے اپنی انعام جیتنے کے بعد کہا کہ اس انعام کے ذریعہ ایک استاد کے کام کو سراہا گیا اور اس سے نوجوانوں کو بہت مدد ملے گی۔ تاہم وہ اس رقم کو ٹیچرز کی ٹریننگ کے اسکول کے لیے مختص کر رہی ہیں جو کہ انسانی خدمت سے جڑے رہنے کا عزم ہے۔ نینسی نے کہا کہ اس رقم سے اسکول کے ہر کمرے کے ساتھ ایک لائبریری قائم کی جائے گی جس سے یہاں ہر طالب علم کو سالانہ 40 کتابیں پڑھنے کا موقع ملے گا۔ اخبار انقلاب ، دہلی کے مطابق اس تقریب کے اختتام پر سابق امریکہ صدر بل کلنٹن نے کہا کہ انہیں آج تک اپنے تمام ٹیچرز کے نام یاد ہیں جب کہ یہ انعام لوگوں کو شعبہ تدریس کی اہمیت یاد دلائے گا'۔ 'گلوبل ٹیچر پرائز' نوبل انعام کے مساوی ہے۔ نینسی نے 1973 میں مغربی نیویارک سے ٹیچنگ کا آغاز کیا تھا۔ نینسی کو پڑھنے، پڑھانے اور بچوں کے درمیان رہنا پسند ہیں ، وہ جب بھی اپنے اسکول میں ہوتی ہے اسکول کے طالب علموں کو کتابوں کے درمیان کھینچ لاتی ہے۔ اسے خود بھی کتابوں سے محبت ہے اور وہ اپنے طالب علموں میں بھی کتاب سے محبت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔

دریاؔ لکھنوی۔ شخصیت و شاعری

اردو شاعری کی اثاث دلی اور لکھنوٗ دبستان ہیں۔ دبستانِ دلی کی شاعری داخلیت پسندی کے گرد گھومتی ہے جس میں سوز و گداز، درد مندی، غم والم، تصوف، حسن و جمال، احساساتِ حسن، خوبصورت تشبیہات، شگفتگی و ترنم،خلوص، سادگی، صداقت، خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔جب کہ دبستان لکھنوٗ کی اپنی ایک شناخت ہے ،انفرادیت ہے ، یہاں کے شعراء میں خارجیت کارنگ پایا جاتا ہے۔ خارجیت پسندی میں لکھنوٗ کا دبستان اتنے آگے نکل گیا تھا کہ وہ شعراء جو دہلی سے لکھنوٗ آئے جو داخلیت پسندی لیے ہوئے تھے انہیں بھی اپنے طرز اظہار میں خارجیت پسندی کو اختیار کرناپڑا۔ جیسا کہ مصحفیؔ نے کیا، مصحفیؔ پر تو سخت تنقید بھی ہوئی یہاں تک کہ انہیں یہ تک کہہ دیا گیا کہ ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ، اس کے باوجود انہیں شاعری میں منفرد اور یکتا مقام حاصل ہے۔آتشؔ میں بھی دلی اور لکھنوی رنگ و روپ نمایاں تھا۔ میرؔ بھی لکھنوٗ گئے تھے۔ شررؔ نے لکھنوٗ کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا۔ لکھنوٗکے دبستان میں دلی کے برخلاف شاعری میں داخلیت کے بجائے خارجیت بنیاد تھی، سلاست، بے ساختگی کی بجائے الفاظ کی شعبدہ بازیاں زیادہ تھیں، کھلاپن اور نزاکت جسے تنقید نگاروں نے نسوانیت کہا، کسی حد تک بات کو کھلے انداز سے کہنا، جو بات کہنی ہے اس میں لگی لپٹی نہیں رکھنی ،

بلکہ صاف صاف کہہ دینا لکھنؤ کے شعراء کا رنگ تھا، اسے فحاشی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لکھنوی دبستان میں اپنے آپ کو علمی اعتبار سے برتر ظاہر کرنے کی روایت پائی جاتی تھی، یعنی عام سی بات کو پر تکلف انداز میں بیان کرنا لکھنوی شاعری کا ایک خاص وصف تھا اور علمیت و فضیلت کی دلیل تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود لکھنؤ دبستانِ شاعری نے اردو زبان و ادب کو وسیع علمی ذخیرہ سے مالا مال کیا۔ لکھنوی دبستان اپنی ایک علیحدہ شناخت لیے ہوئے ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں لکھنوی شاعری دبستانوں کی تاریخی، سماجی اور ادب کی منفرد ترویج، زبان و بیان کی ادائیگی میں اپنا ثانی نہیں۔ لکھنؤ شاعروں کا شہر، اردو کی ترویج و ترقی کا شہر، ادیبوں اور دانشوروں کا منبع و مرکز، اردو تہذیب و تمدن کا گڑھ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں لکھنو کے شعرا اپنے نام کے ساتھ لکھنوی اور دہلی کے شعرا اپنے نام کے ساتھ دہلوی فخریہ طور

پر لگایا کرتے تھے۔ 'دہلی' اور 'لکھنؤ' شعرا کی پہچان تھا۔ دہلی اجڑی تو لکھنؤ میں اردو کے چرچے تیز ہوئے۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے

اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

لکھنؤ کو کئی اعتبار سے سبقت حاصل رہی، ترقی پسند تحریک کا آغاز لکھنؤ سے

ہوا۔ لکھنؤ کے دبستان میں جو نرمی، پیار، ٹھہراؤ، بھینی بھینی خوشبو ہے اس کا ثانی نہیں ۔ 'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ 'لکھنؤیت سے مراد شعر وادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے جُدا ہے۔ لکھنؤ کے اصل رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانہ پر نظر ڈالئے جب لکھنؤ کا شباب تھا، دولت کے دریا بہہ رہے تھے، آسمان سے ہُن برس رہا تھا، دور دور سے باکمال اور اہل فن کھنچے چلے آرہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک لیے فرش راہ تھا'۔ دیکھئے یہ شعر لکھنوی انداز کی ایک جھلک ۔

ایک زرا آپ کو زحمت ہوگی
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

دہلی دبستان کا اپنا رنگ ہے، دہلی اسکول آف اردو غزل کی وسعت اور اثرات اردو شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں گے۔ دبستان دہلی نے میر تقی میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، میر حسن، داغؔ دہلوی، بیخودؔ دہلوی اور بے شمار عظیم شاعر پیدا کیے۔ داغؔ کا شعر دیکھئے ۔

رات اس کو بھی خواب میں دیکھا
جس کو ہر دم حجاب میں دیکھا

لکھنؤ تو تھی ہی شاعروں کی سرزمین، بقول ڈاکٹر ابو للیث صدیقی ' ناسخ کو اساتذہ لکھنؤ میں بڑا مقام حاصل ہے۔ کیونکہ انھوں نے ہی سب سے پہلے دلی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا اور لکھنؤ کی زبان و شاعری کو قواعد و ضوابط کی سند عطا کی'۔ یہاں کے معروف شعراء میں ناسخؔ، برقؔ، آتشؔ، شوقؔ، سحرؔ لکھنؤ، جلال لکھنؤ، امانت لکھنؤ، آتشؔ کی تو کیا بات ہے۔ لکھنؤ

رنگ دیگر شعراء میں بھی نظر آتا ہے جیسے حسرتؔ موہانی کے ہاں لکھنوی رنگ ہے۔ میرؔ بھی دلی گئے تو انھوں نے کہا۔

لکھنؤ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میرؔ کی سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

نام قاضی عبد الرحمٰن انصاری، دریاؔ تخلص، لکھنؤ کے باسی تھے اس لیے لکھنوی ٹھہرے۔ ان کے جد امجد ہرات سے ہجرت کرکے دہلی کے قریب موضع ٹپل ضلع بلند شہر میں آباد ہوئے تھے، یہاں انہیں قاضی مقرر کرکے سندِ فیروز شاہی عطا کی گئ۔ عبد الرحمٰن انصاری کے والد کا نام عبد الغفار تھا۔ جنھوں نے دیوبند اور بعد ازاں لکھنؤ کے اسلامی دارالعلوم سے دینی تعلیم حاصل کی اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہیں لکھنؤ میں عبد الرحمٰن انصاری کی ولادت 1891ء میں ہوئی۔ گویا دریاؔ پیدائشی لکھنوی ہیں۔ دریاؔ عربی، فارسی

اور اردو میں مہارت رکھتے تھے، اور جوانی میں ہی غزل کہنے لگے تھے۔۔ انہوں نے
گوالیار کے شہر لشکر میں اپنے ہم عصر شعراء کی ادبی انجمن بھی بنائی اور اس کے تحت لشکر
میں شعر و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ قانون کے طالب علم بھی رہے اور
عملی طور پر کچھ عرصہ وکالت بھی کی۔ انہوں نے 1948ء میں پاکستان ہجرت کی اس
دوران آپ بیمار رہنے لگے تھے۔ اسی سال آپ کا انتقال
ہوا۔ پاکستان میں مدفون ہوئے۔

گمنامی میں چلے جانے والے شاعر دریاؔ لکھنوی جنہوں نے شعر تو کہے، بڑے شاعروں کی
صدارت میں اپنا کلام بھی سنایا لیکن اپنا کلام کبھی کسی جگہ چھپوانے کی زحمت نہیں
کی۔ دریاؔ لکھنوی کا یہ کلام 1925 سے 1939 تک کے درمیان تخلیق پایا۔ ان کا جس
قدر کلام بھی ہے ہاتھ سے لکھا ہوا ان کے فرزند ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کے پاس محفوظ رہا۔
جنہوں نے ان بوسیدہ کاغذ کے صفحات کو سنبھال کر رکھا یہ عمل اپنے والد سے عقیدت
اور ادب سے دلچسپی کا مظہر ہے۔ دریاؔ کے انتقال کو 67 برس گزر چکے ہیں اتنے طویل
عرصہ کے بعد ایک گمنام شاعر کو مجموعہ کلام کی اشاعت کی صورت میں متعارت کرانا
شاعر سے اپنی محبت اور عقیدت کا مظہر تو ہے ہی یہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ
اس خاندان میں علم و ادب سے حقیقی لگاؤ پایا جاتا ہے، شعر و شاعری کے جراثومے اس

خاندان کے احباب کے خون میں گردش کر رہے ہیں۔ دریاؔ لکھنوی کے بیٹے ڈاکٹر حفظ الحمٰن اس خدمت کے لیے قابل مبارک باد ہیں ان کا یہ لائق تحسین عمل ادب کے فروغ کا باعث ہے۔اب رہی یہ بات کہ ایسے شاعر کا کلام کس نوعیت کا ہے جسے اس شاعر نے مشاعروں میں اس وقت کے بڑے شعراء کی صدارت میں توپڑھا لیکن اسے کسی ادبی جریدے میں شائع کرانے کی کوشش نہیں کی، کسی جریدے نے از خود بھی ان کے کلام کو شائع نہیں کیا، اس دور کے شاعر دوست احباب نے بھی اس جانب توجہ نہیں دی۔اس میں دریاؔ لکھنوی کی سادگی، شہرت سے بے نیازی، انکساری و عاجزی کا دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ آج تو ہم جیسا ادب کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والا اگر کبھی کوئی ایک شعر بھی گڑھ لیتا ہے تو اولین کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح کہیں چھپ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی کہی ہوئی غزل جب تک کسی کو سنا نا لے اس کا کھانہ ہضم نہیں ہوتا۔ اُس زمانے کے لوگ شہرت کی بیماری سے آزاد ہو کر خاموشی سے بس اپنا کام کیے جاتے تھے۔ میرے دادا شیخ محمد ابراہیم آزادؔ جنہیں بیخودؔ دہلوی کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل تھا نے اپنا دیوان 'دیوانِ آزاد' بہ مشکل چھپوایا، اس کے ساتھ بے شمار کلام، اور نثری مضامین کسی بھی جگہ چھپ نہ سکے اور اب ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہا، کس کے پاس ہیں یا صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ کسی نے سخن ور اسی شاعر کو کہا ہے جس کا دیوان چھپ چکا ہو ؂

سخن ور ہے وہی جو صاحبِ دیوان ہو ناجی

نہیں تنک فردیوں کی تاب یہ ممکن کہ شاعر ہوں

مجموعہ کلام 'موج دریا' دریاؔ لکھنوی کے صاحبزادے ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کی وجہ سے گمنامی سے دنیا کے سامنے آنے کا باعث بنا۔ اس مجموعے نے دریاؔ لکھنوی کے کلام کو پھر سے زندہ کردیا ہے۔ دریاؔ لکھنوی کا پورا نام قاضی عبدالرحمٰن انصاری، تخلص دریاؔ اور شہر لکھنؤ کے باسی تھے اس لیے لکھنوی ٹھہرے۔ یہ خاندان حضرت ایوب انصاری کی باقیات میں سے ہے، شاعری اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے جو نسل در نسل کئی نسلوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ زیادہ تر شاعر داغؔ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر شعراء نے داغؔ کے شاگردوں سے تلمذ حاصل کیا۔ میرے خاندان کے شعراء بھی داغؔ اسکول سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح ریاست گوالیار سے تعلق رکھنے والے اکثر شعراء کا شجرۂ شاعری جنابِ داغؔ دہلوی سے جاملتا ہے۔ جیسے ریاضؔ انصاری جیوری نے نوحؔ ناروی شاگرد رشید داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ قاضی عبدالرحمٰن دریاؔ معروف شاعر مضطرؔ خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ عبدالوہاب انصاری نے دریاؔ لکھنوی کو نوحؔ ناروی کا پیروکار شاعر کہا ہے۔ دریاؔ لکھنوی نوح ناروی طرز کے شاعر کہے گئے اور نوح ناروی داغؔ کے شاگرد تھے۔۔ مضطرؔ خیرآبادی کا نام آتے ہی ان کی مشہور و معروف غزل ذہن میں نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ پوری غزل یہاں لکھ دوں

لیکن جگہ کی تنگی کے باعث دو اشعار پر ہی اکتفا کروں گا۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
نہ میں مضطرؔان کا حبیب ہوں نہ میں مضطرؔان کا رقیب ہوں
جو پلٹ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

افتخار حسین مضطر خیر آبادی کا زمانہ 1862-1927 کا ہے۔ یہ علامہ مولوی فضل حق خیر آبادی کے پوتے تھے۔ جان نثار اختر اور جاوید اختر اس خاندان کی ادبی اظہار کا تسلسل ہیں۔ اس خاندان میں شاعری اور ادب سے وابستگی نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ مضطر خیر آبادی کے خاندان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دریاؔ لکھنوی نے مضطر خیر آبادی کی قربت حاصل کی، خاندان بھی شاعر، ان کا اپنا مزاج بھی شاعرانہ تو پھر کلام کی کیا بات ہو سکتی ہے۔

دریاؔ کے مجموعہ کلام ''موج دریا'' میں جو غزلیں شامل ہیں ان کے نیچے یہ بھی تحریر ہے کہ یہ غزل دریاؔ نے کس مشاعرہ میں اور پڑھی اور وہ مشاعرہ کس شاعر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس دور کے معروف اور بڑے شعراء جن کی صدارت میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں دریاؔ نے اپنا کلام سنایا ان میں جگر مراد آبادی، بیخودؔ دہلوی، سیمابؔ اکبر آبادی اور حضرت مانی جائسی شامل

ہیں۔ اب جس شاعر نے ایسے ایسے بلند پایہ استاد شاعروں کی صحبت میں اپنا کلام سنایا ہو اس کی شاعری یقینا پایہ کی شاعری ہوگی۔ دریاؔ کی شاعری میں حسن ہے، درد ہے، مٹھاس ہے، اچھوتا پن ہے۔ سوز و گداز، درد مندی، غم والم، تصوف، حسن و جمال، احساساتِ حسن، تشبیہات، شگفتگی و ترنم، خلوص، سادگی، صداقت، خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔

دریاؔ لکھنوی کا زمانہ انیسوی صدی عیسویں کے آخری نصف سے بیسویں صدی عیسویں کے نصف تک کا ہے۔ اس دور کے ممتاز سخنوروں میں احمد رضاؔ بریلوی، سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی، شادؔ عظیم آباد، علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، شیخ محمد ابراہیم آزاد، ریاضؔ انصاری جیوری، مولانا غلام شہیدؔ، آسیؔ غازی پوری، حسنؔ بریلوی، علامہ ضیاء القادری، محمد عبداللہ بیدلؔ، حافظ خلیل الدین حسن حافظؔ پیلی بھیتی، محمد یوسف راسخؔ، منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری، محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولھا صوفیؔ، جمیل نقوی مرحوم، خلیلؔ صمدانی شامل ہیں۔ یہی شعراء جناب دریاؔ کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں۔ دریاؔ لکھنوی کو اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ خاندانی روایات، شعراء کی صحبت، استاد کی نظر عنایت نے دریاؔ لکھنوی کی شاعری میں نکھار پیدا کر دیا۔ وہ حقیقت اور سچائی کے شاعر ہیں، ان کی شاعری میں رکھاؤ اور

نظم و ضبط اور محاسنِ کلام کا معیار صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ وہ صرف ایک کہنا مشق شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ اردو زبان سے محبت ، چاہت ان کے کلام سے صاف عیاں ہے ۔

ادھر جاتا تو ہے قاصد اگر پوچھیں تو کہہ دینا
.برا ہے اور بھی حالِ دلِ ناچار پہلے سے

غالبؔ نے ناسخ کے لیے کہا تھا کہ وہ ایک فنے ہیں (یعنی غزل گوئی پر قادر تھے)، اسی طرح دریاؔ لکھنوی غزل گو شاعر ہیں، ان کے مجموعہ 'موج دریا' میں تو غزلیں ہی ہیں۔ بہت ممکن ہیں کہ ان کا دیگر کلام بھی ہو جو تا حال پوشیدہ ہے۔ دریاؔ لکھنوَ کی 'بزم ادب' لکھنوَ کی سرگرمیوں کے روح واں رہے، دریاؔ غزل کے شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں محاورات کی خوبی، زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں زبان وبیان میں نرمی ، سادگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دریاؔ کی شاعری میں دکھ بھی ہیں، غم بھی ، انھوں
نے تلخ باتوں کو سہل انداز سے بیان کیا ہے۔

اک نہ اک دن جان تو جانے ہی والی تھی مگر
غم تو اس کا ہے مرا قاتل پشیماں ہوگیا

دریاؔ لکھنوی کا لہجہ مضطر خیر آبادی کی طرح خالص ہندوستانی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ کمال انہیں اپنے خاندانی ورثے اور استادوں کی صحبت سے ہی حاصل ہوا ہے ۔

وہ چلے آتے ہیں ہاتھوں میں کلیجہ تھامے
کون کہتا ہے کہ فریاد میں تاثیر نہیں

دریاؔ لکھنوی کے کلام میں سادگی، خلوص اور صداقت کا عنصر نمایاں ، شاعر نے فنی رموز کو سچائی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ شعراء لکھنؤ کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے اپنی ساری صلاحیت شعر کی ظاہری حُسن و خوبی سے مزین کرنے میں صرف کردی۔ دریاؔ لکھنوٴ کی شاعری میں لکھنوی شاعروں کا یہ انداز بھی نمایاں ہے ۔

ترے دل میں میرے نالوں کے شکوے تو ہزاروں ہیں
مگر کوئی تجھے اپنا ستم بھی یاد آتا ہے

دریاؔ لکھنوی نے شاعری میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو عام زندگی میں معروف ہیں اور عوام الناس ان سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کا انداز اور لب ولہجہ سیدھا سادہ اور عام ہے ۔

میری حسرت ہے کہ ان کے آستاں پر مر رہوں
ان کی یہ تاکید کوئی دوسرا در دیکھئے

دریاؔ لکھنوی نے اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات نہیں کرتے بلکہ جو بات کہنی ہوتی ہے اسے صاف صاف کہہ ڈالتے ہیں۔ یہی ادا ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ لکھنؤ دبستان کی یہی ایک خوبی بھی ہے۔

بچا مرتے ہی مرتے دل کے ہاتھوں تو جوانی میں
میرا عہدِ شباب اک حادثہ تھا زندگانی میں

دریاؔ لکھنوی کو میرؔ کی طرح خطاب اور گفتگو کا انداز اچھا لگتا ہے۔ وہ کہیں کہیں خود کو بھی مخاطب کرکے باتیں کرتے ہیں۔

دریاؔ وہ حال بھی تو مرا پوچھتے نہیں
کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

دریاؔ لکھنوی کی شاعری میں یاس اور حسرت کا بھی بڑا دخل ہے، ان کی شاعری رنجیدہ دکھی اور ناامیدی کی جھلک ہے۔

دمِ نزع ہے روح کھنچنے لگی ہے رہا دل کا دل ہی میں رازِ نہانی
انھوں نے تو آنے میں تاخیر کردی تو ہی ساتھ دے کچھ مرا زندگانی

اسی طرح محبوب کے دیر سے آنے کی فریاد اس طرح کرتے نظر آتے ہیں ۔

آہ وہ آئے تو کب آئے عیادت کو مری

جب مجھے تربت میں دریاؔ دھرنے والے دھر چکے

طنز کرنا شاعری کا خاص وصف ہے۔ تمام ہی شاعروں خاص طور پر غزل گو شعراء میں طنز کا رنگ پایا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ کا طنز اپنا ثانی نہیں رکھتا، د میرؔ کے طنز کا ایک شعر ۔

ہوگا کسو دیوار کے سائے تلے میرؔ

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

دریاؔ لکھنوی کے ایک شعر میں طنز کا انداز کچھ اس طرح جھلکتا دکھائی دیتا ہے ۔

خبر سن کر مرے مرنے کی یہ ارشاد فرمایا

جنوں جب حد سے بڑھتا ہے یہی انجام ہوتا ہے

شاعری کے بارے میں دریاؔ لکھنوی کا کہنا ہے کہ یہ فن قسمت سے آتا ہے، کوشش اور جستجو سے حاصل نہیں ہوتا، اپنا اپنا خیال اور رائے ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ انسان کوشش اور جستجو کرے تو وہ کسی بھی فن میں مہارت حاصل کر سکتا

ہے۔ بہر کیف دریاؔ لکھنوی کا خیال توحسب ذیل شعر میں یہی ہے۔ دیکھئے یہ شعر ۔

جسے کہتے ہیں فنِ شاعری قسمت سے آتا ہے
نہیں ہوتا سعی سے شعر دریاؔ زندگی بھر میں

دریاؔ لکھنوی اپنے ظاہر اور باطن کے استعمال کے ساتھ محبوب مزاجی اور محبوب حقیقی کی یاد کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ۔

میرے ظاہر پر نہ جا کافر مرے باطن کو دیکھ
دل میں تیری یاد ہے لب پر خدا کا نام ہے

(اگست102015)

ریاضؔ انصاری جیوری شاگردِ رشید نوحؔ ناروی۔ شخصیت و شاعری

ریاضؔ انصاری جیوری ہندوستان کے ضلع' بلند شہر' سے تعلق رکھتے ہیں۔اس شاعر کا زمانہ 1898 سے 1974 کا ہے۔ گویا بیسویں صدی عیسویں کے آغاز سے 1974 تک۔ اس دور کے ممتاز سخنوروں میں احمد رضاؔ بریلوی، سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی، شادؔ عظیم آباد، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا محمد علی جوہر، حسرتؔ موہانی، شیخ محمد ابراہیم آزاد، مولانا غلام شہیدؔ، آسیؔ غازی پوری، حسنؔ بریلوی، علامہ ضیاء القادری ، محمد عبداللہ بیدلؔ، حافظ خلیل الدین حسن حافظؔ پیلی بھیتی، محمد یوسف راسخؔ، منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری، محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولھا صوفیؔ، جمیل نقوی مرحوم، خلیلؔ صمدانی، ناصرؔ کاظمی اور دیگر شامل ہیں۔یہی شعراء جناب ریاضؔ انصاری جیوری کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں۔ریاضؔ انصاری جیوری کا شجرۂ شاعری جنابِ داغؔ دہلوی سے جا ملتا ہے وہ اس طرح کہ انہوں نے نوحؔ ناروی، شاگرد رشید داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔انہوں نے 17 برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا خیال ہے کہ انہوں نے پہلا شعر 1915 میں کہا ہوگا۔ریاضؔ انصاری جیوری کا ایک معروف شعر ۔

جنگ ظلمت سے رہے گی میرے نورِ فکر کی
میں چلا جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی

ریاضؔ انصاری جیوری کے خاندان اور دیگر شعراء نے ریاضؔ انصاری جیوری کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار نثر اور نظم میں کیا اور تقریظیں لکھیں ۔نثر میں خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں سلیمؔ کوثر، گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیسؔ، ندؔا فاضلی، وکیل انصاری، شکیل گوالیاری، وقار صدیقی گوالیاری، ڈاکٹر اے ایم زتشی گلزار دہلوی، محفوظ الرؤف انصاری شامل ہیں جب کہ نظم میں خراج تحسین پیش کرنے والوں میں محمد خالدؔ کفایت، رئیس الدین رئیسؔ، یاضؔ گوالیاری شامل ہیں۔
ریاضؔ انصاری جیوری کے بارے میں گوپی چند نارنگ کا ایک خوبصورت جملہ دیکھئے لکھتے ہیں ’ سترہ برس کی عمر سے زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے شاعری کی دیوی کی پوجا ارچنا میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی‘۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی شاعری کے بارے میں ان کا مزید کہنا ہے کہ ’ ریاضؔ انصاری جیوری کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کو کبھی سود وزیاں کا کھیل نہیں سمجھا بلکہ زمینی سچائیوں کو اپنی سوچ سے جہاں تک ممکن ہوا پیش کیا۔ اُن کی شاعری میں جو رکھ رکھاؤ اور نظم و ضبط ہے اور محاسنِ کلام کا جو معیار نظر آتا ہے وہ اُن کی مشاقی کی دلیل ہے‘۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی شخصیت اور شاعری پر ان کے خاندان کے متعدد احباب جو ذوقِ ادب و شاعری رکھتے ہیں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ وکیل انصاری نے لکھا کہ ’ ریاضؔ انصاری جیوری کا تعلق قصبہ ضلع بلند شہر سے تھا لیکن وہ

تمام زندگی گولیار کو آباد کیے رہے۔ وہ گوالیار کی علمی و ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ وہ صرف ایک کہنا مشق شاعر ہی نہ تھے بلکہ اردو زبان سے محبت، چاہت اور اس کے فروغ و ترقی کے لیے بھی سرگرم رہے'۔ پیشہ کے اعتبار سے استاد تھے۔ اسکول میں ٹیچر ہونے کو فخر سمجھا اور ہمیشہ اسکول ہی میں پڑھاتے رہے۔ لفظ ماسٹر ان کے نام کا لازمی جذو بن چکا تھا،اکثر لوگ انہیں ماسٹر جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اسی حوالہ سے وقار صدیقی گوالیاری نے لکھا کہ' ریاض انصاری جیوری نے صرف مدرس کی حیثیت سے اردو زبان کی خدمت ہی نہیں کی بلکہ پوری طرح اردو تحریک کا ساتھ بھی دیا۔ گوالیار میں جب بھی اردو کی تعلیم و ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی گئی اس کے خلاف ہر احتجاج میں انہوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ 1915 میں گوالیار میں بزم ادب' کی سرگرمیوں کے روح رواں رہے۔ 1947-1972 تک وہ 'بزم اردو' کے معتمد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1955 میں انجمن ترقی اردو کی گوالیار شاخ کا قیام دوبارہ عمل میں آیا ریاض صاحب انجمن کے سرپرست کی حیثیت سے ابتداء سے آخر دم تک ہر کام اور موقع پر برابر عملی تعاون کرتے رہے۔ وہ جلسے میں بلاناغہ شرکت کرتے اور ہر منظور شدہ تجویز کو عملی صورت دینے میں انتہائی مستعدی کا ثبوت دیتے۔انہوں نے انجمن کے اَن گنت وفود کی سربراہی کی'۔

شکیل گوالیاری نے ان کی شخصیت کا جو نقشدہ کھینچا ہے وہ کچھ اس طرح سے

ہے۔ ’گورا رنگ، میانہ قد چہرے پر سنجیدگی و متانت رحم و انصاف شفقت و محبت کی جھلک، خود ستائی، تکبر اور غیبت جیسے اخلاقی و روحانی امراض سے پاک صاف، تصنع اور تکلف سے کوسوں دور صبر و تحمل کے خوگر، مدح وزم سے بے نیاز، دوست نوازی اور احباء پروری کی زندہ تصویر، شاعری زندگی دونوں میں سادگی پسند، ہر اصلاحی اور علمی و ادبی کام میں پیش پیش، قوم وملت کی خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے شرشار، زبان اردو کے حقیقی سرپرست، اتحاد و یکجہتی کے حامی، ہندو اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول صاف دل صاف گو لیکن کسی کی دل آزاری سے محترز، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہر محفل میں زینت صدارت، ہر تقریب میں مرکزِ توجہ عمر کے آخری ایام تک مذکورہ اوصاف سے متصف، ضعیفی میں بھی خوش الحان، ایسے تھے قاضی ریاض الدین انصاری جیوری‘۔ وقار صدیقی گوالیاری نے لکھا کہ ’ ریاض صاحب فطری طور پر بڑے خوش طبع زندہ دل، ملنسار، خلیق، بچوں میں بچے، بوڑھوں میں بوڑھے واقع ہوئے تھے۔ ہر قسم ، کے تعصب سے قطعاً پاک، نفرت اور برہمی سے مبر، گفتگو میں طوالت پسند تھے لیکن انداز گفتگو کی دلچسپی اس طوالت کی عیب پوشی تھی اور یہ طوالت پسندی طلباء کو ایک بات کئی کئی طور سمجھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ طبعاً انتہائی پر سادگی پسند تھے ہمیشہ کرتا پاجامہ، شیروانی یا کوٹ اور ٹوپی بس یہ ان کا لباس تھا۔ خواہش نام و نمود سے عمر بھر متنفر رہے‘۔

ریاضؔ انصاری جیوری کیونکہ داغؔ اسکول سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ ان کی شاعری میں داغؔ کی آن بان اور شان ہونا ہی تھی، ساتھ ہی میرؔ سے بھی متاثر تھے۔ اور نوحؔ ناروی کے تو وہ باقاعدہ شاگرد تھے۔ اسی لیے گوپی چند نارنگ نے کہا کہ 'ریاضؔ کے ابتدائی غزلوں میں نوحؔ ناروی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں'۔ ریاضؔ انصاری کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے جس میں انھوں نے اپنے آپ کو داغؔ اور میرؔ کے خوشہ چینوں میں ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

زبانِ داغؔ کہاں دردِ اور سوزِ میرؔ کہاں
ریاضؔ ہم ہیں فقط ان کے خوشہ چینوں میں

ریاضؔ انصاری جیوری نے داغؔ اسکول سے اپنی وابستگی کو اپنے لیے اعزاز تصور کیا اس کا حق ہمیشہ ادا کرتے رہے۔

آپ گھبرائیں نہ زلفوں کی پریشانی سے
یہ سنور جاتی ہیں کچھ اور پریشان ہو کر

ریاضؔ انصاری جیوری نے ہمیشہ غزل کہی وہ غزل کے شاعر گردانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محاورات کی خوبی، زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعارؔ میں میرؔ کی سی تیزی کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان میں نرمی، سادگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ریاضؔ انصاری جیوری کی غزلوں کے چمن

زار میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوجاتا کہ یہ کس قدر نفیس اور پختہ شاعر ہے۔ ریاضؔ کی غزل شفاف، اجلی اجلی، جھومتی ہوئی، سرور فراہم کرتی ہے۔ شکیل گوالیاری نے درست کہا کہ 'ہر شعر ریاض صاحب کے دکھوں سے جو جھتی ہوئی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زندگی کی تلخیوں کو خوش گوار بنانے اور خود کو مذاقِ عالم کے سانچے میں ڈھالنے کی مسلسل کوشش شاعر کی حوصلہ مندی کا پتہ دیتی ہے'۔

عشق کو دیکھئے منزل سے بھی آگے پہنچا
دل ابھی منزلِ اُلفت کے مقامات میں ہے

ریاضؔ انصاری جیوری نے زندگی کو سلگتا ہوا جہنم قرار دیا۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے ۔

اک اضطراب مسلسل ہے شورِ پیہم ہے
یہ زندگی تو سلگتا ہوا جہنم ہے
لطف نہیں، سکوں نہیں، چین نہیں، خوشی نہیں
یہ بھی ہے کوئی زندگی یہ کوئی زندگی نہیں

پروفیسر قمر رئیسؔ نے ریاضؔ انصاری جیوری کو 'مجاہد اردو' کا خطاب دیا۔ کیونکہ ریاضؔ انصاری جیوری صرف استاد اور شاعر ہی نہ تھے بلکہ وہ اردو زبان

کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی فکر مند رہے، عملی طور پر جدو جہد کرتے رہے۔ ندا فاضلی نے اپنے مضمون میں ریاض انصاری جیوری کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے مراسم اور گوالیار میں ان کی آمد اور ریاض انصاری جیوری سے ملاقات کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جس سے ریاض انصاری جیوری کی اردو زبان سے محبت اور عقیدت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ذاکر حسین صدر ہندوستان گوالیار آئے تھے۔ ملاقات میں ریاض انصاری جیوری بھی شامل تھے۔ ذاکر حسین نے ان سے پوچھا ''قاضی صاحب آپ اتنی ڈگریوں کے ساتھ ابھی تک اسکول کے ٹیچر ہیں، فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں'۔ اب یہ امتحان کا وقت تھا، ریاض انصاری جیوری نے اپنے لیے کچھ نہ مانگا۔ انہوں نے صدر جمہوریہ ہند سے کہا'' میرے لیے آپ اتنا کر دیجئے کہ اردو جو آزادی کے بعد سے سیاست کے نرغے میں ہے اس کی حفاظت فرمائیں۔ میری خواہش ہے میری زندگی تک یہ خوب صورت زبان وراثت کے طور پر نئی نسل کو ملے''۔ اگر ریاض انصاری جیوری چاہتے تو اپنی اعلیٰ تعلیم و تجربہ کی بنیاد پر کالج کیا جامعہ میں پروفیسری تو لے ہی سکتے تھے لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی ذات سے زیادہ اجتماعی مفاد کو عزیز رکھتے ہیں۔

ریاض انصاری جیوری نے تقسیم ہند کو عملی طور پر دیکھا، باوجود انہوں نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ جب انہوں نے ہند کے مسلمانوں کے ساتھ

متعصبانہ رویہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اندر ایک کرب اور درد محسوس کیا اور اس ستم گری پر اپنے جذبات کا کھلے بندو اپنے اشعار میں اظہار کیا۔

جس کے ہاتھوں نے گلستان کو سنوارا برسوں
اب وہ گلشن میں رہے ننگِ گلستان ہو کر!

ریاضؔ انصاری جیوری نے ہندوستان کی مٹی کو اپنے لیے انتخاب ضرور کیا لیکن ان کے اپنے کہتے ہیں اور ریاضؔ کے بعض اشعار سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اپنوں کی جدائی اور تنہائی انہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنوں کو یاد کرتے تھے۔

ہزاروں گھر جہاں ویران ہوں اپنوں کی دوری
وہاں نظارۂ سیر چراغاں دیکھتے کیا ہو
گلوں میں دل کشی اب وہ غنچوں میں دلآویزی
گلستان میں ہے اب کیا، اب گلستان دیکھتے کیا ہو

پاکستانی سیاست میں آجکل انقلاب اور تبدیلی کی بہت باتیں ہو رہی ہیں۔ ریاضؔ انصاری جیوری نے اس موضوع پر کیا خوب کہا۔

زر پرستوں پر عتاب آجائے گا
زرد چہروں پر شباب آجائے گا

جب سمجھ لیں گے کہ دشمن کون ہے

بس اسی دن انقلاب آ جائے گا

اپنے اس شعر میں ریاض انصاری جیوری نے کس قدر پیاری بات کہی ہے ۔

یہی ریاض دعا ہے کہ جیتے جی نہ اٹھیں

کسی کے آگے میرے ہاتھ التجا کے لیے

ریاض انصاری جیوری کی غزلوں سے چند منتخب اشعار ۔

کسی کو عیش میسر ہوا، کسی کو سکوں

مرے نصیب میں غم ہائے روزگار آئے

ہمارے بعد بھی آئی بہار گلشن میں

مگر سنا ہے کہ پھر پھول مسکرا نہ سکے

ریاض اس میں لاکھوں نے غوطے لگائے، کچھ اس طرح ڈوبے اُبھر نے نہ پائے

محبت وہ بے تھاہ ہے اک سمندر، کہیں جس کا دنیا میں ساحل نہیں ہے

ہم چاہتے ہیں جتنا اُن کو، وہ بھی ہمیں چاہیں مشکل ہے

ہم اُن سے نباہیں لاکھ مگر، وہ ہم سے نباہیں مشکل ہے

نہیں تمہیں مجھ سے گر محبت تو پھر جتانے سے فائدہ کیا؟

جو بات دل میں نہ ہو، زباں پر وہ بات لانے سے فائدہ کیا؟
خدا کے لیے یوں شبِ ماہ میں تم، نہ نکلا کرو گھر سے باہر اکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے، کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لے لے
ہنس ہنس کے یوں خوب فریبِ محبت نہ دو مجھے
پہچانتا ہوں خوب تمہاری نظر کو میں
کرو ہلاک یوں بجلیاں گرا کے مجھے
خدا کے واسطے دیکھو نہ مسکرا کے مجھے
''ہمارے نام نہ اب بھیجنا کبھی نامہ''
یہ نامہ بر نے دیا ہے جواب لا کے مجھے
آئے، بیٹھے اور اُٹھ کر چل دیے
یہ بھی ملنے کا کوئی انداز ہے؟
فیاضؔ گوالیاری نے ریاضؔ انصاری جیوری کے سانحہ ارتحال پر منظوم خراج تحسین اس طرح پیش کیا۔
غروب ہوگیا وہ آفتاب پچھلے دنوں
جو روشنی ہی نہیں، روشنی کا معدن تھا
وہ داغؔ و نوحؔ کی فنی روایتوں کا امیں
نگار خانۂ فطرت کا ایک نقش مبیں

بس ایک شورشِ تحسین و داد باقی ہے
نہیں ہے وہ تو مگر اس کی یاد باقی ہے

خواجہ حسن ثانی نظامیؒ سجادہ نشیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا سانحہ ارتحال

درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سجادہ نشین ، معروف ادیب و دانشور خواجہ حسن نظامیؒ کے فرزندِ ارجمند خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ دہلی میں انتقال کر گئے۔ وہ بیک وقت ایک صوفی، عالم دین، باکمال ادیب اور دانشور اور خانقاہی نظام کے علمبردار تھے۔ خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کے والدبزرگوار خواجہ حسن نظامیؒ اپنے وقت کے معروف ادیب، دانشور اور سجادہ نشین تھے۔ حسن ثانی نظامی بھی اپنے والد ماجد کی طرح صاحب طرز ادیب تھے۔ وہ اپنے والدبزرگوار کے جاری کردہ ماہنامہ 'منادی' سے وابستہ رہے، یہ رسالہ 1955 ء سے ان کی ادارت میں مسلسل جاری رہا، جریدہ 'منادی' کے اوراق خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کی علمیت اور قابلیت کا عملی اظہار ہیں۔

خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بعد ازاں انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن کیا۔ ان کا خاندان ایک دینی ، علمی اور ادب کی اعلیٰ اقدار کا امین ہے۔ انہیں علم وادب سے محبت اور لگاؤ ورثہ میں ملا۔ وہ تحریر و تقریر کے فن میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ دینی و علمی موضوعات پر انہوں نے سو سے زیادہ ریڈیو کے پروگراموں میں شرکت کی اور مختلف

دینی، اخلاقی، ادبی، علمی اور تصوف جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ ہندوستان کے معروف و معتبر علمی و ادبی اداروں کے تحت مختلف پروگراموں میں وہ مسلسل لیکچر دیتے رہے۔ انہوں نے ہندوستان کی نمائندگی اقوام متحدہ میں بھی کی۔ دنیا بھر میں ان کی علمیت و قابلیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ خانقاہی نظام کے بھی علمبردار تھے۔ وہ حضرت نظام الدینؒ، حضرت امیر خسرو اور اپنے والد حضرت خواجہ حسن نظامی کے عرس پر ہر سال مختلف پروگرام تشکیل دیا کرتے تھے جن میں محفل نعت، محفل سماع اور مختلف سیمنار و لیکچر شامل ہوا کرتے۔ وہ ان پروگراموں میں ذاتی دلچسپی لیا کرتے ساتھ ہی ار خود بھی مختلف تصوف کے موضوعات پر تقاریر اور خطبات دیا کرتے تھے۔

خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ ایک متواضع، خوش اخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ کشادہ دلی اور خرد نوازی ان کی پہچان تھی۔ وہ ہمیشہ امت میں اتحاد و اتفاق کے خوہش مند اور اس کے لیے عملی جدوجہد کرتے رہے۔ وہ صوفیانہ روایت کے اعلیٰ نمونہ اور دبستان دہلی کے امین تھے۔ ان کے لکھنے کا ایک خاص انداز اور اچھوتا اسلوب رکھتے تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنی کتاب تصوف رسم اور حقیقت اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات فوائد الفواد کا اردو ترجمہ کیا اس سے مرحوم کی صلاحیت اور اسلوبِ تحریر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انہوں نے

رسالہ منادی کو جاری رکھنے کے علاوہ اپنے والد بزرگوار کی مختلف تصانیف وتالیفات کو از سر نو شائع کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو ایک قابل تحسین اقدام تھا۔ اپنے والد کی کتب کی ازسرِ نو اشاعت کے سلسلے کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ جو کتابیں انہوں نے دوبارہ شائع کیں ان میں کچھ کتابیں 1857 کی جدوجہد آزادی سے متعلق ہیں۔

خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ ہندستان کی متعدد علمی وادبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ ہمدرد دواخانہ اور جامعہ ہمدرد بھارت کے بانی شہید حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید کے انتقال کے بعد خواجہ حسن ثانیؒ غالب اکیڈمی کے چیرَمین رہے، حکومت ہندوستان کی جانب سے انہیں Pride of Delhi Award (Delhi Gaurav) سے نوازا گیا۔ خواجہ صاحب آل انڈیا صوفی کانفرنس کے صدر نشین بھی رہے۔ اس کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ ، دہلی اردو اکیڈمی سے بھی وابستہ رہے۔ دہلی کی شاید ہی کوئی ادبی و علمی انجمن یا ادارہ ایسا ہوگا جس سے خواجہ صاحب کی وابستگی نہ رہی ہو اور انہوں نے اس کی سرپرستی نہ کی ہو۔ وہ 'خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے سیکریٹری اور امیر خسرو سوسائٹی سے بھی وابستہ تھے۔

خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کے انتقال پر ہندوستان کی مختلف مقتدر شخصیات نے

اپنے انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے مطابق ’وہ اپنے والد خواجہ حسن نظامی مرحوم کی تہذیبی روایات کے امین تھے۔ انھوں نے دہلی کی زندگی میں اسی بنا پر ایک خاص مقام حاصل کیا تھا۔ علمی و ادبی اعتبار سے ان کا شغف متنوع تھا۔ دہلی کی ادبی محفلوں اور انجمنوں میں وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کی گفتگو میں بڑی شیرینی اور ایک حِس مزاح بھی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دہلی کی محفلوں میں بہت مقبول رہے۔ اُن کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا۔ اُن کو زمانے میں شکار کا بھی تھا، وہ اپنا اچھا وقت جنگلو میں گزارا کرتے تھے، جہاں کے تجربات انھوں نے بڑے دل نشین انداز میں قلم بند کیے‘۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر کا کہنا ہے کہ خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کا نام علم تصوف کے تعلق سے پوری دنیا میں عزت و احترام سے لیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستانی ادب اور تہذیب کے وہ ہمیشہ امین رہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر ان کی گہرے نظر تھی خصوصاً دلی کی روایات کی وہ ہمیشہ پاسداری کرتے رہے‘۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کی خدمات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ’مرحوم علوم کے مختلف شعبوں میں گہری نظر رکھتے تھے جس کا اظہار ہم برابر اُن کی تقریروں میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف اداروں سے وابستہ رہ کر اہم علمی خدمات انجام دیں

ہیں۔ بلاشبہ خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ کا انتقال دہلی کی قدیم تہذیب و

ثقافت کے ایک روشن باب کا خاتمہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں'۔

خواجہ سید حسن ثانی نظامیؒ 15 مئی 1931 کو پیدا ہوئے۔ 15 مارچ 2015 کو 83 سال کی عمر میں بے شمار مریدین کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کا انتقال ان کے اپنے گھر واقع بستی حضرت نظام الدین میں ہوا، وہ ذیابیطس اور دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ تدفین درگاہ شریف کے 'خواجہ ہال' میں ان کے والد حضرت (خواجہ نظام الدین کی قبر اطہر کے ساتھ تدفین عمل میں آئی۔ (15 اگست 2015

موسمیاتی تبدیلیوں' کے وزیر کو بیرون ملک کا موسم راس نہیں آیا

موسمیاتی تبدیلیوں کے وفاقی وزیر سینٹر مشاہد اللہ خان جو گزشتہ دنوں بیرون ملک دورے پر تھے بی بی سی کی اردو سروس کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسی باتیں کہہ گئے جن کی پاداش میں انہیں وفاقی کابینہ کی رکنیت سے مستعفی ہونا پڑا۔خان صاحب جو چرب زبانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، بے وقت ، بے محل اور بے موقع غیر ضروری گفتگو کرکے وزارت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ 2015 کو دھرنوں ، احتجاج و سیاسی معرکوں کے ساتھ ساتھ استعفوں کا سال بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ دھرنوں کی بات تو بہت ہوچکی اس کی حقیقت پر آخری کیل کیمشن کی رپورٹ نے ٹھونک دی۔جہاں تک استعفوں کا تعلق ہے تو یہ سلسلہ جاوید ہاشمی سے شروع ہوا تھا آخری خبریں آنے تک ہماری اسمبلیاں ایم کیوایم کے استعفوں کی لپیٹ میں ہیں اور میڈیا ان استعفوں سے خوب خوب مزے لے کر وقت پاس کررہا ہے۔ استعفٰے دو قسم کے سامنے آئے ایک انفرادی اور دوسرے اجتماعی، اجتماعی استعفٰے سے مراد ایسے استعفٰے جو کسی سیاسی جماعت نے مشترکہ طور پر دیے، جیسے تحریک انصاف اور ایم کیوایم نے اجتمائی طور پر احتجاجًا اور تحفظات کے نتیجے میں دیے اور انفرادی استعفٰے جیسے مخدوم جاوید ہاشمی ، نبیل گبول اور پیپلز پارٹی کی علیزے حیدر نے اپنی اپنی نشستوں سے اسپیکر کو استعفٰے پیش کردئے۔ ایسے استعفٰے بھی مارکیٹ میں آئے

کہ جنہیں طلب کرنے کے مطالبات کیے گئے، جیسے گو نواز گو کے نعرے کے ساتھ وزیراعظم کو استعفی دینے ۔اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق کو بھی استعفی دینے کے مطالبات سامنے آئے جو وقت کے ساتھ دم توڑ گئے اس لیے کہ وہ بے وقت کے راگ تھے۔

سینیٹر مشاہد اللہ خان صاحب کا استعفی ایک منفرد استعفی ہے۔ جو اپنی مرضی سے، خوشی سے، کسی وجہ کے باعث، مطالبات اور تحفظات کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ استعفیٰ وزیر اعظم نے عسکری قوت اور سول جمہوری حکومت کے مثالی تعلقات میں غلط فہمی سے بچاؤ کے لیے طلب کیا، اس استعفیٰ کا تعلق خان صاحب کی سینٹ کی رکنیت سے نہیں بلکہ وہ جس وزارت کے چیف تھے اس سے عہدے سے ان کا استعفی طلب کیا گیا یعنی اب وہ پاکستان کی ماحولیاتی تبدیلیوں سے لا تعلق ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بڑے تغافلانہ عارفانہ انداز میں اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ’ انہیں وزارت کی کوئی پروا نہیں‘، واقعی ہونی بھی نہیں چاہیے اس لیے کہ انہیں پوری امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد جب ان کے بیان کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس پر برف پڑ جائے گی، لوگ اسے بھول جائیں گے تو خان صاحب کو پھر کوئی اور محکمہ سپرد کردیا جائے گا۔ وہ اپنی پارٹی کے سرگرم ہی نہیں بلکہ گرما گرم ، کروفر اور مخالفین کو ٹاک شوز کی میز پر سخت سے سخت جملے ، حتیٰ کہ غیر پارلیمانی الفاظ اور جملوں تک کے استعمال سے

گریز نہ کرنے والے کھلاڑی گردانے جاتے ہیں۔ لیکن وہ خواہ کتنے ہی کروفر رکھتے ہوں اس وقت تو ان کا سارا کروفر دھڑام سے زمین بوس ہوگیا، جب انہیں فوری طور پر غیر ملک سے واپسی کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی فوری استعفیٰ دے دینے کے سخت احکامات دیے گئے جس کے نتیجے میں انہوں نے پاکستان آکر استعفی دینے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ای میل کے ذریعہ ہی پاکستان کی سرحدوں سے دور رہتے ہوئے اپنی وزارت سے مستعفی ہونے کا پروانہ میل کردیا۔ ساری اکڑ پُھو جاتی رہی، روب و دب دبا ڈھیر ہوا، کرخت زبانی اور بدزبانی کچھ کام نہ آئی۔ ان کی جگہ مخدوم جاوید ہاشمی ہوتا تو اس بے عزتی پر سینٹ کی رکنیت کے ساتھ ساتھ پارٹی رکنیت کو خیر باد کہہ کر گھر بیٹھ جاتا۔ کاش ہمارے سیاست دانوں
میں اتنا حوصلہ پیدا ہو جائے۔

مشاہد اللہ خان کے استعفیٰ سے دیگر پارلیمانی ارا کین کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو اس بات کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ پارٹی لیڈر کسی بھی صور اپنے دامن میں آئے ہوئے دھبے کیا ایک دھبہ بھی برداشت نہیں کرتا۔ پارٹی کا کیسا ہی وفادار، کام آنے والا، مشکل میں ساتھ نبھانے والا، مخالفین کو سخت سے سخت جواب دینے والا، جیالا، سرخا، سبزا، جاں نثار تحریکیا ہی کیوں نہ ہو، اس کی اپنی جماعت کے لیے قربانیاں ہی ،کیوں نہ ، سچ گو

ایماندار، مخلص، طویل ساتھ نبھانے والا، عمر میں بڑا یا چھوٹا، نیک نام ہو یا بد نام اگر اس کی وجہ سے لیڈر بہادر پر حرف آئے تو پارٹی سربراہ تمام باتوں کو پس پشت ڈال کر اسے آسمان سے زمین پر پھینک دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ ایسی مثالیں ہماری سیاست میں بے شار پائی جاتی ہیں۔ کپتان عمران خان نے اپنے دھرنے میں مخدوم جاوید ہاشمی کے ساتھ کیا سلوک کیا، جسٹس ریٹائرڈ وجیہ الدین کو سر پر بٹھایا اور پھر اب اس کے سفید بالوں کی سفیدی کا بھی خیال نہ کیا۔ یہی حال مشاہد اللہ خان کے ساتھ بھی ہوا بقول کالم نگار الطاف حسین قریشی 'ان کی اپنی جماعت کے لیے بڑی قربانیاں ہیں، وہ کھردرے انداز میں سچ بات کہنے کی شہرت رکھتے ہیں، مگر یوں لگا کہ وہ تنے ہوئے رسے پر چلتے ہوئے توازن قائم نہ رکھ سکے'۔ یہ بات بہت واضح طور پر بے شار تجزیہ نگاروں نے کہی کہ مشاہد اللہ نے کوئی نئی بات نہیں کہی، البتہ کہنے کا انداز، مقام، وقت مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے بیرون ملک اس طرح کا بیان دے کر حکومت وقت کو شرم شار کیا۔ موجودہ حالات میں جب کہ سول و عسکری قوتیں ایک پیج پر رہتے ہوئے ملک کے اندر اور بیرونی دشمنوں سے بر سر پیکار ہیں، گھڑے مردے بے وقت اکھاڑنے کے مترادف تھا۔ جو خان صاحب نے اپنے زور خطابت میں دکھایا۔ وزیر دفاع کی مثال دی جاتی ہے، کہ وہ بھی اسی قسم کی گفتگو کر چکے ہیں، دیگر کئی لوگ اس جانب اشارہ کر چکے ہیں، بقول کالم نگار طارق بٹ (21 اگست روزنامہ جنگ) مشاہد اللہ نے جو کچھ کہا وہ پی ٹی آئی کے رہنما بریگیڈیئر (ر) سائمن سے

بالکل مختلف نہیں تھا۔ اپنے انٹرویو میں۔ بریگیڈیئر صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دراصل ظہیر الاسلام وزیراعظم اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف کو لڑا کر دونوں کی چھٹی کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ خود ٹیک اوور کر سکیں، مگر اس انٹرویو پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا شاید اس وجہ سے کہ وہ ایک اہم آدمی تھے نہ کہ وفاقی وزیر۔ وفاقی وزیر کی طرف سے اس طرح کے بیانات کی اہمیت کچھ اور ہوتی ہے'۔ اس کا عملی مشاہدہ پوری قوم نے مشاہد اللہ خان کے معاملے میں دیکھا۔

مشاہد اللہ خان صاحب ایک سینئر سیاست داں ہیں، پڑھے لکھے ہیں، عمر رسیدہ ہیں، سیاسی سمجھ بوجھ کے حامل ہیں انہیں از خود سوچنا چاہیے تھا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کرنے بیرون ملک گئے تھے۔ پاکستان کے سیاسی معاملات سے پردہ اٹھانا مقصد نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انٹرویو نشر ہوتے ہی وزیر اعظم نے خان صاحب سے فوری استعفیٰ طلب کیا، ان سے ان کے بیان کی وضاحت طلب کی، وزیراعظم کے ترجمان نے اپنے بیان میں وضاحت کی کہ جس ٹیپ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا کوئی وجود نہیں۔ وزیر اعظم کو ایسی کوئی ٹیپ کا علم نہیں اور نہ ہی کوئی ٹیپ کسی کو سنائی گئی'۔ وزیر اطلاعات نے بھی موسمیات و تغیرات کے وزیر کے اس بیان کی سختی سے تردید کی اور اس واقعہ کو من گھڑت قرار دیا۔ اسی طرح ڈی جی آئی ایس پی آر نے بھی میڈیا میں چلنے والی اس خبر اور ٹیپ سے متعلق

خبر کو بے بنیاد اور حقیقت سے دور قرار دیا۔ ٹیپ کیا تھی، مشاہد اللہ نے کیا تفصیل بیان کی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ اپنے دیے گئے انٹرویو میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ خان صاحب یہ کہتے بھی نظر آئے کہ ' انہوں نے یہ گفتگو اپنے کانوں سے نہیں سنی البتہ انہیں اس گفتگو کا علم دوسروں کے ذریعہ ہوا اور یہ کہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں'۔ کس قدر افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اس قدر اہم اور بلند منصب پر فائز شخص سنی سنائی باتوں کا اظہار اس طرح برملا کرے جیسے وہ از خود اس جگہ موجود تھا۔ اسے اقتدار کا نشہ، گھمنڈ، غیر ذمہ داری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ انہیں اس کی جو سزا ملی وہ ان کے جرم کے مقابلے میں کم ہے۔

اگر یہ بات وزیر موصوف نے درست بھی کہی تو یہ ان کا منصب اور مقام نہیں تھا۔ وہ اپنی جماعت میں اپنی حیثیت، وزیر اعظم سے اپنی قربت ، اعتماد اور بھروسے کے نشے میں ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کے بل دھڑام سے گرا دئے گئے۔ وزیر اعظم نے بروقت درست قدم اٹھایا، معاملے پر وقتی طور پر مٹی پڑ گئی، لیکن یہ سزا اس جرم کے مقابلے میں کم دکھائی دیتی ہے۔ سر دست خان صاحب کو ملکی معاملات سے دور رکھنا بہتر ہوگا۔ ابھی کل (20اگست) کو وزیر اعظم کراچی تشریف لائے جہاں انہوں نے کئی تقاریب میں شرکت کی اس میں اہم میٹنگ اپیکس کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں مشاہد اللہ خان بھی شریک نظر

آئے۔ یہ کچھ اچھا تاثر نہیں تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ یہ عمل دوسروں کے لیے مثال بنے گا، وہ آئندہ احتیاط سے کام لیں گے، بیان بازی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں گے کہ کوئی بات ایسی نہ کریں جو ان کے منصب اور عہدہ سے بڑھ کر ہو۔ لیکن اس عمل سے جو سامنے آیا یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خان صاحب سے استعفیٰ وقتی طور پر معاملے پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔ یہ محض ایک تھپڑ تھا جو وزیراعظم نے سزا سمجھتے ہوئے وزیر موصوف کے منہ پر دے مارا اور پھر اگلے ہی لمحے اسے گلے سے لگا لیا اور آئندہ یہ عمل نہ کرنے کی ہدایت کردی۔ مشاہد اللہ خان کا یہ عمل معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ انہوں نے کون سی ایسی بات نئی کہی سوال یہ ہے کہ اس عمل سے پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں مجروح ہوا ہے، ہماری جگ ہنسائی ہوئی ہے اور عسکری قوت میں غلط تاثر گیا ہے۔ موجودہ سیاسی صورت حال، ملک میں جاری آپریشن اور دیگر حالات کے تناظر میں بہتر یہی تھا کہ اس قسم کے موضوعات کو نہ چھیڑا جائے۔ وقاتی طور پر یہ معاملا سرد خانے میں چلا گیا ہے لیکن کسی بھی وقت اس پر سے گرد صاف ہوگی تو کئی سوال اٹھیں گے۔ کئی دوسرے جو اسی قسم کے بیانات دے کر استثنیٰ لیے ہوئے ہیں اور وزارت کے مزے لوٹ رہے ہیں انہیں بھی جواب دینا ہوگا۔ (21 اگست 2015)

میرے پوتے محمد صائم عدیل کی رسمِ آمین

اسلام کامل دین اور زندگی بسر کرنے کا مکمل ضابطہ اور سلیقہ پیش کرتا ہے۔ سورۃ 'آل عمران' کی آیت 19، میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا 'اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے'۔ اسی طرح سورۃ 'المائدہ' آیت 3، میں کہا گیا، ترجمہ: 'آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمتیں تم پرپُوری کردیں اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کیا'۔ زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط ، سلیقہ ، ہدایات اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ اپنے بندوں تک بھیجے۔ قرآن کا پڑھنا اور سننا باعث رحمت و برکت اور 'ذکراللہ' کی ایک قسم ہے۔ اپنے بندے کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند اور محبوب ہے۔ اللہ نے سورۃ 'الاعراف' کی آیت 204 میں ارشاد فرمایا ترجمہ: 'اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سُنا کرو اور خاموش رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت ہو جائے'۔ اسی طرح سورۃ' فاطر' آیت 29،30 میں کہا گیا، ترجمہ: ' جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اُس تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جس میں ہر گز خسارہ نہ ہوگا'۔ گویا قرآن کا سننا اور پڑھنا ہمارے لیے افضل، باعثِ رحمت ، باعثِ ثواب اور باعثِ برکت ہے۔ قرآن کی عظمت و فضیلت کے لیے یہی کہنا کافی ہے

کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں ہمارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے، ارشاد فرمایا ’تم میں سب سے بہتر افضل بندہ وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے‘۔ اسی حوالے سے ایک اور حدیث جامعہ ترمذی میں ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ’جس نے قرآن پاک کا ایک حرف پڑھا اس نے ایک نیکی کمالی اور یہ کہ ایک نیکی اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق دس نیکیوں کے برابر ہے۔ مزید وضاحت کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا، میں یہ نہیں کہتا کہ ’الم‘ ایک حرف ہے‘ بلکہ الف ایک حرف ہے‘ لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (اس طرح ’الم‘ پڑھنے والا بندہ تیس نیکیوں کے برابر ثواب حاصل کرنے کا مستحق ہوگا‘۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ الانعام‘ آیت 20، میں ارشاد فرمایا ترجمہ ’جو بندہ ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس‘ جیسی دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا‘۔

مسلمان گھرانوں میں بچہ جیسے ہی بولنا شروع کرتا ہے، اسے الفاظ کی پہچان ہونے لگتی ہے تو اسے قرآن کریم پڑھانے کی ابتدا کرادی جاتی ہے۔ مذہبی اور اسلامی رسم و رواج کے مطابق بچے کا قرآن پڑھنے کی ابتدا کا عمل ’رسمِ بسم اللہ‘ کے زمرہ میں آتا ہے۔ خواہ اس عمل کو رسم کا نام دیا جائے یا نہیں لیکن یہ گویا بچے کے باقاعدہ پڑھنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعض گھرانے بچے کے قرآن

پڑھنے کے عمل کی ابتدا کو ایک رسم کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔ رسمِ بسم اللہ اور رسمِ آمین کی روایت اسلامی اقدار میں سے ہیں۔ بچے کو سب سے پہلے اللہ کہنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ بابا، ماما، دادا، دادی، نانا، نانی اور دیگر قریبی رشتوں کے نام سیکھتا ہے۔ اس مرحلے کے بعد بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملے ادا کرنے لگے۔ یہ عمر تین برس کی ہوتی ہے۔ اب اُسے با قاعدہ پڑھنے کی جانب راغب کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بچے کو با قاعدہ کلام مجید پڑھانے کی ابتدا کو 'رسمِ بسم اللہ' کہا جاتا ہے۔ کلام مجید کے پڑھنے کا عمل بعض خاندانوں میں پر جوش طریقے سے ادا کیا جاتا ہے اس طرح کہ یہ ایک تقریب کی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس تقریب کو بے شمار لوگوں کو جمع کر کے ہی کیا جائے یہ والدین، بہن بھائی، دادا، دادی، نانا، نانی اگر چاچا، تایا، ماموں یا خالائیں اور پھوپیاں بھی شامل ہوں تو اچھا ہے مل کر خوشی کا اہتمام کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری بھی نہیں۔ استطاعت اور گنجائش پر منحصر ہے۔ اسی طرح جب بچہ کلام مجید ناظرہ مکمل پڑھ لیتا ہے تو 'رسمِ آمین' کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ گویا یہ اس بات کی خوشی کا اظہار ہوتا ہے کہ بچے نے الحمد اللہ کلام مجید ناظرہ پڑھ لیا ہے۔ یہاں بھی تقریب ضروری نہیں، مختصر تقریب بھی ہو سکتی ہے، بڑے پیمانے پر بھی اس کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی لازمی امر نہیں، استطاعت اور گنجائش کی بات ہے۔ میرے پی ایچ ڈی مقالے کا عنوان حکیم محمد سعید شہید کے حوالے سے تھا۔ یہ بات

2009ء کی ہے۔ تحقیق سے حکیم محمد سعید کی شخصیت کے حوالے سے بے شمار باتیں سامنے آئیں جن کو میں نے اپنی تحقیق کا حصہ بنایا۔ رسمِ بسم اللہ اور رسم آمین کے حوالہ سے جو بات مجھے معلوم ہوئی اور وہ میں نے ان کی شخصیت کے باب میں درج بھی کی وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

شہید حکیم محمد سعید کی رسم بسم اللہ 1922ء میں تین برس کی عمر میں ادا ہوئی۔" ہندوستان کے معروف عالم مولانا احمد سعید نے قرآن مجید کی سورۃ خلق کی پہلی آیت پڑھائی۔ اس موقع پر بچوں کی نماز با جماعت کا بھی اہتمام ہوا۔ تقریب کے دولھا نے امامت کے فرائض سرانجام دیے اس طرح آپ (حکیم محمد سعید) بچوں کی جماعت کے امام ہوئے اور نماز عصر پڑھائی۔ تین برس کے حکیم محمد سعید نے جگت چچی کے گھر قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور صرف پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ "رسم آمین" کی تقریب کا اہتمام بھی بڑے پر وقار طریقے سے ہوا۔ ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جانے کے بعد آپ کی والدہ نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا بیٹا اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے آپ کو حوض قاضی، اجمیری دروازہ، دہلی کی اونچی مسجد' مسجد گاڑی بان' میں قائم مدرسہ تعلیم القرآن میں داخل کرا دیا گیا۔ مسجد کے پیش امام حافظ عمر دراز علی نے آپ کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ اس وقت حکیم محمد سعید کی عمر نو برس

تھی۔ 1927ء میں آپ نے اپنی والدہ کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سے قبل آپ چھ برس کی عمر میں پہلا روزہ بھی رکھ چکے تھے"۔

میرا پوتا محمد صائم عدیل گزشتہ چار سال سے سعودی عرب کے شہر جدہ میں اپنے ابو امی کے ہمراہ مقیم ہے۔ کئی عمرے کرچکا ہے، الحمد اللہ گزشتہ برس صائم نے اپنے امی ابو کے ہمراہ حج کی سعادت بھی حاصل کر لی۔ گویا اب انہیں حاجی صاحب کہا جاسکتا ہے جدہ کے پاکستانی انٹر نیشنل اسکول میں کلاس سوم میں پڑھتے ہیں۔ یہ میرے بڑے بیٹے عدیل صمدانی کے بڑے صاحبزادے ہیں اور میرے پہلے پوتے بھی ہیں۔ محمد ارسل نبیل میرا دوسرا پوتا ہے جو میرے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نبیل صمدانی کا بڑا بیٹا ہے۔ میں اپنے ان دونوں پوتوں کا خاکہ الگ الگ تحریر کرچکا ہوں۔ جو اردو کی ویب سائٹ ' ہماری ویب' پر آن لائن موجود ہیں۔ میرے خاندان میں اس قسم کی تقریبات کا رواج پایا جاتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میرے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نبیل نے کلام مجید حفظ کیا تو اس کی رسم آمین' کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جس میں خاندان کے احباب نے کثیر تعداد میں ' شرکت کی تھی۔ اس وقت میرے والد اور والدہ دونوں حیات تھے۔ تقریب دادا اور دادی کے سائے میں منعقد ہوئی تھی۔ آج ہم اس مرتبہ اور اس مقام پر پہنچ چکے ہیں، یہ بھی اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ دن دکھایا۔ ہمارے پوتے کی رسم آمین ہماری سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے لیے صائم

کی دادی نے اپنے گھر واقع صفورہ چورنگی کے نزدیک ’ شاہرہ کرن اسپتال ‘ پر واقع اسکالہ کمیونٹی سینٹر ‘ کا انتخاب کیا۔ اس کمیونٹی سینٹر کو جو ایک شادی ہال بھی ہے یہ ’ سعادت حاصل ہے کہ یہاں ہر سال رمضان المبارک میں مردوں اور خواتین کے لیے نماز تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سال بھی اس سینٹر میں نماز تراویح پیں کلام مجید پڑھا گیا۔ کئی سال کے بعد اس سال قیام پاکستان کی تقریبات شایان شان طریقے سے منائی جارہی تھیں۔ رسمِ آمین کے لیے 13 اگست کا دن اس وجہ سے طے پایا کہ اس دن اسکالہ کمیونٹی سینٹر میں کوئی تقریب نہیں تھی۔ صبح یوم آزادی یعنی 14 اگست تھی، یوم آزادی کی تقریبات اپنی بہاریں دکھارہی تھیں ، ہر جانب سبز ہلالی پرچم لہرارہے تھے۔ ہر عمارت خوبصورت ، رنگین اور روشن قمقموں سے جگ مگ کر رہی تھی، قومی نغموں سے فضاء گونج رہی تھی۔ رسمِ آمین جس ہال میں منعقد ہونے جارہی تھی وہ بھی چھوٹے چھوٹے قمقموں سے روشن تھا، بعد نماز عشاء تقریب میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہال میں پہنچنے والے سب سے پہلے مہمان صائم کے پردادا یعنی میرے چچا تھے، مغیث صمدانی اس وقت ہمارے خاندان کے بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ وہ میرے والد مرحوم کا پرتو ہیں ، میں انہیں دیکھ کر اپنے والد کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ ماں باپ جیسی ہستی دنیا سے چلی جاتی ہے تو ان سے عقیدت و محبت زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے مجھے اپنی امی اور ابا کی یاد اور ان کی باتیں زیادہ یاد آنے لگیں ہیں۔ میں اپنے گھر پیں تو اس بات کا تو

اظہار نہیں کرتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات بات پر جب بھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو میری امی یا ابا سے تعلق ظاہر کرتی ہو تو میں ان کی یادوں کو اپنے اندر اترتا محسوس کرتا ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ اب میری ان سے جلد ملاقات ہونے والی ہے۔ زندگی کا زیادہ سفر گزر چکا ہے۔ مختصر زندگی باقی ہے دیکھیں اس کا اختتام کب ہوتا ہے اور میں اپنے والدین سے کب جا ملتا ہوں۔

بات اپنے پوتے صائم کی رسم آمین کی کر رہا تھا۔ مہمان آ چکے تھے۔ مہمانوں کو دو حصو ں میں ایک قنات نے تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک جانب پردہ دار خواتین تھیں دوسری جانب مرد حضرات تھے۔ ہال کی کشادگی اور دلکشی نے اس تقسیم کو جاذب نظر بنا دیا تھا۔ ویسے بھی یہ ایک مذہبی اور اسلامی اقدار کی حامل تقریب تھی۔ اسے مذہبی اقدار اور روایات کے ساتھ ہی منعقد ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے معاشرے میں اکثر برائیوں اور خرابیوں کی ایک وجہ خواتین کی حجاب سے دوری بھی ہے۔ قرآن نے خواتین کو واضح الفاظ یں پردے کا حکم دیا ہے۔ پاکستان اسلامی ملک ہونے کے باوجود اسلامی اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہونے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ہم چند سالوں سے ہر سال ہی سعودی عرب جا رہے ہیں۔ خواتین باپردہ اور عبا وقبا میں نظر آتی ہیں۔ بازاروں میں ، شپنگ سینٹرز میں، تفریحی مقامات پر، اسپتالوں میں، ائرپورٹ پر الغرض ہر جگہ عباپوش خواتین نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی رکاوٹ ، پردہ یا عبا خواتین کے کاموں میں حائل نظر نہیں

آتا۔ پاکستان میں صورت حال مختلف ہے۔اکثر احباب یہ کہتے ہیں کہ پردہ تو نظر کا ہوتا ہے، ظاہری طور پر اپنے آپ کو مخصوص لباس میں ڈھانپنے کا نام پردہ نہیں۔ان کی اس بات میں بھی وزن ہے کہ واقعی پردہ نظر ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہی قسم کی چیز دو پلیٹوں میں ڈھکی ہوئی ہو اور دوسری جانب وہی چیز ایک پلیٹ میں کھلی ہوئی ہو تو دیکھنے والے کی نظر فورناً کھلی ہوئی پلیٹ پر پڑے گی۔ کھلی ہوئی چیز پر گرد و غبار، مکھی مچھر بہ آسانی پہنچ جائیں گے جب کہ ڈھکی ہوئی چیز گرد و غبار کے علاوہ نظر بد سے بھی محفوظ رہتی ہے۔

خواتین کے لیے پردے کے احکامات کلامِ کریم کی دو سورتوں میں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ' النور' آیت 31 میں خواتین کے لیے پردے کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا، ترجمہ: 'اور اَے نبی ﷺ ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں ،اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں بجز اس کے کہ ظاہر ہو جائے ، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اِن لوگوں کے سامنے : شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں،اپنے مملوک، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں،اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔وہ اپنے پاؤں زمین پر

مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے'۔ قرآن کریم کی ایک اور سورۃ میں بھی خواتین کو منہ ڈھانپنے کا حکم دیا گیا۔ سورۃ' الاحزاب' کی آیت 59، ترجمہ: 'اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مُسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (مونہوں) پر چادر لٹکا کر گھونگٹ نکال) لیا کریں۔ یہ امر اُن کے لیے موجبِ شناخت (و امتیاز) ہوگا تو کوئی اُن) کو ایذا نہ دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے"۔ اس حوالے سے متعدد احادیث مبارکہ بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ترمذی، ابو داؤد میں حدیث بیان ہوئی 'ایک مرتبہ آنحضرت محمد ﷺ کے پاس آپؐ کی شریک حیات حضرت اُمِ سَلَمہؓ اور حضرت مَیمونہؓ بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابنِ اُمِ مکتومؓ آگئے۔ آنحضرت ﷺ نے دونوں بیویوں سے فرمایا: احتجبامنہ 'ان سے پردہ کرو'۔ بیویوں نے عرض کیا: یارسول اللہ الیس اعمیٰ لایبصرنا ولایعرفنا، 'یارسولؐ اللہ ! کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے'۔ آپؐ نے فرمایا: افعمیا وان انتما، الستما تبصرانہ، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟'۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت آئشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اُس سے پردہ کیا۔ کہا گیا آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں، یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا؟ جواب میں اُمّ المومنین نے فرمایا: لکنی انظر الیہ، 'میں تو اسے دیکھتی ہوں'۔

کلام مجید کی سورۃ' النور' آیت 31 کی تشریح کرتے ہوئے مفسرِ قرآن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں 'باپ' کے لیے استعمال ہونے والے عربی کے لفظ 'اٰبآئِ' کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ' اس لفظ کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ' دادا،پَردادا، نانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی دَدھیال اور ننھیال،اور اپنے شوہر کی دَدھیال اور ننھیال کے اِن سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح وہ اپنے والد اور خُسر کے سامنے آسکتی ہے'۔ بعض خواتین اپنے بزرگوں کو جو احترام دیتی ہیں وہ عزت واحترام وہ اپنے شوہر کے بزرگوں کے لیے ان میں پایا نہیں جاتا جس کی تاویل یہ پیش کردی جاتی ہے کہ شوہر کے باپ کے علاوہ کسی اور بزرگ سے ان کا کیا رشتہ؟ حالانکہ شوہر سے رشتہ جڑ جانے کے بعد شوہر کے تمام رشتوں سے وہی تعلق قائم ہوجاتا جو شوہر کا ہوتا ہے۔ ان کی عزت و توقیر میں کوتاہی کم علمی کے سوا کیا ہوسکتی ہے۔ پردہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر بہت زیادہ تحقیق و جستجو کے ساتھ قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ بعض معاملات میں اختلافات بھی آڑے آجاتے ہیں۔ لیکن جو بات قرآن میں کہہ
دی گئی وہ ہر صورت میں پتھر پر لکیر ہے، ہمارے لیے اس کا ماننا، اس کا اقرار کرنا اور اس پر عمل کرنا لازمی امر ہے۔

تقریب کی ابتدا اللہ کے نام سے ہوئی، تقریب کے دولھا ہمارے پوتے محمد صائم

عدیل نے سعودی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے 'توپ' یا جبہ پہنا ہوا تھا جس میں وہ بہت ہی حسین نظر آرہے تھے۔ فربہ جسم گول مٹول کہا جاسکتا ہے۔ کبھی سرخ سفید تھے اب گندمی رنگ، کتابی چہرہ، گلابی ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں، نکھرا نکھر، ہنستا مسکراتا چہرہ۔ان کی نانی نے ان کے گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالا، دادا کا حق ادا کرتے ہوئے ہم نے بھی ایک عدد ہار انہیں پہنایا، اسٹیج پر موجود صائم کے تمام ہی بزرگ موجود تھے۔ رسم آمین کی تقریب کا آغاز ہوا۔ صائم نے بسم اللہ کے ساتھ سورۃ فاتحہ، سورۃ النصر، سورۃ اللھب، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تلاوت کی۔ ہال میں موجود تمام ہی مہمانوں نے دولھا میاں کو دعاؤں سے نوازا، عدیل کے خالو محمد مکین قریشی نے دعا کرائی ۔ اس طرح تقریب کا اہم اور بنیادی مرحلہ اختتام کو پہنچا۔ دوسری جانب کھانے کی تیاری شروع ہوچکی تھی۔ مہمانوں کی تواضع گرما گرم کباب پراٹھے اور حلوے، گلاب جامن کے ساتھ کی گئی۔ اس طرح یہ پر وقار تقریب اختتام کو پہنچی۔ (23اگست 2015)

آگ کا دریا' کی خالق قرۃ العین حیدر۔افسانہ و ناول نگاری کی بادشاہ'

(21 اگست 2015 کو قرۃ العین حیدر کو جدا ہوئے آٹھ برس بیت چکے ہیں)

اردو افسانہ و ناول نگاری کی بادشاہ قرۃ العین حیدر ایک ایسی عبقری لکھاری تھیں کہ جب بھی ذکر افسانے یا ناول کا ہوگا یا پھر 21 اگست آئے گی تو ان کو پڑھنے والے انہیں یاد کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ناول کی دنیا میں 'آگ کا دریا' ایک ایسا شہکار کارنامہ ہے کہ جسے تحریر کیے برسوں سال بیت گئے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ کل ہی کی بات ہے۔ اردو کی یہ مایۂ ناز ادیبہ 21 اگست 2007 کو ہمیشہ ہمیشہ کے ملک عدم کوچ کر گئیں لیکن وہ اپنی خوبصورت تحریروں میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔انہوں نے افسانوں، ناولوں اور کہانیوں کا ایسا بے بہا خزانہ ، لفظوں کی کہکشاں، حسین جملوں کی بے مثال قمر پیکر چھوڑی ہے کہ جس کی مثال اردو ناول و افسانہ کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ قرۃ العین حیدر معروف اردو کے پہلے افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی ہیں۔ افسانہ نگاری انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھی لیکن وہ صرف افسانہ نگار ہی نہ تھیں بلکہ ناول نگار اس پائے کی کہ آج تک 'آگ کا دریا' اور 'آخر شب کے ہمسفر' کا مقابل کا ناول سامنے نہ آسکا۔ ان کا ناول 'آگ کا دریا' اور 'آخر شب کے ہمسفر' کو اردو ادب کی شاہکار تخلیق

گردانہ جاتا ہے۔ اس پر انہیں بھارتی حکومت کی جانب سے باوقار ادبی اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

عالمی شہرت یافتہ یہ ادیبہ قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1927 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئیں، وہیں پلی بڑھی، تعلیم حاصل کی۔ خاندان اردو ادب کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو افسانے کے پہلے افسانہ نگار شمار کیے جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا انتقال 21 اگست 2007 کو دہلی کے نزدیک ایک اسپتال نوئیڈا (Noida) میں ہوا، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں مدفن ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر ان ادیبوں میں سے تھیں کہ جنہوں نے قیام پاکستان کے وقت 1947 میں پاکستان ہجری کی کچھ ہی عرصہ بعد وہ لندن چلی گئیں اور وہاں سے ان کی سوچ نے شاید حالات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان آنے کے بجائے واپس اپنے وطن ہندوستان چلی جائیں، جہاں پر ان کے آباؤاجداد کی قبریں تھیں، ان کی یادیں تھیں اور وہ 1960 میں لندن سے واپس دہلی سدھار گئیں۔ 'تھی خاک جہاں کی پہنچ وہی پر وہ'، دراصل ان کا وجود

ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا اسے اپنے مقام پر واپس پہنچنا تھا، حالات اور واقعات تو ذریعہ بن جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا، ہندوستان کے اخبار

سے وابستہ رہیں ساتھ ہی کہانیاں Illustrated Weekly India اور Imprint بھی لکھتی رہیں۔ صحافی کی حیثیت سے تو وہ مشہور نہ ہوئیں البتہ کہانی نویس، افسانہ نگار اور پھر ناول نگاری نے انہیں اس وقت بامِ عروج پر پہنچا دیا جب ان کا ناول 'آگ کا دریا' 1959 میں لاہور سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔اس کے بعد ان کے افسانوں اور ناولوں کی لائن لگ گئی۔ کیونکہ وہ ہندوستان کی سرزمین میں پلی بڑھی تھیں، ان کا خاندان عرصہ دراز سے ہندوستان کی مٹی سے وابستہ تھا، ان کے والد تو اردو کے پہلے افسانہ نگار تھے ہی ان کی والدہ 'نذر زہرہ' بھی لکھاری تھیں۔ انہوں نے بھی کہانیا لکھیں۔ انہوں نے شروع میں بنتِ نذر الباقر کے نام سے اس کے بعد نذر سجاد حیدر (1894-1967) کے نام سے کہانیاں لکھیں۔ باپ افسانہ نگار، ماں کہانی نویس تو بیٹی بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کرداروں کا غلبًا ہونا قدرتی عمل تھا۔ چنانچہ ان کے اس عمل کو بعض ناقدین نے تنقید کا نشانہ بنایا بقول زاہدہ حنا ''قرۃ العین حیدر کے بارے میں یہ فتویٰ بھی دے دیا گیا تھا کہ وہ خان بہادروں اور رائے بہادروں کے خوش باش لڑکوں اور لڑکیوں کی کہانی لکھتی ہیں، زبان ان کی انگریزی زدہ ہے اور ان کے کرداروں کا تعلق ہماری مٹی سے نہیں۔ ان کی سیاسی بصیرت، تاریخی سماجی حقائق کے ادراک پر بھی مٹھی بھر راکھ ڈالی گئی ''۔ ادیب، دانشور اور لکھاری کسی بھی قسم کی چار دیواری سے آزاد ہوتا ہے، اس کی سوچ کا تعلق

تمام طرح کے حدود و قیود سے ماورا ہوتا ہے، وہ سیاسی، نسلی، علاقائی، لسانی اور تعصب کی پابندیوں اور گروہ بندیوں میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا اس کی سوچ، خیالات و فکر ان تمام چیزوں سے جدا ہوتی ہے۔ لہٰذا لکھاری خواہ کسی زبان کا ہو، کسی ملک سے اس کا تعلق ہو وہ صرف اور صرف لکھاری ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ سوچتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، خاص طور پر اپنے ارد گرد کے ماحول سے، اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر، اب برقی میڈیا پر دکھائے جانے والے گفت و شنید کے مکالموں سے جو کچھ وہ اخذ کرتا ہے اپنی تحریروں میں اپنی سوچ شامل کرکے اس کا اظہار کردیتا ہے۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر جو عینی آپا'' کے نام سے بھی معروف تھیں کی تحریروں کو اسی تناظر میں لینا چاہیے۔'' ادیب خواہ پاکستان کا ہو، ہندوستان کا ہو یا کسی اور ملک سے اس کا تعلق ہو وہ ادیب اور لکھاری ہی ہوتا ہے اس کی سوچ تخلیق کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔ عینی آپا ادیبوں، دانشوروں اور لکھاریوں کے لیے صرف ادیب تھیں، لکھاری تھیں، افسانہ نگار تھیں، ناول نگار تھیں اور کہانی نویس۔

عینی آپا کی تحریروں کی پذیرائی تو ان کی زندگی ہی میں شروع ہوچکی تھی۔ انہیں 1967 میں ان کی کتاب 'پت جھڑ کی آواز' پر Sahitya Academi Award سے نوازا گیا۔ 1989 میں ان کے ناول 'آخر شب کے ہمسفر' پر ہندوستان کے سب سے باوقار ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ ہندوستان کی حکومت نے

انہیں 1985 میں 'پدم شری' ایوارڈ دیا، 2005 میں 'پدم بھوشن جیسے اعلیٰ ایوار سے نوازا گیا۔ ادبی اداروں اور انجمنوں کی جانب سے انہیں بے شمار اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا۔ اعزازات یقینا کسی بھی شخص کی محنت کو سرائنے کا ایک معقول طریقہ ہوتے ہیں۔ کسی بھی مستحق کو یہ ضرور ملنے چاہیے۔ اصل میں حقیقی اعزاز جو عینی آپا کو حاصل ہے وہ یہ کہ وہ جو تحریری سرمایا موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے چھوڑ گئیں ہیں جس سے لوگ طویل عرصہ تک استفادہ کرتے رہیں گے اور کر رہے ہیں، یہ ان کا سب سے بڑا اور عظیم اعزاز ہے۔ ان کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ لوگ انہیں آج بھی اسی محبت اور عقیدت کے ساتھ پڑھ رہے ہیں، یاد کر رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے لندن سے واپس ہندوستان جا کر صحافت کے شعبہ کو اپنے لیے ذریعہ معاش کا ذریعہ بنایا لیکن ان کا اصل مقصد تو ادب تخلیق کرنا تھا۔ اخبارات سے وابستگی تو پیٹ کی مزدوری اور روٹی روزی کے لیے تھی۔ انہوں نے کہانیاں لکھیں، اپنے والد اور والدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ افسانے کی جانب آئیں اور پھر ناول نگاری ان کا اوڑھنا بچھونا ٹھہرا۔ انہوں نے بے شمار کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کے والد کو اردو کے پہلے افسانہ نگار اور عینی آپا کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے اردو ادب کو ایک نیا اسلوم اور اچھوتی شناخت دی۔ ان کی تصانیف میں 'میرے بھی صنم خانے 1949 '، صفینہ غم 1952'

پت جھڑ کی آواز 1965'، 'روشنی کی رفتار 1982'، 'چائے کے باغ 1965'، '،'
آگ کا دریا 1959 ' ، 'پکچر گیلری'، چاندنی بیگم'۔ 'آخر شب کے ہمسفر'، 'مرے بھی'
صنم خانے'، ' سفینہ غم دل'، 'کارجہاں دراز ہے' کے علاوہ دلبر، اگلے جنم موہے بٹیانہ
کیجیو، سیتاہرن، گردش رنگ چمن ،آوارہ گرد شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر استاد بھی تھیں ، کیلی فورنیہ یونیورسٹی میں مہمان مقررہ رہیں، شعبہ اردو بھی Visiting Professor مسلم یونیورسٹی جہاں پر ان کے والد رجسٹرار رہے تھے رہیں، بعد میں تاحیات پروفیسر کے مرتبہ پر فائز ہوئیں۔ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہیں ، انجمن ترقی اردو پاکستان نے ان کی شخصیت پر ایک کتاب ''قرۃ العین حیدر : اردو فکشن کے تناظر میں'' شائع کی، انجمن ترقی اردو پاکستان کے جریدے مہنامہ 'قومی زبان' نے ان پر خاص نمبر شائع کیا۔ انہوں نے تو افسانہ، ناول اور کہانی کے حوالے سے اس قدر مواد تخلیق کیا ہے کہ ہمارا مورخ برسوں ان کو اپنا موضوع بناتا رہے گا، محقق ان کے تخلیق کردہ مواد پر تحقیق کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ لکھاری ان کی شخصیت اور کارناموں پر قلم چلاتے رہیں گے۔ ان پر کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، رسالوں نے خاص نمبر شائع کیے ہیں، مضامین لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جارہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ایک جگہ لکھا

جس قسم کے ناول میں لکھتی ہوں' کے لیے تو ریسرچ ظاہر ہے کہ بہت ضروری''

ہے، علاوہ آرٹ ، ہسٹری ، آرکیالوجی اور موسیقی سے میری گہری دلچسپی اس چھان پھٹک میں معاون ثابت ہوتی ہے، یہ کون سی انوکھی بات ہے'۔پتہ چلتا ہے کہ قرۃ العین حیدر صرف افسانہ نگار، کہانی نویس اور ناول نگار ہی نہ تھیں بلکہ وہ ایک استاد بھی تھیں، صحافی بھی، انہیں موسیقی ، آرٹ ، تاریخ اور آرکیالوجی سے بھی لگاؤ تھا۔ یہی نہیں بلکہ ناول نگار اور افسانہ نگار تو اپنے ماحول اور ارد گرد کے ماحول کا مطالعہ باریک بینی سے کرتا ہے وہیں سے وہ مختلف کرداروں سے واقف ہوتا ہے جن کو اپنی کہانی، افسانے اور ناول میں خوبصورانداز سے پیش کرتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے بھی یہی کیا ہے۔ ان کے کردار آسمانوں میں نہیں رہتے بلکہ یہیں ہمارے آپ کے درمیان گھومتے پھرتے اور اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہم انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں جب قرۃ العین حیدر نے انہیں اپنے ناولوں، افسانوں اور کہانیوں میں بناسنوار کر پیش کر دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو اس دنیا سے جدا ہوئے آٹھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی یادپڑھنے والوں کے دلوں میں آج بھی روشن اور تابندہ ہے اور یہ یادہمیشہ قائم ودائم رہے گی۔ (25اگست 2005)

'دبستانوں کا دبستان' (کراچی)۔مثالِ بے مثال

تذکرہ نگاری اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے کہ جس کی اہمیت اور افادیت روز اول سے ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور افادیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ادب میں شعراء، ادباء ، ادیبوں اور دانشوروں کے تذکروں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ بھی ہوتے ہیں اور تنقید بھی۔ اگر تذکرہ نگاری نہ ہوتی تو آج ماضی کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں حال کے بے خبر ہوتا، اسی طرح اگر حال کے شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے مرتب نہیں ہوں گے تو مستقبل کے شاعر اورادیبوں کے آج کے شاعروں و ادیب گم نام رہیں گے ۔ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بے شمار ہے کہ جن کا کلام طباعت پذیر نہیں ہوا، نہ ہی ان کی کوئی نثری تصنیف شائع ہوئی، یہ تذکرہ ہی ہیں کہ جنھوں نے ایسے گم نام شاعروں اور ادیبوں کو پہچان دی اور انہیں گمنامی سے محفوظ رکھا۔ اردو میں تذکرہ نگاری سے قبل فارسی میں کچھ تذکرے تاریخ میں ملتے ہیں۔تذکرہ سے مراد در کسی بھی کتاب یا مضمون میں شعراء و ادباء کا ذکر یا علیحدہ سے ایسی کتاب جس میں شاعروں، ادیبوں اور محققین و مصنفین کے بارے میں معلومات درج ہوں۔1490ء میں دولت شاہ کی تصنیف میں شعراکے بارے میں معلومات درج ملتی ہیں۔ اردوتذکرہ نگاری میں میر تقی میؔر کانام سرِ فہرست ہے۔ میؔر نے اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ''نکات اشعرا'' کے

عنوان سے مرتب کیا تھا جو 1751ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تذکرے میں ستر یا بہتر (70-72) شاعروں کا تذکرہ تھا۔ تذکرہ نگاری میں میر تقی میرؔ کے علاوہ جو بڑے نام تاریخ میں ملتے ہیں ان میں شفیق اورنگ آبادی، مصحفیؔ، قایم چاندپوری، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ شامل ہیں۔ افضل بیگ قاشقال کا تذکرہ ''تحفہ الشعرا' ء، حمید اونگ آبادی کا تذکرہ ''گلشن گفتار' 1752ء، فتح علی گردیزی کا تذکرہ '1752 ریختہ گویان' 1753ء، میر حسن دہلوی کا تذکرہ تذکرہ شعرائے اردو'، غلام ہمدانی مصحفی کا تذکرہ تذکرہ ہندی' 1795ء، مصطفیٰ خان شیفتہ کا مرتب کردہ تذکرہ 'گلشن بے خار' 1835ء، قابل ذکر تذکرے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' بھی تذکرہ نگاری کی ایک کڑی ہے۔ لالہ سری رام کی مرتب کردہ پانچ جلدیں ''خم خانۂ جاوید'' کو مشفق خواجہ نے اپنے وقت کے بہترین تذکرہ کہا ہے۔ امروہہ کے شاعر غلام ہمدانی مصحفیؔ کے مرتب کردہ تین تذکرے ''عقدِ ثریا''، 'تذکرہ ہندی گویا'' اور ریاض الفصحا'' تذکروں کی فہرست میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی جامعہ '' موہن لال کھاڑیا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر رئیس احمد نے اپنی تحقیقی کتاب اردو تذکرہ نگاری 1835ء کے بعد'' جو 2011ء میں شائع ہوئی، ریختہ کی ویب'' سائٹ پر مکمل متن کے ساتھ موجود ہے میں بہت ہی تفصیل سے اس اچھوتے موضوع کو خوبصورت طریقے سے سمیٹا ہے۔ پاکستان میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا ہے، بے شمار تذکرے شعراء اور ادیبوں نے مرتب کیے۔

میرے دوست پروفیسر سراج الدین قاضی نے حیدرآباد سندھ کے ادیبوں، شاعروں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا تذکرہ مرتب کیا، محمد خاور نوازش جن کا تعلق ملتان سے ہے نے ''مشاہیرِ ادب: خارزارِ سیاست میں'' کے عنوان سے ایک تذکرہ مرتب کیا جسے مقتدرہ قومی زبان نے 2012ء میں شائع کیا۔ اسی طرح بے شمار تذکرے وقت کے ساتھ ساتھ مرتب ہوتے رہے اور منظر عام پر آتے رہے۔

دبستانوں کا دبستان، کراچی ادیبوں، محققین، نقادوں، شاعروں، مصوروں، مورخین، سیاحوں، سماجی اور علمائے دین کا ایک مسلسل تذکرہ ہے جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے احمد حسین صدیقی پیشہ کے اعتبار سے آرکیٹیکچر ہیں اس تذکرہ کی تدوین گزشتہ 13 سالوں سے کر رہے ہیں۔ اس کی اولین جلد 2003ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ احمد حسین صدیقی صاحب کی خوش نصیبی کے انہیں استاد الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے رہنمائی کرنے والوں کی خصوصی توجہ حاصل ہوئی۔ احمد حسین صدیقی نے تذکرہ کی اولین جلد میں لکھا ''میرے ذوقِ ادب کو مہمیز دینے والے ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر ہی یہ کام شروع کیا''۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس ادبی کام کی سرپرستی فرمان فتح پوری صاحب نے کی ہو اس کے معیار اور افادیت کی کیا بات ہوگی۔ احمد حسین صدیقی صاحب ادبی ذوق کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ ان میں ادبی ذوق و شوق ہی ہے کہ جس نے اس تذکرہ کو اب تک

جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ ان کے رسالے نگارِ پاکستان'' میں بھی مدیر کی حیثیت سے شامل رہے۔ یہ ادبی جریدہ جو نیاز فتح'' پوری کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی پہچان تھاڈاکٹر صاحب کی رحلت کے ساتھ ہی خاموش ہوگیا۔ یعنی اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی۔ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم کے صاحبزادے بھی تعلیمی ادارے سے منسلک ہیں ان کی دو بیٹیاں بھی جامعہ کراچی میں درس وتدریس سے وبستہ ہیں۔ ڈاکٹر عظمیٰ فرمان تو شعبہ اردو میں ہی استاد ہیں، صدر شعبہ بھی رہیں۔ احمد حسین صدیقی، سید محمد اصغر کاظمی جو رسالے کے مدیران میں شامل تھے سب کے سب ڈاکٹر فرفان فتح پوری کے جاری کردہ جریدے کو زندہ نہ رکھ سکے۔ اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے انتقال پر شیخ الجامعہ نے اس ادبی جریدے کی اشاعت کے حوالے سے کہا تھا کہ جامعہ کراچی اس رسالے کو 'گود' لے لی گی یا لے لیا ہے'۔ اس کے باوجود یہ پرچہ ڈاکٹرفرمان مرحوم کی طرح خاموش ہوگیاہے۔

احمد حسین صدیقی کا تعلق ہندوستان کے شہر امروہہ سے ہے جہاں پر وہ 1937 میں پیدا ہوئے۔ بلدیہ اعظمیٰ کراچی سے ملازمت کا آغاز کیا۔ کراچی بلڈنگ اتھارٹی کے چیف کنٹرولر ہوئے، 1994 سے 1997ء تک کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ادبی و علمی ذوق ہونے کے

باعث ادب کے مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ اپنی خودنوشت ''سیاحتِ ماضی'' کے عنوان سے لکھی، امروہہ کی تاریخ 'کشورِ اولیاء' کے عنوان سے لکھی۔ کراچی کی تاریخ 'گوہر بحیرۂ عرب' کے نام سے مرتب کی۔ احمد حسین صدیقی کا تصنیفی سفر تذکرہ کے حوالہ سے 2003 سے شروع ہوا۔ ''دبستانوں کا دبستان'' (کراچی) کی اولین جلد اسی سال منظر عام پر آئی۔ اس جلد میں 194 ادیبوں، شاعروں، ممتاز ادبی شخصیات کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ پہلی جلد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس جلد کی کمپوزنگ انہوں نے کمپیوٹر پر از خود کی۔ یہ ایک مشکل کام ہوتا ہے لیکن شوق کے آگے کوئی بھی کام مشکل نہیں ۔ مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے اور احساس ہے کیوں کہ میں بھی گزشتہ کئی برس سے اپنے مضامین اور کتابیں از خود کمپیوٹر پر کمپوز کرتا ہوں۔ اس میں سہولت ہی سہولت نظر آتی ہے۔ کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا اور کام جلد ہو جاتا ہے۔

دبستانوں کا دبستان 'کراچی کی پہلی جلد کی اشاعت کے دو سال بعد ہی دوسری جلد' 2005ء میں منظر عام پر آ گئی ۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ احمد حسین صدیقی کے تذکرہ کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس جلد میں پہلی جلد کے مقابلے میں زیادہ ادبی شخصیات کے بارے میں معلومات درج ہیں۔ یہ جلد 439 ادیبوں ، شاعروں، محققین کے بارے میں مختصر اطلاعات فراہم کرتی ہے۔ اردو کے معروف شاعر

راغبؔ مرادآبادی نے اس جلد کی اشاعت پر اپنے مخصوص شاعرانہ انداز سے کتاب اور صاحب کتاب کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔

تذکرہ اہل علم وادب کا اب تک ایسا کوئی نہیں

جس میں ہو شامل شاعر' ناشر' صحب تصنیف اور فنکار

شاعر ناشر عالم فاضل بزم کی زینت ہیں راغبؔ

یہ ہے دبستانوں کا دبستان بزم آرائی کا شہکار

معروف ادیب مشفق خواجہ مرحوم نے دبستانوں کا دبستان، کراچی کی دوسری جلد پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ 'اردو کا سب سے بڑا تذکرہ ''خم خانۂ جاوید'' جس کی پانچ جلدیں گزشتہ صدی کی پہلی چار دہائیوں کے درمیان شائع ہوئی بلا شبہ نامکمل رہ جانے کے باوجود زبردست اہمت کی حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرے کے مرتب لالہ سری رام کو متعدد اہل علم کی معانت حاصل تھی۔ لیکن احمد حسین صدیقی کا کام بھی جاری ہے جو انہوں نے تن تنہا انجام دیا اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ کسی اہم شہر کے حوالے اتنے بڑے پیانے پر کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہوا'۔ مشفق خواجہ مرحوم کا کہنا تھا کہ دبستانوں کا دبستان، کراچی ایک ایسی تصنیف ہے جو اپنے مؤلف کو زندہ رکھے گی۔

2010ء میں 'دبستانوں کا دبستان'، کراچی کی تیسری جلد منظر عام پر آئی۔ یہ جلد سابقہ دونوں جلدوں کا تسلسل تھا۔ اس کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گو اس کی اشاعت میں پانچ سال لگ گئے۔ مؤلف اپنے تذکرہ کو بہتر سے بہتر کی جانب لے جانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس جلد میں 181 ادیب، محقق، نقاد، مصور اور مورخ شامل ہوسکے۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس جلد پر اپنی رائے جسے پیش لفظ ہی کہا جاسکتا ہے لکھا انہوں نے اپنی بات کی ابتدا غالبؔ کے اس شعر سے کی ۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

ڈاکٹر فرمان نے لکھا'' احمد حسین صدیقی کی'' دبستانوں کا دبستان''کراچی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو شاعروادب کی تقریباً ستر اسی سالہ تاریخ کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اس کا کینوس صرف تنقیدی شذرات یا مختصر مبصرانہ جائزوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں مذکور جملہ شاعروں اور ادیبوں کے اصل نام، نسبت، تاریخ ولادت وجائے پیدائش، ہجرت و مسافرت اور خانوادوں درسگاہ کی تفصیل رومائی، تعلیمی نسبتوں کی توضیحات کو ضروری سوانحی کوائف وعصری میلانات کی نشاندھی کے ساتھ اس طرح سمیٹ لیا گیا ہے کہ تذکرہ نگاری وتاریخ نویسی دونوں کا حق ادا ہوگیا ہے۔ دبستانوں کا دبستانکا حیرت انگیز وصف یہ ہے

کہ یہ آغاز سے لے کر انجام تک مصور ہے یعنی اس میں جن ادیبوں اور شاعروں تذکرہ آیا ہے ان کی تصویریں بھی دی ہوئی ہیں۔اس طرح کا کوئی دوسرا تذکرہ اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں نظر نہیں آتا اور اس لیے میں نے اسے ''مثالِ بے مثال'' کا نام دیا ہے''۔انجمن ترقی اردو دہلی کے ڈاکٹر خلیق انجم نے اس تذکرہ پر اپنے خیالات کا اظہار حرفِ آغاز' کے عنوان سے کرتے ہوئے لکھا کہ ' 'احمد حسین صدیقی صاحب نے بڑی' محبت ، لگن اور جستجو سے یہ تذکرہ لکھا یہ ہر شاعر کا ذکر قدیم تذکروں کی طرح دو تین سطروں میں نہیں بلکہ تذکرے میں شامل شاعروں اور ادیبوں کے اتنے حالات درج کردیے ہیں کہ مستقبل کا مورخ اس تاریخ سے بھرپور مواد حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تذکرہ تحقیق اور تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے''۔

چار سال کے وقفے کے بعد 'دبستانوں کا دبستان' (کراچی) کی پانچویں جلد 2014ء میں منظر عام پر آئی۔ دبستان کی یہ جلد 355 شاعروں ، ادیبوں، دانشوروں، مصوروں، محققین کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف کا بھی یہ سعادت حاصل ہو سکی کہ دبستان کی اس جلد کے صفحہ نمبر132-133 پر میرا تذکرہ بھی شامل ہو سکا۔ جس کے لیے میں مؤلف کے علاوہ مؤلف کے معاون سید محمد اصغر کاظمی کا بھی ممنون ہوں کے انہوں نے ہی میرے بارے میں دو صفحات تحریر کیے۔اس سے قبل وہ مجھ پر ایک مضمون بعنوان ''اردو کے خوش فکر ادیب و محقق'' بھی لکھ چکے

ہیں جو اردو کی معروف ویب سائٹ 'ہماری ویب' پر آن لائن موجود ہے۔فراست رضوی نے۔'دبستانوں کا دبستان' اور اس کے مؤلف کو منظوم خراج عقیدت اس طرح پیش کیا۔

اس شہر کی یادوں کو کیا رخشندہ
ہر لفظ ہے موتی کی طرح تابندہ
اے احمد حسین ادب کے محسن
تجھ سے ہے دبستانِ کراچی زندہ

دہلی سے تعلق رکھنے والے شاعر احمد علی برقیؔ اعظمی نے' دبستانوں کے دبستان' کو منظوم خراج تحسین ان اشعار میں پیش کیا۔

ہے 'دبستانوں کا دبستان' اک کارِ عظیم
ہو دنیائے ادب میں برقیؔ سب کا یہ منظورِ نظر
یہ علمی شہکار نہ ہو بس کراچی تک محدود
جاری رکھیں اس تاریخی کام کو سب اربابِ نظر

دبستانوں کا دبستان' (کراچی) اردو زبان کے تذکروں میں ایک قیمتی اور منفرد اضافہ' ہے۔ جس انداز سے اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اگر یہ اسی طرح جاری و ساری رہا تو اب تک مرتب ہونے والے تمام تذکروں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ یہ

بلاشبہ ایک محبت طلب کام ہے ساتھ ہی تحقیق و جستجو کا طالب بھی۔ احمد حسین صدیقی کو
اللہ ہمت اور صحت دے کہ وہ اس اہم ادبی کام کو جاری و ساری رکھ سکیں۔

(26اگست2015)

این اے 154 لودھراں کا عدالتی فیصلہ۔ تیسری وکٹ بھی گر گئی

پاکستان کے سیاسی موسم میں تبدیلی یا بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ ایک مسئلہ حل ہوتا یا اس پر برف پڑتی ہے تو دوسرا تیار۔ کسی نے درست کہا کہ جمہوریت ہمیں راس ہی نہیں آتی۔ سیاسی ماحول میں کشیدگی اور مسائل کے یکے بعد دیگرے پیدا ہو جانے کی ابتدا کپتان کے دھرنوں اور علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کے انقلاب مارچ کے بعد سے شروع ہوئی۔ دھرنوں کا ڈراپ سین تو کمیشن کی رپورٹ نے کر دیا تھا۔ کمیشن کی رپوٹ عمران خان کے خلاف ضرور آئی لیکن جو بات کپتان شروع سے کہہ رہا ہے اس میں کچھ نہ کچھ صداقت کے آثار وقت کے ساتھ ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ 'منظم دھاندلی' کے لفظ نے نون لیگ کو ظاہری اعتبار سے برتری دلوا دی اگر منظم کا لفظ نہ شامل کرایا گیا ہوتا تو صرف دھاندلی کی بنیاد پر 2013 کے انتخابات کا دھڑام تختہ ہو جانا تھا۔ عمران خان جن چار حلقوں کو کھولنے کی رٹ گزشتہ سال بھر سے لگائی ہوئی ہے۔ ان میں سے تین کا نتیجہ آ چکا اور تحقیقاتی کمیشن نے دھاندلی نہیں بلکہ بے قاعدگی کی بنیاد پر پہلے سعد رفیق کو NA-125 لاہور سے نا اہل قرار دیا، ان کے مقابلے میں تحریک انصاف کے حامد خان تھے جو سپریم کورٹ چلے گئے اور ان کی وکٹ گر گئی۔ اِسٹے آڈر کی بدولت وہ وقتی طور پر اپنی سیٹ پر براجمان ہیں، وزارت کے مزے لے رہے ہیں۔ عدالت نے اس حلقہ میں

انتخابات میں اس قدر بے قاعدگی دیکھی کہ یہاں از سر نو انتخابات کا حکم دے دیا۔
دھاندلی اور کیسی ہوتی ہے۔ اسے عدالت نے دھاندلی نہیں کہا بلکہ بے قاعدگی کہہ دیا۔ لیکن ہمارے سیاست دانوں میں اتنا حوصلہ اور برداشت کہاں کہ سیٹ ہاتھ سے جانے دیں۔ جیسے ہی عدالت نے سعد رفیق کے حلقہ کا فیصلہ سنایا تھا، وہ سپریم کورٹ جانے کے بجائے عوام کی عدالت میں چلے جاتے۔ ان کا قد کاٹھ بڑھ جاتا، عوام میں عزت و توقیر میں اضافہ ہوجاتا لیکن اوپر سے نیچے تک کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ جو صاف ستھری سیاست کی جانب آئے۔ اگر ضمنی انتخابات کے نتیجے میں نون لیگ ہار بھی جاتی تو کیا قیامت آجاتی؟، حکومت چلی جاتی، سعد رفیق کے بغیر نواز شریف کی کیبنیٹ ادھوری رہ جاتی۔ سعد رفیق اتنا بڑا دماغ ہے نون لیگ کے لیے کہ اس کے بغیر نوز شریف صاحب کے لیے سیاست کرنا مشکل ہوجاتا۔ ملک میں ریل کا نظام درھم برھم ہوجانا تھا، اسمبلی سعد رفیق کے بغیر ادھوری رہ جاتی۔ آخر کیا ڈر و خوف تھا اور ہے۔ سعد رفیق اسٹے آڈر کے ساتھ وزیر ہیں، ان کے چہرہ پر وہ تازگی اور تازگی اب نظر نہیں آتی۔
سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔(NA-122) نون لیگ اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق کی سیٹ گویا کپتان جن چار حلقوں کے کھولنے کی بات مسلسل کر رہا تھا ان میں سے یہ دوسرا حلقہ تھا جس میں عدالت نے سنگین بے قاعدگی کی بنیاد پر ایاز

صادق صاحب کو گھر بھیج دیا۔ پہلے تو کہا گیا کہ ہم عدالت کے فیصلے کا احترام کرتے ہیں۔دوسرے ہی دن نہیں معلوم کیا کھچڑی پکی کے نون لیگ کے وزیر ایک ایک کرکے عدالت کے فیصلے کے خلاف زہر افشانی کرنے لگے۔ایاز صادق کا فرمانا تھا کہ الیکشن ٹریبونل کے فیصلے کو تحفظات کے ساتھ مانا ہے، سپریم کورٹ فیصلہ معطل کردیتا ہے تو اس عرصہ میں اسپیکر رہوں گا، ان کا کہنا ہے کہ ان کا دل اس حلقہ سے دوبارہ الیکشن لڑنے کا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا دارومدار ان کی پارٹی پر ہے۔ ویسے قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ ایاز صادق کو سپریم کورٹ سے اسٹے آڈر لینے کے بجائے عوام کی عدالت میں جانا چاہیے۔ یہی کام سعد رفیق کو بھی کرنا چاہیے تھا۔ معلومات فراہم کرنے کے وزیر باتدبیر پرویز رشید نے فیصلے کو متعصبانہ قرار دیتے ہوئے، متعلقہ جج کی خوب خوب خبر لی، بقول جج صاب پرویز رشید نے انہیں مارنے کی بھی دھمکی دے ڈالی۔ جج کے متعصب ہونے کی وجہ وزیر موصوف نے یہ بیان کی کہ فیصلہ کی کاپی دینے میں تاخیر کی گئی تاکہ اسپیکر صاحب اپنے اپیل کا حق استعمال نہ کرسکیں یعنی کے نون لیگ سعد رفیق کی طرح ایاز صادق صاحب کی براخاستگی کو سپریم کورٹ کے توسط سے اسٹے آڈر حاصل کرلے۔ سیاست کے رنگ بھی خوب ہیں ، فیصلہ حق میں آجائے تو واہ واہ، فیصلہ سنانے والا جج یا کمیشن کے رکن جج دودھ میں دھلے ہوئے ، جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ کی کاپی سب سے پہلے وزیر اعظم کو فراہم کردی جائے ، تو سب اچھا، کمیشن کی رپورٹ کپتان کے

خلاف آ گئی تو کیمشن اچھا، اس کے سارے اراکین ایماندار۔ سعد رفیق کے حلقے میں بے قاعدگیوں کی بنیاد پر انہیں سیٹ سے بے دخل کر دیا جائے تو قیامت، عدالت خراب، جج متعصب، اسی طرح ایاز صادق کے حلقے کا فیصلہ کپتان کی فتح، نون لیگ کی شکست تو جج خراب، عدالت متعصب۔ لاہور میں طاہر القادری کے مرکز پر ہونے والے مظالم کسے یاد نہیں، اس پر قائم ہونے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ دے دی، کہاں گئی وہ رپورٹ؟ یہ تعصب ہے یا سچائی؟ پرویز رشید کے خیال میں الیکشن ٹریبونل کا فیصلہ خود نمائی اور تعصب پر مبنی ہے۔ان کے خیال میں بے ضابطگیاں الیکشن کمیشن کی تھیں سزا ایاز صادق اور محسن لطیف کے نون لیگی امیدواروں کو دی گئی جب کہ تحریک انصاف کے رکن صوبائی اسمبلی کو سزا سے استثنیٰ دے کر متعصبانہ رویے کا اظہار کیا گیا۔

پنجاب کے وزیر قانون کی باتیں تو سب ہی سے نرالی ہوتی ہیں وہ بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی ایاز صادق کی حمایت میں گرما گرم پریس کانفرنس کر ڈالی اور فیصلے کو نون لیگ کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے کمیشن کے سربراہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ انہوں نے جسٹس کاظم ملک پر الزام لگایا کہ یہ فیصلہ اس وجہ سے نون لیگ کے خلاف آیا ہے کہ جج صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے نون لیگ سے ٹکٹ مانگا تھا جو انہیں نہیں دیا گیا، جج صاحب نے یہ اس کا بدلہ لیا ہے۔ رعنا ثناء کی سوچ پر افسوس صد افسوس۔ جسٹس کاظم ملک بھی خاموش

نہیں رہے انہوں نے چیلنج کیا رعنا ثناء اللہ کو کہ اگر وہ یہ ثابت کردیں تو وہ استعفیٰ دے دیں گئے اور معافی بھی مانگے گے۔ عدالتوں سے محاز آرائی اور عدالتوں کے خلاف باتیں کرنا ہر سیاسی جماعت کا ٹریک ریکارڈ رہا ہے۔ بات حق میں ہو تو درست، خلاف ہو تو جج کیا اور عدالت کیا اور کیا عدالت کا احترام۔ ماضی میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ سیاسی جماعتوں نے اپنے خلاف فیصلے کو نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ عدالت کے وقار کو مجروح کرنے میں کوئی کثر نہیں اٹھا رکھی۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا ملک اپنی عمر کی ساتویں دیہائی مکمل کرلے گا لیکن ہمارے سیاست دانوں میں Maturity نہیں آئی۔ سیاست کو ملک و قوم کی بھلائی، بہتری اور ترقی کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے سیاست کو لوٹ کھسوٹ، دولت جمع کرنے، طاقت کے زور پر دوسروں کو نیچا دکھانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اور اب ایک اور (NA-122) کے بعد سردار حلقہ ایاز صادق (NA-125) سعد رفیق نون لیگی جنہوں نے الیکشن تو آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا لیکن بعد میں جب میاں صاحب کی نون لیگ حکومت میں آگئی تو انہوں نے نون لیگ جوائن کرلی۔ گویا اب وہ 154 لودھراں کا۔ تحریک انصاف NA- نون لیگ کے ہی ایم این اے تھے۔ یہ حلقہ ہے کے جہانگیر ترین یہاں سے الیکشن ہار گئے تھے اور آزاد امیدوار صدیق خان بلوچ جو اب نون لیگی رکن قومی اسمبلی ہیں کامیاب ہوئے

تھے۔ ملتان کے جج رعنا محمود نے فیصلہ سناتے ہوئے صدیق خان بلوچ کو جعلی ڈگری کے باعث تاحیات نہ اہل قرار دے دیا۔ گویا نون لیگ کی تیسری وکٹ بھی گر گئی۔ اب نون لیگ کے وہ وزیر جنھوں نے ایاز صادق کے خلاف فیصلے کو متعصب کہا تھا اب وہ کیا کہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب نون لیگ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ شکت کو خوش دلی سے قبول کریں۔ سپریم کورٹ سے اِسٹے آڈر لینے کے بجائے اپنے شکست خوردہ امیدواروں کو گھر بھیج دیں۔ نون لیگ کے پاس بہت اچھے لوگ ہیں۔ سعد رفیق، ایاز صادق اور صدیق بلوچ کی نہ اہلی اس بات کا ثبوت ہے کہ عمران خان چار حلقوں کی بات کررہے ہیں وہ درست ہے۔ چوتھی وکٹ خواجہ آصف کی ہے ان کے مقابلے میں عثمان ڈار پی ٹی آئی کے امیدوار تھے۔ یہ کیس بھی عدالت میں ہے۔ اس حلقے کا فیصلہ عمران خان کے حق میں ہو یا نہ ہو چار میں سے تین حلقوں میں عمران خان کی واضع کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ کپتان کی باتوں میں سچائی دکھائی دیتی ہے۔ کپتان کو 75 فیصد کامیابی حاصل ہوچکی ہے۔ ابتدائی طور پر تیسری وکٹ گرنے کے بعد بھی نون لیگ کے وزیر اور دیگر نون لیگی شکت کو تسلیم کرنے کے بجائے دیدہ دلیری سے نون لیگ کا دفاع کرتے نظر آرہے ہیں۔ لیکن چند لوگوں کی باتوں سے خاص طور پر طلال چودھری کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نون لیگ کے حلقوں میں یہ سوچ پیدا ہورہی ہے کہ وہ ب ان تینوں حلقوں میں ضمنی انتخابات میں چلے جائیں۔ یہ بات تاحال حتمی نہیں ، نواز شریف صاحب ملک سے باہر ہین ان کی واپسی پر ہی اس حوالے سے حتمی فیصلہ سامنے

آئے گا۔ (26 اگست 2015)

اردو کی ویب سائٹ ' ہماری ویب ' پر مضامین کی دوسری سینچری

' ہماری ویب ' (Hamariweb) کا آغاز آج سے ۷ سال قبل (14 اگست 2007) کو ہوا تھا۔ گویا یہ سیب سائٹ اپنے قیام کے 8 سال مکمل کر چکی ہے۔ اس ویب کی آٹھ سالہ کارکردگی حوصلہ افزء ہی نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ویب سائٹ کا ایک مقصد لکھناریوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ہے ۔یہ جدید تقاضوں، جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہے جس کے مقاصد میں پاکستانی کلچر کا فروغ، معاشرتی اقدار کی ترویج، قومی زبان اردو کے فروغ وترقی کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں آن لائن پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے ۔ ہماری ویب کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے دیگر مما لک میں بھی ایک مقبول ویب سائٹ کا درجہ حاصل ہے۔اس نے اپنے قیام سے مسلسل معلوماتی، تفریحی، کھیل، تعلیمی اور ادب و ثقافت سے متعلق بے شمار پروگراموں کا انعقاد کیا ہے جو بہت کامیاب اور مقبول ہوئے اور اس کے قارئین نے انہیں بے انتہا پسند بھی کیا ہے۔ ہماری ویب نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی اداروں اور ویب سائٹ کی پارٹنر ہے اور متعدد ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہے۔ اپنے صارفین کی ضروریات اور خدمت میں مسلسل رواں دواں ہے۔ اپنی عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ہماری ویب کی سرپرست کمپنی 'Webiz Media'اس وقت پاکستان کی ۱۰۰ تیزی سے ابھرتی کمپنیوں

کی فہرست میں شامل (Arabia 500)اور علاقائی ۵۰۰ کمپنیوں (Pakistan 100) ہو چکی ہے، جو اس بات کی غماز ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں پاکستان کے نوجوان اپنی فیلڈ میں بہت کچھ کر گزرنے کی بھر پور صلاحیت اور جذبہ رکھتے ہیں۔ہماری ویب کے ان اعزازات کی بنیادی وجہ ہماری ویب اور اس کے صارفین کے مابین اعتماد کا تعلق ہے۔

ہماری ویب' پر میرے مضامین کے آن لائن ہونے کاآغاز13 دسمبر2013 کو اس' وقت ہوا جب میں سعودی عرب کے شہر جدہ میں تھا۔ سرگودھا سے تعلق رکھنے والے شاعر عابد خورشید کا یہ مجموعہ کلام ''لمس'' تھا جس پر میں نے سیر حاصل روشنی ڈالی تھی۔ کتب پر تبصرہ یا ان پر تفصیلی مضمون لکھنا میرے پسندیدہ مشاغل میں سے ہے۔ میں نے اب تک بے شمار کتب پر تبصرے کیے بعض پر تفصیلی مضامین بھی تحریر کیے ۔ دوسرا مضمون ایک 'خاکہ' تھا جو میں نے جامعہ سرگودھا میں رہتے ہوئے لکھا تھا۔ادیبوں ، شاعروں، دانشوروں اور اہل قلم کے قدر داں اور کتاب دوست امریکہ میں مقیم عبد الوہاب خان سلیم میرے دوست اور جامعہ کراچی میں میرے بیچ میٹ رہے ان کا تھا۔ اس میرے 'ہماری ویب' سے عشق و محبت کے سلسلے آگے بڑھتے رہے۔ مضامین بھیجنے اور آن لائن ہونے کا سلسلہ تیزی سے جاری رہا۔ 11 ستمبر 2014 کو میرے مضامین کی سینچری مکمل ہوئی ، اس مرحلے پر میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''ہماری ویب پر میرے مضامین کی

سینچری (100)''۔ میں ایک سال کے عرصہ میں ہماری ویب سے اچھی طرح متعارف ہوگیا تھا۔ میں نے اب اپنے مضامین اور کالموں کی اشاعت کے لیے اخبارات اور رسائل کے مدیران کی جانب دیکھنا اور مضامین کی اشاعت کے لیے طویل عرصہ انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تاہم کبھی کبھار روزنامہ جنگ میں کوئی مضمون شائع ہو جاتا لیکن میری مکمل توجہ ہماری ویب میں مضامین آن لائن ہونے پر رہی۔ اس دوران ہماری ویب نے آن لائن لکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے ایک ادارہ ''رائیٹرز کلب'' بھی تشکیل دیا۔ جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا اور میں نے اس ادارے کی اہمت کو محسوس کرتے ہوئے اس میں شمولیت ختیار کر لی۔ کلب کی مجلس منتظمہ کے عہدیداران کا انتخاب ہوا تو مجھے رائیٹرز کلب' منتخب کر لیا گیا۔ کلب کا مقصد ایسے لکھنے والے جو آن لائن لکھنا چاہتے ہیں' کی حوصلہ افزائی و رہنمائی کرنا تھا۔ گویا اب ہم از خود آن لائن لکھنے والوں کے رہنما بن گئے۔

2015 کے ابتدائی دنوں میں ہماری ویب نے اپنے آن لائن لکھنے والوں کی ای بک (E-Book) ترتیب دینے کا منصوبہ شروع کیا اور ابتدائی طور پر ہماری ویب پر 15 لکھنے والوں کی ای بک تیار کی گئیں جن میں بہ لحاظ عہدہ میری ای بک اول نمبر پر تھی . میری ای بک میں میرے 147 مضامین شامل ہوئے۔ کسی بھی لکھنے والے کے لیے یہ امر باعث اطمینان اور خوشی کا ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق شائع

ہو اور ہماری ویب لکھنے والوں کی اس قلبی خواہش کی تکمیل کر رہی تھی۔ بات صرف ای بک کی تدوین اور آن لائن تک محدود نہ رہی بلکہ ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' نے ای بک کی تعارفی تقریب بھی آرٹس کونسل آف پاکستان میں منعقد کی جس کے مہمان خصوصی معروف شاعر و ادیب پروفیسر سحر انصاری صاحب تھے۔ اس تقریب میں ان مصنفین کو جن کی ای بک تیار کی گئیں تھیں شیلڈ سے نوازا گیا۔

پہلی سینچری مکمل ہونے کے بعد مَیں اپنی دوسری سینچری کی جانب رواں دواں تھا۔ مجھے ایک سہولت یہ میسر ہے کہ میں اپنے خیالات کو قلم کے ذریعہ کاغذ پر منتقل نہیں کرتا بلکہ میرے خیالات، نظریات اور احساسات میرے ذہن سے براۓ راست سے ہوتی ہوئی (Key Board) میرے ہاتھ کی انگلیوں کی جُنبش سے کمپیوٹر کی بورڈ کمپیوٹر اسکرین پر منتقل ہوجاتے ہیں۔ یعنی میں اپنے مضامین اردو یا انگریزی دونوں زبانوں میں کمپیوٹر پر از خود کمپوز کرلیتا ہوں، اگر کسی جگہ عربی لکھنے کی ضرورت پیش آئے تو بھی عربی آسانی سے لکھ لیتا ہوں اس طرح میرا بہت سا وقت بچ جاتا ہے، کام جلدی ہوجاتا ہے۔ میرے بعض کرم فرما جب دوست احباب جب میری تحریریں جلدی جلدی ہماری ویب پر جنہیں میں 'فیس بک' پر بھی شیر کر دیا کرتا ہوں دیکھتے ہیں تو اکثر کہتے ہیں کہ تم لکھنے کے معاملے میں انسان ہو یا جن، بہت ممکن ہے کہ انہیں کچھ اور بھی خیال آتا ہو،

تو میرے وہ احباب سن لیں کہ میرے زیادہ لکھنے کا راز صرف یہ ہے کہ میں کمپیوٹر پر از خود لکھتا ہوں، ساتھ ہی اب میرا زیادہ وقت اپنے گھر پر ہی گزرتا ہے، میرا کمپیوٹر ہی اب میرا محبوب ہے، ساتھی ہے، غم گسار ہے۔ یہ میرا اور میں اس کا عاشق۔ جب بھی میں افسردہ ہوتا ہوں تو یہ مجھے تسلی تشفی دیتا ہے، میری دلجوئی کرتا ہے، جس طرح چھوٹے بچے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں اور وہ اپنا دکھ و ضد بھول کر کھلونوں میں لگ جاتے ہیں اسی طرح میرا کمپیوٹر میرا کھلونا بھی ہے یہ مجھے اپنے ساتھ لگا کر میرا غم، میری افسردگی، بسا اوقات دنیا سے بیزاری کو بھلا دیتا ہے۔ میرے گھر میں وہ جگہ جہاں کمپیوٹر رکھا ہے، میری کتابیں رکھی ہیں، یہ میرا دفتر بھی ہے، بیڈ روم بھی،ملاقاتیوں سے ملنے کی جگہ بھی یہی گوشہ عافیت ہے،یہی میری پسندیدہ جگہ ہے، اس جگہ اگر میں گھنٹو بیٹھا رہوں تو میں نہ تو بور ہوتا ہوں اور نہ ہی تھکن اور اکتاہٹ و پریشانی کا احساس ہوتا ہے۔

میری دوسری سینچری کا پہلا مضمون بھی میں نے جدہ میں رہتے ہوئے تحریر کیا۔ یہ مضمون ایک تاثراتی تھا۔ سعودی عرب سے میری واپسی تھی 20 ستمبر کو الوداعی طواف کے لیے خانہ کعبہ گیا، جہاں پر حاجیوں کی آمد شروع ہو چکی تھی، کعبے کے گرد جہاں نظر جاتی مسلمان احرام میں نظر آرہے تھے۔ حاجی ہی کیا بلکہ خانہ کعبہ جانے والے خواہ عمرہ کی غرض سے ہی کیوں نہ جائیں اللہ کے

مہمان ہوتے ہیں۔ میں نے اس صورت حال کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا اور دوسری سینچری کا پہلا مضمون ''خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہاریں'' آن لائن ہوا۔ اس سینچری کے ابتدائی مضامین سعودی عرب میں رہتے ہوے لکھے گئے۔ ان میں کچھ آپ بیتی اور کچھ سفر نامے کا حصہ تھے۔ یہ سفر نامہ اور آپ بیتی میرے مستقبل کے منصوبوں میں سے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو یہ دونوں کتابیں طباعتی صورت میں منظر عام پر آئیں گی۔ ویسے ان کتابوں کے اکثر مضامین ہماری ویب پر آن لائن ہو چکے ہیں۔

پاکستان واپس آیا تو یہاں کا سیاسی موسم لاہور اور اسلام آباد میں عمران خان اور علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کے دھرنوں، انقلاب مارچ اور آزادی مارچ سے نقطہ عروج سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ سانحہَ ماڈل ٹاؤن رونما ہوا، اسلام آباد ریڈ زون میں دھرنوں کے دوران ہلاکتیں ہوئیں ۔ میں نے سیاسیات میں ایم اے بھی کیا اور سماجی علوم میں ڈاکٹریٹ بھی، سیاسیات سے دلچسپی یقینی ہے ، میں اس ماحول کے اثرات لیے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ سیاسی اور نیم سیاسی موضوعات پر کالم نگاری میں تیزی آ گئی۔ گو اس موضوع پر پہلے بھی لکھ چکا تھا لیکن اب اخبارات اور ٹی وی دیکھ کر طبیعت مچلنے لگی اور اپنے دل کی بھڑاس قلم و قرطاس کے ذریعہ نکالنا شروع کر دی۔ کئی کالم لکھے جیسے، دوسری سینچری میں سیاسی و نیم سیاسی اور ملکی حالات و واقعات کے حوالے سے جو کالم تحریر کیے

ان میں 'کپتان کا لاڑکانہ شو: حکمت عملی پر نظر ثانی کی ضرورت، کپتان کا پلان 'سی' اور نواز حکومت ، داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں، پرویز مشرف اور 600 شریک ملزمان ۔قصہ تمام ہوا، سانحہ فیصل آباد کے بعد کپتان کا کراچی میں کامیاب شو، حیدرآباد میں 'الطاف حسین یونیورسٹی' کا قیام۔ایک مستحسن اقدام، کپتان کے 126 دنوں کا احتجاج۔ واپسی دانشمندانہ اقدام، پشاور میں آرمی پبلک اسکول کا واقعہ رونما ہوا، اس سے کیسے نظر چرا سکتا تھا چنانچہ سانحۂ آرمی پبلک اسکول پشاور: معصوم شہیدوں تمہیں سلام اور دوسرا کالم اسکول کی پرنسپل کی شہادت پر 'طاہرہ قاضی شہید: بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال' تحریر کیا جسے روزنامہ جنگ نے بھی شائع کیا، بھارتی وکرم سود' کی ہرزہ سرائی اور ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، دہشت گردی کے خلاف قومی' اتفاق رائے: وقت کی ضرورت، پاک چین اقتصادی راہدری منصوبہ: اتفاقِ رائے ایک اچھی روایت، نواز شریف کا تیسرا دور، اسحاق ڈار کا تیسرا بجٹ، نریندر مودی کی پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی، برقی (الیکٹرانک) میڈیا اور شتر بے مہار آزادی، ترک خاتونِ اول کا ہیروں کا ہار اور سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خاندان کا مظفر نگر (یو پی) کے نصف حصہ کی ملکیت کا دعویٰ، سابق صدر و وزیر اعظم آزاد کشمیر سردار محمد عبد القیوم خان۔ مخلص کشمیری رہنما، کراچی میں دو ہزار سے زیادہ ہلاکتیں: گرمی، لوڈ شیڈنگ یا غفلت ۔ذمہ دار کون؟، جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ۔ کیا

سبق ملا؟، تحریکِ انصاف کے اراکینِ اسمبلی کو ڈی سیٹ کرنا۔ نتائج کیا ہوں گے، دنیا کی بہترین ٹیچر کا اعزاز۔ پہلی بار عالمی سطح پر استاد کی پذیرائی، 'موسمیاتی تبدیلیوں' کے وزیر کو بیرون ملک کا موسم راس نہیں آیا اور تیسری وکٹ بھی گر گئی شامل ہیں۔

شخصیات پر لکھنا تو میرا سب پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اب تک میں پچاس سے زیادہ لوگوں پر سوانحی مضامین اور خاکے لکھ چکا ہوں۔ دوسری سینچری میں جن لوگوں پر قلم اٹھایا، بعض کو ان کے انتقال پر خراج تحسین پیش کیا، بعض کی برسی پر انہیں یاد کیا شامل ہیں۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر صابر لودھی بھی اللہ کو پیارے ہوئے، شاہ عبد اللہ بن عبد العزیز السعود کی وفات، شہید کی ماں (جنرل راحیل شریف کی والدہ)، ناصرؔ کاظمی، سرسید احمد خان: ایک عہد ساز شخصیت، 'اداس نسلیں' کے خالق عبد اللہ حسین۔ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھے، عارف احمد صدیقی: سیلف میڈ انسان، دریاؔ لکھنوی: شخصیت و شاعری ریاضؔ انصاری جیوری شاگردِ رشید نوحؔ ناروی: شخصیت و شاعری، خواجہ حسن ثانی نظامیؒ سجادہ نشیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا سانحہ ارتحال، ڈاکٹر فرزانہ شفیق مکہ المکرمہ جاتے ہوئے حادثہ میں جاں بحق، 'آگ کا دریا' کی خالق قرۃ العین حیدر۔ افسانہ و ناول نگاری کی بادشاہ شامل ہیں۔

کتابوں کا تذکرہ اوپر کرچکا ہوں۔ دوسری سینچری میں کئی شعراء کے مجموعہ کلام پر سیر حاصل مطالعہ کیا۔ اس سلسلے کا آخری مضمون احمد حسین صدیقی کا مرتب کردہ ''دبستانوں کا دبستان' (کراچی) کا مطالعہ ہے۔ یہ تذکرہ چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور اس پر مزید کام جاری ہے۔ آپ بیتی کے حوالے سے بھی چند مضامین اس سینچری کا حصہ ہیں۔ اپنے پوتے کی رسم آمین کی روداد بھی مضمون کی صورت میں قلم بند کی ہے۔ ذیل میں ان 100 مضامین کی فہرست ان کے یو آر ایل کے ساتھ شامل ہے تاکہ کسی بھی قاری کو متعلقہ مضمون تک پہنچنے میں مشکل پیش نہ آئے۔

۱۰۱۔ خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=51802

۱۰۲۔ بارہ (۱۲) ربیع الاول ۱۴۳۵ھ کی شب روضۂ رسول ﷺ پر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=52072

۱۰۳۔ حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سے سعدیہ راشد سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=52440

۱۰۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ میرے مہرباں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=52579

۱۰۵۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن۔ ایک جائزہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=52742

۱۰۶۔ مسعود احمد برکاتی، پاکستان کے سینئر صحافی و مدیر سے مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=52872

۱۰۷۔ سید شعیب احمد بخاری، سابق وزیر حکومت سندھ سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53068

۱۰۸۔ فرقان احمد شمسی ڈائریکٹر جنرل۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53237

۱۰۹۔ پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری ۔ایک شخصیت ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53311

۱۱۰۔ حکیم محمد سعید شہید پر اولین پی ایچ ڈی تحقیق

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53391

۱۱۱۔ ’ شیخ محمد ابراہیم آزادؔ۔ شخصیت و شاعری‘ ادیب و محقق محمود عزیز کی نظر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53463

۱۱۲۔ حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر سے مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53591

۱۱۳۔ ماہر کتابیات و کتابدار۔اختر ایچ صدیقی سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=53711

۱۱۴۔ بے جا تعریف اعجابِ نفس اور خود پسندی کا باعث ہوتی ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=53805

۱۱۵۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان بلوچ۔بے بہا خوبیوں کے حامل

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=53936

۱۱۶۔ داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54058

۱۱۷۔ لائبریرین شپ کے فروغ میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کا کردار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54128

۱۱۸۔ ''بے طرز کالم نگار''۔ڈاکٹر صفدر محمود

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54240

۱۱۹۔ کپتان کا لاڑکانہ شو۔ حکمت عملی پر نظر ثانی کی ضرورت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54561

۱۲۰۔ گورنمنٹ کالج، ناظم آباد میں میری خدمات کے بارہ سال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54664

۱۲۱۔ کپتان کا پلان 'سی' اور نواز حکومت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54763

۱۲۲۔ پرویز مشرف اور ۶۰۰ شریک ملزمان ۔ قصہ تمام ہوا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=54883

۱۲۳۔ معذوروں کا عالمی دن ۔ نابینا افراد پر تشدد

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55010

۱۲۴۔ حکیم محمد سعید شہید پر پی ایچ ڈی تحقیق اور عذرا قریشی۔ ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55130

۱۲۵۔ سانحہ فیصل آباد کے بعد کپتان کا کراچی میں کامیاب شو

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55161

۱۲۶۔ حیدر آباد میں ’ الطاف حسین یونیورسٹی ‘کا قیام۔ایک مستحسن اقدام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55267

۱۲۷۔ کپتان کے ۱۲۶ دنوں کا احتجاج۔ واپسی دانشمندانہ اقدام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55540

۱۲۸۔ طاہرہ قاضی شہید ۔ بہادری،فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=55684

۱۲۹۔ سانحۂ آرمی پبلک اسکول پشاور۔ معصوم شہیدوں تمہیں سلام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56037

۱۳۰۔ بھارتی ’وکرم سود‘ کی ہرزہ سرائی اور ڈاکٹر عامر لیاقت حسین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56122

۱۳۱۔ عارف احمد صدیقی۔سیلف میڈ انسان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56296

۱۳۲۔ دہشت گردی کے خلاف قومی اتفاق رائے۔وقت کی ضرورت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56380

۱۳۳۔ پروفیسر صابر لودھی بھی اللہ کو پیارے ہوئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56550

۱۳۴۔ شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز السعود کی وفات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56759

۱۳۵۔ 'ہماری ویب 'رائیٹرز کلب۔برقی میڈیا کے مصنفین کا ادارہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56850

۱۳۶۔ فرانسیسی اخبار ' ہیبڈو' کے مکروہ عزائم اور مغرب کو اسلام فوبیہ، ۲۰۱۵ء،

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=56868

۱۳۷۔ کیا 'پاکستان' سعودی حکمراں شاہ سلمان کا بھی دوسرا گھر ہوگا ہماری ویب، ۲۰۱۵ ء،

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=57060

۱۳۸۔ سچل سرمست پبلک لائبریری خیر پور کے لائبریرین فرحت اللہ بیگ سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=57094

۱۳۹۔ کڑوا سچ بولنے والا کھرا انسان 'چودھری محمد سرور

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57224

۱۴۰۔ جامعہ بلوچستان کے پروفیسر ڈاکٹر افتخاالدین خواجہ سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57315

۱۴۱۔ کشمیر سے اظہارِ یکجہتی کا دن۔۵ فروری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57315

۱۴۲۔ ادیب، شاعر، دانش ور عطأالحق قاسمی ۲۷ کے یا ۴۳ کے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57574

۱۴۳۔ شہید کی ماں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57644

۱۴۴۔ اردو میں نعتِ رسول ﷺ کی روایت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57689

۱۴۵۔ پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود: تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57718

۱۴۶۔ ڈاکٹر سکینہ ملک : : تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57778

۱۴۷۔ حکیم محمد سعید پر تحقیق کے حوالے سیقمر مرزا سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=57852

۱۴۸۔ محمد خورشید عالم : تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=57900

۱۴۹۔ جامعہ پشاور کے استاد سید لیاقت علی سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=57963

۱۵۰۔ پروفیسر رحمت اللہ خان بلوچ : تحقیق کے حوالے سے ایک مکالمہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58009

۱۵۱۔ ناصؔر کاظمی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58048

۱۵۲۔ ریاکاری دکھاوا نام ونمود

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58535

۱۵۳۔ تقسیمِ میراث یا ترکہ اور ہمارے والدین کی میراث کی شرعی تقسیم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58694

۱۵۴۔ کراچی میں NBF بک شاپ کا افتتاح۔کتاب کلچر کے فروغ میں اہم پیش رفت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58723

۱۵۵۔ سرسید احمد خان۔ ایک عہد ساز شخصیت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=58899

۱۵۶۔ ' پاکستانی ۔ امریکن' پر مرتب تصنیف 'وہاب نامہ' ۔ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=59954

(۱۵۷۔ اماں حوا کے شہر جدہ میں کچھ دن (سفر نامہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60063

۱۵۸۔ کراچی این اے246 انتخابی معرکہ ،ایم کیو ایم نے میدان مارلیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60107

۱۵۹۔ طائف کے پہاڑوں کے درمیان کچھ لمحات۔ سفر نامہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60222

۱۶۰۔ دبئی ائر پورٹ روشن و حسین ۔کچھ دیر قیام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60244

۱۶۱۔ پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بھی اللہ کو پیارے ہوئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60384

۱۶۲۔ مدینہ منورہ میں وادِی جن ۔آنکھوں دیکھی ،کانوں سنی کچھ باتیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60444

۱۶۳۔ جنگِ بدر کے میدان میں چند لمحات۔ سعادت و نصیب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60567

(۱۶۴۔ جنت المعلیٰ میں کچھ لمحات : (مکہ المکرمہ کا متبرک و مقدس قبرستان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60964

۱۶۵۔ شَعبان المعظّم : متبرک اسلامی مہینہ اور شبِ برات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=60970

(۱۶۶۔ جنت البقیع میں چند لمحات: (مدینہ منورہ کا متبرک، مقدس اور تاریخی قبرستان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61227

۱۶۷۔ جِنّات کا انسانی روپ میں مجھ سے مخاطب ہونا۔آپ بیتی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61305

۱۶۸۔ ایگزیکٹ ،میڈیا چینل اور جعلی ڈگریوں کا اسکینڈل

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61495

۱۶۹۔ ’یوم تکبیر‘ 28 مئی

ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=61682

۱۷۰۔ ’نورِ فکر‘ مجموعہ کلام ریاضؔ انصاری جیوری۔ ایک مطالعہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61792

۱۷۱۔ ’بول‘ کا بول بالا ہوگا یا.....بولتی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61796

۱۷۲۔ پاک چین اقتصادی راہدی منصوبہ۔اتفاقِ رائے ایک اچھی روایت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=61838

۱۷۳۔ فاران کلب کے تحت ’مولانا محمد علی جوہر لائبریری ’بیاد‘ خالد ایم اسحاق‘ مرحوم کا افتتاح

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62023

۱۷۴۔ نواز شریف کا تیسرا دور، اسحاق ڈار کا تیسرا بجٹ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=6220

۱۷۵۔ روزہ اور ذیابیطس (شوگر)کے مریض

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62349

۱۷۶۔ نریندر مودی کی پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی

ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=62506

۱۷۷۔برقی (الیکٹرانک) میڈیا اور شتر بے مہار آزادی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62523

۱۷۸۔ سندھ میں جگر کی پیوند کاری سینٹر کا قیام۔ایک خوش آئند اقدام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62714

۱۷۹۔ ترک خاتونِ اول کا ہیروں کا ہاراور سابق وزیر اعظم یوسف رضاگیلانی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62726

۱۸۰۔ میری ماں کی پانچویں برسی اور معراج الدین کا افطار دستر خوان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62794

۱۸۱۔ 'اداس نسلیں' کے خالق عبد اللہ حسین ۔ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=62841

۱۸۲۔ دنیا کا سب سے بڑاافطار دستر خوان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63049

۱۸۳۔ لیلتہُ القدر۔ رحمتوں ،برکتوں اور دعاؤں کی قبولیت کی رات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63071

۱۸۴۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے خاندان کا مظفر نگر (یو پی) کے نصف حصہ کی ملکیت کا دعویٰ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63353

۱۸۵۔ سردار محمد عبد القیوم خان۔ مخلص کشمیری رہنما

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63360

۱۸۶۔ کراچی میں دو ہزار سے زیادہ ہلاکتیں: گرمی، لوڈ شیڈنگ یا غفلت۔ذمہ دار کون؟

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63438

۱۸۷۔ جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ۔کیا سبق ملا؟

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63529

۱۸۸۔ ’ڈاکٹر فرزانہ شفیق‘ مکہ المکرمہ جاتے ہوئے حادثہ میں جاں بحق

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=63596

۱۸۹۔ ’ریختہ لائبریری‘ اور پاکستانی صحافی و کالم نگار مسعود اشعر

ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=63655

۱۹۰۔ تحریکِ انصاف کے اراکینِ اسمبلی کو ڈی سیٹ کرنا۔ نتائج کیا ہوں گے

ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=63766

۱۹۱۔ دنیا کی بہترین ٹیچر کا اعزاز۔پہلی بار عالمی سطح پر استاد کی پزیرائی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=63990

۱۹۲۔ دریاؔ لکھنوی۔ شخصیت و شاعری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64079

۱۹۳۔ ریاضؔ انصاری جیوری شاگردِ رشید نوحؔ ناروی۔ شخصیت و شاعری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64079

۱۹۴۔ خواجہ حسن ثانی نظامیؒ سجادہ نشیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا سانحہ ارتحال

ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64258

۱۹۵۔ 'موسمیاتی تبدیلیوں' کے وزیر کو بیرون ملک کا موسم راس نہیں آیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64258

۱۹۶۔ میرے پوتے محمد صائم عدیل کی رسمِ آمین

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64671

۱۹۷۔ 'آگ کا دریا' کی خالق قرۃ العین حیدر۔افسانہ وناول نگاری کی بادشاہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64674

۱۹۸۔ این اے 154 لودھراں کا عدالتی فیصلہ۔ تیسری وکٹ کی گر گئی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64725

۱۹۹۔ 'دبستانوں کا دبستان' (کراچی)۔مثالِ بے مثال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=64706

۲۰۰۔ ہماری ویب پر میرے مضامین و کالموں کی دوسری سینچری

ہماری ویب پر میرے مضامین کی پہلی سینچری ستمبر 2014 کے ابتدائی دنوں میں مکمل ہوئی تھی اور اب یہ دوسری سینچری بھی اگست 2015 کو پائے تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ ستمبر کی ابتدائی تاریخیں یعنی 5,4,3 میری زندگی میں خاص مقام رکھتی ہیں ۔ وہ اس طرح کہ میرے والد محترم ۵ ستمبر کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۔ یہ حادثہ ۱۹۹۷ء کو پیش آیا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ کل کی بات ہے۔ میری والدہ محترمہ 2009 میں 3 ستمبر کو اللہ کو پیاری ہوئیں اور 4 ستمبر کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ اپنی ان دونوں محترم ہستیوں کو جو مجھے سب سے زیادہ عزیز و محترم ہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

ان کی مغفرت کی دعا کے ساتھ اپنے اس یادگار مضمون کو بھی ختم کرتا ہوں۔ (31 اگست 2015)

حجاب کا عالمی دن 4 ستمبر

'حجاب' عربی اور 'پَردَہ' فارسی زبان کا لفظ ہے ،اردو میں بھی لفظ پردہ ہی مستعمل ہے لیکن حجاب کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے معنی کم و بیش ایک جیسے ہی ہیں یعنی نقاب، اوڑھنا، ستر، آڑ،اوٹ، رکاوٹ، چلمن، نقاب، حیا، شرم، جھجک، جھینپ، گھونگٹ،آھنگ،الاپ، پردہ عبایا یا،برقع وغیرہ '۔ آسان الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حجاب یا پردہ سے ' عورت کا اپنے آپ کو غیر محرموں اور اجنبیوں سے خود کو پوشیدہ یا چھپاکے رکھنا ہے'۔ لفظ 'عورت' بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'چھپی ہوئی، ڈھکی ہوئی،پوشیدہ، مخفی اور پردہ نشیں کے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں لفظ پردہ کا استعمال دیگر چیزوں کے لیے بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر ہم اپنے گھروں، دفتروں، دکانوں کی کھڑکیوں، دروازوں، روشن دانوں پر حسین و جمیل پردے لٹکاتے ہیں اور انہیں 'پردہ' کہا جاتا ہے، ایک ہی جگہ یا کمرے کو کپڑے کے ذریعہ دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پردہ کہلاتا ہے۔ اکثر بڑے ڈرائنگ روم کو جو ڈائنگ روم بھی ہو کو عارضی پردے کے ذریعہ دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کچی آبادیوں ، غریب محلوں، خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں میں کپڑے کے پردوں کا عام استعمال نظر آتا ہے۔ کچے مکانوں میں دروازوں حتیٰ کے باورچی خانوں،

غسل خانوں اور بیت الخلا یا جائے ضرورت کے دروازوں پر کپڑے یا ٹاٹ کے پردوں سے ہی اس جگہ کو محفوظ کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں حجاب سے مراد وہ 'پردہ' یا 'حجاب' ہے جو مسلمان عورت کو قرآن میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عالمی سطح پر مخصوص دن (Day)، سال (Year) اور دس سالوں (Decade) کو منانے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں نے مختلف دنوں، ہفتوں، سالوں اور دس سالوں کا انتخاب کیا جس کا بنیادی مقصد عالمی سطح کے مسائل اور issues جن میں اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے دلچسپی رکھتے تھے کو اجاگر کرنا تھا۔ بسا اوقات یو این کے ذیلی ادروں نے اپنے پروگرام کے مطابق بعض مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے مخصوص دنوں کو مقرر کرلیا جیسے عالمی ادارہ صحت WHO نے صحت کا عالمی دن، World No-Tobacco Day، ٹی بی، دل کا عالمی دن، گردوں کا عالمی دن وغیرہ کے انعقاد کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح یونیسکو نے بھی بعض موضوعات کو اجاگر کرنے اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف دنوں کا انتخاب کیا اور اس دن اس موضوع کی مناسبت سے سیمینار، ورکشاپ، کانفرنسیز اور نمائش کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جیسے 'پانی کا عالمی دن'، عالمی لٹریسی ڈے'، عالمی ماحولیاتی ڈے'، ماں کا عالمی دن، باپ کا عالمی دن، مادری زبان کا عالمی دن، کتاب کے عالمی دن کے لیے یونیسکو نے 23 اپریل کا انتخاب کیا اور اس دن کو "کتاب اور کاپی رائٹ کا عالمی دن

قرار دیا۔بنیادی مقصد عوام الناس میں کتاب کی اہمیت اجاگر کرنا،کتاب سے محبت اور انسیت کا شعور بیدار کرنا، لوگوں میں مطالعہ کی عادت کا فروغ شامل ہے اور اسی طرح دیگر موضوعات پر دنوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔دنوں کے علاوہ پورے پورے سال کو کسی عالمی نوعیت کے موضوع کے منتخب کر لیا جاتا ہے جیسے 1968 عالمی سال برائے انسانی حقوق تھا، 1970 عالمی سال برائے تعلیم تھا، 1974 عالمی سال برائے آبادی کے طور پر منایا گیا۔ پورے سال ان موضوعات پر آگاہی کے پروگرام ترتیب دئے جاتے رہے، اسی طرح دس سالوں یعنی (Decade) پر مبنی پروگرام بھی اقوام متحدہ کی جانب سے ترتیب دیے جاتے ہیں جیسے 2015-2005 زندگی کے لیے پانی (Water for Life Decade) منتخب کیا گیا ہے۔

4 ستمبر کو ’حجاب کا عالمی دن‘قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات واضح اور طے شدہ حقیقت ہے کہ اقوام متحدہ یا اس کا کوئی ذیلی ادارہ حجاب یا پردہ کو اہمیت نہیں دے گا اور اس کے لیے کوئی دن مقرر نہیں کر سکتا۔ جس کی وجہ مغرب کا اسلام سے واضح ٹکراؤ ہے۔ مغرب نے تو عورت کے حجاب کرنے یا نقاب لینے کو غیر قانونی قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی پر سزا تجویز کی ۔ مغرب یا مغربی ممالک کے لیے حجاب یا پردہ غیر اہم ہو سکتا ہے لیکن مسلمان عورت کے لیے حجاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔ 4 ستمبر کو’ عالمی حجاب دن‘ منتخب کرنے کی وجہ یہ سامنے آئی کہ 2 ستمبر 2003 میں فرانس میں عورت کے اسکارف پر پابندی کا قانون منظور

کیا گیا۔اس سے قبل مختلف مغربی ممالک غیر اعلانیہ طور پر مسلمان خواتین کے حجاب کرنے یا نقاب لینے کو نہ پسند کرتے اور اسے تضحیک آمیز نظروں سے دیکھا کرتے۔ گویا ایسی مسلمان خواتین کے لیے متعصبابہ اور امتیازانہ سلوک روا رکھا جاتا۔ 11/9 کے واقع کے بعد اس رویے میں زیادہ تیزی آ گئی۔ یہ واقعہ دنیا کی تاریخ میں مغرب اور مشرق کے مابین کھچاؤ اور تناؤ کا باعث بنا، مغرب نے مسلمانوں سے منافقانہ، باغیانہ اور نفرت آمیز رویہ اختیار کرنے کی ابتدا کی۔امریکہ میں رونما ہونے والے اس واقع نے پورے مغربی ممالک کو مسلم ممالک سے بد خواہ و بد اندیش کردیا۔ مغرب کو ہر داڑھی والا مسلمان دہشت گرد اور حجاب میں موجود مسلمان عورت مشکوک دکھائی دینے لگی۔ فرانس میں حجاب پر پابندی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اب مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ مغرب زدہ ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لیے عملی میدان میں نکلیں اور ان کا مقابلہ مردانہ وار کریں۔ چنانچہ جولائی 2004 میں لندن میں قائم مسلمانوں کی ایک تنظیم 'اسمبلی فار دی پرٹیکشن آف حجاب' کے زیر اہتمام مغرب کے غیر اخلاقی اور امتیازی رویے کے خلاف منظم و متحد ہو کر جدوجہد کا آغاز کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں مسلم دنیا کے کئی سو محققین، علماء و مدبرین نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت علامہ یوسف القرضاوی نے کی، مفکرین و محققین نے حجاب کی اہمیت، ضرورت اور مغرب کی بے جا پابندیوں، رویوں اور غیر اخلاقی و غیر قانونی عمل کی شدید

مذمت کی اور مقالات پیش کیے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے اختتام کانفرنس 4 ستمبر کو عالمی یوم حجاب'' منانے کا اعلان کیا۔ مختلف دنوں کا اہتمام کرنے کے لیے اقوام متحدہ'' کی جو فہرست اس وقت نیٹ پر موجود ہے اس میں چار ستمبر تاحال خالی ہی ہے۔ اگر اقوام متحدہ چاہے تو اس دن (4 ستمبر) کو اقوام متحدہ کی جانب سے مسلمان خواتین کے لیے 'عالمی یوم حجاب' کا دن قرار دے سکتی ہے۔

یکم فروری کو بھی 'عالمی حجاب ڈے' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد بنگلہ دیشی نژاد جواب امریکن ہیں ناظمہ خان نے یکم فروری 2013 کو رکھی اور اسی روز پہلا 'عالمی یوم حجاب' منایا گیا۔ نیٹ پر فراہم اطلاع کے مطابق امریکہ کے شہر نیویارک میں کوئی 116 مندوبین نے شرکت کی جس میں مسلمان خواتین جو حجاب لیتی ہیں کے مسائل اور مشکلات کا دفع کرنے کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کیا گیا اور یکم فروری کو اس دن کے لیے منتخب کیا گیا۔ ناظمہ خان جو ایک پڑھی لکھی باپردہ بنگلہ دیشی امریکن سماجی کارکن ہیں ۔ خواتین کے حوالے سے سماجی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ دن خواہ کوئی سا بھی ہو یکم فروری یا 4 ستمبر بنیادی بات مقصد کا حصول ہے۔ اس دن ان تمام تنظیموں، اداروں خصوصاً خواتین کے حقوق کا تحفظ کرنے والی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ اس دن کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف پروگرام ترتیب دیں، اس موضوع پر مضامین

شائع کیے جائیں، قلم کار اس دن اس موضوع پر خصوصی مضامین تحریر کریں، اخبارات اور رسائل اس کی مناسبت سے مضامین کی اشاعت کا اہتمام کریں۔ حجاب یا پردہ پس ، ماندگی

کم تری، احساس محرومی کا باعث نہیں بلکہ یہ مسلمان عورت کی زینت ہے،اس کا حسن ہے، اس کا فخر ہے، اس کا مان ہے۔

ہمارے معاشرے میں اکثر برائیوں اور خرابیوں کی ایک وجہ خواتین کی حجاب سے دوری بھی ہے۔ قرآن نے خواتین کو واضح الفاظ میں پردے کا حکم دیا ہے۔پاکستان اسلامی ملک ہونے کے باوجود اسلامی اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہونے سے قاصر نظر آتا ہے۔ ہم چند سالوں سے ہر سال ہی سعودی عرب جا رہے ہیں۔ خواتین باپردہ اور عبا وقبا میں نظر آتی ہیں۔ بازاروں میں ، شپنگ سینٹرز میں، تفریحی مقامات پر، اسپتالوں میں،ائر پورٹ پر الغرض ہر جگہ عباپوش خواتین نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی رکاوٹ ،پردہ یا عبا خواتین کے کاموں میں حائل نظر نہیں آتا۔ پاکستان میں صورت حال مختلف ہے۔اکثر احباب یہ کہتے ہیں کہ پردہ تو نظر کا ہوتا ہے،ظاہری طور پر اپنے آپ کو مخصوص لباس میں ڈھانپنے کا نام پردہ نہیں۔ان کی اس بات میں بھی وزن ہے کہ واقعی پردہ نظر ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہی قسم کی چیز دو پلیٹوں میں ڈھکی ہوئی ہو اور دوسری جانب وہی چیز ایک پلیٹ میں کھلی ہوئی ہو تو دیکھنے والے کی نظر فورنا

کھلی ہوئی پلیٹ پر پڑے گی۔ کھلی ہوئی چیز پر گرد و غبار، مکھی مچھر بہ آسانی پہنچ جائیں گے جب کہ ڈھکی ہوئی چیز گرد و غبار کے علاوہ نظر بد سے بھی محفوظ رہتی ہے۔

خواتین کے لیے پردے کے احکامات کلام کریم کی دو سورتوں میں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ سورۃ' النور' آیت 31 میں خواتین کے لیے پردے کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا:

ترجمہ: 'اور اَے نبی ﷺ ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں بجز اس کے کہ ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر اِن لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے'۔

کلام مجید کی سورۃ' النور' آیت 31 کی تشریح کرتے ہوئے مفسرِ قرآن سید ابوالا

علیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرن میں 'باپ' کے لیے استعمال ہونے والے عربی کے لفظ ابآءِ 'کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ' اس لفظ کے مفہوم میں صرف باپ ہی ' نہیں بلکہ دادا،پَردادا، نانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی دَدھیال اور نَنھیال، اور اپنے شوہر کی دَدھیال اور ننھیال کے اِن سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح وہ اپنے والد اور خُسر کے سامنے آسکتی ہے'۔ بعض خواتین اپنے بزرگوں کو جو احترام دیتی ہیں وہ عزت و احترام وہ اپنے شوہر کے بزرگوں کے لیے ان میں پایا نہیں جاتا جس کی تاویل یہ پیش کردی جاتی ہے کہ شوہر کے باپ کے علاوہ کسی اور بزرگ سے ان کا کیا رشتہ؟ حالانکہ شوہر سے رشتہ جڑ جانے کے بعد شوہر کے تمام رشتوں سے وہی تعلق قائم ہو جاتا جو شوہر کا ہوتا ہے۔ ان کی عزت و توقیر میں کوتاہی کم علمی کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ پردہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر بہت زیادہ تحقیق و جستجو کے ساتھ قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ بعض معاملات میں اختلافات بھی آڑے آ جاتے ہیں۔ لیکن جو بات قرآن میں کہہ دی گئی وہ ہر صورت میں پتھر پر لکیر ہے، ہمارے لیے اس کا ماننا، اس کا اقرار کرنا اور اس پر عمل کرنا لازمی ہے۔

قرآن کریم کی ایک اور سورۃ میں بھی خواتین کو منہ ڈھانپنے کا حکم دیا گیا۔ سورۃ ' الاحزاب' کی آیت 59: ترجمہ: 'اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور

مُسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (مونھوں) پر چادر لٹکا کر گھونگٹ نکال) لیا کریں۔ یہ امر اُن کے لیے موجبِ شناخت (وامتیاز) ہوگا تو کوئی اُن) کو ایذا نہ دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے''۔اس حوالے سے متعدد احادیث مبارکہ بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

ترمذی، ابو داؤد میں حدیث بیان ہوئی 'ایک مرتبہ آنحضرت محمد ﷺ کے پاس آپؐ کی شریک حیات حضرت اُمِ سَلَمہؓ اور حضرت مَیمونہؓ بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابنِ اُمِ مکتومؓ آ گئے۔آنحضرت ﷺ نے دونوں بیویوں سے فرمایا: احتجبامنہ 'ان سے پردہ کرو'۔ بیویوں نے عرض کیا: یارسول اللہ الیس اعمیٰ لایبصرنا ولایعرفنا، 'یا رسولؐ اللہ ! کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے'۔آپؐ نے فرمایا: افعمیا وان انتما، الستما تبصرانہ، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتیں؟'۔اسی طرح ایک مرتبہ حضرت آئشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اُس سے پردہ کیا۔ کہا گیا آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں، یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا؟ جواب میں اُمّ المومنین نے فرمایا: لکنی انظر الیہ، 'میں تو اسے دیکھتی ہوں'۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے کہ ''عورت کی خوبی دو باتوں میں ہے۔ اس کو کوئی نامحرم نہ دیکھے اور وہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے''۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی محفل میں عورتوں میں سے بہترین عورت سے متعلق بات چلی، تو کسی نے کسی صفت کا اظہار کیا تو کسی نے کسی صفت کو عورت کے لیے بہترین قرار دیا۔ اسی دوران حضرت علیؓ کسی کام سے اپنے گھر تشریف لے گئے اور وہاں جا کر حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے محفل میں ہونے والے موضوع کا تذکرہ فرمایا، تو حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے فرمایا کہ ''میرے خیال میں دنیا کی سب سے بہترین عورت وہ ہے جو نہ خود کسی غیر مرد کی طرف دیکھے اور نہ کوئی غیر مرد اس کی طرف دیکھے''۔ حضرت علیؓ اپنے گھر سے واپس اسی محفل میں تشریف لائے اور بتایا کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے بہترین عورت کی پہچان یہ بتائی ہے۔ تو بنی کریم ﷺ نے فرطِ محبت سے فرمایا ''تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے''۔

عورت کا اپنے آپ کو غیر محرموں اور اجنبیوں سے خود کو پوشیدہ یا چھپا کے رکھنے سے مراد یہ ہر گز نہیں کہ عورت کو ایک چادر میں چاروں جانب سے لپٹ کر ہی باہر نکلنا چاہیے۔ ہمارے رسول ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ نے کہا کہ 'بہترین عورت وہ ہے جو نہ خود کسی غیر مرد کی طرف دیکھے اور نہ کوئی غیر مرد اس کی طرف دیکھے' اس سے ہر گز مراد یہ نہیں کہ عورت ایک چادر میں اس طرح لپٹ جائے کہ اسے کچھ نظر ہی نہ آئے، فاطمہؓ نے دیکھنے اور دکھانے کو منع فرمایا۔ حتیٰ کہ نابینا کو بھی جو غیر محرم ہو کو دیکھنے کو منع فرمایا گیا۔ قرآن کی

سورۃ' الاحزاب' کی آیت 59 میں کیا کہا گیا'اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مُسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (مونہوں) پر چادر لٹکا کر گھونگٹ نکال) لیا کریں۔یہاں بھی صرف منہ کو چادر کے پلو سے جس طرح گھونگٹ نکالا جاتا ہے اس طرح چھپانے کا حکم ہے۔قرآنی آیات میں، احادیث مبارکہ میں غیر محرم کو دیکھنے اور دکھانے اور اپنے منہ کو چھپانے کا حکم نظر آتا ہے۔ کسی بھی جگہ یہ موجود نہیں کہ عورت اپنے منہ کو اس طرح چھپائے کہ اس کے لیے چلنا مشکل ہو جائے، یہ بھی حکم نہیں ملتا کہ ایک عورت جو شرعی پردہ کرتی ہو، جب اس کے سامنے اس کے عزیز رشتہ دار یا اس کے شوہر کے قریبی عزیز رشتہ دار آ جائیں، وہ ان سے پردہ ضرور کرے، گھونگٹ ضرور نکالے لیکن ان کے ادب و احترام میں انہیں کم از کم سلام ضرور کرے۔ ہمیں کسی بھی جگہ اس قسم کا کوئی حکم یا پابندی نظر نہیں آتی کہ شرعی پردہ کرنے کا مقصد اپنے اور اپنے شوہر کے قریبی رشتہ داروں کو جو تمہارے سامنے آ جائیں تو تم اَن جان بن جاؤ، بُت بن جاؤ، ان کے احترام میں انہیں سلام بھی نہ کرو۔اس کی وضاحت اس وجہ سے کرنا پڑی کہ ہمارے معاشرہ میں اکثر ایسی خواتین نظر آتی ہیں جو شرعی پردہ کرتی ہیں، بازاروں، شاپنگ سینٹرز میں، خرید و فروخت کے مرکز، سبزی والے، دودھ والے، پھل فروخت کرنے والے سے خوب بھاؤ تاؤ کرتی ہیں، بلکہ دام کم کرانے کے لیے غیر محرموں سے خوب خوب مکالمہ ہوتا ہے لیکن اپنی کسی محفل میں اپنے گھر آئے ہوئے اپنے ہی عزیز رشتہ دار یا شوہر کے

عزیز رشتہ داروں کو سلام کرکے عزت دینا مناسب تصور نہیں کرتیں۔ ہم اگر اپنے بڑوں کی عزت و تکریم نہیں کریں گے تو ہمارے بچے ہم سے کیا سبق لیں گے۔ ایسا کرکے ہم ان کی کیا تربیت کریں گے۔ قرآن تو احترام کا، عزت کا، محبت کا، اچھے سلوک کا درس دیتا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ تو اپنے سے چھوٹوں کو بھی سلام کرنے میں پہل کر دیا کرتے تھے۔

سعودی عرب میں شاہ عبداللہ نے 2011 میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے خواتین کو بلدیاتی انتخابات میں بطور امیدوار شرکت کا حق دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سعودی عرب میں سے اب تک کا تیسرا موقع ہے کہ سعودی شہری کونسلوں کے ارکان کا انتخاب 2005 کریں گے۔ موجودہ بلدیاتی انتخابات میں 200 خواتین نے انتخابات میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ خواتین کو بلدیاتی نظام میں کردار ادا کرنے کے شاہی فرمان کے باوجود اس وقت یہ موضوع زیر بحث ہے۔ سخت گیر مذہبی سوچ کے حامی ایک مبلغ عبد الرحمان لبراک نے واضع طور پر خواتین کی بلدیاتی نظام میں شمولیت کی مخالفت کی ہے ۔جب کہ خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم تنظیموں اور کارکنوں کا موقف یہ ہے کہ سعودی خواتین کو صرف بلدیاتی الیکشن میں امیدوار بننے کی اجازت دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ملک کے تمام شہری بلدیاتی اداروں میں خواتین ارکان کے لیے باقاعدہ کوٹے بھی مقرر کیے جائیں۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاب یا پردہ خواتین کے لیے کسی بھی جگہ

کسی بھی لمحے رکاوٹ اور مشکلات پیدا نہیں کرتا۔ ایسی خواتین جو حجاب لیتی ہیں، پردہ، کرتی ہیں ہماری سیاست کا ہم حصہ رہیں ہیں اور اب بھی ہیں اور اب بھی عملی سیاست میں سرگرم عمل دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر فریدہ احمد مرحوم نے منتخب ایوانوں میں نمائندگی کی ،ڈاکٹر فرحت ہاشمی عالمہ ہیں ، قمر النساء قمر سماجی کارکن ہیں ، النساء سینٹر میں اکثر سماجی بہبود کے پروگراموں میں پیش پیش نظر آتی ہیں، سمیعہ راحیل قاضی سے کون واقف نہیں ، سیاست بھی کرتی ہیں، ٹی وی ٹاک شو میں خوب بولتی بھی ہیں،ڈاکٹر شائستہ زیدی استاد اور معروف اسکالر ہیں، ڈاکٹر فوزیہ صدیقی حجاب میں رہتے ہوئے اپنی بہن کے لیے کس طرح تن من دھن سے کوششوں میں لگی ہوئی ہیں، ناظمہ خان عالمی یوم حجاب، ۲ فروری کی خالق)، بنگلہ دیشی امریکن ہیں جو امریکہ میں رہتے ہوے) حجاب کرتی ہیں اور سارے کام بھی سرانجام دیتی ہیں۔ عالمی سطح کی معروف خواتین جو حجاب کے ساتھ اعلیٰ خدمت انجام دے رہی ہیں دیگر کے علاوہ امریکہ کی اسلی سانسر، جمیلہ افغانی، ابتہاج محمد، مریم سلطانہ، خولہ بنت الزہروی، نیا اسمٰعیل نواب، رابعہ البصری، سوریا سید، فوج میں، پولس میں، ائر فورس میں، نیوی میں ، بنکوں میں ، انشورس کمپنیوں میں، اسپتالوں میں، ڈیوو کی بسوں میں میزابانی کرتی بہ حجاب میزابانیں ، ہوائی جہازوں کو اڑاتی ہوئی پائیلٹ اور فضائی میزبان حجاب میں نظر آتی ہیں۔ کیا کبھی کسی میزبان نے یہ شکایت کی کہ حجاب سے اس کے کاموں میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

حجاب میں رہتے ہوئے جب خواتین کو از خود کوئی مشکل نہیں پیش آتی تو سامنے والوں کو خصوصاً مغرب زدہ ذہن کو کیا تکلیف اور پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ بات پریشانی کی نہیں بلکہ مسلمانوں سے تعصب، بغض، کینہ ہے جس کا اظہار مختلف طریقے سے کیا جاتا ہے۔
مسلمان خواتین جو حجاب لیتی ہیں انہیں چاہیے کہ وہ مغرب کے بلاجواز اعتراضات و مشکلات کا مقابلہ اسلامی جذبے اور ہمت سے کریں۔ یہ ہمارا ایسا عمل ہے کہ جسے کسی دنیاوی عمل سے نافذ نہیں کیا گیا بلکہ یہ تو ایک ایسا ہی عمل ہے کہ جیسے ہم اپنے مالک کے دیگر احکامات پر عمل کرتے ہیں اسی طرح خواتین کو اس پر بھی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سوا نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر خواتین پردے کے بارے میں قرآنی آیات کی تشریح اور وضاحت میں مختلف دلیلیں اور تاویلیں بھی پیش کرتی ہیں۔ بعض اپنی دلیل میں یہ بھی کہتی ہیں کہ خانہ کعبہ میں دوران طواف منہ کھلا رکھنے کا حکم دیا گیا۔ بے شک ایسا ہے اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے۔ اس قسم کی تمام تر باتوں، تاویلوں اور دلیلوں کا جواب صرف یہ ہے کہ ہم وہ کرتے ہیں جس کا حکم اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں دیا اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے اس حکم پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی۔
پردے کے حوالے سے معروف شاعر اکبر الہٰ آبادی کی ایک معروف نظم سے دو اشعار

ے

بے پردہ آئیں مجھ کو نظر چند بیبیاں

اکبر زمین میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا

کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر الٰہ آبادی کی یہ نظم ان کے دور میں مسلمان خواتین کے پردہ کی صورت حال کی تصویر کشی کرتی ہے۔ آج ہمیں اپنے ملک اور دیگر اسلامی ممالک میں جو تصویر نظر آتی ہے وہ زیادہ پریشان کن نہیں۔ اچھائی کی ، بھلائی کی کوششیں جاری رکھنی چاہیے۔ اگر کوئی ایمانداری سے سروے کرے تو نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ آج مسلمان خواتین میں حجاب کا رواج زیاہ ہوا ہے۔ وجوہات کچھ بھی ہوں۔ لیکن ایسا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے بھی حجاب کو اپنی شاعری میں موضوع بنایا۔ مسلمان عورت کو اپنے فارسی شعر میں جنابِ فاطمہؓ کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ تو اپنے آپ کو چھپا کر رکھے گی تو تب ہی تیری گود میں اعلیٰ و بلند

کردار کے انسان پرورش پا سکیں گے ۔

بتولے باش وپنہاں شوازیں عصر

کہ درآغوش شبیرے بگیری

ترجمہ: اے مسلمان عورت تو جناب فاطمہؓ بتول) کی پیروی کر اور اُن کا طریقہ اختیار) کرتے ہوئے بیرونی دنیا سے اپنے آپ کو چُھپا کر رکھ تاکہ پھر تیری گود میں جناب امام (حسینؓ (شبیرؓ) ایسے اعلیٰ اور بلند کردار انسان پرورش پا سکیں

پاکستان کی ایک سیاسی ومذہب جماعت نے 4 ستمبر تا 14 ستمبر 'عشرہ فروغِ حجاب' منانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ ایک مستحسن قدم ہے۔ ملک بھر میں سیمینار، کانفرنسز اور گفتگو کے پروگرام منعقد کیے جائیں گے، جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں میں حجاب کے موضوع پر تقریریں ہوں گی، حجاب سے متعلق مواد تقسیم کیا جائے گا، حجاب کے حوالے سے یہ ایک اچھا اور مثبت قدم ہے۔ خواتین کی دیگر فلاحی وسماجی تنظیموں اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والے اداروں کو بھی اس دن حجاب کے حوالے سے خصوصی پروگراموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بھی اس دن حجاب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے پروگراموں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن بھی اس دن خصوصی پروگرام کریں۔ اس عمل سے مغربی دنیا کو یہ پیغام جائے گا کہ مسلمان اپنے دینی تشخص کے حوالے سے غافل نہیں اور نہ ہی وہ اسلام دشمنوں کے مزموم عزائم سے خوف زدہ ہوں گے۔ (4 ستمبر 2015 مصنف سے رابطے کے لیے۔ E-Mail: drraissamdani@yahoo.com)

اسکندریہ لائبریری اور اس کی تباہی و بربادی

اسکندرِ اعظم کی موت (ضون ۳۲۳ق۔م) کے بعد بطلیموس حکمران سوتر کا نے (285-246ق۔م) اپنے دانشمند مشیر ڈیمٹرس (Demitrious of Phaleron) کے مشورے سے کتب خانہ اسکندریہ کی بنیاد رکھی جس کے ساتھ ایک نہایت وسیع اور معیاری میوزیم بھی قائم کیا۔ اس علمی ادارے کو دنیا کی سب سے پہلی ہمہ گیر یونیورسٹی بھی کہا جاتا ہے۔اس کی عمارت اس دور کے بہترین خوش نما پتھر کی بنی ہوئی تھی جس میں بڑے بڑے کمرے مطالعہ کے لیے مختص تھے۔ اس میں ایک شعبہ نشرواشاعت کا بھی تھا جس کے توسط سے آس پاس کے ملکوں کو کتابیں بھیجی جاتی تھیں۔ اس علمی مرکز کے قائم ہونے سے اسکندریہ میں یونانی کتب فروشی چمک اُٹھی اور یونانی طلباء حصولِ علم کی خاطر اسکندریہ کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ کتب خانہ نینوا کے کتب خانے کی مانند شاہی سرپرستی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں جو کتابیں جمع کی گئیں تھیں وہ پپائرس (Papayrus) کے رولوں پر تھیں جب کہ نینوا کے کتب خانے میں کتابیں مٹی کی تختیوں (Clay Tablets) پر تحریر تھیں۔ مصر میں پپائرس پر لکھنے کا آغاز حضرت مسیح سے تقریباً چار ہزار برس پہلے ہوا تھا۔ مصریوں نے پپائرس کی دریافت کرکے بنی نوع انسانی پر عظیم احسان کیا ہے۔

اسکندریہ میں تصنیف وتالیف کے فروغ کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اشیاء جن پر تحریر کیا جاتا۔ بہت سستی اور ان کا حصول آسان تھا جس کے باعث اسکندریہ میں علمی سرگرمیوں نے فروغ پایا اور ساتھ ہی ساتھ کتب خانوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔
اسکندرِ اعظم کا کتب خانہ علمی سرگرمیوں کی نمایاں مثال پیش کرتا ہے۔ اس کتب خانے میں کتابیں جمع کرنے کا طریقہ بہت مشہور ہے اور علمی ذوق کی ایک بہترین مثال بھی۔ ایک یونانی مورخ 'گیلن' رقم طراز ہے کہ بادشاہِ وقت 'پیٹولیمی سوم' کے حکم کے مطابق جو نہی کوئی جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتا اس میں موجود تمام سیاحوں کی تلاشی لی جاتی اگر ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ یا کوئی ایک کتاب بھی نکلتی اسے بحقِ سرکار ضبط کر لیا جاتا لیکن حکومتِ وقت کی جانب سے یہ احکامات تھے کہ کتابوں کی نقل کے بعد اصل کتاب اس کے مالکوں کو واپس بھیج دی جائیں۔ اس واقعہ کی تصدیق کئی اور مورخین نے بھی کی ہے۔ ڈیورانٹ لکھتا ہے کہ لوگ دُور دُور سے پرانے نسخے اسکندریہ کے کتب خانے میں مُنہ مانگے داموں فروخت کیا کرتے تھے۔
کتاب خانے میں کتابوں اور قلمی نسخوں کی تعداد سے متعلق تمام مورخین اس نقطے پر متفق ہیں کہ اس دور میں اس کتب خانہ سے بڑھ کر ذخیرہ علم کہیں اور

موجود نہ تھا۔ مورخین نے ذخیرہ علم کی تعداد دو لاکھ سے سات لاکھ تک بتائی ہے۔
مہتمم کتب خانہ و لائبریرین رہی ترلیس انتہائی ذہین اور علم و ادب سے بے انتہا لگاؤ رکھتا تھا۔ یہاں قدیم زمانے کی تمام قدیم و نایاب کتب موجود تھیں۔ دس بڑے وسیع ہال نما کمروں میں ان کتب کو ذخیرہ کیا گیا تھا۔ الماریاں دیواروں میں بنائی گئی تھیں۔
(Callimachus/Kallimachos, 310/305-240 مشہور فلسفی کیلیمارکس BC) اس کا دست راست تھا۔ نیز کتب خانے کے بعض انتظامی اُمور کے علاوہ کتابوں کے مضمون وار تقسیم اور کیٹلاگ (فہرست) کی تیاری کا کام کیلی ماکس کے سپرد تھا جس کو اس نے بڑی لگن اور محنت سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ایلفرڈ ہیسل نے لکھا ہے کہ کیلی ماکس نے اسکندریہ لائبریری کی کتابوں اور مخطوطات کا کٹیلاگ پینکس (Pinakes) کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس عظیم کتب خانے میں جو عجائب گھر کا ایک حصہ تھا یونانی زبان کی تمام بہترین کتابیں موجود تھیں اور دس بڑے وسیع کمروں میں ذخیرہ کی گئی تھیں جن پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔ الماریوں میں کتابیں بہ اعتبار فن و مضمون، رکھی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں پر بھی نمبر پڑے ہوئے تھے۔ عام پڑھنے والوں کے علاوہ تحقیق کرنے والوں کے لئے علیحدہ کمرے تھے۔ جہاں تمام طرح کی سہولتیں فراہم تھیں۔ یہ کتب خانہ بہ یک وقت ایک جامعہ (University) اور دارالتحقیق (Research Institution) تھا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ، غربی مورخین نے اس کتب خانے کی تباہی اور جلانے کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا ہے۔ جب کہ یہ کتب خانہ 47 ق۔م میں تباہ و برباد ہوا۔ جب جیولس سیزر نے اسکندریہ کو تاراج کیا تو ساحل پر لگنے والی آگ نے شہر اسکندریہ کے ساتھ شاہی محلات، عجائب گھر اور کتب خانے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ عظیم کتب خانہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے پنی کتاب 'اسکندریہ کا کتب خانہ' میں ان لازامات کی سختی سے تردید کی ہے۔ دلیل کے طور پر علامہ شبلی نے لکھا 'اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل یہ ہے کہ جہاں تک اس کتب خانہ کو جلائے جانے کا بیان ہے وہ اسلام کے دَور سے پہلے ہی برباد ہوچکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتب خانہ شاہانِ مصر نے جو بت پرست اور بہت سے خداؤں کے ماننے والے تھے نے قائم کیا تھا جب مصر میں عیسایت کا دور شروع ہوا تو عیدائی بادشاہوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ان کتابوں کی بربادی شروع کردی اور ان کے اس ارادے کو پادریوں نے اور بھی اشتعال دیا'۔ شبلی نے ایک مشہور عالم 'موسیوریناں' جو فرانسیسی تھا کہ رائے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ 'اگرچہ یہ بار بار کہا گیا کہ کتب خانہ اسلام کے خلفائے راشدین کے دور میں جلایا گیا جب کہ یہ صحیح نہیں کتب خانہ مذکورہ اس زمانے سے پہلے ہی برباد ہوچکا تھا'۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے مضمون 'کتب خانہ اسکندریہ' میں اس لزام کی سختی سے اور دلائل کے

ساتھ تردید کی ہے۔ علامہ ندوی نے معروف مورخ 'جرجی زیدان' کی پیش کردہ دلیل سے متعلق لکھا ہے کہ 'زیدان نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ مسلمانوں نے فارس کا کتب خانہ جلا دیا جب وہ اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلادیا کرتے تھے تو یقینا انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلادیا ہوگا'۔ علامہ نے لکھا ہے کہ اگر اس دلیل کو درست مان لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ رومیوں نے آرشمیدس کی کتابیں جو پندرہ سو اونٹوں پر بار تھیں جلادیں، جیولس سیزر نے اسکندریہ کا شاہی کتب خانہ جلا دیا، اس لیے کہ یورپ کی عظیم الشان حکومت علم کی سخت دشمن تھی، خود افلاطون نے سقراط کے پاس جاتے وقت اپنی ادبی تصانیف جلادیں۔ ابترہم نصرانی کی موت کے وقت اس کے عیسائی اعزہ نے اس کی مملوکہ فلسفہ کی نادر تصنیفات جلادیں۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا تو انبار در انبار کتابیں جلا دیں۔ عیسائی پادری 'متار کوئی' نے پندھوریں صدی عیسویں کے آخر میں سلیمنکا میں علوم شرقیہ کی چھ ہزار کتابوں میں آگ لگا دی۔ اسپین کے ایک متعصب پادری زنبیر نے غرناطہ میں عربی زبان کے دس ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگادی۔ طرابلس شام میں جب انگریزوں نے صلیبی جنگ میں فتح پوئی تو وہاں کے کتب خانے کو جس میں تقریباً تین لاکھ کتابیں تھیں نہایت وحشیانہ طور پر برباد کردیا۔ عیسائیوں نے فتح اندلس کے موقع پر ایک نہیں متعدد کتب خانے برباد کردیے۔ فرفوریس کی تصانیف کے تمام نسخے شہنشاہ تھوڈوسیس نے جلوادئے (یہ تھیوڈسیس وہی ہے جو تاریخی تحقیقات کی

رو سے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہے) اس بناپر زیادہ تر قرین قیاس یہی ہے کہ عیسائیوں ہی نے اسکندریہ لائبریری کو بھی جلایا ہوگا۔ مسلمانوں کی جراٗت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فتوح و مغازی کی سینکڑوں کتابوں میں سے ایک میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں'۔ علامہ ابن ندیم بغدادی نے بھی مسلمانوں پر عائد کردہ اس الزام کی کھلے الفاظ میں تردید کی ہے۔(9 ستمبر 2015)

اردو کے نفاذ کا اعلیٰ عدالت کا فیصلہ ۔ عمل درآمد ضروری ہے

اردو کو بطور سرکاری و دفتری زبان رائج کرنے کے حوالے سے سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب جواد ایس خواجہ کا فیصلہ تعمیر پاکسان، مستحکم پاکستان و ترقیِ پاکستان کے لیے ایک مستحسن قدم ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے تین رکنی بنچ جس کی قیادت جناب جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ کر رہے تھے متفقہ طور پر اردو کو بطور دفتری زبان فوری طور پر نافذ کرنے کا حکم جاری کیا۔ اعلیٰ عدالت کے اس تاریخ ساز فیصلے کا جس قدر بھی خیر مقدم کیا جائے کم ہے۔ اس فیصلے کے دور رس نتائج نکلیں گے۔ سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس جواد ایس خواجہ نے پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 251 کا بلاتاخیر نافذ کرکے پاکستان اور پاکستانی قوم کو اس کی حقیقی شناخت اور اس کی زبان دے کر عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ پاکستان کے سپریم کورٹ نے پاکستان کے آئین 1973 ء کے آئینی تقاضے کو پورا کیا ہے۔ ان کا یہ اقدام پوری پاکستانی قوم پر احسان عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا یہ عظیم کارنامہ پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف سنہرے حروف سے لکھا جائے گا بلکہ اسے تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ پاکستان کے آئین کے مطابق 15 سالوں میں یعنی 1985 ء تک اردو کو بطور سرکاری و دفتری زبان کے رائج ہوجانا چاہیے تھا لیکن یہ آئینی و قانونی اقدام سرخ فیتے کی نظر ہوتا رہا اور 30 سال بیت گئے۔ سپریم

کورٹ کے اس تاریخی فیصلے نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں کہا گیا ہے کہ ’آئین پاکستان کے آرٹیکل 251 پر عمل درآمد نہ ہونے کے باعث پاکستان کے کسی شہری کو کوئی تکلیف یا نقصان ہوتا ہے تو وہ شہری حکومت کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے‘۔ اس فیصلے کا ہر سطح پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد کی صورت میں پاکستانی عوام کا وہ طبقہ جو بمشکل اردو ہی لکھ پڑھ سکتا ہے اس کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ انگریزی میں جاری کردہ احکامات عام پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔ اس فیصلے کی ایک قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ صوبائی اور علاقائی زبانوں کے فروغ پر غیر معمولی توجہ دی ہے۔

جو کام گزشتہ 68 سال میں ہماری جمہوری وڈکیٹٹروں کی حکومتیں نہ کرسکیں وہ کام جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ نے اپنے مختصر دور چیف جسٹسی میں کر دکھایا۔ خواجہ صاحب کے اس عمل سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو، اس میں نیک نیتی بھی شامل ہو تو وہ کام مشکل نہیں ہوتا اسے بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی کام کو کرنے کی نیت ہی نہ ہو، ارادہ ہی نہ ہو، اندر سے دل صاف نہ ہو تو وہ کام مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ انور شعور کا یہ قطعہ کس قدر مناسب ہے ۔

اپنے تیسویں چیف جسٹس
صرف چوبیں دن کام کرکے
کچھ بڑے فیصلوں کی بدولت
وہ گئے ہیں بڑا نام کرکے

قومی زبان اور اس کے نفاذ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے اردو کو سب سے پہلے 25 فروری 1948ء کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔اس موقع پر پاکستان کے اولین وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ صرف اردو ہی مغربی اور مشرقی پاکستان کو یکجا و متحد رکھ سکتی ہے۔ لیاقت علی خان کی یہ فکر سچ ثابت ہوئی ۔ اگر اس وقت اردو زبان کو قومی و سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ پاکستان دولخت نہ ہوتا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی قانون ساز اسمبلی کی قرار داد کے حق میں ہی بات کی تھی ۔ قائد اعظم نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ 24 مارچ 1948ء کو واضح طور پر کہا تھا کہ ’ صوبے میں سرکاری زبان کے طور پر جس زبان کا چاہیں انتخاب کریں لیکن جہاں تک صوبوں کے درمیان خط وکتابت کا تعلق ہے وہ اردو میں ہوگی۔اردو واحد زبان ہے جو پورے ملک میں بولی و سمجھی جاتی ہے ‘۔ ہم نے 1947ء سے 2015ء تک نہ تو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی قرار داد کو اہمیت دی، لیاقت علی خان اور قائداعظم محمد علی

جناح کی باتوں پر عمل کیا اور نہ پاکستان کا دستور 1973 جسے بجا طور پر متفقہ دستور کی حیثیت حاصل ہے پر عمل کیا۔ دستور پاکستان 1973 کے آرٹیکل 251(1) میں کہا گیا ہے کہ ''پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اسے سرکاری اور دیگر استعمال کے انتظامات 15 سالوں میں کر لیے جائیں''۔ 68 سال گزر جانے کے بعد یہ کام پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب جواد ایس خواجہ نے ایک عدالتی فیصلے میں کر کے تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ قانونی پٹیشن ایڈووکیٹ کوکب اقبال نے دائر کی تھی جو اردو زبان کی ترقی نفاذ سے متعلق تھی۔ سپریم کورٹ کے تین رکنی بنچ جس کے سربراہ سابق چیف جسٹس جواد ایس خواجہ تھے حکومت کو ہدایت جاری کیں کہ وہ آرٹیکل 252 میں دی گئیں اپنی دستوری ذمہ داریاں پوری کرے'۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری حکومت اور صوبائی حکومتیں صدق دل سے، ایمانداری سے اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ سرخ فیتے کی ریشہ دوانیوں کو آڑے نہ آنے دیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہمارے ملک و قوم کے زیادہ مسائل اس وجہ سے ہیں کہ ہم 68 سال بیت جانے کے باوجود اب تک ایک قوم نہیں بن سکے۔ اردو زبان کے سرکاری طور پر نفاذ اور عمل درآمد سے ہی ہم پاکستانی قوم بن کر ابھر سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اردو بولنے، سمجھنے، لکھنے، پڑھنے والے اکثریت میں ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی بولنے، سمجھنے والے تعداد میں کم لیکن طاقت میں

بھولو پہلوان ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ 68 سال سے وہ اکثریت پر اپنی مرضی مسلط کیے ہوئے ہیں۔ اردو بولنے سمجھنے والے کم ترجب کہ انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کا پلہ بھاری ہی نہیں بلکہ وہ اس اکثریتی آبادی پر حکمرانی کر رہا ہے۔ پاکستان کے آئین جس میں اردو کے نفاذ کو یقینی بنانے کو کہا گیا اس پر عمل درآمد کو مختلف حیلے بھانے سے پسِ پشت ڈالا جاتا رہا۔ یہ اردو زبان ہی ہے جو ہمیں ایک قوم بنا سکتی ہے۔ چاروں صوبوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکتی ہیں، دراصل چاروں صوبوں کی زنجیر یہی اردو زبان ہی ہو سکتی ہے۔ صوبائی اور مقامی زبانیں بولنے اور سمجھنے والے اردو زبان کے ذریعہ ہی ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ ہم اس زبان کے ذریعہ ہی ہم تخلیقی کام میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ عدالت کے اس فیصلہ کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے حکومت اس فیصلہ پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔ ملک کے چاروں صوبوں، آزاد کشمیر و دیگر علاقوں میں اردو زبان کو فوری طور پر سرکاری دفاتر میں نافذ کیا جائے اور تمام ترکاروائی

اردو زبان ہی میں کرنے کی ہدایات جاری کی جائیں۔

اچھی بات ہے کہ اس فیصلے کے بعد وزیراعظم ہاوس اور ایوان صدر کے مابین اردو میں خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ نئے چیف جسٹس سے صدر مملکت جناب ممنون حسین نے اردو میں ہی حلف لیا اور تمام ترکاروائی اردو میں عمل میں

آئی۔ ایچ ای سی نے جامعات کو اردو میں خط و کتابت کی ہدایت کر دی ہے۔ اس فیصلے کے بعد پاکستان میں امریکی سفارت خانے نے اردو میں اپنی ویب سائٹ تشکیل دے لی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ امریکی سفارتی اہل کار اس انتظار میں تھے تاہم ہمارے سرکاری اداروں کو ابھی اپنی ویب سائٹ اردو میں بھی بنانے کا خیال نہیں آیا۔ امید ہے کہ اس جانب سرکاری اور دیگر ادارے توجہ مبزول کریں گے۔ اسی طرح نفاذ اردو کا یہ سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ پاکستان کے آئین اور سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کر کے ہم بڑے مقاصد حاصل کر سکیں گے۔

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عدالت اعظمیٰ کے اس فیصلے کے بعد انفرادی طور پر بعض شخصیات ، بیورو کریٹس، تجزیہ نگار، لینکر پرسن کی جانب سے عدالت کے اس فیصلے پر عمل درآمد کو مشکل ہی نہیں بلکہ اس کے نقصانات سے برملا آگاہ کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ ایک اعتبار سے اچھی بات ہے کہ ان احباب کے خیالات و نظریات سے اس کے منفی پہلو بھی سامنے آسکیں گے۔ ان لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو انگیریزی کے پروردہ ہیں۔ بعض شخصیات ٹی وی ٹاک شوز میں غیر ضروری خدشات کا اظہار کر رہے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ ہمارا پورا نظام اردو میں ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا ایم بی بی ایس کے طلبہ اردو میں ڈاکٹر بن سکتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب تک کسی ایسی اردو

کتاب کا انگریزی یا دیگر زبان میں ترجمہ نہیں ہوا جسے عالمی طور پر شہرت حاصل ہو جب کہ انگریزی کی ایسی بے شمار کتابیں جن کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے موجود ہیں۔ اس قسم کی باتیں کرنے والے اور اس قسم کی سوچ رکھنے والے شروع ہی سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اردو کو اس کا اصل مقام حاصل ہو سکے۔ وہ صرف اشرافیہ کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں بے شمار ملک اور قومیں ایسی ہیں جو انگریزی کے بغیر ہی ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں اور ماہرین پیدا کر رہی ہیں۔ انگریزی پڑھنے اور اس میں مہارت حاصل نہ کرنے کی بات کسی نے نہیں کی۔ انگریزی ضرور پڑھائی جائے لیکن اعلیٰ عدالت کے احکامات کے مطابق ہر سطح پر اردو کا نفاذ وقت کی ضرورت ہے۔

انگریزی کی اہمیت اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں، جس طرح کسی بھی ملک میں اس کی قومی زبان کی اہمیت ہے اور وہ قومی زبان اس ملک میں رابطے کا کام کرتی ہے اسی طرح انگریزی کو عالمی سطح پر رابطہ کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو زبان کے دفتری و قومی زبان کے نفاذ کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ انگریزی کو اپنے ملک سے دیس نکالا دے دیا جائے۔ اس کا سیکھنا، پڑھنا، سمجھنا، پڑھنا پڑھانا اپنی جگہ قائم و دائم رہنا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو باہر کی دنیا میں ہمارے مستقبل کے معمار، ہمارے نوجوان، ہمارے ھنر مند غیر ممالک میں کس طرح اپنے ملک کا نام روشن کریں گے۔ بے شمار ممالک کی مثالیں ہمارے

سامنے ہیں جہاں پر ان کی زبان کا بول بالا ہے۔ وہاں کی زبان ہر اعتبار سے وہاں حکمرانی کرتی ہے۔ چین، جاپان، جرمنی میں انگریزی میں خط وکتابت نہیں ہوتی۔ وہاں ان کی اپنی زبان ہی کی حکمرانی ہے۔ وہاں انگریزی بھی ساتھ نہیں دیتی۔ ایک سال قبل میرے بیٹی (فاھینہ)، داماد (عاصم مشکور) اور میری نواسیاں (نہا، کشف) اور نواسہ (ارحم عاصم) بہ سلسلہ ملازمت جرمنی چلے گئے۔ جرمنی کے شہر ڈوزلڈارف میں ان کا قیام ہے۔ وہاں پہنچ کر سب سے اہم اور مشکل مرحلہ جرمنی سمجھنا اور اسے یکھنا تھا۔ مختصر وقت میں بچوں نے جرمنی یکھ لی اور اب وہ اپنے اسکول میں جرمنی اسی طرح بولتے اور سمجھتے ہیں جس طرح پاکستان میں اردو اور انگریزی، میری بیٹی فاھینہ نے بھی اچھی خاصی جرمنی یکھ لی ہے۔ وہاں بھی انگریزی موجود ہے، ایسا نہیں کہ جرمنی اور دیگر مہالک میں انگریزی نہیں وہ اپنی جگہ اور وہاں کی مقامی زبان اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے جرمنی دنیا میں سرفہرست ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے جس قدر مواقع جرمنی میں ہیں کہیں اور کم ہیں۔

جرمنی، چین، جاپان کو چھوڑدیجئے سعودی عرب میں کتنی انگریزی ہے۔ کیا وہاں کا نظام عربی زبان پر نہیں چل رہا۔ ہمارے پاسپورٹ پر entry کی جگہ 'دخول' کی مہر نہیں لگائی جاتی؟ exit کی جگہ 'خروج' اور کیا تاریخیں عربی میں نہیں لکھی جاتیں؟ سعودی عرب میں زندگی کے ہر ہر شعبہ میں عربی کا

استعمال ہے۔ انگریزی اپنی جگہ ہے۔ سعودی شہری عربی پڑھتے، بولتے اور عربی بول کر ہی ڈاکٹر بھی بنتے ہیں، انجینئر بھی اور دیگر پیشوں میں بھی اعلیٰ مہارت حاصل کرتے ہیں۔ پھر ہم اپنے ملک کا نظام اردو میں تبدیل کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا اردو کے نفاذ سے ہمارے بچے ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ اور دیگر پیشوں میں اعلیٰ مہارت حاصل نہیں کر پائیں گے۔ یہی وہ دلائل ہیں جو اردو کے نفاذ کے حوالے سے آجکل اخبارات میں اور ٹی وی پر بعض احباب جو اپنے اپنے شعبہ میں نامی گرامی بھی ہیں دیتے نظر آرہے ہیں۔ ان سے صرف اس قدر عرض ہے خدارا 68 سال بعد اب یہ موقع آیا ہے کہ ہماری حکومت اپنے طور پر نہ سہی اعلیٰ عدالت کے فیصلے کی پابند ہوتے ہوئے اردو کو اس کا جائز مقام دینے جارہی ہے۔ ٹی وی پر منفی باتیں کرکے حکومتی ذمہ داران اور اداروں کی حوصلہ شکنی نہ کریں۔ اگر حکومت اس فیصلہ پر عمل کرنے جارہی ہے تو اسے اس فیصلہ پر عمل کرنے دیں۔ (14 ستمبر 2015)

سانحہ حرم شریف۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں

جمعہ 11 ستمبر 2015ء عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان کا وقت تھا، خانہ کعبہ کے چار اطراف مسجد الحرام میں توسیعی منصوبے پر تعمیراتی کام کے لیے لگی ہوئی ایک دیو ھیکل کرین اوپر کی جانب سے لہراتی ہوئی صفا و مروہ کے درمیانی مقام کی چھت پر گری جس نے صفاو مرو کی چھت کے کچھ حصہ کو نقصان پہنچایا، پھر خانہ کعبہ کے صحن میں مقام ابراہیم سے اندر کی جانب وہاں موجود زائرین پر آ گری جس سے اب تک اطلاعات کے مطابق 111 افراد شہید اور 238 سے زیادہ شدید زخمی ہوئے جو مکہ کے اسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔ خیال ہے کہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو فریضہ حج کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ ان میں 52 پاکستانی بھی ہیں۔ 11 کی شہادت کی تصدیق ہو چکی ہے۔ شہید ہونے والے پاکستانی زائیرین کا تعلق لاہور، مردان، مہمند ایجنسی، دیر، کوئٹہ، سانگھڑ، لکھڑ منڈی سے ہے۔ اس سانحہ پر جس قدر بھی دکھ اور افسوس کیا جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام شہدا کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے وہ جس مقصد کے لیے گھر سے نکلے تھے پروردگار ان کے اس مقصد کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے۔ جو لوگ زخمی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جلد صحت کاملہ عطافرمائے۔ آمین۔

سانحہ حرم شریف کے دل خراش مناظر دیکھ کر خانہ کعبہ کا ماحول اور نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ نظروں میں وہ جگہ جہاں حرم شریف کی توسیعی منصوبہ کے سلسلے میں کام کرنے والی دیو ھیکل کرینیں لگی ہوئی ہیں، رات ہو یا دن ہر وقت ہر لمحہ یہ کرینیں کام کرتی ہمارے سروں پر چہل قدمی کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی ڈر یا خوف کا احساس نہیں ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہمارے سروں پر اوپر ویلڈنگ کرنے والوں کے چنگاریاں بھی آ کر گریں لیکن مجال ہے کہ کسی لمحہ کسی بھی قسم کا ڈر یا خوف آیا ہو۔ میں 2011ء میں پہلی مرتبہ سعودی عرب گیا بعدازاں بلاوا آتا رہا اور میں اپنے رب کے بلاوے پر ہر سال ہی حاضری دیتا رہا۔ ابھی پانچ ماہ قبل اپریل 2015ء میری واپسی ہوئی تھی۔

ساری چیزیں تازہ ہیں، ہر چیز نظروں کے سامنے ہے، صفا و مروا میں سات چکروں کا منظر، زمینی منزل اور اوپر کی منزل پر سات چکر کی جگہ، مقام ابراہیم کو تو کبھی بھلایا جا ہی نہیں سکتا اس لیے کہ طواف کعبہ کے بعد مقام ابراہیم پر پہنچ کر دو رکعت نفل کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ بے شمار ہوگ رش سے بچنے کی خاطر مقام ابراہیم کے سامنے اندر کی جانب چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ وہاں سایہ کا ہونا بھی ہے دوسرے یہی سے صفا و مروا کا راستہ بھی ہے۔ یہی وہ جگہ بتائی گئی ہے کہ جہاں پر یہ کرین آ کر گری۔

،جب یہ حادثہ رونما ہوا اس وقت مکہ المکرمہ میں شدید بارش ہو رہی تھے

تیز طوفانی ہوائیں اور آسمانی بجلی کی گھن گرج، چمک و گھرگھراہٹ بے انتہا شدید تھی۔ آندھی آئے یا طوفان، برف پڑے یا اولے گریں، بجلی گرے یا پہاڑ خانہ کعبہ کے گرد طواف نہیں رکتا، اللہ کے بندے اپنے نبی ﷺ کے چاہنے والے پروانوں کی طرح خانہ کعبہ کے طواف میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں اپنے رب سے توبہ استغفار کرنے، اسے پکارنے، معافی مانگنے کے سوا کچھ اور سجائی نہیں دے رہا ہوتا، ان کے آگے کون ہے، پیچھے کون ہے، مرد ہے یا عورت کچھ پتا نہیں، کوئی دھکا دے رہا ہوتا ہے تو اس کی فکر نہیں کہ کون ہے جس نے دھکا دیا، نہ عورت کو عورت کا پتا، نہ مرد کو مرد کا پتا، بس اللہ اللہ کی صدائیں لگاتے، تلبیہ پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ کے طواف میں مدہوش رہتے ہیں۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ
اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ

"میں حاضر ہوں، یا اللہ میں حاضر ہو' میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں۔ بیشک تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں اور ملک بھی' تیرا کوئی شریک نہیں"۔ یہی صدائیں ہر ایک زبان پر ہوتی ہے۔

جس وقت کرین گری، اس وقت بھی طوافِ کعبہ جاری تھا، نماز پڑھنے والے نماز پڑھ رہے تھے، دعائیں مانگنے والے دعائیں مانگ رہے تھے، قرآن کی تلاوت کرنے والے تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ کرین گری جس نے نہ معلوم کس کس کو اپنی

لپیٹ میں لے لیا۔ زخمی ہوئے کچھ اسی وقت اللہ کو پیارے ہوگئے۔ شہید کا درجہ ملا۔ ان کے خون سے حرم شریف کا فرش رنگین ہوگیا۔ جانے والوں کا دکھ، افسوس اپنی جگہ، زخمی ہونے والوں کی تکلیف اپنی جگہ، لواحقین کا غم سر آنکھوں پر لیکن زرا یہ تو دیکھئے کہ ان شہیدوں نے کیا درجہ پایا،ان کے نصیب میں کتنی بڑی سعادت آئی، ایسی سعادت کہ ہم مسلمان اس سعادت کی تمنا کرتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں کہ پروردگار ہمیں مکہ میں موت آئے، مدینہ میں ہمارا دمِ آخر ہو، یہ تو وہ شہید ہیں کہ مکہ المکرمہ میں ہی نہیں بلکہ اللہ کے گھر خانہ کعبہ کے صحن میں ان ارواح نے قفسِ عُنصُری سے پرواز کر کے مقامِ محمود پر جا پہنچی۔ شہیدوں کا دکھ، ان کے لواحقین سے ہمدردری اور ان کے غم میں شریک ہوتے ہوئے پروردگار سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہیدوں کی شہادت کو قبول فرمانا۔اقبالؔ کا شعر ؎

اُن شہیدوں کی دِیَت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خُون جن کا حرم سے بڑھ کر

ان تمام باتوں کے باوجود ایک سوال کا ذہن میں آنا قدرتی عمل ہے کہ جس جگہ لاکھوں کا مجمع ہو وہاں پر اس قسم کا حادثے کا پیش آجانا۔ ایک سوالیا نشان ضرور ہے لیکن تاریخ میں کبھی اس سے پہلے کوئی واقعہ اس قسم کا خانہ کعبہ کے صحن میں رونما نہیں ہوا۔ حرم شریف کی توسیع کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے زمانے

سے شروع ہوا تھا جو آج تک جاری و ساری ہے۔ اس کی بنیادی وجہ عمرہ اور حج کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہے۔ توسیع کی وجہ سے اب ایک وقت میں پچاس لاکھ عازمین حج بسہولت تمام مناسک حج ادا کر سکتے ہیں۔ سعودی اخبار نے وزیر حج جناب بندر حجار کے حوالے سے لکھا ہے کہ توسیعی منصوبہ مکمل ہونے کے بعد آئندہ پانچ سال کے دوران حجاج کی تعداد 3 کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ حرم شریف کا توسیع کا مختصر جائزہ لیں تو صورت حال کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مکہ میں بے شمار اصلاحات کیں ۔ خاص طور پر مکہ میں آنے والے سیلاب کے سدِ باب کے لیے ''المدعا'' میں مرَوہ کے قریب) ایک بند تعمیر کرایا جس کے باعث کئی سال تک حرم شریف اور اہل مکہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے۔ حرم شریف کی اولین توسیع حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور 17 ہجری میں ہی ہوئی۔ 18 ہجری میں خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے توسیع کا کام کرایا۔ اموی خلیفہ امیر معاویہ نے مکہ کی ترقی اور فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک نے کعبتہ اللہ کی حفاظت کے لیے حرم شریف کے چاروں طرف ایک مضبود پشتہ تعمیر کرایا۔ گورنر مکہ خالد بن عبداللہ نے کعبہ میں کئی ترقیاتی کام کیے۔ عقبہ بن الازرق نے کعبہ میں سب سے پہلے روشنی کا انتظام کیا۔ عہد عباسی میں مکہ کی تعمیر میں بہت کام ہوئے، نہر زبیدہ ان میں ایک ہے، خلافت

عثمانیہ کے ہر حاکم نے مکہ کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ حرم شریف کی توسیع کا کام بھی کرایا۔ ترکی فرمارواؤں نے اپنے دور میں حرم کی توسیع ترجیحی بنیادوں پر کی۔

سعودی فرماں حکمراں ترقی اور توسیع کے ایک نہ رکنے والے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب کا ہر شہر تیزی سے ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ سعودی حکمران شاہ عبدلعزیزؒ آلِ سعود نے 1368ھ میں حرم شریف کی توسیع کا اعلان کیا۔ یہ منصوبہ حرم شریف کی تاریخِ توسیع کا اہم ترین منصوبہ تھا۔ اس منصوبے پر بیس سال مسلسل کام ہوتا رہا۔ حرم شریف کی خارجی سمت کی توسیع نہایت اہم تھی اس کا کل رقبہ ساٹھ ہزار مربع میٹر تھا مسجد حرام کی دونوں منزلوں کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں ٹائل لگائے گئے۔ ساتھ ہی عثمانی دور کی تعمیرات کی بھی اصلاح و ترمیم سے سنوارا گیا اور سعودی دور کی توسیع کو عثمانی دور کی توسیع سے باہم ملا دیا گیا۔ مطاف کو بھی وسیع کیا گیا۔ اس میں سفید سنگِ مرمر کا استعمال کیا گیا جس کی خوبی یہ ہے کہ یہ گرمی کی تپش سے گرم نہیں ہوتا۔ زم زم کے کنوے تک پہنچنے کے لیے دروازے لگائے گئے کعبہ شریف کا دروازہ تبدیل کیا گیا جس میں خالص سونے کی پلیٹیں جڑی گئیں جن کا وزن 286 کلو گرام ہے۔ اس عظیم توسیع میں صفا و مروا کے درمیانی جگہ بھی شامل تھی۔ دوسری منزل پر بھی سعی کی سہولت فراہم کی گئی۔

شاہ فہد بن عبد لعزیز مرحوم نے بھی حرم شریف کی توسیع میں ذاتی دلچسپی لی۔ ماہِ سفر 1409ھ میں مزید توسیع کا فوری طور پر حکم دیا۔ ان کے دور میں بھی توسیع کا کام جاری رہا۔ ان کے دورِ حکمرانی میں ''مسعا'' کے درمیانی حصے میں پل نما چھ گزرگاہیں بنائی گئیں۔ نمازیوں کی سہولت کے لیے دوسری منزل پر چڑھنے کے لیے خودکار زینے نصب کیے گئے۔ مسجد حرام کی چھت کو نماز کے قابل بنایا گیا تاکہ وقت ضرورت یہ چھت نماز کے لیے استعمال ہوسکے۔ خادمِ حرمین شریفین شاہ عبد اللہ بن عبد العزیز مرحوم کے دور حکمرانی میں مسجد الحرام اور مسجد بنوی کے عظیم الشان توسعی منصوبوں کا آغاز ہوا۔ اس منصوبے پر اخرجات کا تخمینہ 10.7 بلین تھا۔ اس کا افتتاح بھی شاہ عبداللہ مرحوم نے 19 اگست 2011ء کو کیا تھا۔ خادمِ حرمین شریفین شاہ سلمان، شاہ عبد اللہ کے انتقال کے بعد سعودی فرماں رواں بنے۔ شاہ سلمان بن عبدالعزیز انتظامی امور کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ شاہ سلمان شہزادہ نائف بن عبد العزیز کی وفات کے بعد ولی عہد کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ شاہ سلمان ابھی صرف 19 برس کے تھے کہ انہیں 1954ء میں ریاض شہر کا میئر بنا دیا گیا تھا۔ ایک سال بعد ہی یعنی ۲۰ سال کی عمر میں انہیں وزیر کا منصب عطا کر دیا گیا تھا۔ 1963ء میں جب کہ ان کی عمر 27 برس تھی انہیں ریاض شہر کا گورنر بنا دیا گیا۔ شاہ سلمان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ 48 سال (1963-2011ء) ریاض شہر کے گورنر رہے۔ ریاض شہر کو ایک چھوٹے

اور دیہات نما شہر سے دنیا کے جدید اور ترقی یافتہ شہروں میں سے ایک شہر بنا دینا شاہ سلمان ہی کا کارنامہ ہے۔ 5 نومبر 2011ء کو انہیں وزیر دفاع کا قلم دان سونپا گیا اور 18 جون 2012ء کو اپنے بھائی شہزادہ نائف کے انتقال کے بعد ولی عہد کا منصب عطا ہوا اور پھر شاہ عبداللہ کے انتقال کے بعد شاہ سلمان سعودی عرب کے حکمراں بنے۔انہوں نے حرم شریف کے توسیع منصوبے پر کام کو اسی طرح جاری رکھا جس طرح شاہ عبداللہ کے دور میں چل رہا تھا۔ حرم شریف کے شمالی و جنوبی صحنوں میں انتہائی توسیع کے منصوبے پر دن رات کام ہو رہا ہے۔ سڑکوں کا نیا جال بچھایا جا رہا ہے۔اس کے تحت گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کے لیے برقی زینو، خودکار راستوں اور ٹنل کی تعمیر شامل ہے۔بیت اللہ شریف کے چاروں جانب گولائی میں وھیل چیئر پر طواف کرنے والوں کے لیے دوسری منزل مختص ہے جب کہ پہلی منزل پر دیگر لوگ طواف کرتے ہیں۔ گولائی میں مخصوص جگہ خانہ کعبہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے طواف کی خاطر ہی بنائی گئی ہے۔ ہیلی پیڈ بھی منصوبے کا حصہ ہے تاکہ حرم شریف سے مریضوں کو تیزی کے ساتھ اسپتال منتقل کیا جاسکے۔اس منصوبے کے علاوہ مکہ المکرمہ کو جدہ کے راستے مدینہ منورہ سے ملانے کے لیے ہائی اسپیڈ ٹرین کے منصوبے پر پہلے ہی کام جاری ہے۔ اس توسیعی منصوبے کی تکمیل کے نتیجے میں مسجد حرام میں 2.5 ملین لوگ ایک وقت میں نماز ادا کرسکیں گے اور حرم شریف کے شمال اور مغربی صحنوں میں آمد و رفت آسان ہوجائے گی، زائرین ٹریفک کے ازدھام سے متاثر ہوئے بغیر

حرم شریف آ جا سکیں گے۔ یہ حرم شریف کی تاریخ کا سب سے بڑا توسیعی منصوبہ ہے۔ زیر زمین راستوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ منیٰ و عرفات کے درمیان برق رفتار ٹرین پہلے ہی سے حج کے دنوں میں زائرین کو لانے اور لے جانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہم مطاف میں قدم رکھتے ہیں اور اپنے سر پر چاروں جانب دیو ھیکل کرینیں کھڑی دیکھتے ہیں تو خوف کا عالم طاری ہو جانا یقینی ہوتا ہے لیکن سامنے اللہ کا گھر جس کی تڑپ اور تمنا لیے ہم خانہ کعبہ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو ہمیں سوائے اپنے رب کے سامنے حاضری کے احساس، اس سے معافی طلب کرنے، توبہ استغفار کرنے، اس کا لاکھ لاکھ شکرادا کرنے کے سوا کچھ سجائی نہیں دیتا۔ مطاف میں پیش آنے والا حادثہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور پہلا حادثہ ہے۔ حرم میں توسیعی منصوبے کا تعمیراتی کام صبح و شام حتیٰ کے رات میں بھی جاری رہتا ہے۔ حج کے ایام میں بھی معمول کے مطابق کام جاری و ساری رہتا ہے۔ اسے دیکھ کر عقل دنگ اور حیران ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد لاکھوں کا مجمع، اندر اور باہر لوگ ہی لوگ اس کے باوجود تعمیراتی کام کسی لمحہ نہیں رکتا۔ سعودی حکومت کے کسی ذمہ دار کا بیان اخبار میں پڑھا کہ یہ حادثہ کسی فنی کمزوری، کرین کے ٹوٹ جانے سے نہیں ہوا بلکہ یہ قدرتی آفات جس میں شدید بارش، طوفانی ہوائیں، گرج چمک، آسمانی بجلی گرجانے

کے باعث کرین اوپر سے نیچے آرہی اور کئی لوگ اپنی جان سے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ شواہد اور وہاں کی صورت حال کو جن لوگوں نے دیکھا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سوچ کا دھاری اسی جانب جاتا ہے۔ تاہم سعودی حکومت اس حادثے کے تمام پہلوؤں پر غور کررہی ہوگی۔ ابتدائی طور پر حرم شریف میں تعمیراتی کام کرنے والی کمپنی بن لادن گروپ' کے خلا ابتدائی اقدامات شروع ہوچکے ہیں۔ وزارت خزانہ کو ہدایت' کی گئی ہے کہ وہ گروپ کے تمام جاری منصوبوں کا جائزہ لے۔ واقعہ کی تحقیقات کے لیے قائم کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ اس حادثے کی کسی حدتک ذمہ داری کمپنی بھی ہے۔ جو حرم کے توسیعی منصوبے پر کام کرہی ہے۔ اور اس نے تعمیراتی مقام پر حفاظتی اقدامات کو یقینی نہیں بنایا۔ جس کی وجہ سے یہ حادثہ رونا ہوا۔ سعودی فرمانروا شاہ سلمان بن عبد لاعزیز نے اس افسوناک حادثے میں زخمی ہونے والوں کی عیادت کی اور کہا کہ' وہ اس حادثے کی تہہ تک پہنچیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اس واقعے کی وجوہ کا پتا چلانے کے لیے تحقیقات کریں گے اور اس کے نتائج عوام الناس کے سامنے لائیں گے'۔ اگر اس حادثہ میں کسی انسانی غیر ذمہ داری سامنے آئی تو اس پر سخت ایکشن ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔ اس سلسلے میں سعودی شاہی دیوان نے حادثے میں جاں بحق ہونے والے ہر فرد کے خاندان کو 10 لاکھ سعودی ریال (تقریباً 2 لاکھ 70 ہزار ڈالر) اور زخمی و معزور ہوجانے والے فرد کے لیے 5 لاکھ سعودی ریال ادا کرنے کا حکم دیا۔ حادثے کے بعد سعودی حکومت کے اقدامات خوش

آیند ہیں۔ شہداء کے لیے دعائے مغفرت، لواحقین کے لیے صبر جمیل عطا کرنے کی دعا،
زخمیوں کے لیے بھی دلی ہمدردی اور جلد صحت یابی کی دعاؤں کے ساتھ اللہ ہم سب کو
ہر طرح کے حادثات سے محفوظ رکھے۔ اقبالؔ نے کہا ہے

مرے خاک وخُوں سے تُو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صِلۂ شہید کیا ہے، تب وتابِ جاودَانہ

ستمبر 2015، مصنف سے رابطہ کے لیے ای میل 15)

(drraissamdani@yahoo.com

کراچی کے لیے 150 ارب روپے کا پیکج۔ نیک نیتی یا بلدیاتی انتخابات

پاکستان میں سیاسی پنڈتوں کی پرانی عادت ہے کہ جیسے ہی انتخابات کا موسم قریب آتا ہے وہ اپنی معصوم عوام کو مختلف قسم کے لالی پاپ دینے کی کوشش مختلف طریقوں سے کرتے ہیں، اقتدار میں موجود سیاست داں کیوں کہ حکومت وقت ہوتے ہیں اس لیے وہ حکومت کی جانب سے عوام کی فلاح کے اعلانات کرتے ہیں ، وہ سیاسی سورما جو حکومت میں آنے کے لیے پھڑ پھڑا رہے ہوتے ہیں waiting for the government ہوتے ہیں وہ محض مستقبل میں ایسے ایسے تیر مانے کی باتیں کرتے ہیں کہ جن کو سن کر حیرت اور افسوس ہوتا ہے کہ انہیں کچھ شرم وحیا نہیں جس قسم کے وعدے یہ عوام سے کر رہے ہوتے ہیں ، عوام کو اور خود انہیں بھی یہ معلو ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی صورت پورے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ناممکن ہوتے ہیں۔ الیکشن 2013 ء کی انتخابی مہم کو اپنے ذہن میں تازہ کیجئے۔ سمجھ لیجئے کہ آپ کے سامنے ایک بڑی اسکرین لگی ہوئی ہے اس پر ہمارے سیاست دان عوام سے کیا کیا وعدے کر رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ہمارے خادم اعلیٰ جنہیں حبیب جالبؔ کے بعض اشعار خوب یاد ہیں کس طرح لہک لہک کر شعر سنایا کرتے تھے، بجلی کا بحران ختم کرنے کا وعدہ یاد ہے پہلے تین ماہ اور پھر لوگوں نے جھنجوڑا کہ چھوٹے میاں صاحب یہ تسی کی کر رہے ہوانا کم وقت ، کچھ وقت بڑھاؤ تو انہوں نے دو سال کردئے تھے، کہاں

گئے تین ماہ اور دو سال، سڑک پر کسی کو گھسیٹنے کی باتیں یاد ہیں، کہاں گئی وہ گھسیٹا گھسیٹی؟ کس پیار سے، محبت سے، آرام سے، مفاہمت سے پانچ سال صدارت کو پورا کرایا۔ بڑے میاں صاحب قبلہ نواز شریف صاحب کے وعدوں کا بھی یہی حال ہے۔

ہمارے کپتان کسی سے پیچھے نہیں تھے، ان کا ایک خاص جملہ ہے 'ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے'، الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کو بریف کیس بھر کر لندن لے کر گئے، برطانوی عدالت میں پیش کرنے، کیا ہوا وہ دعویٰ، کہاں گئے وہ ثبوت، اب ان کی پیروی میں ان کی جماعت کے ایک نومولود فیصل واڈا نے بھی وہی کچھ کیا، حاصل؟ کپتان کا کہنا تھا کہ کرپشن نہیں کرنے دیں گے، دوسری جانب اپنے ہی وزیر کو کرپشن کے الزام میں نکال باہر کر رہے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی بھی یہی روایت اور تاریخ چلی آرہی ہے گزشتہ چار دیہائیوں سے۔ جب اقتدار میں ہوں تو سب اچھا، خوب لوٹو، خوب بناؤ، خوب مزے اڑاؤ، جب کرسی ڈگمگانے لگے تو ہائے بیچاری عوام، ہائے بیچاری عوام۔ غریب عوام نظر آنے لگتی ہے۔ ان کا درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ عام انتخابات میں تو ابھی دو ڈھائی سال ہیں، کوئی معجزہ ہی ہوجائے کہ انتخابات وقت سے پہلے ہوجائیں۔ البتہ دھرنوں کے دنوں میں آسار نظر آرہے تھے کے تیسرے امپائر کی انگلی کسی بھی وقت اٹھ سکتی ہے لیکن وہ وقت نواز لیگ کے لیے ساتھ خیریت سے گزر گیا۔ اب جس قسم کے خدشات، اقتدار حاصل کرنے کی باتیں ہورہی ہیں، عوام کے لیے فلاحی منصوبوں اور پیکیجیز سامنے آرہے ہیں ان سے کچھ کچھ اشارے مل رہے کہ

سیاست میں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ میاں صاحب کو کچھ نظر آ راہ ہے، اسی لیے تو ڈر و خوف ہے۔اب حالات کچھ بھی ہوں، حکمرانوں کو مستقبل قریب جو کچھ بھی ہوتا نظر آ رہا ہو ، وہ اس ڈر و خوف کے پیش نظر یا اپنے اقتدار کو بچانے کے پیش نظر، مخالفین کو اپنے مقام پر رکھنے کی وجہ سے اگر عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے کسی بھی قسم کے منصوبے یا پیکیج کا اعلان کرتے ہیں اور اس پر ایمانداری سے عمل درآمد ہوتا ہے تو اس سے اچھی کوئی اور بات نہیں۔ غریب عوام کی بہبود کے لیے ہر طرح کے اقدامات ہونے چاہیے۔وہ قابل تعریف اور عوام کے لیے احسن اقدام ہوگا۔

اس تمہید کے بعد اب اصل موضوع پر کچھ بات ہو جائے کہ کراچی ایک ایسا منفرد شہر اور ایسے باسیوں کا شہر ہے کہ جسے کوئی حکومت، یا سیاسی جماعت آج تک اون نہیں کیا۔ یہ شہر پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی اور کما کر دینے والا شہر ہے، اعداد و شمار بتاتے ہیں ملک کی کل آمدنی کا ساٹھ فیصد یہ شہر دیتا ہے۔اب اس کی تاویلیں مختلف لوگ مختلف دیتے ہیں کچھ کہہ دیتے ہیں یہ ساٹھ فیصد صرف کراچی نہیں کماتا بلکہ اس میں دیگر شہروں کے تاجروں کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔کچھ بھی صحیح کراچی حکومتی آمدنی کا ہمیشہ سے سب زیادہ کماؤ شہر رہا ہے اور ہے۔اس کے مقابلے میں کراچی پر کس کی کتنی توجہ رہی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ پنجاب کی حکومت نے سب سے زیادہ لاہور

کی ترقی پر توجہ دی، یقین نہ ہو تو پرانے لاہور کو دیکھ لیجئے اور موجودہ لاہور کی سیر کر آئیں۔ پتا چلتا ہے کہ اس شہر کو کسی نے اون کیا ہوا ہے، اس پر توجہ دی ہوئی ہے، اس پر ترقیاتی کام ہوا ہے۔ اون کرنا یہ ہوتا ہے کہ وہاں ترقی نظر آئے۔ زبانی جمع خرچ کرنے سے آپ کسی شہر کو اون نہیں کر سکتے۔ یہ اون ہے کہ کراچی لاوارث، بے یار و مددگار عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ اس کی سڑکیں کھنڈر کی کیفیت میں، پانی، بجلی، صفائی، سیورج، لاقانونیت، چوری، ڈکیتی، موبائل، پرس چھیننا، قتل و غارت گری کونسا کام اور جرم ایسا ہے جو یہاں آزادی سے نہیں ہو رہا تھا یا کونسا کام ہے جس پر حکومت نے گزشتہ سات سالوں سے توجہ دی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے کراچی کے لیے 150 ارب روپے کا ترقیاتی پیکج کا اعلان کیا ہے۔ اس پیکج کی تفصیلات ایک پریس کانفرنس میں سندھ کے وزیر بلدیات سید ناصر حسین شاہ نے پیش کیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ’ پاکستان پیپلز پارٹی نے ہمیشہ کراچی کو اون کیا ہے اور ہمارے شہید قائد ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے بعد ہماری شہید قائد محترمہ بینظیر بھٹو نے بھی کراچی کے لیے ریکارڈ ترقیاتی کام کروائے ‘۔ بے شک دونوں شہیدوں نے کراچی ہی کو نہیں بلکہ پورے ملک کو اون کیا اور پورے ملک میں ترقیاتی کام کرائے۔ ناصر حسین شاہ پیپلز پارٹی کے موجودہ شریک چیئرمین جناب آصف علی زرداری کے

پانچ سالوں کو بھول گئے یا پھر انھوں نے سچائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پانچ سالوں کو پارٹی کے اقتدار میں شامل ہی نہ کیا ہو۔ سائیں قائم علی شاہ کا بھی تو ڈھائی سال کو موجودہ دور کس کھاتے میں جائے گا، اسے بھی ناصر شاہ صاحب بھول گئے ان سات سالوں میں کراچی پر کس قدر توجہ دی گئی۔ کس طرح کراچی کو اون کیا گیا سب کے سامنے ہے۔ کہتے ہیں ناصر شاہ صاحب کہ ’ آج بھی ہمارا مکمل فوکس کراچی پر ہے ‘۔ شاہ صاحب آپ ہی کیا اس وقت تو ہر سیاسی جماعت کا فوکس کراچی ہے، ہر ادارے کا فوکس کراچی، ایسا لگتا ہے کہ یہ دور کراچی کراچی کھیلنے کا دور ہے۔ ٹی وی ٹاک شوز، جس چینل پر گفتگو سنیں کراچی کی گونج کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے۔ حوالہ کوئی بھی ہو۔ پورا پاکستان دودھ میں نہایا ہوا ہے صرف کراچی گندگی کا ڈھیر، برائیوں کا مرکز، مخالفین کا گڑھ، اسی لیے تو ہمارے وزیر اعظم بڑے میاں صاحب نے بھی فرمایا کہ پہلے ’کراچی کو ٹھیک کرلیں پھر کچھ اور کریں گے‘ درست فرمایا میاں صاحب نے جب تک آپ کراچی کو ٹھیک کریں گے اس وقت تک آپ کے اقتدار کے پانچ سال مکمل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ اللہ خیر صلہ کراچی کو سدھارنے کی آپ ہیٹرک کرنے جارہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو یہ نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ نے تیسری بار کراچی کو ٹھیک کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے آپ اس میں کامیاب و کامران ہو۔ کراچی کے باسی آپ کے بے انتہا ممنون و مشکور ہوں گے، ممنون اس لیے بھی کہ آپ نے کراچی ہی کے ایک باسی ’ممنون حسین‘ کو ممنون کرکے ریاست کے سب سے

اعلیٰ عہدہ پر بیٹھا دیا۔ اس کے لیے بھی اہل کراچی آپ کے ممنون ہیں۔
بات کراچی پیکج کی ہو رہی تھی، یہ پیکج بھی کراچی کو ٹھیک کرنے کے لیے ہی تو ہے۔ ٹھیک کرنے کے کئی طریقے ہیں ان میں سے ایک یہ پیکج بھی ہے۔ کراچی ایک طریقے سے بھی ٹھیک ہو رہا ہے۔ پیکج بھی ایک طریقہ ٹھیک کرنے کا۔ ہم تو اس ایج گروپ سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہم نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور کو بہت قریب سے دیکھا، بینظیر کے دور کو دیکھا، میاں صاحب کے تین ادوار اور کراچی کو ٹھیک کرنے کے اقدامات ہمارے سامنے ہیں، ضیاء الحق، پرویز مشرف ہی کیا ہم نے تو ایوب خان کو بھی دیکھا۔ سب نے کس کس طرح کراچی کو ٹھیک کیا ہماری عمر کے لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔
بلاول کراچی سدھار پیکج' کی کل رقم 150 ارب روپے ہیں۔ اس رقم کو حسب ذیل' مدوں میں کراچی کو ٹھیک کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ کراچی کی سڑکوں کے 78 اا سکیموں پر 17364 ملین روپے، پل، فلائی اوورز اور کلورٹ کی 10 اسکیموں پر ملین روپے، کراچی واٹر اینڈ سیورج بورڈ کے لیے 45450 ملین روپے (اس 3803 میں کے فور اور ایس تھری پرجیکٹ شامل نہیں)، پارکس اور ہر ٹیکلچر کی 17 اسکیموں پر روپے ریسکیو 1299 برائے کراچی ڈویژن کی تین اسکیموں پر 820 روپے، 6584 فائر اینڈ ڈیزاسٹر مینجمنٹ کی 11 اسکیموں پر 18904 میلن روپے، تو لوں

اور ڈرینج کی 33 اسکیموں پر 28175 ملین روپے، پلانٹ اینڈ مشنری کی پانچ اسکیموں پر روپے، سولڈ ویسٹ مینجمنٹ کی اسکیم کے لیے 4600 ملین روپے ، مختلف سوک 1760 سہولیات کی پانچ اسکیموں کے لیے 1980 ملین روپے ، ٹرانسپورٹ اینڈ سی ڈی کی 7 اسکیموں پر 12100 ملین روپے اور بلاک ایلویشن سمیت دیگر اسکیموں کے لیے 9000 ملین روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ ہر اسکیم کے لیے ملین میں رقم رکھی گئی ہے۔ خدا کرے یہ اعداد و شمار کا گورکھ دھندا ثابت نہ ہو، یہ رقم ایمانداری سے کراچی کو سدھار نے پر لگ جائے تو کراچی کی قسمت ہی بدل جائے گی۔ لیکن ماضی کی تاریخ تو کچھ اور ہی رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کی کراچی کو ترقی دینے کی، سدھارنے کی اور اسے اون کرنے کی یہ عملی کوشش نیک فعال ثابت ہو، یہ دکھاوا نہ ہو، کاغذی کورکھ دھندا نہ ہو، بلدیاتی انتخابات کے لیے کشش نہ ہو، سیاسی اعلان نہ ہو حقیقی معنوں میں شہر کراچی کی ترقی مقصود ہو۔

پیکجوں کا زمانہ شروع ہوچکا ہے، سندھ میں کراچی سدھار پیکج کے بعد وزیر اعظم میاں نواز شریف نے ملک میں زراعت اور کاشتکاروں کی فلاح کے لیے 341 ارب روپے کے پیکج کا اعلان کیا ہے۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں، کیا یہ بھی پنجاب میں بلدیاتی انتخابات سے جڑے مقاصد کا حصہ ہے یا واقعی نون لیگ کسانوں کی ہمدرد و غمخوار ہو گئی ہے، اسے ڈھائی سال کے اقتدار کے بعد کسانوں کی زبوں حالی کا خیال آیا، جس طرح سندھ حکومت کو طویل عرصہ گزر جانے کے بعد کراچی کی حالت کا

خیال آیا اور بلاول بھٹو زرداری نے امدادی پیکج کا اعلان کیا۔ اس طرح کے پیکیجز ماضی میں اعلان کیے جاتے رہے ہیں۔ کراچی پر ان پیکجوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے ایک سابقہ کالم میں جو کراچی میں 200 سے زیادہ ہلاکتوں پر تھا لکھا تھا کہ کراچی کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے، عمل ہے، سوچ ہے اس پر وہ قیام پاکستان سے آج تک عمل پیرا ہیں۔ایوب خان نے سر توڑ کوشش کی کہ کراچی کو اپن بنالیں پر کراچی والے تو محترمہ فاطمہ جناح کے دیوانے تھے۔ انہوں نے گلاب کے پھول کے مقابلے میں لالٹین کی روشنی کو بلند کیا، گلاب کے پھول کی خوشبو انہیں ایک آنکھ نہ بھائی۔ بھٹو صاحب کا جادو سر چڑھ کر بولا، پورے ملک میں جئے بھٹو جئے بھٹو کی صدائیں گونجیں، انہوں نے کلین سوئیپ کیا لیکن کراچی نے نو ستاروں کو جگمگایا، شاہ احمد نورانی قبلہ اور ان کی چابی کو جنت کی چابی تصور کرتے ہوئے انہیں اپنا رہبر بنالیا۔ اس سے بھی پہلے کی تاریخ اگر یاد ہو تو کراچی کے رہنما جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد مرحوم اور پروفیسر محمود اعظم فاروقی مرحوم ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان کی سیاست میں الطاف حسین پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ایم کیو ایم نام کی کوئی چیز دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی کراچی کا اپنا ایک الگ رنگ، الگ مزاج اور منفرد سیاسی مزاج تھا۔الطاف بھائی نے سیاست میں قدم رکھا،ایم کیو ایم وجود میں آئی تو انہوں نے کراچی پر ایسا جادو کیا کہ لوگ انہی کہ ہو رہے۔ ان کی جماعت کراچی کی نمائندگی

گزشتہ دو دیہائیوں سے زیادہ عرصہ سے کر رہی ہے۔ سیاست کا یہی تو حسن ہے، کسی بھی سیاسی جماعت پر جس قدر ظلم وزیادتی ہوتی ہے عوام کی ہمدردیاں اس سے اور زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ پیکج کیا کوئی کام دکھا سکیں گے۔ اگر ان پیکجوں نے یہ کام دکھا یا کہ کراچی میں حقیقی طور پر سدھار کے آثار بھی نظر آنے لگے، جن منصوبوں کے لیے اربوں کی رقم مختص کی گئی ہے وہ ان منصوبوں پر لگتی نظر آئی، کراچی کی سڑکیں بنتی نظر آئیں، پل، فلائی اوورز اور کلورٹ بنتے دکھائی دیے ، واٹر اینڈ سیورج بورڈ میں ایمانداری دکھائی دی، پانی کراچی کو ملتا نظر آیا، واٹر بورڈ کے وال مین جو بھتہ خوری میں ملوث ہیں ان کی بھتہ خوری بند ہوئی، پارکوں کی حالت بہتر ہوئی ، نئے پارک بنائے گئے،

ریسکیو 1299 برائے کراچی ڈویژن کو فعال ہوتے دیکھا، فائر اینڈ ڈیزاسٹر مینجمنٹ کی اسکیموں پر رقم ایمانداری سے خرچ کی گئی اور دیگر اسکیموں پر رقم ایمانداری سے خرچ ہوتی نظر بھی آئی تو پیپلز پارٹی کو فائدہ ہی ہوگا نقصان نہیں۔ پیپلز پارٹی کے سینئر سعید غنی نے کسی ٹی وی ٹاک شو میں بڑی سچائی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا کہ کراچی پیکج اس لیے نہیں دیا گیا کہ اس سے پیپلز پارٹی بلدیاتی انتخاب میں سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے انہوں نے کہا کہ میں بلدیاتی انتخاب میں بہت زیادہ تبدیلی پھر بھی نہیں دیکھ رہا تھوڑا بہت ادھر یا ادھر ہو سکتا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جسے ہمارے سیاست دان کہتے ہوئے

ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی قیادت ان سے ناراض نہ ہوجائے۔ سعید غنی جیسے مثبت اور صحیح سوچ کے حامل سیاستدانوں کی ہی ہمیں ضرورت ہے۔ سچ کو سچ، غلط کو غلط کہنے کی ہر سیاسی کارکن میں جرات اور ہمت ہونی چاہیے۔ قیادت کے ڈر و خوف سے جینا گویا درباریوں کے طرز عمل کے مصداق ہے۔ (18 ستمبر 2015)

میر تقی میرؔ۔ اردو غزل کے بے تاج بادشاہ

(205 سال قبل 20 ستمبر 1810ء کو دنیا سے رخصت ہوئے)

دنیائے اردو ادب کے بے تاج بادشاہ، غزل کی دنیا کے شہنشاہ میر تقی میرؔ کو دنیا چھوڑے 205 سال ہو گئے۔ وہ اکبر آباد میں 1722 ء میں پیدا ہوئے، انتقال 20 ستمبر 1810ء مطابق 1135 ھ لکھنؤ میں ہوا۔ طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود میرؔ دنیائے ادب پر آج بھی حکمرانی کر رہے ہیں اور زندہ و تابندہ ہیں۔ میرؔ ان استاد الاساتذہ میں سے ہیں کہ جن کو اردو شاعری کے بڑے بڑے شاعروں نے نہ صرف سراہا بلکہ ان کی شاعری کی برملا تعریف و توصیف میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ شعرائے متاخرین نے انہیں ''خدائے سخن'' کا خطاب دیا۔ ایک عالم میرؔ کی شاعری کا مُعتَرف و معتقد رہا اور یہ سلسلہ تا حال جاری و ساری ہے۔ مرزا غالبؔ جیسے استاد شاعر نے برملا میرؔ کے معتقد ہونے کا اقرار کیا ؂

اپنا تو عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہیں جو معتقدِ میر نہیں

پھر غالبؔ نے میرؔ کے معتقد ہونے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دنیا کو یہ

باور بھی کرایا کہ غالبؔ ہی ریختے کے استاد نہیں ، ان سے پہلے میرؔ بھی زبان و بیان کے استاد رہ چکے ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر بہت معروف ہے ۔

ریختے کے تُم ہی استاد نہیں ہو ، غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ذکرِ میر ' میر تقی میرؔ کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جو ان کی نجی زندگی کے واقعات ، ' ان کی شخصیت پر تفصیلی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس خود نوشت کو میرؔ پر معلومات کا اَساسی ماخذ تصور کیا جاتا ہے۔ میرؔ کی شاعری اور ان کی زندگی پر گزشتہ دو صدیوں سے کام ہو رہا ہے۔ بے شمار مورخین ، محققین و مصنفین نے میرؔ کو اپنا موضوع بنایا اور تحقیق کی، شاعروں نے میرؔ پر شاعری کی اور نظم میں میرؔ کو خرج تحسین پیش کیا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا کہ جس نے میرؔ کی غزل گوئی کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب 'کلیاتِ میرؔ' عمدہ کاوش ہے؛ یہ اُن کا ڈی لٹ کا مقالہ بھی تھا۔ جسے انھوں نے مطبوعہ صورت میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈی لٹ کے لیے پیش کیا تھا۔ میر تقی میرؔ کی نجی زندگی اور ان کی شاعری کے حوالے سے انتہائی محنت و جستجو کے ساتھ حقائق کو جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کو میرؔ پر ایک مستند تحقیق کی حیثیت حاصل ہے۔

میرؔ کے اجداد کا وطن 'حجاز' تھا، وہ حجاز سے ہجرت کر کے ہندوستان کے شہر دکن سے ہوتے ہوئے گجرات میں پناگزیں ہوئے، جہاں سے وہ اکبر آباد آئے جو اس وقت ہندوستان کا مرکزی شہر اور دارالخلافہ بھی تھا، میرؔ کا خاندان نسلاً ایک اعلیٰ خاندان تھا، عربی ہونے کے ناطے ان میں عرب کے باسیوں کی اعلیٰ روایات اور خاصیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔غیض و غضب، غصہ، قہر،، شدت، گرمی، جوش، ولولہ، شدت پسندی، غیرت، ندامت، حمیت، شرافت، ثابت قدمی، برداشت، درگزر، ایثار،
قربانی، ندامت، اضطراب، کسمساھٹ، بے چینی و بے کلی ان کی شخصیت اور شعری میں نمایاں نظر آتی ہے۔خاندانی اثرات کے ساتھ ساتھ میرؔ پر حالات اور واقعات جو ان کی زندگی میں گزرے کے اثرات بھی ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔ میرؔ کے مطابق 'ان کے دادا نے فوج میں ملازمت اختیار کی لیکن وہ جلد ہی ہندوستان کے شہر گوالیار جاکر انتقال کرگئے'۔ میرؔ کے والد محمد علی 'علی متقی' کے نام سے معروف تھے وہ اپنے اس خطاب کی مناسبت سے پرہیزگار، متقی اور درویش صفت انسان تھے۔ میرؔ کا کہنا ہے کہ ان کے والد روز و شب یادالٰہی میں مصروف رہا کرتے۔قدرت کا نظام بھی خوب ہے کہ باپ درویش، متقی و پرہیزگار اور بیٹا بلا کا غزل گو۔
میر تقی میرؔ اکبر آباد میں 1722ء میں پیدا ہوئے۔ تحقیق کے بعد میرؔ کی پیدائش کا یہی سال سامنے آیا۔ میرؔ کا خاندان مالی اعتبار سے مستحکم نہ

تھا بلکہ غربت کا دور دورہ ہی رہا۔ میرؔ نے بھی غربت ہی دیکھی۔ میرؔ کی ابتدائی تربیت اپنے درویش صفت والد کی زیر سایہ ہوئی لیکن وہ تو دنیا سے دور کی دنیا کے مکین تھے۔ میرؔ سات سال کی عمر میں سید امان اللہ کے سپرد کر دئے گئے جنہیں میرؔ نے 'عم بزرگوار' لکھا ہے۔ بہت جلد میرؔ اپنے والد اور اپنے ان بزرگوار سے محروم ہو گئے۔ اب میرؔ کی نجی زندگی مشکلات و مصائب کا شکار ہو گئی، سوتیلے بھائیوں نے میرؔ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا۔ میرؔ کا یہ دور غربت، تنگ دستی، افلاس کا دور تھا۔ میرؔ میں اپنے والد کی ایک خصوصیت خود داری بھی تھی۔ وہ انتہا درجہ کے خود دار واقع ہوئے تھے۔ تلاش معاش کے سلسلے میں شہر شہر نگر نگر گئے، اس وقت میرؔ صرف دس برس کے تھے۔ آگرہ میں کوشش کی کہ معاش کا کوئی ذریعہ بن جائے لیکن ناکامی ہوئی مجبوراً دلی کا رخ کیا۔ یہاں بھی میرؔ کو پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ حد سے زیادہ پریشانی، بے بسی، غربت نے گویا میرؔ کو چاروں جانب سے گھیر لیا تھا۔ دوبارہ آگرہ چلے گئے لیکن پھر مجبور ہو کر دلی واپس آ گئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزوؔ کے یہاں رہنے لگے۔ یہاں بھی میرؔ کی مشکلات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہی ہو گئیں۔ یعنی خاندانی مصائب نے بھی گھیرا تنگ کر دیا۔ انسان مسلسل پریشانیوں اور مشکلات میں گھرا رہے تو وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔ شکر ہے کہ میرؔ نے اپنے آپ کو ذہنی دباؤ سے محفوظ رکھا، میرؔ کے خاندان میں ذہنی مریض ہونے کے آثار پائے جاتے تھے، ان کے

چچا ذہنی طور پر مفلوج تھے۔ حالات کے ہاتھوں میرؔ مجنوں ضرور ہو گئے تھے، تنگ آ کر اپنے خاندان کے احباب سے لا تعلق ہو گئے اور دلی میں معاش کی غرض سے کئی جگہ ملازمتیں بھی کیں۔ان حالات میں بھی شاعری جاری رہی۔ اپنے درد و غم کا ذکر میرؔ نے اپنے اس شعر میں بھرپور طریقے سے کیا ہے ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اب وہ دور آ چکا تھا کہ میرؔ کی شاعری نے اپنا سکہ جما لیا تھا، ہر جانب میرؔ کی غزل گوئی کے چرچے عام تھے۔ دوسری جانب دلی کے حالات ابتری کی جانب رواں دواں تھے، مغلیہ سلطنت روبہ انحطاط تھی، ابدالیوں نے دلی پر حملہ کرکے اس کا حال برا کر دیا تھا، مرہٹوں نے انتشار کی فضاء پیدا کی، روہیلوں نے مظالم در مظالم کرکے ظلم کی تاریخ رقم کر دی تھی، نادر شاہ دلی پر حملہ آور ہوا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ، اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے رہی سہی کسر پوری کرکے دلی کو تاراج کر لیا، دلی کو خوب لوٹا گیا، سارا نظام درہم برہم کر دیا گیا، یہی وقت تھا جب دلی کے اجڑنے کی داستان رقم ہوئی۔ 1857 ء کے غدر نے مغلیہ سلطنت کے ساتھ قدیم تہذیب و تمدن کی بساط الٹ کر رکھ دی۔اس طرح درانیوں، ابدالیوں، مرھٹوں، جاٹوں اور روھیلوں نے یکے بعد دیگرے دلی کو خوب خوب لوٹا اور قتل و غارت گری سے دلی کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا۔ یہاں تک

کے مغل حکمراں انگریزوں کے ملازم بن کر رہ گئے۔ میرؔ دلی کی کاہش پذیری کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ وہ ایک حساس دل لیے ہوئے تھے ان واقعات سے الگ تھلگ کیسے رہ سکتے تھے۔ دلی کے اجڑنے کی داستان رقم کی۔ میرؔ نے کہا۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں
تھا کل تک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دلی کے ابتر حالات نے وہاں کے باسیوں کو دلبرداشتہ کردیا تھا، شاعروں کی اکثریت نے دلی سے لکھنؤ کا رخ کیا۔ میر تقی میرؔ نے بھی دلی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کیا۔ میرؔ شاعر کی حیثیت سے اپنی شہرت کا ڈنکا بجوا چکے تھے۔ نواب وزیر الملک آصف الدولہ بہادر نے میرؔ کو لکھنؤ بلوا بھیجا۔ میر نے بھی اس پیش کش کو غنیمت جانا اور دلی کو چھوڑ لکھنؤ جا بسے۔ اس وقت میرؔ ساٹھ کے ہو چکے تھے۔ یہاں آکر اطمینان کا سانس لیا اور پھر لکھنؤ سے واپس مڑ کر نہ دیکھا۔ گو وہ لکھنؤ میں اداس ضرور تھے لیکن اس کے باوجود لکھنؤ کو اپنی آخری پناہ گاہ و آرام گاہ بھی بنا لیا اور زندگی کے اختتام تک لکھنؤ ہی کو آباد کیے رکھا۔ وہ لکھنؤ گئے تو اپنی دلی کیفیت اور اداسی کا اظہار کچھ اس طرح کیا۔

لکھنؤ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میرؔ کی سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

دبستانِ دہلی کا اپنا رنگ ہے، دہلی اسکول آف اردو غزل کی وسعت اور اثرات اردو شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں گے۔دبستانِ دلی کی شاعری داخلیت پسندی کے گرد گھومتی ہے جس میں سوز وگداز، درد مندی، غم والم، تصوف، حسن و جمال، احساساتِ حسن، خوبصورت تشبیہات، شگفتگی وترنم،خلوص، سادگی، صداقت،خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔دبستان دہلی نے میر تقی میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، میر حسن، داغؔ دہلوی، بیخودؔ دہلوی اور بے شمار عظیم شاعر پیدا کیے۔ میرؔ کا انداز اور شاعری سب سے جدا، گفتگو کا انداز مختلف اور سخن نرالا ہے، جس کا اعتراف خود میرؔ نے اس شعر میں کیا۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جُدا ہے

ایک اور جگہ اپنی بات کے مستند ہونے اور سارے زمانے میں بلند و بالا ہونے کا فخریہ انداز اس طرح سے کیا۔

سارے عَالم پر ہوں مَیں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دلی اور لکھنؤ شاعروں کے شہر تھے، اردو کی ترویج وترقی کے شہر، ادیبوں

اور دانشوروں کا منبع و مرکز، اردو تہذیب و تمدن کے گڑھ تصور کیے جاتے تھے۔
ہندوستان کی تاریخ میں لکھنؤ کے شعرا اپنے نام کے ساتھ لکھنوی اور دہلی یا دلی کے
'شعرا اپنے نام کے ساتھ دہلوی فخریہ طور پر لگایا کرتے تھے۔ 'دہلی
اور' لکھنؤ' شعرا کی پہچان تھا۔ دہلی اجڑی تو لکھنؤ میں اردو کے چرچے تیز ہوئے۔ کسی
شاعر نے لکھنؤ کے حوالے سے کہا۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

میرؔ نے 'ذکر میر' کے علاوہ ایک کتابچہ 'فیضِ میر' کے عنوان سے لکھا۔ یہ کتابچہ میرؔ کے مذہبی عقائد و خیالات کا پتا دیتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی بعض مختلف قسم کی دلچسپیوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مورخین نے میرؔ کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کی اہمیت و ضرورت کو بنیاد قرار دیا ہے۔ اردو تذکرہ نگاری میں بھی میر تقی میرؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ میرؔ نے اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا جو 1751ء میں منظر عام پر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تذکرے میں ستر یا بہتر (70-72) معروف و غیر معروف شعراء کا تذکرہ ہے۔ ہر شاعر کی شخصیت اور اس کا منتخب کلام ساتھ ہی اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ تذکرہ اس دور کے شعراء کے

تذکرے کے ساتھ ساتھ اس میں خود میر تقی میرؔ کی شخصیت اور اس دور کے شاعرانہ ماحول کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔

میرؔ بنیادی طور پر شاعرانہ مزاج رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام عمر شعر و شاعری کی دنیا میں بسر کی ۔ اسی کے سہارے زندہ رہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے اہم سرمایہ یہی ان کی شاعری ہی ہے۔ وہ اپنی شاعری کو درد غم کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی شاعری ہنگامہ اور اس ہنگامہ خیز شاعری نے شاعری کے ماحول میں ھلچل بھی بپا کی۔ اردو غزل کے اس شاعر نے تمام عمر غزل سرائی کی ۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنے اس شعر میں اس طرح کیا۔

کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ و بے گہ غزل سرائی ہے

میرؔ کی شاعری احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کے گرد گھومتی ہے ۔ زندگی میں جن حادثات و واقعات سے وہ دوچار ہوئے ۔ اگر وہ نہ ہوئے ہوتے۔ ان کے دل پر پتھروں سے وار نہ کیے جاتے۔ وہ غموں سے چور چور نہ ہوئے ہوتے۔ وہ اپنوں اور پرائیوں کی بے اعتنائیوں کا شکار نہ ہوئے ہوتے۔ انہیں در در کی ٹھوکرے کھانے کو نہ ملتیں۔ غربت اور افلاس کی چکی سے نہ گزرے ہوتے۔ ان کے جذبات کو پاؤں تلے نہ روندا گیا ہوتا۔ دلی سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دلی کے چکر نہ

لگانے پڑتے، ان کی خواہشوں کا، آرزوؤں کا خون نہ ہوا ہوتا تو وہ میر تقی سے میرؔ نہ بنتے۔ میر نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہے۔ انہیں عربی کے علاوہ فارسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ میرؔ جب کبر سنی کو پہنچے تو انہوں نے اپنی شعری کیفیت کا حال اپنے اس شعر بیان کیا ۔

لُطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میرؔ
اَب شعر ہم پڑھیں ہیں تو وُہ شد و مد نہیں

غزل گوئی میں میرؔ کی بلندی کو اب تک کوئی نہ چھو سکا۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرؔ کے کلام سے چند اشعار ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں ، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیمارئ دل نے آخر کام تمام کیا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے ، اگر خدا لایا

فقیرانہ آئے ، صدا کر چلے

میاں خوش رہو، ہم دعا کر چلے
ہنستے ہو روتے دیکھ کر ہم سے
چھیڑ رکھی ہے تم نے کیا ہم سے
میرؔ صاحب، زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
سو ظُلم اُٹھائے تو کبھی دور سے دیکھا
ہر گز نہ ہوا یہ کہ ہمیں پاس بُلالے
چپکے سے آجاتے ہو آنکھیں بَھر بَھر لاتے ہو
میرؔ گُزری کیا ہے دل پر کُڑھا کرو ہو اکثر تم
ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
پیدا کہاں ہیں ایسے پر گندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی
رفتہ رفتہ اُس پری کے عشِق میں
رفتہ رفتہ میرؔ سا دانا دِوانہ ہوگیا
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
آئے ہیں میرؔ مُنھ کو بنائے جِفا سے آج

شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج
عِشق و محبت کیا جانو میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں میرے دِل کو کوئی کھاتا ہے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو
کل وُہ تشریف یاں بھی لائے تھے
پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے
، سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ
کِس بھروسے پہ آشنائی کی
پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
یہ زمانہ نہیں اَیسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو بُرا اپنا بھلا کرتے ہیں
بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کے اِس کارگہ شیشہ گری کا

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی
کیا پتنگے نے اِلتماس کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رُو رُو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صُبح ہُوئی آرام کیا

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
نادان یہاں کِسو کا کِسو کو بھی غم ہوا

شعلہ بھڑک اٹھا مِرے اِس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ضعیف العمر افراد کا عالمی دن: یکم اکتوبر

(International Day of Older Persons)

(1st October)

اقوام متحدہ کی جانب سے یکم اکتوبر ضعیف العمر افراد کا عالمی دن قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ دن International Day of Older Persons کو عزت واحترام دینے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ پاکستان میں ضعیف لوگوں کے لیے ”بزرگ شہریوں“ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ 14 دسمبر 1990ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی قرارداد نمبر 106/45 کے ذریعہ یکم اکتوبر کو ضعیف العمر افراد کا عالمی دن قرار دیا۔ پاکستان سمیت دنیا کے تمام ممالک اس دن ضعیف العمر افراد کا عالمی دن مناتے ہیں۔

معاشرہ کی بہتری، ملکی ترقی، دنیا کو بہتری کی جانب لے جانے کے لیے ہر سطح پر مختلف النوع اقدامات کیے جارہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے بعد مسائل اور شخصیات کے حوالے سے عالمی سطح پر دن، ہفتہ، سال اور دس سال (دیہائی) کا انتخاب کیا، اس کا بنیادی مقصد عالمی سطح کے مسائل اور issues جن میں اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے دلچسپی رکھتے تھے کو اجاگر کرنا تھا۔

شخصیات کو ان کی حیثیت اور اہمیت کے اعتبار سے خراج تحسین پیش کرنا تھا۔اقوام متحدہ کے بعض ذیلی اداروں نے اپنے پروگرام کے مطابق بعض مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے مخصوص دنوں کو مقرر کرلیا جیسے عالمی ادارہ صحت WHO نے صحت کا عالمی دن، گردوں کا عالمی دن، دل کا عالمی دن، ٹی بی کا عالمی دن، World No-Tobacco Day وغیرہ کے انعقاد کی بنیاد رکھی۔اسی طرح یونیسکو نے بھی بعض موضوعات کو اجاگر کرنے اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف دنوں کا انتخاب کیا اور اس دن اس موضوع کی مناسبت سے سیمینار، ورکشاپ، کانفرنسیز اور نمائش کا اہتمام کیا جانے لگا۔

جیسے 'پانی کا عالمی دن'، عالمی لٹریسی ڈے'، عالمی ماحولیاتی ڈے'،،مادری زبان کا عالمی دن، کتاب کا عالمی دن وغیرہ شخصیات کے حوالے سے ماں کا عالمی دن، باپ کا عالمی دن اور اسی طرح یکم اکتوبر کو دنیا بھر کے ضعیف العمر لوگوں کا عالمی دن (International Day of Older Persons) قرار دیا گیا۔اس کا مقصد دنیا بھر میں ضعیف العمر افراد کو مختلف اداروں میں سہولتوں کی فراہمی کی غرض سے علیحدہ کاؤنٹر تشکیل دے کر انہیں سہولیات فراہم کرنا تا تھا۔

معاشرہ کے ایسے افراد جو اپنی عمر کے 60 سال پورے کر چکے ہوں انہیں خصوصی توجہ اوران کی مشکلات کو ترجیحی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرنا۔ضعیف العمر افراد ہر ملک کا اہم حصہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی اہم ہوتا ہے۔

خیال کیا جارہا ہے کہ آئندہ 2030ء تک دنیا میں ایسے افراد کی تعداد 1.4 بلین ہو جائے گی۔ چنانچہ اتنی بڑی تعداد جو اپنی عمر کا بہترین حصہ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے پیشے، اپنے اہل و عیال اور خاندان کو دے چکے ہوتے ہیں اس بات کے مستحق ہیں کہ اب وہ معاشرہ جسے فعال بنانے میں وہ اپنا کردار ادا چکے ہوتے ہیں معاشرہ انہیں وہ کچھ واپس کرے جس کے وہ مستحق ہیں۔

اس سال کے لیے جو موضوع منتخب کیا گیا ہے وہ ہے ""Sustainability and Age Inclusiveness in the Urban Environment". اس موضوع پر دنیا بھر کے ممالک میں سیمینار، لیکچر، کانفرنسیز اور دیگر آگاہی کے پروگرام تشکیل دیے جائیں گے۔ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے کہ جہاں یکم اکتوبر کو بزرگ شہریوں کے عالمی دن کے حوالے سے مختلف پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ اخبارات میں اس موضوع پر خاص مضامین شائع ہوتے ہیں، ریڈیو اور ٹی وی بھی اس دن بزرگ شہریوں کے حوالے سے خصوصی پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔

مغربی دنیا عمر رسیدہ لوگوں کو old persons کہتی ہے۔اس کے معنی تو ضعیف العمر لوگ ہی ہیں ۔ اسلامی دنیا انہیں 'بزرگ شہریوں' کے نام سے پکارتی ہے۔ مغربی ممالک میں ضعیف العمر لوگوں کے لیے زندگی گزارنے کا ایک الگ طریقہ کار ہے۔ وہ ان کی سہولتوں، آسائشوں کے لیے بے شمار طریقے اختیار کرتے ہیں

لیکن ''اولڈ ہاؤسیس'' کا تصور مغربی دنیا کے لیے مخصوص ہے۔ ان اولڈ ہاؤسیس میں ضعیف العمر خواتین و حضرات اپنی زندگی گزارتے ہیں۔اسلام نے رشتوں کو احترام دیا، انہیں عزت دی، ان کی وقعت اور بلندی و مرتبے میں اضافہ کیا۔ اسلامی معاشرہ میں گھر کا بزرگ جیسے جیسے عمر کے بلند حصہ پر پہنچتا ہے اس کی عزت واحترام میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے اب ہمارے ملک میں بھی ایدھی ہوم اور دیگر لاورثوں کے ادارے مغرب کے اولڈ ہاؤسیز کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ان اداروں میں لاورثوں کے علاوہ ایسے ضعیف العمر افراد بھی موجود ہوتے ہیں جنہیں ان کی اولاد نے سہارا دینے سے انکار کر دیا ہوتا ہے۔ لیکن ایسے افراد تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں ابھی صورت حال بہت بہتر اور بزرگوں کی عزت واحترام پایا جاتا ہے۔

ماں باپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے ماں باپ ہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمانوں کے ماں باپ بھی بزرگ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو نبی ﷺ نے کسی دوسرے کے ماں باپ کو برا بھلا کہنے کو بھی منع فرمایا۔ ماں باپ ہماری دوزخ بھی ہیں اور ہماری جنت بھی ہیں۔ وہ اس طرح کہ اگر ہم اپنے ماں یا باپ کی خدمت کریں گے ، ان کا خیال رکھیں گے، ان کی راحت رسانی کا ذریعہ بنیں گے تو ہم جنت کے حق دار ہو سکتے ہیں اگر ہمارا عمل اس کے برعکس ہو گا یعنی ماں باپ کی نافرمانی کریں گے اور انہیں ایذا رسانی کا باعث ہوں گے تو ہمارے مقدر میں دوزخ کے سوا کچھ

بھی نہیں ہوگا جیسا کہ آج کل ہمارے معاشرہ میں ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض لوگ دنیاوی معاملات، اپنی مصروفیات یعنی شوہر اور بیوی دونوں ملازم، اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کی خاطر اور دیگر کئی وجوہات کے باعث اپنی ماں یا باپ کا حق اس طور ادا نہیں کرتے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ آپ اپنی اولاد کو بہتر مستقبل دینا چاہتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے آپ اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر بیرون ملک ڈالر، ریال یا دینار کی چمک میں کھو جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کے ماں باپ بھی آپ کا بہتر مستقبل ہی چاہتے تھے۔ بہتر مستقبل کی سوچ آپ کے اندر آپ کے والدین سے ہی آئی۔ اپنے بچوں کو بہتر مستقبل ضرور دیں لیکن اپنے والدین کی قیمت پر نہیں۔ انہیں ان کا بھی حق دیں۔ ان کا اتنا ہی خیال رکھیں جتنا آپ اپنی اولاد کا رکھتے ہیں۔ ''معارِف الحدیث'' کے مصنف مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے صحیح مسلم کی حدیث نقل کی ہے ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی ذلیل ہو' وہ خوار ہو' وہ رسوا ہو۔ عرض کیا گیا' یا رسول اللہ ﷺ کون؟ (یعنی کس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے) (آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ بدنصیب جو ماں باپ کو یا دونوں میں کسی ایک ہی کو بڑھاپے کی حالت میں پائے پھر (ان کی خدمت اور ان کا دل خوش کرکے) جنت حاصل نہ کرے''۔ ماں اور باپ میں ماں کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں جس کے پیروں تلے جنت رکھ دی گئی ہو

اس بزرگی کا مرتبہ سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ ایک اور حدیث سے ماں باپ کے علاوہ دیگر قریبی رشتہ داروں اور پھر ان کے قریبی رشتہ داروں جو بزرگی کے مرتبے پر فائز ہیں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ مجھ پر خدمت اور حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری ماں، پھر میں کہتا ہوں تمہاری ماں، تمہاری ماں، اس کے بعد تمہارے باپ کا حق ہے، اس کے بعد جو تمہارے قریبی رشتہ دار ہوں، پھر جو ان کے بعد قریبی رشتہ دار ہوں''۔ اس حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں ہمارے والدین کے علاوہ ان کے قریبی رشتہ دار بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبد الحہ نے اپنی کتاب ''اُسوۂ رسُول اکرم'' میں لکھا ہے کہ والد کے دوست جو یقینا بزرگی کی مرتبے پر ہی ہوتے ہیں کا خیال رکھنے کے بارے میں الادب المفرد کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی کہ ''رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے باپ کے دوست کا خیال رکھو، اس سے قطع تعلق نہ کرو (ایسا نہ ہو کہ اس کی دوستی قطع کرنے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ تمہارا نور بجھا دے''۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث صحیح بخاری و سیرۃ النبیؐ میں یہ بنان کی گئی ہے ارشاد فرمایا: آپؐ نے کہ ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے، عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کوئی اپنے ماں باپ پر کیوں کر

لعنت بھیج سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، اس طرح کہ جب کوئی کسی کے ماں باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو بُرا بھَلا کہے گا''۔

بوڑے شخص کی تعظیم کے حوالے سے ترمذی و مشکواۃ کی حدیث ہے جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کے سبب تعظیم و تکریم کی اللہ تعالی اس کے بڑھاپے کے لیے ایسے شخص مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم و تکیرم کرے گا''۔

پاکستان میں بزرگ شہریوں کو سہولیات فراہم کرنے کے زبانی دعوے بہت کیے جاتے ہیں لیکن عمل صفر نظر آتا ہے۔ بزرگ شہریوں کو قانونی طور پر سہولیات کی فراہمی کے لیے بیشتر ممالک میں قانون موجود ہے لیکن پاکستان دنیا کا شاید واحد ملک ہے جہاں زبانی جمع خرچ زیادہ، عمل نا ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ تاہم خیبر پختونخواہ حکومت نے بزرگ شہریوں کو قانونی طور پر سہولیات کی فراہمی کے لیے قانونی تحفظ فراہم کرنے میں پہل کی ہے۔ خیبر پختونخواہ کی صوبائی اسمبلی نے 19 نومبر 2014ء کو 'خیبر پختونخواہ سینئر سٹیزن ایکٹ 2014' منظور کیا۔ یہ بل The Khyber Pakhtun Khyber Khwa Senior Act 2014 کہلاتا ہے، یہ

ہے۔ یہ ایکٹ خیبر پختونخواہ حکومت کے Pakhtunkhwa Act XIV of 2014 میں 2 دسمبر 2014ء کو شائع ہوا۔ دیگر صوبے اور (Govt. Gazette) گزیٹ مرکزی حکومت کی جانب اس موضوع پر کسی بھی قسم کی قانونی پیش رفت نظر نہیں آتی۔ پاکستان میں قائم Senior Citizens Foundation Pakistan (SCFP) اس حوالے سے سرگرم عمل ہے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک خبر نامہ بھی شائع ہوتا ہے جس میں فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ ضرورت اس عمل کی ہے کہ سینئر شہریوں کو سہولتوں کی فراہمی کے لیے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس حوالے سے حسب ذیل شفارشات پیش کی جارہی ہیں۔

ا۔بزرگوں (ضعیف العمر) افراد کو مختلف شعبوں میں سہولیات کی فراہمی کے لیے خیبر پختونخواہ حکومت کی پیروی کرتے ہوئے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔

۲۔بزرگ شہریوں کو دیگر لوگوں کے ساتھ لائن میں لگانے کے بجائے ان کے لیے علیحدہ سے کاؤنٹر کا انتظام کیا جائے۔ جہاں پر محض بورڈ آویزاں نہ ہوں جیسے کراچی ائر پورٹ پر پاسپورٹ پر اسٹیمپنگ کے لیے بورڈ تو آویزاں ہیں کہ 'بزرگ شہریوں کے لیے' لیکن وہ کاؤنٹر دیگر لوگوں سے کھچا کھچ بھرے نظر آتے ہیں جب کہ اے ایس ایف کے اہل کار بڑی تعداد میں گھومتے نظر آتے ہیں۔

۳۔ ہوائی جہاز، ریل اور عام بسوں میں سفر کی صورت میں بزرگ شہریوں سے آدھا کرایا وصول کیا جائے۔

۴۔ پولس اہل کاروں کو ہدایت ہو کہ وہ جب کسی بزرگ شہری کو سڑک عبور کرتے

دیکھیں تو وہ ان کی رہنمائی کریں۔

۵۔ بنکوں، ڈاک خانوں، وصولیابی کے کاؤنٹر پر بزرگ شہریوں کی علیحدہ سے لائن کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ پینشن کی وصولی کے طریقہ کار کو آسان تر بنایا جائے۔ پیشن کے لیے طویل فارم کی جگہ مختصر فارم تشکیل دیا جائے۔

۷۔ پیشن کی ادائیگی صرف نیشنل بنک آف پاکستان تک ہی محدود نہ ہو بلکہ تمام کمرشل بنکوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ بھی پینشن کی ادئیگی کر سکیں۔

۸۔ نیشنل سیونگ کی اسکیموں میں بزرگ شہریوں کے لیے جاری کردہ بہبود سیونگ سرٹیفیکیٹ اور پینشن اکاؤنٹ کا شرح منافع آج سے چار سال قبل کی سطح پر تھا وہی کیا جائے۔ سالانہ بجٹ میں ان سکیموں پر شرح منافع کم نہ کیا جائے۔

۹۔ نیشنل سیونگ سینٹرز میں ریکارڈ کو کمپیوٹرائز تو کردیا گیا ہے اس کے باوجود طریقہ کار طویل ہے جس کے باعث سینٹرز میں لمبی لمبی لائینیں لگ جاتی ہیں۔ نیشنل بنک کی طرز پر سیونگ سینٹرز کا منافع برائے راست سرٹیفیکیٹ ہولڈر کے بنک اکاؤنٹ میں چلا جائے۔

۱۰۔ بعض ضعیف العمر افراد اپنی یادداشت اور ضعیفی کے باعث پینشن بک یا سیونگ سرٹیفیکیٹ کھودیتے ہیں۔ ڈپلیکیٹ دستاویزات کی فراہمی کا طریقہ کار آسان بنایا جائے اور اس کی فراہمی جلد از جلد ممکن بنائی جائے۔

۱۱۔ بعض ضعیف العمر افراد اپنے ہاتھوں میں راشے کے باعث چیک پر دستخط مشکل

سے کر پاتے ہیں، اکثر بنک کے اہل کار اور سیونگ سینٹر کے اہل کار انہیں پریشانی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس مشکل کا کوئی حل نکالا جائے۔

۱۲۔ اولڈ ایج بینیفٹ کا دائرہ تمام سینئر سٹیزن تک وسیع کیا جائے۔ اس وقت مخصوص افراد ہی اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

۱۳۔ نیشنل سیونگ ،پینشن یا اولڈ ایج بینیفٹ کے ذریعہ ضعیف العمر افراد کو انشورنس کی سہولت فراہم کی جائے۔

۱۴۔ ضعیف العمر افراد کے لیے ہر یونین کونسل، یونین کمیٹی کی سطح پر ریڈنگ روم اور لائبریری تشکیل دی جائے۔

فرزندِ اقبال (جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال) کا سانحہ ارتحال

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا کون چاہنے والا نہیں۔ ادب سے وابستہ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے اقبال کو نہ پڑھا ہو۔ میں کافی دیر سے کوشش میں تھا کہ علامہ اقبال پر مضمون تحریر کرکے محسنِ انسانیت، معمارِ قوم، تخلیق پاکستان کا خواب دیکھنے والے، شاعرِ مشرق، نثر نگار، سیاسی بصیرت رکھنے والے، ریاست کا فلسفہ دینے والے، نوجوانوں میں بیداری کا تصور پیدا کرنے والے اور اسلام کے بہترین شارح کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں اپنے آپ کو بھی شامل کر لو۔ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے اقبال کا یوم پیدائش جو آئندہ ماہ 9 نومبر کو آرہا ہے کا انتخاب کیا اور ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا تھا۔ خیال تھا کہ اس وقت تک مکمل کر لوں گا کہ اچانک فرزندِ اقبال جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی خبر نے دل کو دھلا دیا وہ 3 اکتوبر 2015ء کو عالم فانی سے عالم جاودانی میں چلے گئے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ علامہ اقبال کے بیٹے تھے لیکن وہ از خود بے بہا خوبیوں، صلاحیتوں کے مالک تھے۔
انہوں نے اپنی زندگی میں کسی لمحہ، کسی موقع پر اس بات کا فائدہ نہیں اٹھایا کہ وہ ایک عظیم شخصیت کے فرزند ہیں۔ انہوں نے قانون و انصاف کی بالا دستی اور علم و فضل میں جو مقام

حاصل کیا اپنے زورِ بازو پر کیا، اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں کی بنیاد پر کیا اور اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت سے حاصل کیا۔ وہ چاہتے تو بہت پہلے اپنے والدِ محترم کے حوالے سے بہت کچھ اور بہت بہتر حاصل کر سکتے تھے۔ وہ خود دار، ذہین اور بے بہا صلاحیتوں کے مالک بھی تھے۔

5 اکتوبر کو ان کی 91 ویں سالگرہ تھی، وہ اسپتال میں زیر علاج تھے، خواہش رہی ہوگی کہ وہ اپنے گھر جا کر اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اپنی سالگرہ منائیں گے لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ انسان سوچتا کچھ ہے، منصوبے کچھ بناتا ہے ہوتا وہ ہے جو مالکِ کائینات نے اس کے لیے لکھ دیا ہوتا ہے۔ قدرت نے یہ دن اور تاریخ ان کی سالگرہ کے بجائے ان کی دنیاوی زندگی کا اختتامی دن لکھا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال شاعر مشرق کی بڑھاپے کی اولاد تھے، ساتھ ہی مرادوں اور منتوں کے نتیجہ میں انہیں ملے تھے۔ اولادِ نرینہ کی خواہش لیے علامہ اقبال سرہند تشریف لے گئے اور شیخ احمد (حضرت مجدد الف ثانی) کے مزار پر منت مانی، یہ بھی التجا کی اگر ان کی مراد پوری ہوئی اور اللہ پاک نے انہیں بیٹا عطا کیا تو وہ اسے لے کر اسی جگہ حاضر ہوں گے۔ کہتے ہیں انسان کی زندگی میں بعض گھڑیاں قبولیت کی ہوتی ہیں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور جاوید اقبال کی صورت میں بیٹا عطا کر دیا تو علامہ اپنے اس بیٹے کو سرہند مجدد الف ثانی کے مزار پر لے کر گئے، اس واقعہ کا ذکر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے

اپنی کتاب 'زندہ رُود' میں کیا ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے حالات زندگی پر ایک مستند تحقیقی تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے جاوید علامہ اقبال کے چھیتے اور لاڈلے بھی تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے قمر الاسلام کو 'جاوید اقبال' بنا دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو گئے۔اپنے چہیتے بیٹے کے لیے علامہ اقبال نے ایسی نظم کہی جو بظاہر توخطاب جاوید اقبال سے تھا لیکن یہ خطاب محض جاوید اقبال سے نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے نوجوانوں سے ہے۔ علامہ نے اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

علامہ اقبال کے اس فرزند نے حقِ فرزندگی خوب نبھایا، باپ نے جو نصیحت کی اس نے اس پر عمل کیا اور اپنا ایک الگ مقام بنایا، اس نے خودی کا سودا نہیں کیا بلکہ اپنی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق نام پیدا کیا۔ اقبال نے اپنے چھیتے بیٹے کے لیے یہ نظم ہی نہیں کہی بلکہ اپنی ایک کتاب کا عنوان ہی "جاوید نامہ" رکھا۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ابتداء میں وکالت کرتے رہے پھر جج

کا عہدہ قبول کر لیا اور اسی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمات کی۔ قانون کے علاوہ اسلامی تاریخ، سیاسیات، فلسفہ اور علامہ اقبال ان کے خاص موضوعات تھے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں اپنی تمام تر صلاحیتیں تصنیف وتالیف میں صرف کیں اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں اپنی سوانح حیات 'اپنا گریباں چاک'، 'افکار اقبال'، 'نظریہ ، 'پاکستان'، 'اسلام میں ریاست کا تصور'، "اسلام اور پاکستان'، 'قائدِ اعظم کا ورثہ Legacy of Quaid-e-Azam (1968, published in English and Urdu)، '1984، زندہ رُود (تین جلدیں، '،) 'Ideogy of Pakistan (1959)'، Stray Reflections: A Note-Book of Iqbal (1961)، Mai Lala Faam (1968, Collection of papers on Iqbal, in Urdu)، انہوں نے 'خطبات اقبال' کے تحت اقبال پر قابل ذکر تحقیقی کام کیا، Pakistan and the Islamic Liberal Movement (1994). '، جہان جاوید' شامل ہیں۔

پاکستان میں ہونے والے 1970 کے انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ فرزندِ اقبال نے لاہور سے کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے مردِ مقابل ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ نتیجہ وہی ہوا جو نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پورے ملک میں جئے بھٹو، سدا جئے کی صدائیں گلی گلی کوچے کوچے میں گونج رہی تھیں۔ معمولی سے معمولی شخص جس کو

بھٹو نے ٹکٹ دیا، جیت اس کا مقدر بنی۔ بڑی بڑی معروف سیاسی شخصیات اس انتخاب میں بھٹو کے سامنے ڈھیر ہو گئیں۔ ان میں فرزندِ اقبال بھی تھے۔ اگر بھٹو صاحب ایک سیٹ مفکرِ پاکستان کے بیٹے کا خیال کرتے ہوئے فرزندِ اقبال کی نذر کر دیتے تو پارٹی کی اہمیت ییں یا انتخابی عمل میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ ان کی توقیر میں اضافہ ہی ہونا تھا لیکن ہمارے ہاں ایسی کوئی روایت پائی نہیں جاتی۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے ایوب خان کے ہاتھوں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا حال دیکھا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں مادر ملت تھیں لیکن پھر بھی ایوب خان کا گلاب کا پھول بازی لے گیا۔ ایوب خان کا انجام کیا ہوا، گلی گلی کیا نعرے لگے، اقتدار کا نشہ ہوتا ہی کچھ عجیب ہے۔ مادر ملت کی شکست کے بارے میں جسٹس جاوید اقبال کا کہنا تھا کہ 'اگر ایوب خان کے دور میں دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی الیکشن میں شکست نہ دی جاتی تو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ بنتا'۔ یہ بات حامد میر نے اپنے کالم میں لکھی ہے۔ انتخابات میں شکست دینے کے بعد بھٹو صاحب نے جسٹس جاوید اقبال کو اپنے سیاسی قافلے میں شامل ہو جانے کی ترغیب دی لیکن فرزندِ اقبال کو یہ گوارا نہ ہوا البتہ چیف جسٹس انوار الحق کی دعوت پر جج بننا قبول کر لیا اور وہ وکیل سے جج بن گئے اور تمام زندگی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بھٹو صاحب سے پہلے بھی فرزندِ اقبال کو اقتدار میں شامل کرنے کی دعوت دی جاتی رہی۔ اسکندر مرزا اور ایوب خان بھی جسٹس جاوید اقبال

کو اپنے اقتدار میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے تھے لیکن جسٹس جاوید اقبال نے ان کی پیش کش کو قبول نہ کیا۔ یحییٰ خان نے بھی جسٹس جاوید اقبال کو انتخابات میں اہم ذمہ داری سونپنے کی پیش کش کی جسے انھوں نے قبول نہ کیا۔ نواز شریف کے دور میں ان کا نام نگراں وزیراعظم کے طور پر تجویز کیا گیا لیکن اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان فرزندِ اقبال کو یہ عہدہ دینے پر تیار نہ ہوئے۔ نواز شریف صاحب نے اُس وقت فرزندِ اقبال کو نگراں وزیر اعظم بنانے کی شفارش تو کر دی کیوں کہ اس وقت یہ معاملہ ان کے کلی اختیار میں نہیں تھا۔ اب جب کہ پاکستان کے صدر کا انتخاب سامنے آیا اور کلی اختیار بھی ہاتھ میں تھا تو فرزندِ اقبال نظر نہیں آئے۔ یہاں مصلحت سامنے آ گئی۔ یہی ہمارے ملک کی سیاست ہے۔ بھٹو سے الیکشن ہارنے اور جج بن جانے کے بعد فرزندِ اقبال نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ جسٹس کی حیثیت سے جو خدمت ہو سکی کریں گے اور باقی وقت تصنیف و تالیف میں صرف کریں گے، انھوں نے ایسا ہی کیا۔

بھٹو کی پھانسی کو جسٹس جاوید اقبال درست نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ بھٹو ہی تھے جنھوں نے انہیں قومی اسمبلی کے انتخاب میں شکست دی تھی لیکن وہ با اصول انسان تھے، جسے سچ سمجھتے برملا اظہار کر دیتے جو غلط تصور کرتے بلا خوف اس کا بھی اظہار کر دیا کرتے۔ بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے انھوں نے ایک واقعہ اپنی سوانح حیات 'اپنا گریباں چاک' میں تحریر کیا۔ فرزندِ اقبال پر لکھنے

والے اس واقعہ کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ’ جس رات بھٹو کو پھانسی دی گئی اس رات وہ (جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال) اپنے بیڈ روم میں گہری نیند سو رہے تھے کہ اچانک زوردار کھڑاک سے کمرے کی کھڑکی کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوئے اور دیکھتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو ان کے پلنگ کی پائینتی کی جانب کھڑے ہیں ۔ ان کا جسم لہو لہان ہے اور کپڑے تار تار ۔ پھر مجھے کہتے ہیں ’دیکھو انہوں نے میرا کیا حال کیا ہے‘۔ یہ کہہ کر وہ (بھٹو صاحب) غائب ہوجاتے ہیں اور میں (جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال) فورناً ٹائم نوٹ کرتا ہوں۔ طلوع آفتاب بھٹو کی پھانسی کی خبر لاتا ہے۔ میں بھٹو کی پھانسی کا وقت معلوم کرکے اپنے لکھے ہوئے وقت سے موازنہ کرتا ہوں تو یہ وہی وقت تھا جب اسے پھانسی چڑھایا گیا‘۔ کالم نگار، تاریخ داں ڈاکٹر صفدر محمود کا کہنا ہے کہ ’ انہوں نے فرزندِ اقبال سے جب یہ قصہ سنا تو انہوں نے جسٹس صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یقین ہے کہ یہ خواب نہیں تھا بلکہ آپ نے کھلی آنکھوں سے بھٹو کو دیکھا؟انہوں نے تصدیق کی کہ یہ خواب ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ ایک سچا واقعہ ہے‘۔ ڈاکٹر صفدر محمود کی حیرانی بجا، اور میں بھی اس حوالے سے کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ یہ ایک خواب ہی تھا۔ بھٹو صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی شکت اثرات اور پھر پھانسی کو درست تصور نہ کرنا ان کے ذہن میں بسے ہوئے تھے۔ جو خواب کی صورت میں سامنے آئے۔

خواب کے حوالے سے اپنا ایک ذاتی واقعہ جو خواب ہی تھا بیان کرنا مناسب لگ رہا ہے۔ میں ہمدرد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میرے مقالے کا موضوع شہید حکیم محمد سعید کی کتب اور کتب خانوی خدمات کے حوالے سے تھا۔ میرے تھیسس سپر وائیزر پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری مرحوم تھے۔ میرا کیس بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز میں تھا فیصلہ یہ ہونا تھا کہ مجھے ایم فل سے پی ایچ ڈی میں کنورٹ کردیا جائے اور تھیسس جمع کرانے کی اجازت دی جائے۔اس لیے کہ مَیں اور میرے سپر وائیزر یہ سمجھتے تھے کہ یہ کام ایم فل کا نہیں بلکہ پی ایچ ڈی کی سطح کا ہے۔ میں نے کام بھی اسی اعتبار سے کیا تھا۔ میرے سپر وائیزر جامعہ ہمدرد میں تاحیات پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے یہ مقام و مرتبہ انہیں شہید حکیم محمد سعید نے اپنی زندگی میں ہی سونپا تھا۔ جب کہ بعض سینئر پروفیسرز جو سابق وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز کے رکن تھے، اس مقام و مرتبہ سے محروم تھے۔ وہ بورڈ کی میٹنگ میں میرے معاملے پر کوئی نہ کوئی اعتراض اٹھا دیا کرتے ، جس سے معاملا طول پکڑتا رہا۔ سپر وائیزر کی ہدایت پر میں نے اپنا مقالہ بھی جمع کرادیا، معاملہ بیچ مجھدار میں اٹک کر رہ گیا اس صورت حال نے دو سال گزردیے میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا، میرے سپر وائیزر بھی مسلسل تگ و دو میں رہتے ، ایک مرحلے پر وہ بھی بد دل ہوگئے اور مجھ سے کہا کہ مجھے مشکل نظر آرہا ہے آپ اپنے مقالے کو کتابی صورت میں چھپوادیجئے ۔ میں بھی خاموش ہورہا، ایک دن خواب میں دیکھتا

ہوں کہ شہید حکیم محمد سعید میرے گھر تشریف لاتے ہیں، وہ اور میں ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں، سامنے ریک پر میرا مقالہ رکھا ہوا رہتا تھا اس جانب وہ اشارہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ کتاب میں لیے جارہا ہوں اسے ہمدرد سے ہی چھپوا دونگا، آپ فکر نہ کریں۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس خواب کو چند دن ہی گزرے تھے کہ میرے سپروائیزر نے مجھے فون کیا اور کہا کہ مبارک ہو بورڈ آف ایڈوانس اسٹیڈیز نے آپ کے مقالے کو ایم فل سے پی ایچ ڈی میں کنورٹ کرنے اور جمع کرانے کی منظوری دیدی ہے۔ مقالہ جمع ہی تھا، ضروری کاروائی ہوئی اور کچھ عرصہ بعد ہندوستان سے رپورٹ مثبت آئیں اور وائے وا کے بعد مجھے ڈگری بھی مل گئی، شہید حکیم محمد سعید کا میرے گھر آنا، میری مشکل اور پریشانی کے حل کی جانب اشارہ یقیناً ایک خواب ہی تھا، ان سے میرے اس قسم کے مراسم ہر گز نہ تھے۔ البتہ میں ذہنی طور پر میں ان سے متاثر تھا، ان دنوں پریشان بھی تھا، اسی ذہنی کیفیت کا نتیجہ یہ خواب تھا۔ بات فرزندِ اقبال کے پاس بھٹو صاحب کے آنے کی تھی، انہوں نے اس واقعہ کو خواب نہیں کہا اور سچا واقعہ قرار دیا بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ اس پر بحث یہاں مناسب نہیں۔

جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے بعض نظریات اور خیالات سے اختلاف بھی کیا گیا۔ کیونکہ وہ از خود کہا کرتے تھے کہ ’ وہ مذہبی سے زیادہ ثقافتی مسلمان ہیں‘۔ بقول حامد میر سوشلسٹ دانشور انہیں اسلام پسند اور مولوی حضرات انہیں ملحد

قرار دیا کرتے تھے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں وہ صاف گو حد سے زیادہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھنا اور دوسروں کو محسوس کرانا چاہتے تھے۔ بعض لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا کہ وہ یعنی فرزندِ اقبال اپنے والدِ بزرگوار سے سبقت لے جانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی صاف گوئی دیکھیں کہ انہوں نے یہ بات بھی اپنی سوانح عمری میں لکھ دی۔ ساتھ ہی یہ دلیل بھی دی کہ علامہ اقبال نے ہمیں یہی ترغیب دی کہ کسی صاحب فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے راستے سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔ وہ تقلید کی بجائے اجتہاد کے قائل تھے۔ اس موضوع پر بھی احباب کا ان سے اختلاف ہوا، جس کا انہوں
نے دلائل کے ساتھ جواب دیا۔ ان کا مطالعہ گہرا، نظر دور رس اور مشاہدہ و مطالعہ وسیع تھا۔

فرزندِ اقبال پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں 5 اکتوبر 1924 کو پیدا ہوئے، ان کی والدہ سردار بیگم علامہ اقبال کی دوسری شریکِ حیات تھیں۔ اقبال کی پہلی شادی کریم بی بی سے 4 مئی 1893 کو ہوئی، ان کا تعلق گجرات کے صاحب حیثیت خاندان سے تھا ان کے والد شیخ عطا محمد کو برطانوی حکومت نے 'خان بہادر' کا خطاب دیا تھا، دوسری شادی میں سردار بیگم سے ہوئی۔ جاوید ابھی 11 برس کے تھے 1913

کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ جاوید اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے 1944 میں بی اے
آنرز) کیا، پنجاب ہی سے انگریزی اور فلاسفی میں ایم اے کی سند حاصل کی، 1954)
میں کیمرج یونیورسٹی لندن سے فلاسفی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ بیرسٹر ایٹ لا
کی ڈگری لنکولنز ان لندن سے 1956 میں حاصل کی۔ جسٹس جاوید اقبال کو
Villanova University اورSeicuk Universityنے ڈاکٹریٹ کی اعزازی
ڈگری بھی عطا کی۔ اپنے والد کے پیشے کو اپناتے ہوئے انہوں نے وکالت شروع کی، پھر
جج ہوگئے، چیف جسٹس بھی رہے، سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج بھی ہوئے۔ سینٹ
کے رکن بھی رہے۔ اپنی ہم پیشہ خاتون جسٹس ناصرہ اقبال سے رشتہ ازدواج میں منسلک
ہوئے۔ اپنی زندگی کی 91 بہاریں دیکھنے کے بعد 3 اکتوبر 2015 کو اس دنیائے فانی سے
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کرگئے، شہر لاہور جہاں ان کے والد علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مدفن
(ہیں فرزندِ اقبال نے بھی اِسی سرزمین کو اپنی ابدی آرام گاہ بنایا۔(7 اکتوبر 2015

قومی اسمبلی 122 کانٹے کا مقابلہ۔ معرکہ کیا سبق دے گیا

آخر کار قوم اعصاب شکن صورت حال سے نکل آئی، این اے 122 لاہور کا معرکہ نون لیگ نے اپنے سر کر لیا۔ کپتان کی جماعت تحریک انصاف صرف چار ہزار ووٹوں سے شکست سے دو چار ہوئی۔ لاہور کے اس حلقہ میں دونوں سیاسی جماعتوں کے درمیان جو صورت حال پیدا ہو چکی تھی، سیاست اپنے عروج پر تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ضمنی الیکشن نہیں بلکہ جنرل الیکشن ہو رہے ہیں۔ صورت حال اس نہج کو پہنچ چکی تھی کہ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا تھا کہ فتح کس کا مقدر ہو گی۔ مقابلہ برابر برابر چل رہا تھا، ایک سیر تو دوسرا سوا سیر، ایک گالی دیتا تو دوسرا اس سے بڑی گالی ۔ پتھر کا جواب اینٹ سے دیا جا رہا تھا۔ انتخابی مہم اس طرح چلی کہ جیسے مقابلہ ایاز صادق اور علیم خان کے درمیان نہیں بلکہ یہ مقابلہ میاں نواز شریف اور عمران خان کے درمیان ہو رہا ہے۔ اب جب کہ غیر حتمی نتائج سامنے آ گئے، مقابلے کو کانٹے کا مقابلہ کہا جا سکتا ہے۔ جیت تو ایک ووٹ سے بھی ہوتی ہے لیکن موجودہ صورت حال میں چند ہزار کی جیت کو واضح اکثریت نہیں کہا جا سکتا۔ نون لیگ نے سرکاری مشینری کے استعمال کے ساتھ برتری ضرور حاصل کر لی ہے لیکن یہ جیت بہت سے سوال لے کر سامنے آئی ہے۔ اس جیت نے پاکستانی عوام کو ایک نئی سوچ دی ہے۔ ہوا کا رخ

بدلتا محسوس کیا ہے، دوسری جانب نون لیگ کے لیے بھی لمحہ فکر ساتھ لائی ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ پاکستان پیپلز پارٹی جو وفاق کی علامت تھی پنجاب میں تیسرے نمبر پر پہنچ چکی ہے۔ کہیں نون لیگ بھی اسی سمت تو نہیں جا رہی۔

پاکستان کی انتخابی تاریخ میں کسی ضمنی انتخاب نے اس طرح پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کہ ہر جانب این اے 122 کی بازگشت ہو، ریڈیو، ٹی وی کا ہر چینل اور اخبارات میں کپتان اور نون لیگ کی ایک دوسرے پر سیاسی سنگ باری کے علاوہ کچھ اور نہ ہو۔برقی میڈیا پر ہونے والے سیاسی ٹاک شو دنگل کا سماں پیش کر رہے ہوں۔ اس ضمنی انتخاب نے کم از کم دونوں جماعتوں کے اصلی چہرے عوام کے سامنے لا کھڑے کیے کہ اگر انہیں اپنی شکست نظر آنے لگے تو یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کہاں تک جا سکتے ہیں۔ اس صورت حال میں ہر قسم کی اخلاقیات ، شرافت، دیانت ، لحاظ مروت ان سے کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ انہیں صرف ٹی وی اسکرین پر آنے، مخالف کے لیے سخت سے سخت زبان استعمال کرنے ، غیر اخلاقی جملے اور الفاظ ہی یاد رہتے ہیں۔ اس مقابلے میں دونوں فریق اس قدر آگے نکل گئے کہ شرافت کی تمام حدود کو پامال کردیا۔ خراب سے خراب، گندے سے گندہ لفظ جو ممکن ہو سکتا تھا ایک دوسرے کے لیے استعمال کیا گیا۔ عمران خان کے ساتھ شیخ صاحب نے بھی جلتی پر تیلی کا کام کیا۔ البتہ اس حوالے سے

دو رائے نہیں کہ اس خراب کلچر کی ابتدا پی ٹی آئی کی جانب سے کی گئی۔ کسی نے کہا کہ جو زبان عمران خان اور شیخ صاحب نے استعمال کی اس کے جواب میں عابد شیر علی ہی پورے اترتے تھے اور وہ پورے اترے۔ سعد رفیق بھی کسی سے پیچھے نہیں، پرویز رشید کا تو کام ہی بادشاہ سلامت پر اٹھنے والی ہر انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا ہے۔ادھر عمران خان نے جلسہ میں کچھ کہا ادھر وزیر اطلاعات نے پریس کانفرنس میں جواب شکوہ بیان کر دیا۔نون لیگ نے بھی اخلاقیات کی تمام حدود پار کرلیں۔حالانکہ حکومتی جماعت کو بہت احتیاط اور محتاط رہنا چاہیے ہوتا ہے۔ شکست اور فتح آنی جانی چیزیں ہیں، انسان بھی دنیا میں نہیں رہتا اگر رہ جاتی ہے تو اس کی شرافت ، اخلاق، اس کا کردار باقی رہ جاتا ہے۔ سیاست میں ہار جیت کو اپنی انا کا مسئلہ ہر گز نہیں بنانا چاہیے، 122 میں تحریک انصاف اور نون لیگ نے ہار جیت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ہر ہر حربہ، ہتھیار، طریقہ استعمال کیا گیا۔ تجزیہ نگاروں نے اسے امیروں کا الیکشن قرار دیا، کہا گیا کہ ووٹروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے دونوں جاب سے تجوریوں کے منہ کھول دیئے گئے، موٹر سائیکلیں تقسیم کی گئیں۔کیا دولت کا بے دریغ استعمال نواز شریف کو اور عمران خان کو نظر نہیں آیا؟ کیا یہ بات ان کے علم نہیں کے ان کے گھوڑے اپنے ساتھ دولت کے تھیلے لیے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ایاز صادق صاحب جیت گئے اور وہ دوبارہ اسمبلی کے اسپیکر بھی بن جائیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا وہ تحریک انصاف کے اراکین کو

اسمبلی سے نکال باہر نہیں کریں گے، اگر وہ ہار جاتے تو کیا قیامت آ جاتی، علیم خان نے وزیراعظم تو بن نہیں جانا تھا۔ سیاست کو سیاست ہی رہنا چاہیے اسے دشمنی میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔

کپتان نے اپنے انتخابی جلسوں اور پریس کانفرنسیز میں میاں صاحب کو ان کی جماعت کو آڑے ہاتھوں لیا ان پر جائز و ناجائز الزامات لگائے انہیں کرپٹ ترین شخص قرار دیا، خلیجی ریاستوں سے رقم لینے کا الزام لگایا، نندی پور پروجیکٹ کا آڈٹ ایشیائی بنک سے کرانے، کرپشن کے ذریعہ 140 ارب بنانے جیسے الزامات لگائے۔ عمران خان نے میاں صاحب کو جدہ چلے جانے کا طعنہ بھی دیا اور کہا کہ وہ جدہ نہیں بھاگے گے۔ جواب میں پرویز رشید نے کپتان کو غدار قرار دیا تو اس کے جواب میں عمران خان نے کہا کہ غدار وہ ہے جن کا پیسہ باہر پڑا ہے، عمران خان کی جانب سے پنجاب پولس کو نون لیگ کا عسکری ونگ قرار دیا گیا۔ عمران خان کے جواب میں نواز شریف تو اس شدت سے نہیں بولے البتہ ان کے وفادار وزیر اطلاعات نے عمران خان کو چور، غدار، پاکستان دشمن، دشمنوں کا آلہ کار قرار دیا انہوں نے کہا عمران خان نے یہودی اور ہندو لابی سے فنڈ لیے اور وہ فنڈز پارلیمنٹ پر حملے کے لیے استعمال کیے۔ حیرت ہے کے فنڈ لے کر پارلیمنٹ پر حملے کرنے کی کیا ضرورت ہے، حالانکہ پارلیمنٹ پر تو بہت پہلے بغیر فنڈ لیے ہی حملہ کیا جاچکا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ شدید، رکیک اور

بیہودہ، غیر اخلاقی جملے دونوں جانب سے استعمال کیے گئے۔انور شعور نے دونوں جماعتوں کے ایک دوسرے پر الزامات کے حوالے اچھا قطعہ کہا۔

انتخاباتی فریق، الزامات

خود اگر ایک دوسرے پہ دھریں

لائق احترام ہیں دونوں

کیوں نہ دونوں پہ ہم یقین کریں

انتخابی عمل کا نتیجہ آچکا، غیر سرکاری اعلان کے مطابق کپتان کا خفیہ ہتھیار کچھ پیچھے رہ گیا جب کہ میاں صاحب کے گھوڑے نے 'خری وقت میں زور دار چھلانگ لگا کر سبقت حاصل کر لی۔ نون لیگ کے ایاز صادق نے 76204 ووٹ حاصل کیے، جب کہ علیم خان نے 72043 ووٹ حال کیے ، ایاز صادق کو کل 4161 ووٹ کی برتری حاصل ہوئی۔ کیونکہ اصل مقابلہ قومی اسمبلی کی نشست پر تھا اس وجہ سے ہر جگہ ایاز صادق کی فتح کی گونج ہے، ان کی فتح کے شادیانے بج رہے رہے ہیں حالانکہ پی پی 147 میں پی ٹی آئی کے شعیب صدیقی نے 31993 ووٹ لے کر میدان مار لیاان کے مقابلے میں نون لیگ کے محسن لطیف کو 28641 ووٹ ملے۔ پنجاب اسمبلی میں کپتان کی جماعت کو فتح ملی لیکن اس کا کوئی چرچہ نہیں ۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ایاز صادق نون لیگ کے اہم رکن تھے، اسپیکر بھی تھے، ان کا حلقہ ان چار حلقوں میں شامل تھا جن کو کھولنے کی باتیں عمران خان عرضہ دراز سے کر رہے

تھے۔ اسلام آباد کے طویل دھرنے بھی اِسی کا نتیجہ تھے۔ غیر سرکاری نتیجہ سامنے آجانے کے بعد جو بات اچھی نظر آئی وہ یہ ہے کہ تحریکِ انصاف کے چودھری سرور، جہانگیر ترین اور علیم خان نے پریس کانفرنس کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ن لیگ نے ریاستی مشینری سے ضمنی الیکشن جیتا، تحفظات کے ساتھ نتائج کو تسلیم کرتے ہیں۔ نتائج کو تسلیم کرلینا ہی پاکستان کے لیے، پاکستانی عوام کے لیے، جمہوریت کے لیے اور حکومت کے لیے بھی نیک شگون ہے۔ نون لیگ کو اس کامیابی پر خوشیاں تو منالینی چاہیے لیکن یہ جیت جیت نہیں بلکہ خطرہ کی گھنٹی ہے اسے ہوشیار ہوجانا چاہیے، اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کر لینے چاہیے، جو غلطیاں ہوچکی سو ہوچکیں، آئندہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ کپتان کی سیاست ایک سمندر ہے جس کی لہریں ملکی سیاست میں سرائیت کرچکی ہیں، جس طرح بیڈ گورنس نے پاکستان پیپلز پارٹی کو میدان سے باہر کیا، آج ان کی جو صورت ہے کہی کل نون لیگ بھی اس کے ساتھ نہ کھڑی ہو۔ تحریکِ انصاف سے کچھ غلطیاں ہوئیں، اگر علیم خان کی جگہ کوئی اور صاف ستھرا، الزامارت سے پاک، ان کی اپنی پارٹی میں پسند کیا جانے والا امیدوار ہوتا تو ایاز صادق میدان سے باہر ہوتے۔ نہ معلوم کپتان کو علیم خان میں کیا خوبیاں نظر آئیں کہ انہوں نے سب اچھوں کو چھوڑ کر اس شخص کا انتخاب کیا اور اسے اپنا خفیہ ہتھیار بھی قرار دیا۔ افسوس یہ خفیہ ہتھایار بھی کام نہ آسکا۔ اگر ایاز صادق کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہوتی، وزیرِاعظم صاحب کا اور خود ایاز صادق

کے لیے انتخابی مہم کے اختتام کے بعد الیکشن مہم میں شریک ہونا، چھوٹے میاں صاحب اور ان کی صوبائی سرکار کا انتخابی مہم میں حصہ لینا، مرکزی سرکار کے کئی وزیروں ، قومی و صوبائی اسمبلی کے اراکین کا انتخابی مہم میں کردار ادا کرنا، سعد رفیق کا ریلوے کالونی میں جاکر ورکروں کو نون لیگ کی حمایت کے لیے آمادہ کرنا، ترقیاتی منصوبوں کا اعلان کرنا، جنہیں الیکشن کمیشن نے ہی بے ضابطہ قرار دے دیا، سابق سیکریٹری الیکشن کمیشن کنور دلشاد نے بھی ترقیاتی منصوبے کا اس موقع پر اعلان کرنے کو خلاف قانون قرار دیا۔ اس تمام تر برتری کے باوجود تحریک انصاف کے امیدوار کو صرف چند ہزار کی شکست کوئی شکست نہیں۔ یہ تو دراصل تحریک انصاف کی فتح ہے۔ صوبائی حلقے میں تحریک انصاف کے امیدوار کی کامیاب کو کیا نام دیا جائے گا۔ اس کی کامیابی کا کوئی ذکر ہی نہیں کررہا، نون لیگ اگر اس حلقہ سے کامیاب ہوئی تو دو حلقوں سے اسے شکست بھی ہوئی۔ اوکاڑہ میں آزاد امیدوار ریاض الحق نے 83240 ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی۔ یہاں نون لیگ کو اور تحریک انصاف کو شکست ہوئی۔ اس طرح دیکھا جائے تو نون لیگ کا گراف دراصل نیچے آیا ہے۔ اسے سنجیدگی کے ساتھ نتائج پر سوچنا ہوگا۔ دونوں سیاسی جماعتوں نے اپنا پورا فوکس ایاز صادق اور علیم خان کے انتخاب پر کیا، رہی صحیح کسر میڈیا نے پوری کردی، ضمنی الیکشن کی ہایپ کریٹ کرنے میں برقی میڈیا نے اہم کردا رادا کیا۔ یہ ضمنی انتخاب ملک کی اہم سیاسی جماعتوں کو یہ سبق دے کر گیا ہے کہ اب بھی وقت ہے سیاست

کو سیاست ہی رہنے دیا جائے۔ اسے امیروں کا کھیل نہ بنایا جائے ۔ دوسرے یہ کہ خدا
را اخلاقیات کی حدود کو پار نہ کریں، ای دوسرے کو غدار، پاکستان دشمن کہنے کی روش
کو بدلیں۔ ہمارے ملک کی کوئی بھی سیاسی جماعت پاکستان دشمن نہیں، کوئی بھی سیاسی
کارکن غدار نہیں سب محبِ وطن ہیں۔ تمام سیاسی جماعتیں پاکستان کی وفا دار ہیں،
پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں پاکستان سے پیار ہے، محبت ہے یہ
ہمارا وطن ہے اس کے ایک ایک زرہ سے ہمیں محبت ہے ہم سب اسے پھلتا پھولتا دیکھنا
چاہتے
ہیں۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔ (12 اکتوبر 2015، E-mail:

drraissamdani@yahoo.com)

سانحہ منیٰ: نہایت افسوس ناک لیکن غیر ضروری تنقید مناسب نہیں

حج ستمبر 2015ء ذی الحجہ 1436 عالم اسلام اور حج کی سعادت حاصل کرنے والوں کو غم زدہ، مَلُول و رنجیدہ کرگیا۔ ۱۱ ستمبر کو مسجد الحرام میں کرین کا افسوس ناک سانحہ ہوا۔ جس میں 111 افراد شہید اور 238 سے زیادہ شدید زخمی ہوئے ۔ ان میں 52 پاکستانی بھی شامل تھے۔ دوسرا واقعہ سانحہ منیٰ ہے جو مناسکِ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں رمی وجمراء اولیٰ (چھوٹے درمیانے.بڑے شیاطین) کو کنکریاں مارنے کے عمل کے دوران بھگدڑ مچ جانے سے سینکڑوں کی تعداد میں حجاج ایک دوسرے کے نیچے دب جانے اور پاؤں تلے کچلے جانے سے جاں بحق ہوگئے۔ یہ واقعہ 'سانحہ منیٰ' 2015ء جب کہ اس قبل ہونے والا واقعہ 'سانحہ حرم شریف' کے نام سے تاریخ میں ہمیشہ دکھ کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ دونوں واقعات انتہائی افسوس ناک اور پورے عالم اسلام کو غم زدہ کرگئے۔

سانحہ منیٰ کوئی پہلا واقعہ نہیں۔ اس سے قبل اس قسم کے اور بھی واقعات ہوچکے ہیں۔ مسلمانوں کے مجمع میں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے.بڑے اجتماعات میں جن میں عیسائی اور ہندو خاص طور پر شامل ہیں ۔ بھگدڑ مچ جانے کے نتیجے

حادثات رونما ہو چکے ہیں اور سینکڑوں قیمتی جانیں جا چکی ہیں۔ منیٰ کے حوالے سے 19 اپریل 1998ء کو شیطان کو کنکریاں مارنے کے دوران بھگدڑ مچ جانے سے 118 عازمینِ حجاج جان بحق ہوئے تھے۔ اس کے بعد 12 جنوری 2006ء کو منیٰ ہی کے مقام پر بھگدڑ مچ جانے سے کم سے کم 364 حجاج اکرم جان بحق ہوئے۔ پاکستان کے سوشل میڈیا اور بعد میں ایک دو نجی چینل پر موجودہ واقعہ کی جو فوٹیج دکھائیں یہ فوٹیج اسی کے واقعہ کی ہیں موجودہ واقعہ کا ان فوٹیج سے کوئی تعلق نہیں۔ منیٰ میں ہونے 2006 والا یہ تیسرا اہم واقعہ ہے۔ ان کے علاوہ دیگر واقعات سعودی عرب میں بھی ہوئے اسی حج کے موقع پر خانہ کعبہ کے صحن میں کرین گرنے کا واقعہ رونما ہوا۔ دیگر غیر، مسلموں کے اجتماعات میں بھی اس قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ بھارت میں ہندوؤں کے مندروں سے ہندوں کی واپسی پر متعدد واقعات ہوئے، گھانا میں اسٹیڈیم میں بھگدڑ کا واقعہ رونما ہوا، بغداد میں 2005ء میں 1000 سے زائد شیعہ زائرین خود کش حملے کی افواہ کے بعد بھگدڑ مچ جانے اور دریائے دجلہ میں ڈوب جانے سے جان بحق ہو گئے تھے۔ اسی طرح کمبوڈیا میں 2010ء میں پانی کے سالانہ میلے کے دوران دریا پر واقع پل پر بھگدڑ مچ جانے سے 375 سے زائد افراد جاں بحق ہو گئے تھے۔ دنیا بھر میں اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں، سعودی عرب میں بھی اس قسم کے واقعات کا ہو جانا غیر معمولی نہیں۔ البتہ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر ہمیں انتظامی معاملات میں کسی بھی قسم کی کوتاہی، خامی، غلطی، تساہلی نظر آئے تو یہ باتیں جواز

فراہم کرتی ہیں اس بات کی کہ ہم انتظامیہ کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔ اس ملک پر تنقید کریں۔ یہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، سعودی حکومتیں حاجیوں، عمرہ ادا کرنے کے لیے جانے والوں کے لیے جو عمدہ سے عمدہ اقدامات و انتظامات مسلسل کر رہی ہیں ان سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سعودی از خود اس مسئلہ کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ محض واقعہ رونما ہو جانا اس بات کا جواز پیدا نہیں کرتا کہ کوئی یہ کہہ دے کہ سعودی عرب مکہ و مدینہ کے ان اجتماعات کے انعقاد سے دستبردار ہو جائے۔ سعودی شاہ سلمان بن عبدالعزیز نے درست طور پر حج انتظامات سے دسبرداری کے مطالبے کو مسترد کیا۔ سعودی شہزادے ترکی الفیصل نے ایک اسلامی ملک کی جانب سے سانحہ منیٰ پر تنقید کو بلاجواز قرار دیا اور کہا کہ وہ حج و عمرہ کے انتظامات کے حوالے سے اپنا استحقاق یا خادمین حرمین شریفین کا امتیاز نہیں جانے دیں گے۔ اس قسم کی تنقید اور رائے کسی بھی طور مناسب نہیں۔ ایران کے صدر حسن روحانی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں اپنی متعینہ تقریر سے ہٹ کر منیٰ میں بھگدڑ کے واقعہ کے اسباب جاننے اور اس سال حج کے دوران پیش آنے والے واقعات کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اسی ملک کے ایک قانون دان ابرہیم رئیسی نے بھی شدید تنقید کی۔ کیوں کہ ہمارا یہ اسلامی ملک عرصہ دراز سے سعودع عرب کے حوالے سے پرخاش رکھتا ہے اس لیے ان کے بیانات کو اسی تناظر میں لیا گیا۔ کل کو اگر کوئی واقعہ پاکستان میں ہو جائے اور یہاں تو ہوتے ہی رہتے ہیں تو کیا ہمارے

ہمسائے بھی اسی قسم کا مطالبہ کریں گے ؟ یا پاکستان کسی بھی ملک میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات جن میں بے شمار بے گناہ ہلاک کردیے جائیں یہ مطابہ کردے کہ اس علاقہ کو کسی اور کے انتظام میں دے دیا جائے۔ اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے مسلمانوں کا اتحاد اور یک جہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ آپس کے باہمی تعلقات میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان ممالک کو تو اس قسم کی صورت حال میں ایک دوسرے کی مدد و معاون ہونا چاہیے۔ خانہ کعبہ ، مطاف ، مکہ المکرمہ ، مدینہ منورہ وہاں کی سڑکوں ، پلوں ، راہداریوں اور وہاں کے نظام کا جائزہ لیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ، ہوجاتا ہے کہ ماضی میں یہاں کیا صورت حال تھی اور اب یہاں کی کیا صورت حال ہے۔ سعودی عرب اس واقع کی تحقیقات کر رہا ہے امید ہے صحیح صورت حال جلد واضع ہوجائے گی۔

مَیں نے تاحال حج کی سعادت تو حاصل نہیں کی لیکن 2012 ء کے بعد سے تقریباً سال میں دو بار سعودی عرب جانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، میں نے ان مقامات کا تفصیلی دورہ کیا ہے، زیارت کی اور ان کا بغور مطالعہ و جائزہ بھی لیا جہاں مناسکِ حج کے ارکان ادا کیے جاتے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر میرے علیحدہ علیحدہ مضامین بھی شائع ہوچکے ہیں۔ میں نے مسجد نمرہ (حج کے موقع پر جہاں سے خطبہَ حج دیا جاتا ہے)کے کوریڈور میں نفل ادا کیے ہیں، منیٰ، عرفات ، مزدلفہ کے میدانوں کو قریب سے دیکھا ہے، خالی خیموں کو جی بھر کے دیکھا

ریل کا نظام میری نظروں کے سامنے ہے، تمام راہ دریاں میری نظروں کے سامنے ہیں انتہائی کشادہ، صاف شفاف، چھوٹے، بڑے شیطانوں کو کنکریاں مارنے کی جگہ کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ حج کے موقع پر اس قدر وسیع مجمع ہوتا ہے کہ بڑی بڑی راہ داریاں، کشادہ سڑکیں بھی تنگ پڑ جاتی ہیں۔ یہ واقعہ بھی اس وجہ سے وقوع پذیر ہوا کہ منیٰ کی خیمہ بستیوں سے دو مختلف راہداریوں سے آنے والے حاجیوں کے دو بڑے ریلے تنگ مقام پر آپس میں ٹکراگئے، جس کے نتیجے میں بھگدڑ مچ گئی۔ حاجیوں کا یہ ٹکراؤ جمرات چھوٹے درمیانے بڑے شیطان) کے بڑے ہال تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے وسیع و) عریض علاقے اور کثیر تعداد میں حاجیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت مکہ میں گرمی بھی انتہا کی تھی کہا جاتا ہے کہ درجہ حرارت 45 سینٹی گریڈ تک پہ پہچا ہوا تھا۔ حاجی پہلے ہی تھکے ماندہ تھے، نقاہت بھی تاری تھی، جلد شیطان کو کنکریاں مار کر مکہ المکرمہ پہنچنا چاہتے تھے تاکہ طواف کر کے اپنے ہوٹل پہنچیں اور آرام کریں۔ جلد بازی ہی ایک وجہ اس حادثہ کی رہی۔ بھگدڑ کی صورت میں، گرمی اور دیگر عوامل نے حاجیوں کو جب ایک کے اوپر ایک کر دیا، جو حاجی گرا اس کو اٹھنے کی مہلت ہی نہ ملی یا وہ اٹھنے کی سکت ہی کھو بیٹھا جس کے نتیجے میں اس کا دم گھٹ گیا، بے شمار حاجی اپنے ہی ساتھی حاجی کے قدموں تلے دب پر اپنی جان کھو بیٹھے۔ دھکم پیل اس قدر شدید تھی اور حاجی تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ جب انہوں نے واپس جانے والی کشادہ سڑکوں کے علاوہ اوپر سے آنے والے پلوں سے بھی تیزی سے اترے

تو ان کی طاقت نے درمیانے جنگلے کی دیوار کو بھی توڑ دیا، اس کا مقصد اپنی جان بچانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوران الجزائریوں کے کیمپ کے اندر شارٹ سرکٹ بھی ہوا اور ایک خیمہ بھی جل گیا۔ وہاں بھی بھگدڑ مچی اسٹریٹ 204 تک کئی کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے اس بھگدڑ میں زیادہ پاکستانی کچلے گئے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

پاکستان کے وفاقی وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف قبلہ پاکستانی حاجیوں کی سربراہی، نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے حاجیوں کے ساتھ ہی تھے۔ جو اب واپس تشریف لا چکے ہیں۔ وہ پاکستانی شہدا حاجیوں کی تدفین اور لاپتہ حاجیوں کی تلاش میں پریشان حال رہے۔ انہوں نے روزنہ جنگ میں ایک مضمون ''سانحہ منیٰ۔تازہ ترین صورت حال'' (شائع شدہ 5 اکتوبر 2015) میں واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ وزیر موصوف کا کام صرف حاجیوں کی رہنمائی کرنا ہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے از خود بھی فریضہ حج ادا کیا۔ یقیناً یہ ان کا پہلا حج نہیں ہوگا۔ پچھلے سال بھی وہ اسی منصب پر تھے اور مکہ تشریف بھی لے گئے تھے، حج بھی کیا ہوگا۔ پاکستان سے بے شمار والنٹیئر حاجیوں کی خدمات کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت 'پرچی' والی ہوتی ہے۔ چند خدمت گزاروں کو میں جانتا ہوں ان سے گفتگو بھی ہوئی۔ حاجیوں کی خدمت پر مفت میں جانے والوں کے لیے پرچی کا نظام رائج ہے جس کے پاس جس قدر بڑی پرچی ہو گی وہ مفت میں

حاجیوں کا والنٹیئر بن کا چلا جائے گا، گویا یہ مفت میں حج کرنے کی پرچی ہے۔ جس قسم کی یہ خدمت کرتے ہیں اس کا اس بات سے باخوبی اندازہ کایا جاسکتا ہے کہ ان خدمت گزاروں کے سربراہ وزیر موصوف ہی تو تھے، انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ''ہم اس روز علی الصبح رمی جمراء اولیٰ سے فارغ ہو کر پیدل ہی سوئے حرم چل پڑے تھے، حرم شریف میں پہنچ کر طواف زیارت میں مصروف تھے کہ منیٰ سے اس سانحے کی خبر بجلی بن کر گری''۔ یعنی خدمات اعلیٰ صاحب کو پاکستانی حاجیوں کی فکر نہیں وہ صبح ہی صبح پہلی فرصت میں شیطان مردود سے فارغ ہو کر مکہ پہنچ گئے، ان کے بقول یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری لیکن وہ بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ کر سکی۔ گری بھی بچارے حاجیوں پر۔ انہوں نے سانحہ کی کئی وجوہات تحریر کی ہیں۔ یہ سب اچھی طرح سے جانتے

ہیں۔انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ حکومت کو چاہیے کہ مفت خور حاجی جو خدمت گزاری کی پرچی کسی نہ کسی طرح حاصل کرکے حج کرتے ہیں کے نظام کا جائزہ لے ان کو اگر مفت میں بھیجنا ہی ہے تو انہیں حاجیوں کی خدمات اور دیکھ بھال کا پابند بنایا جائے، حج کرنے پر پابندی عائد کردی جائے۔ وزیر موصوف اگر اس پر عمل کریں گے تو دیگر ان کے ہمراہ جانے والے خدمت گزار بھی ایسا کریں گے۔وزیر موصوف نے پاکستان واپس پہنچ کر سینٹ میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی جسے ایوان نے یکسر مسترد کردیا، حتیٰ کہ اپوزیشن نے علامتی واک آوٹ بھی کیا۔ سردار صاحب نے سینٹ کو بتایا کہ منیٰ حادثہ میں 99 پاکستانی شہید ہوئے، جن میں سے 70 کی

تدفین کردی گئی ہے باقی 29 کے بارے میں سعودی حکومت نے نہیں بتایا۔ 18 لاپتہ ہیں، 2 زیر علاج ہیں۔ سردار صاحب نے حکومت کی جانب سے سانحہ منٰی کے شہدا کے لواحقین کو 5 لاکھ روپے امداد دینے کی خبر بھی سنائی، سرکاری رپورٹ کو چیئر میں سینٹ نے کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ رپورٹ غیر بخش ہونے پر اپوزیشن ارکان نے وفاقی وزیر اور حکومت کی کارکردگی پر شدید تنقید کرتے ہوئے اس کو حکومت کی نااہلی قرار دیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ایک سوال کا ذہن میں آنا قدرتی عمل ہے کہ جس جگہ لاکھوں کا مجمع ہو وہاں پر اس قسم کا حادثے کا پیش آجانا ایک سوالیا نشان ضرور ہے؟ لیکن تاریخ میں منیٰ ہی کے مقام پر اس قسم کے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ حادثہ کا سبب سامنے آچکا ہے، سعودی حکام بھی اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس حادثے کے نتیجے میں جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی ہے۔ تمام ممالک کے حاجیوں کی جان قیمتی تھی جو اللہ کو پیارے ہوئے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آئندہ اس قسم کے واقعات نہ ہوں ان کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے، یقیناً سعودی حکومت نے سانحہ منیٰ کے لیے جو تحقیقاتی کمیشن بنایا ہے وہ سانحہ کی وجوہات کے ساتھ ساتھ آئندہ کی روک تھام کے لیے بھی اقدامات تجویز کرے گا۔ سعودی حکومت نے جس طرح سانحہ حرم شریف کے واقعہ کے بعد بعض فوری اقدامات کیے تھے وہ اس واقعہ کے بعد بھی اسی طرح کے

اقدامات کریں گے۔ اس سانحہ پر جس قدر بھی دکھ اور افسوس کیا جائے کم ہے۔ سانحہ منیٰ ہر پورے عالم اسلام کو غمزدہ کرگیا۔ اللہ تعالیٰ تمام شہدا کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے۔ آمین 29) اکتوبر 2015، E-Mail: drraissamdani@yahoo.com)

(حکیم محمد سعید شہید۔ تحقیق کے آئینے میں (قسط۔۱

شہید حکیم محمد سعید کی 17ویں برسی کے موقع پر

(روزنامہ 'جناح'' اسلام آباد، لاہور، کراچی نے اپنی اشاعت 17،18 اکتوبر 2015 کو شائع کیا)

شہید حکیم محمد سعید جنہیں آج سے ۱۷ سال قبل ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو روزہ کی حالت میں شہید کر دیا گیا تھا۔ آپ دنیائے اسلام کی ایک نامور، قابل احترام اور کثیر الجہات شخصیت تھے جن کی خدمات کا دائرہ بے شمار شعبہ ہائے زندگی تک پھیلا ہوا ہے، خاص طور پر معاشرہ کی بہبود اور عالم اسلام کی فلاح، علم و حکمت، طب و سائنس، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تربیت، صحافت، رسائل و جرائد اور اشاعت کتب، عربی زبان کی ترویج و ترقی، کردار و اخلاق کی تعمیر، نونہالوں کی تعلیم و تربیت، تعمیر و استحکام وطن کے علاوہ پاکستان میں لائبریری تحریک اور کتب خانوں کی ترقی و فروغ میں آپ کی خدمات نمایاں، فقید المثال اور دور رس اثرات کی حامل ہیں۔ بقول اسلم لودھی 'آپ کا شمار ان عظیم المرتبت افراد میں ہوتا ہے جن کی زندگی کا بنیادی مقصد خدمت اور تعمیر و ترقی وطن رہا، آپ نے اپنی زندگی میں قومی سطح پر خلوص و شفقت، علم و فضل

اور ایثار و قربانی کے انمٹ نقوش چھوڑے''۔ چیف جسٹس (ر) انوار الحق کے بقول حکیم محمد سعید ایک ایسے انسان تھے جن کے کمالات کے دائرے کا احاطہ کرنے بیٹھیں تو' آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ کوئی اکیلا آدمی اتنے مفید کام بھی کر سکتا ہے، اس وسیع پیمانہ پر'۔

کتاب اور کتب خانہ حکیم محمد سعید کی شناخت ہے جو تاابد آپ کو زندہ وجاوید رکھے گی، اپنی اس شناخت سے آپ کو بے حد عقیدت اور لگاؤ تھا جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب آپ نے شہر علم مدینتہ الحکمہ کے بارے میں اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ تیار کیا تو اس قطعہ اراضی پر کہ جس پر شہر علم بسایا گیا ہے سب سے پہلے پائے تکمیل کو پہنچنے والی عالی شان عمارت لائبریری کی تھی جو بیت الحکمہ کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ اس لائبریری کو بجا طور پر دنیا کی ایک منفرد، مثالی اور ایشیاء کی بڑی لائبریری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ نے اس کتب خانے کا نام بیت الحکمہ رکھا تو آپ کے ذہن میں اسلامی دور کا وہ تاریخی ادارہ بیت الحکمت کا تصور جاگزیں تھا جسے عباسی خلیفہ جعفر المنصور (المتوفی 135ھ۔158 ھ) نے بغداد میں قائم کیا تھا بعد میں خلیفہ ہارون الرشید (المتوفی 170ھ۔ 391ھ) نے اسے ترقی دی۔ گویا آپ کسی بھی تعلیمی ادارے کی اصل روح کا ادراک رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ شہر علم (مدینتہ الحکمہ) کی اصل روح (بیت الحکمہ) کی تخلیق کو اولیت دی گئی

اوربیت الحکمہ کی تعمیر کے بعد دیگر تعلیمی اداروں جن میں اسکول، کالج، یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹس شامل تھے کا قیام عمل میں لایا گیا۔

حکیم محمد سعید ان صاحب فضل و کمال شخصیات میں سے تھے کہ جن کی ضیاء علم و دانش نے بیسویں صدی کو منور اور تابناک بنا دیا۔ آپ کا نقطہ نظر واضح، رائے دو ٹوک اور مصلحت سے پاک تھی، آپ انسان دوست، درد مند معالج، محقق اوردانش ور، تاریخ دان، فروغ تعلیم کے داعی، مدیر مولف و مصنف، اعلیٰ منتظم، اسلامی علوم پر ماہرانہ نظر رکھنے والے، ملکی سیاست کے نباض، حقیقت پر مبنی سوچ و فکر کے حامل اور ایک وضع دارانسان تھے۔ بقول ایس ایم ظفر 'حکیم محمد سعید خون کے آخری قطرہ تک محب وطن تھے'۔ درحقیقت آپ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ رحیم بخش شاہین کے مطابق عام طور پر لوگ سانسوں کی گنتی اور شب و روز کے شمار کو زندگی سمجھتے ہیں جب کہ حکیم' محمد سعید کے نزدیک زندگی سعی پیہم اور جہد مسلسل کا نام ہے'۔

حکیم محمد سعید کے آباؤ اجداد کا تعلق چین کے شہر سنکیانگ سے تھا جہاں سے یہ خاندان سترھویں صدی کے آغاز میں ہجرت کرکے پشاور منتقل ہوا، تقریباً 80 سال بعد اس خاندان نے پشاور سے ملتان ہجرت کی اور 135 برس پنجاب کی سرزمین کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے عشرہ میں آپ کے خاندان کے

افراد نے پنجاب کی سرزمین کو الوداع کہتے ہوئے دہلی ہجرت کی اور حوض قاضی کو اپنا مسکن بنایا۔ 1856ء میں حکیم محمد سعید کے پردادا دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے آپ کے دادا حافظ شیخ رحیم بخش 1864ء اور نانا کریم بخش 1861ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مزاجاً مہم جو واقع ہوئے تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد پیلی بھیت منتقل ہو گئے، وہیں پر حافظ شیخ رحیم بخش کی شادی ہوئی، 1883ء میں حکیم محمد سعید کے والد حافظ حکیم عبدالمجید کی پیدائش ہوئی، 1886ء میں آپ کے چچا حافظ عبدالرشید پیدا ہوئے۔ آٹھ برس پیلی بھیت میں رہنے کے بعد آپ کے دادا دوبارہ دہلی چلے گئے اور حوض قاضی کو از سر نو آباد کیا۔

حکیم محمد سعید 9 جنوری 1920ء (16 ربیع الثانی 1338ھ) کو صبح چار بج کر سترہ منٹ پر ہندوستان کے شہر دہلی کے کوچہ کاشغری، بازار سیتارام میں پیدا ہوئے۔ برصغیر کے معروف عالم دین حضرت مولانا احمد سعید نے آپ کا نام ''محمد سعید'' رکھا۔ سعید کے معنی ہیں 'سعادت، مبارک، بابرکت، نیک، خوبیوں والا، خیر و عافیت والا'۔ آپ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ابھی آپ صرف ڈھائی برس کے تھے کہ آپ اپنے والد حکیم عبدالمجید (ولادت 22 جون 1883ء، بمقام پیلی بھیت۔ وفات 22 جون 1922ء) کے سایہ سے محروم ہو گئے آپ کے والد حافظ قرآن تھے اور ان کا روحانی تعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے تھا۔

1900ء میں حکیم حافظ حاجی عبدالمجید بانی دواخانہ ہمدرد کا نکاح رابعہ بیگم سے ہوا۔ آپ انتہائی نیک، اطاعت اور خدمت گزار، نماز و روزہ کی پابند، پردہ کی پابند، محنتی، وفاشعاراور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ خواجہ حسن نظامیؒ نے آپ کو مادر ہمدرد کا خطاب دیا تھا۔ محترمہ رابعہ بیگم کے انتقال کے بعد خواجہ حسن نظامیؒ نے ان کے احترام میں ایک کتاب بعنوان 'مادر ہمدرد'' لکھی اپنی والدہ کے بارے میں حکیم محمد سعید نے لکھا' میری والدہ نہایت نرم مزاج خاتون تھیں، مگر ساتھ ہی گرم مزاج بھی تھیں۔ ساری زندگی اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ ان کی تربیت کا سارازور اخلاق پر تھا۔ بداخلاقی پر سخت سزا دیتی تھیں' '۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''اگر ان میں یہ عظمتیں نہ ہوتیں تو ابا جان کے انتقال کے بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا' ۔

حکیم محمد سعید کے والد حکیم عبدالمجید ایک مستقل مزاج شخص تھے۔ آپ کو ادویات کے خواص میں خاص دلچسپی تھی۔ شوق اور مہارت کے باعث انھوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ ہندوستانی دواخانے میں ملازمت کرلی۔ اس عرصے میں طب کا مطالعہ بڑی گہرائی اور طب کی متعدد کتابوں کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا۔ آپ کو جڑی بوٹیوں سے گہرا شغف تھا اور ان کی پہچان کا ملکہ حاصل تھا آخر کار انھوں نے نباتات کے میدان میں اترنے کا نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ بیماریوں کی شفاء کے لیے ہندوستان بھر سے جڑی بوٹیاں حاصل کرنے کا

بھی فیصلہ کیا۔ بقول حکیم محمد سعید 'آپ ایک بلند پایہ نبض شناس تھے۔ یعنی جڑی بوٹیوں کے ماہر'۔ حکیم عبدالمجید بڑی محنت سے حکیم اجمل خان کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ انھیں احساس ہوا کہ حکیم اجمل صاحب ان کی دیانت پر شک کرنے لگے ہیں۔ غیرت فطرت نے یہ شبہ برداشت نہ کیا اور اس عظیم انسان نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا۔

۱۹۰۶ء میں اپنے سسر رحیم بخش صاحب سے کچھ پیسے لے کر ہمدرد کی بنیاد ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ جڑی بوٹیوں کی تجارت بھی شروع کی۔ ہمدرد دکان کو چلانے کے لیے حکیم عبدالمجید نے نباتات سے دوائیں بنانا شروع کیں اور ان کی اہلیہ رابعہ بیگم نے ہر مرحلے پر اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔

ہمدرد دواخانے کی پہلی دوائی 'حب مقوی معدہ' تھی۔ رابعہ بیگم اور ان کی بہن فاطمہ بیگم دونوں عبدالمجید صاحب کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور سل بٹے سے نباتات پیس کر ہاتھ سے گولیاں بناتی تھیں۔ حوض قاضی سے ہمدرد کی منتقلی لال کنویں کی ایک دکان میں ہوئی اور جب اس کاروبار میں وسعت پیدا ہوئی تو اس کو لال کنویں سے اس کی ابتدائی جگہ منتقل کرنا پڑا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو اس جگہ سے ہمدرد کے نئے دور کا آغاز ہوا حکیم عبدالمجید کی انتھک محنت اور مستقل مزاجی نے ہمدرد کو نا قابل تسخیر بنا دیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو ہمدرد کا نیا دور شروع ہوا، لیکن افسوس اس نئے دور کی افتتاحی تقریب کے دوران حکیم عبدالمجید علیل تھے اور اس عظیم الشان تقریب میں شرکت نہ کر سکے۔ ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو ۳۹ سال

کی عمر میں آپ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہونے کے لیے ہمدرد کا ایک باب کھلا چھوڑ گئے۔ اس وقت حکیم محمد سعید کی عمر ڈھائی برس تھی، آپ کی پرورش آپ کی والدہ رابعہ بیگم اور آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے کی۔

شہید حکیم محمد سعید کی رسم بسم اللہ ۱۹۲۲ء میں تین برس کی عمر میں ادا ہوئی۔
ہندوستان کے معروف عالم مولانا احمد سعید نے قرآن مجید کی سورۃ خلق کی پہلی آیت پڑھائی۔ اس موقع پر بچوں کی نماز با جماعت کا بھی اہتمام ہوا۔ تقریب کے دولھا نے امامت کے فرائض سرانجام دیے اس طرح آپ بچوں کی جماعت کے امام ہوئے اور نماز عصر پڑھائی۔ تین برس کے حکیم محمد سعید نے جگت چچی کے گھر قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور صرف پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا۔ ''رسم آمین'' کی تقریب کا اہتمام بھی بڑے پروقار طریقے سے ہوا۔ ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کی سعادت حاصل ہو جانے کے بعد آپ کی والدہ نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا بیٹا اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے آپ کو حوض قاضی، اجمیری دروازہ، دہلی کی اونچی مسجد 'مسجد گاڑی بان' میں قائم مدرسہ تعلیم القرآن میں داخل کرا دیا گیا۔ مسجد کے پیش امام حافظ عمر دراز علی نے آپ کو قرآن مجید حفظ کرایا۔ اس وقت حکیم محمد سعید کی عمر نو برس تھی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ

نے اپنی والدہ کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سے قبل آپ چھ برس کی عمر میں پہلا روزہ بھی رکھ چکے تھے۔
حکیم محمد سعید حصول علم سے کبھی غافل نہ ہوئے، دینی تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد آپ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے ماسٹر ممتاز حسین اور ماسٹر اقبال حسین سے حاصل کی جب کہ عربی و فارسی کے استاد قاضی سجاد حسین تھے ۔ قاضی سجاد حسین کا شمار اس وقت ہندوستان کے عربی اور فارسی کے نامور علماء اور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی ہدایت پر آپ نے طب کا خاندانی پیشہ اختیار کرنے اور طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا، ۱۹۳۶ء میں جب کہ آپ کی عمر ۱۴ برس تھی آپ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ آیور ویدک اور یونانی طبیہ کالج دہلی میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے یہاں پر آپ کے اساتذہ حکیم عبدالحفیظ، میجر ظفریاب حسین اور ڈاکٹر اے جی قریشی تھے۔ پاکستان ہجرت کے بعد جب آپ طبیب کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ہمدرد کے فروغ و ترقی کے لیے کوشاں تھے آپ نے محسوس کیا کہ آپ کو انگریزی زبان میں گفتگو کے دوران مشکلات پیش آ رہی ہیں تو آپ نے بلا جھجک انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ انگریزی کے ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ آپ نے لکھا کہ 'انگریزی زبان میں گٹ پٹ کرنے کی مشق کراچی میں کی۔ میری

استاد شفیقہ ائرمارشل میکڈانلڈ، کمانڈر انچیف پاکستان ائر فورس کی اہلیہ تھیں' ۔ اس عمل سے آپ نے ثابت کیا کہ حصول علم میں وقت اور عمر کی قید نہیں۔ انسان عمر کے کسی بھی حصہ میں باقاعدہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ حکیم محمد سعید کی شادی ان کی خالہ زاد محترمہ نعت بیگم سے ۱۹۴۳ء میں دہلی میں ہوئی۔ نعمت بیگم ایک مثالی وفادار صابر و شاکر اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے انھیں ایک ایثار پیشہ خاتون قرار دیا۔ حکیم محمد سعید نے اپنی زندگی کی کہانی میں اپنی شریک حیات کے بارے میں تحریر فرمایا کہ 'اگر ایسی معصوم شریک حیات مجھے نہ ملتیں تو شاید میں وہ سارے کام نہ کر سکتا کہ جو میں نے کر لیے ہیں۔ انھوں نے ہر تکلیف برداشت کرکے میری راحت کو ہر راحت پر مقدم رکھا۔ جب غربت کا دور دورہ تھا تو بھی وہ ثابت قدم رہیں۔ ہم دونوں نے خاموشی سے فاقے بھی کر لیے۔ پھر جب کراچی میں ہمدرد کے قیام کا وقت آیا تو اس عظیم خاتون کے پاس جو زیور تھا وہ سب مجھے دے دیا اور ہمدرد کے قیام میں اس عظمت نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا'۔

حکیم محمد سعید اور محترمہ نعت بیگم کی رفاقت ۳۸ برس پر محیط ہے۔ آپ کی شریک حیات نے ایسا حق رفاقت ادا کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ۱۸ اگست ۱۹۸۱ء دن کے دو بجے اللہ کو پیاری ہوئیں۔ حکیم صاحب کی اولاد میں ایک بیٹی سعدیہ راشد ہیں جو محترم حکیم صاحب کے بعد ہمدرد کے جملہ امور کی نگراں و

سرپرست ہیں۔ حکیم محمد سعید اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید سے بہت متاثر تھے۔ حکیم عبدالحمید کو بھی آپ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ درحقیقت حکیم محمد سعید کی تعلیم و تربیت، سیرت اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں آپ کی والدہ رابعہ بیگم اور آپ کے بڑے بھائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ دونوں کی تربیت نے آپ کو ایک مثالی انسان بنا دیا۔ حکیم صاحب نے اپنی کہانی میں تحریر فرمایا کہ ”میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی جان نے میری تربیت اور محبت کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر دی۔ وہ زندگی کے ہر لمحے میرے سامنے ایک نمونہ بن کر رہے ہیں اور مجھے انھوں نے انسان بنا دیا۔“ ایک اور جگہ آپ نے اعتراف کیا کہ ”میرا رواں رواں ان کا زیر احسان ہے۔“ اپنے بڑے بھائی سے تمام عمر ہدایت و رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ درحقیقت حکیم محمد سعید کی زندگی اپنے بڑے بھائی کا پرتو ہے۔ وہی ان کے آئیڈیل تھے۔ خود ان کے بقول ”زندگی کی ہر دوڑ میں اور سعی و جہد کی ہر منزل میں تتبع حمید سے غافل نہیں رہا۔“ ایک اور جگہ آپ نے لکھا ’میں نے پوری زندگی اپنے بھائی جان محترم کے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کو آج تک ناں نہیں کہا ہے‘۔ حکیم عبدالحمید بھی اپنے چھوٹے بھائی سے بے پناہ محبت کیا کرتے تھے حتیٰ کہ آپ حکیم سعید سے اس حد تک مطمئن تھے کہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ’اگر سرسیدؒ مرحوم مسدس حالی اللہ کے سامنے پیش کریں گے تو میں حکیم سعید کو پیش کر دوں گا‘۔ اگر مبالغہ نہ

سمجھا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی کہ آج پاکستان میں حکیم محمد سعید صاحب کا جو کارنامہ مدینتہ الحکمہ کی شکل میں نظر آتا ہے وہ بھی حکیم عبدالحمید صاحب کی تعلیم و تربیت اور مشوروں کا حاصل ہے' ۔ محترمہ سعدیہ راشد کا کہنا ہے کہ ' ابا جان اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، بہت احترام کرتے تھے۔ نہ جانے وہ انھیں چھوڑ کر کیسے چلے آئے۔ کہیں انھوں نے ضرور لکھا ہوگا۔ یہ پاکستان کا جذبہ تھا اور مسلم لیگ سے ان کی وابستگی جس نے انھیں پاکستان چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ انھیں اپنے بھائی سے بہت محبت تھی اور انھیں چھوڑ کر آنا ان کے لیے یقیناً ایک کٹھن کام تھا۔ میں سمجھتی ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی۔ اللہ کو ان سے اچھے کام کرانے تھے۔ انھوں نے دل و جان سے پاکستان کی خدمت کی، لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کیا' ۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالصتاً مذہبی تھا۔ نماز، روزہ، تلاوت قرآن مجید، بڑوں کا حد درجہ ادب چھوٹوں کا لحاظ اور شفقت کے ساتھ پیش آنا خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس ماحول کا نقشہ حکیم صاحب نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے ۔ ' صبح اٹھے تو محترمہ والدہ صاحبہ کو ہمیشہ ہی جاء نماز پر دیکھا اور سوتے وقت ان کو تلاش کیا تو ان کو جاء نماز پر پایا۔ گھر کا ماحول یہ تھا کہ ہر انسان نمازی تھا۔ ہر شخص حافظ قرآن تھا۔ احترام کا یہ عالم کہ کیا مجال کہ سب سے بڑی بہن کے سامنے زبان کھل جائے۔ والدہ محترمہ اور بھائی کے سامنے ٹوپی کے بغیر جانا مشکل تھا۔ بات کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا تھا

کہ آواز نیچی رہے۔ ہماری والدہ محترمہ خاندان کی چوہدری تھیں۔ وہ ہر فرد خاندان، بلکہ ہر فرد معاشرہ سے محبت واحترام سے ملتی تھیں۔ خاطر تواضع کا اہتمام خوب تھا۔ گھر کا ماحول یہ تھا کہ نماز روزے کا بڑا احترام تھا اور تلاوت قرآن حکیم معمولات زندگی۔ اسی بات سے دیانت وصداقت کا درس ملتا رہتا تھا۔ میرے دور میں ماحول یہ تھا کہ محلے کا کوئی بزرگ قریب سے گزر جاتا تو بچے ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ السلامُ علیکم سے استقبال کرتے تھے۔ جواب میں وعلیکم السلام کے ساتھ دست شفقت سے نہال ہو جاتے تھے۔ بچوں کا حال یہ تھا کہ کوئی بزرگ سامان اٹھائے چل رہا ہے تو بچے فوراً سامان ہاتھوں میں لے لیتے تھے اور بزرگ کو ان کے گھر تک چھوڑ آتے تھے۔ آپ نے اعتراف کیا کہ "آج میں جو کچھ بھی ہوں، وہ بھائی جان محترم کے نقش قدم پر چلنے کا ثمر ہے۔ بزرگوں کا احترام کرکے میں سعید بنا ہوں"۔

اپنے والد کے انتقال (۲۲ جون ۱۹۲۲ء) کے بعد ہمدرد مطب کی نگرانی اپنی والدہ کی سرپرستی میں حکیم عبدالحمید نے سنبھال لی تھی اس وقت آپ کی عمر ۱۳ برس تھی جب کہ حکیم محمد سعید صرف ڈھائی برس کے تھے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اور طبّی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکیم محمد سعید اپنے بھائی حکیم عبدالحمید کے ہمراہ ہمدرد کو مزید فعال بنانے میں مصروف ہوگئے اور پاکستان ہجرت کرنے سے قبل (۱۹۴۰ء۔۱۹۴۷ء) تک بھرپور طریقہ سے ہمدرد کے فروغ کی جدوجہد کرتے رہے۔

دونوں بھائیوں کی زندگی کا مقصد اب طب یونانی کی نہ صرف ترویج و ترقی تھا بلکہ ہمدرد کو ایک دواخانہ سے بڑھا کر خدمت خلق کا ایک عظیم الشان ادارہ بنانا تھا۔ بس یہی ایک دھن ان دونوں کو تھی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، ان کے خلوص اور لگن کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور انھیں قابل رشک کامیابی سے نوازا ۔ اور ہمدرد ایشیا کا سب سے بڑا دوا ساز ادارہ بن گیا۔ حکیم محمد سعید نے عطاروں کی مددگاری، نسخہ بندی، عطاری، دوا سازی، پیکٹ و پارسل تیار کرنا بہی کھاتا، روزنامچہ نویسی، خطوط کے جوابات دینے کے علاوہ ہمدرد کے انتظامی امور میں مہارت حاصل کر چکنے کے بعد باقاعدہ مطب شروع کیا۔ ۱۹۴۰ء میں آپ کو ہمدرد کے جملہ امورِ انتظامی بھی سونپ دیے گئے۔ اب حکیم محمد سعید ہمدرد کے سب کچھ تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے مقام پر ہونے والے تاریخی جلسہ عام جس میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی اس میں حکیم محمد سعید شریک تھے۔ قرار داد پاکستان پیش کیا جانے والا روح پرور منظر سعید ملت کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا قائدا عظم محمد علی جناح کی تقاریر نے آپ کے ذہن کو جلا بخشی۔ وہ بنیادی طور پر تحریر و تحقیق کے آدمی تھے۔ شہر دہلی سیاست کا گڑھ تھا۔ قائد اعظم دہلی میں اکثر قیام کرتے تھے اس طرح سعید ملت اکثر و بیشتر ان کی زیارت سے فیض یاب ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حکیم صاحب کے مختلف سیاست دانوں سے تعلقات

استوار ہو چکے تھے اور وہ ان کے خیالات سے بہرہ مند ہوتے پھر حکیم صاحب کا منطقی ذہن سیاسی حالات کا تجزیہ کرتا جو اکثر درست ثابت ہوتا اور پرانی گرہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد تحریک پاکستان میں حیران کن برق رفتاری آ گئی۔ ادھر سعید ملت خانقاہی مزاج رکھنے والے تنہائی پسند نہیں تھے ان کی ملاقات زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے انسانوں سے ہوتی۔ ہمدرد کی وجہ سے بڑی شخصیات کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوتا۔ اپنے ذاتی مراسم، مشاہدے اور غور و فکر کا عادی ہونے کی وجہ سے وہ چشم بینا کے مالک بن چکے تھے۔ ان کی بصیرت پکار پکار کر ان کو منزل کے تعین پر مجبور کر رہی تھی۔ ہندوؤں کا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔ گاندھی کی منافقت کھل کر سامنے آ چکی تھی۔ قائد اعظم اپنی اصول پرستی اور خلوص بے کراں کی بنا پر برصغیر کے سیاسی افق پر چھا رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانان برصغیر کی واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھر چکی تھی۔ فرنگیوں کی ناانصافیوں اور بدعہدیوں کانگریس کی کہہ مکرنیوں، وعدہ خلافیوں اور ہٹ دھرمیوں، اپنوں بیگانوں کی جفاؤں کے باوجود قیام پاکستان کی راہ ہموار ہو چکی تھی بلکہ لب بام دو چار ہاتھ رہ گیا تھا اور کمند بفضل خدا بڑی مضبوط تھی۔

حکیم محمد سعید نے غور فکر کے بعد بہت بڑا فیصلہ کیا اور وہ یہ تھا کہ ’’بھارت میں جس انداز کی حکومت قائم ہوگی میں اس کا وفادار نہیں رہ سکتا،

لہٰذا مجھے پاکستان جانا ہوگا''۔ یہ اتنا بڑا فیصلہ تھا جسے دیوانگی قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہ تاج شاہی چھوڑ کر کاسۂ گدائی تھامنے والی بات تھی۔ جھونپڑی سے محل میں جانا آسان ہوسکتا ہے، لیکن محل سے جھونپڑی میں آنے کے لیے جرات رندانہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پاکستان آنے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی کا آغاز از سر نو کیا جائے اور وہ بھی بے سرو سامانی کے نقطہ آغاز سے، کیوں کہ بھارت میں ہمدرد کے جملہ اثاثے وقف ہو چکے تھے۔ اس سے بڑی بات، عاشق زار بھائی کی مخالفت کا سوہان روح خیال تھا۔ وہ بھائی جس کے ہر فیصلہ کو شہید پاکستان حرفِ آخر قرار دیتے تھے، لیکن یہ حب اختیاری کا معاملہ تھا،اب خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، مصائب و آلام اس کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ یہ خاردار راستے پر ننگے پاؤں چلنے والا معاملہ ہوتا ہے اسے دو دھاری تلوار پر گامزن ہونا بھی کہتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو سے سعید ملت کے خوش گوار تعلقات تھے اس سلسلے میں آپ نے ایک بار دو ٹوک الفاظ میں کہا 'میں پنڈت جواہر لال نہرو کا قریبی دوست ہو سکتا ہوں، لیکن اس کی حکومت کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ منافقت کی مجھ میں صلاحیت ہی نہیں۔' یہ الفاظ ادا کرکے سعید ملت نے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ وہ اسلام جو سعید ملت کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پھر چودہ اگست ۱۹۴۷ء والا سورج طلوع ہوا۔ (16 اکتوبر 2015)

(حکیم محمد سعید شہید۔ تحقیق کے آئینے میں (قسط۔ 2

شہید حکیم محمد سعید کی 17.برسی کے موقع پر

(روزنامہ ’جناح‘‘اسلام آباد، لاہور، کراچی نے اپنی اشاعت 17،19,18اکتوبر 2015کو شائع کیا)

.برصغیر تقسیم ہوگیااور مملکت خداداِدِ پاکستان، معرض وجود میں آگئی، لیکن اس کے بعد (یا پہلے) جو کچھ ہوااس نے حکیم محمد سعید کا سینہ چھلنی کردیا۔ ظلم وبربریت کا فیل مست بے زنجیر ہوگیااور انسانیت کو پس دیوار منہ چھپا کر آنسو بہانا پڑے۔ مسلمان کش فسادات حکیم محمد سعید نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ دہلی میں ان کے کئی چاہنے اور چاہے جانے والے شہید ہوگئے۔ سرزمین دہلی میں جن کی جڑیں صدیوں سے جمی ہوئی تھیں وہ خشک اور بے حقیر تنکوں کی طرح دوش ہواپر اڑنے لگے۔ ہمدم، دوست، سب کچھ لٹا کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ رشتے دار اور مضبوط تعلقات تارِ عنکبوت سے زیادہ ناپائیدار ثابت ہوئے۔ علم وادب کے خزانے جلادیے گئے۔ عزتیں لوٹی گئیں، مہر و محبت کے شبستان نذر آتش کردیے گئے۔ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت شروع ہوگئی۔ ہندوؤں، سکھوں کا کردار اس قدر گھناؤنا، اس قدر نفرت انگیز تھا کہ حکیم

محمد سعید نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کر دیا۔ ہندستان میں آپ نے اپنے پیاروں کے ساتھ مل کر بہت بڑا مشن پورا کر دیا۔ ادارہ ہمدرد عوام الناس کی خدمات کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ نوزائدہ مملکت پاکستان کے عوام کی خدمت بھی کی جائے۔ حکیم محمد سعید نے عزیز رشتہ داروں، دوستوں اور بے شمار چاہنے والوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنانے کے بارے میں حکیم محمد سعید نے اپنی کہانی میں تحریر فرمایا کہ ''میں کراچی کیوں آیا؟ ایک دل چسپ داستان ہے۔ ایک تو بات یہی ہے کہ جناب حکیم احسن صاحب دہلی میں طبیہ کالج میں میرے ساتھ طب پڑھا کرتے تھے پھر سندھ اسمبلی کے اسپیکر آنریبل سید میاں محمد شاہ صاحب سے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے ہاں تعلق قائم ہوا۔ پھر ان سے دوستی ہو گئی۔ سید میران محمد شاہ اس زمانے ۱۹۴۷ء میں وائسرائے کی کونسل میں بیٹھنے کے لیے خاص لباس ٹیل کوٹ، کالی نکٹائی وغیرہ کے ساتھ آیا کرتے۔ اب دوستی پھیلی تو سندھ کے وزیر اعلیٰ خاں بہادر محمد ایوب کھوڑو جب دہلی آتے تو میں ان کا میزبان بنا۔ سندھ کے وزیر تعلیم جناب پیر الٰہی بخش صاحب سے دوستی تھی۔ وہ میرے گھر ٹھہرا کرتے تھے۔ میر غلام علی تالپور کا بھی میں ہی میزبان ہوتا تھا۔ وہ وزیر داخلہ سندھ تھے۔ یہ دوستیاں مجھے راولپنڈی کے بجائے کراچی لے آئیں، ورنہ فکر و فہم کے لحاظ سے راولپنڈی میں صنعت لگانی چاہیے تھی۔ میری دوربین نگاہیں راولپنڈی کا مستقبل ۱۹۴۷ء میں دیکھ سکتی

تھیں'۔

پاکستان ہجرت کی تین وجوہات بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا کہ ' میں 9 جنوری 1947ء کو ہمیشہ کے لیے کراچی آگیا، اپنی والدہ محترمہ رابعہ بیگم کو روتا چھوڑ کر آیا، اپنے عظیم محسن اور بھائی کو اداس چھوڑ آیا، اپنی ہر جائیداد چھوڑ آیا، اپنا پیارا شہر دہلی چھوڑ آیا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ میں فکری اعتبار سے اور مزاجی لحاظ سے بھارت کا وفاراد نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں بھارت کا وفادار نہیں ہو سکتا تھا تو مجھے اصولاً وہاں رہنا نہیں چاہیے تھا۔ بھارت چھوڑنے پر میرا ہر دوست مخالف تھا۔ میرے عزیز و اقارب کو میرا بھارت چھوڑنا گوارا نہ تھا، حتیٰ کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تک نے بھی پاکستان نہ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میرے بزرگ بلکہ دوست حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی رائے بھی یہی تھی کہ مسلمانوں کو بھارت میں رہنا چاہیے، مگر میں نے اصول کی خاطر ہر چیز قربان کر دی اور خالی ہاتھ پاکستان چلا آیا'۔

ہجرت کی دوسری وجہ آپ نے یہ بیان کی کہ '' وقت گزرتا گیا بھائی جان محترم کے بیٹے عبدالمعید اور حماد احمد بڑے ہوتے رہے ان نہایت اچھے بھتیجوں کے دل میں ضرور یہ خیال آیا کہ یہ چچا جان کون بزرگ ہیں جو سارے کاروبار پر حاوی و قابض ہیں ان کی جائیداد تو ابا جان سے بھی زیادہ ہے جس دن میں نے اپنے

بھتیجوں کے دلوں میں اس کانٹے کو محسوس کیا میں نے ایک تاریخی فیصلہ کر لیا۔ میں نے 1944ء 1944ء میں کراچی کو اپنا مرکز بنانے کا ارادہ کر لیا، مگر بات ٹلتی رہی۔ 1944ء میں، میں کراچی آ کر رہا تھا۔ پھر مارچ 1947ء میں کراچی آیا۔ یہاں سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ میں زمین خریدی۔ ایک مکان کا فیصلہ کیا۔ اب میں نے ہجرت کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ میں خاندان میں کوئی افتراق پیدا نہیں کر سکتا تھا اور میں اپنے عظیم بڑے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ ساتھ دل کا ساتھ تھا یہ ساتھ محبت کا ساتھ تھا۔ یہ ساتھ احترام کا ساتھ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا ہمدرد خاندان میں چچا بھتیجوں کی لڑائی کا کوئی بھی امکان ہو۔ عزتِ خاندان نے مجھے راہ ہجرت دکھائی۔ میں نے اسے سنت کے طور پر قبول کر لیا۔ 9 جنوری 1948ء کو میں نے صبح ۱۰ بجے ہندستان چھوڑ دیا'۔ ہجرت کی تیسری وجہ آپ نے یہ بیان کی کہ ''ستمبر 1947ء میں دہلی میں جو قتل عام ہوا اس نے 1857ء کی یادیں تازہ کر دیں اس میں جوانمردی اور جرات سے ہم نے ہمدرد کو محفوظ کیا، مگر یہ بھی فیصلہ کیا کہ پاکستان جا کر قسمت آزمائیں'۔

9 جنوری 1948ء دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر حکیم محمد سعید کو رخصت کرنے دیگر لوگوں کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید، آپ کے استاد مولانا قاضی سجاد حسین موجود تھے۔ قاضی سجاد حسین نے حکیم صاحب کو عربی اور فارسی

پڑھائی تھی۔ آپ اسی روز ہندوستان سے اپنی شریکِ حیات اور بیٹی سعدیہ کے ہمراہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے۔ کراچی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ سندھ کالونی، جمشید کوارٹرز کے مکان 1/185 میں رہائش اختیار کی جو حافظ محمد الیاس کی نگہبانی میں تھا۔ شہر کراچی آپ کے لیے نیا نہیں تھا۔ آپ 1944ء اور 1947ء میں بھی یہاں آ چکے تھے، لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی۔ آپ نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندستان کو مستقل طور پر خیر باد کہا اور پاکستان کو دل و جان سے اپنا وطن بنایا۔ آپ اپنا سب کچھ ہندستان چھوڑ آئے تھے۔ آپ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابتدائی چند ماہ مشکل میں گزرے۔ ہر وقت مصروف رہنے والے کے پاس کوئی مصروفیت نہ تھی۔ دہلی میں بے شمار جائیداد کا مالک، پیکارڈ کار میں سفر کرنے والا کراچی میں میلوں پیدل سفر کر رہا تھا۔

آپ اس کوشش میں تھے کہ مطب کے لیے کوئی جگہ مل جائے۔ بالآخر آپ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ایک پارسی ایڈلجی ڈنشا کے ذریعہ کراچی کے علاقے آرام باغ میں شاہراہ لیاقت (فیریئر روڈ) پر اعوان لاج میں جگہ مل گئی اور ہمدرد مطب کا آغاز ہوا۔ افتتاح 19 جون 1948ء کو وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش نے کیا۔ مطب کا آغاز ہوا۔ اللہ نے برکت دی۔ مریض آنے لگے۔ اب دوا سازی کے لیے جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی، اس موقع پر آپ کی دوستی کام آئی، آپ کے دوست اسپیکر

سندھ اسمبلی کے توسط سے آرام باغ میں اعوان لاج کے سامنے قائم دھرم شالہ کا نیچے کا حصہ حاصل ہوگیا۔ یہاں سے ہمدرد پاکستان کے تحت دوا سازی کے کام کا آغاز ہوا۔

دواؤں کی تیاری کے بعد ان کی فروخت بھی ضروری تھی اب ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں سے لوگوں کو آسانی سے ہمدرد کی دوا مل سکے ۔ اس وقت صورت حال بہتر ہو چکی تھی۔ مطب شروع ہو چکا تھا، دوائیں تیار ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ نونہال گرائپ واٹر کی وہ بوتلیں جو ہندوستان سے چلتے ہوئے آپ کے بڑے بھائی نے آپ کے ہمراہ کر دی تھیں کہ وقت ضرورت کام آئیں گی وہ تمام فروخت ہو چکی تھیں۔ ان بوتلوں کی فروخت کے لیے آپ نے بڑی محنت اور مشقت کی تھی، کیوں کہ یہ کام آپ نے از خود انجام دیا تھا۔ کراچی کی معروف شاہراہ فریئر روڈ پر ایک دکان ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدی گئی۔ پاکستان میں یہ ہمدرد کا نقطہ آغاز تھا۔ آپ نے اپنا مطب اور اپنی خدمات کو زندگی کے اختتام تک اسی جگہ پر قائم رکھا۔ اس مقام تک پہنچنے سے قبل آپ کو مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آپ نے استاد کی حیثیت سے ملازمت کی بھی کوشش کی۔ حاجی سر عبداللہ ہارون یتیم خانہ جو کراچی کے قدیم علاقے کھڈا مارکیٹ میں قائم ہے۔ اب اس علاقے کا نام نیا آباد میمن سوسائٹی ہے۔ یتیم خانہ کے ساتھ ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا یہ اب حاجی عبداللہ ہارون گورنمنٹ اسکول کے نام سے موجود ہے۔ حکیم محمد سعید اس اسکول میں پہنچے اور کہا کہ ' حافظ قرآن ہوں استاد کی حیثیت سے ملازمت چاہتا ہوں'، آپ کو کامیابی

نہ ہو سکی۔ اس طرح سول اسپتال کے نزدیک ایک اسکول میں بھی آپ کو ملازمت نہ مل سکی۔ لیکن آپ نے حوصلہ نہ ہارا، جدوجہد کرتے رہے، حتیٰ کہ کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔ آپ نے ایک اسکول میں چھ ماہ استاد کی حیثیت سے بچوں کو تعلیم بھی دی اور اسی دوران یہ فیصلہ بھی کیا کہ مستقبل میں اسکول ضرور قائم کریں گے۔

مطب اور دوا سازی کے کام میں استحکام پیدا ہوا تو آپ نے اپنی طبّی خدمات کے دائرے کو کراچی کے علاوہ دیگر شہروں تک وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں ہمدرد کی بنیاد رکھی۔ ایک سال بعد ۱۹۵۱ء میں لاہور میں انارکلی میں مطب قائم ہوا جس کا افتتاح وزیرِاعلیٰ پنجاب میاں محمد ممتاز دولتانہ نے کیا۔ بعد ازاں آپ پشاور، راولپنڈی، ملتان اور سکھر میں بھی مطب کرنے لگے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ مطب والے دن بطور خاص روزہ رکھا کرتے اور بغیر کسی وقفہ کے مریضوں کو دیکھا کرتے۔ آپ نے لندن میں بھی مطب کیا۔ مریض غریب ہوتا یا امیر آپ نے کبھی کسی مریض سے فیس نہیں لی طب کے فروغ کے لیے طبیہ کالج قائم کیا جس کا افتتاح 14 اگست 1958ء کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے کراچی میں کیا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کا قیام دہلی میں 1947ء میں عمل میں آیا۔ کراچی میں ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی بنیاد 1956ء میں پڑی۔ اس سے قبل آپ 1953ء میں ہمدرد کو وقف کر چکے تھے۔ اور

اس کی راہ متعین کر دی تھی۔ ارشاد احمد حقانی کے بقول حکیم صاحب پاکستان کے ان مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے جو قوم کی عظمت اور رفعت کے لیے انتھک محنت کرتے ہیں۔ دولت تو بہت سے لوگوں نے کمائی، لیکن حکیم صاحب نے یہ دولت ایک درجن سے زائد میدانوں میں قومی زندگی کو شان دار اور مال دار بنانے کے لیے وقف کر دی۔ خود درویشی کی زندگی گزاری۔ ایس ایم ظفر کے خیال میں ’مجھے تو وہ اس دور کے ابوذر غفاری دکھائی دیتے ہیں جو اپنی ضرورت سے زیادہ دولت وقف کرتے جاتے ہیں اور دولت جمع کرنے والوں اور ارتکاز زر کے ملزموں کو اپنے عمل اور بیانات سے بے نقاب کر رہے ہیں‘۔ خدمت انسانی کا یہ اعزاز شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوا ہو کہ آپ نے اپنی زندگی میں معاشرے کے ہر طبقے کے تین ملین مریضوں کا علاج کیا۔ ان میں امیر بھی تھے غریب بھی، جوان بھی تھے بوڑھے بھی۔ سربراہانِ مملکت سے لے کر نچلی سطح تک کے لوگ شامل تھے۔ کسی ایک سے بھی تشخیص و تجویز کا معاوضہ (Consultation Fee) نہیں لیا۔

حکیم محمد سعید کا کہنا تھا کہ وہ صحافی بننا چاہتے تھے۔ علم و ادب سے شغف تھا اور تحریر و تصنیف کی جانب ابتدا ہی سے مائل تھے۔ 1932ء میں ہمدرد صحت کا اجرا دہلی سے ہوا، اس کے اولین مدیر خواجہ نیاز احمد تھے۔ 1933ء سے حکیم عبدالحمید اس کے مدیر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں یہ ذمہ داریاں حکیم محمد سعید کو سونپ دی گئیں، لیکن عملی طور پر آپ نے 1941ء میں ادارت کے فرائض سنبھالے۔

یہ تحریر و تصنیف کی ابتدا تھی۔ طبّی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے اس رسالہ کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی اور اس کی 19 جلدیں قیام پاکستان تک شائع ہوئیں۔
1951ء میں آپ نے اس رسالہ کی اشاعت کراچی سے شروع کی، لیکن اس کا تسلسل ہندستان سے جاری کی گئیں جلدوں سے ہی برقرار رکھتے ہوئے اس کی جلد 20 کا اولین شمارہ جو جنوری 1951ء میں حکیم محمد سعید کی ادارت میں جاری ہوا تھا کراچی سے جاری ہونے والا پہلا شمارہ تھا۔ ہمدرد کے علاوہ آپ کی ادارت میں کئی رسائل جاری ہوئے ان میں ہمدرد نونہال (1953ء)، اخبار الاطب (یکم جنوری 1955ء)، پیامی (1995ء) میڈیکل SPEM (ء۔ 1999ء)، ہمدرد میڈیکس (اپریل ۱۹۵۷ء 1977 1987ء)، جریدہ () Endeavour (ٹائم (1978ء)، ہمدرد اسلامیکس (1978ء 1983ء)، خبرنامہ ہمدرد (1960ء) شامل ہیں۔ حکیم محمد سعید شہید کا تحریری سرمایہ نصف صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ علم و ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو کہ جس پر آپ نے نہ لکھا ہو۔ آپ کی انگریزی اور اردو تصانیف 250 سے زیادہ ہے۔
طب کے میدان میں کامیابی حاصل ہو جانے کے بعد آپ نے معاشرہ کے دیگر مسائل اور کمزوریوں کی جانب توجہ دی۔ اس سلسلہ میں آپ نے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، سماجی کارکنوں، سیاست دانوں، ماہرین تعلیم اور مذہبی دانشوروں کو دعوت دی کہ وہ آگے آئیں اور عام لوگوں کی مشکلات و مسائل کے حل

میں شریک ہوں۔

حکیم محمد سعید نے خدمت خلق، وطن سے محبت اور اصلاح معاشرہ کے لیے مختلف طریقے اور پروگرام ترتیب دیے ان میں جاگو جگاؤ، پاکستان سے محبت کرو پاکستان کی تعمیر کرو، پاکستان کا یوم آزادی ۱۴ اگست کے بجائے 27 رمضان المبارک کو منانے کی تحریک، کتب خانوں کے قیام اور فروغ کی تحریک، آواز اخلاق، ڈاکٹروں، حکیموں اور سائنس دانوں میں سہ فریقی اتحاد، علما اور علم کا احترام، صحت مند قوم، خودی، دن میں دو وقت کھانا، اردو زبان کی ترویج وترقی، اسلامی تعلیمات کا فروغ، جہاں دوست، جوانان امروز کے علاوہ شام ہمدرد جو بعد میں ہمدرد مجلس شوریٰ کہلائی کے علاوہ بزم ہمدرد نونہال شامل ہے۔ شام ہمدرد کا آغاز 1961ء میں کیا گیا۔ اس کے ذریعے پاکستانی دانشوروں، ادیبوں، شعراء، حکماء اور سائنس دانوں، سیاست دانوں، ماہرین تعلیم، صحافیوں غرض ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو ایک ایسا فقید المثال پلیٹ فارم مہیا کیا گیا جس کے ذریعے وہ اپنا نقطہ نظر عوام الناس تک پہنچا سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا غیر سیاسی ادارہ ہے جسے بام عروج پر پہنچانے کے لیے آپ نے مسلسل محنت اور جدوجہد کی۔ حتیٰ کہ اسے عالمی شہرت حاصل ہو گئی۔ 1955ء میں حکیم محمد سعید نے فقید المثال تحریک شام ہمدرد کو 'ہمدرد مجلس شوریٰ' کا مرتبہ ومقام دینا طے کیا۔ شورائیہ ہمدرد کے بنیادی مقاصد کی وضاحت آپ نے ان الفاظ میں

کی 'شورائیہ ہمدرد پاکستان میں ارباب اقتدار کی فکر و عدل کو صراط مستقیم دینے کا فریضہ انجام دے گی۔ اس ملی جدوجہد کا منتہائے مقصود صاحبان اقتدار کو بہ خلوص صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کے اقدامات پر تبصرہ کرنا اور غلط پر گرفت قائم کرنا۔' بقول عطاء الحق قاسمی ''اس طرح گویا انھوں نے چاروں صوبوں کے عوام اور دانشوروں کو محبت کی لڑی میں پرو دیا' ۔

شام ہمدرد کے مقررین اور صدور کی تعداد تقریباً ایک ہزار کے قریب رہی۔ چونکہ شوریٰ ہمدرد کا مزاج سیاسی نہیں ہے بلکہ اس کا اعلیٰ ترین مقصد حکومت وقت کو نہ صرف مشورہ دینا بلکہ عوام الناس کو رہنمائی بھی فراہم کرنا تھا اس لیے شوریٰ کے اراکین کی تعداد کو محدود رکھا گیا یہ تعداد مجموعی طور پر ۱۷۳ سے آگے نہ بڑھ سکی اور یہ معزز اراکین اپنا کام احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ شوریٰ ہمدرد حکیم محمد سعید شہید کی علمی، طبّی سماجی، ثقافتی اور تعلیمی خدمات کا ایک عظیم الشان مرکز ہے، ایک ایسا مرکز ہے جو کہ علم کا چراغ جلائے ہوئے ہے اور فکر و عمل کی راہیں نہ صرف کھولتا ہے بلکہ ان راہوں کو کشادہ ہی کرتا جارہا ہے۔ شوریٰ ہمدرد غیر سیاسی فورم لیکن اہل سیاست کی رہنمائی کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ شوریٰ ہمدرد کے ذریعے حکیم صاحب نے علم و ادب میں ایک شان دار اور منفرد روایت قائم کی آپ نے شوریٰ ہمدرد

کے ذریعہ خود کو ہمیشہ کے لیے اس فانی دنیا میں فنا ہو کر بھی لافانی کر لیا ہے اور ان کی یہ عظیم الشان خدمت تاریخ ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھے گی۔

آپ بچوں سے بے انتہا محبت کرنے لگے تھے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں "جب میں نے اپنی محبت کو اس قدر بڑھا لیا کہ مجھے پاکستان کا ہر بچہ اور دنیا کا ہر بچہ اپنا لگا تو پھر مجھے بزم ہمدرد نونہال شروع کرنے کا خیال آیا میں جس طرح اپنی اولاد کی بھلائی کی سوچتا ہوں اسی طرح میں ہر بچے کی بھلائی کی سوچتا ہوں۔ یہ اس سوچ کے نتیجہ میں بڑوں کی شام ہمدرد کی طرز پر بچوں کی شام ہمدرد کا تصور سامنے آیا۔ آپ نے اپنے رفقاء کے مشورے سے "بزم ہمدرد نونہال" (نونہال اسمبلی) کی ابتدا کی۔ کراچی کے بعد پشاور، راولپنڈی اور لاہور میں بزم کے اجلاس منعقد ہونے لگے۔ آپ بچوں کے پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے۔ بچوں سے محبت اس قدر بڑھی کہ آپ نے بچوں کے لیے باقاعدہ اور مسلسل لکھنا شروع کر دیا اور اس قدر لکھا کہ نونہال ادب کے تمام مصنفین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ 1992ء میں لکھی گئیں بارہ "سچی کہانیاں" بچوں کے ادب میں ایک انمول اضافہ ہے۔ بچوں کے لیے جتنی تعداد میں سفر نامے لکھے شاید ہی کسی اور نے بچوں کو اتنی اہمیت دی ہو۔ اس کے علاوہ بچوں کی صحت، غذاؤں،، حفظان صحت اور اخلاق پر بے شمار مضامین اور کتب تحریر کیں۔

تعلیم و تعلم کی اہمیت کو حکیم سعید نے اس حد تک سمجھا اور اشاعت تعلیم کے لیے اس" قدر کام کیا کہ بچوں کے سرسید کہے جانے لگے۔ بقول الطاف حسین قریشی 'وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے تھے کہ پاکستان کی بہترین خدمت یہ ہے کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا معیاری انتظام کیا جائے اور لوگوں بالخصوص حکمرانوں کے اخلاق سنوارنے پر بھرپور توجہ دی جائے'۔

حصول علم، تخلیق علم، فروغ علم اور تحفظِ علم کے حوالے سے حکیم محمد سعید کی خدمات ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ پاکستان کی ۵۸ سالہ تاریخ میں ہمیں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملی کہ کسی فرد واحد نے علم کے حوالے سے اس قدر عظیم خدمات سرانجام دی ہوں۔ تصانیت کے حوالے سے آپ کی تخلیقات تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔

تعلیم کے بارے میں آپ کی رائے یہ ہے کہ 'تعلیم کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا اور تربیت کے بغیر انسانیت میں نکھار پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم و تربیت کے بغیر آدمی ایسا ہے کہ جیسے بے روح، ایک جسد بے حیات۔ تعلیم کے بغیر ایک ملت زندگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی اور تربیت کے بغیر ایک ملک عظمت حاصل نہیں کر سکتا'۔

ہم فخر ملت حکیم محمد سعید کی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز

روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انھوں نے باری تعالیٰ کے احکامات اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے آپ کو پہلے فنافی العلم کے درجہ پر پہنچایا اور پھر فروغ علم کو اپنا سچا اور کھرا نصب العین قرار دیا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی اسی کی خاطر قربان کر دی'۔مدینتہ الحکمہ میں قائم بیت الحکمہ اور دیگر تعلیمی اداروں میں قائم کتب خانے اوران میں جمع اور محفوظ لاکھوں کتابیں اور ان سے استفادے کا مربوط نظام علم کو جمع، محفوظ، ترتیب و تنظیم و ترسیل علم کی واضح مثال ہے۔ بقول ڈاکٹر انیس خورشید ''حکیم صاحب خود بھی کتاب کے رسیا ہیں اور عوام تک ان کو پہنچانے کے لیے کتب خانوں کے قیام ان کو قابل استعمال بنانے اور فروغ دینے کے لیے ایک ملک گیر مربوط نظام کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کی شادی پر آپ نے کتابوں کی ایک قابل استعمال لائبریری بھی جہیز میں دی تھی۔ کتب خانوں کی تحریک کے حوالے سے ملک بھر میں آپ نے جو کام کیا ہے وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے' ۔فروغ علم کے حوالے سے آپ کا سب سے بڑا خواب شہر علم و ثقافت بسانا تھا۔ 1977ء میں مکہ مکرمہ میں پہلی عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی حکیم محمد سعید شہید اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جارہے تھے کہ راستے میں شہر علم بسانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ آپ کا کہنا ہے کہ وجدانی کیفیت میں جو نام ذہن میں آیا وہ مدینتہ الحکمت تھا۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''قیام مکہ کے دوران میں نے طواف کعبہ کے بعد

مقام ابراہیم پر بیٹھ کر قرآن حکیم سے راہنمائی طلب کی تو وجدانی کیفیت کی تصدیق ہو گئی۔" 18 اگست 1983ء کوحب ڈیم سے ۲۳ کلو میٹر پہلے اور ناظم آباد سے 26 کلومیٹر دور 1260 ایکڑ زمین اس مقصد کے لیے خریدی گئی۔ اس شہر علم کا سنگ بنیاد دسمبر 1983ء کو ملک کے 150 دانشوروں، عالموں، صحافیوں، ممتاز سیاست 15 دانوں، ماہر تعلیم کے علاوہ مختلف ممالک کے سفارتکاروں اور مذاکرہ ملی تعلیمات نبوئ کے مندوبین کی موجودگی میں رکھا گیا۔ ہر ایک مندوب نے اپنے اپنے نام کی ایک ایک اینٹ نصب کی۔

مدینتہ الحکمہ میں سب سے پہلے پائے تکمیل کو پہنچنے والی عمارت "بیت الحکمہ" (لائبریری) کی تھی۔ جس کا افتتاح ۱۱ ستمبر 1989ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کیا۔ اس شہر علم میں قائم ہونے والے دیگر اداروں میں ہمدرد یونی ورسٹی سنگ بنیاد ۱۷ جون 1985ء بہ دست صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق) ہمدرد اسکول) سنگ بنیاد 16 جون 1987ء بہ دست صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق)، ہمدرد کالج،) ہمدرد ولیج اسکول ہاؤس، ہمدرد کالج آف اسکالرز ایسٹرن میڈیسنز (طب مشرق) ہمدرد کالج آف میڈیسنز (ایم بی بی ایس)، ہمدرد کالج آف مینجمنٹ سائنسز، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف فارماکولوجی اینڈ ہربل ریسرچ، بائیو ٹیکنالوجی سینٹر برائے ہربل میڈیسن،

ہمدرد کالج آف کامرس، ہمدرد انڈسٹریل سٹی، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، الفرقان ہوسٹل، بین الاقوامی کانفرنس سینٹر، ہمدرد سینٹر آف ایکسی لینس فار ٹریننگ اینڈ ڈویلپمنٹ، سائنس مرکز، اسپورٹس کمپلیکس، اسٹاف کالونی، باغ اور عظیم الشان مسجد قائم ہے۔

حکیم محمد سعید کی زندگی کا ہر لمحہ علم و حکمت کے میدانوں میں پیش رفت سے عبارت تھا ۔ شام ہمدرد کے ذریعہ آپ نے پاکستان میں ایک فکری انقلاب برپا کیا۔ ہمدرد رسائل وجرائد کے ذریعہ سے انہوں نے نہ صرف پاکستان میں حسن فکر و عمل کی دعوت مسلسل دی بلکہ عالمی سطح پر دنیا نے آپ کی خدمات جلیلہ کا برملا اعتراف کیا۔ جریدہ ہمدرد نونہال نے تعمیر اذہان کا بے مثل کارنامہ انجام دیا، ہمدرد صحت نے پیام صحت دیا، ہمدرد میڈیکس (انگریزی) نے دنیا میں طب عربی کا آوازہ بلند کیااور ہمدرد اسلامیکس انگریزی) نے عالمی سطح پر اسلام کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فروغ علم اور اسے عام کرنے کے باب میں آپ کا ایک عظیم الشان کارنامہ سندھ کے گورنر(19 جولائی 1993ء۔ 17 نومبر1993ء) کی حیثیت سے انتہائی مختصر عرصہ میں شدید جدوجہد کرکے چار یونیورسٹیاں قائم کرادیں۔آپ نے گورنر ہاؤس میں 18 کتوبر ء` 20 ربیع الثانی 1414 ہجری` جمعتہ المبارک کو عید مسلمین بنادیا پاکستان993 کی چار یونیورسٹیوں (سرسید یونیورسٹی برائے سائنس و ٹیکنالوجی، بقائی یونیورسٹی

اوف ہیلتھ سائنسز، جامعہ قائدِ اعظم (سندھ مدرستہ الاسلام) اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین) کے قیام کے لیے دستاویزات (چارٹرز) عطا فرمائے۔ اس موقع پر گورنر ہاوس میں منعقدہ تقریب میں سندھ کی تمام جامعات کے وائس چانسلر صاحبان سے خطاب کرتے ہوئے شہید حکیم محمد سعید نے کہا کہ 'میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس گورنر ہاؤس میں کہ جہاں قائدِ اعظم نے زمام اقتدار سنبھال کر تعمیر پاکستان کے ذیل میں کل پاکستان اول تعلیمی کانفرنس کی داغ بیل ڈالی تھی آج میں سندھ میں چار جامعات کے قیام کی اجازت دینے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ درس گاہیں تعلیم و تربیت اور تدریس کی خدمت جلیلہ میں نہایت لگن' ذمہ داری اور اخلاص کے ساتھ مصروف ہیں۔ ان کا مرتبہ اور معیار بلند کرنا ایک سعادت ہے۔ ایک فرض ادا کرنے کے مترادف ہے جامعات کا درجہ ملنے سے ان کا مراکز علم و حکمت کو اپنے نیک عزائم اور بلند تر مقاصد کی تکمیل میں سہولت ہوگی۔

حکیم محمد سعید سیاسی آدمی نہ تھے، لیکن سیاست کے لیل و نہار سے اچھی طرح واقف تھے۔ بلکہ سیاست کے نباض تھے۔ بے شمار سیاست دانوں، سربراہان مملکت، وزیروں، سفیروں، بادشاہوں، شہزادوں غرض بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں سے آپ کے بہت اچھے اور گہرے تعلقات رہے، لیکن آپ نے کسی بھی دور میں کسی ایک سے بھی ذاتی فائدہ حاصل نہ کیا۔ پاکستان میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

اور جرنل محمد ضیاء الحق سے آپ کے بہت اچھے اور قریبی تعلقات تھے۔ جرنل محمد ضیاء الحق کے دور میں آپ مشیر طب (978ء۔1982ء) بھی رہے۔آپ کا درجہ مرکزی وزیر کے برابر تھا۔ جب تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے اپنی اصل حیثیت کو برقرار رکھا یعنی مطب برقرار رکھا اور اپنی دیگر تمام تر مصروفیات اور خدمات کا سلسلہ ویسے ہی جاری رہا۔ اس دور میں تمام تر اخراجات خود کیے سرکاری مراعات حاصل نہ کیں۔
ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں مولانا کوثر نیازی کی وجہ سے جو آپ کے دوست تھے کراچی سے قومی اسمبلی کا الیکشن اپنی مرضی کے بغیر لڑا جس میں کامیابی نہ ہونا تھی نہ ہوئی، کیوں کہ آپ اپنے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر اعوان 'ان کے اجلے نام کو پاکستان کے مقتدر حکمرانوں نے اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا، مگر اس میں ناکام رہے' ۔
شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی ساری زندگی راہ عمل و تعمیر کی ایک روشن مثال ہے۔ 'انھوں نے تادم مرگ علم و آگہی، خدمت خلق اور تدبر و تدبیر کی شمع جلائے رکھی'۔ وہ مٹھاس ہی مٹھاس۔ ایسی مٹھاس جس سے روح میں تازگی آجاتی ہے۔ وہ ایک ماہر طبیب، ایک صاحب اسلوب ادیب، ایک سرگرم سیاح اور ایک مستعد چانسلر تھے۔ نذیر ناجی نے درست کہا 'وہ مکمل طور پر تہذیب و تمدن میں ڈھلی ہوئی شخصیت تھے۔ ان کا رکھ رکھاؤ طرز گفتگو، لباس، طور اطوار اور شائستگی ،

کسی چیز میں بناوٹ نہیں تھی ان کا سب کچھ سچ تھا وہ ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت کے مالک تھے'۔ مفتی تقی عثمانی نے حکیم محمد سعید کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا' حکیم صاحب ایک وضع دار شخصیت تھے، انھوں نے پاکستان کے ابتدائی دور میں فقر و افلاس کا بھی خاصا وقت گذارا، ہمدرد دواخانہ کے قیام کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اُس دور کی مشکلات کو انھوں نے جس خندہ پیشانی سے جھیلا، اس کی داستان کبھی کبھی وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب مولانا مفتی محمد شفیع) سے انہیں ابتدا ہی سے عقیدت اور محبت تھی چنانچہ حضرت والد) صاحب کے پاس ان کا کثرت سے آنا جانا رہتا تھا اور اِسی تعلق کے نتیجے میں دارالعلوم کے قیام کے وقت وہ اس کے بانی ارکان میں شامل ہوئے۔ مشاغل کے تنوع اور ہجوم کے باوجود وہ ہمیشہ پر سکون رہتے تھے، انہیں کبھی بھی گھبراہٹ سے مغلوب نہیں دیکھا، ان کا نظام الاوقات اتنا مستحکم اور معمولات اتنے مضبوط تھے کہ وہ ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتے اور مطمئن رہتے تھے'۔ حکیم محمد سعید ایک بااصول انسان تھے اپنے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہو کر ہی آپ نے زندگی میں کامیابی و کامرانی حاصل کی۔ اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں آپ نے کرن خلیل کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ''میں اپنے خاص اصول رکھتا ہوں اور ان اصولوں کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے زندگی میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ میں کسی سے نفرت کرنا نہیں جانتا۔ میں محبت کرتا ہوں، احترام کرتا ہوں اور خوش

رہتا ہوں۔ جو برا کہتے ہیں ان کو اچھا کہتا ہوں۔ جو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کی راحتوں کا سامان کرتا ہوں۔ محنت کرتا ہوں۔ وقت ضائع نہیں کرتا، وقت کا احترام کرتا ہوں۔ وقت کے اس قدر پابند کہ لوگ آپ کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کر لیا کرتے درحقیقت آپ اپنے اس قول 'وقت اللہ کی امانت ہے اس کا صحیح استعمال عبادت ہے' کی عملی تفسیر تھے۔ شہید پاکستان کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ نے راقم الحروف کو زیر نظر تحقیق کے لیے بطور خاص انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ 'انہیں حکیم صاحب کی وقت کی قدر کرنے اور اس کی پابندی کرنے کی عادت نے سب سے زیادہ متاثر کیا'۔ روزنامہ پاکستان لاہور کے ڈاکٹر اجمل نیازی کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے اپنی آرزو کے بارے میں کہا 'میری آرزو، آرزو پاکستان۔ میری تمنا، پاکستان میں صد فی صد تعلیم۔ میری خواہش صحت سے سرشار ملت پاکستان۔ میرا مقصود پاکستان علم و حکمت کا گہوارہ، میرا مطمع نظر پاکستان میں امن و چین۔ شرافت و صداقت، امانت و دیانت۔ میری جستجو پاکستان میں قناعت'۔ اپنے فلسفہ زندگی کے بارے میں پاکستان ٹیلی وژن پر نعیم بخاری کو انٹرویو دیتے ہوئے واضح کیا کہ 'میرا فلسفہ زندگی خدمت اور کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے'۔ اپنی شہادت سے چند روز قبل (9 ستمبر 1998ء) کو اپنے بڑے بھائی کے نام اپنے آخری خط میں مطب سے ریٹائر

ہونے کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ آپ نے تحریر فرمایا 'میں 9 جنوری 2000ء کو مطب سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔ 9 جنوری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں مطب کا آغاز کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ خدمت خلق کا حق اس طرح بھی ادا کر دیا ہے میں نے'۔

آپ کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں 1966ء میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا۔ 1981ء میں استنبول یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی جانب سے سرٹیفکیٹ آف میرٹ دیا گیا۔ 1982ء میں فاؤنڈیشن برائے ترویج سائنس، کویت نے اسلامک میڈیسن پرائز سے نوازا۔ 1984ء میں آپ کی نمایاں سائنس خدمات کے اعتراف میں آپ کو اسٹاک ہوم سویڈن میں منعقد ہونے والے ایکو پنکچر اور متبادل ادویہ کے سیمپوزیم کے خصوصی اجلاس میں ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگری'' عطا کی گئی۔ ایک خصوصی کانوکیشن میں جو 3 جون 1984ء کو منعقد ہوا ڈاکٹر نوبیل نے یہ اعزازی ڈگری آپ کو پیش کی۔ کمشنر بہاول پور نے بہاولپور کے عوام کی جانب سے صادق دوست ایوارڈ سے نوازا۔ 1993ء میں ہیومن رائٹس سوسائٹی پاکستان نے آپ کی ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں کی جانب سے (WHO) انسانی حقوق ایوارڈ'' سے نوازا۔ 1995ء میں عالمی ادارہ'' ورلڈ نوٹوبیکو ڈے میڈل ایوارڈ''، 1996ء ایوارڈ کانفرنس (پاکستان لیگ امریکہ)'' برائے صحت تعلیم اور سماجی خدمات اور 1996ء میں رو

ٹری کلب، اسلام آباد کی جانب سے آؤٹ اسٹینڈنگ پاکستانی ایوارڈ، سے نوازا گیا۔ 1998ء میں بو علی سینا انٹرنیشنل پرائز، 1999ء میں آپ کو ''جناح ایوارڈ'' اور انٹرنیشنل ایسوسی ایشن اوف لائنز کلبز کی جانب سے ''لائنز نیشنل پرائڈ ایوارڈ 1999ء'' سے نوازا گیا۔ حکومت پاکستان نے شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی میڈیسن کے شعبے میں قابل قدر خدمات کے اعتراف میں 14 اگست 2000ء کو انہیں پاکستان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ''نشان امتیاز'' (بعد از وفات) دینے کا اعلان کیا، 23 مارچ 2001ء کو ایوان صدر میں ایک شاندار اور پر وقار تقریب میں صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ نے یہ اعزاز حکیم محمد سعید کی صاحبزادی محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ کو عطا فرمایا 'شہید حکیم محمد سعید کو مختلف القابات سے بھی نوازا گیا جن میں 'بچوں کے سرسید'، ' سرسید ثانی'، ' عہد جدید کے ابن سینا'، 'مجدد طب' وغیرہ شامل ہیں۔ شہادت کے بعد آپ کو ' شہید پاکستان'، ' شہید وطن'، ' فخر ملت' کے القابات سے نوازا گیا۔ حکیم محمد سعید ایک مکمل انسان تھے۔ انسانیت کی خدمت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنایا، اسی کے لیے جئے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ ہر سانس کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کیا اور اسی مقصد عظیم کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کر دی۔ جئے جس کے لیے جان اس پہ دے دی یہی بس داستان زندگی ہے۔ بقول حکیم نعیم الدین زبیری ' حکیم صاحب جو آج بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اٹھ گئے تو سہارا ابھی ایسا لگتا ہے اٹھ

گیا'۔

17 اکتوبر 1998ء، بروز ہفتہ (25 جمادی الثانی 1419ھ)، روزہ کی حالت میں نماز فجر کی ادائیگی کے بعد کراچی میں مریضوں کی خدمت کے لیے اپنے مطب پہنچتے ہی شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ وطن عزیز پر جان نثار کرنے والا، پاکستان کو امن کا گہوارہ بنا دیکھنے والا، وہ جس نے اپنا تن من دھن سب
کچھ قوم اور ملک پر نچھاور کر دیا حتیٰ کہ اپنی جان بھی اس پر نثار کر دی۔ اس عظیم انسان کی قربانیوں کی کوئی حد، کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ وہ مملکت پاکستان کا ہی نہیں امت مسلمہ کا سرمایہ تھا۔ وہ زندہ ہے اوزندہ رہے گا۔ حکیم محمد سعید کی شخصیت، خدمات اور کارناموں پر بہت لکھا گیا، لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کے ہر ہر پہلو پر تحقیق کی جاسکتی ہے اسی طرح خدمات اور کارناموں پر الگ الگ تحقیق ہو سکتی ہے۔(16 اکتوبر 2015، مصنف سے رابطے کے لیے ای میل :drraissaamdani@yahoo.com)

کلکرنی کا کالا منہ ۔ بھارت کا اصل چہرہ

بھارت کے متعصب ہندوؤں کی تنظیم شیو سینا کے دہشت گردوں نے اپنے ہی ہم وطن و ہم مذہب سدھندرا کلکرنی جو بھارتی سیاست داں، صحافی، کالم نگار اور بھارتی تھنک ٹینک 'آبزرور ریسرچ فاؤنڈیشن' (Observer Research Foundation, ORF) کے سربراہ بھی ہیں کے چہرہ پر کالا پینٹ مل کر اس کا منہ کالا کردیا، یہ عمل محض کلکرنی کا منہ کالا کرنا ہی نہیں بلکہ ایسا کرکے شیو سینا کے دہشت گردوں نے بھارت کا اصلی چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمیں تو ان بھارتی دہشت گردوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم 67 سال سے دنیا کو بھارت کی پاکستان دشمنی کے حقائق دکھا رہے کہ بھارت مسلسل پاکستان دشمنی پر آمادہ ہے، اس نے پاکستان کے وجود کو پہلے دن سے ہی قبول نہیں کیا ہے، اس نے سازش کرکے پاکستان کو دولخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا، حال ہی میں نریندر مودی نے دنیا کے سامنے اس اعتراف بھی کیا کہ انہوں نے بنگلہ دیش قائم کرایا، وہ کشمیریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھا رہا ہے، اس نے کشمیریوں کو ان کے حقِ خودارادیت سے محروم کیا ہوا ہے، اقوام متحدہ کی قرارداد کی مسلسل نفی کررہا ہے، بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کررہا ہے، وہ کسی صورت بھی پاکستان کو خوش حال اور ترقی کرتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہندو تنظیم شیو سینا کے غنڈوں نے کلکرنی کے

منہ پر سیاہی مل کر پاکستان کے اصولی موقف کی تائید کر دی، ثابت ہوگیا کہ بھارت پاکستان سے کس قدر عداوت، نفرت اور دشمنی رکھتا ہے۔

پاکستان کے سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی کتاب "Neither a back nor a dove" کی تعارفی تقریب کی دعوت بھارت کی ایک تھنک ٹینک تنظیم آبزرور ریسرچ فاؤنڈیشن کے چیئرمین سدھندرا کلکرنی (Sudheendra Kulkarni) نے دی۔ اس کتاب میں قصوری صاحب نے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے حوالے سے بہت سے حقائق بیان کیے ہیں۔ سدھندرا کلکرنی بنیادی طور پر کمیونسٹ خیالات کا حامل کالم نگار، صحافی اور سیاسی کارکن ہے۔ یہ بھارتی کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کا رکن بھی رہ چکا ہے۔ 1996ء میں یہ بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) سے منسلک ہوا، مارکسی نظریات رکھتا تھا لیکن جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ مارکسی نظریات بھارت کے لیے مناسب نہیں۔ چنانچہ اس نے ان نظریات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بھارتی سیاست دانوں کے قریب بھی رہا اٹل بہاری واجپائی کی تقاریر بھی لکھتا رہا۔ 2008ء میں لال کرشن ایڈوانی کا شریک کار بن گیا جس نے اسے سیاسی طور پر متعارف کرانے اور اوپر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2009ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) پارٹی سے علیحدہ ہوگیا۔ کو شکست ہوئی تو اس کا کردار بھی پارٹی سے ختم ہوگیا۔ لیکن 2012ء میں یہ دوبارہ بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) میں شریک ہوگیا۔ اس دوران اس نے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ

تھک ٹینک کی بنیاد رکھی اور اس کے زیر اہتمام مختلف سیاسی، نیم سیاسی اور ادبی و علمی سرگرمیاں شروع کیں۔ یہ بھارت میں ہونے والے ایک معروف اسکینڈل Cash-for-votes کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ چند روز قبل ممبئ میں اس نے خورشید قصوری صاحب کو ان کی کتاب کی تقریب رونمائی کی دعوت دی۔ بظاہر اس تقریب کا سیاست سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن بھارت کی انتہاپسند تنظیم شیو سینا کے غنڈوں نے کلکرنی کو اس تقریب کے انعقاد سے روکا اور مختلف قسم کی دھمکیاں دیں۔ بھارت کے انتہاپسندوں کی جانب سے ایسا کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ مسلسل اس قسم کی غیر اخلاقی، پاکستان دشمن حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کو بھارت کے دورہ پر خطرناک انجام کی دھمکی دے کر دورے کو ملتوی کرانا، سمجھوتا ایکسپریس کی بندش، پاکستان کے فنکاروں کے لیے بھارت میں داخلے پر انہیں دھمکیاں دینا، فن کار غلام علی کا شو ملتوی کرانا، گائیں کے گوشت پر مسلمانوں کو قتل کر دینا، جو مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں انہیں مختلف حیلے بہانوں سے پریشان کرنا اس تنظیم کا شیوہ ہے۔ مودی حکومت نے اس تنظیم کی دہشت گردی کو روکنے کے بجائے انہیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت بھی یہی کچھ چاہتی ہے جو اس تنظیم کے دہشت گرد کر رہے ہیں۔

ممبئ میں قصور صاحب کی کتاب کی تقریب کا انعقاد تمام تر دھمکیوں کے باوجود

منعقد ہوا۔ کلکرنی کا کہنا تھا کہ وہ ہر صورت تقریب کا اہتمام کریں گے۔ ان کے خیال میں 'نا دھمکی سے، نہ بندوق سے، نا گولی سے بات بنتی ہے بولی سے'۔ بات مناسب ہے کہ دھمکیاں اور دہشت گردی سے بات بگڑتی ہی ہے بنتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان مسلسل بھارت سے گفت وشنید کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے پر زور دے رہا ہے لیکن بھارت اس سے اتنا ہی دور بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تقریب کا آغاز ہونے والا تھا، مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔ تقریب کے مہمان خصوصی اور صاحبِ کتاب خورشید قصوری صاحب بھی تقریب میں پہنچے، میزبان سدھندرا کلکرنی جوں ہی تقریب گاہ پہنچے تقریب گاہ کے باہر موجود متعصب ہندو تنظیم شیو سینا کے غنڈوں نے کلکرنی کے اوپر دھاوا بول دیا، ان کے منہ پر کالا پینٹ اس طرح ملا کے ان کا پورا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ اس موقع پر انہیں زدو کوب بھی کیا گیا۔ یہ سیاہ چہرہ کلکرنی کا نہیں بلکہ شیو سینا کے غنڈوں نے بھارت کا اصلی چہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ شیو سینا کے غنڈوں نے یہ عمل کرکے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ بھارت جو سیکولرزم کا دعویٰ کرتا ہے اس کے قول و فعل میں کس قدر تضاد ہے۔ اس صورت حال کے باوجود میزبان اپنے موقف پر ڈٹے رہے، شیو سینا کے غنڈو نے کلکرنی کو 'پاکستان کا ایجنٹ' قرار دیا جس کے جواب میں کلکرنی کا کہنا تھا وہ 'پاکستان کا ایجنٹ نہیں وہ امن کا ایجنٹ ہے' (I am agent of peace not Pakistan)، وہ اپنے مقصد پر ڈٹا رہا، اس کا ارادہ مختہ اور لگن سچی تھی۔ وہ ایک علمی کام کرنے جا رہا تھا۔ شیو سینا کے

کارندے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے ، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، خورشید قصوری کی کتاب کا تعارفی پروگرام طے شدہ شیڈول کے مطابق منعقد ہوا، فرق صرف یہ پڑا کے کلکرنی کا لے منہ کے ساتھ تقریب میں بیٹھا رہا، اس نے اپنے خیالات کا اظہار بھرپار انداز سے کیا، کلکرنی کا یہ کالا منہ بھارت کے انتہا پسند و متعصب ہندوؤں کے منہ پر تماچہ تھا۔

کلکرنی کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ بھارت کے تمام ہندو شیو سینا کی سوچ اور خیال کے حامی نہیں وہاں کلکرنی جیسے اصول پسند، لبرل، انتہا پسندی، تعصب کو برا کہنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔ بھارت میں ایسے لوگ ہیں جو پاک بھارت تعلقات کو قائم رکھنے کے حامی ہیں ۔ شیو سینا کو اپنے کالے کرتوتوں پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ اس کے اس طرح کے اقدامات سے پاک بھارت تعلقات تو متاثر ہوں گے ہی ساتھ ہی دنیا کے سامنے بھارت کا امیج خراب ہی نہیں ہوگا بلکہ اسے دہشت گرد، غیر مہذب قوموں میں شامل کیا جائے گا۔ خود بھارت میں شیو سینا کے اس بے ہودہ فعل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، بہت سے لوگوں نے ، سوشل میڈیا پر، برقی میڈیا پر ، اخبارات میں لکھنے والوں نے اس عمل کی شدید الفاظ میں مذمت کی، بھارت کی سیاسی جماعت کانگریس نے اس عمل کی سخت الفاظ میں مذمت کی، بی جے پی کے رہنما ایل کے ایڈوانی نے بھی اس واقعے کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے اسے ’ بھارت کے چہرے پر سیاہی مل دینے کے

مترادف قرار دیا۔ نریندر مودی کا اس پر کیا ردِ عمل رہا اس کی باز گشت سنائی نہیں دی۔ وہ تو از خود انتہا پسند، پاکستان دشمنی کے نتیجے میں اقتدار تک پہنچا سکا ہے۔ وہ اس واقعے کی مذمت کس طرح کر سکتا ہے۔ حکومت نے شیو سینا کے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا ہے لیکن ان کے حوالے سے حکومت کا رویہ نرم نظر آتا ہے جس سے لگتا ہے کہ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی۔

اس واقعہ پر خورشید قصوری کا کہنا تھا کہ شیو سینا لوگوں کو احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے، سیاسی آزادی انہیں یہ حق دیتی ہے کہ وہ اگر اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے تو اس کے خلاف احتجاج کرتے، آواز بلند کرتے لیکن جو کچھ انہوں نے کیا برا کیا۔ ایسا ہر گز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ قصوری صاحب نے کہا کہ کتاب لکھنے کا مقصد پاکستان اور بھارت کے درمیان پائی جانے والی کچھ بڑی غلط فہمیاں دور کرنا ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں، تمام مسائل مذاکرات کے ذریعہ ہی حل ہو سکتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہو چکے ہیں، ایل او سی پر جب بھی فائرنگ ہوتی ہے پاکستان اور بھارت دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں۔ تقریب سے قبل قصور اور کلکرنی نے پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ قصوری صاحب کا کہنا تھا کہ پاکستان اور بھارت 9 مرتبہ جنگ کے دہانے پر آ چکے ہیں ہم مسئلہ کشمیر کا حل

چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں لڑنے کے لیے نہیں امن کا پیغام لے کر بھارت آیا ہوں، دونوں ممالک کے روابط ختم ہونے سے تباہی آ جائے گی۔ دونوں ممالک کے عوام کو مثبت پیغام دے کر امن قائم کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کلکرنی کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے واقعات سے دلبرداشتہ نہیں ہوں احتجاج پرامن انداز میں ہونا چاہیے میں نے کئی بار پولس اور لاٹھی چارج کا سامنا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور بھارت کے عوام ہر صورت میں امن کے خواہ ہیں۔

بھارت کی حکومت اور بھارت کے سنجیدہ طبقے کو اس قسم کے واقعات کا نوٹس لینا چاہیے، شیو سینا کے غنڈے ایسا کرکے پورے بھارت کو دنیا میں رسوا و بدنام کرنے کا باعث ہورہے ہیں ۔ بھارتی حکومت کو اس قسم کے سیاسی گروہوں پر پابندی جیسے اقدامات سے بھی ہرگز گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کے لوگ کسی بھی ملک کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انہیں ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو یہ بڑھ کر کینسر کی صورت اختیار کر لیں گے۔ ایسے ناسوروں کا قلع قمع کر دینا ہی ملک و قوم کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ بھارت کا میڈیا قابل مبارک باد ہے کہ اس نے شیو سینا کے غنڈو کو اس واقعہ پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ بھارت کی انتہا پسند جماعت شیو سینا کوئی نئی تنظیم نہیں بلکہ اسے قائم ہوئے پچاس برس ہونے کو ہیں ۔ لیکن پاکستان کے حوالے سے اس کی سوچ اور رویہ

بہت منفی رہا ہے۔ اس جماعت سے اسی قسم کے واقعات کی توقع آئندہ بھی کی جا سکتی ہے۔ بھارت کی انتہا پسند تنظیموں راشٹریہ سیوک سنگھ، وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل، ابھینا و بھارت، شیو سینا جیسے تنظیموں کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ مودی حکومت میں ان گروپوں نے قومی دھارے میں شامل ہو کر حکومت پر اثر انداز ہونے کی کوشش شروع کردی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت پھر 2002 میں گجرات میں مسلمانوں کا سب سے خوفناک قتل عام کس کی سرپرستی میں ہوا کس کو نہیں معلوم؟ وہی تو آج بھارت کے مائی باپ بنے ہوئے ہیں ۔گائے اسمگل کرنے کے الزام میں انتہا پسندوں نے ایک مسلمان نوجوان ڈرائیور نعمان جس کا تعلق سہارنپور سے تھا کو بجرنگ دل کے دہشت گردوں نے مار مار کر شہید کردیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ وہ اپنے ٹرک میں ھائیں، بھیس ایک شہر سے دوسرے شہر لے جارہا تھا۔ یہ واقعہ ہماچل پردیش میں پیش آیا۔ ان شدت پسندوں کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو بھارت میں رہنا ہے تو انہیں گائے کا گوشت کھانا ترک کرنا ہوگا۔ یہ منطق بھی خوب ہے کہ بھارت دنیا بھر میں گائیں کا گوشت سپلائی کرنے والا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے اور اپنے ملک میں مسلمانوں پر پابندی۔ اس صورت میں کلکرنی کے منہ پر سیاہی ملنے جیسے واقعات کا ہوجانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔

ادب کا نوبل انعام 2015 بیلا روس کی مصنفہ سویتلانا الیکسیاوچ کے نام

نوبل پرائز دنیا کا سب سے معروف انعام ہے جو عالمی سطح پر ہر سال چھ شعبہ جات میں بلا تفریق رنگ ، نسل ، قوم ، زبان دیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک سوئیزرلینڈ سے تعلق رکھنے والے کیمسٹ اور انجینئر ڈاکٹر الفرڈ برنارڈ نوبل (1833-1890) جس نے بارود dynamite ایجاد کیا تھا نے اپنی زندگی کے اختتام پر 9 ملین ڈالر کی رقم چھوڑی ساتھ ہی ڈاکٹر نوبل نے وصیت (will) کی کہ اس رقم سے ہر سال ''نوبل پرائزز'' (Nobel Prizes) دیے جائیں ۔اس نے اپنی وصیت میں یہ بھی لکھا کہ یہ نوبل انعام ہر سال بلا تفریق قومیت کے دیا جائے ساتھ ہی اس نے چھ شعبہ جات کا تعین بھی کیا،ان میں شعبہ جات میں 'امن، ادب، فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی یا میڈیسن اور معاشیات شامل ہیں۔ ڈاکٹر نوبل کی وصیت کے مطابق نوبل انعام بلا تفریق قوم 1900ء سے دیا جارہا ہے۔ پاکستان کی دو شخصیات کو دنیا کا یہ عالمی ایوارڈ 'نوبل پرائز' حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹر عبد السلام کو 1979 میں رائل سویڈش اکیڈم آف سائنسز نے فزکس میں اعلیٰ کارکردگی پر نوبل انعام سے نوازا، 2014 میں نارویجین نوبل کمیٹی نے بچوں کے حقوق اور تعلیم کے فروغ کے حوالے سے پاکستان کی ملالہ یوسفزئی کو نوبل انعام سے نوازا۔ملالہ دنیا کی سب کم عمر نوبل انعام یافتہ ہیں۔ نوبل

انعام ہر شعبے میں الگ الگ دیا جاتا ہے۔

اس سال (2015)کاادب کا نوبل انعام بیلا روس کی مصنفہ سویتلانا الیکسیاوچ (Svetlana Alexievich) کے نام رہا۔67 سالہ الیسیاوچ1948میں یوکرین میں پیدا ہوئیں، ان کے والد کا تعلق بیلا روس سے تھا، نوبیل کمیٹی کا کہنا ہے کہ سویتلانا الیکسیاوچ کو یہ انعالم ان کی کثیر آوازوں والی تحریروں پر Polyphonic Writings دیا گیا ہے۔ جن میں عصر حاضر کا کرب اور جرات کو موضوع بنا گیا ہے۔ ان کا پہلا ناول جو پہلی مرتبہ 1985ء War's Unwomanly Face ''جنگ کا غیر نسوانی چہرہ'' میں شائع ہوا تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کی خواتین پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس کتاب میں سو سے زیادہ ان خواتین کے انٹرویوز کیے گئے ہیں جنھوں نے نازی جرمنیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس ناول کی دو ملین سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں ، یہ ناول دنیاکے 19 ممالک میں شائع ہوا۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ جنگ کی تباہ کاریوں کے بچوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ الیکسیاوچ نے 21 دستاویزی فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ بیلاروس کی یہ خانون مصنفہ بیلا روس میں مشکلات کا شکار رہی جس کے باعث اس نے 2000کے بعد پہلے سوئیزرلینڈ میں بعد میں جرمنی کے شہر گوٹینبرگ اور برلن میں رہائش اختیار کرلی۔

سے گفتگو میں نوبل انعام حاصل کرنے والی سویتلانا SVT سوئیزر لینڈ کے چینل
'الیکسیاوچ کا کہنا تھا کہ نوبل انعام جیتنے کے بعد ان کے جذبات 'پیچیدہ
سے ہیں، مجھے بہت خوشی ہے، تاہم یہ دوسری طرف ایک لحاظ سےcomplicated
پریشان کن بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب انہیں نوبیل انعام جیتنے کی خبر دی گئی تو وہ گھر
یوں کاموں میں مصروف تھیں اور اپنے کپڑے استری کر رہی تھیں۔ جب ان سے پوچھا
گیا کہ وہ جیتی جانے والے 9 لاکھ60 ہزار ڈالر رقم کا کیا کریں گی تو انہوں نے کہا ''میں
صرف ایک کام کروں گی، اور وہ یہ کہ اپنے لیے آزادی خریدوں گی۔ مجھے کتابیں لکھتے
ہوئے بہت وقت لگتا ہے، پانچ سے لے کر دس سال۔ انہوں نے کہا میرے پاس نئی
کتابوں کے دو نئے آئیڈیاز ہیں اور اب مجھے ان پر کام کرنے کی آزادی مل جائے
کا کہنا ہے کہ اس سال کاSara Daniusگی'۔ سوئیزر لینڈ اکیڈمی کی سیکریٹری سارا دانیس
انعام حاصل کرنے والی سویتلانا الیکسیاوچ نے 40 سال سابق روس کے عوام کے
بارے میں مطالعہ کیا، یہ ناول محض تاریخی ہی نہیں ہے بلکہ اس خطہ کے لوگوں کے
بارے میں تفصیلی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ سارا نے سویتلانا الیکسیاوچ کے اس
ناول کو ایک بہترین کتاب قرار دیا اور مطالعہ کرنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ سویتلانا
الیکسیاوچ کے اس ناول 'جنگ کا غیر نسوانی چہرہ' کا مطالعہ ضرور کریں۔

نوبل انعام کا اجراء 1900ء میں شروع ہوا تھا اس وقت سے ہر سال دیگر متعین شعبہ جات میں نوبل انعام بھی دیا جارہا ہے۔ سوئیزرلینڈ اکیڈمی کی جانب سے انعام دینے والے لیے کچھ اصول و ضوابط طے شدہ ہیں ۔ جو ادیب ان شرائط پر پورا اتر تا اسے یہ انعام دیا جاتا ہے۔ 115 سالوں سے نوبل انعام کا سلسلہ جاری ہے۔اس دوران ادب کے شعبہ میں 108 ادیبوں کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ان میں سے اب تک 14 خواتین ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ سوتیلانا الیکسیاوچ 13 ویں خاتون ادیبہ ہیں جنھوں نے یہ انعام حاصل کیا ہے۔ ان سے قبل 12 خواتین ادب کا نوبل انعام حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں گرازیہ ڈیلیڈا((1926، سگریڈ انڈسیٹ 1928 پرل بک (1938)، گیبریال میسٹرال (1945)، نیلی سچز (1966)، ناڈینی غورڈیمر، (1991) ٹونی موریسن (1993)، وسلاوا سیمبوروسکا (1996)، ایلفرڈی جیلی نیک، (2004)، (2013) ، ایلیس مونرو (2009)، ہرٹا مولر (2007)، ڈورس لیسنگ اور سوتیلانا الیکسیاوچ (2015) شامل ہیں۔اس طرح ادب کی دنیا میں 14 خواتین لکھاری ایسی ہیں کہ جنھوں نے نوبل انعام حاصل کرکے تاریخ میں اپنا نام سنہرے حروف میں لکھو لیا ہے۔ جنگل بک کے مصنف رڈیارڈ کپلنگ کم عمر مصنف تھے جنہیں نوبل انعام ملا۔ ان کی عمر اس وقت 42 برس تھی۔ 2007ء میں نوبل انعام حاصل کرنے والی مصنفہ ڈورس لیسنگ عمر رسیدہ مصنفہ تھیں نہیں نوبل انعام ملا تھا۔

اس کی عمر اس وقت 88 سال تھی۔ پاکستان میں گزشتہ دنوں ایک تحریک شروع ہوئی تھی کہ امن کے نوبل انعام کے لیے عبد الستار ایدھی کو نام شامل کیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایدھی اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں نوبل انعام سے نوازا جائے۔ منتظمینِ نوبل انعام تک یہ آواز پہنچی یا نہیں، کچھ کہنا مشکل ہے۔ نوبل انعام کمیٹی کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ (14 اکتوبر 2015، E-mail:

drraissamdani@yahoo.com)

نون لیگ کا اندرونی خلفشار

پاکستان کی کوئی بھی سیاسی جماعتوں ایسی نہیں جس میں دھڑے بندی، گروہ بندی، آپس کی چپقلش نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ بعض تانگہ پارٹیاں جیسے ہمارے شیخ صاحب کی مسلم لیگ ہے، اعجاز الحق کی مسلم لیگ ہے، نیشنل پیپلز پارٹی، سندھ ڈیموکریٹک الائنس، ترقی پسند پارٹی، پاکستان وومن مسلم لیگ اور دیگر غیر معروف سیاسی جماعتیں اور گروہ۔اس طرح کی سیاسی پارٹیاں صرف اپنے بنانے والے کے گرد گھومتی ہیں جیسے شیخ صاحب کی پارٹی ان کے گرد ہی گھومتی ہے، اعجاز الحق کی مسلم لیگ کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ اس طرح کی پارٹیاں ان باتوں سے محروم ہوتی ہیں۔ اختلافات بری بات نہیں، تنقید بھی بری بات نہیں بشرطیکہ تعمیری ہو۔اسے جمہوریت کا حسن بھی قرار دیا جاتا ہے۔ حکمراں جماعت میں اگر باہمی گرہ بندی، گروپ بندی، ایک دوسرے پر رکیک سے رکیک، بھونڈے اور بیہودہ الزامات لگنے شروع ہو جائیں تو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ پارٹی کی قیادت کی گرفت اپنی جماعت پر سے کمزور ہو رہی ہے۔ پارٹی میں موجود گروہ بندی کرنے والے اپنے آپ کو طاقت ور سمجھنے لگ گئے ہیں۔ بسا اوقت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے اپنی ہی پارٹی سے جو حکمراں پارٹی ہوتی ہے زیادہ مراعات اور فوائد حاصل کرنے کا اشارہ دیا جات ہے۔ اس کے لیے پاور پالیٹکس

کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جو پارٹی کے اندر رہ کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے عمل کا نام ہے۔ ویسے پاور پالیٹکس حکمراں جماعت اپنی طاقت دیگر سیاسی جماعتوں یا مخالف سیاسی جماعتوں پر استعمال کرکے کیا کرتی ہے۔ وہ جماعتیں جو اقتدار میں نہیں ہوتیں ان میں بھی آپس میں گروہ بندی اور ایک دوسرے سے شدید مخالفت پائی جاتی ہے وہاں حکومتی طاقت کے بجائے پارٹی میں طاقت کا حصول بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد جماعتوں کو کمزور سے کمزور کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کا مسلم لیگ (ق)، پاکستان پیپلز پارٹی جیسا انجام ہو جاتا ہے۔

پاکستان مسلم لیگ (نواز) کو حکومت کرتے کئی سال ہو چکے ہیں، یہ تیسری بار وفاقی حکومت میں ہے اور پنجاب کی حکومت تو اس جماعت کے پاس عرصہ دراز سے ہے۔ نون لیگ نے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، اس پارٹی کو تتر بتر ہونا پڑا، اس کے سربراہان کو طویل عرصہ تک ملک سے باہر رہنا پڑا اس دوران اس جماعت کے اکثر لوگ ق لیگ میں چلے گئے اور کئی سال حکمرانی کا مزا لوٹتے رہے۔ بعض ثابت قدم بھی رہے۔ یہی حال پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی ہوا تھا، ذوالفقار علی بھٹو کے بعد جماعت کئی دھڑو میں تقسیم ہو گئی۔ لیکن جب وقت آیا تو دونوں جماعتوں نے یکے بعد دیگرے انتخابات میں اکثریت حاصل کی حکومت میں آگئیں۔ گویا جس جماعت پر جس قدر ظلم وزیادتی ہوتی ہے عوام میں اس کے لیے ہمدردیاں

اور بڑھ جاتی ہیں۔ ایک مثال متحدہ قومی موومنٹ یعنی ایم کیو ایم کی بھی ہے۔ اس کے ساتھ صورت حال مختلف رہی، اس پر بھی گزشتہ برسوں میں کئی بار آپریشن ہوا، کارکن مارے گئے، بھاگ گئے لیکن ہر بار جب حالات بہتر ہوئے، انتخابات میں اس جماعت نے حصہ لیا اسے پہلے سے زیادہ طاقت سے عوام نے کامیاب کیا۔ این اے 246 کا الیکشن ہمارے سامنے ہے اور اب بھی

بلدیاتی انتخابات کا نتیجہ سابقہ نتائج جیسا ہی نظر آ رہا ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت پر ظلم وزیادتی اور اس کا ردِ عمل ہم عرصہ دراز سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

میرا آج کا اصل موضوع سیاسی جماعتوں کے باہمی اختلافات نہیں بلکہ حکمراں جماعت نون لیگ کے اندر آپس کی گروہ بندی اور اختلافات ہیں۔ معمولی نوعیت کے اختلافات تو اس جماعت میں شروع ہی سے پائے جاتے ہیں۔ یعنی مسلم لیگ بطور سیاسی جماعت نام ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے اور نئی جماعت بننے کا ہے۔ میاں صاحب کی لیگ میں ٹوٹ پھوٹ کی جو بنیادی وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں تین قسم کے سیاسی لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو پرویز مشرف کی مسلم لیگ جسے ق لیگ کہا جاتا ہے میں نہیں گئے، ثابت قدم رہے، مشکلات اور ظلم وزیادتیاں برداشت کیں، جیلوں میں رہے، نواز شریف کی وفاداری کا جھنڈا تھامے رہے، ایسے لوگ تعداد میں کم ہیں۔ دوسرا گروہ ان مفاد پرست سیاست دانوں کا

ہے جو مشکل وقت میں پتلی گلی سے نکل کر حکمراں جماعت یعنی مسلم لیگ (ق) میں شامل ہو گئے ، وزیر رہے، سفیر رہے، بڑے بڑے محکموں کے سربراہ رہے، خوب مال بنایا، ہر روز کلف والے کپڑے پہن کر، کبھی سوٹ ٹائی کے ساتھ ٹی وی پر فلسفیانہ گفتگو کیا کرتے ، لگتا تھا کہ ان سے بڑھ کوئی فلسفی دنیا میں نہیں۔ پرویز مشرف کی تعریف، جدہ بھاگ جانے والوں کو برا بھلا کہتے نہیں تھکتے تھے. ان کی اکثریت آجکل کس جماعت میں ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے دیکھا کہ نون لیگ اقتدار میں آ گئی ہے وہ اِدھر ُادھر کی جماعتوں سے چھلانگ لگا کر نون لیگ کا جھنڈا ہاتھ میں تھامے اگلی صف میں جا بیٹھے۔ یا اپنی جماعت سے ناراض تھے ٹکٹ نہیں دیا گیا، حکمراں جماعت نے دانا ڈالا، فٹ آ گئے۔ رعنا ثناء اللہ بھی کبھی پاکستان پیپلز پارٹی میں تھے، کہتے ہیں کہ ٹکٹ نہیں دیا گیا ناراض ہو گئے۔ چھوٹے میاں صاحب نے تھپکی لگائی آ گئے نون لیگ میں۔ یہ سب ایک دوسرے کے کرتوتوں سے خوب خوب واقف ہیں، ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ غلطی معاف ایک گروپ میاں صاحب کے عزیز رشتہ داروں کا بھی ہے جو اس وقت بڑا مضبوط ہے اور میاں صاحب کو بہت عزیز بھی۔ یہ گروہ اپنے آپ کو شریف فیملی کا وارث سمجھتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ حکومت کرنے کا حق صرف اور صرف اسی اشرافیہ طبقے کو ہی حاصل ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ اب وزارتوں پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ صرف انہیں کا ہے۔ ان میں کچھ تو واقعی میاں صاحبان کے ددھیالی، کچھ ننھیالی اور کچھ سسرالی ہی

نہیں بلکہ میاں صاحباب کے بچوں کے سسرالی بھی بڑی تعداد میں ایسے ہیں جو خود کو اصل نون لیگ کا جاں نثار شیر تصور کرتے ہیں۔ میاں صاحباب ان تمام طرح کے گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ کریں تو آخر کریں کیا۔ سسرالیوں سے وزارت کیسے واپس لیں، سمدھی کا رشتہ تو بہت نازک ہوتا ہے، تب ہی تو اہم کام اسی کے سپرد کردیے جاتے ہیں۔

خواجہ آصف کا یہ بیان پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ان کی چودھری نثار سے گزشتہ چار سال سے کٹی ہے، بات چیت ہی نہیں ہوئی۔ چودھری نثار کا بیان تھا کہ وزارت داخلہ کو وزارت پانی، بجلی ودفاع سے کیا لینا دینا۔ ان کا فرمانا ہے کہ انہیں جی ایچ کیو سے رابطے کے لیے وزیر دفاع کے ذریعہ جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ افواج سے رابطے کے لیے کسی بھی طور وزیر دفاع کے محتاج نہیں۔ بھلا سوچئے کہ لوگ تو دونوں کو میاں صاحب کا دایاں اور بایاں بازو تصور کیے ہوئے ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے تو باقی کا تواللہ ہی مالک ہے۔ پرویز رشید کا کہنا ہے کہ ان وزیروں کے اختلافات سے حکومت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا فرمانا ہے کہ چودھری نثار اور خواجہ آصف میں ناراضگی اور بات چیت بند ہے، وزیر داخلہ اور وزیر پانی، بجلی اور دفاع میں بات چیت بند نہیں۔ خوب منطق اور لاجواب دلیل ہے۔ وزیر اطلاعات صاحب فرق پڑتا ہے، یہی فرق بڑے اختلاف کا باعث بن جاتا ہے۔ ملک کے اہم منصب پر براجمان لوگ باہم ناراض اور ایک دوسرے کی شکل

دیکھ کر کنی کاٹ جاتے ہوں تو ان کا اثر ملک کے معاملات پر پڑنا لازمی ہے۔ احسن اقبال بھی ان دنوں کچھ روٹھے روٹھے سے ہیں یا پھر بعض وزراان سے ناخوش ہیں۔کچھ نہ کچھ معاملا احسن اقبال کا بھی ہے۔ دیگر اور وزراء میں بھی سرد جنگ نظر آ رہی ہے جو کسی بھی وقت عابد شیر علی کے والد چودھری شیر علی کی دھاڑ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

عابد شیر علی، میاں صاحب کے رشتہ دار وزیر ہیں۔ یہ مخالفین پر شیر کی طرح دھاڑتے نظر آتے ہیں۔ان کا طرز گفتگو جارہانہ، ظالمانہ اور غیر شائستانہ ہوتا ہے اس میں تو دو رائے ہیں ہی نہیں۔ گزشتہ دنوں ان کے والدِ محترم چودھری شیر علی (بڑے شیر علی) کی دھاڑ سب نے سنی، دھاڑ کس کے خلاف تھی پنجاب کے وزیر اعلیٰ چھوٹے میاں صاحب کے ناک کے بال چودھری ثناء اللہ کے خلاف، ثناء اللہ کو کوئی پروا نہیں کہ لاہور سیٹلائٹ ٹاؤن کے واقعے کے اصل ذمہ داران میں ان کا نام ہے تو ہوتا رہے، چھوٹے میاں صاحب کی آشیر باد کے سامنے سب کچھ ڈھیر ہے۔۔بڑے شیر نے یہاں تک کہہ دیا کہ چھوٹا شیر (عابد شیر) بھی اپنی وزارت سے ہی نہیں نون لیگ سے بھی مستعفی ہوجائے گا۔۔بڑے شیر نے ثناء اللہ پر کیا کیا الزامات نہیں لگائے۔ انہیں پنجاب کا' لا قانون منسٹر' کہہ کر مخاطب کرتے رہے، قانون شکن منسٹر کہا اور ان پر بیس افراد کو قتل کرنے کا الزام بھی لگاڈالا۔ چھوٹے میاں صاحب کو بھی تڑی دے ڈالی کے وہ چودھری ثناء اللہ کو

نکال باہر کریں۔ انہوں نے کہا کہ میاں صاحب فیصل آباد میں آپ کا رشتہ دار ایم پی اے ہار گیا، آپ کا اسپیکر لاہور میں صرف ڈھائی ہزار ووٹ لے کر جیتا۔ بڑے شیر کے خیال میں ایسا بھی چوھری ثناء اللہ کی وجہ سے ہوا۔ جواب میں ثناء اللہ کا کہنا یہی تھا کہ بڑے شیر کی ذہنی کیفیت درست نہیں، دراصل وہ اپنے بیٹے کو فیصل آباد کا میئر بنانا چاہتے ہیں۔ بڑے شیر کی پریس کانفرنس میں رعنا افضل کے علاوہ کئی نون لیگی لیڈر بھی موجود تھے۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے۔ بڑے شیر تن تنہا پریس کانفرنس نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے دائیں بائیں کئی لیگیوں کو لیے بیٹھے تھے۔ دونوں کا تعلق پنجاب کے شہر فیصل آباد سے ہے۔ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ بلدیاتی انتخابات کے لیے اپنی اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ بلدیاتی الیکشن میں ٹکٹوں کی تقسیم میں اپنا حق تسلیم کرانا چاہتے ہیں، چودھراہٹ کی جنگ میں دونوں نے پارٹی کی ساکھ کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

نون لیگ کے اندر یہ کوئی پہلا جھگڑا نہیں اس سے پہلے بھی کئی رہنما نون لیگ سے خاموشی اختیار کر چکے ہیں۔ ممتاز بھٹو بڑے کرّوفر کے ساتھ نون لیگ میں آئے تھے اب خاموش ہیں۔ واپسی کا سوچ رہے ہیں۔ کھوسہ خاندان کے نواز لیگ سے اختلافات سب پر عیاں ہیں۔ جاوید ہاشمی کا آنا جانا شاید اب پھر سے آجانا چل رہا ہے۔ اس طرح چھوٹے موٹے بے شمار نون لیگی آپس میں ناخوش و ناراض ہیں۔

دیگر پارٹیوں کا بھی کوئی اچھا حال نہیں سب ہی میں توڑ پھوڑ، لڑائی جھگڑا، آنا جانا چل رہا ہے۔ نون لیگ کیونکہ حکمراں جماعت ہے اس کے اندر باہمی خلفشار ملک کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ ویسے ہی ملک اس وقت نازک صورت حال سے گزر رہا ہے۔ پالیسیاں کہیں اور بن رہی ہیں، ہدایات کہیں اور سے آرہی ہیں۔ جب حکمراں اندر سے کمزور ہوجائیں تو اسی قسم کی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔

سندھ میں نون لیگ کا ووٹ بنک نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ اقتدار میں آنے کے بعد قیادت کی جانب سے اس بات کی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ سندھ یا اس کے شہری علاقوں پر توجہ دی جاتی۔ جسٹس (ر) سید غوث علی شاہ نون لیگ کے پرانے حامی اور عہدیدار رہ چکے ہیں۔ ان سے نون لیگ کی قیادت کے اختلاف ہوئے، جسٹس صاحب نے کچھ ہاتھ پیر مارے، بات نہ بنی تو خاموش ہورہے پھر ملک سے باہر چلے گئے آج کل پرویز مشرف کی پارٹی کے گرد چکر لگا رہے ہیں شاید کوئی اتحاد بن جائے اور وہ اس اتحاد میں کوئی اعلیٰ منصب پا سکیں۔ سندھ میں نون لیگ کے وہ لیگی جن کو نون لیگ نے سندھ کی نمائندگی کے لیے سینٹ کا رکن بنایا، انتخابات میں بار بار ٹکٹ دیے، یہ دوسری بات کہ وہ جیت نہ سکے انھوں نے پارٹی کے اختلافات کے حوالے سے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ حال ہی کی بات ہے کہ نون لیگ کی سندھ کی صوبائی قیادت نے بلدیاتی انتخابات کے حوالے سے

اندرون سندھ کا دورہ کیا، اس دورے کی جو کہانیاں اخبارات کی زینت بنی ہیں ان کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر بلدیاتی انتخابات سندھ میں ہوتے ہیں تو نون لیگ کا کم از کم اندرون سندھ سے صفایا ہونے کا خدشہ پورا پورا موجود ہے۔ رپورٹ یہ ہے کہ نون لیگ کے ورکر یا سپورٹر صوبائی قیادت سے انتہائی نہ خوش ہیں اپنے دورے میں ان عہدیداران کو انتہائی ذلت آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لوگوں نے انہیں یکسر مسترد کردیا۔ نون لیگ کے صوبائی صدر اسماعیل راہو، سینئر صوبائی نائب صدر شاہ محمد شاہ، مرکزی نائب صدر سینئر سلیم ضیا ایڈوکیٹ اور صدر مملکت کے مشیر چوہدری طارق بھی ان دوروں میں شریک تھے لیکن یہ سب نون لیگی کارکنوں کو مطمئن کرنے میں ناکام ہوئے۔ کارکنوں نے ان رہنماؤں کے خلاف شدید احتجاج کیا، نعرے لگائے، جلسے درہم برہم کردیے یہاں تک کے کچھ کے کپڑے بھی تار تار کردئے۔ کارکن زخمی بھی ہوئے۔ کارکنوں کا کہنا تھا کہ اسماعیل راہو اور شاہ محمد شاہ برے وقت میں پارٹی چھوڑ کر دوسری سیاسی جماعت کا حصہ بنتے رہے ہیں، مختلف پارٹیوں میں بات نہ بنی تو سفارشی طور پر دوبارہ نون لیگ میں شامل ہوگئے۔ نون لیگ کی مرکزی قیادت اس صورت حال سے کس حد تک واقف ہے، اسے تصویر کا صحیح رخ دکھایا گیا ہے یا نہیں۔ اندرون سندھ یہ حال ہے تو شہروں میں بھی کچھ حال اچھا نہیں۔ کراچی کی نون لیگی قیادت ٹی وی ٹاک شو میں بیٹھ کر سب اچھا ہے سب اچھا ہے کی گردان کرتی رہے۔ اچھا کچھ بھی نہیں، سندھ کے نون لیگی سینئر تو

بن سکتے ہیں قومی یا صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات میں کسی بھی نون لیگی کے کونسلر منتخب ہونے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔

نون لیگ کو سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش ہے کہ اس نے مسلم لیگ (ق) میں شامل ہوجانے، وزارتوں کے مزے لوٹنے والوں کو نہ صرف ویلکم کہا بلکہ انہیں اپنے دیرینہ اور وفادار جنھوں نے برے وقت میں نواز شریف کا جھنڈا تھامے رکھا تھا کو پیچھے کر دیا۔ سیاسی جماعتوں میں عروج وزوال دونوں آتے ہیں۔ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ایسی پارٹیاں جو برسوں برسر اقتدار رہیں وقت کے ساتھ ساتھ ان کا صفایا ہوگیا۔ پڑوسی ملک میں کانگریس کی آج کیا صورت ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی زندگی میں اپ اینڈ ڈاؤنس آتے رہے۔ آج کل اس کا گراف نیچے کی جانب ہے۔ میاں صاحبان نے رشتہ داریوں سے بالاتر ہوکر اگر پارٹی کے معاملات کو سلجھانے کی کوشش نہ کی اور اس بات کا اکتفا کیے رکھا کہ اگر دو آپس میں بیان بازیاں کریں تو دونوں کو بیان دینے سے منع کردیں۔ اس سے بات نہیں بنے گی۔ محض بیان دے دینے سے اختلافات ختم نہیں ہوں گے۔ نواز شریف نے فرمایا کہ 'پارٹی اختلافات باہر لانے والوں کے خلاف سخت کاروئی کریں گے'۔ آخر کھچڑی کب تک اندر ہی اندر پکتی رہے گی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ابال آہی جائے گا۔ اختلافات کو باہر آنے دیں تاکہ اندر کی صورت حال سامنے آسکے، اگر

اب اس صورت حال کو روک دیا گیا تو کچھ عرصہ بعد پھر لاوا باہر آجائے گا۔ پارٹی کارکنوں میں پائی جانے والی بے چینی کو دور کریں اگر ان کی شکایات درست ہیں تو انہیں دور کرنے کے احکامات جاری کریں۔ خوشامدی ٹولا اقتدار کے مزے لے رہا ہے، پارٹی کو مستحکم کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں۔ ایک شیر آپ کا رشتہ دار ہے دوسرا شیر چھوٹے میاں صاحب کا لاڈلا ہے۔ مقابلہ سخت ہے، فیصل آباد کو شیروں کی آپس کی لڑائی سے بچائیں۔ ان دونوں شیروں کا عمل پارٹی کے لیے نقصان کا باعث ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھ کر دیگر شہروں میں بھی چھوٹے بڑے شیر دھاڑنا شروع کر دیں گے جس سے پارٹی کو نقصان کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ (22 اکتوبر 2015، مصنف سے رابطے کے لیے 03332142076 اى میل: drraissamdni@yahoo.com سیل:)

نواز اوباما ملاقات ۔ کیا کھویا، کیا پایا

(روزنامہ جناح، اسلام آباد، لاہور، کرچی میں 28 اکتوبر 2015 کو شائع ہوا)

پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے مختصر وفد اور چند اہل خانہ کے ہمراہ امریکی صدر بارک اوبامہ کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا۔ میاں صاحب کو وزیر اعظم کی حیثیت سے دوسری بار وائٹ ہاؤس مدعو کیا گیا تھا۔ اس پر میاں صاحب زیادہ خوش نظر آئے۔ بیرون ممالک کے دورے سربراہان مملکت کے لیے کوئی خاص بات نہیں ، تمام ممالک کے سربراہان اس قسم کے دورے کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے ملک کے سربراہان زیادہ ہی بیرون ممالک کے دوروں کے عادی ہیں، یہ دورے کبھی سرکاری اور کبھی نجی ہوتے ہیں۔ دورہ کوئی سا بھی ہو اس پر قوم کا سرمایہ ہی صرف ہوتا ہے۔ ایک روایت ہمارے سربراہان کی یہ بھی رہی ہے کہ یہ سرکاری دورے پر اپنے ہمراہ پوری بارات لے کر سفر کرنے کے عادی تھے۔ صحافیوں کی پوری ٹیم، میڈیا پرسنز کی ٹیم، کیمرہ مین ، اینکرپرسنز، وزیر ، سفیر، سیکریٹری ، اہل خانہ ، خاص طور پر خاتون اول اور جو قریب ہوا دورے کا ساتھی ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے پورا پورا جہاز وقف ہوجایا کرتا۔ بھلا ہو الیکٹرانک میڈیا کا کہ اس نے واویلا اور شور شرابا کرکے، بڑے بڑے وفد میں

شامل لوگوں کے نام اور تصاویر عام کیئے، تجزیہ نگاروں کی جانب سے سخت تنقید کی گئی جس نے سربراہان کو اپنے سرکاری دورے میں مختصر ٹیم لے جانے کا عادی بنادیا۔ ورنہ تو ہر دورے میں گیارہ گیارہ کھلاڑیوں کے دو ٹیمیں بشمول اپنی پسند کے امپائر، کمنٹریٹر اور کورج کرنے والے صحافی و کیمرہ مینوں کا گروہ ساتھ ہوا کرتا تھا۔

بارک اوباما سے ملاقات کی جو تصویریں اور ویڈیوز سامنے آئی ہیں انہیں دیکھ کر میاں صاحب اور اوباما کی باڈی لینگوئج کا بغور مطالعہ بتا رہا ہے کہ وقت ملاقات میاں صاحب کے چہرہ پر مصنوعی ہنسی تھی۔ وہ مصنوعی ہنسی کو کچھ زیادہ ہی طول دے گئے۔ جب کہ اوباما کے چہرے کی دھیمی مسکراہٹ اندر سے یہ کہہ رہی تھی کہ ' میاں صاحب کیوں مصنوعی ہنسی ہنس رہے ہو، اصل بات کرو'۔ اوباما سے ساتھی وفد کے اراکین کے تعارف کا منظر بھی دیدنی تھا۔ میاں صاحب کے قریبی وزراء اور مشیران ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے، میاں صاحب باری باری ان کا تعارف اوباما سے کراتے جاتے اور ان کے بارے میں مختصر بتا رہے ہوں گے۔ سب سے پہلے مشیر خارجہ جنہیں امریکہ جانا اس وجہ سے مہنگا پڑا کہ میاں صاحب جاتے جاتے خاموشی سے کیبنٹ ڈویژن کو کہہ گئے کہ ہماری غیر موجودگی میں سرتاج عزیز سے ایک وزارت (National Security Affairs) واپس لے کر لیفٹیننٹ جنرل (ر) ناصر جنجوعہ کے حوالے کر دینا اور ایسا ہی ہوا۔ سرتاج عزیز گئے تو

تھے مشیر خارجہ و قومی سلامتی کے امور کے مشیر کی حیثیت سے جب واپس وطن آئے تو صرف مشیر برائے امور خارجہ تھے۔ تو یہ دورہ سرتاج عزیز کے لیے خسارے کا سودا ثابت ہوا۔ آگے بڑھیں تو جناب وزیر دفاع و پانی و بجلی کے وزیر خواجہ آصف صاحب تھے اور ان کے بالکل برابر

کندھے سے کندھا ملائے ہوئے وزیر داخلہ قبلہ چودھری نثار اس طرح اکڑے کھڑے تھے کہ نظریں دونوں کی اوباما پر گڑی ہوئی تھیں۔ اندر ہی اندر ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے بچو دیکھ لوں گا، میاں صاحب کے کہنے پر میں تیرے برابر کھڑا ہوگیا ہوں ورنہ میری تو تجھ سے چار سال سے بات چیت بند ہے۔ ساتھیوں میں سمدھی جی نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے۔ خیر چھوڑیں اس معاملے کو یہ ہمارا اندرونی معاملا ہے۔ بقول وزیر اطلاعات قبلہ پرویز رشید صاحب ' بات چیت خواجہ آصف اور چودھری نثار کے درمیان بند ہے، وزیر دفاع اور وزیر داخلہ کے درمیان تو نہیں'۔ یہ بات بھی درست ہے۔ اقتدار کی ہانڈی میں ساجا ہے، ذاتی طور پر ایک دوسرے کے ہرجائی ہیں۔ زرا غور کریں کہ ہم اگر کسی کانفرنس میں جاتے ہیں باقاعدہ تقریب سے قبل آپس میں بے شمار مسائل پر بات ہوتی ہے، صلاح و مشورے ہوتے ہیں، حکمت عملی پر بات ہوتی ہے کہ کب کس وقت کیا کرنا ہے، کس کو کیا کرنا ہے، جب سینئر وزیروں میں بات چیت نہیں تو کیا خاک صلاح و مشورہ ہوا ہوگا۔ حکمت عملی پر گفتگو ہوئی ہوگی۔ جہاں چودھری نثار نے کچھ کہنا تھا

انھوں نے لکھا ہوا پڑھ دیا جہاں خواجہ آصف نے اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا وہاں انھوں نے کر دیا۔ بات ختم۔

میاں صاحب کی ظاہری شخصیت بڑی جاذب نظر ہے، گورے چٹے، دراز قد، کھلا کھلا چہرہ، وہ سیاست بھی خوب کرتے ہیں، تب ہی تو چوتھی باری کے خواب دیکھنا شروع کردیے ہیں۔ اگر انصاف کی بات کی جائے تو میاں صاحب بیرون ملک کے سربراہان سے ملاقات میں کمزور ہیں۔اس کی وجہ غالباً ان کا انگریزی زبان پر عبور حاصل نہ ہونا ہے۔انھوں نے اپنی اس کمزوری پر توجہ بھی شاید نہیں دی، اس مرتبہ بھی وہ پوری کوشش کے باوجود اپنے ہاتھ میں موجود پرچی کو چھپا نہیں سکے۔ یہ پرچی بڑی ظالم چیز ہے، بندے کا کام بناتی بھی ہے اور بگاڑ بھی دیتی ہے۔ کسی بھی موقعہ پر جب میاں صاحب دیکھ کر تقریر کرتے ہیں یا گفتگو کرتے ہیں وہ بھی انگیزی زبان میں تو ذوالفقار علی بھٹو یاد آجاتے ہیں، کیا ادا تھی، کیا روب و دبدبا تھا اور کس خوبصورتی سے سامنے موجود امریکی یا انگریز کو شیشے میں اتارا کرتے تھے، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس نے جو بہادری دکھائی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔بینظیر کا تو مقابلہ ہی نہیں، اس کے اندر ایک وقار تھا، کانفیڈنس تھا، گفتگو کا سلیقہ تھا، انگریزی پر مکمل عبور، لہجہ، انداز اور ادائیگی، انتہائی خوبصورت، دلنشیں، جاذب نظر اور پھر اس کی شخصیت میں سحر تھا۔ اسی طرح گفتگو کرنے، قائل کرنے، متاثر کرنے میں جنرل پرویز

مشرف کا بھی جواب نہیں ۔ ان کا انداز، حافظہ، الفاظ کا استعمال سامنے والے کو تڑپا دیا کرتا تھا۔ اختلافات اپنی جگہ لیکن قائدِ اعظم ، قائدِ ملت کے بعد پاکستان کے یہ تینوں سربراہان انگریزی زبان میں فلبدی تقریر کرنے اور سامنے والے سے گفت و شنید کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ کہنے والوں نے کہا، لکھنے والوں نے لکھا میاں صاحب کو یہ بات اچھی لگے یا بری کہ میاں صاحب سے بہتر ان کی صاحبزادی مریم نواز نے امریکی خاتون اول مشیل اوباما کے ساتھ گفتگو اور صحافیوں کے سامنے زیادہ کانفیڈینس کا مظاہرہ کیا۔ بہت ممکن ہے کہ نواز لیگ مستقبل میں نواز شریف اور شہباز شریف کے بیٹوں کے بجائے مریم نواز کو اپنا لیڈر بنالے۔ اس لیے کہ دونوں میاں صاحبان کی نرینا اولادیں سیاست میں تو ہیں ان کی سوچ سطحی ہے، اور شخصیت میں لیڈری والا حسن دکھائی نہیں دے رہا۔ اس لیے امکانات یہی ہیں کہ نواز لیگ کی آئندہ کی صف اول کی لیڈر مریم نواز ہو سکتی ہیں جن کے مدِمقابل آصفہ بھٹو زرداری یا فاطمہ بھٹو میدان سیاست میں ہوں گی ۔ پاکستان کے مستقبل کی سیاست میں ان خواتین کے صف اول میں آنے کے آثار نمایاں ہیں۔ کون آگے جاتا ہے یہ کہنا قبل از وقت ہے۔

وزیر اعظم نواز شریف اور امریکی صدر بارک اوباما کے درمیان ہونے والی ملاقات کے نتیجے میں جو مشترکہ اعلامیہ سامنے آیا ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو چند اہم باتوں کے سوا کوئی خاص بات سامنے نہیں آتی۔ البتہ دورے سے قبل

جن خدشات کا ذکر کیا جارہا تھا کہ امریکہ ان امور پر پاکستان کی گرفت کرے گا، ڈو مور کرنے کو کہے گا، جیسے بھارت میں دہشت گردی، افغانستان کی جانب سے دباؤ اور جوہری صلاحیت کو کم سے کم کرنا شامل تھا کسی ایک پر بھی امریکہ کی جانب سے کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ سب سے اہم خدشہ یہ تھا کہ اوباما بہادر نواز شریف سے کہیں گے کہ پاکستان اپنا ایٹمی پروگرام کو ختم نہیں تو محدود کردے۔ لیکن اس دورے میں دونوں رہنماؤں کی جانب سے اس قسم کی کوئی بات سامنے نہیں آئی جو ایک اچھی اور پاکستان کے لیے مثبت بات ہے۔ مشترکہ اعلامیہ دس نکات پر مشتمل ہے ان میں (۱) دیر پا شراکت داری (An Enduring Partnership) یعنی دونوں ممالک مختلف شعبوں میں دیر پا شراکت داری قائم کریں گے۔ (۲) اقتصادی نمو (Economic Growth) امریکہ پاکستان کے ساتھ اقتصادی میدان میں تعاون جاری رکھے گا۔ تاکہ پاکستان کی معیشت مستحکم ہوسکے۔ (۳) تجارت اور سرمایہ کاری (Trade, and Investment) امریکہ پاکستان کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری میں تعاون کرے گا، سرمایہ کاری اور تجارت سمیت تمام شعبوں میں تعاون کے فروغ کے لیے دوطرفہ اقدامات پر اتفاق کیا گیا۔ (۴) تعلیم اور سوسائٹی میں تعاون (Education and Civil Society Cooperation)، تعلیم کے شعبہ میں امریکہ اپنا تعاون نہ صرف جاری رکھے گا بلکہ اسے وسعت دی جائے گی۔ (۵) موسمیاتی تبدیلی و توانائی میں تعان (Climate Change and Energy) امریکہ موسمیاتی تبدیلی اور توانائی کے شعبہ میں پاکستان سے تعاون بڑھانے کی ضرورت

۔ (۷)علاقائی سا(Promoting Global Health) ہے، (۶) عالمی صحت کا فروغ
(Regional Security and لمیت اور انسدادِ دہشت گردی
Counterterrorism) امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف پاکستان کی کوششوں کو
سائیبر تحفظ (۹) ،(Defense Cooperation) سراہا، (۸) دفائی تعاون
(Cybersecurity)، (۱۰)(Strategic جوہری سلامتی اور جوہری عدم پھیلاؤ
Stability, Nuclear Security, and Nonproliferation) شامل ہیں۔
دونوں سربراہان کی ملاقات میں باہمی تعاون کو بڑھانے پر اتفاق کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھارت کی جانب سے کنٹرول لائن کی مسلسل خلاف ورزیوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا، اس کے علاوہ افغانستان اور طالبان کے مذاکرات پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف شعبوں میں تعاون بڑھانے کے علاوہ اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ امریکہ پاکستان کو آٹھ نئے ایف سولہ طیارے فروخت کرے گا۔ امید ہے اس دورے سے دونوں ملکوں کے درمیان تعاون بڑے گا اور اعتماد کی فضاء قائم ہو گی۔
عمومی طور پر تو نواز شریف کا امریکہ کا یہ پھیرا کامیاب ہی رہا۔ البتہ امریکہ نے واضح طور پر بھارت کی جانب سے کی جانے والی دہشت گردی کے لیے بھارت کو ایسے اقدامات سے روکنے کی کوئی بات نہیں کی لیکن دونوں ممالک یعنی پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری کے لیے کردار ادا کرنے کا عندیہ دیا ہے، جو سابقہ وعدوں کی طرح صرف عندیہ ہی رہے گا۔ بھارت کے افغانستان میں

بیٹھ کر کراچی اور بلوچستان میں پاکستان دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونے، کشمیری مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھانے جیسے اہم امور پر امریکہ نے کوئی واضح حکمت عملی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ امریکہ آسانی سے بھارت کو پاکستان میں عدم استحکام کی کارروئیوں کو روکنے کو کہہ سکتا ہے۔ وہ بھارت کو جو پاکستان سے مذاکرات سے دور بھاگ رہا ہے مذاکرات پر آمادہ کر سکتا ہے۔ البتہ اس نے آپریشن ضرب عضب کے نتیجے میں ہونے والی کامیابیوں کو خوش آئند قرار دیا ہے۔ وزیر اعظم نے امریکی وزیر دفاع سے بھی ملاقات کی، وزیر دفاع نے دہشت گردوں کے نیٹ ورک کے خاتمے کے لیے پاکستان کی کوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف پاک فوج کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ وزیر دفاع کارٹر نے دہشت گردوں کے نیٹ ورک ختم کرنے میں پاکستان کے اقدامات کی تعریف کی اور پاک فوج، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور عوام کی قربانیوں کو سراہا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اوباما انتظامیہ نے 2016ء کے لیے پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف کروئی کے لیے کولیشن سپورٹ فنڈ جاری رکھنے کے لیے کانگریس کو درخواست بھیج دی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کے مستقبل پر کچھ بھی کہنے سے انکار بھی کر دیا ہے۔ امریکہ کی پاکستان کے لیے نوااز شریف کے دورہ پر نرم اور لچک دار پالیسی ایک سوالیا نشان ہے۔ امریکہ کچھ عرصہ قبل ہی بھارت کے ساتھ پینگیں پڑھاتا نظر آ رہا تھا، یہ وہ امریکہ ہے جس نے ہمیشہ پاکستان کو وقت پر دھوکہ ہی دیا ہے۔ اس سے اچھائی کی امید کرنا حماقت سے کم

نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اوباما کی واپسی نذدیک ہونے کے باعث اس نے اپنی پالیسی وقتی طور پر نرم اور لچک دار کردی ہو، امریکہ سے ہمیں کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ امید کی جانی چاہیے کہ دونوں سربراہوں کے اس دورے سے خطے میں امن و سلامتی اور استحکام کی راہ ہموار ہو گی۔

ممتاز مفتی۔ شخصیت نگار، کہانی و افسانہ نگار

ممتاز مفتی کہانی، افسانہ اور شخصیت نگاری کا خوبصورت حوالہ ہیں۔انہوں نے جس شخصیت کو بھی اپنا موضوع بنایا اسے اِس خوبصورتی اور اچھوتے پن کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ وہ شخصیت اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گئی۔ ممتاز مفتی نے شخصیت نگاری، خاکہ نویسی کو ایک نئی ہیئت دی، انداز دیا، ایک نیا اسلوب دیا۔ مَیں ممتاز مفتی کا پیرو کار اس اعتبار سے ہوں کہ ممتاز مفتی شخصیت نگاری کے فن کے استاد ہیں اور میں بھی اس شعبے میں گزشتہ تین دہائیوں سے ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں، شخصیت نگاری، خاکہ نگاری کا ایک طالب علم ہوں، میں نے ممتاز مفتی کو پڑھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا، اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے روحانی استاد ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ آج میرا موضوع ممتاز مفتی ہیں۔ ان پر لکھنے کی ابتدا ان ہی کی کہی ہوئی بات سے ہی شروع کرونگا، ممتاز مفتی کا کہنا تھا کہ ’ آپ کو صرف اس شخصیت پر لکھنے کا حق حاصل ہے جس کے لیے آپ کے دل میں جذبہَ احترام ہے‘۔ میں ممتاز مفتی کی اس بات کی سو فیصد تائید کرتا ہوں، میری اپنی رائے بھی یہی ہے اور میں نے اپنے تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ شخصیات کو اپنا موضوع بنانے والوں کو انہی لوگوں پر قلم اٹھانا چاہیے جن کے لیے ان کے دل میں محبت، اِحتِرام، عزت، توقیر اور حُرمت کا جذبہ پایا جاتا

ہو۔ الحمد اللہ مَیں نے اب تک بے شمار احباب کی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا، ان میں شاعر، ادیب، مصنفین، سماجی شخصیات، سیاسی شخصیات، اپنی ماں اور اپنے باپ کے علاوہ بعض عزیز و رشتہ داروں پر لکھ میرے دل میں ان کے لیے یہی جذبہ تھا۔ اردو کا یہ مایۂ ناز افسانہ نگار، خاکہ نگار اور سفر نامے لکھنے والا ادیب و قلم کار 27 اکتوبر 1995ء میں ہم سے جدا ہوا لیکن اس کی تحریریں آج بھی ادب کی دنیا میں روشن اور تازہ ہیں۔ میرے دل میں ممتاز مفتی کے لیے جذبہ احترام ہے، اسی جذبے نے مجھے آج ممتاز مفتی کو اپنا موضوع بنانے کا حوصلہ دیا۔ ویسے بھی میری سوچ یہ ہے کہ جن بھلے لوگوں کو میں نے دیکھا ہے، ان سے کچھ سیکھا ہے، انہیں پڑھا اور ان کی شخصیت اور ان کی تحریر سے کچھ حاصل کیا ہے، انہیں اپنی زندگی کی کتاب میں شامل کرلینا ادب اور ادیب کی خدمت میں اپنا حصہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اسی حوالے سے مَیں نے کبھی کہا تھا ؎

جن کو کبھی دیکھا ہے اپنی حیات میں

قلم بند انہیں کر رہا ہوں زندگی کی کتاب میں

ممتاز مفتی نے 90 برس عمر پائی۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، اتار چڑھاؤ، غریبی امیری، اچھا برا ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے سو ممتاز مفتی نے مشکل وقت بھی دیکھا اور خوش باش بھی بہت رہے۔ قلم کی مزدوری نے انہیں

عزت دی اور مالی خوش حالی سے بھی نوازا۔ میرے لیے یہ لمحات خوشی کے ہیں کہ میں ممتاز مفتی جیسی علمی و ادبی شخصیت کو اپنی زندگی کی کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق ممتاز مفتی اُردو دنیا کے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو بحث کو محبت کی نہیں ادب کی قینچی شمار کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو صاحب نظر بھی نہیں کہتے بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ ان کا علم خام ہے'۔ چنانچہ میں نے اپنے خام علم کی بنیاد پر اپنے اس روحانی استاد کو خراج تحسین پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مفتی کا کہنا تھا کہ 'وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ وہ ان میں سے ہیں جن پر زندگی گزرتی ہے'۔ ان کا کہنا ہے کہ راستے آتے گئے اور وہ انہیں ناپتے گئے۔ حتیٰ کہ ادب کی دہلیز پر بھی وہ اَن جانے میں آ پہنچے۔ اور پھر ایسے جوہر دکھائے کہ اپنا ایک الگ نام پیدا کیا۔

ممتاز مفتی کو میں نے دیکھا اور اس کی کہانیاں، افسانے، شخصی خاکے اور مضامین پڑھے اور انہیں حقیقت کے قریب پایا۔ ممتاز مفتی کا انداز اچھوتا ہے، نرالا ہے، پڑھنے والوں کو وہ بور نہیں کرتا۔ اگر کسی شخصیت کو متعارف کراتا ہے تو وہ پورے مضمون میں سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ممتاز مفتی کا کہنا درست ہے کہ' وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اس میں اس کی نگاہ شامل ہوتی ہے۔ اسے جو کچھ نظر آتا ہے وہ وہی لکھتا ہے، نیز اس نے کبھی

حتمی سچائی پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا بس اس نے تو اپنا سچ لکھا ہے'۔ڈاکٹر اسلم فرخی کا خیال ہے کہ ' سچا فنکار نثر لکھے یا شعر کہے۔ لفظ لفظ سے روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے'۔ ممتاز مفتی کے خاکوں میں لفظوں کی مدھر مدھر جھنکار پڑھنے والے کو مسرور کر دیتی ہے۔ان کا صاف ستھرا، نکھرا نکھرا لہجہ شخصیت کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ مفتی کا کہنا ہے کہ کسی بھی ادیب میں تین خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں حس، شدت اور تضاد۔ ممتاز مفتی نے اپنے ایک مجموعے میں زیادہ تر ادیبوں کو اپنا موضوع بنایا، چنانچہ اس نے اس مجموعے کا نام ہی ''اوراوکھے لوگ'' رکھا۔ ان میں انور سدید، احمد بشیر، مسعود قریشی، آذر ذوبی، مظہر الاسلام ، اشفاق احمد ، ثاقبہ رحیم الدین، الطاف توہر، ابن انشاء، الطاف گوہر، بانو قدسیہ، بشریٰ رحمٰن ، ادا جعفری، عزیز ملک، پروین عاطف،
پرروہیلہ، حسام الدین راشدی، سرفراز اقبال، روشن سبطین، سجاد حیدر، فکر تونسوی، قدرت اللہ شہاب اور وہ خود ممتاز مفتی شامل ہے۔ شخصیات کی اس فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ممتاز مفتی کو ادبی شخصیات سے کس قدر انس اور لگاؤ تھا۔ وہ ان کا کتنا احترام اور ادب کیا کرتا تھا۔ باوجود اس کے کہ بعض قد وکاٹ میں اس سے کہیں کم ہیں لیکن ممتاز مفتی نے انہیں بھی عزت دی، توقیر دی، احترام دیا۔
ممتاز مفتی کا اصل نام 'ممتاز حسین' ہے لکھاری کی حیثیت سے وہ ممتاز مفتی

ہیں۔ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے شہر بٹالہ میں 12 ستمبر 1905ء کو پیدا ہوئے 90 سال بعد 27 اکتوبر 1995 ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے اجداد مغلوں کے دربار میں میر منشی تھے، یہ وہ دور تھا جب میر منشی ہونا اعزاز و توقیر کی بات ہوا کرتی تھی۔ ان لوگوں کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ان کے اجداد کو مفتی کا لقب ملا۔ اسی مناسبت سے ان کا خاندان اپنے نام کے ساتھ مفتی لگانے لگا۔ ممتاز حسین نے بھی انہی کی پیروی کی اور وہ ممتاز حسین سے ممتاز مفتی ہوگئے۔ان کے والد اسکول ٹیچر تھے بعد میں صدر مدرس بنے۔ ممتاز مفتی نے میٹرک وہیں سے کیا، بی ڈی پی کالج انبالہ، ہندو سبھا کالج امرتسر وار پھر اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ رہے 1929ء میں بی اے پاس کیا۔ ابتدا میں اسٹینو گرافر رہے لیکن کا مزاج دفترانا نہ تھا، والد استاد تھے یقینا ان سے متاثر ہوں گے تب ہی تو ملازمت کے دوران فن معلّمی سیکھنے کی فکر میں رہے اور سینٹرل ٹریننگ کالج سے بی ٹی کر لیا اور اسی کی بنیاد پر اسکول ٹیچر بن گئے۔استاد کی حُرمَت، عظمت، مرتبہ، عزت و احترام اور بڑائی اپنی جگہ ساتھ ہی یہ عمل استاد کو متبع و فرمانبرداری کے بجائے حکمرانی کی عادت ڈال دیتا ہے ۔ مغل حکمراں اورنگ زیب نے جب اپنے باپ شاہ جہاں کو قید میں ڈالا دیا تو باپ نے اپنے حاکم بیٹے اورنگ زیب سے التجا کی کہ اُسے قیدی کی حیثیت سے بچوں کو پڑھانے کی اجازت بخشی جائے تو اورنگ زیب نے اپنے قیدی بیٹے شاہ جہاں سے کہا تھا 'ابا جان ابھی طبیعت سے حکومت

کی بو نہیں گئی'۔ ممتاز مفتی بھی احکامات پر عمل کرنے کے بجائے احکامت دینے کی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بھلا دفتری کی نوکری کیوں جاری رکھ سکتے تھے۔استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز مفتی میں مطالعے کا شوق پیدا ہوچکا تھا۔ اور وہ لکھنے کی جانب بھی مائل ہوچکے تھے۔ ان کے ایک ساتھی میاں حفیظ الرحمٰن کی صحبت نے انہیں آکسفورڈ ڈکشنری پڑھنے کی لت ڈالی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وہ اپنے والد سے ملاقات کے لیے ملتان جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات ادب کی معروف شخصیت ن م راشد سے ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کا کہنا ہے کہ ' اس وقت ن م راشد 'نذر محمد تھے اور میں ممتاز حسین تھا'۔ راشد اور مفتی کے والد محکمہ تعلیم میں تھے۔ دونوں کے والد کا تعلق ان دونوں کی قربت کا باعث بنا اب مفتی کی ادبی صلاحیتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ راشد اردو جریدے 'نخلستان' کے مدیر ہوگئے اور انھوں نے مفتی کو' نخلستان 'میں لکھنے کی جانب مائل کیا۔صلاحیت تو تھی ہی صحبت نے اسے چار چاند لگا دیے۔ مفتی تو پہلے ہی لکھاری ذہن رکھتے تھے، انھوں نے ایک اردو فلم 'ہٹیلی دلھن' پر طنزیہ مضمون لکھا۔ یہاں سے مفتی کے لکھنے کی باقاعدہ شروعات ہوئی، اس کے بعد ایک اور مضمون 'الجھاؤ' لکھا، ادبی جریدہ 'ادبی دنیا' کے سالنامے میں مفتی کا پہلا افسانہ 1936ء میں 'جھکی جھکی آنکھیں' شائع ہوا۔ اب مفتی باقاعدہ افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ دلی سے شائع ہونے والے جریدے 'ساقی' میں کہانیاں شائع ہونے لگیں۔لکھنے کے ساتھ ساتھ اس دور کی ادبی شخصیات سے بھی راہ ورسم

خوب بڑھ چکی تھی، ان میں عاشق بٹالوی، صلاح الدین، میرا جی، شاہد احمد دہلوی اور دیگر شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کرشن چندر، عصمت، فیاض محمود، بیدی، منٹو اور غلام عباس کی تحریریں مختلف ادبی رسائل کی زینت بن رہی تھیں۔ ایسے میں ممتاز مفتی بھی کہانی نویسوں اور افسانہ نگاروں میں اپنا نام شامل کرانے میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی فیض اور احمد ندیم قاسمی بھی میدان میں آگئے۔ اب مفتی کی مقبولیت عام ہوچکی تھی۔ ان کی کہانیوں ااور افسانوں کو پسند کیا جانے لگا تھا۔ ممتاز مفتی نے اسکول کی ملازمت کو خیر باد کہا اور ریڈیو میں ملازم ہوگئے۔ ممتاز مفتی کا پہلا مجموعہ 'ان کہی' شائع ہوا۔ 1947ء میں اپنی فلم 'سلطانہ رضیہ' فلمانے بمبئی چلے گئے۔ لیکن ان کا دل وہاں نہ لگا اور وہ واپس پاکستان چلے آئے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے انہیں صحیح سمت دکھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے لیے ممتاز مفتی کا کہنا ہے کہ'. اشفاق اور قدسی میر دامن خوشی تیپیپءہ'۔ وہ ہفتہ وار' استقلال 'ہوائی فوج اور آزاد کشمیر ریڈیو اور اس کے بعد شعبہ اطلاعات سے وابستہ ہوگئے۔ اس وقت تک ان کی کئی کہانیوں کے مجموعے چھپ چکے تھے ان میں گہما گہمی، غبارے، چپ، اسمارائیں، نظام سقہ شامل تھے۔ 1961ء میں ان کی ایک دھماکہ خیز تصنیف سامنے آئی جس نے ممتاز مفتی کو دنیائے ادب میں ایک منجھے ہوئے لکھاری کے طور پر پیش کیا وہ تھی 'علی پور کا ایلی'، یہ ایک ضخیم کتاب تھی جسے معروف ادیب اشفاق احمد نے شائع کیا

تھا۔ ان کی ایک اور کتاب 'گڑیا گھر' بھی شائع ہوا۔

ممتاز مفتی کی شخصیت کی تصویر احمد بشیر نے کچھ اس طرح کھینچی ہے 'ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے، چھوٹے قد کا منحنی چہرہ، گدلی گدلی بے جان آنکھیں اور بڑا سا سر'۔ شخصیت کے بارے میں ممتاز مفتی کہ کہنا ہے انسان کی شخصیت ایک گورکھ دھندہ ہے۔ ایک ایسا الجھاؤ جس کا سرا نہیں ملتا۔ میری دانست میں انسانی شخصیت کو پیاز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، فرد کی حیثیت چھلکے کی ہے۔ چھلکے ہی چھلکے، چھلکے ہی چھلکے یہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے، ایک دوسرے کی شکل قطعی طور پر مختلف اگرچہ بظاہر سب ایک سے نظر آتے ہیں۔ فکر تونسی پر لکھے گئے اپنے خاکے کا عنوان ہی مفتی نے پیاز کا 'چھلکا' رکھا ہے اور اپنے شخصی مضامین کے مجموعے کا نام 'پیاز کے چھلکے' رکھا۔ انسان کی شخصیت کی دوسری مثال ممتاز مفتی انسانی شخصیت کو جادوگر کے ڈبے سے دیتے ہیں۔ ایک ڈبہ کھولو تو اندر سے دوسرا ڈبہ نکل آتا ہے۔ دوسرا کھولو تو تیسرا نکل آتا ہے تیسرا کھولو تو چھوتا۔ ڈبے میں ڈبہ، ڈبے میں ڈبہ'۔ واقعی انسان شخصیت کی مثال کچھ ایسی ہی ہے جو ممتاز مفتی نے بیان کی ہے اور جب میں نے ممتاز مفتی کو بہ حیثیت ایک شخصیت کے مطالعہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے بھی اس کی شخصیت پیاز کے چھلکے کی مانند ہی لگی، ایک چھلکے پر دوسرا اور دوسرے پر تیسرا، آخر میں سفید خوبصورت لکیریں گول دائرے ہی گول دائرے لیکن ممتاز

مفتی کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ اس کی بعض باتوں سے اختلاف بھی کیا گیا، یہاں انہیں بیان کرنا مناسب نہیں، جو ادب تخلیق ہوا وہ کیا ہے، ذاتی زندگی میں اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی جو قابل گرفت ہو سکتی ہے تو اس کی گرفت ضرور کی گئی۔ مثلا قدرت اللہ شہاب کا ممتاز مفتی کے بارے میں کہنا تھا کہ 'مفتی کی دوستی ایک لاعلاج پھوڑا ہے، اس کی ٹیسوں میں لذت ہے'۔ مفتی کو کبھی موسیقی کا بھی سوق چڑھا رہا، اس کی تحریر کے کئی رنگ ہیں۔ گلاب کے پھول کی طرح حسین، چنبیلی کی طرح بھینی بھینی، موسم سرما کی سرد ہواؤں کی طرح سرد۔برف کے گالوں کی طرح سفید اور حسین۔ مفتی کی تحریر اپنے قاری کو مصنوعی ہنسانے کی کوشش بھی نہیں کرتی ، بلکہ عام سے بات، عام زبان میں جو پڑھنے والے کو سوچنے کی جانب مائل کرتی ہے۔ ان کی معروف تخلیقات میں علی پور کا ایلی، انکھ نگری،اوکھے اولڑے ،اور اوکھے لوگ،پیاز کے چھلکے، مہندی والا ہاتھ ،چپ، رام دین ، غبارے، لبیک، ان کہی،تلاش اور مفتیانے شخصیت نگاری۔ مضامین) شامل ہے۔)

عمران خان اپنی نجی زندگی کی دوسری اننگ میں کلین بولڈ

تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان اپنی نجی زندگی کی دوسری اننگ میں بھی کلین بولڈ ہوگئے۔ یہ اننگ جنوری 2015 ء کو شروع ہوئی تھی صرف نو ماہ جاری رہی اس اعتبار سے یہ بہت ہی مختصر اننگ رہی۔ کپتان کی پہلی اننگ 9 سال جاری رہی تھی، گویا 9 کا ہندسہ کپتان کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ کپتان کی پہلی شریک سفر ایک مالدار باپ کی بیٹی تھی ، جمائیماخان، لیکن متعدد وجوہات کے باعث وہ خان صاحب کے ساتھ چل نہیں سکی، اور نو سال بعد اس اننگ کا اختتام ہوا۔ اپنی پہلی اننگ میں کپتان نے جمائیماکے ساتھ مل کر دو چھکے لگائے پہلا چھکا 18 نومبر 1996ء کو لگایا، یہ ان کا بڑا بیٹا ہے سلیمان عیسیٰ ، دوسرا چھکا 10 اپریل 1999 کو لگایا یہ ان کا چھوٹا بیٹا ہے قاسم۔ 2014ء میں ان کی برطانوی شریک حیات نے کپتان کو کلین بولڈ کردیا۔ کپتان کی زندگی کی دوسری اننگ 9 جنوری 2015ء کو شروع ہوئی۔ اس بار بھی ان کے مدمقابل ایک برطانوی پاکستانی خاتون تھی جو پیشے کے اعتبار سے صحافی اور ٹی وی اینکر تھی۔ ریحام خان برطانوی پاکستانی ضرور تھیں لیکن ان کا خاندان پشتون تھا۔ وہ ہندکو اور پشتو بہت روانی سے بولا کرتی ہیں۔ کپتان کی دونوں سابق ہمسفروں میں ایک بات قدر مشترک رہی کہ دونوں کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جمائیما سے علیحدگی کے بعد کپتان اور

جمائیما میں دوستانہ مراسم قائم ہیں۔ ہونے بھی چاہیے کیونکہ وہ کپتان کے دو بیٹوں کی ماں ہے۔ اس کا اتنا حق تو ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے باپ سے اچھے مراسم رکھے۔

نو ماہ قبل کپتان نے جن حالات میں شادی کی تھی اس وقت اکثر لوگوں نے انگلی اٹھائی تھی کہ وہ حالات ایسے نہیں تھے کہ کپتان شادی کرتے، کچھ وقت گزار لیتے پھر یہ فریضہ انجام دے لیتے لیکن انہوں نے تمام تر ابتر حالات کو پسِ پشت ڈال کر سہاگ راگ منا ڈالی۔ یہ بندھن بھی عجیب تھا کہ قائم ہوتے ہی چیمہ گوئیاں شروع ہوگئیں کہ یہ

بندھن قائم رہتا نظر نہیں آرہا۔ آخر کیوں؟ ریحام خان ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں، وہ اپنی نجی زندگی کی ایک اننگ پہلے ہی کھل چکی تھی، ان کے بچے بھی تھے، عمران خاں توان کا دوسرا سپنا تھے، کپتان بھی چھوٹے نہ تھے، یہ 25 نومبر 1952ء کو دنیا میں آئے تھے جب انہوں نے دوسری اننگ کا آغاز کیا تو یہ 62 کے تھے۔ عاقل اور بالغ بھی، پاکستان کی سیاست میں لوگوں کو ان سے امیدیں وابستہ تھیں، ان کے چاہنے والے تو پوری دنیا میں ہیں لیکن پاکستان میں ان کے چاہینے والوں کی تعداد لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں میں ہوگی، پھر آخر اس مختصر وقت کے بعد کہ اس عرصہ میں تو نئی نویلی دلھن کی مہندی بھی ٹھیک طرح صاف نہیں ہوئی ہوتی یہ نوبت طلاق تک کیسے پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے یقینا بے شمار سوالات چھپے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ

سامنے آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کپتان کی زندگی کا معاملا ہے اس میں کسی کو بلا وجہ دخل دینے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے لیکن جب کوئی شخصیت عوامی بن جاتی ہے تو اس کا ہر ہر فعل، ہر ہر عمل عوام سے پوشیدہ نہیں ہوا کرتا، وہ ملک و قوم کا سرمایا اور ملکیت بن جاتا ہے، اس کی تکلیف عوام کی تکلیف ہوتی ہے اس کی خوشی عوام کی خوشی ہوتی ہے۔ اس لیے عوام کو کپتان کے اس عمل پر جو یقینا اس کا نجی عمل ہے کس قدر افسوس اور دکھ ہوا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ کپتان نے جب دوسری اننگ کا آغاز کیا تو اس کی اس شادی میں چند لوگ ہی شریک تھے حتیٰ کہ کپتان کی حقیقی بہنیں بھی اس میں شریک نہ تھیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا گیا کہ ’ اس شادی پر کپتان کی بہنیں خوش نہیں تھیں ان کا کہنا ہے کہ ان کی بھابی تو جمائیما ہی ہے کیوں کہ وہ ان کے بھتیجوں کی ماں ہے‘۔ ریحام خان سے شادی کا فیصلہ کب، کیوں اور کس طرح ہوا اس بارے میں تاحال واضح بات سامنے نہیں آ سکی۔ ساتھ ہی طلاق کا فیصلہ کیوں، کب اور کیسے ہوا، قیاس آرائیاں ہیں، باتیں ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ ریحام خان سے کپتان کی علیحدگی کی خبریں بہت عرصہ سے گردش کر رہی تھیں۔ سوشل میڈیا پر ہی نہیں بلکہ ٹی وی پر کچھ سینئر لنکر اس جانب اشارہ کرتے نظر آئے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سہاگ رات کے فوری بعد ہی معاملات خرابی کی جانب چلا

گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ ریحام خان سیاست میں اہم کردار کی خواہش مند تھی، جیسا کہ اس نے ایک ضمنی انتخاب میں بھرپور مہم چلائی یہ دوسری بات کہ وہ ضمنی انتخاب تحریک انصاف جیت نہ سکی، تحریک انصاف کی اس شکست کا بھی ریحام خان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ وہ عمران کی اجازت سے عملی سیاست میں اتری، انتخابی مہم میں حصہ لیا اور جب کپتان نے اسے سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا تو وہ رک تو گئی لیکن یہ بھی ایک وجہ رہی اختلافات کی، یہ وجہ اتنی بڑی اور شدید نہیں کہ اس کو بنیاد بنا کر زندگی کو دولخت کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ بعض نے اختلاف کی وجہ پیسہ اور جائیداد بتایا وہ بھی اس قدر اہم نہیں۔ ریحام بھی اور کپتان بھی مالی طور پر مستحکم اور خوش حال ہیں۔
وجوہات جو بھی رہیں ہوں ۔ یہ کوئی اچھا عمل نہیں، قرآن نے طلاق کو جائز کہا لیکن اللہ نے اسے ناپسندیدہ فعل بھی قرار دیا۔ ہمارے معاشرے میں طلاق کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ایک ایسا فعل ہوتا ہے کہ جس کے اثرات نہ صرف فیصلہ کرنے والوں کی زندگی پر پڑتے ہیں بلکہ اس کی اولاد، بہن بھائی اور پورا خاندان اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔
اکثر نادان معمولی معمولی اختلافات کی بنیاد پر دوسروں کو یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ اگر اختلافات ہیں تو فلاں اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ زندگی کا کس قدر اہم اور نازک فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کے اثرات دور تک بلکہ نسلوں تک جاتے ہیں۔ طلاق لینے والی

خواتین کو دنیا اپنی گفتگو میں یہ کہہ کر مخاطب کرتی ہے کہ اچھا وہ جس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی، جو مرد طلاق دے دیتا ہے اسے دنیا اس طرح مخاطب کرتی ہے کہ اچھا وہ جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس طرح کے جملے تعریفی نہیں بلکہ طنزیہ ہوا کرتے ہیں۔ کپتان کے اس فعل پر پیپلز پارٹی کی ایک خاتون لیڈر نے عمران کو ہیٹرک کرنے کا مشورہ دیا، اسی طرح کسی نے ریحام خان کو بھی ہیٹرک کا مشورہ دیا۔ اس قسم کے جملے دونوں کی تعریف بیان نہیں کر رہے بلکہ یہ ان پر تیر و نشتر چلائے جا رہے ہیں جس کا موقع دونوں نے از خود فراہم کیا ہے۔

کپتان اور ریحام کے اس بندھن سے کپتان کا کیا ملا اور ریحام کو کیا حاصل ہوا؟ اس کا تجزیہ کیا جائے تو کپتان خسارے میں نظر آتا ہے اور ریحام خان ہیٹرک پر پہنچ جانے کے بعد بھی فائدہ کی جانب گامزن نظر آتی ہے۔ کپتان نے جب شادی کا فیصلہ کیا اور پھر شادی بھی کر لی تو کپتان کے چاہنے والوں کی اکثریت نے کپتان کے اس فعل کو اندر سے اچھا محسوس نہیں کیا، گو یہ کپتان کی نجی زندگی کا فیصلہ تھا پھر بھی انہوں نے اسے قبول کر لیا اور کپتان کا نعرہ اسی طرح لگاتے رہے۔ اب جب کے کپتان کا یہ فیصلہ سامنے آیا تب بھی کپتان کے چاہنے والے افسردہ ہیں، غمگین ہیں، بوجھل دل سے یہ کہتے نظر آرہے ہیں کہ یہ عمران کا ذاتی معاملا ہے۔ اس عمل سے کپتان کی سیاسی ساکھ بھی

متاثر ہوئی، سیاست میں کپتان کے مخالفین یہ کہہ کر خاموش ہیں کہ ہمیں تو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ بیل منڈھیر نہیں چڑھے گی، وزیر اعظم میاں نواز شریف نے اپنی جماعت کے لیڈروں کو منع کر دیا ہے کہ وہ عمران کے اس عمل پر کسی بھی قسم کا تبصرہ نہ کریں۔ یہ بھی ایک اچھا اقدام ہے اس کے پیچھے عمران سے ہمدردی کا جذبہ نہیں بلکہ سیاسی برتری کا روب ظاہر کیا گیا ہے۔ اب اگر یہ جائزہ لیں کہ اس عمل سے ریحام خان خسارہ میں رہی یا اسے کپتان کے مقابلے میں فائدہ ہوا تو لگتا ہے کہ ریحام خان نے اگر از خود یہ سودا کیا تو وہ خسارہ کا سودہ نہیں بلکہ اسے فائدہ ہی ہوا۔ وہ اس طرح کہ عمران سے بندھن میں بندھنے سے قبل کتنے لوگ ریحام کو جانتے تھے، ایک چھوٹے سے چینل پر ریحام لوگوں کے انٹر ویو ہی تو کیا کرتی تھی اور بس، بی بی سی سے وابستہ رہی اسے کس کو معلوم ، اس کی تو ڈگری کو بھی جعلی قرار دیا گیا، عمران نے اس کا دفع کیا۔ اب جب کہ ریحام عمران خان سے آزاد ہو گئی ، وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکی ہے۔ پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا میں جانی جانے لگی ہے۔ اس نے سیاست کا مزاہ بھی خوب اچھی طرح چھک لیا ہے، کسی نے تو یہاں تک کہا کہ ' وہ پارٹی کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ عمران replace کرنا چاہتی تھی'۔ وہ پڑھی لکھی ہے، اس نے سیاسی لوگوں کے انٹر ویوز بھی کیے ان سے بھی اس نے بہت کچھ سیکھا ہے، اب وہ لکھے گی تو اس کے قلم میں طاقت ہوگی، دنیا کا بڑے سے بڑا اخبار اسے اپنے ہاں لینے پر تیار ہوگا، اگر ٹی وی جوائن کرنا چاہیے

گی تو پاکستان کا بڑے سے بڑا چینل اسے خوش آمدید کہے گا، پاکستان سے باہر بھی بی بی سی اور وائس آف امریکہ بھی اسے اپنا ساتھی بنانا خوشی سے پسند کریں گے۔ اگر اس نے پاکستان میں سیاست کرنے کا ارادہ کیا تو بھی اسے ہاتھو ہاتھ لیا جائے گا، اگر اس نے اپنی سیاسی جماعت بنا کر پاکستانی سیاست میں اترنے کی منصوبہ بندی کی تو بھی وہ کامیاب ہو گی ۔ لیکن خیال یہی ہے کہ وہ پاکستان کی سیاست میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرے گی۔

امکانات اس بات کے زیادہ ہیں کہ وہ کالم نگاری کرنے کو ترجیح دے گی تاکہ چھپی ہوئی کہانیاں باہر آئیں۔ حتمی طور پر کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے۔ آج تو اس فیصلے کی پہلی رات ہے، صبح کیا کچھ پریس میں ہوگا یہ وقت بتائے گا۔ (30 اکتوبر 2015)

بھارت کا 'گورباچوف' نریندر مودی

بھارت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے نریندر مودی کے افراتفری، دہشت گردی، غنڈہ گردی، مسلمانوں، سکھوں، نچلی ذات کے ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کے قتل عام، پاکستان کے خلاف زہر اگلنے جیسے واقعات کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مودی بہادر اگر اسی ڈگر پر بھارت کو لیے دوڑتے رہے تو وہ وقت بہت جلد آ جائے گا جب یہ روس کے گورباچوف کی طرح بھارت کے گورباچوف بن کر دنیا کے سامنے سینہ تان کر کہیں گے کہ دیکھو میں نے یہ سچ ثابت کر دیا کہ بھارت اب بھی ایک قوم کا ملک نہیں بلکہ اس میں مسلمان ، سکھ بڑی تعداد میں بستے ہیں ۔ہمارے قائد نے تو بانگ دھل کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں لبتی ہیں ، نریندر مودی تمہیں مبارک ہو تم نے ہمارے قائد کی بات کا اب بھی پاس رکھا ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تم انشاءاللہ ان سے بھی آگے جاؤگے اور یہ ثابت کروگے کہ بھارت میں اب بھی مسلمان بڑی تعداد میں بستے ہیں، یہاں کشمیری بھی ہیں ، یہاں سکھ بھی ہیں جن کا جینا بھارت کے انتہا پسند ، متعصب ہندوؤں نے دو بھر کیا ہوا ہے۔ ہندوستان جو اب بھارت ہے صرف ہندوؤں کی سرزمین نہیں تاریخ گواہ ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں نے ہزار سال حکمرانی کی ہے۔ دنیا میں جغرافیائی حالات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں، انسانی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں،

باہمی اختلافات اور رنجشیں مشکل صورت اختیار کرلیتی ہیں یہاں تک کہ ایک ہی باپ کے دو بھائی اپنا گھر الگ الگ بسا لیتے ہیں۔ یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔۔برصغیر پر حکمرانی کرنے والے مسلمان حکمرانوں کی سوچ یہ نہ تھی کہ یہ سرزمین صرف مسلمانوں کی ہی ہے بلکہ واضح طور پر مسلم و ہندو ساتھ ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔اگر وہ اس وقت متعصبانہ رویہ اختیار کرلیتے تو آج بھارت میں ہندو دیکھنے کو بھی نہ ملتا۔ متحدہ ہندوستان میں جب باہمی اختلافات ہوئے، حکومت کمزور پڑ گئی ،آپس کی رنجشیں اتنی بڑھ گئیں کہ طاقت وروں کو موقع مل گیا قابض ہونے کا اور وہ ہندوستان پر انگریز کی شکل میں قابض ہوگئے۔ اب پھر سے انگریز سے آزادی کے ساتھ ساتھ 'دو قومی نظریہ بھی سامنے آگیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک (ہندو) نہیں بلکہ دو قومیں یعنی مسلمان اور ہندو بستی ہیں جن کا مذہب الگ، بود و باش الگ، معاشرت الگ، رہن سہن الگ، سوچ الگ، لباس میں فرق، سوچ مختلف، تہوار الگ، زبان الگ، تاریخ الگ تو جغرافیہ بھی الگ ہی ہونا چاہیے۔ اس دو قومی نظریے نے عملی جامہ پہنا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ 1947ء کی تاریخ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ ان سے بہتر جانتے ہیں جنھوں نے وہ تاریخ کتابوں میں پڑھی ۔ اس وقت بھی ہندو انتہا پسندوں اور متعصبوں نے کچھ اسی قسم کا کھیل مسلمانوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ جو اب نریندر مودی کے دور میں 67 سال بعد دہرایا جا رہا ہے۔

نریندر مودی صاحب آپ کا شکریہ آپ نے مسلمانوں کے خلاف جس کھیل کی ابتدا 2002ء میں گجرات کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا بڑے پیمانے پر قتل عام کرکے کی تھی وہی تاریخ اب تمہارے وزیراعظم ہونے کی سرپرستی میں دوہرائی جارہی ہے۔ بابری مسجد کو نذر آتش کرنے کا واقعہ مسلمان کبھی نہیں بھول سکتے، کشمیریوں پر مظالم سے بھارت کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا، سکھوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ شاید تمہاری تعصب کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکا، نچلی ذات کے اپنے ہم دین ہندوؤں کے ساتھ بھارت کا رویہ سب کے سامنے ہے، گائیں کا گوشت کھانا تو دور کی بات گھر میں رکھنے ، اس ٹرک ڈرائیور کو جو اپنے ٹرک میں گائیں ایک شہر سے دوسرے شہر لے جارہا تھا تمہارے شیو شینا کے غنڈوں نے مار ڈالا، پاکستانی فن کار تمہارے دیش میں جائیں تمہارے غنڈوں کو یہ برداشت نہیں، خورشید قصوری کی کتاب کی رونمائی میں تم نے اپنے ہی صحافی کلکرنی کا منہ کالا کرکے دنیا کو بھارت کا اصل چہرہ دکھایا، پاکستانی امپائر جو دنیا میں نیوٹرل امپائر کے حوالے سے مشہور ہے وہ تمہیں قبول نہیں، پاکستان کرکٹ بورڈ کے پاکستانی اراکین کو تمہارے بورڈ نے دعوت دی تھی بھارت آجانے کی ، تمہارے متعصب غنڈوں نے اخلاق ، تہذیب اور مہمان نوازی کی ساری حدیں مسمار کر کے ان کے خلاف احتجاج کیا اور انہیں واپس آنے پر مجبور کردیا۔ کشمیریوں کے خلاف تو تمہارے مظالم کی داستان بھری پڑی ہے، تم نے ان کا حق غضب کیا ہوا ہے۔ سکھ

تو تمہارے دین سے قریب تر ہیں، یہ وہی سکھ ہیں جنھوں نے 1947ء میں تمہارا ساتھ دیا تھا اور ٹرینوں کی ٹرینیں مسلمانوں کے خوب سے رنگٹ ڈالی تھیں۔ کچھ ان کی ان کی قربانیوں کا ہی احساس کرلیتے، تم نے ان کی مقدس کتاب کی بے حرمتی کی، کیا تمہیں ان کی خالصتان تحریک کا علم نہیں، یہ وقتی طور پر دب گئی لیکن اچھا ہوا شیو سینا کے ہندو غنڈوں نے سکھوں کو پھر سے بیدار کردیا۔ نچلی ذات کے ہندوؤں کو تم نے مارڈالا ان بیچاروں کو تو کوئی والی وارث ہے ہی نہیں۔ گزشتہ چند ماہ میں ہونے والے دہشت گردی کے تمام واقعات اس بات کے لیے کافی ہیں کے کسی بھی دن نریندر مودی روس کے گورباچوف بن کر از خود یہ اعلان کردیں گے کہ کشمیر آزاد، خالصتان آزاد، وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آزاد۔ اس طرح مودی صرف ہندو متعصب پسندوں کے ہی لیڈر نہ رہیں گے بلکہ وہ تمام آزادی حاصل کرنے والوں کے محبوب بن جائیں گے۔ ایاز میر نے درست لکھا کہ 'نریندر مودی وہ بہترین چیز ہیں جو پاکستان انڈیا میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ انڈیا کو جنرل ضیا دور کے پاکستان جیسا بنارہے ہیں تو کیا اس سے زیادہ پاکستان کی کوئی اور خیر خواہی ہوسکتی ہے'۔ بات تو سو فیصد درست نظر آرہی ہے۔ خوب کیجئے پاکستان کی خیر خواہی، انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ان تمام تر متعصبانہ اعمال کا ثمر دنیا کے سامنے ہوگا۔

بھارت کا ایک بڑا طبقہ یہ محسوس کرتا رہا ہے اور شاید اب بھی کرتا ہے کہ

پاکستان بھارت دشمن ہے، اس کے حصے بخرے کرنا چاہتا ہے، اس کا خیر خواہ نہیں۔ ایسا ہر گز نہیں، پاکستان میں کبھی بھی یہ سوچ پائی نہیں گئی، اس سے پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں، ہمارے لاکھوں مسلمان بھائی بھارت کی سرزمین میں آباد ہیں، کشمیریوں کی جدوجہد میں مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یہاں بسنے والے ہزاروں خاندانوں کے آباؤاجداد کی قبریں بھارت کی مٹی کا حصہ ہیں۔ بھلا پاکستان کس طرح یہ چاہے گا کہ بھارت کو نقصان پہنچے، کہتے ہیں جنگ آمد بجنگ آمد، جب بلاجواز جنگ مسلط کردی جائے تو مقابلہ تو کرنا ہی ہے، پاکستان رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے بھارت سے کم ضرور ہے لیکن جوش، جذبہ، دنیا کی بہترین فوج، فضائیہ اور بحریہ کے ساتھ ساتھ ایٹمی قوت کا تو سب ہی کو معلوم ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود پاکستان کو کیا ضرورت کے بلاوجہ بھارت سے پنگا لے، اس کے دیش میں رہنے والے متعصب دہشت گرد تنظیمیں خاص طور پر شیو سینا ان کی سرپرستی کرنے والا وزیر اعظم ہی کافی ہے۔

کرکٹ ڈپلومیسی، ناکامی کے ذمہ داروں کی سرزنش ضروری ہے

بھارت میں جب سے نریندر مودی وزیراعظم کی کرسی پر براجمان ہوئے ہیں بھارت دہشت گردوں، انتہا پسندوں، تعصب گروں، غنڈوں اور بدماشوں کی دہشت گردی، پاکستان دشمنی، مسلمان دشمنی کی لپیٹ میں ہے۔ دہشت گرد تنظیم شیو سینا کے دہشت گردوں کو کھلی چھٹی حکومت کی جانب سے دے دی گئی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں، جس کا چاہیں منہ کالا کریں، جس کو چاہیں زندہ جلادیں، جس کو چاہیں مار مار کر ہلاک کردیں، مسلمانوں، سکھوں، نچلی ذات کے ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کا کھلم کھلا قتل عام کریں، کسی بھی پاکستانی کی جس قدر ہوسکے اپنے ملک میں تذلیل کریں، اپنے ملک سے نکل جانے کی کھلم کھلا دھمکی دیں، مسلمانوں کو یہ دھمکی دیں کہ اگر انہیں گائیں کا گوشت کھانا ہے تو وہ بھارت میں نہیں رہ سکتے۔ نریندر مودی کے دور میں بھارتی انتہا پسند منہ زور ہوگئے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر اسمبلی کے رکن انجینئر راشد نے درست کہا کہ یہ مودی کا ہندوستان ہے گاندھی کا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت اب گاندھی کے علاوہ جواہر لال نہرو، شاستری، گلزاری نندہ، ڈیسائی، چرن سنگھ، اندرا گاندھی، راجیو، وی پی سنگھ، چندرہ شیکر، نرشما، ذیوگاؤدا، گجرال، واجپائی، موہن سنگھ اور سوامی کا بھی بھارت نہیں بلکہ اب یہ صرف اور صرف نریندر مودی اور انتہا پسندوں کا ملک ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ

بات ہر ایک کے علم میں ہے، ایک عام مسلمان ان حالات میں بھارت جانے کی سوچ بھی نہیں رہا۔ بھارت کے یہ انتہا پسند خورشید قصوری کی کتاب کی تعارفی تقریب کے حوالے سے میزبان کلکرنی کا منہ کالا کر چکے تھے، پاکستانی گلوکار کا پروگرام منسوخ کرایا جاچکا تھا، پاکستانی امپائر علیم ڈار کو شیو سینا کے غنڈوں کی دھمکیوں کی وجہ سے ایمپائرنگ سے روک دیا گیا تھا اور انہیں واپس وطن بھیج دیا گیا، یہی نہیں بلکہ پی سی بی کو بھی مسلسل دھمکیا مل رہی تھیں ان تمام حالات اور واقعات کے باوجود پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیرَ میں شہریار خان، چیرَ مین ایگزیکٹیو کمیٹی نجم سیٹھی، چیف آپریٹو آفیسر سبحان احمد کا بھارت کا دورہ کرنا سمجھ اور عقل میں آنے والی بات نظر نہیں آتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شہریار خان ایک منجھے ہوئے بیوروکریٹ اور سابق سیکریٹری خارجہ بھی رہ چکے ہیں وہ تو بھارت کے مزاج کا زیادہ بہتر ادراک رکھتے ہوں گے لیکن انہوں نے بھی ان تمام باتوں کو اہمیت نہیں دی اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھارت پہنچ گئے۔ بھارت جا کر بھی حالات کا ادراک نہ ہوا، کہا جارہا ہے کہ پاکستان کے سفارت خانے کے حکام نے کرکٹ ڈپلومیسی اختیار کرنے والے ان نادانوں کو روکا کہ وہ اس ملاقات کو منسوخ کر دیں، بھارتی بورڈ کے اراکین سے ملاقات کرنے ممبئی کے وانکھیڈے اسٹیڈیم میں قائم بھارت کرکٹ بورڈ کے دفتر نہ جائیں لیکن یہ دنیا کے سب سے عقل بند انسان اس کے باوجود وہاں چلے گئے جس کے نتیجے میں شیو سینا کے غنڈوں نے ان کے خلاف مردہ باد کے نعرے تو لگانا

ہی تھے پاکستان کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ وہاں یہ نعرے لگے کہ 'شہریار خان واپس جاؤ'۔ کیا عزت رہ گئی شہریار خان کی اور نجم سیٹھی صاحب خود تو ذلیل و خوار ہوئے ملک اور قوم کو بھی بدنام کرانے میں کوئی کثر نہ چھوڑی۔

کیا پاکستان بھارت کے ساتھ کرکٹ کھیلے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، کیا بھارت کے ساتھ کرکٹ پاکستان کی عزت سے بڑھ کر ہے، ٹی 20 ہماری انا ہے کہ ہم ضرور کھلیں، اس کے بغیر ہم کرکٹ کی دوڑ سے باہر ہو جائیں گے۔ پاکستان کی عزت اور وقار کے سامنے شہریار خان اور نجم سیٹھی کی کوئی وقعت نہیں۔ انہوں نے تمام تر اقدامات حکومت کی اجازت کے بغیر کیے، بھارت تو کسی بھی طور کسی سطح پر بھی پاکستان سے بات کرنے کو تیار نہیں، شیو سینا کے غنڈوں کے کالے کرتوں کی بھارتی حکومت نے آج تک مذمت تک نہیں کی انہیں لگام دینا تو بہت بڑی بات ہے۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے سرکاری سربراہ نواب زادہ شہریار محمد خان اور عملی سربراہ نجم سیٹھی صاحب یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر شیو سینا کے دہشت گرد ان کے قدموں میں گر جائیں گے، ان کے ہاتھ چومیں گے، انہیں سر آنکھوں پر بیٹھائیں گے۔ دیکھ لیا اپنی سوچ حشر کیا ہوا۔ نواب زادہ صاحب ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جدی پشتی نواب ابن نواب، پاکستان کی سول سروس میں بہت خدمات ہیں، اقوام متحدہ میں بھی پاکستان

کی نمائندگی کی ،اس وقت ان کی عمرِ عزیز 81برس ہے۔ یہ 29مارچ 1934ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔اب انہیں از خود کرکٹ بورڈ کی سربراہی سے سبکدوش ہوجانا چاہیے، حکومت کو بھی سوچنا چاہیے کہ اس عمر میں ان پر اس قدر بوجھ ڈال کران کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے۔ ویسے بھی جو کام جس کا ہے وہ اسی کو ساجھے، کرکٹ کھیلنا کرکٹ کے کھلاڑیوں کا کام ہے انہیں کرکٹ کھیلنے بھی دیں اور کرکٹ کے معاملات کو چلانے بھی دیں۔ان عہدوں پر صرف اور صرف کھلاڑی کو ہی نامزد کیا جانا چاہیے۔ کچھ ذکر ہر فن مولا جو سیاست داں کا جو کالم نگار، تجزیہ نگار، جیو کے ملازم ،جنگ کے وظیفہ دار، سابق نگراں وزیر اعلیٰ پنجاب، کرکٹ تو جیسے ان کا خاندانی شوق رہا ہے قبلہ نجم سیٹھی صاحب کا بھلا کرکٹ بورڈ میں چیرَ مین ایگزیکٹیو کمیٹی، واہ صاحب واہ یہ عہدہ بھی خوب ہے، صاف ظاہر ہورہا ہے کہ یہ نوازنے کے سوااور کچھ بھی نہیں، اگران کے نگراں وزیراعلیٰ پنجاب کے دور میں نواز حکومت کو اقتدار مل گیا توکیاان کی وجہ سے ملا کہ انہیں نوازنے کا عمل مسلسل جاری رکھا ہوا ہے، کسی نے لکھا کہ اس شخص پر بھارتی عشق سوار تھا جس کے تحت انہوں نے سب کے روکنے کے باوجود 'بگ تھری' والے معاملے میں بھارت کی حمایت کرکے سارے پتے بھارت کے ہاتھ میں دے دیے تھے'۔ قبلہ سیٹھی صاحب کوپتہ نہیں چلا ورنہ ابصار عالم چیرَ میں پیمراہرگز

نامذدنہ ہوپاتے۔ شہریار ایک شریف اور خاندانی آدمی ہیں انہوں نے یہ اعتراف توکیا کہ بھارت میں ان کو بے عزت کیا گیا وہ اپنی تزلیل پر شرمندہ بھی ہیں لیکن نجم سیٹھی صاحب شرمندہ ہونا تو دور کی بات وہ اس واقع کو اپنی بے عزتی تصور ہی نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں شیو سینا کے انتہا پسندوں نے جو کچھ بھی کیا اچھا کیا۔ اس سارے کھیل میں سیٹھی صاحب کا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔ سابق کرکٹر سرفراز نواز نے کسی ٹی وی ٹاک میں سیٹھی صاحب کی کرپشن اور بے اعتدالیوں کی جو تعریف کی اگر اس میں سو فیصد حقیقت نہیں تو کچھ تو درست ہوگا، سرفراز نواز کوئی عام انسان تو نہیں، کرکٹ میں اس کا ایک نام ہے، اس نے اپنی زندگی کرکٹ کو دی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے جس سیاسی جماعت سے وابستگی اختیار کی وہ سیٹھی صاحب کی پسند کی نہیں۔ سیٹھی صاحب نے اگر وہ پروگرام نہ دیکھا ہو تو اسے ضرور دیکھیں۔ چڑیا صرف آپ کے پاس ہی نہیں یہ دوسروں کے پاس بھی ہے اور بہت کچھ بتاتی ہے۔ نجم سیٹھی صاحب نے اپنے پروگرام میں اس معاملے پر لب کشائی فرماتے ہوئے واضح کیا کہ ’ بھارت سے چھ سیریز کھیلنے کا معاہدہ ہوا تھا، کرکٹ اور سیاست کو ساتھ ساتھ نہیں چلنا چاہیے ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جو پاکستان کی بہتری کے لیے کام کرنے والوں پر تنقید کرتے ہیں‘۔کیا خوب پاکستان کی بہتری بھارت میں عمل میں آئی ہے۔ گویا موجودہ حالات میں بھارت کے کرکٹ بورڈ سے گفت و شنید پاکستان کے مفاد میں تھی چاہے اس دوران پاکستان کے خلاف شدید نعرے بازی ہو۔ صرف کسر یہ رہ گئی

تھی کہ شیو سینا کے غنڈے اس موقع پر بھی پاکستانی وفد کے ساتھ وہی بے ہودہ حرکت کرتے جو انہوں نے کلکرنی کے ساتھ کی تھی۔ فرمانا ہے کہ مذاکرات کی صورت میں ہی دنیا کے سامنے بھارت کا اینٹی مسلم اور اینٹی پاکستان رویہ سامنے آتا، قبلہ دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ بھارت نے کبھی پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ وہ ازل سے اینٹی مسلم اور اینٹی پاکستان ہے۔ انہوں نے بی سی سی آئی کے سربراہ کے ساتھ ایک ایم او یو کیا تھا جس کے مطابق بھارت اگلے چند سالوں میں چھ سیریز کھیلیں گا۔ چار پاکستان کے وینیو یعنی دبئی میں جب کہ دو بھارت میں ہوں گی۔ کیونکہ یہ ایم او یو سیٹھی صاحب نے اپنے دور میں کیا تھا اس لیے اس کی بہت اہمیت تھی، بقول سیٹھی صاحب اس سے پاکستان کو اربوں کا فائدہ ہونا تھا جو کہ شیو سینا کے غنڈوں نے ہونے نہیں دیا۔ ساری گفتگو اور وضاحت کا لبِ لباب یہ تھا کہ پاکستان کرکٹ کو اربوں کا فائدہ ہونا تھا وہ نہیں ہوا۔ ایسے پیسے کا کیا فائدہ جہاں عزت نہ ہو، احترام نہ ہو، سیکیورٹی نہ ہو۔ بھارت اس قابل ہی نہیں کہ ہماری کرکٹ ٹیم تمہاری اس کی سرزمین پر میچ کھیلے۔ حکومت کو کرکٹ بورڈ کے سربراہان کے بارے میں سنجیدگی سے کوئی مثبت قدم اٹھانا چاہیے۔ کرکٹ ڈپلومیسی میں ناکامی کے ذمہ داران کی سرزنش ضروری ہے ایسے لوگوں کو آگے لانا چاہیے جن کے سامنے پاکستان کا وقار مقدم ہو پیشہ نہیں۔ وہ جز وقتی کرکٹ بورڈ کے منتظم نہ ہوں بلکہ کل وقتی کرکٹ بورڈ کا نظم و نسق چلانے میں اپنی تمام تر صلاحتیں بروئے کار.

لائیں۔

پروفیسر سحرؔ انصاری کے اعزاز میں تقریبِ توصیفی

دانشوروں، شاعروں، اساتذہ، مصنفین ، تخلیق کاروں کی پذیرائی اور ان کی علمی ادبی خدمات کو سراہانے کا عمل ہر دور اور ہر حکومت نے انجام دیا۔ پروفیسر سحرؔ انصاری اردو کے ان معدودِ چند شاعروں اور نثر نگاروں میں سے ہیں کہ جن کی علمی و ادبی کاوشوں کو نہ صرف علمی و ادبی حلقوں نے ہمیشہ سراہا بلکہ حکومت کی سطح پر بھی ان کی کاوشوں کی پذیرائی کی جاتی رہی۔ 2005ء میں تمغہ امتیاز سے نوازا گیا، جب کہ موجودہ حکومت نے انہیں 2015ء میں ستارہ امتیاز سے سرفراز کیا۔ سحرؔ انصاری کی شاعری محض انسانی عمل نہیں بلکہ اس میں ان کے اندر موجود شاعر کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اہل علم نے حکومت کے اس اقدام کو سراہا اور علمی و ادبی انجمنوں نے ان کے اعزاز میں توصیفی تقاریب کا اہتمام کیا۔ آن لائن لکھنے والوں کے فورم ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' نے سحرؔ انصاری کے اعزاز میں مقامی ہوٹل میں استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں رائیٹرز کلب کے لکھاریوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سحرؔ انصاری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رائیٹرز کلب کی جانب سے اردو کے فروغ اور علمی و ادبی خدمات کے لیے کی جانے والی کاوشوں کو سراہا انہوں نے کہا کہ 'رائیٹرز کلب' آن لائن لکھنے والوں کا ملک کا اولین ادارہ ہے جو حقیقی معنوں میں اردو کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے

۔ مجھے خوشی ہے کہ کلب کے سربراہ ابرار احمد اور صدر ڈاکٹر صمدانی اردو کی ترقی اور علم وادب کے فروغ میں بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس موقع پر ہماری ویب رائیٹرز کلب کی جانب سے پروفیسر سحرؔ انصاری کی خدمت میں توصیفی شیلڈ پیش کی گئی۔

پروفیسر سحرؔ انصاری کا کہنا تھا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کسی بھی موقع پر اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے کسی بھی قسم کی سفارش کو کبھی اچھا نہیں سمجھا، اللہ نے وقت کے ساتھ ساتھ مجھے جو عزت دی میں اس پر جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں اور میں نے از خود ایسا ہی کیا ہے کہ بس خاموشی سے کام کیے جاؤ، صلے کے لیے کبھی کسی انسانی قوت کی جانب نہ دیکھو بلکہ صلہ دینے والی اللہ کی ذات ہے۔ وہ محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ انہوں نے کہا مجھے پہلے تمغہ خدمت دیا گیا اور اب ستارہ امتیاز سے نوازا گیا، اللہ کا شکر اور احسان ہے۔ میں نے اس اعزاز کے لیے کسی سے سفارش نہیں کی۔ پروفیسر سحرؔ انصاری صاحب سے رائیٹرز کلب کی جانب سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ آن لائن لکھنے والوں کے اس فورم کی سرپرستی قبول فرمائیں اور اس کے سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے ان کی رہنمائی کریں۔ رائیٹرز کلب کی اس درخواست کو سحرؔ انصاری صاحب نے بخوشی قبول کیا جسے تقریب میں موجود لکھاریوں نے تالیا بجا کر سحرؔ انصاری کا شکریہ ادا کیا۔

ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' کے صدر کی ذمہ داریاں میرے ناتواں کاندھوں پر ہیں۔ جب کہ اس کے سربراہ و چیرَمین ابرار احمد صاحب ہیں۔ معروف صحافی و کالم نگار جناب عطا محمد تبسم صاحب اس کے معتمد ہیں۔ ابرار احمد صاحب نے مہمان خصوصی سحؔر انصاری اور مہمانان کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے موجودہ دور میں ڈیجیٹل فارمیٹ میں علمی مواد کی تخلیق اور اسے آن لائن کرنے کی ضرورت اور اہمت بیان کی۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت ہماری ویب پر لکھنے والوں کی ہزاروں تخلیقات آن لائن ہیں ۔ نیز آن لائن لکھنے والوں کا تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ رئیٹرز کلب کے قیام کے بعد سے ہماری ویب پر لکھنے والوں کی تعداد میں تیزی اضافہ ہوا ہے اور یہ تعداد 15ہزار سے تجاوز کرچکی ہے۔

پروفیسر سحؔر انصاری نے 1973ء میں جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو سے درس و تدریس کاآغاز کیا۔ 1974ء میں وہ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں آگئے اور پھر اسی شعبہ کے ہو کر رہ گئے۔ جامعہ کراچی میں ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ کئی سال صدر شعبہ رہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ میں ایڈیٹر و سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ چین اور جاپان میں بھی درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ہفت روزہ 'نئ جمہوریت' کے مدید بھی رہے، کئی سال سے آرٹس کونسل کی

ادبی کمیٹی کے سربراہ اور دیگر عہدوں سے وابستہ ہیں۔ ادارہ یادگار غالبؔ اور غالبؔ لائبریری کی ترقی اور فروغ میں اپنا حصہ ڈال چکے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے دنیا کے بے شمار ممالک میں پاکستان کی نمائندگی کرچکے ہیں۔پروفیسر سحرؔ انصاری کی شخصیت مختلف پہلو لیے ہوئے ہے۔ وہ شاعر بہت اچھے ہیں، نثر نگاری بھی ان کی خوب تر ہے، نقاد ہیں خوش گُلو وخوش اِلحان ہیں، خوش وضع و خوش قطع ہیں، شیریں زبان وشیریں کلام ، بھی۔ خوش طرز و خوش اِقبال بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک تمغے کے بعد دوسرے تمغے سے حکومت نے نوازا۔پروفیسر سحر انصاری مجلسی آدمی ہیں، لوگوں میں رہنا پسند کرتے ہیں ،۔ بولتے زیادہ ہیں، کراچی کی ادبی محفلوں کے دولھا بنے نظر آتے ہیں، صدر محفل اور صدرِ مشاعرہ کی حیثیت سے خوب خوب جچتے ہیں اور اس کا حق بھی خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں۔ سحرؔ انصاری نے کم کہا جو کچھ کہا اچھا کہا، کم لکھا جو کچھ لکھا معیاری لکھا، درویش صفت انسان ہیں،ان کا نثری و نظم کا ذخیرہ مطبوعہ سے زیادہ غیر مطبوعہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ زندگی میں اس فکر میں نہیں رہے کہ ان کی کتابیں دھڑا دھڑ منظر عام پر آتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فیض احمد فیضؔ پر ایک نثری کتاب ’’ فیض کے آس پاس‘‘ 2011ء میں اس سے قبل انہوں نے جوشؔ کے مقالات ’’مقالات جوش‘‘ کے عنوان سے مرتب کیے۔ ’ذِکرِ غَالبؔ ذِکرِ عَبدالحق‘ ان کی نثری کتاب ہے۔ ’تنقیدی افق‘ سحرؔ انصاری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ’’اسالیب‘‘ کے عنوان سے 2010 ء میں سحرؔ انصاری

صاحب کی سرپرستی میں ایک کتابی سلسلہ (سالنامہ) شروع ہوا۔ ''نمود'' سحرؔ انصاری کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ادبستان جدید نے 1976ء میں شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سحرؔ صاحب کو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے تین سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن شاعری کرتے دو دیہائیوں سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا تھا۔ 'نمود' میں سحرؔ انصاری کی 20 سال کی شاعری ہے۔ اس میں ان کی غزلوں اور نظموں کا وہ وہ انتخاب ہے جو 1955ء سے 1975ء تک پر محیط ہے۔ سحرؔ صاحب معروف شاعر فیضؔ کے حلقہ احباب میں سے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلا کا فلیپ فیضؔ صاحب سے لکھوایااور فیضؔ صاحب نے بہت ہی خوبصورت فلیپ لکھا۔ فیضؔ نے لکھا''نمود'' ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق ہے، جسے جدید ادب میں ایک معتبر اضافہ سمجھنا چاہیے۔ سحرؔ کے کلام میں ابہام یا ایہام کی کوئی آمیزش اور دوسرے زندگی کے روزمرہ مظاہر سے پل یا سڑک، شفاخانہ ہو یا تجربہ گاہ کسی ذہنی یا جذباتی تجربہ کی تجرید اور کشیدگی کے بعد جس طرح سحرؔ انھیں نظم کرتے ہیں وہ انھیں سے مخصوص ہے''۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام 'خدا سے بات کرتے ہیں' ہے۔ سحرؔ انصاری علمی ادبی سرگرمیوں کے میں گزشتہ کئی سالوں سے فعال ہیں۔ آرٹس کونسل میں کئی سالوں سے ادبی کمیٹی اور دیگر انتظامی امور میں شامل رہتے ہیں۔ غالب لائبریری سے بھی وابستہ رہے۔ اکتوبر 2015ء میں سحرؔ انصاری کو ایک اور اہم اور بہ عزت ذمہ داری سونپ دی گئی۔ انہیں انجمن ترقی اردو پاکستان کا

خازن بھی مقرر کر دیا گیا۔ یہ عہدہ بظاہر ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت، مزاج اور طبیعت سے متضاد نظر آتا ہے لیکن ماضی میں انجمن ترقی اردو میں اس عہدہ پر کئی معروف ادیب و دانش ور خدمات انجام دے چکے ہیں۔ سحر انصاری نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی وہ علم و ادب کے فروغ و ترقی کے شعبہ میں خدمات انجام دینے والے ادبی و علمی اداروں کی رہنمائی و سرپرستی میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کے دوست اور ان کی انجمنوں کے خیر خواہی میں تن من دھن سے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ (3 نومبر 2015)

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی

عمران خان اپنے دوسری اہلیہ ریحام خان سے قطع تعلق کرنے کے بعد کل 3 نومبر کو پشاور میں پہلی بار میڈیا کے سامنے تشریف فرما ہوئے ان کے دئیں بائیں ان کے قریبی ساتھی اور ہمدرد بیٹھے تھے۔ یکایک کسی صحافی کے ایک سوال پر ان کا چہرہ بگڑ گیا، ماتھے پر بل پڑ گئے، آگ بگولہ ہو کر اس صحافی پر خوب برسے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ اس غریب، نہ تجربہ کار اور نادان صحافی نے ان سے جو سوال کیا وہ کچھ مناسب نہ تھا، یہ سوال عمران کی حالیہ طلاق کی خبر سے متعلق تھا۔ جسے سنتے ہی عمران ماضی قریب میں چلے گئے اور ان کا بلڈ پریشر ایک دم شوٹ کر گیااور وہ اس صحافی پر بری طرح برہم ہوئے، عمران خان کے اس غیر معمولی ردِ عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر میرے ذہن میں اطہر نفیس کے ایک شعر کا مصرع گردش کرنے لگا اور میں بہت دیر تک اس شعر کو مکمل کرنے کی سعی میں رہا، مجھے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ پہلا مصرع ہے یا دوسرا۔ البتہ مصرع مکمل طور پر ذہن کے سات پردوں سے ہوتا ہوا زبان پر آئے بغیر نہ رہ سکا ۔میں نے اپنی یادداشت کو اس جانب مرکوز کر دیا لیکن شعر مکمل نہیں ہو پایا۔ میری یہ مشکل اس وقت حل ہو گئی جب میرے ایک نیم شاعر دوست کا فون آ گیا، میں نے اپنی مشکل کا ذکر کیا، اس نے بتایا کہ یہ اطہر نفیس کے شعر کا پہلا مصرع ہے۔ شعر کا دوسرا مصرع بھی

بتا دیا۔ اس طرح میری مشکل آسان ہوئی شعر یہ ہے ۔

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی

کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

یہ دھوپ عمران خان کو ہر رخ سے پریشان کرے گی۔ تحریک انصاف کے رہنما اس معاملے سے جتنی بھی جان چھڑائیں ، غصہ کریں، ڈرائیں دھمکائیں، یہ کہیں کہ یہ ان کا نجی مسئلہ ہے انہیں یہ دھوپ ہر رخ سے پریشان کرتی رہے گی۔ اس کا یہ حل ہر گز نہیں جو کپتان نے اختیار کیا۔ اپنے آپ کو شانت کریں، ٹھنڈے دل و دماغ سے نازک صورت حال سے نمٹنے کی حکمت عملی ترتیب دیں۔ تھوڑی سی بے احتیاطی اور غلطی معاملے کو بگاڑ دے گی یا مشکل میں ڈال دے گی۔ ان کی سیاسی ساخت خراب ہوگی، ان پر تنقید کی جائے گی، یعنی ایک خرابی کئی خرابیاں پیدا کردے گی۔ کپتان اس سوال کو زہر کا پیالا سمجھ کر پی جاتے اس عمل سے ان کی موت ہرگز واقع نہ ہوتی ، جواب نہ دیتے۔ بے شمار لوگ پریس کانفرنسوں میں بعض سوالوں کا جواب نہیں دیتے صاف کہہ دیتے ہیں کہ میں اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ ان کا جواب ہی غلط نہیں تھا بلکہ صحافی پر برس پڑنا اس سے زیادہ غلط تھا۔ کپتان کے ساتھ جو ہوا کوئی نیا یا اچھوتا واقعہ نہیں ، بے شمار لوگوں کی نجی زندگی میں ایسے لمحات آتے رہتے ہیں، کپتان کی تو یہ دوسری شادی تھی لوگوں کی تو تین تین چار چار شادیاں ناکام ہوجاتی ہیں، شادی

کا ناکام ہوجانا کوئی معیوب بات نہیں۔ طلاق ہوجانا بھی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی نہیں، بے شمار طلاقے ہوتی ہیں، عمران خان اور ریحام کی طلاق ہو گئی تو کیا قیامت آ گئی۔ یہ شادی تو صرف نو ماہ قائم رہی ، جمائیما کے ساتھ تو وہ نو سال رہے۔ غلطی ہو جاتی ہے، بڑے بڑے دانا لوگ بسا اوقات دھوکا کھا جاتے ہیں، ٹریپ ہو جاتے ہیں، ان کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں، شادی کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہی ہے نہ کہ جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں، خان صاحب کی جوڑی ریحام کے ساتھ اس مختصر وقت کے لیے بنی تھی ، ختم ہو گئی۔ وجوہات میں جانے کی ضرورت نہیں، رفتہ رفتہ خود ہی سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ اگر ہمیں فوری وجوہات معلوم ہو جائیں تو کیا ہوگا اور اگر ایک ماہ یا چھ ماہ بعد سامنے آئیں گی تو کیا حاصل ہوگا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ ایک خلش، دکھ، احساس ، تکلیف دونوں فریقین کو زندگی بھر رہے گی، اسے کسی صورت دونوں کی زندگی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ یہی وہ دھوپ ہے جو دونوں کو زندگی پر پریشان کرتی رہے گی۔ لیکن جب چڑیاں چگ گئیں کھیت تو پچھتاوت کیا ہوت والی مثال ہو گی۔ دونوں فریقوں میں سے یہ آواز کس کے دل کی ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا ۔

کچھ غم نہیں اُس سے بچھڑ جانے کا شاکر
افسوس اتنا ہے میرا ہوکے بھی میرا نہ ہوا

سیاسی لیڈر عوام کے دلوں میں گھر کرلے، مقبولیت کی بلندیوں کو چھولے، لوگ

اس سے پیار کرنے لگیں، اسے اپنا رہنما و رہبر بنالیں، اس کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کو ہر لمحہ تیار رہیں، وہ کہے کہ کھلے میدان میں دھرنا دینا ہے تو وہ اپنے معصوم بچوں کے ہمراہ کئی دن اور کئی راتیں کھلے آسمان کے نیچے، سخت گرمی میں سڑک پر گزاردیں۔ وہ عام شخصیت نہیں ہوتی، وہ خوش ہوتا ہے تو لوگ اس کے ساتھ خوش ہوتے ہیں وہ تکلیف میں پڑ جائے تو اس کے چاہنے والے اس کے غم میں ، اس کے دکھ تکلیف میں خود کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے جو لوگ یہ عذر پیش کر رہے ہیں کہ یہ کپتان کا ذاتی معاملہ ہے ، نہیں ہر گز نہیں ، یہ اس کا ذاتی اس اعتبار سے ضرور ہے کہ نکاح کے بول عمران اور ریحام نے ادا کیے، نو ماہ کچھ دن ساتھ گزارے، لیکن لوگوں کے لیڈر کو دکھ پہنچا، تکلیف ہوئی، وہ پریشان نظر آ رہاہے یہ دکھ ، یہ تکلیف اور پریشانی اس کے کروڑوں چاہنے والوں کا دکھ ہے، ان کی تکلیف ہے۔ سیاست دان عوام کے دلوں کی دھڑکن بن جاتے ہیں، وہ جب عوامی زندگی میں داخل ہوجاتے ہیں تو معروف جمہوری اصولوں کے مطابق اس لیڈر کی کوئی بات کوئی معاملہ ان کا ذاتی یا نجی نہیں رہتا، خوشی ہو یا غم ان میں شریک ہونے کا حق ان کے چاہنے والوں کو حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کا طرز زندگی ملکیت ، دوسروں سے برتاؤ، تراش خراش، گفتگو کرنا، ہنسنا، رونا، لباس طعام و خوراک اور خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا عوام کا حق بن جاتا ، ہے۔ذوالفقار علی بھٹو کو دیکھ کر لوگوں نے شلوار قمیض کے کلچر کو اپنایا، قائدا عظم سگار پیا کرتے تھے ، بے

شمار لوگوں نے ان کی اس عادت کو اپنایا، نواز شریف کھانے میں سری پائے کا شوق رکھتے ہیں لوگوں نے اسے بھی اپنایا، اسی طرح بے شمار ایسی باتیں اور عادتیں ہیں جو عوام اپنے لیڈر میں دیکھ کر اپنا لیتے ہیں۔ والدین کی بے شمار باتوں کو ان کے بچے کاپی کیا کرتے ہیں، اساتذہ کو اپنا آئیڈیل بنا کر ان کے بے شمار طالب علم ان کی متعدد باتوں کو اپنا لیتے ہیں۔ سیاست دانوں کے بعض جملے اور بعض نعرے اس قدر مشہور ہو جاتے ہیں کہ وہ برسوں عوام الناس کی زبان پر رہتے ہیں۔

دنیا میں سیاست دانوں کی نجی زندگی کے حوالے سے، ان میں شادی، طلاق، بچے، لڑائی جھگڑے غرض ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہوتا جس پر میڈیا میں گفتگو نہ ہوتی ہو۔ تبصرہ نہ کیا جاتا ہو۔ عالمی قوانین عوامی شخصیات کی نجی زندگی سامنے لانے کی اجازت دیتے ہیں۔ امریکی نائب صدر راک فیلر نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی تو میڈیا نے اسے خوب اچھالا، ایک طوفان برپا کر دیا، لیڈی ڈیانا کو طلاق ہوئی تو خوب چرچے ہوئے، خود عمران خان نے بھرے مجمعے میں یہ نہیں کہا تھا کہ 'میں شادی کر لوں' ، انھوں نے اپنی اس شادی کا اعلان پریس کانفرنس میں صحافیوں کے سامنے ہی تو کیا تھا۔ اب اگر وہ مختصر ہی صحیح طلاق کی تفصیل بتا دیتے تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ وہ میڈیا میں ذاتی زندگی پر کھل کر بات کرتے رہے ہیں۔ بعض سمجھدار تجزیہ نگار اس مسئلہ پر ضرورت سے زیادہ

جذباتی نظر آتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس صحافی کو یہ سوال ایک ماہ بعد پوچھنا چاہیے تھا، ایک تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ اس صحافی نے بہت اجلت میں سوال کیا اسے یہ سوال چھ ماہ بعد کرنا چاہیے تھا۔بہت خوب موت آج ہوئی میت کو دفن کرنے کے لیے ایک ماہ اور چھ ماہ کا وقت مقرر کیا جارہا ہے۔ ایک سینئر تجزیہ نگار نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ عمران نے صحافی کے سوال کے جواب میں بالکل صحیح رویہ اختیار کیا، پاکستان کا کلچر باقی دنیا سے مختلف ہے اس لیے عمران خان سے کیے گئے بیہودہ سوال پر ان کا ردِ عمل بھی مختلف ہی آنا تھا، سوال کرنے والے صحافی کے منہ پر جواب میں تھپڑ بھی مارا جاسکتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ عمران خان سے علیحدگی سے متعلق سوال کا وقت صحیح نہیں تھا، یہ سوال چھ مہینے بعد اور تمیز کے دائرے میں کیا جانا چاہیے تھا۔جب ایک تجزیہ نگار نے اس شدت پسندانہ رائے پر اظہار خیال کیا تو جواب میں کہا گیا کہ اسے ایک نہیں دو تھپڑ رسید کردینا چاہیے تھے۔ ایک سینئر صحافی دوسرے صحافی کے بارے میں یہ رائے دے رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عمران قصداًاس صحافی کے سوال کو پوری طرح سنے بغیر آپے سے باہر ہوگئے ہوں اور انہوں نے میڈیا کو اس مسئلہ پر آئندہ کے لیے انڈر پریشر کرنے کی حکمت عملی اختیار کی ہو۔ کچھ بھی ہوجائے عمران اس دھوپ سے بچ نہیں سکیں گے وہ خواہ کسی بھی دیوار کا سہارا لیں ، جب جب جہاں جہاں صحافیوں کو موقع ملے گا وہ ان سے اس حادثے کے حوالے سے ضرور سوال کریں گے۔ کیا عمران سے ان کی پہلی بیوی کے بارے میں سوال نہیں

کیا جاتا؟ صحافی تو اب بھی معاملے کی چھان بین پر پورا زور لگائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اصل حقائق کا پتا لگا سکیں۔ وہ کب اس میں کامیاب ہوں گے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ عمران کی ازدواجی زندگی کا دوسرا سفر مختصر رہا، جلد علیحدگی ہو گئی ۔ عمران تو پہلے ہی اپنی پہلی ازدواجی زندگی سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، سیاست نے انہیں سہارا دیا ہوا تھا، اس صورت حال سے وہ اور بھی ٹوٹ بھوٹ کر رہ گئے ہوں گے۔ معروف شاعر جونؔ ایلیا بھی اپنی ازدواجی زندگی میں اسی
قسم کی صورت حال سے دوچار ہوئے تھے۔ اس پر انھوں نے اپنے غم اور دکھ کا اظہار اس طرح کیا تھا، یہی صورت حال عمران پر بھی صادر آتی ہے ۔

عشق سمجھے تھے، جس کو وہ شاید
تھا بس ایک نارسائی کا رشتہ
میرے اور اُس کے درمیاں نکلا
عمر بھر کی جدائی کا رشتہ

اقبالؔ۔ تیری عظمت کو سلام

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(9نومبر1877۔21اپریل 1938ء)

اقبالؔ دنیائے عالم کی قدآور، بلند و بالا اور عظیم شخصیت کا نام ہے۔ اقبالؔ کی شاعری، نثر نگاری، سیاسی بصیرت، ریاست کا فلسفہ، نوجوانوں میں بیداری کا تصور، اسلام کے بہترین شارح ان کی ایسی منفرد خصوصیات ہیں کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی صفات وامتیازی وصف انہیں دیگر سے ممتاز کرتا ہے۔ شاعرِ مشرق نے پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں 9نومبر1877ء میں آنکھ کھولی ۔ ان کے والد شیخ نور محمد مذہبی انسان تھے معمولی تعلیم تھی، والدہ محترمہ امام بی بی خاموش طبع اور نرم دل خاتون تھیں۔ ان کا انتقال 9نومبر 1914ء کو ہوا۔ان کے والد کا انتقال 1930ء میں ہوا۔ اقبالؔ نے اپنی ماں کے لیے اپنے احساساس اور جذبات کا اظہار اس طرح کیا ۔

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا!

نُور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

اقبالؔ کی تعلیم کا نقطۂ آغاز دینی مدرسہ تھا، مولانا ابو عبداللہ غلام حسن اور شیخ نور محمد سے کلام مجید پڑھا، پھر اقبالؔ جدید تعلیم کے حصول کے لیے مولانا میر حسن کے سپرد کر دیے گئے۔ مولانا میر حسن کے مکتب میں اقبالؔ نے اردو، فارسی اور عربی ادب پڑھنا شروع کیا۔ اب اقبال کو 'اسکاچ مشن اسکول' میں داخل کر دیا گیا جہاں پر باقاعدہ جدید تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اقبالؔ کی تعلیم و تربیت میں میر حسن کی تربیت کا بہت بڑا دخل ہے جو سر سید احمد خان کے علم و عمل تعلیم کے حوالے سے جدید نظریات کے حامی بھی تھے۔ استاد کے دل میں سر سید اور علی گڑھ تحریک کی جو قدر و عظمت تھی وہ شاگرد کے دل میں بھی پیدا ہو گئی ۔ سر سید کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا جذبہ بھی اقبالؔ میں پیدا ہو چکا تھا۔ اقبالؔ نے 16 برس کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا، ساتھ ہی وہ خاندانی رسم و رواج کے مطابق دولھا بھی بن گئے اور ان کی شادی کریم بی بی سے انجام پائی، ان سے اقبال کے دو بچے ہوئے بیٹی معراج بی بی اور آفتاب اقبال۔ انٹر گورنمنٹ مرے کالج سے کیا اور بی اے

لاہور کے گورنمنٹ ڈگری کالج سے 1897ء میں کیا۔ اب اقبال شاعری کی جانب باقاعدہ راغب ہوچکے تھے۔ ان کے استاد میر حسن نے اقبال میں شعر و شاعری کا ذوق بھی پیدا کردیا تھا۔ فلسفہ میں ماسٹرز کیا، یہاں سر تھامس آرنلڈ ان کے استاد تھے۔ماسٹرز کرنے کے بعد اقبال نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا پہلے اورینٹل کالج لاہور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفہ کے استاد رہے۔ 1905ء تک اقبال تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر ٹرینٹی کالج کیمرج میں تعلیم حاصل کی، جہاں پر انہیں پروفیسر براؤن اور سارلی کی سرپرستی ملی اور انھوں نے ان دونوں اساتذہ سے فیض حاصل کیا، اسی دوران اقبال جرمنی چلے گئے وہاں انھوں نے میونخ یونیورسٹی اپنے تحقیقی مقالے ''ایران میں مابعد از طبعیات کا ارتقاء'' کے موضوع پر مقابلہ لکھا جس پر وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری سے فیض یاب ہوئے۔ 1908ء میں برطانیہ کے کالج ’ لنکزاِن‘ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہوگئے، جہاں ان کے سینئر پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔ لندن میں قیام مختصر رہا جلد ووطن واپس آگئے اور وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔

1910ء میں علامہ اقبال کا عقد ثانی سردار بیگم سے ہوا ان کے بطن سے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال 5 اکتوبر 1924ء کو پید ہوئے۔ جسٹس جاوید اقبال شاعر مشرق کی بڑھاپے کی اولاد تھے، ساتھ ہی مرادوں اور منتوں کے نتیجے میں انہیں ملے

تھے۔ اولادِ نرینہ کی خواہش لیے علامہ اقبال سرہند تشریف لے گئے اور شیخ احمد (حضرت مجدد الف ثانی) کے مزار پر منت مانی، یہ بھی التجا کی اگر ان کی مراد پوری ہوئی اور اللہ پاک نے انہیں بیٹا عطا کیا تو وہ اسے لے کر اسی جگہ حاضر ہوں گے۔ کہتے ہیں انسان کی زندگی میں بعض گھڑیاں قبولیت کی ہوتی ہیں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور جاوید اقبال کی صورت میں بیٹا عطا کر دیا تو علامہ اپنے اس بیٹے کو سرہند مجدد الف ثانی کے مزار پر لے کر گئے، اس واقعہ کا ذکر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب 'زندہ رُود' میں کیا ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے حالات زندگی پر ایک مستند تحقیقی تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے جاوید علامہ اقبال کے چہیتے اور لاڈلے بھی تھے۔ علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو جاوید اقبال 13 برس کے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے قمر الاسلام کو 'جاوید اقبال' بنا دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید کر دیا۔ اپنے چہیتے بیٹے کے لیے علامہ اقبال نے ایسی نظم کہی جو بظاہر تو خطاب جاوید اقبال سے تھا لیکن یہ خطاب محض جاوید اقبال سے نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے نوجوانوں سے ہے۔ علامہ نے اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کی شاعری محض انسانی عمل نہیں بلکہ اس میں ان کے اندر موجود شاعر کی آواز محسوس ہوتی ہے وہ بنیادی طور پر ایک شاعر اور فلسفی پیدا ہوئے۔ 'مخزن' کے سابق مدیر شیخ عبدالقادر نے لکھا کہ 'غالبؔ اور اقبالؔ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے' اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں' دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا'۔ اقبالؔ نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے غالبؔ کو جرمن شاعر 'گوئٹے' کا ہم منصب قرار دیا۔ بانگِ درا میں اقبالؔ نے' مرزا غالبؔ' کے عنوان سے نظم کہی جو غالبؔ کو خراج تحسین بھی ہے اور اسی نظم کے ایک شعر میں اقبالؔ نے غالبؔ کو جرمن شاعر 'گوئٹے' کا ہم نوا قرار دیا اور جرمنی کے اس شہر کا ذکر کیا جہاں گوئٹے دفن ہے۔ اقبالؔ کی اس نظم کے چند اشعار ۔

فکرِ انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کُجا
تھا سراپا روح تُو، بزم سخن پیکر ترا

زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہا بھی رہا
آہ! تُو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہا کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے

ویمر' جرمنی کا وہ شہر ہے جس میں معروف جرمن شاعر 'گوئٹے 'مدفن ہے۔ اردو' زبان کو غالبؔ کے ساتھ ساتھ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ پر بھی فخر ہے۔ اقبالؔ ان شاعروں میں سے ہیں کہ جنھوں نے شاعری.برائے شاعری نہیں کی بلکہ ان کی شاعری میں فلسفہ و حکمت کے مشکل و پیچیدہ اور خشک مسائل کو اشعار کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری محض شعر و سخن کا شاہکار ہی نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کو درست سمت لے جانے، اسے جھنجوڑنے کا خوبصورت ذریعہ ہے۔ اقبالؔ نے قدیم و مشکل اصطلاحات و تلمیحات کے لب و لہجہ کو صحیح رخ میں ڈھالا۔ اقبال کی بعض بعض نظمیں اقبالؔ کے فلسفہ حیات کی آئینہ دار ہیں ان میں 'ساقی نامہ' اور' مسجد قرطبہ' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عبادت.بریلوی کے بقول 'اقبالؔ شاعری میں موضوعات کے اعتبار سے تنوع، وسعت اور ہمہ گیری ہے لیکن وہ بنیادی طور پر عظمت انسانی اورانسانیت کے شاعر ہیں۔ ان کے

تمام افکار و خیالات اسی انسان اور انسانیت کے مختلف انفرادی اور اجتماعی معاملات و مسائل کے گرد گھومتے ہیں'۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی شاعر، ادیب، فلسفی، دانشور، علم و حکمت رکھنے والا کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے اقبالؔ کو خوبصورت الفاظ میں خراج عقیدت پیش نہ کیا ہو۔ اقبالؔ کے بے شمار اشعار ضرب المثال ہیں۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق کا کہنا تھا کہ ''علامہ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین شُعراء اور مفکرین میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی حیات ہی میں انہیں 'شاعر مشرق' کہا جانے لگا''۔ ای ایم فاسٹر کا کہنا ہے کہ ''یہ بھی ہمارے شہنشاہانہ طرزِ حکومت کا ایک کرشمہ ہے کہ اقبال جیسا شاعرِ جس کا نام گزشتہ دس برس سے اُس کے ہم وطن مسلمانانِ ہند میں بچے بچے کی زبان پر ہے، اُس کے کلام کا ترجمہ اس قدر عرصے کے بعد جاکر ہماری زبان میں ہوسکے۔ ہندُوں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے' وہی مسلمانوں میں اقبالؔ کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے' اس لیے کہ ٹیگور کو بنگال سے باہر اس وقت تک کسی نے نہ پوچھا جب تک وہ یورپ جاکر نوبل پرائز نہ حاصل کر لائے۔ برخلاف اس کے اقبالؔ کی شہرت یورپ کی اِعانت سے بالکل مُستثنیٰ ہے''۔ مصر کے ڈاکٹر عبد لوہاب عزام نے اقبال کو رومی قرار دیا ان کا کہنا تھا کہ ''اگر جلال الدین رومیؒ اس زمانے میں جی اُٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے۔ ساتویں صدی کے

جلال اور چودھویں صدی کے اقبال کو ایک ہی سمجھنا چاہیے"۔

کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کے استاد پروفیسر نکلسن جنھوں نے اقبال کی مشہور زمانہ فارسی نظم "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کرکے اور اس پر دیباچہ و حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے رُوشناس کرایا۔ نکلسن کا کہنا ہے کہ "اقبال کی شاعری نے نوجوان مسلمانوں میں بیداری پیدا کردی ہے اور بعض نے یہاں تک کہہ گیا کہ جس مسیحا کا انتظار تھا وہ آگیا ہے"۔

اقبال وہ نابغۂ روزگار تھے جن کی علمی وادبی وسیاسی فکر نے برصغیر کے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی، ان میں ملی خودداری کو اجاگر کیا، مسلمانوں کو خود شناسی کا سبق سکھانے کے لیے فکری جہاد کیا۔ تصور پاکستان کا خواب دیکھا اس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہٰ آباد منعقدہ 29 دسمبر 1930ء کے صدارتی خطبہ میں کیا۔ اقبال کا یہ خطبۂ الہٰ آباد' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ اقبال کا فکری اور ادبی شاہکار ہے۔ اس خطبہ میں ملی تشخص کی عالمانہ تشریح ملتی ہے۔ اس خطبہ کو تحریک پاکستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ کی اس سوچ نے مسلمانوں کے لیے ایک مسلم ریاست کے قیام کی سمت کا تعین کردیا۔ مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کا

خواب دیکھنے والے علامہ اقبالؔ تھے اور اس خواب کی عملی تعبیر پیش کرنے والے ، اسے حقیت کا روپ دینے والے قائدِ اعظم محمد علی جناح تھے۔جناح کا اقبالؔ کے بارے میں کہنا تھا کہ ''اقبالؔ کی ادبی شخصیت عالمگیر ہے۔ وہ بڑے ادیب ' بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے، لیکن اس حقیقت کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑے سیاستدان بھی تھے۔۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا مجھے موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا''۔قراردادِ پاکستان منظور ہونے پر بانی پاکستان قائدِ اعظم نے کہا 'آج اقبال زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے'۔ پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا اس کی جدوجہد جاری تھی۔ اقبالؔ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تو قائدِ اعظم نے کہا ''میرے پاس سلطنت نہیں ہے، لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا''۔اقبالؔ کا کردار عملی سیاست میں بھی دکھائی دیتا ہے وہ 1926ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1930ء میں خطبہ الٰہ آباد تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جو انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے 21 ویں سالانہ اجلاس کے موقعے پر صدر کی حیثیت سے دیا اور پاکستان کے نظریہ کی وضاحت زیادہ واضح الفاظ میں پیش کی۔

اقبالؔ، داغؔ دہلوی کے براہِ راست شاگرد نہیں تھے لیکن خط و کتابت کے ذریعہ اقبالؔ نے داغؔ سے رہنمائی لی جس کی وہ دل سے قدر کیا کرتے تھے۔ داغؔ کا کہنا تھا کہ ''کلامِ اقبال میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے''۔ داغؔ کو اس بات پر فخر تھا کہ'' اقبالؔ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی''۔ داغؔ اور اقبالؔ کے مابین سلسلہ تلمذ بہت دیر قائم نہیں رہا۔ لیکن اقبالؔ کے دل میں داغؔ سے مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر تھی۔ اور داغؔ نے بھی اقبالؔ کے کلام میں اصلاح کی گنجائش نہ سمجھا۔ بھارت کے رابندر ناتھ ٹیگور نے اقبال کے انتقال پر کہا ''ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے اَدب میں ایسی جگہ خالی کر گئے ہیں، جس کا گھاؤ مدت مدید میں بھی بھر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستا کا رُتبہ آج دُنیا میں اِتنا کم پایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں اَیسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے، جن کے کلام نے عالمگیر مقبُولیت حاصل کر لی ہو''۔

علامہ اقبال کی پہلی اردو میں کتاب 'علم الاقتصاد' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان کے شعری مجموعوں میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضرب کلیم، ارمغانِ حجاز، زبور عجم، جاوید نامہ، اسلام اور جمہوریت، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ قابل ذکر ہیں۔ فارسی میں اقبال کی تین کتابیں 'اسرار خودی'، 'رموزِ

بے خودی‘ اور ’پیام مشرق‘ شامل ہیں۔اقبال کو1922 ء میں برطانیہ کی جانب سے ’سر‘ کا خطاب ملا، انہیں ”ترجمانِ حقیقت“ کا لقب بھی سے بھی نوازا گیا۔اقبال کی تمام ’ تر کتب فارسی، اردو اور انگریزی ایسی ہیں کہ ہر ایک پر طویل لکھا جاسکتا ہے، یہی نہیں بلکہ اقبالؔ کی بعض بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون تحریر کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کے لیے اقبالؔ کی لکھی گئیں نظمیں اپنی مثال آپ ہیں، اس قدر آسان الفاظ، عام فہم ، با معنی، دلچسپ کے بچے بہت دلچسپی سے انہیں پڑھا کرتے ہیں۔ دعا ’لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری، زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری‘ ایک ایسی دعا ہے کی جس کی مثال نہیں ملتی۔

علامہ اقبال کو اپنی طویل علالت کے باعث احساس ہوچلا تھا کہ اب وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں گے۔ اس وقت آپ کو سب سے زیادہ فکر اپنی لائبریری کی ہوئی جس میں نایاب و نادر کتب بڑی تعداد میں محفوظ تھیں۔ چنانچہ آپ نے 13اکتوبر1935ء میں اپنا وصیت نامہ تحریر کرایا۔ اس وصیت نامہ کے مطابق اپنی ذاتی لائبریری کی تمام کتابیں انجمن حمایت اسلام کے کالج ’اسلامیہ کالج‘ لاہور کی لائبریری کو بطور تحفہ دینے کی وصیت کی۔ علامہ کی وصیت کے مطابق آپ کی ذاتی لائبریری کا ذخیرہ کتب اسلامیہ کالج کی لائبریری کو دیا گیا۔ اس ذخیرہ کو لائبریری میں ’اقبال کلیکشن‘ کے نام سے علیحدہ رکھا

گیا۔ شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال 21 اپریل 1938ء کو رضائے الٰہی سے مالک حقیقی سے جا ملے، لاہور کی بادشاہی مسجد کے اساسی دروازے کے باہر دائیں جانب مدفن ہوئے۔ اقبالؔ کے شعر پر اختتام کرتا ہوں ۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

متحدہ کی ایوانوں میں واپسی

جمہوریت کی گاڑی چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو ہر صورت میں ملک و قوم کے لیے مفید اور بہتر ہوتی ہے۔ پاکستان کی 68 سالہ تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کم اور آمریت کا دور دورہ زیادہ رہا۔ ایسی صورت حال بھی آئی کہ سیاسی جماعتوں نے از خود آمروں کو دعوت دی اقتدار سنبھالنے کی اور انھوں نے اقتدار سنبھالا۔ ترقی کے اعتبار سے موازنہ کیا جائے تو جمہوری دور کے مقابلے میں آمروں کے دور میں ملک نے زیادہ ترقی کی، عوام میں زیادہ خوش حالی آئی اس کے باوجود جمہوری طرز حکمرانی کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا کہ آمریت کے مقابلے میں لولی لنگڑی جمہوریت بہتر ہے۔ آمریت میں آمر اور اس کے حواریوں کی حکمرانی چلتی ہے۔ ان کی مرضی اور منشاء کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جمہوری دور میں عدالتیں آزاد ہوتی ہیں، میڈیا آزاد ہوتا ہے، مختلف سطح پر سینٹ، قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیاں موجود ہوتی ہیں جہاں پر عوام کے نمائندے اپنی آواز، اپنے خلاف ہونے والے ظلم و زیادتی کی دوھائی دے سکتے ہیں، اگر کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی ہو تو میڈیا اسے انصاف دلانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ایسی بے مثال مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ عدالت نے سو موٹو نوٹس لیا اور مظلوم کو انصاف مل گیا یا کسی بات کو میڈیا نے اچھالا اس پر فوری توجہ دی

گئی۔ جمہوری نظام میں منتخب نمائندے اپنا رشتہ پارلیمانوں سے منقطع کرلیں تو پھر ان کی آواز سننے والا، ان کی شکایات حکومت تک پہنچانے والا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ منتخب ایوانوں کے توسط سے منتخب نمائندے اپنی آواز متعلقہ حکام تک بہ آسانی پہنچا سکتے ہیں۔

پاکستان میں موجودہ حکومت 2013ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آئی۔ اسے ڈھائی سال کا عرصہ حکمرانی کرتے ہوئے ہوگیا ہے، اتنا ہی عرصہ ابھی باقی ہے۔ اس تفصیل میں جائے بغیر کہ نون لیگ کا طرزِ حکمرانی کیسا ہے، اِن ڈھائی سالوں میں ملک نے کتنی ترقی کی، عوام میں کس قدر خوش حالی آئی، لاء اینڈ آڈر کی کیا صورت حال رہی، دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس حکومت نے کیا اقدامات کیے، اندرونی اور بیرونی خلفشار سے کس طرح نمٹا گیا۔ دھرنوں کی سیاست سے کیسے نمٹا گیا۔ دھاندلی کے الزامات کا مقابلہ کیسے کیا گیا، تمام امور اپنی جگہ لیکن جمہوری نظام چل رہا ہے۔ بیچ بیچ میں سخت اور کٹھن حالات نے اس حکومت کو آگھیرا، خاص طور پر تحریک انصاف اور علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے حکومت کو اپنے آگے لگایا ہوا تھا، دھرنوں کی سیاست، جلسے جلوسوں، ریلیوں کی سیاست نے نون لیگ کو ہچکولے کھانے پر مجبور کردیا، ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا کہ نیوٹرل امپائر کی انگلی اٹھنے کے اشارے بھی سامنے آئے لیکن جمہوریت نے تمام تر حالات کو شکست دی، جمہوری کا سورج طلوع

رہا۔ دہشت گردی ایک ایسا مسئلہ حکومت کو درپیش رہا کہ اس سے نمٹنے کے لیے اسے سو جتن کرنے پڑے۔ آپریشن ضربِ عضب میں حکومت کے ساتھ تمام سیاسی جماعتیں متحد اور منظم نظر آئیں۔ کراچی آپریشن میں بھی سیاسی جماعتوں کے اتحاد کی یہی صورت حال تھی۔ ملک کی چوتھی اور سندھ کی دوسری بڑی سیاسی جماعت متحدہ قومی موومنٹ ایم کیو ایم) بھی آپریشن ضرب عضب اور کراچی آپریشن کے حق میں حکومت کے) ساتھ تھی۔ اس نے بھرپور طریقے سے کراچی میں آپریشن کی حمایت کی اور اپنی تمام تر حمایت اور تعاون کا یقین دلایا۔ کراچی میں آپریشن جیسے جیسے آگے بڑھا سندھ کی اس جماعت کے تحفظات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس جماعت نے اپنے تمام منتخب نمائندوں کے ساتھ احتجاجاً تمام ایوانوں سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصہ قبل یہی عمل تحریک انصاف کی جانب سے بھی کیا جاچکا تھا، ان کے استعفے منظور نہیں ہوئے تھے اور وہ واپس ایوانوں میں آچکے تھے۔ اس طرح قانون میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کوئی منتخب نمائندہ احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے اور حکومت اس کی ناراضگی دور کردے تو وہ اپنا استعفیٰ واپس لے کر ایوان کا حصہ بن سکتا ہے۔ حکومت نے ایم کیو ایم کے اس مسئلہ پر بھی یہی حکمت عملی اپنائی اور انہیں سمجھاتے اور مناتے رہے اور استعفے واپس لینے پر رضامند کرتے رہے۔ جس کے لیے

کئی راستے اختیار کیے گئے، مولانا فضل الرحمٰن سے ثالث کا کردار ادا کرنے کی درخواست کی گئی جسے انہوں نے قبول بھی کیا اور وہ ایم کیو ایم کو منانے ایم کیو ایم کے مرکز نائن زیرو بھی تشریف لے گئے۔ جو ایک اچھا اقدام تھا گو ان کے اس عمل کو ان کی اپنی جماعت کے بعض لوگوں نے تنقید کا نشانہ بھی بنایا، مولانا صاحب نے کوشش کی لیکن بات بن نہ سکی، بگاڑ پیدا ہوتا گیا، یہ بات طے تھی کہ اگر ایم کیو ایم کے استعفے قبول کر لیے جاتے تو ملک میں جمہوریت کے لیے مشکلات ہی نہیں بلکہ جمہوری بحران پیدا ہوجانے کا خطرہ تھا۔ اس کی ایک وجہ نون لیگ اور پیپلز پارٹی درمیان پیار و محبت رشتہ جدا ہوچکا ہے۔ بلکہ ان کے درمیان فاصلے پیدا ہوچکے ہیں۔ چنانچہ حکومت ایم کیو ایم سے رابطے میں رہی اور نون لیگ اور نواز شریف کے بہ اعتماد وزیر اسحاق ڈار صاحب کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور دونوں جماعتوں میں سمجھوتا ہوگیا جس کے نتیجے میں سندھ کے معاملات کے لیے ایک گریوانس کمیٹی تشکیل پا گئی جس کی ڈیمانڈ ایم کیو ایم کر رہی تھی۔ گریوانس کمیٹی (Grievance Redressal Committee, GRC) تشکیل عمل میں آچکی ہے۔ اس میں جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، جسٹس (ر) اجمل میاں، جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان، بیریسٹر فروغ نسیم اور سیکریٹری داخلہ حکومت پاکستان شامل ہیں۔ اس کمیٹی کو تین ماہ میں اپنی رپورٹ حکومت پاکستان کو پیش کرنا ہے۔ ان میں سے بیریسٹر فروغ نسیم نے اپنی مصروفیات کے باعث معزرت کر لی ہے، امکانات یہی ہیں کہ ان کی جگہ حکومت کسی

اور ایم کیو ایم کی اہم شخصیت کو اس کا رکن نامزد کردے گی۔ میڈیا پر الطاف حسین کے بلیک آؤٹ کا مسئلہ ہائی کورٹ میں ہے، اس پر حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان کچھ پیچیدگی سامنے آئی ہے وہ بھی افہام و تفہیم سے دور ہوجائے گی۔ اس لیے کہ اسی میں حکومت کے لیے بہتری ہے اور یہی سندھ کی اس دوسری بڑی سیاسی جماعت کے لیے بھی بہتر ہے۔ ایم کیو ایم کے سیاسی وفد کی ڈی جی رینجرز سے ملاقات بھی مستقبل میں بہتر حالات کا اشارہ دے رہے ہیں۔

پیر 2 نومبر 2015ء کو متحدہ کے سینیٹرز ایوان بالا میں واپس پہنچ گئے۔ خوش آئند بات تھی کہ ایوان میں موجود اراکین نے اپنے ساتھیوں کو ڈیسک بجا کر خوش آمدید کہا۔

نون لیگ کے سینیٹر مشاہد اللہ خان صاحب ایم کیو ایم کے طاہر مشہدی کی نشست پر گئے اور انہیں ایوان میں واپس آنے پر مبارک باد دی۔ اس موقع پر چیئرمین سینٹ نے خصوصی رولنگ دی جس میں کہا گیا کہ 'چیئرمین سینٹ اور اسپیکر کے استعفوں کی منظوری کے حوالے سے کردار کو متنازع بنایا گیا' ایم کیو ایم کے پارلیمانی لیڈر فاروق ستار نے استعفوں کے بعد کہا تھا کہ حکومت ان کی بات نہیں سن رہی تھی اس لیے استعفے دیے۔ اب چونکہ حکومت ان کی بات سن رہی ہے اس لیے انہوں نے استعفے واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے، مذکورہ استعفے سیاسی ہونے کے حوالے سے کافی مواد موجود تھا، استعفے موثر ہونے سے قبل ایم کیو ایم نے استعفے واپس لیے۔ چیئرمین نے کہا کہ ایم کیو ایم ارکان

جتنا عرصہ احتجاجاً استعفوں پر رہے، اس عرصے کی چھٹی کی درخواست دے سکتے ہیں۔
اس کے علاوہ زیر التوا بزنس کے حوالے سے بھی درخواست دے سکتے ہیں'۔ایم کیو ایم کا کہنا تھا کہ انھوں نے احتجاجاً استعفے دیے تھے پارلیمان کے خلاف نہیں ہیں۔ انھوں نے وزیر خزانہ اسحاق ڈار ار وزیر اطلاعات پرویز رشید کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ متحدہ کے فاروق ستار نے کہا ہے کہ وہ جمعیت علمائے اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن کی بدولت پارلیمنٹ میں واپس
آئے ہیں۔
سینٹ کے بعد متحدہ کے منتخب نمائندہوں نے قومی اسمبلی میں بھی اپنی حاضری ڈال دی ہے اور وہاں سے بھی اپنے استعفے واپس لے لیے، وہ جمعہ 6 نومبر کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوئے، مسلم لیگ نون کے اراکین اسمبلی نے ڈیسک بجا کر ان کا خیر مقدم کیا،اس موقع پر قومی اسمبلی کے قائم مقام اسپیکر مرتضٰی جاوید عباسی نے رولنگ دی کہ ایم کیو ایم کے ممبران اسمبلی کے استعفے واپس قرار دیے جاتے ہیں،ڈپٹی اسپیکر نے ایم کیو ایم کے ممبران کا ایوان میں واپسی کا خیر مقدم کیا۔اسپیکر نے آئین اور قانون کا حوالہ دیتے ہوئے رولنگ دی۔اب متحدہ قومی موومنٹ کی جانب سے سندھ اسمبلی میں بھی درخواست جمع کرادی گئی ہے کہ ان کی جماعت نے سندھ اسمبلی کی نشستوں سے

مستعفی ہونے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ اس کو واپس لیتے ہیں اور انہیں بدستور سندھ اسمبلی کا رکن برقرار رکھا جائے۔ اسپیکر آغا سراج درانی نے ایم کیو ایم کے استعفیٰ واپس لینے کا فیصلہ کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ استعفے قائد حزب اختلاف خواجہ اظہار الحسن اور ایم کیو ایم کے پارلیمانی لیڈر سید سردار احمد کی سربراہی میں دیگر 43 اراکی نے ذاتی طور پر اسپیکر آغاسراج درانی سے ان کے چیمبر میں ملاقات کی اور اپنے استعفے واپس لینے کی اجتماعی درخواستیں پیش کیں۔ متحدہ کے سات ارکان نے جو بیرون ملک ہیں استعفوں سے متعلق اپنی کردرخواستیں بذریعہ فیکس ارسال کیں، جن میں عادل صدیقی، ارم عظیم فاروقی، محمد اشفاق منگی، خالد بن ولایت ، محمد عدنان، امیر مظاہر اور رؤف صدیقی شامل ہیں۔ اب متحدہ کے تمام اراکین منتخب ایوانوں میں اپنا آئینی اور جمہوری حق احسن طریقے سے انجام دیں گے۔ متحدہ کا یہ عمل ان کے جمہوری سوچ رکھنے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سیاسی جماعت جمہوریت پسند جماعت ہے اس کا دہشت گردی اور پاکستان مخالف سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ملک میں، جمہوریت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں، جمہوری کردار ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ملک میں موجود جمہوری عمل کی گاڑی کا پہیہ پٹری سے اتر جائے یا جام ہوجائے یا یہ تباہ و برباد ہوجائے۔ پاکستان کی کوئی ایک سیاسی جماعت بھی ایسی نہیں جس میں بیڈ ایلیمنٹس موجود نہ ہو، گلو بٹ ، لنگڑا، کنکٹا، موٹا، پہاڑی نہ جانے

کیا کیا نام کے دہشت گرد و انتہا پسند ہر جماعت میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ اُس جماعت کو استعمال کرکے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ ماضی میں بے شمار ایسے واقعات رونما ہوچکے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کے کارندے غیر ذمہ دارانہ معاملات میں ملوث پائے گئے، یہاں تک کہ ہوئی جہاز تک ہایہ جیک کرلیا گیا۔ ایم کیو ایم میں بھی یقیناً ایسے لوگ ہیں جن کے خلاف کاروائی ہورہی ہے۔ اس جماعت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جو لوگ کسی بھی جرم میں ملوث ہوں انہیں قانون نافذ کرنے والے اپنی گرفت میں نہ لیں، ضرور انہیں گرفتار کریں لیکن انہیں گرفتار کرکے قانون کے مطابق ان کے ساتھ عمل کیا جائے۔ یہ بات مناسب اور قانون کے مطابق بھی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ حکومت اور ایم کیو ایم کے معاملات نارمل ہوجائیں گے، اسی میں دونوں جماعتوں کی بہتری ہے، اسی میں عوام کا مفاد ہے، اسی میں جمہوری قدروں کی بقا ہے۔ ایم کیو ایم کا منتخب ایوانوں میں واپس آجانا پارٹی کے لیے بھی، سندھ کے خصوصاً شہری علاقوں کے عوام کی فلاح و بہبود میں مثبت ثابت ہوگا۔ سیاست ضرور کی جائے لیکن ایوانوں میں رہ کر سیاست کرنا جمہوری عمل کو مضبوط کرتا ہے، جمہوریت پنپتی ہے، پروان چڑھتی ہے، ملک و قوم ترقی کی جانب گامزن ہوتے ہیں۔

شیشہ کیفے کی بندش کا حکم

یہ امر باعث ستائش ہے کہ پاکستان کی سب سے اعلیٰ عدالت سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک تین رکنی بنچ جس کی سربراہی چیف جسٹس جناب انور ظہیر جمالی کر رہے تھے، اپنے ایک آڈر میں چاروں صوبائی حکومتوں کو حکم دیا ہے کہ ملک میں قائم غیر قانونی 'شیشہ کیفے' فوری طور پر بند کروائے جائیں۔ معزز عدالت نے چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرل کو حکم دیا ہے کہ وہ فوری طور پر صوبوں میں قائم شیشہ گھروں کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کریں۔ اعلیٰ عدالت کے اس آڈر کے بعد چند دن قانون نافذ کرنے والے ادارے متحرک نظر آئے اور اس کے بعد معاملا سرد خا کی نظر ہو گیا۔ اطلاعات کے مطابق پنجاب اسمبلی میں شیشہ نوشی کو روکنے کے لیے قانونی بل کی تیاری کی جاچکی ہے لیکن دیگر صوبوں میں تاحال قانونی طور پر اس لعنت سے نمٹنے کے لیے اقدامات کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ کراچی میں قانون نافذ کرنے والے اداروں نے کچھ دن شہر کے شیشہ کیفے پر چھاپے مارے اور شاید انہیں بند کرادیا گیا ہو اور ان کے خلاف قانونی کاروائی بھی کی گئی جو ایک قابل تعریف بات ہے لیکن یہ عمل چند دن کے بجائے مستقل جاری رہنے والا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا فرض ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے آڈر پر من و عن عمل کریں۔

حقہ پینا ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے، یہ صدیوں سے گاؤں، دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں پیا جا رہا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ بھی حقہ پیا کرتے تھے۔ حقہ دراصل تمباکو کے استعمال کا ایک ذریعہ ہے۔ جس میں تمباکا مزا یا نشہ کوئلہ کی آگ کی تپش کے بعد پانی سے ہوتا ہوا دھویں یا بھاپ کی شکل میں انسان کے منہ کے ذریعہ جسم کے اندر جاتا ہے اور حقہ پینے والا اسے واپس اپنے منہ کے توسط سے باہر نکالتا ہے۔ اس عمل سے تمباکو کے مضر اثرات تو جسم کے مختلف حصوں میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں اور خالی دھواں باہر نکال دیا جاتا ہے۔ سگریٹ یا شیشہ پینے والا باہر نکلتے دھویں کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے کہ اس نے ایک کش لگایا اور واپس دھویں کا سفید بادل اپنے منہ سے باہر نکال رہا ہے وہ نادان اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ کہ سگریٹ، حقہ، شیشہ کے مضر اثرات جو جسم کے اندر رہ گئے وہ دھواں بن کر باہر نہیں نکلے بلکہ انہوں جسم کے اندر اپنے شکار تلاش کرنا شروع کر دیے ان کا شکار نشہ کرنے والے کا دماغ ہوتا ہے جسے وہ ماؤف کر دیتے ہیں، انسان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم سے کم ہوتی جاتی ہے، دل کو اندر ہی اندر نقصان پہنچتا ہے، پھیپھڑے متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور یہی وہ نشہ ہوتا ہے جو کبھی کینسر کے نام سے، کبھی دل کے دورے کے نام سے، کبھی دمے کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ شیشہ پینے والا یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ یہ بیماری تو کسی کو بھی

ہو سکتی ہے مجھے بھی ہو گئی لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نشہ کرنے والوں میں یہ بیماریاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا زیادہ ہوتی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے سروے کے مطابق ہمارے ملک میں پچیس ملین افراد تمباکو کا نشہ کرتے ہیں، تمباکو کے نشے سے مراد سگریٹ، شیشہ، سگریٹ کے ذریعہ استعمال کیا جانے والا نشہ ہے۔اس تعداد میں مرد 36 فیصد ہیں اور خواتین جن میں زیادہ تر جوان لڑکیاں ہیں نو فیصد ہیں۔اسی سروے کے مطابق پاکستان میں تمباکو کا نشہ یعنی سگریٹ، شیشہ سے ہر سال ساٹھ ہزار افراد ان بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا اور وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

نشہ خواہ کوئی بھی ہو انسانی زندگی کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی قسم کے نشے سامنے آ چکے ہیں۔ ان میں ایک نشہ 'شیشہ' بھی ہے۔ شیشہ دیہاتوں کے روایتی حقہ کے بجائے جدید، مختصر، خوش نما، رنگین حقہ کے ذریعہ ہی پیا جاتا ہے حقہ میں شیشہ ڈال کر کش لگایا جاتا ہے۔ شیشہ، سگریٹ اور دیگر نشہ آور چیزوں کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ مضر صحت ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیشہ کیفے میں بیٹھ کر بظاہر حقے کے کش لگانا فیشن بن گیا ہے۔ ملک میں شیشہ گھروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری نوجوان نسل تیزی سے اس دَل دَل میں پھنستی جا رہی ہے۔ شیشہ پینے کا رجحان

تیزی سے پھیل رہا ہے، شیشہ کی تباہ کاریوں کا اندازہ کیے بغیر ہمارے نوجوان جن میں لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہیں شیشہ کیفے کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ جو چیز بظاہر انہیں تسکین دے رہی ہے وہ انہیں اندر ہی اندر مفلوج کر رہی ہے۔ یہ ایک ایسا نشہ ہے جو انسان کے دل و دماغ اور جسم کے دیگر اعضاء کو متاثر کرتا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ایک سگریٹ مشکل سے پانچ منٹ میں پی لیا جاتا ہے جب کہ شیشے کا سیشن کم سے کم آدھے گھنٹے کا ہوتا ہے، گویا شیشہ کے کش لگانے والا ایک وقت میں آدھے گھنٹے تک نشہ کی کیفیت میں رہتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیشے میں سگریٹ کے مقابلے میں 36 فیصد زیادہ ٹار، 1.7 فیصد زیادہ نیکوٹین اور 8.3 زیادہ کاربن مونو آکسائیڈ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیشہ سگریٹ کے مقابلے میں زیادہ اور تیزی سے انسانی جسم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ سگریٹ تو سگریٹ نوش کرنے والے کے پھیپھڑے متاثر کرتا ہے جب کہ شیشہ انسانی دل، دماغ، گلا، پھیپھڑوں کو متاثر کرتا ہے۔ شیشے سے دل کی بیماری کا عارضہ ہو سکتا ہے، سانس سے متعلق بیماریاں جیسے دمہ Asthma، پھیپھڑوں کا کینسر Lungs Cancer، گلے کی نالی کا کینسر (Cancer of esophagus)، نمونیہ، حاملہ خواتین میں سانس کی بیماریاں اور نو مولود بچوں میں، سانس کی بیماریاں شامل ہیں ہو سکتی ہیں۔

میں نے گلشن اقبال بلاک 6 کے علاقے میں قائم شیشہ کیفے میں دوپہر ایک سے

تین بجے کے درمیان اسکول کے بچوں کو اسکول کا یونیفارم پہنیں شیشہ کیفے میں ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے شیشہ پیتے دیکھا ہے۔ ان بچوں کے یونیفارم دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی نجی انگریزی میڈیم اسکول کے طالب علم ہیں اور نویں یا دسویں کلاس کے طالب علم ہوں گے۔ کیا ان کے والدین کو علم ہے کہ ان کا بچہ اسکول کی چھٹی ہو جانے کے بعد کتنی دیر بعد گھر آیا، اسکو کی چھٹی ہو جانے کے بعد کا وقت اس نے کہا گزارا انہیں ابھی اس بات کا احساس نہیں لیکن جب یہی بچہ ، یہی طالب علم نشے کا عادی ہو چکا ہوگا ، نشے نے اس کو نہ جانے کن کن بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہوگا اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور جب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ ہمیں صرف یہی نہیں سوچنا چاہیے کہ حکومت کی جانب سے شیشہ کیفے کے خلاف کاروائی کی جائے، حکومت ہی انہیں بند کرائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھیں، اسکول کی چھٹی کب ہوتی ہے، انہیں اسکول اور گھر پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے، اگر وہ زیادہ وقت لگا رہے ہیں تو خاموشی سے ان کی ریکی کیجئے ، دیکھئے کہ وہ اسکول کے بعد کا وقت کہا گزار رہے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے میں اپنی گاڑی میں بیگم کے ہمراہ اپنے چچا کی تیمارداری کے لیے نکلا ، مجھ سے کچھ دیر قبل میرا چھوٹا بھائی بھی اپنی گاڑی اپنی بیگم کے ہمراہ وہیں جانے کے لیے نکل چکا تھا۔ میں اپنے چچا کے گھر پہنچ گیا وہ بہت دیر بعد وہاں پہنچے ، میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ جب گھر سے نکلے تو ان کے چھوٹے بیٹے علی

ندیم کا کوچنگ سینٹر سے نکلنے کا وقت تھا۔آتے آتے انہوں نے چھپ کر اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بیٹے کی نقل و حرکت کی ریکی کی کہ وہ کوچنگ سینٹر سے گھر کی جانب کس راستے سے واپس جاتا ہے، راستے میں رکتا ہے یا سیدھا گھر چلا جاتا ہے۔ مجھے یہ بات سن کر اچھا لگا کہ آجکل کے حالات میں والدین کو اپنے بچوں پر اسی طرح کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ شیشہ کے کیفے عام دکانوں میں کھلے ہوئے ہیں، یہ دکانیں ہم آپ ہی انہیں کرایہ پر دیتے ہیں، خدارا اگر اللہ نے آپ کو دولت سے نوازا ہے، جائیداد دی اور آپ ایک یا کئی دکانوں کے مالک ہیں تو دکان کرائے پر دیتے وقت یہ لالچ نہ کریں کہ کون زیادہ کرایہ دے رہا ہے بلکہ اس بات کی چھان بین اچھی طرح کرلیں کہ دکان کرایہ پر لینے والا کیا کاروبار کرے گا، اس سے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیں کہ اس دکان میں شیشہ کیفے ہرگز ہرگز نہیں
کھلے گا۔ اس عمل سے ہم اپنی آنے والی نسل کو نشہ جیسی خوف ناک لت سے محفوظ رکھیں گے۔

حکومت پاکستان نے اور عالمی ادارہ صحت نے تمباکو اور اس سے ملتی جلتی تمام نشہ آور چیزوں پر پابندی عائد کردی ہے۔ ان کا استعمال قانونا جرم ہے۔ اس قانون کے تحت سرعام شیشہ کیفیز کو فوری بند کیا جائے، سگریٹ پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہ تمام، کی تمام شیشہ پر بھی عائد ہوں گی، شیشہ کے

نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تعلیمی اداروں میں آگاہی کے پروگرام ترتیب دیے جائیں۔ انفرادی طور پر والدین اپنے بچوں کو شیشہ کے نقصانات سے آگاہ کریں۔ شیشہ استعمال کرنے والے یا کسی بھی قسم کے نشے کے عادی لوگ اپنے سینسز کھو بیٹھتے ہیں، انہیں اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی، ان کا دماغ ماعوف ہو جاتا ہے، کھوئے کھوئے رہتے ہیں، چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں، ان کی آنکھوں کی رونق اور چمک ماند پڑ جاتی ہے، وہ دوسروں سے نظریں چرانے لگتے ہیں، ان کا اپنے اوپر کنٹرول ختم ہو جاتا ہے، غیر اخلاقی ، نازیبا ، گری ہوئی حرکات کرنا ان کے لیے عام سی بات ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ جو اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں وہ پیسے کی لالچ میں پاکستان کی نئی نسل کو تباہی کی جانب لے جانے پر عمل پیرا ہیں یہ پاکستان کے مستقبل کو تباہ و برباد کرنے کے مترادف ہے۔ پاکستان کا مستقبل نئی نسل سے وابستہ ہے اور شیشہ کا کاروبار کرنے والے پاکستان کے مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں پاکستان کی عدالت اعظمیٰ کا فیصلہ روشنی کی ایک کرن کی مانند ہے۔ یہ وقت کی ضرورت اور آنے والی نسل کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی جانب اہم قدم ہے ۔ اس فیصلے پر اس کی اصل روح کے ساتھ ، انصاف اور ایمانداری سے اور سختی کے ساتھ عمل ہونا چاہیے۔

روزنامہ جناح، اسلام آباد، لاہور، کراچی اور روزنامہ اتحاد لاہور میں 13 نومبر 2015 کو شائع ہوا)

بھارت کے صوبہ بہار میں نریندر مودی کی زلت آمیز شکست

بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی کو متعصبانہ، تشدت پسند، مسلمان دشمن اور پاکستان مخالف رویے نے صوبہ بہار کے انتخابات میں زلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔ مودی کی بی جے پی کے مقابلے میں نتیش کمار، لالو پرشاد یادیو اور راہول گاندھی کے اتحاد نے واضح برتری حاصل کر لی۔ صوبہ بہار کے صوبے کی اسمبلی کی کل 243 سیٹوں کے انتخاب میں بی جے پی صرف 58 سیٹیں حاصل کر سکی جب کے اس کے مقابلے میں تین جماعتی اتحاد نے 178 سیٹوں پر کامیابی حاصل کر کے مودی کو بھارت کے صوبے بہار شریف نے چاروخانے چت کر کے مودی کو ایسا آئینہ دکھایا جس ان کا اصل چہرہ صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ بی جے پی کی یہ شکست نریندر مودی کی متعصب، مسلمان دشمنی اور پاکستان سے بلاوجہ پرخاش کا شاخسانہ ہے۔ بی جے پی کی انتخابی مہم خود مودی جی نے چلائی، انھوں نے انتخابی مہم میں چالیس سے زیادہ جلسے اور ریلیوں کی سربراہی کی لیکن تمام تر متعصبانہ حربے پر صوبہ بہار کے عوام نے خاک میں ڈال دی۔ نریندر مودی کا اکھنڈ بھارت، ہندوتوا، مسلمانوں سے دشمنی و تعصب، پاکستان سے نفرت، نیچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ غیر انسانی و غیر اخلاقی رویہ بی جے پی کو فائدہ نہ پہنچا سکا۔ وزیر اعظم بھارت کی کرسی حاصل کرنے کے بعد مودی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ ماضی میں جس متعصبانہ، فرقہ پرست

پالیسی پر عمل کر چکے ہیں اب اس پالیسی پر عمل درآمد کرنا ان کے لیے اور زیادہ آسان ہوگا، کیونکہ وہ اب بہ اختیار ہیں، معمولی سی لب کشائی سے بی جے پی، آر ایس ایس اور شیو سینا کے کارندے مودی مخالفین کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ وہ یہ بھول گئے کہ اقتدار عزت بھی عطا کرتا ہے اور نہ انصافی، ظلم وزیادتی، متعصبانہ سوچ اختیار کرنے والے کو لمحہ بھر میں بے عزت بھی کر ڈالتا ہے۔ مودی سرکار نے دہلی میں اپنی شکست سے سبق حاصل نہیں کیا اس کے برعکس شکست کا بدلہ لینے کے لیے شدت پسندوں کے غیر آئینی، غیر قانونی، خیر اخلاقی، غیر جمہوری، متعصبانہ، شدت پسندانہ اقدامات پر خاموشی اختیار کی جو اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ شیو سینا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور دیگر متعصب وفرقہ پرست تنظیمیں بھارت سرکار کی سرپرستی میں مسلمانوں، پاکستان، نچلی ذات کے ہندوؤں کے خلاف، سکھ اور عیسائیوں کے خلاف منظم کاروائیاں کر رہے ہیں اور مودی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کسی ایک واقعہ کی کھلے بندوں مذمت نہیں کی، اگر بات کی بھی تو وہ بقول شخصے ایسی کی کہ بکری نے دودھ دیا اور وہ بھی مینگنیوں بھرا۔

لالو پرشاد یادیو جو صوبہ بہار کے سابق وزیر اعلیٰ اور بی جے پی کے خلاف بننے والے اتحاد کے ایک رکن بھی ہیں نے انتخابات میں مودی کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے ،ہکہ 'بی جے پی کا حکومت میں رہنا ملک کو تقسیم کر دے گا

مَیں نے یہی بات بہار کے انتخابات سے قبل اپنے ایک کالم 'بھارت کا گورباچوف نریندر مودی' میں کہی تھی کہ اگر بی جے پی کی سرپرستی مودی کے ہاتھ میں رہی تو وہ بھارت کو مزید تقسیم کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے اور وہ بھارت میں روس کے گورباچوف ثابت ہوں گے۔ اب یہی بات بھارت کے اپنے لیڈر کہنے لگے ہیں۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ شیو سینا جس کی مذموم، بیہودہ مسلمان دشمن و پاکستان دشمن کارائیوں پر مودی سرکار نے اپنی آنکھیں موندی ہوئی ہیں اس نے بھی صوبہ بہار میں بی جے پی کی شکست کا ذمہ دار نریندر مودی کو ٹھہراتے ہوئے کہا ہے کہ مودی جی مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو لگام دینے، ان کے خلاف کاروائی کرنے میں ناکام رہے جس کے باعث بہار میں بی جے پی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شیو سینا ہی کیا بھارت کے تمام تجزیہ نگاروں، سیاسی لیڈروں، حتیٰ کہ امریکی اخبار نیویورک ٹائمز کے اداریے میں بھی بہار میں شکست کا ذمہ دار مودی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اب مودی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ مودی کی سیاسی پرورش فرقہ پرست، متعصب تنظیم آر ایس ایس کے کارکن کی حیثیت سے ہوئی تھی، وہ بہت جلد اپنی متعصبانہ پالیسیوں کی وجہ سے گجرات کا وزیر اعلیٰ بن گے، پھر طاقت کے بل بوتے پر ہم خیال اور کانگریس سے بد دل ہونے والے ان کے گرد جمع ہوگئے اور ملکی سطح پر بی جے پی کی لیڈر شپ پر قابض ہوگئے، وزارت عظمیٰ پر پہنچ جانے کے باوجود انہوں نے اپنی منفی سوچ اور متعصبانہ رویہ نہ بدلہ۔ مسلمانوں کی دشمنی، پاکستان سے نفرت سے بھارت کو مزید تقسیم نہیں

کیا جاسکتا ؟ کہنے میں تو یہ جملہ اچھا ہے لیکن نریندر مودی کی اب تک کی پالیسیاں اور طرز حکمرانی بھارت کو اِسی جانب گامزن کیے ہوئے ہے۔

نریندر مودی کے وزیر اعظم بننے کے بعد سے اب تک کی ناکام حکومتی پالیسی، مختلف شہروں میں ہندو انتہاپسندوں و شدت پسندوں کی کاروائیاں، مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی، کشمیر میں ظلم وزیادتی، اقلیتوں کے ساتھ ظلم وزیادتی، نچلی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ ناروا سلوک پر حکومت اور نریندر مودی کا عمل اور خاموشی نے بھارت کے اعتدال پسند، جمہوریت پسند، لبرل، دانشوروں، تجزیہ نگاروں، مصنفین، سائنس داں، ماہرین تعلیم، فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والوں اور معاشرے کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں حتیٰ کے سابق فوجیوں کی تنظیم نے مودی سرکار کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے حکومتی اعزازات و انعامات واپس کرکے دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ مودی کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ کانگریس کے رہنما راہول گاندھی نے بہار کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور راشٹریہ سیوک سنگھ ملک کو تقسیم نہیں کرسکتے، نہ ہی ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑاکر کوئی الیکشن جیت سکتا ہے۔

راہول گاندھی کا تجزیہ اپنی جگہ، لالو پرشاد یادیو کی رائے اپنی جگہ لیکن یہ بات طے ہے کہ دہلی کے بعد بہار شریف میں بی جے پی کی ناکامی نے بھارت میں مستقبل کی سیاست کا تعین کردیا ہے۔ مودی کا گراف مسلسل نیچے کی جانب ہے وہ

دن دور نہیں جب مودی اقتدار سے جان چھڑانے کے لیے قبل از وقت انتخابات کا اعلان کردیں گے یعنی وسط مدتی انتخابات کی راہ ہموار کرنے میں نریندر مودی اہم کردار ادا کریں گے۔

پاکستان کے ساتھ ان کا رویہ مسلسل ' میں نہ مانو' والا ہے۔ ان کے حالیہ دورہ مقبوضہ کشمیر میں کچھ ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں پاکستان سے اچھے تعلقات اورمذاکرات کی بحال کااشارہ دیا گیا لیکن انہوں نے اس اشارے کو گول کرتے ہوئے نام لیے بغیر یہ کہا کہ کشمیر کے مسئلہ پر مجھے کوئی بھی سمجھانے کی کوشش نہ کرے وہ اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مودی کا خیال ہے کہ وہ کشمیریوں کو 50 کروڑ کے امدادی پیکج سے مقبوضہ کشمیری عوام کے دکھوں کا مداوا کرسکے گے۔ انہیں اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ ان کا یہ دورہ مقبوضہ کشمیری کے رہنماؤں کو جیل میں ڈال کر، نظر بند کرکے پولس اور فوجیوں کے سائے تلے ممکن ہوسکا۔ مودی جی آپ کی گرفت سے بھارت کے صوبے نکلتے جارہے ہیں آپ کشمیریوں کو اپنا ہم نوا کیسے بنا سکتے ہیں۔آپ کو اپنی انتہا پسندانہ پالیسیوں کا نتیجہ مل چکا ہے۔ یہ پالیسیاں آپ کے سیاسی مستقبل میں بہتری لانے کے بجائے آپ کو شکست کی دلدل میں دھکیلتی جارہی ہیں۔آپ نے تو فخریہ کہا تھا کہ آپ بہار کے انتخابات ہر صورت میں جیتے گے نیز یہ کہ آپ نے یہ انتخابات جیتنے کا تہیہ کر رکھا ہے، کہا گیا آپ کا تہیہ، کہا گیا آپ کا

غرور، کہا گیا آپ کا تکبر۔ آپ کی سربراہی میں نکلنے والے چالیس ریلیوں نے آپ کا ساتھ نہ دیا، چھ لاکھ سے زیادہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے کارکنوں کو آپ نے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ بی جے پی کے حامیوں کو پولنگ اسٹیشن تک پہنچانے کافریضہ انجام دیں گے۔ انہوں نے یہ کام بڑی جانفشانی سے کیا، آپ کا وفادار بن کر کیا لیکن وہ عوام جنہیں یہ کارکن پولنگ اسٹیشن تک لے کر گئے، انہوں نے اپنا ووٹ آپ کے بجائے آپ کے مخالف اتحاد کے ڈبے میں ڈال دیا، کیوں؟ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں۔ اپنی پالیسی میں تبدیلی لائیں، مسلمان دشمنی اور پاکستان سے نفرت آپ کو زندگی بھر بے چین رکھے گی، چاہے آپ وزارتِ عظمیٰ پر جلوہ افروز رہیں یا گجرات واپس چلے جائیں، بی جے پی سے وابستہ رہیں یا اس سے علیحدہ ہوجائیں مسلمانوں کے خون سے آپ کے ہاتھ رنگے ہیں۔ وہ خون آپ کو زندگی بھر پریشان رکھے گا۔ غلطیوں کا ادراک کرتے ہوئے مثبت سوچ اختیار کریں، خود بھی درست سمت اختیار کریں اپنے انتہا پسند، شدت پسند ساتھیوں کو بھی لگام ڈالیں۔ آپ سے پہلے 67 سال تک جو بھی تخت دہلی پر براجمان رہے وہ پاکستان کا کچھ نہ بگاڑ سکے، آپ بھی اس مملکت کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ یہ ملک قائم رہنے کے لیے بنا ہے انشاء اللہ قائم و دائم رہے گا۔ آپ کا انجام وہی ہوگا جو آپ سے پہلے تخت دہلی پر حکمرانی کرنے والوں کا ہوا۔ آج بہار شریف کے شریفوں نے انتخابات میں آپ کو آئینہ دکھا کر آپ کی کوتائیوں کا، آپ کی انتہا پسند،

شدت پسند پالیسیوں کا، شیو سینا اور راشٹریہ سیوک سنگھ اور دیگر انتہا پسندوں، فرقہ پرستوں کے ہاتھوں کھیلنے کا سبق سکھایا ہے کل اور صوبے بھی دہلی اور بہار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کو اسی طرح بدترین شکست سے دوچار کریں گے۔ چنانچہ مودی جی ہوش کے ناخون لیجیے، جوش انسان کو بہتری سے برائی کی جانب لے جاتا ہے۔ آپ بھی جوش نہیں بلکہ ہوش میں آئیں۔

کتاب میلہ، نعت ریسرچ سینٹر اور خوش اِلحان نعت گو صبیح رحمانی

کتاب میلہ پروگرام کے مطابق اختتام کو پہنچا۔ کراچی میں آج اس علمی، ادبی، کتابی دلچسپی کا آخری دن تھا۔ لوگ پہلے دن کی طرح جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ہم نے آج بھی اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے کتاب میلے کا رخ کیا۔ فیضؔ کے تمام شعری مجموعوں پر مشتمل مجموعہ ''نسخہ ھائے وفا'' جنگ پبلی کیشن کے اسٹال پر ملا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی سوچا کہ چلو یہ مجموعہ پچاس فیصد ڈسکاؤنٹ پر مل جائے گا۔ معلوم ہوا کہ جنگ صرف اپنی ہی مطبوعات پر یہ رعایت دے رہا ہے دیگر اداروں کی کتب پر مشکل سے بیس فیصد، فیضؔ کے اس مجموعہ پر وہ بھی نہیں۔ کافی بحث مباحثہ کیا لیکن ہاتھی کے دانت دیکھنے کے اور دکھانے کے اور والی مثال ہے۔ بڑے بڑے اشتہار، لوگوں کے جم غفیر کا واویلا، زیادہ سے زیادہ رعایت دینے کے دعوے اور حقیقت اس کے برعکس۔ پیاسے کو تو پانی پینا ہی ہوتا ہے، ہم اس مجموعہ کو ہر صورت میں لینا چاہتے تھے سومنہ مانگی قیمت دی۔ کتاب میلے کی بعض کتابیں ایسی تھیں کہ جن پر کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں دیا جارہا تھا اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ان کتب کی ڈیمانڈ بہت ہے۔ ان میں سے ایک فیضؔ کا یہ شعری مجموعہ 'نسخہ ھائے وفا' بھی تھا۔ اچھی کتاب کے مل جانے کا سرور سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ پہلے دن ہم صرف ایک ہال

کے اسٹالوں پر گھومے تھے، ابھی دو ہالوں کے اسٹالوں پر سجی کتابوں کو دیکھ کر اپنی علمی پیاس بجھانا تھی، آخری دن بھی تھا اور ملتان سے ہمارے ایک عزیز عبدالحمید خالد نے فرمائش کی تھی کہ ہم صبیح رحمانی جو ایک خوش فکر و خوش ادا اور خوش نظر و خوش نوا نعت گو ہیں کے اسٹال ''نعت ریسرچ سینٹر' پر حاضری دیں۔ فصیح رحمانی شام چار تا سات اپنے اسٹال پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہم اسی وقت ہال نمبر دو میں پہنچے فصیح رحمانی نعت ریسرچ سینٹر کے اسٹال پر موجود ایک صاحب سے گفتگو میں مصروف تھے ان سے فارغ ہوئے تو ہم نے اپنا تعارف، حمید صاحب کی فرمائش کا ذکر بھی کیا، وہ فوراً پہچان گئے۔اخلاق سے ملے، کچھ دیر ہی بیٹھ سکا، اس لیے کہ ایسے معروف لوگ اگر پبلک پلیس پر ہوں تو ان سے ملنے اور قربت کا شرف حاصل کرنے والوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ ہمیں ان کی شہرت اور مصروفیات کا ادراک تھا، اس لیے جلدی جلدی بعض موضوعات پر گفتگو ہوئی، انہوں نے اپنے نعت ریسرچ سینٹر کی تفصیل بتائی، اپنے جاری کردہ رسالے 'نعت رنگ' کے پچیس شماروں کا ذکر کیا، ایک کتابچہ بھی عنایت فرمایا جس میں نعت رنگ کے ان شماروں کا مختصر تعارف درج ہے۔ ہم نے سرسری طور پر وہاں پر رکھے ہوئے ان شماروں پر طائرانہ نظر ڈالی، یہاں نعت ریسرچ سینٹر کی شائع کردہ کتب بھی رکھی تھیں ان کو بھی دیکھا۔اپنے نبی ﷺ سے عشق ہمارا ایمان ہے ،شاعری اور نعتیہ شاعری میرا خاندانی ورثہ ہے، میرے خاندان میں متعدد نعت گو شاعر، صاحب دیوان شاعر

گزرے ہیں اور اب بھی اس صنف ادب میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ میں بھی کچھ کر لیتا ہوں، اپنے آپ کو شاعروں کے صف میں شمار ہر گز نہیں کرتا، نثر نگاری پر ہی اکتفا ہے، شخصیت نگاری میرا مخصوص شعبہ ہے، کئی احباب کی شخصیت و شاعری پر کتب آچکی ہیں۔ اپنے جدِ امجد شیخ محمد ابراہیم آزادؔ جو نعت گو شاعر اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی شخصیت اور شاعری پر ایک کتاب مرتب کی جو 2013 ء میں شائع ہوچکی ہے۔ شخصیت نگار کی ایک کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل موضوع سے ادھر ادھر اکثر نکل جاتا ہے، اس کی اپنی شخصیت تو کسی بھی حوالے سے اس میں ضرور آ ہی جاتی ہے۔ بہت کوشش کرتا ہوں کہ ایسا نہ کروں پھر بھی نہ دانستہ طور پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ صبیح رحمانی سے گفتگو کے حوالے بات ہو رہی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود شاعر بھی ہیں اور نعت پڑھتے بھی ہیں، ان کی خوش ادائیگی کی کیا بات ہے۔ انکا کہنا تھا کہ نعت ریسرچ سینٹر قائم کرنے کا مقصد نعتِ رسول مقبول ﷺ کا فروغ ہے۔ وہ اس موضوع کو تحقیق کے نقطہ نظر سے اہمیت دیتے ہیں، نعت کے کسی بھی موضوع پر اگر کوئی تحقیق کی خواہش رکھتا ہے تو وہ اوران کا ادارہ اس کی رہنمائی اور معاونت بھرپور طریقے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایسے کتنے ہی محقق ہیں جنہوں نے نعت کے موضوع پر ایم فل کیا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد احمد کے پی ایچ ڈی تحقیق کا موضوع تھا 'اردو نعت پاکستان میں'' ۔ فصیح رحمانی جب یہ گفتگو کر رہے تھے تو میری نظروں کے سامنے اپنے دوست ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی کا مقالہ آگیا۔ ان کے مقالے کا موضوع

ہے ’عہد نبویؐ کی نعتیہ شاعری‘ ، میں نے فصیح رحمانی کو اپنے دوست کے اس مقالے کے بارے میں بتایا۔ ابھی چند روز قبل ہی میں ڈاکٹر تبریزی کے گھر گیا تھا اور ان کے اس مقالہ کو دیکھ کر میں اپنے مقالے پر کیے ہوئے کام کو بھول گیا۔ دو جلدوں میں ، ہر جلد ایک ایک ہزار صفحات پر مشتمل۔ اس موضوع پر یہ اولین کام ہے جو ڈاکٹر تبریزی نے انتہائی محنت ، جانفشانی، طویل جد وجہد کے نتیجے میں کیا، ان کا کہنا تھا کہ اس کام میں بائیس سال صرف ہوئے، واقعی ہوئے ہوں گے، جس نوعیت کا اور جس قدر ضخیم یہ کام ہے ،آسانی سے اور چند سالوں میں ممکن نہیں۔ یہ علمی و تحقیقی جائزہ سات ابواب پر مشتمل ہے اس میں ڈیڑھ سو سے زائد صحابہ کرامؓ کا نعتیہ کلام یکجا کیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب اس مقالے کو چھپوانے کی سعی میں ہیں اور یہ کام اس پائے کا ہے کہ اسے طباعتی صورت میں سامنے آنا بھی چاہیے تاکہ عشق نبی ﷺ میں شرشار دیوانوں کے علم یہ آسکے کہ نبوی عہد میں نعت کی کیا صورت تھی، نعت کہنے والے کون کون لوگ تھے، ان میں مسلمان بھی تھے غیر مسلم بھی،اس دور کی نعت تھی کیا، الفاظ کیا تھے، شاعری کا رنگ و روپ کیا تھا،ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ جلد اپنے اس مقصد کو حاصل کر لیں گے۔اس لیے کہ انہوں نے مجھے تقریظ لکھنے کو کہا۔

فصیح رحمانی نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ وہ ملتان میں رہبر صمدانی اور

سرور صمدانی سے واقف ہیں، ان دونوں بھائیوں کو جو میرے چچازاد بھائی ہیں کو شاعری واشت میں عطا ہوئی ہے۔ ان کے والد تابش صمدانی ملتان کے نامی گرامی معروف نعتیہ شاعر تھے ، ان کے دادا خلیل صمدانی ،پردادا شیخ محمد ابرہیم آزادؔ جو میرے بھی پردادا ہیں بیکانیر ،راجستھان کے نامی گرامی صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ فصیح رحمانی ’نعت رنگ‘ کے مدیر بھی ہیں ، خود بھی مضامین لکھتے ہیں دیگر لکھنے والوں کو بھی اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک قیمتی لائبریری بھی قائم کی ہوئی ہے۔ وہ کسی ادارہ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں، پہلے بھی کئی اداروں میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ نعت پڑھنا ان کا شوق اور شاعری ان کی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت ہے۔ صبیح رحمانی کا ایک شعر ؂

ایک اِک گام پہ روشنی کرو مدحت کے چراغ
نعت کی روشنی پھیلاؤ جہاں تک پہنچے

فصیح رحمانی کے حوالے سے ایک بات یہاں لکھنا چاہتا ہوں جو میں وقت کی تنگی کے باعث اس وقت ان سے نہ کہہ سکا، البتہ اپنے سعودی عرب جانے کا ذکر ضرور ہوا۔ میں نے ایک مضمون ’خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہار‘ کے عنوان لکھا تھا جو 25 ستمبر 2014ء کو ہماری ویب پر آن لائن ہوا۔ اس مضمون میں فصیح رحمانی کے حوالے سے جو کچھ لکھا اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ’’خانہ کعبہ میں

حاضری اور روضہ رسول ﷺ پر سلام عرض کرنے کی خواہش کس مسلمان کے دل میں نہیں ہوتی۔ میرے دل میں بھی یہ خواہش تھی جو الحمد اللہ پہلی بار ۲۰۱۱ء میں پوری ہوئی۔ اپنی اس آرزو کا اظہار میں نے اشعار میں اس طرح کیا تھا، دو اشعار ؎

ہے تمنا کرلوں طوافِ کعبہ ایک بار
پھر چاہے میرا دمِ آخر ہو جائے
عطا ہو جائے آبِ زم زم کا ایک گھونٹ ہی
تشنہ لبی میری اب تو تمام ہو جائے

خوب خوب مانگا، دل کھول کر مانگا، بے جھجک مانگا، اپنے لیے اوروں کے لیے، جن جن احباب نے دعاؤں کے لیے کہا ان سب کی دعائیں نام لیے بغیر کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ سب کے نام لیے جاسکتے، دعائیں کیں۔ جس لمحہ میں طواف کعبہ کر رہا تھا اور حاجی صاحبان میرے ارد گرد تھے یکایک میرے لبوں پر سید فصیح رحمانی کا یہ کلام آگیا ؎

کعبہ کی رونق کعبہ کا منظر، اللہ اکبر اللہ اکبر
دیکھوں تو دیکھے جاؤں برابر، اللہ اکبر اللہ اکبر
حیرت سے خود کو کبھی دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کبھی میں حرم کو
لایا کہاں مجھ کو میرا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

تیرے کرم کی کیا بات ہے مولا، تیرے حرم کی کیا بات ہے مولا
تا عمر کر دے آنا مقدر، اللہ اکبر اللہ اکبر

فصیح رحمانی کی خوش الحانی و خوش نوائی تو اپنی جگہ دل کو مسحور کر دینے والی ہے ہی ان کی شاعری میں بھی رچاؤ ہے، درد ہے ، جاذبیت ہے، سریلا پن ہے، ادب ہے ، احترام ہے، اپنے نبیؐ کی چاہت اور عشق رچا بسا ہوا ہے۔ ان کا کلام حمد اور نعت مقبول زدِ خاص و عام ہیں۔ فصیح رحمانی سے قربت کی یہ پہلی ملاقات تھی جو بہت خوش گوار رہی ساتھ ہی یادگار بھی ۔ وہ جو خدمت علم و ادب، خصوصاً نعت رسول مقبول ﷺ کے حوالے سے کر رہے ہیں قابل تعریف ہے۔ کتاب میلہ جو اپنے سلسلے کا گیارواں میلہ تھا سابقہ میلوں سے ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علم و ادب سے، کتاب سے محبت و عقیدت کا یہ سلسلہ یعنی کتاب میلہ صرف بڑے شہروں تک محدود نہیں ہونا چاہیے اسے ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں تک پھیلانا چاہیے۔ منتظمینِ میلہ خاص طور پر پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسو سی ایشن ، نیشنل بک فاؤنڈیشن کے تمام عہدیداران قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے کراچی جیسے شہر میں عوام کو بہت مختلف اور معلوماتی تفریح مہیا کی اور کتابوں سے محبت کا احساس دلایا جس میں وہ مکمل طور پر کامیاب رہے۔ (16 نومبر 2015)

کتاب میلہ۔کتاب کلچر کا فروغ وقت کی ضروری

کراچی ایکسپو سینٹر میں گیارواں کتاب میلہ 12 نومبر کو سج گیا پروگرام کے مطابق یہ 16 نومبر تک جاری رہے گا۔ پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلر ایسو سی ایشن قابل مبارک باد ہے کہ وہ ایسے حالات میں جب کہ لوگ کتاب کی جانب مائل نہیں، پڑھنے کا رجحان ختم ہوچکا، لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے آجانے کے بعد کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اب اگر کسی کو کچھ پڑھنے یا لکھنے کی ضرورت ہو تو انٹرنیٹ اس کی یہ علمی ضرورت آسانی سے پوری کر دے گا۔ ایسا ہرگز نہیں کتاب کی اہمیت اور ضرورت انٹرنیٹ کی آمد سے کم ہرگز کم نہیں ہوئی کتاب آج بھی اسی طرح تمام ذرائع حصول علم میں سرفہرست ہے۔ تہذیب انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جو کتاب سے تہی دامن رہا ہو اور فکر کتاب سے آزاد ہو جائے۔ کتابیں بلند خیالات اور سنہری جذبات کی دستاویزی یادگاریں ہوتی ہیں۔ شیخ سعدی کا قول ہے کہ اچھی کتابوں کا مطالعہ دل کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے‘، البیرونی‘ نے کہا ’خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں‘، یہ معلومات کے ثمر دار درختوں کے باغ ہیں، گزرے ہوئے بزرگوں کے دھڑکتے دل ہیں، حسن و جمال کے آئینے ہیں اور وقت کی گزری ہوئی بہاروں کے عکس ہیں۔ کتابیں بولتی ہیں، یہ ایک ایسی روشنی ہے کہ جس نے

گزرے زمانے کی شمع کو کسی لمحہ مدھم ہونے نہیں دیا۔ زمانے کی ترقی اسی مینارہ نور کی مرہون منت ہے۔ یہ ایک ایسا انمٹ لازوال سرمایہ ہے کہ جس نے انسانی ترقی کے تمام ادوار یعنی ماضی، حال اور مستقبل کو مربوط رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا خوش گوار فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ کتاب کا حصول اس قدر آسان ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کتاب ہمیں اسلاف اور ان لوگوں کے حالات بڑی آسانی سے مہیا کر دیتی ہے جن تک ہم پہنچ نہیں سکتے۔ کتاب جیسا ساتھ کسی کو مل سکتا ہے کہ جب آپ چاہیں کچھ وقت آپ کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جائے اور جب آپ پسند کریں تو سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگی رہے، آپ کی خواہش ہو تو آپ کے جسم و جان کا جزو بن جائے۔ جب تک آپ چاہیں خاموش رہے اور جب آپ کا جی اس سے بولنے کو چاہے تو چہکنے لگے۔ آپ کسی کام میں مصروف ہوں وہ خلل انداز نہیں ہوتی اور آپ تنہائی محسوس کریں تو آپ اسے شفیق ساتھی محسوس کریں۔ کتاب ایک ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا اور نہ کبھی آپ کا ساتھ دینے سے جی چراتا ہے۔ شاعر خیال آفاقی کے بقول ۔

نئے ذریعۂ بلاغ خوب ہیں لیکن

کتاب میں جو مزاہ ہے، کتاب ہی میں رہا

کراچی میں کتاب میلے کا افتتاح قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ نے کرتے

ہوئے کہا کہ کتب میلے کا انعقاد خوش آئند ہے ایسے کتب میلے اندرون سندھ کے شہروں میں بھی ہونا چاہیں۔اس سے لوگوں کو فائدہ ہوگا اور لوگوں میں شعور اجاگر ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے تعلیم کو نظر انداز کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم پڑھی لکھی قوم ہیں۔انہوں نے کہا کہ ہمارا تعلیمی بجٹ کم ہے۔ ان کا یہ بھی فرمانا تھا کہ ہم نے اپنے آپ کو بے وقوف بنایا کہ ہمارے ہاں 62 فیصد شرح خواندگی ہے۔ دنیا اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ از خود وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں اپنے دور کی تعریفیں اور اپنے دور میں کیے گئے اقدامات کی فہرست پیش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ بے وقوف تو ہمارے سیاست دان اور حکمراں آج تک پوری قوم کو بناتے چلے آرہے ہیں۔ حزب اختلاف میں ہوں تو لمحہ موجود کے حکمرانوں میں کیڑے نظر آتے ہیں، اپنا دور حکمرانی بھول جاتے ہیں، تعلیمی بجٹ کم ہے، آج نظر آرہا ہے، جب خود حکومت میں تھے تب تعلیم کا خیال نہیں آیا۔ خیر یہ باتیں ایک الگ موضوع کا تقاضہ کرتی ہیں۔ کراچی کے بہتر حالت میں تقریب قابل تعریف تھی۔ ترکی کے کونصل جنرل مورات ایم انارت بھی تقریب کا حصہ تھے انہوں نے بھی اظہار خیال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ترکی زبان میں لکھی گئی 42 کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ تقریب سے پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسو سی ایشن کے چیرَمین عزیز خالد، کتب میلے کے کنوینز اویس جمیل مرزا، قاضی اسد عابد اور آغا مسعود حسین نے بھی خطاب کیا۔ کتاب میلے میں کراچی کے عوام پہلے ہی دن

میلے میں جوق در جوق پہنچے۔ اس بار کتاب میلہ زیادہ سلیقے اور سجاوٹ کے ساتھ سجایا گیا ہے۔ اسے کتابوں کی تاریخ کا سب سے بڑا میلہ کہا جا رہا ہے۔ پہلے ہی روز ریکارڈ خریداری ہوئی۔ ایکسپو سینٹر کراچی کے تین وسیع ہالوں میں رنگا رنگ، چمکتے دھمکتے اسٹال لوگوں کی توجہ اپنے جانب متوجہ کر رہے ہیں۔

میلے کی ایک اچھی بات کتابوں پر پچیس سے پچاس فیصد رعایت دینا ہے۔ کتابیں خریدی جا رہی ہیں، دھڑا دھڑ لوگ کتابیں خرید رہے ہیں، حکیم محمد سعید جن کا کہنا تھا کہ 'یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم سب سے کم وقت اور سب سے کم دولت جس چیز پر خرچ کرتے ہیں وہ کتاب ہے' اگر وہ زندہ ہوتے تو کتابوں کی خریداری کو دیکھ کر ان کا دل یقیناً باغ، باغ ہو جاتا۔ گھر کے پورے پورے افراد چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میلے کا رخ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ کل رات ہم بھی گئے اس میلے سے کچھ حاصل کرنے۔ ہمارے ہمراہ بیگم، بیٹا، بہو اور پوتا ارسل نبیل بھی تھا گویا کراچی میں موجود میری کل کائینات میرے ہمراہ تھی۔ کتاب میلے میں جانا میری فیملی کا معمول ہے۔ جوں ہی میلے کا چرچہ اخبارات میں شروع ہوتا ہے میری بہو ڈاکٹر ثمرہ یاد دلاتی رہتی ہے کہ کتاب میلے میں جانا ہے۔ میلے میں جا کر خوش گوار احساس ہوا، اچھا لگا، ہم سال بھر جس قسم کی تقاریب اور محفلوں میں جاتے ہیں یہ تقریب ان تمام سے مختلف اور پر لطف تھی۔ تمام

ہی اسٹالوں پر گئے، اچھی اچھی کتابیں دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ سب ہی کتابیں خرید لائیں لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ بیگم نے اسلامی کتب کے اسٹالوں پر زیادہ وقت گزارا اور متعدد اسلامی موضوعات کی کتابیں خریدیں۔ ہماری بہو ڈاکٹر ثمرا نے اپنے بیٹے کے ہمراہ بچوں کی کتابوں کے اسٹالوں سے ارسل صاحب کے لیے بچوں کی کتابیں خریدیں، بیٹے صاحب ڈاکٹر نبیل تمام اسٹالوں کو دیکھ کر ہی اپنا جی خوش کرتے رہے۔ ہم فیضؔ کی شاعری کے مجموعوں نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندہ نامہ، دستِ تہہ سنگ، سروادیٔ سینا، شام شہریاروں، مرے دل مرے مسافر اور غبار ایام شامل ہیں، ان مجموعوں پر مشتمل کلیات فیض بعنوان ''نسخہ ہائے وفا'' وہ بھی پاکٹ سائز لینے کی خواہش میں تھے۔ کئی اسٹالوں پر معلوم کیا بڑے سائز میں تو تھا لیکن پاکٹ سائز صرف ایک اسٹال پر تھا لیکن وہ ختم ہو چکے تھا۔ پاکٹ سائز لینے کا فلسفہ اب یہ ہے کہ ہم اپنی ذاتی لائبریری جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھی گزشتہ برس وفاقی اردو یونیورسٹی کے کتب خانے ' مولوی ڈاکٹر عبد الحق میموریل لائبریری ' کو عطیہ کر چکے۔ اب اپنے ذاتی ذخیرے میں صرف وہ کتابیں رکھتے ہیں جو ہمارے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں یا جن موضوعات پر ہم لکھتے لکھاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ذخیرہ میں اقبالؔ، غالبؔ، ناصرؔ، راشدؔ کے پاکٹ سائز مجموعے موجود ہیں، یہ جگہ بھی کم گھیرتے ہیں، مطالعہ کرنے میں سہولت ہوتی ہے اور کم خرچ بالا نشیں بھی۔ دو کتابیں ہم نے خریدیں، وہ ہمیں پچاس فیصد ڈسکاؤنٹ پر ملیں

ایک 'رضاء الحق صدیقی کی کتابیں بولتی ہیں'، اس میں اردو کی چند نثری اور شعری مجموعوں پر جامع تبصرہ ہے۔ اس میں بعض بہت اچھی کتابیں ہیں جن پر جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب ڈاکٹر محمد عمر رضا کی 'اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت' ہے، ڈاکٹر عمر کا تعلق جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے لکھا ہوا ہے، کتاب انڈین مصنف کی ہے لیکن یہ کتاب پاکستان کے پبلشر نے شائع کی ہے۔ ہندوستان میں اردو پر بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ انڈین کتاب کے اس طرح چھاپنے کے قانونی پہلو کیا ہیں، اس میں جائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں آم کھانے سے مطلب، گٹھلیوں سے کیا لینا دینا، انڈین بک پاکستانی ادیبوں کے لیے اور پاکستانی ادب انڈین ادیبوں کے لیے قیمتی، دلچسپ اور غنیمت ہوتا ہے۔ اول تو اس کا ملنا ہی مشکل ہوتا ہے اگر مل جائے تو غنیمت۔ اپنے موضوع پر اچھی اور معلوماتی کتاب ہے۔ شخصیات ہمارا سب سے پسندیدہ موضوع رہا ہے اور اب تک جو کچھ لکھا اور چھاپا ہے اس میں شخصیات زیادہ ہیں۔ ایک کتاب لاہور سے الفیصل نے 'یادوں کی مالا' اور دوسری کراچی سے 'فضلی سنز نے 'جھولی میں ہیرے اور موتی' شائع کی۔ ان دونوں میں متعدد شخصیات کے خاکے اور سوانحی مضامین ہیں۔ ان کتب کی اشاعت کے بعد اتنی شخصیات پر لکھا جاچکا ہے کہ تیسری کتاب آسانی سے چھپ جائے گی۔ کالم نگاری تو بعد کی پیداوار ہے جس نے اب تمام اصناف کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بات کراچی میں ایکسپو میں لگی کتابوں کی نمائش کی شروع کی تھی، ذات بیچ میں آگئی۔ کالم نگار کی یہ بھی

ایک مجبوری ہوتی ہے۔ جسے پڑھنے والے نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ میلہ رات نو بجے تک سجا رہتا ہے۔ ابھی دو دن باقی ہیں۔ لوگوں کی دلچسپی اور ذوق و شوق اور کتابوں کی خریدی کے پیش نظر امکانات اس بات کے ہیں کہ انتظامیہ اس میں ایک دن کا اضافہ کردے گی۔ اس لیے کہ اہل کراچی کو اس قسم کی معلوماتی تفریح ایک سال بعد میسر آئے گی۔

خوشبوؤں کا شہر 'پیرس' ۔ لہو لہان

فرانس کا شہر 'پیرس' جو خوشبوؤں کا شہر کہلاتا ہے، امن کا شہر ، روشنیوں کا شہر، سیاحوں کا شہر ہفتہ 14 نومبر 2015ء کو دہشت گردی کے ہاتھوں لہو لوہان ہوگیا۔ یہ دہشت گردی کا اس قدر بڑا واقعہ ہے کہ اسے فرانس کا نائن الیون کہا جارہا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق داعش نے خود کش حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی۔ کار میں سوار دہشت گردوں نے پیرس کے سات مختلف مقامات پر گولیا اور خود کش حملے کیے۔
کنسرٹ ہال میں سو سے زیادہ افراد کو یر غمال بنا کر بیں سے زیادہ افراد کو ہلاک کردیا، ہال میں تین خود کش حملہ آوروں نے اپنے آپ کو دھماکہ خیز مواد سے اڑا لیا۔ یہ کنسرٹ ہال پیرس کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ دوسرا دہشت گردی کا واقعہ شہر کے شمالی حصے میں ایک فٹ بال اسٹیڈیم کے قرب وجوار میں ہوا جہاں پر اُس وقت فرانس اور جرمنی کے درمیان عالمی دوستانہ میچ کھیلا جارہا تھا، میچ دیکھنے والوں میں فرانسیسی صدر فرانسوا ولاند اپنی کابینہ کے ہمراہ اسٹیڈیم میں میچ دیکھ رہے تھے ، اسٹیڈیم میں چارو جانب 80ہزار شائقین میچ دیکھنے والوں میں شامل تھے جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے ، اسٹیڈیم کے آس پاس تین دھماکے ہوئے، تیسرا حملہ ایک جاپانی ہوٹل میں ہوا ، یہ ہوٹل پیرس کے شمالی حصے میں واقع ہے ۔اس کے علاوہ پیزا سینٹر، کمبوڈیا کے ہوٹل

سمیت چھ مقامات پر یکے بعد دیگرے حملے ہوئے۔ ان حملوں میں 160افراد لقمہ اجل بن گئے اور 300افراد کے زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں، ان میں سے ایک سو کے قریب زخمیوں کی حالت تشویش ناک بتائی جارہی ہے۔ انتہائی افسوس ناک، قابل مذمت فعل ہے اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ دنیا کے تمام ہی ممالک نے اس دہشت گردی کو انسانیت سوز قرار دیتے ہوئے سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے۔ فرانس میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی ہے، پیرس کو فوج کے حوالے کردیا گیا ہے۔ فرانس کی سرحدیں سیل کردی گئی ہیں۔ بے گناہ افراد کے ساتھ ساتھ آٹھ حملہ آور وں کے ہلاک ہونے کی اطلاعات بھی ہیں۔ دنیا میں ہونے والا یہ پہلا واقعہ نہیں البتہ اسے بڑا واقعہ ضرور کہا جاسکتا ہے۔

دہشت گردوں کے حملوں کا مقصد کیا تھا ؟ ایسا کرکے انہوں نے کیا حاصل کیا؟ حملہ آور کون تھے ؟ ان کا تعلق کس تنظیم سے تھا؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کے جوابات سامنے بھی ہیں اور پوشیدہ بھی ہیں، سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والوں کو اچھی طرح علم ہے کہ کون مار رہاہے، کیوں مار رہاہے ۔انہیں بھی علم ہے جو دہشت گردی کا شکار ملک ہیں ، اس کا علم انہیں بھی ہے جو دہشت گردی کر رہے ہیں، خود کش حملے کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حملہ کرنے والے گروپ یا تنظیمیں اعلانیہ طور پر دہشت گردی کے واقعہ کے فوری بعد اس کی ذمہ داری قبول کرلیتی ہیں۔جب دشمن از خود بتا رہا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے تو امریکہ اور

اتحادی اس دشمن کو ختم کیوں نہیں کر دیتے۔ بھیجیں اپنی اتحادی فوج کو جو انہیں پکڑے اور انہیں بند کر دے۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں کھیل نہیں، اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو امریکہ اور اس کے اتحادی کبھی کا ان دہشت گردوں کا قلع قمع کر چکے ہوتے۔ فرانس کی خبر رسا ایجنسی نے کسی عینی شاہد کے حوالے سے بتایا ہے کہ حملہ آوروں میں سے ایک شخص چلا چلا کر یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب فرانس کے صدر فرانسوا والاند کی اس پالیسی کا نتیجہ ہے جس کے تحت فرانس نے شام میں مداخلت کی۔ فرانس مغربی دنیا کے اس اتحاد کا ایک اتحادی ہے جو شام میں داعش کی سرکوبی میں مصروف عمل ہے، فضائی حملے کیے جا رہے ہیں۔ فرانس کی جانب اس بات کی تصدیق کی جا چکی ہے کہ یہ حملے داعش کی جانب سے کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرانسوا والاند نے اس حملے میں مسلمانوں کی تنظیم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

پیرس میں ہونے والے ان حملوں کے پیچھے عالمی سطح پر ہونے والی کشمکش، بے جا مداخلت کا دخل ہے، جس نے دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک کے علاوہ مغربی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ مصر میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے کیا حال بپا کیا، صدام حسین کو موت کے گھاٹ اتار کر دم لیا۔ پھر برطانیہ کے سابق وزیر اعظم کو جب اپنے کیے پر احساس ندامت نے تنگ کیا تو اپنا دامن چھاڑتے ہوئے مصر پر امریکہ اور اتحادیوں کی کاروائی پر مگر

مچھ کے آنسو بہاتے دکھائی دیے۔ افغانستان میں امریکہ اور اس کی اتحادیوں نے کیا کچھ نہیں کیا، کیا حاصل ہوا، اب وہاں سے واپسی مشکل نظر ہو رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا جب بارک اوباما بھی برطانیہ کے سابق وزیر اعظم کی طرح اپنے کرتوتوں پر ندامت کے آنسوں بہائیں گے اور اپنے عمل کو غلط کہتے ہوئے شرمندہ ہوں گے۔

پاکستان کئی سالوں سے دہشت گردی کا شکار ہے۔ پاکستان کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ روزنامہ 'جناح' نے اپنے اداریے میں درست لکھا ہے کہ ' اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مذکورہ حملہ امریکہ اور یورپ کی دوغلی پالیسیوں اور دو عملیوں کے سبب کیا گیا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف یورپ اور امریکہ دہشت گردی کے خاتمے کا اعلامیہ جاری کرتے ہیں اور باہم نیٹو اتحاد بنا کر اسلامی ملکوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں'۔ دنیا کے طاقت ترین ممالک جن میں سے ایک فرانس بھی ہے ، امریکہ کے بعد دوسرا نائن الیون ہو جانا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے لمحہ فکر یہ ہے۔ پالیسیوں پر ، اپنی سوچ پر، حکمت عملی پر ، مسلمانوں کو دہشت گردوں کے ساتھ ملانے پر اب انہیں سوچنا ہوگا، اس حکمت عملی کو بدلنا ہوگا۔ فرانس کے صدر نے اپنے خطاب میں ان حملوں کو شدت پسند تنظیم دولت اسلامیہ سے نتھی کر دیا۔ امریکہ اور اس کے اتحادی یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے کتنے اسلامی ملک ایسے ہیں جو

شدید دہشت گردی کا شکار ہیں۔ پاکستان میں آپریشن ضرب عضب جاری ہے اور ملک کے کونے کونے میں موجود دہشت گردوں کا صفایا کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں ہونے والے دہشت گرد حملوں میں کتنی بڑی تعداد میں عسکری اور سویلین شہید کیے جاچکے ہیں۔ کون سا اسلامی ملک ہے جو دہشت گردی کی لپیٹ میں نہیں، مصر، شام، یمن، لبیا حتیٰ کہ سعودی عرب بھی دہشت گردی کی کاروائیوں سے محفوظ نہیں رہا۔ دہشت گردی خواہ کسی بھی ملک میں ہو، دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، مشرق میں ہو یا مغرب میں، شمال میں ہو یا جنوب میں وہ قابل مذمت ہے۔ فرانس میں ہونے والی دہشت گردی کی مذمت دنیا کے ہر ملک نے کی اور کرنی بھی چاہیے۔

پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف نے پیغام دیا ہے کہ پاکستان دکھ کی اس گھڑی میں فرانس کے ساتھ کھڑا ہے۔ انہوں نے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے عالمی برادری کے ساتھ مل کر کردار ادا کرنے کا اعادہ بھی کیا۔ میاں صاحب کا بیان وقت اور حالات کے مطابق مناسب قابل تعریف ہے لیکن عالمی برادری کو بھی اپنی اسلام دشمن پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ پاکستان عالمی برادری کا ساتھ دینے کی سزا ہی تو بھگت رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ چھوٹے ممالک کے درمیان ہونے والے کشیدہ معاملات کو ثالت کا کردار ادا کرتے ہوئے حل کرا سکتے ہیں۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں پاکستان

کے وزیراعظم میاں نواز شریف کا دورہ امریکہ کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کے دشمن ملک بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی کے دورہ امریکہ کا موازنہ کرنے سے یہ صورت حال واضح ہوجاتی ہے کہ امریکہ کی نیت میں کھوٹ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ پاک بھارت کشیدگی ختم ہو، کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق حل ہو، بھارت میں مسلمانوں، دیگر اقلیتوں کے ساتھ جو متعصبانہ سلوک کیا جارہا ہے وہ دنیا سے پوشیدہ نہیں۔ صدر بارک اوباما نے مودی سے گفتگو میں ان موضوعات کو زیر بحث ہی نہیں لائے۔ اس کی وجہ نیت میں کھوٹ ہے۔ نہیں چاہتے کہ دونوں ممالک میں امن قائم ہو، دونوں کو اپنا لیس سر بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی اسی قسم کی پالیسیوں اور ان کے دوہرے معیار کے باعث نفرت کی سیڑھی کا گراف اوپر کی جانب بڑھتا رہا حتیٰ کہ نوبت موجودہ صورت حال تک پہنچ گئی۔ نائن الیون سے سبق حاصل کرنے کے بجائے نفرت اور انتقام کا رخ مسلم ممالک کی جانب کر دیا گیا، جس سے حالات بگڑتے چلے گئے اور بگڑتے چلے جارہے ہیں۔ روزنامہ 'ایکسپریس' کے اداریے نے درست لکھا کہ 'دہشت گرد تنظیمیں نہ اسلام کی کسی تعلیم کا نتیجہ ہیں نہ عام مسلمانوں کی تائید انہیں حاصل ہے بلکہ مسلم ممالک خود بدترین طور پران کی دہشت گردی کا شکار ہیں'۔ فرانس میں ہونے والے دوسرے نائن الیون سے سبق سیکھتے ہوئے، مغربی دنیا کو اپنی پالیسیوں پر اور حکمت عملی پر نظرثانی کرنا ہوگی۔ جب تک دہشت گردی کی بنیاد کو ایڈریس نہیں کیا جائے گا دہشت گرد اپنی کارائیاں

جاری رکھیں گے۔ انہیں انگیج کریں، وجوہات معلوم کریں، اپنی پالیسیوں میں تبدیلی لانے کا یقین دلائیں، نہ انصافیوں کا ازالہ کریں، جیو اور جینے دو پر عمل کریں تو اس دہشت گردی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ گولی سے، بندوق سے، بم سے، بمباری سے، ڈرون سے یا فضائی حملوں سے دہشت گردی ختم نہیں ہو گی۔ پیار محبت، ہمدردی، عفو و در گزر سے کام لیتے ہوئے گفتگو کی میز پر مسائل کے حل کی جانب جایا جا سکتا ہے۔ بہ صورت دیگر دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ ہر واقع کے بعد اس کا ماتم کریں گے اور بس، ایک وقت آئے گا کہ ماتم کرنا بھی غیر ضروری ہو جائے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ وقت آجائے عالمی برادری کو سنجیدگی سے اس اہم مسئلہ پر سوچ بچار کرنا ہو گا۔

فیض احمد فیضؔ۔ 20 نومبر 1984ء کو دنیا سے رخصت ہوئے

فیض احمد فیضؔ ادب کی دنیا کا ایک عظیم نام، تابشؔ دہلوی کا کہنا تھا کہ ’ عظیم شخصیتوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے ‘۔ الحمد اللہ مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے اردو ادب کی اس عظیم شخصیت کو نہ صرف دیکھا بلکہ بہت قریب سے دیکھا۔ فیضؔ صاحب بلاشبہ پاکستان کے اُن چند معدودِ چند شاعروں اور ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے دنیائے ادب میں پاکستان کو بلند مقام دیا۔ فیضؔ کو 1963ء میں روس کی جانب سے ’ لینن امن انعام ‘ سے نوازا گیا، عالمی ایوارڈ وصول کرنے کی تقریب میں فیض نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا ’’ امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی سرحدیں آپس میں مِل جاتی ہیں ‘ اس لیے امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ ‘ ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں ‘‘۔ فیضؔ کو چار مرتبہ ادب کے نوبل انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔

فیضؔ 13 فروری 1911 ء میں پاکستان کے شہر سیالکوٹ ، ڈسٹرکٹ نارووال کے نزدیک ایک گاؤں کالا قادر (فیض نگر) میں پیدا ہوئے۔ 20 نومبر 1984ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کی دنیاوی زندگی کا دورانیہ 73 سال ، 7 ماہ اور 7 دن رہا۔ فیضؔ اور اقبالؔ ہم شہر تھے یعنی دونوں کا تعلق سیالکوٹ سے تھا، دونوں کی شاعری کا

رنگ بھی ایک تھا البتہ دونوں کے اسلوب مختلف تھے۔ اس کی وضاحت فیضؔ نے تسلیم الٰہی زلفی سے ایک سوال کے جواب میں کی۔ فیضؔ کا کہا کہنا تھا کہ ان کی شاعری میں اقبالؔ کا رنگ ہے البتہ اقبالؔ کا اسلوب الگ ہے اور میرا طرز بیان دوسرا لیکن جہاں تک انسان دوستی، انسان کی عظمت، عدل و انصاف، استحصال کا خاتمہ، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، یہ سب اقبالؔ ہی کی تعلیمات کا اثر ہے'۔ فیضؔ، غالبؔ سے بھی متاثر تھے، غالبؔ کی عظمت کا اعتراف اقبالؔ جیسے بلند پایہ شاعر نے بھی کیا اور غالبؔ کو جرمن شاعر گوئٹے 'کا ہم منصب قرار دیا۔ فیضؔ پر کارل مارکس کے اثرات بھی تھے وہ مارکسی' خیالات رکھتے تھے۔ فیض جنوبی ایشیا کی ترقی پسند ادبی تحریک کے بانی ارکان میں سے تھے اور ترقی پسند خیالات کے حامی تھے جن کا وہ کھلے الفاظ میں اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات پر سختی سے عمل پیرا رہے لیکن اپنے خیالات زبردستی کسی پر تھوپنے کی کبھی کوشش نہیں کی، ایک زمانے میں جلا وطنی کی زندگی بھی گزاری، ایک دور ایسا بھی تھا کہ لوگ فیضؔ کے اشعار برملا پڑھتے ہوئے ڈرا کرتے تھے اور پھر یہ دور بھی آیا کہ مشاعروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر فیض ہی فیض ہوا کرتے تھے، متعدد گلوکاروں کو فیض کا کلام گانے سے ہی شہرت ملی۔ اقبال بانو، مہندہ حسن اور دیگر گانے والوں نے فیضؔ کا کلام گایا جس سے انہوں نے شہرت کی بلندیوں کو اور بھی چھو لیا۔ اقبال بانوں کی گائی ہوئی فیض کی غزل 'ہم بھی دیکھیں گے ،لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے ، وہ دن کہ

جس کا وعدہ ہے، جو لوح ازل پہ لکھا ہے، جب ظلم و ستم کے کوہ گراں۔ روئی کی طرح اڑ جائیں گے'۔ اسی طرح مہدی حسن کی گائی ہوئی فیضؔ کی غزل' گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے'، بہت مشہور ہوئی۔
حالات کیسے بھی رہے، حکمراں کیسے بھی آئے فیضؔ اپنے نظریات سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ یہ خوبی فیضؔ کو بڑا شاعر بناتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اردو زبان کو غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ پر فخر ہے۔ فیضؔ کے بارے میں کہا گیا کہ وہ لوگوں سے جلد تعلقات بنانے یا مکس اپ ہونے والوں میں سے نہ تھے بلکہ وہ بہت لیے دیئے رہا کرتے تھے۔ یہ ان کی شاعری کی ایک صفت تھی۔ ان کی شاعری میں جذباتیت کا بھی احساس پایا جاتا ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھئے۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

فیضؔ ایک بڑا شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک ماہر تعلیم، منتظم بھی تھے، وہ آٹھ سال (۱۹۶۴ء۔۱۹۷۲ء) حاجی عبد اللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل رہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں اس وقت جب فیضؔ اس کالج کے پرنسپل تھے تو میں اس

کالج کا طالب علم تھا، یہ زمانہ تھا (۱۹۶۸ء۔ ۱۹۷۰ء) کا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں میرا تبادلہ اسی کالج میں ہوگیا اور ۲۳ سالوں (۱۹۷۴ء۔ ۱۹۹۷ء) اس کالج میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت نے تمام تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تو فیضؔ صاحب نے سرکاری ملازمت اختیار کرنا گوارا نہ سمجھا اور کالج کی پرنسپل شپ سے سبکدوش ہوگئے لیکن وہ جب بھی کراچی میں ہوتے کالج ضرور آیا کرتے، اس طرح مجھے فیضؔ صاحب کو نزدیک سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ فیض صاحب نے ملازمت اختیار کی تھی ،آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز ہی استاد کی حیثیت سے ایم اے او کالج امرتسر سے 1935ء میں کیا تھا،آپ برطانوی ہند میں فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے اعلیٰ عہدہ پر بھی پہنچے ، اس وقت جب آپ نے محسوس کیا کہ انگریز اندرونِ خانہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کر رہا ہے تو آپ نے فوج کی ملازمت کو خیر باد کہ دیا اور روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کی ادارت سنبھال لی۔ وہ روزنامہ امروز کے ایڈیٹر بھی رہے۔ گویا فیضؔ شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ فوجی بھی تھے، صحافی بھی، استاد بھی ، اعلیٰ منتظم اور ماہر تعلیم بھی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے اور بااصول انسان تھے۔ فیض احمد فیضؔ کا ایک خوبصورت شعر ؂

پھر نظر میں پُھول مہکے ، دل میں پھِر شمعیں جلیں
پھِر تصّور نے لِیا اُس بزم میں جانے کا نام

قیام پاکستان کے دوسرے سال ہی فیض ایک سازش کا حصہ بن گئے ، 'راولپنڈی سازش کیس' فیض، سید سجاد ظہیر ، میجر جنرل اکبر خان اور دیگر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے ، سجاد ظہیر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔ یہ کیس پاکستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔فیض صاحب اس کے بعد بھی گرفتار کیے گئے۔ 'زندہ نامہ' فیض کا مجموعہ کلام اسی دور کی یادگار ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں نے

اور پھر یہ بھی کہا۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اک طرز تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک

اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

.فیض نے کراچی کی غریب بستی لیاری میں کالج کا سربراہ بننا کیوں پسند کیا

اس بات کا جواب فیض صاحب نے ڈاکٹر غلام حسین اظہر کو ایک انٹر ویو میں دیا، یہ انٹر ویو ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب ''فیض کی تخلیقی شخصیت: تنقیدی مطالعہ ''میں شامل ہے۔ سوال کیا گیا کہ 'آپ نے اس ادارے کی سربراہی کیوں قبول کی تھی'؟فیض صاحب کا کہنا تھا''جس علاقے میں حاجی عبد اللہ ہارون کالج قائم کیا تھا اس میں ہائی سکول کے علاوہ تعلیم کی اور سہولتیں نہ تھیں، اس علاقہ میں اکثریت غریب عوام کی ہے، ماہی گیر، گاڑی چلانے والے اور مزدور پیشہ لوگ جو بچوں کو کالج نہیں بھجوا سکتے تھے، یہ علاقہ بُرے لوگوں کا مرکز تھا یہاں ہر قسم کا غیر مستحسن کاروبار کیا جاتا تھا، اکثر غلط راہ پر بچپن ہی سے پڑ جاتے تھے، یہاں عبد اللہ ہارون نے یتیم خانہ بنوایا تھا جو ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گیا تھا، باقی کچھ نہیں تھا،ان کے (حاجی عبد اللہ ہارون) جانشینوں کی مصروفیات کچھ اور تھیں، صرف لیڈی نصرت ہارون کو اس ادارے سے دلچسپی تھی۔ لندن سے واپسی پر انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم یہ کام سنبھال لیں۔ ہم نے جا کر علاقہ دیکھا، بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا، یہاں انٹر میڈیٹ کالج بنایا، پھر ڈگری کالج پھر ٹیکنکل اسکول اور پھر آڈیٹوریم ، کچھ رقم ہارون انڈسٹری سے خرچ کی گئی، کچھ ہم نے فراہم کی،ماہی گیروں کی سب سے بڑی کوآپریٹو سوسائیٹی بنی، انھوں نے ہمیں ڈائیریکٹر بنالیا، ہم نے طے کیا کہ سوسائیٹی کے اخراجات سے بچوں کو مفت تعلیم دی جائے اور بچوں کے سب اخراجات یہی ادارہ برداشت کرے، اس کالج میں طلبہ کی اکثریت کو مفت تعلیم دی

جاتی تھی''۔

فیض خوش پوش انسان تھے، زیادہ تر سوٹ پہنا کرتے، سگریٹ پینا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ایک مرتبہ آپ کالج تشریف لائے، آپ نے اپنے منفرد انداز میں اساتذہ اور طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کالج سے اپنی وابستگی پر روشنی ڈالی، آپ نے کہا' 'اس کالج سے میرا جو تعلق رہا ہے اس وجہ سے میں اپنے آپ کو یہاں اجنبی یا مہمان تصور نہیں کرتا، آپ نے اس کالج سے اپنی وابستگی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ 'لیڈی نصرت ہارون مرحوم نے ہم سے کہا کہ لیاری میں جو کالج قائم ہوا ہے اس کی سرپرستی آپ حاصل کرلیں چناں چہ ہم لیاری میں آئے اور اس کالج کے علاوہ یہاں کے مکینوں کا جائزہ لیا مجھے یہاں عجیب سی مخلوق نظر آئی ہم نے فوراً حامی بھر لی، اس طرح ہمارا اس ادارے سے تعلق قائم ہوگیا۔ پھر اساتذہ اور ساتھیوں کی ایک اچھی جماعت مل گئی اس طرح یہ کالج بہت جلد ڈگری کالج بن گیا۔ اس کی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ آپ نے کہا کہ ''لیاری جیسی بستی میں علم کو عام کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے لیے ہم نے کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب ہوئے''۔ اس سوال کے جواب میں کہ ''فیض صاحب آپ عبد اللہ ہاران کالج سے الگ کیوں ہوئے''؟ آپ کا جواب تھا کہ یہ ادارہ قومی تحویل میں لیا جانے والا تھا اور مجھے گھر بھی واپس آنا تھا، کراچی میں کالج بن گیا، اسپتال بن گیا، اتنا کچھ بن گیا اب

آگے دوسرے لوگ چلائیں' ۔

مقامِ فیضؔ ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیضؔ اپنی فوکس ویگن میں کالج آیا کرتے تھے، ان کا ڈرائیور ایک دبلا پتلا نوجوان تھا، اُسے ہم نے ہمیشہ صاف ستھرا، خوش پوش دیکھا، اس مانے میں تنگ پتلون ، نوک دار جوتوں کا رواج تھا جسے عرف عام میں ' ٹیڈی فیشن' کہا جاتا تھا، یہ ڈرائیور ٹیڈی لباس اور جوتوں میں ہوا کرتا تھا، زلفیں بڑی بڑی، سامنے سے وحید مراد بنا رہتا تھا۔ اس کی خوش پوشی اور اسمارٹ رہنا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ فیضؔ صاحب کو اپنے ڈرائیور کا یہ انداز دلبرانہ بھی پسند تھا، وہ خود بھی خوش پوش تھے اور خوش پوشی کو پسند کیا کرتے تھے ۔ فیضؔ کا شعر ۔

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

فیضؔ ایک سیدھے سادھے مسلمان تھے، افتخار عارف نے ایک انٹر ویو میں فیض صاحب سے پوچھا آپ جب پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں تو کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوتا؟" فیض صاحب نے بغیر کسی تامل کے یہ بات کہی کہ زندگی

میں دو پچھتاوے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں قرآن حفظ کرنا چاہتا تھا مگر چار پانچ پاروں کے حفظ کے بعد میں نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے ساری عمر اس کا ملال رہا۔ دوسرا یہ کہ میں کرکٹر بننا چاہتا تھا اور نہیں بن سکا''۔ یہ بات تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ فیضؔ عربی جانتے ہی نہ تھے بلکہ عربی میں ایم اے تھے۔ فیضؔ قرآن مجید حفظ کرنا چاہتے تھے اور چند پارے حفظ بھی کر چکے تھے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اندر کا فیضؔ کیسا تھا۔ یہ بات آغا ناصر نے اپنے مضمون 'فیض کی چند باتیں' جو اخبار اردو کی جلد ۲۸ شمارہ ۲، ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں نقل کی ہے۔

فیضؔ نے شہر کراچی میں رہتے ہوئے کئی ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور سماجی تنظیموں کی سرپرستی بھی کی۔ کراچی میں ادارہ یادگار غالبؔ، فیض احمد فیضؔ نے مرزا ظفرالحسن سے قائم کروایا تھا۔ فیض صاحب تو اس ادارے کی سرپرستی کیا کرتے تھے، مرزا ظفرالحسن کی زندگی کا مقصدِ حیات یہ ادارہ تھا۔ ادارہ یادگار غالب کے قیام کی روداد مرزا ظفرالحسن نے اپنے ایک مضمون ''فیضؔ ایلس اور میں'' میں اس طرح بیان کی کہ ''جنوری ۱۹۶۸ء کے پہلے ہفتے میں سبط حسن نے ٹیلی فون پر کہا فیضؔ نے تمہیں بلایا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا میرا اندازہ ہے کہ تم نے غالب کے پرزے اڑانے کی جو کوشش کی تھی اس کی کوئی سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس جملے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے دن سبط

کے گھر پہنچا جو سڑک پار فیضؔ کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم دونوں فیضؔ کے گھر گئے جہاں انہوں نے کہا فروری ۱۹۶۸ء میں پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں غالبؔ کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے۔ ہمارا بھی ارادہ ہے کہ کراچی میں کچھ کام کریں۔ آپ ایک انجمن بنائیں اور شروع کردیں، اس کے بعد کہا' البتہ ایک بات یاد رکھیے ویسے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے مگر از خود کوئی کام نہیں کریں گے۔ آپ جو کام ہمارے سپرد کریں، کریں گے'۔ اس کے بعد اضافہ کیا 'دوسروں کے متعلق سمجھ لیجیے کہ وعدے سب کریں گے پورا کوئی نہیں کرے گا'۔ اس پر سبط حسن نے کہا ''ہم تو وعدہ بھی نہیں کرتے۔ سارا کام تم ہی کو کرنا ہوگا''۔ فیضؔ نے آخری جملہ کہا ''بالکل تنہا''۔ یہ میرے لیے کوئی چیلنج نہیں اعزاز تھا۔ کیوں کہ فیضؔ جیسی شخصیت کو مجھ پر اعتماد کہ میں انجمن بنا سکتا ہوں، صد سالہ برسی کا انتظام کرسکتا ہوں اور سب کچھ اکیلے۔ اس وقت نام طے کیا ''بزمِ غالبؔ'' اور پانچ سات منٹ ٹھہر کر آگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات سے پہلے یا اس کے بعد سبط اور فیضؔ میں میری بابت کیا گفتگو ہوئی۔ نہ میں نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔ بزمِ غالبؔ کے قیام اور نام کا اعلان اخباروں میں چھپوادیا دو چار دن بعد بزم کے پیڈ بنوانے انجمن پریس گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ اس نام کی ایک انجمن دس پندرہ برس سے قائم ہے۔ اس خیال سے کہ نام پر کیوں کسی سے جھگڑا مول لیں اور وہ بھی ابتدائی دنوں میں اپنے طور پر طے کیا کہ بزم غالبؔ کی بجائے ''ادارۂ یادگارِ غالبؔ'' نام

رکھوں۔ فیضؔ سے پوچھا تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب نام کی تبدیلی کا اعلان اخباروں میں شائع کر دیا۔ جیب میں دھیلہ نہ دمڑی ادارہ یادگارِ غالبؔ قائم ہوگیا۔ ایک ہفتے بعد فیضؔ کے بتائے ہوئے چند لوگوں کو ٹیلی فون کیا کہ فلاں اتوار کو صبح فیضؔ کے گھر جمع ہوں ادارے کی بابت کچھ گفتگو ہوگی۔ وہ سب آئے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ فیضؔ ادارے کے صدر ہوں۔ سبط نے یا شاید فیضؔ نے میرا نام لے کر کہا یہ اس کے معتمد عمومی ہوں۔ اس کے بعد مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جتنے مدعوئین اتنے ہی عہدے دار اور اراکین بلکہ بعض جو نہیں آئے تھے انھیں بھی رکن عاملہ بنا لیا گیا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ جاتے وقت سبط حسن نے پھر کہا تم نے ہمیں رکن تو بنایا ہے کام ہم دمڑی کا نہیں کریں گے۔ سید اپنے قول کا سچا نکلا''۔ مرزا ظفرالحسن نے ادارے کی لائبریری کی عمارت کی تعمیر کے حوالے سے لکھا کہ ''عمارت کس طرح بنی، کس طرح ہاتھ سے نکل گئی ایک طویل کہانی ہے۔ یہاں اتنا اشارہ کردوں کہ عمارت کو منہدم ہونے سے فیضؔ نے بچایا۔ اگر ان کا نام اور شخصیت درمیان میں نہ ہوتی تو آج غالب لائبریری کی جگہ اس عمارت کا ملبہ ہوتا''۔ ادرہ یادگار غالبؔ اور غالبؔ لائبریری اب بھی ناظم آباد نمبر 2 میں گورنمنٹ کالج فار مین کے احاطے کے کارنر پر قائم ہے۔ کچھ عرصہ اس کی نچلی منزل میں بنک قائم ہوگیا تھا لیکن اب مکمل عمارت ادارہ یادگار غالبؔ کی ملکیت ہے۔

فیض پیپلز پارٹی کے اولین دورِ حکومت میں وزیر اعظم کے تعلیم و ثقافت کے امور کے مشیر بھی رہے۔ جلد اس عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔1977ء میں فیض پہلے ماسکو گئے اور کچھ عرصہ قیام کیا پھر بیروت چلے گئے اور چار سال افرو ایشیائی انجمن کے سہ ماہی مجلے 'لوٹس' کے مدیر اعلیٰ رہے۔ان کی شریکِ سفر ایلس ، فیض کی سیکریٹری تھیں۔بیروت میں لوٹس سے وابستگی یاسر عرفات کا انتخاب تھا وہ چار برس بیروت میں رہے۔

1978ء سے 1982ء کے درمیان فیض تواتر کے ساتھ دہلی، ماسکو، شام، عراق، مصر، الجزائر، جاپان امریکہ اور کنیڈا بلائے جاتے رہے۔ پاکستان سے محبت اور کشش انہیں اپنے وطن میں لے آئی۔ اب فیض شاید تھک چکے تھے ، انہیں آرام کرنا تھا لیکن زندگی نے انہیں آرام کرنے کی مہلت نہ دی ۔ تسلیم الٰہی زلفی نے اپنی کتاب 'فیض احمد فیض بیروت میں'' لکھا ہے کہ بیروت میں قیام کے بعد فیض کا تقرر کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ہوچکا تھا لیکن انھوں نے واپس چانسلر سے معزرت کر لی اور واپس پاکستان چلے آئے، درحقیقت وہ مٹی جس سے ان کی تخلیق ہوئی تھی اس نے واپس اپنی جگہ پہنچنا تھا اور اُسی مٹی نے فیض کو 20نومبر1984ء کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور فیض وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ وہاں جانے والوں کی یادیں باقی رہ جاتی ہے ، فیض بھی ہماری یادوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے حقیقت ہے کہ فیض جیسا حسن وسچائی کا شاعر مشکل سے پیدا ہوتا ہے ۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

نومبر192015

گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

بلدیاتی انتخابات کے دوسرے مرحلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ سندھ کے ضلع بدین میں کچھ یو ہوا کہ ' اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے '۔ شعر کا پہلا مصرع یہ ہے 'دل کے پھپولے جل اٹھے سینے کے داغ سے۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے '۔ ذوالفقار مرزا نے جیالا ہو کر جیالوں کو شکست دے دی، پی پی میں مرزا کی حیثیت گھر کے بھیدی والی ہے۔ یہ کل تک سابق صدر آصف علی زرداری کا بہ اعتماد ساتھی ، دوست تھا آج سینہ تان کر اسے للکار رہا ہے۔ سیاست اسی کو کہتے ہیں۔ ملک میں بلدیاتی انتخابات کا دوسرا مرحلہ بھی بخیر آفیت کسی بڑی خرابی کے بغیر اختتام کو پہنچا۔ دوسرا مرحلہ پہلے مرحلے سے مختلف نتائج سامنے نہیں لا سکا۔ پنجاب میں نون لیگ نے برتری حاصل کی ، سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو برتری حاصل ہوئی۔ گویا بلدیاتی انتخابات میں حکمرانی طاقت بلے بلے رہتی ہے۔ پنجاب بدستور آگے جب کہ عمران خان کی تحریک انصاف کا گراف نیچے کی جانب رواں دواں ہے۔ اس کی وجہ خان کی بعض پالیسیاں، حکمت عملی، بیانات اور کچھ انہیں پہنچنے والے صدمے بھی ہیں جس سے ان کے حامی کچھ بد دل اور پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں پنجاب کی کل 2399 نشستوں میں سے تحریک انصاف صرف 291 نشستیں حاصل کر سکی۔ نون لیگ نے 893 اور آزاد امیدواروں کو

سیٹوں پر برتری حاصل رہی۔ پاکستان پیپلز پارٹی 12، ق لیگ 9 سیٹوں پر کامیاب 718 ہوئی۔ یہ بات بھی سب ہی کو معلوم ہے کہ آزاد گھوڑے آزاد رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ چمک دھمک، ریل پیل، اختیارات، عہدہ کی چمک انہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور وہ بہتے دریا میں تختے پر سوار ہونے کے بجائے سرکاری جہاز میں سوار ہونے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ تنہا پرواز کرنا آزاد امیدواروں کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتی ہے۔ ماضی میں تو یہی ہوتا رہا ہے کہ آزاد جیت کر آنے والے آزاد زندگی نہیں گزارتے بلکہ وہ اچھا کھانے پینے والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اب اگر پنجاب کے آزاد نمائندے نون لیگ میں شامل ہوجاتے ہیں تو نون لیگ کے بلدیاتی امیدواروں کی تعداد 1611 ہوجائے گی۔ اس طرح تحریک انصاف کے لیے بلدیاتی ماحول میں نون لیگ کو ٹف ٹائم دینا مشکل ہوگا۔

صوبہ سندھ کی صورت حال پنجاب سے مختلف ہے۔ یہاں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکمرانی ہے۔ پہلے مرحلے میں پی پی نے واضح برتری حاصل کی دوسرے مرحلے میں پی پی کو اپنوں نے ہی مشکل میں ڈال دیا۔ یہاں کل سیٹوں کی تعداد 1833 تھی اس میں سے پی پی نے 821 نشستیں حاصل کیں، 113 آزاد امیدوار کامیاب ہوئے، متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) 118، مسلم لیگ (ن) 82 اور مسلم لیگ فنگشنل نے 22 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ سندھ میں تاحال تحریک انصاف کا وجود نہیں۔

اندرون سندھ ہونے والا اتحاد بھی اتحادیوں کو کوئی ایک سیٹ بھی نہیں دلا سکا۔ سندھ کی سیاست واضح طور پر شہری اور دیہی میں منقسم ہے۔ ماضی میں بھی شہروں میں ایم کیو ایم اور دیہی علاقوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کو برتری حاصل ہوتی رہی ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے جاری آپریشن کے پیش نظر قیاس آرئیاں ہو رہی تھیں کہ شاید بلدیاتی انتخابات میں ایم کیوں ایم کا گراف نیچے کی جانب چلا جائے اور اس کا فائدہ تحریک انصاف ،
پاکستان پیپلز پارٹی یا فنکشنل لیگ کو پہنچے لیکن تمام تر قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں، ایم کیو ایم کا ووٹر جوں کا توں اپنی سیاسی قیادت کے ساتھ دکھائی دیا۔ اس جماعت کو حیدر آباد میں واضح برتری حاصل ہوئی ۔اس نے حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کی 70 سیٹیں حاصل کرلیں، جب کہ میرپور خاص کے 33 وارڈز میں بھی ایم کیو ایم جیت گئ۔ ایم کیوایم کے لیے نیک شگون جب کہ مخالفین کے لیے جھٹکا ہے۔ یہ جھٹکا بہت شدید نہیں برداشت ہوجائے گا اس لیے کہ ماضی میں بھی ایسے جھٹکے لگتے رہے ہیں۔
بلدیاتی انتخابات کے دوسرے مرحلے کی ایک دلچسپ بات سندھ کے ضلع بدین میں پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق وزیر داخلہ، آصف علی زرداری کے قریبی دوست، جن کی اہلیہ پاکستان کی قومی اسمبلی کی پہلے خاتون اسپیکر بھی رہیں یعنی ذوالفقار مرزا نے اپنی ہی پارٹی کا مرکز تصور ہونے والے ضلع بدین میں

پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو شکست سے دوچار کر دیا، مرز گروپ نے ضلعی ہیڈ کواٹرز کے تمام 14 وارڈز پر فتح حاصل کر لی۔ مرزا کی اس سیاسی فتح کو سیاسی حلقے پاکستان پیپلز پارٹی کی اس کے اپنے ہی گھر میں شکست تصور کر رہے ہیں۔ میڈیا میں یہ تاثر دیا گیا کہ جیسے اندرون سندھ مرزا نے فتح حاصل کر لی ہو ایسا ہر گز نہیں ہے مرزا گروپ کو بدین کے 14 وارڈز میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ان نشستوں پر مرزا کی کامیابی کے بعد مرزا کے حامیوں نے خوشی میں جو نعرے لگائے وہ بڑے ہی دلچسپ اور مرزا کی سیاسی حکمت عملی کا اظہار تھے۔ یعنی مرزا کی واہ واہ تو ہونی ہی تھی، ان کے حق میں تو خوب خوب نعرے لگے ، ساتھ ہی بے نظیر بھٹو کے حق میں نعرے لگائے گئے جب کہ سابق صدر آصف علی زرداری کے خلاف نعرے بازی ہوئی۔ مرزا نے مختلف چینل کو جذباتی انداز میں انٹر ویوز دیے ان میں اپنے آپ کو پاکستان پیپلز پارٹی سے منسلک لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں سے اعلان جنگ کی بات کی۔ اس سے مراد سابق صدر پاکستان، ان کے سابق دوست ہیں، بہت ممکن وہ ان کے مستقبل کے دوست بھی ہوں، اس لیے کہ سیاست میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے ۔ مرزا کی باتوں سے ، حکمت عملی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ انتخاب پاکستان پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے ہی لڑا، وہ بلاول اور بے نظیر کو استعمال کرتے رہے لیکن آصف علی زرداری سے اپنی پرخاش نکالتے رہے۔ مرزا کے بیٹے، مرزا کی بیگم صاحبہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو چکے

ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی یقیناً اس پر کوئی قدم اٹھائے گی۔ مزا تو تب ہوتا کہ مرزا پاکستان پیپلز پارٹی سے اپنی وفاداری ختم کردیتے، منتخب ایوانوں سے استعفےٰ دے دیتے پھر کسی بھی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیتے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ بدین میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ووٹر مرزا کے ہاتھوں استعمال ہوا، اگر اسے یہ معلوم ہوجاتا کہ مرزا کا پاکستان پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تو مرزا کی کامیابی کی یہ صورت ہر گز نہ ہوتی۔ بیگم مرزا کا فرمانا ہے کہ پی پی کارکنوں نے قیادت کے خلاف بھرپور یوٹرن آؤٹ دیدیا۔ یہاں بیگم صاحبہ کی قیادت سے کیا مراد ہے، بلاول بھٹو زرداری یا آصف علی زرداری۔ قیادت اس وقت دونوں کے ہاتھوں میں ہے۔ بلاول چیرٔمین اور زرداری شریک چیرٔمین ہیں۔ اگر پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ان دونوں کو مسترد کردیا ہے تو بیگم صاحبہ کو بھی قیادت کو مسترد کرتے ہوئے فوری طور پر قومی اسمبلی کی سیٹ سے ڈی سیٹ ہوجانا چاہیے۔ انصاف اور قانون کا تقاضہ تو یہی ہے۔ یا پھر آپ پاکستان پیپلز پارٹی کی سی ای سی کی میٹنگ بلا کر پارٹی کی قیادت کو ڈی سیٹ قرار دلوادیں۔ بات سیدھی سادھی سی ہے کہ اب دونوں میں سے کوئی ایک ڈی سیٹ ہوگا۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔ ڈی سیٹ ہونے کا عمل تیسرے مرحلے کے بعد ہوگا یا اس سے قبل ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی بدین میں اپنا گروپ بنا کر کامیابی حاصل کرلینا پی پی کے لیے ایک دھچکے سے کم نہیں۔ کہنا چاہیے کہ مرزا نے آصف علی زرداری کی

نیندیں اڑادی ہیں، پاکستان پیپلز پارٹی کے ذمہ داران کو نئی حکمت عملی اپنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۔

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیرَ مین آصف علی زرداری کا فرمانا ہے کہ ’ لگتا ہے الیکشن کمیشن کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور ڈوری غیر متعلقہ حلقوں کی جانب سے ہلائی جارہی ہیں‘۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ سندھ کے 81 بلدیاتی حلقوں میں انتخابات سے ایک روز قبل پولنگ ملتوی کر دی گئی تھی۔ مرزا کی فتح پر زرداری صاحب تاحال خاموش ہیں، لگتا ہے کہ تانے بانے بن رہیں ہیں ، سوچ بچار جاری ہے، کونسا ترپ کا پتہ پھینکا جائے کہ جو مرزا کو مات دے دے۔ ان کی سوچ کا دھارا یقینا بدین میں پاکستان پیپلز پارٹی کی شکست کے گرد گھوم رہا ہوگا۔ پاکستان پیپلز پارٹی سندھ میں اپنی شکست تسلیم نہیں کر رہی اور شکست ہے بھی نہیں ایک ضلع میں مرزا جی کیا کر سکیں گے لیکن پی پی میں شگاف ڈال دیا گیا ہے اور یہ شگاف کسی اور نے نہیں بلکہ ان کے اپنے چھیتے مرزا نے ڈالا ہے جسے انہوں نے سندھ کی اہم وزارت سونپی تھی۔ بلاول بھی بدین پہنچے تھے، ان کے لیے بھی بدین میں پاکستان پیپلز پارٹی کی شکست ایک بڑا سیٹ بیک ہے۔ پنجاب کے بعد اب سندھ میں بھی پی پی کا گراف گرتا ہوا

نظر آ رہا ہے۔ اب مرزا جی نے کراچی کا رخ کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کراچی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنی اصل حلیف ایم کیو ایم کے حلقوں میں بھنگڑا ڈالتے ہیں۔ ایم کیوں ایم کو پہلے ہی دو جماعتی اتحاد سے مقابلہ ہے۔ کہیں مرزا جی بھی اس اتحاد کے تیسرے کھلاڑی نہ بن جائیں اور پی پی کے بجائے ایم کیو ایم پر وقت ڈال دیں۔ کپتان مرزا کو تھپکی دے چکے ہیں، یعنی انتخابات میں جیت کے فوری بعد عمران خان مرزا جی کو مبارک باد دے چکے ہیں۔ مرزا جی کہاں جاتے ہیں انہیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس طرح کی جیت کے بعد حوصلہ بلند ہو جاتے ہیں اور ہرا ہی ہرا نظر آنے لگتا ہے۔ قومی لیڈر بننے کی امنگیں انگڑالیاں بھی لینے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر مرزا اپنی ہی کوئی سیاسی پارٹی دے ڈالیں یا پھر پاکستان پیپلز پارٹی مرزا) تو بن ہی جائے گی۔ ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے یہ آنے والا وقت ہی بتائے (گا۔

پہلے اور دوسرے دور کے بعد بلدیاتی انتخابات کا تیسرا بازار دسمبر میں سجے گا۔ حیدر آباد، میرپور خاص میں آٹھ جماعتی اتحاد کے خلاف میدان مارنے کے بعد متحدہ میں جوش و جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ ان کے لیڈران کراچی میں اپنی شاندار کامیابی کی نوید دے رہے ہیں۔ تحریک انصاف نے دوسرے مرحلے کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی اسی لیے نتیجہ بھی ویسا ہی سامنے آیا۔ لیکن

کراچی میں ایسی صورت حال نہیں یہاں تحریک انصاف اپنی اتحادی جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر حلیم کی دیگ پکانے کا سامان جمع کر رہی ہے۔ کراچی میں کامیابی کے لیے جماعت اسلامی بھی پر امید ہے۔ دو جماعتی اتحاد کو ایم کیو ایم، اے این پی اور پاکستان پیپلز پارٹی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ نتیجہ کیا ہوگا یہ وقت بتائے گا۔ خدا کرے جس طرح بلدیاتی انتخابات کے پہلے دو مرحلے کسی بڑے خون خرابے کے بغیر گزر گئے تیسرا مرحلہ بھی امن و سکون سے پائے تکمیل کو پہنچے۔ اس کے لیے تمام جماعتوں کو صبر، برداشت اور درگزر سے کام لینا ہوگا۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔ اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ ہمارا ملک سلامت رہے ہمارا شہر محفوظ رہے۔

گڈ گورننس یا بیڈ گورننس۔ سنجیدگی کی ضرورت

گورننس انگریزی زبان کے لفظ 'گورن' Govern سے ماخوذ ہے۔اس کے لفظی معنی 'حکومت کرنے' یا 'نگرانی کرنے کے' ہیں۔اس طرح گڈ گورننس،اچھی حکمرانی اور بیڈ گورننس،بری حکمرانی ہوئی۔بقول محمود شام 'موضوع تو آجکل یہی ہے کہ فوج کو ایسا بیان دینے کا حق تھا یا نہیں'۔پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ بیان کیا تھا ؟اور یہ کس کنٹکس میں دیا گیا۔کور کمانڈرز کی میٹنگ ، معمول کی کاروائی ہوتی ہے، مقررہ مدت کے بعد فوج کے بڑے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور لمحہ موجود کے معاملات و مسائل پر صلاح ومشوری کرتے ہیں، تمام معاملات پر بریفنگ دی جاتی ہے اور تمام امور پر غور کیا جاتاہے اور پھر اس کا حاصل عوام اور حکومت کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں فوج کے بڑے سر جوڑ کر بیٹھے، طے شدہ ایجنڈے پر غور ہوا، ایجنڈے کا ایک نقطہ لمحہ موجود کی حکومت کی کارکردگی بھی تھی۔ تمام باتوں پر اطمینان کا اظہار کیا گیا،آرمی چیف نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ 'ملک سے دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے جاری آپریشن میں قوم کی مکمل حمایت قابل تحسین ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ آپریشن کے طویل المدت فوائد کے حصول اور ملک بھر میں پائیدار امن کے لیے گورننس بھی اسی طرح ہونی چاہیے'۔یہی کچھ بعد میں کور کمانڈر زکی میٹنگ کے

بعد آئی ایس پی آر کی جانب سے جاری ہونے والی اخباری پریس ریلیز میں بھی کہا گیا۔ اس میں کون سی ایسی قابل گرفت ، قابل اعتراض اور دل دکھانے والی بات کی گئی ہے ۔ اگر کوئی بڑا یہ کہے کہ اپنی اصلاح کرلو، اپنے طرز حکمرانی پر نظر ثانی کرلو، بہتری کی جانب آئیں ، بہتر کام کریں، اگر ہر کام فوج نے کرنے ہیں تو پھر آپ کی کیا ضرورت ہے، جمہوری اصولوں پر عمل پیرا ہوں، احتساب ہر ایک کا ہونے دیں، سندھ اور پنجاب میں تفریق نہ کریں، آپ اپنی عادات واطوار ، حرکات و سکنات درست کرلیں تاکہ آپ کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا ہے وہ زیادہ بہتر طور پر سامنے آئے اس کے دور رس نتائج بھی سامنے آئیں گے۔ اچھا کرنے لینے کی بات کرنا یا مشورہ دینا آئین اور قانون کے خلاف تو نہیں ہے، لیکن اس بیان نے ایک پیج پر ہونے کی حقیقت کو آشکارا کردیا،اندر چھپے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ دلِ ناتوں پر یہ بیان بجلی بن کر گرااور حکمرانوں میں سے بعض نے دل کے پھپولے پھوڑے۔ ایک بات کافی عرصہ سے تجزیہ نگار کہہ رہے تھے کہ دونوں شریفوں میں اتحاد و اتفاق اور پیار کا رشتہ مضبوط ہے، دونوں کو ایک صفحہ پر ظاہر کیا جارہا تھا، گڈ گورننس کا کہنے دینے سے اصل چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔

گورننس کو بہتر بنانے کا بیان گویا توجہ دلاؤ نوٹس لمحہ موجود کے حکمرانوں کی نازک طبیعت پر گراں گزرا۔اس بیان پر میڈیا تو خوب چلایا ہی ساتھ ہی

حکومتی ترجمان بیان داغ ڈالا کہ 'ادارے آئین کی حدود میں رہیں' ، گویا اچھی گورننس کا مشورہ دینے والوں کو دو ٹوک الفاظ میں کہا گیا کہ اپنی حدود میں رہیں۔ کیا یہاں یہ بات کہنا مناسب تھا، اس کا فیصلہ آپ ہی کریں البتہ جب سے خواجہ آصف نے وزیر دفاع کا قلم دان سنبھالا ہے پہلا موقع تھا کہ انہوں نے معقولیت کا دیدہ دلیری سے مظاہرہ کرتے ہوئے دیگر حکمران ٹولے کے مقابلے میں معقول اور مناسب بات کی، انہوں نے کہا کہ ' آپریشن ضرب عضب اور گڈ گورننس کے تعلق سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، افغانستان میں 16 ممالک کی افواج جو 15 سال میں حاصل نہیں کر سکی وہ پاک فوج نے ڈیڑھ سال میں حاصل کر لیا'۔ دیگر مشیروں، وزیروں ، قرابت داروں، عزیز رشتہ داروں نے اس حوالے سے جو بھی بیانات دیے ، گفتگو کی وہ ٹی وی ٹاک شوز میں ڈھکے ڈھکے انداز میں، کچھ نے بیباکانہ انداز میں اس بات کا اظہار کیا کہ یہ جمہوری حکومت ہے اور اقتدار کا سرچشمہ ملک کا انتظامی سربراہ ہوتا ہے۔ بات اپنی جگہ درست کہی گئی کہ وزیر اعظم ملک کے تمام معاملات نگراں اور ذمہ دار ہوتا ہے لیکن گاڑی کی سمت درست نہ ہو تو اس کی سمت کا تعین کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ سربراہ پاک فوج کا کہنا تھا کہ جے آئی ٹیز ترجیحی بنیادوں پر تحقیقات مکمل کریں، تاخیر آپریشن کو متاثر کررہی ہے، فاٹا ریفارمز پر عملدرآمد اور آئی ڈی پیز کی باعزت واپسی کو یقینی بنایا جائے۔ انہوں نے انٹیلی جنس بنیاد پر آپریشنز بالخصوص ضرب عضب کے نتائج پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اجلاس میں بیرونی چیلنجز، نیشنل ایکشن پلان اور

فاٹا اصلاحات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ سربراہ فوج کے بیان اور آئی ایس پی آر کی پریس ریلیز میں کوئی بات ایسی نہیں جو حکومت کی دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کے مترادف ہو۔ بات صاف صاف ، دو ٹوک الفاظ میں کہی گئی تھی، فوجی انداز بھی ایسا ہی ہوا کرتا ہے کسی کو برا لگے یا اچھا وہ طے شدہ پلان پر ایف 16 تیاروں کی طرح پرواز بھرتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتے ہیں۔ بات اتنی سے تھی کہ افواج پاکستان نے لمحہ موجود حکومت سے صرف اتنا کہا کہ وہ موجود حکومت اپنی حکمرانی میں بہتری لائے۔ سرکاری سطح پر جس کام میں بہتری نظر آتی ہے کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اچھا کام کیا۔ موجودہ صورت حال میں سول حکومت کے جو اچھے کام ہیں ان کے پیچھے سول حکومت کی گڈ گورننس کے بجائے فوج کی گڈ گورننس نظر آتی ہے۔ سیلاب آجائے تو فوج، زلزلہ آجائے تو فوج، سیلاب اور زلزلے کے دوبارہ آبادکاری کا مرحلہ ہو تو فوج، دہشت گردی، انتہا پسندی کے خلاف کاروائی کرنی ہو تو وہ فوج ہی کرتی ہے، سرحدوں کی حفاظت ، دشمن وطن کی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کرے تو اس کا جواب بہادر سپاہی ہی دیتے ہیں، انتخابات کی بات ہو تو کہا جاتا ہے کہ پولنگ اسٹیشن پر نہیں بلکہ پولنگ اسٹیشن کے ہر بوتھ پر ایک جوان موجود ہو۔ کوئی عمارت گر جائے تو فوج اپنی مہارت سے دبے ہوئے لوگوں کو نکالے، سیاچن میں برف تلے دب جانے والے فوجیوں کو بھی فوج کے جوانوں نے ہی نکالا، کرپشن کے خلاف کاروائی فوج کرے، بڑی مچھلیوں کو فوج پکڑے، کراچی میں آپریشن فوج کرے، کرپشن کے خلاف روائی فوج

کرے، سندھ میں کرے واہ واہ، بڑے بھائی کے صوبے میں نہ نہ، ڈاکٹر عاصم کو پکڑ لیا بہت خوب، پنجاب کے موجودہ وزیر رعناء مشہود کی رقم لیتے ہوئے ویڈیو موجود، رعناء ثناء کہیں یہ ان کا ذاتی معاملا ہے، رقم لینا اور دینے سے کرپشن کا کوئی تعلق نہیں، بات اپنی جگہ درست لیکن چوری چھپے کوئی کام کرنا مناسب بھی نہیں۔ یہ ہے جمہوری حکومت کی گڈ گورننس۔ کام فوج کرے میاں جی سب اپنے کھاتے میں ڈالتے جائیں۔ لوگ خود کشیاں کر رہے ہیں حکومت خاموش، بجلی کے بل تیز گام کی طرح بڑھائے جا رہے ہیں حکومت خاموش، اراکین اسمبلی، وزیر نہ سینٹ میں جائیں نہ قومی اسمبلی میں حکومت خاموش، میاں صاحب کا اپنا ریکارڈ کونسا اچھا ہے۔ غیر ملکی دوروں سے فرصت ملے تو کچھ اور سوچیں۔ حکومت کی کارگزاری یعنی بیڈ گورننس کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ یہ کالم اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ مزید تفصیل میں جایا جائے۔

فوج نے گڈ گورننس کی بات کی وہ ہی ابھی ہضم نہیں ہوئی تھی کہ چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس انور ظہیر جمالی نے سینٹرل جیل کراچی میں انسداد دہشت گردی کی دو عدالتوں کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے کہا کہ 'موجودہ نظام عدل میں کوئی بڑی خامی نہیں ملک میں بیڈ گورننس کا ماحول بنا ہوا ہے، جب تک ادارے ایمانداری اور محنت سے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کریں گے مسائل نہیں ہوں گے'۔ چیف جسٹس نے انتہائی مناسب اور حقیقت

پسندانہ بات کی ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ لحہ موجود کی حکومت کی حکمرانی میں اداروں میں گڈ گورننس دکھائی نہیں دیتا۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے حکومت کی توجہ اس جانب دلا کر اپنا فرض پورا کیا ہے ان کا کہنا تھا کہ اچھی حکمرانی یہ ہے کہ عوام کے مسائل حل ہوں۔ انہوں نے کہا کہ گڈ گورننس کے حوالے سے یہ مسئلہ عذاب بنا ہوا ہے، مہنگائی، قرضے، کرپشن وغیرہ اس معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے بھی گڈ گورننس کی جانب حکومت کی توجہ دلائی۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اختیار رکھنے والے، سیاسی طاقت کے مالک جن میں حکمران جماعتوں کے اہل کار، سرکاری افسر، بیوروکریٹ، اعلیٰ عہدے دار شامل ہیں عوام کی بھلائی کے بجائے ان کا خون چوس رہے ہیں، کرپشن کے نت نئے طریقے اختیار کرکے اپنی دولت میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں، وزیر، مشیر، ماتحت اہل کار اپنی اپنی پارٹی لیڈر کو سب اچھا ہے، سب اچھا ہے کا پہاڑا سناتے رہتے ہیں اور وہ ان کی لغو اور جھوٹ کو تسلیم کرکے صرف اپنے سیاسی مخالفین کو اپنے بیانات سے ڈرانے اور دھمکانے کے سوا کچھ اور نہیں کر رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں حقیقی معنوں میں گڈ گورننس ہو، ہر ادارہ اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے، قانون کے مطابق، عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایمانداری سے کام کرے۔ حکومت عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے بنائے اور موجود منصوبوں پر ایماندار لوگوں سے ان پر عمل کرائے۔ گڈ گورننس یا بیڈ گورننس کے بیانات کو اپنے لیے توہین، اہانت، ہتک یا ذلت تصور نہ

کرے اور کسی بھی قسم کی بھبکی نہ دے اور نہ ہی اکڑ فوں دکھائے، نہ ہی غیظ و غضب میں آئے، نہ ہی آگ بگولہ ہو بلکہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے۔ ان بیانات میں حقیقت پوشیدہ ہے، انہیں اپنے خیر خواہوں کا توجہ دلاؤ نوٹس تصور کرتے ہوئے اپنی طرز حکمرانی پر سنجیدگی سے توجہ دے، فوج جو کام ضربِ عضب کے تحت کر رہی ہے اسے آزادانہ طور پر کرنے دے، کراچی میں جو آپریشن ہو رہا ہے فوج اسے غیر جانبدارانہ طور پر انجام تک پہنچانا چاہتی ہے اسے وہ کام کرنے دینا چاہیے، دہشت گردی، انتہا پسندی کے خلاف اقدامات جاری و ساری رہیں، احتساب بلا تفریق ہونا چاہیے، امیر کے لیے ایک غریب کے لیے دوسری حکمت عملی مناسب نہیں، سندھ میں احتساب پنجاب میں کھلی چھٹی مناسب نہیں۔ احتساب بلا تفریق ہونا ہی ملک و قوم کے مفاد میں ہے۔

اقدار' کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار کی سیاست کی جاتی ہے'

پاکستان کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کے بعد ہمارے ملک کے سیاست دانوں نے کبھی بھی اقدار کی سیاست نہیں کی اس کے برعکس ہر ایک نے اقتدار کے حصول کی سیاست کی اور اسے اپنی زندگی کا حاصل بنایا۔ لحہ موجود کے سیاست داں، وزیراعظم پاکستان قبلہ میاں نوز شریف نے گلگت بلتستان میں ایکسپریس ہائی وے' ائر پورٹ اور بجلی گھر بنانے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ 'بددیانت اور کرپٹ حکومتوں نے ملک کو نقصان پہنچایا' ہم نے کسی سے رشوت مانگی نہ ہی کمیشن لیا، قومی خزانہ امانت ہے' خیانت کرنا گناہ کبیرہ ہے' نیت میں کھوٹ اللہ کو پسند نہیں' کمیشن نہ لینے کی وجہ سے بیرونی حکومتیں مہربان ہوئیں اور کرپٹ حکومتوں کو 100 روپے میں بیچنے والی مشین ہمیں 60 روپے میں دیں' خدمت نعروں سے نہیں کچھ کر گزرنے سے ہوتی ہے' انہوں نے مزید فرمایا کہ 'ہم اقتدار کی بجائے اقدار کی ساست کر رہے ہیں'۔ وزیر اعظم صاحب کی تمام باتیں مناسب ہوں گی ، ہو سکتا ہے ان میں سچائی بھی ہو۔ اگر ایسا ہی ہو رہا ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں ، ان کی جماعت کو اور ان کے ساتھیوں کو ثابت قدم رکھے ۔ یہ بات کہ وہ اقتدار کی نہیں 'اقدار' کی سیاست کر رہے ہیں قابل غور ہے اور اپنے اندر بہت سے ابہام لیے ہوئے ہے۔ بانیٔ پاکستان قائد اعظم

محمد علی جناح اور ان کے رفیق کار، ساتھی پاکستان کے اولین وزیر اعظم لیاقت علی خان تک تو یہ بات کہہ جا سکتی ہے کہ ملک میں اقتدار کی سیاست نہیں ہوئی بلکہ اقدار کی سیاست کی گئی لیکن اس کے بعد کوئی ایک دور حکومت بشمول لمحہ موجود کے حکمران میاں نواز شریف صاحب کے ایسا نظر نہیں آتا کہ جس نے سیاست اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہ کی ہو۔ سیاست کا تو پہلا سبق ہی اقتدار حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ سیاست داں تو میدان سیاست میں قدم رنجا فرماتا ہے تو وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ سے کم کے خواب نہیں دیکھتا۔ اقدار ہیں کیا؟ خاص طور پر مسلمانوں کی اقدار کیا ہیں۔ ہماری اقدار شرافت، دیانت، صداقت، بزرگی، اصالت، نجابت، سچائی، راست بازی، امانت داری، خدمت اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی کے معاملات پر عمل کرنا اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دینا ہیں۔ اس کلیہ کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم سیاست دانوں کے کردار گفتار اور عمل کا جائزہ لیں تو ہمیں تصویر کا وہ رخ نظر نہیں آتا جس جانب وزیر اعظم، نے اشارہ کیا ہے۔ اقدار تو سچائی سے کام لینے کا نام ہے، جھوٹ سے پرہیز کا نام ہے ہماری سیاست اور سیاست داں نہ تو سچائی سے کام لیتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی وہ جھوٹ بولنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ہماری سیاست میں تو یہ مقُولہ عام ہے اور اس پر عمل ہوتا نظر بھی آتا ہے کہ سیاست میں ہر چیز جائز ہے۔ سیاست میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، سیاست داں

مفروضہ پر ایک دوسرے پر سنگین سے سنگین ، حتیٰ کہ ذاتی نوعیت کے الزامات لگاتے ہوئے ذرہ برابر ہچکچاہٹ ، تردد نہیں محسوس نہیں کرتے۔ اس کی مثالیں ایک نہیں ہزاروں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ حالیہ سیاسی صورت حال میں ہی دیکھ لیں عمران خان نے نواز شریف پر اور خود نواز شریف صاحب نے اور ان کے ساتھیوں نے کیا کیا الزامات ، بہتان، اتہام، دوش اور اُلہنا نہیں کیا۔ آصف علی زرداری کے بارے میں میاں برادران نے انتخابی مہم میں کیا کچھ نہیں کہا، پی پی کے لیڈروں نے نواز لیگ کو بھی کبھی نہیں بخشا، عمران خان نے الطاف بھائی کو تو کبھی بخشا ہی نہیں، لندن بریف کیس لے گئے ، نتیجہ کیا نکلا، صفر، بعد میں ان کے ہی ایک لیڈر پھر قسمت آزمانے لندں یاترا پر گئے، الزامات کے بوچھاڑ ہوئی کیا حاصل پھر صفر، اسی طرح ایم کیو ایم نے عمران پر کیا کیا الزامات نہیں لگائے۔ ہماری سیاست میں تو ایک دوسرے کو کھلے عام گالیاں دینے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

سابقہ سیاسی جوڑ توڑ کو یاد کریں تو کیا نواز شریف صاحب اور زرداری صاحب نے مری اور چھانگا مانگا میں کیا کیا تھا؟ دعوت ولیمہ میں اراکین کو لے گئے تھے۔ یہ تھی ہماری اقدار کی سیاست۔ ووٹ خریدنا ہماری سیاست میں کوئی بری بات نہیں ، ہر سطح پر خرید و فروخت ہوتی رہی ہے۔ لوٹا کریسی کیا ہے؟ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا، وننگ ہارس کی جانب دوڑ لگا دینا، آج ادھر تو کل اُدھر

ہماری سیاست ہے۔ عمران خان سیاست میں آگے نظر آئے تو سیاست کے بے شمار لوٹوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور تلاش میں لگ گئے کہ کس طرح عمران کے نور نظر نہ سہی نور نظروں کے نور نظر ہی بن جائیں۔ میاں صاحب بمعہ اہل خانہ جدہ کے سفر پر روانہ ہوئے تو کتنے جانثاروں نے میاں صاحب کے جھنڈے کو تھامے رکھا، اکثریت نے بلوں کی تلاش شروع کردی اور بلوں میں گھس کر پناہ حاصل کی، کچھ نے ق لیگ کو اقتدار کی کرسی کی جانب جاتے دیکھا تو دوڑ پڑے ق لیگ کی جانب، خوب مزے لیے وزارت کے، سفارت کے۔ کیسی جمہوریت، کیسی لیڈر سے وفاداری، کون سے نواز شریف، کہاں کے میاں صاحب، پرویز مشرف آج آمر ہیں، اس وقت کیا تھے، اقدار یا اقتدار؟ میاں صاحب کی قسمت نے پھر سے پلٹا کھایا، اقتدار ان کی جھولی میں آن پڑا۔ وہ تمام جنہوں نے مختلف بلوں میں چھپ کر جان بچائی تھی، کچھ پرویز مشرف اور ق لیگ کے پرچم تلے وزارت کے مرتبہ پر فائز ہو کر اپنی جیبیں گرم کرچکے تھے۔ واپس میاں صاحب کی جانب لپکے۔ کچھ تردد میں رہے، سہارا ڈھونڈا، کسی کو پکڑا، کچھ نے با آواز بلند معافی مانگی، کچھ نے اندرون خانہ توبہ کی، خوشامد کی اور آگئے پھر سے میاں صاحب کی جھولی میں اور یہی نہیں بلکہ پھر سے وزارت پر براجمان نظر آرہے ہیں۔ شرم اور حیا نام کی کوئی چیز نہیں۔ حیرت اور افسوس ہوتا ہے جب وہی ق لیگ اور پرویز مشرف کے دور میں وزارت کے مزے لوٹنے والے اکثر ٹی وی ٹاک شو میں دیدہ دلیری کے ساتھ، شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ق لیگ اور پرویز مشرف پر

تبرا بھیجتے، لعنت ملامت کرتے، ان کی سرزنش کرتے ، مغلظات ، بد گوئی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور قبلہ نواز شریف کی تعریف و توصیف،مداح سرائی، وکالت کرتے، توصیفی کلمات بیان کرتے، قصیدہ خواں ، ممدوح ہوتے میاں صاحب کے گیت گاتے دکھائی دیتے ہیں۔آج میاں صاحب کا اقتدار غروب ہو جائے کسی بھی وجہ سے ہمارے ملک میں سیاست میں تو سب کچھ ممکن ہے ، یہی قصیدہ پڑھنے والے لوٹے فورناً میاں صاحب کو پیٹ دکھا کر رفو چکر ہو جائیں گے ، کسی اور چڑھتے سورج کی جانب دوڑ لگادیں گے۔ سیاست کی اقدار تو یہ ہیں ۔ان سے ہمیں کب چھٹکارہ نصیب ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں ۔ اچھائی کی امید نظر نہیں آرہی۔آج ہی تازہ تازہ لیڈر بننے والے اس اعتبار سے کہ انہیں ان کے علاقے بدین والوں نے بھاری مینڈیٹ سے نوازا،بڑے فخریہ انداز سے فرمایا کہ سیاست داں کی دو ہی جگہیں ہوتی ہے ایک محل یا جیل۔ گویا ان کی نظر میں سیاست داں یا تو محل میں رہے گا، محل ایمانداری، سچائی اور اقدار پر عمل کرنے سے تو بن نہیں سکتا، یہ تو کرپشن سے، لوٹ کھسوٹ سے، ناجائز دولت بنانے سے ہی محل بن سکتا ہے۔ جس سیاست داں کے ذہن میں ہی یہ ہو کہ اسے محل بنانا ہے تو وہ عوام کی خاک خدمت کرے گا۔ کون سیاست داں ایسا ہے جو یہ عزم لے کر میدان میں آتا ہے کہ اُسے جیل جانا ہے۔ اگر جیل ہی جانا ہے تو کوئی بھی غیر قانون کام کرلے جیل چلا جائے گا۔ وہ تو محل کے خواب دیکھتا ہے، اقتدار کے خواب لے کر میدانِ سیاست میں آتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں محترم کہ زرداری کو جیل میں ، الطاف حسین

کو جیل میں ہونا چاہیے۔ یہ وہی والی بات ہوئی کہ سارے سیاست داں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں میں ہی میں رہ جاؤں۔ خواب دیکھنے میں کیا مزائقہ ہے۔ میاں صاحب یہ ہے ہمارے سیاست دانوں کی سوچ ، یہ ہیں ہمارے مستقبل کے حکمراں نہ سہی سیاست داں۔ ان کی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تربیت کا کوئی اہتمام کریں۔

میاں صاحب کی سوچ قابل قدر ہے۔ ان کے خیالات کہ وہ ملک میں اقتدار نہیں اقدار کی سیاست کر رہے ہیں۔ صبح کا بھولا شام کو گھر پہنچ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ میاں صاحب کی سوچ نے مثبت انداز فکر اختیار کیا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ در حقیقت اقدار کی سیاست کرنا ہی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ سیاست میں شامل محترم سیاست دانوں کو اپنی سوچ کو اقتدار کے بجائے اقدار کی جانب رکھنان چاہیے کہ اقتدار تو آنی جانی چیز ہے، انسان فانی ہے، ہر چیز کو ایک نہ ایک دن فنا ہونا ہے۔ باقی رہنے والی اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ، زندگی بسر کرنے کے لیے جو طریقہ کار اپنی کتاب قرآن مجید میں بیان کر دئے اور اس کا عملی نمونہ ہمارے نبی ﷺ نے خود کرکے دکھا دیا، ان کے بعد صحابہ اکرام نے اپنے طرز حکمرانی سے ہمیں جو سبق دیا وہ ہمارے لیے نمونہ ہے۔ ہماری سیاست کی اقدار تو یہ ہیں کہ بھری مجلس میں ایک عام شخص خلیفہ وقت سے پوچھ سکتا ہے کہ جو کرتا آپ نے ذیب تن کیا ہوا ہے، جو کپڑا سب کے حصے میں آیا وہ اتنا نہیں تھا کہ اس سے ایک

کرتا بن سکے پھر آپ نے یہ کرتا کیسے بنا لیا جو آپ اس وقت زیب تن کیے ہوئے ہیں۔اس پر خلیفہ وقت اس شخص پر ناراض نہیں ہوئے، اسے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی، ریاست کے اہل کاروں نے اسے اٹھا کر مجلس گاہ سے باہر نہیں پھینک دیا بلکہ خلیفہ وقت اس کی وضاحت کرتے ہیں جس سے وہ شخص مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ تھی خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کی اقدار کی سیاست ۔سیاست دانوں کو اس طرح کے بے شمار واقعات سے سبق لیتے ہوئے ہوئے اقتدار کی نہیں اقدار کی سیاست کرنی چاہیے۔

بلدیاتی انتخابات نے کراچی کی سیاسی رونقیں بحال کردیں

ملک میں بلدیاتی انتخابات کے پہلے اور دوسرے مرحلے کے تیسرا مرحلہ جوش و خروش سے جاری ہے۔ تیسرے مرحلے کے انتخاب دارالخلافہ اسلام آباد میں یکم دسمبر کو ہوئے مسلم لیگ نون کو غیر سرکاری نتائج کے مطابق ایک ووٹ کی برتری حاصل ہو سکی ۔ نون لیگ کے سید ظفر علی شاہ ہار گئے جو کہ نون لیگ کے اسلام آباد کے میئر کے بھی مضبوط امیدوار تصور کیے جارہے تھے۔ غیر سرکاری نتائج کے مطابق کل 50 نشستوں میں سے نون لیگ 19، تحریک انصاف 18 اور 10 آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ یہاں بھی تحریک انصاف دوسرے نمبر پر رہی۔

تیسرے مرحلے کا دنگل 5 دسمبر کو کراچی میں سجے ہوگا۔ اس کے لیے آج کل بازار انتہائی سج دھج کے ساتھ گرم ہے۔ طویل عرصہ کے بعد کراچی کی سیاسی رونقیں لوٹ آئی ہیں۔ جس سڑک، چوراہے کو دیکھیں سیاسی جماعتوں کے کیمپس لگے ہوئے ہیں ۔ اپنے اپنے لیڈروں کی، جماعت کے گانے تیز آواز سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے ہیں۔ پارٹی ترانے، جھنڈوں کی بہاریں اور جوشیلے نعروں کی گونج ہر جانب سنائی دے رہی ہے، ریلیاں اور جلسے جن پر الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے پابندی ہے ہر جماعت ہی اس کی کھلم کھلا خلاف

ورزی کرتی نظر آرہی ہے۔ ریلیاں سب ہی جماعتوں کی نکل رہی ہیں، کارنر میٹنگ جو جلسوں کا روپ دھار لیتی ہیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں لیکن تاحال کوئی نہ خوش گوار واقع رونما نہیں ہوا، یہ ایک اچھی بات ہے۔ ہر جماعت ایک دوسرے پر لعن تعن کر رہی ہے، کیڑے نکالے جارہے ہیں، اگلے پچھلے کرتوتوں کو نکال نکال کر پیش کیا جارہاہے، کراچی کو فتح کرنے، کراچی کو واہ گزار کرانے کی باتیں ہو رہی ہیں، کہاجارہا ہے کہ پانچ دسمبر کو کراچی ہمارا ہوگا، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ہمارا ہوگا ان تمام تر الزامات در الزامات کے کوئی نہ خوش گوار واقع کا نہ ہونا سیاسی جماعتوں کے سربراہوں، لیڈروں کی دانش مندی تصور کیا جانا چاہیے۔ اگر یہ لیڈران دانستہ طور پر کسی خاص حکمت علمی کے تحت اپنے کارکنوں کو تصادم سے دور رکھے ہوئے ہیں تو، انہیں آئندہ انتخابات والے دن بھی اور اس کے بعد بھی اسی سیاسی تدبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سیاست اسی کانام ہے۔ تصادم یا لڑائی جھگڑا کسی بھی طور مناسب نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم کراچی کی سطح پر سیاسی لیڈروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصادم سے، دنگا فساد سے، ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے سے سیاسی فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کو تو کچھ نہیں بگڑتا، غریب کارکن زخمی ہوجاتے ہیں، جان سے چلے جاتے ہیں، لواحیقین زندگی بھر چلے جانے والوں کی یاد میں گزار دیتے ہیں، لیڈروں کاکام افسوس کے دو بول بول دینا اور بس۔

کپتان نے کراچی کا طوفانی سیاسی دورہ کیا اور متعدد کارنر میٹنگوں جنہوں نے جلسے کی شکل اختیار کر لی تھی انتہائی جوشیلے انداز سے مخالفین کو للکارتے، ڈراتے، دھمکاتے، شکست کا خوف دلاتے نظر آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ کراچی کو لسانی بنیاد پر تقسیم نہیں ہونے دیں گے، بوری بند سیاست ختم کریں گے، کراچی کو ترقی یافتہ شہر بنائیں گے، ان کا حدف میزبان سیاسی جماعت تھی جس کو وہ اپنا ازلی سیاسی دشمن تصور کرتے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے ایم کیوایم کو تنقید کا نشانہ بنایا، حتیٰ کے اس کے قائد پر بھی رکیک حملے کیے۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا انہیں جب اور جہاں موقع ملتا ہے ایم کیوایم پر دشنام ترازی کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، ایسا وہ زبانی جمع خرچ ہی کرتے بلکہ ایم کیوایم مخالفت یا دشمنی میں وہ سالوں پہلے ثبوتوں کا بھرا بریف کیس لے کر برطانیہ گئے تھے، پر کچھ حاصل نہ ہوا، چند دن قبل ان کے ایک مقامی لیڈر بھی گئے لندن ثبوتوں کی ٹوکری لے کر لندن لیکن کچھ سامنے نہیں آسکا۔ خیر بات کہیں اور نکل گئی۔ کراچی وہ اکیلے نہیں آئے بلکہ ان کے ہمراہ ان کے اتحادی جماعت کے سربراہ سراج الحق بھی تھے۔ کراچی میں دونوں جماعتوں کا پکا سیاسی اتحاد ہے، یہ اتحاد بھی خوب ہے، جہاں ضرورت ہو اتحاد جہاں ضرورت نہ ہو وہاں دونوں کی سمتیں الگ الگ، قومی اسمبلی میں اسپیکر کے انتخاب میں سراج الحق اور ان کی جماعت نے ن لیگ کے امیدوار کو ووٹ دیا جب کہ تحریک انصاف نے مخالفت میں۔ خیبر پختون خواہ میں بھی اتحاد کراچی جیسا ہی ہے۔ اس

اتحاد نے بھی کراچی میں کپتان کی ریلیوں اور جلسوں کو چار چاند لگا دئے، رونق بڑھا دی، نفری میں اضافہ کردیا، جوش وخروش آسمان سے باتیں کررہا تھا۔ کپتان اپنے دھرنے والے اسٹائل میں مخالفین کو للکارتے رہے۔ خدا کرے انتخابات کا حشر دھرنوں والا نہ ہو، پنجاب کے بلدیاتی انتخابات والا نہ ہو۔ لگتا ہے کہ وہ یہاں وہ صورت حال نہیں ہوگی، مکمل کامیابی نہ سہی کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوجائے گا۔ دونوں کے اتحاد پر یہ شعر دیکھیں ۔

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کراچی میں بلدیاتی انتخابات میں 1520 نشستوں کے لیے 5401 امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہے۔ ان میں 70 لاکھ سے زائد ووٹر اپنا رائے دہی استعمال کریں گے۔ کراچی کے 6 اضلاع ہیں جن میں پولنگ ہوگی۔ جن جماعتوں کے امیدوار مدِ مقابل ہیں ان میں تحریک انصاف وجماعت اسلامی، ایم کیوایم، نون لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی، اے این پی، مرزا گروپ، نبیل گبول گروپ، سنی تحریک، مہاجر قومی موومنٹ کے علاوہ آزاد امیدواروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ دوسری جانب کراچی میں عرصہ دراز سے ہولڈ رکھنے والے میزبان سیاسی جماعت ایم کیوایم بھی بھرپور انداز سے انتخابی مہم چلارہی ہے۔ ریلیاں نکل رہی ہیں، جلسے ہورہے ہیں، بیان بازی اور الزام اور جوابِ الزام کا سلسلہ جاری ہے، متحدہ

کا کہنا ہے کہ کپتان الطاف حسین کی فکر چھوڑیں اپنا منشور پیش کریں، دہشتگردوں کے حمایتی کراچی کے عوام کو جھوٹے نعروں سے لبھا رہے ہیں۔ متحدہ کے قائد نے کہا کہ جماعت اسلامی اور پی ٹی آئی والے کچھ بھی کرلیں کراچی میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ آج پاکستان پیپلز پارٹی کی ریلی بھی شیریں رحمان کے قیادت میں نکلی یہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی صفورہ چورنگی پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس میں کوئی اور بڑا لیڈر دکھائی نہیں دیا۔ سابق صدر آصف علی زرداری ملک سے باہر ہیں، واپس آنے کی امید بھی نہیں، سر دست بلاول کے بس کی بات نہیں۔ سائیں وزیراعلیٰ میدان سیاست میں آ نہیں سکتے، دیگر لیڈروں کو شاید اجازت نہیں یا انہیں اختیار نہیں کہ وہ انتخابات کے حوالے سے کوئی فعال کردار ادا کرسکیں۔ ملیر کے جلسے میں جو پارٹی کا یوم تاسیس کے حوالے سے منعقد کیا گیا، بلاول ہیلی کاپٹر سے جلسہ گاہ بھی اترے اور واپس اسی ہیلی کاپٹر سے پرواز کر گئے۔ خاصہ جوش و خروش تھا پارٹی ورکروں میں، بلاول کے دائیں جانب شیریں رحمان ہی نظر آئیں، کوئی اور قابل ذکر لیڈر دکھائی دیا، کیا حکمت عملی ہے نہیں معلوم۔ اے این پی کی جگہ جس طرح خیبر پختون خواہ میں تحریک انصاف نے لے لی ہے لگتا ہے کہ کراچی میں بھی اے این پی کا ووٹر تحریک انصاف کی جانب متوجہ ہے۔ اے این پی شاہی سید جب سے سینیٹر بنے ہیں اپنے آپ کو اے این پی کی اوپر کی سطح کے لیڈروں میں شمار کرنے لگے ہیں، ٹی وی ٹاک شو میں سیاست کرنا اب انہیں زیادہ مناسب لگتا ہے۔ کراچی میں رہنا بھی انہیں

اچھا نہیں لگتا۔ نون لیگ نے لگتا ہے بادلوں کا رخ دیکھ کر کراچی میں اپنی انتخابی مہم کو بین بین رکھا ہوا ہے۔ نون لیگ کے مقامی لیڈر شپ فیلڈ رہنے کے بجائے ٹی وی ٹاک شوز میں سیاسی موضوعات پر فلسفہ بیان کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نبیل گبول کا گروپ لیاری کے چند علاقوں تک محدود ہے جب کہ مرزا جی کا گروپ بھی کراچی کے چند علاقوں تک محدود ہے، اسی طرح مہاجر قومی موومنٹ بھی مخصوص علاقوں میں اثر رکھتی ہے۔ بلدیاتی انتخابات کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آرہا ہے وہ سابقہ نتائج سے کچھ مختلف دکھائی نہیں دے رہا۔ اب تک پہلے مرحلے میں حکمراں جماعت نون لیگ بازی لے گئی کپتان اور پیپلز پارٹی منہ دیکھتے رہ گئے، دوسرے مرحلے میں سندھ کی حکمراں جماعت پیپلز پارٹی نے 22 اضلاع میں کامیابی حاصل کرکے میدان مار لیا، یہاں تحریک انصاف کا وجود ہی نہیں تھا۔ اسلام آباد میں بھی نون لیگ آگے ہے جب کہ تحریک انصاف دوسرے نمبر پر ہے، یہاں پی پی کا صفایا ہوگیا، اب تیسرا اور آخری مرحلہ کراچی کا ہے یہاں بھی کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ نون لیگ کی سرد مہری، پیپلز پارٹی کی سست روی یہی پتا دے رہی ہے کہ یہاں بلدیاتی اداروں پر حکمرانی کرنے والی سابقہ جماعت ہی بازی لے جائے گی۔

معذوروں کا عالمی دن۔ ۳ دسمبر

اقوام متحدہ نے دنوں ، ہفتوں ، سالوں اور دس سالوں کا انتخاب کیا جس کا بنیادی مقصد عالمی سطح کے مسائل اور issues جن میں اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے دلچسپی رکھتے ہیں کو اجاگر کرنا ہے۔ بسا اوقات یو این کے ذیلی ادروں نے اپنے پروگرام کے مطابق بعض مسائل کو اہمیت دیتے ہوئے مخصوص دنوں کو مقرر کرلیا جیسے عالمی ادارہ صحت WHO نے صحت کا عالمی دن، World No-Tobacco Day، گردوں کا عالمی دن، دل کا عالمی دن، ٹی بی کا عالمی دن وغیرہ کے انعقاد کی بنیاد رکھی ۔ اسی طرح یونیسکو نے بھی بعض موضوعات کو اجاگر کرنے اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے مختلف دنوں کا انتخاب کیا اور اس دن اس موضوع کی مناسبت سے سیمینار، ورکشاپ، کانفرنسیز اور نمائش کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جیسے 'پانی کا عالمی دن'، عالمی لٹریسی ڈے'، عالمی ماحولیاتی ڈے'، ماں کا عالمی دن، باپ کا عالمی دن، مادری زبان کا عالمی دن ، کتاب کا عالمی دن اور اسی طرح دیگر موضوعات پر دنوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معذور افراد سے اظہار یکجہتی اور ان کے مسائل و معاملات کو اجاگر کرنے کے لیے 1992ء میں اقوام متحدہ نے 3 دسمبر کو 'معذوروں کا عالمی دن' (International Day of Persons with Disabilities, IDPD) قرار دیا۔ اس دن دنیا بھر میں معذوروں کے حوالے سے مختلف پروگرام ترتیب دئے جاتے

ہیں۔پاکستان میں بھی اس دن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ہر سال کا موضوع مختلف ہوتا ہے۔ 2015ء کا موضوع Inclusion matters: access and empowerment for People مقرر کیا گیا ہے۔اس موضوع کے حوالے سے سیمینارز، کانفرنسیز اور لیکچر اور دیگر پروگراموں کا انعقاد کیا جائے گا۔ پاکستان میں معذوروں کی فلاح و بہبود سے متعلق فلاحی تنظیمیں معذوروں کے لیے مختلف پروگرام ترتیب دیتی ہیں۔

ایک سروے کے مطابق دنیا کی کل آبادی کا 15 فیصد یا ایک بلین افراد جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل ہیں کسی نہ کسی طور معذوری میں مبتلا ہیں۔آرگنائیزیشن برائے اکنامک کوآپریشن وڈیولپمنٹ (OECD) کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک جہاں تعلیم عام نہیں وہاں معذوروں افراد تعدادا میں زیادہ ہیں۔ان میں خواتین کی تعداد زیادہ بتائی جاتی ہے۔ترقی پذیر ممالک میں معذوروں کی تعداد 80 فیصد بتائی گئی ہے۔یونیسف (UNICEF) کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایسے بچے جو کسی اعتبار سے معذور ہیں اور شاہراہوں پر زندگی گزارتے ہیں تعداد کے اعتبار سے 30 فیصد ہیں۔ معذور افراد کو جائز اور مناسب سہولیات فراہم کرنے کے لیے دنیا کے 45 ممالک میں قانون سازی کی گئی۔ معذور افراد کی تربیت و تعلیم کے حوالے سے جو اعداد و شمار یونسکو کی جانب سے بیان کیے گئے ہیں ان کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں 90 فیصد بچوں کے لیے

اسکول یا تربیت گاہیں موجود نہیں اور ایسے بچے اسکول ہی نہیں جاتے۔ دنیا میں معذور بچوں میں تعلیم کا تناسب صرف 3 فیصد بیان کیا گیا ہے۔دنیا میں 386 ملین افراد جو کسی بھی اعتبار سے معذوری کے زمرے میں آتے ہیں مختلف سرکاری ، نیم سرکاری یا نجی اداروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ عالمی لیبر آرگنائیزیشن (ILO) کے مطابق دنیا میں ہزاروں معذور افراد ایسے ہیں جو اپنے طور پر چھوٹا موٹا کام یا کاروبار کرکے گزربسر کرتے ہیں جب کہ 400 ملین معذور افراد کسمپرسی اور مشکلات کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

پاکستان ترقی پذیر ممالک میں شامل ہے۔ یہاں بھی معذور افراد کی حالتِ زار ابتر اور قابل توجہ ہے۔ معذور افراد کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون موجود نہیں۔ نہ ہی سرکاری سرپرستی میں معذوروں کی فلاح و بہبود کے ادارے ہی قائم کیے گئے ہیں۔ البتہ نجی شعبہ میں ، خدمت خلق اور فلاحی اداروں کی جانب سے معذورافراد کی تعلیم اور نگہداشت کے ادارے مختلف شہروں میں قائم ہیں۔ پاکستان میں معذور افراد کو مختلف سرکاری محکموں میں ملازمت کے مواقع فراہم کرنے کا حق معذوراں کو ۱۹۸۱ء میں جاری ہونے والا ایکٹ آرڈیننس دیتا ہے یہ آرڈیننس Disabled Persons (Employment and Rehabilitation) Ordinance 1981 ہے۔ اس وقت کی حکومت یہ آرڈیننس تو جاری کردیا لیکن سرکاری محکموں میں اس قانون کا اطلاق آج تک نہیں ہوا۔ پاکستان میں معذور افراد کل آبدی کا

(PWD's فیصد ہیں۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں معذور افراد کی تعداد جو2.49
نے اپنے سروے میں بیان کی ہے اس کے مطابق صوبہ(statistics in Pakistan
پنجاب میں 2.5 فیصد یعنی 2816795 ہے، صوبہ سندھ میں 3.05 فیصد یعنی
ہے، صوبہ خیبر پختونخواہ میں 2.1 فیصد یعنی 566265 ہے، صوبہ1432148
بلوچستان میں 2.33 فیصد یعنی210391 ہے،اسلام آباد میں1.20 فیصد یعنی
ہے ، کل معذورین تعداد کے اعتبار سے 5035951 ہیں۔ نادرا نے90 16352
ہزار کے قریب معذور افراد کو کارڈ بھی جاری کردیے ہیں ۔ حکومت پر لازم ہے کہ
مختلف محکموں میں جو4049 اسامیاں خالی ہیں معذور افراد ان میں ملازمت فراہم
کرے۔ تاکہ معاشرے کے اس اہم طبقے کو اس کا جائز حق مل سکے۔2002 ء میں
National Policy for Persons with Disabilities حکومت کی جانب سے
بھی جاری کی جاچکی ہے۔ معذوروں کے لیے کیے جانے والے ان اقدامات پر اگر
ایمانداری سے عمل درآمد کیاجائے تو معاشرے کا یہ محروم طبقہ خوش حال زندگی گزانے
کے قابل ہوجائے گا۔ ایسا کرنا ہمارا اخلاقی اور قانونی فرض بھی ہے۔

معذورافراد ہر اعتبار سے ہم سب کی توجہ اور ہمدردکے مستحق ہیں ۔ ان کی بہبود ، اسکول
اور تربیتی اداروں کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ پاکستان میں سابقہ حکومتوں کے ادوار
میں سرکاری ملازمت میں مختصر کوٹہ مقرر کیاگیا جس پر ایمانداری سے عمل درآمد نہیں
ہوااس کی واضح مثال ایک سال قبل نابینا

افراد کی جانب سے ہونے والا وہ احتجاج تھا جس پر پولیس نے بے رحمی سے تشدد بھی کیا تھا۔ پاکستان بھر میں پولس کے اس طرز عمل کی شدید الفاظ میں مذمت بھی کی گئی تھی۔ سفید چھڑی لیے معاشرے کے یہ افراد سرکاری محکموں میں قانون کے مطابق ملازمت کے حصول کا مطالبہ کر رہے تھے جو ہر اعتبار سے جائز تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معذورین کو ان کا جائز اور قانونی حق دیا جائے۔ جس محکمے میں معذور افراد نہیں وہاں انہیں ملازمت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ سرکاری اداروں کے علاوہ نجی ادارے، کمپنیاں، اخبارات کے دفاتر، ٹی وی سینٹر، تجارتی و صنعتی ادارے بھی معذور افراد کو انسانی ہمدردی کے طور پر ملازمت کے مواقع فراہم کریں۔ ہم اگر ایسا نہیں کریں گے تو ہمارے معاشرے کا یہ مظلوم طبقہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہمارے اور آپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر ہی مجبور ہوگا۔

فلاحی ادارے جنہوں نے معذورین کی فلاح و بہبود، تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کیے ہوئے ہیں لائقِ تحسین ہیں وہ والدین جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے امتحان میں ڈالا کہ انہیں معذور اولاد عطا کی اور وہ ان کی پرورش، نگہداشت، دیکھ بھال دل و جان سے کر رہے ہیں۔ ایک جانب تو وہ کسی غیر کے لیے مصروفِ عمل نہیں بلکہ اپنے خون کی آبیاری کر رہے ہیں جو ان کا حق اور فرض بھی ہے تو دوسری جانب ان کا یہ عمل عبادت کا حصہ بھی ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس

کے بدلے یقینا اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ قرآن کریم کی سورۃ التغابن کی آیت 15 میں ارشاد ربانی ہے کہ ’تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہے اور خدا کے ہاں بڑا اجر ہے‘۔ سفید چھڑی کا ہاتھ میں ہونا اس بات کی علامت تصور کیا جاتا ہے کہ چھڑی کا حامل شخص بینائی سے محروم ہے، اگر کوئی ایسا شخص کسی لمحہ خاص طور پر سڑک کے کنارے نظر آجائے تو دیر کیے بغیر اس کی مدد کو پہنچنا ہر ایک کے فرائض شامل ہے۔ اسی طرح دیگر معذورین کی مدد و رہنمائی میں ہمیں کسی تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

حکومت وقت پر لازم ہے کہ ملک میں معذورین کی سہولیات، تعلیم و تربیت کے لیے کسی بھی قسم کا قانون موجود نہیں ماسوائے 1981ء کے آرڈیننس کے۔ اس آرڈیننس پر من و عن عمل نہیں ہو رہا۔ ضرورت ہے کہ ایسے افراد کے لیے قانون سازی کی جائے تاکہ معاشرے کے اس طبقہ کو جلد انصاف اور سہولت میسر آسکے۔

وزیر خزانہ پر قرض لینے کا بھوت سوار ہے

آج میں کسی ادبی موضوع پر لکھنا چاہتا تھا ’جناح‘ اخبار کا اداریہ پڑھ کر میری سوچ کا دھارا 2013ء کی انتخابی مہم کے تانے بانے بننے لگا میاں صاحب نے اپنا ایک منشور پیش کیا تھا، اپنی انتخابی تقریروں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ حکومت میں آ کر غربت کا خاتما کر دیں گے، غریب کو مشکلات سے نجات دلائیں گے، ملک کو قرضوں سے نجات دلائیں گے ، کشکول توڑ دیں گے، بھیک نہیں مانگے گے، اپنے وسائل پر بھروسہ کرکے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے۔ ڈھائی سال کی حکمرانی میں یہ تمام باتیں کہیں دکھائی نہیں دیں۔ میاں صاحب کہا گیا آپ کا منشور، کیا ہوئے آپ کے وعدے غربت کو ختم کرنے کے، غریب کی مشکلات کو دور کرنے کے، کہا گیا آپ کا وعدہ کہ آپ کشکول توڑ دیں گے۔ آج سب کچھ ویسا کا ویسا ہی ہے۔ نہ غربت ختم ہوئی، نہ غریب کی مشکلات میں کمی آئی، نہ کشکول ہاتھ سے چھوٹا، نہ قرض لینے کے عادت گئی، نا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت گئی بلکہ اس میں تیزی آچکی ہے۔ وزیر خزانہ قرض حاصل کرنے کے ایکسپرٹ بن چکے ہیں بہ الفاظِ دیگر اسحٰق ڈار صاحب آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سے قرض حاصل کرنے کے ماہر حصولِ قرضہ جات‘ بن چکے ہیں۔ انہیں وزیر خزانہ سے ’وزیر حصول قرضہ جات‘ بنا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

انھوں نے ایسے گُر سیکھ لیے ہیں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک قرض کی منظوری میں ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر قرض کی اگلی قسط کی منظوری دے دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو قرض وہ دے رہے ہیں وہ کئی گنا ہو کر واپس انہیں کے پاس آجائیگا، وزیر خزانہ ، اپنے سمدھی وزیر اعظم پر ایک اور احسان داغ دیتے ہیں کہ دیکھو سمدھی جی میں اس بار بھی قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہوئی نہ میری سیٹ پکی چوتھی ٹرم کے لیے۔

نوید ہو کہ لحہ موجود کی حکومت نے قرضوں کی ادائیگی کے لیے 313 درآمدی اشیاء پر آئندہ 72 گھنٹوں میں ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد وزیر خزانہ نے یہ بیان کیا ہے کہ ایسا کرنے سے حکومت کا40 ارب روپے ریونیو کا شارٹ فال پورا کرنے کی شرط کی تکمیل ہوجائے گی۔ چناچہ وزیر موصوف نے درآمدی اشیاء پر ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے لیے 5 دسمبر سے پہلے پہلے یہ اقدام کرنا ہوگا۔ یہ درآمدی اشیاء ہیں کیا؟ فہرست پر نظر ڈالی جائے تو عقل حیران اور پریشان ہوجاتی ہے کہ اس فہرست میں ایسی اشیاء کی کثرت ہے جو عام بلکہ غریب عوام کے استعمال کی ہیں۔ بلکہ روز مرہ ضروری استعمال میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وزیر خزانہ تجربہ کار ہیں، میاں صاحب جب بھی وزارت اعظمی کی کرسی پر براجمان ہوتے ہیں خزانہ کسی اور کو دینے کا سوچتے بھی نہیں اس لیے کے خزانہ ہے ہی ایسی چیز

غیر کو کیوں جائے۔ گھر کی چیز گھر ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ اسحٰق ڈار صاحب ٹھہرے اپنے وہ بھی سمدھی جی، اعتماد اور اعتبار کا یہ عالم ہے کہ 313 اشیاء کی جو فہرست تیار کی گئی ہے میاں صاحب نے اس کو ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی، اگر میاں صاحب از خود اس فہرست کو دیکھ لیتے تو یقیناً وہ وزیر خزانہ کے اس اقدام کو روک دیتے۔ میرا تو خیال یہ بھی ہے کہ یہ فہرست وزیر خزانہ صاحب نے بھی نہیں دیکھی بلکہ ان کے محکمے کے کارندوں نے جو فہرست نیچے سے بھیج دی انہوں نے اس کا موضوع دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ ان سے بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے اربوں روپے کا ریوینو شارٹ فال پورا ہونے کی شرط کی تکمیل ہوجائے گی انہوں اس فیصلے کو میاں صاحب کی جانب بڑھا دیا۔ موصوف وزیر نے اس کے اثرات و مضمرات پر قطعناً سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وزیر اعظم صاحب کو اتنی کہا فرست کے کہ وہ اس فہرست کو دیکھیں جس میں آلو، مٹر، گاجر مولی لکھا ہو انہیں تو بیرون ممالک کے دوروں سے ہی فرست نہیں۔ عمران خان کے سوالوں کا جواب دینے میں اپنی پوری صلاحیتں صرف کر رہے ہیں۔ کاش میاں صاحب یہ دیکھ لیتے کہ ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھانے کے لیے جن اشیاء کو فہرست میں شامل کیا گیا ہے ان کا تعلق امیروں سے ہے یا غریب عوام سے۔

زرا دیکھئے، اس پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے کہ جو اشیاء در آمد کی جاتی ہیں

جن پر ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھانے کی کاروائی عمل میں لائی جانے والی ، جو غریب عوام پر مہنگائی کا بم بن کر گرنے والی ہے اس فہرست میں پھل جن میں ناشپاتی، امرود، آم، کینو، لیمو، چکوترا، سیب، کشمش، انار، کھجور، سبزیوں میں کھیرا، ٹماٹر، آلو، مٹر، لوبیا، دہی، مکھن، ڈیری مصنوعات ، پنیر، کھویا، ڈبل روٹی، مشروبات، ٹوتھ پیسٹ، صابن، اچار اور اس طرز کی دیگر استعمال کی اشیاء اس فہرست کا حصہ ہیں۔ کیا یہ اشیاء غریب عوام کے روز مرہ استعمال کی نہیں؟ ان اشیاء کو کیا رائے ونڈ میں رہنے والے، ڈیفنس، کلفٹن، سیٹلائٹ ٹاؤن ، جوہر ٹاؤن، گلشن اقبال، بنی گالا اور اسلام آباد کے پوش اور بڑے علاقوں والے استعمال کرتے ہیں؟ وزیر خزانہ کی اس ماہرانہ کاروائی سے غریب اور نچلے درجے کے عوام مہنگائی کے سیلاب تلے دب جائیں گے۔ امیروں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وزیر اعظم صاحب اب بھی وقت ہے اس اہم مسئلہ کی جانب کچھ توجہ کیجئے اور اگر ممکن ہو سکے تو ان احکامات کو واپس لے کر غریب عوام کو مہنگائی سے بچا لیجئے۔

موجودہ سال کا بجٹ پیش ہوئے چار ماہ کا عرصہ ہو چکا اب وزیر موصوف کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ بیٹھے بٹھائے غریب عوام کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی کیا سوجی۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا ملک قرضوں پر چلایا جا رہا ہے۔ قرض لیا، اس قرض پر سود ادا کرنے کے لیے قرض لیا، واپس کر دیا، قرض کی اقساط ادا کرنی

ہیں اس کے لیے قرض لیا اور واپس کر دیا۔ آئی ایم ایف سے قرض لیا ورلڈ بنک کا قرض اتار دیا، ورلڈ بن سے قرض لیا آئی ایم ایف کا قرض اتار دیا۔ کچھ منصوبوں پر ظاہر کر دیا باقی کھایا پیا گیا۔ لحہ موجود کے وزیر خزانہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا عمل اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ پاکستان کی بقا اور سلامتی صرف اور صرف قرضوں کے حصول میں ہے۔ اس ملک کو قرضوں سے ہی چلایا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وزیر خزانہ، خزانہ کے محکمہ کے اعلیٰ افسران اپنی تمام تر صلاحتیں اور کوششیں اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کو کس طرح شیشے میں اتارا جائے کہ وہ قرض دینے پر مسلسل آمادہ رہیں۔ دیگر باتوں کے علاوہ یہ معاملہ بھی گورننس کے بہتر نہ ہونے کی صورت ہے۔ جس کی نشاندھی ہم جیسے کالم نگار، تجزیہ نگار، اخبارات کے ادارےیے مسلسل کرتے رہیں ہیں۔حکومت کی خراب کارکردگی جسے بیڈ گورننس کہا گیا پر عسکری قیادت نے بھی توجہ دلائی، جس پر حکومت چلا اٹھی۔اب چیف جسٹس آف پاکستان نے بھی کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ ’ بیڈ گورننس سے لا تعلق رہ کر عوام کو حکومت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے، کیا ہمیشہ بھیک مانگ کر ملک چلائیں گے۔ بھیک کے پیسوں سے منصوبے بنائیں گے اور پھر انہیں چلانے کے لیے مذید بھیک درکار ہوگی‘۔ حکومت کی آنکھیں اب بھی نہ کھلیں تو پھر کب کھلیں گے ، اور پھر کس طرح پانی سر سے اوپر بہتا ہے، اعلیٰ اختیارات کے ادارے حکومت کی توجہ واضح الفاظ میں ، آسان اور سہل زبان میں ، حکومت کی

توجہ بیڈ گورننس کی جانب مبذول کرا رہے ہیں کہ خدارا اپنی کارکردگی کو بہتر کیجئے۔ قرضوں سے ملک کو چلانے کی روش کو بدلیں۔ بے شمار ایسے منصوبے بنائے جا سکتے ہیں جن سے حکومت کی آمدنی کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ ہمارا ملک بے پناہ مختلف النوع قسم کی معدنیات سے مالا مال ہے۔ درآمد کے بجائے برآمدات کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ عالمی منڈی میں پاکستانی مصنوعات کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ تجارت، صنعت کو فروغ دیا جائے۔ ملک کے ایسے ادارے جو دودھ دیتی گائیں تھے اب بے کار اور ناکارہ ہوچکے ہیں ان کو از سرِ نو دودھ دینے والی گائیں بنائیں۔ میرٹ کو آسمانی صحیفہ سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ اگر ملک و قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو رشتہ داری، دوستی، اقربہ پروری، فرقہ واریت، لسانیت ہر قسم کے تعصب سے اپنے آپ کو پاک کرتے ہوئے صرف اور صرف میرٹ پر لوگوں کا انتخاب کریں۔ آپ کے سدھی بے پناہ خوبیوں کے مالک ہیں لیکن انھوں نے پاکستان کو قرضوں کے دلدل میں پھنسا دیا ہے نکالنے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ ملک میں ٹیلنٹ موجود ہے۔ ایسے لوگوں کو تلاش کرنا آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ ٹیلنٹ تلاش کیجئے اور خیر باد کہہ دیجئے اپنے دائیں اور بائیں خوشامدیوں کو، قرض سے محبت کرنے والوں کو، قرض دلوانے کے ماہرین کو ان سے فلاح کی امید نہیں۔ علاوہ ازاں حکومت میں شامل صدر مملکت سے لے کر وزیر اعظم تک، وزیروں، سفیروں سے لے کر مشیروں تک سب کو اپنے طرزِ حکمرانی کو بدلنا ہوگا۔ اپنے رہن سہن کو بدلنا ہوگا، سادگی کو اپنانا ہوگا، اخراجات کو

کم سے کم کرنا ہوگا، ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کے روز مرہ کے اخراجات کو
کنٹرول کرنا ہوگا، وزیراعظم صاحب کو اپنے غیر ملکی دورہ پر نظرثانی کرنا ہوگی، اپنے
ساتھ فوج ظفر موج کی روایت کو ختم کرنا ہوگا۔ قرض اتاروں ملک سنواروں اسکیم کہا
گئی؟ اسے زندہ کیجئے سب سے پہلے پرانے اکاؤنٹ کا کھوج نکالیے کہ کتنا سرمایا آیا تھا اور
وہ کہاں گیا، کس کس کے پیٹ میں گیا۔ قرض کی لعنت سے چھٹکارہ ہی ملک اور قوم کی بقا
ہے۔ مالیاتی اداروں کے دباؤ تلے ملک و قوم کو نہ دباتے جائیں، یہ ہمیں مٹی تلے دبا
کر اوپر اشتہار لگادیں گے جس پر لکھا ہوگا ہے کوئی خریدار۔

محمد سجاد ساجد مرحوم۔ پاکستان لائبریرین شپ کی محترم شخصیت

سجاد ساجد کی پیشہ ورانہ خدمات نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہیں
سابق لائبریری پرفیشنل / لائبریرین : اسٹیٹ بینک آف پاکستان لائبریرین' ، ٹیچرسز
، (اسپیشلائزڈ لائبریری (اسکولز
گورنمنٹ کالج برائے طلباء ، ناظم آباد، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی، ڈائریکٹریٹ آف
(کالجز، بیت الحکمہ (ہمدرد یونیورسٹی لائبریری

محمد سجاد ساجد 19 نومبر 2015ء کو طویل علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ کالج لائبریرین تھے اور مختلف کالجوں اور اداروں میں خدمات انجام دے چکے تھے، ان کی پیشہ ورانہ خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ کالج ڈائریکٹریٹ میں آفیسر آن اسپیشل لائبریریز بھی رہے۔ لائبریری پروفیشن کے لیے سجاد صاحب کی (OSD) ڈیوٹی خدمات کا دائرہ وسیع اور مختلف جہت پر مشتمل ہے۔ سجاد ساجد مرحوم سے میرے مراسم اس وقت سے تھے جب سے میں نے اس پروفیشن میں قدم رکھا تھا۔ میں 35 سال خدمات انجام دے کر 2009ء میں ریٹائر ہوا، سجاد ساجد صاحب مجھ سے قبل ء میں ریٹائر ہوچکے تھے۔ وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے کہ جنھوں نے 1991 اپنے پیشے کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد

رکھی جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سجاد ساجد ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے۔ ان کی رہنمائی میں کالج لائبریرینز کی ایک گریڈ سے دوسرے گریڈ میں ترقی، نان گزیٹیڈ سے گزیٹیڈ اسٹاف میں شامل کیا جانا، انٹر اور بے کی سطح پر لائبریری سائنس کا بطور اختیاری مضمون کے متعارف ہونا تاریخی کارنامے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہم ایک دوسرے سے دور ضرور ہوگئے تھے لیکن پیشہ ورانہ تعلق نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔ سجاد صاحب سے میرے مراسم کا آغاز 1971ء ہی میں ہوگیا تھا۔ میں نے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، جامعہ کراچی سے اپنی پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز کیا تھا، سجاد ساجد، ڈاکٹر انیس خورشید کے کلاس فیلوز میں سے تھے، وہ سندھ کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوچکے تھے اور اسکول ڈائریکٹریٹ کی لائبریری میں خدمات سرانجام دیا کرتے تھے۔ دو سال بعد ہم ڈگری لے کر ملازمت میں آئے تو قسمت سے ہمارا تقرر بھی کالج میں ہی ہوگیا۔ یہ بات ہے 1973ء کے آخر کی۔ سجاد ساجد صاحب مختلف جگہ سے ہوتے ہوئے اس وقت کالج ڈائریکٹریٹ میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (لائبریرینز) تھے۔ کراچی کے کالج لائبریرینز ان ہی سے رہنمائی کے لیے ان کے دفتر میں دوڑے دوڑے چلے آیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں سمیع اللہ مرحوم، سید ناظر علی، محمد عثمان، محمد یوسف، صابرہ سلطانہ مرحومہ، صالحہ زبیری شامل تھے جو ہمیں ان کے دفتر میں زیادہ دکھائی دیا کرتے تھے ہوسکتا ہے کہ اور لوگ بھی ہوں لیکن میں نے ان حضرات کو ہی سجاد ساجد کے دفتر میں

زیادہ دیکھا بعد میں یہ سب ہی ہمارے بھی حلقۂ دوستی میں آ گئے۔ سجاد صاحب کالج کے حوالے سے بہت مشہور اور لوگوں کی مدد کرنے کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ ہم کالج جوائن کرنے سے قبل سجاد صاحب کی خدمات میں حاضر ہوئے اور کراچی کے ایک کالج میں اپنی تعیناتی کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں جوائنگ رپورٹ جمع کرانے کے گر بتائے۔ سجاد صاحب سے یہ ہمارا پہلا باضابطہ انٹر ایکشن اور تعلقات کا آغاز تھا، یہ تعلقات پیشہ ورانہ بھی تھے اور ذاتی نوعیت کے بھی۔ ان سے تعلقات کا دورانیہ تقریباً 40 سال پر محیط ہے۔ ہم ان سے بہت جونیئر تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے سینئر ہونے کا روب نہیں جھاڑا، ہمارے درمیان برابری کی سطح کے تعلقات رہے، ہم جونیئر ہو کر بھی ان کے ایسے ہی دوست تھے جیسے ان کے ساتھ کے لوگ تھے۔ خیال کرنے والوں میں سے تھے، ہنس مکھ، سیدھے سادھے، پیشہ ورانہ معاملات میں فنا فل تھے۔ جس کام پر لگے اسے کامیابی کی سطح پر پہنچا کر دم لیا۔ اصولوں پر سودا کرنا نہیں جانتے تھے۔

سجاد ساجد صاحب نے 1955 نے کراچی لائبریری ایسو سی ایشن کے سرٹیفیکیٹ کورس سے پیشہ ورانہ تعلیم کا آغاز کیا۔ جامعہ کراچی میں شعبہ لائبریری سائنس کا آغاز 1956 میں ہوا سجاد صاحب پہلے سیشن کے طلبہ میں شامل تھے، اسی طرح جب ایم اے 1962ء میں شروع ہوا تو آپ پہلے سیشن کے طلبہ میں شامل تھے۔ سجاد صاحب کی پیشہ ورانہ زندگی 53 برس (1952ء۔2005ء) پر محیط ہے۔ خدمات کا یہ سلسلہ

تاحال جاری ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے کتب خانے سے چھ برس (1952ء۔ ء) وابستہ رہے، گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد، ٹیچرسز اسپیشلائزڈ1957 لائبریری، ڈائریکٹریٹ آف کالج ایجوکیشن میں لائبریری خدمات انجام دیں، 1992 ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بیت الحکمہ (ہمدرد یونیورسٹی لائبریری) میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سجاد صاحب پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ سرگرم رہے، ''کونسل آف اسکول اینڈ کالج لائبریریز'' کے تاسیسی صدر ہیں اور کالج لائبریریز کے مسائل اور انٹر و بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون کے اجراء میں آپ کی خدمات قابل قدر یں۔

Banka' سجاد ساجد مرحوم 1931ء میں ہندوستان کے ضلع بہار کے ایک قصبے 'بنکا میں پیدا ہوئے۔ میٹرک 1946 میں بنکا سے ہی کیا، قیام پاکستان کے بعد کراچی میں ہجرت کی ۔ جامعہ کراچی سے معاشیات اور لائبریری سائنس میں ایم کیا، وہ ہومیوڈاکٹر بھی تھے۔ پیشہ ورانہ حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی لائبریری سے 1952ء میں کیا یہاں وہ چھ سال کام کرتے رہے۔اسی سال یعنی 1956 ء میں جامعہ کراچی میں شعبہ لائبریری سائنس کی بنیاد پڑی اور پوسٹ گریجویٹ کورس کا آغاز ہوا، محمد سجاد ساجد پہلے سیشن 57ء۔1956ء کے طالب علم تھے۔اس کلاس کے بعض طالب علموں میں ڈاکٹر انیس خورشید ،

محمد عادل عثمانی، عبد اللہ خان، صادق علی خان، سید افتخار حسین سبزواری، محمد عبید اللہ سیفی، محمد اظہار الحق ضیاء شامل تھے۔ بعد ازاں جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری سائنس نے ایم اے کا آغاز کیا تو سجاد ساجد 1962ء کی ایم اے کی پہلی کلاس کے طالب علم تھے۔ اس اعتبار سے سجاد ساجد پاکستان لائبریرین شپ کے اساسی پروفیشنلز میں اور اس پیشے کے اولین ہراول دستہ کا حصہ تھے۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز 1952ء میں شروع ہوا تھا اس کا پہلا دور 1992ء میں سرکاری ملازمت کے اختتام پر ختم ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے سلسلہ ملازمت ختم نہیں کیا اور جامعہ ہمدرد کے کتب خانے سے وابستہ ہو گئے۔ سید اختر علی جو بیت الحکمہ کے چیف لائبریرین تھے انہوں نے بتایا کہ سجاد صاحب ۲۰۱۱ء تک جامعہ ہمدرد کے کتب خانے سے منسلک رہے۔ اس وقت ان کی عمر 79 سال ہو چکی تھی اور وہ اکثر بھولنے کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جس کے باعث مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ان کے لیے ہمدرد کا طویل سفر مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے از خود ملازمت کا سلسلہ ترک کر دیا۔ اس طرح ان کی ملازمت کا سلسلہ جو 1952ء سے شروع ہوا تھا2011ء کو 59 سال تک جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ گویا لائبریری پروفیشن کے لیے ان کی خدمات نصف سینچری سے زیادہ عرصہ پر محیط ہیں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

پیشہ ورانہ خدمات کے علاوہ لائبریرینز کی فلاح و بہبود، ان کے اسٹیٹس کی

بلندی کے لیے، ملازمت میں ترقی اور نئے گریڈ میں ترقی کے لیے ساتھ ہی لائبریری سائنس کو انٹر و بی اے میں بطور اختیاری مضمون متعارف کرانے میں سجاد ساجد کا اہم کردار ہے۔ کراچی کے بعد سندھ کے دیگر شہروں میں اس کی تقلید کی گئی۔ اس جدوجہد میں سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے لائبریرینز کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ جو نام اس وقت ذہن میں آرہے ہیں ان میں محترمہ فرخندہ لودھی مرحومہ اور رانا جماعت علی خان کا ہے کہ جنھوں نے پنجاب میں لائبریری سائنس کے اجراء میں بڑی جدوجہد کی۔ اس حوالے سے پی ایل اے کی کوششیں بھی اہم ہیں۔

1970ء کی دھائی میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت میں ایک منفرد اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ بعد ازاں بی اے میں اس مضمون کو بحیثیت اختیاری مضمون کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس اقدام سے لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا دائرہ لائبریری انجمنوں اور جامعات سے بڑھ کر کالجوں تک وسیع ہوگیا جس سے اس مضمون کی اہمیت اور شہرت میں اضافہ ہوا ساتھ ہی لائبریری پروفیشن کو اور زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی اور عوام الناس میں اس پیشہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کالجوں میں لائبریری سائنس کے لیکچرر کی اسامیوں سے مختلف جامعات سے فارغ التحصیل ہونے والے پروفیشنلز کے لیے جاذب نظر ملازمت کے زیادہ مواقع سامنے آئے۔ اس منفرد اندار فکر کو عملی

جامہ پہنانے کی عملی جدو جہد مختلف اداروں، انجمنوں اور پروفیشنلز کی جانب سے کی گئی۔ اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے بورڈ آف اسٹڈیز نے اپنی میٹنگ منعقدہ 28 فروری 1974ء کو انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی سطح پر لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون متعارف کرانے کی سفارش کی۔ اس سے قبل یہ فکر مختلف لوگوں کے ذہنوں میں تھی بعض نے اپنی تحریروں میں اس جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ لیکن کسی بھی قابل اعتماد ادارے کی جانب سے یہ اولین کوشش تھی۔ جامعہ پنجاب کی فیکلٹی آف آرٹس نے اس سفارش کو اپریل 1947ء کو منظور کیا' اکیڈمک کونسل نے جنوری ۱۹۷۵ء میں اس کی 30 منظوری دی۔ لاہور کے سیکنڈری وانٹر میڈیٹ تعلیمی بورڈ نے دسمبر 1974ء کو اس تجویز کو منظور کیا۔ اس فیصلے کی اطلاع پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے 21 جنوری 1957ء کو جاری کی۔ لاہور بورڈ نے 'کمیٹی برائے نصاب' تشکیل دی جس کے کنوینز ڈاکٹر ممتاز انور تھے۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ جب تک کالجوں میں لائبریری سائنس کے لیکچرر کا تقرر نہ ہو جائے اور نصاب کے مطابق خصوصی نصابی کتاب شائع نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کالج کو اس مضمون کو شروع کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نصاب کمیٹی کے اس فیصلے کے بعد پنجاب کے کالجوں میں لائبریری سائنس کے مضمون کا اجراء التواء کا شکار ہو گیا تاہم کالجوں سے تعلق رکھنے والے پیشہ وروں نے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔

پنجاب کے علاوہ صوبہ سندھ میں عملی جدوجہد کا آغاز 1976ء میں ہوا۔ سندھ کونسل آف اسکول وکالج لائبریریز جس کے صدر محمد سجاد ساجد تھے نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۰ اپریل 1976ء بنام چیرٔمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کراچی سے درخواست کی کہ کراچی کے کالجوں میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ بورڈ کی اکیڈمک کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ 10 مئی 1976ء کو منعقد ہوئی کمیٹی نے قرارداد نمبر ا کے تحت کونسل کی درخواست اصولی طور پر منظور کرتے ہوئے نصاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی کمیٹی نے انٹرمیڈیٹ لائبریری سائنس کے نصاب کا مسودہ تیار کیا جسے بورڈ نے منظور کرتے ہوئے ۱۶ اگست ۱۹۷۶ء کو لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون کے انٹرمیڈیٹ نصاب میں شامل کرلیا۔ حیدرآباد اور سکھر کے تعلیمی بورڈوں نے بھی ۱۹۷۷ء میں اس مضمون کو اپنے نصاب میں شامل کرلیا۔ اسی سال اسلام آباد کے فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ نے بھی اس مضمون کو انٹر کی سطح پر نصاب میں شامل کرلیا اس طرح فیڈرل بورڈ کے تحت فیڈرل کالج برائے خواتین اسلام آباد میں بھی انٹر کی سطح پر لائبریری سائنس کی تدریس کا آغاز ہوا۔ اس تمام تر جدوجہد میں سجاد ساجد پیش پیش نظر آتے ہیں۔

انٹر میڈیٹ کی سطح پر لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون کے متعارف ہو جانے کے بعد نصاب کے مطابق تصانیف طلباء کی اولین ضرورت تھیں ۔ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ منظور شدہ نصاب کے مطابق اولین نصابی تصنیف انٹر میڈیٹ سال اول کے لیے 1980ء میں " ابتدائی لائبریری سائنس " کے عنوان سے جبکہ سال دوم کے لیے " مبادیات لائبریری سائنس " کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ۔ صوبہ سندھ اور فیڈرل بورڈ میں لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون متعارف ہو جانے کے بعد دیگر صوبوں کے نصاب میں شامل کرنے کی جدوجہد شروع کی گئی۔

1977ء میں پاکستان کے تمام انٹر میڈیٹ بورڈوں کے سربراہان (چیئرمین) نے اپنے اجلاس منعقدہ لوئر ٹوپہ میں اصولی طور پر لائبریری سائنس کو بحیثیت اختیاری مضمون انٹر میڈیٹ میں شامل کرنا منظور کر لیا۔ 1989ء میں حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم نے اس مضمون کو " نیشنل اسکیم آف اسٹڈیز " میں شامل کرتے ہوئے انٹر میڈیٹ کی سطح پر اس مضمون کو پڑھانے کی اجازت دی۔ انٹر بورڈز چیرَمین کمیٹی کی منظوری کے بعد مرکزی وزارت تعلیم کے مراسلہ مورخہ 26 نومبر 1990ء کی روشنی میں پنجاب کے تقریباً تمام بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن نے انٹر میڈیٹ کی سطح پر لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون کے اجراء اور امتحان لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کیا جس کا اطلاق انٹر میڈیٹ امتحان (گیارہویں جماعت) 1991ء سے کیا گیا۔ پنجاب میں مضمون کی تدریس کا مسئلہ تعطل کا شکار رہا۔

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے حکومت پاکستان، وزارت تعلیم (کریکلم ونگ) کے حوالہ سے نوٹیفیکیشن مورخہ یکم جنوری 1991ء کے تحت لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون اجراء کے احکامات جاری کیے۔ 1993ء میں وزارت تعلیم کریکلم ونگ نے اپنے سرکلر مورخہ ۷ جنوری 1993ء کے تحت لائبریری سائنس کو قومی اسکیم آف اسٹڈیز کے ہیومانیٹیز گروپ میں شامل کیا۔ طویل جدوجہد کے بعد فرخندہ لودھی کی جدوجہد کامیاب ہوئی اور پنجاب کے تقریباً تمام ہی انٹرمیڈیٹ بورڈوں کے تحت لائبریری سائنس اب بے شمار کالجوں میں پڑھایا جانے لگا۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ کالج لائبریریز لائبریری کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ تدریس کے فرائض بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

انٹرمیڈیٹ میں لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون متعارف ہو جانے کے بعد انٹر اور ایم اے کے درمیان کے خلا کو پر کرنا ہر اعتبار سے ضروری تھا۔ اس مرحلہ پر بھی کراچی نے پہل کی۔ سندھ کونسل آف اسکول وکالج لائبریریز جس کے صدر محمد سجاد ساجد ہی تھے نے تحریری طور پر اپنے مکتوب بنام شیخ الجامعہ کراچی 29 نومبر 1978ء درخواست کی کہ لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون بی اے کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اپنے اس مطالبہ کے حق میں کونسل نے کئی دلائل بھی دئے۔ درخواست شعبہ لائبریری و

انفارمیشن سائنس، جامعہ کراچی کو بھیج دی گئی۔چیئر مین شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس نے اپنے خط مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۷۹ء سندھ کونسل آف اسکول وکالج لائبریرینز کے صدر کواپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''لائبریری سائنس ایک پوسٹ گریجویٹ کورس ہے اور یہ انڈر گریجویٹ سطح پر شروع نہیں کیا جاسکتا۔یہ عمل بی اے میں لائبریری سائنس کے اجراء میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف تھا۔سندھ کونسل آف اسکول وکالج لائبریرینز نے اپنے صدر محمد سجاد ساجد کی رہنمائی میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔مختلف سیاسی، سماجی، تعلیمی، جامعہ کراچی کی اکیڈمک کونسل وسینٹ کے اراکین، منتخب نمائندوں اور لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کومسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔اس سلسلے میں انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات کے صدر حکیم محمد سعید سے درخواست کی گئی کہ وہ اس التواء شدہ مسئلہ کو حل کرانے میں کردار ادا کریں۔آپ نے اُس وقت کے وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی کے نام اپنے خط مورخہ 12 مارچ 1979ء میں اس اہم مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس مضمون کو بی اے کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی۔حکومت نے کورس کی تشکیل کے لیے ایک قومی کمیٹی بھی بنائی۔پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی کوششوں سے یہ نصاب 1988ء میں منظور ہوگیا۔جامعہ کراچی کے بورڈ آف اسٹڈیز نے قومی نصاب کمیٹی کے نصاب کو اپنے اجلاس مورخہ 12 دسمبر 1979ء کو منظور کرتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کو

منظوری کے لئے بھیج دیا جسے جامعہ کراچی کی اکیڈمک کونسل نے اپنے اجلاس مورخہ 23 جنوری 1980ء کو اس کی منظوری دی۔ ایک سال بعد نصاب پر عمل درآمد کے لیے اسے کراچی کے کالجوں میں بھیجاگیا۔ اس اقدام کے فوری بعد کراچی کے کالجوں میں یہ مضمون پڑھایا جانے لگا۔ اب یہ مضمون پاکستان کی تمام جامعات میں بی اے کی سطح پر بطور اختیاری مضمون کے رائج ہے۔

کالجوں میں خدمات انجام دینے والے لائبریرینز کو نان گزیٹڈ سے گزیٹڈ اسٹاف میں شامل کیا جانا اور پھر ان انہیں 17 سے 18 اور پھر 19 گریڈ میں ترقی کے لیے کامیاب جدوجہد میں سجاد ساجد کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ سجاد ساجد نے ریٹائر ہونے کے بعد ایک لائبریری اسکول بھی قائم کیا اور اس کورس کو سندھ بورڈ آف ٹیکنکل ایجوکیشن سے منظور کرایا۔ سجاد ساجد کی مکمل عملی جدوجہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک کمیٹڈ انسان تھے جس چیز کو اصولی طور پر درست سمجھتے اس کی کامیابی پر عمل شروع کردیتے اور اپنے مقصد کے حصول تک کام کرتے رہتے۔ سجاد ساجد بے بہاخوبیوں کے مالک تھے۔ مجلسی مزاج رکھتے تھے۔ ان کے آفس میں دوستوں کا ہجوم رہا کرتا۔ ملنسار اور مل کر خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ 84 سال عمر پائی 19 دسمبر 2015ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ کا پیارے ہوئے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، للہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ (یکم دسمبر 2015ء)

کراچی اور اسلام آباد کے میئر کا فیصلہ ہوگیا

ملک میں بلدیاتی انتخابات کے پہلے اور دوسرے مرحلے کے بعد تیسرا مرحلہ بھی اختتام کو پہنچا۔ تیسرے مرحلے کے انتخاب دارالخلافہ اسلام آباد میں یکم دسمبر کو ہوئے مسلم لیگ نون کو غیر سرکاری نتائج کے مطابق برتری حاصل ہو گئی ۔ نون لیگ کے سید ظفر علی شاہ ہار گئے جو نون لیگ کے اسلام آباد کے میئر کے بھی مضبوط امیدوار تصور کیے جارہے تھے۔ لیکن میئر نون لیگ ہی کا ہوگا۔ غیر سرکاری نتائج کے مطابق کل 50 نشستوں میں سے نون لیگ 19، تحریک انصاف 18 اور 10 آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ یہاں تحریک انصاف دوسرے نمبر پر رہی۔ تیسرے مرحلے کا آخری میدان 5 دسمبر کو پنجاب کے چند اضلاع کے علاوہ کراچی میں دھوم دھام سے سجا اور اپنے منطقی انجام کو کسی بڑے حادثے کے بغیر اختتام کو پہنچ گیا۔ بازار انتہائی سج دھج کے ساتھ گرم تھا۔ طویل عرصہ کے بعد کراچی کی سیاسی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ جس سڑک چوراہے کو دیکھیں سیاسی جماعتوں کے کیمپس لگے ہوئے تھے ۔ اپنے اپنے جماعت کے ترانے تیز آواز سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ پارٹی ترانے ، جھنڈوں کی بہاریں اور جوشیلے نعروں کی گونج ہر جانب سنائی دے رہی تھی، ریلیاں اور جلسے جن پر الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب سے پابندی تھی ہر جماعت ہی اس کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتی نظر آئی۔ ریلیاں سب ہی جماعتوں

نے نکالیں۔ کارنر میٹنگ جلسوں کا روپ دھار لیا کرتی تھیں، لیڈر تیز و تند تقاریر سے عوام کو اپنی جانب متوجہ کرتے رہے۔ دوران مہم کوئی نہ خوش گوار واقع رونما نہیں ہوا، یہ ایک اچھی بات رہی۔ ہر جماعت ایک دوسرے پر لعن تعن کرتی رہی، ایک دوسرے کے اگلے پچھلے کرتوت گنوانے، ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ کراچی کو فتح کرنے، کراچی کو واہ گزار کرانے کی باتیں ہوتی رہیں، کوئی کہتا تھا کہ پانچ دسمبر کو کراچی ہمارا ہوگا، دوسرا کہتا کہ نہیں ہمارا ہوگا ان تمام تر الزامات در الزامات کے باوجود کوئی نہ خوش گوار واقعہ کا نہ ہونا سیاسی جماعتوں کے سربراہوں، لیڈروں کی دانش مندی تصور کیا جانا چاہیے۔ اگر یہ لیڈر کسی خاص حکمت علمی کے تحت اپنے کارکنوں کو تصادم سے دور رکھے ہوئے تھے تو انہیں آئندہ بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سیاست اسی کا نام ہے۔ تصادم یا لڑائی جھگڑا کسی بھی طور مناسب نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم کراچی کی سطح پر سیاسی لیڈروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصادم سے، دنگا فساد سے، ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے سے سیاسی فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کا تو کچھ نہیں بگڑتا، غریب کارکن زخمی ہو جاتے ہیں، جان سے چلے جاتے ہیں، لواحقین زندگی بھر چلے جانے والوں کی یاد میں گزار دیتے ہیں، لیڈروں کا کام افسوس کے دو بول بول دینا اور بس۔ اس دوران عمران خان نے کراچی کا طوفانی سیاسی دورہ بھی کیا اور متعدد جلسوں میں انتہائی جوشیلے انداز سے مخالفین کو للکارا، ڈرایا، دھمکایا، شکست کا

خوف دلایا۔ لیکن یہ سب کچھ بھی کام نہ آیا۔ کراچی میں جماعت اسلامی نے تحریک انصاف کے ساتھ اتحاد بنا کر الیکشن لڑا، یہ اتحاد بھی متحدہ کے ووٹ بنک کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کراچی میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں 1520 نشستوں کے لیے 5401 امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ ان میں 70 لاکھ سے زائد ووٹروں کو اپنا رائے دہی استعمال کرنا تھا۔ کراچی کے 6 اضلاع ہیں جن میں پولنگ ہوئی۔ جن جماعتوں کے امیدوار مدِ مقابل تھے ان میں تحریک انصاف و جماعت اسلامی، ایم کیو ایم، نون لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی، اے این پی، مرزا گروپ، نبیل گبول گروپ، سنی تحریک، مہاجر قومی موومنٹ کے علاوہ آزاد امیدواروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ کراچی میں عرصہ دراز سے حکمرانی کرنے والی سیاسی جماعت ایم کیو ایم نے بھی بھر پور انداز سے انتخابی مہم چلائی۔ ریلیاں نکلیں، جلسے ہوئے، بیان بازی اور الزام اور جوابِ الزام کا سلسلہ عروج پر رہا، بلاول ھیلی کاپٹر سے جلسہ گاہ ملیر پہنچے اور لکھی ہوئی تقریر پڑھ ڈالی۔ اسی ھیلی کاپٹر سے واپس پرواز کر گئے۔ اے این پی کا ووٹر تحریک انصاف کی جانب متوجہ ہوگیا ہے۔ نون لیگ نے لگتا ہے بادلوں کا رخ دیکھ کر کراچی میں اپنی انتخابی مہم کو بین بین رکھا۔ نون لیگ کے مقامی لیڈر شپ فیلڈ میں رہنے کے بجائے ٹی وی ٹاک شوز میں سیاسی موضوعات پر فلسفہ بیان کرنے کو ترجیح دیتی رہی۔ نبیل گبول کا گروپ لیاری کے چند علاقوں تک جب کہ مرزا جی کا گروپ ملیر کے چند علاقوں تک محدود رہا، اسی طرح مہاجر قومی

موومنٹ بھی مخصوص علاقوں میں سرگرم رہی۔ انتخاب کا دن بخیر و عافیت گزر گیا، جو واقعات لڑائی جھگڑے کے ہوئے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں تو خون خرابے کا گمان کیا جارہا تھا۔

کراچی میں بلدیاتی انتخابات کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آیا ہے وہ انتخابات کے پہلے اور دوسرے مرحلے کے نتائج سے کچھ مختلف نہیں۔ پنجاب میں پنجاب کی حکمراں جماعت اپنے میئر بنانے میں کامیاب ہوئی، اندرون سندھ میں سندھ کی حکمراں جماعت پیپلز پارٹی نے 22 اضلاع میں کامیابی حاصل کرکے میدان مار لیا، یہاں تحریک انصاف کا وجود ہی نہیں۔ اسلام آباد میں بھی نون لیگی میئر بنے گا، تحریک انصاف یہاں دوسرے نمبر پر ہے ، یہاں پی پی کا صفایا ہوگیا، تیسرے اور آخری مرحلے میں پنجاب کے حلقوں میں نون لیگ سرپٹ دوڑتی ہوئی آگے نکل گئی، شیخ رشید سمیت تحریک انصاف پیچھے رہ گئی۔ راولپنڈی میں بھی نون لیگ نے میدان مار لیا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی واش آؤٹ ہو گئی، کراچی میں 5 دسمبر کو ہونے والا معرکہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا، بے شمار قسم کے منفی تجزیے، وسوسے، خدشات ،دنگا فساد، خون خرابے کی باتیں دم توڑ گئیں ، کراچی پر گزشتہ تیں برس سے حکمرانی کرنے والی جماعت متحدہ قومی موومنٹ باوجود مشکلات کے شہر قائد کے عوام کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب رہی اور اپنا میئر بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ کراچی کی کل 209 نشستوں میں سے متحدہ کو 117

نشستیں حاصل ہو چکی ہیں کچھ کا نتیجہ ابھی آنا باقی ہے، پیپلز پارٹی کو 17، آزاد 13 اور تحریک انصاف و جماعت اسلامی کے اتحاد اور نون لیگ 32 نشستوں پر کامیابی حاصل کر سکی۔ متحدہ نے واضح برتری حاصل کر لی ہے اور اسے اپنا میئر اور ڈپٹی میئر بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ حیرت انگیز طور پر متحدہ کے غیر معروف امیدواروں نے تینوں مخالف جماعتوں کے ضلعی صدور حافظ نعیم الرحمٰن، علی زیدی اور پیپلز پارٹی کے نجمی عالم کو شکست سے دوچار کر دیا یہ متحدہ کے خلاف اتحاد کے ستون تصور کیے جارہے تھے۔ متحدہ کے کامیاب امیدوار وسیم اختر کو متوقع کراچی کا میئر اور متحدہ کی ہی زرین مجید ڈپٹی میئر کی مضبوط امیدوار نظر آرہی ہیں۔

متحدہ کی واضح برتری کو مخالف جماعتوں کے مقامی سربراہوں نے چھوٹے موٹے تحفظات کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے۔ تحریک انصاف کے ڈاکٹر علوی نے فتح پر متحدہ کو مبارک باد دی، دیگر لیڈروں نے بھی فراغ دلی کا ثبوت دیا جو ایک مثبت پیغام ہے جو سیاسی جماعتوں کو جائے گا اور اس سے بہتر فضاء قائم ہونے میں مدد ملے گی۔ البتہ تحریک انصاف کے ضلعی صدر علی زیدی کی جانب سے نتائج سے قبل پریس کانفرنس میں جو زبان استعمال کی گئی اور مخالف جماعت کے ووٹرں کو مخاطب کرتے ہوئے جو جملہ کہا گیا وہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا، یہ کراچی کے عوام کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ انہیں کسی موقع پر اپنے یہ الفاظ

واپس لے لینے چاہیے۔ انتخابات اختتام پذیر ہوئے ۔ اب سب کو مل کر اپنے اپنے شہروں کی حالت زار کو بہتر بنانے میں وقت ذائع کیے بغیر لگ جانا چاہیے۔ جیتنے والوں کو بلا تفریق اپنے شہر کے ہر ہر علاقے، گلی کوچے کے مسائل کو بلا تفریق حل کرنے کی سعی کرنا ہوگی۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جس کی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوں، گٹر لائنیں چوک نہ ہوں، پانی، بجلی، گیس کے مسائل نہ ہوں، ٹرانسپورٹ کے مسائل سے کوئی شہر دوچار نہ ہو۔ مسائل کا انبار ہے ہر شہر میں منتخب نمائندوں کو چاہیے کہ وہ اولین فرصت میں ان مسائل کے حل کی منصوبہ بندی کریں۔ حکومت ان نمائندوں سے مکمل تعاون کرتے ہوئے انہیں فنڈز فراہم کرے۔

اختر جوناگڑھی، شاعر و ادب کا سانحۂ ارتحال

اردو کے شاعر، ادیب، کالم نگار محمد اختر جوناگڑھی کراچی میں 5 نومبر 2015 ء کو انتقال کر گئے۔ ان کا نام قاضی محمد اختر، تخلص اختر کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کی سرزمین جوناگڑھ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے جوناگڑھی ٹھہرے۔ وہ معروف محقق، ادیب و دانشور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے صاحبزادے تھے۔ علم و ادب سے رغبت اور شعر و شاعری سے لگاؤ انہیں وراثت میں ملا تھا۔ اختر جوناگڑھی 8 جون 1943 ء کو ہندوستان کے صوبے گجرات کی سرزمین کاٹھیاواڑ کی ریاست جوناگڑھ میں عالم وجود میں آئے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کے والد نے کراچی کی علمی ، ادبی اور شعر و ادب کی سرگرمیوں میں اہم کرادا ادا کیا۔ وہ انجمن ترقی اردو سے بھی منسلک رہے۔

اختر جوناگڑھی نے اپنے گھر کی علمی، ادبی ، شعر و شاعری کی فضاء میں بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ اس علمی و ادبی ماحول نے اختر جوناگڑھی کو شعر گوئی کی جانب راغب کیا اور وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے، ساتھ ہی نثر لکھنے کی جانب بھی راغب ہوئے۔ وہ ابھی کالج ہی میں تھے کہ ان کی تحریریں اردو کے معیاری ادبی رسائل کی زینت بننے لگیں جس نے اختر جوناگڑھی کو حوصلہ

دیااور وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ ان کا مجموعہ کلام ''ہم تو پتھر ہو گئے'' شائع ہوا۔ ان کی نثر کی کتاب ''آج کا بھارت'' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔

اختر جوناگڑھی کو علم وادب سے وابستہ افسانہ نگار اور استاد خاتون کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ان کی شریک حیات پروفیسر رئیس فاطمہ کراچی کے ایک مقامی کالج میں اردو کی پروفیسر تھیں ۔ افسانہ نگار ان کی خاص وصف ہے۔ عمدہ افسانے لکھتی ہیں۔ میرا ان سے تعلق کالج کے حوالے سے رہا۔ کالجوں کی انجمن کی سرگرمیوں میں انہیں دیکھا اور پھر انجمن ترقی اردو میں بھی انہیں دیکھا۔ اختر جوناگڑھی شاعر ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی تھے ۔ وہ روزنامہ جنگ سے وابستہ رہے۔ اختر جوناگڑھی کے بارے میں زیادہ معلومات باوجود کوشش کے نہ مل سکیں۔ کراچی کی ادبی و علمی سرگرمیوں کے متحرک ادیب راشد اشرف نے ازراہ عنایت اختر جوناگڑھی کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیں۔ ان کے بارے میں دو صفحات کا تعارف احمد حسین صدیقی صاحب کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے تذکرے ''دبستانوں کا دبستان' (کراچی) میں موجود مختصر تعارف مجھے میل کر دیا۔ اختر جوناگڑھی کے حوالے سے میری یہ مختصر سی تحریر راشد اشرف اور دبستانوں کا دبستان کی بنیاد ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے احمد حسین صدیقی صاحب کے اس تذکرہ پر تفصیلی مضمون بھی لکھا تھا جو انجمن ترقی اردو کے جریدے

قومی زبان' میں شائع ہوا۔ اس تذکرہ کا یہی فائدہ ہے کہ یہ فوری طور پر کسی بھی' شاعر، ادیب کا تعارف کرادیتا ہے۔ آخر میں اخترؔ جوناگڑھی کے دو اشعار ؎

یہ تو نہیں کہ مجھ کو رفاقت نہ مل سکی
پھر تیرے بعد ایسی محبت نہ مل سکی
تجھ سے بچھڑ کے میں نے محبت تو کی' مگر
پھر ویسی جسم و جاں کی وہ وہ چاہت نہ مل سکی

ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' کے تمام لکھاری ساتھیوں کے جانب سے اخترؔ جوناگڑھی کی رحلت پر دلی افسوس اور دکھ کا اظہار کرتا ہوں۔ دعا گو اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، جملہ لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے، خصوصاً ادیب و دانشور، افسانہ نگار پروفیسر رئیس فاطمہ کو اپنے شاعر و دانش ور شوہر اخترؔ جوناگڑھی کی جدائی کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔ راشد اشرف صاحب کا بھی خصوصی شکریہ۔

(6دسمبر2015ء)

سوشل میڈیا پر ڈاکٹر عامر لیاقت کی والدہ کی تضحیک۔ افسوس ناک عمل

میرا ایک کالم بہ عنوان ''الیکٹرونک میڈیا اور شتر بے مہا آزادی'' (روزنامہ 'جناح' میں 27 نومبر 2015ء) کو شائع ہوا تھا جس میں الیکٹرونک میڈیا میں کھلے عام فحاشی، بے حیائی، عریانیت کا رونا رویا تھا۔ میڈیا کی مادر پدر آزادی نے ہمارے گھروں میں داخل ہو کر مشرقی روایات اور اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ایک ایسی تہذیب ہمارے گھروں میں گھس آئی ہے جو نہ صرف اسلامی تہذہب اور شعائر کی دشمن ہے بلکہ حیاداری اور شرافت کے عام معیار و تصورات سے بھی متصادم ہے۔ یہ بے حیا تہذیب ہمارے معصوم بچوں اور نوجوان نسل کو ''نیکی'' سے دور اور ''بدی'' کے قریب کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ پرائیویٹ چینل کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ ان چینلوں کو تو مخصوص لوگ اور ادارے چلا رہے ہیں، جن سے باز پرس کی جا سکتی ہے لیکن سوشل میڈیا' تو ہے ہی تمام پابندیوں سے آزاد، نہ کوئی چلانے والا، نہ کوئی مالک، نہ ' کوئی ملازم، نہ کوئی روکنے والا، نہ کوئی دیکھنے والا، جو جس کا جی چاہے کسی کے بارے میں لکھ دے، جو تصویر چاہی ڈال دی۔ مرد ہے تو عورت کے نام سے چیٹنگ ہو رہی ہے، عورت ہے تو مرد بنا ہوا ہے۔ کم عمر ہے تو عمر پچیس سال لکھ کر ٹوئیٹ اور فیس بک اور دیگر ویب سائٹ پر جی بھر کے بے حیائی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں کوئی ضابطہ اخلاق نہیں، کوئی طریقہ کسی کو روکنے کا، منع

کرنے کا نہیں۔ کم عمر بچیاں چکمے میں آ جاتی ہیں، نتیجہ ماں باپ، بہن بھائی، گھر، خاندان کی عزت کا جنازہ نکالنے فیس بک فرینڈ کے نرغے میں آ کر عمر بھر کے لیے خود بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، والدین، بہن بھائی، عزیز رشتہ دار سب رسواء اور شرم شار ہوتے ہیں۔ بعض لڑکیوں نے تو خودکشی تک کر لی۔ برائی کا برا انجام۔

الیکٹرانک میڈیا کی معروف شخصیت ڈاکٹر عامر لیاقت حسین بولنے کے 'ماہر القادری' اور لکھنے کے 'جمیل الدین عالی' ہیں، میرا ان سے کالم نگاری کا تعلق ہے۔ کبھی کبھار انہیں کسی پروگرام میں دیکھ لیا کرتا ہوں، جب سے وہ صبح سویرے ٹی وی پر جلوہ افروز ہونے لگے ہیں تو ان کے دیدار بالکل ہی نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ ہم رات گئے تک لکھتے ہیں، مجبوری ہے کہ وہی لمحے سکون اور خاموشی کے میسر ہوتے ہیں، صبح سویرے نماز کے بعد جو سوتے ہیں ظہر کی خبر لاتے ہیں۔ اس لیے ان سے ٹی وی پر ملاقات نہیں ہوتی۔ ویسے بھی ہماری اور ان کی سیاسی سوچ میں فرق ہے، عبادت کی راتوں کے ان کے ٹی وی پروگرام کے ہم حامی نہیں اس لیے کہ از خود جو وقت عبادت کا ہوتا ہے وہ ان کے سامنے بیٹھ کر، ان کی شکل دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر اور سب سے بڑھ کر کمرشل بریک میں بیہودہ اشہارات دیکھنا اچھا نہیں لگتا، شبِ قدر کی رات ہے، عبادت کرنا اس رات میں سب سے افضل عمل ہوتا ہے، آپ ٹی پر جلوہ افراز ہیں، چلیں بہت

اچھا پروگرام، بہت اچھی باتیں آپ کر رہے ہیں، بہت خوب نعتیں آپ پڑھ رہے ہیں، ہم بیٹھے ہیں ٹی وی کے سامنے، آپ ہر آدھے گھنٹے بعد کمرشل بریک پر چلے جاتے ہیں، کیا ٹی وی دیکھنے والے اس وقت اپنا ٹی وی بند کر دیتے ہیں، نہیں ہر گز نہیں بلکہ وہ اس دوران انہیں چینل پر چلنے والے فضول حتیٰ کہ بیہودہ اشتہارات بھی دیکھنا پڑتے ہیں، کیا یہ عبادت کا حصہ ہوتا ہے۔ خیر یہ الگ معاملا ہے نہ ہی اس وقت یہ میرا موضوع ہے۔ ان کا ایک کالم جس کا عنوان ہے ''تحریک انصاف معافی کب مانگے گی؟'' (روزنامہ جنگ نومبر (2015 پڑھ کر بہت دکھ ہوا، اسی کرب نے یہ کالم لکھنے پر مجبور کیا۔ ہم آپس 30 میں دست و گریبا ہوجائیں، لڑائی جھگڑا، دنگا فساد، حتیٰ کے نوبت پولس، عدالت تک پہنچ جائے، جب اور جہاں موقع ملے ایک دوسرے کو برا بھلا کہیں لیکن کسی بھی اختلاف اور رنجش کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ماں باپ کو مغلظات بکنا، بے ہودہ اور نازیبا الفاظ زبان استعمال کرنا، گالی گلوچ کرنا انتہائی گری ہوئی بات ہے، ایسا کرنے والا اپنی پست ذہنی کیفیت کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے، اس کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے، اس کی پرورش کیسے ہاتھوں میں ہوئی ہے، اس کے والدین موردِ الزام نہیں بلکہ وہ اپنے والدین کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ کسی کے باپ یا ماں کو گالی دینے کے حوالے سے ایک حدیث ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تمہارے

ساتھ یہ (بزرگ) کون ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ میرے والد بزرگوار ہیں۔ یہ سن کر آں حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ' والد کے ادب واحترام کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے آگے ہر گز نہ چلنا کہ اس سے ان کی بے ادبی ہو گی۔ اپنے والد کے بیٹھنے سے پہلے ہر گز نہ بیٹھنا اور ان کا نام لے کر انہیں نہ بلانا اور ان کی وجہ سے کسی کو گالی نہ دینا کہ جواباً وہ بھی تمہارے والد کو گالی دے '۔ اب سوشل میڈیا کے وہ صاحب یا صاحبہ جن کا نام ڈاکٹر عامر نے اپنے کالم میں لکھا ہے، ان کا تعلق تحریک انصاف سے ہے، میرے محترم یا محترمہ آپ نے ڈاکٹر عامر کی مرحوم والدہ کی شان میں جو بھی زہر افشانی فرمائی ہے، دیکھئے حدیث مبارکہ کیا کہتی ہے آپ از خود اندازہ کر لیجئے۔ ماں کا رتبہ کس قدر بلند اور عظیم ہے اس کا اندازہ اس حدیث مبارکہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے 'حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ پر خدمت اور حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری ماں' پھر میں کہتا ہوں تمہاری ماں' پھر میں کہتا ہوں تمہاری ماں' اس کے بعد تمہارے باپ کا حق ہے' ۔ ماں خواہ کسی کی بھی ہو وہ ماں ہوتی ہے۔ 'ماں تو سب کی ساجھی ہوتی ہے'۔ ماں کے لیے غلط زبان کا استعمال، گستاخی، گناہ کے زمرہ میں آتا ہے۔ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کا اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ ان کی ماں کے ساتھ گستاخی پر ان کے اندر کا انسان لرز گیا ہے، ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے، وہ شدید دکھ و کرب کی

کیفیت میں ہیں۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے اوسان کھو بیٹھتا ہے، گستاخی کرنے والا اگر سامنے موجود ہو تو اس کے ساتھ انتہا درجہ کا سلوک سرزد ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عامر میں برداشت اور درگزر کا مادہ پایا جاتا ہے، انھوں نے یہ کالم لکھ کر اپنے دکھ کا اظہار کر دیا ہے، اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے، ہو سکتا ہے اس موضوع پر وہ اور بھی لکھیں، اگر انہیں ٹی وی کے پروگرام میں بولنے کا موقع ملا تو وہ اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالیں گے۔ اس طرح کہ گستاخی کرنے والے یا کرنے والی کے چاروطبق روشن ہو جائیں گے۔

میں حیران ہوں کہ آخر ڈاکٹر عامر تحریک انصاف سے اس بے ہودہ حرکت پر معافی منگوانے کی خواہش کیوں رکھتے ہیں؟ بالفرض تحریک انصاف کی جانب سے معافی مانگ لی بھی گئی تو کیا وہ گستاخانہ الفاظ جو لکھنے والے نے لکھ دیے، وہ آن لائن ہو گئے، مٹ سکتے ہیں، وہ گھاؤ جو ڈاکٹر عامر کے سینے میں لگ چکا، معافی نامے سے بھر جائے گا؟ وہ بیہودگی دھل جائے گی، جانے دیجئے ڈاکٹر عامر، بڑا دل کیجئے، یقین کریں لکھنے والے نے جذبات میں آکر یہ حرکت کر تو دی وہ اندر سے شرمشار ضرور ہوگا، ندامت اس کے کلیجے کو کچوکے لگا رہی ہوگی یہی نہیں بلکہ جب کبھی اس کے ساتھ زندگی کے کسی موڑ پر کوئی واقعہ پیش آئے گا، اُسے اپنی اس حرکت پر پیشمانی اور خجالت اٹھانا پڑے گی اور وہ بے چین ہو کر آپ سے از خود معافی طلب گار ہوگا۔

تحریکِ انصاف کے ان مہربانوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ شدت پسندی ہے، واقعہ دراصل یہ ہوا کہ ڈاکٹر عامر نے ایک کالم ”ریحام کا شکوہ اور عمران کا جواب شکوہ“ (روزنامہ جنگ 23 نومبر) لکھا جس میں بقول ان کے ’’ان کا دل چاہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے دونوں (ریحام اور عمران) کی زبان بن جائیں اور سابقہ بھابی نے جو انداز اختیار کیا ہے اُسی کی تقلید میں پہلے (روح اقبال سے معذرت کے ساتھ) شکوہ اور پھر جواب شکوہ کے چند اشعار دونوں ’علیحدگی پسندوں‘ کی نذر کرکے اُن سے گزارش کرونگا کہ اب بس کیجئے اور دونوں اپنی اپنی نئی زندگی کا آغاز کیجئے“۔ اس تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے شاعری فرماتے ہوئے ریحام کی جانب سے شکوہ اور کپتان کی طرف سے جوابِ شکوہ نظم کیا۔ یہ شاعری کپتان کے پروانوں، دیوانوں اور چاہنے والوں کے دل پر گراں گزری، کسی نے دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہوگا، کسی نے ایک دوسرے سے مل کر غبار نکال لیا ہوگا اور یہ موصوف یا موصوفہ زیادہ ہی جذبات میں آ گئے اور ڈاکٹر عامر کی والدہ مرحومہ محمودہ سلطانہ کے بارے میں نازیبا، غیر اخلاقی، فحش، مغلظات جملے مرحومہ کے لیے لکھے۔ وہ ماں جو اب اس دنیا میں بھی نہیں کے لیے اس طرح کی بیہودگی ہر اعتبار سے قابل مذمت ہے، اللہ اس قسم کی گستاخی کرنے والوں کو خاص طور پر اور دیگر سوشل میڈیا پر وقت گزارنے والوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔ کپتان کے چاہنے والوں یہ بتاؤ کہ عمران کی ریحام سے طلاق پر کس کس نے اظہار

خیال نہیں کیا؟اخبار کی دنیا کا شاید ہی کوئی کالم نگار ایسا ہو جس نے اس موضوع پر قلم نہ اٹھایا ہو، ٹی وی ٹاک شو میں شاید ہی کوئی پروگرام ایسا ہوا ہو جس میں اس موضوع پر گفتگو نہ کی گئی ہو۔لکھنے والوں نے لکھا، بولنے والوں نے بہ آواز بلند اپنے خیالات کا اظہار کیا، تحریک انصاف کے متوالے کس کس کو روکیں گے، کیا جواب ہے اس کا ان کے پاس، ات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر عامر نے کچھ زیادہ ہی کر دیا تھا، اس لیے یہ نوبت آئی۔ ہم لکھنے والوں اور بولنے والوں کو کسی کے بھی ذاتی معاملات میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر صاحب قبلہ آپ کے اختیار میں تو دونوں ہتھیار ہیں ، محتاط رہنا ہی مناسب ہے۔

نئی نسل کو کیا معلوم کہ ' محمودہ سلطانہ 'ڈاکٹر عامر لیاقت کی مادر ہی نہیں یا وہ شیخ لیاقت حسین کی شریک سفر ہی نہ تھیں بلکہ وہ پاکستان کے سیاسی منظر نامے پر ایک طویل عرصہ تک مسلم لیگی خاتون کی حیثیت سے فعال کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ وہ پاکستان کی ان محترم خواتین میں سے تھیں کہ جنھوں نے قیام پاکستان ہی نہیں بلکہ تعمیر پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ مسلم لیگی تھیں اور مرتے دم تک مسلم لیگی رہیں۔ مسلم لیگ کے حوالے سے ان کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ شیخ لیاقت حسین بھی مسلم لیگی ہی تھے، متحدہ قومی مومنٹ کے لیے بھی ان کی بہت خدمات ہیں۔ڈاکٹر صاحب خاموش صرف مسلم لیگی ہی نہیں، صرف

متحدہ ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان خاموش ہے۔ کیا بھٹو صاحب سے زیادہ مینڈیٹ اب تک پاکستان میں کسی کو ملا؟ ابھی تو مینڈیٹ ملا بھی نہیں، شکست پر شکست، اس پر غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے، اگر کہیں مینڈیٹ مل گیا تو کیا عالم ہوگا۔ ہم نے تو بھٹو صاحب کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے، جیالوں کا جوش و خروش دیکھا ہے، پاکستان کے کونے کونے، چپہ چپہ سے جئے بھٹو کی آوازیں گونج رہی تھیں، غلطیاں بھٹو سے بھی ہوئیں، بھٹو کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا، تنقید آصف علی زرداری پر بھی ہوتی ہے، میاں صاحب کو کیا کچھ نہیں کہا جاتا، ٹی وی پر ان کی ڈمی بنا کر کس طرح کھلے عام طنز کیا جاتا ہے اور کس کس سیاست داں کا مذاق نہیں اڑایا جاتا۔ لیکن پی پی کے جیالوں، یا نواز شریف کے متوالوں نے یہ کچھ نہیں کیا جس کا مظاہرہ کپتان کے شیدائیوں کی جانب سے سامنے آرہا ہے۔ یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے آج ڈاکٹر عامر کی والدہ کو نشانہ بنایا گیا ہے کل کوئی اور کالم نگار نشانے پر ہوگا۔ گویا اختلافِ رائے کی گنجائش ختم کردی جائے۔ تنقید نہ کی جائے، غلط کو غلط نہ کہا جائے، قومی لیڈر ملک و قوم کی امانت ہوتا ہے، اس کا کوئی فعل ذاتی نہیں ہوا کرتا، قوم جب خوشی میں اس کی ساتھی ہوتی ہے تو اس کے دکھ درد میں بھی شریک ہی ہوگی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ خصم کیا برا کیا، کرکے چھوڑ دیا اس سے بھی برا کیا۔ چنانچہ عمران خان نے شادی کی غلط کیا، کرکے طلاق دی اس سے بھی برا کیا۔

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کو اپنے ورکرز کی تربیت کی اشد ضرورت ہے، باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ، ہر سیاسی جماعت میں ٹریننگ مراکز قائم کیے جائیں۔جہاں پر انہیں اس بات کی تربیت دی جائے کہ سیاسی معاملات میں صبر و برداشت کس طرح کیا جاتا ہے، دوسروں کو برداشت کرنا سیاست کا لازمی جذو ہے، سوشل میڈیا پر کس قسم کی زبان استعمال کرنی چاہیے،ٹی وی چینل پر کس طرح گفتگو کی جاتی ہے، گفتگو کے آداب کیا ہیں، محفل میں کسی بھی موضوع پر کس طرح بات کرنا چاہیے، لکھنے والوں کو بھی لکھنے کی تربیت دی جائے۔ محض قلم ہاتھ میں لے کر سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کی روش اچھی نہیں۔ اس کے نقصانات تو ہیں فوائد نہیں۔ جلسوں میں ، تقاریب میں قسمت سے بریانی میسر آجائے تو اس پر گدوں کی ٹوٹ نہیں پڑنا چاہیے، ایک بریانی کی پلیٹ کی کیا حقیقت ہے۔ بیٹھنا کیسے ہے، نعرے بازی کس طرح کرنی ہے، عوام کو کس طرح اپنی پارٹی کے بارے میں کنونس کرنا ہے۔ لوگ اچھے اخلاق سے ، اچھے کردار سے آپ کے ہم نوا بنیں گے، بیہودگی، بد
تہذیبی، غیر شائستگی سے نہیں۔

پارلیمنٹ لاجز میں منشیات کا استعمال؟ سینیٹر کلثوم پروین کا انکشاف

مسلم لیگ نواز کی سینیٹر کلثوم پروین نے قائمہ کمیٹی کے اجلاس کے دوران یہ انکشاف فرمایا کہ 'پارلیمنٹ لاجز میں ساری رات چرس چلتی ہے، بعض اوقات ارکان کمروں میں بھی منگوالیتے ہیں، رات بھر ہلہ گلہ چلتا رہتا ہے'۔ عوام کے منتخب نمائندوں کی رہائش گاہ پارلیمنٹ لاجز کے حوالے سے اس قسم کے الزامات پہلی بار نہیں لگائے گئے اس سے قبل رکن قومی اسمبلی جمشید دستی بھی اس قسم کی باتیں کرتے رہے ہیں۔انہوں نے پریس کانفرنس میں اسی قسم کی باتیں بڑے کانفیڈینس کے ساتھ بیان کی تھیں۔ مَیں نے اپنے ایک کالم بعنوان' شیشہ کیفے کی بندش کا حکم' (روزنامہ 'جناح' 13 نومبر 2015ء) میں پاکستان کی اعلیٰ عدالت کے ایک تین رکنی بنچ جس کی سربراہی چیف جسٹس جناب انور ظہیر جمالی کر رہے تھے کے ایک آڈر کی تفصیل تحریر کی تھی جس میں انہوں نے اپنے ایک آڈر میں چاروں صوبائی حکومتوں کو حکم

دیا تھا کہ ملک میں قائم غیر قانونی 'شیشہ کیفے' فوری طور پر بند کروائے جائیں۔ معزز عدالت نے چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرل کو حکم دیا تھا کہ وہ فوری طور پر صوبوں میں قائم شیشہ گھروں کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کریں۔ ملک میں منشیات کا استعمال اس قدر عام ہوتا جارہا ہے کہ فٹ پاتھ ، سڑک کے کنارے نشہ کرتے تو ہمیں عام نظر آتے ہیں۔ اس لعنت نے ہمارے ملک کے منتخب ایوانوں کی رہائش گاہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

نشہ خواہ کوئی بھی ہو، غریب کرے یا امیر، پڑھا لکھا کرے یا جاہل، رکن اسمبلی کرے یا کوئی وزیر سفیر یہ انسانی زندگی کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی قسم کے نشے سامنے آ چکے ہیں۔ چرس بھی ان میں ایک نشہ ہے۔ اس کی باقاعدہ کاشت ہمارے ہی ملک کے ایک صوبے میں کی جاتی ہے جو غیر قانون ہے۔ چرس دیگر نشہ آور اشیاء جیسے افیون، ہیروئن، حشیش ،شیشہ، سگریٹ ، بھنگ ،شراب، تمباکو، نسوار اور دیگر نشہ آور اشیاء سب ہی مضر صحت ہیں۔ چرس میں دیگر نشہ آور اشیاء کی طرح ٹار، نیکوٹین اور کاربن مونو آکسائیڈ کی مقدار نقصان دہ حد تک زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چرس تیزی سے انسانی جسم کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ نشہ سگریٹ، افیون، ہیروئن، حشیش ،شیشہ، سگریٹ ، بھنگ ،شراب اور دیگر قسم کے نشہ استعمال کرنے والے کے پھیپھڑوں کو متاثر کرتا ہے، دل کی بیماری کا عارضہ ہو سکتا ہے، سانس سے متعلق بیماریاں

(Cancer گلے کی نالی کا کینسر،Lungs Cancer پھیپھڑوں کا کینسر،sthma جیسے دمہ
نمونیہ ، سانس کی بیماریاں، of Oesophagus)
شامل ہیں ہو سکتی ہیں۔شراب کو تو تمام تمام قسم کے نشہ آور اشیاء میں سب خراب نشہ
کہا گیا ہے۔اسے ''ام الخبائث' کیا گیا ہے۔
عالمی ادارہ صحت (WHO) کے سروے کے مطابق ہمارے ملک میں پچیس ملین افراد
تمباکو کا نشہ کرتے ہیں، تمباکو کے نشے سے مراد سگریٹ، شیشہ، سگریٹ کے ذریعہ
استعمال کیا جانے والا نشہ ہے۔اس تعداد میں مرد 36 فیصد ہیں اور خواتین جن میں
زیادہ تر جوان لڑکیاں ہیں نو فیصد ہیں۔اسی سروے کے مطابق پاکستان میں تمباکو کا نشہ
یعنی سگریٹ، شیشہ سے ہر سال ساٹھ ہزار افراد ان بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن کا
ذکر اوپر کیا گیا اور وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔حکومت پاکستان نے اور عالمی
ادارہ صحت نے تمباکو اور اس سے ملتی جلتی تمام نشہ آور چیزوں پر پابندی عائد کر دی
ہے ۔ان کا استعمال قانوناً جرم ہے۔اس قانون کے تحت ،سر عام نشہ کرنا خواہ وہ کسی بھی
قسم کا ہو پابندیاں عائد ہیں یہ پابندیاں عام شہریوں پر عائد ہیں اسی طرح تمام حکومتی
عہدیداروں، خواہ وہ سینٹ ، قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی کے ارکین ہوں ان پر بھی عائد
ہوتی ہیں۔پاکستان کے محترم چیف جسٹس جناب انور ظہیر جمالی نے ملک میں شیشہ کا
کاروبار کرنے والوں اور لوگوں کو نشہ کا

عادی بنانے والوں کے خلاف حکم جاری فرمایا اسی طرح انہیں پاکستان کی سینیٹر کلثوم پروین جن کا تعلق حکمراں جماعت سے ہے کے ان انکشافات پر بھی جو نٹس لینا چاہیے۔

اسلام میں ہر قسم کے نشہ کی ممانعت ہے۔ مسلم شریف کی حدیث ہے حضرت جابرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص یمن شہر سے جواب ایک ملک کا درجہ رکھتا ہے حضرت محمد ﷺ کی خدمات میں حاضر ہوا اور آپؐ سے ایک قسم کی شراب کے بارے میں دریافت کیا جو ایک اناج (جسے معزکہا جاتا تھا) سے تیار کی جاتی تھی۔ اسے یمن کے لوگ نشہ کے طور پر پیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس سے پوچھا کہ کیا اس میں نشہ ہے تو اس شخص نے جواب دیا، رسول اللہ ﷺ اس میں نشہ ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ بے شک اللہ کا وعدہ ہے کہ جو کوئی نشہ آور چیز استعمال کرے گا تو ان کو ''تین ۃ الخیل'' پلایا جائے گا، اس شخص نے دریافت کیا رسول اللہ ﷺ یہ تین ۃ الخیل کیا چیز ہے۔ آپؐ نے فرمایا جہنمیوں کا پسینہ یا پیپ''۔ چنانچہ ہر نقسم کا نشہ حرام ہے اس میں چرس بھی شامل ہے۔ شراب پینے والوں کے بارے میں تو حدیث مبارکہ ہے کہ جو شراب پیئے گا اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں کرے گا۔

پاکستان میں منشیات کے عادی افراد کی تعداد 50 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ چرس

افیون، ہیروئن، حشیش، بھنگ، سگریٹ، نسوار اور تمباکو پرانے قسم کے نشوں میں شمار ہوتے ہیں اب تو نئی نئی قسم کے نشے جیسے شیشہ ایجاد ہوچکا ہے، جسے کھلے عام، ریسٹورانوں میں، دکانوں میں جو شیشہ گھر کہلاتے ہیں، شرفا اپنی محفلوں میں فخریہ اہتمام کرنے لگے ہیں۔ یہ شیشہ ہی ہے جس کے بارے میں اعلیٰ عدالت نے تمام شیشہ گھروں کی بندش کا حکم جاری کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نشہ خواہ کوئی بھی ہو اس کے فروخت کرنے اور اس کے استعمال پر سختی سے قانون کے مطابق عمل درآمد کرایا جائے۔ اگر حکومت وقت نے اس جانب توجہ نہ دی تو یہ ناسور ہماری نئی نسل کو رفتہ رفتہ ناکارہ بنادے گا۔ جب یہ خبر اخبارات کی زینت بنی اور ہماری نئی نسل نے اسے پڑھا ہوگا تو ان کے معصوم ذہنوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ پارلیمنٹ لاجز کا مطلب ہمارے منتخب اراکین قومی اسمبلی و اراکین سینٹ کی رہائش گاہیں ہے۔ اس جگہ منشیات کا استعمال گویا ان اراکین کے گھروں میں منشیات کا استعمال ہے۔ چیرَمین سینٹ اور چیرَمین قومی اسمبلی، وزیر داخلہ کو اس جانب خصوصہ توجہ دیتے ہوئے اس اہم خبر یا افواہ کی تحقیق کرنے کا حکم جاری کرنا چاہیے۔ اگر واقعی ہمارے منتخب نمائندں کی رہائش گاہوں میں نشہ آور اشیاء پائی جاتی ہیں یا استعمال کی جاتی ہیں تو ان کا فوری تدارک لازمی ہے۔

سشما سوارج اور سرتاج عزیز کا پرجوش ہینڈ شیک

پاک بھارت تناؤ پر آخر کار سرد موسم کا اثر ہو ہی گیا۔ برف پگل ہی گئی۔ پیرس میں ڈرامائی انداز میں ہونے والی نریندر مودی اور میاں نواز شریف کی تین منٹ کی ملاقات نے خطے کی گرم سیاسی فضاء کو تبدیل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بھارت میں ہندو انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کی جانب سے جو مسلمان دشمن اور پاکستان کے خلاف کاروائیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ بیرونی دنیا بھی بھارت کو اس جنونی کیفیت سے نکلنے کی جانب اشارے کرنے لگی تھی۔ پاکستان میں بھارتی انتہا پسند تنظیم شیو سینا اور دیگر انتہا پسندوں کی کاروائیوں پر سخت برہمی اور نفرت پائی جارہی تھی۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ محسوس ایسا کیا جانے لگا کہ پاکستان اور بھارت ایک بار پھر میدان جنگ میں آمنے سامنے آجائیں گے۔ لیکن دونوں ممالک کے قائدین کے تدبر، ہوش مندی اور باشعور دنیا کا سوچنے والوں نے اس کشیدہ ماحول کو تبدیل کرنے کی جانب خود کو مائل کیا۔ کشیدہ ماحول کی تبدیلی کا باعث پیرس میں ہونے والی دونوں وزراء اعظم یعنی نریندر مودی اور میاں نواز شریف کی تین منٹ کی ملاقات بنی جس نے 'ہارٹ آف ایشیا کانفرنس' میں اپنا عملی کردار ثابت کردیا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکمراں کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ پہل کرنے والا معاملا تھا، انا دونوں جانب تھی، ٹوٹے تاروں کو کس طرح جوڑا جائے۔ ملاقات کیسے ہو، ملاقات کو کیا نام دیا جائے، کون کس کو مذاکرات کی دعوت دے۔ ان تمام باتوں کا حل پانچویں ہارٹ آف ایشیا کانفرنس' نے فراہم کر دیا۔ دونوں سربراہوں نے ایک' دوسرے سے کانا پھوسی کرتے ہوئے صرف یہ ہی کہا کہ چلو اس کانفرنس سے فائدہ اٹھائیں اور اس کو بہانا بنا کر بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیں۔ اس کانفرنس کا افتتاح وزیراعظم نواز شریف اور افغان صدر اشرف غنی نے اسلام آباد میں کیا۔ کانفرنس میں بھارت کی وزیر خارجہ سشما سوراج سمیت 10 ممالک کے وزرائے خارجہ اور 12 عالمی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس سے پہلے بنکاک میں پاکستان اور بھارت کے سلامتی کے مشیروں نے بھی ملاقات کی جس سے دونوں ممالک کے مابین اعتماد سازی کی فضا میں بہتری کے آثار رونما ہوئے۔ اس ملاقات میں کشمیر کے علاوہ کئی تصفیہ طلب امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب دونوں ممالک کے درمیان گرم آب و ہوا کو سرد کرنے کی جانب پہلا قدم اٹھا۔

بھارت کی وزیر خارجہ سشما سوراج 9-8 دسمبر 2015ء کو منعقد ہونے والی 'پانچویں ہارٹ آف ایشیا کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد تشریف لائیں تو پاکستان کی جانب سے ان کا شاندار استقبال کیا گیا، وہ بھی پاک سرزمین پر

قدم رنجا فرمانے پر خاصی پر جوش تھیں۔ پاکستان کے خارجہ امور کے مشیر سرتاج عزیز نے اپنی ہم منصب کا استقبال پر جوش انداز سے اس طرح کیا کہ جیسے وہ اپنے کسی برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے مل رہے ہوں۔ اخبارات نے جو تصویر دونوں رہنماؤں کی شائع کی اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے مشیر خارجہ کافی جذباتی نظر آرہے تھے۔ خوشی اور مسکراہٹ کا سیلاب ان کے چہرہ سے عیاں تھا۔ اگر سرتاج عزیز کے منہ میں مصنوعی بتیسی ہوتی تو اُس لمحے جب انہوں نے سشما سوراج سے ہینڈ شیک کیا ان کی مصنوعی بتیسی سشما سوراج کے ہاتھوں میں گر چکی ہوتی۔ سشما سوراج سے سرتاج عزیز کا ہنڈ شیک لوگوں میں پسند کیا گیا۔ سرتاج عزیز کے اس خوش گوار عمل سے مثبت پیغام بھارت گیا ہوگا اور سشما جی بھی متاثر ہوئیں ہوں گی ۔ برعکس جب سشما سوراج نواز شریف سے ملاقات کے لیے پہنچیں تو وہ انداز بالکل مختلف تھا جس میں سشما جی دونوں ہاتھوں کو جوڑے ہوئے نمستے کر رہی ہیں اور نواز شریف صاحب فاتحانہ انداز سے ان کی جانب نظر شفقت کیے ہوئے ہیں۔ بظاہر ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ، بسا اوقات انسان کی باڈی لینگویج سے بہت کچھ اشارے ملتے ہیں۔ سشما سوراج کی تعریف و توصیف سرتاج عزیز اور وزیر اعظم صاحب کی جانب سے یقینا کی گئی اس کے جواب میں سشما جی کا نواز شریف صاحب کے بارے میں کہنا تھا کہ 'وزیر اعظم صاحب ہندوستان کو آپ کے اخلاص پر شک نہیں ہے، ہماری حکومت پوری دنیا میں آپ کے اخلاص کی تعریف کرتی ہے'۔ سشما سوراج نے وزیر اعظم کو بلدیاتی

انتخابات میں کامیابی پر مبارک باد بھی دی۔

سشما سوراج بی جے پی کی پرانی اور منجھی ہوئی لیڈر ہیں وہ سات مرتبہ بھارت کی پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوچکی ہیں۔ مختلف وزارتوں پر فائز بھی رہ چکی ہیں۔ پرویز مشرف جب آگرہ تشریف لے گئے تھے، واجپائی اس وقت بھارت کے وزیراعظم تھے۔ اس وقت سشما سوراج بھارت کی وزیر اطلاعات تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے سربراہان کے مابین ہونے والے ناکام مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی، شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والی خاتون ہیں۔ انہیں بہت سے شعر زبانی یاد ہیں۔ سشما سوراج نریندر مودی سے کم پاکستان دشمنی نہیں رکھتیں۔ یہ مودی کی طرح بد زبان، شاطر، تنگ نظر اور متعصب ذہن کی مالک ہیں۔ جن انتخابات کے نتیجے میں مودی سرکار جیت کر آئی تو اس کی انتخابی مہم میں جتنا زہر نریندر مودی نے پاکستان کے لیے اگلا تھا اس سے کہیں زیادہ سشما سوراج پاکستان کے لیے خون آلود زبان استعمال کرچکی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کس طرح موجودہ منصب پر پہنچتے۔ پاکستان دشمنی نے ہی تو بی جے پی کو اقتدار تک پہنچایا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود سیاست ایسے عمل کا نام ہے کہ اس میں ہر چیز جائز ہے۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ، آج گالی دو کل الفاظ واپس لے لو۔

کانفرنس کے اختتام پر جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا اس میں کہا گیا ہے کہ دونوں ملکوں نے باہمی جامع مذاکرات کا از سر نو آغاز کرنے کا فیصل کیا ہے اور اس ضمن میں پاکستان اور بھارت کے خارجہ امور کے سیکریٹریوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات کے شیڈول اور طریقہ کار کا تعین کریں۔ ان مزاکرات میں امن و سلامتی کے معاملات، پاک بھارت اعتماد سازی کے اقدامات، مسئلہ کشمیر، سیاچن، سر کریک، وولر بیراج، ترابہ نیویکیشن پراجیکٹ پر بھی بات چیت ہوگی۔ انسدادِ دہشت گردی، نارکوٹکس کنٹرول جامع مذاکرات کا حصہ ہوں گے۔ پاکستان نے بھارت کو ممبئی ٹرائل کو جلد منطقی انجام تک پہنچانے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ دہشت گردی کے خاتمے میں تعاون کا عزم کیا گیا، دونوں ممالک اقتصادی و تجارتی تعاون پر بھی جامع مذاکرات میں بات چیت کریں گے۔ عوامی رابطوں میں اضافہ بھی طے پایا۔

مشترکہ اعلامیہ ایک رابطے کی کاروائی ہوتی ہیں۔ اس کے بغیر تمام تر کاروائی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل بھی دونوں ممالک کے درمیان کشیدہ صورت حال پیدا ہوئی، سخت سے سخت بیانات جاری ہوئے، محسوس ہونے لگتا کہ کسی بھی لمحے خطرناک خبر سننے کو مل جائے گی لیکن پھر کوئی بریک تھرو ہو جاتا، ملاقاتیں ہوتیں، مشترکہ اعلامیہ جاری ہوتا اور حالات کچھ عرصہ کے لیے نارمل ہو جاتے۔ ایسا ایک بار نہیں متعدد بار ہو چکا ہے۔ اس جانب دونوں جانب کے

سیاست دانوں، رہنماؤں کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ آخر پاکستان اور بھارت کب تک ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے، پاکستان ایک حقیقت ہے اور بھارت بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔ دونوں نے اس دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ بھارت کی آبادی کا بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان کے عوام ان مسلمانوں کے ساتھ مذہبی اور روایتی، تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی تعلق کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے عوام ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں بدامنی ہو، لوگ پریشان حال رہیں اور بھارت کے عوام کو بھی پاکستانی عوام کے لیے ایسے ہی جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔ دونوں ممالک کے عوام کا ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی رشتہ یا تعلق ہے۔ سشما سوراج ہی کو دیکھ لیں، وہ جب پاکستان آئی تو انہیں یہ بات یاد آگئی کہ ان کے والدین کا تعلق لاہور کے علاقے دھرم پورہ سے تھا۔ اس سے قبل ایڈوانی کا تعلق حیدرآباد سندھ کے کسی علاقے سے تھا۔ یہی صورت حال بے شمار پاکستانیوں کی ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں تو پھر دشمنی کیسی، جو حکومت بھی آئے وہ اپنے اپنے ملک کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔ جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ نہ ہی کسی نے کسی ملک کو جنگ سے خوش حالی دلائی ہے۔ جنگ ہر صورت میں جیتنے والے اور ہارنے والے کے لیے تباہی و بربادی ہی لے کر آتی ہے۔ چنانچہ جو کچھ ہو چکا اسے بھلا کر دوستی کی جانب، عوام کی بھلائی کی جانب بڑھا جائے کہ اسی میں دونوں ملکوں کے عوام کی بھلائی مضمر ہے۔

ایک اچھی بات یہ بھی سامنے آئی کہ بھارتی وزیر خارجہ نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی 2016ء میں ہونے والے سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد میں تشریف لائیں گے۔ خدا کرے کہ دونوں ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کا جو آغاز ہوا ہے وہ مشترکہ اعلامیہ کے مطابق خوش گوار شکل میں قائم و دائم رہیں، نریندر مودی پاکستان کا تشریف لائیں تاکہ امن و آتشی کے ماحول میں دو طرفہ اضافہ ہو۔ دونوں کے درمیان خوش گواری کے اثرات صرف دونوں ملکوں کے عوام پر ہی نہیں پڑتے بلکہ ان کے اثرات دنیا میں موجود ان ملکوں سے محبت کرنے والوں پر بھی ہوتے ہیں۔ بہتر تعلقات میں ہی دونوں ملکوں کے عوام کی فلاح ہے۔(12دسمبر2015)

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام 'بیاد جمیل الدین عالی' تقریب

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے

جمیل الدین عالی ایک عہد ساز شخصیت، اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ، کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے سرشار، مستقل کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا ولولہ لیے ہوئے تھے۔ علمی، ادبی، سماجی، فکری، تہذیبی حوالوں سے عالی جی کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمی و ادبی سرمایے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو، رائیٹرز گلڈ ان کی زندگی کے ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ جو انہیں مدتوں زندہ رکھیں گے۔ عالی جی کے لکھے ہوئے ملی نغمے ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے عالی جی کی کاوشیں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ 23 فروری کو عالی جی کی سانسوں کو سفر اختتام پذیر ہوا۔ اگلے روز 24 دسمبر کو کراچی کے آرمی قبرستان میں اپنی والدہ اور شریک حیات کے درمیان ابدی نیند سو گئے۔ عالی جی سے کون واقف نہیں، کس کس کے کام عالی جی نہیں آئے، کون ہے جو ان سے نہیں ملا، کس کس پر انہوں نے عنایتیں نہیں کیں۔ ایک طویل فہرست ہے ان لوگوں کی جو عالی جی سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی میں سہی انہیں

خراج تحسین پیش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عالی کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے ہفتہ دسمبر کو 'یاد جمیل الدین عالی تقریب' کا اہتمام کیا۔ گویا عالی کے رخصت ہونے 13 کے بیس دن بعد، جسے اس حوالے سے پہل کرنا تھی اس نے اس تعزیتی ریفرنس کے انعقاد میں 20 دن لگا دیے۔ ہو سکتا ہے کہ انجمن کے منتظمین کو عالی جی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کا غم اس قدر شدید ہو اور ہونا بھی چاہیے ۔چلیے دیر آید درست آید، ہر کام کا وقت قدرت کی طرف سے مقرر ہے۔ عالی جی کا لکھا ہوا خوبصورت ملی نغمہ ۔

ہم تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں

ہم مصطفوی ﷺ ، مصطفوی ﷺ ، مصطفوی ﷺ ، ہیں

راقم کئی سالوں سے انجمن کے کتب خانے واقع گلشن اقبال سے استفادہ کر رہا ہے۔ دونوں ہی فوائد حاصل ہوتے ہیں، مطلوبہ مواد کا حصول بھی، ساتھ ہی اکثر وہاں پر موجود احباب سے ادبی موضوعات پر گفتگو سے آکسیجن مل جاتی ہے جو کالم لکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح انجمن میں منعقد ہونے والی علمی و ادبی تقاریب میں شرکت سے بھی علمی و ادبی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ عالی جی کی یاد میں تقریب میں جانا میرے لیے سعادت تھی۔ عام طور پر تو انجمن میں ادبی پروگرام ہال نما کمرے میں ہی ہوتے ہیں لیکن آج کی بیادِ

عالی کی تقریب کے لیے انجمن کے لان میں پنڈال سجایا گیا تھا۔ تاکہ زیادہ لوگ سما سکیں۔ آج میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا ورنہ تو اکثر لیٹ ہو ہی جاتا ہوں۔ چند لوگ ہی پنڈال میں موجود تھے لیکن لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ سحر انصاری صاحب، ڈاکٹر فاطمہ حسن،برطانیہ سے تشریف لائی ہوئیں نجمہ عثمان آچکی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے جناب ڈاکٹر قاسم پیرزادہ، ذوالقرنین (راجو جمیل)، پروفیسر شائستہ زیدی،ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر فداانصاری، صبیحہ صبا، صغیر احمد جعفری، اکبر اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر خواجہ، محمود عزیز، رضوان احمد، پروفیسر سعید حسن قادری، رخسانہ صباء، سیدین رضوی، یاسمین فاروقی،اظفر رضوی مرحوم کے صاحبزادے حسنین رضوی، محمد معروف، محمد صابر،انور جاوید ہاشمی، سعیدی صاحب (یہ سر سید احمد خان کے پڑپوتے ہیں) اور دیگر بھی تقریب گاہ میں موجود نظر آئے۔

عالی جی کے فرزند ارجمند ذوالقرنین جمیل (راجو جمیل) نے اپنے والد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بتایا کہ عالی جی 23 نومبر کو دنیا سے رخصت ہوئے اور 24 نومبر کو ان کی تدفین آرمی قبرستان میں عمل میں آئی۔ آرمی قبرستان میں تدفین کے حوالے سے انہوں بتایا کہ آرمی چیف آف اسٹاف مرزا اسلم بیگ تھے، اس وقت عالی جی کو آرمی کی جانب سے ایک ایک ہزار گز کے دو پلاٹوں کے لیے خط موصول ہوا، اس میں لکھا تھا کہ ہم آپ کو کسی بھی اچھی جگہ یہ پلاٹ دینے کی

خواہش رکھتے ہیں، راجو جمیل نے بتایا کہ والد صاحب نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ مجھے دو نہیں بلکہ تین پلاٹ چاہیے، ایک اپنے لیے، ایک اپنی والدہ کے لیے اور ایک اپنی شریک حیات کے لیے اور یہ تینوں پلاٹ مجھے آرمی کے قبرستان میں چاہیے۔یقینا اپنے خط کا جواب دیکھ کر متعلقہ حکام حیران و پریشان ہو گئے ہوں گے، انہیں یہ یقین نہیں آ رہا ہو گا کہ پاکستان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا عالی جی کی خواہش تھی کہ وہ آرمی کے قبرستان میں اپنی ماں اور اپنی شریک حیات کے ساتھ دنیاوی زندگی کے بعد کی زندگی ایک ساتھ آرمی کے قبرستان میں بسر کریں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، یقینا اس جواب سے آرمی کے افسران لاجواب ہو گئے ہوں گے اور عالی جی کا قد ان کی نظروں میں کس قدر بلند ہوا ہو گا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا، عالی جی کو ان کی زندگی میں ہی ان کی خواہش کے مطابق تین پلاٹ آرمی کی جانب سے الاٹ کر دیئے گئے تھے، ان میں سے دو پلاٹوں پر دائیں جانب عالی جی کی والدہ، بائیں جانب عالی جی کے شریک حیات طیبہ بانو آرام فرماں تھیں، درمیان کا پلاٹ 23 نومبر تک خالی تھا لیکن قبر بے تابی سے اپنے مکین کی راہ تک رہی تھی اور اپنے ہر دلعزیز مکین کے لیے اپنا سینہ واہ کیے ہوئے تھی، 24 نومبر کو اس کی گود عالی جی کے جسم اطہر سے منور ہو گئی۔

ذوالقرنین جمیل جو اب انجمن ترقی اردو کے صدر بھی ہیں نے اپنے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ لکھنا پڑھنا اپنی جگہ لیکن بابا کے تین کارنامے ایک انجمن، دوسری جامعہ اردو اور تیسرا رائیٹرز گلڈ کا قیام اور اس کی زیر سایہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو جمع کرنا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ۔ ان کا کہنا تھا کہ بابا انجمن اور گلڈ کے معاملات میں اس قدر فنا تھے کہ ہم بہن بھائی یہ کہا کرتے کہ ہم چانچ بہن بھائی نہیں بلکہ سات بہن بھائی ہیں، یعنی پانچ ہم اور ایک بہن 'انجمن' اور ایک بھائی 'گلڈ' ہے۔

انہوں نے بتایا کہ رائیٹرز گلڈ بابا کا ایک بڑا کارنامہ تھا، ان کی خواہش ہے کہ گلڈ دوبارہ سرگرم ہو اس کے لیے انہوں نے عملی کوششیں شروع کردی ہیں، لاہور سے خوشخبری ملی ہے۔ پرانے لوگوں کی خدمات قابل قدر ہیں لیکن نئے لکھنے والوں کو بھی گلڈ کی جانب دیکھنا چاہیے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ دس برس کی عمر سے گلڈ کو دیکھ رہے ہیں۔ اُس وقت کے پہلے اجلاس میں اس وقت کی نہایت معتبر علمی و ادبی شخصیات مجھے بابا کے گرد نظر آیا کرتی تھیں ان میں بطور خاص ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، سلیم احمد، ابرہیم جلیس، ابن انشاء، حمید کاشمیری جیسے اعلیٰ اور معتبر لوگ شامل تھے۔ اس وقت اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے۔ ذوالقرنین جمیل کا کہنا تھا کہ ان کے والد نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک انجمن ترقی اردو کے معاملات کو دیکھتے رہے۔ ان کے لیے دعا کریں ۔ ذوالقرنین جمیل نے بابائے

اردو کے حوالے سے بھی اپنی یادیں بیان کیں۔ گلڈ کے حوالے سے عالی جی ایک شعر ۔

پھر دیکھا کہ بچہ بچہ ہنستا تھا اور عالی جی

فردیں لکھتے مسلیں پڑھتے اور ''گلڈ'' چلاتے تھے

معروف شاعر و ادیب پروفیسر سحر انصاری جو انجمن ترقی اردو کے خازن بھی ہیں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عالی جی کو بھرپور انداز سے خراج تحسین پیش کیا انہوں نے کہا کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عالی جی کا لگایا ہوا پودا رائیٹرز گلڈ فعال ہو رہی ہے۔ یہ بڑا کام ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ عالی جی کے تمام کام تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ پیش رو اور پیش بیں شخصیت تھے ۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف پر بہت کچھ اور بامقصد لکھا ہے۔ سحر انصاری سے استفسار کرتے ہوئے پروفیسر شائستہ زیدی نے وضاحت چاہی کہ آپ حضرات تمام تر ادبی سرگرمیاں جامعہ کراچی سے باہر ہی کرتے ہیں۔ سحر انصاری نے اس استفسار کا خوبصورت جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ' اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے بس شرمندہ ہیں کمال کرنے والوں کے سامنے اور کمال کرنے والے شرمندہ بھی نہیں'۔ عالی جی نے اپنے ملک کے لیے، اردو کے لیے، تعلیم اور شعر و ادب کے لیے کیا نہ کیا ۔

عالی تو نے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی

یہ تو بتا تیری کوتارانی دیس کے کس کام آئی؟

جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر، ضیاء الدین یونیورسٹی کے موجودی شیخ الجامعہ شاعر و ادیب ڈاکٹر پیرزادہ قاسم صدیقی جنہیں جمیل الدین عالی بہت عزیز رکھتے تھے نے مرحوم عالیؔجی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں ذوالفقار علی بخاری اور جمیل الدین عالی کی ہمت افزائی کی وجہ سے ہوں۔انہوں نے واضح کیا کہ عالی جی نے قیام پاکستان قبل شاعر کی حیثیت سے اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ پاکستان کے حوالے دنیا بھر میں انہوں نے نام روشن کیا وہ یادگار ہے۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے بتایا کہ عالی جی کا کہنا تھا کہ سوچیں اور غور کریں کہ آنے والا کل کیسا ہوگا، اپنے عہد اور ماضی کے ساتھ مستقبل کو دیکھتے تھے۔ مستقبلیات کے حوالے سے عالی جی کی تحریریں ہمارے سامنے ہیں جن میں سوچ و فکر اور دانشورانہ سلسلہ موجود ہے۔ عالی جی کو پاکستان کے دولخت ہونے کا شدید دکھ تھا۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں علامہ اقبال سے یہ اعتراف کیا۔

ہاں میرے بابا، ہاں میرے مرشد میں تجھ پر قربان
تو نے بنایا، میں نے بگاڑا تیرا پاکستان

تقریب کے آغاز پر انجمن ترقی اردو کی اعزازی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن نے

مختصر الفاظ میں بیاد جمیل الدین عالی تقریب کے شرکاء کو خوش آمدید کہا ان کا کہنا تھا کہ عالی جی اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے۔ انجمن ایک باوقار اور مضبوط ادارہ ہے جس کی انہوں نے آبیاری کی اور یہ اپنی جگہ پر مستحکم ہے، اسے برقرار رکھنا اب ہماری ذمہ داری ہے۔ عالی جی کے لازوال قومی نغموں میں پاکستان سے محبت جھلکتی ہے، عالی جی نے ثابت کردیا کہ وہ صرف خواب نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کی تعبیر بھی کرتے تھے۔ رخسانہ صباء نے نظامت کے فرائض ادبی چاشنی کے ساتھ خوبصورت انداز سے انجام دیے۔ وہ بیچ بیچ میں عالی جی کے اشعار اور دوہے بھی سناتی رہیں۔ تلاقت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔
پروفیسر سعید حسن قادری نے تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز کیا اور عالی جی کے لیے دعائے مغفرت کرائی اور مختصراً عالی جی کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا۔
شاعرہ، افسانہ نگار نجمہ عثمان صاحبہ آٹھویں اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے برطانیہ سے پاکستان تشریف لائی تھیں انہوں نے بھی بیاد جمیل الدین عالی تقریب میں شرکت کی، اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عالی جی کے دل میں مکمل پاکستان بسا ہوا تھا۔ وہ پاکستان کو اپنے ساتھ لے کر چلا کرتے تھے، وہ جب برطانیہ تشریف لاتے تو ایسا لگتا تھا کہ عالی جی نہیں بلکہ پورا پاکستان آگیا ہے۔ آرکیٹیکٹ جناب حیات رضوی امروہوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے عالی جی سے اپنے مراسم کی تفصیل بیان کی انہوں بتایا کہ ایک دن عالی جی

کا فون آیا، ان کی آواز سن کر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، خوشی کا احساس اپنی حدوں کو چھو رہا تھا، فرمایا کہ مجھ سے ملو، میں نے کہا کہ کب کہنے لگے ابھی آ جاؤ، میں اسی وقت ان کے پاس گیا، کہنے لگے کہ انجمن ترقی اردو کی عمارت 'اردو باغ' کا نقشہ تیار کرنا ہے۔ میں نے خوشی سے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور مجھے فخر ہے کہ اردو باغ کا ڈیزائن میں نے عالی جی کی فرمائش پر تیار کیا۔ یہ عمارت تکمیل کے مراحل میں ہے۔

اردو ویب سائٹ 'اردو منزل' کے جناب صغیر احمد جعفری نے بھی اظہار خیال کیا، ان کا کہنا تھا کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے عالی جی کی خدمات نا قابل فراموش ہیں اب ہماری ذمہ داری ہے کہ نوجوان نسل تک ان کا اثاثہ پہنچائیں۔ سیدین رضوی نے رکن قومی اسمبلی کشور زہرہ کا پیغام پڑھ کر سنایا اور عالی جی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا، یاسمین فاروقی، سید اظفر رضوی مرحوم کے صاحبزادے سید حسنین رضوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ انور جاوید ہاشمی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا، طالبہ عروج زہرہ نے عالی جی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں اسکول اور پھر کالج میں عالیؔ جی کے نغمے گایا کرتی تھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جس شاعر کے قومی نغمے گا گا کر انعامات حاصل کر رہی ہوں اس کے تعزیتی اجلاس میں بولنا بھی پڑے گا، انہوں کہا کہ جیوے جیوے پاکستان، ہم مصطفوی مصطفوی ہیں اور بے شمار نغمے میں نے گائے اور

انعامات حاصل کیے۔ رفعت صدیقی نے عالی جی کے شعری مجموعے 'لاحاصل' سے چند دوہے سنائے۔

اب جو میرے بغیر انجمن آرائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ تم کو میری یاد آئی ہے

محمد زبیر کا تعلق انجمن ترقی اردو کے کتب خانے سے ہے وہ گزشتہ آٹھ سال سے عالی جی کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عالی جی کی زندگی کے آخری ایام میں محمد زبیر ان کے قریب رہے، خدمت کی، خیال رکھا، جو ادبی کام عالی جی ان سے کرانا چاہتے تھے ان میں معاونت کرتے رہے۔ ان کی حیثیت عالی جی کے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ اہم رکن کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ عالی جی کے انتقال، تدفین اور دیگر معلومات فراہم کرنے میں بھی محمد زبیر پیش پیش رہے۔ بیاد جمیل الدین عالی کی تقریب ایک مقرر محمد زبیر بھی تھے۔ محمد زبیر کی گفتگو اور ان کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ عالی جی کی سانسوں کے اختتام پر کس قدر افسردہ ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار منتظمین کے شکریے سے شروع کیا اور بتایا کہ آج سے آٹھ سال قبل فیصلہ ہوا کہ مجھے اب انجمن ترقی اردو کی لائبریری کے بجائے جمیل الدین عالی کے گھر پر ان کے ادبی وعلمی کام خاص طور پر ان کے کالموں کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے خدمات انجام دینا ہوں گی۔ ایک جانب یہ فیصلہ میرے لیے خوشی لیے ہوئے تھا تو

دوسری جانب ڈر اور خوف بھی مجھے پریشان کر رہا تھا۔ مجھے اس سے قبل اس طرح کے کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں اس سوچ میں گم تھا کہ جمیل الدین عالی اتنا بڑا نام اور مجھے ان کے ساتھ کام کرنا ہوگا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا ہمت کرکے فون پر وقت لیا اور ان کے گھر چلا گیا، گیٹ پر جاکر اپنے حاضر ہونے کی اطلاع دی، مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا گیا، میں ایک لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا انسان ہوں، مجھے اپنے پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس قدر عالی شان ڈرائینگ روم میں موجود ہوں۔ ابھی میری سوچ کا دھارا مختلف قسم کے تانے بانے بن رہا تھا کہ اتنے میں محترم جمیل الدین عالی صاحب اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے ڈرائینگ روم میں تشریف لے آئے، میرا تو خیال تھا کہ مجھے بتایا جائے گا کہ مجھے فلاں کمرے میں جاکر کام کرنا ہے، اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کھڑے ہو کر عالیؔ جی کا استقبال کیا اور انہوں نے انتہائی شفقت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ میری ان سے اولین ملاقات تھی۔ دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اب تم میرے ساتھ رہوگے، میرے ساتھ کھاؤ گے اور کام بھی کروگے۔ اس دن کے بعد سے میں عالیؔ جی کے ساتھ سائے کی طرح رہا کرتا، جو وہ ہدایت دیا کرتے ویسا کیا کرتا، میں نے انہیں انتہائی نفیس انسان پایا، ہمدرد، شفیق، محبت کرنے والے، ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ عالیؔ جی بہت بڑے شاعر تھے،

پاکستان

ہی نہیں بلکہ دنیا میں ان کا نام تھا، ان کے دوہے اور دیگر اصناف شاعری کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے روزنامہ جنگ میں کالموں کو منفرد اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ میں ان کے کالموں کے مجموعے کی ترتیب وتدوین پر ہی کام کر رہا ہوں۔ میں یہ بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ عالی جی ہر اعتبار سے بڑے شخصیت کے مالک تھے لیکن وہ ایک مثالی انسان تھے، اور مثالی انسان ہونا میری رائے میں کسی بھی شخص کی سب سے اہم اور بڑی خوبی ہوتی ہے۔ محمد زبیر نے عالی جی کی بہت سے خوبیوں کی نشاندھی کی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا اور عالی جی کے اہل خانہ کا شکریہ بھی ادا کیا کہ انہوں نے اسے (محمد زبیر) کو عالی جی کے آخری سفر پر روانہ ہونے سے قبل غسل کی ادیگی میں اسے شریک ہونے کی اجازت دی، محمد زبیر کا کہنا تھا کہ اسے اس بات پر فخر حاصل ہے کہ عالی جی کو غسل دینے میں وہ بھی شریک رہا جو میرے لیے اتنی بڑی سعادت ہے کہ میں اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گا اور عالی جی کے تمام اہل خانہ کا انتہائی شکر گزار بھی ہوں۔

تقریب کے آخری مقرر رضوان احمد صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا اور عالی جی کی مغفرت کی دعا کرائی۔ انہوں نے بتایا کہ عالی جی بڑے اصولی آدمی تھے، میں ان کے پاس کسی تھے۔ انہوں بتایا کہ ایک شام میں کسی تقریب کے سلسلے میں دیگر احباب کے ساتھ عالی جی کے گھر پر موجود تھا، شاید کوئی

تقریب ان کے گھر پر ہی تھی، اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، 'عالی جی نے سلام دعا کی اور ایک دم گویا ہوئے کون گورنر؟ میں کسی گورنر کو نہیں جانتا، انھوں نے مجھ سے وقت لیا؟ میں اس وقت مصروف ہوں، ان سے نہیں مل سکتا'۔ رضوان احمد کا کہنا تھا کہ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ گورنر صاحب ہیں تو انہیں بلالیجئے، ملاقات کر لیجئے، کہنے لگے سندھ کے نئے گورنر کا پی اے کا فون تھا، کہتا تھا کہ گورنر صاحب آپ کے گھر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ میں انہیں آنے کی اجازت کیسے دے دوں، گورنر ہوں گے اپنے لیے، یہ تقریب پہلے سے طے ہے، اگر انہیں ملنے آنا ہے تو وقت لے کر ضرور آجائیں، عالی جی اصولوں کے معاملے میں انتہائی اصول پسند تھے۔ عالی جی ان چند لوگوں میں سے تھے کہ جن کے دل پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں، ان کی ہر سانس میں سے پاکستان کی خوشبو آتی ہے۔ پاکستان کے دائم و قائم رہنے کی دعا کرنے والے عالی جی اب ہم میں نہیں رہے اللہ تعالیٰ عالی جی کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ مرتے مرتے بھی وطن کو زندہ رہنے کی دعا دے گئے۔

ہم تو مٹ جائیں گے اے ارض وطن لیکن تجھ کو
زندہ رہنا ہے قیامت کی سحر ہونے تک

سولہ دسمبر (16) پھولوں کے جنازوں کا دن

جی ہاں یہ دن تھا ٹھیک ایک سال قبل 16 دسمبر 2014ء کا، جس دن دہشت گردوں نے سفاکیت ، بربریت کی ایسا مثال قائم کی تھی کہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور مثال ایسی مل سکے۔ اس دن کتنی ہی ماؤں کے لخت جگر خون میں نہلا دیے گئے، ماؤں پر قیامت گزر گئی، زمین کانپ اٹھی تھی، آسماں لرز گیا تھا، شجر تھر تھرا گئے تھے، پہاڑ بیقراری کے عالم میں آ گئے تھے، انسان تو انسان جانوروں نے بھی اس بربریت پر اشک بہائے ہوں گے، پھولوں کو لہو لہان دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسدؔ کی لاش ڈشمن بھی جس کو دیکھ کے نمناک ہو گئے ایک سال قبل آج ہی کی صبح رونما ہونے والا دہشت گردی کا واقعہ اپنی نوعیت کا شاید پہلا واقعہ تھا جس میں دہشت گردوں نے معصوم بچوں ، اسکول کی پرنسپل طاہرہ قاضی، اساتذہ اور دیگر کو نشانہ بنایا تھا۔ سات دہشت گرد بھی افواج پاکستان کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ دن ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ دل کو ہلا دینے ، خون کو گرما دینے ، دماغ کو ماعوف کر دینے والا دن۔ آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم پھولوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہلا دیا۔ معصوم بچے اور دیگر 9 افراد شہید کر دیئے گئے تھے۔ کمسن معصوم پھول دہشت 132 گردوں کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے

لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی دردناک داستاں چھوڑ گئے جو زندگی بھر ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پل پل یاد کرتی رہیں گی، اشک بہاتی رہیں گی، بہنیں معصوم بھائیوں کو یاد کرکے خون کے آنسوں بہائیں گی۔ باپ اپنے جگر گوشوں کی یاد کے آنسوں اپنی آنکھوں سے باہر نکلنے نہ دیں گے بلکہ ان کی آنسوں کا سمندر ان کے جگر کو اندر ہی اندر چھید ڈالے گا۔ معصوم پھولوں کے جانزہ اٹھے تو ایک کہرام بپا ہوا، اشکوں کا سیلاب رواں تھا، آہو اور سکیوں میں پھولوں کے جنازوں کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔

پھول دیکھے تھے جنازوں پر ہمیشہ شوکتؔ
کل میری آنکھوں نے پھولوں کے جنازے دیکھے

پاکستان گزشتہ کئی سالوں سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اب تک 55 ہزار سے زیادہ لوگ دہشت گردی کا نشانہ بن چکے ہیں اور ایک کھرب ڈالر سے زیادہ کا مالی نقصان ہو چکا ہے۔ دہشت گردی کی لپیٹ میں پاکستان ہی نہیں دنیا کے بے شمار ممالک حتیٰ کے امریکہ جیسا بڑا ملک بھی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ کچھ ممالک دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے کرتے اپنی معیشت کو تباہ و برباد کر چکے ہیں ۔ دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز نائن الیون کے بعد شروع ہوا۔امریکہ میں رونما ہونے والا 9 ستمبر 2001ء کا واقعہ دہشت گردی کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ جسے 9/11 کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پیرس

میں ہونے والے واقعہ کو پریس کا نائن الیون کہا جا رہا ہے۔ انہیں دنیا کی تاریخ کے الم ناک واقعات قرار دیا جاسکتا ہے۔ نائن الیون کے بعد پاکستان میں دہشتگردی کے بے شمار واقعات رونما ہوچکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق 2003ء سے 2015ء کے درمیان 55900 سے زیادہ پاکستانی دہشت گردی کا نشانہ بنے، 2002ء سے 2015 ء کے درمیان پاکستان میں کل 415 خود کش حملے ہوئے، مجموعی طور پر 6000 بم دھماکے ہوئے۔ ایک سروے کے مطابق ان سالوں کے درمیان ملک بھر میں 6104 خود کش حملے اور دھماکے ہوئے۔ مختلف بم دھماکوں اور خود کش حملوں میں جام شہادت نوش کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے۔ بے نظیر بھٹو پر ہونے والا حملہ، کوئٹہ میں بلیرڈ ہال دھماکہ، پشاور مارکیٹ بم حملہ، 8 جون شیعہ زائرین کی بس ایران سے کوئٹہ آتے ہوئے بس پر حملہ ہوا، اسی روز کراچی ائر پورٹ پر دہشت گردوں کے ہاتھوں 30 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتادیا گیا، 2 نومبر واگہہ بارڈر پر خود کش حملہ، لیکن 16 دسمبر 2014ء کی صبح رونما ہونے والا دہشت گردی کا واقعہ اپنی نوعیت کا انتہائی دکھ بھرا واقعہ تھا۔ جس وقت ان معصوم بچوں کے جنازے اٹھے ہوں گے عرش بھی ہل گیا ہوگا۔ اسکول کے معصوم پھولوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہالا دیا۔ 132 معصوم بچے اور دیگر 9 افراد شہید کر دیئے گئے۔

پاکستان کا ہر شہر دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے لیکن پشاور کو دہشت گردوں کا

مرکز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس دوران پشاور شہر نے دہشت گرد کے بے شمار واقعات دیکھے اپنی بہادر فوج کے عظیم اور بہادر فوجیوں کے جنازے اٹھائے، بے گناہ مردوں، خواتین اور بچوں کو اپنے ہاتھوں دفن کیا۔ یہ وہ دن تھا کہ جس نے پورے ملک کے عوام کو خون کے آنسو رلادیا۔ اس نے تمام واقعات کو پیچھے چھوڑ دیا۔پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا، ہر ایک خواہ وہ پاکستان میں ہو یا پاکستان سے باہر، مسلمان ہو یا غیر مسلم ہر ایک پر لرزہ طاری ہوگیا تھا، بچوں کے بہیمانہ قتل سے درد کی ایسی ٹیس اٹھی تھی کہ اس نے ہر ایک کو بے چین کرکے رکھ دیا تھا۔ پاکستانی عوام حوصلہ مند ہیں، بہادر ہیں، حالات کا مقابلہ کرنے کی جرت رکھتے ہیں۔ دہشت گرد تھک جائیں گے لیکن پاکستان کے عظیم حوصلہ مند لوگ ہمت ہارنے والے نہیں۔ دہشتگردوں کی سفاکی،.بر.بریت اور درندگی کا اندزہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسکول کا ایک طالب علم جو قسمت سے زندہ بچ گیا تھا اس کا کہنا تھا کہ ان کی پرنسپل طاہرہ قاضی کے ساتھ انتہائی.بر.بریت کا سلوک کرتے ہوئے ان کے سامنے انہیں شہید کردیا۔ اسکول کی ایک اور بہادر استاد افشاں احمد نے بھی بہادری کی لازوال داستان رقم کی۔ اسکول کے ایک طالب علم عرفان اللہ نے ایک گفتگو میں بتایا تھا کہ اس کی ٹیچر افشاں احمد چھلانگ لگا کر بچوں اور دہشت گردوں کے درمیان آگئیں اور انہیں للکار کر کہا کہ 'تم میرے مردہ جسم پر میرے بچوں کو مار سکتے ہو۔ میں اپنے بچوں کو فرش پر خون میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی'۔ دہشت گردوں نے

انہیں زندہ جلا ڈالا لیکن وہ پھر بھی بچوں کو بھاگنے کا کہتی رہیں، جان بچانے کی ترکیبیں بتا
تی رہیں۔ سلام ہو ایسی بہادر ماؤں، بیٹیوں اور استادوں پر۔ ظلم کرنے والوں کی
ڈھٹائی، بے رحمی، بے غیرتی تو دیکھیں کہ اپنے بے رحمانہ عمل پر ان کے ہاتھ کا کانپنا تو
دور کی بات، دل نہیں دھلا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کر گزرنے کے احکامات و ہدایت
کے منتظر دہشت گردوں نے اسکول کے آڈیٹوریم میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو خون میں
نہلانے کی کاراوئی کے بعد موبائل پر بات کرتے ہوئے اپنے آقاؤں سے کہا اور
پوچھا کہ 'آڈیٹوریم میں تمام بچوں کو مار دیا ہے اب کیا کریں؟ یہ وہ الفاظ تھے جو دہشت
گردنے کسی سے کہے۔ اس کے جواب میں اسے کہا گیا کہ 'فوج کا انتظار کرو' خود کو بم
سے اڑانے سے پہلے انہیں اڑا دو'۔ دہشت گرد اور ان کے رہنما اس قدر سنگ دل اور
سفاک ہو چکے ہیں کہ انہیں ان کے سامنے ان کے حقیقی والدین، بچے، بیوی بھی ہو تو وہ
انہیں بھی اسی بے دردی سے قتل کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے کیونکہ انہیں تو یہ باور
کرایا جا چکا ہے کہ ان کے عمل کے عوض انہیں جنت ملنے والی ہے۔ کاش انہیں کوئی یہ
باور کراسکے کہ انہیں جنت نہیں بلکہ انہیں تو دوزخ بھی قبول نہیں کرے گی۔ پروردگار
نے اگر دوزخ سے
بھی بدتر کوئی ٹھکانہ بنایا ہوگا تو یہ دہشت گرد اس کا ایندھن ہوں گے۔
دہشت گردی کا نشانہ تو بے شمار پاکستانی بن چکے ہیں لیکن آرمی پبلک اسکول

کے معصوم بچوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے ملک کے عوام میں دہشتگردی سے نمٹنے کا شعور بیدار کیا، ملک کی سیاسی قوت کو باہمی اختلافات کو بھلا کر باہم مل کر دہشت گردی جیسے ناسور کو پاکستان سے نکال باہر کرنے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ فوجی قوت جو دہشت گردی سے پہلے ہی نبرد آزما تھی اس میں نیا جوش و ولولہ پیدا ہوا ہے۔آپریشن ضرب عضب اور کراچی آپریشن سے اب امید ہو چلی ہے کہ ملک کی سیاسی قوت اسی طرح متحد اور متفق رہی تو پاکستان کے بے شمار مسائل خاص طور پر دہشت گردی کی لعنت سے پاکستانی قوم چھٹکارا پالے گی۔آرمی پبلک اسکول کے معصوم اور بے گناہ بچو اب تم اس دنیا میں نہیں رہے۔ تم تو شہادت کا مرتبہ پا چکے ہو اور شہیدوں کے لیے جنت کی نوید ہے۔ تمہیں جنت مبارک ہو ،جنت کے پھولو تمہیں سلام۔ (16 دسمبر 2015)

شہید پرنسپل طاہرہ قاضی۔ بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال

طاہرہ قاضی نام ہے بہادری کا، شجاعت کا، فرض شناسی کا اور قربانی کا۔ جنہوں نے دہشت گردوں کے سامنے ایک عورت ہوتے ہوتے ہوئے دلیری سے، اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر اپنے معصوم شاگردوں کے سامنے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرکے پوری قوم کو یہ پیغام دیا کہ دہشت گردی کے سامنے، دہشت گردوں کے سامنے زندگی کی پروہ کیے بغیر سینہ سپر ہو کر ان کی بزدلانہ کاروائیوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ 16 دسمبر 2014ء ملک کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ اس دن دل کو ہلا دینے، خون کو گرما دینے، دماغ کو ماعوف کردینے والا سانحہ پیش آیا۔ آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم بچوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہلا دیا۔ 132 معصوم بچے اور دیگر 9 افراد شہید کردیئے گئے۔ اسکول کی پرنسپل طاہرہ قاضی نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال پیش کی۔ کہا جاتا ہے کہ فوجی کمانڈوز آپریشن کے دوران انہیں دہشتگردوں کے شکنجے سے بہ حفاظت باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن وہ یہ کہہ کر دوبارہ اسکول میں واپس چلی گئیں کہ میں اپنے اسکول کے بچوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ جس کے نتیجے میں درندہ صفت دہشتگردوں نے بے رحمی، صفاکی، بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں شہید کرڈالا۔ طاہرہ قاضی نے جرأت

اور قربانی کی جو تاریخ رقم کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ واقعہ رونما ہونے کے بعد رات گئے تک ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہیں آیا زندہ ہیں یا انہیں بھی دہشتگردوں نے شہید کردیا ہے۔ کافی تلاش کے بعد جب اسکول میں پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھا گیا تو ان میں ایک لاش طاہرہ قاضی کی بھی تھی جن کی شناخت بھی نہیں ہو پا رہی تھی کیونکہ ان کی لاش مسخ ہو چکی تھی۔ ان کے لواحقین نے ان کے زیوارات سے انہیں پہچانا۔ طاہرہ قاضی نے شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر پوری قوم کو یہ سبق دیا کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی بھی مشکل آئے ہمیشہ اپنے فرض کو مقدم رکھا جائے، ظلم و جبر کے سامنے فرار ہونے سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے ڈٹ جایا جائے حتیٰ کہ اپنی جان چلی جانے کا اندیشہ ہو تو اس کی بھی پروانہ کی جائے۔ ابتدا میں یہ کہا گیا کہ جلائی جانے والے لاش طاہرہ قاضی کی لیکن بعد میں ان کے لواحقین نے اس بات کی نفی کہ انہیں شہید کیا گیا، جلائی جانے والے لاش اسکول کی ایک اور استاد کی تھی۔ یہ بہادر استاد تھیں افشاں احمد کہ جنہوں نے بہادری کی لازوال داستان رقم کی۔ اسکول کے ایک طالب علم عرفان اللہ نے ایک گفتگو میں بتایا تھا کہ اس کی ٹیچر افشاں احمد چھلانگ لگا کر بچوں اور دہشت گردوں کے درمیان آگئیں اور انہیں للکار کر کہا کہ تم میرے مردہ جسم پر میرے بچوں کو مار سکتے ہو۔ میں اپنے بچوں کو فرش پر خون میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی'۔ دہشت گردوں نے انہیں زندہ جلا ڈالا لیکن وہ پھر بھی بچوں کو بھاگنے کا کہتی

رہیں، جان بچانے کی ترکیبیں بتاتی رہیں۔ سلام ہو ایسی بہادر ماؤں، بیٹیوں اور استادوں پر۔

دہشتگردوں کی سفاکی، بربریت اور درندگی کا اندزہ اس بات سے لگ یاجاسکتاہے کہ اسکول کے ایک طالب علم جو قسمت سے زندہ بچ گیا تھا کا کہنا تھا کہ ان کی پرنسپل کو ان کے سامنے شہید کیا گیا۔ دہشتگرد بچوں سے ان کے نام پوچھتے اور ان کے والد کے پیشے کے بارے میں سوال کرتے۔ جن کا تعلق پاک افواج سے ہوتا انہیں اسی وقت بے رحمی سے ختم کردیا جاتا۔ طاہرہ قاضی کے بارے میں یقینا ان کے پاس معلومات ہوں گی کہ ان کے شور کرنل (ریٹائر) قاضی ظفر اللہ ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے طاہرہ قاضی کے ساتھ انتہائی بربریت کا سلوک کرتے ہوئے طالب علموں کے سامنے انہیں جلا کر شہید کردیا۔ دہشتگروں کا یہ عمل انہیں جنت میں لے جائے گا۔ کس قدر گمراہ ہیں اور لاعلم ہیں ان کے سربراہ اور یہ دہشتگرد خود۔ یہ عمل کرنے والے مسلمان تو کیا انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں۔

طاہرہ قاضی گزشتہ 15 سال سے آرمی پبلک اسکول و کالج میں درس وتدریس سے وابستہ تھیں۔ اس اسکو کی پرنسپل مقرر ہونے سے قبل وہ اسی اسکول کی جونئیر ٹوڈ برانچ کی پرنسپل بھی رہ چکی تھیں۔ ان کا تعلق لنڈی ارباب سے تھا۔ لنڈی

ارباب پشاور سے بہت نذدیک صرف 15 منٹ کی مسافت پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔طاہرہ قاضی اور ان کے شوہر کرنل (ریٹائر) قاضی ظفر اللہ کا تعلق اسی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں میں زیادہ تر احمد زئی، قاضی، ارباب، فتح خان خیل اور گورگشت آباد ہیں۔اس گاؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس گاؤں سے پشاور شہر کے علاوہ پشاور کے اہم جگہوں جن میں ائر پورٹ، رنگ روڈ شامل ہے کو راستہ جاتا ہے۔زراعت اور چھوٹی صنعتوں سے وابستگی اس گاؤں کے لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔گاؤں لنڈی ارباب چپلی کباب کے لیے بھی مشہور ہے۔طاہرہ قاضی کو15دسمبر 2012ء کو 'پرنسپل آف دی ائر' کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ طاہرہ قاضی ایک اچھی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی منتظم بھی تھیں۔

فرض شناسی کی حسین مثال طاہرہ قاضی نے پیش کرکے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اگر موت کے سائے واضع طور پر نظر آرہے ہوں ظلم و بربریت کے سامنے ڈٹ جایا جائے، اپنے فرائض سے غفلت نہ برتی جائے۔ طاہر قاضی کو بہ حفاظت درندوں کے شکنجے سے نکال لیا گیا تھا وہ فوجی کمانڈوز کے کہنے پر باہر تو چلیں آئیں لیکن ان کے ضمیر نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ اپنے معصوم بچوں ، اساتذہ اور اسکول کے دیگر عملے کو دہشتگردوں کے رحم و کرم پر رہنے دیں۔ وہ یہ دیکھ آئیں تھیں کہ دہشتگرد سفاکی کے ساتھ انہیں شہید کر رہے ہیں انہوں نے واپس اسکول

کے اندر جانے کا فیصلہ کیا حالانکہ انہیں احساس ہوگا کہ ان کے اس عمل سے ان کی اپنی جان بھی جاسکتی ہے۔ پھر بھی وہ واپس چلی گئیں۔ اپنے بیٹے احمد قاضی سے ٹیلی فون پر آخری گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ 'فون بند کرو میں نے بچوں کے والدین کو اطلاع کرنی ہے' ۔ سر پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے اور طاہرہ قاضی اپنے فرائض کی انجام دہی میں فکر مند تھیں۔ان کے بیٹے نے درست کہا کہ انہیں اپنی ماں کی اس قربانی پر فخر ہے۔ طاہر قاضی کی اس بے مثال قربانی پر پوری قوم کو ان پر فخر ہے۔ حقیقیت یہ ہے کہ انہوں نے فرض شناسی اور قربانی کی لازوال مثال پیش کرکے پوری اساتذہ برادری کا ہی نہیں

بلکہ پوری قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔طاہرہ قاضی کی جرَت اور بہادری پر پوری قوم کا انہیں سلام۔

آتش و دہن میں کھڑی تھی تُو
گلشن کے تحفظ میں کڑی تھی تُو
درندے گھس آئے تھے وہاں
معصوم کلیوں کا تھا جو گلستان
استاد بڑے شجیع ہوتے ہیں
سمندر جیسے وسیع ہوتے ہیں
شہید ہو کر اَمر ہوتی طاہر قاضی

وحشت پہ مبتلا ہے گئی باری

(دسمبر162015)

سابق چیف جسٹس افتخار چودھری۔ صدارتی نظامِ حکومت کے حامی

پاکستان کے سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے ملک میں ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی نوید سنائی تھی۔ ان کا بیان اخبارات میں آیا تھا کہ وہ جلد ایک نئی سیاسی جماعت کا اعلان کرنے والے ہیں ۔ بہت ممکن ہے کہ موجودی بلدیاتی انتخابات کے مراحل مکمل ہونے اور ان کے نتائج کاانتظار کر رہے ہوں ۔ ان نتائج کی روشنی میں اپنی جماعت کے خدو خال کو حتمی شکل دیں۔ نئی جماعت کا اعلان تو سامنے نہیں آیاالبتہ انھوں نے عوام کے نام ایک خط تحریر کیا ہے جو 28 نومبر کے اخبارات کی زینت بنا۔
اس خط میں سابق چیف جسٹس افتخار چودھری نے پاکستان کی ابتر صورت حال کی تصویر کشی تو کی اس کے ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ 'پارلیمانی جمہوریت کے نام پر جو ہوا وہ ہم نے دیکھ لیا، ان کی خواہش ہے کہ ہمیں ایک نئے متبادل جمہوری نظام کے قیام کی ضرورت ہے ، قائداعظم کی فکر کی روشنی میں ایسے نظام کی جانب بڑھنا ہوگا جو 'صدارتی نظام جمہوریت اور اعلیٰ جمہوری اقدار پر قائم ہوگا اور کیوں نہ عوامی نمائندگان صرف قانون سازی تک محدود رہیں اور دیگر اختیارات عوام کو منتقل کردیے جائیں'۔
سابق چیف جسٹس افتخار چودھری کے اس خواہش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ

چودھری صاحب پاکستان میں ' صدارتی نظام حکومت ' کے حامی نظر آرہے ہیں اور وہ جس نئی سیاسی جماعت کا اعلان کریں گے اس کے منشور میں ملک میں صدارتی نظام حکمرانی کی تجویز شامل ہوگی۔ سابق چیف جسٹس صاحب کی رائے کوئی نئی نہیں، پاکستان میں صدارتی نظام حکومت کا تجربہ ہوچکا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے صدارتی نظام حکمرانی ہی رائج کیا تھا۔ جس میں اختیارات کا سرچشمہ نچلی سطح پر عوام کے منتخب نمائندوں کے پاس تھے ۔ ایوب خان کا بنیادی جمہوریت کا نظام ملک میں رائج رہ چکا ہے۔ اس نظام میں نچلی سطح کے نمائندوں کے پاس اختیار ہوتا ہے اور عوام کے روز مرہ کے مسائل بہت آسانی سے حل ہورہے تھے۔ لیکن ایوب خان کے بعد آنے والے سیاست دانوں نے صدارتی نظام کے بجائے پارلیمانی نظام حکومت کو ملک کے لیے زیادہ بہتر محسوس کیا۔ پارلیمانی نظام حکومت میں سول حکومتوں نے تسلسل کے ساتھ بلدیاتی انتخابات نہیں کرائے، قومی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین سے کام چلانے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے وہ مسائل جن کا تعلق ان کی بنیای ضروریات سے ہوتا ہے وہ مسائل حل نہ ہوئے۔ پرویز مشرف کے دور میں مقامی حکومتوں کا نظام رائج ہوا، نچلی سطح پر عوام کو اختیارات دئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ آج پرویز مشرف کے اس دور کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کراچی شہر کی ترقی کو ہی لے لیں تو آج مخالفین بھی مصطفیٰ کمال کی مثال دینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔پرویز مشرف بھی صدارتی نظام حکومت کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ گویا اس

نقطہ پر سابق چیف جسٹس اور سابق صدر مملکت پرویز مشرف کی سوچ میں خاصی مطابقت پیدا ہوچکی ہے۔ یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ پرویز مشرف بھی اور اب سابق چیف جسٹس بھی عملی سیاست میں قدم رنجا فرما چکے ہیں اور سیاست میں کچھ بھی ممکن ہے۔ کل کے دشمن آج کے دوست اور آج کے دوست آئندہ کے مخالفین ہو سکتے ہیں۔ اگر ہماری سول حکوتیں اقتدار سے محرومی کے خوف سے بلدیاتی یا مقامی حکومتوں کے نظام کو ملک میں جاری رکھتیں تو لوگ اس نظام سے بد دل نہ ہوتے۔ بد قسمتی سے اقتدار میں شراکت ہمارے حکمرانوں کو پسند نہیں۔ ملک میں موجودہ بلدیاتی انتخابات موجودہ جمہوری حکومت خوشی سے نہیں کرارہی بلکہ یہ بات سب ہی کے علم میں ہے کہ اگر اعلیٰ عدلیہ حکومت کے پیچھے ڈنڈا لے کر نہ پڑتی تو نواز شریف یا پیپلز پارٹی کی حکوتوں نے بلدیاتی انتخابات ہر گز نہیں کرانے تھے۔ ان انتخابات سے حکومتوں کی اصل حقیقت سامنے آنے کا ڈر جو ہوتا ہے۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی واش آؤٹ ہو گئی، تحریک انصاف نے نون لیگ کو ٹف ٹائم دیا، اسلام آباد میں مسلم لیگ نون معمولی سی برتری حاصل کر سکی، اندرون سندھ میں نون لیگ اور تحریک انصاف کا وجود نظر نہیں آیا، کراچی میں 5 دسمبر کو ہونے والا معرکہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا، بے شمار قسم کے منفی تجزیے، وسوسے، خدشات، دنگا فساد، خون خرابے کی باتیں دم توڑ گئیں، کراچی پر گزشتہ تیس برس سے حکمرانی کرنے والی جماعت باوجود مشکلات کے شہر قائد کے عوام کو اپنا ہم نوا بنانے میں اس بار بھی کامیاب رہی۔ دھاندلی کے الزامات بھی

سامنے نہیں آئے۔

سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اپنے خط میں تحریر کیا جو حقیقت بھی ہے کہ ’آج تک ایک مزدور کی، ایک کسان کی، ایک ڈرائیور کی، ایک چپڑاسی کی، ایک کلرک کی، زندگی میں خوشیوں کی کوئی رمق اس نظام نے باقی نہ چھوڑی ہے۔ ملک کی غالب آبادی سسک سسک کر اور چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر جی رہی ہے۔ ان کے لئے بوڑھی ماں کے علاج کی سہولت نہیں، چھوٹے بچے بیمار پڑ جائیں تو ڈھنگ کا علاج دستیاب نہیں، تعلیم پر ساہوکاروں کے پہرے ہیں۔ دستور پاکستان تعلیم وصحت ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ بنیادی شعبے پرائیویٹ ہاتھوں میں جا چکے ہیں۔ تعلیم ایک کاروبار ہے اور صحت بھی۔ کیا ایک فلاحی ریاست ایسی ہوتی ہے؟ ڈگری تو ہے ملازمت نہیں ۔ مواقع اول تو ہیں ہی کم اور جو ہیں ان پر رشوت اور سفارش کے منحوس سائے ہیں۔ قیمتی ریاستی اداروں کو بہتر کرنے کے بجائے پرائیویٹائز کیا جارہا ہے۔ اسٹیل مل ہو، پی آئی اے ہو، ریلوے ہو یا واپڈا ہر طرف ایک انحطاط ہے۔ یہ انحطاط نہیں انحطاط مسلسل ہے‘۔

سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا تجزیہ غلط نہیں ہمارے ملک کی حقیقی صورت حال یہی ہے۔ ہمیں اس جانب توجہ دینا ہوگی۔ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر

قربان کرنا ہوگا، اقتدار میں آنے والوں کو یہ سوچ بدلنا ہوگی کہ اب حکمرانی صرف اور صرف انہی کا حق ہے۔ جب تک وہ زندہ ہیں وہی حکمرانی کریں گے، جب اس کے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑنے شروع ہوجائیں گے تو وہ اس فکر میں لگ جائیں گے کہ ان کے بعد ان کا بیٹا، ان کی بیٹی ہی اقتدار میں رہے۔ جن ممالک میں بادشاہت ہے تو ان میں اور ہمارے جمہوری نظام میں فرق کیا ہوا، وہ اپنے دستور کے مطابق شہزادے کو سربراہ بنا لیتے ہیں ہم جمہوری نظام حکومت میں صرف اس فکر اور کوشش میں ہوتے ہیں کہ ہمارے بعد ہمارا بیٹا یا ہماری بیٹی ہی ہماری جانشین ہو۔ جب تک سیاست داں اس سوچ کو نہیں بدلیں گے ملک میں حقیقی ترقی نہیں ہوگی۔ سابق چیف جسٹس نے جن چیزوں کی جانب نشاندھی کی ہے وہ اسی طرح پروان چڑھتی رہیں گی۔ سابق چیف جسٹس افتخار چودھری کا کہنا ہے کہ ' کیوں نہ قائداعظم کی فکر کی روشنی میں ایک ایسے نظام کی طرف بڑھا جائے جو صدارتی نظام حکومت اور اعلیٰ جمہوری قدروں پر کھڑا ہو اور عوامی نمائندگان صرف قانون سازی تک محدود رہیں اور دیگر اختیارات عوام الناس کو نچلی سطح پر منتقل کر دئے جائیں'۔ سابق چیف جسٹس افتخار چودھری سے انتہائی ادب سے عرض ہے کہ نظام چاہیں پارلیمانی جمہوری نظام ہو یا صدارتی نظام، جمہوریت ہو۔ دونوں نظام برے نہیں مسئلہ اس نظام کی اصل روح کے مطابق عمل درآمد کا ہے۔ پیپلز پارٹی کا پانچ سال کا عرصہ زرداری صاحب کی صدارت میں گزر گیا، وہ بلدیاتی انتخابات سے راہ فرار اختیار کرتی رہی اور اس کے پورے پانچ سالہ

دور میں بلدیاتی انتخابات نہیں ہوئے۔ نون لیگ حیلے بہانوں سے ڈھائی سال گزار دیے۔ نون لیگ بھی ملک میں بلدیاتی انتخابات کے حق میں نہیں تھی، ملک کی اعلیٰ عدالت اگر حکومت کو مجبور نہ کرتی تو یہ حکومت بھی انتخابت ہر گز نہ کراتی۔ اگر پارلیمانی جمہوری نظام پر تسلسل کے ساتھ، اس کی حقیقی روح کے عین مطابق عمل درآمد ہوتا رہے تو مقامی حکومتوں کے نظام کے ذریعہ اصل اقتدار عوام تک پہنچتا رہے گا اور لوگوں کے مسائل حل ہوتے رہیں گے۔ ایک نظام سے دوسرے نظام کی جانب منتقل ہونا ملک و قوم کے لیے کڑا امتحان اور مشکلات کا باعث ہوگا۔ ویسے بھی پاکستان اب نئے نئے تجربات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تمام سیاسی جماعتیں، سول سوسائیٹی لحہ موجود کے حکمرانوں کو مجبور کریں کے وہ نظام حکمت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، سختی سے مقامی حکومتوں یا بلدیاتی نظام پر عمل کرتے

رہیں۔ اس طرح عوام الناس کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل ہوتے رہیں گے۔

ری پبلکن ڈونلڈ ٹرمپ، نریندر مودی کے نقش قدم پر

امریکن ری پبلکن پارٹی سے تعلق رکھنے والے ڈونلڈ ٹرمپ نے سستی شہرت حاصل کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے خلاف دشنام طرازی میں بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی کے نقش قدم پر عمل پیرا ہیں۔ امریکہ میں صدارتی انتخابات کی گہما گہمی کا آغاز ہوچکا ہے۔ ری پبلکن اور ڈیموکریٹس کے متوقعہ امیدواروں نے اپنے لیے امریکی عوام کی توجہ حاصل کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کرنا شروع کردیے ہیں۔ بارک اوبامہ کا اپنی دوسری باری کے بعد صدارت سے جی بھر چکا ہے اور نہ ہی ان کے ارد گرد ان کے مشیران انہیں تیسری باری کی جانب متوجہ کر رہے ہیں۔ یہ تو پاکستان ہی ہے کہ یہاں دو نہیں بلکہ تین تین باریوں کے بعد بھی چوتھی باری کی خواہش دل میں مچلتی ہے ، مقصد اقتدار ہاتھ سے نہ چھوٹے ، حالت کچھ بھی ہوجائے، ویل چیئر پر ہوں تب، بات کرتے ہوئے منہ سے رال ٹپکتی ہو تب اقتدار میں رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔ عزت سے جانے کی روایت ہمارے ملک میں پائی ہی نہیں جاتی۔

ہیلری کلنٹن ڈیموکریٹس کی جانب سے امریکی صدارتی نامزدگی کی امیدوار ہیں، جس کے لیے انہوں نے بھرپور طریقے سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا شروع کردیا ہے ۔ وہ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ بھی رہیں، سیاست میں عرصہ دراز سے

ہیں، سیاسی گھرانے میں پرورش پائی، سیاسی شوہر سے تربیت شدہ ہیں۔اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ ہیلری ڈیموکریٹس کی صدارتی امیدوار کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں ان کے علاوہ بھی امیدوار ہیں لیکن ہیلری صدارتی امیدوار کے طور پر ایک مضبوط شخصیت نظر آرہی ہیں۔ اس کے بر عکس ری پبلکن سے تعلق رکھنے والے ڈونلڈ ٹرمپ امریکہ کے مالدار بلکہ ارب پتیوں میں سے ایک ہیں،ان کے نام سے ایک طویل ٹاور ہے جس میں وہ اپنی تجارتی اور اب سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا رئیل اسٹیٹ کاکاروبار بہت وسیع اور کئی ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر سیاست کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے شروع کردیے ہیں۔ وہ ایک نجی چینل کے مالک بھی ہیں۔امریکہ میں ٹرمپ کی وجہ شہرت ایک سیاسی لیڈر کے طور پر نہیں بلکہ وہ امریکہ میں رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے ماہر کے طور پر جانے جاتے ہیں، میڈیا سے بھی ان کا تعلق ہے، بولنے میں ماہر ہیں، گھٹیا اور بے باک اندازِ میں گفتگو کرتے ہیں۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے بہت کم عرصے میں امریکہ میں صدارتی امیدوار کے لیے ٹکٹ حاصل کرنے کے امیدوار کے طور پر اپنے آپ کو منوالیا ہے اس کی وجہ ان کی وہ دشنام طرازیاں ہیں جو انہوں نے امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں اور دیگر اقوام کے بارے میں کی ہیں۔ انہوں نے امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کا ڈیٹا بیس

بنانے کی تجویز دی جسے لوگوں نے غیر منطقی قرار دیا، مسلمانوں کے لیے علیحدہ شناختی کارڈ کے اجراء کی بات کی جو امریکی قانون اور اخلاق کے منافی ٹھہرایا گیا۔ ٹرمپ نے مسلمانوں کو امریکہ سے بے دخل کر دینے کی بات کی تو دنیا ان کی اس دشنام طرازی پر حیران ہو گئی، حتیٰ کہ امریکہ کے صدر بارک اوباما نے بھی ٹرمپ کے ان خیالات کو منفی اور امریکہ کے قانون کے خلاف قرار دیا۔ ڈونلڈ ٹرمپ اس سے قبل بھی طرح طرح کی نت نئی اور عجیب و غریب باتیں کرکے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا چکے ہیں۔ امریکی عوام اس شخص کو مسخرے کے طور پر تصور کرتے ہیں جب انہوں نے نیویارک میں اپنے صدارتی امیدوار کے لیے ری پبلکن کے ٹکٹ کا مطالبہ کیا تو لوگ حیران ہوئے اس لیے کہ انہیں تو امریکی سیاست میں ایک جوکر تصور کیا جاتا تھا جو اپنی دولت کے بل بوتے پر میڈیا میں آکر لوگوں کو خوش کرنے کی باتیں کیا کرتا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے میکسیکو کے تارکین وطن کے خلاف بھی مہم چلائی، وہ ہسپانوی اور کالے امریکیوں کے خلاف بھی باتیں کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بانگ دہل کہا کہ میکسیکو کے 20 لاکھ سے زائد غیر قانونی تارکین وطن جو امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں انہیں امریکہ سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کی وجہ ڈونلڈ ٹرمپ یہ بتاتے ہیں کہ میکسیکین امریکہ میں جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں ان کی وجہ سے امریکہ میں جرائم کی شرح بہت بڑھ چکی ہے۔ حیرت ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ میکسیکو کے تارکین پر اس قسم کے الزامات لگا رہے ہیں وہ یہ بات بھول گئے کہ یہی میکسیکو کے

تارکین امریکہ کی معیشت میں اضافے کا باعث بھی ہیں۔ امریکہ تو ایک ایسا ملک ہے کہ جس میں تارکین وطن بے شمار ہیں، ہر مذہب، ہر نسل، ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ امریکہ میں آباد ہیں۔ امریکہ کی معاشی ترقی میں ان تارکین کا اہم کردار ہے۔ اگر یہ تمام تارکین امریکہ سے نکال دیے جائیں تو امریکہ کی تمام تر ترقی ٹریڈ ٹاور کی طرح دھڑام سے زمیں بوس ہو جائے گی۔

ڈونلڈ ٹرمپ کو ری پبلکن پارٹی کا شدت پسند متعصب تصور کیا جاتا ہے، اس نے کچھ عرصہ قبل نسل پرستی کا پرچار کیا۔ وہ نسل پرستی کا نعرہ لگا کر عوام کے مخصوص طبقے کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔ نسل پرستانہ سیاست نے بھارت میں نریندر مودی جیسے سیاسی لیڈر کو مقبول بنایا اور وزیر اعظم کے منصب پر بھی فائض کر دیا۔

ڈونلڈ ٹرمپ بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ عوام کی دکھتی رگ ہے انہیں اس جانب متوجہ کرنے سے سیاست کی بازی ان کی گرفت میں آجائے گی۔ ڈونلڈ ٹرمپ ایسے سیاسی کرداروں میں سے ایسا منفرد اور انوکھا کردار ہے کہ جس نے معذوروں کا مزاق بھی اڑایا۔ امریکہ کے پڑھے لکھے اور سمجھدار طبقے نے ڈونلڈ ٹرمپ کی اس بیہودہ حرکت کو پسند نہیں کیا۔ دنیا میں پھیلی ہوئی دہشت گردی جس میں طالبان کے علاوہ اب داعش کی جانب سے کی جانے والی کاروائیوں کو بنیاد بنا کر کسی بھی قوم کے لیے سرحدوں کو بند کر دینا، ان کے لیے علیحدہ شناختی کارڈ یا ڈیٹا بیس کی بات کرنا، مسلمانوں کی عبادت

گاہوں کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرنا کسی بھی طور مناسب نہیں، چند لوگوں کے غلط کام کی سزا کس طرح افراد کے پورے گروہ کو دی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی باتیں اور دلیلیں غیر اخلاقی اور امریکہ کے قانون کے منافی ہیں۔ صدر بارک اوبامہ کہے چکے ہیں کہ ' امریکی عوام اور امریکی دستور اس نوعیت کی انتہا پسندی کی اجازت نہیں دیتے اور امریکہ مسلمانوں کے تمام حقوق کا ضامن ہے'۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے مسلمانوں کے خلاف ڈونلڈ ٹرمپ کی دشنام طرازی کے جواب میں کہا کہ ' مسلمانوں سے تعصب رکھ کر داعش کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ کھوکھلے نعروں اور مسلمانوں پر پابندی جیسی باتیں کرکے شدت پسندی کو ختم کرنا ممکن نہیں' ۔ ہیلری واضح طور پر ری پبلکن صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ سے مخاطب تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 'تعصب، غرور اور تکبر امریکی صدر کی خصوصیات نہیں ہوتیں'۔ ان کا کہنا تھا کہ ' شدت پسندی سے نمٹنے کی حکمت عملی میں مسلمانوں کو سائیڈ لائن نہیں کیا جانا چاہیے وہ امریکہ میں مقیم ہوں یا کہیں اور کیوں کہ مسلمان داعش کے خلاف جنگ میں اہم اتحادی ہیں'۔ ہیلری کلنٹن کے علاوہ بھی کئی امریکی لیڈروں نے ڈونلڈ ٹرمپ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ صدارتی امیدوار جیب بش بھی ان میں شامل ہیں۔ جیب بش نے ڈونلڈ ٹرمپ کو ذہنی مریض قرار دیا۔ سابق نائب صدر ڈک چینی نے ڈونلڈ ٹرمپ کی مسلمانوں کے خلاف دشنام طرازی کو اپنے اعتقاد کے خلاف کہا، امریکی ایوان نمائندگان کے اسپیکر پال ریان نے ڈونلڈ ٹرمپ کی باتوں کو غیر امریکی کہتے

ہوئے انہیں فضولیات سے تعبیر کیا۔ امریکہ کے علاوہ اسرائیل کی پارلیمان کے چالیس سے زیادہ اراکین نے بھی ڈونلڈ ٹرمپ کے مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے ڈونلڈ ٹرمپ کا اسرائیل کا دورہ منسوخ کرادیا تھا لیکن بہت سے اسرئیلی ٹرمپ کے حمایتی کے طور پر سامنے بھی آئے۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے یہ عجیب بات بھی کہی کہ امریکہ میں ہر ایک امریکی اسلحہ بردار ہو، اسے آلاتِ حرب رکھنے کی کھلم کھلا آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ ان کے 'گن کلچر' کا بھی امریکہ میں بہت مزاق اڑایا گیااور انہیں غیر سنجیدہ لوگوں میں گردانا گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ڈونلڈ ٹرمپ کی باتوں کو لوگوں نے سنا، ایک بڑی تعداد ان کی ہمنوا دکھائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ جو بظاہر نظر آرہی ہے کہ دہشت گردی سے نفرت بہت سے مسائل کو جنم دے رہی ہے، دہشت گردوں سے نفرت بڑھ رہی ہے، جب بھی دہشت گردی کا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو مخصوص گروہ اور تنظیم اس کی ذمہ دری میڈیا پر قبول کرلیتی ہے، اس طرح مقامی لوگوں میں دہشت گردوں کے خلاف نفرت کا پیدا ہوجانا قدرتی عمل ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اسی سال نیویارک میں جو ریلی نکالی، بعض میڈیا رپورٹس کے مطابق اس میں دس ہزار امریکیوں نے شرکت کی۔ اسی ریلی میں ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے صدرارتی امیدوار ہونے کا اعلان بھی کیا۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس طرح ہندوستان میں متعصب ہندوؤں اور شدت پسندوں کی بڑی تعداد

نریندر مودی کے ساتھ ہو سکتی ہے اور اسے بھارت کا وزیر اعظم بنوایا جا سکتا ہے اسی طرح امریکہ میں بھی ایسا ہو سکتا ہے ، ہوا کا رخ بدل جائے اور یہ دس ہزار، لاکھوں کروڑوں میں تبدیل ہو جائیں اور ڈونلڈ ٹرمپ جیسا متعصب امریکہ کا صدر بن جائے تو، یہ امریکہ ہی کی نہیں دنیا کی بد قسمتی ہو گی۔ جس پارٹی کی جانب سے وہ صدارتی امیدوار ہونے کا ٹکٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی پارٹی میں ان سے زیادہ مضبوط اور ہر اعتبار سے مناسب لیڈر اس عہدہ کے امیدوار موجود ہیں۔ وہ کسی بھی صورت ری پبلکن پارٹی کو ڈونلڈ ٹرمپ کا صدارتی امیدوار نامزد نہیں ہونے دیں گے ۔ اس لیے کہ ڈونلڈ ٹرمپ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ خود امریکہ کے لیے بھی مشکلات کا باعث ہو گا۔

الف نون کے 'الن' اللہ کو پیارے ہوئے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

2015ء نے جاتے جاتے علم وادب کا ایک اور چراغ گل کردیا۔ مزاح نگار، ڈرامہ نگار، مترجم ، ناول نگار،مدیر ، اداکار اور پاکستان میں تھیٹر کے بانی کمال احمد رضوی 17 دسمبر 2015 ء کو عالم فانی سے ہمیشہ ہمشہ کے لیے عالم جاودانی میں چلے گئے۔انھوں نے ٹی وی مزاحیہ ڈرامہ 'الف نون' سے شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔ ڈارامہ کے خالق بھی وہ از خود ہی تھے اور اس ڈرامے کا مرکزی کرداروں بھی انھوں نے الن کے نام سے خود ہی ادا کیا۔ جب کہ نون یعنی ننھے کا فلمی اداکار رفیع خاور نے ادا کیا۔الن اور نون کی جوڑی اس ڈرامے میں اس قدر ہٹ ہوئی کہ لوگ اس ڈرامے کو دیکھنے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔یہ جوڑی اداکار ننھا' رفیع خاور' کی خود کشی کر لینے کے بعد اچانک ٹوٹ گئی تھی اور الن تنہا رہ گئے۔اس بعد بھی انھوں نے کئی ڈرامے کیے اور لکھے بھی لیکن الف نون جیسی شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ 29 سال بعد 17 دسمبر 2015 ء کو الن دوبارہ اپنے ساتھی ننھے سے جا ملے۔

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موج زمانہ لے گئی نہ جانے ان کو کس طرف

الن (کمال احمد رضوی) اداکار کے طور پر معروف ہوئے لیکن ان میں حس مزاح کا ایسا لطیف احساس پایا جاتا تھا کہ دیکھنے اور سننے والے داد دیے بغیر نہ رہ سکتے۔ ان کے جملے ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ہوا کرتے، ان کے مزاحیہ فقرے نپے تلے اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ طنز کے تیر و نشتر لیے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہی لکھے ہوئے جملوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس انداز سے ادا کیا کرتے کہ مزاح کا لطف دوبالا ہو جایا کرتا۔ پاکستان ٹیلی وژن پر الن کا تحریر کردہ ڈرامہ الف نون 72-1971ء کے درمیان پہلی مرتبہ ٹیلی کاسٹ ہوا، یہ متعدد قسطوں پر مشتمل تھا۔ معاشرے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، ادبی موضوعات کو ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ الن (کمال احمد رضوی) اور ننھا رفیع خاور) اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے کہ جو وقت الف نون کی ٹیلی) کاسٹ ہونے کا ہوتا اس وقت محلوں کی گلیوں میں سنناٹا ہوا کرتا لوگ اس بات کی کوشش کیا کرتے کہ وہ الف نون کے نشر ہونے سے قبل اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔ اس ڈرامہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1970 سے 1980 کے درمیان یہ سیریل کراچی ٹیلی وژن سے تین بار ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ الف نون میں دو بنیادی کردار تھے ایک ’الن‘ (کمال احمد رضوی) جب کہ دوسرا کردار اداکار رفیع خاور ننھے کے نام سے ادا کیا کرتے تھے۔ الف یعنی الن

دبلے پتلے اسمارٹ تھے۔ ان کا کردار سنجیدگی لیے ہوئے تھا جب کہ نون یعنی ننھا اس کے مقابلے میں گول مٹول اور موٹے تھے۔ ار ان کا کردار مزاحیہ تھا، جس وقت یہ جوڑی ٹیلی ویژن پر نمودار ہوتی انہیں دیکھ کر ہی لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجایا کرتی۔

رفیع خاور فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔ فلمی اداکار تھے ان کی پہلی فلم 'وطن کا سپاہی' تھی۔ ننھا نے بے شمار فلمیں کیں۔ وہ عموماً مزاحیہ اداکاری ہی کیا کرتے تھے۔ فلموں میں تو وہ کامیاب نہ ہوسکے البتہ کمال احمد رضوی کے لکھے ہوئے ڈرامے میں رفیع خاور کو بے پنا شہرت ملی۔ کہا گیا کہ رفیع خاور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی ہیروئن کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے۔ ان کا عشق ناکام عشق ہوگیا۔ وہ بظاہر صحت مند تھے لیکن دل کے بہت ہی چھوٹے نکلے۔ انہوں نے دل برداشتہ ہوکر 2 جون 1986ء کو اپنے آپ کو گولی کا نشانہ بنالیا اور خودکشی کر لی۔ ننھے کے انتقال کا اثر کمال احمد رضوی پر بھی ہوا۔ اس لیے کہ ننھے کہ اس عمل سے الن اپنے ساتھی اور دوست سے محروم ہوگئے۔ اس کے بعد کمال احمد رضوی نے کئی ڈرامے کیے لیکن ننھے کے بغیر ان کی اداکاری ادھوری ادھوری محسوس کی گئی۔ خود الن کو بھی اس بات کا شدید احساس تھا۔ انہوں نے لکھنے کا عمل تو جاری رکھا لیکن اداکاری سے اجتناب کرنے لگے۔ اب وہ زیادہ وقت پڑھنے میں دینے لگے تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

بکھری ہیں فضاؤں میں اس طرح تری یادیں

جس سمت نظر اُٹھی ' آواز تری آئی

کمال احمد رضوی نے متعدد ڈرامے تحریر کیے ان میں مسٹر شیطان، آدھی بات، بلاقی بدذات، بادشاہت کا خاتمہ، جولیس سیزر، صاحب بی بی گلام، چور مچائے شور، کھویا ہوا آدمی، خوابوں کا مسافر، ہم سب پاگل ہیں، آپ کا مخلص شامل ہیں، انہوں نے مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ان میں تہذیب، آئینہ، شمع کے علاوہ بچوں کا رسالہ بچوں کی دنیا، تعلیم وتربیت، پھلواری شامل ہیں۔ کمال احمد رضوی بے بہا خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے قلم میں روانی اور پختگی تھی۔ ان کی سوچ کا دھارا ہمیشہ معاشرے میں کسی نہ کسی برائی ، خامی یا کمزوری کو دور کرنے کی جانب ہوا کرتا۔ الف نون کے بے شمار اقساط میں انہوں نے روزمرہ کے مسائل ، لوگوں کی مشکلات پر خوبصورت انداز سے طنز کے تیر چلائے ۔ وہ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ اداکار بھی اتنے ہی اچھے تھے۔ بنیادی طور پر وہ تخلیق کار تھے۔ تھیٹر کے حوالے سے ان کی خدمات کو پاکستان میں پہلا پتھر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ بجا طور پر founding father of theatre in Pakistan کہلائے جاتے ہیں۔ کمال احمد رضوی کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا نعم البدل مشکل ہی نہیں بلکہ نہ ممکن ہے۔ وہ اپنی ذات میں ادارہ تھے۔ شخصی کمالات اور خوبیوں کا مجموعہ۔

جنہیں دیکھ کر جیتے تھے ناصؔر

وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں

کمال احمد رضوی کا تعلق ہندوستان کے شہر بہار شریف سے تھا وہ 1930ء میں بہار کے گاؤں ’گیا‘ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہندوستان میں ہی حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد پانچ سال بعد 1951ء میں انھوں نے پاکستان ہجرت کی،اس وقت ان کی عمر 21 برس تھی ۔شروع میں کراچی پھر لاہور منتقل ہوگئے لیکن پھر کراچی میں رہائش اختیار کی۔ کمال احمد رضوی ترقی پسند خیالات رکھتے تھے، ان کے دوستوں کا حلقہ بھی ترقی پسندوں پر ہی مشتمل تھا۔ کراچی کے ابتدائی سالوں میں شہر کراچی کے شاعر، ادیب و دانشور کراچی کے معروف علاقے صدر میں قائم کیفے جارج میں شام کے اوقات میں جمع ہوا کرتے اور ادبی محفلیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ کیفے جارج کے بعد پاک ٹی ہاؤس ادیبوں کی پناہ گیا بن گیا۔ کمال احمد رضوی بھی ابتدائی ایام میں ان محفلوں میں بھرپور شریک ہوا کرتے۔حکومت کی جانب سے انہیں 1989ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ بلاشبہ کمال احمد رضوی کے انتقال سے ادبی دنیا ایک تخلیق کار سے محروم ہو گئی ۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

قومی بچت کی اسکیموں پر منافع میں کمی۔ وزیر خزانہ کا ایک اور تحفہ

وزیر خزانہ اسحاق ڈار صاحب نے غریبوں، تنخواہ دار، پنشنرز، بیواؤں کو ایک اور تحفہ عنایت فرمایا ہے۔ یہ تحفہ انہوں نے اپنے ہر دلعزیز چہیتے ادارے آئی ایم ایف کے دباؤ میں اس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پاکستان کے غریب، تنخواہ دار اور پنشنرز، بیواؤں اور بڑھاپا اسکیم کے سہارے اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے والوں کو دیا ہے۔ وزیر خزانہ نے قومی بچت کے منافع میں مزید کمی کر دی ہے۔ وزارت خزانہ نے اس سلسلہ میں جو نوٹیفیکشن ملک بھر کے تمام نیشنل سیونگ سینٹرز کی برانچوں کو جاری کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ بہبود پینشنرز اور بیواؤں کے ماہانہ سیونگ اکاؤنٹ منافع میں مزید کمی کرتے ہوئے ایک لاکھ روپے کے عوض اب 880 روپے ماہانہ ادا ہوں گے جب کہ بچت سیونگ اکاؤنٹ میں ماہانہ 565 روپے اسی طرح چھ ماہ کے لیے خریدے جانے والے ایک لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹس پر اب 3400 کے بجائے 2880 روپے ادا کیے جائیں گے۔

وزیر خزانہ صاحب نے ابھی چند دن قبل قرضوں کی ادائیگی کے لیے 313 درآمدی اشیاء پر ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھائی تھی۔ اس کا مقصد انہوں نے یہ بیان کیا تھا کہ ایسا کرنے سے حکومت کا 40 ارب روپے ریونیو کا شارٹ فال پورا کرنے کی

شرط کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ درآمدی اشیاء تھیں کیا؟ فہرست پر نظر ڈالی جائے تو عقل حیران اور پریشان ہو جاتی ہے کہ اس فہرست میں ایسی اشیاء کی کثرت تھی جو عام بلکہ غریب عوام کے استعمال کی ہیں۔ بلکہ روز مرہ ضروری استعمال میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہر ایک نے چیخ چیخ کر دُوہائی دی، داد خواہی کی کہ اس کا بوجھ غریب اور عام آدمی پر پڑے گا لیکن انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ نہیں' اس سے غریب آدمی متاثر نہیں ہوگا' اور انہوں نے کسی کا کوئی جواز نہ سنا اور حکومت کا 40 ارب روپے ریونیو کا شارٹ فال پورا کرکے، آئی ایم ایف کو خوش کرکے ان کے دل کو ٹھنڈک اور راحت نصیب ہوئی۔ ابھی تو اس ٹھنڈک میں کمی بھی نہ آئی ہوگی کہ انہیں ملک کے غریب، مظلوم طبقے کو حکومت کی جانب سے جو سہولت فراہم ہو رہی تھی اس پر ایک اور ہتھوڑا چلانے کا خیال آگیا حالانکہ کچھ ماہ قبل ہی تو قومی بچت اسکیموں پر شرح منافع میں کمی کی گئی تھی۔ قبلہ وزیر خزانہ کے پاس اس کا کیا جواز ہے اور وہ کیا منطق پیش کرنا چاہیں گے، بہبود سیونگ سرٹیفیکیٹ یا پینشن سیونگ اکاؤنٹ تنخواہ دار اور پنشنرز، بیواؤں اور بڑھاپے کی اسکیمیں ہیں۔ حکومت نے یہ اسکیمیں صرف اور صرف پینشنرز کے لیے یا ضعیف العمر افراد جن کی عمر 60 برس سے زیادہ ہو گئی ہے ان کے لیے شروع کی تھیں۔ آپ کے خیال میں آپ کے اس اقدام سے امیر آدمی متاثر ہوا ہوگا۔ بہبود سیونگ سرٹیفیکیٹ تو جاری ہی پینشنرز کو کیا جاتا ہے۔ یہ

پینشنرز اپنی زندگی بھر کی بچت یہ سمجھ کر کہ حکومت کی اسکیم زیادہ محفوظ ہے جمع کرادیتا ہے۔ یہ رقم اسے حکومت سے ہی تو ملی ہوئی ہوتی ہے جو اسے ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے حکومت کو ہی دے دیتا ہے اور اس پر اسے جو منافع ملتا ہے اس سے اپنا گزربسر کرتا ہے۔ آپ کو ڈیفینس سیونگ سرٹیفیکیٹ پر منافع کم کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اس لیے کہ ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکیٹ لے کر رکھنے والے غریب، تنخواہ دار اور پنشنرز، بیوائیں نہیں ہوتیں بلکہ یہ سرٹیفیکیٹ وہ لوگ خریدتے ہیں جن کے پاس وافر پیسہ ہوتا ہے انہیں اس پیسے پر فوری رقم کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنی اس رقم کو دس سال کے لیے حکومت کے خزانے میں جمع کرادیتے ہیں اور دس سال بعد اپنی اصل رقم چارگنا اضافے کے ساتھ حاصل کر لیتے ہیں۔

حکومت تو یہ نعرہ لے کرآئی تھی کہ غریب کو مشکلات سے نجات دلائیں گے، ملک کو قرضوں سے نجات دلائیں گے ، کشکول توڑ دیں گے، بھیک نہیں مانگیں گے، اپنے وسائل پر بھروسہ کرکے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے۔ ڈھائی سال کی حکمرانی میں یہ تمام باتیں کہیں دکھائی نہیں دیں۔ کہاں گیا نون لیگ کا منشور، کیا ہوئے عوام سے کیے ہوئے وعدے، غریب کی مشکلات کو دور کرنے کے وعدے، کہاگیا آپ کا وعدہ کہ آپ کشکول توڑ دیں گے۔ آج سب کچھ ویسا کا ویسا ہی ہے۔ نہ غربت ختم ہوئی، نہ غریب کی مشکلات میں کمی آئی، نہ کشکول ہاتھ سے

چھوٹا، نہ قرض لینے کی عادت گئی، نا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت گئی بلکہ اس میں تیزی آچکی ہے۔ وزیر خزانہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سے قرض منظور کرانے میں ماہر ہو چکے ہیں، قرض لے کر حکومت کا خسارہ پورا کرنا ہو تو قرض، قرض کی قسط واپس کرنا ہو تو قرض، قرض تو واپس ہوتا ہی نہیں وہ تو جوں کا توں برقرار رہتا ہے اور ہر دن اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ مقروض پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ تحفہ ہے جو ہم اپنی آنے والی نسل کو دے رہے ہیں۔ تاریخ بڑی بے رحم ہوتی ہے، لمحہ موجود میں تو تاریخی حقائق کو بعض لوگ چھپا لیتے ہیں لیکن وقت کا دھارا حقیقت کو آشکار کر ہی دیتا ہے۔
جناب اسحاق ڈار صاحب یاد رکھیے تاریخ آپ کو قرض کے حصول میں ماہر وزیر خزانہ کے طور پر یاد رکھے گی۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا جائے گا کہ میاں نواز شریف کی حکومت میں پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ مقروض پیدا ہوا کرتا تھا۔ یہ بات کہنے سے بات بنے گی نہیں کہ آپ سے پہلے بھی یہی کچھ ہو رہا تھا، اور نہ ہی یہ منطق درست ہے کہ کیونکہ ہم سے پہلے کی حکومتوں نے بھی قرض لیے اس لیے ہم نے بھی ایسا ہی کیا، یہ کوئی منطق نہیں، اگر کسی نے برائی کی تو آپ بھی اس پر عمل پیرا رہیں۔ جواب تو دینا ہی ہوگا آج نہیں تو کل، یہاں نہیں تو وہاں۔ اب بھی وقت ہے اس جانب توجہ دیجئے۔ قرض سے نجات کے لیے اقدامات کریں۔ پاکستان کی سرزمین بڑی ذرخیز ہے، یہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اس

ٹیلنٹ کو کیسے ڈھونڈا جائے اور استعمال کیا جائے۔ قدرتی ذخائر کی اس ملک میں کمی نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ذخائر کو تلاش کرکے کام میں لایا جائے۔ اگر میاں صاحب یہ اعلان کردیں کہ آج سے میں ایک ناشتہ اور ایک کھانا کھاؤنگا، قوم بھی اس پر عمل کرے، کیوں کہ ہم نے قرض نہیں لینا، یقین کریں قوم کا ایک ایک بچہ آپ کے شانہ بشانہ کھڑا ہوگا۔ آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے اعلان کیا تھا کہ قرض اتارو ملک سنوارو تو اس قوم نے آپ کی کس کس طرح مدد نہیں کی تھی۔ کیا ہوا اس قرض اتارو ملک سنوارو اسکیم کا؟

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمام تر صلاحیتیں، توانائیاں، وسائل، سرکاری مشینری، ذاتی مشینری کا پچیس فیصد صرف اس بات پر لگی ہوئی ہے کہ حکومت کو کس طرح قائم رکھا جائے بچایا جائے، عمران خان کا مقابلہ کیسے کیا جائے، ایم کیوایم کو کس طرح قابو میں رکھا جائے، کیسی ترکیب کی جائے کہ زرداری سے تعلقات خراب بھی نہ ہوں اور زرداری واپس ملک میں بھی نہ آئے، سندھ اور پختون خواہ حکومتوں سے کیسے نمٹا جائے، بلوچستان میں حکومت بس چلتی رہے، مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو اپنے ساتھ کس طرح ملا کر رکھا جائے، اے این پی تو اب کسی کھاتے میں ہے ہی نہیں، پچیس فیصد اس بات پر کہ دہشت گردی سے کیسے نمٹا جائے، کس کو کس جگہ لگایا جائے، کس کو فارغ کردیا جائے، صرف پچیس فیصد ملک کی بہتری پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔ جو تھوڑی بہت

توانائی بچتی ہے وہ غیر ملکی دورہ پر خرچ کی جارہی ہے۔

آپ پاکستان کے کسی بھی قومی بچت کے مرکز چلے جائیں۔ وہاں 99 فیصد افراد وہ نظر آئیں گے جن کی عمرین 60 برس سے زیادہ ہوں گی، ان میں ضعیف مرد اور عورتیں شامل ہوتی ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اسٹک ہوتی ہے، بعض بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے آرہے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے مرد اور عورتیں بھی ہوتی ہیں کہ جن کو ان کے عزیز رشتہ دار سہارا دے کر لارہے ہوتے ہیں۔ وزیر خزانہ صاحب آپ کو ایسے لوگوں پر بھی ترس نہیں آیا، ایک پرائمری اسکول ٹیچر، ایک کلرک، ایک چپڑاسی جس کو پینشن کے وقت زیادہ سے زیادہ 20 لاکھ روپے مل جاتے ہوں گے ان میں سے نصف وہ اپنی ضروریات پر لگادیتا ہے، جس میں مکان بنانا ہے، بیٹی کی شادی کرنا ہے وغیرہ وغیرہ باقی اگر اس نے 10 لاکھ بہبود سیونگ سرٹیفیکیٹ یا پنشنرز اکاؤنٹ میں رکھ دیے تو اسے اس رقم پراب 9400 روپے مل رہے تھے۔ آپ نے اُس پر ظلم کیا کہ اس رقم کو بھی کم کردیا اور اب اس کو 8800 روپے ملیں گے گویا آپ نے جون کے بجٹ میں جو 10 فیصد پینشن بڑھائی تھی وہ چھ ماہ بعد ہی واپس لے لی اور اب اس کو اپنی جمع شدہ رقم ہر ماہ 600 روپے کم ملیں گے۔ وزیر خزانہ صاحب یہ بظاہر بہت معمولی سے رقم ہے اور آپ کے لیے تو یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ بھی نہیں لیکن اس غریب شخص کے لیے جس کے گھر میں چھ سے آٹھ افراد کھانے والے ہیں یہ رقم

اہمیت رکھتی ہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ غریب، تنخواہ دار اور پنشنرز، بیواؤں اور بڑھاپا اسکیم پر منافع کی شرح کو بڑھایا جاتا نہ کے اِسے کم کر کے غریب کی مشکلات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

لودھراں میں تحریک انصاف نے میدان مارلیا

23 دسمبر 2015ء کو ہونے والا قومی اسمبلی حلقہ این اے 154 لودھراں کا ضمنی انتخاب تحریک انصاف کو شاندار فتح سے ہم کنار کرگیا اور نون لیگ کو بدترین شکست دے گیا۔اس سے قبل ہونے والے این اے 122 کا ضمنی انتخاب میں قومی اسمبلی کے اسپیکر ایاز صادق فتح یاب ہوئے تھے۔اس وقت نون لیگ شیر کے نشان کے ساتھ شیر نی بن کر سامنے آئی تھی اور تحریک انصاف کے تمام تر دھاندلی کے شور شرابے کو بے بنیاد اور لغو تصور کیا جانے لگا تھا۔اس انتخاب نے نون لیگ کے بارے میں یہ تاثر قائم کر دیا تھا کہ نون لیگ عوام میں اپنی مقبولیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، اس کا گراف اوپر کی جانب ہے، عمران خان باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے نون لیگ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ایاز صادق کی جیت نے نون لیگیوں کے حوصلے بلند کر دیے تھے وہ سینہ تان کر عمران خان کے تمام تر الزامات کو 'نہ مانوں' کی رٹ سے تشنیع دے رہے تھے۔نون لیگ کا بونے سے بونا لیڈر بھی تحریک انصاف کو آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔جب کے تحریک انصاف شکست کے باعث بغلے بجاتی دکھائی دے رہی تھی۔اس ضمنی انتخاب کے بعد ملک میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں نون لیگ کی پے در پے فتح سے نون لیگیوں کا مارل اور زیادہ ہائی ہوگیا تھا جب کہ تحریک انصاف بلدیاتی انتخابات میں شکست کے بعد اور بھی

زیادہ پستی میں چلی گئی تھے۔ آخری معرکہ کراچی میں ہوا جس میں تحریک انصاف کو جماعت اسلامی سے اتحاد فائدے کے بجائے نقصان کا باعث بنا۔ تحریک انصاف کو پوری امید تھی کہ وہ کراچی میں بلدیاتی انتخابات میں فاتح بن کر ابھرے گے لیکن یہاں بھی تحریک انصاف اور جماعت اسلامی کو کامیابی نہ ہوئی اور کراچی کا میئر بنانے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔

شکست در شکست کے بعد تحریک انصاف کے لیڈروں اور کارکنوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے، کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی کیفیت تھی۔ انصافیے ابھی اسی کیفیت میں تھے کہ لودھران کا ضمنی انتخاب سر پر آگیا۔ جو صورت حال سامنے تھی، تحریک انصاف ضمنی انتخابات میں شکست کھارہی تھی، بلدیاتی انتخابات میں پنجاب اور سندھ میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، یہ خیال کیا جارہا تھا اور تجزیہ نگاروں کی اکثریت بشمول میرے یہ خیال کررہی تھی کہ لودھراں میں بھی نتیجہ کچھ مختلف نہیں ہوگا۔ تحریک انصاف کے امیدوار جہانگیر ترین نون لیگ کے امیدوار صدیق بلوچ سے ہار جائیں گے باوجود اس کے کہ صدیق بلوچ کو کورٹ سے انتخاب لڑنے نا اہل قرار دیا گیا، اس سے ان کے کارکنوں میں بدلی پھیلی، وہ اپیل میں گئے جہاں سے انہیں الیکشن لڑنے کی اجازت مل گئی۔ ادھر کپتان نے اپنے جوہر دکھائی، کارکنوں کو حوصلہ دیا، نون لیگ کے خلاف خوب خوب بھڑکایا، دوسرے جانب تحریک انصاف کے امیدوار جہاگیر ترین نے اپنی تمام تر

طاقت انتخاب جیتنے پر لگادی۔ تحریکِ انصاف کے چودھری سرور نے لودھراں میں ڈیرے ڈالیے۔ دونوں جانب سے سخت مقابلہ تھا۔ اس کے باوجود تجزیہ نگاروں کا خیال یہی تھا کہ نون لیگ کم مارجن سے ہی صحیح لیکن میدان مار لے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، تجزیہ نگاروں کے تجزیے غلط ثابت ہوئے، نون لیگ میدان مارنے کے بجائے شکست کھا گئی۔ نون لیگ کی اس شکست کو نون لیگ کے لیے بڑا اَپ سیٹ قرار دیا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ تحریکِ انصاف نے نون لیگ کو گہرا ڈینٹ لگایا ہے۔ اس جیت سے تحریکِ انصاف کا دیرینہ الزام کے 2013ء کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی کو تقویت ملی ہے۔ لودھراں کا یہ حلقہ اُن چار حلقوں میں سے ایک ہے جس کو کھولنے کی گردان تحریکِ انصاف عرصہ دراز سے کرتی چلی آرہی ہے۔اس کے لیے اس نے 126 دن کا دھرنا بھی دیا، یہ حلقہ ان چار میں سے ایک ہے۔ اس وجہ سے بھی کپتان کا یہ کہنا کہ ’دیکھو میں نہیں کہتا تھا کہ چار حلقے کھول دو دھاندلی ثابت ہوجائے گی، اس حلقہ میں شکست سے ثابت ہوگیا کہ میری بات درست ہے، 2013کے انتخابات منظم دھاندلی کا نتیجہ تھے‘۔ ضمنی انتخاب میں کامیابی کپتان کی اس بات کو تقویت دے رہی ہے۔ لیکن موجودہ ضمنی انتخاب کے حالات میں اور 2013کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کپتان جس قدر اب ملک میں مقبول ہوچکے ہیں، تحریکِ انصاف منظم اور عوام میں مقبول ہوچکی ہے اُس وقت نہیں تھی۔

لودھراں ضمنی انتخاب میں تحریک انصاف کی فتح کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان میں سے چھ حسب ذیل ہو سکتی ہیں۔ (1) ایک وجہ یہ ہے کہ نون لیگ کو لودھراں کے ضمنی انتخاب سے قبل دیگر ضمنی انتخابت جیسے ایاز صادق کے انتخابات میں جو فتح حاصل ہوئی، اس کے بعد پنجاب میں بلدیاتی انتخابات میں جو فتح حاصل ہوئی حالانکہ اسے خیبر پختون خواہ اور سندھ بشمول کراچی میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اس کے باوجود نون لیگی لیڈر اور اس کے ورکر ضمنی انتخاب اور بلدیاتی انتخاب کے نشہ میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے لودھراں کے انتخاب کو آسان سمجھا، وزیر اعظم صاحب نے کسان پیکج کا اعلان ضرور کیا لیکن یہ حربہ بھی لودھران کے عوام کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا۔ لیگی لیڈروں نے لودھراں کے ضمنی انتخاب میں دلچسپی نہیں لی، جب کے تحریک انصاف نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کردیں۔ (2) دوسری وجہ نون لیگ نے ایک ایسے شخص کو اپنا امیدوار بنایا جو 2013ء کے الیکشن میں آزاد حیثیت سے جیت کر نون لیگ میں شامل ہوا تھا، اگر نون لیگ کے بجائے پیپلز پارٹی حکمراں جماعت ہوتی تو یہ آزاد امیدوار پیپلز پارٹی میں شریک ہو جاتا۔ گویا صدیق بلوچ کو اقتدار چاہیے تھا خواہ وہ نون سے ملے یا پی پی سے ملے۔ حلقے کے لوگوں کے ذہنوں میں اس شخص کا یہ کردار تھا۔ الیکشن میں جیت تو گیا لیکن پھر یہاں کے انتخابات کو الیکشن کمیشن نے کالعَدَم قرار کیوں دیا، اس کی وجہ صدیق بلوچ کی جالی ڈگری تھی، لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی رہی کہ اس شخص نے جعلی ڈگری کی بنیاد

پر الیکشن لڑا۔ یہ صاف ستھرا انسان نہیں۔ (3) تیسری وجہ صدیق بلوچ کی شکست کی یہ رہی کہ نون لیگ نے ضمنی انتخاب میں صرف یہ دیکھا کہ صدیق بلوچ نے 2013ء میں انتخابات آزاد امیدوار کی حیثیت سے جیت کر نون لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی چنانچہ نون لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا اِسی مرد مجاہد کا پیدائشی حق ہے، نون لیگ نے لودھراں کی مقامی لیڈر شپ سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور انہیں خاطر میں نہ لاتے ہوئے صدیق بلوچ کو ٹکٹ دے دیا، چنانچہ نون لیگ کی لودھراں کی مقامی لیڈر شپ اس بات سے اختلاف رکھتی تھی اور اس نے دلجمعیَ سے، خلوص سے انتخاب میں وہ سرگرمی نہیں دکھائی اور حصہ نہیں لیا۔ (4) چوتھی وجہ صدیق بلوچ بہادر کی اپنی ذات میں موجود کچھ خامیاں اور کمزوریاں بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صدیق بلوچ صاحب لودھراں کے لوگوں کے کام تو کرواتے رہے ہیں لیکن لودھراں میں ان کی شخصیت پر انگلیاں اٹھتی رہی ہیں۔ کسی مجرے میں ان کی موجودگی کی کوئی تصویر بھی اخبار کی زینت بن چکی ہے۔اس کی تصدیق پاکستان کے ایک سینئر صحافی عارف نظامی کر چکے ہیں۔ اسی طرح دیگر قسم کے معاملات سے انہیں جوڑا جاتا رہا ہے۔ (5) پانچویں وجہ پاکستان پیپلز پارٹی کی ناکام سیاست ہے، جس کی وجہ سے پی پی کا گراف نیچے کی جانب چلا گیا۔ پارٹی پنجاب میں اپنی سابقہ حیثیت کھو چکی ہے ۔ اس کا ووٹر نون لیگ کے علاوہ تحریک انصاف کی جانب متوجہ ہوا ہے اور اس ضمنی الیکشن میں پی پی کے کافی ووٹ تحریک انصاف کی جھولی میں آن گرے، جس نے تحریک انصاف کو

فتح سے دوچار کیا۔ (6) چھٹی وجہ جہانگیر ترین کی فتح اور صدیق بلوچ کی شکست کی یہ رہی کہ جہانگیر ترین اپنے ذاتی حیثیت میں اور اپنی پارٹی کے حوالے سے انتظامی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی وہ ایک بہترین منتظم ہیں انہوں نے اپنی اس صلاحیت کو اس ضمنی انتخاب میں بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ دوسرے تحریک انصاف کے چودھری سرور جو پہلے ہی سے پارٹی کی تنظیمی معاملات میں اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کررہے ہیں انہوں نے شروع ہی دن سے لودھراں میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ لودھراں کی مقامی لیڈرشپ اور وہاں کے مقامی زمینداروں، وڈیروں، چودھریوں اور بااثر لوگوں کو تحریک انصاف کا پیغام پہنچانے میں کامیاب رہے۔ انہیں تحریک انصاف کے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے مقابلے میں نون لیگی لیڈر اور مقامی لیڈرشپ نے خاطر خواہ کوششیں بھی نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے ان کا امیدوار صدیق بلوچ آزاد حیثیت میں الیکشن جیت کر حکمران جماعت میں شامل ہوگیا لودھراں کے ووٹروں کی اکثریت بھی حکمرانوں کا ساتھ دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس الیکشن نے ثابت کردیا کہ ہوا کا رخ نون لیگ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ جہانگیر ترین نے 1,29,606 ووٹ حاصل کیے جب کہ نون لیگ کے امیدوار صدیق بلوچ نے 93,183 ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح صدیق بلوچ کو 36423 ووٹوں سے شکست ہوئی۔ ووٹرز کا ٹرن آوٹ 60 فیصد رہا۔ اس الیکشن میں پاکستان پیپلز پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام (ف) کے امیدوار بھی الیکشن لڑرہے تھے ان دونوں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔

پنجاب کے اس حلقے میں متحدہ قومی موومنٹ کا ووٹ بنک بھی ہے اور وہ جماعت بھی یہاں سرگرم عمل تھی یہاں اس جماعت نے نون لیگ کے امیدوار کی حمایت کا اعلان کیا تھا لیکن متحدہ کی حمایت بھی صدیق بلوچ کے کام نہ آ سکی۔ 'الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا' ۔لودھراں کے اس ضمنی انتخاب نے تحریک انصاف میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ سابقہ ضمنی اور بلدیاتی انتخابات میں شکست سے جو منفی اثرات ورکروں پر پڑے تھے اس الیکشن نے پوری پارٹی کو تازہ دم اور حوصلہ مند کر دیا ہے۔ فتح کے بعد پارٹی میں جو لہر آئی ہے اسے قائم و دائم رہنا چاہیے۔

لیاری کی بسمہ، وی آئی پی پروٹوکول کی نذر ہو گئی

کراچی کے علاقے لیاری سے تعلق رکھنے والی دس سالہ بچی سول اسپتال میں ٹراما سینٹر کے افتتاح کے نتیجے میں وی وی آئی پی کے پروٹوکول کے نتیجے میں جاں بحق ہو گئی۔ سول اسپتال میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیرَمین بلاول بھٹو زرداری اور سید قائم علی شاہ نے نئے تعمیر ہونے والے ٹراما سینٹر کا افتتاح کرنے کے لیے اسپتال پہنچنا تھا۔ ان سیاسی شخصیات کی حفاظت کے لیے صبح ہی سے پورے علاقے میں پولیس تعینات کر دی گئی تھی۔ سول اسپتال کے ارد گرد کی سڑکیں عام ٹریفک کے لیے بند کر دی گئیں تھیں، حتیٰ کہ ان سڑکوں پر پیدل سواروں کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیاری کے ایک بے روزگار رہائشی کی دس سالہ بچی بسمہ بیمار تھی اور اس کی حالت خراب ہوتی نظر آ رہی تھی۔ بسمہ کا بات اپنی لخت جگر کو ہاتھوں میں اٹھائے سول اسپتال سے کچھ دور کھڑا ڈیوٹی پر موجود پولس اہلکاروں کی خوشامد کرتا رہا، اس نے انہیں بتایا کہ بچی کی حالت انتہائی خراب ہے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے لیکن پولس اہلکاروں نے بسمہ کے باپ کی فریاد کو پیروں تلے روند دیا اور اسے سول اسپتال جانے کی اجازت نہیں دی۔ وقت گزرتا رہا، بچی کی حالت خراب ہوتی گئی لیکن ڈیوٹی پر معمور پولیس اہل کار خدا معلوم کس مٹی کے بنے ہوئے تھے انہیں معصوم بچی کی حالت پر قطعناً رحم نہ آیا۔

بسمہ کے باپ کی تڑپ، بچی کو اسپتال تک پہنچانے کی منت سماجت، پولس اہلکاروں سے ہاتھ جوڑ کر بچی کی زندگی کی بھیک مانگنے، التجائیں کرنے، خوشامد درآمد کرنے کی صورت حال کو میڈیا کی آنکھ بار بار دکھاتی رہی، حکومتی اعلیٰ عہدیداروں نے بھی ٹی وی پر یہ مناظر دیکھے ہوں گے، عام لوگ یہ صورت حال اپنے ٹی وی اسکرین پر دیکھتے رہے، سب لوگ بسمہ کے باپ کی بے بسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے، ساتھ ہی پروٹوکول پر معمور شاہ کے وفاداروں کے رویے کو بھی دیکھا جارہا تھا لیکن کسی نے بسمہ کے باپ پر رحم نہیں کھایا۔ بسمہ کے باپ کو لوگوں نے ٹی وی اسکرین پر بسمہ کو اپنے ہاتھوں میں لیے سڑک پر دوڑتے ہوئے دیکھا، اسے جب جانے کی اجازت نہ ملی تو وہ تمام تر حسار کو توڑ کر سول اسپتال کی سڑک پر کپڑے میں لپٹی بسمہ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے سول اسپتال پہنچ گیا لیکن ظالموں کی بے حسی کے باعث دیر ہو چکی تھی، ڈاکٹروں نے معائینے کے بعد بتایا کہ وہ اگر دس منٹ قبل پہنچ جاتا تو شاید بسمہ بچ جاتی لیکن اسے دنیا سے رخصت ہوئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بلاول اور وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کے لیے لگائے جانے والے پروٹوکول نے بسمہ کی جان لے لی۔ اس کا حساب کون دے گا، ان اعلیٰ شخصیات سے تو کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا، حساب لینا تو دور کی بات ہے۔ دونوں شخصیات نے دکھ کا اظہار کر کے مرنے والی کے خاندان پر احسان عظیم کیا ہے۔

یاد رکھیے یہ ظلم کی ایک قسم ہے، اس کا حساب تو دینا ہوگا دنیا میں نہ سہی آخرت میں ضرور آپ کو اس کا حساب دینا ہوگا۔

مجبور اور بے بس باپ، غم زدہ ماں اپنی لخت جگر کے جسد خاکی کو لے کر گھر کو واپس ہوئے۔ غریب اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ سندھ کے حکمران پچاس سے زیادہ لشکارے ماتی رنگ برنگی گاڑیوں میں، سینکڑوں محافظوں کے حسار میں سول اسپتال پہنچے، جہاں ان پر پھول نچھاور کیے جارہے تھے، دوسرے جانب بسمہ کی ماں اور باپ اپنی لخت جگر کی جدائی پر ماتم کر رہے تھے اور اپنے پھول کو اس کی آخری آرام گاہ پہنچانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اعلیٰ شخصیات کے پروٹوکول، ان کی جان عزیز کی حفاظت کی خاطر سڑکوں کو بند کرنے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا اور نہ ہی پروٹوکول کی وجہ سے بسمہ کا اس طرح مرجانا پہلا واقعہ تھا اس سے قبل متعدد واقعات ہوچکے ہیں۔ اعلیٰ شخصیات کو جب بھی کہیں سے گزرنا ہوتا ہے تو اس علاقے کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لوگ اسپتال جانے سے محروم ہوجاتے ہیں، رکشاؤں میں بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں اعلیٰ سیاسی عہدوں پر پہنچ جانے کے بعد وہ خود اور ان کے وفادار یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ اب یہ لوگ دنیا میں اعلیٰ و افضل ہیں، انہیں زندگی بھر کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ موت تو ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے اور جس کی موت جس طرح لکھی ہے وہ اسی طرح ہی آکر رہے گی۔ یہ

حفاظتی دیواریں، پروٹوکول، پچاس پچاس گاڑیاں، آگے پیچھے درجنوں موبائیلیں، سڑک پر معمور سینکڑوں اہل کار دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے اور موت کا فرشتہ اپنا کام کر جائے گا۔ ایسا ہوچکا ہے ، ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں کتنی ہی شخصیات ایسی ہیں کہ جو حسار میں رہتی تھیں، آگے پیچھے حفاظت کرنے والوں کی لمبی قطاریں، آگے باڈی گارڈ ، پیچھے باڈی گارڈ، لیکن پھر بھی موت کا فرشتہ آن موجود ہوا ، پچاس پچاس گاڑیاں، پولس اہل کار ، درجنوں موبائلیں موت کے فرشتے کو اپنا کام کرنے سے نہ نوک سکیں۔ مثالیں تو سینکڑوں ہیں ، ضیاء الحق مرحوم کی سیکیورٹی کم تھی، محترمہ بے نظیر بھٹو کے محافظ کم تھے ، پرویز مشرف پر جان لیوا حملے نہیں ہوئے۔ قسمت سے بچ گئے یہ دوسری بات ہے، سلمان تاثیر کا قتل کیسے ہوا، سعودی عرب کے شاہ فیصل کس طرح قتل کیے گئے، بھارت میں مہاتما گاندھی قتل ہوئے، اندرا گاندھی کا انجام کیا ہوا، لبنان کے حریری کس طرح مارے گئے، لیاقت علی خان کو بھرے مجمعے میں گولی کا نشانہ بنایا گیا، مجیب الرحمٰن کا کیا انجام ہوا، ابراہم لنکن ، مارٹن لوتھر، جان ایف کنیڈی کس طرح مارے گئے۔ کیا ان لوگوں کی سیکیوریٹی نہیں تھی۔ چند کو چھوڑ کر یہ وہ لوگ تھے جن کے آگے اور پیچھے حفاظتی گاڑیوں کی لمبی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ موت برحق ہے، جس لمحہ موت کے فرشتے کو حکم ہوا کہ اس نے آپ کی روح قبض کرنی ہے تو وہ آپ کی حفاظت پر معمور سینکڑوں اہلکاروں کی کھلی آنکھوں کے سامنے آپ کو بہ

حفاظت اٹھا لے جائے گا۔

افسوس ناک پہلو بسمہ کی موت کے بعد یہ سامنے آیا کہ بجائے اس کے کہ پی پی کے رہنما و ذمہ داران اپنی غلطی کو تسلیم کرتے، اس بچی کے گھر بلاول بھٹو زرداری، وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ از خود تشریف لے جاتے، لیکن اس کے بر عکس اس بچی کے والد جو رنج والم میں بتلا تھے کو گاڑی میں بٹھا کر وزیر اعلیٰ صاحب کے سامنے لے جایا گیا جہاں پر سندھ کے ناکام کپتان نے بچی کے والد سے افسوس کا اظہار کیا۔ سندھ کے سینئر وزیر بھی جو مستقبل کے بڑے وزیر بھی ہو سکتے ہیں نے ٹی وی پر افسوس ناک بیان دیا ان کا فرمانا تھا کہ بچی کے مرنے کا افسوس ہے لیکن بلاول ان کے لیے قیمتی ہے، گویا بچی مر گئی کوئی بات نہیں بلاول کا پروٹوکول زیادہ اہم تھا، اسی طرح وزیر اعلیٰ کے مشیر قیوم سومرو کا فرمانا تھا کہ ٹھیک ہے بچی کا انتقال ہو گیا لیکن جس مقصد کے لیے بلاول اسپتال جا رہے تھے وہ مقصد بھی زیادہ اہم تھا، انہوں نے فرمایا کہ پنجاب اور خیبر پختون خواہ میں بھی پروٹوکول کے باعث جانیں گئیں ہیں، اگر بسمہ کی جان چلی گئی تو کیا ہوا، دوسرے صوبوں میں بھی تو جانیں گئیں ہیں۔ بہت خوب، اسے کہتے ہیں ڈھٹائی، ندامت، افسوس اور غم ذدہ غریبوں کی دل جوئی کرنے کے بجائے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے ایسا کیا تو کیا ہوا دوسرے صوبوں میں بھی تو ایسا ہوتا رہا ہے۔ البتہ زرداری صاحب نے آئندہ اسپتالوں

میں تقریبات نہ کرنے کی ہدایات جاری کردی ہیں۔ مرنے والی بچی کے والدین لیاری سے تعلق رکھتے تھے، وہ لیاری جو پاکستان پیپلز پارٹی کا گڑھ سمجھی جاتی رہی ہے۔ آج یہ وقت آگیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے وزیر اعلیٰ اور دیگر اعلیٰ لیڈر لیاری جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ پروٹوکول کے ساتھ، حفاظتی گاڑیوں کی بارات کے ساتھ، سینکڑوں پولیس او ررینجرز کے ساتھ لیاری جانے سے کتراتے ہیں۔ یہ وہ تبدیلی ہے جو ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی اور آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو زرداری کی پیپلز پارٹی میں واضح طور پر محسوس کی جارہی ہے۔ اندرون سندھ کے علاوہ ملک کے تمام علاقوں میں پیپلز پارٹی رفتہ رفتہ اپنی حیثیت کم یا ختم کرتی جارہی ہے۔ کراچی کے کچھ علاقوں میں پارٹی کی تائید موجود ہے لیکن یہاں بھی گراف نیچے کی جانب ہے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے اعلیٰ قیادت کے لیے۔

لیاری کی بسمہ کی موت اور اس کے بعد پیپلز پارٹی کے بے شمار چھوٹے۔بڑے لیڈروں کے بیانات سے بسمہ کے والدین، عزیز رشتہ داروں کو تو تکلیف پہنچی ہی ہوگی عام لوگوں کو پارٹی کے سیاسی لیڈروں کی باتیں، تاویلیں اور دلائل سن کر دلی صدمہ ہوا، جس گھر میں موت واقع ہوجائے اس موت پر دکھ، افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے، لواحقین سے اظہار ہمدردی کیا جاتا ہے،انہیں تسلی و تشفیع دی جاتی ہے، ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے کچھ عملی اقدامات کیے جاتے ہیں۔

نہ کہ پارٹی کے لیڈر اس قسم کی باتیں کریں کہ پنجاب میں، خیبر پختون خواہ میں بھی تو اعلیٰ شخصیات کے پروٹوکول کے موقع پر لوگ مرے ہیں اگر یہ واقعہ ہوگیا تا کیا ہوا۔ سیاسی لیڈر تو ایسے موقعہ سے فوری فائدہ اٹھاتے ہیں، جیسے ہی یہ واقع رونما ہوا تھا، بلاول بھٹو، سید قائم علی شاہ اور دیگر پارٹی کے لیڈر سول اسپتال میں افتتاح کرنے کے بعد سیدھے مرنے والی بچی کے گھر چلے جاتے، اس کے باپ کو سینے سے لگاتے، عزیز رشتہ داروں کو تسلی دیتے، ان کے لیے کچھ امداد کا اعلان کر دیتے، ان کا یہ عمل غموں پر مرہم رکھنے کے مترادف ہوتا۔ صرف یہ اعلان نہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ انکوائیری کرائی جائے گی، جو ذمہ دار ہوگا اس کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی اسی قسم کی غلطیوں نے پارٹی کو آسمان سے زمین پر دے مارا ہے۔

نواز' مودی پرجوش معانقہ۔کیا گل کھلائے گا

اچانک ایسا کیا ہوا کہ نریندر مودی اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ اچانک نواز شریف سے ملاقات کرنے پاکستان کی سرزمین پر آ دھمکے۔ نواز شریف سے ان کا گرم جوشی سے معانقہ کیا گل کھلائے گا، میاں صاحب کو سالگرہ کی مبارک باد دی،ان کی والدہ کی قدم بوسی کی ، کھانا کھایا اور یہ جا اور وہ جا۔ ان کا دورہ کیا تھا افغانستان کی جانب سے آنے والی سرد طوفانی ہوا کا جھونکا تھا جو یکایک پاکستان میں داخل ہوا، سیاسی موسم کو وقتی طور پر خوش گوار کرکے واپس چلتا بنا۔ افغانستان کے صدر اشرف غنی نے مودی سے اپنی ملاقات میں ایسی کونسی بات کان میں کہہ ڈالی جو مودی کے دل کو ایسی لگی کہ مودی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی کابینہ کو اعتماد میں لیا نہ ہی عسکری قیادت کو اطلاع دی، تمام تر قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر افغانستان سے واپس اپنے دیس جاتے ہوئے طیارے کے پائیلٹ کے کان میں خاموشی سے کہہ دیا کہ سردار جی بس تھوڑی سے دیر کے لیے اپنے پرانے دوست سے معانقہ کرلوں جھپی پالوں پھر چلتے ہیں اپنے دیس کو۔ اور ایسا ہی ہوا آئے بھی وہ گئے بھی، چرچہ سارے زمانے میں ہوگیا۔ مقاصد کیا تھے ؟ ایسی اجلت کیا تھی ؟ کسی کو دکھانا تھا؟ حاضری لگانا تھی، کسی سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنا تھا، اوباما کو

یہ باور کرانا تھا کہ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، اشرف غنی نے کوئی بات ایسی کہہ دی تھی کہ تم نے نواز شریف سے معانقہ کیے بغیر اپنے گھر نہیں جانا اسے پورا کر دکھایا۔ یا کسی اور نے قسم دے دی تھی کہ دیکھو تم نے افغانستان سے واپس اپنے دیس جانے سے پہلے پاکستان کی سرزمین پر اپنے قدم ضرور رکھنا ہیں ورنہ آنے والے دن تم پر اور تمہاری سرکار پر بھاری گزریں گے۔ ان جوتشیوں، عاملوں، فعال نکالنے والوں، ستاروں کا علم جاننے والوں کا کوئی بھروسا نہیں، بڑی شخصیات ان باتوں پر بہت یقین رکھتے ہیں، ہمارے سابق صدر آصف علی زرداری صاحب کے بھی ایک پیر صاحب ہیں جو وہ کہہ دیتے ہیں زرداری صاحب وہی کچھ کرتے ہیں۔ آج کل پیر صاحب نے اپنے ملک میں داخلے پر پابندی لگادی ہے، خبر دار ادھر کا رخ مت کرنا مشکل میں پڑ جاؤ گے، تم سے پہلے جو اُس مرتبہ پر فائز تھے جس پر تم پانچ سال براجمان رہ چکے ہو ان کا حشر دیکھ رہے ہو، وطن کی محبت میں بہادری دکھائی، دھر لیے گئے، اب بھنور سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ زرداری میاں اگر تم نے بھی انہی کی پیروی کی تو تمہارا بھی یہی کچھ انجام ہوگا۔ اس لیے خبردار اور ہوشیار ادھر کا رخ ہر گز مت کرنا۔ بڑے میاں صاحب کا کوئی بھروسہ نہیں، یہ اس مرتبہ میٹھی چھری بنے ہوئے ہیں، خاموشی خاموشی میں وہ کچھ کر رہے ہیں جن کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دونوں کے درمیان نہ تو باقاعدہ ملاقات ہوئی، نہ پریس کانفرنس کی گئی اور نہ ہی مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا۔ بہ ظاہر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چلتے چلتے راستے میں اپنا گاؤں آیا، سوچا کہ چلو اپنے پرانے جاننے والوں سے ملاقات کرتے جائیں اور ان کے ساتھ ایک کپ چائے پی لی جائے تاکہ سفر کی تھکن بھی اتر جائے، اگلے پر احسان بھی ہو جائے گا، نام بھی ہوگا، چرچہ بھی۔ تا حال صورت حال واضح نہیں ہو سکی ممکن ہے کہ آئندہ دنوں میں حقائق سامنے آجائیں۔ مودی جی سے خیر کی امید رکھنا حماقت ہوگی، جس نے پاکستان کو شروع دن سے قبول ہی نہ کیا ہو وہ بھلا اب 68 سال بعد کیا قبول کرے گا اور وہ بھی نریندر مودی جس کی نس نس میں مسلمانوں سے اور پاکستان کے لیے نفرت کینہ، عداوت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ دنیا دکھاوا تو ہو سکتا ہے، کسی کی آشیرواد، حاصل کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کے لیے خیر خواہی، بھلائی، اچھائی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مودی کے اس طوفانی دورے سے کسی کو بھی خوش فہمی میں ہرگز نہیں رہنا چاہیے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا ابھی چند مہینوں کی بات ہے بھارت کے انتہا پسند اور شدت پسند ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا، کرکٹ ٹیم، خورشید قصوری کی کتاب کی رونمائی، ٹرک ڈرائیور جو گائیں اپنے ٹرک پر لے جا رہا تھا یہی اس کا جرم ٹہرا، یا وہ بے قصور مسلمان جس پر گائیں کا گوشت کھانے کا الزام لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ واقعات ہوتے رہے اور انہی مودی جی کو سانپ سونگھا ہوا تھا، انہوں نے تمام تر

واقعات پر چپ سادھ لی تھی، اپنے انتخاب میں انہوں نے مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف جو زہر اگلا کیا وہ سب بھلایا جاسکتا ہے۔ سشما سوراج بھی پاکستان آکر خوش گپیا کر کے چلی گئیں، یہ وہی سشما سوراج ہیں جو انتخابات کے دوران کھانا کھانے اور پانی پینے سے پہلے پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کیا کرتی تھیں، زہر اگلا کرتی تھیں پھر کچھ اور بولا کرتی تھیں۔ یہ عالمی رہنماؤں کا دباؤ یا پریشر، اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینا ہے کہ جس نے مودی سرکار کو پاکستان سے گفت و شنید پر مجبور کیا تاکہ دنیا کو دکھا سکیں کہ دیکھو ہم تو امن پسند ہیں بات چیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہوگا وہی جو گزشتہ 68 سالوں میں ہوتا آیا ہے۔

بھارت میں جب سے نریندر مودی سرکار آئی ہے پاکستان کے ساتھ سیاسی سطح پر اور دونوں ملکوں کی سرحدوں پر کشیدگی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ نریندر مودی جب سے بھارت کے وزیر اعظم بنے ہیں بھارت کے شدت پسند دہشت گردوں نے بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف کاروائیاں تیز کر دی تھیں، بھارت میں ہندو انتہا پسندوں اور دہشت گردی کی کارائیاں اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ پاکستان اور بھارت ایک بار پھر میدان جنگ میں آمنے سامنے آجائیں گے۔ یہ تاثر بھی عام ہو چلا تھا کہ بھارت میں انتہا پسندوں اور شدت پسندوں کو بھارت کے وزیر اعظم کی آشیرواد حاصل ہے۔ اس لیے کہ نریندر

مودی مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف ہونے والی کاروائیوں میں خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اس سے مودی جی کا ایک بڑی جمہوری قوت کے سربراہ کی حیثیت سے امیج گر رہا تھا، دنیا انہیں ایک سیاسی لیڈر کے بجائے انتہا پسند کے طور پر پیش کرنے لگی تھی۔

اب اس تاثر کو کس طرح دور کیا جائے، اس کے لیے انہوں نے پیرس کانفرنس میں مختصر ملاقات کا ڈرامہ رچایا، پھر سشما سوراج کو راہ ہموار کرنے کا ٹاسک دیا اور اب از خود پاکستان کی محبت یا خیر خواہی میں نہیں بلکہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے کے لیے، امریکہ دباؤ کو دور کرنے کے لئے انہوں نے یہ طوفانی دورہ کیا۔ جس سے کچھ اور حاصل ہو یا نہ ہو مودی جی کو سیاسی طور پر کچھ سنبھالا ضرور مل گیا۔

نریندر مودی کا قیام پاکستان کی سرزمین پر صرف دو گھنٹے اور چالیس منٹ رہا یعنی انہوں نے 4.22 پر لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا اور ٹھیک دو گھنٹے چالیس منٹ بعد 7.02 پر پر واپس اپنے جہاز کی سیڑھی پر چڑھ گئے۔ اس مختصر سے وقت میں نواز شریف سے جھپی ڈالی، نواز شریف کی والدہ سے ملاقات، چھوٹے میاں صاحب سے بھی بغل گیر ہوئے، ان سے لمبی ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا، نون لیگ کی مستقبل کی لیڈر مریم نواز سے ملاقات کی، پسندیدہ وزیروں، صفیروں سے مصافحہ کیا، کیک کاٹنے کی تقریب میں شرکت کی، تحائف کا تبادلہ کیا، نواز شریف کی نواسی کی شادی کی مبارک باد دی، دوپہر کا کھانا کھایا۔ مختصر سے شیڈول میں

اس بات کی کہیں گنجائش نظر نہیں آتی کہ دونوں ملکوں یا عوام کی بھلائی کے حوالے سے دونوں رہنماؤں کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی بات چیت ہوئی ہوگی۔ کشمیر تو بہت دور کی بات ہے۔ دفتر خارجہ نے اس دورے کو خیر سگالی کا دورہ کہتے ہوئے واضح کیا کہ نواز مودی ملاقات میں ملکر کام کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ بہت اچھی بات ہے اگر اتنی بات بھی ہوئی۔ خدشات اپنی جگہ لیکن اس طوفانی دورے سے اتنا ضرور ہوا کہ دونوں ممالک کے درمیان جو کشیدگی کی فضاء کافی عرصہ سے قائم تھی اس پر کچھ گرد پڑ گئی ،
سیاسی موسم خوش گوار ہوگیا، سرحدوں پر جو بلا وجہ کاروائیاں ہو رہی تھیں ان میں کمی آئے گی، ہوسکتا ہے کہ وہ بالکل رک جائیں۔ اس عمل کو جاری رہنا چاہیے۔ دونوں ملک کے عوام کی بھلائی اسی میں ہے کہ دونوں ممالک کی حکومتیں اپنے تمام مسائل بشمول مقبوضہ کشمیر کے مسئلے کو افہام و تفہیم سے ، گفت و شنید سے حل کر لیں۔ جنگ مسائل کا حل نہیں، وہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تو ہوسکتی ہے امن و سکون کا باعث ہر گز نہیں ہوسکتی اور اب جب کہ دونوں ممالک ایٹمی قوت ہیں جنگ سے گریز ہی دونوں ملکوں کے عوام کے مفاد میں ہے۔
سشما سوارج کے پاکستان آجانے سے، چکنی چپڑی باتیں بنانے سے ، سرتاج عزیز کی تعریف کردینے سے، نریندر مودی کے ڈرامائی انداز سے پاکستان آجانے سے دونوں ممالک کے درمیان طویل عرصہ پو محیط کشیدہ تعلقات دوستی میں نہیں بدل جائیں

گے۔ اس سے پہلے بھی بھارت کے تین وزیر اعظم پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ پاکستان کا دورہ کرنے والے وزیراعظم مودی چوتھے وزیر اعظم ہیں۔ حالات اور واقعات یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان سے بہتر تعلقات بھارت کے مفاد میں ہیں۔ بھارت کو اپنی تجارت وسط ایشیا تک بڑھانے کے لیے پاکستان سے زمینی راستہ درکار ہوگا، تاپی گیس منصوبہ دونوں ممالک کے لیے مفید ہے۔ کشمیر اصل میں دونوں فریقین کے درمیان اصل وجہ ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی مستقل حل سامنے آنا چاہیے اور وہ حل سوائے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے کوئی اور نہیں۔ اسی میں دونوں ملکوں کی بھلائی ہے اسی میں کشمیری عوام کی بھلائی ہے۔

بیاد جمیل الدین عالیؔ بہ اہتمام ایوان اردو کی تقریب میں اظہار خیال

جمیل الدین عالیؔ اردو زبان و ادب کا نقصانِ عظیم ہے۔ عالیؔ جی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ، کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے سرشار، مستقل کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا ولولہ لیے ہوئے تھے۔ علمی، ادبی، سماجی، فکری، تہذیبی حوالوں سے عالیؔ جی کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمی و ادبی سرمایے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو، رائیٹرز گلڈ ان کی زندگی کے ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ جو انہیں مدتوں زندہ رکھیں گے۔ عالیؔ جی کے لکھے ہوئے ملی نغمے ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے عالیؔ جی کی کاوشیں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے علاوہ مختلف اداروں کی جانب سے عالیؔ جی کی یاد میں تعزیتی اجلاسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری ہے۔ عالیؔ جی کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات اس بات تقاضہ کرتی ہیں کہ ان کی انہیں خراج عقیدت پیش کیا جائے اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کو روشناس کرایا جائے۔

ایوانِ اردو ایک قدیم ادارہ ہے جس کے بانی ڈاکٹر حمید الدین شاہد مرحوم

تھے۔ جب تک ڈاکٹر شاہد حیات رہے ایوانِ اردو ادبی و علمی سرگرمیوں کے حوالے سے فعال رہا۔ ڈاکٹر شاہد نے اپنے گھر 43 بلاک بی، فرید الدین بقائی روڈ ناظم آباد کا نام ہی 'ایوانِ اردو' رکھ لیا تھا اور آج بھی اس گھر پر ایوانِ اردو کی تختی آویزاں ہے۔ ڈاکٹر حمید الدی شاہد کے فرزند ارڈاکٹر خرم حمید جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں نے عالی جی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بیادِ جمیل الدین عالی کا اہتمام اپنی رہائش گاہ پر.بروز ہفتہ دسمبر بعد مغرب کیا۔ اس تقریب کے روح رواں جناب محمود عزیز صاحب تھے۔ وہ26 ایوان اردو کے معتمداعزازی بھی ہیں۔ تقریب کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کی معتمداعزازی ڈاکٹر فاطمہ حسن نے کی۔

راقم نے بھی اس موقع پر عالی جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے

جمیل الدین عالی ایک عہد ساز شخصیت، اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ، کچھ کر گزرنے کے جَذبَہ سے سرشار، مستقل کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا ولولہ لیے ہوئے تھے۔ علمی، ادبی، سماجی، فکری، تہذیبی حوالوں سے عالی جی کی

کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمی وادبی سرمایے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو، رائیٹرز گلڈ ان کی زندگی کے ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ جو انہیں مدتوں زندہ رکھیں گے۔ عالی جی کے لکھے ہوئے ملی نغمے ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے عالی جی کی کاوشیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ 23 نومبر کو عالی جی کی سانسوں کو سفر اختتام پذیر ہوا۔ اگلے روز 24 نومبر کو کراچی کے آرمی قبرستان میں اپنی والدہ اور شریک حیات کے درمیان ابدی نیند سو گئے۔ عالی جی سے کون واقف نہیں، کس کس کے کام عالی جی نہیں آئے، کون ہے جو ان سے نہیں ملا، کس کس پر انھوں نے عنایتیں نہیں کیں۔ ایک طویل فہرست ہے ان لوگوں کی جو عالی جی سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی میں سہی انہیں خراج تحسین پیش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عالی کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

آرمی قبرستان میں تدفین کے حوالے سے عالی جی کے فرزند ارجمند راجو جمیل صاحب نے بتایا تھا کہ آرمی چیف آف اسٹاف مرزا اسلم بیگ تھے، اس وقت عالی جی کو آرمی کی جانب سے خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ہم آپ کو کسی اچھی جگہ کشادہ پلاٹ دینے کی خواہش رکھتے ہیں، راجو جمیل نے بتایا کہ والد صاحب نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ مجھے دو نہیں بلکہ تین پلاٹ چاہیے، ایک اپنے

لیے، ایک اپنی والدہ کے لیے اور ایک اپنی شریک حیات کے لیے اور یہ تینوں پلاٹ مجھے آرمی کے قبرستان میں چاہیے۔یقیناً خط کا جواب پڑھ کر متعلقہ حکام حیران و پریشان ہوگئے ہوں گے، انہیں یہ یقین نہیں آرہا ہوگا کہ پاکستان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا عالی جی کی خواہش تھی کہ وہ آرمی کے قبرستان میں اپنی ماں اور اپنی شریک حیات کے ساتھ دنیاوی زندگی کے بعد کی زندگی ایک ساتھ آرمی کے قبرستان میں بسر کریں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، یقیناً اس جواب سے آرمی کے افسران لاجواب ہوگئے ہوں گے اور عالی جی کا قد ان کی نظروں میں کس قدر بلند ہوا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا، عالی جی کو ان کی زندگی میں ہی ان کی خواہش کے مطابق تین پلاٹ آرمی کی جانب سے الاٹ کر دیئے گئے تھے، ان میں سے دو پلاٹوں پر دائیں جانب عالی جی کی والدہ، بائیں جانب عالی جی کے شریک حیات طیبہ بانو آرام فرماں تھیں، درمیان کا پلاٹ 23 نومبر تک خالی تھا لیکن قبر بے تابی سے اپنے مکین کی راہ تک رہی تھی اور اپنے ہر دلعزیز مکین کے لیے اپنا سینہ واہ کیے ہوئے تھی، 24 نومبر کو اس کی گود عالی جی کے جسم اطہر سے منور ہوگئی۔

عالی جی کے تین کارنامے تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جائیں گے۔ ایک بابائے اردو کے بعد طویل عرصہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اعزازی معتمد کی

حیثیت سے خدمات انجام دینا، دوسری جامعہ اردو کا قیام اور تیسرا رائیٹرز گلڈ کا قیام اور اس کی زیر سایہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو جمع کرنا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ عالی جی انجمن اور گلڈ کے معاملات میں اس قدر فنا تھے کے ان کی اولادوں کا کہنا تھا کہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ وہ چانچ بہن بھائی نہیں بلکہ سات بہن بھائی ہیں، یعنی پانچ وہ اور ایک بہن 'انجمن' اور ایک بھائی 'گلڈ' ہے۔ راجو جمیل رائیٹرز گلڈ دوبارہ سرگرم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں گلڈ کے حوالے سے عالی جی ایک شعر۔

پھر دیکھا کہ بچہ بچہ ہنستا تھا اور عالی جی
فردیں لکھتے مسلیں پڑھتے اور ''گلڈ'' چلاتے تھے

عالی جی جب بھارت ماتا سے پاکستان آئے تو وہ شاعر کی حیثیت سے معروف تھے۔اس فن میں اپنا اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ پاکستان کے حوالے سے انہوں نے دنیا بھر میں نام روشن کیا وہ یادگار ہے۔ عالی جی کے تمام کام تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔بقول پروفیسر سحر انصاری وہ پیش رو اور پیش بیں شخصیت تھے۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف پر بہت کچھ اور بامقصد لکھا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کالم منفرد اور معلوماتی ہوا کرتے تھے۔کالم نگاری میں بھی عالی جی نے جدت پیدا کی۔ جس موضوع پر کالم ہوتا اس کے

بارے میں ذاتی مشاہدات اور معلومات بھی جمع کر دیا کرتے تھے۔ وہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں تھے وہ کچھ اور کرنا چاہتے تھے۔

عالی تونے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی

یہ تو بتا تیری کوتارانی دیس کے کس کام آئی؟

عالیؔ جی کی اصول پسندی کا ایک واقعہ رضوان احمد صاحب نے سنایا تھا جسے میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ رضوان صاحب نے فرمایا کہ وہ ایک شام دیگر کے ساتھ عالیؔ جی کے گھر کسی تقریب میں مدعو تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، 'عالیؔ جی نے سلام دعا کی اور ایک دم گویا ہوئے کون گورنر؟ میں کسی گورنر کو نہیں جانتا، انہوں نے مجھ سے وقت لیا؟ میں اس وقت مصروف ہوں، ان سے نہیں مل سکتا'۔ رضوان احمد کا کہنا تھا کہ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ گورنر صاحب ہیں تو انہیں بلا لیجئے، ملاقات کر لیجئے، کہنے لگے سندھ کے نئے گورنر کا پی اے کا فون تھا، کہتا تھا کہ گورنر صاحب ابھی آپ کے گھر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ میں انہیں آنے کی اجازت کیسے دے دوں، گورنر ہوں گے اپنے لیے، یہ تقریب پہلے سے طے ہے، اگر انہیں ملنے آنا ہے تو وقت لے کر ضرور آجائیں۔

عالیؔ جی سچے محب وطن اور کٹر پاکستانی تھے۔ اس کا ثبوت ان کے لکھے ہوئے بے شمار ملی نغمے ہیں۔ انہیں پاکستان کے دولخت ہونے کا شدید دکھ تھا۔ انہوں نے

اپنے ایک شعر میں علامہ اقبال سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

ہاں میرے بابا، ہاں میرے مرشد میں تجھ پر قربان

تو نے بنایا، میں نے بگاڑا تیرا پاکستان

اپنے وطن کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہم تو مٹ جائیں گے اے ارضِ وطن لیکن تجھ کو

زندہ رہنا ہے قیامت کی سَحر ہونے تک

عالی جی اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے۔ عالی جی کے لازوال قومی نغموں میں پاکستان سے محبت جھلکتی ہے، عالی جی نے ثابت کردیا کہ وہ صرف خواب نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کی تعبیر بھی کرتے تھے۔ عالی جی کے دل میں مکمل پاکستان بسا ہوا تھا۔ وہ پاکستان کو اپنے ساتھ لے کر چلا کرتے تھے عالی جی کے اس شعر پر بات کو ختم کروں گا۔

اب جو میرے بغیر انجمن آرائی ہے

لوگ کہتے ہیں کہ تم کو میری یاد آئی ہے

ایوان اردو میں بیاد جمیل الدین عالی کی تقریب رات گئے اختتام پزیر ہوئی۔ معراج جامی نے تمام مہمانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

وفاق اور سندھ، اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا

سندھ میں رینجرز کے اختیارات کے حوالے سے وفاق اور حکومت سندھ کے مابین کشیدگی شدت اختیار کر گئی ہے اب جب کہ وفاق نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے رینجرز کو مکمل اختیارات کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا ہے اور حکوم سندھ نے وفاق کے اس حکم نامے کو مسترد کر دیا۔ دونوں حکومتیں آمنے سامنے آچکی ہیں۔ اختلافات کوئی ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ بہت واضح ہیں۔ وفاقی وزیر اطلاعات کا یہ فرمانا کہ انہوں نے یعنی وفاق کے ساڑے تین پوائینٹ تسلیم کر لیے ہیں معاملا صرف آدھے پوائینٹ پر اختلاف کا ہے۔ اگر اس تشریح کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی صورت حال واضح نہیں ہوتی، دونوں فریقین کی جانب سے توپوں کے منہ ایک دوسرے کی جانب کھلے ہوئے ہیں۔ آگ کے گولے ایک دوسرے کی جانب پھینکے جا رہے ہیں۔ ایک جانب سندھ کے وزراء ہیں تو دوسری جانب وفاق کے وزیر داخلہ، یہ معاملا کیسے حل ہوگا اور رینجرز کے اختیارات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ کوئی ایک فریق بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں، ایک سیر تو دوسرا سوا سیر دکھائی دے رہا ہے۔

وفاق کی جانب سے وزیر داخلہ نے انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت مزید دو ماہ

کے لیے سندھ کی منتخب اسمبلی کی قرار داد کو پس پشت ڈالتے اور رینجرز کے اختیارات کو محدود کرنے کے اقدامات کو مسترد کرتے ہوئے رینجرز کو مکمل اختیارات کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ اس کا جواب جو ہونا تھا وہی ہوا حکومت سندھ نے وفاق کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ رینجرز کے اختیارات کے حوالے سے وفاق کی ہدایت پر عمل نہیں کر سکتے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما آصف علی زرداری نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وفاق نے سندھ پر حملہ کرکے آئین کو پامال کیا، سلسلہ جاری رہا تو قوم عدم استحکام اور بے یقینی کی دلدل میں پھنس جائیگی، عوام ان کوششوں کو مسترد کر دیں گے۔ کراچی آپریشن کے کپتان شاہ صاحب اعلان کر چکے 'ہم ڈرنے والے نہیں، کوئی صوبے پر آنکھ نہیں اٹھا سکتا، وزیر اعظم اپنے چودھری کو سندھ پر حملے سے روکیں'۔ قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ نے الزام لگایا کہ وفاق سندھ کے اختیارات چھین کر انہیں صوبائی حکومت کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ان بیانات کی معاملے کی شدت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ وزیروں کے بیانات کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ سندھ حکومت نے اس معاملے کو آئینی کہتے ہوئے اسمبلی میں قرار داد پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ اب سندھ کی حکومت قانونی راستہ اختیار کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اس لیے کہ سندھ حکومت یہ کہہ چکی ہے وفاق کی جانب سے رینجرز کو اختیارات کا دیا جانا آئین کی دفعہ 147 کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے برعکس وزیر داخلہ کا موقف یہ ہے کہ اسے

انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997 کے تحت اختیارات حاصل ہیں۔

وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے حالیہ دورہ کراچی میں سندھ کے وزیر اعلیٰ کو جو کہ کراچی میں ہونے والے آپریشن کے کپتان بنائے گئے تھے کو نو لفٹ کیا وہ سب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا، جب وزیر اعلیٰ نے میاں صاحب کی توجہ وفاق کی زیادتی پر دلائی تو انہوں نے صرف اس قدر کہا کہ اسلام آباد آجائیں بیٹھ کر بات کرلیں گے۔ میاں صاحب کا وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کو نو لفٹ کرنے کا اثر اس قدر ہوا کہ شاہ صاحب تقریب کی باقی کاروائی کو ادھورا چھوڑ کر سیدھے امراض قلب کے اسپتال پہنچ گئے۔ اس سے قبل شاہ صاحب نے جلدی جلدی میاں صاحب سے اس قدر ضرور کہا کہ وفاقی وزیر داخلہ صوبائی حکومت کے امور میں مداخلت کر رہے ہیں، آپ بھی ہماری نہیں سن رہے ، بتائیں ہم کیا کریں۔ ان مختصر باتوں پر میاں صاحب نے شاہ صاحب کو اسلام آباد آنے کا کہا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا کہ کراچی آپریشن انہوں نے شروع کیا وہ اسے ادھورا نہیں چھوڑیں گے۔ دہشت گردی کا خاتمہ اور کراچی میں مکمل بحالی امن ہمارا مشن ہے۔ تنازع کے دوران سندھ میں گورنر راج کی سن گن بھی موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ وفاق کے بعض وزیر اس کی سختی سے تردید کرچکے ہیں۔ وفاق کی جانب سے یہ انتہائی قدم ہوگا جس سے جمہوریت کو ہی نہیں بلکہ پورا سیاسی نظام اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ وزیر اعظم میاں نواز شریف کے سیاسی فیصلوں اور اب تک مختلف سیاسی اور

انتظامی معاملات کے حوالے سے انہوں نے جو حکمت عملی اپنائی ہے اس کے پیش نظر محسوس ہوتا ہے کہ وہ سندھ میں رینجرز کے اس گھمبیر اور بگڑے مسئلے کو بھی افہام و تفہیم سے حل کر لیں گے اور ملک سندھ کے حوالے سے خلفشار اور عدم استحکام ہونے سے محفوظ رہے گا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کراچی میں آپریشن کے نتیجے میں امن آیا ہے، سیاسی حکمت علمی اور تمام سیاسی جماعتوں کا کراچی آپریشن پر اتفاق خوش آئند بات ہے لیکن رینجرز کی دن رات کی محنت اور حکمت عملی سے کراچی کی رونقیں بحال ہوئیں ہیں، یہاں علمی، ادبی، سماجی فضاء یکسر بدل گئی ہے۔ایکسپو سینٹر میں کتاب میلے کا انعقاد، آرٹس کونسل میں ادبی میلے کا انعقاد، انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام تقریباً ہر ہفتہ ادبی نشست کا اہتمام اور دیگر علمی و ادبی محفلوں کا تسلسل کے ساتھ انعقاد کراچی میں امن و سکون کی علامت ہیں۔ دہشت گرد کاروائیوں میں بے انتہا کمی آئی ہے، اسٹریٹ کرائم، موبائل اسنیچنگ، بھتہ مافیا الغرض طرح طرح کے جرائم کو رینجرز اور پولس نے کنٹرول کیا۔ لوگ آزادانہ طور پر دن ہو یا رات مصروفیات نظر آتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں جو خوف اور ڈر تھا وہ بڑی حد تک جاتا رہا ہے۔ رینجرز کو اختیارات سندھ حکومت نے ہی دیے تھے، رینجرز کی اقدامات کو سندھ حکومت کی سطح پر سراہا گیا ہے۔پھر سندھ کے حکمرانوں میں یہ احساس کیوں

کرپیدہوگیا کہ رینجرز کے اختیارات کو محدود اور کچھ قدغن لگائی جائے۔ اس کے پیچھے کئی عوامل ہیں۔ ان میں اگر سو فیصد حقیقت نہیں تو کچھ کوتاہیاں ضرور ہیں جن کے باعث سندھ حکومت کو یہ احساس ہوتا گیا کہ صوبے میں کچھ ان کے خلاف یا ان کی مرضی کے بغیر ہو رہا ہے۔ اس کی بنیاد ڈاکٹر عاصم کی طویل گرفتاری ہے محسوس کی جارہی ہے جس نے اس معاملے کو گھمبیر بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر عاصم کی گرفتاری کوئی غیر معمولی واقع نہیں اس سے قبل بے شمار اہم لوگوں کو گرفتار کیا جاتا رہا ہے۔ خود آصف علی زرداری پابند سلاسل رہ چکے ہیں۔ رینجرز نے ڈاکٹر عاصم کو تین ماہ اپنی تحویل میں رکھا، جو الزامات سامنے آئے وہ اس قدر گھمبیر نہیں، یا تو ابھی کچھ ہے جس کی پردہ داری ہے والا معاملہ ہے۔ بصورت دیگر زمینوں کو رعایتی قیمت پر خرید لینا، کیمشین لینا، ملازمت دینا، اسپتال میں ان لوگوں کا علاج کرنا جن کو یہ حق حاصل نہیں تھا وغیر وغیرہ اور پھر ان کے خلاف دہشتگردوں کے سہولت کار کا مقدمہ درج کیا گیا۔ سندھ حکومت نے اس گرفتاری کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور ڈاکٹر عاصم کو کسی طرح بچانے کی ایسی تدابیر بھی کیں جو حکومتی سطح پر مناسب نہیں تھیں۔ اس عمل نے رینجرز اور وزارت داخلہ کو حکومت سندھ کے اقدامات کو مناسب نہ سمجھا اور وفاق اور حکومت سندھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔

وزیراعظم میاں نواز شریف نے شروع میں اس معاملے سے اپنے آپ کو الگ تھلگ

رکھا اور اپنے وزیروں کو بھی کھلی چھٹی دے دی کہ وہ سندھ حکومت کو خوب خوب سنائیں، لتاڑیں، تنقید کا نشانہ بنائیں ادھر سندھ حکومت کب پیچھے رہنے والی تھی اس کے وزیروں نے بھی اپنی توپوں کا منہ وفاق کے جانب کر دیا۔ حتیٰ کہ آصف علی زرداری نے دبئی میں بیٹھ کر سخت بیانات دیے، بلاول بھٹو زرداری نے ان سے بھی زیادہ سخت زبان استعمال کی۔ اس طرح معاملہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ وزیر اعظم کے حالیہ دورہ کراچی میں میاں صاحب نے صوبے کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا اس سے یہ احساس تقویت پا گیا کہ وفاق کی جانب سے اب تک جو کچھ سامنے آیا میاں صاحب کے علم میں سب کچھ تھا اور وہ خاموش تماشائی بنے رہے۔ اگر وہ تدبر سے کام لیتے ہوئے ابتداء ہی میں حکومت سندھ کو اعتماد میں لے لیتے، حکومت سے رابطہ کر لیتے، وزیر اعلیٰ کو اسلام آباد اسی طرح طلب کر لیتے جیسے اب انہوں نے دعوت دی اور اس موضوع پر گفت و شنید کی تو بات بگاڑ کی جانب نہ جاتی۔ وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ سے وزیر اعظم میاں نواز شریف کی ملاقات ہوئی، میاں صاحب نے شاہ صاحب کو تھپکی دی اور کہا کہ آپ کراچی آپریشن کے کپتان تھے، ہیں اور رہیں گے۔ کراچی آپریشن جاری رکھنے پر اتفاق ہوا جو ایک مثبت اقدام ہے، وفاق کا جاری کردہ اختیارات کا نوٹیفیکشن برقرار رہے گا، چودھری نثار کو ایک ہفتہ میں معاملا حل کرنے کی ہدایت کی۔ یہ ہے شاہ صاحب کی میاں صاحب سے ملاقات کا حاصل۔ چودھری نثار کو حکومت سندھ کے تحفظات کو دور کرنا ہوتا تو وہ رینجرز کی دو ماہ کے لیے

تعیناتی کا حکم نامہ جاری نہ کرتے، گفت و شنید کا باب شروع کر دیتے۔ لگتا یہ ہے کہ ٹال مٹول، لارے لپوں سے دو ماہ گزار لیے جائیں گے۔ اس کے بعد معاملہ اسی جگہ پر کھڑا ہو گا جہاں پر اب سے چند دن قبل تھا۔ مبہم اور غیر واضح صورت حال ہے۔

دونوں فریقین نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جانب کوئی ٹھوس اور قابل عمل نکات پر گفتگو نہیں کی۔ عوامی مفادات پر کوئی سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے اس اہم تنازع کا مستقل حل ضروری ہے۔

حکومت کی مفت علاج اسکیم

وفاقی حکومت کی جانب سے ملک کے غریب عوام کے لیے نیشنل ہیلتھ انشورنس پروگرام کا اعلان کیا جس کے تحت خط افلاس سے نیچے کی زندگی گزارنے والے افراد جن کی تعداد 32 لاکھ خاندان بتائی گئی ہے کو مفت میڈیکل کی سہولیات حکومت وقت کی جانب سے مہیا کی جائیں گی۔ بظاہر دیکھا جائے تو یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ شکر ہے حکومت کو غریبوں پر ٹیکس لگا کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے یا ٹیکس خسارہ پورا کرنے کے علاوہ بھی کچھ خیال آیا۔ وزیر اعظم میاں نواز شریف صاحب نے فرمایا کہ غریبوں کا علاج اب مفت ہوگا، انہیں گھر کی اشیاء فروخت کرنا نہیں پڑیں گی۔ یومیہ 200 روپے آمدن والے افراد کو قومی صحت کارڈ جاری کیا جائے گا، ہر خاندان کو سالانہ 3 لاکھ روپے تک علاج معالجہ کی سہولت حاصل ہوگی، علاج کی رقم تجاوز کرنے پر بیت المال مزید 3 لاکھ روپے دے گا۔ تفصیلات میں کہا گیا ہے سر دست اس اسکیم کا اطلاق 15 اضلاع میں ہوگا جسے بعد میں 23 تک بڑھا دیا جائے گا اور آگے چل کر اس کا اطلاق پورے ملک میں ہوگا اور جب یہ وقت آئے گا تو میاں صاحب کی حکومت کا مقررہ وقت اختتام کو پہنچ چکا ہوگا، اگر کوئی اور اقتدار آ گیا تو وہ اس اسکیم کو کھڈے لائن لگا دے گا۔ اس لیے کہ ہمارے ملک میں 68 سال سے یہی دستور چلا آرہا ہے۔ جو

بھی نیا حکمراں آتا ہے اپنے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو سرد خانے کی نظر کر دیتا ہے۔
اگر کوئی منصوبہ تکمیل کے مرحلے میں ہوتا ہے تو وہ اس پر اپنے نام کی تختی لگوا کر فیتا
کاٹ دیتا ہے۔

سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس وقت ایسے مزدور ہیں جن کی آمدنی یومیہ 200 روپے ہے، ہمارے ہاں کا مزدور کم سے کم 500 روپے سے کم نہیں لیتا، کیا کوئی سرکاری ادارہ ایسا ہے جہاں پر خاک روب کی تنخواہ 6000 روپے ہو۔ حکومت نے تو از خود کم سے کم ماہانہ 13000 ہزار روپے مزدوری مقرر کی ہوئی ہے۔ البتہ مکینک کی دکانوں، جنرل اسٹوروں، پنچر بنانے والی شاپس پر کام کرنے والے چائلڈ لیبر ایسے ضرور ہیں جن کو صرف 200 روپے یومیہ مزدوری دی جاتی ہوگی۔ گھروں میں کام کرنے والی ملازمائیں ہوسکتی ہیں جو 6000 روپے ماہانہ تنخواہ پر کام کرلیتی ہیں۔ حکومت Minimum Wages Ordinance 1961, اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ادا کیا جانے والے معاوضے سے مراد وہ اخراجات جو کسی بھی محنت کرنے والے کو ادا کیے جائیں ۔ یومیہ شرح وقت اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ موجودہ حکومت کے احکامات کے مطابق جس کا اطلاق یکم جولائی 2015ء سے ہوا کم سے کم محنت کا معاوضہ جو کسی بھی غیر ھنر مند اور چائلڈ لیبر جس کی عمر (14-17) سال کے درمیان ہوگی اس کا ماہانہ معاوضہ یا تنخواہ 13000 ہزار روپے ماہانہ ہوگی۔ اس کا اطلاق سندھ، پنجاب اور بلوچستان

میں ہوگا۔ خیبر پختونخواہ نے علیحدہ سے یومیہ شرح کا اعلان کیا جس کے مطابق کم سے کم اجرت 461.54 یومیہ اور کم سے کم ماہانہ اجرت 12000 روپے مقرر کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی وضاحت کے مطابق 8 گھنٹے روز مزدوری کرنے والے کی یومیہ مزدوری 500 روپے اور 26 یوم کام کرنے کی صورت میں اسے 13000 روپے ادا کیا جائے گا۔

یہ بات عقل و سمجھ سے بالاتر ہے کہ حکومت نے 200 روپے معاوضہ وصول کرنے والوں میں کون لوگ شامل ہیں۔ اگر بھیک مانگنے والوں کی آمدنی کا صحیح پتہ چل جائے تو وہ 200 یومیہ نہیں بلکہ 2000 یومیہ تک ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں حکومت کی جانب ایسے لوگوں کے لیے طبی مراعات کا اعلان کا فائدہ کس کو ہوگا نہیں معلوم؟

سرکاری اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کو جو حال ہمارے ملک میں ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ سرکاری ملازمین کے لیے سرکاری اسپتال ہی تو ہیں جہاں سے وہ اپنا اور اپنے خاندان کا علاج کرا سکتے ہیں۔ مشکل سے دو فیصد سرکاری ملازمین ادھر کا رخ کرتے ہوں گے۔ وہ لوگ جن کی آمدنی حکومت نے 200 روپے یومیہ بتائی ہے کو یہ سہولت سرکاری اسپتالوں سے ہی مہیا ہوں گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ حکومت اس رقم کو ملک میں قائم سرکاری اسپتالوں کی بہتری کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں اسپتال اور ڈسپنسریاں قائم کردیتی، ان میں مطلوبہ اہلیت کے طبی ماہرین فراہم کردیتی، تربیت یافتہ پیرامیڈیکل

اسٹاف مہیا کر دیا جاتا، دواؤں کی فراہمی کو یقینی بنا دیا جاتا، اسپتال میں موجود آپریشن تھیٹر کو جدید ساز و سامان سے آراستہ کر دیا جاتا، اسپتالوں میں غریب مریضوں کے ساتھ جو غیر اخلاقی، غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے اس پر خصوصی توجہ دے دی جاتی۔ ایسی صورت میں دو سو روپے یومیہ لینے والے ہی بلکہ پانچ سو روپے لینے والے اور سرکاری ملازمین بھی اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

نیشنل ہیلتھ انشورنس پالیسی کی افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان سہولیات کا مرکز اور منبع سرکاری اسپتال اور ڈاپنسریاں ہی ہوں گی، ان اسپتالوں کی، ڈپنسریوں کی حالت اس قدر ابتر ہے کہ اسکیم کے کامیاب ہونے کے آثار محدود نظر آرہے ہیں۔ وزیر مملکت سائرہ افضل تارڑ نے اس اسکیم کو دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد پروگرام قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ ملک کی پچاس فیصد آبادی جو علاج کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی استفادہ کر سکے گی۔کیا پاکستان کے 15 اضلاع کی آبادی پچاس فیصد ہے جو اس اسکیم سے مستفیض ہوگی؟ پاکستان میں تو 133 اضلاع ہیں۔ بلوچستان میں 27، خیبر پختونخواہ 24، پنجاب 35، سندھ 20، اسلام آباد 1، ٹرائیبل ایریا فاٹا 7، آزاد کشمیر 10 اور گلگت بلتستان میں 9 اضلاع ہیں۔ کس طرح آپ ملک کی پچاس فیصد آبادی کو اس اسکیم سے مستفیض کریں گے۔ اس اسکیم کے عمل درآمد اور اس کو ملکی سطح تک پھیلانے کی

عملی کوشش ضروری ہے بصورت دیگر دوسرے اضلاع میں احساس محرومی پھیل سکتا ہے۔ ساتھ ہی اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی ابتر حالت پر توجہ مرکوز کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اگر ملک میں جگہ جگہ اسپتال اور طبّی سہولیات کے مراکز قائم ہوں جہاں پر بلا تفریق رنگ و نسل، طبّی سہولیات مہیاں ہوں، حکومت کی جانب سے انتظامی امور میں سخت پالیسی پر عمل کیا جائے تو اس قسم کی اسکیمیں مفید ہو سکتی ہیں اور صحیح معنوں غریب و مستحق افراد کے لیے صحت جیسی نعمت کو برقرار رکھنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

وزیر اعظم صاحب نے اس پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائی طور پر دو صوبوں یعنی پنجاب اور بلوچستان کے 15 اضلاع کے 12 لاکھ خاندوں کو قومی صحت کارڈ جاری کیے جائیں گے۔ بعد ازاں ان میں مزید 8 اضلاع کے 20 لاکھ خاندانوں میں بتدریج اضافہ ہوگا۔ کل اضلاع ہوگئے 23 باقی 110 اضلاع نے کیا قصور کیا ہے۔ کیا یہ آپ کی سوتیلی اولادیں ہیں۔ وفاق کی جانب سے کسی بھی عوامی فلاح و بہبود کی کوئی بھی اسکیم ایسی صورت میں ہی مفید اور قابل عمل ہو سکتی ہے جب کہ اس کے ثمرات پورے پاکستان میں ظاہر ہوں۔ کسی ایک یا دو صوبوں تک محدود وہ بھی چند اضلاع تک اسکیم کو قومی اسکیم ہونے میں سوالات اٹھتے ہیں۔ وفاق جب بھی کوئی اسکیم بنائے اس کے پیش نظر پاکستان کا چپہ چپہ ہونا چاہیے ۔ یہ کہہ کر کہ ابھی چند کے لیے بعد میں اوروں کو بھی ملے گا۔

مناسب نہیں۔ کیا ہم اپنے گھر میں کوئی چیز لائیں اور اپنے چھ بچوں میں سے صرف دو کو دے کر یہ کہہ دیں کہ باقی کو دو ماہ بعد اور اس کے بعد باقی دو کو ایک سال بعد دیا جائے گا۔ یہ نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی ایسا کیا جانا چاہیے۔ وفاق کی حیثیت پاکستان کے سربراہ کی ہے، باپ کی ہے، اسے سب کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اسکیمیں تشکیل دینے والے یقینا نیچے کے لوگ ہوتے ہیں ان کے پیش نظر عوام کی اور حکومت کی حیثیت اور اس کے فوائد اور نقصانات پیش نظر نہیں ہوتے وہ تو اپنے باس کو خوش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مصالہ تیار کرکے پیش کر دیتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے پروگراموں کو آگے بڑھانے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لے کر پیش رفت کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غریب عوام کے لیے مفت علاج کی سہولت فراہم کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور اس کی ذمہ داری بھی اس نے صحت کے شعبہ میں یہ اسکیم متعارف کرا کے ایک مستحسن کام کیا ہے۔ خدا کرے کہ وزیر اعظم صاحب کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ یہ اسکیم صرف دو صوبوں تک محدود نہ رہے بلکہ دیگر صوبے اور علاقوں کے غریب عوام بھی اس سے مستفیض ہوں۔

ایک فیصد میں پانچ کروڑ۔ سودا برا نہیں

ایسا وزیر و خزانہ قسمت سے ملتا ہے جو ہر دم اس فکر میں رہتا ہو کس طرح غریبوں کو غریب اور امیروں کو امیر بنانے کی اسکیمیں متعارف کرائی جائیں؟ قرض کس طرح حاصل کیا جائے؟ اور پھر قرضوں کی ادائیگی کس طرح کی جائے۔ ابھی چند دن قبل قرضوں کی ادائیگی کے لیے 313 درآمدی اشیاء پر ریگولیٹری ڈیوٹی بڑھادی گئی۔ مقصد وزیر خزانہ نے یہ بیان کیا تھا کہ ایسا کرنے سے حکومت کا 40 ارب روپے ریونیو کا شارٹ فال پورا کرنے کی شرط کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ اشیاء کیا تھیں؟ دوبارہ عرض کر رہا ہوں ناشپاتی، امرود، آم، کینو، لیمو، چکوترا، سیب، کشمش، انار، کھجور، سبزیوں میں کھیرا، ٹماٹر، آلو، مٹر، لوبیا، دہی، مکھن، ڈیری مصنوعات، پنیر، کھویا، ڈبل روٹی، مشروبات، ٹوتھ پیسٹ، صابن، اچار اور اس طرز کی دیگر استعمال کی اشیاء شامل تھیں۔ تنقید ہوئی تو سب کے منہ یہ کہہ کر بند کردیے کہ اس کے اثرات غریب پر نہیں پڑیں گے۔ گویا غریب یہ اشیاء نہیں استعمال کرتا۔ مارے اور رونے بھی نہ دے والی مثال تھی۔ ابھی اس کارنامے کو چند دن ہی ہوئے تھے کہ پنشنرز کے لیے جاری کی جانے والی بہبود سیونگ سرٹیفیکیٹ پر منافع کی شرح کم کرنے کا اعلان فردیا ساتھ ہی یہ خاص جملہ کہ اس کا اثر غریب پر نہیں ہوگا۔ گویا

پینشنرز امیر کبیر ہوتے ہیں۔ ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکیٹ خرید کر طویل عرصہ اپنا پیشہ چار گنا کرنے والے امیر ہوتے ہیں، منافع پر کٹوتی صرف بہبود سیونگ اسکیم کے لیے تھی۔ اب ایمنسٹی اسکیم متعارف کرائی گئی ہے جس کے توسط سے کالا دھن سفید بنایا جاسکے گا۔ اس اسکیم کے مطابق ایک فیصد ٹیکس ادا کرکے پانچ کروڑ کا کالا دھن سفید کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے انکم ٹیکس ترمیمی بل 2016ء جو ہمارے وزیر خزانہ نے منتخب ایوان میں پیش کرکے موجودہ سال کا پہلا کارنامہ انجام دیا ہے۔

پہلے ٹیکس اکٹھا کرنے اور کالے دھن کو وائٹ کرنے کا جو طریقہ کار وزیر خزانہ نے بیان فرمایا ہے اس کی چیدہ چیدہ باتوں پر غور کر لیتے ہیں۔ تاکہ بات سمجھنے میں آسان ہوجائے۔ انکم ٹیکس ترمیمی بل 2016 کے مطابق ایک فیصد ٹیکس دے کر 5 کروڑ روپے کا کالا دھن سفید کرایا جاسکے گا۔ 31 جنوری 2016ء تک گوشوارے جمع کرانے پر گزشتہ چار سال کی آمدنی کا ذریعہ نہیں پوچھا جائے گا۔ سالانہ ٹیکس گوشواروں کے آڈٹ کی بھی چھوٹ حاصل ہوگی۔ 2016 سے 2018ء کے دوران ٹرن اوور پر ٹیکس ریٹس مختلف ہوں گے، فائلر بننے کے بعد ٹیکس کی شرح بتدریج کم ہوتی جائے گی۔ یہ بل دستور کے آرٹیکل 73 کے تحت مالیاتی بل انکم ٹیکس (ترمیمی) بل 2016ء پیش کہلائے گا۔

چیئرمین سینٹ میاں رضا ربانی نے یہ معاملہ متعلقہ کمیٹی کو بھجوادیا۔ کمیٹی تجاویز کا جائزہ لے کر اپنی شفارشات

پیش کر دے گی۔

پہلے تو دیکھنا یہ ہے کہ سینٹ میں اس بل کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے، کمیٹی اور پھر سینٹ کے اراکین نے کالے دھن کو کوڑیوں کے مول میں سفید کرنے کی وزیر خزانہ کی تجویز کو قبول کر لیا تو پھر تو وزیر خزانہ کی یہ خواہش پوری ہوسکے گی کہ سینٹ قومی اسمبلی کے لیے سفارشات مرتب کرے بصورت دیگراس بل کا بھی وہی حشر نہ ہو جو اس سے قبل اپوزیشن جماعتوں نے پی آئی اے کی نج کاری کے سلسلے میں صدارتی آرڈیننس کا کیا تھا۔ سنوائی ہے کہ ایمنسٹی اسکیم کے معاملے میں سینٹ میں موجود حزب اختلاف کی جماعتوں نے حکومت کو شرمندہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔تازہ ترین اطلاعات یہی ہیں۔ پی آئی اے کی نج کاری کی طرح اس بار حکومت نے صدارتی آرڈیننس کا سہارا لینے کے بجائے سینٹ کے ذریعہ اپنی اسکیم کو منظور کرانے کی حکمت علمی اپنائی ہے اور درست طریقہ بھی یہی ہے۔ اجلت کی صورت میں صدارتی آرڈیننس کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔پی آئی اے کی نج کاری کے معاملے پر حکومت کو سبکی اٹھانا پڑی تھی۔ تحریک انصاف کے چیئر میں ایمنسٹی اسکیم کو عمران خان نے اسکیم کو کالا دھن سفید کرنے کے لیے حکومتی پیشکش قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس بل کی سخت مخالفت کی جائے گی، پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے بھی اس بل کی مخالفت کی۔ جماعت اسلامی کے امیر بھی اس بل پر تنقید کر چکے ہیں۔ ممکن ہے ایم کیوایم بھی اسی راہ پر

چلے۔ ایسی صورت حال میں نظر یہی آرہا ہے کہ مخالفین خاص طور پر سندھ سے تعلق رکھنے والے حزب مخالف کے اراکین نے سندھ میں رینجرز کے معاملے کا بدلہ سینٹ میں لینے کی حکمت عملی اپنالی ہے۔ حکومت نے سندھ حکومت کے تحفظات کو پس پشت ڈال کر وزیر داخلہ نے رینجرز کو تمام تر سابقہ اختیارات کے ساتھ دو ماہ کی توسیع کا نوٹیفکیشن جاری کردیا تھا۔ پیپلز پارٹی اور ایک کیو ایم کے دلوں میں وفاق کے اس اقدام کی پرخاش موجود ہے۔ سینٹ میں دیگر جماعتیں بھی حکومت مخالفت میں ایک ہوجاتی ہیں جس کے باعث حکومت کو سینٹ میں اپنی من مانی کرنا تو دور کی بات ہے اسے سبکی سر ہونا پڑ رہا ہے۔

حکومت کی جانب سے ٹیکس ریلیف اسکیم کو ملک کی معیشت کو استحکام دینے کی حکمت عملی قرار دیا جارہا ہے۔ ٹیکس نیٹ میں اضافے کا باعث قرار دیا جارہا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کے بے شمار ممالک میں کالے دھن کو سفید کرنے کی اس قسم کی اسکیموں کا اعلان کیا جاتا رہا ہے، ہمارے پڑوسی ملک میں بھی کئی بار اس قسم کی اسکیموں کا اعلان ہوچکا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، ہماری روایات اور قدریں مختلف ہیں۔ ان اسکیموں کا بنیادی فلسفہ یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے ناجائز طریقے سے، لوٹ مار سے، جائز و ناجائز طریقے سے دولت جمع کر لی ہے وہ اگر چاہیں تو اس ناجائز دولت کا کچھ حصہ حکومت کو ادا کرکے اپنی غیر قانونی دولت کو قانونی بنا

لیں۔ یہ گویا ٹیکس چوروں کے لیے عام معافی کا اعلان ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں اس عمل سے حکومت کو کچھ نہ کچھ رقم ضرور قومی خزانے کے لیے مل جاتی ہے، ٹیکس نیت ورک میں بھی اضافہ ہوتا ہے لیکن وہ حکومتیں جو اپنی معیشت کو استحکام دینے میں ناکام ہو جاتی ہیں، ٹیکس نیٹ ورک میں کسی طرح اضافہ نہیں ہو رہا ہوتا، ملک کے سرمایہ کاروں، تاجروں کا اعتماد حکومت پر سے اٹھ جاتا ہے، وہ کسی طور بھی سرمایا کاری میں دلچسپی نہیں لیتے ایسی صورت حال میں ایمنسٹی اسکیم جیسے اقدامات کے ذریعہ کوشش کی جاتی ہے معیشت کو استحکام دینے کی، ٹیکس نیٹ میں کسی طرح اضافہ کرنے کی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پاکستانی ماہرین معیشت خواہ ملک کے اندر ہوں یا بیرون ملک کے تعاون سے چوروں ، لٹیروں ، کالا دھن جمع کرنے والوں کے بجائے ایسی اسکیمیں تشکیل دلوائے جو ہماری روایات، وقار اور باعزت ہوں جن سے ملکی معیشت کو استحکام مل سکے۔ وزیر خزانہ کی صلاحیتں دو سالوں کے اقدامات سے واضح ہو چکی ہیں۔ ملک قرضوں پر چلایا جا رہا ہے۔ ٹیکس پر ٹیکس لگا کر خسارہ پورا کیا جا رہا ہے کوئی بھی ٹھوس اور ایسا اقدام سامنے نہیں آیا جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ اب نہیں تو کچھ عرصہ میں ہماری معیشت مستحکم ہو جائے گی۔ پاکستان اپنے وسائل پر انحصار کرنے کی حکمت علمی پر چل پڑے گا۔ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کی اس بات میں وزن ہے کہ ’ معیشت

مستحکم ہو تو ملک اور فوج مضبوط ہوگی'، لیکن معیشت کس طرح مضبوط ہوگی، ایمنسٹی اسکیم کے ذریعہ، کالے دھن کو کوڑیوں کے عوض سفید کرنے سے نہیں۔ ہر گز نہیں اس قسم کی اسکیمیں عارضی اقدامات ہوا کرتے ہیں ان سے ملک کی معیشت مستحکم نہیں ہوگی، بھلا چوری کے پیسے سے، ناجائز ذرائع سے جمع شدہ پیسہ برکت کا باعث ہوگا، استحکام کا باعث ہوگا، کالے دھن کو سفید کرنے کا یہ طریقہ چوروں کو، لٹیروں کو خوش کرنے کی تدبیر کہی جاسکتی ہے۔ ملکی معیشت کے استحکام کا باعث مشکل ہی سے ہوگی۔ سرمایہ کاری بورڈ کے چیرٔ میں ڈاکٹر مفتاح اسماعیل نے اس اسکیم کے بارے میں فرمایا کہ وزیر اعظم کی اعلان کردہ اسکیم سے ملک کے ذمہ دار شہری ٹیکس کے دائرہ کار میں آئیں گے'۔ بہت خوب جنھوں نے کالا دھن جمع کیا، ٹیکس چوری کیا وہ ملک کے ذمہ دار شہری ہوئے۔ اسی طرح فیڈریشن آف پاکستان چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے ایک سابق عہدیدار نے اس اسکیم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تاجر برادری طویل عرصے سے کسی رعایتی اسکیم کا انتظار کر رہی تھی، انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ یہ اسکیم تاجر برادری کی مشاورت سے مرتب کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تاجر برادری ملک کی سب سے بڑی ٹیکس دہندہ آبادی ہے جو قومی خزانے کو سالانہ اربوں کی ادائیگی کرتی ہے۔ یہ بات واقعی قابل قدر ہے کہ ہمارے ملک کا تاجر طبقہ قومی خزانے میں کروڑوں جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر تاجر حضرات پہلے ہی ٹیکس ادا کر رہے ہیں تو انہیں کیا ضرورت پڑی ایمنسٹی اسکیم کی۔ کالے دھن کو سفید

کرنے والی اسکیم اور رعایت کی۔ جو تاجر ایمانداری سے ٹیکس ادا کر رہے ہیں وہ قابل احترام ہیں اور ملکی معیشت کے استحکام میں ان کا اہم کردار ہے۔ اگر تاجروں کو رعایت ہی درکار ہے تو بہت سی ریاعتیں ہو سکتی ہیں جو تاجروں کو دی جا سکتی ہیں۔ یہ اسکیم صرف ایسے تاجروں کے لیے مفید اور کارآمد ہی جنہوں نے ٹیکس ادا نہیں کیا، دولت پہ دولت بناتے چلے گئے، دولت کا رکھنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، چھپانا مشکل ہو جاتا ہے اب انہیں اس قسم کی ریاعت درکار ہوتی ہے اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کی، اس سے انہیں تو بے پناہ فائدہ ہوتا ہے جب کہ حکومت کو اونٹ کے منہ میں زیرہ والی کیفیت ہوتی ہے۔ حکومت کی ٹیکس ریلیف اسکیم سے کالا دھن رکھنے والوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے، ایسا موقع کبھی کبھی ملتا ہے۔ صرف ایک فیصد میں 5 کروڑ سودا برا نہیں۔

سعودی ایران تنازع اور پاکستان کی حکمت عملی

سعودی عرب اور ایران کے درمیان تنازع اس وقت شدت اختیار کر گیا جب سعودی عرب کے 12 شہروں میں 47 دہشت گردوں کے سر قلم کر دیئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ افراد 2003ء سے 2006ء کی درمیانی مدت میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات میں ملوث تھے، سعودی ایجنسی کا کہنا ہے کہ زیادہ تر کا تعلق دہشت گرد تنظیم سے تھا۔ ان 47 افراد میں شیعہ مبلغ شیخ نمر الباقر النمر اور فارس الشویل بھی شامل تھے۔ ان میں سے تمام کا تعلق سعودی عرب ہی سے تھا ماسوائے دو کے جو مصر اور چاڈ کے شہری تھے۔ شیخ نمر الباقر النمر جو سعودی عرب کے معروف عالم تھے اور شیعہ عقائد رکھتے تھے کو سزائے موت دیے جانے کے خلاف ایران نے سخت موقف اختیار کیا، ایران میں مشتعل مظاہرین نے سعودی مشن پر دھاوا بول دیا پیٹرول بموں سے حملے کیے اور فرنیچر و عمارت کو آگ لگا دی۔ ایران کے صدر روحانی نے گو ان حملوں کی مذمت کی لیکن ساتھ ہی سعودی عرب کے اس عمل پر احتجاج بھی کیا۔ ایران میں ہونے والے ان واقعات کا رد عمل یہ ہوا کہ سعودی عرب نے ایرانی سفارتی اہل کاروں کو ملک چھوڑنے کا فوری حکم دیدیا۔ ایران سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے، تمام پروازیں اور تجارت بھی معطل کر دی گئی، دونوں ممالک کے درمیان سخت کشید اختیار کر گئی۔ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے دونوں اسلامی ملکوں کے درمیان

ہونے والے اس تنازع میں بعض اسلامی ممالک بھی فریق بن گئے۔ کسی ملک میں ایران کے خلاف احتجاج ہوا تو کسی ملک میں سعودی عرب کے خلاف۔ بغداد میں ریاض کے سفارتی مشن پر راکٹ حملہ ہوا، بحرین میں بھی مظاہرین نے خوب احتجاج کیا اور سفارت خانے کو جلانے کے عمل کو بزدلانہ اقدام قرار دیا۔ متحدہ عرب امارات نے واقعہ پر احتجاج کرتے ہوئے ایران سے اپنے سفارتی تعلقات محدود کرنے کا اعلان کر دیا۔ بحرین، سوڈان اور کویت نے بھی ایران سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ دوسری جانب ایران کی حمایت میں عراق کے کئی شہروں میں مظاہرے کیے گئے۔ تاہم سعودی عرب نے ایران سے تمام طرح کے تعلقات منقطع کر لیے لیکن ایرانی زائرین پر سعودی عرب آنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ تنازع شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ باوجود اس کے کہ دنیا کی بڑی طاقتوں امریکہ، چین، جرمنی، فرانس، یورپی یونین کے علاوہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بانکی مون نے بھی دونوں فریقوں کے درمیان ہونے والی کشیدگی پر تشویش کا اظہار کیا اور دیگر اسلامی ممالک کو دونوں کے درمیان کشیدگی ختم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی درخواست بھی کی۔ عرب لیگ کا اجلاس بھی طلب کر لیا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا کردار ادا کرتا ہے۔

پاکستان دنیا کی ایک اہم اسلامی مملکت ہے۔ دنیائے اسلام کی دو اہم ریاستوں سعودی عرب اور ایران کے مابین ہونے والی کشیدگی اور سفارتی بحران میں

پاکستان کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اس کے حوالے سے مختلف آرا، تجاویز، مشورے منظر عام پر آرہے ہیں۔ سعودی عرب سے پاکستان کی قربت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ سعودی سرزمین سے پاکستان کے تعلقات سات سمندروں سے بھی بڑھ کر ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ سعودی عرب پاکستانی مسلمانوں کا روحانی مرکز و منبع ہے۔درحقیقت پاکستانی مسلمانوں کا جسم پاکستان میں ضرور ہے لیکن یہاں کے ایک ایک مسلمان کی روح تو مکہ اور مدینہ میں ہے۔ پاکستانی عوام کسی بھی اعتبار سے ، کسی بھی مرحلے پر سعودی عرب پر اٹھنے والی انگلی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔دوسری جانب ایران پاکستان کا اہم اسلامی پڑوسی ملک ہی نہیں بلکہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان خصوصی عقائد کا رشتہ نازک صورت حال لیے ہوئے ہے۔ فقہی و مسلکی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے لیکن دونوں ممالک کے مسلمانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔پاکستان دونوں کے لیے اہم ہے اور دونوں پاکستان کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ایک سے روح کا رشتہ ہے تو دوسرے سے جسمانی تعلق ہے۔ پاکستان نہ تو سعودی عرب کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی ایران سے تعلق ختم کر سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں پاکستان کو انتہائی محتاط اور دانائی کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی پوزیشن کو بین بین رکھنا ہوگا۔ اس صورت حال میں پاکستان کا کردار ایک ثالث کا ہونا چاہیے ، پاکستان اس پوزیشن میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کو ، ہمدردوں کو، سرپرستوں کو، اپنے چاہنے والوں کو مذاکرات کی میز پر لے آئے۔

دنیا کے بعض ممالک نے پاکستان کو اشاروں کناروں میں اس کردار کو ادا کرنے کی جانب اشارہ بھی کیا، کیوں کہ وہ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تجزیہ کاروں، کالم نگاروں کی اکثریت کی بھی یہی رائے ہے کہ پاکستان ہی دونوں فریقین کے مابین ثالثی کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ابتداء کس طرح ہو؟ کیا دونوں فریق از خود اس خواہش کا اظہار کریں گے، ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا بلکہ پاکستان کو از خود اس کا اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ وہ اپنے ان دونوں عزیز ترین مسلمان ملکوں اور دوستوں کے درمیان پیدا ہو جانے والی غلط فہمی کو دور کرانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کو تیار ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک بھی پاکستان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیتا یا انکار کر دیتا تو پھر کوئی اور صورت ہوتی۔ یہ تجویز مناسب نہیں کہ پاکستان دونوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دینے کا اعلان کر دے اور اگر ایسا ہوگا، جو کہ نہیں ہوگا وہ ملک سعودی عرب ہی ہو سکتا ہے، یہ بھی مناسب نہیں اور نہ ہی عقلمندی کا تقاضہ ہے کہ پاکستان خاموش تماشائی بن جائے، جو چاہیں دونوں کریں۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کی حیثیت خطہ میں ایسی نہیں کہ وہ یہ صورت اختیار کرے۔ اب صرف اور صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ پاکستان کے حکمراں تدبر کے ساتھ، حکمت کے ساتھ، دانائی کے ساتھ دونوں دوست ممالک کو اس صورت حال سے باہر نکالنے کی حکمت عملی اپنائیں، وزرائے خارجہ کی سطح پر یا اس سے نیچے کی سطح پر وفد بھیجے، پیغامات بھیجنے کا وقت نہیں اولین فرصت

میں وزیراعظم پاکستان پہلے سعودی عرب کا ہنگامی دورہ کریں، سعودی حکمراں پاکستان سے محبت کرتے ہیں، ان کے قدر داں بھی ہیں، میاں صاحب کے ذاتی مراسم بھی سعودی حکمرانوں سے ہیں امید ہے کہ سعودی فرمارواں، میاں صاحب کو مایوس نہیں کریں گے، مثبت جواب کی صورت میں وہ تہران تشریف لے جائیں اور اپنے ایرانی دوست ملک کے سربراہان کو بھی افہام و تفہیم کے ساتھ اس اہم اور نازک مسئلہ کو کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ کوشش کرنے میں کوئی قباحت نہیں، کامیابی کی صورت میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ سب کے سامنے ہے۔ ناکامی کی صورت میں بھی آپ کے بلند کردار کی تعریف و توسیف ہوگی۔

پاکستان کی تاریخ اتحاد و اتفاق، دوستی اور صلاح جوئی کی رہی ہے۔ بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے اسلامی ممالک کے درمیان اتحاد و اتفاق کا درس دیا، شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری سے ہیں یہی پیغام ملتا ہے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم کے قیام میں پاکستان کا کلیدی کردار ہے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم بھی اس تنازع میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پاکستان کا کردار ہر اعتبار سے مثبت نظر آرہا ہے۔ کامیابی کے قوی امکانات موجود ہیں۔ سعودی وزیر خارجہ فوری پاکستان تشریف لائے۔ ان کا یہ عمل کیا اشارہ دیتا ہے۔ چار شعبوں میں 34 ملکی اتحاد سے تعاون کی یقین دہانی وزیر خارجہ کو کرائی گئی۔ گویا پاکستان بالواسطہ اس اتحاد کا حصہ تو بن ہی گیا۔ ایران اور

سعودی عرب کے درمیان کشیدگی کو اگر جلد از جلد ختم کرنے کا سلسلہ شروع نہ ہوا تو یہ تنازع ایک ایسی آگ کی شکل اختیار کرلے گا جسے بجھانا شاید کسی کے اختیار میں بھی نہ رہے اور یہ بھی کہ اس آگ میں صرف یہ دو ممالک ہی نہیں جلیں گے بلکہ یہ آگ کئی اسلامی ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ مسلمان تو پہلے ہی دہشت گردی کا شکار ہیں، مغرب انہیں دہشت گرد کے طور پر پیش کرنے کی پوری کوشش میں ہے۔ اسلامی ملکوں کی اقوام متحدہ کا خواب تو شاید کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ساری دنیا میں اور زیادہ رسوا ہوں گے۔ جگ ہنسائی ہوگی، مسلم قوت کا شیرازہ بکھر جائے گا، کمزور سے کمزور ملک مسلم ممالک کو زیر کرنے کی سوچیں گے۔ بڑی طاقتیں تو پہلے ہی سے تیار بیٹھی ہیں کہ انہیں جوں ہی موقع ملے مسلمانوں کو رسوا کرنے کا، ان کا شیرازہ بکھیرنے کا وہ اپنی اولین فرصت میں اپنا مقصد پورا کریں۔ ان ممالک کو بھی سوچنا چاہیے جنھوں نے دونوں فریقین میں سے کسی ایک کی حمایت میں اس کا ساتھ دینے کا اعلان کردیا، ایسا کرکے انھوں نے کسی ایک فریق کی آشیرباد تو حاصل کرلی لیکن مسلمانوں کے بڑے نقصان کی فکر نہیں کی۔ اس زمانے میں جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں، ایسی بے شمار مثالیں دنیا میں موجود ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد مسئلے کا حل مذاکرات کی میز پر ہی نکالا گیا۔ پاکستان اور بھارت کی مثال موجود ہے دونوں کو جنگوں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سعودی عرب اور ایران بھی تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے تمام تنازعات کو گفت وشنید سے حل

کرنے کی کوشش کریں اسی میں دونوں ممالک کے عوام کی بھلائی ہے۔

'ایوانِ اردو کے زیر اہتمام 'بیاد جمیل الدین عالی

جمیل الدین عالی اردو زبان و ادب کا نقصانِ عظیم ہے۔ عالی جی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ، کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے شرشار، مستقل کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا ولولہ لیے ہوئے تھے۔ علمی، ادبی، سماجی، فکری، تہذیبی حوالوں سے عالی جی کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمی و ادبی سرمایے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو، رائیٹرز گلڈ ان کی زندگی کے ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ جو انہیں مدتوں زندہ رکھیں گے۔ عالی جی کے لکھے ہوئے ملی نغمے ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے عالی جی کی کاوشیں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے علاوہ مختلف اداروں کی جانب سے عالی جی کی یاد میں تعزیتی اجلاسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری ہے۔ عالی جی کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات اس بات تقاضہ کرتی ہیں کہ ان کی انہیں خراج عقیدت پیش کیا جائے اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کو روشناس کرایا جائے۔

ایوانِ اردو ایک قدیم ادارہ ہے جس کے بانی ڈاکٹر حمید الدین شاہد مرحوم تھے۔

جب تک ڈاکٹر شاہد حیات رہے ایوانِ اردو ادبی و علمی سرگرمیوں کے حوالے سے فعال رہا۔ ڈاکٹر شاہد نے اپنے گھر 43 بلاک بی، فرید الدین بقائی روڈ ناظم آباد کا نام ہی ایوانِ اردو' رکھ لیا تھا اور آج بھی اس گھر پر ایوانِ اردو کی تختی آویزاں ہے۔ ڈاکٹر' حمید الدی شاہد کے فرزند ار ڈاکٹر خرم حمید جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں نے عالی جی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بیادِ جمیل الدین عالی کا اہتمام اپنی رہائش گاہ پر،بروز ہفتہ دسمبر بعد مغرب کیا۔ اس تقریب کے روح رواں جناب محمود عزیز صاحب تھے۔ وہ 26 ایوان اردو کے معتمد اعزازی بھی ہیں۔ محمود عزیز صاحب انجمن ترقی اردو میں باقاعدہ حاضری دینے والوں میں سے ہیں، لکھنا، پڑھنا، لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور علمی وادبی موضوعات پر خوبصورت انداز سے گفتگو کرنا اور معلومات فراہم کرنا ان کے پسندیدہ مشاغل میں سے ہیں۔ راقم سے محمود عزیز صاحب سے تعلق کا ذریعہ انجمن ترقی اردو میں نشست اور انجمن کے زیر اہتمام ہونے والے ادبی پروگرام ہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو گلشن اقبال نے مجھے کئ ادبی شخصیات سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ انجمن وسیلہ بنی متعدد علمی وادبی شخصیات سے قربت کی روستی کا۔ ان میں سے ایک محمود عزیز صاحب بھی ہیں۔ ان کی شخصیت میں پوشیدہ خصوصیات پر سے کیسی اور وقت پردہ اٹھاؤں گا۔ محمود عزیز صاحب مختلف رسائل جیسے بقائی نیوز، سب رس، ابجد، تکبیر اور دیگر ادبی و علمی رسائل سے قلمی تعاون کرتے رہے ہیں، روزنامہ مقدمہ میں بھی ادبی صفحہ مرتب کر چکے ہیں،

مجھے خوشی ہے کہ محمود عزیز جیسا ہمدرد دوست عمر کے آخری حصہ میں میسر آیا۔ سر دست ان کے لیے یہ شعر پیش خدمت ہے۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

فاصلہ کچھ نہیں تیرے در تک زندگی راستے میں پڑتی ہے

عالی جی کے رخصت ہو جانے کے بعد میں نے اپنی اولین فرصت میں انہیں خراج تحسین پیش کیا اور میرا کالم روز نامہ 'جناح' میں 25 نومبر کو شائع ہوا۔ عالی جی سے میرا روحانی علمی و ادبی تعلق تھا، یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ عالی جی کی سانسوں کا سفر اختتام پذیر ہو چکا ہے، ان کی تدفین صبح عمل میں آئے گی، میں نے وہ رات آنکھوں میں کاٹی اور انہیں خراج تحسین پیش کر کے سویا، یہی خراج عقیدت دوسرے دن روز نامہ 'جناح' میں شائع ہوا۔ ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا عالی جی کے حوالے سے کہیں نہ کہیں تعزیتی نشستیں منعقد ہو رہی ہیں اور ان کی یادوں کے دیے جلائے جا رہے ہیں۔ چند روز قبل جب ہم انجمن کے کتب خانے میں حسب معمول موجود تھے عزیز صاحب نے فرمایا کہ وہ بھی عالی جی کو خراج تحسین پیش کرنے کے سلسلے میں کوئی تعزیتی اجلاس منعقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور مجھے اس تقریب میں عالی جی پر کچھ کہنا ہوگا۔ چند دن بعد عزیز صاحب نے تقریب کی تاریخ اور جگہ کے لیے فون پر اطلاع دی اور تقریب گاہ کا ایڈریس میسج بھی کر دیا۔ طے پایا کہ وہ میرے ہمراہ چلیں

گے۔ تقریب شام میں تھی ، اسی روز صبح میں انجمن ترقی اردو میں صادقین کی مصوری اور رباعیات پر ڈاکٹر سلمان احمد (بانی صادقین فاؤنڈیشن ، امریکہ) سے گفتگو کا پروگرام بھی تھا۔ محمود عزیز صاحب سے طے ہوا کہ ہم بعد نماز عصر ان کے دولت کدے پر پہنچ جائیں گے اور پھر وہاں سے ہمارا سفر تقریب گاہ کے لیے شروع ہوگا۔ ایسا ہی ہوا، ہم وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ محمود عزیز صاحب کے گھر دو احباب اور بھی تھے وہ بھی شریک سفر ہوئے۔ محمود عزیز صاحب تقریب کو کامیاب بنانے میں مستعد و متحریک نظر آرہے تھے، کبھی خود فون کرتے اور کبھی ان کے پاس فون آجاتا۔ کہنے لگے کہ النساء چلیے ہم نے ان کے حکم کی تعمیل میں گاڑی النساء کی جانب دوڑادی۔ وہاں پہنچ کر فرمایا، معراج جامی آرہے ہیں، ابھی ان کا نام ہی لیا تھا کہ وہ النساء کے گیٹ کے سامنے موجود تھے ، معراج جامی ہمیں دیکھ کر اور ہم انہیں دیکھ کر کھل اٹھے۔ ہماری کیفیت مومنؔ کے اس شعر کی سی تھی ۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

یہاں سے محمود عزیز صاحب نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ان کی نشست پر معراج جامی آگئے ، پہلے ہی کیا کم خوش بختی تھی اب ایک اور ادیب و شاعر ہمارے دائیں جانب مسکرامسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ عزیز صاحب نے فرمایا کہ وہ

یہاں سے ٹیکسی میں دو دوستوں کے ساتھ تقریب گاہ جائیں گے ۔ ہم اب چلے معراج جامی کی سرپرستی میں تقریب گاہ۔ فوٹو گرافر صاحب کا بہت انتظار کیا گلشن چورنگی پر وہ کہیں کے کہیں چلے گئے بعد میں انہوں نے فون پر فرمایا کہ آپ جائیں میں خود آجاؤں گا۔ پروگرام کا آغاز چھ بجے ہونا تھا، اس وقت ہم گلشن چورنگی پر تھے۔ کراچی میں یہ وقت ٹریفک کی روانی کے اعتبار سے انتہائی گھمبیر ہوتا، پانچ منٹ کا فاصلہ تیس منٹ میں طے ہو پاتا ہے۔ تقریب گاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم ہی لیٹ لطیف نہ تھے اوروں کا بھی یہی حال ہے، پنڈال خالی ہی تھا، آنے والے ٹریفک میں پھنسے ہوئے تھے۔ انجمن کی معتمد اعزازی ڈاکٹر فاطمہ حسن کسی طرح پہنچ گئیں۔ البتہ راجو جمیل صاحب جنہیں آج کی تقریب کی صدارت کرنا تھا تقریب میں نہ پہنچ سکے۔ منتظمین نے ڈاکٹر فاطمہ حسن کی سربراہی میں تقریب کا آغاز کیا اور کرنا بھی چاہیے تھا۔ محمود عزیز صاحب نے تقریب کے آغاز میں چند باتیں کیں اور فرمایا کہ بقیہ کاروائی معراج جامی صاحب سرانجام دیں گے۔ جامی صاحب نے اپنی مسحور کن مسکراہٹ، دلفریب اندازِ گفتگو کے ساتھ کاروائی کا غاز کیا، تلاوت وکلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن صاحبہ
کو مسندِ صدارت عطا کی گئی۔ مجھے بھی دعوت دی گئی کہ میں بھی اسٹیج پر پہنچوں، تقریب میں گفتگو تو کئی بڑوں کو کرنا تھی جن میں عالی جی کے بیٹے راجو جمیل اور پروفیسر سحر انصاری و دیگر شامل تھے لیکن وہ صاحبان بہ وجوہ نہ پہنچ سکے، چنانچہ تقریب کے مرکزی مقرر ہم ہی قرار

پائے۔ اس کے لیے ہم بالکل بھی تیار نہ تھے۔ یہ محبت تھی محمود عزیز صاحب کی، انہوں نے عزت افزائی کی۔ حالانکہ میں نے کافی دیر ہو جانے کے باعث معراج جامی صاحب سے درخواست کی کہ تقریب کو مختصر کر دیجئے اور چاہیں تو مجھے نہ بلوائیں۔ جس پر جامی صاحب نے کڑا سا جواب دیتے ہوئے فرمایا جی نہیں آپ ضرور بولیں گے۔ خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔

تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ معراج جامی صاحب نے عالی جی کی یاد میں ہونے والی تقریب کے حوالے سے خوبصورت جملوں سے بات کو آگے بڑھایا اور باری باری مقررین کو بلاتے رہے۔ بیچ بیچ میں عالی جی کے حوالے سے شعر بھی سناتے رہے۔ قائدہ بھی ہے، احترام کے پیش نظر مقررین جونیئر مقررین کو پہلے بلوایا جاتا ہے لیکن جب اس تقریب کی روداد مرتب کی جاتی ہے تو اس ترتیب کو احترام و عزت کے پیش نظر بدل دیا جاتا ہے۔ یعنی اول صدر محفل کی باتوں کو پیش کیا جاتا ہے پھر دیگر مقررین کی باتوں کو تحریر میں لایا جاتا ہے۔ سو یہاں بھی اسی قائدے اور احترام کو ہی ملحوظِ خاطر رکھا جا رہا ہے۔

انجمن ترقی اردو کی اعزازی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن نے صدارتی خطاب میں عالی سے اپنی وابستگی کا ذکر کیا، عالی جی نے اپنی زندگی میں جو ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈال دی ہے اس کی تفصیل بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ عالی جی اپنی

تحریروں کے حوالے سے ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے۔ انجمن ایک باوقار اور مضبوط ادارہ ہے جس کی انہوں نے آبیاری کی اور یہ اپنی جگہ پر مستحکم ہے، اسے برقرار رکھنا اب ہماری ذمہ داری ہے۔ان کا کہنا تھا کہ عالی جی ایک غیر معمولی نابغہ شخصیت تھے، شاعری کے ساتھ ان کی توجہ اداروں کے ساتھ شخصیات پر بھی مرکوز رہی۔ انہوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی انہوں نے کہا کہ عالیؔجی نے مجھے اس اہم قومی ورثے کی ذمے داری سونپی اب کی رحلت نے مجھے دکھ کا گہرا احساس دیا، وہیں اس ذمے داری کے بوجھ کو بڑھا دیا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن نے کہا کہ عالی جی نے اردو کو دوہے کی صنف سے مالا مال کیا،پھران کے دوہے پڑھنے کا انداز لحن سونے پہ سہاگہ تھا۔ یہ عطائے تخلیق نعمت ہے۔ وطن سے محبت عالی جی کے نغموں میں آہنگ کی طرح رچی بسی ہے۔ ان کا نغمہ جیوے جیوے پاکستان'' پاکستان کے ساتھ امر رہے گا۔ پھر ''اے وطن کے سجیلے جوانوں میرے نغمے تمہارے لیے ہیں'' لکھا تھا، آج بھی یہ قومی نغمہ دلوں میں وہی جذبے جگا دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالی جی نے بابائے اردو مولودی عبدالحق کے مشن کو جاری رکھا، انجمن کے ماقاصد کی تکمیل کریت ہوئے اردو یونیورسٹی کے خواب کو خیال سے حقیقت تک پہنچایا۔ عالیؔجی کا نام وطن، انجمن اور ادب کے روشن حوالوں کے ساتھ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

آرکیٹیکٹ جناب حیات رضوی امروہوی جو 'عمارت کار' کے مدیر بھی ہیں نے اظہار خیال کرتے ہوئے عالی جی سے اپنے مراسم کی تفصیل بیان کی انہوں بتایا کہ ایک دن عالی جی کا فون آیا، ان کی آواز سن کر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، خوشی کا احساس اپنی حدوں کو چھو رہا تھا، فرمایا کہ مجھ سے ملو، میں نے کہا کہ کب کہنے لگے ابھی آجاؤ، میں اسی وقت ان کے پاس گیا، کہنے لگے کہ انجمن ترقی اردو کی عمارت 'اردو باغ' کا نقشہ تیار کرنا ہے میں نے خوشی سے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور مجھے فخر ہے کہ اردو باغ کا ڈیزائن میں نے عالی جی کی فرمائش پر تیار کیا۔ یہ عمارت تکمیل کے مراحل میں ہے۔
تقریب کے پہلے مقرر محمد زبیر کا تعلق انجمن ترقی اردو کے کتب خانے سے ہے وہ گزشتہ آٹھ سال سے عالی جی کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عالی جی کی زندگی کے آخری ایام میں محمد زبیر ان کے قریب رہے، خدمت کی، خیال رکھا، جو ادبی کام عالی جی ان سے کرانا چاہتے تھے ان میں معاونت کرتے رہے۔ ان کی حیثیت عالی جی کے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ اہم رکن کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ عالی جی کے انتقال، تدفین اور دیگر معلومات فراہم کرنے میں بھی محمد زبیر پیش پیش رہے۔ محمد زبیر کی گفتگو اور ان کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ عالی جی کی سانسوں کے اختتام پر کس قدر افسردہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آج سے آٹھ سال قبل فیصلہ ہوا کہ مجھے اب انجمن ترقی اردو کی لائبریری کے بجائے جمیل الدین عالی کے گھر پر ان کے ادبی و علمی کام خاص

طور پر ان کے کالموں کی ترتیب وتدوین کے حوالے سے خدمات انجام دینا ہوں گی۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی کہ عالی جی کی تمام علمی ضروریات کا خیال رکھوں ۔ وہ انتہائی نفیس اور شفیق انسان تھے، ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت میری زندگی کا قیمتی سرمایا ہے۔جہانگیر خان نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عالی جی اپنے وطن سے بے پناہ محبت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر مشاعرہ پڑھنے سے انکار کردیا اس لیے کہ پاکستان کو دولخت کرنے میں ہندوستان کا کلیدی کردار تھا۔ تقریب سے سید طارق حسین نے بھی اظہار خیال کیا جو سکھر سے تشریف لائے تھے ۔ انہوں نے ایوان اردو کے بانی ڈاکٹر حمید الدین شاہد کی ادبی خدمات خاص طور پر خطوط نویسی کے حوالے سے گفتگو کی۔

عالی جی ان چند لوگوں میں سے تھے کہ جن کے دل پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں، ان کی ہر سانس میں سے پاکستان کی خوشبو آتی ہے۔ پاکستان کے دائم و قائم رہنے کی دعا کرنے والے عالی جی اب ہم میں نہیں رہے اللہ تعالی عالی جی کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ مرتے مرتے بھی وطن کو زندہ رہنے کی دعا دے گئے۔

ہم تو مٹ جائیں گے اے ارض وطن لیکن تجھ کو
زندہ رہنا ہے قیامت کی سحر ہونے تک

معراج جامی صاحب ہر مقرر کے بعد عالیؔ جی کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ تحسین سرور کے بیٹے علی فیضان نے بھی عالی جای کے ساتھ اپنے والد کے تعلقات کا احاطہ کیا۔ حسین علی امام بھی دیگر مقررین میں سے ایک تھے۔ تقریب میں ایوان اردو کی جانب سے اعزاز توسیفی بعد از مرگ جمیل الدین عالی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے صاحبزادے راجو جمیل صاحب کو پیش کی جانا تھا۔ یہ شیلڈ سامعین کو ڈاکٹر حمید الدین شاہد کے صاحبزادے اور میزانِ تقریب ڈاکٹر خرم نے سامعین کو دکھانے کا فریضہ انجام دیا۔ راقم نے بھی اس موقع پر عالیؔ جی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالیؔ جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے

جمیل الدین عالیؔ ایک عہد ساز شخصیت، اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ، کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے سرشار، مستقبل کے لیے کچھ چھوڑ جانے کا ولولہ لیے ہوئے تھے۔ علمی، ادبی، سماجی، فکری، تہذیبی حوالوں سے عالیؔ جی کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمی و ادبی سرمایے کے علاوہ انجمن ترقی اردو، جامعہ اردو، رائیٹرز گلڈ ان کی زندگی کے ایسے عظیم کارنامے ہیں کہ جو انہیں مدتوں زندہ رکھیں گے۔ عالیؔ جی کے لکھے ہوئے ملی نغمے ہمارے ملک کا

قیمتی اثاثہ ہیں۔ بابائے اردو کے بعد اردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے عالی جی کی کاوشیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ 23 نومبر کو عالی جی کی سانسوں کو سفر اختتام پزیر ہوا۔ اگلے روز 24 نومبر کو کراچی کے آرمی قبرستان میں اپنی والدہ اور شریک حیات کے درمیان ابدی نیند سو گئے۔ عالی جی سے کون واقف نہیں، کس کس کے کام عالی جی نہیں آئے، کون ہے جو ان سے نہیں ملا، کس کس پر انہوں نے عنایتیں نہیں کیں۔ ایک طویل فہرست ہے ان لوگوں کی جو عالی جی سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہی میں سہی انہیں خراج تحسین پیش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عالی کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

آرمی قبرستان میں تدفین کے حوالے سے عالی جی کے فرزند ارجمند راجو جمیل صاحب نے بتایا تھا کہ آرمی چیف آف اسٹاف مرزا اسلم بیگ تھے، اس وقت عالی جی کو آرمی کی جانب سے خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ ہم آپ کو کسی اچھی جگہ کشادہ پلاٹ دینے کی خواہش رکھتے ہیں، راجو جمیل نے بتایا کہ والد صاحب نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ مجھے دو نہیں بلکہ تین پلاٹ چاہیے، ایک اپنے لیے، ایک اپنی والدہ کے لیے اور ایک اپنی شریک حیات کے لیے اور یہ تینوں پلاٹ مجھے آرمی کے قبرستان میں چاہیے۔ یقینا خط کا جواب پڑھ کر متعلقہ حکام حیران و پریشان ہو گئے ہوں گے، انہیں یہ یقین نہیں آرہا ہو گا کہ پاکستان میں

ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ گویا عالی جی کی خواہش تھی کہ وہ آرمی کے قبرستان میں اپنی ماں اور اپنی شریک حیات کے ساتھ دنیاوی زندگی کے بعد کی زندگی ایک ساتھ آرمی کے قبرستان میں بسر کریں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، یقینا اس جواب سے آرمی کے افسران لاجواب ہوگئے ہوں گے اور عالی جی کا قد ان کی نظروں میں کس قدر بلند ہوا ہوگا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا، عالی جی کو ان کی زندگی میں ہی ان کی خواہش کے مطابق تین پلاٹ آرمی کی جانب سے الاٹ کر دیئے گئے تھے، ان میں سے دو پلاٹوں پر دائیں جانب عالی جی کی والدہ، بائیں جانب عالی جی کے شریک حیات طیبہ بانو آرام فرماں تھیں، درمیان کا پلاٹ 23 نومبر تک خالی تھا لیکن قبر بے تابی سے اپنے مکین کی راہ تک رہی تھی اور اپنے ہر دلعزیز مکین کے لیے اپنا سینہ واہ کیے ہوئے تھی، 24 نومبر کو اس کی گود عالی جی کے جسم اطہر سے منور ہو گئی۔

عالی جی کے تین کارنامے تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جائیں گے۔ ایک بابائے اردو کے بعد طویل عرصہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اعزازی معتمد کی حیثیت سے خدمات انجام دینا، دوسری جامعہ اردو کا قیام اور تیسرا رائیٹرز گلڈ کا قیام اور اس کی زیر سایہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو جمع کرنا ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ عالی جی انجمن اور گلڈ کے

معاملات میں اس قدر فنا تھے کے ان کی اولادوں کا کہنا تھا کہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ وہ چانچ بہن بھائی نہیں بلکہ سات بہن بھائی ہیں، یعنی پانچ وہ اور ایک بہن 'انجمن' اور ایک بھائی 'گلڈ' ہے۔ راجو جمیل رائیٹرز گلڈ دوبارہ سرگرم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں گلڈ کے حوالے سے عالی جی ایک شعر۔

پھر دیکھا کہ بچہ بچہ ہنستا تھا اور عالی جی

فردیں لکھتے مسلیں پڑھتے اور ''گلڈ'' چلاتے تھے

عالی جی جب بھارت ماتا سے پاکستان آئے تو وہ شاعر کی حیثیت سے معروف تھے۔ اس فن میں اپنا اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ پاکستان کے حوالے سے انہوں نے دنیا بھر میں نام روشن کیا وہ یادگار ہے۔ عالی جی کے تمام کام تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بقول پروفیسر سحر انصاری وہ پیش رو اور پیش بیں شخصیت تھے۔ انہوں نے ادب کی مختلف اصناف پر بہت کچھ اور بامقصد لکھا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کالم منفرد اور معلوماتی ہوا کرتے تھے۔ کالم نگاری میں بھی عالی جی نے جدت پیدا کی۔ جس موضوع پر کالم ہوتا اس کے بارے میں ذاتی مشاہدات اور معلومات بھی جمع کردیا کرتے تھے۔ وہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں تھے وہ کچھ اور کرنا چاہتے تھے۔

عالی تونے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی

یہ تو بتا تیری کوتارانی دیس کے کس کام آئی؟

عالی جی کی اصول پسندی کا ایک واقعہ رضوان احمد صاحب نے سنایا تھا جسے میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ رضوان صاحب نے فرمایا کہ وہ ایک شام دیگر کے ساتھ عالی جی کے گھر کسی تقریب میں مدعو تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، 'عالی جی نے سلام دعا کی اور ایک دم گویا ہوئے کون گورنر؟ میں کسی گورنر کو نہیں جانتا، انہوں نے مجھ سے وقت لیا؟ میں اس وقت مصروف ہوں، ان سے نہیں مل سکتا'۔ رضوان احمد کا کہنا تھا کہ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ گورنر صاحب ہیں تو انہیں بلا لیجئے، ملاقات کر لیجئے، کہنے لگے سندھ کے نئے گورنر کا پی اے کا فون تھا، کہتا تھا کہ گورنر صاحب ابھی آپ کے گھر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ میں انہیں آنے کی اجازت کیسے دے دوں، گورنر ہوں گے اپنے لیے، یہ تقریب پہلے سے طے ہے، اگر انہیں ملنے آنا ہے تو وقت لے کر ضرور آجائیں۔

عالی جی سچے محب وطن اور کٹر پاکستانی تھے۔ اس کا ثبوت ان کے لکھے ہوئے بے شمار ملی نغمے ہیں۔ انہیں پاکستان کے دولخت ہونے کا شدید دکھ تھا۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں علامہ اقبال سے اعتراف کرتے ہوئے کہا ۔

ہاں میرے بابا، ہاں میرے مرشد میں تجھ پر قربان
تو نے بنایا، میں نے بگاڑا تیرا پاکستان

اپنے وطن کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہم تو مٹ جائیں گے اے ارض وطن لیکن تجھ کو
زندہ رہنا ہے قیامت کی سَحر ہونے تک

عالؔی جی اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے۔ عالؔی جی کے لازوال قومی نغموں میں پاکستان سے محبت جھلکتی ہے۔ عالؔی جی نے ثابت کردیا کہ وہ صرف خواب نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کی تعبیر بھی کرتے تھے۔ عالؔی جی کے دل میں مکمل پاکستان بسا ہوا تھا۔ وہ پاکستان کو اپنے ساتھ لے کر چلا کرتے تھے عالی جی کے اس شعر پر بات کو ختم کروں گا ۔

اب جو میرے بغیر انجمن آرائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ تم کو میری یاد آئی ہے

ایوان اردو میں بیاد جمیل الدین عالؔی کی تقریب رات گئے اختتام پزیر ہوئی۔ معراج جامی نے تمام مہمانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

بلدیاتی نظام کی بحال

ملک کے دو صوبوں سندھ اور پنجاب کے بلدیاتی کے نتیجے میں کامیاب ہونے والے منتخب بلدیاتی نمائندوں جن میں چیرٔمین، وائس چیرٔمین ، کونسلرز اور وارڈ ممبر شامل تھے نے حلف اٹھالیا۔ جمہوریت کی تکمیل کے اس عمل کے بعد ملک میں چھ سال بعد بلدیاتی نظام کی بحالی ممکن ہو سکی ۔ بلدیاتی نظام کی ضرورت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں ، سیاست دان جب تک برسر اقتدار نہیں ہوتے ان کے سینے میں عوام کی فلاح و بہبود کا درد اور زبان پر عوام کی بھلائی کا کلمہ ہوتا ہے، ساتھ ہی بلدیاتی نظام کی خوبیاں گنواتے نہیں تھکتے۔ بلدیاتی نظام دراصل سیاست دانوں کی تربیت ، سیاست کے داؤپیچ سیکھنے کی نرسری ہوتے ہیں۔ وہ اسی نظام سے پروان چڑھ کر صوبائی ، قومی اسمبلی اور سینٹ کے رکن بنتے ہیں۔ لیکن یہی سیاست دان جب پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (نون) کی شکل میں برسر اقتدار آجاتے ہیں تو انہیں بلدیاتی نظام یاد ہی نہیں آتا، اس کی افادیت دور دور نظر نہیں آتی۔ بلدیاتی نظام کا اختتام پاکستان پیپلز پارٹی کے سابقہ دور حکومت میں ہوا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فوری طور پر نظام دوبارہ فعال ہوجاتا ، انتخابات کرادیئے جاتے لیکن زرداری صاحب نے ایوان صدر میں بیٹھ کر اپنی تمام تر توانائیاں اس بات پر لگادیں کہ وہ قسمت سے کرسیٔ صدارت پر براجمان

ہوگئے ہیں، انہیں کسی نہ کسی طرح پانچ سال پورے کرنا ہیں۔ اس مقصد کے لیے مفاہمت اور این آر او جیسے اقدامات بھی انہوں نے کیے، انہوں نے اپنا وقت پورا کیا اور عزت کے ساتھ ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ مخالف قوتوں نے لاکھ زور لگایا، بلدیاتی نظام کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی لیکن ان پر تو صرف ایک ہی جنون تھا کہ میرا صدارت کا ٹینیور پورا ہو جائے۔ اس وقت حزب اختلاف کا میدان میاں صاحبان کے پاس تھا۔ بظاہر الفاظ اور جملے تو ضرور استعمال کیے گئے لیکن کہا گیا کہ میاں صاحب نے فرینڈلی اپوزیشن کی اور بیک ڈور چینل کے ذریعہ یہ طے تھا کہ زرداری صاحب کو ان کا پانچ سال کا ٹینیور مکمل کرنے دینا ہے۔ اس دوران ہلکی پھلکی مخالفت جاری رکھنی ہے۔ چنانچہ پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے دور اقتدار میں بلدیاتی انتخابات کو پس پشت ڈالے رکھا، مختلف قسم کے حیلے بہانے کیے جاتے رہے تاکہ وقت کو گزارا جائے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

آصف علی زرداری صاحب کے بعد پیپلز پارٹی کا جو حشر نشر 2013ء کے انتخابات میں ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا پنجاب سے سوایا ہوگیا اور سندھ میں وفاق کی علامت یہ جماعت شہروں سے مکمل طور پر ہاتھ دھو بیٹھی۔ وجوہات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میاں صاحب نے اقتدار سنبھالا، بے شمار مسائل اور مشکلات تھیں۔ ان کی پرائیٹی کی فہرست میں بھی بلدیاتی انتخابات

نہیں تھے۔ دوسری جانب مخالف سیاسی جماعتوں نے ملک میں بلدیاتی نظام کی بحالی پر
دباؤ بڑھایا اور ملک کی اعلیٰ عدلیہ نے بلدیاتی نظام کی بحالی کا فیصلہ نہ صرف سنایا بلکہ
حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ بلدیاتی نظام بحال کرے، انتخابات کرائے تاکہ عام لوگوں
کے وہ مسائل ایوانوں کے منتخب نمائندے حل نہیں کرپاتے بلدیاتی نظام کے ذریعہ حل
ہوں۔ اعلیٰ عدلیہ کے احکامات کو بھی مختلف حیلے بہانوں سے ٹالا گیا، کبھی کوئی کبھی بہانا
سامنے لاتے رہے لیکن عدلیہ نے حکومت وقت کو بھاگنے کا موقع ہی نہ دیا۔ سندھ کی
حکومت بار بار وقت مانگتی رہی آخرکار مجبور ہوکر انتخابات کی جانب آنا ہی پڑا۔ مجبوراً
دلِ خستہ ہوکر انتخابات کرانا پڑے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ اس حوالے سے سبقت لے
جاچکا تھا۔ وہاں بلدیاتی انتخابات ہوچکے تھے اور تحریک انصاف کا پلڑا وہاں بھاری تھا۔
نون لیگ کو یہی ڈر و خوف کھائے جارہا تھا کہ کہیں خیبر پختون خواہ کی طرح پنجاب میں
بھی نون لیگ کا صفایا نہ ہوجائے۔ ایک پریشر خیبر پختونخواہ میں بلدیاتی نظام کی بحالی
بھی تھا جب ایک صوبے میں بلدیاتی نظام بحال ہوسکتا ہے تو دیگر صوبوں میں کیوں
نہیں؟ صوبہ پنجاب اور سندھ میں بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ پرامن اور بغیر کسی بہت
بڑی پریشانی کے انتخابات کا مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ پنجاب میں نون لیگ کو واضح اکثریت
حاصل ہوئی۔ سندھ میں شہروں میں متحدہ کا پلڑا بھاری رہا جب کے اندرون سندھ
پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیابی ملی لیکن اندرون سندھ بھی پی پی کے اپنے لوگوں نے

مشکلات پیدا کیں ان میں سابق وزیر داخلہ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا نے ضلع بدین میں پی پی کو ٹف ٹائم دیا۔ لیکن اندرون سندھ پی پی کو برتری حاصل رہی کراچی، حیدرآباد، میر پور میں متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) بازی لے گئی۔انتخابات کا مرحلہ مکمل ہو جانے کے بعد پنجاب اور سندھ میں بلدیاتی نظام کی بحالی سے پہلے ہی بلدیاتی نمائندوں کو اختیارات کا شوشا شروع ہوگیا اور اس حوالے سے احتجاج بھی شروع کر دیا گیا جو کہ قبل از وقت تھا۔جب تک نمائندے حلف نہ اٹھالیں ، میئر، ڈپٹی میئر ، چیئر مین، وائس چیئر مین، کونسلر، حلف نہ اٹھالیں ، اپنے اپنے دفاتر قائم نہ کر لیں، ان کے ایوان باقاعدہ تشکیل پالیں پھر اختیارات کا معاملہ سامنے آنا چاہیے تھا۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایسا ہوا، نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ بلدیاتی نظام میں نون لیگ، پی پی بھی شامل ہے ان جماعتوں کے نمائندے بھی بلدیاتی اداروں کے سربراہ ہوں گے، ان کے بھی کونسلرز کو اپنے اپنے علاقوں میں کام کرنا ہے۔ اختیارات بحال ہوں گے تو اس سے تمام ہی جماعتوں کو فائدہ پہنچے گا۔

صوبہ پنجاب اور سندھ کے بلدیاتی نمائندوں نے الحمد اللہ حلف اٹھالیا۔ چند دنوں میں میئر، ڈپٹی میئر بھی اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔ بلدیاتی نظام کی بحال کا کریڈٹ موجودہ حکومت کو جاتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ موجودہ

حکومت نے یہ کام خوشی کے ساتھ، بلدیاتی نظام کی اہمت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یا یہ سوچ کر نہیں کیا کہ بلدیاتی نظام سے عام لوگوں کے مسائل خاص طور پر نکاسی آب، پانی، سڑکوں کی دیکھ بھال جیسے مسائل بہتر طور پر بلدیاتی نمائندے حل کر تے ہیں۔ وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں میاں صاحب کی حکومت کو بلدیاتی نظام 6 سال قبل اپنی مدت پوری کرکے ختم ہوچکا تھا بحال کرنے کا کریڈٹ دیا جانا چاہیے۔

اب جب کہ عوام کے منتخب نمائندوں نے حلف اٹھالیا ہے، یوسیز کی باضابطہ تشکیل عمل میں آچکی ہے اور اس کے نمائندے اپنی اپنی یوسیز میں پہنچ چکے ہیں، یوسیز کے منتخب چیئرَ مین اور وائس چیئرَ مینوں نے اپنے اپنے دفاتر سنبھال لیے ہیں۔ منتخب نمائندوں کو اپنا اپنا کام شروع کردینا چاہیے۔ صوبہ پنجاب میں نون لیگ اور صوبہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی بلدیاتی نمائندوں کو وہ تمام اختیارات دینے میں یقینا پس و پیش نہیں کریں گے اس لیے کہ بغیر اختیارات کے یہ نظام بے معنی ہو کر رہ جائے گا، غیر فعال نظام ملک اور عوام پر بوجھ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس نظام کو کامیاب اسی وقت بنایا جاسکتا ہے جب منتخب نمائندوں کو کام کرنے کا اختیار ہو، انہیں فنڈز فراہم کیے جائیں گے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے وزیر بلدیات سندھ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ' منتخب بلدیاتی نمائندوں کے ساتھ بھرپور تعاون جاری رکھیں گے۔ تمام منتخب

نمائندے عوامی مینڈیٹ سے آئے ہیں، منتخب بلدیاتی نمائندوں کو اختیارات دینے کے پابند ہیں اور وہ انہیں دیئے جائیں گے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کے ایم سی یا ڈی ایم سیز میں فنڈز کی کوئی کمی نہیں ہونے دی جائے گی، ان کا کہنا تھا کہ اس سال ترقیاتی کاموں کے لیے ڈھائی ارب روپے کا خصوصی پیکج دیا ہے'۔ وزیر بلدیات کا بیان حوصلہ افزا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ پی پی بھی عوامی منتخب نمائندوں کو اہمیت دیتی ہے۔ البتہ پی پی کے سیکریٹری اطلاعات کا یہ فرمانا کہ 'اگر ہم نے مناسب سمجھا تو بلدیاتی نمائندوں کو اختیارات دے دیں گے' مناسب نہیں۔ یہاں کسی انفرادی شخص یا جماعت کے مناسب سمجھنے یا نہ سمجھنے کا سوال نہیں بلدیاتی نظام جمہوریت کا ایک اہم ستون ہے، اس کے ذریعہ ملک میں جمہوری ادارے مضبوط ہوتے ہیں، عوام کے روز مرہ کے مسائل کا حل بلدیاتی نظام میں ہی ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو باہمی مشورے سے ملک میں بلدیاتی نظام کی کامیابی کے لیے دل بڑا کرنا چاہیے، بلدیاتی نمائندے عوام کے منتخب کردہ ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے ہی ہے۔ اس سطح پر جماعت اور سیاست سے بالا تر ہوکر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چند شہروں کے علاوہ شہروں میں صفائی ستھرائی، سڑکوں کی خستہ حالی، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر، ٹریفک جام ہوجانے کے معاملات اس قدر گھمبیر صورت اختیار کرچکے ہیں کہ ان پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، یہ کام بلدیاتی نمائندوں کے کرنے کے ہیں یہ انہیں ہی کرنے چاہیں۔ سندھ حکومت بھی اپنا دل

بڑا کرے۔ اختیارات دے دینے سے سندھ حکومت کی نیک نامی ہی ہوگی۔ گلی محلوں میں بلدیاتی نظام کامیاب ہوگا تو عوام پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ حکومتوں پر ان کا اعتماد بڑے گا۔ شہروں کی ناگفتہ بہ حالت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ بلدیاتی نمائندوں کو وہ تمام اختیارات دوبارہ لوٹادیے جائیں جو انہیں پہلے حاصل تھے۔ عوام کی فلاح و بہبود اسی مُضمِر ہے۔ (شائع شدہ روزنامہ 'جناح' 18 جنوری 2016)

وزیر اعظم پاکستان اور سپہ سالار کا مصالحتی مشن

صد شکر کہ پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف ، سپہ سالار راحیل شریف اپنے وفد کے ہمراہ دوست اسلامی ملک سعودی عرب اور ایران کے درمیان پیدا ہوجانے والے بحران کے حل کے لیے ثالثی کردار ادا کرنے سعودی عرب تشریف لے گئے۔

جس دن سے دونوں اسلامی ممالک کے درمیان کشیدگی اور سفارتی بحران پیدا ہوا تھا پاکستان کے عوام کی سوچ کا دھارا یہی تھا کہ پاکستان کے لیے دونوں ہی اسلامی ممالک اہم ہیں ، ان دونوں کے درمیان کشیدگی کے اثرات پورے عالم اسلام پر ہوں گے۔ مغرب پہلے ہی مسلمانوں کے لیے مثبت سوچ نہیں رکھتا، اکثر ممالک میں مسلمانوں کے لیے جگہ تنگ ہوتی جارہی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں مسلمان ممالک کے درمیان کشیدگی سے دنیا میں مسلمانوں کی قوت اور بھی کم ہوجائے گی۔ جگ ہنسائی اپنی جگہ ہوگی۔ اس کا کوئی نہ کوئی مثبت حل ضروری ہے۔ پاکستان کے عوام کی غالب اکثریت چاہتی تھی کہ پاکستان کو اس نازک صورت حال میں انتہائی تدبر اور فہم وفراست کا ثبوت دینا چاہیے ۔ دونوں اسلامی دوستوں میں سے کسی ایک کی حمایت کے بجائے دونوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔

دونوں برادر اسلامی ملکوں کے درمیان جب تصادم کی صورت حال پیدا ہوئی تو کون

تھا جس کی سوچ یہ نہیں تھی کہ یہ دونوں ممالک تصادم کا راستہ اختیار نہ کریں، یہ تصادم محض دو اسلامی ممالک تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس تصادم نے دنیا کے بے شمار اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لاکھڑا کر دینا تھا۔ دو بھائیوں کی لڑائی میں نہ معلوم کتنے اور تصادم کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ ہر ایک کے ذہن میں یہی تھا، کالم نگاروں نے اپنے کالموں میں، تجزیہ نگاروں نے اپنی گفتگو میں اسی رائے کا اظہار کیا کہ پاکستان کو دونوں ملکوں کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرنا چاہیے اس کی بنیادی وجہ پاکستان کے دونوں ملکوں کے ساتھ مسلم ملک ہونے کے علاوہ انتہایہ قریبی اور اعتماد کے رشتہ کا ہونا ہے۔ دونوں ملکوں سے پاکستان کا تعلق واضح نشاندھی کر رہا تھا کہ سعودی عرب اور ایران کے سربراہان پاکستان کے ثالثی کے کردار کو خوش دلی سے قبول کریں گے اور یہی ہوا۔ جوں ہی یہ تجویز متعلقہ فریقین کو پہنچی انہوں نے کسی بھی قسم کے پس و پیش، تامل اور توقف کے پاکستان کی اس پیش کش کو مان لیا تب ہی تو دونوں شریفوں نے پہلے ریاض کی راہ لی جہاں پر کامیابی نے قدم چومے۔ سعودی حکام سے وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف، سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا، سعودی عرب کے شاہ سے ملاقات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا مصالحتی مشن انشاء اللہ کامیاب ہوگا۔ مثبت پیش رفت سعودی حکام سے ملاقات میں ہوئی امکانات یہی ہیں کہ ایران کے ذمہ داران بھی اسی جذبہ اور خیر سگالی کا

اظہار کریں گے۔ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف، سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کا یہ عمل پاکستانی عوام کی امنگوں اور خواہشات کے عین مطابق ہے۔ درحقیت میاں صاحب اور جنرل راحیل شریف نے اپنے عوام کے دل جیت لیے ہیں۔

میں نے اپنے کالم 'سعودی ایران تنازع اور پاکستان کی حکمت عملی' شائع شدہ روزنامہ جناح' 15 جنوری 2016ء میں لکھا تھا کہ 'پاکستان دنیا کی ایک اہم اسلامی مملکت ہے۔ دنیائے اسلام کی دو اہم ریاستوں سعودی عرب اور ایران کے مابین ہونے والی کشیدگی اور سفارتی بحران میں پاکستان کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے۔ سعودی عرب سے پاکستان کی قربت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ سعودی سرزمین سے پاکستان کے تعلقات سات سمندروں سے بھی بڑھ کر ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ سعودی عرب پاکستانی مسلمانوں کا روحانی مرکز و منبع ہے۔درحقیقت پاکستانی مسلمانوں کا جسم پاکستان میں ضرور ہے لیکن یہاں کے ایک ایک مسلمان کی روح تو مکہ اور مدینہ میں ہے۔

پاکستانی عوام کسی بھی اعتبار سے، کسی بھی مرحلے پر سعودی عرب پر اٹھنے والی انگلی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔دوسری جانب ایران پاکستان کا اہم اسلامی پڑوسی ملک ہی نہیں بلکہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان خصوصی عقائد کا رشتہ نازک صورت حال لیے ہوئے ہے۔ فقہی و مسلکی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے لیکن دونوں ممالک کے مسلمانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ پاکستان دونوں کے لیے اہم ہے اور دونوں پاکستان کے لیے

لازم و ملزوم ہیں۔ ایک سے روح کا رشتہ ہے تو دوسرے سے جسمانی تعلق ہے۔
پاکستان نہ تو سعودی عرب کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی ایران سے تعلق ختم کر سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں پاکستان کو انتہائی محتاط اور دانائی کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی پوزیشن کو بین بین رکھنا ہوگا۔ اس صورت حال میں پاکستان کا کردار ایک ثالث کا ہونا چاہیے ، پاکستان اس پوزیشن میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کو مذاکرات کی میز پر لے آئے۔ پاکستان کے حکمراں دونوں دوست ممالک کو اس صورت حال سے باہر نکالنے کی حکمت عملی اپنائیں ، وزرائے خارجہ کی سطح پر یا اس سے نیچے کی سطح پر وفد بھیجنے، پیغامات بھیجنے کا وقت نہیں اولین فرصت میں وزیر اعظم پاکستان پہلے سعودی عرب کا ہنگامی دورہ کریں ، سعودی حکمراں پاکستان سے محبت کرتے ہیں، ان کے قدر داں بھی ہیں، میاں صاحب کے ذاتی مراسم بھی سعودی حکمرانوں سے ہیں امید ہے کہ سعودی فرمارواں، میاں صاحب کو مایوس نہیں کریں گے، مثبت جواب کی صورت میں وہ تہران تشریف لے جائیں اور اپنے ایرانی دوست ملک کے سربراہان کو بھی افہام و تفہیم کے ساتھ اس اہم اور نازک مسئلہ کو کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ کوشش کرنے میں کوئی قباحت نہیں، کامیابی کی صورت میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ سب کے سامنے ہے۔ ناکامی کی صورت میں بھی آپ کے بلند کردار کی تعریف و توسیف ہوگی'۔ میاں صاحب نے ایسا ہی کیا بلکہ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کو بھی اس امن ، دوستی اور

مصالحتی مشن کا حصہ بنا کر دنیا کو پیغام دیا کہ پاکستان میں جمہوری اور عسکری قیادت ہم رکاب ہے۔ میں ہر گز لاؤڈا سپیکر پر یہ اعلان نہیں کر رہا کہ مَیں نے سب سے پہلے یہ رائے دی تھی، یہ طریقہ نجی ٹی وی چینلوں کا ہے کہ چھوٹی چھوٹی خبر کے ساتھ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے سب سے پہلے خبر نشر کی۔ تھوڑا سا شعور بھی رکھنے والے ہر پاکستانی کی سوچ یہی تھی کہ پاکستان کو سعودی ایران تنازع میں ثالث کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف، سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کی سعودی فرماں رواں اور دیگر اعلیٰ حکام سے کامیاب مذاکرات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ سامنے آیا ہے وہ حوصلہ افزا اور امیدوں سے لبریز ہے۔ اعلامیہ میں میاں نواز شریف نے کشیدگی پر انتہائی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تنازع کے جلد اور پر امن حل پر زور دیا اور کہا کہ پاکستانی عوام سعودی عرب کی سالمیت کو درپیش کسی بھی خطرے کی صورت میں سعودی عوام کے ساتھ کھڑے ہوں گے، پاکستان چاہتا ہے کہ امت مسلمہ کے وسیع تر مفاد میں تنازعات کو پر امن طریقے سے مذاکرات سے حل کیا جائے، دوسری جانب سعودی فرمانروا شاہ سلمان نے سعودی عرب کے لیے پاکستانی عوام کی محبت کے جذبے کو سراہتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب مسلم امہ میں بھائی چارے کا فروغ چاہتا ہے
۔ تنازعات کے خاتمے اور امن کے لیے پاکستان کا کردار قابل ستائش ہے اس لیے سعودی عرب بھی معاملے کا

پر امن حل چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان دفاع، سلامتی، معیشت، تجارت کے شعبوں میں تعاون اور دہشت گردی و انتہا پسندی جیسے مشترکہ دشمن سے مل کر مقابلہ کرنے پر اتفاق کیا گیا۔ سعودی وزیر خارجہ نے ثالثی کے حوالے سے پاکستان کے سرگرم کردار کی تعریف کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ دانشمندی کا مظاہرہ کیا جائے گا اور کشیدگی بند ہونا چاہیے۔ سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف نے سعودی وزیر دفع نائب ولی عہد محمد بن سلمان السعود سے ملاقات کی جس میں خطے کی صورت حال اور باہمی دلچسپی کے دیگر امور پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف، سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کے سعودی عرب کے دورے اور وہاں شاہ سلیمان بن عبد العزیز اور دیگر سعودی اعلیٰ حکام سے ملاقات کے بعد جو مثبت اور حوصلہ افزا صورت حال سامنے آئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا اگلا قدم بھی کامیابی اور فتح کی نوید سنائے گا۔ ایران سے بھی یہی توقع ہے کہ وہ اپنے پڑوسی دوست ہمسائے کے ساتھ اپنی قدیم روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے امن، دوستی، بھائی چارے، پیار و محبت کے اس پیغام کو دنیا کے مسلمانوں کی آواز تصور کریں گے اور وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف، سپہ سالار پاک افواج راحیل شریف کی بے لوث مصالحتی کوششوں اور خلوص کا جواب اسی خلوص اور

محبت سے دیں گے۔

باچا خان یونیورسٹی چارسدہ پر دہشت گرد حملہ

دہشت گردی کے واقعات واقعی ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ پشاور کی سرزمین چارسدہ کی باچا خان یونیورسٹی پر ہونے والا دہشت گردی کا یہ حملہ 2016ء کا بڑا اور اہم سانحہ ہے ابھی ایک ماہ قبل ہی تو ہم نے 16 دسمبر 2014ء میں ہونے والے آرمی پبلک اسکول کے سانحہ کی یادوں کے چراغ روشن کیے تھے۔ ان معصوم اسکول کے بچوں اور دیگر شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا تھا کہ دہشت گردوں نے ہمیں نئے سال میں ایک اور زخم لگا دیا۔ اس بار دہشت گردوں کا نشانہ معصوم اور چھوٹے بچے نہیں تھے بلکہ یونیورسٹی کے طلباء تھے جو کچھ ہی وقت میں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے شعبوں میں ملک کی ترقی کا حصہ بننے والے تھے۔ یہ ہمارا قیمتی سرمایا تھے۔ یہ ہمارا مستقبل تھے۔ دہشت گردوں نے اس بار ہمارے بڑے بچوں کو نشانہ بنایا ہے۔ خاموشی سے، چھپ کر، نہتے وہ بھی بچوں پر اس طرح کی کاروائی واضح کرتی ہے کہ دشمن خواہ کوئی بھی ہے وہ انتہائی بذدل، کمزور، کوتاہ اندیش، سفلہ، کم ظرف، فرومایہ ہے تب ہی تو معصوم بچوں اور نہتے طلباء وطالبات کو چھپ کر نشانہ بناتا ہے اور وہ یہ عمل مسلسل ایک دیہائی سے زیادہ عرصہ سے کیے چلا جارہا ہے۔ ہم ہر بار اس کے بذدلانہ فعل کی مذمت کرتے ہیں، حوصلہ دینے کے رسمی جملوں سے زخموں کو بھرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ بلند بانگ دعوے کرنے

والے کہ انہوں نے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی ہے، ان کے تمام ٹھکانوں کا پتہ لگا لیا ہے، ان کا انفرااسٹرکچر تباہ کر دیا ہے۔کیا یہ سب کچھ زبانی کلامی ہی ہے؟ شہید ہو جانے والوں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور دیگر اہل خانہ سے کوئی پوچھ کر دیکھے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ ہم آپ ہمدردی کے دو بول بول کر، دو صفحات کا ایک کالم لکھ کر یا برقی میڈیا پر غم زدہ منہ بنا کر افسوس کر اظہار کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ شہیدوں کے لواحقین زندگی بھر اس امید پر اپنے آپ کو تسلی و تشفی دے رہے ہوتے ہیں کہ شاید ہماری حکومت اور ہمارے ذمہ داران اس بار کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کر لیں جس کے نتیجے میں آئندہ کسی بھی قسم کی دہشت گردی نہ ہو اور دہشت گرد اپنے انجام کو پہنچ جائیں لیکن ہر چیز کی کوئی حد اور کوئی انتہا ہوتی ہے۔ ناکامی اور کیا ہے، مجبوری کسے کہتے ہیں یہی تو ہے۔ افسوس صد افسوس ہم اپنے آپ کو دنیا میں بڑے اسلامی ملک کو طور پر اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، ہم ایٹمی قوت بھی ہیں، جمہوریت کے راگ الاپتے نہیں تھکتے، طاقت ور ترین ہماری افواج ہے، ہمارا نظام جدید اور اعلیٰ ہے لیکن ہمارا عمل کیا بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ امریکہ کا صدر جاتے جاتے سچ بول کر جا رہا ہے کہ 'پاکستان کے کچھ حصوں میں آنے والی کئی دہائیوں تک بد امنی جاری رہے گی'۔اوباما کے اس جملے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سوچ بچار کی ضرورت ہے اور اس کا یہ عمل تحقیق طلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امریکہ کو ہمارے مستقبل کا علم ہے یا

پھر یہ جو کچھ دہشت گردی ہو رہی ہے پاکستان دشمن قوتوں یا دہشت گردوں کے تانے بانے امریکہ سے تو کہیں نہیں مل رہے۔پڑوسی دشمن جس سے آج کل تعلقات گرم نہیں بلکہ سرد اور خوشگوار سے ہیں پر ہے تو دشمن ، اس پر اعتماد کرنا ، بھروسہ کرنا نادانی ہے۔ کہیں یہ سانحہ پٹھان کوٹ کا ردِ عمل تو نہیں۔ تحقیقاتی عمل میں اس پہلو کو نظر نہیں کرنا چاہیے۔ باوجود اس کے کہ بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی نے اس واقعہ پر افسوس اور دکھ کا اظہار کیا ہے۔افغانستان بھی ہمارا پڑوسی اسلامی ملک ہے۔ بتایا گیا ہے کہ دہشت گردوں کے پاس افغانستان کی سمز تھیں اور ایک دہشت گرد کے مرنے کے بعد بھی اس کے فون پر افغان سم سے کالیں آ رہی تھیں۔ یہ بات واضح ہے کہ دہشت گردوں کا مرکز افغانستان ہے۔ وہاں سے بیٹھ کر کاروائیاں ہو رہی ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ چار دہشت گرد یونیورسٹی کے عقبی دیوان کے اوپر لگے خار دار واروں کو کاٹ کر کیمپس میں داخل ہوئے۔ ان کا اصل ہدف جامعہ میں ہونا والا مشاعرہ تھا جس میں 600 کے قریب مہمان موجود طلباء کی تعداد 3000 ہزار کے قریب تھی۔ وہ اپنے ہدف مشاعرہ گاہ نہیں پہنچ سکے ، ایڈمنسٹریشن بلاک اور طلبہ ہاسٹل تک ہی پہنچے تھے کہ جامعہ کی سیکیوریٹی گارڈ اور انتہائی مختصر وقت میں پاک فوج جائے وقوعہ پر پہنچ گئی اس نے ان دہشت گردوں کو ان کے ہدف تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔ اگر مشاعرہ شروع ہو چکا ہوتا اور مہمان و طلباء و

اساتذہ وہاں موجود ہوتے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نقصان کس قدر زیادہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ رکھا لیکن جو نقصان ہوا وہ کیا کم ہے۔ اس کا جس قدر غم کیا جائے کم ہے۔ اس سانحہ میں طلبہ کے علاوہ ایک پروفیسر ڈاکٹر حامد حسین نے کی بھی شہادت ہوئے۔ ایک زخمی طالب علم کہا کہنا ہے کہ جیسے ہی گولیا چلنے کی آواز آئی سر حامد نے طلبہ کو کمرہ میں رہنے کی ہدایت کی اور خود پستول اٹھائے گولیا چلا کر دہشت گردوں کو طلبہ سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی اثنا میں دہشت گردوں نے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور وہ نیچے گر گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ ڈاکٹر حامد حسین نے برطانیہ کی برسٹل یونیورسٹی سے شعبہ کیاء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی ، ان کا تعلق صوابی سے تھا۔ ان کا تین سالہ بیٹا حاشر حسین ہے۔ ڈاکٹر حامد نے شہادت نوش کرکے استاد کا سر فخر سے بلند کردیا ہے، انہوں نے قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ ڈاکٹر حامد نے یہ ثابت کردیا کہ استاد کی نظر میں اس کے طالب علم اس کے اپنے بچوں کی طرح ہیں ۔ وقت آنے پر وہ ان کی حفاظت اسی طرح کرتا ہے جس طرح اپنے بچے کی کرتا ہے۔ سانحہ آرمی اسکول کی پرنسپل طاہرہ قاضی اور ایک استاد نے بھی اپنے اسکول کے بچوں کی جان بچاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ ڈاکٹر حامد کے علاوہ شہادت نوش کرنے والے جامعہ باچا خان کی لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین افتخار بھی ہیں۔ افتخار نوجوان تھے تین روز قبل ان کی شادی ہونے والی تھی۔ شہید ہونے والوں کی تعداد 25 بتائی جارہی ہے جب زخمیوں

کی تعداد 60 سے اوپر ہے۔جب کہ چاروں دہشت گرد بھی مارے گئے۔

پاکستان ایک دیہائی سے زیادہ عرصہ سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اب تک 55 ہزار سے زیادہ لوگ دہشت گردی کا نشانہ بن چکے ہیں اور ایک کھرب ڈالر سے زیادہ کا مالی نقصان ہوچکا ہے۔ دہشت گردی کی لپیٹ میں پاکستان ہی نہیں دنیا کے بے شمار ممالک حتیٰ کے امریکہ جیسا بڑا ملک بھی دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔کچھ ممالک دہشت گردوں سے مقابلہ کرتے کرتے اپنی معیشت کو تباہ و بر باد کر چکے ہیں ۔ دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز نائن الیون کے بعد شروع ہوا۔امریکہ میں رونما ہونے والا 9 ستمبر 2001ء کا واقعہ دہشت گردی کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔جسے 11/9 کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔نائن الیون کے بعد پاکستان میں دہشتگردی کے بے شمار واقعات رونما ہوچکے ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق 2003ء سے 2015ء کے درمیان 55900 سے زیادہ پاکستانی دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ 2002ء سے 2015ء کے درمیان پاکستان میں کل 415 خود کش حملے ہوئے ، مجموعی طور پر 6000 بم دھماکے ہوئے۔ایک سروے کے مطابق ان سالوں کے درمیان ملک بھر میں 6104 خود کش حملے اور دھماکے ہوئے ۔ مختلف بم دھماکوں اور خود کش حملوں میں جام شہادت نوش کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے۔28 اکتوبر 2001 ء میں بہاولپور میں چرچ پر حملہ ، بے نظیر بھٹو پر ہونے والا حملہ کراچی میں سابق گورنر معین الدین حیدر کے بڑے ،

بھائی احتشام الدین حیدر گولیوں کا نشانا بنایا جانا، کوئٹہ میں بلیرڈ ہال دھماکہ، پشاور مارکیٹ بم حملہ، 8 جون شیعہ زائرین کی بس ایران سے کوئٹہ آتے ہوئے بس پر حملہ ہوا، اسی روز کراچی ائرپورٹ پر دہشت گردوں کے ہاتھوں 30 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتادیا گیا، 2 نومبر واگھہ بارڈر پر خودکش حملہ، صفورہ چورنگی کراچی میں بس پر حملہ، لیکن 16 دسمبر 2014ء کی صبح رونما ہونے والا دہشت گردی کا واقعہ اپنی نوعیت کا شاید پہلا واقعہ تھا جس میں دہشت گردوں نے معصوم بچوں، اسکول کے پرنسپل، اساتذہ اور دیگر لوگوں کو نشانہ بنایا۔ سات دہشت گرد بھی افواج پاکستان کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ دن ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ دل کو ہلا دینے، خون کو گرمادینے، دماغ کو ماعوف کردینے والا دن۔ آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم پھولوں کو دہشت گردوں نے بے دردی، سفاکی اور بے رحمی سے خون میں نہالا دیا۔ معصوم بچے اور دیگر 9 افراد شہید کر دیئے گئے۔ایک ماہ قبل ہی ہم نے اس واقعہ 132 کے ایک سال گزرجانے کی یاد تازہ کی اور شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ ہم نے دیگر دہشت گردی کے واقعات سے کیا سبق حاصل کی؟ کیا حکمت عملی اپنائی؟ کیا منصوبہ بندی کی؟ نیشنل ایکشن پلان پر کس قدر عمل درآمد ہوا، بلند بانگ دعوں، بہادری کے بیانات، منصوبے کاغذوں پر تو ضرور بنائے گئے لیکن عمل کہی نظر نہیں آیا جس کا نتیجہ 20 جنوری کو پاکستان کے دشمنوں، دہشت گردوں نے خیبر پختونخواہ کے شہر چارسدہ کی باچا خان یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ اور عملے

کو نشانا بنایا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاسی اور عسکری قوتیں سنجیدگی کے ساتھ دہشت گردی کے اس ناسور کا سدِ باب کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کریں۔ نیشنل ایکشن پلان پر اس کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔ اشارے اس جانب کیے جارہے ہیں کہ نیشنل ایکشن پلان پر اس کی اصل روح کے مطابق عمل درآمد نہیں ہورہا۔ آپریشن ضرب عضب کی کامیابی ضروری ہے، شواہد اور بے شمار دہشت گرد گرفتار بھی کیے جاچکے ہیں۔ آخر ان تمام ثبوتوں کی روشنی میں اصل حقائق کیوں سامنے نہیں آرہے۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ اس طرح کے حملوں کو روکنا جس میں خود کش حملہ آور اپنی جان دینے کا مصمم ارادہ کرچکا ہو کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ دہشت گردی کی وجوہات اور دہشت گردوں کے سربراہوں، اداروں اور تنظیموں کے خاتمے کے بغیر دہشت گرد حملے بند نہیں ہوں گے۔ جب سب کچھ معلوم ہوگیا کس نے بھیجا، کہاں سے کنٹرول ہوا تو پھر دہشت گردوں کے سرغناؤں تک پہنچنے میں کیا قباحت ہے۔

سندھ اسمبلی کے احاطے کے بے دخل مکین

گزشتہ دنوں سندھ اسمبلی بلڈنگ کے احاطے کے اندر رہائش پذیر 10 خاندانوں کو بے دخل کرکے انہیں سرد موسم میں کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور کردیا گیا۔ ان کے کچے پکے مکان جو گزشتہ نصف دہائی سے ان کے سر چھپانے کا سامان تھے چھین لیے گئے۔ مکانوں کو مسمار کرنے کی وجہ ناجائز اور غیر قانونی ہونے کے علاوہ یہ سامنے آئی کہ اس جگہ پر اراکین سندھ اسمبلی کے لیے پارکنگ لاٹ تعمیر کی جائے گی۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ کا احاطہ کافی کشادہ ہے، یہاں ایک جانب کچھ مکانات بنے ہوئے ہیں مکانوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ مکانات حکومت کی جانب سے باقاعدہ بنا کر نہیں دیئے گئے بلکہ کسی زمانے میں جب دہشت گردی کے لفظ سے اہلِ کراچی ناآشنا تھے، کراچی امن و سکون کا گہوارہ تھا، اسمبلی کے ملازمین کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی رہائش بلڈنگ کے احاطے کے ایک جانب اختیار کرلیں اور ایسا ہی ہوا، ایک ایک کرکے ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وہاں مکانات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ملازمین نے اسمبلی کے احاطے کے اندر بلااجازت رہائش اختیار نہیں کی بلکہ متعلقہ حکام کی مرضی شامل حال رہی۔ سرکاری اداروں میں یہ عام سے بات ہے کہ وہاں کے نچلے درجے کے ملازمین جن میں چوکیدار، خاکروب، دفتری وغیرہ شامل ہوتے ہیں، اس ادارے کے اسی بلڈنگ میں

رہائش اختیار کرلیتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ نچلے درجے کے چند ملازمین نے یہاں رہائش اختیار کر لی۔

میرا تجربہ ہے کیوں کہ میری ملازمت کالج کی تھی، اکثر کالجوں اور اسکولوں میں ملازم چوکیدار، خاکروپ یا دفتری اسی بلڈنگ کے اندر رہائش اختیار کرلیتے ہیں۔ جگہ کی عام طور پر کمی نہیں ہوتی، وہ متعلقہ افسران کی اجازت سے عمارت کے اندر ہی اپنا ٹھکانا بنا لیتے ہیں اور اپنی فیمیلی کے ساتھ رہائش پذیر ہوتے ہیں جہاں پر انہیں ہر چیز مفت میں مہیا ہوتی ہے یعنی، بجلی مفت، پانی مفت، گیس مفت، صفائی ستھرائی کا کوئی مسئلہ نہیں، ایک اعتبار سے ان کی اور ان کے خاندان کی زندگی بہت آرام سے بسر ہوتی ہے۔ ایک کالج میں تو یہ تک تھا کہ وہاں کا چوکیدار جو کالج میں رہائش پذیر تھا صبح کے اوقات میں اسکول وین چلایا کرتا تھا جو کہ اس کی اپنی تھی، چنانچہ رات میں وہ اسکول وین بڑے اطمینان سے کالج میں کھڑی کیا کرتا تھا۔ اسمبلی کے احاطے میں قائم خود ساختہ مکانات یقینا غیر قانونی ہیں۔ اگر اسمبلی کے ملازمین کی رہائش کے لیے کوئی باقاعدہ منصوبہ ہوتا تو مکانات تمام بنیادی سہولتوں اور طریقہ کار کے مطابق تعمیر کیے جاتے لیکن یہاں تو جس کسی کا جی چاہا اس نے اپنی مرضی سے مکان بنا لیا اور رہائش اختیار کر لی، وقت کے ساتھ ساتھ وہ انکروچمنٹ بھی کرتا رہا۔ اصولی طور پر تو یہ غلط تھا۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ

رہائش کا یہ سلسلہ جب شروع ہوا تھا اس وقت کے حالات کچھ اور تھے آج حالات بہت مختلف ہیں۔ان رہائشیوں کو یہاں سے بے دخل کیا جانا تو درست لگتا ہے لیکن انہیں نوٹسز دے کر ان کے مکانوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دینا کسی بھی طرح مناسب اور جائز نہیں۔ یہ تمام رہائشی اپنی مرضی سے یہاں نہیں رہ رہے بلکہ متعلقہ حکام کی آشیر باد انہیں حاصل رہی ہے تب ہی تو انہوں نے یہ جرت کی کہ اسمبلی جیسی عمارت کے اندر اپنا گھر بنا لیا۔آج تو کوئی کسی سرکاری عمارت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ حکومت سندھ کو چاہیے کہ وہ یہاں کے مکینوں کو بے دخل ضرور کرے لیکن انہیں متبادل جگہ فراہم کردے۔ یہ متبادل جگہ کراچی کے کسی بھی حصہ میں ہو سکتی ہے۔ میں نے جب اس مسئلہ کے بارے میں معلومات کیں تو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں ایسے خاندان بھی رہائش پذیر ہیں کہ جو اپنی مدت ملازمت پوری ہو جانے کے بعد ریٹائر ہو گئے، کچھ اللہ کو بھی پیارے بھی ہوگے لیکن ان کے بچے جو سندھ اسمبلی کے ملازم بھی نہیں یہاں رہائش رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے خاندان ہیں کہ جن کے باپ دادا یہاں ملازم تھے انہوں نے کوشش کر کے اپنے بیٹوں یا پوتوں کو یہاں ملازم کرا دیا اب وہ یہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس جگہ پارکنگ لاٹ بنائی جائے یا نہیں ہر دو صورتوں میں یہاں رہائش غیر قانونی ہے۔ خاص طور پر اسمبلی کی سیکیوریٹی کو دیکھتے ہوئے، دہشت گردی کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے، ان مکینوں کو اس بنیاد پر مستقل رہنے کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ گزشتہ چار دیہائیوں یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے یہاں

رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ غلط کام غلط ہی رہے گا خواہ وہ پچاس سال قبل ہوا ہو یا کوئی آج غلط کام کرے۔ البتہ یہاں کے مکینوں کا یہ حق بنتا ہے کہ انہیں کوئی متبادل جگہ فراہم کرنے سے قبل خاندانوں کو، معصوم بچوں کو سردی کے موسم میں کھلے آسمان تلے نہ کیا جائے۔ یہ انسانیت کے خلاف ہے، قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ وہ لوگ ہیں جو اسی ادارے میں خدمات انجام دے رہے ہیں، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کے باپ دادا نے اپنی پوری زندگی اسمبلی اور اسمبلی کے اراکین کی خدمات میں صرف کردی۔ ان میں سے بعض اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہوں گے انہیں اس طرح بے گھر کردینا ان کی خدمات کا صلہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کے خاندان کے ساتھ زیادتی ہے۔ سندھ اسمبلی کے اراکین خاص طور پر اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر، وزیر اعلیٰ اور وزراء کو چاہیے کہ وہ ان خاندانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو فوری نوٹس لیں اور تمام خاندانوں کو متبادل جگہ فراہم کرنے سے قبل انہیں یہاں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ یہ جگہ کراچی کے کسی بھی آباد علاقے میں دی جاسکتی ہے۔ حکومت وقت کے لیے ایسا کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ حکومت بہت آسانی سے تمام مکینوں کو متبادل رہائش دے سکتی ہے۔

سندھ اسمبلی کے احاطے کے اس حصہ پر جہاں یہ گھر بنے ہوئے ہیں جنہیں اب جزوی طور پر مسمار کردیا گیا ہے پر پارکنگ لاٹ تعمیر کرنے کا فیصلہ گزشتہ حکومت

کے دور میں کیا گیا تھا۔ ایم کیو ایم کے پارلیمانی لیڈر سید سردار احمد کا کہنا ہے کہ پارکنگ لاٹ بنانے کا منصوبہ چار پانچ سال پہلے کا ہے اور یہ کہ یہ کواٹر خالی کرانے کے لیے ہم نے ملازمین سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں متبادل رہائش فراہم کریں گے۔ اس پانچ پرانے منصوبے پر اب عمل درآمد ہونے جارہا ہے۔ موجودہ اسپیکر سندھ اسمبلی نے اس وعدے کو پورا کرنے کا ایک اور وعدہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ متبادل جگہ فراہم کرنے سے قبل ان مکینوں کے کواٹروں کو مسمار کرنے کے احکامات کس نے جاری کیے۔ متعلقہ حکام کے علم میں نہیں تھا کہ اگر انہیں اس بہیمانہ طریقے سے بے دخل کردیا گیا تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔ جب اس طریقے سے بلاسوچے سمجھے اقدامات کیے جائیں گے تو لوگوں کو موقع ملے گا سیاست کرنے کا، اپنی دکان چمکانے کا۔ ان بے گھر خاندانوں کی داد رسی کرنا، ان کے خلاف متعلقہ حکام کی توجہ مبذول کرانا، چھوٹ چھوٹے بچے کھلے آسمان تلے زندگی گزار رہے ہیں، کھانے پینے کے مسائل ہیں ان میں اگر کچھ لوگوں نے تعاون کیا، اور انہیں سہولت فراہم کی چاہے وہ ایک بس منگوا کر جو فائیو اسٹار بس کی صورت میں تھی برا نہیں کیا۔ انسانیت کی خدمت کی ہے۔ آغا سراج درانی جو اس وقت اسمبلی کے اسپیکر ہیں ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس واقعہ سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لیں اور متاثرین کو اپنی پہلے فرست میں متبادل جگہ فراہم کی جائے۔

فہمیدہ ریاض اور امداد حسینی کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی

اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے اردو کی معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض کو 'کمالِ فن ایوارڈ' اور سندھی و اردو کے معروف شاعر و ادیب امداد حسینی کو ان کے شعری مجموعے 'دھوپ کرن' کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے دونوں علمی و ادبی شخصیات کے اعزاز میں تقریب پذیرائی کا اہتمام بروز ہفتہ 16 جنوری 2016ء کی صبح کیا۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر و ادیب پروفیسر سحر انصاری جو انجمن ترقی اردو کے اعزازی خازن، آرٹس کونسل آف پاکستان کے نائب صدر اور ہماری ویب رائیٹرز کلب 'کے سرپرستِ اعلیٰ بھی ہیں نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر فاطمہ حسن، معروف ڈرامہ نویس نور الہدیٰ شاہ، ڈاکٹر آصف فرخی اور مہ ناز رحمٰن شامل تھیں۔

شاعرہ فہمیدہ ریاض کا وطن ہندوستان کا شہر میرٹ (یوپی) ہے جہاں پر انہوں نے 28 جولائی 1946ء کو ایک علمی ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ فہمیدہ کے والد ریاض الدین احمد شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ 'دبستانوں کا دبستان کراچی' میں فہمیدہ ریاض کے حوالے سے لکھا ہے کہ ' ان کے والد قیام پاکستان سے قبل ہی 1930 ء میں پاکستان آگئے تھے ۔ سندھ کے معروف ماہر تعلیم نور محمد نے حیدر آباد سندھ میں ایک اسکول قائم کیا تو اپنے اسکول کے لئے انہوں نے ایک

مسلمان استاد کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے درخواست کی، چنانچہ جناب ریاض الدین حیدرآباد آئے اور اسکول سے منسلک ہوگئے۔ یہاں انہیں سندھ کے ادیبوں اور شاعروں کا حلقۂ احباب میسر آیا۔اس صحبت نے ان میں سندھی زبان و ادب سے گہرا لگاؤ پیدا کردیا۔ فہمیدہ حیدرآباد سندھ میں پلی بڑھیں، تعلیم حاصل کی، انہوں نے بہت کم عمر میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ابھی وہ پانچ سال ہی کی تھیں کہ والد انتقال کرگئے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کی والدہ کی نگرانی میں ہوئی جو خود بھی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔فارسی ادب کا ذوق رکھتی تھیں۔حالات کا ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کیا انہوں حیدرآباد میں ریاض الدین میموریل گرلز اسکول بھی قائم کیا لیکن یہ اسکول قائم نہ رہ سکا۔ فہمیدہ نے تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو، سندھی اور فارسی زبان و ادب پر عبور حاصل کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان پر خبریں پڑھنے سے کیا۔ کم عمری میں شادی ہوگئی جس کے بعد وہ لندل چلی گئیں تھیں، بد قسمتی سے یہ شادی کامیاب نہ ہوئی، لندن میں بی بی سی سے بھی وابستہ رہیں۔ کچھ دن بحیثیت اسسٹنٹ کسی لائبریری میں بھی کام کیا۔ دوسری شادی ظفر علی اجن سے ہوئی جواشتراکی ذہن اور بائیں بازو کے سیاسی ورکر تھے۔ فہمیدہ نے ان اشتراکی نظریات کو قبول کیا اور وہ ایک مارکسی اور بائیں بازوں کے نظریات رکھنے والی شاعرہ کے طور پر مقبول ہوئیں۔ فہمیدہ نے اپنے اس قطعہ 'تصویر' میں کیا کہا ہے ۔

مرے دل کے نہاخونے میں اک تصویر ہے میری
خدا جانے اُسے کس نے بنایا' کب بنایا تھا
یہ پوشیدہ ہے میرے دوستوں سے اور مجھ سے بھی
کبھی بُھولے سے لیکن میں اسے گر دیکھ لیتی ہوں
اسے خود سے ملاؤں تو میرا دل کانپ جاتا ہے

فہمیدہ نے اپنا ایک رسالہ 'آواز بھی' جاری کیا جو فہمیدہ کی بے باک اور آزاد شاعری اور ظفر علی اجن کے مارکسی اور بائیں بازوں کے نظریات کے پرچار کے باعث حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگادی۔ پاکستان میں یہ دور ضیاء الحق کا تھا۔ فہمیدہ بھی سیاسی ذہن رکھتی تھیں 1980ء کی دیہائی میں انہیں ہندوستان میں آٹھ سال گزانا پڑے۔ ہندوستان کے حوالے سے انہیں مختلف قسم کی باتیں بھی سننے کو ملیں۔ انہیں ہندوستان کا ایجنٹ بھی کہا گیا۔ بے نظیر دور میں واپس وطن آگئیں ۔اب حالت ان کے لیے سازگار تھے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اور اردو ڈکشنری بورڈ کی ایم ڈی بھی رہیں۔ ان کی تصانیف میں پتھر کی زبان، دھوپ، بدن دریدا، ادھورا آدمی، کھلے دریچے ، خط مرمز، گلابی کبوتر، آدمی کی زندگی، حلقہ میری زنجیر کا، پتھر کی زبان سب لعل وگہر: کلیات 1967-2000 ء اور دیگر شامل، Godovari: a noval، ہیں ۔ ان کے علاوہ شاہ عبد الطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

فہمیدہ کی کتاب 'یہ خانۂ آب گل: انتخاب دیوان شمس تبریزی۔جلال الدین رومی' اردو ترجمہ پہلے بار منظر عام پر آیا تو علمی و ادبی حلقوں میں حل چل مچ گئی، کہاں بائیں بازو اور اشتراکی ذہن رکھنے والی شاعرہ اور کہا جلا الدین رومی ۔اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر نعمان الحق نے تحریر کیا ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ ' پہلا ایڈیشن چھپا تو بزرگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ آخر آج کل اس شاعرہ کو اچانک رومی سے کیسے شغف پیدا ہوگیا؟ کہاں بگڑی اور داڑھی والے مولانا رومی ' ایک صوفی صافی شیخ، فقیر، حافظِ قرآن ، مدرسہ کے استاد، جن کے اشعار میں جگہ جگہ قرآنی آیات ، احادیث ، روایتی عربی ،ابیات ، قصہ ہائے پارینہ، اصطلاحات تصوف ان سب کی کثرت سے گونا گونی ہے اور کہا فہمیدہ ریاض کہ جن کا رشتہ اشتراکی کوچہ گردوں سے رہا۔ وہ بائیں بازوں والی مارکسی شاعرہ جن کے ہاں روایت سے ایک بے قرار سرکشی ہے۔ جن کے ہاں بدن، بلکہ عورت کا بدن، حجاب سے نکل کر موضوع سخن ہوگیا ہے۔ وہ موضوعِ سخن جس میں ایک جسارت انگر نیارومانی بھی ہے۔عالم فطرت کے حیاتیاتی کی عمل بھی ہیں، تولید بھی ہے، تسکین بھی ہے، پہچان بھی ہے اور نسوانی بدن کے خم و پیچ اور نشیب و فراز بھی ہیں ! لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟ کہا رومی کہا فہمیدہ؟ اور پھر اس سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ ہر خانۂ آب و گل والی فہمیدہ کوئی اور ہی فہمیدہ ہیں، یہ پچھلی والی شاعرہ کا نیا جنم ہے، بدن دریدہ والی فہمیدہ عدم

نابود ہوئیں اور ایک نئی فہمیدہ پیدا ہوئیں، مسئلہ تاریخ سے حل ہوگیا'۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بسا اوقات انسان اندر سے کچھ ہوتا ہے، حالات اور ظاہری تعلقات اور کیفیات اسے کچھ اور بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور مارکسی فلسفہ حیات کے علم بردار تھے انہیں ۱۹۶۳ء میں لینن انعام سے نوازا گیا، یہ عالمی ایوارڈ وصول کرنے کی تقریب میں فیضؔ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا'' امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں' اس لیے امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ' ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں''۔ فیض صاحب نے اپنے خیالات زبردستی کسی پر تھوپنے کی کبھی کوشش نہیں کی، ایک زمانے میں آپ نے جلا وطنی کی زندگی بھی گزاری، ایک دور ایسا بھی تھا کہ لوگ فیضؔ کے اشعار برملا پڑھتے ہوئے ڈرا کرتے تھے اور پھر یہ دور بھی آیا کہ مشاعروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر فیضؔ ہی فیضؔ ہوا کرتے تھے، متعدد گلوکاروں کو فیض کا کلام گانے سے ہی شہرت ملی۔ فیضؔ ایک سیدھے سادھے مسلمان تھے، افتخار عارف نے ایک انٹرویو میں فیضؔ سے پوچھا آپ جب پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کی طرف دیکھتے ہیں تو کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوتا؟'' فیض صاحب نے بغیر کسی تامل کے یہ بات کہی کہ زندگی میں دو پچھتاوے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں قرآن حفظ کرنا چاہتا تھا مگر چار پانچ پاروں کے حفظ کے بعد میں نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے ساری عمر اس کا ملال رہا۔ دوسرا یہ کہ

میں کرکٹر بننا چاہتا تھا اور نہیں بن سکا‘‘۔ یہ بات تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ فیض صاحب عربی جانتے تھے اور انھوں نے عربی میں بھی ایم اے کیا ہوا تھا لیکن یہ بات کہ وہ قرآن مجید حفظ کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ چند پارے حفظ بھی کر چکے تھے بہت کم لوگ اس سے آگاہ ہوں گے۔ آپ کی اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اندر کا فیض کیسا تھا۔ یہ بات آغا ناصر نے اپنے مضمون ’فیض کی چند باتیں‘ جو اخبار اردو کی جلد ۲۸ شمارہ ۲، ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں نقل کی ہے۔ اسی طرح فہمیدہ کے اشتراکی نظریات، شاعری میں بعض موضوعات کا آزادانہ اظہار اپنی جگہ لیکن مذہبی عقیدت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

امداد حسینی بنیادی طور پر سندھی کے شاعر اور ادیب ہیں۔ افسانہ نگاری، مضمون نویسی، کالم نگاری کے علاوہ انھوں نے مختصر کہانیاں اور گیت بھی لکھے۔ ان کے گیت معروف گلوکاروں عابدہ پروین، بلقیس خانم، ارشد محمود، روبینہ قریشی، ذرینہ بلوچ نے ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی پر گائے۔ پیشہ کے اعتبار سے استاد ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ، سندھ ٹیکس بک بورڈ، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ سندھی لینگویج اتھارٹی کی گورننگ باڈی کے رکن ہیں، انجمن ترقی اردو کی مجلس مشاورت کے رکن بھی ہیں۔ سندھی رسالے ’مہران‘ کے مدیر رہے۔ انھوں نے مرزا قلیچ بیگ کے معروف ناول ’زینت‘

کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ ان پہلا سندھی زبان کا مجموعہ 'امداد آھے رول (امداد آوارہ ہے) تھا جو بہت مقبول ہوا، 'شہر' حیدرآباد کے حوالے سے طویل ان کی نظم پر مشتمل تھا، دو دو چنیسر، سندھ جے دیٖنی ادب جو کیٹلاگ، ھوا جی ساھمون (ہوا کے سامنے)، جب کہ اردو زبان کا مجموعہ کلام 'دھوپ کرن' جس پر اکادمی ادبیات نے انہیں ایوارڈ سے نوازا شامل ہیں۔

امداد حسینی کی کتاب 'دھوپ کرن' جس پر اکادمی ادبیات کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا کے بارے میں پروفیسر انوار احمد زئی نے خوبصورت تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امداد حسینی! تم نے اپنی مختصر کتاب میں زمانے بھر کے دکھ اور درد، کرب اور تکلیف، ہنسی اور قہقہے، گلے اور شکوے، امید و بیم، خواب اور تعبیریں، سب کچھ جمع کردی ہیں کہ اس سے گزرتے ہوئے کبھی میرؔ یاد آئے کبھی شاہ لطیف، کبھی سچل، کبھی بلھے شاہ، کبھی فرید، کبھی بابا رحمان، کبھی شاہ کریم، کبھی گل خان نصیر۔ تمہاری مرلی کی دھن پر کتنے گیت خود بخود اترتے رہے اور قطرہ قطرہ رات گزرتی رہی'۔ پروفیسر انوار احمد زئی کے خیالات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ امداد حسینی کا یہ مجموعہ ادب کی مختلف اصناف پر مشتمل ہے۔ جس میں خوشی و غمی، دکھ اور سکھ سب ہی کچھ تو ہے۔ اکادمی ادبیات کی جان سے امداد حسینی کے اس مجموعے کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ درست ہے۔ یہ مجموعہ بجا طور پر ایوارڈ کا حق دار تھا۔

سندھ کی یہ دونوں شخصیات 16 جنوری کی صبح انجمن ترقی اردو میں شاعروں اور ادیبوں کے درمیان جلوہ افروز تھیں۔ چھوٹا ہال نما کمرہ دونوں مہمانوں کو دیکھنے اور سننے والوں سے بھر چکا تھا۔ لیٹ پہنچنے کی سزا یہ ملی کہ پیچھے بہ مشکل تمام سیٹ مل سکی۔ انجمن کے زیر اہتمام ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والا مہمان مدعو ہوتا ہے۔ لیکن آج کی تقریب اس اعتبار سے منفرد تھی کہ آج جو شخصیات مہمان تھیں ان دونوں کا تعلق سندھ کی سرزمین سے تھا۔ شاعر و ادیب اپنے مہمانوں کا نام سن کر کھچے چلے آئے تھے۔ یہ بات تو سچ ہے کہ جب سے ڈاکٹر فاطمہ حسن انجمن کی معتمدِ اعزازی کے مسند پر براجمان ہوئی ہیں انجمن میں گویا ماضی کی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ عالی جی مرحوم نے بے شمار اچھے کام کیے لیکن ان میں ایک اچھا کام انجمن کے لیے ڈاکٹر فاطمہ حسن کا بطور معتمد انتخاب ہے۔ پروردگار انہیں اس کا بھی صلہ عطا فرمائے۔ ہر ہفتہ کی صبح ادبی محفل سجی ہوتی ہے۔ گویا نئی معتمد نے انجمن میں بہار کا سما پیدا کر دیا ہے۔
انجمن کی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن نے دونوں مہمانوں کا مختصر تعارف کرایا، اکادمی ادبیات کی جانب سے دیے جانے والے ایوارڈ پر فہمیدہ ریاض اور امداد حسینی کو مبارک باد پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ فہمیدہ ریاض ہمارے ملک کی

معروف شاعرہ ہیں وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ نثر بھی بہت اچھا لکھتی ہیں، ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا بے باکی سے کہا اور بہت خوب کہا۔ امداد حسینی سندھی زبان کے شاعر جو اردو میں بھی شاعری کرتے ہیں کے بارے میں ڈاکٹر فاطمہ حسن کا کہنا تھا کہ امداد حسینی جنھیں میں امداد بھائی ہی کہتی ہوں بہت بڑے شاعر ہیں یہ ایوارڈ انہیں بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا لیکن دیر آید درست آید۔ آج ہم ان دونوں مہمانوں کو سنیں گے۔ معروف ڈرامہ نویس نورالہدیٰ شاہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امداد حسینی جدید شاعری کے قدآور شاعر اور سندھی زبان کے بڑے نقاد ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی جڑیں زمین میں اور زمین سے جڑیں لوگوں سے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ عورت پوری سوچتی ہے تو آدھا لکھتی ہے جب کہ مرد آدھا سوچتا ہے اور پورا لکھتا ہے۔ فہمیدہ نے پورا سوچا اور بلا جھجک پورا ہی لکھا۔ فہمیدہ ریاض کے بارے میں ڈاکٹر آصف فرخی کا کہنا تھا کہ فہمیدہ نے جدید اردو شاعری میں ایک توانا لہجہ دریافت کیا ہے شاعری کے علاوہ وہ ایک سنجیدہ افسانہ نگار کے طور پر بھی سامنے آئی ہیں۔ مہ ناز رحمٰن نے کہا کہ فہمیدہ نے اپنی کتاب 'بدن دریدہ' میں عورت کی حیثیت سے بات کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ ممکن نہیں کہ ایک عورت بھی یہ باتیں کر سکتی۔

فہمیدہ ریاض نے حاضرین سے اپنے خطاب میں زیادہ باتیں امداد حسینی کے حوالے

سے کیں، بعد میں اپنا کلام بھی سنایا۔ امداد حسینی کے بارے میں فہمیدہ کا کہنا تھا کہ وہ محبت کی شاعری لکھتے ہیں ان کی شاعری پڑھتی آئی ہوں۔ ان سے میری محبت بڑی پرانی ہے انھوں نے مضامین بھی لکھے۔انھوں نے ماڈرن شاعری کا راستہ اختیار کیا، انھوں نے سندھی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کی۔وہ من موجی اپنی دھن میں رہنے والے شاعر ہیں۔

فہمدہ ریاض کے چند اشعار۔

کبھی دھنک سے اترتی تھی ان اداؤں میں
وہ شوخ رنگ بھی دھیمے پڑے ہواؤں میں
جب نیند بھری ہو آنکھوں میں، جب رات گئے بیلا مہکے
اور چار طرف ہو سناٹا، چپ چاپ گہر ہوتے ہوں لمحے
ایسے میں ہوا کا جھونکا بھی، پتوں میں جو آہٹ کرتا ہے
مجھے تو گماں یہ ہوتا ہے جیسے وہ ہنسا آہستہ سے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، پھر میں چپکے سے ہنستی ہوں
پھر میں چپکے سے ہنستی ہوں، دھیرے دھیرے سوجاتی ہوں

امداد حسینی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی شاعری اور نثر کے بارے میں تفصیل سے بات کی۔انھوں نے اپنا اردو اور سندھی کلام بھی سنایا۔ اپنی معروف نظم سندھ ایسا تو نہیں تھا' اور' کمرے کی دیواریں پانچ '۔ امداد'

حسینی کی ایک نظم 'پاگل ہوا بھی ساتھ میں ہے' کے چند اشعار۔

دن کی کس کو تلاش رات میں ہے
چاند کی لالٹین ہاتھ میں ہے
کہیں باہر سے وہ نہیں آتی
موت جو کچھ بھی ہے حیات میں ہے
تجھ سے مل کر مجھے لگا ایسا
خود سے ملنا بھی ممکنات میں ہے

صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں نئے مضامین ملتے ہیں، انہوں نے بڑے حوصلے سے اپنے آدرس کو قائم رکھا ہے۔ یہ ایوارڈ اہمیت کے حامل ہیں۔ فہمیدہ نے سیاسی اور سماجی اور احتجاجی شاعری کی اور بڑے حوصلے اور عملی طور پر اپنے آدرش کو قائم رکھا۔ جب کہ ان سے قبل خواتین کے مسائل کے بارے میں مرد لکھتے تھے لیکن فہمیدہ ریاض نے خواتین کی شاعری لکھتی ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری نے امداد حسینی کی علمی ادبی خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

تقریب کے اختتام پر صدر انجمن ترقی اردو راجو جمیل نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

گرم سیاسی موسم : وفاق بہ مقابلہ سندھ

آجکل سیاسی موسم انتہائی گرم ہے، فریقین ایک دوسرے پر گولا باری کرنے میں سبقت لے جانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ سیاست میں تلخ کلامی اس وقت شروع ہوئی جب وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف بیرون ملک کے دورے پر تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں وزیر داخلہ جو موجودہ بینہ کے سب سے اہم، طاقت ور وزیر تصور کیے جاتے ہیں نے ایک پریس کانفرنس میں سندھ کے حکمراں سیاست دانوں کو آڑے ہاتھو لیا۔ چودھری نثار نے سندھ کے حکمرانوں کے ساتھ اپنی جماعت کی پنجاب کی حکومت پر بھی تنقید کرتے ہوئے پنجاب میں اسکولوں کی بندش کو دہشگردوں کی حوصلہ افزائی قرار ددیا۔ اپنی اس پریس کانفرنس میں وزیر داخلہ نے اپوزیشن لیڈر کی حکومت سے مک مکا کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ اسی مک مکا کا الزام تحریک انصاف لگاتی رہی ہے۔ انہوں نے اپنی ہی حکومت سے پوچھا کہ اس کے بدلے میں کیا حاصل ہوا، ان کا یہ بھی فرمانا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف بندوق کی جنگ تو سیکوریٹی اداروں کی کاوشوں سے جیت رہے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر ہار رہے ہیں۔ چودھری نثار نے تحریک انصاف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ خیبر پختونخواہ نے اسکول بند نہ کرکے اچھی مثال قائم کی ، انہوں نے فرمایا کہ پیپلز پارٹی مایوسی پھیلا رہی ہے ، مایوسی اور ڈپریشن پھیلانے والوں کا راستہ روکنا ہوگا۔ چودھری نثار کے

بارے میں مختلف قسم کی خبریں بہت عرصہ سے گردش کر رہی ہیں کہ ان کا جھکاؤ کپتان کی جانب ہے، ان کے اس قسم کے بیانات جس میں کپتان کی پارٹی کے لیے نرم گوشہ دکھائی دیتا ہے کی وجہ سے ان خبروں کو تقویت ملتی ہے۔ سوشل میڈیا پر مسلسل اس قسم کی قیاس آرائیاں کافی عرصہ سے چل رہی ہیں کہ چودھری صاحب اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے کے فیس میں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ نواز شریف اور ان کی جماعت کے لیے بہت بڑا سیاسی جھٹکا ہوگا۔ جب کہ ان کی جماعت کے چند وزراء چودھری صاحب پر ظاہری طور پر مگرمچھ کے آنسو بہائیں گے لیکن اندر سے خوشی منا رہے ہوں گے کہ چلو میاں صاحب کے ایک چھیتے سے تو نجات ملی۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی ایسی مثالیں ماضی میں ملتی ہیں کہ لوگوں نے اقتدار کو ٹھوکر مار کر مخالف جماعت کا رخ کیا، یا پھر وہ خاموشی سے گھر بیٹھ گئے، چودھری سرور گورنری چھوڑ کر تحریک انصاف میں شامل ہوگئے۔ مخدوم شاہ محمود بھی پاکستان پیپلز پارٹی کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ خیر یہ تو نون لیگ کا اندرونی معاملہ ہے۔ میاں صاحب چودھری نثار کو اتنا بڑا قدم شاید ہی اٹھانے دیں۔ چودھری صاحب اور میاں ہی نون لیگ کے والد لیڈر ہیں جن کے درمیان عزت اور مروت کا رشتہ بھی قائم ہے۔ چودھری صاحب ناراض بھی ہوئے لیکن انھوں نے میاں صاحب کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ خاموشی ضرور اختیار کر لی۔ میاں صاحب کے علاوہ وہ پارٹی کے ہر ایک لیڈر کی خامیوں کے بارے میں وہ دو ٹوک الفاظ میں بیان داغ دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ نون لیگ کے نڈر، بے باک لیڈر گردانے جاتے ہیں۔

چودھری نثار کی اس بمباری سے سندھ حکومت اور پاکستان پیپلز پارٹی میں ہیجان کی کیفیت پیدا ہوجانا یقینی تھا۔ ایک سے زیادہ پارٹی لیڈروں نے اپنی بندوق کا رخ چودھری نثار کی جانب کرتے ہوئے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے چودھری صاحب کی کارکردگی پر متعدد سوالات اٹھائے۔ خورشید شاہ صاحب نے چودھری نثار کو وزیر اعظم کی آستین کا سانپ قرار دیا۔ مولا بخش چانڈیو نے چودھری نثار کو طالبان کا ترجمان اور نثار کھوڑو نے چودھری صاحب سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔وزیر داخلہ کی پریس کانفرنس سے ایک روز قبل ہی سپہ سالار پاکستان جنرل رحیل شریف نے کراچی کا دورہ کیا تھااور کور ہیڈ کواٹر میں امن و امان سے متعلق اجلاس کی صدارت کی تھی ۔ آرمی چیف نے اجلاس کے بعد اس عزم کا اظہار کیا کہ کراچی کے عوام کی روز مرہ زندگی کو بے خوف اور پر امن بنانے کے لیے کسی بھی حدتک جائیں گے، کراچی کو دہشت گردی سے پاک کیا جائے گا۔ شہر قائد میں امن و امان اور عوام کے تحفظ کو یقینی بنائیں گے۔آرمی چیف نے حکم دیا کہ کراچی میں دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو تباہ کرتے ہوئے شہر سے باہر ان کے ٹھکانوں اور رابطوں کو ختم کیا جائے۔ جنرل راحیل کے اس عزم کے بعد چودھری صاحب کا ایک دم سے ڈنڈا لے کر سندھ حکومت کو ٹھیکا لگانا ،کیا ان میں کسی بھی قسم کا تعلق ہوسکتا ہے؟ گرما گرم سیاسی ماحول میں جب

کہ پاکستان پیپلز پارٹی چودھری نثار کے لگائے ہوئے زخموں کو صاف کرتے ہوئے جوابی کاروائی کر ہی رہی تھی ، ایک کے بعد ایک پیپلز پارٹی کا رہنما چودھری نثار کے لگائے گئے الزامات کا جواب دے رہا تھا۔ وزیر اعظم میاں نواز شریف نے گرما گرم ماحول کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ وفاق' سندھ حکومت سے تصادم نہیں چاہتا، اقتصادی استحکام اور دہشت گردی کے خلاف کامیابیوں نے عوام میں نئی امید پیدا کر دی ہے، گرما گرمی کے اس ماحول میں رینجرز نے کراچی سے عذیر بلوچ کی گرفتاری ظاہر کرتے ہوئے انہیں دہشت گردی کی عدالت میں پیش کرکے نوے دن کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ ایک منصوبے کا حصہ ہے؟ نون لیگ کی جانب سے پاکستان پیپلز پارٹی پر پے در پے حملے کرکے اسے مفلوج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، کچھ اس قسم کی اطلاعات بھی ہیں کہ پیپلز پارٹی پر سیاسی دباؤ بڑھا یا جارہا ہے، اس کے اثرات سندھ کی ایک اور بڑے سیاسی جماعت پر بھی ہوں گے جو پہلے ہی مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ چودھری نثار کی جانب سے مک مکا کی بات گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے مترادف ہے۔ کیا سید خورشید شاہ صاحب کو میاں صاحب یا ان کی حکومت نے فائدہ پہنچایا ؟ کیا انہیں خریدنے کی کوشش کی گئی؟ کیا خورشید شاہ صاحب کو اب پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ سیاست میں کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ جہاں تک مک مکا کا تعلق ہے تو زرداری صاحب کی صدارت میں میاں صاحب کی فرینڈلی اپوزیشن سے قوم اچھی طرح واقف ہے۔

میاں صاحب اور زرداری صاحب کے درمیان کسی بھی قسم کے خفیہ مک مکا کو بعید از قیاس تصور نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کے درمیان تو کسی بھی قسم کا مک مکا نہیں لیکن دونوں سیاسی پارٹیوں کے سربراہان کے درمیان کچھ انڈر اسٹینڈنگ کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ میاں صاحب اور پی پی کے لیڈروں کے درمیان مک مکا کی پرانی تاریخ ہے۔ میاں صاحب پی پی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کے عادی رہے ہیں، قوم کو اچھی طرح یاد ہے کہ میاں صاحب اور بے نظیر بھٹو کے درمیان 'میثاق

جمہوریت' کے نام سے مکا مکا ہوا تھا، دوسرا مک مکا پیپلز پارٹی کے سابق دور میں جس میں زرداری صاحب صدر مملکت کے منصب پر فائز تھے، میاں صاحب نے ان سے پانچ سال پورے کرنے کا خاموش مک مکا کیا ہوا تھا جس کا عملی مظاہرہ پوری قوم نے دیکھا، اس عمل کو جمہوریت بچاؤ معاہدہ بھی کہا گیا، اب زرداری صاحب بھلا میاں صاحب کا یہ احسان کیسے بھلا سکتے ہیں، اس لیے کہا یہی جارہا ہے کہ یہ سب مک مکا ہے، میاں صاحب نے پیپلز پارٹی کے لیے مشکلات پیدا نہیں کیں، فرینڈلی اپوزیشن کی، ان پر یہ الزام لگا یا گیا، انہوں نے اسے جمہوریت بچاؤ رویہ کہا اب زرداری صاحب بھی میاں صاحب کی حکومت کو کس طرح گرا سکتے ہیں، وہ بھی فرینڈلی اپوزیشن کا جواب فریڈلی باتوں سے ہی دیں گے، ظاہر میں ایک دوسرے پر الزام تراشیاں ہوتی رہیں گی۔ ڈاکٹر عاصم کو کس شد ومد کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا، کس قدر آہ و بکا کی گئی، ریمانڈ پر ریمانڈ، بیانات پر بیانات، نکلا کیا، سہولت کاری کا

الزام، اسپتال میں دہشت گردوں کا علاج ہوا، اب کہاں ہے ڈاکٹر عاصم، بہت آرام و سکون کے ساتھ اسپتال کے وی آئی پی روم میں ، جہاں تمام طرح کی آسائشیں حاصل ہیں۔ ڈاکٹر عاصم کا معاملا ٹھنڈا ہوچکا اب عذیر بلوچ اسکرین کی زینت بن چکا ہے۔ اس کے حوالے سے کئی علاقائی لیڈروں کو اسکرین پر آنے کا موقع مل گیا ہے۔ عذیر بلوچ کب گرفتار ہوا، رینجرز کی بیان کردہ کہانی درست ہے یا پھر وہ باتیں درست ہیں جو میڈیا اور سوشل میڈیا میں عرصہ دراز سے گردش کررہی ہیں، بعض بعض تجزیہ نگار تو چھ ماہ قبل عذیر کی گرفتاری کی خبر دے رہے ہیں، حتیٰ کہ وزیر اعلیٰ سندھ نے بھی یہ کہتے ہوئے کہ رینجرز نے ان سے عذیر بلوچ کی گرفتاری کا بتایا، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ انہوں نے بھی سنا ہے کہ عذیر بلوچ کو پہلے گرفتار کیا جاچکا تھا۔ کیا صحیح ہے کیا غلط، ہمارے ملک کا نظام اور سیاست کا دستور نرالا ہے۔ یہاں ہر چیز ممکن ہے۔ عوام کی نظریں سیاست دانوں کے پر نہیں بلکہ صاحب اختیار قوتوں پر ہیں ، ان کا خیال ہے کہ جنرل راحیل شریف جن کے ریٹائر منٹ میں چند ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں اور انہوں نے اپنی مدت ملازمت میں توسیع نہ لینے کا فیصلہ بھی کیا ہے تو کیا وہ اس باقی ماندہ وقت میں اپنا ہدف مکمل کرلیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ مکمل تورپر یہ کام ان کی موجودگی میں نہ ہوپائے لیکن فوج ایک ایسا ادارہ ہے کہ جہاں شخصیت سے بڑھ کر ادارے کا تقدس اہم ہوتا ہے ، شخص کوئی بھی ہو جس ہدف کا فیصلہ ہوچکا اس پر ہر صورت میں عمل ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے امید یہی

ہے کہ جنرل راحیل شریف کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کی جگہ کوئی بھی ہوگا، دہشت گردی کے خلاف، پاکستان کو خصوصاً کراچی کو دہشت گردی اور دیگر برائیوں سے پاک کرنے کا عمل جاری و ساری رہے گا۔ جہاں تک سیاست دانوں کے بیانات کا تعلق ہے تو ہمارے سیاست داں باتوں کے غازی ہیں وہ اپنے مخالف کو دشمن تصور کرکے اس پر حملہ کرتے ہیں حالانکہ سیاست میں برداشت اور درگزر سے آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ الفاظ اور جملوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنے سے اچھائی ہوگی برائی نہیں۔

سپہ سالار پاکستان کا صائب فیصلہ

سپہ سالار پاکستان جنرل راحیل شریف کی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے گردش میں رہنے والی تمام خبروں نے دم توڑ دیا جب سپہ سالان نے یہ اعلان کیا کہ وہ مدت ملازمت میں توسیع نہیں لیں گے۔ جنرل صاحب نے یہ فیصلہ کرکے یہ ثابت کردیا کہ وہ ایک سچے سپاہی ہیں۔ انہیں قومی مفاد عزیز ہے اپنی ذات نہیں۔ جنرل صاحب نے جب سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان سے دہشت گردی کو جڑ سے ختم کرکے دم لیں گے ، ان کے اس عزم کا ساتھ پاکستان کے ہر طبقہ فکر نے کھلے دل اور بے خوف وخطر ہو کر دیا۔
دہشت گردوں کا قلہ قما کرنے کے لیے جو اقدامات سپہ سالار نے کیے اور جس طرح ان اقدامات پر عملی طور پر عمل عوام الناس کو نظر آیا ، پاکستانی عوام کے دلوں میں سپہ سالار کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا گیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ جنرل راحیل شریف حقیقت میں پاکستان کے سچے ہمدرد، مخلص اور ملک کی بہتری کے لیے کچھ کرنے کا پختہ عظم رکھتے ہیں۔
گزشتہ دنوں پاک فوج کے ترجمان جنرل عاصم باجوہ نے سماجی ویب سائٹ ٹوئٹر پر یہ بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ سربراہ پاک فوج جنرل راحیل شریف کی مدت ملازمت میں توسیع سے متعلق افواہیں بے بنیاد ہیں جب کہ اس حوالے سے آرمی

چیف جنرل راحیل شریف کا کہنا ہے کہ پاک آرمی عظیم ادارہ ہے اور مدت ملازمت میں توسیع پر یقین نہیں رکھتا۔ ان کا یہ بھی کہنا سو فیصد درست ہے کہ ملک سے دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کئے جانے والے اقدامات بھرپور طاقت کے ساتھ جارہ رہیں گے، پاکستان کا وسیع تر ملکی مفاد مقدم ہے اور ہر قیمت پر ملک کو محفوظ بنایا جائے گا۔ جنرل راحیل شریف نے یہ بھی کہا کہ پاکستان آرمی ایک عظیم ادارہ ہے مدت ملازمت میں توسیع پر یقین نہیں رکھتا، مقررہ وقت پر ریٹائر ہو جاؤں گا۔ دہشت گردی کے خاتمہ کا سلسلہ بھرپور عزم کے ساتھ جاری رہیگا، پاکستان کا قومی مفاد ہر چیز پر مقدم ہے اور اس کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا۔

کسی بھی سرکاری ملازمت میں یہ ایک معمول کا مرحلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے ایک قانون ابتدا سے بنا ہوا ہے جس کے تحت ہر سرکاری ملازم کو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے پر اپنے عہدہ سے ریٹائر ہونا ہوتا ہے۔ البتہ پہنچ رکھنے والے مختلف طریقے سے اپنے مدت ملازمت کو توسیع دلواتے رہتے ہیں۔ ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ اہم شخصیات نے اپنی مدت ملازمت میں توسیع حاصل کی یا اُسے اُس کے بااعتماد ہونے کی بنا پر اس عہدہ پر برقرار رکھا گیا۔ اس لیے کہ قانون میں بھی اس کی گنجائش موجود ہے۔ سابق آرمی چیف کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے جنہیں توسیع دی جاتی رہی لیکن ایک وقت ایسا آگیا کہ انہیں جانا ہی پڑا۔

اس کے علاوہ بھی بے شمار مثالیں ہیں سرکاری ملازمین کی کہ جن کی مدت ملازمت میں توسیع دی جاتی رہی۔ قانون میں یہ گنجائش ہے کہ صدر مملکت وزیر اعظم کی سفارش پر ان کی مدت ملازمت میں توسیع کر سکتے ہیں۔

جنرل راحیل شریف کی سرکاری ملازم کی حیثیت سے مدت ملازمت اس سال کے آخر میں پوری ہو رہی ہے۔ اس میں ابھی دس ماہ باقی ہیں لیکن ان کے ریٹائرمنٹ کو قبل از وقت موضوع بنایا گیا اور مختلف بیانات سامنے آئے، ایسا کیوں ہوا؟ کس کے ایما پر ہوا، آخر کار سپہ سالار کو اس موضوع کے حوالے سے وضاحت کرنا پڑی۔ ان کی وضاحت سے اس حوالے سے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے، تمام افواہیں دم توڑ گئیں۔ سپہ سالار کے اس فیصلے کو عوام اور لیڈران قوم کی اکثریت نے مناسب فیصلہ، خوش آئند، وقار میں اضافے کا باعث قرار دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل راحیل شریف جیسے پیشہ ور جنرل، محبِ وطن رہنما کی پاکستان کو ایک طویل عرصہ کے لیے ضرورت ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں جنرل راحیل شریف کا اسی حیثیت میں برقرار رہنا ملک اور قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں ہے۔ ملک میں نیشنل ایکشن پلان کو ابھی پائے تکمیل تک پہنچنا باقی ہے، کراچی اور دیگر علاقوں میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ابھی مکمل نہیں ہوا، ملک میں کرپشن کے خاتمے کے لیے جاری آپریشن کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنا باقی ہے۔ یقیناً سپہ سالار کی بھی یہی خواہش اور کوشش ہے کہ جب ان کی مدت ملازمت کا

وقت آئے تو وہ اپنے تمام تر اہداف پائے تکمیل کو پہنچا چکے ہوں۔ لیکن دہشت گردی اور کرپشن کے ناسور کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے میں ایسی ہی سنجیدگی، تیزی، بلند حوصلہ کی ضرورت ہے جو جنرل راحیل شریف نے دکھائی ہے۔ دہشت گردی اور کرپشن کو اس عرصہ میں شاید مکمل طور پر دور کرنا ممکن نہ ہو لیکن سپہ سالار کی خواہش اور عملی کوشش ہے کہ وہ اس کام کو جہاں تک ممکن ہوسکے آگے بڑھادیں، ملک سے دہشت گردی کا خاتمہ کردیں اور کرپشن کے خاتمے کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی گئی ہے اسے ان کے جانے کے بعد بھی جاری رکھا جاسکے۔ سپہ سالارِ پاکستان نے قبل از وقت اپنے ارادوں کا فیصلہ بانگِ دھل کرکے ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے، قوم کو حیران کردیا، ان کا یہ فیصلے نے ان کی عزت اور وقار میں اضافہ کا باعث ہوا ہے، ہمارے ملک میں طاقت وریا اثر رسوخ رکھنے والے سرکاری ملازمین کے لیے مدت ملازمت میں توسیع لے لینا ایک ایسا کلچر بنا ہوا ہے کہ جس نے بعض اداروں کے ملازمین میں بددلی پیدا کر رکھی ہے جنرل راحیل کا یہ فیصلہ ملک میں مدت ملازمت میں توسیع کلچر کے خاتمے کا باعث بھی ہوگا۔ عوام الناس کے علاوہ ملک کی بعض اہم سیاسی جماعتوں نے بھی سپہ سالار کے اس فیصلہ کو سراہا اور اسے ایک صائب فیصلہ قرار دیا۔ یہ سیاسی جماعتیں جو کچھ عرصہ تک جنرل صاحب کی مدت ملازمت میں توسیع کے مشورہ دے رہی

تھیں نے بھی اس فیصلہ کو قابل تحسین فیصلہ کہا ہے۔ سپہ سالار کے اس فیصلے سے ملک میں برپا ہونے والی قیاس آرائیاں، آئے دن اخبارات میں آنے والے تجزیے اور تبصرے، ٹی ٹاک میں تجزیہ نگاروں کی آراء اپنی موت آپ مرگئیں ہیں۔ سپہ سالاِ پاکستان کے اس فیصلے کے وہ از خود اور ان کے ساتھی اپنے اہداف کے حصول کے لیے انتہائی تند دہی کے ساتھ کام کریں گے تاکہ وقت مقرہ پر اپناہدف حاصل کر سکیں، ایک اہم بات ادارے میں اعتماد اور دلجمعی کے ساتھ کام کرنے اور مدت ملازمت کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوگی، ساتھیوں میں اعتماد بڑھنے کا باعث ہوگا۔ ریٹائر منٹ کو معیوب سمجھنے والے اپنے آپ کو دھوکا دیا کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ صرف وہ ہی اس کے اہل ہیں جب کہ جنرل راحیل شریف نے اپنے فیصلے یہ ثابت کردیا کہ یہ سوچ کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں، دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہیے، دیگر دشعبوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ اپنے عہدوں سے چمٹے رہتے ہیں، چاہے ان کی کارکردگی کچھ ہو، آخر میں ایسے لوگ عزت سے رخصت نہیں ہوتے، اسی قسم کی صورحال سیاسی جماعتوں میں بھی پائی جاتی ہے، پارٹی بنانے والا سیاست داں پارٹی کی رہنمائی کو اپنا جدی پشتی حق تصور کرتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پارٹی وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑتی جاتی ہے،
ہمارے بعض حکمراں ایسے رہے کہ وہ بات کرتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے بار بار رومال سے اپنی رال صاف کیا کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو سب سے بہتر حکمراں تصور کیے ہوئے تھے۔ گئے تو لیکن اپنے پیروں چلتے نہیں، ایسی

حکمرانی سے کیا فائدہ۔

سپہ سالار پاکستان نے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی شخص اگر اپنے کردار اور عظم و ہمت سے مثبت مقام بنالے تو اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اپنے آپ کو ہمشہ کے لیے اس عہدہ کا اہل سمجھ بیٹھے۔ جنرل صاحب کا یہ فیصلہ ہر اعتبار سے سراہا گیا، اسے ایک اعلیٰ فیصلہ ہر اعتبار سے مناسب گردانا جارہاہے اور ایسا ہونا چاہیے۔ تاریخ میں سپہ سالار پاکستان کے اس فیصلہ کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

تعلیمی اداروں کی بندش مسئلہ کا حل نہیں

کالم نگاری میرا شوق ہے ذریعہ معاش نہیں، یہ ’ سیلف امپوز‘ ذمہ داری ہے اسے میں اسی طرح ادا کرتا ہوں جس طرح میں اپنے کام دورانِ ملازمت کیا کرتا تھا۔ عام طور پر دو دن میں ایک کالم لکھتا ہوں، آج دوسرا دن ہوگیا تھا، میں کچھ خاموش خاموش سا تھا،لکھنے کی جانب طبیعت مائل نہیں ہورہی تھی ۔ میری بہو ڈاکٹر ثمرا کچھ محسوس کرتے ہوئے گویا ہوئی کہ ابو لگتا ہے کہ آپ اپنے کالم کے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں، میں خاموش ہورہا، پھر بولی ابو ایسا کریں کہ تعلیمی اداروں کی جبری بندش کے حوالے سے کچھ لکھیں ،اس موضوع پر آپ نے ابھی تک نہیں لکھا۔ میرے ذہن میں کوئی اور موضوع تھا لیکن میری سوچ کا دھارا اس جانب ہوگیا۔ حکومت پنجاب نے اسکولوں کو جبری بند کیوں کیا؟ اس حوالے سے یہ خبر میری نظر سے گزرچکی تھی کہ پنجاب میں تعلیمی اداروں کی بندش کا فیصلہ افغانستان سے 13 خود کش بمبار پاکستان میں داخل ہونے کی اطلاع پر کیا گیا۔ پاکستان فوج کے زیر انتظام تعلیمی ادارے ، پنجاب کے تمام سرکاری و نجی تعلیمی ادار وے بند کردیے گئے۔ ، اس کے علاوہ ملک بھر میں جامعات ‘ کالجوں اور اسکولوں میں سکیورٹی الرٹ کردی گئی۔ فوری طور پر یہ اقدام درست تھا، کسی بھی حادثہ سے بچاؤ کا ایک یہ بھی راستہ تھا جو اختیار کیا گیا لیکن سوچ نے بات یہ ہے کہ آرمی پبلک اسکول کے

واقعہ کو ابھی ایک سال ہی گزرا ہے کہ پشاور کے ایک اور تعلیمی ادارے میں اسی نوعیت کا واقع رونما ہوگیا۔ 16 دسمبر 2014 ء سے 20 جنوری 2016ء کے درمیان ایک سال ایک ماہ تین دن میں سکیورٹی کے حوالے سے ہم نے کیا اقدامات کیے۔ امریکہ میں 11/9 کے بعد دہشت گردی کا کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا. برطانیہ نے 7/7 کے بعد آخر ایسے کون سے اقدامات کیے کہ دہشت گردوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا، اب فرانس میں بھی شاید ہی کوئی اور واقعہ دہشت گردی کا ہو لیکن ہم کیسی قوم ہیں، کیسی حکومت ہے ہماری کہ ہم اس حوالے سے وہیں کہ وہیں کھڑے ہیں، دہشت گرد آرمی پبلک اسکول میں داخل ہوئے کاروائی کی ، جان دی اور چلتے بنے، ایک سال بعد باچا خاں یونیورسٹی میں آئے کاروائی کی ، جان دی اور کام کردکھایا۔ ہم نے پہلے بھی زبانی جمع خرچ کیا اور اب بھی وہی کچھ کر رہے ہیں۔

دہشت گردوں کا تعلیمی اداروں کے معصوم بچوں کو نشانہ بنانا اس قدر گھناؤنا فعل ہے کہ اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔ سمجھ سے باہر ہے کہ دہشت گرد اس قدر سفاک اور سنگ دل ہیں کہ معصوم اور پھولوں پر گولیاں برساتے ہوئے ان کی ہاتھ نہیں لرزتے، ان کا ضمیر کس طرح انہیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ پھولوں کو خون میں نہلا دیں۔ لیکن ایسا ہوا، پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں دہشت گردوں نے نہتے ، معصوموں کو خون میں نہلا دیا، ان پر اس قدر گولیا

ں برسائیں کہ وہ پھول اپنے اساتذہ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ 16 دسمبر 2014ء جس دن دہشت گردوں نے سفاکیت، بربریت کی ایسا مثال قائم کی تھی کہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور مثال ایسی مل سکے۔ اس دن کتنی ہی ماؤں کے لخت جگر خون میں نہلا دیے گئے، ماؤں پر قیامت گزر گئی، زمین کانپ اٹھی تھی، آسماں لرز گیا تھا، شجر تھرا گئے تھے، پہاڑ
بیقراری کے عالم میں آ گئے تھے، انسان تو انسان جانوروں نے بھی اس بربریت پر اشک بہائے ہوں گے، پھولوں کو لہو لہان دیکھ کر ہر آنکھ اشک بار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ 132 معصوم بچے اور دیگر 9 افراد شہید کر دیئے گئے تھے۔ کمسن معصوم پھول دہشت گردوں کے ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی درد ناک داستاں چھوڑ گئے جو زندگی بھر ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پل پل یاد کرتی رہیں گی، اشک بہاتی رہیں گی، بہنیں معصوم بھائیوں کو یاد کر کے خون کے آنسوں بہائیں گی۔ باپ اپنے جگر گوشوں کی یاد کے آنسوں اپنی آنکھوں سے باہر نکلنے نہ دیں گے بلکہ ان کی آنسوں کا سمندر ان کے جگر کو اندر ہی اندر چھید ڈالے گا۔ معصوم پھولوں کے جنازے اٹھے تو ایک کہرام بپا ہوا، اشکوں
کا سیلاب رواں تھا، آہوں اور سکیوں میں پھولوں کے جنازوں کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ ابھی اس غم کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ دہشت گردوں نے 20 جنوری 2016ء کو خیبر پختونخواہ کے شہر چارسدہ کی باچا خان یونیورسٹی کے

طلباء، اساتذہ اور عملے کو نشانہ بنایا۔ جس میں دو درجن سے زیادہ طالب علم، استاد اور دیگر شہید ہوئے جب کہ بے شمار زخمی۔ یکم فروری کو کراچی کے ایک نجی اسکول کے باہر کچھ پوسٹر دیکھے گئے جس میں دہشت گردوں نے دہشت گردی کرنے کی دھمکی دی جس کے باعث اسکول میں خوف وہراس پھیل گیا والدین اپنے بچوں کو فوری طور پر اسکول سے گھر لے گئے۔ دہشت گردی کی تمام کاروائیوں میں دہشت گرد تو اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتے ہیں یعنی ہماری لاء انفورسمنٹ ایجنسیز انہیں جہاں تک ممکن ہوتا ہے کم سے کم وقت میں ان کا صفایا کردیتی ہیں لیکن دہشت گرد تو اس ارادے سے ہی کاروائی کرنے کے مقام پر داخل ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی جان دینی ہے، اگر کوئی دہشت گرد پولیس اور فوج کے ہاتھوں بچ بھی جاتا ہے اور اسے یہ احساس ہوجاتا ہے کہ اسے اب پکڑلیا جائے گا تو وہ اولین فرصت میں خود کو بم سے اڑا لیتا ہے۔ باچا خان یونیورسٹی میں دہشت گردی کے بعد مختلف قسم کی دہشت گردی کی خبریں گردش کرتی رہیں جس کے باعث اسکولوں کو بند کرنا پڑا، خاص طور پر پنجاب میں اسکولوں کی حفاظتی اقدامات، نہ مناسب سکیورٹی کے باعث اسکولوں کو بند کردیا گیا، گو اب یہ کھل چکے ہیں، نجی اسکولوں کے مالکان نے حکومت کو سکیوریٹی فراہم کرنے کا مطالبہ کیا اور اس وقت تک اسکولوں کو بند رکھنے کا کہا جب تک حکومت اسکولوں کو فول پروف سیکیوریٹی فراہم نہیں کردیتی۔

پنجاب حکومت کے اس اقدام کو جس میں تمام اسکولوں کو بند کردیا گیا نہ مناسب قرار دیا گیا، وفاقی وزیر داخلہ نے حکومت پنجاب کے اس اقدام پر تنقید کی، میاں نواز شریف نے بھی اس اقدام کو غیر مناسب قرار دیا۔ حکومت پنجاب کے اس عمل سے صوبے میں خاص طور پر بچوں میں خوف و حراس ، بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو جانا قدرتی عمل تھا۔ اس لیے کہ دہشت گردی پختونخواہ میں ہوئی اور پنجاب کی حکومت نے اسکولوں میں مناسب سکیوریٹی انتظامات نہ ہونے کے باعث بند کردیا، یہی نہیں بلکہ پنجاب میں ایسی باتیں بھی سامنے آئیں کہ جن سے استاد کے مرتبے کی توہین ہوئی، استاد کا وقار مجروح ہوا۔ سکیوریٹی سے ایک استاد کا کیا تعلق یہ تو حکومت یا نجی اسکولوں کی انتظامیہ کا کام ہے۔ تعلیمی اداروں کی بندش مسئلہ کا حل نہیں ، یہ تو بہت ہی عارضی اور کمزور حکمت عملی کا اظہار ہے، دشمن اور دہشت گرد یہی تو چاہتا ہے کہ اس کے اقدامات سے خوف پھیلے، بے یقینی کی فضاء پیدا ہو اس عمل سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ مسئلہ کی بنیاد، اصل کار کو ایڈریس کرنے کی ضرورت ہے۔ کیڑا لگے درخت کے پتوں، ٹہنیوں حتیٰ کے تنے کا علاج نہ کریں بلکہ درخت کی جڑوں کے علاج کی ضرورت ہے ۔ضرب عضب کے ذریعہ دشمن اور دہشت گرد کے ٹھکانوں پر مسلسل کاروئی کی جارہی ہے، انہیں نیست و نابود کرنے کے اقدامات کیے جارہے ہیں ، بے شمار دہشت گرد مارے جاچکے ہیں لیکن یہ ایسا ناسور بن چکا ہے کہ قابو میں آئے نہیں آتا۔ فوج کو جو کرنا ہوتا ہے کرتی ہے۔ اس کے تمام تر اقدامات کا نتیجہ

ہے کہ دہشت گرد اپنی کاروائیوں میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

عارضی طور پر تعلیمی اداروں کی بندش کوئی بڑی بات نہیں لیکن کیا اس بندش کے دوران وہ اقدامات کر لیے گئے جن مقاصد کے حصول کے لیے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا گیا تھا۔ اگر نہیں تو یہ عمل طالب وعلموں میں دہشت اور خوف کو بڑھانے کا باعث ہوا، اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ پرائیویٹ اسکولوں کے ایک بڑے گروہ نے اسکول دوبارہ کھولنے سے منع کر دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انہیں حفاظتی انتظامات درکار ہیں جو حکومت انہیں فراہم کرے۔ کسی تجزیہ کار نے رائے دی کہ پرائیویٹ اسکول ہر طالب علم سے اضافی رقم لیں اور اس رقم سے وہ اسکول کے بچوں کے حفاظتی اقدامات کر لیں۔ اگر اس کی اجازت دے دی گئی تو پرائیویٹ اسکول اسے بنیاد بنا کر خوب رقم بٹوریں گے۔ نجی تعلیمی اداروں کی آمدنی پہلے ہی ماشاء اللہ بہت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک اسکول سے دو اور دو سے تین حتیٰ کہ مختصر وقت میں یہ تعداد درجنوں میں پہنچ جاتی ہے۔ اسکولوں میں اضافہ مالکان کہا سے کرتے ہیں، یہ وہ منافع ہی تو ہے جس سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس قسم کا مشورہ مناسب نہیں۔ حکومتی تعلیمی اداروں میں جہاں دہشت گردی ہو سکتی ہے وہاں فوری طور پر ضروری اقدامات کیے جائیں۔ جیسے جامعہ کراچی کی وہ دیوار جو اسکیم 33 اور سچل گوٹھ کی جانب ہے اونچی کی جارہی ہے اور اس پر

خاردار تار نصب کیے جارہے ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر تعلیمی اداروں نے اپنی چار دیواری کے باہر فٹ پاتھ پر نرسریاں بنانے کی اجازت دی ہوئی ہے جیسے کراچی یونیورسٹی روڈ پر دیوار کے کنارے بے شمار نرسریاں بنی ہوئی ہیں۔ نہیں معلوم یہ کرایہ پر دی ہیں یا خدمات خلق ہے۔ رات کے اوقات میں یہ نرسریاں غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ جامعہ کراچی اہم شاہراہ ہے جو چارصدہ واقعہ سے قبل تک رات میں تاریک ہوا کرتی تھی، چارسدہ واقعہ سے کراچی یونیورسٹی روڈ کی قسمت روشن ہو گئی اور وہاں لائٹیں لگانے کا عمل شروع کردیا گیا۔ کاش ہم کسی نقصان سے قبل ہی کوئی کام کرنے کے عادی ہوجائیں ہمیں اس وقت ہوش آتا ہے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے اور نقصان پہنچ چکا ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی اداروں کی سکیورٹی کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے جبری بندش مسئلہ کا حل نہیں۔

ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

پاک و ہند کے صفِ اول کے ادیب، علامتی اور استعاراتی اسلوب کے افسانہ نگار، شاعر، کالم نگار، تنقید نگار، کہانی نویس، ڈرامہ نگار انتظار حسین لاہور میں 2 فروری 2016 کو 93 برس کی عمر میں انتقال کر گئے انا اللہ وانا علیہ راجیعون۔ اللہ تعالیٰ انتظار حسین کی مغفرت فرمائے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

انتظار حسین 7 دسمبر 1923ء کو ہندوستان کے ضلع میرٹھ، بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت جب کہ ان کی عمر 22 سال تھی پاکستان ہجرت کی اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ میرٹھ کالج سے بی اے جب کہ پنجاب یونیورسٹی سے اردو اور انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ادبی ذوق ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھا۔ انتظار حسین نے اپنی سوانح حیات بعنوان 'چراغوں کا دھواں' میں لکھا ہے کہ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں روایات کی پابندی کی

جاتی تھی، ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ مذہبی اسکالر بنیں لیکن انھوں نے ادب کے میدان کا انتخاب کیا اور کامیاب بھی رہے۔ افسانہ ان کی پہچان تھی، لیکن وہ محقق بھی پائے کے تھے، تنقید بھی بہت اچھی لکھتے تھے، کالم نگار بھی خوب تھے، انھوں نے سیاست کے علاوہ تمام موضوعات پر کالم لکھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے ایوب خان کے دور میں کالم نگاری شروع کی، اسی وقت طے کرلیا تھا کہ سماجی، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر کالم لکھیں گے انھوں ایسا ہی کیا، روزنامہ مشرق میں ان کی کالم بہت مشہور ہوئے۔ سیاست پر نہ لکھنے کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی تھی کہ ہر اخبار کی ایک خاص پالیسی ہوتی ہے اور وہ پابندیوں کی چھتری تلے تخلیقی کام نہیں کرسکتے۔ اخبار کی انتظامیہ کی پابندی کو وہ اپنی ذہنی آزادی پر قدغن تصور کرتے تھے۔ دیگر موضات پر ان کے کالم پڑھنے والوں میں بہت مقبول تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پرگندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

انتظار حسین دسمبر 2015 میں کراچی تشریف لائے تھے۔ کراچی میں یہ ان کی زندگی کا آخری قیام تھا۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے زیر اہتمام آٹھویں عالمی اردو کانفرنس 2015ء کا افتتاحی اجلاس 8 دسمبر منگل منعقد ہوا۔ آڈیٹوریم مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان مہمانوں میں مَیں بھی ایک نشست پر

بیٹھا تمام مہمانوں کو آتا دیکھ رہا تھا۔ وقت ہو چکا تھا منتظمین پریشانی کے عالم میں نظر آ رہے تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت انتظار حسین صاحب کو کرنا تھی جنہیں لاہور سے تشریف لانا تھا۔ ان کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ افتتاحی اجلاس انتظار حسین اور دیگر مہمانوں کے بغیر ہی شروع کر دیا گیا۔ میزبان ہما میر نے آگاہ کیا کہ انتظار حسین صاحب کی فلائٹ آ چکی ہے وہ اس وقت راستہ میں ہیں جلد پہنچ جائیں گے۔ اجلاس شروع ہوا اسٹیج پر ڈاکٹر قاسم پیرزادہ، سندھ کے وزیر تعلیم نثار کھوڑو، فرہا زیدی، طلعت حسین، زہر نگاہ، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، حسینہ معین، کشور ناہید، ڈاکٹر ابو اکلام قاسمی، ڈاکٹر قاسم بگھیو، ڈاکٹر عالیہ امام، امداد حسینی، عبد المالک غوری، محمود الاسلام، ہندوستان سے آئے ہوئے شمیم حنفی، پروفیسر سحر انصاری اور احمد شاہ تشریف فرما تھے۔ اجلاس شروع ہوئے ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ محترم انتظار حسین صاحب اپنے مخصوص انداز، مسکراتے ہوئے تشریف لے آئے۔ انتظار حسین صاحب کو دیکھ کر ہال میں موجود لوگوں میں خوش گوار احساس نمایاں تھا۔ افتتاحی اجلاس کا موضوع 'نفاذِ اُردو، مسائل اور امکانات' تجویز کیا گیا تھا۔ دیگر کے علاوہ انتظار حسین صاحب نے بھی اپنے مخصوص انداز میں تفصیلی خطاب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تہذیبی انحطاط کے اس دور میں زبان و ادب کی ترقی ایک معجزہ ہے۔ انہوں نے ملک میں اردو کے نفاذ کے حوالے سے مدلل گفتگو کی۔ انتظار حسین کو قریب سے دیکھنے کے یہ میرے یہ آخری لمحات تھے۔ ان سے سرسری ملاقات، سلام

دعا تک محدود رہی۔ ان کی شخصیت کو اگر میں الفاظ میں بیان کروں تو ان کی شخصیت کا ظاہری خاکہ کچھ اس طرح سے بنتا ہے۔ وہ نستعلیقی قسم کے انسان تھے۔ چھوٹا قد، صاف ستھرا گول چہرہ، سفید کھلتا ہوا رنگ، چہرہ پر خوش نما مسکراہٹ، دھیمی اور مدھر آواز، اونچی ناک، باریک ہونٹ، آنکھوں میں سوجھ بوجھ کی چمک، کشادہ پیشانی، صاف ستھری شخصیت اور صاف ستھرا لباس، داڑھی مونچھ سے آزاد کلین شیو۔ سر پر مختصر بال جن میں چاندی نمایاں، سنجیدہ طرز گفتگو، معلومات کا خزانہ، ہر موضوع پر تفصیلی اور حوالائی گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔ یہ تھے انتظار حسین جنہیں اب مرحوم لکھتے ہوئے انگلیاں ساتھ دے رہیں۔ قلم اس لیے نہیں کہا کہ اب قلم کے بجائے کمپیوٹر کی بورڈ پر انگلیاں چلتی ہیں۔ کمپیوٹر کی بورڈ ہی اب ہمارا قلم ہے۔

انتظار حسین منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے، ایک متوسط پڑھے لکھے گھرانے میں آنکھ کھولی، جہاں کا ماحول ادبی تھا۔ انہوں نے شاعر کی حیثیت سے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ افسانہ نگاری کا آغاز پاکستان ہجرت کے بعد کیا۔ وہ ن۔م۔ راشد سے متاثر تھے۔ انہوں نے افسانہ کو حقیقت نگاری سے ہٹ کر علامتی اور داستانی اسلوب میں افسانہ نگاری کی روایت ڈالی۔ انہیں علامتی

افسانہ نگاری کا بابائے آدم گردانہ جاتا ہے۔ انتظار حسین کے متعدد افسانے اور ناول اردو ادب میں یادگار ہیں۔ ان کا اولین افسانوں کا مجموعہ 'گلی کوچے' 1953ء میں منظر عام پر آیا۔ان کی معروف تصانیف میں 'آگے سمند رہے (ناول)، بستی (ناول)، تذکرہ (ناول)، چاند گرہن (ناول)، دن (ناول)، معروف افسانوں میں شہر آشوب، آخری آدمی، خالی پنجرہ، خیمے سے دور، شہر افسوس، کچھوے، کنکرے، گلی کوچے، چراغوں کا دھواں، ولی تھا جس کا نام، جل گرجے (داستان)، نثریے سے آگے، قیوما کی دکان (آپ کی پہلی کہانی تھی)، کہانیوں کا مجموعہ جنم کہانیاں ہے، خود نوشت دو جلدوں میں چراغوں کا دھواں اور وہ جو کھو گئے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں 1987ء میں پرائڈ آف پرفارمینس دیا گیا بعد ازاں ستارہ امتیاز سے نوازا گیا، حکومت فرانس نے ستمبر 2014ء میں آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز عطا کیا،ان کے افسانوں کے انگریزی، فرانسیسی، ہندی، بنگلہ اور دیگر زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔انہیں خود بھی کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انتظار حسین مجلسی آدمی تھے، لوگوں میں رہنا پسند کیا کرتے تھے، حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیوں میں ، ادبی نشستوں اور کانفرنسوں میں

شرکت تو ان محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ زندگی کے آخری ایام تک علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے انتقال سے کوئی دو ماہ قبل دسمبر میں کراچی میں ہونے والے آٹھویں عالمی اردو کانفرنو میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ کراچی میں اپنے قیام کے دوران وہ انجمن ترقی اردو پاکستان بھی تشریف لے گئے۔ کراچی کے بعد لاہور میں ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں بھرپور شرکتب کی۔ وہ علیل رہنے لگے تھے لیکن ادب سے ان کی دلچسپی والہانہ تھی، کمزور اور علالت کے باوجود وہ لاہور سے کراچی تشریف لائے اور عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کی۔ انتظار حسین کی کمی شاید ہی پوری ہوسکے، ان کے چلے جانے سے اردو ادب کو جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ پاکستان ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت سے محروم ہوگیا۔ وہ مختصر علالت کے بعد 2فروری 2016 کو وفات پاگئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاہور کی مٹی کے ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان کی سرزمین میرٹھ کے شہر بلند شہر میں طلوع ہونے والا ادب کا یہ مہتاب لاہور کی سرزمین میں پیوند خاک ہوگیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ غالبؔ ؎

وُہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام سُنا ہے کل رات مرگیا وہ

کراچی ادبی میلہ 2016

امریکی (US Aid) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے امریکی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی وقنصل خانے کے تعاون سے منعقد ہونے والا ساتواں ادبی میلا شہر کراچی کے مغربی میں ساحل سمندر کے کنارے بیچ لگشرری ہوٹل میں اہم ثقافتی تقریب تھی۔ کراچی میں امن اور سکون قائم ہوجانے کے بعد جس کا سہرا یقیناحکومت وقت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو جاتا ہے کراچی از سر نو اپنی روائتی روش اور روشنیوں کی جانب لوٹ رہا ہے بلکہ لوٹ چکا ہے۔ ثقافتی، علمی ادبی سرگرمیاں بحال ہوچکی ہیں۔ تواتر کے ساتھ ادبی و علمی تقریبات کا انعقاد اس بات کا پتا دیے رہی ہیں کہ یہاں امن قائم ہوچکا ہے، لوگوں کے دلوں میں جو خوف اور ڈر کی فضا قائم ہوچکی تھی وہ دور ہوچکی ہے۔ مغرب بعد یا رات گئے گھروں سے نکلنا خوف کی علامت بن چکا تھا، اب رات بھر رت جگہ کا سما پیش کر رہا ہوتا ہے۔ گزشتہ سال کے اختتام پر آرٹس کونسل آف پاکستان کے زیر اہتمام آٹھویں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی، اہل کراچی نے اردو زبان و ادب کے حوالہ سے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ کانفرنس میں بھارت، بنگلہ دیش،، برطانیہ کے علاوہ پاکستان کے تمام بڑے شہروں سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانش کی بڑی تعداد اردو زبان کی قدر میں اضافہ کا باعث ہوئی۔ کراچی کی علمی ،ادبی، سرسبز و شاداب فضاء کو ادبی ستاروں نے

چار چاند لگا دئے ۔ایکسپو سینٹر میں کتابی میلے کا اہتمام کیا گیا، نجی اداروں کی جانب سے آئے دنوں کتابوں کی نمائش، انجمن ترقی اردو پاکستان کے کی جانب سے ہر ہفتہ ادبی نشست کا اہتمام اس کے علاوہ عالمی مشاعرہ اور دیگر تقریبات کا انعقاد تسلسل کے ساتھ ہونا کراچی کے بدلتے ہوئے حالات کا پتا دے رہے ہیں۔ کراچی میں چند روز قبل بلدیاتی انتخابات کی گہما گہمی بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی اور خوشی اور مسرت کا مقام ہے کہ اس دوران کسی قسم کا کوئی ایک بھی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کراچی کے ماحول میں جو خوشگوار تبدلی آئی ہے وہ اہل کراچی کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ۔یاد ہے اچھی طرح کہ رات ہوتے ہی لوگ غیر ضروری طور پر نہ تو خود گھروں سے نکلتے نہ ہی اپنے بچوں کو گھر سے نکلنے دیتے تھے۔ جو لوگ رات میں باہر کسی مجبوری کے باعث ہوتے تو اہل خانہ ان کی واپسی تک ان لیے خیر کی دعائیں ہی کرتے رہتے تھے۔ لوگوں نے قیمتی موبائل رکھنا چھوڑ دیے تھے، پرس میں کم سے کم رقم رکھا کرتے، نئی گاڑی کا چھن جانا ایک عام سے بات تھی، خواتین نے سونے کے زیورات پہننا چھوڑ دیے تھے۔یہ تھی کراچی کہ صورت حال جو اب واپس اپنی اصل میں لوٹ آئی ہے اور اس کا سہرا بہر کیف حکومت وقت اور عسکری قوت کو ہی جاتا ہے اور جانا چاہیے۔ اس لیے کہ ہماری پولیس حالات میں بہتری لانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ پولیس خواہ پنجاب کی ہو یا سندھ کی یہ ایک ہی نسل، ایک سوچ، ایک فکر اور ایک فلسفہ کے پیروکار ہیں ۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی عمارت سو

سال قدیم ہو جائے تو اس عمارت کو اوپر سے لاکھ بنا سنوار دیا جائے وہ ڈر اور خوف کی علامت ہی بنی رہتی ہے اس کا واحد حل یہی ہوتا ہے کہ اس عمارت کو مکمل طور پر منہدم کرکے نئے سرے سے اس کی تعمیر کی جائے سو ہمارے ملک میں پولیس کا محکمہ ایک قدیم عمارت کی مانند ہے اس کی اصلاح کسی بھی طور ممکن نہیں اس کا واحد حل یہی نظر آتا ہے کہ اس محکمے کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے، پڑھے لکھے لوگوں کو میرٹ پر بھرتی کیا جائے ، تنخواہیں و مراعات ایک پولیس والے کی وہی ہوں جو ایک 17 گریڈ کے آفیسر کو حاصل ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ پولیس بہتر نتائج دے سکے۔

بات علم و ادب اور کراچی ادبی میلے کی شروع کی تھی پہنچ گئی پولیس پر۔ جیسا کہ سب کے علم میں ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کتابوں کی اشاعت کا ایک بڑا اور معتبر ادارہ ہے، تجارت کو فروغ دینے اور زیادہ سے زیادہ آمدنی کے اہداف تک پہنچنے کے لیے تمام ہی تجارتی ادارے مختلف قسم کے پروگرام تشکیل دیتے ہیں۔ تجارت کتابوں کی ہو تو ادب اس کا لازمی حصہ ہے۔ ادب، ادیب، کتاب اور ناشر ایک دوسرے سے باہم اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ناشرین، ادب اور ادیبوں کے حوالے سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا اہتمام کرتے ہیں اور انہیں کرنا بھی چاہیے۔ ملک میں بے شمار بڑے ناشر موجود ہیں ان میں سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی فاؤنڈر ڈائیریکٹر

امینہ سید کو کریڈٹ جاتا ہے کہ وہ کئی سال سے ادبی میلے کا اہتمام کر رہی ہیں۔ جس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔ اس طرح کی سرگرمیاں علم و ادب کے فروغ کا باعث ہوا کرتی ہیں، لکھنے والوں کو ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کو سننے اور اس سمت آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ہم تو کتاب سے دور ہوتے جارہے ہیں، پڑھنے کی عادت مفقود ہو کر رہ گئی، رہی سہی کثر انٹرنیٹ نے پوری کردی ہے، ہمارے گھروں میں دنیا جہان کی ہر شہ ملتی ہے اگر کچھ نہیں ہوتا تو وہ کتاب ہوتی ہے جو شاید ہی کسی گھر کے ڈرائینگ روم کی زینت بنی دکھائی دیتی ہو۔ جس کے گھر یہ ہوتی ہے وہ قابل مبارک باد ہیں۔ اس کی وجوہات بہت سی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کو ایسے مواقع میسر ہی نہیں آتے کہ وہ اس جانب توجہ دیں۔ گزشتہ دنوں ایکسپو میں ہونے والی کتابوں کی نمائش میں ریکارڈ کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کو مواقع میسر آئیں تو لوگ اس جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ ادبی سرگرمیاں جن میں کتابوں کی نمائش، ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے ادبی تقریبات، مشاعرے منعقد ہوتے رہیں تو وہ علم و ادب سے محبت اور لوگوں کو از سرِ نو کتاب کی جانب مائل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ساتویں ادبی میلے کا افتتاح جمعہ 5 فروری کو ہوا جو تین دن جاری رہا، اس کے لیے جس جگہ کا اہتمام کیا گیا وہ شہر کراچی کا

مغربی کونا تھا۔ پھر بھی عاشقانے علم وادب بڑی تعداد میں وہاں پہنچتی رہی، بیچ لگشرری ہوٹل ماحول کے اعتبار سے یقیناً آئیڈیل جگہ ہے اور اس بات کا بھی احساس دلاتا ہے کہ منتظمین کے سامنے اخراجات کی کوئی اہمیت نہیں تھی، یہ بھی ایک اچھی بات ہے لیکن اس نقطہ نظر سے کہ اس میں کراچی کے عام و خاص لوگ بھی شریک ہو جائیں مشکل صورت تھی اگر یہی میلہ ایکسپو سینٹر میں سجا ہوتا تو شرکت کرنے والے لاکھ یا سو لاکھ نہ ہوتے بلکہ یہ تعداد لاکھوں میں ہوتی، جیسے گزشتہ دنوں عالمی کتابوں کی نمائش میں لوگوں کی تھی۔ اگر ایکسپو نہ سہی آرٹس کونسل آف پاکستان اس کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ ہوٹل میں منعقدہ تقریب سے عام لوگوں میں ذہنوں میں مختلف سوچ پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی تقریبات کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو لازمی بنانا ہونا چاہیے، محدود شرکت اور عمدہ لوازمات تقریب کو محدود بنادیتی ہے۔ جہاں تک آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے ادبی میلے کا سوال ہے یہ ایک کامیاب شو ہر اعتبار سے رہا۔ میلے کے افتتاحی اجلاس سے خطاب میں امینہ سید کا فرمانا تھا کہ 'ہم نے اس لٹریچر فیسٹیول کا آغاز 2010 میں اس وقت کیا جب ملک میں دہشت گردی اور تشدد کی فضا تھی اور ہم آج جس جگہ موجود ہیں وہ سب لوگوں کے پیار اور سپورٹ کا نتیجہ ہے، ہم کتاب اور مصنفوں کے جشن میں سب کو خوش آمدید کہتے ہیں، انھوں نے وضاحت کی کہ اس تقریب کو میلہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں کتابوں کی کثیر تعداد اپنے اندر ایک الگ رنگ سموئے ہوئے ہے'۔ افتتاحی اجلاس

کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں معروف افسانہ نگار انتظار حسین کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرکے انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی مغفرت کی دعا کی گئی۔

امینہ سید کا کہنا تھا کہ کراچی فیسٹیول سے متاثر ہوکر انہوں نے 2011 میں بچوں کے ادبی میلے کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد اساتذہ ادبی میلہ، لاہور ادبی میلہ، فیض ثقافتی میلہ سمیت متعدد ادبی میلوں کا ایک سلسلہ چل نکلا جو آج تک جاری ہے،انہوں نے بتایا کہ جب انہوں نے اس میلے کا آغاز کیا تھا تو اس وقت لوگوں کی آمد پانچ ہزار تھی جو بڑھ کراب یہ تعداد سوا لاکھ سے زائد ہوچکی ہے۔ یہ میلا چونکہ امریکی تعاون سے منعقد ہوا تھا اس لیے امریکی قونصل جنرل کی شرکت بھی لازمی تھی اور انہوں نے خطاب بھی فرمایا۔ اس وقت برائن ہیتھ امریکہ قونصل جنرل ہیں انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کراچی ادبی میلہ شہر کی اہم ترین ثقافتی تقریب ہے۔ یہ میلا پاکستان اور غیر ملکی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو ایک جگہ جمع کرکے انہیں اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ کراچی ادبی میلہ پاکستان کے شاندار ادبی ورثے کی نمائندگی کرتا ہے۔ قونصل جنرل نے اس موقع پر امریکی ادارے برائے بین الاقوامی ترقی (یو ایس ایڈ) کے 165 ملین ڈالر کی لاگت سے جاری پاکستان ریڈنگ پراجیکٹ کا بھی ذکر بھی کیا جس کے تحت 10 لاکھ طلباء میں مطالعے کو فروغ دینے کے لیے صوبائی اور مقامی محکموں کو معاونت فراہم کی جارہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ 155 ملین ڈالر کی لاگت سے سندھ بیسک

ایجو کیشن پروگرام (ایس پی ای پی) کے تحت سندھ کے 50 ہزار بچوں کو 106 نئے تعمیر ہونے والے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ نہوں نے بتایا کہ امریکی حکومت کی معاونت سے 10 ہزار طلباء پاکستانی جامعات میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں جب کہ ہر سال ایک ہزار طلبا مختلف تبادلہ پروگراموں کے ذریعہ امریکہ کا دورہ کرتے ہیں۔ کلیدی خطاب ڈاکٹر پرویز ہود بھائی اور فہمیدہ ریاض کا تھا۔

ادبی میلے کی خاص بات مختلف کتابوں کی تعارفی تقریبات کا اہتمام تھا۔ اس حوالے سے انیس ہارون کی کتاب 'کب مہکے گی فصل گل'، ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب 'اردو کی تشکیل جدید' اور دیگر کتب کی تعارفی تقریب کے علاوہ مختلف ادیبوں اور شاعروں جن میں انتظار حسین، عبد اللہ حسین، جمیل الدین عالی اور کمال احمد رضوی کو ان کی علمی ادبی خدمات پر خراج تحسین پیش کیا گیا، ڈائجسٹوں کے حوالے سے بھی نشست ہوئی۔

میلہ تین دن جاری رہنے کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ اختتامی دن انتظار حسین کے نام رہا۔ اس موقع پر انتظار حسین کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے میزبان امینہ سید نے کہا کہ انتظار حسین نہ صرف ایک معروف افسانہ نگار تھے بلکہ وہ کراچی ادبی میلے کے باقاعدہ اسپیکر تھے، اُن کی اچانک موت نے دانشور حلقے کو سوگوار کر دیا ہے۔ تین دن اپنی بہاریں دکھاتا کراچی کا یہ خوبصور ادبی میلا اختتام پذیر ہوا۔

شاہد احمد دہلوی پر ایک عمدہ کتاب

ادب کی دنیا کا ایک معتبر نام شاہد احمد دہلوی، ادب اور موسیقی ان کی زندگی تھی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے بقول 'ان کی صلاحتوں کے ادیب ہر روز نہیں پیدا ہوتے بلکہ جس دور میں پیدا ہو جائیں اسے ان پر ناز کرنا چاہیے'۔ شاہد احمد دہلوی جس زمانے میں پیدا ہوئے اس زمانے کے لوگوں کو تو ان پر ناز ہوگا ہی جب تک دنیا باقی ہے ادب سے تعلق رکھنے والے اس بات پر ناز کرتے رہیں گے کہ ان کے قبیلے میں شاہد احمد دہلوی جیسا ادیب پیدا ہوا۔ آج میں ایک ایسی کتاب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ادب کے ایک کثیر التحریر مصنف، خاکہ نگار، ترجمہ کرنے کے ماہر، ساز و سنگیت کے ماہر، معروف ادبی جریدے 'ساقی' کے مدیر اور اردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادب پر گہری نظر رکھنے والے ادیب شاہد احمد دہلوی پر مرتب کی گئی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے، فن خاکہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی پر مرتب کی جانے والے یہ کتاب کراچی کے نوجوان ادیب راشد اشرف نے مرتب کی جو انہوں نے ازراہ عنایت مجھے عنایت فرمائی، شکریے کے ساتھ میں نے ان سے اجازت چاہی تھی کہ میں اس کتاب کا پوسٹ مارٹم کرنے کروں ز، اس پر وہ ہنس دیے تھے گویا یہ اجازت تھی۔

شاہد احمد دہلوی 'ادب اور موسیقی کی دنیا کا ایک معروف و معتبر نام، ماہنامہ 'ساقی' شاہد احمد دہلوی کی پہچان تصور کیا جاتا ہے، ساقی میں تحریر کردہ اداریے بعنوان 'نگاہ اولین' شاہد احمد دہلوی کے رشحاتِ قلم کا انمول نمونہ ہیں۔ان اداریوں میں شاہد احمد دہلوی نے اپنے دور کے علمی و ادبی ماحول کی عکاسی کی ہے، ادبی سرگرمیوں کی تفصیل خوبصورت انداز سے بیان کی ہے،اُس دور کی باہمی نہ انصافیوں اور ادیبوں کے مابین ہونے والی چپقلشوں کا ذکر بھی ملتا ہے،ادب کی مختلف اصناف کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے، ساقی کے علاوہ جو ادبی جرائد شائع ہو رہے تھے ان کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کا ذکر ان اداریوں میں ملتا ہے۔شاہد احمد دہلوی کی نظر بہت گہری، سوچ مثبت، انداز فکاہیہ تھا۔انہوں نے جو بھی لکھا شائستہ اور سلیقے سے لکھا، تنقید بھی کی تو شگفتگی اور مُؤدّبانہ انداز میں۔شاہد احمد دہلوی جیسی باصلاحیت علمی و ادبی شخصیات روز پیدا نہیں ہوتیں۔لمحہ موجود کے نوجوان ادیب راشد اشرف نے شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے ''گلدستۂ شاہد احمد دہلوی: ساقی سے انتخاب، خاکے اور متفرق تحریریں'' مرتب کرکے ایک جانب تو شاہد احمد دہلوی سے اپنے علمی و ادبی تعلق کو آگے بڑھایا ہے دوسرے یہ کہ شاہد احمد دہلوی کے حوالے سے ادبی کام جو ابھی تک مختلف اوراق میں بکھرا ہوا تھا اسے یکجا کردیا ہے۔

راشد اشرف ایک نوجوان ادیب ہیں، پیشہ تو ان کا انجینیرنگ ہیں لیکن ادبی ذوق اور ادب سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ کتابوں خاص طور پر پرانی کتابوں کو جگہ جگہ سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور انہیں عام لوگوں سے متعارف کراتے ہیں۔ ان پرانی کتابوں کو متعارف کرانے کا ذریعہ انٹرنیٹ ہے، وہ فیس بک پر ان نایاب اور قیمتی کتابوں اور ان کے لکھنے والوں کا تعارف خوبصورتی کے ساتھ کراتے ہیں۔ اکثر لوگ فیس بک کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کرتے ہیں ، میرا استدلال اس حوالے سے یہ ہے کہ ہر چیز کے منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں، اب یہ طالب پر ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتا ہے۔ انٹرنیٹ میں بے تہاشہ خامیاں اور برائیاں ہیں لیکن کیا آج ہم انٹرنیٹ کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح فیس بک کو بعض لوگوں نے تصاویر ڈالنے اور دوسروں کی تصویریں دیکھنے کی حد تک محدود کیا ہوا ہے یہ ان کی اپنی سوچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھتے ہیں راشد اشرف جیسے کتنے ہی لوگ ہیں جو فیس بک کو علمی ، ادبی، تہذیبی و ثقافتی معلومات دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور کتنے ہی ایسے احباب ہیں جو اس علمی ادبی خدمت سے فیضیاب ہورہے ہیں۔ میری تمام کالم اخبار میں شائع ہونے کے بعد فیس بک کی زینت بنتے ہیں اور کتنے ہی لوگ اس سے فیضیات ہوتے ہیں۔

میں بات راشد اشرف کی کررہا تھا نکل گئی فیس بک اور انٹرنیٹ کی جانب۔ راشد

کا تعلق بدایوں سے ہے، ان کے والد بنکر اور والدہ شعبہ تدریس سے تعلق رکھتی تھیں، بچپن سے پڑھنے اور لکھنے کی جانب مائل ہیں، اے حمید کے بعد ابن صفی کا تفصیلی مطالعہ کیا، ہمدرد نونہال میں اس وقت مضمون لکھا جب یہ نویں جماعت میں تھے اور حکیم محمد سعید سے انعام حاصل کیا۔ افسانہ بھی لکھتے ہیں، مشفق خواجہ کو اپنا رہنما قرار دیتے ہیں۔ ابن صفی کے حوالے سے ان کی کتاب 'ابن صفی کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ' اور' ابن صفی شخصیت و فن 'منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'مولانا چراغ حسن حسرت ہم تم کو نہیں بھولے' کے علاوہ 'طرز بیاں اور (پرانی کتابوں کا اتوار بازار اور تبصرے اور متفرقات' بھی ان کی تصانیف ہیں۔ ادبی میدان میں یہ جس قدر متحرک ہیں لگتا ہے کہ ادب کے میدانِ کارزار میں تیزی سے چوکے اور چھکے لگاتے رہیں گے۔

راشد اشرف کا یہ مجموعہ شاہد احمد دہلوی پر پہلا کام نہیں اس سے پہلے متعدد علمی و ادبی شخصیات نے شاہد احمد دہلوی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مضامین بھی لکھے اور متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ۔ ان میں سے چند کا ذکر راشد اشرف نے اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ جیسے ڈاکٹر جمیل جالبی کا مرتب کردہ ساقی کا شاہد احمد دہلوی نمبر اور شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ ، ڈاکٹر محمد عارف کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جو کتابی صورت میں شائع ہوا، عقیل عباس جعفری نے شاہد احمد دہلوی کے موسیقی پر مضامین تحقیقی کام کیا ان کا

مرتب کردہ مجموعہ 'مضامین موسیقی'۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی سرپرستی میں شاہد احمد دہلوی پر کام ہوا، 'یاد شاہد' مقبول جہانگیر کا مرتب کردہ مجموعہ ہے جو شاہد احمد دہلوی پر بہترین اضافہ ہے۔ مضامین کی تعداد تو بے شمار ہے جن میں شاہد احمد دہلوی کی مختلف اصناف پر تحریروں اور ان کی شخصیات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی ادبی خدمات اس مجموعہ کی بنیاد ہیں۔ خاص طور پر رسالہ 'ساقی' میں شاہد احمد دہلوی کے جو شخصی خاکے شائع ہوئے ان کا انتخاب، اہم یہ کہ ساقی کے اداریے بعنوان نگاہ اولین پہلے شمارہ، جنوری 1930ء سے اکتوبر 1936ء تک کے اداریے اس مجموعہ کا حصہ ہیں۔ مجموعہ طور پر کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے۔ مؤلف کا لکھا ہوا پیش لفظ اور شاہد احمد دہلوی کے فرزند محمود احمد کا تعارفی مضمون علیحدہ ہے۔ پہلے فرزند شاہد احمد دہلوی نے کیا لکھا ہے اسے دیکھئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ 'دلی سے لٹ پٹ کر آنے کے بعد ابا کی ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازمت کی خبر سن کر راجہ مہدی علی خان نے بمبئی کے کسی رسالے میں یہ لکھا ''شاہد صاحب آپ کا ریڈیو میں ملازمت کرنا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شیکسپئر ریوڑیاں بیچ رہا ہو یا ملٹن نے نان چھولے کی دکان لگالی ہو''۔ آپ اس بات پر بہت ہنسے تھے۔ ابا بہت خوش مزاج، زندہ دل اور بہت خود دار انسان تھے۔ ان کے لیے قیمتی موٹر کار یا گدھا گاڑی کا مصرف

ایک تھا۔ ''گدھا گاڑی میں بیٹھنے سے انسان کا وقار کم نہیں ہوتا''۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میری پھوپھی زاد بہن صبیحہ آرا نے کسی شخص کی بڑائی کرتے ہوئے ابا سے کہا: ماموں اس کے پاس تین موٹر کاریں ہیں''۔ اس پر ابا نے بیڑی کا کش لیتے ہوئے بہت'' اطمینان سے کہا تھا: ''ہاں، وہ تینوں کاروں میں ایک ساتھ سفر کرتا ہوگا''۔ شاہد احمد دہلوی کے طنز و مزاح کے بارے میں محمود احمد لکھتے ہیں ''ابا کے فقرے طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے تھے۔ ایک دوپہر ہم لوگ ریڈیو سن رہے تھے۔ ایک فلمی گانا نشر ہو رہا تھا''آئے گا.... آئے گا آنے والا.. آئے گا'' ابا کمرے میں داخل ہوئے اور یہ کہتے ہوئے ''کھائے ... کھائے... جوتے کھائے گا کھانے والا'' ریڈیو بند کر دیا''۔ شاہد احمد دہلوی از خود موسیقی سے بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ ایک عمدہ سازندہ نواز اور سنگیت نگار تھے۔

گلدستہ شاہد کا حصہ اول جریدہ 'ساقی کے اداریے ہیں جو مدیر کی حیثیت سے شاہد احمد دہلوی نے 'نگاہ اولین' کے عنوان سے لکھے، یہ اداریے ادب کا دلکش نمونہ ہیں، یہ اداریے اس کے علمی ادبی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ حصہ دوم میں ساقی سے شاہد احمد دہلوی کے چند منتخب کردہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں 'یہ آل انڈیا ریڈیو ہے' کے عنوان سے لکھے گئے سلسلہ وار مضامین شامل ہیں، اس حصے میں ایک مضمون ''اجڑے دیار کی آخری بہار'' ہے۔ بقول راشد اس مضمون کو

بلاشبہ حاصل مطالعہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ مضمون دلی کی معاشرتی زندگی ، بولیوں ٹھولیوں اور دلچسپ واقعات کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں شاہد احمد دہلوی اپنے فن کے عروج پر نظر آتے ہیں۔ کتاب میں شامل شاہد احمد دہلوی کے خاکوں سے شاہد احمد دہلوی کی شخصیت کے اہم پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ کتاب کا چوتھا حصہ تصاویر پر مشتمل ہے۔ المختصر کتاب کو بہت سلیقے کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح کے شاہد احمد دہلوی کی شخصیت کے تمام ہی پہلو چھم چھم کرتے سامنے آجاتے ہیں۔

تحقیق : فطرتِ انسانی اور وقت کی ضرورت

(جامعہ سندھ جامشورا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں پی ایچ ڈی کے حتمی سیمینار کے حوالے سے)

(روزنامہ ’جناح‘ اسلام آباد، لاہور، کراچی اور کشمیر 3 فروری 2016ء میں شائع ہوا)

فطرت انسانی ابتدائے آفرینش سے اشیاء کی حقیقت معلوم کرنے کی متقاضی رہی ہے۔ تجسس و تحقیق کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اگر ہم بنظر غائر اس امر پر غور کریں کہ وجہ تخلیق انسان کیا ہے تو یہ امر واضح ہوگا کہ مشیئت ایزدی کا تقاضہ یہ ہے کہ تعقل و تفکر کو انسان اپنا رہبر بنائے۔ قرآن کریم کی سورۃ الجاثیۃ (۴۵)، آیت ۱۳، پارہ الیہ یردُّ میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ ۲۵ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ں ترجمہ: ”اور مسخر کیا تمہارے لیے تمام تر جو کچھ زمین و آسمان میں ہے۔ بیشک جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے اس میں (قدرتِ خدا کی) نشانیاں ہیں“۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت فکر دی اور ساتھ ہی فکر کو لا محدود قرار دیا اور حکم دیا کہ ہر شہ جو کہ زمین پر ہے اور آسمان پر قابل غور ہے۔ پھر یہ بھی ارشاد ہوا کہ یہ

تمام اشیاء مسخر ہیں تاکہ انسان وسائل کی کمی کا شکوہ نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی سورۃ النحل (١٦) ، آیت ١٢ (پارہ رُبَمَا۔ ١٤) میں ارشاد فرمایا کہ ''وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۙ

ترجمہ: اور اسی نے رات اور دن کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور سورج اور چاند کو بھی اور تارے اُس کے حکم کے تابع ہیں۔ اس بات میں عقل و دانش والوں کے لیے یقیناً نشانیاں ہیں''۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت یعنی ترک دنیا کو قطعی طور پر غلط قرار دیا ہے۔ ہمیں اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز نہیں کرنا۔ ہمیں آفتاب کی تمازت ، ہوا کے سرد و گرم جھونکوں ، سورج کی تمازت اور چاند کی چاندنی کہکشاں کے جگمگاتے ستاروں ، لہلہاتے کھیتوں، میووں اور پھلوں سے لدے درختوں، باغیچوں میں مہکتی کلیوں، خوشبو لٹاتے پھولوں، زمین کی گردش، سمندر کی بھپری ہوئی موجوں، برف پوش اور قوس وقزح کے رنگوں میں فطرت کے حقائق معلوم کرنا ہیں، یہی تحقیق ہے، جستجو ہے اور غور و فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے اور تحقیق و جستجو کی فطری صلاحیت سے نوازا ہے۔ بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہنا بھی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ تحقیق ، جستجو، کھوج لگانا، تفکر ابتداء ہی سے انسانی

عادتوں میں سے ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے۔ جب ہم کسی بھی موضوع پر کوئی مضمون لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں یا کسی موضوع پر کوئی مقالہ تحریر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لیے بہتر سے بہتر مواد تلاش کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم تحقیق کے عمل، تحقیق کے اصولوں اور تحقیق کے فن اور طریقہ کار سے بھی پوری طرح آگاہ ہوں، بصورت دیگر ہم مضمون یا مقالہ تو لکھ تو لیں گے لیکن وہ مضمون یا مقالہ متعین اصولوں اور معیار کے مطابق نہیں ہوگا۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اصلیت معلوم کرنا، دریافت کرنا، کھوج لگانا، تفتیش کرنا، حقیقت کو ثابت کرنا، نیا مواد سامنے لانا۔ اصطلاح میں تحقیق کے معنی ہیں کہ کسی تعلیمی، علمی موضوع کے بارے میں اس طرح تحقیق کرنا، جستجو کرنا یا کھوج لگانا کہ اس کی حقیقی اور اصل شکل اس طرح واضح ہو جائے کہ کسی بھی قسم کا ابہام نہ رہے۔ گویا سچائی کی تلاش کا نام تحقیق ہے۔ سید جمیل احمد رضوی نے اعداد و شمار کو مرتب کرنے کو تحقیق کہا ہے۔ انھوں نے مالک رام کے حوالہ سے تحقیق کی وضاحت اس طرح کی کہ ”تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ ہے ح۔ق۔ق، جس کے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین یا بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے الفاظ میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے

الگ کریں'' ۔انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔انگریزی لفظ یا نیا۔جب کہ لفظ (again) 'بمعنی' دوبارہ (re) ریسرچ دو لفظوں کا مخفف ہے یعنی ری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس کے معنی ہیں (verb) فعل (search) سرچ نزدیک سے اور احتیاط سے معائینہ کرنا، جانچنا یا ٹیسٹ کرنا اور کوشش کرنا، کھوج' لگانا، تفتیش کرنا، تجسس کرنا، تفکر کرنا، چھان بین کرنا، اس طرح سے جیسے ایک سرجن جب زخم کی گہرائی معلوم کرنے کے لیے تیز دھاری آلہ سے زخم کو کریدتا ہے تو وہ زخم کی طح تک پہنچنے کی پوری کوشش کرتا ہے اس بات کی پرواہ کیے بغیر کے مریض کو کس قدر تکلیف ہوگی ۔ہفت زبانی لُغت کے مطابق لفظ ریسرچ کے لیے اردو، سندھی اور کشمیری میں لفظ 'تحقیق'، بلوچی میں 'کھوج'، پشتو میں 'لٹون' اور پنجابی میں 'کھوج' استعمال ہوتا ہے۔

تحقیق کی کوئی ایک تعریف ایسی بیان نہیں کی جا سکتی جو دنیا میں کی جانے والی تحقیقات پر پورا اترتی ہو۔ تحقیق کی وضاحت ماہرین نے اپنے اپنے انداز سے بیان کی ہے۔کتاب اصول تحقیق''کے مصنف عبدالحمید خان عباسی کے مطابق ''کسی تعلیمی مسئلہ '' موضوع) کے بارے میں ایسے اسلوب سے کھوج لگانا کہ اس کی اصلی شکل ، خواہ) معلوم ہو یا غیر معلوم، اس طرح نمایاں ہو جائے کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے'' تحقیق کہلاتی ہے۔ ڈاکٹر احسان اللہ نے اپنی تصنیف ''تعلیمی تحقیق اور اس کے اصول و مبادی'' میں تحقیق کو سائنسی طریقہ کار کو

اپناتے ہوئے تعلیمی مسائل کے حل تلاش کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے انھوں نے واضع کیا کہ ” تحقیق محنت مشقت، طلب، تفتیش اور باغور جانچ پڑتال کے عمل کا نا ہے اور اس عمل کا تعلق ہر اس مسئلہ سے ہے جو انسانی زندگی اور اس کے روز مرہ معمول سے متعلق ہے“۔ ڈاکٹر متین خان کے مطابق ہر دور اور ہر زمانہ کا محقق اپنے اپنے طور پر تحقیق کرتا رہا ہے۔ فلسفی اور سائنسداں ابن سینا۔ ابن خلدون، ڈارون، نیوٹن اور آدم اسمتھ تحقیق کا اپنا انداز رکھتے تھے۔ ڈارون کے مطابق ’ تحقیق تلاش و جستجو کی امتیازی خصو صیت ہے“ انھوں نے تحقیق کے بارے میں ڈارون کی یہ رائے بھی تحریر کی کہ ”کام میں باقاعدگی اور اس سے محبت تحقیق کے لیے لازمی جذو ہے“۔ مغربی مفکر پال (Paul) اور کرافورڈ (Crwford) کے مطابق ”تحقیق غیر مکشف حقائق کی ایک منظم و مرطوط تلاش ہے۔ ایک اندازکار جس کے ذریعے لوگ مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہیں اور کوشا رہتے ہیں کہ انسانی جہل و ناواقفیت کی سرحدیں پیچھے دھکیل دیں“۔ کرافورڈ کے مطابق ”تحقیق ایسے مسائل کے مطالعہ کا ایک طریقہ ہے جن کے نتائج کا استخراج، جزوی طور یا کلی طور پر، حقائق سے کیا جاتا ہے۔

کسی بھی قوم کی ترقی تحقیق پر عمل پیرا ہوئے بغیر ممکن نہیں، جس قوم نے اس میدان میں جس قدر جدوجہد کی اسے اتنی ہی ترقی و عروج حاصل ہوا۔ تحقیق انسانی زندگی کے تمام تر شعبوں میں بہتر سے بہتر کی راہ دکھاتی ہے۔ معاشرہ

میں زندگی بسر کرنے والے جن مسائل اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں تحقیق انہیں مسائل اور مشکلات کا حل نکالنے کی عملی قوت رکھتی ہے۔ یہ مسائل اور مشکلات معاشرتی، سیاسی، تعلیمی، سائنسی، تجارتی، حکومتی منصوبہ بندی سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔ تحقیق کسی بھی ایسی موضوع پر جس پر مواد پہلے س موجود ہو، اس پر لکھا جاچکا ہویا کسی بھی موضوع پر مختلف انداز سے اظہار خیال کر دینا تحقیق نہیں بلکہ تحقیق نام ہے نئی دریافت ، نئی ایجاد کا۔ تحقیق کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تحقیق (Analyzing) کا، معطیات کا تجزیہ (collecting) نام ہے معلومات کی جمع آوری کا، اور تحقیق نام ہے اہم سوالوں کے جوابات تلاش (interpreting) کا، وضاحت کرنے کا۔ لیکن، مکمل اور ایک کامیاب تحقیق کے نتیجے تک پہنچنے کے لیے ایک مخصوص طریقہ کار اور مخصوص مراحل پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو تحقیق کے باقاعدگی ہو، (be controlled)، regorous) عمل کے دوران ضبط کی پابندی ، (verifiable) اور تصدیق شدہ ہو، (validity) درست ، (systematic) ہو۔ (critical)اور تنقیدی، (Empirical) تجرباتی

تحقیق کے حوالے سے مجھے 29 جنوری 2016ء کو جامعہ سندھ کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں پی ایچ ڈی مقالے کے آخری سیمینار میں بطور ایکسپرٹ شریک ہونے کا موقع ملا۔ جامعہ سندھ جامشورو میں تحقیق کا عمل باقاعدگی اور

منظم طریقے سے ایچ ای سی کی تمام تر طریقہ کار کے مطابق جاری ہے۔ میں اس سے قبل دیگر جامعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا داخلی ممتحن اور وائیوا کنڈکٹ کرتا رہا ہوں ، پی ایچ ڈی مقالے سے سیمینار میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شرکت پہلا تجربہ تھا۔ جامعہ سندھ کی پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ جو سابق پی وی سی بھی رہ چکی ہیں اس مقالے کی نگراں سپروئیزر جب کہ پروفیسر ڈاکٹر پرویز احمد پٹھان پرو وائس چانسلر جامعہ سندھ اس تحقیق کے معاون سپر وائیزر ہیں۔مقالہ نگار محمد اختر رند کے مقالہ کا عنوان Library Marketing in Sindh: application and impact of marketing on library and information services in public sector University libraries of Jamshoro ہے۔ یہ ایک نیااور منفرد عنوان ہے ۔ جامعہ سندھ کے سینٹ ہال میں پی ایچ ڈی اسکالر اختر رند نے تحقیق کے بارے میں پریزنٹیشن دی۔ پروفیسر ڈاکٹر نور محمد جمالی پی وی سی لاڑکانہ کیمپس جامعہ سندھ نے سیمینار کو چیئر کیا، راقم کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز پروفیسر ڈاکٹر نگینہ پروین، پروفیسر ڈاکٹر اقبال حسین قاضی، پروفیسر غلام حسین خاصخیلی، پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد میمن، میڈیا اینڈ کمیونیٹی کے پروفیسر سومرو محمد صدیق، پاکستان اسٹڈی سینٹر کی ڈائیریکٹر ، ریسرچ اسکالر شجاع محمد ، زاہد حسین چنا، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس کے استاد عارف بھٹی، پروفیسر شیریں گل سومرو، طلبہ وطالبات بھی موجود تھے۔ محقق کی

پریزنٹیشن کے بعد سوال جواب ہوئے جس میں محقق نے اپنے موقف کا اچھے انداز سے دفاع کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر جمالی، پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ شیخ کے علاوہ راقم نے تحقیق اور پریزینٹیشن کے حوالے اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے عمل کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ جامعہ سندھ میں تحقیق کے بنیادی لوازم و ضروریات کے عمل پر سختی سے عمل حقیقی تحقیق کا باعث ہو رہا ہے۔ جامعات کی سطح پر تحقیق وقت کی ضرورت ہے۔

پی آئی اے : چلے تو نقصان نہ چلے تو اس سے زیادہ نقصان

پی آئی اے کا بحران ٹل گیا، ہڑتال ختم ہو گئی۔ نقصان کس کا ہوا، نواز شریف، پرویز رشید یا مشاہد اللہ کا یا سہیل بلوچ اور اس کے حواریوں کو جنھوں نے ملک کے اتنے بڑے ادارو ے ایک کو ہفتہ مفلوج بنائے رکھا۔ اس دوران مالی خسارہ 5 ارب روپے ہوا، یہ نقصان ان دونوں کا میں سے کسی کا بھی ہوابلکہ یہ ملک اور قوم کا نقصان ہے۔ مصالحت کرنا ہی تھی تو پہلے ہی کر لیتے۔ قوم اس مالی نقصان سے تو بچ جاتی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ پی آئی اے کے موجودہ بحران میں حکومت کی گردن میں سریا دکھائی دے رہا تھا۔ نواز شریف از خود اس حوالے سے سخت زبان استعمال کرتے نظر آئے ان کے وزیر بے تدبیر پرویز رشید، شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار۔ انہوں نے ابتدامیں ہی جس طرح کی گفتگو کی اس سے صاف نظر آرہا تھا کہ حکومت اس مسئلہ کو انا کا مسئلہ بنا رہی ہے۔ کیا نون لیگ نے پیپلز پارٹی کی حکومت میں پی آئی اے کی نجکاری کی مخالفت نہیں کی، احتجاجی ریلی نہیں نکالی۔ دوسرے یہ کریں تو غلط۔ خود کریں تو درست۔ کسی ادارے کے لوگ اپنا حق مانگنے کے لیے مطالبات کریں، حتیٰ کے سڑکوں پر آجائیں اور یہ ان کا جمہوری حق بھی ہے تو آپ ان کی بات سننے کے بجائے یہ کہیں کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو' ہم ان کے پر کاٹ دیں گے'۔ خدا کا خوف نہیں، طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ گردن میں سریا

کس کو کہتے ہیں، غرور، تکبراور طاقت کا نشہ اور کیسا ہوتا ہے۔ ماضی میں جن حکمرانوں نے غریبوں پر ظلم کیا ان کا انجام دردناک ہی ہوا۔ ایک اور وزیر جنہیں پی آئی اے کے حوالے سے ایکسپرٹ تصور کیا جاتا ہے ان کی گفتگو ہی تیر و نشتر کی بوچھاڑ ہوتی ہے، مخالفین کے لیے خراب زبان استعمال کرنے کے حوالے سے مشاہد اللہ خان صاحب مشہور ہیں۔ وہ اصل مسئلہ کو ایڈریس نہیں کر رہے بلکہ ان کا زور اس بات پر ہے کہ حزب اختلاف، کپتان اس بحران کو خراب کر رہے ہیں، عقلمند انسان تم اس کا حل نکالو، خورشید شاہ کیا کر رہے ہیں، کپتان کا کیا پروگرام ہے، دیگر سیاسی جماعتیں کیا منصوبہ بندی کر رہی ہیں تم ان کے پیچھے لگ گئے ہو، اصل بحران جو تمہارے سر پر منڈلا رہا تھا اس کے حل کے لیے عملی اقدامات نہیں کر رہے تھے۔اس بحران کو تدبر کے ساتھ حل کیا جاسکتا تھا لیکن طاقت کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا ہے جس کا نتیجہ بحران خراب سے خراب صورت اختیار کرتا گیا۔ملازمین کی ہڑتال کو اور بحران کو خراب کرنے میں نواز شریف کا وہ ساتھی بھی برابر کا شریک نظر آ رہا ہے جس نے کراچی میں ہڑتالی ملازمین پر تشدت کرنے کا مشورہ دیا، سختی سے پیش آنے کی حکمتِ عملی اپنائی، جس کے نتیجے میں دو لوگوں کی جانیں چلی گئیں۔ کیا احتجاج کرنے والوں سے نمٹنے کا یہی حل ہے کہ ان پر گولی چلادی جائے، لاہور کا واقعہ جس پر حکومت آج تک شرمندہ ہے اس کے پاس لوگوں کو مارنے کا کوئی جواز نہیں، عمران خان کے دھرنوں میں یہی کچھ کیا گیا، کراچی ائر پورٹ پر گولی کس نے چلائی، ہڑتال

کرنے والے از خود اپنے اوپر گولی چلائیں گے وہ چلاتے تو مخالفین پر چلاتے، اس طرح کی حکمت عملی اور وزیروں کے احمقانہ بیانات نے بحران کو گھمبیر شکل دی۔ شکر ہے عابد شیر علی یا سعد رفیق جیسے سخت گیر وزیروں کو یہ ذمہ داری نہیں دی ورنہ زیادہ فساد سامنے آجانا تھا۔ مسئلہ حل کی جانب جانے کے بجائے پیچیدگی کی جانب بڑھا حکومتی ردِ عمل، حل کی تدابیر کے لیے جس قسم کے بیانات سامنے آئے ان سے حکومت کی سوچوں میں غرور اور تکبر کی بو آرہہ تھی۔ متبادل حل پیش کیا گیا کہ نجی ائر لائن سے طیارے مستعار لے کر فلائٹ آپریشن بحال کیا جائے گا، کچھ روٹ دیگر ائر لائن کے دے دیے جائیں گے۔ لازمی سروس ایکٹ کا نفاذ، ایک اور مضحکہ خیز حل کیا سامنے آیا کہ ایک نئی قومی ائر لائن بنانے کا اعلان کر دیا گیا، بہت خوب یہ جو سفید ہاتھی ہے یہ قومی ائر لائن نہیں۔ اسے دفن کرنا اتنا آسان نہیں۔ میاں صاحب کو یہ مشورہ نہ معلوم کس مشیر یا وزیر نے دیا، انہوں نے کس ماہر سے مشورہ کیا، بلا سوچ سمجھے اعلان کر دیا کہ ہم نئی قومی ائر لائن بنائیں گے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ نئی ائر لائن کو چلانے کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ موجودہ قومی ائر لائن کے اسٹاف کو آپ دفن کر دیں گے، ان کا باقی ماندہ سامان تو نئی ائر لائن کو وراثت میں ملے گا وہ خواہ جیسا ہی ہوگا۔ نئے لوگوں کا انتخاب کہاں سے ہوگا، کیا وہ مخلوق براہِ راست آسمان سے منگوائی جائے گی یا کسی بیرون ملک سے برآمد کی جائے گی نہیں اس کا انتخاب آپ، آپ کے وزراء کریں گے وہ آپ کی

حمایت یافتہ ہوں گے، وہ آپ کی جماعت کے ورکر ہوں گے ، تو یہی رونا تو اس وقت آپ اور ہم رو رہے ہیں کہ پی آئی اے میں سابقہ حکمراں جماعتوں نے اپنے ورکر بھرتی کرائے، بھرتیاں میرٹ پر نہیں ہوئیں، کیا گارنٹی ہے کہ اب جو نئی قومی ائر لائن بنے گی اس میں بھرتیاں میرٹ پر ہوں گی۔ ایسا کرکے آپ ایک سفید ہاتھی کو دفن کیے بغیر دوسرا سفید ہاتھی پیدا کردیں گے جو پری میچیور برتھ ہوگی۔ مشکلات اور مسائل بڑھنے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آج آپ الزام لگا رہے ہیں کہ سابقہ حکومت نے اپنے دور میں اپنے لوگوں کو بھرتی کیا، آپ نے بھی تو 2013 کے بعد ایک ہزار لوگوں کو پی آئی اے میں بلازم رکھا، کیا یہ میرٹ پر ہوا، نہیں؟ کل نئے آنے والے یہی الزام آپ کو بھی دیں گے کہ ایک ہاتھی کو دفن نہیں کیا دوسرا ہاتھی قوم پر مسلط کردیا۔

یہ بات تو سو فیصد درست ہے کہ پی آئی اے، پاکستان اسٹیل ملز اور دیگر بڑے سرکاری اداروں کو ہر حکومت نے اپنے دور میں اپنے کارکنوں کو میرٹ کا خون کرتے ہوئے بھرتی کیا۔ اب ان اداروں کی حالت انتہائی ابتر ہوچکی ہے۔ پی آئی اے ان میں سر فہرست ہے۔ سیاسی بنیادوں پر بھرتی ہونے والوں کی کارکردگی صفر رہی ۔ پیپلز پارٹی رخصت ہوئی تو ملازمین کی تعداد 18 ہزار سے زیادہ تھی، طیاروں کی تعداد 38 ہے یعنی ایک طیارے کے لیے تقریباً 500 افراد، دنیا کی دیگر ائر لائنز میں طیاروں کی مناسبت سے فی طیارہ سو افراد کافی ہوتے ہیں،

بھارت میں یہ تناسب 114 افراد کا ہے، ترکی، سعودیہ، ایمریٹس میں اس سے بھی کم ہے، جب کہ کارکردگی کہیں بہتر ہے۔ پی آئی اے کو ہر دور میں ہر حکومت نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، اپنی پسند کے ملازمین اور اس کے سربراہان مقرر کیے جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے۔ اس عمل سے اخراجات کا بوجھ بڑھتا گیا، کارکردگی کا گراف اس قدر نیچے آگیا کہ یہ ادارہ جس کا نام فخر سمجھا جاتا تھا دلدل اور کھائی میں گرتا ہی چلا گیا۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ ہوائی سفر کرنے والے یہ کہنے لگے کہ ہماری فلائٹ پی آئی اے کے علاوہ کسی اور ائر لائن میں کرائیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ہماری قومی ائر لائن کی وہ کارکردگی تھی جس نے ہوائی سفر کرنے والوں کو اس سے متنفر کر دیا، خسارہ اور نقصان اپنی جگہ ۔ کرپشن نے اس کی رہی سہی کسر پوری کر دی، جہاز پرانے، ائر ہوسٹسز وہی پرانی جن کی عمریں پچاس سے اوپر چلتے ہوئے فوکر جہاز کی طرح ڈولتی ہوئی، غلطی یا مجبوری سے سفر کرنے کی نوبت آ گئی تو پورا سفر دعائیں کرتے گزر جاتا ہے، متعلقین اپنے گھروں میں دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ سفر خیر سے مکمل ہو۔ حالات اور واقعات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو پاکستان کا ہر ذی شعور شخص یہ کہے گا کہ پی آئی اے کا کچھ ہونا چاہیے ، حکومت سخت اقدامات لے اس کے سدھار کے، ملازمین کی چھانٹی با عزت طریقے سے کی جائے، غیر ضروری اخراجات کم کیے جائیں، گولڈن شیک ھینڈ دیا جائے نئی بھرتی پر پابندی لگادی جائے ، صرف اس ادارے کے لیے ریٹائر منٹ کی حد ساٹھ ، سے کم کرکے پچاس

کر دی جائے، پینشن مکمل ہو اور اسی طرح کے جاذب نظر پیکج ملازمین کے لیے ہو سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہماری سیاسی جماعتیں ناکام رہی ہیں اس طرح کے اداروں کو سرکاری سرپرستی میں چلانے کی۔ صرف پی آئی اے ہی نہیں اسٹیل کا کیا حال ہے، ریلوے کا نظام کیا اور کہا جا رہا ہے۔ سرکاری بسوں کا کیا حال ہے، پولیس کی ماشاء اللہ شاندار کارکردگی ہے؟ ہے کوئی ادارہ جو سرکار کی سرپرستی میں ہو اور اس کی کارکردگی کو ہم تسلی بخش قرار دیں ایسی صورت میں ملک و قوم کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس قسم کے اداروں کو پرائیواٹائز ہی کر دیا جائے۔ لیکن ہر کام کا ایک سلیقہ ہوتا ہے، بھونڈے انداز سے جو کام کیے جائیں گے ان کا انجام بھی بھونڈا ہی ہوگا۔ اگر نئی قومی ائر لائن بنائی گئی تو یہ بحران ختم نہیں ہوگا، پی آئی اے ملازمین میں پھوٹ ڈال کر، ان میں بغاوت پیدا کر کے ہو سکتا ہے کہ حکومت اس میں کامیاب ہو گئی کیا ٹوٹ کر آ جانے والے آپ کے وفادار رہیں گے؟ وہ نئی ائر لائن میں محنت سے کام کریں گے، نہیں وہ صرف اور صرف اپنی نوکری بچانے کے لیے اپنی وفاداریاں تبدیل کریں گے اور آئندہ بھی ادارے کے لیے نقصان کا باعث ہوں گے۔ خدا کا شکر یہ ہے کہ ابھی تک کسی مشیر نے میاں صاحب کو یہ مشورہ نہیں دیا لیکن مستقبل قریب میں اس پر عمل بھی ہو سکتا ہے کہ ہڑتالیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا جائے۔ اطلاعات ہیں کہ کچھ گرفتاریاں ہو چکی ہیں، شوکاز جارہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی

حکومت میں کراچی پورٹ ٹرسٹ کی یونین نے ہڑتال کی، حکومت نے سخت موقف اختیار کرتے ہوئے یونین کے تمام عہدیدوں اور کارکنوں کو جیل بھیج دیا۔ جس اب لازمی ایکٹ کا نفاذ کیا گیا ہے اس زمانے میں بھی اسی طرح کا قانون نافذ کرکے بے شمار لوگوں کو پاکستان کی مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان میں میرے چچا مغیث احمد صمدانی اور میرے دوست چودھری اشرف بھی تھے۔ اس زمانے میں کے پی ٹی یونین کی صدر خورشید صاحب مرحوم ہوا کرتے تھے۔ سخت گرمی، ہمارے چچا کو سکھر کی جیل بھیج دیا گیا، محبت نے غالب آنا تھا آئی ہم سخت گرمی میں سکھر اور پھر حیدرآباد کی جیل کے بعد کراچی کی جیل میں ان سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ آج زمانہ بدل گیا ہے حکومت اس قسم کی ہمت شاید نہ کرے لیکن سخت موقف سے خرابیاں ہی پیدا ہوں گی۔ پی آئی اے حکومت کے لیے واقعی سفید ہاتھی کی صورت اختیار کرگیا ہے، اللہ کی پناہ سالانہ پانچ ارب کا نقصان، وزیر اعظم کا فرمانا کہ سورج طلوع ہونے سے غروب ہونے تک پی آئی اے دس کڑور کھا جاتا ہے۔ یونین کے عہدیداروں کو بھی عقل کے ناخون لینے کی ضرورت ہے۔ جو سیاسی جماعتوں نے ہڑتال کی حمایت کی یہ ان کی سیاسی مجبوری تھی، سیاسی جماعتوں کے اپنے منشور میں خسارے میں چلنے والے قومی اداروں کی نجکاری کرنا ہے۔ اس وقت پی آئی اے کی یہ صورت ہے کہ چلے تو نقصان نہ چلے تو اس سے زیادہ نقصان ملک و قوم کو پہنچ رہا ہے اس سے جس قدر جلد ممکن ہو سکے نجات حاصل کی جانی چاہیے۔

موج دَریا۔ مجموعہ کلام دریاؔ لکھنوی

موج دَریا۔ بیاض عبدالرحمٰن انصاری دریاؔ لکھنوی نیا بازار لشکر (گوالیار)، مرتبہ ڈاکٹر حِفظ الرحمٰن انصاری، فضلی بک، 2016

لکھنؤں کے شاعر عبدالرحمٰن انصاری جو دریاؔ تخلص کرتے تھے کا مجموعہ کلام 'موج دریا' کے نام سے شائع ہوا۔ کچھ عرصہ قبل مجھے مجموعہ کا مسودہ اظہار خیال کے لیے دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی بساط بھر معلومات کی روشنی میں اس پر کچھ لکھ دیا تھا۔ اب جب کہ شاعری کا مجموعہ شائع ہوگیا ہے، میرے وہ تاثرات کتاب کے ابتدا میں شامل ہیں۔ اسے پیش لفظ یا دیباچہ کہا جاسکتا ہے۔

اردو شاعری کی اثاث دلی اور لکھنؤ دبستان ہیں۔ دبستانِ دلی کی شاعری داخلیت پسندی کے گرد گھومتی ہے جس میں سوز وگداز، درد مندی، غم والم، تصوف، حسن و جمال، احساساتِ حسن، خوبصورت تشبیہات، شگفتگی وترنم، خلوص، سادگی، صداقت، خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔جب کہ دبستان لکھنؤ کی اپنی ایک شناخت ہے، انفرادیت ہے یہاں کے شعراء میں خارجیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ خارجیت پسندی میں لکھنؤ،

کا دبستان اتنے آگے نکل گیا تھا کہ وہ شعراء جو دہلی سے لکھنؤآئے جو داخلیت پسندی لیے ہوئے تھے انہیں بھی اپنے طرز اظہار میں خارجیت پسندی کو اختیار کرنا پڑا۔ جیسا کہ مصحفی نے کیا، مصحفی پر تو سخت تنقید بھی ہوئی یہاں تک کہ انہیں یہ تک کہہ دیا گیا کہ ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں ، اس کے باوجود انہیں شاعری میں منفرد اور یکتا مقام حاصل ہے۔آتش میں بھی دلی اور لکھنوی رنگ و روپ نمایاں تھا۔ میرؔ بھی لکھنؤ گئے تھے۔ شررؔ نے لکھنؤ کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا۔ لکھنؤکے دبستان میں دلی کے برخلاف شاعری میں داخلیت کے بجائے خارجیت بنیاد تھی، سلاست، بے ساختگی کی بجائے الفاظ کی شعبدہ بازیاں زیادہ تھیں، کھلا پن اور نزاکت جسے تنقید نگاروں نے نسوانیت کہا، کسی حد تک بات کو کھلے انداز سے کہنا، جو بات کہنی ہے اس میں لگی لپٹی نہیں رکھنی ، بلکہ صاف صاف کہہ دینا لکھنؤکے شعراء کا رنگ تھا، اسے فحاشی کا نام بھی دیا گیاہے۔ لکھنوی دبستان میں اپنے آپ کو علمی اعتبار سے برتر ظاہر کرنے کی روایت پائی جاتی تھی، یعنی عام سی بات کو پر تکلف انداز میں بیان کرنا لکھنوی شاعری کا ایک خاص وصف تھا اور علمیت وفضیلت کی دلیل تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود لکھنؤ دبستانِ شاعری نے اردو زبان وادب کو وسیع علمی ذخیرہ سے مالا مال کیا۔ لکھنوی دبستان اپنی ایک علیحدہ شناخت لیے ہوئے ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں لکھنوی شاعری دبستانوں کی تاریخی، سماجی اور ادب کی منفرد ترویج ، زبان وبیان کی ادائیگی میں اپنا ثانی

نہیں۔ لکھنو شاعروں کا شہر، اردو کی ترویج و ترقی کا شہر، ادیبوں اور دانشوروں کا منبع و مرکز، اردو تہذیب و تمدن کا گڑھ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں لکھنو کے شعرا اپنے نام کے ساتھ لکھنوی اور دہلی کے شعرا اپنے نام کے ساتھ دہلوی فخریہ طور پر لگایا کرتے تھے۔ 'دہلی' اور 'لکھنؤ' شعرا کی پہچان تھا۔ دہلی اجڑی تو لکھنؤ میں اردو کے چرچے تیز ہوئے۔ کسی شاعر نے لکھنؤ کے حوالے سے کہا۔

دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے

اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

لکھنؤ کو کئی اعتبار سے سبقت حاصل رہی، ترقی پسند تحریک کا آغاز لکھنؤ سے ہوا۔ لکھنؤ کے دبستان میں جو نرمی، پیار، ٹھہراؤ، بھینی بھینی خوشبو ہے اس کا ثانی نہیں ۔ 'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ 'لکھنویت سے مراد شعر و ادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے جُدا ہے۔ لکھنؤ کے اصل رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانہ پر نظر ڈالئے جب لکھنؤ کا شباب تھا، دولت کے دریا بہہ رہے تھے، آسمان سے ہُن برس رہا تھا، دور دور سے باکمال اور اہل فن کھنچے چلے آ رہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک لیے فرش راہ تھا'۔ دیکھئے یہ شعر لکھنوی انداز کی ایک جھلک نظر آئے گی ۔

ایک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

دہلی دبستان کا اپنا رنگ ہے، دہلی اسکول آف اردو غزل کی وسعت اور اثرات اردو شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں گے۔دبستان دہلی نے میر تقی میر، سودا، درد، مصحفی، انشاء، میر حسن، داغ دہلوی، بیخود دہلوی اور بے شمار عظیم شاعر پیدا کیے۔داغ کا شعر دیکھیے۔

بُتوں کے کوچے سے ہم دل فگار ہو کے چلے

شکار کرنے کو آئے، شکار ہو کے چلے

رات اس کو بھی خواب میں دیکھا

جس کو ہر دم حجاب میں دیکھا

لکھنؤ تو تھی ہی شاعروں کی سرزمین، بقول ڈاکٹر ابو للیث صدیقی ' ناسخ کو اساتذہ لکھنؤ میں بڑا مقام حاصل ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہی سب سے پہلے دلی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا اور لکھنؤ کی زبان و شاعری کو قواعد و ضوابط کی سند عطا کی'۔ یہاں کے معروف شعراء میں ناسخ،،برق، آتش، شوق، سحر لکھنؤ، جلال لکھنؤ، امانت لکھنؤ، آتش کی تو کیا بات ہے۔ لکھنؤ رنگ دیگر شعراء میں بھی نظر آتا ہے جیسے حسرت موہانی کے ہاں

لکھنوی رنگ نظر آتا ہے۔ میرؔ بھی دلی گئے تو انہوں نے کہا ۔

لکھنوَ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میرؔ کی سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

گمنامی میں چلے جانے والے شاعر دریاؔ لکھنوی جنھوں نے شعر تو کہے، بڑے شاعروں کی صدارت میں اپنا کلام بھی سنایا لیکن اپنا کلام کبھی کسی جگہ چھپوانے کی زحمت نہیں کی۔ دریاؔ لکھنوی کا یہ کلام 1925 سے 1939 تک کے درمیان تخلیق پایا۔ ان کا جس قدر کلام بھی ہے ہاتھ سے لکھا ہوا ان کے فرزند ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کے پاس محفوظ رہا۔ جنھوں نے ان بوسیدہ کاغذکے صفحات کو سنبھال کر رکھا یہ عمل اپنے والد سے عقیدت اور ادب سے دلچسپی کا مظہر ہے۔ دریاؔ کے انتقال کو 67 برس گزر چکے ہیں اتنے طویل عرصہ کے بعد ایک گمنام شاعر کو مجموعہ کلام کی اشاعت کی صورت میں متعارف کرانا شاعر سے اپنی محبت اور عقیدت کا مظہر تو ہے ہی یہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس خاندان میں علم وادب سے حقیقی لگاؤ پایا جاتا ہے، شعر و شاعری کے جراثومے اس خاندان کے احباب کی رگو میں گردش کر رہے ہیں۔ دریاؔ لکھنوی کے بیٹے ڈاکٹر حفظ احمٰن اس خدمت کے لیے قابل مبارک باد ہیں ان کا یہ لائق تحسین عمل ادب کے فروغ کا باعث ہے۔اب رہی یہ بات کہ ایسے شاعر کا کلام کس نوعیت کا ہے جسے اس شاعر نے مشاعروں میں اس وقت کے بڑے شعراء کی صدارت میں تو پڑھا لیکن اسے

کسی ادبی جریدے میں شائع کرانے کی کوشش نہیں کی، کسی جریدے نے از خود بھی ان کے کلام کو شائع نہیں کیا، اس دور کے شاعر دوست احباب نے بھی اس جانب توجہ نہیں دی۔ اس میں دریاؔ لکھنوی کی سادگی، شہرت سے بے نیازی، انکساری و عاجزی کا دخل زیادہ نظر آتا ہے۔ آج تو ہم جیسا ادب کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والا اگر کبھی کوئی ایک شعر بھی گڑھ لیتا ہے تو اولین کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح کہیں چھپ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی شاعر اپنی کہی ہوئی غزل جب تک کسی کو سنا نہ لے اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اُس زمانے کے لوگ شہرت کی بیماری سے آزاد ہو کر خاموشی سے بس اپنا کام کیے جاتے تھے۔ میرے دادا شیخ محمد ابراہیم آزادؔ جنہیں بیخودؔ دہلوی کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل تھا نے اپنا دیوان 'دیوانِ آزاد' بہ مشکل چھپوایا، اس کے ساتھ بے شمار کلام، اور نثری مضامین کسی بھی جگہ

چھپ نہ سکے اور اب ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہا کس کے پاس ہیں یا صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ کسی نے سخن ور اسی شاعر کو کہا ہے جس کا دیوان چھپ چکا ہو ؎

سخن ور ہے وہی جو صاحبِ دیوان ہو ناجی\
نہیں تک فردیوں کی تاب یہ ممکن کہ شاعر ہوں

مجموعہ کلام 'موج دریا' دریاؔ لکھنوی کے صاحبزادے ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کی

وجہ سے گمنامی سے دنیا کے سامنے لانے کا باعث بنا۔ اس مجموعے نے دریاؔ لکھنوی کے کلام کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ان کے خاندان کے ایک چشم و چراغ عبد الصمد انصاری جنہیں شاعری خاندانی ورثہ کے طور پر ملی نے مجھے طباعت سے قبل 'موج دریا' کا مسودہ اس فرمائش کے ساتھ دیا کہ میں اس پر اظہار خیال کروں۔ میں ادب میں نثری مضامین میں کچھ اضافہ کرتا رہتا ہوں۔ شخصیات میرا خاص موضوع رہے ہیں۔ ان میں شاعروں پر بھی کچھ لکھا ہے۔ دریاؔ لکھنوی پر لکھنے کی فرمائش نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ دریاؔ لکھنوی کی شاعری جو اس سے پہلے کہیں نہیں چھپی۔ اس پر تو کسی پختہ اور منجھے ہوئے شاعر سے لکھوانا چاہیے تھا۔ میں کیا میری بساط کیا۔ لیکن جب ادب کے سمندر میں رہنا ہے تو آس پاس کی مچھلیوں کے ساتھ ساتھ تو چلنا ہی ہوگا۔ کہاں شاعری کا دریا کہاں میں دریا کی ایک چھوٹی سے مچھلی جو شاعری کا طالب علم تو ہو سکتا ہے لیکن دریاؔ لکھنوی جیسے پختہ شاعر کے مجموعہ کلام پر قلم اٹھائے بہت ہی مشکل کام ہے۔

دریاؔ لکھنوی کا پورا نام قاضی عبد الرحمٰن انصاری، تخلص دریاؔ اور شہر لکھنؤ کے باسی تھے اس لیے لکھنوی ٹھہرے۔ یہ خاندان حضرت ایوب انصاری کی باقیات میں سے ہے، شاعری اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے جو نسل در نسل کئی نسلوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ زیادہ تر شاعر داغ اسکول سے تعلق رکھتے

ہیں۔اکثر شعراء نے داغؔ کے شاگردوں سے تلمذ حاصل کیا۔ میرے خاندان کے شعراء بھی داغؔ اسکول سے ہی تعلق رکھتے تھے۔اس طرح ریاست گوالیار سے تعلق رکھنے والے اکثر شعراء کا شجرۂ شاعری جنابِ داغؔ دہلوی سے جاملتا ہے۔ جیسے ریاضؔ انصاری جیوری نے نوحؔ ناروی، شاگرد رشید داغؔ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ قاضی عبدالرحمٰن دریاؔ معروف شاعر مضطرؔ خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ عبدالوہاب انصاری نے دریاؔ لکھنوی کو نوحؔ ناروی کا پیروکار شاعر کہا ہے۔دریاؔ لکھنوی نوح ناروی طرز کے شاعر کہے گئے اور نوح ناروی داغؔ کے شاگرد تھے۔۔ مضطرؔ خیرآبادی کا نام آتے ہی ان کی مشہور و معروف غزل ذہن میں نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ پوری غزل یہاں لکھ دوں لیکن جگہ کی تنگی کے

باعث دو اشعار پر ہی اکتفا کروں گا۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

نہ میں مضطر ان کا حبیب ہوں نہ میں مضطر ان کا رقیب ہوں

جو پلٹ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

افتخار حسین مضطرؔ خیرآبادی کا زمانہ 1862-1927 کا ہے۔ یہ علامہ مولوی فضل حق خیرآبادی کے پوتے تھے۔ جو شاعر، فلاسفر، مذہبی اسکالر، ادبی شخصیت، اردو

عربی کے عالم، جدوجہد آزادی کے مجاہد تھے۔ جان نثار اختر اور جاوید اختر اس خاندان کے ادبی اظہار کا تسلسل ہیں۔ اس خاندان میں شاعری اور ادب سے وابستگی نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ مضطر خیرآبادی کے خاندان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔
دریاؔ لکھنوَ
ی نے مضطر خیرآبادی کی قربت حاصل کی، خاندان بھی شاعر، ان کا اپنا مزاج بھی شاعرانہ تو پھر کلام کی کیا بات ہو سکتی ہے۔
دریاؔ کے مجموعہ کلام ''موج دریا' میں جو غزلیں شامل ہیں ان کے نیچے یہ بھی تحریر ہے کہ یہ غزل دریاؔ نے کس مشاعرہ میں اورپڑھی اور وہ مشاعرہ کس شاعر کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس دور کے معروف اور بڑے شعراء جن کی صدارت میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں دریاؔ نے اپنا کلام سنایا ان میں جگرؔ مرادآبادی، بیخودؔ دہلوی، سیمابؔ اکبرآبادی اور حضرت مانی جائسی شامل ہیں۔اب جس شاعر نے ایسے ایسے بلند پایہ استادشاعروں کی صحبت میں اپنا کلام سنایا ہو اس کی شاعری یقینا پایہ کی شاعری ہوگی۔ دریاؔ کی شاعری میں حسن ہے، درد ہے، میٹھاس ہے، اچھوتا پن ہے۔ سوز وگداز، تصوف، احساساتِ حسن، تشبیہات، شگفتگی و ترنم،خلوص، سادگی، صداقت، خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔ جن مشاعروں میں دریاؔ نے اپنا کلام سنایاان میں مشاعرہ.بزم اردو .برمکان عبدالرشید، تاباں صاحب، حضرت جی ، گوالیار، مادھوگنج.برمکان رستم

داروغہ، سالانہ مشاعرہ بزم اردو ٹاؤن ہال لشکر ابن عباس، ڈاکٹر ظل الرحمٰن، نیا بازار، رائے خان بھیا صاحب لشکر، منظر صاحب، سید عابد علی، مرار، مشاعرہ بزم اردو، مشاعرہ وکٹوریہ کالج لشکر، مشاعرہ سرکاری امام باڑہ منجانب آنگرے صاحب، مشاعرہ بزم اردو بصدارت حضرت مانی جائسی، مشاعرہ بہار اردو ہائی اسکول، مرار بہ صدارت سیماب اکبر آبادی، مشاعرہ حضرت جی، بہ صدارت بیخودؔ دہلوی (۲۴ اگست ۱۹۳۰ء)، مشاعرہ بزم اردو بر مکان ڈاکٹر ضیاء عباس، ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء، مشاعرہ جھانسی، یکم اکتوبر ۱۹۳۲ء، مشاعرہ لکڑ خانہ، ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء، مشاعرہ مظہر صاحب، ۲۶ ستمبر ۱۹۳۰ء، مشاعرہ بر مکان حکیم احمد صالح مشاعرہ کالج، ۳۰ اگست ۱۹۳۶ء، مشاعرہ بر مکان مشتاق صاحب ۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء، مشاعرہ وکٹوریہ کالج، ۲۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ہونیوالا، مشاعرہ مزار چھنگا شاہ رح، ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء، مشاعرہ حکیم احمد یکم فروری ۱۹۳۹ء، مشاعرہ ۲۱ جنوری بہ صدارت جگر مراد آبادی، مشاعرہ بزم اردو لشکر، ۷ مارچ ۱۹۳۹ء شامل ہیں۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دریاؔ کی شعر گوئی کے عروج کا زمانہ دس سالوں یعنی 1930 سے 1940 پر محیط ہے۔

دریاؔ لکھنوی کا زمانہ انیسوی صدی عیسویں کے آخری نصف سے بیسویں صدی عیسویں کے نصف تک کا ہے۔ اس دور کے ممتاز سخنوروں میں احمد رضاؔ بریلوی، سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی، شادؔ عظیم آباد، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا

محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، شیخ محمد ابراہیم آزاد ، ریاضؔ انصاری جیوری، مولانا غلام شہیدؔ ، آسیؔ غازی پوری، حسنؔ بریلوی،علامہ ضیاء القادری ، محمد عبداللہ بیدلؔ ، حافظ خلیل الدین حسن حافظؔ پیلی بھیتی، محمد یوسف راسخؔ ، منشی عبدالشکور خاں برقؔ اجمیری ، محمد عبداللہ المعروف بہ امیر دولھا صوفیؔ، جمیل نقوی مرحوم، خلیلؔ صمدانی شامل ہیں۔یہی شعراء جناب دریاؔ کے ہم عصر کہے جاسکتے ہیں۔دریاؔ لکھنوی کو اردو کے علاوہ عربی اور فارسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔وہ کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ خاندانی روایات ، شعراء کی صحبت ، استاد کی نظر عنایت نے دریاؔ لکھنوی کی شاعری میں نکھار پیدا کردیا۔ وہ حقیقت اور سچائی کے شاعر ہیں،ان کی شاعری میں رکھاؤ اور نظم و ضبط اور محاسنِ کلام کا معیار صاف پڑھا جاسکتا ہے۔ وہ صرف ایک کہنا مشق شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ اردو زبان سے محبت ، چاہت ان کے کلام سے صاف عیاں ہے ۔

ادھر جاتا تو ہے قاصد اگر پوچھیں تو کہہ دینا
برا ہے اور بھی حالِ دلِ ناچار پہلے سے.

غالبؔ نے ناسخؔ کے لیے کہا تھا کہ وہ ایک فنے ہیں (یعنی غزل گوئی پر قادر تھے)۔اسی طرح دریاؔ لکھنوی غزل گو شاعر ہیں،ان کے اس مجموعہ 'موج دریا' میں تو غزلیں ہی ہیں۔ بہت ممکن ہیں کہ ان کا دیگر کلام بھی ہو جو تاحال پوشیدہ

ہے۔ دریاؔ لکھنوی کی 'بزم ادب' کی سرگرمیوں کے روح واں رہے، دریاؔ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں محاورات کی خوبی، زبان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں زبان و بیان میں نرمی، سادگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ دریاؔ کی شاعری میں دکھ بھی ہیں، غم بھی، انھوں نے تلخ باتوں کو سہل انداز سے بیان کیا ہے۔

اک نہ اک دن جان تو جانے ہی والی تھی مگر
غم تو اس کا ہے مرا قاتل پشیماں ہوگیا

دریاؔ لکھنوی کا لہجہ مضطر خیر آبادی کی طرح خالص ہندوستانی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ کمال انھیں اپنے خاندانی ورثے اور استادوں کی صحبت سے ہی حاصل ہوا ہے۔

وہ چلے آتے ہیں ہاتھوں میں کلیجہ تھامے
کون کہتا ہے کہ فریاد میں تاثیر نہیں

دریاؔ لکھنوی کے کلام میں سادگی، خلوص اور صداقت کا عنصر نمایاں ہے، شاعر نے فنی رموز کو سچائی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ شعراء لکھنؤ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی ساری صلاحیت شعر کی ظاہری حُسن و خوبی سے مزین کرنے میں صرف کردی۔ دریاؔ لکھنؤ کی شاعری میں لکھنوی شاعروں کا یہ انداز بھی نمایاں ہے۔

ترے دل میں میرے نالوں کے شکوے تو ہزاروں ہیں
مگر کوئی تجھے اپنا ستم بھی یاد آتا ہے

دریاؔ لکھنوی نے شاعری میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو عام زندگی میں معروف ہیں اور عوام الناس ان سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کا انداز اور لب ولہجہ سیدھا سادہ اور عام ہے۔

میری حسرت ہے کہ ان کے آستاں پر مر رہوں
ان کی یہ تاکید کوئی دوسرا در دیکھئے

دریاؔ لکھنوی نے اپنی بات کو بیان کرنے کے لیے بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات نہیں کرتے بلکہ جو بات کہنی ہوتی ہے اسے صاف صاف کہہ ڈالتے ہیں۔ یہی ادا ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ لکھنو دبستان کی یہی ایک خوبی بھی ہے۔

بچا مرتے ہی مرتے دل کے ہاتھوں تو جوانی میں
میرا عہدِ شباب اک حادثہ تھا زندگانی میں

دریاؔ لکھنوی کو میرؔ کی طرح خطاب اور گفتگو کا انداز اچھا لگتا ہے۔ وہ کہیں کہیں خود کو بھی مخاطب کرکے باتیں کرتے ہیں۔

دریاؔ وہ حال بھی تو مرا پوچھتے نہیں
کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

دریاؔ لکھنوی کی شاعری میں یاس اور حسرت کا بھی بڑا دخل ہے، ان کی شاعری رنجیدہ دکھی اور ناامیدی کی جھلک نظر آتی ہے ۔

دمِ نزع ہے روح کھنچنے لگی ہے رہا دل کا دل ہی میں رازِ نہانی
انھوں نے تو آنے میں تاخیر کردی تو ہی ساتھ دے کچھ مرا زندگانی

اسی طرح محبوب کے دیر سے آنے کی فریاد اس طرح کرتے نظر آتے ہیں ۔

آہ وہ آئے تو کب آئے عیادت کو مری
جب مجھے تربت میں دریاؔ دھرنے والے دھر چکے

طنز کرنا شاعری کا خاص وصف ہے۔ تمام ہی شاعروں خاص طور پر غزل گو شعراء میں طنز کا رنگ پایا جاتا ہے۔ میر تقی میرؔ کا طنز اپنا ثانی نہیں رکھتا، د میرؔ کے طنز کا ایک شعر ۔

ہوگا کسو دیوار کے سائے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

دریاؔ لکھنوی کے ایک شعر میں طنز کا انداز کچھ اس طرح جھلکتا دکھائی دیتا ہے

ے

خبر سن کر مرے مرنے کی یہ ارشاد فرمایا

جنوں جب حد سے بڑھتا ہے یہی انجام ہوتا ہے

شاعری کے بارے میں دریاؔ لکھنوی کا کہنا ہے کہ یہ فن قسمت سے آتا ہے، کوشش اور جستجو سے حاصل نہیں ہوتا، اپنا اپنا خیال اور رائے ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ انسان کوشش اور جستجو کرے تو وہ کسی بھی فن میں مہارت حاصل کرسکتا ہے۔ بہر کیف دریاؔ لکھنوی کا خیال توحسب ذیل شعر میں یہی ہے۔ دیکھئے یہ شعر ے

جسے کہتے ہیں فنِ شاعری قسمت سے آتا ہے

نہیں ہوتا سعی سے شعر دریاؔ زندگی بھر میں

دریاؔ لکھنوی اپنے ظاہر اور باطن کے استعمال کے ساتھ محبوب مجازی اور محبوب حقیقی کی یاد کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ے

میرے ظاہر پر نہ جا کافر مرے باطن کو دیکھ

دل میں تیری یاد ہے لب پر خدا کا نام ہے

ڈاکٹر حفظ الرحمٰن انصاری قابل مبارک باد ہیں اور قابل ستائش بھی کہ انہوں

امریکہ جیسے تیز ترین ملک میں رہتے ہوئے اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کلام کی طویل عرصہ حفاظت کی۔ یہ کلام جسے بہت پہلے منظر عام پر آ جانا چاہیے تھا باوجوہ نہیں آیا۔ کہتے ہیں دیر آید درست آید۔ اس کام کے لیے یہی وقت مقرر تھا۔ جس جس نے بھی اس مجموعہ کی تدوین و اشاعت میں کردار ادا کیا وہ قابل مبارک باد ہیں۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی نظم یا نثر کا سرمایہ اس کے انتقال کے طویل عرصے بعد مطبوعہ صورت میں منظر عام پر آ جائے۔ اتنے طویل عرصے میں کسی بھی شاعر کا کلام یا نثر نگار کا تحریری سرمایہ زمانے کے سرد و گرم ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ عبد الصمد انصاری کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے اس کام کا اہل سمجھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق جو کچھ لکھ سکتا تھا لکھ دیا ہے۔ امید ہے کے مجموعہ کلام چھپنے کے بعد تنقید نگار لکھنؤ کے اس گمنام شاعر کی شاعری پر میری بات کو اور آگے بڑھائیں گے۔ یہی جستجو ہے، تحقیق اسی کا نام ہے۔

احتساب: دوسروں کا حلال اپنا حرام

احتساب دوسروں کا ہی اچھا لگتا ہے، کسی طرح احتساب کا رخ اپنی یا اپنے ساتھیوں کی جانب ہو جائے تو وہ زہر بلکہ حرام لگنے لگتا ہے۔ یہ ظالم 'احتساب' ہے ہی ایسی بلا، صرف دوسرے کے لیے ہی پسند کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ساتویں دہائی ختم ہونے کو آئی لیکن ہم نے اپنے ملک سے حاصل تو کیا اُسے کچھ دینے کا کبھی سوچا ہی نہیں۔ جس کا جس حیثیت میں بس چلا اس نے دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹا، سینما کا ٹکٹ بلیک کرنے والے سے صدر کے عہدے تک، افسر سے چپراسی تک ہر ایک نے دونوں ہاتھوں سے خوب خوب نوچا، خوب مال بنایا، بنک بیلنس، دولت، جائیداد ملک کے اندر ملک سے باہر، لیکن پیٹ ہے کہ بھرکے ہی نہیں دیتا۔ احتساب کی باز گشت کافی عرصہ سے جاری تھی، سر دست سندھ کی ہوائیں اس کی لپیٹ میں تھیں، لمحہ موجود کے احتساب میں ڈاکٹر عاصم سرفہرست چلے آرہے تھے، بعض دیگر سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی اس میں شامل ہوئے۔ عوام نے احتساب کے اس عمل کو ملک وقوم کے لیے غنیمت جانا، جس طرح دہشت گردوں کے خلاف ہماری عسکری قوت کام کررہی ہے اور اس کے عملی نتائج پوری قوم کے سامنے ہیں، آج کا کراچی ماضی کے کراچی سے یکسر مختلف دکھائی دیتا ہے، رات ہی میں اپنے بھائی پرویز اور ندیم سے یہ بات کررہا تھا اور انہوں نے بھی اس بات کی تائید کی کہ

واقعی اب گاڑی میں سفر کرتے ہوئے، بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے، بنک سے باہر نکلتے ہوئے، موبائل پر کھلے عام بات کرتے ہوئے خوف اور ڈر جاتا رہا ہے۔ کبھی خوف کا یہ عالم تھا کہ جیب سے موبائل نکالتے ہوئے ڈر لگا کرتا تھا، بنک سے چاہیے دو ہزار ہی لیے ہوں باہر نکلتے ہوئے خوف آیا کرتا تھا۔ خواتین جو تنہا رکشا میں سفر کر رہی ہوتی تھیں سر عام بلکہ مصروف ترین شاہراہ پر روک کر ان کے ہاتھوں سے چوڑیاں، کانوں سے بندے اور پرس چھین لینا عام سی بات ہو گئی تھی۔ اگر کسی بہادر نے بہادری دکھائی تو اسے اپنی جان سے جانا پڑتا تھا۔ کراچی آپریشن کا نتیجہ ہے کہ آج کا کراچی گزرے ہوئے کراچی سے بہت مختلف ہو چکا ہے خدا کرے اب وہ دن لوٹ کر نہ آئیں اور امن و سکون کی فضاء اسی طرح قائم رہے۔

بات احتساب کی کر رہا تھا سندھ کے بعد احتساب کا رخ مڑنا ہی تھا، احتساب کرنے والے خود بھی محسوس کر رہے ہوں گے ہو سکتا ہے کہ وہ اندر سے شرمندہ بھی ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ ان سے زیادتی ہو رہی ہے، عام و خاص بھی یہ سوچ رہے تھے کہ کیا سارے بدمعاش اور کرپٹ سندھ میں ہی موجود ہیں، کیا برے کام کرنے والے کراچی میں آباد ہو چکے ہیں باقی صوبے اور شہر دودھ میں دھلے ہوئے ہیں ۔ حالانکہ میڈیا سب ہی کے کالے کرتوت اسکرین پر دکھاتا رہا ہے، وزیروں کو پیسے لیتے ہوئے ٹی پر دکھایا گیا ہے اس کے باوجود وہ مسندِ وزارت پر ڈٹے

نظر آرہے ہیں۔ عدالتوں نے اس جانب اشارہ کیا، کمیشنوں کی رپورٹوں نے بھانڈا پوڑا لیکن احتساب کرنے والوں کو نہیں معلوم سانپ سونگھ گیا تھا، انہیں پنجاب میں ہونے والی کرپشن، لوٹ مار، دہشت گردی، ترقیاتی منصوبوں میں گھپلے، بڑے بڑے عہدوں پر من پسند افراد کی تقرری اور میرٹ کا خون ہوتا، اقرباء پروری جیسی برائیاں نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ لوگوں نے کھلے الفاظ میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ سراسر زیادتی ہے، حزب اختلاف کی سیاسی جماعتیں تو چلا ہی رہی تھیں۔

سندھ کی حکومت مسلسل وفاق سے نالا نظر آئی اور وفاق کو صوبائی معاملات میں مداخلت سے باز رہنے کا مشورہ دیتی رہی، بے شمار پریس کانفرنسیز کرکے سندھ کے حکومتی ذمہ داروں نے احتساب کے عمل کو سندھ سے پنجاب تک پہنچانے اور انصاف سے کام لینے کی دوھائی دی۔ ایک دن آیا کہ چیرمین نیب کی طرف سے کرپشن مقدمات جلد سے جلد نمٹانے اور اس کا دائرہ سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب تک بڑھانے کے احکامات جاری کیے۔ متعدد اہم حکومتی شخصیات پر مقدمات کے حوالے سے بلا خوف و خطر پیشرفت جاری رکھنے، ہنگامی بنیادوں پر احتساب کے عمل پر عمل کرنے جیسے اعلانات سامنے آئے۔ نیب کے اعلانات سے یہ احساس پیدا ہوا کہ اب نہ انصافی کی فضاء ختم ہوگی اور احتساب کا دائرہ پنجاب تک وسیع ہوگا۔

ابھی احتسابی عمل بڑے بھائی کے گھر کی دہلیز تک پہنچا ہی نہیں تھا، ابھی تو

صرف تیاری ہی شروع ہوئی تھی، کرپشن کرنے والوں کی فہرستیں تیار ہی ہو رہی تھیں، تیار کیا ہو رہی تھیں ان فہرستوں کو جنہیں سرد خانے کی نظر کر دیا گیا تھا وہاں سے نکالنے کا عمل شروع ہونے ہی والا تھا کہ شیروں کو اس کی بھنک پڑ گئی کہ ہم تو جگر تھام کے بیٹھے ہیں اب ہماری باری آئی، پھر کیا تھا سیاسی پنڈتوں نے، شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے اپنی اپنی چھریوں کی دھارے تیز کرنا شروع کر دیں، کسی نے کہا کہ خبر دار اگر اس جانب غلطی سے بھی نظر کی تمہاری آنکھیں نکال دی جائیں گی، کسی نے کہا کہ اگر تمہاری پرواز اس جانب ہوئی تو یاد رکھو تمہارے پر کتر دئے جائیں گے، کوئی بولا ناخن تراش دیں گے، تمام زور نیب افسران کو کاٹنے پر تھا اور تو اور حیرت کا بت اس وقت ریزہ ریزہ ہوگیا جب وزیر اعظم میاں نواز شریف کا بیان آیا کہ 'نیب اپنے دائرے میں رہے ورنہ کاروائی کریں گے' ، ساتھ ہی یہ اعلان بھی سامنے آیا کہ احتساب کے عمل کی نگرانی کے لیے آزاد کمیشن بنائیں گے، اور احتساب کے قانون کو شفاف بنانے کے لیے اس میں ترمیم کی جائے گی۔ وزیر اعظم نے 16فروری 2016 کو بہاولپور میں مسلم لیگ (ن) کے نومنتخب نمائندوں سے خطاب کے دوران قومی احتساب بیورو نیب) کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ حکومت) احتساب سے متعلق قانون میں تبدیلی لانے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہی ہے، میاں صاحب کا فرمانا تھا کہ نیب حکام سرکاری افسران کو ڈراتے اور تصدیق کے بغیر معصوم لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔ آخر میاں صاحب کو یہ

ادراک ہو ہی گیا کہ نیب معصوموں کو تنگ کر رہی ہے، حالانکہ سندھ کی حکومت چلا چلا کر تھک گئی اسی قسم کی شکایت کرتی رہی اس وقت وفاق کو یا میاں صاحب کو یہ احساس کیوں نہیں ہوا؟ میاں صاحب کا اس وقت اس قسم کا بیان دینا سوالیا نشان ہے؟ میاں صاحب کے اس بیان کو نیب کو ڈرانے دھمکانے کے زمرہ میں لیا جارہا ہے، بعض حلقے یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ نیب کا شکنجا پنجاب کے بعض اہم سیاست دانوں کو اپنی گرفت میں لینے جارہا تھا۔ عین وقت پر میاں صاحب نے خبر دار کردیا۔ بعض تجزیہ کاروں نے میگا کرپشن کے 150 مقدمات کی فائلیں جن میں علامہ آصف زرداری، بڑے میاں صاحب اور چھوٹے میاں صاحب، سمدھی وزیر صاحب، یوسف رضا گیلانی، راجہ پرویز اشرف، چودھری شجاعت، چودھری پرویز الٰہی، اسلم رئیسانی، حسین حقانی، آفتاب شیر پاؤ، یونس حبیب، غضفر گوندل، ، ایاز خان نیازی، توقیر صادق، میاں منشاء، جنرل سعید الظفر، سلمان صدیق، شاہد رفیع، اسماعیل قریشی، حکیم ارشد، ہارون اختر، جہانگیر صدیقی، محمد صدیق میمن اور دیگر کے اسمائے گرامی شامل ہیں احتساب بیورو کی جانب سے جولائی 2015ء میں سپریم کورٹ میں جمع کرائی گئی ہے۔ دیگر کیسیز اس کے علاوہ ہیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ وزیر اعظم صاحب نیب کے اس عمل کا خیر مقدم کرتے، اسے آزادی سے احتساب کرنے دیتے، چیرَمین نیب کا انتخاب باہمی رضامندی سے ہوا تھا، وہ حکومت اور حزب اختلاف کے منتخب کردہ ہیں۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ جب بھی احتساب کا عمل آگے بڑھتا نظر آتا ہے، یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب احتساب تمام

مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر کیا جائے گا، اس وقت کوئی نہ کوئی مصلحت ، کسی طاقت ور کی مداخلت اس عمل کو آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ اگر صرف ان لوگوں سے جنھوں نے کرپشن کے ذریعہ ملک کی دولت جمع کی، محض وہ دولت ہی ملک میں آجائے تو پاکستان کے بے شمار مسائل حل ہوجائیں لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ حکومت کے اس اقدام کو عام لوگوں نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اسے اس طرح لیا گیا کہ احتساب جب سندھ میں ہو یا دوسروں کا ہو تو جائز اور حلال جب اپنا احتساب ہوتا نظر آئے تو ناجائز اور حرام ، یہ روش ہماری تباہی اور بربادی کا موجب ہو رہی ہے۔ جب تک ملک میں انصاف اور ایمانداری کا بول بالا نہیں ہوگا، کرپشن کرنے والوں کو کڑا احتساب نہیں ہوگا انہیں سخت سے سخت سزائیں نہیں دی جائیں گی، ملک کی ترقی کی رفتار سست روی کا شکار ، رہے گی، عوام غریب سے غریب اور کرپشن کرنے والے امیر سے امیر ہوتے رہیں گے۔ ملک کے سیاست دانوں کا جائزہ لیں ہر سیاست داں وقت کے ساتھ ساتھ دولت سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا رہا ہے۔ ایسے ایسے سیاسی ورکر جو گلیوں اور سڑکوں پر ٹوٹی چپل پہن کر گھوما کرتے تھے ، سیاست میں آئے، وزیر بنے ان کے پر لگ گئے، جی چاہتا ہے کہ ان کے نام بھی لکھ دوں لیکن نہیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے ان کا حال ہمارے سامنے ہے، غریب بستی میں رہنے والے آج دبئی اور لندن سے کم کی بات نہیں کرتے جن کے پاس اپنے ملک میں رہنے کو پکہ گھر نہیں تھا سیاست نے انہیں دبئی کا شہری بنا، ، دیا۔ یہ سب کچھ ایمانداری سے ہو سکتا ہے

کبھی نہیں ، یہی تو کرپشن ہے، اس کا احتساب بہت ضروری ہے۔

اُٹھ مُسلِم پاکستان بچا۔ایک اچھی کتاب

اُٹھ مُسلم پاکستان بچا، تحریک پاکستان کے مجاہد، قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ساتھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علی گڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے والے مولوی فرقان احمد انصاری (علیگ) کی آپ بیتی ہے، تحریک پاکستان کی تاریخ ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس دور کی کہانی بھی ہے جس دور میں مصنف اس جامعہ سے وابستہ رہے، اس تصنیف کو بلا شبہ پاکستان کے قیام کے بنیادی فلسفہ یعنی دو قومی نظریہ کی تفسیر بھی کہا جاسکتا ہے۔ مولوی فرقان احمد انصاری (علیگ) کی یادداشتوں، خیالات، افکار، نظریات، احساسات اور فکر کو ان کے صاحبزادے مولوی محمد سلطان عالم انصاری (ایڈووکیٹ) نے مہارت اور خوبصورتی سے مرتب کیا ہے جس میں حق فرزندگی کا اسلوب بھی نمایاں ہے۔

زیر نظر تصنیف کو شائع ہوئے دس برس ہوچکے ہیں۔برادر سرور صمدانی جن کا تعلق ملتان سے ہے نے مارچ2007 میں یہ کتاب مجھے ارسال کی تھی۔ غالباً ان کی خواہش یہ بھی رہی ہوگی کہ میں اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھوں، میں نے کتاب کا تفصیلی مطالعہ بھی کیا کتاب پر درج میرے کچھ نوٹس اس بات کی نشاندھی کرتے ہیں لیکن نہیں معلوم کیا وجہ ہوئی کہ میں اس پر تبصرہ نہ لکھ سکا۔ وقت

گزرتا چلا گیا۔ یہ کتاب میری ذاتی لائبریری کا حصہ بن گئی، کالج سے ریٹائرمنٹ اور پھر جامعہ سرگودھا اور جامعہ منہاج میں درس وتدریس سے فارغ ہو کر واپس کراچی آیا تو میری ذاتی لائبریری کی رونق ماند پڑی ہوئی تھی، اداسی طاری تھی وہ مجھ سے میری عدم موجودگی کا گلہ کرتی نظر آئی۔ کتاب تو ویسے بھی ایک ایسا ساتھی اور دوست ہے کہ جب ہم چاہیں تو وہ ہم سے مخاطب ہوتی ہے اگر ہم نہ چاہیں تو وہ چپ چاپ خاموشی سے ایک ہی جگہ پڑی رہتی ہے اور ہم سے ہماری بے رخی کا گلا بھی نہیں کرتی۔ جب ہم چاہیں وہ کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارنے پر تیار ہو جائے اور جب ہم پسند کریں تو سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگی رہے، بلکہ ہماری خواہش ہو تو ہمارے جسم و جان کا جزو بن جائے۔ جب تک ہم چاہیں خاموش رہے اور جب ہمارا جی اس سے بولنے کو چاہے تو چہکنے لگے۔ ہم کسی کام میں مصروف ہوں وہ خلل انداز نہیں ہوتی اور ہم تنہائی محسوس کریں تو وہ ہماری شفیق ساتھی بن جاتی ہے۔ کتاب ایک ایسا قابل اعتماد دوست ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا اور نہ کبھی ہمارا ساتھ دینے سے جی چراتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

یہ وہ وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ جب میں نہ رہونگا تو میرے اس علمی ذخیرے کا کیا بنے گا،اب میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی لائبریری کو کسی ایک یا ایک سے زیادہ کتب خانوں کو عطیہ کردوں تاکہ میرا یہ علمی سرمایہ کسی کباڑی کے توسط سے فٹ پات کی زینت بننے سے محفوظ رہے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی ایسی لائبریری کو یہ کتابیں عطیہ کروں جو انہیں میرے ہی نام سے علیحدہ محفوظ کرلے یعنی میرے نام کا گوشہ قائم ہوجائے۔ وفاقی جامعہ اردو کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر اقبال سے میرے مراسم تو پرانے تھے ،ملتان سے تعلق رکھنے والے میرے دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کراچی آئے تو ان کے توسط سے ڈاکٹر ظفر اقبال میرے اور زیادہ قریب آگئے۔ جامعہ اردو کی

لائبریری 'مولوی ڈاکٹر عبد الحق میموریل لائبریری' میں اہل علم کے ذاتی ذخیرے رکھنے کی روایت ہے کئی گوشے قائم ہیں۔ میں نے مناسب جانا کہ اپنی ذاتی لائبریری بابائے اردو کے نام سے موسوم اس لائبریری کو عطیہ کردوں۔ یہ میرے گھر سے قریب بھی ہے میری پہنچ میں بھی رہے گی۔ اس کے لائبریرین مختار اشرف میرے ایم اے کے ساتھی اور دوست ہیں انہوں نے اس سلسلے میں میری رہنمائی کی اور میں نے اپنی ذاتی لائبریری جامعہ اردو کے کتب خانے کو عطیہ کردی ، جہاں پر 'گوشہ ڈاکٹر رئیس صمدانی کے تحت میری کتابیں محفوظ ہوچکی ہیں ۔اس سے قبل میں چند سو کتب 'ناصر عارف' حسین میموریل لائبریری' کراچی اور اپنے مرحوم دوست ڈاکٹر یوسف میمن کو ان کی لائبریری 'یوسف لائبریری' میرپور خاص کو عطیہ کرچکا

تھا۔ ان کتب خانوں میں میرے نام کا گوشہ تو نہیں لیکن کتب کو اپنے ذخیرے میں سلیقے سے شامل کر لیا۔ 'ناصر عارف حسین میموریل لائبریری' میں ایک بورڈ لگایا گیا ہے جس پر کتب عطیہ کرنے والوں کے نام درج ہیں راقم کا نام بھی اس بورڈ پر درج ہے۔ڈاکٹر یوسف میمن اللہ کو پیارے ہو چکے، نہیں معلوم وہ لائبریری اب کس حال میں ہے۔ چند دن قبل برادر سرور صمدانی کا فون آیا اور انہوں نے مجھ سے 'اٹھو مسلم پاکستان بچا' پر کچھ لکھنے کو کہا اور مجھے یاد دلایا کہ انہوں نے کتاب کی ایک کاپی مجھے بھیجی تھی۔ ان کی بات درست تھی، میں نے ان سے وعدہ کر لیا، اب فکر ہوئی کہ یہ کتاب کس لائبریری سے ملے گی۔ لکھنا تو بعد کی بات تھی سر دست کتاب کی تلاش کا مرحلہ شروع ہوگیا، پہلی فرصت میں جامعہ اردو گیا اور وہاں اپنے گوشے میں یہ کتاب تلاش کی، موجود نہیں تھی، اب میں نے 'ناصر عارف حسین میموریل لائبریری' کا رخ کیا جہاں پر یہ کتاب میرا انتظار کر رہی تھی۔ سوانحی ادب اور آپ بیتیوں کے ساتھ صاف ستھری رکھی ہوئی مل گئی، دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی اور اپنے اس فیصلے پر اطمینان بھی ہوا کہ میں نے جو کتب برسوں کی جدو جہد کے بعد جمع کی تھیں اب صرف میرے ہی کام نہیں آرہیں بلکہ ان سے ہر خاص و عام کو علمی فیض پہنچ رہا ہے۔

ملتان، بزرگوں، اولیاء کی سرزمین سے میرا تعلق بہت گہرا ہے وہ اس طرح کہ

قیام پاکستان کے چند ماہ بعد دنیا میں میری آمد ملتان کے قریب تحصیل میلسی میں ہوئی۔ یہ شہر اُس وقت ضلع ملتان کا حصہ تھا۔ اس ناطے سے مجھے ملتان کی مٹی سے جذباتی لگاؤ اور عشق ہے، اس کی مٹی میں ابدی نیند سوئے ہوئے بزرگوں سے محبت اور عقیدت ہے، اس کی مٹی میں میرے اپنے خاندان کی بے شمار محترم ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں ۔اس لیے جب بھی ملتان کے حوالے سے کوئی بات ہوتی ہے تو میرا دل اس جانب خود بہ خود کھچا چلا جاتا ہے۔ تابشؔ صمدانی جو ملتان کے نامی گرامی نعت گو شاعر تھے ان سے میرے خاندانی مراسم و تعلق تو تھا ہی، ان سے میرا روحانی طور پر عقیدت و احترام کا تعلق بھی تھا۔ سرور صمدانی اور رہبر صمدانی تابشؔ صمدانی کے صاحبزادگان ہیں اور انہیں کہ نقش قدم پر رواں دواں بھی ہیں ، یہ بھی مجھے عزیز ہیں۔ ان دونوں کے چچا جو عمر میں مجھ سے چھوٹے لیکن میرے بھی چچا ہیں اپنے نام کی طرح حسین ہیں ملتان ہی کے باسی ہیں ۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی ، تونسہ شریف سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب ان کا قیام ملتان ہی میں ہے۔ ڈاکٹر تونسوی سے میرا تعلق اور دوستی کی پینگیں اس وقت بڑھیں جب وہ اور میں سرگودھا یونیورسٹی کے ٹیچرس ہاسٹل میں آمنے سامنے کمروں میں رہائش پذیر تھے، ساتھ ناشتہ، ساتھ کھانہ، گرمیوں کی شامیں باہر کھلی فضاء میں اور سردیوں کی سرد شامیں میرے کمرے میں گزرا کرتی تھیں۔ڈاکٹر خالد ندیم اور طارق کلیم کو یاد نہ کرنا زیادتی ہوگی، کیا حسین دن تھے جب یاد آتے ہیں تو یادوں کی بارات چھم چھم

کرتی چلی آتی ہے۔ میلسی کے حوالے سے میرا ایک شعر پھر اصل موضوع کی جانب دوبارہ آتا ہوں۔

میلسی ہے ایک شہر پانچ دریاؤں کی سرزمین پر
میں ہوں رئیسؔ اُسی آسماں کا ایک ستارہ

اُٹھ مُسلم پاکستان بچا کے مصنف مولوی فرقان احمد انصاری کا تعلق ہندوستان کے شہر سہارنپور سے تھا۔ جب تک ہندوستان میں رہے علیگڑھ اور مسلم یونیورسٹی کو اپنے اوپر اوڑھے رکھا، ان کی زندگی کا مہور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ تھی، یونیورسٹی میں اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں انہیں یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین اعزاز 'خادم' سے بھی نوازا گیا، قائد اعظم کے کہنے پر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن قائم کی، کالج یونین آفس سے کانگریس کا جھنڈا اتار کر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا، علیگڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی، مسلم لیگ سہارنپور کے سیکریٹری اور مسلم لیگ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے صدر بھی رہے۔ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو اس کے ہراول دستہ بن گئے۔ پاکستان قائم ہوا تو فرقان انصاری جیسا مسلم لیگی، جس کی رگوں میں پاکستان سے محبت اور عقیدت کا خون گردش کر رہا تھا بھلا کیسے ہندوستان میں رہ سکتا تھا، وہ پاکستان تشریف لے آئے حالانکہ ان کے گھر کے احباب ان کے ہمراہ پاکستان نہیں آئے۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد انہوں نے

بھارت کی سرزمین کو اپنے لیے مناسب نہ جانا اور پاکستان آ گئے ملتان کی سرزمین کو اپنا مسکن بنایا۔ انہوں نے 1960 تک ملازمت کی اور پھر ریٹائر ہو گئے اور ملتان میں وکالت کا آغاز کیا، ملتان میں علیگڑھ اولڈ بوائز ایسو سی ایشن کی سرگرمیوں میں شریک رہے اور مختلف عہدوں پر فائز بھی۔ وہ ملتان کے نامور وکیل اور محترم شخصیات میں گردانے جاتے تھے۔ 29 مئی 1997ء کو 81 سال کی عمر میں رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لیے ملتان کی مٹی کے ہو رہے۔

ہر پڑھے لکھے شخص کی طرح فرقان انصاری نے بھی اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو اپنی ذات تک محدود رکھنا پسند نہیں کیا بلکہ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور اس دور کی تاریخ کو آئندہ نسلوں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی آپ بیتی تحریر کی جو درحقیقت فرقاب انصاری کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ یہ بقول مخدوم شاہ محمود قریشی 'یہ کتاب ایک تاریخ ہے مسلمانان ہند کے اقتدار کے خاتمے کے بعد کی، تقسیم ہند سے پہلے اور دوران تقسیم اور اس کے بعد کے حالات کی۔ اس میں ظلم و ستم کی داستان ہے جو ہندو اور انگریز نے ہندوستان میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا، تحریک پاکستان اس کا اہم موضوع ہے'۔

فرقان انصاری صاحب کی یادگار داستان کو ان کے صاحبزادے مولوی محمد سلطان عالم

انصاری نے مہارت سے مرتب کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ’’یہ آپ بیتی ہے ایک ایسے شخص کی جس نے ان زمانوں کا ذاتی طور پر مشاہدہ کیا اور ان تحاریک میں حصہ بھی لیا۔ اس میں اگر ایک جانب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرز زندگی ، نظامِ تعلیم اور کردار سازی کا ذکر ہے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تحریک پاکستان کی نشان دہی ہے تو دوسری جانب یہ نظریہ پاکستان ’دو قومی نظریہ‘ جو کہ بلاآخر بنیاد پاکستان بنا‘ کے عوامل آشکار کرتی ہے۔اس میں اندیشوں کا بھی برملا اظہار ہے جو انھوں نے اہل اقتدار کی روش دیکھ محسوس کیے اور ان پر قابو پانے کا طریق بھی تجویز کیا‘‘۔ صہبا اختر نے کتاب اور اس کے مصنف کی اہمیت کو اپنی نظم ’’کتابیں‘‘میں کس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ۔

کتابوں کا افسوں نہیں ٹوٹتا
کبھی ان کا سورج نہیں ڈوبتا
مبارک ہیں وہ ہاتھ اور قلم
جو کرتے ہیں زندہ کتابیں رقم
کتابوں میں جس نے اضافہ کیا
سرِ طاق فن اِک دیا رکھ دیا

یہ حقیقت ہے کہ کتابوں کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا مولوی فرقان احمد انصاری نے اپنی آپ بیتی خوبصورت انداز سے لکھنے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سجادہ نشین درگاہ حضرت بہاء الدین زکریہ ملتانی اور سابق گورنر پنجاب مخدوم محمد سجاد حسین قریشی نے اپنے مضمون 'میرے دوست..... میرے ساتھی' کے عنوان سے فرقان انصاری کو خوبصورت الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ" مولوی صاحب موصوف سے میری شناسائی برسوں پرانی تھی۔ وہ صاف ستھرے اور تعمیری ذہن کے با اصول آدمی تھے۔ بڑے ملنسار، بذلہ سنج، خوش پوش اور کھری کھری باتیں کرنے والے آدمی، انھیں سیاسی اور سماجی میدانوں میں یکساں ملکہ حاصل تھا۔ سہارنپور کے اس خاندان نے بہت جلد اپنی صلاحیتوں، اخلاق اور ملنساری کے بل پر ملتان میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی فرقان احمد انصاری مسلم لیگ کے ہراول دستے کے با صلاحیت اور کہنہ مشق سپاہی تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے سلسلے میں جان توڑ کر کام کیا تھا۔ وہ سراپا ایک ایسی تحریک تھے جس کی لو بادِ مخالف سے کبھی ماند نہ پڑ سکی اور اس کی روشنی ہر سو پھیلتی رہی"۔ کتاب کی ایک خاص بات سہارنپور کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے کے علاوہ دیوبند کے شہرۂ آفاق علماء کرام جن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد قاسمیؒ، حضرت مولانا حافظ محمد یٰسین دیوبندیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا شبیر علی تھانویؒ، حضرت

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور دیگر مقتدر علماء شامل ہیں کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے جو کتاب کو زیادہ پر لطف ، معلوماتی اور متبرک بناتا ہے۔ ان کے علاوہ سر سید احمد خان علی گڑھ اور علیگڑھ یونیورسٹی کا تفصیلی ذکر ہے۔ اخباری تراشوں کے حوالے سے ، معلومات اچھے انداز سے سامنے آتی ہیں۔ تصاویر نے کتاب کے حسن میں اضافہ کیا ہے، ایک حصہ تاثرات پر مشتمل ہے ۔ ڈاکٹر اسد اریب، بیگم شامی سلطان ، صاحبزادہ فاروق علی خان ، ملک محمد رفیق رجوانہ کے علاوہ مولوی فرقان احمد انصاری کے لیے سرور صدانی کے نظمیہ احساسات بھی شامل ہیں۔ ہر اعتبار سے کتاب اپنے قاری کو دوران مطالعہ بور ہونے نہیں دیتی۔ اچھی اور معلومات سے بھرپر تصنیف ہے۔ سرور صدانی کے

چند اشعار پر

اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

اک مجاہد تو بھی تحریک پاکستان کا
عمر بھر فرمانِ قائدؒ پر عمل پیرا رہا
ملتِ اسلامیہ کا تو رہا ہے غمگسار
بالیقین تو قائدؒ اعظم کا پیرو کار تھا
مدتوں محسوس ہوگی تیری فرقت کی کمی
شکر ہے لازم ! کوئی جس حال میں جیسا رہے
مالکِ ارض و سما سے اپنی سرورؔ ہے دعا

رحمتوں کا تیری مرقد پر سدا سایہ رہے

بنتِ حوا کے تحفظ کا بل 2015

پنجاب اسمبلی نے ’خواتین کے تحفظ کا بل 2015‘ منظور کرکے خواتین پر تشدد، بد کلامی، مارپیٹ، معاشی استحصال، جذباتی اور نفسیاتی تشدد نیز سائبر کرائمز جیسے گھناؤنے کرائم کی روک تھام کی عملی کوشش شروع کردی۔ بل میں خواتین کے تحفظ کے لیے شیلٹر ہوم، شکایات کے ازالے کے لیے ٹال فری نمبر قائم کیا جائے گا، جب کہ تحقیقات کے لیے ڈسٹرکٹ پروٹیکشن کمیٹی قائم کی جائے گی، پروٹیکشن آفیسر شکایت ملنے کے بعد متعلقہ شخص کو مطلع کرنے کا پابند ہوگا، بل کے تحت پروٹیکشن آفیسر سے مزاحمت کرنے پر چھ ماہ تک کی سزا اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ جب کہ شکایت یا اطلاع کرنے پر تین ماہ کی سزا اور پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے تک جرمانہ کیا جاسکے گا، غلط شکایت کی صورت میں خاتون کو تین ماہ قید اور پچاس ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی، متاثرہ خاتون کو گھر سے بیدخل نہیں کیا جاسکے گا، اخراجات بھی مرد اٹھائے گا، نان نفقہ ادا کرنے سے انکار پر عدالت تشدد کے مرتکب مرد کی تنخواہ سے کٹوتی کرکے ادا کرسکے گی، بل میں یہ بھی درج ہے کہ خواتین پر تشدد کرنے والے مرد کو دو دن کے لیے گھر نکالا کردیا جائے گا، تشدد کرنے والے مردوں کو جی پی ایس ٹریکر سسٹم کی تنصیب کو عدالت کے حکم سے مشروط کیا گیا ہے، جی پی ایس ٹریکر سسٹم والے کڑے (شناختی

کڑے) کو بازو سے اتارنے پر ایک سال قید اور پچاس ہزار سے دو لاکھ روپے تک جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے. بل میں یہ بھی شامل ہے کہ تشدد کے مرتکب مردوں کو اسلحہ خریدنے اور اسلحہ لائسنس حاصل کرنے سے روکا جاسکے گا.ان کے پاس موجود اسلحے کو بھی عدالت میں جمع کرانے کی ہدایت کی جاسکے گی۔اس بل کے تحت پنجاب بھر میں متاثرہ خواتین کے لیے شیلٹر ہومز بنائے جائیں گے جب کہ شیلٹر ہومز میں متاثرہ خواتین اور ان کے بچوں کو بورڈنگ اور لاجنگ کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی، مصالحت کے لیے بھی سینٹرز قائم کیے جائیں گے۔تشدد کی تفصیل کا ایک ڈیٹا بیس بھی مرتب کرنے کی بات اس بل میں کی گئی ہے جو کہ جدید ٹیکنالوجی کو اپنانے کی جناب ایک مثبت قدم ہے۔

بل میں بنتِ حوا کو ظالم مردوں سے بچانے اور انہیں تحفظ دینے کی بہت اچھی باتیں ہیں۔کاش ، کاش اور کاش ان باتوں پر عمل درآمد کرانے والے بل پر اس کی اصل روح کے مطابق عمل درآمد بھی کرا سکیں۔ خواتین کو تشدد سے بچانے کے لیے یہ کوئی پہلا قدم نہیں ، اس سے پہلے بھی اس قسم کے اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ حقوق نسواں کے حوالے سے کام کرنے والی این جی اوز حکومتوں کی توجہ اس جانب متوجہ کراتی رہی ہیں۔ ماضی میں ملازم پیشہ خواتین کو کام کرنے کی جگہوں پر مختلف طریقوں سے ہراساں کیے جانے کے خلاف اور بنتِ حوا کو جنسی طور پر ہراساں کیے جانے سے محفوظ رکھنے کا ایکٹ 2010 میں منظور کیا گیا تھا۔ اس

قانون نے کام کرنے کی جگہوں، بشمول پولیس اسٹیشن، حوالات، جیلوں، اسکولوں، جامعات اور پبلک مقامات کو بنتِ حوا کے لیے محفوظ بنایا۔ اس ضابطہ اخلاق کا مقصد کارکن خواتین کو ایک ایسا بہ عزت ماحول فراہم کرنا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ تصور کرسکیں۔ اس قانون پر کس قدر عمل ہوا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اس ضابطہ اخلاق کو قانون پر عمل درآمد کرانے والوں نے تفریحی مقامات پر لوگوں سے نکاح نامے طلب کیے جس سے یہ ضابطہ بہتری لانے کے بجائے پولیس کے لیے ناجائز آمدنی کا ذریعہ بنا۔ ایسا نہیں کہ اس قانون سے کچھ بہتری نہیں آئی، کچھ نہ کچھ اچھے اقدامات بھی ہوئے جیسے پشاور اور اسلام آباد میں لیگل سینٹر بنائے گئے اور دیگر اقدامات بھی ہوئے۔ اس ایکٹ کے علاوہ مختلف حکومتیں بنتِ حوا پر تشدد کی روک تھام کے لیے قانونی اقدامات بھی کرتی رہی ہیں۔ ان میں عورت مخالف رسم و رواج کے خاتمے کا قانون، عورتوں پر تیزاب پھینکنے کی روک تھام کا قانون، نیشنل کمیشن آن اسٹیٹس آف ویمن کو بااختیار بنانے کا قانون، قیدی عورتوں کی فلاح کا قانون جیسے قوانین ماضی میں منظور کیے جاتے رہے ہیں۔ کسی بھی چیز میں بہتری لانے میں دو عوامل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ان میں سے ایک قانون سازی اور دوسرا جو سب اہم ہے وہ اس قانون پر عمل درآمد۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ہم زبانی جمع خرچ خوب کرنا جانتے ہیں، بلند بانگ دعوے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن جب عمل کرنے کی بات آتی ہے تو وہاں ہماری کارکردگی صفر

ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمارا پہلا قدم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کونسا ایسا جرم ہے جس کے لیے قانون موجود نہیں ، کیا چوری کرنے کی سزا نہیں، قتل کی سزا موجود نہیں ، کسی کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی سزا موجود نہیں، بنتِ حوا کے ساتھ زیادتی کرنے کی سزا موجود نہیں اس کے باوجود قتل ہو رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، اسٹریٹ کرائم جاری ہیں، خواتین پر تشدد ہو رہا ہے، جائیدادوں پر قبضے ہو رہے ہیں، لوٹ مار کا بازار گرم ہے اس کی وجہ صرف اور صرف قوانین پر عمل درآمد کا نا ہونا ہے۔ جرم کا ارتکاب کرنے والے کو یہ اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ معاملا پولیس اور پھر عدالت میں جائے گا، اگر پولیس سے مک مکا نہ ہو سکا تو عدالت میں معاملا اس قدر طول پکڑے گا کہ دادا مقدمہ کرے گا اور پوتا اس کا فیصلہ سنے گا۔

خواتین پر تشدد کو روکنے کے لیے دنیا کے ہر ملک میں قوانین موجود ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہاں قانون کے ساتھ ساتھ اس پر سختی کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے۔ سعودی عرب میں گاڑی چلانے والا یا ٹیکسی ڈرائیور ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی صرف اس وجہ سے نہیں کرتا کہ اسے معلوم کہ اس کا جرم قانون سے چھپ نہیں سکے گا اور اسے اپنے جرم کی سزا ہر صورت میں بھگتنا پڑے گی۔ یہی ڈر اور خوف اسے جرم سے روکے رکھتا ہے۔ ہم اس خوف سے بالکل آزاد ہیں ، ہمارے ذہنوں میں صرف یہ ہوتا ہے کہ جو جرم سرزد ہوا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے

کون کون سے طریقے رائج ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جرم کرنے میں کوئی ڈر و خوف حائل نہیں ہوتا۔ ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کی حالیہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال یعنی 2015 میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی 3265 خواتین معاشرے کی بے حسی کی بھینٹ چڑ ہیں۔ بیرون دنیا کے اخبارات میں یہ تعداد 5401 رپورٹ کی گئی۔ واقعات کی نوعیت اغوا، تیزاب پھینکنے، زنا بالجبر اور جنسی تشدد کے واقعات تھے۔ عورت فاؤنڈیشن کی رپورٹ ہے کہ سب سے زیادہ عورت پر تشدد کے واقعات پشاور میں ہوئے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے وہ شہر جہاں عورت پر تشدد کے واقعات سب سے زیادہ ہوتے ہیں ان میں لاہور، سرگودھا، اوکاڑہ، ڈی جی خان، پاکپتن، ساہیوال، میر پورخاص، شکار پور اور گھوٹکی شامل ہے۔ عورت فاؤنڈیشن نے عورتوں پر تشدد کے جو اعداد و شمار شائع کیے وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لیے کافی ہیں۔ 1086 بنتِ حوا اغوا ہوئیں، 792 بنتِ حوا قتل کی گئیں، 435 بنتِ حوا جنسی زیادتی کا شکار ہوئیں، 379 بنتِ حوا نے خود کشی کی، 346 بنتِ حوا غیرت کے نام پر قتل ہوئیں، 298 بنتِ حوا پر گھریلو تشدد کیا گیا، 50 کا جنسی استحصال ہوا، 46 کے چہرے تیزاب سے بگاڑ دیے گئے، 32 بنتِ حوا ایسی تھیں کہ جن کو زندہ جلا دیا گیا اور 1160 بنتِ حوا دیگر تشدد کا شکار ہوئیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان میں 70 سے 90 فیصد خواتین کسی نہ کسی قسم کے گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ غالباً اس تعداد میں وہ خواتین بھی شامل ہیں جنہیں ان کے شوہر کسی بھی معمولی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کر دیتے ہیں وہ

بھی گھریلو تشدد کی ایک صورت بنا لی گئی۔

بنتِ حوا پر تشدد کی وجوہات مختلف ہیں حالانکہ اسے تو کائینات کا حسین تحفہ کہا گیا ہے، انسانوں کے باپ حضرت آدمؑ نے اماں حوا کو اللہ تبارک و تعالیٰ سے فریاد کر کے مانگا تھا۔ اگر حوا نہ ہوتیں تو یہ کائینات کیسے پھلتی اور پھیلتی۔ حوا کا وجود نسل انسانی کے پھلنے پھولنے کا باعث ہے۔ کلام مجید کی سورۃ النساء اولین آیت میں کہا گیا ہے کہ " اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلائیں"۔ اماں حوا کی پیدائش کے بارے میں قرآن مجید کی سورۃ النساء کی اولین آیت میں لفظ "نفس" استعمال کیا گیا ہے جس معنی 'نفس، جاندار، روح، شخص، پسلی، ہڈی کے لیے گئے ہیں، صحیح بخاری کی حدیث جس کے راوی حضرت ابو حریرہ ہیں۔ آنحضرت محمد ﷺ نے فرمایا "میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ عورتوں کا خیال رکھو، کیوں کہ انہیں بنایا گیا ہے ہڈی (پسلی) سے، اور پسلی کے سب سے خم دار حصہ جو اس کے اوپر کا حصہ ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے، یہ ٹوٹ جائے گی، اگر اسے چھوڑ دوگے، یہ بدستور غم دار رہے گی۔ اس وجہ سے میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ عورتوں کا خیال رکھنا"۔ بنتِ حوا کے بغیر زندگی ادھوری اور ویران کے مترادف ہے، اسلام خواتین کے تحفظ کا ضامن ہے تو پھر ہمیں کسی دنیاوی قانون کی کیا

ضرورت لیکن ہمارے سماجی رویے اور ہماری خاندانی روایات نے مرد کو عورت پر تشدد پر اکسایا۔ اس میں بڑی وجہ تعلیم کا عام نہ ہونا اور جہالت ہے جس نے معاشرہ میں عورت کو محض ایک لونڈی، غلام، نوکرانی سمجھ لیا ہے۔ عورت پر تشدد کا ریشو نکالا جائے تو ان علاقوں میں بہت زیادہ ہے جہاں تعلیم کی کمی ہے، جہالت ہے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ سنجیدگی سے ملک میں تعلیم کو عام کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔ تعلیم عام ہوگی تو بے شمار مسائل اور مشکلات خود بخود حل ہوجائیں گے۔ ان میں سے ایک بنتِ حوا پر تشدد بھی شامل ہے۔ حکومت نے بل تو منظور کر لیا اب ضرورت ہے کہ اس بل پر سختی سے عمل درآمد بھی کیا جائے۔ عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں یہ بل بھی دیگر قوانین کی مانند فائلوں اور کتابوں کی زینت بن کر رہ جائے گا۔

مردم شماری۔ موخر کیوں؟

پاکستان میں ہونے والی چھٹی مردم شماری موخر کردی گئی۔ حکومتِ وقت نے ایک سال قبل الیکشن کمیشن کی شفارش پر مارچ 2016 میں مردم شماری کرانے کا اعلان کیا تھا۔ الیکشن کمیشن نے بلدیاتی انتخابات سے قبل 7 نومبر 2014 کو حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ بلدیاتی انتخابات سے قبل ملک میں مردم شماری کرالی جائے لیکن حکومت کو تو بلدیاتی انتخابات کرانا بالِ جان نظر آرہا تھا وہ بھلا مردم شماری کا کس طرح سوچ سکتے تھے۔ آخرکار حکوت کو اعلان کرنا پڑا کہ مردم شماری مارچ میں کرائی جائے گی لیکن جیسے جیسے مارچ قریب آرہا تھا مردم شماری کے حوالے سے سیاسی پنڈتوں کے بیانات جس قسم کی آرہے تھے ،ان سے یہی بو آرہی تھی کہ مردم دشماری موخر ہوجائے گی۔ وجوہات بے شمار، ان سب میں اہم مفادات ہیں ، وہ مفادات مختلف نوعیت کے ہیں اس لیے کہ مردم شماری بہت سے مسائل سے پردہ چاک کردیتی ہے، ملکی ترقی کے لیے حقیقی اعداد و شمار سامنے لے آتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے سرمایہ دار، جاگیردار، وڈیرے ، سیاسی پنڈت یہ نہیں چاہتے کہ مردم شماری کی بنیاد پر ملک میں منصوبہ بندی ہو۔ سردست چھٹی مردم شماری جس کی ابتدائی تیاریاں مکمل بھی کی جاچکی تھیں ، وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کی صدارت میں منگل 29 فروری کو ہونے والے مشترکہ مفادات کونسل کے

اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ سیکورٹی آپریشنز کی وجہ سے مردم شماری کے عمل کو سردست موخر کر دیا جائے۔ اس اجلاس کے فیصلے میں کہا گیا ہے کہ تمام صوبوں کی مشاورت سے سیکورٹی فورسیز کی پہلے سے طے شدہ مصروفیات اور جاری آپریشن کے باعث مردم شماری کا عمل ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مردم شماری کے نئے شیڈول اعلان اسٹیک ہولڈرز شراکت داروں) کی مشاورت کے بعد کیا جائے گا۔ مردم شماری کے لیے ملک میں ایک) لاکھ نفری کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بھی نہیں۔

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہماری فورسیز اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق کافی عرصے سے مصروف ہیں۔ سرحدوں کی حفاظت اور دشمن سے ہمہ وقت چوکنا رہنے کے علاوہ ملک کے اندر ہونے والی دہشت گردی جیسے موزی مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کی رات دن کوشش کر رہی ہیں۔ یہ فورسیز ہی تو ہیں کہ جب بھی کوئی مشکل گھڑی ہوتی ہے یا آفت آن پڑے تو فوری طور پر ہر ایک کی نظر فورسیز کی جانب جاتی ہے، سیلاب ہو، زلزلہ ہو، انتخابات ہوں یا پھر مردم شماری یا خانہ شماری حتیٰ کہ اب تو پولیوں کے قطرے پلانے کے لیے بھی فورسیز کا سہارا لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی نہیں حکومت وقت سے مخالف سیاست دانوں کو اختلاف انتہا کو پہنچ جائے تو حکومت مخالف قوتیں تیسرے ایمپائر کی جانب دیکھنے لگتی ہیں۔ ہر مشکل اور پریشانی

کا حل فورسیز ہی میں نظر آتا ہے۔ مردم شماری جیسا کام بہت ہی اہم اور نازک ہوتا ہے۔اس عمل سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہماری آبادی کتنی ہوچکی ہے، ان میں مرد، عورتیں اور بچے کتنے ہیں اور پھر ان کی تعداد کے اعتبار سے ان کی ضروریات کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں کا تعین کیا جاتا ہے، لحہ موجود میں تو مردم شماری موخر کرنے کا جواز بڑی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن ماضی میں حکمرانوں اور سیاسی پنڈتوں نے مردم شماری کبھی وقت پر نہیں ہونے دی، کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ اور عذر پیش کرکے اس عمل کو ہمیشہ پیچھے دھکیلا گیا۔ اس حوالے سے تاریخ کو دھرانا نہیں چاہیے۔ نواز شریف صاحب اپنے سابقہ دورِ حکمرانی میں مردم شماری کرانے کا کریڈٹ لے چکے ہیں ۔ امید ہے کہ وہ اس دور میں بھی مردم شماری کرا کے کریڈٹ اپنے نام کرانے میں کامیاب ہوں گے۔

پاکستان میں مردم شماری کی تاریخ 1951 سے شروع ہوتی ہے یعنی اولین مردم شماری میں ہوئی تھی جس سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہماری آبادی ساڑھے سات کروڑ1951 ہے۔ اس لیاقت علی خان وزیر اعظم تھے لیکن انہیں 16 اکتوبر1951 کو شہید کر دیا گیا تھا اور ان کی خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے۔ وقت مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش ہے پاکستان کا حصہ تھا اس لیے اس خطہ کے لوگوں کی تعداد بھی اس میں شامل تھی۔ اس وقت یہ طے ہوا تھا کہ اب

ہر دس سال بعد مردم شماری ہوا کرے گی۔ تاکہ حکومت اسی اعتبار سے عوام کی ضرریات کی منصوبہ بندی کرے۔ پہلا اور آخری موقع تھا کہ پورے دس سال بعد دوسری مردم شماری 1961 میں ہوئی۔ اب ہماری آبادی نو کروڑ سے تجاوز کر چکی تھی۔ یہ دور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا تھا۔ اس مردم شماری میں بھی مشرقی پاکستان ہمارے ساتھ تھا۔ اب تیسری مردم شماری طے شدہ شیڈول کے مطابق 1971 میں ہونی چاہیے تھی لیکن یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ہمسایہ دشمن ملک نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے حالات پیدا کیے ہوئے تھے ، جنگ کی صورت حال کے باعث یہ مردم شماری ایک سال آگے کرنا پڑی اور تیسری مردم شماری 1972 میں ہوئی۔ اس وقت ذو الفقار علی بھٹو ملک کے حکمران تھے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا چنانچہ ہم آبادی کے اعتبار سے ساڑھے چھ کروڑ رہ گئے۔ 1981 میں چوتھی مردی شماری وقت مقررہ پر ہوئی اس وقت آبادی تقریباً نو کروڑ کے قریب تھی یعنی 7820000 ، یہ دور جنرل ضیاء لحق کا تھا۔ پانچویں مردم شماری کو جسے 1991 میں ہونا تھا مختلف حیلے بہانوں سے آگے بڑھایا گیا اور وہ 1998 میں ہوئی اس وقت پاکستان کی آبادی بڑھ کر 13 کروڑ لاکھ ہوچکی تھی۔ اس وقت میاں نواز شریف وزیر اعظم تھے۔ اب چھٹی مردم 23 شماری کی طے شدہ مدت کب کی پیچھے جاچکی اب بھی اس کے اہتمام میں رکاوٹیں ہیں۔ دس کے بجائے 18 سال ہو چکے ہیں لیکن مردم شماری ہے کہ ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ ہر حکومت اسے اپنے لیے بیالِ جان تصور کرتی ہے اس لیے کہ جب آبادی کی صحیح تصویر

سامنے آجائے گی تو اس کے مطابق اقدامات بھی تو کرنا پڑیں گے۔ بدقسمتی سے ہم لاتوں کے بھوت ہوچکے ہیں، جب تک ہمارے سر پر کوئی ڈنڈا نہیں ہوتا ہم کام نہیں کرتے۔

اب بلدیاتی انتخابات کی مثال ہمارے سامنے ہے اگر اعلیٰ عدلیہ اپنا ڈنڈا نہ چلاتی تو یہ انتخابات ہوسکتے تھے؟ عدلیہ کے فیصلے کے باوجود ہر صوبائی اور مرکزی حکومت کس قدر لَیت و لَعل اور ٹال مٹول سے کام لیتے رہی ہیں۔ آخر مجبور ہو کر گھٹنے ٹیکنے پڑے اب انتخابات ہوگئے تو اس مشینری کو کام شروع کرنے میں اور اختیارات دینے میں کس قدر پَش و پیش اور سوچ بچار سے کام لیا جارہا ہے۔ بعض کا تو خیال ہے کہ مردم شماری کے لیے بھی اعلیٰ عدالت ہی اپنا ڈنڈا گھمائے گی تو کام ہوگا۔

ایک سروے کے مطابق پاکستان میں ہر سال 45 لاکھ سے 50 لاکھ لوگوں کا اضافہ ہوتا ہے، جولائی 2014ء کا سروے کہتا ہے کہ پاکستان کی کل آبادی 19 کروڑ اور 35 لاکھ ہوچکی ہے اس اعتبار سے دسمبر 2015 میں پاکستان کی آبادی 20 کروڑ کو چھو رہی ہوگی۔ مردم شماری کے لیے ایک ادارہ علیحدہ سے موجود ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہر دس سال بعد اس ذمہ داری کو انجام دے۔ پولیس یا فوج تو کام میں بیرونی مداخلت کو روکنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں، اصل کام تو اس ادارے کا ہے کہ اس نے اس اہم کام کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی ہے۔ منصوبہ سازوں کو دنیا کے وہ ملک نظر نہیں آتے جہاں طے شدہ شیڈول کے مطابق مردم

شماری ہوتی ہے ، ہمسایہ بھارت ہی کی مثال لے لیں وہاں شیڈول کے مطابق مردم شماری ہوتی چلی آرہی ہے اور پھر نئے اعداد وشمار کے مطابق منصوبہ سازی کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں جو مسائل ہیں اور جو حل نہیں ہو رہے اس کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم بلاسوچے سمجھے ، تحقیق کیے بغیر منصوبے بنائے چلے جارہے ہیں۔ سارازور موٹر وے بنانے، جنگلا بس چلانے، گرین بس چلانے ، اورنج بس چلانے پر لگایا جارہا ہے۔ کیا پاکستان میں صرف لاہور، اسلام آباد اور کراچی ہی بڑے شہر ہیں ان کے علاوہ بھی بے شمار شہر ایسے ہیں جہاں کے مسائل انہی بڑے شہروں کی مانند ہیں انہیں کون حل کریگا۔ آبادی کتنی ہے ، ان کے لیے پانی، بجلی، اناج اور دیگر ضروریات کا انتظام ان کی تعداد کے اعتبار سے ہی تو کیا جائے گا۔ لمحۂ موجود کی حکومت کو تین سال ہونے کو ہیں اب خیال آیا گرین بس چلانے کا، سرکلر ریلوے کا منصوبہ عرصہ دراز سے سرد خانے کی نظر ہے ، کراچی میں پہلے بھی گرین بسیں چل چکی ہیں ان کا کیا انجام ہوا وہ اہل کراچی کو خوب معلوم ہے، گرین بس کی جگہ سرکلر ریلوے کو فعال کردیا جاتا تو وہ کراچی کے عوام کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔ کراچی سرکلر ریلوے کراچی کی ترقی اور عوام کی ٹرانسپورٹ کے مسئلے کا بنیادی حل ہے جو جاپان کی حکومت کے تعاون سے از سرِ نو شروع ہونے کے انتظار میں ہے۔ گرین بس منصوبے پر 16 ارب روپے لاگت کا تخمینہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گا کم نہیں ہوگا، اس منصوبے کی افادیت اپنی جگہ لیکن سرکلر ریلوے زیادہ اہم اور پائے دار حل

ہے۔ وفاق اور سندھ حکومت کراچی سرکلر ریلوے کے لیے جاپان کی حکومت کی وہ شرائط کو اہمیت نہیں دے رہی جس میں کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان ریلوے کی اس زمین پر کہ جہاں جہاں سے ریل کی پٹری گزرتی ہے غیر قانونی تجاوزات کو ہٹا دے، یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں، سندھ حکومت وفاق کے تعاون سے یہ کام بہ آسانی کر سکتی ہے۔ لیکن اس میں کیا راز پنہا ہے نہیں معلوم۔ دنیا کے تمام ممالک اپنے تمام تر مسائل اپنی آبادی کے اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر حل کرتے ہیں۔ اس کے بغیر مسائل کا دائمی حل ممکن نہیں۔ کو حکومت نے مردم شماری کا سال کہا ہے اس وقت موجودہ حالات کے پیش نظر 2016 مردم شماری موخر ضرور کر دی گئی ہے لیکن اس سال میں ابھی کئی ماہ باقی ہے، متعلقہ ادارے کو اس کی تیاری کی ہدایات کرتے ہوئے جیسے ہی حالات بہتر ہوں اور فورسیز اس کام کے لیے تیار ہوں مردم شماری کا انجام پا جانا ملک اور قوم کے مفاد میں ہوگا۔

کمال نے کوئی کمال نہیں کیا

سیاست تو دنیا میں ہر جگہ کمال کی ہے لیکن ہمارے ملک میں سیاست نے دنیا بھر کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ شاید سیاست نام ہی اپنے مفادات کے حصول کا ہے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں بغاوت کوئی نئی بات نہیں، مسلمان حاکموں کی تاریخ کے اوراق اس بات سے بھرے پڑے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو، بھائی نے بھائی کو اقتدار کی خاطر جیل میں ڈالا حتیٰ کے جان سے ہی مروادیا اور خود حکمراں بن بیٹھے۔ یہ سلسلہ منتقل ہوتے ہوتے موجودہ دور تک آن پہنچا ہے۔ بادشاہت ہوتی تو وہی کچھ ہورہا ہوتا لیکن جمہوریت میں صورت حال مختلف ہوتی ہے اس لیے سیاست مفادات کی ہو کر رہ گئی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں بغاوت کی تاریخ جو مجھے یاد ہے ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کے ساتھ مسلم لیگی کی حیثیت سے کی تھی۔ بہت ممکن ہے اس سے قبل بھی ایسا ہوا ہو لیکن اُس دور کی تاریخ مجھے یاد نہیں، ایوب خان کے مارشل لاء سے قبل بھی اقتدار کی خاطر اُکھاڑ بچھاڑ کی تاریخ موجود ہے، یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت کے کسی لیڈر نے جب بھی بغاوت کی اُسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ۔ سوائے بھٹو صاحب کے کہ جنہوں نے ملک کی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنا لوہا منوایا، حکمرانی کی اور عالمی طاقتوں پر بھی اپنا سکہ بٹھایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے

پاکستانی عوام کی بھاری اکثریت کے دلوں میں اپنے نام کی ایسی مہر ثبت کی کہ اس کے پھل سے پیپلز پارٹی آج بھی مستفیض ہو رہی ہے، جئے بھٹو نہ تو بے نظیر کے لیے ہے نہ آصف علی زرداری کے لیے اور نہ ہی بلاول کے لیے ، یہ صرف ذوالفقار علی بھٹو کے لیے ہی لگایا جاتا ہے، بے نظیر کی تو بات ہی کیا ہے وہ تو بھٹو کی بیٹی تھی اس لیے اس میں بھٹو کی خوبیاں اور صلاحیتوں کا ہونا قدرتی عمل تھا۔ اس کے بعد بھٹو کے نام پر زرداری صاحب نے بھی پانچ سال خوش اسلوبی سے گزارے۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں کئی باغیوں نے جنم لیا، مولانا کوثر نیازی نے بھی بغاوت کی اور پروگریسو پیپلز پارٹی بنائی، انجام صفر، ممتاز بھٹو نے بغاوت کی مختلف پارٹیاں بنائیں ،ان کے حصے میں کیا آیا؟ حنیف رامے مساوات پارٹی بنا کر باغی ٹھہرے حاصل کچھ نہ ہوا، غلام مصطفیٰ کھر بھی بے نظیر کو پارٹی سے الگ دیکھنے کی خواہش لیے رہے، غلام مصطفیٰ جتوئی نے نیشنل پیپلز پارٹی بنا کر کیا حاصل کیا، وہ وزیر اعظم اپنی سیاسی جماعت یا اپنی مقبولیت کی وجہ سے نہیں بنائے گئے ، ڈاکٹر صفدر عباسی اور ناہید خان بغاوت کا علم ہاتھ میں لیے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا بھی نہیں، مخدوم امین فہیم نے پارلیمنٹیرین بنائی وہ پیپلز پارٹی کا تسلسل ہی تھا، شیرپاؤ خیبر پختونخواہ تک محدود ہیں، مرزا جی یعنی ذوالفقار مرزا نے بھی اپنے پارٹی کے قائد کے خلاف کیا کچھ واویلا نہیں کیا، پھرتے ذلیل و خوار کوئی پوچھتا بھی نہیں والی کیفیت ہے۔ انہوں نے الطاف حسین اور متحدہ کے خلاف کیا کچھ الزامات

نہیں لگائے۔ آخر کار ٹھنڈے ہو گئے۔ پیپلز پارٹی میں شاید اور بھی باغی ہوں میرے ذہن میں نہیں۔

دوسری بڑی جماعت جس نے سب سے زیادہ باغی پیدا کیے مسلم لیگ ہے۔ قائد اعظم اور قائد ملت لیاقت علی خان کے بعد مسلم لیگ میں جیسے باغی پیدا کرنے کی فیکٹری لگ گئی ۔ تمام باغیوں کے نام گنوانا مشکل ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو سے مخدوم جاوید ہاشمی تک جنہوں نے خود کہا کہ ’ ہاں میں باغی ہوں‘ سارے باغیوں کا کیا حال ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ الگ پارٹی بنائی تو وہ محض تانگہ پارٹی تک محدود رہے۔ قائد اعظم مسلم لیگ پنجاب کی حکومت تک محدود رہی ، میاں نواز شریف کو کیوں کہ اقتدار میں شریک کر کے ضیاء الحق نے ان کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ جسے انہوں نے اور چھوٹے میاں صاحب نے عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے ملک کا اقتدار تیسری بار بھی حاصل کیا لیکن میاں برادارن کی مسلم لیگ کو بھٹو کے مقابلے میں ملک گیر سطح پر پذیرائی آج بھی حاصل نہیں ، وہ پنجاب کے کاندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرتے رہے۔ مسلم لیگ (ق) نون سے ٹوٹ کر بنی ، پھر مسلم لیگ (ق) سے بغاوت کرکے ماروی میمن ، شیخ وقاص حامد زاید اور دیگر دوبارہ نون لیگ میں شامل ہوئے، شیخ رشید کی پارٹی، اعجاز الحق کی، مسلم لیگ (ضیاء) تانگہ پارٹیاں ہی ہیں، جمعیت علمائے پاکستان جس کے سربراہ علامہ شاہ احمد نورانی تھے ان کے معتمد مولانا عبدالستار نیازی نے بغاوت کی اور

الگ گروپ قائم کیا، نیشنل عوامی پارٹی میں بھی گروپ ہوئے۔ دور کیا جانا اپنے کپتان کی تحریک انصاف میں بغاوت نہیں ہوئی، مخدوم جاوید ہاشمی کا کیا حال ہوا،ان کے خون میں لگتا ہے بغاوت رچی بسی ہے وہ تحریک انصاف میں شامل ہوئے اور دوبارہ باغی بنے ، حاصل کیا ہوا، چند دن میڈیا میں شہرت اس کے سوا کچھ نہیں ؟ جسٹس (ر) وجیہہ الدین احمد نے بھی بغاوت کا الم بلند کیا کپتان کے سامنے کچھ نہ چلی، آخر کار خاموش ہوئے۔ للو پنجو تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔

الطاف حسین کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کا سلسلہ رحمان ملک سے شروع ہوا تھا جب وہ ایف آئی اے کے ڈائیریکٹر تھے، بعد میں وہی الطاف حسین کے عاشق ہوئے،جب دیکھو لندن الطاف بھائی سے شرفِ ملاقات کے لیے دوڑے چلے جارہے ہیں۔ان کے بعد عمران خان صاحب نے فرمایا کہ میں لندن جارہا ہوں الطاف حسین کے خلاف ثبوتوں کا بریف کیس لے کر،دنیا سوچ رہی تھی کہ بس اب الطاف حسین کا کام تمام ہوا، کہاں گئے وہ ثبوت، ان کے بعد انہی کی جماعت کے ایک کارندے فیصل واڈا جن کے بارے میں سنائی ہے کہ کمال سے متاثر ہیں نے یہی کچھ ڈرامہ رچایا، لندن گئے، پر تماشا نہ ہوا، کیا ہوئے وہ ثبوت ، کیا ہوئے وہ دعوے؟ ذوالفقار مرزا بھی متحدہ کے خلاف ثبوتوں کا ڈرامہ کرتے رہے ، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا، فیصل واڈا کو چھوڑیں وہ تو ایک معمولی

کارکن ہی تو ہے عمران خان کو اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ وہ ایک قومی سطح کے لیڈر ہیں ، اس قسم کی سیاست سے فائدہ نہیں نقصان ہی ہوتا ہے۔ کیا ہوئے عمران خان کے دعوے، کیا ہوئے الطاف حسین کے بارے میں ثبوت، سب ہوا ہوگئے، سب کچھ عمران خان بھول گئے ۔ جب اپنی ضرورت پڑی تو متحدہ سے کراچی میں جلسے کے حوالے سے خاموشی اختیار کرنا پڑی، اس لیے کہ ضرورت تھی۔ یہ ہے ہمارے سیاست دانوں کی سیاست۔

لمحہ موجود میں کمال نے کوئی کماہ نہیں کیا،ان کی بغاوت کے بارے میں ہر خاص و عام ، پرنٹ میڈیا ہو یا برقی میڈیا سب کی ایک ہی رائے سامنے آئی ہے کہ نیا جال لائے پرانے کھلاڑی ، حالات اور واقعات کی ، الزامات کی جو تصویر کشی کی گئی اُسے دیکھ کر معمولی سیاسی شعور رکھنے والا بھی یہ کہہ رہا ہے کہ الزامات گزشتہ کئی دیہائیوں سے الطاف حسین اور متحدہ پر لگائے جاتے رہے ہیں لیکن انہیں ثابت آج تک نہیں کیا گیا۔ کیا میڈیا پر رنج والم ، سوگ ، ماتم ، ملال ، افسوس کی صورت بنالینے سے، ہچکیوں اور سسکیوں کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لینے سے ہمدردیاں حاصل ہو سکتی ہیں تو کمال میاں کے ہر دلعزیز سابق قائد آنسوں بہانے میں ، رونے میں رنج والم کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ یہ ھنر انہیں ان کے سابق قائد نے ہی سکھایا ہے،پریس کانفرنس میں انہوں نے رونا دھونا شروع کیا ایسا لگا کہ کمال کی

صورت میں الطاف حسین کی روح آ گئی ہے۔ مظلومیت کا جو نقشہ پیش کیا وہ واقعی اچھا تھا جسے سرکاری طور پر وزیر داخلہ صاف الفاظ میں ایک سے زیادہ بار رد کر چکے ۔ وزیر داخلہ اسی سیاسی جماعت کے کرتا دھرتا ہیں جس جماعت نے اپنے دورِ اقتدار میں اس سیاسی جماعت کا کڑا احتساب کیا تھا، یہ احتساب اب بھی ہو رہا ہے۔ احتساب تو پیپلز پارٹی نے بھی کیا، جنرل نصیر اللہ بابر کا احتساب کون بھول سکتا ہے، متحدہ کی منفی کارگزاری اپنی جگہ، الطاف حسین کی غلطیاں اور کوتاہیاں اپنی جگہ یہ جماعت اپنے پیدائش سے آج تک مسلسل باغیوں کو جنم دے رہی ہیں۔ یہ باغی عام طور پر اندر کے بھیدی ہی ہوتے ہیں اسی لیے تو لنکا ڈھاتے ہیں۔ الطاف حسین میں بے شمار خامیاں ہیں لیکن جتنے باغی ماضی میں جنم لے چکے اور جن کی پیدائش چند دن قبل ہوئی اور وہ جو آئندہ دنوں میں جنم لینے والے ہیں تمام کے تمام الطاف حسین کے انتہائی قریبی ،تربیت یافتہ ،پرورش کردہ، سکھائے ہوئے ، بنائے ہوئے، سنوارے ہوئے اور پالے ہوئے ہیں۔ ان سب نے اسی ہانڈی میں کھایا ہے جسے الطاف حسین اپنے ہاتھوں سے پکایا کرتے تھے۔ میں الطاف حسین کا طرفدار کبھی نہیں رہا اور نہ ہی متحدہ کا حامی لیکن سیاسی شعور اور سیاسی سوچ یہ بتا رہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے کہنے والا آزادی سے، دل سے یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ اس سے کہلوایا جارہا ہے بالکل اسی طرح جیسے ماضی میں کہلوایا گیا، کروایا گیا، لایا گیا، ٹرکوں میں بٹھا کر۔ فرق اتنا نظر آ رہا ہے اس مرتبہ ڈرامہ نگاروں نے اداکاروں کو اسکرپٹ تو

پرانا ہی تھما دیا البتہ سختی سے تاکید کی کہ خبردار کسی بھی عمل سے معلوم نہ ہوکے کہ تمھیں کس کی آشیر واد حاصل ہے۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ایک نہ ایک دن اس راز سے پردہ اٹھ ہی جائے گا، جیسے ماضی میں ہونے والے الزامات پر سے پردہ اٹھ چکا ہے۔یہ بھی کہ کمال نے اپنے قائد جسے وہ اپنا باپ بھی کہا کرتے تھے سے ایسے وقت میں غداری کی ہے جب کہ الطاف حسین کی زبان بندی ہے اور وہ صحت کے حوالے سے بھی انتہائی مشکلات کا شکار ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتی تو کسی بھی گھر کے بھیدی کو یہ جرات ہر گز نہ ہوتی۔

کمال کے دامن میں تو نیک نامی تھی ، شہر کراچی کو بنانے کا، محنت سے کام کرنے کا، ایمانداری اور خلوص سے کام کرنے کا ہار گلے میں پڑا ہوا تھا، بس زبان کے بیہودہ ہیں، طاقت کے نشے میں میڈیا پر کراچی والوں کو الو کا پٹھا کہہ چکے ہیں،اب ان کا ظمیر جاگ گیا ہے ان کے ساتھ چند اور کا بھی ظمیر جاگا ہے،اس ظمیر نے انہیں سچ بولنے پر مجبور کر دیالیکن انہوں نے اپنی بغل میں جس کو بٹھا کر ظمیر کی آواز لوگوں تک پہنچائی اس کے بارے میں تو مختلف کہانیاں ہیں۔ تمام کہانیوں کو جانے بھی دیں تو خود موصوف اپنے زبان سے جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں سچائی کی رمق دکھائی نہیں دے رہی، پاکستان کے لیے ان کا ظمیر جاگا، انہوں نے اپنے لیے علم بغاوت بلند نہیں کیا بلکہ یہ عوام کا درد

ہے جس نے انہیں مجبور کیا، بقول ان کے وہ پاکستان کے لیے آئے ہیں۔ بہت خوب پاکستان سے محبت کا درد ؟ کیا کہنے، تیسرے صاحب ڈاکٹر ہیں ان کا ایک واقعہ سوشل میڈیا پر ایک صاحب نے سنایا غالباً ان کا نام عارف ہے لندن میں مقیم ہیں، باغی تو نہیں ہوئے لیکن متحدہ کے اب کارکن نہیں ،الطاف بھائی کے جانثار ضرور ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نوے کی دیہائی میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صغیر کو کسی جگہ بلایا گیا تو یہ لیٹ پہنچے معلوم کیا تو موصوف نے بتایا کہ ان کے پاس کنوینس نہیں تھا کسی کی موٹر سائیکل مانگ کر یہاں تک پہنچے ہیں ۔اب کمال سے جپھی ڈالنے وہ کس گاڑی میں آئے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے قوم کے ہمدردوں کا، ان کا بھی ظمیر جاگ چکا ہے۔ بچپن میں قائد کے عاشق ہوئے، جوان ہوئے تو وزارت ملی گئی، گفتگو کا انداز فلسفیانہ رہا ہے، پاکستانی اور انگریز شہریت رکھتے ہیں، ان کا بھی ظمیر جاگا اور دوڑے چلے آئے کمال کی محبت میں، اچھی بات ہے، یہ سب وہ ہیں جو اپنا ناتا متحدہ سے توڑ چکے تھے، بعض دور اندیش ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جس کشتی میں سوار ہوں اگر انہیں یہ محسوس ہوجائے کہ یہ کشتی ڈوبنے والی ہے تو وہ کھٹ دوسری کشتی میں سوار ہونے کی تگ و دو کرنے لگتے ہیں۔الطاف حسین کی کشتی بھی ہچکولے کہا رہی ہے۔ کمزور دل والوں کا کیا کام ہچکولے لیتی کشتی میں سفر کرنے کا۔

ایک اور اہم نقطہ جس کی جانب سوشل میڈیا پر عارف نام کے کوئی صاحب ،نے اپنے

ویڈیو پیغام میں بتایا کہ الطاف حسین کئی سالوں سے ایک ہی خاندان کے چار افراد کے نرغے میں ہیں۔ان تک لندن میں موجود کسی کارکن کی رسائی ممکن نہیں۔یہی چار افراد جو آپس میں قریبی رشتہ دار ہیں الطاف حسین کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں، جو یہ کہتے اور چاہتے ہیں وہ الطاف حسین کہتے اور بولتے ہیں۔ڈاکٹر ندیم نصرت لندن میں الطاف حسین کے قریب ہوتے ہوئے بھی بے بس ہیں۔ یہ بیان متحدہ کے ذمہ داران کے لیے سوچنے اور تحقیق کی جانب اشارہ کرتا ہے۔اگر واقعی کچھ ایسا ہے تو ذمہ داران کو اس جانب بھرپور توجہ کرتے ہوئے اس بات کی تحقیق کرنی چاہیے۔ ویڈیو پیغام دینے والے نے محمد انور کا نام لے کر یہ تفصیل بیان کی ہے۔دیگر قریبی لوگوں میں محمد انور کے بھائی، بہنوئی اور بیٹی کا نام لیا گیا ہے۔سیاست میں 'مائنس ون' کی اصطلاح کافی استعمال ہوتی رہی ہیں ۔اب بھی یہی کہا جارہا ہے کہ بغاوت کی بنیاد مائنس الطاف ' ہے یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ماضی میں مائنس بے نظیر، مائنس آصف علی زرداری، حتیٰ ، کہ مائنس نواز شریف بھی ہوتا رہا ہے۔ متحدہ میں تو مائنس کی باتیں بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں، کیونکہ متحدہ کی سیاسی حیثیت مختلف ہے اس کے مخالف اس کے اپنے بھی ہیں پرائے بھی ، ہر سیاسی جماعت کی نظروں میں یہ کھٹی ہے ، نواز شریف ہوں یا آصف علی زرداری جب متحدہ سے فائدہ ہورہا ہو تو یہ حضرات نائن زیرو جانے میں دیر نہیں لگاتے، جب کام نکل جاتا ہے تو اس میں سو سو کیڑے نظر آنے لگے ہیں، آصف علی زرداری کو صدارت کے لیے سب سے پہلے کس نے

نامزد کیا، الطاف حسین نے، اس وقت الطاف حسین بہت اچھا تھا،این اے 246 کا ضمنی انتخاب ہوا حقیقت سامنے آئی، بلدیاتی انتخابات ہوئے، پردہ اور چاک ہوا تو تمام تر سوچ بدل گئی، اقتدار، کراچی ہاتھ سے چلے جانے کا ڈر تو فورناً آنکھیں پھیر لیں، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نواز شریف کی حکومت ڈولنے لگی تو متحدہ بہت پیاری لگی، اسے گلے لگانے میں دیر نہیں کی۔ یہی سیاست ہے ہمارے ملک کی۔ کمال کی پریس کانفرنس کے بعد جو صورت حال محسوس کی جاسکتی تھی وہ کسی شاعر کے اس شعر سے عیاں ہے۔

مٹا رہا تھا نام میرا وہ انہی پتھروں سے اب
میرے نام کو چوم کر جو قسمیں کھاتا تھا

کمال کے بعد قائم خانی، وسیم اور رضا ہارون نے جتنے الزامات لگائے وہ تمام کے تمام ماضی میں متحدہ اور الطاف حسین پر لگائے جاچکے ہیں، یہ کسی عدالت میں ثابت نہیں کیے گئے۔اس لیے کہ الزام تراشی کرنے والوں نے الزام تو لگائے لیکن ثبوت کسی نے پیش نہیں کیے۔ کمال سے جب کہا گیا کہ آپ ثبوت پیش کریں تو صاف کنی کاٹ گئے اس لیے کہ یہ الزامات سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔آج بھی کچھ ایسا ہی ہے، الزامات ہیں لیکن ثبوت نہیں،.برقی میڈیا کوایک اچھا موضوع ہاتھ آگیا، کئی دن اس میں گزر جائیں گے، کالم نگاروں کو بھی موضوع چاہیے ہوتا ہے۔ مجھ سمیت شاید ہی کوئی کالم نگار ایسا ہوگا جس نے کمال کی

باکمال باتوں کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ حکومت کی پالیسی وہ ہے جو وزیر داخلہ نے اس حوالے سے بیان کردی ہے اور یہ بھی کہ دیکھو اور انتظار کرو۔برقی میڈیاکے بعض تنگ نظر الطاف حسین اور متحدہ سے اپنی اگلی پچھلی تمام کدورتوں اور نفرتوں کا انتقام لے رہے ہیں ، بہت عرصہ کے بعد یہ موقع ہاتھ آیا کہ جس کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا تھا آج الطاف اور کمال کے تعلقات کے حوالے سے ایک خاتوں اینکر اتنا آگے نکل گئیں اور ایسا سوال بھی کمال سے پوچھ لیا جو مرد بھی ٹی وی پر کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ مہربانوں نے الطاف حسین کی موت کی خبر سوشل میڈیا پر دی حتیٰ کہ الطاف حسین کو مردہ اور کفن پوشی میں بھی دکھادیا گیا۔ یہ ٹیکنالوجی کا کمال ہے کہ اس کے ذریعہ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ دکھانا کوئی مشکل کام نہیں۔ سیاسی دشمنی میں اس قدر آگے نکل جانا حیرت اور افسوس کی بات ہے ۔ ایک نہ ایک دن سب ہی کو جانا ہے،اگر الطاف حسین کا وقت آگیا ہے تو وہ ضرور جائے گا، دنیا کی کوئی طاقت اسے روکنے والی نہیں۔ الطاف حسین حتمی اور آخری آدمی نہیں ، قائد اعظم ، قائد ملت، ذوالفقار علی بھٹو،بے نظر بھٹو رخصت ہوئے ان کی جگہ اوروں نے لے لی، انسان آنی جانی چیز ہے، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ سیاست میں شخصیات وقتی طور پر تواہم ہوتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔۔بڑے بڑے سیاست داں چلے گئے الطاف حسین بھی رخصت ہو جائے گا تو قیامت نہیں آجائے گی۔ یہ ملک قائم رہے گا،

کراچی آباد رہے گا، یہاں کی نمائندگی کرنے والے اور پیدا ہوجائیں گے۔ آخر الطاف حسین سے پہلے بھی تو کراچی کی نمائندگی لوگ کر رہے تھے اب اگر کوئی تبدیلی آجائے گی تو اس سے اہل کراچی پر قیامت برپا نہیں ہوجانے والی۔ شخصیت سے بڑھ کر ہمارا ملک ہے، ہمارا شہر ہے ہمیں اس کی فکر زیادہ ہونی چاہیے۔ (15 مارچ 2015)

کمال کی باتیں'۔ کمال احمد رضوی کی تصنیف'

اس کالم کا عنوان 'کمال کی باتیں' ہی مناسب تھا لیکن میں نے قصداً وضاحت ضروری سمجھ کر مصنف کمال احمد رضوی لکھا،، ورنہ کالم پڑھنے والے کالم کا عنوان پڑھ کا بدگمانی کا شکار ہو جاتے اور سمجھتے کہ یہ لمحہ موجود کے سیاسی کمال کی باتیں ہیں۔ آج کل مصطفیٰ کمال برقی میڈیا میں اِن ہیں، ہر جانب ان کی بہادری اور سیاسی حکمت عملی کے چرچے عام ہیں۔ مَیں سیاسی کمال پر اپنا کالم بعنوان ''کمال نے کوئی کمال نہیں کیا'' لکھ کر اپنی انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو چکا ہوں۔ اس وقت کوئی بھی ٹی وی چینل ایسا نہیں جس نے کمال شو نا کیا ہو، کوئی اینکر ایسا نہیں جس نے کمال سے اَٹکھیلیاں نہ کی ہوں اور کوئی کالم نگار ایسا نہیں جس نے کمال پر ہاتھ صاف نہ کیا ہو، تو پھر میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ حالات حاضرہ پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی کرنٹ موضوع پر کالم لکھیں۔ گویا لکھاریوں میں مقابلہ ہے لکھنے کا۔ اس حوالے سے ایک لطیفہ سن لیجئے ۔ میرے ایک کالم نگار دوست اور ہماری ویب رائیٹرز کلب کے ساتھی ایم ابرہیم خان صاحب نے کلب کے حالیہ اجلاس میں اُس وقت سنایا جب گفتگو زیادہ کالم لکھنے کے حوالے سے شروع ہوئی۔ لطیفہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا کہ اگر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کھجلی ہو تو کیا

ہوتا ہے، دوست نے جواب دیا دولت آتی ہے، پھر اس نے پوچھا کہ اگر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں کھجلی ہو تو کیا ہوتا اس نے کہا کہ رقم جاتی ہے یا نقصا ہوتا، اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اس نے پھر پوچھا کہ اگر پیر میں کھجلی ہو تو کیا ہوتا ہے دوسرے دوست نے جھنجلاتے ہوئے کہا بھئی اپنا راستہ لے کسی ڈاکٹر کے پاس جا تجھے خارش کی بیماری ہے۔ گویا بہت زیادہ لکھنا بھی بیماری ہے، کالم نگار کا ایک کالم ختم نہیں ہوتا ذہن دوسرے کالم کے تانے بانے بننے شروع کر دیتا ہے۔ ہماری ویب رائیٹرز کلب کے ایک اور دوست ہیں عظیم اعظم عظیم، انہیں بھی کالم لکھنے کی دھن اور جنون ہے ان کا کہنا ہے کہ جب تک وہ اپنا کالم مکمل نہیں کر لیتے پاگل سے رہتے ہیں۔ اس موقع پر ان کی بیگم ان سے کہتی ہیں کہ آپ پہلے اپنا کالم مکمل کر لیں تا کہ گھر میں نارمل ہو جائیں۔ حال کچھ اپنا بھی ایسا ہی ہے، ایک کالم چھپنے کے بعد دوسرے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، سلسلہ ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

معروف اداکار، ہدایتکار اور قلمکار کمال احمد رضوی کے انتقال کے بعد ان کی آخری بیگم محترمہ عشرت جہاں رضوی نے اپنے اداکار اور لکھاری شوہر کمال کی منتخب تحریروں کو جو مختلف احباب کے بارے میں تھیں یعنی کچھ خاکے اور کچھ مضامین کو کتابی شکل دے کر کمال کی باتیں' کے عنوان سے شائع کیا۔ کمال شادیوں کے حوالے سے خاصہ کشادہ دل' واقع ہوئے تھے۔ عشرت جہاں ان کی غالباً

تیسری زوجہ ہیں۔ان سے پہلے دو کا ذکر کمال نے اپنی تحریر میں کیا ہے، ممکن ہے کہ اسکور اس سے زیادہ ہو، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مزاح نگار، ڈرامہ نگار، مترجم ، ناول نگار مدیر ، اداکار اور پاکستان میں تھیٹر کے شہسوار کمال احمد رضوی 2015ء کے آخری شکار، تھے یعنی ان کا انتقال 17 دسمبر 2015 ء کو ہوا۔ ان کی شخصیت تو تھی ہی ایسی کہ انہیں خراج تحسین پیش کرنا ہر لکھاری نے ضروری جانا، میں نے بھی ان پر کالم لکھا جو ہماری ویب پر بعنوان ''الف نون کے 'الن' اللہ کو پیارے ہوئے'' آن لائن ہوا۔ کمال کے انتقال کے ڈھائی ماہ کے اندر اندر 'کمال کی باتیں' کا شائع ہوجانا ، کمال کی بیگم کا اپنے شوہر سے سچی محبت کا عملی ثبوت ہے۔ 17دسمبر کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی انہیں دنیا سے رخصت ہوئے تین ماہ بھی نہیں ہوئے، عشرت جہاں نے عدت کی پرواہ کیے بغیر کمال کی باتوں کو عوام الناس تک پہنچانا ضروری جانا۔ اگر عدت کے چار ماہ اور دس دن پورے کر لیتیں تو اچھا تھا، مجبوری میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔کمال کی باتوں کو جلد سے جلد منظر عام پر لاکر انہوں نے شوہر سے اپنی سچی محبت کا ثبوت دیا ہے۔

9 مارچ 2016ء کو کمال کی باتوں کی تعارفی تقریب کا اہتمام آرٹس کونسل آف پاکستان کی ادبی کمیٹی کی جانب سے منظر اکبر ہال میں کیا گیا۔ مجھے بھی کتاب کی تعارفی تقریب میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا بلکہ لطف دوبالا ہوگیا۔ شاعروں

اور ادیبوں کے درمیان دلی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، ایک جملہ بھی دل کو بھا جائے تو اطمینان ہو جاتا ہے اس تقریب میں تو بڑے بڑے لکھاریوں کی باتیں سننے کو ملیں۔ ہال میں داخل ہوا تو کچھ مہمان آ چکے تھے، یعنی وقت مقررہ پر پہنچنے والا صرف میں ہی نہیں تھا۔ سب سے پہلے معراج جامی اور راشد اشرف سے ملاقات ہوئی، جامی صاحب بڑے نفیس آدمی ہیں، اکثر ان سے انجمن ترقی اردو کی تقاریب میں ملاقاتیں رہتی ہیں، راشد اشرف سے ادب کی دنیا کا ہر فرد واقف ہے، پرانی کتابوں کے بازار میں جانا اور نادر و نایاب کتب کا تعارف برقی میڈیا پر کرانا ان کا محبوب مشغلہ ہے، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ 'کمال کی باتیں' مرتب کرنے اور شائع کرنے میں کمال کی بیگم کے ساتھ ساتھ راشد اشرف کا بھی اہم کردار ہے۔ تقریب اپنے وقت مقررہ سے بہت بعد شروع ہو سکی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے، ایک وجہ یہ بھی رہی کہ عین اسی وقت آرٹس کونسل میں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ سید قائم علی شاہ صاحب کی سواری آئی ہوئی تھی خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے انہیں کسی تقریب میں شرکت کرنا تھی، بڑے سائیں جس جگہ ہوں وہاں سیکیوریٹی کی صورت حال کیا ہوگی، آرٹس کونسل کے چاروں جانب پولیس موبلیں کھڑی تھیں، اتنے مہمان تقریب میں نہیں ہونگے جتنے ان موبائلوں میں سڑک کنارے بڑے سائیں کی حفاظت پر سیکیوریٹی کا عملہ معمور تھا۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔ حکمرانوں کا نیک ہدایت دے۔ آرٹس کونسل کی انتظامیہ کو چاہیے کہ جب ایسی وی وی آئی پی شخصیت نے کسی تقریب میں آنا ہو تو اس دن

صرف وہی تقریب منعقد ہو دیگر تقاریب ملتوی کردی جائیں اس لیے کہ ادبی تقاریب میں آنے والوں کی اکثریت عمر رسیدہ احباب کی ہوتی ہے انہیں پارکنگ جیسی صورت حال سے نمٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس قدر موبائلیں دیکھ کراور پولیس اوسر رینجرس کو دیکھ کردل کی دھڑکن بلاوجہ تیز ہوجاتی ہے۔

نوجوان ادیب آغا شیرازی نے میزبانی کے فرائض احسن طریقے سے انجام دیے ، بیچ بیچ میں آرٹس کونسل کی سیکریٹری ڈاکٹر ہما میر بھی جلوہ افروز ہورہی تھیں۔ دونوں ہی میزبانوں نے 'کمال کی باتیں' کی تعارفی تقریب کو کمال طریقہ سے تکمیل کو پہنچایا۔ اسٹیج پر پر.براجمان دانشوروں میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، پروفیسر سحر انصاری ، ذاہدہ حنا، حسینہ معین، ایس ایم شاہد، رضا کاظمی، عشرت جہاں، بختیار احمد اور شبیہ الحسن کاظمی تشریف فرماں تھے۔ تقریب کے پہلے مقرر ایس ایم شاہد تھے انہوں نے وہی باتیں کیں جو کتاب کے فلیپ پر اور کمال میرا دوست ' کے عنوان سے انہوں نے تحریر کی ہیں۔ یعنی یہ کہ 'کمال نے انسانی کمینگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اتنا گہرا کہ جو شخص کمینہ نہیں بھی ہوتا تھا وہ بھی اسے کمینہ نظر آتا تھا اور اس کی اہمیت ملاحظہ فرمایئے کہ الف نون میں کمینے کے کردار کے لیے اس نے اپنے آپ کو منتخب کیا اور اُس کردار کو اس خوش اسلوبی سے سے نبھایا کہ ساری دنیا میں اس کے کروڑو دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کمال کا خود اپنے آپ کو

الف نون میں ایک چالاک اور برے آدمی کی طرح پیش کرنا اس کی انسان دوستی اور محبت کا سب سے بڑا ثبوت ہے'۔

کمال احمد رضوی کی شریک حیات عشرت جہاں رضوی جن کا اس کتاب کی تدوین و اشاعت میں کلیدی کردار ہے۔ انہوں نے کتاب میں'' 84 ء سے 2015 تک۔ کمال کے ساتھ'' کے عنوان سے کمال کے ساتھ اپنے اکتیس سال اور اکتیس دن کی رفاقت کی کہانی صاف گوئی سے بیان کی ہے، لگتا ہے کہ انہوں نے سب کچھ جوں کا توں بیان کردیا کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کہتی ہیں 'یہ داستانِ حیات اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں عشرت بُرہان سے بیگم کمال احمد رضوی بنی۔ اُس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ جو نیا سفر میں شروع کرنے جارہی ہوں وہ کتنا مشکل ہے۔ شاید میری عمر کا تقاضا تھا یا میری آنکھوں پر بندھی ہوئی محبت کی وہ پٹی تھی جس سے آگے دیکھنا میرے لیے شاید ممکن نہ تھا۔ میرے نزدیک کمال انتہائی ذہین، بذلہ سنج، محبت کرنے والے، خوش خوراک، خوش لباس اور ہنس مکھ انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا دوسرا رخ انا پرستی اور غصہ تھا جو میری آنکھوں سے اوجھل تھا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ رنگ بھی کھلتے گئے۔ کبھی تو محبتوں کی برسات ہوتی تو کبھی غصے کے اولے سر پر برسنے لگتے مگر میں نے میدان خالی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس چیلنج کو قبول کرلیا کہ کمال احمد رضوی کو فتح کرلینا ہی میری کامیابی ہے، کہتی ہیں کہ 'ہماری ازدواجی زندگی میں بڑے

اُتار چڑھاؤ آئے مگر اس کے باوجود گاڑی چلتی رہی، کمال انا پرست تھے، بہ حیثیت شوہر وہ ایک مثالی شوہر تو نہ بن سکے لیکن بحیثیت دوست ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، کمال کے اندر کا غصہ دراصل اُن کی وہ محرومیاں تھیں جو اُن کو ورثے میں ملی تھیں، چھوٹی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد اکیلے رہے۔ والد نے دوسری شادی کی، سوتیلے پن اور تنہائی نے اُن کے اندر ایک نفرت اور غصہ پیدا کر دیا تھا، ضدی اور دُھن کے پکے تھے۔ چیلنج کو قبول کرنا اچھا لگتا تھا'۔آگے لکھتی ہیں کہ 'عمدہ شراب، عمدہ کھانا، عمدہ دوستوں کی محفل بہت پسند تھی شاید اسی لیے دوستوں کی بڑی تعداد ان کے اِرد گرد موجود رہتی تھی۔دوستوں کے معاملے میں بہت خوش قسمت انسان تھے۔انہیں لوگوں کے دل میں گھر کرنے کا فن آتا تھا، اُن کے مطابق ان کی خوش بختی تھی کہ وہ سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیضؔ، شاکر علی، سبطِ حسن جیسے بڑے لوگوں کے درمیان اور قریب رہے۔ پینٹنگز کا بہت شوق تھا اور دوستیاں بھی زیادہ پینٹروں سے تھیں، معین نجمی، شاکر علی، جمیل نقش، احمد پرویز، علی امام، وہاب جعفر، سید جہانگیر جیسے مہان لوگ ان کے جگری یار تھے''۔بیگم کمال کی تحریر سے کمال کی نجی زندگی کے بارے میں اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی جو تقریب کے بھی مقرر تھے اور کتاب میں 'اعترافِ

کمال' کے عنوان سے کمال کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا ہے۔ انہوں نے کمال کی خاکہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'سعادت حسن منٹو کا خاکہ لکھا ہے وہ بھرپور ہے اور دل گرفتہ کرنے والا خاکہ ہے۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب سعادت حسن منٹو مشہور تھے اور کمال احمد رضوی گمنام تھے'۔ ڈاکٹر کاظمی کا کہنا ہے کہ 'کمال کی حقیقت نگاری ہمیشہ بے رحمانہ رہی ہے'۔ بختیار احمد صاحب نے بھی کمال کی شخصیت اور ان کی باتوں کے حوالے خوبصورت باتیں کیں، خاص طور پر کمال کے ایک مخصوص جملے 'تیری تو میں ..... عزت کرتا ہوں' کا ذکر کیا۔ شیخ الحسنین کاظمی نے کمال کی ڈرامہ نگاری کا ذکر کیا، ذاہدہ حنا نے اپنا لکھا ہوا مختصر مضمون پیش کیا، حسینہ معین نے کہا کہ کمال صاف گو انسان تھے جس کو پسند کرتے اسے پسند کرتے تھے جس کو نہ پسند کرتے اسے نہ پسند ہی کیا کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا پی ٹی وی میں بہت اچھے لوگ تھے ان میں سے ایک کمال بھی تھی۔ تقریب کے صدر پروفیسر سحر انصاری نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مقررین نے کمال کی شخصیت اور اس کتاب پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، ان کا کہنا تھا کہ اس کتاب کا عنوان ہی اچھا لگا، انہوں نے کہا کہ کمال کی یادیں لیکن اصولِ بیان باتوں والا ہے یہ خوبی بہت کم نظر آئے گی'۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر قاسم پیرزادہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'کمال واقعی ہر دلعزیز شخصیت اور ہمارے عہد اور زمانے میں اگر شخصیت ہر دلعزیز کہی جاسکتی ہے تو بچے،،بڑے، بوڑھے سب کے لیے ہر دلعزیز ،

قابل توجہ جاذب نظر شخصیت تھے۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے کہا کہ وہ چوکس انسان تھے۔ ذہین اور فہیم لوگوں میں سے تھے۔ چیلنج دینا اور چیلنج قبول کرنے والے تھے، ان کی زندگی میں نشیب وفراز تھے، انسانی نفسیات میں جکڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر پیرزادہ نے بیگم کمال کی تحریر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مکمل تحریر ہے، انہوں نے پہلی مرتبہ لکھا لیکن مکمل اور بے لاگ لکھا، سچ لکھا، مصلحت سے کام نہیں لیا۔ کمال بذلہ سنج، خوش خوراک بھی تھے، خوش لباس بھی، انہیں کٹھن وقت بھی دیکھنا پڑا، وہ غصیلے اور دھن کے پکے تھے، انہوں نے انسانی کمینگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ عمدہ شرابی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی شراب پیا کرتے تھے۔ عمدہ دوستوں کی محفل پسند کیا کرتے تھے'۔

کمال احمد رضوی اداکار کے طور پر معروف ہوئے لیکن ان میں حسِ مزاح کا ایسا لطیف احساس پایا جاتا تھا کہ دیکھنے اور سننے والے داد دیے بغیر نہ رہ سکتے۔ ان کے جملے ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ہوا کرتے، ان کے مزاحیہ فقرے نپے تلے اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ طنز کے تیر ونشتر لیے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہی لکھے ہوئے جملوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس انداز سے ادا کیا کرتے کہ مزاح کا لطف دوبالا ہوجایا کرتا۔ پاکستان ٹیلی وژن پر ان کا تحریر کردہ ڈرامہ الف نون 72-1971ء کے درمیان پہلی مرتبہ ٹیلی کاسٹ ہوا، یہ متعدد قسطوں پر مشتمل تھا۔ معاشرے کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، ادبی موضوعات

کو ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ الن (کمال احمد رضوی) اور ننھا (رفیع خاور) اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے کہ جو وقت الف نون کی ٹیلی کاسٹ ہونے کا ہوتا اس وقت محلوں کی گلیوں میں سنناٹا ہوا کرتا لوگ اس بات کی کوشش کیا کرتے کہ وہ الف نون کے نشر ہونے سے قبل اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں۔اس ڈرامہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1970 سے 1980 کے درمیان یہ سیریل کراچی ٹیلی ویژن سے تین بار ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ کمال احمد رضوی نے متعدد ڈرامے تحریر کیے ان میں مسٹر شیطان، آدھی بات، بلاقی بدذات، بادشاہت کا خاتمہ، جوس سیزر، صاحب بی بی غلام، چور مچائے شور، کھویا ہوا آدمی، خوابوں کا مسافر، ہم سب پاگل ہیں، آپ کا مخلص شامل ہیں، انہوں نے مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ان میں تہذیب، آئینہ، شمع کے علاوہ بچوں کا رسالہ بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت، پھلواری شامل ہیں۔ کمال احمد رضوی بے بہا خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے قلم میں روانی اور پختگی تھی۔ ان کی سوچ کا دھارا ہمیشہ معاشرے میں کسی نہ کسی برائی، خامی یا کمزوری کو دور کرنے کی جانب ہوا کرتا۔ الف نون کے بے شمار اقساط میں انہوں نے روزمرہ کے مسائل، لوگوں کی مشکلات پر خوبصورت انداز سے طنز کے تیر چلائے۔ وہ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ اداکار بھی اتنے ہی اچھے تھے۔ بنیادی طور پر وہ تخلیق کار تھے۔ تھیٹر کے حوالے سے ان کی خدمات کو پاکستان میں پہلا پتھر تصور کیا جاتا ہے۔

کمال کی باتیں' میں جو خاکے کمال کے تحریر کردہ شامل ہیں ان میں فیضؔ صاحب، منٹو' صاحب، احمد پرویز۔ نامہربان یادیں، ہماری انیس آپا، حفیظ جاوید، حمید کاشمیری، انور جلال شمزا، پراسرار نجمی، صفدر میر، شاکر علی، شوکت رضوی، سبطِ حسن، ستارہ بائی کانپوری، تجمل بھائی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پاک ٹی ہاؤس، الحمرا کے عنوان سے مضامین، ترگنیف۔ شخصیت اور فن گلبرٹ گارڈنر، یہ ترجمہ ہے جو کمال نے کیا۔ کمال پر لکھے گئے کالموں میں منو بھائی کا کالم 'کمال احمد رضوی ہمارے ہاتھوں میں سے نکل گئے، یہ جنگ میں شائع ہوا تھا، انتظار حسین کا کالم 'کچھ کمال احمد رضوی کے بارے میں، یہ روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوا تھا، کشور ناہید کا کالم 'الف نون یا کمال احمد رضوی بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کمال کی تحریروں کا اچھا مجموعہ ہے۔ یہ تو ابتدا ہے کمال کی بے شمار تحریریں ہیں جن کو کتابی صورت میں مرتب کرنے اور شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ راشد اشرف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ 'کمال احمد رضوی ان لوگوں میں سے تھے جو زندگی کو کھیل نہیں سمجھتے اور اسے آہنی ہاتھوں سے نمٹنا جانتے ہیں'۔ کتاب کا عنوان 'کمال کی باتیں' کمال رضوی اپنی زندگی میں ہی طے کر گئے تھے۔ راشد ہی اس کتاب کی تدوین و اشاعت کے اصل محرک ہیں۔ راشد کا یہ عمل علم و ادب کی تدوین، اشاعت اور فروغ کے حوالے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

ساری تدبیریں، سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے، پرویز مشرف آخرکار بیرونِ ملک چلے گئے۔ اس ہفتہ کی یہ گرما گرم ، بعض دلوں کو افسردہ کرنے والے، بعض کو راحت پہنچانے والی، کسی کو گرمانے والی تو کسی پر آسمانی بجلی بن کر گرنے والی خبر رہی۔ جمعرات 17 مارچ کو یہ دل ہلا دینے والی خبر اخبارات کی زینت بنی۔ 'سپریم کورٹ آف پاکستان کے لارجر بنچ نے سابق آرمی چیف جنرل (ر) پرویز مشرف کا نام ای سی ایل سے نکالنے سے متعلق سندھ ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار اور وفاقی حکومت کی اپیل خارج کرتے ہوئے قرار دیا کہ'' اگر وفاقی حکومت یا سنگین غداری کیس کی سماعت کے لیے قائم خصوصی عدالت کسی قانونی بنیاد پر ملزم کا نام ای سی ایل پر برقرار رکھنا چاہے تو سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا اور پرویز مشرف کی نقل و حرکت محدود کر سکتے ہیں۔ حکومت پرویز مشرف کے بیرون مل جانے کا فیصلہ خود کرے۔ اگر پرویز مشرف کو بیرون ملک جانے کی اجازت نہیں دیتی تو حکومت قانونی حکم جاری کرے۔ چیف جسٹس نے ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ ای سی ایل میں نام ڈالنا نہ وفاقی حکومت یا خصوصی عالت کا کام ہے، سارے کام سپریم کورٹ کے کندھے پرچڑھ کر نہ کروائے جائیں، بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت خود کچھ نہیں کرنا چاہتی اور عدالت کا شیلٹر لینا چاہتی

ہے'۔ عدالت عالیہ کا فیصلہ بہت واضح اور دو ٹوک ہی نہیں بلکہ حکومت وقت کو صاف الفاظ میں یہ بتا دینا تھا کہ حکومت عدالت کا کندھا استعمال نہ کرے، اسے از خود کرنا ہے سو کرے، اس کے پاس قانونی اختیارات ہیں۔ بال اب حکومت کے کورٹ میں آ چکی تھی۔ سپریم کورٹ کے بعد اب کوئی ادارہ کوئی طاقت ایسی نہیں باقی بچی تھی جس جانب حکومت اس حوالے سے دیکھتی ۔ اب دو ہی راستے تھے ایک وہ جس پر حکومت نے عمل کیا دوسرا یہ بھی تھا جو عدالت نے تجویز کیا تھا یعنی اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے پرویز مشرف کا نام ای سی ایل میں موجود رہنے دیتے اور صاف الفاظ میں مشرف کو باہر جانے سے روک سکتی تھی۔ نون لیگ کی اعلیٰ قیادت مشرف کے مسئلہ پر تقسیم ہو چکی تھی۔ بعض زیادہ طاقت ور نون لیگی وزیر اور بشمول پنجاب کے وزیر اعلیٰ اسی فیصلے کے حق میں تھے جس پر عمل کیا گیا۔ نواز شریف صاحب نے اُن نون لیگی ساتھیوں کے فیصلے سے اتفاق کیا، حالانکہ کچھ خبریں ایسی بھی تھیں کہ بدھ کے روز جب یہ افواہ عام ہوئی کہ پرویز مشرف نے بیرون ملک جانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں تو نوز شریف صاحب نے یہ احکامات جاری فرما دیے تھے کہ مشرف باہر نہ جانے پائے لیکن رات گئے جب طاقت ور نون لیگیوں نے سر جوڑے اور اس مسئلہ پر مشاورت کی تو مشرف کو باہر جانے کے حق میں نون لیگی طاقتیں غالب آ گئیں اور وہ نون لیگی وزیر جنھوں نے مشرف کے حوالے سے بڑے لمبے چوڑے، بلند بانگ دعوے کیے ہوئے تھے اگر مشرف کو باہر جانے دیا گیا تو ہم یہ کر دیں گے ہم وہ کر دیں گے بغلیں ،

جھانکنے اور وضاحتیں کرنے پر مجبور نظر آئے۔ نواز شریف صاحب نے اسی میں عافیت جانی کے یہ بلا ملک سے دور ہی رہے تو ان کے حق میں اور نون لیگیوں کے حق میں بہتر ہے۔ مشرف کو محفوظ راستہ دینے کے حق میں نون لیگ کے بعض دانشور اور کالم نگار بھی تھے، وہ اپنی رائے کا اظہار وقفہ وقفہ سے کرتے رہے ہیں۔ قبلہ عطاؔ الحق قاسمی صاحب نے اپنے کالم 'وزیر اعظم پاکستان اور پرویز مشرف' شائع شدہ روز نامہ جنگ 18 مارچ 2016ء فرماتے ہیں ''جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے پرویز مشرف کے معاملے میں پہلے دن سے میرا موقف یہی رہا ہے کہ یہ شخص آئین سے غداری اور اس کے علاوہ دوسرے سنگین جرائم کا مرتکب تو ہوا ہے مگر ہمارے ہاں کے معروضی حالات کے پیش نظر اس معاملے میں ''مٹی پاؤ'' والی پالیسی صحیح ہے۔ میں نے تو یہ بات مسلسل لکھی تھی کہ یہ معاملہ یہیں ختم کردیں کیوں کہ حکومت پرویز مشرف کا بال تک بیکا نہیں کرسکے گی، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوم پرویز مشرف کے جرائم معاف کردے گی ایسا نہیں ہوگا لیکن ایک وسیع تر قومی مفاد میں وزیر اعظم پاکستان اپنے دل پر پتھر رکھ کر موصوف کو باہر جانے کی اجازت دے دی جانی چاہیے''۔ یہی کچھ حکومت نے کیا معروضی حالات قومی مفاد میں حکومت نے دل پر پتھر رکھ ہی لیا، کاش یہ پتھر بہت پہلے رکھ لیا جاتا۔

گلے میں گھنٹی کون باندھے، نون لیگیوں نے فیصلہ تو کرلیا، وزیر اعلیٰ پنجاب

کا یہ کام نہیں، وزیر اطلاعات شاید اس فیصلے کے حق میں نہیں تھے اس لیے یہ ذمہ داری پورے کرنے سے گریزاں نظر آئے، خواجہ صاحبان اور منصوبہ بندی کے وزیر بھی مشرف کے باہر جانے کے حوالے سے زمین آسمان ایک کر دینے کی باتیں کر چکے تھے بھلا وہ کیسے یہ اعلان کرتے ۔ نون لیگیوں میں ایک ہی وزیر سب سے طاقت ور ہے جو نواز شریف کو روٹھ کر بھی دکھائے ، کئی کئی دن نواز شریف سے بات نہ کرے تب بھی میاں صاحب اس سوہنے وزیر کو کچھ نہیں کہتے ، نہیں معلوم ایسی کون سی خوبی یا گیدڑ سنگھی چودھری صاحب کے پاس ہے کہ وہ نون لیگیوں میں طاقت ترین وزیر ہیں۔ اب یہ ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ، کیونکہ وہ اس فیصلے کے حق میں بھی تھے اس لیے اس کا اعلان اور حکومت کی حکمت عملی کا اعلان کرنے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے لی۔ سنئیے انہوں نے کیا فرمایا، پریس کانفرنس سے اپنے خطاب میں کہا کہ ’ سابق صدر پرویز مشرف کی جانب سے طبّی بنیادوں پر بیرون ملک جانے کی درخواست کی گئی، مشرف کے وکلا نے ای سی ایل سے نام نکالنے کی درخواست کی ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ مشرف چار سے چھے ہفتوں کے اندر علاج کے بعد ملک واپس آ جائیں گے جس پر حکومت نے مشرف کو علاج کے لیے بیرون ملک جانے کی اجازت دے دی ہے۔

چودھری نثار نے فرمایا کہ پرویز مشرف کا نام ای سی ایل سے نکالنے کا حکم سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ معاملے پر مک مکا کرنا ہوتا تو عدالت جانے کی کیا ضرورت تھی جب کہ حکومت پر تنقید کرنے والوں

نے پرویز مشرف کو گارڈ آف آنر دے کر رخصت کیا، انہوں نے واضح کیا کہ پرویز مشرف کا نام پونے دو سال سے ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ہے جب کہ حکومت نے ہر فورم پر مشرف کا نام ای سی ایل سے نکالنے کی مخالفت کی، انہوں کہا کہ مشرف کو محفوظ راستہ دینے والے اب باتیں بنا رہے ہیں، پہلے دن سے کہا تھا حکومت کی پرویز مشرف سے کوئی ذاتی رنجش نہیں'۔ جمعرات کی صبح عدالت عالیہ کا فیصلہ آیا، بیرون ملک جانے کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں، چودھری نثار کی پریس کانفرنس شام میں ہوئی، اب تو پرویز مشرف کا جانا یقینی ہوچکا تھا، صبح تین بجے کی فلائٹ میں سیٹ بھی بک کرالی گئیں، سیکیوریٹی خدشات کے پیش نظران کی روانگی کو، ان کے ائرپورٹ کے روٹ کو خفیہ رکھا گیا، اور مشرف ائرپورٹ پہنچے جمعہ کا سورج پرویز مشرف نے دبئی میں دیکھا۔ میر تقی میرؔ کا یہ شعر معاملات کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرف کو محفوظ راستہ دے کر بہ حفاظت بیرون ملک جانے دینے پر نون لیگ اور حکومت وقت کو نشانہ بنایا، حالانکہ یہ تنقید بے معنی اور بے وجہ معلوم ہوتی ہے۔ پیپلز پارٹی تو پرویز مشرف کے فیض یعنی این آر او کے نتیجے میں اقتدار میں آئی، وزیروں نے حلف اٹھایا، پیپلز پارٹی کے

پانچ سالا دور میں مشرف آزادی سے باہر جاتے اور آتے رہے، جب مشرف کی رخصتی ہوئی تو یہ پیپلز پارٹی ہی تو تھی جس نے مشرف کو شاندار طریقے سے ریڈ کارپٹ فراہم کیا، گارڈ آف آنر پیش کیا، اپنی جھینپ مٹانے کو یہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس گارڈ آف آنر میں پارٹی کا کوئی کارندہ شریک نہیں تھا، وہ اقدام تو حکومت اور برسر اقتدار پارٹی کا تھا۔ ہماری سیاست میں یہ روایت عام ہے کہ اچھا اچھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو، اچھا کام ہم کریں، برا کام دوسرے کریں۔ اب اس روش کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اکثر کالم نگار پرویز مشرف کی بیماری پر خوب خوب لکھتے رہے ہیں، اس عمر میں کون ہے جو بیمار نہیں، کمر کی تکلیف کوئی خاص بات نہیں۔ سب لوگ محسوس کر رہے تھے کہ بیماری تو ایک سبب بن رہی ہے مراعات حاصل کرنے کا، کیا وہ یہ کہتے کہ میں سابق چیف آف آرمی اسٹاف ہوں چنانچہ میں کسی عدالت میں حاضر نہیں ہو سکتا، نظر آ رہا تھا کہ مشرف کا کچھ نہیں ہوگا، پتا نہیں ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ پرویز مشرف کوئی سیاسی لیڈر نہیں کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے تو ان کی پارٹی بھی چپ سادھے رہے، دیگر سیاسی لیڈروں کی تو بات ہی کیا تھی، ان کے پیچھے ایک مضبوط قوت ہے، جو کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ان کے ہر دلعزیز شخص کا بال بھی بیکا ہو۔ درست کہا قاسمی صاحب نے یہ حکومت پرویز مشرف کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، اور یہ حکومت ہی کیا کوئی بھی اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب جو سیاسی گیدڑ یہ باتیں کر رہے ہیں کہ حکومت

انہیں واپس لائے ، وہ مقدمات کا سامنا کریں ، وغیرہ وغیرہ وہ خوابوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ نواز حکومت کے بعد اگر خدا.برا وقت پاکستان پر نہ لائے پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت آ بھی گئی تو وہ بھی پرویز مشرف کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اس پارٹی کی تو ادائیں ہی نرالی رہی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی سر.براہ کے دور میں پھانسی دے دی گئی ، انہیں سانپ سونگے رہا، اُس جنرل کا کیا بگاڑ لیا، بے نظیر کے دو بھائی قتل کر دیے گئے ، ان کے قاتلوں کو اپنے دور اقتدار میں کیوں گرفتار نہیں کیا گیا، خود بے نظیر کے قاتلوں کو اپنے دورِ اقتدار میں کیوں نہیں ڈھونڈ نکالا۔ اقتدار ملتا ہے تو دوسرے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔

پرویز مشرف ڈکٹیٹر ضرور تھے لیکن ان کی محبِ وطنی تمام تر شکوک و شبہات سے بالاتر ہے، وہ ملک و قوم کے ہمدرد اور اپنے خون کے آخری قطرے تک محبِ وطن کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے دور میں ترقی کی شرح ہر اعتبار سے موجودہ اور سابقہ حکومت کے مقابلے میں کہیں زیادہ رہی، ڈالر کنٹرول میں رہا، کرپشن دوسروں نے ضرور کی ہوگی لیکن مشرف پر کسی قسم کا کرپشن کا الزام نہیں، قرضوں کی صورت حال کنٹرول میں تھی، مہنگائی کا جن جواب قابو سے باہر ہے مشرف کے دور میں کنٹرول میں رہا، پاکستان دنیا میں 114 ویں نمبر پر تھا آج 144 پر چلا گیا ہے۔ مشرف نے این آر او کیوں کیا؟ کیا مجبوری تھی، اکبر بگٹی کیس سے وہ بہ عزت

بری ہوگئے، لال مسجد اور 12 مئی کے واقعات میں انہیں شامل کیا گیا، اگر کیس چلے گا تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا، رہا غداری کا مقدمہ تو اس کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ مشرف اس میں بھی سرخ رو ہوں گے۔ ایک کالم نگار نے لکھا 'آخر کار کمانڈو فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا' حیرت کی بات ہے کہ موصوف کو مشرف کی رخصی کے کارواں میں بے شمار فوجی اور نیم فوجی دستے نظر نہیں آئے، حکومت کی جانب سے کلین چیٹ دکھائی نہیں دی، وہ فرار نہیں بلکہ بقول خلیل احمد نینی تال والا 'آن بان شان سے پرویز مشرف رخصت کرادئے گئے'۔ ان کی رخصتی شاندار طریقے سے ہوئی، رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ صبح کی پھوٹتی کرنوں اور ائر پورٹ کی چکا چوند لائٹوں میں عمل میں آئی۔ پرویز مشرف کیوں آئے تھے یہ بھی ایک راز ہی رہا، وہ بیرون ملک جس انداز سے پاکستان کا نام روشن کررہے تھے وہ سب پر عیاں ہے، بے نظر کے بعد پرویز مشرف ہی تھے کہ جنہیں مغرب کی جامعات لیکچر کے لیے مدعو کررہی تھیں اور ان سے انہیں بھاری مالی منفعت بھی ہورہی تھی۔ یہ صلاحتیں ہمارے حکمرانوں میں کم کم پائی جاتی ہیں۔ وہ اب واپس آئیں گے یا نہیں یقین سے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ وہ جہاں بھی رہیں گے پاکستان کا نام روشن کرتے رہیں گے۔

میرا دوست 'سبطین رضوی' بھی چلا گیا

میرا ایک اور دوست دنیا سے چلا گیا
تھا خوب سیرت انسان بہت جلد چلا گیا
مغفرت ہو سبطین کی دعا گو ہے رئیسؔ
ہو جنت اُسے نصیب جو چھوڑ کر چلا گیا

زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے وہ جب چاہے جس کو چاہے اپنے پاس بلالیتا ہے، ہفتہ 26 مارچ کو میرے بچپن کا دوست ،جوانی کا ساتھی ،آگرہ تاج کالونی میں میرا طویل عرصے کا پڑوسی، ہمارا بچپن اور جوانی ایک ساتھ گزری، اس سے میری دوستی ہی نہ تھی بلکہ ہمارے گھریلو مراسم بھی تھے۔ محمد سبطین رضوی عمر میں مجھ سے چھوٹا ہی تھا لیکن موت یہ کب دیکھتی ہے۔ اس کا وقت پورا ہوچکا تھا، ایک موزی مرض نے آن دبوچا اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملا، بچے تو بڑے ہیں لیکن ماں یا باپ کی کمی کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ میرا یہ دوست سیلف میڈ تھا، اس کے باپ کا سایہ اس کے سر سے اس وقت ہی اٹھ گیا تھا جب اس نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا، میں نے اپنے اس دوست کے والد کی تدفین میں بھی شرکت کی ان کا انتقال ایک حادثہ میں ہوگیا تھا۔ میٹرک کرکے اِسے اپنے والد کی جگہ کے ای ایس سی میں نوکری مل گئی اور پھر اس کی زندگی کی طویل جدو جہد آغاز ہوا جو مارچ 2016 کو اختتام کو پہنچا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ پڑھا بھی ، اس وقت

یہ اپنے گھر کا واحد کفیل بھی تھا۔ شادی ایک استاد سے ہوئی، دونوں نے مل کر اپنے بچوں کی پرورش اچھے انداز سے کی، بچوں کو پڑھایا لکھایا، بڑا بیٹا امریکہ میں، ایک بیٹی جدہ میں باقی پاکستان میں ہیں۔ بچوں کے حوالے سے اس کی مثال حمایت علی شاعر کے اس شعر کی سی ہے۔

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں
کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

سبطین کے ساتھ بچپن اور جوانی کے بیتے دنوں کی تفصیل میں سر دست میں نہیں جا رہا اس لیے کہ یہ ایک طویل کہانی ہے جو پچیس سے تیس سالوں پر محیط ہے، زندگی نے وفا کی تو پھر کسی اور وقت اس کا احاطہ کروں گا۔ آگرہ تاج کالونی، لیاری کی کچی آبادیوں میں سے ایک ہے جس کے مکینوں کی اکثریت اردو بولنے والوں پر مشتمل تھی جو اب نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے آنے والوں کے لیے لیاری میں بہار کالونی اور پھر آگرہ تاج کالونی کے نام سے یہ آبادیاں قائم ہوئیں، ہم انہی بستیوں کے مکین رہے۔ 80ء کی دیہائی میں ہم نے اس بستی کو خیر باد کہا اور ہم دوست تتر بتر ہوگئے۔ اب ہماری ملاقاتیں خوشی اور غمی کے موقعوں پر ہو کر رہ گئی تھیں لیکن سالوں کی محبت، انسیت، چاہت کا یہ عالم کہ جب کبھی ایک دوسرے سے ملے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ڈھیروں خون بڑھ گیا ہے۔ وہاں کے دوست ایک دوسرے کے لیے بہت عزیز اور اچھوتے

ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے ۔

دوستی عام ہے لیکن اے دوست
دوست ملتا ہے.بڑی مشکل سے

گلستان جوہر، پہلوان گوٹھ کے قبرستان میں اتوار کی شب بعد نماز عشاء میرے اس دوست کو عزیزوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کی موجودگی میں قبر کی گود کے سپرد کیا جارہا تھا۔ اس کے بیٹے کو امریکہ سے آنا تھا اس کے باعث میرے دوست نے ایک شب اور ایک دن ایدھی سینٹر کے سرد خانے میں بسر کیا۔ قبر کے چاروں جانب لوگ اپنا منہ قبر میں ڈالے ہوئے تھے ، بعض بعض کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ مجسم مردے کے ساتھ لحد میں کود جائیں۔ میرا یہ دوست نہا دھو کر ، نئے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھا، چند لمحو میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لحد میں اتار دیا جائے گا۔مَیں بے بسی کی تصویر بنا آخر میں کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ عمرِ عزیز کی کرشمہ سازی کہیے کہ اب ہم اپنے پیاروں کو لحد میں اتارنی کی رسم میں بھی عملی طور پر حصہ لینے سے قاصر ہو چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ایسے کاموں میں پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی کیا کم شکر ہے کہ پروردگار نے اس قدر ہمت دی کہ اپنے دوست کے سفر آخر میں شریک ہوگئے اور اس وقت اپنے دوست کو قبر کی گود میں جاتا دیکھ رہا ہوں۔ سبطین کے ساتھ بیتے شب و روز کی فلم تھی جو قبرستان میں چل رہی تھی، نظروں کے سامنے ابدی نیند

سوئے ہوئے بے شمار انسانوں کی آخری آرام گاہیں تھے لیکن میں ماضی کی یادوں میں گم تھا۔ کوئی ایک بات ، ایک واقعہ ، کوئی ایک واردات ہو تو اس کا ذکر کروں، طویل عرصہ ساتھ رہا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا تھا کہ ہماری ملاقات نہ ہوتی ہو۔ میرے بچپن کے ان دوستوں میں اس وقت ظفر اور احمد حسین بھی موجود تھے، بعض دوست جیسے ارشاد قاضی اس وقت موجود نہیں جس کی وجہ اس کی بیماری ہے۔ کچھ ملک اور کچھ شہر کراچی سے باہر اپنی دنیا آباد کرچکے ہیں، بعض دوست ہم میں عمر سے بڑے بھی تھے وہ بھی اس وقت نظر نہیں آئے جن میں سید ممتاز زیدی، چودھری اشرف، مغیث احمد صمدانی ، سید حیدر رضاء ، عابد زیدی شامل ہیں یہ ہمارے سینئر دوستوں میں سے تھے، اب ان کی صحت بھی انہیں اجازت نہیں دے رہی ہوگی، بعض اللہ کو پیارے ہوچکے، سید جمال احمد سبطین کے بہنوئی بھی ہیں ان کا غم یقیناً زیادہ شدید ہے، انہوں نے تو سبطین کی پرورش اور دیکھ بھال اپنے بچوں کی طرح کی۔ لیکن کیا کیا جائے ۔ انسان زندگی میں کیا کیا منصوبے بناتا ہے اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اصل منصوبہ وہ ہے جو ہمارے مالک نے ہمارے لیے بنایا ہوا ہے۔ جرأت الہ آبادی کا شعر ۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پَل کی خبر نہیں

سبطین کچھ عرصے سے بیمار تھا مجھے معلوم ہوا تو میں اسے دیکھنے اس کے گھر

گیا، ملاقات کرکے تشویش ہوئی لیکن اس کا اظہار نہیں کیا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ایک ایسی بیماری نے آلیا ہے جو کم ہی جاتی ہے، اگر جاتی ہے تو اپنے مریض کو ساتھ لے کر جاتی ہے۔کافی دیر اس کے پاس بیٹھا، بہت سی باتیں کیں، ماضی کے قصے یاد دلائے، ماضی کے دوستوں کا ذکر ہوا، اس کی آواز بھی صاف نہیں تھی، کچھ کچھ سمجھ میں آتا کچھ نہیں، اس کی نگاہ بھی متاثر ہوچکی تھی۔ رخصتی چاہی تو وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا، اس کی چال ایک عام انسان کی چال نہیں تھی بلکہ اس کی چال بتا رہی تھی کہ اسے اپنے اوپر قابو نہیں ہے، ہمت کرکے چل رہا ہے۔ نظر سے نظر ملی، اس نے مجھے اور میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ یہی میری اور اس کی آخری ملاقات تھی۔ اس سے قبل جب وہ تندرست تھا تو پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے انتقال پر اس سے ملاقات ہوئی تھی، جامعہ کراچی کے قبرستان میں وہ اور میں بہت دیر گفتگو کرتے رہے۔ سبطین فرمان صاحب کے عزیزوں میں سے ہے، واپسی پر میں نے ہی اُسے اس کے گھر ڈراپ کیا تھا۔

ایک ملاقات کراچی ائرپورٹ پر ہوئی، اس نے بتایا کہ وہ اپنی بیگم کو جدہ کے لیے رخصت کرنے آیا ہے، سبطین کی ایک بیٹی جدہ میں ہے۔ میں اپنی بیگم کے ہمراہ جدہ میں کچھ وقت گزار کر واپس آیا تھا۔اس کا بڑا بیٹا امریکہ میں مقیم ہے، مالی پریشانی دور دور نہیں تھی، خوش حالی تھی، اب جب کہ باغ باں کے لگائے ہوئے پودے تناور درخت بننے جارہے تھے اور باغ باں کو آرام و سکون میسر آتا، بے فکر ہو کر بقیہ زندگی گزتی، تقدیر میں کچھ

اور ہی لکھا تھا، باغ باں کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ وہ اپنے لگائے ہوئے پودوں سے فیض حاصل کرتا۔ اس نے اپنی دنیا وہاں بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

مرنے والے مر تو جاتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ احباب مردے کو قبر میں اتارنے کی رسم احتیاط کے ساتھ ساتھ جلد بازی بھی کیا کرتے ہیں، اتارنے والے لحد میں اتار رہے ہوتے ہیں، چاروجانب کھڑے جن کی نظریں قبر کے اندر گڑی ہوتی ہیں مختلف قسم کی آوازیں اس موقع پر سنائی دیتی ہیں۔ ان جملوں سے وہ قبر میں اتارنے والوں کو ہدایات دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی تدفین کے عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ تیزی اور جلد بازی نے اس وقت مجھے متاثر کیا اور اس قسم کی شعری کیفیت ہوئی، جب واپس ہوئی تو یہ احساس پیدا ہوا جسے اس شعر میں بیان ہوا ہے۔

دم تو لو چلے جانا جلدی کیا ہے
لحد میں اتارنے کا انتظار تو کر لو

زندگی کے آخری سفر میں ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس سفر میں شرکت کرکے ثواب حاصل کرے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی میں دور دور ہی ہوتے

ہیں لیکن آخری وقت میں ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس کیفیت کا ذکر کچھ اس طرح سے ہوا۔

لحد تک آج جو میرے ساتھ آئے ہو
زندگی میں تو کبھی دو قدم ساتھ نہ دیا

اللہ تعالیٰ میرے اس دوست کی مغفرت فرمائے آمین۔ میں نے پیشگی اپنے ان احباب کا شکریہ ادا کر دیا ہے جو مجھے لحد کے سپرد کرتے وقت قبرستان میں موجود ہوں گے لیکن یہاں میں یہ شکریہ اپنے دوست کی جانب سے ان احباب کا ادا کر رہا ہوں جنھوں نے اس کی تدفین میں شرکت کی۔

مرقد تک میرے ساتھ آنے والو تمہارا شکریہ
میری خاطر زحمت اٹھانے والو تمہارا شکریہ
ہے اب جو سفر باقی کر لیں گے وہ تنہا ہی ہم
حوصلہ بڑھا کر لحد تک پہنچانے والو تمہارا شکریہ
اگلا پڑاؤ ہے کٹھن اور رستہ بھی ہے اڑچن اڑچن
مغفرت کی دعا دینے والو تمہارا شکریہ
بنا تھا جس خاک سے رئیسؔ آ پہنچی ہے منزل پہ وہ
مٹھی بھر خاک نچھاور کرنے والو تمہارا شکریہ

شہر قائد میں پروفیسر آفاق احمد بھوپالی کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

بھارت کے شہر بھوپال سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ ادیب، شاعر۔ محقق، ماہر غالبیات و اقبالیات پروفیسر آفاق احمد جن کا انتقال بھوپال میں 30 مارچ 2016 کو ہوا تعزیتی ریفرنس اکادمی ادبیاتِ پاکستان سندھ اور محبانِ بھوپال فورم کے زیر اہتمام اکادمی ادبیات کے آڈیٹوریم، لیاقت میموریل لائبریری بلڈنگ میں 2 مئی 2016 کو منعقد ہوا۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان سندھ کے ریذیڈنٹ ڈائیریکٹر جناب قادر بخش سومرو صاحب کی عنایت کہ انہوں نے مجھے اس تعزیتی ریفرنس کی اطلاع ہی نہیں دی بلکہ اس میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ پروفیسر سحؔر انصاری صاحب جنہوں نے اس تعزیتی اجلاس میں اظہار خیال بھی کرنا تھا نے بھی تعزیتی اجلاس میں شرکت کا کہا۔ اب میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے ان دو کرم فرماؤں کی بات کو ٹال سکتا۔ ویسے بھی ہماری ویب ’رائیٹرز کلب‘ کے صدر کی حیثیت سے میری اور دیگر عہدیداران کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ شہر قائد میں ہونے والی علمی، ادبی، ثقافتی اور سماجی تقریبات میں شریک ہوں اور اس کی مختصر روداد ہماری ویب پر آن لائن کریں، یہ ہماری ویب رائیٹرز کلب کے مقاصد کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔

میں وقت مقررہ سے قبل ہی پہنچ چکا تھا، مقررین بھی آچکے تھے انہیں دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ پروفیسر آفاق احمد بھوپالی مرحوم کے حوالے سے آج کئی محترم شخصیات کو سننے کا شرف حاصل ہوگا۔ ادبی تنظیم محبانِ بھوپال کے عہدیداران و ذمہ داران تو موجود تھے ہی شہر قائد سے تعلق رکھنے والے کئی ادیب اور شاعر بھی آج اس تعزیتی اجلاس میں موجود تھے۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر حکیم عبدالحنان صاحب تشریف فرما تھے، کیونکہ میں نے جامعہ ہمدرد سے ہی ڈاکٹریٹ کیا اس لیے حکیم عبدالحنان صاحب کو دیکھ کر زیادہ مسرت ہوئی۔ سحرؔ انصاری صاحب کے بغیر شہر قائد میں ہونے والی کوئی بھی ادبی تقریب مکمل نہیں ہوتی، گویا سحرؔ انصاری اور شہر قائد میں ہونے والی ادبی تقریبات لازم و ملزوم ہوچکے ہیں۔ میں نے اپنے سابقہ مضمون میں جو روزنامہ 'جناح' میں شائع ہوا تھا سحرؔ انصاری صاحب کو 'کراچی کی ادبی تقریبات کے دولھا' کا خطاب دیا تھا۔ وہ واقعی محفل میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے تقریب کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی صاحب سے شناسائی تو بہت پرانی ہے لیکن آج یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کا تعلق بھی بھوپال کی سرزمین سے ہے اور وہ مرحوم پروفیسر آفاق احمد کے انتہائی قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں سے ہیں۔ اسی طرح محبانِ بھوپال فورم سے تعلق رکھنے والے احباب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

تقریبا کا آغاز اللہ کے بابرکت نام سے ہوا، نعت رسول مقبول ﷺ پیش کی گئی، میزبان محترم جو محبانِ بھوپال فورم کے ذمہ داران میں سے ہیں پروفیسر آفاق احمد مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی اور مقررین کو باری باری اظہار خیال کی دعوت دیتے رہے۔ ایک بات جو جناب قادر بخش سومرو صاحب نے کہی بہت دل کو لگی کہ ادیب صرف ادیب ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی خطہ زمین سے ہو۔ اسی سوچ اور اسی فلسفہ کی بنیاد پر انہوں نے بھارت کے شہر بھوپال سے تعلق رکھنے والے ادیب پروفیسر آفاق احمد کے لیے منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس کو یقینی بنانے میں عملی کردار ادا کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ادیب خواہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو ضروری نہیں کہ ہم تعزیتی اجلاس ہی منعقد کریں، آپ کسی بھی ادیب، شاعر کے حوالے سے کوئی تقریب منعقد کرنا چاہیں تو اکادمی ادبیاتِ پاکستان ہر طرح کا تعاون کرے گی۔ ڈاکٹر یونس حسنی نے اپنے خطاب میں اپنے اور پروفیسر آفاق احمد کے تعلق کا ذکر کیا ان کا کہنا تھا کہ پروفیسر آفاق احمد کے دو ہی دوست ایسے تھے جن سے ان کے تعلقات کبھی کشیدہ نہیں ہوئے ان میں سے ایک میں ہوں۔ میرے ان سے کبھی تعلقات خراب نہیں ہوئے، اس لیے کہ پروفیسر آفاق احمد جو کام بھی کیا کرتے اس میں اپنے آپ کو فنا کردیا کرتے تھے، جس ادارے میں وہ شامل ہوتے اسے زمین سے آسمان پر لے جاتے لیکن اس دوران وہ اکثر نہیں بلکہ زیادہ تر لوگوں سے رنجش مول لے لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر یونس حسنی کا کہنا تھا کہ ان کے اور

پروفیسر آفاق احمد کے تعلقات نصف صدی پر محیط رہے ان میں سے نصف حصہ وہ ان کے ساتھ رہے اور نصف حصہ دور رہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ پروفیسر آفاق احمد در اصل افسانہ نگار ہی تھے لیکن بعد میں وہ تحقیق اور تنقید کی جانب چلے گئے۔ پروفیسر سحرؔ انصاری نے بتایا کہ پروفیسر آفاق احمد ایک شریف النفس انسان تھے، غالبؔ اور اقبالؔ پر انہیں اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ تقریب کے آخری مقرر جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر حکیم عبد الحنان صاحب تھے۔ ان کا تعلق بھی پروفیسر آفاق احمد سے بہت گہرا اور قریبی رہ چکا ہے۔ انہوں نے پروفیسر آفاق احمد کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ دیگر مقررین نے بھی پروفیسر آفاق احمد کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔

پروفیسر آفاق احمد مرحوم کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پروفیسر آفاق احمد کی تعلیم و تربیت بھوپال کے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی انہوں نے ہندوستان کے اسی شہر میں 30 جولائی 1932ء کو آنکھ کھولی ،ان کی دنیاوی زندگی کا سفر 83 سال بعد 30 مارچ 2016ء کو اختتام پذیر ہوا اور بھوپال کی مٹی کو ہی اپنے لیے دائمی آرام گاہ بنایا۔ بھول کی سرزمین کو لکھنؤ اور دلی کے بعد ادب اور زبان کے حوالے سے منفرد مقام حاصل ہے۔ بھوپال میں شاعروں اور ادیبوں کو عزت و احترام سے نوازا گیا، بھوپال

تہذیب و ثقافت ، زبان ادب کے حوالے سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ پروفیسر آفاق احمد کو اسی علمی وادبی ماحول میں پرورش پانے کا اعزاز حاصل ہوا، اسی جگہ وہ درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے۔ وہ بھوپال کے ایم ایل بی کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہے۔ نامور استاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کئی حیثیتوں کے مالک تھے وہ شاعر، ادیب ، محقق، مفکر، صحافی، مترجم، افسانہ نگار، انشاپرداز ، کہانی نویس کی ، حیثیت رکھتے تھے۔ پروفیسر آفاق احمد کا ' مثنوی سحر البیان ' کی ترتیب و مقدمہ بہت معروف ہے اس کا ذکر جناب حکیم عبدالحنان صاحب نے بھی اپنی تقریر میں کیا۔ انہوں نے مزاح نگار ملا رموزی کی غیر مطبوعہ کہانیوں کا مجموعہ بھی ترتیب دیا، ہندو افسانہ نگار راج گوپال اچاریہ کی کہانیوں کا مجموعہ بھی ترتیب دیا، پریم چند شناسی اور اقبالؔ پر بہت کام کیا۔ غالبؔ کے حوالے سے انہیں استاد تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی ادبی اداروں کے معتمد کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ان اداروں کو بام عروج پر پہنچایا۔ پروفیسر آفاق احمد کے انتقال سے اردو دنیا ایک نامور ادب ، شاعر، محقق، مصنف اور استاد سے محروم ہو گی۔ شہر قائد سے تعلق رکھنے والے ادیب پروفیسر آفاق احمد کے انتقال پر اپنے انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ بلا شبہ پروفیسر آفاق احمد اپنی علمی وادبی خدمات کے حوالے سے اردو دنیا میں انتہائی عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد

رکھا جائے گا۔ ہماری ویب رائیٹرز کلب ادیب، شاعر و محقق کی جدائی پر اپنے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتا ہے اور دعا گو ہے پروردگار مرحوم کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ آخر میں احمد علی برقی اعظمی کے نذرانہ پروفیسر آفاق احمد پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

پروفیسر آفاق احمد کا نہیں کوئی جواب
شخصیت ہے جن کی اقصائے جہاں میں انتخاب
ہیں سپہرِ علم و دانش پر وہ مثلِ ماہتاب
اُن کے ہیں عصری ادب میں کارنامے بے حساب
اُن کے رشحاتِ قلم ہیں مرجعِ دانشوراں
جن سے اربابِ نظر ہوتے رہیں گے فیضیاب
کر رہے ہیں ضوفشاں شمعِ ادب بھوپال میں
اُن کے فکر و فن کی کم ہوگی نہ ہرگز آب و تاب
اُن کے گُلہائے مضامیں سے معطر ہے فضا
ہیں وہ گلزارِ ادب میں سرخرو مثلِ گُلاب
اپنے قول و فعل سے اردو کے ہیں خدمتگذار
ہے دعا شرمندۂ تعبیر ہوں سب اُن کے خواب
عمر بھر رخشِ قلم کرتا رہے جولانیاں

مرجعِ اہلِ نظر ہو اُن کی برقیؔ ہر کتاب

(مئی 3،2016ء)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری۔برصغیر کے معروف ادب وداشور

برصغیر کے معروف ادیب و دانشور، ماہر اقبالیات اور ماہر غالبیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اسلوب احمد انصاری 4 مئی کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔پروفیسر اسلوب احمد انصاریانتقال پر ہماری ویب رائیٹرز کلب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر رئیس صمدانی نے اپنے تعزیتی پیغام میں اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رحلت کو انگریزی اور اردو ادب کا نقصان عظیم قرار دیا ہے۔پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا شمار اردو کے چند بڑے علمی اور ادبی اور نقادوں میں ہوتا تھا جنہوں نے اردو تنقید کو نئی جہت اور نئے رجحانات سے آشنا کیا۔پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے برسوں خدمات انجام دیں۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو میں بھی خوب لکھا، انہیں اقبالیات کا ماہر سمجھا جاتا تھا، وہ غالبیات کے بھی ماہر تھے۔ان کے متعدد کتب لندن اور امریکہ سے شائع ہوئیں۔ وہ 1925 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور 91 کی عمر میں علی گڑہی کو اپنی آرام گا بنایا۔ان کی تدفین علی مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے انتقال سے اردو زبان اپنے ایک مضبوط ستون سے محروم ہو گئی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جو کبھی پورا نہیں ہوگا۔ ہماری ویب رائیٹرز کلب پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے انتقال پر انتہائی دکھ اور افسوس کا اظہار کرتا ہے اور دعا گا ہے کہ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا ہو۔ آمین۔

رابندر ناتھ ٹیگور۔بنگالی زبان کا شیکسپئر

مئی دنیائے ادب کی نامور شخصیت شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مکالمہ نگار، 7 موسیقار، نغمہ نگار، مصور (پینٹر)، فلسفی، اداکار اور تعلیم کے شعبہ میں اعلیٰ خدمات انجام دینے والے رابندر ناتھ ٹیگور کا 155 واں یوم پیدائش ہے۔ ٹیگور 7 مئی 1861 ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے ، ہندوستان پر اس وقت برطانوی راج تھا۔ اس کی زبان بنگالی اورانگریزی تھی۔ نسلاً برطانوی انڈین اور قومیت بنگالی تھا۔ اس کا اصل نام روبندر ناتھ ٹھاکر تھا۔ یہ ٹھاکر سے ٹیگور بن گیا۔ ٹیگور کم عمری میں ہی لکھنے کی جانب راغب ہوا، اس کی اولین کتاب اس وقت شائع ہوئی جب اس کی عمر 17 برس تھی۔ ٹیگور کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل نہیں کی وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے 1878 میں انگلستان گیا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ڈگری لیے بغیر واپس آگیا اور فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے طور پر علم حاصل کرے گا اور اپنی شخصیت کی تعمیر کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب بھی ہوا۔ انہوں نے اپنے طور پر بنگالی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر ایسا عبور حاصل کیا جس نے انہیں دنیا کا صف اول کا قلم کار بنا دیا۔ ٹیگور نے بنگال میں ایک مدرسہ قائم کیا جس نے بہت جلد ایک جدید جامعہ کی صورت اختیار کرلی۔ ٹیگور بنیادی طور پر بنگالی زبان میں نثر لکھی اور

شاعر کی، ساتھ ہی اس نے اپنی تحریروں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جس سے اُسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی شاعری کو بہت پسند کیا گیا یہاں تک کہ اسے 1913 میں ادب کے شعبے میں ایشیا کا پہلا نوبل انعام شاعر کی حیثیت سے دیا گیا۔ تاج برطانیہ نے دوسال بعد 1915 میں اسے 'سر' کے خطاب سے نوازا۔ برطانوی اعزازات واپس کرنے کی متعدد مثالیں موجود ہیں ٹیگور نے بھی برطانوی اعزاز واپس کرنے کی روایت کو برقرار رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکمرانی کے دوران جب جلیانوالہ باغ، پنجاب میں جنرل ڈائر کے احکامات پر ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا گیا، نہتے لوگوں پر گولیا برسائی گئیں جس کے نتیجے میں ہزاروں بے گاہ انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ انگریزی کی دہشت گردی، بربریت اور ظلم و ستم پر ٹیگور نے احتجاج کرتے ہوئے اپنا نوبل انعام واپس کردیا۔ ٹیگور کے اس اقدام کو برصغیر میں پذیرائی ملی اور وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ ٹیگور کیونکہ بنگالی تھا اسے بنگالی زبان کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے ۔ بنگلہ دیش کا قومی ترانہ اسی کا لکھا ہوا نغمہ ہے جو اس نے کبھی لکھا ہوگا۔ اس لیے کہ ٹیگور کا انتقال تو قیام پاکستان سے بھی پہلے ہوگیا تھا۔ ٹیگور میں قوم پرستی کے جذبات پائے جاتے تھے۔ وہ شروع ہی سے بنگال کی خود مختاری کے حق میں تھا۔

ٹیگور کی قوم پرستی اپنی جگہ لیکن وہ ایک اعلیٰ درجہ کا فلسفہ اور شاعر بھی

تھا۔اسے رومی، گوئٹے، بلھے شاہ اور وارث شاہ کا ہم پلہ فلسفی اور شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ جتنا اچھا شاعر تھا اتنا اچھا نثر نگار بھی۔ اسے دنیا کے چند بڑے ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ٹیگور کا ناول ’کابلی ولا‘ معروف ناول ہے جس کا 36 زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ اس موضوع پر ہندی اور اردو میں فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ دیگر ناولوں میں ٹاٹا گھونسلہ، گری رنگت والا، گھر اور دنیا، عمل در عمل شامل ہیں۔ ٹیگور کی نظم ’سونیٹ‘ جو انگریزی زبان میں ہے بہت مشہور اور شاعری میں بلند مقام رکھتی ہے۔ ٹیگور کی کتاب ’زبان کی سائنس‘ مختلف زبانوں کے تاریخی ارتقا پر مستند کتاب تصور کی جاتی ہے۔ ٹیگور ایک اچھا مصور ہونے کے ساتھ ساتھ اداکار بھی تھا، اس نے کچھ عرصہ عملی طور پر اداکاری بھی کی۔ وہ بہترین گیت نگار بھی تھا اس نے تین ہزار گیت اور سات ڈرامے تحریر کیے۔ اس کے مشہور ڈراموں میں ’ڈاک گھر‘، ’راجا‘ والمیکی کی ذہانت، چڑھاوا، راجا، ڈاک گھر اور ’گورا‘، بے حرکت، آبشار، سرخ کنیز شامل ہیں۔ بنگالی زبان میں ٹیگور کی شاعری کے مجموعوں میں بھانو سمہ ٹکا کے نغمے، مثالی، سونے کی کشتی، گیتا جلی، گیت مالا، کرین کی اڑان شامل ہیں۔ ٹیگور نے اپنی یادداشتیں بھی مرتب کیں جو جیون سمرتی یعنی ’میری یادیں‘ اور چھلبیلا یعنی ’ میرے لڑکپن کے دن ‘کے نام سے منظر عام پر آئیں۔ ٹیگور نے 150 سے زیادہ کتب تحریر کیں جن میں سے بیشتر کا دنیا کے بے شمار زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ ٹیگور کی علمیت و قابلیت اور مختلف علوم پر دسترس نے

اسے عالمی سطح کا مفکر اور دانشور بنا دیا تھا۔ اسے دنیا کے بڑی جامعات نے لیکچر کی دعوت دی وہ ان تمام جامعات میں گیا اور خطاب کیا۔

پاکستان کے حوالے سے ٹیگور اختلافی شخصیت بھی رہا۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر بنگالی تھا۔ اس حوالے سے یقینا اس کی تمام تر ہمدردیاں اور محبت بنگال اور بنگلہ کے لیے رہی ہوں گی۔ بنگلہ دیش کے قیام اس کے مرنے کے بعد ہوا۔ جہاں تک ادب اور ادیب کا تعلق ہے اس کی قومیت کچھ بھی ہو، وہ کوئی زبان بھی بولتا ہو اسے محدود نہیں کیا جاسکتا، اس بنیاد پر کہ وہ بنگلہ دیشی ہے، ہندوستان یا بھارتی یا ہندی زبان بولتا ہے، انگریز ہے، جرمن ہے، فرانسیسی ہے، چینی یا جاپانی الغرض اس کی زبان اور ملک ور قومیت کچھ بھی ہو وہ ادب اور ادیب ہے اسے کسی دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ ادب اور ادیب عالمی طور پر ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی ادب کا فروغ۔ علامہ اقبال جو شاعر مشرق اور پاکستان کا تصور پیش کرنے کے خالق ہیں ، ان کی شاعری کو اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو بھارت میں آج بھی تسلیم کیا جاتا ان کا تحریر کردہ ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' وہاں آج بھی گایا جاتا۔ کتنے ہی شاعر و ادیب ایسے ہیں جنہوں نے پاکستان ہجرت نہیں کی لیکن وہ اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندومت سے تعلق رکھنے والے کرشن چندر، منشی پریم چند، فراق گورکھپوری، بیدی اردو

کے ادیبوں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے منشی پریم چند کو اردو افسانہ نگاروں کا سرتاج کہا۔ ایوب خان کے دور حکمرانی میں ٹیگور کے گانوں پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن ادیبوں اور دشاعروں نے اسے پسند نہیں کیا اس کے خلاف آواز بلند کی یہاں تک کہ حکومت کو اپنا اقدام واپس لینا پڑا۔ ٹیگور نے مرینا لیلی دیوی سے 1883 میں شادی کی۔ اس کے پانچ بچے ہوئے جن میں سے دو کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔ ٹیگور کا انتقال 7 اگست 1941 میں 80 سال کی عمر میں ہوا۔

شاعروں کے شاعرادیبوں کے ادیب۔ پروفیسر سحرؔ انصاری

پروفیسر سحرؔ انصاری کا اصلی نام 'انور مقبول انصاری' ہے۔ سحرؔ تخلص کرتے ہیں، اپنے نام اور تخلص کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ ''میٹرک کے سرٹیفیکیٹ اور بعد کی تعلیمی اسناد میں میرا نام انور مقبول انصاری ہے۔ اسکول ہی کے زمانے میں شعر گوئی کی طرف رجحان ہوگیا تو ایک عدد تخلص سَحرؔ انصاری رکھ لیا۔ اب یہ اس قدر معروف ہوگیا کہ میں خود اپنے اصل نام کے لیے اجنبی ہوگیا ہوں''۔ ان کا خاندانی سلسلہ نسب حضرت ایوب انصاری سے جاملتا ہے اس لیے انصاری ٹھہرے۔ انصاری صاحب کے خاندان میں بعض بڑی ادبی شخصیات کے نام ملتے ہیں ان میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے والد کے بزرگوں کا تعلق مرادآباد سے جب کہ ان کی والدہ کے بزرگ میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن مرادآباد ہے، انہوں نے ہندوستان کے شہر 'اورنگ آباد' دکن میں 27 دسمبر 1941ء کو آنکھ کھولی۔ ان کے نانا معروف شاعر مولوی سمیع الزماں سرابؔ میرٹھی' اسمٰعیل میرٹھی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا لیکن وہ ایک فطری شاعر ہیں گویا شاعری کا وصفِ لطیف انہیں مالک حقیقی کی جانب سے عطا کیا گیا۔ سحرؔ انصاری نے جالبؔ مرادآبادی کے شاگرد ہیں جو جگرؔ مرادآبادی کے معاصر ہیں۔ سحرؔ انصاری نے پہلا مضمون ''میرؔ اور فانیؔ کا غم'' کے عنوان سے لکھا اس

وقت سحر صاحب نویں جماعت کے طالب علم تھے۔

ادب، شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ آرٹ سے بھی دلچسپی تھی۔ اس شعبہ میں بھی کام کیا۔ سحر انصاری کی شاعری محض انسانی عمل نہیں بلکہ اس میں ان کے اندر موجود شاعر کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ابھی تو زندگی کو ریزہ ریزہ چن رہا ہوں میں
ابھی سے یہ شکست کا سوال کیسے آگیا

ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی حاصل کی۔ 1950ء میں والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور کراچی کے مکین ہوئے۔ ناظم آباد میں رہائش اختیار کی، آج بھی ناظم آباد ہی میں رہائش رکھتے ہیں۔ کراچی کے علاقے بہادر آباد میں مقبول عام اسکول میں پڑھا، 1958ء میں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد سے بی ایس سی کیا۔ جامعہ کراچی سے تین ایم اے کیے ایک انگریزی میں، دوسرا اردو ادب میں اور تیسرا لسانیات میں کیا۔ آپ گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد کے اولین طالب علم تھے۔ اس وقت اس کالج کا نام ' سینٹرل گورنمنٹ کالج فار مین' ہوا کرتا تھا۔ 2008ء میں اس کالج نے اپنے قیام کے پچاس سال مکمل کیے تو کالج کا مجلّہ 'روایت' کا گولڈن جوبلی نمبر شائع کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی کالج کے پرنسپل تھے ئیں دیگر

ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کالج میگزین کا چیف ایڈیٹر بھی تھا۔ میگزین کے لیے سحؔر صاحب کے تاثرات اس حوالے سے ضروری اور اہم تھے کہ وہ 1956ء میں اس کالج کے اولین طالب علموں میں سے تھے۔ کالج کے جنرل رجسٹر میں سحؔر صاحب کا پہلا نام، جب کہ محمد احمد فاروقی صاحب کا دوسرا نام ہے۔ یہ بات سحؔر صاحب نے کالج کے حوالے سے اپنے تاثرات میں بیان کی ہے۔ یہ تاثرات کالج کے مجلّہ 'روایت' گولڈن جوبلی نمبر 2008ء میں ان کے مضمون ''میری درس گاہ: چند یادیں'' میں درج ہیں۔ انصاری صاحب اس کالج کے پہلے میگزین سیکریٹری اور بعد میں یونین کے صدر بھی رہے۔ کالج کا پہلا مجلّہ ڈاکٹر اسلم فرخی کی سرپرستی میں جس کے سیکریٹری انصاری صاحب تھے شایع ہوا۔ یہی وہ لمحات اور معاملات تھے جب سحؔر انصاری صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے گھر جو کالج کے نزدیک ہی ہے گیا اور ان سے کالج میگزین کے گولڈن جوبلی نمبر کے لیے تاثرات اور کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے پر گفتگو کی۔ انصاری صاحب سے میری قربت کی یہ ابتدا تھی گو میں ان کے نام، شاعری اور کام سے بہت پہلے سے متعارف تھا۔ وہ 1974ء میں جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے، میں اس وقت جامعہ کراچی کے کتب خانہ میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ ساتھ ہی شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں آنا جانا بھی رہتا تھا کچھ عرصہ میں اس شعبہ میں جزو وقتی استاد بھی رہا۔ اب ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' انصاری صاحب سے مزید قربت کا باعث ہو رہا ہے۔ کالج میگزین کے لیے سحر صاحب نے اپنا

مضمون بھی دیا جو متعلقہ شمارہ میں شامل ہے۔ اسی سال کالج کے زیر اہتمام مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ سحر صاحب نے اس مشاعرہ کی صدارت کی۔ اس طرح سحر صاحب سے تعلقات اور شناسائی کی زنجیر آگے بڑھی اور اب جب میں ہماری ویب رائیٹرز کلب کا صدر منتخب ہوا، یہ کلب آن لائن لکھنے والوں کا پہلا فورم ہے۔ لکھنے والوں کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ رائیٹرز کلب نے ای بک (E-Book) کا پروگرام بھی تشکیل اور ابتدائی طور پر 15 لکھاریوں کی ای بک تیار کی گئیں۔ ای بک کی تعارفی تقریب آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر سحر انصاری صاحب اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اس طرح سحر صاحب اور ہم رفتہ رفتہ قربت کی منزلیں طے کرتے چلے جارہے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سحؔر انصاری کا ایک شعر ؎

ہنستے چہرے بھی دھوکا ہیں، روتی آنکھیں بھی ہیں فریب
لوگ نہ جانے دل میں کیا کیا بھید چھپائے پھرتے ہیں

سحؔر انصاری نے 1973ء میں جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو سے درس وتدریس کا آغاز کیا۔ دوسرے ہی سال یعنی 1974ء میں وہ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں آگئے اور پھر اسی شعبہ کے ہو کر رہ گئے۔ جامعہ کراچی میں ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ کئی سال صدر شعبہ رہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ میں ایڈیٹر و سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ چین اور جاپان میں بھی درس و

تدریس سے وابستہ رہے۔

ہفت روزہ 'نئی جمہوریت' کے مدیر بھی رہے۔ کئی سال سے آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے سربراہ اور دیگر عہدوں سے وابستہ ہیں۔ ادارہ یادگار غالبؔ اور غالبؔ لائبریری کی ترقی اور فروغ میں اپنا حصہ ڈال چکے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے دنیا کے بے شمار ممالک میں پاکستان کی نمایندگی کرچکے ہیں۔ اردو سے تعلق اور انسیت رکھنے والا شاید ہی کوئی ادیب و شاعر ایسا ہوگا جو سحرؔ انصاری کے نام سے واقف نہ ہو۔ کراچی کے باسی توان سے خوب خوب متعارف ہیں۔ حکومت پاکستان کی جانب سے پروفیسر سحر انصاری کو ان کی علمی و ادبی خدمات پر ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا گیا۔ اس سے قبل 2005ء میں انہیں تمغہ امتیاز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ سحرؔ انصاری کا کہنا ہے کہ وہ سفارش کے قائل نہیں انہوں کبھی اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے کبھی کسی سے کسی بھی قسم کی سفارش نہیں کرائی۔ وہ اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے۔ انہیں جو کچھ ملا ہے وہ خدا کی دین ہے۔ ان کے مجموعہ کلام 'خدا سے بات کرتے ہیں' میں شامل ایک شعر ان کے اس خیال کی عکاسی کرتا ہے۔

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

پروفیسر سحرؔ انصاری کی شخصیت مختلف پہلو لیے ہوئے ہے۔ وہ شاعر بہت اچھے ہیں، نثر نگاری بھی ان کی خوب تر ہے، نقاد ہیں، خوش گُلو و خوش اِلحان ہیں، خوش وضع و خوش قطع ہیں، شیریں زبان و شیریں کلام بھی۔ خوش طرز و خوش اِقبال بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک تمغے کے بعد دوسرے تمغے سے حکومت نے نوازا۔ ان کے شخصیت کے ظاہری خد وخال یا ان کا حلیہ بیان کیا جائے تو کچھ اس طرح کی صورتِ حال ابھر کر سامنے آتی ہے۔ گندمی رنگ، دراز قد، فربہ جسم، اب کچھ کمر جھک گئی ہے، موٹی کٹورہ آنکھیں جن میں سوجھ بوجھ کی چمک، کھڑے نقش، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، سبک رفتار، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، ان کی شخصیت کی ایک انفرادیت اور پہچان ان کی زلفوں کا دراز ہونا ہے، مخصوص روایتی لباس کالی شیروانی اور علی گڑھ پیجامہ ہے۔ سحرؔ صاحب کے قبیلے کے ایک شاعر ریاضؔ انصاری جیوری نے زلفوں کے حوالے سے خوبصور شعر کہا ہے۔

آپ گھبرائیں نہ زلفوں کی پریشانی سے
یہ سنور جاتی ہیں کچھ اور پریشاں ہو کر

پروفیسر سحر انصاری صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری، معصومیت اور شاعر ہونے کا خوشگوار اظہار نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنی

وضع قطع کے حوالے سے سحرؔ انصاری کا یہ خوبصورت شعر دیکھئے۔

یہی ہے وضع ہماری یہی ہماری شناخت
کبھی سنا ہے پرندوں کو پَر بدلتے ہوئے

مجلسی اور دوست دار آدمی ہیں، لوگوں میں رہنا پسند کرتے ہیں، گفتگو کرنا، ادبی موضوعات خاص طور پر شاعری اور شاعروں کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ بولتے زیادہ ہیں، کراچی کی ادبی محفلوں کے دولھا بنے نظر آتے ہیں، صدر محفل اور صدرِ مشاعرہ کی حیثیت سے خوب خوب جچتے ہیں اور اس کا حق بھی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ معروف ادیب مشفق خواجہ مرحوم نے اپنے ایک ادبی کالم میں سحر صاحب کو ''شہرِ انصاری'' کہہ کا پکارا تھا۔ ان کے ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ سحرؔ انصاری نے اس موضوع پر کیا خوب شعر کہا۔

سحرؔ اک دوسرے سے اس طرح ملتے ہیں ہم اکثر
ہمارے درمیاں تقدیر تک آنے نہیں پاتی

ادبی محفلوں کو سجانے کی بات اپنے اس شعر میں حسین انداز سے کہی۔

اپنے خوں سے جو ہم شمع جلائے ہوئے ہیں
شب پرستوں پہ قیامت بھی تو ڈھائے ہوئے ہیں

سحؔر انصاری نے کم کہا جو کچھ کہا اچھا کہا، کم لکھا جو کچھ لکھا معیاری لکھا، درویش صفت ہیں، ان کا نثری و نظم کا ذخیرہ مطبوعہ سے زیادہ غیر مطبوعہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ زندگی میں اس فکر میں نہیں رہے کہ ان کی کتابیں دھڑا دھڑ منظر عام پر آتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فیض احمد فیضؔ پر ایک نثری کتاب ''فیض کے آس پاس'' 2011ء میں جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر نے شایع کی۔ اس سے قبل انہوں نے جوشؔ کے مقالات ''مقالات جوش'' کے عنوان سے مرتب کیے۔ 'ذِکرِ غالبؔ ذِکرِ عبدالحق' سحر انصاری کی نثری کتاب ہے۔ 1971ء میں غالب لائبریری کے تحت ہفتہ مطالعہ عبد الحق یکم ستمبر سے 7 ستمبر 1971ء کو منایا گیا۔ یہ کتاب اسی سلسلے کے حوالے سے مرتب کی گئی۔ اس کتاب میں مقدمے کا مقدمہ سحر انصاری کا تحریر کردہ ہے، بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبد الحق کی تحریر کردہ روئیداد مقدمہ غالب کے علاوہ ان کا ایک مضمون غالب اور میرن صاحب' شامل ہے۔ آخر میں اشاریہ عبدالحق دیا گیا ہے۔ 'تنقیدی افق' سحؔر انصاری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں سینتیس مضامین دو حصوں میں منقسم ہیں ایک 'نظری تنقید' دوسرا 'ادب تا ادب'، دوسرے حصہ میں عملی تنقید کے عنوان سے مختلف تخلیق کاروں اور ان کے فن کا مطالعہ ہے۔ یہ کتاب جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈیز سینٹر نے شایع کی ہے۔ ''اسالیب'' کے عنوان سے 2010ء میں سحؔر انصاری صاحب کی سرپرستی میں ایک کتابی سلسلہ (سالنامہ) شروع کیا گیا۔ اس ترتیب وتدوین سحؔر انصاری کی شاعرہ بیٹی ڈاکٹر 'عنبر

حسیب عنبرؔ کے سپرد ہے۔ اس ادبی کتابی سلسلہ کا پہلا شمارہ نومبر۔ دسمبر 2010ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا شمارہ جنوری۔مارچ 2011ء تھا، تیسرا اپریل۔ جون 2011ء، چوتھا جولائی۔دسمبر 2011ء اور پانچواں جولائی 2011ء۔دسمبر 2012 میں شایع ہوا۔ یہ کتابی سلسلہ چیف ایڈیٹر کی علمی مصروفیات کے باعث وقتی طور پر بند ہے۔

سحرؔ انصاری کے شعری مجموعے اب تک دو ہی سامنے آئے ایک 'نمود' کے عنوان سے دوسرا 'خدا سے بات کرتے ہیں' کے عنوان سے شایع ۔پہلے اور دوسرے مجموعے کا دورانیہ تیس برس پر محیط تھا، اب دوسرے مجموعہ کو منظر عام پر آئے پانچ برس ہو چکے ہیں۔دونوں مجموعوں کے درمیان طویل مدت کی وضاحت سحرؔ انصاری نے اس طرح کی کہ ' خدا سے بات کرتے ہیں 'اور ' نمود' کے مابین جو تیس سال کی مدت حائل ہے اس طویل سناٹے میں میری ذاتی بے توجہی ، بے ترتیبی اور بے نیازی کا دخل رہا ہے۔' پہلے نثری کتاب ' فیض کے آس پاس' کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سحر صاحب نے فیضؔ سے اپنے مراسم، قربت، نظریات اور دیگر موضوعات پر مضامین تحریر کیے۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے 'سرآغاز' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''پروفیسر سحرؔ انصاری ملک کے علمی وادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں گزشتہ چار پانچ عشروں میں انہوں نے جس سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ ادبی موضوعات پر تحریری اور

زبانی طور پر اظہار خیال کیا اور ادبیات کی تدریس کا اہم فریضہ سرانجام دیا اس کی ملک بھر میں پذیرائی بھی ہوئی اور اس کی وجہ سے ان کے ارادتمندوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم ہوا۔ پروفیسر سحرؔ انصاری کا ایک خاص وصف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور تخلیقی زندگی کے اس مرحلے میں ان کی مدد کرنا ہے۔ جب یہ مدد سب سے زیادہ ضروری اور اگلی مسافتوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکی ہے۔ کتنے ہی اچھے تخلیق کار ان کی حوصلہ افزائی و رہنمائی کے سبب اب بڑے اعتماد کے ساتھ گلشن ادب کی آبیاری کر رہے ہیں''۔

نمود'' سحرؔ انصاری کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ادبستان جدید نے 1976ء میں شائع'' کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سحرؔ صاحب کو جامعہ کراچی سے منسلک ہوئے تین سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن شاعری کرتے دو دہائیوں سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ 'نمود' میں سحرؔ انصاری کی 20 سال کی شاعری ہے۔ اس میں ان کی غزلوں اور نظموں کا وہ وہ انتخاب ہے جو 1955ء سے 1975ء تک پر محیط ہے۔ سحرؔ صاحب معروف شاعر فیضؔ کے حلقہ احباب میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلا کا فلیپ فیضؔ صاحب سے لکھوایا اور فیضؔ صاحب نے بہت ہی خوبصورت فلیپ لکھا۔ فیضؔ نے لکھا''نمود'' ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق ہے، جسے جدید ادب میں ایک معتبر اضافہ سمجھنا چاہیے۔ سحرؔ کے کلام میں ابہام یا ایہام کی کوئی آمیزش اور دوسرے زندگی کے

روز مرہ مظاہر سے پل یا سڑک، شفاخانہ ہو یا تجربہ گاہ کسی ذہنی یا جذباتی تجربہ کی تجرید اور کشیدگی کے بعد جس طرح سحرؔ انھیں نظم کرتے ہیں وہ انھیں سے مخصوص ہے''۔ ''نمود'' کا پیش لفظ پروفیسر مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں'' سحرؔ کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کی نظمیں آپ سے اس ''شخص'' کا تعارف کرادیتی ہیں جو آپ میں موجود ہے۔ سحرؔ کی آواز میں دکھ ہے مگر اس کے ساتھ یہ ڈری ہوئی ، سہمی ہوئی آواز نہیں ہے یہ بے خوف اور بے لاگ آواز ہے، ان کی ایک نظم بھی ایسی نہیں جس میں کہنے کی بات کہنے کی طرح نہ کہی گئی ہو''۔ 'نمود' کے بارے میں خود سحرؔ کی رائے یہ ہے کہ 'نمود میرے لیے سووینیر کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ فیض احمد فیضؔ، پروفیسر مجتبیٰ حسین، آذرزوبی، اقبال مہدی کی محبتوں سے مزین ہے اور اس کی تدوین میں محسن بھوپالی ، عالم تاب تشنہؔ اور مرزا ظفرالحسن کا خلوص شامل ہے ، وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں۔

سحرؔ انصاری کا دوسرا مجموعہ کلام 'خدا سے بات کرتے ہیں' 2010ء میں اکادمی بازیافت نے شائع کیا۔اس میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی، سحرؔ نے نثری نظمیں بھی کہیں متعدد اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ مجموعے میں مبین مرزا کی رائے شامل ہے وہ لکھتے ہیں 'سحر انصاری عہدِ جدید کے اُن قلیل التعداد شعرا میں ہیں جو نہ صرف یہ کہ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ علم و آگہی ایک دوسرے کے لیے

لازم و ملزوم ہیں بلکہ انھوں نے اپنی ذہنی درّاج، اور متواتر اور ہمہ جہت مطالعے سے اپنے شعر و سخن کو وہ آبدی ہے جو اُن کی شناخت کا ایک جدا حوالہ بنتی ہے'۔

سحؔر انصاری علمی ادبی سرگرمیوں کے میں گزشتہ کئی برسوں سے فعال ہیں۔ آرٹس کونسل میں کئی سالوں سے ادبی کمیٹی اور دیگر انتظامی امور میں شامل رہتے ہیں۔ غالب لائبریری سے بھی وابستہ رہے۔ اکتوبر 2015ء میں سحؔر انصاری کو ایک اور اہم اور با عزت ذمہ داری سونپ دی گئی۔ انہیں انجمن ترقی اردو پاکستان کا خازن اور نگراں ادبی امور بھی مقرر کردیا گیا۔ یہ عہدہ بظاہر ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت، مزاج اور طبیعت سے مُتضاد نظر آتا ہے لیکن ماضی میں انجمن ترقی اردو میں اس عہدہ پر کئی معروف ادیب و دانش ور خدمات انجام دے چکے ہیں ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، افتخار احمد ادنی، عبدالخالق عبد الرزاق، اظفر رضوی اور ڈاکٹر جاوید منظر شامل ہیں۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو کے نو منتخب عہدیداران نے پاکستان کے صدر جناب ممنون حسین سے ملاقات کی، نو منتخب عہدیداران میں صدر اعزازی ذوالقرنین جمیل راجو جمیل) جو جناب جمیل الدین عالی کے صاحبزادے ہیں، پروفیسر سحؔر انصاری) اعزازی خازن) ڈاکٹر فاطمہ حسن (معتمد اعزازی)، اور متولیان میں ڈاکٹر انوار احمد،) ڈاکٹر اختر شمار، ڈاکٹر یوسف خشک شامل تھے۔

اردو کے معروف ادیب و دانشور معین الدین جینابڑے نے ڈاکٹر خالد ندیم کی مرتب کردہ کتاب 'رقعاتِ مشفق خواجہ' کے پیش لفظ میں لکھا کہ 'بابائے اردو کی سانسوں کا سفر ختم ہوا، لیکن کام رُکا نہیں کہ وہ مشفق خواجہ کی سانسوں میں زندہ تھے۔ مشفق خواجہ کی سانسوں کا سفر ختم ہوا لیکن کام میں پھر بھی کھنڈت نہیں پڑی کہ احباب کی سانسوں میں وہ بھی زندہ ہیں'۔ معین الدین جینابڑے کی اس بات کو آگے بڑھایا جائے تو صورت کچھ اس طرح کی بنتی ہے کہ اردو کی ترقی کا سفر انجمن ترقی اردو کے سائے تلے، بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا وہ بابائے اردو کی سانسوں پر ختم ضرور ہوا لیکن رکا نہیں اور ڈاکٹر مشفق خواجہ سے ہوتا ہوا، جمیل الدین عالیؔ کی سانسوں تک پہنچا، عالیؔ جی کے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد انجمن کی ترقی کا سفر جاری و ساری ہے اور اب یہ سفر ایک نہیں بلکہ کئی سانسوں میں منتقل ہو چکا ہے ان میں راجو جمیل، ڈاکٹر فاطمہ حسن اور پروفیسر سحرؔ انصاری کی سانسوں تک پہنچ چکا ہے۔انشاء اللہ بابائے اردو کا لگایا ہوا یہ پودا جو اب تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے ترقی کے منازل طے کرتا رہے گا۔ پاکستان میں اردو کے صفِ اول کے ادیب و شاعر پروفیسر سحرؔ انصاری کی علمی و ادبی کاوشوں کے اعتراف میں 2005ء میں انہیں تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔اب 2015ء میں حکومتِ وقت کی جانب سے وہ ستارہ امتیاز سے سرفراز ہوئے۔

پروفیسر سحر انصاری نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی وہ علم وادب کے فروغ وترقی کے شعبہ میں خدمات انجام دینے والے ادبی و علمی اداروں کی رہنمائی و سرپرستی میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ ادیبوں اور شاعروں کے دوست اور ان کی انجمنوں کے خیر خواہی میں تن من دھن سے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ موجودہ دور انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا دور ہے۔ انٹرنیٹ معلومات کے ذخیرہ کرنے، بہ آسانی حصول میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ جس موضوع پر چاہیں جدید معلومات سیکنڈوں میں سامنے آجاتی ہیں۔ اب انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کی ویب سائٹ بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں اور بے شمار علمی و ادبی مواد، نثر و نظم سافٹ فارم میں دستیاب ہے۔ 'ہماری ویب پاکستان میں اردو کی سب سے زیادہ دیکھی جانے والی ویب سائٹ (Hamariweb)' ہے جس کا 14 اگست 2007 کو ہوا تھا۔ یہ ویب سائٹ جدید تقاضوں، جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہے جس کے مقاصد میں پاکستانی کلچر کا فروغ، معاشرتی اقدار کی ترویج، قومی زبان اردو کے فروغ وترقی کے ساتھ ساتھ آن لائن لکھنے والوں اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں آن لائن پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے۔ ہماری ویب کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی ایک مقبول ویب سائٹ کا درجہ حاصل ہے۔ 2014ء میں ہماری ویب کے زیر اہتمام ''رائٹرز کلب'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد آن لائن لکھنے والوں کو ایک فورم فراہم

کرنا، ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ رائیٹرز کلب نے اپنے مقاصد کی تکمیل تیار کیں جن کی تعارفی تقریب آرٹس (E-Book) میں ابتدائی طور پر 15 ای بک ٹ ن کانسل آف پاکستان میں منعقد ہوئی، سحؔر انصاری اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔ اس طرح سحؔر صاحب سے ہمارے تانے بانے آگے بڑھتے گئے۔

اب سحؔر انصاری صاحب نے سرپرست اعلیٰ کا اعزاز رائیٹرز کلب کو بخش دیا ہے۔ اب سحؔر صاحب کے ساتھ ہماری قربتیں اور زیادہ ہوجائیں گی بلکہ ہوگئیں ہیں۔ حال ہی میں میرے چند احباب نے میری مطبوعہ اور برقی کووشوں پر مبنی توضیحی کتابیات مرتب کی جو اس وقت زیر اشاعت ہے۔ مَیں نے پروفیسر سحؔر انصاری صاحب سے کتاب کے فلیپ کے لیے ان کی رائے کی درخواست کی۔ میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ سحؔر صاحب نے اس کتابیات کے حوالے سے میرے بارے میں چند کلمات تحریر فرمائے جو اس کتاب کے فلیپ پر شایع ہوئے۔ سحؔر انصاری کے مطابق ''ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی ایک ہمہ صفت موصوف ہیں۔ اس دور میں جب جہل اندھیرے پھیلانے والے ہات اپنے عمل پر زرا بھی شرمندہ نہیں ڈاکٹر صمدانی حرفِ خیر اور فروغ کتب کی شمعیں روشن کرتے جاتے ہیں۔ کتب خانوں اور فن کتب داری کے تو وہ بانیوں میں سے ہیں لیکن انھوں نے کتابوں اور مقالات کی تصنیف کا بھی حق ادا کردیا۔ مطبوعہ کتب کی تعداد ۳۳ ہے اور مقالات کی تعداد پانچ

سو سے زاید ہے۔ ہمارے ملک میں اشاریہ سازی اور کتابیات کی ترتیب و تدوین کو عموماً غیر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اہم علم اور اہل تحقیق جانتے ہیں کہ یہ تحقیق کی دنیا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی تحریروں کی توضیحی کتابیات شایع ہو رہی ہے۔ ان میں اسلوب اور موضوعات کا جو تنوع ہے وہ یقیناً محققین کے کام آئے گا۔ ڈاکٹر صمدانی اب تحریر سے آگے بڑھ کر E-Book کی دنیا میں بھی رہ نمایانہ کردار ادا کر رہے ہیں وہ ہماری ویب رائیٹرز کلب' کے بھی سربراہ ہیں اور ان کا حلقہ اثر وسیع سے

وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ صمدانی صاحب سے میرے ذاتی مراسم بھی ہیں وہ مجھے ہمیشہ سے خوش اخلاق، متبسم، علم نواز اور ذمے دار انسان کی حیثیت سے عزیز ہیں۔ میں توضیحی کتابیات کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں''۔ آخر میں پروفیسر سحر انصاری کے مجموعوں 'خدا سے بات کرتے ہیں' اور 'نمود' سے

انتخاب ۔

بدلتے موسموں کی آگہی کس کی ضرورت ہے
میں اکثر سوچتا ہوں شاعری کس کی ضرورت ہے
مکان کو تو خبر بھی نہیں ہوئی ہوگی
جو دکھ ہوا ہے ہمیں بام و در بدلتے ہوئے
اے زمیں تو جو بھی ہو لیکن ہمارا ساتھ دے

زندہ رہنے کے لیے صرف آسماں کافی ہے
ہم تو ایک حرف محبت سے بھی مر سکتے ہیں
تیر کیوں ڈھونڈ کے لاتے ہو نشانے کے لیے

رہے تھے جسم و جاں کی طرح ساتھ ہم
پھر کچھ تو تم بدل گئے کچھ ہم بدل گئے

اک تبسم جس کو ہونٹوں پر سجایا تھا سحر
آنکھ میں آئے ہوئے آنسو سے پہچانا گیا

دائرے میں وقت کے خود کو فنا کرتے چلیں
آئیں رہنے کی کوئی قیمت ادا کرتے چلیں

! تجھے معلوم تو ہوگا میری جاں
تجھے اک شخص نے چاہا بہت ہے

وصال و ہجر سے وابستہ تہمتیں بھی گئیں
وہ فاصلے بھی گئے، اب وہ قربتیں بھی گئیں

کیا خبر تھی ترے انداز گریز
صرف ملنے کے بہانے ہوں گے

حرف صداقت کا نام آپ نہ بدلیں سحر
لوگ خفا ہیں تو ہوں، لوگ خفا ہی تو ہیں
میں زمانے کو آخر بُرا کیوں کہوں

جانتا ہوں کہ خود ہی زمانہ ہوں میں
نہ کسی سے کرم کی امید رکھیں ، نہ کسی کے ستم کا خیال کریں
ہمیں کون سے رنج ملے ہیں نئے کہ جو دل کے زیاں کا ملال کریں
میرے قبضے میں نہ رفتہ ہے نہ آیندہ ہے
اک یہی لمحۂ موجود ابھی زندہ ہے
اب ایک مرحلۂ ترکِ دوستی یہ ہے
کہ پہلے تجھ سے خفا تھا اور اب خفا بھی نہیں
سحؔر انصاری کی ایک خوبصور غزل ۔
سزا بغیر عدالت سے میں نہیں آیا
کہ باز جرم صداقت سے میں نہیں آیا
فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا
اڑا کے لائی ہے شاید خیال کی خوشبو
تمہاری سمت ضرورت سے میں نہیں آیا
تیرے قریب بھی یاد آ رہے ہیں کار جہاں
بہت قلق ہے کہ فرصت سے میں نہیں آیا
گزر گئے یوں ہی دو چار دن اور اس کے بعد
یہی ہوا کہ ندامت سے میں نہیں آیا

ہمیشہ ساتھ رہا ہے سحر میرا سورج
گزر کے وادیٔ ظلمت سے میں نہیں آیا

(مئی 8،2016)

وزیر اعظم، جوش نہیں ہوش کی ضرورت ہے

پانامالیکس نے پاکستان کے سیاسی ماحول میں ہل چل ہی نہیں مچائی بلکہ تہلکہ مچا کے رکھ دیا ہے۔ سیاست میں گویا بھوچال آگیا ہے۔ سیاسی موسم نقطہ عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ وزیراعظم میاں نواز شریف اپنے نرم مزاج اور شائستہ طرز تکلم کی حامل شخصیت کے طور پر اپنا ایک مثبت مقام رکھتے ہیں۔ ہم 2013 سے ان کا تیسرا دور حکمرانی دیکھ رہے ہیں ۔ ان کا پہلا اور دوسرا دور بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ، بے نظیر، پرویز مشرف ، آصف علی زرداری اور دیگر سیاسی رہنماؤں کی مخالفت کو انہوں نے بہت ہی تحمل اور برداشت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ دور حکمرانی میں عمران خان کے جلسے ، جلوسوں حتیٰ کہ دھرنوں کے دنوں میں جب تیسرے ایمپائر کی انگلی اٹھنے کے اشارے بھی ملتے نظر آرہے تھے میاں صاحب اس قدر خوف زدہ یا پینک نظر نہیں آئے جتنے وہ پانامالیکس کے سامنے آجانے کے بعد نظر آرہے ہیں۔ عمران خان کی تند و تیز مخالفت ، پیپلز پارٹی کے ایک مضبوط دھڑے کی مخالفت کے نتیجے میں ہونے والی گولا باری کے نتیجے میں پریشان اور حواس باختہ ہوگئے ہیں۔ میاں صاحب کا طرز عمل ، سیخ پا ہونا، سخت اور گرم لہجے میں تند و تیز زبان کا استعمال ، میاں صاحب کو اپنا اقتدار ہاتھ سے نکلتا تو نظر نہیں آرہا، کہیں انہیں یہ ڈر اور خوف تو نہیں ہو رہا کہ

پاکستان کی اعلیٰ عدالت کی سربراہی میں قائم ہونے والے کمیشن نے اپوزیشن کے بنائے ہوئے ٹرمس آف ریفرنس TRO's کی روشنی میں غیر جانبدارانہ تحقیق کی تو کہیں دودھ کا دودھ پانی کا پانی نہ ہوجائے۔ سیف الرحمٰن کو تو کامیابی حاصل نہ سکی کہیں پاناما لیکس حکومت کا دھڑن تختہ نہ کردیں۔

گزشتہ دنوں سکھر تا ملتان موٹر وے کے افتتاح کے موقع پر سکھر میں انتہائی مختصر مگر انتہائی مہنگے دورے پر میاں صاحب نے اپوزیشن کے جو لتے لیے، جس زبان میں انہوں نے اپنے مخالفین سے گفتگو کی، ان کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ میاں صاحب محسوس کر رہے ہیں کہ اگر عمران خان، بلاول بھٹو زرداری اور سید اعتزاز احسن اگر اسی طرح حکومت پر چڑھائی کرتے رہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو میاں صاحب کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ میاں صاحب زور خطابت میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے پاکستان کی اپوزیشن اور دہشت گردوں کو ایک ہی مقصد کے لیے کام کرنے والا کہہ ڈالا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اپوزیشن بقول میاں صاحب کے وہی مقاصد رکھتی ہے جو دہشت گرد رکھتے ہیں تو پھر تو ان کے خلاف بھی وہی آپریشن ہونا چاہیے جو دہشت گردوں کے خلاف ہو رہا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں میاں صاحب آئندہ یہی کچھ نہ کہہ دیں کہ جو آپریشن دہشت گردوں کے خلاف ہو رہا ہے وہی اپوزیشن یا ان لوگوں کے خلاف بھی ہو جو پاناما لیکس کے حوالے سے شفاف تحقیقات کا مطالبہ

کر رہے ہیں۔ پھر میاں صاحب نے پاناما لیکس کی تحقیقات کو ایک سال قبل ہونے والے تحریک انصاف کے دھرنوں سے بھی جوڑ دیا۔ حالانکہ ان دھرنوں کا موجودہ بحران سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

بات کچھ ہو بھی پاناما لیکس نے میاں برادران کی حکومت کے پاؤں تلے زمین نکال کر رکھ دی ہے۔ ابھی تو اپنے آصف علی زرداری کھل کر میاں صاحب کی مخالفت میں نہیں، بعض حلقوں کا تو خیال ہے کہ زرداری صاحب میاں صاحب کو اپنی جانب جھکانے کے لیے کچھ دباؤ ڈلوا رہے ہیں، اگر زرداری صاحب دل سے میاں صاحب کی مخالفت شروع کردیں جس کے آثار دکھائی نہیں دیتے ، اس کے علاوہ ایم کیو ایم اپنے داخلی اور خارجی انتشار کے باعث کھل کر میاں صاحب کی مخالفت کرنے کی پوزیشن میں نہیں، ان دونوں کی وجہ سے میاں صاحب پر دباؤ کچھ کم ہے۔ بصورت دیگر حالات اس سے کہیں مختلف ہوتے۔ سیاسی صورت حال کو بگاڑنے میں سیاسی عناصر کا پورا پورا ہاتھ ہوتا ہے۔ میاں صاحب کی کچن کیبنٹ پاناما لیکس کے معاملے پر کسی ایک بات پر متفق نہیں ، کوئی وزیر کوئی بیان دے رہا ہے تو کوئی وزیر کچھ کہتا نظر آ رہا ہے۔ وزیر کہہ رہے ہیں کہ آف شور کمپنیاں شریف خاندان کی نہیں جب کہ میاں صاحب کے صاحبزادگان اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کمپنیاں ہماری ہیں۔ اس قسم کے بیانات نے حالات کو خراب کیا، اپوزیشن نے اس سے فائدہ اٹھایا ، اپوزیشن کا کام تو تاک میں رہنا ہوتا ہے

کہ ادھر حکومت نے کوئی غلط کام کیا، اس نے فوراً اس کا واویلا مچا کر حکومت گرانے کی کوشش کی۔ غلطی اس وقت ہوئی جب میاں صاحب نے کمیشن کے بنانے کا اعلان تو کردیا اپنے طور پر بنا کر قوم کے سامنے TRO's لیکن اس کے ضوابط یعنی ٹرمس آف ریفرنس رکھ دئے۔ مانا یہ کام حکومت کا ہی ہے لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ ہمارا احتساب کرو لیکن اس طریقے سے کرو۔ میاں صاحب اب زمانہ بدل چکا ہے، آزاد میڈیا کا دور ہے، جمہوریت ہے، بولنے کی آزادی ہے۔ اب کوئی بھی خواہ حکمراں ہی کیوں نہ ہر کام اپنی مرضی سے نہیں کرسکتا۔ اگر اس مرحلے پر حکومت اپوزیشن کو اعتماد میں لے لیتی اور انہیں ضوابط کی تشکیل میں شریک کرلیتی تو بات اتنا آگے نہ جاتی، حکومت نے اِسے معمولی نوعیت کا معاملہ سمجھا اور اپنے طور پر ضوابط کا اعلان کردیا اس کے نتیجے میں اپوزیشن نے سخت قسم کے ٹرمس آف ریفرنس بنا کر حکومت کے سامنے پیش کردیے ان نے حکومت کو بیخ پا کردیا کیونکہ ان ضوابط کا واضح پیغام TRO's ٹرمس آف ریفرنس یہ ہے کہ تحقیقات سب سے پہلے شریف خاندان کی پانا مالیکس کے حوالے سے کی جائیں جب کہ حکومت اس کمیشن کے کام کو طول دینے کے موڈ میں تھی۔ یعنی قیام پاکستان سے تحقیق کرتے کرتے کمیشن جب تک پانا مالیکس تک پہنچے گا، موجودہ حکومت کا اقتدار ختم ہوچکا ہوگا۔ چنانچہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اپوزیشن اتنی بھی کچی گولیاں کھیلی ہوئی نہیں۔ انہوں نے ترپ کا پتہ حکومت کی جانب دے مارا جس سے میاں صاحب اور ان کی ٹیم آگ بگولہ ہوگئی۔ چیخ و پکار

پریشانی، پریس کانفرنس پر پریس کانفرنس، جو منہ میں آرہا اگل رہے ہیں۔ اس سے، صورت حال بہتری کے بجائے خراب ہورہی ہے۔ وزیر اعظم کی بات درست ہے کہ وہ اس مسئلہ پر کسی سے ڈکٹیشن نہیں لیں گے۔ لینی بھی نہیں چاہیے لیکن جمہوریت کا خوبصورت حسن یہی ہے کہ مخالفین کو بھی ساتھ لے کر چلا جائے۔ اچھا ہوا کہ اپوزیشن پر بات چیت اور باہمی صلاح مشورہ پر مسئلہ کو طے کرنے کا عندیہ دیاTRO's نے بھی اور وزیر اعظم نے بھی اپوزیشن کو کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی جو پاناما لیکس پر بنائے پر اتفاق پیدا کرے گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میاں TRO's جانے والے کمیشن کے لیے صاحب شروع ہی میں چھوٹے میاں صاحب سے ملاقات کر لیتے اور یہ فیصلہ شروع ہی میں ہوجاتا جو اب ہونے جارہا ہے تو دونوں جانب سے جو گولا باری ہوئی وہ نہ ہوتی۔ میاں صاحب کی یہ بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ وہ اس مسئلہ پر پارلیمنٹ میں نہیں جائیں گے۔ پارلیمنٹ تو جمہوریت کی شہ رگ ہے، بنیاد ہے، منبع ہے۔ اب تک تو میاں صاحب اور ان کے ساتھی اپوزیشن کو یہ تانا دیا کرتے تھے کہ احتجاج، جلسے، جلوس، دھرنوں کے بجائے پارلیمنٹ میں اپنے مطالبات لے کر جائیں اب پاناما لیکس پر پارلیمنٹ سے میاں صاحب کا فرار کیا معنی رکھتا ہے۔ میاں صاحب پاناما لیکس کی پہلی قسط نے یہ طوفان برپا کیا، دوسری قسط آنے کو تیار اور تیسری پر کام جاری ہے۔ پاناما لیکس پاکستانی سیاست اور معیشت میں

کیا ستم ڈھائے گی یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا سر دست یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پاناما لیکس نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ قوم کو اچھی طرح یاد ہونا چاہیے کہ سوئس اکاؤنٹ اور سرے محل کی تحقیقات کا کیا بنا؟۔ میاں صاحب کے چہیتے سیف الرحمٰن نے کیا کچھ نہیں کیا تھا، نتیجہ صفر، افتخار چودھری صاحب نے اپنے دور میں آصف علی زرداری پر سوئس اکاؤنٹس کا مقدمہ دوبارہ کھولنے کا حکم دیا، نتیجہ صفر، اس لیے کہ صدر کو استثنٰی حاصل ہے، اب بھی اگر پاناما لیکس میں سے میاں صاحب کے بارے میں کچھ نکل بھی آتا ہے تو میاں صاحب کو پاکستانی قانون کے تحت استثنٰی مل جائے گا اور ان کا کچھ نہیں ہوگا۔

میاں صاحب اقتدار کی فکر نہ کیجئے آپ کا نام پاکستان کی تاریخ میں تین بار حکمرانی کرنے والے سیاست داں کی فہرست میں لکھا جاچکا یہ تاریخ کا حصہ رہے گا۔ اب تو آپ کو اپنے جان نشین کی فکر کرنی چاہیے ۔ دیکھئے چھوٹے میاں صاحب نے پنجاب کے لیے اپنا جانشین تیار کرلیا، آپ نے اپنے جانشینوں حسن اور حسین کو کاروبار کی نظر کردیا عقل مند کون آپ یا چھوٹے میاں صاحب؟ انہیں آپ اب سیاست میں لا نہیں سکتے،، اگر لاتے بھی ہیں تو انہیں بہت وقت اور مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اب جو آپ کا جو جانشین نظر آرہا ہے اکثر تجزیہ نگار اس جانب اشارہ بھی کر رہے ہیں، راقم بھی کئی ماہ قبل اپنے کالم میں یہ

لکھ چکا ہے کہ آپ کی صاحبزادی 'مریم نواز' شریف خاندان کی آئندہ رہنما ہو سکتی ہیں۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں ، اچھا انتخاب ہے، پاکستان میں خواتین کو ویسے بھی زیادہ پذیرائی ملتی ہے۔ مریم نواز کو عملی سیاست میں اس طرح لائیں کہ وہ آپ کا بہترین متبادل ثابت ہو سکیں۔ لیکن اس انتخاب میں آپ کو اپنی پارٹی کے اندر مشکلات ہو سکتی ہیں۔ آپ کی جماعت میں بعض مضبوط وزیر بھی ہیں، سمدھی جی بھی تو ہیں جن کی خدمات طویل بھی ہیں اور وہ آپ کے وفادار بھی رہے ہیں۔ وہ بھی تو امیدواری کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن آپ کے خاندان کے لیے 'مریم' سے بہتر اور اچھا انتخاب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

الزام تراشی کا کلچر

پاکستان کی اعلیٰ عدالت کے جج اور چیف جسٹس اکثر حکمرانوں کو کبھی واضح طور پر اور کبھی مخمل میں لپیٹ کر، کبھی کسی طرح کبھی کسی طرح ان کی کوتاہیوں، غلطیوں اور اہم امور پر ان کی عدم دلچسپیوں کی نشاندھی کرتے رہتے ہیں۔ ہفتہ 7 مئی کو پاکستان کی اعلیٰ عدالت کے چیف جسٹس محترم انور ظہیر جمالی نے قانون کی تعلیم کے موضوع پر کراچی میں سیمینار سے خطاب میں ملک کے اساسی ایشوز کی جانب توجہ دلائی۔ ان کا کہنا تھا کہ 'کوئی فرائض نبھانا نہیں چاہتا، قانون پر عمل درآمد صرف عدلیہ کی ذمہ داری نہیں، الزام تراشی کا کلچر پروان چڑھ رہا ہے، بنیادی اور اہم معاملات پر متفقہ لائحہ عمل تیار نہ کرنا ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے'۔ جناب چیف جسٹس کہا کہنا تھا کہ 'ہم نے بحیثیت قوم منفی سوچ کی روش اپنا رکھی ہے جس کی بناء پر بنیادی معاملات پر متفقہ فیصلے نہیں ہوپتے۔ آج ملک میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کا چلن عام ہے ہر شخص حقوق کی بات کرتا ہے لیکن اپنی ذمہ داریاں اور فرائض نبھانے کو تیار نہیں'۔ جناب چیف جسٹس کی باتوں میں ایک اہم پیغام تھا انہوں نے قوم کے ہر فرد کو تو پیغام دیا ہی لیکن ان کی باتوں میں حکمرانوں کے لیے خاص پیغام پوشیدہ ہے۔ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت ہمارے سیاست

داں سوائے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے کچھ اور نہیں کر رہے ۔ ایک سیاست داں دوسرے پر بغیر ثبوت اور شواہد کے الزام لگانے میں دیر نہیں لگا رہا، جو جی میں آتا ہے ایک دوسرے پر الزام کھلے عام لگائے جا رہے ہیں۔ جب ان سے ثبوت کی بات کی جاتی ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں ثبوت دینا حکومت کا کام ہے ، گویا ان کا کام صرف مخالفین پر بے پرکے الزام لگانا ہے ، ان کی جانب سے ثبوت حکومت فراہم کرے، گویا حکومت کو کوئی اور کام نہیں ، ہماری حکومت کون سا کسی سے پیچھے ہے وہ بھی ، سیاست کے اس تالاب میں سب ہی ایک جیسے ہیں۔ جناب چیف جسٹس نے درست فرمایا کہ ' مسائل کے حل کے لیے سب سے پہلے ملکی آبادی پر توجہ دینا ہوگی'۔ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ حکومت کی توجہ ملک کے عوام کے علاوہ ہر چیز پر ہے، لوگ مر تے ہیں تو مریں، انہیں مہینوں تنخواہیں نہ ملیں کوئی فرق نہیں پڑتا ، پڑھ لکھ کر نوجوان بے روزگار پھرتے ہیں ، کوئی پروا نہیں، نہ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی فکر، نہ لوگوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کی پروا، مہنگائی کا جن بے قابو ہو رہا ہے ہوتا رہے ، عوام کی بھلائی کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں، مردم شماری کو کسی نہ کسی حیلے بھانے ملتوی کرتے رہنا، مردم شماری ہوگی تو نئے اعداد و شمار سامنے آجائیں گے ان اعداد و شمار کے مطابق کام کرنا پڑے گا اس لیے مردم شماری ہی نہ ہونے دو تاکے کام ہی نہ کرنا پڑے۔ ملک قرضوں تلے دبے چلے جا رہا ہے، عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لے لینا، خواہ ، شرائط کچھ بھی ہوں

متعلقہ وزیر کی خصوصیت اور اعلیٰ صلاحیت تصور کی جاتی ہے۔ جب بھی قرض کی قسط منظور ہوتی ہے تو وزیرِ خزانہ شاباش وصول کرتے ہیں۔ قرض کے حوالہ سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں، بلکہ ہر کالم نگار اس موضوع پر لکھتا رہا ہے۔ یاد کریں 2013ء کی انتخابی مہم ، میاں صاحب اپنی انتخابی تقریروں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ حکومت میں آکر غربت کا خاتما کردیں گے، غریب کو مشکلات سے نجات دلائیں گے، ملک کو قرضوں سے نجات دلائیں گے ، کشکول توڑ دیں گے، بھیک نہیں مانگے گے، اپنے وسائل پر بھروسہ کرکے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے۔ تین سال کی حکمرانی میں یہ تمام باتیں کہیں دکھائی نہیں دیں۔ میاں صاحب کہاگیا آپ کا منشور، کیا ہوئے آپ کے وعدے غربت کو ختم کرنے کے، غریب کی مشکلات کو دور کرنے کے، کہاں گیا آپ کا وعدہ کہ آپ کشکول توڑ دیں گے۔ آج سب کچھ ویسا کا ویسا ہی ہے۔ نہ غربت ختم ہوئی، نہ غریب کی مشکلات میں کمی آئی، نہ کشکول ہاتھ سے چھوٹا ، نہ قرض لینے کے عادت گئی، نا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت گئی ۔ وزیر خزانہ قرض حاصل کرنے کے ایکسپرٹ 'ماہر حصولِ قرضہ جات' بن چکے ہیں ۔ انہوں نے ایسے گُر سیکھ لیے ہیں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک قرض کی منظوری میں ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر قرض کی اگلی قسط کی منظوری دے دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو قرض وہ دے رہے ہیں وہ کئی گنا ہو کر واپس انہیں کے پاس آجائیگا۔ وزیر خزانہ ، اپنے سمدھی وزیر اعظم پر ایک اور احسان

داغ دیتے ہیں کہ دیکھو سمدھی جی میں اس بار بھی قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیااور شاباش وصول کرتے ہیں۔

قوم کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ گورننس کو بہتر بنانے کا مشورہ ہمارے حکمرانوں کی نازک طبیعت پر کتنا گراں گزرا تھا۔اس بیان پر حکومتی ترجمان کی جانب سے بیان آیا تھا کہ اداروے آئین کی حدود میں رہیں' ، گویا اچھی گورننس کا مشورہ دینے والوں کواپنی' حدود میں رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔افواج پاکستان نے حکومت سے صرف اتنا کہا تھا کہ حکومت اپنی حکمرانی میں بہتری لائے۔ہمارے حکمراں کسی کی اچھی بات کو اپنے لیے تنقید تصور کرتے ہیں۔اعلیٰ عدالت کے سابق چیف جسٹس نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ دیا تھا، حکومت نے اس پر کیا کیا؟ موجودہ چیف جسٹس نے بھی اس امرپر افسوس کا اظہار کیا کہ' قیام پاکستان کو سات دہائیاں ہونے کا آئیں مگر اب تک قومی زبان سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم کے طور پر نافذ نہیں ہو سکی۔ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنے عدالتی نظام کو بھی جلد از جلد قومی زبان اردو میں منتقل کرنا اور پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی قانون کی تعلیم قومی زبان میں دیئے جانے کا اہتمام کرنا ہوگا۔

چیف جسٹس صاحب کے خیالات سے اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں، اس سے قبل بھی اعلیٰ عدالت کی جانب سے ہی اردو کے حق میں فیصلہ آیا تھا، اب بھی اعلیٰ عدالت نے اردو کے نفاذ کی بات کی ، عمل درآمد

ذمہ داری ہے حکومت کی اور ہماری حکومت ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسا کھیل کھیلتی رہتی ہے جس کی وجہ سے ملک کی ترقی کا پہیہ رکا رہتا ہے باقی سب کام ہو رہے ہوتے ہیں۔

آجکل پاناما لیکس نے حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے، کبھی دھرنے، کبھی جلوس، کبھی جلسے حکومت کو کچھ کرنے ہی نہیں دیتے۔ مشورہ دینے والے ہیں کہ مشورے دیے جارہے ہیں، حکومت کے لیے سب مشورے بے سود اور بے کار ہیں۔ سیاست داں پہلے اپنے بھلے کی سوچتا ہے، پھر کچھ اور۔ چیف جسٹس محترم انور ظہیر جمالی کی اس بات کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک میں الزام تراشی کا کلچر تیزی سے فروغ پارہا ہے۔ اس حوالے سے میڈیا کے کردار کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ الیکٹرنک میڈیا پر زیادہ ذمہ داری اس لیے ہے کہ الیکٹرانک میڈیا پر کہی ہوئی بات، نشر شدہ خبر، دکھائی جانے والی صورت حال کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ حالت کیسے ہی کیوں نہ ہوں حکمرانوں پر بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں بڑھتے ہوئے الزام تراشی کے کلچر کو روکے، از خود اس کا حصہ نہ بنے، سیاست داں بھی عقل و شعور اور سمجھداری کا ثبوت دیں، سستی شہرت، وقتی مشہوری کی خاطر مخالفین پر بے سروپا الزامات لگانے سے گریز کریں۔

حقیقت ایک نہ ایک دن عیاں ہو ہی جاتی ہے۔

الحمد اکیڈمی کا مجلّہ 'الحمد'۔ سیرت نمبر ۲۔ تعلیم و تربیت اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، ۲۰۱۵ء

تعلیمی اداروں کے زیر اہتمام میگزین کی اشاعت پرانی روایت ہے۔ یہ مجلے تعلیمی، تدریسی، نصابی، ہم نصابی، ادبی، علمی حتیٰ کہ کھیل کود کی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہوتے ہیں اور اس تعلیمی ادارے کی تمام تر سرگرمیوں، ذہنی فکر اور مثبت سوچ کی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں، ان لسے اس تعلیمی ادارے کی ۹ علمی کارکردگی، طلبہ کی ذہنی فکر، ادبی اور علمی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا جاسکتا ہے ہے۔ یہ مجلے اس درسگاہ کی آبرو بھی ہوتا ہے اور علامتِ وقار بھی، دستاویز بھی ہوتا ہے اور تاریخ بھی۔یہی وجہ ہے کہ معیاری تعلیمی ادارے مجلّہ کی باقاعدہ تدوین واشاعت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔
الحمد اکیڈمی کے زیر اہتمام منظر عام پر آنے والا مجلّہ 'الحمد' سیرت نمبر کا دوسرا شمارہ ہے ۔اس سے قبل مجلّہ الحمد کا اولین شمارہ شائع ہوچکا ہے جس پر کراچی کے انٹر میڈیٹ تعلیمی بورڈ نے دوسرا انعام دے ممتاز کیا۔ الحمد اکیڈمی پاکستان کے معروف اور معیاری تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے جس کی مختلف شاخیں گلشن اقبال، پی ای سی ایچ ایس کے علاوہ حیدرآباد اور لاڑکانہ کے علاوہ سعودی عرب کے شہروں جدہ اور ریاض میں بھی اس کی شاخیں قائم ہیں۔ الحمد اکیڈمی کا قیام 1998ء میں عمل آیا۔ مختصر عرصہ میں

اکیڈمی نے تعلیم کے فروغ میں جو ترقی کی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اکیڈمی کی باگ دوڑ مخلص، ایماندار اور علم دوست احباب کے ہاتھوں میں ہے۔ تعلیم کے میدان میں یہ ادارہ اگر اسی رفتاری سے ترقی کے منازل طے کرتا رہا تو ایک دن ملک کے چند بڑے اور معیاری تعلیمی اداروں میں سے ایک ہوگا۔

کراچی انٹر میڈیٹ تعلیمی بورڈ نے کراچی کے کالجوں کے زیر اہتما شائع ہونے والے میگزین کے درمیان مجلات کے سیرت نمبروں کا مقابلہ منعقد کرایا۔ الحمد اکیڈمی کے شائع کردہ مجلّہ 'الحمد' سیرت نمبر کو دوسری پوزیشن حاصل ہوئی۔ اس مجلّہ کی کامیابی اور پذیرائی نے الحمد اکیڈمی کی انتظامیہ کا حوصلہ بڑھایا اور انہوں نے سیرت ہی کے موضوع پر 'الحمد سیرت نمبر ۲' شائع کرنے کا اہتمام کیا جو اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔

میرے بہت ہی محترم جناب عابد حسین صدیقی صاحب جو اب میرے قریبی پڑوسی اور ایک ہی مسجد بلکہ ایک ہی صف کے نمازی بھی ہیں نے یہ مجلّہ ازراہِ عنایت مجھے دیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کو کہا۔ عابد صاحب نفیس انسان ہیں، میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ کالج ڈائیریکٹریٹ میں پروفیسر افتخار احمد انصاری مرحوم اور پروفیسر افتخار علی مرحوم اور پروفیسر ضیاء الدین مرحوم کے آفس میں ہوا کرتے تھے اور ہم اپنے معاملات کے حوالے سے اکثر ڈائریکٹریٹ کے چکر لگایا کرتے تھے۔ یہ بات ہے 1974 اور اس کے بعد کی، عابد صاحب اس وقت بھی اتنے ہی ملنسار اور بہ اخلاق تھے لیکن سخت انتظامی رویہ رکھتے تھے۔ آج بھی ان کا اخلاق اور ملن ویسا ہی ہے۔

مجلّہ 'الحمد' سیرت نمبر ۲، تعلیم و تربیت اسوۂ حسنہ کی روشنی میں' ظاہری اور باطنی' اعتبار سے خوبصورت ہے۔ یہ مجلّہ موضوعاتی ہے اور اس میں صرف تعلیم اور تربیت کے حوالے سے مضامین شامل ہیں۔ تمام مضامین اسوۂ حسنہ کی روشنی میں تحریر کیے گئے ہیں کسی بھی موضوع پر خاص نمبر کی تدوین و اشاعت زیادہ مشکل ہوتی ہے کیونکہ مواد ، کے حصول اور انتخاب میں مدیران کو متعلقہ موضوع تک محدود رہنا ہوتا ہے۔ مجلّہ الحمد کے مدیران اپنی اس کاوش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ سیرت کے موضوع پر تعلیم و تربیت کے حوالے سے معیاری مضامین ، پائے کے لکھنے والوں کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں ۔ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ سے مجلے کا آغاز ہوا ہے۔ مجلے کے مدیر ڈاکٹر محمد اظہر سعید نے 'کلمات الحمد' کے عنوان سے مجلّہ کی تدوین و اشاعت پر مختصر روشنی ڈالی ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ 'اللہ تعالیٰ کا نہایت فضل و کرم ہے کہ مجلّہ الحمد کی پہلی اشاعت کو مقبولیت عطا کی اور اہل علم ، اساتذہ، طلبہ اور قارئین سیرت نے اس کو پسند فرمایا اور ہماری حوصلہ افزائی کی'۔اس کے سرپرست اعلیٰ جناب کلیم رحمانی صاحب ہیں ، مدیر اعلیٰ محمد خالد پٹی والا ہیں ، جب کہ مجلس مشاورت میں پروفیسر محمد فاروق سبحانی، عابد حسین صدیقی، ڈاکٹر مختار احمد زندانی ، مفتی محمد انوار حسین اور حافظ نعمان عالم شامل ہیں۔ ان احباب کی کاوشوں اور محنت اور سب سے بڑھ کر سیرت حضرت محمد ﷺ سے والہانہ محبت کے باعث سیرت کے حوالے سے ایک عمدہ مجموعہ سامنے آ سکا۔ جس کے لیے یہ احباب قابل مبارک باد ہیں۔

مجلّہ 11 مقالات کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم صاحب کا مقالہ 'عہد نبوی ﷺ کا نظام تعلیم' ایک طویل اور اپنے موضوع پر سیر حاصل مواد فراہم کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ 'تعلیمی تحریک کے دو ارکان ہیں، استاد اور شاگرد۔ اُستاد سے آپ ﷺ نے کہا کہ اگر لوگوں کو تعلیم دینے میں تم نے کوتاہی برتی تو کل خدا کے یہاں تمہارا مواخزہ ہوگا، فرمایا، 'جو شخص عالم ہے اور دوسروں کو نہیں سکھاتا، قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ لگائی جائے گی'۔ مصنف نے لکھا کہ 'یہ وہ وعید تھی جس نے علما کو اور استادوں کو پھر گھر میں چین سے نہیں بیٹھنے دیا وہ ڈھونڈ ھونڈ کر طالب علموں کو پڑھاتے تھے انتہائی ناسازگار حالات میں پڑھاتے تھے، اس لیے کہ کہیں اس آتشیں وید کے مصداق نہ قرار پائیں'۔ مقالہ 53 قرآنی آیات و احادیث اور دیگر اسلامی کتب کے حوالوں سے مذین ہے۔ ڈاکٹر محمد امین کے مقالے کا عنوان ہے 'نبی اکرم ﷺ کا منہاج تربیت'۔ مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے آنحضرت محمد ﷺ کے اسلوبِ تعلیم و تربیت کی متعدد مثالیں درج کی ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ایک معروف اسلامی محقق اور مصنف کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے مقالے کا عنوان ہے 'عہد نبوی کا نظام تعلیم'۔ مقالے میں عہد نبوی کے نظام تعلیم کی صورت حال تفصیل سے بیان کی ہے انہوں نے لکھا کہ ' مدینہ منورہ میں شروع میں نو مساجد اور بعد میں چالیس مساجد قائم ہوگئیں تھیں۔ ان سے اکثر مساجد میں درس و تدریس کا انتظام بھی تھا'۔ مولانا محمد طاسین کی علمیت و قابلیت بھی کسی سے مخفی نہیں، ان کے مقالے کا عنوان ہے 'تعلیمِ حکمت سیرت طیبہ کی روشنی میں'۔ پروفیسر عبدالجبار

شاکر کے مقالے کا عنوان ہے 'نبی اکرم ﷺ کا تعلیمی اسوہ اور ہم'، یہ مقالہ اپنے موضوع پر مدلل معلومات فراہم کرتا ہے۔ شاکر صاحب تعلیم کے شعبہ سے وابستہ تھے، اسلامی علوم پر دسترس تھی۔ مولانا ڈاکٹر اکرام اللہ جان قاسمی کے مقالے کا عنوان ہے رسول اکرم ﷺ کے طریقۂ تعلیم کی خصوصیات'، قاسمی صاحب کا مقالہ اپنے موضوع' پر سیر حاصل معلومات فراہم کرتا ہے پچاس سے زیادہ حوالے بھی شامل ہیں۔ سید عزیز الرحمٰن صاحب کے مقالے کا عنوان ہے ''پاکستان کے لیے مثالی نظام تعلیم: تعلیمات نبوی کی روشنی میں''۔ مقالے کا آغاز علم اور تعلیم کی تعریف سے ہوا ہے تعلیم کی اہمیت، تعلیم فرض ہے اور تعلیم انسانی ترقی کا ذریعہ، مقصد تعلیم مشاہیر و، ماہرین تعلیم کی نظر میں اور دیگر موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مقالے میں پاکستان کا موجودہ نظام تعلیم اور تجاویز برائے نصاب و نظامِ تعلیم بھی بیان کی گئیں ہیں۔ مقالہ ڈیڑھ سو سے زیادہ حوالہ جات سے مذین ہے۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی علمی و دینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے 'پاکستان میں مثالی نظامِ تعلیم کی تشکیل اور تعلیماتِ نبوی ﷺ'، انہوں نے اپنی تحریر کا آغاز سورۃ اقرأ' سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ 'پڑھنا اور لکھنا دونوں علم کے اجزا ہیں۔ پڑھنا اس لیے کہ' اس کے بغیر علم بے معنی ہے اور لکھنا اس لیے کہ آیندہ نسلوں کے لیے علمی سرمایہ جمع ہوتا رہے اور اشاعتِ علم کا مقصد پورا ہوتا رہے'۔ محمود عالم کے مضمون کا عنوان 'اہل قلم کی اخلاقی ذمے داریاں اور تعلیمات نبوی ﷺ' ہے جس میں انہوں نے لکھاریوں کی اخلاقی ذمہ داریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'قلم ایک امانت ہے اور اللہ

تبارک و تعالیٰ نے جن لوگوں کو قلم عطا فرمایا ہے ان کی ذمے داریاں چند در چند ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس چیز کا علم عطا فرمایا ہے جو دوسروں کو نہیں ملا۔ اہل قلم قیادت و سیادت کے منصب پر فائز ہیں، اور ان کی اولین ذمے داری دنیا میں امن و امان، عدل و انصاف اور خیر و فلاح کا قیام اور تعمیر و ترقی ہے۔ شرعی اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک مسلمان اہل علم اور اہل قلم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے اور دعوت و تبلیغ اور جہاد حرف ان کے فرائض میں شامل ہے'۔ سید فضل الرحمٰن کا مقالہ تربیت اولاد اور نبوی تعلیمات سے بحث کرتا ہے۔ اولاد کی تربیت معاشرہ کا ایک اہم موضوع ہے، خاص طور پر آج کل کے حالات میں والدین کو اپنی اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مولانا سید محمد متین ہاشمی کے مقالے کا عنوان ہے 'تربیت خودی کا نبوی نصاب'۔ مجلے کے مدیر ڈاکٹر محمد اظہر سعید کے مقالے کا عنوان 'نبوی انداز تربیت' ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تربیت کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کے انداز تربیت کے حوالے سے متعدد
احادیث اور واقعات قلم کیے ہیں۔

مجموعی طور پر مجلے میں شامل مقالات تعلیم و تربیت کے تمام پہلوؤں کا احاطے کرتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ کالج کا ایک مجلّہ ہے لیکن میری رائے میں یہ مجلّہ اپنے موضوع پر تحقیق اور حوالے کا قیمتی مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کو ہر کتب خانے کی زینت ہونا چاہیے، اسلامی موضوعات پر لکھنے والے، تحقیق کرنے والے اور معلومات کے خواہش مندوں

کے لیے یہ مجموعہ بہت ہی مفید اور کارآمد حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ (۱۱ مئی
۲۰۱۶ء)

پاناما لیکس اور اپوزیشن کے سات سوال

پاناما لیکس کا جس دن سے نُزول شروع ہوا ہے، پاکستان کی سیاست میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ انکشافات کی دو قسطیں منظر عام پر آچکی ہیں تیسری آنے کو ہے۔ پہلی قسط سے جو انکشافات ہوئے دوسری قسط نے ان میں اور زیادہ اضافہ کردیا۔ انکشافات کا سلسلہ ابھی رکا نہیں، سنوائی ہے کہ بہت جلد تیسری قسط بھی اسی آب تاب اور چمک دمک سے جلوہ افروز ہوگی اور اس میں بھی کئی سیاسی پردہ نشینوں کے اسمائے گرامی پاکستانی قوم کو دیکھنے کو ملیں گے۔ پاناما لیکس کے ذریعہ جو آف شور کمپنیاں اور ان کے مالکان سامنے آرہے ہیں، تجارتی نقطہ نظر سے یہ کوئی خاص بات نہیں۔تاجر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے، جس ملک میں چاہے تجارت کرے، اسٹیٹ کا کاروبار کرے، اسٹیل مل خریدے یا اسے بیچ دے، محل خریدے یا اسے بیچ دے، فلیٹس خریدے یا بیچ دے یا کوئی اور کاروبار کرے، قانون اسے یہ حق دیتا ہے۔ آف شور کمپنیاں خاموشی کے ساتھ، چوری چھپے، پردے میں رہتے ہوئے تجارت کا ذریعہ ہوتی ہیں، یہ ٹیکس بچانے یا کم سے کم ٹیکس دے کر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ وہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ آف شور کمپنی قائم کرنے والے کے پاس دولت کہاں سے آئی، جائز ہے یا ناجائز، آف شور کا مطلب ہی چھپا ہوا، مخفی، پردے میں، چوری کو چھپانا، کالے دھن کو تجارت

میں لگانا، اور اس دولت سے یا تجارت سے جو آمدنی ہو اس پر ٹیکس کی بچت کرنا، ٹیکس نہ دینا ہے۔ اس قسم کی تجارت اور کاروبار کسی بھی تاجر کے لیے تو ٹھیک ہو سکتا ہے اس لیے کہ اس کی زندگی کا مقصد ہی جائز و ناجائز دولت کو اس طرح چھپانا اور ایسے کاروبار میں لگانا کہ کالا دھن بھی محفوظ رہے اور اس کالے دھن میں خاموشی کے ساتھ تیزی سے اضافہ بھی ہوتا رہے۔ آف شور طریقے سے چھپائی گئی دولت کی ایک مثال چند روز قبل ہی سامنے آچکی ہے، بلوچستان کے سیکریٹری خزانہ کے گھر سے 73 کروڑ نوٹوں کی گڈیاں، ایک کلو سے زائد سونے کا خزانہ قومی احتساب بیورو نے برآمد کیا۔ اب اگر سیکریٹر خزانہ کو کوئی آف شور کمپنی قائم کرنے کی راہ دکھا دیتا تو آج پاناما لیکس میں موصوف کا نام بھی کسی آف شور مالک کی حیثیت سے شامل ہوتا۔ لاعلمی، ڈر اور خوف کے باعث موصوف دولت اپنے گھر ہی میں جمع کرتے رہے۔ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے گھر کون آسکتا ہے، داد دینی پڑتی ہے نیب کو کہ اس کے جاسوسوں نے کس طرح غیر قانونی طریقے سے جمع کی گئی ملکی دولت کا پتا لگایا۔ پاکستان میں یہ کوئی پہلی مثال نہیں، ماضی میں نوٹوں کی گڈیاں ندی اور نولوں پڑی ہوئی مل چکی ہیں۔

بات یہ شروع کی تھی کہ آف شور کمپنی قائم کرنا اس میں سرمایاکاری کرنا، قانونی طریقے سے یا غیر قانوی طریقے تاجروں کے لیے، دولت کی حوص رکھنے والوں کے لیے تو جائز بھی اور ناجائز بھی ہو سکتا ہے لیکن سیاست دانوں کے

لیے کسی بھی طور مناسب نہیں، پاناما لیکس میں ہزاروں لوگوں کے نام ہیں لیکن واویلا کن ناموں پر ہو رہا ہے ان لوگوں کے ناموں پر جو کسی نہ کسی طور سیاست سے وابستہ ہیں، حکومت میں ہیں، وزیر اعظم ہیں، وزیر ہیں، سیاسی جماعت میں اہم عہدہ رکھتے ہیں، یا وزیر اعظم کے خاندان کے لوگ بیٹی یا بیٹے، کسی وزیر یا سابق وزیر کے بچے وغیرہ، کسی سیاسی پارٹی میں ہیں یا رہ چکے ہیں، حتیٰ کہ ایسے افراد کے قریبی رشتہ دار بھی اس میں شامل ہیں تو بھی اصل ذمہ دار سیاست داں ہی ٹھہرایا جا رہا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کا نام پاناما لیکس کی اب تک آنے والی کسی فہرست میں شامل نہیں اس کے باوجود اپوزیشن وزیر اعظم کی سخت گرفت کر رہی ہے عام پاکستانی بھی اس سوچ میں ہے کہ وزیر اعظم کے بچے باوجود اس کے کہ وہ جدی پشتی تاجر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اتنی کم عمر میں اتنا کچھ اپنے طور پر کیسے حاصل کر لیا، سوچ کا دھارا وزیر اعظم کی حیثیت کی جانب بڑھتا ہے اور سوال ذہن میں آتے ہیں، یہی سوال جو اپوزیشن نے وزیر اعظم کے سامنے رکھے ہیں اور وہ ان کے جواب چاہتی ہیں۔ اسی طرح کے سوالات ان تمام سیاست دانوں سے بھی کیے جانے چاہیے جن کے نام یا ان کے خاندان میں سے کس کا نام پاناما پیپرز میں شامل ہو۔ سیاست دانوں کے پاس اس قدر کثیر سرمائے کا انکشاف ہو تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سیاست دان نے اپنے منصب اور اختیار کا استعمال کرتے ہوئے دولت کمائی ہوگی۔ سیاست داں تو غریبوں سے ہمدردی کا نعرہ لگا کر میدان میں

اترتا ہے، ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا نعرہ لگاتا ہے، عوام کو خوش حالی دینے کی بات کرتا ہے۔ اس کا عمل اگر ایسا ہو کہ وہ خود اور اس کا خاندان امیر سے امیر تر اور عوام غریب سے غریب تر ہو جائیں تو اس سیاست داں یا ان سیاست دانوں سے سوال تو بنتے ہیں۔ قوم ان سے پوچھنے کا حق رکھتی ہے۔ ان پر لازم ہے کہ وہ جواب دیں، تاکہ اگر ان پر غلط الزام لگایا جا رہا ہے تو ان کے دامن پر لگے داغ دھل جائیں۔ اپوزیشن نے وزیر اعظم صاحب سے سات سوالات کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ے فیئر میں فلیٹس پر وضاحت کریں، فلیٹس کب خریدے گئے؟

۲۔ اگر فلیٹس وزیر اعظم کی ملکیت نہیں تو برطانوی اخبارات میں خبروں کی وضاحت کی جائے؟

۳۔ وزیر داخلہ نے فلیٹس پر جو بیان دیا وزیر اعظم صاحب اس کا جواب دیں؟

۴۔ وزیر اعظم 1985 سے 2016 تک بیرون ملک جائیداد کی تفصیلات پیش کریں؟

۵۔ 1985 سے 2016 تک وزیر اعظم اور ان کے اہل خانہ نے کتنا ٹیکس دیا؟

۶۔ وزیر اعظم اپنے اہل خانہ کے نام آف شور کمپنیوں کی تفصیلات بتائیں؟

۷۔ آف شور کمپنیوں کی مالیت کیا ہے اور سرمایہ کاری کتنی کی گئی۔ لندن کے اپارٹمنٹس کے واجبات کی ادائیگی کے 22 ملین ڈالر آپ نے کہاں سے ادا کیے؟

وزیر اعظم صاحب کی جانب سے تمام سوالوں کے جوابات ان کے قریبی اور بہ

اعتماد وزیر پریس کانفرنسز میں دے چکے ، ان سوالات کے جواب میں اپوزیشن کو خوب تنقید اور جواب شکوہ پیش کرکے اپوزیشن کی طبیعت صاف کرنے کی پوری کوشش کی۔ خود وزیر اعظم نے واضح طور پر کہا کہ میں اپوزیشن کے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں، یہ بھی کہ وہ پارلیمنٹ میں بھی نہیں جائیں گے ، جب ان کے اس فیصلہ پر تنقید ہوئی تو انھوں نے فیصلہ واپس لیا، پہلے خبر تھی کہ وہ جمعہ کے اجلاس میں جائیں گے جو ملتوی ہوگیا اب خبر ہے کہ وزی اعظم پیر کے روز پارلیمنٹ میں تقریر کریں گے ، نہیں معلوم کہ وہ سوالوں کے جوابات دیتے ہیں یا نہیں۔ پارلیمنٹ سے فرار کو تنقید کا نشانہ بنا یا گیااس پر تنقید کرنا جائز بھی ہے ، تحریک انصاف کی جانب سے جب دھرنے دئے گئے تو یہ میاں صاحب ہی تھے جنھوں نے کہا تھا کہ جو بھی پریشانی ہے اس کا اظہار پارلیمنٹ میں آکر کیا جائے ، دھرنے مسائل کا حل نہیں۔ اب کیا ہوگیا؟ اپنے لیے یہی بات درست ہو گئی۔ عجیب منطق ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے۔ پارلیمنٹ نے تو آپ کو جنم دیا ہے، آپ اس سے ہی فرار اختیار کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کی تو اس میں اکثریت ہے پھر کس بات کا ڈر اور خوف۔

پاناما لیکس کا بم سیاست دانوں پر خاص طور پر وزیر اعظم صاحب پر آسمانی بجلی بن کر ایسا گرا ہے کہ اس سے نکلنا مشکل نظر آرہا ہے۔ صاف صاف بتاتے ہیں تو پکڑے جاتے ہیں، جھوٹ اب چل نہیں سکتا، کمیشن اگر بن بھی گیا تو اس میں بھی

اسی قسم کے سوالات میاں صاحب کا پیچھا کریں گے۔ اب تو چیف جسٹس صاحب نے بھی کمیشن کے قیام کے لیے مشکلات کا خط لکھ دیا ہے جس سے معاملا دو دھاری تلوار کی طرح حکومت پر لٹک چکا ہے۔ سنوائی ہے کہ میاں صاحب نے مولانا 'اقتدار' (مولانا فضل الرحمٰن) کے ذریعہ زرداری صاحب سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ وہی زرداری صاحب ہیں جن پر بڑے اور چھوٹے میاں صاحب کرپشن کے کیا کیا الزامات لگایا کرتے تھے۔ اقتدار بھی کیا بلا کی چیز ہے بندے کو کیسی کیسی قلابازیاں کھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لگتا ہے سیاست نام ہی غلط بیانی کرنے، جھوٹ بولنے، دوسروں پر کیچڑ اچھالنے، الزام تراشی کرکے مکر جانے کا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پاناما لیکس کا معاملا جو پیچیدہ صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کمیشن بنانے پر اتفاق ہو جائے گا، ٹرم آف ریفرنس دونوں افہام و تفہیم سے بنالیں گے، دونوں جانب سے سیز فائر ہو جائے گا، کمیشن اپنا کام سبک رفتاری سے جاری رکھے گے، اپوزیشن ٹھنڈی ہو جائے گی، حکومت سکھ کا سانس لے گی۔ جب کمیشن کی رپورٹ آئے گی میاں صاحب کے دن پورے ہو چکے ہوں گے، یعنی 2018 آچکا ہوگا، الیکشن تمام پارٹیوں کو اپنی جانب متوجہ کرلے گا اور میاں صاحب جیسے اس پہلے بحرانوں سے نکلتے رہے ہیں۔ پاناما لیکس کے بحران سے بھی نکل جائیں گے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند۔ دنیائے ادب کی قدآور شخصیت

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا نام تو سنا تھا، یہ بھی معلوم تھا کہ وہ انگریزی اور اردو ادب کی ایک قدآور شخصیت اور نظم کے لاجواب شاعر ہیں۔ خدا بھلا کرے انجمن ترقی اردو کے منتظمین کا کہ انہوں نے کہ جب ڈاکٹر صاحب کراچی آئے تو ان کے ساتھ ایک ادبی نشست کا اہتمام کرکے ادب کی بلند مرتبہ شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور شاعری کے حوالے سے ان کی گفتگو سننے کا موقع فراہم کیا۔ڈاکٹر صاحب کے تعارف میں انجمن ترقی اردو کی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن نے اچھی بات کہی کہ ' ہم تقریبات نہیں کراتے بلکہ ملاقات کراتے ہیں اُن سے جو اپنے علم اور اپنے قلم سے خدمت کر رہے ہیں'۔ واقعی اس ادبی نشست کی یہی صورت تھی ، وہ تقریب ہر گز نہیں تھی بلکہ اردو نظم کے بڑے شاعر سے ایک خوبصورت و خوش گوار ملاقات تھی۔ یہ ادبی نشست 9اپریل 2016 کو انجمن ترقی اردو گلشن اقبال کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ گفتگو کا موضوع تھا 'شعری لوازمات۔ عصرِ حاضر کے تناظر میں''۔نشست کی ابتدائی تفصیل کے بعد ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی شخصیت ، علمی و ادبی خدمات اور شاعری پر کچھ باتیں ہوں گی۔

آج مجھے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ لانبا قد، صحت مند جسم، ہنستا مسکراتا چہرہ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں جن میں سوجھ بوجھ کی چمک، چشمے نے آنکھوں کو اور بھی حسین بنا دیا تھا، سر پر کچھ کچھ سفید بال، ستواں ناک جس کے نیچے قینچی استرے کی دسترس سے محفوظ سپاٹ میدان یعنی نہ موچھ نہ داڑی، گوری رنگت، سفید چمک دار دانت، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، چال میں سبک رفتاری اور ڈھیلا پن، ہالف سلیپ شرٹ اور پینٹ میں ملبوس ڈاکٹر ستیہ پال آنند 85 برس کی عمر میں بھی کسی انڈین ہیرو سے کم خوبصورت نہیں لگ رہے تھے۔ چال میں ڈھیلے پن کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے بیان کی کہ ان کے دونوں گھٹنے مصنوعی لگے ہوئے ہیں اور پھر عمر بڑی ظالم شہ ہے بڑوں بڑوں کو جھکا دیتی ہے۔ الختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری، علیت و قابلیت اور معصومیت کا خوشگوار اظہار۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر ستیہ پال کی ظاہری شخصیت ہی جاذب نظر نہیں وہ اندر سے بھی ایک اچھے انسان ہیں، بہ اخلاق ہیں، خوش گفتار ہیں، خوش مزاج ہیں، خوش خوراکی کا اندازہ نہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھا انسان ہونا بڑی بات ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

خدا تو ملتا ہے، انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

مجھے ڈاکٹر ستیہ پال کی شخصیت میں ایک علم دوست، علم پرور، شاعر وادیب، ماہر لسان وادب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی دکھائی دیا جس نے اپنی زندگی کا مطمع نظر حصولِ علم وادب، ترسیلِ علم وادب اور ادب کا فروغ بنایا اور وہ اپنے اسی مقصد پر آج بھی کاربند ہے۔ معروف شاعر وادیب معراج جامی نے میزبانی کے فرائض خوبصورت انداز سے انجام دیے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند امریکہ سے تشریف لائے ہیں، یہ بنیادی طور پر پاکستانی ہیں، تقسیم ہند کے وقت یہ بھارت تشریف لے گئے پھر انگلستان اوراب امریکہ میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بنیای طور پر نظم کے شاعر ہیں، افسانہ نگار بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ ادب کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی مختلف جہتیں گفتگو میں سامنے آئیں۔ انہوں نے ڈاکٹر آنند کو ادب کا آفتاب قرار دیا۔ اظہار خیال کرنے والوں میں انجمن ترقی اردو کی معتمد ڈاکٹر فاطمہ حسن کے علاوہ انجمن کے صدر ذوالقرنین جمیل، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر شارق علی شامل تھے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے اپنی گفتگو کا آغاز اپنی عمر بتا کر کیا ان کہنا تھا کہ وہ اسی ماہ 85 برس کے ہونے والے ہیں، انہوں نے کہا کہ وہ بنیادی طور پر پاکستانی ہیں، پاکستان کے شہر چکوال کے ایک قصبے ’کوٹ سرنج‘ میں 24 اپریل 1931ء میں پیدا ہوئے، میٹرک پنجاب سے کیا، حالات کے پیش نظر

تقسیم کے وقت اپنے خاندان کے ہمراہ مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ منتقل ہوگئے۔ اُن کی مادری زبان پنجابی ہے، ایم اے انگریزی میں پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ سے کیا،اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور پہلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ،ان کے مقالے کا عنوان "Changing concept of the nature of reality and literacy techniques of expression" تھا ڈاکٹر صاحب نے دوسرا ڈاکٹریٹ ٹرینیٹی یونیورسٹی ، ٹیکساس سے فلسفے میں کیا۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا کہنا تھا کہ انہوں نے 13 مختلف جامعات میں انگریزی ادب پڑھایا۔ اب امریکہ میں مستقل قیام ہے، لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں اور شاعری کرتے ہیں۔ڈاکٹر ستیہ پال کو انگریزی اور اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، بحور، چھند جیسی دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔اسی حوالے سے وہ تقابلی ادب کے اچھے استاد تصور کیے جاتے ہیں۔ڈاکٹر آنند نے 1957 میں پرومیلا آنند Promila Anandسے شادی کی ان کے دو بیٹے پراموڈ Pramod اور سچن Sachin ہیں۔

شعری لوازمات عصرِ حاضر کے تناظر میں' کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر آنند کا' کہنا تھا کہ اردو کو اس قدر اہمیت اس کے لیے کام کرنے کے باوجود جو بابائے اردو مولوی عبد الحق اور جمیل الدین عالی جیسے اردو سے محبت کرنے والوں نے کیا اردو کو وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکا۔ انہوں نے عہد بہ عہد اردو ادب کے حوالے سے گفتگو کی، انہوں نے شاعری میں استعاروں کی بات کی، ان

کا یہ بھی کہنا تھا کہ شاعری میں آمد کی کوئی حیثیت نہیں، ان کے خیال میں شعر کہنے والا اپنی ذہنی کیفیت یا شعور کو الفاظ میں ڈھالتا ہے جسے شاعری میں آمد سے تشبیہ دی گئی ہے، ان کا کہنا تھا کہ آمد اور آورد کا عمل موجودہ دور کی شاعری میں دخل نہیں، بنیاد استعارہ ہوتا ہے جسے مختلف اور نیا ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ کہنے والا اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، وہی موضوعات جنہیں وہ محسوس کرتا ہے ان میں سے ہی کسی استعارے کو بنیاد بنا کر آگے بڑھتا ہے۔ گویا وہ استعارہ کو شاعری کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ اس کے بر عکس شاعری میں آمد اور آورد کی اصطلاحیں عام ہیں، غالبؔ نے تو بہت پہلے شاعری میں آمد کے حوالے سے کہہ دیا تھا کہ مضامین غیب سے خیال میں آتے ہیں، ممکن ہے کہ ڈاکٹر آنند کے نزدیک غالبؔ کے غیبی مضامین استعارہ ہوں۔ غیبی خیالات کی بات غالبؔ نے اپنے اس شعر میں کہی ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ڈاکٹر ستیہ پال نے چھ سے سات سو نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تاثر بھی ہے کہ وہ غزل کے مقابلے میں نظم کے قائل ہیں۔ بلکہ بعض ناقدین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ڈاکٹر آنند غزل کے خلاف ذہن رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر آنند سب سے زیادہ نظمیں کہنے والے شاعر ہیں ۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن نے ڈاکٹر آنند کی چھ

سو نظموں میں سے ساٹھ نظموں کا انتخاب کیا جو بعنوان 'ستیہ پال آنند کی ساٹھ منتخب نظمیں' کے عنوان سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ مولفہ کے مطابق اس انتخاب میں بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی سے لے کر آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے وسط تک لکھی گئی نظمیں شامل ہیں۔ انھوں نے ستیہ پال کو زود گو شاعر قرار دیا، ان کا کہنا ہے کہ 'شاعری میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا رویہ روایت سے بلند آہنگ انحراف کا ہے اور اس رویے کو ان کا معاصر نقادوں نے بھی پوری طرح اُجاگر کیا ہے'۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن نے کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر آنند کی شاعری کے حوالے سے مختلف شعراء کے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم کا کہنا ہے کہ 'ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند نے تمثیل سے باہر کھڑے ہو کر تمثیل کے کرداروں کو دیکھا نیز خود سے باہر نکل کر خود کا نظارا کرنے کی جو روش اختیار کی ہے وہ اردو نظم کو ایک انوکھی قوت عطا کر رہی ہے'۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ 'ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند بہت صحیح وقت پر اردو میں ظاہر ہوئے'، جب کہ اختر الایمان کا کہنا ہے کہ 'ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند کی نظمیں، غزل کی لفظیات، استعارات اور زبان سے چپک جانے والی مٹھاس سے یکسر پاک ہیں'، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ 'ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند نے یک صد نظمیں اس بات کے عملی ثبوت کے طور پر لکھیں کہ مغربی قارئین ان جیسی نظموں کو انگریزی یا دیگر یورپی زبانوں میں پڑھ کر محسوس کریں گے کہ موضوعاتی، معانیاتی اور اسلوبیاتی سطحوں پر یہ

کسی طرح بھی مغربی شاعری سے کم درجے کی نہیں ہیں۔ ان میں جو معانیاتی قوس قزح ہے، مشرقی اور مغربی شعری روایت کے درمیان جو جمالیاتی پُل بنانے کی کوشش ہے، انگریزی سوچ، ہندوستانی مزاج اور اردو اظہار کا جو جزرومد ہے، ہندوستانی تناظر کی جو چھائیں ہے، جو انوکھا اور نیا ذائقہ ہے وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے'۔ معروف شاعر پروفیسر سحر انصاری کا خیال ہے کہ ہم کلاسیکی رویوں کے بغیر تجربے نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند نے اہم نظمیں لکھی ہیں جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہیں۔ انہوں نے جدید زندگی کو لکھا ہے اور عالمی ذہن تو اسی طرح بنتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے ڈاکٹر آنند کی شاعری کے حسن کی تعریف ان الفاظ میں کی۔ 'ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند جدید اور شاعری میں جمالیاتی رومانی حیثیت کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس رومانیت کے مفہوم میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے کہ جو جمالیات کی سب سے تابناک جہت ہے۔ یہ رومانیت تجربوں کی وسعت اور تہہ داری کا جمالیاتی احساس بخشتے ہوئے جمالیاتی انبساط عطا کرتی ہے۔ یہ رومانیت اکثر جمالیاتی انکشافات کرتی ہے اور ماضی اور حال کے تجربوں کو عموماً اس طرح چھوتی ہے کہ جمالیاتی اور ارتعاشات Aesthetic vibrations پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح ستیہ پال آنند ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے سامنے آجاتے ہیں'۔ ڈاکٹر شارق علی کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر سَتیہ پَال آنند کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غزل کے مخالف ہیں

لیکن یہ غلط ہے وہ جوشؔ کی مانند جس موضوع پر کہتے ہیں کہتے چلے جاتے ہیں، تقابل ادیان ان کا خاص موضوع ہے، وہ جو کچھ نظم میں کہتے ہیں عہد حاضر کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں،انھوں نے افسانے بھی لکھے، غزل بھی کہی اب نظم کہہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کو ان کی علمی و ادبی خدمات پر اعزازات سے بھی نوازا گیا، جواہر لعل نہری فیلوشپ، اردو مرکز ایوارڈ، لاس اینجلز اور حکومت پنجاب، بھارت کی جانب سے Shiromani Sahityakar Award سے نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر سَتیہ پال آنند کی تصانیف میں اردو، انگریزی اور ہندی کی کتب شامل ہیں۔ اردو میں شائع شدہ مجموعوں میں 'دل کی بستی، دست برگ، پھول پھول نظم، وقت لاوقت، شہر کا ایک دن، کتھا چار جنموں کی، تتھاگت نظمیں، جو نسیم خندہ چلے، میرے اندر ایک سمندر، لہو بولتا ہے، مجھے نہ کرو وداع شامل ہیں۔ مختصر کہانیاں: جانے کے لیے، اپنے مرکز کی طرف، دل کی بستی، اپنی اپنی زنجیر، پتھر کی سلیب۔ناول: آہٹ، چوک گھنٹا گھر، عشق موت اور زندگی، شہر کا ایک دن۔ ہندی مطبوعات: یوک کی آواز، پینٹر باوری، آزادی کی پکار بھوری، دل کی بستی، چوک گھنٹہ گھر۔ گیت اور غزلیں۔ پنجابی میں: سویر دوپہر شام، مٹھو مٹھا، غزل غزل دریا، غزل غزل ساگر، غزل غزل لہر۔ انگریزی میں :Life's a jtale, Some shallow, ssome deep, sunset Starands, If Winter Comes, One Hundred

شامل ہیں۔Buddhas, A Vagrant Mirror and The Dream Weaver

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی ایک نظم جس کے بارے میں ڈاکٹر آنند نے لکھا کہ مرزا غالبؔ کے مصارع پر مبنی میری تیس مختصر نظموں میں سے یہ نظم ڈاکٹر آنند نے حال ہی میں اپنے فیس بک میں پوسٹ کی ہے ۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
ذرہ...اقل اقل ، فقط اک نقطہ، طمعہ، جزو
ذرہ خفیف، ہیچ، فردست، کفِ کاک
!ذرہ قلیل سالمہ ، ایٹم، الیکٹران
اور آفتاب ...برتر و ممتاز، بالاتر
فوق النظیر، لاجواب و بے مثال کُل
! ہاں آفتاب، جامع، جمیع، جملہ مطلقاً
ذروں کا مجموعہ ہے مگر آفتاب بھی
اس کا ثبات ذروں کے ادغام میں ہے بست
ہر ذرہ غیر منقسم، واحد اکائی ہے
یہ بستگی، پیوستگی ذروں کی دین ہے
ورنہ یہ آفتاب تو ہے ریت کی دیوار

غالبؔ کو کوئی کیسے بتاتا یہ واقعیت

انیسویں صدی میں تو کوئی جانتا نہ تھا

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی نظم 'خود نوشت سرگشت' سے انتخاب ۔

جو مسئلے تھے، حل ہوئے

جو راستے تھے، کٹ گئے

جو منقلیں تھیں، طے ہوئیں

جو خارزار آبلوں کی آبرو بنے ہوئے بچھے تھے

اب چبھن کی میٹھی یاد بن کے رہ گئے

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی ایک نظم مقروض سے انتخاب ۔

بھاگتا ہوں

کوئی تیزی سے تعقب میں لگا ہے

مجھ پہ پیچھے سے جھپٹنا چاہتا ہے

لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا، پھر سنبھلتا

تیز تر قدموں سے آگے بھاگتا ہوں

میرا کالر اُس کے ہاتھوں کی پکڑ میں آتے آتے

پھٹ گیا ہے

شبِ براءت۔ رحمتوں اور برکتوں والی رات

شَعبان المعظم کی پندرہویں شب مغفرت اور بخشش والی رات ہے، اسی وجہ سے اس رات کو ''شبِ براءت'' کہا جاتا ہے۔ یہ رات شعبان کی چودہ تاریخ، سورج غروب ہونے سے شروع ہوتی ہے اور پندرہویں تاریخ کی صبح صادق ہونے تک برقرار رہتی ہے۔ کتب احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم شعبان کے مہینے میں کثرت سے روزے رکھا کرتے اکثر آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم شعبان کو رمضان سے ملا دیتے، مگر امت کو شعبان میں بکثرت روزے رکھنے سے منع فرما دیا، البتہ نصف شعبان کی رات کو قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی۔ حدیث مبارکہ ہے کہاس رات میں اللہ تعالیٰ سب سے نیچے کے آسمان (سماء الدنیا) پر اُتر آتا ہے اور انسانوں کو ان کے گناہ معاف کرنے کے لیے پکارتا ہے۔
شب' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رات کے ہیں، 'براءت' عربی زبان کا لفظ' ہے جس کے معنی بری ہونے اور نجات پانے کے ہیں۔ اس طرح شبِ براءت کا مطلب ہے' نجات پانے والی رات'۔ یہ وہ رات ہوتی ہے جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے رحمت سے اپنے نیک اور توبہ کرنے والے بندوں کو جہنم سے نجات عطا فرماتے ہیں۔
اس رات کو کئی اور ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے جیسے لیلۃ المبارکۃ یعنی

برکتوں والی رات، لیلۃ الرحمۃ اللہ کی رحمتوں کے نزول کی رات، لیلۃ البراءۃ یعنی جہنم سے نجات اور بری ہونے والی رات

لیلۃ الصّک دستاویز والی رات۔ ان تمام متبرک ناموں کے باوجود یہ رات شب برات کے نام سے موسوم ہے۔

اس رات کی اہمیت کا اندازہ قرآن کریم کی سورۃ" الدخان"، آیات 1-6 سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ترجمہ" قسم (اس) روشن کتاب کی۔ بلاشبہ ہم نے اسے برکت والی رات میں نازل کیا، یقیناً ہم (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں۔ اس (رات) میں ہر حکمت والے کام کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ ہماری جانب سے حکم (نافذ) ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے"۔ ان آیات مبارکہ میں جس مبارک شب کا تذکرہ ہے مفسرین نے شب قدر سے مراد لی ہے جو نزول قرآن کی رات ہے اور جس کا تذکرہ "سورۃ القدر" میں ہے۔ مفتی منیب الرحمٰن کا کہنا ہے ' حضرت عکرمہ اور بعض دیگر مفسرین کرام نے اس سے شعبان المعظم کی پندرھویں شب مراد لی ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس مبارک رات کے متعلق ارشاد فرمایا ہے" اس رات میں ہمارے حکم سے ہر حکمت والا کام تقسیم کر دیا جاتا ہے"۔ یعنی شب برات میں بندوں کا رزق، ان کی اموات و پیدائش کے امور، آئندہ رونما ہونے والے حادثات واقعات غرض سال بھر میں ہونے والے تمام امور کے احکام الگ الگ

تقسیم کردیے جاتے ہیں، اور ہر کام کے فرشتوں کو اُن کا کام سونپ دیا جاتا ہے، جس کی وہ سال بھر طے شدہ دن اور وقت پر سختی سے تکمیل کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا ''شعبان کی پندرویں شب کو تو اللہ تعالیٰ سوائے مشرک اور کینہ ور کے سب کی مغفرت فرمادیتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جب شعبان کی درمیانی رات آئے تو اس رات کو قیام کرو اور دن کا روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات کو غروب آفتاب ہی سے آسمانِ دنیا پر نزول رحمت فرماتا ہے اور (اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے) ہے کوئی بخشش کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں ، ہے کوئی (کشادگی) رزق کا خواست گار کہ میں اسے رزق عطا کروں، ہے کوئی مبتلائے مصیبت کہ میں اسے مصیبت سے نجات دوں، اسی طرح تمام حاجت مندوں کی حاجات کا ذکر کرکے رحمت باری انہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور یہ (فیضان عطا اور سلسلہ لطف و کرم) طلوع فجر تک جاری رہتا ہے''۔ سنن ابن ماجہ نے نقل کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتی ہیں کہ ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لیے کھڑے ہوئے ، نماز شروع کی، '' اور سجدے میں پہنچے تو اتنا طویل سجدہ کیا کہ مجھے یہ خطرہ ہو گیا کہ شاید خدا نخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح قبض ہو گئی ہے، یہاں تک کہ میں پریشان ہو کر اٹھی اور پاس جاکر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انگوٹھے کو حرکت دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ حرکت فرمائی، جس سے مجھے اطمینان ہوگیا اور میں اپنی جگہ لوٹ آئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو (تھوڑے سے کلام کے بعد) فرمایا، عائشہ ؑ تم جانتی ہو کہ یہ کون سی رات ہے، میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب جانتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ نصف شعبان کی رات ہے۔ خداوندِ عالم اس رات میں خاص طور سے اہل عالم کی طرف توجہ فرماتا ہے اور مغفرت مانگنے والوں کی مغفرت اور رحم کی دُعا کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے''۔

شَعَبان کی پندرہویں شب قبرستان جانا

شَعَبان المعظّم کی پندرہویں شب قبرستان جانا اور اپنے مرحوم عزیز واقارب، احباب اور عامتہ المسلمین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا اور ایصال ثواب کرنا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،آپ فرماتی ہیں کہ اس شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باری میرے ہاں (آرام فرمانے کی) تھی کہ اچانک میں نیند سے بیدار ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں نہ پایا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنّت البقیع میں پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی آمد کو محسوس کرکے) فرمایا ''کیا تمہیں اس

بات کا خدشہ تھا کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ زیادتی کریں گے''۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ! میں نے (بشری تقاضے کے تحت) یہ سمجھا کہ شاید آپ کسی اور زوجۂ مطہرہ کے حجرۂ انور میں تشریف لے گئے ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالٰی نصف شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف فرماتا ہے''۔ اس حدیث مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے شعبان کی نصف شب کو مدینہ منورہ کے قبرستان 'جنت البقیع' میں جانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسلمان اس شب قبرستان جاتے ہیں اور اپنے اپنے عزیز رشتہ داروں، جاننے والوں کے علاوہ عام مسلمونوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کرتے ہیں، ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ گویا اس رات بطور خاص قبرستان جانا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے البتہ خواتین کو قبرستان جانے سے منع کیا گیا ہے ۔ قبروں پر موم بتیاں اور اگربتیاں جلانا مناسب نہیں ،اگر بتی جلانے کا مقصد خوشبو ہو تو اسے قبر سے ذرا دور لگا دینا چاہیے، موم بتی، تیل یا گھی کے چراغ روشنی کے لیے یا تلاوت کلام پاک کے لیے لگانا مقصود ہوں تو وہ بھی قبر سے ذرا دور فاصلے پر جلانا چاہیے۔

شَعبان کی پندرہویں شب کی نفلی عبادات

فضیلت اور برکت کے اعتبار سے شبِ برات ایک مقدس اور اہم رات ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس رات ہمارے لیے کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ یہ رات کس قدر نازک اور کتنی اہم ہے ہماری قسمت میں کیا لکھ دیا جائے گا، ہم اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ غنیتہ الطالبین میں ہے کہ " بہت سے کفن دھل کر تیار رکھے ہوتے ہیں، مگر کفن پہننے والے ان سے بے خبر بازاروں میں گھوم پھر رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی قبریں کھدی ہوئی تیار ہوتی ہیں، مگر ان میں دفن ہونے والے خوشیوں میں مست خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہنس رہے ہوتے ہیں حالانکہ ان کی موت کا وقت قریب آ چکا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے اپنے مکانات کی تعمیر کا کام مکمل ہونے والا ہوتا ہے، مگر ان کے مالکوں کی موت کا وقت بھی قریب آ چکا ہوتا

ہے"۔ چنانچہ اس مقدس رات کو کسی صورت بھی غفلت، بھول، بے توجہی میں ہر گز ہر گز نہیں گزارنا چاہیے، نہیں معلوم کہ یہ رات ہمیں آئندہ سال نصیب ہو گی بھی یا نہیں۔ اس اہم رات میں خصوصی نفلی عبادات کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ وہ رات ہے جس میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمتوں کی بارش کرتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس رات کی آمد سے قبل ہی اس رات کے فیوض و برکات کے حصول کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کرلیں اور یہ بھی عہد کریں کہ ہم آئندہ غلط کاموں کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ غنیتہ الطالبین میں بیان کی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ” اس رات میں سال بھر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کا نام لکھا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مرنے والے کا نام بھی لکھا جاتا ہے۔ اسی رات مخلوق کا رزق تقسیم ہوتا ہے اور اسی رات ان کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں“۔ ایک اور حدیث مبارکہ ہے کہ ارشاد فرمایا اللہ کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اس رات مخلوق کی عمر، ان کی روزی اور حاجیوں کے نام بھی لکھے جاتے ہیں“۔ شعبان المعظم کی اس مقدس رات میں جو شب برأت کہلاتی ہے حسب ذیل نفلی عبادات کی فضیلت ہے۔

غروبِ آفتاب کے وقت کا کلمہ اور درود شریف

علمائے اکرام نے لکھا ہے کہ غروب آفتاب کے وقت لَا حُولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ العَلِیُّ العظیم چالیس بار پڑھا جائے۔

ساتھ ہی درود شریف سو مرتبہ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے چالیس سال کے گناہ معاف فرمادے گا۔

نماز تحیتہ الوضو

مغرب کی نماز سے قبل غسل کیا جائے اگر کسی سبب غسل کرنا ممکن نہ ہو تو باوضو ہو کر دو رکعت تحیتہ الوضو پڑھے، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد آیتہ الکرسی ایک بار، سورۂ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھنا باعث ثواب ہے، یہ نماز

بہت افضل ہے۔

درازیٔ عمر کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ درازیٔ عمر بالخیر عطافرمائے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۂ قدر ایک مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے 21 مرتبہ سورۂ اخلاص، ایک مرتبہ سورۃ یٰسین کی تلاوت کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر، گڑگڑا کر اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ درازیٔ عمر بالخیر عطافرمائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جسے سنن ابی داؤد نے نقل کیا ہے کہ فرمایا آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے " اللہ سے اس طرح ہاتھ اٹھاکے مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رخ سامنے ہو ہاتھ الٹے کرکے نہ مانگا کرو اور جب دُعا کر چکو تو اپنے ہاتھ چہرے پر پھیر لو"۔

نماز خیر

شعبان المعظم کی پندرھویں شب میں سو رکعتوں کی نماز کو" نماز خیر" کا نام حضرت شیخ المشائخ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی معروف کتاب "غنیتہ الطالبین" میں دیا ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ سو رکعتوں میں ایک ہزار بار سورۃ الاخلاص یعنی ہر رکعت میں دس بار قل ہوُاللہ احد پڑھیں۔ اس نماز کی بڑی

فضیلت آئی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ مجھ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ و سلم کے تیس صحابیوں نے بیان کیا ہے کہ اس رات جو شخص یہ نماز پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر بار نگاہ کرتا ہے، اور ہر بار اس کی ستر حاجتیں پوری کرتا ہے، جن میں کم سے کم حاجت گناہوں کی مغفرت ہے۔

بلاؤں سے حفاظت کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تمام بلاؤں، جادو ٹونا اور آفات سے محفوظ رکھے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۂ آیت الکرسی ایک مرتبہ، سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے 21 مرتبہ سورۂ اخلاص، 21 مرتبہ سورۃ آیت الکرسی، 21 مرتبہ درود شریف پڑھ کر صدق دل سے اللہ سے دعا کریں اللہ تعالیٰ ہر طرح کی بلاؤں، جادو، ٹونا اور آفات سے محفوظ رکھے۔ بلاؤں اور جادو سے محفوظ رہنے کی ایک صورت بعض دینی کتب میں یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ شعبان المعظم کی پندرھویں رات بیری (یعنی بیر کے درخت) کے سات پتے پانی میں جوش دے کر (جب پانی نہانے کے قابل ہو جائے تو اس پانی سے) غسل کیا جائے۔ یہ عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے کرم سے تمام سال جادو اور بلاؤں کے اثر سے محفوظ رہے گا۔

اللہ اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے

دو رکعت نماز کی نیت اس طرح کریں کہ نماز کی نیت میں یہ الفاظ شامل کریں کہ اللہ تبارک و تعالٰی اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے ایک مرتبہ سورۃ یٰسین ، 21 مرتبہ درود شریف پڑھ کر صدق دل سے اللہ سے دعا کریں کہ وہ اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔

رزق میں کشادگی اور برکت کے لیے نماز و دعا

دو رکعت نماز ، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد آیتہ الکرسی ایک بار ، سورۃ اخلاص پندرہ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام اشک بار آنکھوں کے ساتھ ،صدق دل سے ، خشوع و خضوع کے ساتھ درود شریف ایک سو مرتبہ پڑھ کر ترقی رزق، کشادگی رزق، برکت رزق کی دعا کریں انشاءاللہ تعالٰی اس نماز کے پڑھنے اور دعا سے اللہ پاک دعا قبول فرمائے گا اور رزق میں ترقی ہو گی۔

عذابِ قبر سے نجات کے لیے نماز و دعا

آٹھ رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص دس دس مرتبہ پڑھیں ۔بعد سلام صدق دل سے ، خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ تعالٰی سے عذاب قبر سے نجات کی التجا کریں، یقیناً اللہ تعالٰی اس شخص کے لیے فرشتے مقرر

کرے گا جو اسے عذاب قبر سے نجات اور داخل بہشت ہونے کی خوشخبری دیں گے۔

گناہوں کی توبہ کے لیے نماز و دعا

شبِ برات کی رات آٹھ رکعت نماز چار سلام سے واسطے مغفرت گناہ پڑھیں، پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ آیت الکرسی 10 مرتبہ، دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ نشرح دس مرتبہ، تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ قدر دس مرتبہ اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص دس مرتبہ پڑھیں ۔پھر چار رکعت اسی ترتیب سے پڑھیں۔ بعد سلام سجدے میں گریا وزاری کرتے ہوئے اعتراف گناہ کے ساتھ، احساس ندامت کے ساتھ، خشوع و خضوع کے ساتھ، اخلاص، نیت سے، امید اور یقین کے ساتھ اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرتے ہوئے ستر مرتبہ استغفار اور ستر مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے گناہوں کی توبہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" اللہ سے اس کا فضل مانگو یعنی دعا کرو کہ وہ فضل و کرم فرمائے، کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اس کے بندے اس سے دعا کریں اور مانگیں" ۔

(جامع ترمذی)

سلامتی حفاظت جان و مال کے لیے نماز و دعا

شبِ برات کی شب سورۃ البقرہ کا آخری رکوع ''امن الرسول سے کافرین تک اکیس مرتبہ پڑھنا واسطے امن و سلامتی حفاظت جان و مال افضل ہے۔

قبولیت دعا

دعا خواہ دنیاوی ہو یا دینی اس مقدس رات میں چودہ رکعت نماز سات سلام سے پڑھیں ہر رکعت میں بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ کافرون ایک مرتبہ، سورۃ اخلاص ایک مرتبہ،، سورۃ ناس ایک مرتبہ پڑھیں، بعد سلام سورۃ آیت الکرسی ایک مرتبہ، سورۃ توبہ کی آخری آیات لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ'' تا عَظِیْمُ تک ایک مرتبہ پڑھ کر اللہ کے حضور قبولیت دعا کی استدا کریں، ضروری ہے کہ دل میں اعتراف گناہ ہو، ندامت کا احساس ہو، اخلاص ہو اور اپنے پروردگار سے امید اور یقین ہو، اللہ تعالیٰ تمام دعائیں قبول کرے گا۔

سورۃ دخان (پارہ 25) سات مرتبہ پڑھنا افضل ہے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ ستر حاجات دنیاوی اور ستر حاجات عقبیٰ کی قبول فرمائے گا۔ اس روز حسب ذیل دعا کثرت کے ساتھ پڑھنا باعث ثواب ہے، اس دعا کے پڑھنے والو کے لیے اللہ تعالیٰ ہزار سال کی عبادت کا ثواب لکھ دیتا ہے اور اس کے ہزار سال کے گناہ مٹا دیتا ہے اور وہ روز حشر قبر سے اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے

چاند کی مانند چمک رہا ہوگا۔ دعا: لَاإِلٰهَ اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَلَوْکَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ترجمہ: ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، ہم اس کے دین کے لیے مخلص ہیں، اگرچہ کافروں کو ناگوار گزرے''

حضرت عارف باللہ اور ڈاکٹر محمد عبدالحہ نے اپنی 'کتاب اُسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم 'میں حدیث بیان کی ہے جس کی راوی حضرت عائشہ صدیقہ ر اللہ تعالی عنہا ہیں۔ آپ فرماتی ہیں کہ شعبان کی پندرھویں شب جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کہتی ہیں کہ صبح کو ان کلمات دعائیہ کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ تم ان کو یکھ لو اور اوروں کو سکھاؤ۔ مجھے جبریل علیہ السلام نے یہ کلمات سکھائے ہیں اور کہا ہے کہ میں انہیں سجدے میں بار بار پڑھا کروں۔ (بیہقی، مشکوۃ، الترغیب والترہیب) دعائیہ کلمات: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَاَعُوْذُبِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوْذُمِنْكَ جَلَّ وَجْهُكَ لَااُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ ط' ترجمہ: ''میں پناہ چاہتا ہوں آپ کے عفو و درگذر کے ذریعہ آپ کے عذاب سے اور پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کے ذریعہ آپ کی ناراضگی سے اور آپ کی شایان شان تعریف نہیں کرسکتا۔ آپ ویسے

''ہی ہیں جیسے آپ نے خود اپنی ثنا فرمائی

شَعبان کی پندرہویں شب کا روزہ

سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' جب شعبان کی درمیانی رات آئے تو اس رات کو قیام کرو اور دن کا روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات کو غروب آفتاب ہی سے آسمانِ دنیا پر نزول رحمت فرماتا ہے اور (اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے) ہے کوئی بخشش کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں؟ ہے کوئی (کشادگی) رزق کا خواست گار کہ میں اسے رزق عطا کروں؟ ہے کوئی مبتلائے مصیبت کہ میں اسے مصیبت سے نجات دوں؟ اسی طرح تمام حاجت مندوں کی حاجات کا ذکر کرکے رحمت باری انہیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور یہ (فیضان عطا اور سلسلۂ لطف و کرم) طلوع فجر تک جاری رہتا ہے ''۔اس دن روزہ رکھنے کا بہت ثواب ہے، جس نے اس روز روزا رکھا اسے دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ شعبان المعظم کی پندرھویں شب ُشب.برات رحمتوں اور.برکتوں والی رات ہے۔اس رات میں پروردگاراپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے،مالک دوجہاں کی طرف سے انوار و تجلیات ، رحمت وبخشش کی بارش ہوتی ہے۔اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی

جانب سے جاری اس رحمت کے سمندر سے کیسے فیض حاصل کریں۔اگر ہم اس امید اور یقین کے ساتھ دعا طلب کریں کہ وہ ہمارا مالک ہے، ہماری دعا کبھی رد نہیں کرتا، وہ ہر مانگنے والے کی توقعات کے مطابق اسے دیتا ہے وہ رحیم ہے، وہ کریم ہے، وہ رازق ہے، وہ دو جہاں کا مالک ہے ہماری دعا یقینا قبول کرے گا۔ہمیں چاہیے کہ اس مبارک رات کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں، غروب آفتاب کے فوری بعد عبادات کا اہتمام کریں۔

شبِ برات اور آتش بازی

ہمارے معاشرے میں بعض غیر شرعی اور بے ہودہ رسم و رواج جن میں آتش بازی جیسی رسم شامل ہے پروان پاچکی ہے ان کی ہر طرح نفی کریں، اپنے بچوں، محلے، پڑوس اور شہر میں جو لوگ اس غیر شرعی فعل میں شریک ہوں انہیں اس کام کے غیر شرعی اور خطرناک حدتک نقصان دہ ہونے کا احساس لائیں۔اپنے بچوں کو خاص طوپر ایسے کاموں سے دور رکھیں۔اس عمل کا اسلامی طرز عمل سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ یہ غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی فعل ہے۔

شبِ برات کے دن حلوہ بنانا

اس دن کو بعض گھروں میں حلوہ پکانے اور عزیز رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جب کہ اس قسم کی روایت کہیں موجود نہیں۔ تاہم اس دن غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ممانعت نہیں یہ عمل باعث ثواب ہے خواہ حلوہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس دن کو مخصوص کر کے یہ عمل کرنے کی مثال کہیں موجود نہیں۔ ہم سال کے 365 میں سے کسی بھی دن یہ نیک کام کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس دن مختلف قسم کے حلوے اور انواع و اقسام کے حلوے پکا پکا کر خواتین اس قدر تھک جاتی ہیں کہ رات میں جو کام انہیں کرنا ہے، جو عین اسلامی اور ہمارے لیے فائدہ مند ہے یعنی عبادت کرنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

شبِ برات اور ٹیلی ویژن

لمحۂ موجود میں ایک اور عمل ہمارے معاشرے میں عام ہو چکا ہے کہ نجی ٹیلی اور سوشل میڈیا پر رات رات بھر خصوصی پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعض چینل کھلے میدانوں میں اس کا اہتمام کرتے ہیں جن میں ہزاروں مرد، خواتین اور بچے رات رات بھر شو کرنے والوں کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس رات ٹیلی ویژن پر شو کرنے والے اچھی باتیں ہی کر رہے ہوتے ہیں، یعنی اس پر موضوع پر علماء اکرام کی تقاریر، حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ پیش ہو رہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف گھروں میں احباب ٹیلی

وژن کے سامنے بیٹھ کر پوری پوری رات پروگرام سننے اور دیکھنے میں گزار دیتے ہیں۔
اس عمل سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ اچھی باتیں سننے کو ملتی ہیں، دل خوش ہوتا ہے، پروگرام کرنے والوں کی دکانیں چمکتی ہیں، چینل کے مالکان کی کمرشل چلانے سے خوب آمدنی ہوتی ہے، ٹی وی چینل ریٹنگ میں آگے سے آگے نکل جانے کے دعوے کرتے ہیں، نقصان کا اندازہ لگائیں کہ ساری رات جو کام ہمیں کرنے تھا اور جس کا حکم بھی موجود ہے اس سے ہم محروم ہوگئے، نہ نماز پڑھی، نہ نفل پڑھے ، نہ عبادت اور نہ ہی دعائیں مانگیں۔ ان سب باتوں سے ہم محروم ہو جاتے ہیں۔ صرف شبِ برات کی شب ہی نہیں ایسے بے شمار مواقع آتے ہیں کہ جن میں یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ کبھی ٹھنڈے دل سے، سنجیدگی کے ساتھ ، تنہا بیٹھ کر غور کیجئے کہ ٹیلی وژن پر اس قسم کا شو کرنے والے ہمیں کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں، اس کے مقابلے میں انہیں فائدے ہی فائدے ہیں۔ اللہ ہمیں نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا

میاں نواز شریف کو پارلیمنٹ میں بلانے کے لیے کیا کیا جتن اپوزیشن نے نہیں کیے تھے۔ جب میاں صاحب نے یہ کہا کہ وہ پارلیمنٹ میں نہیں آئیں گے اس پر تو گویا ایک طوفان کھڑا ہوگیا تھا، اپوزیشن نے میاں صاحب کے لتے لے لیے۔ وہی نہیں بلکہ ٹی وی ٹاک شوز میں ہر اینکر پرسن میاں صاحب کے اس فیصلے کو غلط اور جمہوری اصولوں کے خلاف کہتا نظر آیا۔ مجھ سمیت کوئی کالم نگار ایسا نہیں تھا جس نے اپنے کالموں میں یہ نہ لکھا ہو کہ پارلیمنٹ سے فرار میاں صاحب کو زیب نہیں دیتا۔ میاں صاحب نے ایسا کیوں کیا تھا؟ وہ پارلیمنٹ کو فیس کرنے سے کیوں کترا رہے تھے، اس لیے کہ پاناما لیکس کے طوفان اور اپوزیشن خاص طور پر کپتان کی سخت ترین تنقید نے میاں صاحب کو نروس کر دیا تھا۔ جب وہ پہلی بار لندن علاج کی غرض سے گئے، پھر اچانک واپس بھی آگئے یہ وہ دن تھے جب میاں صاحب محسوس کر رہے تھے کہ ان کا پاناما لیکس کے طوفان سے باہر نکلنا شاید مشکل ہو۔ اُن دنوں کی ان کی باڈی لینگوئج بتا رہی تھی کہ وہ انتہائی نروس، افسردہ اور پریشانی کے عالم میں ہیں۔ ادھر عمران خان نے جس قسم کا طوفان پاناما لیکس کے حوالے سے ملک میں پیدا کر دیا اس سے میاں صاحب اور ان کے ساتھی پریشان نظر آ رہے تھے۔ انسان سوچتا کچھ ہے مالک تقدیر نے جو لکھا ہوتا ہے ہوتا وہ ہے۔ میاں صاحب،

نے اپنا فیصلہ تبدیل کیا یعنی انہوں نے پہلے جمعہ 13 مئی مقرر کیا قومی اسمبلی میں حاضر ہونے کا پھر کچھ معاملات گھمبیر ہوتے نظر آئے تو فیصلہ بدل لیا، جس پر ان پر اور زیادہ تنقید ہوئی ، آخر کار انہوں نے پیر 16 مئی مقرر کی، عام خیال تھا کہ شاید میاں صاحب پارلیمنٹ میں نہیں آئیں گے، سرکاری حلقوں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی، میاں صاحب کے قریبی ساتھی اپوزیشن سے ملاقاتیں کرکے میاں صاحب کی موجودگی کو ساتھ خیریت سے گزارنے، ہنگامہ آرائی نہ کرنے کی درخواستیں کر رہے تھے لیکن ظاہری بھڑ کیں مار رہے تھے۔ اپوزیشن نے جو حکمت عملی تیار کی ، جو سامنے بھی آئی، وہ اس میں بری طرح ناکام ہو گئی، پارلیمنٹ میں عمران خان کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ بڑی تیاری سے ، ثبوتوں کے ساتھ آئے ہیں، لگ رہا تھا کہ عمران خان اندر ہی اندر اس سوچ میں تھے کہ میری باری تو آنے دو میاں صاحب ، تمہاری تو میں ایسی خبر لوں گا کہ یاد کروگے لیکن ایسا کیا ہوا ؟ کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی، 'ہماری ویب' کے ایک کالم نگار سید انور محمود کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ 'عمران ماموں بن گئے'۔ لیکن یہ من جانب اللہ ہوا، میاں صاحب کو اس طوفان سے بچانا تھا چنانچہ پوری اپوزیشن بشمول عمران خان کے ذہن ماعوف ہوگئے، ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاہ گیا۔ خورشید شاہ کی تقریر کیا تھی بس یہ اعلان تھا کہ خوش رہو نواز شریف ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ دیکھو ہم نے اپنے لیڈر کی خوشی کو کس خوش اسلوبی سے منطقی انجام کو پہنچایا، تمہیں کس خوبصورتی سے

اس بھنور سے نکال دیا اور میاں صاحب مشکل سے صاف نکل گئے۔ میرا درج ذیل شعر آمد نہیں بلکہ آورد ہے، استعارہ وزیر اعظم ہیں اور لمحۂ موجود کے ماحول سے متاثر ہو کر ہے

تمہیں بلانے کے کیا کیا جتن ہم نے نہیں کیے
تم آئے اور چلے بھی گئے، ہم دیکھتے ہی رہ گئے

اپنے لکھے ہوئے خطاب میں نواز شریف نے اپوزیشن کے چند سوالوں کے جوابات تو دیے۔ ثبوت ضروری نہیں، ویسے بھی پاکستانی سیاست میں بغیر ثبوت کے الزامات کی روایت عام پائی جاتی ہے۔اپنی صفائی پیش کی اور جو کچھ اپنے اور اپنے خاندان کے رئیس ابن رئیس ہونے کی کہانی سنائی وہ اپنی جگہ تھی، اپوزیشن اگر چاہتی تو بڑی اچھی طرح تنقید کا نشانہ بنا سکتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، باہر جاکر بھی جو کچھ اپوزیشن نے کہا اس سے بھی ان کی حکمت عملی کی ناکامی واضح تھی۔ اس موضوع پر پہلے ہی میرا تجزیہ یہ تھا کہ ' اندازہ ہوتا ہے کہ کمیشن بنانے پر اتفاق ہو جائے گا، ٹرم آف ریفرنس دونوں افہام و تفہیم سے بنالیں گے، دونوں جانب سے سیز فائر ہو جائے گا، کمیشن اپنا کام سبک رفتاری سے جاری رکھے گے، اپوزیشن ٹھنڈی ہو جائے گی، حکومت سکھ کا سانس لے گی۔ جب کمیشن کی رپورٹ آئے گی میاں صاحب کے دن پورے ہو چکے ہوں گے، یعنی 2018 آچکا ہوگا، الیکشن تمام پارٹیوں کو اپنی جانب متوجہ کر لے گا اور میاں

صاحب جیسے اس سے پہلے بحرانوں سے نکلتے رہے ہیں۔ پاناما لیکس کے بحران سے بھی نکل جائیں گے''۔ یہ کالم 16 مئی کو ہماری ویب پر ' پاناما لیکس اوراپوزیشن کے سات سوال' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ متحدہ اپوزیشن نے جس انداز سے ایوان سے واک آؤٹ کیا، اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو تھا۔ وجوہات جو بھی رہی ہوں، یہ عمل پاکستان کے لیے، جمہوریت کے لیے، سیاست دانوں کے لیے، حکومت کے لیے کسی بھی اعتبار سے فائدہ مند نہیں ۔ میاں صاحب نے اپوزیشن کے اس عمل کو بھرپور طریقے سے کیش کرانے کی کوشش کی ، جلسے کیے، عمران خان پر بھرپور تنقید کی، اس لیے کہ عمران خان بھی اس معاملے میں ملوث نکلے، اب پھر سے دونوں جانب سے ایک دوسرے پر تنقید بلکہ شرم ناک حدتک برا بھلا کہنے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سب کچھ کر کے نواز شریف دوسری بار لندن جاچکے ، مقصد علاج بتایا جارہا ہے، پہلے بھی مقصد علاج ہی تھا، نہیں معلوم ان سیاست دانوں کو کس قسم کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں کہ جن کا علاج ملک میں نہیں ہوسکتا، لندن ہی علاج کا مرکز کیوں ہوتا ہے۔ دوسری جانب مثبت پیش رفت بھی ہوئی،اپوزیشن نے اپنی ناکام حکمت عملی سے سبق سیکھااور حکومت سے مذاکرات اور مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی تشکیل پر تیا ہو گئی۔ مشترکہ کمیٹی تشکیل پا چکی ہے، امید کی جارہی ہے کہ تحقیقاتی کمیشن کے لیے ایسے TRO's تشکیل پاجائیں گے جن کی روشنی میں پارلیمانی کمیٹی پاناما پیپرز، آف شور کمپنیوں، قرضوں کی معافی اور کک بیکس کی تحقیقات کے لیے ٹی اوآرز تیار

کرے گی۔

پاناما لیکس میں پاکستان کے بے شمار مقتدر سیاست دانوں ، ان کے اہل خانہ ، ارکان پارلیمنٹ اور تاجروں کے نام سامنے آچکے ہیں۔ تعداد پانچ سو سے زیادہ بتائی جارہی ہے پاناما لیکس نے صرف پاکستانی سیاست اور معیشت ہی کو آلودہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے کئی، ملکوں کے سربراہان، وزیر اعظم پاناما لیکس سے شرم سار ہوچکے ہیں، بعض تو اس قدر غیرت مند تھے کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی بھی ہوگئے، بعض نے سرِ عام معافی طلب کی، برطانوی وزیر اعظم کو اپنی پارلیمنٹ میں جواب دہ ہونا پڑا۔ پاکستان میں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تاحال کچھ کہا نہیں جاسکتا، نواز شریف صاحب کی ظاہری حرکات و سکنات ، مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی دوڑ دھوپ، جلسوں کا اہتمام ، لندن میں زرداری صاحب سے ملاقات ، اسفند یار ولی کا پینترا بدلنا اور یہ کہنا کہ 'کسی کا باپ بھی نواز شریف سے استعفیٰ نہیں لے سکتا' معاملے کی سنگینی کا پتا دے رہی ہیں۔ معاملہ سنگین ہے، میاں بہ ظاہر مسکراتے چہرے سے گفتگو فرمارہے ہیں لیکن ان کی باڈی لینگویج بتا رہی ہے کہ وہ اندر سے خوف زدہ ہیں، انہیں اقتدار ماضی کی طرح وقت سے قبل سرکتا اور ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ از خود یہ خواہش رکھتے ہوں کہ پاناما لیکس ، آف شور کمپنیوں، فلیٹس کے معاملے پر وہ از خود مستعفی ہوکر عوام کی عدالت میں چلے

جائیں لیکن ان کے اس فیصلے میں ان کے اپنے قریبی ساتھی ان کے ہم رکاب ساتھ نظر نہیں آتے، وہ کسی صورت وقت سے قبل اپنی وزارتوں کے مزے سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے۔ میاں صاحب کا یہ آپشن برا نہیں، اگر وہ اس آپشن کو لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو عوام میں ان کی عزت اور توقیر میں اضافہ ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ عوام انہیں چوتھی بار بھی اپنے سر کا تاج بنالیں، ویسے بھی دیگر سیاسی جماعتوں کا حال برا ہی ہے، پاکستان پیپلز پارٹی میں اختلافات اوپری سطح پر صاف نظر آرہے ہیں، پنجاب میں اس کا صفایا ہوچکا، اس کے لیڈر دیگر جماتوں میں اپنی جگہ بنانے میں مصروف ہیں، کپتان کی سیاست کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے، عمران خان چاہتے ہیں کہ تن تنہا عوام انہیں ذوالفقار علی بھٹو بنادیں، ایسا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کپتان میں برداشت کم ہی ہے، ان کی اپنی جماعت میں اختلافات سب پر عیاں ہے، دیگر جماعتیں تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔ نواز شریف کے مخالف کوئی بڑا اتحاد بنتا دکھائی نہیں دے رہا، اپوزیشن اتحاد کی صورت حال ہی میں پارلیمانی کمیٹی کی تشکیل کے وقت سامنے آگئی تھی جس میں ایم کیو ایم نے اتحاد سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ ایسی صورت حال میں نواز شریف اب بھی عوام کے لیے بروں میں کم برے کا آپشن نظر آرہے ہیں۔

میری سرگذستِ حیات۔ اپنی زبانی

سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں، زندگی کی تریسٹھویں (٦٧) بہار دیکھ رہا ہوں، سچ بات تو یہ ہے کہ اب بہت ہو چکا، بہت کچھ کھا لیا، بہت کچھ دیکھ لیا، بہت کچھ پڑھ لیا، بہت کچھ لکھ بھی لیا اور چھپ بھی گیا۔ اب ہمارا بھی چل چلاؤ ہے، نہیں معلوم کب ہوا کا تیز جھونکا چلے اور چراغ گل ہو جائے۔ ویسے بھی جب سے ہماری انجیوپلاسٹی ہوئی اور ایک انسٹینٹ دل شریف میں ڈلا تب سے ہمارے دل نے ہمیں یہ احساس دلانا شروع کر دیا ہے کہ وہ ہمارے جسم میں موجود ہے، دھک دھک کر رہا ہے، اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنی دھک دھک بند کر سکتا ہے۔ ویسے اختیار کا مالک تو ہمارا پیدا کرنے والا ہے، اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا خواہ ہمارا دل ہمیں کتنا ہی ڈرائے دھمکائے ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔ غالبؔ نے اپنی آپ بیتی میں اِسی بات کو اس طرح کہا کہ ''جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی''۔ تو جناب ہماری داڑھی و مونچھ میں بھی چاندی نمایاں ہو چکی ہے، گالوں پر چیونٹی
کے انڈے بھی نظر آنے لگے ہیں البتہ ابھی دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

آپ بیتی قلم بند کرنا بڑا کٹھن کام ہے حالانکہ لکھنے والا، خاص طور پر جو خاکہ نگاری بھی کرتا ہو پہلے ہی اپنے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوتا ہے۔ آپ بیتی یا اپنے خاکے میں ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ بندہ اپنی ذات سے متعلق اچھی باتیں لکھے تو اپنے منہ میاں مٹھو والی مثال صادق آتی ہے، اچھا بھی نہیں لگتا، برائی لکھے، کیڑے نکالے تو کیسے، ہم نے دوسروں کے خاکے لکھے ہیں، ہر صورت میں خاکہ اڑانے سے احتراز کیا ہے، تو پھر اپنے بارے میں بھی ایمانداری سے ہی کام لیں گے۔ البتہ جوشؔ کی 'یادوں کی بارات' والی صاف گوئی کے ہم قائل نہیں حالانکہ ہے تو وہ بھی صاف گوئی۔ معاشرتی اقدار کا تقاضہ ہے کہ کچھ پردہ ضروری ہے۔ ہمارا مذہب بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے کہ 'آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خود ستائی کہلائے اور ازراہ کسرِ نفسی یا جھوٹ موٹ اپنی برائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے'۔ اسی بات کو پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی آپ بیتی ''میری کہانی'' میں ایبراہم کاؤلے کے حوالے سے لکھا ''اپنے حالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ اگر انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خاکہ ہو یا آپ بیتی لکھنے والے کو سچائی اور ایمانداری کا دامن تھامے رہنا چاہیے، اس کا بنیادی مقصد باطن میں چھپے موتیوں کی تلاش ہونا چاہیے۔ تہذیب و شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے ہمیں

اپنی تلاش اور اپنے باطن میں چھپے رازوں کو افشا کرنے کی سعئی کرنا چاہیے۔

میرے پرکھوں کی سرزمین راجستھان تھی، اس حوالے سے میں بنیادی طور پر راجستھانی یا راجپوت ہوں ، راجپوتانہ نے بھی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں، میرا بائی، مہدی حسن اور ریشماں کو مشتاق احمد یوسفی نے راجستھان کے تین طرفہ تحفے قرار دیا ہے جن کے وہ قائل اور گھائل ہیں حالانکہ وہ خود بھی راجپوت ہی ہیں۔ بعد میں ہمارے بزرگوں نے ہندوستان کے ضلع مظفر نگر (یوپی) کے قصبہ حسین پور کو آباد کیا۔ مظفر نگر ایک ایسی مردم خیز سرزمین ہے جس نے علمائے دین، صوفیائے کرام اور فقہائے اسلام کو جنم دیا، اہل علم ودانش کی ایک بڑی جماعت پیدا کی ،ان شخصیات میں بعض احباب کے نام فخر سے لیے جا سکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، شہید ملت خان لیاقت علی خان ، مولانا شبیر احمد عثمانی، زاہد حسین ، اولین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان ، جسٹس (ر) ناصر اسلم زاہد، محمد ابصار حسین قرنی، مفتی و محدث مولانا عبدلمالک ، مولانا عبد الخالق کاندھلہ والے، شیخ محمد ابراہیم آزادؔ، ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم، ڈاکٹر الطاف حسین قریشی ، مبشر احمد واحدی ، شاعر مزدور احسان دانش ، تابش صمدانی ، شوکت تھانوی، صاحبزادہ عاشق کیرانوی کا وطن بھی مظفر نگر تھا۔ اس اعتبار سے مجھے ایسی متبرک سرزمین سے

نسبت حاصل ہے جس کی کوکھ نے عظیم ہستیوں کو جنم دیا۔ میرے خاندان میں اکثر احباب تدریس اور شاعری سے شغف رکھتے ہیں، صاحب دیوان شاعر بھی ہیں اور بے دیوان شاعر بھی، مَیں شعر گھڑ لیتا ہوں، شاعری میرے خمیر میں تو ہے لیکن تاحال باقاعدہ شاعری نہیں کی اپنے موضوع پر لکھنے سے فرصت ہی نہیں ملی، البتہ موقعہ محل یا ضرورت کے لیے شعر کہہ لیتا ہوں، جیسے مظفر نگر کے حوالے سے

یہ شعر ؎

مظفر نگر تری مٹی کی عظمت کو سلام
کیسے کیسے گوہر نایاب پیدا کیے تونے

میرے پردادا شیخ محمد ابراہیم آزادؔ صاحب کا دیوان ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے ''ثنائے محبوب خالق: دیوان آزاد'' کے نام سے شائع ہوا تھا، ۷۵ سال بعد اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں کراچی سے شائع ہوا، آزادؔ صاحب وکیل تھے، بیکانیر میں جج اور چیف جج بھی رہے، نثر بھی لکھی، تصوف ان کا خاص موضوع تھا، ان کے متعدد مضامین ''پیامِ اتحاد'' میں شائع ہوئے۔ دادا شیخ خلیل صمدانی صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کے بیٹے تابشؔ صمدانی کئی نعتیہ مجموعوں کے خالق ہیں۔ میرے خاندان میں ادب سے تعلق کا یہ سلسلہ اللہ کے فضل سے کئی پشتوں سے جاری ہے۔ کئی احباب شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ جنابِ آزادؔ استاذ

الشعراء افتخار الملک سید وحید الدین احمد بیخودؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ادب سے وابستگی میرے خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میری مختصر سی سرگذستِ حیات سنیے اور خود میری ہی زبانی۔
میری زندگی کا سب سے اہم اور منفرد واقعہ خود میری پیدائش ہے۔ جی ہاں یہی سچ ہے، تو سنیئے یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ میرے والدین کی شادی قیام پاکستان سے پانچ ماہ قبل مارچ ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی، میرے وجود کا خمیر ہندوستان میں معرض وجود میں آچکا تھا، اسے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ میرے والدین کو پاکستان ہجرت کا قصد کرنا پڑا، ’لے کر رہیں گے پاکستان بٹ کر رہے گا ہندوستان ‘‘کی صدائیں میرے کانوں میں براہِ راست تو نہیں البتہ اپنی ماں کے کانوں سے ہوتی ہوئی مجھ تک ضرور پہنچیں۔ اس کا احساس میں آج بھی محسوس کرسکتا ہوں، کیوں کہ میں اُس وقت شکم مادر میں رہتے ہوئے ہجرت کی بہاروں کا لطف لے رہا تھا۔ مجھے بروز پیر ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو یعنی قیامِ پاکستان کے سات ماہ بعد اس دنیا میں آنا تھا اور آیا۔ پنجاب کے ایک دیہات نما شہر ’میلسی ‘میں اپنے ماموں جناب محبوب احمد سبزواری کے گھر پیدا ہوا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو میری والدہ اپنے میکے مشرقی پنجاب کے شہر فرید کوٹ میں تھیں، والد صاحب بیکانیر میں تھے، چنانچہ والدہ نے اپنے بھائیوں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور پنجاب کی

سرزمین ان کی مستقر ٹھری جب کہ والد صاحب نے کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔

میلسی ہے ایک شہر، پانچ دریاؤں کی سرزمین پر
میں ہوں رئیسؔ اُسی آسماں کا ایک ستارہ

یہ وہ زمانہ تھا جب عام طور پر بچوں کی پیدائش گھروں میں ہوا کرتی تھی، محلوں میں بعض عورتیں بچوں کی پیدائش میں مددگار کا کردار ادا کیا کرتی تھیں، اُنھیں عرف عام میں 'دائی' کہا جاتا ہے۔ 'دائی' کوئی کوالیفائیڈ نرس نہیں ہوتی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر زنِ حاملہ کا سہارا ہوا کرتی تھی۔ میری امی اور مَیں بھی ایک دائی جس کا نام 'اَنسری' تھا کے رحم و کرم پر تھے۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ اپنے دادا کا پہلا پوتا، اپنی پھوپھیوں اور چچاؤں کا پہلا بھتیجا، یہی وجہ تھی کہ میری آمد پر میرے چاہنے والوں نے کان لگائے ہوئے تھے کہ کیا خبر آتی ہے اب تو سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ وقت سے پہلے ہی اطلاع آجاتی ہے کہ دنیا میں آنے والا ابنِ آدم ہو گا یا وہ بنتِ حوا ہو گی۔ اچانک یہ اطلاع ملے کے نومولود بابا آدم کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے تو خوشی دوبالا ہوجاتی ہے۔ دنیا میں میری آمد متوقع ہی تھی کہ 'دائی' نے اعلان کر دیا کہ اس دنیا میں آنے والے رئیسِ اعظم ہیں وہ سر کے بل نہیں بلکہ پیروں کے بل اس دنیا میں آئیں گے۔ زچگی کی اصطلاح میں اِسے بچے کا الٹا پیدا ہونا کہا جاتا ہے۔ دائی کی اس دیدہ دلیری نے گھر کے ماحول

کو یکٹ سر بدل کے رکھ دیا، خوشی کا ماحول افسردگی میں بدل گیا، موقع واردات پر موجود چہرے کملا گئے، فضاء غمگین ہو گئی،اس خبر نے کراچی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جہاں پر میرے والد صاحب اپنے پہلے بیٹے کے باپ بننے کی خبر سننے کے لیے بے تاب تھے، میرے دادا کو اپنے دادا بننے کی خبر کا انتظار تھا اور میری پھوپھیاں اور چچا اپنے بھتیجے کا اس دنیا میں آنے کا انتظار بے تابی سے کر رہے تھے، وہ بھی اس خبر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اب مجھے ہی نہیں بلکہ میری ماں کی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ گویا مَیں نے دنیا میں آنے سے پہلے ہی یہ کارنامہ انجام دیا کہ اپنی ماں کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔رہا معاملہ الٹے اور سیدھے کا،تو بات یہ تھی کہ مَیں نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ مَیں جوں ہی اس دنیا میں آؤں دائی صاحبہ میری گردن دبوچ لیں، مَیں تو اُس سے اپنی قدم بوسی کرانا چاہتا تھا،ایسا ہی ہوا، مَیں دنیا

میں چلتا ہوا ہی آیا، گویا الٹا پیدا ہوا، اپنا اپنا طریقہ واردات ہے۔ بچے کا الٹا پیدا ہونا بھی کیا چیز ہوتا ہے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں، مَیں جوان ہوگیا تھا، کالج میں پڑھا کرتا تھا،اُس وقت ہم آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے، چھٹی کا دن تھا، صبح ہو چکی تھی لیکن مَیں ابھی سو رہا تھا، ابا جان نے سوتے سے اٹھایا کہنے لگے چلو ایک صاحب پڑوس سے آئے ہیں میرے دوست ہیں ان کی کمر میں

چِک آ گئی ہے تم اُن کی کمر پر اپنے سیدھے پیر کی ایڑی رکھ دو، پہلے تو مَیں سمجھا ہی نہیں،مَیں نے آنکھیں ملتے ہوئے ساتھ ہی ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا ہوا ہے ؟پاپا (والد صاحب کو ہم پاپا کہا کرتے تھے)، انھوں نے وہی جملہ پھر دہرایا، مَیں نے انتہائی ادب سے کہا کہ میں کوئی پہلوان، ہڈی جوڑنے والا یا مالشیہ ہوں، کہنے لگے ، نہیں بھئی، بات یہ ہے کہ کیونکہ تم الٹے پیدا ہوئے تھے اس لیے تمہارے پیر کی ایڑی میں یہ تاثیر ہے کہ اگر کسی کی کمر میں چِک آ جائے تو تمہارے اس عمل سے اس کی تکلیف دور ہو جائے گی۔ ابا جان کا حکم تھا، مجال نہیں تھی کہ چوں چرا کی جاتی، خاموشی سے آنکھیں ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں گیا وہ صاحب فرش پر اوندھے منہ پڑے تھے،مَیں نے جا کر ویسا ہی کیا جیسا ابا جان نے کہا۔ بعد میں بھی اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہوئے۔ جس طرح دنیا میں بے شمار قسم کی فضولیات اور توہمات ہیں، یہ بھی انھی میں سے ایک ہے۔

چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ مَیں اپنے دادا کے ساتھ بہار کالونی کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گیا تھا، ایک دن دادا نماز پڑھنے میں مصروف تھے مَیں مسجد کی چھوٹی سے دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور بلند آواز سے اُس زمانے کا ایک مشہور گانا ''اے میرے دل کہیں اور چل اس دنیا سے دل بھر گیا'' گانے لگا، دادا کو میری یہ حرکت بری

نہیں لگی بلکہ انہوں نے گھر آ کر خوش ہو ہو کر سب کو میری اس حرکت کے بارے میں بتایا، اس زمانے کا ایک اور واقعہ جو میری نظروں کے سامنے کبھی کبھی آ جاتا ہے وہ میرے دادا کا اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کا انتقال ہوا تو انھیں بہار کالونی والے گھر ہی میں پلنگ کھڑے کرکے ان پر چادریں ڈال کر غسل دینے کی جگہ بنائی گئی تھی ،مَیں بار بار اس جگہ آ جایا کرتا لوگ مجھے وہاں سے بھگا دیا کرتے۔ کچھ بڑا ہوا تو بہار کالونی والے گھر سے آگرہ تاج کالونی والے جھونپڑی نما گھر منتقل ہونا یاد ہے، ایک چھوٹا سا کمرہ جس کی چھت ایس بسٹاس کی شیٹوں کی تھی، صحن کی چار دیواری سرکنڈوں کی، بارش میں چھت درمیان سے ٹپکا کرتی اور ہم اپنے پلنگ کبھی اِدھر کبھی اُدھر کرلیا کرتے۔ غسل خانہ علیحدہ ،لازمی اثاث البیت (Toilet) قدیم طرز کا جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا، رفتہ رفتہ گھر پکا ہوتا گیا لیکن تمام کمروں کی چھت ایس بسٹاس ہی کی تھیں، سردیوں میں سرد، گرمیوں میں گرم اور برسات میں اللہ کی رحمت اندر آیا کرتی لیکن گھر اپنا تھا، یہی خیال ہم سب کو خوش و خرم رکھا کرتا، اسی گھر اور اسی ماحول میں ہم سات بہن بھائی پروان چڑھے اور بڑے ہوئے۔

بچپن میں خاموش طبع تھا، مجال ہے کہ کسی کے سامنے کوئی بات کرلوں، مجھے گونگے شاہ کا خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد جوہر کھلے ، اسٹیج پر

بولنا، مجمعے کے سامنے تقریر کرنا، پروگراموں کی کمپیرنگ کرنا، تقریری مقابلوں میں حصہ لینا عام سی بات ہو گئی۔پڑھائی میں مشکل سے پاس ہونے والا، کھلنڈرا قسم کا تھا، عام طور پر احباب کا خیال یہی تھا کہ یہ مشکل سے میٹرک کر لے تو اسے کسی ٹیکنکل کام میں لگا دیا جائے ، ہوا بھی ایسا ہی ،ابھی انٹر ہی کیا تھا یار لوگوں نے پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں اپرنٹس شپ میں بھرتی کرادیا،اس کا قصہ کچھ اس طرح ہے ،۱۹۶۸ء کی بات ہے میں انٹر کر چکا تھا، میرا تعلیمی ریکارڈ بہت نمایاں نہیں تھا، بس نارمل تھا۔ ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ فیصلہ ہوا کہ میں کوئی ٹیکنکل لائن اختیار کروں، ساتھ ہی اپنی پڑھائی بھی جاری رکھوں۔چنانچہ میں نے عبداللہ ہارون کالج میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے لیا۔ہمارے رشتہ کے ماموں لئیق احمد مرحوم پاکستان مشین ٹول فیکٹری میں ملازم تھے، انہوں نے مجھے فیکٹری میں شروع ہونے والی اپرنٹس شپ میں بھرتی کرادیا۔ یہ خالصتاً ٹیکنکل کام تھا۔ شروع کے دو ماہ(Apprenticeship) پر فِٹ کرنے کے بعد لوہے کی فائل کے ذریعہ مخصو (Bench) لوہے کے ٹکڑوں کو بنچ ص طریقے سے گھسنا ہوتا تھا۔ دو ماہ کے بعد کارکردگی کی بنیاد پر کوئی مشین مین بن جاتا، کا کاریگر تو کوئی بنچ فٹر ہی رہتا، مرِیٹ کر میں (Lathe Machine) کوئی خراد مشین نے دو ماہ گزار لیے اس کے بعد مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں اسے جاری رکھ سکتا چنانچہ مَیں تو دوماہ بعد ہی بھاگ کھڑا ہوا، یہ نرم و نازک ہاتھ تو،

قلم چلانے کے لیے تھے، ان سے لوہا کس طرح گھسا جا سکتا تھا۔ اس قدر سخت محنت کا کام میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو قلم چلانا تھا اور تعلیم کے میدان میں رہنا تھا خراد مشین کا ''خرادیہ'' کیسے بن سکتا تھا۔

حساب کتاب سے مجھے شروع ہی سے الجھن تھی، یہی وجہ ہے کہ میٹرک میں حساب کا پرچہ مشکل سے پاس کیا تھا۔ مرزا غالبؔ کا بھی حساب سے جی گھبراتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ 'انہیں جوڑ لگانا نہیں آتا'۔ میٹرک پیلے اسکول سے پاس کیا، وہ دور پیلے اسکولوں ہی کا تھا، اُس وقت تعلیم کو لوگوں نے تجارت نہیں بنایا تھا۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بڑا نام تھا، لوگ فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم نے کوتوال بلڈنگ، جیکب لائن، وسطانیہ، لیاری کواٹر، این جے وی میں پڑھا، ڈی جیرین ہونا بڑا اعزاز تھا، عبدالقدیر خان جیسے نامور لوگ ڈی جیرین ہیں۔ میرا سرکاری اسکول کراچی میں پی اے ایف ماری پور اب اِسے 'بیس مسرور' کہتے ہیں کہ کیمپ نمبر ۲ میں تھا۔ میرے گھر سے خاصا دور تھا، پیدل جانا مشکل ہوا کرتا تھا، لفٹ لے لیا کرتے یا پھر سرکاری بسیں ہمارا مقدر ہوا کرتی تھیں۔ اسکول کا ماحول صاف ستھرا نیم فوجیانہ تھا، اکثر اساتذہ کیمپس ہی میں رہا کرتے تھے، سول ادارے ہوتے ہوئے بھی فوجی ڈسیپلن تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہوئی تو میں نویں جماعت میں تھا، ایوب خان کی تاریخی تقریر ''دشمن نے کس قوم کو للکارا ہے'' ہم نے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب

کے آفس کے ریڈیو پر سنی تھی۔ کیمپس میں کرکٹ گراؤنڈ بہت عمدہ تھے، کرکٹر امتیاز احمد کو اسی جگہ کھیلتے دیکھا تھا، اسکول کے دوست فوجیوں کی اولادیں ہی تھیں، یقیناً ان میں سے اکثریت نے فوجی ملازمت اختیار کی ہوگی۔ بہت کم سے ملاقات ہو سکی۔ چند نام ہی ذہن میں ہیں ریاض، اختر، افتخار، اظہر، شمیم، ظفراللہ نیازی جس نے ایک مرتبہ میری خاصی بٹائی کی تھی، طالبات بھی کلاس میں تھیں لیکن ان میں سے کسی کا نام ذہن میں نہیں۔ اساتذہ سب ہی محنتی، قابل اور اچھا پڑھانے والے تھے، جی چاہتا ہے کہ ان سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھوں پر طوالت ایسا کرنے سے روک رہی ہے، ان سب کے لیے محبت بھرا اسلام عقیدت جو نام اب ذہن میں ہیں ان میں محمد احمد قریشی صاحب، کلیم صاحب، محمد ظہیر صاحب، امیر الہدیٰ صاحب، محمد احمد صدیقی (علیگ)، افسر صاحب، بھی ہوئے، فیض احمد شاہ مرحوم، سلیم صاحب، زرین (DEO) افسر صاحب ڈی ای او صاحب، اکرام صاحب مرحوم ان کا جوانی میں ہی انتقال ہوگیا تھا، مسیز مرتضیٰ اور مسیز شمیم شامل تھیں۔ ظہیر صاحب اور امیر الہدیٰ صاحب ایجوکیشن سپروائیزر ہوگئے تھے۔ ایف ایس سی سندھ مسلم کالج سے کیا، یہاں پروفیسر کوہاٹی پرنسپل ہوا کرتے تھے، لحیم شحیم، صحت مند اور بارُعب انسان تھے، ان کے سامنے کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، جوں ہی ان کی گاڑی کالج گیٹ کے سامنے آکر رکا کرتی نیچے سے اوپر تک سناٹا چھا جا یا کرتا، کالج کے اساتذہ میں پروفیسر اویس احمد

ادیب، پروفیسر اسحاق اور پروفیسر چودھری صاحب اردو کے استاد ہوا کرتے تھے،پروفیسر سید لطف اللہ صاحب تاریخ اسلام پڑھایا کرتے تھے، یہ بعد میں میرے ساتھی اور دوست بھی ہوئے، بی اے عبداللہ ہارون کالج سے کیا، یہاں ہمارے پرنسپل فیض احمد فیضؔ صاحب تھے۔ فیض صاحب پر میرا خاکہ 'فیضؔ

میرا پرنسپل' میری خاکوں کی کتاب 'جھولی میں ہیرے اور موتی' میں شامل ہے۔

دھیمے لہجے کے ساتھ ساتھ دھیمہ پن ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔

گریجویشن کے بعد اکنامکس میں ماسٹر کرنے جامعہ کراچی کی دہلیز پر قدم رکھا، اکنامکس میں ماسٹر کرکے بنکر بننے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن اکنامکس کے بجائے لائبریری سائنس کے شعبے میں داخل کرلیے گئے۔ شادی ہوئی، تین بچے بھی ہوگئے پر ہم نے اپنی پڑھنے اور لکھنے کی ڈگر نہ بدلی، شادی کے ۱۰ سال بعد ایک ایم اے علم سیاسیات میں اور کر ڈالا،ہمارا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اگر عملی سیاست میں حصہ لینے کی ضرورت ہوئی تو سیاست کے یہ رموز کام آئیں گے لیکن نوبت ہی نہیں آئی، سیاست دانوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر صبح و شام کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں،اب تو سیاست نام ہے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا، پیسے بنانے کا، کرپشن کرنے کا اور جان سے مار ڈالنے کا، ٹی وی پر جو روز سیاسی دنگل سجا ہوتا ہے وہی کافی ہے عبرت والوں کے لیے۔

پڑھائی کا بھوت بدستور ہمارے سر پر سوار رہا، کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے، ہم مسلسل اس چکر میں رہے کہ کسی طرح پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مل جائے، نہ معلوم کیوں جیسے جیسے ہمارے مضامین اور کتابیں منظر عام پر آ رہی تھیں پی ایچ ڈی کرنے کی ہوس بڑھتی ہی جارہی تھی، یہاں آ کر دوستوں نے ہری جھنڈی دکھا دی، وہ دوست جو اس پوزیشن میں تھے کہ ہمارا ہاتھ تھام لیتے، تیرنا تو ہم نے خود ہی تھا، بس ڈوبتے کو تنکے کے سہارے والی بات تھی، انہوں نے ایسی کنی کاٹی کے خود تو تیر کر ساحل پر جالگے، ہم رہ گئے وہیں پر کھڑے کے کھڑے، پر ہمارے باطن میں جو دیا روشن ہوا تھا اس کی روشنی ماند نہیں پڑی، ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری، ایک جانب عمر کے ماہ و سال ہمیں تیزی سے بڑھاپے کی جانب رواں دواں کیے ہوئے تھے دوسری طرف خواہش تھی کہ اس میں ذرہ برابر کمی نہیں آ رہی تھی بلکہ روز بہ روز جوان ہی ہو رہی تھی، بالآخر ۲۰۰۳ء نے دستک دی، میرا ہمدرد یونیورسٹی میں جانا ہوا ہی کرتا تھا، بیت الحکمہ (ہمدرد لائبریری) کے ڈائریکٹر پروفیسر حکیم نعیم الدین زبیری جو ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے ڈائریکٹر اور جامعہ ہمدرد کے 'لائف پروفیسر' بھی تھے، میری ان سے مراسم کی نوعیت قدیمی تھی، عمر کے فرق کے باوجود دوستانہ مراسم تھے۔ ایک دن ان سے تحقیق پر گفتگو ہوئی، مَیں نے ایک موضوع کا اظہار کیا کہ اس موضوع پر کام کیا جاسکتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پی ایچ ڈی سے نیچے بات نہیں ہوگی یعنی ایم فل نہیں کروں گا،

تیار کرنے کو synopsis انہوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور مجھے اس موضوع پر کہا، مَیں تو تیار ہی بیٹھا تھا اور ٹاپک بھی اپنی پسند کا، پھر کیا تھا، رات دن لگا کر ایک خاکہ تیار کیا اور ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے معمولی سی کانٹ چھانٹ کی اور پی ایچ ڈی کا پہلا پتھر رکھ دیا گیا، داخلے سے پہلے ہی کام بھی شروع ہو گیا، جب بھاری بھر کم سپر وائیز رہنمائی کے لیے تیار ہو تو پھر کیا چاہیے تھا، ہم نے کام شروع کر دیا۔

جون ۲۰۰۳ء میں کام شروع کر دیا گیا، مَیں نے فیصلہ کیا کہ دو سال میں کام مکمل کر لوں گا، یہی ہوا، مَیں رات رات بھر کام میں لگا رہتا، مجھے مواد کے حصول میں مشکل پیش نہیں آئی، میری ذاتی لائبریری میں اس موضوع پر وافر مواد موجود تھا، 2006 ء میں تھیس جمع کرا دیا، تھیس تو مکمل ہو گیا لیکن جاتے جاتے مجھے ایک ایسا تحفہ دے گیا جو میری باقی ماندہ زندگی میں میرے ساتھ رہے گا وہ ہے میرے کمر کے مہروں کی تکلیف، مسلسل اور زیادہ کمپیوٹر پر کام کرنے کے نتیجے میں مَیں ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا مریض بن چکا تھا۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں مَیں ریٹائر بھی ہوا اور مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

لباس انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مَیں نے کالج میں ملازمت کے

دوران کبھی شلوار قمیض نہیں پہنی، ہمیشہ پینٹ شرٹ، سوٹ یا سفاری سوٹ پہنا کرتا، یہ نہیں کہ شلوار قمیض میں کوئی برائی ہے بس یہ میرا مزاج تھا، میرے گھر کا لباس کرتا شلوار ہی ہے، پینٹ شرٹ کے نیچے چپل پہنے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ کھانے میں ہر شے کھالیتا ہوں، لیکن چاول اور کالی مسور کی دال جسے کھڑی مسور کی دال بھی کہا جاتا ہے ،ہری مرچ اور پودینے کی چٹنی، اچار اور سلاد کے ساتھ پسندیدہ ڈش ہے، سبزیوں میں بینگن سخت نا پسند ہیں، پھلوں میں کینو پسندیدہ ہیں، مٹھائی میں کچھ بھی پسند نہیں، بس جو سامنے آجائے چکھ لیتا ہوں، کھانے کے دوران چپ چپ کی آواز نکالنے والوں کا گلا کاٹنے کو جی چاہتا ہے، چائے پیتا ہوا وہ شخص بھی اچھا نہیں لگتا جو سڑپ سڑپ کرکے چائے پیے، کھانا کھانے کے دوران اس بات کا خیال نہ رکھنے والے کہ ان کے منہ کے اطراف خصوصاً داڑھی یا مونچھوں پر کچھ لگ گیا ہے،ایسے لوگ سامنے والے کا کھانا بد مزہ کردیتے ہیں ۔ بچپن میں ہم نے ایک اصطلاح ایجاد کی تھی وہ یہ کہ جب ہم سب مل کر کھانا کھارہے ہوتے اور کسی کے منہ پر کچھ لگ جاتا تو اس وقت کہا جاتا 'شاخ پے اُلو'، یہ جملہ سن کر ہر شخص اپنا اپنا منہ صاف کرنے لگ جاتا۔ جس کسی کے منہ پر کچھ لگا ہوتا وہ خود بہ خود صاف ہو جاتا، اس طرح بات بھی بن جاتی کسی کو برا بھی نہیں لگتا تھا۔ کسی کی دل آزاری مجھے اچھی نہیں لگتی، کوشش ہوتی ہے کہ میرے عمل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔برداشت اور درگزر کا مادہ مجھ میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، میں اپنی

زندگی میں اپنوں اور غیروں کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی، کڑوی کسیلی حتیٰ کہ تیر و نشتر اپنے اندر خاموشی سے محفوظ رکھتا رہا ہوں، مجھے اپنی حیثیت و مقام کا ہمیشہ احساس رہا یہی وجہ ہے کہ مَیں ساری زندگی زبان بند کیے رہا، اپنے لبوں کو سیے اور منہ کو تالا لگائے رہا، میرے صبر کو بارہا آزمایا گیا، میری خاموشی کو توڑنے کے لیے ہزار حربے استعمال کیے گئے، پر مَیں نے چپ کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، اس کا نقصان بھی ہوا لیکن فوائد زیادہ حاصل ہوئے، معدہ خراب نہیں ہوا، بد ہضمی نہیں ہوئی، جگر، گردے، پھیپڑے سب کچھ ہی ٹھیک رہا بس ایک دل نے آخر میں آکر گڑبڑ کردی۔

قدرتی حسن اور نزاکت کا قدر دان ہوں، میک اپ زدہ کو دیکھ کر دل خراب ہونے لگتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ موٹاپے سے اللہ بچائے۔

خواتین پردے میں بھلی لگتی ہیں، سعودی عرب میں خواتین کو عبایا پہننا لازمی ہے، وہ اس میں اچھی بھی لگتی ہیں۔ زیادہ آزادی خرابی کا باعث ہوتی

ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سی برائیاں اسی وجہ سے ہیں۔ پہلی بار سعودی عرب گیا، عمرہ کیا اور کئی ماہ وہاں گزارے اس لیے کہ میرے دونوں بیٹے ایک جدہ میں دوسرا جیذان میں تھا۔ خواتین کے عبایا سے متاثر ہو کر یہ قطعہ کہا۔

حسُن و جمال تھا کیا خوب

عبا و قبا تھا کیا خوب

اوڑھ لی ہو جیسے چادر نور کی

چودھویں کی رات تھی کیا خوب

شہروں میں اپنے کراچی کی کیا بات ہے، کبھی یہ روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا، اب تو سیاست نے اس شہر کا حلیہ ہی بگاڑ کے رکھ دیا ہے، لاہور بھی کم اچھا نہیں، اب تو مجھے سرگودھا بھی اچھا لگنے لگا ہے۔اسلام آباد میں مصنوعیت اور دکھاوا نمایاں ہے۔ پاکستان سے باہر سعودی عرب کی کیا بات ہے، مکہ دل کا سکون ہے تو مدینہ راحتِ جان ، جی چاہتا ہے کہ دن مکّہ میں گزرے تو رات مدینے میں وہ بھی روضہ رسول صلی اللہ علیہ و سلم کے سامنے یہ سب نصیب کی بات ہے جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا، یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے ، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

بات سعودی عرب کی چلی تو جناب مَیں ۲۹ مئی ۲۰۱۱ء کو سعودی عرب پہنچا اور پانچ ماہ جون تا اکتوبر ۲۰۱۱ء) یہاں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی،خانہ کعبہ کو پہلی بار اپنی) آنکھوں سے دیکھا کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، کس قدر حسین منظر تھا، کیا خوبصورتی تھی، نور ہی نور، مَیں اس کے بعد بے شمار مرتبہ خانہ کعبہ گیا، بہت بہت دیر سامنے رہا، کئی فرض نمازیں

اس طرح ادا کیں کہ میرے اور خانہ کعبہ کے بیچ کچھ نہیں ہوتا تھا اور فاصلہ مشکل سے دو گز، یعنی اول صف میں، کعبہ شریف کو بالکل قریب سے دیکھا، چھوا، چمٹا، لپٹا، التجائیں کیں، حرم کی چوکھٹ کو پکڑ کر روتا رہا، گریہ وزاری کرتا رہا، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا رہا، حرم کی چوکھٹ کے بالکل نیچے کھڑے ہو کر مسلسل آنکھیں ٹھنڈی کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، حجرِ اسود کے کئی بوسے لینے کی سعادت ملی، لیکن پہلی نظر کا منظر بھلائے نہیں بھولتا، جب بھی کعبہ شریف کا خیال آتا ہے وہی پہلی نظر کا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا

ہے، رہی بات مانگنے اور دعا کی، تو اپنی اس کیفیت کو اشعار میں مَیں نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

مانگنے تو بہت کچھ گیا تھا، پر ہوا عجب حال

تھے اشک جاری، اندر تھا ایک تلاطم برپا

سوچتا ہی رہا کروں پیش اپنی سیاہ کاریاں

نہ دل نے دیا ساتھ نہ زباں پہ ہی کچھ آسکا

مَیں نے پہلا عمرہ اپنی شریکِ حیات شہناز، بیٹے عدیل اور نبیل، اپنی چھوٹی بہو ثمرا نبیل کے ہمرہ جمعہ ۳ جون ۲۰۱۱ء یکم رجب ۱۴۳۲ھ کو کیا، میری انجیوپلاسٹی کو ابھی ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا، مجھ میں اتنی طاقت اور حوصلہ

نہیں تھا کہ طواف کے سات پھیرے اور صفا و مروا کے ساتھ چکر از خود چل کر کر سکتا ان دنوں حرم شریف میں رش بھی زیادہ تھا، چنانچہ وہیل چیر لے لی گئی ، خانہ کعبہ، کے سات طواف عدیل نے وہیل چیر چلائی اور صفا و مروا کے درمیان سات پھیروں میں چھوٹے بیٹے نبیل نے مجھے کھینچا، دونوں بیٹوں کو اپنے عمرہ کا ثواب تو ملا ہی، ساتھ ہی میری ویل چیر چلانے کا ثواب بھی حاصل ہوا ہوگا۔ اس دوران مَیں دیگر دعاؤں کے ساتھ یہ بھی دعا کرتا رہا کہ پروردگار جب تو نے مجھے یہ سعادت عطا کی کہ اپنے گھر بلالیا تو مجھے یہ بھی توفیق عطا فرما کہ آئندہ میں خود چل کر یہ سعادت حاصل کر سکوں، اللہ نے میری یہ دعا قبول فرمائی اور مَیں نے بعد میں کئی عمرے اور متعدد طواف خود چل کر کیے۔ زیادہ قیام جدہ میں ،بڑے بیٹے عدیل کے پاس تھا، شروع میں تو عدیل اپنے ساتھ حرم شریف لے جاتا رہا لیکن پھر ہم دونوں نے سوچا کہ ہمیں از خود ہی ہمت کرنی چاہیے اور ایسا ہی ہوا، دونوں میاں بیوی جدہ سے مکہ جانے لگے، کعبہ شریف کے خوب خوب پھیرے لیے، مقام ملتزم، مقامِ ابراہیم ، میزابِ رحمت پر دعائیں کیں، حطیم میں نمازیں ادا کیں، صفا و مروہ کے چکر کیے ، حجرِ اسود کے خوب خوب بوسے نصیب ہوئے، آبِ زم زم جتنا پی سکتے تھے پیا۔ کعبہ شریف کی قربت کا خوب خوب موقع ملا ، حسرت پوری کی، انسان اور اللہ کا معاملہ ایسا ہے کہ دل ہی نہیں بھرتا، ہم طواف کرکے گھر پہنچتے اور آئندہ جانے کی باتیں شروع کردیا کرتے ۔ مدینے میں بھی حاضری ، ہوئی،مدینے کی ٹھنڈک کا کیا کہنا

سعادت اور نصیب کی بات ہے۔اپنی اس کیفیت کو مَیں نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

کچھ ایسی تصویر بس گئی ہے دل میں کعبہ شریف کی
آنکھوں میں ہر دم رہتی ہے تصویر کعبہ شریف کی
پیاس بجھی ہے ، نہ بجھے گی یہ تو ہے مجھے معلوم
پھر بھی اک چاہت سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی
ایک باراور جاؤں ، پھرجاؤں اور جا کرواپس نہ آؤں
بس یہی اک تدبیر سی لگی رہتی ہے کعبہ شریف کی

حرم کے میدان میں باب الفتح کے سامنے، باہر کی جانب ،پہاڑ کے دامن میں قائم اپنے پیارے نبی کی پیدائش گاہ (مَولِدُالنبیِ) صلی اللہ علیہ و سلم کو دیکھا، اس گھر کی تعمیر نو کر کے یہاں اب ایک عوامی کتب خانہ (مکتبہ مکہ المکرمہ) قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ جگہ مولدِ نبی کے نام سے ہی جانی جاتی ہے، ' الکردی خاندان' کے 'ماجد کرد' سے ''مجیدیہ لائبریری'' جو ان کی ذاتی لائبریری تھی خریدی گئی، یہ لائبریری نایاب اور قیمتی کتب پر مشتمل ہے۔کتابیں سلیقے سے دیدہ زیب الماریوں میں ترتیب وار رکھی ہیں۔ کتب خانے کے مدیر کا کمرہ(آفس) وہی جگہ ہے جہاں پر ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی دنیا میں آمد ہوئی، یہ بات مجھے مدیر مکتبہ (لائبریرین) یَسلم بن

عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَار نے ہی بتائی، الحمد اللہ مجھے اس کمرے میں بیٹھنے اور کچھ وقت گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، یسلم صاحب سے جب مَیں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مجھے خصوصی توجہ دی، اپنے آفس میں لے گئے، قہوا پلایا، کتب خانے میں موجود قدیم اور نادر کتب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیں۔ یَسلم بن عبدالواحد بن یَسلم بَاصَفَار اہل بیت میں سے ہیں، جامع مسجد امام البخاری کے امام وخطیب بھی ہیں ۔ جدہ میں اماں حوا کے مقبرہ پر بھی حاضری کا موقع ملا، قدیم قبرستان کو مقبرہ حوا کا نام دیا گیا ہے اس میں اور بھی بے شمار قبریں ہیں، قبروں پر نمبر بھی ڈلے ہوئے ہیں لیکن اماں حوا کی قبر کا کوئی مخصوص نشان نہیں، نہ ہی یہاں کے ملازمین کے علم میں ہے کہ اماں حوا کی قبر کون سی ہے۔ سعودی عرب میں قبروں کے نشانات کہیں بھی نہیں، جنت المعلیٰ، جنت البقیع اور دیگر قبرستانوں میں کسی بھی قبر پر کوئی نشان نہیں ملتا۔ فیفاء میں میرا چھوٹا بیٹا نبیل فیفاء جنرل اسپتال میں ڈاکٹر تھا، محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان کے علاقے مری، ایوبیہ، نتھیا گلی، بارہ گلی میں آگئے ہیں، اسپتال بھی پہاڑ کی چوٹی پر، اس کا گھر بھی پہاڑ کی چوٹی پر، ہم گھر سے باہر نکلتے یا ٹیکسی سے اتر کر گھر میں جاتے تو ہماری چال اے آر وائی (ARY) کے ڈرامے ''بلبلے'' والی' مومو' کی طرح ہوا کرتی تھی، پہاڑی

علاقوں کا موسم عام طور پر سرد ہی ہوا کرتا ہے، فیفاء کا موسم بھی سرد، خوش گوار اور صحت افزا تھا، بارش کا ہونا معمول تھا، اکثر بارش کے ساتھ اُولے بھی گرا کرتے، یہاں ائیر کنڈیشن کی ضرورت نہیں ہوتی، اسے مَیں نے دیہات لکھا ہے، اس کی وجہ یہ کہ یہاں کے مکینوں کی اکثریت وہ لوگ ہیں جن کا لباس سعودیوں سے مختلف ہے، ہمارے دیہاتیوں کی طرح یہ دھوتی (فوطہ) پہنتے ہیں، وہ بھی رنگ برنگی، آدھی پنڈلیاں کھلی ہوئی ،اوپر قمیض اس پر کوٹ، دونوں بے رنگے اور بے ڈھنگے ، دھوتی کو کمر پر خوب اڑسا ہوا کہ یہاں موٹی تہہ بن جاتی ہے، کمر پر ایک چوڑی بیلٹ بندھی ہوتی ہے، عام طور پر عمرہ یا حج کے دوران جو بیلٹ استعمال ہوتی ہے یہ اُسی طرح کی بیلٹ عصال) ہوتی ہے، اس بیلٹ کے بالکل سامنے ناف پر ایک خنجر یا چاقو (سکن) جس کا) دستہ اوپر کی جانب واضح نظر آ رہا ہوتا ہے لگائے رکھتے ہیں، سر پر ٹوپی کے بجائے رسی لپٹی ہوئی ہوتی ہے، اس میں درخت کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں جس میں پتے اور پھول لگے ہوتے ہیں لگائے رکھتے ہیں۔ یہ لباس بوڑھے اور جوان دونوں کا ہوتا ہے۔ ’گات ‘ کھانا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

دوست بنانے کا قائل ہوں، دوستی بگاڑنے کا قائل نہیں ، مَیں نے زندگی میں اپنے دوستوں کو ممکن حد تک کانچ کے گلاسوں کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھا ہے ، جس کسی سے تعلق دوستی قائم ہوگیا اس سے ناتا جوڑے رکھا، بے شمار دوستوں

کی ناپسند باتوں اور عادتوں کو محض اس وجہ سے درگزر کیا کہ تعلق دوستی جڑا رہے۔دوستی کے بارے میں میرا فلسفہ یہ ہے کہ ’’دوستی قربانی چاہتی ہے‘‘۔ دوستوں کی کڑوی کسیلی باتیں، کسی حد تک ناپسندیدہ باتوں کو اس وجہ سے درگزر کیا جائے کہ دوستی کا بندھن قائم رہے۔ کچھ دوست اپنے مزاج میں انتہائی کڑوے، کسیلے، بدمزاج بھی ہیں ان کی بدمزاجی اور تیزابیت کو

.برداشت کیے رہا، ان سے دوستی قائم ہے۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے اپنی اس سوچ کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا، اس لیے کہ میں مجبور کردیا گیا کہ میں بعض احباب سے رسم تعلق منقطع کرلوں اور میں نے بادلِ نہ خاستہ ایسا کیا۔ سینما میں فلم دیکھنے کا شوق کبھی نہیں رہا، شادی کے بعد بیگم کے ساتھ صرف ایک بار سینما میں فلم دیکھنے گیا، کلاسیکل میوزک پسند ہے، غزلیں سننا اچھا لگتا ہے، مہدی حسن، گلشن آرا سید، منی بیگم، تصور خانم،اقبال بانو کی گائی ہوئی غزلیں روح کو تسکین پہچاتی ہیں۔ تاش تو کھیل لیا کرتا ہوں لیکن برج، پچیسی، شطرنج کھیلنا ہی نہیں آتی اور نہ ہی کبھی کھیلی۔ گھر کے کاموں میں بیوی کی مدد کرکے خوشی محسوس کرتا ہوں، جھاڑو دینا اچھا نہیں لگتا، برتن دھولیتا ہوں، صفائی بھی کرلیتا ہوں، اپنی کتابوں کی صفائی ستھرائی از خود کرتا ہوں۔ جب بیٹی گھر پر تھی تو وہ کام کرنے نہیں دیا کرتی تھی اب بہوئیں موجود ہوں تو کام کرنا ممکن نہیں، جب دونوں گھر پر نہ ہوں تو آزادی سے بیوی کا ہاتھ بٹادیا کرتا ہوں۔ بیوی پر رُعب نہیں جماتا، کوشش کرتا ہوں آواز دھیمی رہے اور

بات بنی رہے۔ آہستہ چلتا ہوں، قدم چھوٹے اُٹھاتا ہوں، اکثر بیوی کے ساتھ چلتے ہوئے بیوی کو ٹوکنا پڑتا ہے کہ وہ بھی آہستہ چلے۔ ہنستا ہوں قہقہا نہیں لگاتا، ہنستے ہوئے آواز بلند نہیں ہوتی، وقت کی پابندی کی کوشش کرتا ہوں، کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرسکوں تو کئی دن پریشان رہتا ہوں۔ محبت کس نے نہیں کی، مَیں نے بھی کی، بہت ہی حسین چیز سے جس کا نام ہے لکھنا اور پڑھنا، محبت ہے کتابوں سے، کھاریوں سے اور کتابوں سے محبت کرنے والوں سے۔

قلم کاروں میں شوکت صدیقی، اشفاق احمد، شاعروں میں میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ فرازؔ، پروین شاکر، سنجیدہ لکھاریوں میں ممتاز مفتی، خاکہ نگاروں میں حالیؔ، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر سلیم اختر، مبین مرزا، انور سدید، پروفیسر صابر لودھی، مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، ڈاکٹر یونس بٹ، کالم نگاروں میں زاہدہ حنا، الطاف حسن قریشی، سیاست دانوں میں قائدِ اعظم محمد علی جناح، ذوالفقار علی بھٹو، سائنسدانوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، اداکاروں میں شمیم آرا، دلیپ کمار، گلوکاروں میں مہدی حسن، نور جہاں، گلشن آرا سید، ایسے اداکار ہیں جنھیں پڑھ کر، دیکھ کر یا سن کر طبیعت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں میں عبد الستار ایدھی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر عبد المعید، ڈاکٹر

طاہر تونسوی، سے متاثر ہوں۔

لکھنا اور چھپنا بھی ایک طرح کا نشہ ہوتا ہے، جس طرح سگریٹ، پان، شراب نوشی، افیون، بھنگ، ہیروئن اور گھات کے عادی اپنی جان لاکھ چھڑائیں ان کے لیے مشکل ہو جا تا ہے اس سے آزاد ہونا اسی طرح لکھنا اور پھر چھپنا بھی ایسا ہی نشہ ہے جس کو لگ جاتا ہے اس سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ مَیں بعض لکھاریوں کی طرح ہر چیز ایک ہی نشست میں لکھنے کا عادی نہیں بلکہ لکھنے کے معاملے میں قدرِے مختلف واقع ہوا ہوں، ایک وقت میں کئی کئی مضامین بشمول کتاب کا لکھنا جاری رکھتا ہوں، جب لکھنے کے لیے قلم کاغذ استعمال ہوتا تھا،اس وقت کئی کئی فائلیں کھلی ہوا کرتی تھیں، جب سے کمپیوٹر سیکھ لیا اور انگریزی اور اردو لکھنا شروع کر دی، تو قلم ہاتھ سے جاتا رہا، اب ایک فولڈر میں کئی کئی موضوعات کی فائلیں بنی ہوتی ہیں۔ گویا اب کمپیوٹر ہی قلم ہے اور کمپیوٹر ہی کاغذ۔ کسی بھی ایک موضوع پر مَیں زیادہ دیر تک نہیں لکھ سکتا، طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ بعض لکھاری ایک مضمون شروع کرتے ہیں اور اسے ختم کرکے ہی دم لیتے ہیں، اپنا اپنا طریقہ واردات ہے۔ لکھنا کب شروع کیا یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، جامعہ کراچی میں ایم اے (اے۔ء۔۱۹۷۲ء) کرنے کے دوران باقاعدہ لکھنے کی جانب رغبت ہوئی، ۱۹۷۵ء میں میری پہلی کتاب شائع ہوئی ، یہ میرا ایم اے کا مقالہ تھا، ۱۹۷۷ء میں کتب خانوں کی ،تاریخ پر دوسری کتاب شائع ہوئی

پہلا مضمون اسلامی کتب خانوں کے بارے میں تھا جو کراچی کے ایک ماہ نامہ ''ترجمان'' میں جنوری ۱۹۷۸میں شائع ہوا۔ سوانحی مضامین لکھنے کی ابتدا بھی ۱۹۷۸ سے ہوئی، پہلا سوانحی مضمون خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تھا جو ماہ نامہ 'ترجمان' کی اگست ۱۹۷۸ کی اشاعت میں شامل ہوا۔ سوانحی مضامین سے مَیں خاکوں اور رپوتاژ کی جانب آیا۔ پہلی رپوتاژ اپنی بیٹی ' سحر' کے انتقال پر ۱۹۸۰ء میں لکھی جو 'ادب وکتب خانہ' میں شائع ہوئی، یہ میری کتاب 'یادوں کی مالا' میں بھی شامل ہے۔اِسی سال اپنے جد امجد شیخ محمد ابر ہیم آزاؔد پر میرا مضمون قصور سے شائع ہونے والے رسالے انوارالصوفیہ' میں شائع ہوا،۱۹۷۸ء ہی میں لائبریری سائنس کے موضوع پر پہلا' مضمون 'پاکستان لائبریری بلیٹن' میں شائع ہوا، میری کتابوں کی تعداد ۳۳ ہو چکی ہے جب کہ ۳۰۰ سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے ایک کالم پچاس سالہ قلمی سفر'' میں لکھا تھا کہ ''ایک لکھنے''
والے کی اصلی عمر وہی ہوتی ہے جو اس کی لکھنے پڑھنے میں گزرتی ہے''، میری اولین کاوش ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی تھی، اس طرح میرا قلمی سفر ۴۰سالوں پر محیط ہے، اب آپ کو میری عمر کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا۔
جمعہ ۷ دسمبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے، میری چھوٹی خالہ ذکیہ خاتون کے ہاں شام پانچ بجے کراچی سے سیکڑوں میل دور اندرون سندھ 'ٹھاروشاہ' میں پہلی لڑکی کی

ولادت ہوئی، نام ’شہناز‘ رکھا گیا، میرے والد صاحب نے پانچ بج کر پانچ منٹ پر ریڈیو پر اعلان کردیا، اس وقت ٹی وی تو تھا نہیں وگرنہ جیو پر اعلان ہوتا کہ ’یہ لڑکی میری ہوئی‘،اس وقت میری عمر پونے تین سال تھی،مَیں حیرت و یاس کی مورت بنا اپنے ابا کی بات کو غور سے سن رہا تھا، میری قسمت کا فیصلہ بغیر مال دیکھے کس بے باکی اور دھڑلے سے کر رہے تھے، کہتے ہیں کبھی زبان سے نکلی کوئی خواہش اللہ تعالیٰ سن لیتا ہے، شاید یہ بھی قبولیت کی گھڑی تھی،اللہ نے میرے ابا کی یہ خواہش سن لی،فرشتوں نے پکے رجسٹر میں ہمارے نام لکھ کر مہر ثبت کر دی ، مَیں نے بھی بڑے ہو کر اپنے والدین کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کیا اس دوران نظریں اِدھر اُدھر بہکی بھی خاص طور پر جامعہ کراچی کی چکا چوند روشنی نے متاثر بھی کیا لیکن اللہ نے ثابت قدم رکھا، سال بعد ۱۹۷۵ء میں مَیں اور شہناز شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ چوتھی ۲۸ دھائی آدھی گزر چکی ہے بندھن قائم ہے، کب تک قائم رہتا ہے ، یہ خدا کو معلوم، مختلف جہات سے مکمل شریک سفر ہیں ،مزاج شناس، ہم نوا اور ہم قدم بھی، ہم مکہ، مدینہ، جدہ ، فیفا (جیذان) کے پھیرے ساتھ ساتھ کر چکے ہیں۔اللہ نے دو بیٹوں عدیل اور نبیل ، بیٹی فاہینہ سے نوازا، پوتے صائم عدیل اور ارسل نبیل، نواسہ ارحم اور نواسیاں نیہا اور کشف میری کل کائینات ہے۔

کتابوں سے محبت اور انھیں سلیقہ سے رکھنے کی عادت شروع ہی سے ہے، ذاتی

لائبریری کئی ہزار کتب پر مشتمل تھی۔ بڑھتی عمر اور اپنے ہی جیسوں کو جو کتابوں کو جمع کرنے کے شوقین تھے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی لائبریری کا کیا انجام ہوا۔ میں اس سے خوف زدہ رہنے لگا تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی میں اپنی لائبریری کسی بہتر لائبریری میں محفوظ کرجاؤں۔ چنانچہ چند سو کتابیں گلبرگ میں قائم ناصر عارف حسین میموریل لائبریری و ریسرچ سینٹر کو، کچھ کتابیں ڈاکٹر یوسف میمن لائبریری میرپور خاص اور باقی تمام کتابیں وفاقی جامعہ اردو کی لائبریری 'ڈاکٹر مولوی عبدالحق میموریل لائبریری' گلشن اقبال کیمپس کو عطیہ کردیں۔ ماب میرے ذاتی ذخیرہ میں وہی کتابیں ہیں جن موضوعات پر میں لکھ رہا ہوں جیسے شخصیات، خاکہ نگاری، کچھ شعراء کے کلام باقی رہ گئے ہیں۔

سرگودھا یونیورسٹی میں گزارے ہوئے میرے روز و شب یادگار اور میری زندگی کا سرمایا ہیں۔ سرکاری عہدہ ملازمت ختم کرچکا تھا، ڈاکٹر محمد فاضل صاحب جامعہ سرگودھا کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے چیرمین تھے جن سے میرے مراسم کی نوعیت برادرانہ تھی، انھوں نے ازراہ عنایت میرا تقرر بحیثیت ایسو سی ایٹ پروفیسر کے اپنے شعبہ میں کرادیا، یہ ان کی عنایت اور مجھ سے محبت تھی، میں نے بھی سرگودھا جانے کا فیصلہ کرلیا۔ مئی ۲۰۱۰ء سے فروری ۲۰۱۱ء میں جامعہ سرگودھا میں تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔

بیماریوں کے حوالے سے اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ میری پوری زندگی بیماریوں سے لڑتے جھگڑتے ہی گزری لیکن یہ بھی نہیں کہ ان بیماریوں نے مجھے کچھ کرنے نہیں دیا، مَیں نے اپنی زندگی بھرپور انداز سے گزاری، بیماریاں آتی رہیں اور علاج کے بعد مَیں نارمل لائف

شروع کردیا کرتا تھا۔

عمر تو بیماریوں سے کھیلتے ہی گزری اپنی رئیسؔ

ایک دل ہی بچا تھا سو وہ بھی کرلے کسرپوری

دل کی تکلیف کیوں ہوئی؟ مَیں تو عام زندگی میں بہت محتاط رہا تھا، خوش خوراک بھی نہیں ہوں، مرغن کھانے بھی نہیں کھائے، پھر میرے دل کو یہ کیا ہوا، کیوں اس نے اس عمر میں مجھے پریشان کیا، یہ راز اللہ کے سوا کسی کو نہیں معلوم، بیماری بھی اللہ کی طرف سے آیا کرتی ہیں، لگتا یہی ہے کہ مجھ سے ہی کوتاہی ہوئی اور مَیں ہی اس کی صحیح دیکھ بھال نہ کرسکا، بہ قول سیماب اکبرآبادی ؎

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں

اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

مَیں اعتدال پسند واقع ہوا ہوں، کبھی اپنی بساط سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں کی، ہمیشہ چادر کو دیکھ کر پیر پھیلائے ہیں، سادہ زندگی بسر کی ہے، فلیٹ خریدنے کی استعداد تھی سو فلیٹ ہی میں رہا، گاڑی کبھی بہت اچھی نہیں رکھی مہران پر اکتفا کرتا رہا، جب تک صحت اچھی تھی موٹر سائیکل استعمال کرتا رہا، زندگی کا زیادہ سفر موٹر سائیکل پر ہی بسر ہوا، میری شریکِ سفر بھی قناعت پسند اور میری ہم خیال ہیں، انھوں نے ہمیشہ میری خوشیوں کا خیال رکھا، میری سوچ اور خواہش کو ترجیح دی، میرے بچوں نے بھی مجھ سے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی جو میرے بس میں نہیں تھی ، میرے بیٹے عدیل اور نبیل میری سوچ کے مطابق میرے ہم قدم رہے، تعلیم حاصل کی اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ میری دونوں بہوئیں مہوش اور ڈاکٹر ثمرا سادگی پسند ہیں ، کم کو زیادہ جانتی ہیں، میری بیٹی فاہینہ بھی صابر اور قناعت پسند ہے، تھوڑے کو بہت جانتی ہے، شادی عاصم مشکور سے ہوئی، خوش و خرم ہیں، عاصم ایک خود دار اور محنت کرکے آگے بڑھنے والوں میں سے ہے، میری نواسی نیہا، نواسہ ارحم اسکول جانے لگے ہیں۔ میرا پوتا صائم میری جان ہے، اسے دیکھ کر میری روح خوش ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کی عمر دراز کرے۔

زندگی میں جنّات کے حوالے سے بھی تجربات ہوئے، جن انسانی روپ میں مجھ سے

مخاطب بھی ہوئے، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی لیکن نقصان نہیں پہنچایا۔ جِنّاَت کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں کو پریشان کرنے والے بھیؐ، ہماری امی پر ایک جِن صاحب آ گئے تھے، کافی پریشانی ہوئی، اس کی تفصیل مَیں نے امی کے خاکے میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ یہاں ایک اور واقعہ بیان کروں گا ۔ میرے ایک دوست کی بیوی (وہ بھی پروفیسر ہے) اس مشکل سے دو چار ہوئی۔ پروفیسرنی صاحبہ کی بعض حرکات ایسی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ جِنّاَت کے اثر وغیرہ کا ہے۔ اسے کسی عامل کے بارے میں معلوم ہوا، سردیوں کا زمانہ تھا میرے دوست نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں مجھے کسی نے ایک عامل کے بارے میں بتایا ہے جو ڈیفنس کے پاس کسی کچی بستی میں رہتا ہے اس کے پاس بیگم کو لے جانا ہے اچھا ہے ایک سے دو ہوں گے ، نہ معلوم کیا صورت ہو، میں تیار ہو گیا، اس کی طبیعت واقعی خراب تھی ، میں اس کے ساتھ ہو لیا، مغرب کے بعد وہ عامل مریضوں کو دیکھا کرتا تھا، ہم بعد نماز مغرب وہاں پہنچ گئے۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے ان کو فارغ کرنے کے بعد اس عامل نے پروفیسرنی صاحبہ کو اپنے دائیں جانب بٹھا دیا، اس کے برابر میرا دوست بیٹھا تھا، عامل نے تفصیل معلوم کی اور عمل شروع کر دیا، خاتون کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا، بڑی بڑی آنکھیں باہر کی جانب، ہم سب کو گھور گھور کر دیکھنے لگی، عامل نے یہ محسوس کیا کہ جِن آسانی سے نہیں جائے گا چنانچہ اس نے اپنے کارندوں کو کوئلے دہکانے کے لیے کہا، کمرے کی لائٹ مدھم کر دیں

عامل بہت زیادہ موٹے دانے والی تسبیح لے کر کھڑا ہو گیا اور تسبیح پڑھنے لگا، اتنے میں کوئلے دھک گئے، عامل نے دھکتے کوئلوں کو ایک مخصوص برتن میں ڈال کر پروفیسرنی صاحبہ کی ناک کے نیچے کیا اور ان پر چھوٹی سرخ مرچیں جن پر اس نے تسبیح پڑھنے کے بعد پھونک ماری تھی کوئلوں پر ڈال دیں، مرچوں کی دھونی سے ہم سب کا برا حال لیکن وہ خاتون جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا، اس عامل نے ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بال پکڑے دوسرے ہاتھ سے مرچوں کی دھونی اس کی ناک میں زبردست طریقے سے دی، کافی دیر کے بعد اس پر کچھ اثر ہوا، عامل اس سے مخاطب ہوا، پوچھا کہ 'بتا تو کون ہے'؟ مردانہ آواز میں جواب دیا کہ ' میں جن ہوں'، تعداد کیا ہے، آکیلا ہوں، اس عورت کو چھوڑدے، کہنے لگا کہ یہ میری بیوی ہے میں نہیں جاؤں گا وغیرہ وغیرہ عامل نے یہ عمل دہرایا، مرچوں کی دھونی نے اس کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں کا برا حال کر دیا تھا لیکن وہ عورت اطمینان سے تھی، آخرکار عامل نے 'جن' کو جانے پر مجبور کر دیا، اس نے جانے کا وعدہ تو کرلیا لیکن فوری طور پر نہیں گیا، ہم یہ سمجھے کہ وہ چلا گیا، واپسی کا سفر شروع ہوا، میرا دوست پہلے ہی بیمار تھا اس صورت حال کے بعد اسے سردی اور بخار ہوگیا، ڈیفنس سے گلشن اقبال تک کا سفر خاصا طویل تھا، میرے دوست کے لیے گاڑی چلانا ممکن نہیں تھا، اس نے مجھ سے گاڑی چلانے کے لیے کہا، یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، وہ جب اگلی سیٹ پر بیٹھنے لگا اور بیوی کو پیچھے سیٹ پر بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اس

کی بیوی نے مردانہ آواز میں کہا " ہٹو میں آگے بیٹھوں گا"۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا، میں نے جب یہ جملہ سنا تو میرے ہوش گم ہو گئے میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ یعنی 'جن' اس عورت میں موجود ہے، اب کیا ہو سکتا تھا، میرا دوست پیچھے بیٹھ گیا، اس کے ساتھ اس کی کوئی ۱۲ سال کی بیٹی بھی پچھلی سیٹ پر تھی، اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہوئے، وہ عورت نظر نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی، گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، میں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ رازداری کے ساتھ اس عورت پر نظر رکھے ہوئے تھا، میں بھی یہ چاہتا تھا کہ خاموشی ٹوٹے، اسی لمحے میرے دوست نے اس کی خیریت پوچھی، شاید وہ بھی چاہتا تھا کہ خوف کا ماحول خوش گوار ماحول میں بدل جائے، اس کے بولتے ہی وہ عورت مردانہ آواز میں چلائی "خاموش بیٹھا رہے"، اس کے بعد وہ میری جانب مخاطب ہوئی، کہنے لگی " تو خاموشی سے گاڑی چلا"، میں نے اپنے دوست سے کچھ کہا، اس کے جواب میں وہ عورت مردانہ آواز میں مجھ پر برس پڑی، بولی، " خاموش نہیں رہے گا، ابھی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا"، اس کے اس جملے نے میرے ہوش گم کردیے، میں اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ اگر اس نے چلتی گاڑی سے دھکا دے دیا تو کیا ہو گا، میرے بدن کا ایک ایک رُواں کھڑا تھا، بدن کپکپانے لگا، وہ یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی، میں بدستور گاڑی چلاتا رہا، جس قدر قرآنی آیات یاد تھیں وہ تمام مسلسل پڑھتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ کسی بھی طرح منزل آجائے، جب ہم شہید ملت روڈ کے پل پر پہنچے تو وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی، کہنے لگی " پان

کھلااور سگریٹ پلا"۔ میں نے جواب دیا کہ میں دونوں چیزیں نہیں استعمال کرتا اپنے میاں سے کہو وہ کھلائے گا۔ اب تو جناب وہ زور سے دھاڑی کہنے لگی 'سگریٹ کی دکان پر گاڑی روک ، سنا نہیں تونے۔ میں نے کہا کہ اچھا دکان آ جائے تو روکتا ہوں لیکن میں نے گاڑی کی اسپیڈ کم نہیں کی، وہ بھی اس کے بعد خاموش ہو رہی، گھر آ گیا، خدا کا شکر ادا کیا، چابی اپنے دوست کے حوالے کی اور اپنے گھر کی راہ لی۔ میرے دوست نے بتایا کہ وہ رات بھر سوتی رہی، صبح اٹھی تو اسے ان تمام باتوں کا علم نہیں تھا کہ اس نے رات میں دو مردوں کو کس قدر خوف میں مبتلا کیا، اس نے بتایا کہ اس عمل کے بعد اس کی بیوی ٹھیک ہو گئی۔ یہ میری زندگی کا نہ بھولنے والا واقعہ ہے،جب کبھی مجھے اس کا خیال آ جاتا ہے ' جن' سے ہو

نے والی گفتگو تازہ ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ سے جنّات پر میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا۔

خطوط نویسی کو ادبی صنف میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عام ہونے سے قبل تک خطوط ہی ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے اور معلومات کے تبادلے کا اہم ذریعہ تھے۔ برقی ڈاک (E-Mail) نے خطوط نویسی کو تہس نہس کردیا۔ ماضی میں لکھاریوں نے خطوط کے ذریعہ اپنے ادبی جوہر دکھائے، کتابی شکل میں شائع ہونے والے خطوط ادبی تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔ غالب

علامہ اقبال، شبلی نعمانی، ابن انشا کے خطوط ادب میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ مَیں نے جب سے لکھنے کی دنیا میں قدم رکھا، اس بات کی عملی کوشش کی کہ میرے نام لکھی گئ ہر ہر تحریر خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو محفوظ کرلوں اور مَیں نے ایسا ہی کیا، میرے علمی ذخیرہ میں ایک ہزار کے قریب خطوط محفوظ ہیں، یہ خطوط و تحریریں تمام طرح کے احباب کی ہیں جن سے میرا خط کتابت کا تعلق رہا۔ بعض اہم شخصیات جن کے خطوط میرے نام آئے اور وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ان تمام خطوط کی فائلیں اپنے ذخیرہ کتب کے ساتھ وفاقی جامعہ اردو کراچی کے کتب کانے میں محفوظ ہیں۔

اپنی تلاش کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی کو اختصار سے قلم بند کر سکوں تاہم بعض موضوعات طویل ہوگئے انہیں مختصر کرنے سے بات مکمل طوپر واضح نہ ہوپاتی، بہت سی باتیں ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔آخر میں اپنی روداد حیات کو سیماب اکبرآبادکے اس شعرپر ختم کرتا ہوں ؎

مری روداد‘ رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

لندن کے پاکستانی نژاد میئر۔صادق خان

پاکستانی نژاد برطانوی شہری صادق خان نے برطانیہ کی تاریخ میں برطانوی دار الحکومت کا پہلا مسلمان میئر منتخب ہو کر ایک نئی تاریخ رقم کی۔ صادق خان کے آباؤ اجداد کا تعلق پاکستان کے شہر کراچی سے تھا۔ یہ خاندان صادق خان کی پیدائش سے قبل برطانیہ منتقل ہوگیا تھا۔ صادق خان کے والد امان اللہ خان محنت کش اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے برطانیہ میں 25برس بس چلائی یعنی وہ بس ڈرائیور رہے۔ ان کے ایک بھائی موٹر مکینک کا کام کرتے ہیں۔ صادق خان نے یہ ثابت کردیا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے اعلیٰ خاندان اور والدین کا رئیس ابن رئیس ہونا ہی ضروری نہیں ہوتا۔ایک عام انسان اگر صدق دل سے محنت کرے، اللہ پر مکمل بھروسہ، سچائی اور ایمانداری سے اعلیٰ مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ صادق خان 8اکتوبر 1970ء کو لندن کے شہر ٹوٹنگ (Tooting) میں پیدا ہوئے، ٹوٹنگ لندن شہر کے جنوب میں واقع ہے۔اسی شہر کی نمائندگی بھی کی۔ وہ چھ بہن بھائی ہیں، ریاضی اور سائنس میں اے لیول کے بعد وہ ڈینٹسٹ بننا چاہتے تھے لیکن ان کے ایک استاد نے انہیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جسے انہوں نے قبول کر لیا، انہوں نے قانون کی ڈگری یونیورسٹی آف نارتھ لندن سے حاصل کی۔ ان کی شادی سعدیہ احمد سے ہوئی ان کی دو بیٹیاں انیشہ خان اور عمارہ خان ہیں۔ صادق خان

اور 'Faimess Not Favours' دو کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان میں سے ایک ہے۔ وہ 'How to Reconnect with British Muslims' دوسری کتاب فٹبال ، باکسنگ اور کرکٹ کے کھلاڑی بھی رہے۔

صادق خان نے قانون کی ڈگری کے حصول کے بعد عملی طور پر انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کیا، وہ برطانیہ کی عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ وہ بے باک ، نڈر، صاف گواور اچھے مقرر بھی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں اور عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار صادق خان کو عوامی حلقوں میں پسند کیا جانے لگا،انہوں نے اپنی عملی سیاست کے لیے برطانویہ کی لیبر پارٹی کا انتخاب کیا، 2005ء میں وہ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوگئے۔ رکن پارلیمنٹ کی حیثیت سے صادق خان کو عوامی حلقوں میں جانے اور ان کے لیے آواز بلند کرنے کا موقع ملا گورڈن براؤن کی کیبنٹ میں منسٹر آف اسٹیٹ برائے کمیونیٹیز مقرر ہوئے ، بعد میں ٹرانسپورٹ کے وزیر بھی ہوئے۔ لندن کے میئر منتخب ہونے تک وہ پارلیمنٹ کے رکن اور وزارت کے عہدہ پر فائز تھے۔ 2016ء کے انتخابات میں برطانیہ کی لیبر پارٹی نے انہیں لندن کے میئر کے لیے اپنا امیدوار نامزد کیا لیبر پارٹی کا یہ فیصلہ صادق خان کے لیے بڑا چیلنج تھا۔ وہ اس پر نازاں بھی تھے اور فکر مند بھی۔ صادق خان ایک غریب گھرانے کے چشم وچراغ تھے ، ساتھ ہی مسلمان بھی تھے جب کے ان کے مدِ مقابل کنزرویٹو پارٹی کے امیدوار ایک

یہودی اور ایک ارب پتی باپ کے بیٹے زیک گولڈ اسمتھ تھے۔ گولڈ اسمتھ تحریک انصاف کے چیئر میں عمران خان کی سابقہ اہلیا 'جمائما' کے بھائی بھی ہیں، یہی وجہ رہی کہ الیکشن کے دنوں میں جب کپتان لندن گئے تو مخالفین نے ان پر تنقید کی کہ اپنے سابقہ سالے کی الیکشن مہم میں اپنا حصہ ڈالنے گئے ہیں، یہ بھی کہا گیا کہ وہ ایک مسلمان کے مقابلے میں ایک یہودی کی حمایت کر رہے ہیں، سابقہ ہی سہی گولڈ اسمتھ ہیں تو سالے صاحب ،ان کی حمایت کرنا تو کپتان کا حق بنتا تھا جو انہوں نے ادا کیا، یہ دوسری بات بقول میر تقی میرؔ ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھ اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

مقابلہ کانٹے کا تھا، یہودی لابی نے صادق خان کے خلاف ہر ہر حربہ استعمال کیا، گولڈ اسمتھ کو برطانوی وزیر اعظم کی اشیر باد بھی حاصل تھی۔ صادق خان کا مسلمان ہونا تو یہودی لابی کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا ہی اس کے علاوہ ان پر بے شمار قسم کے الزامات لگائے گئے، شدت پسندوں کا ساتھ دینے کا الزام لگایا گیا، لندن کے لوگوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی ہر ممکن سعی کی گئی ان سب کے باوجود گولڈ اسمتھ کا کام تمام ہو گیا اور انہیں عبرت ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔بقول نواب محمد یار خان امیرؔ ، بعض لوگ اس شعر کو میر تقی میرؔ یا امیر مینائی کا کہتے ہیں ، لیکن یہ شعر ہے امیرؔ کا ۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

صادق خان نے 13 لاکھ 10 ہزار ووٹ حاصل کیے ،ان کے حق میں ووٹوں کا تناسب فیصد رہاجب کہ زیک گولڈ اسمتھ کو 9 لاکھ 94 ہزار ووٹ ملے، ووٹوں کا تناسب 4331 فیصد رہا۔ صادق خان کی کامیابی نے ثابت کر دکھایا کہ لندن کے شہری خواہ کسی بھی مذہب، زبان، قوم، نسل، قبلے سے تعلق رکھتے ہوں انہوں نے لندن کے میئر کے انتخاب میں تمام قسم کے تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عوام کی فلاح و بہبود اور لندن شہر کی ترقی کو بنیاد بنا کر اپنے لیے میئر کا انتخاب کیا۔ صادق خان کی کامیابی یقینا یہودیوں کے لیے شدید دَھچکااور مسلمانوں کے لیے سرور وانبساط کا باعث ہے اور ہونا بھی چاہیے ۔ لندن کے عوام کا یہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مغرب میں ابھی ایسی اقوام موجود ہیں جو مسلمانوں کو بعض وجوہات کے باعث دیگر پر فوقیت دیتی ہیں، پورے مغرب میں ایک مثبت پیغام اس فتح سے گیا ہے، یہاں تک کہ امریکی صدارتی امیدوارڈونلڈ ٹرمپ جو مسلمانوں کے لیے اچھا ذہن ، مثبت سوچ نہیں رکھتے تھے ، صادق خان کی فتح نے ان پر بھی مثبت اثرات مرتب کیے اور انہوں نے صادق خان کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی یہ دوسری بات کہ صادق خان نے یہ پیش کش ٹھکرا دی ہے۔ اس کی وجہ ٹرمپ کا وہ کردار ہے جو دوران انتخابی مہم مسلمانوں کے

حوالے سے سامنے آیا ہے۔

اپنے کالم کا اختتام صادق خان کے ایک خوبصورت عمل پر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات روزنامہ جنگ کے کالم نگار اشتیاق بیگ نے اپنے کالم بعنوان 'میئر لندن پر عائد بھاری ذمہ داریاں' (25 مئی 2016) میں برطانوی جریدے ''انڈی پینڈنٹ' کی رپورٹ کے حوالے سے قلم بند کیا ہے۔ اشتیاق بیگ لکھتے ہیں کہ انڈی پینڈنٹ کی اس رپورٹ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کو چھو لیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ'' 2009ء میں جب صادق خان کو برطانوی ملکہ کی خصوکونسل کے رکن کی حیثیت سے چنا گیا تو بکنگھم پیلس سے صادق خان کو ایک فون کال موصول ہوئی جس میں اُن سے کہا گیا کہ آپ ملکہ برطانیہ کے سامنے بائبل پر حلف لیں گے لیکن صادق خان نے قرآن پاک پر حلف لینے پر اصرار کیا اور کہا کہ ''میں صرف قرآن پاک پر ہی حلف لیتا ہوں کیونکہ میں مسلمان ہوں''۔ شاہی محل کی انتظامیہ نے انہیں کہا کہ ہمارے پاس قرآن پاک نہیں ہے، اگر آپ قرآن پر حلف لینا چاہتے ہیں تو اپنے ساتھ قرآن لے آیئے''۔ چنانچہ صادق خان حلف برداری تقریب میں اپنے ساتھ قرآن پاک لے کر گئے اور قرآن پر ہی انہوں نے حلف لیا۔ تقریب حلف برداری کے اختتام پر صادق خان نے قرآن پاک شاہی محل کی انتظامیہ کو ہدیہ کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ چاہتے ہیں کہ میرے بعد اگر کوئی دوسرا مسلمان شاہی محل میں حلف اٹھانے آئے تو بائبل کے بجائے قرآن پر حلف

اٹھائے''۔ صادق خان کا یہ عمل انہیں ایک بے باک اور نڈر مسلمان ثابت کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور مغربی دنیا میں مغربی ذہن کے پروردہ مسلمان دشمنوں کے درمیان خود کو مسلمان کہنے پر ناز کرتے ہیں۔البتہ صادق خان کے میئر کا حلف اٹھانے کی تقریب لندن کے ایک چرچ میں منعقد ہوئی ، انہوں نے میئر کا حلف اٹھانے کے بعد.برطانیہ کے شری سوامی نرائن مندر کا دورہ بھی کیا۔ ان اقدامات سے وہ لندن کی مختلف کمیونیٹیز کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ صرف مسلمانوں کے ہی میئر نہیں بلکہ پورے لندن کے میئر ہیں۔

ہماری ویب پر میرے مضامین وکالم کی تیسری سینچری

الحمد اللہ پاکستان کی سب سے بڑی ویب پورٹل ’ ہماری ویب‘ پر میرے مضامین و کالم کا آغازتو آج سے 9 (Hamariweb) ‘کی تیسری سینچری مکمل ہوئی۔ ’ہماری ویب سال قبل (14 اگست 2007) کو ہوا تھا البتہ اس سے میرے تعلق کا آغاز 13 دسمبر 2013 کو اس وقت ہوا جب میں سعودی عرب کے شہر جدہ میں تھا۔ پہلا مضمون ایک شعری مجموعے ’لمس‘ کا تعارف تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ’ہماری ویب‘ سے میرے عشق و محبت کے سلسلے آگے بڑھتے رہے۔ مضامین بھیجنے اور آن لائن ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔ سات ماہ کے مختصر عرصے میں 11 ستمبر 2014 کو میرے مضامین کی سینچری مکمل ہوچکی تھی ، اس دوران مَیں ہماری ویب سے اچھی طرح متعارف ہوچکا تھا۔ میں نے اب اپنے مضامین اور کالموں کی اشاعت کے لیے اخبارات اور رسائل کے مدیران کی جانب دیکھنا اوراشاعت کے لیے طویل عرصہ انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تاہم کبھی کبھار روزنامہ جنگ میں کوئی مضمون شائع ہوجاتا لیکن میری مکمل توجہ ہماری ویب پر ہی مرکوز رہی۔مَیں گزشتہ چار دیہائیوں سے لکھ رہا ہوں، بے شمار موضوعات پر لکھا، کتابوں کی تعداد 33 اور مضامین وکالم 500 سے زیادہ ہو چکے۔ حال ہی میری علمی و ادبی نگارشات پر مبنی (توضیحی کتابیات) شعبہ اردو، جامعہ سرگودھا کے استاد ڈاکٹر خالد ندیم، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ،جامعہ منہاج لاہور کے استاد

ڈاکٹر اقبال حسین اسد اور شاہد محمود مہر نے مرتب کی شائع ہوئی ہے جس میں میری تصانیف و تالیفات پر تبصرہ اور مضامین و کالموں کی مکمل فہرست موجود ہے۔ مَیں یہ بات فخر کے ساتھ کہتا ہوں اور یہاں لکھ بھی رہا ہوں کہ مجھے ہماری ویب نے کالم نگار بنایا، ہماری ویب سے منسلک ہونے سے قبل میں لکھاری تو تھا لیکن کالم نگاری نہیں تھا، ہماری ویب کے توسط سے میں نے کالم نگاری کی دنیا میں قدم رکھا، ہماری ویب پر میرے کالموں کی اشاعت وجہ بنی کہ 'روزنامہ جناح' جو کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے بیک وقت شائع ہوتا ہے نے میرے کالموں کو اپنے اداراتی صفحہ پر جگہ دی اور میرے 50 سے زیادہ کالم اس اخبار کی زینت بنے۔ ادب کی اس صنف نے مجھے اپنی جانب ایسا راغب کیا کہ اب میں کالم نگاری زیادہ کرتا ہوں۔ شاید اس کی ایک وجہ میرا سیاسیات میں ایم اے اور سوشل سائنسز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حصول بھی ہو سکتا ہے۔ روزنامہ جناح میں میرے کالم ''رشحاتِ قلم'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

2014ء میں ہماری ویب نے آن لائن لکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے ایک ادارہ رائیٹرز کلب' تشکیل دیا۔ کلب کی مجلسِ منتظمہ کا انتخاب ہوا تو مجھے 'رائیٹرز کلب' کا' صدر منتخب کر لیا گیا۔ کلب کا مقصد آن لائن لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی و رہنمائی کرنا تھا۔ گویا اب ہم آن لائن لکھنے والوں کے رہنما بھی بن گئے۔ 2016ء میں کلب کو ایک سال مکمل ہوا اور نئی مجلس

انتظامیہ تشکیل پائی، احباب کی محبت ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم اپنے منصب پر قائم رہیں۔ایک جانب رائٹرز کلب کی علمی و ادبی سر گرمیاں جاری ہیں تو دوسری جانب مضامین و کالم آن لائن کرنے کا عمل بھی جاری و ساری ہے۔ رائیٹرز کلب پر الگ سے تفصیلی مضمون لکھا جاچکا ہے جو رئیٹرز کلب کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔

دوسری سینچری31 اگست 2015 ء کو مکمل ہو گئی ۔دوسری سینچری کا پہلا مضمون بھی میں نے جدہ میں رہتے ہوئے تحریر کیا۔ یہ مضمون ایک تاثراتی تھا۔ سعودی عرب سے میری واپسی تھی 20 ستمبر 2015 کو الوداعی طواف کے لیے خانہ کعبہ گیا، جہاں پر حاجیوں کی آمد شروع ہوچکی تھی، کعبے کے گرد جہاں نظر جاتی مسلمان احرام میں نظر آرہے تھے۔ حاجی ہی کیا بلکہ خانہ کعبہ جانے والے خواہ عمرہ کی غرض سے ہی کیوں نہ جائیں اللہ کے مہمان ہوتے ہیں۔ میں نے اس صورت حال کو اپنے مضمون کا عنوان بنایا اور دوسری سینچری کا پہلا مضمون ''خانہ کعبہ میں اللہ کے مہمانوں کی بہاریں'' آن لائن ہوا۔ اس سینچری کے ابتدائی مضامین سعودی عرب میں رہتے ہوہے لکھے گئے۔ ان میں کچھ آپ بیتی اور کچھ سفر نامے کا حصہ تھے۔ یہ سفر نامہ اور آپ بیتی میرے مستقبل کے منصوبوں میں سے ہیں۔ مجھے ایک سہولت یہ میسر ہے کہ میں اپنے خیالات کو قلم وقرطاس کے ذریعہ کاغذ پر منتقل نہیں کرتا بلکہ میرے خیالات ، نظریات اور احساسات میرے ذہن سے برائے راست

سے ہوتی ہوئی (Key Board) میرے ہاتھ کی انگلیوں کی جُنبش سے کمپیوٹر' کی' بورڈ کمپیوٹر اسکرین پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ یعنی میں اپنے مضامین اردو یا انگریزی دونوں زبانوں میں کمپیوٹر پر از خود کمپوز کرلیتا ہوں، اگر کسی جگہ عربی لکھنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ بھی آسانی سے لکھ لیتا ہوں اس طرح میرا بہت سا وقت بچ جاتا ہے، میرے بعض کرم فرما میری تحریریں جلدی جلدی ہماری ویب پر جنہیں میں 'فیس بک' پر بھی شیر کر دیا کرتا ہوں دیکھتے ہیں تو اکثر کہتے ہیں کہ تم لکھنے کے معاملے میں انسان ہو یا جن، بہت ممکن ہے کہ انہیں کچھ اور بھی خیال آتا ہو، تو میرے وہ احباب سن لیں کہ میرے زیادہ لکھنے کا راز صرف یہ ہے کہ میں دھن کا پکا ہوں، محنت مشقت (لکھنے پڑھنے کی حد تک) کا عادی ہوں،اب مجھے پڑھنے کے بعد لکھنے کا جنون ہے۔ریٹائر منٹ کے بعد میرا زیادہ وقت اپنے گھر پر ہی گزرتا ہے، میرا کمپیوٹر ہی اب میرا محبوب ہے، ساتھی ہے، غم گسار ہے۔ یہ میرا اور میں اس کا عاشق ہوں۔جب بھی میں افسردہ ہوتا ہوں تو یہ مجھے تسلی تشفی دیتا ہے، میری دلجوئی کرتا ہے، جس طرح چھوٹے بچے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں اور وہ اپنا دکھ و ضد بھول کر کھلونوں میں لگ جاتے ہیں اسی طرح میرا کمپیوٹر میرا کھلونا بھی ہے یہ مجھے اپنے ساتھ لگا کر میرا غم، میری افسردگی، بسا اوقات دنیا سے میری بیزاری کو دور کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی رات کے کسی پہر میری نیند اچاٹ ہو جاتی ہے، کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی ہوتی تو میں اپنے آرام دہ بستر کو خیر باد کہہ کر اپنے

محبوب سے محوِ گفتگو ہو جاتا ہے۔ میرے گھر کی وہ جگہ جہاں کمپیوٹر اور میری کتابیں رکھی ہیں، میرا دفتر بھی ہے، ڈرائینگ روم بھی ہے، ملاقاتیوں سے ملنے کی جگہ بھی یہی گوشہ عافیت ہے، یہی میری پسندیدہ جگہ ہے، اس جگہ اگر میں گھنٹو بیٹھا رہوں تو میں نہ تو بور ہوتا ہوں اور نہ ہی تھکن اور اکتاہٹ و پریشانی کا احساس ہوتا ہے۔ کمپیوٹر گویا میرا قلم و قرطاس ہے۔

تیسری سینچری کی شروعات 3 ستمبر سے ہوئی، پہلا مضمون 'حجاب کا عالمی دن' تھا، 8 ماہ کے عرصے میں تیسری سینچری مکمل ہوئی، تیسری سینچری میں کالموں کی تعداد زیادہ ہے۔اس دوران روزنامہ 'جناح' میں میرے کالم چھپنے لگے، ایڈیٹوریل صفحہ کے انچارج ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی صاحب کی عنایت کے باعث کالم نگاری کا یہ سلسلہ جو ہماری ویب تک محدود تھا اخبار تک وسیع ہوگیا اور تین ماہ کے مختصر عرصے میں پچاس سے زیادہ کالم روزنامہ جناح کی زینت بن گئے، یہی کالم ہماری ویب پر بھی آن لائن ہوئے۔ تیسری سینچری میں تیزی کی وجہ یہی روزنامہ جناح بنا۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی شخصیات اور ادبی موضوعات پر لکھنا تو میرا محبوب مشغلہ ہے ہی۔ جن ادبی و علمی شخصیات پر لکھا ان میں میر تقی میرؔ، فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال، حکیم محمد سعید، ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والی سویتلانا لیکسیا وچ، ممتاز مفتی، شاعر مشرق علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیضؔ، انتظار حسین، سجاد ساجد، اختر جونا

گڑھی، شہید پرنسپل طارہ قاضی، جمیل الدین عالی، فاطمہ ثریا بجیا، کمال احمد رضوی، سبطین رضوی، پروفیسر آفاق احمد بھوپالی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند پر مضامین شامل ہیں۔ کتب پر تبصرہ یا ان پر تفصیلی مضمون لکھنا میرے مشاغل میں سے ہے۔ متعدد کتب پر مضامین تحریر کیے ۔ ادبی نششتوں کے حوالے سے چند مضامین ، عالمی سطح منائے جانے والے عالمی دن جیسے حجاب کا عالمی دن، ویلنٹائن ڈے، معذوروں کا عالمی دن، ضعیف العمر افراد کا عالمی دن، کتاب کا عالمی دن کے حوالے سے بھی چند مضامین اس سینچری کا حصہ ہیں۔ ذیل میں تیسری سنچری کے 100 مضامین کی فہرست موضوعات کے اعتبار سے اور ان کے یو آر ایل کے ساتھ شامل ہے تاکہ کسی بھی قاری کو متعلقہ مضمون تک پہنچنے میں مشکل پیش نہ آئے۔

شاعر، ادیب، دانشور اور دیگر اہم شخصیات

۱۔ میر تقی میرؔ۔ اردو غزل کے بے تاج بادشاہ: (205 سال قبل 20 ستمبر 1810ء کو دنیا سے رخصت ہوئے)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65781

۲۔ فرزندِ اقبال (جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال) کا سانحۂ ارتحال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=66282

۳۔ حکیم محمد سعید شہید۔ تحقیق کے آئینے میں (17ویں برسی کے موقع پر)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=66639

۴۔ ممتاز مفتی۔ شخصیت نگار، کہانی و افسانہ نگار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=67145

۵۔ اقبالؔ۔ تیری عظمت کو سلام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=67426

۶۔ فیض احمد فیضؔ۔ 20 نومبر 1984ء کو دنیا سے رخصت ہوئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=67882

۷۔ عالیؔ جی بھی رخصت ہوئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68080

۸۔ محمد سجاد ساجد مرحوم ۔ پاکستان لائبریرین شپ کی محترم شخصیت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68525

۹۔ اخترؔ جوناگڑھی، شاعر و ادب کا سانحۂ ارتحال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68582

۱۰۔ الف نون کے ' الن' (کمال احمد رضوی) اللہ کو پیارے ہوئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69304

۱۱۔ 'بیاد جمیل الدین عالیؔ' بہ اہتمام ایوان اردو کی تقریب میں اظہار خیال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70010

۱۲۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے (انتظار حسین)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71207

۱۳۔ 'بجیا' بھی چل بسیں (فاطمہ ثریا بجیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71455

۱۴۔ میرا دوست 'سبطین رضوی' بھی چلا گیا۔ ہماری ویب 29 مارچ 2016

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=7369

۱۵۔ پروفیسر آفاق احمد بھوپالی ۔ شاعر، ادیب، ماہر اقبالیات و غالبیات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75358

۱۶۔ ادیب و دانشور اسلوب احمد انصاری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75574

۱۷۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ بنگالی زبان کا شیکسپئر: آج ۷ مئی ٹیگور کی پیدائش کا دن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75575

۱۸۔ پروفیسر سحرؔ انصاری: شاعروں کے شاعر ادیبوں کے ادیب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75600

۱۹۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند ۔ دنیائے ادب کی قد آور شخصیت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75933

کتاب ،کتاب میلہ اور ادب

۱۔ اردو کے نفاذ کا اعلیٰ عدالت کا فیصلہ ۔ عمل درآمد ضروری ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65471

۲۔ ادب کا نوبل انعام 2015 بیلا روس کی مصنفہ سویتلانا الیکسیاوچ کے نام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=66871

۳۔ پروفیسر سحر انصاری کے اعزاز میں تقریبِ توصیفی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67362

۴۔ کتاب میلہ۔ نعت ریسرچ سینٹر اور خوش اِلحان نعت گو صبیح رحمانی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67808

۵۔ کتاب میلہ ۔کتاب کلچر کا فروغ وقت کی ضروری

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67828

۶۔ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام 'بیاد جمیل الدین عالیؔ' تقریب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68943

۷۔ ایوانِ اردو کے زیر اہتمام 'بیاد جمیل الدین عالی'

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=70162

۸۔ فہمیدہ ریاض اور امداد حسینی کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی: ہماری ویب ۳۰ جنوری ۲۰۱۶ء

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=70943

۹۔ کراچی ادبی میلہ، ہماری ویب آن لائن ہماری ویب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71334

کتب کا تعارف و مطالعہ

(ا۔ شاہد احمد دہلوی پر ایک عمدہ کتاب (گلدستہ شاہد احمد دہلوی مرتبہ راشد اشرف

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71444

۲۔ موج دریا۔ مجموعہ کلام دریآ لکھنوی ہماری ویب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=72023

۳۔ اٹھ مسلم پاکستان بچا۔ ایک اچھی کتاب ہماری ویب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=72218

۴۔ کمال کی باتیں۔ مصنف کمال احمد رضوی، ہماری ویب

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=73114

۵۔ الحمد اکیڈمی کا مجلّہ 'الحمد': سیرت نمبر ۲۔ تعلیم و تربیت اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، ۲۰۱۵ء

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75827

خاص دنوں کے حوالے سے

ا۔ حجاب کا عالمی دن 4 ستمبر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65058

۲۔ ضعیف العمر افراد کا عالمی دن: یکم اکتوبر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65970

۳۔ معذورں کا عالمی دن ۔ ۳ دسمبر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68412

۴۔ ویلنٹائن ڈے ہماری روایت نہیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71555

۵۔ ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' اور کتاب کا عالمی دن 2016

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=74910

۶۔ شبِ برات ۔ رحمتوں اور برکتوں والی رات

سماجی، سیاسی، علمی ، ادبی معاشرتی اور کرنٹ افیئرز پر کالم

۱۔ اردو کے نفاذ کا اعلیٰ عدالت کا فیصلہ ۔ عمل درآمد ضروری ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65471

۲۔ سانحہ حرم شریف ۔ اپنے مشاہدات کی روشنی میں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65547

۳۔ کراچی کے لیے 150ارب روپے کا پیکج ۔ نیک نیتی یا بلدیاتی انتخابات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=65622

۴۔ قومی اسمبلی 122کانٹے کا مقابلہ۔ معرکہ کیا سبق دے گیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=66410

۵۔ سانحہ منیٰ :انتہائی افسوس ناک لیکن غیر ضروری تنقید مناسب نہیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=66449

۶۔ کلکرنی کا کالا منہ ۔ بھارت کا اصل چہرہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=66785

۷۔ ادب کا نوبل انعام 2015 بیلا روس کی مصنفہ سویتلانا الیکسیاوچ کے نام

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=66871

۸۔ نون لیگ کا اندرونی خلفشار

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=66938

۹۔ نواز اوباما ملاقات ۔ کیا کھویا، کیا پایا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=67018

۱۰۔ عمران خان اپنی نجی زندگی کی دوسری اننگ میں کلین بولڈ ہو گئے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=671

۱۱۔ بھارت کا 'گوربا چوف' نریندر مودی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=67172

۱۲۔ کرکٹ ڈپلو میسی، ناکامی کے ذمہ داران کی سَرزنش ضروری ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=67304

۱۳۔ یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی: عمران خان کی دوسری طلاق

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=67407

۱۴۔ متحدہ کی ایوانوں میں واپسی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=67516

۱۵۔ شیشہ کیفے کی بندش کا حکم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67676

۱۶۔ بھارت کے صوبہ بہار میں نریندر مودی کی زلت آمیز شکست

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67715

۱۷۔ خوشبوؤں کا شہر ’ پیرس‘۔ لَہو لُہان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=67829

۱۸۔ گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (بلدیاتی انتخابات کا دوسرا مرحلہ سندھ کے حوالے سے)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68019

۱۹۔ گڈ گورننس یا بیڈ گورننس تک۔ سنجیدگی کی ضرورت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68194

۲۰۔ ’اقدار‘ کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار کی سیاست کی جاتی ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68305

۲۱۔ بلدیاتی انتخابات نے کراچی کی سیاسی رونقیں بحال کردیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68411

۲۲۔ وزیر خزانہ پر قرض لینے کا بھوت سوار ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68484

۲۳۔ کراچی اور اسلام آباد کے میئر کا فیصلہ ہوگیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=68575

۲۴۔ سوشل میڈیا پرڈاکٹر عامر لیاقت کی والدہ کی تضحیک۔ افسوس ناک عمل

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68787

۲۵۔ پارلیمنٹ لاجز میں منشیات کا استعمال؟ سینیٹر کلثوم پروین کا انکشاف

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68847

۲۶۔ سشما سوارج اور سرتاج عزیز کا پر جوش ہینڈ شیک

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68890

۲۷۔ سولہ دسمبر (16) پھولوں کے جنازوں کا دن

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=68955

۲۸۔ شہید پرنسپل 'طاہرہ قاضی ۔ بہادری، فرض شناسی اور قربانی کی اعلیٰ مثال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69086

۲۹۔ سابق چیف جسٹس افتخار چودھری۔ صدارتی نظامِ حکومت کے حامی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69183

۳۰۔ ری پبلکن ڈونلڈ ٹرمپ' نریندر مودی کے نقشِ قدم پر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69239

۳۱۔ قومی بچت کی اسکیموں پر منافع میں کمی۔ وزیر خزانہ کا ایک اور تحفہ

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69305

۳۲۔ لودھراں میں تحریک انصاف نے میدان مار لیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69451

۳۳۔ لیاری کی بسمہ، وی آئی پی پروٹوکول کی نذر ہو گئی

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69452

۳۴۔ نواز' مودی پرجوش معانقہ۔ کیا گل کھلائے گا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=69536

۳۵۔ وفاق اور سندھ' اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70012

۳۶۔ حکومت کی مفت علاج اسکیم

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70013

۳۷۔ ایک فیصد میں پانچ کروڑ۔ سودا برا نہیں

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70014

۳۸۔ سعودی ایران تنازع اور پاکستان کی حکمت

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=7010

۳۹۔ بلدیاتی نظام کی بحال

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70368

۴۰۔ وزیر اعظم پاکستان اور سپہ سالار کا مصالحتی مشن : ہماری ویب ۲۱ جنوری ۲۰۱۶ء

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?

id=70393

۴۱۔ باچا خان یونیورسٹی چارسدہ پر دہشت گرد حملہ : ہماری ویب، ۲۱ جنوری

۲۰۱۶ء
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=70489
۴۲۔ سندھ اسمبلی کے احاطے کے بے دخل مکین : ہماری ویب ۳۰ جنوری ۲۰۱۶ء
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=70942
۴۳۔ گرم سیاسی موسم : وفاق بہ مقابلہ سند :: ہماری ویب، ۲ فروری ۲۰۱۶ء
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=71056
۴۴۔ سپہ سالار پاکستان کا صائب فیصلہ :: ہماری ویب، ۲ فروری ۲۰۱۶ء
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=71057
۴۵۔ تعلیمی اداروں کی بندش مسئلہ کا حل نہیں
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=71190
۴۶۔ پی آئی اے : چلے تو نقصان نہ چلے تو اس سے زیادہ نقصان
ttp://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=71874
۴۷۔ احتساب : دوسروں کا حلال اپنا حرام
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=72150
۴۸۔ مردم شماری ۔ موخر کیوں؟ روزنامہ جناح ، ۴ مارچ ۲۰۱۶ء ، ہماری ویب
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=72422
۴۹۔۔ کمال نے کوئی کمال نہیں کیا
http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?
id=72904

۵۰۔ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا (پرویز مشرف کی بیرون ملک روانگی)

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=73218

۵۱۔ وزیر اعظم' جوش نہیں ہوش کی ضرورت ہے

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75657

۵۲۔ الزام تراشی کا کلچر

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75706

۵۳۔ پانامہ لیکس اور اپوزیشن کے سات سوالات

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=75841

۵۴۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=76296

۵۵۔ لندن کے پاکستانی نژاد میئر۔ صادق خان

http://www.hamariweb.com/articles/article.aspx?id=76369

۵۶۔ ہماری ویب پر میرے مضامین وکالم کی تیسری سینچری

استقبالِ رمضان۔ رحمتوں و فضیلتوں والا مہینہ

الحمد اللہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ مبارک ماہ ہمارے لیے بے بہا رحمتیں اور برکتیں لیے ہوئے سایۂ فگن ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے بے انتہا اخلاقی و روحانی فیوض و برکات لیے ہوئے ہوگا۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم ان فیوض و برباکات سے اپنے آپ کو فیض یاب کریں یا اپنی کوتائی، سستی اور کاہلی کے سبب اس موقع کو اپنے ہاتھ سے گنواں دیں۔ رمضان المبارک ایک بابرکت اور فضیلت والا مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوااور امت پر روزے فرض کیے گئے۔ قرآن مجید کی سورۃالبقرہ آیت ۱۸۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل) کو الگ الگ کرنے والا ہے، تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے"۔ جس مہینے میں ہمیں قرآن مجید جیسی عظیم کتاب ملی جو ہمارا دستور حیات ہے، ہمارا رہنما ہے اور ضابطۂ زندگی ہے چنانچہ جس مہینے میں ہمیں حکمت سے بھرا قرآن ملا ہو، دستور حیات ملا ہو، کلامِ خدا ملا ہو اس سے بڑھ کر مبارک مہینہ ہمارے لیے بھلا اور کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقدس مہینہ ہے جس میں پروردگار عالم نے روزے فرض کیے ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی امتوں پر بھی روزوں کا

حکم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری بنی حضرت محمد ﷺ کی امت پر روزے کا حکم دیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا ''یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاکُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَاکُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن (سورۃ البقرہ، آیت ۱۸۳)، ترجمہ '' اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ اور پرہیز گاری پیدا ہو''۔اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ روزہ ہمارے اندر تقویٰ اور پرہیز گاری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی فرمایا گیا 'لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن 'یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔اس ماہ مبارک کی ایک اور اہمیت اور فضیلت 'لیلتہ القدر' ہے۔ اس ماہ کا آخری عشرہ اور اس عشرے کی طاق راتیں یعنی اکیس21,23.25,27,29 ہیں۔ لیلتہ القدر اکثر و بیشتر انہی طاق راتوں میں ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان طاق راتوں میں زیادہ عبادت کا اہتمام کیا کرتے، مجاہدہ کرتے اور مشقت کیا کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے، فرمایا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں'۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث جسے معارف الحدیث میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے بتایئے کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ کون سی رات شب قدر ہے تو میں اس

رات اللہ سے کیا عرض کروں اور کیا دعا مانگوں؟ آپ ﷺ نے عرض کیا 'اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ' تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ" ۔ترجمہ "اے میرے رب! تو بہت معاف کرنے والا اور بڑا ہی کرم فرما ہے اور معاف کر دینا تجھے پسند ہے۔ پس تو میری خطائیں معاف فرمادے"۔ لفظ ' رمضان' کے معنی گناہوں ، خطاؤں، کوتاہیوں ،خامیوں ، بے احتیاطی اور انسانی غفلت کو جلادینے کے بھی ہیں۔

ارکانِ اسلام میں روزہ کوایک اہم رکن کی حیثیت حاصل ہے۔اس کے فرض کرنے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ نے تقویٰ، پرہیز گاری، ضبط نفس ، صبر و برداشت قرار دیا ہے۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کو برائیوں، غلط کاموں، شیطانی خواہشات سے دور رکھتی ہے اور انسان کو نیک عمل کرنے کی جانب مائل کرتی ہے۔ روزہ ہمارے اندر ضبطِ نفس پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یعنی اس مبارک ماہ کے بنیادی فلسفے پر عمل پیرا ہونے کے باعث یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق مکمل اخلاقی و روحانی پابندیوں پر عمل کرنے سے روزہ ہمارے اندر موجود منفی خواہشات اور منفی جذبات کو قابوں میں رکھنے کی استطاعت پیدا کرتا ہے۔ انسان کی خودی جو اس پر غالب رہتی ہے وہ شیطان اور شیطانی عمل سے اپنے آپ کو بچانے اور محفوظ رکھنے کی طاقت اپنے اندر پیدا کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں روزے کو صبر" قرار دیا ہے۔"

روزہ انسان میں صبر، برداشت، ثابت قدمی، اور استقلال پیدا کرتا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں"۔
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ شعبان کی آخری تاریخ میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے جو بہت بڑا مہینہ ہے، بہت مبارک ہے، اس مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالٰی نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ تعالٰی کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا، اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے زرق میں اضافہ کیا جاتا ہے جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو اللہ کی رضا اور ثواب)

حاصل کرنے کے لیے) افطار کرایا تو یہ عمل اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسّی پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلادے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے۔ (اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) جو آدمی اس مہینہ میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف و کمی کردے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا، اور اسے دوزخ سے رہائی اور (آزادی دے گا"۔ (شعب الایمان للبیہقی، معارف الحدیث

رمضاب المبارک کے روزے جو کہ فرض عبادت ہیں کے عناصر یا مقاصد میں جو چیزیں

بطورِ خاص شامل ہیں ان میں ُغذا یا کم کھانا، آرام یا کم سونا، کم بولنا، جائز اورحلال خواہشات پر پابندی اور قدغن کو بھی برداشت کرنا شامل ہیں۔ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق کم کھانے سے انسان صحت مند رہتا ہے، بیماریاں کم سے کم اُسے گھیرتی ہیں اور یہ بھی کہ کم کھانے سے بھوک کا احساس رہتا ہے جس سے دوسروں کی بھوک کا خیال رہتا ہے اور انسان غریبوں اور بھوکوں کی دادرسی کی جانب مائل ہوتا ہے، کم خوراکی انسان کی عمر میں اضافے کا بھی باعث ہوتی ہے جب کہ بسیار خوری انسان کی شدید دشمن تصور کی جاتی ہے۔طب یونانی کے ماہرین پیٹ کی خرابیوں کو تمام امراض کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔روزہ رکھ لینے کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ روزہ رکھا اور جیسے تیسے وقت پورا بھی کر لیا، افطار کے وقت دن بھر کی کسر نکالتے ہوئے ڈٹ کر کھایا،اِسی طرح سحری میں اس قدر کھایا کہ اللہ کی پناہ، کھانے میں بھی اعتدال قائم رکھنے کو کہا گیا ہے۔روزہ صبر و برداشت کا نام ہے۔ بات بات پر خفا ہونا، غصہ میں رہنا، لڑائی جھگڑا کرتے رہنا، گھر میں ہیں تو بیوی اور بچوں پر غضب ڈایا جارہا ہے، آفس یا باہر ہیں تو باہر والوں سے غصے کے عالم میں رہنے سے روزے کا مقصد جاتا رہتا ہے۔ روزے میں کم سونا اور عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور اس ماہ میں فرض کا ثواب دگنااور نفلی اور سنت کی ادائیگی کا ثوات ستر گناہ کردیا جاتا ہے، جو لوگ روزہ تو رکھ لیتے ہیں لیکن دن بھر سو کر گزار دیتے ہیں جوں ہی افطار کا وقت قریب آیا جلدی جلدی اٹھے اور شروع ہوگئے کھانے پینے۔ ایسے

روزے اللہ کے دربار میں قبول ہی نہیں ہوں گے۔ کم بولنا، روزہ کی حالت میں فضول، بیہودہ گفتگو اور زیادہ بولنے سے ثواب جاتا رہتا ہے، چاہیے کہ ہم روزہ رکھیں اس دوران کم سے کم بولیں ، فضول گفتگو سے پرہیز کریں، غیبت اور دروغ گوئی نہ کریں، مبالغہ آمیزی اور کذب سے دور رہیں۔ ہمیں چاہیے کہ رمضام المبارک کی فیوض و برکات کو ہرگز ہرگز اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں، نہیں معلوم ہمیں آئندہ زندگی میں یہ سعادت نصیب ہو گئی بھی یا نہیں۔

....دل 25 کا خود 66 کے۔ جانشین یا کچھ اور

میاں صاحب بائی پاس آپریشن الحمد اللہ کامیاب رہا، پاکستانی قوم کی دعائیں ان کے ساتھ تھیں۔ چھوٹے میاں صاحب خیریت دریافت کرنے اور کامیاب آپریشن کی مبارک باد دینے لندن پہنچ گئے اور کہا کہ بھائی صاحب مبارک ہو آپ کا دل اب 25 کا ہوگیا ہے اس پر بڑے میاں صاحب نے کثر افسردگی میں جواب دیا کہ دل تو 25 کا ہوگیا پر میں تو 66 کا ہوں۔ میاں صاحب دل کو تو جوان کیا جاسکتا ہے لیکن آپ کی عمر کو کم دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ آپ کی عمر کا گراف تو اب اوپر کی جانب ہی رواں دواں رہے گا۔ یہ باتیں تو اپنی جگہ ازراہ مزاق کی ہیں لیکن میاں صاحب اب وہ والے میاں صاحب نہیں رہیں گے۔ عوامی جلسوں میں اچھل کود اب مشکل ہوجائے گی لیکن یہ سیاست کا بھوت انسان کو اتنی آسانی سے جانے والا نہیں پھر اقتدار کا نشہ کب جانے والا ہے۔

وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کی اوپن ہارٹ سرجری ہونے کے بعد قیاس آرائیاں شروع ہو چکی ہیں کہ میاں صاحب کو مکمل صحت مند ہونے میں تین سے چار ماہ لگ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ان ہاوس تبدیلی کے آ سکتی ہے؟ چھوٹے میاں صاحب آپریشن کے بعد دوبارہ وزیر اعظم کی مزاج پرسی کرنے چلے گئے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد مسعود نے کی اطلاع کے مطابق چھوٹے میاں صاحب یہ کہہ کر گئے ہیں کہ وہ بڑے میاں صاحب کو اس بات پر راضی کرکے ہی واپس لوٹیں گے کہ انہیں وقتی طور پر ہی سہی اپنا کوئی جانشین مقرر کردینا چاہیے۔ چھوٹے میاں صاحب اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مسلم لیگ نون کے ذمہ داران اس بات کی سختی سے تردید کرتے دکھائی دے رہے ہیں کہ اس قسم کی کوئی تجویز زیر غور نہیں۔ دوسری جانب چھوٹے میاں صاحب کے بیرون ملک روانہ ہوتے ہی پاکستان پیپلز پارٹی کے جوشیلے اور جوان چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے یہ بیان داغا کہ چودھری نثار کسی صورت میاں نوز شریف کے جانشین کے طور پر قبول نہیں' ۔ گویا'' چودھری نثار بھی ایک امیدوار ہیں میاں صاحب کے جانشین ہونے کے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ چودھری نثار کی پارٹی میں بڑی تعداد کی سپورٹ حاصل ہے۔ متعدد وزراء اس معاملے پر خاموش تماشائی نظر آرہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نون لیگ کا فارورڈ بلاک بن چکا ہے جسے چودھری نثار کی آشیرباد حاصل ہے۔ کچھ بھی ہو چودھری نثار نون لیگ میں مضبوط حیثیت کے مالک ہیں، اسٹیبلشمنٹ میں بھی ان کا اچھا اثر رسوخ ہے۔ موجودہ حکومت کی تشکیل کے وقت چودھری نثار پنجاب کی تخت نشینی کی خواہش رکھتے تھے لیکن چھوٹے میاں صاحب نے تخت لاہور سے دستبردار ہونے سے صاف انکار کردیا۔ مجبوراً چودھری نثار کو وزارت داخلہ کا قلم دان سونپا گیا۔ موجودہ حکومت کے تین سالہ دور میں چودھری صاحب کی دیگر اہم وزیروں سے ناراضگی، حتیٰ کہ

وزیر اعظم نواز شریف سے کئی کئی ماہ ملاقات نہ کرنا جیسے واقعات ان کی جانب سے طاقت اور اہمیت کا کھلا اظہار رہا ہے۔

جانشینی کے حوالے سے چھوٹے میاں صاحب خود بھی تو بھاری بھر کم امیدوار ہیں۔ وہ تخت لاہور میں اپنی کامیابی کی بنیاد پر تخت اسلام آباد پر متمکن ہونے کا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیں گے۔ اس کے لیے انہیں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنا ہوگا اس کے بغیر وہ اس منصب کے اہل نہیں۔ ایسا کرنے میں وقت بھی لگے گا اور اس دوران ان کی اپنی پارٹی میں پھوٹ پڑ سکتی ہے، اپوزیشن تو پہلے ہی پاناما لیکس پر حکومت کو چت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جانشینی کے حوالے سے اور بھی امیدوار میدان میں ہیں ۔ سمدھی جی بڑے میاں صاحب کے بہت بہ اعتماد وزیر ہیں۔ جب بھی کوئی آڑا وقت آیا اسحاق ڈار صاحب ہی حکومت کی جانب سے پیش پیش رہے ہیں اور اب بھی وہی پیش پیش ہیں۔ وزیر اعظم جاتے جاتے انتظامی اختیارات انہیں ہی دے گئے ہیں۔ ویسے بھی ان کے پاس اہم وزارت ہے۔ کوئی اور وزیر میاں نواز شریف کے اس قدر قریب اور بہ اعتماد اور بہ صلاحیت نہیں۔ بیگم کلثوم نواز شریف صاحبہ کا نام بھی لیا جارہا ہے لیکن شاید وہ اس اہم ذمہ داری کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کر پائیں۔ ویسے وہ آڑے وقت میں سیاست نشیب و فراز سے گزر چکی ہیں۔ اگر وہ کسی مصلحت کے تحت تیار ہو بھی جاتی ہیں تو انہیں قومی اسمبلی کی مخصوص نشست پر الیکشن لڑنا ہوگا، قانونی پہلو بھی آڑے آئیں گے ۔

ان تمام تر آپشن کے علاوہ ایک سب سے مضبوط ، بھاری بھر کم جانشین خود میاں نواز شریف کی صاحبزادی مریم نواز ہو سکتی ہیں۔ نواز شریف اور مسلم لیگ نون کی جانب سے جس انداز سے مریم نواز کو سیاست کے میدان میں متعارف کرایا جارہا ہیں، سیاسی معاملات میں مریم نواز کو موقع دیا جارہا ہے ، اس کی گرومنگ کی جارہی ہے اس سے اندازہ یہ ہورہا ہے کہ میاں صاحب کو اپنے جانشین کے طور پر اپنی بیٹی مریم نواز میں وہ تمام تر خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں ، بہ وجود اس کے کہ شریف خاندان کے کئی لوگ سیاست میں ہیں، شہباز شریف کا بیٹا حمزہ شہباز عملی سیاست میں اپوزیشن کو رکھ رکھ کر سنا رہا ہے۔ لیکن معاملہ جانشین کا آیا تو بڑوں بڑوں نے اپنا جانشین اپنے ہی اولاد کو بنا یا۔ کسی نے درست کہا کہ سیاست بے رحم ہوتی ہے۔ میں نے بہت عرصہ قبل اپنے کالم میں نون لیگ کی جانب سے مریم نواز کے وزیر اعظم ہونے کا اشارہ کیا تھا کہ میاں صاحب اپنی بیٹی مریم کو خاندان کے تمام لوگوں پر فوقیت دیتے ہوئے پاکستان کے آئندہ کی وزیر اعظم کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنا کوئی جانشین بنایا تو وہ صرف ان کی اپنی بیٹی مریم نواز ہی ہوگی۔

بھٹو خاندان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو کو جانشین بنا دیا گیا اس وقت بھٹو کے دونوں بیٹے حیات تھے۔ بے نظیر بھٹو جب تک اقتدار میں رہیں بھٹو کے اصل جانشین بھٹو جونیئر کو

سین سے آوٹ ہی رکھا اور وہ اب تک عملی سیاست میں نہیں۔ بے نظیر کی شہادت کے بعد آصف علی زرداری کا پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کر لینا، بلاول بھٹو کی کم عمری میں ہی جانشین بنا کر علمی سیاست میں اتار دینا، اقتدار، طاقت اور قوت کو اپنے ہاتھ سے باہر نہ جانے دینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ سیاست کو بے رحم اسی لیے کہا گیا کہ سیاست میں اپنا اور اپنے قریب ترین کا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں میں ون مین شو ہے۔ جس نے سیاسی جماعت بنائی اس نے کبھی اپنا جانشین کسی دوسرے کو نہیں بنایا اول تو یہ نوبت ہی نہیں آئی، اگر نوبت آئی بھی تو باپ نے بیٹے یا بیٹی کو، بھائی نے بھائی یا بہن کو، ہمارے سیاسی رہنماؤں کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی۔ مسلم لیگ شخصیات میں تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی موجودہ مسلم لیگ (ن)، مسلم لیگ (ضیاء)، آل پاکستان مسلم لیگ، مسلم لیگ (ق)، پاکستان مسلم لیگ (ف) ، عوامی مسلم لیگ میں تقسیم ہو چکی ہے، جمیعت علماء اسلام (ف) اور جمیعت علماء اسلا (س)، جمیعت علمائے پاکستان بھی تقسیم ہو چکی ہے، یہی صورت حال پاکستان پیپلز پارٹی کی بھی ہے ،پاکستان پیپلز پارٹی (شہید بھٹو)، پاکستان پیپلز پارٹی (شیر پاؤ)، اے این پی دو حصوں میں منقسم ہے الغرض ہماری سیاسی جماعتیں شخصیات کے گرد گھومتی نظر آرہی ہیں، شخصیت فعال تو پارٹی سرگرم ، شخصیت غیر فعال تو مائنس ون فارمولا گردش کرنے لگتا ہے۔ الطاف حسین غیر فعال ہوئے ، وجہ صحت یا کچھ بھی ہو ، مائنس ون کی باتیں شروع، زرداری ملک سے باہر گئے ، محسوس

ہوا کہ ان کا واپس آنا مشکل ہوگیا تو مائینس ون کی باتیں اور اب میاں صاحب دل عارضے میں مبتلا ہوئے ۔ پاناما لیکس اسکینڈل آیا تو مائینس ون کی باتیں شروع ہو جاتی ہے۔

ہاں تو میں بات میاں نواز شریف کے جانشین کی کر رہا تھا۔ آپریشن سے قبل میاں صاحب نے جس کانفیڈینس ، بہادری، جواں مردی کا مظاہرہ دکھایا، بائی پاس کے مریض کو آپریشن سے چوبیس گھنٹے قبل اسپتال میں داخل کر لیا جاتا ہے، اسے اسٹریس نہ لینے، آرام کرنے، بی پی ، شوگر کو کنٹرول کرنے کے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ میاں صاحب کی بہادری اور ان کے ڈاکٹروں کی میاں صاحب کے لیے دریا دلی دیکھیں کہ میاں صاحب نے دو عدد اہم اجلاسوں کی ویڈیو لنک پر صدارت کی اور خوب خوب گفتگو کی۔ لوگ حیران و پریشان تھے کہ یہ کس قسم کا بائی پاس ہے کہ مریض بے خوف وخطر، ڈاکٹر مریض کی تمام تر سرگرمیوں سے بے پرواہ ایسا بائی پاس تو پہلے کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ ایک ہفتہ قبل جب وہ واپس پاکستان تشریف لائے ، اسمبلی سے خطاب کیا، اس میں ان کو جو کامرانی نصیب ہوئی، اس نے گویا میاں صاحب کے اندر ایسا جوش اور ولولہ پیدا کردیا تھا کہ انہوں نے خیبر پختونخواہ کے دور دراز شہروں میں بڑے۔بڑے جلسوں میں تقریریں ہی نہیں کیں بلکہ ان جلسوں میں گویا میاں صاحب نے سرکش کے جوہر دیکھائے۔ ان کا چلانا، عمران خان کو خاص طور پر للکارنا، کوئی کہہ سکتا تھا کہ اس شخص کا

چند دن بعد بائی پاس ہوگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر سوشل میڈیا پر یہ تک کہہ دیا گیا کہ یہ سب ٹوپی ڈرامہ ہے، بائی پاس گویا مک مکا ہے، میچ فکس ہے، سارا کچھ پاناما لیکس سے توجہ ہٹانے اور مظلوم بن کر بچ نکلنے کی باتیں ہیں۔

بے شمار لوگوں کے بائی پاس ہو چکے ہیں، میں بھی اس مرحلے سے گزر چکا ہوں بائی پاس کی نوبت تو نہیں آئی البتہ انجو گرافی اور پھر انجو پلاسٹی ضرور ہوئی۔ اس کیفیت کو مجھ جیسے دل کے مریض بخوبی آپریشن سے پہلے کی صورت حال کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ میاں صاحب کا کیس غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ وہ بہت زیادہ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں، اگر واقعی ایسا ہے تو پھر انہیں اپنے جانشین کے انتخاب کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، وہ بہت جلد ویڈیو لنک پر قوم سے مخاطب ہوں گے اور اپنی خیریت سے قوم کو مطلع فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (1915-2015)

نوٹ : مضمون طویل ہونے کے باعث قسط وار پیش کیا جائے گا۔

قسط: 1

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے (فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔ (مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

لائبریری سائنس کی تعلیم ،تربیت اور تحقیق کو کتب خانوں اور لائبریری تحریک کے فروغ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور تربیت یافتہ افرادی قوت اپنے پیشے کی ترقی اور فروغ میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ تحقیق اس شعبے کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے اور نئی راہ دکھاتی ہے۔ یہ باب پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم ،تربیت اور اس شعبہ میں ہونے والی تحقیق کا احاطہ کرتا ہے۔کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم کا آغاز کب ، کہاں اور کیسے ہوا ، دنیا کے مختلف ممالک میں لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت

کے اداروں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کی ابتداکیسے ہوئی کن اداروں اور شخصیات نے اس پیشہ کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت جن سطحوں پر دی جارہی ہے یعنی سرٹیفیکیٹ ، پوسٹ گریجویٹ ، ماسٹر ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ انٹر اور بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون اور فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا تفصیلی جائزہ بھی اس باب کا حصہ ہے لائبریری سائنس کی تعلیم کے فروغ میں انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات (Society for the Promotion and Improvement of Libraries) کے کردار کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ انجمن کے صدر شہید حکیم محمد سعید نے پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کی ترقی میں جو کردار ادا کیا شواہد کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لائبریرین شپ کا آغاز

انسان میں جب اپنے خیالات و افکار کو قلم بند کرنے کا شعور پیدا ہوا اور اس نے اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کو اپنی آنے والی نسلوں کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تو کتاب معرض وجود میں آئی۔ اپنی اس تحریر کو جو مٹی کی تختیوں، دھاتوں، درختوں کی چھالوں، جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر تھی جس مقام

پر محفوظ کیا وہ جگہ کتب خانہ کہلائی۔ انسان کا یہ عمل دراصل اپنے دور کی تاریخ کو محفوظ کرنا تھا۔ ڈاکٹر انیس خورشید تاریخ نویسی کو کتب خانوں کے قیام کا باعث قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'تاریخ اور کتب خانے دونوں ایک انمٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، تاریخ جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں سے کتب خانے موجود ملتے ہیں' (۱) ۔ کتب خانوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم کے لائبریرین کا بنیادی فریضہ ریکارڈ کو جمع و محفوظ کرنا تھا، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابتدا میں لائبریرین اپنے دور کا عالم و فاضل اور دانشور ہوا کرتا تھا۔ قدیم بابل، مصر، ہندوستان، چین، یونان اور روم میں لائبریرین ایک مذہبی پیشوا (پادری) ، عالم یا استاد ہوا کرتا تھا، اس کی کئی ذمہ داریاں تھیں لیکن ریکارڈ کو محفوظ رکھنا بنیادی ذمہ داری تھی (۲)۔

عہد قدیم کا آغاز تاریخ کو محفوظ کرنے سے شروع ہوتا ہے اس دور میں پہلا لائبریرین سلطنت میں شاہی Chou تھا اسے ۵۵۴ ق۔م میں Laotse ایک چینی تھا جس کا نام دستاویزات (آرکائیوز) کی ترتیب و تنظیم پر معمور کیا گیا تھا مشرق وسطی میں بابلی سمیری اور کلدانی اقوام کے کتب خانے، (Assyrians آشوری، (Babylonians) پائے جاتے ہیں۔ ان اقوام نے میسوپوٹیمیائی تہذیب کو جنم دیا جو سرزمین عراق کی تہذیب کہلاتی ہے۔ عراق کا پرانا نام کلدہ تھا، کلدانی وادی دجلہ وفرات کی قدیم ترین اقوام میں سے ہیں، سارگن کلدہ کا

مشہور بادشاہ تھا جو ۳۸۰۰ ق۔م۔ عکاد کے مقام پر تخت نشیں ہوا، سارگن اول کے کتب خانے کو دنیا کے قدیم ترین کتب خانوں میں سے ایک کتب خانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتب خانے کا لائبریرین ابن سارو (Ibn Saru) تھا، جو فن کیٹلاگ سازی کا ماہر تھا(۳)۔ آشوری (Assyrians) جو سامی النسل تھے نے بابلیوں (Babylonians) کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی، انہوں نے ۲۰۰۰ ق م سے ۵۰۰ ق م تک شاندار کتب خانے قائم کیے۔ کتب خانہ آشور بنی پال ایک شاہی اور اس دور کا سب سے اہم اور معروف کتب خانہ تھا جسے سارگن دوم نے ۷۰۵ ق۔م۔ میں کھوروسا آباد (Khorosabad) کے مقام پر قائم کیا، کتب خانے کی کتابیں مٹیکی تختیوں (Clay Tablets) پر تھیں، مضامین کے اعتبار سے مرتب کی گئی تھیں اور الواح کے مندرجات کو حروف سے واضح کیا گیا تھا(۴)۔ مٹی کی یہ الواح (کتابیں) چھ مضامین، مذہبی عقائد (Dogma)، تاریخ، قانون، سائنس، طلسمی یا ساحرانہ ادب (Magic)، سوانح اور داستانوی ادب (Legends) کے تحت ترتیب وار رکھی تھیں (۵)۔ اُر کے مقام سے ملنے والی مٹی کی تختی سے ایک لائبریرین اِمٹ اینو (Amitanu) کا نام ملا ہے، اسی طرح آشور بنی پال کے کتب خانے کا ایک لائبریرین نابیو ذوقب گگ (Nabu-Zuqubgig) تھا(٦)۔ اس دور میں کتب خانوں کے انتظام اور کتابوں کو کسی خاص ترتیب سے رکھنے کے آثار نمایاں طور پر ملے ہیں، ساتھ ساتھ لائبریرین کے ناموں کا بھی ذکر پایا جاتا ہے جو عام طور پر پادری (Priest) یا مذہبی رہنما اور اپنے وقت کا عالم فاضل شخص ہوا

کرتا تھا بعد ازاں یہ ذمہ داری استاد کو منتقل ہوئی۔اس دور میں لائبریرین کی دو اہم ذمہ داریاں شروع ہوئیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پیشہ ورانہ تعلیم کی ابتدا تھی، پہلی ذمہ داری کتابیات و کیٹلاگ مرتب کرنا تھا جس کا آغاز اسکندریہ لائبریری سے ہوا، دوسری ذمہ داری محققین کو لائبریری کے استعمال کی ترغیب دینا کہ وہ کتب خانے کی کتابوں سے استفادہ کر سکیں (۷)۔ مصر دریائے نیل کی زرخیز وادی ہی کا نام ہے جہاں سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا اور انسان نے پتھروں اور ریگستانوں کے بجاے دریاؤں کے کنارے رہنا شروع کیا، اس دور میں کتابوں نے ایک نئی صورت اختیار کی، پریونان کی اسکندریہ لائبریری میں ملتی Papyrus) یہ کتابیں بردی کاغذ)پپائرس ہیں۔علوم کی درجہ بندی کا باوا آدم افلاطون (۴۲۸۔۳۴۷ ق م) کو تصور کیا جاتا ہے اس نے علوم کو تین درجوں یعنی طبعیات، اخلاقیات اور منطق میں تقسیم کیا۔افلاطون کے بعد ارسطو(۳۸۴ ق م) نے بھی علوم کی تقسیم پیش کی۔لائبریری میں کتابوں کی درجہ بندی اسکندریہ لائبریری سے شروع ہوتی ہے۔ کیلی ماکوس یا (Callimachus ۲۶۰۔۲۴۰ ق م) اپنے زمانے کا ایک معروف شاعر اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ) اسکندریہ لائبریری سے بھی وابستہ تھا بعض مورخین نے اسے اسکندریہ لائبریری کا لائبریرین بھی لکھا ہے، یہ فن کیٹلاگ سازی اور درجہ بندی کا ماہر استاد تھا،اس نے کے نام سے مر (Pinakes)'اسکندریہ لائبریری کی کتابوں کا ایک کیٹلاگ پینکس کے (Paypyrus) تب کیا جو بردی کاغذ

۲۰اوراق پر مشتمل تھا۔برردی کاغذ پر کتابوں کی یہ فہرست صرف کیٹلاگ ہی نہ تھا بلکہ قدیم دنیا کی معلوم کتابوں کی کتابیات تھی۔ کیلی ماکوس کو درجہ بندی، کیٹلاگ سازی اور کتابیات کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے(۸)۔دوسرے معنوں میں کیلی ماکوس کو فن کتاب داری یا لائبریری سائنس کا بانی کہا جا سکتا ہے۔یونان کے بعد روم کتب خانوں کا مرکز بن گیا، کتب خانوں کے قیام کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کی تنظیم پر بھی خاص توجہ کی گئی۔ ابتدا میں یہ کام یونانی جنگی قیدیوں سے لیا گیا ان میں لائبریرین ٹیرنین (Tyrannion) ، سی جے ہائی جینس (C.J.Hyginus)، کائیوس مولیئس (Caius Molissus)، ایمو ئیس میکر (Eomieus Mackeer)۔(۹) کے نام قابل ذکر ہیں

حواشی وحوالہ جات

۱۔انیس خورشید" پیش لفظ" ۔ در، محمد فاضل خان۔ کتب خانوں کی تاریخ: عہد قدیم سے عہد مغلیہ تک (ملتان: بیکن بکس،۱۹۸۸ء) ص ص۔ج۔ہ

2. Encyclopedia of Library and Information Science/ed. by Allen Kent and Harold Lancour.- (New York: Marcel Dekker, 1977) , Vol. 7, p. 414.

۳۔ خان، محمد فاضل ، کتب خانوں کی تاریخ: عہد قدیم سے عہد مغلیہ تک (ملتان: بیکن بکس،۱۹۸۸ء) ، ص۔۴

۴۔ ایضاً۔ ص ص۔ ۱۱۔۱۴

5. Encyclopedia of Library and Information Science. ref. 2, p.414

۶۔ خان، محمد فاضل ، کتب خانوں کی تاریخ۔ حوالہ ۳، ص۔ ۱۳

7. Encyclopedia of Library and Information Science. ref.2, p. 2

۸۔ خان، محمد فاضل۔، کتب خانوں کی تاریخ۔ حوالہ ۳، ص۔ ۴۱

۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۴

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 2

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال

(1915-2015)

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ’’پاکستان میں لائبریری تحریک کے)

فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار‘‘ سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔

(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

گزشتہ سے پیوستہ

عہد قدیم میں کتب خانوں کی تباہی علمی دنیا کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے جس کے

ساتھ ہی رومن سلطنت اختتام پذیر ہوئی اور قرون وسطی اور جدید دور کا آغاز ہواجو

اٹھارویں صدی تک رہا۔اس دور میں کتب خانوں نے ترقی کی اور ان میں باقاعدہ

کے مطابق بیسویں صدی (Williamson's) تنظیمی امور انجام پانے لگے۔ ولیم سنز

کے ابتدائی دور کے لائبریرین کی ذمہ داری ماضی کے ورثے کی حفاظت کرنا ہی تھی (

۔کاغذ اور چھاپے خانہ کی ایجاد نے کتابوں کو ایک (۱۰

نیا روپ دیا اور کتب خانوں کی دنیا میں انقلاب بر پا ہو گیا۔ کاغذ اہل چین کی ایجاد ہے
نامی ایک چینی نے ایجاد کیا۔ ڈاکٹر (Tsai Lun) تقریباً ۱۰۵ عیسوی میں سائی لون
عبدالحلیم چشتی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا ہے کہ 'عصر حاضر کے نامور محقق
عبدالحیٔ الکتانی نے مرجاتی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ۸۸ھ میں یوسف ابن عمرو
نے مکہ معظّمہ میں سب سے پہلے کاغذ بنانے کا کارخانہ قائم کیا، غالباً اسی کاغذ کو ابن ندیم
نے ''ورق تھامی'' کے لفظ سے کتاب ''الفہرست''میں ذکر کیا ہے (۱۱)۔ دنیاے اسلام
میں الفہرست کا مولف ابن ندیم کتابیات سازی کا ماہر تصور کیا جاتا ہے (۱۲)۔

کاغذ اور چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد کتابیں تیزی کے ساتھ چھپنے لگیں جن کے باعث
کتب خانوں میں نئے تنظیمی مسائل پیدا ہوئے کتابیں بہت زیادہ تعداد میں منظر عام پر
آنے لگیں ساتھ ہی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ اس صورت حال میں کتب خانو
ں میں کام کرنے والوں کے فرائض میں تبدیلی آئی اور انہیں زیادہ توجہ کتب خانوں کی
تنظیم پر دینا پڑی۔ مختلف النوع مسائل اور معاملات کے باعث کتب خانوں کا نظام روایتی
لائبریریز کے بجاے کلیسا کے عہدیداروں اور مذہبی دانشوروں کو منتقل ہو گیا، انہوں
نے کتب خانوں کو جدید خطوط پر آراستہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں میں
(David اور ڈیوڈ ھیوم (Gabriel Naude) (گیبریل ناڈ (۱۶۰۰ء۔۱۶۵۳ء
Hume) شامل

ہیں۔گیبریل ناڈاُس دور کا ایک ایسا لائبریرین تھا جس نے لائبریرین شپ میں انتھک محنت سے نام کمایا(۱۳)۔گیبریل ناڈ نے جو ایک معتبر محقق' مصنف اور لائبریرین تھا لائبریریز کی رہنمائی اور لائبریری کے تنظیمی امور سے متعلق رہنما اصول مرتب کئے، ماہرین گیبریل ناڈ کی ان کوششوں کو لائبریری سائنس کا نقطہ آغاز بھی کہتے ہیں۔اس کی کتاب Advis Pour Dresser Une Bibliotheque تھی جس میں انتخاب کتب کے رہنما اصول، ترتیب اور مواد کے استعمال اور اضافے کے لئے تجاویز شامل تھیں۔ عوامی اور سرکاری کتب خانوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں میں بھی کتب خانو ں کی ضرورت کو محسوس کیاجانے لگا اور لوگ حکومت وقت سے اچھے کتب خانوں کے قیام کا مطالبہ کرنے لگے۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں کتب خانے قائم ہوئے۔
اس صورت حال میں روایتی لائبریرین کے برعکس ایسے لائبریرین کی ضرورت محسوس ہوئی جو دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کا بھی ماہر ہو۔ سر این تھونی پنیزی (Sir Anthony Panizzi) (۱۷۹۷ء ۔ ۱۸۷۹ء) چارلس ایمی کٹر (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۳ء) (Charles Ammi Cutter) اور چارلس جیوٹ (Charles Jewett) اس دور کے ماہر لائبریریز میں سے تھے (۱۴)۔
فرانس کو کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے ۔کتابوں کی تیزی سے طباعت کے باعث کتب خانوں میں علمی مواد وافر

مقدار میں آنے لگا جس نے کتب خانوں میں کام کرنے والوں کو روایتی تعلیم و تربیت سے ہٹ کر باقاعدہ ٹریننگ اور فنی تربیت حاصل کرنے پر مجبور کردیا۔ فرانس میں قائم قائم شدہ (the Ecole des Chartes) ہونے والے ادارے ایکول ڈیلس چارٹس ۱۸۱۰ء نے ۱۸۴۷ء میں کتابیات سازی کے ساتھ ساتھ آرکائیوز کی تربیت کا اہتمام کیا کتابیات کی تدوین تو بہت پہلے ہی ہو چکی تھی، فرانس میں اس فن کو پزیرائی حاصل ہوئی اور اس فن نے ایک پیشہ ورانہ مہارت کی شکل اختیار کر لی۔ انیسویں صدی کی آخری دھائی میں ماہرین کتب خانہ نے اپنی تحریروں میں کتب خانوں میں خدمات انجام دینے والے عملے کی باقاعدہ تربیت کی ضرورت واہمیت پر زور دیا۔ کتب خانوں میں کام کرنے والے لوگوں نے اپنی انجمنیں بھی بنانی شروع کر دیں۔ ۱۸۲۹ء میں مارٹن شیر ٹیننگر (Martin Scherttinger) نے لائبریری تعلیم و تربیت کے لئے خصوصی لائبریری اسکول کی ضرورت پر زور دیا۔ جرمنی میں ایک یونیورسٹی پروفیسر اینٹون کلیٹ (Anton Klette) نئے پیشہ سے اسقدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ۱۸۷۱ء میں لائبریرینز کی تربیت پر سخت موقف اختیار کیا۔ ۱۸۷۴ء میں فریبرگ (Freiberg) یونیورسٹی کے لائبریرین رُلمین (Rullman) نے لائبریری سائنس کا تین سال کا یونیورسٹی کورس تیار کیا، اس نے جرمن لائبریری ایسوسی ایشن کے قیام اور لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا منصوبہ بنانے کی غرض سے لائبریرینز کی ایک میٹنگ بلانے کی تجویز بھی دی تھی لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

جرمنی میں ڑلیمن کی تجویز ۱۸۸۶ء میں کامیاب ہوئی اور کارل ڈیٹزاکاٹکو (Karl Dziatzko) نے پہلا لائبریری سائنس کورس گوٹنجن یونیورسٹی (Gottingen University of) میں شروع ہوا۔ یہ کورس لائبریری سائنس کے ایک استاد اور یونیورسٹی کے ڈائریکٹر کارل فرنزاس ٹوڈی سنکو (Darl Franzotto Diziatko) نے تیار کیا تھا۔ ۱۹۰۰ء میں جرمن لائبریری ایسوسی ایشن ڈریسڈین (Dresden) کے مقام پر قائم ہوئی، اٹلی اور سویڈن نے بھی گوٹنجن یونیورسٹی کی طرز پر لائبریری اسکول قائم کیے یہ وہ وقت تھا جب میلول ڈیوی کولمبیا میں لائبریری اسکول کے قیام کی منصوبہ بندی کررہا تھا (۱۵)۔ انٹرنیٹ پر دستیاب
معلومات کے مطابق جرمنی میں تقریباً ۷ ادارے لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم فراہم کررہے ہیں (۱۶)۔
امریکہ میں کتب خانوں کی تاریخ امریکہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ نظر آتی ہے خاص طور پر ۱۸۷۶ء کے بعد لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم کے آغاز سے قبل ۱۱۴ کتوبر ۱۸۷۶ء میں امریکہ،،برطانیہ اور کنیڈا کے لائبریریز (Librarians) کا ایک اجتماع امریکہ کے شہر فلاڈیلفیا کے مقام پر منعقد ہوا جس میں 'امریکن لائبریری ایسوسی ایشن (American Library Associations) کا قیام عمل میں '

ایسو سی ایشن کے (Justin Winsor) آیا، بوسٹن پبلک لائبریری کے جسٹن ونسر
(Ainsworth R. صدر، لائبریری آف کانگریس کے آنسورتھ اسپاٹ فورڈ
Spotford) شکاگو پبلک لائبریری کے ولیم ایف پول،
(Henry)اور نیوآرک اسٹیٹ لائبریری کے ہنری ہومس (William F. Poole)
A. Homes) (Melvil Dewey) نائب صدور اور میلول ڈیوی اے ایل اے
(ALA) کا سیکریٹری مقرر ہوا (۱۷)۔ امریکن لائبریری ایسو سی ایشن جرنل
کا پہلا شمارہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۷۶ء کو شائع ہوا میلو(American Library Journarl)
اور ۲۱ صف اول کے لا (Managing Editor) ل ڈیوی اس جرنل کا مدیر منتظم
ئبریریز ایسو سی ایٹ ایڈیٹر تھے (۱۸)۔ اس شمارے میں دیگر تحریروں کے علاوہ میلول
بھی شامل تھی (۱۹)۔(The Profession) ڈیوی کی معرکتہ الآرا تحریر
امریکہ میں لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم وتربیت شروع کرنے کے لئے اس وقت
ولیم فیڈرک پول،(Justin Winsor) کے صف اول کے لائبریریز جسٹن ونسر
نے (Melvil Dewey) اور میلول ڈیوی(William Frederick Poole)
سات نکاتی پروگرام پیش کیا۔ اس منصوبے کا اصل خالق میلول ڈیوی تھا۔ طویل جدوجہد
کے بعد ڈیوی ۱۸۸۷ میں کولمبیا یونیورسٹی میں ''اسکول آف لائبریری اکانومی
شروع کرنے میں کامیاب ہوا۔ پہلی کلاس(School of Library Economy)''
جو ۵ جنوری ۱۸۸۷ء کو شروع ہوئی جو ۲۰ طلبہ پر مشتمل تھی (۲۰)۔ ۱۸۸۹ء میں

ڈیوی کا یہ اسکول البانی کے مقام پر نیو یارک اسٹیٹ لائبریری میں منتقل ہوا اور (New York State Library School) کہلایا، ڈیوی بدستور اس کا سربراہ رہا(۲۱)۔لائبریری سائنس کی باقاعدہ تعلیم وتربیت شروع ہونے کے بعد امریکہ کے دیگر شہروں میں بھی لائبریری اسکول قائم ہوئے ان میں پراٹ انسٹی ٹیوٹ (Pratt Institute) ۱۸۹۲ء، ڈریکسل انسٹی ٹیوٹ (Drexel Institute) ۱۸۹۰ء، آرمور انسٹی ٹیوٹ، شکاگو، (Armour Institute, Chicago) ۱۸۹۳ء جو ۱۸۹۷ء میں ایلونائے یونیورسٹی (University of Illinois) منتقل ہو گیا، ۱۸۹۱ء میں لوس اینجل پبلک لائبریری (Los Angeles Public Library) میں لائبریری سائنس کی تربیت شروع ہوئی، ۱۹۰۰ء میں پٹسبرگ میں کارنیگی لائبریری (Carnegie Library of Pittsburgh) میں بچوں کے کتب خانوں کے حوالے سے مخصوص کورس شروع ہوا، ۱۹۵۱ء میں (Association of American Library Schools) قائم ہوئی، کارنیگی (Carnegie) اور کارنیگی کارپوریشن (Carnegie Corporation) نے لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے لئے بھی لائبریری اسکولوں کی مدد کی (۲۲)۔امریکہ میں قائم ہونے والے یہ لائبریری اسکول پروفیشن کی ترقی کی بنیاد بنے۔امریکہ کی ولیم سنز رپورٹ (Williamsons' Report) کے مطابق ۱۹۲۴ء میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے لائبریرین شپ کے فروغ و ترقی کے لئے ایک تعلیمی بورڈ (Board of Education for Librarianship) قائم کیا، بورڈ نے امریکہ میں لائبریری تعلیم وتربیت

میں معیار قائم کرنے کے اقدامات کئے۔ ولیم سنز نے اپنی رپورٹ میں امریکہ کے ۱۴ اسکولوں پر تنقید کرتے ہوئے ان کے نصاب کو غیر معیاری قرار دیا۔

لائبریری تعلیم وتربیت کی ترقی اور فروغ کا عمل جاری رہا حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں پہلا (Doctoral Degree) ایڈوانس گریجویٹ کورس شروع ہوا جس میں پی ایچ ڈی پروگرام بھی شامل تھا(۲۳)۔امریکہ میں قائم ہونے والے لائبریری اسکول پوری دنیا میں لائبریرین شپ کی ترقی کی بنیاد ثابت ہوئے۔امریکہ اور کنیڈا کے مختلف ادارے اور جامعات جن میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے پروگرام بیچلرز، ماسٹر،ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر موجود ہیں کی تعداد تقریباً ۴۳ ہے جن کے بارے میں معلومات انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے (۲۴)۔

حواشی وحوالہ جات

10. Encyclopedia of Library and Information Science. ref.2, p.418.

۱۱۔ چشتی، عبدالحلیم ۔۔اسلامی کتب خانے : دوسری صدی ہجری (۱۳۳ھ ۷۴۹ء) سے ساتویں صدی ہجری (۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء) تک (پی ایچ ڈی مقالہ، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، جامعہ کراچی، ۱۹۷۸ء) ، ۱۶۷ص

۱۲۔ ندیم، محمد اسحاق ابن، الفہرست۔ ترجمہ مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ زیر نگرانی مولانا
حنیف ندوی۔ (لاہور: ادارہ ثقافت
اسلامیہ، ۱۹۴۹ء)، ۹۱۴ص۔

13. Winger, Harold W. Aspects of Librarianship: A Trace
Work of History.
Library Quarterly. xxxi, (October 196), 321, quoted in
Anis Khurshid.
"Standards for Library Education in Burma, Ceylon, India
and Pakistan".
(Ph.D dissertation, USA: Pittsburgh,1973), p.6

14. Encyclopedia of Library and Information Science. ref.2,
p.416

15. Ibid.

16. 1) Bayerische Beamtenfachhochschule / Fachbereich
Archiv- und
Bibliothekswesen, Web Site:http://www.bib-
bvb.de/fachbereich/inhalt.htm
(Accessed Dec.15, 2004)
2) Bayerische Staatsbibliothek / Bayerische
Bibliotheksschule.
Web Site:http://www.bib-bvb.de/bib_schule/bib_sch.htm
(Accessed

Dec.15, 2004)

3) Bibliotheksschule in Frankfurt a.M. - Fachhochschule für Bibliothekswesen. Web Site:http://www.fhsbib.uni-frankfurt.de/ (Accessed Dec.15, 2004)

4) Fachhochschule Hamburg, FB Bibliothek und Information. Web Site: http://allekto.bui.haw-hamburg.de/ (Accessed Dec.15, 2004)

5)Fachhochschule Potsdam, Fachbereich Archiv-Bibliothek Dokumetation Web Site: http://www.fh-potsdam.de/

ABD/abd_home.htm (Accessed
Dec.15, 2004)
6) Hochschule der Medien Stuttgart / Fachbereich
Information und
Kommunikation, Web Site: http://www.iuk.hdm-
stuttgart.de/ (Accessed
Dec.15, 2004)
7) Humboldt-Universität, Berlin, Institut für
Bibliothekswissenschaft.
Web Site: http://www.ib.hu-berlin.de/ (Accessed Dec.15,
2004)
17. Gates , Jean Key . Introduction to Librarianship (New
York: McGraw-Hill,
1976) , p.79

18. The American Library Journal. 1 (September 30, 1876) in., Jean Key Gates. ref. 17, p.78

19. Dewey , Melvil . 'The Profession'. The American Library Journal. 1 (Sept. 30, 1876), quoted in., Jean Key Gates. ref. 17, p.239

19. Gates, Jean Key. Introduction to Librarianship. ref. 17, p. 90

20. Sharma, Jagdish Saran . Libray Movement in India and Abroad. (New Delhi: Ess Ess Publications, 1986), p. 174.

21. Ibid., pp.91-92.

23. ALA World Encyclopedia of Library and Information Services/ed. by Robert Wedgeworth and others.- (Chicago: ALA, 1980), p.326

24. 1) The Catholic University of America, School of Library and Information . Web Site: http://slis.cua.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

2) College of St. Catherine, St. Paul, Minnesota, Master of Lib. Inf. Sc. Web Web Site:http://minerva.stkate.edu/offices/academic/mlis.nsf

Accessed Dec.15, 2004)

3) Dominican University, Illinois, Graduate School of Lib. and Information Science. Web Site: http://www.dom.edu/gslis/ (Accessed Dec.15, 2004)

4)East Carolina University,Department of Broadcasting, Librarianship, and Educational Technology. Web Site: http://www.soe.ecu.edu/LTDI/ (Accessed Dec.15, 2004)

5)Emporia State University, Kansas, School of Library & Information Management. Web Site: http://slim.emporia.edu/ (Acce Dec.15, 2004)

6)Florida State University at Tallahassee, The School of Library and Information Studies Web Site: http://www.lis.fsu.edu/ (AcceDec.15, 2004)

7)Indiana University,School of Library and Information Science. Web Site: http://www.slis.indiana.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

8)Kent State University, School of Library and Information Science. Web Site: http://web.slis.kent.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

9)Louisiana State University, School of Library and Information Science.
Web Site: http://slis.lsu.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

10)North Carolina Central University, School of Library and Information Sciences. Web site: http://www.nccu.edu/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

11)Paratt School of Information and Library Science. Web Site:
http://www.pratt.edu/sils/index.html (Accessed Dec.15, 2004)

12)Rutgers School of Communication, Information, and Lib. Studies, New Jersey. Web Site: http://www.scils.rutgers.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

13)San Jose State University, School of Library and Information Science (SLIS). Web Site: http://witloof.sjsu.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

14)Simmons College, Graduate School of Library & Information Science.
Web Site: http://www.simmons.edu/gslis/ (Accessed Dec.15, 2004)

15)Southern Connecticut State University, School of Communication,
Information and Library Science. Web Site:

http://www.southernct.edu/departments/ils/ (Accessed Dec.15, 2004)

16)St.John's University, New York, Department of Library and Information Scienc. Web Site: http://www.stjohns.edu/ (Accessed Dec.15,2004)

17)University at Buffalo - School of Informatics - Department of Library & Information Studies. Web Site: http://informatics.buffalo.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

18)Texas Womens University, School of Library and Information Studies. Web Site: http://www.twu.edu/cope/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

19) University of Alabama, School of Library and Information Studies. Web Site: http://www.slis.ua.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

20) University of California-Los Angeles, Department of Library and Information Science. Web Site: http://is.gseis.ucla.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

21) University of Hawaii, School of Library and Information Studies.

Web Site: http://www2.hawaii.edu/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

22)University of Illinois at Urbana-Champaign, Graduate school of lib. and information science. Web Site: http://alexia.lis.uiuc.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

23) University of Iowa, School of Library and Information Science.
Web Site: http://www.uiowa.edu/

libsci/ (Accessed Dec.15, 2004)

24)University of Kentucky, School of Library and Information Sc. Web Site:http://www.uky.edu/CommInfoStudies/SLIS/(Accessed Dec.15,2004)

25)University of Long Island, New York, Palmer School of Library and Information Science. Web Site:http://www.cwpost.liunet.edu/cwis/cwp/palmer/index.html (Accessed Dec.15, 2004)

26) University of North Carolina, Department of Library and Information Studies. Web Site: http://www.uncg.edu/lis/ (Accessed Dec.15, 2004)

27)University of North Carolina, Chapel Hill, School of Inf. & Library

Science. Web Site: http://ils.unc.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

28) University of North Texas, The School of Library and Information Sciences. Web Site: http://www.unt.edu/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

29) University of Oklahoma, School of Library and Information Studies. Web Site: http://www.ou.edu/cas/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

30)University of Pittsburgh, The School of Lib. and Information Sciences. Web Site: http://www2.sis.pitt.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

31)University of Rhode Island, The Graduate School of Lib. & Information Studies. Web Site: http://www.uri.edu/artsci/lsc/ (Accessed Dec.15, 2004)

. 32)University of South Carolina, College of Lib. and Information Science. Web Site: http://www.libsci.sc.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

33)University of South Florida, School of Library and Information Science. Web Site: http://nosferatu.cas.usf.edu/lis/ (Accessed Dec.15, 2004)

34)University of Southern Mississippi, School of Library and Information Science. Web Site: http://www-dept.usm.edu/

slis/ (Acce.Dec.15,2004)

35)University of Wisconsin-Madison, School of Library & Information Studies . Web Site: http://polyglot.lss.wisc.edu/slis/ (Acce.Dec.15,2004)

36)University of Wisconsin-Milwaukee, School of Library and Information Science. Web Site: http://www.uwm.edu/Dept/SOIS/ (Acce.Dec.15,2004)

37) Wayne State University, Library and Information Science Program. Web Site: http://www.lisp.wayne.edu/ (Accessed Dec.15, 2004)

38) Dalhousie University , Library and Information Studies. Web Site: http://www.mgmt.dal.ca/slis/ (Accessed Dec.15, 2004)

39)McGill University, Graduate School of Library and Information Studies. Web Site: http://www.gslis.mcgill.ca/ (Accessed Dec.15, 2004)

40)University of Alberta, School of Library and Information Studies. Web Site: http://www.slis.ualberta.ca/ (Accessed Dec.15, 2004)

41) University of British Columbia, School of Lib. Archival, and Information Studies. Web Site: http://www.slais.ubc.ca/ (Accessed Dec.15, 2004)

42)A History of Library Education. London: Clive Bingley, Université de Montréal, École de Bibliothéconomie et des Sciences del Information. Web Site: http://www.fas.umontreal.ca/EBSI/ (Accessed Dec.15,2004)

43) University of Western Ontario, Graduate School of Lib. &Inf. Science. Web Site: http://www.fims.uwo.ca/lis/ (Accessed Dec.15, 2004)

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 3

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال

(1915-2015)

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ’’پاکستان میں لائبریری تحریک کے)

فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار‘‘ سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔

(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

گزشتہ سے پیوستہ

نے سب سے پہلے لا(Henry Richard Tedder)برطانیہ میں ہنری رچرڈ ٹیڈر

ئبریری کی تربیت کی جانب لوگوں کو مائل کیا۔ ۱۸۸۰ء میں منعقد ہونے والی لا

ئبریری ایسو سی ایشن کی سالانہ کانفرنس میں ٹیڈر نے لائبریری اسٹاف کی عملی تربیت

Assistant)کے لیے ایک قرار داد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ معاون لائبریریز

Librarians) کی تربیت کی ذمہ داری نئی قائم ہونے والی ایسو سی ایشن لے یا پھر لا

ئبریرین شپ کو ایک پیشہ کا درجہ حاصل ہو جائے (۲۵)۔ کہا

جاتا ہے کہ یہ قرار داد برطانیہ میں لائبریری تعلیم و تربیت کا آغاز اور لائبریرین شپ کو ایک الگ پیشہ کی حیثیت دلوانے میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ڈاکٹر رام شو بھت پرساد سنگھ نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے (۲۶)۔لائبریری اسکول کے قیام پر طویل بحث و مباحثے کے بعد یونیورسٹی کالج لندن میں پہلا کل وقتی لائبریری اسکول ۲۹ ستمبر ۱۹۱۹ء کی ڈائریکٹر شپ میں قائم ہوا۔اسکول یونیورسٹی کی (Dr. E.A.Baker) میں ڈاکٹر بیکر حدود میں واقع تھا اس کے باوجود یہ ایک پوسٹ گریجویٹ اسکول نہیں تھا۔زیادہ تر طلباء کی تعلیمی قابلیت گریجویٹ سے کم تھی (۲۷)۔برطانیہ میں لائبریری تعلیم و تربیت لائبریری ایسوسی ایشن کے اختیار میں رہی۔۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۳ء کے درمیان برطانیہ میں لائبریری تعلیم میں نمایاں ترقی ہوئی جب یہاں کل وقتی کورس کالج کی سطح پر شروع ہوا اور لائبریرین شپ کا پیشہ دیگر پیشوں کے مقابل آگیا (۲۸)۔انٹرنیٹ پر برطانیہ کے ۶ اداروں کے بارے میں معلومات موجود ہیں جہاں پر لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے (۲۹)۔

ساؤتھ افریقہ اور آسٹریلیا کا لائبریری تعلیم کا نظام برطانوی طرز سے قریب نظر آتا ہے ۔ابتدا میں دونوں ممالک میں امتحانات کی ذمہ داری پیشہ ورانہ ایسوسی ایشن کے پاس تھی جو رفتہ رفتہ یونیورسٹی اور کالجوں تک وسیع ہو گئی۔ساؤتھ افریقہ میں لائبریری تعلیم کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ہوا، پہلی کلاس

جوہانسبرگ پبلک لائبریری میں شروع ہوئی (۳۰)۔ ۱۹۵۰ء تک افریقہ میں کئی لا ئبریری اسکول قائم ہو چکے تھے۔

آسٹریلیا میں نیو ساؤتھ ویلز کی پبلک لائبریری کے لائبریرین اینڈرسن
نے پہلی لائبریری کلاس کا آغاز کیا، ۱۹۳۷ء میں آسٹریلین (H.C.L.Anderson)
قائم ہوا (Australian Institute of Librarians) انسٹی ٹیوٹ آف لائبریریز
انسٹی ٹیوٹ کی کانفرنس ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوئی جس میں امتحان لینے اور سرٹیفیکیٹ ،
کی سربراہی میں قائم (John Metcalfe) کے اجراء کے لیے ایک بورڈ جان میٹ کالف
(Institute کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں انسٹی ٹیوٹ کو لائبریری ایسوسی ایشن آف آسٹریلیا
میں تبدیل کر دیا گیا (۳۱)۔ ۱۹۶۰ء (of Library Association of Australia
کی یونیورسٹی میں گریجویٹ کورس (New South Wales) میں نیو ساؤتھ ویلز
(Faculty یونیورسٹی (۳۲) کی فیکلٹی آف اطلاعات (Canbra) شروع ہوا۔ کینبرا
کے تحت لائبریری وانفارمیشن اسٹڈیز قائم ہے۔ آسٹریلیا میں اس (of Information
وقت لائبریری وانفارمیشن سائنس کے ۴ ادارے مصروف عمل ہیں (۳۳)۔

چین مشرقی ایشیا کا ایک ملک ہے جس کی تاریخ قدیم اور متنوع ہے۔ ولادتِ مسیح سے تین ہزار سال پہلے بھی یہ دنیا کا متمدن ترین ملک سمجھا جاتا تھا۔ کاغذ اور چھپائی کے حوالے سے دنیا چین کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔ چائنیز کمیونسٹ

۱۸۸۸ء۔۱۹۲۷ء) کو جدید چینی لائبریرین شپ کا بانی) Li Ta-chao پارٹی کا بانی تصور کیا جاتا ہے یہ ایک بڑی چینی یونیورسٹی کا لائبریرین بھی رہ چکا تھا(۳۴)۔اس نے چین میں لائبریرین شپ کی ترقی اور فروغ کیلیے اہم کام کیا۔چین کی قومی لائبریری کا قیام ۱۹۱۰ء میں بیجنگ (پیکنگ) کے مقام پر عمل میں آیا۔تائیوان میں نیشنل تائیوان یونیورسٹی (۳۵) میں بھی گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف لائبریری وانفارمیشن سائنس قائم ہے۔

ایران جنوبی ایشیا کی ایک قدیم اسلامی مملکت ہے، ۱۹۳۵ء تک اس کا نام فارس تھا۔ ایران کی سرزمین علم اور عالموں کے حوالے سے منفرد مقام رکھتی ہے۔لائبریری تعلیم کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوا،ایران کی وزارت ثقافت کے تحت چار ماہ کا کورس ٹیچرس کالج تہران میں منعقد ہوا، ۱۴ سال بعد ۱۹۵۲ء میں تہران یونیورسٹی نے یونیسکو اور USIS کے تعاون سے ایک چھ ماہ کے لائبریری کورس کا انعقاد کیا(۳۶)، اسی قسم کے کورسز ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ئ ء میں منعقد ہوئے، ۱۹۶۰ء میں اسکول لائبریریز کے لئے ٹیچرز ٹریننگ کالج تہران میں کورس منعقد ہوا جس میں ناصر شریفی استاد کی حیثیت سے شامل تھے (۳۷)۔تہران کی فیکلٹی آف ایجوکیشن کے تحت ۱۹۶۶ء میں لائبریری سائنس میں ماسٹر پروگرام شروع ہوا جس کی منصوبہ بندی میں امریکی لائبریری سائنس کے ماہرین شامل تھے اسی دوران ایران لائبریری ایسوسی ایشن (Iran Library Association) بھی قائم ہو

ئی۔۱۹٦۸ء میں تبریز یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ ڈپلومہ شروع کیا گیا (۳۸)۔انٹر
((LISDIRAN) نیت پر موجود لائبریری وانفارمیشن سائنس ڈائریکٹری.برائے ایران
کے مطابق ایران میں لائبریری سائنس میں بی اے ، ایم اے اور پی ایچ کی سہو (۳۹
لیات جو ادارے فراہم کررہے ہیں ان میں علامہ طباطبائی یونیورسٹی ' تہران، اسلامک
آزاد یونیورسٹی' تہران، قم یونیورسٹی، شاہد چمران یونیورسٹی 'اھواز، شیراز یونیورسٹی،
تہران یونیورسٹی ،پیام نوریونیورسٹی، الازہر یونیورسٹی ، تبریز یونیورسٹی اور ایران
یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز شامل ہیں۔

۱۹۴۸ء میں آزاد ہو جانے کے بعد سیلون میں لائبریری سرگرمیوں کی جانب توجہ دی
گئی ۔ ۱۹٦۰ء میں سیلون لائبریری ایسو سی ایشن کے قیام کے بعد لائبریری تعلیم و تربیت
پر توجہ دی گئی۔ ڈاکٹر انیس خورشید نے بونی (۴۰) کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'سیلون
میں لائبریری ایسو سی ایشن کا قیام کتب خانوں کی ترقی کی تاریخ میں ایک عظیم اقدام
ہے'۔ ایسو سی ایشن نے ایک لائبریری جرنل بھی شائع کیا۔جونیر کالج دیہی والا
میں انڈر گریجویٹ ڈپلومہ ان لائبریرین شپ ، سیلو ن لائبریری ایسو (Dehiwala)
سی ایشن کے تحت انڈر گریجویٹ سطح کا چھ ماہ کا کورس منعقد ہوا۔ اس وقت
یونیورسٹی (۴۱) میں شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس قائم ہے۔ Kelaniya

25. Bramley, Gerald , A History of Library Education.
(London: Clive Bingley,
1969), p.1

۲۶۔ سنگھ، رام شوبھت پرساد، ہندوستان میں لائبریری تحریک کا آغاز وارتقاء (نئی
دہلی: ادارہ فکر جدید، ۱۹۸۵ء) ص۔۱۱۸

27. Bramley, Gerald, ref. 25, pp. 30.31

28. Ibid. p.61

29. 1)Aberystwyth University, Department of Information
and Library Studies.
Web Site: URL: http://www.dil.aber.ac.uk/ (Accessed
Dec.20, 2004)

2)Loughborough University of Technology, Department of
Information and
Library Studies. Web
Site:URL:http://info.lut.ac.uk/departments/ls/
Accessed Dec.20, 2004)

3)University of Bristol-Part-time,MSC in Information & Lib.
Management.
Web site: http://www.bris.ac.uk/education/ilm/ (Accessed
Dec.20, 2004)

4)University College London, School of Library, Archive
and Information

Studies (SLAIS). Web Site: http://www.ucl.ac.uk/

uczcw11/slais/slais.htm
(Accessed Dec.20, 2004)
5)University of Northumbria at Newcastle, Department of Information and
Library Management.
Web Site: http://online.northumbria.ac.uk/ (Accessed Dec.20, 2004)
6)University of Wales, Department of Information and Library Studies.
Web Site: http://www.dil.aber.ac.uk/index.htm (Accessed Dec.20, 2004)
30. Bramley, Gerald. ref. 25, p. 104
31. bid., p.113
32. Web Site: http://comedu.canberra.edu.au/ (Accessed Dec.20, 2004)
33. 1)Curtin University of Technology School of Media and Information.
Web Site: http://smi.curtin.edu.au/ (Accessed Dec.20, 2004)
2)Royal Melbourne Institute of Technology (RMIT), Faculty of Business,
Information Management and Library Studies.

Web Site: http://www.rmit.edu.au/bus (Accessed Dec.20, 2004)

3)University of Canberra, Faculty of Communication, Library and Information Studies . Web Site: http://comedu.canberra.edu.au/ (Accessed Dec.20, 2004)

4)University of Technology, Sydney, AU, Department of Information Studies. Web Site: http://www.hss.uts.edu.au/departments/DIS/ (Accessed Dec.20, 2004)

34. ALA World Encyclopedia of LIS. ref. 23, p.333

35. Web Site: http://www.lis.ntu.edu.tw/ (Accessed Dec.20, 2004)

36. Haider, Syed Jalaluddin . 'Library Education in Iran'. International Library Review. 6 : (1976) , 310.

37. Ibid., p. 311

38. Haider, Syed Jalaluddin, 'Library Education in Iran and Pakistan'. in Anis Khurshid. Library Education Across the Boundaries of Cultures. (Karachi: Library Science Department, University of Karachi. 1981), p. 97

39. Library and Information Directory of Iran (LISDIRAN) Website: http://www.nouruzi.itgo.com/lisdiran/schools.html (Accessed December 25, 2005.

40. Bonny, Harold V. Library Services for Ceylon. Ceylon: Department of Cultural Affairs, 1960. p.4. quoted in., Anis Khurshid. Standards for Library Education. ref. 56. p. 299.

41. Kelaniya University. Department of Library and Information Science. Web Site: http://www.kln.ac.lk/social/index.htm (Accessed Dec.20, 2004)

(: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 4

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915
یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے)
فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

گزشتہ سے پیوستہ

.برما جنوب مشرقی ایشیا کا ایک ملک جو ۱۹۳۵ء تک ہندوستان کا حصہ تھا۔برما میں آزادی کے بعد لائبریرین شپ کی جانب توجہ دی گئی۔.برما کے شہر رنگون میں نیشنل لائبریری ۱۹۵۲ء میں قائم ہوئی، اس کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں سے منسلک کتب خانے بھی قائم ہوئے۔.برما میں مختلف ممالک خاص طور پر بھارت سے تعلق رکھنے والے ماہرین لائبریری سائنس مختلف پروگراموں کے تحت آتے رہے اسی امریکن لائبریری ایسو سی ایشن کے فورڈ لائبریری پروجیکٹ کے تحت ۱۹۵۵ سے ۱۹۵۹ کے در میان.برما سے بعض لوگوں کولائبریری سائنس کی

تعلیم وتربیت کے لئے امریکہ بھیجا گیا۔ ڈاکٹر انیس خورشید کے مطابق ' نہار رنجن رائے
کی رپورٹ میں لائبریرین شپ میں اسپیشل گریجویٹ (Nihar Ranjan Ray)
کورس کا ذکر ملتا ہے یہ رپورٹ ۱۹۵۴ء میں پیش کی گئی۔ برما لائبریری ایسوسی ایشن
کا قیام بھی اسی سال عمل میں آیا۔۱۹۵۹ء میں (Burma Library Association)
لائبریری سائنس کا مختصر مدت کا کورس یونسکو کے ماہر نہار رنجن رائے (Nihar
کے تعاون سے منعقد ہوا۔ اس کورس کو (Ranjan Ray
برما میں اولین کورس کا درجہ حاصل ہے جو ڈپلومہ کورس کی بھی بنیاد بنا"۔ یونیورسٹی
کی سطح پر رنگون آرٹس وسائنس یونیورسٹی، سینٹرل لائبریری رنگون کے تحت ایک ماہ کا
انڈر گریجویٹ کورس منعقد ہوا۔ نیشنل لائبریری نے بھی جنوری ۱۹۵۶ء میں ایک
کورس کا اہتمام کیا۔ اشرف علی کے مطابق انڈونیشیا میں ۱۹۵۲ء میں لائبریری اسکول
قائم ہوا، ۱۹۶۶ء میں فلپائن یونیورسٹی نے گریجویٹ سطح
کے دو کورسوں کا آغاز کیا، تھائی لینڈ میں ایک لائبریری تعلیمی پروگرام 1951ء میں
چولانگ کورن یونیورسٹی نے شروع کیا (۴۲)۔

بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء میں آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا اس سے قبل ۱۹۴۷ء
سے ۱۹۷۰ء تک یہ پاکستان کا ایک صوبہ (مشرقی پاکستان) تھا۔ ۱۹۵۵ء

میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے لائبریری سائنس کا ۳ ماہ کا سرٹیفیکیٹ کورس شروع کیا۔ اس کورس کے سربراہ فضل الٰہی مرحوم تھے۔ ۱۹۵۷ء میں ایم ایس خان نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں یہ کورس دوبارہ شروع کیا۔ ۱۹۵۹ء ڈھاکہ یونیورسٹی پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ۱۹۶۲ء ایم ایل ایس (ایم اے) شروع ہوا۔ آزادی کے بعد ایسٹ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن ' لائبریری ایسوسی ایشن آف بنگلہ دیش (Library Association of Bangladesh, LAB) بن گئی ڈھاکہ یونیورسٹی نے ۱۹۷۶ء میں ایم فل اور ۱۹۷۹ء میں پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا، جب کہ ایم اے پروگرام پہلے ہی سے موجود تھا۔ البتہ ۱۹۸۸ء میں آنرز (لائبریری وانفارمیشن سائنس) بھی شروع کیا۔ راجشاہی یونیورسٹی نے بھی ۱۹۹۱ء میں ڈپلومہ کورس کا آغاز کیا (۴۳)۔

ہندوستان (بھارت) میں لائبریری سائنس کی تعلیم کی ابتدا ریاست بڑودہ میں ایک امریکی ماہر لائبریری سائنس ولیم بورڈن نے ۱۹۱۱ء میں کی۔ ریاست بڑودہ کے مہاراجہ سرسیاجی راؤ گائکوارڈ نے اپنی ریاست میں عوامی کتب خانوں کو منظم کرنے اور لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے لئے امریکہ کے ایک معروف لائبریرین سرولیم ایلانس بورڈن (William Alans Borden) کو کتب خانوں کا سربراہ مقرر کیا۔ بورڈن جو کولمبیا لائبریری اسکول میں استاد رہ چکا تھا نے کتب خانوں کو منظم کرنے کے علاوہ اسی سال لائبریری کلاس بھی شروع

کی (۴۴)۔ اس کورس کے نصاب میں لکھنے کا طریقہ، جلد سازی، نظام اجراء، کتابیات وغیرہ شامل تھے۔ چار سال بعد ۱۹۱۵ء میں پنجاب کی حکومت نے ایک اور امریکی کو جو میلول ڈیوی کا شاگرد بھی (Asa Don Dickinson) پروفیسر آسا ڈان ڈکنسن کو جدید طریقوں پر منظم و (Collection) تھا پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ مرتب کرنے کی غرض سے بلایا۔ ڈکنسن نے لائبریری کو منظم کرنے کے علاوہ 1915 ء میں لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس شروع کیا۔ سرٹیفیکیٹ کورس کی یہ کلاس پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عملے اور مقامی کالجوں کے لائبریریز پر مشتمل تھی جن کی تعداد ۳۰ تھی۔ اس وقت کے حالات اور ضروریات کے مطابق اس کورس کا مقصد کتب خانوں میں زیر ملازمت عملے کو لائبریری سائنس کے جدید اصوں اور طریقوں سے واقف کرانا تھا (۴۵)۔ ڈاکٹر حیدر کے مطابق یہ ایک مختصر مدت کا سرٹیفیکیٹ کورس تھا اوران لوگوں کے لیے شروع کیا گیا تھا جو لائبریرین شپ کو ایک پیشہ کے طور پر اختیار کرنا چاہتے تھے۔ کورس کے نصاب میں درجہ بندی (نظری)، کیٹلاگ سازی، کتابیات اور انتخاب کتب اورانتظام کتب خانہ شامل تھا۔ عملی کام پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جب کہ یونیورسٹی لائبریری میں عملی تربیت ضروری تھی۔ اساتذہ میں ڈکنسن اور شامل تھے (۴۶)۔ قریشی کے مطابق ڈکنسن ۱۲ اکتوبر (Helen)اس کی بیوی ھیلن ۱۹۱۵ء کو لاہور پہنچے، نومبر میں انہوں نے جدید لائبریری کے طریقہ کار پر متعدد لیکچرز کا اہتمام کیا، وہ یونیورسٹی میں صرف نو ماہ

قیام کرنے کے بعد جولائی ۱۹۱۶ء کو واپس امریکہ چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد
نے بھی اس کلا (Woolner)تربیتی کلاس ۱۹۱۸ء میں دو سال بعد منعقد ہوئی۔ وولنر
س میں لیکچر دیا۔ وولنر کی سرپرستی میں کورسز کو توسیع دی گئی یہ کام پہلے لالہ مکند لا
نے (Lala Labhu Ram) اور پھر لالہ لبھو رام (Lala Mukand Lal) ل
کیا۔ یہ کورس لائبریری سائنس کے نظری اور عملی اسباقکا مرکب تھا۔ وولنر اس دوران
۱۹۰۳ء۔ ۱۹۲۸ء) پنجاب یونیورسٹی کے اعزازی لائبریرین بھی تھے ساتھ ہی وہ)
یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کے چیئرمین تھے (۴۷)۔
نے لائبریری کی تنظیم نو کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ (Dickinson)ڈکنسن
سرگرمیوں کی سرپرستی بھی شروع کی جس کے نتیجہ میں 'پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن'
قائم ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند میں قائم ہونے والی یہ اولین پیشہ ورانہ ایسو سی ایشن
تھی (۴۸)۔ ڈاکٹر شرما کے مطابق اکتوبر میں لاہور سے تعلق رکھنے والے لا
ئی (Librarians Club) 'ئبریرینز ایک جگہ جمع ہوئے اور ایک ' لائبریرینز کلب
بنیاد رکھی بعد میں اس کلب کو پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن کا نام دیا گیا۔ (۴۹)۔
۱۹۲۰ء میں آندھرا دیسا لائبریری ایسو سی ایشن(Andhra Desa Library

میں ٹریننگ کلاس شروع کی۔ ۱۹۲۹ء میں (Vijayawada) نے (Association
نے جو اس وقت مدراس یونیورسٹی (Dr.S.R.Ranganathan) ڈاکٹر رانگا ناتھن
کے لائبریرین تھے مدراس لائبریری ایسو سی ایشن (Madras Library
کے تحت سرٹیفیکیٹ کورس کا آغاز کیا جسے ۱۹۳۱ء میں مدراس (Association
یونیورسٹی نے اپنی نگرانی میں لیتے ہوئے اسے ڈپلومہ کورس میں بدل دیا۔ ہندوستان
میں یونیورسٹی کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم کی یہ اولین کوشش تھی۔ ۱۹۳۵ء میں
خان بہادر اسد اللہ کی سرپرستی میں امپیریل لائبریری کلکتہ (جواب بھارت کی قومی لا
ئبریری ہے) میں لائبریری اسکول قائم ہوا۔ بنگال لائبریری ایسو سی ایشن (Bengal
نے ۱۹۳۷ء میں سرٹیفیکیٹ کورس کا آغاز کیا۔ اس اسکول (Library Association
نے ۱۹۴۵ء تک لائبریری تعلیم کی تربیت کا اہتمام کیا (۵۱)۔ ہندوستان میں لائبریری
سائنس کی تعلیم و تربیت لائبریری انجمنوں کے علاوہ جامعات کی سطح پر شروع ہوئی اور
مختلف ریاستوں کی جامعات نے ڈپلومہ کورسیز شروع کئے ان میں آندھرا یونیورسٹی نے
کی سرپرستی میں ڈپلومہ کورس (Dr. M.O.Thomas) ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر تھامس
شروع کیا ایک سال بعد ۱۹۳۶ء میں رنگاناتھن کی کوششوں سے مدراس یونیورسٹی میں
ڈپلومہ شروع ہوا۔ اسی طرح بنارس ہندو یونیورسٹی میں ۱۹۴۲ء، بمبئی یونیورسٹی میں
۱۹۴۳ء، کلکتہ یونیورسٹی میں ۱۹۴۴ء اور دہلی یونیورسٹی میں ۱۹۴۵ء میں ڈپلومہ کورس
شروع ہوئے۔

ڈاکٹر رنگا ناتھن کی سرپرستی میں لائبریری سائنس میں ڈگری پروگرام (ماسٹر اِن لائبریری سائنس) دہلی یونیورسٹی میں ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا جس میں پی ایچ ڈی اور ایم فل پروگرام بھی تھا (۵۲)۔ اس وقت بھارت کی متعدد جامعات میں لائبریری سائنس کی تعلیم ڈپلومہ، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی تک رائج ہے۔ بمبئی یونیورسٹی (۵۳)، پنجاب یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، اِندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (۵۴) وغیرہ لائبریری سائنس کی تعلیم کے حوالے سے دنیا میں منفرد اور اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر رام شوبھت پرساد سنگھ کے مطابق 'ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے پہلے صرف پانچ یونیورسٹیوں میں لائبریری سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی اب اس کی تعداد بڑھ کر ۳۴ ہو گئی ہے' (۵۵)۔ آزادی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لائبریری اسکول قائم ہوا جس نے ۱۹۵۱ء میں تعلیم کا آغاز کیا ابتدا میں سرٹیفکیٹ کورس تھا جسے ۱۹۵۸ء کے بعد بیچلرز کورس میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر رنگا ناتھن نے اپنی تمام زندگی کی کمائی ایک لاکھ روپے مدراس یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی سارادا رنگا ناتھن چیر
(Sarada
Ranganathan Chair of Library Science) قائم کرنے کے لیے دیے۔ چیئر کے قائم ہو جانے سے
مدراس یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کا ایک علیحدہ شعبہ قائم ہو گیا جو آج

بھی قائم ہے (۵٦)۔

جاپان میں بھی لا ئبریری سائنس کی تعلیم مختلف اداروں اور جامعات کی سطح پر رائج

(یونیورسٹی (Keio۵۷، ہے ان میں اسکول آف لا ئبریری و انفارمیشن سائنس

،یونیورسٹی (۵۸)،یونیورسٹی آف لا ئبریری اینڈ انفارمیشن سائنسSurugadai،

یونیورسٹی آف ٹوکیو میں انفارمیشن سائنس،(۵۹) Tsukuba Science City

MLIS ڈیپارٹمنٹ قائم ہے (٦۰)۔ ملائیشیا میں یونیورسٹی آف ملائیشیا (٦١)کے تحت

پروگرام منعقد کیا جارہا ہے۔ جنوبی کوریا کے کئی اداروں اور جامعات میں لا ئبریری و

Ewha،(یونیورسٹی (٦٢ Daejinانفارمیشن سائنس کی تعلیم کا اہتمام ہے ان میں

کالج میںKeimyung، (یونیورسٹی (٦٤ Kangnam، (یونیورسٹی (٦٣ Womans

نیشنل یونیورسٹی کے تحت کالج آفKongjuلا ئبریری سائنس کا شعبہ قائم ہے (٦۵)۔

(ونیورسٹی (٦٧ Konkukایجو کیشن و لا ئبریری و انفارمیشن سائنس قائم ہے (٦٦)۔

Soong Eui،(نیشنل یونیورسٹی (٦٩ Pusan، (یونیورسٹی (٦٨ Kwangju،

Sung Kyun، (کالج (۷۰Women's

یونیورسٹی (۷٢)، میں لا ئبریری و انفارمیشن Yonsei، (یونیورسٹی (۷١ Kwan

سائنس ڈیپارٹمنٹ قائم ہیں۔

میں رائل اسکول آف لا ئبریری و انفارمیشنBiblioteksskole ڈینمارک کے

سائنس(Royal School of
میں ماسٹر پروگرام کا انعقاد کیا (۷۳) (Library and Information Science
یونیورسٹی (۷۴) میں شعبہ لائبریری وOulu (Finland) کی جارہا ہے۔ فن لینڈ
میں لا (Dublin) انفارمیشن سائنس قائم ہے۔آئرلینڈ میں یونیورسٹی کالج ڈبلن
ئبریری و انفارمیشن سائنس ڈیپارٹمنٹ کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم ڈگری کی سطح
(University of Parma) پر دی جارہی ہے (۷۵)۔ اٹلی کی یونیورسٹی آف پارما
Agiellonian میں لائبریری سائنس انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ پولینڈ میں (۷٦
اور(۷۸) Nicholas Copernicus University of Torun،(یونیورسٹی(۷۷
یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی تعلیم نصاب کا حصہ ہے۔ (۷۹) Wroclaw
روس اور مشرقی یورپ کے ممالک سے کتب خانوں کی قدیم تاریخ وابستہ ہے۔ پولینڈ،
یوگوسلاویہ، جرمنی، ہنگری اور دیگر ممالک میں کتب خانوں کے ساتھ ساتھ لائبریری
سائنس کی تعلیم کی جانب بھی خصوصی توجہ دی گئی۔روس کی خازن (Kazan) اسٹیٹ
اکیڈمی برائے فنون و ثقافت میں لائبریری و انفارمیشن کی فیکلٹی قائم ہے (۸۰)۔اسی
طرح ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی (۸۱)کے تحت بھی لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم کا
اہتمام ہے۔اسرائیل کی تین جامعات Hebrew(۸۲)، Bar Ilan (۸۳) اور
Haifa یونیورسٹی (۸۴) میں لائبریری سائنس کے شعبہ جات قائم ہیں۔

لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم وتربیت دنیاکے تقریباً تمام ہی ممالک میں انڈر گریجویٹ، بیچلرز ڈگری، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر دی جارہی ہے۔ انٹرنیٹ پر موجود معلومات اور یونیسکو کی ڈائریکٹری برائے لائبریری اسکول (۸۵) کے مطابق جن ممالک کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے ان کے علاوہ لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت افغانستان، آسٹریا، بلجیم،،برازیل، بلغاریہ، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، چیکوسلواکیا، مصر، ایتھوپیا، فن لینڈ، گھانا، عراق، جمائیکہ، اردن، کوریا، میکسی کو، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، نائیجیریا، پیراگوا، پیرو، فلپائن، ہالینڈ، پرتگال، رومانیہ، سعودی عرب، سینی گال، اسپین، سوئیڈن، سوئیزرلینڈ، تھائی لینڈ، تونیسیہ، یوگینڈا، یونوگوا، وینزولا، یوگوسلاویہ اور زیمبیا شامل ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

42. Ray, Nihar Ranjan. Report of the Director-Organiser on the Working of the Special Graduate Course of Training in Librarianhsip. April-July 1954. quoted in Anis Khurshid. Standards for Library Education. ref.56, p. 320

۴۳۔ اشرف علی۔کتب اور کتب خانوں کی تاریخ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،
۲۰۰۲ء) ، ص ۳۳۹۔۳۴۱

44. International Encyclopedia of Information and Library Science/ed. by John Feather and Paul Sturges.- (London: Routledge,1997) , p.175

45. Sharma, Jagdish Saran. Libray Movement in India. ref. 20, p.5

46. Dickinson, Asa Don. Punjab University Library Training Class of 1915-1916: Extracts from the Diary. PLA Journal. 2 (2): 71-71, April 1968

47. Haider, Syed Jalaluddin. 'Educating Future Librarians in Pakistan. a library educator's perspective'. Education for Information.16 : (1998), 30

48. Qarshi, Afzal Haq. 'Dr. A. C. Woolner: An Architect of Department of Library Science, University of the Punjab Lahore'. Pakistani Librarian. no.3, (1997.), 9

49. Anwar, Mumtaz A. 'Asa Don Dickinson: the Founding Father of Modern Librarianship in British India'. Pakistan Library Bulletin. 21 no.2 (June 1990):18

50. Sharma, Jagdish Saran. Libray Movement in India. ref. 20, p.139

51. Ibid., p.5

52. Reddy, K. Siva and K. Somasekhara Rao. Library and Information Sciene Eduation in India: A Case for need based Curriculum Development. quoted in N. Guruswamy Naidu. Librarianship in Developing Countries. (New Delhi: Ess Ess Publications,1992) , p.182.

53. Web Site: http://members.rediff.com/vidyarthi/dlishome.htm (Accessed Dec. 25, 2004)

54. Indhrah Ghandi National Open Univerissty. Web Site: http://www.ignou.ac.in/ (Accessed Dec. 25, 2004)

۵۵۔ سنگھ ، رام شوبھت پرساد، حوالہ ۲۶، ص۔ ۱۲۰

56. Anis Khurshid. "Standards for Library Education in Burma,Ceylon, India and Pakistan". (Ph.D dissertation, USA: Pittsburgh,1973), pp.378-79

57. Web Site: http://www.slis.keio.ac.jp/index.html (Accessed Dec.25, 2004)

58. Web Site:http://www.surugadai.ac.jp/faculty/cir/ (Accessed Dec.25,2004)

59. Web Site : http://www.slis.tsukuba.ac.jp/inst/ (Accessed Dec.25, 2004)

60. Web Site: http://www.is.s.u-tokyo.ac.jp/ (Accessed Dec.25, 2004)

61. Web Site: http://www.fsktm.um.edu.my/ (Accessed Dec.25, 2004)

62. Web Site: http://dept.daejin.ac.kr/

djlis/main.htm (Accessed Dec.25 2004)

63. Web Site:

http://www.ewha.ac.kr/ewhaeng/school/sch_aca_03_04.htm

(Accessed Dec.25, 2004)

64. Web Site: http://www.kangnam.ac.kr/eng/c/c3_a.htm

(Accessed Dec.25,

2004)

65. Web Site: http://kmlis.keimyung-c.ac.kr/ (Accessed Dec.25, 2004)

66. Web Site: http://www.kongju.ac.kr/en/sub02_fr01_02.html (Accessed Dec.25, 2004)

67. Web Site: http://lis.kku.edu/ (Accessed Dec.25, 2004)

68. WebSite:http://www1.mju.ac.kr/my2001/english/college/human/human6.htm (Accessed Dec.25, 2004)

69. Web Site:http://mis.pusan.ac.kr/pnu/english/New/subpages/sub5/col_02_05.htm (Accessed Dec.25, 2004)

70. Web Site: http://www.silla.ac.kr/eng/admission.htm (Accessed Dec.25, 2004

71. Web Site: http://slisnet.skku.ac.kr/ (Accessed Dec.25, 2004)

72. Web Site: http://lis.yonsei.ac.kr/ (Accessed Dec.25, 2004)

73. Weeb Site: http://www.db.dk (Accessed Dec.25, 2004)

74. Web Site: http://syy.oulu.fi/kil.html (Accessed Dec.25, 2004)

75. Web Site: http://www.ucd.ie/

lis/index.html (Accessed Dec.25, 2004)

76. Web Site: http://www.aldus.unipr.it/ (Accessed Dec.25, 2004)

77. Web Site: http://bilon.miks.uj.edu.pl/index.html (Accessed Dec.25, 2004)

78. Web Site: http://www.his.uni.torun.pl/en/deplibais/deplibais.html (Accessed Dec.25, 2004)

79. Web Site: http://www.ibi.uni.wroc.pl/indexen.html (Accessed Dec.25,2004)

80. Web Site: http://www.kgaki.kcn.ru/cpec1.htm (Accessed Dec.25, 2004)

81. Web Site: http://msuc.edu.ru/binf.htm (Accessed Dec.25, 2004)

82. Web Site: http://sites.huji.ac.il/slais/libschl.htm (Accessed Dec.25, 2004)

83. Web Site: http://www.is.biu.ac.il/ (Accessed Dec.25, 2004)

84. Web Site: http://lib-stu.haifa.ac.il/English/ (Accessed Dec.25, 2004)

85. World Guide to Library Schools and Training Coruses in Documentation.

: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 5

(1915-2015)

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے)
فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی
گزشتہ سے پیوستہ
پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم، تربیت اور تحقیق

پاکستان ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ''ڈکنسن لا ئبریری اسکول'' وقتی طور پر بند ہو چکا تھا۔اس وقت پاکستان میں موجود کتب خانوں کی حالت انتہائی ابتر تھی ، ملک میں لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا کوئی ادارہ موجود نہ تھا۔پنجاب لائبریری اسکول کے علاوہ تمام کے تمام لائبریری اسکول اور لا ئبریری سائنس کی تربیت کے مراکز ہندوستان میں ہی قائم تھے۔ڈاکٹر رنگا ناتھن (۱۸۹۲ء ۔ ۱۹۷۲ء) جنہیں ہندوستان لائبریرین شپ کے بانی ہونے کا اعزاز حاصل ہے' کی لائبریری خدمات کا دائرہ صرف ان

علاقوں تک محدود رہا جو تقسیم ہند کے نتیجے میں بھارت کا حصہ بنے۔ اس صورت حال میں پاکستان میں دیگر شعبوں کی طرح لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ابتدا سے شروع ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرکے آنے والے لائبریرین شپ کے پیشے سے وابستہ شخصیات نے مکمل خلوص، عقیدت محنت اور جذبے کے ساتھ ملک میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی عملی جدوجہد کی۔ انہوں نے از خود لائبریری انجمنوں کے تحت لائبریری سائنس کی تربیت کے کورسیز کا اہتمام کیا ساتھ ہی حکومت اور جامعات کو بھی اس جانب مائل کیا کہ وہ بھی اس شعبہ کی ترقی اور فروغ کے اقدامات کرتے ہوئے لائبریری سائنس کو اپنے نصاب میں شامل کریں۔ ڈاکٹر انیس خورشید کے مطابق ان لوگوں میں جنھوں نے ملک میں لائبریری تعلیم کی روایات کو از سر نو تعمیر کی'' منزل سے ہمکنار کیا ان میں سید ولایت حسین، خواجہ نور الٰہی اور عبد الصبوح قاسمی پنجاب لائبریری اسکول سے تربیت حاصل کر چکے تھے)، عبدالمعید (رنگا ناتھن کے تحت دہلی لائبریری اسکول کے فارغ التحصیل تھے)۔ جمیل نقوی مرحوم (کے ایم اسد اللہ کی امپیریل لائبریری کلاس میں شامل تھے'' (۸٦)۔ ان شخصیات کے علاوہ فضل الٰہی مرحوم (لندن اسکول سے ڈپلومہ حاصل کر چکے تھے)، عبدالرحیم خان (B.L.S.) ٹورنٹو، الحاج محمد شفیع (بانی رکن انڈین لائبریری ایسوسی ایشن) اور الطاف شوکت اُن شخصیات میں سے تھے کہ جنھوں نے پاکستان میں لا

ئبریری تعلیم وتربیت کی داغ بیل ڈالی۔ امپیریل لائبریری کلکتہ کے سابق لائبریرین، انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے بانی سیکریٹری اور لائبریری ایسوسی ایشن لندن کے فیلو خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ خان (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۴۹ء) ، نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی۔ خان بہادر ہندوستان لائبریرین شپ کی ایک اہم شخصیت تھے، ان سے بے شمار امیدیں وابستہ تھیں، حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کو وزارت تعلیم میں افسر بکار مقرر کر لیا گیا تھا لیکن موت نے آپ کو(Officer on Special Duty) خاص مہلت ہی نہ دی اور آپ ۱۹۴۸ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کی تحریک میں لائبریرین شپ کے علاوہ بعض شخصیات (جو تعلیم اور کتب خانوں سے والہانہ لگاؤ رکھتی تھیں) کی خدمات بھی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی سرپرستی میں جامعہ کراچی میں پہلا پوسٹ گریجویٹ لائبریری اسکول قائم ہوا جسے پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں ہمیشہ ایک منفرد مقام حاصل رہے گا، پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین مرحوم جنھوں نے ہمیشہ اس پیشے کی سرپرستی کی اور پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (۱۹۵۷ء) کے تاسیسی صدر ہونے کے علاوہ اپنے انتقال تک ملک میں کتب خانوں کے قیام، ترقی اور فروغ کی جدوجہد میں لائبریریز کی رہنمائی

اور سرپرستی کرتے رہے۔ پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور لائبریری تحریک کے فروغ میں حکیم محمد سعید شہید کی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ آپ انجمن فروغ و تر قی کتب خانہ جات (Society for the Promotion and Improvemnt of Libraries, SPIL) کے تاسیسی صدر (۱۹۶۰ء۔ ۱۹۹۸ء) ہونے کے ساتھ ساتھ ملک میں کتب خانوں کی ضرورت، ترقی، فروغ اور لائبریرین شپ کے پیشے کی اہمیت کا بہ خوبی ادراک رکھتے تھے۔ ہمدرد

یونیورسٹی میں بیت الحکمہ (لائبریری) جو بجا طور پر ایشیا کا ایک عظیم کتب خانہ ہے کا قیام کتب خانوں سے آپ کے والہانہ محبت کا عملی ثبوت ہے۔ ہمدرد یونیورسٹی میں بیت الحکمہ کے زیر اہتمام (SPIL) کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں میں تقریباً ۱۶ کتب خانے، اسپل ملک میں متعدد کتب خانوں کا قیام، قومی نوعیت کے سیمینار، ورکشاپ اور کانفرنسوں کا انعقاد، لائبریری سائنس کی تعلیم اور تربیت کے کورسیز کے اہتمام کے علاوہ آپ نے ہمیشہ لائبریرین شپ کے پیشے کی سرپرستی کی۔

لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت جو ابتدائی سطح (سرٹیفیکیٹ کورس) سے شروع ہوئی تھی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی مختلف پاکستانی جامعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک عام ہو چکی ہے۔ انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تعلیم پاکستان میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں لا

ئبریری سائنس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالمعید (۸۷)، ڈاکٹر انیس خورشید (۸۸)
محمد عادل عثمانی (۸۹)، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری (۹۰)، اور ڈاکٹر جلال الدین حیدر (،
کی تحریریں اس موضوع پر بنیادی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ سجاد الرحمٰن، ڈاکٹر عبد (۹۱
الستار چودھری اور افضل حق قرشی کی مرتب کردہ کتاب (۹۲) لائبریری سائنس کی
تعلیم و تربیت کے بارے میں عمدہ کوشش ہے۔ پاکستان لائبریری سائنس کی تعلیم کے
مدارج حسب ذیل ہیں۔

(Certificate Course)۱۔ سرٹیفیکیٹ کورس

(Post-Graduate Diploma Course)۲۔ پوسٹ گریجویٹ (ڈپلومہ کورس

(Master's in Library and Information Science) ۳۔ ایم اے (لائبریری سائنس

(M Phil/Ph D in Library and Information Science) ۴۔ ایم فل پی ایچ ڈی

(Library Education through Distance System)۵۔ فاصلاتی نظام کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم

(Library Science as an Optional Subject at Intermediate and B. A. level) ۶۔ لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون انٹر اور بی اے میں

(Certificate Courses) سرٹیفیکیٹ کورسز

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں لائبریری سرگرمیوں کی ابتدا ہوئی۔ پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن (۱۹۲۹ء) کو از سر نو منظم کرنے کی ابتدا کی گئی اور اسے مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کا نام دیا گیا لیکن صوبوں کے ادغام کے بعد اسے دوبارہ پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن (Punjab Library Association) بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن نے لائبریری سائنس میں سرٹیفیکیٹ کورس شروع کیا لیکن یہ ایک ہی سال میں بند ہو گیا (۹۳) ۔انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری تعلیم و تربیت کی یہ پہلی کوشش تھی۔ فضل الٰہی مرحوم کورس کے نگراں تھے ۔ ڈاکٹر عبدالمعید پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن کے تحت جاری ہونے والے سرٹیفیکیٹ کورس کے بانی ہونے کے علاوہ اساتذہ میں سے ایک تھے (۹۴)۔اختر صدیقی کے مطابق ''خواجہ نور الٰہی اور محمد امین بھی اس کورس کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب لائبریری اسکول کو سابقہ حیثیت میں بحال کرنے کی کوشش کی گئی ، کورس کی مدت بھی وہی رہی، ۱۹۵۵ء میں اس کورس کو گریجویٹس کے لیے محدود کرکے ڈپلومہ کورس میں بدل دیا گیا یہ کورس ایک سال کی مدت پر مبنی تھا'' (۹۵) اور ۱۹۵۹ء تک جاری رہا جب پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام عمل میں آیا اور پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کا آغاز ہوا۔

کراچی لائبریری ایسوسی ایشن ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی ۔ اس ایسوسی ایشن

نے ۱۹۵۲ء میں لائبریری اسکول قائم کیا، محمد شفیع مرحوم اس کے ڈائریکٹر تھے جب کہ جمیل نقوی مرحوم اور نور محمد خان اساتذہ میں سے تھے۔ چار ماہ کا یہ سرٹیفیکیٹ کورس کراچی میں اپنی نوعیت کا اولین کورس تھا جس نے لائبریرین شپ کو بنیاد فراہم کرنے میں مدد دی۔ ڈاکٹر انیس خورشید، محمد عادل عثمانی اس کورس کے اولین طلبہ میں سے تھے جنھوں نے اپنی صلاحیتوں اور کاوشوں سے پاکستان لائبریرین شپ کو ایک عظیم قوت عطا کی۔ کورس میں داخلے کی بنیاد انٹرمیڈیٹ تھی لیکن میٹرک پاس طلبہ جنھیں کم از کم دو سال کسی بھی لائبریری میں کام کرنے کا تجربہ ہوتا اس کورس میں داخلے کے اہل تھے، ایک سال میں ایک کورس ہی منعقد کیا جاتا، اس اسکول کے کل پانچ سیشن مکمل ہوئے جن میں تقریباً ایک سو سے زائد امیدواروں نے لائبریری کی تربیت حاصل کی (۹۶)۔ ڈاکٹر حیدر کے مطابق ۱۹۶۳ء تک اس اسکول میں داخلہ لینے والے ۲۱۰ طلبہ میں سے ۱۵۱ طلبہ نے کامیابی حاصل کی (۹۷)۔ ۱۹۵۶ء میں پشاور یونیورسٹی نے تین ماہ کے سرٹیفیکیٹ (ریفریشر کورس) کا انعقاد کیا، کورس انچارج ایک غیر ملکی ماہر لا ئبریری سائنس جی۔ ایم کوبل (Gerald M. Coble) تھے، ڈاکٹر عبدالصبوح قاسمی اس کورس کے ایک استاد تھے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیان سابقہ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے تحت بھی سرٹیفیکیٹ کورسیز منعقد ہوئے۔

حواشی و حوالہ جات

86. Anis Khurshid. (Ph. D. dissertation), ref. 56, p.381

87. Abdul Moid. ''Library Education in Pakistan'. PLA Journal. 2 no. 2 (April 1968) : 83-93.

88. Anis Khurshid. 'Library Training in Pakistan'. UNESCO Bulletin for Libraries. 151 (1961): 31-33

89. Usmani, M. Adil. 'Certificate Courses in Library Science.' (Editorial) Pakistan Library Bulletin. 18 nos. 2-3 (June - September 1987)

90. Sabzwari, Ghaniul Akram. 'Library Education and Manpower in Pakistan'. Pakistan Library Bulletin. 4 nos. 3-4, (March-June 1972) : 55-71

91. Haider, Syed Jalauddin 'Library Education in Iran and Pakistan'. ref. 35, pp. 91-106.

92. Sajjadur Rehman, A. S. Chaudhry and Afzal Haq Qarshi. ed., Library Education in Pakistan: Past, Present and Future. (Lahore: PULSAA,

1992) 218p.

93. Qureshi, Naeemuddin. ''Twenty Years of Librarianhsip in Pakistan''. 1947 - 67. Pakitan Library Review. (New Series). 1no.1 (March 1968): 61

94. Usmani, M. Adil. 'Dr. Abdul Moid: A Tribute to the departed soul'. (Editorial). Pakistan Library Bulletin. 15(1-2): March-June 1984.

95. Anis Khurshid. (Ph.D dissertation) , ref. 56, p.381

96. Anis Khurshid. 'Library Trainning in Pakistan'. Pakistan Library Review. no.1 (March 1958) : 37

۹۷۔ حیدر، سید جلال الدین۔ پاکستان میں کتب خانوں کی انجمنیں ترجمہ سید عزیز ، ہمدانی۔ ماہ نامہ کتاب، ۵ نمبر ۱۱۔۲۱ جولائی۔اگست، ۱۹۷۱ء) : ۸)

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 6 :)

(1915-2015)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان "پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار" سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

گزشتہ سے پیوستہ

پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ (P.B.W.G.) کا قیام ۱۹۵۰ء میں عمل میں آیا، ۱۹۵۹ء میں گروپ نے لائبریری اسکول قائم کیا۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۲ء تک انڈر گریجویٹ ڈپلومہ (Diploma in Bibliography and Special Librarianship) کا اہتمام کیا گیا، کورس کی مدت ٦ ماہ تھی ۔سید ولایت حسین شاہ کے مطابق گروپ کی جانب سے یہ ڈپلومہ کورس لائبریری ایسو سی ایشن لندن کی طرز پر شروع کیا گیا تھا (۹۸)۔پہلی کلاس ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی ۴٦ طلبہ نے داخلہ لیا، کورس کا اختتام ١٦ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ہوا، ۲۳ طلبہ امتحان میں شریک ہوئے ۔

کورس کی فیس ۳۸ روپے تھی، اساتذہ کو پانچ روپے فی لیکچر کے حساب سے اعزازیہ دیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کی سفارش پر کورس کا نام تبدیل کرکے 'ہائیر سرٹیفیکیٹ کورس ان لائبریری سائنس (Higher Certificate Course in Library Science) کر دیا گیا(۹۹)۔ یہ کورس تا حال بغیر کسی تعطل کے جاری ہے۔ ۱۹۸۶ء میں حکومت پاکستان کے شعبہ لائبریریز، وزارت تعلیم نے پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ اور اس کے کورس کو باقاعدہ منظور کرلیا(۱۰۰) ۔پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر اسکول کے سرپرست اور ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ایڈوائیزر رہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۲۰۰۴ء تک کورس کے ۵۰ سیشنز ہوئے جن میں کل ۱۳۷۱ امیدواروں نے داخلہ لیا ان میں سے ۱۱۸۶ امیدوار کامیاب ہوئے جن میں ۵۰۲ طلبہ اور ۸۴۴ طالبات تھیں۔ نصاب میں کتاب اور کتب خانوں کی تاریخ، لائبریری آپریشن، درجہ بندی نظری و عملی، کیٹلاگ سازی نظری و عملی، حوالہ جاتی خدمات و انفارمیشن ورک، کتابیات و اشاریہ سازی نظری و عملی شامل ہیں (۱۰۱)۔ نظری امور کے ساتھ ساتھ عملی کام پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں حکیم محمد سعید کی سرپرستی میں 'انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات، اسپل (Society for the Promotion and Improvement of Libraries, SPIL) کے نام سے قائم ہوئی۔ پاکستان لائبریرین شپ کے لئے ایسو سی ایشن کی دیگر خدمات

کے علاوہ انڈر گریجویٹ سطح پر مختلف سرٹیفیکیٹ کورسیز کا انعقاد شامل ہے۔ سوسائیٹی نے اسکول کے کتب خانوں اور ان کے انتظام کے لیے ٹیچرز لائبریریز کی تربیت پر خصو صی توجہ دی اور مختلف کورسیز ملک کے مختلف شہروں میں

منعقد کئے۔ان کورسیز کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سرٹیفیکیٹ کورسیز (SPIL) اسپل

نمبر شمار--- سال----- جگہ---- کورس------ مدت------- تاریخ انعقاد

ا۔------۱۹۶۰ء--- کراچی--- سرٹیفیکیٹ کورس-- ایک ہفتہ---۱۹۶۰ء

(۲۔ ۱۹۶۴ء کراچی سیمینار ایک ہفتہ (۱۴۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۴ء اسکول لائبریریز

۳۔ ۱۹۶۶ء حیدرآباد سرٹیفیکیٹ کورس (ورکشاپ) ا۔ ۲ ہفتہ (۵۔۱۰ ستمبر ۱۹۶۶۔

(ٹیچرز لائبریرین

۴۔ ۱۹۶۶ء سکھر سرٹیفیکیٹ کورس (ورکشاپ) ا۔ ۲ ہفتہ (۱۲۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۶ء ٹیچرز لا

(ئبریرین

۵۔ ۱۹۶۶ء کوئٹہ سرٹیفیکیٹ کورس (ورکشاپ) ا۔ ۲ ہفتہ (۱۹۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۶ء۔ ٹیچرز

(لائبریرین

انجمن نے ان کورسیز کے انعقاد کے بعد لائبریرینز اور ٹیچرز لائبریریز کی رہنمائی اور

سہولت کے لیے لائبریری ہینڈ بک (School Library

نے اسی ہینڈ بک کو (SPIL)۱۹۶۶ء میں (۱۰۲) ، ۱۹۸۲ء میں اسپل (Handbook
اردو زبان میں بعنوان ”اسکول کے کتب خانے: نظم، ترتیب و خدمات“ (۱۰۳)
شائع کیا۔

ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی زیر سرپرستی جامعہ ملیہ ملیر میں جامعہ انسٹی ٹیوٹ آف
کے لیے پاکستان لائبریری(Librarians) ایجوکیشن کے تحت اسکولوں کے لائبریرینز
ایسوسی ایشن کے تعاون سے ۱۹۶۱ء میں لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس شروع
ہوا، ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کورس منقطع رہنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں شعبہ لائبریری
سائنس جامعہ کراچی کے تعاون سے دوبارہ شروع ہوااور ۱۹۷۲ء تک جاری رہا(۱۰۴)
۔

۱۹۶۱ء میں سینٹرل لائبریری بہاولپور نے تین ماہ کا سرٹیفیکیٹ کورس شروع کیا۔
پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن
کو لاہور میں اور ایسٹ (West Pakistan Library Association,WPLA)
(East Pakistan Library پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن
کو ڈھاکہ میں انڈر گریجویٹ سطح پر لائبریری سائنس کی تر(Association,EPLA
بیت کا اہتمام کرنے کی سفارش کی۔ پی ایل اے کی درخواست پر مغربی پاکستان لائبریری
جسے ون یونٹ کے خاتمے کے بعد دوبارہ پنجاب لا (WPLA)ایسوسی ایشن

ئبریری ایسو سی ایشن کا نام دیا گیا تھا نے ۱۹۶۳ء میں
لائبریری سائنس کے سرٹیفیکیٹ کورس کا اجراء کیا (۱۰۵)۔ ۱۹۷۲ء تک سال میں ایک سیشن بعد ازاں سال میں دو سیشن ہونے لگے۔ ۱۹۸۸ء تک یہ اسکول اپنی خدمات کے سال مکمل کر چکا تھا اس دوران اس کے ۴۰ سیشن ہوئے ان میں ۱۲۵۲ طلباء و ۲۵ طالبات نے کورس مکمل کیا ان میں سے ۷۶۴ طلبہ اور ۴۸۸ طالبات تھیں۔ ۱۹۸۳ء میں اس ایسو سی ایشن نے اپنی خدمات کا دائرہ لاہور سے بڑھا کر راولپنڈی اور پھر بہاولپور تک وسیع کر دیا۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۸ء تک اس کے راولپنڈی سینٹر میں ۹ سیشن ہوئے اور کل ۴۶۰ طلبہ نے کورس مکمل کیا ان میں ۲۴۶ طلبہ اور ۲۱۴ طالبات تھیں۔ اس طرح ۱۹۸۸ء تک اس اسکول نے ۲۵ سالوں میں ۱۸۱۲ طلبہ کو لائبریری سائنس کی تربیت دی (۱۰۶)۔ کورس کا نصاب درجہ بندی، کیٹلاگ سازی، کتابیات سازی، انتخاب کتب و ریفرنس ورک، تنظیم و انتظام کتب خانہ شامل ہیں (۱۰۷)۔

سندھ یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے کی ابتدائی کوشش ۱۹۵۰ء میں شروع ہوئی۔ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر اے بی اے حلیم نے ڈی جے سائنس کالج کے پرنسپل پروفیسر اے ایل شیخ کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد لائبریری سائنس کے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس کی ایک اسکیم تیار کرنا تھا۔ یہ اسکیم یونیورسٹی کے کیلنڈر میں موجود ہے

لیکن سندھ یونیورسٹی کے کراچی سے حیدرآباد منتقل ہو جانے کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا(۱۰۸)۔ ڈاکٹر عبدالمعید ۱۹۵۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، ڈاکٹر محمد علی قاضی جو ۱۹۵۴ء میں لائبریری سے منسلک ہو چکے تھے ۱۹۵۵ء میں لائبریرین مقرر ہوئے۔ قاضی صاحب ۱۹۶۵ء میں ایک تین ماہ کا انڈر گریجویٹ کورس ''ماڈرن سر ٹیفیکیٹ کورس'' کے نام سے شروع کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ بقول بیگم ہاشمی 'پہلے سال ۲۰ شاگردوں نے اس کورس میں داخلہ لیا قاضی صاحب خود ایک مضمون 'کتاب اور کتب خانوں کی تاریخ' پڑھانے پر مقرر ہوئے، اس کورس سے قاضی صاحب مطمئن نہ ہوئے ان کی خواہش رہی کہ اس کورس کا درجہ بڑھادیا جائے، ۱۹۶۶ء میں یونیورسٹی کے اعلیٰ حکام نے اس کورس کو بند کرکے اس کی جگہ (Undergraduate Diploma Course in Library Science) جاری کرنے کی اجازت دی اور ہر شاگرد کے لیے بارہویں جماعت پاس ہونا لازمی قراردیا' (۱۰۹)۔ یہ کورس صرف ایک سال جاری رہا۔

حوالہ و حواشی

98. Hussain, S. V. 'Library Education in Pakistan'. Pakistan Library Review.

1 no.4 (Dec.-March 1969) : 22

99. Pakistan Bibliographical Working Group. School of Librarianship,

Prospectus, Course of Studies & Regulations, 1990 onword.

(KarachI:

PBWG, 1990) p.4

100. Pakistan. The Gazette of. , Karachi: Manager Printing

Corporation

Pakistan Press., No. F-2-3/86-PR, Dated 22.12.1986)'

Tuesday, January

13, 1987.

101. Pakistan Bibliographical Working Group. Prospectus,

ref. 99.

102. Muhammad Jahangir and G. A. Sabzwari. eds., School

Library Handbook

(Karachi: Society for Promotion and Improvement of

Libraries, 1966),

115p.

۱۰۳۔ سبزوری، غنی الاکرم۔اسکول کے کتب خانے: نظم، ترتیب وخدمات ۔
کراچی: انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات بہ اشتراک ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۸۲ء))
۱۷۹ص۔،

۱۰۴۔ ڈاکٹر محمود حسین اور تحریک کتب خانہ پاکستان: مجلس مذاکرہ بیاد ڈاکٹر محمود حسین
صدر انجمن کتب خانہ پاکستان، خان مرتبہ صادق،
علی منعقدہ ۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء (کراچی: خورشید نشاں، ۱۹۸۵ء) ، ص ۸۲۔

105. Punjab Library Association (formerly West Pakistan

Library Association).

Certificate in Library Science, Course of Studies
Regulations. 1980
Onword.- (Lahore: Dyal Singh Trust Library, 1980), p. 1

۱۰۶۔ الطاف شوکت ، ڈائریکٹر آف اسکول، پنجاب لائبریری ایسوسی ایشن خط ۲۷ دسمبر ۱۹۸۸ء بنام رئیس احمد صمدانی

107. Punjab Library Association. Course of Studies. ref. 105

108. Abdul Moid. ''Early Days of Library Science Department: Some Reminiscences''. in Anis Khurshid Library Education Across the Boundaries and Culture. ref. 38, p.25.

۱۰۹۔ ہاشمی ،بیگم، "شعبہ لائبریری سائنس اور ڈاکٹر محمد علی قاضی (مرحوم)" ، پاکستان لائبریری بلیٹن ۲۳ نمبر ۴ (دسمبر ۱۹۹۲ء) : ۹

ڈاکٹر اسلم فرخی کا سفر آخر

معروف استاد، ادیب، دانشور، صاحب طرز نثر نگار، خاکہ نگار، شاعر، محقق اور براڈکاسٹر پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی جنہوں نے ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں 23 اکتوبر 1923ء میں آنکھ کھولی تھی کی زندگی کا سورج اردو زبان کو علمی وادبی سرمائے سے مالا مال کرنے کے بعد 93 سال کی عمر میں 15 جون 2016ء،9 رمضان المبارک 1437ھ بروز بدھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ڈاکٹر صاحب کی تدفین انتقال کے اگلے روز 16 جون 2016ء، 10 رمضان المبارک بروز جمعرات ان کی وصیت کے مطابق جامعہ کراچی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ڈاکٹر اسلم فرخی کا وطن ضلع فرخ آباد کا صدر مقام فتح گڑھ تھا جہاں انہوں نے لڑکپن اور جوانی بسر کی۔ قیام پاکستان کے بعد ستمبر 1947ء میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی اس وقت ان کی عمر 24 سال تھی۔انہوں نے جامعہ کراچی سے ماسٹر اور گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد میں لیکچرر کی حیثیت خدمات انجام دینے کے دوران ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1956ء میں ڈاکٹر صاحب کا تقرر اس کالج میں ہوا جو اس وقت سینٹرل گونمنٹ کالج ہوا کرتا تھا۔کالج کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں ڈاکٹر اسلم فرخی پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ اردو کے دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر عبد السلام اور پروفیسر انجم اعظمی شامل تھے۔ ڈاکٹریٹ کر لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تقرر

جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں ہوگیا اور وہ گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم آباد سے جامعہ کراچی منتقل ہوگئے۔ جامعہ میں درس وتدریس کے ساتھ انھوں نے رجسٹرار، شعبہ تصنیف وتالیف کے سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، ساتھ ہی علمی و ادبی سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ ان کے رشحاتِ قلم سے جو علمی وادبی سرمایہ منظر عام پر آیا وہ ہر دو اعتبار سے یعنی تعداد اومعیار کی انتہائی منزل پر ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے سانحۂ ارتحال سے ہم اردو ادب کی ممتاز شخصیت سے محروم ہوگئے۔ڈاکٹر صاحب کا شمار ملک کے ممتاز دانشوروں میں ہوتا تھا۔ وہ استاد، شاعر، صاحب طرز نثر نگار، خاکہ نگار، محقق، نقاد، بچوں کے ادیب اور براڈکاسٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ریڈیو پاکستان سے بہ طور مسودہ نگار چھ سال منسلک رہے، ریڈیو کے لیے فیچر، ڈرامے اور تقریریں لکھیں، ریڈیو سے پروگرام 'روشنی' میں ان کی گفتگو ہر ہفتہ نشر ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا لیکن شاعری ان کی پہچان نہیں تھی بلکہ وہ خاکہ نگار کی حیثیت سے زیادہ معروف ہوئے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں نے خاکہ نگاری میں ڈاکٹر اسلم فرخی سے بہت کچھ سیکھا، اس فن میں مَیں انہیں اپنا روحانی استاد تصور کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا کہنا تھا کہ ان کا اصل حوالہ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی ہیں جن کے

بارے میں وہ چھ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بزرگارِ دین سے غیر معمولی عقیدت ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی خاص بات تھی ۔انہوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا لیکن ان کا زیادہ کام خاکہ نگاری کے حوالے سے ہے۔ ان کی تصانیف میں دبستانِ نظام (نظام الدین اولیا) محمد حسین آزاد۔ حیات و تصانیف، تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار (تدوین)، چاند بی بی سلطانہ، زوجہ وزیر حسن، قتیلؔ و غالبؔ (اسد علی انوری)، اردو کی پہلی کتاب (محمد حسین آزادؔ) نیرنگ خیال (محمد حسین آزادؔ) ، قصص ہند (محمد حسین آزادؔ)، عدائیتہ القرآن (ڈپٹی، نذیر احمد)، نظام رنگ (حضرت سلطان جی کا خاکہ)، گل دستہ احباب (شخصی خاکے) ، لال سبز کبوتروں کی چھتری (خاکے)، (آنگن میں ستارے (خاکے)، فرید و فرید فرید بابا فرید) ، بچوں کے سلطان جی، فرمایا سلطان جی نے، بچوں کے رنگ رنگ امیر) خسرو، بزم شاہد (شاہد احمد دہلوی کی تحریریں)، رونقِ بزمِ جہاں، سات آسمان (سات کلا سکی شاعروں کے ادبی خاکے)، موسم بہار جیسے لوگ (خاکے)، بزم صبوحی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب 'دبستانِ نظام' کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی خاکہ نگاری کو بلاشبہ انفرادیت حاصل ہے۔ ان کے لکھے ہوئے خاکے ہر اعتبار سے زندہ، جاندار اور دل کش ہوتے ہیں، ان میں گہری انسان شناسی ، خلوص ، محبت ، وسعتِ معلومات اور اسلوب کی تازگی نے ان کے خاکوں میں ایک ایسی جان ڈال دی ہے کہ پڑھنے والے پر خوش گوار اثر ہوتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شخصیت سے وہ از خود ملا اور اس سے اچھی طرح واقف ہے۔

ڈاکٹرڈاکٹر اسلم فرخی جامعہ کراچی سے منسلک ہونے سے قبل گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ناظم آباد جو کبھی سینٹرل گورنمنٹ کالج ہوا کرتا تھا میں طویل عرصہ درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے اس کالج میں 12 سال (ریٹائرمنٹ تک خدمات انجام دیں۔ اس سے قبل میں حاجی عبد اللہ(1997-2009 ہارون گورنمنٹ کالج میں 23 برس خدمات انجام دے چکا تھا۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں نے کالج میں رہتے ہوئے بے شمار کام کیے، تقریبات کے انعقاد میں بھرپور شرکت کی، ہم نصابی سرگرمیوں کا نگراں رہا، کالج میگزین کا چیف ایڈیٹر رہا، کالج کے انتظامی امور میں معاونت کرتا رہا۔ 2008 میں کالج کے قیام کو پچاس سال مکمل ہوئے تو کالج میگزین 'روایت' کا گولڈن جوبلی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ ہوا، کالج پرنسپل پروفیسر سید خورشید حیدر زیدی نے میگزین کے چیف ایڈیٹر کی ذمہ داری مجھے سونپ دیں، اس سے قبل 2004 میں بھی میری ادارارت میں 'روایت' کا ایک شمارہ شائع ہوچکا تھا۔ گولڈن جوبلی نمبر میں کالج سے وابستہ سینئر اساتذہ و طلبہ سے مضامین یا ان کے تاثرات حاصل کرنے کا پروگرام بھی تشکیل پایا، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کالج کے ابتدائی فیکلٹی کا ایک اہم حصہ رہ چکے تھے۔ معروف شاعر وادیب پروفیسر سحرؔ انصاری اس کالج کے اولین سیشن کے طالب علموں سے تھے، دونوں سے رابطہ کرنا میرے حصے میں آیا، دونوں احباب سے میں کالج میگزین کے لیے تاثرات لکھوانے

میں کامیاب ہوا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے گھر کا پتہ معلوم کرکے ایک دن میں ان کے گھر پہنچ گیا، ڈاکٹر فرخی سے قربت کی یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے قبل سرسری ملاقاتیں کئی بار ہوچکی تھیں۔ نام بتایا، مدعا بیان کیا، شفقت سے پیش آئے، طے ہوا کہ میں آئندہ اتوار کو حاضر ہوجاؤں ڈاکٹر صاحب بولتے رہیں گے اور مجھے لکھنا ہوگا۔ ایسا ہی ہوا، اتوار کی صبح میں ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچ گیا، ان کے ڈرائینگ روم میں ہم دونوں ہی تھے، اب انہوں نے بولنا شروع کیا اور میں تیزی سے لکھ رہا تھا، طے پایا کہ جو کچھ لکھا ہے اسے ٹائپ کرکے انہیں دکھا دیا جائے، ایسا ہی ہوا، ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو پڑھا اور مجلّہ میں شامل کرنے کی اجازت دی، ڈاکٹر صاحب کے یہ تاثرات کالج میگزین روایت' گولڈن جوبلی نمبر 2008 کے صفحہ 21 تا 24 پر موجود ہیں۔ اسی طرح سحرؔ انصاری صاحب نے بھی اس دور کے اپنے تاثرات تحریر کیے جو کالج میگزین میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے تاثرات میں فرمایا ''میں دسمبر 1956 ء میں اس کالج میں داخل ہوا تھا۔ میں نے کالج میں رہ کر محمد حسین آزادؔ حیات و تصانیف مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ کالج کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں ہے جس میں شریک نہ رہا ہوں۔ لائبریری کا انچارج رہا، کھیلوں کا انچارج رہا، طلبہ یونین کا انچارج رہا غرض یہ ہے کہ بے شمار ذمہ داریاں قبول کیں اور اپنے نذدیک انہیں بڑی کامیابی سے پورا کیا۔ پہلے کالج میگزین کی ترتیب وتدوین بھی میرے ہی

ذمہ رکھی تھی اور یہ میگزین 'المنورہ' کے نام سے شائع ہوا تھا''۔ گورنمنٹ کالج ناظم آباد سے قبل ڈاکٹر صاحب نے ریڈیو پاکستان، ایس ایم کالج میں بھی خدمات انجام دیں۔ گورنمنٹ کالج سے ڈاکٹر صاحب جامعہ کراچی تشریف لے گئے اور وہاں رہتے ہوئے شعبہ اردو میں درس وتدریس کے علاوہ صدر شعبہ، رجسٹرار، شعبہ تصنیف و تالیف کے سربراہ کے فرائض بھی انجام دیے۔ان کی نگرانی میں متعدد ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وفاقی اردو یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔انجمن ترقی اردو پاکستان سے نو سال سے زائد عرصے تک بحیثیت مشیر علمی و ادبی وابستہ رہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات قابل قدر ہیں۔حکومت پاکستان کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کو' صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی' سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کافی عرصہ سے بیماری کی کیفیت میں تھے۔ان کے رحلت کرجانے کی اطلاع انٹرنیٹ پر دیکھی، افسوس ہوا، تدفین اگلے روز طے پائی۔ڈاکٹر صاحب کا گھر گلشن اقبال کے بلاک 5 میں ہے۔ نماز جنازہ ظہر کی نماز کے بعد 'مدینہ مسجد' میں ہونا تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر دیکھا ہوا تھا، میں وقت مقررہ پر ان کے گھر پہنچ گیا۔ بے شمار علمی ادبی ، سیاسی، سماجی شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے احباب موجود تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور ڈاکٹر صاحب اپنے عزیز رشتہ داروں، خاندان کے احباب، علمی و ادبی

شخصیات کے قافلے کے ہمراہ سفرِ آخر پر روانہ ہوئے۔ ان کی آخری منزل جامعہ کراچی کا قبرستان تھی۔ جنازہ بس کے علاوہ بے شمار کاروں کا یہ قافلہ صمدانی اسپتال کے سامنے والی شاہراہ سے گلشن چورنگی، ڈسکو بیکری کے سامنے سے ہوتا ہوا ابوالحسن اصفہانی روڈ پر واقع جامعہ کے آئی بی اے گیٹ سے جامعہ کی حدود میں داخل ہوا اور جامعہ کی خاموش فضاؤں میں منزل مقصود پر پہنچا جہاں پر جامعہ کراچی کے قبرستان میں لحدِ فرمان اپنے ساکن کے انتظار میں اپنا دامن واہ کیے ہوئے تھی۔

رمضان اور گرمی کے باعث جامعہ میں طلبہ کی تعدادِ کم تھی، سڑکیں ویران فضاء غَمگین اور سوگوار تھی۔ سڑکوں کے دونوں جانب کھڑے گم صُم اور ششدر درختوں نے ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید تو کہا مگر حزیں اور دل گرفتگی کے ساتھ، ٹہنیاں جُھک جُھک گئیں، غنچے سہم کر پتوں کی اوٹ میں چھپ گئے، جامعہ کی عمارتیں بھی ملول تھیں ان پر سیاہ بادلوں نے اداسی کی چادر بچھائی ہوئی تھی۔ شعبہ اردو، شعبہ تصنیف وتالیف، ایڈمن بلاک نے اپنے محبوب کو کفن میں ملبوس قافلے کے ہمراہ آخری منزل کی جانب رواں دواں دیکھا تو وہ بھی اپنے باغ باں کا سامنا نہ کرکے رنج والم میں ڈوب گئے۔ کچھ ہی دیر میں قافلہ آئی بی اے، اے ای آر سی، شعبہ فارمیسی، ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کے برابر سے ہوتا ہوا جامعہ کے قبرستان پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے عقیدت رکھنے والے کچھ احباب

پہلے ہی سے قبرستان میں موجود تھے اور قافلے کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ ایک ایسا دارالمقابر ہے جہاں ایک خاص نظم و ضبط ہے، کوئی مکین اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتا یعنی انکروچمنٹ نہیں ہوتی، یہ تو ہم انسانوں کی بستیاں ہیں جہاں کا ہر رہائشی اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کا بس چلے تو اپنے گھر کے سامنے کی گلی یا سڑک کو بھی اپنے گھر میں شامل کر لے۔کاش ہم شہر خاموشاں کے مکینوں سے ہی کچھ سبق سیکھیں۔ اب وقتِ آخر تھا۔ سب لوگ سر جھکائے لحدِ اسلم فرخی کے گرد جمع تھے۔ نم آنکھوں،افسردہ اور بوجھل دل کے ساتھ اپنے ہر دلعزیز استاد، ادب کے قیمتی سرمایے اور ایک شفیق و مہربان بزرگ کے جسد خاکی کو اپنے ہاتھوں آغوش لحد کے سپرد کر رہے تھے ،ڈاکٹر اسلم فرخی کے صاحبزادے ڈاکٹر آصف فرخی جو کٹ کاٹ اور جسامت میں اپنے والد کے مُشابِہہ ہیں استقامت اور حوصلے کے ساتھ اپنے والد کے جسمِ خاکی کو لحد کے سپرد کیے جانے کے عمل میں شریک رہے۔ وہ اس موقع پر صابر و شاکر نظر آئے جیسا کے حکم خداوندی ہے کہ ’ ہر ایک کو لوٹ کر واپس جانا ہے‘۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی موت کا وقت بھی مقرر کر رکھا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر اسلم فرخی کی لحد گلاب کے پھولوں اور پتیوں سے سجادی گئی۔اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسلم فرخی کی 93 سالہ طویل زندگی اختتام کو پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب کی لحد کے انتہائی دائیں جانب ذاکرہ مقبول زوجہ مقبول بٹ شہید کی قبر ہے، دوسری جانب برابر کی جگہ ابھی خالی ہے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی ہی میں وصیت کی تھی کہ ان کی

آخری آرام گاہ جامعہ کراچی کے قبرستان میں ہو، اس کے لیے کئی سال قبل ڈاکٹر صاحب نے متعلقہ وائس چانسلر سے باقاعدہ اجازت حاصل کر لی تھی، ساتھ ہی اپنے برابر والی جگہ اپنی شریک حیات کے لیے مختص کرالی تھی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہ شعر انہی لمحات کی کیفیت کے اظہار کے لیے کہا ہوگا۔

آج اپنے ہی ہاتھوں تجھے مٹی میں دبا آئے
کل تک تیرے جینے کی دعا مانگ رہے تھے

جامعہ کا یہ قبرستان اس اعتبار سے منفرد اور فضیلت لیے ہوئے ہے کہ اس میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والی نامی گرامی شخصیات ابدی نیند سو رہی ہیں۔ ایک جانب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے جسد خاکی کو ان کی لحد کے سپرد کرنے کا عمل جاری تھا، لوگ ٹولیوں کی صورت میں مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا، مجھے وہ تمام اساتذہ یاد آرہے تھے جو میرے زمانے میں جامعہ میں تھے۔ متعدد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب یاد آگئے جو چند قبروں کے فاصلے پر ہی ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے سفر آخر کے قافلے کے ہمراہ میں تین برس قبل ہی میں یہاں آیا تھا۔ ان کے سفر کی داستان بھی قلم بند کی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا انتقال 3اگست 2013ء اور 25 رمضان المبارک کو ہی ہوا تھا۔ یہاں جو اہل علم موجود ہیں میں ان کی قبور مبارک پر حاضری دے چکا ہوں ان میں شعبہ سیاسیات کے استاد پروفیسر

ڈاکٹر رضوان احمد، پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ،پروفیسر ڈاکٹرابوالخیر کشفی، طاہرہ کشفی،پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید ،ڈاکٹر سید شاہد علی رضوی، پروفیسر ڈاکٹر افضال حسین قادری، پروفیسر ڈاکٹر نسیمہ ترمذی، پروفیسر مولانا منتخب الحق قادری، پروفیسر ڈاکٹر سید حامد محمود، پروفیسر ڈاکٹر ریاض السلام شامل ہیں۔یقینا اور بھی ہوں گے ، میں نے جن کی قبروں پر حاضری دی ان کے نام تحریر کردیے ہیں۔ غم و حُزن کی اس کیفیت میں سوچ کا مہور وہ قدآور علمی وادبی شخصیات تھیں جو اس قبرستان میں ابدی نیند سو رہی ہیں ۔ ایک ایک کرکے سب نظروں کے سامنے تھیں۔ ان سب کے لیے دعائے مغفرت کی ۔ میں 1984 میں بھی اس قبرستان میں اپنے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر عبد المعید صاحب کی تدفین کے موقع پر آیا تھا،ان کا انتقال 13 جنوری 1984 کو ہوا تھا۔ آج ان کی یاد بھی اود کرآئی، ان کی قبر پر بھی دعا کی ۔ جامعہ کراچی میں زمین کا یہ چھوٹا سا قطعہ زمین کس قدر مردم خیز ہے کہ جس میں بے شمار اہل دانش علماء، شعراء ادبا، صوفیہ، حکماء آسودہَ خاک ہیں۔مجھے توزمین کے اس مختصر سے ٹکڑے، پر رشک آرہا تھا کہ اس زمین نے کیسی کیسی علمی وادبی شخصیتیں پیدا کیں اور وہ اس کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آسودہ خاک ہیں ۔ کلام مجید کی سورۃ 'طٰہٰ' کی آیت 55 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اسی زمیں میں سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی زمین میں پھر واپس لوٹائیں گئے اور اسی سے پھر دوبارہ تمہیں نکال کھڑا کریں گئے''۔اسی حوالے سے کہاوت

مشہور ہے کہ پہنچی وہی پے خاک جہاں کا خمیر تھا'۔ بیشک ہمیں واپس لوٹ کر جانا ہے۔ یہ شعر اس وقت کی صورت حال کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے ۔

ہجوم سلسلۂ رفتگاں دکھائی دیا
زمین پر ہی مجھے آسماں دکھائی دیا

قبر کی تاریکی ، خوف اور دیگر باتیں اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر صاحب کی لحد ان کے مزاج کے عین مطابق صاف ستھری، کشادہ، روشن اور سادہ سی لگی لیکن کچھ دیر بعد جب اس لحد کے اندرونی منظر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا جائے گا اور دنیاوی روشنی سے تعلق نہ رہے گا یقیناً خدا کی رحمت کی روشنی اُسے منور رکھے گی۔کچھ ہی دیر میں لحد کو اوپر سے ڈھانپ دیا گیا، احباب نے لحد پر مٹی ڈال کر اہل قبر سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا، انجمن ترقی اردو پاکستان جس کی ترقی میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات شامل رہی تھیں کی جانب سے پھولوں کی چادر چڑھائی گئی دیگر ادبی اداروں کی نمایندگی بھی تھی، آرٹس کونسل آف پاکستان کے احمد شاہ صاحب بھی موجود تھے، ،ہماری ویب 'رائیٹرز کلب' کی نمایندگی ،مَیں اس کے صدر کی حیثیت سے کر رہا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر صاحب کا جسد خاکی منوں مٹی تلے چلا گیا۔یوں ہندوستان کے شہر '' لکھنؤ '' سے 23 جنوری1923ء میں شروع ہونے والی زندگی کا دنیاوی اختتام پاکستان کے ایک بڑے شہر کراچی میں 16 جون2016 ء مطابق 10 رمضان المبارک بروز جمعرات کو

ہوا۔

قبر کے گرد کھڑے احباب نے فاتح پڑھی اور ڈاکٹر صاحب کے لیے مغفرت کی دعا کی
واپسی شروع ہوئی ،مَیں اپنی کار میں بیٹھا تو ڈاکٹر صاحب کی قبر نظر آ رہی تھی دل ہی دل،
میں اُن کے لیے ایک بار پھر دعا کی اور خدا حافظ کہا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ استاد قمر
جلالوی کے اس شعر کے ذریعہ کہہ رہے ہوں ۔

شکریہ اے قبر تک پہچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اسی خیال کو مَیں نے اپنی ایک نظم 'شکریہ' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے اس کے دو
شعر ۔

مرقدتک میرے ساتھ آنے والو تمہارا شکریہ
میری خاطر زحمت اٹھانے والو تمہارا شکریہ
ہے اب جو سفر باقی کرلیں گے وہ تنہا ہی ہم
حوصلہ بڑھا کر لحد تک پہنچانے والو تمہارا شکریہ

کہتے ہیں کہ موت العالِم موت العالَم کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس دنیا سے چلے
جانا، دنیا سے ایک عالِم کا چلے جانا ہے۔ عالِم مشکل سے پیدا ہوا

کرتے ہیں۔ یہ یقیناً نقصانِ عظیم ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب بات کہی ہے ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

موت.بر حق ہے ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے رخصت ضرور ہو گئے لیکن وہ ہمیشہ ہماری یادوں میں رہیں گے۔ ان کے علمی و ادبی کارنامے اس دنیا میں رہتی دنیا تک لوگوں کو فیض پہنچاتے رہیں گے۔اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔آمین۔ثم آمین۔

مرنے والے مرتے ہیں فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

(جون2016ء مطابق 13 رمضان المبارک 1437ھ19)

: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 7

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال

(1915-2015)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے

فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔

مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

۱۹۷۲ء میں فیڈرل لائبریری ایسو سی ایشن (Federal Library Association)

، راولپنڈی نے ایک سرٹیفیکیٹ کورس نیشنل سینٹر کے تعاون سے منعقد کیا۔ ۱۹۷۴ء

میں پاکستان امریکن کلچرل سینٹر نے لائبریری سائنس میں تین ماہ کے سرٹیفیکیٹ

کورس کا اجراء کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس (قیام ۱۹۸۵

ء) کے تحت ۱۹۸۸ء میں ''سرٹیفیکیٹ ان لائبریرین شپ

کے پروگرام کا اجراء ہوا یہ ایک انڈر گریجویٹ کورس ہے۔ اس کے ساتھ ہی بی اے ''
لائبریری سائنس جسے یونیورسٹی نے بی ایل آئی ایس کا نام دیا ہے، جامعہ کے تحت ایم
ایل آئی ایس پروگرام بھی شروع ہو چکا ہے۔

۱۹۸۶ء میں حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے محکمہ لائبریریز نے ۶ ماہ کا ایک سر
ٹیفیکیٹ کورس اسلام آباد اور کرچی میں ایک ساتھ شروع کیا، کلاس اپریل ۱۹۸۷ء
میں اسلام آباد میں اور اپریل ۱۹۸۸ء میں کراچی میں شروع ہوئی۔ کورس کے اجراء
کے مقاصد یہ بیان کیے گئے تھے کہ ''حکومت پاکستان کے شعبہ لائبریریز نے کتب خانوں
میں ماتحت پیشہ ورانہ عملے کی کمی پر قابو پانے کے لیے انڈر گریجویٹ سطح پر ایک چھ ماہ
کی مدت کا ایک معیاری لائبریری سائنس کا سرٹیفیکیٹ کورس تشکیل دیا۔ اس سر
ٹیفیکیٹ کے

حامل اسکول اور چھوٹے کتب خانوں میں خدمات انجام دے سکیں گے اور انہیں بحیثیت
لائبریری اسٹنٹ، ٹیکنکل اسٹنٹ، ریفرنس اسٹنٹ، کیٹلاگنگ اسٹنٹ،
کلاسیفیکیشن اسٹنٹ کی حیثیت سے بڑے اور چھوٹے کتب خانوں میں بی پی ایس ۹،
۱۰ یا ۱۲ (BPS-9, 10, 12) میں اپنی تعلیم کی مناسبت سے ملازمت حاصل کر سکیں
گے (۱۱۰)۔ داخلے کے امیدواروں کے لیے تعلیم کی حد میٹرک گریڈ سی یا اس سے زیادہ
کسی بھی لائبریری میں ایک سال کا تجربہ رکھنے والے امیدوار کو ترجیحی بنیاد پر داخلہ
دینے کی ہدایت تھی، ساتھ ہی ہر سیشن میں صرف ۲۵ طلبہ

کو داخلہ دینے کی پابندی بھی تھی۔ نصاب پانچ مضامین معاشرے میں کتب خانوں کا کردار، لائبریری آپریشن، درجہ بندی، کیٹلاگ سازی اور ریفرنس و انفارمیشن ورک پر مشتمل تھا (۱۱۱)۔ یہ کورس ۱۹۸۸ء کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ انڈر گریجویٹ کورسز کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورسز (Post -Graduate Diploma Courses)

پاکستان میں پہلا پوسٹ گریجویٹ لا ئبریری اسکول کر اچی یونیورسٹی میں ۱۰ اگست ۱۹۵۶ء میں یونیورسٹی لا ئبریرین (ڈاکٹر عبدالمعید) کی نگرانی میں جنہو ں نے امریکہ سے تر بیت حاصل کی تھی قائم ہوا (۱۱۲)۔ڈاکٹرعبد المعید کے مطابق نصاب کی تیاری میں ڈاکٹر ڈونالڈ اسمتھ (Dr. Donald Smith)ڈائریکٹر

واشنگٹن یونیورسٹی لائبریریز) جو ان دنوں انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن، کراچی
جو آسٹریلیا کی نیشنل (Mr. L. C. Key) یونیورسٹی کے لائبریرین تھے(، ایل سی کی
لائبریری کے ڈپٹی لائبریرین تھے اور ان دنوں حکومت پاکستان کی دعوت پر کولمبو پلان
کے تحت ملک میں کتب خانوں اور لائبریری تعلیم کی ترقی کی جامع منصوبہ بندی کے لیے
آئے ہوئے تھے) ،نور الصفا، ڈائریکٹر آرکائیوز اینڈ لائبریریز، حکومت پاکستان، ایچ
اے قاضی اسسٹنٹ ڈائریکٹر، آرکائیوز اینڈ لائبریریز، حکومت پاکستان ، نور محمد خان، لا
ئبریرین اسٹیٹ بینک آف پاکستان، جارج بی مور لینڈ (George B. Moreland)
سے مدد لی گئی۔ یہ کورس شام کے اوقات میں کراچی کے سینئر لائبریرینز کے تعاون
سے منعقد ہوا کرتا تھا، (۱۱۳)۔ کورس شروع ہونے کے ایک سال بعد' ایل سی کی'
نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی جس میں لائبریری سائنس کے کل وقتی پوسٹ
گریجویٹ ایک سالہ پروفیشنل کورس کے انعقاد کے لیے دو لائبریری اسکولوں (ایک
دونوں حصوں میں) لاہور اور ڈھاکہ میں قائم کرنے کی تجویز بھی دی (۱۱۴)۔ 'کی
نے لائبریری اسکول کے قیام کے سلسلے میں کراچی کو نظر انداز کیا۔ بقول ڈاکٹر 'Key
انیس خورشید 'کی' نے کراچی یونیورسٹی کے لیے اس کورس کی سفارش نہیں کی اور نہ ہی
کوئی حوالہ دیا حالانکہ وہ از خود کورس مرتب کرنے والوں میں سے ایک تھا(۱۱۵)۔
یہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس بہت ہی محتاط حکمت عملی کے ساتھ اور پیریم ڈینٹن
(J. Periam Danton's کے نصابی مینول

جو یونیسکو کے لیے تیار کیا گیا تھا کی بنیاد پر بنایا گیا تھا (Core Curriculum Manual) ۔ کراچی میں لائبریری اسکول کے قیام اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر لائبریری (۱۱٦) سائنس کی تعلیم و تربیت کے آغاز سے لائبریرین شپ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، اس پیشے سے منسلک لوگوں نے اس اقدام کو اپنے پیشے اور خود اپنے لیے روشنی کی ایک کرن تصور کیا۔ صحیح وقت اور صحیح سمت اُٹھنے والا یہ ایک تاریخی قدم تھا جس کے باعث آج لائبریرین شپ کا پیشہ ایک مضبوط اور تناور درخت بن چکا ہے، لائبریری سائنس کی تعلیم پاکستان کی متعدد جامعات میں اعلیٰ سطح پر دی جارہی ہے اور یہ معیار کے اعتبار سے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے کم نہیں۔ پاکستان لائبریرین شپ کے بانی ڈاکٹر عبدالمعید کا یہ اقدام تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائیگا۔ بقول اشرف "ڈاکٹر عبدالمعید تجربہ کار لائبریرین تھے انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں رنگا ناتھن کی زیر نگرانی جاری ہونے والے لائبریری تربیتی کورس میں بھی شرکت کی تھی اور بعد میں امریکہ کی جامعہ مشی گن یونیورسٹی ۱۹۵۵ء میں (University of Michigan) سے لائبریری سائنس کی ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ ان کے طویل تجربے اور مہارت کی وجہ سے کراچی یونیورسٹی کتب خانوں کی تربیتی کوششوں میں ملک کی دوسری جامعات کے لیے مثالی نمونہ ثابت ہوئی" (۱۱۷) ۔

جامعہ کراچی میں قائم ہونے والا لائبریری اسکول پاکستان کی دیگر جامعات کے لیے بھی فائدہ اٹھایا (Key Report) تقلید کا باعث ثابت ہوا۔ پنجاب اور ڈھاکہ نے جس میں ان مقامات پر کل وقتی لائبریری اسکول قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن پنجاب یونیورسٹی نے اس کے باوجود اپنے کورس کو پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس میں تبدیل کرنے میں تین سال لگائے۔ حالانکہ پنجاب لائبریری اسکول ۱۹۱۵ء میں ہی قائم ہو چکا تھا، قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں سرٹیفکیٹ اور ۱۹۵۵ء میں انڈر گریجویٹ ڈپلومہ شروع کر دیا گیا تھا۔ عبدالرحیم پہلے پاکستانی لائبریرین تھے جنھوں نے ٹورنٹو، کنیڈا سے بی ایل ایس کیا، ان کی کوششوں سے ۱۹ ستمبر ۱۹۵۹ء کو پنجاب یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس کا آغاز ہوا (۱۱۸)۔ بقول افضل حق قرشی ''یونیورسٹی میں ڈپلومہ کورس شروع کرنے کا فیصلہ ۱۹۴۵ء میں ہو گیا تھا لیکن اس پر حتمی طور پر ۱۹۵۹ء میں عمل ہوا'' (۱۱۹)۔ ڈھاکہ یونیورسٹی (سابقہ مشرقی پاکستان) نے بھی ۱۹۵۹ء میں ہی پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس شروع کر دیا تھا۔ پشاور یونیورسٹی لائبریری کا قیام ۱۹۵۱ء میں عمل میں آیا ڈاکٹر عبدالصبوح قاسمی اس کتب خانے کے بانی لائبریرین تھے انھوں نے اسی سال لائبریری میں خدمات کا آغاز کیا۔ گیرالڈ کوبل (Grerald M. Coble) لائبریری ایڈوائزر کے طور پر ریفریشر کورس منعقد کرکے واپس امریکہ چلے گئے یہ کورس پشاور یونیورسٹی میں لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے آغاز کی بنیاد بنا۔ بقول حامد

رحمان، ۱۹۶۲ء میں قمر مرزا کا تقرر لائبریری سائنس کے ڈپلومہ کے آغاز کا باعث ثابت ہوا۔ مقامی اساتذہ کے علاوہ (Mrs. L. Walden) اور (Mr. N. Barron) کی خدمات بھی اساتذہ کے طور پر حاصل کی گئیں (۱۲۰)۔ڈپلومہ کورس کے نصاب کے لیے جامعہ کراچی اور پنجاب کے علاوہ لندن لائبریری ایسوسی ایشن کے پروگرام سے بھی مدد لی گئی۔پشاور یونیورسٹی کے آٹھ سال بعد ۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد علی قاضی مرحوم کی کوششوں سے لائبریری سائنس ڈیپارٹمنٹ کا قیام عمل میں آیا (۱۲۱) ۔ قاضی صاحب کے علاوہ معین الدین خان اور آئی اے ایس بخاری مرحوم شعبہ کے اساتذہ میں شامل تھے (۱۲۲)۔

بلوچستان یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام اور پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس کا آغاز ڈاکٹر افتخار خواجہ، میر حسن جمالی اور مجتبیٰ علی کاظمی کی کوششوں سے ۱۹۸۱ء میں ہوا (۱۲۳)۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام ۱۹۸۳ء میں عمل میں آیا۔کلاس شام کے اوقات میں شروع ہوئی تھی لیکن ۱۹۸۵ء سے یہ کورس کل وقتی ہوگیا اور کلاس صبح کے اوقات میں منعقد ہونے لگی۔ڈاکٹر فاضل خان شعبہ کے بانی چیرمین تھے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ملک کی چھٹی یونیورسٹی ہے جہاں پر لائبریری سائنس کی تعلیم پوسٹ گریجویٹ سطح پر شروع ہوئی ۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان نے بھی لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کا آغاز کر دیا ہے۔

رائج ہے (۱۲۴)۔(BLIS) ۱۹۸۹ء سے پی اے ایف کالج، کراچی میں بیچلر

حوالے و حواشی

110. Pakistan. Government of. Ministry of Education, Department of Libraries. 'Certificate Course in Libray Science: Syllabus'. Islamabad: The Department, n.d. p.63 168.

111. Ibid.

112. Haider, Syed Jalaluddin. 'The Department of Library and Information

Science, University of Karachi: a case study'. Pakistan Library Bulletin.
28 no.2-3 (June - September 1987) : 29
113 Abdul Moid. Early Days of the Library Science. ref. 108 , pp.26-27
114. Key, L. C. Report and Proposals on the Establishment and Improvement of Libraries and Library Services in Pakistan. (Karachi: 1956) (typewritten)
115. Anis Khurshid.'Library Education at Graduate Level in Pakistan:Concerns, Issues and Practices'. PLA Journal. 19 & 20 (Oct. 1996-Oct 1997) : 9
116. Danton, J. Periam. Education for Librarianship. (Paris: UNESCO, 1949), pp.15-24.
۱۱۷۔ اشرف علی، کتب اور کتب خانوں کی تاریخ۔ حوالہ ۴۳، ص۔۳۵۸

118. Hamid Rehman. 'Profile of Library Sciene Departments'. PLA Journal. no. 9. (April 1990) : p. 14

119. Qarshi, Afzal Haq. Development of Curriculum at the University of the Punjab; Dickinson;s contributions and afterwards. in Library Education in Pakistan, ref. 92, p.85

120. Hamid Rehman. Development of library Education at Peshawar University A Descriptive Aaccout., in A Treatise on Libarary and Information Science in Pakistan/ by Sajjadur Rehman. (Lahore: PULSAA, 1990) , pp.120-121

121. Rafia Ahmed Sheikh. Department of Library & Information Science, University of Sindh; an overview. in Hallmarks of Library and Information Services in Pakistan. ref. 138. p.151.

۱۲۲۔ ہاشمی، بیگم، شعبہ لائبریری سائنس اور ڈاکٹر محمد علی قاضی مرحوم۔ حوالہ ۱۰۹،
ص۔ ۹

123. Hamid Rahman. Library Science Education in Universities. in Hallmrks of Library and Iformation Services in Pakistan. Muhamad Asghar, Afzal Haq Qarshi and Syed Jamil Ahmed Rizvi ed. (Lahore: Pubjab University Library Science Alumni Association (PULSAA), 1993), p.157

124. Anis Khurshid. Library Education at Graduate Level. ref. 115, p.14

حضرت علیؓ بن ابی طالب۔21رمضان المبارک شہادت کا دن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ رمضان المبارک میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں لیکن اس بات پر تمام ہی مورخین متفق ہیں کہ خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم جو مصری تھا نے رمضان المبارک کے تیسرے ہفتے کی کسی تاریخ کو حضرت علیؓ پر زہر سے بجھی تلوار سے ایسا وار کیا کہ آپ جاں بر نہ ہوسکے۔ بشیر ساجد نے اپنی کتاب ’ فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ ‘میں مختلف مورخین کے حوالے سے آپ کی شہادت کی جو تاریخیں درج کی ہیں ان کے مطابق محمد ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے حضرت امام حسنؓ کی زبانی رمضان بروز جمعہ 40ھ (25 جنوری 661ء) ، طبری ، میور اور امیر علی کا بھی 17 اس پر اتفاق ہے ، ابن سعد کی دوسری روایت یہ ہے کہ 17 رمضان کو جمعہ کے دن آپ پر حملہ ہوا اور 19 رمضان کو اتوار کے دن وفات پائی، یہی رائے مورخ عمر ابو النصر مصری کی ہے، سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں 21 رمضام تاریخ لکھی مجلّہ نقوش (رسول ﷺ نمبر) کے مضمون نگار راجہ محمد شریف نے لکھا ہے کہ ،
حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی روز جس دن کہ آپ زخمی ہوئے یا اس کے تیسرے ’ دن 20 رمضان المبارک 40ھ کو انتقال فرمایا، ’محسن اعظم و محسنین ‘کے مصنف سید اطہر حسین نے اور ’تاریخ اسلام جلد اول‘ کے مصنف فقیر سید وحیدالدین بھی اس سے متفق

ہیں ، ان سب کے برعکس شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحقیق یہ ہے کہ آپؓ 27 رمضام کو زخمی ہوئے اور 30 رمضان کو بروزیک شنبہ (اتوار) کو فوت ہوئے، ڈاکٹر طہٰ حسین (الفتنتہ الکبریٰ) کا بھی یہی خیال ہے۔ان کے علاوہ بیشتر مورخین نے حضرت علی کی شہادت کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ پر حملہ 19 رمضان کو نمازِ فجر کی نماز کے دوران ہوا اور دو دن بعد یعنی 21 رمضام المبارک 40 ہجری کی صبح آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی عراق کے شہر نجف کی امام علی مسجد میں دفن ہوئے۔

خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ ،آنخضرت محمد ﷺ کے چچیرے بھائی ہی نہ تھے بلکہ آپ نے حضور اکرم ﷺ کی آغوشِ نبوت میں پرورش پائی ۔آپ ﷺ نے بچپن ہی سے علیؓ کو اپنے دامن پرورش میں لے لیا تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیدائش قبیلہ ہاشمی میں 13 رجب المرجب ، بروز جمعہ مطابق 599ء میں ہوئی۔ والد ابو طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی، والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی تھا۔ ابو طالب آنخضرت محمد ﷺ کے حقیقی چچا تھے۔ ابو طالب نے اپنے بیٹے کا نام 'زید'، والدہ نے 'حیدر' اور آنخضرت محمد ﷺ نے 'علی' رکھا۔آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ حضرت علیؓ آنخضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجتہ الکبریٰ کی نگرانی اور سرپرستی میں پل کر جوان ہوئے۔ سعادت اور نصیب کی بات ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نجیب الطرفین ہاشمی تھے، حضرت علیؓ

تین بھائی تھے، عقیل ابن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب اور علی ابن ابی طالب۔
حضرت علیؓ کو یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ وہ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔
جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت محمد ﷺ کو اپنے آخری نبی کے طور پر مبعوث فرمایا آپ ﷺ نے باقاعدہ طور پر اسلام کی دعوت دی تو مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ، عورتوں میں حضور ﷺ کی شریکِ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے اسلام کی دعوت کو قبول کی اور بچوں میں حضرت علی نے لبیک کہا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ رسول اکرم ﷺ پیر کو مبعوث ہوئے اور میں منگل کو ایمان لایا'۔ حضرت علیؓ، وصالِ نبوی تک دامن رسالت سے وابستہ رہے۔ نبی پاک حضرت محمد ﷺ بھی علیؓ کو انتہائی عزیز رکھتے تھے، علیؓ نے بھی اپنی زندگی دامن نبوی سے جوڑے رکھی۔ اس رفاقت اور تعلق نے علیؓ کی زندگی میں نکھار پیدا کردیا تھا، سایہ نبوی میں علم و تربیت کے جو مواقع علیؓ کو حاصل ہوئے اور انہوں نے بھی اس قربت اور تربیت کو اپنے لیے غنیمت جانا۔ آنحضرت محمد ﷺ سے دینی و دنیاوی علم سیکھا، یہ خصوصیت اور مقام صرف علیؓ کے حصے میں آیا، چنانچہ آپ میں بلند پایہ اوصافِ کمالات اور آپ کا دامن تمام آلودگیوں سے بالکل محفوظ تھا۔ مکتب بنوت سے آپ کو فیض حاصل ہونا قدرتی عمل تھا کیونکہ قبول اسلام کے بعد آپ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں منعقد ہونے والے تبلیغی اجتماعات اور جلسوں میں آپ حضور ﷺ کے ہمراہ ہوتے۔ آپ علم کا دریا تھے، قرآن تفسیر، حدیث، فقہ و دیگر علوم پر آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کاتبِ وحی بھی رہے۔ حضرت عبداللہ بن

عباس جو خود بھی عالم تھے نے حضرت علیؑ کی علمیت کے بارے میں فرمایا کہ دس حصوں میں سے خدا نے علیؑ کو نو حصے علم عطا فرمایا اور دسویں حصے میں بھی آپ شریک تھے۔ خود آنحضرت محمد ﷺ نے علیؑ کو علم کا دروازہ قرار دیا۔

حضرت علیؑ پر رسول اکرم ﷺ کا اعتماد، بھروسہ، محبت، پیار اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ آپ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرہؑ کی شادی حضرت علیؑ سے کر دی۔ شادی کے اس بندھن نے علی مرتضیٰؑ کو نبی پاک ﷺ کی قربت اور چاہت میں باندھ دیا۔ فاطمۃ الزہرہؑ سے علیؑ کی چاہت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نکاح کے بعد جب تک فاطمۃ الزہرہؑ حیات رہیں حضرت علیؑ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت بی بی فاطمہؑ سے تین بیٹے حس ابن علی، حسین ابن علی، محسن ابن علی، اور دو بیٹیاں اُمِ کلثومؑ بنتِ علی اور زینب بنت علی تھیں۔ ان میں سے علیؑ کے صاحبزادے محسنؑ کم عمری میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ فاطمۃ الزہرہ اور حضرت حسنؑ 'جنت البقیع' میں آرام فرما ہیں۔ راقم الحروف کو متعدد بار جنت البقیع میں اہل قبور کے قبروں پر حاضر ہونے فاتحہ اور سلام عرض کرنے کا شرف حاصل ہوا، بی بی فاطمۃ الزہرہ کی قبر مبارک پر بطور خاص حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جنت البقیع میں کیسی کیسی متبرک و محترم ہستیوں کی قبور کس حال میں ہیں سب جانتے ہیں، وہاں قیاس کی بنیاد پر اور عام لوگوں کو کہتے سنتے ہیں کہ یہ قبر فاطمہؑ کی ہے، یہ حسنؑ کی ہے، یہ

عثمانؓ کی ہے ، یہ حضور ﷺ کے ننھے بیٹے ابراہیم کی ہے، شروع ہی میں اندر کی جانب حضرت عائشہ صدیقہؓ آرام فرماں ہیں۔ کس عقیدے کو صحیح جانیں کس کو درست اور کس کو غلط۔ قبروں کی ظاہری حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ امام حسینؓ واقعہ کربلا کے حوالے سے تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کا مرحلہ آیا تو آنحضرت محمد ﷺ اپنے رفیق حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ عازمِ مدینہ ہوئے ، مکہ میں امانتوں کے حوالے سے آپ ﷺ پر کچھ ذمہ داریاں تھیں انہیں انجام دینے کے لیے آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کا ہی انتخاب کیا، آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ہدایت کی کہ ہجرت کی شب آپ ﷺ کی چادر اوڑھ کر آپ ﷺ کے بستر پر سو جائیں ، صبح لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ تشریف لے آئیں۔ مکہ میں یہی وہ رات تھی جب کہ کفار نے آنحضرت ﷺ کو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ کر آپ ﷺ کی جان کو نقصان پہنچانے کا پروگرام تشکیل دے رکھا تھا، اس کے لیے وہ غار ثور تک حضور ﷺ کی تلاش میں گئے جہاں پر آپ ﷺ اپنے ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ موجود تھے ، لیکن کفار آپ ﷺ تک نہ پہنچ سکے۔ کفار دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ، وہ تو محمد ﷺ کے انتظار میں تھے کہ آپ ﷺ کب فجر کی نماز کے لیے اپنے کمرہ مبارک سے نکلتے ہیں اور وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے لیکن کفار کی تمام تر حکمت عملی ناکام ہوئی، حضرت علیؓ نے رات حضور ﷺ کے بستر پر گزاری صبح ہو کر وہ تمام امور انجام دیے جو آپ ﷺ نے

علیؓ کے سپرد کیے تھے۔ بعد ازاں علیؓ بخیر و عافیت مدینہ چلے گئے۔ اب علیؓ کی مدنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، مکی زندگی کے تجربات اور آنحضرت ﷺ کی سرپرستی میں علیؓ نے ایک بہ ہمت،،برد بار، فرض شناس، بہادر، نڈر ہونے کے ساتھ حکمت، فصاحت و بلاغت اور شعر وخطابت میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ آپ نے بچپن سے دامن نبوت میں پروش اور تعلیم و تربیت پائی، جوانی میں شرف و صاہرت سے سرفراز ہوئے اور وصال نبوی تک دامن رسالت سے وابستہ رہے۔ چنانچہ آپ میں بلند پایہ اوصاف کمالات اور آپ کا دامن تمام طرح کی آلودگیوں سے بالکل محفوظ تھا۔ مکتب نبوت سے آپ کو فیض حاصل ہونا قدرتی تھا کیونکہ قبول اسلام کے بعد آپ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں منعقد ہونے والے اجلاسوں اور اجتماعات میں ہر چھوٹی بڑی تبلیغی محافل میں آپ ﷺ کے ہمراہ ہوتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے جو خود بھی عالم تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی علمیت کے بارے میں فرمایا ہے دس (۱۰) حصوں میں سے خدا نے علی کرم اللہ رجہ' کو نو حصے علم عطا فرمائے اور دسویں حصے میں بھی آپ شریک تھے۔ خود حضور پر نور نبی دو عالم محمد مصطفےٰ ﷺ نے آپ کو علم دروازہ قرار دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدنی زندگی ہمیں مکی زندگی سے زیادہ متحرک اور سرگرم نظر آتی ہے۔ یہاں بھی علیؓ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال ہی کفارِ مکہ اور دیگر کفار سے چپقلش شروع ہو گئی

اور نوبت جنگوں تک پہنچی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام غزوات میں اور آپ ﷺ کے وصال کے بعد اپنی شہادت تک تمام جنگوں میں کفار کے ساتھ عملی طور پر شرکت کی اور اپنی بہادری، حکمت عملی کے جوہر کا اظہار کیا۔ غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق میں علی مرتضٰی نے دشمنوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی 6 ہجری میں صلح حدیبیہ کے معاہدے کی عبارت تحریر کی، اگلے ہی سال 7 ہجری میں خیبر فتح ہوا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بنیادی کردا تھا، 8 ہجری میں آپؓ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں شریک تھے، فتح مکہ کے روز آپؓ نے آنحضرت ﷺ کے ہمراہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تمام بتوں کو توڑ کر گرادیا۔ اسی طرح غزوۂ حنین میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جواں مردی اور بہادری سے کفار کے رو برو اپنی بہادری کو دب دبہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، یہاں تک کہ دشمن کو الٹے منہ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ تبوک کا واقعہ 9 ہجری میں پیش آیا، اس میں علیؓ مسلمانوں کے لشکر کا حصہ نہیں تھے اس لیے کہ آنحضرت ﷺ نے از خود آپؓ کو اپنے نائب کے طور پر مدینہ میں چھوڑ دیا تھا۔ المختصر یہ کہ کفار کے ساتھ مقابلے کا سفر جو جنگ بدر سے آنحضرت ﷺ کی زندگی میں شروع ہوا تھا غزوہ حنین پر اختتام پذیر ہوا یہ سفر حضور ﷺ کی زندگی کا آخری سفر تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام غزوات میں اپنے پیارے نبی ﷺ کے شانا بہ شانہ دکھائی دیتے ہیں۔

اعلانِ برات یعنی اس بات کا اعلان کہ کفار و مشرکین پر کعبہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کا اعلان بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہزاروں کفار و مشرکین کی موجودگی میں کیا جب کہ اس موقع پر مسلمان صرف تین سو تھے۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح سے پیش آیا کہ سن 9 ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی سربراہی میں تین سو مسلمانوں پر مشتمل قافلہ حج بیت اللہ کے لیے مکہ روانہ کیا۔ گویا ابو بکرؓ امیر حج تھے۔ قافلے کے روانہ ہو جانے کے بعد سورۃ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے احکامات اور کفار اور مشرکین کا خانہ کعبہ میں داخلہ ممنون قرار دینے کا حکم صادر فرمایا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے مکہ روانہ کیا کہ وہ حج کے اجتماع میں حکم خداوندی کا اعلان کریں۔ چنانچہ حج کے موقع پر ایک جانب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مسلمانوں کو حج کی تعلیم اور مسائلِ حج سے آگاہ کیا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حج کے موقع پر سورۃ توبہ کی پہلی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں جن میں کہا گیا تھا کہ آیندہ سال سے کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا اور جن مشرک قبائل کے مسلمانوں سے معاہدے ہیں وہ چار ماہ کے بعد ختم ہو جائیں گے۔ کفار اور مشرک اس اعلان پر ششدر رہ گئے اُس وقت سے آج تک خانہ کعبہ میں کوئی غیر مسلم داخل نہیں ہو سکتا۔ جب ہم مکہ کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو گیٹ کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہے ”غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے“۔

غزوات کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مختلف اوقات میں کفار اور مشرکین کی سرکوبی اور تبلیغ اسلام کی غرض سے مسلمان دستوں کے سربراہ کی حیثیت سے بھی بھیجا جاتا رہا جیسے بنی سعد کے مقابلے کے لیے فدک ایک دستہ بھیجا گیا، یمن میں ہمدان کی جانب ایک دستہ بھیجا گیا جس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ حجتہ الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے آپ وہاں سے سو اونٹ ساتھ لے کر یمن سے مکہ پہنچے۔

واپسی پر غدیر خم جو اب رابغ کہلاتا ہے کے مقام پر آپ ﷺ نے پڑاؤ ڈالا اور ایک خطبہ دیا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ 'میں جس کا مولا ہوں، علیؓ بھی اس کے مولا ہیں، جو علیؓ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔اے اللہ ! جو علیؓ سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت رکھ'۔ اس خطبے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس خطبے میں علیؓ کی تعریف کی وجہ اس لیے پیش آئی کہ کچھ لوگوں حضرت علیؓ کے بارے میں غلط قسم کی باتیں کہنے لگے تھے۔

آنحضرت محمد ﷺ کا وصال 12 ربیع الاول 11 ہجری کو ہوا، آپ ﷺ کے قریبی عزیزوں نے تجہیز و تکفین میں شرکت کا شرف حاصل کیا ان سب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ یہ شرف بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا کہ انہوں نے آپ ﷺ کو قبر اطہر میں اتارا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ

اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا دنیاوی ساتھ اختتام کو پہنچا۔ وصالِ نبی ﷺ کے بعد مسلمانوں میں جو کیفیت برپا ہوئی وہ ایک لازمی امر تھا۔ خلافت کا تاج رفیق اور دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سر سجا دیا گیا، علیؓ تو نبی ﷺ کے تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ تھے انھوں نے ابو بکر صدیق کے انتخاب کو نہ صرف قبول کیا بلکہ واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ 'آپ کو یعنی ابو بکر کو نبی کریم ﷺ نے نماز میں مقدم فرمایا، اب کون سی ہستی آپ کو موخر کر سکتی ہے'۔ خلیفہ اول کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ دوم منتخب کیا گیا اس موقع پر بھی علیِ مرتضیٰؓ نے خندہ پیشانی سے خلیفہ کے انتخاب کو لبیک کہا اور حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ہر طرح کا تعاون کیا۔ خلیفہ دوم کے بعد جب خلیفہ سوم کے انتخاب کا مرحلہ آیا اس وقت بھی نبی ﷺ کے فرمانبردار، محبت کرنے والے نے خاموشی کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی بیت کر لی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا آپ کو انتہائی دکھ ہوا۔ تینوں خلفاء کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو تعاون کیا وہ قابل تعریف ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ پر باغیوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا جو تین دن قائم رہا اور مسند خلافت خالی رہی۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی اکابر صحابہ میں ایسی تھی جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ جن میں طلحہ اور زبیر پیش پیش تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی درخواست کی آپ نے ارشاد فرمایا

میں امیر ہونے سے وزیر ہونے کو بہتر سمجھتا ہوں تم جن کو منتخب کروگے میں بھی اس ' کو منتخب کروں گا'۔ لیکن تمام لوگوں نے آپ کی منت سماجت کی اور کہا کہ 'ہم آپ سے زیادہ کسی کو اس کا مستحق نہیں پاتے اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو منتخب کر سکتے ہیں'۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر عذر پیش کیا لیکن لوگوں کے بے حد اصرار پر آپ نے اسے قبول فرمایا اور مجمع عام میں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بیعت خلافت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا پتہ لگانے اور ان کے قتل کا قصاص لینے کا مطالبہ زور شور سے کیا جانے لگا حتیٰ کہ طلحہ اور زبیر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چونکہ ہم نے بیعت اسی شرط پر کی ہے کہ حدود و قصاص جاری و قائم کروگے اس لیے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو ڈھونڈ نکالو اور قصاص لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ جب تک لوگ راہِ راست پر نہ آجائیں اور کُل امور منظم نہ ہوجائیں اس وقت تک ایسا کرنا ممکن نہیں۔ مجھ میں ایسی قدرت نہیں ہے حالانکہ مجھ کو خود عثمانؓ کے حقوق و قصاص کی فکر ہے۔ اس کے بعد قاتلین عثمانؓ کے قصاص کی بابت سرگوشیوں نے آگ کی صورت اختیار کرلی جس کے نتیجے میں جنگِ جمل ظہور پذیر ہوئی جس میں ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ کے ماننے اور کلمہ پڑھنے والے صف آرا تھے۔ جنگ کے اختتام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ از خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ

عنہا کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور پوچھا' اماں مزاج کیسا ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا اچھی ہوں'۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا 'خدا ہم دونوں کو معاف فرمائے'، جنگ کے کچھ عرصے کے بعد حضرت عائشہؓ نے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا 'میرے بچوں یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی اس لیے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی سے کام نہ لینا چاہیے'۔ جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا 'اُم المومنین سچ فرماتی ہیں۔ خدا کی قسم میرے اور ان کے درمیان اس کے علاوہ کوئی بات نہ تھی وہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہارے نبی کی حرم ہیں'۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں سے عبارت دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے شب و روز جنگی تیاریوں اور اندرونی خلفشار کو نمٹانے میں صرف ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کا نظم و نسق کے قیام اور بیرونی فتوحات کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ دراصل آپ کو منصب خلافت جن حالات میں ملا اور جو حالات بعد میں ہوئے ان کا لازمی نتیجہ اسی قسم کا نکلنا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد مملکت کے حالات رفتہ رفتہ بدلتے گئے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت تک حالات بہتر رہے، حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت سے حالات نے منفی رخ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا، آپ کی شہادت نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

کا دور خلافت پریشانیوں، کفار کے علاوہ اپنوں سے نبرد آزما ہونے، جنگیں لڑنے، فتوحات کرنے اور حالات کو بہتر کرنے میں ہی گزرا۔ شدید اختلافات کے اسباب میں بنیادی عنصر حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کی اصل وجہ یہی تھی جس کی وجہ سے دونوں صحابہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئے تھے۔ باوجود اس کے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا دورِ خلافت جنگیں کرنے، شورشوں سے نمٹنے میں صرف ہوا پھر بھی آپ نے نظام خلافت کی اصلاح کی اور انہیں دوبارہ صحیح سمت میں لانے کی بھرپور کوشش کی۔ وقت نے مکمل ساتھ نہ دیا لیکن جہاں تک ممکن ہو سکا آپ نے خلافت کے جملہ نظام کی اصلاح کی پوری کوشش کی۔ مال میں ایسی اصلاحات کیں جس سے آمدنی میں اضافہ ہوا۔ آپ فطرتاً سپاہی، بہادر اور میدان جنگ کے فاتح تھے۔ فوج اور فوجی ساز و سامان کی جانب آپ کی خاص توجہ رہی، عمال اور عمال سے محاصل و فراج کی آمدنی کا سختی کے ساتھ احتساب کرتے، مقررہ وقت سے اگر تاخیر ہو جاتی تو احکام جاری کیا کرتے، تحریری بازپرس کے علاوہ کمیشن مقرر کرکے عمال کے طرز عمل کی تحقیقات کراتے۔ بیت المال کی حفاظت حضرت عمرؓ کے طرز کی تھی۔ زمینوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتے، عمال کو ان کے ساتھ نرمی حسن سلوک کی ہدایت فرماتے، عدل و مساوات میں آپ بے مثال تھے، آپ کے نددیک سب برابر تھے، تمام علوم میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ کلام الٰہی سے آپ کو خاص رغبت تھی۔ کلام اللہ پر آپ کی نظر نہایت وسیع تھی، تفسیر

کی کتابیں اور احادیث کے ابواب تفسیر آپ کی رویتوں سے معمور ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ جن کے فتاویٰ پر فقہ حنفی کی بنیاد ہے آپ کے فیض یافتہ تھے۔ تصوف جیسے دقیق موضوع پر آپ کو مکمل عبور حاصل تھا، آپ کے خطبات فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ فن تحریر کی بنیاد آپ نے رکھی اور ابوالاسود کے ذریعہ نحو کے قواعد مرتب کرائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فطرتاً سلیم تھے، آپ کی ذات خلق نبوی کا پیکر اور تعلیمات اسلامی کی تصویر تھی۔ آپ کے فضائل اخلاق میں سب سے نمایاں زہد تقویٰ ہے، عبادت و ریاضت آپ کی زندگی کا اہم جز تھا۔ آپ امین اُمت تھے۔ اپنے حق سے زیادہ بیت المال سے کچھ لینا حرام تصور کیا کرتے، آپ کی پوری زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ نماز کی حالت میں عبدالرحمٰن ملجم کے ہاتھوں زخمی ہو جانے کے بعد 21 رمضان المبارک کو آپ تریسٹھ سال کی عمر میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ (اتوار 20 رمضان المبارک 1437 ھ، 26 جون 2016ء)

انعام احمد صدیقی۔ شریف النفس انسان

دنیا فانی ہے، جو دنیا میں آیا ہے اُسے موت کا مزاہ لازمی چکھنا ہے۔یعنی ہر چیز کو فنا ہونا ہے سوائے خدا کی ذات کے۔اللہ تعالٰی نے ہر ایک کی موت کا وقت بھی مقرر کر رکھا ہے جو اٹل ہے۔،بڑے سے بڑے ،طاقت ور سے طاقت ور کو بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے یا زندہ رہے، موت پر ایمان اور یقین کامل ہونے کے باوجود بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی موت کا یقین نہیں آتا۔ان کی یادیں برسوں ساتھ رہتی ہیں ۔ایسی ہی ایک شخصیت انعام احمد صدیقی کی بھی تھی ۔ نفیس، ملنسار، کم گو لیکن گفتگو میں بردباری اور علمیت کا اظہار نمایاں تھا۔16 مارچ 2016ء کو اسی سال کی عمر میں آناً فاناً دنیا کو چھوڑ چھاڑ وہاں بسیرا کیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ان کی محبت آمیز گفتگو، صلح جوئی، شفقت آمیزی، عاجزی، انکساری، حسنِ اخلاق اور اخلاص کے سحر سے نکلنا مشکل امر ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ۔

ایک مسافر کے سفر جیسی ہے سب کی دنیا
کوئی جلدی میں کوئی دیر سے جانے والا

انعام احمد صدیقی صاحب سے میرے تعلقات کے متعدد پہلو تھے۔ عمر میں فرق ہونے کے باوجود ہمارے مابین دوستانہ مراسم تھے۔ وہ مجھے رئیس اور مَیں انہیں انعام بھائی کہا کرتا تھا۔ خاندانی معاملات کے علاوہ خاندانی انجمن 'ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن' میں وہ ہمیشہ فعال رہے مجھ سمیت خاندان کے دیگر لوگوں کو فعال ہونے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ انہیں یہ علم تھا کی میرا قلم و قرطاس سے تعلق ہے،کچھ لکھ لیا کرتا ہوں ، کافی عرصہ قبل انھوں نے مجھے خاندان کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میں نے بارہا کہا کہ یہ ممکن تو ہے لیکن خاندان اور خاندان کی انجمن میں مجھ سے زیادہ قابل اور لکھنے والے لوگ موجود ہیں ، بہتر ہے کہ وہ یہ کام انجام دیں، حقیقت یہ ہے کہ میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، وہ عام طور پر ہر پندرہ دن میں ایک بار مجھے ضرور فون کر کے معلوم کیا کرتے کہ کام کہاں تک پہنچا، میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے انہیں ٹال دیا کرتا تھا۔ اس حوالے سے میری رہنمائی کے لیے ایک خاکہ بھی تیار کر کے مجھے دیا جو دراصل مجوزہ کتاب کے مضامین کی فہرست ہے۔اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان کی خواہش کو ان کی زندگی ہی میں پورا کیوں نہ کیا۔اگر یہ کام مجھ سے نہ ہو سکا اور آثار کچھ ایسے ہی ہیں تو اللہ کے گھر جب آمنا سامنا ہوگا تو میں ان کا کیسے سامنا کرونگا۔

انعام بھائی سے اپنی پہلی باقاعدہ ملاقات جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صحیح تاریخ تو ٹھیک یاد نہیں میں نے جب انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1968 میں پاس کر لیا تھا، پڑھنے لکھنے میں سو سو ہی تھا، میٹرک کے نتیجے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ سائنس پڑھنا ہمارے بس کی بات نہیں، میٹرک سائنس کے مضامین کے ساتھ بہ مشکل تمام پاس کیا، بلاوجہ ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ بندہ اپنی اوقات میں رہے، ہر کوئی تو ڈاکٹر، انجینئر یا سائنسداں نہیں بنتا، سی ایس ایس آفیسر آرٹس پڑھ کر عوام پر حکومت کیا کرتے ہیں، استاد کا مرتبہ و مقام سب پر عیاں ہے، دیگر پیشے بھی بہ عزت اور معتبر ہیں۔ چنانچہ ہم نے معاشیات کے ساتھ آرٹس لے لی، کامرس ہمارے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ حساب کتاب سے رغبت ہی نہیں تھی، غالبؔ کو بھی ریاضی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ خواہش بنکر بننے کا تھا، اُس زمانے میں بنک کی نوکری کا بہت چرچا اور چارم تھا۔ چنانچہ انٹر کرنے کے بعد مناسب جانا کہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لی جائے ساتھ ہی شام کے کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی جاری رکھی جائے۔ حصول ملازمت کے لیے صاحبِ اختیار، ردولت کے اعتبار سے نہیں بلکہ عہدے اور مرتبے کے اعتبار سے مراد ہے ساتھ ہی ایسے لوگ جو دوسروں کے کام آنے والے ہوں کی جانب دیکھا جاتا تھا آج بھی یہی صورت حال ہے ۔جب ایسے لوگوں پر نظر دوڑائی جو اس حوالے سے ہمارے کام آسکتے تھے تو اُن میں ایک شخصیت انعام احمد صدیقی کی بھی نظر آئی جو اُس وقت گلیکسو لیبارٹری میں عہدے کا تو علم نہیں لیکن آفیسر

ضرور تھے۔ ایک دن ہم اپنی ملازمت کی درخواست لیے گلیکسو لیبارٹری کے دفتر واقع ڈاکیارڈ روڈ پہنچ گئے، فیکٹری اور دفتر دونوں ایک ہی جگہ تھے، استقالیہ میں نام بتایا، دربان نے صدیقی صاحب کا نام سنتے ہی ہمیں عزت و احترام سے انتظار گاہ میں بیٹھنے کو کہا اور فون پر صاحب کو اطلاع دی کہ کوئی کم عمر نوجوان آپ سے ملاقات چاہتا ہے، نام رئیس بتاتا ہے، دیکھنے میں غریب لگتا ہے۔ صاحب نے ہمارا نام سنا اور گرین سگنل دے دیا۔ آفس میں داخل ہوئے تو ایک بڑے ہال نما کمرے میں بے شمار میزیں اور کرسیاں لگی تھیں، اچھی خاصی تعداد میں لوگوں کی موجودگی کے باوجود خاموشی طاری تھی، لوگ سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ آفیسروں کی میزیں سامنے کی جانب تھیں دیکھنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ صدیقی صاحب آفیسر ہی ہیں۔ اس وقت ان کی شخصیت کے خدو خال کی صورت کچھ اس طرح تھی۔ گورے چٹے، سوٹ بوٹ میں ملبوس، ٹائی لگی ہوئی، صاف شفاف چہرہ، نہ داڑھی نہ موچھ، سپاٹ میدان یعنی کلین شیو، کھڑے نقش، چھوٹی غلافی آنکھیں جن پر موٹے شیشے والا چشمہ لگا ہوا، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، کتابی چہرہ، درمیانہ قد، چوڑا سینہ، متناسب جسم، خوبصورت خدو خال، سنجیدہ طرز گفتگو، دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ، المختصر صورت شکل، وضع قطع، چہرے مہرے سب سے شرافت، تحمل، وضع داری اور معصومیت کا خوشگوار اظہار، یہ تھے 1968 کے انعام احمد صدیقی۔

اُن کی پر کشش شخصیت اور آفیسرانہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے اور سوچا کہ ہمارا کام بنا ہی بنا۔ خیر و عافیت کے بعد بات آگے بڑھی ، تعارف کی ضرورت نہیں تھی ، اُن کے لیے صرف اِتنا ہی کافی تھا کہ ہم انیس بھائی کی پیلوٹھی کی اولاد ہیں۔ ہماری عزت کے لیے یہی کافی تھا۔ خوش اخلاقی سے ملے، مختصر گفتگو کے بعد مدعا بیان کیا، جواب میں انھوں نے کیا کہا اُس وقت ہمارے پلے کچھ نہیں پڑا، اِتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ درخواست دیدی جائے ، وہ کوشش کریں گے۔ بات سمجھ میں نہ آنے کا معمہ یہ ہے کہ انعام بھائی جب گفتگو کیا کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے الفاظ ان کے منہ میں گھوم پھر کر مشکل سے باہر نکل رہے ہیں ، نزدیک ہو کر سنیں تو بات سمجھ میں آجایا کرتی اگر بندہ دور ہوتا تو بس ہاں ہوں ہی کر کے فارغ ہو جاتا ۔ نپے تلے فقرے ایک خاص لہجے میں بولتے اور چپ ہو جاتے، عجیب اتفاق تھا کہ یہاں سیر کو سوا سیر ٹکرا گیا، ہم اُس زمانے میں کم گوئی کا شدید شکار تھے، ہمارے بڑوں نے ہمیں 'چپ شاہ' کا خطاب دیا ہوا تھا۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے ہم نے عافیت اسی میں جانی کے اجازت چاہی جائے ۔ وہ کم گو تھے اور فضول گفتگو کے قائل ہر گز نہ تھے، کام کی بات کیا کرتے لیکن توجہ اور دلچسپی کے ساتھ ۔ انہوں نے کس حد تک کوشش کی یہ معلوم نہ ہو سکا۔ ہمیں اس زمانے میں نوکری نہ مل سکی لیکن ایک بات ہماری زندگی کے لیے جو اچھی ہوئی اور اس کا تمام تر کریڈٹ اپنے والد مرحوم کو دیتا ہوں کہ ہماری تعلیم بغیر کسی رکاوٹ اور وقفے

کے جاری رہی۔ یعنی بی اے کے بعد جامعہ کراچی میں داخلہ لے لیا اور ایم اے کر لیا، ایم اے کا نتیجہ آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ملازمت کے دروازے کھل گئے اور بغیر کسی سفارش کے کالج میں ملازمت مل گئی وہ بھی گریڈ 17 میں، جس کا اختتام ریٹائر منٹ پر گریڈ 19 میں ہوا۔ تعلیم کے تسلسل سے فائدہ یہ ہوا کہ اعلیٰ ڈگری کے حصول کی امنگ پیدا ہوئی، ساتھ ہی قلم اور قرطاس سے ایسا ناتا جڑا کہ ہم اُسی کے ہو کر رہ گئے۔ تعلیم کے حوالے سے دوسرا ایم اے سیاسیات میں اور پھر سوشل سائنسز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی جامعہ ہمدرد سے حاصل کی۔ اچھا ہی ہوا اس قت ملازمت نہ ملی بصورت دیگر ہم کسی اور جانب لگ جاتے، اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

سالوں بعد یہاں بھی سَن تو ٹھیک یاد نہیں، ہاں تیں پینتیس برس اُدھر کی بات ہے انعام بھائی سے خاندانی انجمن 'ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن' کے اجلاس میں ملاقات ہو گئی، بس اب تو ان کا اور ہمارا ٹاکرا اکثر و بیشتر ایسو سی ایشن کی لوکل میٹنگوں سالانہ اجلاسوں میں ہونے لگا جو برسوں پر محیط ہے۔ خاندان میں ہونے والی خوشی ، اور غمی کی تقریبات میں ملاقاتیں اپنی جگہ تھیں۔ ایسو سی ایشن کے حوالے سے مختلف پروگرام ترتیب دیے، اجلاسوں کی روداد کی ترتیب وغیرہ میں انعام بھائی سے تعلقات قریب سے قریب تر آتے گئے۔ 1990 کی بات ہے انعام صاحب ایسو سی ایشن کے صدر تھے۔ اسی سال ایسو سی ایشن نے اپنے

قیام کی گولڈن جوبلی کا انعقاد انہیں کی سرپرستی میں کیا۔ شاندار تقریب شاہد اطہر کے گھر واقع راشد منہاس روڈ پر منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ایسو سی ایشن نے خاندان کا شجرہ بھی شائع کیا۔ خاندان کا شجرہ 1925 میں پہلی بار شائع ہوا تھا 65 سال بعد ایسو سی ایشن اس شجرہ کو 1990 میں دوبارہ شائع کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ اس کے مرتبین مشکور احمد مرحوم اور خالد پرویز مرحوم ہیں۔ انعام احمد صدیقی نے شجرہ کا تعارف 'پیشوائی' کے عنوان سے تحریر کیا۔ انہوں نے شجرہ کی اہمیت، تدوین اور اشاعت پر روشنی ڈالی، انہوں نے لکھ کہ 'یہ حسنِ اتفاق میری خوش نصیبی بھی بن گیا ہے کہ اس شجرہ کو پیش کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح اس کام کی تکمیل پر آپ سب حضرات بھی خوشی و مسرت سے ہمکنار ہوں گے'۔ ایسو سی
ایشن کے قیام کے پچاس سال مکمل ہونے پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا۔

یہاں کچھ باتیں میرے اپنے بارے میں بر سبیل تذکرہ آ گئی ہیں۔ شخصیت نگار یا خاکہ نگار کی یہی ایک کمزوری ہوتی ہے کہ وہ جب کسی شخصیت کو اپنا موضوع بناتا ہے تو اس کا اپنا حوالہ یا تعلق اس میں لازمی آ جاتا ہے۔ شخصیت نگار اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اُس شخصیت کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انعام بھائی سے میرا خاندانی تعلق بہت گہرا اور قریبی ہے۔ اس تعلق کو باہم بننے والے رشتوں نے اور زیادہ قریب اور مضبوط

کر دیا تھا۔ ان سے میرا خاندانی تعلق کچھ اس طرح کا ہے کہ ان کے نانا شیخ عزیز احمد صاحب اور میرے والد مرحوم کے دادا یعنی میرے پر دادا شیخ محمد ابراہیم آزاد حقیقی بھائی تھے۔ بعد میں دونوں بھائیوں کی اولادوں کی باہم شادیاں ہوئیں۔ بہ فضلِ تعالیٰ آزاد صاحب کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں جب کہ عزیز احمد صاحب کے تین بیٹے اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔ آزاد صاحب کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں عزیز احمد صاحب کے دو بیٹوں سے جب کہ عزیز احمد کی تین بیٹیوں کی شادیاں آزاد صاحب کے دو بیٹوں سے ہوئیں۔ یعنی حسین صمدانی کے والد بزرگوار کے حصے میں عزیز احمد صاحب مرحوم کی دو بیٹیاں آئیں۔ انعام صدیقی کے نانا عزیز احمد اور دادا علی احمد جناب نبی بخش کے بیٹے اور آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔ اس طرح خاندانی رشتے داری کے اعتبار سے انعام احمد صدیقی کے نانا اور میرے پر دادا آپس میں بھائی تھے۔ اس خاندان میں باہم شادیاں ہونا خاندانی امتیاز بھی تھا جو بعد میں بھی جاری رہا۔ میرے حقیقی اُم مغیث احمد صمدانی کا عقد ثانی انعام احمد صدیقی کی ہمشیرہ طیبہ خاتون (خاتونِ یثرب) سے ہوا۔ ان کی زوجۂ اول حمیرا صمدانی' عزیز احمد کی پوتی اور حنیف احمد صمدانی مرحوم کی بیٹی اور انعام احمد صدیقی کی والدہ کی بھتیجی تھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ہمارے چچا جناب مغیث احمد صمدانی کی زوجہ اول حمیرا صمدانی کا انتقال ہوگیا، کچھ عرصہ بعد محسوس ہوا کہ اب ان کی تنہائی کو ختم ہونا چاہیے ، اس لیے کہ زندگی کو رواں دواں رکھنا ضروری ہے

انسان آتے جاتے رہتے ہیں۔ تلاش کمیٹی جو ہمارے والد مرحوم اور والدہ مرحومہ پر مشتمل تھی، مغیث صمدانی بھی اس کمیٹی کے خاص رکن تھے کی نظر انعام صدیقی کی ہمشیرہ خاتونِ یثرب پر پڑی، اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہمارے والدین نے مجھے اور عارف احمد صدیقی مرحوم کو یہ ذمہ داری سونپی کہ ہم باقاعدہ جناب انعام صدیقی صاحب کے گھر جائیں اوران کی والدہ محترمہ سے اپنا مدّعا بیان کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم دونوں نے جناب انعام احمد صدیقی سے ان کے گھر جاکر ملاقات کی اور مدعا بیان کیا، مذاکرات کا یہ ابتدائی دور ہمارے اورانعام بھائی کے مابین ہی ہوا۔ رشتہ قبول کر لیا گیا اور حجاب وقبول کے خوشگوار لمحات بخوبی انجام پائے۔ اس نیک کام میں انعام صدیقی کا بنیادی اور مثبت کردار تھا۔ انعام صاحب کی فکر یہ تھی کہ خاندان کے بزرگوں کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے لوگ اپنے بچوں کی شادیاں خاندان ہی میں کریں، وہ اس مقصد کے لیے ایسو سی ایشن کے اجلاسوں میں لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کراتے رہے۔ اس موضوع پر ان کی تحریک پر متعدد بار بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ ایسو سی ایشن کے مرکزی اجلاسوں میں انہوں نے باقاعدہ قرار دادیں پیش کیں، ان کی خواہش یہ تھی کہ یہ کام ایسو سی ایشن کے پلیٹ فارم سے انجام دیا جانا چاہیے۔ 'ینگ مین حسین پوری ایسو سی ایشن' میں انعام صاحب ہمیشہ سرگرم رہے، میں بھی کچھ عرصہ فعال رہا، اس کا سیکریٹری جنرل دو بار رہا جب کہ انعام بھائی بھی اس کے صدر اور دیگر عہدوں پر فائز رہے۔ کچھ سالوں سے میں غیر

فعال ہوگیا تھا لیکن انعام بھائی اس کی سرگرمیوں میں بلاتعطل سرگرم تھے۔

انعام احمد صدیقی کے آباؤاجداد راجپوتانہ (راجستھان) کی ریاست بیکانیر کے مکین تھے، 1088ء میں مشرب بہ اسلام ہوئے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ہمارے اجداد نے دہلی کا رخ کیا اور پھر ہندوستان کے ضلع مظفر نگر کے قصبے 'حسین پور' میں مستقل رہائش اختیار کی۔ اِسی تعلق سے یہ خاندان حسین پوری کہلاتا ہے جو بنیادی طور پر راجپوت ہے۔ شیخ محمد ابرہیم آزآد نے اپنے نعتیہ دیوان 'ثناء محبوب خالق'، طبع شدہ ۱۹۳۲ء میں لکھا ہے کہ 'ہمارے مورث اعلیٰ حضرت دیوان باری بخش علیہ الرحمتہ جو ہندوستان کے ایک حکمراں خاندان سے تھے جو ۱۱۴۸ بکرمی (۱۰۸۸ء) میں مشرب بہ اسلام ہوئے پہلے آپ کا نام بیر بل تھا بعد اسلام لانے کے باری بخش ہوا'۔ خاندان حسین پور کی ایک اور محترم شخصیت محمد حنیف حسین پوری نے خاندانِ باری بخش کے بارے میں تحریر فرمایا کہ 'یہ خاندان روز اول سے کائیتہ سے موسوم ہے اور چونکہ ابتدا سے یہ خاندان بھٹنیر میں رہا اس لیے ایکڑی وال بھٹنا گر کے نام سے موسوم ہوا جس زمانہ میں سلطان محمود غزنوی کا بھٹنیر پر حملہ ہوا (جو اس وقت ریاست بیکانیر ہنومان گڑھ کے نام سے مشہور ہے) اس خاندان کے جد امجد بحالت پریشانی بھٹنیر سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے۔ شہاب الدین شاہجہاں کے دور حکومت میں یہ خاندان دہلی سے ہندوستان کے ضلع مظفر

نگر کے قصبے حسین پور میں آباد ہوا اور حسین پوری کے نام سے معروف ہوا۔

انعام احمد صدیقی کا گھرانہ ہندوستان کے شہر آگرہ میں رہائش پذیر تھا۔انہوں نے میٹرک آگرہ ہی سے کیا۔ حد درجہ پڑھاکو واقع ہوئے تھے۔ اسکول میں داخل ہوئے تو سال میں دو دو کلاسیں پاس کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی بارہ.برس کے ہی تھے اور میٹرک پاس کرلیا۔ آگرہ کے تعلیمی ریکارڈ میں انہوں نے ایک تاریخ رقم کی جس کا چرچہ اس وقت اخبارات میں بھی ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد 1951 میں اس خاندان نے آگرہ سے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کے علاقے پی آئی بی کالونی میں رہائش اختیار کی ۔ بعد میں فیڈرل بی ایریا کو اپنا مسکن بنایا۔ کراچی سے ہی انٹر اور بی کام کے بعد حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ پڑھائی جاری رکھ سکتے چنانچہ گلیکسو لیباریٹری میں ملازمت اختیار کر لی ، ملازمت کے دوران ہی ایم بی اے کیا اور ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدہ پر پہنچے حتیٰ کہ اسی ادارے سے ریٹائرمنٹ بھی حاصل کی ۔ ان کا یہ عمل انہیں مستقل مزاج ظاہر کرتا ہے۔ عام طور پر سرکاری ملازمت میں پینشن کی مقناطیسیت تو ایسا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن نجی اداروں میں کام کرنے والے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں، جہاں دو پیسے زیادہ ملے ، کھٹ اپنی دکان بڑھا لی، مستقل مزاج اور قناعت پسند لوگ ہی نجی اداروں میں جم کر کام کیا کرتے ہیں۔ ہمارے والد صاحب نے پاکستان آنے کے بعد صرف دو نجی کمپنیوں میں کام

کیا وہیں سے ریٹائر ہوگئے۔

وہ اپنے خاندان کے واحد کفیل تھے، یہ خاندان والدین کے علاوہ تین بھائیوں اور چار بہنوں پر مشتمل تھا، ان کے والد نے بھی ملازمت کی لیکن خاندان کی تمام تر ذمہ داری انھی کے کاندھوں پر تھی، افتخار احمد صدیقی اور احترام احمد صدیقی ان کے بڑے اور سوتیلے بھائی تھے جو اپنے اہل و عیال کے ہمراہ کراچی میں ہی رہائش رکھتے تھے۔انعام صدیقی صاحب کی ازدواجی زندگی دیر میں شروع ہوئی جس کی وجہ گھریلو ذمہ داریاں تھیں، ان کی خواہش تھی کہ ان سے پہلے ان کی بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہوجائیں۔ کچھ تساہلی تلاش کمیٹی کی بھی تھی، دراصل قدرت نے ان کی زندگی کا سنجوک ہندوستان کے شہر دہلی جو کبھی دلی ہوا کرتی تھی کی سکونت رکھنے والی کے ساتھ لکھا تھا۔آخر کار سات سمندر پار رہنے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ علی گیرین کو خوب رو نوجوان کے لیے مناسب جانا۔1984ء میں ان کا گھر آباد ہوا، اس وقت وہ 48 بہاریں دیکھ چکے تھے۔دلی اور وہاں کے عظیم شاعر لازم و ملزوم ہیں۔ان کے ذکر کے بغیر دلی کا ذکر ادھورا،ادھورا سا ہوگا، میر تقی میرؔ اردو شاعری کے خدائے سخن جن کے بارے میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے کہا کہ اردو شاعری بھی اگر اپنا خدا رکھتی تو وہ میر تقی میرؔ ہوتے۔ سوداؔ، دردؔ، ذوق، مرزا غالبؔ کی تو بات ہی کیا ہے اور مومن دلی کی آن بان اور شان۔ افسانہ نگار انتظار حسین نے

دلی تھا جس کا نام' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی ۔ بیگم انعام احمد صدیقی کا تعلق' اسی اُجڑے ہوئے دیار سے ہے۔ دلی کے حوالے سے میر تقی میرؔ کی غزل کے چند اشعار ۔

کیا بود و باش پوچھو ہو یورپ کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

علی گیرین خاتون جن کا نام ڈاکٹر فریدہ انعام ہے نے ہندوستان کی سرزمین کو خیر آباد کہا اور انعام صدیقی کے ساتھ ساتھ پاک سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لیا۔ اس تعلیم یافتہ جوڑے کو اللہ نے تین بیٹیوں ثمین، ملیحہ ،اسریٰ اور ایک بیٹے صہیب انعام سے نوازا۔ تہذیب ، شائستگی ، شرافت ، دیانت ، رکھ رکھاؤ تو پہلے ہی اس گھرانے میں موجود تھا علی گیرین خاتون نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیے۔ دونوں نے مل کر اپنے بچوں کی پرورش کی اور انہیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا، تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد اور خوش ہیں، بیٹا کیونکہ آخر میں دنیا میں آیا اس لیے اسے پیچھے ہی رہنا

تھا، وہ ابھی اپنی تعلیم کے اختتامی مراحل میں ہے۔ حمایت علی شاعرؔ کا شعر بچوں کی تعلیم کے حوالے سے انعام بھائی کے جذبات کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

بس ایک کام کیا میں نے زندگی بھر میں
کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

کسی بھی شخص کو سمجھنے، جانچنے، پرکھنے، محسوس کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اہم اس شخص سے قربت، میل ملاقات، راہ و رسم، برے وقت میں اس کا عمل اور رویہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر اس شخصیت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، ہم سفر ہونا بھی کسی شخصیت کو جانچنے کا پیمانہ قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے شاعر ندا فاضلی کے مطابق۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ندا فاضلی کی بات میں سچائی ہے، ان کا اشارہ کس قسم کے آدمیوں کی جانب ہے نہیں معلوم میرا خیال ہے کہ ہر آدمی میں ایک باپ، بیٹا، بھائی، شوہر، چچا، تایا، خالو، ماموں، پھوپا، نانا، دادا وغیرہ کے علاوہ دوست، پڑوسی، آفیسر یا ماتحت وغیرہ بیس ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ رشتے ہوتے ہیں، ہر حیثیت

میں اس کا رویہ اور کردار مختلف ہوتا ہے۔اِنہیں رشتوں سے آدمی اپنی پہچان بناتا ہے۔ اس کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔انعام احمد صدیقی ہر حیثیت میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔بیٹے کی حیثیت سے وہ ایک فرمانبردار بیٹے ، ماں اور باپ کا حددرجہ خیال کرنے والے تھے، بھائی کی حیثیت سے انھوں نے اپنی بہنوں کو مثالی محبت اور شفقت دی ، وہ ایک اچھے اور خیال کرنے والے شوہر ، بچوں سے پیار کرنے والے ان کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسٔر نہ اٹھارکھنے والے باپ،،بڑے بھائیوں کا حد درجہ احترام کیا کرتے، دیگر رشتوں میں بھی توازن قائم رکھا، دوستوں کے دوست، پڑوسیوں نے بھی انہیں مثالی پڑوسی کہا۔ہر ایک سے نرمی، شفقت اور شائستگی سے پیش آنا ان کی شخصیت کا خاص وصف تھا۔ وہ تنہائی پسند ہر گز نہ تھے بلکہ مجلسی انسان تھے، کم گو تھے لیکن جب بھی بولنا سوچ سمجھ کر اور شائستہ انداز سے گفتگو کرنا ان کی عادت تھی۔ ایسے خوش مزاج اور زندہ دل لوگ دنیا میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ تمام تر خوبیوں کے ساتھ ساتھ یقیناان میں خامیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں گے، انسان مجسم اچھا ہی اچھا نہیں ہوسکتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت کی خوبیاں ان کی خامیوں پر حاوی تھیں۔

انعام بھائی سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے کوئی ایک ماہ قبل ہی ہوئی تھی، صلح جوئی ، میل ملاقات ، باہمی رنجش کے خاتمے کی لگن اور جستجو ان میں

کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ میری رہائش گاہ کے ساتھ مقیم میرے چھوٹے بھائی ندیم صمدانی کے گھر اپنے بہنوئی مغیث احمد صمدانی سے ملاقات اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے تھے۔ان کی بیگم بھی ہمراہ تھیں۔اس وقت بھی وہ اچھے نہ تھے،پیشاب کی تکلیف تھی، یورین بیگ لگا ہوا تھا، مقصد نیک تھا اس لیے طویل سفر کرکے بھی کھنچے چلے آئے۔ بڑھاپا تو پھر بڑھاپا ہوتا ہے۔ ان پر بھی بڑھاپہ آچکا تھا۔ اب وہ 1968 والے خوب رو نوجوان نہ تھے ، کمر قدرے جھک گئی تھی، بالوں میں سفیدی آچکی تھی، چہرے پر کمزوری کے آثار نمایاں ، داڑھی میں چاندی، سر پر سفیدی، آنکھوں پر لگے موٹے گلاسوں والے چسمے کے پیچھے سے چُندھیائی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کمزور جسم الغرض بڑھاپا تھا کہ نمایاں ہو رہا تھا۔ غالبؔ نے اپنی آپ بیتی میں اِسی بات کو اس طرح کہا کہ ''جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی''۔کچھ یہی صورت انعام صاحب کی بھی تھی داڑھی و مونچھ میں بھی چاندی نمایاں ہو چکی تھی، گالوں پر چیونٹی کے انڈے بھی نظر آنے لگے تھے البتہ ان کے دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئی تھی، گفتگو کا وہی انداز لیکن نقاہت نمایاں تھی۔ یہ عمر بھی کیا ظالم چیز ہے ، بندے کا حلیہ کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ لیکن یہی تو زندگی ہے، یہی تو اللہ کا نظام ہے ہمیں اسی نظام کے آگے سر جھکا کر صبر و شکر کرتے رہنا ہے۔

ان کی موت کا سبب باتھ روم میں بغرض وضو کرنے جانا بنا،جہاں وہ گر گئے، سر میں شدید چوٹیں آئی اور بیہوش ہوگئے، ڈاکٹروں نے ان کے دماغ کا فوری آپریشن بھی کر ڈالا جو کامیاب نہ ہوسکا۔ موت برحق ہے، مرنا سب کو ہے پر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ انعام بھائی نے خاصی عمرپائی مگران کی جدائی کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے نیک، پرہیزگار، نماز روزے کے پابند، شریف النفس اور وضعدار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ کلام مجید کی تلاوت کی عادت تھی، وہ کلام مجید بہت تیزی سے پڑھا کرتے تھے۔ مجھ جیسا اگرایک پارہ پڑھتا تو وہ چار پارے پڑھ کر یہ جا اور وہ جا۔

میر تقی میرؔ نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا ’پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ‘۔ آگرہ کی مٹی سے طلوع ہونے والا یہ سورج جو 24اپریل 1936ء کو طلوع ہوا تھا 80برس اپنی روشن کرنوں سے اپنوں اور پرائیوں کو فیض یاب کرنے کے بعد کراچی کی سرزمین میں 16 مارچ 2016ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔اب وہ وہاں ہیں جہاں ہم سب کی نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ان کے جدا ہوجانے کا افسوس کبھی ختم نہ ہوگا۔ وہ اب دلوں میں زندہ رہیں گے، ہم ان کی اچھی اور قابل تقلید باتوں سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ بقول شاعر ؎

اور وہ جو دل نواز تھا چلا گیا

ایک سوگواردرد سے رشتہ ضرور ہے

شاعر مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

یٰسین آباد (عزیز آباد) کے قبروستان میں عزیزوں، رشتہ داروں ،پڑوسیوں اور دوستوں کی موجودگی میں انعام بھائی کو قبر کی گود کے سپرد کیا جارہا تھا۔ قبر کے چاروں جانب لوگ اپنا منہ قبر میں ڈالے ہوئے تھے ، بعض بعض کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ مجسم مردے کے ساتھ لحد میں کود جائیں۔انعام بھائی نہائے دھوئے ، نئے کپڑے زیب تن کیے ابدی زندگی کے سفر پر روانہ ہونے جارہے تھے، چند لمحوں میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لحد میں اتار دیا جائے گا۔مَیں بے بسی کی تصویر بنا آخر میں ایک قبر سے ٹیک لگائے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ عمرِ عزیز کی کرشمہ سازی کہیے کہ اب ہم اپنے پیاروں کو لحد میں اتارنے کی رسم میں بھی عملی طور پر حصہ لینے سے قاصر ہو چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ایسے کاموں میں پیش پیش ہوا کرتے تھے۔ چند برس اُدھر کی بات ہے انعام احمد صدیقی کے بڑے بھائی احترام احمد صدیقی کے انتقال پر ہم انہیں غسل دینے میں پیش پیش تھے۔یہ بھی کیا کم شکر ہے کہ پرودگار نے اس قدر ہمت دی کہ انعام بھائی کے سفر آخر میں شرکت ہو گئی اور اس وقت انہیں قبر کی گود میں جاتا دیکھ لیا۔ میرے ذہن میں ان سے مراسم کی ایک فلم چل رہی تھی، ان کے ساتھ گزارے ہوئے

لمحات کو میں ایک ایک کرکے یاد کر رہا تھا۔ اُسی وقت یہ ارادہ بھی کیا کہ انعام بھائی سے اپنے تعلق کو قلم و قرطاس پر منتقل کروں گا۔ وقت گزرتا گیا، مصروفیات آڑے آتی گئیں، ایک دن انعام احمد صدیقی کی ہمشیرہ خاتونِ یثرب جو میری چچی بھی ہوتی ہیں کا فون آیا اور انعام بھائی پر کچھ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لکھنے کے حوالے سے میرے بارے میں جو تعریفی جملے کہے انہیں یہاں نہیں لکھ رہا، اس میں اپنی تعریف کا پہلو آ جائے گا، دو روز بعد ہی شاہد اطہر صاحب کا بھی فون آیا اور انہوں نے بھی انعام احمد صدیقی مرحوم کے حوالے سے لکھنے کی بات کی حالانکہ وہ از خود بھی اچھا لکھتے ہیں اور لکھیں گے بھی۔ اب میں نے لکھنے کی دیگر مصروفیات منسوخ کیں اور انعام بھائی کے بارے میں لکھنے کا منصوبہ بنایا دوسری جانب رمضان المبارک بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس کی بھی برکت شامل حال رہی، ابتدائی روزوں میں ہی یہ تحریر اپنے اختتام کو پہنچی۔ جن احباب کا خیال ہے کہ میں انعام بھائی پر کچھ لکھ سکتا ہوں کے شکریے کے ساتھ اپنی بات کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انعام بھائی کی مغفرت فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب کرے۔ آمین

(12 جون 2016، مطابق 6 رمضان المبارک 1437ھ)

یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا۔اے چاند یہاں نہ نکلا کر

کراچی میں عالمی شہرت یافتہ قوال امجد صابری کا بہیمانہ قتل

اندھیر نگری چوپٹ راج... ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا والی صورت حال نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ ٹکے سیر بھاجی تو کیا ہوگی یہاں تو انسانی جان ٹکے کی بھی نہیں۔ دہشت گرد جب چاہتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں گولیوں کا نشانہ بنا کر خون میں نہلا دیتے ہیں۔ کہنے کو ہم مسلمان ہیں، نمازی بھی، پرہیز گار بھی۔ اس کے باوجود نہ رمضان کا خیال، نہ روزہ کی فکر، نہ یہ خیال کہ ہم جس کی جان لینے جارہے ہیں وہ بھی مسلمان ہے، وہ بھی روزہ سے ہوگا، یہ کیسی فکر ہے، یہ کیسی سوچ ہے، یہ کونسا فلسفہ ہے، کون سا مذہب یہ تعلیم دیتا ہے، کون سا فرقہ، کونسا مسلک یہ کہتا ہے کہ بے گناہ کی جان لے لو، بے قصور کو مار ڈالو ہر اس کو جو آپ سے سیاست میں، عقائد میں، فرقے، مسلک میں یا کسی اور بات میں زرا سا بھی اختلاف رکھتا ہو اسے لہو لہان کر ڈالو۔ دور جانے کی ضرورت نہیں جب سے رمضان شروع ہوئے ہیں کتنے بے گناہ خون میں نہا چکے ہیں۔ ہر ایک ناحق قتل کے بعد وزیر اعظم، وزیر داخلہ، قتل سندھ میں ہو تو سائیں قائم علی شاہ صاحب، پنجاب میں ہو تو چھوٹے میاں صاحب، اسی طرح خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے وزیر اعلیٰ انتہائی ہمدردی کا بیان

جاری فرما دیتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہہ کر مسئلہ پر خاک ڈال دی جاتی ہے کہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لیں۔ نہیں معلوم یہ دم کب نکلے گا، نکلے گا بھی یا نہیں، قاتل کب کیفرِ کردار تک پہنچیں گے۔ کب امن قائم ہوگا، کب دہشت گرد اپنی کاروائیاں بند کریں گے۔

حکیم محمد سعید سے لے کر مفتی شامزئی تک، میلاد النبی ﷺ کے جلسے سے آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچوں تک، نہتے پولس والوں سے لے کر مسلح افواج کے جوانوں تک، پولس وین پر حملے سے پولیو ورکرز پر حملوں تک، زائرین کی بس کو بھون ڈالنے سے لے کر سفورہ چورنگی پر بس حملے تک، ڈاکٹر شکیل اوج سے ڈاکٹر سید وحید الرحمٰن تک، سابق وزیرِ اعظم پاکستان یوسف رضا کے بیٹے کے اغوا سے موجودہ چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ سجاد علی شاہ کے بیٹے اویس شاہ کے اغوا تک اور اب اپنے رب سے چین کی، جینے کی بھیک مانگنے والے، مدینہ کی آرزو کرنے والے، غریبوں کے دن سنورنے کی دعا کرنے والے اور یہ نعت نبوی ﷺ خوش الحانی سے پڑھنے والے کہ ’قسمت میں مری چین سے جینا لکھ دے... ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ لکھ دے، جنت بھی گوارا ہے مگر میرے لیے... اے کاتبِ تقدیر! مدینہ لکھ دے، تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم ہم غریبوں کے دن سنور جائیں گے‘، عالمی شہرت یافتہ قوال اور نعت خواں امجد...

صابری کا کراچی میں بے دردی اور بہیمانہ قتل دہشت گردوں کی جانب سے واضح پیغام ہے کہ وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل

میں ہمہ وقت آزاد اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ انہیں کسی کا ڈر نہیں ، انہیں کسی کا خوف نہیں، جب اللہ کا ہی ڈر نہ ہو تو انسانی عمل سے وجود میں آنے والے پروگرام، قوائد و ضوابط سے ڈر و خوف کیسا۔ آخر کوئی انسانیت کے قاتلوں سے پوچھے کہ امجد صابری کا قصور کیا تھا؟ قوالی یا نعت خوانی اس کے آباؤں اجداد سے چلا آرہا ہے، قوالی کی روایت تو امیر خسرو اور حضرت غریب نواز نظام الدین اولیا کی روایت کے طور پر برصغیر میں برسوں سے رائج ہے۔ اختلاف اپنی جگہ ، اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ جو چیز پسند نہ ہو اسے بے چوں وچرا نیست و نابود کر دیا جائے۔ انسانی جان لے لی جائے وہ بھی رمضان جیسے مقدس مہینے میں۔

حبیب جالبؔ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ' یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا ...اے چاند یہاں نہ نکلا کر ' واقعی یہاں اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں، رسمی طور پر بیانات جاری کرنے کے سوا عمل صفر ہوتا ہے۔ وزیر اعظم صاحب نے لندن میں بیٹھ کر ہمدردی کا بیان جاری کر دیا اور اب امجد صابری کی بیوا اور بچوں کے لیے ایک کروڑ کی امداد کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے ، کیا ایک کروڑ سے ان معصوموں کے غموں کا ازالا ہوگا، کیا وہ یہ رقم وصول کر کے اپنے شوہر اور اپنے باپ کی جدائی کو بھلا سکیں گے، ہر گز نہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ احباب اختیار انتہائی سنجیدگی سے اس ناسور کا مستقل حل

تلاش کریں، اس ناسور کی جڑ تک پہنچا جائے۔ اصل قاتل تو ہماری سرزمین سے کہیں دور موجود ہیں، جب تک ان تک نہیں پہنچا جائے گا، انہیں اس عمل سے دور رہنے کی سعی نہیں کی جائے گی، جب تک ان کے مقاصد میں تبدیلی نہیں آئے گی، ہماری سرزمین میں چھپے ہوئے قاتلوں کو جب موقع ملے گا وہ وار کرتے رہیں گے۔ یہ تو اس بات سے بھی واقف نہیں کہ وہ کسی کو کیوں قتل کر رہے ہیں، اس سے کیا حاصل ہوگا، انہیں تو صرف یہ باور کرادیا جاتا ہے کہ فلاں تمہارا ٹارگٹ ہے اس پر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانا، خون بہانا اور بس، کبھی تو ان کا وار خالی چلا جاتا ہے، کبھی ٹھکانے پر لگ جاتا ہے، اگر کبھی اپنے ٹارگٹ کو نشانہ بناتے ہوئے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ اپنی جان دینے میں لمحہ کی دیر نہیں لگاتے، انہیں تو یہ یقین ہوتا ہے کہ جیسے ہی انہوں نے کسی بے گناہ کی جان لینے کے بعد اپنی جان ختم کی گویا وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے۔ ضرورت اس عمل کو روکنا ہے جس کے لیے ایسی حکمت عملی کی ضرورت ہے جو ٹھوس اور پائیدار منصوبہ بندی پر کی جائے۔

خیبر پختونخواہ کی حکومت نے اپنے حالیہ بجٹ میں مدرسہ حقانیہ جو کہ مولانا سمیع الحق کی زیر سرپرستی چلنے والا مدرسہ ہے کے لیے 30 کروڑ مختص کیے۔ بظاہر ایسا نظر آرہا ہے کہ پختونخواہ حکومت یا عمران خان نے ایسا کرکے گویا شدت پسندی کی حوصلہ افزائی کا قدم اٹھایا اوراب اس حکومتی رقم سے نہ معلوم کتنے

اور طالب تیار ہوں گے۔ عمران خان اور پختونخواہ حکومت پر اس قسم کی تنقید کی جا رہی ہے۔ ایسا کس لیے کیا گیا، مولانا سمیع الحق کی جھولی میں اتنی بڑی رقم ڈالنے کی وجہ کیا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کے مقابلے میں مولانا سمیع الحق کے ہاتھ مضبوط کرنا اور ان کی آشیر باد حاصل کرنا تو نہیں یا کوئی اور چھپا ہوا مقصد جو تا حال سامنے نہیں آیا۔ اس حوالے سے کالم نگار منصور آفاق کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے ان کا کہنا ہے کہ میرے خیال میں عمران خان نے یہ فنڈنگ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے کی ہے۔' اس ادارے کے طلبہ کو معاشرے کا حصہ بنانے کے لیے کی ہے انہیں مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے لیے کی ہے۔ انھیں بنیاد پرستی سے دور رکھنے کے لیے کی ہے۔ انہیں اُن علوم سے روشناس کرانے کے لیے کی ہے جو بند دماغوں کی کھڑکیاں کھولتے ہیں۔ وہاں جب ہر طالب علم کے لیے انٹرنیٹ کی سہولت میسر ہوگی تو اس کی آنکھوں میں روشنی آئے گی۔ وہ جب خوبصورت دنیا کو دیکھے گا تو غور کرے گا کہ ان کی زندگیوں میں خوبصورتیاں کیسے آ سکتی ہیں۔ وہاں کے طالب علم جب مذہبی علوم علاوہ دوسرے علوم بھی پڑھیں گے تو ان کے ذہن میں وسعت پیدا ہوگی اور اس مدرسے میں پڑھ کر دہشت گرد نہیں سچے اور کھرے پاکستانی بنیں گے'۔ کالم نگار کی ان باتوں میں دہشت گردی کا ایک ایسا حل نظر آ رہا ہے جس کی صحیح معنوں میں ضرورت ہے۔ شدت پسند ذہنوں کے ذہن بدلنے کی ضرورت ہے، شدت پسندوں تک پہنچنے کی ضرورت ہے، انہیں اپنائیت کا احساس دلانے کی ضرورت ہے۔ انہیں مار کر یا پکڑ کر جیل

میں بند کر دینے یا انہیں پھانسی دیدینے سے اس مرض کا علاج نہیں ہوگا۔ مرض کی وجوہات معلوم کر کے اس کا علاج کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مولانا سمیع الحق سچے پاکستانی ہیں، وہ دہشت گردی کے حق میں بھی نہیں، طالبان انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے توسط سے اور دیگر ایسی ہی شخصیات کے توسط سے مسئلہ کے حل کی جانب جایا جاسکتا ہے۔ حکومت خصوصاً مسلح افواج پہلے اس مرض کا علاج کرنے میں ضرب عضب جاری کیے ہوئے ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، کراچی کا امن بحال ہوا ہے، روز مرہ کے جرائم میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن دہشت گردی کی کاروائیاں وقفے وقفے سے ہو ہی رہی ہیں۔ ان میں کب اور کس طرح کمی آئے گی یہ وقت ہی بتائے گا۔

امجد صابری سے پہلے بھی کئی اہم لوگ اسی طرح دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ ان کے لیے بھی افسوس ہوا، ماتم ہوا، ہمدردی کے بیانات جاری ہوئے، امداد کا اعلان ہوا، دہشت گردوں کا جڑ سے صفایا کر دینے کے بلند بانگ دعوے کیے گئے، جلسے، جلوس، ٹی وی اینکرز نے ان کے لیے خصوصی پروگرام کیے، کالم نگاروں نے کالم لکھے اور پھر خاموشی طاری ہو گئی، ہر کوئی اپنے اپنے معاملات میں ایسے لگ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ امجد صابری کے لیے بھی یہی کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، یہ غم و غصہ، یہ افسوس اور دکھ کی فضاء بھی رفتہ رفتہ خاموش ہو جائے

گی۔ لیکن امجد صابری کے پانچ معصوم بچے ہمیشہ اپنے باپ کو یاد کرتے رہیں گے، اس کی بیوہ جب تک زندہ رہے گی اپنے شوہر کا ماتم کرتی رہے گی، اس کی بوڑھی ماں اپنے جواں بیٹے کو ہر دم یاد کرکے آنسو بہاتی رہے گی۔ اس کا بھائی اپنے بھائی کا غم مناتا رہے گا ۔ باقی سب کچھ اپنی ڈگر پر آجائے گا۔ امجد صابری تمہیں جنت مبارک ہو۔

(: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 8

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔ مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

گزشتہ سے پیوستہ

ماسٹرزان لائبریری وانفارمیشن سائنس (Master's in Library & Inf. Science) لائبریری سائنس میں پہلا ماسٹر پروگرام شروع کرنے کا اعزاز بھی جامعہ کراچی کو حاصل ہوا۔ ڈاکٹر انیس خورشید سربراہِ شعبہ کی کوششوں سے لائبریری سائنس میں ایم اے پروگرام کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر خورشید کے مطابق سائنٹیفک کمیشن (۱۹۶۰ء) اور کمیشن برائے قومی تعلیم (۱۹۶۱ء) کی رپورٹ میں

ملک میں دو دو ڈگری کورسیز اور وہ بھی دو جامعات میں کرنے کی سفارش نظر انداز کر تے ہوئے لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کچھ دلچسپی کا اظہار گیا تھا۔ڈیپارٹمنٹ آف آرکائیوز و لائبریریز نے ڈاکٹر انیس خورشید کو اس مقصد کے لیے مرکزی وزارت تعلیم کے لیے ایک منصوبہ تشکیل دینے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر خورشید جامعہ کراچی کے وائس چانسلر اور معروف تاریخ داں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی اجازت سے اس شرط پر تیار ہوئے کہ وزارت اتفاق کرے کہ وہ کراچی میں ایک لا ئبریری اسکول قائم کرے گی۔ ڈاکٹر خورشید کے مطابق انہوں نے دو سالہ ڈگری پروگرام جس میں جاری ڈپلومہ پروگرام بھی شامل تھا تیار کیا اس میں عملی کام پر زیادہ زور دیا گیا تھا ساتھ ہی یہ ایک (Research-oriented) کورس تھا جو لائبریری اور تحقیق کی مخصوص ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا. نصاب کی تیاری کے سلسلے میں معروف

اور Dr. Lester Asheim،Dr. M. I. Rufsvold ماہرین لائبریری سائنس Dr.S.R. Ranganathan سے مشورہ کیا گیا تھا(۱۲۵)۔ جامعہ کراچی میں یہ وہ دور تھا جب ڈاکٹر عبدالمعید ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے لیے امریکہ کی (University of Illinois) میں تھے ۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ڈاکٹر ہاشمی کی جگہ جامعہ کراچی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے جو بقول ڈاکٹر حیدر ملک میں کتب خانوں اور لائبریریز کے بڑے ہمدرد تصور کیے جاتے

تھے (۱۲۶) ۔ ڈاکٹر قریشی مرحوم کی زیر سرپرستی دہلی یونیورسٹی میں (جب وہ ڈین کے عہدے پر فائز تھے)۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر رنگا ناتھن کی سربراہی میں شعبہ لائبریری سائنس کا قیام عمل میں آیا تھا اور ایم اے کورس شروع ہوا تھا۔ جنوبی ایشیاء میں قائم ہونے والا یہ پہلا ڈگری پروگرام تھا اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر قریشی صاحب ہی کے مشورے پر کراچی یونیورسٹی میں پہلا پوسٹ گریجویٹ کورس شروع کیا گیا (۱۲۷)۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی پہلی کانفرنس کراچی میں منعقد ہو چکی تھی جس میں پاکستان کے صدر مملکت میجر جنرل اسکندر مرزا کی شرکت نے بھی لائبریرین شپ کے پیشے کی مقبولیت اور لائبریری سائنس کی تعلیم پر مثبت اثرات رونما کیے تھے ۔ تمام تر حالات کراچی میں ماسٹر پروگرام کے شروع ہونے میں معاون ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر ممتاز انور کا کہنا ہے کہ " لائبریری سائنس میں ماسٹر پروگرام کے انعقاد کا فیصلہ فیڈرل سیکریٹری تعلیم نے پنجاب یونیورسٹی کے بجائے کراچی یونیورسٹی کے حق میں کیا" (۱۲۸)۔

ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر نے کراچی یونیورسٹی میں ماسٹر کورس کے شروع کرنے میں ڈاکٹر انیس خورشید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ' اس پروگرام کو تیار کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں خورشید صاحب کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس پروگرام کو مرتب کرنے کے سلسلے میں خورشید

صاحب کی لگن اور دن و رات کی محنت کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے نہ صرف ڈاکٹر قریشی صاحب کا تعاون حاصل کیا بلکہ اسکیم کو مختلف مراحل سے گزارنے کے سلسلے میں خاصی جدوجہد بھی کی۔ خورشید صاحب کی کوششیں ۱۹۶۲ء میں ایم اے پروگرام کے قیام کی صورت میں بارآور ہوئیں۔ دراصل اس کامیابی کو ملک کی تحریک کتب خانہ میں ایک نئے باب کا اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ حقیقت میں یہی وہ موڑ تھا جہاں سے پاکستان میں لائبریرین شپ کو ایک نئی جہت ملی۔ باقاعدہ طور پر ایک مستقل مضمون اور علیحدہ پروفیشن کی حیثیت سے قبولیت حاصل ہوئی۔ کراچی یونیورسٹی کی پیروی کرتے ہوئے دوسری جامعات نے بھی ایم ایل ایس کی تعلیم کا بندوبست کیا (۱۲۹)

۔

ڈھاکہ یونیورسٹی (سابقہ مشرقی پاکستان) نے ۱۹۶۲ء ہی میں ماسٹر پروگرام شروع کیا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک ملک کی کسی جامعہ میں لائبریری سائنس میں ماسٹر پروگرام شروع نہیں ہوا حتیٰ کہ جامعہ پنجاب جہاں پر ۱۹۵۹ء میں پوسٹ گریجویٹ کورس شروع ہوچکا تھا ماسٹر پروگرام شروع کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے اپنی کانفرنس منعقدہ ۴۔۵ اگست ۱۹۷۳ء بمقام سیدو شریف، پشاور قرارداد نمبر ۱۱ میں پنجاب اور پشاور یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کو لائبریری سائنس میں ماسٹر پروگرام شروع کرنے کی تجویز پیش کی (۱۳۰)۔ ۱۲ سال بعد ۱۹۷۴ء میں ملک کی دو جامعات پنجاب اور

سندھ یونیورسٹی میں ماسٹر پروگرام کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر انور کے مطابق "جامعہ کراچی میں ایم اے شروع ہونے کے بعد پنجاب میں بھی یہ سہولت فراہم ہونے کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ سابقہ طلبہ کی ایک انجمن (Library Science Alumni Association, LIBSAA) قائم کی گئی جس کے تحت اس تحریک کو آگے بڑھایا گیا۔ (LIBSAA) ڈاکٹر انور جامعہ پنجاب میں ماسٹر کورس (جو ۱۹۷۴ء میں شروع ہوا) کو کی کوششوں کا ثمر قرار دیتے ہیں جب کہ اس انجمن کی تمام تر سرگرمیاں بہت پہلے ماند پڑ چکی تھیں" (۱۳۱)۔ قریشی کے مطابق 1915ء سے ۱۹۷۳ء تک لائبریری کلاس یونیورسٹی لائبریری سے منسلک تھی۔ ۱۹۷۳ء میں شعبہ لائبریری سائنس علیحدہ حیثیت میں قائم ہوا اور ممتاز انور اس کے اولین صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ شعبہ کے قیام میں ان کی خدمات کا بہت دخل ہے (۱۳۲)۔ جامعہ سندھ میں شعبہ لائبریری سائنس ۱۹۷۰ء میں قائم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ کے مطابق ۱۹۷۴ء میں ضرورت محسوس ہوئی کے لائبریری سائنس کے کورس کو دو سالہ پروگرام میں تبدیل کر دیا جائے اس مقصد کے لیے اسی سال ماسٹر پروگرام کا آغاز ہوا اور لا ئبریری سائنس کا کل وقتی شعبہ صبح کے اوقات میں خود مختار شعبہ بن گیا۔ ۱۹۷۴ء میں شعبہ مرکزی لائبریری کے ساتھ نئے کیمپس واقع جامشورو میں منتقل ہوا (۱۳۳)۔ ۱۹۸۰ء میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن (سابقہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن) کی نصاب پر نظرثانی کے لیے بنائی گئی کمیٹی کی

سفارشات کی روشنی میں ۱۹۸۲ء میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ پروگرام کو ڈگری کورس جو لائبریری سائنس کی بیچلرز ڈگری پر مشتمل تھا تبدیل کر دیا گیا (۱۳۴)۔ پشاور یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس میں ماسٹر پروگرام ۱۹۸۳ء اور بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کا قیام ۱۹۸۱ء میں ہو چکا تھا۔ماسٹر پروگرام چار سال بعد ۱۹۸۴ء میں شروع ہوا (۱۳۵)۔ ڈاکٹر فاضل ۱۹۸۳ء میں اسلامیہ یونیورسٹی میں شعبہ لائبریری سائنس قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے چنانچہ ڈپلومہ کلاس شروع ہونے کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۸۴ء میں ڈگری کلاس شروع ہو گئی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ملک میں لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ماسٹر پروگرام شروع کرنے والی ساتویں یونیورسٹی ہے جس نے ۲۰۰۱ء میں لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ماسٹر پروگرام کا آغاز کیا۔زکریا یونیورسٹی ملک کی آٹھویں یونیورسٹی ہے جہاں پر ۲۰۰۵ء میں ماسٹرز پروگرام کا آغاز ہوا۔

لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ماسٹر پروگرام

نمبر شمار---- سالِ آغاز----- شہر----- یونیورسٹی-------- کورس

ا۔----------- ۱۹۶۲ء--- کراچی--- کراچی یونیورسٹی--- ایم ایل آئی ایس

۲۔---------------۱۹۷۴ء---لاہور---- پنجاب یونیورسٹی ،-- لاہور ایم ایل
آئی ایس

۳۔---------------۱۹۷۴ء---- حیدرآباد-- سندھ یونیورسٹی ،--- جامشورو ایم
ایل آئی ایس

۴۔-------------- ۱۹۸۳ء--- پشاور-- پشاور یونیورسٹی-- ایم ایل آئی ایس

۵۔-------------- ۱۹۸۴ء--- کوئٹہ --بلوچستان یونیورسٹی-- ایم ایل آئی ایس

۶۔-------------۱۹۸۴ء--- بہاولپور-- اسلامیہ یونیورسٹی ،--- بہاولپور ایم ایل
آئی ایس

۷۔-----------۲۰۰۱ء---- اسلام آباد--علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی-- ایم ایل
آئی ایس

۸۔-------------- ۲۰۰۵ ---ملتان -----بہاالدی ذکریہ یونیورسٹی-- ایم ایل
آئی ایس

پاکستان کی آٹھ (۸) جامعات میں لائبریری سائنس کی تعلیم بیچلر اور ماسٹر سطح پر رائج ہے۔ جب کہ پانچ جامعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سہولیات بھی موجود ہیں۔

معیار اور مارکیٹ میں پیشہ ورانہ عملے کی طلب کے تجزیہ سے

یہ وضاحت ہوئی کہ " ۱۹۹۰ء تک ملک کے چھ لائبریری اسکولوں نے ۳۳۰۴ لائبریری
گریجویٹ پیدا کیے جب کے اس شعبے میں ۳۳۶۳ گریجویٹ کی ضرورت تھی"(۱۳۶)
۔ معین الدین خان نے بھی لائبریری تعلیم اور مارکیٹ کی ضرورت کے حوالے سے
حقیقی صورت حال واضح کرنے کی اچھی کوشش کی ہے(۱۳۷)۔ لائبریری اسکولوں میں
فیکلٹی کی تعداد، تعلیمی قابلیت اور انکی تحقیقی کاوشوں کے حوالے سے ڈاکٹر سجاد الرحمٰن کے
تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام اسکولوں کے کل (۳۷)اساتذہ میں سے (
ایسے ہیں جن کی ایک بھی تخلیق موجود نہیں (۱۳۸)۔ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیے (۱۵
کی روشنی میں لائبریری اسکولوں کو سنجیدگی کے ساتھ حکمت عملی ترتیب دینے کی
ضرورت ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر ممتاز انور (۱۳۹)، ڈاکٹر عبد الستار چودھری (۱۴۰)، ا
فضل حق قریشی (۱۴۱) کی تحریریں معلوماتی
مواد فراہم کرتی ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

125. Anis Khurshid. Library Education at Graduate Level.
ref. 115, p.9

126. Haider, Syed Jalaluddin, 'Prof. Abdul Moid (1920-84), Father of Pakistan Librarianship. Pakistan Library Bulletin. 15 nos.1-2 (March-June 1984) :

p.43

127. Haider. Syed Jalaluddin. ed., Making of Librariandhip in Pakistan.
(Karachi: Bureau of Composition, Compilation & Translation, University of
Karachi, 1987) , p.44

128. Anwar, Mumtaz A. Towards the Master;s Degree over a cup of tea.
quoted in Sajjadur Rehman. A Treatise on Libarary and Information
Science in Pakistan. ref. 120, p. 122

129. Haider, Syed Jalaluddin. Making of Librarianship in Pakistan. ref.127,p.44

130. Pakistan Library Associtiion. Pakistan Librarianship, 1972-73; being the
Proceedings of the 9th Annual Conference of the Pakistan Library
Associtiion, Saidu sharif, Aug. 4-5-, 1973. Anis Khurshid ed.)Karachi:
PLA, 1973 , p.112

131. Anwar, Mumtaz A. Towards the Master's Degree. ref. 128, p. 124.

132. Qarshi, Afzal Haq. Development of Curriculum at the University of the Punjab. Library Education in Pakistan. ref. 92, p. 86

133. Rafia Ahmed Sheikh. Department of Library & Information Science, University of Sindh: an overview. in., Hallmarks of Library and Information Services in Pakistan. 123, p.151

134. Haider, Syed Jalaluddin. The Department of Library and Information Science. ref. 112, p.31.

135. Hamid Rahman. Library Science Education in University of Balochistan. in Hallmarks of Library and Information Services. ref.123, p.157

136. Hamid Rahman. Demand and Supply of Library Science Graduates in Pakistan. in Library Education in Pakistan: ref. 92, p.39

137. Khan, Moinduddin. Library Education and Marketing Information. in

Library Education in Pakistant. ref. 92, pp.41-49

138. Hallmarks of Library and Information Services in Pakistan. ref. 123, p.148.

139. Mumtaz A. Anwar. State of the Library Profession in Pakistan: from Celebration to Reality. in Library Education in Pakistan. ref. 92, p. 44

140. Chaudhry, Abdus Sattar. Information Science Component in Library Education in Pakistan. in Library Education in Pakistan. ref. 92, pp.41-49

141. Qarshi, Afzal Haq. Development of Curriculum at the University of the Punjab. in Library Education in Pakistan. ref. 92, pp.77-94

عیدُ الفطر۔ مسلمانوں کا مذہبی و ملی تہوار

معروف سفر نامہ نگار و کالم نگار مستنصر حسین تارڑ کے بقول 'عید تو بچوں کے چہروں سے منسوب ہے۔ میرے والد کے لیے میرا چہرہ عید تھا، میرے لیے میرے بچوں کے چہرے عید اور اب پوتے، پوتیوں کے چہرے عید کا چاند ہیں۔ جب بھی وہ افق پر ابھر تے ہیں، گھر آتے ہیں، تو بس وہی دن عید کا دن ہو جاتا ہے'۔ واقعی عید تو بچوں کی خوشی سے ہی ہوتی ہے، عید کے دن اپنے بچوں اور پوتے، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں کو دیکھ کر خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ عید کے روز جب بچے خوبصورت، دیدہ زیب، رنگ برنگے کپڑے پہن کر، ہاتھ میں گھڑی، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ، بچیوں کے گلے میں پرس، ہاتھوں میں چمکتی جھل مل کرتی چوڑیاں، بالوں میں حسین کلپس، کانوں میں رنگین ٹوپس، انگلیوں میں انگھوٹیاں، پیروں میں میچنگ کے سینڈل، تتلیوں کی مانند ادھر سے ادھر، سلام کرتے، عیدی وصول کرتے، دوڑتے پھرتے ہیں تو یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب ہر دیکھنے والے کی روح تازہ ہو جاتی ہے، خوشی کا احساس کئی گنا بڑھ جاتا ہے، ان معصوم سی، کومل سی، کلیوں اور پھولوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ عید کے دن کا یہ منظر اس بات کا مظہر ہوتا ہے کہ عید خوشی کا دن ہے، شکر بجا لانے کا دن ہے، مسرت و شادمانی کا دن ہے۔

عید الفطر' عربی زبا کا لفظ ہے جو 'عید' اور 'فطر' سے مرکب ہے۔ 'عید' کے لفظی معنی' توجہ کرنے، مسرت وانبساط اور خوشی و شادمانی کے ہیں۔ یہ خوشی، جشن، فرحت اور چہل پہل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہ اس سے مراد لوٹنا، پلٹنا، واپس ہونا، پھر آنا کے بھی لیے گئے ہیں۔وجہ اس کی یہ بیان کی گی ہے کہ چونکہ یہ دن ہر سال آتا ہے اور اس کے لوٹ آنے سے اس کی فرحت و مسرت اور برکت وسعادت کے لمحات بھی اس کے ساتھ لوٹ آتے ہیں اس لیے اس دن کو عید کہا جاتا ہے۔ لفظ 'فطر' کے معنی روزہ کھولنے کے ہیں یعنی روزہ توڑنا، ختم کرنا،یکم شوال کو روزوں کا سلسلہ اختتام کو پہنچتا ہے، فطر کا لفظ کسی کام کو از سرنو یا پہلی بار کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس روزاللہ تعالیٰ بندوں کو روزہ اور عبادات رمضان کو ثواب عطا فرماتے ہیں اسی وجہ سے اس تہوار کو عید الفطر کہا گیا ہے۔ عیدالفطر کو 'چھوٹی عید' یا' میٹھی عید' بھی کہا جاتا ہے جب کہ عیداالضحیٰ کو 'بڑی عید' کہا جاتا ہے۔

عید کی خوشیوں اور رسم و رواج کا آغاز یکم شوال یا عید کا چاند نظر آجانے کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے، رمضام المبارک اسلامی مہینوں میں مبارک و برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ ہے، جب کہ شوال اسلامی کیلنڈر کا دسواں مہینہ ہے۔ رمضان المبارک میں قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا، مسلمانوں پر روزے فرض کیے

گئے، نمازِ تراویح، شبِ قدر اس مہینے کی خاص عبادات اور تحفے ہیں۔ چھوٹے اپنے بڑوں کو چاند کا سلام کرتے اور بڑے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں، اب چاند کی مبارک باد موبائل اور انٹرنیٹ، فیس بک، ای میل پر بھی ایک دوسرے کو دینے کی رسم نے مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ گھروں میں رات سے ہی صبح ہونے والی عید کی خوشیاں اور نماز عید کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہے۔ فجر کی نماز کے بعد عید کی نماز کا وقت سورج کے ایک نیزہ کے برابر بلند ہوجانے پر ہوتا ہے، ہر نماز سے پہلے اذان اور اقامت کہی جاتی ہے لیکن عید کی نماز کو اذان اور اقامت سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، عید کے نماز میں چھ تکبیرات بھی ہوتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی عید کی نماز کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں، غسل کے بعد نئے کپڑے پہنا کر اور خوشبو لگا کر مرد حضرات اپنے بچوں کے ہمراہ مسجد یا عید گاہ کی جانب رواں دواں نظر آتے ہیں، راستے میں آہستہ آواز سے تکبیر ' اللہ اکبر اللہ اکبر، لاالہ الا اللہ ، واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد' کا ورد کرتے ہیں۔ نماز عید کے بعد احباب آپس میں گلے ملتے ہیں،ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ نماز سے واپس گھر پہنچ کر اپنے گھر کی خواتین کے ساتھ عید کی خوشیاں شیر کرتے ہیں۔ عیدی دینے اور لینے کی رسم ہوتی ہے، قریبی عزیز رشتہ داروں کے گھر جاتے ہیں، بعض احباب قبرستان جاتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہوجانے والے اپنے عزیزوں کی قبور پر فاتح پڑتے ہیں۔ عید الفطر کے دن روزہ رکھنا رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ صدقہ فطر نماز عید سے قبل ادا کرنے

کے احکامات ہیں، صدقہ فطر ہر مسلمان، مرد، عورت، بچے، چھوٹے بڑے پر فرض ہے۔ اس کی ادائیگی کا وقت شوال کا چاند نظر آنے کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے اور نماز عید کی ادائیگی سے قبل تک رہتا ہے۔ اگر صدقہ فطر نماز عید سے قبل ادا نہ ہوا تو یہ عام صدقہ شمار ہوتا ہے۔ صدقہ فطر کی رقم اجناس کی نسبت سے مقرر کیا جاتی ہے، اس بار صدقہ فطر کی رقم فی کس 120 روپے مقرر کی گئی ہے۔

مختلف قوموں میں خوشیاں اور تہوار منانے کی روایت بہت قدیم ہے، ہر قوم اور ہر نبی کے زمانے میں خوشیاں منانے کی رسم موجود نظر آتی ہے،اس دن اس قوم کے لوگ حسب روایت اچھا لباس ذیب تن کیا کرتے، مزے مزے کے کھانے پکاتے، خود بھی کھاتے عزیز رشتہ داروں کو بھی کھلایا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ خوشی و شادمانی کا اظہار کیا کرتے۔ یہ خوشیاں مختلف مواقعوں پر منائی جایا کرتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشیاں منانا انسان کی فطرت ہے۔ تہوار مختلف قوموں کی تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ہر قوم اپنے رسم و رواج، مذہبی شعار، معتقدات کے مطابق اپنے تہوار مناتی ہے۔ یہ تہوار ان کی عید ہوتی ہے۔ جیسے عیسائیوں میں کرسمس، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی، درگا پوجا، کرواچوتھ وغیرہ، سکھوں میں ویسا کی تہوار ان کے عید کے دن ہیں۔ اس دن وہ بھرپور طریقے سے خوشیوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں عید کا تہوار اسلام کے

مزاج اور مسلمانوں کی اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی و علمی اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ہماری دینی و ملی اقدار کا آئینہ دار ہے۔زکوۃ اور صدقہ فطر کی ادیگی سے عید کی بنیادی روح کی تکمیل ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں نبی آخری الزماں حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور مسلمانوں کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن خوشیاں منانے کی ہدایت فرمائی۔اس کا آغاز یکم شوال 2 ہجری مطابق 27 مارچ 624 عیسوی سے ہوا۔ سنن ابی داؤد کی حدیث ہے، اسے مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنی کتاب 'معارفِ الحدیث' میں بھی نقل کیا ہے ۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ (جن کی کافی تعداد پہلے ہی سے اسلام قبول کر چکی تھی) دو تہوار منایا کرتے تھے، اور ان میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: یہ دو دن جو تم مناتے ہو ان کی کیا حقیقت اور حیثیت ہے؟ (یعنی تمارے ان تہواروں کی کیا اصلیت اور تاریخ ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ: ہم جاہلیت میں یعنی) اسلام سے پہلے یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے (بس وہی رواج ہے جو اب تک چل رہا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دو تہواروں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیے ہیں (اب وہی تمہارے قومی اور مذہبی تہوار ہیں) یوم عید الاضحیٰ اور یوم عید الفطر"۔ گویا رسول اللہ ﷺ نے عہد جاہلیت کے تہواروں

کو منانے سے منع فرمادیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں اپنے خصوصی انعام و اکرام کے طور پر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مبارک ایام مسلمانوں کو عطا فرمائے ہیں۔

عید الفطر کے دن ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے معمولات کے حوالے سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث جسے 'معارف الحدیث' میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے راوی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ تشریف لے جاتے تھے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے، پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف رخ کرکے خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے اور لوگ بدستور صفوں میں بیٹھے رہتے تھے، پھر آپ ان کو خطبہ و نصیحت فرماتے تھے اور احکام دیتے تھے اور آپ ﷺ کا ارادہ کوئی لشکر یا دستہ تیار کرکے کسی طرف روانہ کرنے کا ہوتا تو آپ ﷺ (عیدین کی نماز کے بعد) اس کو بھی روانہ فرماتے تھے یا کسی خاص چیز کے بارے میں آپؐ کو کوئی حکم دینا ہوتا تو اسی موقع پر وہ بھی دیتے تھے۔ پھر (ان سارے مہمات سے فارغ) آپؐ عید گاہ سے واپس ہوتے تھے''۔

قرآن کریم کی سورۃ المائدہ کی آیت 114 میں حضرت عیسیٰؑ کی دعا کے حوالے سے عید کا تذکرہ آیا ہے۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ ابن مریم سے ان کے حواری ان سے خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ 'اے عیسیٰ ابن مریم ! کیا آپ کا رب ہم سے

آسمان سے کھانے کاایک خوان اُتار سکتاہے؟ ،تو حضرت عیسیٰؑ نے کہا: اللہ سے ڈرواگر تم مومن ہو۔ اُنھوں نے کہا: ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہوجائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسیٰ ابنِ مریم نے دُعا کی: اے اللہ ! ہمارے رب ! ہم پر آسماں سے ایک خوان نازل کر، جو ہمارے لیے ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی (عربی میں لفظ' عید' استعمال ہوا ہے) کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تُو بہترین رازق ہے'۔

عید سعید کے روز ہم جتنی بھی خوشیاں منائیں، جس جس طرح منائیں ہر صورت میں تہذیب، شائستگی، اسلامی اقدار اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

رمضام المبارک میں ہم نے جو نیک اعمال کیے، روزے رکھے، نماز پڑھی، صدقہ و خیرات کیا، زکوۃ دی، برے کاموں سے بچیں رہیں۔ رمضان لمبارک میں مساجد نمازیوں سے بھری رہتی ہیں، اعتکام کرنے والے اعتکاف کرتے ہیں۔ الغرض نیکی اور اچھے اعمال کا یہ سلسلہ رمضان لمبارک کے بعد منقطع نہیں ہونا چاہیے۔ عید ہمارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا باعث تو ہو لیکن نیک اور اچھے اعمال کے منقطع ہونے کا باعث نا بنے۔ بقول شاعر ؎

آپ ادھر آئے ادھر دین اور ایمان گئے

عید کا چاند نظر آیا تو رمضان گئے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ شروع ہوا ادھر بازاروں، شاپنگ سینٹرز میں خریداروں کا رش شروع ہوگیا، بازار اور شاپنگ سینٹرز رات رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ آخری عید ہو اس کے بعد خریداری کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ عید کا مطلب ہر گز ہر گز فضول خرچی، بے جا اخراجات کرنا نہیں، قیمتی لباس پہننے کا نام نہیں ، روزہ تو ہمیں صبر کا، برداشت کا ، اعتدال پسندی کا، سادگی کا، دوسروں کا خیال رکھنے کا درس دیتا ہے۔ عید تو اللہ کا شکر بجا لانے کا نام ہے، رمضان المبارک ساتھ خیریت سے گزر گیا، ہم نے تمام روزے رکھے اور نیک اعمال کیے ان کا شکر ادا کرنے کا نام عید ہے، عید فضول خرچی کرنے، لہو و لعب ، بدعت و خرافات اور خر مستیوں کا نام نہیں۔ رمضام المبارک اور عید کا اہتمام کر لینے کے بعد شوال کے چھ روزوں کا بہت ثواب ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ 'جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہ شوال کے چھ نفلی روزے رکھے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا'۔ اس حدیث مبارکہ کی تشریح مولانا محمد منظور نعمانی نے 'معارفِ الحدیث ' میں یہ بیان کی ہے کہ رمضان کا مہینہ اگر 29 ہی دن کا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے 30 روزوں کا ثواب دیتے ہیں اور شوال کے 6 نفلی روزے شامل کرنے کے بعد روزوں

کی تعداد 36 ہو جاتی ہے اور اللہ تعالٰی کے کریمانہ قانون ''الحسنۃ بعشر امثالھا'' ایک نیکی کا ثواب دس گنا) کے مطابق 36 کا دس گنا 360 ہو جاتا ہے اور پورے سال کے دن سے کم ہی ہوتے ہیں۔ پس جس نے پورے رمضان المبارک کے روزے رکھنے 360 کے بعد شوال میں 6 نفلی روزے رکھے وہ اس حساب سے 360 روزوں کے ثواب کا مستحق ہوگا اجر و ثواب کے لحاظ سے یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی بندہ سال کے 360 دن.برابر روزے رکھے'۔ بس ہمیں چاہیے کہ رمضام المبارک کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اپنی نمازوں کو قائم رکھیں، نیکی اور اچھائی کا سلسلہ جاری و ساری رکھیں۔

عبدالستار ایدھی کو سلام عقیدت

عبدالستار ایدھی نام ہے ایک ایسی شخصیت کا جس کی زندگی انسانیت کی خدمت سے عبارت نظر آتی ہے۔ ایدھی نے پاکستان میں انسانی خدمت کی ایسی لازوال روایت قائم کی کہ آج پاکستان میں بے شمار لوگ انفرادی اور اجتمائی طور پر لوگوں کی خدمت میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ عبدالستار ایدھی میرا ذاتی دوست نہیں، میرا رشتہ دار نہیں، اور نہ ہی اُس سے میرے ذاتی مراسم ہیں البتہ مَیں نے عبدالستار ایدھی کو اس وقت بہت قریب سے دیکھا جب وہ جوان تھا،اس کی پوری زندگی خدمت انسانیت سے وابستہ نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی فلاحی خدمات کا آغاز کراچی کے علاقے میٹھا در سے کیا تھا، میٹھادر اور میری رہائش کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا، عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج جس میں مَیں نے ۲۴ سال خدمات انجام دیں میٹھادر اور کھارادر سے کچھ ہی مسافت پر ہے۔

عروس البلاد کراچی کی ایک قدیم بستی ''لیاری'' میرے اور عبدالستا ایدھی کے مابین قدرِ مشترک ہے۔ ایدھی بنیادی طور پر کراچی کی ایک غریب اور کچی بستی لیاری کا باسی ہے اور میرا بچپن اور جوانی بھی اِسی بستی میں گزری۔ میری فلاحی اور نیم سیاسی سرگرمیوں کا مہور بھی لیاری ہی رہا۔ لیاری نام ہے

کراچی کی ایک ایسی بستی کا جس میں ایک طرف تو انتہائی غریب لوگ آباد ہیں تو دوسری جانب متوسط لوگوں کے علاوہ میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی جو کاروباری ہیں کھارادر، میٹھا در، وزیر میشن، صرافا بازار، میمن سوسائیٹی جیسی آبادیوں میں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہتے ہیں لیکن وہ مالی طور مستحکم ہیں۔ عبد الستار ایدھی نے انسانیت کی خدمات کا آغاز میٹھادر سے کیا۔ تقسیم سے قبل یہاں ہندوں کی اکثریت تھی اب ان قدیم بلڈنگوں میں رہنے والے مکینوں کی اکثریت میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی، سندھی، ترک اور کچھ سے تعلق رکھنے والوں کی ہے۔ یہ علاقہ انتہائی تنگ اور گنجان آباد ہے، میٹھادر اور کھارادر کے اردگرد واقع علاقوں میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی پیدائش گاہ وزیر میشن، موسی لائن، میمن سوسائیٹی (نوآباد)، کھڈا مارکیٹ، مچھی میانی مارکیٹ شامل ہیں۔ میٹھادر کے مشرق میں جوڑیا بازار، لی مارکیٹ، پرانا حاجی کیمپ، گارڈن، لسبیلا لیاقت آباد، فیڈرل بی ایریا، گلشن اور جامعہ کراچی ہے، مغرب میں کراچی پورٹ،، کیماڑی، منوڑہ، جنوب میں صرافہ بازار اور ککری گراؤنڈ، موسیٰ لین، کلری، بغدادی، بہار کالونی، آگرہ تاج کالونی اور شیر شاہ قبرستان اور شمال میں نیو میمن مسجد، بولٹن مارکیٹ، سٹی اسٹیشن، کلفٹن اور ڈیفنس ہے، میرا خاندان قیام پاکستان کے وقت ہجرت کرکے کراچی آنے والوں میں سے تھا،ابتدا میں کراچی کی قدیم آبادی ''کھڈا مارکیٹ'' میں رہائش اختیار کی،کچھ عرصہ کے بعد بہار کالونی منتقل ہوگئے اور پھر آگرہ تاج کالونی میں''

اپنا گھر بنا لیا۔ میرا بچپن، جوانی انہی علاقوں میں گزرا۔

عبد الستار ایدھی کے پرکھوں کا تعلق ہندوستان کے علاقے گجرات سے تھا، ایدھی گجرات کے علاقے 'بانٹوا' میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا، تقسیم ہندوستان کے وقت اس خاندان نے کراچی ہجرت کی لیاری کا علاقہ میٹھادر ان کا مستقر ٹھہرا، اسوقت ایدھی کی عمر ۱۹ برس تھی۔ دکھی انسانیت کا خدمت کا جذبہ ایدھی میں اپنی ماں کی خدمت سے پیدا ہوا، ایدھی ابھی گیارہ برس کا تھا کہ اس کی ماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ معزور ہو گئی، یہی نہیں ہوا بلکہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنا ذہنی توزن بھی کھوparalyzed بیٹھی ، ایسی صورت میں اُسے کل وقتی خدمات گزار کی ضرورت تھی ، ایدھی نے اس کام لیے اپنے سے بہتر کسی کو نہ پایااوراس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ماں پر مرکوز کردی اور اس کی خدمات میں لگ گیا، ایدھی اپنے ماں کے تمام تر کام از خود کیا کرتا تھا، کھانا کھلانا، کپڑے بدلوانا، صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا، نہلانا دھلا، ایدھی کی زندگی میں یہی وہ لمحات تھے کہ اس کے اندر انسانیت کی خدمات کا جذبہ بیدار ہوا۔ ایدھی کی ماں آٹھ سال بعد انتقال کرگئیں اور اپنے بیٹے کے اندر خدمات کا ایسا جذبہ اجاگر کر گئی جس نے ایدھی کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدمت کا نشان بنا دیا۔ ایدھی کی ماں نے ایدھی کو بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ مہربان رہنے اور غریبوں کی مدد کرنے کی تلقین کی تھی۔ ایدھی نے اپنی ماں کی

اسی نصیحت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔
عبدالستار ایدھی کو دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ اپنی ماں کی خدمت کے نتیجے میں ملا، اگر ایدھی اپنی ماں کی خدمت نہ کرتا تو شاید آج وہ اس مقام و مرتبہ پر نہ ہوتا، یہ مرتبہ، یہ اعزاز، یہ مقام ماں کی خدمت کے عوض نصیب ہوا اور اس اعزاز و مرتبے کو پروان چڑھانے میں بھی ایک عورت کا عمل دخل رہا اور وہ نیک صفت، وفا شعار عورت ہے بلقیس ایدھی، عبدالستار ایدھی سے شادی سے قبل بلقیس ایدھی نرس کے پیشے سے تعلق رکھتی تھی اور عبدالستار ایدھی کی ڈسپنسری میں خدمات انجام دیا کرتی تھی، ایدھی نے ۱۹۶۵ء میں بلقیس ایدھی سے شادی کی، شادی کے بعد سے آج تک بلقیس ایدھی نے اپنے شوہر کا ایسا ساتھ نبھایا کہ جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ یہ قدم قدم پر ایدھی کے ساتھ رہی، ایدھی کو اس مقام، مرتبہ اور منزل پر پہنچانے میں اس کا کردار قابل رشک ہے۔
قیام پاکستان کے بعد ایدھی نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق کاروبار شروع کیا لیکن اس میں اس کا دل نہیں لگا کیونکہ اس کے دل میں توانسانیت کی خدمات کا جذبہ جنم لے چکا تھا، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں اس نے میٹھادر میں ایک دکان خریدی اور اس میں غریب لوگوں کے لیے

ڈسپنسری قائم کی، جو ڈاکٹر اس کی ڈسپنسری میں مریضوں کو دیکھا کرتا تھا اس نے ایدھی کو طبّی امداد کے تمام امور کی تربیت بھی دی۔ یہ ایدھی کی فلاحی خدمات کا نقطہ آغاز تھا۔ ایدھی اپنے آپ کو اس ڈسپنسری تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اس نے پہلی بار عوام سے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے مدد کی اپیل کی، لوگوں نے اس کی بات کو توجہ سے سنا، اللہ تعالیٰ نے اس کی بات میں اثر پیدا کر دیا تھا، لوگوں نے اس پر بھروسی کیا، اعتماد کیا، ابتدائی طور پر ایدھی کو دو لاکھ روپے کی رقم وصول ہوئی، اسی رقم سے ایدھی نے اپنی خدمات کے دائرہ کو وسیع کیا، ایک کمرہ پر مشتمل ڈسپنسری ایک چھوٹے سے اسپتال میں تبدیل ہو گئی، ایک ایمبولینس بھی خرید لی گئی۔ ان آنکھوں نے نوجوان ایدھی کو ملیشا کے کپڑے کا لباس زیب تن کیے اسی چھوٹے سے اسپتال کے سامنے چارپائی پر بیٹھے بارہا دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی فون نایاب چیز ہوا کرتا تھا، اکثر لوگ ایدھی کو از خود آ کر کسی بھی قسم کے حادثہ کی اطلاع کیا کرتے تھے، ایدھی نے اپنی سماجی ادارے ایدھی ٹرسٹ کا آغاز مبلغ پانچ ہزار روپے سے کیا تھا جو ترقی کر کے کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔

اگست ۲۰۱۱ء کی بات ہے لیاری کے علاقے موسیٰ لائن میں ایک بلڈنگ کے

زمین بوس ہو جانے کا واقع پیش آیا جس میں کئی خاندان ملبے تلے دب کر اپنی جان کھو بیٹھے۔اِن دنوں مَیں سعودی عرب میں تھا، عمرے بھی کیے اور مدینہ میں حاضری بھی دی، زیادہ وقت اپنے بڑے بیٹے عدیل کے پاس جدہ میں اور اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر نبیل کے پاس پہاڑی علاقہ فیفاء (جذان) میں گزرا ۔فیفاء سعودی عرب کا وہ علاقہ ہے جو یمن کی سرحد پر ہے، پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، یہاں آ کر مری ، ایوبیہ، نتھیا گلی اور بارہ گلی کی یاد تازہ ہو گئی، سرد موسم، تقریباً روز ہی بارش کا ہونا، یہاں میرا کام کچھ نہیں تھا ماسوائے عبادت ، کھانا پینا اور آرام کے البتہ یہاں مَیں نے خاکے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور کئی احباب کے خاکے لکھے ، کچھ خاکے جو سرگودھا میں رہتے ہوئے شروع کیے تھے، یہاں انہیں مکمل کرنے کا موقع مل گیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ یہاں سکون تھا، امن تھا،لکھنے والے کو اچھا ماحول میسر آجائے تو وہ اسے غنیمت جانتا ہے۔اِسی دوران کراچی میں موسیٰ لائن میں بلڈنگ گرنے کی افسوس ناک خبر آئی ،رمضان کا مہینہ تھا، ایک دن ڈاکٹر عامر لیاقت حسین نے اے آر وائی پر اپنے پروگرام 'شہر رمضان' میں اس بلڈنگ تلے دب جانے والی ایک فیمیلی کو بلایا شاید دو بچے ہی زندہ بچ گئے تھے ان کے والدین اور دیگر بہن بھائی ملبے تلے دب جانے سے اللہ کو پیارے ہوگئے تھے ، وہ پروگرام دیکھ کر دکھ اور کرب تو

قدرتی تھا، موسیٰ لائن کی مخدوش عمارتیں ، تنگ وتاریک گلیاں نظروں میں گھوم گئیں۔ مَیں برسوں اپنے گھر سے کالج موٹر سائیکل پر اِسی موسیٰ لائن کے سامنے سے جایا کرتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ عبدالستار ایدھی کا خاکہ لکھنے کی وجہ یہی موسیٰ لائن کی گرنے والی عمارت ہے۔آج سے ۳۹ سال قبل ۱۹۷۳ء میں اِسی موسیٰ لائن میں زمین بوس ہونے والی ایک بلڈنگ کا منظر اوراس کی تباہ کاریاں، حلاکتیں اور وہاں عبد الستار ایدھی کے ہمراہ لاشیں نکالنے، امداد فراہم کرنے کا منظر سامنے آگیا۔ عبد الستا ایدھی نے اُس وقت اس بلڈنگ کے گرنے پر دن رات از خود ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے نکالا تھا،ایدھی اس وقت جوان تھا، اس کے رضاکار بھی تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی اس کی ایمبولینسیز نے جوکام کیا تھا وہ بھی قابل تعریف تھا ،ایدھی کی سماجی خدمات کو شہرت اُسی واقع سے ملی تھی ،اس وقت کا ایدھی آج کے ایدھی سے جسمانی طور پر مختلف ہے،مَیں نے اُسے اپنے ہاتھوں سے گری ہوئی عمارت کے ملبے تلے دبی ہوئی عورتوں، بچوں اور مردوں کی لاشوں کو نکالتے دیکھا تھا۔ مسخ شدہ اور ایسی لاشیں جن کے نذدیک جاتے ہوئے لوگ ڈرا کرتے تھے عبد الستار ایدھی ہر طرح کے ڈر و خوف سے آزاد ہو کر اس بدبو دار اور تعافن زدہ لاش کو ٹھکانے لگا دیا کرتا تھا۔ کیا جذبہ تھا، ایدھی کی خدمات کا شہرہ ۱۹۷۳ء میں موسیٰ

لائن میں زمین بوس ہونے والی عمارت اور عبد الستار ایدھی کی فراہم کردہ خدمت سے عوام الناس کا اعتماد ایدھی پر بڑھتا گیا اور ایدھی کی خدمات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ آج ایدھی فاؤنڈیشن کو دنیا میں سب سے بڑے خدمتی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔

آج کے عبد الستار ایدھی کو گزشتہ سال ائر پورٹ پر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، مَیں کراچی سے لاہور جارہا تھا، جہاں سے مجھے سرگودھا یونیورسٹی جانا تھا،ائر پورٹ پر عبد الستار ایدھی بھی موجود تھا،اس کا سفر بھی کراچی سے لاہور کے لیے تھا،لاہور ائر پورٹ پر دو نوجوان ایک دائیں اور ایک بائیں ایدھی کا ہاتھ پکڑے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نہ سیکیوریٹی تھی، نہ پولس نہ پولس کی موبائلیں، نہ لوگوں کو روکا گیا، نہ ٹریفک ہی جام ہوا، اگر غلطی سے کوئی کوئی وزیر یا سفیر ہوتا تو اس وقت ائر پورٹ پر قیامت کا سما ہوتا، چھوٹا قد، وہی کالے رنگ کے ملیشیا کا شلوار قمیض ، سر پر مخصوص کالی ٹوپی ، سانولا رنگ جس میں کسی قدر سیاہی کی آمیزش، پیروں میں چپل، سفید کالی داڑھی لمبائی میں بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، پیشانی سے عظمت و بزرگی آشکارہ ، چہرہ پر متانت وسنجیدگی، دھیرے دھیرے ، چھوٹے چھوٹے قدموں سے ائر پورٹ سے باہر آئے، نہ وہ دبدبا

تھا نہ وہ جوش، چہرہ پر اطمینان اور بردباری نمایاں تھی، وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مَیں نے ایدھی کو جوانی میں بھی دیکھا تھا۔آج کا ایدھی جسمانی اعتبار سے مختلف ہے۔ انسانیت کی خدمت کے طویل سفر نے ایدھی کی شخصیت میں نیکی، بھلائی اور دوسروں کی مدد واعانت کی سفیدی کو اجاگر کر دیا ہے، ایدھی کا چہرہ ایک مہربان اور شفیق انسان کا چہرہ محسوس ہو رہا تھا، سنجیدہ اور متین انسان کا چہرہ، سلام اس عظیم ہستی پر۔

ایدھی فاؤنڈیشن کے تحت خدمات کی مختلف جہتیں ہیں، ایمبولینس سروس کے حوالے سے یہ دنیا کی سب سے بڑی خدمتی تنظیم ہے، ایدھی ایمبولینسیز میں ائر ایمبولینس بھی شامل ہے، ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر مریضوں کی تیز تر منتقلی میں کام آتے ہیں، صرف کراچی میں ۸ اسپتال مفت طبّی امداد فراہم کر رہے ہیں، موبائل ڈسپنسری اور بلڈ بنک اس کے علاوہ ہے، ایدھی کے تحت ۱۵ ''اپنا گھر'' ہیں جس میں بے سہارا، لاوارث، ذہنی معزوروں کو پناہ ملی ہوئی ہے۔ایدھی کے تحت ''جھولا'' ایک ایسی منفرد خدمت ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی، پاکستان میں جس کا کوئی نہیں اللہ کے بعد ایدھی اس کا سہارا اور مددگار ہوتا ہے۔انسان خواہ امیر ہو یا غریب، وارثین موجود ہوں یا وہ لاوارث ہو

مرنے کے بعد اس کے جسد خاکی کو جلد سے جلد خاک کی نظر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے فوری تدفین عمل میں نہ لائی جاسکے، یا لاش لاوارث ہو تو عبدالستا ایدھی کے ''مردہ خانے'' ہی ان مردوں کی وقتی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ کراچی میں سہراب گوٹھ پر قائم ایدھی مردہ خانہ لاوارث لاشوں اور وقتی طور پر محفوظ کرائی گئی لاشوں کا مرکز ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس مردہ خانے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، لاشیں کفن پہنیں شیلفوں پر اوپر نیچے ترتیب سے رکھی ہوتی ہیں، دیکھ کر ایدھی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہاں مردوں کو غسل دینے اور کفنانے کا انتظام بھی ہے۔ عورتوں کے لیے غسل و کفن کا مرکز میٹھادر میں قائم ایدھی مرکز میں ہے۔

عبدالستار ایدھی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جارہا ہے اور لکھا جائے گا۔ ایدھی پر مرتب کی جانے والی سوانح حیات انگریزی میں ہے جسے ایک معروف مصنفہ نے بڑی محنت اور مہارت سے مرتب کیا ہے۔ My Feudal Lord کی خالق تہمینہ درانی، تعارف کی محتاج نہیں، انہیں اپنی اِسی کتاب سے شہرت حاصل ہوئی، یہ غلام مصطفٰی کھر کی سابق ا ورزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی موجود شریک حیات ہیں، معروف سیاست داں سر سکندر حیات کی پوتی اور شوکت اللہ درانی کی بیٹی ہیں۔ انہوں نے

کے نام سے مرتب کی A Mirror to the Blind عبدالستار ایدھی کی سوانح حیات ہے، یہ سوانح ۱۹۹۶ء میں نیشنل بیورو آف پبلی کیشن نے شائع کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایدھی کی زندگی کی کہانی انہوں نے ٹیپ کی اور یہ ٹیپ چالیس گھنٹوں پر محیط ہے۔اس سوانح حیات میں عبدالستار ایدھی کی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔

کا ۳۶ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔کیا ہیMy feudal Loard تہمینہ درانی کی کتاب اچھا ہو کہ ان کی اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ہو جائے تاکہ عام لوگ ایدھی کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے جان سکیں۔

۱۹۸۹ء میں حکومت پاکستان نے ایدھی کو 'نشان امتیاز' دیا، بے شمار مقامی تنظیموں اور اداروں نے بھی ایدھی کو اعزازات سے نوازا۔ عالمی سطح پر بھی ایدھی کو اعزاز سے نوازا گیا، ۱۹۸۸ء میں آرمینیا میں زلزلہ سے متاثرہ افراد کی خدمت کے اعتراف میں اس وقت کی روس کی حکومت نے ایدھی کو ''لینن امن انعام'' سے نوازا، فلپائن حکومت نے ۱۹۸۶ء میں عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کو ''میگسیسا ایوارڈ (Magsayay award)'' دیا، ۲۰۱۰ء میں یونیورسٹی آف بیڈفورڈشائر نے

ایدھی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اسی طرح عبدالستار ایدھی کو مختلف اداروں نے اعزازات و انعامات سے نوازا لیکن ایدھی کے لیے اصل اعزاز و انعام تو پاکستان کے لوگوں کا اعتماد اور بھروسہ ہے، وہ والہانہ محبت، عقیدت اور احترام ہے جو لوگ ایدھی پر نچھاور کرتے ہیں۔ اللہ ایدھی کو سلامت رکھے۔

۸ ستمبر ۲۰۱۱ء، ۱۰ شوال ۱۴۳۲ھ، جدہ، سعودی عربیہ

عبدالستار ایدھی کو سلام عقیدت

خدمت خلق کا نشان ، چھ دیہائیوں تک عوام الناس کی بلا تفریق خدمات کو یقینی بنانے والا، لوگوں کے دکھ درد بلا امتیاز دور کرنے والا، غریبوں ، مسکینوں، ناداروں کے لیے فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والا، عوام الناس کی خدمت کو ایک نئی جہت اور نئی سمت دینے والا عبد لستار ایدھی 8 جولائی کی شب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگیا۔ انا اللہ وانا علیہ راجیعون۔ پاکستان میں آج جتنے بھی خدمت خلق کے ادارے اور تنظیمیں ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے خدمات کا ڈھنگ اور سلیقہ ایدھی سے ہی سیکھا اس کی پیروی کی ۔ عبد لستار ایدھی نام ہے ایک ایسی شخصیت کا جس کی زندگی انسانیت کی خدمت سے عبارت نظر آتی ہے۔ ایدھی نے پاکستان میں انسانی خدمت کی ایسی لازوال روایت قائم کی کہ آج پاکستان میں بے شار لوگ انفرادی اور اجتمائی طور پر لوگوں کی خدمت میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ عبد الستار ایدھی میرا ذاتی دوست نہیں تھا، میرا رشتہ دار نہیں تھا، اور نہ ہی اُس سے میرے ذاتی مراسم تھے البتہ مَیں نے عبد الستار ایدھی کو اس وقت بہت قریب سے دیکھا جب وہ جوان تھا، اس نے اپنی فلاحی خدمات کا کا آغاز کراچی کے علاقے میٹھا در سے کیا تھا، میٹھا در اور میری رہائش کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا، عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج جس میں مَیں نے ۲۴ سال خدمات انجام دیں

میٹھادر اور کھارادر سے کچھ ہی مسافت پر ہے۔

عروس البلاد کراچی کی ایک قدیم بستی ''لیاری'' میرے اور عبدالستا ایدھی کے مابین قدرِ مشترک ہے۔ ایدھی بنیادی طور پر کراچی کی ایک غریب اور کچی بستی لیاری کا باسی ہے اور میرا بچپن اور جوانی بھی اِسی بستی میں گزری۔ میری فلاحی اور نیم سیاسی سرگرمیوں کا مہور بھی لیاری ہی رہا۔ لیاری نام ہے کراچی کی ایک ایسی بستی کا جس میں ایک طرف تو انتہائی غریب لوگ آباد ہیں تو دوسری جانب متوست لوگوں کے علاوہ میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی جو کاروباری ہیں کھارادر، میٹھادر، وزیر میشن، صرافا بازار، میمن سوسائیٹی جیسی آبادیوں میں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہتے ہیں لیکن وہ مالی طور مستحکم ہیں۔ عبدالستار ایدھی نے انسانیت کی خدمات کا آغازا میٹھادر سے کیا تھا۔ تقسیم سے قبل یہاں ہندوں کی اکثریت تھی اب ان قدیم بلڈنگوں میں رہنے والے مکینوں کی اکثریت میمن، کاٹھیاواڑی، گجراتی، سندھی، ترک اور کچھ سے تعلق رکھنے والوں کی ہے ۔ یہ علاقہ انتہائی تنگ اور گنجان آباد ہے، میٹھادر اور کھارادر کے اردگرد واقع علاقوں میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی پیدائش گاہ وزیر میشن ، موسی لائن، میمن سوسائیٹی نوآباد)، کھڈا مارکیٹ، مچھی میانی مارکیٹ شامل ہیں۔ میٹھادر کے مشرق میں جوڑیا) بازار، لی مارکیٹ ،پرانا حاجی کیمپ،گارڈن، لسبیلا ،لیاقت آباد، فیڈرل بی ایریا، گلشن اور

جامعہ کراچی ہے، مغرب میں کراچی پورٹ، کیماڑی، منوڑہ، جنوب میں صرافہ بازار اور ککری گراؤنڈ، موسیٰ لین، کلری، بغدادی، بہار کالونی، آگرہ تاج کالونی اور شیر شاہ قبرستان اور شمال میں نیو میمن مسجد، بولٹن مارکیٹ، سٹی اسٹیشن، کلفٹن اور ڈیفنس ہے، میرا خاندان قیام پاکستان کے وقت ہجرت کرکے کراچی آنے والوں میں سے تھا، ابتدا میں کراچی کی قدیم آبادی ''کھڈا مارکیٹ'' میں رہائش اختیار کی، کچھ عرصہ کے بعد بہار کالونی منتقل ہوگئے اور پھر ''آگرہ تاج کالونی'' میں اپنا گھر بنالیا۔ میرا بچپن، جوانی انہی علاقوں میں گزرا۔

عبدالستار ایدھی کے پرکھوں کا تعلق ہندوستان کے علاقے گجرات سے تھا، ایدھی گجرات کے علاقے 'بانٹوا' میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا، تقسیم ہندوستان کے وقت اس خاندان نے کراچی ہجرت کی لیاری کا علاقہ میٹھادر ان کا مستقر ٹھہرا، اسوقت ایدھی کی عمر ۱۹ برس تھی۔ دکھی انسانیت کا خدمت کا جذبہ ایدھی میں اپنی ماں کی خدمت سے پیدا ہوا، ایدھی ابھی گیارہ برس کا تھا کہ اس کی ماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ معزور ہوگئی، یہی نہیں ہوا بلکہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنا ذہنی توزن بھی کھوparalyzed بیٹھی، ایسی صورت میں اُسے کل وقتی خدمات گزار کی ضرورت تھی، ایدھی نے اس کام لیے اپنے سے بہتر کسی کو نہ پایااوراس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ماں پر مرکوز کردی اور اس کی خدمات میں

لگ گیا، ایدھی اپنے ماں کے تمام تر کام از خود کیا کرتا تھا، کھانا کھلانا، کپڑے بدلوانا، صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا، نہلانا دھلانا، ایدھی کی زندگی میں یہی وہ لمحات تھے کہ اس کے اندر انسانیت کی خدمات کا جذبہ بیدار ہوا۔ ایدھی کی ماں آٹھ سال بعد انتقال کر گئیں اور اپنے بیٹے کے اندر خدمات کا ایسا جذبہ اجاگر کر گئی جس نے ایدھی کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدمت کا نشان بنا دیا۔ ایدھی کی ماں نے ایدھی کو بچپن ہی سے دوسروں کے ساتھ مہربان رہنے اور غریبوں کی مدد کرنے کی تلقین کی تھی۔ ایدھی نے اپنی ماں کی اسی نصیحت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

عبد الستار ایدھی کو دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ اپنی ماں کی خدمت کے نتیجے میں ملا، اگر ایدھی اپنی ماں کی خدمت نہ کرتا تو شاید آج وہ اس مقام و مرتبہ پر نہ ہوتا، یہ مرتبہ، یہ اعزاز، یہ مقام ماں کی خدمت کے عوض نصیب ہوا تھااور اس اعزاز و مرتبے کو پروان چڑھانے میں بھی ایک عورت کا عمل دخل رہااور وہ نیک صفت، وفا شعار عورت ہے بلقیس ایدھی، عبد الستار ایدھی سے شادی سے قبل بلقیس ایدھی نرس کے پیشے سے تعلق رکھتی تھی اور عبد الستار ایدھی کی ڈسپنسری میں خدمات انجام دیا کرتی تھی، ایدھی نے ۱۹۶۵ء میں بلقیس ایدھی سے شادی کی، شادی کے بعد سے ایدھی کے انتقال تک یعنی 51 سال بلقیس ایدھی نے اپنے شوہر کا ایسا ساتھ نبھایا کہ جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ یہ

قدم قدم پر ایدھی کے ساتھ رہی، ایدھی کو اس مقام، مرتبہ اور منزل پر پہنچانے میں اس کا کردار قابل رشک ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ایدھی نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق کاروبار شروع کیا لیکن اس میں اس کا دل نہیں لگا کیونکہ اس کے دل میں توانسانیت کی خدمات کا جذبہ جنم لے چکا تھا، چنانچہ ۱۹۵۱ء میں اس نے میٹھادر میں ایک دکان خریدی اور اس میں غریب لوگوں کے لیے ڈسپنسری قائم کی، جو ڈاکٹر اس کی ڈسپنسری میں مریضوں کو دیکھا کرتا تھا اس نے ایدھی کو طبّی امداد کے تمام امور کی تربیت بھی دی۔ یہ ایدھی کی فلاحی خدمات کا نقطہ آغاز تھا۔ ایدھی اپنے آپ کو اس ڈسپنسری تک محدود رکھنا نہیں چاہتا تھاچنانچہ اس نے پہلی بار عوام سے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے مدد کی اپیل کی، لوگوں نے اس کی بات کو توجہ سے سنا، اللہ تعالیٰ نے اس کی بات میں اثر پیدا کر دیا تھا، لوگوں نے اس پر بھروسی کیا، اعتماد کیا، ابتدائی طور پر ایدھی کو دو لاکھ روپے کی رقم وصول ہوئی، اسی رقم سے ایدھی نے اپنی خدمات کے دائرہ کو وسیع کیا، ایک کمرہ پر مشتمل ڈسپنسری ایک چھوٹے سے اسپتال میں تبدیل ہو گئی، ایک ایمبولینس بھی خرید لی گئی۔ ان آنکھوں نے نوجوانا ایدھی کو ملیشا کے کپڑے کا لباس زیب تن کیے اسی چھوٹے سے اسپتال کے سامنے چارپائی پر بیٹھے بارہا دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی فون نایاب چیز ہوا کرتا تھا، اکثر لوگ ایدھی کو

از خود آکر کسی بھی قسم کے حادثہ کی اطلاع کیا کرتے تھے، ایدھی نے اپنی سماجی ادارے ایدھی ٹرسٹ کا آغاز مبلغ پانچ ہزار روپے سے کیا تھا جو ترقی کرکے کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔

عبد الستار ایدھی کو گزشتہ سال ائرپورٹ پر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، مَیں کراچی سے لاہور جارہا تھا، جہاں سے مجھے سرگودھا یونیورسٹی جانا تھا۔ائرپورٹ پر عبد الستار اید بھی موجود تھا،اس کا سفر بھی کراچی سے لاہور کے لیے تھا،لاہور ائرپورٹ پر دو نوجوان ایک دائیں اور ایک بائیں ایدھی کا ہاتھ پکڑے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ نہ سیکیوریٹی تھی، نہ پولس نہ پولس کی موبائلیں، نہ لوگوں کو روکا گیا، نہ ٹریفک ہی جام ہوا، اگر غلطی سے کوئی کوئی وزیر یا سفیر ہوتا تو اس وقت ائرپورٹ پر قیامت کا سما ہوتا، چھوٹا قد، وہی کالے رنگ کے ملیشیاکا شلوار قمیض ، سر پر مخصوص کالی ٹوپی ، سانولا رنگ جس میں کسی قدر سیاہی کی آمیزش، پیروں میں چپل، سفید کالی داڑھی لمبائی میں بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ،پیشانی سے عظمت و بزرگی آشکارہ ، چہرہ پر متانت و سنجیدگی، دھیرے دھیرے ، چھوٹے چھوٹے قدموں سے ائرپورٹ سے باہر آئے، نہ وہ دبدبا تھا نہ وہ جوش، چہرہ پر اطمیان اور بردباری نمایاں تھی، وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مَیں نے ایدھی کو جوانی میں بھی دیکھا تھا۔آج کا ایدھی جسمانی اعتبار سے مختلف نظر آرہا تھا۔ انسانیت

کی خدمت کے طویل سفر نے ایدھی کی شخصیت میں نیکی، بھلائی اوردوسروں کی مدد و اعانت کی سفیدی کو اجاگر کر دیا ہے، ایدھی کا چہرہ ایک مہربان اور شفیق انسان کا چہرہ محوس ہو رہا تھا، سنجیدہ اور متین انسان کا چہرہ، سلام اس عظیم ہستی پر۔

ایدھی فاؤنڈیشن کے تحت خدمات کی مختلف جہتیں ہیں، ایمبولینس سروس کے حوالے سے یہ دنیا کی سب سے بڑی خدمتی تنظیم ہے، ایدھی ایمبولینسیز میں ائر ایمبولینس بھی شامل ہے، ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر مریضوں کی تیز تر منتقلی میں کام آتے ہیں، صرف کراچی میں ۸ اسپتال مفت طبّی امداد فراہم کر رہے ہیں، موبائل ڈسپنسری اور بلڈ بنک اس کے علاوہ ہے، ایدھی کے تحت ۱۵ ’’اپنا گھر‘‘ ہیں جس میں بے سہارا، لاوارث، ذہنی معزوروں کو پناہ ملی ہوئی ہے۔ایدھی کے تحت ’’جھولا‘‘ ایک ایسی منفرد خدمت ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی، پاکستان میں جس کا کوئی نہیں اللہ کے بعد ایدھی اس کا سہارا اور مددگار ہوتا ہے۔انسان خواہ امیر ہو یا غریب، وارثین موجود ہوں یا وہ لاوارث ہو مرنے کے بعد اس کے جسد خاکی کو جلد سے جلد خاک کی نظر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے فوری تدفین عمل میں نہ لائی جاسکے، یا لاش لاوارث ہو تو عبدالستا ایدھی کے ’’مردہ خانے‘‘ ہی ان مردوں کی وقتی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ کراچی میں سہراب گوٹھ پر قائم ایدھی مردہ خانہ لاوارث لاشوں اور وقتی طور

پر محفوظ کرائی گئی لاشوں کا مرکز ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس مردہ خانے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، لاشیں کفن پہنیں شیلفوں پر اوپر نیچے ترتیب سے رکھی ہوتی ہیں، دیکھ کر ایدھی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہاں مردوں کو غسل دینے اور کفنانے کا انتظام بھی ہے۔ عورتوں کے لیے غسل و کفن کا مرکز میٹھادر میں قائم ایدھی مرکز میں ہے۔ عبد الستار ایدھی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جارہا ہے اور لکھا جائے گا۔ ایدھی پر مرتب کی جانے والی سوانح حیات انگریزی میں ہے جسے ایک معروف مصنفہ نے بڑی محنت اور مہارت سے مرتب کیا ہے۔ My Feudal Lord کی خالق تہمینہ درانی، تعارف کی محتاج نہیں، انہیں اپنی اِسی کتاب سے شہرت حاصل ہوئی، یہ غلام مصطفیٰ کھر کی سابق ا ور وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی موجود شریک حیات ہیں، معروف سیاست داں سر سکندر حیات کی پوتی اور شوکت اللہ درانی کی بیٹی ہیں۔ انہوں نے عبدالستار ایدھی کی سوانح حیات A Mirror to the Blind کے نام سے مرتب کی ہے، یہ سوانح ۱۹۹۶ء میں نیشنل بیورو آف پبلی کیشن نے شائع کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایدھی کی زندگی کی کہانی انہوں نے ٹیپ کی اور یہ ٹیپ چالیس گھنٹوں پر محیط ہے۔ اس سوانح حیات میں عبد الستار ایدھی کی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔ تہمینہ درانی کی کتاب My feudal Loard کا ۳۶ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی اس کتاب

کاترجمہ اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ہو جائے تاکہ عام لوگ ایدھی کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے جان سکیں۔

۱۹۸۹ء میں حکومت پاکستان نے ایدھی کو "نشان امتیاز" دیا، اب اس کے انتقال کے بعد حکومت نے ایدھی کے لیے ستارہ امتیاز کا اعلان کیا ہے۔ بے شمار مقامی تنظیموں اور اداروں نے بھی ایدھی کو اعزازات سے نوازا۔ عالمی سطح پر بھی ایدھی کو اعزازار سے نوازا گیا، ۱۹۸۸ء میں آرمینیا میں زلزلہ سے متاثرہ افراد کی خدمت کے اعتراف میں اس وقت کی روس کی حکومت نے ایدھی کو "لینن امن انعام" سے نوازا، فلپائن حکومت نے ۱۹۸۶ء میں عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کو "میگسیسا ایوارڈ (Magsayay award) دیا، ۲۰۱۰ء میں یونیورسٹی آف بیڈفورڈشائر نے ایدھی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ اسی طرح عبدالستا ایدھی کو مختلف اداروں نے اعزازات و انعامات سے نوازا لیکن ایدھی کے لیے اصل اعزاز و انعام تو پاکستان کے لوگوں کا اعتماد اور بھروسہ تھا، وہ والہانہ محبت، عقیدت اور احترام تھا جو لوگ ایدھی پر نچھاور کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے عظیم لوگ صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ وہ 2013 میں گردوں کے مرض میں مبتلا ہوئے، بیماری اس قدر طویل ہوئی کہ ان ڈائلیسیز ہونے لگا اور کل ۸ جولائی کی شب اللہ کو پیراے ہوئے۔ ان کی نماز جنازہ کراچی کے نیشنل اسٹیڈیم میں ادا کی گئی اور لاکھوں محبت کرنے والوں کی موجودگی میں انہیں

ان کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی قبر میں اتار دیا گیا۔ ایدھی کو پوری قوم کا سلام عقیدت۔

کالم نگار محمد احمد سبزواری کی رحلت

معروف کالم نگار، ماہر معاشیات محمد احمد سبزوار جو ایم اے سبزواری کا ے نام سے معروف تھے 104 سال کی عمر میں کراچی میں جمعہ 15 جولائی 2016 کو انتقال کر گئے۔ ایم اے سبزواری روزنامہ جنگ میں 23 سال سے مختلف موضوعات پر کالم تحریر کرتے رہے، ان کا خاص موضوع معاشیات ہو کرتا تھا۔اس موضوع پر انہوں نے بے شمار کالم تحریر کیے۔ تاہم دیگر علمی وادبی موضوعات پر لکھتے رہے۔ کتابوں پر تبصرے کرنا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ انجمن ترقی اردو کے ادبی رسالے 'قومی زبان' میں مختلف تصانیف پر تبصرے بھی کیا کرتے تھے۔ کالم نگاری کی دنیا میں سبزوار صاحب معمر ترین کالم نگار تھے۔ ان کا آخری کالم روزنامہ جنگ میں 9 جولائی 2016 کو بعنوان 'وزیر خزانہ اور ان کی ٹیم مستحق داد' شائع ہوا۔2013ء میں ایم اے سبزواری صاحب سو سال کے ہوئے ، وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے چاق وچوبند اور فعال بھی تھے ۔ اس موقع پر ان کے اعزاز میں مختلف تقاریب منعقد ہوئیں تھیں۔ اس سلسلے کی ایک تقریب تحریک نفاذ اردو پاکستان کی جانب سے 'شام اعزاز محمد احمد سبزواری: تکریم پذیرائی' سماعت گاہ ناظم آباد کراچی میں زیر صدارت ڈاکٹر سید مبین اختر سرپرست اعلیٰ تحریک منعقد ہوئی تھی۔ محمد احمد سبزواری نے اپنی صد سالہ زندگی کے واقعات اور اردو میں میٹرک تا ایم اے حصول تعلیم

واستاد کا ذکر انتہائی فخر سے کیا تھا۔ گویا سبز وار صاحب اردو سے اپنی وابستگی کو قابل فخر و اعزاز تصور کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے پروردگار کا شکر بھی ادا کیا تھا جس نے انہیں بہ ہوش و حواس بغیر کسی سہارے کے چلنے پھرنے، پڑھنے کا اہل بنائے رکھا اور ایک صدی عمر گزارنے کا حوصلہ بخشا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد احمد سبز واری صاحب بڑے بہ ہمت اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔

محمد احمد سبز واری کا وطن ہندوستان کا شہر بھوپال تھا۔ بھوپال نے بڑے بڑے اہل علم و دانش کو جنم دیا، اردو زبان سے محبت اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہنا اہل بھوپال کے خون میں شامل تھا۔ وہ اسی مردم خیز سرزمین میں 16 جنوری 1913 میں پیدا ہوئے۔ تقسیم پاکستان کے بعد بے شمار علمی و ادبی شخصیات نے بھوپال سے پاکستان ہجرت کی ان میں سے ایک محمد احمد سبز واری بھی تھے۔ ہندوستان میں محمد احمد سبز واری صاحب راشنگ آفیسر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ محکمہ اعداد و شماریات میں ریسرچ اسپیشلٹ منسلک ہوگئے اور اسی محکمہ سے بطور چیف اسٹیٹیکل آفیسر کے 1980 میں ریٹائر ہوئے۔ گویا ریٹائرمنٹ کے بعد سبز واری صاحب 36 برس زندہ رہے اور فعال رہے۔ انہوں نے پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور میں پرجیکٹ کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ وہ جامعہ کراچی میں شوشیالوجی شعبہ سے بھی وابستہ رہے ، یہاں انہوں نے خاندانی

منصوبہ بندی کے پرجیکٹ میں کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔1993 میں انہوں نے بطور کالم نگار روزنامہ جنگ سے وابستگی اختیار کی جو رہتے دم تک قائم رہی ان کے کالم 'معیشت کی جھلکیاں' کے عنوان سے شائع ہوا کرتے تھے۔ یوں تو انہوں نے بے شمار کالم تحریر کیے ان میں بعض کوپزیرائی حاصل ہوئی ان میں 'تعلیمی اداروں کا معیار بڑھتا رہیگا'، شرائط زکوۃ، اقوام متحدہ کا ہیڈ پارک کارنر'، 'مودی جی دورے'، ' نادار کہاں ہیں'، 'ٹریڈ پالیسی'، 'بجٹ بخار'، ' مردم شماری'، گوادر کو اعلی شہر بنایئے'۔ترقی میں ملک کس سطح پر ہے' شامل ہیں۔

محمد احمد سبزواری کو پڑھنے اور لکھنے سے شروع ہی سے لگاؤ تھا ان کی تحریر کردہ کہانی میں بعنوان 'جنون کی کہانیاں' لاہور سے شائع ہونے والے رسالے1931 تہذیبِ نسوان' میں شائع ہوا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے لکھنے کا دورانیہ 80' برس پر محیط ہے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن سے ایم اے کیا، انہوں نے پی ایچ ڈی کی ابتدا بھی کی۔ 1948 میں پاکستان ہجرت کی حکومت پاکستان کی ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت وہ متعدد بار امریکہ اور دیگر ممالک مختلف تربیتی کورسیز کے لیے بھی گئے۔ اردو سے وابستگی معاشیات ان کا موضوع تھا اوران کی اولین کتاب بھی معیشت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جو 1935 میں شاہوئی ۔

اردوزبان میں ان کی کتاب

ہمارا بنک'' 1942 میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی جو بنکنگ کے موضوع پر اردو'' زبان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی پہلی شماریاتی رپورٹ کا اردو ترجمہ کرنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل تھا۔ 1997 میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے ڈاکٹر محبوب الحق کی کتاب (Human development in South Asia) کا اردو ترجمہ جو محمد احمد سبزواری نے کیا تھا شائع کیا۔ معاشی اصطلاعات میں بھی سبزواری صاحب کی خدمات قابل ذکر اور قابل ستائش ہیں۔ 1951 میں اردو انگریزی اصطلاحات پر مبنی کتاب 'اصطلاحات بنکاری' شائع ہوئی۔ یہ کتاب انگریزی اردو اصطلاحات کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترجمہ نویسی ان کا خاص موضوع تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے انہوں نے متعدد دستاویزات کے ترجمے کیے جو آج بھی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے نصاب کا حصہ ہیں۔ انہوں نے متعدد مضامین اور دستاویزات اور کتب کے ترجمے بھی کیے۔

تبصرہ نویسی بھی محمد احمد سبزواری کے شوق میں شامل تھا، وہ کراچی سے شائع ہونے والے ادبی جریدے 'افکار' کے بعد انجمن ترقی اردو کے جریدے 'قومی زبان' میں مستقل تبصرے کیا کرتے تھے۔ اردو زبان سے عقیدت اور محبت نے انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قریب بھی کردیا، انہوں نے بابائے اردو کی ٹیم میں بھی خدمات انجام دیں۔ اسکول و کالج کے زمانے میں میگزین ایڈیٹر بھی

رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ روزنامہ جنگ میں کالم لکھ رہے تھے اور انجمن ترقی اردو کے رسالے 'قومی زبان' میں مضامین وکتابوں پر تبصرے کیا کر رہے تھے۔ محمد احمد سبزواری جیسے حوصلہ منداور باہمت لوگ دنیا میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ان کی تخلیقات معیار اور تعداد کے اعتبار سے ہزاروں میں ہوں گی۔ انہوں نے طویل عرصہ اردو زبان کو علمی وادبی سرمائے سے مالا مال کیا جو رہتی دنیاتک طالبان علم کو فیض پہنچاتا رہے گا۔اللہ محمد احمد سبزواری کی مغفرت کرے۔

سعودی عرب میں دہشت گردی۔ قابل مذمت

دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ کوئی ملک بھی دہشت گرد کارروائیوں سے محفوظ نہیں۔ دہشت گردی کا باقاعدہ آغاز 11/9 کے بعد سے ہوا۔ جب سے دہشت گردی نے ایک ناسور کی مانند بے شمار ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ خاص طور پر اسلامی ممالک دہشت گردی کی لپیٹ میں ہیں۔ اس حوالے سے پاکستان سر فہرست نظر آتا ہے۔ دنیا کا بڑا اور اہم ملک سعودی عرب دہشت گردوں کے نشانے پر ہے۔ پیر 4 جولائی 2016ء میں سعودی عرب اور مسلمانانِ اسلام کے مقدس شہر مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ کے قریب خود کش دھماکہ کیا گیا۔ مدینہ کے علاوہ جدہ اور قطیف میں چار خود کش دھماکے ہوئے۔ ان میں سے ایک مدینہ منورہ میں، دہشت گرد نے مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہو کر کاروائی کی لیکن بروقت سیکیورٹی افراد کی کاروائی کے باعث اس نے اپنے آپ کو مسجد نبوی اور جنت البقیع کے درمیان سیکیورٹی چیک پوسٹ کے قریب کار پارکنگ میں خود کو بم سے اڑا لیا جس کے نتیجے میں افطار کرتے ہوئے پانچ سیکیورٹی اہل کار شہید ہو گئے۔ عین دھماکے کے وقت مسجد نبوی میں اقامت کہی جا رہی تھی۔ یہ دھماکے اس وقت ہوئے جب مدینہ منورہ میں سحری و افطار کی علامت کے طور پر کینن فائر کا وقت تھا، یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ یہ کینن کے فائر ہونے کی آواز ہے۔ اس وجہ سے لوگوں میں خوف

وہراس بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خود کش دہشت گرد 28 سالہ مسلم حماد الجہیدی بتایا گیا ہے، یہ شخص سعودع عرب کو کئی دہشت گردی کی کارویئوں میں مطلوب تھا۔ دو دھماکے سعودی عرب کے مشرقی شہر قطیف میں مسجد فراج العمران کے قریب خود کش دھماکے ہوئے ، دھاماکے میں خود کش بمبار ہلاک ہوگیا۔ خود کش بمبار 23 سالہ عبدالرحمٰن العمر، 20 سالہ ابرہیم العمر، 20 سالہ عبدالکریم الحسنی بتائے گئے ہیں، تیسرا خود کش دھماکہ جدہ میں بحرالاحمر میں سلیمان فقیہ اسپتال کے نذدیک واقع امریکی قونصل خانے کے قریب ہواایک خود کش بمبار جسے اب تک کی اطلاعات کے مطابق پاکستانی ظاہر کیا جارہا ہے نے خود کو دھماکے سے اڑالیا جس کے نتیجے میں دو سیکیورٹی اہلکار زخمی ہوگئے۔ یہ خود کش دہشت گرد پاکستانی نژاد تھا جس کانام عبد ال للہ گلزار خان بتایا گیا ہے۔

واضح طور پر توان خود کش حملوں کی ذمہ داری کسی دہشت گرد تنظیم نے قبول نہیں کی ہے لیکن عرب نیوز کی اطلاع کے مطابق جدہ اور قطیف میں دہشت گردی کی منصوبہ بندی داعش نے سیریا میں کی اور خود کش حملہ آوروں کو خود کش جیکٹیں فراہم کیں۔ مکہ اور مدینہ میں کوئی ایسی مسلمان دہشت گردی تو دور کی بات لڑائی جھگڑا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پاکستانی ہی کیا دنیا کا ہر مسلمان حرمین شریفین کے لیے اپنی جان بھی دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ جہاں تک دہشت گردی کا تعلق ہے اس وقت دنیا کا ہر ملک اور اسلامی دنیاکے تمام ہی سلطنتیں

دہشت گردی کا شکار ہیں، سعودی عرب میں اس قسم کے واقعات پہلے مرتبہ نہیں ہوئے بلکہ دہشت گردی ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے۔ 1979ء کی بات ہے کہ دہشت گرد خانہ کعبہ میں قبضے کے لیے داخل ہوگئے تھے۔ اس دہشت گردی کو سعودی عرب کے علاوہ پاکستان کے بہادر کمانڈوز نے ناکام بنایا تھا۔ سعودی عرب کے تنازعہ بعض اسلامی ممالک سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ دیگر ممالک بھی باہم دشت و گریباں نظر آتے ہیں، دہشت گردوں کے منصوبے تو اپنی جگہ اسلامی ممالک باہم ایک دوسرے پر الزام تراشی اور ایک دوسرے کو کمزور کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ سعودی عرب کی یمن میں کارروئیاں، حوثی باغیوں کی لشکر کشی اور دیگر کاروائیوں کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ یمن میں باغیوں کی مدد کون کون نہیں کر رہا، یہ بات بھی سب پر عیاں ہے، شام کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے، لیبیا، تیونس میں بھی صورت حال خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے، سعودی عرب اور ایران بھی ایک دوسرے سے خوش نہیں، سعودی عرب نے 35 ممالک کی افواج پر مشتمل اتحاد تشکیل دیا، دہشت گرد تنظیموں کی جانب سے اسلامی ممالک میں دہشت گردی پھیلانے کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ اس میں پاکستان کے علاوہ سعودی عرب اور دیگر اسلامی ممالک بھی شامل ہے۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا کہ کوئی دہشت گرد واقعہ رونما نہ ہوتا ہو۔

لمحۂ فکر یہ ہے کہ دہشت گرد تنظیمیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں، ان کا بنیا

دی مقصد دنیا میں اسلامی شرعی نظام کا قیام بھی ہے۔ دیگر ممالک میں دہشت گردی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن کیا کوئی مسلمان اللہ کے گھر خانہ کعبہ اور ہمارے نبی ﷺ کے روضہ مبارک اور مدینہ منورہ میں کشت و خون کا بازار گرم کرنے، بے گناہ مسلمانوں کو شہید کرنے کا عمل کرنا تو دور کی بات مسلمان تو ایسا سوچ کر ہی لرز جاتا ہے۔ یہ کیسے جنت کے حصول کی خواہش رکھنے والے لوگ ہیں، کہ جس نے جنت عطا کرنی ہے، جس کے سامنے ہم گڑگڑا کر، عاجزی کے ساتھ، دن میں پانچ مرتبہ سجدہ ریز ہوتے ہیں، اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنے لیے خیر مانگتے ہیں، گناہوں کی توبہ کرتے ہیں، اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے جنت کی دعا کرتے ہیں۔ عجیب اور سمجھ سے بالا ہے کہ مدینہ منورہ میں جنت البقیع اور روضہ رسول ﷺ کے عین درمیان خود کش حملہ کرنے والا یا حملہ کرنے والے، انہیں اس عمل پر تیار کرنے والے، کس منہ سے سجدہ ریز ہوتے ہیں، کس منہ سے توبہ اور جنت کی دعا کرتے ہیں۔ یہ بات واضح ہوچکی کہ یہ خود کش دھماکے کرنے والے غیر مسلم نہیں تھے، یہ سعودی، پاکستانی تھے، گیا مسلمان ہی تھے۔ ان کی مسلمانیت پر کیا کہا جاسکتا ہے؟ ان کو اس عمل پر اکسانے والے، ان کا برین واش کرنے والے، انہیں جنت کا سبز باغ دکھا کر خود کش حملہ کرنے والوں کو پروردگار ہدیت دے، پروردگار اگر ان کی قسمت میں ہدایت نہیں تو انہیں اس دنیا سے اسی طرح اٹھالے جیسے ان کے تیار کردہ خوش کش بمباروں کو دنیا سے نیست و نابود کردیا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ مسجد نبوی کی دیوار

اور جنت البقیع کی دیوار کے درمیان بہت ہی کم فاصلہ ہے، اس جگہ سے روضہ رسول ﷺ چند قدم کے فاصلے پر ہے، اس خود کش حملہ آور، بدبخت، وحشی، جنگلی، درندہ کہاں جاکر یہ دھماکہ کرنا چاہتا تھا؟ یقیناً اگر اسے موقع مل جاتا یا پھر اللہ نے اسے اسی حد تک محدود رکھا کہ وہ ہمارے آقا و مولا نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے روضہ مبارک تک نہ پہنچ سکا، اس نے یہ جرت کیسے کی؟ اگر وہ مسلمان تھا تو اسے خوف خدا نہ آیا، اسے رسول ﷺ سے چاہت اور ان کا مقام کا خیال نہ آیا، مدینہ منورہ تو شہر امن ہے، شہر سکون ہے، شہر چین ہے، شہر اطمینان ہے، شہر آرام ہے، شہر صلح، شہر آشتی ہے، شہر پناہ ہے، شہر حفاظت ہے پھر دہشت گردنے کیسے اور کیوں کر یہ قدم اٹھایا؟ کلمہ پڑھنے والا تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا، ایسا عمل کرنا تو دور کی بات ہے، اس منصوبے کا ماسٹر مائنڈ کیا کوئی مسلمان ہو سکتا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ جو مسلمان اپنے پیارے نبی ﷺ کے روضے کی ایک جھلک دیکھنے کی خواہش لیے رہتا ہو، اس کی خواہش اور تمنا ہی یہ ہو کہ اسے زندگی میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں حاضری ہو جائے، وہ ایک مرتبہ اپنے آقا و مولا کے روضہ کا دیدار کر لے، وہاں سلام عقیدت پیش کر دے، وہ تو اپنے نبی ﷺ کے نام پر اپنی جان و مال، عزت و آبرو قربان کرنے کر ہر لمحہ تیار رہتا ہو، وہ بھلا اس طرح کی کاروائی کرنا تو دور کی بات سوچ میں بھی یہ عمل نہیں لا سکتا، یقیناً یہ عمل کرنے والا مسلمان ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہودیوں سے نفرت، امریکہ سے نفرت،۔برطانوی پالیسی سے

اختلاف اور دشمنی اپنی جگہ، کوئی اس بات سے متفق نہیں کہ امریکہ دنیا میں اپنا لوہا منوانے کے لیے جو اقدامات کر رہا ہے ان سے شدید اختلاف ہو سکتا ہے، امریکہ کی پالیسیاں کسی بھی مسلمان ملک کے فائدے میں نہیں، وہ تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی مخلص نہیں، وہ مفاد پرست ملک ہے، اسے صرف اور صرف اپنا مفاد، اپنا فائدہ عزیز ہے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے، طرح طرح سے، مختلف ملکوں کو لالچ دے کر، امداد اور قرض دے کر اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ سعودی عرب کا جھکاؤ بھی اسی جانب نظر آتا ہے، دہشت گردوں کے لیے یہی عمل سعودی عرب سے دشمنی کا باعث ہو سکتا ہے، دیگر اختلافات بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ خانہ کعبہ، مکہ و مدینہ کو نشانہ بنائیں۔ اس قسم کی دشت گردی سے مسلمانوں کے ان مقدس و محترم مقامات کی حرمت مجروح ہوئی ہے، مسلمانوں کی دل دکھی ہوئے ہیں، وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئے ہیں، دہشت گردوں کو سوچنا ہوگا کہ ان کا یہ عمل کس قدر تکلیف کا باعث ہوا ہے۔ اللہ تعالی انہیں نیک ہدایت دے۔

شوال المکرم اور غزوہ اُحد

شوال المکرم اسلامی مہینوں کا دسواں مہینہ ہے۔ اس مہینے میں متعدد اہم اور تاریخی واقعات رونما ہوئے جو مسلمانوں کے لیے ہمیشہ یادگار اور قابل ذکر ہیں۔ شوال المکرم سے قبل رمضان المبارک اختتام پذیر ہوتا ہے۔یکم شوال روزوں کے اختتام کا انعام قرار پایا یعنی اس دن کو عیدالفطر قرار دیا گیا یعنی خوشی کا دن، یہی وہ مہینہ ہے کہ جس میں دو غزوات لڑی گئیں ۔ ان غزوات میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کے لشکر کی از خود کمان کی وہ ان میں سپہ سالار تھے۔ غزوہ احد 3 ہجری بروز جمعہ 15 شوال کو وقوع پذیر ہوئی تھی، فتح مکہ کے بعد شوال المکرم ہی میں غزوہ حنین واقع ہوئی۔ یہاں ہم غزوہ اُحد کی یاد تازہ کریں گے۔

عہد نبوی ﷺ میں 27 غزوات و سرایا ہوئے ۔ ان میں سے اولین غزوہ بدر تھی۔غزوہ بدر پہلی جنگ تھی جو مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش قبیلے جو کافر تھے کے درمیان 17 مارچ 624 عیسوی مطابق 17 رمضان المبارک 2 ہجری کو ہوئی ۔اس دن کو ’یوم الفرقان‘ کہا گیا کیونکہ یہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کو فتح و غلبہ دے کر واضح کر دیا گیا کہ اسلام حق ہے اور کفر و شرک باطل ہے۔ غزوہ بدر کی فتح نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند اور کفار کے

سامنے سینہ سپر ہونے کا جذبہ بڑھا دیا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ جب اسلامی مہینے شوال المکرم میں غزوہ اُحد کا میدان سجنے کا وقت آیا تھا تو نبی ﷺ کی رائے یہ تھی کہ یہ جنگ مدینہ منورہ کے اندر رہتے ہوئے لڑی جائے یعنی مسلمان مدینے میں رہتے ہوئے اپنا دفع کریں۔ اس کے برعکس نوجوان اور پرجوش صاحبہ اکرمؓ کی رائے یہ تھی کہ ہم کفار کا مقابلہ کھلے میدان میں اسی طرح کریں جس طرح بدر کے میدان میں مسلمانوں نے کفار کے مقابلے میں کیا تھا اور فتح سے ہمکنار ہوئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے نوجوان وپرجوش صحابہ کی رائے کو اہمیت دی اور کفار سے مقابلے کے لیے احد پہاڑ کے دامن میں کفار کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ غزوہ اُحد جبلِ اُحد کے دامن میں 3 ہجری بروز جمعہ 15 شوال کو وقوع پذیر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا لشکر اُحد کے دامن میں کرانہ وادی میں درہ (شعب) کے نددیک جمع ہوا۔ جس میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے کفار کے ساتھ جنگ میں از خود حصہ لیا اور اس جنگ میں 70 صحابہ اکرمؓ نے شہادت نوش کیا

اُحد پہاڑ وہ ہے جس سے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو بھی خاص انسیت و محبت تھی۔ ارشاد نبوی ہے کہ ''کوہِ اُحد سے ہم محبت کرتے ہیں اور یہ بھی ہماری محبت کا دم بھرتا ہے''۔ ایک اور حدیث نبوی ہے جس کے راوی حضرت انسؓ ہیں آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کی نظرِ شفقت جبلِ اُحد پر پڑی تو آپ ﷺ نے

اپنی زبان مبارک سے بے ساختہ 'اللہ اکبر' کہا اور فرمایا کہ ' یہ پہاڑ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہے'۔ جبلِ اُحد کے بارے میں ایک اور حدیث جو کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کوہِ اُحد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہوگا جب تم اس کے پاس سے گزرو تو اس کے درختوں کا میوہ کھا لیا کرو اگر کچھ بھی نہ ملے تو وہاں صحرا کی گھاس ہی چبا لیا کرو ''

راقم کو جبل اُحد کو دیکھنے، اس کے دامن میں قائم شہدائے احد پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ بات ہے اتوار 12 جنوری 2014ء کی، میں جبلِ اُحد کے دامن میں تھا۔ دائیں جانب اُحد اپنی وجاحت لیے فخریہ انداز سے یہاں آنے والوں کا استقبال کر رہا تھا تو بائیں جانب ایک بڑی چار دیواری جس پر جنگلہ لگا ہوا تھا موجود تھی۔ سامنے اونچا وسیع و عریض پہاڑ جبلِ اُحد ہے اور یہ چار دیواری جنگ احد میں شہادت حاصل کرنے والے شہدا کی قبروں پر مشتمل ہے۔ شہدا کی یادگار کے بعد ایک اور کم اونچا پہاڑ بھی نظر آرہا تھا جس پر لوگ کافی تعداد میں موجود نظر آرہے تھے، یہ چھوٹا سا پہاڑ جسے اب ٹیلہ کہا جاسکتا ہے'' جبلِ روما'' ہے۔ اس چھوٹے سے پہاڑ پر اور اس کے ارد گرد جنگِ اُحد کا معرکہ عمل میں آیا، 70 جلیل القدر صحابہ اکرمؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کی قبریں جبلِ احد اور جبلِ روما کے درمیان چار دیواری میں موجود

ہیں۔ان شہدا میں سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے چچا سید الشہدا سیدنا حمزہؓ بن عبدالمطلب کی قبر مبارک بھی ہے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب ۔ ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا، علماء اکرم سے جنگ اُحد کے معرکے کی تفصیل سنی تھی اللہ نے یہ سعادت عطا کی کہ جبل اُحد کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا، جبلِ احد کی جانب رخ کیا اس پر غور سے، نگاہ جما کر، جی بھر کر دیکھا اور سلامِ عقیدت پیش کیا۔ پہاڑ تو بے جان ہے پھر اسے سلام عقیدت پیش کرنا؟جی ہاں میں نے اس عظیم المرتبت ، مقدس پہاڑ کو سلامِ عقیدت پیش کیا اس لیے کہ جمادات میں دوستی و دشمنی نیک بختی و سعادت مندی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔فرمان خداوندی ہے ترجمہ) ’’اور ہر ایک چیز اللہ کی حمد بیان کرتی ہے‘‘۔ (سورۃ بنی اسرائیل)۔ جبلِ اُحد) کی عظمت کا اندازہ اس روایت سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ سیدنا انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ’’ جب اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر نور کی تجلی ڈالی تو وہ عظمتِ خداوندی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ جس میں سے تین ٹکڑے مکہ مکرمہ میں اور تین ٹکڑے مدینہ منورہ میں جاپڑے۔ مکہ مکرمہ میں جبلِ حرا، جبلِ ثبیر اور جبلِ ثور معرض وجود میں آئے اور مدینہ منورہ میں جبلِ اُحد، جبلِ ورقان اور جبلِ رضوی ظہور پذیر ہوئے‘‘۔

شہدائے اُحد کی عظمت اور مقام تاریخ اسلام میں سنہرے حروف سے درج ہے۔ اُحد

کے دامن میں ایک چار دیواری جسے خستہ حال ہی کہا جائے گا موجود ہے نیچے کوئی چار فٹ پکی دیوار ہے اس کے اوپر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چار دیواری ایک مستطیل ہے اندر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر نظر آرہے ہیں جن کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ قبریں ہیں اس مستطیل کے درمیان میں ایک قبر ہے جس کے اوپر صرف ایک پتھر ہی لگا ہوا ہے اس کے چاروں طرف کوئی دو فٹ اونچی بوسیدہ دیوار بھی ہے۔ یہ قبر شہداء اُحد کے سردار سید الشہدا سیدنا حمزہؓ کی قبر مبارک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس چار دیواری میں صرف اُحد کے شہدا ہی دفن نہیں بلکہ ان کے بعد مختلف ادوار میں لوگوں کی تدفین اس میں ہوتی رہی ہے۔ ''تاریخ مدینہ منورہ'' کے مصنف محمد عبد المعبود نے موطا امام مالک کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شہدائے اُحد کے ۴۶ سال بعد ایک مرتبہ سیلاب کی وجہ سے سیدنا عمرو بن الجموع اور سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کی قبریں کھل گئی تھیں۔ یہ دونوں انصار غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ ان کے وجود اس طرح تروتازہ پائے گئے گویا کہ کل ہی دفن ہوئے تھے۔ دونوں میں سے ایک نے ہاتھ زخم پر رکھا ہوا تھا۔ اور اسی حالت میں دفن کر دیا گیا۔ پس جب ان کا ہاتھ اس زخم سے ہٹایا گیا تو چھوڑتے ہی وہ فوراً زخم پر حسب سابق آگیا''۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ شہداء احد کی زیارت کو ہر سال تشریف لے جاتے تھے اور ان الفاظ میں سلام پیش کیا کرتے تھے۔ ''سلام علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار'' ۔ہم نے بھی شہدائے احد اور دیگر اہل قبور کے لیے مغفرت کی دعا کی

غزوہ اُحد کا معرکہ جبلِ اُحد کے دامن میں ہوا۔ وادیٔ کرانہ میں ایک چھوٹا سا پہاڑ بھی موجود ہے جسے 'جبلِ روما' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس کی اونچائی ۲۰ سے ۲۵ فٹ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سب ہی لوگ بہ آسانی چڑھ جاتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر پہنچ کر شہدائے اُحد کی یادگار واضح طور پر نظر آتی ہے اس میں موجود تمام قبروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نیز اسی جانب جبل اُحد تا حد نظر انتہائی اونچا صاف طور پر جلوا نما ہے۔ جنگِ بدر میں شکست کھا کر اس وقت کے قریشِ مکہ کی حالت اس مچھلی کی طرح تھی جسے پانی سے نکال کر خشکی میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک ایک دن مشکل سے گزار رہے تھے اور بھرپور انداز سے جنگی تیاروں میں مصروف تھے۔ ہجرت کا تیسرا ہی سال تھا۔ مشرکین مکہ نے تین ہزار کا لشکر ابو سفیان کی سرکردگی میں تیار کیا۔ عورتوں کی سرپرستی ابو سفیان کی بیوی ''ہندہ بنتِ عتبہ'' کر رہی تھی۔ یہ وہی ہندہ ہے جس نے حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کی شہادت کے بعد ان کا جگر نکال کر چبایا جب نگلا نہ جاسکا تو تھوک دیا تھا۔ مسلمانوں کو جب مشرکین کی اس سورش کا علم ہوا تو نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے مشرکین کا مقابلہ کرنے کے اقدامات کیے، صرف ایک ہزار کا لشکر تیار ہوسکا۔ ان میں سے ۳۰۰ افراد کی کمان عبد اللہ بن اُبی کے ہاتھ میں تھی۔ عبد

اللہ بن اُبی نے عین وقت پر غداری کی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس مدینہ چلا گیا اب ۱۰۰۰ مشرکین کے مقابلے میں صرف ۷۰۰ مسلمان رہ گئے۔ اس موقع پر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی (ترجمہ۔ پس کیا ہے واسطے تمہارے بیچ منافقوں کے دو فرقے ہو رہے ہو۔ اور اللہ نے الٹا کیا اب ان کو بسبب اس چیز کے کہ کمایا انہوں نے۔ کیا ارادہ کرتے ہو تم یہ کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا! اللہ نے ؟ اور جس کو گمراہ کرے اللہ پس ہر گز نہ پائے گا تو واسطے اس کے راہ'') ایک طرف کفار تعداد میں بہت زیادہ اور جنگی ساز و سامان سے آراستہ تھے تو دوسری جانب مسلمانوں میں جذبہ اور ایمان کی قوت تھی۔ معرکہ جبلِ اُحد کے دامن میں ہوا۔ مسلمانوں کی سرپرستی اور رہنمائی نبی اکرم حضرت محمد ﷺ نے کی جب کہ کفار کا لشکر ابو سفیان کی کمان میں تھا۔ اس جنگ میں مشرکین کا پلڑا بھاری رہا، بظاہر انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کامیاب ہوئے اور انہوں نے جنگِ بدر کا بدلہ لے لیا۔ دوسری جانب اللہ کے نبی ﷺ اور ان کے ساتھی تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور غزوہ احد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کا جوش و جذبہ بلند تھا اور وہ مشرکین کو بہادری کے ساتھ پے در پے وار کرکے ختم کر رہے تھے۔ مشرکین پسپا ہو رہے تھے محسوس ہوا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ ۵۰ تیر انداز جنہیں آنحضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کی پشت پر موجود کوہ عینین میں ایک شگاف یا درہ پر معمور کر دیا تھا جہاں سے مشرکین کے حملے کا خطرہ تھا۔ ان تیر اندازوں کی کمان حضرت عبد اللہ بن جبیرؓ کر رہے تھے۔ آپ

ﷺ نے انہیں تاکید فرمائی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے اس درہ کو کسی صورت نہیں چھوڑنا۔ پیراویسی تبسم نے اپنے مضمون 'غزوہ امت اور تعلیم امت' میں 'صحیح بخاری کتاب الجہاد' کے حوالے سے حضور ﷺ کی اس ہدایت کو اس طرح نقل کیا ہے "اگر تم دیکھو کہ پرندے ہم کو اچک لیے جارہے ہیں تو اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمہارے پاس کسی کو بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور مار کر پامال کر دیا ہے تب بھی ایسا نہ کرنا"۔ جب ان تیر اندازوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔ کفارِ مکہ شکست کھاتے اور بھاگتے نظر آئے تو انہوں نے سمجھا کہ فتح ہو گئی ہے چنانچہ ان تیر اندازوں کی اکثریت نے درہ کو چھوڑ دیا اور میدان جنگ میں چلے آئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔ درہ پر صرف ۱۰ تیر انداز رہ گئے تھے۔ مشرکین کی فوج میں شامل خالد بن ولید جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور عکرمہ بن ابی جہل درہ کی جانب سے آ نکلے اور عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر کے مسلمانوں کے لشکر پر چڑھ دوڑے۔ ان کے اس حملے نے جنگ کا نقشہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ مشرکین کی فتح کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔ مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ حضور ﷺ کی اس ہدایت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کسی صورت بھی اس درہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ درہ پر معمور مسلمانوں نے حضور ﷺ کی اس ہدایت پر عمل نہ کیا جس کے نتیجے میں فتح شکست میں بدل گئی۔

غزوہ احد کے حوالے سے دوسرا اہم واقعہ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا ہے۔ حضرحمزہؓ کو شہادت کا رتبہ تو ملا لیکن مشرکین نے آپ کے مردہ جسم کی بے حرمتی کی، آپ کے کان ناک اور دیگر اعضاء کاٹ دیے۔ ابو سفیان کی بیوی ''ہندہ'' نے حضرت حمزہؓ کے شہید، ہونے کے بعد ان کے جسم مبارک کو چیر کر ان کا جگر نکالا، اسے چبایا جب نگل نہ سکی تو اسے تھوک دیا۔ ہندہ نے حضرت حمزہ کو شہید کرنے پر اپنے کڑے، بالیاں اور گلے کا ہار انعام میں وحشی کو دیا۔ حضرت حمزہؓ ایک بہادر اور دلیر صحابی تھے آپ نے جنگ بدر میں بے شمار مشرکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا یہ بات مشرکین کے علم میں تھی چنانچہ وہ دیگر کے علاوہ حضرت حمزہؓ کے خون کے پیاسے تھے۔ مشرک جبیر بن مطعم نے وحشی' نامی ایک غلام کو آزاد کر دینے کا لالچ دیگر حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کا ٹاسک ' دیا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا موقع دیکھ کر حضرت حمزہؓ پر ایسا وار کیا کہ وہ شہید ہو گئے۔
آنحضرت ﷺ نے جب حضرت حمزہؓ کی شہادت شدہ لاش دیکھی تو بہت غم گین ہوئے فرمایا ایسا دردناک منظر میری نظر سے کبھی نہیں گزرا'۔ آپ ﷺ نے شہدائے اُحد، کے لیے فرمایا کہ ''میں قیامت کے دن ان کا شفیع ہوں''۔ وحشی بعد میں ایمان لے آیا تھا لیکن حضور ﷺ نے اسے
اپنے سامنے آنے سے منع فرما دیا تھا۔

غزوہ اُحد میں آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر کا عام ہو جانا اور آپ ﷺ کے دندانِ مبارک کے شہید ہو جانے کا واقع بھی ہے۔ حضرت مُصعب بن عمیرؓ کی شکل و صورت نبی اکرم محمد ﷺ سے ملتی جلتی تھی۔ جس وقت مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر انہیں شہید کر رہے تھے تو حضرت مُصعبؓ آنحضرت ﷺ کو محفوظ رکھنے اور انہیں بچانے کی کوشش میں شہید ہو گئے۔ مشرکین نے یہ افواہ پھیلا دی کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ یہ خبر صحابہ اکرم پر بجلی بن کر گری، ایک سراسیمی پھیل گئی، افراہ تفری کا پھیل جانا ایک قدرتی عمل تھا۔ مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت دم خم تھا وہ بھی اس خبر کے پھیل جانے سے جاتا رہا۔ مشرکین کی عورتوں نے اس خبر پر خوشی کے ترانے گائے۔ لیکن یہ خبر سچ نہیں تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت ابو دجانہؓ اور دیگر صحابہ اکرم نے آپ ﷺ کو گھیرا ہوا تھا دشمنوں نے تیروں کی بارش کی، پتھر پھینکے، صحابہ نے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا اس کے باوجود آپ ﷺ کی پیشانی اور بازو زخمی ہو گئے اور آپ ﷺ کے دو دانت مبارک بھی شہید ہو گئے۔ اس وقت بھی اللہ کے نبیؐ نے مشرکین کو بد دعا نہیں دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ 'اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتی'۔ اس جنگ میں ۷۰ مسلمان شہید ہوئے۔ اس روز تکلیف اور زخموں کے باعث نبی اکرم ﷺ نے ظہر کی نماز بیٹھ کر ادا کی اور آپ ﷺ کے ساتھ مقدیوں نے بھی بیٹھ کر ہی نماز ادا کی۔

غزوہ اُحد میں نبی ﷺ کے دندان مبارک کے شہید ہونے کی بات ہو تو یمن کے محلے قرن کے باسی حضرت خواجہ اویس قرنی کا خیال آنا لازمی ہے۔ حضرت اویس قرنی احسان و مہربانی اور نبیؐ سے محبت کے اعتبار سے محترم تابعین میں سے ہیں۔ آپ یمن کے شہر قرن کے رہنے والے تھے۔ آپ اتنے درویش منش اور ایسے فقیر تھے کہ لوگ آپ کو دیوانہ تصور کیا کرتے تھے۔ سید علی ہجویری نے اپنی تصنیف 'کشف المحجوب' میں اویس قرنی کو اہل تصوف کا عظیم مشائخ قرار دیا ہے۔ قرنی سچے عاشق رسولؐ تھے عالم جسمانی میں حضرت محمد ﷺ کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا لیکن روحانی طور پر آپ اپنے نبیؐ کے خیال میں گم رہا کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اویس قرنی اپنی والدہ محترمہ کے واحد کفیل تھے اور اپنی والدہ کی خدمت کے علاوہ تنگ دستی نیز انہیں تنہا نہ چھوڑنے کے باعث قرن سے باہر نہیں جا سکتے تھے یہی وجہ رہی کہ آپ نبی اکرم ﷺ کی ظاہری زندگی میں زیارت نہ کر سکے۔ ان کا ذریعہ معاش شتر بانی یعنی اونٹ چرانہ اور زمین پر گری ہوئی کھجور کی گٹھلیاں اکٹھی کرکے انہیں بازار میں بیچ کر اپنا گزر بسر کرنا تھا۔ اویس قرنی کو جب غزوہ اُحد کے حالات خصوصاً حضرت محمد ﷺ کے دانت کی شہادت کا علم ہوا تو حضورؐ کو پہنچنے والی اذیت و تکلیف کے خیال سے آپ تڑپ اٹھے اور زار و قطار روتے تھے آنسوں تھے کہ تھم نے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ جب آپ کو احساس ہوا کہ دانت ٹوٹنے سے حضور ﷺ کو اس قدر شدید

تکلیف ہوئی ہوگی تو آپ نے ایک پتھر اپنے دانت پر مار کر اپنا دانت توڑ ڈالا، پھر آپ کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ دانت نہیں بلکہ اس کے برابر والا دانت حضورؐ کا ٹوٹا ہو تو آپ نے دوسرا دانت توڑ ڈالا، پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کا نیچے والا دانت ٹوٹا ہو تو آپ نے اپنا نیچے والا دانت توڑ ڈالا۔ اس طرح آپ نے یکے بعد دیگر تمام دانت توڑ ڈالے کہ کسی طرح اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کا کامل اتباع حاصل ہو سکے۔ اللہ اللہ اپنے نبیؐ سے محبت کی لازوال مثال ہے۔ اُحد کے مقام سے مَیں نے حضرت اویس قرنی کو سلام عقیدت پیش کیا۔

غزوہ اُحد کے شہداء کو غسل دیے بغیر نیز ایک قبر میں کئی کئی شہدا کو دفن کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھی گئی۔ انہیں باقاعدہ کفن بھی نہیں پہنایا گیا اس کی وجہ اس وقت کفن کے کپڑوں کا میسر نہ ہونا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کفن کے لیے جو چادریں میسر تھیں اور لمبائی میں کم یا چھوٹی تھیں جس کے باعث حضور ﷺ نے ہدایت کی کہ منہ ڈھانپ دیا جائے اور پیروں کو حرمل، گھاس یا پتوں سے ڈھانپ دیا جائے۔ البتہ سید الشہدا حضرت حمزہؓ کو ایک ہی چادر میں دفن کیا گیا۔ صحابی حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری کو غسل الملائکہ کہا گیا یعنی جنہیں فرشتوں نے غسل دیا۔ اس واقع کا ذکر پیر اویسی تبسم نے اپنے مضمون 'غزوہ اُحد اور تعلیم امت' میں 'سیرت ابن ہشام' کے حوالے سے اس طرح

کیا ہے کہ ' حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری نے مشرکین کے سپہ سالار ابو سفیان پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ابوسفیان کو قتل کر دیتے۔ مگر شداد بن الاسود نے ان کے وار کو روک لیا اور اپنی تلوار سے حضرت حنظلہ بن ابی عامر انصاری کو شہید کر دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔ ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کرو۔ بیوی نے کہا کہ شبِ اُحد ان کی شادی ہوئی تھی۔ صبح کو اٹھے غسل کی حاجت تھی۔ غسل کیلئے آدھا سر دھویا تھا کہ دعوت جنگ کی آواز کان میں پڑی۔ فوراً اسی حالت میں وہ شریک جنگ ہوگئے۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسی سبب سے اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کہلاتے ہیں''۔ روایت ہے کہ اس واقع کے کئی برس بعد آنحضرت محمد ﷺ شہدائے احد کی قبروں پر آئے اور شہداء پر نماز جنازہ پڑھی۔ اُحد کے میدان میں مسلمان خواتین بھی شریک جنگ تھیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ ، ام سلیمہؓ ، ام سیطؓ، ام ایمنؓ، حمنہ بنت جحشؓ، ام عمارہؓ، نسیبہ بنت کعب انصاریؓ، حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) اور دیگر شامل تھیں۔ یہ خواتین مشکیں بھر بھر کر لاتیں اور مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں۔ بعض خواتین زخمیوں کے زخموں کو دھوتیں، انہیں صاف کرتی اور ان کی مرہم پٹی کیا کرتیں۔ سلام ان تمام مومن خواتین پر جنہوں نے اُحد کی جنگ میں مردوں کے شانا بشانہ حصہ لیا۔

ترکی میں فوجی بغاوت۔ ہمارے لیے کوئی سبق ہے

ترکی میں عسکری بغاوت یعنی مارشل لاء نافذ کرنے ، جمہوریت پر شب خور مانے کی کوشش ترکی کے غیور عوام نے ناکام بنادی۔ ترکی کے عوام کا جمہوریت کے لیے یہ عمل بے مثال ، بہادرانہ و دلیرانہ عمل ہی نہیں بلکہ اقوام عالم کے لیے تقلید مثال ہے خاص طور پر جن ممالک میں فوجی بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بد قسمتی سے ان ریاستوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ پاکستان اپنی آزادی کی 69 سالہ (1947ء۔2016ء)تاریخ میں چار مرتبہ مارشل لاء کی کڑوی بہاریں دیکھ چکا ہے، جنرل ایوب خان (1958۔ اس میں جنرل یحییٰ خان کا دور بھی شامل ہے، جنرل ضیاء الحق (4 , 1971) جولائی1988-1977) اور جنرل پرویز مشرف (اکتوبر1999۔2008) وقفے وقفے سے پاکستان پر حکمرانی کرچکے ہیں۔ کسی ایک جنرل کے فوجی اقدام پر، فوجی بغاوت پر، جمہوریت کو پاؤں تلے روندنے پر انہیں کسی بھی قسم کی خاص طور پر عوام کی جانب سے مُزاحمت کا سامنا نہیں کرناپڑا، ہر ایک جنرل نے بڑے آرام سے، سکون کے ساتھ جمہوری حکمرانوں کو، جمہوریت کا خاتمہ کرکے اپنی حکمرانی کا اعلان فخریہ انداز سے کیا۔ یہی نہیں بلکہ فوجی حکمرانوں کے اس عمل پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے، مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ فوجی مداخلت کے آثار و امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے حکمرانوں کے خلاف جب بھی تحریک شدومد سے ہوتی ہے تو فوجی مداخلت کے،

لیے اصطلاحات مثلاً تیسرے امپائر کی انگلی اٹھنے والی ہے، بوٹوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے وغیرہ قسم کی باتیں کھلے عام کہی جانے لگتی ہیں۔ آج ہی تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے 17 جولائی 2016 کشمیر کے شہر اسلام گڑھ میں انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ 'پاکستان میں فوج آئی تو لوگ خوشیاں منائیں گے ، مٹھائی بانٹی جائیگی اور خوشیاں منائی جائیں گے '۔ وجہ انہوں نے کچھ بھی بیان کی ہو موجودہ حکومت میں لاکھ کیڑے نکالے، خرابیاں بیان کی، نواز شریف کے طرز حکمرانی میں سو برائیاں بیان کی، ہوں قومی سطح کے لیڈر کی سوچ اس کے چاہنے والوں میں منتقل ہوتی ہے اور یہ سوچ تمام عوام کی نہ سہی تحریک انصاف کے کارکنوں کی یقینا ہوچکی ہوگی، یہ سوچ کا یہ انداز کسی بی اعتبار سے مناسب نہیں، قومی لیڈر تو عوام کی تربیت کرتا ہے، انہیں صحیح اور غلط راستوں کی کی نشاندھی کرتا ہے۔ اختلاف کس قدر بھی شدید ہو کم از کم جمہوریت کے مقابلے میں فوجی حکمرانی کو، ڈکٹیٹر کی چھڑی کو، مارشل لاء کو درست کہنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ عمران خان نے مٹھائی کی بات کے ساتھ جو باتیں نواز شریف اور ان کی حکمرانی کے بارے میں کہیں وہ اپنی جگہ درست ہیں ، ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں جنہوریت کو فوج سے نہیں نواز شریف کی بادشاہت سے خطرہ ہے وزیر اعظم باہر جائیں تو ان کی بیٹی شہزادی بن جاتی ہے، قذافی اور صدام بھی عوام کو جواب نہیں دیتے تھے آج نواز شریف بھی عوام کو جواب دینا پسند نہیں کرتے، دونوں کا انجام دنیاکے سامنے ہے، حسنی

مبارک کے بچوں کی طرح نواز شریف کے بچوں کے پیسے بھی ملک سے باہر پڑے ہیں، جمہوریت کے نام پر ملک کو لوٹا جارہا ہے، ان کا کہنا تھا کہ ترک قوم سڑکوں پر اس لیے آئی کہ طیب اردوان وہاں خوشحالی لے کر آئے اور ملک کی دولت بڑھائی یہاں ، وہ ملک میں خوحالی لے کر آئے، تعلیم اور عوام کی صحت کی سہولیات کے لیے پیشہ خرچ کیا، ترک صدر نے اپنی عوام کی خدمت کی ار تمام قرضے ختم کیے، ترکی میں عوام کی خدمات کرنے والے حکومت کے ساتھ عوام کھڑے ہوگئے۔ ہمارے وزیر اعظم نے اقتدار میں آکر اپنی دولت اور جائیداد بڑھائی، نواز شریف نے تین سالوں میں چھ ہزار ارب کا قرضہ چڑھایا، ہر پاکستانی بچہ آج بیس ہزار کا مقروض ہے۔ کپتان کی باتیں میں کچھ وزن نظر آتا ہے، نواز شریف کیوں کہ تیسری بار حکمرانی کر رہے ہیں ، اس وجہ سے بھی اور کچھ ان کے مزاج میں بھی اقتدار کی اہمیت کم سے کم ہو گئی ہے، انہیں یہ اندازہ ہے کہ جب تک پنجاب ان کی گرفت میں ہے ان کی حکمرانی پر حرف نہیں آئے گا اور بے شمار اہم معاملات کو بہت ہی معمولی گردانتے ہیں اور اہمیت نہیں دیتے۔ان کی سابقہ دوبار حکومتیں وقت سے پہلے ہی ختم کی گئیں اب تیسری بار محتاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی لیکن ان کے طرز حکمرانی بتارہا ہے کہ انہیں کوئی ڈر و خوف نہیں ، لگتا ہے کہ وہ اب جب کہ حکمرانی کا زیادہ وقت گزر چکا ہے کم وقت باقی ہے ، اگر اس بار بھی ان کے اقتدار کا خاتمہ سابقہ ادوار کی مانند ہوجائے تو وہ پھر سے مظلوم بن جائیں گے اور پھر عوام خاص

طور پر پنجاب کے عوام انہیں پھر سے اپنے کاندھوں پر بٹھا لیں گے۔

بات ترکی میں فوجی بغاوت اور اس کی ناکامی کی شروع کی تھی بیچ میں کپتان اور نواز شریف صاحب نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ لیکن یہ بھی ضروری تھی۔ ترکی میں فوجی بغاوت کی کئی وجاہات اوپر آچکی ہیں اب انہیں دھرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترکی ایک مختلف قسم کا ملک ہے، تاریخی اعتبار سے وہاں مذہب سے عقیدت پائی جاتی ہے، ترکی نے سالوں خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی حفاظت اور اسے ترقی دینے میں گزرے ہیں۔ ترکی کی سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور مذہبی تاریخ ہے۔ اتاترک مصطفیٰ کمال نے ترکی 1922 میں جمہوریہ یا ری پبلیکن بنایا لیکن یہ سلطنت دنیا کے نقشہ پر ایسے مقام پر واقعہ ہے جو اہمت کی حامل ہے۔ یہ ایک یوریشائی ملک جو جنوب میں مغربی ایشیاء میں جزیرہ نما انو طولیہ اور جنوب مشرقی یورپ کے علاقے بلقان تک پھیلا ہوا ہے۔ جن میں بلغاریہ، مغرب میں یونان، شمال میں جارجیا، مشرق میں آرمینا، ایران، مشرق میں عراق اور شام واوقع ہیں۔ اسی طرح شمال میں ملکی سرحدیں بحیرہ اسود اور مغرب میں بحیرہ روم ہے۔ اس طرح ترکی ایس ملک ہے جس کی سرحدیں آٹھ ملکوں سے ملتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس ملک کے عوام اور یہاں کے حکمرنوں کا خاص مزاج اور منفرد سوچ پائی جاتی ہے۔

اخباری اور ٹی وی خبروں کے مطابق ترک عوام فوجی باغیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے، لوگوں نے ٹینکوں کے سامنے سینے تان لیے، جانیں دے کر فوجی ٹولے کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا اور جمہوریت کے خلاف سازش کو ناکام بنا دیا۔ ترکی عوام نے اپنے لیڈر ترک صدر رجب طیب ایردوان کی ہدایت پر جمہوریت اور موجودہ حکومت کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اطلاعات کے مطابق چھ ہزار فوجی گرفتار کیے جاچکے ہیں جن میں 70 جرنیل اور ایڈمرل شامل ہیں، 265 افراد ہلاک، افراد زخمی حکومت نے 2745 کرنل اور ججوں کو برطرف کردیا ہے۔ تمام تر 1440 تفصیلات اخبارات میں چھپ چکی ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ترکی کے عوام نے فوجی مداخلت اور فوجی بغاوت کو دوسری بار ناکام بنادیا، 15 جون کو ہونے والی فوجی بغاوت آخری سانسیں لے رہی ہے، جمہوری حکومت نے باغیوں کے ساتھ سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ہے، ترکی صدر کا کہنا ہے کہ باغیوں کو سزائے موت دینا ہوگی۔ بغاوت کے پیچھے امریکی ہاتھ بھی ہوسکتا ہے کہ اس لیے کہ موجودہ حکومت مخالف لیڈر گولن اور ان کے ساتھیوں کی حوالگی کے لیے حکومت امریکہ اور یورپی ممالک سے رابطہ کرنے کی تیاری بھی کررہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سازش میں گولن اور ان کے حامی بھی ملوث ہوں۔ ترکی میں فوجی بغاوت کو تو عوام نے ناکام بنا دیا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا اس عمل کے اثرات پاکستان پر بھی ہوسکتے ہیں، کیا ہم پاکستانی عوام ترکی کے لوگوں سے کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ ترکی کے عوام کا عمل پاکستانیوں کے لیے یہ

کھلا پیغام ہے کہ جمہوریت فوجی حکمرانی کا نعمل البدل ہر گز نہیں، کمزور جمہورت، بیساکی پر چلنے والے جمہوری حکومت فوجی ڈکٹیٹر کی حکمرانی سے بہتر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترک عوام کا یہ عمل جمہوریت کے علمبردار حکمراں ٹولے کو بھی یہ پیغام دے رہا ہے کہ دیکھو، ہوش کے ناخن لو، اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، عوام کی جانب توجہ کرو، ان کی بھلائی کو سوچو، تم کتنی دولت جمع کروگے، کتنی جائیداد بناؤگے، ایک نہ ایک دن تمہیں یہ سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا ہے، اگر یہ دولت اپنے ملک میں ہوگی تو یہ کم از کم اپنے وطن کے تو کام آجائے گی، بیرون ملک جو دولت تم نے جمع کر رکھی ہے وہ تو تمہارے مرنے کے بعد وطن میں نہیں لائی جاسکے گی، کیا سرے محل پاکستان کی ملکیت بنا، کیا آفشور کمپیوں میں لگایا گیا تمہارا پیشہ تمہارے وطن کے کام آسکے گا۔ حکمرانوں صرف نواز شریف ہی نہیں بلکہ وہ حکمران جو آئندہ حکمران بنیں گے یا جو اب بھی سندھ اور خیبر پختونخواہ میں حکمرانی کر رہے ہیں اگر تم نے عوام کی بھلائی کے لیے کام کیے، ان کی خیر خواہی کے منصوبے بنائے، صحت، تعلیم، حفظان صحت، خوراک اور دیگر کاموں میں نیک نامی کے کام کیے تو عوام تمہیں اسی طرح محفوظ رکھیں گے، فوجی انقلاب سے بچائیں گے جس طرح ترکی کے عوام نے اپنی جمہوری حکومت کو جان دے کر بچایا۔ اگر نہیں تو پھر عمران خان کی بات سچ ثابت ہوگی کہ 'پاکستان میں فوج آئی تو مٹھائی بانٹی جائیگی'۔ فوجی قوت کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جانا ترکی کے عوام کا یہ عمل

ثابت کر رہا ہے کہ ملک کے حکمراں ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دیں، لوٹ کھسوٹ نہ کریں، ملکی دولت بیرون ملک نہ بھیجیں، آف شور کمپنیوں میں ملکی دولت نہ لگائیں، اپنے بگڑے ہوئے بچوں کو ملک کے سے محبت کا درس دیں، انہیں لاڈ و پیار میں نہ بگاڑیں اس کے برعکس عوام کی بھلائی اور مشکلات کا خیال رکھیں، عوام اپنے دل کا آپریشن ملک کے ہی اسپتال میں کراتے ہیں تو حکمراں بھی ایسا ہی کریں، اگر حکمراں عوام کے صحیح معنوں میں خدمت گزار ہوں گے تو عوام بھی ترکی کے عوام کی طرح برے وقت میں، آڑے وقت میں ، فوجی یا کسی بھی قسم کی بغاوت میں حکمرانوں کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے ان کے اقتدار کو ہر قیمت پر بچائیں گے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوگا تو مٹھائی ہی تقسیم ہوگی۔

پاکستان کی تاریخ میں بھی حکومتوں کے خلاف فوجی بغاوت ناکام ہوتی رہی ہیں لیکن ان بغاوتوں کو عوام نے ناکام نہیں بنایا بلکہ وہ بغاوتیں بغاوت کرنے والوں کی ناقص حکمت عملی یا پھر حکومت وقت کے اداروں نے انہیں ناکام بنایا۔ 1951 میں راولپنڈی سازش کیس جس کے روح رواں جنرل اکبر تھے، یہ پاکستان کے اولین وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کا زمانہ تھا، 1980 میں فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق کے دور حکمرانی میں بغاوت ہوئی جس کے سر کردہ میجر جنرل تجمل حسن ملک تھے، 1995 میں بے نظیر بھٹو کے دور وزارت اعظمی میں میجر جنرل ظہر

السلام عباسی کی سرکردگی میں بغاوت کی کوشش ہوئی جو ناکام بنادی گئی۔ کسی بھی فوجی بغاوت کو عوام ناکام بنائیں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ترکی کے عوام قابل ستائش ہیں۔ جمہوریت کے الم کو بلند رکھنے میں ترکی کے عوام کا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ اس ناکام فوجی بغاوت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر عوام کی خوش حالی کے کام کیے جائیں گے تو عوام بھی ان کے لیے کام کرنے والوں کے کام آئیں گے، خواہ انہیں اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ پاکستان کے حکمرانوں کے لیے اب بھی وقت ہے۔ دل کا آپریشن اگر واقعی ہوا ہے تو بہت آرام ہوچکا، غریب لوگ بائی پاس کے بعد دوسرے ہی دن سے اپنا کام شروع کردیتے ہیں، آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ وزیراعظم صاحب نے ڈیڑھ ماہ لندن میں آرام کیا، آنے کے بعد لاہور میں آرام فرما ہیں آخر یہ آرام کب تک چلے گا، ملک کی فکر کریں۔ اگر حکمرانی سے دل بھر چکا تو مستقل آرام کیجئے قبل از وقت انتخابات کا اعلان کرکے قوم کو ذہنی عذاب سے نکال کردعائیں لیں۔ (۱۹ جولائی ۲۰۱۶)

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 9 :)

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (1915-2015
یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ”پاکستان میں لائبریری تحریک کے)
فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار“ سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

خلاصہ :

لائبریری وانفارمیشن سائنس ایک علم ہے جو عرصہ دراز سے دنیا کی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ پاکستان میں اس علم کی باقاعدہ تعلیم کی ابتدا سو سا قبل میں جامعہ پنجاب سے ہوئی تھی۔ آج یہ علم پاکستان کی متعدد جامعات کے 1915 نصاب کا حصہ ہے۔ اس علم کی سو سالہ تاریخ کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ اس علم میں ہونے والی تحقیق کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے۔ یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے سے ماخوذ ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

لائبریری وانفارمیشن سائنس میں ایم فل پی ایچ ڈی پروگرام

لائبریری سائنس میں پہلا پی ایچ ڈی پروگرام کراچی یونیورسٹی نے ۱۹۶۷ء میں شروع کیا۔ ڈاکٹر عبدالمعید کی زیر نگرانی ۱۹۷۸ء تک چھ امیدواروں نے داخلہ لیا۔ امیدواروں میں سینئر لائبریرینز اور لائبریری سائنس کے اساتذہ شامل تھے لیکن ان میں سے صرف عبدالحلیم چشتی جن کا رجسٹریشن ۱۹۷۱ء میں ہوا تھا اپنی تحقیق مکمل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہیں پاکستان میں پہلی پی ایچ ڈی ڈگری ۱۹۸۱ء میں عطا ہوئی (۱۴۲) ۔ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی کے مقالہ کا عنوان ' اسلامی کتب خانے: دوسری صدی ہجری (۱۳۳ھ ۷۴۹ء سے ساتویں صدی ہجری (۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء) تک' ہے (۱۴۳)۔ کراچی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی پروگرام میں داخلہ لینے والے پہلے طالب علم محمد عادل عثمانی تھے جو اس وقت کراچی یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین تھے (۱۴۴) لیکن وہ اس تحقیقی کام کو پائے تکمیل کو نہ پہنچاسکے۔ ڈاکٹر غنی الاکرم سبزوری نے مکہ المکرمہ میں ملازمت کے دوران ہی کیلی فورنیا، امریکہ کی سینچری یونیورسٹی سے

۱۹۸۳ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی (۱۴۵)۔

جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس میں ۱۹۶۷ء میں شروع ہو

نے والا لائبریری سائنس کا پی ایچ ڈی پروگرام ملک کا اولین پروگرام تھا۔ اس اقدام نے لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم میں کراچی کو حسب سابق اولیت دی۔ اس پروگرام کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ ڈاکٹر حیدر نے پاکستان کے لیے اسے ہوس مندانہ پروگرام قرار دیتے ہوئے ملک میں اس کی کامیابی پر شک و شبہ کا اظہار کیا (۱۴۶)۔ آپ نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں اس پروگرام کی ناکامی کے اسباب تفصیل سے بیان کیے اور یہ موقف بھی اختیار کیا کہ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک شخص جو دیگر ذمہ داریاں بھی نبھا رہا ہو سات پی ایچ ڈی اسکالرز کی رہنمائی کر سکے (۱۴۷)۔ ڈاکٹر انیس خورشید کے مطابق '' برخلاف ان کے اندیشے کے تین پی ایچ ڈی ڈگریاں دی جا چکی ہیں'' (۱۴۸)۔

آپ نے اس پروگرام کے کامیاب نہ ہونے کی مختلف وجوہات بیان کیں ان میں مواد کی عدم دستیابی، داخلہ لینے والوں کی صحیح سمت رہنمائی کا نہ ہونا، تحقیقی طریقہ کی تربیت کا فقدان اور یہ کہ محقق کے لیے پی ایچ ڈی الاؤنس یا اور کسی بھی قسم کی کشش کا نہ ہونا۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر عبد المعید کا یہ اقدام تو ہر اعتبار سے مناسب اور بر وقت تھا۔ البتہ اس پروگرام میں داخلہ لینے والوں نے اسے اپنے لیے محض ایک اعزاز تصور کیا اور ذاتی وجوہات کے باعث مقصد حاصل نہ کر سکے۔

۱۹۸۵ء میں جامعہ کراچی نے دو سالہ ایم فل پروگرام کا آغاز کیا۔ یہ

پروگرام کورس ورک اور مقالہ پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر حیدر کے مطابق ' یہ بات حیرت انگیز ہے کہ کسی ایک نے بھی اس میں داخلہ لینے کی کوشش نہیں کی' (۱۴۹)۔ کورس میں پائی جانے والی خامیوں کے باعث ۱۹۹۴ء میں یو نیورسٹی نے کورس ورک و مقالہ نگاری کو صرف مقالہ لکھنے تک محدود کر دیا۔ ۱۹۸۷ء میں جامعہ کراچی کے پی ایچ ڈی پروگرام پر نظر ثانی کی گئی۔ شعبہ کی استاد نسیم فاطمہ پی ایچ ڈی میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں جس کی ایک وجہ اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تھیسس سپروائزر ہونا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں ڈگری کا اجراء ہوا۔ مقالہ کا عنوان ' اردو مخطوطات کی کیٹلاگ سازی و معیار بندی (۱۵۰) ہے۔ اس وقت جامعہ کراچی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے تحت حسب ذیل طلبہ ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لیے ہوئے ہیں۔

جامعہ کراچی میں ایم فل رپی ایچ ڈی میں انزول طلبہ

نمبر شمار	نام طالب علم	سپروائزر رنگراں	موضوع
۱۔	پروفیسر ملاحت کلیم شیروانی	پروفیسر ڈاکٹر انیس خورشید	Interactive role of information generating, hanlding institutions in Pakistan with special referecne to Pakistan.
۲۔	منیرہ نسرین	ڈاکٹر نثار احمد زبیری	Information seeking behaviour of Media Personnel.
۳۔	خواجہ مصطفیٰ	پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر	A Model for Network of Health Scienes Libraries in Karachi.
۴۔	شمشاد احمد	پروفیسر ڈاکٹر نسیم فاطمہ	Research Study of Library and Archival Record in Directorate of Sindh, Archive Karachi
۵۔	عطاء الرحمن	ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی	پنجاب کے دینی مدارس کے کتب خانے
۶۔	نگہت قدیر	ڈاکٹر محمد عذیر	کراچی میں اخباری کتب خانے
۷۔	عطاء اللہ	پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین حید	Digital Library initiatives in Pakistan; Propose Digital Library Model for the Aga Khan University.

سندھ یو نیورسٹی ، جا مشورو ملک کی دوسری یو نیورسٹی ہے جس نے جا معہ کر ا چی کے بعد لا ئبریری سا ئنس میں اعلیٰ تعلیم کی ابتدا کی ۔ ڈاکٹر رفعیہ کے مطا بق۱۹۸۱ء میں ایم فل پروگرام شرع کیا چھ امیدوار رجسٹر ہو ئے (۱۵۱)۔ صرف ڈا کٹر الشرکھیو بٹ نے ۱۹۸۰ء میں ایم فل مکمل کیا ۔ ۲۰۰۱ء میں سندھ یو نیورسٹی نے لا ئبریری سا ئنس میں پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا۔ ڈا کٹر بٹ کے مطابق شعبہ کے پا نچ اسا تذہ رجسٹر ہو ئے ہیں انُ میں سے خدیجہ انصا ری اور بیگم ہا شمی کے نگراں ڈاکٹر بُٹ ہیں شیریں گل سومرو ‘ منظور احمد حاجانو اور نثار احمد صبح یو تو ڈا کٹر رفعیہ احمد شیخ کی زیر نگرانی تحقیق کر رہے ہیں(۱۵۲)۔ نثار احمد صبح اپنا کام مکمل کر چکے ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی ، بہا ولپور نے ۱۹۸۵ء میں پی ایچ ڈی پروگرام کا آغازکیاجو ڈاکٹر محمد فاضل خان کی عملی جدوجہد کا نتیجہ تھا انہیں شعبہ کا با نی چیئر مین ہو نے اور اسی یو نیورسٹی سے ۱۹۹۴ء میں پی ایچ ڈی حا صل کر نے کا اعزاز بھی حا صل ہے۔ ڈاکٹر فاضل ملک کی دوسری شخصیت ہیں جنہیں جا معہ کر ا چی کے بعد یہ اعزاز حاصل ہوسکا۔ آپ کے مقالہ کی نگراں (سپروائزر) شعبہ لا ئبریری و انفارمیشن سائنس ، جامعہ سندھ، کی پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ تھیں(۱۵۳)۔ شعبہ لا ئبریری و انفارمیشن سا ئنس ، اسلامیہ یونیورسٹی ، بہا ولپور میں ڈا کٹر فاضل کی نگرانی میں حسب ذیل امید وار ایم فل ,پی ایچ ڈی میں انرول ہیں (۱۵۴)۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم فل ر پی ایچ ڈی میں انرول طلبہ

نمبر شمار	نام امیدوار	عنوان
۱۔	عبدالرحمان بخاری	A Study of users attitudes towards the use of Resources and Servicesin University Librariesin Pakistanand Azad Kashmir
۲۔	غلام عباس	Impact of IT in Agricultur Universities of Pakistan.
۳۔	اشتیاق احمد	Inter-library Loan in University Libraries in Pakistan.
۴۔	محمد یعقوب چودھری	Continueing Education in Library Science in Pakistan.
۵۔	فوزیہ ہاشمی	Contribution of Unesco towards Bibliographical Development
۶۔	ایم ایچ شفیق	Librarianship as a Choice of Career.
۷۔	ماہ بشریٰ	A Study of Library Professionals towards Special Librarianship in Pakistan.
۸۔	سجاد رموز	A Study of Services & Standards for Secondary School Libraries in Pakistan.
۹۔	شاہد	Services and Systems in Brail Libraries in Pakistan.
۱۰۔	طاہر شاہ	Service abd Standards of Libraries of Higher Learing institutions in Pakistan.
۱۱۔	عائشہ سعدیہ	Comparative Study of Attitudes towards the use of Information Sources by Physical and Social Scienctists in University Libraries of Pakistan

پنجاب یو نیورسٹی لا ہور کے شعبہ لا ئبریری و انفارمیشن سا ئنس کے تحت پی ایچ ڈی پروگرام کا آغاز ۱۹۹۹ء میں کیاگیا ۔ اس کے اولین طلبہ میں اسی، شعبہ کے اسا تذہ افضل حق قرشی، خالد محمود(۱۵۵) اور کنول امین(۱۵۶) ہیں۔خالد اور کنول کے معا ون سپروائیزرپروفیسر ڈاکٹر سید جلال ا لدین حیدر تھے۔ افضل حق قرشی ڈاکٹر محمد فاضل خان صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی میں رجسٹرڈ ہوئے ان کا موضوع "Libraries During the Mughal Period" ہے۔ خالد محمود نے اپنی تحقیق ۲۰۰۴ء میں مکمل کی اورپنجاب یونیورسٹی، لاہور سے لا ئبریری سائنس میں ڈاکٹریٹ کر نے والے پہلے اور پاکستانی جامعہ سے یہ اعزاز حاصل کر نے والے چوتھے محقق ہیں۔ کنول امین نے ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ۔۲۰۰۵ء میں شعبہ میں ایم فل ، پی ایچ ڈی پروگرام کا آغاز کیا گیا داخلہ حاصل کر نے والوں میں فرزانہ شفیق، ہارون ادریس، میاں محمد الیاس، محمد اجمل خان، محمد عارف، محمد رفیق اعوان، محمد رفیق، مزمل طاہرہ، نوشین فاطمہ، شفیق الرحمٰن شامل ہیں۔

بلو چستان یو نیورسٹی کو ئٹہ کے شعبہ لا ئبریری و انفارمیشن سا ئنس کے تحت

۱۹۹۴ء میں ایم فل پروگرام کا آغاز ہوا۔ شعبہ کے خورشید اختر انصاری، (۱۵۷) ، شمسہ مبین (۱۵۸) اور محمد الیاس (۱۵۹) ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں جب کہ شہنواز خان کا کام جاری ہے (۱۶۰)۔ ۲۰۰۳ء میں پی ایچ ڈی پروگرم کا آغاز ہوا۔ شعبہ کی بورڈ آف اسٹڈیز نے ۲۰۰۳ء میں ان کے داخلوں کی سفارش کی۔ خورشید اختر انصاری (۱۶۱) کو جو شعبہ کے سربراہ بھی ہیں اور محمد الیاس (۱۶۲) کے تحقیقی خاکوں (Synopsis) منظور کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اعلیٰ اختیاراتی اداروں سے حتمی منظوری کی سفارش کی۔

حوالے و حواشی

142. Anis Khurshid. Library Education at Graduate Level.
ref. 115, pp. 14-15.

۱۴۳۔ چشتی، عبدالحلیم۔ اسلامی کتب خانے۔ حوالہ ۱۱، ص ۱۶۷

144. Usmani, Muhammad Adil. 'Ph. D Research by Pakistani Librarians'.
Pakistan Library Bulletin. 18 no. 4 (December 1987) 10.

145. Sabzwari, Ghaniul Akram. Critical Evaluation and Modification of Dewey
Decimal Classification Numbers Relating to Islamic and Pakistani Topics.

California, (Ph. D. dissertation USA: Century University. 1983) , 234p.

146. Haider, Syed Jalauddin.' Status of Library Research in Pakistan'. Libri. 28: 4 (1978) : 333.

147. Haider, Syed Jalauddin. 'Educating Future Libraries'. ref.47, p.41

148. Anis Khurshid. Library Education at Graduate Level. ref. 115, p. 15.

149. Haider, Syed Jalauddin.'Educating Future Libraries. ref. 47.

۱۵۰۔ نسیم فاطمہ ، ''اردو مخطوطات کی کیٹلاگ سازی و معیار بندی'' (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، کراچی: شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، جامعہ کراچی ،۱۹۹۵ء) ، ۹۳۲ص۔

151. Rafia Ahmed Sheikh. Department of LIS. ref. 121, p.152.

۱۵۲۔ بٹ ' ڈاکٹر اللہ رکھیو۔ چیر مین، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، یونیورسٹی آف سندھ،انٹرویو از محقق، ۷ اپریل ۲۰۰۴ء
(متن ضمیمہ ۱۲)

153. Khan, M. Fazil. Coordinate Planning for University
Libraries in Pakistan:
problems, perceptions, prospects, organization and
implementation'. (Ph.
D. dissertation Bahawalpur : Islamia University. 1984),
323p.

۱۵۴۔ خان، محمد فاضل۔ خط بتاریخ ۱۸ مئی ۲۰۰۴ بنام رئیس احمد صمدانی۔

155. Khalid Mahmood. Alternative Funding Model for
Libraries in Pakistan.
(Ph. D dissertation, Departmenet of Library and Information
Science,
University, Punjab, Lahore 2003) , 413p.

156. Kanwal Amin. Phylosophy and Framework of Collection
Management and
its application in Universities Libraries of Pakistan: and
Appraisal.(Ph. D
dissertation, Department of Library and Information
Science, University of
Punjab, Lahore. 2005), 312p.

157. Ansari, Khurshid Akhtar. Evaluation of Public Libraries in Balochistan.
(M.Phil dissertation, Department of Library an Information Science,
University of Balochistan, 1999), 215p.

158. Shamsa Mubeen. Use of Academic Libraries in Balochistan. Quetta:
(M.Phil dissertaion, Department of Library and Inforamtion Science,
University of Balochistan. 1996), 170p.

159. Muhammad Ilyas. The Status of Copyright and Book Piracy in Pakistan.
(M. Phil thesis Department of Library and Inforamtion Science, University
of Balochistan, 1996) , 139p.

160. Baloch, Shahnawaz. (M. Phil topic) Alternative funding support system for
Public Libraries. (Not completed)

161. Ansari, Khurshid Akhtar, letter dated 12th August 2005. to Rais Ahmed

Samdani (Ph.D topic: Standards for Public Libraries in Balochistan)

162. Muhammad Ilyas. (Ph. D. topic . Development and future needs of Library and Information Science Education(

(: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 10

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔ مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

ہمدرد یونیورسٹی کے ' ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ' نے قلیل مدت میں تحقیق کی نئی روایات قائم کی ہیں اور مختلف موضوعات جیسے اسلامیات ' لسانیات ' طب اور دیگر متعدد موضوعات پر ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا ہے۔ اس شعبہ کو ڈاکٹر جمیل جالبی ' ڈاکٹر قاضی اے قادر اور مسعود احمد برکاتی جیسے اعلیٰ پائے کے ریسرچ اسکالروں کی سرپرستی

حاصل ہے (۱۶۳)۔ راقم الحروف کا داخلہ ایم فل پی ایچ ڈی طالب علم کی حیثیت سے اگست ۲۰۰۳ء میں ہوا (
۔ وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کا آغاز (۱۶۴
۲۰۰۳ء میں ہوا اولین طالب علم مختار اشرف اسی جامعہ کے لائبریرین بھی ہیں کی تحقیق کا موضوع ''کراچی کے جامعاتی کتب خانوں میں ذخیرہ اردو کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے۔

صدر شعبہ اردو ڈاکٹر وقار الحسن گل ان کے نگران ہیں (۱۶۵) جو لائبریری سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ بھی کر چکے ہیں۔

پاکستانی جامعات جن میں ایم فل رپی ایچ ڈی کی تعلیم رائج ہے

نمبر شمار	یونیورسٹی	سال	پروگرام
۱۔	کراچی یونیورسٹی	۱۹۶۷ء/۱۹۸۵ء	پی ایچ ڈی رایم فل
۲۔	سندھ یونیورسٹی ،جامشورو	۱۹۸۱ء/۲۰۰۱ء	ایم فل رپی ایچ ڈی
۴۔	اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور	۱۹۸۵ء	پی ایچ ڈی
۵۔	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۹۹۹ء	پی ایچ ڈی
۶۔	بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ	۱۹۹۴ء/۲۰۰۳	ایم فل رپی ایچ ڈی
۸۔	ہمدرد یونیورسٹی، کراچی	۲۰۰۳ء	ایم فل رپی ایچ ڈی
۹۔	وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی	۲۰۰۳ء	ایم فل رپی ایچ ڈی

پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کو جامعات کے تحت ۴۸ سال جب کہ پی ایچ ڈی اور ایم فل شروع ہوئے ۳۷ سال گزر چکے ہیں۔ ۳۷ سالوں میں صرف پانچ لوگ پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر سکے۔ یہ صورت حال لائبریری سائنس کے ان ماہرین اور ذمہ داران کو دعوت فکر دیتی ہے کہ جنھوں نے اپنی تمام عمر مختلف جامعات میں گزاری۔ کیا اس پیشہ سے وابستہ لوگ تحقیق کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے یا پھر دیگر وجوہات درمیان میں حائل رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پیشہ سے وابستہ لوگ باصلاحیت اور محنتی ہیں ان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور تحقیق کرنے کی لگن اور جستجو پائی جاتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی مختلف جامعات سے تقریباً (۱۸) پاکستانی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر چکے ہیں (۱۶۶)۔ ان میں ڈاکٹر عبدالمعید (۱۶۷) ڈاکٹر عبدالصبوح قاسمی (۱۶۸)، ڈاکٹر انیس خورشید (۱۶۹)، ڈاکٹر ممتاز انور (۱۷۰)، ڈاکٹر محمد فصیح الدین (۱۷۱) ، ڈاکٹر افتخار خواجہ (۱۷۲)، ڈاکٹر نذیر احمد (۱۷۳)، ڈاکٹر نعیم قریشی (۱۷۴)، ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری (۱۷۵)، ڈاکٹر رفیعہ احمد شیخ (۱۷۶) ، ڈاکٹر عبدالستار چودھری (۱۷۷)، ڈاکٹر سجاد الرحمٰن (۱۷۸)، پروفیسر ڈاکٹر اللہ رکھیو بٹ (۱۷۹)، ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر (۱۸۰)، ڈاکٹر حافظ محمد خالد، (۱۸۱) ڈاکٹر سکینہ ملک (۱۸۲)، ڈاکٹر محمد رمضان (۱۸۳) اور ڈاکٹر روبینہ طارق (۱۸۴) شامل ہیں۔

لائبریری سائنس میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا یہ تناسب واضح کرتا ہے کہ لائبریرین شپ کے پیشے میں قابل لوگوں کی کمی نہیں ان میں تحقیق کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ پاکستانی جامعات میں بعض مشکلات اور مسائل کے باعث وہ نتائج سامنے نہیں آسکے۔ اس موضوع پر پاکستانی ماہرین کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ اصل محرکات سامنے آسکیں۔ ڈاکٹر حیدر کا کہنا ہے کہ "آخر لوگ پی ایچ ڈی کیوں کریں؟ جبکہ انہیں بغیر پی ایچ ڈی کے مراعات مل جاتی ہیں جنہیں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بھی لوگ مدتوں تک ان کے لیے ترستے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اس نے کیا کچھ حاصل کیا جو اُسے پہلے حاصل نہیں تھا۔ پی ایچ ڈی میں داخلہ ایک مشکل امر بنا دیا گیا ہے۔ جو خود پی ایچ ڈی نہیں تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا شخص بھی پی ایچ ڈی ہو لہٰذا ہمیشہ مشکلات پیدا کرتے رہے تاکہ لوگ ناامید ہو جائیں، پی ایچ ڈی کو ایک ہوا بنا دیا گیا۔ جب کہ دوسرے شعبوں میں اس سلسلہ میں کافی حوصلہ افزائی کی گئی۔ پڑوسی ملک ہندوستان میں تقریباً ۴۰۰ لوگ لا ئبریری سائنس کے
موضوع پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں" (۱۸۵)۔

ڈاکٹر اللہ رکھیو بُٹ تعلیمی اور تحقیقی ڈگریوں کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے دو اسباب کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں ایک رہبری یا نگرانی (Guidance) کی کمی

فقدان ہے اور طالب علموں میں عدم دلچسپ بوجہ کسبِ معاش، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی تحقیق کرنا چاہتا ہے تو میرے خیال میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے وہ کر سکتا ہے' (

۔پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل خان کی رائے میں پہلی وجہ ہمارے پیشہ ور حضرات کی (۱۸۶ عدم دلچسپی ہے اور دوسری وجہ حائل مشکلات بھی ہیں۔ مثلاً جب میں نے لائبریریز کے لیے دوران ملازمت بلا رخصت پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کا قانون بنوایا تو اکیڈمک کونسل کے بہت سے اساتذہ کرام اسے خوش دلی سے قبول نہیں کر رہے تھے' (۱۸۷)

۔ڈاکٹر سکینہ ملک صرف تین افراد کے پی ایچ ڈی حاصل کرنے کو افسوس ناک قرار دیتی ہیں اور درج ذیل وجوہات بیان کرتی ہیں:

تحقیق کا ارادہ کرنے والے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی بالخصوص اساتذہ کی (۱)

طرف سے۔

تحقیق مواد کی کمیابی اور اس کے حصول میں مشکلات۔ (۲)

تحقیق کروانے والے سپروائزر دستیاب نہیں۔ (۳)

بیرون ملک جامعہ میں داخلہ کے اخراجات اور دیگر مسائل پاکستان میں بسنے وا (۴)

لے ملازمت پیشہ افراد کے لیے نا ممکنات میں سے ہیں۔

تحقیق کے آغاز میں محقق کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً موضوع کا انتخاب (۵)

کی تیاری' مواد کی حصولیابی' (Synopsis) کتابیات کی تیاری' تحقیقی خاکہ '

سوالنامہ کی تیاری وغیرہ ایسے مراحل ہوتے ہیں کہ جن میں کسی

مخلص رہنمائی کرنے والے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر رہنمائی کرنے والے مخلص نہیں ہوتے اور مشکلات بتا کر حوصلے پست کر دیتے ہیں۔

(٦) تحقیق کے مکمل ہونے کا وقت معین نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں لائبریری سائنس میں اول پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے والے ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی جنھوں نے ڈاکٹر عبدالمعید مرحوم کی زیر نگرانی تحقیق کی ان کا کام گیارہ سال میں اختتام کو پہنچا۔ شعبہ لائبریری سائنس، بلوچستان یونیورسٹی میں اس وقت تین اساتذہ ایم فل موجود ہیں اور پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کروا رہے ہیں (١٨٨)۔

پروفیسر خورشید اختر انصاری کے خیال میں پاکستان میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی سند رکھنے والے حضرات کی تعداد میں کمی کی وجوہ کئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

١۔ لائبریری سائنس میں ڈاکٹریٹ کرنے والوں نے اپنی مادر علمی اور اس پیشہ کی ترقی کے بجائے بیرون ملک ملازمت اور ذاتی مفاد کے حصول کو ترجیح دی۔

٢۔ یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام کا طریقہ کار انتہائی پیچیدہ، سست اور حوصلہ شکن ہے۔

٣۔ بیرونی یونیورسٹیوں کے مطالعاتی پروگرام اور اعلیٰ تعلیمی وظائف کے بارے

میں وزارت تعلیم یا تو اس کی تشہیر نہیں کرتی یا قلیل میعاد کے نوٹس پر معلومات فراہم کی جاتی ہے۔

۴۔ بعض یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے قوانین بہت سخت ہیں۔ مثلاً بلوچستان یونیورسٹی میں ایم فل مکمل کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت ہے۔ایم فل میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے سیمینار لیکچر کے لیے حاضرین میں ۳۰ اساتذہ کی حاضری کا کورم پورا ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ سیمینار منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے حربے حوصلہ شکنی کے مترادف ہیں (۱۸۹)۔

شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس جامعہ پنجاب کے استاد ڈاکٹر خالد محمود کے خیال میں جن احباب نے پی ایچ ڈی کر لیا انہوں نے دیگر لوگوں کو اس جانب راغب نہیں کیا،'' یعنی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے حوصلہ شکنی کرتے رہے نیز پی ایچ ڈی ایک مشکل کام ہے ہمارے لائبریریز نے ہمت نہیں کی کہ وہ اس مشکل کام کو کر گزرنے کی کوشش کرتے (۱۹۰)۔

ماہرین کی رائے اور حقائق کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان لائبریرین شپ میں قابل اور ذہین لوگوں کی کمی نہیں رہی۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر نہ ہونے کے باعث بیرون ملک میں موجود سہولتوں سے فائدہ اٹھایا گیا لائبریری سائنس میں تحقیق کے حوالہ سے مثبت تبدیلی آئی ہے جامعہ

کراچی کے علاوہ دیگر جامعات میں بھی تحقیق کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ پاکستان کی سات جامعات (کراچی ۷، سندھ ۵، پنجاب ۱۱، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۱۱، بلوچستان ۲ ہمدرد ۱ اور وفاقی اردو یونیورسٹی ۱) میں کل ۲۸ لوگ تحقیق (ایم فل پی ایچ ڈی) میں، مصروف ہیں۔ تحقیق میں معاونت کرنے والوں کی فکر بھی تبدیل ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں خاص طور پر جامعات میں تقرری و ترقی کے لیے نئے قوانین کے سبب امید ہے کہ باوجود مشکلات کے مزید افراد تحقیق کے میدان میں قدم رکھیں گے۔

حوالے و حواشی

۱۶۳۔ ''ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ہمدرد یونیورسٹی ایم فل ،پی ایچ ڈی پروگرامز ایک جائزہ''۔
خبرنامہ ہمدرد۔ ۴۳ نمبر ۸ (اگست ۲۰۰۳ء) : ۱۳۔۱۴

164. (1) Major (R) Mazharuddin Ahmed, Dy Registrar (Academics), Hamdard University, Notification No. No.HU/DRA/2002/73, dated July 12, 2003.

(2) Major (R) Mazharuddin Ahmed, Dy Registrar (Academics)Hamdard University Notification No. HU/DRA/2002/ 200, October 28, 2003.

۱۶۵۔ مجاریہ۔ مجلس اعلیٰ تعلیم و تحقیق، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنا
لوجی نمبرات ت۱۱،۶ ' ۳/۰۳، مورخہ ۱۷
(اکتوبر ۲۰۰۳ء۔ (اصل کاپی مختار اشرف یونیورسٹی لائبریرین کی فائل میں محفوظ ہے

166. Usmani, M. Adil. "Ph. D Research by Pakistani Librarians'. ref.144, p.24

167. Abdul Moid. "Urdu Language Collection in American Libraries." (Ph. D dissertation, USA: llinois University, 1964)

168. Qasmi, A. S.A "Code for Cataloguing Material Published in Urdu, Pushto and Punjabi". (Ph.D dissertation, USA: Columbia , 1967)

169. Anis Khurshid. "Standards for Library Education in Burma, Ceylon, India and Pakistan". (Ph.D dissertation, USA: Pittsburgh, 1973),740p.

170. Anwar, Mumtaz A. "The Career of the Pakistan Libraries : A Study of

Socio- Economic backgrounds Influences in the Vocational Choice and
Appraisal of Librarianship in Pakistan." (Ph.D dissertation , USA:
Pittsburgh, 1973)

171. Fasihuddin. "A Study of Indexing Policies and practices and the Literature
of Taxicology." (Ph. D dissertation, USA: Pittsburgh, 1976)

172. Khawaja, Iftikharuddin. "Standards for the Evaluation of Library
Programmes of the Secondary Schools of Pakistan. "(Ph.D dissertation,
USA Virginia Univesity, 1979)

173. Nazir Ahmed. "An Analysis of Academic Libraries in the Punjab (Pakistan)
and Proposal for their Development." (Ph. D dissertation, UK : London:
External , 1981)

174. Qureshi, Naimuddin. "Standards for University Libraries in

Pakistan."
(Ph. D dissertation, USA: Pittsburgh, 1982)
175. Sabzwari, Ghaniul Akram. (Ph. D dissertation), ref. 145.
176. Rafia Ahmed Sheikh. "A General Information Programme for Pakistan with special Reference to the Promotion of Cultures in Libraries and other Information Centres in Pakistan." (Ph. D dissertation, London: University College, UK. 1983)
177. Abdus Sattar Chaudhary. "Relationship between Political Alignment and Scientific Communication: A Bibliometric Study of Egyptian Science Publications." (Ph. D dissertation, USA: Illinois, 1985)
178. Sajjadur Rehman. "Teaching of Management in Relation to Different Management Theories in the Library Schools of North America: an

Explanatory Study." (Ph. D dissertation, G. B College of Librarianhsip, Wales. 1987)

179. Butt, Allah Rakhio. "Development of the Publishing Industry in Sindh." (Ph. D dissertation, G. B College of Librarianhsip, Wales. 1987)

180. Haider, Syed Jalaluddin. "Acquiring Foreign Materials for Pakistani Libraries: A Study." (Ph. D dissertation, London: Loughborough University of Technology, 1993) , 307p.

181. Khalid, Hafiz Muhammad. "Cooperation and networking in University Libraries: A Model for Invitation and Implementation in Countries with less Developed Systems." (Ph. D dissertation, Manchester Metropolitan University.1997)

182. Sakina Malik. "Problems of Library Education in Asian Countires:
Suggession and Recommendations" (Ph. D dissertation, Concordia
University, USA. 2000)

183. Muhammad Ramzan. "Utilization Levels and Librarians' Attitudes toward
Information Technilogy (IT): Application in Academic and
Research Libraries in Pakistan." (Ph. D. dissertation, St. George University
International, U. K.), 2003.

184. Rubina Tariq Chohan."Perceptions of User Education in University
Libraries of Pakistan" (Ph. D dissertation, University of Manchester,
U. K. 2003)

۱۸۵۔ حیدر، پروفیسر ڈاکٹر سید جلال الدین۔ سابق صدر شعبہ ،لائبریری وانفارمیشن
، سائنس ،جامعہ کراچی،انٹر ویو از محقق
(مارچ۲۰۰۴ء ، کراچی (متن ضمیمہ ۱۲ ۱۲

(۱۸۶۔ بٹ، پروفیسر ڈاکٹر اللہ رکھیو۔انٹر ویو، حوالہ ۱۵۲(متن ضمیمہ ۱۲

۱۸۷۔ خان، پروفیسر ڈاکٹر محمد فاضل ۔ ایچ ای سی پروفیسر و صدر شعبہ ،، شعبہ لائبریری
وانفارمیشن سائنس، علامہ اقبال اوپن
یونیورسٹی،اسلام آباد، ،انٹرویو از محقق ، ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۵ء ، کوئٹہ (متن ضمیمہ ۱۲)
۱۸۸۔ سکینہ ملک۔ چیف لائبریرین بلوچستان یونیورسٹی،انٹرویو از محقق ، ۱۹ جون ۲۰۰۳
ء، کوئٹہ (متن ضمیمہ ۱۲)
۱۸۹۔ انصاری، خورشید اختر۔ چیرمین شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس، بلوچستان
یونیورسٹی ،انٹرویو از محقق، ۱۹ جون ۲۰۰۳ء
(متن ضمیمہ ۱۲)
۱۹۰۔ خالد محمود، ڈاکٹر۔ لیکچرر، شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس ، پنجاب یونیورسٹی،
لاہور ،انٹرویو از محقق ،۲۸ دسمبر ۲۰۰۴ء (متن ضمیمہ ۱۲)

تھریسا مے۔برطانیہ کی دوسری خاتون وزیر اعظم

تھریسا میری مے .برطانیہ کی دوسری خاتون وزیر اعظم ہیں جو مارگریٹ تھیچر کے بعداس عہدہ پر فائز ہوئیں ۔برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون عوامی رائے کے احترام میں اپنے منصب سے مستعفی ہوئے، ابھی ان کی حکمرانی کا کچھ وقت باقی تھا۔ کیمرون کا کہنا تھا کہ .برطانوی عوام نے یورپی یونین کے ساتھ الحاق جاری رکھنے کے حوالے سے ان کی رائے کے .برعکس رائے دی ،ایسی صورت میں ان کا وزیراعظم رہنے کااخلاقی جواز ختم ہوچکا ہے ، چنانچہ وہ اس عہدے سے مستعفی ہورہے ہیں۔ اگر کیمرون کی اس بات سے کلی اتفاق بھی کر لیا جائے اور یہ معلوم بھی ہوتا ہے کہ ان کے مستعفی ہونے کی صرف یہی وجہ ہے کوئی اور نہیں، یہ بہت .بڑی بات ہے، قابل تقلید عمل ہے حاکموں کے لیے خصوصاً پاکستان کے حکمرانوں ، وزیروں اور سفیروں کے لیے جو .بڑے سے .بڑے واقعہ پر اس طرح خاموشی اختیار کر لیتے ہیں جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو یا پھر اپنے عہدے پر قائم رہنے کے ایسے ایسے جواز پیش کرتے ہیں، اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل دیتے نظر آتے ہیں۔ ڈیویڈ کیمرون کا یہ عمل قابل ستائش اور قابل تعریف ہے۔ اہم اور خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ .برطانوی عوام یا کیمرون کی اپنی پارٹی میں سے کسی نے ان کی حمایت میں مظاہرہ ، نہیں کیا، آواز نہیں اٹھائی، کوئی اخباری بیان سامنے نہیں آیا

ان کی پارٹی کے وزیروں نے ٹی وی پر آکر شاہ سے وفاداری کے لیے حلق پھاڑ پھاڑ کر اعلان نہیں کیا، ہماری صورت حال یہ ہے کہ اگر شاہ کسی بات کو سچ بھی سمجھے ، وہ خود خاموش رہے اس کے وفادار پورے ملک میں ایک ہنگامہ سر پر اٹھا لیتے ہیں، ٹی وی پر شاہ کے حق میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں گویا یہ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوچکا ہے۔ نہیں معلوم ہمارے ملک میں سیاسی میچیورٹی کب آئے گی، ستر سال کم نہیں ہوتے، دو نسلیں پروان چڑھ چکی ہیں، قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والا بچہ آج 70 سال کا بوڑھا ہوچکا ہے۔ جب اس موضوع پر بات کی جاتی ہے تو سیاست کے کھلاڑی یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ان ستر سالوں میں فوجی آمریت طویل عرصہ رہی، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سربراہ تو بے شک فوجی رہا لیکن اس کے ساتھ تو غیر فوجی اور سیاسی لوگ حکمرانی کرتے رہے۔ دراصل ہماری سیاسی جماعتوں میں سیاسی تربیت کرنے کا کوئی منصوبہ کوئی پروگرام ہی نہیں، جو بھی سیاست داں مقبول ہوگیا وہ صرف اپنی قیادت کو چلتے رہنے پر رواں دواں نظر آتا ہے، اپنی جماعت کے کارکنوں کی سیاسی تربیت کی جانب کسی بھی سیاسی لیڈر کا خیال نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر سیاسی جماعت اپنے ورکرز کی سیاسی، اخلاقی ، تہذیبی تربیت کرے۔ اپنے ورکرز کو مثالی سیاسی ورکر بنائے۔ تحریک انصاف کے معزول لیڈر جسٹس (ر) وجیہہ الدین احمد نے جب وہ اپنی جماعت میں فعال تھے اس جانب پیش قدمی کی کوشش کی تھی جو ان کی قیادت کو پسند نہیں آئی، نتیجہ سامنے ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی میچیوریٹی

کا یہ عالم ہے کہ ہمارے سیاست داں ٹی وی ٹاک شو پروگرام جو لائیو ہو رہا ہوتا ہے، خاتون اس کی میزبانی کر رہی ہوتی ہیں، باہم دست و گریباں ہوتے بہیں، کھلے عام گالی گلوچ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

بات تھریسامے کی شروع کی تھی چلی گئی پاکستانی سیاست پر، تھریسامے برطانیہ کی دوسرے خاتون وزیر اعظم ہیں۔ یہ آکسفورڈ کی فارغ والتحصیل ہیں، 1997 سے برطانوی پالیمان کی رکن اور طویل عرصہ سے برطانیہ کی وزیر داخلہ رہنے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں۔ سیاست میں آنے سے قبل تھریسامے بنک آف انگلیڈ کے لیے اور ایک مالیاتی ادارے کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔ تھریسامے کے سیاسی خیالات کیمرون سے مختلف نہیں، انھوں نے کیمرون کے خیالت کی حمایت کی تھی لیکن انسانی کمزوری، طاقت اور وزارت اعظمی کی کشش و چمک نے انہیں اپنے نظریات کو پس پشت ڈالنے پر مجبور کردیا، وزیراعظم بننے کے بعد انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ بھی کیمرون کی ہم خیال تھیں لیکن اب عوامی رائے کا احترام کرتی ہیں۔ وہ اب یورپی یونین میں برطانیہ کی واپسی کی ہر کوشش کے خلاف ہیں۔ جون میں برطانیہ میں ہونے والے ریفرینڈم میں برطانوی عوام نے باطانیہ کو یورپی یونین سے الگ ہوجانے کے حق میں فیصلہ دیا۔ برطانوی عوام کا یہی فیصلہ کیمرون کے لیے استعطے کا باعث بنا کیوں کہ کیمرون برطانیہ کے یورپی یونین کے ساتھ رہنے کے حامی تھے۔ کیمرون کے مستعفی ہوجانے کے بعد

وزارت اعظمی کی دوڑ میں دو امیدوار تھے ایک تھریسا مے اور دوسرے اینڈریا لیڈسم،
تھریسا مے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ، سمجھدار، سیاسی سوج بوجھ رکھنے والے سیاست داں ہیں،
برطانوی سیاست میں گزشتہ 19 سال سے سرگرم عمل ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ 1997
میں برطانیہ کی رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئیں ۔اس سے قبل وہ مقامی سطح پر سماجی اور سیاسی
سرگرمیوں میں فعال رہ چکی تھیں۔ 2002 میں تھریسا مے برطانیہ کی سیاسی جماعت
کنزرویٹو پارٹی کی پہلی خاتون چیئرپرسن کے عہدہ پر فائز ہوئیں، برطانیہ کے وزیر داخلہ
ہوم سیکریٹری) کی حیثیت سے وہ گزشتہ چھ سالوں سے خدمات انجام دے رہی تھیں۔)
ان کے سیاسی تدبر نے انہیں وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن ہونے میں اہم کردار ادا
کیا۔ ان کے مقابلے میں اس عہدہ کے لیے جو امیدوار تھے انہیں تھریسا مے کے مقابلے
میں پذیرائی نہ مل سکی۔

برطانیہ کی 90 سالہ ملکہ الزبتھ دوم حکمرانی کے 64 سال مکمل کرچکی ہیں، انہوں نے
اپنے والد کنگ جارج ششم کے انتقال کے بعد 6 فروری 1952 کو تاج برتاطانیہ کا عہدہ
سنبھالا تھا۔ ان کے زیر نگرانی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہونے والی تھریسا مے
تیرھویں وزیر اعظم ہیں۔ ان سے قبل ونسٹن چرچل، انتھونی ایڈن، ہیرولڈ میکلن،
الیک ڈگلس ہوم، ہیرولڈ ولسن، ایڈورڈ ہیتھ، جیمس کلاگھن، مارگریٹ تھیچر، جان میجر،
ٹونی بلیئر، گورڈن براؤن اورڈیوڈ

کیمرون شامل ہیں۔ تھریسا میری مے یکم اکتوبر 1956 کو پیدا ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر 60 سال ہے، تھریسا مے کے والدین کا انتقال ان کی کم عمر ہی ہوگیا تھی، اس کے والد ایک حادثہ میں جب کہ اس کی والدہ بھی انہیں دنوں انتقال کر گئیں تھی۔ تھریسا مے نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی، گریجویشن 1977 میں کیا۔ جغرافیہ ان کا بنیادی مضمون تھا۔ لیکن وہ خدمت خلق اور سیاست کے میدان کی شہسوار تھیں۔

آکسورڈ میں ان کی تعلیم کا زمانہ وہی تھا جب پاکستان کی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹوں بھی آکسفورڈ سے وابستہ تھیں۔ بے نظیر بھٹو کی تعلیم کا زمانہ 1973 سے 1977 کا تھا، انہوں نے گریجویشن تو ہارڈورڈ سے سے کیا، اس کے بعد وہ سینٹ کیتھرائین کالج، آکسفورڈ سے وابستہ ہو گئیں، وہ لیڈی مارگریٹ ھال (Lady Margrate Hall, LMH Oxford) سے بھی بہ سلسلہ تعلیم وابستہ رہیں، 1976 میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر بھی منتخب ہوئیں تھیں، یہی وہ دور تھا جب تھریسا مے بھی آکسفورڈ سے منسلک تھیں۔ اس تعلق کی وجہ سے اس بات میں حقیقت ہو سکتی ہے کہ بے نظیر بھٹو نے تھریسا مے اور ان کے شوہر فلپ مے (Philip May) کے ساتھ شادی میں کوئی کردار ادا کیا ہو۔ تھریسا مے اور فلپ مے کی شادی 1980 میں ہوئی تھی۔ بعض احباب نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ تھریسا مے اور پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کے مابین بھی اچھے تعلقات ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ پاکستان کے حق میں بہتری کا ہی باعث ہوگا۔ تھریسا مے اور جرمن چانسلر انجیلا مرکل ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ

اور سیاسی شعور رکھنے والی خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ دونوں کے والد مذہبی رہنما تھے۔ جرمن چانسلر انجیلا مرکل اور برطانوی وزیر اعظم تھریسا مے کی قربت اور دوستی کا واضح ثبوت یہ ہے کہ تھریسا مے نے برطانیہ کی وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے ایک ہفتہ بعد ہی جرمن چانسلر کی دعوت پر پہلا عالمی دورہ بحیثیت وزیر اعظم جرمنی کا کیا۔ جرمنی کے شہر برلن میں جرمن چانسلر انجیلا مرکل سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور باہمی امور پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ مے کا کہنا تھا کہ جرمن ہمارا خاص دوست ملک ہے اس کے ساتھ تعلقات میں اضافہ ہی ہوگا کمی ہرگز نہیں آئے گی۔ تھریسا مے نے اپنے والدین کے بغیر اپنی عملی زندگی کو کامیاب بنا کر یہ ثابت کردیا کہ وہ ایک باہمت، حوصلہ مند خاتون ہیں۔ وہ جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں، اس کی ایک وجہ ان کا ذیابیطس یعنی شوگر کا مریض ہونا ہے وہ 2012 سے اس مرض میں مبتلا ہیں اور روز انسولین لیتی ہیں۔ برطانیہ میں ان کے وزیر اعظم کے انتخاب کے دوران ان کے مخالفین کو ان کی کوئی ایسی خامی، غلطی یا اسکینڈل تو نا ملا جس کو بنیاد بنا کر وہ مے کو سیاسی طور پر کمزور کرنے کی سعی کرتے، انہوں نے تھریسا مے کو بے اولاد ہونے کا طعنہ دیا۔ یہ اپنی جگہ درست ہے کہ تھریسا مے کے ہاں اولاد نہیں لیکن مخالفین کا یہ طعنہ تھریسا مے کے لیے نقصان کے بجائے فائدہ مند ثابت ہوا۔ برطانوی عوام نے تھریسا مے کے مخالفین کی اس بات کو پسند نہ کیا اور اسے ایک گری ہوئی بات گردانا۔ ثابت ہوتا ہے کہ سیاست میں لوگ خواہ وہ

کسی بھی قوم و ملک سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے سیاسی مخالفین کے لیے کسی بھی سطح تک جا سکتے ہیں۔

(: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 11

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ’’پاکستان میں لائبریری تحریک کے)
فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار‘‘ سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

گزشتہ سے پیوستہ

انٹر اور بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون

۱۹۷۰ء کی دھائی میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ایک منفرد اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ انٹر میڈیٹ بعد ازاں بی اے میں اس مضمون کو بحیثیت اختیاری مضمون کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس اقدام سے لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا دائرہ لائبریری انجمنوں اور جامعات سے بڑھ کر کالجوں تک وسیع ہوگیا جس سے اس مضمون کی اہمیت اور شہرت میں اضافہ ہوا ساتھ ہی لائبریری پروفیشن کواورزیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی اور عوام

الناس میں اس پیشہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

عادل عثمانی نے لائبریری سائنس میں اس اقدام کو لائبریری تعلیم میں ایک نیا رجحان قرار دیا (۱۹۱) ۔اس انداز فکر کے خالق ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ۱۹۷۲ء میں یہ نظریہ پیش کیا۔

آپ نے اپنے ایک مضمون میں تجویز کیا کہ کالجوں کی سطح پر لائبریری سائنس کو" بحیثیت اختیاری مضمون دیگر مضامین کی طرح نصاب میں شامل کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ تجویز بھی کیا کہ ٹیچر ٹریننگ کالجوں میں بھی دیگر مضامین کے ساتھ لائبریری سائنس کو ایک مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کیا جائے"۔ (۱۹۲)

اس منفرد انداز فکر کو عملی جامہ پہنانے کی عملی جدو جہد مختلف اداروں اور احباب کی جانب سے کی گئی۔ ڈاکٹر ممتاز انور کے مطابق "پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے ۱۹۷۴ ء۔ ۱۹۷۵ء کے دورانیے میں ایک منفرد انداز فکر اپناتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ اضافی معلومات اور کتب خانوں کے استعمال پر مبنی اضافی مضمون انٹر میڈیٹ اور بیچلر سطح پر متعارف ہو اور جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو سیکنڈری اسکولوں کے بہ اختیار احباب سے ہر کلاس کی

نصابی کتب میں معلومات کے استعمال پر مبنی ایک باب کی شمولیت کی کوشش کی جائے"۔ (۱۹۳)۔اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری سائنس کے بورڈ آف اسٹڈیز نے اپنی میٹنگ منعقدہ ۲۸ فروری ۱۹۷۴ء کو انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی سطح پر لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون متعارف کرانے کی سفارش کی۔ فیکلٹی آف آرٹس نے اس سفارش کو ۳۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو منظور کیا' اکیڈمک کونسل نے جنوری ۱۹۷۵ء میں اس کی منظوری دی۔لاہور کے سیکنڈری و انٹرمیڈیٹ تعلیمی بورڈ نے دسمبر ۱۹۷۴ء کو اس تجویز کو منظور کیا۔ اس فیصلے کی اطلاع پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے ۲۱ جنوری ۱۹۷۵ء کو جاری کی۔ لاہور بورڈ نے کمیٹی برائے نصاب' تشکیل دی جس کے کنوینر ڈاکٹر ممتاز انور تھے۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا' کہ جب تک کالجوں میں لائبریری سائنس کے لیکچرر کا تقرر نہ ہو جائے اور نصاب کے مطابق خصوصی نصابی کتاب شائع نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کالج کو اس مضمون کو شروع کرنے کی اجازت نہ دی جائے (۱۹۴)۔ نصاب کمیٹی کے اس فیصلے کے بعد پنجاب کے کالجوں میں لائبریری سائنس کے مضمون کا اجراء التواء کا شکار ہو گیا تاہم کالجوں سے تعلق رکھنے والے پیشہ وروں نے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔

پنجاب کے علاوہ صوبہ سندھ میں ڈاکٹر سبزواری کی اس منفرد انداز فکر پر عملی جدوجہد کا آغاز ۱۹۷۶ء میں ہوا۔ سندھ کونسل آف اسکول و کالج لا

ئبریریز نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۷۶ء بنام چیرَ مین بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجو کیشن کراچی سے درخواست کی کہ کراچی کے کالجوں میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون انٹر میڈیٹ کے نصاب میں شامل کیا جائے (۱۹۵) ۔ بورڈ کی اکیڈمک کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ ۱۰ مئی ۱۹۷۶ء کو چیرمین بورڈ پروفیسر اے ایم فرید کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ میٹنگ میں شریک اراکین میں پروفیسر افتخار علی پروفیسر مسز ایچ بی مصطفیٰ شاہ ' پروفیسر ایاز قادری ' ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی ' پروفیسر ظہور احمد ' پروفیسر مسز ایس وائی افضال 'پروفیسر انیتہ غلام علی سابق وزیر تعلیم ، حکومت سندھ، پروفیسر قاضی احمد سعید (سیکریٹری بورڈ) شامل تھے ۔ کمیٹی نے قرارداد نمبر ا کے تحت کونسل کی درخواست اصولی طور پر منظور کرتے ہوئے نصاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی کمیٹی نے انٹر میڈیٹ لائبریری سائنس کے نصاب کا مسودہ تیار کیا جسے بورڈ نے منظور کرتے ہوئے ۱۶ اگست ۱۹۷۶ء کو لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون کے انٹر میڈیٹ نصاب میں شامل کر لیا۔ حیدر آباد اور سکھر کے تعلیمی بورڈوں نے بھی ۱۹۷۷ء میں اس مضمون کو اپنے نصاب میں شامل کر لیا۔ اسی سال اسلام آباد کے فیڈرل بورڈ آف انٹر میڈیٹ نے بھی اس مضمون کو انٹر کی سطح پر نصاب میں شامل کر لیا اس طرح فیڈرل بورڈ کے تحت فیڈرل کالج برائے خواتین اسلام آباد میں بھی انٹر کی سطح پر لائبریری سائنس کی تدریس کا

آغاز ہوا۔ اس وقت یہ مضمون کراچی کے علاوہ صوبہ سندھ کے بیشتر کالجوں میں پڑھایا جارہاہے۔ سندھ پبلک سروس کمیشن کی جانب سے لیکچرر لائبریری سائنس کی حیثیت سے کئی اساتذہ کا تقرر کیا جاچکا ہے۔

انٹر میڈیٹ کی سطح پر لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون کے متعارف ہو جانے کے بعد نصاب کے مطابق تصنیف طلباء کی اولین ضرورت تھی۔ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ منظور شدہ نصاب کے مطابق اولین نصابی تصنیف انٹر میڈیٹ سال اول کے لیے ۱۹۸۰ء میں " ابتدائی لائبریری سائنس " (۱۹۶) کے عنوان سے شائع ہوئی جس کا اٹھارواں (۱۸) ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے جبکہ سال دوم کے لیے " مبادیات لائبریری سائنس " (۱۹۷)کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں پہلی با رشائع ہوئی۔

اس کتاب کا سترواں (۱۷) ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں شائع ہو چکا ہے صوبہ سندھ اور فیڈرل بورڈ میں لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون متعارف ہو جانے کے بعد دیگر صوبوں کے نصاب میں شامل کرنے کی جدوجہد شروع کی گئی۔ ۱۹۷۷ء میں پا کستان کے تمام انٹر میڈیٹ بورڈوں کے سربراہان (چیئرمین) نے اپنے اجلاس منعقدہ لوئر ٹوپہ میں اصولی طور پر لائبریری سائنس کو بحیثیت اختیاری مضمون انٹر میڈیٹ میں شامل کرنا منظور کر لیا۔ وزارت تعلیم نے جنوری ۱۹۷۹ء میں ایک 'قومی کمیٹی' تشکیل دی جس کے ذمہ انٹر میڈیٹ کے لیے لا

ئبریری سائنس کا نصاب تیار کرنا تھا۔ کمیٹی کے اراکین میں ڈاکٹر انیس خورشید (چیئر مین) ' ڈاکٹر محمد علی قاضی ' عبد الحفیظ اختر ' بشیر علی خان ' مشتاق احمد ' اللہ رکھیو بٹ ' سائیں محمد ملک 'غلام علی منگی ' ایم اے کاظمی ' محمد یوسف ' ایم آئی چغتائی ' رانا جماعت علی خان ' جہان خان ملک کے علاوہ لائبریری آف کانگریس ' پشاور یونیورسٹی شعبہ لائبریری سائنس ' آرمی ایجوکیشن (جی ایچ کیو) اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ کمیٹی نے "لائبریری اسٹڈیز" کے عنوان سے انٹر میڈیٹ لائبریری سائنس کا نصاب تیار کیا۔ قومی کمیٹی کے تیار کردہ نصاب کو پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا (۱۹۸) ۔ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن نے اپنی بارھویں کانفرنس منعقدہ ۲۷۔ ۳۰ نومبر ۱۹۸۲ بمقام پشاور قرارداد نمبر ۸ سی کے ذریعہ وزارت تعلیم (کریکلم ونگ) حکومت پاکستان کے اس اقدام کو خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے انٹر و بی اے کی سطح پر لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ امید ظاہر کی کہ ملک کے کالجوں میں اس پر جلد عمل درآمد شروع ہو گا۔ اس قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ یہ کانفرنس فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے درخواست کرتی ہے کہ لائبریری سائنس کو سینٹرل سپیریر سرویز کے امتحان کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ (۱۹۹)۔

۱۹۸۸ء میں وفاقی وزارت تعلیم نے مرکز تحقیق و نصاب، پنجاب کے تعاون سے لا ئبریری سائنس برائے جماعت گیارہویں و بارہویں کا نظر ثانی شدہ نصاب مرتب کیا اور بذریعہ لیٹر نمبر F-3-2/88-SRO(SRO) مورخہ ۳ جنوری ۱۹۸۹ء پاکستان کے تمام تعلیمی بورڈز آف انٹر میڈیٹ و سیکنڈری ایجوکیشن کو ارسال کیا۔ ۱۹۸۹ء میں حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم نے اس مضمون کو "نیشنل اسکیم آف اسٹڈیز" میں شامل کرتے ہوئے انٹر میڈیٹ کی سطح پر اس مضمون کو پڑھانے کی اجازت دی۔ انٹر بورڈز چیئرمین کمیٹی کی منظوری کے بعد مرکزی وزارت تعلیم کے مراسلہ نمبر F1-2/88/SRO/(SRO) مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۹۰ء کی روشنی میں پنجاب کے تقریباً تمام بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن نے انٹر میڈیٹ کی سطح پر لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون کے اجراء اور امتحان لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کیا جس کا اطلاق انٹر میڈیٹ امتحان (گیارہویں جماعت) ۱۹۹۱ء سے کیا گیا (۲۰۰)۔ پنجاب میں مضمون کی تدریس کا مسئلہ تعطل کا شکار رہا۔ بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے حکومت پاکستان، وزارت تعلیم (کریکلم ونگ) کے حوالہ سے نوٹیفیکیشن نمبر ا، مورخہ یکم جنوری ۱۹۹۱ء کے تحت لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون اجراء ۹۱ کے احکامات جاری کیے (۲۰۱)۔ ۱۹۹۳ء میں وزارت تعلیم کریکلم ونگ نے اپنے سرکلر نمبر F. 3-1/93-SST. مورخہ ۷ جنوری ۱۹۹۳ء (۲۰۲) کے تحت لائبریری سائنس کو قومی اسکیم آف اسٹڈیز کے Humanities Group میں شامل

کیا۔ طویل جدوجہد کے بعد پنجاب کے تقریباً تمام ہی انٹرمیڈیٹ بورڈوں کے تحت لا ئبریری سائنس اب بے شمار کالجوں میں پڑھایا جارہا۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ کالج لائبریرینز لائبریری کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ تدریس کے
فرائض بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ راقم الحروف کے علاوہ پنجاب ہی سے کئی مصنفین کی نصابی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔

انٹر بورڈ چیرَمین کمیٹی نے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ سے لائبریری سائنس کے نصاب کے مطابق کتب تحریر کرنے کی درخواست کی تھی۔ محمد نذیر کے مطابق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے انکار کے نتیجہ میں کتاب لکھنے کا کام سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو کے سپرد کردیا گیا(۲۰۳)۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو نے نیشنل رویو کمیٹی وزارت تعلیم (کریکلم ونگ) حکومت پاکستان کی منظوری سے فروری ۲۰۰۱ء میں گیارہویں (۲۰۴) اور بارہویں (۲۰۵) جماعت کیلیے نصابی کتب شائع کیں انگریزی زبان میں ان نصابی کتب کو پروفیسر اختر حنیف مرحوم نے تحریر کیا۔

حوالے و حواشی

191. Usmani, M. Adil. 'New Trends in Library Education in Pakistan' (Editorial). Pakistan Library Bulletin. 8 nos.1-2 (1977)

192. Sabzwari, Ghaniul Akram. 'Library Education and Manpower needs in Pakistan'. Pakistan Libray Bulletin. 4 no. 3-4 (March 1972) : 63

193. Anwar, Mumtaz A. State of the Library Profession in Pakistan in Library Education in Pakistan. ref.92, p. xiii

194. Ibid., p:xiv

195. Sajid, M. Sajjad. dated April 4, 1976 to Chairman, Board of Intermediate Education, Karachi. (Original letter with Mr. Sajjid)

۱۹۶۔ صمدانی، رئیس احمد، ابتدائی لائبریری سائنس (کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۰ء)، ۲۲۸ص۔

۱۹۷۔ صمدانی، رئیس احمد، مبادیات لائبریری سائنس (کراچی: صمدانی اکیڈمی۔ ۱۹۸۵ء)، ۱۹۸ص۔

198. Curriculum in Library Sciene for Intermediate Classes

(XI-XII) (Peshawar:

Pakistan Library Association. 1983) , 27p.

199. Pakistan Library Association. Pakistan Librarianship:

1980-82, Role of

Library in the National Reconstruction in the 15th Century

Hijra;

Proceeding of the 12th Annual Conferenceof the Pakistan

Library

Association, November 27-30, 1982, held at Peshawar.

ed., Sain

Mohammad Malik.- (Peshawar : PLA, 1989) , p: 177.

۲۰۰۔ محمد نذیر، ’’ لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون : پس منظر و پیش رفت‘‘

۔پاسا نیوز ۴ نمبر ا۔۲ (جنوری ۔ جون ۱۹۹۲ء) : ۸۔۱۰

۲۰۲۔ نوٹیفیکیشن نمبر ا،۹۱ مورخہ یکم جنوری ۱۹۹۱ء ، در' پاسا نیوز۔ ۲ نمبر ۴، ۳ نمبر ا

مارچ۱۹۹۱ء) : ٦)

202. Notification No. F. 3.1/93-SST, Islamabad the 7th

January 1993 . in

PULSSA News. 5 no. 4 (December 1993), 9

،۲۰۳۔ محمد نذیر، ’’ لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون‘‘ ، حوالہ ۲۰۰

204. Sindh Textbook Board Jamshoro. Library Science: Part
One for Class XI
(Karachi: National Book Foundation. 2001) , 60p.
205. Sindh Textbook Board Jamshoro. Library Science: Part
Two for Class XII
(Karachi: National Book Foundation. 2001) , 103p.

آزاد جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے انتخابات 2016

آزاد جمو و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے انتخابات 2016 کا نتیجہ سب کے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہے۔ کس نے کیا کھویا کیا پایا یہ بھی عیاں ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے برج الٹ گئے، بلند بانگ دعوے کرنے والے اور اپنی جیت کی پیشگی اطلاع دینے والوں کے چہرے لٹک گئے، کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی مثال ہے، دھاندلی اور میں نہ مانوں والی رٹ ، بعض سیاسی پنڈتوں نے اپنی ہار کو بادلِ نخواستہ تسلیم کرکے فراغ دلی کا ثبوت بھی دیا۔ آزاد کشمیر کے انتخابات کا میلہ 22 جون 2016 کو سجا۔ پاکستان کی اور آزاد کشمیر کی بڑی اور روایتی سیاسی جماعتیں میدان میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے دعوے کرتی نظر آئیں۔ لیکن سب کے دعوے، سب کی بھڑکیں دھری کی دھری رہ گئیں اور میدان پاکستان کی حکمراں جماعت پاکستان مسلم لیگ (نون) نے مار لیا۔ اس جیت کو عرف عام میں کلین سوئیپ کہا جاتا ہے۔ اسمبلی اراکین کی کل تعداد 42 ہے۔ ان سیٹوں پر پاکستان مسلم لیگ (نواز) کو 31 سیٹوں پر کامیابی حاصل ہوئی، گویا نواز لیگ کو یہاں اپنی حکومت بنانے کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، وہ بہت ہی آسانی سے آزاد جمو و کشمیر میں اپنے اقتدار کا آغاز کردے گی۔ نواز لیگ کے مقابلے میں پاکستان پیپلز پارٹی جو اس وقت آزاد کشمیر میں حکومت میں تھی ان انتخابات میں بری طرح شکست سے دوچار ہوئی۔ بلکہ اسے

زلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا، صرف 3 سیٹیں اس کا مقدر بنیں۔ سابقہ انتخابات کے وقت پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان میں اقتدار میں تھی، جب آزاد کشمیر میں انتخابات ہوئے تو اسے واضح اکثریت حاصل ہوئی اور اس نے حکومت بنائی۔ شکست کی وجوہات اپنی جگہ، درست یا غلط لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام انتخابات میں اس جماعت کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں جو پاکستان میں حکومت میں ہوتی ہے۔ تاریخ یہی بتارہی ہے۔ وجوہات کا جائزہ لیں تو یہی بات سامنے آتی ہیں کہ.برسر اقتدار جماعت کشمیر میں زیادہ بہتر انداز سے کام کرتی ہے، زیادہ فنڈاور ترقیاتی کاموں پر رقم خرچ کرتی ہے۔ وسائل اور اختیارات کے باعث.برسر اقتدار جماعت کا کئی اعتبار سے پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ وسائل کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے بھی برسر اقتدار جماعت کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جس کے باعث وہ عوام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی صورت حال موجودہ انتخابات میں بھی ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی گو کشمیر میں حکومت میں تھی لیکن اس کے وزیر اعظم اور وزراء اقتدار کے گھمنڈ میں رہے۔ انہیں بلاول بھٹو زرداری زیادہ پر کشش اور عوام پر اثر انداز ہونے والا لیڈر محسوس ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ بلاول، نیا خون ہے، جوش ہے، ولولہ ہے، اپنے نانا اور اپنی ماہ کی طرح دبنگ اور دلیر ہے۔ وہ آزاد کشمیر کے عوام پر آسانی سے اثر انداز ہوگا۔ اس نشے میں رہے اور عوام بہتری کے کاموں کو پس پشت ڈال دیا۔ دوسری جانب نواز شریف اور ان کے ساتھی آجکل پاناما لیکس کے ساتھ ساتھ اپنی

بیماریٔ دل کے باعث فیلڈ سے باہر تھے۔ مخالفین یہ سمجھ بیٹھے کہ میدان آسانی سے مار لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، نواز شریف کی خاموشی نے ضرور رنگ دکھایا لیکن اس فتح میں ان کی کشمیر کے معاملے میں واضح موقف یا کشمیریوں سے محبت اور وابستگی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس حوالے سے نوز لیگ کی پالیسی انتہائی ناقص اور کمزر رہی ہے۔

دراصل پاکستان پیپلز پارٹی نے جو سندھ کے علاوہ آزاد جمو و کشمیر میں بر سر اقتدار میں ہے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے خاطر خواہ کام نہیں کیے، سندھ میں حکومت کی جو کارکردگی ہے،اس کے اثرات بھی اہل کشمیر نے قبول کیے، کراچی جیسے شہر میں کشمیریوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے وہ کھلی آنکھوں سندھ میں حکومت کی کارکردگی کو محسوس کر رہے تھے۔ یہاں مقیم کشمیریوں کے بچے ہی تو کشمیر میں رہتے ہیں۔۔بڑے سائیں کی جو کارگزاری سندھ میں ہے اس کے اثرات کا ثمر ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی کو کشمیر کے انتخابات میں اہل کشمیر نے دیا۔ان کے صرف دو امیدوار چودھری عبدالمجید اور چودھری محمد یٰسین کامیاب ہوسکے۔ پیپلز پارٹی کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ اگر اب بھی ہوش کے ناخن نہ لیے تو پھر 2018 بہت دور نہیں، اس انجام سے بچنا ہے تو درست سمت میں قدم بڑھانا ہوگا۔ بصورت دیگر شکست اور پھر شکست مقدر ہوگی۔

عمران خان کی جماعت تحریک انصاف بھی میدان میں تھی۔ کپتان حسب عادت، اور

حسب روایت پرجوش تقریریں کرتے رہے، نواز شریف کو جو بائی پاس آپریشن کے نتیجے میں پہلے لندن پھر اپنے گھر لاہور میں آرام فرما تھے۔ خاموشی سے کپتان کی بھڑکیں سنتے رہے۔ کپتان زیادہ تر دھاندلی اور پاناما لیکس کے حوالے سے تحریک چلانے، نون لیگ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی باتیں کرتے رہے۔ دھرنا ان کی تحریک کا مہور رہا، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تیسری شادی کی باتیں بھی کرتے رہے،ایسے موقع پر یہ موضوع غیر سنجیدہ تھا۔ کشمیر میں انتخابات کا ان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ امیدوار بھی نا تجربہ کار تھے، تحریک انصاف تنظیمی مسائل سے بھی دوچار رہے، سیکنڈ لائن لیڈر شپ میں باہمی چپقلش بھی پائی جاتی ہیں، تحریک چلائی جائے یا نہیں اس ایشو پر بھی لیڈروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پھر یہ جماعت خیبر پختونخواہ میں برسر اقتدار بھی ہے، وہاں کی کارکردگی کے اثرات بھی کشمیری عوام پر پڑے، لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ اس جماعت کی ایک صوبے میں عوام کی بھلائی کی کیا صورت حال ہے۔ چنانچہ یہ جماعت بھی صرف 2 سیٹیں لینے میں کامیاب ہو سکی۔ کشمیر کی ایک اہم شخصیت جو گزشتہ کشمیر اسمبلی کے 7 بار رکن رہ چکے تھے، اب جب کہ انہوں نے تحریک انصاف کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تو انہیں بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا، جی ہاں بیرسٹر سلطان محمود بھی الیکشن ہار گئے۔ سیاسی حلقے بیرسٹر صاحب کی شکست کو بڑا سیٹ بیک قرار دے رہے ہیں۔ تحریک انصاف کو دو حلقوں کشمیر ویلی میں کامیابی حاصل ہو سکی، غلام محی الدین دیوان اور عبد الماجد خان فتح مند

ہوئے۔ کپتان کی جانب سے ایک بات بہت اچھی اور قابل تعریف یہ ہوئی کہ نتائج کے آجانے کے بعد انہوں نے میڈیا پر نون لیگ کے سربراہ کو مبارک باد دی، یہ ان کا بڑا پن رہا۔ اس کے برعکس پاکستان پیپلز پارٹی کے بلاول بھٹوزرداری نے نتائج کو مسترد کرتے ہوئے مسلم لیگ ن پر پری پول دھاندلی کے الزامات لگائے۔ دیگر جماعتیں خاص طور پر کشمیر میں سیاسی جماعتیں بھی ڈھیر ہوگئیں مسلم کانفرنس کے 2 امیدوار سردار عتیق احمد خان اور محمد صغیر نے کمیابی حاصل کیں۔جموو کشمیر پیپلز پارٹی کے سردار خالد ابرہیم خان کامیاب ہوسکے۔ ہارنے والوں کی جانب سے دھاندلی کا واویلا کرنا ہماری سیاست کا لازمی عنصر بن چکا ہے۔ ان انتخابات میں دھاندلی کے حوالے سے کوئی قابل ذکر بات سامنے نہیں آئی، دھاندلی کی باتیں مخالفت برائے مخالفت کے سوا کچھ نہیں۔ نتائج کے خوش گوار اثرات نواز شریف صاحب پر ہونا قدرتی عمل تھا۔ نتائج نے دل کے آپریشن اور اس کے اثرات کو دور بھگادیا انہوں نے اسی روز کشمیر کا ہنگامی دورہ کرڈالا۔ ان کی باڈی لینگوج بتارہی تھی کہ وہ آپریشن اور پاناما لیکس کے حوالے سے جس ڈپریشن کا شکار تھے کشمیر کی جیت نے اسے کوسوں دور کردیا ہے۔ وہ جیتے ہوئے پہلوان کی مانند اکھاڑے میں جیتنے والوں کو مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ مخالفین کو بھی للکار رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ’ آزاد کشمیر کے پرامن انتخابات جمہوری قوتوں کی فتح ہے گویا یہ ہراس شخص کی

فتح ہے جس نے جمہوری عمل میں حصہ لیا جو ہار گئے انہیں اپنی غلطیوں اور خامیوں کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا چاہیے جن کی وجہ سے عوام ان سے ناراض ہوئے ان کا کہنا تھا کہ ' کامیابی دھرنے نہیں کچھ کرنے سے ملتی ہے ، ہمارے خلاف کیا کچھ نہیں کہا گیا لیکن عوام نے مسترد کر دیا، انہوں نے جتنی سیٹیں جیتیں ان کے احتجاج میں بھی اتنے ہی لوگ ہوں گے، دھرنے والوں کی کارکردگی سامنے آ گئی،بڑے بڑے برج الٹ دئے گئے'۔ میاں نواز شریف صاحب کی باتوں میں وزن نظر آ رہا ہے۔اینکر پرسن اور تجزیہ نگار سلیم صافی کے بقول 'جو نتائج آئے اس کی وجہ عمران کی بچگانہ، بلاول کی زرداری انہ اور نواز شریف کی شریفانہ سیاست ہے'۔بچگانہ اور زردارانہ تو درست لگتا ہے لیکن جہاں تک میاں صاحب کی شریفانہ سیاست کا تعلق ہے تو اس سے مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا، سیاست اور شریفانہ ، یہ کیسے ممکن ہے، یہ دونوں تو آگ اور پانی کی طرح ہیں۔ ہمارے ملک میں سیاست میں شریفانہ طرز عمل کب اور کس لیڈر نے دکھایا، یہاں تو اقتدار نام ہے اپنے مخالفین سے انتقام لینے کا، سیاست نام ہے مال بنانے کا، دولت جمع کرنے کا، جائیدادیں بنانے کا، آف شور کمپنیوں میں پیسہ لگانے کا، بیرون ملک بنکوں میں دولت محفوظ کرنے کا، اپنے ملک کی دولت بیرون ملک جمع کرنے کا، سرائے محل خریدنے کا، لندن اور دبئی میں قیمتی فلیٹس خریدنے کا۔بہت ممکن ہے کہ اس وقت جب کہ دل کے آپریشن کے نتیجے میں میاں صاحب جسمانی طور پر کمزور ہو گئے ہیں، پاناما لیکس نے انہیں ڈیپریس کر دیا ہے۔ کیا قوم میاں

صاحب کی ماضی کی سیاست بھول سکتی ہے، مری اور دیگر مقامات پر اراکین کو یرغمال رکھنے، اراکین کی خرید وفروخت کون بھول سکتا ہے۔اس وقت قدرت نے انہیں ایک ایسے موقع پر غیر معمولی خوشی سے نوازا ہے کہ جس وقت وہ پاکستان میں متعدد معاملات کے حوالے سے پریشان تھے ۔آزاد کشمیر کے انتخابات میں فتح ان کے حوصلے بلند کرنے اور مخالفین کے منہ بند کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔اب دیکھنا یہ ہے کہ کشمیر میں حاصل ہونے والی فتح اہل کشمیر کے لیے کس قدر مثبت ثابت ہوتی ہے اور نون لیگ اس فتح سے اپنی بگڑی ساکھ کو کس حد تک سنبھالا دینے میں کامیاب ہوپاتی ہے۔(25 جولائی 2016)

الوداع بڑے سائیں۔ تبدیلی ضروری تھی

سابق صدر آصف علی زرداری نے آخر کار سید قائم علی شاہ کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اس تبدیلی کی ضرورت بہت پہلے سے محسوس کی جارہی تھی اور اسے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ چلیے دیر آید درست آید۔ سندھ کے بڑے سائیں سید قائم علی شاہ صاحب بہت ہی محترم، نیک اور سادہ لوگ انسان ہیں۔ دیانتدار اور معاملہ فہمی کا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کا اثاثہ ہیں، بانی اراکین میں سے ہیں، دستور پاکستان کے مسودہ پر دستخط کرنے والوں میں سے ہیں۔ بھٹو خاندان کے وفادار بھی۔ ان کی شرافت، دیانت اور سادگی پر کوئی حرف نہیں۔ میں انہیں ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے دیکھ رہا ہوں۔ پارٹی پر کڑے وقت بھی آئے لیکن شاہ صاحب بھٹو خاندان پر قربان اور وفادار ہی رہے۔ 1970 کے عام انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر خیر پور سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا، اس سے قبل وہ ایوب خان کے دور اقتدار میں خیر پور ڈسٹرکٹ کونسل کے چیرَمین رہ چکے تھے۔ تعلق سندھ کے ضلع خیر پور سے ہے۔ انہوں نے جسٹس (ر) سید غوث علی شاہ صاحب کو جو مسلم لیگ ن) کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے شکست دی تھی۔ سید غوث علی شاہ نے عدلیہ سے) ریٹائر ہو کر سیاست کا رخ کیا تھا اب نون لیگ کے ناراض سیاست دانوں میں شمار کیے جارہے ہیں۔ سید قائم علی شاہ نے پارلیمانی

سیاست کا آغاز پیپلز پارٹی کے رکن کی حیثیت سے کیا انہیں پارٹی ٹکٹ دیتی رہی ، وہ الیکشن لڑتے رہے اور کبھی قومی اسمبلی اور کبھی سندھ اسمبلی میں اپنی سیاست کے جوہر دکھاتے رہے۔ وہ وفاقی وزیر بھی رہے، سینیٹر بھی۔ اس دوران ایسا وقت بھی آیا کہ سید غوث علی شاہ کا پلڑا بھاری پڑگیا اور 1997 کے عام انتخابات میں بڑے سائیں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ سید غوث علی شاہ بھی خیر پور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

سائیں سید قائم علی شاہ کی سیاسی زندگی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ صاف ستھری سیاست کرتے رہے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ شاہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں جامعہ کراچی بی اے کیا، ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی۔ شرافت، دیانت اور اچھا انسان ہونے کے لیے تعلیم ضروری نہیں، تربیت ، ماحول اور خاندانی روایات انسان کو معاشرے کا بہترین فرد بناتے ہیں۔ قائم علی شاہ ان میں سے ایک ہیں۔ وہ سندھ کی سیاست سے وابستہ رہے نیز ایک ہی سیاسی جماعت کے ہو رہے اور اسی پر اکتفا کیا ، یہاں تک کہ جب ضیاء الحق کے دور اقتدار میں پاکستان پیپلز پارٹی پر مشکل وقت آیا، بھٹو صاحب کے ساتھ شاہ صاحب بھی گرفتار ہوئے۔ بھٹو کے ساتھی پی پی کے متعدد سینئر سیاست داں مشکل وقت میں خاموش ہو رہے، ادھر اُدھر ہوگئے، پارٹیاں بدل لیں لیکن بڑے سائیں ثابت قدم رہے۔ بے نظیر کی سیاست کا آغاز ہوا تو سائیں کو سندھ پیپلز پارٹی کا صدر بنادیا گیا اور وہ

اس عہدہ پر طویل عرصہ رہے۔ شاہ صاحب نے ایک الیکشن کے علاوہ تمام انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ 2008 کے عام انتخابت میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ساتھ ہی سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی مقرر ہوگئے ان کے بڑے وزیر کا دورانیہ 2013 کے عام انتخات کے بعد بھی جاری رہا۔ وہ سندھ کے 28 ویں وزیر اعلیٰ تھے۔ قومی اسمبلی کے علاوہ انہیں سات مرتبہ سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہے وہ 1990 ,،1997،2002، 2008اور 2013 میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ۔ اسی طرح وہ 1973 میں پہلی مرتبہ سندھ پیپلز پارٹی کے صدر بنے 1977 تک صدر رہے، اس کے بعد 1987 سے 1997 اور پھر 2004 سے اپنی وزارت اعلیٰ کے اختتام تک سندھ پیپلز پارٹی کے صدر رہیں۔ انہیں نہ تو پارٹی کی صدارت سے نہ ہی اسمبلی کے رکنیت ، وزارت یا وزارت اعلیٰ سے الزام لگا کر ہٹایا نہیں گیا۔ لوگ انہیں سیدھا وزیر اعلیٰ کہہ کر خاموش ہوجایا کرتے تھے۔ ان کی سادگی کی وجہ سے ان پر ایک الزام ضرور لگایا جاتا رہا کہ وہ پارٹی کے سربراہ آصف علی زرداری کے کہنے کے مطابق معاملات کو چلاتے رہے ، یہ ایک لازمی حصہ تھا وہ اپنی پارٹی کے سربراہ کی بات نہ مانتے تو پھر کس کی بات مانتے، ان پر یہ بھی الزام لگایا جاتا رہا کہ وہ پارٹی کے کسی بھی طاقت ور وزیر کے کہنے پر فیصلے لے لیا کرتے تھے، ان پر یہ بھی الزام لگا کہ انہیں کسی کرپٹ وزیر کے خلاف کاروائی کا اختیار نہیں تھا۔ پارٹی کو جو بات کہلوانا ہوتی شاہ صاحب کے ذریعے آسانی سے کہلوادیا کرتے تھے۔ پارٹی پر اور

نہ ہی حکومتی اداروں پر ان کی گرفت رہی تھی ، ہر سیاسی طاقت ور ، ہر ادارہ بے سونڈ ہاتھی ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی مثال تو ایسی تھی کہ وہ سندھ حکومت کے آگے آگے چل رہے تھے، اصل کام دکھانے والے ان کے پیچھے پیچھے تھے اور کام دکھا رہے تھے۔ وہ شاہ صاحب سے دائیں مڑنے کو کہتے شاہ صاحب ایسا ہی کرتے، بائیں مڑنے کو کہتے شاہ صاحب بائیں مڑ جاتے، رک جانے کو کہتے رک جاتے، چلنے کو کہتے چلنے لگتے۔ صوبے کی حکومت کبھی اس طرح بھی چلا چلتی ہے، آخر کب تک گاڑی چلتی۔ وفاق سے بھی شاہ صاحب کے معاملات کمزور تھے۔ انہیں بزرگ جان کر عزت تو کی جاتی لیکن ان کی باتوں پر کان دھرنے کی توفیق نہ رہی تھی۔ اس میں شاہ صاحب کا قصور نہ تھا، شاہ صاحب عمر کے جس حصے میں پہنچ چکے ہیں ، یہ عمر اس طرح کی سرگرمیوں کی نہیں، وہ تو پروگراموں تقریبات کی صدارت کے لیے موضوع شخصیت ہیں اور اب وزارت اعلیٰ سے فراغت کے بعد وہ اسی قسم کی سرگرمیوں میں دیکھے جائیں گے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ کی شہریت حاصل کرکے وہیں کے ہو رہیں گے۔ پر شاہ صاحب کا دل وہاں لگے گا نہیں۔ دوڑ دوڑ پاکستان آیا کریں گے

بڑے سائیں نے شادیاں تین کیں لیکن تینوں خاندانی روایت کے مطابق۔ اس حوالے سے ان کا کوئی ایک اسکینڈل بھی سامنے نہیں آیا۔ ان کی پہلی اور دوسری شریک حیات طبعی موت مریں۔ اس کے بعد شاہ صاحب تنہائی کا شکار ہوئے چنانچہ

خاندان کے لوگوں کی مرضی سے انہوں نے تیسری شادی کی۔ ماشاء اللہ ان کے 4 بیٹے اور 8 بیٹیاں ہیں۔ سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ، کچھ ڈاکٹرز ہیں، سی ایس ایس اعلیٰ عہدہ پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی نفیسہ شاہ میدان سیاست میں اپنے جوہر دکھا رہی ہیں۔ رکن قومی اسمبلی ہیں، معاشی امور کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی چیرپرسن ہیں۔ سیاسی امور پر ان کی گہری نظر ہیں، اکثر ٹی وی ٹاک شوز میں اپنی پارٹی کا دفعہ کرتی اور سیاسی موضوعات پر تجزیہ پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ شاہ صاحب کی اولاد کے بارے میں بھی کوئی منفی بات سامنے نہیں آئی۔ کبھی یہ ذکر نہیں ہوا کہ سید قائم علی شاہ کی پاکستان سے باہر کوئی جائیداد ہے، کوئی فلیٹ ہے، کوئی کاروبار ہے یا ان کی بھی کوئی آفشور کمپنی ہے۔ ان کی گفتگو میں شائستگی ہے،انہوں نے مخالفین کے بارے میں کبھی گری ہوئی زبان استعمال نہیں کی، سیاسی انتقام کے وہ قائل ہی نہیں۔ البتہ کبھی کبھی ان کی زبان پسل ضرور جایا کرتی تھی۔ اس کی وجہ عمر کا تقاضہ تھا۔

سائیں سید قائم علی شاہ 13 ستمبر 1928 کو خیر پور سندھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہ گویا 88برس کے ماشاء اللہ ہو چکے ہیں۔ اس عمر میں انہوں نے سندھ جیسے مشکل اور ٹیڑھے صوبے کی وزارت اعلیٰ کا بار اپنے کاندھوں پر لیا ہوا تھا۔ ذمہ داران کو اب نہیں معلوم کس وجہ سے اس بات کا خیال آگیا کہ اب بڑے سائیں پر

رحم کر دیا جائے، انہیں رخصت کر دیا جائے۔ بظاہر جو حالات اور واقعات لمحہ موجود کا حصہ ہیں ان میں صوبے میں گڈ گورننس، رینجرز کو اختیارات دینے کا معاملا ہے، کراچی آپریشن کا دائرہ کراچی سے بڑھا کر پورے سندھ تک کرنے کا معاملا ہے جو سب سے اہم نظر آ رہا ہے۔ اس لیے کہ سندھ کے اصل حکمراں یہ ہر گز نہیں چاہتے کہ ایسا ہو رینجرز کراچی سے باہر قدم رکھے، کراچی میں پیپلز پارٹی کے ایم کیو ایم سے معاملات مسلسل کشیدہ چل رہے ہیں، کراچی کا سیاسی اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آ رہا۔ بظاہر اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے کہ رینجرز کو جب جب، جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے کاروائی کرکے اپنا شکار کر لیتی ہے۔ اختیارات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، سائیں ضرب عضب کے حوالے سے سندھ کے کپتان بھی تھے، ان کی کپتانی ڈھیلی جا رہی تھی، سندھ میں خاص طور پر کراچی میں دہشت گردی پر کنٹرول تو کیا گیا لیکن پھر بھی دہشت گرد کاروائی کرنے سے بعض نہیں آ رہے، پیپلز پارٹی کے بعض وزراء جو مختلف الزامات میں مطلوب ہیں ان کا بھی معاملا ہے، ڈاکٹر عاصم حسین کو شاہ صاحب رہائی نہیں دلا سکے۔ اس قسم کے معاملات کو دیکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کی ٹاپ کی لیڈر شپ نے سندھ میں تبدیلی کو ناگزیر سمجھا، سندھ پیپلز پارٹی میں متعدد سینئر سیاست دانوں کو بائی پاس کرتے ہوئے ایک کم عمر، کم تجربہ کار سیاست دان کو سید قائم علی شاہ کی جگہ وزارت اعلیٰ کا ہار پہنایا جا رہا ہے۔ یہ سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ سید عبد اللہ شاہ کے بیٹے سید مراد علی شاہ

ہیں۔ مراد علی شاہ کی سیاسی عمر یقیناً کم ہے، سید قائم علی شاہ کے مقابلے میں مراد علی شاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ضرور ہیں لیکن سیاسی تعلیم و تجربہ شاہ صاحب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ عبد اللہ شاہ کی وزارتِ اعلیٰ کے زمانے میں بھی کراچی میں آپریشن ہو رہا تھا، عبد اللہ شاہ مرحوم اس حوالے سے اہل کراچی کے لیے جانے پہچانے ہیں۔ اس وقت مراد علی شاہ زیادہ کم عمر اور جوشیلے پیپلز پارٹی کے جیالے تھے۔ پھر یہ ملک سے باہر چلے گئے، کنیڈا کو اپنا مسکن بنایا، نومبر 2014 میں کنیڈا کی شہریت ترک کرکے پاکستان تشریف لائے، پیپلز پارٹی ان پر مہربان ہوئی، جامشورو سندھ سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، سندھ کی اہم وزارت کے ساتھ ساتھ سندھ کے سینئر وزیر کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ قسمت کی دیوی مہربان ہوئی، قبلہ آصف علی زرداری کی نظر کرم سندھ کی وزارت اعلیٰ کے لیے ان پر پڑی، ایک اعتبار سے یہ بہتر انتخاب ہے کہ مراد علی شاہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ یہ سندھ کے تمام تر حالات کا ادراک کرتے ہوئے صوبے میں بہتری لانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ سندھ سے تعلق رکھنے والے تجربہ کار اور سمجھ بوجھ رکھنے والے، پارٹی کے وفادار بھی ایک درجن سے زیادہ سیاسی لیڈروں کو پس پشت ڈال کر پارٹی کے ایک کم سیاسی کھلاڑی کو کپتان بنانے میں کیا حکمت ہے، یہ پارٹی کے سربراہان ہی جانتے ہوں گے یا پھر وقت یہ بتائے گا کہ ایسا کیوں کر کیا گیا۔ کیا وہ تمام سینئر رہنماء خاموشی سے اپنے سے جونیئر کی کپتانی میں

فعال سیاسی کھیل جاری رکھ سکیں گے؟ ایسا کرکے پیپلز پارٹی نے اپنے لیے نئی مشکلات تو کھڑی نہیں کرلیں؟ یہ بھی ممکن ہے کہ نیا کپتان سندھ کے بگڑتے حالات کی کشتی کو پار لگانے میں کامیاب ہوجائے۔ اگر اس نے اپنے سینئرز کے ساتھ عاجزی، انکساری، رواداری، احترام سے کام لیا تو ممکن ہے کہ پیپلز پارٹی کا ایک جونیئر کپتان اچھی کپتانی کرکے اور پارٹی کو مشکل سے نکالنے اور سندھ کے عوام کے لیے سکون اور راحت کا سامان بن سکے گا۔ پر آثار کچھ مختلف دکھائی دے رہے ہیں۔ اللہ سندھ اور سندھ کے سب ہی لوگوں پر اپنا فضل کرے۔

(282016 جولائی)

مقروض ملک کے صدر کے لیے 34 گاڑیوں کا پروٹوکول

اسلامی جنہوریہ پاکستان کے صدر قبلہ ممنون حسین صاحب ایک شادی میں شرکت کے لیے اسلام آباد سے لاہور تشریف لے گئے۔ رپورٹ کرنے والوں نے رپورٹ کی کہ اسلام آباد ائرپورٹ پر ان کا استقبال چیف سیکریٹری پنجاب کیپٹن (ر) زاہد سعید اور آئی جی پنجاب مشتاق سکھیرا سمیت دیگر اعلیٰ حکام نے کیا۔ صدر گرامی محترم ممنون حسین کے ایئر پورٹ سے نکلتے ہی اسلام آباد سے آئی ان کی گاڑیوں کے ساتھ چیف سیکریٹری اور آئی جی پنجاب کے پروٹوکول اور سیکورٹی کی گاڑیاں بھی شامل ہو گئیں۔ اس دوران ٹریفک پولیس کی گاڑیاں اور موٹر سائیکل اسکواڈ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ صدر محترم جب گورنر ہاؤس پہنچے تو پروٹوکول کی گاڑیوں کی مجموعی تعداد 34 ہو گئ تھی۔

ہر گاڑی کا ایک چلانے والا تو ضرور ہوگا اور کم از کم ہر گاڑی میں تین سے چار افراد تو لازمی بیٹھے ہوں گے۔ اگر یہ تعداد چار بھی شمار کرلی جائے تو افرادی قوت جو پروٹوکول اسکواڈ کے ساتھ تھا اس کی تعداد 134 بن جاتی ہے۔ اب آتے ہیں ان غریب پولیس والوں کی جانب جو لاہور ائرپورٹ سے گورنر ہاؤس تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صدر گرامی کی حفاظت کے لیے معمور کیے گئے ہوں گے۔ ان گاڑیوں میں کتنا پیٹرول لگا ہوگا، اس کی مالیت کیا ہوگی، صدر صاحب کو ایئر

پورٹ سے گورنر ہاؤس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا ہوگا، زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ، بلکہ اس سے بھی کم، اس لیے کہ وی وی آئی پیز کا اسکواڈ ہوائی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، مجال نہیں کہ اس کے راستے میں دور دور تک کوئی پرندہ پر بھی مار سکے۔ اس آدھے گھنٹے میں ملک و قوم کا کتنا سرمایہ بلا وجہ اور غیر ضروری طور پر پھونک دیا گیا۔ تمام تر اخراجات جمع کیے جائیں تو آدھے گھنٹے میں ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپے جل کر خاک ہوگئے۔ پھر صدر صاحب گورنر ہاؤس سے شادی ہال بھی تشریف لے گئے ہوں گے، واپس گورنر ہاؤس بھی آئے ہوں گے اور پھر جیسے اسلام آباد سے آئے اسی طرح واپس بھی تشریف لے گئے ہوں گے۔ شادی میں شرکت سرکاری تقریب نہیں بلکہ یہ ان کا نجی اور ذاتی فعل ہے۔ اس پر سرکار کا سرکاری پروٹوکول اور ملک و قوم کا سرمایا کیا انصاف کے زمرے میں آتا ہے؟

چند گھنٹے قبل سندھ کے نئے وزیر اعلیٰ سید مراد علی شاہ صاحب نے گورنر ہاؤس میں اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اپنے ابتدائی کلمات میں انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ میرے پرٹوکول کو کم رکھا جائے اور یہ کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے میں ایسے وقت کا انتخاب کریں گے کہ ٹریفک میں کم سے کم خلل واقع ہو۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے خدا کرے نئے وزیر اعلیٰ اپنی اس خواہش پر عملی طور پر عمل کرانے میں کامیاب بھی ہوجائیں۔ بات صدر مملکت کے

پروٹوکول کی کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کے بڑے لوگوں کو تھریڈ ہوتے ہیں، ان کی حفاظت متعلقہ اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے، انہیں ہر قیمت پر ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر جگہ، ہر ملک اور ہر شہر میں دہشت گردی عام ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے جتنے واقعات ہو چکے اور جس قسم کے تھریڈ موجود ہیں ان کے پیش نظر وی آئی پیز کی حفاظت انتہائی اہم اور ضروری ہے لیکن ضرورت سے بڑھ کر کوئی کام کرنا کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں۔ ہمارا ملک غریب ملکوں کی فہرست میں آتا ہے، ہمارے وسائل محدود ہیں، ہم پہلے ہی بہت مقروض ہیں، ہماری معیشت قرض پر کھڑا ہوئی ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ قرض لینے میں ماہر القادری ہیں، قرض کے حوالے سے جس کسی حکومت، ادارے سے گفتگو کرتے ہیں اسے اس طرح شیشے میں اتار لیتے ہیں کہ عالمی بنک ہو یا آئی ایم ایف اسحاق ڈار کی باتوں میں فوری آ جاتے ہیں اور پاکستان کو قرض کی قسط منظور ہو جاتی ہے۔ جو بظاہر تو اچھا عمل لگتا ہے لیکن ہمارا ملک اور قوم قرض کے ظالم پھندے میں مسلسل جکڑتی جارہی ہے۔ اللہ سے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ پروردگار ہمیں ایسے حکمراں نصیب فرماں جو اس ملک کو اس قوم کو تمام طرح کے قرضوں سے نجات دلا سکیں، موجودہ حکومت سابقہ حکومتوں کے نقشے قدم پر رواں دواں ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ پاکستانی قوم مقروض ہے بلکہ ہر پیدا ہونے والا پاکستانی بچہ مقروض پیدا ہو رہا ہے۔ ہمیں قرض جیسی لعنت سے کب چھٹکارا نصیب ہوگا، اس کے دور دور

آثار بھی نظر نہیں آرہے۔

دکھ اورافسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمراں جب تک حکومت میں نہیں ہوتے بلکہ حکومت کے حصول کی جدوجہد کے مرحل میں ہوتے ہیں اس وقت انہیں وی آئی پیز کا پرٹوکول زہر نظر آتا ہے، اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں، اس بات کا اعلان بھی کرتے ہیں کہ اگر ہم حکومت میں آگئے توپروٹوکول کے اس رواج کی زنجیریں توڑ ڈالیں گے، جیساکہ سندھ کے نئے وزیر اعلیٰ نے آج ہی اعلان فرمایا۔ سادگی اختیار کریں گے، کشکول پھینک دیں گے، قرض نہیں لیں گے ، لیکن جب وہی سیاسی پنڈت اس منصب پر فائز ہوجاتے ہیں،انہیں پروٹوکول ضروری محسوس ہونے لگتا ہے،اپنی جان کی زیادہ فکر اور قوم کی فکر سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اس قسم کے پروٹوکول کو دیکھنا بند کر دیتی ہیں، قرض کا حصول ملک و قوم کے مفاد میں محسوس ہونے لگتا ہے۔ کشکول توڑ نا تو دور کی بات یہی کشکول فخر کی علامت نظر آرہا ہوتا ہے۔ قرض کی قسط منظور ہونے پر فخر اور خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

میں نے اپنی بات کو پروٹوکول سے شروع کیا تھا لیکن پاکستان قرضوں کی صورت حال پر ختم کرتا ہوں۔ ہفتہ 30 جولائی 2016 کی رپورٹ جو ایک اخبار نے شائع کی اس کے مطابق 'پاکستان کو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے ایک ارب 34 کروڑ ڈالر

کا قرض ملنے کے بعد بیرونی قرضوں کا حجم 50 ارب 85 کروڑ ڈالر سے بڑھ کر 52 ارب کروڑ ڈالر تک پہنچ گیا ہے جو ملک کی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں 30 فیصد کے لگ بھگ 19 ہے۔ بیرونی قرضوں کے مطابق اب ملک کا ہر شہری 313.896 ڈالر (روپے) کا مقروض ہوگیا ہے۔ پاکستان کے ذمے آئی ایم ایف کے قرضے 25205.89 کا حجم 4 ارب 35 لاکھ ڈالر سے بڑھ کر 5 کروڑ 20 لاکھ ڈالر تک پہنچ گیا ہے'۔ قرضوں کی صورت حال سابقہ حکومتوں کے ادوار میں اس قدر دِگرگُوں نہ تھی۔ ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ بیرونی قرضوں سے پیداوری صلاحیت بڑھ نہیں رہی ۔ مستقبل میں پاکستان کو بیرونی قرضوں کی ادائیگی میں سخت مشکلات کا سامنا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ حکومت وقت کے ذمے اندرونی قرضوں کا حجم 3600 ارب روپے تک پہنچ گیا ہے۔ ایسی صورت حال ملک و قوم کے لیے ، معیشت کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ملک کے حکمرانوں کو بلاوجہ کے اخراجات سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ شان و شوکت سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ کون سا حکمراں اپنے ساتھ یہ شان و شوکت اور یہ پروٹوکول لے گیا، سب کچھ یہی رہ جانا ہے۔ ملک و قوم کی فکر اور اس کی فلاح و بہبود کو اپنی ترجیحات میں رکھنا ہی دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔ (30 جولائی 2016)

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 12 :)

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (1915-2015

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے (
فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

خلاصہ :

لائبریری وانفارمیشن سائنس ایک علم ہے جو عرصہ دراز سے دنیا کی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ پاکستان میں اس علم کی باقاعدہ تعلیم کی ابتدا سو سا قبل 1915 میں جامعہ پنجاب سے ہوئی تھی۔ آج یہ علم پاکستان کی متعدد جامعات کے نصاب کا حصہ ہے۔ اس علم کی سو سالہ تاریخ کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ اس علم میں ہونے والی تحقیق کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے۔ یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے سے ماخوذ ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

انٹرمیڈیٹ میں لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون متعارف ہو جانے کے بعد انٹر اور ایم اے کے درمیان کے خلا کو پر کرنا ہر اعتبار سے ضروری تھا۔ اس مرحلہ پر بھی کراچی نے پہل کی۔ سندھ کونسل آف اسکول و کالج لائبریرینز نے تحریری طور پر اپنے مکتوب بنام شیخ الجامعہ کراچی ۲۹ نومبر ۱۹۷۸ء درخواست کی کہ لائبریری سائنس کو بطور اختیاری مضمون بی اے کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اپنے اس مطالبہ کے حق میں کونسل نے کئی دلائل بھی دئے۔ درخواست شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، جامعہ کراچی کو بھیج دی گئی۔ چیرمین شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس نے ابتدائی جواب کونسل کے صدر کو اپنے خط بتاریخ ۷ دسمبر ۱۹۷۹ء میں لکھا کہ یہ معاملہ آئندہ ہونے والے بورڈ آف اسٹڈیز کے اجلاس ۳۰ دسمبر ۱۹۷۹ء میں زیر بحث لایا جائیگا (۲۰۶) طے شدہ ایجنڈہ کے مطابق بورڈ آف اسٹڈیز میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ چیرمین شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس نے اپنے خط مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۷۹ء سندھ کونسل آف اسکول و کالج لائبریرینز کے صدر کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ لائبریری سائنس ایک پوسٹ گریجویٹ کورس ہے اور یہ انڈر گریجویٹ سطح پر" شروع نہیں کیا جاسکتا (۲۰۷)۔

سندھ کونسل آف اسکول و کالج لائبریرینز نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے

جدوجہد کا آغاز کیا۔ مختلف سیاسی، سماجی، تعلیمی، جامعہ کراچی کی اکیڈمک کونسل و سینٹ کے اراکین، منتخب نمائندوں اور لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کو مسئلہ کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات کے صدر حکیم محمد سعید سے درخواست کی گئی کہ وہ اس التواء شدہ مسئلہ کو حل کرانے میں کردار ادا کریں۔ آپ نے اُس وقت کے وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی کے نام اپنے خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۷۹ء (۲۰۸) میں اس اہم مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس مضمون کو بی اے کے نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کی۔

(آپ کے خط کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔ (خط کا عکس ضمیمہ ا

وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کے نام حکیم محمد سعید کا خط

میں یہ خط بی اے میں لائبریری سائنس بطور اختیاری مضمون متعارف کرانے کے" سلسلے میں لکھ رہا ہوں طلباء، والدین اور کتب خانوں کی ترقی میں دلچسپی رکھنے والوں کے شدید مطالبہ جنہوں نے مجھ سے بطور صدر انجمن فروغ و ترقی کتب خانہ جات اسپل) رابطہ کیا۔ علاوہ ازیں اخبارات میں شائع ہونے والے خیالات کے باعث میں) نے یہ خط لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اسپل بطور شہریوں کی تنظیم کے اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہے کہ اس جوش انگیز مسئلہ پر توجہ دے اور یونیورسٹی کے حل وعقد سے اس معاملہ پر مناسب توجہ مبذول کرنے کی

درخواست کرے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسپل پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ میں مصروفِ عمل ہے۔ میں اس کی سرگرمیوں اوران کا مرانیوں کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو اس نے کراچی میں انجام دیں لیکن میں یہاں بطور خاص جامعہ کراچی میں جاری کردہ ''اسپل گولڈ میڈل'' کا ذکر ضرور کرونگا جس کا مقصد پاکستان میں لائبریری تعلیم کا معیار بلند کرنا اور ذہین لوگوں کو اس شعبہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ پاکستان میں لائبریری تعلیم کے حوالہ سے اسپل کی دلچسپی کا یہ انتہائی واضح ثبوت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈگری کلاسیز میں لائبریری سائنس کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے متعارف کرانے سے لائبریری سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا معیار ایم اے کی سطح پر مزید بلند ہوگا۔ میں دیگر بے شمار خوبیوں کا تصور کرسکتا ہوں جو ڈگری کی سطح پر لائبریری سائنس کے بطور اختیاری مضمون متعارف ہونے سے طلباء پر مشتق ہونگی۔ پیشہ ورانہ کورس کے اجراء سے قوم پر جو فوائد مستبط ہونگے ان کے پیش نظر میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ یونیورسٹی خصوصیت کے ساتھ کورس کے اجراء کو فوقیت دے۔ لہٰذا ایسا کرنے سے ہم پانچویں ترقیاتی منصوبہ کی تجویز ملازمت فراہم کرنے والی تعلیم

Job Oriented

پر عمل پیرا ہو سکیں گے"۔ Education
حکیم محمد سعید

لائبریری سائنس کے اس مسئلہ میں آپ کی دلچسپی کی دوسری مثال یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں راقم الحروف نے اپنے کتاب 'ابتدائی لائبریری سائنس' محترم حکیم صاحب کی خدمت میں ارسال کی ساتھ ہی حکیم صاحب کی توجہ بی اے میں لائبریری سائنس کے التواکے معاملے پر مبذول کرائی۔ آپ نے اپنے جواب مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۰ء (۲۰۹) میں نہ صرف کتاب کی وصولیابی پر شکریہ ادا کیا بلکہ التوا شدہ مسئلہ پر کچھ اس طرح استفسار کیا۔ (خط کا عکس ضمیمہ نمبر ا

لائبریری پروموشن کی یہ دو مطبوعات مجھے مل گئی ہیں ۔ اس ہدیہ علمی کے لیے میں" آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں" پاکستان لائبریری بلیٹن' میں نے تلاش کرایا ہے۔ اگر آیا ہو گا تو لائبریری سے مجھے مل جائے گا اور میں اس کا مضمون جس طرف آپ نے رہنمائی کی ہے ضرور دیکھوں گا۔ اکیڈمک کونسل جامعہ کراچی کے ارکان کی ایک فہرست مجھے بھجوا دیجیے۔ نیز شیخ الجامعہ کی خدمت میں جو خط میں نے بھجوایا تھا اس کی ایک نقل بھی"۔ آپ کا مخلص
حکیم محمد سعید

اس دوران پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن اور پنجاب کالج لائبریری ایسو سی ایشن نے مشترکہ طور پر 'کالج لائبریریز کے مسائل' پر ایک سیمینار منعقد کیا۔ سیمینار میں 'معلومات کی ساخت اور استعمال' پر مبنی کورس کے اجراء کی تجویز پیش کی گئی۔ ڈاکٹر انیس خورشید کے مطابق "بعد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (اب اس کا نام ہائیر ایجو کیشن کمیشن ہے) نے ۱۹۸۰ء میں ان تجاویز کی حمایت کی جب اس نے بی اے' بی کام اور بی ایس سی کے لیے لائبریری اسٹڈیز کے نصاب کی منظوری دی۔ بنیادی طور پر یہ کتب کے استعمال پر مبنی کورس تھا۔ حکومت نے اس کورس کی تشکیل کے لیے ایک قومی کمیٹی بھی بنائی۔ پاکستان لائبریری ایسو سی ایشن کے سیکریٹری جنرل سائیں محمد ملک نے اس مسئلہ کے حل کی کوشش کی اور یہ نصاب ۱۹۸۸ء میں منظور ہو گیا۔ یہ خاص طور پر کتب کے استعمال پر مبنی کورس کے طور پر مرتب کیا گیا تھا جس کا مقصد لائبریری سائنس کو ایک نصاب کے طور پر متعارف کرانا تھا اور طلباء میں کتابوں اور کتب خانوں کے استعمال کا ذوق پیدا کرنا تھا (۲۱۰)۔ ڈاکٹر خورشید کے مطابق دوسری فیکلٹیز سائنس اور کامرس نے اس کورس کو قطعاً قبول نہیں کیا (۲۱۱)۔ غالباً سائنس اور کامرس کے طلباء کے لیے اس کورس میں کسی بھی قسم کی کشش نہیں تھی۔ پیشہ واریت (Professionalization) اور ملازمت دلانے والی تعلیم (Job Oriented Education) کے اس دور میں جب کے طلباء کلیہ فنون کے بے شمار مضامین سے دور ہوتے جا رہے ہیں اس قسم کا

میں بہتری کا باعث نہ (Grade) مضمون جو مارکس کے ساتھ ساتھ ڈویژن یا گریڈ اور بی ایس سی (.B.Com) ہو کیسے قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ بی اے، بی کام کے لیے بنائے جانے والے اس مضمون کو طلباء نے صرف اور صرف اپنی (.B.Sc) معلومات میں اضافہ کے لئے ہی پڑھنا تھا۔ چنانچہ یہ کورس بی کام اور بی ایس کے لیے بے سود ثابت ہوا۔ البتہ ای کورس نے بی اے کے لیے لائبریری اسٹڈیز سے لائبریری سائنس کے نام کے ساتھ ساتھ ایک اختیاری مضمون کی حیثیت اختیار کر لی اور اب یہ کورس جامعہ کراچی سے ملحق کئی کالجوں کے علاوہ پنجاب کے کئی کالجوں میں بھی پڑھایا جارہا ہے۔

۱۷ مئی ۱۹۷۹ء کو اسلام آباد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی قائم کردہ کمیٹی ۱۶ نے (Curriculum Revision Committee), UGC) برائے نظر ثانی نصاب نے (Board of Studies) نصاب تشکیل دیا۔ جامعہ کراچی کے بورڈ آف اسٹڈیز قومی نصاب کمیٹی کے نصاب کو اپنے اجلاس مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو منظور کرتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کو منظوری کے لئے بھیج دیا جسے ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کو بورڈ آف اسٹڈیز کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے اکیڈمک کونسل کو منظوری کے لیے بھیجا گیا نے اپنے اجلاس مورخہ (Academic Council) جامعہ کراچی کی اکیڈمک کونسل جنوری ۱۹۸۰ء کو اس کی منظوری دی (۲۱۲) ۔ ایک سال بعد نصاب پر عمل درآمد ۲۳ کے لیے اسے کراچی کے کالجوں میں بھیجا گیا۔ اس اقدام

کے فوری بعد کراچی کے سرسید گورنمنٹ گرلز کالج میں ۱۹۸۲ء میں یہ مضمون پڑھایا جانے لگا۔ اس وقت کراچی کے سات کالجوں میں یہ مضمون بی اے میں پڑھایا جارہا ہے (۲۱۳)۔

۲۰۰۱ء میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن (سابق یونیورسٹی گرانٹ کمیشن) نے لائبریری سائنس کے نصاب کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک قومی کمیٹی تشکیل (Curriculum Revision Committe, UGC) برائے نظرثانی نصاب دی۔ کمیٹی کا اجلاس ہائیر ایجوکیشن کمیشن (سابق یونیورسٹی گرانٹ کمیشن) کے ریجنل آفس واقع لیاقت میموریل لائبریری بلڈنگ میں ۲۶ تا ۲۸ فروری ۲۰۰۲ء منعقد ہوا۔ اس کمیٹی میں ۱۴ نمائندوں نے شرکت کی جن میں ۴ کالج کے نمائندے تھے کمیٹی برائے نظرثانی نصاب نے بی اے کے نصاب پر نظرثانی کی اور نصاب کو قومی تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔

آن لائن، (Electronic Sources) لائبریری میں کمپیوٹر کا استعمال، برقی ذرائع فلاپی ڈسک، (C.Ds) سی ڈیز، (Disc) ڈسک، (Online Sources) ذرائع کے علاوہ درجہ بندی اور کیٹلاگ سازی پر مشتمل ۲۰ نمبر کا (Floppy Disc) پریکٹیکل بھی نصاب میں شامل کیا گیا جو اس سے پہلے نہیں تھا (۲۱۴)۔ اس طرح

یہ نصاب جدید تقاضوں کے مطابق تشکیل پا گیا۔

حوالے و حواشی

206. Akhtar Hanif. Chairman, Department of Library and Information Science, University of Karachi letter Dated Dec. 7, 1978 to Sajjad Sajjiad.

207. Akhtar Hanif. Chairman, Department of Library and Information Science, University of Karachi. letter dated January 24, 1979. to Sajjad Sajjiad.

208. Hakim Muhammad Said No. SPIL/79/1272, dated 12th March 1979 to Vice Chancellor, University of Karachi.

۲۰۹۔ حکیم محمد سعید، خط حوالہ نمبر ھ ن ف ل ۸۰ ۱۱۷، کراچی : ۲ شعبان المعظم ۔ ۱۴۰۰ ہجری ۱۶ جون ۱۹۸۰ء بنام رئیس احمد صمدانی (خط کا عکس ضمیمہ ا)

210. Anis Khurshid. Library Education in Pakistan, ref. 92, p. 26

211. Ibid.

212. Course of Studies for B. A. (Pass) Examinations of 1986 to onword/

Karachi: Dean Faculty of Arts, University of Karachi. p: 79

۲۱۳۔ ہمامنان بٹ، بی اے میں لائبریری سائنس کی تعلیم کے مسائل (کراچی:
لائبریری پروموشن بیورو، ۲۰۰۲ء) ، ص ۶

214. University Grants Commission.(Higher Education Commission)
Curriculum of Library Science for B.A/BLIS/MLIS (Revised 2002)
(Islamabad:UGC, 2002) , .52p.

(: پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 13

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (1915-2015)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے

فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔

مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

گزشتہ سے پیوستہ

پاکستان میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم

فاصلاتی تعلیم (Distance Education) کا تصور کوئی نیا نہیں ترقی پذیر مما لک میں

اس طریقہ تعلیم کو بڑے پیانے پر اختیار کیا گیا ہے۔ اصطلاح' اوپن یونیورسٹی' (

(Open University) ہم معنی ہے فاصلاتی تعلیم (Distance Education)

کے' خط وکتابت کے ذریعہ تعلیم وغیرہ۔ فاصلاتی تعلیمی نظام اپنی بعض مخصوص خصو

صیات کے باعث حصول علم کی خواہش کی تکمیل کا باعث

ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ کے ان لوگوں کے لیے امید کی ایک کرن ہے جو کسی وجہ سے علم حاصل نہ کرسکے ہوں یا ملک کے دور دراز علاقوں میں رہائش پذیر ہوں جہاں پر رسمی تعلیم کی سہولتیں میسر نہ ہوں۔ یہ طریقہ تعلیم اعلیٰ تعلیم یعنی ایم فل اور پی ایچ ڈی کو بھی زیادہ سے زیادہ عام کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ ترقی پذیر ممالک اپنے ملک سے خواندگی کی شرح کو بھی کم کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد کے مطابق ' یہ ایک ایسا تعلیمی عمل ہے کہ جس میں تدریس وقت اور فاصلے کو مٹانے کی غرض سے ہوتی ہے ' (۲۱۵) اور یہ کہ فاصلاتی تعلیم میں شائع شدہ مواد سمعی وبصری معاونت کی اضافی راہنمائی کے ساتھ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹیلی فون ' ٹیوٹوریلز (Tutorials) بھی استعمال ہوتے ہیں۔ راہنمائی اور مشاورت کے طریقہ کو بھی مزید وسعت اور ترقی دی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی مطالعاتی مراکز بھی قائم کیے جاتے ہیں (۲۱۶)۔

ہیلری پیری ٹون کا کہنا ہے کہ ' کسی منصوبہ کے تحت اور باقاعدہ تعلیم کی فراہمی جہاں ایک طرف استاد اور دوسری طرف طالب علم کے درمیان فاصلہ ہو فاصلاتی تعلیم کہلاتی ہے (۲۱۷)۔ فاصلاتی نظام تعلیم کی حسب ذیل خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

نے فا صلا تی تعلیم کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ اس میں(R. M. Gagane) گیگن
استاد اپنے طالب علم سے جسما نی طور پر دور ہوتاہے یہی چیز فاصلا تی تعلیم میں تما م
تعریفوں میں بیان کی گئی ہے چناچہ استاد اور طالب علم کی دوری ہی فاصلا تی تعلیم کی تمام
اقسام میں بنیادبنتی ہے خواہ ان میں کسی کی بنیاد پرنٹ پر ہو ، سمعی،ریڈیو پر ہو ، ویڈیو یا
ٹیلی ویژن پر ہو ، کمپیوٹر پر مبنی ہو یا سیٹلا ئٹ پر منحصر ہو (۲۱۹)۔ مختصر یہ کہ فا صلا
تی تعلیم با قا عدہ تعلیم کی پا بندیوں سے آزاد ، رنگ ، قوم ، نسل ، مذہب ، فرقہ ، زبان ، ملک ،
علاقہ ، عمر اور وقت سے ما ورا ہوکر خواہشمندوں کی علمی ضروریات کی تکمیل کر تی ہے۔

فاصلاتی تعلیم کا تاریخی پس منظر

فاصلاتی تعلیم کی تاریخ ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال پرانی ہے۔ ہوم برگ کے مطابق اس کا آغاز ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء میں ہوا جب کیلب فلپ (جو کہ شارٹ ہینڈ کے نئے طریقوں کا استاد تھا) نے اشتہار دیا کہ جو یہ ہنر سیکھنا چاہتے ہوں ہفتہ وار ایسا کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے لوگوں نے موثر انداز میں یہ ہنر سیکھا۔ انیسویں صدی کے دوران بہت سے ملکوں کے تعلیمی اداروں نے مراسلاتی کورسز کا اجراء کیا ان ممالک میں سویڈن، جرمنی، برطانیہ اور امریکہ شامل ہیں۔ سوئڈن میں منظم تعلیم کا آغاز ۱۸۳۳ء میں ہوا ۱۸۷۵ء میں ہرموڈز نے مالموں میں ایک چھوٹا مراسلاتی اسکول کھولا، جرمنی میں منظم فاصلاتی تعلیم کا آغاز ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ برطانیہ میں منظم فاصلاتی تعلیم کی ابتداء پوسٹ کارڈز کے ذریعہ شروع ہوئی۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں روس میں اس تعلیم پر توجہ دی گئی اسی سال ریڈیو کو اسکولوں میں تعلیم کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے شروع میں آسٹریلیا، فرانس، نیوزی لینڈ اور روس میں فاصلاتی تعلیم کے لیے ادارے قائم ہوئے اور پروگرام ترتیب دیے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم تک یہ طریقہ تعلیم پوری دنیا میں پھیل گیا۔ امریکہ میں ۱۹۶۰ء میں مراسلاتی پروگرام شروع ہوا۔ افریقہ میں مراسلاتی تعلیم کا پہلا کالج ۱۹۲۶ء میں قائم ہوا۔ ٹیلر اور وائٹ کے مطابق ۱۹۹۰ء تک فاصلاتی تعلیم پوری دنیا میں عام ہو چکی تھی (۲۲۰)۔

فاصلاتی تعلیم پر مشتمل تعلیمی ادارے اور جامعات دنیاکے تقریباً تمام ہی ممالک میں
اپنے اپنے عوام کو تعلیمی سہولیات فراہم کر رہے ہیں۔پڑوسی ملک بھارت میں فاصلاتی
تعلیم کے چار ادارے (DR. B. R. Ambedkar Open University) قیام ۲۶
اگست ۱۹۸۲ء' نیو دہلی میں (Indira Ghandhi Open Univeristy) قیام ستمبر
۱۹۸۵ء' راجستھان میں (Dota Open University) قیام ۱۹۸۷ء' صوبہ بہار
میں (Nalauda Open University) قیام ۱۹۸۷ء اور (Maharasties
State Open University) قائم ہیں۔
تھائی لینڈ میں ' UK Open University , England برطانیہ میں
Sukhothai Thammathirat Open University ' سری لنکا میں Open
University of Sri Lanka ' جاپان میں Korean Air and
Correspondence University اور Japanese University of the Air
' Fern University ' جرمنی میں University Terbuka ' انڈونیشیاء میں
کنیڈا میں Athabasca University اسپین میں University National de
Education a distancia, Spain ' اسرائیل میں Everyman's
University' چین میں Central Radio and Television Univesity
اور University Nacional Abierta (UNA) Venezeula شامل ہیں۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کے تحت لائبریری سائنس کے مختلف کورسیز جن کا اہتمام جامعات کر رہی ہیں میں سرٹیفیکیٹ، پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ، بیچلر بی ایل آئی ایس اور ایم ایل آئی ایس شامل ہیں ان کی تفصیل ڈاکٹر (رمیش بابو ۲۲۱)

نے حسب ذیل بیان کی ہے۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کے ادارے

نمبر شمار	نام یونیورسٹی	☆سرٹیفکیٹ	☆ڈپلومہ	☆ بی ایل آئی ایس	☆ ایم ایل آئی ایس
۱۔	آندھراپردیش اوپن یونیورسٹی	-	-	-	☆
۲۔	اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی،نیودہلی	-	-	-	☆
۳۔	کاکاتیا(Kakatiya)یونیورسٹی،ورانگال	☆	-	☆	-
۴۔	کشمیر یونیورسٹی ،سرینگر	☆	-	-	-
۵۔	مادوراج کماراج یونیورسٹی	☆	-	☆	-
۶۔	موہن لال سوکھادیا یونیورسٹی،اودے پور	☆	-	-	-
۷۔	پنجاب یونیورسٹی ،پٹیالہ	-	☆	-	-
۸۔	سری وینکاتسوارا(Venkateswara)یونیورسٹی	☆	-	-	-
۹۔	یونیورسٹی آف مدراس	☆	-	☆	☆
۱۰۔	یونیورسٹی آف راجستھان ،جے پور	☆	-	-	-

ایم ایل آئی ایس پروگرام پیش کر تی ہے (۲۲۲)۔ (University of Annamalai) ان کے علاوہ یو نیورسٹی آف اناملائی کے تقریباً آدھے (ALA) اے ایل اے

گریجویٹ لائبریری تعلیم کے مروجہ پروگرام اس کے اپنے کیمپس سے باہر منعقد ہوتے ہیں (۲۲۳)۔برطانیہ میں یونیورسٹی آف ویلز (University of Wales) کا شعبہ انفارمیشن و لائبریری اسٹڈیز فاصلاتی تعلیم کے تحت ماسٹر پروگرام پیش کرتا ہے (۲۲۴)۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

پاکستان میں فاصلاتی تعلیم کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا قیام ۱۹۷۴ء میں یو نیورسٹی ایکٹ نمبر xxxix ۱۹۷۴ء جسے قومی اسمبلی نے ' پیپلز اوپن یونیورسٹی ' کے نام سے منظور کیا عمل میں آیا۔ ۱۹۷۷ء میں اس کا نام تبدیل کرکے 'علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' رکھ دیا گیا (۲۲۵)۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی فاصلاتی نظام تعلیم پر مبنی ملک کی واحد یونیورسٹی ہے کہ جس کی علمی سرحدیں' پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سر حدوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس سے قبل' دنیا میں صرف UK اوپن یونیورسٹی کی مثال موجود تھی۔ یونیورسٹی نے پچھلے تیس برسوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ کوئی بھی دوسری یونیورسٹی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اب اس کے طلبہ کی تعداد ساڑھے چار لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ اتنی بڑی تعداد کی انرولمنٹ یقیناً یونیورسٹی کے تعلیمی معیار پر اعتماد کی علامت ہے۔ یونیورسٹی کے میٹرک سے لے کر پی ایچ ڈی کی سطح تک تعلیمی پروگراموں کی تعداد

اور کورسز کی تعداد ۱۰۶۹ ہے اور آئے دن ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یو ۱۰۵ نیورسٹی کے مرکزی کیمپس کے علاوہ ۸۶ علاقائی کیمپس' علاقائی دفاتر اور کو آرڈینیٹنگ آفیسرز فروغ علم اور اشاعت تعلیم کی تحریک میں سرگرم ہیں۔ ۱۸۰۰ سے زائد مطالعاتی مرکز اس کے علاوہ ہیں۔ یونیورسٹی کا اتنا بڑا نیٹ ورک اس بات کی غما زی ہے کہ غیر رسمی طرز تعلیم نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ اپنے طلبہ کی تعداد' کورسز اور پروگراموں کے تنوع اور آئی ٹی کی سہولیات کے پیش نظر اس یونیورسٹی کا شمار دنیا کی میگا یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ پچھلے سال اس یونیورسٹی کو دنیا کی سترہ میگا یو نیورسٹیوں کے کلب میں شامل کیا گیا جو یقینا ایک بڑا اعزاز ہے (۲۲۶) اپنے فلسفہ' نظام' تعلق وظائف اور منجملہ ساخت کے اعتبار سے پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔ یونیورسٹی کا مرکزی کیمپس اسلام آباد میں ہے اور ریجنل کیمپسز کا ایک وسیع نیٹ ورک پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ ادارہ دو سو سے زیادہ موضوعات میں ابتداء سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیمی سہولتیں فراہم کر رہا ہے (۲۲۷)۔

حوالے و حواشی

۲۱۵۔ محمد ارشد، فاصلاتی تعلیم : نظریہ' نظام اور طریقہ ہائے کار (اسلام آباد : نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء) ، ص۔ ۱۵

۲۱۶۔ محمد ارشد، فاصلاتی تعلیم میں طلبہ کی امدادی خدمات (اسلام آباد: نیشنل بک فا
ؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء) ، ص۔ ا

217. Ibid. p17.

218. Rao, Chandra Sekhra and G. Sujatha. Open University Library and its Relationship with the teaching/learning programmes: a case study of Ambedkar Open University Library System. quoted in Librarianship in Developing Countries/by N. Guruswamay Naidu.- (New Delhi: Ess Ess Publications, 1992) , p.247

219. Gagane, R. M. The Condition of Learning. (New York: Rinehart and Winston, 1977) p. 8, M. Rashid. 446, p. 19.

۲۲۰۔ محمد ارشد، فاصلاتی تعلیم : نظریہ نظام اور طریقہ ہائے کار۔ حوالہ ۲۱۵، ص ص
۴۰۔۴۱

221. Babu, B. Ramesh. Distance Education in Library and Information Science. quoted in N. Guruswamy Naidu.- Librarianship in Developing Countires.

(New Delhi: Ess Ess Publications, 1992) , p.243

222. Varalakshmi, R. S. R. Distance Education in Library and Information Science. quoted in New vistas in Library and Information Science/ ed. by A. A. C.Raju.- (Delhi: Vikas , 1995) , pp. 370-381.

223. Lenox, Mary F. Distance Education: report of a Survey of Campus (Extension courses in Graduate Library Education Programme Accredited by ALA Journal of Educatioin for Library & Information Science. 31 (1990): 68.

224. Haider, S. J. Educating Future Libraries in Pakistan. ref. 47, p. 40.

225. Niaz Hussain. ''Open University Library: its role and services''. News Bulletin. Pakistan Library Association, Federal Branch. .30-31, (June-Dec.1993):1

۲۲۶۔ الطاف حسین، سید، وائس چانسلر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، '' خطبہ استقبالیہ جامعہ نامہ (مئی ۲۰۰۴ء) : ۴ ''

227. Muhammad Arif. 'MLIS through Distance Education: AIOU experience'. Pakstan Library & Information Science Journal. 35 no.1 (March 2004) : 23

پنچھی اڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے۔ بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق
اردو کے حوالے سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گیں
اگست ۲۰۱۶ء کو ان کی ۵۵ ویں برسی منائی جارہی ہے ۱۶
اردو کی قد آور شخصیت بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو ہم سے جدا ہوئے 55 برس بیت چکے ہیں ان کا انتقال 16 اگست 1961 کو کراچی میں ہوا اور اپنے ہی قائم کردہ انجمن ترقی اردو اور اردو کالج (جو اب جامعہ بن چکا ہے) ، بابائے اردو روڈ میں ابدی نیند سو رہے ہیں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یاد اور ان کے روشن کیے ہوئے علم و ادب چراغ آج بھی روشن ہیں اور نئی نسل کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ باغِ اردو کے نام سے انجمن ترقی اردو کی شاندار عمارت گلستان جوہر میں تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی، نے بابائے اردو کی خدمات کے حوالے سے درست نقشہ کھینچا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”اگر بابائے اردو مولوی عبدالحق نہ ہوتے اور اردو سے انھیں یہ والہانہ وابستگی اور مجنونانہ لگاؤ نہ ہوتا تو کیا واقعی موجودہ دور میں اردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوتا جو آج بہت سی زبانوں کے لیے باعث رشک ہے انھوں نے اردو کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا اس کو اپنے

پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا زندگی کی راہوں پر دوڑایا اس کے بازوؤں میں حریفوں سے مقابلہ کی سکت پیدا کی اردو کی تاریخ ، مخالفت کی تاریخ کشمکش کی تاریخ ہے ہنگاموں کی تاریخ ہے بابائے اردو کی ذات نہ ہوتی تو اردو کے لیے ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ ہوتا ممکن تھا کہ وہ ان معرکوں میں کام آجاتی اور آج کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا۔

بابائے اردو کے طفیل ہی وہ زندہ اور سرخ رو ہے دنیا میں شاید ہی کوئی مثال،زبان سے اس قدر بے پناہ محبت کی کہیں اور ملتی ہو وہ سپردگی اور انہماک اور استغراق اور وہ دھن جو جنون کی سرحد سے ٹکراتی ہے دینا کے عظیم ترین دماغوں ہی کا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ بابائے اردو کی اردو سے یہ لگن تحریک پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی بنی"۔

حقیقت یہ ہے کہ آج اردو کو جو بھی مقام و مرتبہ حاصل ہو سکا ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی انتھک کوششوں کا ہی ثمر ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ وہ قیام پاکستان کے چودہ سال بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے لیکن جس عمارت کی بنیاد سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے ساتھ رکھی جاتی ہے وہ عمارت اتنی ہی دیر پا اور مضبوط و مستحکم بھی ہوتی ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو کے جن حریفوں کا ذکر کیا ہے اگر بابائے اردو نے اس کی بنیادوں میں اردو سے محبت اور عقیدت کا جذبہ نہ بھر دیا ہوتا تو وہ حریف کب کے اسے مٹی تلے دفن کر چکے ہوتے۔ بابائے اردو نے اردو کی نہ ختم ہونے والی زندگی کا جو پتھر

قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں رکھ دیا تھا وہ اس قدر بھاری بھر کم اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند تھا کہ اسے گرانے ، پاش پاش کرنے کی تمام تر تدبیریں ناکام ہوئیں اور آج اردو بابائے اردو کے طفیل ہی زندہ اور سرخ رو ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق ۱۸۹۴ء میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کر رہے تھے تو وہاں انہیں جن اکابرین کی قربت اور صحبت میسر آئی ان کے اثرات نے مولوی عبد الحق کو اردو کا متوالا دیوانہ اور عاشق زار بنا دیا ان عظیم اہل علم و دانش میں علامہ شبلی نعمانی، سر سید احمد ، خان، سیدراس مسعود، محسن الملک، سید محمود، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلنڈ اور بابو مکھرجی شامل تھے۔ بابائے اردو کو سب سے زیادہ محبت وعقیدت سر سید احمد خان سے تھی وہ ان کی علمی، سیاسی اور معاشرتی بصیرت کے قائل اور گھائل ہو گئے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب بابائے اردو نے یہ فیصلہ کیا کہ انہوں نے اردو زبان کی ترقی کے لیے وہ کچھ کرنا ہے جو اردو کو تاحیات زندہ سلامت رکھے۔ اردو سے عشق اسی دوران شروع ہو چکا تھااور اردو بابائے اردو کی محبوبہ بن چکی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال دی گئی تھی بابائے اردو ۱۹۱۲ء میں انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے اس سے قبل ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۱ء علامہ شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی اور مولوی عزیز مرزا اس کے سیکریٹری رہے۔ پروفیسر آرنلڈ انجمن کے اولین صدر تھے۔ بابائے اردو نے ایک کام یہ کیا کہ وہ انجمن کو علی گڑھ سے حیدر آباد دکن لے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں

انجمن اورنگ آباد سے دہلی منتقل کردی گئی۔ مولوی عبدالحق اردو کے تحفظ اور بقا کی جنگ لڑتے رہے۔ ہندوستان کے ہندو قومی
زبان ہندی رکھنے کے لیے سرگرم تھے، گاندھی جی بھی ان کے ہمنوا اور اس کے حق میں تھے۔

۱۸۹۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد برطانوی دور حکومت میں بابائے اردو نے انڈین سول سروس اختیار کی اور چیف ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے دہلی میں حکومت کے محکمہ داخلہ میں کام کا آغاز کیا۔ مولانا اورنگ آباد میں صوبائی انسپیکٹر آف اسکول بھی رہے۔ اس دوران سرسید احمد خاں کی بنائی ہوئی آل انڈین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جس کا نام بعد میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' ہوا۔ اس کا مقصد مسلم معاشرہ میں تعلیم اور دانشوری کا فروغ تھا۔ عبدالحق اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بابائے اردو حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ وہ ابتداء میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل کے فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ بعد میں وہ شعبہ فیکلٹی آف اردو کے چیرمین مقرر ہوئے۔ اس سے قبل وہ ۱۹۳۰ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بابائے اردو نے 'انگلش اردو' ڈکشنری مرتب کی۔

قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مولوی عبد الحق نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا وہ خالی ہاتھ پاکستان آئے ۔ انجمن کا تمام تر ریکارڈ، مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ جو دہلی منتقل ہوا تھا ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ ساز و سامان کے اعتبار سے تو خالی ہاتھ تھے لیکن ان کے باطن میں ان کی محبوبہ 'اردو' اور 'انجمن ترقی اردو' چھپی ہوئی تھی جو ان کے ہمراہ پاکستان آئی۔ یہاں آکر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انجمن کی تشکیل نو کی اور پھر اس کے زیر سائے کاموں کا آغاز کیا۔ کراچی میں انجمن کا دفتر قائم ہوا مولوی صاحب انجمن کے بدستور سیکریٹری رہے۔ شیخ عبد القادر اس کے صدر،

مقرر ہوئے۔ انجمن کے دفتر کے لیے مولوی صاحب کراچی کی قدیم بستی لیاری میں قطعہ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ ابتدائی طور پر انجمن کا دفتر اسی جگہ قائم ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں مولوی عبد الحق نے انجمن کی اس عمارت میں 'اردو کالج' قائم کیا۔ اب مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے تحت ملک میں اردو کے فروغ و ترقی کی جدوجہد کو اپنا نصب العین بنایا دوسری جانب کراچی کے غریب عوام کی بستی لیاری میں اردو کالج قائم کرکے یہ ثابت کیا کہ وہ غریبوں اور نچلے درجہ کے طبقے میں احساس محرومی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کے غریب اور متوسط طبقے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اردو کالج کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس نے کراچی کے غریب عوام کو تعلیم کے حصول میں ہر ممکن رہنمائی اور سرپرستی کی۔ اردو کالج سے فارغ التحصیل طلباء نے

بعد میں دیگر اداروں کے تحت بابائے اردو کے مشن کو آگے بڑھایا۔

بابائے اردو جب تک حیات رہے انجمن کے ساتھ ساتھ ملک میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سرگرداں رہے۔ انجمن کے تحت قائم ہونے والے تعلیمی ادارے 'اردو کالج' میں مختلف علوم کی تعلیم اور کالج کی عمارت میں توسیع کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیفات اور ترجمے کا کام بھی جاری و ساری رہا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق جب پاکستان آئے ان کی عمر ۷۷ برس تھی۔ پاکستان میں ان کی سرگرمیوں کا دورانیہ ۱۴ سال ہے اس دوران ان کی عمر عزیز ۷۷ برس سے ۹۱ برس رہی۔ انہوں نے ۹۱ برس کی عمر میں ۱۹۶۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ عمر تو آرام اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ہوتی ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی ہمت کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے ضعیف العمری میں کس قدر تھکا دینے والے کام کیے یہ سب اردو زبان کے لیے جذبہ ہی تو تھا جس نے ان سے یہ عظیم کام کروائے انجمن ترقی اردو پاکستان اور اس کے تحت بے شمار کتب کی تصنیف، تالیف و ترجمہ اور اشاعت، ماہنامہ قومی زبان کی مسلسل اشاعت، اردو کالج جو اب وفاقی اردو یونیورسٹی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

بابائے اردو کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ انجمن کا دفتر گلشن اقبال بلاک ۷ میں قائم ہو چکا ہے جہاں بابائے اردو کے قائم کردہ کتب خانے بھی ہیں۔ وفاقی اردو یونیورسٹی اس وقت تین کیمپسیز پر مشتمل ہے۔ لیاری میں عبدالحق کیمپس، گلشن

اقبال ، یونیورسٹی روڈ پر گلشن کیمپس اور اسلام آباد میں بھی اسلام آباد کیمپس کام کر رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں اس وقت کی حکومت نے ملک کے تمام تر تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا چنانچہ اردو کالج کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء میں ایک صدارتی حکم کے تحت اردو کالج کو جامعہ کا درجہ دے دیا تھا۔ گلشن کیمپیس میں قائم کتب خانے کا نام ''بابائے اردو مولوی عبد الحق یادگاری کتب خانہ'' ہے۔ یہ قومی ادارے قومی ملکیت میں ضرور ہیں لیکن بابائے اردو کی یادگار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق محقق، نقاد، خاکہ نگار اور خطبہ ،مقدمہ یا دیباچہ نگار کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ ''چند ہم عصر'' بابائے اردو کے خاکوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے اپنے ہمعصروں کے خاکے دلچسپ اور منفرد انداز میں لکھے ہیں۔ خاکہ نگاری میں ان کی یہ کتاب بے حد مقبول ہے۔ بابائے اردو کی نثر نگاری میں سادگی کا عنصر نمایاںہے۔ عام فہم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہاں بھی مولوی صاحب سر سید کی نثر نگاری سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سرسید کی نثر کے حسن کو اپنے خیالات و نظریات میں جذب کرکے نئی نسل کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خطبات اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات کو اردو کے لیے بانگ درا کہا گیا ہے۔ دکنی مخطوطات کو تلاش کرکے ان پر تحقیق کرنا اور ان کتب پر 'مقدمہ' حاشیے اور صحتِ متن کے اعلیٰ نمونے

پیش کیے۔ معراج العاشقین، سب رس، قطب مشتری، گلشن عشق اور علی نامہ بابائے اردو کی تخلیقات میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کی کتاب 'اردو کی نشو نما میں علمائے اکرم کا حصہ' معرکتہ الآرا کتاب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق کا وطن ہندوستان کا شہر ہاپوڑ تھا جہاں وہ ۱۶ نومبر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے ۷۷ برس متحدہ ہندوستان میں گزارے جب کہ بڑھاپے کی زندگی کے ۱۴ برس پاکستان میں بسر کیے اور وہ کارنامے انجام دئے جو رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے کراچی میں ۹۱ برس کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو وفات پائی، اپنے ہی قائم کیے ہوئے انجمن ترقی اردو کے مرکز اور اردو کالج (اب وفاقی اردو یونیورسٹی عبد الحق کیمپس) جو لیاری میں بابائے اردو روڈ پر واقع ہے کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بابائے اردو نے اپنے ایک خاکے کا اختتام اس مصرعے پر کیا ہے، میں نے بھی ان کے لیے اسی مصرعے کا انتخاب کیا پنچھی اڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے۔

دو ماہ بعد آپ کی خدمت میں

اپنی تحریرات پڑھنے والوں سے آج میں دو ماہ بعد مخاطب ہو رہا ہوں۔ شکر الحمد اللہ میرے قلم نے دوبارہ چلنا شروع کیا۔ دو ماہ بغیر لکھے کیسے گزرے۔ اس کیفیت کو میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ بسا اوقات کوئی معقول وجہ سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی کام کو کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے میں بھی دوچار رہا۔ اگست 16 کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی 55 ویں برسی کے موقع پر میرا مضمون ''پنچھی اڑ گیا پر ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے'' آن لائن ہوا تھا اس کے بعد میرے قلم کو ایسی چپ لگی کہ پورے دو ماہ اس نے باوجود کوشش کے چل کر نہیں دیا۔ البتہ اس دوران کوئی سو کے قریب مضامین مجھے پڑھنا پڑے جو پاکستان کے حوالے سے مقابلے کے لیے لکھے گئے تھے۔ یہ مقابلہ ہماری ویب رائیٹرز کلب کے زیر اہتمام منعقد کرایا گیا تھا موضوع تھا میرا پاکستان کیسا ہو' ایک ہی موضوع پر سو مختلف لکھاریوں کی تحریرات پڑھنا اور ان کے معیار کا تعین کرنا کٹھن اور مشکل کام تھا۔ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی اب اس مقابلے کے نتائج کا اعلان بھی کیا جاچکا ہے۔ تمام ہی لکھاریوں نے پاکستان سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار انتہائی خوبصورتی کے ساتھ اس طرح کیا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو پاکستان سے محبت و عقیدت کا اظہار کرنے والے ہر لکھاری کو انعام کا مستحق قرار دے دیتا

لیکن مقابلہ تو پھر مقابلہ ہوتا ہے، کسی کو تو فوقیت دینا ہی پڑتی ہے۔ سو ایسا ہی ہوا۔ اس مشقت میں کوئی ایک ماہ لگ گیا۔ وقت مقرر تھا 6 ستمبر کو اعلان بھی کیا جانا تھا۔ اللہ کے فضل سے یہ کام وقت مقررہ پر ہوگیا۔ کسی کی حق تلفی ہوئی ہو تو اس کے لیے اللہ مجھے معاف فرمائے۔ کوئی انفرادی طور پر یہ محسوس کرتا ہو کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تو اس سے بھی معافی کی درخواست۔ ہر لکھنے والا جس نے اپنے قلم کے ذریعہ پاکستان سے اپنی دلی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا قابل مبارک باد اور ستائش کے قابل ہے۔ جی تو کرتا ہے کہ ہر لکھاری کا نام لے کر اسے خراج تحسین پیش کروں لیکن مجبوریا ں ہیں ، انشاء اللہ ان تمام مضامین کی ایک ' ای بک ' تشکیل دینے کی کوشش کی جائے گی۔ابتدائی کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ای بک کا عنوان ''میرا پاکستان کیسا ہو؟ ہماری ویب رائیٹرز کلب کے لکھاریوں کی نظر میں''۔اگر کسی لکھاری نے مضمون لکھا ہو ، کسی وجہ سے مقابلہ میں شرکت نہ کی جا سکی ہو تو وہ اپنا مضمون اب بھی بھیج سکتے ہیں اس مضمون کو ای بک میں شامل کر لیا جائے گا۔

اب آتا ہوں قلم کی خاموشی کی جانب ۔اس کی وجہ ڈھیروں مضامین کا پڑھنا تھا، اس مشقت سے تھکن کا غلبہ طاری رہا، اس دوران بے شمار موضوعات اور طرح طرح کے مسائل و معاملات سامنے آئے ، ایک کالم سندھ کے بڑے سائیں سید قائم علی شاہ کی رخصتی پر لکھا تھا عنوان تھا ''الوداع بڑے سائیں۔ تبدیلی ضروری تھی

خیال تھا کہ ایک کالم میں نئے سائیں قبلہ سید مراد علی شاہ کو خوش آمدید کہوں گا، یہ اس اعتبار سے بھی منفرد اور ممتاز ہیں کہ ان کے والد بزرگوار قبلہ سید عبد اللہ شاہ مرحوم بھی سندھ کے بڑے سائیں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں۔ کراچی کی قدیم بستی لیاری سید عبداللہ شاہ کی پسندیدہ جگہ تھی ان کے رات دن اسی علاقے میں بسر ہوا کرتے تھے اور ہمیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ ہم لیاری کے ہی مکین تھے اور لیاری میں واقع عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کالج میں میری علمی خدمات 23 سالوں پر محیط ہیں۔ یہ دور حکمرانی تھا بے نظیر بھٹو شہید کا۔ ہم نے سید عبد اللہ شاہ کو دیکھا، سنا اور سندھ پر حکمرانی کے جوہر بھی دیکھے اور اب ان کے بیٹے کی حکمرانی کو بھی دیکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ قبلہ مراد علی شاہ کو خوش آمدید کہنے کی خواہش پوری نہ ہوئی اب بات پرانی ہو چکی ہے ، ہماری نیک تمنائیں ، خواہشات اور کامیابی کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ علامہ آصف علی زرداری نے انہیں لائن میں پیچھے سے سندھ کے بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ان کی قسمت ہے۔ جوان ہیں، جوشیلے ہیں، جیالے ہیں، پارٹی سے محبت کا جذبہ موجود ہے، وفادار ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، مثبت سوچ رکھتے ہیں ، سندھ اور سندھ کے عوام بشمول شہری علاقوں کے عوام کے لیے بہتر کرنے کی سوچ اور خواہش رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں ان کے نیک مقصد میں کامیاب کرے ، جو لائن میں ان سے بہت آگے تھے وہ وہیں کھڑے رہ گئے اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے ، مستقبل

قریب میں انہیں بھی اسی اعزاز سے نوازے۔

پاناما لیکس' نے میاں صاحب کے مخالفین کو متحرک کیا ہوا ہے عمران خان پاناما لیک' سے کچھ زیادہ ہی مقاصد حاصل کرنے کی امید سے ہیں۔ البتہ قبلہ زرداری صاحب میاں صاحب کی کرسی کا ایک ڈنڈا پکڑ کر انہیں پریشانی میں تو مبتلا کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کا دھڑن تختہ نہیں چاہتے۔ یعنی جمہوریت کو ڈے ریل کرنے کے حق میں نہیں۔ اس وقت عمران خان تنہائی کا شکار نظر آرہے ہیں، لیکن سیاست لمحوں میں نئے رخ اختیار کرلیتی ہے، ابھی 30 اکتوبر میں پندرہ دن باقی ہیں، نہیں معلوم کون کون اپنے فیصلوں پر نظرثانی کرتا ہے، ڈاکٹر طاہر القادری صاحب ملک سے باہر ہیں، انہیں رام کرنے کی کوششیں نظر آرہی ہیں، کچھ اور بھی اسمبلی سے مستعفی ہونے کی باتیں کررہے ہیں۔ کپتان پاناما کے حوالے سے میاں صاحب کو مستعفی ہونے پر مجبور کررہے ہیں۔ لیکن انہیں ہر جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے ہمسائے دشمن کی جانب سے سرحدوں پر جو صورت حال ہے، جس قسم کے پاکستان مخالف بیانات مودی اور اس کے ہمنوا دے رہے ہیں اس صورت حال میں کپتان کی جانب سے میاں صاحب کا رخصت ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ دیکھیں اس بار کپتان کامیاب ہوتے ہیں یا پھر سابقہ دھرنوں کی طرح اپنے حامیوں کو شرمندہ اور افسردہ کرکے ہیٹرک کی جانب رواں دواں ہوجاتے ہیں۔

انہی دو ماہ کے دوران سندھ شہری علاقوں کی سیاسی جماعت کے سربراہ نے عجیب و غریب، مضحکہ خیز صورت حال پیش کردی جس سے ان کے اپنے مشکل میں آ گئے۔ جس قوم کے باپ دادا نے اپنا سب کچھ قربان کر کے پاکستان کے قیام میں اہم کردار ادا کیا ہو، وہ خود یا ان کی اولاد پاکستان کے بارے میں وہ الفاظ جو اس سیاسی جماعت کے قائد نے کہے کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔ جو الفاظ کہے گئے انہیں زبان پر لاتے ہوئے، قلم کے توسط سے قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے نہ دل، نہ دماغ اور نہ ظمیر اس بات کی اجازت دے رہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ فلاں فلاں نے پاکستان کے خلاف بات کی ان کے خلاف کچھ نہ ہوا، بہت خوب قائدِ محترم کوئی غلط کام کرے تو ہم بھی کریں، کوئی گالی دے تو ہم بھی دیں، اس منطق اور دلیل میں کوئی وزن نہیں۔ پاکستان تا ابد 'زندہ باد' رہے گا۔ اس کو بری آنکھ سے دیکھنے والے، اس کے لیے غلط الفاظ ادا کرنے والے دنیا میں ہی رسوا ہوں گے، ناکام ہوں گے، نامراد رہیں گے۔ پاکستان کی 59 تاریخ پر نظر ڈالیں تو بہت سے چہرے ایسے نظر آتے ہیں کہ جنہوں نے پاکستان کے لیے اسی قسم کے بیہودہ الفاظ استعمال کیے۔ انہیں اس دنیا سے گئے سالوں ہو چکے قوم انہیں کس نام سے یاد کرتی ہے؟ ان کا ذکر کن الفاظ سے ہوتا ہے۔ سب کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے پر اپنی دھرتی ماں کے لیے گالی ہرگز باداشت نہیں کی جا سکتی۔ برائی پھر برائی ہے، اس کی پیروی، اس کی نقالی باشعور لوگوں کو، اہل علم

کو، تہذیب یافتہ قوم کو کسی صورت زیب نہیں دیتی۔

ایم کیو ایم کے بطن سے حقیقی تو پہلے ہی جنم لے چکی تھی، اس سال پاک سرزمین پارٹی جس کے بنانے والے کہتے ہیں کہ ان کی سیاسی جماعت پاکستان کی سطح کی جماعت ہے لیکن گروپ کے قائدین کی گفتگو کا محور و منبع ایم کیو ایم کے قائد ہی رہے ہیں۔ یہ اگر ایک الگ سیاسی جماعت بھی ہے تو اس نے ایم کیو ایم کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے۔ ایم کیو ایم ابھی حقیقی اور کمال و انیس کے تیر نشتر کی زد میں تھی کہ اس کے اپنے قائد نے از خود 'مائنس ون' کا فارمولا پیش کر دیا اور اپنے ہی عمل سے اپنے آپ کو مائنس ون کر لیا۔ اب یہ جماعت دو واضح دھڑوں ایم کیو ایم پاکستان جس کی قیادت ڈاکٹر فاروق ستار نے سنبھالی اور دوسری ندیم نصرت کی سرپرستی اور قائد تحریک کی رہنمائی میں ایم کیو ایم (لندن) کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکی ہے۔ آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے، یہ وقت ہی بتائے گا کون حق پر ہے کون غلط ہے۔ وقت ہی اسے ثابت کرے گا۔ لیکن یہ عمل اس جماعت کے لیے، جماعت کے رہنماؤں کے لیے، اس جماعت کے کارکنوں کے لیے، اس جماعت کو جو ایک مخصوص قوم اپنا مسیحا سمجھتی رہی تھی اس کے لیے ہر گز ہر گز اچھا نہیں ہوا اور نہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو پاکستان میں سیاسی جماعتوں میں ٹوٹ پھوٹ کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں، جس کسی کو کچھ شہرت حاصل ہوئی اس نے الگ جماعت بنا لی، پاکستان میں کون سی سیاسی جماعت ایسی ہے جس کے حصے

بکرے نہیں ہوئے۔بڑی بڑی منظم جماعتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں۔ مسلم لیگ کے کتنے دھڑے ہوئے اور آج بھی ہیں، جماعتِ اسلامی جو بہت ہی منظم جماعت ہے اس میں اختلافات ہوئے اور بڑی بڑی شخصیات نے اپنی اپنی الگ تنظیمیں بنائیں، پاکستان پیپلز پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی، اس کے کئی دھڑے ہوئے، عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) دو دھڑوں میں تقسیم ہے ایک کا سربراہ بیٹا تو دوسرے دھڑے کی سربراہ ماں ہے۔جو اے این پی (ولی) کے نام سے میدان سیاست میں ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت علمائے اسلام کئی کئی دھڑوں میں منقسم ہیں۔یہی نہیں تحریک انصاف میں بھی دھڑوں کے قیام کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں۔ سیاست کی کل ٹیرھی ہوتی ہے، کل کے دوست آج کے دشمن اور آج کے دشمن کل کے دوست بن جاتے ہیں ، یہ سیاست داں قابل اعتبار اور قابل بھروسہ نہیں ہوا کرتے ، ان کا کوئی پتہ نہیں کہ یہ کسی وقت کیا چیز پیش کر دیں اور اپنے چاہنے والوں کو مشکل میں ڈال دیں۔

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 14 :)

(پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915

یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے)
فروغ اور کتب خانوں

کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
(مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی

گزشتہ سے پیوستہ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحت لائبریری تعلیم کا آغاز جولائی۱۹۷۸ء میں ہو
ا۔پرائمری اسکول اساتذہ کے لیے (Primary Teachers' Orientation
Course) کورس شروع ہوا۔اس کورس میں ایک یونٹ (School Library
Management) شامل کیا گیا۔یہی کورس بعد میں یونیورسٹی میں لائبریری سا
ئنس کے شعبہ کے قیام کا باعث بنا۔(۲۲۸) شعبہ کے قیام میں علامہ اقبال اوپن
یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین محمود الحسن مرحوم کی بے پناہ جدوجہد شامل تھی۔شعبہ
کا باقاعدہ قیام فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے تحت ۱۹۸۵ء میں عمل میں آیا۔پاکستان
لائبریری بلیٹن کے اداریے میں اسے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی جانب سے

ملک کے کتب خانوں کی افرادی قوت کو پورا کرنے کی ایک اچھی اور بر وقت کوشش قرار دیا گیا (۲۲۹)۔ ۱۹۸۸ء میں ''سرٹیفیکیٹ ان لائبریرین شپ'' کے پروگرام کا اجراء کیا گیا جسے ڈگری کی سطح تک بڑھا دیا گیا۔

بی اے لائبریری سائنس کی سطح پر لازمی مضامین کے علاوہ چار مضامین لائبریری سائنس سے متعلق نصاب میں شامل کئے گئے۔ اولا الذکر دو کی کامیاب تکمیل پر سرٹیفیکیٹ ان لائبریرین شپ کا اجراء کیا جاتا ہے۔

بی اے لائبریری سائنس کی ڈگری کا اجراء صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی طالب علم نے لائبریری سائنس کے چار مضامین کے ساتھ باقی کے لازمی مضامین کی کامیابی کی تکمیل بھی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے کی ہو لیکن ہر ایف اے ایف ایس سی طالب علم وسائل کتب خانہ تنظیم و ترتیب اور خدمات کتب خانہ کے کورس پاس کر کے سرٹیفیکیٹ ان لائبریرین شپ حاصل کر سکتا ہے۔ بی اے کے چار مضامین میں آٹھ کتب بطور نصاب پڑھائی جا رہی ہیں (۲۳۰)۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے بی اے لائبریری سائنس یعنی بیچلر کورس (B.A) کو (BLIS) کا نام بھی دیا جس کے باعث ابہام پیدا ہوا کیوں کہ بی ایل آئی ایس ایک پوسٹ گریجویٹ کورس ہے جو ملک کی دیگر جامعات کے تحت منعقد کیا جاتا ہے جب کہ اوپن یونیورسٹی کا کورس انڈر گریجویٹ سطح کا

کورس ہے اور اس کے لیے بنیادی تعلیمی اہلیت ایف اے ایف ایس سی ہوتی ہے۔
۲۰۰۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس کے تحت دو سال کے ایم ایل آئی ایس (MLIS) پروگرام کی ابتداء ہوئی۔اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے فارغ التحصیل بہت سے بی ایل آئی ایس اور دیگر گریجویٹ ملک کے مختلف کتب خانوں میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر جامعات کے گریجویٹس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ملازمت کر تے ہوئے ایم ایل آئی ایس کر سکیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے گھر اور دفتر کو چھوڑے بغیر اس مضمون میں ماسٹر کرلیں۔ لہٰذا اس طبقہ کا بہت زیادہ زور تھا کہ فاصلاتی تعلیم کی بنیا د پر ایم ایل آئی ایس پروگرام شروع کیا جائے۔ چنانچہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ایم ایل آئی ایس پروگرام ۲۰۰۱ء سے شروع کیا (۲۳۱) ۔
مستقبل قریب میں شعبہ کی جانب سے لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرام شروع کرنے کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے (۲۳۲)۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ملک میں لائبریری و انفارمیشن سائنس میں ماسٹر پروگرام شروع کر نے والی ساتویں یونیورسٹی ہے اس سے قبل کراچی یو

نیورسٹی (۱۹۶۲ء) ' سندھ یونیورسٹی (۱۹۷۶ء) ' پنجاب یونیورسٹی (۱۹۷۴ء) ' پشاور یونیورسٹی (۱۹۸۲ء) ' بلوچستان یونیورسٹی (۱۹۸۳ء) ' اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور (۱۹۸۳ء) میں رسمی نظام تعلیم کے تحت ماسٹر پروگرام جاری تھا۔ اس پیشہ سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت نے ملک میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحت فاصلاتی طریقہ تعلیم میں لائبریری سائنس کی تعلیم کو ایک اچھا اور بر وقت اقدام قرار دیا اور اس کی تعریف کی لیکن بعض لوگوں نے ان کورسیز کے خلاف بھی دلائل دیے ان کا خیا ل ہے کہ فاصلاتی نظام کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم مناسب نہیں۔ اختر حنیف نے کہا کہ یہ کورس بے مقصد نہیں اور عجلت میں تشکیل دیا گیا ہے اور یہ کورس دیگر جا معات سے متصادم ہے جہاں یہ کورسیز پہلے ہی سے جاری ہیں (۲۳۳)۔ محبوب کا کہنا ہے کہ یہ پروگرام ماہرین لائبریری سائنس فراہم کرنے کے لیے معیاری ضروریات کو پورا نہیں کرتا (۲۳۴)۔ غیور حسین نے کورس کے بارے میں کہا کہ ' کورس کی تدوین میں معیار کو ہر گز مد نظر نہیں رکھا گیا کہنے کو تو کورس نیم پیشہ ور عملہ کی تربیت کے لیے ہے لیکن موضوعات اور وسعت کے اعتبار سے ایم ایل ایس اور ڈپلومہ کے طلباء کے لیے تیار کیا گیا محسوس ہوتا ہے (۲۳۵) ۔ڈاکٹر سجاد الرحمٰن کا خیال ہے کہ یہ پروگرام ملک میں لائبریری تعلیم کی کامیابیوں پر تباہ کن اثرات مرتب کریگا(۲۳۶) ۔ڈاکٹر انیس خورشید نے ڈاکٹر سجاد الرحمٰن کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ

'It

has been ill-advised attempt which has no precedence
کورس کے بارے میں anywhere in the professional world'.(237)
منفی خیالات یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن کسی بھی چیز کے لیے یہ جواز کہ کیوں کہ دنیا میں یہ کسی اور ملک میں نہیں اس وجہ سے ہم بھی اس پر عمل نہ کریں غیر منطقی نظر آتا ہے۔ نصاب میں کسی بھی قسم کی خامی یا کمی کو وقت کے ساتھ ساتھ باآسانی دور کیا جا سکتا ہے۔ انٹر اور بی اے میں لائبریری سائنس کے اجراء اور اس کے بارے میں لوگوں کے تحفظات بھی ہمارے سامنے ہیں۔ یہ کورسیز اب کامیابی سے چل رہے ہیں۔ نصابی کتب بھی آچکی ہیں اور کالجوں میں لائبریری سائنس کے لیکچررز کا تقرر بھی ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر رمیش بابو کے مطابق ''آج ہندوستان میں ۱۷۰ روایتی یو نیورسٹیوں میں تقریباً ۴۴ یونیورسٹیاں بشمول اوپن یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے مختلف پیشہ ورانہ کورسیز جیسے لائبریری و انفارمیشن سائنس کا انعقاد کر رہی ہیں (۲۳۸) ۔مدراس یونیورسٹی میں ۱۹۸۸ء سے فاصلاتی تعلیم کے تحت لائبریری سائنس میں ما
پروگرام کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ (MLIS) سٹر

ڈاکٹر سید جلال الدین حیدر نے فاصلاتی تعلیم کے تحت لائبریری تعلیم پر کی جانے والی تنقید کے جواب میں تحریر کیا کہ ' حقیقت یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو اگر دلائل کی بنیاد پر قبول بھی کر لیا جائے تو پاکستان جیسے ملک

میں یہ غیر معمولی نہیں ۔فاصلاتی تعلیم کے تحت پیشہ ورانہ کورسز کے لیے مطالعاتی مواد کے معیاری نہ ہونے کے بارے میں ڈاکٹر حیدر کا کہنا ہے کہ دیگر شہروں سے تعلق رکھنے والے کتب خانوں میں کام کرنے والے اگر اپنی پیشہ ورانہ تعلیمی استطاعت اور قابلیت بڑھانے کے خواہشمند ہوں تو کیا وہ اس مقصد کے لیے وہ کراچی یا لاہور جا ئیں ؟ کیا وہ یہ عیش و عشرت برداشت کر سکتے ہیں؟ یہ پروگرام ایک مخصوص منصوبہ بندی اور اور عظیم مقصد کے لیے شروع کئے گئے ہیں' (۲۳۹)۔

فاصلاتی نظام تعلیم میں طلبہ امدادیِ خدمت پر انحصار کرتے ہیں ان کی کئی شکلیں ہیں با لمشافہ تعلیم' فاصلات بذریعہ کمپیوٹر' مشاورت' تفویض شدہ مواد کی جانچ' ورکشاپ ٹیلی فون پر تدریس' ٹیوٹوریل امداد وغیرہ جو فاصلاتی اساتذہ' مشیروں' تربیت دینے والوں' سپروائزروں' ساتھی طلبہ اور خاندان کے افراد کی طرف سے منظم اور غیر منظم صورتوں میں ہو سکتی ہیں (۲۴۰)۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے ریجنل کیمپس ۷۰ پارٹ ٹائم ریجنل رابطہ آفیسرز اور ایک ہزار سے زیادہ اسٹڈی ۳۲ سینٹر قائم ہیں۔سب سے اہم خط وکتابت و راہنمائی ہے جو جز وقتی اساتذہ (ٹیوٹر) فرا ہم کرتے ہیں اس میں اسٹڈی سینٹرز پر طلبہ سے بالمشافہ ملاقات شامل ہے (۲۴۱)۔یو نیورسٹی کے اس طریقہ کار سے طلبہ کی زیادہ مشکلات حل ہو جاتی ہیں، ہر

ریجنل آفس میں قائم لائبریری لیب کی حیثیت رکھتی ہے جہاں پر لائبریری سائنس کے طلبہ پیشہ ورانہ لائبریرین سے عملی امور میں مدد لے سکتا ہے۔

شعبہ لائبریری و انفارمیشن نے سرٹیفکیٹ اور بی ایل آئی ایس پروگرام کے نصاب پر مشتمل کتب اردو زبان میں مرتب کیں یہ کتب نصاب کا پوری طرح احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں 'وسائل کتب خانہ' (یونٹ ا۔۹) (۲۴۲) ، وسائل کتب خانہ' (یونٹ ۱۰۔ ۱۸) (۲۴۳)، 'خدمات کتب خانہ (یونٹ ا۔۹) (۲۴۴) ، خدمات کتب خانہ (یونٹ ۱۰۔۱۸) (۲۴۵) ، کتب خانوں کی تاریخ (یونٹ ا۔۹) (۲۴۶) ، کتب خانوں کی تاریخ (یونٹ ۱۰۔۱۸) (۲۴۷)، درجہ بندی و کیٹلاگ سازی یونٹ ا۔۹(۲۴۸) اور یونٹ ۱۰۔ ۱۸ شامل ہیں (۲۴۹)۔ ایم ایل آئی ایس کے تمام مضامین کی راہنما کتب (Study Guide) کے علاوہ طلبہ کو مطالعہ میں سہولت کے لیے نصاب میں شامل موضوعات پر مشتمل کتب شائع کی گئیں۔ راقم الحروف نے ایم ایل آئی ایس کے آخری سیمسٹر کے ایک مضمون (Serial Management) کی اسٹڈی گائیڈ (Study Guide) (۲۵۰) تحریر کی۔

حوالے و حواشی

228. Mahmudul Hasan. 'Establishing the Department of Library and Information Science at Allama Iqbal Open University'. Pakistan Library

Bulletin. (Editorial) 16 no.2 (June 1985)

229. Library Education through Distance Teaching System. (Editorial),
Pakistan Library Bulletin. 16 no. 2 (June 1985).

۲۳۰۔ سید غیور حسین، سید۔ ’’علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کی تدریس‘‘ نیوز بلیٹن، پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (فیڈرل برانچ) نمبر ۳۲۔۳۳۔ (جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۴ء) : ۹۔۱۰

231. Muhammad Arif. 'MLIS through Distance Education. ref. 227, p.23.

232. Allama Iqbal Open University , Islamabad, Prospectus: Post Graduate
Programmes, the University, Spring, 2003. pp. 28-29.

234. Akhtar Hanif. 'Library Education through Distance Teaching System.
Pakistan Library Bulletin. 16 no. 2 (June 1985) , ii

234. Khan, Mahboob Hussain. 'An Appraisal of the Allama Iqbal Open
University's Library Education Programme'. PULSAA News. 4 nos.1-2
(January - June 1992) : 32 -33.

۔ غیور حسین، سید۔ حوالہ ۲۳۰، ص۔ ۱۴ ۲۳۵

236. Sajjadur Rehman. March 28, 1988 to Dr. G. A. Allana, Vice Chancelor, Allama Iqbal Open University, Islamabad.quotted in., Anis Khurshid. Libray Education in Pakistan: Concerns, ref. 92, p. 24

237. Anis Khurshid. Libray Education in Pakistan: Concerns, issues and Practices. quoted in Library Education in Pakistan. ref. 92, p 26

238. Babu, B Ramesh Distance Education in Library and Information Science. quoted in N. Guruswamy Naidu.- Librarianship in Developing Countires. ref. 221, p.228

239. Haider, Syed Jalaluddin. Educating Future Libraries in Pakistan. ref. 47.

۲۴۰۔ محمد ارشد، فاصلاتی تعلیم میں طلبہ کی امدادی خدمات ۔ حوالہ ۲۱۶، ص۔ ۳

241. Muhammad Arif. 'MLIS through Distance Education. ref. 227, p.24

۲۴۲۔ وسائل کتب خانہ: تنظیم وترتیب ۔ یونٹ ا۔۹، بی اے کوڈ ۴۲۲ (اسلام

آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء) ، ۴۰۴ص

۲۴۳۔ وسائل کتب خانہ: تنظیم وترتیب۔ یونٹ ۱۰۔۱۸، بی اے کوڈ ۴۲۲ ([illegible]
آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء)۴۴۹ص

۲۴۴۔ خدمات کتب خانہ: یونٹ ا۔۹، بی اے کوڈ ۴۲۳ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء) ، ۳۷۶ص۔

۲۴۵۔ خدمات کتب خانہ: یونٹ ۱۰۔۱۸، بی اے کوڈ ۴۲۲ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء (

۲۴۶۔ کتب خانوں کی تاریخ: یونٹ ا۔۹، بی اے کوڈ ۴۶۶ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،)

۲۴۷۔ کتب خانوں کی تاریخ: یونٹ ۱۰۔۱۸، بی اے کوڈ ۴۶۶ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)

۲۴۸۔ درجہ بندی کیٹلاگ سازی: بی اے، یونٹ ا۔۹، کورس کوڈ۔ ۴۶۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء) ،۳۳۹ص

۲۴۹۔ درجہ بندی کیٹلاگ سازی: بی اے، یونٹ ۱۰۔۱۸، کورس کوڈ۔ ۴۶۷ (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء) ،۳۸۰ص

250. Samdani, Rais Ahmed. Study Guide: Management of Serial Publications: Units 1-18, Course Code 5519. (Islamabad: Department of Library and

Information Science, Allama Iqbal Open University,
2002) , 135p.

اجتماعی شادی کی منفرد تقریب

تقریبات میں شرکت ایک عام سے بات ہے، عمومی طور پر دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں لوگ سب سے زیادہ شادی کی تقاریب میں شرکت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عمل متعدد اعتبار سے فوقیت اور فضیلت کا حامل ہے۔ نکاح یا شادی ایک ایسا فعل ہے کہ جس کی بنیاد پر ہی یہ دنیا پھلی پھولی، شادی محض انسانی خواہشات کا نام نہیں اور نہ ہی جذبات واحساسات کی تکمیل اس کا مقصد ہے۔ یہ ایک ایسا فرض اور ایسی سنت ہے کہ جس کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے اسے اپنے سنت قرار دیا۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ”النکاح من سنتی“ نکاح کرنا میری سنت ہے‘۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں نکاح‘، کرنے، کن سے نکاح کیا جائے، کتنے نکاح کیے جائیں اور دیگر احکامات کا ذکر بہت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت (221) میں مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرنے کا کہا گیا، سورہ النساء کی آیت (3) میں دو دو یا تین تین یا چار چار نکاح کرنے کی بات کی گئی ترجمہ ”اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکوگے تو اُن کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار اُن سے نکاح کرلو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ (کرسکوگے تو ایک عورت (کافی ہے

یا لونڈی جس کے تم مالک ہو اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤگے''۔ اسی سورہ کی آیت 22 تا 24 میں کن سے نکاح کیا جائے اور کن سے نکاح نہ کیا جائے کی تفصیل ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعراف (7) آیت (189) ترجمہ '' وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے''۔ سورۃ الرعد (13) آیت (38) ترجمہ ''اے محمد ﷺ تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسُول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا''۔ سورۃ النساء آیت نمبر ایک (۱) ترجمہ '' اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلائیں''۔ مفسرِ قرآن حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا جیسے آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ۔ دُوسرے جاندار کا جاندار سے بلا طریقہ توالد متعارف پیدا ہونا جس طرح حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور تیسرے جاندار سے جان دار سے بطریقِ توالدِ متعارف پیدا ہونا جیسا کہ اور آدمی آدم وحوا سے اِس وقت تک پیدا ہوتے آرہے ہیں ۔ اور فی نفسہٖ عجیب ہونے میں اور قدرت کے سامنے عجیب نہ ہونے میں تینوں صورتیں برابر ہیں''۔ پہلا نکاح آدم علیہ السلام اور اماں حوا کا ہوا۔ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے اپنی ایک تصنیف میں آنحضرت محمد ﷺ پر درود بھیجنے کی

فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اور حضرت حوا کی بھی ولادت ہو گئی۔ اب آدم علیہ السلام نے اماں حوا کا قرب چاہا تو اللہ رب العزت نے روکا ملائیکہ کو حکم دیا کہ رک جاؤ تمہارا نکاح کراتے ہیں، نکاح کے بعد تم مہر ادا کرنا تب 'حوا' تمہارے لیے 'آدم' حلال ہوگی۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا پروردگار نکاح اور حجاب و قبول تو ٹھیک ہے لیکن مہر کیا دونگا؟ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مدارج النبوت' میں بیان کیا اور بھی کئی مصنفین نے اسے اپنی کتب میں بیان کیا ہے'' ۔آپ (حضرت آدمؑ) نے عرض کیا میرا مہر کیا ہوگا۔ تو باری تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے فرمایا کہ آدم تو اور حوا دونوں مل کر میرے مصطفیٰ پر 2 مرتبہ درود پڑھ لینا۔ دونوں نے تین مرتبہ یا20 مرتبہ مصطفیٰ پر درود پڑھا تو حضرت حوا حلال ہو گئیں۔ دنیا میں آدم و حوا کی ملاقات مکہ میں جبل رحمت پر ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سے پہاڑی ہے ہر سال حجاج اکرم اسی جبل رحمت پر جمع ہوتے ہیں اور خطبہ حج سنتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جتنے بھی نبی آئے تمام کی شادیاں ہوئیں اور اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے بھی نوازا۔

نکاح انبیاء کی سنت ہے، قرآن کریم میں انبیاء کی ازواج اور ان کی اولادوں کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت اور اسے آدھا ایمان اور شادی نہ کرنے کو زندگی سے فرار اختیار کرنا قرار دیا۔ متعدد احادیث

مبارکہ و سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ پیر انتظام الدین موتی نے اپنے مضمون 'نکاح کی اہمیت' (جنگ 14 اکتوبر 2016ء) میں لکھا ہے کہ '' ایک مرتبہ جب بعض صحابہ کرامؓ نے عبادت و ریاضت میں یکسوئی و دلچسپی کے پیش نظر آنحضرت ﷺ سے اپنی شہوت کو ختم کر دینے کی خواہش ظاہر کی تو آنحضرت ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور شادی نہ کرنے کو زندگی سے فرار اختیار کرنا قرار دیا''۔اسی طرح حجتہ الوادع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''میں تمہیں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں ، وہ تمہارے پاس امانت ہیں، ان کے بارے میں اللہ سے ڈرو''۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں جو کوئی نکاح کی طاقت ، استطاعت رکھے تو اسے نکاح کرلینا ہی چاہیے کیونکہ وہ نگاہ کو جھکنے والا شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو شخص نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا ، اسے چاہیے کی وہ روزہ رکھے کیونکہ وہ ڈھال ہے''۔احکاماتِ خداوندی اور ارشاداتِ نبوی ﷺ سے نکاح کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ شادی انسان کی اہم فطری ضرورت اور اس کی بقا و تحفظ کی ضامن ہے۔

ظہور اسلام سے قبل بھی حجاب و قبول کا طریقہ رائج تھا، تمام انبیاء نے شادیاں کیں۔ اگر شادیوں اور کثیر اولاد کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو دنیا کس طرح آباد ہوتی، زمانہ جاہلیت میں مرد و عورت کے باہمی تعلق کے متعدد طریقے رائج تھے ، ظہور اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے حجاب و قبول کا جو

طریقہ بیان فرمایا مسلمانوں کے لیے وہی بہتر، فطرت و حکمت کے عین مطابق ہے۔
شادی میں دیگر احباب کی معاونت اور ملاپی کرادار اہمیت رکھتا ہے۔ مرد کی جانب سے اس کے والدین یا سرپرست عورت کے اولیاء اور سرپرستوں کو پیام دیتے ہیں اور ضروری معاملات طے ہوجانے کے بعد باقاعدہ نکاح کی رسم انجام پاتی ہے۔ دنیا میں جیسے جیسے حوص، لالچ، لمحوں میں امیر بننے کی خواہش، مادہ پرستی اور دنیاوی ضروریات غالب آنا شروع ہوئیں بے شمار قسم کی.برائیاں معاشرہ میں پیدا ہوگئیں۔ ان میں سے ایک.برائی شادی کو اپنے لیے امارت کا ذریعہ بنانے کی خواہش بھی ہے۔ یہ بات عام ہے کہ ہمارے معاشرے میں بے شمار لڑکیوں کی شادی اس وجہ سے نہیں ہوپاتی کہ ان کے والدین جہیز دینے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ جس کے نتیجے میں لڑکیوں کی عمریں ڈھلتی چلی جاتی ہیں اور معاشرے میں دیگر مسائل اور مشکلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی معاشرتی مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ شادی نہ ہونے کی وجوہات اور بھی ہیں لیکن ان میں سے ایک لڑکی کے والدین کا امیر وکبیر نہ ہونا ہے۔ جہاں ایک جانب معاشرہ میں بے شمار خرابیاں پائی جاتی ہیں اسی جانب بے شمار اچھائیاں اور خوبیاں بھی ہیں۔ شادی جیسے اہم فریضے میں انفرادی طور پر معاونت کرنے کی رسم مسلم معاشرے میں بہت قدیم ہے۔ پھر معاشی ضروریات نے اس انفرادی خدمت کو بھی معاش سے منتھی کردیا اور انفرادی خدمت انجام دینے والوں نے 'شادی دفتر' قائم کرلیے اور وہ اس کام کا معاوضہ لینے لگے اور یہ بھی دیگر کاروبار میں سے ایک بن

گیا، لیکن انسانوں کے ملاپ میں خدمت کا جذبہ ختم نہیں ہوا آج بھی بے شمار لوگ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر یہ خدمت انجام دے رہے ہیں ،ایک ہی وقت میں کئی کئی جوڑوں کو شادی کے بندھن میں جوڑنا اور ان کے لیے سامان ضروری کا اہتمام کرنے کو ''اجتماعی شادی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اجتماعی شادی کا تصور مسلم معاشرہ میں ہی نہیں بلکہ غیر مسلم معاشرے بھی پایا جاتا ہے اجتماعی شادی میں شادی کے تمام تراخراجات بشمول جہیز متعلقہ فلاحی ادارہ برداشت کرتا ہے۔ پاکستان میں متعدد فلاحی ادارے ایسے ہیں جو اجتماعی شادیوں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ جیسے الغوثیہ ویلفیئر آرگنائزیشن، منہاج القرآن ویلفیئر فاؤنڈیشن، ایدی فاؤنڈیشن، جذبہ فاؤنڈیشن،امام خمینی ٹرسٹ، انصار برنی اور صارم برنی ٹرسٹ ، حوا علم الشفاء ٹرسٹ کے علاوہ کئی ادارے اس نیک کام میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ مجھے گزشتہ دنوں 'حوا علم الشفاء ٹرسٹ' کے زیر اہتمام اجتماعی شادیوں کی تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ پاکستان میں انسانیت کی خدمت کو عوامی سطح پر عام کرنے کا تاج بلا شرکت غیرے عبدالستار ایدھی مرحوم کے سر سجا ہے۔ اس سے قبل بھی انسانیت کی خدمت کی جارہی تھی ، انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر بھی لیکن اسے عام لوگوں تک ایک خاص طریقے اور ڈھنگ سے پہنچانے میں ایدھی مرحوم کا اہم کردار ہے۔ اب ہمارے ملک میں کئی شخصیات عبدالستار ایدھی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں اور انسانیت کی فلاح کے بے شمار کام انتہائی خوش اسلوبی سے انجام پا رہے ہیں۔ ان

میں سے ایک 'حوا علم الشفاء ٹرسٹ' کے بانی و چیئرمین جناب واحد علی رحمانی بھی ہیں۔ان کی خدمات کا بنیادی مقصد بلا تفریق لوگوں کو معیاری صحت اور تعلیمی خدمات فراہم کرنا ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے 1990ء میں کراچی میں متوسط لوگوں کی بستی سرجانی ٹاؤن میں 'فاطمہ کڈنی کیئر اسپتال' قائم کیا، یہ اسپتال ستمبر2013 سے گردے کے مریضوں کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ اسپتال ڈائیلاسیز کے لیے پچاس بیڈ پر مشتمل ہے۔ اس میں اب تک 12ڈائیلاسیز مشینیں کام کر رہی ہیں اس اعتبار سے اسے کراچی میں ڈائیلاسیز کا تیسرا بڑا اسپتال تصور کیا جاتا ہے۔ڈائیلاسیز ایک مہنگا علاج ہے لیکن اس سینٹر میں غریبوں اور ناداروں کو ڈائیلاسیز جیسے مرض کو مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کراچی کے علاقے سخی حسن کے قریب 'شیخ آئی اسپتال' بہت عرصہ سے غریب و نادار افراد کی خدمت میں سرگرم عمل ہے۔

اجتماعی شادی کی تقریب سرجانی ٹاؤن میں واقع فاطمہ کڈنی کیئر اسپتال کے احاطے میں منعقد ہوئی۔ ہم جب تقریب میں پہنچے تو متعدد الیکٹرنک میڈیا کی گاڑیاں تقریب کی کوریج کے لیے باہر موجود تھیں، مہمانوں کے لیے دو ہال مختص تھے، شروع کے بڑے پنڈال میں دولھا اور دلھنوں کے عزیز رشتہ دار بڑی تعداد میں موجود تھے،اندازہ ہو رہا تھا کہ لوگوں کی اکثریت متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اندر کے پنڈال میں اسٹیج پر نو (9) دولھا، رحمانی صاحب اور نکاح

خواں موجود تھے، شادی کی اہمیت پر بیان بھی ہو رہا تھا، اسی پنڈال میں ایک جانب نو جوڑوں کا جہیز الگ الگ اور ایک جیسا جہیز سجا ہوا تھا جس میں ایک عام متوسط خاندان کے استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء شامل تھیں جیسے مسیری، الماری، پنکھا، استری، کراکری، برتن، کپڑے اور دیگر سامان شامل تھا۔ نکاح کی رسم شروع ہوئی ایک ایک کرکے ہر دولھا اور دلھن کے وکیل اور گواہوں کو اسٹیج پر بلایا گیا اور ایجاب و قبول کی رسم ادا کرائی گئیں۔ نکاح ہو جانے کے بعد دلھنوں کو بھی اسٹیج پر ان کے اپنے اپنے دولھا کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ نکاح کے بندھن میں بندھنے والے تمام دولھا اور دلھنیں شاد اور خوش نظر آرہے تھے۔ حوا ٹرسٹ کے توسط سے ان نو (9) لڑکوں اور لڑکیوں کو نئی زندگی شروع کرنے کا ایسا سہارا نصیب ہوا جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ غریبوں، ناداروں، مسکینوں، مفلسوں کی مدد کرنا تو عام سے بات ہے جسے اللہ نے توفیق دی ہوتی ہے وہ کرتا ہی ہے لیکن شادی کے بندھن میں اس انداز سے باندھ دینا انسانیت کی بڑی خدمات ہے۔ اس طرح کے کاموں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ صاحبِ استطاعت لوگوں کو حوا علم الشفاء ٹرسٹ اور اس جیسے فلاحی اداروں کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے۔ رحمانی صاحب اور ان کی ٹیم کے تمام اراکین قابل مبارک ہیں کہ انہوں نے دن رات محنت سے خدمتِ انسانی کا یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔ لوگوں نے تصاویر لیں اور بنوائیں، میڈیا نے انٹر ویوز کیے، سیلفیاں بھی لینے والوں نے لیں، ہر دولھا اور دلھن کے چہرہ پر خوش گوار

تاثرات نمایاں تھے۔ عزیز رشتہ دار بھی بہت خوش تھے۔ رحمانی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کے ہمراہ تصویر بھی بنائی گئی۔ تمام مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ میں واحد رحمانی صاحب سے براۓ راست تو واقف نہیں تھا ایک مرتبہ ان کے اسپتال جانا ہوا وہاں ان سے ملاقات بھی ہوئی ، با اخلاق، ملنسار اور انسانیت کی خدمت کے جذبے سے سرشار شخصیت ہیں۔ دراصل میرا چھوٹا بیٹا حافظ نبیل صمدانی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے جو اعلم الشفاء ٹرسٹ کے اسپتال ''فاطمہ کڈنی کیئر سینٹر اسپتال کے ڈائیلائیز سینٹر کا نگراں ہے۔ اس اسپتال کا ڈائیلائیز سینٹر اسی کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ اس حوالے سے میں حوا ٹرسٹ اور 'فاطمہ کڈنی کیئر سینٹر اسپتال' سے بخوبی واقف ہوں۔ ٹرسٹ کے آنکھوں کے اسپتال میں بھی غریب اور کم آمدنی والے لوگوں کا بہت ہی کم پیسوں میں بہ آسانی اور معیاری علاج فراہم کیا جارہا ہے۔

اجتماعی شادی کی روایت عام ہے۔ پاکستان میں متعدد فلاحی ادارے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ علامہ ڈاکٹر طاہر القادری کے ادارے منہاج القرآن ویلفیئر فاؤنڈیشن کے اہتمام شادیوں کی سالانہ اجتماعی تقریب منعقد ہوتی ہے، گزشتہ دنوں منعقد ہونے والی تقریب میں 20 مسلمان اور چار مسیحی جوڑے شادی کے مقدس رشتے میں بندھے ، پارا چنار میں 50 جوڑوں کی اجتماعی شادی کی تقریب کرم ایجنسی کے علاقے پارہ چنار میں منعقد ہوئی، جذبہ فاؤنڈیشن کے تحت 50 اجتماعی

شادیوں کا اہتمام کیا گیا، مئی 2016 میں الغوثیہ ویلفیئر آرگنائیزیشن کے زیر اہتمام اجتمائی شادیوں کا میلہ سجایا جاتا ہے، اس دن 135 جوڑوں کی شادی کا اہتمام کیا گیا۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اجتماعی شادی کی تقریبات کا رواج پایا جاتا ہے۔ جنوبی کوریا میں شادی کی اجتماعی تقریب میں 50 ممالک کے چار ہزار جوڑوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا، یہ تقریب یونی فیکشن چرچ میں منعقد ہوئی جہاں پر 4 ہزار جوڑوں کے علاوہ 12 ہزار جوڑے انٹرنیٹ پر شادی کے بندھن میں بندھے۔ چرچ میں اجتمائی شادی کی تقریب دیکھنے 20 ہزار افراد نے شرکت کی۔

فلاحی ادارے جو اجتمائی شادیوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں قابل مبارک باد ہیں۔ وہ ایک ایسی انسانی خدمات انجام دے رہے ہیں جس کا کوئی نعمل بدل نہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی بہت بڑی خرابی کا سدِباب ، اللہ کے دربار سے اجرِ عظیم کے حقدار اور یہ عمل ایک ایسا صدقہ جاریہ ہے کہ جن خاندانوں کو شادی کے بندھن میں باندھا ان کا خاندان جیسے جیسے پھلے پھولے گا، پروان چڑھے گا اس کا اجر ملتا رہے گا۔ ایسے بے شمار والدین ہمارے ارد گرد موجود ہیں کہ جن کی بیٹیاں صرف اس وجہ سے گھر میں جوانی سے بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ جاتی ہیں کہ ان کے والدین انہیں جہیز نہیں دے سکتے۔ اول تو جہیز جیسے لعنت اور برائی کو ہی ختم ہو جانا چاہیے لیکن بعض مجبوریاں ایسی آڑے آجاتی ہیں کہ انسان بے

بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ ہمیں بھی نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (قسط 15 ،آخری

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے سو سال (2015-1915)

(یہ مضمون مصنف کے پی ایچ ڈی مقالے بعنوان ''پاکستان میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں
کی ترقی میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار'' سے موخوذ ہے۔یہ مقالے کا چوتھا باب ہے۔
مقالے پر مصنف کو جامعہ ہمدرد سے 2009 میں ڈاکٹریٹ کی سند دی)

گزشتہ سے پیوستہ

پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے ادارے اور کورسز

قیام پاکستان کے بعد سے ۲۰۰۵ ء تک مختلف اداروں، انجمنوں اور جامعات کے تحت پوسٹ گریجویٹ، ماسٹرز اور ایم فل و پی ایچ ڈی کی سطح پر مختلف کورسز کی تعداد کا صوبوں کے اعتبار سے جائزہ لیں تو معلوم ہو تا ہے کہ سب زیادہ کورسز صوبہ سندھ میں منعقد ہوئے جن کی تعداد ۲۱ ہے، پنجاب میں ۱۳، صوبہ سر حد میں ۳ ، صوبہ بلوچستان میں ۴، اسلام آباد میں ۲ اور علامہ اقبال اوپن یو نیورسٹی کے تحت ۳ کورسز شروع ہوئے جو تا حال جاری ہیں۔صوبوں کے اعتبار سے کل کورسز کی تعداد حسب ذیل رہی۔

۱۹۴۷ء - ۲۰۰۵ء کے درمیان منعقد ہونے والے کورسز

صوبے	سرٹیفکیٹ کورسز	پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	ماسٹرز	ایم فل/پی ایچ ڈی	کل تعداد
سندھ	۱۳	۲	۲	۴	۲۱
صوبہ پنجاب	۵	۳	۳	۲	۱۳
صوبہ سرحد	۱	۱	۱	-	۳
صوبہ بلوچستان	۱	۱	۱	۱	۴
اسلام آباد	۲	-	-	-	۲
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی	۲	-	۱	-	۳
کل تعداد	۲۴	۷	۸	۷	۴۶

(Conclusion) حاصل مطالعہ

پاکستان میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم ، تر بیت و تحقیق کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی کہ قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں انڈر گریجویٹ سر ٹیفیکٹ کورسز کا انعقاد مختلف کتب خانوں اور لائبریری انجمنوں کی جانب سے کیا گیا لائبریری سائنس کی تعلیم و تر بیت کا یہ سلسلہ بعد میں بھی وقتاً فوقتاً جاری رہا لیکن یہ ایک وقتی ضرورت تھی کیوں کہ ، یہ تمام کورسز علاوہ دو کورسز (ایک کراچی اور ایک لاہور) کے جن کی تعداد ۲۳ ہے وقت کے ساتھ ساتھ بند ہوگئے۔لاہور میں پنجاب لائبریری ایسو سی ایشن کے زیر اہتمام لائبریری سائنس کا سر ٹیفکیٹ کورس جو۱۹۶۲ء میں شروع ہوا تھا تا حال جاری ہے اسی طرح کراچی میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ کے زیر اہتمام قائم ہو نے والا اسکول آف لائبریرین شپ قائم ہے اور اس ادارے کے تحت جو کورس ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تھا تا حال جاری ہے۔

جامعات کے تحت پوسٹ گریجویٹ سطح پر لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم، تربیت و تحقیق مستقل اور دیرپا ثابت ہوئی اس کا آغاز جامعہ کراچی سے ۱۹۵۶ء میں ہوا، رفتہ رفتہ ملک کی دیگر جامعات نے اس کی تقلید کی، پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کے بعد ماسٹرز اور پھر ایم فل و پی ایچ ڈی کی تعلیم مختلف جامعات میں شروع کر دی گئی جو آج بھی جاری ہے۔ جدول ۱۸ سے اس وقت مختلفاداروں اور جامعات میں جاری لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم، تربیت و تحقیق کی صورت حال واضح ہے۔

جامعہ کراچی، پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کی تعلیم پوسٹ گریجویٹ، ایم اے اور پی ایچ ڈی تک دی جارہی ہے، جامعہ پشاور میں پوسٹ گریجویٹ اور ایم اے (ایم ایل آئی ایس)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحت سر ٹیفکیٹ اور بی اے (بی ایل آئی ایس)اور ایم ایل اآئی ایس کی تعلیم کا اہتمام ہے۔ ملک کی دو جامعات وفاقی اور یونیورسٹی کراچی اور ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کا آغاز اسی سال کیا جب کہ ان جامعات میں لائبریری و انفارمیشن سائنس کے باقاعدہ شعبہ جات قائم نہیں ہیں۔ بہاء الدین ذکریہ یونیورسٹی نے بھی اسی سال بی ایل آئی ایس کی تعلیم کا آغاز کر دیا ہے۔

پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کے فروغ میں شہید حکیم محمد سعید کا کردار
جس کے حکیم محمد سعید تاسیسی صدر) (SPIL) انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات تھے)کے مقاصد میں ملک میں لائبریری تحریک کے فروغ اور کتب خانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کا اہتمام اور فروغ بھی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انجمن نے مختلف اقدامات کیے۔ ان میں ملک کے مختلف شہروں میں لائبریری سائنس کے تربیتی کورسیز کے انعقاد کے علاوہ لائبریری سائنس کی تعلیم کے تربیتی اداروں سے عملی تعاون شامل تھا۔ اسپل نے محسوس کیا کہ ملک میں کتب خانو ں کا فروغ وترقی لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ تربیت یافتہ عملہ بہتر لائبریری خدمات فراہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں اسپل نے اسکول کے کتب خانوں میں (جہاں پیشہ ورانہ عملہ بالکل ہی موجود نہیں تھا) اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اسکولوں کے اساتذہ کو لائبریری سائنس کی ابتدائی تربیت دینے کا پروگرام مرتب کیا۔ یہ بات اہم ہے کہ اسپل وہ واحد انجمن ہے جس نے اپنی سرگرمیوں کو بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے شہروں تک وسیع کیا۔ ڈاکٹر بُٹ کے مطابق ' اسپل نے جن خطوط پر کام کیا وہ کسی اور ایسوی ایشن نے نہیں کیا۔ ہر ایسو ی ایشن حتیٰ کہ پی ایل اے تک کی سرگرمیاں ملک کے بڑے شہروں تک محدود رتھیں لیکن اسپل وہ واحد ایسو ی

ایشن تھی کہ جس نے لائبریری سرگرمیوں کا دائرہ بڑے شہروں کے علاوہ ملک کے چھو ٹے شہروں تک بڑھایا۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد' سکھر اور کوئٹہ میں سیمینار منعقد کیے۔ اسی طرح خیرپور جیسے چھوٹے شہر میں اسپل کا سیمینار منعقد ہوا۔ اسپل نے بلا تفریق پو رے ملک کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اپنے آپ کو بڑے شہروں سے باہر نکالا۔

یہ بہت بڑی بات تھی رنگ و نسل اور علاقہ سے آزاد ہو کر اسپل نے لائبریری تحریک کے فروغ' کتب خانوں کی ترقی اور عوام میں لائبریری شعور پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا (۲۵۱)۔

ڈاکٹر انیس خورشید کے مطابق کتب خانوں کی تحریک کے حوالہ سے ملک بھر میں آپ حکیم محمد سعید) نے جو کام کیا وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ آپ) حکیم محمد سعید) کی قیادت میں کراچی ہی سے اسکول کے کتب خانوں کے لیے اسکولوں) کے اساتذہ اور پرنسپلوں کے لیے ایک ورکشاپ کا انعقاد بھی شامل ہے جس کا دائرہ بعد میں اسکول لائبریری کے کورس کی صورت میں اندرون سندھ اور کوئٹہ تک بڑھا دیا گیا (۲۵۲)۔ یہ کورسیز ان سیمینار کے علاوہ ہیں جو اسپل نے مختلف موضوعات پر ملک کے مختلف شہروں میں منعقد کیے۔ اسپل نے بشمول شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس جامعہ کراچی ان تمام اداروں سے عملی تعاون کیا جو لائبریری تعلیم و تربیت کے مختصر میعاد

کے کورسز منعقد کرتے رہے ان میں پاکستان ببلو گرافیکل ورکنگ گروپ' کراچی لا ئبریری ایسو سی ایشن' فیڈرل لائبریری ایسو سی ایشن کے علاوہ شعبہ علم کتاب داری' جامعہ ملیہ بھی شامل ہے جس کے سرٹیفیکیٹ کورس ۱۹۶۸ء کی تقسیم اسناد میں حکیم محمد سعید مہمان خصوصی تھے (۲۵۳)۔

اسپل کی مطبوعات میں لائبریری سائنس کی عام کتب' دستی کتب' روئیداد (Proceedings) ' پلان' ڈائریکٹری' رپورٹس' کتابیات اور تجاویز شامل ہیں۔ ان مطبوعات نے لائبریری سائنس کی تعلیم میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ (ان کا تفصیلی ذکر آئندہ باب میں آئے گا) یہ ایک جانب تو لائبریری سائنس کے طلبہ کے لیے معاون ثابت ہوئیں تو دوسری جانب انہوں نے کتب خانوں میں خدمات انجام دینے والے پیشہ ورانہ عملے کے لیے رہنما کا کردار ادا کیا۔ یہ مطبوعات لائبریری سائنس کے محققین کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سبزواری کے مطابق ' اسپل کی مطبوعات لائبریری لٹریچر میں اہم اضافہ ہے۔ لائبریری پر تحقیق
کرنے والا یا لائبریری سائنس کے کسی موضوع پر کتاب یا مضمون لکھنے والا اسپل کی مطبوعات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ مواد پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے (۲۵۴)۔

نے اسکولوں میں کتب خانوں کے قیام اور ان کے نظام کو بہتر طور پر چلا (SPIL) اسپل
نے کے لیے ٹیچر لائبریرین کی تربیت کیلئے نہ صرف کورسز منعقد کیے ساتھ ہی مستقبل
میں ان کی رہنمائی اور سہولت کے لیے اردو اور انگریزی میں لائبریری ہینڈ بک بھی شا
ئع کیں۔ ۱۹۶۶ء میں (۲۵۵) کے عنوان سے اسپل نے انگریزی زبان میں ایک رہنما
شائع کی جو اسکولوں میں کتب خانوں کے قیام میں مدد اور ان کے انتظام کو بہتر طور
پر چلانے میں معاون ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر سبزواری کے مطابق ۶۵ ۔ ۱۹۶۶ء میں
پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں انجمن کی جانب سے ورکشاپس ہوئے۔ ان کا مقصد
اساتذہ لائبریرین کو کتب خانوں کے پیشہ ورانہ کام اور خدمات سے روشناس کرانا،
موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینا اور ترقی کا منصوبہ بنانا تھا۔ اس ورکشاپ کے بعد اس
ضرورت کا شدت سے احساس ہوا کہ کوئی ایسی کتاب مرُتب کی جائے جو ہمارے اسکول
کے کتب خانوں کی تنظیم میں معاون ومددگار ہو (۲۵۶)۔ یہ ہینڈ بک محمد جہانگیر اور
غنی الاکرم سبزواری نے مرتب کی جسے اسپل نے شائع کیا۔
۱۹۸۲ء میں اسپل نے اسی ہینڈ بک کو اردو زبان میں شائع کرنے کی ضرورت محسوس
کی چنانچہ یہ ذمہ داری پھر سے ڈاکٹر غنی الاکرم سبزواری ہی کو سونپی گئی جسے آپ نے
بہت ہی خوش اسلوبی سے پورا کیا اور " اسکول کے کتب خا

نے : نظم ' ترتیب و خدمات '' (۲۵۷) کے عنوان سے یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ حکیم : محمد سعید نے کتاب کے پیش لفظ میں تحریر کہ

جناب سبزواری نے بڑی محنت اور اپنے طویل تجربہ کی روشنی میں ایسی کتاب مرتب ' کی ہے جس میں کتب خانہ کے تمام شعبوں اور خدمات کا مختصر لیکن واضح طور پر احاطہ کیا ہے۔ کسی اسکول میں پیشہ ور لائبریرین موجود نہ ہوں تب بھی صدر مدرس اور اساتذہ اپنے طور پر کتب خانہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسی تمام ہدایات اور رہنما اصول موجود ہیں جن کی مدد سے کتب خانہ بہ آسانی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ تاہم ہر اسکول میں پیشہ ورانہ تعلیم یافتہ لائبریرین کا تقرر ضروری ہے جو اپنی تعلیم و تربیت کی بنا پر بہتر طور پر کتب خانے کو منظم کر سکتا ہے اور معیاری خدمات انجام دے سکتا ہے (۲۵۸)

نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ ذہین لوگوں کو اس پیشہ (پروفیشن) (SPIL)اسپل کی جانب راغب کیا جائے تاکہ پاکستان لائبریرین شپ ذہین لوگوں کا پیشہ بن جائے اس طرح اس پیشہ کا وقار بلند ہوگا اور کتب خانوں کی کارکردگی میں نمایاں اضافہ بھی ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسپل نے ملک کے دانشوروں اور ماہرین تعلیم کی ایک کثیر تعداد کو اسپل کے پلیٹ فارم پر جمع کیا دوسری جانب لائبریری سائنس کے طلبہ کے لیے گولڈ میڈل کا اجراء بھی

کیا۔ یہ ’’ اسپل گولڈ میڈل‘‘ کے نام سے شعبہ لائبریری وانفارمیشن سائنس جامعہ کراچی کے ایم ایل آئی ایس کے طلبہ میں اس طالب علم کو ہر سال دیا جاتا ہے جس نے لائبریری سائنس کے (SPIL)اول پوزیشن حاصل کی ہو۔ اسپل کے اس اقدام سے طلبہ میں مقابلہ کا رجحان پیدا ہوا۔

ڈاکٹر اللہ رکھیو بٹ کے خیال میں یہ ایک اچھا فیصلہ تھا اس سے طلباء میں پڑھائی میں مقابلہ کا رجحان پیدا کرنے میں اس قسم کے اقدامات سے مثبت اثرات پڑتے ہیں۔ لائبریری سائنس میں یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے (۲۵۹)۔ اختر انصاری کے مطابق ’ستائش اور حوصلہ افزائی کسی بھی طالب علم کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے، کراچی یونیورسٹی کے MLIS طلباء کے لئے گولڈ میڈل کا اجراء بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس ضمن میں دوسرے اداروں اور انفرادی اشخاص کو بھی حوصلہ افزائی کے کاموں میں

اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور یہ اقدام یقیناً فروغ علم میں اور پیشے کی ترقی میں معاون ثابت ہوا ہے‘ (۲۶۰)۔ اسپل گولڈ میڈل کے بارے میں حکیم صاحب نے جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :

’’ اسپل پاکستان میں کتب خانوں کی ترقی اور فروغ میں مصروفِ عمل ہے۔ میں اس کی سرگرمیوں اور ان کامرانیوں کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا جو اس

نے کراچی میں انجام دیں لیکن میں یہاں بطور خاص جامعہ کراچی میں جاری کردہ اسپل گولڈمیڈل" کاذکر ضرور کرونگا جس کا مقصد پاکستان میں لائبریری تعلیم کا" معیار بلند کرنا اور ذہین لوگوں کو اس شعبہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ پاکستان مین لائبریری تعلیم کے حوالہ سے اسپل کی دلچسپی کا یہ انتہائی واضح ثبوت ہے" (۲۶۱)۔

پاکستان میں لائبریری وانفارمیشن سائنس کی تعلیم کے مطالعہ سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچی کہ قیام پاکستان کے بعد اس مضمون کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ ایک بھی ادارہ موجود نہیں تھا۔ لائبریرین شپ سے تعلق رکھنے والی شخصیات جنھوں نے پاکستان ہجرت کی تھی نے لائبریری انجمنوں کے تحت لائبریری سائنس کی تعلیم وتربیت کی ابتدائی جو انڈر گریجویٹ سطح پر تھی ۔ اس مضمون کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ۱۹۵۶ء میں اس وقت ہوا جب جامعہ کراچی نے پہلی بار پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کورس کا آغاز کیا، جامعہ کراچی کا یہ اقدام پاکستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا باقاعدہ نقطہ آغاز تھا جس نے ملک میں لائبریری سائنس کی تعلیم ،تربیت اور تحقیق کے عمل کا صحیح سمت کا تعین کردیا۔ دیگر جامعات نے جامعہ کراچی کی پیروی کی اس مضمون کی تعلیم کا اہتمام کیا جو آج بھی جاری ہے۔

حکیم محمد سعید اور انجمن فروغ وترقی کتب خانہ جات جس کے آپ تاسیسی صدر تھے نے ملک میں لائبریری سائنس کی تعلیم تربیت اور تحقیق کے فروغ اور ترقی کے لیے جو کام کیا وہ پاکستان لائبریرین شپ کی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔

حواشی و حوالے

۲۵۱۔ بٹ، اللہ رکھیو۔انٹرویو، حوالہ ۱۵۲

۲۵۲۔ انیس خورشید۔"صاف شفاف شخصیت" درکتاب سعید مرتبہ ڈاکٹر ظہور احمد ، (اعوان (پشاور:ادارہ علم وفن پاکستان،۱۹۹۸ء

ص ۔۲۵۱

۲۵۳۔ خان، صادق علی ، ڈاکٹر محمود حسین اور تحریک کتب خانہ پاکستان۔ حوالہ ۱۰۴،

ص۔ ۸۷

۲۵۴۔ سبزواری، غنی الاکرم۔ سابق صدر شعبہ ،لائبریری وانفارمیشن سائنس ،جامعہ کراچی ولائبریرین جامعہ اُمہ القریٰ

مکہ المکرمہ ، سعودی عربیہ ،انٹرویو از محقق،۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء ، کراچی

255. School Library Handbook. ref. 102, 115p.

۲۵۶۔ سبزواری، غنی الاکرم ۔ اسکول کے کتب خانے۔ حوالہ ۱۰۳، ص۔ ۱۴

۲۵۷۔ ایضاً۔

۲۵۸۔ حکیم محمد سعید۔ پیش لفظ۔ در اسکول کے کتب خانے۔ حوالہ ۱۰۳، ص۔ ۱۱

۲۵۹۔ بٹ' اللہ رکھیو۔انٹرویو، حوالہ ۱۵۲

۲۶۰۔ انصاری 'خورشید اختر۔انٹرویو، حوالہ ۱۸۹

261. Hakim Muhammad Said, Letter No. SPIL/79/1272,

dated 12th March

1979. to Vice Chancellor, University of Karachi.

مجلّہ 'الحمد'۔شمارہ نمبر ۳ (جنوری 2016) مطالعہ سیرت اور آج کے معاشرے کے لیے ہدایات

الحمد اکیڈمی، شمارہ :3۔ ربیع الاول 1437ھ جنوری 2016ء۔

تعلیمی اداروں کی جانب سے میگزین مجلّہ کی اشاعت ایک پرانی روایت ہے۔ یہ مجلے تعلیمی، تدریسی، نصابی، ہم نصابی ، ادبی، علمی حتیٰ کہ کھیلوں کی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہوتے ہیں اوراس تعلیمی ادارے کی تمام تر سرگرمیوں، ذہنی فکر اور مثبت سوچ کی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں،ان مجلّوں کے توسط سے تعلیمی ادارے کی علمی کارکردگی ، طلبہ کی ذہنی فکر ، ادبی اور علمی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا جاسکتا ہے۔ مجلّہ اس درسگاہ کی آبرو بھی ہوتا ہے اور علامتِ وقار بھی، دستاویز بھی ہوتا ہے اور تاریخ بھی۔یہی وجہ ہے کہ معیاری تعلیمی ادارے مجلّہ کی باقاعدہ تدوین واشاعت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ جب میں گورنمنٹ کالج برائے طلبہ ، ناظم آباد میں تھا تو کالج کا مجلّہ ''روایت'' دو سال میری ادارت میں شائع ہوئے۔ یہ شمارے آج بھی کالج کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔

الحمد اکیڈمی ایک پیشہ ورانہ اکاؤنٹینسی کی تعلیم کا ادارہ ہے۔ اس کا قیام

کلیم رحمانی صاحب کی سرپرستی میں 1998ء میں عمل میں آیا، کراچی، حیدرآباد پھر وقت کے ساتھ ساتھ کراچی ہی میں ایک اور شاخ گلشن اقبال میں قائم ہوئی، لاڑکانہ کے علاوہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں بھی اس ادارے کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ مجلّہ کی پشت پر سعودی عرب کے شہر ریاض میں بھی ایک شاخ دکھائی گئی ہے۔ گزشتہ 18 سالوں سے یہ تعلیمی ادارہ کامیابی اور ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ اپنے قیام سے اب تک یہ ادارہ 300 سے زیادہ چارٹرٹ اکاؤنٹینٹ تیار کرچکا ہے۔ اس ادارے کے تحت 25000 سے زیادہ طلبہ زیور تعلیم سے آراستہ ہوچکے ہیں اس وقت اس ادارے اور ڈگری (CIMA) سی آئی ایم اے، (ACCA) اے سی سی اے، (CA) کے سی اے میں 2000 سے زیادہ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ الحمد (Degree Program) پروگراموں اکیڈمی کے بین الاقوامی مرکز کو اکاؤنٹینسی کے حوالے سے سعودی عرب میں اولین اور (FIA Qualifications) ، ایف آئی اے ACCA) ادارہ جو اے سی سی اے سینٹر کا درجہ حاصل ہے۔ یہ پہلا پاکستانی ادارہ ہے جو پیشہ ورانہ (CBE) پہلے سی بی ای تعلیم میں انویسٹمنٹ لائیسنز جاری کر رہا ہے۔ مختصر عرصہ میں اکیڈمی نے جو ترقی کی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اکیڈمی کی باگ دوڑ مخلص، ایماندار اور علم دوست احباب کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ادارہ اگر اسی برق رفتاری سے ترقی کے منازل طے کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں کہ جب اس کا شمار ملک کے بڑے تعلیمی اداروں میں ہوگا۔

الحمد اکیڈمی کے زیر اہتمام منظر عام پر آنے والا مجلّہ ’الحمد‘ سیرت نمبر کا تیسرا(3) شمارہ ہے۔اس سے قبل مجلّہ الحمد کے اولین شمارے کو مقبولیت حاصل ہوئی، مجلّہ کی کامیابی اور پذیرائی نے الحمد اکیڈمی کی انتظامیہ کا حوصلہ بڑھایااور انہوں نے سیرت ہی کے موضوع پر ’الحمد سیرت نمبر2‘ شائع کیااور اب تیسرا شمارہ بھی شائع ہوچکا ہے۔میرے مہربان دوست جناب عابد حسین صدیقی جو الحمد اکیڈمی سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجلّہ الحمد‘ کی اداراتی کمیٹی کے رکن بھی ہیں نے مجلّہ الحمد کا شمارہ نمبر (2) مجھے دیا ساتھ ہی ’اس پر کچھ لکھنے کی درخواست بھی کی، میں نے بساط استطاعت کے مطابق اس شمارے پر مختصر لکھا جو اردو کی معروف ویب سائٹ ’ہماری ویب‘ پر آن لائن موجود ہے۔کچھ عرصہ قبل عابد صاحب نے اسی مجلے کا شمارہ نمبر3 دیا اور حسبِ سابق اس پر بھی اظہار خیال کی دعوت دی۔ریٹائر منٹ کے بعد اب ہمارا کام ہی قلم چلانا رہ گیا ہے، پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا مشاغل ہیں۔ تخلیق سے جڑ جانے کے بعد تخلیق کار نثر لکھے یا شعر کہے، اس کی تخلیق کے بعد اُسے جس قدر خوشی ہوتی ہے کسی اور کام سے نہیں ہوتی۔ کمپیوٹر اور انٹر نیٹ کے اس دور میں سوشل میڈیا اور اردو ویب سائٹس کا بھلا ہو کے انہوں نے تخلیق کاروں کو اخبارات اور رسائل وجرائد کے مدیران کی خوشامد درآمد سے آزاد کر دیا ہے۔ لکھا اور کسی بھی ویب سائٹ پر فوری آن لائن ہوگیا۔ سیرت نبوی ﷺ کے حوالے سے کسی بھی مضمون، کتاب یا مجلّہ کا مطالعہ اور پھر اس پر اظہار خیال سعادت اور

نصیب کی بات ہے۔ میرا تعلق اردو کی معروف ویب سائٹ ''ہماری ویب'' سے اس لیے میں خود بھی اپنی تمام تر تحریریں خاص طور پر کالم اسی ویب سائٹ پر آن لائن کردیتا ہوں ۔ تمام لکھنے والوں کو بھی دعوت عام ہے کہ وہ بھی اپنی نگارشات اگر چاہیں تو اس ویب سائٹ پر آن لائن کردیا کریں۔

الحمد اکیڈمی کا مجلّہ ''الحمد' مطالعہ سیرت اور آج کے معاشرے کے لیے ہدایات ''، شمارہ نمبر 3 ظاہری اور باطنی اعتبار سے خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔اپنے موضوع پر بھر پور معلومات کا خزانہ ہے، یہ مجلّہ موضوعاتی ہے اور اس میں صرف سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے مضامین شامل ہیں۔ کسی بھی موضوع پر خاص نمبر کی تدوین واشاعت زیادہ مشکل ہوتی ہے کیونکہ مواد کے حصول اور انتخاب میں مدیران کو متعلقہ موضوع تک محدود رہنا ہوتا ہے۔ مجلّہ الحمد کے مدیران اپنی اس کاوش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ مجلّہ سیرت النبی ﷺ آج کے معاشرے کے لیے ہدایات کے حوالے سے معیاری مضامین اور موضوع پر دسترس رکھنے والوں کے رشحاتِ قلم کا حاصل ہے۔ مجلے کے مدیر ڈاکٹر محمد اظہر سعید نے 'کلمات الحمد' کے عنوان سے مختصر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ '' مجلّہ الحمد نے دو برس قبل اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہم نے پہلے شمارے سے جس موضوعاتی تخصص کا التزام کیا تھا، وہ جاری ہے اور یہ تازہ شمارہ آج کے معاشرتی مسائل کے حوالے سے ہے، اور ایسے چند مسائل کے سلسلے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، جن

سے اجتماعی طور پر آج ہم دوچار ہیں''۔ مجلّہ کے سرپرست کلیم رحمانی صاحب ہیں، مدیر اعلیٰ محمد خالد پیٹی والا ہیں، جب کہ مجلس مشاورت میں پروفیسر محمد فاروق سبحانی، عابد حسین صدیقی، ڈاکٹر مختار احمد زندانی، مفتی محمد انوار حسین اور حافظ نعمان عالم شامل ہیں۔ ان احباب کی کاوشوں اور محنت اور سب سے بڑھ کر سیرت حضرت محمد ﷺ سے والہانہ محبت کے سبب ایک عمدہ مجموعہ سامنے آسکا ہے جس کے لیے یہ احباب قابل مبارک باد ہیں۔

یہ شمارہ 15 مقالات کا مجموعہ ہے۔ لکھنے والوں میں مولانا سید محبوب حسن واسطی، ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، پروفیسر محمد اکرم رضا، پروفیسر سید محمد سلیم، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی، سید حامد، ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی، مفتی غلام

قادر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا سید رشید احمد ارشد، سید عزیز الرحمٰن پروفیسر محمد یوسف صابر، مولانا ڈاکٹر اکرام اللہ جان قاسمی، مولانا مفتی عبد الا۔ حد شامل ہیں۔ مولانا سید محبوب حسن واسطی کے مضمون کا عنوان 'عظیم ترین محسن انسانیت' ہے، ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری اسلامی موضوعات پر بہت خوب لکھتے ہیں، طویل عرصہ ہوا ان سے ملاقات نہیں ہوئی، انھوں نے 'خطبہ حجتہ الوداع کی اہمت کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے، پروفیسر محمد اکرم رضا کے مضمون کا عنوان ہے 'اک عرب نے آدمی کا بول بالا کردیا'، پروفیسر سید محمد سلیم نے ' معاملہ

فہمی اور سیرتِ طیبہ ' پر لکھا ہے، ڈاکٹر محمود احمد غازی سے کون واقف نہیں انہوں اپنے مضمون میں نبی کریم ﷺ کی حکمت وتدبیر بیان کی ہے ،ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی کے مضمون کا عنوان ہے 'منصوبہ بندی اسوۂ حسنہ سے ماخوذ ایک اصول کا جائزہ، سید حامد نے سیرت رسول ﷺ میں تدبیر و تنظیم کے عناصر کو اپنا موضوع بنایا ہے،ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی نے رسول اکرم ﷺ اور شہری منصوبہ بندی پر لکھا ہے ، مفتی غلام قادر کا موضوع ہے 'اُسوۂ نبی ﷺ اور اولیاء اللہ'، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری بھی معروف لکھنے والے ہیں انہوں نے سماجی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کیے ہیں، مولانا سید رشید احمد ارشد نے اس دور کے تمدنی اثرات کو اپنا موضوع بنایا ہے، سید عزیز الرحمٰن کے مضمون کا عنوان ہے 'ہماری موجودہ مشکلات اور سیرت طیبہ' ،پروفیسر محمد یوسف صابر نے اپنے مضمون میں تعلیمات بنوی ﷺ کی روشنی میں طبقاتی تعصبات اور ان کا حل پیش کیا ہے، مولانا ڈاکٹر اکرام اللہ جان قاسمی نے مذہبی رواداری کو موضوع بنایا ہے اور مولانا مفتی عبد الاحد نے خود کشی اور اس کے اسباب سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔

مجلّہ میں شامل تمام مضامین آج کے دور میں ہونے والی بے اعتدالیوں ،.برائیوں اور خامیوں کی نشاندھی اور ان کا حل سیرت النبی ﷺ کے فرمان کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ آخر میں اس قدر کہنا ہی کافی ہوگا کہ الحمد اکیڈمی کے ذمہ

داران نے اپنے ادارے کے زیر اہتمام درس وتدریس کے ساتھ ساتھ سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے مجلّہ در مجلّہ کی تدوین واشاعت کا جو اہتمام کیا ہے وہ تحلیقات کی دنیا میں ہمیشہ منفرد اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ سیرت ﷺ کے حوالے سے قارئین ہمیشہ ان سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ (29 اکتوبر 2016ء)

ڈاکٹر خلیق انجم۔اردو کا گوہر آبدار بھی چل بسا

پڑوسی ملک بھارت سے افسوس ناک خبر ملی کے معروف ادیب اور عصر حاضر کے نامور محقق، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے سابق سیکریٹری موجودہ نائب صدر، ماہر غالبیات تنقید و تحقیق ماہر ڈاکٹر خلیق انجم 18 اکتوبر 2016ء کو صبح 10.30 بجے اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجیعون، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ دنیائے اردو کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کا نام جانا پہچانا ہی نہیں بلکہ وہ معتبری کے بلند مقام پر تھے۔ بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں کے ادیبوں، شاعروں، محققین و تنقید نگاروں کے دلوں میں ان کے لیے بے بہا عزت و احترام پایا جاتا ہے۔ وہ 40 سال انجمن ترقی اردو (ہند) سے وابستہ رہے، سیکریٹری کے علاوہ اپنی آخری سانسوں تک انجمن کے نائب صدر رہے۔

مجھے ڈاکٹر خلیق انجم کو قریب سے دیکھنے کا موقع اُس وقت ملا جب میں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس میں تدریس سے وابستہ تھا۔ جامعہ سرگودھا کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام دو روزہ انٹر نیشنل اردو کانفرنس 3-4 نومبر 2010ء کو منعقد ہوئی، کانفرنس کا موضوع تھا 'اردو زبان

اور عصری آگہی'۔ یہ ایک تاریخ ساز کانفرنس تھی ۔شاہینوں کے شہر سر گودھا میں اردو زبان کے حوالے سے اس نوع کا بین الاقوامی اجتماع اور بڑی تعداد میں بیرون ملک اور اندرون ملک کے اہل علم و دانش کا یکجا ہونا اور ادبی و تحقیقی مقالات پیش کرنا، خیالات وافکار کا تبادلہ کرنا، اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے اجتمائی آواز بلند کرنا اور مکالمہ کی صورت ترتیب دینا قابل تعریف بات ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ راقم کو اس کانفرنس میں بھر پور شرکت کا موقع ملا اور اردو کے اس عظیم دانشور کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع حاصل ہوا۔ سرگودھا جیسے شہر میں' انٹر نیشنل اردو کانفرنس کا خواب شرمندہ تعمیر نہیں ہو سکتا تھا اگر کانفرنس کے انعقاد میں اردو کی نامور شخصیت، شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی عملی جدوجہد شامل نہ ہوتیں۔ جن کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا کہ ' ' وہ طبعناً فعال شخصیت ہیں اور جس کام کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کو ہر زاویے سے قابل توجہ بنا دیتے ہیں''۔ عطاء الحق قاسمی نے تونسوی صاحب کے بارے میں لکھا کہ ' 'یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر طاہر تونسوی جیسا ایک فعال سر براہ میسر ہوا''۔ میری خوش قسمتی کہ میں اور ڈاکٹر طاہر تونسوی جامعہ سرگودھا کے ٹیچرز ہاسٹل کے مکین تھے۔ وہ روم نمبر ۲ اور میں روم نمبر ۵ کا رہائشی تھا، کھانے کی میز پر ساتھ ہوتے، ہم دونوں ہی دیر سے کھانا کھانے کے عادی تھے چنانچہ اکثر میرا کمرہ ڈائینگ روم بھی ہوا کرتا تھا۔

میرے ان سے دوستانہ مراسم تھے، رات گئے علمی وادبی موضوعات پر گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہتا، شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد ندیم کے علاوہ طارق کلیم بھی اکثر ہماری محفل کا حصہ ہوا کرتے۔ اس حوالے سے میں شعبہ اردو کی علمی وادبی سرگرمیوں کا شریک رہتا۔ کانفرنس میں بھارت، بنگلہ دیش، مصر، امریکہ کے علاوہ پاکستان کے تمام بڑے شہروں سے تعلق رکھنے والے اہل علم ودانش کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور شاہد ماہلی بھارت کے شہر دہلی سے تشریف لائے تھے۔ بنگلہ دیش سے کلثوم ابوالبشر تھیں اور مصر سے ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم تھے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام ہی بڑے ادیب کانفرنس میں شریک تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ اس کانفرنس کے موقع پر بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مقالے کا عنوان تھا 'آزادی کے بعد برِصغیر میں اردو کے مسائل'۔ راقم نے اس

کانفرنس کی روداد قلم بند کی تھی جو اردو کے ادبی جریدے ماہنامہ ''نگارِ پاکستان'' شمارہ جنوری 2011 میں شائع ہوئی تھی۔ 1،

ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار برصغیر کے صف اول کے محققین میں ہوتا تھا، انہوں نے اردو ادب کے حوالے سے جو ادب بھی تخلیق کیا وہ تعداد اور معیار کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان کے رشحاتِ قلم سے 80 تصانیف وتالیفات اور بے

شمار مضامین منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو ادب کی کسی ایک یا چند اصناف تک محدود نہ رکھا بلکہ انھوں ادب کی ہر صنف پر قلم اٹھایا۔ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے انھوں نے کسی تنظیم، گروپ یا گروہ کا انتخاب نہیں کیا بلکہ جب جہاں اور جس پلیٹ فارم سے اردو کی ترقی اور فروغ کی تحریک کی بات ہوئی انھوں نے اسے لبیک کہا اور اس میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ انجمن ترقی ہند سے وہ کوئی چالیس برس مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ وہ بلاشبہ اردو کی تہذیبی و ثقافتی اقدار اور روایات کے علم بردار تھے۔ ان کی معروف تصانیف میں ذکر آثار الصنادید، انتخاب خطوطِ غالبؔ، متنی تنقید، غالبؔ کا سفر کلکتہ اور ادبی معرکہ اور حسرت موہانی، مولوی عبدالحق۔ ادبی و لسانی خدمات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غالبؔ کے مکاتیب کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم کو غالبؔ پر اعلا درجے کی تحقیق کرنے والوں میں شمار کیا جات ہے۔ اس موضوع پر ان کی اولین کاوش ''غالب کی نادر تحریریں'' تھی اس کے بعد ''غالب اور شاہان تیموریہ'' ۱۹۷۴ء میں اور '' غالب کچھ مضامین'' منظر عام پر آئیں۔ مکاتیبِ غالبؔ کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم کی قابل قدر تحقیق پانچ جلدوں پر مشتمل مکاتیب غالبؔ کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے علاوہ انجمن ترقی اردو پاکستان نے یکے بعد دیگرے شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تصنیف غالبؔ کے خطوط کی جلد اول میں لکھا ہے کہ '' سوانح نگاری کے بہترین ماخذ خطوط ہوتے ہیں۔ فن کار کے خاندانی حالات، اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اس کے عقائد و

نظریات، اس کی سیرت و شخصیت کا پورا علم ان ہی خطوط سے ہوتا ہے، اپنے عصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اپنے فن اور خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، یہ سب بہت واضح انداز میں تو فنکار کے خطوط میں ، اور اکثر ذرا مبہم آپ بیتیوں اور روزنامچوں میں ملے گا''۔اس کے بعد وہ جوشؔ ملیح آباد کی نثر کی جانب متوجہ ہوئے، یادوں کی بارات کے علاوہ خطوط بھی جوشؔ کی نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہیں، اس حوالے سے 'جوشؔ بنام ساغرؔ' تفصیلی مقدمہ کے ساتھ مرتب کی۔ ان کی کتاب 'مرزا محمد رفیع سوداؔ' کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تصنیف اردو تحقیق کے بلند ہونے کا پتا دیتی ہے۔ خاکہ نگاری کے حوالے ڈاکٹر خلیق انجم نے عبدالحق کی خاکہ نگاری۔ فن اور تنقید'' میں لکھا ہے''خاکہ نگاری کا فن بہت مشکل'' اور نازک فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب ادا کرنے پڑتے ہیں ٹھیک اسی طرح خاکہ میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی خوبصورت مورت کس طرح تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی میں نے صرف زائد حصے کو علاحدہ کیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگاری کا ہوتا ہے وہ سوانح عمری میں زائد حصے کو اس طرح الگ کر دیتا ہے کہ شخصیت اپنے اصل روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے''۔خاکہ نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم نے کس قدر

پیاری بات کہی، وہ اپنی شخصیت میں بھی یہی خاصیت لیے ہوئے تھے۔
ناصؔر کاظمی نے اپنے اس شعر میں بھی خوبصورت لوگوں کے اٹھ جانے کاذکر خوبصور انداز میں کیا ہے۔

اُٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

اردو شاعری کی اثاث دلی اور لکھنوَ دبستان ہیں۔ دبستانِ دلی کی شاعری داخلیت پسندی کے گرد گھومتی ہے جس میں سوز وگداز، درد مندی، غم والم، تصوف، حسن و جمال، احساساتِ حسن، خوبصورت تشبیہات، شگفتگی وترنم، خلوص، سادگی، صداقت، خطابیہ انداز پایا جاتا ہے۔ دہلی اپنے اندر علم وادب، شعر و دانش کی ایک اچھوتی اور طویل تاریخ لیے ہوئے ہے۔ اس شہر کو شاعری، علم و دانش اور فن کا منبع ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس مٹی نے اردو زبان کے ایسے ایسے عظم شاعروں اور ادیبوں کا جنم دیا ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا نام آج بھی دنیائے اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ دہلی دبستان کا اپنا رنگ ہے، دہلی اسکول آف اردو غزل کی وسعت اور اثرات اردو شاعری پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں گے۔ دبستان دہلی نے میر تقی میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، میر حسن، داغؔ دہلوی، بیخودؔ دہلوی، مومن اور بے شمار عظیم شاعروادیب پیدا

کیے۔اس مٹی کی خصوصیات میں فارسی آمیز زبان، جذبات کا عشق اظہار، بے باکی، عشق مجازی، حزنِ و یاس، تصوف، سادگی اور اختصار کو کوئی سانی نہیں۔ مغلیہ دور سلطنت سے آج تک یہ شہر شاعری اور علم و دانش کے حوالے سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے "دہلی کا شاعر غمِ روزگار کا ستایا ہوا، غمِ عشق کا مارا ہوا، اسی لیے اس کے کلام میں دونوں کسک اور کھٹک پائی جاتی ہے۔ سیاسی حالات نے اسے قنوطی بنادیا، تصوف نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصوف عطا کیا"۔ ہر زمانے میں اس شہر نے اردو کی بڑی شخصیات کو جنم دیا ہے، غالبؔ اور ان جیسے دیگر شعراء نے اپنے لہو سے شعر، علم و دانش کے چراغ روشن کیے ہیں۔ اردو کی خدمت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے دہلی کے بارے میں یہ خوبصورت شعر کہے ۔

اے جہان آباد ! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش ترے بام در
ذرہ ذرہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں ترے خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہا کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

اردو کے اس گوہرِ آبدار ڈاکٹر خلیق انجم کا وطن شہر دہلی تھا وہ اسی شہر میں 22 اگست 1935ء کو پیدا ہوئے تھے اور اپنی اکیاسی سالا زندگی گزارنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُسی شہر دہلی کی مٹی کے ہو رہے۔ ان کا انتقال 18 اکتوبر 2016ء کو ہوا۔ ڈاکٹر خلیق انجم ہندوستان کے شہر دہلی میں ضرور رہتے تھے لیکن وہ اصل میں اردو زبان و ادب کے صفیر تھے، انہیں اردو سے عشق اور اردو بولنے والوں سے عقیدت تھی، اردو خواہ ہندوستان میں بولی جاتی ہو، پاکستان میں، بنگلہ دیش میں ، لندن میں یا امریکہ میں وہ ہر جگہ خوشی خوشی جاکر اردو کی ترقی، بقا، تحفظ اور شعر وادب کے سروں کو بلند کرنے میں اپنا حصہ ڈالا کرتے ، اسی طرح دنیا کے جس ملک اور شہر میں اردو بولنے والے تھے وہ ڈاکٹر خلیق انجم سے اس طرح پیار کرتے اور عقیدت سے پیش آیا کرتے جیسے وہ ان کے ہی ہم وطن ہوں۔ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی وفات کو ایسا ہی محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک پاکستانی ادیب و دانشور سے محروم ہوگئے ہوں۔ انہوں نے دہلی کالج سے اردو میں ایم کیا، 1950 میں کروری مل کالج دہلی میں استاد ہوگئے، لکھنے پڑھنے اور درس وتدریس کے ساتھ ساتھ خود بھی آگے بڑھنے کی جدوجہد کرتے رہے، 1962ء میں پی ایچ ڈی کرنے میں کامیاب ہوئے، 1972 میں دہلی میں محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر ہوگئے۔ انجمن ترقی ہند سے وابستہ رہے، جنرل سیکریٹری طویل عرصہ رہے۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت وہ انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر تھے۔ ادبی رسالہ 'ادبی تبصرے' دہلی مدیر رہے۔

جریدہ کتاب نمانے نے ''ڈاکٹر خلیق انجم ۔ شخصیت و ادبی خدمات'' بھی شائع کیا۔
ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت، علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے اردو دنیا تحقیقی عمل جاری رکھے گی، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر لکھا جائے گا اور تحقیق ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب کی جدائی سے دنیائے اردو میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اللہ تعالی مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ ڈاکٹر احمد علی برقی نے ڈاکٹر خلیق انجم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

تھے خلیق انجم ادیب خوش بیاں
اب نہیں ہیں جو ہمارے درمیاں
عمر بھر تھے مرجعِ دانشوراں
تھے وہ عملاً ناشر اردو زباں
ان کی ہیں معروف بزم آرائیاں
بزم اردو کی تھے وہ روح رواں
شہر دہلی میں تھے اڑتیس سال تک
مستقل وہ اردو گھر کے پاسباں
یاد آئیں گے وہ اہل ذوق کو
جن کے رشحاتِ قلم ہیں جاوداں

زیبِ تاریخِ ادب ہیں اُن کے کام
معترف ہے ان کی عظمت کا جہاں
دہلی کی تاریخ پر ان کی کُتب
آج بھی ہیں مرجعِ دیدہ وراں
اُن کی ہیں اسّی کتابیں یادگار
جن کا برقیؔ اعظمی ہے قدرداں
(یکم نومبر 2016)

قومی راز کا افشا ہونا اور پرویز رشید کی قربانی

سیاست کے رنگ بھی خوب ہیں یہ کبھی بندے کو آسمان پر اور کبھی دھڑام سے زمین پر دے مارتی ہے، نہیں معلوم کس لمحے کیا ہوجائے۔ میڈیا میں دھاڑتا، چلاتا، پروٹول کے ساتھ پریس کانفرنسیز کرتا، مخالفین کو للکارتا، ڈراتا دھمکاتا، ان پر لعن طعن کرتا، ہتک کرتا، پھبتی کستا، اب تو نوبت مغلظات تک آن پہنچی تھی۔ مخالفین پر گرجتا، برستا، سو سو صلاواتیں سناتا ہوا نظر آیا کرتا، ہر چینل پر ٹاک شو میں بلایا جاتا، اس کے سوا کسی اور کی بات کی اہمیت نہ تھی، حکومت کا نقطہ نظر بیان کرنے کا اختیار صرف اسی کو تھا۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ایک ایسا طاقت ور وزیر لحہ بھر میں سین سے ایسے غائب ہوجائے گا کہ جیسے وہ دنیا میں کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ سینٹر اور وزیر اطلاعات پرویز رشید کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے، اس سے قبل بھی کئی سیاسی ہیرو لحہ بھر میں زیرو بن چکے ہیں۔ عزت مآب جن کا اقبال بلند ہوتا ہے اپنے درباریوں کو قید کردینا تو دور کی بات انہیں قربان کرنے میں دیر نہیں لگاتے، لطفِ تماشہ یہ بھی ہے کہ درباری خوشی خوشی قربان بھی ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کا صدقہ دے رہے ہیں، وہ کچھ عرصہ اُسے درباریوں میں پھر سے شامل کرلیا جائے گا۔

پرویز رشید' لحہ موجود کے بادشاہ سلامت کے دربار کے سب سے چھیتے درباری تھے۔' انہوں نے یہ مقام یوں ہی حاصل نہیں کیا، کسی دوسری جماعت سے نواز لیگ میں نہیں آئے، نہ ہی وہ ق لیگ حصہ رہے، یہ ان درباریوں میں سے بھی نہیں کہ جنھوں نے پرویز مشرف کی حکومت میں وزارت کے مزے لوٹے، یہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں کہ جنھوں نے ڈکٹیٹر کی حکومت ختم ہونے کے بعد کچھ وقت ق لیگ میں گزارا اور میاں صاحب سے معافی طلب کرنے کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگادی۔ آخر میاں صاحب کو رحم آیا اور انہیں اپنے دربار کا حصہ بنا لیا۔ پرویز رشید صاحب جن کو تازہ تازہ قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے، پرانے ن لیگی ہیں، میاں صاحب کے وفادار اور جان نثار ساتھیوں میں سے ہیں۔ تب ہی تو انہیں حکومت کی سب سے اہم وزارت یعنی وزارت اطلاعات سونپی گئی۔ وزارت اطلاعات یا وزیر اطلاعات تو حکومت کی زبان ہوا کرتا ہے، حکومت کا ترجمان ہوتا ہے، حکومت کو جو بات بھی عوام تک یا اپنے مخالفین تک پہنچانا مقصود ہوتی ہے اپنے اسی اہم درباری کے ذریعہ پہنچاتی ہے۔ سرکاری ٹی وی یا سرکاری ریڈیو تو گویا وزیر اطلاعات کا اپنا زرخرید ادارہ ہوتا ہے۔ وہاں تو اس ایک چہرے کے علاوہ کسی اور کا چہرہ نظر ہی نہیں آتا۔ اب سوچنے اور غور و فکر کرنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہ سلامت نے اپنے سب سے قریبی، سب سے عزیز تصور کیے جانے والے درباری کی قربانی ہی کیوں اور کیسے دیدی۔ شواہد بتاتے ہیں کہ متنازع خبر کو لیک

کرنے کا معاملا انتہائی سنگین نوعیت کا تھا۔ اس کے شعلے اس قدر بلند ہو چکے تھے کہ اس بھڑکتی اور سلگتی آگ کو معمولی قسم کے فائر بریگیڈس سے قابو میں لانا مشکل ہی نہیں بلکہ نہ ممکن تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آگ ایک یا دو بیروکریٹس کی قربانی سے بھی مدھم نہیں ہوتی اس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے اس آگ کو اپنے دربار کے سب اہم درباری کو ہی قربان کرنا پڑا۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ قومی سلامتی کے امور کے حوالے سے جو اجلاس ہوا، اس اجلاس میں تو وزیر موصوف موجود ہی نہیں تھے۔ کیونکہ قومی سلامتی کے حوالے سے جو متنازع، پلانٹڈ اور من گھڑت خبر پرنٹ میڈیا کا حصہ بنی وہ اسی وزارت کے توسط سے یا وزیر موصوف کے علم کے ساتھ متعلقہ رپورٹر تک پہنچی۔ اس وجہ سے پرویز رشید صاحب ہی کو اس کوتاہی اور قومی سلامتی کے بارے میں معلومات قبل از وقت یا نہ مکمل یا بالکل غلط کسی ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر کو دینے کا ذمہ دار قرار ٹھہرایا گیا۔ ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے یہ خبر شائع ہونے سے روکنے کے لیے اخبار کی انتظامیہ یا متعلقہ ایڈیٹر سے رابطہ کر کے اسے رکوانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے اس حوالے سے حکومت کو آگاہ کیا۔ دنیا کے ممالک میں عام طور پر تو رواج یہی ہے کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہو تو اس واقعہ کا تعلق جس شعبے سے ہوتا ہے اس کا سربراہ یا وزیر مستعفی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ریل گاڑی کا کوئی بڑا حادثہ ہو جائے تو وزیر ریلوے مستعفی ہو جایا کرتے ہیں۔

ہوائی حادثہ ہو جائے تو

متعلقہ وزیر مستعفی ہوجاتا ہے لیکن ہمارے ملک میں اس قسم کی کسی روایت کا وجود نہیں ملتا، یہاں تو الٹا متعلقہ وزیر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس حادثے کی وجوہات بیان کرتا ہے۔ میاں صاحب اپنے اس بااعتماد، وفادار درباری کی قربانی کے حق میں نہیں تھے، چند بڑے درباروں نے میاں صاحب کو قائل کیا کہ ہو سکتا ہے کہ اس قربانی سے معاملا ٹل جائے اور ایسا ہی ہوا۔ قربانی دے دی گئی۔ کوتائی تو صاف نظر آ رہی ہے، قومی سلامتی کی حفاظت پر مامور ذمہ داران کو اس کوتائی کے خلاف سخت ردِ عمل کا اظہار کرنا پڑا، فوری طور پر آگ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے پرویز رشید صاحب کی قربانی دے کر یہ تاثر دیا گیا کہ معاملے کا سخت نوٹس لیا جارہا ہے۔ اعلیٰ اختیارات اور اعلیٰ حکام پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دینے کی باتیں بھی سامنے آئیں لیکن اس پر عمل تا حال نظر نہیں ہوا۔ انہی دنوں تحریک انصاف نے اسلام آباد بند کرنے کا اعلان کر دیا، احتجاج، جلسہ، جلوس، دھرنے کی حد تک تو بات مناسب تھی، کپتان جوش میں کچھ آگے ہی نکل گئے اور اسلام آباد بند کرنے کا اعلان کر ڈالا، جب دس لاکھ لوگ اسلام آباد میں جمع ہوجاتے تو اسے تو خود بہ خود بند ہو ہی جانا تھا، بند کرنے سے کپتان از خود پھنس گئے۔ حکومت کو سخت ایکشن کا موقع مل گیا، عدالت نے بھی کہہ دیا کہ ' احتجاج کا حق لا محدود نہیں'۔ 30 اکتوبر سے تاریخ 2 نومبر کر دی گئی، لوگ تیاری میں لگ گئے، 28 تاریخ کو شیخ رشید کی لال حویلی کو اسٹیج بنا کر جلسہ کرنے کا پروگرام بنا، جس میں کپتان نے بھی شرکت

کرنا تھی، حکومت نے اس احتجاج کو ناکام بنا دیا، اتنا ضرور ہوا کہ شیخ صاحب بہادرانہ کرتب دکھاتے ہوئے، کبھی پیدل اور کبھی موٹر بائیک پر جلسہ گاہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور مختصر خطاب بھی کیا۔ اس شو کو ٹریلر کہا گیا۔ اصل شو 2 نومبر کو ہونا تھا۔ لوگ بنی گالہ میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ گرفتاریاں ہوئیں اور حالات سنگین ہوجانے کے خطرات نظر آنے لگے۔ ممکن ہے کہ حکومت کی تمام تر توجہ کپتان کے اسلام آباد مارچ پر لگ گئی ہو، اب کیونکہ خطرہ ٹل گیا تھا، یوم تشکر بغیر کسی بدمزگی کے منا لیا گیا، معاملات نارمل ہوگئے، حکومت اور کپتان اور خیبر پختونخواہ کی حکومت کے مابین سنگین صورت حال پیدا ہوچکی تھی، پختونخواہ کے وزیر اعلیٰ اپنا قافلہ لے کر پنجاب میں داخل ہونا چاہتے تھے، حکومت نے انہیں باڈر پر ہی روک لیا، شیلنگ کی گئی، حالات خراب سے خراب تر صورت حال کی جان جارہے تھے۔ دونوں فریقین کا پارہ بلند ترین سطح پر پہنچا ہوا تھا، یہاں تک کہ کھلے عام ٹی سی پر غیر اخلاقی، بیہودہ،

لغو، خرافات، انٹ شنٹ اور اوٹ پٹانگ، اول فول جملے بازی عام ہوگئی۔ اسی خراب صورت حال میں پاکستان کی عدالت عظمیٰ کا کردار بہت اہم رہا، پاکستانی عوام کو عجیب و غریب قسم کے مخمصہ، تذبذب اور سراسیمگی کی کیفیت سے باہر نکالنے میں عدالت نے بنیادی کردار ادا کیا۔ آئندہ جو کچھ بھی ہو لیکن فوری طور پر عدالت کے عمل نے ملک کو بڑی مشکل سے نکال دیا۔ عدالت کے روبرو دونوں فریقین یعنی میاں صاحب اور کپتان کے وکیلوں

نے پاناما لیکس کی تحقیقات کے لیے جوڈیشل کمیشن کے قیام پر جس رضامندی کا اظہار کیا ہے وہ بھی سیاسی ماحول کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔ پوری قوم نے اس پر سکھ کا سانس لیا۔ عدالت نے دونوں فریقین کو صبر تحمل سے کام لینے کی ہدایت بھی کی۔ حکومت کی ہدایت پر دونوں فریقین اپنے اپنے سخت موقف سے دو قدم پیچھے چلے گئے، یعنی اسلام آباد کو بند کرنے کی کال واپس لے کر اس دن تشکر کا اہتمام مخصوص جگہ کرنے کا اعلان ہوا، حکومت نے فوری طور پر جن سڑکوں کو کنٹینر لگا کر بند کر دیا تھا، جگہ جگہ پولیس اور دیگر ایجنسیز کے لوگ عمران خان کے کارکنوں کے تعاقب میں تھے انہیں واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ اب حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ عدالت میں اپنے اوپر لگنے والے الزامات کے حوالے سے اپنا دفع کرے۔ قومی سلامتی کے حوالے سے جو بات انگریزی اخبار کی زینت بنی پھر میڈیا نے اس کی خوب خوب تشہیر کی اس جانب توجہ دے۔ جس بہ اختیار اور اعلیٰ حکام پر مشتمل افراد پر کمیٹی کی تشکیل کی بات کی گئ تھی وہ تشکیل دے کر تحقیقات کو حتمی شکل دے تاکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ جس شخص کو قربان کیا گیا ہے اگر وہ اور دیگر قصور وار ہیں تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے، اگر ان کی قربانی سیاسی قسم کی ہے تو انہیں دوبارہ حسب روایت دربار کی زینت بنا لیا جائے۔

کہتے ہیں کہ انسان کو بڑا بول کبھی نہیں بولنا چاہیے، تکبر اور گھمنڈ اللہ کو

پسند نہیں، وزیر موصوف کی بھڑکیں، دعوے، مخالفین کے بارے میں کیسی بیہودہ باتیں یہ کیا کرتے تھے۔ عمران خان نے جب تیس اکتوبر کو اسلام آباد بند کرنے کا اعلان کیا بعد میں تاریخ بدل کر 2 نومبر کردی گئی، اکثر چینلز نے وزیر موصوف کی وہ وڈیو متعدد بار چلائی جس میں وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے ہیں'' عمران خان 30 اکتوبر کو نہیں ہوگا''، اس جملے سے ان کی مراد کیا تھی، یہ تو وہ ہی بتا سکتے ہیں، عمران نے کہاں جانا تھا، دنیا سے چلے جانا تھا، ملک چھوڑ جانا تھا، سیاست چھوڑ جانا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات کے حوالے سے وہ لمحہ اللہ کو ناگوار گزرا اور پسند نہیں آیا، جس طرح انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس میں اس کی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔ 30 اکتوبر بلکہ 2 نومبر آیا، حالات بہت ہی پریشان کن تھے لیکن عمران خان زندہ ہے موجود ہے، پارٹی اس کی موجود ہے، وہ اسی طرح اس کا سربراہ ہے، اس کے برعکس، پرویز رشید ٹی وی چینلز سے، خبروں سے ایسے غائب ہوئے کہ جیسے بکرے کے سر سے سینگ ۔ان کی قربانی کا تعلق عمران کے احتجاج سے دور دور کا نہیں ،وہ تو قدرت کی طرف سے زیادہ سنگین معاملے کی گرفت میں آگئے۔ قبلہ پرویز رشید کے لیے اب یہی مشورہ ہے کہ اب اگر دربار میں واپسی ہو بھی جائے اور لگتا ہے کہ ایسا ہو جائے گا، مناسب ہوگا کہ وہ آئندہ بڑے بول نہ بولیں، بھڑکے لگانے سے گریز کریں۔ یہ کوئی پہلی قربانی نہیں اس سے قبل کئی نون لیگیوں کے ساتھ ایسا ہوچکا ہے، چرب زبان مشاہد اللہ ، کو قربان نہیں کیا گیا

رعنا ثناء اللہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا، پنجاب کے ایک اور رعنا جن کی قربانی ہوئی اب پھر سے پنجاب کی کابینہ میں وزیر ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دور میں بھی ایسی قربانیاں ہوچکی ہیں۔ حسین حقانی کو قربان کیا گیا۔ اس قسم کی سیاسی قربانی کا مقصد فوری طور پر آگ پر پانی ڈالنا ہوتا ہے اوراس عمل سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔آج حسین حقانی اور اس جیسے کتنے ہی معاملات سرد خانے کی نظر ہوچکے۔ ہماری سیاست یہی ہے۔ بات سیدھی اور سادہ سی ہے کہ پارٹی کا سربراہ اپنے گرد جن متوالوں کو جمع کرتا ہے، حکومت یا اقتدار کے حصول کے بعد بادشاہ سلامت اپنے اپنے درباریوں کو مختلف طریقے سے خوش کیا کرتے ہیں۔ انہیں اپنے لیے ہر کام کرنے پر آمادہ کرنا، نوازنے، اپنا گرویدہ بنانے، اپنا وفادار بنانے کے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں ان میں وزارت، سفارت، رکن اسمبلی، سینیٹر، پارلیمانی سیکریٹری، مشیر، معاون خصوصی، بوڑھے بوڑھوں کو اگر وفاداری کے پیمانے پر پورا اترتے ہیں تو کسی کو پی ٹی وی کا سربراہ، کسی کو ریڈیو پاکستان کا سربراہ، کسی کو پی آئی اے، کسی کو اسٹیل مل، کسی کو نیب، کسی کو پارٹی کا عہدہ تو کسی کو کچھ ، کسی کو کچھ الغرض مراعات کے ذریعہ حکمراں یا بااختیار لوگ اپنے وفاداروں ، قربانی کا بکرا بننے والوں ، درباریوں ، ان کے لیے جان دینے والوں کی پرورش کیا کرتے ہیں اور جب وقت پڑتا ہے تو وہ اپنے کسی نہ کسی درباری کو اسی طرح قربان کردیتے ہیں جس طرح پرویز رشید کو قربان کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کا

المیہ یہی ہے کہ یہاں جو بھی برسر اقتدار آیا اس نے اپنی یا پارٹی کی وفاداری کو ترجیح دی ، میرٹ اور صلاحیت کا گلا کاٹا۔ نون لیگ تیسری مرتبہ اقتدار میں آئی ، با صلاحیت لوگ اوپر نہیں پہنچ سکے۔ وجہ با صلاحیت شخص خوشامدی نہیں ہوگا، درباری نہیں بنے گا، غلط کو غلط ، صحیح کو صحیح کہے گا، یہ کسی لیڈر پسند نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ نون لیگ کو وزیر خارجہ کے لیے پورے پاکستان میں کوئی شخص نہیں ملا، لوگ تو بہت ہیں پر وہ با صلاحیت لوگ نون لیگ کے دربار سے وابستہ نہیں۔ صدر پاکستان ممنون حسین کی مثال اس حوالے کافی ہے ، جب صدر کے جیتنے کے آثار نہیں تھے تو جسٹس سعید الزماں صدیقی کو اپنا امیدوار بنا دیا لیکن جب صدر کے عہدہ کے لیے یقینی جیت تھی تو جسٹس صاحب نظر نہیں آئے یہاں وفاداری اور درباری ہونا ضروری قرار پایا، یہ صورت حال صرف نون لیگ میں ہی نہیں ہر سیاسی جماعت ایک آدھ کو چھوڑ کر یہی حال ہے۔ ٹیلنٹ اور صلاحیت کو لیڈر پسند نہیں کرتے. تحریک انصاف کا یہی حال ہے کیا جسٹس ر) وجیہ الدین با صلاحیت نہیں ، مخدوم جاوید ہاشمی پرانا سیاست دان اسی طرح اور) کپتان کے ساتھ نہیں چل سکے۔ کپتان کو ان کی پروا بھی نہیں۔ جب تک صلاحیت ہماری سوچ کا مہور اور منبع نہیں بنے گی، جب تک ہم میرٹ کو فوقیت نہیں دیں گے ، ہمارے ملک کی سیاسی صورت حال اسی قسم کی رہے گی۔

ایک راجستھانی کی کہانی خود اس کی زبانی

مَیں بنادی طور پر راجستھانی ہوں۔ میرے پرکھوں کی سرزمین رجستھان کی ریاست بیکانیر تھی۔ غزنوی حکمران نے جب بھٹنیر پر حملہ کیا تو میرے خاندان کے جدِ امجد بھٹنیر (موجودہ بیکانیر) سے دہلی منتقل ہو گئےاور دہلی سے منسلک شہر کھڈی ضلع شکار پور کو اپنا مسکن بنایا۔ بعدہ یوپی میں ضلع مظفر نگر کو آباد کیا اور قیام پاکستان تک اسی سرزمین کو آباد کیے رکھا۔ اس حوالے سے مجھے راجستھانیوں سے دلی لگاؤ، اور ان سے پیار و محبت کا رشتہ ہے۔

مَیں گزشتہ چار دیہائیوں سے قلم و قرطاس سے وابستہ ہوں، لکھنے لکھانے کی رفتار کبھی تیز کبھی سست اور کبھی بہت ہی دھیمی لیکن لکھت کا دھارا کبھی جامد نہیں ہوا، ایسی شخصیات پر زیادہ لکھا جنہیں دیکھا، پرکھا، محسوس کیا، ان پر بھی لکھا جنہیں کبھی نہیں دیکھا صرف پڑھا اور محسوس کیا۔ لکھنے کے حوالے سے میرا نقطہ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جس چیز میں سچائی نظر آئے، بھلائی دکھائی دے، نصیحت کا یا کچھ سیکھنے کا کوئی پہلو سات پردوں میں چھپا ہو نظر آئے اسے سامنے لانے کی سعیَ کی جائے، ساتھ ہی یہ مقصد بھی کہ جو کچھ پروردگار نے صلاحیت پیدا کردی ہے اس سے مخلوق انسانی کو فیض پہنچے، میری

نظر میں یہ بھی مخلوق کی خدمت ہے کہ کسی بھی شخصیت میں پنہا معمولی معمولی خوبیوں کو، صلاحیتوں کو عام کیا جائے۔

میرے ایک دوست تھے انعام اختر بھوجانی، ان کی بیگم کا نام تھا روبینہ اختر فرید۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں لیاری کے علاقے آگرہ تاج کالونی میں رہائش پذیر تھا اور میرے زیادہ تر تعلقات اسی علاقے کے مکینوں کے ساتھ تھے۔ میری ملازمت بھی لیاری کے ایک کالج میں تھی اس وجہ سے میں لیاری کے لوگوں کے ساتھ اس قدر گھلا ملا ہوا تھا کہ میرا اوڑھنا بچھونا وہی لوگ ہوا کرتے تھے۔ مسٹر بھوجانی قدیم کراچی کے علاقے رنچھوڑ لائن کے باسی تھے۔ لیاری کے سماجی کاموں کے حوالے سے ہم ایک دوسرے کے نذدیک آ گئے تھے۔ 1988ء میں نے لیاری کو خیر باد کہا اور عبد اللہ ہارون گورنمنٹ کالج سے بھی تبادلہ گورنمنٹ کالج برائے طلبہ، ناظم میں ہوگیا۔ اب لیاری کے احباب سے راہ و رسم رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی یہاں تک کہ ختم ہی ہو گئی۔ میں ریٹائر منٹ کے بعد سرگودھا یونیورسٹی اور پھر سعودی عرب چلا گیا۔ میرے دوست کی بیٹی نے میرے مضمون کا انتخاب کیا اور وہ سرسید کالج میں پڑھتی رہی، اسے کتاب اور کتب خانوں سے زیادہ ہی انسیت تھی چنانچہ اس نے میری کتابوں کا مطالعہ کیا اور انٹر اور بی اے تک میری ہی کتابیں پڑھیں تو وہ میرے نام سے بخوبی آشنا ہو گئی لیکن اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے والد اور میں باہم دوست رہے ہیں۔ میں اکثر

سرسید کالج پریکٹیکل لینے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس بچی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے تفصیل بتائی، ساتھ ہی اپنے والد کا نام اور دیگر تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ یہ تو میرے عزیز دوست کی اکلوتی بیٹی اور اپنے جڑواں بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ اس نے صرف میری تصانیف کا مطالعہ ہی کیا تھا۔ یہ اس کی سعادت مندی کہ وہ مجھے اپنا استاد تصور کرتی تھی حالانکہ میں نے اسے کلاس میں باقاعدہ نہیں پڑھایا تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ لائبریری سائنس کا کوئی کورس بھی لیاقت لائبریری میں ہوتا ہے، تو اس نے وہا بھی داخلہ لے لیا اب وہ میری باقاعدہ شاگرد ہو چکی تھی۔ اس کے والد کا بہت جلد انتقال ہوگیا تھا، مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ ایک دن میں نے اس سے اس کے والد اور اپنے دوست کے بارے میں پوچھا کہ یہ حادثہ کب اور کس طرح پیش آیا۔ اس کی زبانی اس کی اور اس کے خاندان کی جو کہانی سنی تو طبیعت اس جانب مائل ہوئی کہ اس بچی کی باتوں میں سچائی ہے، دکھ ہے، کسک ہے، کھٹک ہے، ٹیس ہے، چبھن ہے، درد ہے۔ میں نے اس کی دکھ سکھ بھری داستان کو اس کی زبانی سنا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس درد بھری کہانی کو قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کروں۔ حال ہی میں میرے ایک سید سبطین رضوی کا انتقال ہوا تو مجھے یکایک بھوجانی یاد آگیا، ساتھ ہی اس کی بیٹی کی سنائی ہوئی درد بھری داستان بھی تازہ ہو گئی۔ جو باتیں یاد رہ گیں تھیں ان کی بنیاد پر میں نے اس درد بھری کہانی کو قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے دوست کو یہ بھی ایک طریقہ ہے خراج تحسین پیش کرنے کا۔ میں

نے اپنے دوست سبطین رضوی کو ایک مضمون کے ذریعہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مقصد اس تحریر کا مقصد یہ کہ دنیا میں ایسے باہمت لوگ بھی ہیں جن پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ جائے تو وہ ثابت قدم رہتے ہیں۔ اندر سے چاہے ٹوٹ پھوٹ چکے ہوں لیکن دنیا کے سامنے اپنی اس ٹوٹ پھوٹ کا اظہار نہیں کرتے۔ یہ بھی کہ ہمیں اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکانا ہے، جو وہ کرتا ہے ہمارے لیے وہی بہتر ہوتا ہے۔

انعام اختر بھوجانی مرحوم کے خاندان نے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کی اور کراچی کو اپنا ٹھکانا بنایا، پاکستان اور بھارت جب ایک دوسرے سے 1965ء کی جنگ میں مصروف تھے تو انعام اختر بھوجانی اس دنیا میں وارد ہوئے۔ یہ خاندان بنیادی طور پر راجستھانی ہے اور راجستھان کے علاقے جیسل میر میں آباد تھا۔ راجستھانی ہونے کے ناتے یہ خاندان میرا ہم وطن بھی ہو۔ 'بھوجانی' کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کئی سو سال قبل راجستھان کی سرزمین میں ایک خاندان آباد تھا ان میں سے ایک شخص کا نام 'بھوجا' تھا، یہ اس وقت کے حکراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا، بھوجا سے مراد کھانا کھلانے والا، خیرات بانٹنے والا، غریبوں کی مدد کرنے والا ہے۔ اس خاندان کے بزرگ 'بھوجا' اپنی خوبیوں اور اچھائیوں، لوگوں کی مدد کرنے کی وجہ سے بھوجانی ہو گئے اور اس خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ بطور خاندانی نام

بھوجانی لگانے لگ گئے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انعام اختر بھوجانی مرحوم جوان ہوئے تو روبینہ اختر فرید مرحومہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ زندگی کی خوشیاں دوبالا ہوئیں، خوشیوں نے دونوں کی زندگی میں ایک نئی روح بھونک دی۔ روبینہ اختر ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ باوجود اس کے کہ مالی ضروریات نہیں تھیں انھوں نے درس وتدریس کے پیشہ کو اپنا مستقبل بنایا اور اسکول کی ٹیچر سے وہ ہیڈ مسٹریس کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے سرفراز کیا تو خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ پروردگار نے ایک نہیں بلکہ دو جڑواں بیٹے دیے، خوشی اور بھی دوبالا ہوگئی، لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ قائم نہ رہی اور یہ دونوں بیٹے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ باغ باں افسردہ ہوگیا، کلی مرجھا گئی لیکن استاد تو دوسروں کو تسلی و تشفی دیا کرتا ہے، دونوں نے اس فیصلہ کو اللہ کا فیصلہ سمجھتے ہوئے قبول کیا، ماں نے اپنے دل کے ٹکڑوں کی جدائی کو درد و کرب کے ساتھ، حوصلے اور ہمت کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن ایک انجانے خوف نے ان کے دل میں مستقل گھر کر لیا تھا کہ اب ان کے ہاں جڑواں اولادیں ہی ہوا کریں گی۔ یہ خوشی کی بات بھی تھی اور ڈر و خوف کی علامت بھی۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد اللہ کے حکم سے روبینہ اختر کی پھر سے گود ہری ہوئی، اب وہ خوش بھی تھیں اور پریشان بھی۔ اللہ کے حکم کے آگے کس کی کیا مجال کہ وہ اف بھی کرے۔ اس بار اللہ نے ایک بیٹی اور بیٹا عطا کیا، دونوں دنیا میں آئے تو معلوم ہوا کہ دونوں بہن بھائی پیر کی ایک ایک انگلی

سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا بھائی کو بہن سے اور بہن کو بھائی سے اس قدر محبت کے دنیا میں ہاتھ پکڑ کر ہی نہیں بلکہ پیر کی ایک انگلی کو باہم جوڑ لیا کہ کہیں دونوں میں سے کسی ایک کو پہلے نہ نکال لیا جائے۔ دونوں صحت مند تھے لیکن دنیا میں اس طرح کا ساتھ ممکن نہیں تھا، چنانچہ ڈاکٹروں نے دونوں کی پیر کی ایک ایک انگلی جو سامنے کی جانب سے جڑی ہوئی تھی علیحدہ کردیں لیکن دونوں بہن بھائیوں کی محبت اور ایک دوسرے سے عقیدت کا عالم کہ ایک کے حصے میں انگلی میں موجود گوشت آیا جب کہ بھائی کی انگلی میں صرف ہڈی آئی۔ اللہ نے دونوں کو زندہ رکھا اور دونوں بڑے ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر دو جڑواں بیٹے ہوئے اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آٹھ سال بعد اللہ نے اس جوڑے کو پھر سے خوشیاں دکھائی اور روبینہ اختر کو ایک بیٹے سے سرفراز کیا، روبینہ بہت حیران اور پریشان تھی کہ اس بار ایک ہی کیوں؟ روبینہ اختر کا یہ بیٹا صرف پانچ سال اپنی زندگی لکھوا کر لایا تھا۔ روبینہ اختر نے تین بار جڑواں بچوں کو جنم دیا، جس میں ان کے کل 6 بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی، ان میں چھ بیٹوں میں سے پانچ اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس ماں کے دکھ کا کیا عالم ہوگا، اس کا احساس کوئی نہیں کرسکتا، دونوں میاں بیوی کو پانچ بیٹوں کی جدائی نے اندر سے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی، دونوں افسردہ رہنے لگے تھے، دنیا سے دل اکتا گیا تھا، کسی سے کچھ نہ کہا لیکن دونوں نے خاموشی سے واپسی کی تیاری شروع کردی، کسی کو اس کی خبر نہ تھی کہ دونوں نے کیا ارادہ کر لیا ہے

اور وہ بہت جلد ایک ایسے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں کہ جہاں سے کوئی دوبارہ واپس نہیں آتا۔ دونوں ایک دوسرے سے پہلے جانے کا دعویٰ کیا کرتے ۔ ایک کہتا کہ میں پہلے جاؤں گا دوسرا فریق کہتا کہ نہیں میں پہلے جاؤں گی۔ یہی ہوا روبینہ اختر نے پہل کرتے ہوئے 25 فروری 2012ء کو دنیا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ باغ باں حیران و پریشان کرے تو کیا کرے،اسے اپنی شریک سفر کی جدائی کا ایسا غم لگا کہ اس نے سوا سال مشکل سے پورا کیااور اپنی بیٹی یازمہ اور اکلوتے بیٹے شہیم بھوجانی کو اکیلا چھوڑ کر دنیا کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی۔ انعام اختر بھوجانی بھی مختصر علالت کے بعد 12 جون 2013ء کو دنیا سے رخصت ہوگئے ۔ میاں بیوی کا لازوال تعلق ،دنیا میں کس قدر قربت کا، محبت کا، ایک دوسرے کے خیال کا ہوگا جب ہی تو دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی کی جدائی کو برداشت نہ کرسکا اور چند ماہ بعد ہی اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ انعام اختر بھوجانی اور روبینہ اختر اپنے بیٹے شہیم اور بیٹی یازمہ کو تنہا چھوڑ کر ملک عدم کو کوچ کر گئے ۔ اس وقت ان بچوں کی عمریں 17،18برس تھیں۔ یازمہ کی پرورش اس کی نانی اور نانا نے کی ، بلکہ وہ انہیں کہ گھر پلی بڑھی جب نانا اور نانی کا انتقال ہوگیا تو یہ اپنے امی اور ابو کے گھر منتقل ہو گئی۔ اس وقت سے دونوں بہن بھائی تنہا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شہیم اب سول انجینئر ہے جب یازمہ بی اے کرچکی ہے، اس دوران اس نے عالمہ کا کورس بھی کیا۔ وہ ایک بہ ہمت اور بولڈ لڑکی ہے، حالات کا مقابلہ کرنا اچھی طرح جانتی ہے، اس کے

چھوٹے قد نے اس کے لیے کچھ مشکلات ضرور پیدا کیں لیکن ان مشکلات کا اس نے حوصلے اور ہمت سے مقابلہ کیا۔ بے باک، نڈر اور صاف گو ہے اس کی اس عادت کو بعض لوگ پسند بھی نہیں کرتے لیکن اس نے بڑوں کی تکریم میں کبھی کوتاہی نہیں آنے دیتی۔ بزرگوں کا حد درجہ احترام کرتی ہے، چھوٹا کا خیال رکھتی ہے۔ اس کم عمری میں گھر کا بوجھ اٹھانا معمولی بات نہیں، یہ کم عمری میں وہ تمام کام بھی کرتی ہے جو بڑی بوڑھی عورتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، اس لیے کہ یہ اس کی مجبوری بھی ہے۔ یہ وہ کام بھی کرتی ہے جو مردوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، اس خاندان پر مشکلات اور غم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن اللہ نے ثابت قدم رکھا اب یہ گھر رفتہ رفتہ اپنی منزل کی جانب گامزن ہے امید ہے بہت جلد دونوں بہن بھائیوں کی زندگی میں پھر سے بہار آئے گی، موسم خوش گوار ہوگا، خوشیاں آئیں گی لیکن انعام اختر بھوجانی اور روبینہ اختر فرید کی کمی سب سے زیادہ ان کی اولاد ہی کو ہوگی۔ اللہ انہیں صبر جمیل عطا کرے۔ اتفاق یہ کہ جب میرے اس دوست کا سانحہَ ارتحال ہوا تو میں سعودی عرب میں تھا۔

ذیابیطس (شوگر) کا عالمی دن '14 نومبر

14 نومبر کو دنیا میں ذیابیطس (شوگر) کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ یہ دن پہلی مرتبہ 1991 میں منایا گیا۔ ذیابیطس سے متعلق آگاہی اس دنیا کو منانے کا بنیادی مقصد ہے۔ 14 نومبر کے انتخاب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انسولین جو ذیابیطس کے مریضوں کی اہم دوا ہے کے موجد بین ٹین تھے۔ بین ٹین کا یوم پیدائش 14 نومبر ہے اس مناسبت سے اس تاریخ کو ذیابیطس کا عالمی دن منایا جانے لگا۔ دنیا بھر میں اس مرض کے بارے میں آگاہی کے حوالے سے اس دن آگاہی کے پروگرام، سیمینار، کانفرنسیز منعقد کی جاتی ہے جن میں ماہرین اس مرض میں مبتلا افراد کو مرض سے بچاؤ احتیاطی تدابیر، دوا، علاج، پرہیز کے بارے میں آگاہی فراہم کی جاتی ہے۔ دنیا بھر، میں ایسے بے شمار تنظیمیں ذیابطیس سے آگاہی پر کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں بھی کئی ادارے اور تنظیمیں ہر سال 14 نومبر کو ذیابطیس سے آگاہی کے پروگرام ترتیب دیتی ہیں۔ اس موضوع پر میں نے جون 2015 میں ایک مضمون ''روزہ اور ذیابیطس شوگر) کے مریض'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو سوشل میڈیا کی ایک ویب سائٹ) ہماری ویب' پر آن لائن ہے۔ اس وقت رمضان المبارک تھے چنانچہ اسی مناسبت سے یہ مضمون تحریر کیا گیا تھا۔ یہ تحریر میرے اُسی مضمون کی بنیاد ہے۔

ذیابیطس (شوگر) کا مرض اب عام ہو چکا ہے۔ دنیا میں اس مرض میں مبتلا لوگوں کی تعداد تقریباً 415 ملین سے زائد ہے۔ گویا کل آبادی کا 10.7 فیصد ذیابیطس کا شکار ہیں۔ پاکستان میں اس مرض میں مبتلا افراد کی تعداد 80 لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ پاکستان دنیا میں 7 ویں نمبر پر ہے جہاں ذیابیطسکا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ آئندہ 15 سالوں تک ہمارا ملک اس مرض کے حوالے سے پانچویں نمبر پر آسکتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں 2040 تک 642 ملین ہو جائے گی ۔ مرض خواہ کوئی بھی ہو مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مرض کے بارے میں جس میں وہ مبتلا ہوچکا ہے آگاہی حاصل کرے۔ سارے ہی مرض تکلیف دہ ہیں لیکن ذیابیطس یا شوگر کا مرض مریض کو دیمک کی طرح خاموشی سے، آہستگی سے اس طرح متاثر کرتا ہے کہ مریض صرف ذیابطیس (شوگر) کا مریض ہی نہیں رہتا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ کئی دیگر امراض میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے جس میں آنکھوں کا متاثر ہونا، دل کی تکلیف ہو جانا، ٹانگوں میں مسلسل درد رہنا، پیر یا انگلیوں میں ہو جانے والے زخموں کے باعث انگلی حتیٰ کہ پیر اور ٹانگ کا کاٹ دیا جانا ، گردوں کا متاثر ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام خطرناک باتوں کے باوجود ذیابیطس (شوگر) کے مریض اگر اپنے مرض کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرلیں تو ان تمام خطرناک قسم کی پیچیدگیوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ مختلف اداروں کے زیر اہتمام ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کو آگاہی کے مختلف پروگرام

ترتیب دیے جاتے ہیں، مختلف تنظیمیں اس حوالے سے کتابیں اور کتابچے بھی شائع کرتے ہیں۔پروگراموں میں شرکت کرکے اور کتابچے حاصل کرکے ہم اس مرض کی پیچیدگیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاؤیونیورسٹی قائم ہے، نیشنل ایسوسی ایشن آف ذیابیطس اینڈ ایجوکیٹر آفNIDE کے تحت ایک ادارہ بھی کام کررہا ہے، اس ادارے نے 'برائٹ' کے نام سے ایک رہنما(NEDP) پاکستان کتابچہ بھی تیار کیا ہے، اس کے علاوہ میر خلیل الرحمٰن سوسائٹی، پاکستان اینڈو کرائن سوسائیٹی، لیاقت نیشنل ہسپتال بھی سرگرم عمل ہے۔اکثر مارین ڈاکٹرز نے ذیابیطس شوگر) کی رہنمائی کے لیے کتابچے بھی تحریر کیے ہیں جیسے پروفیسر ڈاکٹر عیص محمد نے) حِفظانِ صحت اور مُہلک امراض سے بچنے کے ابدی اصول' کے عنوان سے کتابچہ تحریر کیا جو ایک اچھی کوشش ہے۔

ذیابیطس (شوگر) کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ان تین اقسام سے پہلے ایک مرحلہ یا ہوتا ہے۔اس اسٹیج کوPre-Diabeties اسٹیج ذیابیطس (شوگر) سے پہلے

کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس مرحلہ میں Impairedglucose tolerance شوگرلیول نارمل سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ ابھی ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کی صف میں داخل نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کے لیے خطرے کا نشان ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کی فہرست میں شامل ہوجائیں گے۔ اس اسٹیج میں مریض کو پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں اسے چاہیے کہ وہ

کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور اپنے شوگر لیول کو دوا کے بجائے خوراک یعنی پرہیز اور ورزش کے ذریعہ کنٹرول کر لے۔ ذیابیطس (شوگر) کی پہلی قسم کو ٹائپ 1 ذیابیطس (شوگر) کہتے ہیں۔ جس میں انسان کا لبلبہ بہت کم انسولین پیدا کرتا ہے یا بالکل ہی نہیں کرتا۔ عام طور پر ٹائپ 1 کے مریضوں کی عمر 20 سال کے اندر اندر بتائی گئیں ہیں۔ بچے یا جوان، ماہرین نے اس قسم کے مریضوں میں ذیابیطس (شوگر) کو موروثی genetic قرار دیا ہے۔ جن لوگوں کو ٹائپ 1 ذیابیطس (شوگر) ہوتی ہے یہ ان کی زندگی کی ساتھی کے طور پر ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس قسم کی ذیابیطس (شوگر) کے مریض دوا میں انسولین کا استعمال کرتے ہیں، غذا، پرھیز وار ورزش پر خاص توجہ دیتے ہوتے Insulin - dependent diabetes (IDDM) ہیں۔ اس قسم کے مریض ہیں۔ ذیابیطس (شوگر) کی ٹائپ 2 عام طور پر ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا وزن زیادہ ہوتا ہے، خوش خوراک ہوتے ہیں، ان کا کام دن دن بھر بیٹھے رہنا ہوتا ہے، ورزش بالکل نہیں کرتے، عموماً بڑی عمر کے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں لیکن اب یہ موروثی genetic بھی ہوتی ہے، بچوں میں بھی اس قسم کو دیکھا گیا ہے۔ تقریباً 90 فیصد ذیابیطس (شوگر) کے مریض ٹائپ 2 ہی کے ہوتے ہیں۔ یہ Non-Insulin dependent diabeties (NIDDM) مریض کہلاتے ہیں۔ ٹائپ 3 وقتی طور پر حاملہ خواتین کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ان کے جسم میں ہونے والی غیر معمولی محرکات ہوتے ہیں۔ یہ عارضی طور پر ہوتی ہے جوں ہی خواتین اس عمل سے فارغ ہوتی ہیں ان کا شوگر لیول خود بخود اصل حالت پر آ جاتا ہے۔

مرض کی شدت کے اعتبار سے ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کو چار گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ ان گروپس میں 'کم ترین شدت والے مریض'، 'درمیانی شدت والے مریض'، زیادہ شدت والے مریض' اور' انتہایہ شدت والے مریض'۔ ٹائپ 1 کے مریض کم' ترین شدت کے گروپس میں آتے ہیں، ایسے مریضوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ان مریضوں کی شوگر کنٹرول میں رہتی ہے، چاہے وہ خوراک وپرہیز، دوا اور ورزش سے کنٹرول کرتے ہوں، ٹائپ 3 جن میں حاملہ خواتین ہوتی ہیں وہ بھی اسی گروپس میں شمار کی جاتی ہیں۔ ٹائپ 2 درمیانی شدت والے مریض ہوتے ہیں جن کی شوگر فوری معلوم ہوئی ہو اور ان کی شوگر کنٹرول میں نہ ہو، اس ٹائپ اور گروپس میں وہ مریض بھی شامل ہوتے ہیں جو انسولین کا استعمال کرتے ہیں۔ انسولین استعمال کرنے والے اس بات کو یقینی بنائیں کہ انہیں کتنی اور کب کب انسولین لینا ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر انسولین کے ڈوز کو خود سے کم یا زیادہ نہ کرے۔

ہمارے جسم کو تندرست و توانا رکھنے اور زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہ ہمیں (glucose) جس ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے اسے شوگر کھانوں میں جیسے روٹی، ڈبل روٹی، پاستا، چاول، آلو، پھلوں اور سبزیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جو ہمارے جگر اور پٹھوں کو مضبوط اور کام کے قابل بناتا ہے۔ شوگر کے استعمال کے لیے ہمارے جسم کو انسولین کی ضرورت ہوتی ہے

۔انسولین انسانی جسم میں شوگر لیول کو کنٹرول میں رکھتی ہے۔انسولین ایک ہارمون ہے جوایک گلینڈ ' لبلبہ ' سے خارج ہوتی ہے۔لبلبہ کے غیر فعال ہوجانے کی وجہ سے انسولین کا اخراج کم یا ختم ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے انسانی جسم میں شوگر زیادہ ہوجاتی ہے۔

ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو صرف شوگر لیول کا ہی خیال رکھنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ذیابیطس (شوگر) کے مریض کو ایک خاص مقدار میں پانی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔اگر مریض پانی کی مطلوبہ مقدار نہیں پیئے گا تو اس کے گردے متاثر ہوں گے ۔ اسی طرح اگر ذیابیطس (شوگر) کا مریض دل کا بھی مریض ہے تو اسے بھی خاص طور پر گرمی کے موسم میں اپنے خون کو ایک خاص حد تک پتلا رکھنے کی ضرورت ہوگی ۔ جو دوائیں وہ اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہو انہیں جاری رکھے۔ایسی خوراک کا استعمال نہ کرے جو خون کو گاڑھا کرتی ہیں۔زیادہ گھی یا تیل اور تلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کرے۔

ذیابطیس کے مرِض پراٹھے کھانیب سے گریز کریں، ممکن ہو تو اولو آئل (olive oil) کا استعمال کیا جائے۔ سادہ روٹی پر اولو آئل لگا لیا جاے، بعض لوگ ناشتہ میں ڈبل روٹی کا استعمال کرتے ہیں، ذیابطیس (شوگر) کے مریض سادہ غذا کا استعمال کریں نیز کم نہ کھائیں، پیٹ بھر کر کھائیں تاکہ پورا دن آرام سے گزر جائے۔ پانی جتنا پی سکتے ہوں پی لیں۔ فجر میں بیدار ہوں، نماز وتلاوت کے بعد ناشتہ کرکے فوری سونے سے گریز کریں

کیوں کہ آپ نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے اگر آپ فوری سو گئے تو طبیعت خراب ہونے کا، ڈر ہے۔ تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد سو جائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عیص محمد نے اپنے کتابچے 'حفظانِ صحت اور مُہلک امراض سے بچنے کے ابدی اصول' میں ذیابیطس (شوگر) کے مریضوں کے لیے خوراک کے متعلق جو ہدایات درج کی ہیں حسب ذیل ہیں :

ذیابطیس کے مریضوں کو کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا پھل جو نہ لیں :

☆آم، انگور، کیلا، گرما، شکر قندی، جاپانی پھل، انجیر اور کھجور میں کافی شوگر ہوتی ہے ۔گنا، گنے کا رس، گنڈیریاں بھی نہ لیں۔

کھانے کی اشیاء جو نہ لیں : سری پائے، کلیجی، مغز، گردے، گوشت گائیں، بھینس، اونٹ) مٹھائیاں، سوڈے کی بوتلیں، اگر بلڈ پریشر نہ ہو تو سوڈے کی) بوتل لی جاسکتی ہے۔ چینی چائے کے چھوٹے چمچے کے برابر) لے سکتے ہیں،Dietڈائیٹ اب تو کینڈریل اور دیگر شوگر کے مریضوں کے لیے دستیاب ہیں ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسکوش یا شربت (اب شوگر فری شربت دستیاب ہیں) نہ لیں، شہد کا ایک چھوٹا چمچہ لے سکتے ہیں، جام، مالمیڈ، پراٹھے، حلوہ پوری، مربہ نہ لیں، سن فلاور، اولو آئل یا مکئی کا تیل استعمال کریں، وہ بھی زیادہ نہ ہو، چپاتی ہلکی ہو، جام مالمیڈ یا مٹھائی اور بسکٹ اگر ڈائٹ بغیر

چینی کے ہوں تو معتدل مقدار میں لے سکتے ہیں۔

پھل جو لے سکتے ہیں : سیب ، آڑو، جامن، کنو، مالٹا، موسمی، فالسہ، بیر سبزیاں جو لے سکتے ہیں : بھنڈی، ٹینڈ، کریلا، بند گوبی، گیا کدو، گھیا توری، پیاز، لہسن، ادرک، ترئی، کھیرا، سلاد، مٹر، گاجر، مولی، شلجم، گوبھی، ساگ، پالک، بھی لے سکتے ہیں۔ ٹماٹر، شملہ مرچ بھی لے سکتے ہیں۔ تاہم اگر خون میں Uric Acid زیادہ ہے تو پھر ٹماٹر، ساگ، پالک، کافی، چائے، سوڈے کی بوتلیں اور کلیجی نہ لیں۔

دال، مونگ، مسور، (چنے کی دال درمیانی مقدار میں) لے سکتے ہیں۔ اگر بلڈ پریشر نہ ہو تو کبھی کبھی سموسہ، پکوڑے، نمکین بسکٹ بھی لے سکتے ہیں۔ ذائقہ میٹھا کرنے کے لیے Sucral پاوڈر یا گولیاں استعمال کریں۔ Candrel گولیا یا Sweetol یا Sweetex گولیا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ذائقہ نمکین کرنے کے لیے سالن میں تھوڑا لیمو یا سرکہ ڈال لیا کریں، تاہم اگر بلڈ پریشر نارمل ہے تو پھر نمک کے پرہیز کی ضرورت نہیں۔

خشک میوہ جات میں چار یا پانچ دانے بادام، دو یا تین اخروٹ ہفتے میں دو یا تین بار لے سکتے ہیں، تاہم یہ لینے ضروری نہیں، اگر عادت ہے تو لے سکتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریض کو میٹھے بسکٹ یا چینی جیب میں رکھنی چاہیے تاکہ اگر کسی وقت شوگر کم ہو جائے تو یہ فوری لے

لیں۔

ذیابطیس کے لیے کچھ ہدایات

۱۔ مریض اپنے گھر میں خون میں شوگر کا چیک اپ کریں۔اس مقصد کے لیے میڈیکل اسٹورز پر گلوکومیٹرز دستیاب ہیں، جن کا استعمال بہت ہی آسان ہے۔ مریض گلا کو میٹر میں لگی سوئی کیس دوسرے کے لیے استعمال نہ کریں۔

۲۔ورزش کا ہتمام کریں، ضرورت سے زیادہ نہیں۔ بعض مریض لمبی لمبی واک کرتے کبھی اپنے لیے کبھی اپنے ساتھ رہنے والے ساتھی کی خاطر کئی کئی میل پیدل چلتے ہیں۔ مریض کو اپنا خیال کرتے ہوئے ورزش کرنی چاہیے۔

۳۔ تمباکو نوشی سے پرہیز کریں

۴۔ دانت، مسوڑوں، آنکھوں، پیر، انگلیوں، دل اور گردوں پر خاص نظر رکھیں اور جس چیز کا ٹیسٹ ہوتا ہوں اسے کبھی کبھار کراتے رہیں۔اپنے پیر اور انگلیوں کو روز ہی دیکھیں، اچھی طرح دھوئیں، انہیں کسی سخت چیز سے دھونے یا مانجھنے کی ضرورت نہیں، ہلکے ہاتھ سے، کسی اچھے صابن سے دھویں اور مناسب لوشن کا استعمال کریں۔

۵۔اپنے ناخن احتیاط سے کاٹیں، اس طرح کے آپ کی کھال نہ کٹ جائے۔

۶۔ ننگے پاؤں چلنے سے گریز کریں، جرابیں پہنیں، کاٹن کے موزے استعمال کریں۔

۷۔ جوتے نرم، ملائم اور آرام دہ استعمال کریں۔ ممکن ہو تو ایسے جوتے نہ

پہنے جن میں کیل کا استعمال کیا گیا ہو۔

۸۔ ذیابیطس کے مریض کو اپنی جیب میں ایک کارڈ یا کاغذ رکھنا چاہیے جس پر لکھا ہو کہ "مَیں ذیابیطس کا مریض ہوں، اگر مَیں بے ہوش ہو جاؤں تو مجھے نزدیکی اسپتال میں لے جائیں"۔ ذیابیطس کے مریضوں کو تنگ جوتے اور تنگ جرابیں نہیں پہننی چاہئیں۔ لیکن آرام دہ بند جوتا کا استعمال مناسب ہے۔

ماہرین کے مطابق ناشتہ سے پہلے (فاسٹنگ) 80 سے 110، دو گھنٹے بعد (رینڈم) سے 140 تک، 12 بجے کے قریب 120 سے 180 تک شوگر لیول مناسب قرار100 دیا گیا ہے۔ مریضوں کے لیے ضروری ہے کہ اس مرض سے خوف زدہ نہ ہوں، اس کے لیے لوگوں کے بتائے ہوئے ٹوٹکوں، نسخوں کو استعمال بھی کریں تو دوا کا استعمال ہر گز ترک نہ کریں۔ خاص طور پر ایسے ٹوٹکے جن میں کہا گیا ہو کہ آپ یہ نسخہ استعمال کریں اسے آپ 15 دن یا ایک ماہ استعمال کریں اس دوران دوا نہ کھائیں اور شوگر بھی چیک نہ کریں ۔ ایک ماہ بعد شوگر چیک کریں آپ کی شوگر ختم ہو چکی ہو گی۔ ایسا ہر گز نہ کریں، ایسے لوگوں کی باتوں میں ہر گز نہ آئیں، مشورہ دینے میں کچھ نہیں جاتا، اپنی زندگی کو اہمیت دیں لوگوں کی باتوں کو نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایک ماہ بعد شوگر ختم ہو یا نہ ہو آپ کا کام تمام ہو چکا ہو گا۔ یہ مرض اپنے مریض کی مکمل توجہ اپنے اوپر چاہتا ہے جس طرح ایک محبوب اپنے عاشق کی مکمل توجہ اپنے سوا کسی اور پر نہیں چاہتا۔ اس لیے

اس مرض کو اپنا محبوب بنالیں ، صرف اس کے ہو کر رہ جائیں، اس کا خیال کریں، اس کی آبیاری دوا، پرہیز سے کریں، یہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا اور طویل عمر آپ کے ساتھ اچھے طریقے سے گزار دے گا۔ اگر آپ نے اس سے دوستی نہیں کی، اس کا خیال نہیں رکھا، اس سے محبت اور دوستی کے جو طریقے ماہرین نے تجویز کیے ان پر عمل نہیں کیا تو پھر یہ آپ کا دشمن نمبر ایک ہوگا۔ آپ کو خاموشی کے ساتھ ، دیمک کی مانند اندر ہی اندر چاٹ جائے گا اور آپ مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ باتیں میں نے سنی سنائی، دیکھی ہوئی، نہیں بلکہ میں گزشتہ کئی سال سے دل کے مرض کے ساتھ ساتھ اس مرض میں بھی مبتلا ہوں، شکر ہے میں نے اسے اپنا محبوب تصور کر لیا ہے، اس کا خیال رکھتا ہے، جو چیز اسے پسند نہیں وہ مجھے بھی پسند نہیں، جو اسے اچھا لگتا ہے وہ میرا بھی پسندیدہ ہے۔ جس طرح جیون ساتھی کے ساتھ زندگی گزرتی ہے ، وہ ہماری زندگی کے ہر چیز میں ظاہر ہو یا باطن وہ اس کا ساتھی ہوتا ہے اسی طرح یہ مرض بھی میری زندگی کا ایسا ہی ساتھی ہے۔ اب جس قدر بھی زندگی ہے اس کے ساتھ ہی بسر ہو گی اور اچھی ، ہنستی، لبستی خوشگوار ہی بسر ہو گی، انشاء اللہ۔ (14 نومبر 2016)

گورنر سندھ تبدیل۔ 'بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ڈاکٹر عشرت العباد خان اپنی 14 سال کی گورنری مکمل کرکے رخصت ہوئے۔ وہ سندھ کے 30 ویں گورنر تھے ، انہیں کم عمر گورنر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے میعاد کے اعتبار سے بھی ان کا ریکارڈ مستقبل میں شاید کوئی نہ توڑ سکے۔ میاں نواز شریف نے کراچی سے تعلق رکھنے والے جسٹس (ر) سعید الزماں صدیقی کو سندھ کا نیا گورنر مقرر کردیا۔ تبدیلی نہ تو حیران کن اور نہ ہی اچانک ہوئی۔ ماضی قریب کے حالات اور واقعات کی گہما گہمی ، الزامات کی گولا باری اور سیاسی صورت حال اس جانب اشارہ کر رہی تھے کہ ڈاکٹر عشرت العباد کی عشرت کے دن گئے جا چکے، انہیں کسی بھی وقت اس عہدے سے رخصت کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی صورت حال اس بات کی متقاضی تھی کہ موصوف کو رخصت کردینا ہی مناسب ہی مناسب تھا لیکن نواز شریف کسی مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ عشرت العباد کی رخصتی کے آثار اس وقت نمایاں ہوگئے جب ان کی اپنی سابقہ جماعت کے منحرف یا سابق ساتھی اور پی ایس پی کے سربراہ مصطفیٰ کمال نے اپنی توپوں کا رخ ان کی جانب کیا اور ان پر شدید قسم کے الزامات عائد کیے۔ رہی سہی کثر اس وقت پوری ہوگئی جب کمالی الزامات کے جواب میں خاموش طبع ، نرم مزاج، دھیمے لب و لہجہ رکھنے والے عشرت العباد نے جوابی بم کے گولوں کی بارش مصطفیٰ کمال پر کرڈالی اور وہ

پھٹ پڑے، ان کا لب و لہجے، انداز، زبان، جملے ماضی کے عشرت العباد سے قطعی مختلف تھے۔ دیکھنے اور سننے والوں نے جب ڈاکٹر عشرت العباد کی وہ گفتگو سنی تو انہیں اُسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ بس اب گورنر صاحب کی ہوئی چھٹی۔ غلط یا صحیح اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔ جنھوں نے برسوں ایک ہی تھالی میں کھایا، ایک ہی لیڈر کو دیوتا اور گرو کا درجہ دیتے رہے ہوں، ایک ہی تالاب میں اشنان کرتے رہے ہوں، ایک نے سال گورنری کے مزے لوٹے تو دوسرا بھی اسی قائد کے کاندھوں کا سہارا لے کر 14 کراچی جیسے بڑے شہر کا مختار کل ٹہر ہوا۔ سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد اب ایک دوسرے کے مدمقابل دست گریباں ہیں۔ دال میں کچھ تو کالا ہے۔ اس بات کا فیصلہ بھی آنے والا وقت ہی کرے گا۔

ڈاکٹر عشرت العباد خان نے سندھ 14 سال گورنری کرکے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ ان کی اس خصوصیت و انفرادیت کو شاید ہی کوئی تبدیل کر سکے گا۔ 14 سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا، اس دوران انہوں نے صدر جنرل (ر) پرویز مشرف، آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف کی حکومت کے تین سالوں میں گورنری کے ایسے جوہر دکھائے کہ کسی نے بھی انہیں اس عہدے سے ہٹانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہاانھوں نے آپ کواس قدر مستحکم اور مضبوط کر لیا تھا کہ حکومتیں آتی رہیں، حکومتیں جاتی رہیں اور وہ گورنری کے منصب پر خوبصورتی

سے براجمان رہے۔ گویا راوی نے 14 سال عشرت کی قسمت میں عشرت ہی عشرت لکھ دی تھی اور موصوف نے عیش و عشرت سے زندگی گزاری جس لمحے گورنری کا سلسلہ منقطع ہوا اُسی لمحہ تمام تر سرکاری پرٹوکول کے ساتھ یہ جا اور وہ جا۔ ان کی رخصتی کے لمحات دیکھ کر پرویز مشرف کی ایوان صدر سے رخصی یاد آ گئی۔ اسے کہتے ہیں سیاست، ایک وہ بھی سیاست تھی کہ مسند وزارت عظمیٰ سے جیل کی سلاخیں اور جیل سے سیدھے جدہ منتقلی، اپنا اپنا انداز اور اپنی اپنی سیاست۔

ڈاکٹر عشرت العباد کو کیوں ہٹایا گیااس کی وجوہات کوئی پیچیدہ اور نہ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ اُن سے جس نے جو کام بھی لینا تھا وہ لے لیا گیا تھا اب وہ کسی کے کام کے نہیں رہے تھے۔ان کی حیثیت گنے کے اس پھوسے کی سی ہو گئی تھی جس سے جوس نکال لیا گیا ہو۔ انہیں جس نے جنم دیا تھا، گورنر کی کرسی کے لیے انتخاب کیا تھا اُسی نے انہیں اپنی اپنا ماننے سے انکار کردیا، یہی نہیں بلکہ اپنے قبیلے سے خارج کرکے قبیلے والوں سے کہا کہ خبردار اب اس شخص سے کوئی تعلق نہ رکھنا اب اس شخص سے ہمارااور ہماری جماعت کا کوئی لینا دینا نہیں۔ جس جماعت سے اس کا تعلق تھا اس کے بھی حصے بخرے ہو گئے ایک لندن میں باقی کراچی میں اور وہ بھی باہم دست و گریباں ۔ نون لیگ اپنا بنانے کا تیار نہیں گورنری سے فارغ کرنے میں بھی پس و پیش، زرداری صاحب نے اپنے دور میں جو کام لینا تھا ان سے لے لیا اب ان کے اور ان کی جماعت کے کام کے بھی نہیں

رہ گئے تھے۔ میاں صاحب وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ جوں ہی موقع ملے موصوف کو چلتا کروں۔ڈاکٹر عشرت بہ اخلاق انسان تھے، نرم مزاجی، شگفتہ بیانی، دھیمہ لہجہ رفتہ رفتہ تعلقات ہر سطح کے بڑے بڑے لوگوں سے ہوگئے تھے۔ان میں سیاسی، غیر سیاسی، عسکری، بیوروکریٹس ،تاجر اور دگیر شامل تھے۔کچھ عرصے سے تعلقات ناخوشگوار تھے، گورنر صاحب ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، کبھی کوئی بہانہ کبھی کوئی مشکل ، کبھی کوئی عذر ،آخر لندن کے باسی کب تک ان کی بہلانے پسلانے میں آتے، گزر بسر مشکل ہو گئی تھی۔ انہیں بہت ڈرایا دھمکایا لیکن انہوں نے بہت سے کام نہیں کیے پھر تو نوبت علیحدگی تک آنا ہی تھی۔ مصطفیٰ کمال کو کہی سے خبر ملی کہ موصوف تو دوہری شہریت رکھتے ہیں ، خبر کیا ملی یہ سب ایک ہی تھالی کے چ ب ہیں اب راہیں جدا ہو گئیں تو کیا ہوا۔ دوہری شہریت تو اپنی جگہ اور بے شمار قسم کے الزام در الزامات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کراچی کے نون لیگیوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ الطاف حسین کے ان دونوں سابقہ چیلوں کے درمیان شروع ہونے والی جنگ کوئی نہ کوئی رنگ ضرور لائے گی۔ میاں صاحب کراچی سے تعلق رکھنے والے بزرگوں پر زیادہ مہربان رہے ہیں، یہاں کی جوان قیادت پر ان کی نظر کم ٹھہرتی ہے۔ نہال ہاشمی پر نہیں معلوم وہ کیسے نہال ہوگئے۔ شاید ان کے سفید بالوں سے دھوکا کھا گئے، انہیں لگا کہ یہ بھی ستر کے پھیرے میں آچکے ہیں۔

جسٹس سعید الزماں صدیقی پر میاں صاحب اس وقت سے مہربان ہیں جب جسٹس صاحب نے پرویز مشرف کے پی سی او کے احکامات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس وقت وہ چیف جسٹس آف پاکستان تھے۔ جسٹس صاحب کا یہ اقدام جمہوریت کے لیے تو بہتر تھا ہی میاں صاحب کے لیے یہ پسندیدہ فعل تھا۔ بس میاں صاحب نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے ہی جسٹس صاحب کو اپنی نظروں کا تارا بنا لیا تھا لیکن کیا کیجئے ہمارے ملک میں ہمیشہ وفادار اور مشکل کا ساتھی ہونا علمیت اور قابلیت پر حاوی آتا رہا ہے۔ میاں صاحب کی واپسی ہوئی، پرویز مشرف رخصت ہوئے، صدارتی انتخاب میں ایک جانب پیپلز پارٹ کے امیدوار زرداری صاحب تھے تو دوسرے جانب میاں صاحب کو کسی مضبوط امیداوار کو لانا تھا چنانچہ جسٹس صاحب آزاد حیثیت میں جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نون کے مشترکہ امیدوار ٹھہرے۔ میاں صاحب کو علم تھا کہ زرداری صاحب کا پلڑا بہت بھاری ہے، ان کا مخالف امیدوار کچلا جائے گا لیکن جسٹس صاحب کی حمایت کرکے ان پر اپنی حمایت کا لیبل لگا دیا۔زرداری صاحب فاتح قرار پائے اور پانچ سال ایوان صدر کو اپنی موجودگی سے فیضیاب کرتے رہے۔2013 کے انتخابات میں میاں صاحب نے مرکز کو قابو کرلیا، پنجاب تو تھا ہی ان کا، پاکستان پیپلز پارٹی میدان سے باہر ہو کر صرف سندھ تک محدود ہو گئی۔ اب دوبارہ صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا، زرداری صاحب نے اپنی مدت پوری کر لی تھی، صدارت کی کرسی خالی ہو گئی ۔ اس بار میاں صاحب کے پاس بہت واضح اختیار اور طاقت تھی، اگر وہ کمزور سے کمزور

شخص کو بھی صدارت کے لیے کھڑا کردیتے تو وہ صدر بن جاتا۔ یہ بات تھی 2013 ء کی اس وقت جسٹس صاحب اس قدر کمزور نہ تھے، عمر بھی کم رہی ہوگی۔ ان کا نام بھی اس عہدے کے لیے گردش کرتا رہا اور وہ ہر اعتبار سے مناسب تھے۔ اعلیٰ تعلیم، تجربہ، بہ اصول بہ کردار، ایماندار اور پاکستان سے محبت کرنے والا محب وطن سب کچھ تو تھا ان میں پر ایک چیز کی کمی تھی وہ نون لیگ کے رکن نہیں تھے، نہ ہی میاں صاحب کے دربار کا حصہ تھے۔ عین وقت پر نہیں معلوم کس نے میاں صاحب کو کیا پٹی پڑھائی کہ علمیت، قابلیت، لیاقت، اصول پسندی، بہ کرداری شکست کھا گئی اور وفاداری، جان نثاری اور درباری ہونا سبقت لے گیا۔ کراچی کے ایک اور بزرگ جو میاں صاحب کے بہت پرانے ساتھیوں اور وفاداروں میں سے تھے وہ میاں صاحب کا انتخاب ٹھہرے، میاں صاحب نے پاکستان کی صدارت کا تاج ان کے سر سجا دیا، ممنون حسین باقاعدہ نون لیگی تھے جب کہ جسٹس صاحب نے باقاعدہ نون لیگ جوائن نہیں کی تھی۔ فیس بک کے ایک دوست شاعر ضیاء شہزاد نے خدمتِ عالی کے عنوان سے یہ قطعہ کہا جو دلچسپ ہے ۔

ہیں کس قدر شریف ہمارے یہ حکمراں
تھالی میں رکھ کے دیتے ہیں لوگوں گورنری
حق بھی نمک کا دینے میں کرتے نہیں ہیں چوک
دیتے ہیں یہ صلے میں بھی منصب صدارتی

جسٹس (ر) سعید الزماں صدیقی 80 کے قریب قریب کے ہو چکے ہیں، ضعیفی، کمزوری، بیماریاں وغیرہ وغیرہ کے باوجود میاں صاحب نے ان سے ملاقات کرکے یہ نہیں دیکھا کہ جسٹس صاحب کس حال میں ہیں، بقول جسٹس صاحب میاں صاحب نے فون کیا اور اپنا فیصلہ سنا دیا، اگر میاں صاحب نے اپنے کسی نہال ہاشمی جیسے درباری کو ان کے پاس بھیجا بھی ہوگا تو اس درباری کی کیا مجال کہ وہ یہ رائے دیتے کہ میاں صاحب ان کی صحت کی صورت حال کیا ہے اور آپ ان پر کیسی بھاری ذمہ داری ڈال رہے ہیں۔ جسٹس صاحب نے بھی گھر آئی نعمت کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا اور خوشی خوشی میاں صاحب سے قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے کہہ دیا۔ اللہ جسٹس صاحب کو یہ بوجھ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، انہیں ہمت اور طاقت دے، انہیں تمام تر بیماریوں سے شفاء کاملہ عطا فرمائے اور وہ کراچی اور اہل سندھ کی خدمت کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت تو ان کی خدمت کرنے کا ہے نہ کہ وہ بیچارے ہمارے صوبے کی خدمات کریں۔ جمعہ ۱۱ نومبر کو انہوں نے حلف بھی اٹھا لیا ہے اور سابقہ گورنر دن کی روشنی میں حکومتی ادب و آداب کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں، انہیں دبئی یا لندن چلے ہی جانا تھا اور وہ دبئی چلے بھی گئے اس لیے کہ یہاں رہنا اب ان کے لیے آسان نہ ہوتا۔ وہ اور ان کے بیوی بچے گورنر ہاؤس کی خوشگوار آب وہوا کے عادی ہو چکے تھے ایسی آب ہوا اور ایسا ماحول اب انہیں میسر آنا ممکن نہیں ہوتا۔ بہت ممکن تھا کہ انہیں پرویز مشرف کی طرح عدالتوں کے چکر لگانا پڑ جاتے، اس لیے انہوں نے مناسب یہی جانا کہ

سر دست سابق صدر زرداری اور پرویز مشرف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک سے باہر خوش گوار فضاء کے مزے لیے جائیں۔ ابھی ان کا ہوائی جہاز کراچی کی فضاؤں کو خیر باد کہتا ہوا دبئ کی فضاؤں میں داخل ہی ہوا ہو گا کہ سینیٹر نہال ہاشمی نے رخصت ہونے والے گورنر اور متحدہ پر تیروں کی برسات کردی۔ ان کے خلاف ایسا زہر اگلا، ایسی زبان اور جملے استعمال کیے، محسوس ہوتا تھا کہ جس زہر کو انہوں نے عرصہ دراز سے اپنے اندر بہ مشکل تمام دبا کر رکھا ہوا تھا اسے حلف برداری کی تقریب ختم ہوتے ہی اگل دیا۔ نہال ہاشمی کی کیا حیثیت رہ گی جب وفاق نے اور نون لیگ نے اس شخص کے بیان کو اس کی اپنی ذاتی رائے قرار دے کر رد دیا۔ اس بات کا اعلان باقاعدہ نون لیگ کی خاتون وزیر اطلاعات نے میڈیا پر کیا۔ موصوف کا خیال ہو گا کہ وہ اس قسم کی زہر افشانی کرکے میاں صاحب کا دل جیت لیں گے لیکن تدبیریں کام نہ آ سکی الٹا ان کی پوزیشن خود اپنی جماعت میں جو پہلے ہی کچھ نہ تھی رہی سہی بھی جاتی رہی۔ بقول میر تقی میرؔ ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

نہال ہاشمی کا سیاست میں کیا مقام و مرتبہ ہے سب کو معلوم ہے، سیاست کے کھلاڑیوں کی مصیبت یہ ہے کہ یہ نمبر بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں

دیتے، کبھی کبھی ان کی ہوشیاری اور چالاکی الٹی ان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ان کی حیثیت یہ ہے کہ یہ اپنے حلقے سے کونسلر کا الیکشن نہیں جیت سکتے، میاں صاحب نے انہیں پنجاب کی سیٹ پر سینیٹر محض اس وجہ سے بنایا کہ میاں صاحب کو کراچی کا کوئی بندہ سینٹ میں ایسا درکار تھا جو سندھ اور کراچی سے تعلق رکھتا ہو۔ عشرت العباد میں خامیاں ہوں گی لیکن ان کے خلاف نہال ہاشمی کی بدزبانی کو بشمول ان کی جماعت کے کسی سیاسی جماعت نے اچھا تصور نہیں کیا سب نے ان کے بیان کی مذمت کی۔ متحدہ کے تمام دھڑوں نے تو کرنی ہی تھی۔ نئے گورنر اپنی ذات میں انتہائی شریف النفس انسان ہیں۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ جامعہ کراچی، لکھنؤ اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وکالت کے پیشے سے وابستہ رہے، جج ہوئے پھر سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہونے کے بعد سپریم کورٹ کے جج اور پھر چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواز شریف صاحب کی دوسری مرتبہ کی حکمرانی میں پرویز مشرف نے سپہ سالار کی حیثیت سے ان کا تختہ الٹا اور حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پی سی او کے احکامات جاری کیے جس کے تحت عدلیہ کے تمام ججوں کو پی سی او کے تحت حلف لینے کا پابند بنایا گیا لیکن جسٹس سعید الزماں صدیقی نے پرویز مشرف کے اقدامات کے آگے سر نہیں جھکایا اور پی سی او کا حلف لینے کے مقابلے میں گھر چلے جانا مناسب جانا۔ ان کے اس عمل سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت و احترام گھر کر گیا جو آج بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جسٹس (ر) افتخار چودھری کی طرح کھلے بندوں

پرویز مشرف کی سیاسی مخالفت بھی نہیں کی، نہ ہی کسی جماعت میں شامل ہوئے، اپنا الگ تشخص برقرار رکھا۔ جو سچ اور صحیح ہوتا اسے درست کہتے جو غلط ہوتا اُسے غلط کہتے۔ ان کے اسی عمل کا نتیجہ ہے کہ میاں صاحب نے سندھ کے گورنر کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ یقینا میاں صاحب کو کچھ اندازہ ضرور ہوگا کہ جسٹس صاحب کی عمر کیا ہے اور ان کی صحت کی صورت حال کیا ہے لیکن انہوں ان سب باتوں کے باوجود انہیں اس منصب پر فائز کیا یہ ان کا بڑا پن ہے۔ اگر نون لیگ کے کسی اور نہالی پر نہال ہوجاتے تو سندھ کے سیاسی حالات مختلف ہوتے۔ اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے ایک غیر سیاسی شخصیت کو اس اہم عہدے کے لیے منتخب کیا۔ جسٹس سعید الزماں صدیقی کو اگر بر وقت یہ اعزاز دے دیا جاتا تو یقینا سندھ کی صورت حال ہر اعتبار سے بہتر ہوتی۔ اب جب کہ خود نواز حکومت کے پاس ڈیڑ سال باقی ہے، سندھ کے حق میں یہ فیصلہ مناسب تو ہے لیکن بہت دیر ہوچکی ہے۔ معروف شاعر داغ دہلوی کے مطابق ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

کہتے ہیں کہ جتنے منہ اتنی باتیں، نہال ہاشمی کی زہر افشانی کے علاوہ بھی سوشل میڈیا پر بے شمار لوگ اپنے اپنے طور پر جسٹس صاحب کی صحت کے حوالے سے مزاحیہ رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ دراصل جس وقت جسٹس صاحب کے باقاعدہ

گورنر مقرر کرنے کا اعلان ہوا اور میڈیا ان کے گھر پہنچا جہاں نون لیگ کے نمائندے کے طور پر نہال ہاشمی بھی وہاں موجود تھے جسٹس صاحب کی جو جھلک اس وقت میڈیا نے دکھائی، اس وقت وہ عام لباس میں میڈیا اور سرکاری کارندوں کو خدا حافظ کہنے اپنے گھر کے دروازے پر آئے اس میں وہ بہت ہی کمزور اور لاغر سے نظر آئے۔ اس پر ایک بھونچال آگیا ان کی عمر، صحت اور ظاہری صورت حال کا چرچا ہر ایک کی زبان پر آگیا حالانکہ حلف.برداری کی تقریب میں جس میں انہوں نے سوٹ پہنا ہوا تھا وہ اس قدر کمزور اور لاغر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کل ان کی طبیعت ناساز ہو، کراچی میں موسم کی تبدیلی کے باعث نزلہ، زکام، بخار اور دیگر وائرس پھیلا ہوا ہے، کچھ دن میں وہ صحت مند ہوجائیں گے اور معمول کے کام انجام دینے لگیں گے۔ سوشل میڈیا میں اس صورت حال پر دلچسپ مکالمے، مزاحیہ انداز میں جملے بازی کا چرچا ہورہا ہے۔ کہا گیا 'اچھے انسان ہیں.بزرگ ہیں سندھ کے ساتھ مذاق چلتا رہتا ہے'، مرتضیٰ گھنگرو نے جملہ کسا کہ 'واہ میاں صاحب ایک صدر دیا صدر ممنون حسین کہا سندھ کو نمائندگی دی۔ اب جسٹس سعید الزماں صدیقی گورنر سندھ بنا کر احسان کیا گیا ہے'۔ طیب اقبال نے اس صورت حال اچھوتے انداز سے بیان کی اور حکومت پر جملہ بھی کسا انکا کہنا ہے کہ 'عام سی نوکری کے لیے NTS ٹیسٹ گورنر اور صدر کے لیے صرف نبض چلنی چاہیے'۔ اسحاق خان اسحاق کا مزاق دیکھئے 'زرداری نے قائم علی شاہ کو ہٹا کر بڑی زیادتی کی ورنہ کمال کی جوڑی بنتی'۔ ایک اور

مزاق دیکھئے جو عبد الحکیم خلجی نے کیا لکھتے ہیں ' نئے گورنر سندھ کی حالت دیکھ کر حکومت کو ان کے پرٹوکول میں ایک عدد ایمبولینس ، ایک عدد ڈاکٹر اور ایک نرس کا اضافہ کرنا چاہیے'۔ رعنا مظہر حسین کی بیٹیے کہتے ہیں 'گورنر سندھ سعید الزماں کی صحت کی صورت حال دیکھ کر ان کی تقریب حلف.برداری آغا خان اسپتال کی ایمرجنسی میں منعقد کر وانے پر غور ڈاکٹروں کی چھٹیاں منسوخ'۔ نسیم خان نسیم نے کہا کہ 'قابل انسان ہیں لیکن وقت گزرنے کے بعد ان سے کام لینے کا فیصلہ کیا'۔ یہ سب کچھ مزاق ہے ، اللہ جسٹس سعید الزماں صدیقی کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے، انہیں عمر صحت کے ساتھ عطا فرمائے۔ (12نومبر2016ء

ٹرمپ فاتح۔ہیلری کو شکست

پروگرام کے مطابق امریکہ کے انتخابات کا نتیجہ آجانے کے فوری بعد مجھے ڈونالڈ ٹرمپ کی فتح اور ہیلری کلنٹن کی ناکامی پر لکھنا تھا۔ انہی دنوں میں ایک مضمون 'مکتوباتی ادب' کے حوالے سے لکھ رہا تھا، سوچا کہ کسی طرح اسے مکمل کرلوں پھر امریکیوں کے فیصلے پر قلم اٹھاؤں گا۔ ابھی یہ دو موضوعات گردش میں تھے کہ اچانک سندھ کے گورنر ڈاکٹر عشرت العباد خان کی عشرت کا خاتمے کا اعلان کردیا گیا۔ میرے نزدیک یہ سیاسی عمل اچانک تو تھا لیکن غیر معمولی ہرگز نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایسا تو ہونا ہی تھا، بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ البتہ لمحہ موجود میں نئے گورنر جسٹس (ر) سعید الزماں صدیقی کی صحت اور ان کی ظاہری کیفیت دیکھ کر اس اہم عہدے کے لیے ان کا انتخاب کرنے والے کی سنجیدگی اور اس کی ذہنی صحت پر حیرت اور پریشانی ضرور ہوئی۔ چنانچہ اپنے دونوں کالموں کو پس پشت ڈال کر پہلے ڈاکٹر عشرت العباد کی رخصتی اور نو منتخب گورنر جسٹس (ر) سعید الزماں صدیقی کی تقرری کے بارے میں لکھنا ضروری جانا اور یہ کالم بعنوان ''گورنر سندھ تبدیل۔'بہت دیر کی مہرباں آتے آتے' لکھا جو سوشل میڈیا پر آن لائن ہوچکا ہے۔

امریکہ میں انتخابات معمول کی کاروائی ہوتے ہیں، نہ لڑائی ، نہ جھگڑا، نہ سر پھٹول، نہ گولی، نہ دھماکے ، معمول کی سرگرمیاں ہوئیں اور ہار جیت ہو گئی۔ امریکہ دنیا کا وہ ملک ہے جہاں صدارتی نظام حکومت کے ساتھ جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ ہر چار سال بعد امریکی اپنے نئے حکمران کا انتخاب کرتے ہیں۔ انتخابات میں جلسے ، جلوس، شور، شرابا، ڈیبیٹ، مذاکرے ہوتے ہیں جن میں امیدوار اپنے اپنے حق میں دلائل دیتے ہیں اور بس ۔ لیکن ہمارے ملک کا تو بابا آدم ہی نرالا ہے، انتخابات میں ہنگامہ آرائی، مارپٹائی، مخالفین کے لیے خراب سے خراب القابات و جملوں کا استعمال ، یہاں تک کہ خون خرابے کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ جیسے جیسے انتخابات قریب آتے ہیں پاکستانی عوام ایک عجیب قسم کے خوف اور ڈر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں اس قسم کی صورت حال پیش نہیں آتی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کی عمر کم اور فوجی حکمرانی کی عمر زیادہ رہی ہے۔ ہمارے جمہوری اور عسکری حکمرانوں نے جمہوریت کے لیے عوام کے ذہنوں کو تیار ہی نہیں کیا۔

بات امریکہ کے حالیہ انتخابات کی کرنا ہے جس میں امریکہ کی ایک خاتون ہیلری کلنٹن جو شائستہ، ملنسار، خوش اطوار، خوش مزاج، خوش خلق، خوش بیان، مؤدب، مہذب، سیاسی سوچ ، سیاسی فکر اور سیاسی سمجھ بوجھ کی مالک ہیں ، امریکی سیاست اور علمی تعلقات کا ادراک رکھتی ہیں ، سیاسی خاندان کی بہو یعنی سابق

امریکی صدر کی شریک حیات ہیں، امریکی حکومت میں اہم عہدوں پر خدمات انجام دے چکی ہیں کا مقابلہ امریکہ کے ایک ارب پتی شخص ڈونالڈ ٹرمپ سے ہوا جسے پیسے بنانیکی مشین کہا جاتا ہے، وہ بزنس کو ترقی دینے کے گُر تو جانتا ہے لیکن سیاست میں کورا ہے، اس کے اثاثوں کی مالیت 3.7 ارب ڈالر بتائی جارہی ہے،دنیا کے امیر ترین لوگوں کی فہرست میں اس کا نمبر 324 واں ہے جب کہ امریکہ میں امارت کے اعتبار سے وہ 156 ویں نمبر پر ہے۔ عادات واطوار کے اعتبار سے وہ بد تہذیب، بد اطوار، اوچھے پن کا مالک، فحش کلامی کرنے والا، دشنام طراز، دریدہ دہن، کثیف الطبع، کرخت، اجڈ، شیخی خورااور چھچھورا قسم کا انسان ہے،عمر 71 ہوچکی ہے، غیر امریکیوں کو پسند نہیں کرتا حتیٰ کہ اس نے انتخابی مہم کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے گورے اور کالے امریکیوں میں نفرت کی دیوار کھڑی کرنے جیسا حربہ بھی استعمال کر ڈالا، گویا متعصب ذہنیت کا حامل بھی ہے۔ اس کی رائے میں امریکہ میں موجود اقلیتی عوام امریکہ پر بوجھ ہیں اور مسلمان دہشت گرد۔ گزشتہ تین دہائیوں میں وہ 3500 مقدمات میں ملوث ہوا، یہ مقدمات اس کے کاروبار کے حوالے سے ہوئے۔ اس کی آمدنی کا کوئی ٹھکانا نہیں 2015 میں ٹرمپ نے اپنے آپ کو کوئی 38 کروڑ 20 لاکھ ڈالر کا مالک ظاہر کیا۔ ان کی اچھی عادتوں میں ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ کسی بھی قسم کا نشہ نہیں کرتے۔ نیویارک میں پیدا ہوئے ،ٹرمپ کا باپ جرمن اور ماں اسکاٹش تھی، ٹرمپ نے تین شادیاں کیں تینوں کا تعلق شوبیز سے ہے، وہ خود بھی شوبیز کا

آدمی ہے، موصوف ٹی وی نیٹ ورک میں پروڈیوسر اور میزبان بھی رہ چکے ہیں۔ تعلیم کوئی خاص نہیں 1968 میں معاشیات میں گریجویشن کیا تھا۔ اپنے والد کے رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے جانشین ہو گئے۔ ٹرپ کی زندگی کی کہانی میں بہت کھوج لگایا کہ کہیں اس کا تعلق سیاسی معاملات، حکومتی مشینری سے وابستگی، فلاحی اور عوام کی بہتری کے لیے اس کا کوئی کام سامنے آئے لیکن کہیں بھی ایسا کچھ نہیں ملا۔

ہیلری کلنٹن ایک پڑھی لکھی، سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، کہنے کو تو ان کے والد بھی بزنس مین تھے۔ 25 اکتوبر 1947 کو شکاگو میں پیدا ہوئیں۔ Wellesley College سے گریجویشن کیا اور Vale Law School سے J.D کی ڈگری حاصل کی، عملی زندگی کا آغاز قانون کے پیشے سے کیا، 1975 میں بل کلنٹن سے شادی ہوئی، وہ 1993 سے 2001 تک امریکہ کی خاتون اول رہیں، اس دوران انہوں نے اپنے شوہر بل کلنٹن کے ساتھ مختلف سیاسی، غیر سیاسی، فلاحی اور صحت و طب کے مختلف کاموں میں عملی حصہ لیا، یہ ان کی سیاسی تربیت کا دور تھا، صدر اوباما صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے ہیلری میں سیاسی سوجھ بوجھ دیکھتے ہوئے انہیں سیکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول کر لی اور وہ 2009 سے 2013 تک اس اہم امریکی عہدے پر کام کرتی رہیں۔ اس اعتبار سے ہیلری امریکہ کی سیاست، عالمی سیاست، مسائل اور انتظامی امور میں مہارت کے درجہ

پر پہنچ چکی تھیں۔ ہیلری کی سوچ میں سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ بچوں کی فلاح و بہبود کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہیلری نے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام بھی کیا اور اس موضوع پر لکھا بھی۔ گویا وہ ایک تخلیق کار بھی ہیں۔ کالم نویسی بھی کی اور کتابیں بھی لکھیں۔ وہ ایک اچھی سلجھی ہوئی، پختہ قلم کار ہیں۔ 1995 سے 2000 کے درمیان Talking it Over کے عنوان سے کالم لکھے۔ 1996 میں بچوں کے حوالے سے ایک کتاب تحریر کی جسے best seller list میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ہیلری کی دیگر تصانیف میں حسب ذیل شامل ہیں:

1)Dear Socks

2) Dear Buddy

3) Kid's Letters to the First Pet (1998)

4) An Invitation to the White House with History (2000)

5) Beatrice's Goat, 2001

2003 میں ہیلری نے اپنی سوانح حیات Living History، کے عنوان سے تحریر کی۔ ہیلری کی اس کتاب پر اُسے کتاب کے پبلشر کی جانب سے 8 ملین ڈالر معاوضہ ادا کیا گیا، اس سوانح حیات کی خصوصیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے ابتدائی مہینے میں اس کتاب کی ایک ملین کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ اس کتاب کے کوئی 12 زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

ہیلری اور ٹرمپ کی شخصیت کا تقابلی موازنہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ری پبلکنز پارٹی نے ہیلری کے مقابلے میں ٹرمپ کا انتخاب کیوں کیا؟ سیاست کے میدان میں ہیلری کا ٹرمپ سے کوئی مقابلہ بنتا ہی نہیں۔اس کے باوجود ری پبلی کنز پارٹی نے ٹرمپ کو اپنا صدارتی امیدوار بنایا، سیاست کے حوالے سے ٹرمپ میں وہ تمام خصوصیات نہیں تھیں جو ہیلری میں تھیں، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ’ری پبلیکنز پارٹی‘ کے پاس ہیلری کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھی؟ محسوس ہوتا ہے کہ ہیلری کے مخالفین نے ٹرمپ کی دولت ، شوبز سے تعلق ، بد اور بیہودہ زبان کے استعمال کرنے کے ماہر ٹرمپ کو ہیلری کے مقابلے کے لیے مناسب جانا ۔ پھر ٹرمپ نے امریکی اور غیر امریکی، کالے اور گورے کی بات کرکے دونوں میں نفرت وتعصب کا بیج بویا۔ مسلمانوں کے خلاف بات کی، امریکہ میں موجود اقلیتوں کے خلاف بات کی ، اس قسم کی متعصبانہ فضاء نے گورے امریکیوں کے اندر ایک خاص سوچ پیدا کردی جس کا اظہار ووٹ کے ذریعہ سامنے آگیا۔ اس انتخابی مہم کو امریکہ کی صدارتی انتخابی مہم میں سب سے متنازعہ انتخابی مہم کہا گیا۔ میرا تجزیہ یہی ہے کہ ہیلری کی شکست کی دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ اہم وجہ یہی رہی کہ ٹرمپ نے گورے امریکیوں کو اکسایا، دیگر اقوام حتی کے کالے امریکیوں سے نفرت دلائی، مسلمانوں کو خاص کر نشانہ بنایا۔ صدارتی انتخاب کا آغاز ہوا، ری

ریپبلیکنز کی جانب سے جب ٹرمپ کا نام سامنے آیا تو بے شمار لوگ یہ سمجھے کہ ٹرمپ مزاق کر رہا ہے کیونکہ اس کا انداز ہی مزاحیہ اور غیر سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ کسی نے اس کی نمائندگی کو سنجیدہ نہیں لیا۔ خیال یہی تھا کہ ڈیموکریٹ کی نمائندہ ہیلری کے مقابلے میں ری پبلیکنز پارٹی کسی قابل سیاست دان کو سامنے لائے گی لیکن ٹرمپ سنجیدہ ہوتا چلا گیا اور ری پبلیکنز نے اُسے ہی اپنا نمائندہ نامزد کر دیا۔ دنیا بھر میں حتیٰ کہ امریکہ میں ہیلری کے صدر بننے کی باتیں ہو رہی تھیں، ٹرمپ کا تو کوئی سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ نتیجہ دنیا کے لیے حیران کن تھا، یہ فیصلہ امریکی عوام کا ہے، کسی کو اس سے کیا غرض، مقابلہ کانٹے کا رہا، ووٹوں کی تعداد یا امریکیوں کی اکثریت نے ہیلری کو کامیاب کیا جب کہ امریکی انتخابی نظام نے ہیلری کو شکست اور ڈونالڈ ٹرمپ کو فتح سے ہمکنار کیا۔ ہیلری کلنٹن کو 59,236903 ووٹ اور ٹرمپ کو 59,085787 ووٹ ملے۔ ٹرمپ کے خلاف امریکہ کی مختلف ریاستوں اور شہروں میں احتجاج ہو رہا ہے، ٹرمپ 20 جنوری کو امریکہ کے 45 ویں صدر کا عہدہ سنبھالیں گے۔ ٹرمپ کے خلاف احتجاج ایسے ہی ہے کہ جیسے ہمارے ملک میں ہر شکست کھانے والی جماعت فاتح جماعت کی فتح کو تسلیم نہیں کرتی اور دھاندلی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ امریکہ میں اب کیا ہوتا ہے یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ پاکستان کے نقطہ نظر سے ٹرمپ کی حکمرانی کیسے ہوگی، بعض لوگوں نے مختلف قسم کے خدشات کا اظہار کیا ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امریکہ میں جمہوریت اور

نظامِ حکمرانی کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہیں، وہاں چہرے بدلنے سے نظام یا پالیسی نہیں بدلتی۔ تنہا ٹرمپ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرسکے گا۔ امریکی صدر بارک اوباما نے ٹرمپ کو مزاج بدلنے اور مخالف ووٹرز اور جماعتوں کو اعتماد میں لینے کا مشورہ دیتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ٹرمپ امریکہ کو متحد کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اگر ٹرمپ نے بہت تیر مارا تو وہ اسرائیل اور بھارت سے اور زیادہ قریبی اور محبت کے تعلقات قائم کرلے گا۔ اسرائیلی لیڈروں نے ٹرمپ کی حمایت کی تھی، ٹرمپ اور مودی کی بہت سے عادات واطوار ملتی جلتی ہیں دونوں میں دوستی کی پینگیں اور زیادہ بڑھ جائیں گی۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔ بہت ممکن ہے ٹرمپ پاکستان کی امداد بند یا اس میں کمی کردے۔ اس سے ہمارے اوپر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بلکہ بہتر ہے کہ امداد دینے والے خود ہی قرض یا امداد دینا بند کردیں، تاکہ ہمارے ہاتھوں میں جو کشکول ہے وہ از خود گرجائے، ہمارے حکمراں تو کشکول کو پھینکنے کے موڈ میں نظر ہی نہیں آتے، قرض لینا ایک خوبی اور متعلقہ وزیر کی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ جو وزیر جتنا زیادہ اور جتنی آسانی سے بیرونی قرضہ ملک کو دلواتا ہے وہ شاباشی اور انعام واکرام کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ہمیں ٹرمپ سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی قطعاً ضرورت اس لیے نہیں کہ ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم ہیں، ہمارا ایمان اور بھروسہ اپنے پیدا کرنے والے پر پختہ ہے۔ امریکہ سے ہماری کوئی جنگ اور اختلاف نہیں، اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو وہ یہ کہ امریکہ ہمارے

دشمن پڑوسی ملک کو غیر ضروری طور پر مستحکم اور مضبوط نہ کرے، اقوام متحدہ نے کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کی جو قرارداد منظور کی ہوئی ہے جس سے بھارت مسلسل راہِ فرار اختیار کر رہا ہے، الٹا کشمیری عوام پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑ رہا ہے اس سے باز آجائے۔ امریکہ ہمیں کچھ نہ دے صرف اقوام متحدہ کی قرارداد پر عمل کرانے پر بھارت کو آمادہ کردے ہمارے لیے یہی کافی ہوگا۔ یہ ایک اچھی مثال ہے جو ٹرمپ نے قائم کی کہ اپنی جیت کے بعد اپنے خطاب میں اس نے ہیلری کی خدمات کی تعریف کی اور تمام امریکیوں کو پیغام دیا کہ وہ رنگ، نسل ،مذہب کی تفریق کے بغیر پوری قوم کی خدمت کریں گے۔ امید یہی کی جانی چاہیے کہ انھوں نے اپنی انتخابی مہم کے دوران امریکہ میں رہنی والی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے لیے جو منفی گفتگو کی اُسے بھی وہ بھلا دیں گے ، کوئی ایسی کاروائی نہیں کریں گے کہ جس سے امریکہ میں رہنے والے کسی بھی غیر امریکی کو پریشانی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ (16 نومبر 2016)

کراچی کا بے اختیار میئر۔حالت کیسے بہتر ہوگی

عہدہ خواہ کوئی بھی ہو اگر کچھ کرنے کا اختیار نہ ہو تو.بڑے سے.بڑا عہدہ بے معنی اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔اکثر سرکاری دفاتر میں کسی افسر کو سزا دینا مقصود ہوتی ہے تو اسے او ایس ڈی (OSD) یعنی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کا عہدہ دے دیا جاتا ہے جہاں پر وہ حاضری کا تو پابند تاہے لیکن اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہوتا، اس کے پاس اختیارات بھی نہیں ہوتے۔ایسی صورت حال میں وہ افسر اپنے ادارے پر بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔بعض صورتوں میں سرکاری افسر کو (Suspend) یعنی کردیا جاتا ہے۔ کسی غلطی پر اپنے عہدے سے برخاست کردیا جاتا ہے۔ جیسے حال ہی میں ایس ایس پی ملیر راؤ انور کو ان کے عہدے سے برخاست کیا گیا تھا۔ایسی صورمیں وہ اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہے لیکن انہیں تمام تر مالی فوائد حاصل رہے یعنی تنخواہ ملتی رہتی ہے، البتہ اختیارات نہ ہونے کے باعث متعلقہ افسر بیکار اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کراچی جو پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔آبادی کے اعتبار سے، شہریوں کے معیار زندگی اور تعلیم کے اعتبار سے گویا شرح خواندگی کے اعتبار سے یہ شہر مختلف اور خاص خصوصیات لیے ہوئے ہے۔یہاں مختلف قومیں بستی ہیں جس کے باعث اسے منی پاکستان کا درجہ بھی دیا جاتا ہے۔کونسی زبان بولنے والا یہاں کا

باسی نہیں، کون سے مذہب کا پیروکار یہاں نہیں رہتا، عقائد کے اعتبار سے ، نظریات کے اعتبار سے یہ شہر اپنی الگ ہی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس شہر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ پاکستان کو سب سے زیادہ پیشہ کما کر بھی دیتا ہے ، اس شہر کی ایک خصوصیت اور خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ غریب پرور شہر ہے، یہاں کوئی آجائے یہ شہر اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، وہ یہاں بھوکا نہیں مرتا، کراچی شہر سے کوئی ایسی خبر آج تک نہیں سنی گئی کہ کوئی بھوک کی وجہ سے اپنے جان دھو بیٹھا ہو۔ اس وقت اس شہر میں بے شمار فلاحی اداروں کی جانب اور بے شمار ہوٹلوں کی جانب غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو تین وقت مفت کھانا کھلانے کا اہتمام ہے۔ ہوٹل یہ خدمت اپنی جانب سے نہیں کرتے بلکے ان ہوٹلوں نے کھانے کی فی کس رقم مختص کی ہوئی ہے لوگ جتنے لوگوں کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں رقم ہوٹل میں جمع کرادیتے ہیں، مثلاً گلشن اقبال کے ایک ہوٹل جو جعفری چشمے والے کے سامنے ہے فی کس کھانے کی رقم 25 روپے اور ناشتہ فی کس 40 روپے ہے۔ رقم دے کر آپ اپنی موجودگی میں غریبوں کو کھانا کھلا سکتے ہیں۔ بے شمار غریب اور بے سہارا ہوٹل کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ ایک اور خصوصیت شہر کراچی کی ایسی بھی ہے جس کا ذکر لازمی ہے وہ یہ کہ اس شہر کی سیاسی تاریخ یہ رہی ہے کہ یہ سیاسی اعتبار سے پورے ملک کے مقابلے میں مخالف سمت چلتا ہے۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے لوگ حکومت مخالف ذہن رکھتے ہیں۔ ایم کیوں ایم کی حمایت کو بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ملک کی حکمراں جماعتوں مسلم لیگ نون، پاکستان پیپلز پارٹی، تحریک انصاف کے خلاف فیصلہ تھا۔ ایم کیو ایم سے پہلے کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیں جب پورے

ملک میں جیئے بھٹو کی صدائیں گونج رہیں تھیں لیکن اس شہر کی ہوا مخالف سمت چل رہی تھی۔ نو ستاروں کی دھوم اور اس تحریک کو کراچی میں سب سے زیادہ پذیرائی ملی۔ بھٹو صاحب سے پہلے بھی یہاں کی سیاسی فضاء کسی ایک جماعت کے حق میں کبھی نہیں رہی۔ البتہ یہاں کا میئر دو مرتبہ جماعت اسلامی کا منتخب ہوتا رہا ہے۔ اس کے بھی سیاسی عوامل تھے۔ اب عرصہ ہوا اس شہر کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں یہاں مسائل کا انمبار لگ چکا ہے، اس کی سڑکیں کھنڈرات کا منظر پیش کر رہی ہیں، کوئی سڑک ایسی نہیں جس کے کنارے کوڑے کرکٹ کے انمبار نہ لگے ہوں۔ ٹریفک کا نظام انتہائی خراب حالت اختیار کرچکا ہے۔ بلدیاتی نظام کی بحالی کے بعد امید ہو چلی تھی کہ اب اس شہر کی حالت کچھ بہتر ہوجائے گی لیکن تمام تر امیدیں تاحال دم توڑتی نظر آ رہی ہیں۔ کہنے کو یہاں سے قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلی اور سینیٹرز بھی منتخب شدہ ہیں۔ عدالت اعظمیٰ کے ڈنڈے کے زور پر بلدیاتی نظام بھی بحال ہوگیا ہے۔ سال سے زیادہ ہوگیا، کونسلر، ڈپٹی چیئرمین، میئر اور ڈپٹی میئر بھی منتخب ہو چکے۔ انہیں ان کے دفتروں میں بٹھا بھی دیا گیا لیکن تمام عوام کے منتخب بلدیاتی نمائندے بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں، کوئی اختیار نہیں، کوئی بجٹ نہیں آخر کریں تو کیا کریں؟ یہ اقتدار بھی بڑی ظالم شہ ہے، اس ظالم نے تو باپ کے ہاتھوں بیٹے کو، بیٹے کے ہاتھوں باپ کو، بھائی کے ہاتھوں بھائی کو، شوہر کے ہاتھوں بیوی کو جیل میں ڈلوایا، اذیتیں دیں، حتیٰ کے جان سے مارنے میں بھی تعامل نہ کیا۔ اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے کے جس کی مثال نہیں ملتی۔

ہمارے قومی اور صوبائی اسمبلی کے اراکین ، سینیٹرز کو اپنے اپنے علاقوں میں چودھراہٹ قائم رکھنے کے لیے فنڈز درکار ہوتے ہیں، وہ اپنے من پسند لوگوں کو نوکریاں اور دیگر طرح سے نوازتے ہیں، علاقے کے لوگ چھوٹے بڑے کام کے لیے انہی چودھریوں کے پاس جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب بھلا بڑا چودھری کب چاہے گا کہ لوگ اسے گھانس نہ ڈالیں اور اپنے علاقے کے کونسلر، چیئر مین اور میئر سے تمام کام کرالیں۔ اس طرح تو ان کی چودھراہٹ کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ وہ کب اور کیوں چاہیں گے کہ بلدیاتی نظام کامیاب ہو، بلدیاتی نمائندوں کو بجٹ دیا جائے، اختیارات دیے جائیں ، ان کے شہر کا میئر با اختیار ہو وہ علاقے میں ترقیاتی کام کرے، صفائی ستھرائی کی نگرانی کرے۔ سڑکیں ، گلیاں اور دیگر ترقیاتی کام ہوں۔

کراچی میں بلدیاتی نظام کو قائم ہوئے سال ہونے کو ہے۔ کراچی کے میئر نے جیل سے میئر کا انتخاب لڑکرایک نئی روایت قائم کی ، میئر کو انتخاب میں حصہ لینے کے لیے جیل سے لایا گیا جہاں اس نے انتخاب لڑا اور جیت کر تاریخ میں ایک نئی روایت قائم کی۔

چار ماہ جیل میں رہا اور اپنے خلاف مقدمات لڑتا رہا، کوئی تیس مقدمات میں اس کے ضمانت ہوئی جس کے بعد اسے رہائی تو مل گئی ، اس نے اپنا آفس بھی سنبھال لیا ہے، بغیر اختیارات کے ، بغیر بجٹ کے میئر کراچی کھنڈر بن جانے والے شہر کو از سر نو کیسے کھڑا کر سکے گا۔ اس کے لیے صوبائی حکومت اور بر سر اقتدار سیاسی جماعت کو بڑا دل کرنا چاہیے۔ ملک میں بلدیاتی نظام کی بحالی اور انتخابات کے بعد میں نے ایک کالم تحریر

کیا تھا جو 18 جنوری 2016 کو روزنامہ جناح میں ''بلدیاتی نظام کی بحالی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس میں کہا تھا کہ ''اب جب کہ عوام کے منتخب نمائندوں نے حلف اٹھا لیا ہے، یونین کونسلز کی باضابطہ تشکیل عمل میں آچکی ہے اور اس کے نمائندے اپنی اپنی یوسیز میں پہنچ چکے ہیں، یوسیز کے منتخب چیرٔمین اور وائس چیرٔمینوں نے اپنے اپنے دفاتر سنبھال لیے ہیں۔ منتخب نمائندوں کو اپنا اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ صوبہ پنجاب میں نون لیگ اور صوبہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی بلدیاتی نمائندوں کو وہ تمام اختیارات دینے میں یقینا پس و پیش نہیں کریں گے اس لیے کہ بغیر اختیارات کے یہ نظام بے معنی ہو کر رہ جائے گا، غیر فعال نظام ملک اور عوام پر بوجھ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس نظام کو کامیاب اسی وقت بنایا جاسکتا ہے جب منتخب نمائندوں کو کام کرنے کا اختیار ہو، انہیں فنڈز فراہم کیے جائیں گے۔ بلدیاتی نظام جمہوریت کا ایک اہم ستون ہے، اس کے ذریعہ ملک میں جمہوری ادارے مضبوط ہوتے ہیں، عوام کے روز مرہ کے مسائل کا حل بلدیاتی نظام میں ہی ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو باہمی مشورے سے ملک میں بلدیاتی نظام کی کامیابی کے لیے دل بڑا کرنا چاہیے، بلدیاتی نمائندے عوام کے منتخب کردہ ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے ہی ہے۔ اس سطح پر جماعت اور سیاست سے بالا تر ہو کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چند شہروں کے علاوہ شہروں میں صفائی ستھرائی، سڑکوں کی خستہ حالی، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر، ٹریفک جام ہوجانے کے معاملات اس قدر گھمبیر صورت اختیار کر چکے ہیں کہ ان پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، یہ کام بلدیاتی نمائندوں کے کرنے کے ہیں یہ انہیں ہی کرنے چاہیں۔ سندھ حکومت بھی اپنا دل

بڑا کرے، اختیارات دے دینے سے سندھ حکومت کی نیک نامی ہی ہوگی، گلی محلوں میں بلدیاتی نظام کامیاب ہوگا تو عوام پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ حکومتوں پر ان کا اعتماد بڑے گا۔ شہروں کی ناگفتہ بہ حالت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ بلدیاتی نمائندوں کو وہ تمام اختیارات دوبارہ لوٹا دیے جائیں جو انہیں پہلے حاصل تھے۔ عوام کی فلاح و بہبود اسی مُضمِر ہے''۔اب بھی اسی بات کو دھراتے ہوئے حکومت سندھ کے اعلیٰ حکام خاص طور پر وزیر اعلیٰ، پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئر پر سن اور شریک چیرَپر سن سے اپیل ہے کہ مانا کہ الیکشن 2018 کی تیاری شروع کی جا چکی ہے، ہر سیاسی جماعت نے اب عوام کو اپنی جانب متوجہ کرنا ہے جس طرح میاں صاحب پورے ملک میں دھڑا دھڑ فیتے کاٹ رہے ہیں، امدادی رقوم کا اعلان کر رہے ہیں، تعلیمی اداروں کے قیام کے اعلانات اور ان کے لیے رقوم کا اعلان بھی کیا جارہا ہے۔ اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی بھی انتخابات میں بھرپور حصہ لے کر اپنی سابقہ حیثیت کو بحال کرنے کی ہر ممکن سعیٔ کرے گی۔ پی پی کے چیرَمین نے پنجاب پر اپنی نظریں گاڑ دی ہیں بلکہ انہوں نے پنجاب میں ہی رہنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ سندھ میں خاص طور پر متحدہ کے عتاب میں ہونے کے باعث ایک خلا ہے جسے پر کرنے کی ہر سیاسی جماعت کوشش کرے گی۔ کراچی میں یہ کوشش اگر کراچی کے میئر کے ذریعہ ہوجائے تو بھی عوام کی نظر میں پیپلز پارٹی کی وقعت بڑھے گی، لوگ اس پارٹی کی جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔ میئر بغیر اختیارات کے ہی آئندہ انتخابات تک چلتا رہا تو عتاب میں ہونے والی پارٹی مظلوم بن کر فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کراچی کی خستہ حالی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اس معاملے پر سندھ کی حکومت بہت ہی

سنجیدگی سے سوچے اور میئر کو اختیارات اور خاص ترقیاتی پیکج کا اعلان کرے۔ اگر کراچی کے عوام کی بھلائی مقصود ہے، ان کے لیے تھوڑا بہت بھی درد اور ہمدردی پائی جاتی ہے تو حکومت سندھ کو اس جانب سوچنا ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ کراچی کی گھمبیر صورت حال کے پیشِ نظر مرکزی حکومت بھی کراچی کے لیے خصوصی ترقیاتی پیکج کا اعلان کرے تو اس سے بھی کراچی کی حالت کافی حد تک بہتر ہو سکتی ہے۔ (22 نومبر 2016)

جنرل راحیل شریف۔ باوقار رخصتی

نومبر 2016 آخر آ ہی گیا اور جنرل راحیل شریف نے اپنے کہنے کے مطابق وقت 29 مقررہ پر ملازمت سے ریٹائر ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل کر کے دکھاتے بھی ہیں۔ بات ہے 2016 کے ابتدائی مہینوں کی یعنی جنوری اور فروری کی کہ اخبارات اور سوشل میڈیا پر جنرل صاحب کے بارے میں اس قسم کی خبریں گردش کرنے لگیں کہ وہ اپنی مدت ملازمت میں توسیع لینے کی خواہش رکھتے ہیں، پاکستانی عوام کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات کے حق میں نظر آتی تھی کہ معروضی حالات، ان کی خدمات اور کامیاب پالیسیوں کے پیش نظر انہیں اپنے عہدے پر برقرار رہنا چاہیے، پاکستان کے اندرونی حالات، دہشت گردی، بھارتی کی جانب سے باڈر پر مسلسل خلاف ورزی جیسے واقعات کا تقاضہ تھا کہ جنرل صاحب ابھی اس منصب پر براجمان رہیں۔ مجبوریاں اور خواہشات اپنی جگہ بااصول باکردار لوگ اپنے اصولوں اور قانون کی حکمرانی کو تمام باتوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنی خواہشات کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ ایسے بہ کردار لوگوں کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد رکھتی ہے ایسے باکردار لوگ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مثال بن جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جنرل راحیل شریف بھی ہیں جنھوں نے حالات کی سنگینی کا سہارا نہیں لیا، سامنے دکھائی دینے والی چکا

چوند روشنی کی جانب نہیں دیکھا بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوے ہر چیز کو قربان کردیا، بہ عزت، بہ احترام اپنے منصب سے سرخ رو ہونا مناسب جانا۔ اُسی زمانے میں یہ موضوع ٹی وی ٹاک شو میں بھی زیر بحث آنا شروع ہوا۔ کالم نگاروں نے اس موضوع پر کالم لکھنا شروع کردیے، کسی نے رائے دی کہ جنرل صاحب کو بھی توسیع ملنی چاہیے جیسا کہ ان سے پہلے سربراہان نے یہ اعزاز خوشی خوشی قبول کیا۔ بعض ایسے سربراہ بھی تھے کہ جنھوں نے از خود اپنے آپ کو توسیع دے لی۔ راقم الحروف اس رائے کے حق میں تھا کہ جنرل صاحب کا مزاج، کردار، عمل دیکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ وقت مقررہ پر باوقار طریقے سے رخصت ہوجائیں گے۔ انہیں قومی مفاد عزیز ہے اپنی ذات نہیں، میرا یہ کالم بعنوان ''سپہ سالار پاکستان کا صائب فیصلہ روزنامہ 'جناح' میں 29 جنوری 2016 کو شائع ہوا تھا۔ یہی کالم سوشل میڈیا '' خاص طور پر 'ہماری ویب' پر آن لائن موجود ہے۔

جنرل راحیل نے جب سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان سے دہشت گردی کو جڑ سے ختم کرکے دم لیں گے، ان کے اس عزم کا ساتھ پاکستان کے ہر طبقہ فکر نے کھلے دل سے دیا۔ دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کے لیے جو اقدامات سپہ سالار نے کیے اور جس طرح ان اقدامات پر عملی طور پر عمل عوام الناس کو نظر آیا، پاکستانی عوام کے دلوں میں سپہ سالار کی قدر و قیمت بڑھتی ہی گئی اور انہوں

نے محسوس کیا کہ جنرل راحیل شریف حقیقت میں پاکستان کے سچے ہمدرد، مخلص نیز انہیں ملک کی بہتری ہر چیز پر مقدم ہے۔ اس موقع پر پاک فوج کے ترجمان جنرل عاصم باجوہ نے سماجی ویب سائٹ ٹوئٹر پر یہ بیان جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''سربراہ پاک فوج جنرل راحیل شریف کی مدت ملازمت میں توسیع سے متعلق افواہیں بے بنیاد ہیں'' اس حوالے سے آرمی چیف جنرل راحیل شریف کا کہنا تھا کہ پاک آرمی عظیم ادارہ ہے اور مدت ملازمت میں توسیع پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملک سے دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کئے جانے والے اقدامات بھرپور طاقت کے ساتھ جاری رہیں گے، پاکستان کا وسیع تر ملکی مفاد مقدم ہے اور ہر قیمت پر ملک کو محفوظ بنایا جائے گا۔ آج جنرل صاحب کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہونے جا رہی ہے۔

باوجود اس کے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں جنرل راحیل شریف کا اسی حیثیت میں برقرار رہنا ملک اور قوم کے اعلیٰ تر مفاد میں ہے۔ ملک میں نیشنل ایکشن پلان کو ابھی پایۂ تکمیل تک پہنچنا باقی ہے، کراچی اور دیگر علاقوں میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ابھی مکمل نہیں ہوا، ملک میں کرپشن کے خاتمے کے لیے جاری آپریشن کو اپنے منطقی انجام تک پہنچنا باقی ہے۔ جو اہداف جنرل صاحب مکمل کرنا چاہتے تھے وہ ابھی پایۂ تکمیل کو پہنچنا باقی ہیں۔ دہشت گردی اور کرپشن کے ناسور کی جڑیں اس قدر گہری ہو چکی ہیں کہ اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے میں ایسی ہی سنجیدگی، تیزی، بلند حوصلے کی ضرورت ہے جو جنرل راحیل

شریف نے دکھائی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ان کا جانشین بھی انہی کے نقشہ قدم پر چلتے ہوئے ان اقدامات کو اسی تندہی سے جاری و ساری رکھے گا۔ جنرل راحیل شریف کا یہ فیصلہ ان کی عزت اور وقار میں اضافہ کا باعث ہوا ہے، ہمارے ملک میں طاقت ور یا اثر رسوخ رکھنے والے سرکاری ملازمین کے لیے مدت ملازمت میں توسیع لے لینا ایک ایسا کلچر بنا ہوا ہے کہ جس نے بعض اداروں کے ملازمین میں بددلی پیدا کر رکھی ہے، ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی لوگ اسی منصب پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید دنیا میں ان سے بہتر انسان پیدا ہی نہیں ہوا۔ جنرل راحیل کا یہ فیصلہ ملک میں مدت ملازمت میں توسیع کلچر کے خاتمے کا باعث بھی ہوگا۔

جنرل راحیل شریف کی نجی زندگی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ ایک راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہ خاندان روایتی طور پر فوجی ملازمت میں پیش پیش رہا ہے اور اب بھی ہے۔ وہ 16 جون 1956 کوئٹہ میں پیدا ہوئے، وہ ایک آرمی آفیسر میجر رعنا محمد شریف کے بیٹے ہیں۔ان کے بڑے بھائی میجر رعنا شبیر شریف 1971 کی جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہوئے اور نشان حیدر سے سرفراز ہوئے۔ ان کے ایک اور بھائی کیپٹن ممتاز شریف بھی آرمی آفیسر تھے، صحت کی خرابی کے باعث جلد ریٹائرمنٹ لے لی۔ جنرل راحیل شریف 1965 کی جنگ

میں دشمن کے دانت کھٹے کرنے والے، بہادری کے جوہر دکھانے والے پاکستان آرمی کا افتخار میجر عزیز بھٹی شہید کے بھانجے بھی ہیں۔ وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ ہیں۔ ایک بیٹا آرمی آفیسر ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی، اسی حوالے سے وہ اپنے الوداعی دوروں کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی بھی تشریف لے گئے اور طلبہ سے خطاب بھی کیا 1976 میں کمیشن حاصل کیا۔

قیام پاکستان سے اب تک یعنی 1947 سے 2016 تک 69 سالہ تاریخ میں پاکستان آرمی کو 15 سربراہان میسر آئے، گویا جنرل راحیل شریف 15 ویں چیف آف آرمی اسٹاف ہیں جو اب ریٹائر ہونے جارہے ہیں ان کی جگہ 16 ویں جنرل آرمی چیف ہوں گے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں (1947 ۔ 1951) کے درمیان پاکستان کو کوئی مسلمان آرمی چیف میسر نہیں آیا، پاکستان آرمی کے اولین چیف جنرل سرفرینک میسروی (Sir Frank Messervy) جو 15 اگست 1947 کو پاکستان آرمی کے اولین سربراہ بنے۔ یہ وہی میسروی ہیں کہ جن کے بارے میں حامد میر نے اپنے کالم 'نیا آرمی چیف' (جنگ 24 نومبر 2016) میں لکھا ہے کہ 'قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد بھارتی حکومت نے برطانوی سرکار کے نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت سے ریاست جموں وکشمیر پر فوجی قبضے کی کوشش شروع کی تو قائداعظم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے پاکستانی فوج کو حکم دیا کہ وہ بھارت کا راستہ روکے لیکن آرمی چیف نے قائداعظم کا حکم

ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار زبانی نہیں بلکہ عملی تھا۔ اس نے حکم تو سن لیا لیکن حکم پر عمل درآمد نہ کیا اور یوں بھارت نے آسانی سے ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ کر لیا"۔ اگر اُس وقت کوئی مسلمان چیف ہوتا تو وہ یقیناً قائدِ اعظم کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرتا اور آج کشمیر کی یہ صورت حال ہی نہ ہوتی۔ بد قسمتی سے سر فرینک میسروی کے بعد بھی کوئی مسلمان جنرل اس عہدے پر پورا نہیں اترتا تھا چنانچہ میسروی کے ریٹائرمنٹ (10 فروری 1948) کے بعد اسی دن جنرل سر ڈوگلس گریسی (General Douglas Gracey) نے آرمی کے دوسرے چیف کی ذمہ داریاں سنبھالیں، یہ 17 جنوری 1951 تک چیف کے عہدے پر تعینات رہا۔ جنرل محمد ایوب خان پہلے مسلمان اور پاکستانی جنرل تھے جنہوں نے جنرل گریسی کی جگہ فوج کی قیادت سنبھالی۔ ایوب خان صاحب کو آرمی کی سربراہی کا ایسا مزا آیا کہ انہوں نے جنرل اسکندر مرزا کو جو اس وقت ملک کے گورنر جنرل تھے برطرف کرکے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور صدارت کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ جنرل ایوب خان نے جرنل موسیٰ خان کو 27 اکتوبر 1958 کو پاکستان کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ یہ فوج کے تیسرے کمانڈر انچیف تھے۔ ایوب خان کی کرسی ڈاماڈول ہونے لگی، بھنور میں پھنس گئی، کوئی راستہ نہ رہا تو اقتدار اپنے ہم پیشہ فوجی جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا جنہوں نے 18 جون 1966 کو کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ جنرل یحیٰ خان کا دور پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور کہلاتا ہے اس لیے کہ پاکستان جب دو لخت ہوا تو وہ سربراہ تھے، جنرل نیازی

نے سابق مشرقی پاکستان میں بھارتی فوجی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ یحیٰ خان 20 دسمبر 1971 تک سربراہ رہیں۔ اب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے حاکم وقت بن چکے تھے انہوں نے 20 دسمبر 1971 کو جنرل گل حسن کو پاکستان کو چھٹا آرمی چیف مقرر کیا لیکن جنرل گل حسن کی مدت بہت ہی مختصر رہی وہ تین ماہ بعد 5 مارچ 1972 کو رخصت ہوگئے ان کی جگہ جنرل ٹکا خان کو کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھٹو صاحب نے بہت ہی سیدھے سادھے جنرل بقول شخصے اللہ میاں کی گائیں نظر آنے والے جنرل ضیاء الحق کو یکم جنوری 1976 کو آرمی کا سربراہ مقرر کیا یہ پاکستان آرمی کے آٹھویں چیف تھے۔ بھٹو صاحب نے 7 سینئر جنرلوں پر فوقیت دیتے ہوئے ضیاء الحق کا انتخاب کیا تھا۔ خیال یہی رہا ہوگا کہ یہ شخص سیدھا سادھا ہے۔ وفادار اور فرمانبردار ثابت ہوگا۔ جنرل صاحب کیسے فرمانبردار ثابت ہوئے کہ بھٹوں صاحب کو تختہ دار پر لٹکا کر ہی دم لیا۔ جنرل ضیاء الحق نے 11 جنوری 1977 کو ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا اور ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ البتہ انہوں نے ازراہ عنایت جنرل مرزا اسلم بیگ کو وائس چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر دیا تھا۔ یہ فیصلہ بھی قدرت کی جانب سے تھا۔ ضیا صاحب آرمی چیف بھی تھے اور صدر مملکت بھی۔ انہیں ہٹانے والا کوئی نہیں تھا سوائے اس ذات کے جو اوپر بیٹھی ہے جو سب سے طاقت ور ہے جو وہ چاہتی ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ پل بھر میں کیا سے کیا ہوجائے گا کسی کو معلوم نہیں۔ 17 اگست 1988 کو ضیاء الحق صاحب بذریعہ فوجی

جہاز بہاولپور سے روانہ ہوتے ہیں، کئی اہم شخصیات بشمول کئی جنرلز ان کے ساتھ تھے۔ طیارے کو فضاء میں ایسا حادثہ پیش آتا ہے کہ اس میں موجود ایک جان بھی نہیں بچ پاتی۔ ضیاء الحق اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں، جنرل اسلم بیگ آرمی کے سربراہ بن جاتے ہیں۔ اب نواز شریف صاحب کا دور حکمرانی شروع ہوجاتا ہے۔ مرزا اسلم بیگ صاحب کے ریٹائرمنٹ میں کچھ وقت باقی ہوتا ہے کہ نواز شریف صاحب کی جانب سے جنرل آصف نواز جنجوعہ کو سربراہی سونپ دی جاتی ہے، جنوری 1993 میں جنجوعہ صاحب اچانک وفات پاجاتے ہیں چنانچہ نواز شریف صاحب کی جانب سے جنرل عبدالوحید کاکڑ کو آرمی چیف بنا دیا جاتا ہے۔ کاکڑ صاحب 12 جنوری 1996 تک اپنے منصب پر فائز رہتے ہیں اور ریٹائر ہوجاتے ہیں۔ اب پاکستان کی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ تھیں انہوں نے فوج کے سینئر ترین جنرل جہانگیر کرامت کو 12 جنوری 1996 کو چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کیا۔ جنرل جہانگیر کرامت کی مدت ملازمت ابھی چندماہ باقی تھی کہ میاں صاحب کادور اقتدار شروع ہوگیا اور میاں صاحب سے جہانگیر کرامت کے کچھ اختلافات ہوگئے، اب فوج کے سربراہ کی حیثیت سے میاں صاحب کو 13 ویں سربراہ کا انتخاب کرنا تھا۔ خوب چھان پھٹک کی گئی، جنرل پرویز سینئر ترین جنرل نہیں تھے ان سے اوپر دو سینئر جنرل تھے لیکن میاں صاحب کو اردو بولنے والا جنرل زیادہ بھایا، شاید انہوں نے بھٹو مرحوم کی طرح یہی سوچا ہو کہ یہ بھی سیدھا سادھا بندہ ہے، کمانڈو ضرور رہ چکا ہے، سیاست اس کے بس کی بات نہیں، یہ وفاداری

میں بھی پیش پیش ہوگا۔ میاں صاحب نے 16 اکتوبر کو جنرل پرویز مشرف کو ملک کا واں چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کردیا۔ پھر کیا ہوا، سیدھے سادھے جنرل نے کیا 13 گل کھلائے، میاں صاحب کو تگنی کا ناچ نچا دیا، یہاں تک کے میاں صاحب جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی گئے بھلا ہو سعودی فرماں رواؤں کا کہ جنھوں نے پرویز مشرف کو اس بات پر تیار کرلیا کہ وہ میاں صاحب کی جاں بخشی کردیں ۔ جنرل صاحب اس وقت کل اختیارات کے مالک تھے، کیسا قانون، کہاں کا قانون، کیسی عدالت اور کیسا مقدمہ یک جُنبشِ قلم میاں صاحب اپنے اہل و عیال کے ہمراہ سلاخوں کے پیچھے سے سیدھے ائر پورٹ اور پھر جدہ۔ میاں صاحب یہ جا اور وہ جا، کہاں کی اخلاقیات، کہاں کے عوام، کیسی جمہوریت ، کیسی سیاست کہاں کی نون لیگ اور اور کہاکے نون لیگی ساتھی، بس اپنی اور اپنے خاندان کی خیر ہو ۔ اب جنرل پرویز مشرف آرمی چیف بھی تھے صدر پاکستان بھی، انتخابت ہوئے تو جنرل صاحب کی پارٹی کو بری طرح شکست ہو گئی۔ اب تو وردی اتارے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا، ملک کی سیاسی جماعتوں کا دباؤ، دوسری جانب ملک کے وکیلوں نے کمر باندھ لی کہ جنرل صاحب وردی اتار دیں باقی خیر ہے۔ پرویز مشرف صاحب نے بہت کوشش کی ، این آر او بھی کیا لیکن بات بنی نہیں آخر وردی اتارنا ہی پڑی ، جب وردی اتر گئی تو بغیر وردی کے بندے کی اوقات ہی بدل جاتی ہے۔ مشرف صاحب نے چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ چھوڑ کر 28 نومبر کو جنرل اشفاق پرویز کیانی کو فوج کا 14 واں چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کردیا۔ جنرل کیانی کے دور

حکومت میں علامہ آصف علی زرداری کی پانچ سالہ حکومت برقرار رہی، 2013 کے انتخابات میں زرداری صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی صرف سندھ تک محدود ہو کر رہ گئی جب کہ میاں نواز شریف صاحب پنجاب میں واضح اکثریت سے جیتے جس کے نتیجے میں انہوں نے مرکز میں بھی حکومت بنائی ۔ میاں صاحب کی یہ تیسری باری تھی جس کا قانونی اختتام 2018 کے انتخابات میں ہونا ہے۔ اس سے قبل کچھ ہو جائے تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ کیانی صاحب ان خوش قسمت چیف میں سے ہیں کہ جن کو جمہوری حکومت نے ان کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع ملی۔ حالات اچھے جا رہے تھے اس لیے جنرل کیانی فوج کی سربراہی کرتے رہے۔ 28 نومبر 2013 کو انہیں کہہ دیا گیا کہ 'بس ، نو مور' اور ان کی مدت ملازمت اختتام کو پہنچی اب میاں صاحب کا ایک اور امتحان شروع ہوا، سابقہ امتحانات اور ان کے نتائج ان کے سامنے تھے۔ ان کی روشنی میں انہوں نے جنرل کیانی کی خالی کردہ کرسی پر کسی نئے جنرل کو بٹھانا تھا۔ یہ فیصلہ یقینا مشکل ہوتا ہے کہ جب ایک سے ایک بڑھ کر شخصیات سامنے ہوں اور آپ کو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو۔ اس وقت میاں صاحب نے جنرل راحیل شریف کا انتخاب کیا جو 29 نومبر 2013 کو عمل میں آیا۔ تین سال مکمل ہونے پر حالات کا تقاضہ کچھ اور ہی تھا لیکن جنرل راحیل مزاج مختلف ہے، وہ عزت اور وقار سے چلے جانا چاہتے تھے ، وہ اپنے اس فیصلے پر ڈٹے رہے اور آج وہ دن آ ہی گیا کہ وہ پاکستانی عوام کے دلوں میں بسے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے منصب سے جدا ہو رہے ہیں ، یہ کہنے

میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستانی عوام کی اکثریت اس حق میں ہر گز نہیں کہ جنرل راحیل شریف یہ عہدہ چھوڑیں۔ انہیں جنرل صاحب سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ نہیں معلوم وہ پوری ہوسکیں گی یا نہیں۔ لیکن وطن عزیز کے لیے ان کے کارنامے خاص طور پر ضرب عضب، کراچی آپریشن، دہشت گردی کے خاتمے کے حوالے سے جو اقدامات کیے وہ لائق تحسین ہیں اور تاریخ کا حصہ رہیں گے۔ پاکستان کی تاریخ میں ان کا مقام اور مرتبہ بلند اور سنہرے الفاظ سے لکھا جائے گا۔ اب میاں صاحب نے پاکستان آرمی کے 16 ویں آرمی چیف اور چیرٔمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کا انتخاب کرنا تھا جو انہوں نے کر دیا ہے۔ سینئر جنرل جن کی فہرست انہیں فراہم کی گئی تمام کے تمام جنرل ایک سے ایک بڑھ کر تھے، ان میں سے کسی کا انتخاب تو ہونا ہی تھا وہ ہوگیا۔ لیفٹینینٹ جنرل قمر باجوہ آرمی چیف جن کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہے اس وقت جی ایچ کیو میں انسپکٹر جنرل آف ٹریننگ اینڈ ایویلوایشن تعینات ہیں، انہوں نے کور کی کمان کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جنرل زبیر حیات کو جوائنٹ چیف آف اسٹاف 10 کمیٹی مقرر کردیا گیا ہے۔ جنرل راحیل شریف تین سال مکمل کرنے کے بعد 29 نومبر کو آرمی چیف کی حیثیت سے ریٹائر ہوجائیں گے۔ جنرل راحیل شریف کی 2016 ریٹائرمنٹ جس پر وقار اور بہ احترام طریقے سے عمل میں آرہی ہے وہ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھی جائے گی، وہ پاکستانی عوام کے دلوں میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ جنرل راحیل شریف کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو قلم سے

قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے طویل وقت اور تحقیق کی ضرورت ہے، ان پر ایک نہیں بلکہ بے شمار کالم، مضامین ہی نہیں بلکہ تصانیف لکھنے کی ضرورت ہے۔ چار صفحات پر مشتمل کالم لکھنا ان کی با وقار رخصی کے شایان شان ہر گز نہیں ، اس کا مقصد تو محض انہیں رخصت کرنے والے قلم قبیلے میں اپنی شمولیت اور جنرل صاحب کو خراج تحسین پیش کرنا مقصود ہے۔ان کی شخصیت اور عظیم کارناموں پر مستقبل کا مورخ یقینا لکھے گا، تحقیق ہوگی اور ان کے خدمات اور کارناموں کا اجاگر کیا جائے گا اور ہونا بھی چاہیے۔ابتدائی طور پر کالم نگار روزنامہ 'خبریں' کے میگزین ایڈیٹر ندیم نظر نے ایک کتاب '' عہدِ راحیل شریف: پاک فوج کے کارہائے نمایاں'' مرتب کی ہے۔ بنیادی طور پر کتاب ندیم نظر کے ان کالموں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے جنرل راحیل شریف، افواج پاکستان ، ضرب عضب، دہشت گردی کے خلاف اقدامات، دہشت گردوں کے حملے، سانحہ اے پی ایس، پشاور، واہ فیکٹری، کومبنگ آپریشن، فضائیہ کے کیمپ پر حملہ اور دیگر موضوعات پر تحریر کیے۔ کتاب اس اعتبار سے قابل تعریف ہے کہ یہ جنرل راحیل شریف کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر منظر عام پر آئی۔ بہ الفاظ دیگر ندیم نظر کی یہ کتاب جنرل راحیل شریف کی بطور آرمی چیف خدمات کا بڑی جامعیت کے ساتھ تذکرہ پیش کرتی ہے۔ (28 نومبر 2016)